زندگی آمیز اور ...ٹ، ۲۳۲
...یرالدین ہاشمی، ۳۲۹
...طفیل، ۳۳۷
...، ۳۴۳

نقوش

لاہور

شخصیات نمبر

طبع ثانی

جنوری ۱۹۵۶ء

مرتب

محمد طفیل

قیمت
سات روپے آٹھ آنے

ادارۂ فروغِ اردو

سالانہ قیمت
۱۵ روپے

ترتیب

	شخصیت	شخصیت نگار
۱	محمد حسین آزاد	آغا محمد باقر، ۹
۲	مولانا شبلی نعمانی	سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ۱۸
۳	حالی	خواجہ غلام الحسنین، ۲۶
۴	مہدی افادی	عبدالماجد دریابادی، ۳۶
۵	مولانا عبدالحلیم شرر	خاکی قزلباش، ۴۵
۶	گرامی	عزیز ملک، ۵۶
۷	مولانا وحیدالدین سلیم	روشن پانی پتی، ۶۳
۸	مرزا رسوا	علی عباس حسینی، ۶۸
۹	آغا حشر	عشرت رحمانی، ۷۳
۱۰	میر ناصر علی	انصار ناصری، ۹۲
۱۱	مولانا راشد الخیری	فضل احمد خاں دہلوی، ۱۰۳
۱۲	اقبال	ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ۱۰۸
۱۳	فانی	جوش ملیح آبادی، ۱۱۵
۱۴	مرزا عظیم بیگ چغتائی	شاہد احمد دہلوی ۱۲۱
۱۵	سید سجاد حیدر یلدرم	قرۃ العین حیدر، ۱۳۰
۱۶	مولوی عنایت اللہ دہلوی	شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی، ۱۴۳
۱۷	پروفیسر شیرانی	ڈاکٹر سید عبداللہ ۱۵۰
۱۸	مرزا فرحت اللہ بیگ	مرزا عصمت اللہ بیگ، ۱۶۰
۱۹	حسرت موہانی	جلیل قدوائی، ۱۶۸
۲۰	مولانا سید سلیمان ندوی	سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ۱۸۰
۲۱	شمس العلماء مولوی عبدالرحمٰن	نواب خواجہ عبدالحمید دہلوی، ۱۸۹
۲۲	آرزو لکھنوی	چودھری جلیل احمد، ۱۹۱

(۲)

	شخصیت	شخصیت نگار
۲۳	ڈاکٹر مولوی عبدالحق	عبادت بریلوی، ۱۹۵
۲۴	ابوالکلام آزاد	غلام رسول مہر، ۲۳۵
۲۵	علامہ دتاتریہ کیفی	رحمت قطبی، ۲۴۲
۲۶	خواجہ حسن نظامی	ملا واحدی، ۲۵۱
۲۷	مولانا عبدالماجد دریابادی	حکیم عبدالقوی دریابادی، ۲۵۸
۲۸	ڈاکٹر ذاکر حسین	ڈاکٹر سید عابد حسین ۲۶۷
۲۹	مرزا محمد سعید	اشرف صبوحی، ۲۷۵
۳۰	مولانا حامد حسن قادری	ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، ۲۸۰
۳۱	رشید احمد صدیقی	آل احمد سرور، ۲۸۵
۳۲	مجنوں گورکھپوری	فراق گورکھپوری، ۲۹۵
۳۳	ڈاکٹر زور	رفیعہ سلطانہ، ۳۰۵
۳۴	اثر لکھنوی	شیخ ممتاز حسین جونپوری، ۳۱۲
۲۵	جگر صاحب	رشید احمد صدیقی، ۳۱۶

۳۶	حفیظ جالندھری	عزیز ملک، ۳۳۲
۳۷	امجد حیدر آبادی	نصیر الدین ہاشمی، ۳۲۹
۳۸	عابد صاحب	محمد طفیل، ۳۳۷
۳۹	مخفی کہستانی	میرزا ادیب، ۳۴۳
۴۰	مولانا صلاح الدین احمد	وزیر آغا، ۳۴۹
۴۱	چودھری محمد علی ردولوی	بیگم اخلاق حسین، ۳۵۴
۴۲	عندلیب شادانی	ڈاکٹر شوکت سبزواری، ۳۵۹
۴۳	ڈاکٹر شوکت سبزواری	سید مشکور عظیم، ۳۶۶

(۳)

۴۴	منٹو ماموں	حامد جلال، ۳۷۳
۴۵	کرشن چندر	مہندر ناتھ، ۳۸۵
۴۶	عصمت چغتائی	خالد لطیف، ۳۹۱
۴۷	راجندر سنگھ بیدی	کنہیا لال کپور، ۳۹۶
۴۸	احمد ندیم قاسمی	خدیجہ مستور، ۴۰۱
۴۹	خواجہ احمد عباس	صالحہ عابد حسین، ۴۱۱
۵۰	ممتاز مفتی	مسعود قریشی، ۴۲۱
۵۱	قرۃ العین حیدر	ابن سعید، ۴۲۹
۵۲	دیوندر ستیارتھی	پرکاش پنڈت، ۴۳۶
۵۳	خدیجہ مستور	ہاجرہ مسرور، ۴۴۱
۵۴	شفیق الرحمٰن	محمد خالد اختر، ۴۴۸
۵۵	تسنیم سلیم چھتاری	سلمیٰ خورشید منیر، ۴۵۹

۵۶	پروفیسر [illegible]	مجتبیٰ حسین، ۴۶۴
۵۷	فیض احمد فیض	ایلس فیض، ۴۷۴

۵۸	کنہیا لال کپور	فکر تونسوی، ۴۸۰
۵۹	شاہد احمد دہلوی	جمیل جالبی، ۴۸۵

۶۰	کلیم الدین احمد	قاضی عبدالودود، ۴۹۴
۶۱	سردار صاحب	وقار عظیم، ۴۹۷

(۴)

۶۲	لاہور کی چند ادبی شخصیتیں	عابد علی عابد، ۵۰۵
۶۳	دلی کی چند ادبی شخصیتیں	شاہد احمد دہلوی، ۵۱۵
۶۴	لکھنؤ کی چند ادبی شخصیتیں	شوکت تھانوی، ۵۳۲
۶۵	حیدر آباد دکن کی چند ادبی شخصیتیں	قطب النسا ہاشمی، ۵۴۹

انتظاریہ

۶۶	سر سید احمد خان	مولوی عنایت اللہ، ۵۵۹
۶۷	ڈپٹی نذیر احمد	قاری عباس حسین، ۵۶۳
۶۸	ریاض خیر آبادی	رئیس احمد جعفری، ۵۶۷
۶۹	پریم چند	جنیندر کمار، ۵۷۱

۷۰	سر عبدالقادر	ڈاکٹر محمد باقر، ۵۷۹
۷۱	ڈاکٹر تاثیر	بیگم تاثیر، ۵۸۵
۷۲	میراجی	محمود نظامی، ۵۸۹
۷۳	ظفر علی خاں	شورش کاشمیری، ۵۹۵
۷۴	نیاز فتحپوری	ابوالخیر مودودی، ۶۰۴
۷۵	پطرس	صوفی تبسم، ۶۰۹
۷۶	جوش ملیح آبادی	احتشام حسین، ۶۱۶
۷۷	عبدالمجید سالک	احمد ندیم قاسمی، ۶۲۵
۷۸	چراغ حسن حسرت	ظہیر بابر، ۶۳۱
۷۹	غلام رسول مہر	خلیل الرحمٰن داؤدی، ۶۳۶
۸۰	وقار عظیم	اقبال عظیم، ۶۴۲
۸۱	ابواللیث صدیقی	صابر علی خاں، ۶۴۷
۸۲	عبادت بریلوی	مبین احسن کلیم، ۶۵۱
۸۳	غلام عباس	پریم ناتھ در، ۶۵۵
۸۴	حجاب امتیاز علی	شوکت تھانوی، ۶۵۸
۸۵	ہاجرہ مسرور	احمد ندیم قاسمی، ۶۶۱
۸۶	شوکت تھانوی	عشرت رحمانی، ۶۷۴



محمد حسین آزاد



سر سید احمد خاں







ڈپٹی نذیر احمد



مولانا حالی







سجاد حیدر یلدرم



[illegible]



فرحت اللہ بیگ



مہدی افادی



سر عبدالقادر



حسرت موہانی



ڈاکٹر تاثیر



آرزو لکھنوی



ڈاکٹر عبدالحق



ابوالکلام آزاد



ظفر علی خاں



دتاتریہ کیفی



خواجہ حسن نظامی



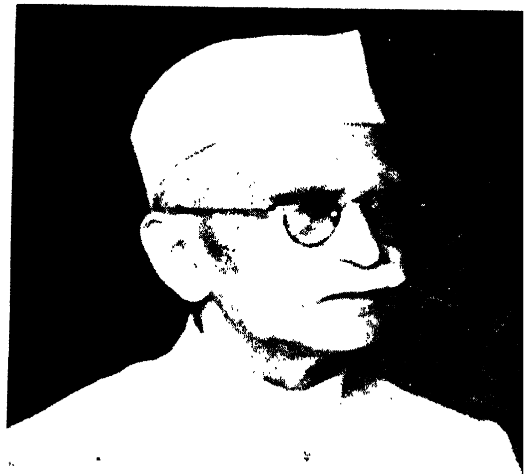
ڈاکٹر ذاکر حسین



غلام رسول مہر



ڈاکٹر عابد حسین



اثر لکھنوی



جوش ملیح آبادی



حفیظ جالندھری



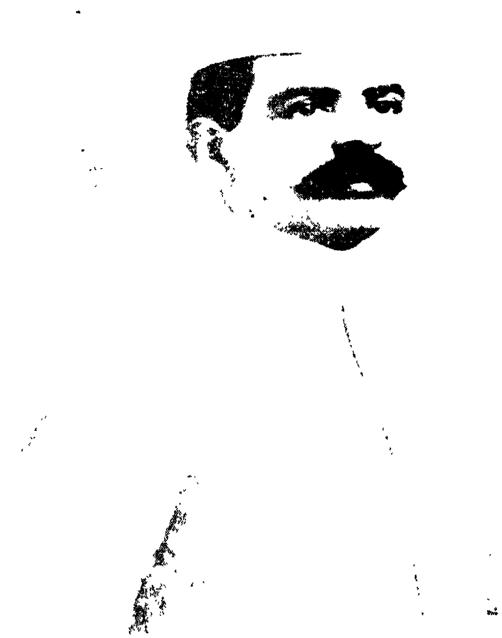
جگر مراد آبادی



فراق گورکھپوری



محرس



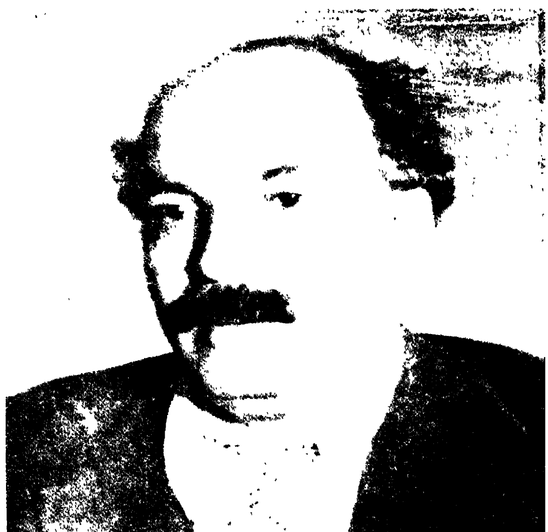
چودھری محمد علی ردولوی



کلیم الدین احمد


عبد المجید سالک


چراغ حسن حسرت


صلاح الدین احمد


عابد علی عابد



کرشن چندر



منٹو



ممتاز مفتی



احمد ندیم قاسمی



عصمت چغتائی



ہاجرہ مسرور







شاہد احمد دہلوی



ظفر ندیم





طلوع

محمد طفیل

اِن ابتدائی صفحات میں کیا کہوں اور کیا نہ کہوں ——— کچھ کہنا بھی چاہوں گا۔ تو سوائے معذرتوں کے اور کوئی بات ہی ذہن میں نہ آئے گی۔ اگر اس نمبر کی ترتیب و تدوین اور مشکلات کے بارے میں کچھ کہتا ہوں۔ تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے کسی کو بھی ہمدردی نہ ہو گی۔ اس لئے مناسب یہ ہو گا۔ کہ چند ایک ضروری باتیں کہہ کے چُپ ہو جاؤں۔

جی چاہتا ہے۔ کہ شخصیت کے موضوع پر بھی چند سطریں لکھوں۔ پھر خیال آتا ہے۔ کہ موضوع مشکل ہے۔ دوسرے بعض اہلِ قلم نے ضمناً اِس موضوع پر (زیرِ نظر شمارہ میں) بہت کچھ کہہ دیا ہے۔ اس لئے کہنے کی نئی بات کہاں سے لاؤں گا ——— لہٰذا یہ بات بھی گئی۔

اب لے دے کے اِس پرچے کی ترتیب کے بارے میں کچھ عرض کرنا باقی رہ جاتا ہے۔ ممکن ہے۔ کہ اس کام کے لئے کوئی بھی مجھ سے بہتر ثابت نہ ہو۔ اِس نمبر کی شانِ نزول، معیار اور افادیت کے ضمن میں سوائے اس کے کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ کہ اتنے اچھوتے موضوع پر اب تک جتنا کام ہُوا ہے۔ وہ دوسری اصنافِ ادب کے مقابلہ میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ اگر گنے چنے اہلِ قلم بھی اِس طرف توجہ نہ کرتے۔ تو اس صنفِ ادب کا اللہ ہی حافظ تھا۔

آج سے اسّی نوّے برس بعد ہم میں سے کوئی بھی اِس بھری دنیا میں زندہ نہ ہو گا۔ جیسے آج سر سیّد اور آزاد کے دَور سے پہلے کا کوئی بھی دیدہ ور موجود نہیں ہے۔ جو ہمیں یہ بتا سکے۔ کہ غالبؔ ایسے تھے اور مومنؔ ایسے تھے۔

یہ تسلیم کہ تذکروں، مکاتیب اور اِکّا دُکّا مضامین سے اُن مشاہیر کی شخصیت کو آج بھی کچھ کچھ سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن کسی شخصیت کے بارے میں مخلصانہ، عین اور ذاتی مشاہدہ جتنا اس شخصیت کو اجاگر کر سکتا ہے۔ وہ تذکروں، مکاتیب اور مضامین سے ممکن ہی نہیں۔ اسی کمی کے شدید احساس نے مجھ سے یہ کٹھن کام کرا لیا ہے۔

سر سیّد سے لے کر موجودہ دَور تک کے مشاہیر پر شخصی نوعیت کے مضامین[1] انہی کے دوستوں اور عزیزوں سے لکھوائے گئے ہیں۔ سر سیّد سے اس نمبر کو اس لئے شروع کیا ہے۔ کہ یہ ادب کی زندگی میں ایک موڑ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بعض مجبوریوں کی بنا پر اِس پرچے کی کوئی باضابطہ ترتیب نہیں رہی۔ اس لئے کہ بعض وہ مضامین، جو ترتیب کے اعتبار سے ابتدا میں آنے چاہیئے تھے۔ وقت پر نہ مل سکے۔ جو وقت پر میسّر آ گئے تھے۔ انھیں ترتیب کے ساتھ پیش کر دیا گیا ہے۔

پہلے حصّہ میں صرف مرحومین کو رکھا ہے۔ خواہ وہ آج سے پچاس برس پہلے ہم سے رخصت ہوئے ہوں۔ خواہ ایک برس پہلے، پھر بھی اس حصّہ میں زمانی

---

[1] مضامین کا مفہوم یہاں PERSONAL SKETCHES ہے۔

ترتیب موجود ہے۔ اِن مشاہیر کی شمولیت اِس حقیقت کی دلیل ہے۔ کہ ان سب کی ادبی حیثیت مسلّمہ ہے۔

دوسرے حصّہ میں وہ اہلِ قلم شامل ہیں۔ جو اپنی ایک مستقل ادبی حیثیت بنا چکے ہیں۔

تیسرے حصّہ میں آج کے نقاد، شاعر اور افسانہ نگار ہیں۔ جن میں سے بیشتر کی ادبی خدمات کو تسلیم کئے بغیر چارہ کار نہ ہوگا۔ بہت ممکن ہے۔ اس حصّہ میں کچھ نام کھٹکیں۔ لیکن میں نے ان کی بے پناہ صلاحیتوں اور خداداد ذہانت کے خوف سے شامل کر لیا ہے۔ اِس لئے کہ اِس کا بڑا امکان ہے۔ کہ وہ چند ہی برسوں کے بعد اپنے پیشروؤں سے پیچھے نہ رہیں۔ چونکہ اِس نمبر کی آج کے لئے کم اور کل کے لئے زیادہ اہمیت ہے۔ اس لئے اِن سب کی شمولیت ناگزیر تھی۔

اِس حصّہ کے بعد ایک بڑا ہی اہم سیکشن اُردو کے مرکزوں یعنی لاہور، دلّی، لکھنؤ اور حیدر آباد دکن کی کچھ نمایاں علمی و ادبی شخصیتوں کے بارے میں ہے۔ جو نامکمل بھی ہے اور مکمل بھی، مکمل اس لئے کہ ایک دَور کی شخصیتیں آگئی ہیں۔ اور نامکمل اس لئے کہ کسی ایک اہلِ قلم سے یہ توقع رکھنا مناسب نہیں۔ کہ وہ شخصی طور سے سب (نئے اور پرانوں) کو جانتا ہو۔ یہ حصّہ اس لحاظ سے بھی بڑا کارآمد ہے کہ بعض اُن اہم ادبی شخصیتوں کا بھی ذکر آگیا ہے۔ جن پر الگ الگ مضامین حاصل کرنا میرے بس میں نہ تھا۔

آخری حصّہ انتظاریہ ہے۔

اِس حصّہ میں بعض مضامین ایسے ہیں۔ جو بڑی مشکلوں سے ملے۔ تاخیر کا سبب بھی یہی مضامین ہوئے۔ اِن مضامین کی عدمِ اشاعت، اِس نمبر کی نمایاں خامی ہوتی۔ اتنی تاخیر بھی گوارا کی۔ اور جتنی انسانی کوششیں ہو سکتی تھیں۔ اُن سے بھی کام لیا۔ پھر بھی کچھ شخصیتوں پر مضامین حاصل نہ ہو سکے۔ خدا نے چاہا تو اِس کمی کو آئندہ پورا کر دیا جائے گا ——— اس حصّہ کی ترتیب بھی حسبِ سابق ہے۔ پہلے مرحومین ہیں۔ جو سرسیّد سے شروع ہو کر میرا جی پر ختم ہوتے ہیں۔ پھر وہ اہلِ علم ہیں۔ جن کے قلم کی سحر کاریوں سے موجودہ ادب مالا مال ہے۔ یہ حصّہ ظفر علی خاں سے غلام رسول مہر تک ہے۔ ان کے بعد نئے تقاضوں سے گہری وابستگی رکھنے والے نقاد و افسانہ نگار ہیں ——— میرے خیال میں شوکت تھانوی اور حجاب امتیاز علی کو اس سے پہلے حصہ میں آنا چاہیئے تھا۔ لیکن یہ دونوں مضامین اتنی تاخیر سے ملے کہ میں انہیں اس جگہ رکھنے پر مجبور ہو گیا۔

کچھ مضامین تاخیر سے ملنے کے سبب شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔ اُن میں اصغر گونڈوی، مسعود حسن رضوی، یگانہ، احتشام حسین، اختر حسین رائے پوری، مجاز، جذبی اور اختر انصاری ہیں۔ یہ سب کے سب اہلِ قلم اُردو ادب میں مسلّمہ حیثیت کے مالک ہیں۔ اس لئے ان کی عدمِ شمولیت میرے لئے بھی بار گذری ہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، و علامہ مشرقی پر بھی (صرف ان کی ادبی حیثیت کے پیشِ نظر) مضامین حاصل کئے تھے۔ جنہیں دوسرے مضامین کے ساتھ آئندہ پیش کر دیا جائے گا۔

اس نمبر میں زیادہ تر اسکیچ ہیں۔ اور یہی ہمارا مقصد تھا۔ صرف چند مضامین ایسے ہیں۔ جو اسکیچ کی بجائے سوانحی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ چونکہ ایسے مضامین سے بھی شخصیت کے خدوخال اجاگر ہوتے ہیں۔ اس لئے موضوع کی مطابقت کے پیشِ نظر انہیں بھی شریکِ اشاعت کر لیا گیا ہے۔

بعض مضامین ہمیں انگریزی اور ہندی میں موصول ہوئے۔ اُن کا اُردو ترجمہ پیش کرنے کے سلسلے میں مکین حسن کلیم اور پرکاش پنڈت کا شکر گذار ہوں ——— جوش ملیح آبادی اور مولانا صلاح الدین احمد پر مضامین ڈاکٹر عبادت بریلوی اور حالی، سرسیّد پر مضامین شیخ محمد اسمٰعیل صاحب پانی پتی کی وساطت سے ملے۔ میں ان حضرات کا بھی شکر گذار ہوں۔

آخر میں مجھے آپ سے پھر یہی کہنا ہے۔ کہ میری کوتاہیوں سے درگذر فرمائیں۔ جن شخصیتوں پر مضامین نہیں چھپ سکے۔ اُن سے تو معذرت ضروری ہی تھی لیکن میری سادگی ملاحظہ ہو کہ میں اُن سے بھی معذرت خواہ ہوں۔ جن کے تذکرے اس نمبر کی زینت ہیں۔ بہت ممکن ہے کسی کو اپنا تذکرہ نہ دیکھ کر اور کسی کو دیکھ کر افسوس ہو۔ اِن تصریحات اور اعترافِ عجز کے بعد اِس نمبر کو ملاحظہ فرمائیں۔

؎۱ - ابھی ابھی ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کا تار ملا ہے۔ کہ "عماد الملک پر مضمون بھیج رہا ہوں" ——— کاش یہ مضمون ذرا پہلے ملتا۔ اب یہ مضمون بھی آئندہ پیش کیا جائیگا۔

(۱)

رفتید، ولے نہ از دلِ ما

فیضی

محمد حسین آزاد

مولانا شبلی نعمانی

حالی

مہدی افادی

مولانا عبدالحلیم شرر

گرامی

مولانا وحیدالدین سلیم

مرزا رسوا

آغا حشر

میر ناصر علی

مولانا راشد الخیری

اقبال

فانی

مرزا عظیم بیگ چغتائی

سید سجاد حیدر یلدرم

مولوی عنایت اللہ دہلوی

محمود شیرانی

مرزا فرحت اللہ بیگ

حسرت موہانی

مولانا سید سلیمان ندوی

شمس العلما مولوی عبدالرحمٰن

آرزو لکھنوی

مولانا محمد حسین آزاد

آغا محمد باقر

مولانا مرحوم کے بزرگ عہدِ نادری میں ہمدان سے ہندوستان آئے اور جہان آباد میں آباد ہوئے۔ علومِ عقلی و نقلی سے آراستہ اور پیراستہ تھے اور انہی کی برکت سے گذر اوقات ہوتی تھی۔ مولانا کے دادا مولانا محمد اکبر دہلی کے نامی گرامی مجتہد تھے اور ان کے گھر میں علومِ دین کا مدرسہ جاری تھا۔ تشنگانِ علوم دور دور سے آکر اپنی پیاس بجھاتے تھے۔ مولانا محمد اکبر کے فرزند مولانا محمد باقر پہلے اسی مدرسے میں پڑھے۔ پھر میاں عبدالرزاق کے درس میں شامل ہوئے۔ میاں صاحب دہلی کے مشہور فاضل تھے اور کابلی دروازے میں درس دیا کرتے تھے۔ وہیں مولانا محمد باقر سے شیخ ابراہیم (ذوق) کی ملاقات ہوئی۔ کئی برس تک یہ دونوں ایک ہی استاد کے دامنِ شفقت میں تربیت پاتے رہے۔ نیکی اور محبت کی بنیاد استقلال پر ہوتی ہے، اس لئے یہ رابطہ آخر دم تک قائم رہا۔ ایک ساتھ پلے، ایک ساتھ بڑھے، ہر سکھ میں شریکِ حال رہے اور تھوڑے فاصلے سے اس فانی دنیا سے رخصت ہوئے۔ ذوق اپنا کلام انہی کے پاس جمع کیا کرتے تھے۔

مولانا محمد باقر اپنے والد کے اکلوتے بیٹے تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت پر پوری توجہ صرف کی گئی۔ علومِ مروّجہ اور علومِ دینی کی تکمیل کے بعد وہ دہلی میں تحصیلدار مقرر ہوئے۔ ایک عرصہ تک ملازمت کی۔ آخر اپنے والد کے مشورے سے ملازمت ترک کر دی اور علومِ مذہبی کی ترویج و تعلیم میں مصروف ہوئے۔ جدت پسند طبیعتیں ہر حال میں اپنے لئے نئے نئے راستے ڈھونڈھ نکالتی ہیں۔ ۱۸۳۶ء میں جب پریس کو آزادی ملی تو انہوں نے دہلی سے پہلا اردو اخبار جاری کیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک مطبع بھی قائم کیا۔ جس میں مولانا کی تالیفات اور دوسری کتابیں شائع ہوا کرتی تھیں۔ اس پریس کا نام پہلے مطبع جعفریہ اور پھر اردو اخبار پریس رکھا۔ اس کے لئے مولانا مرحوم نے کشمیری دروازہ (دہلی) کے اندر ایک بہت بڑا مکان بہ نیتِ وقف تعمیر کرایا۔ استاد ذوق نے اس کی تاریخِ تعمیر کہی۔

ع سعادت گاہِ امامِ دارین

اسی مکان میں مولانا مرحوم کا مدرسہ اور کتب خانہ تھا۔ انہوں نے نادر اور بیش بہا کتب کا ذخیرہ افادۂ عام کے لئے جمع کیا تھا۔ مولانا کی تنوّع پسند طبیعت نے ایک اور مشغلہ بھی اختیار کیا۔ اپنے مکان کے قریب ایک بہت بڑا احاطہ بنوایا۔ جس کے چاروں طرف کوٹھریاں تھیں اور بیچ میں بہت بڑا صحن۔ اس میں غیر ممالک کے تاجر آکر ٹھہرتے اور ہفتے میں ایک دن اپنے مال کی نمائش کرتے۔ اس کا نام

"نیلام گھر" تھا۔ یہ نہ صرف آمدنی کا ذریعہ تھا بلکہ اس کے ذریعے مختلف ممالک کے حالات سے بھی واقفیت حاصل ہوتی تھی۔

اس دور کے مسلمان انگریزوں سے تعلقات رکھنا مذہباً معیوب سمجھتے تھے۔ لیکن دہلی کالج کے پرنسپل مسٹر ٹیلر سے مولانا کی گاڑھی چھنتی تھی۔ یہ اُن کے اور وہ اِن کے ہر کام میں شریک تھے۔

۱۸ ربیع الاول کو مولانا محمد باقر کو خداوند تعالیٰ نے ایک فرزند عطا کیا۔ ان کے دلی دوست شیخ ابراہیم ذوقؔ نے "ظہورِ اقبال" تاریخ پیدائش کہی۔ محمد حسین نام رکھا۔ اپنے والد کی طرح وہ بھی اپنے باپ کے اکلوتے بیٹے تھے۔ پہلے گھر میں دینی تعلیم دی۔ پھر علومِ مروّجہ کی تکمیل مسٹر ٹیلر پرنسپل دہلی کالج کے مشورے سے دہلی کالج میں کی۔ مضمون نویسی میں ہمیشہ اول آتے تھے اور انعام پاتے تھے۔ کالج کے زمانے میں ماسٹر پیارے لال آشوب مولوی نذیر احمد، منشی ذکاء اللہ ان کے ہم مکتب تھے۔ منشی صاحب مرحوم سے ان کی دلی دوستی تھی جو آخر دم تک اسی طرح نبھ گئی۔

دہلی کالج سے فارغ ہونے کے بعد استاد ذوقؔ کی خدمت میں باقاعدہ حاضر ہونے لگے۔ اپنے فرائض سے فارغ ہوکر بعدِ عصر ان کی قدم بوسی کے لئے جاتے اور رات گئے تک ان کی خدمت میں حاضر رہتے۔ جب تک استاد زندہ رہے یہ وتیرہ اسی طرح قائم رہی۔ ان کے دل میں اپنے استاد کی اس قدر عظمت تھی کہ جہاں کہیں وہ ان کا ذکر کرتے ہیں۔ خون کے آنسو ٹپک پڑتے ہیں۔ استاد ذوقؔ بھی ان پر خاص توجہ رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی تحریروں میں ہر جگہ مولانا مرحوم انہیں استادِ ظاہر و باطن لکھتے ہیں۔ انہیں اپنے استاد کا کلام بیشتر زبانی یاد تھا۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مولانا آزاد نے اپنے والد کے پریس اور اخبار کو سنبھالا۔ ان کے مضامین اور طرزِ تحریر سے یہ اخبار بے حد مقبول ہوا اور غدر ۱۸۵۷ء تک باقاعدہ جاری رہا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی پر مولانا بے لاگ تنقید کرتے رہتے۔ اس لئے مغلیہ سلطنت کا جام زندگی لبریز ہونے کے بعد اس اخبار کی تمام کاپیاں بحق حکومت ضبط کر لی گئیں۔ جن کے پاس اس کے پرچے تھے انہوں نے حکومت کے خوف سے ضائع کر دیئے۔ کچھ پرچے حیدرآباد دکن میں لالہ چھٹن لال کے پاس موجود ہیں۔ اس کے اکثر اقتباسات مختلف اخباروں میں چھپ چکے ہیں۔

جب دلّی میں غدر پڑا، مولانا کی عمر کوئی تیس برس کی تھی۔ دہلی کالج کے پرنسپل مسٹر ٹیلر ان کے والد کے گہرے دوست تھے۔ وہ کالج کے کچھ کاغذات لے کر مولانا کے گھر آ گئے اور چار دن چھپے رہے۔ آخر باغیوں کو پتہ چل گیا کہ مسٹر ٹیلر مولانا کے ہاں روپوش ہیں۔ دروازے کے سامنے بہت سے شورہ پشت جمع ہو گئے اور شور مچایا کہ ٹیلر کو ہمارے حوالے کر دو۔ سمجھانے بجھانے سے یہ لوگ تو چلے گئے لیکن مسٹر ٹیلر اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگے۔ دوسرے دن علی الصبح وہ اپنے ضروری کاغذات مولانا محمد باقر کے حوالے کرکے گھر سے نکلے کہ کشمیری دروازے سے باہر نکل جائیں اور انگریزی فوج سے جا ملیں۔ لیکن باغی ان کی تاک میں تھے۔ انہوں نے نکلتے ہی بھانپ لیا۔ وہ بھاگ کر مولانا محمد باقر کی مسجد میں گھسے۔ انہوں نے وہاں سے بھی گھسیٹ نکالا اور پاؤں میں رسی باندھ کر گلیوں میں گھسیٹتے پھرے۔ یہاں تک کہ وہ ہلاک ہو گئے۔

جب دلّی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو مولانا محمد باقر مسٹر ٹیلر کی ہدایت کے بموجب ان کے کاغذات لے کر انگریز حاکم کے پاس پہنچے۔ وہ کاغذات دیکھتے ہی آگ بگولا ہو گیا اور پوچھا مسٹر ٹیلر کہاں ہیں؟ انہوں نے جواب دیا۔ انہیں تو لوگوں نے مار دیا۔ اس نے حکم دیا، انہیں گرفتار کر لو اور گھر ضبط کر لو۔ اِدھر مولانا گرفتار ہوئے، اُدھر کامیاب سپاہی گھر میں گھس آئے۔ گھر میں ۲۲ نیم جان تھے سنگینیں دکھا کر انہیں گھر سے نکال دیا اور تمام املاک بحق سرکار ضبط ہو گئی۔

مولانا محمد حسین آزادؔ ان سب کو لے کر گھر سے نکلے۔ قریب ہی "دھوبی واڑہ"[1] تھا۔ وہاں جا کر گلی میں بیٹھ گئے۔ ابھی یہ طے بھی نہ کر پائے تھے کہ کہاں جائیں کہ ایک گولا پاس آکر گرا اور مولانا کی ایک دودھ پیتی بچی دھماکے سے دہل گئی کئی دن بعد وہ اسی حالت میں جاں بحق ہو گئی۔ یہ قافلہ وہاں سے اٹھ کر برف خانہ

---

[1] جہاں اب دلّی میں کناٹ پیلس ہے۔

وہاں پہنچ کر آرام کا سانس لیا۔ کئی وقت کے بعد روٹی کھائی اور خدا کا شکر کیا۔

اردو اخبار کے ایک منشی سونی پت کے رہنے والے تھے۔ وہ اور ان کے بیوی بچے بھی مولانا کے ساتھ تھے۔ انہوں نے کہا، سب لوگ سونی پت چلیں۔ مولانا نے اہلِ خاندان کو ان کے ساتھ سونی پت روانہ کیا اور خود دہلی واپس آ گئے کہ اپنے شفیق باپ کی خبر لیں۔ چند دن ایک سکھ کرنیل کے پاس قیام کیا۔ وہ ان کے والد کا دوست تھا۔ اسی کے ذریعے سائیس کے لباس میں ایک دن دہلی دروازے کے باہر خونی دروازے کے سامنے میدان میں ان عمائدینِ شہر کو دیکھا جنہیں گولی مارنے کا حکم دیا گیا تھا۔ انہی میں ان کے والد بزرگوار بھی تھے۔ وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ بعد نماز دور سے نظریں چار ہوئیں انہوں نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ چلے جاؤ اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ دو چار روز بعد معلوم ہوا کہ انہیں گولی مار کر شہید کر دیا گیا۔

مولانا روتے دھوتے، صبر کی سل سینے پر رکھے، پریشان حال دہلی سے روانہ ہو گئے۔ سر پر استاد کے کلام کا پلندہ تھا۔ یہی بھرے گھر میں سے اٹھایا تھا کہ اگر ان کا کلام برباد ہو گیا تو ان کا نام بھی باقی نہ رہے گا۔ دریا کے پل کے قریب پہنچے تھے کہ ایک گورے نے للکارا" او بڈھا! ادھر آؤ" پلندہ کی طرف اشارہ کیا اور پوچھا" اس میں کیا ہے؟" مولانا ابھی جواب بھی نہ دینے پائے تھے کہ اس نے سنگین سے پلندہ اتار پھینکا۔ کاغذات تتر بتر ہو گئے۔ اس نے دیکھ کر کہا" جاؤ بھاگ جاؤ" مولانا نے جلدی جلدی منتشر کاغذات اکٹھے کئے اور پلندہ سر پر رکھ دریا پار اتر گئے۔ جیب میں ایک کوڑی نہ تھی۔ جگہ جگہ مسجدوں اور سراؤں میں ٹھہرتے، محنت مزدوری کرتے۔ آخر چلتے چلتے لکھنؤ جا پہنچے۔ لکھنؤ میں اکثر لوگ واقف تھے اور مدت سے لکھنؤ دیکھنے کی تمنا تھی۔ وہاں کے ادیبوں سے ملے۔ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے معرکے دیکھے۔ ان کی مجلسوں میں شریک ہوئے۔ کہیں نہ کہیں سے میر تقی مرحوم کے بیٹے کو بھی ڈھونڈ نکالا۔ ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی سعادت حاصل کی اور جب ان سے رخصت ہوئے تو بطور تبرک ان سے چند اشعار لکھوا کر حرزِ جاں بنا لئے۔ یہ تبرک اب بھی میرے پاس محفوظ ہے۔

اطلاع ملی کہ ان کے وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے ہیں اور گرفتار کرانے والے کے لئے پانسو کا انعام مقرر ہوا ہے۔ یہ سن کر گھبرا گئے۔ اپنا مختصر سا سامان اٹھایا اور لکھنؤ سے بھی روانہ ہو گئے۔ آخر چلتے چلاتے مدراس جا پہنچے۔ نیل گری کے ملٹری سکول میں ایک استاد کی ضرورت تھی وہاں ملازمت کر لی۔ چند مہینے ملازمت کی اور وہاں سے بمبئی آ گئے۔ کچھ عرصہ بمبئی میں رہے۔ فارسی زبان کی تحقیقات کا بچپن کا شوق تھا۔ بمبئی میں پارسیوں کے موبدوں سے ملے، ان کے مذہبی صحیفے دیکھے اور ان کی زبان کا جائزہ لیا۔ آخر وہاں بھی زیادہ دن نہ رہ سکے۔ وہاں سے چلے تو پنجاب کا رخ کیا۔ مالوہ میں سے ہوتے ہوئے، شہر شہر کی سیر کرتے، سنگرور (ریاست جیند) میں آ کر دم لیا۔ یہ چھوٹی سی مگر محفوظ جگہ تھی۔ اتفاق کی بات کہ وہاں محکمۂ فوجداری میں محافظ دفتر کی اسامی خالی تھی۔ مولانا نے درخواست دی اور یہ اسامی انہیں مل گئی۔ فروری ۱۸۵۹ء سے لے کر نومبر ۱۸۶۰ء تک نہایت جانفشانی سے ملازمت کی۔ خوشنودی کی سند حاصل کی اور وہاں سے استعفا دے دیا۔

اس کے بعد مولانا جگراؤں (ضلع لدھیانہ) آئے۔ یہاں سے ارسطو جاہ خان بہادر سید رجب علی شاہ "مجمع البحرین" کے نام سے ایک اخبار نکالتے تھے۔ وہ علوم دینی میں مولانا کے والدِ ماجد کے شاگرد تھے۔ اپنے استاد زادے کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے۔ مولانا کی حالت ایسی خراب ہو گئی تھی کہ وہ انہیں پہچان بھی نہ سکے۔ مولانا نے ان کے پریس میں ملازمت اختیار کر لی۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ مولانا ان کے استاد کے بیٹے ہیں تو انہوں نے سر آنکھوں پر بٹھایا اور تقاضا کیا کہ اپنے اہلِ خانہ کو یہیں بلا لیجئے۔ مولانا کو اہلِ خاندان کی اور اہلِ خاندان کو مولانا کی مطلق خبر نہ تھی۔ خط لکھا۔ جب یہ خط سونی پت پہنچا تو سب کی جان میں جان آ گئی۔ نذریں نیازیں دی گئیں۔ غرض کچھ عرصے بعد یہ لوگ جگراؤں آ گئے۔ ارسطو جاہ نے حقِ شاگردی ادا کیا اور لوگوں کو اس طرح اپنے ہاں رکھا جس طرح انہی کے خاندان کے رکن ہیں۔

جگراؤں میں انہیں ہر طرح کا آرام اور آسائش حاصل تھی۔ لیکن ارادوں اور آرزوؤں کا خون ہوتے جاتا تھا۔ دسمبر ۱۸۶۰ء میں ڈائرکٹر تعلیم دورہ کرتے ہوئے کی نو ہے۔ پہنچے اور وہاں ڈاک بنگلے میں ٹھہرے۔ مولانا نے اس موقع کو غنیمت جانا اور ان سے ملاقات کی۔ چاہتے تھے کہ محکمۂ تعلیم میں ملازمت مل جائے نتھیں اور بیچ میں۔

اور میں ملک اور قوم کی خدمت کر سکوں۔ ڈائرکٹر تعلیم نے ان خیالات کی قدر کی اور مدد کرنے کا وعدہ کیا۔

مولانا کے بہنوئی سیالکوٹ میں پوسٹ ماسٹر تھے۔ کچھ عرصہ کے لئے وہ سیالکوٹ آئے اور وہاں سے ایک دم کشمیر جنت نظیر کی سیر کا ارادہ کر لیا۔ کشمیر کی سیر کر کے واپس آئے تو سیالکوٹ ہی میں مقیم ہو گئے۔ یہاں پرانی اور نایاب کتابوں کی تجارت شروع کر دی۔ جہاں سے کوئی اچھی کتاب ملتی خرید لیتے، پھر بڑے بڑے امیروں کو خطوط کے ذریعے اطلاع دیتے کہ میرے پاس فلاں فلاں کتاب برائے فروخت موجود ہے۔ ابھی یہ سلسلہ اچھی طرح چلنے بھی نہ پایا تھا کہ ان کے بہنوئی لاہور تبدیل ہو گئے۔ ان کے ساتھ مولانا بھی لاہور آ گئے۔ یہاں ارسطو جاہ گورنر پنجاب سرہنری لارنس کے میر منشی تھے۔ ان کی خط و کتابت تمام تر فارسی میں ہوتی تھی۔ ارسطو جاہ نے یہ کام مولانا کے سپرد کر دیا۔ اس دور میں انہوں نے لاتعداد فرمان اور چٹھیاں فارسی میں لکھیں جن میں سے اکثر کی نقلیں میرے پاس محفوظ ہیں۔

اسی زمانے میں پوسٹ ماسٹر جنرل کے دفتر میں کچھ عرصہ بلا تنخواہ کام کیا۔ آخر ۱۹ اپریل ۱۸۶۱ء سے تیس روپے ماہوار پر ڈیڈ لیٹر آفس میں ملازم ہو گئے۔ یہاں وہ ڈاک خانے کے اعلانات کا ترجمہ کرتے تھے۔ دسمبر ۱۸۶۲ء میں دو سال کی ملازمت کے بعد انہیں ملتان لائن پر بحیثیت اوورسیئر تبدیل کر دیا گیا۔ اگرچہ تنخواہ زیادہ ملتی۔ لیکن وہ لاہور سے باہر جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ آخر استعفا دے دیا۔ پوسٹ ماسٹر جنرل ان کے کام سے خوش تھا۔ اس نے ڈائرکٹر تعلیم میجر فلر کے نام ایک سفارشی چٹھی دی جس میں لکھا کہ "مولوی صاحب بلاشبہ عالم آدمی ہیں اور محکمۂ تعلیم کے لئے نہایت موزوں ہیں۔"

مولانا لدھیانہ میں میجر فلر سے مل چکے تھے۔ یہ چٹھی لے کر ان سے پھر ملاقات کی۔ اتفاق کی بات کہ ادھر انہوں نے استعفا دیا اور ادھر محکمۂ تعلیم میں ۲۵ روپے ماہوار پر ملازمت کی اسامی مل گئی۔ یہاں سے مولانا کی ادبی اور علمی زندگی کا آغاز ہوتا ہے اور وہ زمانہ شروع ہوتا ہے جس کے ایک مدت سے وہ آرزومند تھے۔ اس سے پہلے وہ سکشا سبھا لاہور کی تعلیمی انجمن کے لئے "آئینۂ عبرت" تصنیف کر چکے تھے۔ یہ کتاب انہوں نے لڑکیوں کے لئے لکھی تھی، ڈائرکٹر تعلیم نے اسے پسند کیا تھا اور وہ اس پر حکومت سے انعام دلوانے کا وعدہ کر چکے تھے۔

بہر حال مولانا سکشا سبھا کے سرگرم رکن تھے۔ نمائش پنجاب کے لئے انہوں نے اردو کی فہرست اور اشیائے نمائش کی تفاصیل نہایت محنت سے تیار کیں۔ ۱۸۶۴ء میں انہوں نے نئے انداز سے عربک گرامر تصنیف کی۔ اس کے بعد علم منطق پر ایک رسالہ مغربی انداز میں لکھنے کی محکمے سے اجازت مانگی۔

۱۸۶۴ء میں انجمن پنجاب قائم ہوئی۔ مولانا اس کے بھی ممتاز رکن تھے۔ تھوڑے دن بعد اس کے سیکرٹری منتخب ہو گئے اور ان کی تنخواہ ۷۵ روپے ماہوار ہو گئی۔ جب انجمن نے اپنا رسالہ مطالب عنیدہ کی اشاعت کے لئے جاری کیا تو مولانا ہی اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ رسالے میں انجمن کی روئداد اور وہ مضامین شائع ہوتے تھے جو انجمن کے جلسوں میں پڑھے جاتے تھے۔ مولانا کی ان تھک کوششوں سے انجمن اور اس کا رسالہ بہت زیادہ مقبول ہوا۔ سارے ہندوستان میں اس کی مانگ تھی۔ اس کے ساتھ ہی انجمن کی شاخیں ملک کے بڑے بڑے شہروں میں قائم ہو گئیں۔ جن کی رہنمائی مرکزی انجمن کرتی تھی۔

اب مولانا کا دائرۂ اثر بڑھنا شروع ہوا اور ان کے جوہر چمکنے لگے۔ وہ شب و روز انجمن کے کام میں منہمک رہتے۔ ہر علم دوست اور پڑھے لکھے فرد سے ملتے۔ کسی کو انجمن کی شرکت کے لئے آمادہ کرتے، کسی کو مضمون لکھنے کے لئے رضامند کرتے، کسی کو انجمن کا ممبر بناتے۔ کسی سے انجمن کے کتب خانے کے لئے کتابیں بطور عطیہ لیتے، کسی سے مستعار کتابیں مانگتے۔ اس طرح مولانا کی کوششوں سے انجمن دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرتی چلی گئی۔ تھوڑے عرصے میں وہ روشنی کا مینار بن گئی۔ سب اسے حیرت و استعجاب سے دیکھتے تھے۔ مرکزی انجمن میں شریک ہونے کے لئے دور دور کے شہروں سے لوگ آتے۔ چندہ کر کے امدادی رقوم بھیجتے اور انجمن کی کامیابی کے لئے دعائیں کرتے۔ اکثر مضمون لکھ کر بھیجتے اور درخواست کرتے کہ بعد از اصلاح اسے انجمن کے جلسے میں پڑھ کر سنا دیا جائے۔

یہ انجمن عملی میدان میں بھی پیش پیش تھی۔ اس نے مدرسے کھولے، مشرقی علوم کی تعلیم کا انتظام کیا، باقاعدہ امتحان لینے اور سندیں دینے کا طریقہ

اختیار کیا۔ اعلیٰ قابلیت کے طلبہ کو انعام اور وظائف دیئے۔ انہیں ملازمتیں دلوانے کے لئے سفارشیں کیں۔ بہت تھوڑے عرصے میں وہ دیسی علوم کی یونیورسٹی کے نام سے مشہور ہوگئی۔ انگلستان کے اخباروں میں اس کے متعلق نہایت ہمت افزا الفاظ میں مقالے لکھے گئے اور آگے چل کر اسی کی بنیادوں پر پنجاب یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔

انجمن کے جلسوں کی رونق بڑھانے اور اس میں مزید دلکشی پیدا کرنے کے لئے مولانا نے ایک مشاعرہ بھی جاری کیا۔ یہ مشاعرہ جلسۂ انجمن کے بعد ہوا کرتا تھا۔ عموماً ایک مصرعِ طرح فارسی کا ہوتا اور دوسرا اردو کا۔ مشاعرے میں جس ترتیب سے غزلیں پڑھی جاتیں، اسی ترتیب سے رسالے کے آخر میں شائع کر دی جاتیں۔ اس سے رسالے کی مقبولیت میں مزید اضافہ ہوا۔ میں بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ یہ مشاعرہ لاہور کی تاریخ میں پہلا باقاعدہ مشاعرہ تھا۔

۱۸۶۵ء میں حکومتِ ہند نے ایک مشن سنٹرل ایشیا کی سیاسی حالت کا جائزہ لینے کے لئے روانہ کیا۔ مولانا بھی اس کے ایک رکن تھے۔ اس کے دو ممبر افغانستان کی حدود سے آگے نہ جا سکے۔ قدم قدم پر جان کا خطرہ تھا اور راستوں کا حال معلوم نہ تھا۔ لیکن مولانا نے ہمت نہ ہاری۔ سفر کا شوق، علمی تحقیقات اور معلومات مہیا کرنے کا جذبہ ان کے قدم آگے ہی بڑھاتا رہا۔ افغانستان کا سفر کرنے کے لئے پشتو سیکھی۔ ترکی زبان میں شُد بُد پیدا کی۔ وہ جہاں جاتے، وہاں کے لوگوں میں اس طرح گھل مل جاتے کہ وہ انہیں اپنا آدمی سمجھتے۔ سفر کرتے کرتے وہ روس کے علاقے میں جا پہنچے۔ حکومتِ ہند کو مدتوں سے خطرہ تھا کہ روس ہندوستان پر حملہ کر دے گا۔ انہوں نے روس کی فوجی طاقت کا پتہ لگایا۔ فوجی چوکیاں دیکھیں۔ آنے جانے کے راستوں کا جائزہ لیا۔ کئی جگہ مصیبتوں میں گھر گئے۔ کہیں وحشیوں کے ہاتھوں میں پھنس گئے۔ کہیں کافر سمجھ کر پکڑ لیا گیا اور قتل کا فتویٰ بھی صادر ہو گیا۔ کہیں جاسوس جان کر دھر لئے گئے۔ مولانا کمالِ ہمت اور استقلال سے ان تمام مصیبتوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ زندگی باقی تھی۔ اس لئے ہر جگہ کسی نہ کسی ترکیب سے جاں بخشی ہو گئی۔ ادھر عزیز و اقربا ان کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے کہ ڈیڑھ سال بعد بخیریت واپس آ گئے۔

سنٹرل ایشیا کی سیاحت سے آ کر چند دن لاہور میں قیام کیا۔ دوست احباب سے ملے۔ انجمن پنجاب کے جلسے میں شریک ہوئے۔ انہیں دیکھ کر دوستوں کو خوشی ہوئی۔ سب نے شکایت کی کہ آپ کے جانے کے بعد انجمن کی صحبتیں پھیکی پڑ گئیں۔ رسالہ نیم جان ہو گیا۔ مشاعرے بند ہو گئے۔ مولانا نے کہا۔ میں کلکتہ سے آ کر پھر وہی کیفیت پیدا کر دوں گا۔ چنانچہ مولانا کلکتے روانہ ہو گئے۔ چند دن دہلی میں قیام کیا۔ شہر بہ شہر ہوتے "گھوڑا ڈاک" میں کلکتے جا پہنچے۔

کلکتے کے قیام میں وہاں کے ادیبوں سے ملے۔ مختلف کتب خانے دیکھے۔ اپنے لئے نایاب کتابیں خریدیں۔ وہاں کے مدرسوں اور مکتبوں کا معائنہ کیا۔ سرکاری افسروں سے ملے۔ یہ سفر اگرچہ بڑا طویل تھا۔ لیکن ہر جگہ تیز رفتار سواریوں کا خاطر خواہ انتظام ہو جاتا تھا۔ اس لئے مولانا کو اس سفر میں کوئی خاص تکلیف پیش نہ آئی۔ کلکتے سے آ کر مولانا نے انجمن کو پھر سنبھالا۔ احباب کا تقاضا تھا کہ کلکتے کے حالات سنائیں۔ ایک جلسے میں انہوں نے کلکتہ کے سفر کا نقشہ کھینچا اور ان لوگوں کے حالات سنائے جن سے انہیں ملاقات کا فخر حاصل ہوا تھا۔

اب مولانا نے انجمن کے جلسوں میں زبانِ اردو کی تاریخ اور شعرائے اردو پر لکچروں کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ یہ لکچر بڑے مقبول ہوئے۔ وہ باقاعدہ انجمن کے رسالے میں چھپتے رہے اور ملک کے دوسرے رسالے انہیں اپنے پرچوں میں نقل کرتے رہے۔ یوں سمجھئے یہ ان کی معرکۃ الآرا کتاب آبِ حیات کی داغ بیل تھی۔ جو ۱۸۸۱ء میں منڈھے چڑھی۔

۱۸۶۷ء سے لے کر ۱۸۶۹ء تک مولانا بچوں کے لئے اردو کی ریڈریں تیار کرتے رہے۔ وہ خود فرماتے ہیں: "یہ کام بڑا مشکل تھا۔ بوڑھا ہو کر بچہ بننا پڑا۔ شب و روز اسی خیال میں رہتا تھا۔ کام کرنے کا زمانہ اور تمام دماغی صلاحیتیں اس کام میں صرف ہو گئیں، جب کہیں جا کر بچوں کے لئے یہ کھلونے تیار ہوئے۔" لطف یہ ہے ان سے کوئی مالی فائدہ مقصود نہ تھا۔ یہ ملک اور قوم کی ضرورت کی چیزیں تھیں اسی زمانے

میں سلسلہ تصنیف و تالیف کے ساتھ "ہمائے پنجاب" کے ایڈیٹر کے فرائض بھی انجام دیتے رہے جو سرکاری اخبار تھا۔

مولانا کے حسنِ لیاقت کو دیکھتے ہوئے ۱۸۶۹ء میں انہیں لاہور گورنمنٹ کالج میں عربی کا پروفیسر مقرر کیا گیا۔ حکومت نے اتنی عنایت ضرور کی کہ اس اسامی کی پوری تنخواہ یعنی ۱۵۰ روپے ماہوار عنایت فرمائے۔ اس وقت دوسرے پروفیسروں کو بمشکل پچاس اور ساٹھ روپے ملتے تھے۔ اس نوازشِ خاص سے اگرچہ مولانا کو آرام کا سانس ملا۔ اور اپنے علمی شوق کی تکمیل اور تصنیف و تالیف کا موقع ہاتھ آیا۔ لیکن ہم پیشہ طبقے میں ان کے دشمن بھی پیدا ہو گئے جو ان کے عروج کو اپنی سُبکی خیال کرتے تھے۔

۱۸۷۴ء میں ۸ مئی کو انجمن پنجاب کے مکان میں ایک خاص جلسہ ہوا۔ مولانا نے اردو شاعری کے متعلق ایک پُرزور تقریر کی جس میں عشقیہ شاعری کی قباحتوں پر روشنی ڈالی۔ اور نیچرل شاعری کی طرف شعراء کی توجہ مبذول کی۔ آخر میں نمونے کے طور پر "شام کی آمد اور رات کی کیفیت" پر ایک طویل نظم پڑھی جسے حاضرین نے بے حد پسند کیا۔ اراکین نے فیصلہ کیا کہ آئندہ سے ہر مہینے ایک عنوان دے دیا جائے اور شعرائے کرام اسی پر طبع آزمائی کیا کریں۔ یہ مشاعرہ گیارہ مہینے جاری رہا۔ سارے ملک میں اس کا چرچا تھا۔ قدامت پسند لوگوں نے اس کی مخالفت بڑی شدت سے شروع کر دی۔ جب یہ مخالفت حدِ ادب سے گذر گئی تو مصلحتاً مشاعرہ بند کر دیا گیا۔ لیکن کیسی نیک ساعت تھی، جب نیچرل شاعری کی بنیاد رکھی گئی۔ اس پر جو سربفلک عمارت تعمیر ہوئی وہ آج آسمان سے باتیں کر رہی ہے اور اپنے بانی کا نام رہ رہ کر یاد دلاتی ہے۔

مولانا ستمبر ۱۸۸۵ء میں سیاحتِ ایران کے لئے تشریف لے گئے۔ مدت سے ارادہ تھا کہ اپنا آبائی وطن دیکھیں۔ لغت آزاد اور سخندانِ فارسی کی تکمیل کروں۔ لیکن موقع نہ ملتا۔ سوءِ اتفاق سے مولانا کی اکلوتی بیٹی کا انتقال ہو گیا۔ انہیں بڑے شوق سے پڑھایا تھا۔ تصنیف و تالیف کے کام میں وہ بڑی مدد دیتی تھیں۔ یہ صدمہ ان کے لئے اس قدر جانکاہ تھا کہ جنون کی سی حالت طاری ہو گئی۔ کسی کام میں دل نہ لگتا تھا۔ سیاحت مولانا کا محبوب مشغلہ تھا اور اس میں وہ دُکھ سُکھ سب کچھ بھول جاتے تھے۔ دوستوں سے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ سب نے منع کیا اور کہا سفر کی صعوبتوں سے طبیعت اور زیادہ خراب ہو جائے گی لیکن وہ اپنی طبیعت کو جانتے تھے۔ ان کے مشورے کی کچھ پروا نہ کی۔ کالج سے چھٹی لی۔ ضروری انتظام کئے اور سیرِ ایران کے لئے روانہ ہو گئے۔ ایران کا کونا کونا چھان مارا۔ سردی شدید تھی۔ بہ ... پڑ رہی ... لیکن انہوں نے ہمت نہ ہاری۔ سخندانِ فارس کی تکمیل کی۔ فارسی بول چال سکھانے کے لئے رائج الوقت زبان میں ایک کتاب تیار کی اور تقریباً ایک سال بعد واپس آئے۔ ان کی غیر حاضری میں لاہور کی ادبی محفلیں سونی پڑ گئی تھیں۔ احباب نے ایک بڑا جلسہ کیا جس میں مولانا نے سیرِ ایران کی کیفیت سنائی۔ اس جلسے میں شریک ہونے کے لئے دور دور سے لوگ آئے۔

مولانا آزاد ملازمت سے بد دل ہو چکے تھے۔ بات یہ تھی کہ حکومت سر رشتۂ تعلیم سے سبکدوش ہونا چاہتی تھی۔ تجویز یہ تھی کہ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی کے حوالے کر دیا جائے۔ اِدھر یونیورسٹی کے اربابِ حل و عقد یہ ارادہ رکھتے تھے کہ تمام علوم و فنون وغیرہ کی تعلیم ترجموں کی مدد سے ہو جایا کرے اور انگریزی ادبیات کی تعلیم کے لئے ایک پروفیسر رکھ لیا جائے۔ یہ سُن کر مولانا کو خوشی ہوئی کہ اب بہتری پنشن ہو جائے گی اور تصنیف و تالیف کے کام کے لئے فرصت کے رات دن ملیں گے۔ اس کے ساتھ ہی کچھ پریشانی بھی تھی کہ آمدنی کے ذرائع محدود ہو جائیں گے۔ انہوں نے درخواست دی کہ مجھے نہری علاقے میں مربعے دے دئے جائیں۔ میں نئے طریقوں سے ان میں زراعت کروں گا۔ ڈائرکٹر تعلیم نے ان کی سفارش کی اور انہیں دو سو ایکڑ نہری زمین دینے کی تجویز منظور ہو گئی جب یہ سفارش آخری مرحلے پر پہنچی تو مخالف تلملا اٹھے اور انہوں نے ایسا داؤ مارا کہ یہ تجویز مسترد ہو گئی۔ اس کے بعد مولانا نے کوشش کی کہ انہیں ای اے سی بنا دیا جائے۔ دشمن اس پر بھی راضی نہ ہوئے۔ یہ تجویز بھی آخری مرحلے پر اس لئے مسترد کر دی گئی کہ ان کی عمر زیادہ ہو چکی ہے۔ اب مولانا نے کتب خانہ جاری کرنے کا منصوبہ بنایا۔ سیرِ ایران کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہاں سے اپنے کتب خانے کے لئے نایاب کتابیں لاؤں گا۔ چنانچہ ایران سے وہ قریباً دس ہزار کی کتابیں لائے۔ گویا اپنا سارا سرمایہ اس کارِ خیر میں صرف کر دیا۔

درگاہ شاہ محمد غوث کے پہلو میں میونسپل کمیٹی سے ایک قطعہ زمین کا لیا اور وہاں اپنے خرچ سے کتب خانے کے لئے عمارت تعمیر کرائی۔ ۱۸۹۰ء میں

مولانا کی صحت خراب ہو گئی اور کتب خانہ بند کر دیا گیا۔ میونسپل کمیٹی نے تقاضا کیا کہ کتب خانہ کھولو یا عمارت کا معاوضہ لے کر عمارت خالی کر دو۔ کتب خانے کی حفاظت کے لئے کوئی موزوں آدمی نہ مل سکا، دوسرے مولانا کسی آدمی کو کتب خانے میں آنے نہ دیتے۔ اس لئے اسے بند ہی کرنا پڑا۔ میونسپل کمیٹی نے عمارت کی لاگت ادا کر دی۔

مولانا کے انتقال کے بعد ان کے فرزند حکیم محمد ابراہیم صاحب نے مولانا کا تمام کتب خانہ یونیورسٹی کو بطور عطیہ دے دیا جہاں وہ "آزاد کولیکشن" کے نام سے محفوظ ہے اور تشنگانِ علوم اس سے مسلسل استفادہ کر رہے ہیں۔

طول طویل سفروں، پے درپے صدموں اور دن رات کی محنت سے مولانا کی صحت خراب ہو گئی تھی۔ جب ان کی صاحبزادی کا انتقال ہوا تو کتنی مدت تک ان پر جنون کی سی کیفیت طاری رہی۔ اس کے علاوہ انہیں خونی بواسیر کا بھی عارضہ تھا۔ جس سے اکثر خون ضائع ہوتا رہتا۔ آخر کار ان تمام تکلیفوں کا اثر ظاہر ہوا۔ وہ اکثر لاہور کے باغوں میں پھرتے رہتے۔ ٹہلتے ٹہلتے میلوں نکل جاتے۔ گھر میں آکر پلنگ پر دراز ہو جاتے اور گھنٹوں بے حس وحرکت پڑے رہتے۔ کالج کے وقت پر تیار ہوتے اور پڑھانے چلے جاتے۔ مولانا کو فقیروں سے بھی ارادت تھی۔ کہتے ہیں اُن دنوں ایک مجذوب "نوان کوٹ" میں آئے ہوئے تھے۔ مولانا اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ ایک دن کالج سے فارغ ہو کر سیدھے ان کے پاس پہنچے۔ انہوں نے کہا۔ دلّی جانے کا حکم ہو گیا ہے۔ مولانا وہاں سے پاپیادہ دلّی روانہ ہو گئے۔ راستے میں اپنی چہیتی بیٹی کا خیال آیا۔ پٹیالے کا رُخ کیا۔ لاہور میں ڈھنڈیا پڑ گئی۔ لیکن کہیں پتہ نہ چلا۔ آخر پٹیالے سے تار آیا کہ مولانا دیوانگی کی حالت میں پٹیالے پہنچ گئے ہیں۔ پٹیالے میں عزیز واقارب نے علاج معالجے کی کوشش کی۔ لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ جتنی دیر میں ان کے بیٹے پٹیالے پہنچے وہ وہاں سے چل دئے۔

پھر دہلی سے اطلاع آئی کہ مولانا دہلی میں ہیں۔ ان کے بیٹے ایک ملازم کو لے کر دہلی پہنچے۔ منشی ذکاء اللہ کے ہاں مقیم تھے۔ کبھی ہوش کی باتیں کرتے، کبھی عالمِ جذب میں کھو جاتے۔ بڑی مشکل سے لاہور آنے پر رضامند ہوئے۔ مگر بادلی کے اسٹیشن پر چپکے سے اتر گئے اور پھر لاپتہ ہو گئے۔ والدہ مرحوم نے نوکر کو دہلی بھیج دیا۔ خیال تھا کہ وہیں پہنچیں گے، اور خود لاہور چلے آئے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ چند دن بعد اسی حالت میں دہلی جا پہنچے۔ جب تک دل لگا دہلی میں رہے۔ آخر لاہور آ گئے۔ کچھ مدت بعد جذبہ کم ہو گیا۔ لیکن حالت وہی رہی کبھی ہوش میں اور کبھی جذب میں۔ اسی عالم میں لاہور کے سنسان باغوں میں پھرا کرتے تھے۔ جب تھک جاتے تو دل پر ہاتھ رکھ کر لیٹ جاتے۔ ملنے جلنے سے گھبراتے اور تنہائی پسند کرتے تھے۔ البتہ طالب علموں سے اس عالم میں بھی اُنس تھا۔ اگر کوئی طالب علم مل جاتا اور وہ کوئی ادق سوال بھی پوچھتا تو اسے اپنے خاص انداز میں سمجھاتے۔ صبح کی سیر بلاناغہ کرتے جب گھر آتے، اپنے مکان کے دروازے بند کر لیتے اور بڑے اہتمام سے تصنیف وتالیف کا کام کرتے۔ اس عالمِ وارفتگی میں فلسفہ "الٰہیات" سے بڑی دلبستگی تھی۔ اسی کے متعلق جو کچھ جی میں آتا لکھتے رہتے۔ اصل میں ان کا دل پسند موضوع فلسفہ ہی تھا۔ لیکن پُرسکون زندگی میں حالات نے اجازت نہ دی کہ اس کی طرف توجہ دیں۔ جب بے اختیار ہو گئے تو یہ شوق پھر اُبھر آیا۔ اس عالم میں بیس سال گذر گئے۔ لیکن ان کی ذات سے کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچی۔

۱۹۰۹ء میں بواسیر کا عارضہ شدت اختیار کر گیا۔ چھ مہینے بے درپے خون ضائع ہوا۔ وہ اتنے کمزور ہو گئے کہ پلنگ پر لیٹ گئے۔ کھانا ترک کر دیا۔ صرف چائے پی لیا کرتے تھے۔ کمزوری بڑھتی چلی گئی۔ یکم محرم سے چائے بھی ترک کر دی۔ آخر ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء کو نصف شب کے قریب عالمِ بقا کی راہ لی۔ یہ خبر آناً فاناً تمام شہر میں پھیل گئی۔ صلاح یہ ٹھہری کہ صبح عاشورہ ہے۔ اس دن جنازہ نہ اُٹھایا جائے۔ ان کے شاگردوں اور عقیدت مندوں کو شکایت کا موقع ملے گا کہ ہم انہیں آخری آرام گاہ تک نہ پہنچا سکے۔ عاشورے کے دوسرے دن دفن کرنے کا اہتمام ہوا۔ شہر میں اشتہار لگ گئے اخباروں میں اعلان ہو گیا۔ اگلے دن مولانا کے جنازے میں شریک ہونے کے لئے ہزاروں آدمی جمع ہوئے۔ کالجوں، سکولوں، دفتروں اور عدالتوں میں چھٹی ہو گئی اور مولانا کا جسدِ عنصری نہایت تزک وشان سے اٹھا کر کاسے شاہ میں دفن کر دیا گیا۔ مدتوں تک اخباروں میں ان کے سوانحِ حیات، پیغاماتِ تعزیت

اور تار کھاٹے وفات چھپتی رہیں۔

مولانا مرحوم مولویانہ اور قدیم وضع کا لباس پہنتے تھے۔ بر کے پائچے کا لٹھے کا پاجامہ، معلق گریبان کا کرتہ، لال نری کی سلیم شاہی جوتی پہنتے تھے گرمیوں میں نین سکھ کا انگرکھا ہوتا اور اس پر سفید چغہ۔ سر پر تن زیب کی چوگوشیہ ٹوپی۔ اس پر سفید صافہ بائیں جانب سے باندھتے تھے۔ سفید جرابیں پہننے کا بہت شوق تھا۔ قدیم وضع کے مطابق گلے میں سفید رومال باندھتے تھے۔

سردیوں میں پاجامہ کو پنڈلیوں پر لپیٹ کر پشمینے کے ساق بند باندھتے۔ زیادہ سردی میں کشمیرے کی نیم آستین پہنتے۔ گھر میں روئی کا کوٹ استعمال کرتے۔ ورنہ نیم آستین پر فرغل پہن لیتے۔ سر پر بجائے ململ کے صافے کے فاختائی یا سفید رنگ، کا کشمیری صافہ باندھتے۔ کشمیری کام کیا ہوا چغہ بہت پسند تھا۔ لباس میں بڑی وضعداری برتتے تھے۔ جب گھر سے باہر نکلتے، اسی لباس میں ہوتے۔ یہ وضعداری عالمِ جنون میں بھی قائم تھی۔

پاکیزگی کا بہت خیال تھا۔ فطرتاً شگفتہ مزاج اور سادہ طبیعت تھے۔ اپنے دل میں کسی سے بغض نہ رکھتے تھے۔ اگر کسی سے شکایت پیدا ہوتی تو منہ پر کہہ دیتے۔ اپنی طبیعت میں تکدر کو جگہ نہ دیتے۔ تصنع اور تکلف سے پاک تھے۔ ہر شخص سے ہمدردی رکھتے تھے۔ طالب علموں سے بہت زیادہ اُنس تھا۔ جہاں کہیں مکان لیتے، اپنے طالب علموں کے رہنے سہنے اور پڑھنے لکھنے کا پہلے خیال رکھتے۔ ہمیشہ ان کے دم کے ساتھ مستحق طالب علم وابستہ رہے۔ ان میں ہندو مسلمان کی کوئی تمیز نہ تھی۔ ان کے شاگرد سارے پنجاب میں پھیلے ہوئے تھے۔ جب کبھی کتابوں اور پرانے سکوں کی تلاش میں نکلتے، ہر ایک سے ملتے اور اس کی ترقی میں مدد دیتے۔

گھوڑے پر سوار ہو کر کالج جایا کرتے تھے۔ دائیں بائیں طالب علم چلتے تھے اور وہ ان سے علمی باتیں کرتے جاتے تھے۔ اگر کسی کو اپنے سبق کے متعلق کچھ پوچھنا ہوتا تو درس و تدریس کا سلسلہ جاری ہو جاتا۔ امتحان کے دنوں میں طالب علموں کا ایک غول ان کے ساتھ چلتا۔ وہ ہر قسم کے سوال پوچھتے اور مولانا ہر ایک کو جواب دیتے۔

مولانا کو تصنیف و تالیف کا بہت شوق تھا اور اشاعتِ علوم کا جذبہ اس پر مستزاد۔ غدر کے بعد ان کا سلسلۂ تصانیف سنہ ۱۸۶۱ء سے شروع ہوا اور سنہ ۱۸۹۰ء میں ختم ہوا۔ تیس سال میں انہوں نے بے شمار کتابیں لکھیں۔ وہ جب کسی کتاب کا مطالعہ کرتے، کاغذ، قلم دوات اپنے پاس رکھتے۔ جہاں کہیں جو چیز پسند آتی یا کارآمد معلوم ہوتی، اسے نوٹ کر لیتے۔ اس طرح مختلف چیزوں کے لئے ان کے پاس مواد جمع ہوتا رہتا۔ اولین فرصت میں وہ ایک چھوٹی سی کتاب تیار کر لیتے۔ جب بھی موقع ملتا اسے دیکھتے اور اس میں اضافہ کرتے رہتے۔ کانٹ چھانٹ کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ وہ اپنی تحریروں کو اس طرح دیکھتے جس طرح ایک کامیاب مصور اپنی بنائی ہوئی تصویر کو دیکھتا ہے اور جہاں کہیں کوئی سقم پاتا ہے، موقلم سے اسے درست کر دیتا ہے۔

تصنیف و تالیف کا وقت نصف شب کے بعد شروع ہوتا۔ پہلے تہجد کی نماز ادا کرتے۔ پھر تصنیف کے کام میں ہمہ تن محو ہو جاتے۔ یہاں تک کہ صبح کی ٹھنڈی ہوا اپنے آنے کی خبر دیتی۔ قلم دان بند کر دیا جاتا۔ نماز فجر ادا کرتے اور اس کے بعد سیر کے لئے نکل جاتے۔ شہر کے چاروں طرف شاداب اور گھنے باغات تھے۔ ان میں تیز رفتار سے سیر کرتے۔ اوس سے بھیگی ہوئی گھاس پر ٹہلتے اور دل و دماغ کو تازہ کرتے۔

غدر کے زمانے میں ایک سکھ سردار نے انہیں ایک دری دی تھی۔ یہ اسے جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ زمین پر یہ دری بچھا دی جاتی۔ سردیاں ہوتیں تو اس پر ایک پتلا سا گدیلا ہوتا اور اس پر سفید چاندنی کا فرش۔ پیچھے گاؤ تکیہ، سامنے لیمپ، پہلو میں کشمیری قلمدان، اس کے برابر تھال اس میں مختلف طرح کے قلم اور مختلف رنگوں کی دواتیں پنسلیں۔ اسی میں ایک طرف تھوڑی سی کٹی ہوئی چھالیہ بھی پڑی رہتی۔ جب جی چاہتا چند دانے اٹھا کر منہ میں ڈال لیتے۔

مولانا سرِشام کھانا کھا لیتے اور دیر تک ٹہلتے رہتے۔ کھانوں میں پلاؤ، کباب اور فرنی بہت مرغوب تھا۔ سفر میں عموماً کباب اور نان کھاتے تھے

پھلوں میں انگور، سردہ، آم اور سیب زیادہ پسند تھے۔ جب بیدانے کا موسم آتا تو روزانہ صبح دل بھر کر بیدانہ کھاتے۔ کھانے کے ساتھ دہی کا ہونا لازم تھا۔ شب برات آتی تو ہمیشہ کہتے کہ میری فاتحہ شب برات کی شام کو پلاؤ پر دیا کرنا۔

مولانا مرحوم کی بڑی بڑی تصانیف ان کی زندگی ہی میں چھپ گئی تھیں۔ ان کے علاوہ بہت سی تصانیف ایسی تھیں جن کا خاکہ تیار کیا تھا لیکن انہیں مکمل کرنے کی نوبت نہ آسکی۔ کچھ تصانیف ایسی تھیں جنہیں صاف کر لیا تھا اور نظر ثانی کے لئے رکھ چھوڑا تھا کہ موقع ملے گا تو ان میں ضروری اضافے کروں گا۔ تذکرۂ علماء، کائناتِ عرب اور نگارستانِ فارس اسی قسم کی تصانیف ہیں جو شائع ہو چکی ہیں۔ جغرافیہ پنجاب بھی لکھا تھا اور اسے صاف بھی کر لیا تھا۔ لیکن وہ کسی وجہ سے شائع نہ ہو سکا۔ عربی گرامر مکمل تیار تھی۔ مگر چھپ نہیں سکی۔ اسی طرح حروفِ ابجد کے لحاظ سے پنجاب کے شہروں کے تاریخی حالات لکھے۔ میں نہیں کہہ سکتا وہ اپنے استفادے کے لئے جمع کئے تھے یا چھپوانے کے لئے۔ ابتدائی زمانے میں تاریخ لاہور بھی لکھی تھی۔ لیکن اسے صاف کرنے کی نوبت نہ آئی۔ اسی تاریخ میں جا بجا تاریخ دہلی لکھنے کا تذکرہ بھی آتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مکمل ہو چکی تھی۔ اس کا مسودہ خدا جانے کہاں گیا۔ عالمِ جنون میں سینکڑوں رسالے فلسفۂ الٰہیات پر لکھے جن میں سے تین شائع ہو چکے ہیں اور باقی تبرکاً محفوظ ہیں۔ انہیں لکھنے اور صاف کرنے میں دلچسپی محنت کی ہے جیسی ان کی عادت تھی۔ حاشیے پر نوٹ ہیں۔ ضرورت کے لحاظ سے مختلف قسم کی سیاہیاں استعمال کی ہیں اور مختلف قسم کے قلم کام میں لائے ہیں۔ بعض الفاظ کا زور دکھانے کے لئے انہیں مختلف انداز میں لکھا ہے۔ اکثر رسالوں کی کئی کئی نقلیں کی ہیں اور ان سب کو ایک مقوّے میں رکھا ہے۔ یہ اہتمام آج کل کے مصنفین سے ممکن نہیں۔

— —— ————

مولانا شبلی نعمانی

سیّد صباح الدین عبدالرحمٰن

مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ ذی قعدہ ۱۲۷۴ھ مطابق مئی ۱۸۵۷ء میں ضلع اعظم گڈھ کے ایک مردم خیز گاؤں 'بندول' میں پیدا ہوئے۔ والدین نے نام محمد شبلی رکھا۔ مولانا اپنی ابتدائی تحریروں میں اپنا نام محمد شبلی ہی لکھتے تھے۔ پھر بعد میں نام کے ساتھ نعمانی اضافہ کر دیا اس نسبت سے بعض لوگوں کو دھوکا ہوتا ہے کہ وہ امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت کی اولاد سے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مولانا ابتدا میں سخت حنفی تھے اور حنفی کہلانا اپنے لئے فخر سمجھتے تھے۔ اس لئے ان کے استاد مولانا فاروق چریاکوٹی نے ان کا لقب نعمانی رکھ دیا اور یہ ان کے نام کا جزو ہوگیا۔

ابتدائی تعلیم حکیم عبداللہ جیراج پوری سے پائی جو مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی اور مولوی سید نذیر حسین صاحب دہلوی کے شاگرد تھے۔ کچھ دنوں مولوی شکر اللہ صاحب سے بھی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ یہ بھی مفتی محمد یوسف فرنگی محلی کے شاگرد تھے۔ اپنے گاؤں سے نکل کر اعظم گڈھ کے مدرسہ عربیہ میں آکر داخل ہوئے۔ یہاں مولانا سخاوت علی جونپوری مرحوم کے شاگرد خاص مولوی فیض اللہ صاحب مرحوم سے عربی پڑھنی شروع کی۔ اعظم گڈھ سے جونپور جا کر بھی مدرسہ حنفیہ امام بخش میں مولوی ہدایت اللہ خان سے کچھ روز عربی پڑھی۔

مولانا کی اصلی تعلیم اس وقت شروع ہوئی جب وہ مولانا محمد فاروق چریاکوٹی کی خدمت میں غازی پور حاضر ہوئے۔ مولانا محمد فاروق اپنے زمانے کے بہت بڑے ادیب، شاعر، نثر نگار، منطقی اور فلسفی تھے۔ ایسے متبحر استاد کے فیض تربیت نے مولانا شبلی جیسے ذہین اور طباع شاگرد کو ایسا جوہر قابل بنا دیا کہ خود زمانہ ان پر فخر کرنے لگا۔ اسی زمانہ میں مولانا فاروق اپنے لائق شاگرد کو مخاطب کر کے فرماتے "اَنَا اَسَدٌ وَاَنْتَ شِبْلٌ" یعنی میں شیر ہوں اور تو بچۂ شیر، مولانا شبلی نے معقولات کی تمام کتابیں مثلاً میر زاہد، ملّا جلال، حمد اللہ اور صدرا و شمس بازغہ وغیرہ ان ہی سے پڑھیں۔ وہ اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں کہ میری تمام ترکائنات مولانا فاروق چریاکوٹی ہی کے افادات ہیں۔ فارسی کا مذاق بھی ان ہی کا فیض ہے۔

مولانا فاروق چریاکوٹی سے درسیات کی تکمیل کے بعد ان کو فقہ اور حدیث کے یگانۂ روزگار اساتذہ سے بھی استفادہ کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس لئے رامپور جا کر مولانا ارشاد حسین سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ وہ حضرت مجدد الف ثانی کی اولاد میں تھے اور اپنی وسعت نظر،

کمالِ فہم اور قوتِ تفقّہ کے لئے مشہور تھے۔ مولانا ان سے فقہ و اصول کی تعلیم ایک سال تک پاتے رہے۔ پھر کچھ دنوں دیوبند میں رہ کر فرائض کا رسالہ پڑھا۔ اس زمانہ میں مولانا فضل حق خیرآبادی کے شاگردِ رشید مولانا فیض الحسن پروفیسر اورینٹل کالج لاہور کی عربی دانی کی بڑی شہرت تھی اور وہ امام الادب کہلاتے تھے۔ مولانا شبلی نے اس چشمۂ فیض سے بھی شاد کام ہونا چاہا۔ اس لئے ان کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے۔ وہ بہت ہی عدیم الفرصت تھے اس لئے انہوں نے اپنے اس مشتاق شاگرد کو مکان سے کالج تک کی مسافت طے کرنے میں جو وقت ملتا اسی میں ادبیات کا درس دینا شروع کیا اور جب مولانا فیض الحسن صاحب چھٹیوں میں لاہور سے اپنے وطن سہارن پور آئے تو مولانا شبلی بھی ان کے ساتھ جا کر مقیم ہوئے۔ یہ صحبت ان کے لئے بہت ہی مفید ہوئی۔ یہیں کے درس نے مولانا میں عربی علم و ادب کا صحیح مذاق حدِ کمال کو پہنچا دیا۔ شعرائے جاہلیت کی تاثیر میں ڈوبی ہوئی سادہ اور سچی شاعری اور اس کی شستہ اور رفتہ زبان ان کے دل میں اتر گئی۔ یہاں تک کہ حماسہ حفظ کر ڈالا اور آخر عمر تک بلا ناغہ صبح کو حماسہ کے اشعار گنگنایا کرتے تھے۔ مولانا فیض الحسن ہی کی صحبت میں انہوں نے قرآنِ پاک کی معجزانہ فصاحت و بلاغت کے نکتے کو سمجھا اور یہ نکتہ شناسی آخر وقت تک قائم رہی۔

ان علوم سے فراغت پائی تو اس زمانہ کے سب سے نامور محدّث مولانا احمد علی سہارن پوری کے پاس رہ کر حدیث پڑھی۔ مولانا احمد علی نے بیس برس کامل بخاری کی تصحیح و تحشیہ میں بسر کئے۔ سینکڑوں علماء ان سے فیض یاب ہوئے تھے۔ ان کا آستانۂ علم مولانا شبلی کی آخری درسگاہ تھی۔

سہارن پور ہی سے اپنے والدِ بزرگوار کے ساتھ سفرِ حج کے لئے بمبئی پہنچے۔ اس وقت ان کی عمر ۱۹ برس کی تھی۔ روضۂ اطہر کے پاس پہنچ کر ایک نظم کہی جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

چوں بہ درت آمدم امیدوار
سایۂ لطفے ز سرم بر مدار

اس مذہبی سفر میں مدینہ منورہ کے تمام کتب خانوں کی سیر بھی کی۔ اہلِ عرب کی فیاضی، سادگی، عزت مندی اور شریفانہ اخلاق سے بھی بے حد متاثر ہوئے۔

حج سے واپسی کے بعد ۱۸۷۶ء سے ۱۸۸۲ء تک اعظم گڑھ اور اس کے اطراف میں رہے، کبھی وکالت کا امتحان دیا، کبھی ملازمت کی ——— کبھی تجارت کی اور زمینداری کا کام دیکھا، مگر ان تمام مصروفیتوں کے باوجود اپنے علمی مشاغل برابر جاری رکھے۔ خاص خاص اعزہ کو اپنے ذوق کی چیزیں پڑھاتے تھے۔ چنانچہ اس زمانہ کے شاگردوں میں ان کے ماموں زاد بھائی مولانا حمید الدین فراہی بھی تھے جن کی تفسیر قرآن عالمِ اسلام میں مشہور ہے۔ اس زمانہ میں مولانا شبلی عموماً فارسی غزلیں اور قصیدے کہتے، اعظم گڑھ شہر میں مشاعرے کرتے جن میں تمام اہلِ ذوق جمع ہوتے۔ ان کی اسی زمانہ کی ایک چیز رزمیۂ کابل و قندھار ہے، اعظم گڑھ میں کوئی انگریز تھا جس نے محاربۂ کابل و قندھار میں شرکت کی تھی۔ اس نے انگریزی میں اس کا حال نظم کیا تھا۔ اسی کی خواہش کے مطابق اس کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا۔ اسی زمانہ میں انہوں نے غیر مقلدوں کے رد میں ایک چالیس صفحہ کا رسالہ "ظل الغمام فی مسئلۃ القرأۃ خلف الامام" لکھا جو کانپور کے مشہور مطبع نظامی میں چھپا۔ اس رسالہ میں انہوں نے منطقیانہ ترتیب و حسنِ استدلال اور انشا پردازی کا خاص لحاظ رکھا۔

۱۸۸۰ء میں اپنے والد کے اصرار سے وکالت کا امتحان دیا اور پاس ہونے کے بعد وکالت شروع کی لیکن اپنی ایمانداری اور سچائی کی بناء پر اس میں ناکام رہے۔ اس لئے عدالت کلکٹری میں قائم مقام نقل نویس کی ملازمت کر لی۔ تنخواہ دس روپے تھی جس میں نو روپے مکان سے کچہری تک کرایۂ آمد و رفت میں اٹھ جاتے تھے۔ اس کے بعد قرق امین کی اسامی عارضی طور پر خالی ہوئی تو اس کی بھی قائم مقامی کی۔ وکالت اور ملازمت کے زمانے میں بھی درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ ۱۸۸۱ء میں وہ اپنے والدِ بزرگوار کے ساتھ اپنے منجھلے بھائی مہدی حسن صاحب سے ملنے کے لئے

علی گڑھ گئے تو وہاں انہوں نے سر سید احمد خان کی مدح میں ایک عربی قصیدہ پڑھا جس کی زبان اور طرز ادا کو دیکھ کر سر سید بہت متاثر ہوئے اور اس کو اپنے اخبار علی گڑھ گزٹ میں شائع کیا۔ اس واقعہ کے سال ڈیڑھ سال بعد ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ میں مشرقی زبانوں کے معلّم مقرر ہوئے تنخواہ چالیس روپے ماہوار مقرر ہوئی۔ یہاں سر سیّد نے ان کے علمی ذوق کو دیکھ کر ان سے ربط ضبط بڑھایا۔ اکثر کھانا ایک ساتھ کھاتے اور روزانہ بلاناغہ دونوں میں گھنٹوں صحبت رہتی۔

علی گڑھ کالج مولانا کے شعر و سخن کے پرچوں سے چمکنے لگا۔ ان ہی دنوں اپریل ۱۸۸۴ء میں علی حزیں کی غزل پر ایک غزل لکھی جس کا مطلع یہ تھا:

گر کم عقل نہ گیرم من حیران چہ کنم
می دہد مغبچہ ام بادہ فراواں چہ کنم

اس غزل کو دیکھ کر خواجہ عزیز الدین لکھنوی او دبیرؔ دہلوی دونوں نے تعریف کی کہ یہ غزل سلف کے کلام کے ہم پلّہ ہے۔ اس حوصلہ افزائی سے مولانا نے حزیںؔ کے تتبع میں اور بھی غزلیں کہیں۔ ان کی شاعرانہ جولانیاں ایسی مشہور ہوئیں کہ کالج کے ہر جلسہ میں ان کی ایک نظم ضرور ہوتی۔ انہوں نے علی گڑھ تحریک کے بعض مفید اثرات کو بہت جلد قبول کر لیا۔ اور ان میں ملّت کی بربادی کا درد اور احساس اتنا بڑھا کہ ان کے رنگین ترانوں میں حُسن و عشق کے افسانوں کے بجائے قوم و ملّت کا سوز بھرنے لگا اور وہ زیادہ تر قومی نظمیں کہنے لگے۔ —— چنانچہ اسی کے تحت ۱۸۸۵ء میں مثنوی "صبحِ امید" لکھی جس میں مسلمانوں کے عروج و زوال کی شرح کے بعد سر سیّد کی نئی تحریک کی کامیابی پر ایک نئی صبحِ امید کی خوشخبری سُنائی۔ یہ مثنوی بہت مقبول ہوئی۔ ان کی نظموں کا موضوع بدل جانے سے وہ روز بروز ایسی پُر درد اور پُر سوز ہوتی گئیں کہ جب کسی جلسہ میں پڑھی جاتیں تو صدر سے لے کر پائیں تک سارا مجمع اثر میں ڈوب جاتا۔

علی گڑھ تحریک کا ایک نمایاں اثر ان پر یہ بھی ہوا کہ وہ انگریزی تعلیم کی ضرورت شدت سے محسوس کرنے لگے۔ چنانچہ علی گڑھ کے چار ہی مہینے کے قیام کے بعد انہوں نے اپنے شہر اعظم گڑھ میں ایک انگریزی اسکول قائم کرنے کی تجویز پیش کی اور ان کی مساعی جمیلہ سے جون ۱۸۸۳ء میں شبلی نیشنل اسکول کے نام سے ایک اسکول کی بنیاد رکھی گئی جو اس وقت تک ڈگری کالج بن چکا ہے۔

سر سید کے کتب خانہ کی کتابوں کے مطالعہ کے بعد ان میں تاریخ نویسی کا ذوق پیدا ہوا، وہ اس کتب خانہ کی الماریوں کے سامنے گھنٹوں کھڑے ہو کر مطالعہ کرتے اور جب تھک جاتے تو اکڑوں بیٹھ جاتے۔ ان ہی کتابوں کے مطالعہ سے ان کو مکمل اسلامی تاریخ لکھنے کا شوق پیدا ہوا، جس کو بعد میں انہوں نے "نامورفرمانروایانِ اسلام" کے سلسلہ سے موسوم کیا۔ یہاں کے قیام کے زمانے میں یورپ کی تحقیقاتِ علمی سے بھی آگاہی حاصل کرتے رہے اور اس میں پروفیسر ارنلڈ نے بڑی مدد پہنچائی۔ چنانچہ دونوں میں ایک دوسرے سے بڑے گہرے تعلقات پیدا ہو گئے۔ پروفیسر ارنلڈ نے ان سے عربی سیکھی اور مولانا نے ان سے فرنچ پڑھی۔

مولانا کے ذوق کا اثر ان کے شاگردوں پر بھی نمایاں ہونے لگا۔ چنانچہ مولوی عزیز مرزا، خواجہ غلام الثقلین اور ڈاکٹر مولوی عبدالحق، سیّد سجاد حیدر یلدرمؔ، سیّد محفوظ علی بدایونی اور شیخ محمد عنایت اللہ دہلوی میں ان ہی کی صحبت میں تحریر و انشاد کا ذوق پیدا ہوا۔ مولانا ظفر علی خان، مولوی ہدایت اللہ (سی۔ پی) اور چودھری خوشی محمد ناظرؔ اور مولوی مسعود علی محویؔ ان ہی کی سخن سنجیوں سے متاثر ہوئے۔

مولانا کے متعدد مضامین اور تصانیف سے بھی علی گڑھ کالج کا نام روشن ہوتا گیا۔ ۱۸۸۷ء میں "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" کے عنوان سے لکھنؤ کے اجلاس محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں اپنا مضمون پڑھ کر سُنایا تو سارے ملک میں اس کی دھوم مچ گئی، مسلمانوں کے کانوں میں اپنے بزرگوں کے کارناموں کی یہ پہلی آواز تھی۔ اسی سال ان کی دوسری تصنیف 'المامون' شائع ہوئی اور تین مہینے کے اندر اس کا پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا مسٹر جارجی زیدان نے اپنی کتاب "ہارون الرشید" میں جو زہر پھیلایا تھا، اس کا تریاق 'المامون' میں پیش کیا۔ ۱۸۹۰ء میں ان کی تیسری تصنیف "سیرۃ النعمان"

منظرِ عام پر آئی۔ اس کتاب میں ان کے اس ذوق و شوق کا اظہار ہے جو ان کو حضرت امام حنیفہ اور فقہ حنفی سے ہمیشہ سے تھا۔ ان کتابوں کی اشاعت کے بعد وہ ملک میں ایسے مشہور ہوئے کہ لوگ ان کو دیکھنے کی تمنا کرتے، اور وہ جابجا خصوصاً حیدر آباد اور بھوپال مدعو بھی کئے جانے لگے

جب الفاروق لکھنے کا خیال ہوا تو ان کو ہندوستان کے کتب خانوں کی کتابیں کافی نہ معلوم ہوئیں۔ اس لئے مصر، شام اور ٹرکی کے کتب خانوں کو کنگھالنے کی ضرورت ہوئی۔ ان کو ترکی سے بڑی محبت بھی تھی۔ اس لئے اس محبوب دیار کی سیر بھی کرنا چاہتے تھے۔ مئی ۱۸۹۲ء میں اس سفر پر پروفیسر آرنلڈ کے ساتھ روانہ ہوئے۔ پروفیسر آرنلڈ پورٹ سعید سے انگلستان چلے گئے اور مولانا قسطنطنیہ کے جہاز پر سوار ہوئے۔ قسطنطنیہ پہنچ کر وہاں تین مہینے رہے۔ ان تین مہینوں کا ہر روز کسی نہ کسی کتب خانہ یا کالج یا مدرسہ کے دیکھنے میں صرف ہوا۔ ہر کتب خانہ کی نایاب کتابیں دیکھیں اور اس کے لئے ان کو روزانہ تین چار میل کا چکر کاٹنا پڑتا تھا۔ یہاں کے اکابر و مشاہیر سے بھی ملتے رہے۔ اس زمانہ میں ترکی اور روس کی جنگ کی وجہ سے شیر پلونا غازی عثمان پاشا کا نام ہندوستان کے ہر کہ و مہ کی زبان پر تھا۔ مولانا ان سے بھی ملے۔ عثمان پاشا اس ملاقات سے ایسے محظوظ ہوئے کہ انہوں نے حکومت کی طرف سے مولانا کو تمغۂ مجیدی عطا کرایا جس کے ساتھ ایک فرمان بھی تھا۔ یہ گویا ایک بیرونی اہلِ مسلم کے خیر مقدم کے سلسلہ میں بڑا اعزاز تھا۔

قسطنطنیہ سے چل کر مولانا بیروت پہنچے جہاں کی علمی ترقیوں سے پوری واقفیت حاصل کی۔ وہاں شیخ طاہر مغربی سے بھی ملے جو زندہ کتب خانہ تھے بیروت سے بیت المقدس آئے اور وہاں کی مقدس عمارتوں کی زیارت کی اور علما و فضلا سے ملاقاتیں کیں۔

بیروت سے قاہرہ آ کر یہاں کے نظامِ تعلیم کا مطالعہ نہایت غور سے کیا۔ ان کا قیام جامع ازہر ہی میں رہا۔ مصر کے سب سے بڑے کتب خانہ خدیویہ کو بھی دیکھا، اور اس کی ترتیب و خوش اسلوبی، زیب و زینت اور خوبیٔ عمارت سے بہت متاثر ہوئے۔

مولانا اپریل ۱۸۹۲ء میں سفر پر روانہ ہوئے تھے اور اسی سال شروع نومبر میں واپس آ گئے۔ واپسی پر علی گڑھ کالج میں شاندار استقبال کیا گیا۔ چودھری خوشی محمد خان ناظرؔ نے جو اس وقت طالب علم تھے ایک نظم کہی جس کا ایک شعر یہ ہے:۔

زینتِ ہر بزم و زیبِ انجمن آید ہمی
آں ادیب و شاعر و ہسٹورین آید ہمی

کالج اسٹاف کی طرف سے جو ڈنر ہوا اُس میں مولانا نے ایک ترکیب بند پڑھا جس کا ایک شعر یہ تھا:

از سفر شبلیِ آزادہ بہ کالج بہ رسید
یا مگر بلبلِ شیراز بہ شیراز آمد

مراجعت کے بعد اپنا سفرنامہ لکھنا شروع کیا جو مطبع مفیدِ عام آگرہ میں ۱۸۹۴ء میں چھپا۔ اس زمانہ میں ہندوستان کی برطانوی حکومت کے تعلقات ترکی سے اچھے نہ تھے لیکن اس کے باوجود مولانا نے یہ سفرنامہ اس طرح لکھا کہ یہاں کے مسلمانوں کے دلوں میں ترکی کی اہمیت کا بیج بو دیا۔

اس سفرنامہ کے بعد ان کی کلیاتِ فارسی شائع ہوئی۔ انہوں نے کالج میں آ کر جو قصائد لکھے تھے، پھر اپنے سفرِ مصر و شام میں جو نظمیں لکھی تھیں، ان میں قومی احساسات اور مذہبی جذبات کا ایسا زور تھا کہ وہ مسلمانوں کی قومی زندگی کے لئے آبِ حیات بن گئیں۔ اس لئے دوستوں کے اصرار پر ان کا مجموعہ مرتب کیا اور جب یہ چھپا تو اہلِ ذوق میں بہت مقبول ہوا۔

۱۸۹۲ء سے ۱۸۹۸ء تک مولانا نے بہت سے محققانہ تاریخی مضامین لکھ کر ملک کے مشہور رسالوں میں شائع کئے جن میں مسلمانوں کے عہدِ زریں کے مرقع کی کوئی نہ کوئی پرانی تصویر تھی۔ ان مضامین میں "کتب خانہ اسکندریہ"، "الجزیہ" اور "اسلام کے قانون میں ذمی رعایا کے حقوق" بھی تھے۔ جن سے تحقیق و تدقیق کی دنیا میں ایک ہلچل مچ گئی۔ یہ مضامین اتنے جامع اور مدلل تھے کہ مخالفین کو بھی ان کی اصابتِ رائے کو تسلیم کرنا پڑا۔ اسی قسم

کے اہم مضامین کا مجموعہ رسائل شبلی میں ہے۔

الفاروق کی اشاعت سے پہلے ہی اس کا غلغلہ تمام ہندوستان میں بلند تھا۔ یہ کتاب ۱۸۹۴ء میں لکھنی شروع کی اور ۱۸۹۸ء میں ختم کی۔ یہ ان کے علمی شاہکاروں میں ہے، اور شاید کسی زبان میں حضرت عمر فاروقؓ کی سیرت اس سے بہتر نہیں لکھی گئی۔ یہ دو جلدوں پر مشتمل ہے۔

جنوری ۱۸۹۴ء میں ہندوستان کی برطانوی حکومت نے ان کو شمس العلماء کا خطاب دے کر ملک کی اس عظیم علمی شخصیت کی قدر افزائی کی۔ اس خطاب پر مبارکباد دینے کے لئے علی گڑھ کالج کی علمی مجلسوں مثلاً اخوان الصفا اور انجمن الادب نے ایک بڑا جلسہ کیا جس میں سرسید، سید محمود، نواب محسن الملک، مولانا حالی، نواب مزمل اللہ خان، مسٹر بک پرنسپل، پروفیسر آرنلڈ اور جسٹس سید کرامت وغیرہ شریک ہوئے۔ اور سبھوں نے تقریریں کر کے مولانا کی علمی خدمات کو سراہا۔ مولانا حالی نے ان کی شان میں ایک عربی قصیدہ بھی پڑھا جس کا عنوان تھا "من الحبیب الی الحبیب" یعنی ایک حبیب کی طرف سے دوسرے حبیب کو ہدیہ۔ اسی سال الہ آباد یونیورسٹی نے ان کو اپنی فیکلٹی آف آرٹس اور بورڈ آف اسٹڈیز کا ممبر بنایا اور الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو بھی مقرر ہوئے۔

۱۸۹۶ء میں میر محبوب علی خان والی حیدرآباد نے ازراہ قدردانی سو روپے ماہوار کا وظیفہ عطا کیا اور یہ شرط کی کہ آئندہ سے مولانا کی تمام تصانیف سلسلہ آصفیہ میں شامل ہوں۔ اس وقت مولانا حیدرآباد تشریف لے گئے تھے۔ چنانچہ اس موقع پر حیدرآباد کے تمام امراء نے مل کر ان کی خدمت میں ایک سپاسنامہ بھی پیش کیا جس میں ان کی علمی خدمات پر اپنے فخر کا اظہار کیا۔

۱۸۹۶ء میں حکومت بھوپال کی دعوت پر وہاں جا کر عربی مدارس کی اصلاح کے سلسلہ میں ان کے لئے ایک دستور العمل تیار کیا۔

مارچ ۱۸۹۸ء میں سرسید جنت کو سدھارے تو مولانا نے مئی ۱۸۹۸ء میں پہلے چھ مہینے کی رخصت لی، پھر استعفا بھیج دیا۔ وہ علی گڑھ میں سولہ سال رہے۔

علی گڑھ سے اپنے وطن اعظم گڑھ آ گئے۔ یہاں انہوں نے ۱۸۹۲ء میں اپنے خاندانی باغ میں ایک چھوٹا سا بنگلہ بنوا لیا تھا جس کو شبلی منزل کا خطاب دیا تھا۔ یہیں آ کر مقیم ہوئے اور یہی ان کی ابدی آرامگاہ بھی ہے، اور اسی احاطہ میں اب دارالمصنفین (شبلی اکیڈمی) ہے۔ یہاں کے قیام کے زمانہ میں اپنے ذاتی کتب خانہ میں کئی ہزار کتابیں جمع کیں۔ اب ان کی صحت خراب رہنے لگی۔ خانگی پریشانیوں میں بھی مبتلا ہو گئے۔ لیکن قومی اور علمی دلچسپیاں قائم رہیں اور ان کے قلم کا مسافر بھی چلتا رہا۔ اسی زمانہ میں علم کلام کا ایک خاکہ تیار کیا اور اسی سلسلہ میں امام غزالی کی سوانحعمری لکھنے کا ارادہ کیا۔ لیکن اس کتاب کو شروع کرنے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ مئی ۱۹۰۱ء میں ریاست حیدرآباد کے سررشتۂ علوم و فنون کی نظامت کے عہدہ پر ان کا تقرر ہوا۔ تنخواہ دو سو روپے مقرر ہوئی جو آگے چل کر پانچ سو تک ہو گئی، وہ اس عہدہ پر فروری ۱۹۰۵ء تک رہے۔

اسی زمانہ میں انہوں نے الغزالی لکھ کر ختم کی جو فروری ۱۹۰۲ء میں چھپی۔ اس میں امام غزالی کے سوانح اور فلسفہ و کلام کا عالمانہ تجزیہ کیا گیا ہے۔

مارچ ۱۹۰۳ء میں ان کی معرکۃ الآرا تصنیف علم الکلام شائع ہوئی۔ اس کی تکمیل کے وقت بیمار ہو گئے تھے۔ لیکن فرش پر پڑے پڑے تکیہ کے سہارے ذرا سا سر اٹھا کر اس کو لکھا کرتے تھے۔

علم الکلام کی اس تاریخ کے بعد جدید علم کلام کی باری آئی اور الکلام کے نام سے یہ فلسفیانہ اور متکلمانہ کتاب ۱۹۰۴ء میں چھپ کر لوگوں کے ہاتھ میں پہنچی۔

حیدرآباد ہی میں مولانا روم کی سوانح عمری لکھنی شروع کی تھی لیکن یہ حیدرآباد سے علیحدگی کے بعد اگست ۱۹۰۶ء میں شائع ہوئی۔ یہ

کتاب بھی بہت مقبول ہوئی۔

حیدرآباد کی ادبی محفلوں میں میر انیس اور مرزا دبیر کے باہمی مقابلہ کی گفتگوئیں ہوا کرتی تھیں۔ مولانا میر انیس کے مدّاح تھے اس لئے انہوں نے "موازنہ انیس و دبیر" کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں یہ بھی ثابت کیا کہ اردو شاعری باوجود کم مائیگی زبان کیا پایہ رکھتی ہے۔ اس غرض کے لئے میر انیس سے زیادہ کوئی شخص انتخاب کے لئے موزوں نہیں ہوسکتا تھا۔ کیونکہ ان کے کلام میں شاعری کے جس قدر اصناف پائے جاتے ہیں اور کسی کے کلام میں نہیں پائے جاتے۔ یہ کتاب بھی حیدرآباد چھوڑنے کے بعد ۱۹۰۶ء میں چھپی۔

مولانا کے عہد نظامت میں دوسرے مصنفوں کی کتابیں جو شائع ہوئیں ان کے نام یہ ہیں۔ "کتاب الآلات" جو عربی میکانکس پر تھی "یوسیڈینر کا سفرنامۂ دکن"، "تاریخ دکن"، اور "نظام اکبری"۔ حیدرآباد کی سیاسی کشمکش سے وہ برابر دل برداشتہ رہے، اس لئے فروری ۱۹۰۵ء میں وہاں سے خود علیحدہ ہوگئے۔ حیدرآباد کے قیام کے زمانہ میں مالی منفعت کے بجائے چھ ہزار روپے کے مقروض ہوگئے جو رفتہ رفتہ ادا ہوتے رہے۔ حیدرآباد ہی کے قیام کے زمانہ میں وہ انجمن ترقی اُردو کے سیکرٹری بھی ہوئے۔

مولانا دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی تعلیمی سرگرمیوں میں برابر حصہ لیتے رہے تھے۔ اس کے سالانہ اجلاسوں میں ان کی موجودگی اور نظموں سے بڑی جان پڑ جاتی تھی۔ وہ ۱۹۰۳ء میں اس کے معتمد مقرر ہوئے اور جب حیدرآباد سے علیحدہ ہوئے تو دارالعلوم کے باقاعدہ معتمدِ تعلیم منتخب ہوئے اور اس فرض کو ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۳ء تک انجام دیتے رہے۔ ندوہ میں جدید نصاب کا اجراء ان ہی کی وجہ سے ہوا، ان کی معتمدی کے زمانے میں یہاں کے طلبہ میں علم و ادب کا غیر معمولی ذوق پیدا ہوا۔ مولانا نے ندوہ کے طلبہ کی ذہنی تربیت کے لئے ایک ماہانہ رسالہ "الندوہ" نکالنا شروع کیا جو بعد میں اُردو زبان کا ایک بہت ہی تحقیقی رسالہ بن گیا۔ اس میں علومِ اسلامیہ کی تجدید، عقل و نقل کی تطبیق، معقول و منقول اور قدیم و جدید علوم کے موازنہ اور عربی نصابِ تعلیم کی اصلاح پر بہت سے محققانہ مضامین شائع ہوئے اور اس کے ذریعہ سے بہت سے ایسے اہلِ قلم پیدا ہوئے جن کے کارناموں سے علم و فن کا گنبد مینا پر شور ہوا۔ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا عبداللہ عمادی کی بسم اللہ اسی دبستان سے ہوئی۔ اس رسالہ نے علمی مباحث کا ایک بڑا ذخیرہ جمع کر دیا۔ اور جدید تعلیم یافتوں کو اسلام کے مذہبی اور علمی کارناموں سے روشناس کیا۔ یہ مئی ۱۹۱۲ء تک مختلف اڈیٹروں کی ادارت میں نکلتا رہا۔

ندوہ کی معتمدی کے زمانے میں بھوپال، حیدرآباد، بمبئی، ڈھاکہ اور بڑودہ وغیرہ کا سفر یا تو ندوہ کے کاموں یا قومی سرگرمیوں کے سلسلہ میں کرتے رہے۔ مولانا محمد علی مرحوم (اڈیٹر کامریڈ) کے اصرار پر بڑودہ گئے تو انہوں نے اورنگ زیب عالمگیر کے الزامات کی تحقیق و جواب میں مفصل مضمون لکھنے کی تحریک کی جو مولانا نے منظور کی۔ چنانچہ اس مضمون کا پہلا نمبر دسمبر ۱۹۰۶ء کے الندوہ میں شائع ہوا اور چھ نمبروں میں مارچ ۱۹۰۷ء میں ختم ہوا۔ بہت ہی پسند کیا گیا۔ اس لئے کتاب کی صورت میں بھی شائع کیا گیا۔

۱۷ مئی ۱۹۰۷ء کو ان کی زندگی میں ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ ان کے کمرے میں ان کے صاحب زادے حامد نعمانی صاحب ایک بھری ہوئی بندوق چھوڑ گئے تھے جو غلطی سے سر ہوگئی اور اس سے ایک پاؤں اس طرح زخمی ہوگیا کہ اس کو آخر میں کاٹنا پڑا۔ بعد میں تمام عمر ایک مصنوعی پاؤں کی مدد سے چلا کرتے تھے۔

اس حادثہ کے وقت شعر العجم لکھ رہے تھے اور اس دن فردوسی کے شاہنامہ پر تبصرہ یہ شعر لکھ کر ختم کیا تھا۔

بریدو درید و شکست و ببست
یلاں را سر و سینہ و پا و دست

بعد میں شعر العجم کو پانچ جلدوں میں ختم کیا۔ پہلا حصہ حنظلہ سے شروع ہوکر نظامی پر ختم ہوتا ہے۔ دوسرا کمال اسمٰعیل سے جامی تک اور تیسرا

فغانی سے ابو طالب کلیم تک ہے، چھٹے اور پانچویں حصوں میں فارسی شاعری کے مختلف اصناف پر عام ریویو ہے۔ یہ تصنیف اردو زبان کی بہترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔

علمی کاموں کے ساتھ مولانا کی مذہبی خدمات بھی جاری تھیں۔ چنانچہ وقف علی الاولاد کے بل (۱۹۰۸ء)، سرکاری دفتروں میں تعطیل جمعہ (۱۹۱۲ء)، وفاق اسلامی، فتنۂ ارتداد، نومسلموں کی مردم شماری وغیرہ میں انہوں نے نمایاں حصہ لیا اور ان کو اپنی بات منوانے میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔

مولانا کو ترکی سے بڑی محبت تھی اور جب برطانوی حکومت کی نگاہ میں ترکوں کا نام لینا بڑا جرم تھا اس وقت مولانا نے بڑی جرأت سے ترکوں سے اپنی محبت کا اظہار کیا۔ ۱۸۹۵ء میں جب ترکوں کے خلاف آرمینیا کا مسئلہ اٹھا اور یورپ کے تمام اخبارات دروغ بیانی سے کام لے کر ترکوں کو ملزم ٹھہرا رہے تھے، اس وقت مولانا نے آزاد اخبار لکھنؤ میں ترکوں کی حمایت میں ایک مضمون لکھا۔ ۱۹۰۸ء میں جب انور بے کی قیادت میں ترکی نے دستوریت کا اعلان کیا تو وہ بے حد خوش تھے۔ وہ ایک ایک نامور نوجوان ترک اور انجمن اتحاد و ترقی کے ایک ایک جانباز کے مداح تھے۔ ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس پر حملہ کیا تو وہ بے حد مضطرب تھے اور جب اس مسئلہ پر بات کرتے تو ان کی شعلہ نفسی کا اندازہ ہوتا۔ پھر اکتوبر ۱۹۱۲ء میں یورپ کی بڑی سلطنتوں کی شہ پاکر بلقان کی ریاستوں نے ترکی کے خلاف لڑائی کا اعلان کر دیا تو مولانا نے "شہر آشوب اسلام" کے نام سے غم و حسرت سے بھری ایک ایسی نظم لکھی جس نے اس حادثہ پر مسلمانوں کے دامن آنسوؤں سے تر کر دیے۔ نومبر ۱۹۱۲ء میں مولانا محمد علی کی کوشش سے ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی سرکردگی میں ایک طبی وفد ترکی کے محاذ جنگ پر بھیجا گیا۔ یہ وفد لکھنؤ سے ہو کر گذرا تو اسٹیشن پر ہجوم کے ساتھ مولانا بھی تھے اور جب ڈاکٹر انصاری پر ان کی نظر پڑی تو انتہائی جوش میں دفعتاً ان کا سر ڈاکٹر انصاری کے بوٹ پر جھک گیا۔ ان کے آنسوؤں نے اس کے گرد و غبار کو دھو دیا اور ان کے لب نے اس کے بار بار بوسے لئے، اور جب یہ وفد واپس ہوا تو مولانا بمبئی میں تھے۔ ان کے استقبال اور خیر مقدم میں ایک بہت ہی پر درد نظم کہی۔ ابھی بلقان کا شور محشر برپا ہی تھا کہ مسجد کانپور کے انہدام کا ایک نیا ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا۔ مولانا نے اس واقعہ پر پرجوش نظمیں لکھیں، وہ ہندوستان کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ تک اسلامی جوش پھیلانے میں رجز کا کام دیتی تھیں۔ ۱۹۱۲ء میں مسلم گزٹ کے نام سے لکھنؤ سے ایک اخبار نکلا، اس میں ان کے جو سیاسی مضامین نکلے ان میں سب سے اہم مضمون "مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ" ہے جو اس قدر مدلل اور پرجوش تھا کہ بقول علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ مصنف حیات شبلی، اس نے مسلمانوں کی سیاست کا رخ شملہ سے قبلہ کی طرف پھیر دیا۔

جولائی ۱۹۱۳ء میں مولانا نے بمبئی سے اپنا استعفا دفتر ندوۃ العلماء بھیج کر اس کی معتمدی سے علیحدگی اختیار کی اور پھر وطن میں آکر قیام کیا اور شبلی اسکول اعظم گڈھ اور مدرسۃ الاصلاح سرائے میر ضلع اعظم گڈھ کے تعلیمی کاموں میں دلچسپی لیتے رہے اور اس قیام کے زمانے میں انہوں نے اس علمی ادارہ کی بنا ڈالنے کی اسکیم تیار کی جو گذشتہ چالیس سال سے ملک میں دار المصنفین کے نام سے مشہور ہے۔ اسکیم تیار کر کے اس کو عملی جامہ پہنانے کو تھے کہ داعی اجل کو لبیک کہا۔ لیکن ان کی نیک نیتی کام آئی، اور ان کی رحلت کے فوراً ہی بعد ان کے شاگرد رشید مولانا سید سلیمان ندوی نے یہ ادارہ قائم کیا جو اب تک چل رہا ہے۔

مولانا کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک سے شروع ہی سے بڑی شیفتگی تھی۔ چنانچہ علی گڈھ کالج کی معلمی کے زمانہ میں "بدر الاسلام" کے نام سے عربی میں ایک رسالہ لکھا تھا جو وہاں کے نصاب میں داخل تھا۔ اس کے بعد سے ان کو ایک بہت ہی بلند پایہ سیرت لکھنے کا خیال رہا۔ چنانچہ یہ کام ۱۹۱۲ء میں بڑے روحانی جوش و سرمستی کے ساتھ شروع کیا، خود فرماتے ہیں:

عجم کی مدح کی، عباسیوں کی داستاں لکھی — مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم — خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

اور واقعی خاتمہ بالخیر ہوا۔ وہ سیرت کی پہلی جلد ختم کر کے دوسری جلد لکھ رہے تھے کہ ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ مرض الموت میں اپنے لائق شاگرد مولانا سید سلیمان ندوی کو تار دے کر اعظم گڑھ بلایا۔ شاگردِ رشید جب استاد کے پاس پہنچے تو وہ عالمِ نزع میں تھے مگر اس حال میں بھی شاگرد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا "سیرت میری تمام عمر کی کمائی ہے۔ سب کام چھوڑ کر سیرت تیار کرو" وفا شعار شاگرد نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "ضرور۔ ضرور!" چنانچہ ان کی وفات کے بعد مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے سیرت النبی کو چھ جلدوں میں مکمل کیا جو اس وقت اردو زبان کی بے مثل کتاب سمجھی جاتی ہے۔

مولانا نے اپنی تصانیف کے علاوہ مختلف عنوانات پر سینکڑوں مذہبی، علمی، تاریخی، ادبی اور سیاسی مضامین لکھے تھے جو اخبارات و رسائل کے صفحات پر بکھرے تھے۔ مولانا سید سلیمان نے ان پراگندہ موتیوں کو دارالمصنفین کی لڑی میں سمیٹنا شروع کیا اور ان کو ۸ جلدوں میں شائع کیا۔ پھر ان کے اردو کلام کا مجموعہ بھی کلیاتِ شبلی کے نام سے طبع ہوا۔ ان کے مکاتیب بھی مکاتیبِ شبلی کے نام سے دو جلدوں میں شائع کئے گئے۔

مولانا اپنے معاصر حالی، آزاد اور نذیر احمد کے ساتھ اردو کے عناصرِ اربعہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ نواب محسن الملک نے ان کی مدح و ستائش میں بالکل صحیح کہا ہے کہ:۔

> "وہ ہمارے زمانہ کے پہلے مصنف ہیں جنہوں نے اپنی تالیفات میں فصاحتِ بیان اور سلاستِ عبارت اور لٹریچر کی تمام خوبیوں کے ساتھ اعتدال اور بے تعصبی اور انصاف کا لحاظ رکھا، اور شاعرانہ خیالات اور ایشیائی مذاق کے موافق مبالغہ و استعارہ، عبارت آرائی اور تصنع سے پاک اور بلاغت سے فلسفیانہ طرز پر سوانح عمری اور تاریخ کے لکھنے کا طریقہ جاری کیا۔"

اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ایک جامع الفنون اہلِ قلم، بے مثل انشا پرداز اور شیریں کلام شاعر کا محض ایک سرسری خاکہ ہے، ان کی اصلی تصویر حیاتِ شبلی میں ملے گی جس کو استاذی المحترم علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھ کر اردو کو اپنے احسان سے گراں بار کیا۔

حالی

خواجہ غلام السیدین

در تبصرۂ گزشتہ حالی۔ حالی | بنوشت زخوب وزشت حالی بحالی
پرسند اگر کہ کیست غمخوارۂ قوم؟ | نیرؔ حالی بگو کہ حالی۔ حالی

(نواب ضیاء الدین خان نیرؔ دہلوی)

نواب سعد اللہ خاں جو شاہجہان (بادشاہ دہلی) کے وزیر تھے ایک روز دیر تک ہاتھ پھیلائے دعا مانگتے رہے۔ دعا سے فارغ ہوئے تو ایک مصاحب نے سوال کیا "کدام آرزو باقیست؟" اب کون سی آرزو باقی رہ گئی ہے؟ یہ سوال محض بطور مزاح کیا گیا تھا کیونکہ شاہ ہو یا گدا، امیر ہو یا فقیر عالم میں کون ایسا ہے جو خالقِ عالم سے کسی حالت میں بھی بے نیاز ہو سکے۔ مگر نواب صاحب نے کیا عمدہ جواب دیا "آدمِ خوب" میں خدا سے اچھے آدمی طلب کرتا ہوں۔ عالمگیر بادشاہ نے اپنے "فرزندِ عالیجاہ" کو ایک خط میں اس واقعہ کی اطلاع دے کر نواب سعد اللہ خاں کے جواب کی تعریف کی ہے کہ "الحق سخنِ خوب گفتہ" (واقعی خوب بات کہی) اور اس کے بعد لکھا کہ "آدمِ خوب مثلِ طلائے بیغش است" ؎

آنچہ پُرجستیم و کم دیدیم و بسیار است و نیست!
نیست جز انساں دریں عالم کہ بسیار است و نیست

یعنی اچھے آدمی کی مثال ایسی ہے۔ جیسے کھرا سونا۔ جس چیز کو ہم نے بہت ڈھونڈا اور کم پایا۔ جو بہت کثرت سے موجود اور باوجود اس کے مفقود ہے۔ ایسی چیز اس عالم میں انسان کے سوا اور کوئی نہیں۔

اب ہم کو دیکھنا ہے کہ وہ کون سی بات ہے جس کی وجہ سے انسان حقیقی معنی میں انسان کہلانے کا مستحق ہے۔ اس سوال کے جواب میں علم اخلاق کی فنی بحثوں کو چھیڑنا، اختلافاتِ حکماء کا ذکر کرنا اور فلسفیانہ گتھیوں کو سلجھانا بے محل ہوگا۔ لہٰذا عملی حیثیت سے اس کا جواب صرف ایک لفظ میں دینا چاہتا ہوں جس سے کسی کو اختلاف نہ ہوگا اور وہ جواب خود مولانا حالی کے کلام سے ماخوذ ہے ———

سرسید احمد خاں مرحوم کا جو مرثیہ مولانا نے لکھا ہے۔ اس میں ایک مقام پر بتایا ہے کہ انسان فصاحت میں سحبان، عقل میں لقمان، جاہ و ثروت میں قارون، زہد و طاعت میں صنعان، ملک و دولت میں خسرو پرویز اور زور و طاقت میں رستم داستان ہو سکتا ہے بلکہ ان سے بھی بڑھ سکتا ہے اور اہلِ دنیا کی نظر میں قطبِ زمان اور غوثِ وقت بھی بن سکتا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ ضروری نہیں کہ وہ حقیقی معنی میں انسان بھی ہو۔

اس کے بعد اس سوال کا جواب کہ انسانیت کیا چیز ہے؟ ان الفاظ میں دیا ہے ؎

چیست انسانی؟ تپیدن از تپِ ہمسائگاں ۔۔۔ از سمومِ نجد در باغِ عدن پژماں شدن!
خوار دیدن خویش را از خواریِ ابنائے جنس ۔۔۔ در شبستاں تنگ دل از محنتِ زنداں شدن
آتشِ قحطے کہ در کنعاں بسوزد باغ و کشت ۔۔۔ بر فرازِ تختِ مصر از تابِ آں بریاں شدن
زیستن در فکرِ قوم و مُردن اندر بندِ قوم ۔۔۔ گر توانی مے توانی سید احمد خاں شدن

ان اشعار میں سرسید مرحوم کی ہمدردی کی طرف اشارہ کر کے مفہوم انسانیت کے بحر نا پیدا کنار کو مولانا نے ایک "ہمدردی" کے کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ اور یہ بات بالکل سچ ہے کہ انسان میں جذبۂ ہمدردی جس قدر قوی ہو اسی قدر زیادہ وہ انسان کہلانے کا مستحق ہے۔

یہ جو مولانا نے سرسید کی تعریف میں فرمایا ہے ؎

زیستن در فکرِ قوم و مُردن اندر بندِ قوم
گر توانی مے توانی سید احمد خاں شدن

خود مولانا کے حسبِ حال بھی ہے۔ لہٰذا میں صرف ایک لفظ بدل کر کہہ سکتا ہوں ؎

زیستن در فکرِ قوم و مُردن اندر بندِ قوم
گر توانی مے توانی حالیؔ دوراں شدن

جس ہمدردی کو معیارِ انسانیت کہا گیا ہے وہ عملی ہمدردی ہے نہ کہ قولی، زبان سے "قوم" "قوم" پکارنا اور قوم کے لئے کچھ نہ کرنا قومی ہمدردی نہیں۔ ملک کی ہوا خواہی کے لمبے چوڑے دعوے کر کے پلیٹ فارموں پر گرجنا اور ملک کی کوئی مفید خدمت انجام نہ دینا ملکی ہمدردی نہیں۔ اگر ہماری ہمدردی سچی محبت، مخلصانہ ہدایت، بے غرضانہ نصیحت، خیر اندیشی خلائق، فراخدلی، بے تعصبی اور ایثار کی کسوٹی پر پوری نہ اُترے تو اس کے متعلق یہی کہا جائے گا ع

"ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا"

خوش قسمتی سے مجھے تینتیس سال تک دہلی اور پانی پت میں مولانا کی خدمت سے فیضیاب ہونے کی عزت حاصل رہی۔ اگرچہ مجھے اس مدت میں بوجہ ملازمت سررشتۂ تعلیم ساڑھے چار سال تک پانی پت سے باہر رہنے کا اتفاق ہوا تاہم تعطیلات میں اور رخصت لے کر بھی اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا تھا اور چونکہ مجھ کو مولانا سے قرابتِ قریبہ حاصل تھی اس لئے کسی وقت بھی ان کی خدمت میں کوئی رکاوٹ میرے لئے نہیں تھی، خواہ مولانا اندر تشریف رکھتے ہوں یا باہر مردانہ مکان میں اور بعض اوقات گھنٹوں ان کی خدمت میں حاضر رہتا تھا۔ ان وجوہ سے مولانا کی نشست و برخاست، اخلاق و آداب، عادات و خصائل اور حضرت کی پبلک اور پرائیویٹ زندگی کے متعلق اصلی حالات معلوم کرنے کے بے شمار مواقع جو مجھے حاصل ہوئے کسی کو حاصل نہیں ہوئے۔ اس کے علاوہ میں نے مولانا کے

کلام کا مطالعہ بھی بہت کچھ کیا ہے اور جو کچھ ان کے کلام میں پایا ہے، وہی ان کی عملی زندگی میں دیکھا۔ لہٰذا میرے بیان کا دارومدار سُنی سُنائی حکایات پر نہیں، بلکہ ذاتی مشاہدات، اور ان واقعات پر ہے جن کی تصدیق خود مولانا کے قلم یا زبان سے ہو چکی ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب اپنے ایک مضمون میں مولانا حالی کے متعلق لکھتے ہیں:

"ایک بڑے شخص کا قول ہے کہ ادیب کا کلام اس کے دماغ کا آئینہ ہوتا ہے۔ اگر اس معیار پر مولانا حالی کے کلام کو جانچا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان کی سیرت اور ان کی حیات سرتا پا ان کے کلام میں موجود ہے۔ وہ مجسم ہمدردی اور مجسم درد تھے اور یہی ان کے کلام کی خصوصیت ہے۔ ان کا ہر ایک مصرع درد میں ڈوبا ہوا جگر پارہ ہے۔ ہماری زبان میں اور بھی ایسے شاعر ہوئے ہیں جن کے کلام میں عجیب اثر اور درد ہے لیکن ان کا درد ذاتی اور محدود ہے۔ حالی کا درد ساری قوم کا درد ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کے پُر درد نغموں نے قوم کے دلوں کو ہلا دیا۔ سوتوں کو جگا دیا اور کاہلوں کو ہوشیار کر دیا۔"

فی الحقیقت مولانا کے کلام کی طرح ان کا دل بھی درد سے لبریز تھا۔ مبدءِ فیاض نے ہمدردیِ خلائق کا مادہ ان کی فطرت میں خاص طور پر ودیعت کیا تھا جس کو بھائی بہنوں کی تربیت نے اور بھی چار چاند لگا دیے۔ استادِ شفیق کی تعلیم نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور زمانہ کے دردانگیز واقعات نے درد دل کو اور بھی بڑھا دیا۔ مولانا کی اسی ہمدردی کی بابت میں چند خاص باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

سچی ہمدردی کے لئے ضرورت ہے کہ انسان کا دل بے جا طرفداری یعنی تعصب سے خالی ہو اور حضرت علی مرتضیٰ (علیہ السلام) کے اس قول پر عمل ہو:

"اُنْظُرْ اِلٰی مَا قَالَ وَلَا تَنْظُرْ اِلٰی مَنْ قَالَ تم اس بات پر نظر کرو کہ کسی نے کیا کہا ہے؟ اور یہ نہ دیکھو کہ کہنے والا کون ہے؟"

اور میں اپنے علم اور واقفیت کی بنا پر کہتا ہوں کہ مولانا ہمیشہ اس زرّیں مقولہ پر کاربند رہے۔

غدر ۱۸۵۷ء سے دو تین سال قبل کا واقعہ ہے جبکہ مولانا کی عمر بیس سال کے قریب تھی اور دہلی میں طالب علم تھے۔ آپ نے ایک رسالہ بزبانِ عربی تصنیف کیا جو کسی منطقی مسئلہ کے متعلق تھا اور جس میں مولوی سید صدیق حسن خاں صاحب مرحوم (نواب بھوپال) کے خیال کی تائید کی گئی تھی۔ مولانا نے اس رسالہ کو اپنے استاد کے سامنے پیش کیا جو ایک مشہور حنفی عالم اور مدرسہ حسین بخش میں معلّم تھے۔ وہ اس رسالہ کو پڑھ کر اس قدر ناراض ہوئے کہ اس کو چاک کر دیا۔ مگر بعد میں کہا کہ رسالہ نہایت لیاقت سے لکھا گیا تھا لیکن چونکہ اس میں ایک وہابی مولوی کی تائید تھی اس لئے چاک کر دیا گیا۔ مولانا کی انصاف پسندی اور بے تعصبی کی یہ پہلی مثال ہے جس کا مجھ کو علم ہے۔

مولانا کا ایک ہم وطن جو اسلام کو چھوڑ کر عیسائی ہو گیا تھا۔ اس نے ایک کتاب تحقیق الایمان اسلام کے خلاف لکھی تھی۔ مولانا نے اس کے جواب میں کتاب تریاقِ مسموم لکھی جو اسی زمانہ میں مذہبی میگزینوں میں چھپ گئی تھی۔ افسوس ہے کہ مجھے اس کا کوئی نسخہ آج تک دستیاب نہ ہوا اور نہ مولانا کا قلمی مسودہ مل سکا۔ یہ ۱۸۶۷ء کے قریب کا واقعہ ہے۔ تین چار سال کے بعد اسی عیسائی کے جواب میں "تاریخ محمدی پر رائے منصفانہ" کے نام سے مولانا نے ایک رسالہ چھپوایا جس کی ایک کاپی خوش قسمتی سے میرے کتب خانہ میں موجود ہے۔ متعصب پادریوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس کا مقابلہ مولانا نے حکمائے یورپ کی ان منصفانہ آراء کے ساتھ کیا ہے جو انہوں نے آنحضرت ﷺ کے متعلق ظاہر کی ہیں۔ اس رسالہ میں بھی سنجیدگی، انصاف پسندی اور بے تعصبی کی وہی شان نظر آتی ہے جو مولانا کی تمام تصانیف کا امتیازی

نشان ہے۔

مولانا کا دل انسانی ہمدردی سے لبریز اور جذباتِ محبت سے مالا مال تھا اسی وجہ سے ان کے کلام میں حقیقی محبت اور ہمدردی کے جذبات موجزن نظر آتے ہیں اور یہ وہ خصوصیت ہے جس کی وجہ سے ان کا کلام دیگر شعراء کے کلام سے ممتاز ہے۔ چند متفرق اشعار ملاحظہ ہوں:

رونا نہ ہوگا حالی شاید یہ کم تمہارا — جب دیکھو آنسوؤں سے دامن ہے تر تمہارا

دل کو یہ تو نے دکھایا ہے کہ دکھ جاتا ہے — چیونٹی کا بھی اگر دل ہے دکھایا جاتا

روزِ محشر کہ زہر شیخ و برہمن پرسند — سر دہم قصۂ عشق تو چو از من پرسند

در غریبی طرح الفت افگنم با ہر کسے — در دلِ گبر و مسلماں وطن خواہد شدن

ہندو سے لڑیں نہ گبر سے بیر کریں — شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں

جو کہتے ہیں یہ کہ ہے بہشت دنیا — وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں

حکیم محمود خاں صاحب مرحوم کا جو مرثیہ مولانا نے لکھا تھا وہ نہ صرف حکیم صاحب کا مرثیہ بلکہ قوم کی تباہی و بربادی کا دردناک مرقع بھی ہے۔ اس مرثیہ میں یہ بتایا ہے کہ دہلی کے محدث، فقیہہ، امام، شاعر، ادیب، طبیب، عالم، واعظ اور دیگر اہلِ کمال ایک ایک کر کے رخصت ہو چکے ہیں۔ قوم کا جاہ و جلال مٹ چکا ہے۔ دورِ آخر میں محمود خاں کے دم سے قوم کی عزت تھی اب وہ بھی نہ رہے۔ مرثیہ کے یہ آخری دو بند جن سے دردِ دل ٹپکتا ہے نہایت حسرت انگیز ہیں:

سنتے ہیں حالی سخن میں تھی بہت وسعت کبھی
تھیں سخنور کے لئے چاروں طرف راہیں کھلی
داستاں کوئی بیاں کرتا تھا حسن و عشق کی
اور تصوف کا سخن میں رنگ بھرتا تھا کوئی
گاہ غزلیں لکھ کے دل یاروں کے گرماتے تھے لوگ
گہ قصیدے پڑھ کے خلعت اور صلے پاتے تھے لوگ

پر ملی ہم کو خیالِ نغمہ اس محفل میں کم
راگنی نے وقت کی لینے دیا ہم کو نہ دم
نالہ و فریاد کا ٹوٹا کہیں جا کر نہ سم
کوئی یاں تکیں ترانہ چھیڑنے پائے نہ ہم
سینہ کوبی میں رہے جب تک کہ دم میں دم رہا
ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا

یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ مولانا علی گڑھ کی تعلیمی تحریک کے حامی اور حکیم محمود خاں مرحوم اس کے مخالف تھے اور اسی وجہ سے باہمی تعلقات میں کشیدگی اور بے لطفی پیدا ہو گئی تھی۔ مگر باوجود اس کے حکیم صاحب کی واقعی خوبیوں کو نہایت خوبی کے ساتھ ظاہر کر کے مولانا نے شرافتِ نفس کا ایسا ثبوت پیش کیا ہے جس کی مثالیں کم ملتی ہیں۔ مرثیہ کا ایک بند ملاحظہ ہو۔ شہرِ دہلی سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں:

ہے کوئی اب تجھ میں ہیرو ایسا یکتائے زماں
واقعاتِ زندگی کر دیجے گر اس کے بیاں

سمجھیں اک افسانہ ناواقف اسے اور داستاں
ہے تعجب خیز، الحق سیرتِ محمود خاں
یا وہ اک جوہر الگ تھا جوہرِ انسان سے
یا نکلتے اب نہیں ایسے جواہر کان سے

میر مہدی مجروح کے دیوان پر جو قطعۂ تاریخ مولانا نے لکھا ہے، وہ بھی حقیقت میں دہلی کے اہلِ کمال کا مرثیہ ہے جن کی موت نے مولانا کے دکھے ہوئے دل کو سخت صدمہ پہنچایا تھا وہ قطعہ یہ ہے :

مجروح آنکہ نامِ سلف زندہ است ازو	ذاتش بود غنیمتِ کبریٰ دریں زماں
دہلی کہ بود کانِ ہنر معدنِ کمال	امروز از کمال نیابی دراو نشاں
جمعے کہ داشت سر بفلک از وجودشاں	راندند سوئے جنتِ ماویٰ یگاں یگاں
زآنانکہ ماندہ اند ازاں جمع یادگار	لبیک مے زنند اجل را زماں زماں
غالب برفت و نیر و آزردہ رفت و ذوق	مومن برفت و حسرتی و عارف از میاں
رفتند و جائے شاں ہمہ خالی گذاشتند	کس برنخاست تا بنشیند بجائے شاں
مجروح ماندہ است ازاں جمع یادگار	یارب بدار از بدِ دورانش در اماں
کایں عندلیب قصہ نمی خواند از بہار	ویں گل خبر نمی دہد از عہدِ گلستاں
القصہ چوں گشتہ وارزاں شد آں متاع	کانرا بہ نقدِ عمر خریدن سزد تواں
پرسد اگر کسے ز تو تاریخ حالیا	گو "نظمِ دلفریب" بود سالِ طبعِ آں

سر سید احمد خاں، نواب ضیاء الدین احمد خاں، خلیفہ سید محمد حسن خاں، ———— اور دیگر معاصرین و احباب کے انتقال پر مولانا نے جو نظمیں لکھی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل پر کیسی چوٹ لگی تھی۔ نواب مختار الملک سر سالار جنگ اوّل (صدرِ اعظم ریاست حیدر آباد دکن) کی وفات پر جو ترکیب بند مولانا نے لکھا تھا اس کا یہی شعر (جو ہر بند کے آخر میں آتا ہے) نواب مرحوم کی خوبیوں کو یاد دلانے اور اہلِ دل کو رُلانے کے لئے کافی ہے :

اے اجل گر تنِ بے جاں نہ تنہا کش سپری
نہ توانی کہ نکو نامیش از یاد بری

مولانا کے احباب میں ہندوؤں کی بھی ایک کافی تعداد تھی جن کے ساتھ مولانا کے دوستانہ تعلقات ایسے ہی تھے جیسے مسلمانوں کے ساتھ۔ مثال کے طور پر ماسٹر پیارے لال صاحب دہلوی اور ان کے بھائی لالہ مدن گوپال صاحب ایم۔ اے اور لالہ سری رام صاحب ایم۔ اے (والد لالہ مدن گوپال صاحب) کے نام پیش کئے جا سکتے ہیں۔ لالہ بہاری لال صاحب مشتاق دہلوی شاعری میں مولانا کے شاگرد تھے۔ میں جس زمانہ میں مولانا کے ساتھ دہلی میں رہتا تھا وہ اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ مولانا کی شفقت اور ان کے برتاؤ کو دیکھ کر جو لالہ صاحب موصوف کے ساتھ تھا میں ان کو مسلمان سمجھتا رہا۔ بہت عرصہ کے بعد جب ان کا نام کسی نے بتایا اس وقت میں نے جانا کہ وہ ہندو ہیں۔ حضرت مشتاق کے انتقال کے بعد مولانا نے جو خط ان کے فرزند لالہ چندو لال صاحب کو لکھا تھا اس کے ایک ایک جملہ سے خلوص اور محبت ٹپکتی ہے۔ چند سطریں ملاحظہ ہوں۔ "میرے دہلوی دوستوں میں سے افسوس ہے کہ ایک خالص اور مخلص دوست کم ہو گیا جس کا بدل ملنا مشکل ہے۔ ایسے وضعدار،

محبت کے پتلے، حاضر و غائب یکساں اور اپنے سکول کے فدائی بہت کم ہوتے ہیں۔"

۱۸۷۴ء میں مولانا نے ایک مثنوی "حبِّ وطن" لکھی جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا جذبۂ حبِّ وطن بہت وسیع تھا جس میں کسی قوم و ملت و مذہب و فرقہ و جماعت کی تخصیص نہ تھی۔ آج کل کے مدعیانِ حبِّ وطن کو یہ مثنوی نہایت غور سے پڑھنی چاہیئے۔ یہاں صرف چند شعر نقل کئے جاتے ہیں:

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر ۔۔۔ نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
ہو مسلمان اس میں یا ہندو ۔۔۔ بودھ مذہب ہو یا کہ ہو برہمو
جعفری ہووے یا کہ ہو حنفی ۔۔۔ جین مت ہووے یا ہو ویشنوی
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو ۔۔۔ سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو
ملک ہیں اتفاق سے آزاد ۔۔۔ شہر ہیں اتفاق سے آباد

۱۸۷۴ء یا اس کے قریب کا ذکر ہے کہ دہلی میں ایک مشاعرہ نواب ضیاءالدین احمد خاں مرحوم کے مکان میں منعقد ہوا۔ شعراء نے دل خوش کن غزلیں اور مجلس کو گرمانے والی نظمیں سنائیں۔ "گھر کی صورت" "در کی صورت" ("گھر" "در" قافیہ اور "کی صورت" ردیف تھی) مولانا نے مصرع طرح پر کچھ نہیں لکھا تھا۔ مگر لوگوں کے اصرار پر انہوں نے اپنی ایک طولانی غزل سنائی جو فی الحقیقت دہلی کی شاعری کا مرثیہ ہے۔ اس غزل کے پورے تیس شعر ہیں۔ ہر شعر حالی کے دردِ دل کی ترجمانی کرتا ہے۔ صرف آٹھ شعر بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں:

تذکرہ دہلیٔ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ ۔۔۔ نہ سنا جائیگا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل ۔۔۔ ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رلانا ہرگز
ڈھونڈتا ہے دلِ شوریدہ بہانے مطرب ۔۔۔ دردانگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز
دیکھ اے داغ آئیگا سینے پہ بہت اے سیاح ۔۔۔ دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز
چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہ خاک ۔۔۔ دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز
کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمہارا دہلی ۔۔۔ ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز
غالب و شیفتہ و نیر و آزردہ و ذوق ۔۔۔ اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانا ہرگز
داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں ۔۔۔ نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز

داغ اور مجروح دونوں اس مجلس میں موجود تھے۔ مولانا مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ یہی پہلا اور آخری مشاعرہ ہے جس میں مجھ کو شرکت کا اتفاق ہوا ہے۔ اگرچہ میری عمر کم تھی تاہم میں نے خاص طور پر محسوس کیا کہ اس غزل نے مجلسِ مشاعرہ کا رنگ بدل دیا اور مولانا کے سنجیدہ اور دردانگیز لہجے سے ایک سناٹا چھا گیا اور تمام سامعین دم بخود رہ گئے۔ کَاَنَّ عَلٰی رُؤُسِہِمُ الطَّیْرُ

یوں تو مولانا کا کوئی کلام نصیحت سے خالی نہیں ہوتا مگر جو ترکیب بند "مسلمانوں کی تعلیم" کے عنوان سے لکھا ہے، وہ ایک خاص شان رکھتا ہے جس میں مسلمانوں کو زمانہ کی زبان سے خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر علم و ہنر اور صنعت و حرفت میں ترقی کرنے کی نصیحت کی گئی ہے۔ اس نظمِ بے نظیر کا پہلا بند ملاحظہ ہو:

زمانہ دیر سے چلّا رہا ہے اے مسلمانو ۔۔۔ کہ ہے گردش میں میری غیب کی آواز پہچانو

سُنے ہوں گے نہ معنی "لاتسبّوا الدّھر" کے تم نے   تو اب سُن لو کہ ہوں میں شانِ ربّانی مجھے مانو
وہ ناصح اور ہوں گے جن کا کہنا ٹل بھی جاتا ہے   اگر میری نہ مانو گے تو پچھتاؤ گے نادانو
مری بازی کا منصوبہ گیا کب کا پلٹ یارو   خبر تم کو بھی ہے کچھ اے مری چالوں سے بیگانو
گئے وہ دن کہ لاکھوں بے ہنریاں عیش کرتے تھے   ہوا ہے بے ہنر جینا بھی اب مشکل مری جانو!
مٹے ہو جس ہنر اور فن پہ تم وہ مٹنے والے ہیں   یہ سودا کب تلک اے شمعِ سحرگاہی کے پروانو
بھرا سمجھے ہو جس گھر کو نہیں دیّار واں کوئی   کہاں بیٹھے ہو تم اے خانۂ ویراں کے دربانو

نصیحت میری مانو اب بھی اپنی ہٹ سے باز آؤ
پھری جس وقت دیکھو میری چتون تم بھی پھر جاؤ

مولانا نے اپنے ایک ترکیب بند میں جو "شکوۂ ہند" کے نام سے موسوم ہے، یہ بیان کیا ہے کہ قدیم مسلمانوں کے عادات و خصائل کیا تھے جن کو وہ ہندوستان میں آنے کے بعد کھو بیٹھے۔ اس عبرت انگیز نظم کے تیرہ بند میں چھٹا بند یہ ہے:

وہ مسلمانوں کی سربازی کی صفت کیا ہوئی   وہ حجازی غیرت اور وہ حمیت کیا ہوئی
تھے مسلمانوں سے سب سے لے کے ننگِ اسلام تک   تھا لقب "خیر الامم" جس کا وہ امت کیا ہوئی
جو کسی کی عزت افزائی سے خوش ہوتا نہیں   واں گواہی جس پہ دیتا تھا وہ عزت کیا ہوئی
دین و دولت، علم و دانش اب کچھ باقی نہیں   حق نے پوری کی تھی جو تم پہ وہ نعمت کیا ہوئی
ملک و مال و سلطنت اک آنی جانی چیز تھی   جو ہمیشہ رہنے والی تھی وہ دولت کیا ہوئی
قریہ قریہ تیرے علم و فضل سے معمور تھا   اے شبستانِ اسلام تیری خیر و برکت کیا ہوئی
جس نے مغرب کو کیا مشرق وہ سورج کیا ہوا   جس سے گھر بن گیا یونان وہ حکمت کیا ہوئی
کوہ و دریا جن کے ہوتے تھے نہ ہرگز سدِّ راہ   وہ ارادے کیا ہوئے اور وہ عزیمت کیا ہوئی
کوئی بھی مشکل تم کو جہاں سے ہٹا سکتی نہ تھی   وہ ثبات اور پائیداری اور وہ ہمت کیا ہوئی
ہوگی اے ہندوستاں آمد ہماری تجھ کو یاد   وہ مسلمانوں کی ہیبت اور صورت کیا ہوئی

وہ رو و دوش اور وہ سینے پہلوانی کیا ہوئے
وہ قدِ بالا وہ چہرے ارغوانی کیا ہوئے

مولانا کی نظم "مدّوجزرِ اسلام" جو "مسدّسِ حالی" کے نام سے مشہور ہے سب سے پہلی اور سب سے بہتر نظم ہے جو مسلمانوں کے عروج و زوال کا سچا فوٹو ہے۔ یہ نظم مولانا نے سرسید مرحوم کی تحریک سے لکھی تھی۔ سرسید کے دل میں اس نظم کی کیا وقعت تھی؟ وہ ان کے ان الفاظ سے ظاہر ہے:

"بے شک میں اس کا محرک ہوا اور اس کو میں اپنے ان اعمالِ حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا؟ میں کہوں گا کہ حالی سے مسدّس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں۔"

اس دردانگیز نظم کے دیباچہ کے چند جملے جو حالی کے دردِ دل کا پتہ دیتے ہیں، ملاحظہ ہوں:

"قوم کی حالت تباہ ہے۔ عزیز ذلیل ہو گئے ہیں۔ شریف خاک میں مل گئے ہیں
علم کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ دین کا صرف نام باقی ہے۔ افلاس کی گھر گھر پکار ہے
پیٹ کی چاروں طرف دہائی ہے۔ اخلاق بالکل بگڑ گئے ہیں اور بگڑتے جاتے
ہیں تعصب کی گھنگھور گھٹا قوم پر چھائی ہوئی ہے۔ رسم و رواج کی بیڑی ایک
ایک کے پاؤں میں پڑی ہے۔ جہالت اور تقلید سب کی گردن پر سوار ہے۔"

جب میں عربی صرف و نحو اور فارسی کی ابتدائی تعلیم اور دینیات کے چند رسالے ختم کر چکا تو میرے والد مرحوم نے مجھے میرے پھوپھا الحاج مولانا مولوی خواجہ ابراہیم حسین صاحب مرحوم کے پاس بمقام امرتسر بھیج دیا۔ جہاں منطق وغیرہ کی کچھ تعلیم حاصل کی۔ چند مہینے کے بعد وہاں سے آیا تو مولانا حالی نے میری والدہ مرحومہ (جو ان کی حقیقی بھانجی تھیں) سے میرے متعلق فرمایا کہ اس کو دہلی بھیج دو۔ تاکہ میرے پاس رہ کر انگریزی تعلیم حاصل کر سکے۔ انہوں نے بخوشی منظور کیا مگر والد مرحوم نے یہ کہہ کر انکار کیا کہ میں اس کو دینی تعلیم دلانا چاہتا ہوں۔ انگریزی تعلیم دلا کر نیچری اور بے دین بنانا نہیں چاہتا۔ مولانا کو اس کی اطلاع ملی تو انہوں نے فرمایا "بھائی غلام عباس (میرے والد کا نام ہے) ہرگز ایسا خیال نہ کریں۔ میں تو اس لڑکے کو دیندار اور پکا مسلمان بناؤں گا۔" الغرض میری والدہ کے اور مولانا کے اصرار پر میرے والد بمشکل اس بات پر آمادہ ہوئے۔ مگر جب انہوں نے دیکھا کہ دہلی کے قیام اور انگریزی تعلیم نے مجھ پر کوئی مخالف اثر نہیں کیا اور میرے مذہبی خیالات میں کوئی فرق نہیں پڑا بلکہ دینی ذوق روز بروز بڑھتا گیا تو بہت خوش ہوئے اور کچھ عرصہ کے بعد میرے چھوٹے بھائی خواجہ غلام الثقلین مرحوم کو بھی دہلی بھیج دیا۔ اس کے بعد پانی پت کے بہت سے لوگوں نے اپنے بچوں کو یکے بعد دیگرے دہلی بھیجنا شروع کیا تاکہ وہ مولانا کی نگرانی میں رہ کر انگریزی تعلیم حاصل کر سکیں۔ اب مولانا کو مکان تبدیل کرنا پڑا۔ پہلے جامع مسجد کے قریب حویلی مفتی صدر الدین خاں کے ایک حصے میں رہتے تھے۔ اب کوچہ پنڈت کے قریب میر افضل کی گلی میں مکان لے لیا اور اپنے مکان کے متصل دوسرا مکان ہم کو کرایہ پر دلا دیا۔ الغرض مولانا کی نگرانی میں ایک پرائیویٹ بورڈنگ ہاؤس قائم ہو گیا اور پانی پت کے بہت سے لڑکے وہاں رہ کر تعلیم سے مستفید ہوئے۔ آج کل پانی پت اور اس کے قریب کی بستیوں میں مسلمانوں اور ہندوؤں میں جو کچھ تعلیم کا چرچا اور شوق ہے اس کی بنیاد مولانا حالی ہی نے ڈالی تھی۔

جس شخص کے دل میں عام انسانی ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہو اور جس کا دل ایک چیونٹی کی تکلیف سے بھی دکھ جاتا ہو اس کو اپنے قریبی رشتہ داروں اور عزیزوں کی موت کا کیا کچھ صدمہ نہ ہوتا ہوگا۔ اس کا اندازہ اس قطعہ سے ہو سکتا ہے جو مولانا نے اپنے برادر عزیز حضرت خواجہ امداد حسین مرحوم کے انتقال پر بطور مرثیہ لکھا تھا اور جس کا ایک ایک شعر حالی کے غمزدہ و صدمہ رسیدہ دل کی حالت کا آئینہ ہے:
وہ مرثیہ یہ ہے ؎

کل سوگ میں بھائی کے اسے دیکھ کے چپ چپ ۔۔۔ حالی سے کہا ہم نے کہ اے بحر معانی
خاموش کبھی ہم نے تجھے یوں نہیں دیکھا ۔۔۔ کیا ہو گئی وہ تیری طبیعت کی روانی
شادی میں تری تہنیتیں ہم نے سنی ہیں ۔۔۔ ماتم میں بھی دیکھی ہے تری مرثیہ خوانی
ہنستا ہے نہ روتا ہے نہ بذلہ ہے نہ نوحہ ۔۔۔ کچھ کہہ تو سہی دل میں یہ کیا تو نے ہے ٹھانی
دنیا ہے یہ اک وادیٔ فنا جس کا اثاثہ ۔۔۔ سب خاک ہے تا انجم و افلاک ہے فانی
ہو جائے گر انسان یونہی ہر رنج میں خاموش ۔۔۔ کس طرح دلوں کے ہوں عیاں راز نہانی
اک آہ بھری سن کے یہ حالی نے کہ جس سے ۔۔۔ دل ہل گئے اور سب کے لہو ہو گئے پانی

فرمایا کہ موجوں سے بھنور کی نہیں آگاہ ساحل پہ ہیں جو راہ سپر قاصی و دانی
حالی ہی کو معلوم ہے حالی کی حقیقت مشکل ہے کسک دل کی عزیزوں کو دکھانی
آئے ہیں سدا بھائیوں سے بھائی بچھڑتے موت ایک کے آگے ہے ضرور ایک کو آنی
پر بھائی ہو جس شخص کا حالی کا سا بھائی غم بھائی کا مرجانے کی ہے اس کے نشانی
جس بھائی نے بیٹوں کی طرح بھائی کو پالا سوکھی ہوئی کھیتی میں دیا باپ کی پانی
جس بھائی کی آغوش میں ہوش اس نے سنبھالا جس بھائی کے سایہ میں کٹی اس کی جوانی
شفقت نے دیا جس کی بھلا مہرِ پدر کو دی آنے کبھی دل پہ نہ بھائی کے گرانی
جینا بھی رہا بھائی گر اس بھائی کے پیچھے لذت نہیں جینے سے نصیب اس کو اٹھانی
دل مردہ ہو حالی کی طرح جس کا عزیزو کیا ڈھونڈتے ہو اس کی طبیعت میں روانی
یہ چُپ نہ لگاتے کسی دشمن کو بھی اللہ یہ چُپ نہیں مرجانے کی ہے دل کے نشانی
بولیں گے بھی سو بار ہنسیں گے بھی جہاں میں یہ ناؤ ہے ہر طرح نہیں پار لگانی
پر آہ کلی وہ جو سب مرجھا گئی دل کی مشکل ہے وہ ہنس بول کے آپس میں کھلانی

باقی رہے گا داغ سدا بھائی کا دل پر
ہر چند کہ فانی تھا وہ اور ہم بھی ہیں فانی

ایک انگریز مسٹر وارڈ جو مولانا کے کلام کے نہایت قدردان اور رباعیات حالی کے مترجم ہیں۔ انہوں نے مسٹر عبدالقادر بیرسٹر (سر عبدالقادر مرحوم) کو جبکہ وہ رسالہ مخزن کے ایڈیٹر تھے، ایک خط میں اس قطعہ کے متعلق لکھا تھا: "میں اس نظم کی کافی تعریف نہیں کر سکتا۔ بار بار پڑھتا ہوں اور نئے لطف لیتا ہوں۔"

مولانا کی گفتگو نہایت نرم ہوتی تھی۔ میں نے کبھی ان کی زبان سے کوئی ایسا کلمہ نہیں سنا جس سے کسی کے دل کو دکھ پہنچے۔ نوکروں کے ساتھ بھی ان کا برتاؤ برادرانہ تھا۔ کسی ملازم کو ڈراتے دھمکاتے نہ تھے۔ اگر کبھی اتفاقاً ایسی صورت پیش آتی تو ان کی دھمکی بھی ہمدردی کا پہلو لیے ہوئے ہوتی تھی۔ غصہ اول تو آتا نہیں تھا اور کبھی آتا تھا تو بھی زبان کو قابو میں رکھتے تھے۔ ان کا ایک ملازم عطاء اللہ جو لنگڑا، لولا، بہرہ اور تیز مزاج تھا اور اس قدر چیخ چیخ کر بولتا تھا جیسے لڑتا ہو۔ اس کے ساتھ بھی کبھی سختی کا برتاؤ نہیں کیا۔ میرے سامنے کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ مولانا نے کسی چیز کی بابت عطاء اللہ سے پوچھا کہ فلاں چیز کہاں ہے، تو اس نے اپنی عادت کے موافق نہایت سخت اور کرخت لہجہ میں کہا "یہ کیا دھری ہے؟" مولانا نے اسے تو کچھ نہیں کیا مگر مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا "دیکھئے یہ عطاء اللہ کس طرح بولتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کیا تو اندھا ہے اور یہ چیز تجھے نہیں سوجھتی۔" ضرورت مندوں کی مالی امداد خاموشی کے ساتھ کرتے تھے۔ ایک لالہ صاحب نے اپنے کاروبار کے لئے مولانا سے قرض مانگا رقم زیادہ تھی۔ مولانا کے پاس روپیہ نہیں تھا۔ انہوں نے اپنے ایک عزیز سے بطور قرض حسنہ دلوا دیا جو بعد میں ادا ہو گیا۔ یہ لالہ صاحب میرے بہت پرانے ملاقاتی ہیں اور اس وقت ان کی مالی حالت اچھی ہے۔ وہ مجھ سے کئی مرتبہ اس واقعہ کا ذکر کر چکے ہیں اور علی الاعلان کہتے ہیں کہ "مجھے تو حالی صاحب نے بنا دیا۔" اگر وہ خود اس بات کا ذکر نہ کرتے تو مجھے اس کا علم بھی نہ ہوتا۔ کسی کی غیبت مولانا کی زبان سے نہیں سنی گئی اگر کسی شخص کا واقعی عیب ان کے سامنے بیان کیا جاتا تو اس کی نرم تاویل کرتے تھے۔ بچوں سے خاص کر بہت محبت اور ہمدردی رکھتے تھے۔ ان کو کبھی یہ بات گوارا نہ تھی کہ کوئی ماں کسی بچہ کو ڈرائے یا دھمکائے یا اس کے ساتھ سختی سے پیش آئے۔ مارنے پیٹنے کا تو ذکر ہی کیا؟ میری

والدہ مرحومہ کا قول تھا کہ " میرے ماموں پر تو سات مائیں قربان ہیں"۔ یعنی مولانا بچوں سے ایسی محبت کرتے ہیں کہ سات مائیں بھی نہیں کر سکتیں۔ خاکساری کا یہ عالم کہ انہوں نے اپنے آپ کو ایک معمولی آدمی سے زیادہ کبھی نہیں سمجھا۔ شیخی، تعلّی اور تکبّر نام کو بھی نہیں تھا۔ مولانا کی خاموش، متین اور سنجیدہ طبیعت کی وجہ سے ایک ناواقف آدمی ان کی گفتگو سے اس بات کا پتہ نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ مصنف یا شاعر یا کوئی عالم آدمی ہیں۔

میرے بھائی آنریبل خواجہ غلام الثقلین مرحوم جو ہر بات کو نہایت گہری نظر سے دیکھتے تھے۔ انہوں نے مولانا کی وفات پر ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو واقع ہوئی، اپنے اخبار "عصرِ جدید" میں ان کی سیرت کے متعلق نہایت جچی تلی رائے لکھی تھی جس پر میں اس تقریر کو ختم کرتا ہوں:

"مولانا یونانی خیالات کی رُو سے ایک معتدل اور متوسط کامل انسان اور صوفیہ خیالات کی رُو سے ایک صاحبِ باطن ولی تھے۔ کبھی کسی کی بُرائی ان کی زبان سے نہیں سُنی گئی۔ ہر شخص کے عیب کی نرم تاویل کرنا پسند فرماتے تھے۔ عزیزوں سے محبت رکھتے تھے۔ غریبوں کی امداد کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ کسی مذہب کے قائل سے سچ اور عمدہ بات سُنتے تھے تو اس کی قدر کرتے اور تعریف کرتے تھے۔ مذہباً نہایت بے تعصب تھے۔ ان کے والدین شیعہ تھے اور مرحوم کو یتیم چھوڑ کر والد ماجد انتقال کر گئے تھے۔ بچپن میں اہلِ سنت و جماعت میں تعلیم پائی۔ لیکن اگر وہ شیعوں کی طرح تعلیم پاتے تب بھی ایسے ہی اعلیٰ خیال اور بے تعصب اور خیر خواہ اسلام شیعہ ہوتے۔ جیسے آپ بلند خیال بے انتہا محبِّ اہلِ بیت اور صوفی منش سُنّی تھے۔ مسلمانوں کے مذہبی اختلافات کو نہایت مکروہ سمجھتے تھے اور طریق نماز کے علاوہ اور کسی طرح اختلاف کے اظہار کو پسند نہ کرتے تھے۔ ان کی اولاد اور خاندان میں دونوں طریقہ کے لوگ موجود ہیں اور وہ کسی کو یہ نہ کہتے تھے کہ وہ کیا طریقہ اختیار کرے۔ ان کے پاس بیٹھنے اور باتیں سُننے سے نہایت بد باطن شخص بھی روحانی فیض پاتے تھے۔ علم اور بیانِ ادب مولانا کی خاص صفت تھی۔ اس کے ساتھ رحم و مروّت ـ پانی پت، بلکہ اس تمام علاقے کو فخر محسوس کرنا ہے کہ ایسا انسانِ کامل اس میں پیدا ہوا جس نے خود کو کبھی غیر معمولی آدمی بھی نہ سمجھا۔ اخلاق میں، عادات میں، برتاؤ میں، مروّت میں، فیّاضی میں اعلیٰ درجہ کا اعتدال تھا۔ عزیزوں اور اولاد کی محبت، تعلیم کا خیال، عالم کی خیر خواہی، نیک آدمیوں کی قدر دانی میں ان کی مثال ضرور ملے گی مگر کم۔ آخر زمانے میں جبکہ دماغ بیکار ہو گیا تھا اور لوگ اپنی عادت کے موافق مختلف خیالات سے جنگ کی خبروں کا ذکر کرتے تھے تو مولانا مرحوم جب بہت سے آدمیوں کے مقتول ہونے کا ذکر سُنتے تھے تو اس قدر تاسف سے آہ کرتے تھے گویا خود اپنے کسی عزیز کے مرنے کی خبر سُنی ہو۔ خدمت گار اُن کو الگ روتے ہیں کہ ایسا آقا دیکھا نہ تھا۔ یہی حالت رشتہ داروں اور اہلِ شہر کی ہے۔ قوم میں بھی کچھ کم افسوس نہ ہوگا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ"

مہدی حسن

عبدالماجد دریابادی

سنہ ولادت تخمیناً ۱۸۶۷ء یا ۱۸۶۸ء ہوگا۔ وفات نومبر ۱۹۲۱ء میں ہوئی۔ عمر ۵۵ سال کے اندر ہی رہی۔

ہوش کی آنکھیں جب کھولیں تو اپنے وطن گورکھپور میں رنگ جما ہوا پایا ریاض خیرآبادی کا — ریاض کا وطن اختیاری گورکھپور تھا۔ وہیں شباب گزارا۔ وہیں سے ریاض الاخبار ہفتہ میں دو بار (سہ روزہ کی اصطلاح اس وقت تک نہیں چل پڑی تھی) نکالا۔ وہیں سے فتنہ اور عطرِ فتنہ کے شگوفے چھوڑتے رہے۔ اور وہیں سے ہنگامہ پرور ناولوں کو اپناتے رہے۔ آج یہ سارے نام اور حوالے قصۂ طلب تلمیحیں ہیں۔ ان کی دو لفظی تشریح بھی سنتے چلئے —

ریاض الاخبار نام کا سیاسی پرچہ تھا لیکن اس کی ادبیت اس کی سیاست پر کہیں غالب۔ ریاض اس میں نثر کی شاعری کرتے۔ اور لوگ بھی بجائے سیاسی معلومات کے زبان و انشا ہی کی خاطر خریدتے۔ فتنہ اس کا ایک ننھا منا سا ضمیمہ جیبی تقطیع کا رنگین کاغذ پر نکلتا۔ اور لطیفوں چٹکلوں سے دل بہلاتا رہتا۔ عطرِ فتنہ کی بابت اب خوب ذہن میں نہیں۔ اسی شان کا ماہانہ پرچہ تھا یا شعر و نثر کی بہار دکھاتا۔ بہرحال اتنا یاد ہے کہ یہ دونوں پرچے نام کے "فتنے" قیامت کی شوخیاں دکھاتے رہتے۔ اور رینالڈز وغیرہ کے عام پسند انگریزی ناولوں کو ریاض اردو میں اپناتے رہتے چنانچہ رینالڈز کا (LOVES OF THE HAREM) حرم سرا کا نام پاکر اردو میں اپنا نام کر گیا۔ اردوئے معلیٰ کے لطیف و شستہ جملے گویا سانچے میں ڈھلے ہوئے۔ اور پھر ریاض اور ان کے دوست رسا رام پوری کے مزیدار اشعار۔ سطر میں بٹے ہوئے۔

یہ فضا تھی جس میں مہدی مرحوم نے آنکھیں کھولیں۔ اسی میں پلے، بڑھے۔ سالہا سال بعد ریاض کو ایک خط میں لکھا "مجھ کو آپ کے ساتھ جو خاص تعلق ہے آپ کو معلوم ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ میں اس وقت سے آپ کے لٹریچر کا دلدادہ ہوں جب لٹریچر کا صحیح مفہوم بھی میرے ذہن میں نہیں تھا" (مکاتیب مہدی صفحہ ۱۸۰)

دلگیر مرحوم ایڈیٹر ماہنامہ نقاد (آگرہ) کے نام اس سے کہیں زیادہ کھل کر لکھا ہے:-

"مرحوم ریاض (خدا اسے مدتوں جلائے) عروسِ سخن کا آشنائے ازلی ہے آپ لٹریچر کی جن نزاکتوں پر مٹتے ہوئے ہیں، وہ ریاض کے قلم کی آوازِ بازگشت ہے۔ آج لٹریچر پر طبع آزمائی کے لئے بہتیرے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ لیکن میں نے پہلے پہل یہ لفظ ریاض الاخبار میں دیکھا۔ جب اس کے مفہوم سے بھی اچھی طرح واقف نہ تھا...... موجودہ لٹریچر اپنی انقلابی حیثیت سے ریاض سے بے نیاز نہیں ہے۔ وہ جس طرح نظم کا مالک ہے۔

آفتابِ نثر بھی ہے۔ اور یہی امتیازی فائقہ ہے جس کی بنا پر وہ انشا پردازی کا مسلّم الثبوت ہیرو ہے (مکاتیبِ مہدی ص۱۸۹)

پیدائش محلہ بسنت پور، گورکھپور کے ایک کھاتے پیتے شریف اور مذہبی رنگ کے خاندان میں ہوئی۔ والد کورٹ انسپکٹر تھے۔ گھر ہی کا ایک حصہ مکتب کہلاتا تھا، وہیں بیٹھ کر حسبِ دستورِ وقت اُردو فارسی پڑھی۔ ممکن ہے کہ عربی کی بھی شُدبُد حاصل کی ہو۔ اور پھر کچھ روز علیگڑھ جا کر اسکول کے درجوں میں پڑھا۔ طبیعت بڑی اخّاذ پائی تھی۔ مزاج میں نفاست و لطافت اور اُردو ادبیات سے مناسبت یہ چیزیں معلوم ہوتا ہے فطرت کی طرف سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ بس انہیں کے سہارے بغیر کوئی ڈگری یا سند حاصل کئے کچھ ہی روز میں اتنا کر لیا اور ایسے چل نکلے کہ اچھے اچھے ڈگری والوں کو راستہ بتلاتے، اور بڑے بڑے سند والے ان کا سامنا کرتے ہچکچاتے۔ بیگم مہدی کی روایت ہے کہ شروع میں گھر پر کسی انگریز سے بھی پڑھا تھا (افاداتِ مہدی ص۵) یہ روایت انہوں نے یقیناً مرحوم ہی سے سنی ہوگی۔

یہ بیگم دوسری بیوی تھیں۔ بڑی چہیتی اور صحیح معنی میں شریکِ زندگی۔ پہلی بیوی کا انتقال مرحوم کی جوانی ہی میں ہو گیا تھا۔ یہ عقد اس کے بعد ہوا ——— معاشرت میں "صاحبیت" کا اثر ممکن ہے انہیں "صاحب" کی معلّمی کا نتیجہ ہو۔

شعوری طور پر بچپن میں علمی اثر سب سے زیادہ سرسید کا پڑا۔ ان کے تہذیب الاخلاق کی ایک جلد دیکھنے کو مل گئی تھی۔ انہیں بیگم مہدی کی روایت ہے کہ "وہ اکثر اس کا ذکر کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ صرف اسی تہذیب الاخلاق نے مجھے آدمی بنا دیا" (افادات ص۶)

مرحوم کا شمار مصنّفین کے زمرہ میں تو مشکل ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ تصنیف یا تالیف ان کی ایک بھی نہیں۔ خوب کہا ہے ہمارے اُردو کے رئیس المصنّفین مولانا سیّد سلیمان ندوی نے کہ۔

"مرحوم کوئی پیشہ ور مصنّف نہ تھے جو پیلوں کی زحمت کے لئے اپنی تصنیفات کا ذخیرہ چھوڑ جاتے" (مکاتیب ص۱۱)

مضمون نگار بھی وہ کوئی پیشہ ور اور بڑے مشّاق نہ تھے۔ ذخیرۂ تحریر کل ۴۱ مضمون ہیں چھوٹے اور بڑے سب ملا کر، اور انہیں میں ترجمہ تنقید بھی شامل ہیں۔ یہ ہفتہ واروں اور ماہناموں میں چھپے ہوئے مضمون ۱۸۹۹ء تا ۱۹۱۹ء یعنی ۲۰ سال کی مدت میں شائع ہوئے۔ اس حساب سے اوسط ہر سال ڈیڑھ مضمون کا پڑتا ہے! یہ اوسط ہوا ورنہ واقعہ یہ ہے کہ عموماً سال میں دو ایک مضمون لکھتے وہ بھی جب طبیعت خوب حاضر ہوتی اور لکھنے کا کوئی داعیۂ قوی موجود ہوتا۔ کسی کسی سال جب طبیعت میں موج آتی تو چار چار پانچ پانچ مضمون بھی لکھ ڈالتے اور درمیان میں مہینوں کیا برسوں کا سنّاٹا ——— تصنیف کے نام سے کل کائنات یہی مجموعۂ مقالات ہے جو افاداتِ مہدی کے نام سے وفات کے بعد شائع ہوا ہے۔ بیچارہ کو نظرِ ثانی و ترمیم وغیرہ کا کوئی موقع نہ مل سکا اور ہر صاحبِ تجربہ جانتا ہے کہ اس کے بغیر تحریر کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے۔ ناممکن تھا کہ سنہ ۱۹۲۰ء و سنہ ۱۹۲۱ء والے مہدی حسن جب ۱۸۹۹ء و سنہ ۱۹۰۰ء والے مہدی حسن (جن کے نام کے ساتھ "افادی الاقتصادی" کا بے معنی سا دُم چھلا لگا رہتا تھا) کی کسی تحریر کو دیکھتے تو اسے بے ہاتھ لگائے بلا اصلاح کئے بجنسہٖ چھوڑ دیتے۔ ——— افادات کی ضخامت ۲۰ × ۲۶ تقطیع پر دوسروں کے لکھے ہوئے دیباچہ وغیرہ کو نکال کر ۳۴۰ صفحہ کی ہے۔

اور ہاں اس سے کچھ کم ضخامت کی ایک کتاب اور بھی ان کے قلم کی رہینِ منّت نکل آئی۔ یہ ان کے خطوط کا مجموعہ ہے مکاتیبِ مہدی کے نام سے ——— مرحوم بڑے اچھے، بڑے پاکیزہ خط نویس تھے۔ ظلم تھا اگر ان کے ان انشائی کمالات کو ضائع ہونے دیا جاتا۔ کچھ قدردان احباب و اعزّہ نے انہیں بچا بچا کر رکھ لیا تھا۔ یہ ادبی جواہر پارے اگر ضائع ہو جاتے تو اُردو کا ایک قیمتی سرمایہ گُم ہو جاتا۔ بیچارہ کی ساری عمر سرکاری ملازمت میں گزری۔ وہ بھی کچھ بہت اُونچی نہیں۔ پہلے نائب تحصیلدار رہے پھر تحصیلدار ہو گئے۔ تنخواہیں اس زمانہ میں کچھ اچھی ہی سی ہوتی تھیں۔ یہ ٹھہرے شاہ خرچ، مزاج کے شوقین۔ نفاست مجسم۔ کھانا ہو تو نفیس، کپڑے ہوں تو نفیس، مکان اور اس کا فرنیچر ہو تو نفیس، ہر خرچ اُجلا۔ ہاتھ ہر خرچ پر کھلا ہوا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ گزر بسر کس طرح کی۔ چہیتی بیوی کے کتنے کپڑے کے حوصلے و ارمان کیسے پورے

گئے۔ لڑکوں کی تعلیم کے اخراجات کیونکر نکالے۔

کئی سال کا زمانہ تو غیر بنارس اور الٰہ آباد کی صدر تحصیلوں میں گذارا۔ باقی بیشتر حصّہ دیہات کی دور دراز تحصیلوں ہی میں بسر کیا، جہاں کتابوں کے کسی بڑے ذخیرہ کے وجود کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ تحصیلداری کے جھمیلوں کو یوں بھی کوئی مناسبت علمی اور تصنیفی مشغلوں سے نہیں ہے اور پھر جبکہ قیام بھی ایسی جگہ ہو۔ جہاں کوسوں نہ کسی علمی صحبت کا پتہ۔ نہ کسی کتب خانہ کا نشان، تو ایسے کوردیہہ میں اور اتنے غیر علمی ماحول میں رہ کر جیّد مقالہ نگاری کر ڈالنا ایک ادبی کرامت ہی کا مرتبہ رکھتا ہے۔

نئی نئی ترکیبیں گڑھنے اور انگریزی سے لے کر اردو میں نئے نئے لفظ ایجاد و اختراع کرنے میں مرحوم کو ایک حد تک ملکہ تھا اور اگر کہیں علمی استعداد مولانا نذیر احمد دہلوی کی سی ہوتی یا لسانیات اور زبان دانی سے مناسبت محمد حسین آزاد کی سی، تو مہدی حسن اس میدان میں سب سے بازی لے جاتے اور اپنے معاصرین کو کہیں پیچھے چھوڑ جاتے۔ پھر بھی جتنا کچھ وہ کر گئے وہ بہت سے پیشہ ور مستند مصنّفین کے لئے بھی باعث رشک ہی ہو سکتا ہے۔

ماسٹر پیس کے لئے "اختراع فائقہ"، ہنی مون "کے لئے" عہد زفاف"، جوائننگ ٹائم کے لئے" وقفہ سبک دوشی"، ایٹیکیٹ کے لئے" عوائد رسمیہ" اس قسم کے الفاظ خدا معلوم کتنے انہوں نے چلانے چاہے، اور ان میں سے کوئی کوئی چل بھی گئے ——— غیر شناختی جنبش لب "" ادھ کھلا علامہ شبلی کے ساتھ"، دماغی صلاحیتیں غیر دانیوں کے ساتھ" "پیارے جناب" اس قبیل کے بھی بہتیرے نقش انہیں نے انگریزی سے اپنائے۔ کچھ ان میں سے جم گئے اور کچھ اڑ گئے! ——— انگریزیت سے متأثر بہت زیادہ تھے اور وہ زمانہ ہی ناص تأثر کا تھا اس لئے وہ اکیلے کیا، سب ہی متأثر تھے۔ اس لئے لفظی اختراعات میں بھی انگریزیت کی جھلک آ گئی اور وہ لفظ اور فقرے اردو میں کھپ نہ سکے۔

اپنے مذہب ادب میں پورے "اہل السنت والجماعت" تھے۔ یعنی سرسید، آزاد، نذیر احمد، حالی، شبلی سب کے قائل۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی آزاد کی افضلیت کا کلمہ پڑھتے، کبھی نذیر احمد کی عظمت کا علم ہوا میں لہراتے، کبھی شبلی پر جان چھڑکتے، کبھی حالی کی اداؤں پر واری جاتے۔ اور کبھی سرسید کو استاد الکل کے رتبہ پر رکھتے ——— یہ سارے دعوے ایک دوسرے کے منافی نہیں۔ اپنے اپنے سیاق میں اور مناسب موقع پر یہ سب باتیں ٹھیک ہیں اور اتنی "تفضیلیت" کی گنجائش مذہب اہل سنت میں پوری طرح موجود ہے۔ سنجیدہ اور علمی ادب اردو کے ان "عناصر خمسہ" کے علاوہ وہ ادب خاص کے بھی استادوں کے پرستاروں میں تھے۔ ریاض کا نام اوپر گزر چکا۔ ایک اور اسی دور کے بہت اچھے لکھنے والے تیرھویں صدی اور صلائے عام کے ایڈیٹر منشی ناصر علی دہلوی تھے۔ دنیا تو اب ان کے نام ہی کو بھول چکی ہے۔ "ادب لطیف" کی اصطلاح پر آج کو چند غاصبوں نے اپنا قبضہ جما لیا۔ ورنہ انشا کی یہ شاخ دراصل ناصر علی کا خاص حصّہ تھی۔ اور مہدی ان کے نام پر مٹے ہوئے تھے۔

خشک نگاری ان کے مذہب میں بہ منزلہ کفر تھی۔ "مولویت" اور "مدرسیت" سے اسی لئے بیزار رہتے۔ اور تو اور خود مولانا سید سلیمان سے مدتوں ان کی "مولویت" کی بنا پر بدظن اور ان کے کمالات کے منکر رہے ——— مولانا شبلی کے انتقال کے دو ہی ان کے سلے واقعۂ پر ملال تھا، مابعد ۲۰ دسمبر ۱۹۱۴ء کو مولوی عبدالمجید صاحب دریابادی کے خط میں لکھتے ہیں۔

"سیرت نبوی کی تکمیل اب قیامت تک ہو چکی ——— یقیناً ہو چی میاں سلیمان اور پروفیسر حمید الدین ترتیب دیں گے۔ اس سے تو نہ ہونا اچھا تھا۔ یقیناً تنقیدی حصّہ مرحوم نے نہیں لکھا ہوگا، جتنے وہ تاریخی حصّے کے بعد شروع کرتے" (مکاتیب مہدی ص ۱۴۲)

بدگمانی بے محل ہی تھی، کچھ دنوں قائم بھی رہی۔ حقیقت کی پہلی جھلکیاں سامنے آنا شروع ہو گئیں۔ تو وہی ۱۹۱۷ء میں دریابادی کو مخاطب کرکے لکھتے ہیں "میں نہایت دلچسپی سے آپ کی ادبی فتوحات کو دیکھ رہا ہوں۔ میرا خیال تھا تصنیفی عہد علامہ شبلی کے ساتھ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ اس خیال کو میں نے ایک مستقل عنوان کے تحت میں چھپا دیا ہے "اردو لٹریچر کا دم واپسیں" عنقریب آپ کی نظر سے گزرے گا۔ جس میں میں نے دکھایا ہے کہ دارالمصنفین سے

ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔" (مکاتیب ص۹)

پھر ستمبر ۴۱ء میں ارض القرآن کی رسید دیتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"میں عربیت سے زیادہ آپ کی ادبیت سے مرعوب ہو رہا ہوں۔ زبان نفس موضوع کے لحاظ سے قطعاً لائق شکایت نہیں۔ یعنی کہیں سے بے جوڑ نہیں۔ اور جب تناسب میں کہیں سے کور کسر نہیں، تو حسن کی جامعیت میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔" (ص۱۰)

اور پھر :- "یہ کہنا بھول گیا کہ طنزیہ لٹریچر کی لطافت آپ کا حصہ ہے" (ص۱۶)

اور ایک بار اور معارف کے بعض چٹپٹے شذرات کی داد میں جو مسز سروجنی نائیڈو کے سلسلہ میں تھے :-

آپ نے شاعرۂ دکن پر جو بجلیاں گرائی ہیں اور اس سلسلہ میں فنون سوسائٹی پر جس خوبصورتی سے لے دے کی ہے سچ یہ ہے وہ نازک خیالی کی آخری حد ہے۔ میں نے بار بار پڑھا اور لطف اٹھاتا رہا۔ — جس زمانہ میں یہ پہلی دفعہ اسٹیج پر آئی ہے اور اس کی زبان سے یہ شعر نکلا ہے :-

در رہ منزل لیلےٰ کہ خطرہاست بسے
شرط اول قدم آن ست کہ مجنوں باشی

خوب یاد ہے کہ بہتیرے دل تھام کر بیٹھ گئے تھے۔ چڑھتی دوپہر سے ڈھلتی چھاؤں زیادہ خوشگوار ہوتی ہے۔ مدت سے سوچ رہا تھا کہ اس کی لچکدار نسائیت کو اپنی چند سطروں کا تختۂ مشق بناؤں لیکن آپ نے میرے لئے بالکل گنجائش نہیں چھوڑی۔ اور ساتھ ہی میرے دل کا ارمان پورا کر دیا۔ جو خاکہ آپ نے کھینچا ہے اور جس پہلو سے چوٹ کی ہے وہ تقلید کی چیز نہیں غلاف شکر میں اس طرح کوٹ کوٹ کر زہر بھرا ہے کہ خود آپ سے داد لینے کو جی چاہتا ہے۔" (ص۲۱)

عام طور پر مزاج ملوانہ اور روایتی پختگی لئے رکھتے تھے نہ مدح میں غلو نہ ہجو میں مبالغہ۔ نہ افراط نہ تفریط۔ لیکن آخر بشر تھے چوک ہی جاتے تھے۔ ان سطور کا راقم، آج کا بنا ہوا "مولانا" اس وقت نرا کھرا "مسٹر" تھا اور مرحوم سے سن میں کوئی ۱۶-۱۷ سال چھوٹا۔ بس اس پر اس طرح مہربان ہوئے کہ کوئی حد ہی نہیں۔ مکاتیب کے ورق ورق اور افادات کی سطروں سطروں پر سطر یہ اسی خورد نوازی کی نذر ——— حوصلہ افزائی کی بھی کوئی انتہا ہوتی۔

مزاج کی نفاست اور طبیعت کی شرافت میں اپنی نظیر آپ تھے یوں کہیے کہ ان کی تخلیق میں جزو اعظم یہی دو عنصر تھے۔ لکھتے وقت کاغذ نفیس ہو۔ قلم نفیس ہو۔ روشنائی نفیس ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ موسم خوشگوار ہو۔ جب کہیں ان کا قلم حرکت میں آسکے۔ مسودہ لکھتے وقت کیا مجال کہ کوئی داغ دھبہ پڑ جائے یا کہیں کاٹ پیٹ کو راہ ملے۔ سرکاری ملازمت سے آزاد ہوتے۔ اور وقت تمام تر اپنا رکھتے، جب بھی اپنی رعایتوں اور اتنے التزامات کے بعد کیونکر ممکن تھا کہ کوئی بڑا ذخیرہ اپنی یادگار چھوڑ جاتے؟ جتنا کچھ ڈالا یہی بہت غنیمت ہے۔

کتابیں نہایت صاف ستھری رکھتے اور جلد اعلیٰ سے اعلیٰ بندھوا کر۔ سیکنڈ ہینڈ یا استعمالی کتاب وہ ہاتھ میں لینا کیا جانیں۔ "دوشیزۂ کاغذی" انہیں کی زبان میں "دست غیر سے مس ہو جانے کے بعد" ان کے کس کام کی رہتی۔ کھانا نفیس کھاتے۔ کپڑا نفیس پہنتے۔ مکان، فرنیچر، ہر چیز میں صفائی، نفاست اور لطافت کا خیال سب پر مقدم۔ کہا کرتے کہ سیکنڈ کلاس کوئی سی بھی شے ہو مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ جو چیز بھی ہو درجہ اول کی ہو۔

اور نزاکت نفس تو کچھ اس سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔ کسی کی دل آزاری کیا دلشکنی بھی جانتے ہی نہ تھے۔ تحریر میں درشت و ناملائم الفاظ لانے کو گالی کے برابر سمجھتے تھے۔ کہتے تھے کہ ایسے موقع پر ثقیل لفظ لانا تحریر کا خون کرنا ہے۔ صرف لطیف اشاروں کنایوں کے جواز کے قائل تھے اور ہلکی پھلکی چٹکیاں کر جانے کے تو بادشاہ تھے۔ اور جہاں خود تو اس پر عامل تھے ہی، دوسروں کو اس روش سے ہٹتے دیکھتے تو ٹوک دیتے۔ شذرات معارف کی ایک عبارت پر مولانا سید سلیمان کو لکھتے ہیں "میری غرض یہ ہے کہ ثقیل الفاظ کی جگہ صرف مفہوم کی تلخی سے کام لیا جائے۔ یہ باتیں کوئی اور آپ کو نہیں

لکھے گا لیکن مجھ کو جس حد تک خلوص ہے، اس کا اقتضائے طبعی یہ ہے کہ جن نکتوں پر غایت ظہور کی وجہ سے دوسروں کی نگاہ نہیں پہنچی، ان کو آپ کی توجہ میں لاؤں"۔ (ص ۲۲)

میری دوسری طالب علمانہ کتاب "فلسفہ اجتماع" نام ہے، نشۂ الحاد کی حالت میں لکھی ہوئی۔ اس میں پیمبروں کا ذکر جا بجا ہے بالکل دنیوی لیڈروں کی حیثیت سے ہے۔ اور ان کے کارناموں پر تنقید و تبصرہ اسی انداز میں، جس میں قومی و ملکی لیڈروں پر ہوتا رہتا ہے۔ اپنے نزدیک اس وقت اس میں ہرج ہی کیا تھا۔ اور اگر کوئی روکتا ٹوکتا تو جواب میں اس کی مولویانہ تنگ نظری اور تعصب پر لے دے دھری ہوتی تھی۔ مرحوم میری تحریر کے قدردانوں میں نہیں، پرستاروں میں، عاشقوں میں تھے۔ اس کے باوجود کچھ ہی دن بعد جب لکھنؤ آئے تو مجھے ایک موقع پر تنہا پا کر بولے کہ:

"فلسفۂ اجتماع کا عاشق زار مجھ سے بڑھ کر کون ہوگا، لیکن سن میں مجھ سے چھوٹے ہو اس لئے ایک بات کان میں ڈالے دیتا ہوں پیمبروں خصوصاً پیمبر اسلام، کا تذکرہ جس طرح آیا ہے، اس سے صاف استخفاف نکلتا ہے عقائد کی بحث سے قطع نظر بہر رنگ کسی سنجیدہ مصنف کی متانت تحریر کے بھی تو منافی ہے۔ جن شخصیتوں کا ادب و احترام کروڑوں انسان کر رہے ہوں ان کے مرتبہ کا لحاظ رکھنا تو لازمۂ تہذیب و شائستگی ہے"۔

بات اتنے خلوص سے کہی گئی تھی کہ سیدھی دل میں اتر گئی۔ اور جو دل سے منکر و مکذب تھا وہ کم از کم زبان و قلم کی حد تک تو آدمی بن گیا۔ اور پھر دو برس بعد جب اس کتاب پر حیدرآباد میں سخت لے دے شروع ہوئی تو اپنے اسی اخلاص و شرافت کے تقاضے سے مجھے لکھا:۔

"میں نے آپ سے لکھنؤ میں ذکر کیا تھا کہ آپ نے گو آنحضرت کی تنقیص نہیں کی تاہم اظہار خیال کی باریک تہ میں ایک طرح کی تضحیک پائی جاتی ہے۔ اور یہ متعلمانہ رنگ ہے مستشرقانہ سنجیدگی نہیں، ایک آدھ لفظ کے ہیر پھیر سے یہ شکایت دور ہو سکتی ہے اور مقصود پھر بھی ہاتھ سے نہیں جائیگا۔ یہ میں آپ کے لئے کر سکتا ہوں آپ اجازت دیتے ہیں؟" (مکاتیب ص ۵۷)

یہ تو آپ بیتی تھی باقی اسی طرح کی مثالیں کوئی گننے پر آئے تو ان کی تحریروں سے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اچھی خاصی نکال سکتا ہے ——— خود بڑے "آزاد خیال" تھے اور بڑے "روشن خیال"، ملائیت کے نام سے بیزار، مولویت کے سایہ سے پناہ مانگنے والے، لیکن ہر آزاد مشربی اور ہر روشن خیالی پر چھاپ تہذیب، شائستگی اور شرافت کی لگی ہوئی۔

تحریر کا اصل جوہر شوخی تھی۔ ظرافت نہیں شوخی HUMOUR نہیں WIT۔ قہقہہ آفرینی نہیں بلکہ صرف ایک انبساطی کیفیت جو بہت پھیلی تو ہونٹوں پر مسکراہٹ لے آئی اور بس۔ محرک قوی نہیں جو حرارت جسم کو انتعاش میں لے آئے، صرف مسکن جو مسرت کی ہلکی ٹھنڈک جسم میں دوڑا دے ——— وصال نہیں صرف خیال وصل۔ بقول شخصے ؎

خیال ہی میں مزے وصل دلربا کے لئے!

مثالوں کا انتظار رہے گا۔ دو چار حاضر ہیں۔ موضوع علمی ہو، ادبی ہو، مذہبی ہو، قلم کی شوخیاں ساتھ کہیں بھی نہیں چھوڑتیں۔

مولانا شبلی کی نیم فلسفیانہ نیم متکلمانہ کتاب الکلام نئی نئی نکلی ہے اس پر تبصرہ کر رہے ہیں:۔

"ہم کو الکلام کے ہوتے کسی کتاب کی ضرورت نہیں۔ جو حضرات جدید علم کلام کی ضرورت کا احساس رکھتے ہیں وہ دیکھیں گے کہ فاضل پروفیسر نے ایک طرف تو بڑے میاں یعنی مذہب کی پگڑی نہیں اتاری۔ اور ساتھ ہی یورپ کے نو خیز چلتے پرزوں یعنی فلسفہ و سائنس کے سامنے تیرہ سو برس کے بوڑھے سے ہاتھ نہیں جڑوائے، بلکہ دونوں میں مصافحہ کرا دیا۔ یہ معتدل روش جو اس علمی نزاع میں اختیار کی گئی وہ شبلی ہی کا حصہ تھا"۔ (افادات ص ۱۲۵)

ایک اور جگہ الندوہ (مولانا شبلی کے ماہنامہ) کا تعارف کرا رہے ہیں اس کی تمہید میں:۔

"غالب زندہ ہوتے تو شبلی کو اردوئے خاصہ کی داد ملتی جس نے ایک نو خیز بازاری یعنی کل کی چھوکری کو جس پر انگلیاں اٹھتی تھیں آج اس لائق کر دیا کہ وہ اپنی بڑی بوڑھیوں اور ثقہ بہنوں یعنی دنیا کی علمی زبانوں سے آنکھیں ملا سکتی ہے۔ جو بن پر آئی ہوئی نچلی نہیں بیٹھ سکتی

تھی مدتوں شعراء سے گاڑھا اتحاد رہا۔ بہ اقتضائے سن بُری طرح کھُل کھیلی ہاتھ پاؤں نکالے اور بہتیرے بنائے بگاڑ دیئے۔ کیونکہ ایک نے ملازمت شیدائی
تھا۔ لیکن یہ باتوں ہی باتوں میں سب کو ٹالتی رہی بعض جگہ بے آبروئی کے سامان ہو ہو کر رہ گئے اور بال بال بچی۔
آخر آخر میں مُلک کے منچلے یعنی ناول نویس تو یہاں تک پیچھے پڑے کہ اس کی پردہ دری میں کچھ اُٹھا نہیں رکھا تھا کبھی کبھی دبی زبان سے اُسے یہ
کہتے ہوئے سُنا ——— "اری اُٹھ جاؤں گی میں صحنک سے" لیکن دفعتہً اس کی حالت نے پلٹا کھایا کثرت فواحش باعثِ سنجیدگی ہوگئی۔ اچھے دن
آتے ہیں تو بگڑی بن جاتی ہے۔ اب وہ مقدس علماء کی کنیزوں میں داخل ہے لیکن سُنا گیا کہ خوش اوصاف شبلی سے زیادہ مانوس ہے اور قریب قریب
انہیں کے تصرف میں رہتی ہے الندوہ اسی کا ایک ثمر پیش رس ہے" (افادات ص۱۰۸، ص۱۰۹)
ایک دیندار اہلِ قلم سے ان کی کوتہ قلمی کی شکایت گرمیوں کے رمضان کے زمانے میں کرتے ہیں اور اپنے قلم کے بانکپن سے صحرائے خشک کو
لالہ زار بنائے دیتے ہیں:۔

"خیر تو ہے؟ آپ کا بالکل پتہ نہیں۔ کیا آپکے رمضان سے میرے مئی کے شدائد کچھ کم ہیں، جو ایک دم سے آپ مہر بلب ہو رہے ہیں؟ تحریری
فاقے رند مشرب دوستوں کے لئے کسی طرح موزوں نہیں، روزہ رکھیئے نہ رکھیئے مگر مجھے یاد ضرور کیجیے۔ (مکاتیب ص۱۱۵)
میں ایک سال حیدرآباد رہا۔ عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہو رہی تھی اور اس کا مقدمۃ الجیش سررشتہ تالیف و ترجمہ ایک سال قبل ۱۹۱۷ء میں کھُل گیا تھا میں
اُسی میں تھا۔ عقائد کی آڑ لے کر دکن کے اخبارات نے گولہ باری شروع کردی۔ اور مدت قیام کے چند مہینے بڑے سخت معرکوں میں گزرے۔ سال بھر
بعد لکھنؤ واپس آیا ہوں، ضابطہ سے تو صرف رخصت لے کر لیکن دل میں استعفا کی نیت مستحکم کر کے۔ حضرت مہدی جیسے مخلص کو سارا ماجرا لکھ
بھیجا ہے۔ اب جواب ملاحظہ ہو:۔

" جس طرح ایک بھوکا خوش ذائقہ کھانے پر گرتا ہے اور جب تک لقمہ تر جلد سے جلد حلق سے نیچے نہیں اُتار لیتا اس کی تسکین نہیں ہوتی
میں چھپانا نہیں چاہتا کہ آپکے دلچسپ عنایت ناموں کے ساتھ مجھے بھی یہی صورت پیش آتی ہے۔ اس میں میرے کنگلے پن کو اس قدر دخل نہیں،
جس قدر آپکے بخل کو۔ کہ یہ نعمت جلد جلد میرے حصہ میں نہیں آتی۔ خوش ہوا قفس کی تیلیاں ٹوٹیں اور پرشکستہ طائر کو ہوائے وطن نصیب
ہوئی۔

وطن بھی لائق رشک، لکھنؤ جس کی فضائے بسیط آپ کی تنشیط دماغی کے لئے زائد از کافی ہے۔۔
آپ لکھتے ہیں کہ "اب وقت اپنا ہے، قلم اپنا ہے، دماغ اپنا ہے" ایک صاحبہ فرماتی ہیں صاف کیوں نہیں کہتے کہ بیگم اپنی ہیں۔ یہ نکتہ رہ
گیا تھا کمی پوری کئے دیتا ہوں" (ص۶۵)
میری شادی کو تھوڑا ہی زمانہ ہوا ہے۔ بیوی اور سالیوں کے ساتھ لکھنؤ سے باندا (اپنی سُسرال) گیا ہوں ریل کا سفر خاصا دلچسپ
رہا۔ حضرت مہدی کو لکھ بھیجا۔ جواب میں آپ بھی شریک ہوں:۔
" آپ کا پرستانِ سفری وہ بھی تختِ رواں (ریل) پر بہت ہی قابلِ رشک رہا۔ سچ یہ ہے کہ جنس لطیف اپنی پاکیزہ دشتی اور کافر ادائی
کے ساتھ کائنات کے خوبصورت چہرہ کا غازہ ہی نہیں ہے ہمارے لئے شرطِ زندگی بھی ہے کہ بغیر اس کے دُنیا مرے سے رہنے کے لائق نہیں
تھی" (ص۶۸)
صاحبِ معارف کو معارف اور مطبوعات دارالمصنفین کی لوح کی سادگی (سادہ لوحی نہیں!) پر متوجہ کرنا چاہتے ہیں تو قلم کا بلبل یوں نغمہ را
ہوتا ہے!۔
" یہ غلط ہے کہ فلسفہ حسن آرائش و زیبائش سے بے نیاز ہے۔ عورت کتنی ہی حسین ہو لیکن بیوگی کے بعد وہ جوبن نہیں رہتا۔ ہیرا تراش کیل

کے اُترتے ہی اس کی سج دھج تراش خراش سب میں فرق آجاتا ہے (ص۳۴)

سارا مہدی لٹریچر انہیں شوخیوں کی تجلیات سے جھل جھل کر رہا ہے۔ شوخی کہیں کہیں بڑھ کر چلبلے پن کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ متانت کی آنکھیں اس منزل پہ پہنچ کر نیچی ہونے لگتی ہیں اور پردے کی باتیں زبانِ قلم پہ بے پردہ ہو کر آنے لگتی ہیں۔

مثالیں ۔۔۔ ایک آدھ ۔۔۔ لیجئے۔ مخاطب مولانا سید سلیمان صاحب ہیں با ایں متانت و تقدس ہیں:۔

”میں خدا خدا کرکے ڈیڑھ سال کے بعد گھن سے چھوٹا یعنی تحصیلداری پر جس کا چند سال شائق نہیں مستقل ہو گیا۔ یہ اضافی تصریح اس لئے ہے کہ وطن آیا تو دارالمصنفین میرے لئے گھر آنگن ہوگا اور آپ سے بوسہ بہ پیام کی جگہ آپ عورت ہوتے تو کہتا لب بہ لب کی ٹھہرتی۔ آخری فقروں سے آپ کے تقدس میں کچھ فرق تو نہیں آیا؟“ (ص۳۴)

انہیں سید صاحب نے پہلی بیوی کی وفات پر دوسرا عقد کیا ہے اور اتفاق سے اس وقت کچھ علیل تھے۔ حضرت مہدی کو ایک اُشقلہ ہاتھ آگیا اور ناگفتنی کس طرح ان کی زبان پر آکر گفتنی ہوگئی ”میں سنتا تھا مولوی خلوت کے رنگیلے ہوتے ہیں۔ لیکن آپ کی روداد عروسی جہاں تک معلوم ہوئی غیر حوصلہ افزا ہے۔ یہ کیا، کہ مرعوب ہو کر صنفِ قوی کی آبرو کھوئی۔ خیر ہزار ری کہ علالت نے پردہ رکھ لیا۔ لیکن دوستوں کو قلق رہے گا کہ جیسے بستر شکن ہونا تھا وہ شاعری کی اصطلاح میں شکن بستہ نکلا۔ عورت کتنی ہی نازک اور لچکدار ہو۔ لیکن یہ اس کی فطرت کا راز ہے کہ حریفِ مقابل کے ثقل پر غالب رہتی ہے یعنی ہار ماننے والی نہیں۔ یہ عجیب شکست خدا کے صرف مقبول بندوں کے حصہ میں آتی ہے یہ تصریحات آپ کے مذاق سے کتنی ہی بیگانہ ہوں غیر سنجیدہ نہیں ہیں۔ آپ کا ہنی مون رعہد زفاف بستر علالت پر گذرا تاہم میں سننا چاہتا ہوں آپ کہاں تک اپنے قصر کی تلافی کر سکے اور آیا آپ خوش ہیں؟ دو آتشہ اچھی کھنچی ہو تو لطفِ مستی کچھ اور بڑھ جاتا ہے، میں اس نشہ کا اثر آپ کے لٹریچر پر دیکھنا چاہتا ہوں۔“ (ص۴۲، ص۴۳)

سید صاحب تو خیر اس زمانہ میں جوان تھے ایک اور بزرگ مولوی مقبول احمد صاحب صمدانی تھے میں نے انہیں جب دیکھا سفید ریش ہی پایا ——— حضرت مہدی سے ان سے بھی ایسی ہی چھوٹ کی ہوتی تھی۔

اس سے آگے بڑھیئے تو سرحدیں عریانی کی شروع ہو جاتی ہیں۔ اور مہدی مرحوم اس صنف میں بھی بند نہ تھے اور نہ اس میدان میں کسی سے پیچھے رہنے والے۔ بلکہ ان کے ادب عالی کی یہی صنعت ایسی ہے جو انہیں آج کے ”ترقی پسندوں“ کی بزم میں ”پیرِ مغاں“ بنائے ہوئے ہے ——— زیادہ نمونے اس صنعت کے تو نقل کرنے کی ہمت کہاں سے لائی جائے۔ دل پر جبر کر کے دو چار فقرے دہرائے بغیر چارہ نہیں:۔

عورت پھنستی ذرا مشکل سے ہے۔ لیکن جہاں پھنسی، اس سے چھٹکارا پسند نہیں کرتی۔ اس کی اصلی غایت زندگی دوسرے کی پھانس ہے . . . . . .
اس کی فتوحات اس کا سرمایۂ نشاط ہیں جن سے اس کے دل کو راحت ملتی ہے اور جن سے وہ جیتے جی کبھی دستبردار نہیں ہو سکتی۔ وہ وار کرکے رہے گی کیونکہ یہ امر اس کی فطرت میں داخل ہے۔ شانہ سے آنچل خود نہ گرائے۔ لیکن اگر اتفاق سے گر جائے تو وہ دل میں خوش ہوگی۔ دہرائے ہوئے آنچل میں دراصل اسے سینہ کا ابھار غائب کرنا منظور نہیں بلکہ وہ چاہتی ہے کہ اور نظر جما کر دیکھئے۔

مجرمانہ نظر بھی ایک طرح کی دادِ حسن ہے جو ہزار پارسائی کے ساتھ بھی وہ آپ سے لے کر رہے گی۔ اسی لئے جوانی کی آرائشوں میں دستانہ کی طرح چپکتی ہوئی انگیا اسے دل سے پسند ہے۔ جس میں یہ ان سرکشوں کو قید رکھتی ہے جنہیں عورت کے ارمانِ مجسم کہیئے۔ یہ دو آتشہ وہ بھی شباب کی۔ جب کھنچ کھنچا کر قدرتی کنٹرول پر ابھری ہو، تو کون ہے جو ان کیف مستی اور بے خودی کے مجسموں کی پرستش کا دلدادہ نہ ہوگا۔ ترکیب عناصر ہی تو ہے ذرا فطرت کی شوخی دیکھئے تو، تنہا مقامات ناز کے لئے گنجائش نکالی بھی تو کہاں؟ دنیا میں معیارِ حسن ہمیشہ مختلف رہا ہے اور آج بھی اختلاف مذاق کے لحاظ سے حسن کیلئے کوئی نصاب مشترک قائم نہ ہو سکا۔ تاہم ہر زمانہ میں عورت کا مقیاس الشباب دائرہ حسن کا مرکز رہا ہے۔ آج تک سننے میں نہیں آیا کہ اہلِ چین کی چپٹی ناک کی طرح سپاٹ سینہ بھی کہیں پسند طبائع ہو۔ (افادات ص۲۱۰، ص۲۱۱)

بعض تصریحات اس سے بھی زیادہ فاش و بے پردہ ہیں —— اور شرفا کی محفل میں یہ بولی ٹھولی آج بھی کچھ عجیب ہی سی ہے، آج سے ۴۰-۴۱ سال قبل ۱۳-۱۹۱۲ء میں جب یہ مضمون اول بار شائع ہوا ہے، تو ظاہر ہے کہ اس وقت یہ کن نظروں سے دیکھا گیا ہوگا!۔

مہدی ادیب و انشا پرداز ہی نہ تھے کچھ حکیم بھی تھے۔ اور خود لا لکھ "نہیں، نہیں، کرتے رہیں، کہیں کہیں باتیں سعدی اور حالی کے رنگ کی کر گئے ہیں۔ اپنے تجربہ کی باتیں دوسروں کو بتاتے ہیں ان کی زندگی سنوارنا چاہتے ہیں، اور دنیا کا نشیب و فراز جس طرح خود ان کی نظر میں ہے، بے اختیار چاہتے ہیں کہ ان کے آس پاس والے بھی اس سے مستفید ہوں۔

مہدی خرافات نگاری کے شیدائیوں میں تھے اور خود بھی کچھ درجۂ اول کے مذہبی نہ تھے اس پر بھی دیکھئے کس حکیمانہ انداز سے مجھے میری "بے ادبیوں" پر ٹوکتے ہیں (زمانہ بچپن یاد کر لیجئے کہ میرے شباب الحاد کا ہے):۔

"گزشتہ تصنیفات کی نظر ثانی کے سلسلہ میں بھی یہ دیکھنا ہے کہ فلسفیت کے زور میں مذہب کی نسبت کوئی ریمارک یا طرز ادا ایسا نہ ہو، جس سے اس کی تحقیر تو خیر خفیف سی بے رخی بھی پائی جائے۔ جو کچھ لکھیئے مسلم بن کر لکھیئے کہ سنجیدگی تصنیف کا اقتضا یہی ہے۔ یہ نکتہ ۴ برس کے بعد سمجھ میں آئے گا۔ لیکن اس درمیان میں میں آپ کو کم از کم ڈاکٹر لیبان کی طرح فیاض دیکھنا چاہتا ہوں۔ ورنہ کسی بانی مذہب کی نفسیت کا اعتراف در اصل "میٹھی چھری زہر کی بجھی" کا مصداق ہوگا۔ اردو میں شبلی کے مصلح اعظم[1] کو محمد نہ لکھیئے، آنحضرت لکھیئے۔ تو لٹریچر آپ کا شکر گذار ہوگا" (مکاتیب ص ۸۱)

باندے میں میرا چھوٹا اور پہلا بچہ ۱۹۱۸ء میں عالمگیر وبائی انفلوئنزا کی نذر ہو گیا دو ایک روز بعد بیوی کو وہیں میکہ میں چھوڑ میں لکھنؤ آگیا ہوں حضرت مہدی تعزیت نامہ لکھتے ہیں:۔

"نہایت افسوس ہوا کہ محبت کا ثمر اولیں ضائع ہوا۔ غالباً یہ عالمگیر بخار کی عنایت ہوگی۔ ہماری متفقہ ہمدردی آپ سے زیادہ ان کے ساتھ ہے، جن کی بھری گود دفعتہً خالی ہو گئی اور جن کا آجکل یہ نقشہ ہوگا ؎

یہ سینہ میں تا زندگانی رہے گا
ترا داغ دل میں نشانی رہے گا!

آپ تنہا نہ چھوڑتے تو اچھا تھا ساتھ رکھیئے یا ساتھ رہیئے۔ کہ نئی نئی چوٹ کے لئے مرہم زخم کی ضرورت ہے۔ قانونِ فطرت کا یہی بے تکا پن بعض وقت بلائے جان ہوتا ہے۔ مگر یہ انسان کی عام تقدیر ہے۔" (ص ۱۷۱)

میں حیدرآباد میں ہوں وہاں کے جوڑ توڑ اور آپس کی سازشیں ایک کھلا ہوا راز تھیں۔ میں کمسن و ناتجربہ کار۔ حضرت مہدی کی دلی آرزو کہ میں محسود ہونے سے بچا رہوں، دیکھئے، یہ مشورہ بھی بانکپن کی کن اداؤں کے ساتھ پیش کرتے ہیں:۔

"جس جلیل القدر شخصیت کا آپ نے ذکر کیا ہے[2] اپنے روابط ان سے قائم رکھیئے۔"

اور ہم چشموں میں یعنی جس دائرہ میں آپ ضابطہ سے رکھے گئے ہیں ان میں سے کسی سے کامیابی تو خیر کبھی بعید سے بعید۔ توقع کا ذکر بھی نہ آئے۔ اسی طرح شب کے کھانے کا راز خمار صبح بھی نہ افشا کرنے پائے، آپ خود نفسیات کے عالم ہیں۔ لیکن جی نہیں مانتا چھوٹا بھائی سمجھ کر حدود سے نکل جاتا ہوں۔

---

[1] ۔ شبلی کی سیرۃ النبی (جلد اول) کے مطالعہ کا یہ اثر ہوا تھا کہ صاحب سیرۃؐ کی عظمت کا اس درجہ میں قائل ہو گیا تھا کہ انہیں مصلح اعظم کے درجہ پر رکھنے لگا تھا —— انکار محض کے مقابلہ میں یہ درجہ بھی غنیمت تھا۔ اور مہدی مرحوم میری اس نفسیت کے رازدار تھے۔

[2] ۔ مرزا سر امین جنگ بہادر صدر المہام پیشگاہ اعلیٰ حضرت تھے۔

میں نے بہتر سے بہتر اشخاص کو بھی دُنیا میں کم ہی پایا۔ دُوسروں کے لُطف قائم رکھنے کی صُورت صرف یہ ہے کہ ہم نسبتہً ان سے بہتر حالت میں ہوں۔ اس خاصۂ طبیعت کو نفسیات کی کس شاخ کے تحت میں رکھیئے گا؟" (ص۴۹، ۵۰)

اور پھر یہ خبر سُنکر کہ میں حیدر آباد سے ایک معقول ملازمت چھوڑ کر چلا آیا ہوں اور واپسی کا قصد نہیں رکھتا، کس طرح مجھے چمکارتے ہیں:-

"کیا واقعی اب واپسی کا قصد نہیں؟ آپ تو فلسفی ہیں دُنیا دیکھنے کے لئے ہے۔ برتنے کے لئے نہیں۔ اوروں کی حماقت سے لطف اُٹھانا بھی ایک عیش ہے"۔ (ص۶۶)

اپنے ایک عزیزِ قریب کے سامنے جو ساتھ ہی مخلص دوست بھی ہیں اپنا دل کھول کر یوں رکھ دیتے ہیں:-

"سمجھو یا نہ سمجھو، میری وطنیت یعنی دُنیائے احباب تم ہی دو دو تین تک محدود ہے۔ اُونچی سے اُونچی سوسائٹی میں اُٹھا بیٹھا، بڑے بڑے جگمگاتے نظارے دیکھنے عمر اس میں گزری لیکن قسم لے لو اگر آنکھیں خیرہ ہوئی ہوں بجلی کی ہوش ربا روشنی میں بیٹھ کر بھی کبھی اپنے سادہ چراغوں سے بے نیاز نہ ہوا۔ اس سے زیادہ نمائشی دنیا میں ہم سے کیا چاہتے ہو، اچھے اچھوں کو دیکھا آپے سے باہر، سبک سری کی چلتی پھرتی تصویر بن جاتے ہیں"۔

مہدی مرحوم کوئی بڑے مذہبی نہ تھے۔ لیکن مذہب بیزار و مذہب دشمن بھی ہرگز نہ تھے۔ آزاد خیال سے تھے اور اپنی رند مشربی کو ہر جگہ اچھالتے رہتے تھے "مولویت" کے نام سے چڑتے اور "مولوی" پر خار کھائے بیٹھے رہتے تاہم مسلمان تھے، توحید کے قائل اور رسالت کی تصدیق کرنے والے۔ لباس مغربی زیب تن رہتا لیکن لباس کے اندر دل خالص مشرقی تھا۔ دماغ مغربیت کے اثر سے اُبچ کی لینے لگتا لیکن یہ اسے گھوم پھیر کے پھر ایمان و اسلام کی طرف واپس لے ہی آتے۔

شفقت، ہمدردی اور اخلاص کے پُتلے تھے۔ قلب رقیق تھا کسی کی تکلیف نہ دیکھ سکتے۔ اپنے بیگانے سب کے ساتھ حُسنِ سلوک کی فکر میں لگے رہتے۔ اور اپنی فیاضی کا دروازہ کسی پر بند نہ رکھتے۔ نماز پابندی سے نہ پڑھتے لیکن جب کبھی پڑھتے اور اکثر غسل تازہ کے بعد ہی پڑھتے تو رفیق حیات، مہدی بیگم کا بیان ہے کہ خشوع خضوع کے ساتھ پڑھتے، اور دعا مانگتے وقت تو تصویر عبودیت بن جاتے ——— زندگی کی مُہلت کچھ روز اور مل جاتی تو مجھے اپنی جگہ یقین ہے کہ ان کی اسلامیت خوب پختہ اور نمایاں ہو کر رہتی اور اپنی تخلیقات حرفی و لفظی کو نظرثانی و اضافہ کے بعد ہر طرح پاک و پاکیزہ بنا کر ایک بڑا ذخیرہ صحیح معنی میں "ادبِ لطیف" کا اپنی یادگار چھوڑ جاتے۔

مولانا عبدالحلیم شرؔر

خاکی قزلباش ایم۔ اے

مولانا عبدالحلیم شرؔر ۲۰ رجمادی الثانی ۱۲۷۶ھ مطابق ۱۸۶۰ء بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام حکیم تفضل حسین تھا۔ ان کے نانا مولوی قمرالدین اودھ کے جلاوطن بادشاہ کی ملازمت میں کلکتہ میں مقیم تھے۔ اسی تعلق نے ان کے والد کو بھی کلکتہ پہنچا دیا اور ۹ سال کی عمر میں عبدالحلیم بھی اپنی والدہ کے ہمراہ لکھنؤ سے کلکتہ آ گئے۔ انہوں نے مٹیا برج میں سب سے پہلے اپنے والد سے اور پھر دیگر اساتذہ سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ فارسی، عربی، منطق، معقولات اور طب کی ابتدائی تعلیم کے علاوہ تھوڑی سی انگریزی بھی پڑھی لیکن بہت ہی ناقص طور پر۔ ۱۸۶۹ء میں مولوی قمرالدین صاحب کی پنشن پر سبکدوشی کے بعد ان کی جگہ پر عبدالحلیم شرر کو مقرر کیا گیا لیکن یہ تعلق دو سال سے زیادہ جاری نہ رہ سکا اور ۱۸۷۶ء میں مولانا شرر نے کلکتہ سے تعلق ترک کرکے لکھنؤ کی سکونت اختیار کر لی جہاں انہوں نے اپنی عربی کی تعلیم مکمل کی۔ ۱۸۷۷ء میں ماموں کی لڑکی سے ان کی شادی کر دی گئی لیکن شادی کے دوسرے ہی سال وہ حدیث کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے دہلی روانہ ہو گئے اور شمس العلماء میاں نذیر حسین محدث دہلوی کے مدرسہ میں حدیث کی تعلیم کی تکمیل کی۔ دہلی کے دوران قیام ہی میں انہوں نے انگریزی تعلیم بھی حاصل کی اور ۱۸۷۹ء کے اواخر میں لکھنؤ واپس چلے آئے۔

کلکتہ کے دوران قیام ہی میں مولانا کو اخبارات کا ذوق پیدا ہو گیا تھا اور وہ اودھ اخبار میں بحیثیت نامہ نگار خبریں لکھ لکھ کر بھیجا کرتے تھے۔ ۱۸۸۰ء میں جب مولانا دہلی سے تعلیم ختم کرکے لکھنؤ آئے تو منشی احمد علی کسمنڈوی کے شوق دلانے پر ان کا ذوقِ نامہ نگاری مضمون نویسی میں بدل گیا اور مولانا نے مختلف اخبارات میں مضمون لکھنے شروع کئے۔ منشی احمد علی کسمنڈوی مرحوم فارسی کا بڑا اچھا مذاق رکھتے تھے اور اکثر اخبارات خصوصاً اودھ پنچ میں مضامین لکھا کرتے تھے۔

مولانا شرؔر نے جب مضمون نویسی شروع کی تو سیاسیات کے بجائے ادبی اور علمی موضوعات پر قلم اٹھایا۔ انشا پردازی پر خاص توجہ دیتے تھے اور مضمون نویسی میں انگریزی مضامین کی تقلید کرتے تھے۔ یہ رنگ چونکہ بالکل نیا تھا اس سے مولانا کی شہرت بہت جلد عام ہو گئی ۱۸۸۱ء ہی میں منشی نولکشور نے انہیں اودھ اخبار کے ادارے میں شامل کر لیا اور یوں ان کی صحافی زندگی کا آغاز ہوا۔

شرؔر غالباً ۱۸۸۴ء تک اودھ اخبار کے ادارے میں شامل رہے۔ اسی دوران میں انہوں نے کچھ اپنی بڑھتی ہوئی شہرت اور کچھ طبیعت

کے جوش سے مجبور ہو کر اپنے ایک دوست مولوی عبدالباسط کے نام سے ایک ہفتہ وار رسالہ "محشر" بھی جاری کیا۔ محشر چونکہ اپنا رسالہ تھا اس لئے اس کی طرف مولانا کی زیادہ توجہ رہنے لگی۔ محشر کی روزافزوں ترقی دیکھ کر کارکنانِ اودھ اخبار کو اسی میں مصلحت نظر آئی ہوگی کہ وہ مولانا کو لکھنؤ سے کہیں باہر بھیج دیں۔ چنانچہ انہیں اودھ اخبار کا خصوصی نامہ نگار بنا کر حیدرآباد بھیج دیا گیا۔ چھ ماہ کے بعد مولانا نے لکھنؤ واپس آنا چاہا مگر کارکنانِ اودھ اخبار نے اجازت نہیں دی۔ محشر مولانا کے لکھنؤ چھوڑنے کے بعد بند ہو چکا تھا۔ مولانا کو اودھ اخبار کی یہ پابندی ناگوار گذری اور وہ ملازمت سے استعفیٰ دے کر لکھنؤ چلے آئے۔

اودھ اخبار میں ۱۸۷۸ء سے لے کر ۱۸۷۹ء تک سرشار کا ناول "فسانۂ آزاد" شائع ہو کر مقبول ہو چکا تھا اور اس کی مقبولیت کے سبب ۱۸۸۰ء میں اسے علیحدہ کتابی صورت میں شائع کر دیا گیا تھا۔ مولانا شرر جب اخباری تعلق سے فارغ ہوئے تو انہوں نے سرشار کی تقلید میں ناول نویسی کو اپنا ذریعۂ معاش بنانا چاہا اور ۱۸۸۵ء میں "دلچسپ" کے نام سے ایک معاشرتی ناول شائع کیا۔ یہ ناول ابتدائی کوشش ہونے کی وجہ سے نسبتاً ناقص تھا لیکن کافی مقبول ہوا۔ اس ناول میں اگرچہ معاشرت ہی کی خرابیوں کا پردہ فاش کیا گیا تھا لیکن فسانۂ آزاد کے برخلاف پلاٹ کی تعمیر پر زیادہ زور دیا گیا تھا اور اسی لئے اسے مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ اس مقبولیت نے مولانا کا حوصلہ بڑھایا اور انہوں نے اس کے بعد اسی ناول کا دوسرا حصہ اور بنکم چندر چٹرجی کے ایک ناول "درگیش نندنی" کا اردو ترجمہ شائع کیا۔ ان دونوں ناولوں کو بھی خاصی شہرت حاصل ہوئی۔

جنوری ۱۸۸۷ء میں مولانا نے اپنا مشہور ماہنامہ "دلگداز" جاری کیا۔ پہلے تو وہ اس رسالے کو بھی اسی اصول پر چلاتے رہے جس پر "محشر" کاربند تھا لیکن پھر اودھ اخبار کی مثال کے پیشِ نظر "دلگداز" میں ناول نویسی کا سلسلہ شروع کر دیا اور ۱۸۸۸ء میں پہلا ناول جو "دلگداز" میں شائع ہوا وہ "ملک العزیز ورجنا" تھا ——————— اس کے بعد مولانا شرر کی ناول نویسی کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہو گیا جو ان کی وفات تک جاری رہا۔ مضمون نویسی بھی برابر جاری رہی۔ اس کے علاوہ مولانا نے تاریخیں بھی لکھیں اور سوانح و سیرت نگاری بھی کی۔

ماہنامہ "زمانہ" کانپور نے جنوری ۱۹۱۱ء میں اُردو کے چند مشہور اہلِ قلم حضرات سے چند سوالات کئے تھے تاکہ ان کے ادبی رجحانات کا اندازہ لگانے میں کچھ مدد مل سکے۔ سوالات یہ تھے:

(۱) اُردو فارسی کی کتابوں میں آپ اس قدر تصنیف و تالیف اور غور و مطالعہ کے بعد کن کن تصانیف کو بہترین خیال فرماتے ہیں؟

(۲) اوائلِ عمر میں کن کن کتابوں کے مطالعہ نے آپ کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچایا اور محظوظ کیا؟

(۳) کیا کسی کتاب یا کتابوں کو آپ کی علمی زندگی کے آغاز سے کوئی خاص تعلق ہے یعنی کیا کسی کتاب کو پڑھ کر آپ کی طبیعت تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ ہوئی تھی؟

(۴) کیا کسی کتاب کے مطالعہ کا آپ کی زندگی پر کوئی خاص اثر پڑا ہے؟

(۵) آپ کی سب سے پہلی تصنیف کا کیا نام ہے اور اس کی ملک نے کیسی قدر کی تھی؟

(۶) اپنی تصانیف میں آپ سب سے بہترین کس کو سمجھتے ہیں؟

یہ سوال نامہ مولانا شرر کے پاس بھی بھیجا گیا تھا اور ان کا جواب علمی ضمیمہ ماہنامہ "زمانہ" کانپور کی جنوری ۱۹۱۱ء کی اشاعت میں شامل ہے۔ — مولانا نے جو جوابات دیئے ہیں ان سے ان کے ادبی رجحانات اور ان کی تصانیف کے موضوع و مقاصد اور ان کے متعلق خود مصنف کے اپنے احساسات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

(۱) "اردو میں سرسید مرحوم، مولانا حالیؔ مرحوم، مولانا شبلی کی تصانیف میرے مذاق میں بہترین تصانیف ہیں۔ فارسی میں زیادہ تصانیف مجھے پسند ہیں جن کی فہرست تیار کرنے کے لئے وقت چاہئے۔

(۲) مجھے زیادہ فائدہ عربی کتابوں کے مطالعہ سے پہنچا اور انہیں سے میں محظوظ بھی ہوتا رہا مگر اردو میں سرسید کی تصانیف اور مولانا آزاد کی کتاب "آبِ حیات" اور "نیرنگِ خیال" نے مجھ پر بڑا اثر ڈالا اور نیز بلکہ بہت زیادہ مسدس حالی نے۔

(۳) انہی کتابوں نے مجھے کچھ لکھنے کی جانب مائل کیا لیکن زیادہ محرک یہ بات ہوئی کہ مجھے انگریزی لٹریچر کی شان اور عربی مصنفین کی تحقیق اور ان کے فراہم کئے ہوئے مواد نے اس جانب مائل کیا کہ عربی سے حاصل کئے ہوئے خیالات و واقعات کو انگریزی مذاق کا لباس پہناؤں اور در اصل میرے لئے محرک یہی خیال تھا۔

(۴) جن کتابوں کا زندگی پر خاص اثر پڑا ہے ایسی بہت سی کتابیں ہیں کسی خاص کتاب کا نام نہیں لے سکتا۔

(۵) میری سب سے پہلی تصنیف "دلچسپ" ہے مگر جس قسم کے تاریخی ناول میں اب لکھتا ہوں اس کا آغاز "ملک العزیز ورجنا" سے ہوا لیکن ان تصانیف سے پہلے میں نے اودھ اخبار میں بہت سے تاریخی، خیالی اور محققانہ مضامین لکھے جو ملک میں بہت مشہور ہوئے اور پسند کئے گئے اور ان کتابوں کی اشاعت سے پہلے میں پبلک میں ایک شہرت حاصل کر سکا تھا جو ان کتابوں کی اشاعت میں مُعین ہوئی۔ ملک نے میری کتابوں کی عموماً بہت قدر کی اور چونکہ میں حیدر آباد چلا گیا تھا اور ان کتابوں سے متمتع ہونے کا خیال نہ تھا اس لئے بہت سے مطابع نے میری کتابیں چھاپ لیں اور میں نے ان کو ابتداً نہیں روکا جس کی وجہ سے میری پہلی تصانیف ہر جگہ چھپ کے شائع ہوئیں اور عموماً بہت پسند کی گئیں۔ آج تک پبلک میں ان کی بے حد قدر ہے۔

(۶) (میری نظر میں میری بہترین تصنیف) یہ بہت مشکل سوال ہے۔ ناولوں میں فردوسِ بریں، ملک العزیز ورجنا، فلورا فلورنڈا، فتح اندلس، ایامِ عرب کو میں بہترین سمجھتا ہوں اور تاریخوں میں "تاریخِ سندھ" کو۔"

مولانا کا مذکورہ بالا بیان کسی مزید تبصرہ کا محتاج نہیں ہے اور ان کے ناولوں پر بحث کے دوران میں ہم مولانا کے اس بیان کو اپنے لئے شمعِ ہدایت سمجھیں گے۔

مولانا شررؔ کی زندگی کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور ۱۸۶۰ء سے لے کر ۱۸۸۴ء تک۔ دوسرا دور ۱۸۸۵ء سے ۱۸۹۶ء تک۔ تیسرا دور ۱۸۹۷ء سے ۱۹۰۰ء تک۔ چوتھا دور ۱۹۰۰ء سے ۱۹۱۴ء تک اور پانچواں دور ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۶ء تک۔

پہلا دور (۱۸۶۰ء تا ۱۸۸۴ء) مولانا شررؔ کی زندگی کا ابتدائی دور ہے جس میں انہوں نے اپنی تعلیم مکمل کی ہے، ان کی مضمون نگاری کا آغاز ہوا ہے، اودھ اخبار کی ملازمت کی ہے، ایک رسالہ محشر جاری کیا ہے۔ اودھ اخبار کی ملازمت کے سلسلے میں حیدر آباد بھی جا کر رہے ہیں — لیکن اس دور میں کوئی ٹھوس تخلیقی کام انجام نہیں دے سکے۔ البتہ آئندہ عملی اقدامات کے لئے راستہ ضرور ہموار ہو گیا۔ اس دور کو مولانا کا تربیتی دور کہا جا سکتا ہے۔

دوسرے دور (۱۸۸۵ء تا ۱۸۹۶ء) میں مولانا شررؔ کی ناول نویسی کی ابتدا ہوئی اور ان کا مشہور رسالہ "دلگداز" بھی جاری ہوا۔ یہ دور دو حصوں پر مشتمل ہے۔ (۱) قیامِ لکھنؤ (۲) قیامِ حیدر آباد اور سفرِ یورپ۔

(۱) قیامِ لکھنؤ کے دوران کے کارنامے حسبِ ذیل ہیں:

۱۸۸۵ء میں "دلچسپ" (ناول) حصہ اول شائع ہوا اور ۱۸۸۶ء میں اسی ناول کا دوسرا حصہ منصۂ شہود پر آیا۔ اس ناول میں مقامی معاشرت

کی خرابیوں کو نمایاں کیا گیا تھا۔

۱۸۸۶ء میں بنکم چندر چیٹرجی کے ناول "درگیش نندنی" کو اس کے انگریزی ترجمے سے اردو میں منتقل کیا۔

۱۸۸۷ء میں ماہنامہ "دلگداز" جاری ہوا۔ پہلے اس کا سالانہ چندہ ایک روپیہ تھا۔ پھر اس میں ناول نویسی کا آغاز کرنے کے ساتھ ہی چندہ دو روپے کر دیا۔

۱۸۸۸ء میں "دلگداز" میں 'ملک العزیز ورجنا' (ناول) شائع ہوا۔ اس ناول کا موضوع صلیبی جنگوں کا وہ دور تھا جب صلاح الدین ایوبی یورپ کے سورما رچرڈ سے نبرد آزما تھا۔ بقول مولانا شرر "یہ ناول گذشتہ اعلیٰ اور عمدہ اور پُرجوش حالات کا ایک مرقع بنا دیا گیا تھا۔

۱۸۸۹ء میں "دلگداز" میں 'حسن انجلینا' (ناول) شائع ہوا۔ اس ناول کا سین ملک جارجیا گرجستان میں کھینچا گیا ہے۔ کریمیا کی لڑائی، ترکوں اور ایرانیوں کی باہمی عداوتیں اور اس باہمی اختلاف نے اسلام کو کیا نقصان پہنچایا۔ یہ تمام باتیں اس ناول میں واضح کی گئی ہیں۔

۱۸۹۰ء میں "دلگداز" میں 'منصور موہنا' (ناول) شائع ہوا۔ اس ناول کا موضوع سلطان محمود غزنوی کا زمانہ ہے اور سلطان محمود کے حملۂ ہندوستان کو پس منظر کے طور پر استعمال کر کے اجمیر کے راجہ کی لڑکی موہنا اور ایک مسلمان سردار منصور کی داستانِ محبت بیان کی گئی ہے۔ یہ ناول مولانا شرر کا واحد ناول ہے جس کا انجام المیہ ہے۔

۱۸۹۰ء میں مولانا نے ایک تاریخی رسالہ 'مہذب' کے نام سے جاری کیا جس میں مشاہیر اسلام کی سوانح عمریاں شائع ہوتی تھیں لیکن ایک سال کے بعد اس ماہنامہ نے مالی مشکلات کی وجہ سے دم توڑ دیا۔

۱۸۹۰ء میں ——— "قیس و لبنیٰ" (ناول) لکھنا شروع کیا۔ اس ناول کا موضوع خلافتِ راشدہ کے زمانہ کی ایک داستانِ عشق ہے۔

۱۸۹۱ء میں مولانا کو بعض خرابیوں کی وجہ سے اپنا کاروبار لکھنؤ میں بند کرنا پڑا اور وہ نواب وقار الملک کی ملازمت میں حیدر آباد چلے گئے۔

(۲) اسم بابو سکینہ کی روایت یہ ہے کہ قیامِ حیدر آباد کے دوران میں مولانا شرر سے اہل بیتِ رسول کی شان میں کچھ بے ادبی ہو گئی تھی جس پر نظام کی ناراضگی کی وجہ سے انہیں حیدر آباد چھوڑنا پڑا۔ نواب وقار الامرا چونکہ مولانا کے مربی تھے اس لئے انہوں نے نظام سے اجازت لے کر مولانا کو اپنے صاحبزادے کی اتالیقی میں انگلستان بھیج دیا۔ اہل بیتِ رسول کی شان میں بے ادبی کی روایت کی تصدیق اور کسی ذریعہ سے نہیں ہو سکی۔ مولانا شرر کے حوالے سے مرزا عسکری نے تاریخ ادب اردو میں یہ بتایا ہے کہ نواب وقار الامرا کے صاحبزادے انگلستان میں رہنے کی وجہ سے مذہب سے بیگانہ ہوتے جا رہے تھے اس لئے نواب صاحب نے مولانا کو ان کا اتالیق بنا کر انگلستان بھیجا۔ چنانچہ مولانا ۱۸۹۳ء سے ۱۸۹۶ء تک انگلستان میں رہے۔

ان کی غیر موجودگی میں ان کے تین ناول "دلکش"، "زبیدہ و حلاوہ" اور "یوسف و نجمہ" جن کو مولانا نے لکھنا شروع کیا تھا اور نامکمل چھوڑ گئے تھے دوسروں نے مکمل کر کے ان کے نام سے شائع کر دئے۔ زبیدہ و حلاوہ کو مولانا شرر نے دوبارہ یورپ کے دوران میں خود ہی مکمل کیا اور واپسی پر فلورا فلورنڈا کے نام سے شائع کر دیا۔ یوسف و نجمہ کو بھی مولانا ہی نے بعدہٗ مکمل کر کے شائع کیا۔ لیکن دلکش کے متعلق یہ پتہ نہیں ملتا کہ اسے مولانا نے پھر مکمل کیا تھا یا نہیں۔ فلورا فلورنڈا میں عیسائی راہبوں اور ننوں کی اندرونِ گرجا اور پرائیویٹ زندگی کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ اس دور کو مولانا شرر کی زندگی کا تجرباتی دور کہا جا سکتا ہے۔

تیسرے دور (۱۸۹۷ء سے ۱۹۰۰ء تک) میں مولانا خاص طور پر تاریخی تحقیقات کی طرف متوجہ رہے۔ انگلستان سے واپس آنے کے بعد وہ حیدر آباد ہی میں مقیم ہو گئے تھے اور 'دلگداز' کو وہیں سے جاری کر دیا تھا۔ ۱۸۹۹ء تک وہ حیدر آباد میں رہے۔ اس دوران میں 'ایام عرب' (ناول) کا پہلا حصہ شائع ہوا۔ اس ناول میں عرب کے زمانۂ جاہلیت کا نقشہ کھینچا گیا تھا۔ اس کے بعد مولانا کی تاریخی تحقیقات نے ایک جھگڑا کھڑا کر دیا۔ بات یہ ہوئی تھی کہ مولانا انگلستان کی ہوا کھا کر تازہ تازہ واپس آئے تھے اور تاریخ عرب کی تحقیقات کرتے ہوئے انہیں ایک خاتون سکینہ بنت حسین کے حالات دستیاب ہوئے جو اپنے زمانے کے لحاظ سے بہت زیادہ فیشن ایبل اور ترقی یافتہ خاتون تھیں۔ مولانا نے ان سکینہ بنت حسین کو اپنی تحقیقات سے سکینہ بنت امام حسینؑ ثابت کرتے ہوئے بحث و مناظرہ کا دروازہ کھول دیا اور ان کی سوانح عمری لکھنی شروع کر دی۔ مولانا نے اپنی تحقیقات کا نچوڑ یہ پیش کیا تھا کہ حضرت سکینہ بنت امام حسینؑ کا انتقال تین سال کی عمر میں قید خانہ میں نہیں ہوا جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے بلکہ وہ بعد ازاں بھی زندہ رہی تھیں۔ اور یہی نہیں بلکہ انہوں نے عرب کے دستور کے مطابق متعدد نکاح کئے تھے اور وہ اپنے زمانہ کی سب سے زیادہ "فیشن ایبل لیڈی" تھیں اور ادب و فن کی بہت بڑی قدر دان تھیں۔ مولانا کی یہ تحقیقات عام مسلمانوں اور خصوصاً شیعوں کو بہت ناگوار گذری۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ مولانا نے امام حسینؑ کی صاحبزادی کی توہین کی ہے اور اپنی تاریخی غلط فہمی سے مسلمانوں خصوصاً شیعوں کے جذبات کو مجروح کیا ہے۔

حیدر آباد کے بعض مقتدر حضرات نے مولانا کو اس ہنگامہ خیز سلسلے سے باز رکھنے کی کوشش کی اور اسی اختلاف کی وجہ سے انہوں نے حیدر آباد چھوڑ دیا لیکن اپنی تحقیقات پر ڈٹے رہے۔ لکھنؤ آنے کے بعد جب مولانا نے 'دلگداز' جاری کیا تو اس میں یہی "سکینہ بنت حسین" کا بقیہ تھا۔

اس دور کے دوسرے کارنامے مندرجہ ذیل ہیں :

۱۸۹۹ء میں "فردوس بریں" (ناول) شائع ہوا۔ اس ناول کا موضوع فرقۂ باطنیہ تھا جو اہلِ حشیش کہلاتے تھے اور یہ فرقہ اسلام کے لئے ایک مستقل فتنہ بنا ہوا تھا۔ اس ناول میں ان کے عروج و زوال کا نقشہ دکھایا گیا ہے اور ان کی ارضی جنت کی سیر بھی کرائی ہے۔ اس کے بعد مولانا نے ایک مختصر رسالہ "حسن بن صباح کی سوانح عمری" بھی شائع کیا۔

۱۹۰۰ء میں 'ایام عرب' (ناول) کا دوسرا حصہ شائع ہوا۔ اس ناول میں عرب کے زمانۂ جاہلیت کی زندگی کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور ایران کے عہد پرویزی کے حالات بھی بیان کئے گئے ہیں۔

۱۹۰۰ء میں ایک اور ناول "مقدس نازنین" کے نام سے منصۂ شہود پر آیا۔ اس ناول میں ایک عیسائی لڑکی اور ایک مسلمان شہزادے کی داستانِ محبت کو بیان کرتے ہوئے عیسائیوں کے راہبوں اور ننوں کی اخلاقی اور اندرونی خفیہ زندگی پر بہت کاری ضرب لگائی گئی ہے۔

۱۹۰۰ء میں مولانا نے ایک انگریزی ناول کا ترجمہ کر کے "ڈاکو کی دلہن" کے نام سے شائع کیا تھا۔

قیام یورپ کے دوران کے جو اثرات مولانا اپنے ساتھ لائے تھے ان کا ظہور ایک طرف تو سکینہ بنت حسین کی سوانح عمری میں ہوا اور دوسرا پردہ کی مخالفت کی صورت میں۔ اپنے اس نظریے کی تبلیغ کے لئے مولانا نے ۱۹۰۰ء میں باقاعدہ ایک پندرہ روزہ رسالہ جاری کیا جس کا نام "پردۂ عصمت" تھا۔

۱۹۰۱ء میں مولانا نے پردہ کی مخالفت میں ایک ناولٹ "بدر النساء کی مصیبت" شائع کیا۔ اس میں پردہ کی سختی سے پابندی کرنے کی وجہ سے دو خاندانوں کی تباہی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔

۱۹۰۱ء میں مولانا "پردۂ عصمت" اور "دلگداز" دونوں کو لکھنؤ میں بند کر کے حیدر آباد چلے گئے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اگرچہ وہ لکھنؤ میں مقیم تھے لیکن حیدر آباد کی ملازمت بدستور جاری تھی۔ صرف نواب وقار الملک کی فیاضی اور ہوم سیکرٹری مولوی محمد عزیز مرزا کی کوشش سے ان کو لکھنؤ میں رہنے کی اجازت مل گئی تھی۔ وہ لکھنؤ میں رہتے تھے لیکن تنخواہ بدستور حیدر آباد سے آتی تھی۔ ۱۹۰۱ء کے درمیان میں انہیں حیدر آباد واپس طلب کیا گیا لیکن وہاں پہنچ کر کچھ ایسے انقلابات کا سامنا ہوا جن سے مولانا اور ریاست حیدر آباد کے تعلقات کو نقصان پہنچا۔ نواب وقار الملک وزارت سے علیحدہ ہو گئے اور پھر ان کا انتقال بھی ہو گیا۔ عزیز مرزا کا اضلاع میں تبادلہ ہو گیا تھا۔ نئے مدار المہام مہاراجہ سرکشن پرشاد کو مولانا سے کوئی خاص ہمدردی نہ تھی اور مسٹر واکر جو فنانس کا انتظام کرنے حیدر آباد آئے تھے ان کے نزدیک ریاست کو مولانا کی خدمات کی ضرورت نہیں تھی۔ چنانچہ ۱۹۰۳ء میں مولانا دوبارہ لکھنؤ واپس آ گئے۔ ۱۹۰۴ء میں "دلگداز" پھر سے لکھنؤ سے جاری ہو گیا۔ اس کے بعد مندرجہ ذیل تصنیفات یکے بعد دیگرے شائع ہوئیں:

جولائی ۱۹۰۴ء سے "دلگداز" میں "شوقین ملکہ" (ناول) شائع ہونا شروع ہوا اور دسمبر ۱۹۰۷ء میں مکمل ہوا۔ اس ناول کا موضوع دوسری صلیبی جنگ کے واقعات ہیں۔ عیسائیوں کی مذہبی دیوانگی اور سلطان عماد الدین اتابک زنگی کا جوشِ جہاد، مسلمانوں کے جنگی کارنامے اور ان کے پس منظر پر حُسن و عشق کی ایک داستان بیان کی گئی ہے۔

۱۹۰ ء میں مولانا شرر کی طرف سے "یوسف و نجمہ" (ناول) مکمل شائع ہوا۔ اس ناول کا موضوع عہدِ تغلق کے ایک خاندانی لڑکے کی داستان ہے۔ عہدِ طفولیت میں والدین کی جُدائی، گردشِ زمانہ کے خوفناک تھپیڑے اور بچپن کے سادہ عشقیہ واقعات، انجام کار بچھڑے ہوئے عزیزوں کا ملاپ، بیان کیا گیا ہے۔ اس ناول کو مولانا کے قیامِ یورپ کے دوران میں ایک مطبع نے کسی اور سے مکمل کرا کے مولانا شرر کے نام سے شائع کر دیا تھا لیکن مولانا نے اس ناول کو دوبارہ خود مکمل کر کے شائع کیا۔

۱۹۰۶ء میں مولانا شرر نے سوانح حیات حضرت جنید بغدادیؒ شائع کی۔

۱۹۰۶ء میں تاریخِ سندھ حصہ اوّل بھی مکمل کر کے شائع کی۔ مولانا اس کو اپنی بہترین تاریخ سمجھتے تھے۔

۱۹۰۷ء میں مولانا شرر نے "سوانح حیات ابوبکر شبلیؒ" مکمل کر کے شائع کی۔ اسی سال مولانا کو ASSISTANT DIRECTOR OF EDUCATION کا عہدہ پیش کر کے حیدر آباد طلب کیا گیا اور وہ لکھنؤ سے پھر حیدر آباد چلے گئے۔

۱۹۰۸ء میں "دلگداز" حیدر آباد سے جاری ہوا۔ لیکن دوسرے ہی سال نظام حیدر آباد مولانا سے کچھ ناراض ہو گئے اور مولانا کو حیدر آباد چھوڑنا پڑا۔ قیام حیدر آباد کے زمانے میں انہوں نے دو ناول "آغا صادق کی شادی" اور "ماہِ ملک" لکھے تھے۔ "آغا صادق کی شادی" میں لکھنؤ کی تہذیب اس کے رسم و رواج خصوصاً شادی بیاہ کے موقع کی رسومات کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ "ماہِ ملک" میں سلطان شہاب الدین محمد غوری کے زمانہ کے افغانستان کے شاہی حالات اور ہندوستان پر محمد غوری کے حملے کو موضوع بنایا گیا ہے۔

۱۹۱۰ء میں "دلگداز" لکھنؤ سے جاری ہوا اور اس کے بعد مندرجہ ذیل ناول سلسلہ وار شائع ہوئے جو "دلگداز" کے صفحات میں شائع ہونے کے بجائے بصورت کتاب علیحدہ شائع کر کے خریدارانِ "دلگداز" اور دیگر شائقین کو قیمتاً بھیجے جاتے تھے:

۱۹۱۰ء میں "فلپانا" (ناول) شائع ہوا۔ اس ناول کا موضوع حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت کا ایک واقعہ ہے۔ مجاہدینِ اسلام کی افریقہ کے تپتے ہوئے ریگستانوں میں معرکہ آرائیاں دکھائی گئی ہیں اور دلچسپی پیدا کرنے کے لئے وہی حُسن و عشق کی چاشنی شامل کر دی گئی ہے۔

۱۹۱۱ء میں "غیب دان دلہن" (ناول) شائع ہوا۔ اس ناول میں بڑی سوسائٹی کے نتائج، بیوی کی مرضی دار غیب دانی، ایک شریف خاندان

کا تباہی سے بچنا، ریاکار دوستوں کی غدارانہ چالیں اور اسی قسم کے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔

۱۹۱۲ء میں "زوالِ بغداد" (ناول) شائع ہوا۔ اس ناول میں جنت العنقود کے حیرت انگیز اسرار، خلفائے عباسیہ کے جاہ و جلال اور ان کے عبرتناک انجام کی داستان بیان کی گئی ہے۔

۱۹۱۲ء میں مولانا محمد علی مرحوم نے مولانا کو "ہمدرد" کی ادارت کے لئے مبلغ دو صد روپیہ ماہانہ پر دعوت دی لیکن بعض وجوہات کی بنا پر مولانا وہاں نہ جا سکے۔

۱۹۱۲ء میں مولانا شرر نے "تاریخ عہدِ قدیم" مکمل کر کے شائع کی۔ اس میں طوفانِ نوحؑ کے بعد سے لے کر حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش تک کی تاریخ بیان کی گئی ہے اور سنوں میں "قبلِ محمدؐ" کا التزام قائم کیا گیا ہے۔

۱۹۱۳ء میں "رومۃ الکبریٰ" (ناول) شائع ہوا جس میں رومیوں کی تہذیب کے عروج و زوال کا نقشہ دکھایا گیا ہے۔

۱۹۱۳ء سے ۱۹۱۴ء تک مولانا ریاست رام پور کے پیچھے بھی پڑے رہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نواب رام پور (جو اس زمانہ میں برسرِ اقتدار تھے) کی عیش پرستی اور ہوس کوشی نے شریفوں، رعایا کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ کسی کی بہو بیٹی کی عزت محفوظ نہ تھی نواب صاحب سے ٹکر لینا آسان کام نہ تھا۔ مولانا شرر تک بھی یہ باتیں پہنچتی رہیں اور "تنگ آمد بجنگ آمد" آخر انہوں نے ہمت سے کام لے کر دو ناول شائع کئے جن میں ایک فرضی ریاست حرام پور کے نواب کی سیاہ کاریوں کو بے نقاب کیا گیا تھا۔

۱۹۱۳ء میں "حسن کا ڈاکو" (ناول) شائع ہوا۔ اس میں ریاست حرام پور کے نواب کی بدکاریاں، نام نہاد مولویوں کی ریاکاریاں اور ان کی وجہ سے سوسائٹی کی تباہی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ ۱۹۱۴ء میں اسی ناول کا دوسرا حصہ شائع ہوا۔

۱۹۱۴ء میں "اسرارِ دربارِ حرام پور" (ناول) دو حصوں میں شائع ہوا۔ یہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

۱۹۱۴ء میں مولانا نے "خوفناک محبت" کے عنوان سے ایک ناول لکھنا شروع کیا جس میں یو۔پی کی دیہاتی زندگی اور زمینداروں کی باہمی رقابت کا خاکہ کھینچا گیا تھا۔ یہ ناول ۱۹۱۵ء میں شائع ہوا۔

پانچویں دور (۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۶ء تک) میں مولانا شرر کو نسبتاً زیادہ آسودگی حاصل ہوگئی تھی اور وہ ہمہ تن تاریخی تحقیقات کی طرف مشغول ہو گئے تھے۔ سوائے دو ناولوں کے باقی اس دور کی تمام تخلیقات کے لئے انہوں نے ماضی کی تاریخ سے مواد حاصل کیا ہے۔ ان کے اس دور کے کارنامے حسبِ ذیل ہیں:

۱۹۱۵ء میں ایک ماہنامہ "دل افروز" جاری کیا جس میں دو ناول بالاقساط شائع ہونے لگے اور بعد ؛ انہیں کتاب کی شکل دے دی گئی۔

۱۹۱۵ء میں "الفانسو" (ناول) شائع ہوا۔ اس ناول میں قدیم تاریخ کے ایک عشقیہ واقعہ کو بیان کیا ہے۔

۱۹۱۶ء میں "فاتح و مفتوح" (ناول) شائع ہوا۔ اس ناول میں فرانس میں عربوں کے داخلہ اور شاہ پرویز کی نازآفریں دختر شہزادی حسینہ کے حسن و عشق کی رنگین داستان بیان کی گئی ہے۔

۱۹۱۷ء میں "بابک خرمی" (ناول) کا پہلا حصہ شائع ہوا۔ اس ناول کا موضوع سلطنتِ عباسیہ کے زمانہ کے واقعات ہیں۔ بابک خرمی کی بے اعتدالیوں اور اس کے مظالم کی المناک داستان بیان کی گئی ہے۔ خلافتِ عباسیہ کے جاہ و جلال اور بابک خرمی کے عبرتناک انجام کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔

۱۹۱۷ء ہی میں "جویائے حق" (ناول) کا پہلا حصہ شائع ہوا۔ اس ناول میں حضرت سلمان فارسی کی ابتدائی زندگی اور آنحضرتؐ کی پیدائش

وبعثت کے متعلق عیسائی راہبوں کے سربراہ کی پیشین گوئی اور انتظار کا حال بیان کیا گیا ہے۔

۱۹۱۷ء میں "سوانح قرۃ العین" شائع ہوئی۔

۱۹۱۷ء میں "تاریخ عزیز مصر" شائع ہوئی۔

۱۹۱۷ء میں "تاریخ مسیح و مسیحیت" شائع ہوئی۔

۱۹۱۸ء میں "بابک خرمی" (ناول) کا دوسرا حصّہ بھی شائع کر دیا گیا۔

۱۹۱۸ء میں مولانا شرر نے "عرب قبلِ اسلام" کی تاریخ بھی مکمل کر کے شائع کر دی۔

۱۹۱۹ء میں "جویائے حق" (ناول) کا دوسرا حصّہ شائع ہوا۔ اس میں خطوط کے ذریعہ جو ناول کے مرکزی کردار ماٰبہ (حضرت سلمان فارسی کا پہلا نام) نے عیسائی راہبوں کے سربراہ کو لکھے، آنحضرتؐ کے ابتدائی حالات، اسلام کی تبلیغ، یہودیوں کی دشمنی، عربوں کی باہمی دشمنی وغیرہ تمام حالات بیان کئے گئے ہیں۔

۱۹۱۹ء میں "لعبتِ چین" (ناول) شائع ہوا۔ یہ ناول بھی اسلامی تاریخ کی ایک کڑی ہے۔ اس میں خلافت کے جھگڑے، عربوں اور ترکوں کی جنگ اور اس کے ساتھ ہی ایک عرب سردار اور ترک دوشیزہ کی داستانِ محبت بیان کی گئی ہے۔ اس ناول کے اختتام پر یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے کشمیر میں عیسیٰ ابنِ مریمؑ کی قبر کا جو سراغ لگایا ہے وہ دراصل عیسیٰ ابنِ حزم کی قبر ہے جو اس ناول کا ہیرو ہے اور اپنی محبوبہ کے ساتھ ہجرت کر کے کشمیر میں پناہ گزین ہو گیا تھا۔

۱۹۱۹ء میں مولانا شرر نے "تاریخ ارضِ مقدس" شائع کی جس میں بیت المقدس اور خانۂ کعبہ کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۹۱۹ء میں "صقلیہ میں اسلامی تاریخ" کے عنوان سے مولانا   کی ایک اور تاریخی تحقیق شائع ہوئی۔

۱۹۱۹ء میں مولانا   نے "سوانح خاتم المرسلین" بھی مکمل کر کے شائع کر دی۔

۱۹۲۰ء میں "عزیزۂ مصر" (ناول) شائع ہوا۔ اس ناول میں ابن طولون کے حالات اور عزیزۂ مصر شہزادی جولینا کی عصمت و انقلاب کی داستان بیان کی گئی ہے۔

۱۹۲۰ء میں "اسیرِ بابل" کے عنوان سے ایک منظوم تاریخ بھی شائع کی۔

۱۹۲۱ء میں "جویائے حق" (ناول) کا تیسرا حصّہ بھی شائع ہو گیا۔ اس ناول میں خطوط کے ذریعہ آنحضرتؐ کی سوانح حیات کو مکمل کر دیا گیا ہے۔

۱۹۲۳ء میں "طاہرہ" (ناول) شائع ہوا۔ اس ناول میں ایک تعلیم یافتہ ہندوستانی مسلمان لڑکی کا قصّہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ ناول بھی مولانا شرر کی پردہ کے خلاف مہم کی ایک کڑی ہے۔

۱۹۲۵ء میں "مینا بازار" (ناول) شائع ہوا۔ اس ناول کا موضوع شاہجہان بادشاہ کا زمانہ ہے۔ بادشاہ ایک زنانہ بازار لگانا چاہتا ہے۔ اس ناول میں اس کے انتظامیہ مسائل اور شرعی حدود وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

شرر نے اس دور میں چند ڈرامے بھی لکھے جن کے نام حسب ذیل ہیں:

شہیدِ وفا۔ میوۂ تلخ اور نیکی کا پھل (۱۹۲۶ء)

شہیدِ وفا اور میوۂ تلخ کے صحیح سنہ اشاعت کا پتہ نہیں چل سکا۔ اسی طرح مندرجہ ذیل ناولوں کے سنہ اشاعت کا پتہ بھی نہیں چل سکا۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ ناول مولانا   کے پانچویں دور کی تصنیف ہیں:

"افسانۂ قیس" (ناول) اس میں قیس عامری اور اس کی محبوبہ کے حالات تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔

"ماہ وبخت" (ناول) یہ ناول بھی تاریخی بتایا جاتا ہے لیکن ہمیں دستیاب نہیں ہو سکا۔

مولانا شرر نے اپنے آخری دور میں متعدد سوانح عمریاں اور تاریخیں لکھیں جن میں سے وہ تالیفات جن کا سنہ اشاعت ہمیں معلوم ہو سکا تھا ان کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ ان کے علاوہ چند تالیفات کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

تاریخ یہود۔ ابوالحسنین۔ ثانی اثنین۔ خواجہ معین الدین چشتی۔ تاریخ خلافت۔ معاشرت وغیرہ۔

اسی زمانہ میں مولانا شرر نے مختلف موضوعات پہ لیکچر بھی شائع کئے جو بہت مقبول ہوئے۔

اور دسمبر ۱۹۲۶ء میں ان کا قلم ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔

مولانا شرر کی تصنیفات بہت زیادہ ہیں اور نایاب ہونے کی وجہ سے ان کا مستند طور پہ ذکر نہیں کیا جا سکتا۔ مرزا عسکری نے تاریخ ادب اردو میں ان کی تصانیف اور ان کے شائع کردہ اخبارات کا ایک دھندلا سا خاکہ پیش کیا ہے (دھندلا اس لئے کہا گیا کہ اس میں تصانیف تالیفات کی صرف تعداد درج ہے نام درج نہیں ہیں) یہ خاکہ حسب ذیل ہے:

اخبارات و رسائل:۔

(۱) "محشر" ہفتہ وار (۲) "دلگداز" ماہوار (۳) "مہذب" ہفتہ وار (۴) "پردۂ عصمت" پندرہ روزہ (۵) "اتحاد" پندرہ روزہ (۶) "العرفان" ماہوار (۷) "دل افروز" ماہوار (۸) "ظریف" ہفتہ وار (۹) "مؤرخ" ماہوار۔ (ان رسائل میں سوائے "دلگداز" کے باقی تمام رسائل نے بہت ہی کم زندگی پائی)

تصانیف:۔

(۱) سوانح عمریاں مثلاً ابوبکر شبلی۔ جنید بغدادی وغیرہ	۲۱
(۲) تاریخی ناول " ایام عرب۔ بابک خرمی وغیرہ	۲۸
(۳) خیالی ناول " حسن کا ڈاکو۔ غیب دان دلہن وغیرہ	۱۴
(۴) تاریخ " تاریخ سندھ۔ عصر قدیم وغیرہ	۱۵
(۵) نظم و ڈرامہ " شہیدوفا۔ شب غم۔ شب وصل وغیرہ	۶
(۶) متفرق	۱۸
	۱۰۲

مولانا شرر کے مضامین کا مجموعہ جو آٹھ جلدوں میں شائع ہوا ہے وہ اس کے علاوہ ہے۔ لیکن مذکورہ بالا تصانیف میں سے بیشتر کے نام بھی نہیں ملتے اور نہ وہ تصانیف ہی کہیں سے دستیاب ہوتی ہیں اس لئے مذکورہ بالا تعداد کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے مولانا شرر کے تاریخی ناولوں پہ تحقیقی کام کیا ہے اس لئے ان کی دوسری تصانیف و تالیفات سے قطع نظر صرف ناولوں کے متعلق یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ مذکورہ بالا خاکہ میں ناولوں کی مجموعی تعداد ۴۲ بتائی گئی ہے گراہم بیلی اپنی کتاب HISTORY OF URDU LITRATURE میں شرر کے ناولوں کی مجموعی تعداد صرف ۳۰ بتاتا ہے۔ رام بابو سکسینہ کی تصنیف بزبان انگریزی A HISTORY OF URDU LITRATURE میں شرر کے ناولوں کی تعداد نہیں بتائی گئی لیکن انہوں نے ۳۱ ناولوں کے نام گنائے ہیں۔ ایم۔ ایچ جعفری۔ ایم اے (علیگ) نے مولانا شرر کے ناولوں پر اپنے مقالے میں جو "علیگ" ہفتہ وار لاہور کی ۱۸ نومبر ۱۹۵۱ء کی اشاعت میں شامل ہے۔ شرر کے ناولوں کی تعداد ۲۰ بتائی ہے۔

اور ناولوں کی فہرست بھی درج کی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جعفری صاحب نے ان تمام تصنیفات کا مطالعہ نہیں کیا جو ان کی فہرست میں شامل ہیں کیونکہ انہوں نے "حسن بن صباح" "نیکی کا پھل" "شبِ غم" اور "ملکۂ زلوبیہ" کو بھی تاریخی ناول بتایا ہے حالانکہ ان میں "شبِ غم" اور "نیکی کا پھل" ڈرامے ہیں اور "حسن بن صباح" اور "ملکۂ زنوبیہ" سوانح عمریاں ہیں۔ میری تحقیقات کے مطابق شرر کے ناولوں کی مجموعی تعداد ۳۲ ہے اور اس کی تفصیل گذشتہ صفحات میں بیان کی جا چکی ہے۔ یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا ناقدین اور مؤرخینِ ادب کے علاوہ باقی کسی نے مولانا شرر کے ناولوں کی تعداد بھی بتانی ضروری نہیں سمجھی ہے اور ان کے ناولوں کے لئے صرف "بیشمار" کے لفظ پر اکتفا کی ہے۔

گذشتہ صفحات میں مولانا شرر کی تصنیفات و تالیفات کی اشاعت کے جو سنہ درج کئے گئے ہیں وہ رام بابو سکسینہ کی تصنیف بزبانِ انگریزی HISTORY OF URDU LITRATURE سے ماخوذ ہیں لیکن ناولوں کے سنہ اشاعت کی تصدیق و تصحیح ماہنامہ "دلگداز" کے پرچوں سے کر لی گئی ہے

مولانا شرر نے ناول نویسی کی ابتدا "دلچسپ" سے کی تھی جو معاشرتی اصلاحی ناول ہے۔ اس ناول کی تصنیف کے سلسلے میں براہِ راست کوئی خاص چیز ہمیں معلوم نہیں ہوتی بلکہ مولانا شرر نے یہ ناول تجربہ کے طور پر لکھا تھا تاکہ ناول نویسی کے میدان میں بھی ان کو اپنی صلاحیت کا اندازہ ہو سکے۔ اس خیال کو اس بات سے بھی تقویت پہنچتی ہے کہ مولانا شرر کے سامنے ناول نویسی کے میدان میں سرشار اور ان سے پہلے ڈپٹی نذیر احمد کی مقبولیت کی مثال موجود تھی اور مولانا شرر نے دہلی کے دورانِ قیام میں انگریزی زبان کی تعلیم حاصل کی تھی اس کے بعد یقیناً چند انگریزی ناولوں کا مطالعہ بھی کیا ہوگا۔ مضمون نویسی میں مولانا شرر اپنے زورِ قلم کا اندازہ کر چکے تھے چنانچہ ناول کے میدان میں انہوں نے ایک تجرباتی قدم اٹھایا جو کامیاب ثابت ہوا۔ اس کے بعد انہوں نے جو دوسرا ناول شائع کیا وہ طبع زاد نہیں تھا بلکہ بنکم چندر چیٹرجی کے ناول درگیش نندنی کے انگریزی ترجمے کا اردو ترجمہ تھا۔ اس اقدام سے بھی پتہ چلتا ہے کہ اس وقت تک مولانا شرر نے ناول نویسی کسی اصلاحی مقصد سے شروع نہیں کی تھی بلکہ اس طرح اپنی شہرت اور تجربہ میں اضافہ کرنا مقصود تھا۔ اُن کا تیسرا ناول "ملک العزیز ورجنا" بعض خاص محرکات کے تحت لکھا گیا۔ اس ناول کی شانِ نزول کے متعلق رام بابو سکسینہ کی کتاب میں یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ دورانِ سفر میں اسکاٹ کے ناول "طلسمان" کے مطالعہ کے بعد مولانا کو اس ناول کی تصنیف کا خیال پیدا ہوا۔ اس تحریک کے علاوہ ایک بات اور بھی قابلِ ذکر ہے اور وہ یہ کہ اپنے رسالہ "دلگداز" کو مقبول بنانے کے لئے بھی مولانا نے ناول نویسی کا سہارا لیا اور "ملک العزیز ورجنا" پہلا ناول ہے جو "دلگداز" میں شائع ہوا۔ اسی ناول کے ساتھ مولانا شرر کا اصلاحی مقصد بھی بروئے کار آیا اور وہ تمام سیاسی اور سماجی عوامل جو ہندوستانی مسلمانوں میں تاریخی رجحانات پیدا کر رہے تھے ان کے اثرات مولانا کے ذہن میں دراصل اسی تیسرے ناول کی اشاعت کے ساتھ بیدار ہوئے۔ مولانا شرر کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ پبلک میں مشہور ہونے کے بہت شائق تھے۔ ان کی زندگی کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں اپنی شہرت کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی بقا کا بھی خاص خیال تھا۔ چنانچہ وہ ہر معاملہ میں پبلک کی پسند کو پیشِ نظر رکھتے تھے۔ خیالی اور معاشرتی ناولوں کے مقابلے میں تاریخی ناول نویسی کی طرف خاص توجہ رکھنے کا سبب بھی قبولِ عام کا شوق تھا جس کا انہوں نے اپنے مضمون بعنوان "ناول" میں اعتراف کیا ہے۔[1] مسلمانوں کے ماضی کو زندہ کرنے اور اسلاف کی تاریخ بیان کرنے کا جذبہ ان کی ناول نویسی کے محرکات میں ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔

مولانا شرر نے تصنیف و تالیف کے لحاظ سے بہت ہی مصروف زندگی گذاری ہے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ایک اچھے صحافی تھے اور اس زمانہ میں برِ عظیم ہندوستان میں صحافت کے میدان میں اتنی بھیڑ نہیں تھی جتنی کہ آج کل نظر آتی ہے۔ وہ اپنی زندگی کو کامیاب بنانے اور بلند مرتبہ

---

[1] مضامینِ شرر ادب و تحقیقی مسائل ص ۲۲۳

حاصل کرنے کے لئے بہت جدوجہد کیا کرتے تھے۔ ان کے بار بار حیدرآباد جانے میں ان کا بھی آدھ تک جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ بسیار نویسی میں اُردو زبان کے مصنفین میں تو وہ اپنا جواب نہیں رکھتے ان کی تصانیف کی تعداد کا صحیح اندازہ تو نہیں لگایا جا سکتا لیکن ان کی تصنیفات میں سے پچاس سے زیادہ کتابیں ہوں گی۔ نام اسی مقالے کے گذشتہ صفحات میں بیان کئے گئے ہیں۔ ان کا قلم ادب کے کسی میدان میں بند نہیں تھا وہ ناول نویس بھی تھے۔ مورخ بھی تھے۔ صحافی بھی تھے۔ ڈرامہ نویس بھی تھے۔ شاعر بھی تھے۔ نقاد بھی تھے۔ مترجم بھی تھے۔ فنونِ لطیفہ کے شائق بھی تھے۔ انشاپرداز بھی تھے۔ شاعر بھی تھے۔ مصلح بھی تھے۔ غرض کیا کچھ نہیں تھے؟ ان کے مقالات اور مضامین جو آٹھ جلدوں پر مشتمل ہیں ان کی اس ہمہ گیر طبیعت کا ثبوت ہیں۔ اُن کے عالمانہ کردار کو سمجھنے کے لئے اس فہرست پر نظر ڈالنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

مضامین شرر جلد اوّل حصّہ اوّل ۔ شاعرانہ اور عاشقانہ مضامین

〃 〃 〃 〃 〃 دوم ۔ 〃 〃 〃 〃 〃

〃 〃 〃 〃 〃 سوم ۔ آغاز و انتہا پر دالے مضامین (امرت دھارا و نگار کے ایڈیٹوریل)

〃 〃 دوم 〃 اوّل ۔ تاریخی و جغرافیائی مضامین

〃 〃 〃 〃 دوم ۔ 〃 〃 〃 〃 مختلف ممالک اور ان کے حالات ۔ اقوام کے تذکرے

〃 〃 〃 〃 سوم ۔ 〃 〃 〃 〃 ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ (اودھ)

〃 〃 سوم 〃 اوّل ۔ سیرِ نسواں ۔ دنیا کے مختلف ممالک کی مشہور عورتوں کا تذکرہ

〃 〃 〃 〃 〃 دوم ۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

〃 〃 〃 〃 〃 سوم ۔ سیرِ رجال ۔ دنیا کے مشہور مردوں کے حالات ۔ مثلاً سقراط ۔ لقمان ۔ ارسطو ۔ قیس عامری وغیرہ

〃 〃 چہارم ۔ ادب اور تحقیقی مسائل کے مضامین ۔ مثلاً فلسفہ علوم اسلامی ۔ لٹریچر ۔ اردو لٹریچر ۔ ناول وغیرہ

〃 〃 〃 پنجم ۔ اصلاحِ قوم و مذہب پر مضامین مثلاً ہمارے ریفارمر ۔ ہماری دورنگی تعلیم وغیرہ ۔

〃 〃 ششم ۔ تاریخی واقعات پر بیانات آرائی ۔

〃 〃 ہفتم ۔ نظم و ڈراما

〃 〃 〃 ہشتم ۔ مقالاتِ شرر مثلاً دنیا ۔ آدھی رات ۔ اُلٹنے والی گھڑی وغیرہ

مولانا شرر کی یہ ہمہ گیری جس کی جھلک مذکورہ بالا مضامین میں نمایاں ہے ان کی عظمت کی دلیل ہے اور اس کی جھلک ان کے ناولوں میں بھی نمایاں ہے ۔

گرامی

عزیز ملک

(اس مضمون کے لئے ڈاکٹر تاثیر مرحوم۔ ابو الاثر حفیظ۔ حافظ مظہر الدین اور شیخ سردار محمد ہوشیار پوری سے بہت سا مواد ملا۔ علاوہ ازیں ماہنامہ مخزن "لاہور" دور ثانی کے بعض پرچوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ عزیز ملک)

مغلیہ عہد حکومت کے آخری دور میں اگرچہ ہندوستان میں اُردو سخن گوئی کا عام رواج ہو چلا تھا۔ تاہم فارسی شعر و شاعری کی شمع بھی گل نہ ہوئی تھی۔ دہلی کے نام نہاد پایہ تخت میں مرزا غالب مرحوم فارسی کے بلند پایہ شاعر کی حیثیت سے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ انہیں خود بھی اُردو کی بہ نسبت اپنے فارسی شعر پر زیادہ ناز تھا اور یہ ناز غلط بھی نہ تھا کیونکہ مرزا کی خیال آرائی، حسن ادا، نزاکت تخیل اور قدرت بیان کی جس قدر رسمائی فارسی کے پیکر میں نظر آتی ہے اُتنی دلکشی اور بے ساختگی معنوی حسن اور صوتی نغمہ و آہنگ کے اعتبار سے اُردو کے قالب میں نمایاں نہیں۔ غالباً "مجموعۂ بے رنگ من است" کی توجیہہ بھی یہی ہو گی یا پھر "کچھ اور چاہیئے وسعت میرے بیان کے لئے"۔

لیکن زبانِ پہلوی کی ہمہ گیر وسعت کے باوصف اُردو زبان نے رفتہ رفتہ اپنے پنجے نہایت مضبوطی سے گاڑ دیئے اور دیکھتے دیکھتے فارسی کی پوری اقلیم سخن کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ حتیٰ کہ انیسویں صدی کے نصف آخر سے لے کر بیسویں صدی کی ابتدا تک ——— علامہ اقبالؔ مرحوم سے پہلے ——— ملک بھر میں ہمیں فارسی زبان کا صرف ایک ہی منفرد اور قابلِ ذکر شاعر نظر آتا ہے۔ یہ یگانۂ روزگار شخصیت مولانا شیخ غلام قادر گرامی مرحوم کی تھی جن کی حیات اور سیرت و کردار پر اظہار خیال اس فرصت کا موضوع ہے۔

غدر کے فتنۂ دار و گیر نے ابھی بساطِ کہن اُلٹی نہ تھی کہ ۱۸۵۶ء میں قدیم مدرسۂ فکر و سخن کا یہ آخری پیامبر جالندھر کے مردم خیز قصبے میں پیدا ہُوا۔ ان کے والد شیخ سکندر بخش ککے زئی برادری کے متمول فرد تھے اور نیل کی رنگائی کا کام کرتے تھے۔

مغربی تعلیم کے رواج سے پہلے مساجد اور قدیم طرز کے مدرسے علوم و فنون کے بیش قیمت مرکز تھے اور ان کی افادی حیثیت گذشتہ صدی کے آخر تک اپنی پوری شانِ رفتہ کے ساتھ قائم تھی۔ چنانچہ گرامی کی ابتدائی تربیت بھی انہی شکستہ بوریوں پر ہوئی۔ عمر کے چھٹے برس محلے کی مسجد میں بائے بسم اللہ سے تعلیم کا آغاز ہُوا۔ چند سال بعد وہ جالندھر کے ایک خدا رسیدہ بزرگ خلیفہ ابراہیم کے مشہور مکتب میں داخل ہوئے جہاں انہوں نے گلستاں

بوستاں اور سکندر نامہ وغیرہ کتابوں کی تحصیل کی۔ ابوالاثر حفیظ کے والد حافظ شمس الدین مرحوم جو گرامی کے ہمدرس تھے اُن کا بیان ہے کہ گرامی بچپن میں بھی شعر کہتے تھے۔ ذکر و استغراق کی نرالی عادت کے سبب سے دوسرے ہم مکتب انہیں مجذوب کے لقب سے پکارا کرتے تھے۔

گرامی نے ابتدا میں اُردو اور پنجابی کی آمیزش سے گنگاجمنی زبان میں شعر کہنا شروع کیا بچپن کی تک بندی ملاحظہ ہو۔

میرا باپ کنڈا صندوقوں کا جندا
میری ماں ہے جیوی بھٹنوں کی کبوی

لیکن بہت جلد ہی اُنھوں نے فارسی زبان پر پُورا عبور حاصل کر لیا تو اُسی کو اپنا ذریعۂ کلام بنا لیا اور پھر مرتے دم تک فارسی ہی میں شعر کہتے رہے۔

جالندھر میں مکتب کا درس ختم ہو چکا تو تحصیلِ دانش اور ذوقِ علم کی تشنگی اُنہیں پاپیادہ کشاں کشاں لاہور لے آئی۔ اورینٹل کالج میں داخلہ لیا۔ منشی فاضل کا امتحان بڑے امتیاز سے پاس کیا۔ کہا جاتا ہے بعض سوالوں کے جواب فارسی نظم میں لکھے۔ غالباً اُسی زمانہ میں اُنہوں نے گرامی تخلص کر لیا تھا اور لاہور کے مشاعروں میں شرکت کرنے لگے تھے۔

لاہور میں وکالت کا امتحان بھی پاس کیا لیکن ہر مردے و ہر کارے کے مصداق قانون کو پیشہ نہ بنایا۔ لاہور سے مراجعت کے بعد امرتسر کے ایک سکول میں فارسی مدرس کی حیثیت سے چلے گئے۔ وہاں کچھ عرصہ قیام رہا اور پھر گورنمنٹ ہائی سکول لودھیانہ میں تقرر ہو گیا۔ یہاں آپ نے نئے طرز کی تعلیم دینا شروع کی۔ طلبا کو فارسی اشعار یاد کرائے اور فارسی بول چال میں ملکہ بہم پہنچانے کی کوشش کی۔ لیکن مقررہ نصاب سے غفلت برتی۔ سالانہ معائنہ کے موقعہ پر انسپکٹر کے سامنے سبکی ہوئی اور بگڑ کر استعفا داخل کر دیا۔ لودھیانہ میں مسٹر بارٹن ایک پولیس آفیسر مولانا کا قدردان تھا اس کے کہنے سے گرامی پولیس سارجنٹ بھرتی ہوئے لیکن طبیعت کی ناموافقت آڑے آئی اور اس پھندے سے بھاگ نکلے۔

جوانی کا عالم تھا کہیں قرار نہ آتا تھا۔ اس اثنا میں رامپور جانا ہو گیا۔ اُن دنوں مرزا داغ وہاں داروغہ اصطبل تھے۔ حضرت امیر مینائی اور کچھ دوسرے شعرا بھی وہیں موجود تھے۔ مشاعروں کا بازار گرم تھا۔ گرامی کی طبعِ رواں بھی شباب پر تھی۔ مشاعروں میں شریک ہونے لگے اور اہلِ نظر ان کے کلام سے دنگ رہ گئے۔ لیکن مرزا داغ نے کسی قدر تنگ نظری کا ثبوت دیا۔ جس سے معاصرانہ چشمک اور باقاعدہ ہجوگوئی کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس چھیڑ چھاڑ کے متعلق بعض اشارات تو ملتے ہیں۔ لیکن مجھے کسی تذکرہ یا روایت سے ان سخنورانِ نامی کی دلچسپ قلمی جنگ کی مفصل روداد معلوم نہیں ہو سکی۔

جب گرامی کی طبیعت کے جوہر کھلنے لگے تو انہیں آبشنے کی تلاش ہوئی۔ غالباً رامپور سے واپسی پر پٹیالہ تشریف لے گئے اور خلیفہ محمد حسین وزیرِ اعظم کے پاس ٹھہرے۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ دکن چلے جائیں تو قدردانی ہو گی —— دکن تو وہ بہرحال گئے لیکن ان کے عازمِ دکن ہونے کے متعلق روایتوں میں بہت سا تضاد ہے اور ان کا از خود دکن تشریف لے جانا قرینِ قیاس معلوم نہیں ہوتا۔

اُن دنوں "پیسہ اخبار" لاہور میں خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے مناقب بعض شعرائے کرام نے شائع کئے۔ یہ سلسلہ اہلِ عقیدت کو پسندِ خاطر ہوا۔ حکیم عبدالمجید دہلوی کی فرمائش پر گرامی نے بھی خواجۂ بزرگ علیہ الرحمۃ کی شان میں منقبت کہی اور شائع کرائی۔ دربارِ اجمیر کے سجادہ نشینِ وقت کے یہاں اس منقبت کا بہت چرچا ہوا۔ اور انہوں نے خوش ہو کر مولانا کو دستار اور طلائی تمغہ بھیجا۔ اور ساتھ ہی دکن جانے کے متعلق بھی اشارہ کیا۔ لیکن وسائل کے فقدان اور کچھ فطری تساہل کی وجہ سے مولینا ایک عرصہ تک متذبذب رہے —— حسنِ اتفاق سے اُنھی دنوں کسی کام سے لاہور آنا ہوا۔ ایک شام مخدوم علی ہجویری کے مزارِ اقدس پر سلام کہنے گئے۔ دل پر عجیب کیفیت طاری ہو گئی۔ مزار کے پائیں جانب ایک گوشے میں سر بزانو بیٹھ گئے اور اسی حالت میں نصف شب تک بیٹھے رہے۔ مخدوم ہجویری کی شان میں ایک منقبت موزوں کی اور وہیں سنا کر واپس آ گئے۔ اس منقبت کے تین بند یہ ہیں۔

السّلام اے رازدارِ نکتۂ تکمیلِ وجود
السّلام اے محرمِ اسرارِ رموزِ ہست و بود

السلام اے عاشقِ تسبیحِ خلاقِ وجود
حمد گویاں در قیام و در رکوع و در سجود
گنج بخشِ فیضِ عالم مظہرِ نورِ خدا
ناقصاں را پیرِ کامل کاملاں را راہنما

السلام اے کعبۂ امید دلہا را خلیل
السلام اے عبدِ مقبولِ خداوندِ جلیل
رہ بمنزل کے تواں بردن گرامی بے دلیل
موسیٰ را خضر باید تشنہ را سلسبیل
گنج بخشِ فیضِ عالم مظہرِ نورِ خدا
ناقصاں را پیرِ کامل کاملاں را راہنما

السلام اے دردمنداں محبت را امام
السلام اے شیخ ما مرشد عالی مقام
گنج بخشی کار نیست شانِ نائبِ خیر الانام
قطبِ وقتِ خویش فرمودست با این احترام
گنج بخشِ فیضِ عالم مظہرِ نورِ خدا
ناقصاں را پیرِ کامل کاملاں را راہنما

منقبت مقبول ہو گئی اور اس رات جناب مخدوم نے خواب میں آپ کو دربارِ عالی کا شرف بخشا اور دکن جانے کی نوید بھی فرمائی۔ غالباً یہ ایک ہی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں جو یکے بعد دیگرے ملتی گئیں اور تقدیر ان کے لئے دکن پہنچنے کا راستہ ہموار کرتی رہی ——— چند ایرانی سیاح جو غالباً رامپوری مشاعروں میں گرامی کے کلام سے متاثر ہوئے تھے اور اب دورانِ سیاحت دکن میں موجود تھے۔ انہوں نے نظام کے دربار میں گرامی کا ذکر کیا اور نظام ان سے غائبانہ متعارف ہوئے۔ یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب قدر بلگرامی دربارِ دکن کے شاعرِ خاص تھے۔ ان کے انتقال کے بعد مولینا گرامی کا انتخاب عمل میں آیا اور وہ ۱۸۹۰ء میں اعزاز و اکرام کے ساتھ دکن بلائے گئے ——— گرامی بحضور آمد اسی موقعہ پر انہوں نے تاریخ کہی تھی۔ اس میں صفت یہ ہے کہ گرامی کے عدد حضور کے ساتھ ملانے سے تاریخ بنتی ہے۔

دکن میں مولینا گرامی کم و بیش پچیس برس رہے۔ اس تمام عرصہ میں نصرت انہیں دربار میں کامل اثر و رسوخ حاصل تھا بلکہ نظام کے مزاج میں بھی خاصا دخل ہو گیا تھا۔ ایک مرتبہ بہار یہ قصیدہ سے پہلے قدر دانی و انعام بالکل داغ کے برابر کرنے لگے۔ داغ استاد شاہ تھے اور گرامی کی حیثیت دربارِ دکن میں شاعرِ خاص کی تھی۔ اس طرح دونوں میں ایک طرح کی رقابت کا آغاز ہوا اور دونوں کے فکرِ سخن کی لسانی حدود بھی ایک دوسرے سے مختلف تھیں تاہم دونوں میں چشمکوں کا سلسلہ از سرِ نو شروع ہو گیا۔ یہاں تک کہ داغ نے نظام کی خدمت میں برسبیلِ غیبت کہا کہ یہ شخص شعر ایسا خاک کہتے ہیں شاید کہیں سے قلمی دواوین ہاتھ آگئے ہیں۔ وہ اب اپنے نام سے پڑھ جاتے ہیں۔ بعد ازاں یہ تو مشہور ہے کہ یہ بات گرامی تک پہنچائی کہ دربار میں داغ نے یوں کہا۔ پھر کیا تھا۔ گرامی نے داغ کی ہجو لکھی۔ داغ بھی جواب دینے لگے۔ داغ عمل میں کر خاک ہو گئے۔ درشت کلمات تک نوبت پہنچی۔ گرامی نے کہا میں بھلا شعر اپنا کیا چاہوں۔ یہ بھی کہا پہلے استاد کا غیر مطبوعہ ذخیرہ میں تھا ——— نظام نے اس تکرار کو یہ کہہ کر بند کرا دیا کہ دونوں حضوری ہو باہم فیصلہ کر لو ——— بہت دونوں تک داغ کو گرامی سے شکایت رہی۔ رفتہ رفتہ یہ اختلاف اور ان دو باکمالوں میں بالآخر صلح ہو گئی۔ ایک نے دوسرے کی عظمت کا اعتراف کر لیا۔ دیوانِ گرامی میں داغ کی تعریف میں ایک مثنوی شامل ہے جس کے آخری تین شعر یہ ہیں۔ ؎

حقیقت فہمِ اسرارِ معانی
شناسائے مزاجِ نکتہ دانی
بیا پروردۂ نورِ نگاہش
ادب یک گوشۂ طرفِ کلاہش
بیاید از زبانِ نکتہ پرور
گرامی مدحتِ داغِ سخنور

اور داغ نے بھی اپنے ایک دو مکاتیب میں گرامی کی تعریف میں چند ایک جملے لکھے ہیں۔

مولینا گرامی نے دربار میں اپنی وضعداری پر کبھی آنچ نہیں آنے دی۔ دستور تھا کہ دربار میں کوئی شاعر سات اشعار سے زیادہ نہیں پڑھتا تھا اگر اعلیٰ حضرت پسند فرماتے تو شاعر کلام کو جاری رکھتا ورنہ سکوت کر لیتا۔ چنانچہ اسی دستور کے مطابق ایک مرتبہ گرامی نے قصیدے کے سات شعر سنائے پھر حکم ہوا تعمیل ارشاد کی۔ پھر حکم ہوا اور سات شعر سنائے۔ تیسری مرتبہ جھنجھلا کر پنجابی میں کہنے لگے ——— "او یار چھاپا ہن کھڑے کھڑے تھک گیا ہاں" ——— نظام مسکرا کر چپ ہو رہے۔ یہ ناز برداریاں گرامی کے بختِ رسا کی دلیل ہیں۔ دربار سے انہیں مقررہ مشاہرہ کے علاوہ بھی اکثر مالی فتوحات ہوتی رہتی تھیں۔ چنانچہ ان کی شادی کے موقعہ پر نظام نے پانچ سیر سونا عنایت فرمایا تھا۔

دکن میں مولینا کی دوسری ادبی دلچسپیوں اور مجلسی سرگرمیوں کے متعلق مجھے چنداں معتبر حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ حالانکہ گرامی کا قیام دکن میں اس عظیم الشان علمی دور سے متعلق ہے جب بہت سے اصحاب علم و فضل وہاں جمع تھے۔ لیکن تذکروں میں کہیں ایک حرف بھی تو ان مجلسوں اور علمی صحبتوں کے بارے میں نہیں ملتا۔

گرامی ۱۹۱۵ء میں مستقل طور پر دکن کو خیرباد کہہ آئے اور ہوشیار پور میں مقیم ہو گئے۔ ان کی اہلیہ محترمہ اقبال بیگم جو شاعرہ تھیں اور "ترک گرامی" تخلص کرتی تھیں ہوشیار پور کی رہنے والی تھیں۔ اسی ازدواجی تعلق کی بنا پر مولانا نے اپنے آبائی وطن جالندھر کو ترک کر کے ہوشیار پور کو مستقل مسکن بنا لیا تھا۔ ستم ظریف لوگ اکثر کہا کرتے تھے کہ مولانا اپنی رفیقۂ حیات کو بیاہ کر جالندھر نہیں لے گئے بلکہ بیوی انہیں بیاہ کر ہوشیار پور لے آئی ہے۔

قیام دکن کے دوران میں گرامی بارہا پنجاب آئے۔ اسی وقفہ میں کسی وقت علامہ اقبال سے رسم و راہ ہوئی ہو گی۔ لیکن دکن سے مراجعت کے بعد علامہ صاحب سے ربط و ضبط بہت بڑھ گیا۔ ان دوستانہ مراسم کی داستان بہت طولانی ہے ——— شاید تنہا گرامی ہی کو یہ فخر حاصل ہے کہ علامہ اقبال اپنے خادم خاص علی بخش کو بھیج کر انہیں لاہور بلوایا کرتے اور مہینوں باصرار اپنے یہاں مہمان رکھتے تھے۔ شب و روز علمی گفتگو ہوتی یا مشورۂ شعر و سخن۔ یہ بات مبالغہ نہیں بلکہ کھلی حقیقت ہے کہ گرامی نے اقبال کے ابتدائی فارسی کلام کی باقاعدہ اصلاح فرمائی۔ مگر یہ واقعہ اس زمانہ کا ہے جب علامہ کی حیثیت فارسی شعر میں کچھ زیادہ مسلم نہیں ہوئی تھی اور مولینا اس میدان کے پرانے شہسوار تھے۔ ذرا آگے چل کر مشورۂ سخن کا یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا بلکہ اب علامہ صاحب کو مولینا کی اصلاح سے اتفاق نہ ہوتا تو قبول نہ فرماتے۔ بہرحال مشورۂ سخن کا یہ سلسلہ آخر تک جاری رہا۔ شاید اسی تعلق کی وجہ سے علامہ صاحب نے گرامی کی وفات کے وقت کہا تھا۔ ؎

یاد ایامے کہ باد گفتگو ہا داشتیم
اے خوشا حرفے کہ گوید آشنا با آشنا

اب یہ اور بات ہے کہ کچھ لوگ علامہ اقبال کو گرامی مرحوم کا شاگرد بتاتے ہیں۔ رسالہ "شمع" آگرہ ۱۹۲۵ء کی کسی اشاعت میں مولانا گرامی کی فارسی غزل پر تعارفی نوٹ میں ایڈیٹر نے لکھا تھا کہ علامہ اقبال کو بھی گرامی سے نسبتِ تلمذ ہے جس پر علامہ مرحوم نے ایڈیٹر کو خط لکھا کہ وہ گرامی کے شاگرد نہیں ہیں۔ آئندہ ماہ یہ خط بھی شمع میں نقل ہوا اور غلط فہمی کے تمام امکانات دور ہو گئے۔ لیکن اس وقت میرے پیشِ نظر رموزِ بیخودی کا وہ نسخہ ہے جو پہلے پہل حکیم فقیر محمد چشتی کے اہتمام سے طبع ہوا۔ یہ نسخہ پاکٹ سائز پر پرویں رقم کا کتابت کردہ ہے۔ سنِ طباعت اس پر درج نہیں غالباً ۱۹۱۶ء یا ۱۹۱۷ء اس کا سالِ طباعت ہو گا۔ اس نسخہ پر علامہ صاحب نے ایک دیباچہ بھی تحریر فرمایا تھا جسے بعد کے ایڈیشنوں سے خارج کر دیا گیا۔ فرماتے ہیں ———

"استاذی علامہ میر حسن صاحب اور مولینا شیخ غلام قادر گرامی شاعر خاص حضور نظام دکن خلد اللہ ملکہ و اجلالہ میرے شکریہ کے خاص طور پر مستحق ہیں۔ کہ ان دونوں سے بعض اشعار کی زبان اور طرزِ بیان کے متعلق قابلِ قدر مشورہ ملا" ———

اس سلسلہ میں مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ مولینا عظامی (تعالی اللہ گرامی راعظامی جانشیں آمد) کے پاس علامہ اقبال ...

بھی محفوظ ہیں جن میں گرامی سے اشعار پر اصلاح طلب کی گئی تھی۔ کاش یہ مکاتیب جمع ہو سکتے —— ویسے علامہ اقبال کو گرامی سے بے پناہ عقیدت تھی۔ انجمن حمایت اسلام کے ایک جلسہ میں علامہ مرحوم نے حاضرین سے گرامی کا تعارف کراتے ہوئے کہا تھا کہ "گرامی کو دیکھ لو۔ تمہاری نسلیں اس بات پر فخر کریں گی کہ ہمارے بزرگوں نے اپنی آنکھوں سے گرامی کو دیکھا تھا اور اس کی زبان سے اس کا کلام سنا تھا۔"

علامہ اقبال سے تعلقات کا المناک پہلو گرامی کے آخری ایام زیست ہیں۔ جبکہ ایک عمر کے دوستانہ مراسم کی بنا پر انہوں نے علامہ صاحب کو ہوشیار پور بلوایا۔ علامہ مرحوم ان دنوں ہندو مسلم کشیدگی کے سبب لاہور میں بہت مصروف تھے۔ اس لئے جا نہ سکے۔ گرامی نے ان کی مجبوری کو تغافل پر محمول سمجھا اور بستر مرگ پر بحسرت تمام یہ الفاظ کہے کہ "زندہ گرامی سے تو اقبال کو کچھ کام پڑتا تھا۔ لیکن آج اسے میری کیا پروا ہے" —— مولینا گرامی نے ۲۹ مئی ۱۹۲۷ء کو سحر کے وقت انتقال فرمایا ——

گرامی کی تمام تر ذہانت شعر و شاعری میں جذب ہو کر رہ گئی تھی۔ دنیاوی کاموں میں ان کی دلچسپی برائے نام سی تھی۔ ویسے بھی طبیعت کی فطری نہاد کے باعث ان کی منزل ذمہ داری سے بہت بلند تھی۔ ایک مرتبہ علامہ اقبال کی معیت میں ایک دوست کے یہاں دعوت پر گئے۔ وہاں کچھ مے و جام کا بھی اہتمام تھا۔ مولینا نے مذاق مذاق میں دو گھونٹ بھر لئے۔ اتفاقاً صبح طبیعت علیل ہو گئی۔ ڈاکٹر رحیم یار خان ان کے علاج کے لئے آئے۔ حالات ما قبل علت سے استفسار فرمایا۔ مولانا نے کمال سادگی سے شب گذشتہ کا ذکر بھی فرما دیا۔ اس وقت بہت سے اصحاب وہاں تشریف فرما تھے ان کی موجودگی میں ڈاکٹر رحیم یار بہت خفیف ہوئے کیونکہ مذکورہ دعوت شبینہ ان کے بھائی کے یہاں ہی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب جا چکے تو حاضرین کا مارے ہنسی کے برا حال تھا۔ علامہ نے پوچھا اس بات کے بتانے کی کیا ضرورت تھی۔ مولینا نے کہا بھائی معالج سے کوئی بات پوشیدہ نہیں رکھنی چاہیئے۔
یہ واقعہ مجھ سے ڈاکٹر تاثیر مرحوم نے بیان کیا تھا ویسے گرامی کی عادتاً یا شغلاً مے نوشی کا ثبوت مجھے کسی دوسری روایت سے نہیں مل سکا۔

مولانا کے کوئی اولاد نہ تھی۔ لاہور میں کسی دوست نے عقد ثانی کا مشورہ دیا۔ اور مولانا نکاح کر بیٹھے۔ چند دنوں کے بعد حرم اول یعنی محترمہ ترک گرامی کو اطلاع ہوئی وہ لاہور آ کر علامہ اقبال سے ملیں۔ علامہ نے اس سے پہلے انہیں کبھی نہ دیکھا تھا۔ محترمہ ان کے سامنے فرش پر بیٹھ گئیں اور کہا —— بیٹا اقبال میں گرامی کی بدنصیب بیوی ہوں —— اتنا کہا اور ہچکی بندھ گئی۔ علامہ نے ان سے کہا کہ مولینا کے چونکہ کوئی اولاد نہیں ہے اس لئے انہوں نے نکاح ثانی فرمایا ہے۔ اور یہ شرعاً کوئی معیوب بات نہیں۔ اس پر ترک گرامی نے جواب دیا۔ گرامی کے گر اولاد نہیں تو میری بھی کہاں ہے۔ میں اس پیرانہ سالی میں اب کہاں جاؤں۔ علامہ صاحب نے ان کو تسلی دے کر رخصت کیا اور خود گرامی سے جا کر ملے اور فرمایا "مولینا آپ جانتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عالم انسانیت پر کتنا احسان فرمایا ہے۔" گرامی بولے ہاں اس میں کس کو کلام ہو سکتا ہے"۔ علامہ نے پھر کہا کہ یہ بھی آپ سے پوشیدہ نہیں کہ رحمت عالم نے صنف نازک کو کس قدر نوازا ہے"۔ کہا فداہ ابی و امی اس میں بھی کوئی شک نہیں" —— اس پر علامہ صاحب نے فرمایا" پھر خدا را بتائیے کہ اگر بروز حشر آپ کی رفیقۂ حیات حضور کا دامن پکڑ کر فریاد کرے گی تو آپ کیا جواب دیں گے" مولینا کچھ دیر کے لئے سوچ میں ڈوب گئے اور پھر قلم برداشتہ حرم ثانی کو طلاق لکھ کر بھجوا دی۔

حرم اول سے انہیں والہانہ محبت تھی مگر بعض اوقات شکر رنجی بھی ہو جاتی تھی۔ جب کبھی شکر میں اس طرح رنج کی آمیزش ہو جاتی تو غلامی جن سے گھر میں پردہ نہیں تھا بڑی مشکل سے میاں بیوی میں صلح کرایا کرتے۔ بحالت اختلاف بیگم سامنے بیٹھی ہیں مگر مولینا انہیں براہ راست مخاطب نہیں کر رہے بلکہ غلامی سے کہتے —— "ان سے کہہ دو فلاں کام کر دیں" اور وہ بھی غلامی ہی سے کہتیں "آج گھر میں پان اور وہ چیز ختم ہو رہی ہے ان سے کہو وہ بازار سے منگوا دیں" اور جب صلح ہوتی تو مولینا اپنے مخصوص لہجے میں چہکتے "ہاں بی بی آگئے ہیں مولینا نواب دین۔ ان کے لئے اور ہمارے لئے ذرا اپنے ہاتھ سے پان لگا کر تو بھجوائیے"۔

گرامی پر ہمیشہ استغراق کی سی کیفیت طاری رہتی تھی۔ جیسے نشے میں ہوں۔ بیٹھے ہوئے حقے کی نے منہ سے لگی رہتی اور دماغ فکر سخن میں غلطاں۔

عقیدت مند شاگرد اور احباب بھی محفل میں بیٹھے ہوتے لیکن مولینا کو سوا اُس ماسوا کی مطلق خبر نہ ہوتی۔ ایسے میں کوئی مخاطب کر لیتا تو عالمِ بالا سے یوں پلٹتے جیسے خوابِ گراں سے چونکے ہیں۔ ایک دن ایسے ہی عالم میں کسی نے پوچھا کہ فلاں شخص کے متعلق کیا خیال ہے۔ فرمایا خوب آدمی ہے۔ اسلام کی خدمت کا حق ادا کر رہا ہے۔ بلکہ مامور من اللہ معلوم ہوتا ہے۔ سائل پھر کہتا۔ لیکن مولینا آپ کو علم نہیں اس نے مہدویت کا دعویٰ کر دیا ہے۔ یہ سن کر فوراً فرمادیا چھوڑو جی اس مردود کے ذکر کو وہ کوئی ازلی بدبخت معلوم ہوتا ہے۔"

ایک مرتبہ علامہ اقبال مرحوم نے علی بخش کو ہوشیار پور بھیجا کہ مولانا کو ساتھ لے آئے۔ علی بخش وہاں مہینہ بھر رُکا رہا۔ مولانا فرماتے آج چلتے ہیں کل چلتے ہیں۔ دراصل گرمی کا موسم تھا مولانا سفر سے بہت گھبراتے تھے۔ آخر ایک دن رختِ سفر باندھ ہی لیا۔ سامان تانگے میں رکھوایا۔ خود باہر تشریف لائے۔ تمازت کے سبب سے تانگہ کی نشست تپ رہی تھی۔ سوار ہوتے ہی نیچے اُتر آئے اور سامان بھی اُتار لیا۔ علی بخش کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ مولینا نے اُس سے فرمایا تم جاؤ اور علامہ سے کہہ دینا تانگہ گرم ہو گیا تھا۔ میں انشاء اللہ سردیوں میں حاضر ہونگا۔

گرامی کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن پر اسلامی تعلیمات کا خاصا اثر تھا۔ بالخصوص تصوّف سے اُنہیں بہت دل بستگی تھی۔ بہت سے اشعار اولیائے کرام کی شان میں اُن کے کلام میں ملتے ہیں۔ اور بہت سے باکمال صوفیوں سے رسم و راہ بھی تھی۔ لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کس سلسلہ سے بیعت تھے۔ ہوشیار پور سے شمالی سمت اڑھائی میل دُور نوری بستی ایک چھوٹا سا گاؤں ہے وہاں اس صدی کے آغاز میں ایک بزرگ محمد شاہ گذرے ہیں۔ جو آجکل آموں کے ایک کشادہ باغ میں آسودہ ہیں۔ اُن سے گرامی کو بہت عقیدت تھی۔ اُن کی توصیف میں ایک رباعی لکھتے ہیں :-

دادند بیا اوجِ معنیٰ راہم
کز حلقہ نگہ بشان محمد شاہم
من ذرہ ام آفتاب در آغوشم
بانغ نظرم باجرم آگاہم

(آخری مصرعہ میں اپنا مقام بھی بتا دیا ہے)

اس مختصر مقالے میں صرف گرامی کی حیات اور سیرت کا جائزہ لینا مقصود تھا۔ تاہم اُن کی شاعری کی ایک جھلک دکھانا بھی یہاں بے موقع نہیں۔ مطبوعہ دیوان میں چند نعتیہ اشعار ملاحظہ ہوں :-

بگیرم دامنِ آں سیّدِ لولاک در محشر — کہ محشر برنتابد تابِ حُسنِ بے حجابش را
شبے در خانۂ زیں آں امامِ انبیا آمد — قضا گیرد عنانش را قدر گیرد رکابش را
قضا گیرد دست در گیرد ازل گیرد ابد گیرد — رکابش را عنانش را عنانش را رکابش را
سوارِ برق شد ماہے فلک آمد عناں گیرش — رکابش بوسہ بر پا زد ملک بوسد رکابش را
گرامی در قیامت آں نگاہِ مغفرت خواہد — کہ در آغوش گیرد جرمہائے بے حسابش را

کہتے ہیں مولینا نے یہ اشعار ملفوف کر کے اپنے ایک مُحب مرزا باقر علی مال افسر کو دے دیئے تھے اور ہدایت کی تھی کہ اس لفافہ کو اُن کے انتقال کے بعد اُن کے ساتھ دفن کیا جائے۔ اتفاق سے مولینا کے وصال کے وقت مرزا صاحب موصوف ہوشیار پور سے باہر کہیں دَورے پر گئے ہوئے تھے۔ چند دنوں کے بعد گرامی مرحوم اپنی رفیقۂ حیات سے خواب میں ملے اور کہا میں نے ایک نعتیہ قطعہ مرزا صاحب کو دیا جو میری خواہش کے مطابق میرے ساتھ دفن ہونے سے رہ گیا ہے۔ تم اُن سے وہ اشعار حاصل کر کے کتبہ کی صورت میں میرے مزار پر لگوا دینا۔ چنانچہ اِس وقت بھی نعتیہ اشعار مولینا کے لوحِ مزار پر کندہ ہیں۔ اسی زمین میں غزل کے دو شعر دیکھئے :-

دماغِ فتنہ را خون کرد آن چشمِ سخندانش   قیامت سر بزانو غمزۂ حاضر جوابش را
زہی بوسم اسیرم تو نیازم حلقہ در گوشم   تبسم را تکلم را تغافل را عتابش را

اُن کے ہاں تکرارِ لفظی بہت پائی جاتی ہے۔ لیکن سماعت پر گراں نہیں گذرتی بلکہ لطف کی حامل ہے۔ مثلاً

الٰہی کو شبے مہتاب و ذوقِ مے پرستیہا   بدستے دستۂ نرگس بدستِ ماہرو دستے

ندرتِ بیان کے لحاظ سے یہ شعر

ہزاران در ہزاران جان و دل افتادہ در راہت   بسا اندوختی رفتی بسا انداختی رفتی

کہیں کہیں سہلِ ممتنع کی مثالیں ملتی ہیں ۔

بے نیاز ایں قدر چرا شدہ   بندہ پرور مگر خدا شدہ
در شکستِ دلم چہ مے کوشی   دشمنِ خانۂ خدا شدہ
ہاں گرامی ترا شناسم من   چہ بلا رند پارسا شدہ

افسوس ہے اس صدی کے بے مثال شاعر کا بیشتر کلام خود اس کے ساتھ ہی دفن ہو گیا۔ انہیں اپنا کلام خوب ضبط تھا۔ آخری عمر میں جمع کر رہے تھے کہ فرصت تمام ہو گئی اور پروانۂ اجل آ پہنچا۔ رباعیات کے مجموعہ کے علاوہ مطبوعہ دیوان چند غزلیات، احباب کے مراثی، قصائد اور نامکمل مثنویوں پر مشتمل ہے۔ اُن کی جودتِ طبع کا اندازہ لگانے کے لئے کافی ہے۔ ایک نامکمل مثنوی بعنوان "خراباتِ جنوں" بھی دیوان کی زینت ہے۔ یہ مثنوی رنگینیٔ طبع، جذبات، نادر الکلامی، حسنِ نگارش اور جدتِ تشبیہات کے لحاظ سے فردوسِ خیال ہے۔ چند اشعار دیکھئے ۔

برآمد حرفِ بیتاب از زبانم   زبان شد موجِ کوثر در دہانم
چہ مے پرسی ز خاکِ دلفریبش   فریبِ نوخطانِ جامہ زیبش
اگر عشق است در راہش بہ آہے   دگر حسن است از خاکش گیاہے
بجائے لالہ اش لیلیٰ دمیدہ   بجائے سبزہ مجنون سر کشیدہ
خرد گم کردہ در ہر گوشہ دلے   قیامت [illegible]
بدامِ آہوان شیران اسیرند   کہ اینجا آہوان شیر گیرند
سراپائے دو چارم شد نگارے   گل اندر گل بہار اندر بہارے
قیامت بے خود طرزِ خرامش   خرامش مستِ نازِ ناتمامش
بلا پابوسِ زلفِ نیم تابش   اجل مزدورِ چشمِ نیم خوابش
تکلم با خموشی در ستیزہ   تبسم در میانش ریزہ ریزہ
دہانش تنگ چون دستِ گرامی   کمر باریک چون فکرِ نظامی

گرامی مرحوم کی شاعرانہ عظمتوں پر ناقدانہ تبصرہ اس مضمون کا منشا نہیں تھا۔ اگرچہ بدقسمتی سے زمانہ اب تک اس طرف بھی اتنی توجہ نہیں دے سکا کہ جس کی وہ مستحق تھیں تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ گرامی ایک عظیم فارسی شاعر کی حیثیت سے بلند مقام رکھتے ہیں ——— اس مختصر مقالہ میں میری کوشش صرف یہ تھی کہ گرامی کی شخصیت اور زندگی کے مختلف گوشوں پر جو اُن کی شاعری سے بھی زیادہ محتاجِ توجہ تھے روشنی ڈال سکتا۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس ضمن میں بھی گرامی کے معاصرین اور ہمنشین بزرگوں نے بہت کم مواد چھوڑا ہے۔ بہر حال جو شائع شدہ واقعات گرامی کے متعلق روایت یا مختلف جزوی مضامین کے واسطے سے میں فراہم کر سکا ہوں میں نے اُن نقوش کو جوڑ کر ایک تصویر بنانے کی کوشش کی ہے جس کی نامکملی کا جتنا احساس خود مجھے ہو رہا ہے شاید دوسرے کو نہ ہو۔

مولانا وحید الدین سلیم

روشن پانی پتی

پانی پت ایک تاریخی اور ادبی شہر ہے۔ اس کے محلّۂ افغاناں میں مولانا وحید الدین سلیم نے ایک معمولی اور غریب سیّد گھرانے میں ۱۸۶۷ء میں آنکھ کھولی۔ آپ کے والد سید فرید الدین درگاہ حضرت بو علی شاہ قلندر کے ایک سنجیدہ اور مسکین طبع مجاور تھے جو اپنی زندگی قناعت کے ساتھ بسر کرنے کے عادی ہو چکے تھے اور وحید الدین سلیم نے بھی اپنی تقریباً تمام زندگی ان کی طرح عسرت اور تنگدستی میں گذاری۔ سلیم کی ابتدائی تعلیم کا آغاز ایک استانی مسماۃ شمس النسا کی تحویل میں ہوا جس نے ان کو قرآن شریف حفظ کرایا۔ اور علی نقی حزیں نے فارسی پڑھائی۔ سید غوث علی شاہ جو ایک باکمال فقیر کا درجہ رکھتے تھے اور سید فرید الدین کے پیر و مرشد بھی تھے، مولانا سلیم پر حد درجہ مہربان تھے۔ یہ ان کی ہی ذہانت، طبع اور توجہ کا نتیجہ تھا کہ مولانا کو مڈل تک تعلیم مل گئی۔ اس زمانے میں مفتوں آپ کا تخلص تھا اور آپ اکثر بچوں کے مشاعرے کیا کرتے تھے جن میں اپنا کلام بڑی دھوم دھام سے پڑھتے اور خوش ہوتے تھے۔ ۱۸۸۲ء میں مڈل کا امتحان دیا اور صوبہ بھر میں اوّل رہے۔ اس کے بعد لاہور اورینٹل کالج میں پڑھنے کے لئے چلے گئے جہاں سے منشی فاضل کا امتحان دیا اور اپنی خداداد قابلیت اور ذہانت کے جوہر دکھاتے اور سب سے اوّل پاس ہوئے۔ دل میں وکالت کرنے کا شوق تھا جس کی تکمیل کے لئے کالج میں داخل ہوئے لیکن افلاس نے یہ آرزو پوری ہونے نہ دی اور تعلیم سے دست بردار ہو کر ذریعۂ معاش کی تلاش میں بہاولپور پہنچے اور ایجرٹن کالج میں ادبِ اردو کے معلّم مقرر ہوئے۔ اس کے تقریباً پانچ سال بعد رام پور کے مدرسہ میں ہیڈ مولوی کی کرسی پر بٹھائے گئے لیکن چند ماہ بھی گذرنے نہ پائے تھے کہ سخت علیل ہو گئے اور واپس پانی پت چلے آئے۔ گھر پر آ کر گھر کے ہو رہے اور علمِ طب کی تعلیم حاصل کر کے ایک دواخانہ کی بنیاد رکھی جو تھوڑے عرصہ تک بھی نہ چل سکا اور نوبت فاقوں پر فاقے جانے لگے۔ مولانا حالی نے اس معصوم اور ذہین نوجوان پر رحم کھایا اور اپنے ساتھ سرسید کے پاس علی گڑھ لے گئے۔ سرسید کے دل پر اس گوہرِ یکتا کی آب و تاب کا وہ اثر ہوا کہ انہوں نے ان کو اپنا لٹریری اسسٹنٹ مقرر کر کے اپنے پاس رکھ لیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد سرسید رحلت فرما گئے اور مولانا سلیم پھر ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ گئے۔ سوچتے سوچتے ایک علمی و ادبی رسالہ "معارف" جاری کیا جس کو ڈیڑھ سال کے بعد ۱۹۰۰ء میں پانی پت اٹھا کر لے آئے۔ بازار میں ایک بالاخانہ پر دفتر بنایا جس میں نصیبن نامی ایک طوائف رہا کرتی تھی۔ ایک روز گرمیوں کے موسم میں دوپہر کے وقت ایک دہقانی گنوار نوجوان بالاخانہ پر چڑھا اور چونکہ اوپر کا دروازہ اندر سے بند تھا "نصیبن نصیبن"

کہہ کہ آواز دینے لگا۔ مولانا مضمون نگاری میں مصروف تھے۔ گھبرا کر پوچھنے لگے "کون ؟" باہر سے آواز آئی "کواڑ کھول !" مولانا غصہ کے عالم میں لڑکھڑاتے ہوئے اٹھے اور زور سے کواڑ کھولے تو دیکھا کہ ایک سیاہ فام گنوار لٹھ لئے کھڑا ہے اور اندر گھسنے کے لئے بیتاب ہے۔ مولانا نے پوچھا "کیا ہے ؟" جواب ملا "نصیبن کہاں ہے ؟" مولانا حیران رہ گئے اور پوچھا "کون نصیبن ؟" اس دیوہیکل نے قہقہہ مار کر کہا "میری ڈھیمن !" مولانا کو پھر غصہ آیا، اپنے آپ کو قابو میں نہ رکھ سکے اور اس کا گریبان پکڑ کر کہا "کیا بکتا ہے ؟" گنوار پھر مسکرایا اور کہنے لگا کہ "بابا تو اپنی کٹھنی رکھنی ؛ چپلے لے لے۔" مولانا کچھ نہ سمجھ سکے اور اس کو زینے سے نیچے دھکیل دیا۔ اس کے کئی روز بعد وہ بازار میں مل گیا جبکہ مولانا سلیم مولانا حالی کے ساتھ ان کے گھر جا رہے تھے۔ سلیم صاحب کو دیکھتے ہی گنوار نے کڑکتی ہوئی آواز میں کہا "یہی وہ کذر حسب میراسی ہے جس نے مجھے میری ڈھیمن سے ملنے نہیں دیا تھا۔" یہ ماجرا دیکھ کر مولانا حالی بہت سٹپٹائے اور جب مکان پر پہنچے تو جناب سلیم کو اندر داخل نہ ہونے دیا اور کہا کہ تم ایسے بازاری آدمیوں سے خدا بچائے۔ بہت منت سماجت کے بعد اصل واقعہ سنایا گیا تب کہیں حالی صاحب خاموش ہوئے۔

دسمبر ۱۹۰۱ء میں "معارف" بھی بند ہو گیا اور مولانا پھر بیکار ہو کر بیٹھ رہے۔ کچھ عرصہ کے بعد "حالی پریس" کے نام سے ایک چھاپہ خانہ جاری کیا اور کتابیں بیچنے لگے۔ لیکن یہاں بھی قسمت نے یاوری نہ کی اس لئے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ اخبار کی ادارت کی باگ ڈور سنبھالی لیکن دو سال کے بعد پھر بیمار ہو گئے اور پانی پت واپس چلے آئے۔ یہاں آکر وہی ڈھاک کے تین پات۔ تھوڑے عرصہ بعد پھر جلا وطنی پر مجبور ہوئے اور لکھنؤ جا کر مسلم گزٹ کے ایڈیٹر بنے۔ اسی زمانے میں مسجد کانپور کا جھگڑا اچھل گیا تو مولانا کا طوفانی قلم کب خاموش رہ سکتا تھا۔ ایک مضمون لکھ مارا جس کا عنوان تھا "اگر میں کانپور کا کلکٹر ہوتا۔" اخبار میں یہ مضمون نکلنا تھا کہ آپ کو ۲۴ گھنٹے کے اندر شہر سے نکل جانے کا حکم مل گیا۔ لاچار ہو کر لکھنؤ کو الوداع کہا اور لاہور جا کر اخبار زمیندار کی کچھ دن ادارت کو شرف بخشا۔ لیکن اخبار میں چند مضامین ایسے لکھ دئے جن کی بنا پر اخبار کی ضمانت ضبط ہو گئی اور اخبار بھی بند ہو گیا۔ چلو چھٹی ہوئی۔ اب پھر پانی پت تھا اور مولانا سلیم۔ یاروں کا جمگھٹ ہر وقت لگا رہتا تھا۔ شعر و شاعری ہوتی اور رفاقوں پر فاقے گذرتے گوپی حلوائی سے دوستانہ تعلقات تھے اس کی دوکان سے دونوں وقت کچوریاں منگاتے اور کھا لیتے۔ اسی دوران میں مسلم حالی ہائی سکول کی بنیاد رکھی گئی اور مولانا نے خواہش ظاہر کی کہ ان کو اردو فارسی پڑھانے پر تعینات کر دیا جائے اور گزارہ کے لئے تیس روپے ماہوار دے دئے جائیں لیکن یہ دعا قبول نہ ہوئی اور مولانا کو چند شعر سکول ہٰذا کے متعلق سپرد قلم کرنے پڑے۔ ایک شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

کیسا بنا مکاں ہے چھت جس کی آسماں ہے
پتھر پڑیں گے اس پر اب آگرے سے آکر

یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس وقت تک سکول بلڈنگ کی محض دیواریں کھڑی کی گئی تھیں۔ قلت زر کی وجہ سے چھتیں نہیں پڑ سکی تھیں۔

مولانا کی آزادروی اور قلندری ایک امر مسلمہ ہے۔ ایک مرتبہ مولانا شبلی آپ کے مہمان ہوئے دوست احباب کا مجمع تھا اور علمی بحث ہو رہی تھی۔ شام کے کھانے کا وقت آیا اور گذر گیا۔ مولانا شبلی بحث میں مصروف رہے۔ ایک آدھ مرتبہ اشارۃً کھانا کھانے کے لئے کہا گیا لیکن مولانا شبلی نے پروا نہ کی۔ بالآخر سلیم نے تنگ آکر یہ شعر بآواز بلند پڑھا ؎

میں نہیں جانوں قبلہ قبلی
روٹی کھالے مرے بھائی شبلی

جب دارالترجمہ حیدرآباد دکن میں ایک گوہر نایاب کی ضرورت محسوس ہوئی تو نگاہ انتخاب مولانا سلیم پر پڑی اور ان کو پانی پت سے بلا کر ترجمہ کا کام ان کے سپرد کیا گیا۔ اس کام پر مامور ہو کر انہوں نے نہایت قابل قدر خدمات انجام دیں۔ نئے نئے الفاظ بنائے۔ جدید اصطلاحات

وضع کیں اور تخلیقِ زبان میں کمال کر دکھایا۔ پھر عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہوئی تو پروفیسری کا عہدہ مل گیا۔ یہ سلیم کی زندگی کا آخری دور تھا۔ شدید علالت کے بعد ۲۹ جولائی ۱۹۲۸ء کو ملیح آباد میں جاں بحق ہوئے۔ ؏

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

مولانا سلیم ایک بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ دراز قد، فربہ جسم، بڑی بڑی آنکھیں اور مشکیں رنگ۔ سبب غور سے کسی کی طرف دیکھتے تو خوف معلوم ہوتا۔ بدن پر خوش نما اچکن، سفید پاجامہ، پاؤں میں انگریزی بوٹ اور جُراب پہنا کرتے تھے۔ ہاتھ میں سُرخ بید کی ایک موٹی سی لاٹھی ہوتی تھی جس پر چاندی کی خوشنما مُوٹھ لگی رہتی تھی۔ سر پر اونچی باڑھ کی ترکی ٹوپی ہوتی تھی جس سے قدِ بالا کی رونق اور بھی دو بالا ہو جاتی تھی۔ طبیعت میں سادگی بدرجۂ اتم موجود تھی۔ بعض اوقات یہ سادگی بزدلی کی حد تک پہنچ جایا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ میرے ایک دوست پنڈت موہن لال شرما ان سے ملاقات کرنے کے لئے گئے تو مولانا خواہ مخواہ یہ سمجھے کہ یہ صاحب کوئی خفیہ پولیس کے افسر ہیں۔ مجھ سے بار بار استفسار کرتے اور جو حالات میں ان کے سُناتا باور نہ کرتے تھے۔ ان کا خوف خود بخود بڑھتا جا رہا تھا۔ حتیٰ کہ ان کی خوشامد اور خاطر مدارت شروع کر دی۔ شرما صاحب بھی بھانپ گئے اور لگے بننے۔ خوب بڑھ بڑھ کے باتیں کرنے لگے اور یہ بھی کہا کہ میں کسی وقت آپ کے پاس حیدر آباد آؤں گا۔ بس پھر کیا تھا تھر تھر کانپنے لگے اور قسمیں کھا کر کہنے لگے کہ آپ کے قیام کے لئے میرے پاس کوئی جگہ نہیں ہے۔ صرف ایک غسلخانہ ہے جس میں بسر اوقات کر رہا ہوں۔ میرا یقین نہ ہو تو روشن صاحب سے پوچھ لیجئے اور میری طرف اشارہ کیا کہ میں شہادت دے دوں۔ حالانکہ نہ میں کبھی حیدر آباد گیا تھا اور نہ مولانا کی جائے اقامت دیکھی تھی۔ میں نے ہاں میں ہاں ملادی اور معاملہ رفع دفع ہوا۔ اس طرح جوں توں کر کے اس روز تو مولانا کی جان بچ گئی۔ لیکن اگلے روز محرم کی تقریب کے سلسلے میں تعزیئے نکل رہے تھے۔ میں اور پنڈت صاحب موصوف بازار میں سے گزر رہے تھے۔ مولانا سلیم شیخ اللہ بندہ ظروف مرچنٹ کے بالاخانے کے برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ شرما صاحب کو دیکھ کر خائف ہو گئے اور جلدی سے اٹھ کر ایک کوٹھڑی میں چھپ گئے۔ شرما صاحب بھی تاڑ گئے اور وہ مجھے اُوپر لے گئے۔ جا کر ہم نے دیکھا کہ واقعی مولانا ایک کوٹھڑی کی دیوار سے لگے کھڑے ہیں۔ مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی اور مولانا بہت کھسیانے ہوئے۔

ایک مرتبہ حیدر آباد دکن سے ان کا چال چلن تصدیق کیا جانا تھا جو بسلسلۂ ملازمت ایک معمول ہوا کرتا ہے۔ جب مولانا کو اس کا علم ہوا تو بہت سٹپٹائے اور رات کو نیند نہیں آئی۔ صبح ہی میرے پاس دوڑے ہوئے آئے۔ ان کے چہرے سے پریشانی اور گھبراہٹ ٹپک رہی تھی۔ آنکھیں پُرنم تھیں۔ میں نے یہ حالت دیکھی تو تسلی دی اور ان کے کہنے پر تھانیدار صاحب کے پاس گیا وہاں جا کر اصلیت معلوم ہوئی اور میں نے واپس آ کر مولانا کی گھبراہٹ دور کی۔ انہوں نے راقم الحروف کو بہت دعائیں دیں اور بھوکوں کو کھانا کھلایا۔ باوجود تنگدستی و عسرت کے مولانا کی طبیعت مخیر اور فیاض تھی۔ غریبوں کے حال پر آنسو بہایا کرتے تھے اور حسبِ توفیق ان کی مدد بھی کیا کرتے تھے۔ جہاں تک کتابوں کا تعلق تھا اس معاملہ میں بخل روا رکھتے تھے اور اپنی کوئی کتاب کسی کو پڑھنے کے لئے عاریتاً بھی نہ دیتے تھے خواہ وہ کتنا ہی قریبی رشتہ دار یا دوست کیوں نہ ہو۔ پان کثرت سے کھاتے تھے۔ حتیٰ کہ پان کی پیک سے داڑھی رنگین رہا کرتی تھی اور چھالیہ کے باریک باریک دانے داڑھی کے بالوں میں اُلجھے ہوئے نظر آیا کرتے تھے۔ چائے بھی بڑے شوق سے پیتے تھے۔ کوئی بھی موسم کیوں نہ ہو ان کے سامنے تپائی پر چائے سے لبریز چار پانچ پیالیاں ہر وقت رہا کرتی تھیں جن کی سطح پر مکھیوں کی تہیں جم جایا کرتی تھیں لیکن مولانا پروا نہ کرتے تھے اور اپنی زوردار پھونکوں سے مکھیوں کو دور کرتے جاتے اور چسکی لیتے رہتے۔ چائے میں شکر کبھی نہ ملاتے تھے بلکہ نمک کی ڈلی پھیر لیا کرتے تھے۔ ننگی چارپائی پر ایک تہمد کسے ہوئے لیٹے رہتے تھے اور سر کو تکئے پر نہ رکھتے تھے بلکہ اونچا رکھتے تھے اور معلق۔ ایک بٹوے میں تھوڑی سی ریزگاری اور چھوٹی الائچیاں رکھا کرتے تھے۔ الائچیوں سے اپنے احباب اور عزیز شاگردوں کی مدارات کیا کرتے تھے۔ خودداری اور بے نیازی کو عینِ مذہب سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ پانی پت کے تحصیلدار شبیر صاحب نے مجھ سے

خواہش ظاہر کی کہ وہ مولانا سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ میں ان کو مولانا کے پاس لے گیا اور تعارف کرایا۔ مولانا خوش تو ہوئے لیکن کیا مجال کہ کوئی کرسی وغیرہ ان کو بٹھانے کے لئے منگا لیں۔ پاس پڑی ہوئی ننگی چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کر دیا۔ بے چارہ تحصیلدار چارپائی پر بیٹھ گیا۔ مولانا نے آنے کا سبب دریافت کیا تو کہا کہ سلام کو حاضر ہوا ہوں۔ مولانا نے "شکریہ" کہا اور میری طرف مخاطب ہو گئے۔ پندرہ بیس منٹ تک شعر و شاعری پر گفتگو کرتے رہے۔ بشیر صاحب بیٹھے بیٹھے اکتا گئے۔ میں سمجھ گیا اور وہاں سے ان کو لے آیا۔

سلیم کے دل میں مولانا حالی کی کتنی عظمت اور عقیدت تھی۔ اس کا اظہار نہیں ہو سکتا۔ ایک مرتبہ میں، آفتاب صاحب اور بلونت سنگھ صاحب پریمی مولانا سلیم کے پاس گئے۔ کچھ دیر کے بعد پریمی صاحب نے حالی کا یہ شعر پڑھ کر کہا کہ مجھے تو اس میں سے صداقت کی بو آتی ہے اور مولانا حالی کو بھی کسی کے ساتھ عشق تھا ؎

اک دسترس سے تیری حالی بچا ہوا تھا
اس کے بھی دل پہ آخر چرکا لگا کے چھوڑا

یہ سنتے ہی مولانا کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اور چہرہ غصہ سے تمتما اٹھا۔ بادل کی طرح گرج کر کہا روشن! تم ایسے شخص کو اپنے ساتھ کیوں لایا کرتے ہو۔ آئندہ اگر یہ شخص میرے پاس آیا تو میں خودکشی کر لوں گا۔ ہزار منت سماجت کی لیکن مولانا کا غصہ فرو نہ ہوا اور ہم تینوں اپنا سا منہ لے کر چلے آئے۔

کافی عرصہ کے بعد ایک روز میں پھر پریمی صاحب کو اپنے ساتھ لے گیا اور کہا کہ چل کر یہ مصرعہ پڑھ دینا مولانا خوش ہو جائیں گے۔

ع ہو گئے ناراض مولانا مری تقریر سے

جس وقت ہم پہنچے مولانا مسکرا رہے تھے لیکن پریمی صاحب کو دیکھتے ہی آگ بگولا ہو گئے اور لاحول پڑھتے ہوئے منہ پھیر لیا اور ہماری طرف پشت کر کے بیٹھ گئے۔ ہم نے ان کو منانے کی بے حد کوشش کی لیکن بے سود۔ میں نے تھک کر کہا کہ پریمی صاحب محض ایک مصرعہ سنانے کے لئے آئے ہیں اور آپ انہیں معاف کر دیں۔ میرے اشارے پر پریمی صاحب نے یہ مصرعہ پڑھا:

ع ہو گئے ناراض مولانا مری تقریر سے

مولانا نے فوراً جواب دیا:

ع کر دیا زخمی کلیجہ اک اچٹتے تیر سے

ان کے دل سے ایک ہوک سی اٹھی اور وہ آبدیدہ ہو کر معصوم بچے کی طرح رونے لگے۔ پھر فرمایا "تم مجھے کچھ ہی کہہ سکتے ہو لیکن مولانا حالی کی شان میں گستاخی برداشت نہیں ہو سکتی۔"

ایک مرتبہ باہر سے ایک واعظ آیا اور درگاہ حضرت قلندر صاحب میں وعظ کرتے ہوئے مولانا حالی کی شان میں یہ کہہ دیا کہ مولانا حالی نیچری اور بے دین ہیں۔ یہ خبر مولانا سلیم تک پہنچی۔ اگلے روز پھر اس واعظ کا وعظ ہونا تھا۔ مولانا کمر کس کر اور اپنے احباب کا ایک مجمع اپنے ساتھ لے کر جلسہ میں پہنچے اور سامعین سے خطاب کر کے فرمایا "اے مسلمانو! اس کافر و ملحد کا وعظ سننا تمہارے لئے حرام ہے۔ یہ مسلمان نہیں ہے، نہ کلمہ گو ہے اور نہ کلمہ کے معنی سمجھتا ہے۔ واعظ بھونچکا رہ گیا اور مولانا کے شاگردوں نے اس کا وعظ نہ ہونے دیا۔ سلیم صاحب فرمانے لگے کہ میں ابھی ثابت کرتا ہوں کہ یہ مکار خفیہ پولیس کا آدمی ہے مسلمان نہیں ہے۔ چنانچہ اس سے مخاطب ہو کر کہا کہ بتا لا الٰہ کے کیا معنی۔ واعظ نے جواب دیا "نہیں ہے خدا" بس پھر کیا تھا مولانا نے کڑک کر کہا۔ حضرات! جو شخص خدا کی ہستی سے بھی منکر ہے وہ مسلمان کیونکر ہو سکتا ہے۔ جلسہ میں ہلڑ مچ گیا اور ہر طرف سے لعنت لعنت کی صدا اٹھنے لگی۔ واعظ کو پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا اور بیک بینی و دو گوش جلسہ گاہ سے نکال دیا گیا۔

جہاں مولانا سلیم کو شعر و ادب سے فطری مناسبت تھی اور فی البدیہہ شعر کہنے میں کمال حاصل تھا وہاں ظرافت کا پہلو بھی ان کی طبیعت میں بدرجۂ اتم

موجود تھا۔ ترکِ موالات کی تحریک کے ایام میں ایک مرتبہ دہلی سے چند لیڈرانِ قوم پانی پت آئے اور لوگوں نے ان کے لئے شہر کے باہر دروازے بنائے اور خیر مقدم کے چند شعر کہلانے کے لئے وہ مولانا کے پاس آئے۔ مولانا نے کہا کہ میں قصیدہ خوانی کے لئے پیدا نہیں ہوا اور مجھ سے کسی کی خوشامد نہیں ہو سکتی۔ اصرار کئے جانے پر شعر کہنے پر رضامند ہوئے لیکن یہ کہا کہ میں اپنے نقطۂ خیال سے شعر کہوں گا، تمہارے زاویۂ نگاہ سے نہیں لوگوں نے کہا بہت اچھا شعر فرمایئے۔ میں بھی اس وقت وہاں موجود تھا۔ مولانا نے فی البدیہہ شعر کہے اور کہا لکھئے ؎

بن کے اب ترکِ موالات کے حامی آئے
کر کے برباد حرم کو یہ حرامی آئے

حاضرین بہت پیچ و تاب ہوئے لیکن کرتے کیا مجبور تھے۔ پھر منت سماجت کی اور اب مولانا نے کروٹ بدلی اور ٹکسالی شعر کہنے شروع کر دئے۔ آغاز اس طرح تھا۔ ؏ مادرِ ہند کے فرزندِ گرامی آئے۔

ایک صاحب ٹیڈو مل منیب ان کے پاس اکثر آیا کرتے تھے۔ ایک روز منیب صاحب نے ان کو زیادہ چونے کا پان کھلا دیا جس سے ان کی زبان پھٹ گئی۔ اس روز سے ہمیشہ ان کو "ٹیڈو" کہہ کر پکارا کرتے تھے۔

نام و نمود سے مولانا سلیم کوسوں دور تھے ـــــــ جرائد کو اپنا کلام بھیجتے تو یا تو کسی فرضی نام سے یا نیچے انگریزی کے دو تین حروف لکھ دیتے گوسوامی تلسی داس جی کی رامائن کے دلدادہ تھے۔ اکثر لوگوں کو بلا کر ان کی زبان سے چوپائیاں سنا کرتے اور بے خودی کے عالم میں جھوم اٹھتے۔

اگرچہ سلیم جسمانی طور پر ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کا کلام دنیا میں گونجتا رہے گا۔ ان کی یاد بنی نوعِ انسان کے دلوں میں تازہ اور دنیائے ادب میں ان کی انفرادیت اجاگر رہے گی۔

مرزا رُسوا

علی عباس حسینی

مرزا ہادی رسوا اور منشی پریم چند اردو ناول کے ستون ہیں۔ رسوا نے اس سے تصوریت اور عینیت نکال کر اسے حقیقت نگار بنایا اور لکھنوی معاشرت کا آئینہ دار۔ پریم چند نے اسے ہمارے دیہاتوں کی صحت مند زندگی بخشی اور اس میں اقتصادی و سیاسی مسائل کے کاکلوں کے بل کھولے۔ رسوا نے جو کچھ اس ضمن میں لکھا اسے اپنا مشغلہ سمجھ کر محض اختیاری طور پر پیش کیا۔ پریم چند نے اسے اپنی زندگی کا سب سے اہم فریضہ قرار دیا اور کسب معاش کا ذریعہ بنایا۔

میرے لئے دونوں واجب التعظیم ہیں۔ رسوا کے سامنے میں نے تیرہ برس تک زانوئے ادب تہ کیا ہے۔ پریم چند کی کہانیوں نے مجھے افسانہ نویسی کا فن سکھایا ہے۔ رسوا میرے استاد ہیں، پریم چند کو پیر طریقت کہہ لیجئے لیکن یہاں مجھے چند اشارات مرزا ہادی رسوا کے متعلق ہی کہنا ہے۔

رسوا کا پورا نام مع ڈگریوں اور تخلصوں کے مرزا محمد ہادی مرزا اور رسوا۔ بی۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی، ڈی۔ ایس۔ او تھا۔ وہ لکھنؤ میں غالباً ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مرزا محمد تقی ایک ذرا فوجی عہدے پر مامور تھے اور فارسی و نجوم و ہندسہ سے خاص ذوق رکھتے تھے۔ مرزا رسوا نے یہ علوم انہی سے سیکھے۔ ابھی وہ پندرہ سولہ برس کے تھے کہ ان کے بڑے بھائی محمد ذکی اور ان کے والد نے انتقال کیا۔ رسوا خالہ اور ماموں کی ولایت میں آ گئے۔ لیکن ان دونوں نے ان کی جائداد و املاک پر قبضہ کر کے اسے اڑا ڈالا۔ حیدر بخش عرف حسین بخش جملہ نے جو خوشنویسی میں ان کے استاد تھے ان کی سرپرستی کی اور فیض آباد کے ایک شریف گھرانے میں ان کی شادی ہو گئی۔ اس نیک بیوی کی حوصلہ افزائی سے مرزا نے منشی اور میٹرک کے امتحانات پاس کئے اور ان کے انتقال سے بددل ہو کر لکھنؤ چھوڑا اور رڑکی چلے گئے۔ وہاں کے انجینئرنگ کالج سے انہوں نے اوورسیری کا امتحان پاس کیا اور صوبہ سرحد میں ریلوے میں ملازمت کر لی۔ کوئٹہ تک لائن انہی کے اہتمام سے بنائی گئی۔ ملازمت ہی کے زمانے میں کیمسٹری اور مکینک کا شوق ہوا۔ اس لئے نوکری چھوڑی اور لکھنؤ آ کر گھر کا اثاثہ بیچا اور انگلستان سے کیمسٹری کے آلات منگوا کر کیمیا اور سیمیا کے تجربے کرنے لگے۔ اس وقت عربی اچھی طرح نہ جانتے تھے۔ اس زبان میں کیمسٹری کی کتابیں پڑھنے کے لئے عربی بھی پڑھ ڈالی اور عبرانی بھی سیکھ لی۔

کچھ دنوں بعد جب معاش میں تنگی محسوس ہوئی تو نخاس کے مشہور اسکول میں مدرسی کر لی اور ایک لوہار کے لڑکے کا ٹیوشن کیا۔ دن میں اسے پڑھاتے اور رات میں اس کی دوکان پر کام سیکھتے اور مختلف آلات اپنے ہاتھ سے ڈھال لیتے۔ ایک گریجویٹ دوست کے طعنہ دینے پر ایف اے اور بی اے کے امتحانات بھی پرائیویٹ طور پر پاس کئے۔ کرسچین ہائی اسکول میں ملازم ہو گئے اور اشراق نامی پرچہ نکالا۔ اس میں ارسطو اور افلاطون کی تصنیفات کے ترجمے بھی چھاپتے تھے

اور ان کے نظریات سے علمی بحثیں بھی کرتے رہتے تھے۔ جب ریڈ کرسچین کالج کھلا تو اس میں عربی فارسی اور تاریخ فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہو گئے اور ازابیلا تھوبرن گرلس کالج نے بھی اپنے وہاں لکچراری دے دی۔ دن کو ریڈ کرسچین میں پڑھاتے اور شام کو ازابیلا تھوبرن میں۔

اسی مشغولیت میں ایک فرنگن کے عشق میں مبتلا ہو گئے۔ مثنوی امید و بیم اسی ابتلا کا نتیجہ ہے۔ یہ مثنوی اردو میں فلسفیانہ رنگ کی پہلی مثنوی ہے۔ دوران عشق میں جوانی نثار ہو گئی تو علم نجوم کی طرف مائل ہو گئے۔ دونوں کالجوں کی نوکری چھوڑ دی اور اس علم کے پیچھے پڑ گئے۔ بڑے سورج گرہن میں بکسر بھی گئے۔ اصطرلاب اور ستاروں کو دیکھنے کے لئے کئی آلات اپنے ہاتھ سے بھی بنائے اور ایک چارٹ ستاروں کا "زیچ مرزائی" کے نام سے ڈیڑھ سو صفحوں کا تیار کیا۔ اسی زمانے میں اپنے کچھ فلسفیانہ مضامین کے انگریزی ترجمے بھی امریکہ بھیج دئیے جن پر وہاں کی یونیورسٹیوں نے انہیں پی ایچ ڈی اور ڈی ایس سی کی ڈگریاں دیں۔ اور اسی زمانے میں منشی جوالا پرشاد ناول فروش کی فرمائش پر ان کے لیے کئے ہوئے انگریزی ناول کا ترجمہ کر دیتے تھے اور ان سے نہایت معمولی معاوضہ لے کر اپنے علمی کاموں میں مشغول ہو جاتے تھے۔ خونی عاشق، خونی جورو، شیطان کا عاشق وغیرہ اسی شغل بیکاری کا نتیجہ ہیں۔

تین چار برس بعد بشپ ریڈ صاحب نے ریڈ کرسچین کالج میں پھر بلا لیا۔ اب کے "الحکیم" نام کا رسالہ مذہبی مباحث پر فلسفیانہ نظر ڈالنے کے لئے نکالا۔ حکیم ممتاز حسین عثمانی اس کے جوائنٹ ایڈیٹر اور خود سینئر ایڈیٹر تھے۔ حکیم صاحب کو شارٹ ہینڈ سے کچھ دلچسپی دکھائی دی تو اردو شارٹ ہینڈ ایجاد کر کے انہی کے نام سے رجسٹری کرا دیا۔ امراؤ جان ادا سے ملاقات ہوئی تو ان کی زبانی زنان بازاری کے تجربات و طرز معاشرت کا علم ہوا کہ ایک ناول کی صورت میں پیش کیا۔ زندگی کے دوسرے مشاہدات ذات شریف اور اختری بیگم میں بیان کئے۔ اور خود اپنے سوانح "شریف زادہ" میں لکھ ڈالے۔ ادھر آل انڈیا شیعہ کانفرنس قائم ہوئی اور اس کا شعبہ تالیف و ترجمہ انہیں سپرد کیا گیا۔ اسی سلسلے میں عربی سے مختلف چھوٹی بڑی دس کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور شیعہ مذہب پر ایک کتاب [illegible] جلدوں میں لکھ ڈالی۔

جب حیدر آباد عثمانیہ یونیورسٹی میں دارالترجمہ کھلا تو وہاں کام کرنے کے لئے بلا لئے گئے۔ وہاں کے تراجم و تالیفات کی ایک لمبی فہرست ہے۔ اس جامعہ کے سررشتہ تالیف و ترجمہ نے جو کتابیں شائع کی تھیں وہ یہ ہیں: فلسفہ اسلام، مفتاح الفلسفہ، حکمت الاشراق، معاشرتی نفسیات، مبادی علم النفس، مفتاح المنطق، کتاب الاخلاق نقوماکس، فیڈرس، لائسس اور پروطاغورس، جمہوریہ افلاطون۔ آخر عمر میں موسیقی کا شوق پیدا ہوا۔ اس سلسلے میں مغربی گانوں کی طرح ہندوستانی گانوں میں بھی علامات و نشانات پر ایک بسیط کتاب لکھ ڈالی جس میں ساڑھے تین سو کے قریب راگ راگنیوں اور گانوں کی علامتیں مقرر کر دیں۔ انہی علمی مشاغل میں اکتوبر ۱۹۳۱ء میں اس حکیم لکھنوی نے انتقال فرمایا۔

مرزا رسوا متکلم تھے، موحد تھے، محقق تھے، سائنٹسٹ تھے، آرٹسٹ تھے، ادیب تھے، شاعر تھے، ناول نویس تھے۔ آج کی نشست میں ہمیں ان کے علمی کاموں سے بحث مقصود نہیں۔ ہمیں تو صرف ان کی ناول نویسی پر ایک طائرانہ نظر ڈالنا ہے۔ اس لئے صرف ان کے طبع زاد ناولوں کا ہی نام لوں گا۔ وہ یہ ہیں۔ افشائے راز یا غریب خانہ، امراؤ جان ادا، ذات شریف، اختری بیگم اور شریف زادہ۔

لیکن یہ بات کبھی نہ بھولنا چاہئے کہ مرزا رسوا نے نہ تو اپنی شاعری کو کوئی اہمیت دی اور نہ اپنی ناول نویسی کو۔ دیوان آج تک زیور طبع سے آراستہ نہ ہوا اور غالباً اب اس کا مسودہ بھی ملنا محال ہے۔ ناول طبع ضرور ہوئے مگر اس طرح کہ مرزا صاحب نے جستہ جستہ اس کے حصے لکھے اور کبھی پوری کتاب سامنے رکھ کر اس پر نظر ثانی نہ کی۔ بس کسی علمی، کسی طبیعیاتی اور کسی کیمیائی تجربے کے لئے انہیں سو دو سو مل گئے پھر انہیں خود اپنی تصنیف سے کوئی مطلب نہیں کہ قلم نے کہاں کہاں ٹھوکریں کھائیں اور کیسے کیسے گل تراشے۔ کہاں کہاں پلاٹ میں خامیاں رہ گئیں، کون کون سے کردار نامکمل چھوڑ دئے گئے یا ناول کی مجموعی صورت کیا ہوئی۔ اسے قبول عام کی سند ملی یا مسترد ہو کر ردی کے بھاؤ بکی۔ ان کے لئے فنون لطیفہ کی تصنیف محض ایک اضطراری فعل تھا بالکل وقتی تفنن کی چیز۔ اسی بے پروائی کا یہ نتیجہ ہے کہ طبع زاد ناولوں میں صرف ایک نوک پلک سے درست ہے۔ افشائے راز اور اختری بیگم بالکل نامکمل ہیں۔ ذات شریف ایک سرسری چیز ہے۔ شریف زادہ سوانحی ضرور ہے مگر خشک۔ ہاں امراؤ جان ادا ایک ایسا ناول ہے جسے انہوں نے جی لگا کر لکھا ہے

اور اس طرح لکھا ہے کہ وہ اردو ادب میں کوہِ نور بن کر ہمیشہ چمکے گا۔

رسوا کے ان تمام ناولوں میں ہماری معاشرت کے مختلف طبقوں اور شعبوں کی نقشہ کشی کی گئی ہے۔ "افشائے راز" "اختری بیگم" میں طبقۂ ادنیٰ و اوسط کی زندگی کے مرقع ہیں۔ "ذاتِ شریف" طبقۂ اعلیٰ کی حماقتوں اور توہم پرستیوں کی تصویر ہے۔ "امراؤ جان ادا" میں طوائف کی زندگی اور اس بدنام گروہ کے پرستاروں کے حالات ہیں۔ اسے بغور پڑھنے سے اس پراگندگی، انتشار، بے اطمینانی اور بے چارگی کا بھی پتہ چلتا ہے جو ۱۸۵۷ء کے بعد اودھ کے بسنے والوں میں عام طور سے پائی جانے لگی تھی۔ "شریف زادہ" میں ایسے خوددار اور با اصول آدمی کی زندگی ہے جس نے افلاس و تنگدستی کا استقلال اور پامردی سے مقابلہ کیا اور محض ذاتی کوشش و جانفشانی سے کامیابی کی منزل تک پہنچا اور اس طرح کا آدمی بن گیا جو ہمارے لئے مثالی ہے۔ یہ ناول سوانحی ہے اور بہت حد تک مرزا رسوا کی آپ بیتی۔

رسوا زبان و بیان پر ماہرانہ قدرت رکھتے تھے اور سیرتوں اور کرداروں کی مرقع کشی میں بلا کی چابک دستی سے کام لیتے تھے۔ وہ ایک صاحبِ نظر حکیم کی طرح انسانی لغزشوں اور غلطیوں کی ہمدردانہ توجیہہ و تنقیح کرتے تھے۔ وہ اپنے پلاٹ کو غیر فطری نہ ہونے دیتے تھے۔ اور نہ ان کو دلچسپ بنانے کے لئے ان میں ناممکن الوقوع حادثات و واقعات کو زبردستی شامل کر دیتے تھے۔ انھوں نے جس معاشرت کو قریب سے دیکھا تھا، برتا تھا جس میں زندگی بسر کی تھی اسے وہ سیدھے سادے الفاظ میں بیان کر دیتے تھے۔ یہ اب ان کے قلم کا معجزہ ہے کہ ہم آپ جیسے لوگوں کی روزمرہ زندگی کے بیان میں بھی اس نے ایسی دلچسپی پیدا کر دی کہ ناظر مسحور ہو جاتا ہے اور اسے کتاب ختم کئے بغیر چین ہی نہیں آتا۔

رسوا سے میں نے تین سال ریڈ کرسچین کالج میں فارسی پڑھی ہے۔ اس زمانے میں ان کے دولت کدہ پر کبھی حاضر نہ ہوا۔ جو کچھ درجہ میں یا کالج میں دیکھا ان میں سے دو چار باتیں اب تک ذہن میں کچھ دھندلی دھندلی سی باقی ہیں۔

پہلی بات تو یہ عرض کر دوں کہ میری نظر میں وہ واقعی حکیم تھے۔ انہی معنوں میں جن میں ہم بوعلی و ارسطو و افلاطون کو حکیم کہتے ہیں۔ عرفی پڑھا رہے ہیں، پورے فلسفۂ اشراق پر لکچر دے دیا۔ اس سلسلے میں الفاظ کی ادبی تحقیق پر بھی روشنی پڑتی جاتی ہے اور مختلف اساتذہ کا کلام مع تنقیدات کے پیش ہوتا جا رہا ہے۔ کالج میں جس مضمون کا پڑھانے والا پروفیسر نہ آیا مرزا صاحب بھیج دئے گئے۔ تاریخ، منطق، فلسفہ، ریاضی، سائنس۔ مرزا صاحب جس درجہ میں پہنچے، انھوں نے مضمون کے متعلق کچھ سوالات کئے، بس اسی موضوع پر سبق ہونے لگا۔ ایک بار نہیں کئی بار ایسا ہوا ہے کہ ایم۔ ایس۔ سی۔ کو ریاضی پڑھانے والے بنگالی پروفیسر گھبرائے ہوئے درجہ میں آئے۔ ہم لوگوں نے کھڑے ہو کر تعظیم کی۔ مرزا صاحب نے فارسی کا سبق روک دیا۔ پوچھا کیا ہے۔ انھوں نے کسی سوال کے حل میں کوئی دقت بیان کی۔ مرزا صاحب نے دراز سے چاک نکالا۔ ان سے پوچھ پوچھ کر تختۂ سیاہ پر سوال لکھا۔ اور بے تامل اسے حل کرتے چلے گئے۔ پروفیسر صاحب کو ان کا حل مل گیا۔ وہ تو "شکریہ پروفیسر صاحب" کہہ کے ادھر گئے، ادھر مرزا صاحب نے پھر شعر کے معنی و مطلب سے بحث شروع کر دی۔

کالج میں تمام اساتذہ یہاں تک کہ خود پرنسپل ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ اول تو اس لئے کہ مرزا صاحب نے اس کالج کے قائم کرنے میں ان کے والد بریڈلے صاحب کی مدد فرمائی تھی۔ دوسرے یہ کہ ہمارے دور تک یعنی ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۸ء تک، مرزا صاحب کی تنخواہ کی یہ حالت تھی کہ پرنسپل نے کہا "مرزا صاحب اب کے ڈیڑھ سو بچتے ہیں۔ اب کے پونے دو سو۔" انھوں نے کہا "وہ بھی سہی۔" ان کو اس کی کبھی فکر نہ رہی کہ تنخواہ کیا ملے گی اور کب ملے گی۔

اسی زمانے میں مرزا صاحب کو اپنی سسرالی جائداد سے پچاس ہزار کے قریب روپے ملے تھے۔ ہم نے لباس اور کسی چیز میں کوئی فرق نہیں دیکھا۔ ہاں جب تک یہ روپیہ رہا یہ ضرور ہوتا تھا کہ لنچ کے وقت ایک ماما چاندی کے کٹورے میں چاندی کے سرپوش سے ڈھکا ہوا حریرہ یا یخنی لاتی تھی اور وہ مرزا صاحب نوش فرماتے تھے۔ ایک سال کے اندر ہی یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اس لئے کہ سرمایہ کچھ علمی اور زیادہ تر تفریحی مشاغل میں خرچ ہو گیا۔

مرزا صاحب نے اپنے بیٹوں کی تعلیم و تربیت پر کبھی دھیان نہ دیا۔ دو صاحبزادوں سے مجھ سے ملاقات تھی۔ بڑے تو یہیں لکھنؤ میں رہتے ہیں اور کسی رئیس کی ڈیوڑھی پر چھوٹے موٹے کاموں پر مامور ہیں۔ انہیں موسیقی میں درک ہے۔ اس لئے سوز خوانی بھی کرتے ہیں۔ دوسرے صاحبزادے حیدرآباد دکن میں سب رجسٹرار تھے۔ ان کے پاس مرزا صاحب کا غیر مطبوعہ ذخیرہ تھا۔ انہوں نے بھی انتقال کیا۔ ان نوادر کا کیا حشر ہوا، اللہ ہی جانتا ہے

حیدرآباد کے قیام کے دوران میں بھی وہ ہر سال لکھنؤ تشریف لاتے تھے اور کوئی مکان کرایہ پر لے کر اس میں رہتے تھے۔ میں دو تین بار ایسے مواقع پر حاضر خدمت ہوا ہوں۔ مزاج کی سادگی کا یہ حال تھا کہ کمرے یا ڈیوڑھی میں دری یا ٹاٹ، اور کبھی کبھی صرف چٹائی پر بیٹھے ہیں۔ مرزا صاحب کے پہلو سے لگی کچھ کتابیں رکھی ہیں اور مرزا صاحب انہیں بڑے ذوق شوق سے پڑھ رہے ہیں۔ جو بھی ملنے آیا وہیں بیٹھ گیا۔ باتیں ہونے لگیں۔ ایسے میں اپنے بے تکلف دوستوں سے گھنٹوں گپ لڑاتے مگر با تکلف لوگوں سے پندرہ بیس منٹ گفتگو کے بعد پہلو بدلنے لگتے اور کتاب اٹھا کر اس کے ورق الٹنے پلٹنے لگتے تھے مطلب یہ ہوتا کہ "اب زیادہ اچھی صحبتوں میں وقت گذارنے کا موقع دیجئے۔"

میں نے ایک بار ان کتابوں کو الٹ کر دیکھا تو حاتم طائی کا قصہ، طوطا کہانی اور اسی طرح کی چیزیں نکلیں۔ میں نے کہا ان چیزوں کے مطالعہ سے کیا فائدہ؟ کہنے لگے "میاں حیدرآباد میں بھانت بھانت کی بولیاں سنتے سنتے اُردو بھول جاتا ہوں۔ یہاں آ کر انہیں پڑھ کر پھر سے زبان پر صیقل کرتا ہوں۔"

مرزا صاحب کا قلم بہت تیز چلتا تھا۔ نثر و نظم دونوں فی البدیہہ لکھتے تھے۔ ان کی اکثر تصانیف احباب کی خاطر یا ناشروں کی فرمائش پر معرض وجود میں آئیں۔ اس پبلشر کو مرزا صاحب کی قوت تخلیق و قوت ترجمہ سے فائدہ اٹھانے کی بڑی فکر رہتی تھی۔ وہ اسی ٹوہ میں لگا رہتا تھا کہ مرزا صاحب کو روپیوں کی کب ضرورت ہے۔ جہاں اسے معلوم ہوا کہ مرزا صاحب کے ہاں ذرا تنگی ہے۔ ایک سو روپے لا کر حاضر کر گیا اور ہفتہ کے اندر کوئی تصنیف یا کسی ناول کا ترجمہ لے گیا۔ ان کتابوں کے لکھنے اور ترجمہ کرنے کا بھی طریقہ یہ تھا کہ ناشر آ کر بیٹھ گیا مرزا صاحب نے لکھنا شروع کیا اور دو گھنٹے تک بے تکان لکھتے رہے۔ جو کچھ انہوں نے لکھا وہ اس نے سمیٹا اور اسی وقت لے گیا۔ دوسرے دن پھر اسی طرح محنت کی، دو تین جزو لکھ دئے۔ اسی طرح چھ سات دن میں کتاب تمام ہو گئی۔ نہ مرزا صاحب نے نظر ثانی کی اور نہ یہ دیکھا کہ پلاٹ میں کوئی جھول تو نہیں رہ گیا ہے یا کسی سیرت کے بیان میں کچھ گھٹانے بڑھانے کی تو ضرورت نہیں ہے۔ ان کے لئے اصلی چیز تو کوئی سائنس کا تجربہ یا کسی ایجاد کی تکمیل تھی، یہ محض دفع الوقتی کا سامان تھا۔ ان پر دھیان دینا اور انہیں مانجھنا نوک پلک سے سجیل بنانا اپنے عزیز و قیمتی وقت کا ضائع کرنا تھا۔

آخر عمر میں موسیقی میں کمال حاصل کیا۔ باریک اور نازک راگنیوں کو اگر گلے سے ادا نہ کر پاتے تھے تو آلاتِ موسیقی کے ذریعہ ستر و ادا کر لیتے تھے۔ انہوں نے تقریباً تین سو راگ و راگنیوں اور گتوں کے علامات لکھ ڈالے تھے۔ وہ غیر مطبوعہ کتاب ان کے حیدرآبادی صاحبزادے کے پاس تھی۔ خدا کرے وہ ضائع نہ ہوئی ہو اور کوئی صاحب ذوق اسے حاصل کر کے شائع کرا دے۔

اس زمانے میں لکھنؤ جب آتے تھے تو مختلف آلاتِ موسیقی ساتھ لاتے تھے۔ یہ آلات جس مکان میں قیام کرتے تھے اس کے بیٹھکے میں سجے رہتے تھے۔ غالباً یہ وجہ تھی کہ وہ ہر کس و ناکس سے اس کمرے میں جا کر ملنا نہ پسند کرتے تھے اور ڈیوڑھی سے ہی ٹال دیتے تھے۔ مرزا صاحب مولانا بھی تھے اور شیعہ بھی اور موسیقی حرام ٹھہری۔ اس لئے اہلِ مذہب کی نظروں میں کیوں سبک ہوں۔ ملنے والوں میں ثقہ لوگ بھی تو تھے۔ اور ہر طرح کے لوگ اس در پر علم کی پیاس بجھانے آتے۔ کیوں خواہ مخواہ مطعون ہوں۔ اس لئے ڈیوڑھی ہی میں دری، چٹائی یا ٹاٹ پر مل لیتے۔ اس کمرے میں ہر ایک بار نہیں پا سکتا تھا۔ وہ بے تکلف صحبتوں کے لئے تھا، جہاں شراب پر بھی گفتگو ہو سکتی تھی، سیہ چشموں کی یادیں بھی تازہ کی جا سکتی تھیں، تان سین کی روح پر فاتحہ بھی پڑھی جا سکتی تھی اور مشرقی و مغربی موسیقی کا مقابلہ بھی کیا جا سکتا تھا۔

مرزا صاحب نے ہر طرح کی زندگی کا تجربہ کیا تھا، اور جو کچھ انہوں نے اپنے ناولوں میں لکھا ہے وہ سب انہوں نے حکیمانہ انداز سے برتا ہے۔ ان کے مزاج میں بلا کی سادگی تھی۔ وہ بڑے منکسر، خلیق اور سچے دوست تھے۔ اسی کے ساتھ بڑے غیور اور خوددار بھی تھے۔ علمی مسائل میں وہ خود اپنی رائے رکھتے تھے۔ اور ایسی بحثوں میں وہ کسی بڑے سے بڑے نام سے مرعوب نہ ہوتے تھے۔ صرف ایک بار میں نے مرزا صاحب کو جھلاتے دیکھا۔ اس کا ذمہ دار بھی میں ہی تھا۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ ایک دعا کا ترجمہ جو آپ سے منسوب ہے، فلاں صاحب مدعی ہیں کہ اصل میں ان کا ہے۔ مرزا صاحب نے کہا "یہاں آج تک تو میں نے اپنی ہی چیزیں دوسروں کو دے دی ہیں۔ میں نے کبھی کسی کی کوئی چیز نہیں لی۔ انہوں نے نہ کہا ہوگا۔" جب میں نے بار بار کہا تو بولے "وہ جھک مارتے ہیں اگر ایسا کہتے ہیں۔

من اش کردہ ام رستم داستاں　　　وگرنہ یلے بود در سیستاں!"

مجھے افسوس ہے کہ زمانے نے مرزا صاحب کو کوئی مستقل کتاب فلسفہ پر لکھنے کا موقع نہ دیا۔ وہ معاش کی مجبوریوں کی وجہ سے ترجمے کے کام پر مجبور رہے۔ ورنہ شاید ہمیں ارسطو و افلاطون کے ساتھ ساتھ اس لکھنوی حکیم کے نظریۂ حیات سے مستفیض ہونے کا موقع ملتا۔ آخر عمر میں شراب سے تائب ہو گئے تھے اور اس کی جگہ افیون کھانے لگے تھے۔ دونوں چیزوں کا استعمال دوا کے طور پر ہوا اور کبھی وہ اعتدال سے نہ بڑھیں۔

مرزا صاحب کا قد میانہ تھا۔ چوڑے چکلے ہاتھ پاؤں۔ چوڑی ہڈیاں، چوڑا چہرہ۔ رنگ صاف مائل بہ گندمی تھا۔ گول داڑھی کبھی سیاہ رہی ہوگی آخر عمر میں جب رکھی تو خضاب لگاتے تھے۔ میری طالب علمی کے زمانے میں تو گول ایرانی ٹوپی پہنتے تھے اور داڑھی صاف تھی۔ آواز نرم اور رسیلی تھی — انداز تکلم متین و باوقار تھا۔ گھوڑے پر سواری کا شوق تھا۔ ایک زمانہ میں ٹنس بھی تھی اور موٹر سائیکل بھی۔ پیرا کی بھی جانتے تھے۔ کشتی بھی لڑ چکے تھے اور بانک بنوٹ بھی سیکھی تھی۔ خط بہت پاکیزہ اور پختہ تھا۔ غزلوں کا غیر مطبوعہ دیوان استاد زادہ نے لے لیا اور مرزا کا کلام اپنا کہہ کر پڑھتے اور سناتے رہے۔ مرزا ایک لفظ شکایت زبان پر نہ لائے۔ مجھ سے فرمایا "اچھا ہی کیا، میرے شغل تفنن کا نتیجہ تھا۔ ممکن ہے ان کے لئے ذریعۂ معاش بنے۔"

آغا حشر

عشرت رحمانی

سرخ و سپید رنگ، کشادہ پیشانی، جسیم و وجیہ، فراخ دل، فراخ حوصلہ، خوش مزاج، خوش ذوق، ایک آنکھ میں کجی، کج خلقی کے نام سے متنفر، صاف گو، پاک باطن، بذلہ سنج، بے خوش بخت انسان، ناطق حیوان، حسین و جمیل فطرت کا مجسمہ آغا محمد شاہ حشر تھا، جس نے کشمیر کے کٹر مذہبی خاندان میں آنکھ کھولی، پابند وضع و شرع والدین کی آغوش میں تربیت پائی جہاں درسِ انسانیت سیکھا۔ دینی علوم ابتدائی تعلیم کا جزو بنے۔ کیونکہ ان کے والدِ بزرگوار سید آغا محمد غنی شاہ کشمیری نہایت متشرع عالم، باعمل مسلمان اور نہایت سادہ مزاج، پرخلوص و با اخلاق انسان تھے۔ سید صاحب مرحوم کشمیری شالوں کی تجارت کرتے تھے۔ سوداگری کے سلسلہ میں اپنے خاندان کے چند افراد کے ساتھ امرتسر سے بنارس جا کر مقیم ہو گئے تھے اور بنارس کے ایک معزز خاندان میں شادی کر کے وہیں کے ہو رہے۔ حشر کی پیدائش ۱۸۷۹ء میں وہیں ہوئی۔ ابتدائی تربیت و تعلیم مشرقی علم و دانش کے گہوارہ میں پائی ۱۹۰۰ء تک بنارس کی گنگا جمنی تہذیب و ہوا، قدیم ہندو مسلم وضعداریوں اور گھریلو تعلیم کے پاکیزہ ماحول نے ان کی طبیعت میں ہمواری، مہر و وفا، یگانگت اور عادات و اطوار میں نرمی، خلوص، انسانی غیرت، حمیت اور ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھر دی۔ بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ مغربی علوم کی روشنی سے بہرہ یاب ہوئے۔ والدِ ماجد کی خواہش تھی کہ مشرقی علوم اور دینی فضائل کی سند حاصل کر کے ان کے دست و بازو بنیں اور تجارت میں ہاتھ بٹائیں۔ اس کے مطابق آغا صاحب کو عالمِ دین بن کر ایک دولتمند کامیاب سوداگر ہو جانا چاہئے تھا۔ لیکن قدرت نے ان کے حق میں کچھ اور ہی فیصلہ کیا تھا۔

چنانچہ بزرگوں کی مساعی اور تنبیہہ و ہدایات کے باوجود ان کی قدرتی صلاحیتیں بغاوت اور سرکشی پر آمادہ ہو گئیں اور علومِ متداولہ حاصل کرنے کے بعد عالمِ شباب میں گھر بار چھوڑ والدین سے منہ موڑ بقول شاعر ؎

نہ شُدھ بُدھ کی لی اور نہ منگل کی لی
نکل گھر سے بس راہ جنگل کی لی

مگر یہ جنگل ناطق حیوانوں کا ایک آباد و شاد بھرا پُرا گلزار تھا جس کی رونق اور شان و شوکت کا مقابلہ ملک کا کوئی بڑا شہر بھی نہیں کر سکتا۔ آغا صاحب اسٹیج اور ڈراما کے عشق میں بمبئی پہنچ گئے۔ اور چند روز تھیٹریکل کمپنیوں کے مالکان پارسی سیٹھوں کی جھڑکیاں گھڑکیاں کھا کر اپنی ضد اور عزم و ہمت کا لوہا ان سے منوا لیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس فطری فنکار نے بڑے بڑے سیٹھ ساہوکاروں کو اپنے قدم چومنے پر مجبور کر دیا۔ جو دن رات ہنس ہنس کر آغا صاحب کی

جھڑکیاں کھاتے اور اپنی تجوری کی خیر منانے کے لئے خوشی سے ہضم کر جاتے۔ حشر شاعر تھے، ادیب تھے، واعظ تھے، خطیب تھے لیکن سب سے پہلے وہ ایک مخلص انسان، ایک عظیم فنکار اور ڈراما نگار تھے۔ یہی وہ اہم خصوصیت تھی جس نے ان کی شخصیت کو ممتاز اور منفرد بنایا اور ہر عام و خاص میں روشناس کرایا۔ شرافتِ نسبی اور والدین کی ابتدائی تربیت نے ان میں انسانی عظمت اور ہمدردی کا وہ مادہ بھر دیا تھا جس نے ان کی ذاتی وصفات کو ہر رنگ اور ہر لباس میں مجلّیٰ کیا۔ بزرگوں کا ادب و احترام، دوستوں کی رفاقت اور چھوٹوں کی محبت وہ اپنا فرضِ اولین سمجھتے۔ وہ نہایت صاف گو اور پاک باطن تھے اور بے حد خلیق و متواضع۔ ایفائے عہد کے پکے، نیت اور ارادے کے سچے اور خدا ترس ہونے کے ساتھ رند مشرب اور آزاد منش تھے مگر عزیزوں و دوستوں کی دلداری اور کمزوروں کی دل دہی میں ہر ممکن ایثار اور قربانی پر آمادہ رہتے۔ والدہ ماجدہ کی الفت اور احترام ان کا ایمان تھا۔ جو ہر دور اور ہر طور میں ان پر غالب رہی۔ عالمِ سرمستی میں بھی جب کبھی آغا صاحب کے پاس والدہ ماجدہ کا خط پہنچتا اُن کے ہوش و حواس پر قابو پالیتا اور نہایت ادب کے ساتھ سنبھل کر اس طرح بیٹھ جاتے جیسے خود ان کے روبرو ہیں۔ بڑے خشوع و خضوع سے از اول تا آخر خط کا لفظ لفظ پڑھتے اور اس میں جو کوئی فرمائش یا ہدایت ہوتی اس کی فوراً تعمیل کے لئے آمادہ ہو جاتے۔

آغا صاحب اپنے چھوٹے بھائی آغا سید محمود شاہ کو (جو بمبئی اور کلکتہ وغیرہ کے قیام میں ان کے ساتھ مقیم تھے) بہت چاہتے اور ان کی ہر جا و بے جا ضد پوری کرتے۔ سید محمود شاہ کو آغا صاحب ایسے شفیق و محترم بھائی کی ذات پر بڑا ناز تھا۔ مگر اپنی من مانی کرنے میں کبھی آغا صاحب کی پروانہ کرتے اور آغا صاحب ان کی ہر بات گوارا کر لیتے۔ بعض اوقات آغا صاحب ان کے لاأبالیانہ انداز پر انہیں تنبیہ کرتے مگر وہ ان کی ایک نہ سنتے۔ اگر کبھی آغا صاحب سختی سے منع کرتے تو سید محمود شاہ بھائی سے ناراض ہو جاتے اور بھوک ہڑتال پر آمادہ ہو کر آغا صاحب کو بے بس کر دیتے۔ آغا صاحب انہیں منانے، خوشامدیں کرتے اور ہر ضد و فرمائش پوری کر کے خوش کر لیتے۔

سید محمود شاہ بھائی کے بل پر بے دریغ روپیہ خرچ کرتے اور حسبِ مرضی دادِ عیش و فراغت دیتے۔ اگر کبھی کسی غیر معمولی ضد کے پوری ہونے میں تاخیر ہو جاتی تو ان کا بڑا حربہ والدہ ماجدہ کا حکم نامہ ہوتا۔ محمود شاہ ماں کو آغا صاحب کی شکایت لکھ بھیجتے اور اپنی تکلیفوں کا ذکر کر کے ان سے آغا صاحب کے نام تنبیہ آمیز خط منگوا لیتے جس میں آغا صاحب کو تاکید ہوتی کہ "محمود کو جس طرح ہو خوش رکھو۔ اگر وہ تکلیف میں ہے تو میں تم سے ناخوش ہوں۔"

یہ تنبیہ آغا صاحب کا ہر نشہ اور ہر عیش و آرام حرام کرنے کو کافی تھی۔ وہ کسی حالت میں ہوتے آغا محمود کی منت سماجت کرتے، گلے لگاتے اور بڑی سے بڑی خواہش پوری کر کے منا لیتے۔ پھر ان سے والدہ کے نام خط لکھواتے "کہ اب میں خوش ہوں" ــــ اور اپنے معافی نامہ کے ساتھ ان کی خدمت میں بھیج کر تسلی بخش جواب کے طالب ہوتے۔ جب تک ان کی جانب سے خوشنودی کے اظہار کا پروانہ نہ مل جاتا سخت مضطرب رہتے۔ اسی طرح والدہ ماجدہ بھی انہیں چاہتی تھیں لیکن آغا محمود کا چھوٹی اولاد ہونے کے سبب بے جا پریشان ہونا بھی گوارا نہ کر سکتیں۔ اس لئے آغا صاحب کو سعادت مند اور صاحبِ اختیار و ذی استطاعت سمجھ کر ناز کرتیں۔ آغا صاحب کا والدین سے خصوصاً والدہ سے پیار ضرب المثل ہے۔

آغا صاحب کی مشرقی وضعداری اور اعلیٰ صلاحیتوں میں ان کے والدِ بزرگوار آغا سید غنی شاہ کا بڑا ہاتھ اور اثر تھا۔ گو باپ نے بیٹے کو کسی اور رنگ کا بنانا چاہا تھا اور قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ لیکن یہ سعادت مند فرزند عظیم فن کار رجعت و قدامت اور خاندانی پیشہ سے بغاوت کرنے کے باوجود والدین کی نافرمانی کو کفر ہی سمجھتا رہا۔ اور ہر کیف و رنگ میں مذہبی و قومی روایات کا تا زیست پابند رہا۔ آغا صاحب کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ خدا اور رسولؐ اور اہلِ بیت کی حرمت و محبت سے ان کا دل معمور تھا۔ طبیعت میں خودداری کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ارادے کے پکے اور قول کے سچے حشر نے بچپن سے لے کر تا دمِ مرگ جو نیت کی اُسے پورا کر کے چھوڑا۔ مزاج میں ضد حد سے زیادہ تھی مگر تعصب نام کو نہ تھا۔ تمام مذاہب اور ان کے بزرگوں کا دل سے احترام کرتے اور ہر مذہب کی پوری معلومات سے فیض یاب تھے۔ کسی کی بے جا خوشامد اور غلط تعریف انہوں نے کبھی گوارا نہ کی بڑے بڑے سیٹھ ساہوکاروں سے معمولی بات پر اَن بن ہو جاتی اور آغا صاحب اپنی ضد پر اڑے رہتے۔ مالی نقصان کے خوف یا لالچ سے کبھی کسی کے سامنے نہ جھکتے۔

نہ کسی کی غلط بات مانتے۔ یہی سبب تھا کہ ابتدا سے ان کی پارسی سیٹھوں سے مشکل سے بنتی اور کسی ایک تھیٹریکل کمپنی سے تھوڑا عرصہ تعلق رہتا کہ اس کو چھوڑ کر دوسری کمپنی کی ملازمت اختیار کر لیتے۔

شروع شروع میں پارسی سیٹھوں کی تجارتی اغراض اور بے جا ضد کی بدولت آغا صاحب کو بہت پریشانیاں بھی اٹھانی پڑیں لیکن انہوں نے اپنی وضعداری اور خودداری کو کبھی ٹھیس نہ لگنے دی۔ رفتہ رفتہ جب فن پر عبور حاصل کر لیا اور ان کے کمال نے اپنا لوہا منوا لیا تو بڑے بڑے مغرور سرمایہ دار ان کے پیچھے پیچھے پھرتے اور ان کی جھڑکیاں بھی خوشی سے سہتے۔

دراصل آغا صاحب کی طبع خوددار اور مزاج غیور ہی نے ان کو اس درجۂ کمال پر پہنچایا۔ سنہ ۱۸۹۶ء میں جب ان کی عمر تقریباً سترہ سال کی تھی اور بنارس کے مشن ہائی اسکول میں زیرِ تعلیم ہی تھے پارسی الفریڈ تھیٹریکل کمپنی وہاں پہنچی۔ آغا صاحب نے اس کے کھیل دیکھے۔ تھیٹر اور ڈرامے کا شوق ان کے دل میں موجیں مارنے لگا۔ اس زمانے میں شعر کہنا شروع کر دیئے تھے۔ منشی احسن لکھنوی اس کمپنی کے مستقل مصنف ڈرامانگار تھے۔ آغا صاحب نے ان کا ایک مشہور ڈراما "چندراؤلی" دیکھا اور اسی انداز پر چند روز میں ایک ڈراما "آفتابِ محبت" لکھ ڈالا۔ یہ مسودہ لے کر مالکِ کمپنی کے پاس گئے جسے جاہل سیٹھ نے ان کی طفلانہ حرکت سمجھ کر منشی احسن کے پاس بھیج دیا۔ منشی صاحب نے آغا صاحب کا مسودہ یہ کہہ کر دیکھنے سے انکار کر دیا کہ "میاں صاحبزادے ڈراما لکھنا بچوں کا کھیل نہیں"۔ آغا صاحب کی فطری ضد اور عزمِ راسخ نے ٹھان لی کہ وہ اس کام کی تکمیل کر کے دم لیں گے اور بزرگوں سے اپنے فن کا لوہا منوا کر چھوڑیں گے۔ چنانچہ والدین سے چھپ کر وہ سنہ ۱۹۰۱ء میں اس عہد کی تکمیل کی غرض سے ترکِ وطن کر کے بمبئی جا پہنچے۔ وہاں متعدد کمپنیوں کے اجارہ دار پارسی سیٹھوں سے ملے مگر کوئی بھی ان کو خاطر میں نہ لایا۔ ایک مالکِ کمپنی نے منشی حبابؔ رامپوری کو (جو اس زمانہ کے بڑے استاد اور ماہر ڈرامانگار تسلیم کئے جاتے تھے) حشرؔ کے ڈرامے 'آفتابِ محبت' کا مسودہ دکھایا۔ انہوں نے بھی آغا صاحب کو ہنس کر دیکھا اور یہ فقرہ کسا کہ "بیٹا! ڈراما لکھنا ہر ایک کا کام نہیں۔ تم ابھی پڑھو لکھو"۔ —— آغا صاحب اس سن میں بھی مشرقی علوم سے اچھی طرح بہرہ یاب ہو چکے تھے اور حبابؔ رامپوری کی مضحکہ آمیز گفتگو اور مالکانِ کمپنی کی بے التفاتی سے دل برداشتہ ہونے کے بجائے اپنے عہد پر اور بھی پختہ ہو گئے۔ آخر کچھ عرصہ بعد اپنی مستقل مزاجی کی بدولت پارسی الفریڈ تھیٹر کمپنی میں بائیس سال کی عمر میں معمولی مشاہرہ پر ملازم ہو گئے۔ اسی عرصہ میں انہوں نے اپنی فنی زندگی کا پہلا نمونہ 'مریدِ شک' پیش کیا۔ جو اس کمپنی نے اسٹیج کیا اور اس کو غیر متوقع طور پر غیر معمولی کامیابی نصیب ہوئی۔ اس کے بعد 'مارِ آستین'، 'میٹھی چھری' اور 'اسیرِ حرص' چار سال کے عرصہ میں لکھے جو پارسی اسٹیج پر بہت کامیاب اور مشہور ہوئے۔ اب حشرؔ کا نام تھیٹر اور ڈرامے کی دنیا میں اپنے بلند پایہ اور پختہ کار معاصرین کی صف میں برابر کا مشہور ہو گیا اور وہی تمام مالکانِ کمپنی جو چند سال پہلے حشرؔ کی معمولی وضع قطع اور سادہ لباس کو دیکھ کر پھبتیاں اڑا چکے تھے، رفتہ رفتہ ان کی تعریفوں کے پُل باندھتے اور منت خوشامد کرتے نظر آنے لگے۔ تھیٹر اور اسٹیج پر حشرؔ کے نام کا سکہ چلنے لگا۔ جہاں جاتے لوگ آنکھیں بچھاتے اور ایک وقت وہ آیا کہ دھن کے پکے حشرؔ کی فنکارانہ شخصیت اور ماہرانہ قدرت تمام معاصرین میں ممتاز تسلیم کی جانے لگی۔ یہ سب حشرؔ کی مستقل مزاجی اور عزمِ صمیم کی بدولت ہوا۔ اور انہوں نے جو پختہ ارادہ کیا اس کو پورا کر دکھایا۔ ملک بھر نے مان لیا کہ اُردو ڈرامے کو نئی زندگی بخشنا اور قدامت میں ترقی کی رُوح پھونکنا حشرؔ ہی کا کام تھا۔

آغا صاحب کی شخصیت گوناگوں خصائص اور متنوع خوبیوں کی مالک تھی۔ ان کی مستقل مزاجی کے سامنے کوئی کام دشوار نہ تھا۔ ان کو جس کام کی دُھن ہو جاتی اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر دم لیتے۔ ایک زمانے میں ہندوستان میں شدھی اور سنگھٹن کا زور ہوا۔ اسلام مہاسبھائی نرغہ میں گھرا نظر آنے لگا۔ مولانا ابوالکلام آزادؔ، خواجہ حسن نظامی اور دیگر مسلمان رہنماؤں نے تبلیغِ اسلام کے لئے شدھی محاذ کے خلاف جدوجہد کا آغاز کیا اور آغا حشرؔ کو بھی اپنی جماعت کے ساتھ شرکت کرنے کی دعوت دی۔ چنانچہ انہوں نے نہایت خلوص اور انہماک سے اس طرف رجوع کیا اور تمام اکابرینِ دین کی صف میں ان کے ہم پلہ مبلغِ اسلام بن کر تبلیغ کا کام کرنے لگے۔ اسی طرح ڈرامانگاری کے سلسلہ میں جب ان کے ہندو معاصر ڈراما نویسوں نے اس بات کا

دعویٰ کیا کہ حشر صرف ایک ہی زبان میں ڈرامے کے مردِ میدان بن سکتے ہیں، سارے ملک کے ڈراما نگاروں کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ تو آغا صاحب نے ہندی ڈرامے لکھنا شروع کر دیئے اور ہندی میں صرف سماجی ڈرامے ہی نہیں لکھے بلکہ بڑے بڑے ہندو معاصر کے مقابلہ میں دھارمک ڈرامے لکھ کر خود ان سے اپنی برتری کا اعتراف کرا لیا۔ اس سلسلہ میں جب آغا صاحب نے پہلا ہندی ڈراما "بلوا منگل" لکھا تو پنڈت نرائن پرشاد بیتاب اور چند دیگر ہندو مصنفین نے اعتراض کیا کہ ہندی زبان سے واقفیت نہیں۔ ہندی اُردو مشترکہ زبان لکھ کر اس صنف میں اپنے عجز کا اظہار کیا ہے۔ آغا صاحب نے اس معاندانہ تنقید کو ٹھنڈے دل سے سُنا اور کمال خلوص سے اس چیلنج کو قبول کر کے زبان کی تکمیل کا بیڑا اُٹھایا۔ آخر بھاگیرتھ گنگا، مدھر مُرلی، آنکھ کا نشہ، بن دیوی اور سب سے زیادہ سیتا بن باس اور بھیشم پرتگیہ ڈرامے شدھ ہندی میں لکھ کر صرف مخالفین سے اپنے کمال کا اعتراف ہی نہیں ان کی شکست کا اعتراف بھی کرا لیا۔ سب سے زیادہ خود پنڈت بیتاب نے ان کی ہندی دانی اور راسم کرداری کی بلندی کو تسلیم کر لیا۔ غرض آغا صاحب کی ضدّی طبیعت اور عظیم شخصیت نے ہر معاملہ میں ان کا ساتھ دیا اور انہوں نے جو نیت کی، اس کو انجام دیئے بغیر نہ چھوڑا۔ ان کا کردار بڑی حد تک گفتار میں جھلکتا تھا۔ بہت کم آمیز تھے۔ ان کے مدّاحوں اور مخالفوں دونوں کی تعداد بہت زیادہ تھی مگر حلقۂ احباب محدود و مخصوص۔ اس لئے لوگ عام طور پر ان کو مغرور و متکبر کہنے لگے تھے۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ اپنے مقابلہ میں کسی دوسرے اہلِ کمال کی تعریف گوارا نہ کرتے تھے۔ یہ بات قطعاً غلط ہے۔ البتہ وہ بد باطن نہ تھے اور صاف گوئی ان کا شعار تھا۔ بُری چیز کی محض مروّت کے طور پر تعریف عیب سمجھتے اور کسی کی خوبی کو سراہے بغیر نہ رہتے۔ حد یہ کہ اگر کوئی دوست از راہِ تمسخر، یا دشمن از راہِ غیبت، ان کو اچھی گالی دیتا تو اس کو سُن کر بھی داد دے بیٹھتے۔ انہوں نے ہمیشہ ہر دوست و دشمن کے قابلِ توصیف کمال کا کھلے دل سے اعتراف کیا۔ ان کے چند مخصوص احباب اس حقیقت کے شاہد ہیں۔ اس لئے یہ کہنا کہ وہ بد دماغ تھے اور کسی اہلِ کمال کو اپنا مدِ مقابل سمجھنا گوارا نہ کرتے، بالکل غلط ہے۔ ان کے ہم سن اور ہم مشرب مخلصین میں لاہور میں حکیم فقیر محمد چشتی مرحوم، پروفیسر عبداللطیف تپش مرحوم اور مولانا عبدالمجید سالک تھے جن کی صحبت میں قیامِ لاہور کے دوران میں شب و روز علمی و ادبی مباحثے بھی ہوتے اور ہنسی دل لگی کی بے تکلف مجلسیں بھی۔ اور ان حضرات کی خوبیوں کے آغا صاحب بہ خلوصِ نیت رطب اللسان تھے۔ چند دیگر حضرات میں مکرمی سیّد امتیاز علی تاج اور مرحوم اختر شیرانی تھے جو آغا صاحب کا بزرگانہ احترام کرتے۔ اور آغا صاحب ان سے کمالِ شفقت سے پیش آتے۔ خصوصاً سیّد امتیاز علی تاج کے جدید فنی مطالعہ اور ڈراما نگاری کے وہ معترف تھے۔

آغا صاحب آخری ایام میں فلمی صنعت کی ترقی اور جدید تھیٹر کے احیاء کے لئے جو لائحہ عمل بنانے کی فکر میں تھے، اس سلسلہ میں مولانا سالک اور تاج صاحب سے اکثر مشورے کیا کرتے۔ تاج صاحب کا جدید شاہکار "انارکلی" شائع ہوا تو آغا صاحب نے سب سے پہلے اس کے محاسن کی داد دی۔ اس کے گیٹ اَپ اور ترتیب کو خاص طور پر پسند کر کے تاج صاحب سے فرمائش کی تھی کہ وہ ان کے ڈرامے بھی اسی انداز سے مرتب کر دیں اور اسی طرح شائع کئے جائیں۔ اسی زمانہ میں چند ایسے حضرات بھی تھے جو آغا صاحب کو بظاہر اپنا بزرگ اور محسن کہتے مگر باطن میں خود کو ان کے مدِ مقابل سمجھتے۔ آغا صاحب ان کے ظاہر و باطن کو تصنّع آمیز گفتگو سے پرکھ لیتے اور ان سے میل ملاپ سے گریز کرتے۔ لیکن چونکہ کسی کی دل آزاری گوارا نہ کرتے اس لئے آغا صاحب ظاہر پرستوں کی سب کچھ سن کر خاموش رہتے۔ نہ ان سے کھل کر ملتے اور نہ ظاہرداری برتتے۔

آغا صاحب کا خصوصی کردار احترامِ آدمیت اور انسان دوستی تھا۔ دولتمند مغرور لوگوں کے سامنے سربلند رہتے۔ ان کی بے جا بات پر سرِ تسلیم خم نہ کرتے مگر کمزوروں سے جھک کر ملتے اور ان کی دل جوئی کرتے۔ وہ بلا کے خود دار اور نازک مزاج تھے مگر مغرور نام کو نہیں۔ غریبوں کی امداد بے دریغ کرتے اور اس طرح کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ نمود و نمائش سے نفرت تھی۔ اسی لئے آغا صاحب ہمیشہ ان لوگوں

گریز کرتے جن کی عادات اور مزاج میں تصنّع اور بناوٹ دیکھتے۔ خواہ وہ اصحاب کتنے ہی بڑے صاحبانِ کمال یا اربابِ دولت کیوں نہ ہوں۔ جن بے خبر اصحاب کا گمان ہے کہ حشر بڑے مغرور انسان تھے، وہ ان کی شخصیت سے قطعاً ناواقف ہیں۔ کیونکہ ان کے واقفین کو بخوبی علم ہے اور بے شمار مثالیں ایسی موجود ہیں کہ حشر نے مخلص احباب سے کھلے دل سے ملنے اور ہر معاملہ میں ان کے ساتھ خلوص و مروّت کا اظہار کرنے میں ہمیشہ سبقت کی۔ نیز کمزوروں سے کبھی بیزاری ظاہر نہ کی بلکہ سدا جھک کر ملے۔ البتہ کسی نااہل اور اہلِ ثروت کے مقابلہ میں ہرگز سر نہ جھکایا۔ مغرور سیٹھ ساہوکاروں سے ہمیشہ اکڑ کر ہی بات کرتے۔ اور جب کبھی ان میں سے کسی کو بے جا ضد پر آمادہ دیکھتے تو سخت کلامی سے احتراز نہ کرتے۔ چنانچہ بارہا پارسی مالکان کمپنی سے آغا صاحب کی جھڑپیں ہوتی تھیں اور وہ اکثر معمولی بات پر ناراض ہو کر ایک کمپنی کی ہزاروں کی ملازمت اور فائدہ چھوڑ کر الگ ہو جاتے۔ ۱۹۰۵ء میں جبکہ تھیٹر اور اسٹیج کی دنیا میں داخل ہوئے آغا صاحب کو صرف پانچ برس گذرے تھے، پارسی الفریڈ تھیٹریکل کمپنی کے مالک سے ذرا سی بات پر جھگڑ بیٹھے اور بگڑ کر نوروزجی پارسی کی منت خوشامد پر اس کی کمپنی میں ملازمت اختیار کر لی۔ اس کمپنی کے لئے اسی سال ڈراما "میٹھی چھری" لکھا۔ مگر کچھ عرصہ بعد نوروزجی سے بھی ان بن ہو گئی اور سیٹھ آردشیر بھائی ٹھونٹھی کی کمپنی میں بمبئی سے مدراس چلے گئے۔ وہاں "سفید خون" اور "صید ہوس" اس دور کے دو مشہور ڈرامے لکھے۔ اس عرصے میں پارسی الفریڈ کمپنی کے مالک بار باران کو منانے کی سعی کر چکے تھے۔ آخر ان کے پیہم اصرار اور ہزاروں خوشامدوں سے مجبور ہو کر پھر ان کے ساتھ شریک ہو گئے۔ لیکن ان سیٹھوں کے مقابلہ میں ان کی تنک مزاجی اور خودداری کبھی دب کر نہ رہی اور آئے دن اسی طرح روٹھنا منانا جاری رہا۔ آخر وہ لوگ آغا صاحب کے مزاج سے واقف ہو گئے اور کسی معاملہ میں کبھی کوئی بات ان کے سوءِ مزاج نہ کرتے۔ حتیٰ کہ آغا صاحب ان کے ساتھ تلخ کلامی اور درشت گوئی سے بھی پیش آتے مگر سب کے سب آغا صاحب کا بے حد لحاظ اور پاسِ ادب کرتے۔ ہر وقت خائف رہتے کہ معلوم نہیں آغا صاحب کب کسی موقعہ پر ناراض ہو کر ان کی بے عزتی پر آمادہ ہو جائیں اور ذرا سی بات پر روٹھ کر قطع تعلق کر لیں۔ کیونکہ حشر کے ڈرامے اب اسٹیج کی بقا کے ضامن تسلیم کئے جاتے تھے اور ان کی نظرِ التفات ان تھیٹر کمپنیوں کی شہرت اور دولت کا سب سے بڑا ذریعہ بن گئی تھی۔ اس لئے ہر مالک کمپنی حشر کے اشاروں پر چلتا۔ اور حشر اس سلوک کو خود غرضی اور مطلب پرستی پر محمول کر کے ہر ایک سے مناسب برتاؤ کرتے۔ برخلاف اس کے بلا امتیازِ مذہب و ملّت باکمال فنکاروں، مغنّیوں، مصوّروں اور اداکاروں کی قدر و منزلت کرتے اور ان کے شایانِ شان سلوک روا رکھتے۔ حشر کی بد دماغی کی شہرت کے مدّعی اگر انصاف سے کام لیتے تو ان کے سامنے حشر کی شخصیت کا یہ روشن پہلو ان کے دعووں کو بے دلیل اور بے بنیاد ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ آغا صاحب اپنے ہر نئے ڈرامے کا ایک ایک سین مکمل ہونے کے بعد ہر ادنیٰ و اعلیٰ اداکار کو سنا کر مشورہ طلب کرتے اور صائب رائے ملنے پر نظرِ ثانی بھی کرتے۔ لیکن کسی بے راہ روی اور خودسری کو گوارا کرنا ان کے بلند اور رچنتہ کردار کے منافی تھا۔ ایک مرتبہ کسی نے آغا صاحب سے ذکر کیا کہ بعض ایکٹروں کا خیال ہے کہ حشر کے ڈراموں کی کامیابی اور شہرت کا سبب ہماری اعلیٰ اداکاری کا کمال ہے۔ ہماری موزوں و برجستہ ادائگی کے ذریعہ اسٹیج گونجتا ہے اور ہماری ہی جانفشانی اور حسنِ کارکردگی کی بدولت تماشائیوں سے دادِ تحسین وصول کی جاتی ہے۔ دراصل کسی پارسی مالکِ کمپنی اور آغا صاحب کے ایک مخالف ہم عصر کی شہ اور ترغیب پر کچھ ایکٹروں نے اس قسم کی چہ میگوئیاں شروع کی تھیں۔ آغا صاحب یہ باتیں سن کر غیض و غضب سے بیتاب ہو گئے۔ لیکن بلا تحقیق کسی کو سرزنش کرنا یا شور مچانا مصلحت کے خلاف سمجھا۔ لیکن ان بے ہنر مدّعیوں کا علاج بھی تجویز کر لیا۔ انہوں نے ڈرامہ "آنکھ کا نشہ" اس انداز سے لکھا کہ اس میں غیر مقفیٰ سیدھے سادے مکالمے تھے۔ کسی مقام پر ایک شعر بھی شامل نہیں تھا اور زبان سلیس اور دلکش ہندی تھی۔ اس تازہ شاہکار کے تمثیل کئے جانے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ ساز و سامان کی تیاری کے ساتھ ساتھ اداکاروں کا انتخاب عمل میں آیا۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جن کی یاوہ گوئی

کا آغا صاحب کو علم ہوا تھا۔ جب یہ ڈراما ان لوگوں کے سامنے پڑھا گیا اور پارٹ تقسیم کئے گئے تو ان کی پریشانی کی کوئی حد نہ رہی۔ سب نے سراسیمہ ہو کر آغا صاحب سے کہا کہ "یہ سادہ مکالمے ہم کیسے ادا کریں گے۔ ڈراما کیسے چلے گا؟ ہماری شہرت بھی خاک میں مل جائے گی۔"

اس پر آغا صاحب نے انہیں مخاطب کر کے ان کے دعووں کا ثبوت طلب کیا کہ "تم تو کہتے ہو کہ حشر کے ڈراموں کی شہرت ہمارے دم سے ہے۔ ہماری اداکاری ان ڈراموں کو کامیاب بناتی ہے۔ تم سب بڑے باکمال نامی گرامی ایکٹر ہو۔ ہر ڈرامہ تمہاری ادائیگی سے چل سکتا ہے۔ میرے لکھنے کا کیا کمال ہے۔ تم اس کو بھی کامیاب بنا سکتے ہو۔ میں نہیں جانتا کس طرح چلے گا۔ میرا کام لکھنا ہے اور میں کچھ نہیں جانتا۔"

اب تو ہر طرف موت کی خاموشی طاری تھی۔ سب سمجھ گئے کہ ان کی باتیں آغا صاحب کے کانوں تک پہنچ چکی ہیں۔ ڈر کے مارے اب کس میں اتنی مجال تھی کہ لب کشائی کرے۔ آغا صاحب کے غیض و غضب کا حال سب پر روشن تھا۔ اب جبکہ آغا صاحب کو (ان کی خاموشی سے) ان کے جرم کا ثبوت مل گیا تو انہوں نے حسبِ عادت گرجنا شروع کر دیا۔ فحش کلامی پر اتر آئے کہ "........ تم نمک حرام ہو۔ احسان فراموش اور دغا باز ہو۔ اب خاموش کیوں کھڑے ہو۔ اگر اپنے ماں باپ کی اولاد ہو تو حشر کے سامنے آ کر مدعی بنو۔ اپنے اپنے حمایتیوں کو بلا کر لاؤ جنہوں نے تمہیں اس غداری کا سبق پڑھایا ہے۔ جس حشر نے تمہیں خاک سے پاک کیا، جس نے تمہیں اسٹیج پر چلنا پھرنا اور بولنا سکھایا، اس کی شہرت کے بانی تم ہو؟ تمہاری شہرت کو چار چاند لگانے کی غرض سے حشر نے اپنے فن کی تذلیل گوارا کی تمہاری آسانی کے لئے، تمہاری جہالت پر ترس کھا کر حشر نے چند مقفیٰ مکالمے اور شعر لکھ کر تمہیں رٹا دیے جن کو تم نے طوطے کی طرح بول کر ان کی دھوم دھام کی بدولت تماشائیوں سے داد لی اور انہی سے پیٹ پالے، شرابیں پیں، اب تم اتنے بدمست ہو گئے ہو کہ جس کا کھاتے ہو اسی پر غراتے ہو۔ حشر صرف قلم کار ہی نہیں فن کار بھی ہے۔ وہ اپنے فن کو اچھی طرح جانتا ہے۔ اپنے حمایتیوں سے کہو کہ اس ڈرامے کا جواب لکھیں۔ یہ ڈراما اسی طرح چلے گا اور حشر کی ہدایت کاری حسبِ معمول اس کو بھی کامیاب بنائے گی۔ تم میں سے جس کو اپنے کمال کا دعویٰ اور شہرت کا خطرہ ہے وہ چلا جائے، جو رہو جائے حشر کے ڈرامے میں حصہ نہ لے ...."

غرضیکہ دیر تک اسی طرح لعنت ملامت کرتے رہے۔ کسی کے ہوش بجا نہ تھے، سب کے سب آغا صاحب کے قدموں پر گر پڑے اور کہنے لگے کہ "معاف کر دیجئے۔"

آخر ان کی واویلا اور مالک کمپنی کی منت سماجت پر آغا صاحب کا غصہ دھیما ہوا۔ رنج و غضب کا بادل برس چکا تو عفو و کرم کی بارش ہوئی۔ رونے دھونے والوں کو سینے سے لگایا۔ ایک ایک کو تسلی دی کہ "تم سب میرے جگر ہو، میرے دست و بازو ہو۔ مگر نادان ہو، اغیار کی باتوں میں آجاتے ہو، راہِ راست سے بھٹک کر بے ہودہ بکنے لگتے ہو۔ میرا بھی دل جلاتے ہو اور خود بھی رنج اٹھاتے ہو۔ میرا ذمہ ہے اس ڈرامے کی کامیابی تمہاری ہی بدولت ہو گی اور تم سب کی مزید شہرت و ناموری کی ضمانت یہی ڈراما بنے گا۔"

چنانچہ آغا صاحب نے دن کا چین اور رات کی نیند حرام کر دی۔ شب و روز کی لگاتار محنت و جانفشانی سے اپنی ہدایت کاری کے وہ جوہر دکھلائے اور ہر اداکار کو وہ وہ گر سمجھائے کہ "آنکھ کا نشہ" ملک گیر شہرت کا مالک بن کے رہا۔ چپہ چپہ پر اس کے اعلیٰ محاسن، دلکش طرزِ ادا، پلاٹ کی افادیت، پرکیف گانوں اور جدید و نادر تکنیک کی دھوم مچ گئی اور حشر کے کمالِ فن کے سامنے مخالفین نے بھی سرِ تسلیم خم کر دیا۔

آغا صاحب کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ وہ ہٹ دھرم، بد دماغ یا ریاکار تھے۔ ان کا عقیدہ فاش سے گویم و

از گفتن خود دل شادم' کے مصداق ہمیشہ یہی رہا کہ خلوص اور سچائی کے ساتھ جو کچھ ان کے دل میں ہوتا تھا' وہی زبان پر آتا تھا۔ اظہارِ حق میں بیباک تھے۔ کبھی بڑے سے بڑے نقصان یا نفع کے لئے سچائی اور دیانت سے منہ نہ موڑتے۔ انہوں نے اپنے متعدد ڈراموں پر کئی کئی بار نظرِ ثانی کی اور اہلِ نظر احباب کے مشورے قبول کرنے سے کبھی احتراز نہیں کیا۔

ان کی جدت پسند طبیعت کبھی کسی کی تقلید گوارا نہ کرتی۔ ہندوستانی اسٹیج کو ان کی جدت و ندرت نے جو عروج بخشا اظہر من الشمس ہے۔ فنِ ڈراما کو جو ارتقائی مدارج عطا کئے ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں۔ زمینِ شعر میں طرزِ خاص کے جو رنگا رنگ پھول کھلائے ان کی شگفتگی و تازگی آج تک اہلِ بصیرت و ذوق کے دماغوں کو معطر کر رہی ہے۔ تھیٹر کی موسیقی اور نغموں کی دلکشی و جدت طرازی اربابِ ذوق و اہلِ فن سے آج تک خراجِ تحسین و عقیدت وصول کر رہی ہے۔ عام زندگی میں آغا صاحب رندِ بلا نوش اور نہایت آزاد منش اور صاف گو تھے۔ وضع کی پابندی ان کی فطرتِ ثانیہ تھی۔ بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ منہ پھٹ اور پھکڑ اس بلا کے تھے کہ بے تکلف احباب کے مجمع میں فحش کلامی سے پرہیز نہ کرتے لیکن اس نہج میں بھی ان کی طبعِ ایجاد پسند روشِ عام ہرگز گوارا نہ کرتی۔ بلکہ نئی نئی گالیاں تصنیف کرتے۔ اور نئے انداز اور دلچسپ اسلوب سے انہیں ادا کرتے۔ ہم پلّہ دوستوں کو گالیاں دے کر اور مقابلہ کی نئی گالی سُن کر خوش ہوتے اور داد دئے بغیر نہ رہتے۔ اس سلسلہ میں ایک پُرلطف واقعہ لاہور کے احباب کی محفل میں پیش آیا۔ آغا صاحب کو آموں سے عشق تھا۔ آموں کی فصل تھی۔ انہوں نے چند دوستوں کو اپنی جائے قیام پر آم کھانے کے لئے مدعو کیا تھا۔ قسم قسم کے آم چُنے ہوئے تھے۔ آغا صاحب لطیفہ پر لطیفہ سُنا رہے تھے اور سب ہنستے بولتے آم کھانے میں مصروف تھے۔ پروفیسر عبداللطیف تپش مرحوم جو آغا صاحب کے مخصوص اور بے تکلف دوستوں میں سے تھے، خلافِ معمول خاموش تھے۔ آغا صاحب نے کئی بار ان کو چھیڑا بھی کہ "بیل کی طرح جگالی کئے جاتا ہے۔ پھوٹے منہ سے بولتا کیوں نہیں؟" اس پر بھی تپش مرحوم کچھ نہ بولے اور چپ چاپ آم کھاتے رہے۔ آغا صاحب بے چین تھے اور چاہتے تھے کہ تپش بھی لطیفہ گوئی میں شریک ہوں۔ کیونکہ اس محفل میں تپش ہی تھے جو آغا صاحب کی فحش کلامی کی ہمسری کر سکتے تھے۔ اس لئے آغا صاحب ان کی خاموشی برداشت نہ کر سکتے تھے۔ آخر آغا صاحب سے نہ رہا گیا اور بے تکلف گالی گلوچ شروع کر کے کہا کہ "اس کو حرام خوری کہتے ہیں جو تعریف کا ایک لفظ بھی زبان سے نکالے بغیر کھائے جاتا ہے"۔ یہ فقرہ اصل میں تپش صاحب کو اُکسانے کی غرض سے کہا گیا تھا۔ اس پر انہوں نے کہا۔ "آغا صاحب یہ آم جو ابھی میں نے کھایا تعریف سے مستغنی ہے۔ اس نے بنارس کے لنگڑے کو مات کر دیا ہے۔ پنجاب کا آم ہے نا آخر!" آغا صاحب نے حسبِ مراد ایک چست فقرہ سُن لیا۔ خوشی سے بیتاب ہو گئے اور تپش کو بے اختیار لپٹا لیا کہ "میری جان یہی باتیں تو سُننے کو جی بے چین تھا۔ زندہ رہو۔" اور پھر دیر تک جھوم جھوم کر داد دیتے رہے۔ حالانکہ یہ آغا صاحب پر سخت چوٹ تھی کیونکہ وہ خود بنارس کے تھے اور ان کے ایک پاؤں میں لنگ تھا۔ لیکن دلچسپ اور برجستہ پھبتی کی (خواہ وہ ان ہی پر کیوں نہ ہو) داد نہ دینا ان کی وضع کے خلاف تھا۔

آغا صاحب کے پاؤں کی کجی کا واقعہ اس طرح ہے کہ عنفوانِ شباب میں ایک بار سیالدہ (کلکتہ) ریلوے اسٹیشن پر کہیں جانے کے لئے ٹرین کا انتظار کر رہے تھے۔ پلیٹ فارم پر ٹہلتے ٹہلتے فکرِ شعر میں محو ہو گئے اور یہ محویت اس حد تک بڑھی کہ پلیٹ فارم سے نیچے گر گئے اور پاؤں کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ کچھ عرصہ اسپتال میں زیرِ علاج رہے۔ مگر ہڈی پوری طرح نہ جُڑ سکی اور پاؤں میں مستقل کجی آ گئی۔

آغا صاحب وضع کے حد درجہ پابند تھے اور یہ وضعداری دوستوں اور رفیقوں کے ساتھ برتاؤ میں بدرجۂ اتم نبھاتے۔ لیکن انہوں نے تمام عمر کسی عادت کا اپنی ذات کو پابند نہ بنایا۔ رندی و سرمستی کے عالم میں استغراق و انہماک ہوا تو دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئے لیکن جب شراب نوشی ترک کی اور اس ترک سے شدید طور پر بیمار ہو گئے تو حاذق اطباء اور معالجوں کے پیہم اصرار کے باوجود ایک قطرہ کو منہ نہ لگایا۔

حتیٰ کہ آخری علالت میں کثرتِ کار کے سبب صحت کے بے حد گر جانے پر ان کے مخلص دوست حکیم فقیر محمد چشتی مرحوم اور دوسرے ڈاکٹروں نے مصلحتاً قدرے شراب نوشی کی تاکید کی۔ مگر مرتے مرگئے، ہرگز نہ چکھی اور آخری دم تک یہی کہتے رہے کہ "اگر یہی عینِ زندگی ہے تو جس کو چھوڑ دیا اسے پھر منہ لگانا ننگِ زندگی بھی تو ہے۔"

شراب نوشی کے بارے میں عموماً پینے والوں کا خیال ہے کہ شدتِ غم اور کثرتِ افکار میں خود فراموشی کی غرض سے اس کا استعمال زیادہ ہوتا ہے اور بقولِ مرزا غالبؔ اکثر لوگ غم غلط کرنے کو اس کے عادی ہو جاتے ہیں ؎

مے ہی پھر کیوں نہ میں پیے جاؤں !
غم سے گر ہو گئی ہو زیست حرام

لیکن آغا صاحب کا معاملہ اس کے برعکس دیکھا۔ انہوں نے اکثر غیر معمولی رنج و غم سے گھبرا کر مے نوشی ترک کی اور اس کا استعمال ہمیشہ سرور و کیف کے لئے کیا۔ فرار کے لئے کبھی نہیں۔ آغا صاحب کا قول تھا کہ "دنیا کی ہر شے کا لطف اس کی اصلیت میں ہے، ملاوٹ میں نہیں غم کھانے کو ملے تو اسے بھی خالص ہی کھاؤ۔" وہ دنیا کے عام افکار سے کبھی نہ گھبرائے۔ نہ کبھی مالی پریشانی سے متاثر ہوئے۔ صرف عزیزوں اور دوستوں کی جدائی کا صدمہ ان کے لئے سوہانِ روح بن جاتا تھا اور ان ایام میں وہ ہر عیش و طرب اور رندی و مستی کو فراموش کر دیتے تھے۔ ۱۹۱۱ء میں آغا صاحب کی شادی ہوئی۔ رفیقۂ حیات سے والہانہ عشق تھا۔ ان سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام "نادر شاہ" تھا۔ اس کی عمر ایک سال کی تھی کہ بمقام لکھنؤ اس کا انتقال ہو گیا۔ آغا صاحب کو اس کی جدائی کا بے حد صدمہ ہوا۔ لیکن بیگم کی رفاقت نے بھلا دیا۔ اس سے تین سال بعد ۱۹۱۶ء میں بیگم نے وفات پائی۔ ان کی مفارقت کی تاب نہ لا سکے اور ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ اس زمانہ میں انہوں نے مے نوشی ہی ترک نہیں کی۔ تمام مصروفیات سے منہ موڑ لیا۔ گوشہ نشین سے ہو گئے۔ یہ المناک واقعہ لاہور کے قیام میں ہوا تھا۔ آغا صاحب نے اپنی محبوب بیگم کو یہاں دفن کر کے کہا تھا کہ :

"جاؤ نیک بخت۔ میں بھی اسی مقام پر تمہارے پہلو میں دفن ہونے چلا آؤں گا۔"

اس زمانہ میں آغا صاحب کی صحت بے حد خراب ہو گئی تھی۔ انہوں نے تمام مصروفیات حتیٰ کہ لکھنا پڑھنا تک ترک کر دیا تھا۔ بیگم کے فراق میں ایک ایسا دردناک نوحہ لکھا تھا کہ سننے والے کلیجہ تھام کر رہ جاتے تھے۔ عرصہ دراز تک آغا صاحب بیتاب اور مضمحل رہے اور لاہور ہی میں مقیم ہو گئے۔

تقریباً ایک سال بعد مسرز جے۔ ایف میڈن تھیٹرز کے مالکان کی منت سماجت اور بار بار کے اصرار پر ۱۹۱۷ء میں کلکتہ چلے گئے اور مدت تک وہیں رہے۔ اس کمپنی کے لئے اپنے جدید اور آخری دور کے شاہکار اسی دوران میں لکھے جن میں زیادہ تر ہندی ڈرامے 'مدھر مرلی'، "بھاگیرتھ گنگا"، "ہندوستان" (تین حصوں میں: شرون کمار، اکبر اور آج) اور "آنکھ کا نشہ" خاص ہیں اور انہیں شاہکار ڈراموں کو خود بھی اسی زمانہ میں پیش کیا۔ اور بڑی حد تک اپنی مرضی کے مطابق فن کی ترقی اور عروج کے لئے جدوجہد کی۔ حشر کے فن کا ترقی یافتہ اصلاحی دور یہیں سے شروع ہوتا ہے جو ۱۹۳۰ء تک اپنے ارتقائی نمونے پیش کر کے تھیٹر کے زوال کے ساتھ ختم ہو گیا ——— آغا صاحب نے ۲۷-۱۹۲۶ء سے بخوبی اندازہ لگا لیا تھا کہ موجودہ اسٹیج زوال پذیر ہے اور اس کا خاتمہ ہو کر رہے گا یا فلمی ترقی کے ساتھ جدید مغربی انداز کا تھیٹر کامیاب ہو سکے گا۔ انہوں نے ڈراما نگاری کے انداز کو بدل کر نئے رخ پر لانے کی کوشش شروع کر دی تھی اور اگر ان کی زندگی وفا کرتی تو ممکن تھا کہ جدید تھیٹر کی ترویج بھی ان کی فنکارانہ مساعی کے ذریعہ عمل میں آ جاتی۔ وہ اس دور کی فلمی دنیا سے بھی مطمئن نہ تھے اور ہر نہج سے اس کی اصلاح و ترقی میں کوشاں تھے۔ اکثر اربابِ فن احباب سے مشورے کرتے اور عملی تدابیر اختیار کرنے میں منہمک رہتے۔ اس سلسلہ میں

لاہور میں "حشر پکچرز" کے نام سے اپنی فلم کمپنی قائم کی اور ۱۹۳۴ء میں ڈراما "بھیشم پرتگیہ" کو فلمانے کی غرض سے از سرِ نو مرتب کر کے آغازِ کار کیا مگر موت کا زبردست ہاتھ انسانی تجاویز و تدابیر سے زیادہ قوی ہے۔ وقت آگیا اور حشر اس دنیا سے رخصت ہو کر لاہور کے قبرستان میانی صاحب میں دفن ہو گئے۔ گویا انہوں نے رفیقۂ حیات سے ۱۹۱۶ء میں جو وعدہ کیا تھا اس کا ایفا کر دیا۔ حشر کی شخصیت گوناگوں خصائص کا مکمل مجموعہ تھی۔ وہ محض ایک اعلیٰ ڈراما نگار ہی نہ تھے بلکہ اس فن کے ماہر اور چابک دست صنّاع بھی تھے۔ اداکاری میں بھی ان کو ڈراما نویسی کی طرح یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ بلند پایہ ہدایت کار بھی تھے۔ بے شمار لوگوں کو ماہر اداکار بنانے میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ آج بڑے بڑے فن کاروں میں ان کے شاگردوں اور خوشہ چینوں کی معقول تعداد موجود ہے۔ ان کے عروج کے عہد میں ہندوستانی اسٹیج اپنے معراجِ کمال پر تھا لیکن آغا صاحب کی جدّت پسند طبیعت اور علوئے ذوق موجودہ معیار اور انداز سے مطمئن نہ تھا۔ وہ ہر لحظہ اس کی مزید ترقی اور تبدیلی کی فکر میں رہتے اور ڈرامے کا معیار اور اسٹیج و اداکاری کے طور طریق کو بلند و بالا دیکھنا چاہتے تھے۔ اس برِ صغیر میں اُردو اسٹیج اور تھیٹر کی تاریخ بھی عجیب رہی ہے۔ اس کی ابتدا شوقیہ ہاتھوں میں بڑی شان سے ہوئی۔ یہ فن شاہوں میں پل بڑھ کر پروان چڑھا تو پارسی سیٹھوں نے گود لیا۔ جنہوں نے برسرِ عام بازار میں ناچ مجرے کے طور پر اس سے کام لینا شروع کیا اور اپنی تجارت کا ذریعہ بنا لیا۔ خود زبان اور ادب سے بے بہرہ تھے۔ باستثنائے چند جاہل لوگوں کے سپرد اس کی غور و پرداخت اور تربیت ہوتی رہی۔ آغا صاحب ہمیشہ اس حالت پر رنج و حسرت کا اظہار کیا کرتے۔ اور جن نامناسب حالات میں ان لوگوں کی ذہنیتوں اور فن کے سدھارنے میں ان کو غیر معمولی جانفشانی اور جگر کاوی سے کام لینا پڑا تھا اس پر سر دھنا کرتے کہ "یہ اعلیٰ فن کن اسفل ہاتھوں میں رہا ہے۔ کاش اہلِ دانش و علم اس کی تربیت اور ترقی کی طرف توجہ کرتے تو اس کی شان ہی کچھ اور ہوتی اور کبھی انحطاط ہوتا نہ زوال آتا۔" سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے اپنی جانِ عزیز اسی دُھن میں نثار کر دی۔

حشر کی فن دانی کا یہ عالم تھا کہ ایک بار عام اداکاری کا ذکر کرتے ہوئے ملک کے نامی گرامی اداکاروں کی فنی ناواقفیت پر اظہارِ افسوس کر رہے تھے۔ کہنے لگے:

"ہماری اداکاری کا یہ حال ہے کہ بڑے بڑے ایکٹر اور ایکٹرسیں اسٹیج پر اچھی طرح
چلنا پھرنا بھی نہیں جانتے۔ سر پیٹنے کو جی چاہتا ہے جب دیکھتے ہیں کہ نامور ایکٹر تک
کو اسٹیج کے عمل اور حرکت تک کی تمیز نہیں۔"

اسی دوران میں آغا صاحب نے پانی مانگا۔ ملازم پانی لایا۔ اس کے ہاتھ میں گلاس دیکھ کر جل کے کھڑے ہو گئے اور بولے:

"یہ دیکھیے اسی قبیل کے لوگ ہماری اسٹیج کی رونق بنے ہوئے ہیں جنہیں گلاس
تھامنے کی تمیز نہیں۔"

اور گلاس ہاتھ میں لے کر مختلف انداز سے یہ بتاتے رہے کہ مختلف کیفیتوں میں گلاس پکڑنے، دوسرے کو پیش کرنے اور خود استعمال کرنے کے کیا کیا انداز اور طریقے ہوتے ہیں۔ دوا کا گلاس کیونکر پکڑا جاتا ہے اور بیمار اسے کیونکر تھامتا ہے۔ پانی یا شربت کے گلاس کی کیا صورت ہوتی ہے۔ شراب کے گلاس کو ہوش کے عالم میں، نیم بیہوشی، سرور کی کیفیت اور مستی میں استعمال کرنے کے متعدد و مختلف طریقے بتا ڈالے۔

حقیقت یہ ہے کہ آغا صاحب کو فن سے عشق تھا اور تن من دھن سب اس پر فدا کر دیا۔ حشر قومی شعار اور مشرقی انداز کے دلدادہ تھے۔ اپنی طرزِ معاشرت میں ہمیشہ اسی کو ترجیح دیتے۔ ملکی سیاست میں انہوں نے کبھی کوئی عملی حصّہ نہیں لیا۔ مگر ملکی غلامی اور غیر ملکی جبر و استبداد کے خلاف تحریر و تقریر کے ذریعہ ہمیشہ آواز بلند کرتے رہے۔ انگریز سے ان کو دلی نفرت تھی۔ اپنے ڈراموں میں جہاں کہیں موقعہ ملا ہے غلط مغربی تقلید پر ہمیشہ طنز کی ہے۔ اور انگریزیت کا مشرقی تہذیب کے مقابلہ پر مذاق اڑاتے ہوئے نئی روشنی کی اندھا دھند تقلید پر سنجیدگی اور ظرافت دونوں

اندازمیں بھرپور وار کئے ہیں۔ مغربی علوم کے ہرگز مخالف نہ تھے اور ایک صاحبِ بصیرت اہلِ علم کی طرح انہوں نے انگریزی زبان اور ادب سے ہر ممکن طریقہ پر اکتساب کیا۔ ان کے والد بزرگوار قدیم وضع اور خیال کے تھے۔ وہ ابتدا میں اولاد کو انگریزی تعلیم سے بچانا چاہتے تھے۔ مگر آغا صاحب نے بڑی سماجت اور دوسرے بزرگوں کی سفارش سے والد صاحب کی اجازت حاصل کی۔ لیکن یہ تعلیم مڈل سے آگے باقاعدگی کے ساتھ جاری نہ رہ سکی تھی۔ تاہم انہوں نے مشرقی السنہ وعلوم میں وافر دستگاہ حاصل کر لی تھی۔ اس کے بعد نجی مطالعہ کے ذریعہ انگریزی ادب پر خاصا عبور حاصل کیا۔ بنارس میں آغا صاحب کا ذاتی کتاب خانہ اب تک محفوظ ہے جس میں ہر زبان اور علم و ادب کی بیشمار کتابیں موجود ہیں۔ اور ان پر آغا صاحب کے ہاتھ کے نوٹ کئے ہوئے حواشی ان کے علمی ذوق وشوق کے شاہد ہیں۔

بچپن میں آغا صاحب کو سر پر انگریزی فیشن کے بال رکھنے کا بڑا شوق تھا۔ لیکن والد صاحب کو سخت نفرت تھی۔ آخر آغا صاحب نے ان سے چھپ کر بال رکھ لئے اور جب ان کے سامنے آتے تو ٹوپی اوڑھے رہتے۔ ایک بار مکان کے متصل بنارس کے مشہور بازار دال منڈی میں ایک دوکان پر بیٹھے تھے اور دوستوں سے باتیں کر رہے تھے۔ بے خیالی اور بے تکلفی سے ننگے سر تھے۔ اتفاقاً والد صاحب اُدھر سے گذرے۔ آغا صاحب نے ان کو آتا دیکھ کر جلدی سے سر ڈھانپنے کی کوشش کی مگر وہ پہلے ہی سر پہ خلافِ مرضی بال دیکھ چکے تھے۔ بحد ناراض ہوئے اور آغا صاحب کو اپنے ہمراہ مکان پر لے گئے۔ جہاں پہنچتے ہی سب سے پہلے قینچی لے کر سارے بال کاٹ ڈالے۔ آغا صاحب کو بڑا رنج ہوا۔ مگر پھر والد صاحب کے حکم کی تعمیل میں مدت تک بال نہ رکھے۔ آغا صاحب لباس اور عام وضع کے سلسلہ میں کوئی خاص پابندی نہ کرتے تھے۔ گو ہمیشہ خوش وضع اور خوش پوش رہتے۔ لیکن زیادہ تر مشرقی لباس کو ترجیح دیتے۔ ریشمی کرتہ، ریشمی مشہدی تہبند اور پاؤں میں پشاوری کامدار جوتا ان کا پسندیدہ لباس تھا۔ اکثر ننگے سر رہتے اور کبھی کبھی سرحدی کلاہ اور پگڑی بھی باندھتے۔ انگریزی لباس استعمال کرنے سے احتراز نہ کرتے لیکن ابتدائی تعلیم و تربیت کے اثر اور انگریز سے نفرت کے سبب ان کی طبیعت میں ایک خاص انداز یہ پیدا ہو گیا تھا کہ مشرقی تہذیب کے مقابلہ میں مغربی تہذیب کے انڈے گندے ہی سمجھتے۔ نئی روشنی کی بے جا تقلید کا مضحکہ اُڑانے میں ہر معاملہ میں پیش پیش رہتے اکثر ڈراموں کے کومک سین میں نئی روشنی کے تاریک پہلوؤں پہ بھرپور طنز کی ہے۔ انگریزی لباس پہنتے مگر اکثر اس میں اپنی مرضی کے مطابق ردّوبدل کر کے۔ سوٹ پہنتے مگر سر پر ترکی یا ایرانی ٹوپی اوڑھتے یا ترکی یا اطلی کوٹ پہنتے۔ آغا صاحب کا محبوب ملبوس ریشمی کرتہ اور ریشمی تہبند تھا۔ جب وہ لاہور میں پہلی بار آئے تو یہاں کی بزمِ ادب نے استقبالیہ مجلس منعقد کی۔ علامہ اقبالؒ بھی اس جلسہ میں تشریف لائے تھے۔ ہزاروں کا مجمع تھا۔ تمام اربابِ شعر و ادب شریک تھے۔ مقررہ وقت پر حاضرین نے بیتابی سے شور مچایا "آغا حشر کو بلاؤ" مگر آغا صاحب کے آنے میں دیر ہو گئی تھی۔ منتظمین کی معذرت پر مجمع میں اور زیادہ اضطراب و انتشار پیدا ہونے لگا۔ آخر کچھ دیر بعد آغا صاحب آئے تو حسبِ معمول اپنی مخصوص وضع میں ریشمی کرتہ اور مشہدی تہبند پہنے ہوئے تھے۔ اکثر لوگوں نے ان کی غیر معمولی شہرت اور فنی کمالات کے چرچے سن کر جس شخصیت کا تصور کیا ہوا تھا آغا صاحب کو اس کے برعکس اس انداز میں دیکھ کر انہیں بڑی مایوسی ہوئی۔ اس سے پیشتر تاخیر کے سبب وہ خاصے مضطرب ہو رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر چند اصحاب نے آوازے کسنا شروع کئے۔ صدرِ استقبالیہ نے تعارف کرایا اور آغا صاحب نے تقریر شروع کرنا چاہی۔ لیکن حاضرین اس حشر کو سننے کے لئے تیار نہ ہوئے اور تالیاں بجا کر شور مچانے لگے۔ مجبوراً آغا صاحب کو چپ رہنا پڑا۔ اس پہ علامہ اقبال غیض میں آگئے اور ڈائس پہ آکر انہوں نے مجمع کو مخاطب کر کے صرف ایک شعر فی البدیہہ فرمایا ؎

شور ایسا ہے کہ قصابوں کی ہو جیسے برات
آیئے لاہور کی یہ بزمِ ماتم دیکھئے!

اور پھر چپ چاپ اسی گوشہ میں جا کر بیٹھ گئے جہاں سے آئے تھے لیکن حاضرین پر سکوت طاری ہو گیا۔ آغا صاحب نے دو چار شعر پڑھے اور

مختصر الفاظ میں بزمِ استقبالیہ کا شکریہ ادا کر کے بیٹھ گئے ۔ اس عرصہ میں مجمع پر ان کی فصاحت و بلاغت اور باکمال شخصیت کا اثر ہو چکا تھا ہر طرف سے داد و تحسین بلند ہوئی اور "ہل من مزید" کی صدائیں آنے لگیں ۔ اب حشر اپنے مخصوص انداز میں شعر و ادب کے گوہر لٹانے لگے اور حاضرین کو وجد میں لانے لگے ۔ اسی طرح مسلسل دو ڈھائی گھنٹے ادبی جواہر لٹاتے اور حشرِ جذبات و کیف برپا کرتے رہے ۔ اس کے بعد اہلِ لاہور جو اب تک ان سے متعارف نہ تھے، بخوبی واقف ہو کر لوہا ماننے لگے ۔

حشر فطری طور پر انتہا پسند واقع ہوئے تھے ۔ کمالِ فن، ظاہری و باطنی اطوار و خصائل، وضع قطع ہر رنگ اور ہر طرز میں ان کی یہی ادا نمایاں رہتی ۔ خوش پوشی، سادگی، ہنسی دل لگی، سنجیدگی، پھکڑپن سب کچھ انتہا کو پہنچے ہوئے تھے ۔ مے نوشی کی انتہا کر دی ۔ ترک پر آئے تو عمر بھر کی عادت کے ترک کو جان لیوا بنا لیا ۔ مذہب کے زیادہ پابند نہ تھے مگر اسلام کے متعصب شیدائی تھے اور ہر مذہب کا احترام فرض سمجھتے ۔ محبت کی تو اس شدت کی کہ جس عشق کے خلاف ان کے قلم نے سدا تیر و نشتر کا کام کیا اس کے قدموں پر سر رکھ دیا ۔ کیونکہ ان کا ایمان تھا کہ :

ع وفاداری بشرطِ استواری عین ایماں ہے

سادگی کا یہ عالم تھا کہ جب جی میں آتا تو ایسا باکمال انسان مخصوص احباب کے ساتھ سڑکوں پر کباب اور مونگ پھلیاں کھاتے پھرنا عار نہ سمجھتا ۔ اور مولانا عبد المجید سالک، حکیم فقیر محمد چشتی مرحوم، پروفیسر عبد اللطیف تپش جیسے مخلصین کے ساتھ لاہور کی گلیوں میں سیر گشت کرنا اور عام کھیل تماشوں میں گھومتا نظر آتا ۔ حشر کو غلامانہ پابندی سے نفرت تھی اور انسانیت کے احترام اور آزادی کو منشائے فطرت سمجھتے ۔ یہی ان کے کردار کی سب سے بڑی بلندی تھی اور ان کی تمام فنکارانہ، شاعرانہ اور فاضلانہ زندگی کے خصائص پر یہی کیفیت زیادہ فائق تھی ۔ جس نے ان کی شخصیت اور ہمہ گیر خصوصیت کو مجلّی کیا ۔ اس عملی عقیدہ کو آغا صاحب نے اپنے آخری شاہکار 'رستم و سہراب' میں قلعۂ سفید کے محافظ ہجیر کی زبان سے یوں ادا کیا ہے :

"پامال گھاس پر رینگتے ہوئے کیڑے کی طرح جینا آزادی کی موت اور
غلامی کی زندگی ہے ـــــ میری تمنّا ہے کہ میرے ہموطن جئیں ـ مگر غلام
بن کر نہیں ـــ آزاد ہو کر ـــ مطیع ہو کر نہیں ـــ سر بلند رہ کر ـــ"

اور یہی جیتا جاگتا حشر ہے ! جس کا نام، کام اور کردار تا حشر زندہ رہے گا ۔

ع حشر زندہ ہے اگر حشر کا فن زندہ ہے

میر ناصر علی

(دبستانِ دلّی کا آخری معلّم)

انصار ناصری

یادش بخیر! اُجڑے دیار شاہجہان آباد دلّی کے بار بار اُجڑنے اور ہر مرتبہ نئی سج دھج کے ساتھ بسنے اور سنورنے کی داستانیں آپ نے بیسیوں دفعہ سُنی ہوں گی اور یہ بھی آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کے ہر بگاڑ میں سدا سے ایک نیا بناؤ مضمر رہا۔ سو سو طرح سے اُجڑی اور لُٹی، پھر نت نئے روپ کے ساتھ بسی اور سجی اور گو ہر نئے سنگھار نے اس کے ظاہری حُسنِ صورت کو بیش از بیش زینتوں سے نیا روپ روغن بخشا، لیکن اس بوڑھی سہاگن کے حُسنِ سیرت کی آن بان سدا ایک سی رہی، اور اس کے شمائلِ باطنی ہزار تزئین و آرائش کے باوجود اپنے مخصوص تیکھے پن پر قائم رہے۔ اس انوپ شہر کی مزاجی کیفیت، سیرت اور ماحول جو اسی سے مختص ہیں صدیوں سے ایک سے رہے۔ یہ کیوں؟ آخر اس شہر میں کون سی خصوصیت ہے جو ایسے ایسے انقلاب بھی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے؟ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کی سو سو تاویلیں ہوئیں، بہت کچھ لکھا جا چکا اور بہت کچھ لکھا جائے گا، جو کچھ لکھا گیا اس سے کہیں زیادہ بُھلایا بھی جا چکا لیکن ایک ایک کر کے بسری باتوں کی پھر پھر تجدید ہوتی رہی۔ کہیں کہیں سے اوراقِ پارینہ جمع کئے جاتے رہے اور طویل و عریض حاشیوں سے سجتے رہے۔ یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔ کچھ ہے بھی ایسا سوز بھرا بیان کہ اس کی دلکشی کبھی کم نہیں ہوتی۔ بالخصوص وہ لوگ جو اس جنّت نشان شہر سے کوئی تعلق رکھتے ہیں، ہمیشہ اس کے ذکرِ جمیل سے دل کے داغ ہرے کرتے رہتے ہیں کہ پچھلے فسادات میں جس بے دردی اور سفّاکی کے ساتھ اس کا سہاگ اُجڑا وہ گذشتہ تمام یلغاروں اور تباہیوں سے مختلف تھا ——— یہ پھر ایسا مسئلہ ہے جس پر کتابوں کی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں، پھر چوٹ کھائے ہوئے دل اس المناک بپتا کو سُنانے بیٹھیں تو ناحق ان کی وقائع نگاری کو بھی کوری جذباتی عبارت آرائی گردانا جاتا ہے اس لئے اس دلخراش ذکر کی تفصیلات کو چھوڑیئے۔ اسے تاریخ نویسوں اور تذکرہ نگاروں کے سپرد کیجیے۔ اس صحبت میں جس عظیم شخصیت کا تعارف مقصود ہے، اس سے جس قدر اس بیان کا تعلق ہے اسی قدر عرض کئے دیتا ہوں ——— وہ بھی یہ مان کر کہ آپ ساتھ دینے پر آمادہ ہیں۔

دلّی کی عظمت کے اسباب میں اس کے "شہرِ خموشاں" کو بڑا دخل ہے۔ دنیا کے کسی شہر میں شاید ہی یہاں سے زیادہ قبریں ہوں اور

ایسی جو یادگارِ روزگار بھی ہوں۔ ذرا قیاس تو کیجئے، اس خاک میں کیسے کیسے خزینے دفن ہیں۔ جلال و جبروت والے شاہنشاہ، حکمت و تدبّر والے وزراء امراء۔ صف شکن و معرکہ آرا سپہ سالار اور ان کے نامور خیل و حشم ہزاروں کی تعداد میں سوئے پڑے ہیں۔ پھر کیسے کیسے جلیل القدر اولیاء اللہ، قطب و ابدال اور صاحبانِ خدمت، جن کے پاک ناموں کی برکت سے یہ اُجڑی بستی "بائیس خواجہ کی چوکھٹ" بنی رہی۔ کیسے کیسے جیّد علماء فضلاء شاعر اور ادیب جن کے قلوب سے علم و دانش کے ایسے سوتے پھوٹے جنہوں نے ایک عالم کو سیرابی بخشی۔ پھر یہ تو وہ ہیں جن کے ناموں کی چکاچوند سے ایک جہان کی نظریں خیرہ ہو گئیں۔ ان کے ساتھ ساتھ ہزاروں ایسے صاحبانِ کمال اور لاکھوں ایسے اربابِ دانش جن کی شہرت محدود سی رہی، اور کروڑوں ان کے متبعین، جنہوں نے ان کے فیضانِ صحبت سے وضعدارانہ رکھ رکھاؤ کے ساتھ اپنی زندگیاں گزاریں، چپ چاپ اپنے اپنے کام کئے اور بے نام و نشان اسی خاک میں سو گئے۔ غرض دلّی کی عظمت و برکت کی نشانیاں اس کے چہار طرف پھیلے ہوئے قبرستان ہیں جن کی تعداد میں چند در چند اضافہ ہی ہوتا رہا، بستی کے مقابلے میں "شہرِ خموشاں" کی آبادی کئی سو گنی بڑھتی رہی اور خاندانی ہڑواڑوں اور احاطوں میں آئے دن کوئی نہ کوئی بزرگ آتے رہے جن سے معنوی لحاظ سے دلّی کا حُسنِ سیرت بڑھتا رہا۔

اب غور فرمائیے اس حقیقت پر جس کی توثیق بڑے بڑے مؤرخین کرتے ہیں کہ گو دلّی بار بار تاراج ہوئی اور بُری طرح اُجڑی، لیکن یہ تباہی و بربادی زندہ شہر تک محدود رہی، شہرِ خموشاں کے مکین سدا تاخت و غارت گری سے محفوظ رہے۔ خفتگانِ خاک کو کسی نے نہ چھیڑا۔ بڑا سبب یہی ہے کہ جب پھر بسی اور سنوری تو پھر اس کے مخصوص نقش و نگار ابھر آئے۔ مسلمانوں کے نزدیک قبروں کی جو تحریم و تکریم ہے، وہ ظاہر ہی ہے۔ اس بنیادی جذبے کی کارفرمائیاں کس حد تک ہمارے قومی شعار کو متاثر کرتی ہیں، ہماری پوری تاریخ اس کے اعلانیہ ثبوت پیش کرتی ہے۔ بحث کی گنجائش ہی نہیں۔ پھر اس میں کسی خاص عقیدے یا نسبت کا ذکر نہیں بلکہ اپنے مردہ بزرگوں اور عزیزوں سے اس عام تعلقِ خاطر کو دخل ہے جس کے اثرات مسلمانوں کے تمدنی نظام میں جاری و ساری ہیں۔ خاندانوں کی تقسیم، کنبے داری کی تار و پود، رشتے اور سلسلے، رسم و رواج سب ہی شقیں اسی ایک جذبے کی جلوہ سامانیوں سے مزیّن ہیں۔ اسی سے افراد اور خاندانوں کی زندگیاں مخصوص ماحول کے سانچوں میں ڈھلتی سنورتی رہیں۔ پھر انہی خاندانی روایات سے قومی کردار و نفسیات کی تشکیل ہوتی رہی۔

اس پس منظر میں اب ذرا اس دردناک حقیقت کے دل ریش اثرات کا اندازہ کیجئے کہ تقسیمِ ملک کی یلغار اور اس کے بعد کی المناک چیرہ دستیوں سے وہ بھی نہ بچ سکے جو برسوں اور قرنوں سے قبروں میں پڑے سو رہے تھے اور جن کے مظاہر محض نسبتی نشانات بجائے خود عبرت کا مرقع تھے۔ خاص خاص مزاروں کو چھوڑ کر جن میں سے بعض تاریخی صنادید کا مرتبہ رکھتے تھے، قبرستان کے قبرستان نیست و نابود ہو گئے۔ ہزاروں خاندانوں کی قبریں ملیا میٹ کر دی گئیں، اور وہ مقدّس علامتیں جو اگلوں اور پچھلوں کے درمیان ایک رابطہ ایک سلسلہ قائم کئے ہوئے تھیں، تہس نہس کر ڈالی گئیں۔ بزرگوں کی ہڈیاں رُلتی پھرنے لگیں اور وہ مٹی جو ان کے جسدِ خاکی کے باقیات کو مجسّم کئے ہوئے تھی فسادات کے بگولوں کے ساتھ نہ معلوم کہاں کہاں سرگرداں بھٹکتے بھٹکتے بالآخر معدوم ہو گئی۔ سارا نقشہ ایسا تتر بتر ہوا کہ قیاس سے بھی اندازہ لگانا مشکل ہو گیا۔ کوئی ایسا نشان باقی نہ رہا جسے دیکھ کر کوئی ———— "بتاتا باغباں رو رو یہاں غنچہ یہاں گل تھا" اندازہ لگائیے اس اعتبار سے ان فسادات کی غارت گری، بہیمیت اور سفّاکی دلّی کے تمام گذشتہ انقلابات سے کس درجہ بڑھ کر قبیح تر اور المناک ہے کہ اصل اساس کو ہی بیخ و بن سے اُکھاڑ پھینکا کہ پھر سے پنپنے کی سرے سے کوئی امید ہی نہ رہی۔ یہ غیر مادّی قسم کی تباہ کاری اپنے دُور رس نتائج کے اعتبار سے تمام ظاہرا غارت گری کے مقابلے میں کس قدر حسرت ناک و عبرت انگیز ہے! ———— جذبات سے قطع نظر، وجوہ پر غور کیجئے تو صاف ہیں۔ قبریں ظاہر ہے مسلمانوں ہی کی ہوتی ہیں۔ تقسیم کے بعد جب آبادیاں اِدھر سے اُدھر منتقل ہوئیں تو وہ سب لوگ جو ان خاموش باقیات کے نام لیوا تھے، یا مارے گئے یا نکالے گئے اور ان کی جگہ وہ لوگ آئے جن کے تمدن میں سرے سے قبرستان کا کوئی تصوّر تک بھی نہ تھا، اس کی تحریم و تقدیس تو کجا۔ اس پر

معاندانہ جذبات کی بربریت، پھر جب وہی لوگ شہید کر دیئے گئے جو ان قبروں سے منسلک تھے تو قبریں کس کے لئے باقی رہتیں اور ناحق جگہ گھیرے رہتیں چنانچہ مزارات ڈھائے گئے۔ تعویذ اور لوحیں توڑ دی گئیں۔ قلمدان اور تختیاں اکھاڑ پھینکی گئیں۔ پختہ قبروں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی اور تقدس مآب خاک کے تودوں کو نہ صرف ہموار کیا گیا بلکہ جگہ جگہ سے اس متبرک زمین کے کلیجے میں شگاف ڈالے گئے، سینے چیرے گئے اور ان ہڈیوں پر جن کی برکت سے یہ فرش کبھی عرش بنا ہوا تھا، دکانوں، کوٹھیوں اور محلوں کی بنیادیں اٹھائی گئیں، اور اکثر و بیشتر انھی مزارات کے پتھر اور اینٹیں ان کوٹھیوں کی دیواروں میں کھپائے گئے —— !!

آپ نے اب تک ساتھ دیا —— یہ تو ذرا جذباتی سی بات، لیکن آیئے میرے ساتھ دلی کے ایک قدیمی قبرستان تک چلیے جہاں اردو کے صفِ اول کے انشاء پرداز میر ناصر علی دفن ہیں —— یہ واقعہ پچھلے سے پچھلے سال کا ہے یعنی تقسیم سے کل پانچ سال بعد جب مجھے اپنے اجڑے وطن جانے کا اتفاق ہوا —— یہ قبرستان قدم شریف کی تاریخی خانقاہ سے ملحق ہے۔ ایک طرف سے خواجہ باقی باللہؒ کی درگاہ سے ملحق قبروں کا سلسلہ چلا آتا تھا۔ دوسری طرف سے مہندی والا قبرستان شروع ہو جاتا تھا جس کا سلسلہ سید حسن رسول نماؒ کے آستانے سے ملحقہ قبرستان سے مل جاتا تھا۔ یہ تینوں قبرستان دلی کے قدیم خاندانوں کے قبرستان تھے جن سے پرانی دلی کی قریب قریب نصف آبادی منسلک تھی۔ جنازے کی گذرگاہ عام طور پر فراش خانہ ہی تھا جو کبھی میرا محلہ تھا۔ آیئے اسی طرف چلیں۔ پل پار کر کے، دوسری طرف آیئے۔ یہاں سے فقیروں، بینواؤں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا، سڑک کے دو طرفہ چادر پھیلائے یا کشکول لئے اندھے، لولے، اپاہج بڑے پرسوز انداز میں صدائیں لگاتے تھے۔ کوئی دن ایسا جاتا ہوگا جو صبح سے شام تک چار پانچ جنازے ادھر سے نہ گذرتے ہوں۔ اس لئے سہارا کافی تھا۔ ان کی یہ آوازیں اب تک میرے کانوں میں گونج رہی ہیں:

”حق اللہ“ —— ”پاک ذات اللہ“ —— ”ایک پیسہ، اندھے کو مل جائے“ —— ”لا الٰہ الا اللہ“ —— اب کوئی فقیر نہیں۔ آدم نہ آدم زاد، سنسان، ہُو حق، عجیب وحشت انگیز ویرانی ہے۔ لیجئے، یہ مسجد آگئی۔ یہ جنازہ گاہ تھی جس میں نمازِ جنازہ ادا کی جاتی تھی۔ پہلے اس کے گرد و پیش کا علاقہ صاف ستھرا رہتا تھا، دو چار مؤذن یا ان کے شاگرد طالب علم ملا صفائی ستھرائی کرتے رہتے تھے۔ اب اس کے آگے منوں کوڑے کے ڈھیر پڑے ہیں، معلوم ہوا کہ میونسپلٹی کی طرف سے بالالتزام شہر کی آخور یہاں لالا کر بھری جا رہی ہے کہ زمین کو ہموار کرنا مقصود ہے۔ مسجد کا اندرونی حوض لبالب بھرا رہتا تھا۔ اب پانی کی بوند بھی نہیں۔ مسجد کے دالانوں میں دو تین شرنارتھی خاندان آرام سے بسے ہوئے ہیں۔ وہیں کھانا پکتا ہے اور مسجد کے اندر ہی حاجت روائی بھی ہوتی ہے، کیا کیا جائے، دلی میں مکانوں کی کمی جو ہے؟ اس عبرت انگیز منظر سے دم ہولا گیا۔ آگے چلئے اس موڑ پر بھی مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک بوڑھا نابینا فقیر جھوم جھوم کر اپنی جھرجھری آواز میں صدا لگایا کرتا تھا ”نا گھر میرا نا گھر تیرا چڑیا رین بسیرا“ اب وہاں کوئی نہیں بے اختیار میری آنکھیں جیسے اس بوڑھے فقیر کو ڈھونڈھنے لگیں، اس قدر اس کی آواز مانوس تھی کہ والہانہ جی چاہا کاش وہ یہاں ہوتا، میں اس سے لپٹ جاتا اور کہتا ”بابا تم دلی کے اس قدیم آستانے کے نقیب ہو۔ تم اپنی جگہ سے نہ ہلو اور برابر اپنی صدا لگاتے رہو ”نا گھر میرا نا گھر تیرا......“ مگر ایسا معلوم ہوا جیسے فقیر اپنی اسی جھرجھری آواز میں کہہ رہا ہو ”کس کے لئے بیٹا؟ کس کو سناؤں اپنی آواز —— اب یہاں سے کوئی جنازہ نہیں گذرتا —— یہ قبرستان اب ”بند“ کر دیا گیا ہے۔ سب اسی دریا گنج والے سرکاری قبرستان میں جاتے ہیں۔ یہ قبریں سب ایک ایک کر کے مٹائی جا رہی ہیں۔ یہاں کوٹھیاں بن رہی ہیں......“ آگے آیئے —— اس طرف کیا ہو رہا ہے، پرانی نہر سعادت جو عرصے سے خشک پڑی تھی، اب پاٹی جا رہی ہے، ہزاروں مزدور کام کر رہے ہیں، اور ان کے میٹ جمعدار طرح طرح کی زبانوں میں بیچ میں آوازیں لگا رہے ہیں۔ عجیب رونق اور گہما گہمی ہے۔ سڑک کے اس پار ان مزدوروں کی خاطر بہت سے خوانچے والے بیٹھے ہیں، کہیں آلو چھولے ہیں، کہیں پکوڑے کہیں دہی بڑے اور پھلکے، کہیں ٹھنڈی ٹھار لسی ہے، کہیں گنے کا رس، جس پر یہ مزدور مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہے ہیں۔ برابر سے قبروں کا سلسلہ

شروع ہے، لیکن قدم شریف جانے والا راستہ اب بند کر دیا گیا ہے۔ اسی قطب روڈ پر کچھ آگے آئیے۔ مجھے یاد ہے، ایک پتلی سی گلی، خواجہ باقی باللہؒ والے قبرستان کو جاتی ہے، یہ رہی سامنے، غنیمت ہے یہ گلی ابھی ہے، اس کے وہانے پر جہاں پہلے بہشتی رہتے تھے، اب کوئی جدید قسم کی ڈیری فارم کھل گئی ہے۔ چاروں طرف بھینسیں ہی بھینسیں ہیں اور اس چھ منزلہ نئی عمارت میں اس ڈیری فارم کا دفتر ہے، وہ دیکھئے نا کوئی سردار صاحب بیٹھے کوپن گن رہے ہیں۔ آگے آیئے، راستہ بند ہے، لیکن شاید اس طرف گھوم کر کوئی راستہ نکل سکے۔ سمت بھی رکھئے۔ جگہ جگہ نئی نئی عمارتیں بن گئیں۔ راستے میں ملبے کے ڈھیر کے ڈھیر پڑے ہیں۔ پہلے یہاں سب مزارات ہی تھے۔ جی ہاں، یہ لیجئے خواجہ باقی باللہؒ کی درگاہ آگئی۔ اس طرف آیئے۔ یہی دروازہ ہے۔ ذرا ٹھہریئے۔ یہ شعر دیکھا آپ نے ؎

فاتحہ مرقدِ ویرآں پہ بھی پڑھتے جاؤ
ان سے کہہ دو جو ہیں اس در سے گذرنے والے

یہ حضرتِ ویرآں کا مزار ہے۔ بڑے جیّد عالم اور درویشِ باصفا تھے۔ شاعر بھی تھے اور واعظ بھی۔ میرے دادا مرحوم نے قرأت انہی سے سیکھی تھی ——— اندر آیئے ——— ذرا یہاں دم لے لیجئے۔ اس آستانے کے ماحول میں کیسی اُداسی سی بسی ہوئی ہے۔ پہلے کبھی یہاں دن رات اوراد و وظائف اور ذکر و شغل کی محفلیں اور حلقے گرم رہتے تھے اور ہر وقت سلامیوں کا تانتا سا بندھا رہتا تھا، درود و سلام کی آوازیں گونجتی تھیں فاتحہ خوانی ہوتی تھی۔ پارے اور رکوع پڑھے جاتے تھے۔ وہ سرور و سوز سب فنا ہو گیا۔ باقی بس اللہ یا خود حضرت باقی باللہؒ۔ یہ کوئیں کے پاس اس بیری کی ٹھنڈی چھاؤں میں شمس العلماء مولوی نذیر احمد کا مزار ہے ——— اس طرف آگے آیئے۔ یہ ان کے فرزندِ ارجمند مولوی بشیر الدین روالدِ ماجد شاہد احمد صاحب مدیر "ساقی") کا مزار ہے۔ چہار طرف ایسے ہی مشاہیر دفن ہیں۔ اس احاطے سے باہر آیئے۔ قریب ہی کہیں شمس العلماء مولوی نذیر حسن شاہ محدث دہلوی (میرے پرنانا) کا مزار بھی تھا، اب مجھے ٹھیک سے یاد نہیں رہا۔ گلی سے اتر کر اس دروازے سے باہر آیئے اس طرف کو میرے نانا مولوی اشرف حسین کا مزار تھا، اور ان کے برابر ان کے بھائی مولوی انور حسین مصروفِ استراحت تھے۔ ادر گرد میرے ننھیال اور شاہد احمد صاحب کے خاندان کی بہت سی قبریں تھیں، ایک کا بھی نشان باقی نہیں۔ سامنے کچھ نئے نئے مکانات بن گئے۔ ایسی ہی اَن گنت قبریں ان میں سما گئیں۔ اب اس میدان میں ننگ، دھڑنگ کالے پیلے لڑکے گلی ڈنڈا کھیل رہے ہیں۔ جی ہاں۔ آہ و سرد کے سوا اور ہم آپ کر بھی کیا سکتے ہیں۔ اب آگے آگے چلتے رہیئے۔ یہ کچے پکے مکانوں کا قصبہ جو بن گیا، یہاں سب جگہ مزارات ہی تھے جن کا سلسلہ قدم شریف کے مزارات سے ملتا تھا۔ اب کہیں چارپائیاں بن رہی ہیں، کہیں ٹرنک۔ وہ کھٹا پٹ اور ٹھوکم پیٹ ہے کہ خفتگانِ خاک بھی کاہے کو آرام سے سو سکتے ہوں گے۔ لیجئے اس واشنگ فیکٹری کے ساتھ اس قبرستان کی حد ختم ہوئی۔ وہ جو سنگِ سُرخ کی سہ منزلہ عمارت ہے جس کی دیواروں پر شلواریں اور دھوتیاں سوکھ رہی ہیں یہاں سے قدم شریف کا قبرستان شروع ہوتا تھا۔ یہ گھنیری چھاؤں والا بڑ معلوم نہیں کے سو برس پرانا ہے، اس سے وابستہ ایک مخصوص منظر اب تک میری آنکھوں میں سمایا ہوا ہے اور مجھے یقین ہے میری طرح ہر دلّی والے کے دل پر نقش ہوگا، ہر سال عید بقر عید کے موقع پر اس قبرستان کے مجاور صاحب چودھری جی اس بڑ کے نیچے سفید چادروں کا فرش بچھواتے اور گرمی کے دنوں میں بڑے بڑے ٹبوں میں برف کا پانی رکھنے اور تازہ دم حقّے۔ نمازِ عید سے فارغ ہو کر اس قبرستان سے منسلک لوگ جب اپنے عزیزوں کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے آتے تو پل دو پل اس بڑ کے نیچے ضرور سستاتے اور حسبِ توفیق چودھری جی کو حقِ خدمت دیئے دلاتے تھے۔ عید بقر عید کے ذکر کے ساتھ ایک ہوک سی دل میں اُٹھی اور ان قبرستانوں کی مخصوص خاموش چہل پہل کے نظارے آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ یوں تو شہرِ خموشاں ہے ہی عبرت کدہ اور عام دنوں میں اس پر اٹا ٹوٹ ویرانی اور اُداسی برستی رہتی ہے، لیکن عید بقر عید کو بیچ بیچ ویرانی اور اُداسی کی جگہ عجیب پُروقار گہما گہمی اور ملگجی آمیز رونق سی آ جاتی تھی۔ عید گاہ سے دوگانہ ادا

کرنے کے بعد عمدہ عمدہ پوشاکیں پہنے لوگ قبرستان آتے، کسی کے ہاتھوں میں سلگتی ہوئی اگر کی بتیاں، کسی کے ساتھ رومالوں میں بندھے گلاب کے پھول، بہشتیوں کی اس روز چاندی ہوتی، جھپا جھپ برابر والے کوئیں سے آدھی پونی مشکیں بھر بھر کر لا رہے ہیں اور چوگنے پچگنے دام وصول کر رہے ہیں۔ بہشتی کم ہیں اور ان کے خریدار زیادہ۔ کوئی اِدھر سے آواز دے رہا ہے کوئی اُدھر سے چیخ رہا ہے۔ وہ اُدھر بھاگے جا رہے ہیں ایک اِدھر کو دلاسا تسلی دیتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔ "ابھی لایا میاں پہلے ادھر دو مشکیں ڈال دوں"۔ لوگ اپنے عزیزوں کی قبروں کو غسل دلا کر پھول چڑھا رہے ہیں عود و اگر کی بتیاں روشن کر رہے ہیں، فاتحہ پڑھ رہے ہیں۔ کسی طرف سے سسکیوں کی دبی دبی آوازیں آ رہی ہیں۔ اِدھر کوئی کٹہرے سے چمٹا زار و قطار رو رہا ہے۔ اُدھر سے ایک صاحب چشم نم لئے گذر رہے۔ اِدھر کوئی بوڑھا کسی جوان کو جس کی ہچکی بندھ گئی ہے، تسلی تشفی دے رہا ہے، اُدھر کوئی جوان کسی بوڑھے کو سہارا دئے چلا جا رہا ہے۔ فقیروں، شہدوں، عورتوں، بچوں کی یورش ہے۔ "الٰہی برسا برس کی خیر — دم قدم سلامت رہیں۔ ہم بھی نام لیوا کاج کر لیوا ہیں۔ سلامتیاں رہیں۔ جان و مال کو دعا دیتے ہیں"۔ کم بخت ایسی رٹ۔ لگاتے ہیں کہ فاتحہ بھی ٹھیک سے پڑھنے نہیں دیتے۔ اِدھر سے لوگ فاتحہ پڑھ پڑھ کر چلتے جاتے ہیں اُدھر سے نئی نئی ٹولیاں اور آتی جاتی ہیں۔ نصف النہار تک یہی سلسلہ چلتا رہے گا — آئیے اس بڑ کے آگے جو مسجد ہے اس طرف چلئے۔ لیجئے اس مسجد میں بھی کوئی سکھ خاندان براجمان ہے۔ یہ بچ[illegible]نے کے ستم رسیدہ ہیں۔ یہ اس کے قریب میری ددھیال کی بڑواڑہ ہے۔ جہاں میرے پردادا، دادا ابا، دادی اماں اور خاندان کے اور بزرگوں کے مزارات ہیں — کچھ قبریں اِدھر ہیں اور کچھ اس کوئیں کے اُدھر — آئیے میں آپ کو دکھاؤں — ہائیں! یہ کیا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے زور سے دل پر گھونسہ مارا — اتنی عمدہ، پختہ، سنگین قبریں، سنگِ مرمر کی بڑی بڑی خوبصورت لوحیں تھیں، اردگرد آہنی کٹہرا تھا، جس کی ابھی چند سال ہوئے میرے والدِ ماجد نے خود کھڑے ہو کر مرمت کرائی تھی — یہ سب کہاں گئیں۔ زمین ہموار — خاک کا ڈھیر بھی نہیں، بالکل صاف میدان — ایسا معلوم ہوا جیسے یہ زمین مجھے پکار رہی ہے۔ اس خاک کے ذرے مجھ سے آ آ کر چمٹ رہے ہیں اور شفقت آمیز انداز سے گلے شکوے کر رہے ہیں — "پانچ برس بعد اب آئے ہو ہماری خبر گیری کرنے، ہمیں دیکھنے، ہم ترستے — ہم راہ تکتے رہے، انتظار کرتے رہے کہ کوئی تو ہمارا نام لیوا، ہمارا اپنا ہماری دُردشا دیکھ جائے اور گو کچھ کر نہ سکے۔ دو آنسو گرا کر آخری بار فاتحہ ہی پڑھ جائے —" معاف فرمائیے، نسبتِ خاص کے باعث مجھے ضبط کا یارا نہ رہا۔ اس کمزوری اور جذباتیت کے لئے آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ یہ مزارات جو ازل اور ابد کے درمیان ایک نشانِ منزل بنے کھڑے تھے، علامتیں تھیں ان گہرے روحانی اور جسمانی رشتوں کی جن سے مجھ جیسے ہزاروں، لاکھوں کے گوشت پوست اور دل و دماغ وابستہ ہیں۔ کبھی کبھی یہاں آ کر ان بزرگوں کی نیکیوں اور بھلائیوں کو یاد کر لیا کرتے تھے۔ ایک طرح کا تزکیہ سا ہو جاتا تھا۔ پریشان خاطر کو ایک طرح کا سکون اور ٹوٹی ہمتوں کو نیا سہارا سا مل جاتا تھا۔ ان کی لائقِ تقلید زندگیوں اور ان کے کارناموں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی — یہ سب آخری نشان مٹ گئے۔ صرف نام ہی نام رہ گئے وہ بھی کسی کے یاد کر لینے کے محتاج — درمیان میں ایک بلند محراب کے نیچے میرے پردادا مولوی ناصر الدین محمد ابو المنصور امام المناظرہ کا مزار تھا، یہ بڑے جلیل المرتبت عالم اور فضیلت والے بزرگ تھے۔ جملہ فضلاءِ ہند اور علماءِ ایران و ترکستان نے ان کو فنِ مناظرہ کا امام مانا تھا۔ ترکی کے آخری خلیفہ نے ان کو خلعت اور تمغے عطا کئے تھے۔ ان کے پہلو میں ان کی اہلیہ محترمہ یعنی میری پردادی کا مزار تھا۔ دوسری جانب میرے دادا مرحوم میر ناصر علی دفن تھے۔ آس پاس اور اعزا اور اقربا کے مزارات تھے۔ ان سب مزاروں کی لوحیں میرے والدِ ماجد میر انتصار علی امام ظلّہٗ نے بنوائی تھیں۔ یہ سب آخری نشانیاں فنا ہو گئیں۔ گویا جو ظاہری رابطہ سا باقی تھا ان فضیلت مآب بزرگوں سے وہ ملیا میٹ ہو گیا — ایسے میں مجھے معاف فرمائیں، یہاں اب ٹھہرا نہیں جاتا۔ چلئے واپس چلیں — اس طرف چلئے — انہی مکانوں کے درمیان سے کہیں نہ کہیں راستہ نکلتا ہوگا۔ ذرا ٹھہرئیے گا۔ یہ اس نئے مکان پر سنگِ مرمر کی تختی سی جو لگ رہی ہے۔ ذرا اسے دیکھوں۔ اس طرف نارکول سے لکھا ہے: "ایشر سنگھ۔" اور اُدھر پشت پر یہ کیا کندہ ہے: "کر گیا گوشۂ سخن خالی" اور نیچے میرے والدِ ماجد کا نام "غلامِ پدر — انتصار علی" ملاحظہ فرمایا آپ نے

۱۹۳۳ء

یہ میرے دادا مرحوم کے مزار کی لوح کا ایک ٹکڑا ہے۔ ایشر سنگھ صاحب نے یا خود توڑا یا یہیں کہیں قبرستان سے اٹھا لائے اور بڑے سگھڑاپے سے اپنے مکان پر اپنے نام کی یہ تختی گھڑ گھڑا کر آویزاں کی۔ مجھے دادا ابا مرحوم کی لوح کی پوری عبارت اب تک یاد ہے:

ہواللہ

جائیم بروز واقعہ پہلوئے او کنید

او قبلۂ من است رُخم سوئے او کنید

مزار خان بہادر میر ناصر علی مدیر "صلائے عام"

سفر کرد ہر گاہ از دارِ فانی   بہ فردوس شد میر ناصر علی خاں

۱۳۵۲ھ

ناصر میر لشکرِ اُردو

۱۳۵۲ھ

کر گیا گوشۂ سخن خالی

۱۹۳۳ء

غلام پدر

انتصار علی

پہلا قطعۂ تاریخ پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی نے کہا تھا جو مرحوم کے ہم مشرب اور خود بڑے پائے کے عالم تھے اور دوسرا قطعہ پروفیسر احسن مارہروی صاحب کا تھا۔ اس قطعہ بند کے کچھ شعر اب تک مجھے یاد ہیں۔ تسلسل میں شاید کچھ فرق ہو:

میر ناصر علی نے کی رحلت   مرغِ جاں نے کیا بدن خالی
کیوں نہ دہلی ہو غم کدہ کہ ہوا   ایک پُرمایہ سے وطن خالی
نظر آتی ہے بزمِ اُردو میں   مسندِ صدرِ انجمن خالی
بایقیں تھا وہ خاتم الادبا   نہ سمجھیئے یہ حسنِ ظن خالی
اس کی ہر بات میں تھی جدت بھی   تھا نہ وہ ناصحِ کہن خالی
عملاً بھی تھا عاملِ کامل   تھا نہ علامِ علم و فن خالی
اس کی دُھن خدمتِ ادب تھی فقط
اور اُردو کی تھی لگن خالی

لوح پر جو شعر تھا اسے ایک بار پھر سن لیجئے، اس کا تعلق میر صاحب کے معتقدات سے ہے، اس کا ذکر آگے آئے گا ؎

جائیم بروز واقعہ پہلوئے او کنید
او قبلۂ من است رُخم سوئے او کنید

ہاں تو ابدی مسکن کا حال آپ دیکھ چکے، یہ حالت آج سے دو سال پہلے تھی، امتدادِ زمانہ سے اب تک کیا دُرگت بن چکی ہوگی، وہ قیاس

کی جا سکتی ہے۔ آیئے اب میر صاحب کے مکان یعنی "دفتر صلائے عام" یا "حویلی ناصر علی خان بہادر" فراش خانہ میں چلیے ——— آپ اکتا تو نہیں گئے؟ لیجئے راستے میں آپ کے ذریعہ ان لوگوں کی معلومات کی خاطر جو میر صاحب کی زندگی کے حالات سے زیادہ با خبر نہیں۔ کچھ باتیں نہایت اختصار کے ساتھ عرض کرتا چلوں:

میر صاحب مرحوم کی پیدائش ۱۸۴۷ء میں دہلی میں ہوئی۔ آپ کا تعلق اس خاندانِ سادات سے ہے جس میں پشت ہا پشت سے علم و فضل چلا آتا ہے۔ شجرہ امام جعفر صادقؓ سے ملتا ہے، جدِ امجد مولوی سید محمد علی مرحوم فضائلِ علوم صوری و معنوی میں یگانۂ روزگار رہتے، والدِ ماجد مولوی سید ناصر الدین محمد ابو المنصور جلیل القدر عالم اور مبلغ تھے۔ ہندوستان کے جملہ علمائے سُنی و شیعہ نے آپ کو امام المناظرہ مانا تھا۔ آپ نے بیسیوں دینی و مذہبی کتابیں تصنیف کیں۔ میر صاحب مرحوم کے برادرِ عزیز مولوی سید نصرت علی مرحوم بھی بڑی لیاقت و فضیلت کے بزرگ تھے۔ انہوں نے بھی سَو سے زیادہ کتابیں تصنیف کیں اور "نصرت الاخبار" "نصرت الاسلام" اور "مہرِ درخشاں" نامی رسالے وقتاً فوقتاً اپنے مطبع "نصرت المطابع" سے شائع کئے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں میر صاحب مرحوم دس برس کے تھے۔ قرآنِ پاک ختم کر لینے کے بعد عربی، فارسی، دینیات، فقہ و حدیث، منطق وغیرہ میں اعلیٰ مدارج طے کئے، اس کے بعد باوجود مخالفت کے انگریزی تعلیم حاصل کی اور ۱۸۶۷ء میں دہلی گورنمنٹ اورینٹل کالج سے انٹرنس کے امتحان میں اوّل آئے۔ دہلی کے مسلمانوں میں شاید پہلے انٹرنس پاس یہی تھے۔ اس کے فوراً ہی بعد سلسلۂ ملازمت شروع ہوا۔ پہلے نان پاٹی سکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر رہے اس کے بعد آپ کی خدمات محکمۂ نمک شمالی ہند میں منتقل کر دی گئیں جہاں مرحوم نے ۱۹۰۰ء تک نہایت نیکنامی سے اپنے فرائضِ منصبی انجام دئیے۔ اسی کے ساتھ ساتھ فرخ نگر (ضلع گوڑگانواں) کی میونسپل کمیٹی کے متواتر ۱۶ سال تک نائب صدر رہے اور انسدادِ قحط سالی اور دیگر تعلیمی کاموں کے سلسلے میں اعلیٰ خدمات انجام دیں۔ جس کے صلے میں ۱۸۹۷ء میں "خان بہادر" کا خطاب عطا ہوا۔ محکمۂ نمک سے پنشن لینے کے بعد تین سال تک دلّی میں مجسٹریٹ رہے۔ یہاں سے پھر آپ کی خدمات پاٹودی ریاست میں منتقل کر دی گئیں جہاں آپ ۱۹۱۳ء سے ۱۹۲۲ء تک چیف منسٹر (دیوانِ ریاست) رہے۔ اس کے بعد سے دلّی اپنے مکان میں واپس آگئے اور مرتے دم تک اپنا مقبولِ خاص رسالہ "صلائے عام" نکالتے رہے۔ چھیاسی برس کی عمر میں ۱۲ جون ۱۹۳۳ء کو رحلت فرمائی۔

خاندان، درسی تعلیم اور سلسلۂ ملازمت کا حال دو لفظوں میں یہ تھا:

علمی مشاغل اور ادبی خدمات کا حال ۱۸۶۷ء سے ۱۹۳۳ء تک یعنی کچھ کم ساٹھ سال کی غیر منقطع کاوشوں پر مشتمل ہے جس کی تفصیل تو کجا مختصر بیان کی بھی اس صحبت میں گنجائش نہیں، اسے کسی آئندہ فرصت تک ملتوی کیجئے۔ فی الحال محض واقعات شماری کے طور پر یوں سُنئے کہ:

یہ صحیح ہے کہ میر صاحب مرحوم نے کوئی مستقل کتاب (یعنی عرفی حیثیت سے کسی ایک مضمون پر کوئی تصنیف) نہیں لکھی جو ان کی اعلیٰ صلاحیتوں اور غیر معمولی علمیت کی آئینہ دار ہوتی۔ عمر بھر مختلف فلسفیانہ، محققانہ اور شاعرانہ قسم کے سینکڑوں مضامین لکھتے رہے جو ان ہی کے مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ ہزاروں صفحات پر مشتمل یہ گراں قدر مضامین اپنی مخصوص نازک خیالیوں اور پاکیزہ بیانی کے باعث اردو ادب میں کلاسیکس کا درجہ رکھتے ہیں کہ ان جیسا اسلوبِ بیان (اسٹائل) اردو ادب میں اپنی نوع کا پہلا اور آخری تھا۔ وہی اس کے موجد تھے اور اختتام بھی، اور انہی کے ساتھ یہ رنگ ختم بھی ہوا ——— نادم ہوں کہ یہاں پھر ناحق اپنی طرف سے میر صاحب کے لٹریچر پر اپنی رائے لگانے کا مرتکب ہوا ——— یہ ذکر "حدیثِ دیگراں" ہی کی زبانی مناسب ہوگا ——— فی الحال ان رسالوں کے نام سُن لیجئے جو میر صاحب مرحوم نے وقتاً فوقتاً شائع کئے:

"تیرھویں صدی"۔ ۱۸۷۶ء میں آگرہ اخبار، آگرہ کے دفتر سے شائع ہوا۔ اس میں دیگر محققانہ و حکیمانہ مضامین اور فقہ و حدیث کے مباحث

سے علاوہ خاصے کی چیز وہ مضامین تھے جن میں میر ناصر علی، سرسید احمد خاں کے رشحاتِ قلم پر انتقاد کرتے تھے۔ اسی زمانے میں سرسید کا اخبار "تہذیب الاخلاق" بھی نکلتا تھا۔ سرسید احمد کے مشن سے میر صاحب کو کوئی تعرّض نہ تھا، وہ محض ان کے علمی ادبی کارناموں پر سخن گسترانہ تنقید کرتے تھے اور اس طرح دادِ سخن دیتے تھے کہ سرسید علیہ الرحمۃ ہمیشہ انہیں "ناصحِ مشفق" کہتے رہے۔ یہ رسالہ کم وبیش چار پانچ سال جاری رہا۔

"زمانہ"۔ تیرھویں صدی کے بعد آگرہ اخبار ہی سے اس نام کا رسالہ جاری کیا، یہ بھی چار پانچ سال تک شائع ہوتا رہا۔

"افسانۂ ایّام"۔ یہ رسالہ اپنے برادرِ عزیز مولوی نصرت علی کے مطبع 'نصرت المطابع دہلی' سے شائع کیا۔ اس کے متعلق خود میر ناصر علی کی زبان سے صرف اتنا سُن لیجئے:

"افسانۂ ایام' نامی ایسا پرچہ نکالا جاتا ہے جو اعلیٰ لٹریچر یعنی غایتِ فصاحت اور کمالِ انشا کا نمونہ ہو۔ اس میں وسعتِ خیال اور ہر طرح کے اظہارِ کمال کا وہ اہتمام کیا گیا ہے کہ مضامین علمی وتحقیقی فلاسفی اور الٰہیات و دینیات کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ ہو سکے۔ یعنی جو غرض "تیرھویں صدی" اور "زمانہ" نامی پرچوں سے تھی وہ جانے نہ پائے اور ساتھ ہی عمدگی مضامین میں ولایت کے اعلیٰ لٹریچر کے عمدہ پرچوں سے کم نہ ہو۔ جن باتوں میں زمانے نے ترقی کی ہے، اس کی حقیقت بتائی جائے کہ اقبال مند قوموں کے نمونے کیا اثر پیدا کرتے ہیں۔ ہماری طبیعتیں کس طرح سنبھل سکتی ہیں۔ زمانے کے ساتھ ترقی کرنے میں ہمیں کیا چھوڑنا اور کیا اختیار کرنا ہے ؎

اورا بہ سعی گر نتواں ساختن زخویش ❊ فرض است در تلاش کہ خود را ازو کنند

یہ پرچہ صرف ان لوگوں کے کام کا ہے جن کی علمی لیاقتیں بڑھی ہوئی ہیں۔ اس سے غرض یہ ہے کہ جن باتوں اور مسئلوں کا زمانے میں شور ہے ان کے سمجھنے اور ان پر رائے دینے کا موقع اہلِ علم کو ملے اور اسلام کی طرف سے زمانہ میں ایسا یادگار رہے جس کی اہلِ کمال کی نظر میں ہمیشہ قدر ہو......"

"ناصری"۔ "افسانۂ ایّام" کے بند ہونے کے کچھ عرصہ بعد ۱۸۸۸ء میں ناصری نامی رسالہ نصرت المطابع دہلی سے شائع کیا۔ اس کے مقالۂ افتتاحیہ کا ایک اقتباس آپ کے سُننے کے لائق ہے:

"مدّت سے یہ شکایت ہے کہ اعلیٰ لٹریچر کا کوئی ایسا پرچہ نہیں نکلتا جس میں ہمارے ملک اور زبان کی ترقی کے پورے سامان ہوں۔ یہ شکایت مٹانے کے لئے ناصری نکالا جاتا ہے۔ پرانے اخباروں کی بے قدری میں نیا پرچہ نکالنا گویا بیقراری میں برق رفتار کا تماشہ ہے۔ لیکن جس طرح ہیدک کے علاجوں میں گرمی کا علاج گرمی سمجھا جاتا ہے، اسی طرح نئے پرچے کا نکالنا اخباروں اور رسالوں کی ترقی کے عجیب سامانوں میں ہے۔ یہ نہیں تو بڑی وجہ اس پرچہ کے نکالنے کی یوں سمجھئے کہ عموماً ہندوستان کے اخباروں کی ردّی حالت ہی اس بات کی محرّک ہوئی کہ

ایک اچھا پرچہ نکالا جائے جو اس فن کی آبرو کا سبب ہو ؎

این نامہ کہ بود نطع این فرش ۔۔۔ من می برمش بہ کنگرۂ عرش

این لعل کہ داشت پائے در گل ۔۔۔ من می نہمش بہ کرسی دل

این جرعہ کہ ریختند بر خاک

من می کشمش بجام افلاک"

ناصری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں مزاح کا عنصر بیشتر تھا۔

"صلائے عام"۔ ناصری کے بعد میر صاحب نے اپنے مطبع "مطبع ناصری" سے ۱۹۰۸ء میں یہ شہرہ آفاق پرچہ نکالا جو اکتوبر ۱۹۳۲ء تک متواتر شائع ہوتا رہا۔

اس گراں قدر ادبی جریدے کے متعدد ارتقائی دور رہے اور ہر دور کی امتیازی خصوصیات بیان کرنے کے لئے بسیط مقالوں کی ضرورت ہے جس کا یہاں محل نہیں۔ مہدی حسن افقادی کی زبان سے صرف آشنائی لیجئے:

"جس زبان کی حیاتِ طبعی بوڑھے نذیر احمد، حالی اور شبلی کے دم تک ہو، وہ سسک سسک کر کب تک چل سکتی ہے۔ لیکن آپ کا عنصر غیر فانی ہے۔ آپ کی زبان مخصوص النوع صفات کے ساتھ کسی اور کے بس کی چیز نہیں۔ آپ کے مضامین کے پاکیزہ مجموعہ سے اردو ادب العالیہ "کلاسیکس" میں مستقل قیمتی اضافہ ہوتا، جو یادگارِ زمانہ رہتا۔"

"صلائے عام" کے متعلق تمام کام میر صاحب خود ہی کرتے تھے، خود ہی کاپیاں اور پروف پڑھتے اور خود ہی ڈاک کے جوابات دیتے۔ یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری ہے کہ متذکرہ بالا رسائل میں سے کسی ایک کی بھی اتنی آمدنی نہ تھی کہ اپنے اخراجات کا خود کفیل ہو سکتا۔ ان کا کل خرچ میر صاحب انتہائی عالی حوصلگی و وضعداری کے ساتھ آخر دم تک خود اُٹھاتے رہے۔ نہ کبھی کسی رسالے میں کوئی اشتہار وغیرہ شامل کیا گیا۔

لیجئے باتوں باتوں میں آپ فراش خانے پہنچ بھی گئے۔ کسی زمانے میں یہ محلہ بھی دتی کے بعض پُرانے محلوں کی طرح ایسا تھا کہ "رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے"۔ خیر —— اس دردناک بیان کو بھول جائیے۔ اس عظیم الشان حویلی کے اس زینے پر دیکھئے۔ غنیمت ہے سنگ مرمر کی تختی اب تک باقی ہے۔ "صلائے عام" جی ہاں اسی بالاخانے پر "صلائے عام" کا دفتر تھا اور میر ناصر علی مرحوم بھی اسی بالاخانہ پر عزلت گزین تھے۔ حویلی کا بڑا دروازہ، وہ سامنے ہے۔ زنان خانے اور کتب خانے کا راستہ بھی تھا —— اب اس طرف نہ جائیے۔ یہاں میری طرح شاید آپ کو بھی دُکھ ہوگا۔ یہی میرا مولد و مسکن تھا۔ مجھے اس مکان کی ایک ایک اینٹ سے جو لگاؤ ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ یہی وہ دیواریں اور کمرے تھے جنہیں ہم اپنا گھر کہتے تھے۔ جو ہماری خوشیوں اور دُکھوں کا شاہد تھا۔ جب یہی گھر ہمارا نہ رہا تو اور کوئی عمارت گھر نہیں بن سکتی۔ پڑ رہنے کے لئے چاہے جہاں رہ لیں —— خیر —— آج کل مکان کے ان دونوں حصوں میں سکھوں اور کھتریوں کی ریل پیل سی بستی آباد ہے۔ نہ معلوم شرنارتھیوں کے کتنے خاندان ہیں جو یہاں پناہ گزین ہیں۔ بعض حصوں میں لالٹینوں کا کارخانہ ہے۔ جہاں شادیانے بجتے تھے اب وہاں گویا ہتھوڑا بجتا ہے۔ خیر —— اس ذکر کو چھوڑئیے اس میں کسی کا کیا دوش —— انقلابات ہیں زمانے کے —— اوپر آئیے۔ صرف یہی حصہ ہے جو اب تک میرے والد ماجد کے قبضے میں ہے۔ یہ کشادہ چھت اور اس کے درمیان میں صدر نشین کی جگہ سنگِ مرمر کی خوشنما جالی دیکھی آپ نے۔ اس چھت پر اکثر میر صاحب مرحوم "شب ماہ" کی محفل سجاتے تھے۔ کبھی مشاعرے ہوتے تھے کبھی علمی مذاکرے اور کبھی خاندان کے لوگوں کے ساتھ سبز چاء کی پارٹیاں۔ سبز چاء میر صاحب کو بہت

مرغوب تھی ——— جا بجا منڈیروں پر پرندوں کے لئے کنڈالیاں اب تک رکھی ہوئی ہیں جو میر صاحب کی خدا ترسی اور رحمدلی کی شاہد ہیں۔ انہوں نے اپنی ذات سے کبھی کسی ذی روح کو نہیں ستایا ——— حیوان تو حیوان، کسی انسان کو کبھی ان کی ذات سے کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا۔ بات کہہ دینے میں بڑی آسانی کے ساتھ کہہ دی گئی۔ لیکن ذرا اس پر غور تو کیجئے، کتنے انسانوں کو آج اس معیار پر جانچا پرکھا جا سکتا ہے۔ جہاں تک اپنے سے بن پڑا دوسروں کو فائدہ ہی پہنچانے کی کوشش کی، اگر اور کچھ نہ کر سکتے تو ہمدردی اور غمگساری ہی کرتے۔ ان کی نیکی، بھلائی، راست بازی اور مروّت کی داستانیں فی الواقع ضرب المثل تھیں۔ ایسے فضیلت والے لوگ اب خود بھی قصّے کہانیوں کے عنوان بن گئے ——— آئیے اس کمرے میں آئیے اور میرے والدِ ماجد سے ملئے۔ ستّر برس کی عمر ہے۔ ضعیف و نزار ہیں۔ اپنے والدِ ماجد کے نقشِ قدم پر چلنا انہوں نے اپنی نجات کا ذریعہ سمجھ رکھا ہے۔ خود انہوں نے چالیس سال تک محکمۂ نمک کی ملازمت کی۔ اب پنشن پاتے ہیں ——— خاندان کے سب لوگ پاکستان جا چکے مگر یہ یکہ و تنہا، بے یار و مددگار، خاص معتقدات پر تکیہ کئے یہیں آبائی مکان کے اس مختصر حصّے میں رہتے ہیں۔ اپنا سارا کام خود اپنے ہاتھ سے کرتے ہیں اور درویشانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان سے بس یہی نہ پوچھئے گا کہ آپ پاکستان کیوں نہیں جاتے؟ ——— ان کا کمرہ عجائب خانہ بنا ہوا ہے۔ پُرانی قلمی تصاویر پرانے قطعے اور کتابت کی وصلیاں، پرانی قلمی کتابیں ——— صلائے عام، کی جلدیں اور صدہا انگریزی، اُردو، عربی، فارسی کی کتابیں اور میر ناصر علی کے دست و قلم کے مسوّدات اور ان کے ہزاروں خطوط جو انہوں نے ان کے نام لکھے، اور کچھ اسی قسم کے خاندانی تبرکات۔ بس یہی ان کی زندگی کا سرمایہ بھی ہیں اور سہارا بھی۔ آئیے ان سے ملئے ——— مگر ——— یہ گئے کدھر ——— کمرے میں تو نہیں ہیں ——— ہاں ——— وہ رہے۔ اپنے ہاتھ سے کنڈالیوں میں پانی بھر رہے ہیں ——— لیجئے وہ آگئے ——— ان کی قدیم روش کی مدارات آپ کو ناگوار تو نہیں گذرے گی؟ ——— ان سے میر صاحب مرحوم کے دو ایک نجی خطوط سُن لیجئے۔ اقربا میں سے میر صاحب مرحوم سوائے میرے والدِ ماجد کے اور کسی کو کم ہی خط لکھتے تھے۔ ان کے خطوط نہ صرف ان کے خاص اسلوبِ نگارش کے آئینہ دار ہونے کی حیثیت سے گراں قدر ہیں بلکہ اس لحاظ سے بھی قیمتی ہیں کہ ان سے مرحوم کی شخصیت کے بعض پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔ ایسے خطوط ہزارہا ہیں لیکن اس صحبت میں صرف تین خطوط سُن لیجئے ——— اپنی جانب سے کچھ عرض نہیں کروں گا۔ نتائج آپ خود اخذ کیجئے:

(۱)

بیٹا!

اب کی دفعہ میری بیماری سے تمہیں بہت زیادہ فکر ہوا اور میں بھی کچھ کچھ آثار سفرِ آخرت کے دیکھ رہا تھا۔ بارے خدا نے تمہاری پریشانی دیکھ لی اور میں نے بھی ابھی چند روز اور زندہ رہنے کا ارادہ کر لیا۔ خدا نے اپنا فضل کیا۔ جبکہ تمہیں میری وجہ سے اس قدر پریشانی ہوئی تو مجھے چاہیئے کہ خدا کے فضل کا بھی ذکر کروں۔

بڑھاپے کی وجہ سے اب کی بیماری میں زیادہ اندیشہ رہا اور معمول سے زیادہ تکلیف ہوئی۔ اسی تکلیف کے سبب رات کو تمہاری بی بی اور عورتوں کو جگایا۔ ایک دفعہ گھبرا کر نیچے چلا گیا۔ رات کو خواب میں دیکھا کہ مر رہا ہوں اور والدِ ماجد مرحوم نے مجھے زمین پر سے اٹھا کر گود میں لیا اور زبانِ مبارک سے فرمایا:

"افسوس! کیسا اچھا لڑکا مر رہا ہے!"

یہ آواز میرے کان میں صاف صاف آئی اور ابھی وہ مجھے سنبھالے ہوئے تھے کہ میری آنکھ کھل گئی

میں گھبرا کر نیچے چلا گیا —— میں نے کبھی والد ماجد کو اپنی طرف سے اس قدر خوش نہیں دیکھا تھا باپ کا خوش ہونا میری نگاہ میں ہزار بہشت اور لاکھ نعمت سے بہتر ہے۔ جس محبت اور پرورش و الطاف سے میں نے ان کی زبان سے یہ لفظ سُنے، میں قیامت تک نہیں بھولنے کا۔ قیامت میں بھی لفظ میری نجات کا ذریعہ ہوں گے۔ اب مجھے کامل یقین ہے کہ دین و دنیا میں میرا بیڑا پار ہو گیا۔ دین کا ثبوت دیکھ لو کہ جس کا باپ بیٹے سے خوش ہو اس کی خوش نصیبی میں کیا شک ہے رہا دنیا کا معاملہ، یہ بھی میرے باپ کے صدقے میں ایسا گزرا کہ خدا سب کو نصیب کرے۔ اب میں خوش ہوں۔ تم بھی میرے ساتھ خوش ہو۔

تم اس خط کو رکھ چھوڑنا تاکہ میرے اعتقاد کا گواہ رہے اور میری وصیت یاد رکھنا کہ والد ماجد کی پائنتی مجھے گاڑ دینا اور ان کے کٹہرے سے ملا دینا۔ اس کے بعد مجھے کوئی تمنا نہیں۔ لوح پر اگر تم کرا سکو تو یہ شعر کندہ کرا دینا ؎

جائیم بروئے واقعہ پہلوئے او کنید
او قبلۂ من است رُخم سوئے او کنید

میر ناصر علی کا کتب خانہ دلّی کے چند گراں قدر کتب خانوں میں سے ایک تھا۔ مکان کا پورا حصّہ "کتب خانہ" کہلاتا تھا۔ چاروں طرف سنگین اور بلوریں الماریاں لگی ہوئی تھیں جن میں سینکڑوں نادر قیمتی قلمی نسخے اور ہزاروں لاکھوں فارسی، عربی، انگریزی کی کتابیں تھیں۔ اس کتب خانے کی ترتیب سے متعلق ایک خط سنئے:

(۲)

بیٹا!

میری ایک آرزو یہ ہے کہ کتب خانے والا مکان تکلف سے آراستہ ہو جائے اور میں دن رات وہیں پڑا رہوں۔ تم اگر ساتھ چائے پینے آ جاؤ تو کیا کہنا، مگر کوئی معمولی ذکر کسی کا نہ ہو۔ کھانا جب بھوک لگے پکا پکایا مل جائے اور لڑکیوں میں سے کوئی آ کر کھلا جائے۔ کوئی نایاب کتاب یا چیز نظر آئے تو مجھے اتنا مقدور ہو کہ فوراً خرید لوں۔ رات کو بے فکر سوؤں اور صبح خوش اٹھوں کوئی مسئلہ فلسفی کا جو سمجھ میں نہ آتا ہو اسے سمجھ لوں اور دوسروں کو سمجھا سکوں۔ دنیا کی جتنی کتابیں دل و دماغ کو خوش کر سکیں سب میرے پاس ہوں۔ جاڑے میں انگیٹھی ہو اور گرمیوں میں برف۔ برسات میں کمرے کے اندر بیٹھا ہوں اور وہ ٹپکتا نہ ہو۔ رات کو جلانے کے واسطے خوبصورت CANDLE STICK کی روشنی ہو اور جو کتاب مجھے پسند ہو وہ میرے سامنے ہو
تم اتنا سامان میرے لئے کر دو تو I WILL DIE HAPPY!

کشادہ صحن کے دوسری جانب اس برآمدے میں ایک بڑی سی میز جو آپ دیکھ رہے ہیں، بس یہی "صلائے عام" کا دفتر تھا۔ اس کے برابر کا

کمرہ میر صاحب کے سونے کا کمرہ تھا۔ اسی میں چالیس برس تک آرام فرماتے رہے اور آخر اسی میں ابدی نیند سو گئے۔ برابر والا بڑا کمرہ ان کا عجائب خانہ تھا۔ مرحوم کو نوادر سے گہری دلچسپی تھی۔ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر عجیب وغریب نادر الوجود چیزیں جمع کرتے تھے۔ آمدنی کا بیشتر حصّہ اسی شوق کی نذر ہوتا تھا۔ مرحوم فنونِ لطیفہ، بالخصوص مصوّری اور کتابت کے جیّد نقاد بھی تھے۔ ۱۹۱۲ء میں دربار کے موقع پر جب قلعہ معلّیٰ کے عجائب خانے کی تنظیم و ترتیب ہوئی تو مرحوم اس کی انتظامیہ کمیٹی کے نائب صدر نامزد کئے گئے۔ آپ کو ملک معظم جارج پنجم کی بارگاہِ سلطانی میں بھی پیش ہونے کا شرف حاصل ہوا ——— ہمارے ہوش میں تو یہ بڑا کمرہ اکثر بند ہی رہتا تھا کسی کو اس میں جانے کی اجازت نہ تھی۔ میر صاحب خود بھی زیادہ تر برابر والی کوٹھڑی میں لکھتے پڑھتے تھے بالخصوص جاڑوں میں۔ یہ کوٹھڑی انہیں تھی بھی سب سے زیادہ پسند ——— یہ خط سُنئے:

(۳)

بٹیا!

یہ مہینہ دسمبر کا ہے، جس کے آخر میں تم آؤ گے۔ اس میں اب تھوڑے دن باقی ہیں پھر بھی میں بہانے ڈھونڈھا کرتا ہوں کہ جب تک تم آؤ تم سے باتیں کرنے کا کوئی حیلہ نکل آئے۔ کل لالہ سری رام کا خط ولایت سے آیا جس میں انہوں نے لندن کا مفصل حال لکھا ہے۔ مگر میں نے ولایت تو درکنار سمندر، جہاز، کلکتہ، بمبئی، مدراس وغیرہ بھی نہیں دیکھے۔ مجھے تمام دنیا میں ہندوستان، ہندوستان میں دلّی، دلّی میں فراش خانہ، فراش خانے میں اپنا گھر اور اس گھر میں یہ کوٹھڑی پسند ہے۔ جس میں انگیٹھی جل رہی ہے اور بجلی روشن ہے۔ میں انگیٹھی سے چمٹا ہوا بیٹھا ہوں۔ اخبار، رسالوں اور کتابوں کا ڈھیر ہے۔ ایک کتاب سے جی ہٹا تو دوسری اٹھا لی اور سب سے گھبرا گیا تو گدّے پر پڑ رہا ......"

اسی کوٹھڑی میں اور اسی گدّے پر میں نے بارہا میر صاحب کو بارگاہِ ایزدی میں سربسجود گریہ و زاری کرتے دیکھا، مرحوم صوم و صلوٰۃ کے پابند نہ تھے لیکن معبودِ ایزدی سے انہیں سچی اور گہری عقیدت تھی۔ باقاعدہ نماز کبھی کبھی پڑھتے تھے لیکن دُعا اکثر کیا کرتے تھے۔ جامع مسجد دہلی کا روزانہ کا پھیرا جب تک ہاتھ پاؤں نے ساتھ دیا، کبھی ناغہ نہ ہوا۔ ضعیفی کے باوجود ساری سیڑھیاں طے کر کے اوپر جاتے اور منبر کے پاس پہنچ کر دعا کرتے۔ راست بازی، صاف دلی، نیک نیتی اور رحم دلی، یہ چند اوصاف ان کے خمیر میں داخل تھے۔ مخلوقِ خدا سے نیکی اور بھلائی کو جزو ایمان سمجھتے تھے۔

لباس میں آرائش زیبائش سے انہیں نفرت تھی۔ ہمیشہ صوفیانہ لباس مرغوب رہا۔ نیچے دامن کا کُرتا، اس پر انگرکھا یا چغہ، سیدھا سادہ عمامہ خاص مواقع پر یہ لباس پہنتے ورنہ محض کُرتا اور پاجامہ اور سر پر گول وضع کی ٹوپی گلے میں پٹکا، بس یہی ان کا لباس تھا۔

قد خاصا دراز، جسم دُہرا، رنگ کھلتا ہوا گندمی، چہرہ صاف اور بھرا بھرا بارعب، بلند پیشانی، بھویں جُدا اور ہلالی شکل کی، آنکھیں درمیانہ، ڈاڑھی مختصر اور گول، سر کے بال خشخاشی، چہرہ عام طور پر مسکراتا رہتا اور مجموعی ہیئت سے شرافت اور نیک دلی ٹپکتی تھی۔ آواز متوسط بلکہ ایک حد تک دھیمی۔ تیزی سے بولتے تھے آخر عمر میں کچھ اونچا سُننے لگے تھے۔ بینائی کمزور ہوگئی تھی اور ہاتھ میں کچھ رعشہ آگیا تھا۔ لیکن لکھنے پڑھنے سے آخر عمر تک کبھی معذور نہیں ہوئے ——— آئیے! اب اس زیارت کدہ سے رخصت ہوں۔

یہ تھے میر ناصر علی کے مختصر حالاتِ زندگی ——— ذکر چونکہ زیادہ تر ان کی شخصیت اور حالات کے باب میں تھا اس لئے اپنی نسبتِ خصوصی کی

وجہ سے، بڑی بھلی جیسی بھی بن پڑیں یہ باتیں مجھے عرض کرنا پڑیں، نادم ہوں کہ اسی تعلق کی وجہ سے اس بیان میں کہیں کہیں اعتقادی سی آمیزش اور کہیں کہیں ذاتی جذبات کی جھلک آگئی۔ میرے لئے اس سے یکسر گریز بھی ممکن نہیں تھا۔ باور کیجئے کہ اس ضمن میں میرا ذکر محض اتفاقی ہے، اس میں اپنی تشہیر ہرگز ہرگز مقصود نہ تھی۔ چونکہ خاندانی حالات تھے اس لئے کہیں کہیں یہ ذکر آ گیا اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ کوئی دوسرا ان باتوں کو بیان بھی نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ جہاں تک ان کی ادبی خدمات اور علمی مرتبے کا تعلق ہے ان کا تذکرہ ان لوگوں کی زبانی ہی مناسب معلوم ہوتا ہے جو مجھ سے ہزار درجہ افضل طریق پر ان کے صحیح مرتبے سے آپ کو روشناس کرا سکتے ہیں۔ جا بجا سے بعض بزرگوں اور دیگر مشاہیر کی تحریروں سے چند مقامات پیش کرتا ہوں۔ ان میں سے بعض میر صاحب مرحوم کے ہمعصر اور ہم مشرب تھے اور اب خود بھی جنت الفردوس کے مکیں بن چکے ہیں۔ ان کی تحریریں بجائے خود تبرک ہیں اور بعض وہ ہیں جنہوں نے جدید اقدار کے حساب سے ان کے لٹریچر کی خوبیوں کا محاکمہ کیا ہے۔ ان سب کے لائقِ تعظیم نام ہی ان آراء کی استقامت کی کافی ضمانت ہیں۔ مجھے ان پر کسی قسم کی حاشیہ آرائی کی بھی مجال نہیں:

ریاض خیر آبادی مرحوم:-

”جب تک اُردو لٹریچر کو بقا ہے، خان بہادر سید ناصر علی کے نام کو بھی ہے۔ غالبؔ سے زیادہ انشا پردازی میں انہوں نے نام پیدا کیا۔ غالبؔ اپنی طرز کے موجد تھے، یہ اپنی طرز کے۔ سر سید مرحوم نے ان کو ہمیشہ ”ناصحِ مشفق“ لکھا۔ ان کے متبعین و حواریّین و معاصرین نے ان کا لوہا مانا۔ ساٹھ پینسٹھ برس میں انشا کے مختلف دور گذرے ان سے کسی نے مخالفت نہ کی۔ انتہا یہ کہ شعرا نے بھی ان کو مانا۔ مثال جو صرف بلند فکر شعراء کا حصہ ہے اس کے وہ بادشاہ تھے نہ کسی نظم میں ان کا جواب ملے گا نہ نثر میں۔ اس کے بعد ان کی نازک خیالی و شوخ نگاری، اسلوبِ بیان کی شستگی اور پاکیزگی، گو خاص خاص کے حصے میں بھی آئی، مگر ان سے کم۔

خان بہادر کے والہ و شیدا احمدی حسن اقتصادی نے جو اپنے مکتوب سے زندہ بن چکے ہیں ان کے نقطے نقطے کو ہمیشہ اپنے لئے مشعلِ راہ سمجھا۔ انہوں نے تقلید اً گو بہت امتیاز پیدا کیا اور ایک طور پر وہ اپنی طرز کے موجد بھی تسلیم کئے گئے مگر بلندیٔ خیال اور ندرتِ مثال کے ساتھ خان بہادر کے لئے زبان کی پاکیزگی اور شستگی اور برجستگی اوّل سے آخر تک ان تمام خصوصیات کی مالک رہی جو ان کی طبعی ذہانت اور بلند نظری نے قدرت سے حاصل کی تھیں، اچھے اچھے انشا پرداز ان کی تقلید سے عاجز تھے۔ مجھے تو رونا اس بات کا ہے کہ کوئی میرا قدر شناس اُس پایے کا باقی نہ رہا۔“

شاد دلگیر اکبر آبادی مرحوم:

”ارضِ تاج (آگرہ) سے ناصر علی کو ازلی نسبت تھی، جس زمانے میں بوڑھے سر سید نے علی گڑھ سے ”تہذیب الاخلاق“ نکال کر اپنے ادبی کارناموں کی دھوم مچا رکھی تھی اسی وقت یعنی ۱۲۹۶ھ میں جوان ناصر علی نے آگرہ سے رسالہ ”تیرھویں صدی“ اس شان سے نکالا کہ

نکلے جدھر سے وہ بھی چرچا ہوا کیا   اس طرح کا جمال ہو ایسا شباب ہو

یا دش بخیر ”تیرھویں صدی“ میں ناصر علی نے جس طرح دادِ سخن دی اسے دیکھ کر کافر ”مہدی“ کو

یہ جواہر پارے اُگلنے پڑے:

"تہذیب الاخلاق" کے ساتھ ساتھ آپ نے جس ٹھاٹھ سے دھوآں دھار مضامین لکھے اور سرسید کے لٹریچر پر جس سلیقے اور سخن گسترانہ شوخیوں سے آپ نے انتقادات کی بھرائی، سچ یہ ہے کہ وہ اردو لٹریچر کی جان ہیں۔ آج سنجیدگی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ میں نہیں جانتا ملک کے نامور اہلِ قلم آپ کے گذشتہ کمالات کی داد دیں گے۔ لیکن میں کھل کر کہتا ہوں کہ آپ نے اس وقت انشا پردازی کو چمکایا جب بہتوں نے قلم بھی ہاتھ میں نہیں لئے تھے۔ آپ کا ادبی مذاق اور خاص طرز کا مادۂ اختراعی دراصل آپ کے اوّلیات میں داخل ہونے کے لائق ہے۔ موجودہ نسل تمام تر "تہذیب الاخلاق" کے ادبی دور کی پیدا کردہ ہے، جب آپ کے لٹریچر کا شباب تھا اور یہیں سے اپنا مرتبہ دیکھ لیجئے۔"

چار پانچ سال بعد رسالہ "تیرھویں صدی" بند ہوا تو اس کا قائم مقام آگرہ ہی سے رسالہ "زمانہ" نکلا جس میں ناصر علی برابر اپنے لطائفِ ادبی سے دنیا کو مستفیض کرتے رہے۔

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اردو نثر میں حکیمانہ و شاعرانہ مضامین لکھنے کے موجد میر ناصر علی ہی ہیں۔ خود فرماتے ہیں:

"نہیں گمنام میں اہلِ سخن میں مرا نام ہے نامی انجمن میں"

رسالہ "دلگداز" کے کسی جھگڑے میں ایک دفعہ یہ بحث ہوئی کہ نثر میں حکیمانہ و شاعرانہ مضامین لکھنے کا موجد کون ہے؟ اس بحث کی وجہ یہ ہوئی کہ صاحبِ دلگداز کی طرف سے اس رنگ کے موجد ہونے کا دعویٰ ہوا تھا جس پر رسالہ ناول لکھنؤ ۱۹۳۰ء میں ایک مضمون لکھا جو اس وقت تو میری نظر سے نہیں گذرا، لیکن اتفاق سے اس وقت کا ایک رسالۂ مضامین ان دنوں میرے پاس آگیا جس میں کسی نے لکھا ہے:

"ہمیں خوب یاد ہے کہ اس رنگ کے مضامین سب سے پہلے ہم نے "تیرھویں صدی" کے صفحوں پر تخمیناً بیس پچیس برس اُدھر دیکھے تھے جو اس زمانے کے لائق نوجوان ناصر علی دہلوی کے زورِ قلم کا نمونہ تھے جنہیں دیکھ کر ہمارے معزز دوست ریاض خیرآبادی نے جو ایک چلبلی طبیعت کے آدمی ہیں اس رنگ کو اُڑایا اور اس کے، بہتے ہیں اپنی فطری شوخیوں کے سبب سے خوب ہی پھلے پھولے۔"

اس کے بعد اور ایسی ہی پیچ دار باتیں بیان کرکے لکھا ہے کہ:

"ان کے (صاحبِ دلگداز) اس رنگ کے موجد ہونے کا دعویٰ اس وقت تک صحیح نہیں ہوسکتا جب تک وہ مذکورہ بالا واقعات کو غلط نہ ثابت کردیں"

"میں وہی ناصر علی ہوں جس نے رسالہ "تیرھویں صدی" نکالا تھا مگر نوجوان نہیں رہا۔ اس وقت کا کوئی آدمی جوان رہا ہو تو میرا قصور۔ جوانی کے ساتھ وہ طبیعت بھی نہ رہی جس کی وجہ سے لکھنے پڑھنے

کا مشغلہ تھا۔ لکھنے کی تو میں نے مدت سے قسم کھالی ہے مگر پڑھنے کی عادت نہیں گئی۔ میں یہ دیکھ کر بہت خوش ہوں کہ جس غرض سے میں نے اردو میں لکھنا شروع کیا تھا، وہ غرض میری آرزو سے زیادہ پوری ہوگئی۔ اب مجھ سے بہت اچھے اچھے لکھنے والے نظر آتے ہیں، جن کی نظم و نثر سے اُردو میں جان پڑ گئی ؎

درمستان زدم تا حالِ ہشیاراں شود پیدا نہفتم قدرِ خود تا قیمتِ یاراں شود پیدا"

"زمانہ" بند کرنے کے بعد نصرت المطابع دہلی سے دو پرچے "ناصری" اور "افسانۂ ایام" اور نکالے۔ اس کے بعد مطبع ناصری سے ۱۹۰۶ء میں رسالہ "صلائے عام" شائع کیا جو مرتے دم تک برابر جاری رہا۔ (یعنی پچیس سال)

"تیرھویں صدی" اور "صلائے عام" کے لٹریچر کے متعلق خود میر صاحب کی رائے آپ کے سننے کے لائق ہے:

"جنہیں کوئی اعتراض نہیں ملتا وہ یہ کہہ اٹھتے ہیں کہ "صلائے عام" میں "تیرھویں صدی" کی سی شوخ بیانی نہیں۔ سچ پوچھئے تو "تیرھویں صدی" کو میں بھول چلا تھا۔ سمجھے ہوئے تھا کہ ایک خیالی بات کا قصہ چار پانچ سال تک چلا، بہت چلا۔ اگر کوئی خوبی اس میں تھی، وہ اس کے ساتھ ختم ہولی۔ "صلائے عام" کے سامنے "تیرھویں صدی" طبیعت کی محض امنگ کا نتیجہ تھی، اب پختہ "مغزانِ معانی" سے سابقہ پڑا ہے۔ آگے میں دوسروں کا حال اپنی زبان میں ادا کرتا تھا۔ جس طرح ڈرامے میں ایکٹر دوسروں کے رنج و سرور کی نقل کرتے ہیں۔ جنگل دیکھا نہیں اور قیس کا پارٹ کر رہے ہیں۔ پہاڑ دیکھا نہیں اور فرہاد بنے بیٹھے ہیں۔ اب میں اپنا حال اپنی زبان سے اس طرح ادا کر رہا ہوں جس میں تصنع کا نام نہیں۔ جو مجھ پر گذرتی ہے، میں جانتا ہوں کہ وہی اوروں پر گذرتی ہوگی۔ آگے جو جی میں آتا کہہ ڈالتا تھا اور کوئی ناپسند نہیں کرتا تھا۔ اب بہت سوچ کر لکھتا ہوں اور شکایت ہوتی ہے۔ آگے جو نہیں سمجھتے وہ بھی خوش ہوتے تھے، اب جو سمجھتے ہیں وہ بھی داد میں کمی کرتے ہیں۔ آگے شوخ بیانی پر چپ ہو جاتے تھے۔ اب متانت میں بھی عیب نکالتے ہیں۔ آگے جن باتوں کو میں بے سمجھے لکھ دیتا تھا، لوگ سمجھ جاتے تھے۔ اب سمجھا کر لکھتا ہوں اور سمجھنے والوں کے لالے ہیں۔ آگے واہ واہ تھی اب آہ آہ ہے!"

آہ! مہدی مرحوم کا یہ کہنا کس قدر سچ ہے:

"ملک میں اچھے لکھنے والے کم ہیں۔ ان میں بھی تھوڑے ہی ایسے ہوں گے جو آپ کے رنگ میں دو سطریں بھی لکھ سکیں۔ ریاض، برہم اور راشد الخیری کے دل سے پوچھئے، ناصر علی پھر کہاں؟ آپ کی زبان اپنے مختص النوع صفات کے ساتھ کسی اور کے بس کی چیز نہیں اور سچ یہ ہے کہ آپ اپنے فن کے اختصاصی (اسپیشلسٹ) ہیں۔ میں آپ میں یونانیوں کی سی لطافتِ خیال پاتا ہوں

آپ کی چشمِ سخن جہاں "جنسِ لطیف" اور اس کے متعلقات کی طرف اشارے کرتی ہے نزاکتِ خیال کی آخری حد ہے۔"

علامہ راشد الخیری مرحوم :-

"چمنستانِ جہاں آباد (دلّی) کی بہار جو ۱۸۵۷ء میں اُجڑ چکی تھی، علم و فضل جن کے قدم چومتا تھا، کمال جن کے روبرو دست بستہ تھا، مدتیں ہوئیں رخصت ہو چکے تھے۔ مگر ان کی نیرنگ صورتوں کو دیکھنے والی آنکھیں اب تک کھلی ہوئی تھیں جن کے ٹھنڈے سانس مٹنے والوں کی یاد میں کبھی کبھی دو آنسو گرا لیتے تھے، اب وہ بھی بند ہو رہی ہیں اور جن سدا بہار پھولوں کی شمیم انگیزیاں رستہ چلتوں کے دل کو مسحور کر لیتی تھیں، صحبتِ شب نے جن کو پارس اور جمالِ ہمنشیں نے جن کو کندن بنا دیا تھا، ان کے بھی چل چلاؤ کا وقت آ گیا، اور آج ہم کو چمنِ ادب کی بزمِ فانی کے اس گوہرِ درخشندہ کو وداع کرنا ہے جو ناصر علی کی ہیئت میں ہمارے سامنے جلوہ گر تھا جس کے قلم نے موتی لٹائے اور زبان نے پھول برسائے، جو کل تک ہمارے ساتھ تھا اور آج ابدی نیند سو رہا ہے۔

خان بہادر سید ناصر علی نے اردو ادب کی حقیقی خدمت کی ہے اور جو روش قریب قریب ستر برس پہلے شروع کی تھی، آخر تک اس پر قائم رہے۔

ان کی زندگی ہم کو اساتذہ کی جیتی جاگتی تصویر دکھا دیتی تھی۔ ان میں ذوق کی سنجیدگی، غالب کی تنک مزاجی اور داغ کی شوخیوں کی ایسی جھلکیں موجود تھیں کہ میں نے کئی مرتبہ اس کا لطف اٹھایا...."

خواجہ حسن نظامی مدظلہ :-

"خان بہادر مولوی ناصر علی دہلی کے موجودہ دورِ انشا پردازی میں قدیمی بزرگوں کی یکتا، اور بے نظیر و بے مثل یادگار تھے، ان کی صورت میں قدامت تھی، لباس میں قدامت تھی، بولنے میں قدامت تھی۔ یہاں تک کہ جب وہ کسی کی بات سنتے تھے یا کسی کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے تھے تو اس میں بھی ایک عجیب موثر ادا قدامت کی ہوتی تھی۔

ان کی معلومات کا یہ حال تھا کہ جس فن کی کتاب ہاتھ میں لیتے اس فن کی بے شمار کتابوں اور مصنفوں کے حالات بیان کر ڈالتے تھے۔ اعلیٰ درجے کے انشا پرداز، تیزی سے لکھنے والے، تیزی سے بولنے والے استدلال میں کسی سے نہ دبنے والے، اپنے آگے کسی کو نہ گردانتے والے، نہایت وضعدار و خوددار فاضل اور علم کے رسیا، عالی دماغ اور ہنس مکھ، نیک اور روشن ضمیر فقیر منش انسان تھے۔

دہلی میں مجھ جیسے چند لکھنے والے خواہ کسی قسم کے تعلّی آمیز دعوے اپنے مخصوص طرزِ تحریر کی نسبت کریں لیکن جو بات مولوی ناصر علی کی تحریر میں تھی وہ ہم میں سے کسی کو بھی میسر نہیں، ان کے رسالے کا نام "صلائے عام" تھا۔ مگر جب نہ "یار" رہے نہ "نکتہ داں" رہے تو صلائے عام

کے ایڈیٹر دنیا میں کیوں رہتے ؟"

مولانا نیاز فتح پوری مدظلہ :-

"(خان بہادر) میر ناصر علی سے میرا تعارف (مرئی نہیں بلکہ قرطاسی) اوّل اوّل ۱۹۱۰ء میں ہوا تھا۔ "صلائے عام" کا شباب تھا اور میرا بھی، لیکن اس فرق کے ساتھ کہ میں اس کا پرستار تھا اور وہ میرا معبودِ خیال۔

میر ناصر علی کی تحریر کا اثر مجھ پر کیا ہوتا تھا اور کیوں، اس وقت تو میں اس سکر و مخموری کا کوئی سبب متعین نہ کر سکا تھا۔ لیکن اب میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کا اصل راز صرف یہ تھا کہ قلم سے لکھنے والے تو بہت ہیں لیکن دل سے لکھنے والا صرف ایک ناصر علی ہی تھا۔

افسوس ہے کہ فطرت نے ایک ہی شخص اس رنگ کا لکھنے والا پیدا کیا اور اسی کے ساتھ وہ رنگ ہمیشہ کے لئے مٹ گیا۔"

مولانا سیماب اکبر آبادی مرحوم :-

اے چراغِ بزمِ روشن کی ضیائے آخری
گلشنِ دہلی کی اے رنگیں صدائے آخری

گھل گیا سوزِ دروں سے شمعِ سوزاں کی طرح
رخصت آخر ہو گیا دُودِ پریشاں کی طرح

داغِ تو اُردو کے صد پارہ جگر کو دے گیا
آہ اپنا رنگ بھی تو ساتھ اپنے لے گیا

فلسفہ اب سادہ تر لفظوں میں سمجھائے گا کون
اب بساطِ ادبن پر پھول برسائے گا کون

اہلِ عالم کو نوا تیری "صلائے عام" تھی
جنبشِ لب ترجمانِ عقدۂ الہام تھی

بزمِ داغؔ و محفلِ غالبؔ خیابانِ نذیرؔ
سب کی رونق تجھ سے تھی اے یادگارِ سوز و میرؔ

ذہنِ شاعر کی ودیعت، عشق کے سینے کا راز
حُسن کی پنہاں حقیقت کیف و کم کا امتیاز

تھی امیں ان سب خزانوں کی تری فکرِ بلند
شوخیاں کرتی تھی بامِ عرش سے جس کی کمند

قلزمِ تحقیق میں بہتا چلا جاتا تھا تُو
تہہ سے طوفانوں کی، موتی ڈھونڈھ کر لاتا تھا تُو

سخت عنوانوں پہ دل میں چھپنے والے حاشیے
سینکڑوں نظموں سے بہتر چار ٹکڑے نثر کے

آہ، وہ اردو میں وارفتہ نگاری اب کہاں
حُسن کی مے میں حدیثِ بیقراری اب کہاں

اے مسافر! ہو ترا اللہ۔ ناصر! الوداع
اے جہان آباد کی آوازِ آخر! الوداع

سید وقار عظیم :-

میر صاحب مرحوم نے ستّر برس کے قریب اردو کی جو لگاتار خدمت کی ہے اسے اُردو زبان کبھی آسانی سے فراموش نہیں کر سکتی۔ ان کی تحریریں مُردہ دلوں کے لئے شگفتگی کا سامان فراہم کرتی رہیں۔

مہدی مرحوم نے شبلی کی پُر سحر نثر سے متاثر ہو کر کہا تھا کہ غالب زندہ ہوتے تو شبلی

کو ان کی اُردوئے خاصہ کی داد ملتی ہے۔ میں میر صاحب کی شگفتہ نثر کو دیکھ کر یہی کہنا چاہتا ہوں۔ وہ صحیح معنوں میں انشا پرداز ہیں۔ ان کی عبارتیں جہاں ایک طرف آزاد کی طرح رنگین و مسرت افزا ہیں وہاں شبلی کی طرح شگفتہ اور مدلّل بھی۔ لیکن ان باتوں کے باوجود بھی بات کو آسان سے آسان زبان میں پیش کرتے ہیں اس طرح کہ حُسن بھی برقرار رہے اور علمیت میں بھی کمی نہ آنے پائے۔

عموماً رنگین اور شگفتہ تحریروں کا خاصہ ہوتا ہے کہ وہ صرف اپنی رنگینی اور لطافت کے لئے پسند کی جاتی ہیں۔ انہیں لوگ صرف اس لئے پڑھتے ہیں کہ زبان تھوڑی دیر اس کے چٹخارے لے اور بس۔ دماغ اور روح اس سے کوئی خاص اثر نہیں لے سکتے۔ آزاد کی تحریریں نثر میں دلکش شاعری کی بہترین مثال ہیں۔ لیکن اکثر اوقات دل اور آنکھیں اپنی بالیدگی کے سامان میں اس قدر منہمک ہو جاتے ہیں کہ دماغ اور روح کے لئے ان میں کم از کم تھوڑی دیر تک کوئی حُسن یا لطف باقی نہیں رہتا۔ لیکن میر ناصر علی مرحوم گو نثر میں شعر کہتے ہیں مگر ایک ادیب کی طرح وہ اپنے مقصد کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ بات اگر شاعرانہ ہے تو بیان مدلّل۔ بیان اگر شگفتہ اور رنگین ہے تو نفسِ مضمون حکیمانہ جس کے ہر لفظ سے ادبیت اور علمیت ٹپکتی ہے۔ گویا شاعری اور فلسفے نے ایک شکل اختیار کر لی، اللہ رے حُسن .... لیکن زیادہ حیرت اس وقت ہوتی ہے جب فلسفی اور شاعر تاثر اپنی تحریروں میں مزاح کی چاشنی ملا دیتا ہے۔

ان خصوصیات کے علاوہ ان کی ایک خوشگوار خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے بیان کو کسی شعر پر ختم کرتے ہیں، یہ طرزِ تحریر گو پرانا ہے لیکن میر صاحب نے اسے بادۂ کہن بنا دیا، اس میں اور زیادہ کیف اور سرمستی پیدا ہو گئی۔ لوگ اس رنگ پر سر دُھننے لگے۔ اس کی خاص وجہ ان کا اشعار کا انتہائی موزوں انتخاب اور نہایت برجستہ استعمال ہے۔ انہوں نے قدیم اور جدید دونوں رنگوں کو اس طرح شیر و شکر کیا کہ اردو انشا میں ایک نیا رنگ پیدا ہو گیا جو صرف انہی سے خاص تھا۔ دنیا ان کی شگفتہ اور رنگین، شوخ اور عالمانہ عبارتوں کو پڑھے گی اور سر دُھنے گی۔ اس جدّتِ بیان پر اردو ہمیشہ ناز کرتی رہے گی اور ان کی ذاتِ والاصفات کے لئے ہمیشہ ماتم!!

شاہد احمد دہلوی مدیر "ساقی":-

"خان بہادر میر ناصر علی مرحوم نے فارسی، عربی اور انگریزی اور فرانسیسی لٹریچر کا بہت وسیع مطالعہ کیا اور اردو میں ایسے مضامین لکھے جو اپنی حلو خیالی اور نزہتِ بیان کی وجہ سے آپ اپنا جواب ہیں۔ خالص ادبی اور شاعرانہ قسم کے مضامین میں فلسفے اور غور و فکر کی چاشنی میر صاحب ہی نے دی اور مغربی لٹریچر کے اثر سے اردو ادب کو گہرے فکر سے روشناس کیا اور ایک نئی شاہراہِ خیال وضع کی، مطالب و معانی فلسفیانہ اور حکیمانہ، وہ بھی جدید سے جدید قسم کے اور اندازِ بیان خالص مشرقی، وہی تشبیہیں، وہی استعارے۔ یہ انہی کا کمال تھا۔ اس اعتبار سے وہ پہلے انشا پرداز

ہیں جو نہ صرف صاحبِ طرز ہیں بلکہ وقیع تھنکر (مفکر) بھی تھے۔

ان کے بے مثل، مدلل اور شگفتہ اسٹائل کی مثال اپنی زبان میں بالکل نئی اور خاصے کی چیز ہے، انگریزی اور دیگر مغربی زبانوں میں اسٹائل کو لٹریچر کی جان سمجھتے ہیں۔ ہماری زبان میں اس پر بہت کم زور دیا گیا بالخصوص نثر میں۔ نظم میں البتہ اچھے اچھے اندازِ بیان اختیار کئے گئے۔ اساتذہ کا کلام دیکھ لیجئے کہ ایک ہی موضوع پر لکھنے کے باوجود ہر استاد کا کلام دوسرے سے جُدا نظر آتا ہے۔ انیسؔ و دبیرؔ میرؔ و مرزاؔ، آتشؔ و ناسخؔ کی جُداگانہ خوبیاں محتاجِ بیان نہیں مگر نثر میں اس کی کمی رہ گئی اور اب تک یہ کمی چلی جاتی ہے۔ ہماری زبان میں نثر نگاری کی ابتدا بھی نظم کی طرح فارسی کی تقلید میں ہوئی مگر نظم کو یہ بات راس آگئی اور نثر میں نہ نبھ سکی۔ اردو نثر کے لئے انگریزی نثر زیادہ مناسبِ حال ثابت ہوئی (بلکہ ایک محقق نے تو یہ بھی ثابت کر دکھایا کہ انگریزی لٹریچر ہی کی اثر اندازی سے اردو نثر کی ابتدا ہوئی) چنانچہ میر صاحب مرحوم نے بھی اپنے مضامین کے لئے مغربی لٹریچر کو نمونہ بنایا اور اردو میں بھی وہی وضع اختیار کی جو والٹیرؔ، بالزکؔ، ایڈیسنؔ، گولڈ اسمتھؔ، جانسنؔ وغیرہ ادیبوں نے اختیار کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مضامین میں ایسے خیالات کی کثرت ہے جن سے اُردو زبان قطعاً نا آشنا تھی اور طرزِ بیان ایسا اچھوتا اور دل میں کھُب جانے والا کہ ذرا بھی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی، چھوٹے چھوٹے سیدھے سادے فقرے اور بات بات پر شعر۔ جو لکھتے تھے وہی بولتے تھے۔ تقریر و تحریر یکساں فلسفیانہ نکتہ سنجیوں اور دلکش بیان سے ان کی معمولی باتیں بھی خالی نہ ہوتیں۔ وہی شوخی اور دبی دبی سی بذلہ سنجی، تبحرِ علمی کے باوجود کہیں اغلاق نہیں بلکہ ایک متین سی مسکراہٹ بات بات میں رچی ہوئی ہے۔"

غالباً ان چند اقتباسات سے آپ کے ذہن میں میر ناصر علی کے علمی و ادبی مقام کا کچھ نہ کچھ سرسری سا خاکہ ضرور مرتب ہو چکا ہوگا، ان سے غرض بھی یہی تھی کہ ان کی شخصیت سے آپ اجمالی طور پر متعارف ہو جائیں۔ ان کے لٹریچر کی جملہ خوبیوں کا محاکمہ اور ان نکات کی افہام و تفہیم جن سے ان کے وہ شمائلِ باطنی تعبیر ہیں جس کا مظہر ان کا دل پذیر اسٹائل ہے، ان سب کے لئے لمبی فرصتیں اور ایک دو مضمون نہیں بلکہ کتابیں درکار ہیں۔ تب تک اسی بیان پر اکتفا کیجئے، جو مختصر ہونے پر بھی خاصا طویل ہو گیا۔

ہاں، اس سلسلے میں ایک جواب طلب سوال ضرور سامعین کے دل میں اُبھرا ہوگا کہ میر ناصر علی کے مضامین کا انتخاب اب تک کیوں نہ شائع ہو سکا۔ اس کی جواب دہی یقیناً مجھ پر عائد ہوتی ہے۔ لیکن یہ بھی ایک دلخراش داستان ہے "حقیقتاً" واقعاتی و حادثاتی "محض" عذرِ گناہ" نہیں "مختصراً" عرض ہے کہ کئی کئی بار ان کے مضامین کے انتخاب ہوئے۔ نقول نہیں۔ کتابت ہوئی، کاپیاں تک مرتب ہو گئیں اور بعض حادثوں کی وجہ سے "تلف ہو گئیں"۔ آخری بار یہ ساری متاعِ عزیز فسادات میں ضائع ہو گئی۔ پھر سے اوراقِ پارینہ جمع کرنے کی سعی کی گئی۔ اس درمیان میں حالات بدل چکے تھے، پوری قوم کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا۔ کتب خانے کے کتب خانے تلف ہو گئے۔ بھلا معمولی جلدوں اور فائلوں کا کہاں نشان رہتا۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح جو بھی مل سکا پھر سے حاصل کیا گیا اور اب "مقالاتِ ناصری" یعنی میر ناصر علی کے مضامین کا انتخاب زیرِ تدوین ہے۔ حالات سازگار رہے تو قوم کا یہ بے بہا سرمایہ جو میرے پاس امانتاً محفوظ ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی پیشِ خدمت ہوگا۔

مولانا راشد الخیری

فضل احمد خان دہلوی

دلّی بازار کھاری باؤلی گلی بتاشان کوچہ نواب مرزا میں قدیم الایام سے علماء کا ایک خاندان آباد تھا جس کے بزرگ وقتاً وقتاً میں عرب سے آئے تھے اور حکومتِ وقت نے شاہزادوں کی تعلیم و تربیت ان کے سپرد کی تھی۔ اسی خاندان سے مولانا راشد الخیری متعلق تھے۔ دورِ آخر میں اس خاندان کے شاگرد و خویش یعنی داماد بھائی شمس العلماء مولانا حافظ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب مرحوم تھے جو مولانا راشد الخیری کے حقیقی پھوپھا تھے۔ شمس العلماء مولوی نذیر حسین صاحب مرحوم جن کے انتقال کو کچھ اوپر ساٹھ برس ہو گئے ہیں اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مولانا علم حدیث کے بڑے ماہر تھے۔ عمر بھر درس و تدریس کا شغل رہا۔ ان کا اسمِ گرامی اہلِ حدیث حضرات کے علم دوست طبقہ کو شاید آج بھی یاد ہو۔ مولانا راشد الخیری کے والدِ ماجد ریاست حیدر آباد میں ایک وقیع عہدہ پر مامور تھے اور حقیقی چچا خان بہادر مولوی عبد الحامد صاحب مرحوم یو۔پی میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ حضرت سر شیخ عبد القادر صاحب مرحوم نے رسالہ مخزن بابت ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۰۷ء کے صفحہ ۶ پر ان خان بہادر صاحب کو "علم دوست بزرگ" کہا ہے۔ اوّل تو مولانا مرحوم عمر میں مجھ سے دس بارہ سال بڑے تھے پھر ان کی سکونت دلّی میں میرے مکان واقعہ کوچہ چیلان دریا گنج سے کافی فاصلہ پر تھی۔ بدیں وجہ مولانا کے اوائل عمری کے حالات کا مجھے زیادہ علم نہیں۔ مولانا خود ہی کبھی کبھار دوستوں کی صحبت میں اس عہد کے لطائف اور پُر کیف حالات سُنایا کرتے تھے۔ طالب علمی کے زمانہ میں ان کے دوست، یارِ غار، اور ہم عمروں میں ایک تو قاری سرفراز حسین صاحب عزمی تھے جو بڑے لطیفہ گو اور بذلہ سنج بزرگ تھے اور میں نے ان کو خوب دیکھا۔ یہ قاری صاحب اپنے زمانہ میں مختلف حیثیتوں سے معروف رہے اگرچہ مدت العمر سپلائی اینڈ ٹرانسپورٹ کے دفتر واقع نینی تال میں ملازم رہے مگر ملازمت کے ساتھ ساتھ تحریر کا شغل بھی جاری رہا۔ انہوں نے چند ناول بھی لکھے جن میں "سعید" "سعادت" وغیرہ کے نام مجھے یاد ہیں۔ دو ایک رسالے حقانیتِ اسلام پر ان کے شائع ہوئے۔ سنہ ۱۹۱۲ء کے لگ بھگ ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک ولولہ اٹھا کہ جاپان میں اشاعتِ اسلام کیجئے چنانچہ حضرت علامہ اقبال مرحوم نے بھی اس خیال کی تائید کی اور اس مقصد کے لئے جاپان جانے پر آمادگی کا اظہار کیا اس وقت قاری سرفراز حسین صاحب نے اس بات کا جائزہ لینے کیلئے کہ وہاں کے حالات اس مقصد کے لئے کہاں تک سازگار ہیں، جاپان کا سفر کیا۔ یہ قاری صاحب بھی مولانا کے انتقال سے چند سال قبل انتقال کر گئے تھے۔ جب تک جئے مولانا سے رابطے ضابطے باقی رکھے۔ مولانا کے دوسرے ہمجولی ان کے پھوپھی زاد بھائی مولوی اشرف حسین صاحب مرحوم تھے جو مولانا حالی سے شرفِ تلمذ رکھتے تھے۔ ان کو شعر فہمی کا بڑا ملکہ تھا لیکن خاموش طبیعت کے انسان تھے۔ لکھنے لکھانے کا شوق نہ تھا۔ آخر میں سب رجسٹرار بلند شہر

تھے وہیں سے پنشن یاب ہوئے۔ مولانا راشد الخیری [illegible] شعر فہمی کے قصے اکثر سُنایا کرتے تھے مولوی اشرف حسین صاحب کی شعر فہمی کا اندازہ ان کے اس دیباچہ سے ہوتا ہے جو انہوں نے مثنوی میر حسن یعنی سحرالبیان پر لکھا تھا۔ یہ دیباچہ پچاس پچپن صفحات پر تھا اور خوب ہی خوب تھا۔ مثنوی مذکور ان دنوں بازار میں ٹکے تین پیسہ کو بکا کرتی تھی۔ کاغذ ردّی، لکھائی چھپائی ناکارہ، کتابت طباعت کی غلطیوں سے پُر ہوا کرتی تھی۔ مثنوی کی اس زبوں حالی کو دیکھ کر شیخ عبدالقادر صاحب مرحوم کو مثنوی کا عمدہ ایڈیشن معہ سیر حاصل دیباچہ کے مخزن پریس دلّی سے شائع کرنے کا خیال ہوا تو انہوں نے اس سلسلہ میں مولانا راشد الخیری سے بھی مشورہ کیا۔ مولانا نے اس دیباچہ کے لئے مولوی اشرف حسین صاحب کو موزوں بتایا اور کہا کہ اگرچہ وہ لکھنے لکھانے کے عادی نہیں تاہم یہ کام میں ان سے ضرور لوں گا۔ مولانا راشد الخیری کے اصرار پر مولوی اشرف حسین صاحب نے پچاس پچپن صفحہ کا دیباچہ مثنوی پر لکھا، اور بے مثل لکھا۔ شیخ صاحب مرحوم نے اس دیباچہ کا کچھ حصہ بطور نمونہ رسالہ مخزن بابت ماہ فروری ۱۹۰۶ء کے شروع کے آٹھ صفحوں پر نقل کیا ہے اور اس پر گیارہ سطروں کا نوٹ بھی لکھا ہے۔ فرماتے ہیں:

"اس دیباچہ کے پڑھنے سے مثنوی کی ایک نئی شان نظر آتی ہے۔ سادہ سادہ
اشعار میں ایسے ایسے نکات اور معانی نکالے ہیں کہ بلبل [illegible] ادیب پڑتی ہے" وغیرہ وغیرہ۔

مولانا راشد الخیری کے تیسرے ساتھی مرزا محمد اشرف گورگانی تھے جو ریاست بہاولپور [illegible] زیرِ تعلیم ہو کر ریٹائر ہوئے تھے راقم نے ان کو بھی دیکھا ہے بڑے ہنس مکھ، زندہ دل اور وسیع معلومات رکھنے والے بزرگ تھے۔ یہ تینوں حضرات [illegible] راشد الخیری سے قبل ہی انتقال کر گئے تھے۔ ان کو مرے کچھ قرنوں گذر گئے۔ شاہجہان آباد کے قبرستانوں میں ان کے جسدِ خاکی کی آخری آرامگاہوں [illegible] پے مہر زمانہ ملیامیٹ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ وہ آج مدح کی شادمانیوں اور ذم کی کاوشوں سے آزاد اور بے نیاز ہیں۔ مولانا کے خاندان اور ان کے یارانِ غار کا ذکر اس غرض سے کیا گیا ہے کہ وہ ماحول دکھایا جائے جس میں مولانا نے آنکھ کھولی، پرورش پائی اور وہ فضا جس نے انہیں متاثر کیا اور وہ صحبتیں جو ان کو میسّر ہوئیں۔ مولانا نے نوکری سے زندگی کی ابتدا کی۔ باپ چچا نوکری کر رہے تھے۔ چوکڑی میں سے تین یار مولوی اشرف حسین صاحب، قاری سرفراز حسین اور مرزا محمد اشرف صاحب نوکریاں کر رہے تھے مولانا نے بھی نوکری ہی کی۔ لیکن خاندانی تاثرات کی بنا پر کبھی کبھی وعظ بھی کر لیا کرتے تھے جو ہم نے نہیں سُنا۔ لیکن تقریر کی صلاحیت تحریر سے کم تھی، اور تحریر کے لئے بھی کسی کے پیٹھ ٹھونکنے کی ضرورت تھی، اس کے لئے سر شیخ عبدالقادر صاحب مرحوم کو اللہ نے ملوا دیا جنہوں نے بیرسٹری کا امتحان پاس کرنے کے بعد دلّی میں وکالت شروع کر دی تھی اور دفتر مخزن بھی لاہور سے دلّی میں منتقل ہو گیا تھا۔ مولانا مخزن کے پرانے مقالہ نویس تھے۔ دلّی میں مخزن کے پہنچنے کے بعد جناب شیخ عبدالقادر صاحب نے مولانا کی حوصلہ افزائی کی جو اس قسم کی حوصلہ افزائیوں میں بے مثل تھے۔ اب کیا تھا مولانا نوکری کو چھوڑ چھاڑ ادارہ مخزن کے رُکن بن گئے۔ میری مولانا سے ملاقات ان کی ملازمت کے زمانہ ہی میں ہوئی۔ جولائی ۱۹۰۶ء میں جب میں ملازمت کے سلسلہ میں دفتر صاحب ڈپٹی اکونٹنٹ جنرل پوسٹ ٹیلیگراف دلّی میں حاضر ہوا ہوں تو مولانا وہاں موجود تھے۔ اس وقت سے لے کر ان کے انتقال کے وقت تک جو ۱۹۳۶ء میں ہوا ہے میرے ان کے تعلقات روز بروز زیادہ ہی ہوتے گئے۔ میری ان کی تیس سال بڑی گاڑھی چھنی۔ اس طویل زمانہ میں کبھی کبھار ہنسی میں کھنسی کلیل میں غلیل ہو جاتا کون تعجب کی بات ہے لیکن اس کی مدت کبھی دس بارہ گھنٹہ سے زیادہ متجاوز نہ ہوئی۔ مولانا کو تلخی، بدمزگی، رنج والم، غم وغصہ سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ وہ ہم سے ملنے سے قبل اپنا ددھیالی محلّہ کھاری باؤلی گلی تاشہ چھوڑ کر اپنے ننھیالی محلّہ کوچہ چیلان کلاں محل میں آ گئے تھے جو ہمارے مکان سے بہت قریب تھا۔ زاں بعد وہاں سے بھی انتقال مکانی کیا۔ اب میرے اور واحدی صاحب کے گویا پڑوسی اور ہمسایہ ہو گئے۔ اس قربِ مکانی نے تعلقات کی پینگوں میں دن دونا رات چوگنا اضافہ کر دیا۔ ان ایّام ۱۹۱۴ء کے لگ بھگ مولانا نیاز فتحپوری "نگار" لکھنؤ کے مالک دلّی تشریف لائے اور کافی عرصہ واحدی صاحب کے ہاں رہے کچھ عرصہ بعد نیاز صاحب کے دوست مولانا عارف ہسوی مرحوم ان سے ملنے دلّی آئے اور واحدی صاحب کے ہاں وہ بھی مقیم ہوئے۔

ان دنوں واحدی صاحب کا دسترخوان احباب کے لئے کشادہ تھا۔ جو آگیا دنوں مہینوں رہا۔ نیاز صاحب نے دلّی میں بہت ہاتھ پاؤں مارے کچھ نہ ہوا۔ شریف منزل میں شریف خانی اطبا کے بچوں کے میاں جی بھی رہے۔ وہاں حکیم اجمل خان صاحب مرحوم مسندِ اقتدار پر تشریف فرما تھے لیکن نیاز صاحب کی توقعات پوری نہ ہوئیں اور ناکام واپس ہوگئے لیکن عارف صاحب دلّی میں ایسے رسے کہ مرکر ہی پیرا دیا۔ ان کو دلی راس آئی اور وہ دلّی میں کامیاب ہوئے ——— مولانا راشد الخیری کا نیاز صاحب سے ستارہ نہ ملا۔ اس لئے کہ مولانا نیاز بہت دور رس تھے اور دور کی کوڑی لاتے تھے۔ پھر تصنّع اور تکلف کا پشتارہ تھے۔ ان باتوں سے مولانا راشد الخیری کو کوئی نسبت ہی نہ تھی وہ سیدھے سادے بے تکلف انسان تھے۔ ظاہر باطن یکساں۔ بننے سے ان کو سخت نفرت تھی، نہ خود بنتے تھے نہ بننے والوں کو برداشت کر سکتے تھے۔ عارف صاحب، اللہ ان کی مغفرت کرے بہت خوش مذاق آدمی تھے۔ شعریت سے ان کو مناسبت تھی۔ شعر اچھا کہہ لیتے تھے۔ اگرچہ وطن ہسوہ ضلع فتحپور (یو۔پی) تھا لیکن تعلیم لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ یاروں کے یار تھے۔ ان کی مولانا راشد الخیری سے دانت کاٹی روٹی تھی۔ عارف صاحب اور مولانا راشد الخیری کی موت میں پندرہ سولہ دن کا آگا پیچھا رہا۔ پہلے عارف صاحب کا انتقال ہوا اور اس کے پندرہ سولہ دن بعد مولانا راشد الخیری کا۔ عارف صاحب کم و بیش سات آٹھ ماہ علیل رہے۔ لاعلاج مرض میں مبتلا تھے۔ منہ میں کینسر ہوگیا تھا۔ جب عارف صاحب علیل ہوئے تو مولانا اچھے بھلے تھے۔ چنانچہ جب عارف صاحب کی مزاج پرسی کے لئے جاتے تو واپسی پر واحدی صاحب کے ہاں اور میرے ہاں ہوتے ہوئے جاتے۔ ان کا حال احوال بیان کرتے اور اظہارِ تشویش کرتے۔ اس اثنا میں خود علیل ہوگئے اور اضمحلال نے شدّت پکڑی، آنے جانے کے قابل نہ رہے تو مجھ سے اور واحدی صاحب سے جو مولانا کی خیریت دریافت کرنے ان کے پاس جایا کرتے تھے، عارف صاحب کی خیریت پوچھتے۔ عارف صاحب کا انتقال ہوگیا تو اس کی اطلاع مولانا کو نہ کی، کہ یہ خود ہی چند دن کے مہمان ہیں ان کو کیوں تکلیف دی جائے۔ عارف صاحب کے انتقال کے دو ایک دن بعد واحدی صاحب مولانا کی عیادت کو گئے۔ مولانا نے پوچھا ارے میاں یہ تو بتاؤ عارف کیسا ہے؟ (ہمارے ان کے درمیان بات چیت کے بس کچھ ایسے ہی انداز تھے، تکلّف برطرف تھا) واحدی صاحب نے جواب دیا وہ تو اب رو بہ صحت ہیں۔ بولے میاں کیوں باتیں بناتے ہو وہ تو جاچکا۔ ضرور ایک آدھ کو اپنے ساتھ گھسیٹے گا۔ چنانچہ پندرہ سولہ روز بعد مولانا بھی گھسٹ گئے۔ دفتر نظام المشائخ جہاں دن میں کاروباری گہما گہمی رہا کرتی تھی، شام کو دیوان خانہ بن جاتا تھا۔ صاحبِ خانہ واحدی صاحب راقم سطورِ ہٰذا، مولانا راشد الخیری، عارف صاحب روزمرّہ کے حاضر باش تھے۔ آندھی جائے، مینہ جائے دیوان خانہ کا ناغہ نہیں۔ اس چوکڑی کے علاوہ اور بھی دو چار آئے گئے ہوا کرتے تھے۔ اگر کوئی تکلّف والا آدمی آگیا تو مولانا کی سٹی گم ہوگئی۔ اب چاہ رہے ہیں کہ کسی طرح گھڑی کی چوتھائی میں یہ رخصت ہو جائے۔ اگر راقم نے اور عارف صاحب نے مولانا کو ستانے کے لئے ان حضرت کو باتوں میں لگا لیا تو مولانا نے نووارد سے آنکھ بچا کر ہونٹوں کے اشارے سے ہماری طرف منہ کر کے تھو تھو کرنی شروع کر دی یعنی جانے کیوں نہیں دیتے؟ کیوں روک رہے ہو؟ اونچے نیچے لوگوں سے ملنے سے گھبراتے تھے۔ کبھی کبھار کسی ایسی صحبت میں پھنس جاتے تو چہرے سے معلوم ہوتا کہ ہزاروں من بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہیں۔ رات کی صحبتوں میں ہنسی مذاق چٹکلہ بازیاں، اگلی پچھلی صحبتوں کے ذکر اذکار ہوا کرتے تھے۔ اتوار تو گویا یوم السبت تھا۔ دنوں مہینوں نہیں برسوں شہر میں نہیں گزارا۔ کبھی مہرولی قطب صاحب میں کبھی مقبرہ ہمایوں، مقبرہ صفدر جنگ میں کبھی اوکھلے کی سیرگاہ میں کبھی فیروز تغلق کے حوضِ خاص پر سارا اتوار گذرا کرتا تھا۔ وہاں سنجیدہ گفتگوئیں بھی ہوتیں اور مذاق بازیاں بھی۔ مولانا کی آواز میں آخر عمر تک کھٹکا تھا۔ مثنوی میرحسن کے بڑے مدّاح تھے اس کے بیسیوں شعر ان کی خوبیاں اور باریکیاں ان کو یاد تھیں مثنوی میرحسن کے اشعار سیر سپاٹے کی صحبتوں میں ایسے پُرتاثیر لہجے میں ادا کرتے کہ ہمارے دل بھی سوز و ساز سے لبریز ہو جاتے تھے۔ عارف صاحب پر لکھنؤ کا اثر تھا۔ کبھی کبھار وہ بھی مثنوی گلزارِ نسیم کا ذکر کرتے تو مولانا گلزارِ نسیم کا یہ شعر:

سنبل مرا تازیانہ لانا — شمشاد اسے سولی پر چڑھانا

سنا کر کہتے واہ پھول چھڑیوں سے کیا لاٹھی پونگے کی خدمت لی ہے جو طبعِ سلیم کے لئے بارِ گراں ہے۔ عارف صاحب یہ گفتگو سن کر دم بخود ہو جاتے تھے

مولانا کو ہیں نے کم و بیش تیس سال دیکھا۔ ان کو یاروں کا یار اور دوستوں کا غمخوار پایا۔ ان کی غمخواری لفظی نہ تھی کہ سوگنہ واروں اور گز بھر نہ پھاڑوں۔ وہ عملی ہمدردی کے ثبوت کے لئے بھی حاضر تھے۔ اہلِ حاجت کی اس طرح خدمت کرتے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ رمضان بھر ان کا دسترخوان کشادہ رہتا تھا۔ دس بیس رانڈ بیوائیں روزانہ ان کے دسترخوان کرم سے سیر ہوا کرتی تھیں۔ دفتر کا چپڑاسی، گھر کی ماما ان کے نوکر نہ تھے۔ ان کے ساتھ اپنوں کا سا برتاؤ کرتے تھے۔ ان کے دفتر کا چپڑاسی نصیر خان علی گڑھ کا رہنے والا تھا۔ وہ دفتر میں کام کرتا تھا اور وہیں رہتا تھا۔ اس کی بیوی مسماۃ "عظیما" گھر میں کام کاج کرتی تھی۔ جب وہ مرض الموت میں گرفتار ہوا تو اس کا علاج اسی ڈاکٹر سے کرایا جو ان کے گھر کا معالج تھا۔ اس کی زندگی کی آخری رات اس کی بیوی کے ہمراہ مولانا راشد الخیری اور بیگم راشد الخیری نے اس کے سرہانے بیٹھ کر کاٹی۔ بیگم صاحبہ بار بار یٰسین شریف پڑھ رہی تھیں اور مولانا کی زبان پر کلمہ شہادت تھا۔ جب وہ مر گیا تو اس کے کفن دفن کا بندوبست کیا۔ اس کی میت کہاروں کے حوالے نہ کی بلکہ وہ خود، ان کے بچے اور داماد اس کو کندھا دیتے ہوئے قبرستان تک گئے اور اس کو اول منزل کر کے واپس ہوئے۔ بیگم راشد الخیری، حق ان کی مغفرت کرے، ڈولی میں سوار ہو کر شہر کی چار دیواری تک میت کے ساتھ گئیں۔ متوفی کی بیوہ ڈولی کے ساتھ ساتھ تھی۔ نصیر خان ایک لڑکا چھوڑ کر مرا تھا اس کو بابو بابو کہا کرتے تھے۔ مولانا نے اس کو میٹرک پاس کروایا۔

اب وہ کراچی کے کسی دفتر میں بابو ہے۔ مولانا کے صدقہ جاریہ نے بابو کو سچ مچ کا بابو بنا دیا۔ نصیر خان کی بیوی عظیما کہا کرتی تھی "الٰہی مولوی صاحب! تمہارے کھیڑے بسیں" (یعنی تمہاری آل اولاد کے گاؤں بسیں) یہ باتیں سُنی سُنائی نہیں چشم دید واقعات ہیں۔ مولانا اچھا کھانے کے شوقین تھے اور دوسروں کو کھلا کر بھی بہت خوش ہوا کرتے تھے۔ ہر تیسرے چوتھے مہینے دیگ چڑھواتے، کھاتے، کھلاتے اور خوشیاں مناتے تھے۔ وہ ہر حال میں خوش رہنے والے انسان تھے اگر ان کے پاس روپیہ ہے تو سبحان اللہ خوب ہی خوب ہے قسم قسم کے کھانے پک رہے ہیں، کھا رہے ہیں اور کھلا رہے ہیں۔ اگر پیسہ کی کمی اور تنگی ہے تب بھی پیشانی پر بل نہیں کسی سے پریشانی کا اظہار نہیں۔ وہی قہقہے اور چہچہے "خوش حال کسانیکہ بہر حال خوش اند" کے پورے مصداق تھے۔

راقم سدا سے جلاوطن آدمی ہے۔ اگر کبھی زندگی کی کسی خلفشار میں سرشار بیٹھا ہے اور مولانا آتے جاتے میرے پاس آنکلے، دروازہ پر دروازہ تھا صبح سے شام تک دو چار بار مجھ کو آوازیں پڑتی تھیں۔ غرض مجھ کو خاموش پاکر تاڑ گئے ضرور کچھ دال میں کالا اور اونچ نیچ ہے۔ اب مجھ کو ہنسانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ کبھی پوچھتے ہیں نواب صاحب کیا بات ہے، کبھی کہتے ہیں ابے کچھ منہ سے پھوٹ تو سہی۔ غرض مجھ کو ہنسا کر ہی پنڈ چھوڑتے۔ خاموشی کی وجہ معلوم ہونے پر اس کے تدارک کی صورتیں بھی بتاتے تھے۔ دنیا ان کو مصورِ غم کہتی تھی اور حزن نویسی ان کا امتیاز تھا لیکن عملاً حزن و ملال سے وہ کوسوں دور تھے۔ بیسیوں لطیفے، چٹکلے، پھبتیاں ان کو رواں تھیں۔ پھبتی ایسی چپتی کہتے کہ دھری جاتی نہ اٹھائی جاتی بس چپک کر رہ جاتی اور متعلق آدمی ٹک ٹکا دیدم دم نہ کشیدم کا مصداق ہو جاتے۔ اِدھر سننے والوں کے پیٹ میں مارے ہنسی کے بل پڑ پڑ جاتے۔ ایک بار ایڈورڈ پارک میں شام کے وقت یہ راقم، مولانا عارف ہسوی، واحدی صاحب اور مولانا بیٹھے ہوئے تھے۔ قضاعنداللہ قاری سرفراز حسین صاحب جن کا ذکر سطور بالا میں ہو چکا ہے، اُدھر آنکلے اور آکر شریکِ صحبت ہو گئے۔ اتفاقاً ایک بڑے میاں سفید ریش کمر جھکی ہوئی، کسی شخص کا اتہ پتہ پوچھنے کے لئے اس مجمع میں آ کھڑے ہوئے۔ ان کو دیکھ کر مولانا بے ساختہ بولے "آیئے جناب قاری برکت اللہ صاحب! بڑی مدت میں دکھائی دیئے آپ کی زیارت کو تو آنکھیں ترس گئی تھیں"۔ چونکہ قاری سرفراز حسین صاحب کے والد کا نام قاری برکت اللہ تھا اس لئے قاری صاحب بہت جھینپے۔ مولانا بولے "جھینپتے کیوں ہو ایسی ہی وضع قطع تو تھی"۔ یہ گفتگو قاری برکت اللہ کے انتقال کے پچاس سال بعد ہو رہی تھی۔ قاری سرفراز حسین صاحب خصوصیت سے ہر دلّی آتے ہوتے تھے۔ مولانا ایک دن ان کے ہاں پہنچ گئے۔ وہ اس وقت خضاب لگائے ڈھاٹا چڑھائے بیٹھے تھے۔ ڈھاٹے میں سے روئی باہر نکل رہی تھی۔ مولانا بولے "یار قاری دُم کی کسر ہے" یعنی دُم لگا لو تو لنگور معلوم ہونے لگو۔ گندمی رنگ ہے، منہ پر روئی بھی لگی ہوئی ہے جو لنگور کی ڈاڑھی کے مشابہ ہے۔ اب صرف دُم کی کسر رہ گئی ہے۔ ۱۹۳۱ء میں مولانا نے شملہ کا پہلی بار سفر کیا۔ میں اور واحدی صاحب بھی ان کے ہمراہ تھے۔ مئی مہینہ کی آخری تاریخیں تھیں اور زناٹے کی گرمی تھی۔ ریل چلے تو ہوا محسوس ہو ورنہ جہاں گاڑی رُکی اور پسینوں میں نہا گئے۔ مولانا کا گرمی کے مارے بُرا حال تھا۔ بولے "میاں شملہ شملہ کی رٹ لگا رہے تھے۔ نہ آگ شملہ ہے نہ انبالہ آگیا، گرمی کا وہی حال ہے۔ یہاں سے شملہ ہے ہی کتنی دور؟" واحدی صاحب نے کہا "یہاں سے دو اسٹیشن آگے نکل کر چنڈی گڑھ کے مقام پر خنکی محسوس ہونے لگتی ہے۔" کہنے لگے "بھائی ایسی سخت گرمی سے نکل کر ایکا ایکی ٹھنڈک میں پہنچ جانا مضر ہے۔ بھئی ذرا اتنا کرنا چنڈی گڑھ آجائے تو مجھے بتا دینا۔" واحدی صاحب میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور خاموش ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں گاڑی چنڈی گڑھ کے نواح میں داخل ہو گئی۔ واحدی صاحب نے کہا "لیجئے مولانا وہ آگیا چنڈی گڑھ!"

یہ سُن کر مولانا نہایت سنجیدگی کے ساتھ سوکھا منہ بنا کر جگہ سے اُٹھے، ٹرنک کھولا اور اس میں سے گرم شیروانی نکالی اس کو پہنا سب بٹن لگائے اور متانت کے ساتھ بیٹھ گئے دو چار منٹ تو خاموش رہے۔ اتنی دیر میں پسینے کے دریا بہہ گئے۔ کہنے لگے "میاں ٹھنڈک ونڈک تو خاک نہیں ہیں تو پسینے میں نہا گیا۔" اب ہم نے اور واحدی صاحب نے قہقہہ لگایا کہنے لگے "سوائے کھلی بازی کے اور بھی کچھ آتا ہے۔" اب صلواتیں سُناتے جاتے ہیں اور شیروانی اتارتے جاتے ہیں۔ ہنسنے ہنسانے کے لئے ایسے چٹکلے ان کو بہت یاد تھے۔ پہلے عرض کر چکا ہوں رمضان بھر ان کے ہاں چہل پہل رہا کرتی تھی۔ روزانہ ان کے ہاں دس دس پندرہ پندرہ آدمی روزہ کشائی، کھانا کھانے اور کھانا لینے کے لئے آیا کرتے تھے عصر کے بعد سے لوگوں کا اجتماع ہونے لگتا تھا۔ کچھ آدمی مردانے مکان میں جمع ہوتے کچھ دروازہ پر بیٹھ جاتے۔ اکثر کے ہاتھوں میں کھانا لے جانے کے لئے برتن بھی ہوا کرتے تھے۔ ایک روز مجھ سے کہنے لگے "میاں آج شام کو ہمارے ساتھ روزہ افطار کر لینا مگر کسی سے اس بات کا ذکر نہ کرنا میں نے آج کسی کو نہیں بلایا ہے۔ حرفو (عارف صاحب) سُن لے گا تو بہت کھور ولائے گا۔" میں سُن کر خاموش ہو گیا۔ ادھر تو مجھ کو یہ پٹی پڑھائی اُدھر سب یاروں کو سُنا آئے کہ آج فضلو (فضل احمد) کے ساتھ دل لگی رہے گی ذرا سویرے سے آ جانا اس کو یہ معلوم نہ ہو کہ سب آئے ہوئے ہیں۔ اگر تم میں سے کسی کو آتے جاتے دیکھ لیا تو پھر مزا کرکرا ہو جائے گا۔ ہم افطار سے کچھ قبل مولانا کے مکان پر پہنچ گئے اور آواز دی، باہر آئے، کہنے لگے "آ گئے! مگر میاں برتن تو لائے نہیں۔ کھانا کس میں لے جاؤ گے؟ یہ دیکھو سب آدمی برتن لئے بیٹھے ہیں۔ یہ تو ممکن نہیں کہ میں کھانے کے ساتھ سب کو برتن بھی دیا کروں۔" اب ہم اول فول بکنے لگے، مولانا سُن رہے ہیں اور ہنس رہے ہیں۔ پھر بولے "نواب صاحب! خفا کیوں ہوتے ہو آؤ اندر آؤ۔" اب جو ہم اندر پہنچے تو دیکھتے کیا ہیں کہ خاصا اجتماع ہے۔ سب نے ہم کو دیکھ کر قہقہہ لگایا اور گلیاں چھانٹنے لگے۔ کوئی کچھ بولتا ہے کوئی کچھ ———— مرنے کو پڑے ہیں، زندگی کی کوئی آس نہیں، معالج جواب دے چکے ہیں، دو تین روز میں سدھار جائیں گے۔ پرسانِ حال کا تانتا لگا ہوا ہے، دو آتے ہیں، چار جاتے ہیں۔ اس حال میں ایک دن کوئی صاحب عیادت کو آئے مزاج پُرسی کے بعد اور لوگوں سے جو ان سے پہلے کے آئے ہوئے بیٹھے تھے، باتیں کرنے لگے۔ انہی دنوں میں شاہ جارج پنجم کا بھی انتقال ہوا تھا اور یہ موضوع زبان زد خاص و عام تھا۔ یہی صاحب بولے ———— "کیوں جناب ان کی جگہ تو ان کا بیٹا ہی بیٹھے گا۔" مولانا پڑے پڑے سُن رہے تھے، نقاہت بھری آواز میں بولے "جی نہیں آپ کے حق میں وصیت کر مرے ہیں۔" یہ ہیں مغفور علامہ راشد الخیری اور یہ ہے ان کی زندگی۔ حق مغفرت کرے بہت خوب آدمی تھے، اب ایسے لوگ کہاں۔ صدق و صفا، مہر و وفا کے پتلے تھے۔ سرورِ دو عالم تاجدارِ مدینہؐ نے فرمایا ہے "تم میں اچھا وہ ہے جو اپنے اہل سے اچھا ہو اور جس کے ہمسایہ اس سے خوش اور مطمئن ہوں۔" سرسری طور پر یہ بات معمولی ہوتی ہے مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص کی بھلائی بُرائی کی جانچ اور پرکھ کا اس سے بہتر معیار ممکن نہیں۔ معمولی علیک سلیک نا بخیر شما بسلامت کی حد تک سب ہی اچھے ہیں۔ راہ چلتوں کو پتھر مارنے والے کے لئے اب بریلی اور آگرہ کے پاگل خانوں میں جگہ نہ ہو تو نہ سہی، لاہور کا پاگل خانہ کیا تھوڑا ہے۔ کسی شخص کی بھلائی بُرائی کو اس کے اہل اور اس کے پاس پڑوس والوں کے علاوہ اور کون جان سکتا ہے جن سے آٹھ پہر کا واسطہ رہتا ہے۔ ہر دوسرے تیسرے مولانا کے ہاں کی مستورات میرے ہاں اور میری ان کے ہاں آتی جاتی تھیں۔ ان کا بچہ بچہ میرے سامنے ہوتا تھا۔ قدیم وضع کی مستورات جب مل کر بیٹھتی تھیں تو دنیا جہان کے جھکنڈن و ہراتی تھیں مگر مولوی صاحب کے ہاں کے کسی آدمی سے مولانا کی شکایت نہیں سُنی۔ بیوی، بیٹے، بیٹیاں، بہوئیں، داماد سب ہی ان کے حُسنِ سلوک کے مدّاح تھے، نوکروں چاکروں کے ساتھ حُسنِ سلوک کا ایک بے مثال واقعہ اوپر بیان کر آیا ہوں۔ واحدی صاحب اور میں ان کے ہمسایہ تھے۔ میری ان کی یاری اور آشنائی بھی تھی اور معاملہ داری بھی۔ اس لئے کہ میری حقیقی بھتیجی ان کے چھوٹے لڑکے میاں صادق الخیری سے منسوب ہے اور ان کی والدہ سے میری والدہ کی قرابت داری بھی تھی۔ بحیثیت دوست اور ہمسایہ کے انہوں نے مجھ کو، واحدی صاحب کو اور عارف صاحب کو کبھی شکایت کا موقع نہ دیا اور ہم کو کبھی خفیف سا بھی اس بات کا احساس نہ ہوا کہ مولوی صاحب بھی اپنے آپ کو کچھ سمجھتے ہیں۔ میری ان کی جو معاملہ داری تھی یعنی سمدھیانے کی نسبت تھیں اس میں کبھی قصور اور فتور نہ آیا۔ اس سے بہتر مولانا کی اچھائی کا اور کیا معیار ہو سکتا ہے تقسیم ملک سے دس گیارہ سال قبل مولانا کا اور عارف صاحب کا انتقال ہو گیا تھا۔ ان حضرات کی موت نے ہماری محفلِ نشاط کو سُونا کر دیا تھا۔ اب میں ہوں اور واحدی صاحب جو جیتے جی ایک دوسرے کے لئے مر گئے۔ وہ کراچی میں ہیں اور میں لاہور میں پڑا اجون بھگت رہا ہوں!

اقبال

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

ممتاز شخصیتوں ہی پر منحصر نہیں، معمولی انسانوں کی زندگی کے بھی کئی پہلو ہوتے ہیں۔ خواہ کسی ایک ہی فرد کی زندگی کے مختلف پہلو ہوں تاہم ہر پہلو ایک جداگانہ حیثیت اور انداز رکھتا ہے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ تمام پہلوؤں کی گوناگونی اور بوقلمونی میں یک رنگی اور ہم آہنگی بھی پائی جائے۔ زندگی میں کامل توازن اور ہم آہنگی ایک نصب العین ہے جس کا تحقق مختلف افراد میں مختلف درجوں کا ہوتا ہے۔ علامہ اقبال کی زندگی کے بھی کئی پہلو تھے۔ وہ اعلےٰ درجے کے شاعر بھی تھے، عالم بھی تھے، فلسفی اور مفکر بھی تھے۔ مذہبی وجدان سے بھی بہرہ ور تھے۔ ملت کے زوال و کمال اور اس کے اسباب و علل کے متعلق بھی صبح و شام کے تفکر اور تاثر کی بدولت غیر معمولی بصیرت رکھتے تھے۔ وکالت کا پیشہ اختیار کرنے کی وجہ سے ان کی ایک حیثیت وکیل اور قانون دان کی بھی تھی۔ ایک پہلو تاہل کی زندگی کا بھی تھا۔ عالم شباب میں رنگینی اور رندی کے دور سے بھی گزرے تھے۔ اور بقول مولانا روم "کر دے و گزشتے" نے زندگی کے تجربات میں گہرائی اور ہمہ گیری پیدا کر دی تھی۔ اقبال کے مرشد عارفِ رومی نے جو کچھ اپنے متعلق کہا ہے، وہ مرید پر بھی حرف بحرف صادق آتا ہے:

من بہر جمعیتے نالاں شدم ‌ ‌ ‌ ‌ جفتِ خوش حالاں و بدحالاں شدم

ہر کسے از ظنِ خود شد یارِ من ‌ ‌ ‌ ‌ وز درونِ من نہ جُست اسرارِ من

اقبال کے شاعر اور حکیم، معمارِ ملت اور ترجمانِ حقیقت ہونے کے متعلق لوگ بہت کچھ لکھ چکے ہیں، لکھ رہے ہیں اور لکھتے رہیں گے۔ مدیر نقوش نے مجھ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ چونکہ میں ایک عرصہ علامہ کی صحبت سے فیض یاب رہا اس لئے اپنی یاد سے کچھ ایسی باتیں قلمبند کروں جن سے اقبال کی شخصیت کے کچھ خد و خال نمایاں ہوں۔ از رہِ امتثالِ امر طبیعت کو کچھ لکھنے پر آمادہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں اس یاد میں ایک لذت بھی ہے۔

ذکرِ حبیب کم نہیں وصلِ حبیب سے

اقبال کا نام تو ہوش سنبھالتے ہی ہمارے کانوں میں گونج رہا تھا۔ انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسوں میں جب وہ ترنم سے طویل نظمیں پڑھتے تھے تو اطفال و پیر و برنا سب مسرور و مسحور ہوتے تھے۔ اسکولوں اور کالجوں کے بعض طالب علم ان کے ترنم کی نقل بھی کرتے تھے۔ غالباً ایک نظم کے ان دو اشعار میں انہوں نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

اڑا لئے کچھ ورق لالے نے کچھ سنبل نے کچھ گُل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

اڑا لی طوطیوں نے، قمریوں نے، عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری

مدرسے کی طالب علمی کے زمانے میں کبھی ان کو قریب سے دیکھنے کا موقع نہ ملا۔ اس کے بعد میں علی گڑھ چلا گیا۔ اس زمانے میں بھی کوئی موقع میسّر نہ آیا۔ علی گڑھ سے نکل کر جب میں ۱۹۱۳ء میں دہلی کالج میں داخل ہوا تو تعطیل کے زمانے میں اپنے نسبتی بھائی ڈاکٹر عطاء اللہ بٹ کے ہمراہ انار کلی والی بیٹھک میں پہلی مرتبہ ان سے ملنے کا موقع ملا۔ ڈاکٹر صاحب علی گڑھ میں میڈیکل افسر تھے وہ علامہ اقبال کے دور کے عزیز بھی تھے اور سیالکوٹ میں ہم کوچہ بھی۔ ان کے ہمراہ ان کی دو یا سہ سالہ بیٹی آمنہ بھی تھی جس کی والدہ میری بڑی بہن ہیں۔ آمنہ بیگم، مجید ملک پاکستان کے پبلسٹی اڈوائزر کی اہلیہ ہیں۔ اس پہلی ملاقات میں میں نے دیکھا کہ وہ بچوں سے بڑی شفقت سے پیش آتے ہیں۔ آمنہ کو، اپنی اہلیہ سے انھوں نے روپے بھی دلوائے میں نے دیکھا کہ اس شاعر بے بدل اور مشہورِ آفاق شخص کے سینے میں ایک سادہ دل ہے۔ کچھ بڑائی کا رعب نہیں، کچھ دور باش کا انداز نہیں۔ اس اثر نے مجھ میں یہ جرأت پیدا کر دی کہ اگرچہ میں کالج کا ایک معمولی طالب علم ہوں لیکن اگر بن بلائے ان پر وقت بے وقت نازل ہو جایا کروں تو تضیع اوقات سمجھ کر بُرا نہیں منائیں گے۔ چنانچہ میں نے یہی حرکت شروع کر دی کہ جتنے روز لاہور میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ ہر دوسرے تیسرے روز شام کو انارکلی کا رُخ کیا اور شام کو پانچ بجے کے قریب نازل ہو گیا۔ کبھی یہ گمان نہیں گزرا کہ میں دو دو چار چار گھنٹے ان کا وقت ضائع کرتا ہوں کہیں ان کو بُرا نہ معلوم ہوتا ہو۔ برسوں میں شاید ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ وہ کوئی بڑا اہم مقدمہ تیار کر رہے تھے اور مجھے بے شرفِ ملاقات، واپس ہونا پڑا۔ کبھی ایسا بھی اتفاق ہوا کہ ادب اور فلسفہ اور فنونِ لطیفہ کی بحث میں مسلسل پانچ گھنٹے صرف ہو گئے۔ پانچ بجے باتیں شروع کیں اور رات کے دس بج گئے۔ ان کو بھلا مجھ سے خام طالب علم سے کیا حاصل ہو سکتا تھا۔ بس یہ ان کی فراخ دلی اور فیضان تھا کہ ایک نوجوان سے اتنی طویل گفتگو سے بھی نہ گھبراتے تھے نہ تکان، نہ ماتھے پر شکن اور نہ کوئی اشارہ کہ اب بس کرو اور چل دو ان کی صحبت میں بند لو اپنے کھانے کا وقت سوختن کر دیتا تھا۔ کھانا ایک وقت نہ کھایا تو کیا اور دیر سے کھایا تو کیا۔ لیکن ایک شام کو میرے ضمیر نے کچھ ملامت کی کہ غذائے روح حاصل کرتے ہوئے اپنی روٹی چھوڑتے ہو تو کون سی بڑی قربانی کرتے ہو۔ لیکن اس مرشد کو کیوں بھوکا مارتے ہو جو محض مروّت اور شفقت میں تمہاری وجہ سے رات کا کھانا نہیں کھاتا۔ چنانچہ ایک شام کو میں نے دیکھا کہ کچھ دیر ہو رہی ہے۔ انار کلی کی گھما گھمی ختم ہے۔ عرض کیا کہ اب میں جاتا ہوں آپ کے کھانے کا وقت ہوگا۔ فرمانے لگے کہ نہیں بیٹھو میں تو رات کو کھانا نہیں کھاتا۔ فقط دودھ کی پیالی سونے سے قبل پی لیتا ہوں۔ اس زمانے میں ان کی عمر چالیس سے بھی کم تھی لیکن اس قلندرانہ کم خوری کی عادت اس وقت بھی راسخ ہو چکی تھی۔ میں نے دیکھا کہ طرح طرح کے آدمی ان کے پاس بے تکلف چلے آتے ہیں۔ علی بخش ان کا وفادار ملازم اس زمانے میں بھی ان کا خدمت گذار تھا معلوم ہوتا تھا کہ اس کو بھی کسی کو روکنے کا حکم نہ تھا ؎

ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو
گیر و دار و حاجب و درباں دریں درگاہ نیست

اقبال مختلف امتحانوں کے ممتحن تھے، فلسفہ کے، فارسی اور اردو کے اور غالباً سول سروس کے پرچے بھی ان کے پاس آتے تھے کثرت سے نالائق طالب علموں کی جوابی بیاضوں کا جانچنا اور مسلسل کئی روز گھنٹوں خرافات پر سے نظر گذارنا۔ یہ نہایت درجہ سوہانِ روح اور جانگداز کام ہے۔ اقبال جس کا غیر معمولی دل و دماغ فطرت نے بصیرت افروزی اور انقلاب آفرینی کے لئے پیدا کیا تھا وہ اپنی عمرِ گراں مایہ کو اس لغو شغل میں ضائع کرتا تھا۔ جب وہ پرچے جانچنے میں مشغول ہوتے میں ان کے پاس بیٹھا ہوا ہر دو چار منٹ کے وقفے پر کوئی اِدھر اُدھر کی بات کرتا وہ اٹھیان سے جواب بھی دیتے اور پرچے بھی دیکھتے جاتے۔ بارہا مجھے یہ خیال آتا ہے کہ اقبال نے

عمرِ گراں مایہ کا جو حصہ امتحانوں کے پرچے دیکھنے میں ضائع کیا اگر اس کا عشرِ عشیر بھی وہ نثر یا نظم کے تخلیقی کام میں صرف کرتے تو انسانوں کی ثروتِ افکار میں بے حد اضافہ ہو سکتا تھا۔

اسپِ تازی شدہ مجروح بزیرِ پالان
طوقِ زرّیں ہمہ در گردنِ خر مے بینم

اقبال وکالت کا کام کچھ زیادہ نہ کرتے تھے۔ غالباً زیادہ تر ہائی کورٹ کی اپیلوں کے کچھ مقدمے لیتے تھے۔ زراندوزی کی ہوس نہیں تھی بس اپنے اخراجات ہی پورے کرنے کی حد تک پریکٹس کرتے تھے۔ مجھ سے ایک روز فرمانے لگے کہ کوئی آٹھ سو روپیہ ماہوار تک کا وکالت کا کام کر لیتا ہوں۔ اگر کسی موکل کے مقدمے میں کامیابی کی کوئی امید نہ ہو تو اس کے اصرار پر بھی مقدمہ نہ لیتے تھے۔ خواہ وہ کتنی ہی فیس پیش کرے لیکن بعض موکل بھی عجیب قسم کے احمق حیوان ہوتے ہیں۔ اقبال کہتے کہ جاؤ اپنی فیس ضائع نہ کرو اور موکل کہتا کہ آپ کو مقدمے کے کمزور یا مضبوط ہونے سے کیا واسطہ آپ اپنی فیس لے کر میری حمایت کی کوشش کیجئے۔ اقبال بڑی مشکل سے ایسے موکلوں سے چھٹکارا حاصل کرتے۔ وکالت کے پیشے میں فطرتِ انسانی کے قبیح پہلوؤں کے مطالعہ کا بہت موقع ملتا ہے۔ ایک مولوی منش موکل ان کے پاس وقتاً فوقتاً تشریف لاتے اور اپنی وراثت کے جھگڑوں کے متعلق ان سے مشورہ طلب کرتے لیکن ہر بار کچھ وعظ بھی فرما جاتے۔ ایک روز علامہ اقبال مجھ سے فرمانے لگے کہ ایک مولوی کا دلچسپ قصہ تمہیں سناتا ہوں۔ وہ جب میرے پاس آ کر بیٹھتا تو کہتا کہ آپ عالمِ دین اور شریعتِ حقہ کے حامی ہیں لیکن آپ داڑھی نہیں رکھتے جو ایک اسلامی شعار ہے۔ آخر ایک روز میں نے کہا کہ مولوی صاحب آپ کی تلقین کا مجھ پر بہت اثر ہوا ہے۔ اور میں نے عہد کیا ہے کہ آپ کے ساتھ ایک معاہدہ کروں۔ مسلمان کے چہرے پر داڑھی نہ ہونا بھی شرعاً ایک نقص اور گناہ ہے لیکن اپنی بہن کو وراثت سے محروم کرنے کی کوشش کرنا ایک شدید قسم کی معصیت اور شریعت کی خلاف ورزی ہے۔ لائیے ہاتھ بڑھائیے میں داڑھی بڑھا لیتا ہوں بشرطیکہ آپ اپنی بہن کو وراثت میں سے حصہ دے دیں۔ مولوی صاحب اس عملی امتحان میں ناکام ہو گئے۔ نہ ان کا ہاتھ آگے بڑھا اور نہ اقبال کے چہرے پر داڑھی بڑھی۔

ایک اور مولوی صاحب سماع کے متعلق ان سے بحث کرنے لگے۔ اقبال نے ان کو قائل کر دیا کہ موسیقی غذائے روح ہے لیکن مولوی صاحب نے فرمایا کہ عورتوں کا گانا سننے میں جنسی جذبات برانگیختہ ہوتے ہیں۔ گانے والی کا چہرہ اور اس کی حرکات کو دیکھ کر ہیجان پیدا ہوتا ہے۔ علامہ فرمانے لگے کہ میں اس کا علاج بتاتا ہوں۔ آپ یوں کیا کیجئے کہ ایسی محفلِ سماع میں آنکھوں پر پٹی باندھ لیجئے اور کس کر لنگوٹ باندھئے۔ صرف کان کھلے رہیں تاکہ آپ سماع کی روحانیت سے بہرہ اندوز ہوں اور جنسی جذبہ انگیزی کے عوامل معطل رہیں۔

علامہ اقبال کے اکثر ملنے والے اس سے متفق ہوں گے کہ ان کی زندگی میں ریاکاری کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ اقبال کو اپنی خوبیوں اور کمزوریوں کا پورا احساس تھا۔ وہ یہ جانتے تھے کہ میں شاعر ہوں اور متفکر ہوں۔ تفکر اور تاثر کی غیر معمولی قوتوں نے ان کی قوتِ عمل کو کمزور کر دیا تھا۔ اگرچہ دوسرے زاویۂ نگاہ سے دیکھئے تو تفکر اور تاثر بھی جس میں غیر معمولی خلاقی اور بصیرت پائی جائے خود ایک قسم کا عمل اور بہت سے ظاہری اعمال کا بدل ہے۔ ٹینی سن نے بھی ایک جگہ اس نکتے کو بیان کیا ہے کہ وہ شاعری جس سے ملت کے قلوب مضبوط ہوں۔ خود ایک اعلیٰ درجے کا عمل ہے۔ بقولِ غالب

ہے خیالِ حسن پر حسنِ عمل کا سا خیال
خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

اقبال نے اپنی شاعری میں جا بجا اپنی سیرت کا خاکہ کھینچا ہے اور علی الاعلان اپنی کمزوریوں کو بیان کیا ہے۔ کہیں کہتے ہیں کہ میں گفتار کا غازی ہوں کردار کا غازی نہیں۔ کہیں اپنی تن آسانی کا ذکر کرتے ہیں:

دیا اقبال نے ہندی مسلمانوں کو سوز اپنا   وہ اک مردِ تن آساں تھا تن آسانوں کے کام آیا

انارکلی والے مکان میں ایک روز تحریکِ خلافت کے قائد مولانا محمد علی ان کے پاس تشریف لائے۔ اور بڑے زور شور سے اقبال کو ملامت کرنے لگے کہ ظالم تم نے لوگوں کو گرما کر ان کی زندگی میں ہیجان پیدا کر دیا ہے اور خود یہاں سے اٹھ کر کسی عملی سیاست میں حصہ نہیں لیتے۔ اقبال نے کہا کہ تم بھی عجیب بے سمجھ آدمی ہو۔ تمہیں یہ معلوم نہیں کہ میں قوم کا قوال ہوں اگر قوال کو خود وجد اور حال آجائے اور وہ بھی زدحق ہیں نہ وبالا ہونے لگے تو قوالی ہی ختم ہو جائے۔ میں نے بھی ایک روز یہ نادانی کی کہ ان سے کہا کہ آپ کو اب عملاً قیادت کرنی چاہیئے اور قوم کو غلامی سے چھڑانے کے لئے جو کچھ کہنا ہے علی الاعلان ببانگِ دہل کہنا چاہیئے۔ نہایت سچائی کے ساتھ فرمانے لگے کہ اگر ایسا کروں تو بہت جلد کسی زندان میں بند کر دیا جاؤں گا میں قید ہونے کے لئے تیار نہیں۔ ان کی زندگی کا انداز یہ تھا کہ وہ اپنی جگہ سے ہلنا نہ چاہتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اپنے وظیفۂ حیات کے متعلق ان کا یہ وجدان اور طبعی میلان بالکل درست تھا۔ جس کو عملی یا سیاسی زندگی کہتے ہیں اس سے ان کی قوتیں مرتکز ہونے کی بجائے منتشر ہو جاتیں اور اقبال اقبال نہ بن سکتا۔ علی گڑھ والوں نے کئی مرتبہ ان کو بلایا لیکن وہ ایک دفعہ سے زیادہ وہاں نہ گئے۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر ضیاء الدین نے بلانے پر بہت اصرار کیا تو ان کو جواب دیا کہ تم علی گڑھ بلاتے ہو۔ مجھے یہیں رہنے دو میں یہاں اللہ گڑھ میں رہتا ہوں۔ ایک مرتبہ میر عثمان علی خان نظام حیدرآباد علی گڑھ آ رہے تھے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کو خیال ہوا کہ اگر اقبال بھی آجائیں اور کچھ اشعار حضور نظام کی شان میں پڑھ دیں تو کچھ زیادہ رقم یونیورسٹی کو مل جائے۔ یہ ان کو تجربہ ہو چکا تھا کہ خط لکھنے سے اقبال پر کوئی اثر نہیں ہوتا اس لئے ڈاکٹر عطاء اللہ بٹ پرنسپل طبیہ کالج کو لاہور بھیجا کہ جاؤ وہ تمہارے عزیز بھی ہیں ان کو اصرار کر کے ہمراہ لیتے آؤ۔ ڈاکٹر بٹ لاہور میں ہمارے ہاں ہی ٹھہرتے تھے انہوں نے مجھے ہمراہ لیا اور ہم دونوں اس مہم کو سر کرنے کے لئے ان کے پاس حاضر ہوئے۔ علامہ اقبال کچھ معذرت کرنے لگے لیکن ڈاکٹر بٹ مصر تھے کہ آپ کو جانا ہی پڑے گا۔ اقبال ٹالنے کے فن کے ماہر تھے۔ فرمانے لگے کہ تم لوگ چاہتے ہو کہ میں نظام کی شان میں اور اس تقریب کے سلسلے میں کچھ اشعار پڑھوں۔ اگر کچھ اشعار ہو گئے تو پھر چلیں گے۔ ڈاکٹر بٹ نے کہا کہ اچھا ہم پھر کل آئیں گے۔ دوسرے روز گئے تو فرمانے لگے کہ رات کو میں جلد بستر پر لیٹ گیا اور فکرِ شعر کرنے لگا۔ کسی آمد یا آورد سے نظام کے متعلق ایک شعر بھی نازل نہیں ہوا اور اس کی بجائے بغیر کوشش کے اور دس بارہ اشعار ہو گئے جو اور ہی مضمون کے ہیں۔ غرضیکہ دو تین روز اسی طرح ٹالا۔ آخر ڈاکٹر بٹ مایوس ہو کر علی گڑھ واپس ہو گئے۔ میں نے علامہ اقبال سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب قومی خدمت سمجھ کر چلے جائیے۔ آپ کے لئے شعر کہنا کون سی بڑی بات ہے۔ ریل کے سفر میں حرکت میں کچھ برکت پیدا ہو جائے گی۔ فرمانے لگے کہ تم خود چند شعر کہہ لو اور وہاں جا کر میری طرف سے پڑھ دو۔ میں نے کہا کہ اس نالائق حرکت کا کوئی جواز نہیں۔

میں نے دیکھا کہ اقبال کی طبیعت میں کئی متضاد نما باتیں تھیں۔ ایک طرف ان کے انداز میں قلندری اور بے نیازی تھی اور دوسری طرف یہ تمنا بھی تھی کہ مجھے کوئی ایسا عہدہ مل جائے جو مجھے مطمئن اور روزگار سے بے فکر کر دے۔ وکالت ان کو زیادہ پسند نہ تھی۔ میں نے ایک روز عرض کیا کہ ایک طرف آپ کے لطیف تاثرات، بلند افکار اور روحانی جذبات اور دوسری طرف یہ ذلیل پیشہ۔ عدالتوں میں زیادہ تر دروغ بافی اور انسانی خود غرضی کی کشمکش، تمام انسانی خباثتوں کا نچوڑ عدالتوں ہی میں نظر آتا ہے۔ آپ کی طبیعت اس کو کیسے گوارا کرتی ہے۔ اس پر انہوں نے اپنے جواز میں یورپ کے دو چار شاعروں کا ذکر کیا جو وکالت کا پیشہ بھی کرتے تھے۔ فرمانے لگے کہ دیکھو ہماری نفسیات یہ ہے کہ انسانوں کے ادنیٰ میلانات اور نفسا نفسی دیکھ کر طبیعت میں بڑے زور کا ردِ عمل ہوتا ہے اور انسان کثافت سے لطافت کی طرف گریز کرتا ہے۔ ایک دو مرتبہ ہائی کورٹ کی ججی خالی ہو گئی جسے ایک مسلمان جج سے پُر کرنا تھا۔ انہیں معلوم ہوا کہ شیخ عبدالقادر بھی اس کے لئے کوشاں ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ ڈاکٹر صاحب یا تو آپ کسی خاص مقصد کی تمنا چھوڑ دیں اور تمنا نہیں چھوڑ سکتے تو اس کے حصول کے لئے جو راستے ہیں وہ اختیار کریں۔ آپ کسی منزل پر پہنچنے کی آرزو رکھتے ہیں لیکن اس کا جو راستہ ہے وہ طے کرنا نہیں چاہتے۔ ان عہدوں کو حاصل کرنے والے خاص طریقے استعمال کرتے ہیں۔ کچھ حکام رسی ہے کچھ آدابِ تملق ہیں۔ کچھ غلامانہ حرکتیں ہیں۔ ان سب طریقوں سے آپ کی طبیعت گریز کرتی ہے اور پھر آپ چاہتے ہیں کہ اس فرنگی حکومت میں آپ کو کوئی بڑا عہدہ مل جائے۔

آپ کے ساتھی اور معاصر جو آپ کے مقابلے میں عشرِ عشیر استعداد بھی نہیں رکھتے وہ ان عہدوں پر فائز ہو جاتے ہیں اور آپ دیکھتے کے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ یا اپنی تمنا بدل لیجئے یا اس تمنا کے حصول کے راستے اختیار کیجئے۔ یہ خدا کی بڑی رحمت تھی کہ ان کی اس قسم کی کوئی تمنا پوری نہ ہوئی۔ خود ہی فرماتے تھے کہ انسان کی بعض دعائیں ایسی ہوتی ہیں کہ خدا اپنی رحمت کی وجہ سے انہیں قبول نہیں کرتا۔ اور مولانا روم کا یہ شعر پڑھتے تھے ؎

بس دعا ئے کاں فنا ہست و ہلاک
از کریمی نشنود یزدانِ پاک

وہ سیاسی اور عملی زندگی کے مردِ میدان نہ تھے اور ان کو عرصہ دراز تک اپنے مخصوص وظیفۂ حیات کا پورا شعور نہ تھا۔ اگر وہ اچھی طرح جانتے کہ میں کیا ہوں۔ اور کیا مخصوص جوہر مجھے ودیعت کیا گیا ہے جو بقولِ خود ؎ کہ بجبریل امینے نتواں کرد گرو۔ تو وہ کبھی ان غلط چیزوں کی تمنا نہ کرتے۔ ایک مرتبہ جنوبی افریقہ میں انڈیا کے ہائی کمشنر بھیجنے کا سوال پیدا ہوا۔ سر فضل حسین نے اقبال سے کہا کہ اگر تم جانے پر آمادہ ہو تو میں کوشش کر کے وائسرائے سے یہ بات طے کرا دوں۔ اقبال نے کہا کہ ہاں کوشش کرو۔ میں جنوبی افریقہ جانے کے لئے تیار ہوں۔ اس کے چند روز بعد سر فضل حسین نے پوچھا کہ تمہاری بیوی پردہ کرتی ہے یا نہیں؟ اقبال نے کہا کہ ہاں وہ تو پردہ کرتی ہے! سر فضل حسین نے کہا کہ تو پھر تمہارا تقرر نہیں ہو سکتا کیونکہ وہاں تمام سوشل تقریبات میں ہائی کمشنر کی بیوی کا بطورِ میزبان شریک ہونا لازمی ہے۔ اس پر اقبال بہت مایوس بھی ہوئے اور برہم بھی۔ اور فرمانے لگے کہ معلوم ہوا کہ اپنی تہذیب اور شعار پر قائم رہتے ہوئے کسی مسلمان کے لئے اس حکومت میں کوئی مقام نہیں۔

اقبال کی طبیعت میں ریاکاری کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ ایک روز فرمانے لگے کہ اگر میں ریاکی کوشش بھی کروں تو کبھی مجھے اس میں کامیابی نصیب نہ ہو۔ ایک روز ایک شخص انارکلی والے مکان کی سیڑھیاں چڑھ کر خاموش ان کی نشست کے کمرے کے دوسرے سرے پر آ کھڑا ہوا۔ اقبال نے پوچھا کہ آپ کون ہیں اور کیسے تشریف لائے ہیں؟ اس شخص نے کہا کہ میں نے آپ کا کلام پڑھا ہے اور مجھے یقین ہو گیا ہے کہ آپ عارفِ ربانی ہیں۔ میں فقط دیدار کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ فرمایا کہ میاں تمہیں کچھ مغالطہ ہوا ہے۔ جو کچھ سمجھ کر آئے ہو میں وہ نہیں ہوں۔ معلوم نہیں کہ اس شخص کو یقین آیا یا نہیں یا اس نے محض اس تردید کو کسرِ نفسی سمجھا۔ یہ احساس علامہ اقبال کو ضرور تھا کہ مجھے خاص کمال، خاص علم اور بصیرت عطا کی گئی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اپنی کوتاہیوں سے بھی واقف تھے۔ شعر میں تو شاعر بہت کچھ کہہ جاتا ہے لیکن ان کی گفتگو میں اپنی ذات کے متعلق تعلی نہیں ہوتی تھی۔ میں نے برسوں میں فقط ایک مرتبہ ان کے منہ سے یہ فقرہ سنا کہ قدرت نے گوئٹے میں کیا رکھا تھا جو مجھ میں نہیں ہے۔ اس کو اکبر سا قدر دان مل گیا اور ہم فرنگی کی غلامی کے زمانے میں پیدا ہوئے۔ فارسی اشعار میں اپنا گوئٹے سے مقابلہ کرتے ہوئے بھی اسی قسم کا اظہارِ تاسف کیا ہے کہ اس کو ملت اور سلطنت قدردان ملی اور اس کے جوہر درخشندہ ہو گئے اور ؎

من دمیدم از زمینِ مردۂ!

اقبال کو زر کی ہوس نہیں تھی۔ وہ علم و فن میں تخلیقی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ ایک روز فرمانے لگے کہ میری قوم کو اچھی کتابیں خریدنے کا شوق نہیں یہ اس زمانے کی بات ہے جب انہوں نے اسرارِ خودی خود اپنے صرفہ سے طبع کرائی تھی اس کے پانسو نسخے دو تین سال تک بھی فروخت نہ ہو سکے۔ بہت سے نسخے دوستوں کو خود تحفتاً دے دئے یا احباب نے خود بطورِ تحفہ طلب کر لئے حالانکہ اس کی قیمت صرف ایک روپیہ تھی۔ فرماتے تھے کہ اگر میں تصنیف سے عزت کا روزگار پیدا کر سکتا تو اور کوئی کام نہ کرتا۔ ایک نوابوں کے خاندان کا ذکر کیا کہ ان کی ریاست کا منیجر جو میرا دوست ہے مجھ سے اسرارِ خودی کا ایک نسخہ نواب صاحب کے لئے تحفتاً لے گیا تھا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد وہ مجھ سے ملنے آیا تو کہا کہ ایک یا دو نسخے مزید تحفتاً عنایت فرمائیے۔ کیونکہ نواب صاحب کے گھر میں جھگڑا ہو گیا ہے کہ جو نسخہ میں لے گیا تھا وہ کس کے لئے ہے جھگڑا مفت لینے پر ہوا۔ یہ کسی کو خیال نہ آیا کہ دو چار روپے کے دو چار نسخے خرید لئے جائیں۔

بانگِ درا کی پہلی ایڈیشن دارالاشاعت نے چھاپی۔ اس کے بعد احباب نے ان کو مشورہ دیا کہ خود چھپواؤ تو منافع زیادہ مل سکتا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد وہ کتابیں خود ہی چھپواتے اور شیخ مبارک علی یا کسی دوسرے کتب فروش کو پورا ڈھیر نقد قیمت پر حوالہ کر دیتے۔ بے نیاز شاعر ہونے کے باوجود سودا کرنے میں وہ بنیوں کو بھی مات کر دیتے تھے۔ اپنی حلال کمائی کو پوری کوشش سے بچاتے تھے۔ ایک مرتبہ میرے سامنے کسی پریس والے سے سودا کر رہے تھے کہ دیکھو طباعت بہت اعلیٰ ہونی چاہیئے اور سیاہی اول درجے کی لگاؤ۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اچھی روشنائی میں شاید ایک دھیلا فی کاپی زیادہ خرچ آتا ہے۔ اگر یہ تھوڑی اجرت بڑھا دیں تو کام اچھا ہوگا۔ لیکن اقبال اصرار کر رہے تھے کہ کام اچھا ہونا چاہئے لیکن اجرت میں دھیلا نہیں بڑھ سکتا۔ میں کہنے والا تھا کہ ڈاکٹر صاحب چھوڑیئے، چند روپوں کی بات ہے، کام اچھا ہو جائے گا۔ لیکن میں خاموش رہا اور اقبال کے اس پہلو کا لطف سے مطالعہ کرتا رہا کہ فلسفے کے ساتھ اس جزرسی کی آمیزش بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ شیخ مبارک علی ان چند ناشروں اور کتب فروشوں میں سے ہیں جو لین دین کے بہت کھرے ہیں۔ علامہ اقبال کو کثیر رقوم وہ یک مشت ادا کر کے کتابوں کے پورے مطبوعہ نسخے اٹھا لیتے تھے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ کچھ رقم کا بقایا شیخ مبارک علی کے ذمہ واجب الادا تھا۔ شیخ صاحب خود وہ رقم لے کر ان کی کوٹھی پر حاضر ہوئے۔ علی بخش نے کہا کہ آج ڈاکٹر صاحب کی طبیعت کچھ ناساز ہے اس لئے اندر زنانے ہی میں بستر پر لیٹے ہیں۔ شیخ صاحب نے کہا کہ ان کو اطلاع نہ کرو، خواہ مخواہ زحمت ہوگی، میں پھر کسی روز حاضر ہو جاؤں گا۔ کچھ روز بعد شیخ صاحب رقم لے کر حاضرِ خدمت ہوئے۔ علامہ نے کہا کہ شیخ صاحب میں آپ کا کئی روز سے منتظر تھا——— شیخ صاحب نے کہا کہ میں تو ایک روز حاضر ہوا تھا لیکن علی بخش سے یہ سُن کر کہ طبیعت ناساز ہے، میں بغیر اطلاع کئے واپس ہو گیا۔ علامہ نے پوچھا کہ کیا رقم لے کر آئے تھے؟ شیخ صاحب نے کہا ہاں رقم ہی تو لایا تھا۔ فرمایا تم نے غضب کیا مجھے اطلاع نہ کرائی۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم رقم لائے ہو تو بستر پر سے کیا میں قبر میں سے بھی نکل آتا۔ یہ علامہ کی بذلہ سنجی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ لین دین کے معاملے میں کافی ہشیاری برتتے تھے۔

علامہ اقبال کی عادات میں بعض غیر معمولی خوبیاں تھیں۔ ایک بہت اچھی عادت یہ تھی کہ وہ ہر شخص کے خط کا جواب ضرور دیتے تھے اور ہمیشہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں نہایت خوشخط تھے۔ اگر تمام لوگ ان کے خطوط محفوظ رکھتے تو ایک بہت بڑا ذخیرہ ہوتا۔ اگر کوئی علم و فن یا مسائل دین و حکمت کی بات پوچھتا تو اکثر طویل اور مبسوط جواب لکھنے سے بھی گریز نہ کرتے تھے۔ طبیعت میں علمی پندار بالکل نہیں تھا جن باتوں کے متعلق وہ سمجھتے تھے کہ دوسرا مجھ سے زیادہ جانتا ہے وہ بے دریغ اس سے استفادہ کرتے تھے، داد دیتے تھے، اظہارِ تشکر کرتے تھے۔ بعض لوگ حیران ہوتے ہیں کہ بعض خطوط میں انہوں نے مولانا سید سلیمان ندوی کی بہت مدح سرائی کی ہے اور ایسے الفاظ لکھ گئے ہیں جن سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ سید سلیمان عالمِ کل ہیں اور اقبال ان کے شاگرد ہیں۔ یہ اقبال کی فیاضیٔ طبع تھی۔ اقبال کا علم اور انداز کا تھا، اور سید سلیمان کا اور انداز کا۔ لیکن جب سید صاحب کے مخصوص معلومات سے استفادہ کرتے تھے تو دل کھول کر اس کا اقرار کرتے تھے۔ شاعری میں جب ان کا مرتبہ مسلّم ہو چکا تھا۔ اس وقت بھی اگر کوئی شخص معقول اعتراض کرے تو اس کو بشرحِ صدر قبول کرتے تھے۔ جوابِ شکوہ کے چھپنے کے بعد علی گڑھ سے ایک صاحب نے بہت سے اعتراضات کئے۔ حسن محمد حیات صاحب نے جو مولانا محمد علی اور شوکت علی کے خاص دوست اور دستِ راست تھے، وہ اعتراضات لکھ کر علامہ اقبال کو بھیجے۔ علامہ نے جو جواب دیا وہ خط میں نے بھی پڑھا۔ اس میں وہ فرماتے ہیں کہ شعر کو بحیثیتِ فن نکھارنے کے لئے بڑی فرصت درکار ہے۔ میں نے وہ نظم جلدی میں لکھی اور جا بجا میرے قلمی نسخہ میں بعض الفاظ اور مصرعوں پر نشان لگے ہوئے ہیں۔ احباب نے اس نظم کو جلدی پڑھنے اور چھاپنے پر اصرار کیا۔ معترض نقاد کو جو خامیاں دکھائی دی ہیں اس سے زیادہ خود میری نظر میں ہیں۔ افسوس ہے کہ اشعار کو بحیثیتِ فنِ لطیف سنوارنے کی مجھے فرصت نہیں۔ اپنے فارسی اشعار اپنے دوست گرامی کو دکھاتے تھے اور گرامی کی اصلاح کو بہ تشکر قبول کرتے تھے۔ اگرچہ خود گرامی اقبال کی شاعری کو جزوِ پیغمبری جانتے تھے۔

عام طور پر شاعروں کو اپنے اشعار سنانے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ بعض اوقات جھوٹ موٹ کے بہانے کرتے ہیں لیکن حقیقت میں سنانے پر اور داد حاصل کرنے پر تلے ہوتے ہیں۔ اس معاملے میں حضرتِ اقبال بالکل انوکھے شاعر تھے۔ انجمن کے جلسوں کے بعد پھر وہ ہمیشہ محفلوں اور مشاعروں

میں اشعار سنانے سے گریز کرتے تھے۔ مشاعروں میں تو وہ قطعاً شریک نہ ہوتے تھے۔ ان کے احباب میں سے بہت تھوڑے ایسے ہوں گے جن کو اقبال نے کبھی اپنی مرضی سے اشعار سنائے ہوں یا جنہوں نے شعر سننے کی فرمائش کی جرأت کی ہو۔ اچھے شاعر بھی بہت کم پیدا ہوتے ہیں اور سخن فہموں کی بھی بہت قلت ہے لیکن ہماری معاشرت کے امراض میں سے یہ ایک لاعلاج مرض ہے کہ جہاں چھوٹی یا بڑی محفل میں کوئی ایسا شخص موجود ہو جو اپنے تئیں شاعر سمجھتا ہے یا لوگوں میں شاعر مشہور ہے تو فوراً مطالبہ ہوتا ہے کہ ہاں کوئی نظم یا غزل ہو جائے۔ سو میں سے ننانوے[99] شاعر اور متشاعر تو خود ہی اس پر آمادہ رہتے ہیں اقبال کو یہ رسم بہت قبیح معلوم ہوتی تھی۔ اقبال جب اپنے انگریزی لیکچر پڑھنے کے لئے مدراس تشریف لے گئے تو غالباً بنگلور میں عورتوں نے ایک جلسے میں انہیں گھیر لیا کہ کچھ اشعار سنا دیجئے۔ اقبال گھبرائے کہ ان سے کیسے پیچھا چھڑایا جائے۔ دروغِ مصلحت آمیز کا ہتھیار استعمال کیا کہ کوئی شعر زبانی یاد نہیں۔ اس پر پردہ کے پیچھے سے ایک مستورہ نے بانگِ درا ان کی طرف پھینکی کہ یہ لیجئے اگر یاد نہیں تو اس میں سے کچھ پڑھ دیجئے۔ اس حرکت نے اقبال کو عاجز کر دیا واپسی میں وہ حیدرآباد دکن میں انہیں خطبات کو وہاں دہرانے کے لئے سر اکبر حیدری کے اصرار سے رکے وہاں عثمانیہ یونیورسٹی کی ایک تقریب میں سروجنی نائیڈو کی بڑی بیٹی پدمجا نے میرے سامنے اقبال سے بزور درخواست کی کہ کوئی نظم سنا دیجئے۔ وہاں بھی اقبال نے ایک ظریفانہ دروغ سے کام لیا کہ میرے مرشد نے منع کیا ہے کہ عورتوں کو شعر مت سنایا کرو۔ سر اکبر حیدری قریب کھڑے تھے۔ کہنے لگے کہ ان کو سنا دو مرشد کے ارشاد کی خلاف ورزی نہیں ہوگی۔ یہ عورتیں اس نوع کی نہیں جو تمہارے مرشد کے ذہن میں ہوں گی۔ مہاراجہ کرشن پرشاد مدارالمہام سلطنت آصفیہ اقبال کے بڑے مداح اور دلی دوست تھے۔ انہوں نے اقبال کی آمد کی تقریب میں ایک عظیم الشان دعوت اپنے محل میں کی جس میں تمام علماء و فضلاء امراء و شعراء اور عہدہ داران سلطنت کو مدعو کیا۔ اقبال نے کہا کہ میں اس محفل میں اس شرط پر شریک ہونے کو تیار ہوں کہ آپ یا کوئی شخص مجھ سے شعر خوانی کی فرمائش نہ کرے۔ مہاراجہ نے کہا کہ یہ تو مشکل ہے۔ اقبال نے کہا کہ پھر میں نہیں آؤں گا۔ دعوت نامے شائع ہو چکے تھے اور تقریب اقبال ہی کے لئے تھی۔ اب اسے منسوخ کیسے کیا جائے اور اقبال نہ ہو تو برات حاضر دولہا غائب والی مثل ہوگی۔ مہاراجہ نے کہا کہ بہت اچھا۔ تمہاری شرط منظور۔ تمہیں کوئی مجبور نہ کرے گا اس شان سے دعوت ہوئی جب کھانا ہو چکا تو مہاراجہ نے بعض امراء سے شعر پڑھنے کو کہا جن کو شاعر ہونے کا شغف تھا یا حواریوں نے ان کو مغالطے میں ڈال رکھا تھا۔ بعض پیشہ ور شاعر بھی تھے ان سے بھی غزلیں پڑھوائیں۔ اب چاروں طرف سے تقاضا شروع ہوا کہ اقبال کچھ سنائیں۔ میں علامہ کے ساتھ صدر میں بیٹھا تھا۔ میں نے ان کی طرف دیکھا کہ یہ دنگل ہو رہا ہے اور طبیعت منغض۔ سر اکبر حیدری اور دوسرے امراء تقاضا کر رہے ہیں لیکن کرشن پرشاد خاموش ہیں کیونکہ اقبال سے بہ اصرار نہ کرنے کا وعدہ کر چکے تھے۔ میں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب تقاضا شدید ہے اور راہ گریز نہیں۔ میں نے ایک دو مرتبہ ہی اپنی زندگی میں اقبال سے ڈانٹ کھائی ہے۔ اس موقع پر تھا انہوں نے مجھے ڈانٹ دیا۔ اس کے بعد کرشن پرشاد نے بصد تامل اشارہ کیا جو عاجزانہ درخواست سے لبریز تھا۔ اقبال مجبور ہو گئے اور فارسی کے چار اشعار غم و غصہ سے لبریز آواز میں سنائے۔

بگذر از خاور و افسونیٔ افرنگ مشو — کہ نیرزد بجوے ایں ہمہ دیرینہ و نو

اور دوسرے اشعار کا مضمون یہ تھا کہ شعر و سخن تو ایک بہانہ ہے ورنہ میرا مقصد یہ ہے کہ مست سیٹے قطار می کشم ناقۂ بے لجام را۔

کسی کی طلب پر شعر نہ سنانے کا ایک اور قصہ بھی وہیں حیدرآباد میں پیش آیا۔ جوش ملیح آبادی اپنے رنگ میں اچھے شعر کہتے ہیں۔ لوگ انہیں شاعر انقلاب کہنے لگے تھے شاعری بحیثیت فنِ لطیف ان کا پیشہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ اپنے تئیں اقبال سے بلند تر شاعر سمجھتے تھے۔ انہوں نے اقبال کو گھر پر چائے کی دعوت دی اور اپنے دو ایک خاص ہم مشربوں کے سوا اور کسی کو نہیں بلایا۔ جوش حیدرآباد میں مجھ سے صبح و شام بے تکلف ملتے تھے اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ میں اقبال سے بہت قریبی رابطہ رکھتا ہوں لیکن انہوں نے مجھے بھی مدعو نہ کیا۔ سرکاری مہمان خانے میں علامہ کے پاس بیٹھا تھا۔ پانچ بجے انہوں نے مجھ سے کہا کہ جوش ملیح آبادی نے چائے پر بلایا ہے، وہاں جانا ہے تمہیں بھی بلایا ہوگا۔ میں نے عرض کی کہ نہیں میں مدعو نہیں۔ وہ اکیلے ہی چل دیئے۔ دوسرے روز مجھے معلوم ہوا کہ جوش نے اس غرض سے بلایا تھا کہ اپنے جواہر پارے ان کے سامنے پیش کروں گا اور اقبال سے ان کا کلام سنوں گا۔ جوش نے بہت سر مارا کہ کچھ سنا دیجئے۔ اقبال یہی جواب دیتے گئے کہ کچھ یاد نہیں۔ انہوں نے جوش صاحب کو مقابلے اور سنانے کی لذت سے محروم ہی رکھا۔

ذاتی روابط کی بنا پر بھی اقبال کے متعلق کچھ لکھنے بیٹھو تو بات میں سے بات نکلتی آتی ہے۔ بے شمار باتیں ہیں جن سے ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ رسالے کے ایک مختصر مضمون میں چند باتوں پر اکتفا ناگزیر ہے۔

———

فانی

جوش ملیح آبادی

اپنے محبوب اور دلنشیں زمانے کے محبوب حضرت فانی بدایونی سے میں اُس وقت ملا تھا جب کہ میری نوجوانی کی مسیں بھیگ رہی تھیں، اور اُن کی جوانی کی داڑھی کے بال سفید ہو چکے تھے۔

ہائے کیا دور تھا، اب یاد کرنے میں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ دنیا اور اس کی ہر شئے کیسی نئی نئی اور سہانی سہانی سی معلوم ہوتی تھی، اور لوؤں اور گرگوں کا بولنا اور فقیروں کا گانا تک اچھا لگتا تھا" بابا خوش رہے تیری نگری"۔

اس طرف صبح کاذب کا دھندلکا مجھے آغوش میں لئے کھیل رہا تھا، اُدھر فانی کی انگنائی میں صبح کی تازہ کرنیں رقص کر رہی تھیں۔

دُنیا جوان تھی مرے عہدِ شباب میں

فانی اُس زمانے میں، یادش بخیر، نو سبزہ امین آباد پارک لکھنؤ کے ایک بالاخانے میں رہتے اور وکالت کرتے تھے۔ لیکن وہ کبھی موکلوں کو تابع نہیں کر سکے۔

وہ وکالت میں دل نہیں لگاتے تھے، دل لگا نہیں سکتے تھے، اُن کی وکالت کی پیشانی پر اُسی طرح Untouched by heart (بے لمسِ قلب) درج تھا، جس طرح بعض دواؤں کی شیشیوں پر Untouched by hand (بے لمسِ دست) چھپا ہوتا ہے۔

فانی وکالت کرتے بھی تو کیوں کر، ایک تو شاعر، دوسرے "اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل" خاندان کے عاشق تو گرفتار، ایک تو کریلا، پھر نیم چڑھا۔

روز بروز بے چارے کا کاروبار بگڑتا ہی چلا گیا، اور اس طرح کہ انھیں خبر بھی نہ ہو سکی کہ میری معاشی زندگی کا دھارا کس ریگستان کی جانب مڑ رہا ہے۔

چناں چہ وہی ہوا جو ہونے والا تھا، اُن کی معاشی زندگی کی بدھیا بیٹھ گئی، اور مصیبت تنہا کب آتی ہے۔ دوسری طرف یہ ہوا کہ اُن کے معاشقے کی دنیا میں ایک ایسا غیر متوقع اور اچانک زلزلہ آیا کہ پورا تختہ ہی اُلٹ کر رہ گیا۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ راجعون!

ناچار کانپتے ہاتھوں سے غریب فانی نے اپنا بوریا بدھنا اُٹھایا اور لکھنؤ سے یہ کہتے ہوئے آگرے چلے گئے:-

جاتا ہے آسماں لئے کوچے سے یار کے
آتا ہے جی بھرا درو دیوار دیکھ کر

فانی کے آگرے جاتے ہی میرے سر پر بھی انھیں کی طرح طوفانی بادل گھڑگھڑانے لگے، اور پھر کچھ ایسے ٹوٹ ٹوٹ کر برسے کہ میں حیدرآباد چلا گیا ——— از درِ دوست چہ گویم بچہ عنواں رفتم۔

ہم دونوں نے ایک ہی حالات میں لکھنؤ کی افسوں فروش سرزمین کو چھوڑا، اُن کی کہانی اُبھر گئی، میری کہانی دبی رہی۔

طالعِ شہرتِ رسوائی مجنوں بیش است
ورنہ طشتِ من واُو، ہر دو زیک بام اُفتاد

ہاں تو میں کہہ رہا تھا فانی آگرے چلے گئے ——— لیکن وہاں بھی اُن کو آسودگی میسّر نہیں آئی۔ نہ غمِ جاناں کم ہوا، نہ غمِ دوراں۔ دیارِ تاج میں بھی شاعر برہنہ سر ہی رہا۔ چولھے کی برودت اور چھاتی کی حرارت نے وہاں بھی غریب کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ ع

بہر زمیں کہ رسیدیم، آسماں پیدا است

یہ مانا کہ آگرے میں اُس وقت شاہ دل گیر، حافظ امام الدین، چھمّو جان، لطیف احمد، مے کش، محمود اور مانی موجود تھے، اور یہ سب کے سب فرداً فرداً اور مجموعاً فانی کے دل کی ڈھارس بندھایا کرتے تھے، لیکن اُس جلے تن کا پھر بھی یہ عالم تھا۔

آگیا جب کوئی، کرلیں چار باتیں اُس سے بھی
پھر وہی سر پھوڑنا جس وقت تنہائی ہوئی

دل بہلانے کی خاطر آگرے سے فانی صاحب نے مانی صاحب کی رفاقت میں ایک ماہ نامہ "تسنیم" کے نام سے جاری کیا، لیکن اِن بدبخت مانیوں، اور فانیوں میں وہ ذوقِ شعر کی آنکھیں پھوڑ دینے والی تاجرانہ بصیرت کہاں کہ وہ کوئی رسالہ تا دیر جاری رکھ سکیں۔

نہ بھائی، ہماری یہ طاقت نہیں
تجھی سے اُٹھیں میر یہ خواریاں

چناں چہ وہ رسالہ کچھ روز نبضِ بیمار کی طرح چل کر، ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔

میرا رسالہ "کلیم" بھی، جو "تسنیم" کے بعد میں نے دہلی سے نکالا تھا، "تسنیم" سے یہ کہتا ہوا اِس جہانِ فانی سے رخصت ہوا تھا۔

تھا جن کو جن کو عشق کا آزار، مر گئے
اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار، مر گئے

فانی صاحب کو آگرے کی ہوا بھی راس نہیں آئی، اُنھوں نے مجھے لکھا کہو تو حیدرآباد آکر قسمت آزمائی کروں" میں نے جواب دیا آیئے اور ضرور آیئے ——— میری سمجھ میں یہ بات نہیں ہے کہ جب سرے سے کسی کے پاس "قسمت" ہی نہیں ہے، تو "قسمت آزمائی" کا مفہوم ہی کیا ہو سکتا ہے۔

اس کے کوئی ہفتے عشرے کے بعد فانی حیدرآباد آگئے اور میرے ہی یہاں اُنھوں نے قیام کیا۔

فانی صاحب کی ملازمت کے سلسلے میں کیا کیا ہفت خواں طے کیے، اور مشہور شاعر نواز مہاراجہ سرکشن پرشاد کے پیہم مساعی کے باوصف، کن کن شفہا کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑا۔ ع

یہ حال مجھ سے یارِ جہاں آشنا نہ پوچھ!

بارے خدا خدا کرکے اُنھیں ایک اسکول کی ہیڈ ماسٹری مل گئی، فانی اور ہیڈ ماسٹر!

کفن بیاور و تابوت و جامہ نیلی کن
کہ روزگار طبیب است و عافیت بیمار

لیکن چند سال میں یہ ہڈ ماسٹری بھی، جسے بمراحم خسروانہ عطا فرما کر ریاستِ حیدر آباد نے اپنی شاعر نوازی پر اعلان فخر کیا تھا، فانی سے چھین لی گئی۔ "خدا بخشے"، مہاراجہ کشن پرشاد کو جب تک وہ زندہ رہے، فانی کی اشک شوئی کا سلسلہ جاری رہا، لیکن اُن کے انتقال کے بعد تو اللہ دے اور بندہ لے کا سانحہ پیش آ گیا۔

اُسی حیدر آباد میں جلیلِ مانک پوری بھی رہتے تھے، اور فانی بدایونی بھی، جلیل "اُستادِ شاہ" تھے اور فانی گدائے راہ۔

یہ داستان، اور اِس قبیل کی تمام داستانیں بہت ہی تلخ ہیں، ایسی تلخ کہ اِنسانی سماج، اور خدائی راج، دونوں سے شدید ترین بغاوت پر اُکساتی اور انسان کو ارضی و سماوی، دونوں حکومتوں کا خوف ناک ترین باغی بناتی ہیں۔

تفو بر تو اے چرخِ گرداں، تفو!!

فانی بے چارہ نہ وطن ہی میں چین سے رہا، نہ غربت میں۔

فانی ہم تو جیتے جی وہ میّت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی، اور وطن بھی چھوٹ گیا

چناں چہ اگر اچھی طرح ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو پتا چل جائے گا کہ یہ وہی متصل ناکامیاں اور یہ وہی مسلسل نامرادیاں تھیں، جنھوں نے فانی سے بزمِ احباب میں ہنسنے بولنے اور زندگی سے لطف اُٹھانے کی صلاحیت ہی چھین لی تھی۔ اور معاشرے سے اُنھیں اِس قدر بیزار کر دیا تھا کہ اور تو اور وہ اپنے مخلص دوستوں تک سے بدگمان ہو گئے تھے، اور زندگی کے آخری اَیّام میں تو اپنا دشمنِ جانی سمجھنے لگے تھے۔ اور اُن کی آنسوؤں میں ڈوبی آنکھیں فرداً فرداً ہر دوست سے کہا کرتی تھیں:۔

ہوئے تم دوست جس کے، دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو

آخر میں اُن کے مزاج کی اس کیفیت سے تنگ آ کر اُن کے دوستوں نے اُن سے ملنا جلنا تقریباً ترک کر دیا تھا۔ اور فانی کی زبان پر تھا:۔

ہم ہیں اور آشفتگی کی آرزو غالب، کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا، جل گیا

فانی تو اپنی اِس قلبِ ماہیت کو سمجھ ہی نہیں سکتے تھے، مگر فانی سے روٹھ جانے والے احباب نے اِس قلبِ ماہیت پر غور کرنے کی زحمت کیوں نہ برداشت کی؟ اِس پر تعجب ہوتا ہے۔

گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا؟

کسی نے اِس پر نگاہ نہیں ڈالی کہ فانی کا سا پیارا اور مخلص انسان اِس درجہ دوست بیزار کیوں ہو گیا۔ کسی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ فانی کی یہ مزاجی کیفیت نکتہ چینی اور غیظ آفرینی کی نہیں، بلکہ اُن پر ترس کھانے کے قابل بات ہے۔

خدا را سینے میں دل کو جگا کر ذرا تصوّر کیجیے اُن لاتعداد قطار در قطار، کارواں در کارواں، فوج بفوج اور موج بموج شدائدِ حیات کا جو ناتوان و نامراد فانی کے سینے کو روندتے ہوئے ہر آن، ہر لمحہ، ہر دقیقہ، ہر صبح اور ہر شام گزرا کرتے تھے۔ گزرا کرتے تھے، بے وقفہ، بے تکان اور لگاتار گزرا کرتے تھے۔ جن کا تانتا ایک نفس کے لئے بھی نہیں ٹوٹتا، یہاں تک کہ فانی، اپنے دل کی تمام گہرائیوں کے ساتھ موت کی آرزو کرنے لگے، موت اُنھیں اپنی دلھن معلوم ہونے لگی، اور بالآخر، ہزاروں دعاؤں، لاکھوں منّتوں اور بے شمار آرزوؤں کے ساتھ وہ موت سے ہم آغوش ہو کر زندگی کے

مجبوریوں کے جبڑوں سے رہائی پا گئے۔

شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم!

کیا آپ فانی کے سے دُنیا کے ٹھکرائے ہوئے، اور زندگی کے توڑے انسان سے، نامِ خدا، یہ توقع کر سکتے ہیں کہ وُہ سماج کو، جس میں اُس کے اقارب و احباب بھی شامل ہیں، شریف و شائستہ اور بھلے آدمیوں کا مجموعہ و گل دستہ سمجھے گا، وُہ اپنے دَور کی حکومت کو نکتہ رس اور جوہر شناس مانے گا، اور وُہ اپنے خدا کو رافت و رحمت کا سرچشمہ خیال کرے گا؟

ایں خیال است و محال است و جنوں

گدّے پر بیٹھ اور گاؤ تکیہ لگا کر فلسفے پر باتیں کرنا بہت آسان ہے، لیکن مصیبت زدگی کی بوکھلاہٹ میں بھی فلسفے کے نقطے پر قائم رہنا بچوں کا کھیل نہیں۔

بسا اوقات یہ دیکھا گیا ہے کہ فلسفۂ مصیبت کے وقت ایک ایسی چھوٹی سی چھتری کا کام دیتا ہے، جو طوفانی بارش میں لگائی گئی ہو۔

یہ صحیح ہے کہ فانی کے سے حالات میں بھی انسان کے دماغ کا توازن درست رہ سکے اور اُس کے اندازے کی سوئی ٹھیک مقام پر رہے، لیکن یہ آدمی کا نہیں دیوآدمی کا کام ہے۔

فانی بے چارہ ناتواں تھا، شدید حسّاس تھا، بلا کا جذباتی تھا، اور اُس کی فطرت میں، شدّتِ لطافت کی بنا پر، نسائیت کا عنصر بھی موجود تھا، ان حالات میں اُس کے واسطے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ شاید حیات نے اُس دردرسیدہ کو جس سانچے میں ڈھال دیا تھا، وہ اُس سے مختلف یا اُس کے برعکس ہو جاتا۔

نظر ہو خواہ کتنی ہی حقائق آشنا پھر بھی
ہجومِ کش مکش میں آدمی گھبرا ہی جاتا ہے

اب قرینِ مصلحت یہی معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنے ذہن کو مصائبِ فانی کے موضوع سے ہٹا لوں، کیوں کہ مرحوم کی درماندگیوں پر غور کرتے کرتے میرا دماغ پھٹنے سا لگا ہے۔

کیا فائدہ کہ اِس سلسلے میں کچھ ایسی باتیں منہ سے نکل جائیں کہ فانی کے بظاہر بعض اُمرا، اور آسمانی رحمت و رافت کے ڈھنڈورا پیٹنے والے بعض "صُلحا" حق کی تلخی سے تِل مِلا اُٹھیں۔

افسوس، بے شمار سخن ہائے گفتنی
خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے

اب حیدر آباد کی دو ایک ہلکی پھلکی باتیں سُنیے، رونا ہو چکا۔ اب ہنسنے کی باری ہے۔

ایک شام کو جب کہ میں فانی صاحب کے صحن خانہ میں بیٹھا اُن سے اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہا تھا کہ علاّمہ علی حیدر صاحب نظم طباطبائی تشریف لے آئے۔

ہم دونوں احتراماً کھڑے ہو گئے۔ اُن کی جانب لپک کے گئے، اُن کے ہات چومے اور نہایت عزّت کے ساتھ اُنھیں صدر مقام پر بٹھا دیا۔

شامتِ اعمال کہ باتوں باتوں میں شاعری کی بات نکل آئی، جس پر علاّمہ نے یہ فرمایا کہ آپ جو چاہیں سو خیال کریں، لیکن میں نے اِس بیاسی تراسی کی عمر میں ایک مصرع بھی اپنی طبیعت کے تقاضے سے مجبور ہو کر اب تک نہیں کہا ہے، یہ جو کچھ بھی میرے کلام کا مطبوعہ و غیر مطبوعہ سرمایہ ہے، وہ تمام تر مصرع ہائے طرح اور فرمایشِ احباب کا نتیجہ ہے اور بس۔

میں نے حیرت سے کہا "علاّمہ بس" ! میں نے دل ہی دل میں کہا بھلا یہ بھی کوئی شاعری ہوئی، اور یہ جذبہ پیدا ہوتے ہی میں نے ایک خاص قسم کا مُنہ بنا کر اُنھیں کچھ اِس بُری طرح گھورنا شروع کیا کہ فانی صاحب کے کبھی نہ ہنسنے والے چہرے پر تبسّم کھیلنے لگا۔

علاّمہ چوں کہ فرطِ پیری سے سر جُھکائے بیٹھے تھے، اُنھیں کچھ پتا نہیں چلا کہ اُن کے پہلو میں کیا ہنگامہ پرورش پا رہا ہے۔ فانی نے بار بار آنکھوں اور ہاتوں کے اِشارے سے مجھے منع کیا کہ میں گھورنا ختم کر دوں، لیکن میں نہیں مانا، فانی نے انتہائی کرب کے علامات کے ساتھ مجھے اِشارے سے بتایا کہ ہنسی کے مارے اُن کا دم نکلا جا رہا ہے۔ میں نے اِس کی بھی پروا نہیں کی اور اپنے مُنہ کو اور بھی مسخرگی آمیز بنا دیا۔

بس پھر کیا تھا، فانی میں تابِ ضبط نہیں رہی، اُنھوں نے بڑی تیزی کے ساتھ چاہا کہ وہ وہاں سے فوراً اُٹھ کھڑے ہوں، لیکن اُٹھتے اُٹھتے ایک بہُت زور کا قہقہہ اُن کے مُنہ سے نکل پڑا، اور وہ قہقہے مارتے ہوئے اپنے کمرے کی جانب، بڑی سراسیمگی و بے چارگی کے ساتھ، بھاگ گئے۔

چناں چہ علاّمہ طباطبائی نے حد سے گزری ہُوئی حیرت و ندامت کے ساتھ، جس میں برافروختگی بھی شامل تھی، اپنا سفید سر میری جانب اُٹھایا، اور اپنی موٹے تاسے کی عینک سے، میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر، مجھ سے سے کہا "حضرت یہ کیا پیش آ گیا، یہ کس قبیلے کی تہذیب ہے ؟"

علاّمہ کو کیا معلوم تھا کہ میں بھی ہنسی کے مارے مرا جا رہا ہوں، مجھ سے کچھ بولا ہی نہیں گیا، اور جب اُنھوں نے مجھ سے کہا "آپ خاموش ہیں!!" تو میرے مُنہ سے ہنسی کے ساتھ "جی جی" نکلا۔ میری اِس "جی جی" پر اُنھوں نے کہا "زندگی میں یہ پہلا واقعہ ہے، آپ لکھنوی تہذیب کے نام لیوا ہیں اور ہنس ہنس کر جی جی کہہ رہے ہیں۔"

بس پھر تو میرا سینہ شق ہو گیا، میں "اُلٹے مر گئے" کہتا ہُوا اُٹھا، اور فانی کی طرح اُٹھتے اُٹھتے میرے مُنہ سے بھی، توپ کے گولے کی طرح ایک پاٹ دار اور خارا شگاف قہقہہ نکل گیا، جس کی دھمک سے علاّمہ تھرّا کر رہ گئے، اور میں برابر قہقہے مارتا ہُوا فانی کی اُسی چارپائی پر آ کر لوٹنے لگا جس پر فانی ہنسی کے مارے لوٹ رہے تھے۔

ابھی ہم لوٹ ہی رہے تھے کہ صحن سے کُتیا کی بڑی زور کی آواز آئی پوں، پوں، پوں، پوں، ہم دونوں ہنسی کے مارے ہوؤں نے کھڑکی سے جھانکا تو معلوم ہُوا کہ علاّمہ علی حیدر صاحب غیظ و غضب سے کانپنے اور سراسیمگی کے باعث سوئی ہُوئی کُتیا کا پاؤں کچل کر باہر تشریف لے جا رہے ہیں ـــ

اُس کے بعد علاّمہ نے ہم دونوں سے مِلنا چھوڑ دیا، اور ہم نے بھی اپنی صُورت اُنھیں کبھی نہیں دکھائی۔ کیا مُنہ لے کر صُورت دِکھاتے۔

اب ایک دُوسرا واقعہ سُنیئے، جس میں فانی کو دم بخود ہو جانا پڑا تھا۔

رات کا وقت تھا، یارانِ سرخوش کے انفاس سے کمرہ مہک رہا تھا اور فانی بھی نیم سرخوشی کے عالم میں کچھ گُن گُنا رہے تھے کہ گُن گُناتے گُن گُناتے وہ یکایک چونک سے پڑے، اِس طرح جیسے بجلی کا جھٹکا لگ گیا ہو۔

میں نے فانی سے کہا "میری جان یہ پھر پیری کا کون سا موسم ہے" اُنھوں نے یکایک سنجیدہ ہو کر (جو ایسی بزم آرائیوں میں سختی کے ساتھ ممنوع ہے) مجھ سے کہا "ذرا کان قریب لاؤ۔"

میں اپنے دونوں کان اُن کے قریب لے گیا اور اُنھوں نے ایک عجیب طعن آمیز لہجے میں پُوچھا "جوشؔ، کیا غم غلط کر رہے ہو؟" میں نے قہقہہ مار کر کہا "تو اور کیا کریں؟" یہ سُن کر، پیمبرانہ وزنی آواز کے ساتھ اُنھوں نے اپنی گردن کو لانبا کرتے ہوئے کہا "اے ظالم، غم غلط کرنے کی چیز نہیں، غم تو ایک امانتِ الٰہی ہے، اِسے غلط کر کے خیانت کرتے ہو؟"

ایک دوسرا قہقہہ مار کر میں نے فانی سے کہا "بڑے آئے غم کو امانتِ اِلٰہی کہنے والے۔ ارے فنیا (فانی کی تصغیر) تو، تو غم کی وَالِدۂ ماجدہ ہے، وَالِدۂ ماجدہ۔ تو اپنے بچّے کو دودھ پلا، چھاتی سے لگا اور پال پوس کر جوان کر دے، یاروں کو اِس الٰہی صاحب کی اَمانت سے کیا سروکار۔ ع

برق سے کرتے ہیں روشن، شمعِ ماتم خانہ ہم

اور کبھی حافظ کا یہ شعر بھی سُنا ہے میاں صاحب زادے؟

چوں غمِ تو نتواں یافت مگر در دلِ شاد
ما بہ اُمیدِ غمت، خاطرِ شادے طلبیم"

یہ سُن کر تمام بزم جھومنے لگی، اور پھر میں نے فانی کی طرف اشارہ کر کے یارانِ طریقت سے کہا "اے بھائیو، اور اے بدمعاشو، دیکھو اس فانی کی طرف، یہ پورا کرۂ ارض ایک امام باڑہ ہے، اور اس امام باڑے میں یہ فانی ایک بہت بڑا تعزیہ ہے جو مدّتوں سے رکھا ہُوا ہے ——

یہ سُنتے ہی قہقہوں کے شور کی موجوں میں تمام محفل ڈوبنے اُچھلنے لگی اور فانی مجھے اس طرح دیکھنے لگے جیسے عہدِ رسالت میں راسخ الایمان مسلمان ابوجہل کی طرف دیکھا کرتے تھے ——

اب رہی فانی کی شاعری۔ سو اُس کے باب میں کوئی لمبی چوڑی عبارت آرائی تضیعِ اوقات سے بھی کچھ زیادہ ہے۔

ہر چند فانی کے معتقدات، مسلّمات، نظریات اور اُن کے فلسفۂ حیات سے مجھے کوئی تعلّق نہیں، بلکہ دبی زبان سے یہ بھی کیوں نہ کہہ دوں کہ مجھے اُن کے نظریات سے اختلاف ہے —— لیکن، اس اختلاف کے باوجود، میں بڑی بلند آہنگی کے ساتھ یہ کہنے پر اپنے کو آمادہ پاتا ہوں کہ فانی ہی وہ شخص تھا جس نے غزل کی سی غیر فطری اور بے معنی صنف کو فطری اور بامعنی بنا دیا۔

روایت و قافیہ پیمائی سے، جس میں تمام تر غزل گو مبتلا رہتے ہیں، فانی نے اپنا دامن ہمیشہ بچایا، اُن کے دماغ نے جو کچھ فکر کی اور اُن کے دل نے جو کچھ محسوس کیا، بس اُسی کو انھوں نے شعر کا لباس پہنایا۔ اور غزل کے فرسودات کو اپنے پاس پھٹکنے بھی نہیں دیا ——

فانی، باقی رہے گا، اور اُس کا کلام، میرے اور دُنیا بھر کے نظریاتی اختلاف کے باوجود، محض اس بنا پر زندہ رہے گا کہ اُس میں خلوص، ولولے اور شعریت کے جوہر کُوٹ کُوٹ کر بھرے ہیں۔

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

مرزا عظیم بیگ چغتائی

شاہد احمد دہلوی

اللہ بخشے مرزا عظیم بیگ چغتائی بھی عجب خوبیوں کے آدمی تھے۔ سدا کے مرجیوڑے۔ پیدا ہوئے تو اتنے نحیف و کمزور کہ روئی کے پہلوں پر رکھے گئے۔ بڑے ہوئے تو روگی مرجبن۔ اللہ کا دیا گھر میں سب کچھ موجود تھا۔ ددھیال بھی جاندار تھی اور ننھیال بھی ساونتی۔ ان کے والد قسیم بیگ چغتائی یو۔پی میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ آبائی وطن آگرہ تھا یہیں ان کی جدّی جائداد بھی تھی۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی کے نانا منشی امداد علی تھے جو اب سے نصف صدی پہلے کے مشہور ناول نگار تھے۔ ان کی تصانیف "رزم بزم" اور "البرٹ بل" ایک زمانے میں بہت مقبول تھیں۔ مرزا صاحب کے والد بڑے ٹھاٹ کے آدمی تھے۔ سرسید کی آنکھیں دیکھے ہوئے علی گڑھ کے ابتدائی گریجویٹس میں سے تھے۔ اپنے زمانے کے اچھے کھلاڑیوں میں شمار ہوتے تھے۔ ورزش کا بھی شوق تھا۔ سواری کے لئے منہ زور سے منہ زور گھوڑے تلاش کر کے رکھتے تھے بڑے طاقتور آدمی تھے۔ ایک بلی نے گھر والوں کو بہت عاجز کر رکھا تھا۔ ایک دن وہ ان کے ہاتھ آ گئی۔ ہاتھ اس کی کمر پر پڑا۔ چاہتے تھے کہ اسے گھر سے باہر اچھال دیں مگر وہ کم بخت کلائی میں لپٹ گئی۔ انہیں بھی تاؤ آ گیا۔ اس نے اپنے پنجوں اور دانتوں سے ان کی کلائی ادھیڑ دی مگر انہوں نے بھی اپنے پنجے کی گرفت اتنی سخت کی کہ اس کی ہڈی پسلی ایک ہو گئی اور اسے اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک اس کا دم نہ نکل گیا۔ ویسے وہ بڑے خوش مزاج آدمی تھے اور چھوٹے بڑے سب سے اچھی طرح پیش آتے تھے۔

چغتائی صاحب چونکہ پیدا ہی کمزور ہوئے تھے اس لئے اور بچوں کے مقابلے میں ان کی طرف والدین کی توجہ زیادہ رہتی تھی۔ لاڈ پیار میں پلے۔ کچھ گھر پر پڑھا، کچھ اٹاوہ کے سکول میں۔ اس کے بعد علی گڑھ سے بی۔ اے اور ایل ایل۔ بی کے امتحانات پاس کئے۔ کالج ہی کے زمانے میں نواب مزمّل اللہ خان کے ہاں ملازمت بھی کر لی تھی۔ کیونکہ شادی ہو گئی تھی اور اخراجات پورے نہ ہوتے تھے۔ اسی زمانے میں مضمون نگاری بھی شروع کر دی تھی، بلکہ بچوں کی کہانی "قصرِ صحرا" کا پہلا حصہ میٹرک پاس کرنے سے پہلے ہی لکھ چکے تھے۔ اس کے باقی دو حصے بعد میں لکھے۔ محنتی اور ذہین بہت تھے۔ جسمانی کمزوری کی تلافی دماغی قوت سے ہو گئی تھی۔ کالج کے زمانے میں اسلامی تاریخ کے سلسلے میں مذہب کا مطالعہ بھی کر ڈالا اور حدیث وفقہ سب چاٹ گئے۔ علی گڑھ والوں کی طرح یہ بھی آزاد خیالی اور مغربیت کے دلدادہ تھے۔ قدامت پسندوں اور مذہبی خیال والوں سے ان کے مباحثے رہنے لگے۔ انہیں اس میں بھی مزہ آتا تھا کہ دوسروں کو چھیڑیں،

ستائیں، جلائیں۔ حدیثیں از بر تھیں مستند کتابوں کے حوالے یاد تھے۔ بڑے دھڑلے سے قائل کر دیتے تھے۔ اس کے بعد یہ نوبت آگئی کہ شرط لگا کر بحث کرتے تھے۔ مثلاً "کسی مولانا قسم کے آدمی سے ڈاڑھی رکھنے نہ رکھنے پر بحث چھڑتی تو شرط لگاتے کہ "اگر تم جیت گئے تو ہم ڈاڑھی رکھ لیں گے اور اگر ہم جیت گئے تو تمہاری ڈاڑھی مونڈ لیں گے۔" بہت سے تو شرط کی نوعیت ہی سے گھبرا کر بھاگ جاتے اور اگر کوئی ہمت کر کے جم گیا تو سمجھو کہ اس کی شامت آگئی۔ سب لڑکوں کو نیوتا دے دیا جاتا۔ شام کو ایک جم غفیر کی موجودگی میں بحث شروع ہوتی۔ کتابیں کھولی جاتیں، دلیل کی تصدیق یا تردید کی جاتی۔ آخر میں نہ جانے کیا ہوتا کہ چغتائی ہی ہمیشہ جیت جاتے۔ پھر کسی نچلے کے ہاں سے شیو کا سامان منگایا جاتا اور نہایت احتیاط سے ڈاڑھی مونڈ کر محفوظ کر لی جاتی۔ اس طرح انہوں نے کئی ڈاڑھیاں جیتی تھیں۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ جیتی ہوئی ڈاڑھی بیچ دی جاتی تھی۔ وہ اس طرح کہ ہارے ہوئے مولانا سے اس کی کوئی مناسب قیمت لے لی جاتی اور ان کی ڈاڑھی بخش دی جاتی۔ اس "قصاص" سے یار لوگ مٹھائی منگاتے اور سب کو شیرینی تقسیم کی جاتی۔ ایسے ہی ایک مباحثے میں چغتائی صاحب ایک دفعہ ہار گئے۔ انہیں ڈاڑھی رکھنی پڑی۔ اس وقت کی ایک تصویر بھی تھی جسے میں نے "کامران" کے سرورق پر چھاپا تھا۔ خدا جانے پھر کیا کفارہ ادا کر کے اس سے نجات پائی۔

چغتائی صاحب کی شادی رامپور کے ایک پٹھان گھرانے میں ہوئی تھی جو مذہب کا بڑی سختی سے پابند تھا۔ چغتائی صاحب نے شادی کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ بیوی کا برقعہ اُتروا دیا اور انہیں اپنے ساتھ کھلے بندوں لانا لیجانا شروع کر دیا۔ اسی وضع سے انہیں اپنی سسرال رامپور بھی لے کر پہنچے تو وہ لوگ بہت بگڑے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ان کی اور سسرال والوں کی ٹھن گئی۔ یہ مصیبت بیچاری بیگم چغتائی کی! باپ بھائیوں کو یہ زعم کہ ہماری لڑکی بھلا ہمارے کہنے سے باہر کیسے ہو سکتی ہے۔ اِدھر بگڑے دل مرزا کہ چاہے جان چلی جائے آن نہ جانے پائے۔ اڑ گئے کہ صاحب وہی ہوگا جو ہم کہتے ہیں۔ سربھرے پٹھانوں نے کہا۔ ایسا ہرگز ہو ہی نہیں سکتا۔ کنبے برادری کے سب بڑے بوڑھے جمع ہوئے۔ صلاح ہوئی کہ لڑکی کو گھر بٹھا لیا جائے اور داماد صاحب کو یک بینی و دو گوش روانہ کر دیا جائے۔ چنانچہ مرزا صاحب سے کہہ دیا گیا کہ ٹھنڈے ٹھنڈے چلتے پھرتے نظر آئیے۔ مرزا کھول گئے مگر کیا کرتے، بولے "میری بیوی سے اور پوچھ لیجئے۔ اگر وہ بھی یہاں رہنا چاہتی ہیں تو خوشی سے رہیں میں چلا جاؤں گا اور اگر وہ میرے ساتھ چلنا چاہتی ہیں تو آپ تو آپ دنیا کی کوئی طاقت انہیں نہیں روک سکتی۔" بات معقول تھی۔ سمجھ میں آگئی۔ لڑکی سے پوچھا تو وہ تیاک سے چادر اوڑھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس غریب کو تو مرزا بھرنا تھا۔ ماں باپ کے بکھرے سے لگی کب تک بیٹھی رہتی؟ گھر والوں نے کہا "بی بی! ہماری بات نیچی کر کے جا رہی ہو تو پھر کبھی اس دہلیز پر نہ آنا۔ آج سے تم ہمارے لئے اور ہم تمہارے لئے مر گئے۔" وہ بیچاری دھاروں روتی میاں کے ساتھ ہولی اور مدتوں میکے نہ گئی۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد چغتائی صاحب نے کتاب "قرآن اور پردہ" لکھی۔ پھر چند سال بعد "حدیث اور پردہ" اور اس کے کچھ عرصہ بعد "نفس پرستی"۔ اسی عرصے میں کچھ لوگوں کے سمجھانے اور کچھ اپنے تلخ تجربات کی وجہ سے انہوں نے مذہب کی طرف سے اپنی توجہ ہٹا کر ادب کی طرف کر لی اور ۱۹۲۹ء سے ان کے ادبی مضامین اور افسانے شائع ہونے لگے۔

جنوری سنہ ۳۲ء میں ان کا افسانہ "انگوٹھی کی مصیبت" نیرنگِ خیال کے سالنامہ میں شائع ہوا۔ اس افسانے کے چھپتے ہی ہمارے ادبی حلقوں میں ایک بھونچال سا آگیا۔ جس کو دیکھو اس کی زبان پر اسی کا ذکر۔ بعد میں چغتائی صاحب نے وہ بے شمار خطوط مجھے دکھائے جو اس افسانے کے بارے میں ان کے پاس آئے تھے۔ بیشتر خطوط توصیفی تھے لیکن بعض خطوط میں نفسیاتی کیفیات کی روشنی میں افسانے کے بعض مقامات کی توضیح چاہی گئی تھی۔ بعض میں شعور اور لاشعور کی بحث کی گئی تھی۔ ایک خاتون نے پوچھا کہ ہیرو جب ہیروئن سے پوچھتا ہے "بھولو گی تو نہیں...... بھولو گی تو نہیں...... بھولو گی تو نہیں......؟" تو اس میں جو وقفے ہیں کیا آپ بتائیں گے کہ یہ لذتِ التئام سے مغلوب ہونے کے ہیں؟ چغتائی صاحب بولے "ہمیں آج تک یہی نہیں معلوم کہ لذتِ التئام کیا ہوتی ہے"۔ چنانچہ ہم دونوں نے لغت میں اس کے معنی دیکھے۔ اور چغتائی صاحب ہنسے کہ میرے تو وہم میں بھی یہ بات نہ آئی تھی۔ لوگ بھی کیسی کیسی توضیحیں کر لیتے ہیں!

اس افسانے کے بعد چغتائی صاحب کے چند اور افسانے دوسرے رسالوں میں چھپے مگر وہ اس طرز کے نہیں تھے۔ اس سال اس سے بہتر اور کوئی افسانہ چھپا ہی نہیں۔ حالانکہ اس زمانے میں بڑے بڑے افسانہ نگار تقریباً سبھی زندہ تھے اور لکھ رہے تھے۔ اس کے کوئی ایک سال بعد میرے پاس ایک خط علی گڑھ سے آیا۔ اس میں چغتائی صاحب کا خط اور دو افسانے تھے۔ خط میں بڑا خلوص تھا اور کسر نفسی بھی۔ ساتھ ہی دیکھنے کی خواہش بھی ظاہر کی تھی۔ ان کا خط پاکر بے حد خوشی ہوئی اور اسی دن سے ان سے ملنے کو جی چاہنے لگا۔ یہ افسانے تھے "ٹکٹ چیکر" اور "کونتار"۔ دوسرا افسانہ بہت مشہور ہوا اور جب ان سے پہلی ملاقات ہوئی تو ہم نے منصوبہ بنایا کہ "کونتار" کا پورا ناول کیسے مرتب کیا جائے۔

مرزا صاحب کا پہلا خط ملنے کے بعد ان سے دس سال تک خط و کتابت کا ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ شاید ہی کوئی ہفتہ ناغہ ہوتا ہو۔ ان خطوں میں دنیا زمانے کی باتیں ہوتی تھیں۔ اور جب خطوں سے جی نہ بھرتا تو وہ دلّی چلے آتے یا مجھے ان کے پاس جانا پڑتا۔

پہلا خط بھیجنے کے دو تین ہی مہینے بعد ان کا خط آیا کہ میں دلّی آ رہا ہوں اور رات کی فلاں گاڑی سے، بیوی بھی ساتھ ہوں گی۔ مرزا صاحب کی تصویر ہم سب دیکھ چکے تھے۔ رات کو میں، انصار ناصری اور فضل حق قریشی انہیں لینے اسٹیشن پہنچے۔ ریل آئی، ایک ایک ڈبہ چھان مارا۔ چغتائی صاحب کا کہیں پتہ نہ چلا۔ جب گاڑی بالکل خالی ہوگئی تو ہم اسٹیشن سے باہر نکل آئے۔ سامنے سڑک پر سے ایک تانگہ گذرا۔ اس میں ایک خاتون اور ایک صاحب دکھائی دیئے۔ فضل حق نے کہا، "وہ جا رہے ہیں چغتائی صاحب!" میں نے اور انصار نے چونک کر انہیں دیکھا۔ کوئی بڈھا ہیرمُرابا سا آدمی تھا۔ موٹی سی عینک لگائے۔ پھر ہم سب ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس پڑے۔ اگلے دن صبح میں گھر ہی میں تھا کہ اطلاع پہنچی "چغتائی صاحب مردانے میں آئے بیٹھے ہیں۔" میں لپک کر پہنچا تو دیکھا کہ بیٹھک میں وہی تانگے والا بڈھا بیٹھا ہے۔ غور سے دیکھا تو اسے تصویر سے کچھ مشابہ پایا۔ اس نے کہا "آپ ہی شاہد صاحب؟" میں نے کہا "جی ہاں" اور وہ مجھ سے چمٹ گئے۔ بولے "اماں میں تو سمجھا تھا کہ کوئی خوفناک شکل کا مولوی ہوگا۔ مولوی شاہد احمد، تم تو اچھے خاصے آدمی ہو۔" پھر خوب ہنسے تو میں نے دیکھا کہ نیچے کے چار دانت غائب۔ زرد چہرہ، آنکھوں کے کونوں پر بے شمار جھریاں، کلّے پچکے ہوئے۔ ہونٹوں کے دونوں طرف قوسیں۔ لبوں پر لاکھا سا جما ہوا۔ چھوٹی چھوٹی کتری ہوئی مونچھیں، ڈاڑھی صاف۔ دبلا پتلا سا شخص عینک کے موٹے موٹے شیشوں میں سے مجھے جھانک رہا ہے۔ میں نے کہا "مرزا صاحب! آپ اپنی تصویر سے بالکل نہیں ملتے۔ کل رات کو آپ کو تانگے میں جاتے دیکھا مگر ہم نے آپ کو نہ پہچانا۔ کہاں ٹھہرے؟ بھابی کہاں ہیں؟ میرے گھر کا پتہ تو آپ کو معلوم ہی تھا۔ یہاں سیدھے کیوں نہ چلے آئے؟" بولے "میں نے بھی تمہیں اسٹیشن پر دیکھا تھا مگر تمہیں جانتا نہ تھا۔ طبیہ کالج میں میری ایک بہن ہیں، ان کے یہاں چلا گیا۔ اب تمہارا گھر دیکھ لیا، شام کو آ جاؤں گا بیوی کو لے کر۔" اس کے بعد ان سے رسالوں اور مضمون نگاروں اور مضمونوں کی باتیں ہوتی رہیں۔ اندازہ ہوا کہ مرزا صاحب کی قوتِ گویائی بھی بہت بڑھی ہوئی ہے۔ دوسرے کو ہاں ہوں سے آگے بڑھنے کی زحمت نہیں دیتے۔ مگر باتیں اتنی دلچسپ کہ گھنٹوں سُنو اور جی نہ بھرے۔

شام کو مرزا صاحب حسبِ وعدہ مع بیگم کے آ گئے۔ رات کو سب احباب جمع ہوئے اور خوب قہقہے چہچہے رہے۔ رات گئے احباب رخصت ہوئے تو ہم سونے کے لئے لیٹے، مرزا صاحب، میں اور میرے منجھلے بھائی۔ مرزا صاحب بولتے رہے۔ میں سنتا رہا۔ وہ بولتے رہے، میں سو گیا۔ صبح اذانوں کے وقت انہوں نے آپ ہی آپ پھر بولنا شروع کر دیا۔ دیکھا کہ ہوں ہاں بھی غائب ہے تو میرا شانہ ہلا کر بولے "ارے بھئی توبۃ النصوح کا پوتا آخر کب تک خواب دیکھتا رہے گا؟" ناچار جاگ کر ان کی باتیں سُننے لگا۔ بولے "سُنتے ہو، میں ابھی بیت الخلاء گیا تو ایک افسانے کا پلاٹ سمجھ میں آ گیا۔ آج جانے سے پہلے تمہیں ہم وہ افسانہ لکھ کر دے جائیں گے۔ لو بس اب اُٹھ بیٹھو۔ منہ ہاتھ دھو ڈالو۔"

اتنے میں کہ تیار ہوں اور ناشتہ آئے چغتائی صاحب نے آدھا افسانہ لکھ ڈالا۔ ناشتے کے بعد کوئی صاحب ان سے ملنے آ گئے۔ میں ٹل گیا۔ کوئی گھنٹہ بھر کے بعد آیا تو ان کے پاس افسانہ مکمل تھا اور وہ میرے منجھلے بھائی سے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ وہ پولیس کے آدمی، ادب کے جھمیلوں سے اللہ نے انہیں محفوظ رکھا تھا۔ بولے "لو میاں سنبھالو انہیں۔ خوب آدمی ہیں تمہارے چغتائی صاحب بھی۔ میاں غضب خدا کا، ساری رات باتیں کرتے رہے۔

تم دونوں!" وہ جب سوئے تھے تو ہم باتیں کر رہے تھے، جب جاگے تو ہم باتیں کر رہے تھے۔ سمجھے کہ ہم ساری رات ہی باتیں کرتے رہے۔ مرزا صاحب اس لطیفے سے بہت محظوظ ہوئے۔

اس کے بعد انہوں نے اپنے افسانے کی شانِ نزول بتائی کہ "کل جو تم نے مجھے سٹیشن پر نہیں پہچانا تو خاصی پریشانی ہوئی۔ مگر واقعی میری تصویر مجھ سے نہیں ملتی۔ اور بھئی وہ تصویر کس کام کی جو اصل سے مل جائے؟ یہ افسانہ اپنی تصویر پر لکھا ہے۔ اس کا عنوان ہے "یہ کس کی تصویر ہے؟" اس کے بعد انہوں نے افسانہ سنایا۔ حیرانی ہوئی کہ قلم برداشتہ ایسا شگفتہ افسانہ! اور اس کے بعد تو میں نے ان کی یہ کیفیت دیکھی کہ باتیں بھی کرتے جا رہے ہیں اور افسانہ بھی لکھ رہے ہیں۔ عدالت میں مقدمہ بھی پیش کر رہے ہیں اور افسانہ بھی لکھا جا رہا ہے۔ اور بعد میں معلوم ہوا کہ اس افسانے کے کچھ ورق تو گھر آ گئے اور کچھ ملزم کی مسل میں لگ کر عدالت کے فائل میں چلے گئے۔

ایک دفعہ اپنی وکالت کے زمانے میں مجھے جودھپور بلایا۔ میں نے لکھا۔ "اگلے ہفتے آؤں گا۔ کچھ دلی سے منگانا ہو تو لکھیے۔" خط آیا "اور کچھ لاؤ یا نہ لاؤ، پائے ضرور لانا۔ مدتیں ہو گئیں کھائے ہوئے۔" دلی سے جودھپور کوئی چوبیس گھنٹے کا راستہ تھا۔ میں نے سوچا کہ پائے لے جاؤں گا، جاڑے کے دن ہیں، خراب نہیں ہوں گے۔" اتفاق سے ایک عزیز جے پور کے آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا "اسٹیشن ہی پر دھر لیے جاؤ گے۔ جے پور، جودھپور، کسی ہندو ریاست میں گائے نہیں ہوتی۔ اور لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔" اس لئے ارادہ ملتوی کر دیا۔ مگر جودھپور پہنچتے ہی مرزا صاحب نے پہلا سوال یہی کیا "پائے لائے ہمارے لئے؟" میں نے نہ لانے کی وجہ بتائی تو بولے "ارے بھئی ہم وکیل ہیں، اگر تم پکڑے جاتے تو ہم تمہیں جرمانہ دے کر چھڑا لاتے۔ ابھی ہمارے ایک موکل کی کار کی ٹکر ایک گؤماتا سے ہو گئی تھی۔ ان محترمہ کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ عدالت نے بارہ روپے جرمانہ کیا۔" میں نے کہا "آپ کی وکالت یہاں کچھ چل بھی رہی ہے؟" کہنے لگے "کیوں نہیں؟ ہمارا رجسٹر دیکھو۔" یہ کہہ کر اپنا رجسٹر نکال کر دکھانے لگے۔ کسی سے پیشگی پانچ، کسی سے دس وصول ہوئے تھے۔ پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ باقی میں ڈال رکھے تھے۔ بہت چہک کر بولے "پچھلے مہینے چالیس روپے کی آمدنی ہوئی، چھ سو بقایا میں ہیں۔" میں نے کہا "ماشاء اللہ خوب چل رہی ہے۔" بولے "میاں تم یافت کو دیکھتے ہو۔ بقایا کو دیکھو۔ ہزاروں پہ نوبت ہے، ہزاروں پر۔" کوئی موکل آ گیا تو جودھپوری منشی کو بلا کر کہا "اس سے کہہ دو کہ وکیل صاحب کے پاس کام بہت ہے۔ کل کچہری میں ملے۔ ارے تم دیکھتے نہیں ہمارے دوست دلی سے آئے ہوئے ہیں۔ موکل تو اور بھی آ جائے گا۔ یہ کب کب ہاتھ آتے ہیں۔" اور پھر مرزا صاحب کی دلچسپ باتیں شروع ہو جاتیں اور باتیں ختم ہونے نہ پاتیں کہ وہ اپنے کسی ناول کا مسودہ سنانا شروع کر دیتے۔ اس زمانے میں انہوں نے اپنا ناولٹ "ویمپائر" لکھا تھا۔ بولے "میں پڑھتا ہوں، تم اس کی زبان ٹھیک کرتے جاؤ۔" میں نے کہا "آپ کی زبان ایسی نہیں ہوتی کہ میں اسے ٹھیک کروں۔" کہنے لگے "نہیں مجھے اپنی کمزوری معلوم ہے۔ میں زبان کا بالکل خیال نہیں رکھتا، بس لکھے چلا جاتا ہوں۔" میں نے کہا "تو آپ یہ مسودہ مجھے دے دیجئے، میں اس کی نظرِ ثانی کر دوں گا۔" کہنے لگے "اچھا سن تو لو۔ ابھی مکمل کہاں ہوا ہے۔ پلاٹ آ کر ایک جگہ اڑ گیا ہے۔ آگے نہیں چلتا۔" پھر دو گھنٹے تک وہ سناتے رہے اور مسودہ ختم ہو گیا۔ پوچھنے لگے "بتاؤ اب اسے ختم کیسے کریں؟" میں نے کچھ بتایا، ان کی سمجھ میں آ گیا، بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے "بس بھئی کل کی روانگی ملتوی کرو تو ہم اپنا یہ ناول مکمل کر کے تمہیں دے دیں گے۔" اس قدر لجاجت سے روکتے تھے کہ مجھے شرمندگی ہونے لگتی تھی۔ انہیں نیند بہت کم آتی تھی۔ رات کو بارہ ایک بجے تک جگاتے تھے۔ اس لئے میں صبح سات آٹھ بجے تک اٹھتا تھا۔ پھر دوپہر کو ضرور سوتا تھا۔ غرض میں تو سوتا ہی رہا اور انہوں نے "ویمپائر" مکمل کر دیا اور دو ایک افسانے بھی لکھ کر تھما دیے۔

چغتائی صاحب کے اور سب عزیزوں کو دیکھ کر کہنا پڑا کہ "ایں خانہ تمام آفتاب است۔" بڑے بھائی ملے، خوب تندرست و توانا۔ معلوم ہوا کہ آپ بھی فرسٹ کلاس وکیل ہیں۔ نیچے کے چار دانت غائب۔ مرزا صاحب سے چھوٹے بھائی ملے۔ قوی الجثہ، مزاجاً صوفی۔ نیچے کے چار دانت غائب۔ ان سے چھوٹے بھائی بالکل چغتائی صاحب کی شکل کے مگر اچھی صحت۔ آپ کیا کرتے ہیں؟ فرمایا "رنگتا ہوں!" نیچے کے چار دانت غائب۔ سب سے چھوٹے بھائی قد میں سب سے بڑے، ماشاء اللہ دلیر زادہ، یہ لمبا تڑنگا جوان۔ معلوم ہوا کہ آپ کو دق ہے۔ نیچے کے چار دانت غائب۔ مجھ سے نہ رہا گیا

میں نے مرزا صاحب سے پوچھا، "یہ کیا مصیبت ہے کہ سب کے چار چار دانت غائب ؟" کہنے لگے، "ایک دانتوں کے ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ انہی چار دانتوں سے پائیوریا ہوتا ہے۔ بس سب نے اکھڑوا ڈالے۔" جب عصمت چغتائی ملیں تو سب سے پہلے میں نے یہی دیکھا کہ کہیں ان کے بھی چار دانت تو غائب نہیں؟ بحمداللہ ان کے سارے دانت برقرار تھے۔

ایک دفعہ پھر خط لکھا کہ "ملنے کو بہت جی چاہتا ہے۔ آجاؤ۔ کسی کے نوکر تھوڑی ہو۔ تم آؤ گے تو تم سے ٹھس کس کر کے کئی افسانے لکھیں گے"۔ میں پہنچا۔ صحت پہلے سے بدتر تھی۔ کھانسی زیادہ تھی۔ میں نے کہا آپ اپنی صحت کی طرف سے غفلت کر رہے ہیں۔ کہنے لگے "ڈاکٹر کہتے ہیں تمہیں دق ہے۔ میں کہتا ہوں مجھے دق نہیں دمہ ہے۔" ان کی ضدی طبیعت نے ڈاکٹروں کی رائے ماننے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ من مانی دوائیں کھاتے رہتے تھے۔ گھر والوں میں سے بھی کسی کی نہ سُنتے تھے۔ بلکہ جو کچھ کوئی کہتا اُدبدا کر اس کے خلاف کرتے اور تکلیف اُٹھاتے۔ بھابی بھی ان کی ضد سے پریشان ہوتی تھیں مگر ان کی ایک بھی پیش نہ جاتی تھی۔ بیچاری خاموشی سے سارے گھر کا کام بھی کرتیں، بچوں کی نگرانی اور پرورش بھی اور شوہر کی خدمت بھی۔ اور کیا مجال جو کبھی پیشانی پر شکن تک آجاتے۔

دو تین افسانے تو چغتائی صاحب نے میرے لئے پہلے ہی سے لکھ رکھے تھے۔ کئی افسانوں کے انہوں نے پلاٹ سُنائے۔ سب اچھے ایک سے ایک عمدہ۔ ایک مارواڑ کا رومان سُنایا ——— سوانہ کی روحیں ——— یہ سب سے زیادہ مجھے پسند آیا۔ کہنے لگے "تو لاؤ پہلے اسی کو لکھ ڈالیں" اور کاغذ قلم لے کر لکھنا شروع کر دیا۔ میں بیٹھا واقعی مکھیاں مارتا رہا کیونکہ اس سال وہاں ساری دنیا کی مکھیاں آگئی تھیں۔ ایک گھنٹہ میں انہوں نے کئی صفحے لکھ ڈالے پھر بولے "میاں ہٹر کھیل چکے۔ لو ذرا اب تم قلم لو۔ میرا ہاتھ تھک گیا۔" میں نے قلم سنبھالا۔ وہ بے تکلف بولتے رہے۔ میں لکھتا رہا۔ دو تین صفحے لکھ کر میں نے کہا "بس جی میں تو لکھ چکا۔ مجھے تو نیند آرہی ہے۔ مرغن کھانے کھلاتے ہو تو سونے بھی دو۔" کہنے لگے "اچھا تو مچھر دانی لگا کر سو رہو۔" عصر کے وقت انہوں نے جگایا۔ "کیا آج چائے نہیں پیو گے؟" اُٹھنا پڑا۔ بولے "افسانہ ختم پر آرہا ہے۔ شام تک ختم ہو جائے گا۔" میں تو چائے پی کر کسی کے ساتھ ٹل گیا۔ مرزا صاحب بیٹھے لکھتے رہے۔ چراغ جلے گھر واپس پہنچا تو بڑے خوش خوش بیٹھے ہوئے تھے۔ کہنے لگے "لو بھئی یہ افسانہ" اور کوئی چالیس فل اسکیپ کا پلندہ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے کہا "شاباش ہے مرزا صاحب آپ کی ہمت کو۔ بس کل صبح کی گاڑی سے میں چلا جاؤں گا۔" جانے کے نام سے ان کا منہ اتر گیا۔ کہنے لگے "نہ جانے کیا بات ہے تم آجاتے ہو تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں بیمار نہیں ہوں۔ کل نہ جاؤ، ہم تمہیں دو افسانے اور لکھ دیں گے۔" انہوں نے یہ بات کچھ ایسے اندوہ ناک لہجے میں کہی کہ میرا دل بھر آیا۔ میں نے کہا "اچھا میں پرسوں چلا جاؤں گا۔" بچوں کی طرح خوش ہونے لگے۔ مجھے تھوڑی دیر بعد خیال آیا کہ میرے پاس چغتائی صاحب کے تقریباً سو صفحے کے مضامین تو ہو ہی جائیں گے۔ اگر سو صفحے کے اور ہو جائیں تو چغتائی نمبر ہی کیوں نہ چھاپ دیا جائے۔ اتنے بڑے مضمون نگار اور ایسے پیارے دوست کی ایک اچھی یادگار ہی قائم ہو جائے گی۔ میں نے ان سے کہا کہ "مرزا صاحب! تو پھر آپ یوں کیجئے کہ کل تو آپ مجھے جو کچھ لکھ کر دے سکیں دے دیں، اس کے بعد پندرہ بیس دن میں مجھے چند مضامین اور لکھ دیجئے۔ میں "چغتائی نمبر" چھاپے دیتا ہوں۔" یہ تجویز انہیں پسند آگئی۔ پوچھا "یک بھی جائے گا؟" میں نے کہا "نہ بکنے کی کوئی وجہ نہیں۔" کہنے لگے "ایک ہفتے میں تمہیں سب مضامین پہنچ جائیں گے۔" میں نے چند تجویزیں انہیں بتائیں کہ اس اس طرح کے مضامین ضرور لکھئے مثلاً ایک آدھ غمناک افسانہ، دو ایک مکالمے یا ڈرامے اور ایک مضمون یہ کہ "میں مضمون کیسے لکھتا ہوں۔" کہا "یہ سب ہو جائے گا۔"

اگلے دن دو مضمون تو انہوں نے لکھ کر دے دئے اور بیسیوں پلاٹ سُنائے۔ پھر کہنے لگے "یہ لکھتے لکھتے میرا ہاتھ تھک جاتا ہے۔ اگر کوئی شارٹ ہینڈ میں لکھنے والا مل جائے تو میں کئی ناول بول دوں۔"

اگلے دن صبح سویرے میں اُٹھ بیٹھا۔ بستر لپیٹنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ مرزا صاحب آگئے۔ افسردگی چہرے سے ظاہر تھی۔ کہنے لگے "ارے بھئی سُنتے ہو آج اور نہ ٹھہر جاؤ، سارے مضامین ساتھ ہی نہ لیتے جاؤ؟" دل کٹ گیا ان کے اس خلوص کو دیکھ کر۔ میں نے کہا "اگر آپ کو میرے ٹھہر جانے سے خوشی ہوگی

تو میں ضرور ٹھہر جاؤں گا، مگر مجھے یہ گوارا نہیں کہ آپ میرے لئے مرتے رہیں۔ پندرہ دن میں تو یہ مضامین لکھے جائیں گے جو میرے پاس ہیں۔ باقی آپ پھر بھیجتے رہئے گا۔" بولے "ارے بھئی تم نہیں جانتے کہ تمہارے یہاں ہونے سے میری کیا کیفیت ہے۔ سچ کہتا ہوں میں بالکل تندرست ہو گیا ہوں۔ بھوک لگنے لگی، خوراک دگنی ہو گئی۔ جی چاہتا ہے کہ لکھوں اور لکھتا ہی رہوں۔ میں اس وقت سے ڈر رہا ہوں کہ تم چلے جاؤ گے تو مجھ سے ایک لفظ بھی نہیں لکھا جائیگا اور پھر بیماری مجھے دبوچ لے گی۔" میں نے ان کو بہلانے کے لئے کہا "اب تو آپ پہلے سے بہت اچھے ہیں۔ میں دلّی جا کر چند یونانی مرکبات آپ کو بھیجوں گا ان سے رہی سہی کمزوری بھی جاتی رہے گی۔" مگر وہ پھیکی سی ہنسی ہنس کر رہ گئے اور بولے "بس تو آج تم نہیں جا رہے؟" میں نے کہا "نہیں!" جلدی جلدی بھابی سے جا کر کہا "شاہد صاحب آج نہیں جا رہے۔ آج انہیں جودھپور کی سیر کرائی جائے گی۔ ذرا تگڑا ناشتہ کرا دو آج۔" ناشتے کے بعد کسی دوست کی کار منگوائی۔ شہر کا ایک چکر اس میں لگایا۔ پھر ایک پرانا قلعہ دکھایا۔ ایک نیا محل تیار ہو رہا تھا، وہ دکھایا۔ ایک عزیز تھے، ان سے ملوایا۔ دوپہر کو گھر آ کے کھانا کھایا۔ باتیں کرتے کرتے میں تو سو گیا اور انہوں نے اتنی دیر میں دو چھوٹے چھوٹے مضمون لکھ لئے۔ کہنے لگے "آج رات کو تمہیں گانا بھی سنوایا جائے گا" میں نے کہا "آپ کو تو اس سے نفرت ہے۔" بولے "تمہیں تو نہیں ہے۔ ایک ہندو پکا گانا گاتا ہے، اسے بلوایا ہے۔" وقت اچھا گزرا۔ صبح ناشتہ پر پھر کچھ روکنے کی تمہید اٹھائی تھی کہ بھابی نے کہا "کیوں آپ انہیں پریشان کرتے ہیں۔ گھر والے پریشان ہوں گے کہ تین دن کو کہہ کر گئے تھے آج چھ دن ہو گئے۔" کہنے لگے "ارے صاحب یہ کسی کے نوکر تو ہیں نہیں کہ ان کی حاضری ضروری ہو۔ ہم یہاں سے ان کے گھر تار دیئے دیتے ہیں۔ انہیں آخر کس بات کا فکر ہے؟" بھابی شاید کچھ اور کہتیں مگر بیچ میں مرزا صاحب کا چھ سال کا بچہ نجو بول پڑا "اماں یہ دلّی میں کیا کرتے ہیں؟" بھابی نے کہا "کچھ بھی نہیں۔" بچے نے کہا "تو پھر یہ کھاتے کہاں سے ہیں؟" ہم سب ہنس پڑے اور وہ بات بھی اڑ گئی۔ چلتے وقت مرزا صاحب نے کہا "وعدہ کرو کہ پھر جلدی آؤ گے۔" میں نے کہا "جب آپ یاد فرمائیں گے حاضر ہو جاؤں گا۔"

نواب صاحب جاورہ نہ جانے کب سے چغتائی صاحب کی قدر دانی پر مائل تھے۔ کچھ عرصے بعد سنا کہ نواب صاحب نے انہیں جاورہ بلا کر چیف جج بنا دیا۔ مرزا صاحب نے جاورہ بلایا۔ میں وہاں بھی گیا۔ نہایت عالیشان کوٹھی انہیں ملی ہوئی تھی۔ چغتائی صاحب بہت بڑے عہدہ دار تھے اور نواب صاحب کے مزاج پر بھی چھائے ہوئے تھے۔ مجھ سے کہا کہ "نواب صاحب سے کب ملو گے؟" میں نے کہا "میں اتنے بڑے آدمیوں سے نہیں ملتا جن سے مل کر مجھے ذلت محسوس ہو۔" مرزا صاحب نے کہا "ارے بھئی تمہارے دادا کے تو بڑے قدر دان ہیں یہ نواب۔ میں نے یہاں لوگوں سے سنا ہے کہ نواب صاحب ایک دفعہ ایسے بیمار پڑے کہ ان کے جینے کی آس نہ رہی۔ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی بزرگ کہہ رہے ہیں۔ "مولوی نذیر احمد کا ترجمۂ قرآن شائع کرو۔ تم اچھے ہو جاؤ گے۔" انہوں نے تمہارے والد سے اجازت منگوائی اور دو جلدوں میں صرف ترجمہ اپنے چھاپہ خانہ سے شائع کیا اور واقعی اچھے ہو گئے۔ تو وہ تم سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔" میں نے کہا "اور کچھ خیرات بھی مجھے دیں گے۔" مرزا صاحب نے کہا "ارے تو پھر کیا ہوا؟" میں نے کہا "مجھے معاف فرمائیے، میں تو صرف آپ سے ملنے آیا ہوں میرے تو نواب یا بادشاہ جو کچھ ہیں آپ ہیں!" مگر مرزا صاحب نے میری اس بات کو کچھ پسند نہیں کیا اور دل میں شاید کچھ ناراض بھی ہوئے۔

جاورہ میں مرزا صاحب کی صحت اور بھی زیادہ خراب رہنے لگی۔ وہاں کی مرطوب آب و ہوا سے ان کی سانس کی شکایت اور بڑھ گئی اور صحت گرتی ہی چلی گئی۔ شاید مشکل سے دو سال جاورہ میں رہے ہوں گے، ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ آپ جودھپور واپس چلے جائیے ورنہ آپ یہاں بہت جلد مر جائیں گے۔ مرزا صاحب بیماری کا عذر کر کے جودھپور چلے آئے اور یہاں سے استعفیٰ بھیج دیا۔ وکالت کا کام پھر شروع کیا مگر بدن میں جان نہ ہونے کی وجہ سے وکالت ٹھس ہی رہی۔ اس لئے اپنی کتابیں چھاپنے کا کام خود شروع کر دیا تھا۔

اب سے کوئی پچاس سال پہلے مولوی نذیر احمد صاحب نے ایک کتاب "امہات الامہ" لکھی تھی۔ یہ کتاب ایک دریدہ دہن پادری کی کتاب کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ اس نے آنحضرت صلعم پر بعض بڑے بیہودہ اعتراضات کئے تھے جن میں خاص طور پر ازواج مطہرات کے سلسلے میں ناگفتہ بہ باتیں

کہی تھیں۔ اس کتاب کا ایک جواب سرسید احمد خاں نے لکھا تھا اور ایک مولوی نذیر احمد نے۔ یوں تو یہ کتاب شروع سے آخر تک ایک علمی اور تاریخی کتاب ہے اور اپنے مواد کے لحاظ سے نہایت قابلِ قدر بھی۔ لیکن مولوی صاحب نے احترام کے الفاظ کسی نام کے ساتھ اس میں نہیں لگائے ہیں۔ اور بعض جگہ فقرے بھی ایسے لکھ گئے ہیں جو زبان کے اعتبار سے چاہے کتنے ہی ٹکسالی کیوں نہ ہوں، رسولِ مقبول و اہلِ بیت کے ادب و احترام کے لحاظ سے قابلِ اعتراض سمجھے گئے۔ مولوی صاحب اس پیرایۂ بیان کا جواز یوں پیش کرتے تھے کہ چونکہ ایک عیسائی پادری اس ساری کتاب کا مخاطب ہے، اس لئے ان کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ یہ توضیح صحیح ہو یا غلط یہاں اس سے بحث نہیں۔ ہوا یہ کہ ہمارے علماء نے اس کتاب کو سوختنی اور مولوی صاحب کو کافر قرار دیا۔ مسلمانوں کے ایک بڑے ذمہ دار لیڈر نے رفعِ شر کے لئے اس کتاب کے سارے نسخے مولوی صاحب سے اپنی تحویل میں لے لئے۔ اور مولوی صاحب کی بغیر اجازت انہیں علماء کے جلسے میں لیجا کر جلوا دیا۔ قصہ مختصر اس ناگوار واقعہ کے بعد مولوی صاحب تین چار سال زندہ رہے مگر انہوں نے ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔ شامتِ اعمال اس کتاب کا نسخہ کہیں سے میرے ہاتھ لگ گیا اور میں نے یہ سوچ کر کہ ایک اچھی کتاب سے مسلمان کیوں محروم رہیں، اسے جوں کا توں چھاپ دیا۔ اس کا چھپنا تھا کہ پھر ہمارے علماء نے اس کے خلاف تحریک شروع کر دی۔ حکومت پر زور ڈالا کہ کتاب ضبط کر لی جائے۔ حکومت کو بھلا کیا غرض پڑی تھی کہ خواہ مخواہ اس جھگڑے میں پڑے، جب اُدھر سے کامیابی نہ ہوئی تو مجھ پر بزرگوں سے دباؤ ڈلوایا گیا۔ یہ بھی ناکام رہا تو قتل کی دھمکیاں دی گئیں اور ہر شہر میں اور دلّی میں اس کے خلاف جلسے ہونے لگے۔ چغتائی صاحب نے مجھے جودھپور سے لکھا کہ ساری کتابیں مجھے بھیج دو اور اعلان کر دو کہ کتاب میرے پاس ہے۔ جس میں ہمت ہو مجھ سے لے لے۔ میں نے انہیں دو سو جلدیں بھیج دیں کہ محفوظ ہو جائیں۔ اور کتاب کی اشاعت، روک دینے کا اعلان کر دیا۔ مسلمانوں نے مجھے نہ صرف معاف کر دیا بلکہ خوش بھی ہوئے کہ چلو غلطی انسان ہی سے ہوتی ہے۔ یہ کیا کم ہے کہ کتاب کی اشاعت بند کر کے اس نے اپنا مالی نقصان کر لیا۔ اُدھر مرزا صاحب کی ضدی طبیعت نے زور مارا اور انہوں نے ایک مراسلہ "انقلاب" لاہور میں چھپوا دیا کہ "امہات الامہ" شاہد احمد کے پاس اب نہیں ہے، میرے پاس ہے۔ جس میں ہمت ہو مجھ سے لے لے، بلکہ مسلمانوں کو چاہئے کہ مجھے کاٹ کر میرا پلاؤ پکائیں اور مُلّاؤں کو کھلا دیں۔ اس کے چھپتے ہی بس آگ ہی تو لگ گئی۔ پندرہ دن بعد مرزا صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ جودھپور کے مسلمانوں نے ان کے گھر کو گھیر لیا اور زبردستی ان سے ساری کتابیں لے گئے۔ اس کے بعد وہ کچہری جا رہے تھے تو دو چار بدمعاشوں نے ان پر لاٹھیوں سے حملہ کیا اور ان کے ایک ہاتھ میں سخت ضرب آئی۔ مرزا صاحب نے لکھا "بھائی بڑی رسوائی ہوئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ یا تو مسلمانوں کے جلسۂ عام میں توبہ کرو اور اقرارِ اسلام کرو ورنہ تم کافر ہو اور قتل کر دیئے جاؤ گے۔ سارے شہر میں آگ پھیلی ہوئی تھی۔ لاکھ میں سب سے کہتا ہوں کہ کتاب میں نے نہیں لکھی، دلّی والے نذیر احمد نے لکھی تھی مگر سب یہی کہتے کہ نہیں تم نے لکھی ہے اور اس میں تم نے سب کو گالیاں دی ہیں۔ چنانچہ مصلحت اسی میں سمجھی کہ اپنے آپ کو یہاں کے علماء کے حوالے کر دوں۔ علماء مجھے ایک بڑے جلسے میں لے گئے۔ مجھ سے سب کے سامنے توبہ کرائی، مجھے کلمہ پڑھوایا اور دوبارہ مجھے مشرف بہ اسلام کیا۔ تب کہیں جان بچی۔ خیر مجھے اس تکلیف اور رسوائی کا بھی اتنا افسوس نہیں، مگر بے حد رنج ہوا اور شرم آئی یہ دیکھ کر کہ وہ دو سو جلدیں جو تم نے مجھے بھیجی تھیں اور مجھ سے مولوی زبردستی چھین لائے تھے، اس جلسے میں جلائی گئیں۔ افسوس کہ پچیس تیس سال میں مسلمانوں نے کوئی ذہنی ترقی نہیں کی۔"

ایک دفعہ مرزا صاحب کا سخت اصرار ہوا کہ خود بھی آؤ اور بھابی کو بھی لے کر آؤ۔ تعمیلِ ارشاد کی گئی۔ اب کے جو انہیں دیکھا تو بڑا دکھ ہوا۔ ان کے پاؤں رہ گئے تھے اور چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے۔ بخار ہر وقت رہتا تھا۔ کھانسی بہت بڑھی ہوئی تھی۔ سوکھ کر قاق ہو گئے تھے۔ مگر دماغ اسی طرح روشن اور مزاج اسی طرح بشاش تھا۔ خوش تو ہمیشہ ہی ہوتے تھے۔ اب کے بہت خوش ہوئے۔ بولے "دیکھو! ابھی تم آئے ہو اور ابھی ہماری بیماری بھاگی جاتی رہی۔" مزے مزے کی باتیں کرتے رہے۔ ہنستے رہے ہنساتے رہے۔ ایک ناول "شراب" لکھنا شروع کیا تھا مگر چند باب ہی لکھ سکے تھے۔ اس کے کچھ حصے سُنائے اور چھاپنے کے لئے مجھے دئیے۔ رات کو جب دسترخوان بچھا تو کھسک کر ساتھ بیٹھ گئے۔ بھابی وہیں سے چیخیں کہ آپ کچھ نہ

کھایا جائے گا۔ کہنے لگے "یہ کھائیں گے تو ہم ضرور۔ اب ہم بالکل اچھے ہیں، کوئی بیمار تھوڑی ہیں" مجھ سے کہتے جاتے تھے "ارے بھئی یہ ہمیں بھی دو لا بالی جھلاتی تھیں مگر وہ اپنا کام کئے جاتے تھے۔ کھایا تو خیر ان سے کیا جاتا تھوڑا تھوڑا سا سب چکھ لیا۔ بارہ ایک بجے تک باتیں کرتے رہے۔ صبح جب مرزا صاحب کو دیکھا تو ان کی حالت غیر تھی۔ معلوم ہوا کہ سخت بدہضمی ہوئی۔ رات بھر اوکتے اور ڈالتے رہے۔ بلیپتن نکل گیا۔ اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ آواز بھی نہ نکلتی تھی۔ دو دن میں طبیعت کچھ سنبھل گئی تھی۔ ہم بازار سے گھوم پھر کر آئے تو تکیے کے سہارے پلنگ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بولے "لو یہ افسانہ تمہارے لئے لکھا ہے۔" پڑھ کر سُنایا۔ عنوان تھا "برتھ کنٹرول"۔ میں ہنس رہا تھا، مرزا صاحب بھی ہنسنے جاتے تھے۔ مجھے کیا خبر تھی کہ یہ ان کا آخری افسانہ ہے، اور میرے لئے ان کی یہ ہنسی بھی آخری! اگلے دن ہمیں دلّی واپس جانا تھا۔ رات کو باتیں کرتے کرتے میری بیوی سے بولے "آپ کا آنا ایسے وقت میں ہوا کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔" پھر ایک اپنا چھپا ہوا لیٹر فارم نکالا اور اس پر کچھ لکھ کر انہیں دیا کہ "اسے قبول کر لیجئے۔" انہوں نے پڑھ کر میری طرف بڑھا دیا۔ مرزا صاحب نے کتاب "کونتار" کا حقِ تصنیف ان کے نام منتقل کر دیا تھا۔ میں نے کہا "یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ آپ کے بچوں کی حق تلفی ہے۔" کہنے لگے "تم خاموش رہو جی۔ تمہیں تھوڑی دے رہے ہیں۔" نہیں مانے اور زبردستی وہ کاغذ میری بیوی کے ہاتھ میں رکھ دیا۔

مرزا صاحب کی صحت گرتی ہی چلی گئی۔ ان کے خطوں سے ان کا حال معلوم ہوتا رہتا تھا۔ اس کے بعد ایسے خط آنے شروع ہوئے جو ان کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے نہیں ہوتے تھے۔ پھر ایک دن ان کا خط ملا کہ "آخری بار آکر مل جاؤ۔ کچھ روپے لینے آنا۔" میں نے روانگی کا تار دیا اور رات ہی کی گاڑی سے چل پڑا۔ اسٹیشن پر ان کے چھوٹے بھائی آئے تھے۔ میں نے پوچھا "چغتائی صاحب کا کیا حال ہے؟" بولے "وہی ہے!" سمجھ میں نہ آیا کہ وہی ہے کا کیا مطلب ہے۔ گھر پہنچ کر دیکھا کہ ان کے حصے کے کمروں میں سناٹا! نہ بھابی نہ بچے۔ ایک کمرے میں پلنگ پر لحاف اوڑھے چغتائی صاحب پڑے تھے۔ پاس کوئی نہیں تھا۔ میں نے آواز دی اور سلام کیا تو منہ پر سے لحاف ہٹایا۔ مجھ پر بجلی گر پڑی۔ مرزا صاحب کے بدلے ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ دکھائی دیا۔ بڑھی داڑھی مونچھیں اور بڑھے ہوئے سر کے بالوں پر ایک رومال بندھا ہوا۔ پیلا چہرہ، پھٹی پھٹی آنکھیں۔ لحاف ہلا تو اس میں سے بدبو کا ایک بھبکا آیا۔ پائیوں کے نیچے پانی کے پیالے رکھے ہوئے تھے مگر پلنگ پر ٹانگ کے چیونٹے پھر رہے تھے۔ میں رونے لگا۔ وہ بھی آب دیدہ ہو گئے۔ میں نے کہا "یہ کیا حالت ہو گئی؟" بولے "بس اب ختم سمجھو۔" پھر ایک دم سے مسکرا دیئے اور کراہتے ہوئے بولے "ارے ارے آپ کو دیکھئے" او۔ لحاف میں سے ایک چیونٹا چٹکی میں پکڑ کر نیچے پھینکا "مرنے سے پہلے ہی اپنا حصہ لینے چلے آئے۔" اتنے میں اندر کے رُخ کا ایک دروازہ کھلا اور ان کی والدہ اندر آئیں۔ بولیں "بیٹے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟" مرزا صاحب نے کہا "یہ شاہد صاحب آئے ہیں، انہیں پہلے چائے پلوایئے۔" اماں چلی گئیں تو ان کی باتوں سے معلوم ہوا کہ اب صرف اماں ہی ان کا خیال رکھتی ہیں۔ ماشاءاللہ بھرا پُرا گھر تھا مگر کوئی ان کے پاس نہ آتا تھا۔ میں نے کہا "بھابی اور بچے کہاں ہیں؟" بولے "رامپور۔" میں نے کہا "وہ کیوں؟" کہنے لگے "بیوی کو میری خدمت کرتے کرتے خود دق ہو گئی۔ میں نے ان سے بارہا کہا کہ تم یہاں سے چلی جاؤ ورنہ تم بھی مر جاؤ گی۔ مگر وہ نہ مانیں۔ جب میں نے دیکھا کہ میں تو مر ہی رہا ہوں اور اگر یہ نہ چلی گئیں تو یہ بھی مر جائیں گی، تو میں نے ان سے کہا، اگر تم یوں نہیں جاؤ گی تو ہم تمہیں طلاق دے دیں گے۔ وہ پھر بھی نہ گئیں۔ میں نے ان سے کہہ دیا کہ آپ کو ہم نے طلاق دے دی، آپ یہاں سے تشریف لے جایئے، تو انہوں نے کہا آپ کے طلاق دینے سے کیا ہوتا ہے۔ ہم نے تو طلاق نہیں لی۔ ہم یہاں سے نہیں جائیں گے۔ آخر میں نے تنگ آکر ان کے میکے والوں کو خط لکھا کہ اپنی لڑکی کو آکر لے جاؤ، میں نے اسے طلاق دے دی ہے۔ خط کے پہنچتے ہی ان کا بھائی آدھمکا اور زبردستی اپنی بہن کو یہاں سے لے گیا۔" میں نے کہا "یہ آپ نے اچھا نہ کیا۔ ساری عمر کی خدمت کا آپ نے یہ صلہ دیا انہیں۔" کہنے لگے "بھائی اگر وہ یہاں رہتیں تو واقعی مر جاتیں۔ ان کے بچانے کی اور کوئی صورت ہی نہیں تھی، اور ہاں سُنو، اصل میں طلاق ہوئی نہیں ہے۔ مگر ان کے گھر والوں کو میں جانتا تھا کہ ایک خط میں ہی آکر لے جائیں گے۔ بیوی نے بہت کہا بھی یہ طلاق نہیں ہے مگر ان کے بھائی نے کہا، جب انہوں نے یہی لکھ کر بھیج دیا تو اگر نہیں ہوئی تب بھی ہو گئی۔"

اس کے بعد ان کی اماں اور بھائیوں اور عصمت چغتائی سے باتیں کرنے پر معلوم ہوا کہ بیماری نے مرزا صاحب کے دماغ پر عجب طرح کا اثر ڈالا ہے

کہ انہیں دوسروں کو تکلیف پہنچا کر لطف آتا ہے۔ مثلاً بھائیوں بھائیوں کو لڑوا دیں گے۔ کسی پر چوری کا الزام لگا دیں گے۔ طبیعت سے گھڑ کر کوئی ایسی بات کہیں گے کہ دو آدمی اُلجھ جائیں۔ ہم سب نے تنگ آ کر ان کی طرف جانا ہی چھوڑ دیا۔ بس ماں کی ہی مامتا ہے جو برداشت کر رہی ہے۔" میں نے کہا، "مگر اب تو ان کا آخری وقت ہے۔ کتنے دن جئیں گے بچارے؟" "مگر سارے بھائی بہن یہی کہتے تھے کہ" یہ نہیں مریں گے۔ کتنی ہی دفعہ ہو چکا ہے کہ مُنّے بھائی مر رہے ہیں، مُنّے بھائی مر رہے ہیں۔ سب بھاگے بھاگے گئے اور وہ نہ مرے نہ ورے۔ پھر اچھے خاصے ہو گئے۔" اس گھر میں تین دن رہنا مجھے اجیرن ہو گیا عجیب بے کسی کی زندگی تھی۔ گرم گرم بخار چڑھتے، پنڈا جھلستا رہتا۔ ہڈیاں تک سُوکھ گئی تھیں۔ کھانسی کے مارے سینے میں سانس نہ سماتا تھا۔ پاؤں بالکل بے کار ہو چکے تھے۔ مگر دماغ روشن تھا۔ کوئی تیمار دار نہیں۔ پیسہ کوڑی پاس نہیں۔ نہ جانے کس وقت دم نکل جائے۔ گھر والے تو مطمئن ہیں کہ یہ مرنے ہی کے نہیں! میں نے جی میں کہا، "اے اللہ تیری شان ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس نے دنیا کو ہنسایا اور مرنے کے بعد بھی ہنساتا رہے گا۔ اور اس عذاب میں مبتلا! تو ہی اپنی مصلحتوں کو خوب جانتا ہے۔" جب میں ان سے رخصت ہونے لگا تو ہاتھ بڑھایا اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ میں رو رہا تھا۔ وہ بھی رو رہے تھے میں نے کہا، "یہ روپے رکھ لیجئے۔" پوچھنے لگے "کتنے ہیں؟" میں نے کہا، "دو سو ہیں۔ اگر زیادہ کی ضرورت ہو تو میں دلّی پہنچ کر اور بھیج دوں گا۔" بولے "بہت ہیں۔ تکیے کے نیچے رکھ دو۔" خدا حافظ کہہ کر میں آنسو پونچھتا باہر نکل آیا۔ پھر ان کی صورت دیکھنی نصیب نہیں ہوئی۔ شاید دو ہفتے گذرے ہوں گے کہ ان کے انتقال کی خبر ملی۔ میں نے کہا، "دیکھئے وہ مر گیا جو مرتا نہ تھا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔"

سیّد سجّاد حیدر یلدرم

قرۃ العین حیدر

یہ جو مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں یلدرم پر مضمون لکھوں، یہ میرے لئے ایک بڑا مرحلہ ہے۔ شخصیت نگاری، خصوصاً ان شخصیتوں کے متعلق کچھ لکھنا جو اب ہمارے درمیان موجود نہیں، ایسے بھی بہت ذمہ داری کا کام ہے۔ "موت" اور زمانے کا وقفہ، یہ دونوں چیزیں ایک دھندلکے ہیں انسان کو چھپا دیتی ہیں اور عموماً یہ دھندلکا ذرا فاصلے سے بڑا رومانی اور خوبصورت دکھلائی پڑتا ہے۔ جب کبھی ہم اپنے مرحوم بزرگوں، عزیزوں، یا اپنے بڑے لوگوں کو یاد کرتے ہیں تو بہت ہی ملے جلے جذبات کے ساتھ ان کے لئے قلم اٹھایا جاتا ہے۔ کچھ ان ہستیوں کے لئے عقیدت ہوتی ہے کچھ ان گذرے زمانوں کے لئے نوسٹیلجیا جن میں یہ لوگ زندہ تھے۔ پھر ان خصوصیات کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو اب ناپید ہیں۔ طرح طرح کے مضمون ہوتے ہیں۔

آج کل یوں بھی ہوتا ہے کہ اس طرح اپنے کرداروں کو متعارف کیجئے جس سے ظاہر ہو کہ آپ ان کی کمزوریوں اور خامیوں کا مذاق اُڑا کر دل ہی دل میں خوش ہو رہے ہیں۔ گویا شخصیت نگاری بھی رہی اور "ممدوح" پر ایک قسم کی ایکٹوٹی بھی ہو گئی۔

پھر اکثر یہ ہوتا ہے کہ ایک انجمنِ توصیفِ باہمی قائم کی جاتی ہے اور ایک دوسرے پر طبع آزمائی ہوتی ہے۔

یہ سب چیزیں اپنی اپنی جگہ پر بہت دلچسپ ہیں لیکن اب کے اس رسالے میں اردو کے ان بڑے ادیبوں کے متعلق بھی تذکرہ کیا جا رہا ہے جن کو ہم "فاقداً" احترام کی نظروں سے دیکھتے ہیں اور جو اب ہماری محفل سے اٹھ کر جا چکے ہیں۔ یلدرم بھی ان لوگوں میں سے ہیں جن کے بارے میں ہم ایک چلتا پھرتا خاکہ نہیں لکھ سکتے۔ اور یلدرم کے متعلق مضمون لکھتے ہوئے میں پوری کوشش یہ بھی کروں گی کہ جو کچھ ان کے بارے میں آپ کو بتلاؤں اس میں محبت کا وہ عنصر نہ آنے پائے جو تصویر کو اسی رومینٹک دھندلکے میں چھپا دیتا ہے۔

لیکن لکھنا شروع کرتے سمے ایک پریشان کن سوال پھر یہ پیدا ہوتا ہے کہ میں کتنا ہی OBJECTIVE مضمون لکھوں، پر چونکہ یلدرم کے پورے کردار میں کہیں پر بھی کوئی چھوٹی سی غیر اہم خامی یا کمزوری نہ تھی اس لئے مضمون پھر لامحالہ مبالغہ آمیز معلوم ہوگا۔ ایسے فرشتہ صفت قسم کے انسانوں کے بارے میں کچھ لکھنا واقعی بہت دشوار ہے۔

فرشتوں کی تصویروں میں رنگ نہیں ہوتا۔ محض نور ہوتا ہے جو اتنا دلچسپ نہیں۔ نور سے آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ رنگ وانوس ایسے دلچسپ اور دلکش ہوتے ہیں۔

مگر خوشی کی بات یہ ہے کہ یلدرم کی تصویر میں رنگ بھی ہیں۔ کیونکہ چودھری محمد علی ردولوی کی مانند، یہ بھی ایک پورے زمانے، پورے دور کے نمائندے تھے۔ روایت کو نبھانے کے لئے میں بھی حالاتِ زندگی سے مضمون شروع کر رہی ہوں اور اس لئے بھی کہ خاندانی اور معاشرتی پس منظر کو اُجاگر کئے بنا یہ اندازہ نہ ہو سکے گا کہ یلدرم میں یہ خصوصیات کہاں سے آئیں۔

یلدرم کے خاندان کو ان سب چیزوں پر بڑا فخر تھا جو ایک زمانے میں انسانیت کا اعلیٰ ترین معیار سمجھی جاتی تھیں۔ یعنی کلچر اور شرافتِ نفس۔ (اس کے علاوہ ان لوگوں کو اپنے نہایت کھرے قسم کے سید ہونے پر بھی سخت ناز تھا) سید حسن ترمزی یلدرم کے نگر سگر دادا تھے جو وسط ایشیا سے ہندوستان آئے۔ (ترمز آج کل سوویٹ ترکستان میں ہے) صدیوں تک اس گھرانے میں علم کی وراثت ایک نسل دوسری نسل کے ہاتھ سونپتی گئی۔ یہ سب عالم لوگ تھے۔ روایتی قسم کے مولوی اور کٹھ ملا نہیں تھے۔ لہٰذا علمیت کے ساتھ ساتھ زندگی کی لہر بھی قائم رہی۔ زیادہ دلچسپ بات یہ تھی کہ بیبیاں بھی پڑھی لکھی ہوتی تھیں۔ اسی گھرانے کی ایک بی بی سیدہ اُمّ مریم نے قرآنِ شریف کا ترجمہ فارسی میں کیا تھا۔ سیدہ اُمّ مریم کی بٹیا یلدرم کی ماں تھیں۔

یہ زمیندار لوگ تھے۔ دربارِ مغلیہ میں سہ ہزاری پنج ہزاری و منصبدار وغیرہ رہے۔ واضح رہے کہ فیوڈل خاندانوں کی LEGEND کے یہ لازمی عناصر ہیں۔ دربار، جاگیریں، شعر و شاعری۔ لیکن اب ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ معاشرے کی تہذیبی اقدار کو انہوں نے اپنے وجود سے کیا فائدے اور کیا نقصان پہنچائے) غدر ۱۸۵۷ء میں یلدرم کے دادا میر احمد علی نے زور شور سے انگریزوں کے خلاف اعلانِ جنگ کیا۔ لہٰذا جاگیریں ضبط ہوئیں اور زوال آیا اور نئی پود کو انگریزی پڑھنا اور سرکاری ملازمتیں کرنا پڑیں۔ (یہ بھی کہانی کا طے شدہ مکمل پیٹرن ہے۔ لکھنؤ، دلّی اور سارے اُتّر پردیش کے اَن گنت مسلمان خاندانوں کی ساری داستان مختصراً یہی ہے۔ محض ناموں کا فرق ہے) یہ انگریزی پڑھنے اور انگریز کی ملازمت کرنے والے یلدرم کے باپ اور چچا تھے۔

یلدرم کے باپ خان بہادر سید جلال الدین حیدر شہر بنارس کے حاکم تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی یعنی یلدرم کے چچا خان بہادر ڈاکٹر سید کرّار حیدر یو۔ پی میں سول سرجن تھے اور انیسویں صدی کے آخر میں صوبے کے مشہور ڈاکٹروں میں ان کا شمار کیا جاتا تھا۔ سنہ ۱۸۹۶ء میں گھوڑے سے گر کر ان کا انتقال ہوا۔

یلدرم سنہ ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ گنگا کے کنارے کھیلنے کودنے میں گذارا۔ بہت نارمل قسم کا پرانے فیشن کا ان کا بچپن رہا ہوگا۔ یعنی ایسا بچپن جس میں ابھی بڑوں پر چائیلڈ سائیکولوجی کے اسرار و رموز کا انکشاف نہیں ہوا تھا۔ یلدرم کے باپ جن کے رعب اور دبدبے سے سارا بنارس تھر تھر کانپتا تھا اپنے بچوں کے لئے ان کے رفیق بھی تھے اور فلاسفر بھی۔ انہوں نے اپنی اولاد کو سب سے پہلا سبق یہ پڑھایا کہ دوسروں کی دل آزاری عظیم ترین گناہ ہے۔ یلدرم اور ان کے تینوں بھائیوں کی زندگیاں اس نصیحت کی کامل تفسیر رہیں۔

سید جلال الدین حیدر ایک عجیب و غریب اور حیرت انگیز شخصیت کے مالک تھے۔ اپنے جاگیردارانہ پس منظر اور خود اپنے وسیع اختیارات اور اقتدار کے باوجود ان کے مزاج میں کسی قسم کا تکبر یا رعونت نہ تھی۔ ان کی پُرشکوہ شخصیت، انصاف پسندی اور کٹّر اصول پرستی کی وجہ سے لوگ ان سے خائف رہتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کی شفقت، نیکی اور دردمندی کی وجہ سے عوام کو ان سے بے اندازہ محبت بھی تھی۔ ان کی زندگی ہی میں بنارس میں انہیں مہاتما اور دیوتا سمان سمجھا جاتا تھا اور ساٹھ ستر برس گذرنے کے باوجود آج بھی وہاں پر ان کا نام ایک طرح کی تقدیس اور عقیدت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔

جب یہ بچے بڑے ہوئے تو خان بہادر صاحب نے انہیں علی گڈھ بھیج دیا اور یلدرم اور ان کے بھائی ایم۔ اے۔ او کالج میں داخل کئے گئے۔

سجاد حیدر یلدرم کی زندگی کے واقعات آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دینے والے نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنی ساری عمر بہت خاموشی اور نرم روی سے گذاری۔ "انا" ہم سب کی ایک بہت بڑی کمزوری ہے۔ بعض دفعہ یہ کمزوری بہت کارآمد ہوتی ہے۔ ورنہ کوئی کلاکار اپنا اظہار نہ کرتا۔ (لیکن زیادہ تر "انا"، یا بقول مولانا ابو الکلام آزاد "ایغو" کس قدر کھل جاتا ہے اور دوسروں کے لئے کتنا صبر آزما ثابت ہوتا ہے) بہرحال یلدرم میں یہ انوکھا پن تھا کہ آرٹسٹ ہونے کے باوجود ان میں اس "ایغو" کا فقدان تھا اور اس وجہ سے انہیں زندگی میں بہت نقصان اٹھانا پڑے۔

اس HUMILITY پر ہمیں قرونِ اولیٰ اور قرونِ وسطیٰ کے کیتھولک فلسفیوں نے بہت کچھ سکھانا چاہا ہے۔ اور بڑے انسان کی سب سے

بڑی نشانی یہی ہے۔

۱۹۱۰ء میں یلدرم نے بی۔ اے کیا اور سارے صوبے میں سیکنڈ آئے (اس زمانے میں علی گڈھ کالج الہ آباد یونیورسٹی سے منسلک تھا) یہ ریاضی میں بے حد کمزور تھے۔ اس لئے ایک مرتبہ انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں سارے صوبے میں فرسٹ آئے لیکن ریاضی میں فیل ہو گئے۔ اس زمانے میں ریاضی انٹرمیڈیٹ کے لئے لازمی مضمون تھی۔[1]

یلدرم یونین کے سیکرٹری اور پریذیڈنٹ رہے۔ تقریر بہت عمدہ کرتے تھے۔ لباس ہمیشہ انگریزی اور بہت اعلیٰ درجے کا پہنتے تھے۔ مولانا محمد علی ان کے کلاس فیلو تھے۔ اسی زمانے میں ایک اور دوست عبد الرحمٰن صدیقی[2] علی گڈھ آن پہنچے۔ لکھنؤ کے چودھری نعمت اللہ بھی اسی کلاس میں تھے۔ انہوں نے بعد میں قانون میں بہت نام پیدا کیا۔ آج سے نصف صدی قبل کے علی گڈھ کے ان مشہور "کھلنڈروں" کی زندگی بہت دلچسپ اور بھرپور رہی ہو گی۔ اس کی ایک ہلکی سی جھلک ہمیں یلدرم کی مشہور طویل نظم "مرزا پھویا علی گڈھ کالج میں" میں ملتی ہے جو انہوں نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں لکھی تھی:۔

ایک صاحب اودھ میں رہتے تھے — مرزا پھویا سب ان کو کہتے تھے
کیا کہوں تھا کہاں چمن ان کا — لکھنؤ تھا کبھی وطن ان کا
گھر سے نکلے نہ تھے تمامی عمر — ساری بھونرے ہی میں گذاری عمر
خیر سے تھا ابھی شباب شروع — عمر کا بیسواں تھا باب شروع
چین تھا دن کو لطف راتوں میں — وقت کٹتا تھا یونہی باتوں میں
کہ فلک ہو گیا خلل انداز — تجھ سے سمجھے خدا ارے دم باز

وہ یوں ہوا ـــ

قوم میں سب سے اعلیٰ و اولےٰ — محسن الملک محسن الدولہ
دردِ قومی کے اس معالج نے — یعنی سیکرٹری کالج نے
سارے شہروں کا جب کیا دورہ — لکھنؤ بھی مشرف اس سے ہوا
دھوم تھی اک فصیح آیا ہے — نیچری فوج ساتھ لایا ہے
وقتِ تقریر اس کا طرزِ بیاں — گہ شرربار گاہ نور فشاں
جادو کرتا ہے سحر کرتا ہے — مہر کرتا ہے قہر کرتا ہے

---

[1] کس قدر خوفناک زمانہ رہا ہو گا۔

[2] کالج سے نکلنے کے بعد انہوں نے ساری عمر پرخلوص اور آن تھک سیاسی جدوجہد میں گذاری۔ پاکستان بننے کے بعد گمنامی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ حال ہی میں کراچی میں ان کا انتقال ہوا ہے۔ انتقال سے کچھ عرصہ قبل انہیں مشرقی بنگال کا گورنر بنا دیا گیا تھا۔ انہی عبد الرحمٰن صدیقی کے والد نے ان کی طالب علمی کے زمانے میں بمبئی کے ایک یتیم لڑکے کی پرورش اپنے ذمے لی۔ پھر یہ لڑکا وظیفہ لے کر ولایت گیا۔ وہاں آئی۔ سی۔ ایس میں لے لیا گیا۔ ہندوستان واپس آکر ملازمت کی۔ پھر آئی سی ایس سے استعفیٰ دے کر بقیہ عمر فلسفۂ اسلام پر کتابیں لکھنے میں گذار دی اور قرآن شریف کا انگریزی ترجمہ کیا۔ قرآن شریف کے اس مترجم نے بھی حال ہی میں گمنامی اور گوشہ نشینی کے عالم میں انگلستان میں انتقال کیا اور اپنی وصیت میں اپنا سارا روپیہ لندن یونیورسٹی کے لئے وقف کر گیا۔ اس یتیم لڑکے کا نام عبد اللہ یوسف علی تھا۔

'جب ہوئے دوست ان کے سارے بضد
تب تو مرزا کے والدِ ماجد
سبا کے جلسے میں خود شریک ہوئے
کر گیا ان پہ جادو اپنا کام
ایک دم یہ تہیہ کر بیٹھے
بس علی گڈھ ہیں مرزا جا کے پڑھے '

چنانچہ مرزا پھویا علی گڈھ بھیج دئے گئے۔ جو کچھ ان پر وہاں بیتی اس کے بعد سے

اک عریضے کی یوں بنا ڈالی — قبلہ ام ظلہ العالی
اولاً مجرا عرض کرتا ہوں — حال پھر اپنا عرض کرتا ہوں
ہو کے رخصت جناب سے پہنچا! — کیا کہوں اس جگہ پہ کیا دیکھا
یاں کے لڑکوں کا حال ہی ہے جدا — ایسا دیکھا کبھی کبھی نہ سنا!
جنس ہر اک نئی دکان نئی — اور تو اور ہے زبان نئی
بو تنعم کی ہو ذرا سی بھی — اس کو کہتے ہیں یاں پہ عیاشی
عطر میں گر کبھی جو کپڑے بسائیں — فوراً عیاش آپ کہلائیں
دوڑتے کودتے اچھلتے ہیں — بھول کر بھی نہ سیدھے چلتے ہیں!
کوئی مارے چھلانگ تو یہ خوش — ٹوٹ جائے جو ٹانگ، تو یہ خوش
ہو گئی میری جان بھی بیکل — جب وہ چیخے "بریک ان ٹو ڈبل"

چند اور شکایات کے بعد خط کے آخر میں ہے

اس لئے عرض ہے کہ یہ چیزیں — لکھنؤ سے روانہ آپ کریں
ایک ڈبہ دیا سلائی کی — پڑیا اک نیلی روشنائی کی
اک برش جوتا صاف کرنے کا — اور برانکو بھی ساتھ تھوڑا سا
دو گھڑے، اک صراحی، پیالے چار — اور ممکن ہو گر تو تھوڑا اچار

سر عبد القادر مرحوم نے کہیں پر ایک دلچسپ واقعے کا ذکر کیا ہے جب یہ ابھی مدیر مخزن نہ تھے اور کسی انگریزی اخبار کے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے اور یلدرم ابھی بی۔ اے میں پڑھ رہے تھے۔ ان کی یلدرم سے پہلی مرتبہ حاجی محمد اسمٰعیل خان صاحب کے یہاں علی گڈھ میں ملاقات ہوئی۔ "حاجی صاحب نے سجاد سے میرا تعارف کرایا۔ جب میں حاجی صاحب سے بات کر کے فارغ ہوا تو سجاد میرے پیچھے پیچھے آئے اور کہنے لگے آیئے میں آپ کو ایک دلچسپ چیز دکھاؤں۔ آپ شبلی نعمانی کو مشق سخن کرتے دیکھنا چاہتے ہیں؟ مولانا شبلی اس وقت حاجی صاحب کے مہمان تھے اور اسی بنگلے کے ایک کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ سجاد مجھے ایک کمرے کی طرف لے گئے جس کا ایک دروازہ باہر کی طرف کھلتا تھا۔ مولانا شبلی دروازے کی طرف پیٹھ کئے بیٹھے تھے اور کچھ لکھ رہے تھے۔ ہم دروازے کے آئینوں میں سے جھانک کر انہیں دیکھ سکتے تھے پر وہ ہمیں نہ دیکھ سکتے تھے۔ ان کا قلم کبھی کاغذ پر چلتا تھا کبھی اس کا ایک سرا منہ کے قریب ہوتا تھا جیسے فکر سخن میں ہیں۔ معلوم نہیں ہم دونوں کا مولانا کو اس طرح دزدیدہ دیکھنا کہاں تک

جائز یا مناسب تھا۔ مگر مجھے اس کا کبھی افسوس نہ ہوا کہ ہم نے یہ حرکت کی۔ اور سجاد حیدر کا یہ جذبہ مجھے بہت بھایا کہ مولانا کو فکرِ سخن کرتے دیکھنے سے ان کو جو لطف آیا اس میں انہوں نے مجھے بھی شریک کرنا ضروری سمجھا اور پہلی ہی ملاقات میں ہم دونوں کو معلوم ہو گیا کہ ہم کس قدر ہم مذاق ہیں۔ مولانا شبلیؔ اپنے شاگردوں میں شبلی غمزؔدہ کے نام سے اس لئے مشہور رہتے کہ وہ فارسی اشعار میں اپنے نام کے ساتھ "غمزدہ" لکھا کرتے تھے۔

علی گڑھ ان دنوں گویا اوکسفرڈ کا موڈل بنا ہوا تھا۔ تھیوڈؔور بیک پرنسپل تھے۔ آرنلڈؔ اور نکلسنؔ انگریزی کے استاد تھے۔ پروفیسر چکرورتی اور ڈاکٹر ضیاء الدین ریاضی پڑھاتے تھے۔ مولوی عباس حسین عربی کے استاد تھے اور مولانا شبلیؔ[1] فارسی پڑھایا کرتے تھے۔ یلدرؔم فارسی میں بہت اچھے تھے۔ لہٰذا شبلی کے بہت پسندیدہ شاگردوں میں سے تھے۔

خوش حال خاندانوں کے لڑکے جو یہاں سے نکلتے ان کو اب مسلمانوں کے نئے معاشرے کی قیادت کرنا تھی۔ جداگانہ مسلم سیاسی پلیٹ فارم کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ (علی گڑھ کی درس گاہ انڈین نیشنل کانگریس کے قیام سے دس سال قبل قائم کی جا چکی تھی) وائسرائے اور گورنر صاحبان آکر اسٹریچی ہال میں ان نوجوانوں کو خطاب کرتے ان کی تقریروں میں مسلمان قوم کی بے اندازہ تعریفیں ہوتیں۔ پھر یہ نوجوان باہر آکر سول سروسوں میں لئے جاتے۔ وائسرائے ہند سے مسلمانوں کے جداگانہ انتخابات اور تقسیم بنگال وغیرہ کے مسائل پر گفت وشنید کرتے۔

یلدرؔم کے سامنے بھی یہی راستے تھے۔ یا یہ قانون پڑھنے کے لئے ولایت جاتے' واپس آکر بیرسٹری کرتے۔ ہائیکورٹ کے جج بنتے یا قوم کی قیادت کرتے اور آخر میں کسی ہندوستانی ریاست کے دیوان بن جاتے۔ ان کے گھر والوں کے سامنے بھی یہی پروگرام تھا۔ لیکن اس کے بجائے آپ ایک سہانی صبح بغداد بھاگ لئے اور کئی سال تک سلطنتِ عثمانیہ اور مشرقی یورپ میں گھومتے رہے۔

زمانۂ طالب علمی سے ان کو ترکی سے ذہنی لگاؤ ہو گیا تھا۔ ہندوستان میں ہی انہوں نے ترکی زبان میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ بی۔ اے کے بعد ابھی یہ علی گڑھ میں ہی مقیم تھے اور ایل۔ ایل۔ بی کے لئے پڑھ رہے تھے جب برطانوی فارن آفس سے کسی نے ان کے ایک انگریز پروفیسر کو لکھا کہ بغداد کے برطانوی قونصل خانے کے لئے ترکی زبان کے ترجمان کی ضرورت ہے۔ پروفیسر نے ان سے ذکر کیا۔ آپ نے ترکی پہنچنے کا یہ موقع غنیمت جانا اور فوراً چل کھڑے ہوئے۔

اسی زمانے میں انہوں نے ترکی ادب کی طرف توجہ کی۔ ۱۹۰۲ء میں انہوں نے احمد حکمتؔ کے ایک ناول "ثالث بالخیر" کا ترجمہ کیا۔ کتاب کے شروع میں ۱۴ اگست ۱۹۰۲ء کی تاریخ کے ساتھ "التماسِ مترجم" کے عنوان سے یہ سطور یلدرؔم نے لکھیں:

> "میں اس ترجمے کو بہت دھوم دھڑکے سے پیش نہیں کرنا چاہتا اور نہ اس جرم کی معافی چاہتا ہوں کہ میں نے ناول کا ترجمہ کیا اور اس طرح پبلک کے مذاق کو ایک مضر شے کی طرف راغب کیا۔ قصوں کے ترجمے آج کل بہت ہو رہے ہیں مگر سب انگریزی سے۔ اور اس کے عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ انگریزی سے بھی کس قسم کے ناولوں

---

[1] شبلیؔ اسی زمانے میں ترکی گئے تھے۔ وہاں سے لوٹ کر انہوں نے ایک نظم لکھی جس میں کچھ یہ تھا کہ میں نے ملک کے ماحول کو وہی پایا جیسا پہلے تھا اس پر کلاس کے کسی شریر لڑکے نے اسی بحر میں یہ شعر لکھ کر نوٹس بورڈ پر لگا دیا ؎

شبلیٔ غمزدہ باصورتِ تُداف کہ ہست
رنگِ او تیرہ و تاریک ہمیں است کہ بود

شبلیؔ نے کلاس میں آکر یہ شعر دیکھا تو بہت خوش ہوئے کہ جس ذہین لڑکے نے یہ شعر کہا ہے اپنا نام بتا دے۔ بھلا کسی کی شامت آئی تھی جو بتاتا۔ بعد میں سیاسی نظریات میں اختلاف کی بناء پر سرسیدؔ سے ان کا بگاڑ ہو گیا اور یہ علی گڑھ سے چلے آئے۔ اور ندوۃ العلماء لکھنؤ اور دارالمصنفین اعظم گڑھ کے کاموں میں مشغول ہو گئے۔

کے ترجمے ہو رہے ہیں۔

میری تمنا یہ تھی کہ کسی طرح ترکوں کے قصے ترجمہ ہوں۔ اس سے نہ صرف ہمارے ناولوں کے لٹریچر میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا بلکہ ترکوں کی سوشل زندگی کا اصلی نقشہ بھی ہمیں نظر آ جائے گا۔ ترکوں کی سوشل زندگی کی تصویر کی ہیں اردو میں اس لئے ضرورت سمجھتا تھا کہ ہماری سوسائٹی اور طرزِ معاشرت میں جو انقلاب پیش آ رہا ہے وہ انہیں بھی پیش آ چکا ہے۔ اس وجہ سے ہمیں اس نقشے سے معلوم ہو جائے گا کہ اس منزل سے وہ کس طرح گذرے ہیں اور اب کہاں ہیں۔ ترجمہ اکھڑا اکھڑا اور انوکھا معلوم ہوگا مگر ترکوں کا طرزِ ادا مجھے کچھ ایسا بھلا معلوم ہوتا ہے اور مغربی اور ایشیائی طرزِ تحریر کا ایسا معقول میل ہے کہ میں نے لفظی ترجمے کی کوشش کی ہے۔ گفتگو انوکھی تو ضرور ہے لیکن سُننے تو سہی:

ع غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد"

اس وقت یلدرم کی عمر کوئی اکیس یا بائیس سال کی تھی۔ اسی زمانے میں انہوں نے اور دوسرے نوجوانوں نے مخزن میں لکھنا شروع کیا۔ مخزن کا یہ ابتدائی دور اردو کی جدید تاریخ میں بہت اہم حیثیت کا مالک ہے۔

بیسویں صدی کے اوّلیں برسوں میں جیسے یہ ایک نئی صبح ہو رہی تھی جس کے اُجالے میں نئی نئی چیزیں منظر میں نمایاں ہوتی جا رہی تھیں۔ ملک میں ایک نیا دور (نہایت بیہودہ لفظ ہے) مطلب یہ کہ ایک عہدِ نو (لاحول ولاقوۃ) شروع ہو چکا تھا۔ یہ بالآخر ایڈورڈین عہد تھا۔ ادب کے میدان میں بڑی گہما گہمی تھی۔ انگلستان کے ادب میں اس وقت امپیریلزم، سوشلزم اور AESTHETICISM کی دھارائیں ساتھ ساتھ بہہ رہی تھیں۔ ایک طرف کپلنگ صاحب جو لکھتے وہ RULE BRITANNIA کے نغمے پر سر دُھن رہے تھے۔ دوسری طرف برنارڈ شا اور ان کی فیبین سوسائٹی کی اشتراکیت کا تصور دماغوں پر رفتہ رفتہ قبضہ جما رہا تھا۔ ساتھ ساتھ ڈبلو بی ایٹس کی مشرقی اور کیلٹک اسرار پسندی اور آئرش قوم پرستی کا چرچا تھا اور سکر وائلڈ اور ان کے مالتی جمالیات کے نظریوں کی گونج فضا میں جھٹکے تھے۔ جی ایم ہوپکنز جدید شاعری کی داغ بیل ڈال چکے تھے۔ پیرس میں الگ اودھم مچی ہوئی تھی۔ جدیدیت کے سارے نئے 'ازم'، تہلکہ بپا کر رہے تھے۔ دوسری طرف مقدس سلطنت روس میں مہاتما ٹالسٹائی نے تھک کر آخر میں یہ سوال کیا تھا کہ "اب کیا کرنا چاہئے؟" اور "خود سوچو اور جواب دو"۔ اور ایک نیا نام سامنے آ چکا تھا ——— میکسیم گورکی

گھر پر، بنگال میں عظیم ناول لکھے جا رہے تھے۔ ٹیگور نے ساری دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔

اس سمے ہمارے ہندوستانی مسلمان نوجوانوں کو کون بڑے فن برائے زندگی کی ضرورت تھی۔ انہوں نے آئیڈیلزم کو اپنایا۔

اسی وقت یلدرم[1] نے لکھنا شروع کیا تھا۔

یلدرم کی رومانیت خالص مغربی (اور ترکی) رومانیت تھی۔ انہوں نے عورت کا ذکر اس انداز سے کیا کہ اب وہ چلمن کے پیچھے سے جھانکنے والی سرشار کی سپر آرا نہ تھی۔ یہ عورت کو اپنے ہمراہ اپنے برابر لانا چاہتے تھے جو ہندوستان میں ناممکن تھا۔ انہوں نے اپنے قصّوں کی لڑکیوں کو لکھنؤ اور دلّی کی حویلیوں کی چہار دیواری سے نکال کر بلیٹی کی چرپائی پر کھلی ہوا میں سانس لینا دیکھنے کی تمنا کی۔ اسی لئے انہوں نے ہندوستان سے باہر ترکی کو اپنا آئیڈیل بنایا۔ اس وقت ایران اور مصر بہت ہی پسماندہ تھے۔ ترکی میں یورپین اقوام کے قرب کی وجہ سے زندگی کی لہر زیادہ تیز ہو چکی تھی۔ یلدرم نے جن ترکی ڈراموں کا ترجمہ کر کے ان کی ہیروئنوں کو اردو پڑھنے والوں سے روشناس کرایا (زہرا، حمرا، قمرآرا، بہیجہ وغیرہ) ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ یلدرم کی آئیڈیل لڑکیاں تھیں۔ یہاں پر میں سر عبدالقادر مرحوم کی تحریر پھر نقل کرتی ہوں جس سے آزادیٔ نسواں کے بارے میں یلدرم کے خیالات کا کچھ پتہ چلے گا۔ سر عبدالقادر لکھتے ہیں:

---

[1] سید سجاد حیدر نے یہ ترکی زبان کا تخلّص اختیار کیا تھا۔ ترکی میں "یلدرم" کے معنی برق کے ہیں۔

"۱۹۰۷ء میں مسلمانوں کی تعلیمی کانفرنس کراچی میں ہو رہی تھی جس کے صدر اس سال مولانا حالیؔ تھے اور سجاد حیدر بھی اس میں شریک تھے۔ ایک دن جب میں جلسے کے بعد اپنی قیام گاہ کی طرف جا رہا تھا تو سامنے سے سجاد آتے نظر آئے۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے کئی ایک چکر اپنے گرد لگائے جیسے خوشی سے رقص کر رہے ہوں۔ مجھ سے کہنے لگے۔ کچھ نہ پوچھئے میرا دماغ اس وقت آسمان پر ہے اور میں زمین پر کسی سے بات کرنے کو تیار نہیں۔ میں نے پوچھا کچھ بتاؤ تو کیا دیکھا ہے۔ کہنے لگے ایک ایسی خاتون[1] سے مل کر آ رہا ہوں جو آزادی کی حامی ہیں اور خود آزادی پر عامل ہیں۔"

بغداد کے بعد ان کا تبادلہ قسطنطنیہ کے برطانوی سفارت خانے میں ہو گیا۔ یہاں یلدرم ترکی کے نئے ادب کی تحریک اور نئے لکھنے والوں اور سیاسی انقلابیوں کے بہت قریب رہے۔ اسی زمانے میں نوجوان وطن پرستوں نے ینگ ٹرک پارٹی کی بنیاد ڈالی۔ یلدرم خود بہت پکے انقلابی تھے۔ یہ برطانوی فارن آفس کے ملازم تھے اور غلام آباد ہند کے باشندے تھے۔ لیکن عالم یہ تھا کہ ینگ ٹرک پارٹی کی اوّلین میٹنگ آپ کے گھر پر ہی منعقد کی گئی اور خفیہ پولیس اور جاسوسوں کی نگرانی کے باوجود مستقل انڈر گراؤنڈ قسم کے جلسے اور کارروائیاں آپ کے یہاں ہوتی رہیں۔

یلدرم کی یہ انقلاب پرستی رومانیت کے جذبے کی وجہ سے پیدا نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے بہت بڑا خطرہ مول لے کر ینگ ٹرک پارٹی کے ساتھ کام کیا۔ پھر لطف یہ ہے کہ بعد میں ساری عمر کبھی بھولے سے اس کا ذکر نہ کیا۔ میرے خیال میں ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو سنسنی خیز شہرت حاصل کرنے کیلئے بعد میں ہمیشہ کے واسطے لیڈر قوم اور غازی وغیرہ بن جاتا۔

وہی "البغو" کا فقدان۔

یلدرم سلطنتِ عثمانیہ میں کئی سال رہے قسطنطنیہ کے بعد ان کا دوسرا پسندیدہ شہر بوڈاپسٹ تھا۔ یہ پہلی جنگِ عظیم سے قبل کا یورپ تھا۔ یہاں پر ہر طرف رومان ہی رومان تھا۔ (وی آنا کے امپیریل اوپیرا میں واگنر کی نسل کے ساتھی ہیوگو وولف ابھی موجود تھے۔ سائبلیس اپنی موسیقی کمپوز کر رہے تھے۔ برلین میں اسٹراس تھے۔ پیرس میں DEBUSSY نے موسیقی میں امپریشنزم کی بنا ڈالی تھی۔ یہ یورپ اگست ۱۹۱۴ء میں ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا)

جنگ چھڑنے سے کچھ عرصہ قبل یلدرم کا تبادلہ امیر یعقوب خان کے سابق امیر کابل کے اسسٹنٹ پولٹیکل ایجنٹ کی حیثیت سے ہندوستان کا کر دیا گیا اور یہ قسطنطنیہ سے وطن واپس آئے۔ امیر یعقوب خان تیسری جنگِ افغان میں شکست کے بعد انگریزوں کے اسیر کی حیثیت سے مسوری میں نظر بند تھے یلدرم نے ترکی کے انقلابی ماحول کے بعد یک لخت خود کو ایک شکست خوردہ افغان بادشاہ کی معیت میں پایا۔ یہ کئی سال تک مسوری اور ڈیرہ دون میں جلا وطن افغان بادشاہ اور شہزادوں کے ساتھ رہے۔

اسی زمانے میں یعنی ۱۹۱۲ء میں یلدرم کی شادی ہوئی جب یہ ترکی سے تنہا لوٹے تھے تو ان کے دوستوں کو گروہ میں بڑی کھلبلی مچی تھی کہ یہ کیا سلسلے ہیں۔ یہ ضرور کوئی ترکن بیاہ کر کے وہاں چھوڑ آئے ہیں جو اب اگلے جہاز سے پہنچتی ہو گی۔ ترکی سے اتنا عشق اور ترکن سے شادی نہ کی۔ اکبر الٰہ آبادی نے اس پر ایک مزے دار قطعہ بھی کہا تھا لیکن انہوں نے دوستوں پر واقعی یہ اکیٹوٹی کر دی کہ کسی ترکن کے بجائے ہندوستان ہی میں بیاہ کیا۔

اُتر پردیش میں ایک اور خاندان سادات ہے جو یلدرم کے گھرانے کی طرح صدیوں سے علمیت اور کلچر کا گہوارہ رہا ہے ملکہ نور جہاں کے عہد میں جب ایرانی عالموں اور مصوّروں نے جوق در جوق ہندوستان آنا شروع کیا۔ اسی زمانے میں نیشا پور ایران کا یہ خاندان جہانگیر کے دربار میں مدعو کیا گیا۔ اور یہاں رام گنگا کی وادی میں انہیں معافی کی زمینیں یعنی "باون گاؤں" مع نوابی کے خطاب کے

---

[1] غالباً یہ کانفرنس پریذیڈنٹ بدرالدین طیب جی کے گھرانے کی کوئی خاتون تھیں۔

عطا کئے گئے۔[1] دربار میں زیادہ تر علمی کام ان کے سپرد رہے خصوصاً حکومت کا نظم و نسق اور محکمہ مالیات کے عہدے۔ اس قبیلے میں کئی کافی دلچسپ ہستیاں گذری ہیں۔ مثلاً ایک صاحب نعمت خان عالی تھے جو شہنشاہ اورنگ زیب کے وزیر تھے۔ اور مذہب کے اختلاف کی وجہ سے مستقل ایک دوسرے سے دلچسپ نوک جھونک رہتی تھی۔ یہ اثنا عشری شیعوں کا گھرانہ تھا لیکن چونکہ یہ بھی عقلیت پرست عالم لوگ تھے اور جاہل قسم کے مولوی نہ تھے۔ لہٰذا ان کے یہاں تعصب یا تنگ نظری کا دور دور گذر نہ تھا۔ اسی لئے جب صوبے کے ایک مشہور اور راسخ العقیدہ سنی خاندان کے لڑکے کا پیغام خان بہادر سید نذر الباقر کی بڑی لڑکی نذر زہرا بیگم کے واسطے آیا تو اسے منظور کر لیا گیا۔

نذر زہرا بیگم اور ان کی چھوٹی بہن ثروت آرا بیگم کو ان کے باپ نے پردے ہی میں گورنسوں سے تعلیم دلوائی تھی۔ خان بہادر نذر الباقر کی [illegible] افضل علی ایک معاشرتی ناول "گوہر کا لال" تصنیف کر چکی تھیں۔ نذر زہرا بیگم کے چھوٹے [illegible] اور [illegible] افضل علی ایک صاحب طرز ادیب تھے ان کی کتاب "تخیلات" اب گمنام اور نایاب ہے۔

امیر کابل کے انتقال کے بعد [illegible] آفس سے یلدرم کی خدمات یو۔پی سول سروس میں منتقل کر دی گئیں۔ ۱۹۲۰ء میں ایم۔ اے۔ او کالج کو یونیورسٹی کا درجہ ملا اس وقت یونیورسٹی کے پہلے رجسٹرار کی حیثیت سے ان کی خدمات سول سروس سے مستعار لے لی گئیں۔ ۱۹۲۵ء میں ان کو حکومت نے [illegible] بلا لیا اور [illegible] انڈیمان و نکوبار کے ریونیو کمشنر کی حیثیت سے پورٹ بلیئر بھیج دیا گیا۔ ہندوستان واپس آ کر یلدرم مختلف [illegible] میں تعینات رہے۔ ۱۹۳۵ء میں خرابیٔ صحت کی بنا پر وقت سے پہلے ریٹائر ہو گئے۔

بقول ان کے ڈیرہ دون [illegible] پنشن یافتہ بڈھوں کا روحانی وطن تھا۔ یلدرم ریٹائر ہونے کے بعد کچھ عرصے کے لئے ڈیرہ دون چلے گئے۔ یہیں انہوں نے اپنا [illegible] شروع کیا تھا اور اکثر یہاں آ کر رہا کرتے تھے۔ یہیں پر انہوں نے ایک خوبصورت کوٹھی بنوائی تھی جس کا نام [illegible] تھا۔

ڈیرہ دون میں ان کے بہت سے دوست پہلے سے ریٹائر ہو کر مستقل رہ رہے تھے۔ مہاراجہ [illegible] ڈاکٹر [illegible] میڈیکل کالج لکھنؤ کے پرنسپل تھے ڈاکٹر رشید [illegible] ان کی [illegible] مولوی عنایت اللہ سابق ناظم دار الترجمہ حیدرآباد دکن اور ان کے بھائی انجینئر [illegible] دونوں شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ دہلوی کے بیٹے تھے۔ آج ان سب کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان کے علاوہ اور بہت سے مسلمان اور ہندو دوست تھے۔ بہت بوڑھے جلا وطن افغان شہزادوں کا پورا قافلہ تھا۔ یہ بوڑھے شہزادے [illegible] یلدرم کے پاس آ کر گھنٹوں بیٹھے رہتے اور گذرے زمانوں کو یاد کر کے روتے۔ ان کی بہت قلیل پنشن انگریز سرکار نے مقرر کر رکھی تھی اور ان کے پاس صرف ان کا [illegible] تھا۔ یلدرم ان سے بڑی محبت سے ملتے اور ان کے دکھ سکھ میں کام آتے۔

۱۳۵۰ھ میں یلدرم حج بیت اللہ کو گئے اور خوش خوش وہاں سے واپس آئے۔ ملازمت کے زمانے میں یہ اکثر چھ چھ مہینے کی رخصت لے کر انگلستان، یورپ اور ترکی میں وقت گذارا کرتے تھے۔ اب ان کو فرصت تھی اور ان کا ارادہ تھا کہ مستقل سیاحت میں مشغول رہیں گے۔ ۱۹۳۸ء میں شدید بیمار پڑے۔ ان کی آنکھ کے نیچے اور پیشانی پر کاربنکل نکلا تھا۔ ان کے چھوٹے بھائی [illegible] کے مشہور ڈاکٹر تھے ان کا آپریشن کیا جو کامیاب رہا۔ شدید تکلیف کے عالم میں بھی انہیں کسی نے کراہتے نہیں سنا۔ آپریشن کے بعد [illegible] لکھنؤ واپس آ کر اپنے معمول میں مصروف ہو گئے۔ یلدرم خالی کبھی نہ بیٹھ سکتے تھے۔ ریٹائر ہونے کے بعد برابر کسی نہ کسی مصروفیت میں لگے رہتے۔ ملازمت کے زمانے ہی میں بہت سی غیر سرکاری ذمہ داریاں ان کے اوپر تھیں۔ [illegible] ایسوسی ایشن کے [illegible] سرگرم [illegible] اور مسلم یونیورسٹی کورٹ [illegible] [illegible]

---

[1] ۱۸۵۷ء تک یہ بھی بڑے عزت و دبدبے والے لوگ تھے

[2] یہ پنجاب میں اسسٹنٹ انکم ٹیکس کمشنر تھے۔ ۱۹۳۸ء میں لاہور میں بیالیس سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔

کے ممبر اور صدر رہے۔ یونیورسٹیوں کے ممتحن تھے۔ ان کی صحت کمزور ہوتی جا رہی تھی مگر یہ ہر نئی مصروفیت خندہ پیشانی سے قبول کر لیتے اور کبھی انکار نہ کر سکتے۔

یلدرم کا حلقۂ احباب حیرت انگیز طور پر وسیع تھا اور سارے ملک میں پھیلا ہوا تھا۔ مولانا شوکت علی، انڈین پولیٹیکل سروس کے انعام الحق دہلوی مرحوم پٹنے کے نواب زادہ مرتضٰے علی خان مرحوم، مراد آباد کے سر محمد یعقوب مرحوم، عبدالرحمٰن صدیقی مرحوم، لکھنؤ کے سر سید وزیر حسن اور مشتاق احمد زاہدی دہلوی ان کے بے حد چہیتے دوست تھے۔ ویسے ان کے احباب کا حلقہ اتنا وسیع تھا کہ مجھے معلوم نہیں اور کتنے لوگوں سے ان کی دوستی تھی۔ بہت سے لوگوں کو — جنہیں میں نے بالکل اجنبی سمجھا، یلدرم کا نام آتے ہی واقعتاً آنسو بہاتے دیکھا ہے۔ ادیبوں کے حلقے میں بھی ان کے دوست تھے۔ ان سے کسی دشمنی یا رنجش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ منشی پریم چند، زمانہ' کانپور کے اڈیٹر دیا نرائن نگم۔ قاضی عبدالغفار، سر تیج بہادر سپرو مرحوم، میر غلام بھیک نیرنگ، سر شیخ عبدالقادر، علامہ تاجور نجیب آبادی، سر سید رضا علی، مولانا ابوالکلام آزاد ان کے عزیز دوستوں میں تھے۔ نئی نسل میں یلدرم کو خواجہ غلام السیدین اور رشید احمد صدیقی پر بہت ناز تھا۔

یلدرم ہندوستان کی تاریخ کے اس دور میں پیدا ہوئے تھے جب کہ ملک نے بہت بڑے بڑے آدمیوں کو جنم دیا تھا اور اپنے یہاں کے اس موجودہ ہولناک قحط الرجال کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ برصغیر کی یہی مسلمان قوم تھی جس نے قومی جدوجہد کے ان سپہ سالاروں بدر الدین طیب جی، رحمت اللہ سیانی، حسن امام، حکیم اجمل خان، ڈاکٹر انصاری، علی برادران، مولانا حسرت موہانی، ڈاکٹر ذاکر حسین، آصف علی اور مولانا آزاد کو پیدا کیا تھا۔ اور جس نے شیخ الہند مولانا محمود الحسن، سید امیر علی، سید محمود، پٹنے کے خدا بخش، سر شاہ محمد سلیمان اور علامہ عبداللہ یوسف علی جیسے عالموں کو پروان چڑھایا تھا۔

یلدرم کو اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں سے بے اندازہ محبت تھی۔ ان کے چھوٹے بھائی سید اعجاز حیدر کا جوانی میں انتقال ہو گیا تھا۔ منجھلے بھائی سید نصیر الدین حیدر بھی بہت علیگیرین تھے۔ یہ بھی پی سی ایس میں تھے اور بعد میں راجپوتانہ کی ریاست ٹونک میں وزیر تھے۔ خان بہادر ڈاکٹر سید وحید الدین حیدر یلدرم کے سب سے چھوٹے بھائی تھے۔ یہ یو۔ پی میں سول سرجن تھے اور لارڈ ولنگڈن اور لارڈ لنلتھگو کے اعزازی فزیشین تھے۔ یلدرم کی وفات کے تین سال کے اندر اندر ان دونوں نے بھی انتقال کیا۔ ان تینوں بھائیوں میں آپس میں اتنی محبت تھی جو آج کل ذرا کم دیکھنے میں آتی ہے۔

یلدرم کو اپنے سارے خاندان سے جو ماشاء اللہ بہت بڑا بھرا پرا خاندان ہے، بہت انسیت تھی۔ یہ گھنٹوں بڑی بوڑھیوں، عزیزوں حتیٰ کہ دور کے رشتہ داروں کے پاس بیٹھ کر ان سے باتیں کرتے اور ان کے دکھ سکھ میں شریک رہتے۔ یہ ایک ایسی خصوصیت تھی جو انہوں نے اپنے ہاں کی کلچر سے ورثے میں پائی تھی۔ یہ ہمارے دیس کے اس قدیم خاندان کے قدیم انسٹی ٹیوشن اور اس تربیت کا نتیجہ تھا جس کی وجہ سے خاندان کو ایک مقدس ENTITY سمجھا جاتا تھا۔

یلدرم کی روشن خیالی اور جمہوریت کا اثر یہ ہوا کہ ان کے خاندان کی، جو ایک قصباتی خاندان ہے، بے شمار لڑکیوں نے اس زمانے میں یونیورسٹیوں کی اعلیٰ ترین ڈگریاں حاصل کیں جب کہ یوپی کے مسلمانوں میں لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم اتنی عام نہ ہوئی تھی جتنی اب ہے۔ یلدرم کی بھتیجیوں اور بھانجیوں نے آج سے پچیس تیس سال قبل کانونٹ اسکولوں میں تعلیم حاصل کی۔ یلدرم کی بیگم صاحبہ ہندوستان کی ان گنتی کی ہندو اور مسلمان خواتین میں سے ہیں جنہوں نے آج سے تیس سال قبل پردے کی رسم کو ترک کیا۔ کرامت حسین گرلز ہائی اسکول لکھنؤ[2] اور مسلم گرلز کالج علی گڑھ کے قیام اور ترقی کے سلسلے میں دوڑ دھوپ کی۔ کھادی کی قومی تحریک کے زمانے میں خواتین کے محاذ پر جدوجہد میں مصروف رہیں۔

---

[1] یہ سجاد ظہیر کے والد تھے۔

[2] لکھنؤ کا مشہور "مسلم اسکول" جو اب بہت بڑا کالج ہے۔

یلدرم بہت پکے مسلمان تھے مگر مذہبی تعصب اور تنگ نظری کو بہت بڑا اخلاقی جرم تصور کرتے تھے مختلف مذاہب کے فلسفوں پر ان کا مطالعہ بہت گہرا تھا۔ نماز کے پابند نہ تھے لیکن کبھی کبھی نماز عشا پڑھ لیتے تھے اور بچوں کی طرح خوش ہو کر کہتے تھے "آج ہم نے نماز پڑھی"۔ ترکوں کے لہجے میں ترکی اور ایرانیوں کے لہجے میں فارسی بولتے تھے۔ عربی بھی روانی اور شگفتگی سے بولتے تھے۔ انہوں نے ہمیشہ مغربی طرز کی زندگی گذاری لیکن جدید "کلب لائف" اور حد سے زیادہ مغربیت زدہ خواتین ان کو سخت ناپسند تھیں۔ ان کے دو بھائیوں کو ہندوستانی کلاسیکل موسیقی پر دسترس حاصل تھی لیکن خود ان کو موسیقی کا بہت زیادہ شوق نہ تھا۔ گو بچوں کی موسیقی کی تربیت کے خیال سے انہوں نے رامپور دربار کے استاد یوسف خان کو کئی سال گھر پر رکھا۔

یلدرم کا طریقۂ فکر حیرت انگیز طور پر سائنٹیفک تھا۔ یہ چیز بدقسمتی سے ہمارے ہاں بہت ہی نایاب ہے۔ وگرنہ ہماری سیاست، ہماری "مذہبی" اور معاشرتی زندگی، ہمارے بیشتر "ادبی" اور "جمالیاتی" نظریات میں وہ شدید بنیادی تضاد، وہ کنفیوژن، ہر خود غلط قسم کا اعتماد اور ذہنی پراگندگی نہ ہوتی جو ہمیں اس وقت اپنے ملک کے ہر شعبے میں نظر آ رہی ہے اور جس کے فقدان کی وجہ سے گرتے گرتے اب ہم بالکل پاتال میں جا پہنچے ہیں۔ ہندو مسلم سوال اور اردو ہندی، ہندوستانی کے مسئلے پر آج سے اٹھارہ سال قبل یلدرم نے ۱۹۳۲ء میں ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد کے سالانہ اجلاس کے لئے جو مقالہ لکھا تھا اس کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا تھا وہ وقت عنقریب آ جائے گا اور جلد آنا چاہئے جب مذہب سے قطع نظر جغرافیائی اور ریجنل بنیادوں پر ان مسائل کو حل کیا جائے گا۔ رسم الخط کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ ملک کے شمال مغربی حصے میں عربی رسم الخط اور باقی سارے ہندوستان میں لامحالہ دیوناگری اسکرپٹ کا استعمال ہوگا۔ اس سلسلے میں جذباتیت سے کام لینا غلطی ہے۔ اتنا درست ہے کی خرابی بسر کے بعد ہم آج بھی پاکستان میں یہ طے نہیں کر پائے ہیں اور ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی اب ریجنل بنیادوں پر زبانوں کی تقسیم و ترویج کے نظریے کا پرچار کر رہی ہے۔

آخر میں یلدرم کے متعلق رشید احمد صدیقی کے ایک مضمون کا اقتباس درج کر رہی ہوں حالانکہ مضمون ایسے ہی بہت طویل ہو گیا ہے:

"اپنے رفقاء اور طلباء سے مجھے اکثر اس مسئلہ پر "بحثنے" کا اتفاق ہوا ہے کہ کوئی نامعقول شاعر نہیں ہو سکتا جس شخص میں شریفوں کے اطوار نہ ہوں اس میں فنون شریفہ کے آثار کیسے مل سکتے ہیں۔ مرحوم اصغر گونڈوی اور سید سجاد حیدر میرے پیش نظر ہیں۔ ان کی دل آویز شاعری اور انشا پردازی تمام تر ان کی دل آویز شخصیت کی آئینہ دار ہے۔ میرے نزدیک فن کی قدریں اور انسان کی قدریں یکساں ہیں۔ ایسا کوئی فن نہیں جو انسان سے اونچا اور اس سے علیحدہ ہو۔

"یلدرم مرحوم علی گڈھ کے ساختہ پرداختہ تھے اور علی گڈھ کے اس زمانے کے طالب علم تھے جب زندگی خوش باشی نہ تھی تو کچھ نہ تھی۔ نہ اب جب زندگی سوائے خوش باشی سب کچھ ہے۔ میں نے ان کی طالب علمی نہ دیکھی لیکن علی گڈھ کا وہ زمانہ دیکھا ہے جب ع

بزم کو برہم ہوئے مدت نہ گذری تھی بہت

جب سے اب تک زمانے کے رویئے اور روانی میں بہت کچھ فرق آ گیا ہے۔ کیا کچھ فرق تھا۔ جن قدروں پر جب مرنے والے لاکھوں تھے اب ان پر روتے والا کوئی نہیں۔ لیکن سجاد حیدر کی حیثیت شمار گانہ تھی۔ ان میں شروع سے آخر تک بہت کم تبدیلی ہوئی۔ یہ ان کی سیرت کا، شخصیت کا بہت اہم اور جہتم بالشان پہلو ہے۔ انہوں نے روزگار کی بہت سی کروٹیں دیکھیں اور ایسی کروٹیں جو معمولی اشخاص کو زیر و زبر کر سکتی تھیں۔ لیکن یلدرم نے فن کا دیا اعتماد و امید افزی تھی کہ ان کو بدلنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔

"مسلم یونیورسٹی کے ابتدائی عہد میں سجاد حیدر اس کے رجسٹرار رہے۔ انہوں نے مہاراجہ صاحب محمود آباد کے صاحبزادے

آفتاب احمد خان، نواب سر مزمل اللہ خان، ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد سب کے ساتھ کام کیا۔ ان میں سے ہر ایک کا وطیرہ جداگانہ تھا۔ اور ان سب سے جدا سجاد حیدر کا تھا۔ انہوں نے کام سب کے ساتھ کیا۔ سازش کسی سے نہ کی۔ میرے نزدیک یہی ایک بات ان کی شرافت نفس اور سیرت کی پختگی کی بڑی محکم دلیل ہے۔

سجاد حیدر [illegible] بھی رہے اور ان کا نام یونیورسٹی میں بھی [illegible] رہے گا۔ [illegible] بھی دیدنی ہے کہ وہ کالا پانی تو گئے لیکن [illegible] گناہ کی پاداش میں نہیں جس کے بغیر کالا پانی کے تصور میں نہ کمی آتی ہے نہ رونق۔ اور یونیورسٹی آئے تو ایسے منصب پر جسے دنیا بعد کی [illegible] سے [illegible] سکتا ہے۔ الا [illegible] سے۔

[illegible] یونیورسٹی میں [illegible] دونوں بہت [illegible] کے لئے شیدا ہو چکے ہیں۔ مولانا حسن مارہروی اور سجاد حیدر [illegible] ترکی اور ترکی ادب سے سجاد حیدر کو عشق تھا۔ میں ترکی سے واقف نہیں ہوں لیکن ترکی ادب سے آشنا مختلف اصحاب سے ترکی کے اردو ترجمے دیکھے ہیں۔ سجاد حیدر اور دوسروں [illegible] ان کا فرق ہے۔ میں نے ایک بار سید صاحب سے پوچھا کہ ترکی ادب پر [illegible] آپ کی [illegible] کا بھی کچھ دخل ہے۔ ایک دفعہ [illegible] ہو گئے۔ آنکھوں میں روشنی پیدا ہو گئی اور چہرہ تمتما اٹھا۔ کہنے لگے جناب —— ترکی زبان جانتے ہیں [illegible] کی زبان سے [illegible] آپ کی [illegible] میں نے بات کاٹ کر کہا [illegible] کہ [illegible] تو یقیناً نہیں ہے۔ آپ کی تو [illegible] نہیں ہے [illegible] اور [illegible] ترکی ترکوں ہی کی زبان ہے اور [illegible] ہو سکتی ہے [illegible] ترکوں کی زبان [illegible] غلام [illegible] غلام رکھا۔

[illegible] آباؤں کی زبان [illegible] سید صاحب [illegible] طاری ہو سکی [illegible] وہ [illegible] کے [illegible] میرے [illegible] کا مشہور ڈرامہ جلال الدین خوارزم شاہ [illegible] سید صاحب سے [illegible] شروع [illegible] سید صاحب قلم کا [illegible] لکھنے بیٹھ گئے [illegible] سید صاحب ترجمہ بولتے جاتے [illegible] [illegible] لکھتے جاتے ہیں۔

[illegible] ان کا قلم [illegible]

[illegible]

[illegible] سجاد حیدر [illegible] دونوں [illegible] شاعر [illegible] قبول [illegible] تمام عمر [illegible] ایک [illegible] [illegible] اس سلسلے میں ایک لطیفہ [illegible] [illegible] سارے لطائف کا مذاق [illegible] [illegible] ان سے کوئی بیس بائیس قدم پیچھے آ رہا تھا۔ اس کی [illegible] [illegible] چلنے کا خاص انداز تھا۔ خود ہلکے پھلکے تھے۔ رفتار اس سے بھی زیادہ ہلکی پھلکی۔ [illegible] چھوٹے چھوٹے [illegible] دس بارہ قدم [illegible] ذرا ذرا رک کر چلتے [illegible] ایک بے تکلف دوست نے ایک فقرہ [illegible] سجاد [illegible] گوشہ [illegible] چلتے چلتے ٹھٹک جاتا ہے۔ سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھتا ہے

اور پھر چل دیتا ہے۔" اس فقرے سے بہت محظوظ ہوئے۔ کہنے لگے: "سانپوں میں رہ کر صرف سانپوں کی چال آئی" اس کی تعریف نہ کر دو گے! اسی انداز سے چپکے بار ہے تھے کہ یکا یک ایک لفافہ سرک کر زمین پر آ رہا۔ سجاد صاحب کو مطلق خبر نہ ہوئی۔ میں نے اٹھا لیا۔ کچھ ہی دور آگے بڑھے تھے کہ دوسرا لفافہ گرا۔ وہ بھی میں نے اٹھا لیا۔ باب العلم کے قریب پہنچ کر تیسرے لفافے نے مفارقت کی، وہ بھی میں نے قبضے میں کیا۔ سجاد صاحب برابر رسالے کے خط لیے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ سید صاحب کے پیچھے میں بھی یونیورسٹی آفس پہنچا۔ آفس پہنچ کر موصوف سٹ پٹائے ہوئے۔ لفافے متعلقہ لوگوں کے حوالے کئے معلوم ہوا تین لفافے کم ہیں۔ جو کہ بہت ضروری اور مخصوص تھے۔ سخت متفکر رہے۔ میں نے تینوں لفافے کچھ وقفے سے واپس کئے سید صاحب فرمانے لگے کہ آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ فوراً کیوں نہ دے دئے۔ اس وقت مجھ پر کیا گذر گئی۔ میں نے کہا آپ مطالعے میں منہمک تھے میں نے مخل ہونا مناسب نہ سمجھا۔

"میرا یہ کہنا تھا کہ سب کچھ بھول گئے۔ فرمایا خوب یاد دلایا۔ یہ ملاحظہ فرمائیے" "ایرانشہر" ہے۔ آپ نے کتنا ستھرا چھپا ہے اور کیسے اچھے اچھے مضامین و نظمیں ہیں۔ ایرانی وطن پرستوں نے اسے برلن سے شائع کیا ہے۔ کاش اُردو میں ایسا پاکیزہ اور دیدہ زیب ٹائپ رواں پاتے۔ اور جناب بات تو یہ ہے کہ جب تک آپ بت شکنی سے رشتہ توڑیں گے اردو کی اشاعت محدود رہے گی۔ میں نے کہا سید صاحب بت شکنی کا تو ہمارے شعر و ادب میں ایک دور رہا ہے بتِ آشنی میں بڑا کمال ہے۔ بقول شخصے ع

حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا

کسی قدر تیز ہو کر فرمایا: "یہی تو مصیبت ہے۔ آپ سب کا اب یہی کام رہ گیا ہے کہ پھبتی کسی، قول میں پھبتیں ملا دیتے ہیں۔ اکبر نے ٹائپ کی خواہ مخواہ مٹی پلید کر دی۔" میں نے عرض کیا: "سید صاحب، اکبر نے تو کہا، نفس نہیں مانا، عمر بھر میں چنگاری لگا دی تب ہنسے۔ پھر فرمایا۔ اور جب بھی تو کچھ زور نہیں لگاتے ہیں۔

"سجاد حیدر بڑے پاکیزہ اور معصوم سرشت انسان تھے۔ ان کو توڑ جوڑ بالکل نہ آتا تھا۔ وہ اپنے آپ پر کبھی فخر کرتے نہیں سنے گئے۔ دوسروں پر بڑی فیاضی سے اکثر فخر کرتے پائے گئے۔ سید صاحب کو میں نے شاید کبھی "تم" کے لفظ سے کسی کو مخاطب کرتے سنا ہو۔ انھوں نے اپنے منصب اور اپنی غیر معمولی مقبولیت کو کبھی ذاتی رفعت اور منفعت کا وسیلہ نہیں بنایا۔ ان کو میں نے برہمی میں آپے سے باہر نہیں پایا۔ نہ ان کے منہ سے ایسے الفاظ سنے جو مذاقِ سلیم پر بار ہو یلدرم جیسے کڑھے ہوئے آدمی بہت کم دیکھے گئے ہیں۔ وہ تمام آداب ان میں رچے ہوئے تھے جو ثقافت کی جان و جواز ہیں۔ ان آداب کو وہ اس لطف اور آسانی سے برتتے تھے جیسے ایک تندرست سانس لیتا ہے یا ایک حسین اپنے حسن کا حامل ہوتا ہے۔ بغیر کسی ارادے یا تکلف کے۔ یلدرم میں رسمی تکلف بالکل نہ تھا۔ ان کی بے تکلفی میں دوستانہ اور شریفانہ شان پائی جاتی تھی۔ وہ اسی حد تک تکلف کرتے تھے جس حد تک شرافت اور سلیقہ کا اقتضا ہوتا تھا۔ اور بے تکلف بھی اسی حد تک ہوتے تھے جس حد تک بے تکلفی حسنِ معاشرت کا جزوِ اعظم سمجھی جاتی ہے۔

"شعر و ادب کا ان کو ذوق محض فطری نہ تھا بلکہ وہ شعر و ادب کے رنگ و رفتار پر حکیمانہ نظر بھی رکھتے تھے

۱؎ لیتھو کی چھپائی

اور اچھی اور بے تکلف انگریزی لکھتے تھے۔ یہ بات ان کے عہد کے ہندوستانیوں میں بہت کم ملتی ہے۔ سید سجاد حیدر ان لکھنے والوں میں تھے جن کا قائل نہ ہونا کم سواد ہونے کی دلیل ہے۔ کم لوگ ایسے دیکھے گئے ہیں جن کی تحریر اور شخصیت میں اس درجہ تک یک رنگی اور توازن ہو —— "

اس اقتباس کے بعد میں مضمون ختم کرتی ہوں۔ یلدرم نے ۱۱ اپریل ۴۳ء کو رات کے دو بجے دفعتاً حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال کیا اس وقت وہ بالکل تندرست تھے اور کچھ عرصہ قبل ہی افغانستان میں چند ماہ گذار کر آئے تھے۔

اور اس وقت ان کی یہ تمنا بھی پوری ہو گئی کہ ان کی انت سمے کی بیماری یا طویل علالت سے دوسروں کو پریشانی یا تکلیف نہ ہو۔ یلدرم لکھنؤ کے عیش باغ کے قبرستان میں سپردِ خاک کئے گئے۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کئے

———

مولوی عنایت اللہ دہلوی

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

بڑھاپے میں بھی سرخ و سفید رنگ ۔ بلند قامت کشادہ پیشانی ۔ بارعب چہرہ مضبوط ہاتھ پاؤں ۔ بھرا بھرا بدن ۔ مونچھیں موجود ۔ داڑھی غائب ۔ نہایت جامہ زیب ۔ سر پر ترکی ٹوپی بدن پر حیدر آبادی شیروانی ۔ فراخ دل ۔ نرم مزاج خاموش طبع نہایت ملنسار ۔ بےحد متواضع ۔ بہت خوش اخلاق ۔ درجہ صفائی پسند ۔ بظاہر بہت بھولے بھالے، بباطن نہایت ہوشیار ۔ آواز میں نرمی ۔ بول چال میں معصومیت ۔ سازشوں سے دور مکر و فریب سے ناآشنا جوڑ توڑ سے ناواقف نہایت درجہ متین اور سنجیدہ ۔ یہ تھے مولوی عنایت اللہ نامور باپ کے قابل فرزند۔

آپ والدہ کی جانب سے سید اور والد کی طرف سے شیخ صدیقی ہیں۔

دہلی کے محلہ قاضی واڑہ میں مولوی عنایت اللہ ۱۸ نومبر ۱۸۶۹ء کو پیدا ہوئے اور دیرہ دون میں ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۳ء کو وفات پائی ۔ جوانی میں عروس ادب سے شادی کی اور ساری عمر اسی کی ناز برداری میں گذار دی ۔ اس لئے پیچھے نہ بیوی چھوڑی نہ بچے ۔ البتہ عروس ادب سے ساٹھ کے قریب اولادیں ہوئیں۔

والد شمس العلماء خان بہادر مولانا ذکاء اللہ میور سنٹرل کالج میں ریاضی کے پروفیسر تھے ۔ دہلی میں ابتدائی تعلیم کے بعد ۹ برس کی عمر میں وہ ان کو اپنے ساتھ الٰہ آباد لے گئے ۔ جہاں یہ مختلف استادوں سے پرائیویٹ طور پر علوم متداولہ کی تعلیم پاتے تھے ۔ اس وقت کا ایک لطیفہ انہوں نے بڑے مزے سے مجھے سنایا ۔ فرمانے لگے کہ " ایک مرتبہ سرسید بمبئی سے علیگڈھ جاتے ہوئے الہ آباد ٹھہرے اور والد صاحب کے پاس قیام کیا ۔ میں کھڑا ہوا تھا کہنے لگے عنایت اللہ! تم آجکل کیا پڑھتے ہو؟ میں نے اور کتابوں کے علاوہ سکندر نامہ کا بھی نام لیا ۔ سرسید نے کہا " اچھا ہم ایک مصرعہ پڑھتے ہیں اس کا مطلب بتاؤ " میں نے عرض کیا " فرمائیے " سید صاحب

سے نے مصرعہ پڑھا ع "تو فخر خراس وفا ساقط از د" میں نے فوراً معنی کہے "تو خراسان کا فخر او راس میں سے ف نکال دی ہے" سید صاحب نے کہا "کس میں سے نکال دی ہے؟" میں نے کہا "فخر میں سے" کہنے لگے "پھر کیا رہا؟" میں نے جلدی سے جواب دیا "خر" اس پر سید صاحب نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا جب وہ ہنسے تو میں اس لطیفے کو سمجھا۔ معنی بتانے کے وقت مجھے مطلق خیال نہ رہا کہ میں گدھا بنا جا رہا ہوں۔"

۱۸۸۰ء میں انہوں نے مڈل کا پرائیویٹ امتحان دیا مگر فارسی میں فیل ہو گئے۔ فارسی کے ممتحن ایک صاحب شمس العلماء مولوی سید امجد علی ایم اے تھے مدت کے بعد جب عنایت اللہ علی گڑھ کالج میں داخل ہوئے تو اتفاقاً مولوی سید امجد علی وہاں پروفیسر مقرر ہو کر آ گئے۔ عنایت اللہ نے ان سے شکایت کی کہ بچپن میں آپ نے مجھے فیل کر دیا تھا۔ مولوی سید امجد علی یہ سن کر بہت ہنسے اور کہنے لگے "اوہو! بڑا افسوس ہوا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ تم ہو۔ ورنہ ضرور پاس کر دیتا۔"

جنوری ۱۸۸۱ء میں والد نے عنایت اللہ کو علی گڑھ تعلیم کے لئے بھیج دیا۔ چونکہ مولانا ذکاء اللہ اور سر سید میں بڑی گہری دوستی تھی۔ اس لئے عنایت اللہ کو انہوں نے اپنے دفتر کے قریب ہی ایک کمرہ رہنے کے لئے دے دیا تاکہ وہ وہاں ہر وقت ان کی ذاتی نگرانی میں رہیں۔

چونکہ عنایت اللہ شروع سے نہایت مؤدب، سعادتمند، صالح، شائستہ، خوش سلیقہ، نیک طینت اور اطاعت شعار تھے۔ اس لئے جلد ہی سر سید کو ان سے محبت ہو گئی اور وہ ان کو اپنے بیٹوں کی طرح چاہنے لگے۔ سید کی یہ محبت عنایت اللہ سے عمر اور وقت کے ساتھ برابر بڑھتی رہی۔ اس میں کبھی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔

سر سید کی یہ محبت بعض اوقات عنایت اللہ کے لئے وبال جان ہو جاتی۔ ہوتا یوں تھا کہ جب کبھی بدقسمتی سے عنایت اللہ بیمار ہو جاتے تو بس ان کی کمبختی آ جاتی۔ فوراً سید صاحب ان کو اپنی کوٹھی پر بلوا لیتے اور وہاں ان سے اتنا سخت پرہیز کرواتے جس کی انتہا نہیں۔ مولوی صاحب سناتے تھے کہ "ایک مرتبہ اسی طرح سید صاحب نے مجھے اپنی کوٹھی پر بلوایا اور خانساماں کو حکم دیا کہ عنایت اللہ کو ایک چوزہ کا شوربا اور تین پتلی پتلی چپاتیاں روزانہ ایک وقت دیا کرو۔ اور خبردار جو کوئی اور چیز اس کو کھانے کو دی۔ چوزہ بھی سے حاشیہ میں مرغی کے بہت چھوٹے سے بچے کو کہتے ہیں جس کے گوشت کے تین چار لقمے بھی شاید مشکل سے ہوں۔ بس صاحب! ہمارا تو یہ سنتے ہی خون خشک ہو گیا کہ آئی آفت۔ مگر قہر درویش برجان درویش۔ کیا مجال تھی جو سید صاحب کے سامنے کچھ بول سکتے۔ شوربا تیار ہو کر سید صاحب کے پاس جایا کرتا اور جب وہ اسے چکھ کر پاس کر دیتے۔ اس وقت ہمیں ملا کرتا تھا۔ تین چھوٹی چھوٹی اور پتلی پتلی چپاتیوں بلکہ پھلکوں سے بیمار تو کیا کسی چھوٹے بچے کا بھی پیٹ نہ بھر سکتا تھا۔ مارے بھوک کے برا حال ہوتا۔ مگر خانساماں کم بخت روٹی کا ایک ٹکڑا بھی زائد نہ دیتا۔ ایک نہ دو پورے پندرہ دن یعنی تیس وقت اسی کرب و بلا کی حالت میں گذر گئے۔ مگر سید صاحب کا دل نہ پسیجا۔ نہ انہوں نے اپنی کوٹھی پر سے ہمیں جانے دیا اور نہ ایک چوزہ اور تین چپاتیوں سے زائد ہمیں کھانا ملا۔ غرض جب بھوک سے برا حال ہوا تو ایک دن ہم نے بڑی جرأت کر کے اور جان پر کھیل کر مگر ڈرتے ڈرتے سید صاحب سے کہہ ہی دیا کہ "جناب اب تو میں بالکل اچھا ہوں۔ اگر اجازت ہو تو اپنے کمرے میں واپس چلا جاؤں" ہماری اس نہایت عاجزانہ التجا کا سید صاحب پر خاک بھی اثر نہ ہوا اور انہوں نے بڑی بے پروائی سے جواب دیا کہ "اچھا ابھی تین دن اور ٹھہرو۔ پھر چلے جانا" اگر کسی بے گناہ ملزم کو تین سال قید بامشقت کا حکم دیا جائے تو شاید اسے اتنا صدمہ نہ ہو جیسے ہمیں سید صاحب کی زبان سے تین دن کی مزید سزا کا حکم سن کر ہوا۔ یا الٰہی تیری پناہ! تین دن تک اور تین چپاتیاں کھانی قسمت میں لکھی ہیں۔ کچھ نہ پوچھئے کہ یہ تین دن کس مصیبت اور تواتر سے گذرے۔ بارے خدا خدا کر کے اٹھارہ دن بعد اپنے کمرے میں آئے اور اس بات کا عہد کیا کہ آئندہ کبھی ہرگز ہرگز بیمار نہیں پڑیں گے اور اگر پڑ بھی گئے تو ہرگز سید صاحب کو خبر نہیں ہونے دیں گے۔ یہ تو پرہیز کرا کے ہمیں ایک دن مرحوم کر کے رکھ دیں گے۔"

کالج میں مولوی عنایت اللہ نے جن فاضل اساتذہ سے پڑھا ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔ مسٹر تھیوڈور بک پرنسپل مدرسۃ العلوم، مسٹر آرنلڈ (مولف پریچنگ آف اسلام)، مسٹر والٹر ریلے، ہیرلڈ کاکس، مسٹر والس، مسٹر جادو چندر چکرورتی، شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی، شمس العلماء مولوی

سید عباس حسین، شمس العلما سید امجد علی۔ ان کے علاوہ جسٹس سید محمود سے انگریزی کی کچھ نظمیں پڑھیں اور جسٹس سر محمد رفیق سے فلسفہ اور نفسیات پر کچھ لیکچر سنے۔

فاضل باپ کی تربیت، قابل اساتذہ کی تعلیم اور بانی مدرسۃ العلوم کی کڑی نگرانی ہی میں مولوی عنایت اللہ نے جو قابلیت اور لیاقت پیدا کی اس نے ان کو چوٹی کا ادیب، بہترین مصنف اور اردو زبان کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ کامیاب مترجم بنا دیا۔ بعد کے زمانہ میں جو محققانہ کتابیں اور بے نظیر تراجم مولوی صاحب نے لکھے، وہ سب لائق باپ کا ورثہ، قابل فخر استادوں کی تعلیم کے اثر اور سر سید مرحوم کی نگرانی کا نتیجہ تھا۔ زمانہ طالب علمی ہی میں ان کی اعلیٰ قابلیت کے جوہر کھلنے لگے تھے۔ اور بی۔ اے پاس کرنے کے بعد تو ان کی علمی قابلیت اور ادبی لیاقت کا اعتراف بارہا سر سید نے کیا۔ سر سید کی دوربین نگاہیں مولوی عنایت اللہ کو ایک نہایت جوہر قابل دیکھ رہی تھیں جو کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ اسی لئے سر سید کو ان سے بے انتہا محبت اور بے حد تعلق تھا۔ اسی دلی لگاؤ کے باعث سر سید ہر وقت ان کی ترقی و بہبودی اور اس سے بھی زیادہ ان کی صحت و تندرستی کی فکر میں رہا کرتے تھے۔

مختلف اوقات میں اپنی وفات تک جس قدر خطوط سر سید نے مولوی عنایت اللہ کو لکھے، وہ سب مولوی صاحب نے نہایت احتیاط سے جمع کر کے ایک بہت ہی خوبصورت اور خوشنما جلد میں ان کو مجلد کرا لیا تھا۔ چمڑے کی جلد پر نہایت نفیس سونے کا کام بنوایا تھا اور اس جلد کو نہایت حفاظت کے ساتھ ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ انتقال سے چند دن پہلے نہ معلوم کیا خیال آیا کہ وہ جلد بیمہ کے ذریعہ ڈیرہ دون سے مجھے بھیج دی اور لکھ دیا کہ اب تک میں نے اس تبرک کی حفاظت کی۔ اب تم کرو۔ اگر موقع لگے تو ان خطوط کے فوٹو لے کر ان کو شائع کر دینا۔ ورنہ اپنی اولاد کو اس کے متعلق وصیت کر جانا۔ اب ان نادر روزگار خطوط میں سے بعض خطوط کی نقلیں ناظرین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں جن سے اس حقیقی محبت اور الفت کا آپ کو کچھ اندازہ ہو گا جو مولوی عنایت اللہ سے سر سید کو تھی اور یہ بھی معلوم ہو گا کہ سر سید مولوی صاحب کی قابلیت اور لیاقت کے اور ان کے تصنیفی کام کے کس قدر قدر دان اور معترف تھے۔

(۱) خط مورخہ ۲۲ مارچ ۱۸۹۲ء

عزیزی عنایت اللہ!

تمہارا خط پہنچا۔ تمہاری صحت سے نہایت خوشی اور طمانیت ہوئی۔ تمہاری علالت سے مجھ کو نہایت رنج تھا۔ اپنی والدہ صاحبہ سے میرا بہت بہت سلام کہنا اور یہ پیغام پہنچا دینا کہ بلاشبہ ماں سے زیادہ کسی کو عنایت اللہ سے محبت نہیں ہو سکتی۔ مگر مجھ کو بھی عنایت اللہ سے کچھ کم محبت نہیں ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ تم کو صرف محبت ہی محبت ہے اور میری محبت میں کچھ عقل کا بھی میل ہے۔ تمہاری محبت خالص ہے۔ میری محبت میں ملاوٹ بھی ہے۔ بہرحال خدا تم کو صحیح و تندرست رکھے۔ والسلام

(۲) خط مورخہ ۲۶ اپریل ۱۸۹۲ء

عزیزی محمد عنایت اللہ

تم کو کچھ یہ بھی خیال ہے کہ تمہاری صحت کا کسی اور کو بھی خیال و فکر رہتا ہے یا نہیں؟ غدر کے بعد سے دلی کے رہنے والوں کی قلب ماہیت ہو گئی ہے اور بے مروتی چھا گئی ہے۔ تم بھی سب سے اول درجے کے بے مروت ہو گئے۔ یہ تو مجھے یقین ہے مگر تمہاری صحت کا ہمیشہ خیال رہتا ہے۔ اپنی صحت سے مطلع کرو۔

(۳) خط مورخہ ۱۶ مئی ۱۸۹۲ء

بنام شمس العلما مولانا ذکاء اللہ

...... تم سے میں اس لئے ناراض ہوا کہ باوجود اس قدر بیماری کے جو دہلی میں ہوئی آپ نے اور آپ کی خدا رسیدہ بیوی صاحبہ نے عنایت اللہ کو دہلی رہنے دیا۔ متعدد دفعہ میں نے ارادہ کیا کہ آپ کو لکھوں کہ عنایت اللہ کو دہلی سے بھیج دو۔ پھر معلوم نہیں کیا کیا اوہام اور خیالات نے گھیرا کہ خط لکھا لکھایا چاک کر دیا۔ اور دل کو اس بات سے تقویت دی کہ خدا پر توکل کرو۔ خدا کا شکر ہے کہ خیر و عافیت سے وہ سخت زمانہ گزر گیا مجھ کو تو دن رات تردد رہتا تھا۔"

(۴) اقتباس خط مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۸۹۲ء

.... اگر کالج کے لڑکے ایسے ہوں جیسے تم ہو تو کون شبہ کر سکتا ہے کہ (علیگڑھ) کالج کو اس سے فخر و اعزاز نہ ہوگا۔

(۵) اقتباس خط مورخہ ۲۵ جنوری ۱۸۹۳ء

.... رسالہ مرسلہ پہنچا میں نے اس کو اول سے آخر تک پڑھا جس خوبی اور عمدگی سے تم نے اسے لکھا ہے وہ محتاج تعریف نہیں۔ میرا دل نہایت خوش ہوا کہ خدا نے تم کو تابعین کی بھی اس قدر لیاقت دی ہے جس پر میں اور تمہاری ماں اور باپ دونوں رشک کرنے پر آمادہ ہیں ....

(یہ فقرات سوانح عمری ابوریحان بیرونی کے متعلق ہیں جو مولوی عنایت اللہ نے لکھی تھی)

(۶) مشہور انگریز مصنف ایمرسن کے مضمون "مکافات" کے ترجمے کے متعلق ۱۴ جون ۱۸۹۵ء کا خط

"نہایت عمدہ مضمون اور نہایت عمدہ اور بے مثل ترجمہ پہنچا۔ بجنسہ و تمامہ تہذیب میں چھاپا جاوے گا۔ تمہارا نہایت دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں

(۷) اسی مضمون کے متعلق سرسید مولانا ذکاء اللہ کو ۹ جولائی ۱۸۹۵ء کے خط میں لکھتے ہیں۔

.... آپ کے تہذیب الاخلاق میں عزیزی عنایت اللہ کا ایک مضمون انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا ہوا چھپا ہے۔ آپ انصاف سے اس کو پڑھیے گا۔ آپ کی تمام عمر ترجمہ کرنے میں گزر گئی۔ کیا آپ بھی ایسا عمدہ ترجمہ کر سکتے ہیں؟ اگر کسی ایسے مطول اور مشکل مضمون کا اردو میں ایسا ترجمہ کر دو تو جو کچھ کہو آپ کی نذر کروں

(۸) خط مورخہ ۲ فروری ۱۸۹۶ء

"......... میں یقین کرتا ہوں کہ تم مجھ سے زیادہ عمدہ اردو لکھتے ہو۔ تم دہلی کے رہنے والے ہو اور میں علی گڑھ کا رہنے والا۔ اور دلی چھوڑے ہوئے مجھے دو جگ سے زیادہ ہو گئے۔

(۹) پروفیسر آرنلڈ کی مشہور عالم کتاب "پریچنگ آف اسلام" کے ترجمہ کے متعلق خط مورخہ ۱۵ فروری ۱۸۹۸ء

"تمہارے مرسلہ ترجمہ کو میں نے دو دفعہ پڑھا اور نہایت ہی دل خوش ہوا۔ اگر تمہارے والد ماجد نے بھی یہ ترجمہ دیکھا ہے تو وہ بھی خوش ہوئے ہوں گے۔ مگر تم کو یقین ہو گا کہ تمہاری لیاقت اور سعادت مندی سے میں تمہارے والد ماجد سے بھی زیادہ خوش ہونے والا ہوں .... تم نے ایسا کام کیا ہے جس کی نظیر آج تک اردو لٹریچر میں نہیں مل سکتی ...."

بی اے ہونے کے بعد سرسید نے مولوی عنایت اللہ کو کالج کی لائبریری کا لائبریرین بنا دیا۔ کچھ دنوں انہوں نے طلبا کالج کو ریاضی کا بھی درس دیا۔ ایک سال تک تہذیب الاخلاق کی اڈیٹری بھی کی اور جب ۱۸۹۶ء میں علی گڑھ کا ہیڈ کلرک شام بہاری لال ایک لاکھ پانچ ہزار چار سو نوے روپے غبن کر کے جیل میں کچھ کھا کر مر رہا تو دفتر کی دوبارہ ترتیب اور حساب کی جانچ پڑتال بھی مولوی عنایت اللہ کے سپرد ہوئی جسے انہوں نے نہایت خوش اسلوبی اور احتیاط کے ساتھ انجام دیا

ایک لاکھ روپے سے زیادہ کا غبن اس شخص کے لیے جس نے ایک ایک کوڑی بھیک مانگ کر جمع کی ہو، کچھ تھوڑا صدمہ نہ تھا۔ یہی غم سرسید کو لے بیٹھا اور اسی غم میں گھل گھل کر آخر انہوں نے ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ سرسید کے انتقال سے مولوی عنایت اللہ دنیا میں اپنے سب سے بڑے شفیق اور ہمدرد سے محروم ہو گئے جس کا صدمہ ان کو آخر عمر تک رہا۔ بڑھاپے میں بھی جب کبھی سرسید کا نام لیتے تو ان کے سینے سے ایک آہ نکلتی تھی۔

سرسید کے انتقال کے بعد ۱۹۰۱ء میں آپ سشن جج جونپور کے چیف سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے اور چودہ سال تک یہ ملازمت کی مگر تصنیف و تالیف کا جو چسکا سرسید لگا گئے تھے وہ دوران ملازمت میں برابر جاری رہا۔ فن جغرافیہ کی بے مثل اور لاثانی کتاب "اندلس کا تاریخی جغرافیہ" اسی عہد کی یادگار ہے

۱۹۱۵ء میں آپ سکرٹری فینانس مقرر ہو کر ریاست گوالیار تشریف لے گئے۔ وہاں کا ایک لطیفہ انہوں نے ایک دفعہ مجھے بڑے مزے سے سنایا تھا۔ فرمانے لگے کہ میں نے ایک روز ہیڈ کلرک سے کہا کہ فلاں فائل جو فلاں دفتر میں گئی ہوئی ہے منگوا لو۔ دو چار دن کے بعد میں نے پوچھا کہ فائل آگئی۔ تو کلرک نے زبان سے تو کچھ

نہ کہا مگر اپنا سر ہلا دیا۔ جیسے ہم انکار کے موقعہ پر ہلایا کرتے ہیں۔ میں نے کہا "بھئی جلدی منگوالو۔ اس کی ضرورت ہے۔" چار پانچ دن کے بعد میں نے پھر پوچھا تو پھر اس نے سر ہلا دیا۔ اس پر میں نے بہت زور سے کہا کہ "بہت جلد منگوالو" کلرک خاموش ہو کر چلا گیا اور زبان سے کچھ نہ کہا۔ کچھ دن انتظار کے بعد میں نے دریافت کیا تو بدستور سابق اس نے سر ہلا دیا۔ اب تو مجھے غصہ آگیا۔ اور میں نے کہا کہ "کتنے دنوں سے تاکید کر رہا ہوں لیکن تم نے اب تک نہیں منگوائی آخر وجہ کیا ہے؟" اس پر کلرک بولا کہ "جناب وہ تو میں نے اسی وقت منگوالی تھی جب آپ نے فرمایا تھا۔" میں نے تعجب سے پوچھا کہ "پھر تم میرے اتنی مرتبہ پوچھنے کے باوجود کیوں سر ہلاتے رہے؟" کلرک کہنے لگا "جناب میں تو سر کے اشارہ سے برابر آپ کو بتا رہا کہ فائل آگئی ہے" میں نے کہا "عقل مند آدمی! تم تو ہر بار سر کو ہلا کر انکار کرتے رہے۔" کہنے لگا۔ "نہیں حضور! میں تو برابر عرض کر رہا ہوں کہ فائل آگئی ہے۔ ہمارے ہاں اقرار یہاں اسی طرح سر ہلایا کرتے ہیں۔" میں نے بہت ہی حیران ہو کر پوچھا کہ "اچھا اگر فائل نہ آئی ہوتی تو تم سر کے اشارے سے کس طرح انکار کا جواب دیتے؟" اس نے جواب میں اس طرح سر ہلایا جس طرح ہم کسی چیز یا بات سے ہو جانے پر سر ہلاتے ہیں۔ میں نے جل کر کہا کہ تمہارے ہاں کا سارا کارخانہ اوندھا ہے خواہ مخواہ مجھے اتنا پریشان کیا۔ اس کے بعد میں نے حکم لکھ کر نوٹس بورڈ پر لگوا دیا کہ آئندہ کوئی کلرک کسی بات کے پوچھنے پر اشاروں سے جواب نہ دے بلکہ جس کو جو کچھ کہنا ہو یا تو منہ سے بول کر کہے یا لکھ کر دے۔"

جب دکن میں عثمانیہ یونیورسٹی کی بنیاد پڑی اور دارالترجمہ قائم ہوا تو سر راس مسعود ڈائرکٹر تعلیمات کو سارے ہندوستان میں مولوی عنایت اللہ سے زیادہ قابل اور لائق اس کی نظامت کے لئے اور کوئی شخص نہ ملا انہوں نے گویا یار مولوی عنایت اللہ کو لکھا۔ کام ان کی دلچسپی کا اور عین ان کی مرضی کے مطابق تھا۔ پھر ان کے محسن و مربی کا تقاضا ان کو بلا رہا تھا کیسے نہ جاتے۔ چنانچہ حیدرآباد پہنچ کر ۱۰ جنوری ۱۹۲۱ء کو انہوں نے نظامت دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی کا چارج لے لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ انتخاب نہایت درجہ صحیح ہوا۔ پشاور سے لے کر کوہاٹ اور بمبئی سے لے کر رنگون تک مولوی صاحب سے زیادہ موزوں اور مناسب شخص اس کام کے لئے ملنا محال تھا۔ اس تقرری سے مولوی صاحب کو نہیں بلکہ کرسئ نظامت کو شرف حاصل ہوا جس خوبی و صفائی، دیانت اور قابلیت کے ساتھ مولوی صاحب نے ناظم دارالترجمہ کی حیثیت سے اپنے علاوہ دیگر ذمہ دارانہ فرائض کو انجام دیا۔ وہ صرف انہی کا حصہ تھا۔ تقریباً تین سو کتابیں ان کے زمانۂ نظامت میں دارالترجمہ نے شائع کیں اور اس طرح مختلف علوم و فنون کا نہایت معقول ذخیرہ اردو میں منتقل ہو گیا۔ اب اردو زبان کی اس لاثانی اور بے نظیر خدمت کے لئے دارالترجمہ کے ناظم مولوی عنایت اللہ کا نام بھی اردو ادب کی تاریخ میں آب زر سے لکھا جائیگا اور ہماری آنے والی نسلیں اردو زبان کے اس محسن اعظم پر فخر کریں گی۔

مولوی صاحب چودہ سال اس عہدہ پر فائز رہے اور فروری ۱۹۳۵ء میں وہاں سے فارغ ہو کر اپنے گھر دہلی میں آگئے۔ مگر چونکہ سکون ایک علمی آدمی کے لئے ضروری ہے اور مولوی صاحب کو وطن میں میسر نہ ہوا اس لئے انہوں نے ڈیرہ دون میں ڈیلنسی روڈ پر ایک کوٹھی خرید لی اور اسی کنج تنہائی میں نہایت خاموشی کے ساتھ اپنے محبوب شغل یعنی تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے جو کچھ لکھتے۔ شاہد احمد صاحب ایڈیٹر ساقی دہلی کو یا مجھے بھیج دیتے۔ ان کی آخری عمر کی تمام تصانیف ہم دونوں ہی نے شائع کی ہیں۔

ہر وقت لکھتے رہنے کی مولوی صاحب کو جو عادت ہو گئی تھی۔ بڑھاپے کی کمزوری، عوارض کی کثرت اور بصارت کی کمی کے باوجود اس میں فرق نہ آیا اور مرتے دم تک ان کے ہاتھ میں قلم رہا۔ صبح کے وقت ناشتے کے بعد لکھنے بیٹھے، لکھتے لکھتے تھک گئے تو ذرا سا سستانے کو آرام کرسی پر دراز ہو گئے۔ ملازم سے پوچھا "کھانا تیار ہے؟" اس نے کہا "حضور! ابھی پندرہ منٹ میں تیار ہوا جاتا ہے۔" کھانا تیار ہو گیا تو ملازم نے جا کر کہا کہ "جناب کھانا میز پر لگاؤں؟" مولوی صاحب نے کچھ جواب نہ دیا۔ آدمی بارعب تھے۔ ملازم کو دوبارہ پوچھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ واپس چلا آیا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد جا کر پھر کھانے کی تیاری کی اطلاع دی مگر مولوی صاحب نے اب بھی کوئی جواب نہ دیا اور خاموش لیٹے رہے۔ اس نے کچھ انتظار کے بعد پھر آواز دی جب مولوی صاحب اب بھی نہ بولے تو اسے کچھ شک ہوا بھاگا ہوا ان کے ڈاکٹر کے پاس گیا۔ اس نے آ کر دیکھا تو کہنے لگا کہ "ان میں اب کیا رکھا ہے۔ دفن کی تیاری کرو۔" حقیقت یہ ہے کہ مولوی عنایت اللہ کے انتقال سے دنیا ایک ایسے انشاپرداز اور ایک ایسے مترجم سے خالی ہو گئی جس کا مثیل عرصہ دراز تک پیدا نہ ہو گا۔ کل من علیہا فان و یبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام۔

لیکن سچ پوچھئے تو میرے دل میں ان کی ادبیت اور ان کی انشاپردازی کی اتنی قدر نہیں جتنی ان کی انسانیت کی ہے۔ ان کی شخصیت عجیب و

غریب محاسن کا مجموعہ تھی۔ اور ان ہی محاسن نے مجھے ان کا عاشق بنا دیا تھا۔ میں جب تک زندہ رہونگا انہیں رو رو کر یاد کرتا رہوں گا
کچھ مجھ ہی پر موقوف نہیں۔ جو شخص بھی ایک مرتبہ ان سے مل لیتا تھا وہ ان کے اخلاق کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔

باوجود علم و فضل، شہرت و ناموری اور ایک معزز عہدہ پر فائز ہونے کے غرور اور تمکنت ان کو چھو بھی نہ گیا تھا۔ نہایت سادگی کے ساتھ ہر شخص سے پیش آتے مہمان کی پوری خاطر مدارات کرتے اور اس سے کبھی نہ اکتاتے۔ اپنی بڑائی اور اپنے کارناموں پر فخر کرتے میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔ ہٹ دھرمی اور اپنی بات کی پچ ان میں نہ تھی۔ ان کے مضامین اور ان کی کسی تصنیف پر کوئی شخص اعتراض کرتا تو کبھی ناراض نہ ہوتے بلکہ بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ اسے سنتے اور اعتراض معقول ہوتا تو فراخ دلی کے ساتھ اسے قبول کرنے میں بالکل نہ جھجکتے۔ جب ۱۹۳۰ء میں حضرت خواجہ سجاد حسین صاحب (فرزند مولانا حالی) کے ہمراہ میں حیدرآباد دکن گیا تو وہ پروفیسر براؤن ہارٹ ڈوزی کی (Essai l'Islamisme) کا ترجمہ ختم کر چکے تھے۔ فلسکیپ سائز کی چار ضخیم جلدیں تھیں۔ مجھ سے فرمانے لگے کہ میں نے یہ ترجمہ بڑی مدت میں اور بڑی محنت سے کیا ہے۔ تم ذرا اسے دیکھو تو کیسا ترجمہ ہے۔ میں حضرت خواجہ سجاد حسین صاحب کے ساتھ نواب فخر یار جنگ بہادر فنانشل سیکرٹری ریاست نظام کے ہاں مقیم تھا۔ وہیں یہ چاروں جلدیں اٹھا لایا اور دیکھنی شروع کیں۔ جب چاروں مسودے دیکھ چکا تو لے جا کر ان کو واپس کر دیے اور کہا کہ آپ کے ارشاد کی تعمیل میں میں نے سارا ترجمہ پڑھ لیا۔ کہنے لگے "پھر بتاؤ کیسا ہے"۔ میں نے نہایت بیباکی کے ساتھ عرض کیا کہ "جناب مولوی صاحب! آپ نے یہ ترجمہ بیکار کیا ہے۔ جب یہ چھپے گا تو آپ جیل میں بیٹھے نظر آئیں گے اور ترجمہ ضبط ہوگا۔" گھبرا کر کہنے لگے "کیوں؟" میں نے کہا "مصنف نے کتاب میں جگہ جگہ خدا پر، قرآن پر اور حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرامؓ پر اعتراض کئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کو پڑھ کر مسلمان مشتعل ہوں گے اور آپ پر فوراً مقدمہ قائم ہو جائے گا"

مولوی صاحب فرمانے لگے "ہاں ڈوزی نے اعتراض تو بیشک کئے ہیں اور میں نے ان کو جوں کا توں ترجمہ کر دیا ہے۔ مگر اب کیا کروں! میں نے ترجمہ میں بڑی محنت اٹھائی۔ سالہا سال کی محنت کو کس طرح برباد کر دوں؟"

میں نے عرض کیا کہ "اس کی بہتر صورت یہی ایک تدبیر ہے کہ جہاں جہاں مصنف نے اعتراض کئے ہیں وہاں حاشیہ پر ان کے جوابات مدلل پیرائے میں دے دئے جائیں۔ تو پھر کتاب کے وہ حصے قابل اعتراض نہیں رہیں گے۔"

مولوی صاحب اس پر فرمانے لگے کہ "یہ میرے بس کا نہیں۔ تم نے اعتراض کیا ہے تو تم ہی ڈوزی کے اعتراضات کے جوابات لکھو اور سارے مسودے کو اپنے ساتھ پانی پت لے جاؤ۔"

میں تعمیل ارشاد میں مسودہ اپنے ہمراہ لے آیا اور اپنی لیاقت اور واقفیت کے مطابق تمام اعتراضات کے جوابات شامل کتاب کئے جو نہایت شدید، بیہودہ، اشتعال انگیز اور نیز گندے اعتراض تھے۔ ان کو مسودہ میں سے حذف کر دیا۔ مولوی صاحب نے مسودہ دیکھا تو میری تحریرات کو پسند کیا اور فرمایا کہ "تم نے ان اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ اس لئے اپنے ہی نام سے ان کو شائع بھی کرنا"

حیدرآباد دکن کی فضا میں جوڑ توڑ، سازش اور پارٹی بازی کا نہایت زور تھا۔ مگر مولوی صاحب اس قسم کی باتوں سے ہمیشہ الگ تھلگ رہے۔ ان کا دل ہمیشہ پارٹی بازی سے متنفر رہا اور کبھی بھی انہوں نے اس ناپاک مشغلے میں اپنا پاؤں نہیں پھنسایا۔ بعض اقتدار پسند لوگوں نے خود ان کے خلاف سازشیں اور ریشہ دوانیاں کیں۔ مگر انہوں نے کبھی کوئی جوابی کارروائی نہیں کی۔ لوگوں نے ان کی جھوٹی سچی شکایتیں افسران اعلےٰ سے بارہا کیں اور ان کو ہٹا کر خود ان کی جگہ پر فائز ہونا چاہا مگر انہوں نے نہ کبھی کوئی جوابی کارروائی کی نہ کبھی کسی کی شکایت حکام بالا سے کی۔ اور نہایت خاموشی کے ساتھ اپنے کام میں معروف رہتے۔ غیبت اور دشنام طرازی کی عادت ان میں بالکل نہ تھی۔ گفتگو بہت مہذب اور شائستہ ہوتی تھی۔ غصہ کے وقت بھی میں نے انہیں کسی کو گالی دیتے یا سخت و سست کہتے نہیں سنا۔ غصہ ان کو کبھی شاذ و نادر ہی آتا تھا۔ اور جب آتا تھا۔ تو اسے نہایت تحمل کے ساتھ دبانے کی کوشش کرتے تھے۔ نہایت درجہ بردبار اور متحمل مزاج تھے ڈوزی کا ضخیم ترجمہ چھپوانے کے لئے میرے سپرد کیا۔ میں نے سستی اور کاہلی میں اس کام کو ٹالے رکھا۔ یہاں تک کہ ۹ برس کا طویل زمانہ گذر گیا۔ مگر انہوں نے کبھی سختی

سے تقاضہ نہیں کیا جب لکھا بہت نرمی اور ملائمت سے لکھا۔ تیمور کی سوانح عمری مطبع معارف اعظم گڑھ میں چھپوائی۔ کتاب تیار ہو کر آئی تو اس خط کے ساتھ مجھے بھیجی کہ میں نے علاوہ کتابت طباعت، کاغذ اور جلد بندی کے ایک سو روپے ان کو صرف اس بات کے دیے تھے کہ کاپیاں بہت احتیاط سے دیکھی جائیں اور کتاب میں کوئی غلطی نہ رہنے پائے۔ اب تم دیکھو کہ کتاب میں غلطیاں رہ گئی ہیں یا نہیں؟ میں نے پڑھا تو اس میں بھی کتابت کی غلطیاں رہ گئی تھیں۔ خود ہی غم و غصہ کھا کر بیٹھ رہے مگر مطبع والوں کو کوئی شکایتی خط نہ لکھا۔

مہمان کی بہت زیادہ خاطر مدارات کرتے اور اس کے آرام و آسائش کا نہایت خیال رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ میں زمانہ ملازمت کچھ دنوں کی رخصت سے حیدرآباد سے دہلی آئے تو مجھے لکھا کہ چار پانچ روز کے لئے میرے پاس آ جاؤ۔ میں گیا تو مہرولی [illegible] کی خاموش فضا میں شہری ہنگاموں سے دور ایک وسیع مکان میں فروکش تھے۔ بڑے تپاک سے ملے اور نہایت محبت سے باتیں کرتے رہے۔ ٹھہرنے کے لئے قریب ایک علیحدہ کمرے کا انتظام کیا اور دن بھر پلنگ اور بستر وغیرہ بچھوایا اور رات کا کھانا کھا کر میں سو گیا۔ صبح نہایت سویرے کوئی چار بجے کے قریب میری آنکھ کھلی تو کیا سنتا ہوں کہ مولوی صاحب ملازم کو آواز دے رہے ہیں اور آہستہ سے کہہ رہے ہیں کہ شیخ صاحب سے پوچھ کر آؤ وہ ناشتہ میں انڈے ابلے ہوئے لیں گے یا چائے یا بالائی دودھ: لڑکے نے جواب دیا کہ ابھی تو بہت سویرا ہے۔ ابھی تو وہ اٹھے بھی نہیں ہوں گے۔ جب وہ اٹھ کر باہر آئیں گے تو ان سے پوچھ لوں گا۔ مگر مولوی صاحب نہیں مانے اور بہت زور سے لڑکے کو تاکید کی کہ جا کر پوچھ آئے۔ اور جو کچھ وہ بتائیں تیار کر دے۔ مجبوراً نوکر میرے کمرے میں آیا اور مجھے آوازیں دیں میں جاگ رہا تھا اور سب ماجرا سن رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ میاں ابھی تو میں نے نماز بھی نہیں پڑھی۔ اتنے سویرے ناشتے کی کیا جلدی پڑ گئی ہے۔ سورج کو تو نکلنے دو۔ وہ کہنے لگا کہ میاں اس میں میرا کیا قصور؟ مجھے تو مولوی صاحب نے پوچھنے کو کہا سو پوچھ لیا ہے۔"

اسی طرح ایک دوسری مرتبہ پہلے دہلی جانا ہوا تو اس وقت اپنے گھر پر ملنے گیا۔ میں نے اس دفعہ مجھے آٹھ سات روز ان کے پاس رہنے کا اتفاق ہوا۔ اسی زمانے میں ایک روز ایک واقعہ ہوا جو مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر ہم دونوں بیٹھے ہی تھے کہ مولوی صاحب کے دوست مرزا محمد سعید صاحب مصنف یاسمین پرنسپل پنجاب کالج ٹہلتے ہوئے آ گئے۔ ان کا مکان بھی مہرولی میں واقع تھا اور کہنے لگے۔ مولوی صاحب! آج آپ کو ایک بڑا مزیدار قصہ سناتا ہوں۔ صبح جو میں نے اپنا لیٹر بکس کھولا تو اس میں علاوہ میری ڈاک کے ایک لفافہ ایسا بھی ملا جس پر ٹکٹ لگے ہوئے تھے اور ڈاک خانے کی مہر اس پر نہیں لگی تھی۔ میں نے پتہ دیکھا تو معلوم ہوا کہ فلاں صاحب نے (مرزا صاحب نے ایک بہت مشہور شخص کا نام لیا) اپنی آشنا کو کسی دوسرے شہر لکھا تھا۔ اور ان کا بھولا بھالا ملازم میرے لیٹر بکس کو سرکاری لیٹر بکس سمجھ کر اس میں وہ خط ڈال گیا تھا۔ میں نے وہ خط کھولا پڑھا اور سارے راز سے واقف ہو کر اس خط کے ساتھ ان صاحب کو اپنے نوکر کے ہاتھ بھیج دیا کہ آپ کا ملازم آپ کا پرائیویٹ خط غلطی سے بجائے سرکاری لیٹر بکس میں ڈالنے کے میرے لیٹر بکس میں ڈال گیا۔ میں نے خط کھول کر پڑھا تو معلوم ہوا کہ آپ نے بھیجا تھا اس لئے آپ کو واپس بھیج رہا ہوں مگر براہ کرم اپنے ملازم کو تاکید کر دیں کہ ہوشیاری سے کام کیا کرے۔" میرا خط پڑھ کر ...... صاحب شرمندہ تو بہت ہوئے ہوں گے۔ مگر کچھ جواب نہیں دیا لیکن نوکر کو انہوں نے ادھر پیٹ کر ضرور نکال دیا ہو گا۔"

مولوی صاحب بہت متین اور سنجیدہ بزرگ تھے۔ یہ واقعہ سن کر خاموش ہی رہ گئے۔ نہ اس پر کچھ تبصرہ کیا نہ کچھ کہا۔

لباس اور مکان و سامان کی صفائی ستھرائی کا مولوی عنایت اللہ کو بدرجہ غایت خیال رہتا تھا۔ صفائی کی یہ عادت ان کی سرشت میں تھی اور ہر وقت اور ہر جگہ دیکھی۔ باقاعدہ غسل کرتے۔ نہایت صاف اور اجلے کپڑے پہنتے۔ کیا مجال جو کسی کپڑے پر کہیں داغ دھبہ دکھائی دے جائے۔ مکان کی تمام اشیا نہایت صاف ستھری اور قرینے سے آراستہ رکھتے۔ کتابیں اور ان کی الماریاں ایسی ہوتی تھیں گویا ابھی بازار سے آئی ہیں۔ جو مسودے لکھتے تھے وہ بھی نہایت یکساں اور داغ دھبے سے پاک ہوتے تھے۔ جو کتابیں چھپوانے بھیجتے ان کے متعلق خاص تاکید اس امر کی ہوتی تھی کہ کتاب بہت اچھے کاغذ پر نہایت عمدہ لکھائی چھپائی کے ساتھ بڑی نفاست سے شائع ہو۔ اور کتابت کی غلطیاں اس میں بالکل نہ ہوں۔ جب کتاب میں غلطیاں رہ جاتی تھیں تو ان سے ان کو بڑی سخت کوفت ہوتی تھی۔

ایسے ہی معاملہ کے بھی نہایت صاف تھے۔ ساری عمر نہ کسی کا پیسہ رکھا۔ نہ کسی کی رقم ماری۔ اور لین دین کے قصے ہی کبھی ان سے کسی شخص کو شکایت پیدا نہیں ہوئی کسی سے کسی بات کو انکار کرنا ان کی عادت میں داخل نہ تھا۔ ایک مرتبہ دیرہ دون سے مجھے لکھا کہ آج کل طبیعت گھبرا رہی ہے۔ دو چار دن کو میرے پاس ہو جاؤ میں اس زمانہ میں کرنال میں ایک نیم سرکاری اخبار "ستارۂ صبح" کا ایڈیٹر تھا۔ بہرحال رخصت لے کر میں دیرہ دون پہنچا۔ اور وہاں کچھ دن رہا۔ ان کا روزانہ کا معمول تھا کہ موٹر میں سیر کے لئے شام کو باہر جایا کرتے۔ ایک شام جو حسب معمول سیر کو نکلے تو چوراہے پر ایک منٹ کے لئے موٹر رکی۔ معاً ایک صاحب آگے بڑھے۔ جیسے انتظار میں ہی کھڑے ہوں! اور کہنے لگے "جناب! میں احمدی مبلغ ہوں۔ اس وقت اتنا وقت کہاں کہ میں آپ سے کچھ تبلیغی گفتگو کروں۔ اس لئے آپ مہربانی فرما کر یہ کتاب خرید لیں۔ اور مکان پر پہنچ کر اطمینان سے ملاحظہ فرمائیں۔ چھ آنے اس کی قیمت از راہ نوازش مجھے مرحمت فرما دیں۔ اس پمفلٹ کو پڑھنے کے بعد احمدیت کے متعلق مزید واقفیت حاصل کرنا چاہیں تو دفتر دعوت و تبلیغ قادیان کو خط لکھ کر ضروری لٹریچر منگوا لیں۔"

یہ سن کر مولوی عنایت اللہ صاحب نے ان صاحب کو تو کوئی جواب نہ دیا۔ مگر جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اتفاق سے اس وقت کچھ پاس نہ تھا۔ اس پر مجھ سے کہنے لگے "میاں ایک چھ آنے دینا گھر پہنچ کر دے دوں گا"۔ میں نے چھ آنے حاضر کر دیئے۔ اور انہوں نے ان صاحب کی نذر کر دیئے۔

جب موٹر آگے چلی تو میں نے کہا "مولوی صاحب آپ کو تو مذہبی معاملات سے کسی قسم کی کوئی دلچسپی نہیں۔ پھر آپ نے یہ چھ آنے کی کتاب کیوں خواہ مخواہ خرید لی؟" بہت ہی بھولے پن کے انداز میں فرمانے لگے "میاں! جب ان صاحب نے کتاب میرے ہاتھ میں پکڑا ہی دی تو بتلاؤ میں کیا کرتا؟"

میں نے ہنس کر کہا "اچھا اگر یہی بات ہے تو آپ نے ان چاول والے صاحب کو پچیس روپے کیوں نہ بھیج دیے؟ انہوں نے بھی تو بن مانگے آپ کو بھیجا تھا؟" کہنے لگے کہ میں ایسے ہی پچیس روپے ضرور بھیج دیتا مگر مجھے خود اس کی بے ایمانی پر غصہ آیا کہ پہلے تو مجھے لکھ دیا کہ تحفتاً بھیج رہا ہوں اور بعد میں قیمت کا طالب ہو گیا۔

چاول کا قصہ یہ ہے کہ دہلی میں عرصہ ہوا ایک صاحب تھے باریک نویسی کی اچھی مشق بہم پہنچا کر ایک چاول پر پوری سورۂ قل ہو اللہ یا انگریزی وغیرہ کی دو سطری عبارتیں لکھیں اور ان کو ملک کے بڑے بڑے معززین، امرا اور رؤسا، نوابوں کے لئے فرمان اور سول حکام کی خدمت میں رجسٹری کر کے بھیجا۔ ساتھ ہی ایک خط بھی لکھتے کہ یہ چاول باریک نویسی کا ایک ایسا حیرت انگیز کمال ہے جس کی مثال ملنا مشکل ہے اور میں نہایت ادب و احترام کے ساتھ آپ کی خدمت میں بطور نذر پیش کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ اسے قبول فرما کر میری عزت افزائی فرمائیں گے۔ جب رجسٹری اور خط کسی معزز آدمی کے پاس پہنچتا تو وہ حسب توفیق اس تحفہ کے بدلے میں سو پچاس روپے ان کو بھیج دیتا۔ اس طرح بہت معقول رقمیں ان کو مل جاتیں اور بڑے عیش و آرام اور فراغت کے ساتھ ان کی بسر ہوتی۔ یہ کام وہ پیشہ کے طور پر کرتے تھے اور اس میں نہایت کامیاب تھے۔ کاروبار بڑھنے پر انہوں نے اسی سلسلہ میں نبوت کا دعویٰ کر دیا تھا۔ اور یہی ان کے حق میں برا ہوا۔ غریب کا تھوڑے ہی دنوں میں سارا کارخانہ تباہ ہو گیا۔ اور مفلس قلاش ہو کر رہ گئے۔ پیچھے پتی بھی ہاتھ سے نکل گئی۔

ہاں تو وہ قصہ بیچ میں رہ گیا۔ ان صاحب نے حیدرآباد کی سول لسٹ میں سے دیکھ کر ایک مرتبہ مولوی عنایت اللہ کو بھی ایک چاول تحفتاً بذریعہ رجسٹری بھیجا۔ اور ساتھ خط بھی۔

مولوی صاحب نے رجسٹری وصول کر لی اور خالی خولی شکریہ کا ایک خط ان کو لکھ دیا۔ رقم کچھ نہ بھیجی

اس پر فوراً ان صاحب کا خط آیا کہ "میں نے تو آپ کو ریاست کا نہایت معزز شخص سمجھ کر یہ عجیب و غریب تحفہ بھیجا تھا۔ آپ کو چاہیئے تھا کہ بطور قدردانی ضرور کچھ نہ کچھ رقم مجھے ارسال فرماتے۔ آپ جیسے رئیس اور معزز شخص کے لئے یہ بات زیبا نہیں تھی۔ اگر زیادہ نہیں تو پچیس روپے بھیج دیں"۔ مولوی صاحب نے لکھا کہ "جو شخص کوئی چیز کسی کو تحفتاً دیا کرتا ہے وہ اس کی قیمت نہیں مانگا کرتا۔ اگر آپ قیمت کے طالب تھے تو چاول تحفتاً نہ بھیجتے"

اس کے جواب میں ادھر سے ایک گالیوں بھرا خط آیا جس میں مولوی صاحب کو بہت کچھ سخت و سست لکھا تھا جس کا مولوی صاحب نے کوئی جواب نہ دیا اور جواب ہو بھی کیا سکتا تھا؟

ایک بہت ہی عجیب سی صفت جو میں نے مولوی عنایت اللہ میں دیکھی وہ دوستوں کے ساتھ فرمانبرداری اور ان کی سچی محبت کی تھی۔ دوستوں کے ساتھ ہر شخص ہمدردی کے ساتھ پیش آتا ہی ہے مگر کم از کم میں نے دوستوں

کے ساتھ اتنی زیادہ الفت کسی اور میں نہیں دیکھی جیسی مولوی عنایت اللہ میں تھی۔ ان کی یہ الفت و محبت دوست کی موت کے بعد بھی اتنی ہی شدت کے ساتھ قائم رہتی تھی جیسی اس کی زندگی میں۔ بلکہ مجھے کہنے دیجئے کہ دوست کی موت کے بعد مولوی عنایت اللہ کے دل میں اس کی محبت نسبتاً زیادہ ہو جایا کرتی تھی۔ اور پھر وہ قائم بھی رہتی تھی۔ ہانڈی کا سا ابال نہ تھا۔

مولوی عنایت اللہ کے ایک محبوب عزیز دوست تھے، جن کا انتقال ہو گیا۔ مرحوم نے ایک بیوہ اور دو چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑے۔ پاس کچھ اثاثہ یا آمدنی نہ تھی جس سے ان جانوں کی پرورش ہوتی۔ مولوی عنایت اللہ تینوں کو بڑے اصرار سے اپنے مکان پر لے آئے۔ ان کا سارا خرچ برداشت کیا۔ اور کوئی دقیقہ ان کی دلجوئی اور خاطر مدارات میں فروگذاشت نہیں کیا۔ بیوہ کو اپنی سگی بہن کی طرح اور بچوں کو اپنے بیٹوں کی طرح رکھا۔ حیدر آباد میں ایک سو بیس روپیہ ماہوار کا مکان محض انہی کے لئے کرایہ پر لیا۔ ورنہ خود اپنے لئے ایک کمرہ کافی تھا۔ اس لئے کہ بیوہ کو تکلیف نہ ہو ایک ماما کھانا پکانے کے لئے رکھی۔ بچوں کی تعلیم میں پوری کوشش کی۔ غرض ہر طرح انہیں آرام پہنچایا۔ جب حیدر آباد سے واپسی ہوئی تو ڈیرہ دون میں ایک کوٹھی سولہ ہزار روپے میں خریدی اور وہاں انہیں رکھا۔ مرحوم دوست کے اہل و عیال کے ساتھ آج کل کون اتنا سلوک کیا کرتا ہے؟

مولوی عنایت اللہ بہت مصروف الاوقات بزرگ تھے۔ بیکار بیٹھنا ان کے لئے ایک مصیبت تھی۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔ بڑھاپے میں بھی جبکہ عام طور پر آرام کی خواہش زیادہ ہوا کرتی ہے، میں نے بیکار نہیں دیکھا۔ اپنے آخری وقت میں بسبب کمزوری میں اضمحلال تھا اور بینائی بھی جاتی رہی تھی۔ ... وہ برابر لکھتے رہتے تھے۔ شیکسپیئر کے اکثر ڈراموں کے ترجمے انہوں نے اسی حالت میں کئے ہیں۔ آخر عمر میں انہوں نے ایک ایسا حیرت انگیز کام کیا جس کا ان لوگوں کو جو مولوی عنایت اللہ سے ذاتی طور پر واقفیت نہیں بہت دشواری سے یقین آئے گا۔ یعنی انہوں نے اس پیرانہ سالی میں ... ایک ضخیم کتاب ... کا ترجمہ کر ڈالا۔ یہ عجیب و غریب تاریخ کی چار موٹی موٹی جلدیں ہیں جو بڑے سائز کے ... ہزار صفحات پر ... مغلوں کی ... زبان میں مغلوں کے تمام خاندان کی نہایت بسیط تاریخ کے متعلق ایک عظیم الشان ... ۱۹۴۵ء میں مولوی صاحب نے اس کا ترجمہ ختم کیا۔ اور تمام کا تمام بذریعہ پارسل مجھے پانی پت بھیج دیا۔ اور لکھ دیا کہ "چونکہ کوئی اور اعلیٰ پایہ کی کتاب سامنے نہ تھی اس لئے اسی تاریخ کو ترجمہ کرنے بیٹھ گیا ورنہ ... اب یہ ... بھیج رہا ہوں۔ اگر موقع ملے تو کہیں شائع کرا دینا۔" اصل کتاب مسلم یونیورسٹی لائبریری علیگڑھ میں موجود ہے۔ یہ مسودہ خوش قسمتی سے پانی پت کی ۱۹۴۷ء کی ... سے بچ کر آ گیا تھا۔ اور میرے پاس اس وقت تک محفوظ ہے۔ لیکن امید نہیں کہ میں اپنی زندگی میں اس کو چھپوا سکوں۔ بہرحال انشاء اللہ کوشش کی جائے گی شاید ان کو ... مل جائے۔

جب اس ضخیم ترجمہ کو دیکھتا ہوں اور مولوی صاحب مرحوم کی آخری وقت کی کمزوری پر نظر کرتا ہوں تو اس عمر میں اتنے عظیم الشان کام کی تکمیل پر بے انتہا حیرت ہوتی ہے اور مولوی صاحب کی ہمت پر بڑا ہی تعجب ہوتا ہے۔

اپنی عمر کے آخری حصہ میں میں نے دیکھا کہ مولوی صاحب کو جوانی میں شادی نہ کرنے کا اب افسوس ہو رہا ہے۔ اسی وجہ سے وہ بالعموم بہت غمگین رہتے تھے کہ اگر شادی کر لیتا تو اولاد ہوتی جو مکان جائداد۔ سامان اور کتابوں کی وارث ہوتی اب یہ سب دوسروں کے پاس جائیں گی۔ ایک مرتبہ میں ان کی لائبریری کی سیر کر رہا تھا کہ میں نے وہاں جغرافیہ فلسطین و شام، اور جغرافیہ خلافت مشرقی مصنفہ لی سٹرینج کی ضخیم جلدیں رکھی ہوئی دیکھیں۔ دونوں جلدیں الماری میں سے نکال کر میں نے مولوی صاحب سے کہا کہ مولوی صاحب اگر آپ اجازت دیں تو یہ دونوں کتابیں میں لے جاؤں۔ بہت ہی درد کے ساتھ مولوی صاحب نے جواب دیا "میاں لے جاؤ۔ یہاں تو میرے مرتے ہی تالے پڑ جائیں گے۔ اور ہر چیز غیروں کی ملکیت ہو جائے گی۔"

کتابوں کا مطالعہ ایسے انہماک سے کیا کرتے کہ اس دوران میں انہیں گرد و پیش کا مطلق دھیان نہ رہتا تھا۔ جب لین پول کی کتاب (Saladin) کا ترجمہ کرنے لگے تو مجھے لکھا کہ صلاح الدین اعظم کی اگر کوئی سوانح عمری عربی یا ... سے لکھی گئی ہو تو بھیج دو۔ میرے ایک عزیز اتفاق سے ڈیرہ دون جا رہے تھے۔ میں نے ان کے ہاتھ کتاب بھیج دی۔ انہوں نے لے جا کر دی تو مولوی صاحب فوراً کتاب کھول کر بیٹھ گئے اور مطالعہ میں ایسے منہمک ہوئے کہ ان صاحب سے بیٹھنے کے لئے بھی نہ کہا۔ بس پڑھنے لگے۔ ... پڑھنے کے بعد جو نظر اٹھائی تو گھبرا کر فرمانے لگے "ہیں آپ کھڑے ہیں؟ معاف کیجئے مجھے خیال ہی نہ رہا۔ تشریف رکھئے۔"

انگریزی سے ترجمہ کرنے کی قابلیت ان میں حیرت انگیز تھی۔ ترجمہ کرنے وقت میں نے دیکھا ہے کہ مولوی عنایت اللہ سوچتے بالکل نہیں تھے۔ بہت روانی کے

ساتھ ساتھ ترجمہ کرتے چلے جاتے تھے۔ اصل کتاب یا مضمون جو پڑھتے بھی میں نے ان کو نہیں دیکھا۔ بس صرف اس کو سامنے رکھ لیتے اور بے تکان ترجمہ کرتے رہتے۔ ترجمہ شدہ مضمون میں کانٹ چھانٹ شاذونادر ہی کرتے تھے۔ بیسیوں صفحات ترجمہ کرنے کے بعد بھی شاید ایک آدھ فقرہ یا سطر کٹی ہوئی نظر آئے گی۔ ورنہ تمام ترجمہ بالکل صاف لکھا ہوا ہوگا۔ دورانِ ترجمہ میں میں نے ان کو ڈکشنری استعمال کرتے بھی نہیں دیکھا۔ جب وہ ناظم دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی تھے۔ تو ان کے اپنے کمرہ میں ہر قسم کی ڈکشنریاں اور لغات الماریوں میں لگی ہوئی تھیں۔ دوسرے کمروں میں مترجمین بیٹھے مختلف کتابوں کے ترجمے کرتے رہتے تھے۔ جہاں کوئی مشکل لفظ آیا یا کسی فقرہ کا ترجمہ نہ ہو سکا۔ [illegible] مترجم نے وہ لفظ یا فقرہ ایک کاغذ پر لکھ کر [illegible] صاحب کو چپراسی کے ہاتھ بھیج دیا۔ اور مولوی صاحب نے فوراً اس پرچہ پر اس کا ترجمہ لکھ کر واپس کر دیا۔ ڈکشنری دیکھنے یا تحقیق و تلاش کرنے کی نوبت بالعموم [illegible] تھی۔ میرے سامنے صرف ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ کسی مترجم نے ایک فقرہ لکھ کر بھیجا کہ اس کا ترجمہ سمجھ میں نہیں آتا۔ مولوی صاحب نے پرچہ ہاتھ میں لیا۔ فقرہ دیکھا اور سوچنے لگے۔ حضرت خواجہ سجاد حسین صاحب مرحوم (فرزند گرامی مولانا حالی) ان کے بچپن کے دوست تھے وہ اس وقت اتفاق سے پاس بیٹھے تھے۔ مولوی صاحب ان کی طرف مخاطب ہوئے اور فقرہ پڑھ کر فرمانے لگے۔ "خواجہ صاحب اس فقرہ کا آپ کے خیال میں کیا ترجمہ ہوگا؟" حضرت خواجہ صاحب مرحوم بہت [illegible] طبیعت کے بزرگ تھے۔ فوراً فرمایا کہ "میرے خیال میں تو اس کا ترجمہ ہوگا [illegible]" مولوی صاحب سن کر پھڑک اٹھے اور کہنے لگے "آپ نے کمال کر دیا۔ اس سے بہتر ترجمہ اس فقرہ کا ہو ہی نہیں سکتا۔" اور پھر وہی ترجمہ لکھ کر بھیج دیا۔

مولوی صاحب مرحوم کتنا عمدہ اور بہترین ترجمہ کرتے تھے اس کا اندازہ آپ کر [illegible] ہوگا کہ ابھی حال میں ایک صاحب نے جو آج کل [illegible] کے ایک [illegible] سکول میں ٹیچر ہیں مجھے ایک خط لکھا جس میں وہ فرماتے ہیں "میں بی۔ اے کا امتحان دینا چاہتا ہوں۔ نصاب میں مرچنٹ آف وینس بھی ہے۔ میں نے اس کے اردو ترجمہ کا مطالعہ کیا جو علامہ عنایت اللہ دہلوی کا کیا ہوا ہے۔ اس ترجمہ سے میں نے بے حد فائدہ اٹھایا۔ سامنے دی ہوئی انگریزی کی شرح [illegible] بھی بعض بعض جگہ پر شیکسپیئر کے مطالب کو واضح نہیں کر سکیں جو اس اردو ترجمہ سے مجھ پر واضح ہو گئیں۔"

پہلی مستقل کتاب جو مولوی صاحب نے ترجمہ کی وہ مسٹر آرنلڈ کی کتاب [illegible] تھی۔ آرنلڈ علی گڑھ کالج میں پروفیسر تھے اور یہ بے نظیر محققانہ کتاب انہوں نے سرسید کی فرمائش سے لکھی تھی۔ جب انگریزی کتاب شائع ہو گئی تو سرسید نے مولوی عنایت اللہ سے کہا کہ تم اس کا اردو ترجمہ کرو۔ مولوی عنایت اللہ کہتے تھے کہ [illegible] ترجمہ میں نے حکم کی تعمیل میں دہلی سے کر کے بھیجا تو سید صاحب نے [illegible] باقی کتاب کے ابتدائی پانچ باب مولوی عنایت اللہ نے علی گڑھ میں بیٹھ کر سرسید کی نگرانی میں کئے۔ اس نگرانی کی دلچسپ کیفیت مولوی عنایت اللہ نے ایک مرتبہ یہ بیان کی :—

"سید صاحب کا ترجمہ سننے کا طریقہ یہ تھا کہ مسودہ اپنے سامنے رکھ لیتے اور مجھ سے کہتے کہ پڑھو۔ مجھے ترجمہ پڑھنے کے لئے سید صاحب کے اس قدر قریب بیٹھنا پڑتا تھا کہ [illegible] پنکھے کی ہوا سے سید صاحب کی داڑھی کے جو بال اڑتے وہ میری گردن پر لگتے جن سے بڑی گدگدی پیدا ہوتی۔ مگر مجھے مجبوراً چپ چاپ بیٹھنا پڑتا تھا۔ ایک طرف میں ہوتا تھا اور دوسری طرف سید صاحب کے [illegible] سکریٹری مولوی سید وحید الدین سلیم پانی پتی کرسی پر بیٹھتے۔ ان کو سید صاحب اس لئے پاس بٹھاتے تھے کہ ترجمہ کو نہایت غور سے سنتے رہیں۔ جہاں کہیں ان کو کتاب میں کوئی بات اسلام کے خلاف معلوم ہو تو فوراً بتلائیں۔ سید صاحب ترجمہ سننے کے لئے اس طرح بیٹھتے کہ [illegible] اس وقت نہیں تھا۔ تیار ہو جاتے اور مجھ سے فرماتے "پڑھو" میں پڑھنا شروع کرتا۔ اگر پڑھتے وقت [illegible] کہیں رکتا تو سید صاحب سمجھتے کہ مترجم نے کوئی غلطی کی ہے۔ سرسید انگریزی بالکل نہیں جانتے تھے۔ فوراً ٹوکتے اور کہتے "مولوی صاحب سمجھتے نہیں" میں عرض کرتا "جی نہیں ترجمہ تو ٹھیک ہے" اس پر دوبارہ ترجمہ پڑھواتے اور پھر فرماتے "اچھا اب آگے چلو" اگر سید صاحب کسی فقرے میں ترمیم کرتے تھے تو [illegible] سنتے تھے۔ [illegible] دفعہ ایسا بھی ہوتا کہ فقرہ میں کوئی لفظ آگے پیچھے ہو گئے [illegible] معنی سا ہو جاتا تو سید صاحب سمجھنے لگتے۔ میں چونکہ [illegible] ترجمہ کر چکا ہوتا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ اس فقرہ کو یوں بنا دیجئے" سید صاحب اس کو اسی طرح بنا دیتے اور میری پیٹھ ٹھونک کر فرماتے [illegible] مولوی وحید الدین سلیم کرسی پر بیٹھے چپ چاپ ترجمہ سنا کرتے اور بہت ہی کم اعتراض کرتے۔ ایک دفعہ اسی طرح

ترجمہ سن کر کمرے سے باہر نکلے تو مجھ سے فرمانے لگے۔ "میں تو بڑی حیرت سے یہ دیکھ رہا تھا کہ تم کس قدر صاف اور سلیس ترجمہ کرتے ہو۔"

اپنے ترجمہ کی شگفتگی اور روانی پر مولوی صاحب کو خود بھی ناز تھا۔ ایک مرتبہ مجھ سے فرمانے لگے کہ میں نے رُڈیارڈ کپلنگ کی کتاب "جنگل بک" کا ترجمہ "زلفی" کے نام سے کیا۔ مگر اس ترجمہ میں اس قدر مشقت اٹھائی کہ اسے ترجمہ کہنا مجھ پر ظلم کرنا ہے۔ اور حقیقت میں وہ ترجمہ ایسا ہی لطیف ہے۔ ہزار غور کرنے پر بھی یقین نہیں آتا کہ یہ ترجمہ ہوگا۔ فقروں کی بندش، الفاظ کی چستی، عبارت کی روانی، بیان کی دلچسپی اور قصہ کا ربط اس ترجمہ میں ایسا عجیب و غریب ہے کہ کسی تصنیف میں بھی بہت مشکل ہی سے ملے۔ ایک مشہور ادیب نے اس کے متعلق مولوی صاحب کو خط لکھا تھا کہ "جب کام کرتے کرتے تھک جاتا ہوں تو دماغ کو آرام دینے کے لیے آرام کرسی پر لیٹ کر آپ کی زلفی پڑھنے لگتا ہوں۔"

ایک دفعہ پانی پت تشریف لائے اور کمرے میں آرام کرسی پر لیٹ کر ایک انگریزی اخبار پڑھنے لگے۔ پڑھتے پڑھتے مجھ سے فرمایا کہ "میاں! ترجمہ کرتے کرتے دماغ کی حالت کچھ ایسی ہو گئی ہے کہ انگریزی اخبار یا کتاب پڑھنے اور اس کی عبارت سے لطف اٹھانے کا مزہ ہی جاتا رہا۔ کیونکہ جب کبھی کوئی انگریزی مضمون یا اخبار ہاتھ میں لیتا ہوں تو بجائے اصل الفاظ کے ان کا اردو ترجمہ آنکھوں کے آگے گھومنے لگتا ہے۔ ایسی حالت میں اصل سے کیا خاک لطف اٹھایا جا سکتا ہے۔"

ایک مرتبہ مزاحاً مجھ سے فرمانے لگے کہ "میاں! یہ ترجمہ کا کام اتنا مشکل اور اتنے جھنجھٹ کا ہے کہ اگر مجھے جوتیاں گانٹھنی آتیں تو وہ پیشہ اختیار کر لیتا مگر ترجمہ نہ کرتا۔ مگر کیا کروں میں اتنا ناکارہ ہوں کہ جوتیاں گانٹھنی بھی نہیں آتیں۔ اس لئے مجبوراً ترجمہ کرتا ہوں۔"

بڑھاپے میں جبکہ ان کے اعضا بہت کمزور ہو گئے تھے۔ بار بار اور مسلسل ترجمہ کرتے دیکھ کر ایک مرتبہ میں نے عرض کیا کہ "اب تو آپ بہت ضعیف اور کمزور ہو گئے ہیں۔ دنیا بھر کے لوگ اس عمر میں پہنچ کر آرام کرتے ہیں۔ آپ اس قدر مشقت کیوں اٹھاتے ہیں اور ہر وقت ترجمہ میں کیوں منہمک رہتے ہیں؟" ہنس کر فرمانے لگے "یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو۔ اب میرے آرام کا زمانہ ہے مگر کیا کروں کہ بچپن سے طبیعت کو کام کرنے کی کچھ ایسی عادت ہو گئی ہے کہ ذرا بھی خالی بیٹھتا ہوں تو دل بُری طرح گھبرانے لگتا ہے۔ اسلئے مجبوراً کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہوں۔"

جوانی کے زمانہ میں مولوی صاحب کا خط نہایت صاف، خوشخط اور نفیس ہوتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے گول گول دائرے۔ ہر ایک حرف طریقے سے لکھا ہوا۔ سطریں بالکل سیدھی۔ مگر آخری عمر میں جو سینکڑوں خطوط انہوں نے مجھے وقتاً فوقتاً حیدرآباد، دہلی یا ڈیرہ دون سے لکھے وہ ایسے ہوتے تھے کہ میرے سوا انہیں کوئی پڑھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اور میں ——— بھی اس لئے کہ پڑھتے پڑھتے کافی مشق ہو گئی تھی۔ حضرت خواجہ سجاد حسین صاحب کے پاس ان کے خط آتے تھے ان کو پڑھنے کے لئے بھی میں ہی بلایا جاتا تھا۔ کثرتِ تحریر کے باعث خط میں یہ تبدیلی رونما ہوئی۔

ایک عجیب عادت مولوی صاحب میں یہ تھی کہ کاغذ کا پورا صفحہ بغیر نقطوں کے لکھتے۔ اور پورا صفحہ لکھنے کے بعد پھر شروع صفحہ سے الفاظ پر نقطے لگانے شروع کرتے اور جلدی جلدی سارے صفحے پر نقطے لگا دیتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ کسی حرف پر ایک کی بجائے تین نقطے لگ جاتے اور کسی پر دو کی بجائے ایک۔ ایسا بھی بارہا ہوا کہ جس حرف پر نقطہ لگنا چاہیئے تھا، وہ خالی رہ جاتا۔ اور جس حرف پر کوئی نقطہ نہ ہوتا اس پر نقطے لگا دیئے۔ اس لئے ان کے خط کو بہت سنبھل سنبھل کر پڑھنا پڑتا تھا۔ ان کا لکھا ہوا مسودہ مجھے اپنے طور پر صاف کر کے کاتب کو دینا پڑتا تھا۔ تب کاتب اس کی کتابت کر سکتا تھا۔ کچھ مولوی عنایت اللہ پر موقوف نہیں سارے ہی بڑے آدمیوں کے خطوط بالعموم ایسے ہی شکستہ ہوتے ہیں۔

ترجمے تو انہوں نے ہزاروں صفحات کا کر ڈالا اور نہایت روانی اور سلاست کے ساتھ۔ مگر کتابوں پر تنقید اور تبصرہ کرنے سے بہت گھبراتے تھے۔ جب ڈوزی کی کتاب (Spanish Islam) کا ترجمہ "عبرت نامۂ اندلس" کے نام سے شائع کرنے لگے۔ تو میں نے کہا اس کتاب کے محاسن اور نقائص پر ایک مضمون اور اندلس کی دوسری تاریخوں سے اس کا موازنہ و مقابلہ بطور مقدمہ آپ کی طرف سے ضرور لکھا جانا چاہیئے تاکہ ناظرین کرام کو کتاب کی حیثیت اور اہمیت کا کماحقہ اندازہ ہو سکے۔ فرمانے لگے "بھئی چاہیئے تو بیشک مگر یہ کام بڑے جھمیلے اور جھگڑے کا ہے میری طبیعت ایسے کاموں سے بڑی گھبراتی ہے۔ لہٰذا یہ کام تم کر دو۔" میں نے کہا "واہ! یہ خوب ہوئی۔ اپنی بلا آپ مجھ پر کیوں ڈال رہے ہیں۔ آپ نے اس کے ایک ایک حرف کا ترجمہ کیا ہے۔ پس آپ سے زیادہ اس کتاب سے اور

کون واقف ہوسکتا ہے؟" فرمانے لگے "نہیں مقدمہ تمہیں ہی لکھنا پڑے گا" مجبوراً میں نے حکم کی تعمیل کی مقدمہ مکمل ہوگیا تو حضرت خواجہ سجاد حسین صاحب نے مجھے کہلا کر بھیجا کہ مقدمہ مولوی صاحب کو سنانے لگو تو مجھے بھی بلوا لینا۔ مولوی صاحب اس زمانہ میں پانی پت آئے ہوئے تھے۔ دونوں صاحبوں نے مقدمہ سنا تو متفقہ طور پر بے حد پسند کیا۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ درحقیقت مقدمہ نہایت لاجواب اور اعلیٰ درجہ کا تھا۔ بلکہ ان دونوں بزرگوں کی عادت میں یہ بات داخل تھی کہ اگر کسی سے کوئی کام کرواتے۔ اور وہ اُسے کرکے لاتا تو خواہ وہ کام کتنا ہی معمولی ہوتا مگر محض اُس شخص کی حوصلہ افزائی اور اس کی دلجوئی کے لئے وہ اس کی بہت زیادہ تعریف کرتے۔ یہی قصہ یہاں ہوا۔ اور مجھے اس امر کا افسوس رہا کہ کاش اگر وہ مقدمہ کی غلطیوں اور فروگذاشتوں کی طرف بھی اشارہ فرماتے تو میری کچھ اصلاح ہوجاتی۔ اب تو جوں کا توں چھپ گیا۔ اپنے عیب خود کسے معلوم ہوا کرتے ہیں جو مجھے معلوم ہوتے۔

مولوی صاحب کی تحریر میں بڑی گھلاوٹ۔ نہایت رس اور بے حد مٹھاس ہوتی تھی۔ جس بات کو بیان کرنا چاہتے اس کی ایسی صحیح اور چلتی جاگتی تصویر کھینچتے کہ سارا نقشہ آنکھوں کے آگے پھر جاتا۔ زبان ایسی صاف سلیس اور سادہ استعمال کرتے کہ بچہ بھی آسانی سے سمجھ لے۔ صفحے کے صفحے پڑھتے چلے جاؤ کہیں کوئی مشکل یا اجنبی لفظ نہ ملے گا۔ ایک مرتبہ انہوں نے مجھے اپنے بچپن کے حالات لکھ کر دیئے تھے جبکہ ان کے والد ان کو تعلیم کے لئے اپنے ہمراہ لے گئے تھے۔ دہلی سے الہ آباد تک کے اس اولین سفر کی جو دلچسپ اور دلآویز کیفیت اسمیں لکھی ہے وہ اتنی پُرلطف ہے کہ بار بار پڑھنے پر بھی سیری نہیں ہوتی اور یہی دل چاہتا ہے کہ پھر پڑھو۔ مضمون کے طویل ہوجانے کا خطرہ نہ ہوتا تو وہ دلچسپ ترین تحریر یہاں ضرور پیش کرتا اور مولوی صاحب کے علمی کارناموں پر بھی ایک نظر ڈالتا مگر مضمون پہلے ہی کافی لمبا ہوگیا ہے اس لئے آخر میں صرف ایک لطیفہ لکھ کر اسے ختم کرتا ہوں۔

دارالترجمہ حیدرآباد میں بیٹھے ہوئے ایک روز مترجموں اور اپنے عملے کے کارکنوں کا ذکر کرنے لگے۔ ایک صاحب کا تذکرہ آیا تو فرمانے لگے: "ایک مرتبہ مجھے انہوں نے رقعہ لکھا کہ میری موٹر میں تیل ختم ہوچکا ہے۔ مبلغ پانچ روپے مرحمت ہوں۔ جب آپ تنخواہ دیں گے اس میں سے وضع کرلیں۔ وہ صاحب شراب بکثرت استعمال فرماتے تھے، میں نے جواباً لکھ دیا "اگر موٹر کے لئے ضرورت ہے تو بشوق پانچ کی بجائے پندرہ منگوالیں۔ لیکن اگر پیٹ کے انجن کے لئے تیل کی حاجت ہے تو ایک پیسہ بھی دینے کے لئے تیار نہیں جو حقیقت ہو وہ لکھ دیں" وہ صاحب باوجود شراب خوار ہونے کے نشے سچے اور بااصول ہیں کہ انہوں نے قطعاً اس بات کو گوارا نہ کیا کہ جھوٹ بول کر روپے منگوائیں اس لئے خاموش ہوگئے اور مجھے کچھ نہ لکھا۔"

پروفیسر شیرانی

ڈاکٹر سید عبداللہ

ایک قوی ہیکل بزرگ میانہ قامت ذرا سے جھکے ہوئے، گندمی رنگ، سر اور مونچھوں کے بال خضاب زدہ، سر پر ترکی ٹوپی، کوٹ پتلون پہنے، بادامی رنگ کے لمبے اونچے بوٹ چڑھائے، ایک خاص انداز میں سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے۔ اسلامیہ کالج لاہور میں سٹاف روم سے حبیبیہ ہال کی طرف بڑھے چلے جا رہے تھے ——— ! مجھ سے میرے رفیق نے کہا "یہی حافظ محمود خان شیرانی ہیں۔

یہ ان سے میرے تعارف کا روزِ اول تھا۔ میں اور میرا رفیق اسلامیہ کالج میں ایم۔ اے فارسی میں داخلہ لینے کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ ان سے میرے تلمذ کا سلسلہ ان کے انتقال تک جاری رہا۔ اس تمام عرصے میں ان سے میرے تعلقات برابر خوشگوار رہے۔ اس لئے مجھے اپنے مخدوم کو جاننے اور پہچاننے کا خوب خوب موقعہ ملا۔ میں اسی اعتماد پر ان کی شخصیت کے متعلق یہ چند صفحات لکھنے پر آمادہ ہوا ہوں۔

حافظ صاحب، حافظ قرآن مجید اور شاید حافظ شاہنامہ بھی تھے۔ اصلاً ٹونک کے رہنے والے، شیرانی الاصل، ان کے بزرگ حضرت سید احمد بریلوی کے مریدانِ خاص میں سے تھے۔ شمس العلماء مفتی عبداللہ ٹونکی کی وساطت سے لاہور میں آگئے اور نٹیل کالج میں داخل ہوئے اور منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ نوجوانی میں شاعری بھی کی مگر بعد میں اپنا یہ ورثہ اپنے نامور فرزند اختر شیرانی کو سونپ دیا۔ اور خود تحقیق کی ولایت سنبھال لی۔ "مخزن" میں مضمون بھی لکھے اور نظمیں بھی۔ "شیرِ دکن"، ان کی ایک مشہور نظم ہے جو مخزن میں چھپی تھی۔ پھر وہ انگلستان چلے گئے، وہاں کچھ دیر قانون کی تعلیم حاصل کی۔ کچھ دیر لوزک اینڈ کمپنی کے مشیرِ علمی کے طور پر کام کیا اور اسلامی فنون میں وہ بصیرت پیدا کی، جو مدتوں یادگار رہے گی۔ وہاں سے اپنے وطن ٹونک آگئے اور کچھ مدت کے بعد اختر شیرانی (داؤد) کو لے کر لاہور میں پھر وارد ہوئے، اور پہلے اسلامیہ کالج، پھر اورنٹیل کالج میں پروفیسر رہ کر ۱۹۴۰ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوگئے۔ انتقال وطنِ مالوف میں ۱۹۴۵ء میں ہوا۔

شیرانی ایک وضعدار، سادہ مزاج مگر غیور طبیعت کے بزرگ تھے۔ وہ لباس میں بھی سادگی پسند تھے اور عام طرزِ ماند و بود میں بھی تکلف اور طمطراق سے نفرت تھی۔ کھانے پینے کی عادتوں میں بھی یہی خصوصیت نمایاں تھی۔ ان کا دسترخوان الوانِ نعمت کی فراوانی کے لئے ضرب المثل تھا مگر وہ خود کم کھانے والے اور دوسروں کو زیادہ کھلانے والے آدمی تھے۔ وہ دوسروں پر احسان کرتے تھے مگر خود زیر بار احسان ہونے سے بہت بچتے تھے اور جب کبھی بامرِ مجبوری کسی کے ذرا بھی احسان مند ہو جاتے تھے تو اس احسان مندی کے جواب میں ایک کے بدلے دس کے اصول پر عمل کیا کرتے تھے۔

یہ شیرانی صاحب کی عادتوں کا سرسری اجمال ہے جس سے ان کی شخصیت کے چند ظاہری خط و خال نمایاں ہوئے ہیں۔ ان کی عظمت نمایاں نہیں ہوئی۔ ان کی عظمت ہر عظیم شخصیت کی طرح کچھ تو ان کے عظیم انفرادی کارنامہ ہائے علمی میں ہے یا پھر ان انسانی بوالعجبیوں میں ہے جن کے حیرت انگیز تضاد میں بشریت اپنی عظمتوں کے راز آشکارا کیا کرتی ہے۔

پروفیسر شیرانی کی سیرت کی بوالعجبیاں جتنی حیرت انگیز ہیں۔ اتنے ہی ان کے کارنامے عظیم اور شاندار ہیں۔ ان کی علمی یادگاریں بہت سی ہیں۔ مگر بڑی یادگاریں ان کی چند علمی تصانیف (پنجاب میں اردو اور تنقید شعر العجم) اور ان کا وہ مجموعہ مسکوکات و مخطوطات ہے جو انھوں نے بڑی محنت سے جمع کیا تھا۔ ان یادگاروں سے ان کی علمی شہرت قائم ہوئی مگر ان کو عظمت اور قبولیت کے مسند پر جس چیز نے بٹھایا، وہ ان کی بلند انسانیت اور شرافت تھی جو موروثی بھی تھی اور اکتسابی بھی۔ اسلاف عالی گوہر تھے۔ اولاد نے بزرگوں کی سب وراثتیں محفوظ رکھیں۔ نیک کام کرنے والے اور نیکی کو پھیلانے والے مروّت کے پیکر مجسم۔ نیکی کا جو سلسلہ ایک دفعہ شروع کیا عمر بھر نباہنے کی کوشش کی۔ ان کی نیکیوں کی داستان طویل بھی ہے اور سبق آموز بھی ——— مگر میرا قلم ان اسرار کو بے نقاب کرنا نہیں چاہتا جن کو انھوں نے خود ظاہر کرنا کبھی گوارا نہیں کیا۔

پروفیسر شیرانی تکلف کے دشمن کتاب کے دوست اور عمدہ کیمیس کے عاشق تھے۔ ان کے یہ میلانات اس زمانے میں بھی ان میں موجود تھے۔ جب مجھے ان کی بارگاہ عنایات میں تقرب نصیب ہوا۔

شاید ۱۹۳۲ء کے مارچ یا اپریل کا مہینہ تھا کہ میں ان کے ہمراہ پشاور گیا۔ اس مہم کا مقصد یہ تھا کہ پشاور سے غزنوی عہد کے سکے سلاطین ترک کے زمانے کی ہندوستانی فارسی کی کتابیں اور نوشہرہ اور سوات کے بنے ہوئے کیمیس حاصل کئے جائیں۔ ۹ بجے صبح گاڑی پشاور چھاؤنی کے سٹیشن پر پہنچی۔ ہم اتر کر قصہ خوانی کی طرف گئے۔ ایک دکان سے چائے پی۔ اس وقت تک دس بج چکے تھے۔ اب جو شہر کے گلی کوچوں کی گردش شروع ہوئی۔ تو پھرتے پھرتے شام کے پانچ بج گئے ——— مارے تھکاوٹ اور بھوک کے میری حالت غیر ہو رہی تھی مگر شیرانی تھے کہ شوقِ عجائب انہیں ایک گلی سے دوسری گلی تک اور ایک کوچے سے دوسرے کوچے تک اس طرح کشاں کشاں لئے جاتا تھا کہ مجھے تعجب تو کیا ہوتا پریشانی ہونے لگی۔ شہر کی تنگ و تاریک گلیوں اور سڑکوں کی دکانوں پر پہنچ کر وہ اس طرح جم کر بیٹھ جاتے کہ میں تھک تھک جاتا مگر وہ تھے کہ ہمت ہارے بغیر کبھی اور کسی دوسری دکان پر کسی چیز کی تلاش میں مصروف رہتے تھے ؎

شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں

جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں!

اس دورے میں انھوں نے بہت سی قلمی کتابیں چند نادر سکے اور متعدد خوش نما چیزیں جمع کئے۔ پروفیسر شیرانی عجائب پسندی کا مجنونانہ شوق رکھنے کے باوجود ایک ہوشیار خریدار رکھتے تھے اور خرید و فروخت کے فن میں کئی گر انہیں یاد تھے چنانچہ بوقت ضرورت وہ ان گروں سے خوب فائدہ اٹھاتے تھے۔ ان میں ایک گر یہ تھا کہ وہ دکان میں داخل ہوتے وقت پہلے سب چیزوں پر ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر بے توجہی اختیار کر لیا کرتے تھے بعد میں بہت آہستہ آہستہ کسی قابل قدر چیز کو دیکھنے جاتے۔ یہ اس لئے کرتے تھے کہ دکاندار یا ذخیرے کا مالک عموماً گاہک سے اس کی توجہ کی قیمت طلب کیا کرتا ہے۔ جونہی اسے معلوم ہوا کہ کسی خاص مال پر گاہک شوق کی نظر ڈال رہا ہے بس وہیں دام زیادہ کر دیئے۔ شیرانی صاحب کو کئی مرتبہ اپنے شوق کی بے تابی کا تاوان بھی ادا کرنا پڑا۔ اس کے سبب انھوں نے بھی یہ گر نکال رکھا تھا۔ چنانچہ دوکاندار کو شاید آخری وقت تک یہ معلوم نہ ہو سکتا تھا کہ ان کی دلچسپی کس چیز سے ہے۔

شیرانی صاحب یوں تو درویش مزاج آدمی اور صلح کل بلکہ محبت کل کا مسلک رکھتے تھے مگر علمی لڑائی میں انہیں بڑا مزا آتا تھا چنانچہ تحقیقی اور تاریخی نزاعات اور لڑائیوں میں ان کا جو وقت گزرتا تھا اس میں وہ بہت خوش رہتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جس زمانے میں وہ پروفیسر محمد حبیب

صاحب کے ترجمہ خزائن الفتوح کی اناٹومی یا پوسٹ مارٹم میں مصروف تھے ہر وقت اسی کا تذکرہ ان کی زبان پہ جاری رہا کرتا اور انھیں اس ہنگامے میں ایک خاص خوشی محسوس ہوتی اور اسی خوشی میں ہر شام فلیمنگ روڈ پر ہمیں چائے کی دعوت بھی دی جاتی۔ ان دعوتوں میں میرے علاوہ میرا مرحوم دوست شیخ محمد ابراہیم بھی شریک ہوتا تھا۔ ہم نے ان دعوتوں میں ان سے بہت کچھ سیکھا چائے بھی پی اور کتابیں بھی پڑھیں۔ شیرانی صاحب اپنی الماریوں سے دھڑا دھڑ حوالے کی کتابیں نکالتے اور سناتے جاتے تھے اور ہر ہر سطر سے غلطیاں نکلتیں غرض بچارے ترجمے کی بُری گت بنائی۔

پروفیسر شیرانی کے تحقیقی طریقِ کار میں خاص اور نئی بات یہ معلوم ہوئی کہ وہ پرانی تاریخ و تہذیب کی سچائیوں تک پہنچنے کے لئے ان کتابوں سے بھی استفادہ کیا کرتے تھے جو زمانے کی تاریخ سے متعلق ہیں مگر ان کا خاص طریق یہ تھا کہ غیر تاریخی کتابوں سے بھی تہذیبی رجحانات کا کھوج لگایا کرتے تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ صحیح مواد عموماً غیر متعلق کتابوں میں ملتا ہے جہاں غیر شعوری طور پہ ایسی باتیں درج ہو جاتی ہیں جو باقاعدہ تاریخوں میں سیاسی یا ذاتی اسباب کی بنا پر نظر انداز ہو جاتی ہیں۔

غرض شیرانی "میدانِ جنگ" میں بڑے خوش و خرّم رہتے تھے۔ خیر حبیب صاحب سے تو ان کی یک طرفہ سی لڑائی تھی کیونکہ ادھر سے جواب کی شاید کوئی کوشش ہی نہیں ہوئی مگر دار المصنّفین والوں سے جو لڑائی ہوئی وہ بڑی معرکے کی لڑائی تھی۔ کیونکہ "شبلی" دبستان جدلیات میں ماہرِ خیال کئے جاتے ہیں اور سرسیّد کے زمانے سے ان کے تیروں اور تلواروں کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک سے ایک بڑھ کر نبرد آزما اور صف شکن۔ سید سلیمان مولانا شبلی کے خاص تربیت یافتہ بزرگ تھے۔ ان کے ساتھ مولانا حبیب الرحمان شیروانی ثالث بالخیر ہو کر بھی "شبلی والوں" کے ہی سالارِ قافلہ تھے۔ غرض پنجاب اور اعظم گڑھ کے درمیان "پانی پت" کی سی لڑائی ٹھن گئی۔ اگرچہ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ پانی پت کی کونسی لڑائی تھی مگر معرکہ بڑا سخت تھا! اس میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق سے لے کر پروفیسر محمد اقبال (علامہ خود سر محمد اقبال) اور ڈاکٹر مولوی محمد شفیع تک سبھی شریک تھے اور سبھی نے اپنے اپنے جوہر دکھائے مگر بہادری کے سچے جوہر اگر کسی نے دکھا کر دنیا کو حیرت زدہ کیا تو وہ پروفیسر شیرانی تھے۔ چنانچہ تنقیدِ شعر العجم اسی جنگ و جدل کا نتیجہ ہے! ان علمی محاربات میں ہمیں پروفیسر شیرانی کی شخصیت کے علمی اور انسانی خصائص کے بڑے بڑے اسرار معلوم ہوئے ـــــــ مثلاً رات رات بھر بیٹھنا تمام تمام دن نئے نئے حوالوں اور نئی نئی کتابوں کی تلاش ہر ہر شخص سے اپنے نتائج پر بحث اور مشورہ ہر ہر لحظہ نیا سگرٹ اور ہر ہر ساعت نئی ڈبیا! مگر اس محنت شاقہ کے باوجود مطمئن اور شگفتہ رہتے تھے، کہا کرتے تھے سچائی اور صداقت کی جستجو بڑی ہی پُر لطف شے ہے اور غلطی بے پر لطف شے ہے تاریخی سچائیوں کے معاملے میں سہل انکاری اور تغافل شعاری اتنی ہی تکلیف دہ بات ہے ـــــــ! "یہ ندوے والے چوٹ اور چٹکی سے کام نکالتے ہیں۔ بھڑک دار عبارت لکھی اور لوگوں کو اپنی طرف مائل کر لیا ـــــــ ان میں محنتی کوئی نہیں اور یہیں یہ مار کھاتے ہیں"

میں نے حاشیے میں لکھا ہے کہ مضمون نگار کا شیرانی صاحب کی ہر رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں مگر جب میں یہ لکھ چکا تو مجھے یاد آیا کہ مجھے اس طرح کی عبارت کی ایک مرتبہ سزا بھی مل چکی ہے۔ میں نے جب سرسیّد اور ان کے رفقا کی نثر کے متعلق انگریزی میں ایک مختصر سی کتاب لکھی جو شیخ محمد اشرف صاحب نے چھاپی تو میں بڑی خوشی سے کتاب کا ایک نسخہ لے کر اپنے مخدوم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا ہدیۂ حقیر پیش کیا ـــــــ! وہ میری کتاب کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور میری بے حد حوصلہ افزائی فرمائی ـــــــ یہ ان کی خاص عادت تھی کہ وہ علمی کام کرنے کے لئے (ع ـــ "بِک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ ہنر کے ساتھ" ـــ کے مصداق) سراپا شفقت و محبت ہو جاتے تھے۔ خصوصاً میں ان کی قلبی توجہ اور لطف و کرم کا بے حد ممنون ہوں۔ غرض انھوں نے بہت اچھے الفاظ میں اپنی رائے ظاہر کی اور اس سلسلے میں آئندہ کام کے کچھ راستے بھی سمجھائے، جن سے مجھے بڑا اطمینان اور فائدہ ہوا۔

ـــــــ مگر اس کہانی کی ایک فصل ابھی باقی ہے! ایک دن میں کیا دیکھتا ہوں کہ شیرانی صاحب یونیورسٹی لائبریری میں میری میز کی طرف

لے مضمون نگار کا پروفیسر شیرانی کی ہر رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

بڑھے آتے ہیں مگر معمول کے مطابق شگفتہ اور متبسّم نہیں۔ میں ابھی ان کے اضمحلال پر غور ہی کر رہا تھا کہ "وہ بالکل میز کے پاس آ گئے اور میری پیش کردہ محولہ بالا کتاب یہ کہہ کر میز پر پھینک دی "لے لو بس یہ اپنی کتاب، علطائے تو ملغائے تو . . . . . . بس دیکھ لیا بس دیکھ لیا . . . . . .! میں نے پوچھا قبلہ کیا بات ہے کیا قصور ہوا۔ کہا۔ بس دیکھ لیا بس دیکھ لیا ———! میں ان کے پیچھے بھاگا اور کوٹ کے طرف دامن کو پکڑ کر اصرار کیا — قبلہ وجہ تو بتائیے کہ میں ندامت کا اظہار کر سکوں ———! کہا "جانے دو بس دیکھ لیا بس دیکھ لیا۔ تم نے تو میرے مضامین پڑھے ہی نہیں ——! "تم نے میرے مضامین پڑھے ہی نہیں ——" یہ کہہ کر لمبے لمبے قدم اٹھائے اور لائبریری سے باہر ہو گئے اور میں کہتا ہی رہ گیا ؎

لو وہ دامن چھڑا کے چل بھی دیئے

حسرتِ خستہ جان سے کچھ نہ ہوا

اس ناراضگی کی وجہ کیا تھی؟ وجہ وہی کہ میں نے لکھ دیا تھا "کہ مضمون نگار کا شیرانی صاحب کی ہر رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں" یعنی میں نے اپنی مذکورہ بالا کتاب میں شعر العجم اور تنقید شعر العجم کے تبصرے میں لکھ دیا تھا کہ تنقید شعر العجم کی عظمت کے باوجود اور شعر العجم کی غلطیوں کے باوجود شعر العجم بڑی کتاب ہے۔ بس یہ بات شیرانی صاحب کو کچھ ناگوار سی ہوئی۔ وہ سمجھے یا شاید انھیں سمجھایا گیا کہ میں شبلی والوں میں سے ہوں اور اس وجہ سے میں نے تنقید شعر العجم کی مرتبہ شناسی نہیں کی۔ شیرانی صاحب کا رنج اس قرب کی وجہ سے بھی تھا جو مجھے ان کی خدمت میں حاصل تھا۔ اس لئے مجھے اس کا بہت افسوس ہوا مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا اور مشہور بات ہے کہ تیر جستہ از کمان باز نیاید ———! خیر آخر بڑی مشکلوں سے یہ بھی دیکھا کہ تیرِ جستہ پھر کمان میں بلکہ ترکش میں آ گیا اور میری جان میں جان آئی ———!

پروفیسر شیرانی کی اس قسم کی ناراضگیوں کا تجربہ میرے علاوہ اور احباب کو بھی ہوا۔ میرے دوست ڈاکٹر محمد باقر کو بھی ایک مرتبہ ایسی ہی آزمائش سے گزرنا پڑا۔ پروفیسر شیرانی ان سے بھی ایک علمی بات پر روٹھ گئے تھے اور بچارے باقر صاحب کو بڑے جتن کرنے پڑے، پھر کہیں جا کر وہ راضی ہوئے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ڈاکٹر باقر صاحب نے ایک خوشنما کھیس کی پیش کش سے انھیں منایا تھا (کہ یہ ان کی خاص مرغوب چیز تھی) اصل بات یہ ہے کہ مخدومی شیرانی صاحب انتہا درجے کے سچے۔ اور اخلاص مند شخص تھے۔ وہ جن لوگوں سے مراسم رکھتے تھے ان میں ظاہر داری کو مطلق روا نہ رکھتے تھے۔ چونکہ خود ان کا مسلک یہ تھا اس لئے وہ دوسروں سے بھی اسی اخلاص کی توقع رکھتے تھے اور معمولی سی کج روی بھی انھیں مضمحل کر دیتی تھی۔ وہ جس سے خفا ہو گئے، خفا ہو گئے۔ پھر ان کی ناراضگی آسانی سے دور نہ ہوتی تھی۔ امن اور جنگ دونوں حالتوں میں وہ بڑے ثابت قدم اور مستقل مزاج تھے۔

کہتے ہیں کہ بچوں اور نوجوانوں کو پڑھانا آسان ہے مگر بڈھوں کو پڑھانا اور ان کی عادتیں بدلنا آسان نہیں لیکن شیرانی وہ اُستاد اور وہ پیرِ طریقت تھے کہ انھوں نے بچوں اور نوجوانوں کی طرح بڈھوں کو بھی پڑھایا اور ان کی عادتیں بھی بدل ڈالیں اور شاید یہ غلط نہیں کہ شیرانی کے پڑھانے سے اگر کسی کو پورا فیض حاصل ہوا تو وہ بڈھوں کو حاصل ہوا ——— وہ یوں کہ وہ جب لاہور میں وارد ہوئے تو انھیں اسلامیہ کالج لاہور میں پروفیسر بنایا گیا۔ اس حیثیت سے انھیں بی۔ اے اور ایم۔ اے کے طلبا کو پڑھانا پڑتا تھا ——— مگر سچی بات یہ ہے کہ پروفیسر شیرانی کلاس روم لیکچرار اچھے نہ تھے۔ وہ طبعاً کم گو تھے اور خوش بیانی اور طلاقتِ لسانی کے جوہر شاید قدرت نے اس وجہ سے انھیں عطا نہ کئے تھے کہ وہ زبان سے زیادہ قلم سے کام لیں۔ اور اہلِ طلب کو ان کے کانوں کے بجائے آنکھوں کے راستے متاثر کریں۔ اس سبب سے (جہاں تک میری دید و شنید مجھے سمجھا سکی) عام طلبا ان سے کم مستفید ہوتے تھے لہٰذا ان کا اثر اگر تھا تو ان پختہ عمر اور پختہ کار لوگوں پر جن میں وہ شب و روز اٹھتے بیٹھتے تھے۔ اور یہی وہ گروہ تھا جو ان کے اصلی کمالات سے صحیح معنوں میں روشناس بھی ہوا اور فیض یاب بھی۔ ان میں اسلامیہ کالج کے پروفیسروں کا ایک گروہ بھی تھا جن کے دل میں پروفیسر شیرانی نے اپنی

---

[1] جن صاحب نے یہ کارِ خیر انجام دیا تھا وہ اب بھی بقیدِ حیات ہیں مگر میں نام نہیں لینا چاہتا۔ وہ مجھ سے ناراض ہو جائیں گے۔

مثال اور تلقین سے علمی تحقیق کی لگن پیدا کر دی تھی چنانچہ ان میں سے بعض آج تک اسی وادی میں گامزن ہیں اور زمانے کی ناموافقتوں کے باوجود شیرانی کی لگائی ہوئی لگن اور پیدا کی ہوئی دھن میں برابر آگے بڑھے جا رہے ہیں ——— ! ان میں ایک بزرگ شیخ عبدالعزیز ہیں جنھیں شیرانی صاحب کی مصاحبت میں ایسا ذوقِ تحقیق حاصل ہوا کہ اس کے نشے میں وہ آج بھی عہدِ مغلیہ کے تہذیبی ورثوں کی چھان بین اور مطالعہ میں مصروف ہیں۔ ایک دوسرے بزرگ پروفیسر سراج الدین آذر تھے جو اب مرحوم ہو چکے۔ یہ شیرانی صاحب کی کتاب دوستی سے متاثر ہوئے۔ چنانچہ انھوں نے بھی ایک بڑا کتاب خانہ جمع کیا جس میں بڑے بڑے نوادر محفوظ ہو گئے۔ ان کے علاوہ ہمارے دوست ڈاکٹر عبداللہ چغتائی بھی ہیں ان کو بھی خارستانِ تحقیق میں الجھانے والے پروفیسر شیرانی ہی تھے ——— ان کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی ہیں مگر سب کے نام گنانا لاحاصل بھی ہے اور دشوار بھی ——— یہ سب لوگ زندگی میں ایک خاص راستے پر چل رہے تھے اور راستہ متعین کر چکے تھے مگر شیرانی صاحب کے فیضِ صحبت اور زبان کی تاثیر سے ان پر اتنا اثر ہوا کہ انھوں نے اپنے شوق و ذوق کے میدان ہی بدل ڈالے اور وہی کچھ کرنے لگے جو شیرانی صاحب خود کرتے تھے۔

یہی وہ چیز ہے جس کو شخصیت کا کرشمہ کہا جاتا ہے۔ شیرانی صاحب کی سیرت کا یہ وہ جادو ہے جس سے ہر وہ شخص متاثر ہوا جو ان سے چند دن بھی ملا ——— اور سچ یہ ہے کہ یہ جادو وہ جادو تھا جو سر پر چڑھ کر بولتا ہو یا نہ بولتا ہو مگر دل میں بیٹھ کر ضرور بولتا تھا۔ اس کا سبب پروفیسر شیرانی کا وہ عشق و جنون تھا جو مسلمانوں کے تہذیبی ورثوں کی بصیرت اور ان کے جوہر کے ادراک نے ان کے دل میں پیدا کر دیا تھا۔ اس عشق و جنون نے ان کی گفتگو میں ایک خاص طلسمِ تسخیر بھر دیا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی علامانہ وسعتِ نظر کا بھی خاص اثر پڑتا تھا۔ ایران اور ہندوستان کی تہذیبی تاریخ سے ان کی گہری واقفیت کو دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی تھی۔ وہ اس تہذیب کے عالم ہی نہ تھے عاشق بھی تھے۔ ان کو مسلمانوں کی ثقافت کے زوال کا بڑا رنج تھا اور وہ اس کے آثارِ باقیہ کے تحفظ کے لیے بے تاب رہتے تھے۔ ان کا یہ دعویٰ تھا کہ مسلمان دنیا کی مہذب ترین اقوام میں سے تھے۔ انھیں ان کے فنونِ لطیفہ کے مطالعہ کا جو موقعہ ملا۔ اس کی بنا پر ان کا خیال یہ تھا کہ مسلمانوں کی جمالیاتی اقدار زیادہ صحیح اور ان کا فنی مطمحِ نظر زیادہ درست اور صائب تھا۔ یہ ان کا خاص کام تھا کہ انھوں نے ادب اور دوسرے فنونِ لطیفہ کے مشترکہ مطالعہ سے ایک تنقیدی نقطۂ نظر کی تعمیر و تشکیل کر لی تھی۔ اسی کی بنا پر وہ مسلمانوں کے ذہن اور ان کے شعور کے متعلق بڑی جامع اور ناقدانہ معلومات رکھتے تھے۔

میں نے جس انداز میں یہ چند سطور لکھی ہیں ان سے ان کی اس محبت کا اندازہ شاید نہ ہو سکے گا جو انھیں اسلامی تہذیب سے تھی خصوصاً ان کے فنونِ لطیفہ سے۔ انھوں نے مسلمانوں کے فنِ سکہ شناسی کا بھی خوب مطالعہ کیا تھا اور اس فن کے نشیب و فراز سے پوری طرح باخبر تھے مگر جب وہ ان سب فنون کی جمالیات پر گفتگو کرتے تھے تو ان کی آنکھوں میں خاص چمک اور ان کی باتوں میں خاص تاثیر پیدا ہو جاتی تھی ——— ان سے ملنے کا جن لوگوں کو موقعہ ملا۔ ان کو اس چیز نے اتنا متاثر کیا کہ ان کے دل میں بھی ان باتوں کا شوق پیدا ہو گیا۔ لاہور میں ایسے فیض یافتہ اور تربیت یافتہ لوگوں کی خاصی جماعت پیدا ہو گئی تھی جس کا ہر ہر فرد شیرانی صاحب کے زیرِ اثر کسی نہ کسی موضوع کی تحقیق میں لگ گیا تھا ——— ان کی ذات اس زمانے میں علم کا منبع اور ان کا گھر طالبانِ تحقیق کا مرجع بن گیا تھا۔ اس کے لئے ان کا علم بھی سہارا تھا اور ان کا اخلاق بھی!

شیرانی صاحب زندگی کے آخری ایام میں اختر شیرانی سے مایوسی کی وجہ سے بہت کبیدہ خاطر اور افسردہ رہتے تھے مگر کتب خانے کی محبت اور اختر کے بچوں سے وابستگی ان کے لئے کچھ نہ کچھ سامانِ راحت مہیا کرتی رہی۔ یوں بچوں کے ساتھ انھیں عموماً اُنس تھا چنانچہ پروفیسر محمد اقبال صاحب مرحوم کے سب صاحبزادے انھیں اپنے اختر سے کچھ زیادہ ہی عزیز تھے اور یہ برخوردار بھی ان سے اتنے بے تکلف اور مانوس تھے کہ جمعرات یا اتوار کی شام ماڈل ٹاؤن پہنچنے کا جو معمول تھا اگر اس میں کہیں فرق آتا تو بہت بے چین رہتے اور دوسرے دن پروفیسر شیرانی سے خوب جواب طلبی ہوتی بغرض یہ کہ شیرانی صاحب کی سیرت بڑی دلکش اور ان کی شخصیت عجب کمالات کا مجموعہ تھی۔ ان کا علم جتنا وسیع اور گہرا تھا ان کی شرافت اور بلند انسانیت اسی قدر لامثال اور لازوال تھی۔ جن لوگوں کو اپنی زندگی میں ان سے کچھ ربط پیدا ہوا وہ انھیں کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔ نہ اس وجہ سے کہ وہ بڑے عالم اور محقق تھے بلکہ اس وجہ سے بھی کہ وہ بڑے پاکیزہ سیرت انسان تھے۔ ان کی بوالعجبیاں بڑی دلکش تھیں مگر تھے وہ با اصول: ان کی ناراضگی بھی مطابقِ آئین تھی اور ان کی رضامندی بھی مطابقِ آئین ——— مگر کونسا آئین؟ آئینِ شرافت! آئینِ انسانیت! یہی دو جملے شیرانی صاحب کی سیرتِ محمود کے کلیدی جملے ہیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ

مرزا عصمت اللہ بیگ

مرزا فرحت اللہ بیگ میرے چچا زاد بھائی تھے۔ گھر میں کوئی تو انہیں بھائی کہتا تھا کوئی بھائی جان۔ کوئی فرحت میاں کہتا تو کوئی مرزا صاحب، کوئی آکا کہتا تھا تو کوئی آکا بھائی۔ مگر میں ان کے والد مرزا حشمت اللہ بیگ کو آکا بھائی کہتا تھا اور مرزا فرحت اللہ بیگ کو بھائی فرحت۔ میرے منہ پر یہی نام چڑھا ہوا ہے اس لئے میں اس مضمون میں ان کو بھائی فرحت ہی کہوں گا۔

جس طرح عرب اپنے گھوڑوں کا شجرہ جان کے برابر رکھتے ہیں بس اسی طرح دلّی والے غدر سے پہلے اور غدر کے بعد اپنے شجرے اور حسب نسب کے معاملے میں عربوں سے بھی دو قدم آگے تھے۔ خدا بخشے ہمارے چچا عنایت اللہ بیگ رات دن بیٹھے کاغذ پر کاغذ چپکاتے اور لمبے لمبے پٹے بنا ڈالتے تھے۔ کبھی ان میں شنجرف سے لکھتے، کبھی روشنائی سے، کبھی زعفران سے لکھتے اور کبھی سیاہی سے۔ کبھی ادھر کی ڈالی اُدھر کر دیتے، کبھی اُدھر کی شاخ ادھر لگا دیتے اور اس طرح برگ و بار پر نام لکھ کر بیل منڈھے چڑھاتے رہتے تھے۔ یہ شوق بھائی فرحت کو بھی تھا مگر اتنی شدت کا نہیں تھا۔ ہاں مہینے دو مہینے میں وہ اپنے لمبے چوڑے گز بھر شجرے کی ضرور زیارت کر لیتے تھے۔ جوڑ اور پیوندوں کا معائنہ کرتے۔ بعض پتوں میں رنگ بھر دیتے اور آخر میں دھونی دے کر پھر صندوق میں حفاظت سے رکھ دیا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے شجرے میں جا بجا نظم کی شاخیں بھی لگا دی ہیں۔ اس کے دو ایک بند آپ بھی سنئے، پھر آپ کو پتہ چل جائے گا کہ ان کے بزرگ کہاں سے آئے، کیسے آئے اور کہاں کہاں نکلے۔ اس سے زیادہ آپ کو خاندانی چھان بین کرنا ہو تو ان کا شجرۂ نسب مضامین فرحت حصۂ چہارم میں دیکھ لیجئے۔ اچھا تو دو بند ملاحظہ فرمایئے:۔

ختن سے چلے مثلِ ریگِ رواں لئے ہاتھ میں تیغ و تیر و کماں
جمائے بدخشاں پہ اپنے نشاں حکومت کی لی ہاتھ میں پھر عناں
جہاں رہ پڑے ہو گیا وہ وطن

لڑائی بھرت پور کی جب چھڑی مدد لیک کی جا کے ہم نے ہی کی
ہمیں سے یہ آخر مہم سر ہوئی وہاں سے نکل راہ دہلی کی لی
جہاں رہ پڑے ہو گیا وہ وطن

بھائی فرحت کہا کرتے تھے کہ میں خالی[1] کے مہینے میں پیدا ہوا تھا۔ میں کہتا تھا کہ اگر آپ یہ بتا دیں کہ انگریزی مہینہ کون سا تھا تو میں زائچہ کھینچ کر ابھی آپ کی زندگی کے پورے حالات بتا دیتا ہوں۔ وہ کہتے میاں! تم کیا بتاؤ گے میں اپنے حالات تم سے زیادہ بتا سکتا ہوں تم نے وہ شعر نہیں سنا؟

کیا لایا تھا سکندر کیا لے گیا جہاں سے
تھے دونوں ہاتھ خالی باہر کفن سے نکلے

——بس میری زندگی کا یہی لب لباب ہے۔ بچپنا گزرا، جوانی گزری، لیجئے بڑھاپے صاحب تشریف لے آئے۔ اب اس مہینہ کا ایک اثر باقی ہے اور وہ یہ کہ میں خالی ہاتھ آیا اور بس اسی طرح خالی ہاتھ پیٹ سے مر جاؤں گا۔ خیر یہ تو باتیں تھیں مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ خالی کے مہینے نے چاہے کوئی دوسرا اثر کیا ہو یا نہ کیا ہو مگر اتنی بات ضرور ہے کہ نہ تو کبھی ان کا دماغ خالی رہا، نہ کبھی ہاتھ خالی رہے اور نہ کبھی کوئی ان کا منصوبہ خالی گیا۔ وہ معمولی[2] درجہ سے ترقی کرتے ہوئے بڑے سے بڑے درجہ تک پہنچے، ہزاروں روپے کمائے، ہزاروں اٹھائے، بڑی نیک نامی سے زندگی بسر کی اور جس خوبی اور خوش اسلوبی سے اپنے فرائضِ سرانجام دیے۔ وہ ہر شخص کی زبان پر ہیں۔ ان کی تحریر اور تقریر میں بلا کی روانی تھی۔ ایک دریا تھا کہ ساحلوں پر سے چڑھتا ہوا، ٹیلیوں اور ٹیلوں سے ٹکراتا ہوا بڑے جوش و خروش سے بہتا چلا جاتا تھا۔ پھر لطف یہ کہ فرائضِ منصبی کی ادائیگی اور سرکاری جھگڑوں کے باوجود دلفزلِ ذوق، ہر فن میں ہوں استاد مجھے کیا نہیں آتا، کے مصداق بنے ہوئے تھے۔ مصوری کا انہیں شوق تھا۔ عکاسی اور فوٹو گرافی میں انہیں مہارت تھی، ڈرامہ لکھنے اور کرنے میں وہ مشّاق تھے، مضمون نگاری کا انہیں شوق تھا، اور شعر و شاعری کا انہیں ذوق تھا۔ اور پھر کمال یہ کہ جس فن میں ہاتھ ڈالا اسے اس خوبی اور خوش اسلوبی سے کر دکھایا کہ بڑے بڑے ماہرِ فن جو ہم چو من دیگرے نیست کے نعرے لگاتے تھے۔ وہ بھی دم بخود ہو گئے اور ان کا لوہا مان گئے۔

اس مضمون کے ساتھ بھائی فرحت کی تصویر بھی ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ اس سے ان کا اصلی رنگ روپ اور وضع قطع پوری طرح ظاہر نہیں ہوتی۔ اس تصویر میں آنکھیں بڑی معلوم ہوتی ہیں، چہرے پر جا بجا روشنی اور سائے کے اثرات ہیں، ٹیڑھی مانگ نکلی ہوئی ہے۔ بال جمے ہوئے ہیں اور وہ اس طرح سوٹ ڈانٹے بیٹھے ہیں کہ بس پورے یورپین معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے میں ان کی قلمی تصویر پیش کرتا ہوں۔ خود انہی کا شعر ہے سہ

مان لیتے ہیں کہ ہم شکل میں گلفام نہیں
کچھ برے بھی نہیں یوں دیکھ تو دو چار میں ہم

مرحوم کا چہرہ کسی قدر لمبا تھا۔ اسے چہرہ نویسوں کی اصطلاح میں کتابی چہرہ کہتے ہیں۔ پیشانی چوڑی اور بھویں کشادہ تھیں۔ ماتھے کی شکنیں اور ابرو کے بل پختہ خیالی، تیز فہمی، اصابتِ رائے اور مستقل مزاجی ظاہر کرتے تھے۔ عقاب جیسی چھوٹی اور تیز آنکھیں تھیں۔ کبھی سوچتے وقت یا تصویر بناتے وقت اپنی دائیں آنکھ اس طرح بند کر لیتے تھے جس طرح نشانہ تاکتے وقت شکاری، یا تصویر کے اثرات دیکھتے وقت، حسن کار اپنی آدھی آنکھ بند کر لیتا ہے۔ ناک اونچی اور سیدھی تھی مگر نتھنے ذرا پھیلے ہوئے تھے۔ مونچھیں بھری ہوئی تھیں مگر بال تتر بتر رہتے تھے۔ ٹھوڑی اور دہانہ چوڑا تھا مگر چاہِ زنخداں کنوئیں سے نہر بن گیا تھا۔ رنگ سیب کی طرح سرخ و سفید تھا اور سر کے بال کھچڑی تھے۔

---

[1] ذی قعدہ کے مہینے کو دلّی کی عورتیں خالی کا مہینہ کہتی ہیں۔ بھائی فرحت ستمبر ۱۸۸۳ء میں پیدا ہوئے تھے۔

[2] ۱۹۰۵ء میں گورنمنٹ اسکول چادر گھاٹ کی مددگاری پر تقرر ہوا۔ چند روز کے بعد ہائی کورٹ کے مترجمی کی خدمت پر مامور ہوئے۔ پھر اسپیشل مجسٹریٹ ہوئے۔ اس کے بعد سیشن جج ہوئے اور آخر میں ہائی کورٹ کے انسپکٹنگ آفیسر مقرر ہوئے یہ خدمت ہائی کورٹ جج کے مساوی تھی۔

پہلے سفید بال چنواتے تھے اور اب کالے بال چنواتے رہتے تھے۔ قد اونچا، سینہ چوڑا اور جسم ورزشی تھا۔ بڑی انکساری سے جھک کر بھی چلتے تو سینہ دو چار انچ آگے ہی نکلا رہتا تھا۔ ورزش چھوڑنے سے توند نے ذرا سرکشی شروع کر دی تھی۔ اس لئے اکثر اسے دباتے رہتے تھے اور کبھی کبھی ڈاکٹر غلام یزدانی یا اپنے کسی رشتہ دار کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پیٹ پر پھرا پھرا کر کہتے تھے کہ ارے میاں دانی ذرا میری توند تو دیکھ کہ کتنی بڑھ آئی ہے۔ روزانہ ڈاڑھی اپنے ہاتھ ہی سے مونڈتے تھے اور ہمیشہ ٹھوڑی پر پہنچ کر چرکا کھاتے تھے۔ کبھی کبھی آخر میں یہ شعر بھی پڑھ دیتے تھے ؎

ڈاڑھی تو منڈاتے ہو مونچھیں بھی منڈا ڈالو!
تب نکلے گی اے فرحت کچھ صورتِ مردانہ

انگریزی لباس پسند نہیں کرتے تھے۔ اگر کسی خاص مجبوری کے تحت پہن لیتے اور کوئی اس میں نقص نکالتا تو فوراً کوٹ پتلون اور ٹائی اتار کر ایک طرف پھینک دیتے اور شیروانی ڈانٹ لیتے تھے۔ انہوں نے ایک خاص موقع پر فرسٹ کلاس سوٹ بنوائے اور ایک دو دن پہننے کے بعد اپنے عزیزوں کو یہ کہہ کر دے دئے کہ یہ بخشو و بردمے دل شہریار۔ ہمیشہ پمپ شوز پہنتے تھے کہ پائتابوں کی مصیبت سے بچے رہیں۔ ململ کا مہین کرتا پہنتے تھے جس میں سے جسم اور سینے کے سنہری روپہلی بال ریشم کے لچھوں کی طرح چمکتے ہوئے نظر آتے تھے۔ چوڑی مہری کا پاجامہ پہنتے جس میں ایک معمولی سا ازاربند لٹکتا رہتا تھا اور اس کے ایک سرے میں چھوٹی سی کنجی بندھی رہتی تھی۔ یہ کنجی اس قلمدان کی تھی جس میں نقد رقم، ہزاروں روپوں کا حساب کتاب اور سب سے قیمتی چیز یہ کہ ان کے شاہکار، تازہ غزلوں اور مضامین کے مسودات کا خزانہ بند رہتا تھا۔

بھائی فرحت نہایت سیدھے سادے اور بے لوث آدمی تھے۔ انہیں نمائشی باتیں، ظاہرداری اور ظاہری ٹیپ ٹاپ ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی مگر حیدرآباد کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ کہاوت ہے، ”حیدرآباد نگینہ، نیچے مٹی اوپر چونا“ یہاں کا طرزِ تمدن اور تہذیب و معاشرت ہندوستان سے بالکل جدا ہے۔ ظاہرا ٹیپ ٹاپ ایسی کہ آپ دیکھ کر دنگ رہ جائیں، موٹر بھی ہے، شوفر بھی ہے، شوفر کا ڈریس بھی ہے، کپڑے بھی ٹیپ ٹاپ کے ہیں۔ ڈرائنگ روم بھی فرسٹ کلاس ہے۔ عہدہ داروں سے ملنے جاؤ تو گھنٹوں دروازہ پر لٹکتے رہو۔ یار لوگ ان سے ملتے ہیں تو سر خم کر کے فرشی سلام جھاڑتے ہوئے رکوع میں پہنچ جاتے ہیں پھر ہاتھ جوڑ کر جی تقصیر! جی سرکار! اور بجا ہے سرکار! کے سوا دوسری بات زبان سے نہیں نکالتے۔ مرزا صاحب بھلا ان باتوں کو کہاں ماننے والے تھے۔ وہ بڑے بڑوں سے برابری سے ملتے تھے۔ دور سے ہی آداب عرض کا پتھر کھینچ مارتے تھے۔ اور بات کرتے وقت زیادہ سے زیادہ جناب کہتے، باقی گر آپ پر ٹالتے، اور جس سے زیادہ میل جول ہوتا اسے تم، اسے یا تو تکار پر ہی ٹرخاتے رہتے تھے۔

ان کا ڈرائنگ روم تو دیکھنے کے قابل تھا۔ گو نمائشی نہ تھا مگر نمائش میں رکھنے کے قابل تھا اور اگر یہ پتہ چلتا کہ یہ جج صاحب کا ہے تو شاید طلائی تمغہ بھی مل جاتا۔ ورانڈہ میں دو چار آرام کرسیاں اور دس بارہ معمولی کرسیاں پڑی رہتی تھیں۔ شاید ہراج سے خرید لائے تھے۔ دیوار پر خود ان کی بنائی ہوئی تصویریں لٹکتی رہتی تھیں ــــ قطب مینار تھا، جامع مسجد دہلی تھی۔ خواجہ صاحب کی درگاہ تھی، خطِ گلزار اور خطِ کوفی میں کلمہ شریف تھا۔ میر پنجہ کش اور چند دوسرے استادوں کے قطعات تھے جو خود انہوں نے کاپی کر کے بڑی دیدہ ریزی سے بنائے تھے۔ انہیں استاد عارف (دہلی کا مشہور مصور) کی شاگردی پر فخر تھا اور اپنی مصوری اور اپنی بنائی ہوئی تصویروں پر بڑا ناز تھا۔ ہائی کورٹ کے جج آتے تو وہیں بیٹھتے، صدرالمہام آتے تو وہیں بیٹھتے اعیانِ حکومت اور وزرائے سلطنت آتے تو وہیں تشریف فرما ہوتے اور ادیب اور شعراء آتے تو وہیں اپنی محفل جماتے مگر جو آتا ان کی مصوری کی داد دیتا تھا اور تصویروں کی تعریف کرتا تھا اور یہ پھولے نہیں سماتے تھے۔

اپنے چند اونچے طبقہ سے تعلق رکھنے والے، فیشن ایبل دوستوں کی زور زبردستی اور مسلسل فرمائشوں سے تنگ آ کر ایک فرسٹ کلاس موٹر بھی خریدی اور ڈرائنگ روم بھی بنایا۔ اسے عصری اور جدید نمونوں کے فرنیچر سے سجایا، خوبصورت اور قیمتی پائدانز اور قالین بچھائے، مصری اور اجنتا آرٹ کے

خوش رنگ پردے آویزاں کئے اور موقع موقع سے بہترین آرٹسٹ اور حسن کاروں کے شاہکاروں سے ڈرائنگ روم کو آراستہ و پیراستہ کیا مگر وہ ہمیشہ بند پڑا رہتا تھا اور خود بدولت تخت پر اکڑوں بیٹھے ہوئے مضمون لکھنے رہتے تھے۔ اس سے فرصت ملتی تو چاندنی کے فرش پر مختلف رنگ اور مختلف نمونوں کے نودس تکیے سرہانے، بازو، سر کے اوپر، سر کے نیچے، پاؤں کے اوپر اور دونوں پاؤں کے بیچ میں رکھ کر اس طرح پڑ جاتے تھے جس طرح چاندنا لوں میں لپٹا ہوا رہتا ہے۔ پھر خطِ مستقیم سے بھی کم جگہ گھیرتے تھے یعنی پاؤں سکیڑ کر گھٹنے پیٹ سے ملا دیتے اور گڑی مڑی ہو کر پڑ جاتے تھے۔ کہتے تھے "میاں! جو مزہ فرش پر لوٹ مارنے میں آتا ہے وہ بات آرام کرسی اور صوفوں میں کہاں ہے؟"

بھائی فرحت کو کتب بینی کا بہت شوق تھا۔ ہراج خانوں (نیلام گھر) سے، کباڑیوں کی دکانوں سے، کتب فروشوں کے مکانوں سے، غرض جہاں سے کتابیں ملتیں چن چن کر پورٹ کا پورٹ باندھ کر لے آتے تھے۔ پھر انہیں ایسا پڑھتے تھے کہ بس نام اللہ کا۔ بقول شخصے دیمک کی طرح چاٹ جاتے تھے۔ مطالعہ کے طریقے بھی نرالے تھے۔ اکڑوں بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ آلتی پالتی مار کر پڑھتے تھے، دوزانوں بیٹھ کر پڑھتے تھے، گڑی مڑی ہو کر پڑھتے تھے۔ چائے پیتے وقت ایک ہاتھ میں چائے کی پیالی رہتی اور دوسرے ہاتھ میں کتاب، کھاتے وقت بائیں ہاتھ میں کتاب رہتی، سیدھا ہاتھ برابر کابی میں پڑتا رہتا اور خود آنکھیں جمائے کتاب پڑھتے رہتے تھے۔ غرض جب تک کتاب ختم نہیں ہوتی کھانے پینے کا ہوش نہیں رہتا تھا۔ اس وقت کوئی ملنے آجاتا تو بڑے جز بز ہوتے۔ کہتے تھے "اماں لمڈے! ذرا دیکھ تو کون آیا ہے۔ موٹر پر آیا ہے یا رکشا پہ؟" قہرِ درویش برجانِ درویش۔ جانتے اور بڑی ترکیب سے پنڈ چھڑا کر آجاتے۔ انہیں تواریخ، دیوان اور تذکرے جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ خدا جھوٹ نہ بلائے تو ان کے کتب خانہ میں کوئی دو ہزار کتابیں ہوں گی۔ جن کا نام، نمبر اور مقام زبان پر تھا۔ اِدھر کسی نے کتاب کو ہاتھ لگایا اور انہوں نے غل مچایا۔ خدا معلوم کیسے معلوم ہو جاتا تھا کہ فلاں کتاب جگہ پر نہیں ہے۔

مضمون ہو یا غزل ایک بیٹھک میں ختم کر دیتے تھے۔ لکھتے وقت ہاتھ نہیں رکتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسپِ قلم میدانِ فصاحت میں چوکڑیاں بھر رہا ہے، اِدھر مضمون ختم ہوا اور ان کے پیٹ میں چوہے دوڑے۔ فوراً موٹر پر بیٹھ سب سے پہلے ڈاکٹر غلام یزدانی صاحب کے پاس پہنچتے۔ دونوں میں دانت کاٹی روٹی تھی، دونوں لنگوٹیے یار تھے اور دونوں رشتہ دار ہونے کے علاوہ ہم مکتب، ہم مدرسہ اور ہم سبق بھی تھے۔ سب لوگ تو زبردستی کی تعریف کر دیتے مگر غلام یزدانی صاحب لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے بلکہ فوراً ٹوک دیتے تھے۔ اگر لفظوں میں کوئی خامی یا خیالات میں کوئی پیچ و خم ہوتا تو انہیں سیدھے رستہ پر لے آتے تھے۔ بھائی فرحت ڈاکٹر غلام یزدانی کو دانی کہتے تھے۔ ایک جگہ ان کے متعلق لکھتے ہیں:

میری اندازِ روش پہ بہرِ اصلاحِ خیال!
محتسب سے کم نہیں فرحت مرا دانی مجھے

چلتے چلتے ایک لطیفہ بھی سن لیجئے۔ بھائی فرحت کا لکھا ہوا نذیر احمد کی کہانی والا مضمون بی۔ اے کے کورس میں تھا۔ اس میں بھی غلام یزدانی صاحب کو جگہ جگہ دانی لکھا ہے۔ ایک طالب علم نے پروفیسر صاحب سے پوچھا کہ جناب یہ دانی کیا معنی؟ پروفیسر صاحب نے فرمایا کہ دانی دانستن سے مشتق ہے۔ اس کے معنی ہیں آگہی۔ پرانے شعراء لفظ ہاتف لاتے تھے۔ مگر مرزا فرحت اللہ بیگ دورِ جدید کے شاعر ہیں۔ اس لئے آپ نے بجائے ہاتف کے دانی کو اپنا دوست بنایا ہے اور لفظ دانی استعمال فرمایا ہے۔ یعنی آگہی یعنی عقل۔ اسے نوٹ کر لو۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ سب سے پہلے وہ مضمون ڈاکٹر غلام یزدانی کو سناتے پھر چھپنے کے لئے بھیج دیتے تھے۔ پھر کیا تھا۔ ہندوستان کے کونے کونے سے تعریف اور تحسین کا شور بلند ہو جاتا۔ عظمت اللہ خاں مزے لے لے کر تعریف کرتے۔ عبدالحق صاحب ہمت بڑھاتے۔ سراج یار جنگ بیٹھ بیٹھے چٹکیاں لیتے، عنایت اللہ اور وحیدالدین سلیم مرحوم تعریفوں کے پل باندھتے تھے، نواب مسعود جنگ بہادر دل بڑھاتے تھے اور مہاراجہ بہادر خوش ہو کر گھڑیاں عنایت فرماتے اور قیمتی قیمتی تحفوں سے سرفراز فرماتے رہتے تھے۔

شاعری تو بھائی فرحت کے ورثے میں آئی تھی۔ مومن خان، غالب، حکیم آغا جان عیش اور سعادت یار خان رنگین سے لے کر خاندان کے ہر فرد کو سخن سنجی کا دعویٰ تھا۔ اس حساب سے دیکھا جائے تو بھائی فرحت نے بقول شخصے شاعری کی گود ہی میں پرورش نہیں پائی تھی بلکہ اس کے کاندھوں پر بھی کودے تھے، توند پر بھی اُچکے تھے۔ اور دولتیاں جھاڑی تھیں۔

ان کے زمانے میں حیدرآباد میں چوٹی کے شاعر موجود تھے۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد آنجہانی، نواب فصاحت جنگ استاد جلیل مرحوم، مولانا علی حیدر طباطبائی (حیدر یار جنگ) کپتان اعجاز حسین شہرت وغیرہ۔ مولانا تو بڑے بڑے شاعروں کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے مگر بھائی فرحت کے بے حد مدّاح تھے۔ کہتے تھے کہ مرزا صاحب کو تو شاعری ورثہ میں ملی ہے۔ غرض سب کے سب مدّاح تھے۔ عزت کرتے تھے اور طرح طرح سے ان کا دل بڑھاتے تھے۔ حضرت بے نظیر شاہ تو اتنے گرویدہ تھے کہ اگر کوئی ان سے پوچھتا کہ ہندوستان میں کتنے شاعر ہیں تو میرے خیال میں وہ صرف ڈیڑھ شاعر ہی گنواتے۔ ان میں سے ایک تو خود کو بتلاتے اور دوسرا آدھا شاعر بھائی فرحت کو بتا دیتے۔

لگے ہاتھوں ان کا ایک لطیفہ اور سن لیجئے۔ بھائی فرحت استاد جلیل سے ملنے گئے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ وہاں اختر یار جنگ (اختر مینائی، امیر مینائی مرحوم کے صاحبزادے) بیٹھے تھے اور بھی کئی شاعر موجود تھے۔ اختر یار جنگ نے ایک شعر پڑھا جس میں فکر مونث باندھا تھا۔ استاد جلیل نے مسکرا کر بھائی فرحت سے پوچھا کہ فکر کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ کہنے لگے میں تو دونوں طرح باندھتا ہوں۔ فرمایا۔ وہ کیسے؟ کہنے لگے کہ جب دیکھتا ہوں کہ واقعی کوئی زبردست فکر آ پڑا ہے تو مذکر باندھتا ہوں اور اگر کوئی چھوٹی موٹی ہے تو اسے مونث باندھ جاتا ہوں۔

بھائی فرحت کو بڑی بوڑھیوں سے اگلے زمانے کے قصے سُننے کا بہت شوق تھا۔ بلکہ طالب علمی کے زمانے میں ایک تاریخی مضمون لکھ کر ارکنٹ پرائز بھی حاصل کیا تھا۔ مضمون کا عنوان تھا "بڑی بوڑھیوں سے سُنے سُنائے غدر کے حالات۔"

خواجہ امان مترجم بوستانِ خیال رشتہ میں بھائی فرحت کے دادا ہوتے تھے۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ رات کے وقت چھوٹے بڑے ان کے گرد جمع ہو جاتے۔ وہ قصے کہتے تھے۔ عیاروں کی عیاریاں اور پیچ در پیچ طلسمات کے واقعات سُناتے تھے اور جو قصہ رات کو کہتے اسی کو دوسرے روز بوستانِ خیال میں لکھ دیتے تھے۔ بھائی فرحت نے بڑی بوڑھیوں سے جب یہ داستان سُنی تو انہیں بھی قصہ گوئی کا شوق چرایا۔ پھر کیا تھا داستان گوئی شروع کر دی۔ رات کے بارہ بارہ بجے تک یہ اپنی داستان بڑے زور شور سے سناتے تھے۔ لوگوں کی دلچسپیاں اتنی بڑھ گئی تھیں کہ دن بھر سوتے رہتے اور رات کو آلتی پالتی مار کر داستان سننے کے لئے بیٹھ جاتے تھے۔ ایک نوکر تھا۔ ہم سب اسے مونگا کہتے تھے۔ شاید بھائی فرحت کے ساتھ بچپن میں کھیلا بھی تھا، کتابیں لے کر مکتب بھی جاتا ہوگا۔ چیچک نکلی اور نابینا ہوگیا۔ وہ حقہ پر حقہ بھر کے لاتا تھا، خود بھی بیچ بیچ میں دو دم مار لیتا۔ پاؤں بھی دباتا جاتا اور بڑے غور سے داستان سُنتا رہتا۔ چند روز کے بعد اچھا خاصا داستان گو بن گیا۔ بھائی فرحت اس کا بہت خیال رکھتے تھے اور ہر طریقے سے اس کی مدد کرتے رہتے تھے۔ جب وہ حیدرآباد آئے تو اس کو بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ یہاں آکر اس نے پیٹ پر سے پاؤں نکالے۔ کپڑے زوردار پہنتا تھا۔ بھائی فرحت کا جوتا اور ٹوپی تو مہینوں صاف نہیں ہوتی تھی مگر مونگا صاحب کی گرگابی پر روز پالش اور شیر گولہ ترکی ٹوپی پر روز استری ہونا لازمی تھا۔ جامہ وار کی شیروانی زیب تن کئے، کالر لگائے، پاؤں میں کالے ریشمی پاتابے ڈٹائے، آنکھوں میں دھوپ کی عینک چڑھائے اور ہاتھ میں گُپتی لے کر نکلتا تو کس کی مجال تھی کہ اسے نوکر کہتا۔ مالک سے زیادہ نوکروں پر حکم چلاتا اور اپنا رعب داب رکھتا تھا۔ یہاں آئے تو مونگا صاحب سے محمد حسین ہو گئے۔ چند روز میں دور دور تک رسائی ہو گئی۔ لوگ دعوتیں دیتے، گاڑی بھیج کر بلاتے اور اس سے داستان سُنتے رہتے تھے۔ جب کوئی اس کا حسب نسب پوچھتا تو کہہ دیتا کہ میں مرزا فرحت اللہ بیگ کا رشتہ کا بھائی ہوں۔ کوئی اعتراض کرتا کہ میاں تم حسین وہ بیگ یہ کیا معمّہ ہے۔ وہ بھی تھا آٹھوں گانٹھ کمیت۔ کہتا کہ جناب اس خاندان کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ اس خاندان میں ایسے ہی نام ہیں۔ دیکھئے نا۔ خواجہ قمر الدین خان ان کے دادا ہیں۔ غلام یزدانی ان کے عزیز ہیں۔ عزیز مرزا ان کے عزیز ہیں اور فصیح الدین ان کے نزدیک کے رشتہ دار ہیں۔ یہ دندان شکن جواب سُن کر

سب کے دانت کھٹے ہو جاتے تھے۔ کسی نے جا کر بھائی فرحت کو یہ رپورٹ دی تو وہ سُن کر بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے کہ میاں سب بھائی بھائی ہیں۔ بنی آدم اعضائے یک دیگر اند۔ اگر اس نے بھائی کہہ دیا تو کیا گناہ کیا۔ اس کے بعد وہ اس سے اور زیادہ محبت کرنے لگے۔ بلکہ جب اپنا مکان بنایا تو اس کے لئے علیحدہ ایک کمرہ تعمیر کروا دیا کہ وہ آرام سے رہے۔ افسوس کہ گزشتہ سال وہ بھی مرگیا۔

اس داستان گوئی کی بدولت بھائی فرحت کو گپ مارنے کی بھی عادت ہو گئی تھی۔ گپ سے حاشا اللہ میرا یہ مطلب نہیں کہ اناپ شناپ اور لغو باتیں بلکہ باتوں باتوں میں بعض وقت وہ ایسے واقعات اور مناظر پیش کر جاتے تھے جو انہوں نے خواب میں بھی نہیں دیکھے تھے اور یار لوگ چشم دید واقعات سمجھ کر تعریفیں کرتے تھے۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ کسی صاحب نے اپنی سیر و سیاحت کا ذکر چھیڑا۔ جوگ فال کی بڑی تعریف کی۔ آبشار کے کئی رُخ بتلائے اور ایک تصویر بتائی جو انہوں نے خود کھینچی تھی۔ بھائی فرحت کب ماننے والے تھے۔ کہنے لگے جناب! آپ نے زاویے تو اتنے بتائے مگر تصویر غلط زاویے سے لی اگر آپ اسے بجائے بمبئی بنگلے کے میسور بنگلے سے لیتے تو راجہ فال، روور، راکٹ، اور ڈیم بلاش چاروں کے چاروں آبشار صاف گرتے ہوئے دکھائی دیتے۔ پھر شموگا کی گھاٹیوں اور آبشاروں کے مناظر کی ایک دلچسپ تصویر کھینچی، بلندی بتائی۔ اس کا مقابلہ دوسرے آبشاروں سے کیا، آر دسے اور نیاگرا فال کا ذکر کیا جسے سُن کر سیاح صاحب پانی پانی ہو گئے اور لطف یہ کہ اپنی غلطی کا بھی اعتراف کیا کہ واقعی وہ میسور بنگلے نہ جا سکے اور یہ ارمان ان کے دل ہی میں رہ گیا۔ جب وہ گردن جھکا کر چل دیئے تو میں نے بھائی فرحت سے پوچھا کہ بھائی! آپ میسور سیاحت دیکھنے کب گئے تھے؟ کہنے لگے "میاں گیا ویا کون تھا۔ میسور گائڈ میں یہ سب کچھ موجود ہے۔ میں نے دیکھا کہ یہ گپیں لگا رہے ہیں تو میں نے بھی ایک گپ لگا دی۔"

بھائی فرحت کے بعض رشتہ دار یورپ کے سفر کو گئے۔ جب وہ واپس آئے تو بھائی فرحت نے کہا کہ میاں! زبردستی تم نے روپیہ کیوں ضائع کر دیا؟ کہنے لگے کہ بھائی ہم نے اس سفر میں بڑے بڑے عجائب دیکھے۔ اور یہ بغیر سفر کے معلوم ہی نہیں ہو سکتے۔ کہنے لگے کہ جناب جو عجائب اس وقت آپ بیان کر رہے ہیں اس سے زیادہ دلچسپ باتیں اور عجائبات تو میں گھر میں بیٹھا بیٹھا بیان کر دوں گا۔ چنانچہ دوسرے روز انہوں نے یورپ کا سفرنامہ لکھ کر سُنایا اور اسے شائع بھی کرا دیا جو لوگوں کو بہت پسند آیا۔ وہ شاید کورس میں بھی داخل ہو گیا تھا۔ اور ان کے رشتہ داروں نے جو سفرنامہ مرتب کیا اسے کسی نے پوچھا تک نہیں بلکہ بعض اہلِ قلم نے تو اعتراض بھی جڑ دئے تھے۔

بات یہ ہے کہ ہر شخص گپ نہیں مار سکتا۔ اس میں تخیل، ذکاوت اور ذہانت کی ضرورت ہے۔ اس قسم کی گپ گپ نہیں بلکہ ادبی شاہکار بن جاتی ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ وہ کسی کشتی کا ذکر کر رہے تھے جو انہوں نے دیکھی ہی نہیں تھی۔ پہلے دونوں پہلوانوں کی آمد اور ان کے دم خم کا نقشہ کھینچا۔ پھر دونوں کو ایسا لڑایا کہ شاید اصل کشتی دیکھنے والوں کو بھی وہ لطف نہ آئے گا۔ کہنے لگے کہ میاں! دونوں پہلوان جانگیے پہن، چادریں پھینک دنگل میں کودے۔ کودتے ہی دونوں نے ہاتھ بلند کر کے یا علی کا نعرہ مارا۔ دو چار اٹکھیلیاں کھائیں، کچھ مٹی بڑھ کر سینے پر ڈالی۔ اور خم ٹھونک کر سامنے آ گئے۔ میاں اڑنچھو نے داراب کا ہاتھ پکڑ، تڑ کی بغل میں کس کر ایک جھٹکا دیا۔ وہ آگے کو جھکا، یہ کمر پر آ گئے، وہ جیٹ غوطہ مار ہاتھوں کو چیر کر نکل گیا۔ اس نے اس کا سیدھا ہاتھ پکڑ دھوبی پاٹ پر کسنا چاہا۔ وہ توڑ کر کے الگ جا کھڑا ہوا۔ آخر ایک دفعہ اڑنچھو اسے دبا ہی بیٹھا۔ داراب زمین سے چپکا پڑا رہا۔ اڑنچھو نے بغلے کس لئے۔ تھوڑی دیر تک خوب رگڑا۔ وہ سیدھے چلا گیا۔ اس نے پہلو میں گھس کر اس کا سینہ کھولنا چاہا۔ وہ بھی موقع تاک رہا تھا۔ یہ کھینچنے میں ذرا غافل ہوئے۔ اس نے ٹانگ پر باندھ جو اڑایا تو میاں داراب چاروں شانے چت جا پڑے۔ اڑنچھو اچک کر سینہ پر سوار ہو گیا۔ وہ مارا، وہ مارا کی آوازوں سے دنگل دہل گیا۔"

ان کا دل محبت سے لبریز تھا۔ پرانے دوستوں میں امیر چند ڈھانڈا، پران، دھنی چند اور اعجاز حسین کے نام کی مالا جپتے رہتے تھے اور ان کی دوستی کا دم بھرتے رہتے تھے۔ آغا حشر سے بھی پرانی یاد اللہ تھی۔ اور وہ ان کے بڑے مدّاح تھے۔ ممکن ہے کہ کوئی ان کے آگے

آغا صاحب کی برائی کر دے ابھی حشر بپا کر دیتے اور ثابت کر دیتے کہ ہندوستان تو کیا دنیا میں اس کی ٹکر کا کوئی آدمی نہیں۔ کہتے تھے کہ ڈرامہ کے فن کا اگر کوئی واقف کار ہے تو حشر ہے۔ ڈائرکٹر ہے تو حشر ہے۔ اگر وہ چاہے تو بامحاورہ اور سلیس اردو میں اچھے سے اچھا ڈرامہ لکھ سکتا ہے۔ مگر وہ تو تجارت کا بندہ ہے، اسے کیا پڑی کہ وہ معیاری ڈرامہ لکھ کر پبلک سے الگ گالیاں کھائے اور سیٹھ صاحب سے الگ دشمنی مول لے۔ میاں وہ تو میڈن (madan) کا نوکر ہے کوئی بیگن کا نوکر نہیں ہے۔ ۱۹۳۵ء میں حشر کا انتقال ہوا۔ کہتے تھے کہ اس کے مرنے سے اردو ادب کا ایک پہلو بالکل تاریک ہو گیا۔ ایک نظم بھی لکھی تھی جس کا آخری شعر یہ ہے:

جب نہ نعم البدل رہا تو کہا
حشر کی موت اک قیامت ہے

یہی کیفیت عزیزوں کے ساتھ تھی۔ ہر عزیز یہ سمجھتا تھا کہ وہ بہ نسبت دوسرے عزیزوں کے مجھ سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ جو عزیز کہیں سے آتا، ان کے پاس ہی آ کر ٹکتا۔ اگر بیوی کے ساتھ ہے تو دو پلنگ اور اگر اکیلا ہے تو ایک پلنگ۔ ناشتہ اور چائے اور دو وقت کے کھانے کا انتظام ہو جاتا۔ ان کا گھر ہر وقت عزیزوں سے بھرا رہتا تھا، اچھا خاصا جمعیت العلماء کا دفتر معلوم ہوتا تھا۔

پہلی شادی ہوئی مگر چار سال کے بعد بیوی کا انتقال ہو گیا۔ بیوی سے بڑی محبت تھی۔ گھر سے کوئی پانچ میل کے فاصلہ پر خاندانی اڑواڑ[1] تھی مگر آپ روز بلا ناغہ دفتر سے آنے کے بعد، قرآن شریف بغل میں داب قبر پر فاتحہ پڑھنے پیدل جاتے اور تین چار پارے پڑھ کر واپس آتے تھے۔ اس رنگ کو شدت پکڑتے ہوئے دیکھا تو بڑی ترکیب سے ان کی دوسری شادی کر دی۔ تھوڑے دن میں بھول سے گئے اور دوسری بیوی سے بڑی محبت ہو گئی۔ مضمون لکھتے وقت ان کی بیوی سامنے بیٹھ جاتیں اور گلوری پر گلوری بنا کر دیتی جاتیں۔ یہ پان پر پان کھاتے رہتے اور برابر مضمون لکھتے رہتے۔ بال بچے شور مچاتے، آنکھ مچولی کھیلتے، دھینگا مشتی کرتے مگر انہیں تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ ایک ایک بچہ کا منہ چومتے اور پھر لکھنے میں مشغول ہو جاتے۔

اس وقت ان کے دو لڑکے اور پانچ لڑکیاں ہیں۔ بڑے لڑکے کا نام شرافت اللہ بیگ ہے۔ اس میں تو بالکل بھائی فرحت کی خو بو ہے۔ میل جول، لین دین، اور بات چیت میں دوسرا بھائی فرحت معلوم ہوتا ہے۔ چھوٹے لڑکے کا نام رفعت اللہ بیگ ہے، وہ آج کل کراچی میں براج رہے ہیں۔

اگر کوئی رشتہ دار بھائی فرحت کے کپڑے پہن لیتا تو پھر وہ خوشی سے اپنے جامہ میں پھولے نہیں سماتے تھے اور بار بار کہتے تھے "دیکھو تو خدا کی قسم تیرے جسم پر یہ شیروانی کتنی ٹھیک اتری ہے۔ بس معلوم ہوتا ہے کہ ظالم نے اپنا ناپ دے دیا تھا۔" رقمی امداد بھی برابر کرتے رہتے تھے۔ کسی کو کھلم کھلا چار کے سامنے کھنکا کر اور کسی کو آہستہ سے کھسکا دیتے کہ کراماً کاتبین کو بھی خبر نہیں ہوتی تھی۔

وہ آخری دم تک اردو کی خدمت کرتے رہے۔ انتقال سے شاید دو سال پہلے انہوں نے ایک اردو مجلس قائم کی تھی۔ جس کے ممبر سب کے سب منتخب روزگار، سر برآوردہ، صاحب قلم، سخن سنج اور سخن فہم تھے۔ ہر مہینہ کے آخری جمعہ پر بلا ناغہ اس کا جلسہ ہوتا تھا۔ ہر چند کہ انہیں دل کا عارضہ تھا مگر تھے بڑے دل گردے کے۔ اسے خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ اردو مجلس کے اجلاس کا دن آتا تو مرحوم کا دل پھول کی طرح شگفتہ اور تر و تازہ ہو جاتا اور چہرے پر خوشی کی لہریں دوڑتی رہتی تھیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ مومن خان نے اپنے مرنے سے پہلے تاریخ کہی "دست و بازو بہ شکست" اور راہی ملکِ عدم ہوئے۔ غالب نے بھی تاریخ کہی مگر گولی کان پر سے نکل گئی۔ واداہ بدر الدین مترجم بوستانِ خیال ساتویں جلد لکھ رہے تھے۔ لکھتے لکھتے ان کے قلم سے آخری الفاظ یہ نکلے "بس اب تم" اور فوراً بعد ہی باغبانِ قضا و قدر نے قلم ان کے ہاتھ سے لیا اور ان کی شاخِ زندگی کو قلم کر دیا۔ بھائی فرحت کے ساتھ بھی اسی قسم کا واقعہ پیش آیا۔

---

[1] اڑواڑ دلّی والے خاندانی قبرستان کو کہتے ہیں۔

اردو مجلس کا جلسہ ختم ہونے کے بعد سب کو تو رخصت کر دیا اور خاص طور پر آگے بڑھ کر سجاد مرزا صاحب (عزیز مرزا صاحب کے فرزند) کو روکا - یہ آج کل لیبیا میں یو۔ این۔ او کی طرف سے ایجوکیشنل اڈوائزر ہیں۔ اور کہنے لگے کہ بھائی سجاد اب آئندہ اس کا جلسہ تم کو کرنا پڑے گا۔ تم ہی رقعہ چھپوا کر تقسیم کرا دینا اور تم ہی اس کا تمام انتظام کرنا۔ سجاد مرزا صاحب نے آئندہ مہینہ کا فوراً ہی پروگرام بنا کر سنا دیا۔ ان کی آنکھیں پروگرام سن کر چمکنے لگیں۔ کہنے لگے لو بھائی گنگا نہا لئے۔ یہ ایک بڑا فکر تھا مگر اب اطمینان ہو گیا۔ اس کے بعد سجاد مرزا صاحب ان سے ادھر رخصت ہوئے اور ادھر وہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ یعنی ان باتوں کے بعد تین گھنٹے تک اور باتیں کیں اور دوسرے روز اتوار کے دن ۲۶/۲۷ اپریل ۱۹۴۷ء کی درمیانی شب میں وہ چہکتا ہوا بلبل اس گلشنِ عالم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔ مولوی مسعود علی صاحب محوی نے تاریخ کہی:-

تھے فرحت بڑے پہلوانِ سخن　　زبانِ معانی تھے حسانِ سخن
جو وہ اُٹھ گئے اُٹھ گئی ان کے ساتھ　　بہارِ زباں، عز و شانِ سخن
عنادل خزاں آگئی باغ میں　　گیا بلبلِ گلستانِ سخن
۱۹۴۷ء　　۱۳۶۶ھ

حسرت موہانی

جلیل قدوائی

جان کو محوِ غم بنا، دل کو وفا نہاد کر!
بندۂ عشق ہے تو یوں، قطع رہِ مراد کر! (حسرت)

اس ایک شعر میں مولانا حسرت موہانی مرحوم نے اپنی سیرت کے نمایاں ترین پہلو کو نہایت بلیغ انداز میں بیان کر دیا ہے۔ مطلب یہ کہ ایک حق پسند انسان کو اپنا مقصد حاصل کرنے کی خاطر بڑی سے بڑی مصیبت جھیلنے کا باقاعدہ طور پر عادی ہو جانا چاہیئے اور حقیقت میں انہوں نے اس اصول پر عمل کر کے اسے ایک فن کا درجہ عطا کر دیا۔

جس واقعہ کا میں ذکر کر رہا ہوں اسے لوگ بھولتے جا رہے ہیں حالانکہ اپنے زمانہ میں وہ کافی ہنگامہ آرائی کا موجب ہوا تھا۔ واقعہ مذہبی نہیں، سیاسی نہیں، ادبی و علمی نہیں، اصلاحی، بلکہ تعلیمی تھا، ایک اصول کا معاملہ تھا اور اصول کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے کی مجاہدانہ شان مولانا کی زندگی کے اس واقعہ میں بھی موجود ہے۔

تعلیم کے مسئلہ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو معلوم ہے کہ مولانا حسرت موہانی ملک میں ثانوی تعلیم کے مؤید تھے اور مسلمانوں کو کثیر تعداد میں صنعت و حرفت، تجارت و زراعت وغیرہ میں شریک ہونے کے قابل بنانے کے لئے ساعی تھے۔ اس خیال سے وہ مسلمانوں کے لئے ایک ایسی یونیورسٹی چاہتے تھے جسے مدارس کے الحاق کا حق حاصل ہو۔ دوسرے معاملات کی طرح اس معاملہ میں بھی ان کے ہم خیال لیڈر چند ہی تھے اگرچہ رائے عامہ ان کے موافق تھی۔ آخر آخر کم و بیش سارے مسلم زعما نے انگریز کی اس ضد کے آگے کہ ایک غیر الحاقی یونیورسٹی ہی منظور کی جائے گی سر تسلیم خم کر دیا مگر مولانا اپنی ضد پر قائم رہے۔

واقعہ غالباً مئی یا جون ۱۹۱۶ء کا ہے۔ مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے جلسہ سے فارغ ہو کر مولانا حسرت لکھنؤ سے علی گڑھ واپس ہی آئے تھے کہ ان کی خانہ تلاشی ہوئی اور نظربندی کا حکم صادر ہو گیا۔ یہ حکم قانون تحفظ ہند کے تحت دیا گیا تھا جس کی نہ داد تھی نہ فریاد، نہ جرم کی نوعیت بتائی گئی، نہ صفائی کا موقع دیا گیا۔ مولانا پوچھتے ہی رہے مگر بمصداق ؎

کہتے ہیں وہ کہ تیری گذارش ہے نا قبول اک بار کہہ چکے جو ہم ارشاد کر چکے (حسرت)

انہیں کوئی سبب نہ بتایا گیا اور تعمیل حکم پر مجبور کیا گیا۔

مولانا نے تعمیل سے انکار کر دیا اور صوبائی حکومت کے پاس ایک عرضداشت روانہ کی۔ اس پر مقامی حکام سخت برہم ہوئے۔ انہوں نے مولانا کی عرضداشت پر صوبائی حکومت کے فیصلہ کا انتظار بھی نہ کیا اور انہیں زبردستی للت پور لے گئے جہاں حاکم ضلع کی عدالت میں مولانا پر عدول حکمی کا مقدمہ چلایا گیا اور کچھ سُنے سُنائے بغیر "آناً فاناً" دو سال کی سزا دے دی گئی، حالانکہ قانون تحفظِ ہند کے سلسلہ میں حاکم ضلع کو کسی قسم کا اختیار نہ تھا۔ صوبائی حکومت اس قانون کے جرائم کی تحقیقات کے لئے خاص کمشنر مقرر کرتی تھی اور علی گڈھ سے للت پور لے جانے کا تو کوئی سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔

للت پور کے حاکم کے فیصلہ کے خلاف مولانا نے سشن میں اپیل کی۔ وہ خارج ہو گئی۔ پھر انہوں نے معاملہ ہائی کورٹ میں لے جانا چاہا تو یہ درخواست رد کر دی گئی۔ اب صبر کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ شاید ایسے ہی موقع پر کسی دل جلے شاعر نے کہا تھا ؎

وہی قاتل، وہی مخبر، وہی منصف ٹھہرے
اقربا میرے کریں خون کا دعویٰ کس پر؟

مولانا کے ساتھ قیدِ فرنگ کا یہ دوسرا واقعہ تھا۔ اس سے پہلے "اردوئے معلیٰ" میں ایک مضمون "مصر میں انگریزوں کی پالیسی" کو شائع کرنے کے جرم میں ۱۹۰۸ء میں وہ ڈیڑھ سال کی سزا پا چکے تھے۔[1] "چکی کی مشقت" والا شعر[2] اور "مشاہداتِ زندانِ فرنگ"[3] اسی قید کی یادگار ہیں۔ اب جو مولانا پر یہ ظلم ہوا تو ملک بھر میں آگ لگ گئی۔ مختلف مقامات مثلاً متھرا، فیض آباد، میرٹھ، حیدر آباد سندھ، دہلی، کلکتہ، سلطان پور، کیھری، کانپور، علی گڈھ، لکھنؤ، الٰہ آباد، بریلی، مراد آباد، آگرہ وغیرہ میں احتجاجی جلسے ہوئے۔ اخبارات نے مضامین لکھے اور حکومت پر زور دیا گیا کہ مولانا کو رہا کر دیا جائے یا کم از کم علیگڈھ جیل میں رکھا جائے تاکہ وہ بیگم حسرت اور اپنے متعلقین سے قریب رہیں اور ان سے ملنے میں انہیں آسانی ہو مگر حکومت کے کان پر جوں نہ رینگی۔ اس کے سوا یہ ہوا کہ مولانا کو ساری میعادِ قید میں للت پور میں بھی نہ رکھا گیا بلکہ وہاں سے جھانسی، جھانسی سے الٰہ آباد، الٰہ آباد سے پرتاب گڑھ، پرتاب گڑھ سے فیض آباد، فیض آباد سے لکھنؤ[4]

---

[1] اس قید کے کچھ حالات اور مصائب پر ملاحظہ ہو مقدمہ "انتخابِ حسرت" مرتبۂ راقم، مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ، کراچی۔

[2]
ہے مشقِ سخن جاری، چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

[3] رہائی کے بعد مولانا نے اردوئے معلیٰ میں اس عنوان سے اپنی قید کے تجربات پر ایک سلسلۂ مضامین شائع کیا تھا جسے پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

[4] حسرت کی یہ مشہور غزل جس میں انہوں نے اپنے مرشد حضرت مولانا شاہ عبدالرزاق صاحب فرنگی محلی کو یاد کیا ہے لکھنؤ کے اسی قید کے زمانہ کی یادگار ہے ؎

اک خلش ہوتی ہے محسوس رگِ جاں کے قریب
آن پہنچے ہیں مگر منزلِ جاناں کے قریب

حشر میں اپنے گناہوں سے مجھے خوف ہو کیا
ان کی رحمت بھی تو ہے منزلِ عصیاں کے قریب

پلٹے اس ڈھب سے کہ پھر ہو نہ جدا خاک مری
کہیں پہنچے بھی تو اس گوشۂ داماں کے قریب

لکھنؤ آنے کا باعث یہ کھلا آخر کار
کھینچ لایا ہے دل اک شاہدِ پنہاں کے قریب

وہ جو ہیں پاس تو محبس بھی ہے اک باغ ہمیں
کامرانی بھی نمودار ہے حرماں کے قریب

روز ہو جاتی ہے رؤیا میں زیارت حسرت
آستانِ شہِ رزّاق ہے زنداں کے قریب

اس قید میں قیامِ فیض آباد کی یادگار ایک اور غزل ہے جس کا مطلع حسبِ ذیل ہے:

درسِ حق جاری ہے یاں بھی حسرتِ آزاد کا
قید خانہ مدرسہ گویا ہے فیض آباد کا

لکھنؤ سے پھر فیض آباد اور فیض آباد سے میرٹھ منتقل کیا گیا۔ علی گڑھ کے قیام سے تو حکام کو خاص ضد رہی۔ مبادا وہاں مولانا آگ لگا دیں۔ علی گڑھ کو بہرحال ہاتھ میں رکھنا تھا اور جنگِ عظیم کے زمانہ میں تو انگریز کسی قسم کا خطرہ مول لے ہی نہیں سکتا تھا۔

قید کی صعوبتوں اور اس جبری تبدیلیٔ آب و ہوا کے باعث مولانا کی صحت خطرناک حد تک خراب رہنے لگی۔ اخبارات نے پھر غل مچایا کہ انہیں علی گڑھ منتقل کر دیا جائے مگر سب کچھ بیکار ثابت ہوا۔ بیگم حسرت نے گورنر صوبہ سے ملنا چاہا مگر اس میں انہیں ناکامی ہوئی۔ پھر انہوں نے ایک عرضداشت بھیجی اس کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ ڈاکٹر انصاری، خواجہ غلام حسین وغیرہ جیسے اکابر نے مولانا سے دریافتِ صحت اور مالی امداد کے سلسلہ میں ملنا چاہا، اس کی بھی اجازت نہ ملی۔ سبھی کہتے تھے حکومت بتلائے آخر مولانا کا جرم کیا ہے۔ کوئی سال بھر اسی طرح گذر گیا۔ آخر کونسل میں سوالات ہوئے تو حکومت نے اپنے خیال میں بڑا تیر مارا کہ مولانا کی ذات حکومت کے خلاف سخت ترین افعال کی مرتکب ہوئی یا ہونے والی تھی۔

یہ مبہم سا جواب ایسا نہ تھا جس سے اہلِ ملک کی تشفی ہو جاتی۔ چنانچہ اب کونسل کے مسلم و غیر مسلم معزز ممبران نے ایک متفقہ عرضداشت گورنر صوبہ سر جیمس مسٹن کی خدمت میں بھیجی جس میں مولانا کے معاملہ پر ترحم آمیز غور کرنے کی ضرورت پر توجہ دلائی گئی۔ اس عرضداشت کا بھی کوئی نتیجہ عرصہ تک برآمد نہ ہوا تو پھر کونسل میں اس کی بابت سوالات ہوئے جن میں یہ تجویز بھی پیش کی گئی کہ مولانا کی علالت کے پیشِ نظر حکومت انہیں مقررہ شرائط پر ان کی علی گڑھ کی قیام گاہ کی حدود تک نظر بند کر دے۔ کچھ عرصہ بعد حکومت نے اس عرضداشت پر توجہ دینے کا وعدہ تو کیا مگر وہ بھی وفا نہ ہوا۔ سر جیمس مسٹن کا عہدِ حکومت ختم ہونے لگا تو پھر انہیں پبلک جلسوں، اخبارات، بیانات اور ریزولیوشنوں کے ذریعہ یاد دلایا گیا کہ مولانا کے معاملہ کو اپنی روانگی سے قبل طے کرتے جائیں۔

ادھر یہ سب کچھ ہو رہا تھا اُدھر ایک دن یہ خبر مشہور ہو گئی کہ ؎

فکرِ احباب کو ناحق ہے رہائی کا خیال　　اور ہی کچھ ہے تمنّا ترے زندانی کی　　(حسرت)

یعنی حکومت نے مولانا کو چند شرائط پر رہا کرنے کا خیال ظاہر کیا تھا مگر خود مولانا نے رہا ہونے سے انکار کر دیا! بمصداق ؎

حسرت وہ اب ہوئے بھی تو کیا مائلِ کرم
جب ختم ساری سختیٔ بیداد کر چکے

یا　بے پر و بال کہاں چھوٹ کے جائیں صیّاد　　ہم اسیرانِ وفا کیش کو آزاد نہ کر　　(حسرت)

سارا ملک متحیر تھا کہ مولانا نے یہ کیا کیا اور کیوں کیا۔ اہلِ دل حیران تھے کہ کیا اس دور میں بھی حق و انصاف کی راہ میں سرفروشی کا ایسا نمونہ جو سقراط، امام ابو حنیفہ اور مجدد الف ثانی کی یاد دلائے، مل سکتا ہے، کم از کم انگریزوں کے دورِ استبداد میں اس قسم کی حرّیت پروری و حق پرستی کی مثال نایاب تھی۔ کیا مسلم اور کیا غیر مسلم کسی جماعت میں اس آن بان اور تیور کا اصول پرست ہندوستان نے کاہے کو پیدا کیا تھا۔

بیگم حسرت موہانی کی تحریر اخبارات میں شائع ہوئی تو معلوم ہوا کہ جن شرائط پر حکومت مولانا کو رہا کرنے کے لئے تیار ہوئی تھی اور جنہیں مولانا نے بلا تامل رد کر دیا تھا، باقاعدہ قید سے بھی زیادہ تکلیف دہ، توہین آمیز اور ناممکن العمل تھیں۔ شرائط ملاحظہ ہوں:

۱۔ تا صدورِ حکمِ ثانی مولانا کو قصبہ کھٹور ضلع میرٹھ کی حدود میں کسی ایسے مکان میں رہنا ہوگا جسے مجسٹریٹ ضلع منظور کرے۔

۲۔ مولانا کو مجسٹریٹ کی اجازت کے بغیر حدودِ مقررہ سے باہر جانے کی اجازت نہ ہوگی۔

۳۔ روزانہ دس اور پانچ بجے دن کے درمیان بجز شدید بیماری کے جس کی افسرِ متعلقہ کو فوراً خبر کی جائے مولانا کو افسر انچارج تھانہ کھٹور کے پاس جاکر اپنی موجودگی کی رپورٹ کرنی ہوگی۔

۴۔ اس کی ممانعت ہوگی کہ مقررہ حدود کے باہر سورج نکلنے یا ڈوبنے کے درمیانی اوقات میں کسی ملاقاتی کو لینے یا رخصت کرنے جائیں۔

۵ ۔ پولیس انچارج کو ان تمام لوگوں کے نام اور پتے بتانے ہوں گے جو ملاقات کے لئے آئیں یا جنہیں مولانا تحریر بھیجیں ۔ یا جن کی تحریر مولانا وصول کریں یا جن سے خط و کتابت کے علاوہ کسی اور طریقہ سے پیام وسلام ہو۔ اگر یہ پیام کسی شخص کے ذریعہ سے ملیں یا بھیجے جائیں تو تین گھنٹے کے اندر اندر اس کا پتہ و نشان معہ مفہوم پیام پولیس انچارج کو بتایا جائے۔

۶ ۔ خطوط، تار اور دیگر اشیاء جو ڈاک سے وصول ہوں بغیر توقف اور بغیر کھولے ہوئے افسر انچارج کو بھیج دی جائیں۔ اپنے خطوط ترسیل سے پہلے افسر مذکور سے سنسر کرائے جائیں۔

۷ ۔ افسر انچارج تھانہ کٹھور کو قیام گاہ کے ہر حصہ میں ہر وقت آزادی سے آنے جانے کی اجازت ہوگی ۔

مولانا نے ان شرائط پر رہائی سے انکار جن الفاظ میں کیا تھا ان کا مفہوم بھی ملاحظہ ہو:

"میرا ضمیر مجھے اجازت نہیں دیتا کہ میں کسی ایسے حکم کی تعمیل کروں جو قانون تحفظِ ہند کے ماتحت دیا گیا ہو اور جس کے ذریعہ مجھے ایک ایسے جرم کی سزا دی جاتی ہو جس کا نہ مجھے علم ہے نہ جس کی نوعیت معلوم ہے نہ جس کا ارتکاب میں نے اپنے علم و یقین میں کیا ہے۔ پھر یہ سزا بھی اس طرح دی جاتی ہو کہ مجھے صفائی کا موقع بھی نہ دیا جائے۔
میں اتنا بے شک کہہ سکتا ہوں کہ اگر مجھے بغیر کسی شرط کے آزاد کر دیا جائے تو میں بطور خود حتی الامکان حکام کے جائز شکوک رفع کرنے کی کوشش کروں گا۔"

سبحان اللہ! سبحان اللہ! کیا یہ دلیری، یہ جرأت، یہ بے خوفی، تاریخِ حریت میں آبِ زر سے لکھے جانے کے لائق نہیں؟ سچ ہے ؎

تو نے حسرت کی عیاں تہذیبِ رسمِ عاشقی
اس سے پہلے اعتبارِ شانِ رسوائی نہ تھا!

حق و باطل کی جنگ کا یہ مرقع نا تمام رہ جائے گا اگر اس فدائے حریت کی شریکِ حیات بیگم حسرت کا، جن سے بڑھ کر سرفروش، دلیر اور شوہر کا ساتھ دینے والی خاتون کا تصور دشوار ہے، اس معاملہ میں رویہ نہ ظاہر کیا جائے۔ واضح ہو کہ یہ واقعہ اب سے تقریباً پچاس سال قبل کا ہے اور اگرچہ آج جنگِ آزادی کی راہ میں جس بے خوفی کے ساتھ چلنا ہمیں حسرت اور ان کی بیگم صاحبہ نے ہی سکھایا، کامیابی حاصل کرنے کے بعد ہر شخص قومی خدمت کا مدعی ہے مگر اس زمانہ میں عورت تو عورت بڑے سے بڑے مردِ آہن کے لئے بیگم حسرت جیسا مجاہدانہ طرزِ عمل اختیار کرنا کسی کے خواب و خیال میں بھی نہیں آ سکتا تھا! انہوں نے مولانا کے انکار کے سلسلہ میں اخبارات کو جو بیان دیا اس میں لکھا تھا:

"حسرت نے جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے اس میں ضد اور خود رائی کو مطلق دخل نہیں ہے۔ میں نے ان کی اس کارروائی کو بے حد اطمینان اور خوشی کے ساتھ دیکھا ہے ایسی نظربندی سے قید بہرحال بہتر ہے۔ حسرت نے خوب کیا۔ مجھے ان سے ایسی ہی امید تھی۔"

یہ خیال رہے کہ یہ رائے کسی آرام کرسی نشین لیڈر کی نہ تھی نہ کسی پیٹ بھرے اور خوشحال گھرانے کی عورت کا خیال تھا جس کے لئے اس کے شوہر کی عدم موجودگی میں آسودگی اور فراغت کا ساز و سامان ہر وقت مہیا رہتا ہے۔ یہ بیگم حسرت کا ردِ عمل تھا جو مولانا کے ہمراہ نمک روٹی کھا کر، اجرت پر سلائی کر کے اور چکی پیس کر گذر اوقات کرتی تھیں مگر اپنے دل کی حرارت اور قوتِ ایمانی اس حد تک قائم رکھتی تھیں کہ اس ذخیرہ سے خود حسرت کو فیض پہنچتا رہتا تھا۔ معلوم نہیں مولانا کی قید کے اس سارے زمانے میں اس پیکرِ حیا و عفت پر کیا بیت گئی ہوگی مگر اللہ رے ضبط و استقلال۔ اقبال نے ایسی ہی سیرت پر کیا خوب تبصرہ

۱؎ مقدمہ "انتخابِ حسرت" مذکورہ صدر میں راقم نے بیگم حسرت کے حالات پر بھی ایک فٹ نوٹ میں کچھ روشنی ڈالی ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ ان کی ذات و صفات پر ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔

کیا ہے ؎

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیال فقر و غنا نہ کر

کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری

حکومت کے لیت و لعل و عذراتِ لنگ یعنی سیاست نیز مولانا کی استقامت کی بدولت سزا کی ساری میعاد یعنی دو سال کی مدت قید ہی میں ختم ہو گئی۔ اور اب وقت آیا کہ وہ اپنے حق کے طور پر آزاد ہوں مگر یہ کسی معمولی مجرم کی آزادی کا سوال نہ تھا۔ یہ مجرم بے جرمی مولانا حسرتؔ کی آزادی کا معاملہ تھا اور حکومت کو جرم پر اتنا غور نہیں کرنا تھا جتنا اپنے مصالح پر۔ چنانچہ حکومت نے ان کی میعادِ سزا ختم ہونے پر کسی قسم کی جراحت ضمیر کے بغیر ان کو ایسی رہائی دی کہ ساتھ ہی احکامِ نظر بندی بھی دینے چاہے مگر حسرتؔ نے شکریہ کے ساتھ پھر انہیں لینے سے انکار کر دیا ؎

حضور مجھ پہ نہ ضائع کریں عطا اپنی کہ مستحق ہوں جفا ہائے التزامی کا (حسرتؔ)

خیر اس مرتبہ بعض اکابر نے مولانا کو چند روز کے لئے اس امر پر راضی کر لیا کہ احکامِ نظر بندی کی بابت حکومت سے بات چیت کرنے کے سلسلہ میں وہ از خود چند دن کے لئے کٹھور ہی میں قیام کر لیں۔ چنانچہ حکومت کو لکھا گیا کہ اگر احکامِ نظر بندی جاری نہ ہوں تو مولانا اپنی خوشی سے حکومت کی شرطوں کا خیال رکھیں گے۔ اس پر حکومت نے حسرتؔ کی شرط منظور کر لی اور احکام نہیں جاری کئے۔ مگر حسرتؔ کے اصرار پر مولانا کے احباب کی طرف سے اس امر کی کوشش جاری رہی کہ مولانا کو علی گڑھ میں رہنے کی اجازت مل جائے۔

حکومت نے کٹھور کے بجائے پہلے میرٹھ میں پھر موہان میں رہنے کی اجازت دی اور نظر بندی سے آزادی برقرار رکھی۔ مولانا نے اصرار کیا کہ کم از کم دو چار دن ہی انہیں علی گڑھ میں قیام کرنے کی اجازت ملے۔ اندیشہ ہوا کہ اس رسہ کشی میں کہیں صورتِ حال پھر نازک نہ ہو جائے۔ مگر اس بار نہ جانے حکومت کے دل میں کیا آگئی یا مولانا کا جذبِ صادق رنگ لایا کہ آخر علی گڑھ میں دو چار دن قیام کرنے کی اجازت مل ہی گئی۔

بعد میں مولانا موہان چلے گئے اور حکومت تو اتنی پگھلی کہ مولانا کی خدمت میں ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ کا الاؤنس بھی پیش کیا مگر انہوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ کچھ دن بعد حکومت نے مولانا کی اس شرط کی بھی تنسیخ کر دی کہ وہ از خود حکومت کے مصالح کا خیال رکھنے کی کوشش کریں، اور انہیں کامل طور پر آزاد کر دیا۔

للہ الحمد میانِ من و او صلح افتاد

حوریاں رقص کناں ساغرِ شکرانہ زدند (حافظ)

یہ رزمیہ داستان ایک بزمیہ داستان کے طور پر ختم ہوتی ہے مگر مولانا کی قید کو پھولوں کی سیج ہرگز نہ سمجھا جائے۔ اگرچہ یہ قید ۱۹۰۸ء کی قید بامشقت کی طرح حبس میں مولانا سے چوروں اور ڈاکوؤں کا سا برتاؤ کیا گیا اور ننگے بدن پر کوڑے لگائے گئے، سخت تو نہ تھی مگر قانونِ تحفظِ ہند بہرحال قوم کے "عشاق" کے لئے مخصوص تھا اور کسی بے پناہ شاعر کے الفاظ میں:

ع عاشقی کھیل نہیں ہے جسے لڑکا کھیلے

بلکہ بقولِ غالبؔ:

ع عشق نبرد پیشہ طلب گار مرد تھا

اس قید میں ان کے ساتھ جیسا برتاؤ کیا گیا اس کا کچھ اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ الہ آباد جیل میں انہیں حکام کے طرزِ عمل کے خلاف مسلسل چار پانچ دن تک کھانا ترک کر دینا پڑا تھا۔ نیز ان کے ساتھ یہ سختی برتی گئی کہ اگرچہ عام قیدیوں سے ان کے اعزا ہفتہ میں ایک بار مل سکتے تھے۔ مولانا کو دو سال کی ساری مدت میں کسی سے بہت کم ملنے دیا گیا اور جب ملنے بھی دیا گیا تو انتہائی توہین و تہدید آمیز سلوک کے ساتھ نیز اسے مولانا کی کسی قسم

کی امداد کرنے سے باز رکھنے کی پوری کوشش کی گئی اور ہر قسم کے ناجائز دباؤ اور دھمکی وغیرہ سے کام لیا گیا۔ مگر مولانا تو بقول شبلی ایک "جن" تھے[1] اور بمصداق ؎

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجے　　اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے　(جگر)

انہوں نے تمام صعوبات کو اس شان سے برداشت کیا اور حریت پروری کے میدان میں اپنی سرکردگی کے ایسے جھنڈے گاڑ دئیے کہ دنیا دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

اردو کے ایک جواں مرگ لیکن منتہی شاعر سجاد انصاری مرحوم نے مولانا کی حریت پروری کی داد ایک نہایت پُراثر اور بدیع نظم "یادِ حسرت" میں دی ہے اس کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اے وہ کہ جو کر چکا ہے برسوں　　زندانِ ستم کی میہمانی
صدقِ بے باک کا فسانہ　　ایثارِ خموش کی کہانی
آئینۂ بے خودی کا جوہر　　موجِ اخلاص کی روانی
"اک محشرِ اضطراب خاموش"[2]　　اللہ ری تیری بے زبانی
ملت کو سکھا دیا ہے تو نے　　آئینِ خلوصِ پاستانی
آتش زنِ خرمنِ ستم ہے　　تیری خاموش نوحہ خوانی!

" فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابندِ نے نہیں ہے " (غالب)

مولانا کی حق گوئی اور بے خوفی کا یہ نسبتاً فراموش شدہ واقعہ آپ نے سُن لیا۔ اس قسم کے نہ جانے کتنے اور اہم یا کم اہم واقعات ہیں جو بہتیرے لوگوں کو معلوم ہیں اور بہتوں کو نہیں، مگر اتنی بات کم و بیش ہر شخص جانتا ہے کہ حق کی حمایت میں اور اصول کی خاطر ان کی چھہتر برس کی زندگی کا تقریباً نصف حصہ قید و بند میں گذرا۔ اتنی طولانی قید کو ہنسی خوشی بلکہ ہنستے کھیلتے برداشت کرنا اور بہ سبیلِ تحریکِ حریت کے ابتدائی دور میں قیدیوں کے ساتھ جو سفاکانہ اور غیر انسانی سلوک[3] روا رکھا جاتا تھا اسے معمولاتِ زندگی میں سمجھنا بہ الفاظِ دیگر "پتھر کو پانی کر دینا"[4] اپنے عقاید میں شدت کے بغیر ممکن نہیں۔

مولانا اپنی ذات سے اک انجمن[5] تھے اور حق گوئی اس انجمن کی شمع تھی۔ اس شمع سے دوسری انجمنیں بھی بقدرِ استطاعت اکتساب نور کرتی تھیں۔

۱؎ مولانا شبلی نے ایک بار حسرت کی سودیشی تحریک پر استقامت کو دیکھ کر کہا تھا:
"تم آدمی ہو یا جن۔ پہلے شاعر تھے ــ پھر پالیٹیشین بنے اور اب بنئے ہو گئے!"

۲؎ حسرت کا پورا شعر جس سے یہ مصرعہ ماخوذ ہے، یہ ہے:
پوشیدہ سکونِ یاس میں ہے　　اک محشرِ اضطراب خاموش!

۳؎ ملاحظہ ہو "مشاہداتِ زندانِ فرنگ" از مولانا حسرت

۴؎ بلایا کوہ پر شیریں کو اے فرہاد! کیا کہنا　　بڑے پتھر کو پانی کر دیا استاد، کیا کہنا　(شاد عظیم آبادی)

۵؎ بہت لگتا ہے جی صحبت میں اس کی　　وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہے　(حالی)

مسلم لیگ، کانگریس، جمعیتہ العلماء، کمیونسٹ وغیرہ، ان میں سے وہ ہر ایک میں شریک رہے مگر کسی کی بھی نکتہ چینی سے باز نہ آئے اور کہیں بھی کھری کھری سُنانے سے نہ چوکے۔ حق یہ ہے کہ تنظیم کی عدم صلاحیت کے ساتھ ساتھ یہی ان کی کمزوری بھی تھی ورنہ وہ اپنے ملک میں اپنے زمانہ کے سب سے بڑے لیڈر ہوتے۔

حق گوئی اور بے باکی سے دوسرے نمبر پر اور صرف دوسرے نمبر پر مولانا کی سیرت کا وہ وصف تھا جسے استغنا اور فقر سے موسوم کیا جا سکتا ہے بلکہ وہ استغنا اور فقر کی ایک زندہ تصویر تھے۔ روپیہ پیسہ سے ان کی بے نیازی ایسی تھی جیسے کوئی سانپ یا بچھو سے ڈرتا ہے۔ اس کا واقعہ میں نے ایک اور موقع پر لکھا ہے جسے یہاں نقل کرتا ہوں: "۱۹۲۸ء میں علی گڈھ میں جب میرے "انتخابِ حسرت" کا مسودہ جامعہ بک ڈپو، دہلی سے اشاعت پذیر کرانے کے لئے ڈاکٹر عابد حسین صاحب لے گئے تو انہوں نے مجھے لکھا کہ جامعہ بک ڈپو سے مجھے اس تالیف کی فروخت پر پندرہ فی صدی رائلٹی دائمی طور پر ملے گی۔ میں نے کہا مولانا کا کلام ہے اس لئے مجھے رائلٹی کا حق نہیں پہنچتا۔ یہ رقم مولانا کو دی جائے۔ کچھ دن بعد ڈاکٹر صاحب نے مجھے بتایا کہ یہ تجویز مولانا کے سامنے رکھی گئی تو انہوں نے اپنی آمدنی دائمی طور پر جامعہ کو بخش دی[1]۔"

اس سے بڑھ کر ریڈیو اسٹیشن لکھنؤ کا قصہ ہے۔ ایک پروگرام کے خاتمہ پر مولانا نے ریڈیو والوں کے سخت اصرار پر صرف تین آنے کے پیسے لینے منظور کئے۔ باقی رقم ایک معصومانہ انداز میں یہ کہہ کر واپس کر دی کہ "اتنی بڑی رقم لے کر ہم کیا کریں گے!" واضح ہو کہ مولانا اس پروگرام کے لئے کانپور سے تشریف لے گئے تھے۔ فرمانے لگے کہ گھر سے ریلوے اسٹیشن تک پیدل گئے۔ ریل میں خفیہ پولیس کی جماعت کی بدولت برف کے ڈبے میں مفت سفر کیا۔ لکھنؤ اسٹیشن سے ریڈیو کے مستقر تک سرکاری موٹر میں آئے۔ یہی موٹر پھر اسٹیشن تک لے جائے گی۔ پھر روپے کس کام کے لئے جائیں ایسا ہی اصرار ہے تو احتیاطاً واپسی سفر کے لئے لکھنؤ سے کانپور تک تیسرے درجہ کا کرایہ تین آنے دے دو۔

یہی حال علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں ممتحنی کے معاوضہ کے روپوں کا تھا۔ اور کسے نہیں معلوم کہ تقسیم کے بعد ہندوستان کی کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی کے ممبر کی حیثیت سے نہ صرف انہوں نے پچھتر روپیہ یومیہ الاؤنس لینے سے انکار کر دیا بلکہ بارہا احتجاج کیا کہ ممبروں کے لئے الاؤنس کی اتنی بڑی رقم غریب اور نافہ کش عوام کے ساتھ بڑا ظلم ہے۔ جب کہ اسمبلی کے دوسرے نو دولتے رکن نئی دہلی کے بڑے بڑے ہوٹلوں یا ارکان حکومت کی شاندار قیام گاہوں میں ٹھہرتے وہ خود سیکرٹریٹ کی شاہراہ کے سامنے وسیع سبزہ زار کے کنارے ایک قدیم بوسیدہ مسجد کے حجرے میں بوریا نشینی کو اپنے لئے قابلِ فخر سمجھتے۔ وہیں سے وہ اخبارات کی پوٹ بغل میں دبائے، ٹوٹی کمانی کی عینک لگائے، موٹے دیسی کپڑے کی ملگجی شیروانی اور پاجامہ پہنے شکستہ سی چھڑی لئے اور بغیر پھندنے کے میلی سی نیچی دیوار کی ترکی ٹوپی پہنے پیدل اسمبلی چل دیتے۔

اور اسی خصوصیت کے ذیل میں ان کی وہ صفت آتی ہے جسے سادگی اور جزرسی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس میں انہیں اتنا غلو تھا کہ نہ صرف اپنی روزمرّہ کی زندگی میں وہ سستا سے سستا اور گھٹیا سے گھٹیا مال استعمال کرتے بلکہ جیسے عیش پسندوں سے بدلہ لینے اور انہیں جلانے پر تُلے ہوں بڑی سے بڑی محفل میں وہ حقیر سے حقیر حالت میں شریک ہوتے۔ شاید اپنی اس صفت کو ابدیت اور دوام بخشنے ہی کی خاطر انہوں نے اپنی تمام تصانیف ردّی سے ردّی کاغذ پر اور خراب سے خراب کتابت اور بدترین چھپائی کے ساتھ شائع کیں اور جلد بندی میں تو بے پروائی کو باقاعدہ راہ دی۔ میرے ایک دوست مزاحاً کہتے تھے کہ مولانا روشنائی کے بجائے اپنے گھر کے نابدان کی کیچ اور جلد بندی میں اپنے سڑے ہوئے پاجاموں کے چیتھڑے استعمال کرتے ہیں۔

مولانا مذہباً حنفی مسلمان تھے۔ نماز روزہ کے سخت پابند اور حج تو انہوں نے اپنی زندگی میں کم و بیش درجن بھر کئے۔ ریل کا سفر ہمیشہ تیسرے

---

[1] مقدمہ "انتخابِ حسرت" مرتبہ راقم مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ۔ کراچی

درجہ میں اور جہاز کا عرشہ پر کرتے یتیمہ حالت میں پیدل چلنا انہیں دل سے مرغوب تھا۔ حضور رسالت مآب کے بعد اگرچہ انہیں بہت سے بزرگانِ دین اور اولیاء اللہ سے عقیدت تھی مگر ان میں بھی شہیدِ کربلا حضرت امام حسینؑ اور اپنے مرشد حضرت مولانا شاہ عبدالرزاق فرنگی محلی اور ان کے خانوادہ کے علاوہ پیران پیر شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے والہانہ شیفتگی تھی۔ ان سب کے حضور مولانا نے اپنے کلام میں نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ یہ اشعار جذبۂ عقیدت ہی کے لحاظ سے نہیں، فنی اعتبار سے بھی مولانا کے آرٹ کے بڑے دلکش نمونے ہیں۔ حضرت غوث الاعظم کی شان میں بعض اشعار ملاحظہ ہوں ؂

کرو کچھ تو ارشاد یا غوث الاعظم سنو میری فریاد یا غوث الاعظم

رہ عاشقی میں کہیں میری محنت نہ ہو جائے برباد یا غوث الاعظم

گرفتاریٔ حسنِ ظاہر سے دل کو کرو جلد آزاد یا غوث الاعظم

اسے تم سوا کون اٹھائے گا مجھ پر پڑی ہے جو افتاد یا غوث الاعظم

کہاں تک رہے دل میں حسرتؔ کے آخر

تمنائے بغداد یا غوث الاعظم

دستگیری کا طلب گار ہوں شیئاً للہ میر بغداد میں ناچار ہوں شیئاً للہ

حالِ دل شرم سے اب تک نہ کہا تھا لیکن آج میں درپئے اظہار ہوں شیئاً للہ

کرم خاص کے لائق تو نہیں میں پھر بھی آپ کا خاص طلبگار ہوں شیئاً للہ

مجھ سے اب دین کی پستی نہیں دیکھی جاتی غلبۂ کفر سے بیزار ہوں شیئاً للہ

پائے رفتن ہے نہ ہے ہند میں جائے ماندن

سخت مشکل میں گرفتار ہوں شیئاً للہ

ہر سچے مسلمان کی طرح ان کا بھی عقیدہ تھا کہ خداوند تعالٰی نے ہر زمانہ میں اور دنیا کے ہر حصے میں بشرطِ ضرورت فدائیانِ حق اور مصلحین قوم روانہ فرمائے جن میں سے دستور کا نہیں علم ہے بہتوں کا نہیں۔ مگر مولانا اس عقیدہ میں بہت آگے نکل گئے تھے۔ وہ کرشن جی سے بھی والہانہ عقیدت رکھتے تھے خاص کر اس لئے کہ سری کرشن کا فلسفہ کرم یوگ ایک فلسفۂ عمل تھا اور اسلام کی تعلیم سے میل کھاتا تھا۔ ہندو کرشن جی کو حسن اور عشق کا اوتار مانتے ہیں۔ شاعرانہ اعتبار سے حسرتؔ حسن و عشق کے پرستار ہونے کے سبب ہی کرشن جی کے پرستار تھے اور متھرا اور اس کے نواحی علاقوں میں پابندی کے ساتھ حاضر ہونے کو اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اسی سلسلہ میں بھی مولانا نے بعض دلچسپ اشعار کہے ہیں، حد یہ ہے کہ اس عقیدت کی بدولت انہوں نے ہندی میں شاعری کی اور بعض بڑی پیاری ہولیاں اور ٹھمریاں کہی ہیں۔ اس موضوع پر ان کی بعض چیزیں دیکھیے:

عرفانِ عشق نام ہے میرے مقام کا حامل ہوں کس کے نغمۂ نے کے پیام کا

متھرا سے اہلِ دل کو وہ آتی ہے بوئے اُنس دنیائے جاں میں شور ہے جس کے دوام کا

مخلوق اک نگاہِ کرم کی امیدوار مشتاق کر رہا ہے بھجن رادھے شیام کا

لبریزِ نور ہے دلِ حسرتؔ، زہے نصیب

اک حسنِ مشک فام کے شوقِ تمام کا

متھرا کہ نگر ہے عاشقی کا دم بھرتی ہے آرزو اسی کا

ہر ذرۂ سرزمین گوکل دارا ہے جمالِ دلبری کا

برسا نہ وندگاؤں میں بھی　　دیکھ آئے ہیں جلوہ ہم کسی کا

پیغامِ حیاتِ جاوداں تھا

ہر نغمہ کرشن بانسری کا

آنکھوں میں نورِ جلوۂ بے کیف و کم ہے خاص　　جب سے نظر پہ ان کی نگاہِ کرم ہے خاص

کچھ ہم کو بھی عطا ہو اے حضرتِ کرشن　　اقلیمِ عشق آپ کے زیرِ قدم ہے خاص

حسرتؔ کی بھی قبول ہو متھرا میں حاضری

سنتے ہیں عاشقوں پہ تمہارا کرم ہے خاص

اور ان کی ہولیوں اور ٹھمریوں کی طرف تو لوگوں کی نظریں ہی نہیں گئی ہیں۔ یوں بھی ان کا لطف کچھ برج بسیا ہی اٹھا سکتے ہیں ؎

مو پہ رنگ نہ ڈار مراری　　منتی کرت ہوں تہاری

پنیاں بھرن کو جائے نہ دیہیں

شیام بھرے پچکاری

تھر تھر کانپت لاجن حسرتؔ　　دیکھت ہیں نر ناری

کہاں بتائے رہے گردھاری　　اورن رل، سدھ بسول ہماری

روؤت دھوؤت تلپت بلکت

ہیں کی رین گئی کٹ ساری

جیا جات برکھائت حسرتؔ　　دیکھ دیکھ بدریا کاری

مولانا کی شاعری کے سلسلہ میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ میں نے بھی متعدد بار صفحے کے صفحے سیاہ کئے ہیں اور دو بار مولانا کے کلام کا انتخاب بھی شائع کیا ہے۔ اس موقع پر میں ان کی شاعری کے بجائے شاعری کے سرچشمہ یعنی ان کے عشق کی نسبت ذرا کھل کر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ مولانا کو اپنی شریکِ حیات بیگم نشاط النساء حسرتؔ سے جو شادی سے پہلے ان کی "بنتِ عم" تھیں بے پناہ عشق تھا؟ ان کے کلام سے ایک "قمرِ خانگی"[1] کے ساتھ ان کی محبت کا پتہ ضرور چلتا ہے مگر اپنی بیگم صاحبہ کے انتقال کے بعد کی چند غزلوں میں تو مولانا نے ان کے ساتھ اپنی محبت کا صاف صاف اعتراف بلکہ اعلان کیا ہے۔ کیا ان اشعار کے بعد اس سلسلہ میں کسی قسم کی غلط فہمی کا احتمال رہ جاتا ہے ؎

عاشقی کا حوصلہ بے کار ہے تیرے بغیر　　آرزو کی زندگی دشوار ہے تیرے بغیر

کاروبارِ شوق کی اب وہ تن آسانی کہاں　　دل پہ ذوقِ شاعری اک بار ہے تیرے بغیر

شرکتِ بزمِ سخن سے بھی نہیں باوصفِ عزم　　بر بنائے بے دلی انکار ہے تیرے بغیر

جس فراغت کا تمنائی تھا میں تیرے لئے　　اب وہ حاصل ہے تو اک آزار ہے تیرے بغیر

دردِ دل جو تھا کبھی وجہِ مباہات و شرف

بہرِ حسرتؔ موجبِ صد عار ہے تیرے بغیر

---

[1] پیشِ نظر جو وہ قمرِ خانگی نہیں　　یہ جوششِ انتظار ہے دیوانگی نہیں　(حسرتؔ)

وجہ کیا خواب میں نہ آنے کی ‏ ‏ شرم انہیں ہو نہ رُوٹھ جانے کی
غیر ممکن ہے تیرے بعد ہوس ‏ ‏ دل کسی اور سے لگانے کی
سرمۂ چشمِ عیش تھی بہ خدا ‏ ‏ خاک تیرے غریب خانے کی
مٹ گئیں آپ بھی مٹا کے تجھے ‏ ‏ سختیاں خود بخود زمانے کی
اب نہ دل ہے نہ وہ ذخیرۂ شوق ‏ ‏ توڑ دوں کنجیاں خزانے کی
یعنی کہنے کی ہے غرض، نہ ہوس ‏ ‏ اب کسی کو غزل سُنانے کی!

اُن کے بعد اب وہ کیا ہوئی حسرتؔ
دل فریبی ترے فسانے کی

بیگم صاحبہ کے دورانِ علالت میں جب کہ مرحومہ کو مولانا سے کچھ غلط فہمی ہو گئی تھی مولانا نے رفع کدورت کے سلسلہ میں ذیل کی دلچسپ و پُر لطف غزل لکھی تھی جو محبوب کو پھسلانے بلکہ گدگدانے کے مترادف ہے ؎

تیرِ ناز آئے تو ان کا آزمانے کے لئے ‏ ‏ پیش کرتے ہیں دل اپنا ہم نشانے کے لئے
میں بھی خوش ہیرا خدا بھی خوش ہے تیرے درد سے ‏ ‏ درد گو وجہِ مصیبت ہے زمانے کے لئے
چھیڑ اگر منظور ہے ان کو تو با وصفِ حجاب ‏ ‏ پھر وہ دیکھیں گے مجھے مسکرانے کے لئے

وہ کہیں پوچھیں تو حسرتؔ کس پہ مرتے ہو کہ ہم
نام تک تیار ہیں اس کا بتانے کے لئے

اسی غزل میں ایک یہ شعر بھی ہے جو خاص توجہ کا مستحق ہے ؎

چھوڑ کر وہ چل نہ دیں آخر زراہِ انتقام
مجھ کو تنہا رات دن آنسو بہانے کے لئے

مرحومہ کے انتقال کے بعد مولانا نے ان کے متعلق جو کچھ شائع کیا اس کا حسبِ ذیل حصّہ غور طلب ہے:

"خدا گواہ کہ راقم کے اس قول میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہے کہ ایثار و انکسار، حیا و غیرت، محبت و مروّت، فہم و فراست، جرأت و صداقت، عزم و ہمت، وفا و سخا، حسنِ عقیدت، صدقِ نیّت، خلوصِ عبادت، حُسنِ خلق، صحتِ مذاق، پاکی و پاکیزگی، صبر و استقلال اور سب سے بڑھ کر عشقِ رسول اور محبتِ حضرتِ حق کے لحاظ سے شاید مسلمان عورتوں بلکہ مردوں میں بھی آج ہندوستان میں کم ایسے افراد موجود ہوں گے جن کو ہم بیگم حسرتؔ سے بہتر تو کیا ان کے برابر بھی قرار دے سکیں۔ ان تمام باتوں کی تفصیل ایک جُداگانہ تصنیف کی طالب ہے۔ لا ریب ؎

این سعادت بزورِ بازو نیست ‏ ‏ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

راقم کو بیگم حسرتؔ کی جُدائی سب سے زیادہ اس خیال سے شاق ہے کہ اب کوئی اس کی کوتاہیوں پر ملامت کرنے والا اور اس کی خامیوں پر زجر و توبیخ کرنے والا نہ رہا۔ ظاہری تعلیم کو چھوڑ کر باقی کل باتوں میں بیگم اس سے بدرجہا بہتر تھیں۔ انہیں ہر قسم کی تنبیہ کا حق حاصل تھا جس کا اثر بھی خاطر خواہ ہوتا تھا۔"[1]

لہ رسالہ "اردوئے معلیٰ" بابت فروری تا اپریل ۱۹۳۷ء

یہ عشق نہیں تو کیا تھا؟ مانا کہ یہ عشق کا بڑھاپا تھا اسی نے جوانی میں کیا کیا گل نہیں کھلائے تھے۔ غزل کی شاعری رمز و اشارت کی شاعری ہے۔ پھر بھی ادب کے مقدمات سامنے رکھتے ہوئے مولانا کے مختلف ادوار کے کلام سے ایسے اشعار چن لینا مشکل نہیں جو کم سے کم عشق کے لئے ایک بے تکلف گھریلو فضا کی غمازی کرتے ہیں اور اس گھریلو فضا میں باوصف تقدس مولانا اس قسم کی شاعری اس قدر جوش کے ساتھ بیگم کیلئے نہیں تو پھر آخر کس کے لئے کرتے تھے؟ ؎

سونگھی تھی جو اک بار وہ خوشبوئے گریباں — اب تک یہ اسی بوئے گریباں کا نشہ ہے

ہم حال انہیں یوں دل کا سنانے میں لگے ہیں — کچھ کہتے نہیں پاؤں دبانے میں لگے ہیں

کہنا ہے انہیں یہ کہ نہ ہم ہوں گے مخاطب — پر کہتے نہیں زلف بنانے میں لگے ہیں

جس نے سونگھی ہو تری زلفِ سیہ کار کی بُو — کیا پسند آئے اسے نافۂ تاتار کی بُو

آج تک جس سے معطر ہے محبت کا مشام — آہ کیا چیز تھی وہ پیرہنِ یار کی بُو

رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرح داری کا — طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا

کر رہی تھی چاندنی نورِ مہ کامل نثار — سو رہا تھا بام پر وہ گیسوؤں والا پڑا

اپنے آپے میں نہیں شوق کے مارے گیسو — پھیلے جاتے ہیں رخِ یار پہ سارے گیسو

مائلِ شوق مجھے پاکے وہ بولے ہنس کر — دیکھو تم نے جو چھوئے آج ہمارے گیسو

فلکِ حسن پہ ہے تابشِ تاروں کی نمود — یا تہِ زینتِ افشاں ہیں تمہارے گیسو

چاندنی رات میں پھولوں کا ہے زیور کیا خوب — رنگ لائے کا ترا حسنِ معطر کیا خوب

قابلِ دید تھی گرمی میں پسینہ کی بہار — تر ہوا ہے عرقِ حسن سے بستر کیا خوب

کھول کر بال جو سوتے ہیں وہ شب کو حسرت — گھیر لیتی ہے انہیں زلفِ معنبر کیا خوب

دن کو ہم ان سے بگڑتے ہیں وہ شب کو ہم سے — رسمِ پابندیٔ اوقات چلی جاتی ہے

تم نے بال اپنے جو پھولوں میں بسا رکھے ہیں — شوق کو اور بھی دیوانہ بنا رکھا ہے

اثرِ عشق سے نکلیں جو تمہارے آنسو — دامنِ جان وہ لے لیجئے سارے آنسو

عالمِ حسن میں ہیں نور کی نہریں جاری — یا رواں عارضِ جاناں کے کنارے آنسو

گریۂ شوق سے تر ہیں جو تمہاری آنکھیں — بن گئے ہیں فلکِ حسن کے تارے آنسو

ہے نرالی سبز کی بھی روئے روشن پر بہار — اوڑھنی بہتر تھی لیکن ارغوانی آپ کی

محبوبی و رنگینی ہیں جز و بدن تیری — سرشارِ محبت ہے خوشبوئے دہن تیری

اس سلسلہ میں عشق کے لئے گھریلو فضا یا شادی شدہ عشق اور اس کے اظہار کی نسبت کچھ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے جسے آج کل فیشن کے خلاف بلکہ حماقت سمجھا جاتا ہے مگر فیشن بذاتہٖ کوئی پائدار حقیقت اور قائم بالذات شئے نہیں۔ ادلنے بدلنے والی چیز ہے، لہٰذا بے اعتبار ہے۔ ایسی ناپائدار بنیاد اور ناقص معیار پر شادی جیسے ادارہ کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا صحیح نہیں۔ صحیح یوں ہے کہ انسان کے جنسی میلان کا نقطۂ آخر جنسی اختلاط ہے اور شادی اس کا فطری نقطۂ عروج ہے جس میں جنسی اختلاط جو عشقِ انسانی کی بنیاد ہے، دوام حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ شادی شدہ عشق سے بڑھ کر دنیا میں کوئی عشق نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا کی نسبت یہ جو کہا جاتا ہے کہ حسن اور متعلقاتِ حسن کا کوئی مخفی سے مخفی پہلو ان کی نظر سے نہیں بچا اور عاشقانہ زندگی کے تمام ادوار کی عکاسی ان کے کلام میں موجود ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کے دل میں عمر بھر اپنی شریکِ حیات کے فطری عشق کی چسک باقی رہی اور اس عشق سے زیادہ

کسی جنسی لگاؤ میں حسن و عشق کے مطالعہ و تجزیہ کی گنجائش نہیں۔

بیگم حسرت کو بھی مولانا سے سچی محبت تھی اور اس کا ثبوت بھی مولانا کے کلام میں موجود ہے۔ زندگی بھر وہ مولانا کے دل و دماغ پر حکمران رہیں اور مولانا بھی خوشی خوشی بلکہ مگن رہ کر ان کا اثر ہی نہیں' لوہا مانتے رہے اور ان کی محبت سے سرشار ہو کر شاعری کرتے رہے۔ بیگم حسرت کی حیات کے زمانہ کے سارے کلام میں سوز و ساز کے ساتھ ساتھ ایک معصومیت' ایک والہانہ پن' ایک خلوص بھی موجود ہے۔ مگر ان کی وفات کے بعد یہ بات نہیں رہی۔ مولانا پر "قبرص کی پری[۱]" کا سایہ پڑنے لگا۔ وہ "رنگینیٔ ژوپا کی زبانی اٹلی کے حسینوں کی کہانی[۲]" سننے اور "حسنِ مغرب[۳]" کا تجزیہ کرنے لگے۔ مزا یہ ہے کہ ان میں سے بعض غزلیں اس زمانہ میں لکھی گئیں جب مولانا ایک مقدس سفر کی حالت میں تھے جس کے دوران میں "جیتے جی تھے جو مرے ناز اٹھانے والے" انہیں مولانا نے خواب میں بھی دیکھا تھا[۴]۔

وجہ یہی تھی کہ فطری عشق کے سوتے خشک ہو چکے تھے اور کوئی پر چلانے والا نہ رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غیر فطری عشق یا جنسی میلان شروع ہو گیا۔ یہ امر قابلِ افسوس ہے کہ مولانا کی شخصیت اور ان کی شاعری دونوں اپنی ارفع سطح سے نیچے اُتر آئیں۔

۱؎ رعنائی میں حصہ ہے جو قبرص کی پری کا   نظارہ ہے مسحور اسی جلوہ گری کا
رفتارِ قیامت یوں ہی کیا کم تھی پھر اس پر   اک طرّہ ہے فتنہ تری نازک کمری کا
پوشاک میں کیا کیا شجری نقش ہیں دل کش   باعث نہ ہوں شوق کی ہو جامہ دری کا
لاریب کہ اس حسنِ ستم گار کی سُرخی   موجب ہے مرے زہد کی عصیاں نظری کا
باوصفِ تلاش ان کی خبر کچھ بھی نہ پا کر   کیا کہئے جو ہے حال مری بے خبری کا
جب سے یہ سُنا ہے کہ وہ ساکن ہیں یہیں کے   عالم ہے عجب شوق کی آشفتہ سری کا
ساتھ ان کے جو ہم آئے تھے بیروت سے حسرت
یہ روگ نتیجہ ہے اسی ہم سفری کا

۲؎ ہم رات کو اٹلی کے حسینوں کی کہانی   سُنتے رہے رنگینیٔ ژوپا کی زبانی
ہونٹوں کے قریب آئی جو وہ زلفِ معنبر   جھٹ چوم لیا ہم نے طبیعت ہی نہ مانی
اٹلی میں تو کیا میں تو یہ کہتا ہوں کہ حسرت
دنیا میں نہ ہوگا کوئی اس شکل کا ثانی

۳؎ حسنِ مغرب میں میں ساعد و گیسو کے سوا   اور بھی کچھ نظر آیا تو وہ بھائیں آنکھیں

۴؎ رُوٹھنے پر بھی مجھے بھول نہ جانے والے   اے بدورانِ سفر خواب میں آنے والے
آج انہیں کے قدموں پر ہے مرا فرقِ نیاز
جیتے جی تھے جو مرے ناز اٹھانے والے   (حسرت)

مولانا سیّد سلیمان ندوی

سیّد صباح الدّین عبدالرحمٰن

مولانا سیّد سلیمان ندوی ضلع پٹنہ ریاست بہار کے ایک مردم خیز گاؤں دیسنہ کے رہنے والے تھے۔ اس گاؤں میں جو خاندان اپنی دینداری اور عبادت گزاری کے لئے سب سے زیادہ ممتاز تھا۔ اسی کے گھر کے سیّد صاحب ایک لعلِ بے بہا تھے۔

ان کی پیدائش ۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء مطابق ۲۳ صفر ۱۳۰۲ھ کو ہوئی۔ ان کے دادا صاحب نے ایک فارسی قطعہ میں ان کی تاریخ ولادت کہی جس کے دو شعر یہ ہیں:۔

چو جُستیم تاریخ او از خرد   یکایک سروشے ز تاریخ و سال
بگفتا کہ بے داد شد مصرعے   شدہ مہرِ تاباں ز بُرجِ کمال

۱۳۰۲ھ

اور وہ واقعی اپنی زندگی میں علم و فضل کے مہرِ تاباں بنے۔

ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں، پھر پھلواری شریف اور دربھنگہ میں پا کر ۱۹۰۱ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے زمانے میں مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی "تقویۃ الایمان" سے بے حد متاثر ہوئے۔ وہ خود اپنی ایک تحریر میں فرماتے ہیں کہ "علمِ کلام کے مسائل، اشاعرہ و معتزلہ کے نزاعات، غزالی، رازی اور ابنِ رشد کے دلائل سب کے بعد دیگرے نگاہوں سے گذرے مگر اسمٰعیل شہیدؒ کی تلقین اپنی جگہ پر قائم رہی"۔ پھلواری شریف کے قیام کے زمانے میں ادبی ذوق پیدا ہوا، وہاں کی خانقاہ میں ہر ہفتہ قوالی ہوتی تھی۔ اس کے اثر سے اس قصبہ میں شعر و سخن کا ہر جگہ چرچا رہتا تھا۔ یہیں سب سے پہلے انہوں نے مولانا عبدالحلیم شررؔ کا ناول "منصور موہنا" پڑھا۔ خود ان کا بیان ہے کہ جس وقت یہ کتاب ختم کی پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

ندوۃ العلماء لکھنؤ پہنچے تو ان کے علمی و ادبی ذوق کی نشو و نما اچھی طرح ہوتی رہی۔ یہاں شاہ عبدالعزیز صاحبؒ محدث دہلوی کے رسالہ "عجالۂ نافعہ" کے پڑھنے سے ان کو علمِ حدیث سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ پھر بستان المحدثین کے مطالعہ سے علمِ حدیث کا شوق اور بھی زیادہ بڑھ گیا۔ بالآخر محدثین کی شخصیتوں میں سے امام مالکؒ سے بے حد گرویدگی پیدا ہو گئی۔ پھر حافظ ذہبی کی تذکرۃ الحفاظ اور حافظ ابنِ حجر کی فتح الباری کے مطالعہ سے محدثین کے کارناموں سے اور بھی زیادہ واقف ہوئے۔ حدیث کے شوق نے رجال کی طرف اور رجال نے تاریخ کی طرف بڑھایا اور اس سلسلہ میں ابنِ ندیم کی کتاب الفہرست،

حاجی خلیفہ کی 'کشف الظنون' اور ابنِ خلکان کی 'وفیات' کا مطالعہ کرتے رہے۔ اپنی ایک تحریر میں فرماتے ہیں کہ میں نے ابنِ خلکان کی کتاب اتنی دفعہ پڑھی کہ اس کے حواشی اور حوالوں سے اس کے اوّل و آخر کے صفحے بھر گئے۔ منطق، فلسفہ اور ادبِ عربی کا ذوق مولانا فاروق چریا کوٹی کے درس میں پیدا ہوا، اور جب مولانا شبلی نعمانی کے حسنِ توجہ سے 'دلائل الاعجاز' پڑھی تو اس سے بہت متاثر ہوئے، اور اسی کو پڑھ کر عربی لکھنے اور بولنے کی مشق پیدا کی۔ حماسہ اور نقد الشعراء کے مطالعہ نے اس ذوق پر جِلا دی اور ان کی پیروی نے عربی میں اشعار کہنے کا انداز پیدا کیا۔ علمِ کلام کا شوق مولانا شبلی نعمانی کی تربیت کا نتیجہ تھا، اور ان کی طالب علمی ہی کے زمانے میں ملل و نحل، شہرستانی، فصل فی الملل والنحل ابنِ حزم، کشف الادلہ ابنِ رشد اور حجۃ البالغہ نے ان پر یکے بعد دیگرے رنگ دکھایا، اردو شعر و شاعری میں امیر مینائی سے متاثر تھے، طالب علمی میں ان کا دیوان مراۃ الغیب برابر مطالعہ میں رکھتے دارالعلوم کے مشاعروں میں امیر مینائی ہی کا روپ بھرتے تھے۔

۱۹۰۵ء میں مولانا شبلی دارالعلوم ندوہ کے جب باقاعدہ معتمدِ تعلیم ہوئے تو سیّد صاحب نے اپنی خوشی کا اظہار ایک طویل فارسی قصیدہ میں کیا۔ مولانا شبلی میں جوہر شناسی کا بڑا وصف تھا۔ انھوں نے سیّد صاحب کو اپنے دامنِ تربیت میں لے لیا۔ ان کے پاس مصر و شام کے مشہور عربی رسائل اور تالیفات برابر آتی رہتی تھیں۔ سیّد صاحب ان کا مطالعہ باقاعدہ کرتے رہتے، اور اس مطالعہ نے ان کو جدید عربی کا ایک اچھا ادیب بھی بنا دیا۔ مولانا شبلی نے رسالہ "الندوہ" نکالنا شروع کیا تو سیّد صاحب نے اس میں "علم حدیث" پر ایک مضمون لکھا، جس کی داد مولانا حالی نے مولانا شبلی کو دی۔ مولانا شبلی نے سیّد صاحب کی علمی صلاحیت دیکھ کر ان کی طالب علمی ہی کے زمانے میں 'الندوہ' کی دیکھ بھال کی خدمت ان کے سپرد کر دی۔

۱۹۰۷ء میں ندوہ کے فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی کا پہلا جلسہ رفاہِ عام لکھنؤ میں ہوا۔ اس میں خواجہ غلام الثقلین نے سیّد صاحب کو عربی میں برجستہ تقریر کرنے کو یہ موضوع دیا کہ "ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیونکر ہوئی" سیّد صاحب نے جھجکے بغیر نہایت مسلسل فصیح و صحیح عربی میں تقریر شروع کر دی۔ تمام جلسہ محوِ حیرت تھا اور ہر طرف نعرہ ہائے آفرین بلند تھے، مولانا شبلی نے غایت خوشی میں اٹھ کر اپنے سر سے عمامہ اتار کر لائق شاگرد کے سر پر باندھ دیا۔

وہ ۱۹۰۷ء میں ندوہ کی تعلیم سے فارغ ہوئے تو مولانا شبلی نے ان کو الندوہ کا سب ایڈیٹر مقرر کیا۔ اس میں انھوں نے مختلف قسم کے مضامین لکھ کر اپنے جامع الفنون ہونے کا ثبوت دیا۔ ۱۹۰۸ء میں وہ ندوہ میں علمِ کلام اور جدید عربی ادب کے استاد بھی مقرر ہوئے۔ اس درس و تدریس کے زمانے میں دروس الادب کے نام سے دو عربی ریڈریں لکھیں جو اب تک مقبول ہیں، فروری ۱۹۱۰ء میں ندوۃ العلما کی طرف سے یہ طے ہوا کہ عربی کے جدید الفاظ و لغات کی ایک ڈکشنری ترتیب دی جائے تو یہ کام سیّد صاحب ہی کے سپرد ہوا۔ اس کو انھوں نے دو برس میں پورا کر کے ۱۹۱۲ء میں پیش کیا۔ علامہ سیّد رشید رضا مصری ایڈیٹر المنار نے اس ڈکشنری کو خاص طور پر پسند کیا۔ اس سے اب بھی عربی مدارس میں نئی عربی زبان کی دقتوں کو حل کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

جولائی ۱۹۱۲ء میں مولانا ابو الکلام آزاد نے کلکتہ سے اپنا مشہور و معروف ہفتہ وار اخبار 'الہلال' نکالنا شروع کیا تو مئی ۱۹۱۳ء میں سیّد صاحب اس کے اسٹاف میں داخل ہو گئے۔ اگست ۱۹۱۳ء میں کانپور کی ایک مسجد کا کچھ حصہ شہید کر دیا گیا تو وہاں کے مسلمانوں میں بڑا ہیجان پیدا ہوا۔ اس سلسلہ میں نہتے مسلمانوں اور ان کے معصوم بچوں پر بے دردی سے گولیاں چلائی گئیں۔ اس خونیں سانحہ نے تمام ہندوستان کو متقل بنا دیا۔ سیّد صاحب نے الہلال میں اپنے خونِ دل سے "مشہد اکبر" کے عنوان سے ایک درد انگیز مضمون لکھا جس میں ان کی مذہبی حمیت، ملی غمخواری اور قومی درد کا امڈا ہوا طوفان نظر آتا تھا۔ جس پرچہ میں یہ مضمون شائع ہوا اس کو برطانوی حکومت نے ضبط کر لیا۔

۱۹۱۳ء کے آخر میں مولانا شبلی کے ایما سے بمبئی یونیورسٹی کے ماتحت دکن کالج پونہ میں السنۂ مشرقیہ کی پروفیسری قبول کر لی۔ لیکن یہاں ڈیڑھ سال بھی نہ رہے ہوں گے کہ نومبر ۱۹۱۴ء میں مولانا شبلی نے انتقال کیا۔ عالمِ نزع میں تار دے کر لائق شاگرد کو اعظم گڈھ بلوایا اور وصیّت کی کہ وہ سب

کام چھوڑ کر سیرۃ النبی کی تکمیل کریں جس کو وہ نا تمام وغیر مرتب چھوڑ رہے تھے۔ استاد کی وصیت پر عمل کیا، اور سرکاری نوکری سے استعفا دے دیا۔

پونہ سے اعظم گڈھ آکر ۱۹۱۵ء میں دار المصنفین کی بنیاد ڈالی۔ اس کا خاکہ مولانا شبلی نے تیار کیا تھا۔ لیکن وہ اس کو عملی جامہ پہنا نہ سکے تھے۔ سید صاحب نے اس کو قائم کرکے ہندوستان میں بغداد کے دار الحکمت کا تخیل عملی صورت میں نمودار کر دیا۔ دار المصنفین کے ناظم ۳۲ سال تک رہے۔ لیکن آخر وقت تک ۲۵۰ روپے سے زیادہ تنخواہ لینا پسند نہیں فرمایا۔

انہوں نے اپنی تصنیف ارض القرآن کی پہلی جلد دار المصنفین کو دے کر اس کے تصنیفی کام کی ابتدا کی اور جب یہ اہلِ علم کے سامنے آئی تو وہ دار المصنفین کے علمی کام کی نوعیت اور سید صاحب کے تحقیق و تدقیق کے گہرے رنگ سے متاثر ہوئے۔ چنانچہ اردو کے مشہور ادیب مہدی افادی نے ان کو ایک مکتوب مورخہ ۹ر ستمبر ۱۹۱۷ء کو لکھا کہ:

"مجھے حیرت ہے کہ ایک کام جو علمِ آثار کے ایک زبردست ماہرِ فن کے کرنے کا تھا، وہ بھی ساٹھ برس کے بعد کسی یورپ کی اکیڈمی میں بیٹھ کر، آپ اس پر کیونکر قابو حاصل کر سکے ہیں۔ عربیت سے زیادہ آپ کی ادبیت سے مرعوب ہو رہا ہوں۔ زبان نفس موضوع کے لحاظ سے قطعاً لائق شکایت نہیں یعنی کہیں سے بے جوڑ نہیں ہے اور جب تناسب میں کہیں سے کور کسر نہیں تو حسن کی جامعیت میں کس کو کلام ہو سکتا ہے؟"

اس کتاب میں ارضِ قرآن کا جغرافیہ۔ اقوامِ عرب کے سیاسی، تاریخی، نسبی، قومی، دینی، تجارتی اور تمدنی حالات پر قرآن مجید کی تطبیق کے ساتھ بحث ہے۔

۱۹۱۶ء کے رمضان المبارک میں 'معارف' کا پہلا پرچہ ان کی ادارت میں نکلا، اور یہ آج تک جاری ہے۔ اس میں وہ کبھی ادیب، کبھی شاعر، کبھی نقاد، کبھی مورخ، کبھی متکلم، کبھی مفسر اور کبھی محدث کی حیثیت سے جلوہ گر ہوتے رہے۔ پھر یہ بقول عبد المجید سالک دنیائے اسلام کا بہترین علمی و تحقیقی رسالہ ثابت ہوا، جس نے ہمارے تاریخ و تحقیق کے ذخیرے کو مالا مال کر دیا۔ تمام اربابِ علم اس رسالہ کو عزت و وقعت کی نظر سے دیکھتے رہے۔ چنانچہ مہدی افادی کے علمی و ادبی ذوق کو اس رسالہ کے مطالعہ سے بڑی تسکین ہوتی تھی۔ وہ اپنے ایک مکتوب میں سید صاحب کو لکھتے ہیں:

"معارف کا ہر نمبر اپنے پیش رو سے بڑھا چڑھا ہوتا ہے اور مجھے حیرت ہے حسنِ سیرت کے ساتھ اچھی صورت کا اہتمام محدود ذرائع اور مقامی مشکلات کے ساتھ کیونکر آپ کر سکے، بہرحال آپ کے دم سے میری امیدوں میں نئے سرے سے جان آگئی ورنہ خیال تھا لٹریچر سے روابط سابقہ نہ رکھ سکوں گا۔"

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ بھی اس رسالہ کو دلچسپی سے پڑھتے چنانچہ سید صاحب کو ایک مکتوب میں تحریر فرمایا کہ معارف ایک ایسا رسالہ ہے جس کے پڑھنے سے حرارتِ ایمانی میں ترقی ہوتی ہے۔

اس علمی و ادبی زندگی کے ساتھ سیاسی مشاغل بھی جاری رہے۔ ۱۹۱۹ء میں علمائے بنگالہ کلکتہ کے سالانہ اجلاس کی صدارت کی اور مولانا عبد الباری فرنگی محلی کی سیاسی تحریکوں میں شامل رہے۔

۱۹۱۸ء میں اپنے محبوب استاد مرحوم کی سیرت النبی جلد اوّل کو مرتب کرکے ملک کے سامنے پیش کیا۔ علمی دنیا کو اس کی اشاعت کا بڑا انتظار تھا جیسا کہ رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم کے حسب ذیل خط سے معلوم ہوگا جو انہوں نے چھندواڑہ سے ۱۰ر اگست ۱۹۱۸ء کو سید صاحب کو لکھا تھا:

"اگر آپ کو پہلے سے بھی اس کا احساس نہ تھا کہ میں سیرتِ نبوی کے لئے عرصہ سے بے قرار ہوں تو کم سے کم یہاں تشریف لانے کے بعد تو قطعی طور پر اس کا احساس ہو گیا ہوگا بلکہ میں نے آپ سے وعدہ لے لیا تھا کہ اگر مکمل نہیں تو اجزا ہی ارسال کر دئے جائیں گے۔ اگر اس پر بھی آپ کو میری بے قراری میں شک ہے تو میں دربارِ نبوی میں ازالہ حیثیتِ عرفی کی نالش دائر کروں گا۔ آپ کے جانے کے بعد سے کل تک برابر انتظار تھا اور مجھ جیسے کاہل اور خط لکھنے میں چور نے بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ ایک عریضہ ارسالِ خدمت کروں۔ آج صبح کے لئے ارادہ مصمم تھا کہ کل شام ہی معارف دیکھنے میں آیا اور سیرت کی پہلی جلد تیار ہو جانے کا مژدہ سُنا اب بھی اگر آپ ایک جلد ارسال نہ فرمائیں گے تو یقین کیجئے کہ میں رسیاں تڑا کر خود اعظم گڈھ آ کودوں گا اور دار المصنفین میں وہ ہڑبونگ مچاؤں گا کہ آپ حضراتِ اہلِ قلم کی محبوب یکسوئی کا خاتمہ ہو جائے گا اور اعظم گڈھ کی آنکھیں محاذِ مغرب سے زیادہ آتش بازی سے خیرہ اور اعظم گڈھ کے کان اس سے کہیں زیادہ گولوں کے پھٹنے سے بہرہ ہو جائیں گے۔"

اسی سال سید صاحب کی محققانہ تصنیف ارض القرآن کی دوسری جلد بھی شائع ہوئی۔ اس میں اقوامِ عرب کے لسانی، مذہبی، تجارتی اور تمدنی حالات پر بحث ہے۔ اس کی اشاعت پر مولانا محمد علی مرحوم نے ان کو تحریر فرمایا:

"واللہ! ارض القرآن جیسی کتاب کے لئے تو ہر تعلیم یافتہ مسلمان کو جس کی آمدنی سو روپیہ ماہوار کی ہے کم از کم دو روپے دینا ضروری ہے اور سیرۃ کے لئے تو ہر شخص کو ایک ماہ کی آمدنی دینا لازمی ہے۔ ہم لاکھ نادار سہی، مگر اتنے نادار بھی نہیں کہ سال میں ۲۰، ۲۵ روپے ایسی کتابوں کی خریداری کے لئے نہ نکال سکیں۔"

ایک دوسرے مکتوب میں مولانا محمد علی مرحوم ایک صاحب کو لکھتے ہیں:

"سلیمان صاحب اسی طرح کتابیں لکھتے رہیں اور ساری عمر بھی خط نہ لکھیں تب بھی شکایت کا موقع نہ ہوگا بلکہ مشکوریت کا سلسلہ جاری رہے گا۔"

پہلی جنگِ عظیم کے بعد ترکوں پر جو آفت آئی اور خلافتِ اسلامی کی مسند جس طرح ویران ہوئی اس کی تفصیل لکھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ زمانہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے بھی بڑا پُر آشوب تھا۔ سید صاحب بھی خلافتِ اسلامی کے انقطاع پر بے حد متاثر اور مغموم رہے۔ خلافت کی اہمیت پر بہت سے مفید مضامین لکھے۔ فروری ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی کی سرکردگی میں معاملاتِ ٹرکی میں انصاف طلبی اور مسلمانانِ ہند کے معاملات کی تشریح کے لئے جو وفدِ خلافت یورپ بھیجا گیا۔ اس کے تین ممبروں میں ایک ممبر سید صاحب بھی تھے۔ اس وفد کے ساتھ اٹلی، فرانس اور انگلستان میں حقوقِ ٹرکی کے لئے زبان و قلم اور دعوت و اشاعت کے ذریعہ لڑتے رہے۔ مسئلہ خلافت پر انہوں نے مشہور انگریزی مجلہ "فارن افیرز" میں ایک نہایت جامع و مانع مقالہ لکھا جس کی تعریف تمام اہلِ نظر نے کی، اسی زمانہ میں سعد زاغلول پاشا مصری وفد لے کر لندن آئے ہوئے تھے۔ سید صاحب نے ان سے بھی مل کر ہندوستانی مسلمانوں کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی۔ سعد زاغلول نے

ان کی عربی دانی کا لوہا مان لیا اور ان سے کہا کہ تم ہم سے بھی اچھی عربی بولتے ہو۔

لندن جانے سے پہلے اپنے استادِ مرحوم کی سیرۃ النبی جلد دوم مرتب کرکے چھپنے کے لئے دی۔ اس کا دیباچہ لندن ہی سے لکھ کر بھیجا۔ اس میں اقامتِ امن، تاسیسِ خلافت، تکمیلِ شریعت، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات، اخلاق اور عادات کا مفصل بیان ہے۔ مولانا شبلی نے اس کو نا تمام چھوڑا تھا۔ بہت سے عنوانات سادہ تھے۔ سید صاحب نے ان کو لکھ کر بطور تکملہ کتاب میں شامل کر دیا اور جا بجا ضروری حواشی بڑھائے۔

وہ لندن ہی میں تھے کہ ان کی کتاب 'سیرۃ عائشہؓ' شائع ہوئی جس میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کے واقعاتِ زندگی اور اخلاق و عادات کی تفصیل اور ان کے علوم و مجتہدات پر فاضلانہ بحث اور عالمانہ تبصرہ ہے۔ اس کی اشاعت پر بیگم صاحبہ بھوپال نے پانچ سو روپے انعام مرحمت فرمایا۔

۱۹۲۰ء کے آخر میں لندن سے واپس آئے تو تحریکِ ترکِ موالات میں پورے جوش و خروش سے حصہ لیا۔ ملک کا دورہ کیا، اخبارات میں مضامین لکھے۔ اس زمانہ میں ان کے دو رسالے "خلافتِ عثمانیہ اور دنیائے اسلام" اور "خلافت اور ہندوستان" بہت مقبول ہوئے جا بجا جلسوں اور خلافت کانفرنسوں کی صدارت بھی کی۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے ان کی وفات پر بیان دیتے ہوئے فرمایا کہ مولانا نے صرف علم و ادب ہی کی خدمت نہیں کی بلکہ ملکی سیاست میں بھی نمایاں حصہ لیا۔ تحریکِ خلافت میں انہوں نے جو خدمات کی ہیں، وہ فراموش نہیں کی جا سکتیں۔ علی برادران کے دوش بدوش ہندوستان کے طول و عرض میں انہوں نے جو تقریریں فرمائیں ان کو بھلایا نہیں جا سکتا۔

ان سیاسی مشاغل کے ساتھ ان کے قلم کا مسافر بھی چلتا رہا۔ ۱۹۲۴ء میں ان کی تصنیف سیرۃ النبی جلد سوم شائع ہوئی۔ اس کے مقدمہ میں اولاً نفسِ معجزہ کی حقیقت اور اس کے امکان و وقوع پر فلسفۂ قدیمہ اور فلسفۂ جدیدہ اور قرآن مجید کے نقطہ ہائے نظر سے مبسوط بحث و تبصرہ ہے اور اس کے بعد خصائصِ نبوت یعنی مکالمۂ الٰہی، وحی، نزولِ ملائکہ، عالمِ رویا، معراج اور شرحِ صدر کا بیان ہے، پھر وہ معجزات مذکور ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں ہے۔ پھر معجزوں کی نامعتبر روایات کی تنقید کا باب ہے اور اس کے بعد وہ بشاراتِ نبوی ہیں جو صُحفِ سابقہ میں موجود ہیں اور جن کے حوالے قرآن و حدیث میں مذکور ہیں۔ اور آخر میں خصائصِ محمدیؐ کا باب ہے۔

۱۹۲۴ء میں ابنِ سعود اور شریف حسین میں جنگ کا آغاز ہوا تو دونوں نے ہندوستان کی مجلسِ خلافت کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مسلمانانِ ہند نے سید صاحب کی صدارت میں ایک وفد حجاز بھیجا کہ فریقین کے سامنے مجلسِ خلافت کی تجویزیں پیش کرے۔ اس سلسلہ میں سید صاحب نے دو ماہ جدہ میں رہ کر مفوّضہ فرائض انجام دئے۔

اکتوبر ۲۵ء میں مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن آف سودرن انڈیا مدراس کی دعوت پر سیرۃ نبوی کے مختلف پہلوؤں پر آٹھ خطبے دئے جو خطباتِ مدراس کے نام سے شائع بھی ہوئے۔ ان میں نہایت اچھوتے انداز میں یہ بتایا گیا ہے کہ کاملیت، جامعیت اور عملیت کے لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام پیغمبروں میں لاثانی ہیں۔ یہ خطبات اپنے ادب و انشا اور شانِ خطابت میں اُردو لٹریچر کے شاہکار سمجھے جاتے ہیں۔

۱۹۲۶ء میں سلطان عبدالعزیز ابنِ سعود نجدی نے مؤتمر حجازیہ اسلامیہ کے نام سے ایک اجلاس طلب کیا جس میں دنیائے اسلام کے نمائندے مدعو کئے۔ ہندوستان میں بھی ایک وفد مقرر ہوا جس کے اراکین مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی اور شعیب قریشی تھے۔ اس کی قیادت سید صاحب کو دی گئی۔ حجاز جا کر اس نمائندہ و منتخب مجمع میں سید صاحب نے عربی میں اظہارِ خیال کرکے مسلمانانِ ہند کی دینی و علمی عظمت کا نقش اچھی طرح قائم کیا۔ تمام نمائندوں نے بڑی اکثریت سے ان کو اس مؤتمر کا نائب الرئیس منتخب کیا اور متعدد دفعہ صدرِ مؤتمر کی غیر حاضری میں صدارت بھی انہوں نے کی۔ اس موقع پر مولانا شبیر احمد عثمانی بھی حجاز میں موجود تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ "ہم سید صاحب کی شہرت سے واقف تھے۔ لیکن ان کی علمی قابلیت کا ٹھیک

اندازہ ۱۹۲۶ء کے موتمر اسلامی میں ہوا۔ ان کی برجستہ عربی تقریر سے ان کی ادبی قابلیت کے ساتھ ان کی جامعیت کا اعتراف ہونے لگا۔"

اس سفر سے واپسی کے بعد زیادہ تر علمی اور مذہبی کاموں میں لگے رہے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر مارگولیتھ کی اسلام دشمنی کے خلاف مضامین لکھے۔ اسی زمانہ میں ایک یورپین اہلِ قلم نے اپنے ایک مضمون میں یہ دکھانے کی کوشش کی کہ مسلمان حکما ارسطو کی گاڑی کے قلی تھے۔ سید صاحب نے اس کا مسکت جواب دیا۔ پھر اسی سال "مسلمان عورتوں کے حقوق" کے عنوان سے معارف کے کئی نمبروں میں مضامین لکھ کر یہ ثابت کیا کہ دنیا کے آخری ربانی پیغام اور تکمیلی دین نے عورتوں کے ساتھ جتنی بے انصافیاں تھیں سب کا خاتمہ کیا اور ان کو سارے حقوق دئیے ۱۹۲۸ء، ۱۹۲۹ء میں نابالغوں کی شادی پر قدغن لگانے کے لئے ساردا ایکٹ کا ہنگامہ اٹھا تو سید صاحب نے مضامین لکھ کر اس پر زور دیا کہ کسی غیر اسلامی حکومت کو مسلمانوں کے نکاح و طلاق کے سلسلہ میں قانون بنانے کا حق نہیں۔ پھر مسلمانوں کے لئے کلچرل اٹونومی کی صدا بلند کی۔

۱۹۲۹ء کے مارچ میں ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد میں "عرب و ہند کے تعلقات" پر لکچر دئے، جو کتاب کی صورت میں چھپ کر چار سو صفحات پر مشتمل ہیں۔ مسلمانوں کے متعلق انگریزوں نے جو غلط فہمیاں پھیلائی تھیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کا تعلق محض فاتحانہ اور حاکمانہ رہا ہے اس کتاب میں اس کی مکمل تردید ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ ہندوستان سے عربوں کا تعلق عہدِ اسلام سے بھی پہلے سے ہے اور اسلام کے بعد عربوں اور ہندوستانیوں کے درمیان نہایت گہرے سیاسی، تجارتی، علمی، مذہبی اور ثقافتی تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ یہ کتاب اپنی تحقیق و تدقیق، تلاش و محنت، صحت و استدلال کے لحاظ سے یورپین زبانوں کی اعلیٰ سے اعلیٰ محققانہ تصانیف کے مقابلہ میں پیش کی جا سکتی ہے۔

۱۹۳۱ء میں عربوں کی جہازرانی پر بمبئی گورنمنٹ کے شعبۂ تعلیم کی سرپرستی میں چار خطبے دئے جن میں یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ موجودہ جہازرانی کی ترقی میں عربوں کا کتنا بڑا حصہ ہے۔

۱۹۳۲ء میں ان کی سیرۃ النبیؐ کی چوتھی جلد شائع ہوئی اس میں قبل از اسلام دنیا کے متمدن ممالک اور خصوصاً عرب کی مذہبی و اخلاقی حالت کی تفصیل ہے۔ اس کے بعد نبوتِ محمدیؐ نے دنیا اور عرب کے لئے جس عظیم الشان اصلاح کا فرض انجام دیا اس کا بیان ہے۔

۱۹۳۳ء میں ان کی مشہور و معروف تصنیف "خیام" شائع ہوئی۔ خیام کو یورپ والوں نے ایک عیش پرست، بدمست اور رندِ لاابالی کی شکل میں پیش کیا ہے لیکن خیام کی اس تصویر کو اصل حقیقت سے کوئی علاقہ نہیں۔ سید صاحب نے اپنی تصنیف میں یہ ثابت کیا کہ وہ بہت بڑا حکیم، فلسفی، صوفی، عالمِ ریاضیات و ہیئت اور ایک صحیح العقیدہ مسلمان تھا اور اس کی شراب بھٹی کی شراب نہ تھی بلکہ شرابِ عبادت شرابِ اخلاص، شرابِ معرفت اور شرابِ حقیقت تھی۔ یہ کتاب علمی دنیا میں بڑی وقعت کی نظر سے دیکھی گئی۔ ایران میں فردوسی کی ہزار سالہ جوبلی منائی گئی تو اس موقع پر افغانستان نے ایران کو جو تحائف بھیجے ان میں یہ "خیام" بھی تھی۔

اکتوبر ۱۹۳۳ء میں نادر خان شاہِ افغانستان کی دعوت پر علامہ ڈاکٹر اقبال اور سر راس مسعود کے ساتھ کابل تشریف لے گئے اور وہاں شاہی مہمان رہ کر کابل یونیورسٹی کی ترتیب، تنظیم اور تکمیل اور وہاں کے تراجم و تالیفات کے دائرے کو وسیع کرنے کے سلسلہ میں مفید مشورے دئے اس سفر میں ڈاکٹر اقبال ان سے بہت ہی متاثر ہوئے، چنانچہ وہ اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ:

> "آج سید سلیمان ندوی ہماری علمی زندگی کے سب سے اونچے زینے پر ہیں وہ
> عالم ہی نہیں بلکہ امیر العلماء ہیں۔ مصنف ہی نہیں بلکہ رئیس المصنفین ہیں ان
> کا وجود علم و فضل کا دریا ہے جس سے سینکڑوں نہریں نکلی ہیں اور ہزاروں سوکھی
> کھیتیاں سیراب ہوئی ہیں۔"

افغانستان کے سفر کے حالات بھی قلمبند کئے ہیں جو "سفرنامۂ افغانستان" کے نام سے شائع ہو گئے ہیں۔

۱۹۳۵ء میں ان کی سیرۃ النبی کی پانچویں جلد نکلی۔ جس میں عبادت کی وہ حقیقت اور اسلام میں اس کے وہ اقسام و انواع اور ان میں ہر ایک کی مصلحت و حکمت اور گذشتہ مذاہب کے اسباق کی وہ تکمیل جو ذات پاک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دنیا میں ظاہر ہوئی، بیان کی گئی ہے۔

۶ نومبر ۱۹۳۶ء کی آل انڈیا فلسطین کانفرنس دہلی کی صدارت کی، اپنے خطبہ میں یہودیوں کے غلبہ سے فلسطین کو بچانے کے لئے جو صورتیں بتائیں وہ اس قدر مدلل اور آنکھیں کھول دینے والی تھیں کہ مصر، فلسطین اور دوسرے عرب ممالک کے اخباروں نے اس خطبہ کو لفظاً بلفظ شائع کیا۔

اس وقت تک ان کے علم و فضل کا پایہ اتنا بلند ہو چکا تھا کہ مختلف ادارے ان کی رکنیت پر فخر حاصل کرنے لگے۔ چنانچہ وہ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے کورٹ کے ممبر بھی ہوئے۔ ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد اور جامعہ ملیہ کے اہم رکن بھی تھے۔ دارالمصنفین کے ناظم اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کے معتمد تعلیمات تو ۱۹۱۵ء ہی سے مسلسل رہے۔ ۱۹۳۳ء میں ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کے سالانہ جلسہ میں شعبۂ اردو کانفرنس کی صدارت بھی کی۔ پھر مارچ ۱۹۳۷ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی طلائی جوبلی ہوئی تو اس کے شعبۂ علوم و فنون کی صدارت بھی ان ہی کو دی گئی۔

۱۹۳۸ء میں سیرۃ النبی کی چھٹی جلد شائع ہوئی۔ اس میں اسلام کی اخلاقی تعلیمات خصوصاً حقوق، فضائل، رذائل اور آداب پر مباحث ہیں، اس کی اشاعت پر مولانا مناظر احسن گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن نے لکھا کہ:

> "نئے حالات نے جدید ذہنیتوں میں جن نئی نئی الجھنوں کو پیدا کر دیا تھا، نہ معلوم جاننے والے جانتے ہیں کہ اعظم گڈھ کے اس زاویہ نشین درویش کے قلم سے ان کی گرہ کشائیوں میں کتنی جلیل و عظیم خدمتیں انجام دی ہیں، جب جائزہ لیا جائے گا تو اسلام کے ایک مخلص فقیر نے علم کے جن بیش بہا سرمایوں کو وقف عام کیا ہے ان کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز نہ ہو کر انشاء اللہ تعالیٰ ہزاروں تک پہنچی ہوئی نظر آئے گی ۔۔۔۔۔۔ لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں کہ پڑھا جائے اور سمجھا جائے اسے زیادہ جس میں کہا جائے کا مطالبہ کیا گیا ہے، بالفاظ دیگر جس میں مسلمانوں کی عملی زندگی پر براہ راست اثر انداز ہونے والی چیز سب سے پہلے آپ کے قلم سے جو نکلی ہے وہ سیرۃ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جلد ششم ہی ہے۔"

۱۹۳۹ء ہی میں ان کی کتاب نقوش سلیمانی بھی شائع ہوئی، اس میں ان کی ان تمام تقریروں اور تحریروں کا مجموعہ ہے جو اردو زبان سے متعلق ان کے قلم اور زبان سے نکلتی رہیں۔ یہ پچھلی چوتھائی صدی کی ادبی تحریکوں کا مرقع ہے۔

۱۹۴۰ء میں بچوں کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت "رحمت عالم" کے نام سے لکھی، لیکن بوڑھے بچے بھی اب اس سے استفادہ کرتے ہیں۔

۱۹۴۱ء میں مسلم یونیورسٹی کی طرف سے ڈاکٹریٹ آف لٹریچر کی آنریری ڈگری ملی۔ یونیورسٹی نے یہ ڈگری دے کر گویا اپنے ہی لئے سرمایۂ افتخار فراہم کیا۔

۱۹۴۲ء میں وہ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے آستانہ پر جا کر جھک گئے، اور علم و حکمت کے اس گنج گراں مایہ نے اپنے کو ایک روحانی پیشوا کے حوالے کر دیا، اور اس کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہ تھا کہ ان میں تکوینی انانیت شکنی اور نفس میں مزید تضرع و ابتہال و شکستگی پیدا ہو۔ چنانچہ اس کے بعد ان کی نمازوں میں، ان کی دعاؤں میں، ان کی تہجدوں ان کی شب بیداریوں میں، ان کے ذکر و شغل میں رضائے الٰہی کی طلب اور بھی زیادہ بڑھ گئی۔

۱۹۴۳ء میں ۸۴۶ صفحات کی حیاتِ شبلی لکھ کر اپنے مرحوم استاد کو اپنا خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اس سے پہلے استاد مرحوم کے مقالات و مکاتیب کو گیارہ جلدوں میں ایڈٹ کر کے شائع کر چکے تھے۔ حیاتِ شبلی ایک شخص کی سوانح عمری ہی نہیں بلکہ مسلمانانِ ہند کے پچاس برس کے علمی، ادبی، سیاسی تعلیمی، مذہبی اور قومی واقعات کی بھی تاریخ ہے۔ یہ سید صاحب کی آخری تصنیف ہے۔ سیرۃ النبی کی ساتویں جلد لکھنے کی کوشش کی مگر دو باب سے زیادہ لکھ نہ سکے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ان سے پہلے لا الٰہ الا اللہ کی تعلیم پھیلانے والے تو بہت سے اہلِ دل اور اہلِ علم گذرے لیکن محمد رسول اللہ کی تعلیم عہدِ حاضر میں ان کی بدولت پھیلی۔ اور ان ہی کی وجہ سے مسلمانوں کے قلوب نورِ محمدیؐ سے منور ہوئے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے بجا طور پر فرمایا کہ:

"سیرۃ النبی اول تا ششم کے اس ضخیم و عظیم الشان کارنامہ کی مثال اردو میں یا کسی اور زبان میں کیا ہوتی، عربی میں ملنا مشکل ہے...... سلیمان کا یہی ایک کارنامہ انہیں سلیمانِ اعظم بنا دینے کے لئے کافی ہے۔ زندگی بھر وہ کچھ اور نہ کرتے تنہا یہی اپنی یادگار چھوڑ جاتے، جب بھی ان کا نام نامی رہتی دنیا تک روشن رہتا۔ رسولِ کریم کے ممتاز سیرۃ نگاروں کی صفِ اول میں انہیں جگہ ملتی اور حشر میں اپنے جدِ اعلیٰ کی نگاہِ کرم و شفقت کے روبرو شبلی اور قسطلانی اور زرقانی کے زمرہ میں وہ بھی محشور ہوتے لیکن سیرۃ النبی کے جلو میں تو ایک پورا لشکر ہے۔ رحمتِ عالم اور ارض القرآن، سیرۃ عائشہؓ اور خطباتِ مدراس، نقوشِ سلیمانی اور خیام، عرب و ہند کے تعلقات اور حیاتِ شبلی، لغاتِ جدیدہ، عربوں کی جہاز رانی، چھوٹی، بڑی، نئی پرانی، دینی، علمی، ادبی درجنوں کتابوں کے مصنف اور بے شمار مقالات کے راقم کو کوئی اردو خواں بھلانا چاہے تو بھی کیسے بھلا سکتا ہے۔ اپنی چالیس سالہ زندگی میں ادبِ صالح سے اردو کے ذخیرہ کو جتنا مالا مال اس مرنے والے نے کیا ہے اس سے بڑھ کر اور کون کر سکتا ہے۔"

۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۶ء تک خالص دینی، مذہبی اور تعلیمی کاموں میں لگے رہے۔ ۱۹۴۶ء میں نواب حمید اللہ خان والئ بھوپال نے ان سے اصرار کیا کہ ریاست بھوپال کے دار القضاۃ اور وہاں کے عربی مدارس کو اپنی نگرانی میں لے کر ان کو خالص مذہبی اور شرعی رنگ میں کر دیں۔ بقول جناب شعیب قریشی صاحب قاضئ ریاست کا عہدہ تو ان کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکا لیکن تعلیمِ عربی کی اصلاح و ترقی کے موقع کو وہ انکار نہ کر سکے۔ وہ جولائی ۱۹۴۶ء سے اکتوبر ۱۹۴۹ء تک بھوپال جا کر جس مقصد کے لئے گئے تھے اس کی تکمیل کے لئے برابر کوشش کرتے رہے۔ لیکن اگست ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد ریاستوں کا حال بالکل ہی بدل گیا تو ۱۹۴۹ء کے دسمبر میں خانہ کعبہ کی زیارت کے لئے عازم ہوئے۔

وہاں سے واپسی کے بعد ہندوستان میں اپنی ساری املاک اور سارا سرمایہ چھوڑ کر جون ۱۹۵۰ء میں پاکستان چلے گئے۔ تاکہ مسلمانوں کی اس نوزائیدہ سلطنت کی خدمت کر سکیں۔ ان کے پاکستان جانے کی اصلی غایت یہ تھی کہ وہاں کی حکومت اور اصحابِ اقتدار کو دین کی طرف متوجہ کریں اور مسلمانوں سے علومِ دین کی حفاظت و اشاعت کا کام لیں۔ اس مقصد کی تکمیل کی خاطر دار المصنفین کی طرح پاکستان میں دائرۃ المصنفین نام کا ایک ادارہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ پاکستان کے سہ سالہ قیام کے زمانہ میں وہ جمعیۃ العلماء اسلام کے صدر، پنجاب یونیورسٹی کمیشن کے ممبر، قائدِ اعظم کی یادگار میں مجوزہ عربی دار العلوم کی کمیٹی کے رکن، دستور ساز اسمبلی کے بنیادی حقوق کی سب کمیٹی کے ممبر، پنجاب کے عربی مدارس کے ایک سالانہ جلسہ کے صدر، کراچی یونیورسٹی کے

سٹیٹ کے ممبر، پاکستان ہسٹاریکل کانفرنس کے صدر بھی ہوئے لیکن دائرۃ المصنفین کا خواب پورا نہ ہوا، اور ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء کو کراچی میں یہ عارف معارفِ ربانی، گلشنِ رسالت کا عندلیبِ خوش نوا، دینِ مبین کا غم خوار، فضل و کمال کا نادرۂ روزگار، صدق و صفا اور خدمت و ایثار کا پیکر اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملا۔ شام کے سفیر نے تدفین سے پہلے جنازہ کے پاس ایک المناک اور درد انگیز تقریر کی جس کا آخری فقرہ یہ تھا:

"اے سلیمان! تمہارے جانے کا اتنا غم نہیں جتنا اس گنجینۂ علم کا صدمہ ہے جو تمہارے ساتھ دفن ہو رہا ہے۔"

ان کے طرزِ انشا پر اردو زبان کے سب سے بڑے ادیب مولانا عبدالماجد دریا بادی فرماتے ہیں:

"سیرۃ النبی کی ضخیم مجلدات سے لے کر خیام، خطباتِ مدراس اور رحمتِ عالم تک بڑی، منجھولی اور چھوٹی کتابوں تک کون سی ایسی ہے جہاں حضرت سلیمان، ایک خشک مولوی، ملّانے معلوم ہوتے ہوں اور صحتِ زبان و سلاستِ بیان نمایاں نہ ہو۔ شستگی، متانت، شرافت یہ تو ان کے اسلوبِ تحریر کے جوہرِ اصلی ہیں اور اس سے جا بجا شوخی و ظرافت کی گلکاریاں اور حسنِ صناعت کی سحر طرازیاں جیسے خاتمِ سلیماں میں نگین۔"

شمس العلماء مولوی عبدالرحمٰن

نواب خواجہ عبدالمجید دھلوی

ان سے میرے تعلقات چالیس برس تک رہے۔ اس عرصہ میں جو فضائل اور خوبیاں مولوی صاحب مرحوم کی میری نظر سے گزریں اگر ان واقعات کا ذکر کروں تو ایک مستقل کتاب لکھنے کی ضرورت ہو۔ تاہم مشتے نمونہ از خروارے عرض کرتا ہوں۔ یہ بیان کرنا کہ مولوی صاحب کے علم کی وسعت کس حد تک تھی تحصیل حاصل ہے جیسے کوئی آفتاب کی روشنی کا ذکر کرے اور اس کے صفات بیان کرے۔ عربی زبان میں ان کی مہارت بدرجۂ اتم تھی۔ تحریر اور تقریر دونوں پر قادر تھے۔ سفر انگلستان میں اس کا بین ثبوت دنیا کے علمائے عربی کے سامنے پیش کیا اور اپنے بیان کی اور زبان کی داد لی۔ فارسی زبان سے چونکہ قدرے میں بھی واقف ہوں یہ عرض کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ مجھے اس زبان کے عالم اہلِ زبان اور دیگر زبان دانوں میں اس پایہ کے کم ملے۔ اردو اور فارسی کے بہت بڑے نقادِ سخن تھے۔ خود بھی شعر فرماتے تھے مگر بہت کم۔ میرے پاس ان کے دو فارسی کے قطعے جو انھوں نے میری عزت افزائی کے لئے فرمائے تھے۔ میری نشست کے کمرے کی زینت تھے۔ جن کو ایک مرتبہ حکیم اجمل خان دیکھ کر حیرت میں رہ گئے ——— علمِ اصطرلاب کا غالباً یہ شخص آخری عالم تھا۔ پٹنہ لائبریری کے لئے اصطرلاب کی شرح لکھ کر وہاں کے افسرانِ لائبریری کے ایما پر وہاں رکھوائی گئی اور اس کام نے ان کی آنکھوں پر ایسا بُرا اثر ڈالا کہ اسی دن سے عینک لگانے کی ضرورت ہو گئی۔

اوائل عمر میں زوجۂ محترمہ کا انتقال ہو گیا صرف اولاد میں ایک کمسن لڑکا چھوڑا۔ مولوی صاحب مرحوم نے نکاحِ ثانی کی طرف کبھی رغبت ہی نہ کی۔ اپنا سارا وقت اور زر و مال اپنے صاحبزادے میاں رشید کی تعلیم و تربیت اور نگہداشت میں صرف کیا۔ بعض عورتوں نے ان پر داؤں ڈالے مگر ان کی عفت زلفِ دراز کے پھندوں میں پھنسنے والی نہ تھی۔ ابتدائے عمر سے آخر وقت تک دنیا میں عفت اور عصمت کے ساتھ زندگی بسر فرمائی۔

پرانے طریقۂ زندگی کے شیدائی تھے۔ پاندان ہر وقت سامنے دھرا رہتا تھا جو جاتا اس کو اپنے ہاتھ سے پان لگا کر دیتے مگر شاگرد کو کبھی نہ دیتے بلکہ پاندان اس کے سامنے کر دیتے کہ اپنے آپ بنائے اور کھائے۔ جس دن شاگردی کی زندگی ختم ہو جاتی خود پان دینے لگتے۔ صدق اور صداقت کے گرویدہ تھے۔ مکان کے دو حصے تھے۔ ایک زنانہ دوسرا صرف ایک کمرہ مردانہ جو گلی راجاں کلاں میں بر سرِ راہ تھا۔ یہی ان کی اہلیہ کے انتقال کے بعد نشست گاہ اور آرام گاہ تھی۔ خواجہ شفیع سے ایک مرتبہ شکایت فرمائی کہ لوگ اس قدر میرے پاس آتے جاتے رہتے ہیں کہ کام کرنے کی فرصت نہیں ملتی۔ انھوں نے عرض کیا کہ آپ زنانہ مکان میں جا کر بیٹھا کریں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ان کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ اتنی وسعت نہ تھی کہ نوکر چاکر رکھ سکیں۔ فرمایا کہ اگر وہاں جا بیٹھا ہوں

اور کوئی شخص دروازے پر آکر آواز دیتا ہے تو مجبوراً رشید میاں سے یہ کہوانا پڑیگا کہ میں موجود نہیں ہوں۔ بچہ اپنے دل میں کیا کہے گا کہ ابا جان جھوٹ بول رہے ہیں اور یہ اس کی تربیت کے واسطے خراب ہوگا۔

تقریباً تیس سال مشن کالج دہلی میں ملازمت کی۔ اس عرصہ میں وہاں مختلف اچھے بُرے یورپین اور دیسی عیسائی پرنسپل رہے سب سے ان کی اچھی نبھی۔ اس وجہ سے کہ یہ اپنے مفوّضہ کام کے سوا کسی کام میں دخل نہ دیتے تھے۔ اگر افسر کسی معاملہ میں ان کا مشورہ بھی چاہتا تھا تو بہت احتیاط سے دیتے تھے۔ ہر معاملے میں ان کی رائے راجح بصواب ہوتی تھی۔ کالج کے طلبہ سب پروفیسروں سے زیادہ ان کا ادب اور عزّت کرتے تھے۔ یہ ان کے وقار اور تہذیب کی وجہ سے تھا۔ کسی کام میں اپنے وقار کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ اپنی قابلیت کی بنا پر دلّی یونیورسٹی میں عربی فارسی اور اُردو کے شعبوں کے صدر رہے۔

مولوی صاحب کی تعلیم و تربیت اپنے والد بزرگوار کی زیرِ نگرانی ہوئی۔ صاحب موصوف مہاراجہ جے پور کی فوج میں ملازم تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ ہندو ریاستوں میں بھی عربی اور فارسی کے علما کی عزّت افزائی ہوتی تھی۔ چنانچہ بہت اچھے اچھے عالم ان دونوں زبانوں کے جے پور میں موجود تھے۔ ان میں سے اکثر جے پور کے انگریزی کے مدرسے کی فارسی اور عربی کی جماعتوں کو تعلیم دیتے تھے۔ یہ ان کے اور دیگر چند عربی دانوں کے شاگرد رہے۔

ان کے والد کی دو بیویاں تھیں۔ یہ چھوٹی بیوی کے بطن سے تھے۔ بڑی بیوی کے بطن سے ان کے بڑے بھائی تھے جن کی اولاد میں حفیظ صاحب ہیں۔ اس بڑے بھائی کے بچے کو بھی انھوں نے اپنے ہی پاس دہلی میں رکھا اور تعلیم و تربیت کی نگرانی کی یہاں تک کہ وہ ملازم ہوگئے۔

مولوی صاحب نسب سے راجپوت نژاد ہیں۔ اسلام قبول کرنے کے بعد سفری مسلمان کہلائے۔ وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ سب شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی فوج میں ملازم تھے۔ جس وقت یہ فوج خلد آباد عالمگیر کی سرکردگی میں گزر رہی تھی سرِراہ ایک بزرگ کا مزار تھا جس کے قریب کوئی باجہ نہیں بج سکتا تھا۔ فوج کے آگے آگے ڈنکا بردار ڈنکے پر چوٹ لگاتا ہوا چلا۔ جب مزار کے قریب آیا گھوڑے پر سے گر پڑا اور فوراً مر گیا۔ اس کی جگہ اسی وقت دوسرا ڈنکا بردار جا بیٹھا اس نے جونہی ڈنکے پر چوٹ ماری مر کر گر پڑا۔ اورنگ زیب وسط فوج میں تھا۔ جب اس کو یہ اطلاع ملی فوراً گھوڑا بڑھا کر آگے آگیا اور ڈنکا اپنے گھوڑے پر رکھوالیا اور مزار کے قریب جا کر کہا کہ حضور یہ باجہ نہیں ہے طبلِ غازی ہے یہ کسی جگہ بند نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ وہ بزرگ قبر سے باہر نکل آئے اور فرمایا کہ تو مسلمانوں کا بادشاہ ہے اور مسلمانوں کے واسطے لڑ رہا ہے تیرا طبل بے شک بجے گا۔ اتنا کہہ کر پھر مزار میں داخل ہوگئے۔ یہ کرامت دیکھ کر اس وقت جتنے راجپوت فوج میں موجود تھے ایمان لے آئے۔ اور ان کا نام "سفری مسلمان" ہوا۔

عہدِ مغلیہ کے آخری دور میں جب ان لوگوں کے واسطے فوجی ملازمت کے دروازے بند ہوگئے تو ان کا پیشہ راجپوتانے کی بیابان نوردی اور غارتگری رہا۔ بعد میں کسی بادشاہ نے ان کو خواجہ کے نواح میں زمینیں عطا فرمائیں اور یہ لوگ وہاں جا کر متوطن ہوئے۔ کاشتکاری اور مویشی پروری کا پیشہ اختیار کیا چنانچہ اب تک اسی حال پر قائم ہیں۔ چند افراد تعلیم پا کر سرکار انگریزی اور راجاؤں کی خدمت گزاری کرنے لگے۔

تقسیم کے بعد مولوی صاحب کراچی اپنے صاحبزادے کے پاس آگئے تھے۔ ابھی پچھلے دنوں وہیں انتقال فرمایا۔ ہمارے پاس ان کے واسطے اب دعائے مغفرت کے سوا اور کیا رہ گیا۔ اللہ تعالیٰ مغفرت کرے اور ان کی اولاد کو فائز المرام کرے۔ عجب خوبیوں کا مرد تھا۔

آرزو لکھنوی

چودھری جلیل احمد

۱۹۴۹ء میں کراچی سے لکھنؤ کا سفر درپیش ہوا تو قصداً بمبئی کی راہ اختیار کی۔ مقصد یہ تھا کہ راستہ میں قیام کرکے حضرت آرزو سے ملاقات کی جائے۔ اس سے پہلے میں نے آرزو صاحب کو دیکھا نہ تھا۔ اُن سے خط و کتابت تھی، اُن کے کلام سے کافی متاثر تھا اور چند ایک غزلوں پر اُن سے اصلاح بھی لی تھی۔

لکھنؤ میں آرزو صاحب کے کافی شاگرد تھے۔ اُن کے چرچے رہتے، اُن کا کلام پڑھا جاتا تھا۔ میرے کرمفرما وصی احمد صاحب اختر جن کے یہاں طالب علمی کے آخری دور میں دن رات میری نشست رہتی تھی، آرزو صاحب کے عزیز ترین شاگردوں میں سے تھے۔ گو کہ وکالت کی مصروفیات میں پڑ کر خود شاعری چھوڑ چکے تھے مگر اس فطری رجحان سے مجبور رہتے۔ اور جب بھی فرصت ملتی تو استاد کا کلام پڑھا جاتا اور اُن کا ذکر ہوا کرتا۔

آرزو صاحب عرصہ ہوا لکھنؤ چھوڑ چکے تھے۔ اور پریشانیوں کے ساتھ مالی پریشانیوں نے ترکِ وطن پر مجبور کیا۔ لکھنؤ میں شاعری کا وہ دور پر آشوب تھا۔ اکھاڑے گرم ہوتے تھے۔ روٹی ملنے کی صرف یہی ایک صورت تھی کہ یا تو باپ دادا کی چھوڑی ہوئی جاگیر ہوتی یا اپنی استادی کے داؤں پیچ دکھا کر لوگوں کو پھانسا جاتا یا کسی رئیس کی درباداری اختیار کی جاتی۔ آرزو صاحب شاید قطعی طور پر ان میں سے کسی بات کو اختیار کرنے سے مجبور رہتے لہذا لکھنؤ میں قیام کی صورت نہ تھی۔ کلکتہ میں نیو تھیٹرس میں گیت لکھنا اور باقی وقت میں تحقیقی کام کرنا پسند آیا۔ ایک عرصہ تک کلکتہ قیام رہا اور پھر وہیں سے بمبئی کا رخ کیا۔ یہ وجہ تھی کہ میں اب تک آرزو صاحب سے ملاقات نہ کر سکا تھا۔

بمبئی میں اُن کا قیام اُن دنوں بھنڈی بازار میں جمشید فیروز محل کی تیسری منزل پر تھا۔ میں نوروباغ پرمٹ آفس سے جہاں میرا قیام تھا، صبح کے وقت اُن سے ملاقات کے لئے گیا۔ اُن کے کلام اور خطوط کو پڑھ کر دل ہی دل میں اُن کے رہنے سہنے اور اُن کے گفتگو کرنے کے انداز کا نقشہ بنا رہا تھا۔ انہیں مختلف خیالات میں الجھا ہوا پہنچا، دروازہ پر دستک دی، اطلاع کرائی۔ نام سے مجھے پہچان لیا اور اندر بلایا۔ کمرے میں ایک چارپائی پر ایک میانہ قد بزرگ، ذرا مضبوط ساخت کا جسم، چوڑی اُبھری ہوئی پیشانی، سر پر سفید بال بالکل باریک اُلجھے ہوئے ریشم کے لچھے، ایک تہبند اور بنیان پہنے ایک اور صاحب سے باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ شیو معلوم ہوتا تھا کہ دو تین دن سے بڑھا ہوا ہے۔

میں نے جاتے ہی تسلیم کیا، اٹھ کھڑے ہوئے اور نہایت تپاک کے ساتھ بغل گیر ہوئے۔ مجھے ایسا اندازہ ہوا کہ جیسے میرے دیرینہ کرمفرما اور سرپرست

ہیں۔ جو صاحب بیٹھے تھے شاید اُنہیں اِس کا اندازہ نہ ہو سکا ہو کہ مَیں ان سے پہلی مرتبہ ملا ہوں۔ اُن صاحب سے ملاقات کرائی اور مجھ سے کراچی اور لکھنؤ کے متعلق گفتگو کرنے لگے اور احباب اور شاگردوں کی باتیں ہونے لگیں۔ چائے آئی اور ہم لوگوں نے چائے پی۔ ان دنوں وُہ ایک عرصہ سے بیمار تھے، ایک کاربنکل نکل آیا تھا جس نے بڑی تکلیف دی تھی اور وُہ بالکل کمزور ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ قلبی دَوروں کی بھی شکایت رہتی تھی۔

دَورانِ گفتگو میں مَیں نے محسوس کیا کہ اُن میں کسی قسم کا تکلّف یا تصنّع نہ تھا۔ طبیعت میں بلا کی سادگی تھی جو اور دلکش تھی۔ نہایت پست آواز میں اور مزے لے لیکر باتیں کرتے تھے۔ باتیں کرنے میں آنکھوں کا خاصا حصّہ ہوتا تھا۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ بالکل محویّت اور احساس کے ساتھ بات کی جا رہی ہے۔ آنکھیں دفعتاً کسی دلچسپ واقعہ سے روشن ہو جاتی تھیں۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ جیسے واقعات کا عکس آنکھوں میں اُتر آیا ہو۔ ہنسی کا بھی ایک مخصوص انداز تھا۔ جس میں خوشی غیر ارادی طور پر شامل تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اُن کا تمام پیکر خوشی میں موجزن ہے۔ اُن کے دونوں کُھلے ہوئے ہونٹوں پر اُس انبساط کی لہریں ہوتی تھیں جو سکونِ قلب کی گہرائیوں سے اُٹھتی ہیں۔ ایک ساعت گفتگو کے بعد میں نے محسوس کیا کہ کمزوری انہیں نڈھال کر رہی ہے۔ لہٰذا مَیں نے جانے کی اجازت مانگی۔ میرے وہیں قیام پر اصرار فرمایا اور اِس وعدے پر اجازت دی کہ شام کو پھر ملاقات کروں۔

مجھے شام کو وقتِ مقررہ پر پہنچنے میں ذرا دیر ہو گئی۔ مکان کے نیچے سڑک پر ملاقات ہو گئی۔ وہ اپنے ایک شاگرد پرتو صاحب کے ساتھ جا رہے تھے۔ مجھ سے کہنے لگے "یہیں قریب میں ایک مسجد ہے جس کے پاس ایک ایرانی چائے والے کی دُکان ہے۔ میں وہیں شام کو بیٹھ جاتا ہوں، میرے ساتھ چلو۔"

چنانچہ ہم ایرانی چائے والے کی دکان پر جا کر باہر بچھی ہوئی بنچ پر بیٹھ گئے۔ اور چائے کے لئے کہا۔ شیشہ کے استکان میں "خالی رنگ" آ گیا اور ہم لوگوں کا دَور شروع ہو گیا۔ لوگ آتے جاتے تھے لیکن انہیں کسی سے سروکار نہ تھا۔ چائے والے سے البتہ رسمی مزاج پرسی کی گئی اور بمبئی کا حال اور وہاں کے احباب کا ذکر شروع ہو گیا۔ ان دنوں جس فلم کمپنی میں کام کر رہے تھے وہ عارضی طور پر بند ہو گئی تھی اور مجھے معلوم ہُوا کہ آجکل مالی طور پر پریشان حال ہیں۔ چائے والے کی دکان کے ساتھ ہی لکھنؤ کے ایک پتنگ ساز کی دُکان تھی۔ ہم لوگ اس پتنگ والے کی دکان پر بیٹھ گئے۔ اس سے اُن کے دیرینہ مراسم تھے۔ اس کی دُکان میں نئی بنی ہوئی پتنگوں کو دیکھا گیا۔ کانپ، ڈھڈے اور دور مانجھے کی باتیں شروع ہو گئیں۔ لکھنؤ میں پتنگ سازی کا عام رواج تھا۔ آرزو صاحب مختلف باتیں پتنگ کے متعلق بتاتے رہے۔ معلوم ہُوا کہ انہیں پتنگ لڑانے کا انتہائی شوق تھا۔ اور اس میدان کے بھی وہ اُستاد تھے۔ عمر نے معذور کر دیا تھا مگر وقت اِس انہماک کو ذہن سے مٹا نہ سکا تھا۔

مجھے دوسرے دن لکھنؤ جانا تھا۔ لہٰذا کراچی واپسی پر بمبئی ہوتے ہوئے جانے کا وعدہ کر کے اُن سے رخصت ہُوا۔ لکھنؤ سے واپسی پر پھر بمبئی پہنچا۔ معلوم ہُوا کہ بہت زیادہ علیل ہیں۔ قلب کا دباؤ بڑھا ہُوا ہے اور ران کے نزدیک چوٹ آ گئی ہے جس سے تکلیف ہے۔ دو ایک مرتبہ ملاقات ہوئی مگر علالت کی وجہ سے گفتگو نہ ہو سکی۔ میں کراچی چلا آیا۔

وُہ پاکستان کے معاملات میں بہت دلچسپی لیتے تھے اور یہاں کی خوش حالی کی خبریں سُن سُن کر بہت خوش ہوتے تھے۔ قائدِ اعظم کا انتقال ہُوا تو وُہ ہندوستان ہی میں تھے۔ انتقال سے بیحد متأثر ہوئے اور فوراً وہیں سے ایک نظمیہ قائدِ اعظم کی صفات کا لکھا جس کے آخری شعر کے آخری مصرعہ سے ان کے انتقال کا سال بھی نکلتا ہے۔ ؎

بن گئی سلطنت نئی - ہو گئی قوم حکمراں

اُٹھ گیا کہہ کے کارکن - کام تمام ہو گیا

یہ ان کی دلکش سادگی اور خلوص کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔ آئندہ سال ڈان کا مشاعرہ ہونے کو تھا۔ آرزو صاحب کے نام دعوت نامہ گیا۔ مَیں نے اور اُن کے اور احباب اور شاگردوں نے جو کراچی میں تھے، اُن کو اصرار کے خط لکھے کہ ضرور تشریف لائیں۔ حالانکہ وُہ بیمار تھے مگر یہ سفر اختیار کیا۔ مشاعرہ ختم ہو گیا مگر احباب نے اُنہیں کراچی ہی میں روک لیا اور اُن کا قیام خوش قسمتی سے میرے ہی ساتھ ہُوا۔ اِس تین ماہ کے قیام میں اُن کے انتقال تک مجھے اُن کی زندگی اور اُن

کی عادات کے مختلف پہلوؤں سے جس قدر استفادہ حاصل کرنے کا موقع ملا وہ ایک بیش بہا تجربہ ہے۔

فطری طور پر آرزو صاحب بہت سادہ، مخلص اور خوددار تھے۔ زر و جاہ کی نہ اُنہیں ہوس تھی اور نہ اقتدار کی چاہت۔ کسی کو اس لئے فوقیت نہ دیتے تھے کہ وہ صاحبِ ثروت ہے یا اِس لئے حقیر نہ سمجھتے تھے کہ وہ نادار ہے۔ اُن کی زندگی جہاں ان کے کمال اور اُن کی علمی اور ادبی کاوشوں کا مرقع ہے وہاں اُن کی مالی دشواریوں کا افسانہ بھی ہے۔ لکھنؤ کے قیام میں مسلسل کئی سال تک "نظامِ اردو" کی تصنیف میں مصروف رہے۔ ایک طرف کام کی دُھن تھی۔ لفظ آوازیں سے پرکھے جا رہے تھے۔ اور استعمال کی کسوٹی پر کسے جا رہے تھے، دوسری طرف بیٹھنے کو مکان اور کھانے کو روٹی تک نہ تھی۔ مگر پائے ثبات کو لغزش تک نہ ہوئی۔ اُن کے لئے چند احباب کا خلوص ہی بہت تھا۔ ہاتھ کا سرہانے سے اُٹھنا کیسا، لب شکایت بھی دامنِ غیرت کے ساتھ ہی سِل چکا تھا۔ ترکِ وطن کے بعد بھی خوشحالی نصیب نہ ہوئی۔ مگر وہ تنگی جو تھی نہ رہی اور ساتھ ہی اُن کے ادبی ذوق میں خلل نہ پڑا۔ اس کے باوجود بھی روپیہ سے اُن کی بے نیازی قائم رہی، اور جب بھی کسی کی مدد کر سکے تو اس میں تامل نہ کیا۔ اس کا تو خیال ہی نہ تھا کہ کسی سے کچھ فائدہ ہو جائے۔ بمبئی کے قیام کے زمانہ میں ایسے واقعات بے شمار ہیں کہ لوگ آئے اور اُنہیں گیت بنا دیئے۔ اتفاق سے جو پاس بیٹھا ہوا، اُسے معلوم ہو گیا ورنہ نہ اس کا ذکر نہ خیال۔

باوجود اس کے کہ شاعرِ بے بدل اور محققِ زبان داں تھے، طبیعت میں سوائے انکسار کے کچھ نہ تھا۔ ہر شخص سے نہایت خوشی سے بات کرتے۔ وضعداری اور خوش خلقی کا یہ عالم تھا کہ کراچی میں جن دنوں بیمار رہے۔ مجھے یہ فکر تھی کہ آرام کریں، مگر وہاں آرام کیسا۔ رات کے دو دو بجے تک جب تک لوگ جمع رہتے، لیٹنا ہی گناہ تھا۔ فرماتے تھے "جلیل صاحب! آپ بھی کمال کرتے ہیں، یہ لوگ اتنی دور سے چل کر مجھ سے ملنے آتے ہیں اور میں بیٹھ کر دو گھڑی اُن سے باتیں بھی نہ کروں"۔

اِس دوران میں چند طالب علم دوست بھی میرے یہاں آئے اور چند ایسے حضرات بھی آئے جنہیں اُن سے لگاؤ تک نہ تھا مگر میں نے دیکھا سب سے گفتگو کا وہی عالم۔ جو شخص گیا، کسی مذاق اور کسی استعداد کا ہو، اُن سے متاثر ہو کر گیا۔ اُن کی ہمدردی اور اخلاق ہر ایک کو موہ لیتا تھا۔ بچوں کے ساتھ بالکل ویسی ہی باتیں کرتے تھے اور بہت جلد انہیں اپنا دوست بنا لیتے تھے۔

عام انسانوں کی طرح رہنا، اُن سے ملنا، اور اُن سے بولنا اِس میں اُنہیں خاص لطف آتا تھا۔ شکایت کا موقع ہو تب بھی شکایت نہ کرتے تھے۔ بمبئی کے ایک صاحب نے آپ کی کتاب "سُریلی بانسری" بغیر اجازت چھاپ لی اور جو رائلٹی نقل اشاعت کے لئے تھی وہ بھی نہ دی۔ میں نے کہا کہ معاملہ طے کیا جائے۔ اس کا جواب لکھتے ہیں:۔

"سُریلی بانسری کے متعلق جو معاہدہ ہوا ہے اُس کی نقل بھیج رہا ہوں اگر ضرورت ہوئی تو اصل بھی بذریعہ رجسٹری روانہ کر دوں گا۔ یہاں کے حکام سے وہاں کے حکام پر اتنی سی رقم کے لئے دباؤ ڈلوانا، اس کے مقابلہ میں دست بردار ہو جانا بہتر ہوگا۔"

ڈان کے مشاعرہ میں اُن لوگوں کے دعوت نامہ پر وہ شریک ہوئے لیکن مشاعرہ کے بعد مشاعرہ کے منتظمین نے خبر تک نہ لی۔ میرے کہنے کے باوجود اُنہوں نے اس سلسلہ میں پھر ان لوگوں سے ملنا یا کہنا پسند نہ کیا۔ فرماتے تھے کہ وہ مجھے دعوت دے کر لائے تھے، قیام کی تدبیر اور سہولت کا خیال اُن کا فرض تھا لیکن وہ خاموش ہیں تو میں اُنہیں اُن کا فرض کیوں یاد دلاؤں، اور میرا نقصان بھی کیا ہوا۔

کراچی کے قیام کے دوران میں ہرچند کہ ابھی تک معاش کا کوئی سلسلہ نہ تھا لیکن اپنے مصارف کا بوجھ احباب پر ڈالنا پسند نہ کیا۔ میرے ساتھ قیام کے دوران میں بھی اپنا کھانا برابر ہوٹل سے منگاتے تھے۔ اور اُن تمام مہمانوں کی خاطرداری کرتے تھے جو ملنے آتے تھے۔

ان کی فطرت اس قدر بلند و برتر تھی کہ آپس کے فتنوں سے بہت دور رہا گئی تھی۔ جس طرح انہوں نے روپیہ کو مقصدِ زندگی نہیں سمجھا اسی طرح شہرت کی تلاش میں بھی حیران و سرگرداں نہیں پھرے وہ کنارہ کش ہو کر خلوصِ دل سے ادبی خدمت میں منہمک رہے۔ جن لوگوں نے ان کو سنا اور سمجھا وہ

ان کو شہرت تو کیا دیتے انہیں سے اُلٹے فیض حاصل کیا۔

اپنے تمام ہم عصر شعرا سے ان کے تعلقات نہایت دوستانہ اور خوشگوار تھے اس لئے کہ وہ کسی شاعر کی نکتہ چینی یا غیبت نہ کرتے تھے اور جس کا جو حق ہوتا تھا اسکی اتنی ہی تعریف کرتے تھے۔

حالانکہ کوئی اسّی سال کا سن تھا پھر بھی بیحد زندہ دل تھے۔ بے تکلف احباب کی صحبت میں لطیفے سنا جاتے تھے اور وہ بے حد ہنستے تھے۔ طبیعت زور پر ہوتی تھی تو برجستہ فقرہ ایسا کہتے تھے کہ آدمی خاموش ہو جاتا تھا۔ مگر زود بیانی اور زور کلامی میں بھی اس کا بڑا خیال رہتا تھا کہ تلخی نہ پیدا ہونے پائے کہ کسی کی دل آزاری کا باعث ہو۔ شاید انسان کی جو اعلیٰ تصویر اُن کے ذہن میں تھی وہ زندگی میں نظر آ جاتی تو جنّت کا مزہ آ جاتا۔ خود فرماتے ہیں ؎

زندگی زندگی نہیں ہے ابھی
آدمی، آدمی نہیں ہے ابھی

موسیقی میں بھی دخل تھا۔ اُن کے گانوں میں فلمی گانوں کی آوازوں کے ساتھ ساتھ وہ رس بھری تانیں بھی موجود تھیں جو پرانے لکھنؤ میں انہوں نے سُنی تھیں۔ آواز میں سوز تھا، اب تک ناطاقتی کے باوجود طبیعت مزے پر ہوتی تھی تو دیر تک گنگناتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی مشکل تانیں آواز کے بل پر نہیں اٹکل اور ذوق کے سہارے کھینچ لے جاتے تھے۔ اس پرانے ماحول کے افسانوی رنگ کا بھی پورا پورا اثر اُن میں موجود تھا۔ جنوں اور بھوتوں کی داستانیں وہ کبھی کبھی ایسے سناتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ انہیں اس پر یقین بھی تھا کہ بھوت ہوتے بھی ہیں۔ اُن کی آنکھوں میں ایسی روشنی آجاتی تھی جیسے انہوں نے کسی جن کو اُتار لیا ہو۔ افسانہ کی شدّت پر شاید وہ یقین کر رہے ہیں۔ باتیں کرتے کرتے مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جاڑوں کی آگ تاپتے تاپتے جیسے میری آنکھ لگ گئی ہو اور آن کہلاتے ہوئے انگاروں کی کتاب تخلیل میں گم ہو کر میں کسی ایسی دنیا میں نکل گیا ہوں جہاں جن اور بھوت رہتے ہوں، آرزو صاحب کا سنجیدہ چہرہ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ شاید یہ بھی کوئی جنوں کا بادشاہ ہے جو انسان کے بھیس میں اُن کی کہانی ہماری زبان میں ہمیں سنانے آگیا ہے۔

نجوم سے اُن کو خاصا شغف تھا۔ رات کو گھنٹوں گھور گھور کر انجمن کو کب کے زہرہ جبینوں کو دیکھا کرتے تھے۔ قدرت کے یہ جھلملاتے ہوئے چراغ اُن کے لئے پیغامِ مسرت اور پیغامِ جدائی لاتے تھے۔ ؎

دیکھئے رنج و خوشی میں لائے کیا وعدے کی رات
ڈوبنے والے ستارے ہنس رہے ہیں شام سے

مگر یہی نہیں اس سے زیادہ بھی اُن ستاروں کی گردش میں انسان کی زندگی کا راز پنہاں ہے۔ "دیکھئے دیکھئے وہ دیکھئے ترک فلک یعنی مریخ صاحب ہیں وہ اُدھر زہرہ ہے اور وہ مشتری ہے۔" "آج زحل برجِ سنبلہ میں ہے۔ وہ دیکھئے وہ تھا نیلگوں ستارہ اس بڑے چمکتے تارے کے پاس۔ اس کا اثر طبیعت میں سوداویت پیدا کرتا ہے۔ اور بڑا منحوس ہے۔" "وہ دیکھئے چاند صاحب برجِ اسد میں جلوہ فرما ہیں مگر دو عقرب نحس ہے۔ آجکل اُن کی نظرِ عنایت ہماری طرف ہے۔" گھنٹوں وہ چاند تاروں کو گھورا کرتے تھے اور یوں مجھے مخاطب کرکے کہا کرتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُن کا شاعرانہ احساس کائنات کی حرکت اور رفتار میں ہم آہنگ ہو کر اپنے سکونِ خاطر کے لئے اُن سے ایک ذریعۂ کلام تلاش کر چکا ہے۔

کئی مختلف ستاروں کی مختلف شکلوں کا ذکر کرتے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ شاعرانہ جذبے کے تحت اپنی جمالیاتی حس کی تسکین کر رہے ہیں شاعرانہ تخیل کی وہ شدّت جو عام پسند طبیعت کا مذاقِ خاص نہ بدل سکی زندگی کے اس مخصوص رُخ میں صاف نظر آتی تھی۔ شاید اسی وجہ سے انہیں پتھروں سے کافی دلچسپی تھی۔ اُنگلی میں کم سے کم دو فیروزے، ایک عقیق اور ایک زبرجد ہر وقت پہنے رہتے تھے۔ اور مختلف دوسرے پتھروں سے انہیں کافی

دلچسپی تھی اور اس سلسلہ میں اکثر کوچہ گرد واقعا "اُن کے اعتقاد سے فائدہ اُٹھا کر ہینگ کے بھاؤ نہ بکنے والی کنکریاں جواہر کے مول اُن کے ہاتھ بیچ جاتے تھے۔ اُن سے کہیئے کہ اُستاد! آپ نے تو معمولی نگینہ خریدا ہے تو اُنہیں یقین نہ آئے گا۔ کیوں صاحب! آخر اُسے کیا ضرورت پڑی کہ ہم سے کھوٹے مونی کے کھرے دام لے جاتا۔

اُن کی آواز میں ایک ڈرامائی کشش تھی، اور کبھی کبھی اپنے لکھے ہوئے ڈراموں کے مکالمے (DIALOGUES) وہ خود بھی بولا کرتے تھے اور اس میں پہروں گھنٹوں کے لئے محو ہو جاتے تھے۔ اُن کے تیوروں سے معلوم ہوتا تھا کہ ڈرامائی (ACTION) کی تمام صورتیں اور حرکت کا ہر پہلو اُن کے ذہن میں محفوظ ہے اور ڈرامہ آواز کے اُتار چڑھاؤ سے لفظوں کی نشست سے کس طرح ادا کیا جائے کہ مفہوم اپنی شدّت کی تصویر بن میں اُترے۔ شاید زندگی کی ڈرامائی کیفیت ہی ہوگی جس نے اُن کے تغزّل میں رنگ کی نظر نواز دل فریبی کے ساتھ اس کے تغیّر اور پرواز کی روح پرور مہک بھر دی تھی جو ہر لفظ کی کلی کھلتے ہی چٹکتی ہے اور نغمہ کے ساتھ ہوا میں ایک نقش چھوڑتی چلی جاتی ہے۔ ؎

بھری آتے ہی کس نے چٹکے سے سسکی
بدلنے لگا کروٹیں مرنے والا

طبیعت میں زود رکا یہ عالم تھا کہ اُن سے کہیئے کہ حضرت اب اس مصرعہ پر تو مصرعہ مشکل ہی سے لگے گا۔ اب جو مصرعہ لگائیں گے تو اس کی پناہ نہیں۔
ایک روز رات کو گیارہ بجے کے قریب میں نے جا بجا کے ہنس کر پیالی لی اور مصرعہ پڑھا:- ؏

چشمِ ساقی میں خمار آتے ہی پیمانہ بنا

مَیں نے کہا حضرت اب اس پر مصرعہ نہیں لگ سکتا۔ جو کہنا ہے وہ سب ایک مصرعہ میں ہی مکمل ہو گیا ہے۔ قدرے تامّل کے بعد فرمایا کہ سنو:- ؎

چشمِ ساقی میں خمار آتے ہی پیمانہ بنا
ہاتھ انگڑائی کو اُٹھے، میخانہ بنا

شعر از خود تبصرہ کا محتاج نہیں۔

اصلاح دینے کا یہ عالم تھا کہ مختلف منزلِ فکر کے شاگرد جمع ہوتے اور آپ وہیں شعر پڑھوانے اور بنانے جاتے تھے۔ لفظوں کی آواز اور معنی سے ہر وقت تجربے کیا کرتے تھے یہ اُن کا کھیل تھا۔ چنانچہ جب قلب کا آخری دورہ پڑا اس وقت بھی کاغذ پنسل لئے اسی فکر میں تھے کچھ لفظ لکھے جا رہے تھے اور کچھ مٹائے جا رہے تھے۔

طبیعت میں بے حد رواداری اور بلا کا گداز تھا۔ دُنیا کی کون سی ایسی دلکش اور دلفریب شئے تھی جس سے اُن کی اثر قبول کرنے والی طبیعت متاثر ہوئے بغیر رہتی۔ اُن کا دل ایک پاک طینت صوفی کا دل تھا جس میں سوائے محبّت کے اور کچھ نہ تھا۔ شاید اُنہیں غمِ روزگار سے بھی محبت تھی۔ کسی دوست کی پریشانی پر وہ فوراً پریشان ہو جاتے تھے اور اُس وقت اُنہیں سکون نہ ملتا جب تک وہ پریشانی ختم نہ ہو جاتی۔ کردار میں اپج اور بڑی جوانمردی تھی۔ علالت چونکہ پیری کے ساتھ ایک مستقل عنوان بن چکی تھی اس لئے اپنی صحت کے لئے کافی فکرمند رہتے تھے۔ مگر بیماری میں جب کبھی ایسا رُخ نظر آتا تھا جہاں لوگ بے سکون ہو جاتے ہیں وہاں انہیں سکون آ جاتا تھا۔ ایسے ہی موقع کا ایک خط میرے نام کا ہے جس کی چند سطور نقل کرتا ہوں:-

ایک آفت سے تو مر مر کے ہُوا تھا جینا
پڑ گئی اور یہ کیسی مرے اللہ نئی

اس وقت اسپتال کے کمرے میں ہوں۔ کلوروفارم کا اثر جو دماغ اور جگر پر رہ گیا تھا اور جسے کوئی نہیں سمجھا دفعتہً اُس نے وہ سوزش اور پھر

درد پیدا کیا کہ ڈاکٹر سے رجوع کرنا پڑا ۔ ہمارے معالج عمل جراحی میں فرد میں گھبرا گئے اور دوسرے ڈاکٹر کے سپرد کرکے کہا کہ میں کچھ نہ سمجھا، اب ان کا علاج تم کرو ۔ انہوں نے گھر پہ آکر دیکھا اور داخلہ اسپتال کی رائے دی ۔

قدرت نے صبح کو پانچ سو روپیہ دلوا دیئے تھے ۔ ایڈوانس اسی وقت گیٹ بنا دیا، دوسرا دن کنٹراکٹ کا تھا، اگر ہم اسپتال میں تھے ۔ اگر یہ روپیہ رات کو نہ ملا ہوتا تو نہ ڈاکٹر آسکتا نہ اسپتال میں داخلہ ممکن تھا ۔ درد جگر روح تحلیل کر رہا ہے ۔ یہ سلسلہ جس کی تیسری کڑی یہ ہے یونہی چلا آرہا ہے ۔ کیا اب بھی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ خالقِ عالم ہر وقت اپنے بندے کا نگران ہے اور نہ سب حال سامان کرتا رہتا ہے . . . . . . "

اور جب یہاں سے آخری سفر کا حکم ملا تو دفعتہً قلب کا دورہ پڑا، ایک ہچکی آئی اور آپ بالکل تیار تھے ۔ ایک شاگرد غلام مصطفیٰ انصاری تسما لکھنوی جو اُس وقت پاس تھے، اُن سے فرمایا " انصاری میں چلا " اور بس چاند میں جوت اور پھول میں باس نہ تھی ۔

(۳)

جادہ چوں نبضِ تپاں در تنِ صحرا بینند

غالب

ڈاکٹر مولوی عبدالحق

ابوالکلام

علامہ دتاتریہ کیفی

خواجہ حسن نظامی

مولانا عبدالماجد دریابادی

ڈاکٹر ذاکر حسین

مرزا محمد سعید

مولانا حامد حسن قادری

رشید احمد صدیقی

مجنوں گورکھپوری

ڈاکٹر زور

اثر لکھنوی

جگر مرادآبادی

حفیظ جالندھری

امجد حیدرآبادی

عابد علی عابد

مخفی کہستانی

مولانا صلاح الدین احمد

چودھری محمد علی ردولوی

عندلیب شادانی

ڈاکٹر شوکت سبزواری

بابائے اُردو

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب

عبادت بریلوی

وہ ایک بڑی اُداس سی شام تھی!

اور شامیں تو ہمیشہ اُداس ہی ہوتی ہیں۔ جھٹپٹے میں اندھیرے کے بڑھتے ہوئے سائے ساری فضا کو مغموم بنا دیتے ہیں۔ ہر چیز سُلگتی ہوئی سی معلوم ہوتی ہے۔ ذرّہ ذرّہ کا دل ڈوبتا ہوا سا محسوس ہوتا ہے ——— اور کائنات کی یہ اُداسی اس حد تک بڑھتی ہے کہ ہر فرد اس میں محصور سا ہو جاتا ہے ——— کم از کم میرے اوپر یہ کیفیت ضرور طاری ہوتی ہے۔ اسی لئے شام کے وقت کسی ایسے کام کی طرف طبیعت راغب نہیں ہوتی جو مزاج کے خلاف ہو۔ دو کام تو اس وقت کسی طرح بھی نہیں ہو سکتے۔ ایک تو کوئی سنجیدہ علمی گفتگو اور دوسرے کسی ایسے شخص سے ملاقات جس سے بے تکلفی نہ ہو۔ اور یہ بے تکلفی بغیر ایک ذہنی مناسبت کے ممکن نہیں ——— چنانچہ میں شام کے وقت ان دونوں سے دور بھاگتا ہوں ——— اور جب بھی مجھ پر کوئی ایسی ناگہانی مصیبت آن پڑتی ہے تو ہمیشہ جوش صاحب یاد آجاتے ہیں اور ان کی وہ بات میرے ذہن میں منڈلانے لگتی ہے جو انہوں نے ادیبوں کے ایک ایسے جلسے میں کہی تھی جس میں شام کے وقت بڑی سنجیدگی کے ساتھ ادب زندگی اور عملی سیاست کے موضوع پر فلسفیانہ موشگافیاں ہو رہی تھیں۔ بحث کے اختتام پر کسی نے جوش صاحب سے بھی پوچھا کہ آپ کی اس سلسلے میں کیا رائے ہے؟ جوش صاحب کہنے لگے "صاحب! جتنی دیر آپ لوگ بحث کرتے رہے میرے دل میں یہی خواہش انگڑائیاں لیتی رہی کہ اے کاش یہاں کوئی رقص ہوتا، نغمے کی کوئی صدا گونجتی ——— آپ دیکھتے ہیں کائنات کی ہر چیز اس وقت برے حال میں ہے۔ ذرّے ذرّے پر کرب کا سا عالم ہے۔ زندگی کی نبضیں ڈوب رہی ہیں ——— اور آپ ہیں کہ فلسفیانہ موشگافیوں میں مصروف ہیں ——— خدا کے لئے کوئی نغمہ چھیڑیئے ——— کسی کو رقص کے لئے آمادہ کیجئے۔ دیکھئے! کہ ادب زندگی اور عملی سیاست کے تمام پہلو آپ پر روشن ہو جائیں گے" ——— جوش صاحب کی اس بات میں جو صداقت ہے اس کو محسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس پر بحث کی گنجائش نہیں ——— غرض کچھ اسی طرح کی کیفیت شام کے وقت مجھ پر طاری ہوتی ہے ——— جی چاہتا ہے تھوڑی دیر کے لئے ایک ایسے ماحول میں اپنے آپ کو مدغم کر دیا جائے کہ کائنات کی اُداسی کا احساس ہی باقی نہ رہے۔

خیر تو دلّی کی اُس اُداس شام کو میری بھی ذہنی کیفیت تھی۔ جی چاہتا تھا وہ شام نئی دِلّی کے کسی بڑے حسین سے ریستوران میں بیٹھ کر گزاری جائے۔ آرکسٹرا سنا جائے۔ کیبرے دیکھا جائے۔ لیکن میرے ایک دوست جو اُس شام میرے ساتھ تھے، اس کے لئے تیار نہیں تھے۔ کیونکہ انہوں نے اُسی شام کو بابائے اُردو سے ملاقات کے لئے وقت مقرر کر لیا تھا ——— اور چونکہ یہ وقت میری خاطر مقرر کیا گیا تھا اس لئے ان کی یہ خواہش تھی کہ مجھے ضرور ملنا چاہیئے۔ مجھے بابائے اُردو کی خدمت میں حاضر ہونے کی دیرینہ آرزو تھی اور اسی لئے میں نے وقت مقرر کرنے کا یہ کام ان صاحب کے سپرد کیا تھا۔ مجھے یہ کیا خبر تھی کہ وہ شام کے وقت وہاں جانے کا پروگرام بنائیں گے۔ لیکن چونکہ اب پروگرام بن گیا تھا اس لئے وہاں پہنچنا بھی ضروری تھا۔ چنانچہ ہم کناٹ پلیس سے دریا گنج کی طرف چل دیئے۔ اور دہلی کی لمبی لمبی سڑکیں (جو بقول سیّد محمد جعفری، زلفِ خوباں کی طرح دراز ہیں) طے کرتے ہوئے وقت سے کچھ پہلے ہی دریا گنج پہنچ گئے۔ راستہ بھر میں یہی سوچتا رہا کہ بابائے اُردو بزرگ ہیں، عالم ہیں، محقّق ہیں، اس لئے ظاہر ہے وہ سنجیدہ سی گفتگو کریں گے۔ کچھ علمی باتیں ہوں گی۔ کچھ قوم کی حالت پر روشنی ڈالیں گے کسی قدر اُردو کے معاملات کا ذکر ہوگا ہنئے لکھنے والوں پر کچھ نکتہ چینی ہوگی ——— اور اس طرح یہ ملاقات تھوڑی دیر میں ختم ہو جائے گی ——— بات یہ تھی کہ مجھے اس سے قبل ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع نہیں ملا تھا۔ خط و کتابت ضرور رہی تھی ——— اور وہ مجھے اچھی طرح جانتے تھے۔ لیکن میں خطوں میں صرف کام کی بات انہیں لکھتا تھا ——— وہ اس کا جواب لکھ دیتے تھے اور بس! ——— ان خطوں میں شفقت اور محبّت کا اظہار ضرور ہوتا تھا لیکن مجھے اس وقت تک ان خطوط سے یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ وہ ملنے جلنے میں کیسے ہیں؟ اس لئے قیاس پر بنیاد رکھ کر میں نے یہ اندازہ لگایا کہ ان کے سامنے مؤدب بیٹھنا پڑے گا۔ سنجیدہ اور علمی نوعیت کی گفتگو ہوگی ——— لیکن ہم کیا کرتے۔ بے بسی اب سامنے کھڑی تھی۔ کیونکہ وقت مقرر ہو چکا تھا ——— اور ہم دریا گنج پہنچ چکے تھے۔

دریا گنج پہنچکر میرے دوست نے اطلاع کرائی۔ اور ہمیں اندر بلا لیا گیا۔

ہم لوگ اندر پہنچے تو دیکھا کہ برآمدے میں بابائے اُردو ایک آرام کرسی پر بیٹھے ہیں۔ قریب ایک چھوٹی سی میز پر اس دن کی ڈاک میں آئے ہوئے اخبارات رکھے ہیں۔ جن کی حالت اس بات کا پتہ دے رہی ہے کہ انہیں پڑھا جا چکا ہے۔ سامنے پیچوان ہے اور وہ حُقّے کے کش لے رہے ہیں۔ ہمارے پہنچتے ہی وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور بڑی محبّت سے ہمیں بٹھایا۔ بات چیت انہوں نے اس طرح شروع کی جیسے وہ مجھے بخوبی جانتے ہیں۔ ایک لمحے کو بھی انہوں نے اجنبیّت کا احساس نہیں ہونے دیا۔ اور ہماری دلچسپی کی باتیں زیادہ کیں۔ ذاتی حالات پوچھے۔ دلّی کے تاثرات دریافت کئے۔ بعض دلچسپ شخصیّتوں کا شگفتہ انداز میں تذکرہ کیا۔ سیاسی حالات اور تہذیبی معاملات پر پُرلطف گفتگو کی۔ زبان اور ادب کے مختلف رجحانات پر تبادلۂ خیال کیا ——— یونیورسٹیوں کے معاملات پر روشنی ڈالی ——— غرض شاید ہی کوئی موضوع ایسا ہو جس پر گفتگو نہ ہوئی ہو لیکن اس گفتگو میں خشکی اور سنجیدگی کے بجائے شوخی اور شگفتگی زیادہ تھی۔ زندگی کے ہلکے پھلکے پہلوؤں کا خیال زیادہ تھا۔ اور اسی خصوصیت نے اس گفتگو کو اتنا پُرلطف، اس ماحول کو اتنا دلآویز اور اس فضا کو اتنا پُرکیف بنا دیا کہ ہم سب اس میں محو ہو گئے ——— ڈوب گئے، کھو گئے اور اس طرح وہ اُداس شام ایک بڑی ہی حسین اور دلآویز شام میں تبدیل ہو گئی۔

بس یوں سمجھئے کہ لطف آ گیا ——— بابائے اُردو کی باتوں میں اتنا تنوع اور ان کے انداز میں اس درجہ شگفتگی نہ ہوتی تو شاید میں بُت بنا بیٹھا رہتا ——— جو کچھ وہ پوچھتے اس کا جواب دے دیتا۔ بہت ہوتا تو علمی اور لسانی مسائل پر کچھ گفتگو ہو جاتی۔ لیکن اس پہلی ملاقات ہی میں اس کے بالکل برعکس ہُوا ——— ساری گفتگو میں شاید ایک لمحے کے لئے بھی وہ سنجیدہ نہیں ہوئے۔ اپنی شگفتگی، طنزیہ انداز اور دلچسپ فقروں سے وہ ہمیں برابر ہنساتے رہے ——— اَن گنت موضوعات پر باتیں ہوئیں۔ لیکن ہر بات میں کوئی نہ کوئی پہلو تھا۔ کوئی نہ کوئی تہہ تھی۔ اور بعض اوقات تو میں نے یہ محسوس کیا کہ ان کی یہ باتیں گہری اور وزنی ہونے کے باوجود لطیفہ سنجی کی چمک دمک اپنے اندر رکھتی تھیں۔ اور اس دن تو مجھے ان کی ہر بات میں ایک لطیفے کا سا لطف آیا۔ میں اس سے قبل بھی بہت سے بزرگوں سے ملا تھا لیکن مزاج کی یہ شگفتگی اور طبیعت کی یہ بذلہ سنجی

میں نے کسی میں نام کو بھی نہیں دیکھی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ انسان سنجیدہ ہوتا جاتا ہے۔ نوجوانوں کی باتیں اُسے اچھی نہیں لگتیں۔ ان کی جدّت پسندی اُسے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اور وہ یا تو پند و نصائح پر کمر باندھ لیتا ہے یا پھر سرزنش اس کے مزاج کا جزو بن جاتی ہے ـــــــ ایسے بزرگ ایک اچھی خاصی مصیبت ہوتے ہیں ـــــــ دل میں ان کے علم و فضل کی چاہے کتنی ہی قدر ہو لیکن طبیعت اُن سے کنّی کاٹتی ہے۔ مزاج ان سے کتراتا ہے۔ اور اُن کے پاس زیادہ بیٹھنے کو جی نہیں چاہتا ـــــــ لیکن بابائے اُردو کو میں نے ان بزرگوں سے بالکل مختلف پایا۔ وہ نوجوانوں میں بیٹھ کر انہی کی سی باتیں کرتے ہیں۔ اور یہ محسوس ہی نہیں ہونے دیتے کہ وہ اُن سے الگ ہیں۔ ان کو چھیڑیں گے۔ بنائیں گے۔ ان پر آوازے کسیں گے۔ ان پر فقرے بھی چست کر دیں گے۔ انہیں دلچسپ واقعات سنائیں گے ـــــــ ایسے ماحول میں سنجیدگی ان پر کم ہی طاری ہوتی ہے ـــــــ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان کی طالب علمی کا زمانہ پھر سے واپس لوٹ آیا ہے ـــــــ اور وہ نوجوانوں اور طالب علموں ہی میں سے ایک ہیں۔ البتہ مراتب کا فرق اُن کی نظروں سے کبھی بھی اوجھل نہیں ہوتا۔ وہ ہر ایک کی حیثیت اور مرتبے کا لحاظ رکھتے ہیں۔ اور اسی لئے ان کی اس شگفتگی اور بذلہ سنجی میں بھی ایک وقار اور رکھ رکھاؤ ہوتا ہے، ایک سنبھلی ہوئی اور رچے دبے رہنے والی کیفیت ہوتی ہے ـــــــ اور یہ ان کے مزاج کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

ہاں تو اس دلچسپ اور پُر لطف گفتگو نے اس اُداس شام کو ایک بڑی حسین اور دلآویز شام میں تبدیل کر دیا۔ کئی گھنٹے ہم بابائے اُردو کے ساتھ رہے۔ اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن یہ خیال کر کے کہ اُن کا وقت بہت قیمتی ہے۔ انہیں بہت سے کام ہوں گے ہم نے اجازت مانگی اور پھر حاضر ہونے کا وعدہ کر کے رخصت ہوئے۔

بابائے اُردو سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ لیکن اس ملاقات نے ان کی شخصیّت کے ایسے گہرے نقوش میرے ذہن پر ثبت کئے جو کبھی بھی ماند پڑنے والے نہیں۔ ویسے تو میں انہیں عرصے سے جانتا تھا۔ ان کی تحریریں دیکھی تھیں۔ ان تحریروں کو والہانہ شوق اور دلچسپی سے پڑھا تھا۔ اور ان کی سادگی اور پُرکاری میں اکثر اپنے آپ کو گم کر دیا تھا۔ وہ جس نصب العین کے پرستار، جس نظریئے کے علمبردار اور جس تحریک کے قافلہ سالار تھے، اس سے مجھے بھی والہانہ وابستگی اور مجنونانہ شیفتگی رہی تھی۔ اس نصب العین، اس نظریئے اور اس تحریک سے میں بچپن ہی سے قریب ہو گیا تھا۔ ان کے علم و فضل اور اجتہاد و تبحّر کی باتیں بہت چھوٹی عمر سے میرے کانوں میں پڑتی رہی تھیں۔ اُردو زبان اور ادب کی تحقیق اور چھان بین میں جو کارہائے نمایاں اُنہوں نے کئے تھے، ان سے میں ہوش سنبھالتے ہی واقف ہونا شروع ہو گیا تھا۔ ان کی شخصیت اور کردار کے بارے میں بعض ایسے حضرات سے میں نے بہت کچھ سُن رکھا تھا جو عرصے تک ان کے قریب رہ چکے تھے ـــــــ لیکن مجھے ذاتی طور پر انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اب جو انہیں قریب سے دیکھا تو ان کی شخصیت ان کی عظمت پوری طرح واضح ہوئی۔ اس کے تنوّع اور رنگا رنگی، اس کی وسعت اور ہمہ گیری کا صحیح احساس ہُوا۔ اور جو کچھ سُنا تھا، جو رائے قائم کی تھی، جو خیالات ذہن میں آئے تھے وہ سب کے سب صحیح ثابت ہوئے۔ بلکہ شاید یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ ان کی شخصیت کے رنگا رنگ پہلوؤں کے اصل خط و خال تو اب میرے سامنے رونما ہوئے۔ جب تک کسی شخصیت کو قریب سے نہ دیکھا جائے، اس سے گفتگو اور بات چیت نہ کی جائے۔ اس وقت تک وہ پوری طرح واضح نہیں ہوتی۔ بہت سے پہلو پردۂ اخفا میں رہتے ہیں۔ سُنی سُنائی بات تو بہر حال سُنی سُنائی بات ہوتی ہے ـــــــ ملاقات کے بغیر ادیب، عالم، محقق، رہنما کو سمجھا جا سکتا ہے لیکن اس ادیب، عالم، محقق اور رہنما میں جو انسانی خصوصیات ہوتی ہیں ان کا صحیح اندازہ نہیں ہو پاتا۔ اس پہلی ملاقات میں میں نے بابائے اُردو کو ایک انسان کی حیثیت سے بھی دیکھا۔ اور اس کے بعد جتنی ملاقاتیں بھی اُن سے ہوئیں، ان کی شخصیت میں ہمیشہ میں نے ایک عظیم انسان کی جھلک دیکھی۔ آج میں اسی لئے ان ملاقاتوں کو اپنی زندگی کا بہت بڑا سرمایہ سمجھتا ہوں۔ ان ملاقاتوں نے مجھے نہ صرف ایک عظیم ادیب، ایک عظیم محقق اور ایک عظیم رہنما سے قریب کیا بلکہ ایک عظیم انسان سے بھی روشناس کرایا۔

جب اس پہلی ملاقات کے بعد وہاں سے رخصت ہو کر ہم باہر نکلے تو کچھ اسی طرح کے خیالات مجھ پر چھائے ہوئے تھے۔ میں ان کے دھندلکوں میں لپٹا ہُوا دریا گنج کی سڑکوں پر سے گزر رہا تھا۔ رات کے سائے گہرے ہو چکے تھے۔ تاریکی پوری طرح پھیلتی جا رہی تھی۔ لیکن آج میں اپنے آس پاس ایک روشنی سی محسوس کر رہا تھا۔ خود اپنی ذات میں مجھے روشنی سی نظر آ رہی تھی۔ جیسے میں نے کسی بیش بہا چیز کو پا لیا ہو۔ جیسے میں نے گوہرِ مقصود کو حاصل کر لیا ہو۔ آج میں بہت خوش تھا۔ میری مسرت اور شادمانی کی کوئی انتہا نہیں تھی ——— کیونکہ آج مجھے ایک ایسی شخصیت سے ملنے کا موقع ملا تھا جس میں انسانیت تھی اور انسانیت تھی اسی لئے عظمت تھی ——— اور ایک عظیم شخصیت سے ملنا ظاہر ہے مسرت اور شادمانی کی بات ہے۔

دِلّی میں میرا قیام زیادہ دنوں نہیں رہ سکتا تھا۔ میں تو صرف چند روز کے لئے ایک ضروری کام سے دِلّی آیا تھا۔ اس لئے دَورانِ قیام میں صرف دو ایک ملاقاتیں بابائے اُردو سے اور ہوئیں۔ ان ملاقاتوں میں بھی انہوں نے بہت سی باتیں کیں ——— متنوع اور متفرق باتیں ——— جن میں سے ہر بات میں کوئی نہ کوئی پہلو نکلتا تھا۔ کچھ نہ کچھ تہیں نظر آتی تھیں ——— کیونکہ بابائے اُردو کبھی بے مقصد بات نہیں کرتے۔ ان کی ہر بات کا محرک کوئی ایسا جذبہ ہوتا ہے جس کی نوعیت انسانی ہوتی ہے۔ اسی لئے ان کی ہر بات میں خلوص کا احساس ہوتا ہے۔ ہمدردی کی جھلک نظر آتی ہے، شفقت اور محبت کا پتہ چلتا ہے ——— بات یہ ہے کہ وہ ہر ایک کی مدد کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ خصوصاً ان لوگوں کی مدد جن میں کام کرنے، زندگی کی راہ پر آگے بڑھنے اور منزلِ مقصود تک پہنچنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔

ایک دن ایسا ہُوا کہ دِلّی سے رخصت ہونے سے قبل صبح کو میں ان کی خدمت میں حاضر ہُوا ——— اور میں نے کہا کہ شام کو میں لکھنؤ واپس جا رہا ہوں" ———

اُنہوں نے فرمایا "لکھنؤ میں اب کیا کرنے کا ارادہ ہے ؟"

میں نے کہا "فی الحال تو کچھ بھی ارادہ نہیں ہے۔ سوچتا ہوں یونیورسٹی میں ڈاکٹر اردو تنقید کے موضوع پر تھوڑا سا تحقیقی کام کر ڈالوں۔ اس طرح وقت بھی کٹ جائے گا۔ بیکاری بھی پریشان نہیں کرے گی۔ اور تھوڑا بہت کام بھی ہو جائے گا ——— اس کے علاوہ دوسری کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔

کہنے لگے "ہاں یہ مناسب ہے۔ تمہیں یہ کام ضرور کرنا چاہیئے ——— یہ خود تمہارے لئے بھی بہت مفید ہوگا اور اُردو کے لئے بھی"

میں نے کہا "آپ کی شفقت اور محبت اگر شاملِ حال رہی تو کچھ نہ کچھ کر لوں گا"

پھر تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولے ——— "لیکن بڑے افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے خاطر خواہ سہولتیں نہیں ہیں۔ دوسرے ملکوں میں تو تحقیق کرنے کے لئے لوگ مقرر کئے جاتے ہیں۔ یونیورسٹیاں انہیں وظائف دیتی ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں کام کرنے والوں کو سب کچھ خود ہی کرنا پڑتا ہے ——— ان حالات میں بھلا تحقیق کیا ہو سکتی ہے ؟"

میں نے کہا ——— "یہ ہے تو حقیقت لیکن ہمیں تو انہیں حالات میں کچھ نہ کچھ کرنا ہے"

بات آئی گئی ہوئی۔ میں رخصت ہو کر لکھنؤ آگیا ——— اور کام شروع کر دیا۔ کئی مہینے گزر گئے۔ میں کام کرتا رہا۔ کبھی کوئی بات پوچھنا ہوتی تو بابائے اُردو کو خط لکھ کر پوچھ لیا کرتا۔ ہمیشہ وہ نہایت شفقت اور محبت سے میری رہنمائی کرتے۔

خاصا وقت اس طرح گزر گیا ؟

اسی دوران میں اینگلو عربک کالج دہلی میں اُردو کے اُستاد کی ایک جگہ خالی ہوئی ——— بابائے اُردو نے اس کے لئے میرا نام تجویز کیا۔ اور مجھے لکھ بھیجا کہ تقرر ہو چکا ہے ——— اور مجھے دِلّی پہنچ جانا چاہیئے ——— اس سے یکسوئی ہو جائے گی اور یہاں رہ کر کام کرنے کا بھی موقع ملے گا۔

میں دِلّی پہنچ گیا۔ اور اس طرح میری زندگی کے ایک نئے دَور کا آغاز ہُوا۔

اس نئے دور میں مجھے سب سے زیادہ مسرت اس بات کی تھی کہ اب مجھے بابائے اردو کے قریب رہنے، ان کو دیکھنے اور سمجھنے، اور ان کے زیرِ نگرانی کام کرنے کا موقع ملے گا —

اور یہ حقیقت ہے کہ دلّی کے دورانِ قیام میں مجھے اُن کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ——— ان کی شخصیت کے تمام روپ میری آنکھوں کے سامنے آئے۔ ان کے کردار کے تمام پہلوؤں کو میں نے دیکھا۔ ان کے خیالات و نظریات کی اصل حقیقت مجھ پر روشن ہوئی۔ ان کے اندازِ فکر کا مجھے صحیح اندازہ ہوا ——— کیونکہ اس زمانے میں تقریباً ہر روز ان کی خدمت میں حاضر ہونا میرا معمول تھا۔ اس زمانے میں کئی کئی گھنٹے میں نے ان کے ساتھ گزارے ہیں۔ اُن کی گفتگو سُنی ہے۔ مختلف موضوعات پر ان سے تبادلۂ خیال کیا ہے۔ انہیں پڑھتے لکھتے، منصوبے بناتے، معاملات کو سمجھتے، مسائل کو سلجھاتے، مخالفین سے اُلجھتے، بے تکلّف احباب میں دلچسپ گفتگو کرتے، فقرے کستے، لطیفے سُناتے ——— غرض ہر حال میں اُنہیں دیکھا ہے ——— اس طرح ان کی زندگی کا ہر رُخ اور ان کی شخصیت کا ہر پہلو میری نظر کے سامنے سے گزرا ہے۔ اور آج میں اس چیز کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ سمجھتا ہوں۔

اُن کی شخصیت میں جس بات نے مجھے سب سے زیادہ متأثر کیا وہ زندگی، اس کے مظاہر اور متعلقات سے گہری دلچسپی ہے ——— اور اس دلچسپی میں انہوں نے جو تنوّع پیدا کیا ہے، جس ہمہ گیری کو جگہ دی ہے وہ انہیں کا حصّہ ہے۔ زندگی کو برتنا، اس کے تمام پہلوؤں سے دلچسپی لینا، ان کی شخصیت کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔ وہ زندگی کی کسی مسرّت سے بھی چشم پوشی نہیں کرتے۔ بلکہ ان مسرتوں کے حصول کو وہ ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ان مسرتوں کو نظر انداز کر دینا کفرانِ نعمت ہے۔

ان مسرتوں کو حاصل کرنے کے مختلف زاویے اور مختلف پہلو ہیں کیونکہ یہ مسرتیں خود زندگی کے مختلف پہلوؤں پر محیط ہیں ——— اپنے آپ کو صحت مند رکھنا، اچھی طرح رہنا، اچھا کھانا، اچھا لباس پہننا، اچھی باتیں کرنا، اچھے لوگوں سے ملنا، اچھے مناظر کو دیکھنا، اچھا ماحول پیدا کرنا، ان سب میں جو مسرتیں پنہاں ہیں ان کا احساس تو اسی شخص کو ہو سکتا ہے جس کی زندگی میں یہ باتیں موجود ہوں ——— اور نہ صرف یہ بلکہ جو دوسروں میں بھی یہ باتیں دیکھنا چاہتا ہو۔

میں نے ان کی شخصیت میں یہ باتیں بدرجۂ اتم پائی ہیں۔ صحت انہیں بہت عزیز ہے۔ وہ اس کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اچھا کھاتے ہیں، اچھا پہنتے ہیں، اچھی باتیں کرتے ہیں، اچھا ماحول پیدا کرتے ہیں ——— یہ ان کی دنیا ہے لیکن وہ خود ہی اس دنیا میں رہنا نہیں چاہتے دوسروں کو بھی اس دنیا میں بسیرا لیتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ انسانی زندگی کی مسرت اُن کے خیال میں کسی ایک فرد کی ملکیت نہیں ہے۔ بلکہ ان کے خیال میں اگر ایک فرد ان تمام مسرتوں کو حاصل بھی کر لے اور دوسرے اس سے محروم رہیں تو مقصد پورا نہیں ہوتا۔ مسرت کا حصول تو اسی وقت ممکن ہے جب مسرت عام ہو۔ چنانچہ وہ اس طرح کے حالات پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن سے یہ مسرتیں عام ہوں اور افراد میں ان کو حاصل کرنے کا شعور بیدار ہو ——— بہت سے لوگوں کو تو ان مسرتوں سے لطف اندوز ہونے کا شعور ہی نہیں ہوتا۔ وہ ایسے لوگوں کے جانی دشمن ہیں۔ ان کے ساتھ تو انہیں ہمدردی بھی نہیں ہوتی۔

ایک زمانے سے اُن کا یہ معمول ہے کہ وہ منہ اندھیرے اُٹھیں گے۔ اور صبح کو جب ساری مخلوق میٹھی نیند سو رہی ہوگی، وہ سیر کے لئے باہر نکلیں گے۔ میدانوں میں جائیں گے۔ باغ ہوں گے تو اسی میں چہل قدمی کریں گے۔ پہاڑ ہوں گے تو ان پر چڑھیں گے۔ دریا ہوگا تو اس کے کنارے ٹہلیں گے۔ سمندر ہوگا تو اس کے مناظر کا لطف اُٹھائیں گے ——— شاید ہی ان کے اس معمول میں فرق آیا ہو ——— فسادات کے زمانے میں بھی انھوں نے اس معمول کو نہیں چھوڑا ——— ایک دفعہ دلّی میں سخت فساد ہو گیا۔ اور چھتیس چھتیس گھنٹے کا کرفیو لگا دیا گیا ——— لیکن وہ اس کرفیو میں بھی سیر کیلئے نکلے۔ ابھی اندھیرا ہی تھا کہ وہ دلّی دروازے کے قریب پہنچے۔ وہاں ایک ہندو صاحب بھی نظر آئے جو ہر روز پابندی سے سیر کو نکلتے تھے ——— اُن سے بھی گھر میں نہ بیٹھا گیا ——— بابائے اردو کی طرح وہ بھی نکل آئے۔ ملاقات ہوئی تو مذاق میں کہنے لگے۔

"صاحب کرفیو لگا ہے۔ آپ ضرور پکڑے جائیں گے۔"

انہوں نے چھوٹتے ہی جواب دیا: "آپ نے بھی تو کرفیو کی خلاف ورزی کی ہے۔ اچھا ہے دونوں پکڑے جائیں گے۔"

مطلب یہ تھا کہ دونوں ایک کشتی میں سوار ہیں۔ اگر پکڑے بھی گئے تو لطف رہے گا۔

ایک صاحب جو آجکل بہت بڑے عہدے پر فائز ہیں، اور جنہیں اپنی صحت کو بنانے کا خیال اب پیدا ہوا ہے۔ ایک دن اتفاقاً بابائے اُردو سے ملے اور پوچھا، "کہ آپ اس عمر میں بھی صبح کو سیر کے لئے پابندی سے جاتے ہیں۔"

انہوں نے کہا: "یہ تو اب میرا معمول ہو گیا ہے۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔"

کہنے لگے: "آپ کی صحت بہت اچھی ہے۔ میں بھی کل سے سمندر پر سیر کے لئے آیا کرونگا۔"

اور دوسرے دن وہ سمندر کے کنارے پہنچے۔ ملاقات ہوئی۔

کہنے لگے: "صبح کی سیر ہے تو اچھی چیز۔ لیکن صبح اُٹھنے میں تکلیف بہت ہوتی ہے۔"

بابائے اُردو نے ہنس کر کہا: "آپ کل سے سیر کے لئے نہیں آئیں گے ——— تکلیف ہو تو سیر نہیں ہوتی۔ سیر تو مسرت اور انبساط کا نام ہے۔ اور مسرت و انبساط کے بغیر پابندی بھی ممکن نہیں!"

اس ایک جملے میں اس سیر اور اس سے مسرت حاصل کرنے کا سارا فلسفہ موجود ہے۔

صبح کی سیر میں کوئی ساتھ ہو جائے تو وہ اس سے دلچسپ باتیں کرتے ہیں۔ خود ہنستے ہیں اور اس کو ہنساتے ہیں۔ صبح کا وقت ان کا بہترین وقت ہوتا ہے۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو پا لیتے ہیں۔ فضا میں اس وقت جو شادابی ہوتی ہے وہ شادابی خود ان کی طبیعت میں بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

اس سیر میں مناظر کے حسن سے لطف اندوز ہونے کا خیال بھی ان کے پیشِ نظر رہتا ہے اور صحت کو بہتر بنانے کا احساس بھی! اور ان دونوں کے درمیان وہ خط نہیں کھینچتے۔

مناظر کے وہ شیدائی ہیں۔ ایک ایک چیز جو مناظر کو حسین بناتی ہے اور خود بھی حسین ہوتی ہے، اس کو وہ مختلف زاویوں سے دیکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی تخیل نہ جانے انہیں کہاں کہاں لے جاتی ہے۔

ایک دن کا واقعہ میں کبھی بھی نہیں بھول سکتا۔

بابائے اُردو ایک سال گرمیوں کا موسم کوئٹہ میں گزار رہے تھے۔ چنار کے ایک بہت بڑے درخت کے نیچے انہوں نے ایک خیمہ لگا لیا تھا۔ اسی خیمے میں رہتے تھے۔ دن بھر اس درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے کام کرتے رہتے تھے۔ چنار کا وہ درخت انہیں بہت پسند تھا۔ جو بھی ملنے آتا، اس کے سامنے چنار کے اس درخت کی تعریف کرتے۔ میں بھی اُن دنوں کوئٹہ میں موجود تھا۔ صبح کو میں وہاں پہنچا تو دیکھا ایک صاحب اُن کے پاس بیٹھے ہیں۔ میں جو پہنچا تو کہنے لگے۔

"بھئی، یہ چنار کا درخت میں انہیں دکھا رہا ہوں۔"

میں نے کہا: "جی ہاں مولوی صاحب! یہ تو واقعی دکھانے ہی کی چیز ہے۔"

پھر اُن صاحب سے مخاطب ہو کر کہنے لگے: "کیوں صاحب، آپ نے یہ چنار کا درخت دیکھا؟"

انہوں نے جواب دیا: "جی ہاں، صاحب، بہت خوب ہے!"۔

بابائے اُردو نے کہا: "نہیں صاحب، ابھی آپ نے نہیں دیکھا۔ پھر دیکھئے!"۔

وہ صاحب پھر بولے: "نہایت ہی خوبصورت درخت ہے۔"

انہوں نے پھر کہا "نہیں صاحب ابھی آپ نے نہیں دیکھا۔"

اب وہ بیچارے کچھ سٹ پٹا سے گئے۔ بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی۔ حیران تھے کہ چنار کے اس درخت میں بابائے اردو کون سی چیز انہیں دکھانا چاہتے ہیں کہ بابائے اردو نے کہا۔

"آپ اس درخت کو بیٹھ کے دیکھئے۔ لیٹ کے دیکھئے، کھڑے ہو کے دیکھئے۔ تب اس کے حسن کے مختلف پہلو آپ کو نظر آئیں گے۔"

مجھے اس بات پر بے اختیار ہنسی آ گئی۔ اور میں نے کہا "مولوی صاحب! اب یہ کل کسی وقت اطمینان سے آکے دیکھیں گے۔ آج پہلا دن ہے ——— چنار کے درخت کو دیکھنے کے آداب تو آتے آتے آئیں گے۔"

وہ صاحب بھی ہنسنے لگے اور بابائے اردو کو بھی ہنسی آ گئی۔

لیکن ایک لمحے میں ان پر سنجیدگی چھا گئی ——— کہنے لگے ——— "یہ تو خیر مذاق کی بات تھی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ درخت کے حسن اور خصوصاً چنار کے درخت کے حسن کا جواب نہیں چنار کے درخت کے حسن میں بہت سے پہلو ہوتے ہیں۔ اسی لئے اسے مختلف زاویوں سے دیکھنا چاہیئے۔ یہ عجیب و غریب درخت ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر تک چنار کے درخت کا شیدائی تھا ——— اس کے زمانے میں ایک دفعہ کشمیر میں کسی جگہ آگ لگ گئی۔ وہاں ایک بڑی ہی خوبصورت اور عالیشان مسجد تھی جس میں لکڑی کا بڑا باریک کام تھا۔ ایسے بیل بوٹے اس پر بنائے گئے تھے جو اپنی مثال آپ تھے۔ کشمیریوں نے اپنا سارا فن اس پر ختم کر دیا تھا ——— اورنگ زیب عالمگیر کو یہ مسجد بہت عزیز تھی۔ لیکن جب آگ کی خبر اس تک پہنچی تو اس نے کشمیر کے حاکم کو صرف یہ لکھ کر پوچھا کہ اس آگ سے چنار کے ان درختوں کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچا جو کئی کئی سو سال پرانے ہیں؟ ——— مسجد پر اس نے کوئی تشویش نہیں ظاہر کی۔ بلکہ اس خیال کا اظہار کیا کہ مسجد تو پھر بھی تعمیر ہو سکتی ہے، اور محنت کی جائے تو پہلی مسجد سے بہتر تعمیر ہو سکتی ہے۔ لیکن چنار کے درخت از سر نو تیار نہیں ہو سکتے۔ اس کام کے لئے صدیاں درکار ہیں۔

غرض اس طرح کی نہ جانے کتنی باتیں درختوں، پہاڑوں، دریاؤں کے متعلق میں نے ان سے سنی ہیں۔ ان باتوں سے ایک تو ان چیزوں سے ان کی گہری دلچسپی ظاہر ہوتی ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ دوسروں میں بھی اس دلچسپی کو پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

پہاڑوں سے ان کو والہانہ دلبستگی ہے۔ کیونکہ ان کے دامنوں میں مناظر کا حسن پرورش پاتا ہے۔ شاید ہی ہندوستان اور پاکستان کا کوئی ایسا پہاڑی مقام ہو جہاں جا کر انہوں نے قیام نہ کیا ہو۔ بعض ایسے پہاڑی مقامات پر بھی وہ جا کے رہے ہیں جہاں کوئی آبادی نہیں۔ لیکن جہاں مناظر کا حسن ہوتا ہے۔ جہاں سکون کی ایک دنیا آباد ہے ——— ان پہاڑوں میں سے ہر ایک کی تفصیل انہوں نے مجھے اکثر سنائی ہے ——— پہاڑ نہ ہوں تو پہاڑوں کے تذکرے ہی میں انہیں لطف آتا ہے ——— لطف لے لے کے وہ اس کی ساری تفصیل کو بیان کرتے ہیں ——— ایک دن مجھ سے شمالی ہندوستان اور جنوبی ہندوستان کے تمام اچھے پہاڑوں کا ذکر کیا ——— کہنے لگے ——— "میں ان تمام پہاڑوں پر جا چکا ہوں۔ لیکن جو بات کوئٹہ میں ہے وہ اور کہیں نہیں" ———

میں نے کہا "لیکن مولوی صاحب کوئٹہ تو نہایت ہی خشک جگہ ہے۔ کوئٹہ کے پہاڑوں کو دیکھ کے طبیعت گھبراتی ہے۔"

کہنے لگے "یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن کبھی تم نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ یہاں کی ہوا کیسی لطیف ہوتی ہے۔ نمی نہ ہونے کے باعث اس میں کیا ہلکا پن ہوتا ہے۔ مطلع یہاں کتنا صاف ہوتا ہے۔ آسمان میں یہاں کتنی دلکشی ہوتی ہے۔ تارے یہاں کتنے حسین نظر آتے ہیں ——— یہاں خشکی ہے لیکن اس خشکی میں بھی ایک حسن ہے۔"

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کی نگاہیں ہر جگہ حسن تلاش کر لیتی ہیں۔ کیونکہ حسن محدود نہیں ہے ——— وہ ان چیزوں میں بھی ہے جو بظاہر حسین نہیں معلوم ہوتیں۔ حسن کے بہرحال مختلف پہلو ہوتے ہیں اور ان کو مختلف زاویوں سے دیکھنا ضروری ہوتا ہے۔

بابائے اُردو کو مختلف موسموں سے بھی بلا کی دلچسپی ہے۔ لہٰذا ہر یہ بات عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ کسی شخص کو ہر موسم سے دلچسپی ہو۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ کسی شخص کو ایک موسم پسند ہوتا ہے۔ لیکن ان کو کوئی ایک موسم نہیں، اپنی اپنی جگہ پر ہر موسم پسند ہے ـــــــ یوں سردیوں کے موسم کو وہ بہترین موسم سمجھتے ہیں۔ لیکن گرمیوں کے موسم کو بھی وہ بُرا نہیں کہتے ـــــــ بلکہ اچھا سمجھتے ہیں۔ اور بعض پہلو ایسے نکال لیتے ہیں جن کی وجہ سے اس موسم کو اچھا سمجھا جا سکے ـــــــ چنانچہ وہ اس کا اظہار بھی کرتے ہیں ـــــــ ایک دن دورانِ گفتگو میں بات نکلی تو میں نے یہ کہا کہ گرمیوں کا موسم بہت ہی خراب ہوتا ہے۔ انسان کی انفرادیت اس موسم میں ختم ہو جاتی ہے ـــــــ وہ حسبِ عادت تھوڑی دیر تو میری گفتگو سنتے رہے، اور پھر بولے ـــــــ "نہیں اگر میوں کے موسم کو خواہ مخواہ خراب سمجھ لیا گیا ہے۔ یہ موسم تو بہت ہی اچھا ہوتا ہے۔ ساری کثافتیں دور ہو جاتی ہیں۔ تیز دھوپ اور گرم لو بھی لطف دیتی ہے ـــــــ اگر یہ موسم نہ ہو تو صراحی کے سوندھے اور ٹھنڈے پانی میں دلکشی کس طرح پیدا ہو سکتی ہے؟ دن میں پلنگ پر تیل پانی کو بچھا کر لیٹتے ہیں جو لطف ہے وہ کس طرح حاصل ہو سکتا ہے؟ ـــــــ ان سب باتوں کو سامنے رکھو تو اس موسم میں بھی ایک دلکشی نظر آتی ہے ـــــــ موسم تو برسات کا خراب ہوتا ہے۔ لیکن اس میں بھی بہت سے اچھے پہلو ہیں۔ بارش میں خود ایک لطف ہے۔ پھر بارش کے جو اثرات گرد و پیش پر ہوتے ہیں وہ اس سے بھی زیادہ پُر لطف ہوتے ہیں۔ ہر چیز سبز ہو جاتی ہے ـــــــ ہر چیز میں زندگی اور قوتِ نمو کا احساس ہونے لگتا ہے ـــــــ البتہ اس موسم میں گندگی ضرور ہوتی ہے۔ اور بارش سے قبل جو حبس ہوتا ہے وہ تکلیف دہ چیز ہے۔ اسی لئے میں برسات کے موسم میں پہاڑ پر چلا جاتا ہوں۔ برسات میں پہاڑ کے موسم میں جو کیفیت ہوتی ہے وہ گرمیوں میں نہیں ہوتی"

اس طرح وہ موسموں کو بھی عزیز رکھتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک میں جو اچھے پہلو ہوتے ہیں، وہ اُن کو نظر انداز نہیں کرتے۔ اور ان اچھے پہلوؤں کو دیکھنے کے سلسلے میں وہ کسی اور کی رائے سے متاثر نہیں ہوتے۔ ان کا نقطۂ نظر سب سے الگ ہوتا ہے۔ اسی لئے ان کی رائے میں بھی ایک جدت ہوتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان کی شخصیت ایک عظیم انفرادیت کی مالک ہے ـــــــ اور اسی انفرادیت کا اظہار ان کی طرف سے زندگی کے ہر شعبے میں ہوتا ہے۔ موسم تک اُن سے نہیں بچتے۔

لباس اور رہن سہن کی لطافت بھی اُن کی زندگی کا لازمی جزو ہے۔ اسی لئے اس کا احساس بھی نے اُن کی شخصیت میں ہمیشہ نمایاں دیکھا ہے۔ لباس میں سادگی اور وضعداری کو وہ ضروری سمجھتے ہیں لیکن اس سادگی اور وضعداری کے باوجود نفاست اور ستھرا پن پیدا نہیں ہونے دیتے۔ لباس میں انہیں وہ بات بہت پسند ہے جس سے انسان جاذب اور جاذب نظر آتا ہے ـــــــ اسی طرح رہنے سہنے میں بھی انہیں ایک ایسا انداز بھاتا ہے جس سے آرام طلبی کاہلی اور سستی کی بو نہ آئے۔ چنانچہ ایک سادگی ان کے رہن سہن کے انداز میں بھی نظر آتی ہے ـــــــ میں نے انہیں ایسی کوٹھیوں میں بھی رہتے ہوئے دیکھا ہے جو محلوں سے کسی طرح کم نہیں تھیں۔ ایسے مکانوں میں بھی قیام کرتے ہوئے دیکھا ہے جو قدیم طرز کے تھے۔ ایسے خیمے میں بھی وقت گزارتے ہوئے دیکھا ہے جہاں آرام دہ مکانوں کی سی آسانیاں نہیں تھیں ـــــــ لیکن ہر حال میں یہ محسوس کیا ہے کہ وہ اپنی نفاست پسندی کو خیرباد کہنے کے لئے کبھی بھی تیار نہیں ہوئے۔ ہر جگہ انہوں نے اسی نفاست اور لطافت سے کام لیا ہے جو ان کی شخصیت کا لازمی جزو ہے۔ سادگی کے ساتھ ضروری چیزوں کی ترتیب میں سلیقہ شعاری ہر حال میں اُن کی جائے قیام کو حسین اور دلآویز بنا دیتی ہے ـــــــ اور اس میں کسی بڑی شعوری کوشش کو دخل نہیں ہوتا۔ یہ صورتِ حال اس طرح پیدا ہو جاتی ہے جیسے اُن کے معمولات میں سے ہے ـــــــ ان کاموں کے لئے ان کے پاس وقت بھی نہیں ہوتا لیکن اس کے باوجود بغیر کسی وقت کے یہ کام انجام پا جاتا ہے۔ انہیں اس میں کسی طرح کی دشواری اور اُلجھن پیش نہیں آتی۔

لباس اور رہن سہن کی لطافت اور نفاست کو وہ صرف اپنی ذات تک ہی محدود نہیں کرتے۔ بلکہ دوسروں میں بھی یہ باتیں دیکھنا چاہتے ہیں ـــــــ چنانچہ اگر کسی شخص کا لباس ٹھیک نہ ہو تو وہ کسی نہ کسی پہلو سے ضرور اس کو اس بات کا احساس دلا دیں گے۔ کوئی چیز انہیں ایسا کرنے سے روک نہیں سکتی۔

ایک واقعہ مجھے یاد ہے! ——

ایک دفعہ لکھنؤ میں ایک وفد ترتیب دیا گیا تاکہ یو پی کے کانگریسی وزیر تعلیم سے اسکولوں میں اردو کی تعلیم کے موضوع پر گفتگو کرے۔ اس زمانے میں ہندی کے مقابلے میں اردو کو گرانے کے خیال سے حکومت کی طرف سے اس بات کی کوشش کی گئی تھی کہ اردو پڑھنے والوں کی تعداد اسکولوں میں کم ہو جائے۔ اس کے لئے حکومت نے کوئی حکم تو جاری نہیں کیا لیکن ایسے حالات ضرور پیدا کئے جس کی وجہ سے طالب علم اردو پڑھنے سے احتراز کریں۔ چنانچہ اس سلسلے میں اردو کے حامیوں نے یہ طے کیا کہ وزیر تعلیم کو صورت حال سے آگاہ کیا جائے۔ بابائے اردو اس وفد کے لیڈر تھے۔ یہ وفد وزیر تعلیم کی کوٹھی پر وقت مقررہ پر پہنچا۔ جو لوگ وفد میں شامل تھے وہ ڈرائنگ روم میں بٹھا دیئے گئے۔ دیر تک انتظار کیا لیکن وزیر تعلیم تشریف نہیں لائے۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد معلوم ہوا کہ وہ آ رہے ہیں ——— وہ تشریف لائے لیکن اس ہیئت کذائی کے ساتھ کہ سیاہ بدن پر صرف ایک سفید دھوتی، گلے میں جنیو، پیروں میں لکڑی کی کھڑاؤں، منہ میں دتون (مسواک)، اور ماتھے پر بڑا سا تلک ——— بابائے اردو سے یہ منظر دیکھ کر نہ رہا گیا۔ بے اختیار کہہ اٹھے۔

"یہ وزیر ہے یا مہیرا ہے مہیرا"

کھڑاؤں کی آوازوں میں یہ آواز گم ہو گئی۔ وزیر تعلیم نے یہی بہتر سمجھا کہ اس نشست کو ملتوی کر دیں۔ کیونکہ اس وقت اسی میں بہتری تھی ——— بابائے اردو کا موڈ خراب ہو چکا تھا۔ اور خیال تھا کہ وہ شمشیر برہنہ ہو جائیں گے۔ وہ تو کہیے کہ وفد کے ممبر آڑے آ گئے۔ ورنہ وفد کی ملاقات ایک میدان کارزار میں تبدیل ہو جاتی۔

اس طرح کے ان گنت واقعات ہیں جن سے ان کی شخصیت کے اس پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔

بابائے اردو کو بہت لذیذ کھانے کا شوق ہے۔ لیکن وہ زیادہ کھانے اور بلا تمیز ہر قسم کے کھانے کو ایک بہت بڑی نشانی سمجھتے ہیں۔ انہیں کھانے سے زیادہ کھانے کی نفاست اور لطافت سے دلچسپی ہے۔ اور اس میں صرف غذا ہی کی نفاست اور لطافت کافی نہیں۔ اس ماحول میں بھی نفاست ضروری ہے جن میں کھانا کھایا جاتا ہے ——— وہ صرف لطیف غذا ہی کھا سکتے ہیں ——— اور وہ بھی مقدار میں بہت کم۔ ان کا خیال ہے زیادہ کھانے اور غیر لطیف چیزیں کھانے سے انسان انسانیت سے دور ہوتا جاتا ہے ——— اکثر انہوں نے مجھ سے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اگر انسان مستقل اور مسلسل ان دونوں باتوں پر عمل کرتا رہے تو اس میں حیوانی خصوصیات رونما ہونے لگتی ہیں۔

ایک دن بڑا لطف آیا۔

کوئٹہ میں ایک بے تکلف دوست نے مجھے اور مولوی صاحب دونوں کو چائے پر بلایا۔ اور بڑا تکلف کیا۔ وہ چائے کیا تھی۔ اچھا خاصا کھانا تھا۔ ڈرائنگ روم میں کئی میزیں کھانے کی چیزوں سے بھری ہوئی تھیں۔ کیک، پیسٹریز، سینڈوچز، انڈے، مکھن، توس، کباب، پھلکیاں، دہی بڑے، برفی، گلاب جامن، انگور، میوہ، گریاں اور ان کے علاوہ نہ جانے کیا کیا کچھ تھا ——— مولوی صاحب تو یہ منظر دیکھ کر گھبرا سے گئے۔

پوچھنے لگے " یہ سارا اہتمام آپ نے میرے لئے کیا ہے؟"

وہ صاحب کہنے لگے " نہیں صاحب! میں نے کوئی خاص اہتمام نہیں کیا۔ یہ تو روزانہ کی چیزیں ہیں؟"

مولوی صاحب نے مذاق میں کہا ——— " تو کیا آپ واقعی چائے میں روزانہ اتنی چیزیں استعمال کرتے ہیں"

میں نے کہا " مولوی صاحب! یہ اپنے وقت کے احمد شاہ بیگڑھ[1] ہیں"

بابائے اردو ہنسنے لگے اور ہنس کر کہا " خدا کے لئے اپنے حال پر رحم کرو"

غرض دیر تک اس طرح کی دلچسپ باتیں ہوتی رہیں۔ اور ہم چائے پیتے رہے۔ اس دن چائے پر موضوع بحث صرف کھانا رہا۔ مولوی صاحب نے اس

---

۱ ۔ ایک بادشاہ جو سیروں کھانا کھاتا تھا لیکن اس پر بھی اس کی سیری نہیں ہوتی تھی۔

دن بعض بڑی دلچسپ باتیں کیں — کہنے لگے —

آپ لوگ جو کھانے میں اتنا اہتمام کرتے ہیں۔ کیا آپ نے کبھی یہ بھی غور کیا ہے کہ گندم سے سارا فساد پیدا ہوتا ہے۔ آدم تو خیر اس کی بدولت جنت سے نکالے گئے۔ لیکن اب انسان کو یہ دنیا سے بھی نکلوا دیتا ہے۔ ہر بیماری گندم کے زیادہ استعمال سے پیدا ہوتی ہے۔ ہر جسمانی فساد کی جڑ گندم ہے لیکن لوگ ہیں کہ گندم پر وہ چکی چلاتے ہیں کہ خدا کی پناہ! گندم کے بعد گوشت کا نمبر ہے۔ زیادہ گوشت کھانے سے انسان میں وحشت اور بربریت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ بالکل جنگلی ہو جاتا ہے۔ جو لوگ گوشت زیادہ کھاتے ہیں ان کے اندر یہ خصوصیات مختلف طریقوں سے اپنے آپ کو نمایاں کرتی ہیں — اسی طرح سبزی اور ترکاری ہے — اس کے زیادہ استعمال سے انسان میں حیوانوں کے سے آثار رونما ہونے لگتے ہیں کیونکہ یہ حیوانوں اور چوپایوں کے کھانے کی چیز ہے — اب صرف ایک چیز رہ جاتی ہے جس کو انسان کھا سکتا ہے۔ اور وہ ہے پھل۔ صرف پھل ہی انسان کے کھانے کی چیز ہے — اور پھل ہمارے ملک میں لوگ کھاتے نہیں!"

میں نے کہا "لیکن مولوی صاحب یہ صاحب پھل کھاتے بھی ہیں اور دوسروں کو کھلاتے بھی ہیں۔ اس لئے ہمیں ان کا شکر گزار ہونا چاہیئے۔"

انہوں نے کہا "ان کا شکریہ تو ادا کرنا ہی پڑیگا۔"

ایک گھنٹے کی اس پُرلطف گفتگو کے بعد ہم وہاں سے رخصت ہوئے!

کھانے پر وہ نہ صرف دلچسپ باتیں کرتے ہیں بلکہ دلچسپ باتیں سننا بھی پسند کرتے ہیں۔ ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ کھانے کے وقت عمدہ ماحول بھی پیدا ہو۔ جو شخص اس ماحول کو ذرا بھی خراب کرے اس کی شامت ہی آجاتی ہے۔ ایسے فقرے اس پر چسپاں کرتے ہیں کہ اس کی طبیعت درست ہو جاتی ہے — کھانا کھلانے میں وہ بڑے شوق کا اظہار کرتے ہیں۔ بڑی محبت سے ایک ایک چیز دوسروں کے سامنے بڑھاتے ہیں۔ اور کھانے پر اصرار کرتے ہیں۔ لیکن اگر کسی نے آداب دسترخوان کی ذرا بھی خلاف ورزی کی تو بابائے اردو اسے بخشتے نہیں۔ اس معاملے میں وہ خاصے حساس ہیں۔ جو بات منہ میں آتی ہے وہ ضرور کہہ دیتے ہیں — لیکن اس کا مقصد سرزنش کرنا نہیں ہوتا۔ صرف احساس دلانا ہوتا ہے۔

ایک شام بابائے اردو نے مجھے کھانے پر بلایا۔ کچھ اور لوگ بھی مدعو تھے — اس دن ایسا ہوا کہ ایک صاحب نے جب بریانی کھانا شروع کی تو اس میں خوب مرغ کا گوشت اور شوربا ڈالا۔ بہت سے لوگ سالن کے ساتھ بریانی کھاتے ہیں لیکن مولوی صاحب کو یہ بات پسند نہیں — ان صاحب کو فوراً بھانپ لیا جو بریانی اور اس کے ذائقے کا خون کر رہے تھے — کہنے لگے — "بھئی انگریز نے ہمیں بہت سی اچھی چیزیں دیں لیکن ہمارے مذاق کو خراب کر دیا۔" اب ہم لوگ حیران کہ یہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ اور انہیں اس وقت یکایک انگریز کا خیال کیسے آگیا۔

میں نے کہا — "جی ہاں مولوی صاحب، انگریزی کھانوں میں ذائقہ نہیں ہوتا۔"

کہنے لگے "ہمارے کھانوں کے مقابلے میں انگریزی کھانوں کے خوش ذائقہ ہونے کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن انگریز نے ایک ستم یہ کیا، ہمارے کھانوں کو جب بھی کھایا ذائقہ کو خراب کر کے کھایا۔"

"— لیکن مولوی صاحب، یہ کس طرح ہوا؟ انگریز تو ذائقے کے معاملے میں بڑے حساس مشہور ہیں۔" میں نے پوچھا۔

انہوں نے جواب دیا "بات یہ ہے کہ انگریز کو ہمارے کھانوں کے ذائقہ کا صحیح احساس نہیں تھا۔ وہ کیا جانے کہ بریانی کا مزہ کیا ہوتا ہے۔ اور مرغ کے شوربے کا ذائقہ کس کو کہتے ہیں؟ ان دونوں میں جو تفاوت ہے اس کو محسوس کرنا اس کے بس کی بات نہیں — اسی لئے انگریز جب بریانی کھاتے تھے تو سالن جس کو وہ "کری" کہتے تھے اس کے ساتھ ملا لیتے تھے۔ حالانکہ سالن کی آمیزش بریانی کے صحیح ذائقہ کو مار دیتی ہے۔ اس کا خون کر دیتی ہے" —

میں سمجھ گیا کہ اس بات کا نشانہ وہ صاحب ہیں جو بریانی مرغ کے شوربے کے ساتھ کھا رہے تھے — وہ صاحب پانی پانی ہو گئے۔ اس لئے میں نے

بات بنائی اور کہا۔

"مولوی صاحب انگریز آخر اتنے دن تک یہاں رہا۔ ہم پر حکومت کی۔ اس کے اثرات کو قبول کرنا تو ناگزیر تھا۔"

کہنے لگے "ہاں لیکن انگریز کی اچھی باتیں بہت کم لوگوں نے سیکھی ہیں۔"

پھر مجھے ایک بات یاد آئی اور میں نے کہا "بریانی اور مرغ کی آمیزش تو خیر ایسی بد مذاقی نہیں جو ناقابلِ معافی ہو لیکن جو لوگ بریانی پالک کے ساگ کے ساتھ کھاتے ہیں، ان کو آپ کیا کہیں گے؟"

کہنے لگے "ان کے لئے تو دعائے خیر ہی کی جا سکتی ہے۔"

اس پر سب لوگ ہنسنے لگے۔

ایک دن دسترخوان پر ایسا ہوا کہ ایک صاحب نے کھانے کے دوران میں چاول کھانے کے بعد انگلیاں چاٹنا شروع کیں۔ ایک اور صاحب ہڈی چوسنے لگے۔ بس مصیبت ہی تو آگئی۔ مولوی صاحب نے بغیر ان کی طرف اشارہ کئے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"انسان ابھی تک حیوان ہے۔ اور طرح طرح سے اس حیوانی خصوصیات کے مظاہرے کرتا رہتا ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ روئے سخن اُن اصحاب کی طرف ہے جو انگلیوں سے دلچسپی لے رہے تھے اور ہڈی سے شغل فرما رہے تھے۔

ایک شام بابائے اُردو نے چند بے تکلف نوجوانوں کی دعوت کی۔ میں بھی اس میں شریک تھا۔ کھانے کے دوران میں اس دن بھی بات زیادہ کھانے کے موضوع پر چل نکلی۔ معاً مجھے اس موضوع پر پنجابی کا دلچسپ لطیفہ یاد آیا۔

میں نے کہا "مولوی صاحب پنجابی زبان میں ایک بہت ہی دلچسپ لطیفہ ہے۔ شاید آپ نے بھی سُنا ہو"۔

کہنے لگے "نہیں۔ میں نے نہیں سُنا"

میں نے سُنانا شروع کیا ——— "دو دوست ایک جگہ دعوت میں گئے۔ دونوں بڑے کھاؤ تھے۔ ہمیشہ ایک ساتھ کھانے پر جاتے تھے۔ اور کھانے کی دل کھول کر داد دیتے تھے۔ اس دعوت میں انہوں نے اتنا کھایا، اتنا کھایا کہ ان میں سے ایک جاں بحق تسلیم ہو گیا"

معاً مولوی صاحب کے مُنہ سے نکلا "انا للہ وانا الیہ راجعون"

میں نے پھر شروع کیا ——— "صاحبِ خانہ کو یہ دیکھ کر افسوس تو ہوا لیکن وہ دوسرے صاحب کو کھانے میں اس قدر منہمک تھے کہ انہوں نے ان کے دوست کے جاں بحق تسلیم ہو جانے کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی ——— اور جو صاحب ابھی تک زندہ تھے ان سے پوچھا۔ کہ کیوں صاحب آپ تو سیر ہو گئے؟ (رتّی رج گئے) انہوں نے اپنے دوست کی لاش کی طرف اشارہ کر کے کہا، سیر ہونے والے تو وہ پڑے ہیں رجے ہوئے تے او پئے ہوئے نیں)"

سب لوگ ہنسنے لگے۔ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے۔

مولوی صاحب نے اس پر یہ کہا کہ "مجھے تو آج یہ لطیفہ حقیقت بنتا ہوا نظر آ رہا ہے"

اور یہ ایک مستزاد لطیفہ تھا۔ کیونکہ اس دن کھانے پر بعض لوگ اس لطیفہ کو حقیقت بنانے پر تُل گئے تھے۔

مولوی صاحب کی برسوں سے یہ عادت ہے کہ وہ صرف ایک وقت کھانا کھاتے ہیں۔ دن میں وہ کھانا نہیں کھاتے۔ اور ان کا خیال یہ ہے کہ ایک وقت کھانے سے ایک طرف تو صحت پر اچھا اثر ہوتا ہے اور دوسری طرف اس میں زیادہ لطافت پیدا کرنے کی فطری خواہش پیدا ہوتی ہے۔ اور پھر سب سے بڑی بات ان کے خیال میں یہ ہوتی ہے کہ دن بھر آدمی بے تکان کام کر سکتا ہے۔ دن میں کھانا کھانے سے اضمحلال کی کیفیت پیدا ہوتی ہے جو کام اور محنت کی جانی دشمن ہے ——— اس سلسلے میں ایک حکیم صاحب کا ذکر انہوں نے مجھ سے کئی بار کیا ہے۔ دوران گفتگو

میں جب بھی کھانوں اور دعوتوں کا ذکر آگیا تو انہوں نے کہا ہے ——— "بھئی حیدر آباد میں ایک حکیم تھا ——— تمہاری بریلی ہی کا رہنے والا تھا۔ عجیب زندہ آدمی تھا۔ کسی کی پروا نہیں کرتا تھا۔ مزاج میں یکسوئی نہیں تھی کہ کسی کا علاج کرے، لیکن مجھ سے اسے بہت محبت تھی۔ طرح طرح کی دوائیں مجھے دیتا تھا لیکن مجھے دواؤں سے ہمیشہ سے نفرت ہے اس لئے اس کی دوائیں یونہی پڑی رہتی تھیں ——— ایک دن کہنے لگا ——— تمہاری صحت بہت اچھی ہے۔ تم سو برس تک زندہ رہوگے۔ بشرطیکہ تم میری ایک بات پر عمل کرو ——— وہ یہ کہ کبھی کسی کے ہاں دعوت نہ کھانا ——— مولوی صاحب نے کہا، اس کی یہ بات آج تک میرے دل پر نقش ہے۔ اسی لئے میں دعوتوں سے گھبراتا ہوں۔ اور کھانا صرف ایک وقت کھاتا ہوں۔"

دعوتوں سے گھبرانے اور احتراز کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس سے آدمی کی انفرادیت ختم ہو جاتی ہے۔ انسان دوسروں کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ پھر تکلفات اس کے لئے مصیبت بن جاتے ہیں۔

ایک دن مجھ سے کہنے لگے "دعوتیں تو آجکل اور بھی مصیبت بن گئی ہیں۔ آجکل دعوتوں میں 'بوفے' ہوتا ہے۔ جس میں سب لوگ کھڑے ہو کر کھاتے ہیں۔ یہ انداز مغرب سے آیا ہے۔ ہماری روایات تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کچھ بھوکے جمع کر دیئے گئے ہیں اور انہوں نے کھانے پر حملہ بول دیا ہے ——— جاپانی سفارت خانے سے ایک دفعہ میرے پاس دعوت نامہ آیا، جس میں یہ بھی لکھا تھا کہ 'بوفے' ہوگا۔ میں نے انہیں یہ لکھ کر بھیجا کہ بوفے، ہماری تہذیبی روایات کے خلاف ہے۔ ہمارے یہاں اس شخص کو بہت برا کہتے ہیں جو کھڑا ہو کر کھائے۔ سلیقے سے بیٹھ کر کھاتے ہیں ——— اس لئے میں شرکت سے معذور رہوں ——— چنانچہ جاپانی سفارت خانے نے معذرت کا خط لکھا۔ اور آئندہ سے اپنے انداز میں تبدیلی کر دی ——— 'بوفے' پھر ان کے ہاں نہیں ہوا۔"

یہ ساری تفصیل اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے۔ ان کی شخصیت میں زندگی سے جو گہری دلچسپی، اس کے لطیف پہلوؤں سے جو لگاؤ، اپنی روایات کا جو پاس لحاظ، اور ان سب کی برتری کا جو احساس اور خیال ہے اس کی مثال کہیں اور نہیں مل سکتی ——— وہ دوسروں کو بھی اس رنگ میں رنگنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں ان کی باتیں کبھی کبھی کسی قدر تلخ بھی معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن ان کا شگفتہ انداز اس تلخی کو اپنے دامن میں چھپا لیتا ہے۔ اور اس طرح اس میں ایک دلکشی اور دلآویزی کی خصوصیت پیدا ہو جاتی ہے ——— یہ مولوی صاحب ہی کا حصہ ہے۔

بظاہر انہیں دیکھنے سے یہ خیال ہوتا ہے کہ ان کے مزاج میں ایک شاہانہ شان ہے۔ اور زندگی میں لطافت اور نفاست پسندی ان کے مزاج کی اسی خصوصیت کا بنیادی نتیجہ ہے۔ لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے کہ وہ زندگی کی مسرتوں کو حاصل کرنے کے لئے صرف انہیں چیزوں ہی کی طرف رجوع نہیں ہوتے جو صرف شاہوں ہی کو میسّر آ سکتی ہیں ——— بعض چھوٹی چھوٹی چیزوں اور معمولی معمولی باتوں سے جو مسرت انسان کو نصیب ہو سکتی ہے وہ اس مسرت کو حاصل کرنے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات تو ان مسرتوں کو حاصل کرنے کے لئے وہ ایسی منزلوں میں قدم رکھتے ہیں کہ ان کے مزاج کو صحیح طور پر نہ سمجھنے والا انسان حیرت سے انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔ اور جو شخص انسانی نفسیات کو نہیں سمجھتا وہ تو نہ جانے کیا کیا غلط قسم کے خیالات قائم کر لیتا ہے ——— نہ جانے ایک شخصیت کا ذہنی رجحان کتنے رنگا رنگ اثرات کا نتیجہ ہوتا ہے۔ کتنے ہی روابط ہوتے ہیں۔ کتنے ہی رشتے ہوتے ہیں جو اس ذہنی کیفیت کی تشکیل کرتے ہیں ——— مولوی صاحب کی شخصیت بھی اس سے مستثنےٰ نہیں ہے۔ بعض اوقات وہ مسرتوں سے سینہ بھر لینے کے لئے جب بالکل معمولی باتوں کی طرف رجوع کرتے ہیں تو اس میں انہیں روابط اور رشتوں سے پیدا ہونے والی ذہنی و جذباتی کیفیت کو دخل ہوتا ہے۔

بابائے اردو کو دنیا جانتی ہے۔ ایک عالم انہیں پہچانتا ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ کبھی کبھی وہ اس جاننے اور پہچاننے والے ماحول سے باہر نکلنا چاہتے ہیں۔ جہاں انہیں کوئی نہ جانے، کوئی نہ پہچانے۔ اور وہ ایک ایسی دنیا میں پہنچ جائیں جہاں آزادی ہو۔ عقیدت مند انہیں نہ گھیریں۔ اور جو ان کا جی چاہے وہ کریں ——— بالکل ایسے بچوں کی طرح جو اس قسم کی پابندیوں سے آزاد ہوتے ہیں ——— میں نے ایسے موقعوں پر ان کی شخصیت

میں ایک ایسے معصوم بچے کی جھلک دیکھی ہے جو ہر اچھی چیز کو دیکھ کر ٹھمکتا ہے اور جو چیز اس سے دُور رکھی جاتی ہے، دوڑ دوڑ کر اس کی طرف جاتا ہے اور اس میں ایک بے نام سی مسرت اُسے حاصل ہوتی ہے۔

زندگی کی بعض بالکل معمولی معمولی باتیں ہوتی ہیں لیکن ان میں کتنا رس ہوتا ہے، کتنی رعنائی ہوتی ہے، یہ کوئی بابائے اُردو سے پوچھے! —

مجھے وہ شام اب تک یاد ہے!

کانپور میں کوئی اُردو کانفرنس تھی۔ کانفرنس کا اجلاس سہ پہر کو شروع ہو کر ختم ہو چکا تھا۔ کانفرنس کے کارکنوں نے اس کے بعد چائے کی دعوت کی تھی۔ اس دعوت میں زیادہ تر نام نہاد شاعر اور ادیب قسم کے لوگ شریک تھے۔ یہ مخلوق بھی عجیب ہوتی ہے۔ یہ لوگ دوسرے کی کم سنتے ہیں۔ اپنی ہی گائے جاتے ہیں۔ بابائے اُردو کو اس مخلوق سے بڑی اُلجھن ہوتی ہے —— خیر تو اس شام کو میں اُن کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ چائے پینے کے بعد وہی سلسلہ شروع ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا، اور جس سے وہ بہت گھبراتے ہیں —— ان میں سے بعض نے اُن کے سامنے اپنی اپنی رام کہانی سنانا شروع کی۔ —— کسی نے کہا، مولوی صاحب، میں ایک نعت لکھ رہا ہوں، کسی نے کہا میں نے ایک مثنوی مکمل کر لی ہے، کسی نے کہا میں نے انسائیکلوپیڈیا کے ترجمے کا منصوبہ تیار کیا ہے —— کسی نے کہا میں آجکل ایک ناول لکھ رہا ہوں —— کسی نے کہا میں نے موجودہ دور کا شاہنامہ تیار کیا ہے —— غرض بھانت بھانت کی باتیں سننے میں آئیں۔ مشکل یہ تھی کہ مولوی صاحب ثقلِ سماعت کے باعث سب کچھ سن نہیں پاتے تھے ساری باتیں مجھ کو سننی پڑتی تھیں۔ اور میں اُن تک پہنچاتا تھا۔ کیونکہ جب کوئی صاحب کچھ کہتے تھے تو مولوی صاحب میری طرف دیکھتے تھے۔ گویا یہ کہہ رہے ہوں کہ یہ کیا بک رہا ہے۔ مجبوراً مجھے بولنا پڑتا تھا —— خاصی آزمائش کا وقت تھا [illegible] لئے —— وہ تو کہئے خیریت ہوئی کہ میزبان نے اٹھ کر تقریر کرنا شروع کر دی۔ وہی تقریر جس میں رسمی سا شکریہ وغیرہ ادا کیا جاتا ہے —— جتنی دیر تقریر ہوتی رہی مولوی صاحب مجھ سے یہ کہتے رہے کہ یہاں بیٹھے بیٹھے پریشان ہو گئے ہیں —— کسی نے ڈکشنری لکھی ہے تو میں کیا کروں؟ —— کوئی ناول لکھ رہا ہے تو مجھے اس سے کیا دلچسپی ہے؟ کوئی اپنے وقت کا فردوسی ہو گیا ہے تو مجھے اس سے کیا؟ —— جیسے ہی تقریر ختم ہوئی مولوی صاحب نے مجھ سے کہا، چلو بھئی کہیں چلنا چاہیئے۔ لوگوں نے گھیرنے کی کوشش کی لیکن ہم کسی طرح وہاں سے جان چھڑا کر نکل آئے —— جب سب پیچھے رہ گئے تو انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور مجھ سے کہا "یہ ہم کہاں پھنس گئے تھے؟ —— خیریت ہوئی ورنہ آج یہ لوگ کچومر نکال دیتے"

میں نے کہا "پروگرام میں بھی تھا کہ شاعر شعر سنائیں گے، وہ تو کہئے خیریت ہی ہو گئی۔ بڑی مشکل سے روکا گیا ان لوگوں کو —— بعضوں کو تو آج نیند نہیں آئے گی۔ ایسا اچھا موقع ان کے ہاتھ سے نکل گیا"

اُنھوں نے کہا —— بھئی جان بچی لاکھوں پائے —— لیکن تم ان لوگوں کے کچھ زیادہ ہی خلاف معلوم ہوتے ہو"

پھر تھوڑی دیر خاموش رہ کر کہنے لگے "یہ کیسے احمق لوگ ہیں۔ آخر یہ اپنے کاموں کا ڈھنڈورا کیوں پیٹتے پھرتے ہیں؟ —— اور پھر مجھے کیوں اس کا نشانہ بناتے ہیں؟ مجھے ان سب باتوں سے کیا دلچسپی ہے؟ ——

میں نے کہا "مولوی صاحب! موقع کے منتظر رہتے ہیں یہ لوگ! جو پھنس جائے اُسے سنبھال لیتے ہیں"

کہنے لگے —— چلو بھئی کہیں چلنا چاہیئے۔ کسی ایسی جگہ جہاں کوئی جاننے والا نہ ہو —— کسی ایسی سڑک پر، کسی ایسے بازار میں چلو جہاں ہمیں کوئی نہ پہچانے۔ اس طرح میں اور دو ایک اور بے تکلف لوگ اُن کے ساتھ چل کھڑے ہوئے —— چلتے چلتے ایک ایسی سڑک پر پہنچے جہاں ایک شخص سنگھاڑے بیچ رہا تھا۔ کہنے لگے "سنگھاڑوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

میں نے کہا "مولوی صاحب اس کی کیا بات ہے؟ کہتے ہیں دل کا داغ دھو دیتا ہے"

پھر کہنے لگے "تو تھوڑے سے لینے چاہئیں"

میں تو اس کا منتظر ہی تھا۔ طبیعت میری بھی چاہ رہی تھی۔ کہنے کی دیر تھی۔ میں نے بڑھ کر تھوڑے سے سنگھاڑے خرید لئے۔ اور چھیل چھیل کر انہیں دیتا گیا۔ خود بھی کھائے، اور دوسروں کو بھی کھلائے۔ مولوی صاحب وہ سنگھاڑے کھاتے جاتے تھے۔ اور ان کی مسرّت کی کوئی انتہا نہیں تھی ——— ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے انہیں کوئی پورا ماحول یاد آگیا ہو۔ وہ کہیں ایسی جگہ پہنچ گئے ہوں جہاں بچپن میں وہ اس طرح گھومتے اور سنگھاڑے کھاتے تھے ——— ایسے لمحوں میں ہمیشہ میں نے ان کی آنکھوں میں ایک چمک دیکھی ہے۔ ان کے چہرے پر مجھے ایک روشنی سی نظر آئی ہے ——— اور میں نے انہیں ایک ایسی دنیا میں پایا ہے جہاں ہر چیز حسین اور دلاویز ہو جاتی ہے۔

اور پھر بارہا انہوں نے مجھ سے اس طرح کی باتیں کی ہیں کہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں جو مسرتیں نہاں ہیں وہی صحیح معنوں میں مسرتیں ہیں۔ مسرت پیسے سے پیدا نہیں ہوتی۔ مسرت محض مادّی ترقی کا نام نہیں ہے۔ مسرّت منصب کی بلندی سے پیدا نہیں ہوتی۔ مسرّت حکومت اور دبدبے کے ساتھ وابستہ نہیں ہے۔ مسرّت کا شہرت سے بھی کوئی تعلق نہیں ——— مسرّت تو ایک کیفیت کو کہتے ہیں۔ اور یہ کیفیت کسی خاص جذبے کی تسکین کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے ——— اس کا محرک کوئی خاص منظر بھی ہو سکتا ہے واقعہ بھی۔ کوئی خیال بھی ہو سکتا ہے عمل بھی ——— اس لئے مسرّت اور اس کے حصول کا دائرہ بہت وسیع ہو جاتا ہے ——— انسان اگر محسوس کرنا چاہے، اور محسوس کرنے کی اس صلاحیت کو بیدار کرے تو ہر طرف مسرّت ہی مسرّت ہے ——— زندگی مسرت اور اس کے حصول ہی سے عبارت ہے۔ لیکن مسرّت کے اس حصول کے لئے ایک ذہنی اور جذباتی تربیت کی ضرورت ہے۔ کہ اس کے بغیر مسرّت کا خیال بھی پیدا نہیں ہوتا ——— مسرّت اس زندگی میں ارزاں ہے بشرطیکہ انسان اس کو حاصل کرنے کا خیال دل میں پیدا کرے۔ اور یہ خیال اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب حالات سے مطابقت پیدا کی جائے، جب زندگی کی ایک ایک چیز سے دلچسپی لی جائے۔ درحقیقت زندگی سے بیزاری مسرتوں کا خون کرتی ہے۔ زندگی تو بسر کرنے کے لئے ہے، بیزار ہو کر منہ موڑ لینے کے لئے نہیں ہے۔ زندگی سے منہ موڑ لینا مسرّت کو خیر باد کہہ دینا ہے اور مسرت کو خیر باد کہہ دینا انسان کی موت ہے۔

ہر شخص کی زندگی ایک چھوٹی سی دنیا ہوتی ہے۔ اس دنیا میں وہ مسرتوں کو پیدا کرتا ہے۔ محنت میں اُسے مسرّت ملتی ہے، محنت سے جو چھوٹی سی پونجی وہ حاصل کرتا ہے اسی میں اسے مسرّت ملتی ہے، جو کام وہ کرتا ہے اس میں اُسے مسرّت ملتی ہے، جن رشتوں میں وہ منسلک ہوتا ہے ان کو برتنے میں اُسے مسرّت ملتی ہے ——— غرض مسرّت ایک ہمہ گیر حقیقت ہے۔ ہم میں سے بہت سے لوگ اس مسرت سے محروم بھی ہو جاتے ہیں کیونکہ انہیں اس کا احساس باقی نہیں رہتا۔ اور یہی انسان کی جذباتی موت ہوتی ہے۔ اور جذباتی موت جسمانی موت سے بھی خطرناک چیز ہے ——— جو شخص زندگی کی اس منزل پر آجائے اس کو یہ احساس باقی نہیں رہتا کہ چھوٹی چیزیں اور معمولی باتیں بھی کوئی اہمیت رکھتی ہیں۔ اُسے یہ خیال نہیں آتا کہ جو باتیں معمولی سمجھ کر نظر انداز کر دی جاتی ہیں ان میں بلا کی دلکشی ہوتی ہے، قیامت کا حسن ہوتا ہے۔ سڑک پر خود چھیل چھیل کر سنگھاڑے کھانے، کبھی کبھی کسی بھاڑ بھونجے کے ہاں سے بھنے ہوئے سوندھے چنے لے کر چبانے، کبھی کسی باغ سے امرود یا نارنگی توڑ کر کھانے اور املی یا آم کے درخت کو دیکھتے ہی اینٹ پھینک کر املی یا آم گرانے میں جو لطف ہے اور اس میں جو مسرّت ملتی ہے، اس کو بیان نہیں کیا جا سکتا، صرف محسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔

جب بھی مولوی صاحب نے مجھ سے اس طرح کی باتیں کی ہیں، میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے کہ یہ ایک انسان کی آواز ہے ——— ایک ایسے انسان کی آواز جس کے جذبات اگر سرد نہیں پڑتے تو زندگی کی ہر بات اُسے اچھی معلوم ہوتی ہے، ہر پہلو اس کا دل لبھاتا ہے، چھوٹی سے چھوٹی بات اور معمولی سے معمولی پہلو کو وہ حسین سمجھتا ہے ——— زندگی میں رس اور شخصیت میں رعنائی کا پیدا ہونا، اس کے بغیر ممکن نہیں!

اُن کی شخصیت سے مجھے ہمیشہ انسانی زندگی کی اسی کیفیت کا آئینہ نظر آئی ہے!۔

اس میں شک نہیں کہ مسرّت کا حصول اور زندگی کو برتنے اور اس سے رس نچوڑ لینے کی تمنا بابائے اُردو کی شخصیت کا بنیادی محور ہے لیکن اس کا مطلب ان کے یہاں ذہنی تعیّش نہیں ہے۔ اس کو ریاست اور امارت سے کوئی نسبت نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ان کی شخصیت میں کام سے دلچسپی، محنت سے

لگاؤ اور نصب العین سے محبت کا احساس اتنا شدید نہ ہوتا۔

بابائے اردو کی زندگی کام سے عبارت ہے۔ صبح سے شام تک مستقل اور مسلسل کام کرنا ان کے معمولات میں داخل ہے۔ بغیر کام کے وہ زندہ نہیں رہ سکتے۔ بیکار بیٹھنا انہیں نہیں آتا۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتے رہنا ان کے مزاج کا بنیادی جزو ہے۔ صبح سے ان کے کام کا جو سلسلہ شروع ہوتا ہے تو رات کو سوتے وقت تک جاری رہتا ہے ــــــ بڑی بات یہ ہے کہ وہ اس کام کو اپنے لئے بوجھ نہیں بناتے۔ بلکہ شوق اور دلچسپی سے کرتے ہیں۔ اسی لئے کام میں بھی انہیں مسرت حاصل ہوتی ہے، شادمانی سے ہمکنار ہونے کا موقع ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس کام کو بھی وہ پیش نظر رکھتے ہیں اس میں گم ہو جاتے ہیں۔ کھو جاتے ہیں، ڈوب جاتے ہیں۔ اور اس طرح ان کی ذات اور کام کے درمیان دوئی کا احساس نہیں ہوتا۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ منسلک معلوم ہوتے ہیں ــــــ قدم قدم پر ایک دوسرے میں جذب ہو جانے کا احساس ہوتا ہے۔ کام کے سلسلے میں ایسا انہماک، اور اس درجہ جذب و شوق میں نے کسی اور شخصیت میں نہیں دیکھا۔

دن بھر اس کام کے سلسلے میں میز پر جھکے رہنا کسی اور کے بس کی بات نہیں۔ ہر شخص دن کو تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتا ہے۔ مولوی صاحب کو اس آرام سے نفرت ہے۔ کیونکہ وہ کام میں حارج ہوتا ہے۔ اسی لئے قیلولے کو وہ انحطاط و زوال کی نشانی سمجھتے ہیں۔ وہ دن کو کھانا ہی نہیں کھاتے اس لئے قیلولہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ایک دن میں نے مسلمانوں کی تن آسانی کے موضوع پر گفتگو شروع کی۔ مسلمانوں کو کام سے جی چرانے کی جو عادت سی ہو گئی ہے، اس پر بات چیت ہوتی رہی۔ مجھے دوران گفتگو میں ایک دلچسپ بات کا خیال آیا۔ اور یہ سوچا کہ ذرا دلچسپی کے لئے یہ بات کہہ ہی دینی چاہیئے۔

چنانچہ میں نے کہا "مولوی صاحب! آپ مسلمانوں کا اتنا خیال رکھتے ہیں، کیا آپ واقعی سچے مسلمان ہیں؟"

کہنے لگے "تو تمہارا کیا خیال ہے؟"

میں نے کہا "مولوی صاحب، آپ مسلمان نہیں ہیں؟"

حیران ہو کر پوچھنے لگے "آخر یہ خیال تمہیں یکایک کیسے پیدا ہوا؟"

میں نے پھر کہا "آپ کسی طرف سے بھی مسلمان نہیں معلوم ہوتے"

انہوں نے پھر کہا "آخر یہ الہام تمہیں کیسے ہوا؟"

میں نے کہا "آپ قیلولہ نہیں کرتے۔ اور دن بھر کام کرتے رہتے ہیں"

بہت زور سے ہنسے۔ اور کہنے لگے "ہاں بھئی، اب مسلمان ہونے کی یہی خصوصیات رہ گئی ہیں"

میں نے کہا "مولوی صاحب آج ہی پر کیا منحصر ہے۔ صدیوں سے مسلمانوں کی یہی روایات رہی ہیں ــــــ بس وہ پلاؤ کھاتے، حرم سرائیں بناتے اور قیلولہ کرتے رہتے ہیں"

اس پر سنجیدہ ہو کر کہنے لگے "اسی نے تو مسلمانوں کی یہ درگت بنا دی۔ افسوس کی بات ہے"

میں نے اس سنجیدہ فضا میں پھر شگفتگی پیدا کرنے کی کوشش کی اور کہا ــــــ "بہرحال پھر آپ تو مسلمان نہیں ہوئے؟"

کہنے لگے "ظاہر ہے ــــــ میں ایسے مسلمان ہونے سے باز آیا"

اور واقعی وہ اس طرح کے مسلمان نہیں ہیں۔ مسلمانوں نے انحطاط میں جو خصوصیات اپنے اندر پیدا کیں یا جن خصوصیات نے انحطاط ان کے اندر پیدا کر دیا، ان سے وہ دور کا واسطہ بھی نہیں رکھتے۔ ان کی شخصیت میں تو فکر و عمل کی وہ خصوصیات میں نے دیکھی ہیں جو زندہ قوموں کے زندہ افراد میں پائی جاتی ہیں۔ یعنی تن آسانی سے نفرت، کاہلی سے بیزاری، اور اس کے برخلاف کام کا شوق، محنت کا خیال، کچھ کرنے اور کرتے رہنے کی آرزو! ــ ـ

ان خصوصیات کے بغیر بابائے اُردو کی شخصیت کا تصور بھی ناممکن ہے!۔

میں نے انہیں مختلف اور متنوع قسم کے کام کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اور ہر کام میں ایک ایسی لگن، میں نے پائی ہے، ایک ایسا شوق اور انہماک مجھے نظر آیا ہے جس کی مثال شاید ہی کسی دوسری شخصیت میں ملے۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ بعض شخصیتیں کسی مخصوص قسم کے کام میں انہماک کا اظہار کرتی ہیں —— بیک وقت کئی قسم کے کام کرنا ان کے بس کی بات نہیں ہوتی —— اور یہ ہے بھی بڑی مشکل بات —— لیکن بابائے اُردو کو دیکھا۔ ابھی انتظامی امور کو دیکھ رہے ہیں، ابھی کوئی لسانی، تہذیبی یا ثقافتی منصوبہ بندی ہو رہی ہے۔ ابھی کوئی تحقیقی اور علمی کام ہو رہا ہے، ابھی کوئی خالص تخلیقی کاوش پیش نظر ہے۔ غرض اُن کی شخصیت میں بیسیوں پہلو اپنا اثر دکھاتے ہیں۔ اسی لئے اس کی رنگارنگی سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے۔

انتظامی معاملات اور دفتری مسائل سے بظاہر انہیں دلچسپی نہیں ہونی چاہیئے کیونکہ بنیادی طور پر وہ ایک ثقافتی رہنما، ایک محقق، ایک عالم اور ایک ادیب ہیں۔ لیکن میں نے تو دیکھا ہے کہ وہ دفتر میں بیٹھے ہیں اور حساب کے رجسٹر تک دیکھ رہے ہیں۔ مددگاروں کو ایک ایک بات سمجھا رہے ہیں۔ ایک ایک بات کی تاکید کر رہے ہیں۔ اور نہ صرف یہ بلکہ ایسے راستے بھی دکھا رہے ہیں جو ایک اعلیٰ درجے کی تخیلی صلاحیت اور ذہانت کے بغیر ممکن نہیں۔ اس طرح انہوں نے بہت سی دفتری اُلجھنوں کو سلجھایا ہے، بہت سے نئے طریقے کام کرنے والوں کو سکھائے ہیں —— لیکن اس میں پیچیدگی اور اُلجھن کو وہ پسند نہیں کرتے۔ انہیں کسی بات کو طول دینا نہیں آتا۔ ان کے پیش نظر تو سب سے پہلے یہ بات ہوتی ہے کہ کام ہونا چاہیئے اور جلد ہونا چاہیئے۔ لیکن دفتری نظام اس میں حائل ہوتا ہے۔ بابائے اُردو اس کا بڑا خیال کرتے ہیں۔ ان کے مزاج میں جو سادگی اور سلامت پسندی ہے، وہ یہاں بھی اپنا اثر دکھاتی ہے —— اسی لئے ان کے اس کام میں بھی ایک غیر رسمی سا ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔

لسانی اور تہذیبی نوعیت کے کام ... ان کی شخصیت ایک خاص پہلو رکھتی ہے۔ وہ بڑے فطرت پرست ہیں۔ انسان اور انسانی زندگی سے انہیں جو گہری دلچسپی ہے اس نے ہمیشہ اس قسم کے کاموں میں انہیں ... دلچسپی ... ہے —— وہ ارتقا پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس لئے لسانی اور تہذیبی معاملات میں بھی ان کا نقطۂ نظر ہمیشہ ارتقائی رہا ہے —— انہیں ان روایات سے دلچسپی ہے جو آگے بڑھنا سکھاتی ہیں۔ ان کی ساری کوششیں اسی مرکز کے گرد ... رہی ہیں اور انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اسی کام میں صرف کیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ تہذیبی معاملات میں اتنے انہماک سے کام کرنے والا اس دور میں سوائے اُن کے اور کوئی پیدا نہیں ہوا —— اور یہ کام بھی انھوں نے اس طرح کیا کہ سارے ماحول میں زندگی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ تہذیبی معاملات کو سمجھنے کا ایک شعور پیدا کر دیا —— جس کے نتیجے میں باقاعدہ تحریکیں شروع ہوئیں۔ اور جن معاملات کو لوگ درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے، اس کے لئے تن من دھن کی بازی لگانے کو تیار ہو گئے۔ یہ سب بابائے اردو کی انتھک کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس لگن، شوق اور انہماک کا نتیجہ ہے جس سے ان کی شخصیت عبارت ہے۔

لیکن ان کے کام کا خاص میدان علمی اور تحقیق ہے۔ جو دلچسپی انہیں اس کام سے ہے وہ اس دنیا میں کسی اور کام سے نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اسی دنیا کے انسان ہیں —— اپنی ساری زندگی انہوں نے اسی علمی اور تحقیقی دنیا میں گزاری ہے —— اور اس میں اپنے شوق اور انہماک سے ایک نئی روایت کا سنگ بنیاد رکھا ہے —— نئی نئی چیزوں کی دریافت، اور ان کو دنیا سے روشناس کرانے کا خیال ان کے مزاج کا جزو ہے۔ اور وہ ساری زندگی اسی پر عمل کرتے رہے ہیں —— جو کارہائے نمایاں اس سلسلے میں ان کے ہاتھوں عمل میں آئے ہیں ان کی ایک مستقل حیثیت ہے۔

ان متنوع اور مختلف کاموں کو بیک وقت خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دینے کا بنیادی سبب یہ ہے کہ وہ ان کاموں کو وبال جان سمجھ کر نہیں کرتے۔ بلکہ ان میں ایک روحانی مسرت محسوس کرتے ہیں۔ اسی لئے کام ان کے لئے کام نہیں رہتا، ذہنی طور پر لطف اندوز ہونے کا ایک ذریعہ بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں بابائے اُردو نے اس سلسلے کی دشوار سے دشوار راہوں کو اپنے لئے آسان بنا لیا ہے۔ اسی لئے یہ کام ان کے معمولات میں داخل ہو گئے ہیں۔ ان کی زندگی کا بنیادی جزو بن گئے ہیں —— بلکہ شاید یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ انہیں کاموں کو اُنھوں نے اپنی زندگی

بنا لیا ہے۔

میں نے اُن سے ایک دن ہمت کر کے کہا ——— "دن میں آپ آرام کیوں نہیں کرتے ؟"

کہنے لگے "دن آرام کرنے کے لئے نہیں ہوتا ——— کام کے لئے ہوتا ہے"

میں نے پھر کہا "آپ دن بھر میز پر جھکے ہوئے کام کرتے رہتے ہیں۔ آپ کو تکلیف نہیں ہوتی ؟"

انھوں نے جواب دیا "کام کرنے سے تو راحت ملتی ہے ——— راحت ایک روحانی مسرت کا نام ہے۔ اور کام ایک روحانی مسرت بخشتا ہے ——— اور یہ مسرت ہی انسانیت کی معراج ہے"

میں نے کہا ——— "آپ کو تکان تو پھر بھی ہو جاتی ہوگی"

کہنے لگے ——— "ہر بات کا انحصار عادت پر ہوتا ہے۔ مجھے دن میں آرام نہ کرنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔ عادت کسی چیز کی بھی ڈالی جا سکتی ہے۔ انسان چاہے تو کام کرنے اور مصروف رہنے کی عادت ڈال لے، چاہے تو سونے اور آرام کرنے کا عادی ہو جائے ——— میں تو یہ کہتا ہوں کہ کھانا پینا، سونا جاگنا سب کی عادت ہو جاتی ہے ——— انسان اپنے اوپر قابو حاصل کرے تو ان سب کی عادت چھوڑ سکتا ہے۔

میں نے کہا ——— "مولوی صاحب کھانا پینا آدمی کس طرح چھوڑ سکتا ہے ؟"

فرمایا "دنیا میں کوئی بات بھی انسان کے بس سے باہر نہیں"۔

ان کی اس قسم کی باتیں بعض اوقات عجیب معلوم ہوتی ہیں لیکن ذرا غور کیجئے تو ان میں بعض بڑی اہم صداقتیں اپنے آپ کو رونما کرتی ہیں جب وہ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں تو ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان اس دنیا میں ایک بہت بڑی طاقت ہے ——— اسے اپنی اس طاقت سے خاطر خواہ کام لینا چاہیئے ——— اگر یہ کام لیا جائے تو انسان کے سامنے دنیا کی ہر چیز جھک جاتی ہے۔ اس کی حلقہ بگوشی اختیار کر لیتی ہے۔ اور اس طرح وہ ساری زندگی پر حاوی ہو جاتا ہے ——— ہر چیز اس کے اشاروں پر رقص کرتی ہے۔

انسان کی عظمت کا جتنا شدید احساس میں نے بابا جی کی شخصیت میں دیکھا ہے۔ کسی دوسری جگہ اس کا عشر عشیر بھی نظر نہیں آتا۔

اسی لئے تو وہ انسانی طاقت کے پرستار ہیں۔ اقبال کو جو وہ اتنا پسند کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اس نے طاقت کی پرستش کی ہے۔ انسان کی عظمت کے گیت گائے ہیں۔ اپنے لہجے میں ایک جارحانہ انداز پیدا کیا ہے۔ اور اپنے انداز میں ایک مردانہ بلند آہنگی کو جگہ دی ہے ——— وہ نیٹشے سے زیادہ قریب ہیں کیونکہ اس نے فوق انسان SUPER MAN کا تصور پیش کیا ہے ——— مولوی صاحب بھی انسان کو اتنی ہی بلندیوں پر دیکھنے کے خواہشمند ہیں۔

قائد اعظم کا ذکر انھوں نے اکثر مجھ سے کیا ہے۔ اور بڑی عقیدت کے ساتھ کیا ہے ——— شاید اتنی عقیدت سے کسی اور کا ذکر انھوں نے مجھ سے نہیں کیا ——— سیاسی لوگوں کو تو وہ کبھی خاطر ہی میں نہیں لاتے ——— لیکن جب بھی قائد اعظم کی بات ہوئی ہے۔ انھوں نے ان سے گہری عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

بابائے اردو کبھی سیاسی جلسوں میں نہیں جاتے لیکن سیاسی جلسوں کا حال بڑی دلچسپی سے سنتے ہیں ——— اور خاص طور پر اس سلسلے میں جو گفتگو ہوتی ہے وہ سننے سے تعلق رکھتی ہے۔

میں ایک دن شام کو دریا گنج پہنچا ——— یہ ان دنوں کی بات ہے جب دہلی میں مسلم لیگ کا معرکۃ الآرا کنونشن اینگلو عربک کالج میں ہو رہا تھا قائد اعظم اس کے صدر تھے۔ اس کنونشن کی ساری روداد میں نے مولوی صاحب کو سنائی ——— اور خصوصیت کے ساتھ اس کا ذکر کیا کہ جب بھی جلسے میں ہنگامے کی صورت پیدا ہو جاتی تھی۔ کسی بات پر شور و شغب ہوتا تھا تو قائد اعظم اپنی جگہ سے اٹھتے تھے اور صرف اتنا کہتے تھے ——— "آرڈر!" ——— بس

سب کو سانپ سونگھ جاتا تھا۔

یہ روداد بیان کر کے میں نے اُن سے کہا "مجھے تو بس اس وقت لطف آجاتا تھا جب وہ 'آرڈر' کہتے تھے"

یہ سُن کر وہ پھڑک اُٹھے اور کہنے لگے ——— "واہ کیا آدمی ہے"

میں نے کہا ——— "مولوی صاحب! دیکھنے میں اتنے کمزور سے معلوم ہوتے ہیں، لیکن ان کی آواز میں اس کے باوجود ایک گرج ہے"

کہنے لگے "یہ گرج تو اس کی آواز میں ہمیشہ رہے گی ——— یہ اس کے مزاج کی گرج ہے"

میرے منہ سے نکلا "حالانکہ اب ان کی عمر پچھتر کے لگ بھگ ہو گی"

انھوں نے کہا "لیکن اس عمر میں بھی اس کے جسم میں باوجود دُبلے پن کے ایک تناؤ ہے ——— جوانوں کی طرح سیدھا چلتا ہے ——— اور مجھے تو اس کی یہی بات سب سے زیادہ پسند ہے"

وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ قائدِ اعظم کے مزاج کی کیفیت ان کے جسم سے بھی ٹپکتی ہے۔ یہ تعریف گویا اس طاقت کی تعریف تھی جو قائدِ اعظم کی شخصیت کے ساتھ مخصوص تھی۔ اور جس سے انھوں نے وہ کام لیا جو مسلمانوں کے کسی لیڈر کے تصور میں بھی نہیں تھا۔

غرض جب بھی طاقت کی بات ہو، جب بھی زور کا تذکرہ ہو تو وہ باغ باغ ہو جاتے ہیں ——— طاقت سے زیادہ انہیں کوئی اور چیز عزیز نہیں۔ اور طاقت سے اس والہانہ وابستگی کا یہ نتیجہ ہے کہ ان کے مزاج میں کسی حد تک ایک انتہا پسندی بھی اثر دکھاتی ہے ——— جو کام بھی وہ کرتے ہیں اُسے اس کی آخری حدوں تک پہنچائے بغیر چین سے نہیں بیٹھتے۔ اور اسی لئے ان کا یہ خیال ہے کہ انسان اس دُنیا میں سب کچھ کر سکتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ انسانی تاریخ سے مثالیں پیش کرتے ہیں۔ انہیں اس بات پر یقین ہے کہ دنیا میں جو ترقی بھی ہوئی ہے، اسی میں انتہا پسندوں کی کوششوں کو دخل تھا۔ دنیا میں جن لوگوں نے بھی کارہائے نمایاں کئے وہ انتہا پسند تھے۔ اعتدال ہمیشہ ارتقا کی راہوں میں حائل ہوتا ہے۔ کیونکہ اعتدال سے کام میں تاخیر ہوتی ہے اور تاخیر و تعویق ترقی کی دشمن ہے ——— ایک خط میں مجھے لکھتے ہیں:-

"سرکاری کاموں میں بہت دیر ہوتی ہے۔ مجھے تاخیر سے اُلجھن ہوتی ہے۔ یہ مسخرے بار بار مجھ سے یہ فرماتے ہیں جلدی نہ کیجئے، اعتدال سے کام لیجئے۔ مجھے اعتدال سے چڑ ہے۔ اعتدال کے معنی تساہل، کاہلی، غفلت کے ہیں۔ ہر کام کرنے والے کو EXTREMIST ہونا چاہیئے۔ تمام مصلح، بانی، یا پیغمبر ایکس ٹری مسٹ، یعنی انتہا پسند تھے۔ اگر بانی اعتدال پسند ہے تو اُس کے پیرو ایک ہی نسل کے بعد آسانی پسند اور کاہل ہو کے رہ جائیں گے۔ سائنس کی سب کمیٹی نے بھی یہی ہدایت فرمائی ہے کہ اس کام میں عجلت نہیں کرنی چاہیئے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہ لوگ اپنے ڈرائنگ روموں میں بیٹھ کر مجھ پر طعن کرتے ہیں اور کہتے ہیں مولوی صاحب بہت جلدی کرتے ہیں۔ ایک صدی کی بحث و تکرار، غور و فکر، مذاکرے، تنقید و تحقیق، مشاہدوں اور تجربوں کے بعد بھی جب میں یہ سُنتا ہوں کہ جلدی نہ کیجئے تو میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ انھیں اپنے علم و عقل پر ناز ہے۔ اگر یہی علم و حکمت ہے تو تُف ہے اس عقل و دانش پر اور حیف ہے اس علم و حکمت پر۔ یہ جاہل بلکہ جہل مرکب ہیں۔ جاہل کو سمجھانا آسان ہے۔ ان جاہل ڈاکٹروں یا عالموں کو سمجھانا مشکل ہے۔ یہ بیسویں صدی یعنی جوہری (اٹامی) عہد میں ایسی باتیں کرتے ہیں جو ڈیڑھ صدی پہلے ہمارے بزرگ کیا کرتے تھے"

اس سے بابائے اُردو کے مزاج کی انتہا پسندانہ کیفیت پر پوری طرح روشنی پڑتی ہے ——— وہ انتہا پسند ضرور ہیں۔ انتہا پسندی کو انسانی ارتقا کے لئے ضروری بھی سمجھتے ہیں۔ یہ بھی انھیں یقین ہے کہ انتہا پسندی طاقت، ولولہ اور اُمنگ کی خالق ہے۔ اور جب تک یہ چیزیں موجود نہ ہوں

انسان کے دل میں کچھ کرنے کا خیال تک پیدا نہیں ہو سکتا ——— لیکن جیسا کہ اس خط سے ظاہر ہے ان کی انتہا پسندی جذباتیت سے تعلق نہیں رکھتی۔ وہ عمل کا نام ہے، ولولے اور اُمنگ کا نام ہے ——— ایک بدلتی ہوئی دنیا کی بدلتی ہوئی کیفیت کا شعور اس میں پوری طرح کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ زندگی میں سائنس کی ترقی سے جو تیزی اور طاقت پیدا ہو رہی ہے اس کو وہ پوری طرح سمجھتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں ——— پھر وقت کا جو تفاوت ہے، ماحول کی جو تفریق ہے، زمانے کا جو اختلاف ہے ——— اس سے بھی وہ ناواقف نہیں ہیں ——— ایک نسل دوسری نسل سے کن اعتبارات سے مختلف ہوتی ہے ——— نئی نسل کے لوگ پُرانی نسل کے لوگوں کے مقابلے میں کون سی امتیازی خصوصیات رکھتے ہیں۔ اس سے بھی وہ ناواقف نہیں ہیں ——— پرانے لوگوں کے مقابلے میں تو نئے لوگوں کو بہرحال انتہا پسند ہونا چاہیئے۔ کہ اس کے بغیر انسانیت کا آگے بڑھنا مشکل ہے ———

بس یہی اُن کی انتہا پسندی ہے ——— شاید ہی کوئی ایسا باشعور انتہا پسند اس دور میں پیدا ہوا ہو! انتہا پسند ہوتے ہیں لیکن ان کی انتہا پسندی بالعموم جذباتیت پر مبنی ہوتی ہے۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ، جیسے جیسے عمر بڑھتی جاتی ہے، انتہا پسندی کے شعلے سرد ہوتے جاتے ہیں۔ بابائے اُردو کے یہاں چونکہ اس کی بنیاد شعور پر استوار ہے اس لئے اس عمر میں بھی اس میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے ——— وہ آج بھی اسی طرح سوچتے ہیں، اور سوچ کر اس پر عمل کرتے ہیں جس طرح آج سے برسوں پہلے کرتے تھے ——— بلکہ میں نے تو ایسا محسوس کیا ہے کہ اب اس میں کچھ زیادہ ہی شدت پیدا ہو گئی ہے۔

اُن کی شخصیت کا یہ ایک بہت ہی اہم پہلو ہے!

ایک ایسے شخص کو سیاسی مصلحت اندیشی سے دُور کا بھی تعلق نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ وہ سیاسی مصلحت اندیشی کے قائل نہیں ہیں۔ ایسے لوگوں کے بھی وہ قائل نہیں جو سیاسی مصلحت اندیشی کا خیال رکھتے ہوں۔ چنانچہ کہیں اگر کسی کی ذات میں اس کا شائبہ بھی انہیں نظر آجائے یا شبہ بھی ہو جائے تو ذرا بھی رواداری نہیں برتتے۔ اس بُری طرح اس کو پھٹکارتے ہیں کہ خدا کی پناہ!

میں نے خود ایک منظر دیکھا ہے۔

دِلّی میں ریڈیو کی زبان پر ایک زمانے میں بڑا ہنگامہ تھا۔ اُردو والے اُردو کی حمایت کرتے تھے اور ہندی والوں نے اس کے خلاف ایک ہنگامہ کھڑا کر رکھا تھا۔ بالآخر حکومت نے ایک کمیٹی بنائی جس کے سپرد یہ کام ہوا کہ وہ ایک ایسی زبان وضع کرے جس پر اُردو اور ہندی دونوں کے علمبرداروں کو اعتراض نہ ہو ——— اس خیال سے کہ اگر یہ اتفاق ہو گیا تو بہت سی اُلجھنیں ختم ہو جائیں گی۔ اس سلسلے میں ایک ایسی ڈکشنری بھی مرتب ہونے والی تھی جو ریڈیو کی زبان کو مستند بنا دے۔ بابائے اُردو کا اس سلسلے میں جو نقطۂ نظر تھا وہ اُنھوں نے پیش کر دیا ——— اور کچھ دنوں یہ کام چلتا رہا ——— پھر نہ جانے کیا بات ہوئی کہ بابائے اُردو کو ریڈیو کے ایک بڑے مسلمان افسر پر کچھ شبہ ہو گیا۔ یہ بات ان تک پہنچی کہ وہ افسر مصلحت اندیشی اور زمانہ سازی سے کام لے رہے ہیں جس سے ہندی والوں کو تقویت پہنچنے کا اندیشہ ہے ——— جب ریڈیو کے ان افسر صاحب کو یہ معلوم ہوا کہ بھانڈا پھوٹ گیا ہے اور بابائے اُردو پر یہ حقیقت کھل گئی ہے تو وہ اپنی طرف سے صفائی پیش کرنے کیلئے اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے ———

بس نہ پوچھیئے کیا منظر تھا! ———

بابائے اُردو نے ان کو دیکھتے ہی ایسا آڑے ہاتھوں لیا کہ بیچارے حواس باختہ ہو گئے۔ اس بُری طرح ڈانٹا ہے، اس قدر بُرا بھلا کہا ہے کہ مجھے بھی ترس آ گیا۔

ریڈیو کے وہ افسر ہر ڈانٹ پر ہنستے تھے اور یہی کہے جاتے تھے "مولوی صاحب! میری بھی تو کچھ سنیئے۔ مجھے بھی تو اپنی صفائی پیش کر

لینے دیجئے۔" لیکن بابائے اردو نے ایک نہ سنی اور یہی کہتے رہے ——— "زمانہ سازی تم لوگوں کی گھٹی میں پڑی ہے۔ اردو کی تحریک کو ہمیشہ اپنوں سے نقصان پہنچا ہے۔۔ ——— تم لوگوں نے اپنا ضمیر بیچ دیا ہے۔ تم مصلحت اندیش اور زمانہ ساز ہو گئے ہو ——— اور یہی تمہاری موت کا پیش خیمہ ہے۔ تمہیں تمہارے مخالفین کبھی بھی نہیں بخشیں گے۔"

انھوں نے کہا ——— "یہ سب صحیح ہے لیکن میری بھی تو سن لیجئے۔"

انھوں نے کہا ——— "میں تو ایسے لوگوں سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتا۔"

غرض اس روز میں نے انھیں بہت ہی برہمی کے عالم میں دیکھا۔ جب خوب ڈانٹ پھٹکار ہو چکی تو انھیں بٹھایا اور پھر ان صاحب نے باتیں شروع کیں لیکن بابائے اردو کا موڈ درست نہ ہوا۔

ایک دفعہ شہید ملت نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب مرحوم سے بھی بڑی سخت گفتگو ہوئی۔

بابائے اردو کا ہمیشہ سے یہ خیال تھا کہ پاکستان میں زبان کے مسئلے کو جلد طے ہو جانا چاہیئے۔ اگر یہ معاملہ لٹکا رہا تو پھر اس میں الجھنیں پیدا ہوتی جائیں گی۔ اور وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ قائد ملت ہی اس کو خوش اسلوبی سے طے کر سکتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے قائد ملت سے کئی بار اس معاملے میں گفتگو کی ——— وہ بابائے اردو کو بزرگ سمجھتے تھے اور ان کی بڑی عزت کرتے تھے ——— انھوں نے ہمیشہ یہی فرمایا "انشاء اللہ جلد اس سلسلے میں عملی قدم اٹھایا جائے گا ——— لیکن ملک میں کچھ ایسے حالات پیدا ہوتے رہے جن کی وجہ سے اس معاملے میں کوئی قطعی فیصلہ نہ ہو سکا۔

ایک دن کسی دعوت میں نوابزادہ صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے پھر اس طرف توجہ دلائی ——— قائد ملت نے یہی بات کہی کہ ابھی حالات اس کے لئے سازگار نہیں ہیں ——— اس پر وہ کچھ رنجیدہ سے ہو گئے ——— شہید ملت کو خود بھی ان کے رنجیدہ ہونے کا احساس ہوا۔ بلکہ دکھ ہوا ——— لیکن اس وقت وہ مجبور تھے۔ کچھ کر نہیں سکتے تھے۔

اس کے کچھ مہینے بعد ایک اور دعوت میں بابائے اردو اور نوابزادہ صاحب اتفاق سے یکجا ہوئے۔ لیکن وہ ان کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ ——— قائد ملت کو پہلے ہی سے اس کا احساس تھا۔ وہ بابائے اردو کے مزاج کو سمجھتے بھی تھے ——— وہ کبھی ان کی بات کا برا نہیں مانتے تھے۔ چنانچہ خود اٹھ کر ان کے پاس آئے اور ہنس کر کہا کہ "مولوی صاحب آپ مجھ سے کچھ ناراض ہو گئے ہیں۔ میں آپ کو منانے آیا ہوں۔"

وہ کہنے لگے ——— "نہیں میں ناراض نہیں ہوں۔ البتہ مجھے یہ شکایت ضرور ہے کہ جو کچھ زبان کے معاملے میں اب تک ہونا چاہیئے تھا، وہ نہ ہوا اور ہم جہاں سے چلے تھے، آج بھی وہیں موجود ہیں۔ یہ نہایت ہی افسوسناک صورت حال ہے۔ اس کے نتائج قوم اور ملک کے لئے بہت ہی خراب ہوں گے۔"

نوابزادہ صاحب نے ہنس کر کہا "مولوی صاحب میں زندہ ہوں تو انشاء اللہ سب کچھ ہو جائے گا۔ آپ فکر نہ کیجئے۔ اطمینان رکھیئے۔" لیکن وہ زندہ نہ رہے اور جو کچھ ہونا چاہیئے تھا اور جو کچھ وہ کرنا چاہتے تھے سب پر پانی پھر گیا۔

اس واقعے کی ساری تفصیل انھوں نے مجھے خود سنائی۔

بہرحال ان واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ وہ سیاسی مصلحت اندیشی کے قائل نہیں۔ وہ تو دو ٹوک بات کہنے کے عادی ہیں۔ دل کی بات ہمیشہ ان کی زبان پر آجاتی ہے۔ اور جو کچھ ان کی سمجھ میں آتا ہے اس کو لوگوں پر ظاہر کر دیتے ہیں۔ کسی مصلحت کے پیش نظر کام کو روک دینا انھیں نہیں آتا۔ ان کے خیال میں جتنی بھی کام میں تاخیر ہوتی ہے، اسی قدر وہ خراب ہوتا جاتا ہے۔

اور یہ بات ایسی کچھ غلط نہیں ہے!

مولوی صاحب کے مزاج میں یہ تیزی ضرور ہے لیکن ویسے مجموعی اعتبار سے ان کی شخصیت میں بڑی نرمی ہے۔ اور اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ان کے

دل میں انسانیت کا درد ہے۔ انسانیت کا سوز ہے۔ اسی لئے وہ انسان دوست ہیں، انسانیت پرست ہیں۔ اسی لئے ان کی شخصیت میں سختی اور نرمی دونوں کا امتزاج ملتا ہے —— زندگی کا جلال اور اس کا جمال دونوں بیک وقت اپنا اثر دکھاتے ہیں —— اور اسی میں ان کی شخصیت کی عظمت کا راز مضمر ہے۔

انھیں غصہ بہت جلد آتا ہے۔ وہ ذرا سی بات میں بگڑ جاتے ہیں۔ برا بھلا کہنے لگتے ہیں لیکن یہ ساری باتیں وقتی ہوتی ہیں۔ یہ غصہ ہمیشہ باقی نہیں رہتا۔ وقت اور حالات اس کے اثرات کو زائل کر دیتے ہیں۔ بلکہ میں نے تو یہ محسوس کیا ہے کہ ان کے اس غصے میں بھی ایک محبت ہوتی ہے۔ ایک خلوص ہوتا ہے —— وہ ان لوگوں پر نہیں بگڑتے جن سے انھیں تعلق خاطر نہیں ہوتا۔ بات یہ ہے کہ جو لوگ ان سے قریب ہوتے ہیں، جن سے انھیں محبت ہوتی ہے، اور جو خود ان سے محبت کرتے ہیں ان سے بابائے اردو کو زیادہ توقعات ہوتی ہیں۔ جب بھی کسی وجہ سے انھیں یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ توقعات جس طرح پوری ہونی چاہئیں، اس طرح پوری نہیں ہو رہی ہیں، تو ان کے مزاج میں برہمی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن بغیر کسی سبب کے ایسا نہیں ہوتا۔ اس کے پس منظر میں کوئی بہت بڑی بات ہوتی ہے —— اور جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا بابائے اردو کا یہ غصہ وقتی ہوتا ہے۔ یہ برہمی عارضی ہوتی ہے۔ میں نے تو ایک ملتے میں یہ دیکھا ہے کہ ابھی کسی پر برہم ہوئے ہیں اور چند منٹ بھی نہیں گزرنے پائے ہیں کہ اس کا خیال بھی نہیں۔ بات حقیقت یہ ہے کہ وہ کوئی بات اپنے دل میں نہیں رکھتے —— وہ بالکل بچوں کی طرح لوگوں پر بگڑتے ہیں۔ ذرا سی دیر میں ناراض ہیں اور ذرا سی دیر میں خوش! —— ان کے دل میں بغض نہیں ہے —— بلکہ اگر میں یہ کہوں تو بے جا نہیں کہ وہ سوائے محبت کے اور کچھ بھی نہیں ہیں —— دشمنوں تک کے خلاف وہ نفرت کو اپنے دل میں جگہ نہیں دیتے۔ کینہ پروری ان کے نزدیک زندگی کی سب سے بڑی لعنت ہے۔ لوگوں نے ان کی مخالفت کی ہے۔ لوگوں نے ان کے خلاف سازشیں کی ہیں۔ انھیں نقصان پہنچایا ہے۔ لیکن انھوں نے ان لوگوں کو معاف کر دیا ہے۔ عفو و درگذر ان کی شخصیت کی ایک اہم خصوصیت ہے —— میں نے خود دیکھا ہے کہ جن لوگوں کی انھوں نے پرورش کی۔ زندگیاں بنائیں، ہر اعتبار سے انھیں زندگی میں بحال کیا۔ لیکن ان میں سے بیشتر احسان فراموش ثابت ہوئے۔ ان لوگوں نے بابائے اردو کے خلاف سازشیں کیں۔ جب ان سازشوں کا پول کھلا تو انھوں نے ایسے لوگوں سے علیحدگی تو ضرور اختیار کر لی لیکن کبھی بھی انتقام کی آگ ان کے دل میں نہیں بھڑکی۔ وہ کبھی بھی ان کی راہ میں حائل نہیں ہوئے۔ بلکہ موقع ہوا تو اس کے بعد بھی ان کی مدد ہی کر دی۔

ایک واقعہ مجھے یاد ہے:

مولوی صاحب کے دفتر میں ایک صاحب کو بہت دخل تھا۔ وہ ان کے بہت قریب ہو گئے تھے۔ انھوں نے ہر اعتبار سے ان کی مدد کی تھی لیکن ایک منزل ایسی آئی جب انھوں نے بعض معاملات میں ان کی مخالفت کی۔ مخالفت کیا اچھا خاصا ہنگامہ کھڑا کیا۔ جب مولوی صاحب کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے ان صاحب سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اور ہمیشہ کے لئے قطع تعلق کر لیا۔ بعض لوگوں نے انھیں یہ مشورہ دیا کہ اس واقعے کو اخباروں میں دیں اور تمام دنیا تک پہنچائیں تاکہ جو کچھ انھوں نے کیا ہے، اس کی سزا انھیں مل جائے —— لیکن مولوی صاحب نے ہمیشہ یہی جواب دیا۔ "میں کسی کو ذلیل کرنا نہیں چاہتا۔ یہ بھی میں نہیں چاہتا —— کہ کوئی اپنی روزی سے محروم ہو جائے۔ میں تو ان حالات میں بھی اگر کوئی موقع آئے گا، تو اس کی مدد ہی کروں گا" ...

اور اس طرح کا کوئی ایک واقعہ ان کی زندگی میں نہیں ہے۔ بے شمار واقعات ہیں۔ وہ ساری زندگی لوگوں کی مدد کرتے رہے ہیں۔ یہ مدد انھوں نے طرح طرح سے کی ہے۔ کسی کو روپیہ دیا ہے، کسی کو ملازمت دلائی ہے۔ کسی کے لئے ضروریاتِ زندگی فراہم کی ہیں، کسی کی تعلیم کا انتظام کیا ہے —— غرض نہ جانے کس کس طرح سے وہ لوگوں کے کام آئے ہیں لیکن ان میں سے بیشتر نے ان کے ان احسانات کو فراموش کر دیا۔ بعضوں نے تو مخالفت پر کمر باندھی اور ذاتی مفاد کی خاطر بڑی ہی شرمناک حرکتیں کیں۔ ان حالات سے دو چار ہوتے رہے لیکن چہرے پر شکن تک نہیں آئی۔

ایک دن میں نے کہا۔ "مولوی صاحب! یہ کیسی افسوسناک بات ہے کہ آپ کو زندگی میں کوئی اچھا آدمی نہیں ملا۔"

کہنے لگے۔ "ہاں، حقیقت ہے۔"

میں نے کہا۔ "لیکن آخر اس کا سبب کیا ہے؟"

کہنے لگے۔ "اسے بدقسمتی ہی کہا جا سکتا ہے۔"

اس جملے میں کتنی حسرت تھی۔ مجھے یہ بات سن کر اس قدر دکھ ہوا کہ بیان سے باہر ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ جو شخص سوائے محبت کے اور کچھ بھی نہ ہو۔ اس کو خود محبت نصیب نہ ہوسکے۔ جن سے وہ محبت کرے وہی اس کو نقصان پہنچانے کے منصوبے بنانا شروع کر دیں۔

زندگی کا یہ کیسا افسوسناک پہلو ہے:

مولوی صاحب کا دل انسانی ہمدردی سے معمور ہے ——— وہ انسان کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے۔ کسی کی پریشانی اُن سے برداشت نہیں ہو سکتی۔ ذرا سی پریشانی دیکھ کر وہ پریشان ہو جاتے ہیں۔ ایک کرب کی سی کیفیت ان کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے ——— لیکن ان کی زندگی کے اس پہلو کو بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ صرف انہی کو اس کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے جنہیں اُن کے بہت قریب رہنے کا موقع ملا ہے۔ اور جو ان کے مزاج سے پوری واقفیت رکھتے ہیں ——— دوسروں کو اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اپنی زندگی کے اس پہلو کو وہ نمایاں نہیں ہونے دیتے ——— بلکہ حتی الامکان ان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ کسی کو اس کا علم نہ ہو۔

آج یہ کون جانتا ہے کہ مولوی صاحب نے کتنے خاندانوں کی پرورش کی ہے۔ کتنی بیواؤں اور یتیموں کا خیال رکھا ہے۔ کتنے طالب علموں کو وظائف دیئے ہیں، کتنوں کو اعلیٰ تعلیم کے لئے ملک سے باہر بھیجا ہے۔ کتنے نوجوانوں کو روزگار سے لگایا ہے، کتنے ادیبوں کی مالی مدد کی ہے ——— شاید اس کو کوئی بھی نہیں جانتا۔ اور جو دو ایک لوگ اس کو جانتے ہیں وہ اگر اس کی تفصیل لکھنا چاہیں تو اس پر دفتر کے دفتر لکھے جا سکتے ہیں ——— میں مبالغہ آرائی سے کام نہیں لے رہا ہوں۔ یونیورسٹیوں میں، دفتروں میں، اُن شہروں میں جہاں مولوی صاحب کا قیام رہا ہے۔ خدا جانے کتنے ہیں جن کی انھوں نے کسی نہ کسی طرح مدد کی ہے ——— ان کی یہ عادت ہے کہ کوئی بھی ان کے سامنے جا کر اپنی پریشانی کا اظہار کرے، وہ اس کی سفارش کر دیں گے۔ اس کے لئے جاننے والوں کو خط لکھ دیں گے، خود جا کر اس کے لئے کہہ دیں گے۔ موقع پڑے گا تو اس کی خاطر لڑائی تک مول لینے کے لئے تیار ہو جائیں گے ——— صرف اس خیال سے کہ اس شخص کی راہوں میں جو الجھنیں حائل ہیں وہ دور ہوں اور اسے آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کا موقع ملے ——— اور یہ سب کچھ ان سے انسان دوستی اور انسانیت پرستی کا وہ خیال کراتا ہے جو ان کے مزاج کا جزو ہے۔ اور جس کو وہ کسی حال میں بھی جدا نہیں کر سکتے۔

جو لوگ ان سے قریب ہیں، جو ان کے ساتھ کسی نہ کسی سلسلے سے وابستہ ہیں ان کا خیال تو وہ اسی طرح رکھتے ہیں جس طرح کوئی باپ اپنے بیٹے کا خیال رکھتا ہے ——— ان میں سے کسی کو اگر ذرا سی بھی تکلیف ہو جائے تو وہ بے چین اور بے قرار ہو جاتے ہیں۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو اسی وقت دیکھے گئے ہیں جب ان کے کسی جاننے والے یا ملازم پر کوئی وقت پڑا ہے۔ دلی کے قتلِ عام میں مسلمان جس طرح تباہ ہوئے اور لاکھوں مسلمانوں کے ساتھ انجمن کے ملازمین پر جو وقت پڑا، اس پر میں نے بابائے اردو کو آنسو بہاتے دیکھا ہے ——— اس کا کچھ اندازہ تو اس ایک خط سے بھی ہوتا ہے جو انہوں نے اس قتلِ عام کے فوراً بعد مجھے لکھا تھا، وہ خط یہ ہے:۔

عزیزمن سلمہٗ

آپ کا خط پہنچا۔ آپ کا پہلا ہی جملہ ہے "دلی تباہ ہو گئی"۔ ہرگز نہیں، مسلمان تباہ ہو گئے۔ اب دلی شاہجہان کی نہیں سکھوں اور پٹیل کے گرگوں کی ہے۔ مجھ سے کیا پوچھتے ہیں۔ میں تو دور تھا۔ آپ اپنی آنکھوں سب کچھ دیکھ چکے ہیں۔ نادر شاہ کا قتلِ عام چند گھنٹے رہا اور اس میں ہندو مسلمان سب ہی تھے۔ غدر کی تباہی میں اگرچہ مسلمان زیادہ تباہ ہوئے لیکن ہندو بھی

بچے نہیں رہے ۱۸۵۷ء کے بعد ۱۹۴۷ء کی تباہی اور قتل و غارت گری سب سے بڑھی ہوئی ہے جو پورے نوّے برس بعد ہوئی ہے اور اس میں صرف مسلمان قتل و تباہ ہوئے۔ یہ منظم سازش تھی۔ نیشنل ہیرلڈ، لکھنؤ نے جو خالص کانگریسی اخبار ہے اس سازش کا راز افشا کیا ہے۔ ۲۲ ستمبر کا پرچہ ضرور دیکھیے . . . . .

میری روداد سنیئے۔ میں ۳ ستمبر کو حیدرآباد سے روانہ ہوا۔ اور گرانڈ ٹرنک ایکسپریس سے ۴ ستمبر کی شام کو بھوپال پہنچا۔ ارادہ تھا ایک روز قیام کرکے ہوائی جہاز سے دہلی چلا جاؤں۔ شعیب قریشی کو میرے آنے کی خبر ہوئی تو اسٹیشن پر پہنچے اور کہا کہ آپ دہلی نہیں جا سکتے۔ وہاں کی حالت خراب ہے۔ میں نے کہا یہ فضول باتیں ہیں۔ اخبار والے اس طرح کی خبریں یوں ہی اڑایا کرتے ہیں لیکن انھوں نے اس شدّت سے اصرار کیا اور اپنی خبریں اس وثوق سے بیان کیں کہ میں ٹھہر گیا۔ اور کہا کہ چار روز کے بعد تحقیق کرکے دیکھوں گا کہ جاؤں یا نہ جاؤں ——— پھر جو خبریں آئیں ان کو کیا بیان کروں۔ حکیم رشید احمد کا خط ۱۲ کا لکھا ہوا ہوائی جہاز سے ۱۸ ستمبر کو ملا۔ اس میں لکھا تھا کہ انجمن کا مکان لٹ گیا۔ سب سامان تباہ ہو گیا۔ البتہ کتب خانہ محفوظ ہے۔ علی شبّر حاتمی بھی میرے ساتھ تھے اور میرے ساتھ دلّی جانے والے تھے۔ اس خط کے وصول ہونے پر وہ جان پر کھیل کر ہوائی جہاز سے دہلی روانہ ہو گئے۔ شعیب صاحب نے ایک خط رفیع احمد قدوائی کے نام دے دیا تھا۔ اور ٹرنک کال سے بھی کہہ دیا تھا۔ میں نے بھی پاکستان ہائی کمشنر اور بعض اور صاحبوں اور ریمر آف کانک سو پریم کمانڈر کے نام خط دے دیئے تھے۔ ہوائی جہاز دہلی پہنچا تو ان کی ایک ایک چیز حتیٰ کہ کپڑوں وغیرہ کی تلاشی لی گئی۔ ان کے ساتھ جو ہندو اور سکھ ہم سفر تھے۔ ان کو کسی نے نہ پوچھا۔ امپیریل ہوٹل پہنچے۔ وہاں ٹھہرنا چاہتے تھے۔ کہا گیا کہ کوئی کمرہ خالی نہیں۔ البتہ بیڈ ٹک دے سکتے ہیں۔ ایک انگریز جو قریب کھڑا تھا اس نے شبّر کو اشارے سے الگ بلایا اور کہا یہاں ہرگز نہ ٹھہرنا قتل کر دیئے جاؤ گے اگر کہیں جگہ نہ ملے تو میرے پاس میڈن ہوٹل میں آ جاؤ۔ میں تمہیں اپنے کمرے میں ٹھہرا لوں گا۔

اب انھوں نے فون کرنے شروع کئے۔ کہیں سے کوئی جواب نہ آیا۔ کچھ دیر کے بعد رفیع احمد قدوائی صاحب کے ہاں سے جواب آیا کہ سات بجے گاڑی بھیجوں گا۔ انتظار کیجئے۔ جیپ کار آئی جس میں دو فوجی سپاہی اور ایک پولیس افسر مسلح موجود تھا۔ اس حفاظت کے ساتھ وہ قدوائی صاحب کے مکان پر پہنچے۔ دوسرے روز اسی حفاظت میں دریا گنج گئے۔ انجمن کا مکان دیکھا وہ سب لٹ چکا تھا۔ البتہ خدا کا شکر ہے کہ کتب خانہ محفوظ تھا۔ اور اس پر سرکاری پہرہ مقرر ہے۔

انجمن والے اور تو سب بچ گئے لیکن منشی بشیر اور ان کے بال بچے قتل کر دیئے گئے جو بچے ہیں ان کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ انہیں مدد کس ذریعے سے اور کہاں پہنچاؤں وہاں سے جو دو ایک خط آئے وہ اتنے دنوں کے بعد۔۔ کہ یہ پتہ لگانا دشوار ہو گیا کہ ابھی وہ وہیں ہیں یا کہیں اور ——— محاسب صاحب زخمی پرانے قلعے میں تھے۔

یہاں یہ خبر مشہور ہوئی کہ سید ہاشمی شہید ہو گئے۔ تحقیق سے یہ معلوم ہوا کہ مولوی عبدالماجد دریابادی نے اپنے دوست مناظر احسن صاحب (جامعہ عثمانیہ) کو لکھا کہ شہدائے دہلی میں سید ہاشمی کا نام بھی ہے۔ اس سے میں بہت پریشان ہوا۔ جگہ جگہ تار دیئے۔ اور خط لکھے کہیں سے جواب نہ ملا۔ آل انڈیا ریڈیو کے ذریعے خیریت منگائی کچھ معلوم نہ ہوا۔ اتفاق سے کل رحم علی الہاشمی کا خط آیا تو معلوم ہوا وہ فریدآباد میں ہیں اور آج آپ کے خط سے بھی تصدیق ہوئی۔

میں نے ایک اسکیم پاکستان میں اردو کی اشاعت کے متعلق تیار کی ہے۔ کراچی میں پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس ہونے والی ہے جس میں پاکستانی وائس چانسلر اور ڈائرکٹران تعلیمات خاص طور پر شریک ہوں گے۔ ان سے گفتگو کرکے صوبوں میں

کام کرنے کا پروگرام بناؤں گا۔ اب مجھے نئی دنیا بنانی ہے۔ ہندوستان سے تو اُردو کو دیس نکالا مل گیا۔ اب کراچی جا کر مشورہ کروں گا کہ انجمن کا صدر مقام کہاں ہو اور ہندوستان اور پاکستان میں کام کس طرح انجام دیا جائے۔

خیر طلب ——— عبدالحق

اس خط سے مسلمانوں کی زبوں حالی پر کیسی تشویش، انجمن کے ملازمین کی حالت پر کس درجہ فکر اور اُردو کی پامالی پر کیسی حسرت ٹپکتی ہے۔ مولوی صاحب نے پاکستان آکر مہاجر مسلمانوں کے ساتھ، انجمن کے ملازمین کے ساتھ اور اُردو کے ساتھ جو کچھ کیا ہے اس کو کچھ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنہیں بابائے اُردو اور ان کے کاموں سے دلچسپی رہی ہے ——— جو ان کے قریب رہے ہیں جنھوں نے ان کو مدد کرتے ہوئے دیکھا ہے اور اس سلسلے میں ان کی دردمندی کی باتیں سنی ہیں ——— اور جن کے سامنے وہ ان حالات پر آنسو بہاتے ہوئے نظر آئے ہیں۔

اس سے ایسا [illegible] میں جو درحقیقت انسان دوستی اور انسانیت پرستی کا جذبہ ہے جو ان کی شخصیت میں ہمیشہ سے نمایاں رہا ہے۔

ان کی شخصیت میں انسان دوستی اور انسانیت پرستی کے ان پہلوؤں کے علاوہ ایک اور پہلو بھی ہے ——— وہ یہ کہ انھیں انسان، اس کے معاملات، اس کے [illegible] اس کے جذبات و احساسات، اس کی واردات و کیفیات سب سے گہری دلچسپی ہے اور وہ اس سلسلے کے تمام مسائل [illegible] [illegible] بات کو [illegible] اس لئے وہ انسان کو فرشتہ نہیں سمجھتے۔ اس کو انسان ہی کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ [illegible] انسان کی [illegible] ان باتوں کی اہمیت کا احساس جو اس کی زندگی میں رنگ بھرتی ہیں، انھیں ہمیشہ رہتا ہے۔

میں ایک دن ان سے جدید ادب کے بعض رجحانات پر گفتگو کر رہا تھا۔ اس سلسلے میں میں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ ادب میں آج کل حقیقت پسندی کے رجحان کے ساتھ ساتھ زندگی سے فرار یا ایک جذباتی رومانی رجحان بھی پیدا ہو رہا ہے وہ ہمارے ادب کے لئے مناسب نہیں ہے۔ [illegible] ——— اس سے لوگوں میں ذہنی تعیش پیدا ہوتا ہے اور [illegible] آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ زندگی عمل کا نام ہے [illegible] ادب اور زندگی دونوں میں اس وقت صرف زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کی ترجمانی ہی ہونی چاہیئے [illegible] ——— اسی طرح کی باتیں میں دیر تک ان کے سامنے کرتا رہا ——— اور وہ نہایت غور سے سنتے رہے۔

جب میں ختم کر چکا تو بولے ——— "پھر تمہارا کیا مطلب ہے؟ ——— کیا تم یہ چاہتے ہو کہ زندگی میں کوئی دلکشی باقی نہ رہے؟"

میں نے جواب دیا ——— "میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ رومان کی طرف آج جو رجحان بڑھ رہا ہے، اس کا زور کم ہونا چاہیئے۔"

انھوں نے کہا ——— "تمہارا یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ زندگی میں رومان اور فرار کی بڑی اہمیت ہے ——— یہ رومان اور فرار نہ ہو تو انسان زندہ نہیں رہ سکتا ——— اس رومان و فرار سے زندگی میں رس پیدا ہوتا ہے۔ رعنائی وجود میں آتی ہے۔ انسان کو زندہ رہنے کے لئے کچھ سہارے ملتے ہیں۔ یہ باتیں نہ ہوں تو انسانی زندگی قبرستان بن جائے۔"

اور ان کی یہ گفتگو سن کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میں تو یہ سمجھتا تھا کہ اس معاملے میں وہ میرے ہمنوا ہوں گے کیونکہ ان کا سن اور ان کی زندگی کا عام انداز اسی کا تقاضا کرتا ہے۔ لیکن انھوں نے میرے خیال سے اختلاف کیا کیونکہ انھیں انسانی زندگی میں رومان اور فرار کی اہمیت کا صحیح اندازہ تھا۔ تجربے نے یہ بات ان کے ذہن نشین کر دی تھی کہ انسان ہمیشہ اور ہر حال میں ایک زاہد خشک نہیں ہو سکتا۔ اس کو زندہ رہنے اور زندگی کو بسر کرنے کے لئے کچھ اور چیزوں کی بھی ضرورت ہے۔ رومان اور فرار کے ہاتھوں یہ چیزیں فراہم ہوتی ہیں۔

بابائے اُردو ہی ایسی اہم باتیں کر سکتے ہیں۔ کیونکہ انھوں نے انسان اور اس کی ذہنی و جذباتی کیفیت کو پوری طرح سمجھا ہے۔ اور اس سلسلے کے بنیادی حقائق کو صحیح طور پر ایک انسان کی طرح محسوس کرنے کی کوشش کی ہے ——— ان حقائق کی اہمیت کو وہ کبھی بھی نظر انداز نہیں کرتے۔

اگرچہ انھیں خود ان میں سے بیشتر حقائق کا عملی تجربہ نہیں ہے کیونکہ انھوں نے بعض مخصوص حالات کے سائے میں زندگی بسر کی ہے اور وہ ایک ایسے ماحول میں رہے ہیں جہاں ان حقائق سے دوچار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ اس کی اہمیت کو نہیں سمجھتے۔ اسی میں تو ان کی بڑائی ہے کہ انھوں نے اس کے باوجود ان حقائق کا شعور اپنے اندر پیدا کیا۔ اور اس کی روشنی میں انسانی معاملات کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے۔ اسی لئے تو ان کے یہاں ان معاملات کو سمجھنے میں ایک صحت مندی کا احساس ہوتا ہے۔

ویسے یہ ایک عام بات ان کے بارے میں مشہور ہے کہ ان کے مزاج میں ایک طرح کی مثالیت اور تصور پرستی ہے۔ اور یہ مثالیت اور تصور پرستی بعض اعتبارات سے ایک غیر متوازن زندگی بسر کرنے کے باعث کبھی کبھی انسان کی جذباتی زندگی کے بنیادی حقائق کو سمجھنے کی راہ میں حائل بھی ہوتی ہے ۔۔۔۔ اور یہ بات کسی حد تک صحیح بھی ہے۔ لیکن یہ صورت حال ہمیشہ اس وقت پیدا ہوتی ہے جب انسان کے نجی مسائل کسی ایسے انفرادی یا اجتماعی کام میں حائل ہوں جو کسی بڑے نصب العین کو سامنے رکھ کر کیا جائے ۔۔۔۔ ایسی صورت میں وہ یہ [illegible] جانتے ہیں کہ کسی کی بیوی بیمار بھی ہوسکتی ہے۔ کسی کا بچہ مر بھی سکتا ہے۔ ۔۔۔ کسی کی کچھ خاندانی الجھنیں بھی ہو سکتی ہیں ۔۔۔۔ کسی کو روپے کی ضرورت بھی پیش آسکتی ہے۔ ایسے مواقع پر وہ برہم ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ برہمی ہمیشہ وقتی ہوتی ہے ۔۔۔ یعنی صرف اس وقت تک ۔۔۔ جب تک انھیں یہ احساس رہتا ہے کہ ان میں سے کوئی بات کسی خاص موقع پر ان کے کام کی راہوں میں رکاوٹ بن رہی ہے ۔۔۔۔

میں نے خود انھیں کئی بار اس طرح برہم ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔

دلی میں ایک دن میں [illegible] ان کے پاس پہنچا تو کسی بات پر بہت بگڑے بیٹھے ہیں ۔۔۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے ۔۔۔ "بڑے ہی نالائق ہوتے ہیں یہ لوگ ۔۔۔۔ شادی کر لیتے ہیں۔ پھر کبھی بیوی بیمار ہے کبھی بچہ بیمار ہے کبھی کوئی مر رہا ہے، کبھی کوئی زندہ ہو رہا ہے ۔۔۔ [illegible] کہ یہ باتیں سب کاموں کو کس قدر خراب کرتی ہیں" ۔۔۔

میں خاموش ہو کر سنتا رہا۔ پھر میں نے پوچھا ۔۔۔۔۔۔ "مولوی صاحب کیا بات ہوئی؟"

کہنے لگے "بات کیا ہوتی ۔۔۔۔ وہ نالائق دو دن سے غائب ہے ۔۔۔ کہہ گیا ہے کہ میری بیوی بیمار ہو گئی ہے ۔۔۔ [illegible] بیمار ہونے کے [illegible] کاغذات اپنے پاس کہیں رکھ کے چلا گیا ہے۔ آج کل یونیورسٹی میں اصطلاحات کے سلسلے میں ایک کام جاری ہے۔ میں نے اس سلسلے میں ان تمام کاغذات کی [illegible] تیار کر کے دیئے تھے۔"

میں نے کہا "مولوی صاحب آپ فکر نہ کیجئے [illegible] ان کاغذات کی ایک نقل میرے پاس موجود ہے۔ [illegible]"

بس ان کا سارا غصہ ہی ختم ہو گیا۔

کہنے لگے ۔۔۔ "اس کی بیوی کی علالت کی خبر سن کر میں نے خود اسے چھٹی دی تھی۔ اور یہ کہا تھا کہ چند روز کے لئے جا کر اس کے علاج کا انتظام کرے۔ آخر یہ کام بھی تو ضروری ہے۔ گھر کا خیال اور گھر والوں کی دیکھ بھال کو انسان کس طرح نظر انداز کرسکتا ہے؟" ۔۔۔

مجھے ہنسی آگئی لیکن میں نے ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے کہا ۔۔۔۔ "جی ہاں مولوی صاحب درست ہے"۔ ۔۔۔

ہنسی اس بات پر آئی کہ ابھی تو وہ اتنے غصے میں تھے لیکن جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ کاغذات مل جائیں گے اور ان کا کام نکل جائے گا تو پھر اسی شخص کے بارے میں ایسی ہمدردانہ باتیں کرنے لگے جس پر اس سے قبل بری طرح برس رہے تھے۔ اور یہ خیال بھر ان پر چھا گیا کہ انسان بہرحال انسان ہے ۔۔۔۔ اسے اپنے فرائض کو پورا کرنا چاہیئے۔ اور اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ انسانی زندگی کے ان حقائق کو نظر انداز نہیں کرتے۔ کبھی اگر ایسا ہو بھی جاتا ہے تو اس کے پیچھے کوئی وقتی الجھن ہوتی ہے ۔۔۔۔ اسی لئے اس سلسلے میں ان کا یہ غصہ بھی دیرپا نہیں ہوتا۔ اس کی نوعیت بھی وقتی ہوتی ہے۔

ان کی انسان دوستی اور انسانیت پر اس سے حرف نہیں آتا۔ کیونکہ وہ تو ان کے مزاج کا لازمی جزو ہے، ان کی طبیعت کا بنیادی حصہ ہے۔ اسے وہ ایک عقیدہ بھی سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک وہ ایک اصول بھی ہے اور ایک نصب العین بھی!

وہ کٹر قسم کے مذہبی آدمی نہیں ہیں۔ لیکن مذہب سے انہیں گہری دلچسپی ہے۔ کیونکہ مذہب کو وہ انسان دوستی اور انسانیت سے الگ نہیں کرتے۔ ان دونوں کے درمیان خط کھینچنا ان کے خیال میں ناممکن ہے۔ وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ مذہب نے ہر دور میں انسانیت کی بہتری کو پیش نظر رکھا ہے۔ ہر زمانے میں اس نے زندگی کو کچھ قدریں دی ہیں، اس کے لئے کچھ اصول وضع کئے ہیں، کچھ معیار قائم کئے ہیں۔ اور اس طرح انسانیت کو ہر اعتبار سے نکھارا اور سنوارا ہے۔ لیکن اس بات کا بھی انہیں شدید احساس ہے کہ ہر زمانے میں لوگوں نے مذہب کی تجارت بھی کی ہے۔ اس سے غلط قسم کے کام بھی لئے ہیں۔ اس کو ذاتی مفاد کے لئے استعمال بھی کیا ہے ـــــ اور اس طرح مذہب کے ان سوداگروں نے انسانی زندگی کے لئے خاصے ہنگامے بھی کھڑے کئے ہیں۔ اسی لئے وہ مذہب کے ٹھیکیداروں سے گھبراتے ہیں۔ ملاؤں سے انہیں الجھن ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ مذہب کا ایک محدود سا تصور پیش کرتے ہیں۔ تنگ نظری ان کے مزاج کا جزو ہوتی ہے۔ عقل کے دروازے وہ اپنے اوپر بند کر لیتے ہیں اور ان کے دماغ کے دریچوں میں کبھی روشنی کا گزر نہیں ہوتا ـــــ اس لئے جس مذہب سے بابائے اردو کو دلچسپی نہیں وہ دراصل ایسے ہی تنگ نظر لوگوں کا مذہب ہے ـــــ سرسید کی عقلیت کا ان پر گہرا اثر ہے ـــــ اور جو کچھ سرسید سوچتے تھے وہی بابائے اردو بھی سوچتے ہیں ـــــ ان کا اسلام دراصل سرسید کا اسلام ہے۔

مولوی صاحب ایسے لوگوں کے سخت خلاف ہیں جو مذہب کو ذاتی نمائش کا ذریعہ بناتے ہیں۔ مذہب کے توسّط سے زندگی میں ایک وقار حاصل کرنا بہت لوگوں کا شعار رہا ہے ـــــ انہیں یہ بات سخت ناپسند ہے۔ ان کے خیال میں تو ہر شخص کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہیئے۔ مذہب کی ایسی مقدس چیز کو اس کے لئے استعمال کرنا جرم ہے۔ چنانچہ وہ ایسے لوگوں سے نفرت کرتے ہیں جنہوں نے مذہب کو اپنی شہرت کا ذریعہ بنایا۔ کیونکہ ان کے خیال میں مذہب کی صحیح اسپرٹ تو اس وقت ختم ہو جاتی ہے جس وقت انسان کے ذہن میں مذہب کو اس طرح استعمال کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ ان لوگوں کے نماز روزے کو مستحسن نہیں خیال کرتے جو ان کو اپنی نمائش کے لئے استعمال کرتے ہیں یا جن کے اندر نماز روزے کے فرائض کو انجام دینے کے بعد دوسروں کے مقابلے میں خواہ مخواہ ایک برتری کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اور جو اس احساس برتری میں آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔

مذہب کی آڑ لے کر جو لوگ تنگ نظری کا مظاہرہ کرتے ہیں ان کے تو وہ جانی دشمن ہیں۔ کسی قسم کی فرقہ پرستی یا طبقاتی منافرت کو تو وہ برداشت کر ہی نہیں سکتے۔ ملاؤں کے وہ اسی وجہ سے خلاف ہیں۔ اور مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان جو برد آزمائیاں ہوتی رہی ہیں وہ انہیں مضحکہ خیز سمجھتے ہیں خصوصاً مسلمانوں کے دو بڑے فرقوں سنیوں اور شیعوں کے درمیان جو اختلافات رہے ہیں اور مختلف زمانوں میں ان اختلافات نے جو عجیب و غریب صورتیں اختیار کی ہیں ان کی مضحکہ خیزیوں کا جب کبھی ذکر آ جائے تو ان کی طبیعت رواں ہو جاتی ہے ـــــ اس موضوع پر ایسی دلچسپ باتیں کرتے ہیں کہ لطف آ جاتا ہے۔

ایک زمانے میں لکھنؤ میں تبرّہ کا ایجی ٹیشن شروع ہوا۔ اس کی عجیب و غریب رودادیں اخبارات میں شائع ہوئیں۔ لوگوں کو حیرت ہوئی۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تبرّہ ایجی ٹیشن کی صورت بھی اختیار کر سکتا ہے ـــــ لیکن بہر حال اس نے ایجی ٹیشن کی صورت اختیار کی۔ اور وہ ایک زمانے تک موضوع بحث بنا رہا ـــــ مولوی صاحب سے ایک دن اسی موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی۔ دوران گفتگو میں وہ کہنے لگے ـــــ "میں ایک دن میں اس تبرّہ ایجی ٹیشن کو بند کرا سکتا ہوں۔"

میں نے کہا ـــــ "کس طرح؟"

کہنے لگے ـــــ "سنیوں کو ذرا ہمّت سے کام لینا پڑے گا"

میں نے کہا ـــــ "مولوی صاحب لکھنؤ میں تو خاصا ہنگامہ ہے۔ کچھ فسادات بھی ہوئے ہیں"

کہنے لگے ——— "فسادات سے کچھ نہیں ہوگا ——— میں تمہیں ایک واقعہ سُناتا ہوں۔ بس کوئی ایسی ہی صورت پیدا کرنے سے یہ سلسلہ ختم ہوسکتا ہے۔"

میں ہمہ تن گوش ہوگیا اور وُہ ہنس ہنس کر یہ واقعہ اپنے دلچسپ انداز میں بیان کرنے لگے۔

"حیدر آباد میں ایک دفعہ سنی شیعوں میں تعلقات بہت کشیدہ ہوگئے۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ بعض محلّوں میں دیواروں تک پہ تبرّہ لکھا جانے لگا۔ سنی مسلمان یہ دیکھ کر بہت پریشان ہوئے۔ میں جہاں رہتا تھا اس محلّے میں پانی کے نل کی دیوار پر کوئی روزانہ رات کو تبرہ لکھ جاتا تھا۔ میں نے خود دیکھا کوئلے سے کوئی شخص ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ اور عثمان غنیؓ کے نام لکھ کر بہت بڑا سا "لعنت" کا لفظ لکھ دیتا تھا۔ صبح کو جو بیچارے اس نل کی دیوار پہ پانی بھرنے آتے تھے وہ سخت چیں بہ جبیں ہوتے تھے لیکن ان کی کچھ پیش نہ جاتی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں۔ محلے کے لوگ میرے پاس بھی آئے۔ اور ساری روداد بیان کی۔ میں نے یہ ساری روداد سُن کر اُن سے کہا کہ تم لوگ تو اپنی تمام کوششیں کر کے ہار چکے ہو۔ اب مجھ پر چھوڑ دو۔ پرسوں سے تم اس نل کی دیوار پر تبرہ لکھا ہُوا نہیں پاؤ گے۔ ——— وہ لوگ میرے اس دعوے پر بہت حیران ہوئے لیکن ڈوبتے کو تنکے کا سہارا، خوش خوش واپس چلے گئے اور بے چینی کے ساتھ آنے والے پرسوں کے دن کا انتظار کرنے لگے۔ میں صبح کو منہ اندھیرے ٹہلنے کے لئے نکلتا تھا۔ ——— دوسرے دن اُدھر سے گذرا تو وہی تین ناموں کے بعد لعنت کا بڑا سا لفظ لکھا ہُوا تھا ——— میں نے کوئلہ اٹھا کر چوتھا نام حضرت علیؓ کا لکھ دیا۔ ——— جب لوگوں نے دن میں آکر یہ دیکھا تو اور بھی پریشان ہوئے۔ میرے پاس آئے اور کہنے لگے "صاحب! آج تو کوئی چاروں پہ تبرّہ لکھ گیا ہے۔" میں نے کہا اس کا عذاب و ثواب میری گردن پہ۔ آج اسے یونہی لکھا رہنے دو۔ کل سے کوئی نہیں لکھے گا ——— زندگی بھر تو چاروں ساتھ رہے۔ اب آخر وقت میں یہ کس طرح جدا ہوسکتے ہیں ——— لوگ چلے گئے ——— دوسرے دن سے وہاں تبرہ نہیں لکھا گیا۔"

یہ سُن کر میں زور سے ہنسا۔ اور میں نے کہا "مولوی صاحب واقعی یہ نسخہ تیر بہدف ہے۔"

جیسا کہ اس واقعہ سے ظاہر ہے اُن کی کسی مذہبی عصبیت کو اس میں دخل نہیں ہے ——— یہ واقعہ تو اس مضحکہ خیز غیر مذہبی حرکت کا ایک دلچسپ جواب ہے۔ جس نے لوگوں کو خواہ مخواہ پریشان کر رکھا تھا۔

اس سے بحث نہیں کہ یہ بات صحیح تھی یا غلط ——— دیکھنے کی بات تو یہ ہے کہ اس واقعے سے اُن کی شخصیت کا ایک بہت ہی دلچسپ پہلو سامنے آتا ہے۔

اِس میں شک نہیں کہ بابائے اُردو ملّاؤں کی طرح مذہبی آدمی نہیں ہیں لیکن ویسے اسلام کو وُہ دُنیا کا سب سے زیادہ عقلی مذہب سمجھتے ہیں۔ اور اس کا جو درد ان کے دل میں ہے اس کا اندازہ کچھ ان سے گفتگو کرنے کے بعد ہی ہوسکتا ہے۔

اسلام اور مسلمانوں کے معاملات پر میں نے ان سے بارہا گفتگو کی ہے ——— اور اس سلسلے میں بے شمار باتیں ہوئی ہیں۔ ایک دن دورانِ گفتگو میں کہنے لگے ——— "مسلمان ہر حال میں مسلمان ہوتا ہے۔ جب بھی وہ اپنے مذہب سے متعلق کسی چیز کو کس مپرسی کے عالم میں دیکھتا ہے تو اس کے جذبۂ اسلامی میں ایسی تحریک پیدا ہوتی ہے جس کا عام حالات میں وہ تصوّر بھی نہیں کرسکتا۔"

پھر مجھے اپنا ایک واقعہ سُنایا۔

کہنے لگے ——— "میں ایک دفعہ چند احباب کے ساتھ جنوبی ہند کے ایک ایسے دُور دراز علاقے میں گیا جہاں اب مسلمان نام کو بھی باقی نہیں ہیں لیکن میں نے وہاں دیکھا کہ ایک پہاڑی پر نہایت ہی پرانی ویران سی مسجد ہے۔ اس مسجد سے یہ اندازہ ہُوا کہ یہاں کسی زمانے میں مسلمان ضرور موجود تھے لیکن زمانے نے ان کا نشان باقی نہ رکھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا مسلمانوں کی یہ مسجد نہ جانے کب سے ویران پڑی ہے۔ یہاں ہمیں اذانیں دینے کی ضرورت ہے۔ آباد مسجدوں میں تو سب ہی اذانیں دیتے ہیں۔ اذان یہاں دینی چاہیئے ——— چنانچہ ہم نے اس مسجد میں خوب اذانیں دیں ——— خوب نمازیں

پڑھیں ——— اور اس طرح کئی دن گزارنے کے بعد ہم وہاں سے رخصت ہوئے۔"

"میرے منہ سے معاً نکلا ——— "مولوی صاحب! آپ نے اپنی بخشش کا سامان کر لیا۔"

اور پھر مجھ پر نہ جانے کیوں گہری سنجیدگی طاری ہو گئی۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے ——— اور مولوی صاحب بھی خدا جانے کن خیالات میں گم ہو گئے۔

دیر تک سکوت کا عالم رہا!۔

مولوی صاحب کو میں نے دیکھا ہے، جب بھی پیغمبروں اور مذہبی رہنماؤں کا ذکر آئے تو وہ ایسی رسمی باتیں نہیں کرتے جن میں عام طور پر عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے ان کی زندگی کے ایسے پہلوؤں کی وضاحت کرتے ہیں جن کی نوعیت انسانی ہوتی ہے۔ اور آنحضرتؐ کے ذکر میں تو خاص طور پر یہ پہلو ان کے پیش نظر رہتا ہے ——— کیونکہ وہ انھیں سب سے کامل اور سب سے عظیم انسان سمجھتے ہیں۔

چند سال ہوئے ایک امریکی خاتون نے "AYESH THE BELOVED OF MOHAMMED" کے نام سے ایک بڑی زہریلی کتاب لکھی۔ یہ کتاب اتفاق سے ان کے ہاتھ آ گئی۔ اس کتاب کو پڑھ کر ——— [illegible] ——— کتاب یوں تو اسلام کے خلاف تعصب کے زیر اثر لکھی ہے، لیکن اس کی اپنی [illegible] مضمون سے [illegible] کوئی [illegible] نہیں ہیں۔ کتاب ختم کرنے کے بعد میں نے مولوی صاحب کو بھی وہ کتاب دی اور درخواست کی کہ آپ بھی ذرا اس کو پڑھئے۔ مجھے [illegible] ——— چنانچہ انھوں نے بھی وہ کتاب پڑھ ڈالی ——— میں نے جب رائے پوچھی تو کہنے لگے ——— اس نے باتیں تو سب تعصب سے لکھی ہیں لیکن [illegible] اس میں [illegible] دشمنی کے علاوہ اس کی اپنی ذاتی دلچسپی بھی شامل ہیں۔ ورنہ [illegible] انھوں نے آنحضرتؐ کی عظمت [illegible] انسانیت نے آپ کو نمایاں کر دی ہے ——— [illegible] اور انسانی زندگی سے انھیں کتنی گہری دلچسپی تھی ——— اور کس قدر خوش [illegible] ——— [illegible] باتوں کو اس نے [illegible] حضرت عائشہؓ اور آنحضرتؐ کے بارے میں کوئی معقول بات کہہ گئی ہے۔"

[illegible] مذہب [illegible] انسانی زندگی [illegible] بلکہ دونوں کو ایک دوسرے کا جزو سمجھتے ہیں ——— یہی وجہ ہے کہ مذہب میں انھیں انسانیت نظر آتی ہے اور انسانیت میں مذہب!

اور مذہب نے اسی نقطۂ نظر کو [illegible] تہذیب و ثقافت کے باہمی تعلق سے گہری دلچسپی رہی ہے۔ مذہب ان کے خیال میں ایک بہت بڑی طاقت ہے اور اس طاقت کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے دوسری طاقتوں کے ساتھ ساتھ تہذیب و ثقافت کی تشکیل و تعمیر میں نمایاں حصہ لیا ہے ——— اس لئے انسانی زندگی میں تہذیب و ثقافت کو وہ بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ ان کی ہر بات کی تان ہمیشہ اسی موضوع پر ٹوٹتی ہے۔ ان کا خاص میدان یہی ہے ——— اور زبان کے معاملات سے تو انھیں اتنا گہرا لگاؤ ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ زبان ہمیشہ تہذیب و ثقافت کی بنیاد ہوتی ہے۔ اسی لئے زبان کے معاملات و مسائل کو انسانی زندگی میں وہ بڑی اہمیت دیتے ہیں اور اردو زبان کے لئے انھوں نے جو اپنی ساری زندگی وقف کر دی اس کا بنیادی سبب بھی یہی ہے۔

اُردو ان کی دُنیا ہے، اُردو ان کی زندگی ہے، اُردو ان کا نصب العین ہے، اُردو ان کا نظریۂ حیات ہے۔ اُردو ان کا مزاج ہے، اُردو ان کی طبیعت ہے ——— غرض وہ اُردو کے سوا اور کچھ نہیں ہیں۔ اُردو کو اُن کی شخصیت سے یا ان کی شخصیت کو اُردو سے الگ کر لیا جائے تو ہر صورت میں دونوں کے وجود کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے ——— میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اگر بابائے اُردو نہ ہوتے اور اُردو سے انھیں یہ والہانہ وابستگی اور مجنونانہ شیفتگی نہ ہوتی تو کیا واقعی موجودہ دور میں اُردو کو وہ مرتبہ حاصل ہوتا جو آج بہت سی زبانوں کے لئے باعث رشک ہے ——— انھوں نے

اُردو کو اس کی اہمیت کا احساس دلایا، اس کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سکھایا۔ زندگی کی راہوں پہ دوڑایا، اس کے بازوؤں میں حریفوں سے مقابلے کی سکت پیدا کی۔ اور اس نے بڑے بڑوں کے دانت کھٹے کر دیئے ——— اُردو کی تاریخ مخالفت کی تاریخ ہے، کشمکش کی تاریخ ہے، ہنگاموں کی تاریخ ہے ——— بابائے اُردو کی ذات نہ ہوتی تو اُردو کے لئے آزمائش کی ان منزلوں سے گزرنا آسان نہ ہوتا۔ ان معرکوں میں وہ کام آجاتی ——— اور آج کوئی اس کا نام بھی نہ لیتا۔

بابائے اُردو نے جس وقت اُردو زبان کو ایک تحریک کی صورت دی، اس وقت کسی کے خیال و گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ زبان کے لئے کچھ کیا بھی جا سکتا ہے۔ اس کے لئے کوئی تحریک بھی چلائی جا سکتی ہے ——— اس کو ارتقا کی راہوں پر گامزن کرنے کے لئے کوئی عملی قدم بھی اُٹھایا جا سکتا ہے۔ زبان تو صرف بولنے کی چیز سمجھی جاتی تھی۔ بابائے اُردو نے اس بات کا احساس دلایا کہ زبان کو اگر سہارا نہ دیا جائے، اس کے لئے کوئی عملی قدم نہ اُٹھایا جائے تو وہ خاطر خواہ ترقی نہیں کر سکتی۔ چنانچہ زبان کے لئے کچھ کرنے کا شعور عام ہوا۔ اُردو کے منت پذیر [illegible] [illegible] اسی طرح اس تحریک کا آغاز ہوا۔ بابائے اُردو نے اس تحریک کی رہنمائی کی۔ لوگوں نے اس سلسلے میں ان کو اپنا قائد مانا۔ [illegible] بڑے بڑے میدان [illegible] انھیں بابائے اُردو کے [illegible]

[illegible] ملتا ہے ——— دیکھنے والا تو صرف [illegible] لغات [illegible] [illegible] ——— [illegible] سارى زندگی [illegible] ——— ایک زمانہ وہ تھا جب مغرب زدہ لوگ اُردو ادب کو حقارت کی نظر سے دیکھتے [illegible] ——— بابائے اُردو نے اس تاریکی میں شوق اور ولولے کی شمعیں فروزاں کیں اور دیکھتے دیکھتے لوگ اُردو ادب کے [illegible] ہو گئے ——— [illegible] سب سے بڑا کام یہ کیا کہ اُردو زبان کی حیثیت منوانے کے لئے اُردو کے دشمنوں سے ٹکر لی۔ اور ان کے [illegible] ——— اور آج نصف صدی کی اسی مسلسل جد و جہد اور مستقل کاوش کا یہ اثر ہے کہ اُردو زبان کسی زبان سے [illegible] اور اس کا ادب کسی زبان کے ادب کے مقابلے میں بھی رکھا جا سکتا ہے۔

میں نے انھیں ہر حال میں اُردو کا [illegible] اور اس کی ترقی کے منصوبے بناتے دیکھا ہے ——— طبیعت ہو، پریشانی ہو، راحت ہو، آرام ہو، کوئی فساد ہو جائے، کوئی ہنگامہ ہو جائے ——— وہ [illegible] کے بارے میں سوچیں گے۔ بابائے اُردو پر [illegible] اُردو کی ترقی کے لئے ان کے سامنے کوئی نیا منصوبہ یا کوئی نئی بات کہہ دیجئے وہ خوش ہو جائیں گے۔ اور ان کی طبیعت بحال ہو جائے گی۔ جب بھی میں ان کی شخصیت کے اس پہلو پر غور کرتا ہوں تو مجھے اس یورپین پروفیسر کی یاد آتی ہے جو جنگ کے زمانے کی ایک رات کو جب شہر پر بم برس رہے تھے اپنے ایک شاگرد کو ٹیلی فون کر کے ایک لفظ کی اصلیت دریافت کر رہا تھا ——— بم اس کی راہ میں حائل نہیں ہوئے تھے۔ موت کے خوف نے اس کو اپنے کام سے غافل نہیں کیا تھا ——— بابائے اُردو کا بھی یہی حال ہے ——— دلی میں قتل عام ہو رہا ہے ——— وہ لوگوں کی زبوں حالی پر خون کے آنسو بہا رہے ہیں۔ انھیں اس کا بڑا غم ہے۔ خطوں میں اس غم کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ لیکن اُردو کے خیال کو اس موقع پر بھی دل سے نہیں نکالتے ——— اور آخر میں لکھ ہی دیتے ہیں:

"میں نے ایک اسکیم پاکستان میں اُردو کی اشاعت کے متعلق تیار کی ہے۔ کراچی میں پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس ہونے والی ہے جس میں پاکستانی وائس چانسلر اور ڈائرکٹران تعلیم خاص طور پر شریک ہوں گے۔ اُن سے گفتگو کر کے صوبوں میں کام کرنے کا پروگرام بناؤں گا۔ اب مجھے نئی دُنیا بنانی ہے۔ ہندوستان سے تو اُردو کو دلیس نکالا مل گیا۔ اب کراچی جا کر مشورہ کروں گا کہ انجمن کا صدر مقام کہاں ہو اور ہندوستان اور پاکستان میں کام کس طرح انجام دیا جائے۔"

دِلّی کی خونچکاں داستان کی تفصیل کے ساتھ جب میں نے بابائے اُردو کے خط میں یہ جملے پڑھے تو مجھ پر وہ کیفیت طاری ہوئی جن کو میں الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر ہوں ——— ان جملوں میں کیسی لگن ہے؟ ——— ان کے ایک ایک لفظ سے کیسا انہماک ٹپکتا ہے؟

اِسی لگن اور انہماک ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ اُنھوں نے اُردو کے لئے صحیح معنوں میں تن من دھن کی بازی لگا دی۔ اپنے آپ کو، اپنی تمام صلاحیتوں کو، اپنے تمام سرمائے کو انھوں نے اُردو پر نچھاور کر دیا۔ انجمن ترقی اُردو، اُردو کی تحریک کی علمبردار تھی۔ چنانچہ انھوں نے اپنی ساری زندگی انجمن کے لئے وقف کر دی۔ شب و روز اسی کے لئے کام کیا ——— جو کچھ کمایا وُہ سب انجمن کو دے دیا۔ ایک پیسہ اپنے پاس نہیں رکھا ——— غالباً ۱۹۴۰ء کے آس پاس کی بات ہے، ساٹھ ہزار روپے کی رقم (غالباً پراویڈنٹ فنڈ) انھیں ملی۔ وہ سب یکمشت انھوں نے انجمن کو دے دی ——— اور "ہماری زبان" میں یہ نوٹ شائع کیا کہ میرا سب کچھ اُردو اور انجمن ترقی اُردو کے لئے ہے۔ میں ایک پیسہ بھی اپنے پاس رکھنا نہیں چاہتا ——— اور خود اگرچہ زندگی بھر انھوں نے انجمن کی خدمت کی لیکن ایک پیسہ کبھی انجمن سے نہیں لیا ——— حیدرآباد سے جو پنشن ملتی تھی اسی میں گزر کرتے تھے ——— اور اگر اُردو کے لئے کسی کو ضرورت ہو تو اس میں سے بھی کچھ نہ کچھ دے ہی دیتے تھے ——— مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں نے دِلّی یونیورسٹی میں اُردو کے شعبے کو بڑی جد و جہد اور ہنگامہ آرائی کے بعد فارسی سے الگ کرایا اور ایک جونیئر لکچرار کے تقرر کی طرف توجہ دلائی تو یونیورسٹی نے مدد دینے سے صاف انکار کر دیا اور یہ جواب دیا کہ یونیورسٹی سائنس کی طرف توجہ کر رہی ہے، اس لئے اُردو کے لئے روپیہ منظور نہیں کر سکتی۔ میں نے بابائے اُردو کو جب صورتِ حال سے مطلع کیا تو کہنے لگے جس اُستاد کا تم تقرر کرانا چاہتے ہو، اگر اس کی تنخواہ یونیورسٹی نہیں دیتی تو فی الحال اس کی ایک سال کی تنخواہ میں دوں گا ——— اور انھوں نے دو ہزار روپے کا چیک بھیج دیا ——— اس طرح دِلّی میں شعبۂ اُردو کی بنیاد پڑی ——— مولوی صاحب کی ذات نہ ہوتی اور وُہ اس طرح کی امداد نہ کرتے تو اُردو کا شعبہ وہاں کبھی بھی قائم نہ ہوتا ——— غرض اُردو کے لئے وُہ سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں ——— ان کے نزدیک روپے کی تو اُردو کے سامنے کوئی اہمیّت ہی نہیں!

ایک صاحب نے ایک دفعہ اُردو کے اس محسنِ اعظم کے بارے میں اس خیال کا اظہار کیا کہ بابائے اُردو سیاسی آدمی ہیں۔ بلکہ انھوں نے ایک سیاست کو پیدا کیا۔ یہ سیاست اُردو زبان کی سیاست ہے۔ اور وہ اس سیاست کے مبصّر اور ماہر ہیں۔ اس میں ان کا کوئی ثانی نہیں ——— یہ خیال ایسا کچھ غلط نہیں ہے۔ بابائے اُردو اس سیاست کے خالق ہیں لیکن یہ سیاست ان کا میدان نہیں ہے۔ ان کا میدان علم و ادب ہے۔ علمی تحقیق اور ادبی تخلیق سے انھیں جو نسبت ہے وُہ اور کسی چیز سے نہیں۔ اس سیاست کو تو انھیں پیدا کرنا پڑا۔ کیونکہ اُردو کی بقا کے لئے اس کی ضرورت تھی۔ لیکن ویسے وُہ بنیادی طور پر علم و ادب کی دُنیا کے انسان ہیں۔ جو مسرّت انھیں پڑھنے لکھنے کے کاموں میں حاصل ہوتی ہے کسی اور کام سے حاصل نہیں ہوتی۔ ان کا بہترین وقت وہی ہوتا ہے جو وہ پڑھنے لکھنے کے کاموں میں صرف کرتے ہیں۔ اکثر انھوں نے مجھ سے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ ان کے شوق کے کام یہی ہیں۔ چنانچہ ان کاموں میں بھی ان کا انہماک دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے ——— میں نے دن دن بھر انھیں لکھنے پڑھنے کے کاموں میں مصروف دیکھا ہے لیکن ان پر کسی کام کی تھکن یا کام سے اُکتاہٹ کے آثار نمایاں نہیں ہوئے ہیں ——— اکثر ایسا ہُوا ہے کہ میں شام کے وقت ان کے پاس پہنچا ہوں۔ اور میں نے انھیں کام کرتے ہوئے پایا ہے۔ اور اس کام میں اتنا منہمک دیکھا ہے کہ میں کمرے میں داخل ہو گیا ہوں لیکن انھیں میرے آنے کی خبر تک نہیں ہوئی ہے۔ میں چُپ چاپ ان کے سامنے بیٹھ گیا ہوں۔ لیکن انھوں نے میری آہٹ تک محسوس نہیں کی ہے۔ پھر لکھتے لکھتے کسی کتاب کی ضرورت ہوئی

ہے تو ان کی نظریں اُٹھی ہیں، اور انھوں نے مجھے دیکھا ہے ـــــ اور معذرت کی ہے۔ لیکن اس معذرت نے ہمیشہ مجھے شرمندہ کیا ہے۔ ایک دن میں شام کو پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بابائے اُردو لوہے کی اس الماری کے سامنے کھڑے ہوئے کچھ پڑھ رہے ہیں جس میں وہ خاص قلمی نسخے رکھتے تھے ـــــ میں کمرے میں داخل ہو گیا۔ لیکن انھوں نے آہٹ محسوس نہیں کی۔ میں نے بھی کچھ نہ کہا اور آدھ گھنٹے تک یونہی کھڑا رہا ـــــ پھر جب بہت اندھیرا ہو گیا تو وہاں سے ہٹے اور مجھے دیکھتے ہی کہا ـــــ " اچھا بھئی آ گئے۔ چلو اندھیرا ہو گیا ہے باہر چل کے بیٹھتے ہیں" ـــــ اور پھر ہم باہر جا کے بیٹھ گئے ہیں ـــــ اور ایک بار نہیں بارہا میں نے انھیں اسی عالم میں دیکھا ہے۔ کتابیں ان کی سب سے بڑی رفیق اور دمساز ہیں۔ وہ بغیر کتابوں کے نہیں رہ سکتے۔ انھیں پڑھنے کا جنون ہے ـــــ مختلف اور متنوع موضوعات پر ایسا باخبر اور ہوشمند پڑھنے والا کوئی اور میری نظر سے نہیں گزرا ـــــ ان کی ساری زندگی پڑھنے اور پڑھنے کے لئے کتابیں جمع کرتے ہوئے گزر گئی۔ کیسی کیسی کوششوں سے انھوں نے کیسی کیسی نایاب کتابیں جمع کیں ـــــ اس کا اندازہ اس وقت ہوتا تھا جب کبھی کسی کام سے وہ اپنے خاص کتب خانے میں جاتے تھے ـــــ ایک الماری کھولی ـــــ اس میں سے کوئی کتاب نکالی۔ اور اس کے ساتھ کئی اور کتابیں نکال لیں ـــــ اب ایک ایک کو اُٹھاتے جاتے ہیں۔ اور کہتے جاتے ہیں۔ یہ کیسی اہم کتاب ہے۔ اس کے حاصل کرنے کے لئے مجھے فلاں فلاں جگہ کا سفر کرنا پڑا۔ فلاں شخص کے ذریعے اس کتاب تک رسائی ہوئی۔ اس پر اتنی رقم صرف ہوئی ـــــ غرض ہر کتاب کے بارے میں وہ پوری تفصیل بیان کرتے ـــــ اور اس میں شک نہیں کہ اپنے ذاتی کتب خانے میں جو کتابیں انھوں نے جمع کی تھیں، ان میں سے ہر ایک کے حاصل کرنے کی ایک تاریخ تھی ـــــ اور میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ اس تاریخ کو بیان کرنے میں وہ ہمیشہ ایک لذت سی محسوس کرتے تھے۔ تقسیم نے ان کتابوں کو تتر بتر کر دیا۔ اور آج اس سے بڑا غم بابائے اُردو کی زندگی میں اور کوئی نہیں۔

یوں تو تمام علوم سے ان کی دلچسپی مسلّم ہے لیکن ادب سے جو لگاؤ انھیں ہے وہ اور کسی چیز سے نہیں۔ ادب کی بات ہوتی ہے، تو ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے وہ ایک مانوس سی دنیا میں پہنچ گئے ہیں۔ گھنٹوں ادب کے مختلف موضوعات پر بات کرنے سے بھی وہ نہیں تھکتے۔ پھر ان کی ادبی باتوں میں جو تنوع ہوتا ہے وہ انہیں کے ساتھ مخصوص ہے۔ کبھی وہ انگریزی کی تنقید پر گفتگو کریں گے۔ کبھی روس کی ناول نگاری پر، کبھی فرانس کے افسانے پر، کبھی ایران اور عرب کی شاعری پر ـــــ اور اگر اُردو ادب کی بات چھڑ جائے تب تو ایک سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگتا ہے۔ جس پہلو کا ذکر ہوگا اس پر ایسی سیر حاصل گفتگو کریں گے کہ ہر لمحہ سننے والوں کو ایک روشنی کا احساس ہوگا۔ مجھے دورانِ گفتگو میں ان سے اَن گنت نئی باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ اور یہ باتیں سن کر مجھے ہمیشہ یہ احساس ہوا ہے کہ اُن سے بڑا اُردو ادب کا عالم آج تک کوئی پیدا نہیں ہوا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ قدیم ادب اور جدید ادب سے انھیں دلچسپی ہے ـــــ اگرچہ ان کی تحقیق کا میدان قدیم ادب رہا ہے لیکن انھوں نے اُردو ادب کے رجحانات کو دوسرے بزرگوں کی طرح پوچ اور لایعنی سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا ہے۔ وہ ان رجحانات سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں ـــــ اور جب کوئی نیا لکھنے والا ان سے ملتا ہے تو انھیں بڑی مسرت ہوتی ہے۔ اس سے تمام رجحانات پر گفتگو کرتے ہیں۔ یہ پوچھتے ہیں کہ وہ کیا لکھ رہا ہے؟۔ ایک ایک لکھنے والے کے مشاغل کو دریافت کرتے ہیں ـــــ غرض ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تمام لکھنے والوں کا اُن سے قریبی تعلق ہے۔ ایک بھی اُن کے لئے اجنبی نہیں ہے ـــــ نئے سے نئے لکھنے والوں کے مضامین وہ شوق سے پڑھتے ہیں۔ اور ان کے بارے میں ایک رائے رکھتے ہیں ـــــ اور اس رائے میں بڑی ہی ہمدردی، بڑی ہی شفقت اور بڑی ہی محبت ہوتی ہے ـــــ تنگ نظری نام کو نہیں ہوتی ـــــ کبھی کسی نئے لکھنے والے کے خلاف وہ کوئی ایسی بات نہیں کہتے جو تنگ نظری پر مبنی ہو۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے آج سے چند سال قبل ایک صاحبہ نے اُردو میں ذرا عریاں قسم کے افسانے لکھے۔ پرانے لکھنے والوں نے ان افسانوں کو پسند نہیں کیا ـــــ اور اس پر خاصی ہنگامہ آرائی ہوئی ـــــ بابائے اُردو نے بھی یہ افسانے پڑھے۔ اور جب بھی میں نے ان کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے یہی رائے دی کہ ان کے موضوع سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن جس انداز میں یہ افسانے

لکھے گئے ہیں وہ اردو افسانہ نگاری میں ایک اضافہ ہے۔ یہ افسانے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ کیونکہ ان کی بنیاد حقیقت و واقعیت پر استوار ہے۔

بابائے اردو خود ایک عظیم ادیب ہیں لیکن انھیں اپنی عظمت کا احساس نہیں —— اور یہی ان کی عظمت کی دلیل ہے۔ عظیم شخصیت کو اپنی عظمت کا خود احساس نہیں ہوتا۔ دوسرے اس کی عظمت کو محسوس کرتے ہیں۔

مجھے ایسے کئی واقعات معلوم ہیں کہ انھوں نے کسی نئے لکھنے والے کا مضمون پڑھا —— انھیں اچھا معلوم ہوا۔ فوراً اس مضمون کا خط اُسے لکھ دیا کہ تم نے نہایت اعلیٰ درجے کا مضمون لکھا ہے —— مجھے تمہارے انداز پر رشک آتا ہے۔ تم نے ایک نیا انداز پیدا کیا ہے۔ مجھے تو تم لوگوں کے سامنے اپنی بے بضاعتی اور کم مائگی کا احساس ہوتا ہے۔

بابائے اردو نے جن لوگوں کو اس مضمون کا خط لکھا تھا اُن میں سے ایک صاحب نے یہ خط اپنی بڑائی کو ظاہر کرنے کے لئے بیسیوں لوگوں کو دکھایا اس طرح مجھے بھی اس کا علم ہو گیا۔

بہرحال بابائے اردو کی عظمت اس واقعے سے ظاہر ہوتی ہے۔

ایک دن میں نے ان سے پوچھا —— "مولوی صاحب! آپ کو ایسے اعلیٰ درجے کے ادبی کام کی تحریک کس طرح ہوئی؟"

کہنے لگے —— "میں نے کام ہی کونسا کیا ہے؟"

میں نے کہا "مولوی صاحب! میں صرف اس خیال سے یہ سوال پوچھ رہا ہوں تاکہ مجھے بھی کام کرنے کا گر معلوم ہو جائے۔"

کہنے لگے "جو تھوڑا بہت کام میں نے کیا ہے، جب بھی اس کو دیکھتا ہوں تو اپنی خامیاں زیادہ نظر آتی ہیں۔ کبھی مجھے یہ خیال نہیں ہوتا کہ میں نے کوئی مکمل کام کیا ہے —— اور جو کچھ کیا ہے اس کے بارے میں آج تک میں یہ نہ سمجھ سکا کہ یہ کس طرح ہوا ہے؟ —— کام کرنے کا شوق مجھے ضرور تھا۔ دھن بھی ضرور تھی —— سو یہ دونوں باتیں اب بھی موجود ہیں —— لیکن ان سے کیا ہوتا ہے۔"

میں نے جب بھی یہ باتیں سنی ہیں میں ایک گہری سوچ میں گم ہو گیا ہوں —— اور یہ خیال مجھ پر چھا گیا ہے کہ ایک عظیم شخصیت ہی اس طرح کی باتیں کر سکتی ہے۔ عجز و انکسار عظیم شخصیت کے مزاج کا خاصہ ہوتا ہے۔ سو یہ بابائے اُردو کی شخصیت میں بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ انھیں اپنی بڑائی کا ذرا بھی احساس نہیں۔ جو کام انھوں نے کئے ہیں ان کو وہ اپنے لئے باعث فخر و افتخار نہیں سمجھتے —— ان کے خیال میں وہ مکمل نہیں ہیں۔ اپنی تعریف و توصیف سے انھیں بڑی اُلجھن ہوتی ہے —— اور یہ تمام باتیں ان کی عظمت پر دلالت کرتی ہیں۔

بابائے اُردو نے جو ادبی کام کیا ہے اس میں تحقیق کا پلہ بھاری ہے۔ تحقیق ان کے مزاج میں داخل ہے۔ وہ ان کی طبیعت کا بنیادی جزو ہے۔ لیکن اُن کی تحقیق ان لوگوں کی تحقیق نہیں ہے جو صرف حاشیے لکھنے اور حوالے دینے کو تحقیق سمجھتے ہیں اور خواہ مخواہ حاشیے لکھ کر اور حوالے دے کر محققین کی فہرست میں اپنا نام لکھوانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی تحقیق حاشیے لکھنے اور حوالے دینے کا نام نہیں ہے —— وہ صحیح معنوں میں تحقیق ہے —— نئی باتوں کو معلوم کرنے کی خواہش اس کو پیدا کرتی ہے۔ چھان بین کا صحیح جذبہ اس کو وجود میں لاتا ہے —— اسی لئے اس میں زندگی محسوس ہوتی ہے —— انھوں نے تحقیق کو تخلیق سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔ اسی لئے اس میں ایک ادبی شان اور تنقیدی آن نظر آتی ہے۔ بابائے اُردو بیک وقت محقق بھی ہیں، ادیب بھی اور نقاد بھی!

ان تینوں کا حسین امتزاج بابائے اُردو کی شخصیت کی بڑی نمایاں خصوصیت ہے، اور اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ان کے مزاج میں بلا کی شگفتگی ہے۔ مزاج کی یہ شگفتگی جس سے انھیں زندگی اور ادب کے ان گنت جمالیاتی پہلوؤں کا احساس دلایا ہے دراصل یہ شگفتگی زندگی سے گہری دلچسپی اور اس کے مختلف پہلوؤں سے والہانہ وابستگی کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے۔ وہ ان کی زندگی کا حصہ ہے۔ ان کی کوئی بات بھی اس شگفتگی سے خالی نہیں ہوتی۔ ہر معاملے میں وہ کچھ نہ کچھ شگفتہ پہلو نکال لیتے ہیں —— اُن پر عمر کا کوئی اثر نہیں ہوا ہے۔ آج بھی ان کی طبیعت میں نوجوانوں کی سی شوخی اور شگفتگی نظر

آتی ہے۔ اور اُن کی ایک ایک بات کے زعفران زار ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ خواہ وہ کسی عالم میں ہوں ہمیشہ وہ ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔

یہاں مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آیا۔

دِلّی میں حکومت ہند نے انجمن کو فیروز شاہ روڈ پر عمارت بنانے کے لئے بڑی عمدہ سی زمین الاٹ کی تھی۔ جنگ کے زمانے میں فوج کے محکمے نے اس زمین پر کچھ عارضی قسم کی چھوٹی چھوٹی عمارتیں تعمیر کر لی تھیں۔ ان عمارتوں میں کئی سال تک فوج میں کام کرنے والی عورتوں کا، جن کو اس زمانے میں "ویکائز" (WACIS) کہتے تھے، دفتر اور ہوسٹل رہا۔ اس لئے انجمن کو اس کا قبضہ نہ مل سکا۔ بابائے اردو برابر کوشش کرتے رہے۔ لیکن حکومت نے کوئی توجہ نہیں کی۔ سر کلاڈ آکنلک سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔ ان کی سفارش پر اختتامِ جنگ سے ایک سال قبل اس زمین کے ملنے کا کچھ امکان پیدا ہوگیا۔ حکومت نے اس بات کی کوشش کی کہ فی الحال عمارت کا ایک حصہ انجمن کو دے دیا جائے اور دوسرے حصے میں وقتی طور پر "ویکائز" کا ہوسٹل قائم رہے۔ جو لوگ انجمن سے دلچسپی رکھتے تھے، انھیں اس سے بڑی خوشی ہوئی۔

میں تو جب بھی شام کو اُن کے پاس جاتا تو پہلا سوال یہی کرتا "مولوی صاحب زمین کا کیا ہوا؟"

اور وہ یہی کہہ دیتے — "ابھی کوشش جاری ہے۔"

ایک دن میں شام کو پہنچا تو دیکھا مولوی صاحب خوش خوش بیٹھے ہیں۔ میں نے سوچا آج کوئی خاص بات ضرور ہوئی ہے — مجھے دیکھتے ہی بولے — "آج ایک بڑا دلچسپ خط آیا ہے۔"

میں نے کہا — "زمین کے سلسلے میں ہوگا۔"

کہنے لگے — "ہاں ہے تو زمین ہی کے بارے میں۔ حکومت کی طرف سے آیا ہے۔ لیکن اس کا مضمون بہت ہی دلچسپ ہے۔"

میں نے کہا "مجھے وہ خط ضرور دکھائیے۔"

بابائے اردو نے وہ خط منگوایا۔ وہ ایک عجیب و غریب خط تھا۔ اس کی عبارت یہ تھی کہ حکومت انجمن کو عمارت کا ایک حصہ دینے کے لئے تیار ہے لیکن قبضہ دینے سے قبل یہ جاننا چاہتی ہے کہ انجمن کے عملے میں کوئی نوجوان غیر شادی شدہ تو نہیں ہے — یہ اس لئے دریافت کیا جا رہا ہے کہ "ویکائز" ابھی کچھ عرصے برابر کے حصے میں رہیں گی۔ اگر انجمن کے عملے میں کچھ نوجوان غیر شادی شدہ لوگ ہوئے تو اس کی وجہ سے بعض الجھنیں پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ حکومت اس سے بچنا چاہتی ہے۔

خط پڑھنے کے بعد مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ میں نے کہا "اس کا جواب بھی اتنا ہی دلچسپ ہو سکتا ہے۔"

کہنے لگے "میں نے جواب لکھ دیا ہے۔ اور یہ لکھا ہے کہ میں انجمن کا سکریٹری ہوں۔ میری عمر ۷۸ سال کی ہے لیکن اس عمر میں بھی میں ۲۰ سال کے جوانوں سے بہتر ہوں۔ اگر حکومت "ویکائز" کے لئے مجھے خطرناک نہیں سمجھتی تو زمین کا قبضہ انجمن کو دے دیا جائے۔"

میں زور سے ہنسا۔ اور میں نے کہا — "مولوی صاحب اس سے بہتر جواب اس خط کا نہیں ہو سکتا تھا۔"

وہ بھی ہنسنے لگے۔ اور دیر تک اس موضوع پر دلچسپ باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔

ایسی شگفتہ بات سوائے اُن کے اور کسی کے ذہن میں نہیں آ سکتی!

ایک دن ایک اور دلچسپ بات ہوئی۔ میں بابائے اردو کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ کچھ خواتین آگئیں۔ اور دھرنا دے کے بیٹھ گئیں۔ میں نے یہ سوچا کہ عورتوں کی باتیں ہمیشہ مہمل اور لایعنی ہوتی ہیں اور یہ عورتیں بھی ایسی ہی باتیں کریں گی۔ اس لئے اُن سے اجازت لے کر وہاں سے چلا آیا۔ وہ عورتیں وہاں بیٹھی رہیں۔

دوسرے دن میں اُن کے پاس پہنچا تو کہنے لگے — "بھئی تم تو کل چلے گئے۔ وہ عورتیں میرے لئے کئی گھنٹے درد سر بنی رہیں۔ کہنے لگیں۔

...

صاحب! ہم نے سنا ہے کہ آپ عورتوں سے نفرت کرتے ہیں۔ آج ہم آپ سے اس کا سبب پوچھنے آئی ہیں۔

میں نے کہا —— "سوال تو بڑا دلچسپ تھا۔ پھر اس کا جواب آپ نے کیا دیا؟"۔

کہنے لگے —— "میں نے انھیں یہ جواب دیا کہ آپ لوگ بھی تو مردوں سے نفرت کرتی ہیں اور اگر نفرت نہیں کرتیں تو کم از کم یہ ظاہر ضرور کرتی ہیں کہ آپ کو مردوں سے نفرت ہے —— میری عورتوں سے نفرت درحقیقت آپ کی اس حرکت کا انتقام ہے"۔

میں ہنسنے لگا —— اور میں نے کہا —— "آپ نے کیسی لطیف بات کہی۔ کاش ان پر اس کا کچھ اثر بھی ہوا ہو"۔

کہنے لگے "اثر ان پر کسی بات کا بھی نہیں ہوتا"۔

میں نے کہا "شاید اسی وجہ سے ان عورتوں کو ناقص العقل کہا گیا ہے"۔

غرض دیر تک ہم اس قسم کی دلچسپ باتیں کرتے اور ہنستے ہنساتے رہے —— آج بھی جب میں اس شام کو یاد کرتا ہوں تو اس باغ و بہار شخصیت کی شگفتگی مجھ پر ایک سرخوشی بن کر چھا جاتی ہے —— اور میں یہ سوچنے لگتا ہوں کہ ان کی اس شوخی اور شگفتگی مجھ پر ایک سرخوشی بن کر کیوں چھا جاتی ہے —— اور میں یہ بھی سوچنے لگتا ہوں کہ ان کی اس شوخی اور شگفتگی میں بھی کتنا توازن ہے۔ اور اس توازن نے اس میں کیسا ستھرا پن اور کس درجہ نکھری ہوئی کیفیت پیدا کی ہے۔ ورنہ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ بہت سی شخصیتوں میں مزاج کی یہ شگفتگی اپنے حدود سے باہر نکل کر ایسی سرحدوں میں داخل ہو جاتی ہے جہاں ابتذال اور عامیانہ پن ہوتا ہے —— اور وہ اسی رنگ میں رنگ جاتی ہے —— مولوی صاحب کی شخصیت میں ان کے توازن اور باقاعدگی نے اس شگفتگی کو ابتذال کی سرحدوں میں داخل ہونے سے روک لیا ہے۔ چنانچہ ان کی شگفتگی اور شوخی میں بھی ایک لئے دیئے رہنے والی کیفیت نظر آتی ہے۔ ایک رکھ رکھاؤ کا احساس ہوتا ہے۔ اس لئے دیئے رہنے والی کیفیت کے ساتھ وہ بات بات میں شگفتگی کو پیدا کرتے ہیں۔ لیکن اس میں ان کی شعوری کوشش کو دخل نہیں ہوتا۔ وہ تو ان کے مزاج میں داخل ہے۔ اور اس لئے شخصیت کا لازمی جزو ہے۔

مولوی صاحب کی شخصیت میں اس شگفتگی کے ساتھ ساتھ چند اور خصوصیات بھی ایسی ہیں جن کے بغیر ان کی تصویر مکمل نہیں ہوتی۔ ان خصوصیات میں بے باکی اور صاف گوئی، محنت اور جفاکشی، خلوص اور صداقت، روشن خیالی اور کشادہ دلی خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں —— جو کچھ ان کے دل میں ہوتا ہے وہ زبان پر آ جاتا ہے۔ وہ کسی بات کو چھپا نہیں سکتے۔ انھیں تساہل پسندی نہیں آتی۔ وہ بیکار نہیں بیٹھ سکتے —— آرام طلبی سے انھیں نفرت ہے۔ تکلفات کے وہ قائل نہیں ہیں۔ باقاعدگی کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتے —— اس لئے ان کی شخصیت ایک کردار کی حامل ہے، اور اس کردار میں ایک ایسی عظمت اور بلندی ہے جو موجودہ دور میں ڈھونڈے سے بھی نہیں مل سکتی —— اس عظمت اور بلندی کا احساس کچھ اور بھی ہوتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنے ماحول کی ناسازگار کیفیت کے باوجود ان خصوصیات کو اپنے اندر باقی رکھا ہے —— انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ریاستی ماحول میں گزارا ہے۔ لیکن ریاستی ماحول کے مذموم اثرات سے انھوں نے ہمیشہ اپنا دامن بچائے رکھا ہے۔ بلکہ ان کی شخصیت کے مطالعے سے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ان پر اس ماحول کا ردِ عمل ہوا ہے۔ اسی لئے انھیں ایسی باتوں سے ہمیشہ نفرت رہی ہے جو ریاستی ماحول میں پیدا ہونے والے انحطاط و زوال کا منطقی نتیجہ ہوتی ہیں۔

ریاستی ماحول موقع شناسی اور زمانہ سازی سکھاتا ہے، خوشامد اور چاپلوسی کا درس دیتا ہے۔ بابائے اردو کو ان باتوں سے نفرت ہے —— اور اس حد تک نفرت ہے کہ بعض اوقات اپنی اس نفرت سے مبنی ہوئی باتوں کو بگاڑ دیتے ہیں لیکن اپنے ضمیر کا گلا نہیں گھونٹتے۔ انھوں نے زندگی میں کبھی کسی کی پروا نہیں کی۔ اپنے ضمیر کی آرزو کو کبھی نہیں دبایا۔ حالانکہ انھیں ایسا کرنے میں بڑے نقصانات اٹھانے پڑے۔ ان کی ساری زندگی لڑتے ہوئے گزر گئی۔ بڑے بڑے معرکے سر کرنا پڑے۔ بڑے بڑوں سے ٹکر لینا پڑی لیکن اپنے راستے سے ہٹنا انھوں نے

گوارا نہیں کیا ——— بلکہ میں نے تو یہ دیکھا ہے کہ جب ان کا حریف زیادہ طاقتور ہو تو وہ اپنی اس بے باکی اور صاف گوئی کا اظہار کچھ زیادہ ہی کرتے ہیں انہیں ڈرنا نہیں آتا ——— خوف کھانا وہ نہیں جانتے۔ کیسا ہی ماحول ہو، جو کچھ ان کے دل میں آتا ہے، وہ اس کا اظہار کر دیتے ہیں۔ انھیں اس کی مطلق پروا نہیں ہوتی کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اس سے انھیں زندگی میں نقصان بھی بہت پہنچا ہے۔ بہت سے لوگ ان کے دشمن بھی ہو گئے ہیں لیکن انھوں نے ان تمام باتوں کی کبھی بھی پروا نہیں کی ہے۔ ایسا کرنے میں ان کا مقصد کسی کو نیچا دکھانا یا اپنی بڑائی ثابت کرنا نہیں ہوتا بلکہ حقیقت کا اظہار ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں جو بات بھی ان کے منہ سے نکلتی ہے، اگرچہ اس کا رنگ جارحانہ اور اس کا انداز طنزیہ ہوتا ہے لیکن اس میں کوئی نہ کوئی اہم حقیقت ضرور ہوتی ہے۔

ایک واقعہ مجھے یاد آیا جو اس حقیقت کی وضاحت کرتا ہے۔

برعظیم کی تقسیم کے بعد انجمن ترقی اردو کے معاملات کو طے کرنے کے لئے حکومت ہند اور بابائے اردو کے درمیان کئی دن تک طویل گفتگو ہوتی رہی حکومت کی طرف سے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد اس کام کے لئے مقرر تھے۔ دوران گفتگو میں مولانا آزاد بار بار یہی کہتے تھے کہ حکومت یہ نہیں چاہتی کہ آپ ہندوستان میں رہیں۔ حکومت یہ نہیں چاہتی کہ انجمن کا ایک دفتر کراچی میں رہے اور ایک دلی میں ——— لیکن وہ یہی کہتے تھے کہ انجمن کو دونوں جگہ کام کرنا چاہیئے۔ کیونکہ انجمن ثقافتی ادارہ ہے ——— جب ان کی بات کو درخور اعتنا نہ سمجھا گیا اور مولانا آزاد نے بار بار حکومت کا تذکرہ کیا تو مولوی صاحب سے نہ رہا گیا ——— جل کر کہنے لگے کہ آپ بار بار حکومت کا ذکر کرتے ہیں کہ حکومت یہ نہیں چاہتی، حکومت وہ نہیں چاہتی ——— حکومت اب کہاں ہے؟ ——— وہ تو پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ختم ہو گئی؟ ——— آپ اپنے آپ کو حکومت سمجھتے ہیں؟ بابائے اردو نے مجھ سے بیان کیا "بے اختیار میرے منہ سے یہ بات نکل گئی میں اپنے آپ کو روک نہ سکا۔ میں نے کہا کہ آدمی کے پیر شدی ——— حکومت ہی کیا ہے جس کا اتنا زور و شور ہے ——— اس لئے اس حقیقت کا اظہار ضرور کر دینا چاہیئے۔ چنانچہ اس طرح میں نے اس کا اظہار کر دیا ——— مولانا آزاد کو یہ بات بری تو بہت معلوم ہوئی ہوگی۔ کیونکہ جب میں نے یہ بات کہی تو ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا ——— لیکن میں نے یہ بات غلط تو نہیں کہی ——— آخر میرے لئے اس اظہار حقیقت کے سوا اور چارہ ہی کیا تھا۔"

اس واقعے سے مولوی صاحب کی بے باکی اور صاف گوئی پر روشنی پڑتی ہے ——— یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شخصیتوں سے مرعوب ہونا نہیں جانتے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ وہ زندگی بھر کسی شخصیت سے خواہ مخواہ مرعوب نہیں ہوئے۔ ان پر کسی کی امارت، منصب، مرتبے کا کوئی اثر نہیں ہوا ——— بلکہ موقع آنے پر تو ایسے لوگوں کو انھوں نے کچھ زیادہ ہی آڑے ہاتھوں لیا ہے۔

ان کی شخصیت میں اس قسم کی سختی ضرور ہے لیکن ویسے وہ کرخت آدمی نہیں ہیں۔ ملنے جلنے میں انھیں آداب اور حفظ مراتب کا بڑا خیال رہتا ہے۔ اپنے چھوٹوں تک کی وہ عزت کرتے ہیں۔ بڑی نرمی اور ملائمت سے ان کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ شفقت اور محبت کا اظہار ان کی طرف سے قدم قدم پر ہوتا ہے۔ شرافت اور نیکی تو ان پر ختم ہے۔ وہ کسی کے ساتھ برائی نہیں کر سکتے ——— وہ شروع سے آخر تک خیر ہی خیر، نیکی ہی نیکی ہیں۔ شر کا لفظ ان کی لغت میں نہیں ہے۔ ان کا نصب العین خدمت ہے۔ اور خدمت ہی کو وہ انسانی زندگی کی معراج سمجھتے ہیں۔ ساری زندگی انھوں نے انفرادی اور اجتماعی طور پر خدمت ہی کی ہے ——— خدمت کا خیال نرمی کو پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ یہ نرمی مزاج کی تیزی کے باوجود ان کی شخصیت میں اپنا اثر دکھاتی ہے۔ انھیں ایک انقلابی کہا جائے تو بے جا نہیں۔ ایک انقلابی شر کے خلاف تیزی اور تندی کو روا رکھتا ہے لیکن خیر کے لئے اس کے پاس نرمی ہی نرمی اور ملائمت ہی ملائمت ہوتی ہے۔ بابائے اردو کا بھی کچھ یہی حال ہے۔

ایک انقلابی کی طرح بابائے اردو بڑی سخت زندگی بسر کرنے کے عادی ہیں۔ اور صحیح کردار کی تعمیر کے لئے سخت زندگی بسر کرنے کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ آرام طلبی سے انھیں نفرت ہے۔ اس لئے جو چیزیں آرام طلبی کے ماحول پیدا کرتی ہیں ان کو بھی وہ اچھا نہیں سمجھتے۔ انھیں اونچی صوفوں اور ایرانی

قالینوں پر بیٹھ کر کام کرنا نہیں آتا۔ وہ تو راحت اور آرام کے بغیر کام کرنے کے عادی ہیں۔ میں نے سخت گرمی میں بھی انھیں مسلسل کام کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ کام کرنے کے لئے گرمی کی شدّت کو وہ کم کرنے کے قائل نہیں۔ چنانچہ گرمی کے موسم میں کمروں کو خس کے ذریعے ٹھنڈا کرنے سے انھیں چڑ ہے۔ اس کو وہ تن آسانی سمجھتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ دِلّی میں ایک دفعہ بعض لوگوں نے اس بات کی کوشش کی کہ ان کے کمروں میں خس کی ٹٹیوں کا انتظام کر دیا جائے لیکن انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ساری مخلوق تو کام کرنے کے لئے خس نہیں لگاتی۔ بغیر خس کے گرمیوں میں کام زیادہ ہو سکتا ہے۔ لطف تو جب ہے کہ لُو اور دھوپ میں بھی کام جاری رہے۔ انسان کو کسی چیز کا محتاج نہیں ہونا چاہیئے۔ جہاں وہ راحت اور آرام کی خاطر بعض چیزوں کا عادی ہو گیا تو سمجھ لیجئے کہ اس دُنیا میں اُس کا ٹھکانا نہیں ہے۔ یہ دُنیا تو انسان سے سخت جانی کا تقاضا کرتی ہے —— اور انسان کو سخت جان ہونا چاہیئے کہ اس سے فکر و عمل کی صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں۔ اور اس طرح انسان صحیح معنوں میں انسان بنتا ہے۔

بابائے اُردو صحیح معنوں میں انسان ہیں، اور یہی ان کی شخصیت کی سب سے بڑی خصوصیت ہے —— ان کی شخصیت میں جو بھی خصوصیات ہیں وہ سب اسی ایک خصوصیت کے گرد گھومتی ہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ ان تمام خصوصیات کے مجموعے ہی سے اس انسانی خصوصیت کا ہیولا تیار ہوتا ہے —— ان کی شخصیت میں کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں ملتی جس کی نوعیت غیر انسانی ہو —— وہ انسان ہیں۔ اُنھیں انسان سے محبت ہے۔ وہ انسان کو سمجھتے ہیں۔ وہ اس کی عظمت کے قائل ہیں۔ اُنھیں اس کے ماضی پر فخر اور حال اور مستقبل پر بھروسہ ہے۔ چنانچہ وہ ایک انسان کی حیثیت سے انسانی زندگی میں ہمیشہ رجائی پہلوؤں کو دیکھتے ہیں۔ اسی لئے ان کی شخصیت میں ولولوں کے چراغ روشن نظر آتے ہیں۔ امنگوں کی شمعیں فروزاں دکھائی دیتی ہیں —— اور ان کی اسی خصوصیت نے انھیں سراپا نور بنا دیا ہے —— لیکن وہ صرف اس نور کو اپنے آپ تک محدود نہیں کرتے۔ اس کی روشنی دُور دُور تک پہنچاتے ہیں —— اور اس روشنی سے زندگی کی تاریکیوں میں اُجالا ہوتا ہے۔ یہ اُجالا افراد کو نئی راہیں دکھاتا ہے، نئے میدانوں سے روشناس کرتا ہے۔ نئی جولانگاہوں کا پتہ بتاتا ہے —— ان کی شخصیت نے اَن گنت لوگوں کو یہ راہیں دکھائی ہیں، ان میدانوں سے روشناس کیا ہے، ان جولانگاہوں کا پتہ بتایا ہے۔ ہماری ثقافتی تہذیبی اور ادبی زندگی پر جو اثرات موجودہ دور میں اُن کی شخصیت نے چھوڑے ہیں۔ وہ اپنی جگہ پر بڑے ہی گہرے اور ہمہ گیر ہیں —— اور اس میں ان کی شخصیت کی انھیں خصوصیات، اور ان کے کردار کے انھیں پہلوؤں کو دخل ہے جن کو برسوں کی مستقل کاوش اور مسلسل جد و جہد کے بعد اُنھوں نے پیدا کیا ہے۔ اسی میں ان کی شخصیت کی عظمت اور اور ہمہ گیری کا راز مضمر ہے۔

میں جب بھی ان کی عظیم اور ہمہ گیر شخصیت کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے ایک اتھاہ سمندر اور ایک سربفلک پہاڑ کا خیال آتا ہے، اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں اس سمندر کی بے پایاں وسعت اور اس پہاڑ کی بے اندازہ عظمت کے نظارے سے مبہوت ہو جانے والا ایک خاموش تماشائی ہوں!

ابوالکلام

غلام رسول مہر

نوا فرو شست ز اندازۂ بہ یشہ خود
غزال بہ زمزمۂ خوام کہ پردہ ہا پست اند

۱۹۱۳ء کے موسم گرما کا آغاز تھا۔ میں ایف۔اے کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا کہ چند دوست دستخطوں کے لئے ایک فارم میرے پاس لائے اور بولے کہ "حزب اللہ" کے ممبر بن جاؤ۔ میں نے پہلی مرتبہ یہ نام سنا تھا لیکن دوستوں پر اعتماد تھا اس لئے تذبذب کے بغیر دستخط کر دیئے۔ دیکھا کہ چھوٹا سا فارم ہے۔ اس پر ٹائپ میں تین چار سطریں چھپی ہوئی ہیں۔ اوپر جلی حروف میں "من انصاری الی اللہ" مرقوم ہے۔ اس کے نیچے قرآن مجید کی ایک آیت ہے اور اس کے ماتحت اردو ترجمہ۔ پایان میں نام، پیشہ، عمر اور پتے کی جگہ خالی چھوڑ رکھی ہے۔ چند روز بعد میں اس فارم کے متعلق سب کچھ بھول گیا۔ ایف۔اے کا امتحان دے کر گھر جانے لگا تو دوستوں سے پوچھا کہ بھئی! کوئی دلچسپ مشغلہ بتاؤ جس سے نتیجۂ امتحان کے انتظار کا وقت بخوبی گزر سکے۔ انھوں نے کہا کہ اخبار جاری کرا لو۔ اور ساتھ ہی دو اخباروں کے نام تجویز کر دیئے۔ ایک روزانہ "زمیندار" دوسرا ہفتہ وار "الہلال"۔ "الہلال" کا چندہ اس زمانے میں آٹھ روپے سالانہ تھا اور اعلان ہو چکا تھا کہ جو لوگ ایک معین مدت میں خریداری کی درخواست کریں گے ان کے چندے میں سے ساڑھے سات روپے "ہلال احمر فنڈ" میں بھیج دیئے جائیں گے۔ میں نے "ہم خرما و ہم ثواب" کے پیش نظر فوراً درخواست بھیج دی لیکن نہ اس وقت تک "الہلال" کی شکل دیکھی تھی نہ یہ معلوم تھا کہ وہ کس قسم کا پرچہ ہے۔ صرف اتنا جانتا تھا کہ "حزب اللہ" کا فارم "الہلال" ہی کے دفتر سے آیا تھا۔

میں گھر پہنچا تو چند روز بعد "الہلال" کا وی۔پی آ گیا۔ پرچہ کھولا تو پورا ٹائپ میں چھپا ہوا تھا اور ٹائپ کے پڑھنے کا میں عادی نہ تھا۔ تکلف سے عبارت پڑھنی چاہی تو وہ عربی الفاظ و تراکیب سے لبریز تھی اور جا بجا آیات درج تھیں۔ کچھ وقت صرف کرنے کے بعد میں نے سمجھ لیا کہ ممکن ہے "ہلال احمر فنڈ" میں چندہ دینے کا "ثواب" میرے نامۂ اعمال میں لکھا جائے۔ لیکن "خرما" کی امید تو نقش بر آب ثابت ہوئی۔ پرچہ ویسے ہی رکھ دیا اور اس کے کسی حصے سے استفادہ کا سوال باقی نہ رہا۔ آٹھویں دن پرچہ آتا تھا۔ میں اسے کھولتا اور پڑھے بغیر ایک جگہ رکھتا جاتا۔ چھٹا ساتواں پرچہ آیا تو اس میں "حزب اللہ" کے اغراض و مقاصد کا ذکر تھا۔ میں چونکہ اس جماعت کا ممبر بن چکا تھا اس لئے طبیعت پر جبر کر کے مضمون پڑھا کہ جس جماعت سے وابستہ ہو رہا ہوں اس کے مقاصد سے آگاہی لازم ہے۔ فارغ ہوا تو دل پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ پھر تمام پرچوں کو اوّل سے آخر تک حرفاً حرفاً دیکھا اور اس امر پر بڑا افسوس کرتا رہا کہ پہلے دن اس کا باقاعدہ

مطالعہ کیوں نہ شروع کر دیا ؎

بے غمِ عشق تو صد حیف از عمرے کہ گزشت
پیش ازیں کاش گرفتارِ غمت می بودم

میں گاؤں میں رہتا تھا، جہاں ہفتے میں تین مرتبہ ڈاک آتی تھی۔ "الہلال" کی آمد کے دن ڈاکئے کی پیشوائی کے جوشِ اشتیاق میں میل ڈیڑھ میل باہر نکل جاتا۔ جہاں وہ ملتا وہیں سے پرچہ کھول کر پڑھنا شروع کر دیتا اور جو دوست یا عزیز ملنے کے لئے آتے ان سب کو ایک ایک مضمون سناتا۔ یہ الہلال سے عشق و شیفتگی کی ابتدا تھی۔ اسی وقت سے مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ عقیدت کا رشتہ استوار ہوا۔ چالیس سال کی مدت میں کاروانِ حیات نے وابستگی و انقطاع کی سینکڑوں منزلیں طے کیں۔ لیکن یہ رشتہ استوار سے استوار تر ہوتا رہا اور آج بھی جبکہ آخری منزل بہت قریب نظر آتی ہے اس تعلق کو زندگی کی ایک عزیز ترین متاع سمجھتا ہوں۔

اسی زمانے میں مولانا سے خط و کتابت شروع ہوگئی تھی اور میری درخواست پر انہوں نے اپنی ایک دستخطی تصویر بھی بھیج دی تھی۔ اگرچہ اس واقعہ کو ایک عمر گذر چکی ہے لیکن آج بھی تصویر پانے کی لذت اسی طرح محسوس کرتا ہوں، گویا یہ نعمت ابھی حاصل ہوئی ہے۔ مولانا سے ملاقات ۱۹۱۴ء میں ہوئی جب میں بی۔ اے میں پڑھتا تھا۔ وہ راولپنڈی کانفرنس سے مراجعت پر بریگینزا ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ میں چند احباب کی معیت میں زیارت کے لئے گیا اور انہیں دیکھا تو اپنے ذہن میں جو تصور قائم کر رکھا تھا اس سے وہ بالکل مختلف نکلے۔ میانہ قامت، جسم نہایت دبلا پتلا، رنگ سرخ و سفید، داڑھی مونچھ صاف، کمبل اوڑھے پلنگ پر بیٹھے تھے۔ صرف چند منٹ سرسری باتیں ہوئیں۔ میرا تعارف ہوا تو فرمایا کہ آج شام کے چار بجے ملو۔ مقررہ وقت پر حاضر ہوا تو ان کے علم و فضل کا رعب دل پر اس قدر چھایا ہوا تھا کہ جذباتِ عقیدت کو دل ہی دل میں موزوں الفاظ کا لباس پہنانے کے لئے ہر کوشش ناکام رہی گویا یہ نقشہ پیش تھا ؎

آزردہ زمن حالِ شبِ وصل چہ پرسی
نے دل خبرم داشت نہ از دل خبرم بود

مولانا نے پوچھا کہ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد کیا ارادہ ہے؟ میری سمجھ میں اس کے سوا کچھ نہ آیا کہ اخبار جاری کروں گا تاکہ ملک و ملت کی کچھ خدمت بجا لاؤں۔ فرمایا "مشغلہ اچھا ہے لیکن تمہیں اندازہ ہے کہ اس طرح منزلِ مقصود کے قریب پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا؟ فرض کرو کہ ابتدائے کار ہی میں آرزو کے مطابق سامان میسر آجاتے ہیں تو اخبار کے استقلال اور اس کی آواز کی پذیرائی کے لئے کم و بیش دو سال کا انتظار تو ضروری ہوگا۔ پھر دو سال اس پذیرائی کے نتائج کا انتظار کرنا پڑے گا۔ گویا جس ذریعۂ خدمت سے کام لینے کا ارادہ کئے بیٹھے ہو اس کے نتائج دیکھنے کے لئے کم از کم چار سال صرف ہو جائیں گے۔ میرے نزدیک حالات کی رفتار ایسی ہے کہ اس مدت کے ایک چوتھے کا بھی انتظار مشکل ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ اس اثنا میں کیا کچھ ہو جائے گا۔" میں دم بخود رہ گیا اور عرض کیا کہ آپ فرمائیں مجھے کیا کرنا چاہیے؟ فرمایا کہ امتحان سے فارغ ہونے کا انتظار کرو۔

"الہلال" بند ہو چکا تھا مولانا نے "البلاغ" نکالا تو اس کے ساتھ ہی کلکتہ میں "دارالارشاد" قائم کر دیا جس میں وہ منتخب نوجوانوں کو قرآنِ حکیم کا درس دیا کرتے تھے۔ یہ قومی اور دینی کارکنوں کی تعلیم و تربیت کا وہ مرکز تھا جس کے لئے مولانا "الہلال" کے زمانے سے انتظامات کر رہے تھے۔ لیکن "دارالارشاد" کے قیام کو ابھی چند ہی مہینے گذرے تھے کہ حکومتِ بنگال نے انہیں بنگال کے حدود سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ وہ رانچی چلے گئے تو وہاں انہیں نظر بند کر دیا گیا۔ ساتھ ہی "البلاغ" بھی بند ہوگیا اور "دارالارشاد" بھی۔ اس اثنا میں درس صرف اڑھائی تین پارے تک پہنچا تھا۔ میرے دل میں ان کی ذاتِ بابرکات سے استفادہ کی جو آرزوئیں موجزن تھیں وہ بھی خون ہو کر رہ گئیں ؎

پنہاں تھا دامِ سخت قریب آشیانے کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

۱۹۲۰ء میں نظر بندی سے رہا ہوئے تو ملک میں ترکِ موالات کی تحریک جاری ہوئی اور وہ ہمہ تن اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے وقف ہو گئے۔ میں اس زمانے میں "زمیندار" سے وابستہ ہو چکا تھا۔ ان سے نیازمندی کے روابط کی تجدید ہوئی۔ اگرچہ سیاسی افکار میں بعض اوقات اختلاف کی صورت بھی پیش آتی رہی۔ لیکن رشتۂ عقیدت بدستور قائم رہا اور ذاتی تعلقات میں بفضل اللہ کوئی خلل نہ آیا۔ ہمارے عہد کی عام حالت یہ ہے کہ حسنِ نیت کی بناء پر بھی کسی سے اختلاف ہو تو اسے ناقابلِ برداشت سمجھا جاتا ہے۔ لیکن مولانا اپنے دوسرے اوصاف و محامد کی طرح اس وصف میں بھی یگانہ حیثیت کے مالک ہیں کہ رائے کے اختلاف یا مسلک کے تفاوت کو انہوں نے ذاتی تعلقات پر کبھی اثر انداز نہیں ہونے دیا۔

میں ان کے بے مثال علم و فضل کے متعلق یہاں کچھ نہ کہوں گا جو نصف صدی سے اس وسیع سرزمین کے آسمان پر آفتابِ جہاں تاب کی طرح تابندہ و درخشندہ ہے۔ وہ ان اصحاب میں سے ہیں جنہیں قدرت صدیوں کے بعد عالمِ انسانیت کو اپنا خاص نعمت کے طور پر عطا کرتی ہے۔ وہ تحریر و تقریر دونوں کی اقلیم کے تاجدار ہیں۔ ان کی غیر معمولی صلاحیتیں اس زمانے میں بھی مشہور فرمانروایانِ علم و فضل کے لئے یکسر حیرت انگیز تھیں۔ جب ان کی عمر پندرہ سولہ برس سے زیادہ نہ تھی۔ ۱۹۰۴ء میں وہ پہلی مرتبہ انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسے میں شرکت کے لئے لاہور آئے تو خواجہ الطاف حسین حالی بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ مولانا وحیدالدین سلیم مرحوم مولانا کو لے کر خواجہ صاحب مرحوم کی خدمت میں پہنچے تو پوچھا کہ خواجہ صاحب اس لڑکے کی عمر کتنی ہو گی؟ انہوں نے فرمایا کہ چودہ پندرہ برس کے ہوں گے۔ سلیم نے کہا یہ "لسان الصدق" کے ایڈیٹر ہیں۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ ان کے والد ایڈیٹر ہوں گے۔ جب معلوم ہوا کہ یہی ایڈیٹر ہیں تو متحیر رہ گئے اور بہت شفقت فرمائی۔ اس وقت سے مولانا کے ساتھ گہرے روابط پیدا ہو گئے۔ "الہلال" کا ابتدائی دور تھا کہ مولانا ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت کے لئے گئے۔ خواجہ حالی کے فرزندِ ارجمند خواجہ سجاد حسین بھی اس میں شریک تھے۔ ان کے ہاتھ خواجہ صاحب نے مولانا کو بہت بہت سلام کہلا بھیجا۔ نیز فرمایا کہ "الہلال" آتا ہے تو چار چار پانچ پانچ دن اس کے سوا کوئی مشغولیت نہیں رہتی۔

اس سے بھی عجیب تر واقعہ یہ ہے کہ مولانا بارہ تیرہ برس کی عمر میں شعر کہنے لگے تھے۔ "ارمغانِ فرخ" کے نام سے ایک گلدستہ نکلتا تھا جس کی ماہانہ طرحوں پر کلکتہ میں مشاعرے ہوتے تھے۔ اسی زمانے کی کہی ہوئی غزلیں اس گلدستے میں شائع ہوتی تھیں۔ مرزا غالبؔ کے ایک شاگرد نادر شاہ خان شوخی رامپوری کلکتہ میں مقیم تھے۔ انہیں کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ مولانا جو غزلیں مشاعروں میں سناتے ہیں وہ انہی کی ہوتی ہیں۔ ایک روز مولانا مسجد سے نکل رہے تھے۔ نادر شاہ خان نے روک لیا اور کہا کہ ایک شاگرد نے جان عذاب میں ڈال دی ہے۔ میں بیمار ہوں اور وہ غزل کے لئے متقاضی ہے۔ چند شعر اسی وقت کہہ دو۔ انہوں نے زمین بتائی "یاد نہ ہو" "شاد نہ ہو"۔ مولانا نے ایک کتب فروش کی دکان پر بیٹھے بیٹھے چھ شعر کہہ دئے۔ نادر شاہ خان بولے کہ اشعار کی تعداد طاق ہونی چاہئے۔ مولانا نے بے توقف کہا ؎

وعدۂ وصل بھی اک طرفہ تماشے کی ہے بات
میں تو بھولوں نہ کبھی، ان کو کبھی یاد نہ ہو

نادر شاہ خان نے کہا کہ صورت سے تو دس بارہ برس کے صاحبزادے معلوم ہوتے ہو لیکن خدا کی قسم عقل باور نہیں کرتی۔

شمس العلماء شبلی مرحوم سے بھی اسی قسم کا واقعہ پیش آیا۔ ان سے مولانا کی خط و کتابت تھی۔ شبلی ۱۹۰۵ء میں بمبئی گئے تو اس زمانے میں مولانا وہیں مقیم تھے۔ ایک دوست کے ہمراہ ملاقات کے لئے پہنچے۔ دوست نے تعارف کرایا تو شبلی کو یقین نہ آیا کہ ابوالکلام آزاد یہی ہیں۔ جب شک کی کوئی گنجائش نہ رہی تو اس درجہ گرویدہ ہوئے کہ "الندوہ" کی ایڈیٹری سونپ دی اور مولانا نے ۱۹۰۵ء کے اواخر سے ۱۹۰۶ء کے اوائل تک یہ خدمت انجام دی۔

بہرحال جو وجود عمر کے ابتدائی مراحل میں وقت کے اکابرِ علم و فضل کے لئے باعثِ حیرت و استعجاب بن گیا تھا، اس کی شان و عظمت کے متعلق میں کج مج زبان کیا کہہ سکتا ہوں۔ مولانا کو خدا نے غیر معمولی حافظہ عطا کیا ہے۔ اس کی محسوس و مشہود مثالیں "تذکرہ" اور "غبارِ خاطر" کی شکل میں دنیا کے

سامنے موجود ہیں۔ "تذکرہ" رانچی کی نظربندی کے زمانے میں لکھا گیا، جب مولانا کے پاس کوئی قابلِ ذکر کتاب موجود نہ تھی۔ "غبارِ خاطر" کے خطوط احمد نگر کی اسیری کے زمانے میں مرتب ہوئے۔ اس وقت بھی وہ کتابوں سے بڑی حد تک محروم تھے۔ لیکن ان کتابوں کے مطالعے سے ہر شخص پر آشکارا ہو سکتا ہے کہ بڑے بڑے کتب خانوں میں بیٹھ کر بھی اس قسم کی چیزیں مرتب نہیں کی جا سکتیں۔ "غبارِ خاطر" پہلی مرتبہ لاہور میں چھپی تھی اور اس کی کاپیاں دیکھنے کا کام مجھے سونپا گیا تھا۔ "مآثر الامراء" کی ایک عبارت کے متعلق میرے دل میں شبہ پیدا ہوا۔ مطبوعہ کتاب میں عبارت وہی تھی جو مولانا نے "غبارِ خاطر" میں درج کی تھی۔ میرا خیال ہے کہ کتاب ایڈٹ کرنے والے نے ایک لفظ کے سمجھنے میں غلطی کی۔ استصواب کی غرض سے مولانا کو لکھا۔ فرمایا: "منقولہ عبارت درست ہے اور یہ "مآثر الامراء" کی فلاں جلد کے فلاں صفحے پر فلاں طرف اوپر کی سطروں میں موجود ہے۔ میں نے تیس سال پیشتر "مآثر الامراء" دیکھی تھی اور یہ الفاظ اسی طرح لوحِ حافظہ پر منقوش ہیں۔"

عزیمت و استقامت مولانا کے آئینۂ طبع کے درخشاں ترین جوہر ہیں۔ انہوں نے جن اصول و مقاصد کی دعوت کے لئے زندگی وقف فرمائی، ان پر کاربندی اور عمل پیرائی میں ہمیشہ چٹان کی طرح جمے رہے۔ اس سلسلے میں ان کی صحت کو نقصان پہنچا، کاروبار تباہ ہوا، ان کی نہایت قیمتی تصانیف کے مسودے ضائع ہو گئے؛ انہوں نے علمی یادداشتوں کے جو مجموعے مرتب کئے تھے اور انہیں اپنی زندگی کا حاصل سمجھتے تھے، وہ سب تلاشیوں میں تلف ہو گئے۔ لیکن ان کی شانِ عزیمت ان تمام نقصانات سے بالکل غیر متاثر رہی۔

ذاتی تعلقات کے سلسلے میں ایک نہایت دشوار و دل گداز مرحلۂ امتحان اس وقت پیش آیا جب احمد نگر کی اسیری کے زمانے میں ان کی اہلیہ محترمہ سخت بیمار ہو گئیں۔ اس موقع پر سپرنٹنڈنٹ ان کے پاس پہنچا اور کہا کہ اگر حکومت سے کچھ کہنا ہو تو میں اسے فوراً بمبئی پہنچا دوں گا۔ مطلب غالباً یہ تھا کہ اگر رفیقۂ حیات کی شدید علالت کی بنا پر مشروط رہائی کی درخواست کریں تو وہ حکومت کے ملاحظہ میں پیش کر دی جائے گی۔ لیکن مولانا نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں حکومت سے کوئی درخواست نہیں کرنا چاہتا۔ سپرنٹنڈنٹ نے پنڈت جواہر لال کی وساطت سے بھی مولانا کو راضی کرنے کی کوشش کی لیکن وہ جو فیصلہ فرما چکے تھے، اس پر قائم رہے۔ وہ خود فرماتے ہیں:

"جونہی خطرناک صورتِ حال کی پہلی خبر ملی ..... میں نے محسوس کیا کہ طبیعت کا سکون ہل گیا ہے اور اسے قابو میں رکھنے کے لئے جدوجہد کرنی پڑے گی۔ یہ جدوجہد دماغ کو نہیں مگر جسم کو تھکا دیتی ہے۔ اس زمانے میں میرے دل و دماغ کا جو حال رہا میں اسے چھپانا نہیں چاہتا۔ میری کوشش تھی کہ اس صورتِ حال کو پورے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کر لوں۔ اس میں میرا ظاہر کامیاب ہوا لیکن شاید باطن نہ ہو سکا۔"

آگے چل کر فرماتے ہیں:

"میں نے تمام معمولات جاری رکھے لیکن ..... اعتراف کرتا ہوں کہ یہ تمام ظاہرداریاں دکھاوے کا ایک پارٹ تھیں جس سے دماغ کا مغرورانہ احساس کھیلتا رہتا تھا اور اس لئے کھیلتا تھا کہ کہیں اس کے دامنِ صبر و وقار پر بے حالی اور پریشان خاطری کا کوئی دھبہ نہ لگ جائے۔"

اس کے باوجود مولانا نے حکومت سے کوئی درخواست نہ کی اور ان کی صاحبِ عزیمت رفیقۂ حیات اس حالت میں دنیا سے رخصت ہو گئیں جب وہ سینکڑوں میل دور اپنے اہم اصول و مقاصد کی خاطر احمد نگر کے قلعے میں محبوس تھے۔ اصول و مقاصد کی قربان گاہ پر عزیز ترین رشتوں کو وہی ہستیاں اس طرح بھینٹ چڑھا سکتی ہیں جنہیں بخشندۂ حیات سے عزیمت و استقامت کی غیر معمولی صلاحیتیں ارزانی ہوئی ہوں۔

مبادا کسی کو خیال ہو کہ مولانا اس افتاد پر انتہائی اضطراب و پریشانی سے تو محفوظ نہ رہ سکے، جیسا کہ انہوں نے خود اعتراف کیا ہے۔ یہ

سچ ہے لیکن یہ خیال صحیح نہ ہوگا۔ صبر کا مفہوم ہی یہ ہے کہ انسان موجباتِ غم کی شدت و فراوانی کے باوجود اپنے احساساتِ حزن پر قابو پالے اور انہیں مناسب حدود سے تجاوز کا موقع نہ دے۔ یہ نہیں کہ احساسات سرے سے باقی ہی نہ رہیں اور انسان کا دل پتھر بن جائے۔ ایک سلیم الفطرت انسان کی طرح مولانا طبعی احساسات سے بدرجۂ اتم بہرہ مند تھے۔ کون اندازہ کر سکتا ہے کہ رفیقۂ حیات کی خطرناک علالت کا خط ملتے ہی ان کے دل پر کیا قیامت گزری ہوگی خصوصاً اس حالت میں کہ وہ اسیر تھے اور پاس رہ کر تیمارداری بھی نہ کر سکتے تھے، جو اکثر انسانوں کے لئے فی الجملہ باعثِ تسکینِ قلب ہوتی ہے۔ یقیناً انہیں بھی آرزو ہوگی کہ رہائی ملے تو خود اپنی اہلیہ کا علاج کرائیں اور تا بہ حدِ امکان اس کا دکھ مٹانے کی کوشش کریں لیکن ان کے سامنے زندگی کے اہم بنیادی اصول و مقاصد بھی تھے۔ وہ کوئی ایسی صورت قبول نہ کر سکتے تھے جو ان اصول و مقاصد کی آبرو پر اثر انداز ہوتی۔ انہوں نے جب اس راستے میں قدم رکھا تھا تو ان تمام قربانیوں کا اٹل فیصلہ کر لیا تھا جو اس سفر کے لوازم میں شامل تھیں۔ جب پے بہ پے وہ قربانیاں طلب کی گئیں تو مولانا نے ایک صاحبِ عزیمت انسان کی طرح انہیں پیش کرنے میں تامل نہ کیا۔ ذاتی تعلقات کے سلسلے میں غالباً یہ سب سے بڑی قربانی تھی جس کا ان سے مطالبہ ہوا۔

ایک مرتبہ انہوں نے مجھے تحریر فرمایا تھا:

> "ہر وقت اسے پیشِ نظر رکھئے کہ استقامت اصل کار ہے۔ اگر ایک آدمی فوج کی نوکری قبول نہیں کرتا تو یہ کوئی جرم نہیں، لیکن اگر سپاہی بن کر اور میدانِ جنگ میں آکر پیچھے ہٹتا ہے تو اس کی سزا موت کے سوا کچھ نہیں ہوتی ہے
>
> ہاں، رہِ عشق ہست کہ رفتن ندارد باز گشت
> جرم را اینجا عقوبت ہست و استغفار نیست
>
> دریا میں اترنے سے پہلے سب کچھ سوچ لینا چاہئے، لیکن جب اتر گئے تو موجوں کا شکوہ فضول ہے اور کبھی بھی سنا نہ جائے گا۔ ممکن ہے پہلے ہی غوطے میں خونخوار نہنگوں کا سامنا ہو جائے لیکن جو شخص سمندر میں کودتا ہے، اسے نہنگوں کے وجود سے بے خبر نہ ہونا چاہیئے۔"

مولانا کی ذاتِ گرامی اس تعلیم ہی کا نہیں بلکہ ہر اس تعلیم کا عملی نمونہ رہی ہے جو ان کی زبان پر جاری ہوئی۔ بلا شبہ ان کے قلب پر بھی رنج و الم کی تمام کیفیتیں پوری شدت سے طاری ہوئیں جو عزیز ترین رشتوں سے انقطاع کا لازمہ ہیں لیکن انہوں نے مقامِ صبر کے واجبات جس شانِ عزیمت سے ادا کئے، ان کی مثالیں تاریخ میں بہت ہی کم ملتی ہیں۔ موجباتِ غم سے متاثر ہونا ہر قلبِ سلیم کا خاصہ ہے لیکن احساسات پر قابو پا لینا صرف صابرین مبشرین کا کام ہے۔

ان کی زندگی میں استقامت کی ایک اور نادر مثال ملتی ہے، جب ہم قوموں کی اکثریت نے ان کے سیاسی مسلک سے اختلاف کیا۔ میرے علم کے مطابق وہ اپنے لئے ۱۹۱۲ء میں جو راہِ عمل طے کر چکے تھے اس پر مدت العمر بے خوفِ لومۃ لائم قائم رہے۔ بیچ میں اکثر ایسے مرحلے آئے کہ بڑے بڑے دعوٰیدارانِ عزم و ہمت کے قدم بھی لڑکھڑا گئے۔ انہوں نے اپنا مسلک بدلنے کے لئے معقول دلائل بھی فراہم کر دیئے۔ لیکن مولانا کے نزدیک صحیح، مفید اور بہترین راستہ وہی تھا جو انہوں نے ۱۹۱۲ء میں اختیار کیا تھا۔ اس سلسلے میں انہیں بے شمار قربانیاں کرنی پڑیں۔ کم و بیش دس سال قید و بند میں گزارے۔ ان کے نہایت اہم دینی و علمی مشاغل کو سخت نقصان پہنچا۔ وہ وسائلِ معاش بھی بالکل تباہ ہو گئے جو انہوں نے اپنی طبیعت کے ذوق کے مطابق اختیار کر رکھے تھے اور جن میں وہ سب سے بڑھ کر کامیاب تھے۔ لیکن ان تمام قربانیوں سے گراں بہاتر قربانی یہ تھی کہ ان کی ہر دل عزیزی کی متاعِ عظیم جل کر راکھ کا ڈھیر بن گئی۔

وہ اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی بنا پر عنفوانِ شباب ہی میں ہمہ گیر شہرت حاصل کر چکے تھے۔ وہ جس طرف نکلتے تھے لوگ اپنی آنکھیں ان کے لئے بچھانے پر آمادہ رہتے تھے اور یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہ ہوگا کہ ان کے لئے مسلسل و متواتر عقیدت کی جن گرم جوشیوں کا اظہار ہوتا رہا، وہ شاید مولانا محمد علی مرحوم کو مستثنیٰ کرنے کے بعد کسی مسلمان رہنما کو نصیب نہ ہوئیں اور یہ غیر معمولی ہر دل عزیزی انہیں اس وقت حاصل تھی جب ان کی عمر بیس اور تیس کے درمیان تھی خاص طور پر قابلِ ذکر

امر یہ ہے کہ ان سے محبت و عقیدت کاملاً بے غرضانہ تھی، یعنی وہ ان رہنماؤں میں نہ تھے، جنہیں مختلف گروہوں نے صاحبِ اختیار و اقتدار دیکھ کر فتحِ بابِ مقاصد کا مرجع سمجھ لیا ہو، لیکن انہیں پیشِ نظر مقاصد کے لئے استقامت و عزیمت کی راہ میں ہر دل عزیزی کی متاعِ عظیم بھی قربان کرنی پڑی اور وہ جس شے کو حق سمجھتے تھے اس سے بال برابر بھی اِدھر اُدھر نہ ہوئے۔ یہ قربانیاں ذکر و بیان میں شاید بہت دل پسند معلوم ہوں۔ لیکن اس پر عمل سہل نہیں۔ نظیری کیا خوب کہہ گیا ہے ؎

نیست آسان بر سفِ آتش زدن

می نماید گرچہ از پروانہ خوش

یہاں سوال مولانا کے افکار و آراء کی درستی یا نادرستی کا نہیں، مقصود صرف یہ ہے کہ ان کی شانِ عزیمت و استقامت واضح ہو جائے۔

مولانا کے عادات و خصائل کا باب بہت وسیع ہے اور اپنے علمی و عملی جوہروں کی طرح عادات و خصائل میں بھی وہ بالکل یگانہ حیثیت کے مالک ہیں۔ مثلاً سحر خیزی ابتدائی دور ہی سے ان کی فطرتِ ثانیہ بنی ہوئی ہے۔ وہ ہمیشہ اوّل وقت اُٹھتے ہیں، گویا نظیری کے اس شعر کی عملی تصویر ہیں ؎

عبادتِ سحری رامکن نظیری کم

کہ ہرچہ کرد دعا ہائے صبح گاہی کرد

ایک مرتبہ سیاسی مصروفیتوں کے سلسلے میں لاہور آئے۔ سردیوں کا موسم تھا۔ میں نے عرض کیا کہ "ملاقات کے لئے کوئی وقت بتا دیجئے۔" فرمایا: "صبح کے چار بجے سے آٹھ بجے تک مل سکتے ہو۔" وہ آٹھ دس دن یہاں مقیم رہے اور میں زیادہ سے زیادہ پانچ بجے ان کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ تین گھنٹے اطمینان سے باتیں کرنے کے لئے مل جاتے تھے۔ پچھلے دنوں میں دہلی گیا تو اس وقت بھی وہ اپنے انتظامی کاموں میں بہت مصروف تھے۔ دس دن ان کے پاس ٹھہرا رہا۔ یہی صبح کا وقت گفتگو کے لئے مقرر تھا۔ سیاسی ہنگاموں میں عمر گزارنے کے باوجود انہیں خلوت و تنہائی بہت پسند ہے۔

تنہائی و خلوت طلبد عشق نظیری

ایں خیل و خدم را بہ امیر حشمے بخش

وہ ایک زمانے میں بہت خوش پوش تھے۔ غالباً ۱۹۲۰ء سے کھدر پہننا شروع کیا اور اب تک اسی پر قائم ہیں۔ وہ ابتدا ہی سے ہلکی غذا کھانے کے عادی ہیں اور بہت کم کھاتے ہیں۔ آج کل تو غذا کی تقلیل غیر معمولی صورت اختیار کر چکی ہے۔ لطیف چینی چائے وقتاً فوقتاً ضرور پیتے ہیں اور اس کے دل کش تذکرے "غبارِ خاطر" میں جا بجا موجود ہیں۔

انہوں نے کبھی کسی کا احسان لینا گوارا نہیں کیا، حتیٰ کہ اپنے ان عقیدت مندوں سے بھی کوئی تحفۂ نیاز بہ آسانی قبول نہیں کرتے جنہیں انتہائی شفقت و نوازش سے انہوں نے عزیزوں کا درجہ دے دیا ہے۔ ایک مرتبہ انہیں عرق النّسا کا عارضہ ہوا۔ شفاء الملک حکیم فقیر محمد چشتی نظامی مرحوم بھی میری طرح مولانا کے عقیدت مند تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ مولانا سے بیماری کے مفصّل حالات پوچھ کر مجھے بتاؤ۔ میں ایسا نسخہ تجویز کر دوں گا کہ بفضلِ خدا یہ عارضہ دوبارہ نہ ہوگا۔ میں نے حالات منگا لئے۔ حکیم صاحب مرحوم نے خوب غور و فکر کے بعد نسخہ تجویز کر دیا اور یہاں سے دوائیں کلکتہ بھیج دی گئیں۔ ان سے فائدہ ہوا۔ حکیم صاحب کی رائے تھی کہ دوائیں کچھ دیر جاری رہنی چاہئیں۔ مولانا نے لکھا:

"مجھے حکیم صاحب کی دواؤں کے استعمال میں ہرگز تامّل نہیں۔ اگر اب بھی ان کا فیصلہ یہی ہے کہ جوہرِ منتّیٰ وغیرہ استعمال کرنا چاہئے تو ضرور کروں گا مگر شرط یہ ہے کہ وہ دواخانے کو حکم دے دیا کریں، تاکہ مجوّزہ مرکّبات وی۔ پی پارسل کے ذریعے پہنچتے رہیں۔ اس صورت میں شکر گزار ہوں گا اور انشراحِ خاطر سے علاج کروں گا۔ ورنہ طبیعت رُک جاتی ہے کہ تحفہ ایک مرتبہ ہونا چاہئے نہ کہ مسلسل۔ اگر حکیم صاحب یا آپ اسے منظور نہ کریں گے تو پھر میں نہ تو فراغِ خاطر کے ساتھ دوا استعمال کروں گا، نہ امتداد و اجرا کی حالت گوارا ہو سکے گی۔"

ایک مشہور عالمِ دین نے مولانا کی تفسیرِ فاتحہ کے بعض حصّوں پر ایرادات کئے اور اس سلسلے میں مناظرانہ رنگ اختیار کر لیا۔ ایرادات کے متعلق مجھے بعض باتیں مولانا سے پوچھنے کی ضرورت پڑی۔ ضمناً یہ بھی لکھا کہ کتاب آپ نے نہیں دیکھی تو میں بھیج دوں۔ فرمایا: "کتاب ہرگز نہ بھیجو۔ یہی بہتر ہے کہ میں اسے نہ دیکھوں۔"

"۱۹۱۸ء سے میں نے جن تین باتوں کا عہد کیا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہر اس شخص کو جو مناظرانہ طریق پر میرے خلاف کچھ لکھے گا

نہ تو جواب دوں گا، نہ اس کی شکایت سے اپنے نفس کو آلودہ کروں گا۔"

پنجاب کے ایک سیاست داں نے ایک بیان میں ایسی باتیں کہیں جو مولانا کے نزدیک یکسر بے اصل تھیں۔ انہوں نے مجھے لکھا:

"اگر میری طبیعت کا وہ انداز ہوتا جو اس وقت تھا جب "الہلال" نکلتا تھا تو یہ ایسا صریح کذب ہے کہ نہیں معلوم کسی عام بیان میں میرے قلم سے کیسے سخت الفاظ اس شخص کی نسبت نکل جاتے، لیکن اب میرا حال دوسرا ہے۔ کوئی شخص کتنے ہی قبیح فعل کا مرتکب ہو، میں یقین کے ساتھ اسے پبلک میں برا کہنا پسند نہیں کرتا۔ ہمیشہ ایسے موقعوں پر اپنا نفس سامنے آجاتا ہے۔ میں چونک اٹھتا ہوں کہ اگر برا ہی کہنا ہے تو اپنے نفس کو کیوں برا نہ کہوں؟"

آخر میں فرماتے ہیں:

"اگر ایک مدعیٔ اسلام میں صدقِ مقال نہیں تو اسلام میں سے کوئی چیز بھی نہیں۔ ولیس وراء ذالک من الایمان حبۃ خردل"

ایک مرتبہ دیر تک ملاقات کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ میں نے ایک عریضے میں شعلہ اصفہانی کا یہ شعر لکھ دیا:

آں بخت نہ داریم کہ ہم بزمِ تو باشیم ــــــ تا و سرِ راہِ تو و آہے و نگاہے

انہوں نے جواب میں تحریر فرمایا کہ اس شعر کا یہاں کیا موقع تھا:

"ایک حدیثِ قدسی ہے: من تقرب الی شبراً تقربتُ الیہ ذراعاً (جو ایک بالشت میرے قریب آتا ہے میں ایک ہاتھ اس کے قریب جاتا ہوں) عمر بھر میری یہ کوشش رہی ہے کہ اس وصف کے تخلق سے محروم نہ رہوں۔ اب بھی اس پر عامل ہوں اور عامل رہوں گا: ع ہزار بار برو صد ہزار بار بیا"

مضمون بہت طویل ہو گیا۔ لیکن جو کچھ کہنا چاہتا تھا، نہ کہہ سکا۔ وہی عرفی والی بات ہوئی کہ ؎

زباں زنکتہ فروماند و رازِ من باقیست ــــــ بضاعتِ سخن آخر شد و سخن باقیست

آخر میں مولانا کی تحریر کا ایک اقتباس پیش کرتا ہوں جو ان کے ایک طویل مکتوب سے ماخوذ ہے۔ کچھ علمی بحثیں فرما رہے تھے کہ خلافِ عادت ان کے قلم سے یہ الفاظ بے اختیار نکل گئے۔ فرماتے ہیں:

"افسوس ہے کہ زمانہ میرے دماغ سے کام لینے کا کوئی سامان نہ کر سکا۔ غالب کو تو صرف اپنی ایک شاعری کا رونا تھا۔ نہیں معلوم میرے ساتھ قبر میں کیا کیا چیزیں جائیں گی ؎

نارَوا بود بہ بازارِ جہاں جنسِ وفا ــــــ رونقے گشتم و از طالعِ دکاں رفتم

بعض اوقات سوچتا ہوں تو طبیعت پر حسرت و الم کا ایک عجیب عالم طاری ہو جاتا ہے۔ مذہب، علوم و فنون، ادب، انشاء، شاعری، کوئی وادی ایسی نہیں جس کی بے شمار نئی راہیں مبدء فیاض نے مجھ نامراد کے دل و دماغ پر نہ کھول دی ہوں اور ہر آن، ہر لحظہ بخششوں سے دامن مالا مال نہ ہوا ہو۔ بحدیکہ ہر روز اپنے آپ کو عالمِ معنی کے ایک نئے مقام پر پاتا ہوں اور ہر منزل کی کرشمہ سنجیاں پچھلی منزلوں کی جلوہ طرازیاں ماند کر دیتی ہیں لیکن افسوس جس ہاتھ نے فکر و نظر کی ان دولتوں سے گرانبار کیا، اس نے شاید سر و سامانِ کار کے لحاظ سے تہی دست رکھنا چاہا۔ میری زندگی کا سارا ماتم یہ ہے کہ اس عہد اور محل کا آدمی نہ تھا مگر اس کے حوالے کر دیا گیا۔"

یہ جو کچھ فرمایا گیا ہے نہ سخن گستری ہے، نہ تعلّی بلکہ سراسر حقیقت ہے، کاش مجھے اندازہ شناسی میں سنائی کا درجہ نصیب ہوتا تو اس کی زبان سے کہتا:

سالہا باید کہ تا یک مردِ حق پیدا شود
بایزید اندر خراساں یا اویس اندر قرن

علاّمہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفیؔ

رحمت قطبی

ایک فن کا واقف ہی اس کے ماہر یا استاد کی شان میں کچھ کہہ سکتا ہے۔ عام اہلِ علم کی تنقید کے ماہر ایک اعلیٰ نقاد کی، لسانیات کی واقفیت رکھنے والا ایک بے نظیر نقاد کی توصیف یا اعتراف میں کچھ کہنے کا اہل ہوا کرتا ہے۔ یادش بخیر آج جس بزرگ کی زندگی کا تذکرہ مقصود ہے اس کی ذاتِ گرامی لاتعداد کمالات اور فضیلتوں کا مجموعہ ہے جن کی معترفانہ تصریح کے لئے بھی ایک ممتاز شخصیت کی ضرورت ہے، اس واسطے اس فرض کو اوروں کے لئے چھوڑ کر جو ہر طرح اس کے ادا کرنے کے اہل ہیں میں علامہ کیفیؔ کی روزانہ زندگی کے چند ایسے کوائف کا ذکر کروں گا جو ان کی شخصی زندگی اور ان کے کردار پر روشنی ڈالتے ہیں اور ادب سے متعلق ان کے بعض نظریوں کو اجاگر کرتے ہیں۔

"میں اسی موضوع پر لکھ سکتا ہوں جس کو میرے شعور نے احاطہ کیا ہوا ہو۔ آہنگ کی بلند لفظی یا معنوی لفظ بازی تم کو میری نثر یا نظم میں کہیں نہ ملے گی۔"

"چونکہ میں ہمہ اوست کے مسلک کا سالک ہوں اس لئے مجھ کو ضرورت نہیں کہ عرش سے پرے جا کر اپنا آشیاں بناؤں اور جبکہ دوئی اور انوکھا پن مجھ سے کوسوں دور ہے تو غیریت اور اجنبیت میرے وہم و گمان میں کس طرح سما سکتی ہے۔"

ایک بار انھوں نے فرمایا کہ ایک دفعہ کسی شخص نے تاکیدی خط بھیجا اور دریافت کیا کہ آپ شعر کس طرح کہتے ہیں؟ آپ نے جواب میں لکھا۔ تمہارے سوال کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا کہ میں یا کوئی شاعر کس حالت میں شعر کہتا ہے مثلاً یونان کا سارا فلسفہ فلسفیوں کی چہل قدمی کرتے ہوئے وجود پذیر ہوا ہے۔ خیر سُننئے میں اسی حالت میں شعر کہہ سکتا ہوں جب میرا ذہن کسی خارجی حقیقت سے متاثر ہو یا جذبۂ صادقہ کی تحریک ہو محض کہنے کے لئے یا فرمائش کی تعمیل میں کبھی شعر نہیں کہا کرتا۔ میں کبھی مضامین وغیرہ کہ جو موضوع سے تعلق رکھتے ہوں نوٹ نہیں کیا کرتا۔ ناول ہو یا افسانہ، نظم ہو یا ڈراما، اس کا مقصد اور رمزی افراد یا کردار میرے ذہن میں مرتب ہوتے ہیں اور میں لکھنا شروع کر دیتا ہوں۔ اب رہی غزل، اگرچہ اس میں مضمون کے تسلسل کی پابندی لازم نہیں ہے اور میری غزلیں عموماً مسلسل ہوتی ہیں جو بظاہر نہیں ہوتیں، ان میں بھی تخیّل کا ایک قسم کا باہمی واسطہ مضمر ہوتا ہے۔"

کئی بار اس کا بھی اقرار کیا کہ "اگرچہ فارسی بہت پڑھی اور سو دو سو شعر بھی کہے مگر میں اپنے تئیں فارسی کے شاعروں میں شمار نہیں کرتا۔" مجھے چونکہ آپ کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہے آپ کے مجموعۂ کلام "واردات" میں سے ایک غزل نکال کے سامنے رکھ دی جس کے دو شعر آپ

بھی سنئے ــ

استوارم لیک زآشوب زماں ایمن نیم — سایہ بر آبم ز سر دیوار افتادہ ام
زاہدا جذب کشش دارد چہ خاک کوئے کدہ — بار بار استادہ گشتم بار بار افتادہ ام

تبسم کے ساتھ فرمایا کہ "ہاں یہ شعر بُرے نہیں مگر ایک تقریب سے وابستہ ہیں جو میرے عزیز دوست لالہ سری رام صاحب "مؤلف" خمخانۂ جاوید" کی ذات سے تعلق رکھتی تھی اس لئے دل سے لگے گئے ہیں۔ وہ کشمیر تشریف لے گئے ہیں وہاں ملازم تھا اور احباب بھی لالہ صاحب کو جانتے تھے اور اردو ادب سے متعلق ان کے مساعی کے مدّاح تھے۔ تجویز ہوئی کہ ان کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا جائے اور طرحی مشاعرہ بھی منعقد ہو۔ یہ غزل فارسی کی طرح میں ہوئی۔"

ایک دفعہ کا واقعہ ذکر کے قابل ہے کہ دوپہر کو آپ کے آرام کرنے کا وقت تھا کہ دو صاحب تشریف لائے خاصی دیر تک بیٹھے رہے اور ادبی باتیں بگھارتے رہے جیسے غالب کے بعض اشعار کی تشریح، فلاں شعر وزن میں ٹھیک ہے یا نہیں، فلاں محاورہ صحیح باندھا گیا ہے یا غلط؟ ملاقاتیوں کا لہجہ سائلانہ بھی تھا اور ناقدانہ بھی۔ آپ بہت سہولت سے ان کو جواب دیتے رہے۔ ایک صاحب نے کہا "میاں یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ کیونکہ اس کا تعلق اُردو کے روزمرہ سے ہے۔" میں اس ملاقات کے وقت موجود تھا۔ جب وہ لوگ چلے گئے تو میں نے عرض کیا۔ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ یہ وہ صاحب تھے جو آپ کے کلام پر ایراد و تعریض کرتے ہیں۔ آپ مسکرائے اور فرمایا "میاں کیا میں ان کو یہاں سے نکلوا دیتا؟ یا ان سے شکایت کرتا؟ یہ دونوں باتیں میری شان کے خلاف تھیں تم دیکھو گے کہ وہ پھر آئیں گے اور ان کو تم بدلا ہوا پاؤ گے۔" چنانچہ بعد میں ایسا ہی دیکھا گیا۔

دہلی میں ایک صاحب کہیں سے آ ٹپکے ہیں اور اپنے آپ کو نظامی عروضی کا ہمرتبہ سمجھتے ہیں ایک دن وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اتفاق سے میں بھی موجود تھا۔ انہوں نے لکھنؤ کے کسی شاعر کا ایک شعر پیش کیا اور پوچھا اس میں کیا عروضی نقص ہے؟ جواب میں آپ نے فرمایا "شاید آپ کو میری ادبی مصروفیتوں کا علم نہیں اور نہ یہ معلوم ہے کہ کن کن اعتراضوں نے مجھے دبا رکھا ہے۔ معانی و بیان کو تو الگ رکھیے اردو کے تلفظ پر جو تازہ حملے ہو رہے ہیں ان کا دفاع مشکل سے ہوتا ہے پھر اتنی فرصت کہاں کہ فلاں شاعر نے بحرِ متدارک کا زحاف بحرِ متقارب میں استعمال کر لیا ہے۔" اور لکچر کے انداز میں فرمایا "یہ وقت ہے کہ سارے اردو والے یک دل اور ہم آہنگ ہو کر اردو کے مستقبل کے لئے سوچیں اور کمر باندھ لیں کہ اس پر ہرگز ہرگز آنچ نہ آنے دیں گے۔" ملاقاتی نے کہا کہ جناب یہ تو بالکل درست ہے جو آپ نے فرمایا۔ لیکن اس شعر کے وزن کے متعلق کیا رائے عالی ہے؟ آپ ہنسے اور فرمایا "آپ شاید بیٹھے بیٹھے غیر حاضر بھی ہو جایا کرتے ہیں۔ میاں تم اپنی کسی دھن میں ہو گئے میں سوال کا جواب دے چکا ہوں۔"

خاکسار کو عروض پر عبور نہیں ہے صرف بحور وغیرہ کا نام جانتا ہوں میں نے ان سے کہا کہ کیفی صاحب نے زحاف کی بابت کچھ فرمایا تو تھا۔ وہ محجوب ہوئے اور ہاں ہاں کر کے رہ گئے۔

آپ کی روزانہ زندگی کے بعض واقعات ایسے ہیں جو ادھر آپ کی وسیع الاخلاقی پر روشنی ڈالتے ہیں، تو ادھر نفسیات کے عجیب اور دشوار نکتے پیش کرتے ہیں۔ سنئے ایک واقعہ جس کا مجھے پورا علم ہے۔ ایک صاحب جو اکثر آیا کرتے ہیں، آئے ہیں اور نہایت منت سماجت اور لجاجت سے مشاعرے کی صدارت کی درخواست کرتے ہیں جو انہیں کے اہتمام سے ہو رہا تھا۔ علامہ کیفی اپنی بیاری اور جسمانی ناقابلیتوں کا ذکر کر کے فرماتے ہیں "تم دیکھتے ہی ہو جو میرا حال ہے۔ کسی جگہ میں مشاعرہ والے کا وقت اور میرا یہ حال!" بہت معذرت کی مگر وہ نہ مانے۔ آخر یہ طے پایا کہ مشاعرے کے وقت سے کچھ پہلے وہ آئیں گے اور علامہ کیفی کو لے جائیں گے۔ اور یہ کہ علامہ موصوف صرف مشاعرہ افتتاح کر کے اور اپنی نظم سنا کے واپس پہنچا دئے جائیں گے۔ پندرہ بیس منٹ سے زیادہ ان کو وہاں نہیں رہنا پڑے گا۔ اگلے دن داعی نے ایک دفعہ زبانی قرارداد کی توثیق و یاددہانی کی اب وہ دن اور وقت آیا مگر نہ کوئی آپ کو لینے آیا نہ کسی قسم کی اطلاع و پیغام ہی آیا۔ اور اگلے دن اخباروں سے معلوم ہوا کہ وہ مشاعرہ ہوا اور خوب ہوا۔

ایک مہینے بعد داعی صاحب آئے مگر انہوں نے مشاعرے کے متعلق اپنی اس عہد شکنی کا ذکر تک بھی نہیں کیا۔ آپ نے جو کچھ ان کا کام تھا وہ کر دیا اور وہ چلے گئے۔ قریباً دو مہینے بعد وہ پھر آئے، ان کی فرمائش جو ادبی نوعیت کی تھی وہ پوری کر کے جب جانے لگے تو علامہ کیفی نے ان کو روکا اور فرمایا "تم دیکھ ہی رہے ہو کہ میں بوڑھا آدمی ہوں ایک زمانہ دیکھا ہے اور ہزاروں آدمیوں کو پرکھا ہے تم کو یہ بھی معلوم ہے کہ لوگ مجھے علامہ بھی کہتے ہیں۔ علامہ و لامہ تو میں نہیں مگر علم نفسیات کو میں نے بہت اچھی طرح پڑھا ہے لیکن تم نے مجھے خبردار کر دیا کہ اس شعبہ میں میری تحقیق اور مطالعہ ناقص ہے۔ میاں کیا تم بھول گئے کہ میری از حد معذرت کے باوجود بھی تم نے مجھ سے اس روز مشاعرے کی شرکت کا وعدہ لیا اور اگلے دن تحریر سے اس کی توثیق و یاد دہانی بھی کی۔ لیکن مشاعرے کے وقت تم کو وہ سب کچھ بھول گیا۔ اس کے بعد نہ زبانی نہ تحریر کے ذریعہ اس عہد شکنی کی معذرت کی، یہ تو یہ مہینے بعد آئے تو بھی اس کا ذکر نہیں اب پھر آئے تو اپنا کام کر کے جا رہے تھے کہ میں نے روکا۔ میں حیران ہوں کہ تم نے مجھ کو کیا سمجھا۔ دونوں ملاقاتوں کے وقت میں تمہارے چہرے کو غور سے دیکھتا رہا نہ اس میں شرم کی سرخی تھی نہ آنکھوں میں جھکاؤ تھا نہ خجالت کا کوئی پسینہ تمہاری پیشانی پر تھا۔ یہ تو ایسی ہی بات ہوئی کہ کوئی اپنے نوکر سے کہے کہ پانی کا گلاس لاؤ۔ جب وہ لائے تو کہا جاؤ لے جاؤ کس نے مانگا تھا۔" داعی صاحب کچھ کہنے کو ہوئے مگر کیفی صاحب نے ذرا سخت آواز سے ان کو روک دیا اور فرمایا۔ "آپ کی معذرت کی میعاد کبھی کی گزر چکی ہے۔ میں اس سلسلہ میں اب ایک لفظ بھی آپ کی زبان سے نہیں سننا چاہتا۔ میں نے اپنے ذہن میں فیصلہ کر لیا ہے کہ تیمور اور ہلاکو کی فہرست میں آپ کا نام لکھنا چاہیے۔ احساسات اور جذبات پر پورا قابو آپ کو جو ہے وہ آپ کو اس کا استحقاق بخشتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تیمور کی پیٹھ میں ایک سال تک سخت خارش رہی مگر اس نے ایک دفعہ بھی کھجلایا نہیں۔ اب میں نے آپ کی نسبت آپ کے معاملہ میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ ادبی امداد تو جہاں تک ممکن ہوگا روکی نہیں جائے گی لیکن آپ کی کسی بات پر اعتبار نہیں کیا جائے گا۔"

حضرت فرمایا کرتے ہیں "بعضوں کا خیال ہے کہ میں جھگڑالو یا طبیعت کا نہایت ذیاض ہوں یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ جو کوئی میرے سامنے کسی قسم کی بدی کرے میں اس کو بھولتا نہیں نہ مجھے غصہ آتا ہے۔ لیکن انتقام کو میں اپنے سے نیچے اور اپنی توہین سمجھتا ہوں" بارہا آپ نے اشعار میں فرمایا ہے اور آپ کا عمل بھی اسی اصول پر ہے کہ بدی کے بدلے میں بدی کرنا بدی کی زندگی کو بڑھانا ہے گھٹانا نہیں۔ کسی شخص نے بری بات کہی، اب اس کا جواب دینا گویا اس برائی میں شرکت کرنا ہے۔

جنوری ۱۹۵۴ء میں آپ کی سالگرہ کے جشن کے موقع پر چار ہزار کی تھیلی جو پبلک کی طرف سے آپ کو پیش کی گئی وہ رقم آپ نے ادبی کاموں اور اداروں کی امداد کے لئے صرف کرنے کو بطور امانت منتظمانِ تقریب کے سپرد کر دی اور اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا "میرے متعلق احباب میں بعض غلط فہمیاں بھی ہیں۔ ایک ان میں سے یہ ہے کہ میں امیر آدمی ہوں، جو رقم ابھی پیش کی گئی ہے اتنا روپیہ کبھی میرے دستخط کے تحت نہیں ہوا۔ یعنی میں جس طرح چاہوں چار ہزار روپیہ صرف کر دوں۔ یہ رقم علمی اور ادبی ہی کاموں میں صرف ہونی چاہیے۔"

یہ سن کر مجھے یاد آیا کہ آپ نے کبھی فرمایا تھا کہ میری زندگی ایسی رہی ہے کہ ذکر کے قابل لین دین کی صورت کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ ہاں مجھے اس وقت قلق ہوتا تھا جب پیسے کی کمی کی وجہ سے میں اپنے مطلب کی کتاب خرید نہیں سکتا تھا۔ یا جب میں کسی اصلی حاجت مند کو تکلیف میں دیکھتا اور اپنی جیب کو خالی پاتا۔

سیاسی جد و جہد اور حصولِ آزادی کے سلسلہ میں علامہ موصوف کے مساعی کسی سے کم نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ محض کہہ بیٹھنے اور غل غپاڑہ مچانے کی آوازیں ان کے یہاں نہیں ہیں۔ چونکہ جو لوگ بہ ڈھول بجا کر ناموری حاصل کرنا چاہتے ہیں انہوں نے آج تک دنیا میں کوئی کام کر کے نہیں دکھایا۔ ہندو مسلمانوں میں باہمی اتحاد اور رواداری کی ترقی ان کی زندگی کا مقصدِ اعظم رہی ہے۔ اس بارے میں نہ صرف تحریر اور تقریر بلکہ ان کا عمل اور برتاؤ شاہد ہیں۔ ایسے آدمی دنیا میں کم ملیں گے جن کے قول اور فعل میں مکمل ہم آہنگی ہو۔ پچھلے بیس تیس برسوں میں خاص کر حصولِ آزادی اور بٹوارے کے سلسلہ میں وقت کے طوفان نے بہت سے

قدم جو استوار سمجھے جاتے تھے ہلا دیے۔ لیکن علامہ کیفی کے اصول اور طرزِ عمل میں سرِ مو بھی فرق نہ آیا۔ اس طوفان کے ابتدائی زمانے میں یہ منحوس خبر بھی کسی طرح شائع ہو گئی تھی کہ موصوف لائل پور میں قتل کر دیے گئے۔ اس پر ہندو اخباروں کے مقابلہ میں مسلم پریس کی آواز زیادہ جگر گداز اور اندوہناک تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ خبر غلط نکلی۔ یہ بھی توجہ کی بات ہے کہ آپ کی ۸۰ ویں سالگرہ کی تقریب میں پاکستان کے مشہور ادیب و صحافی مولانا عبدالمجید صاحب سالک نے یہ فرمایا: "حضرت کیفی کے مداح ہندوستان کی بہ نسبت پاکستان میں بہت زیادہ ہیں۔" میرے خیال میں علامہ موصوف کی صلح پسندی، صالحانہ زندگی اور باہمی رواداری سے متعلق اس سے زیادہ مضبوط شہادت اور کیا ہو سکتی ہے۔

علامہ موصوف کی قابلیت اور استعداد جس قدر جامع ہے اسی قدر ان کے اخلاق وسیع اور ان کا دل فراخ ہے وہ ہندوستان کے کسی باشندے کی عام اس سے کہ اس کا مذہب و ملت کیا ہے تحقیر و توہین گوارا نہیں کر سکتے۔ حال کی بات ہے کہ دہلی میں جشنِ جمہوریت پہلی دفعہ منایا گیا۔ لال قلعہ کے دیوانِ عام میں جشن سے متعلق ایک مشاعرہ منعقد ہوا جس کے افتتاح کی ذمہ داری موصوف سے منسوب تھی۔ چنانچہ آپ وقت پر تشریف لائے۔ دیوانِ عام بہت خوبصورتی سے سجایا گیا تھا آپ نے ادھر ادھر انتظامات دیکھ کر پوچھا کہ صدر اور شعراء کے بیٹھنے کی جگہ کہاں ہے؟ منتظمین نے "شاہ نشین" کی طرف اشارہ کیا۔ "شاہ نشین" وہ مقام ہے جہاں حضرت بادشاہ رونق افروز ہوا کرتے تھے۔ اتفاق سے راقم اس وقت علامہ کے قریب تھا۔ میں نے دیکھا کہ آپ کا مرجھایا ہوا چہرہ غصہ سے لال ہو گیا۔ جذبات اس قدر غلبہ آور ہوئے کہ مشکل سے یہ الفاظ ان کی زبان سے ادا ہو سکے "یہ مسلمانوں کے زعیم بادشاہ ظل اللہ (خدا کا سایہ) ہوتا ہے اور پھر بہادر شاہ جس کو قوم نے اولین جنگِ آزادی کا لیڈر مانتے ہوا اس کی نشست کی جگہ کی یہ بے حرمتی میں برداشت نہیں کر سکتا۔" پاس کے لوگوں نے بھی یہ سنا ان کے مزاج بھی بھڑکنے کو تھے اور منتظم گھبرائے ہوئے تھے کہ آپ کے واپس چلے جانے سے تقریب ہی درہم برہم نہ ہو جائے۔ غضبناک منتظموں کی انتہائی منت اور معذرت کے بعد آپ نے یہ منظور کیا کہ وہ "شاہ نشین" پر جا کر مشاعرہ کا افتتاح کر دیں گے اور جو نظم اس موقع کے لیے لکھی تھی وہ بھی اسی وقت پڑھ دیں گے مگر وہاں بیٹھیں گے نہیں۔ چنانچہ آپ نے بصد رنج و تاب "شاہ نشین" پر جا کر مشاعرہ کا افتتاح کیا اور کھڑے کھڑے نظم پڑھی۔ شری شنکر پرشاد صاحب چیف کمشنر دہلی نے جو صدرِ مشاعرہ تھے بہت زور دیا کہ آپ بیٹھیں ۔۔۔ مگر آپ چپ چاپ الٹے پاؤں نیچے اتر آئے۔ طبیعت اتنی کبیدہ ہو گئی تھی کہ فوراً ہی میری ہمراہی میں مکان پر چلنے کا ارادہ ظاہر فرمایا۔ سواری کا انتظام قلعہ سے باہر تھا۔ رات کا وقت اور سردی کا موسم پھر دیوانِ عام سے قلعہ کے لاہوری دروازے تک کا راستہ کئی فرلانگ سے کم نہیں اور آپ کی یہ پیرانہ سالی اور بیماری اس پر مستزاد۔ میں نے مودبانہ عرض کیا کہ قبلہ میں آپ کو اپنی پیٹھ پر آرام سے لے چلتا ہوں۔ فرمانے لگے "نہیں نہیں تو سید زادہ ہے کیوں مجھے گنہگار کرتا ہے؟" آخر نہ مانے اور میرا ہاتھ تھامے ہانپتے کانپتے قلعہ کے باہر پہنچے وہاں ایک ہنگامہ تھا کوئی سواری نہ مل سکی۔ آخر سائیکل رکشا پر سوار ہو چلے۔ راستہ اتنا ناہموار تھا کہ ہچکولے کھاتے کھاتے سارا بدن ٹوٹ گیا اور خدا خدا کر کے آپ کی قیام گاہ "سری نواس" ۱۷ علی پور روڈ پہنچے۔ جب آپ کو پہنچا کر میں واپس ہونے لگا تو ارشاد ہوا "میاں تمہیں معلوم ہے میں کتنی دیر "شاہ نشین" پر کھڑا رہا محسوس ہوا کہ انگاروں پر کھڑا ہوں اور جانتے ہو راستے کی یہ تمام صعوبتیں اتنی دیر کھڑے ہونے کا کفارہ ہیں۔" اللہ اللہ یہ اخلاق اور یہ تہذیب اب کہاں؟ زمانہ اپنا ورق الٹ چکا ہے وہ دور ہی پلٹ گیا ہے اور ماحول کا وہ سانچہ ہی ٹوٹ گیا ہے جس میں ڈھل کر آدمی انسان بنتے تھے۔ خدا ہماری اس ملی جلی گنگا جمنی تہذیب کی جھلملاتی شمع کو بادِ حوادث کے جھونکوں سے بچائے رکھے کہ اس کے بعد اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ یہ مشاعرہ دو دن تک ہوتا رہا مگر دوسرے روز منتظمین کو "شاہ نشین" چھوڑنا پڑا۔

اکتوبر ۴۸ء کا واقعہ ہے کہ شیخ مستجاب علی صاحب نے اپنی لڑکی کی شادی پر [illegible] علامہ کیفی کو شرکت کی دعوت دی۔ شیخ مستجاب علی کے والد سے کیفی صاحب کے دوستانہ ہی نہیں بلکہ برادرانہ تعلقات تھے اور ان تعلقات میں ایک عاشقانہ وارفتگی سی پیدا ہو گئی تھی۔ مستجاب علی صاحب کے والد کے انتقال کو نصف صدی سے زیادہ زمانہ گذر چکا ہے اور علامہ کیفی کی پیرانہ سالی انتہائی منازل کی طرف بڑھ رہی تھی مگر موصوف نے مستجاب علی صاحب

کی دعوت قبول کی اور باوجود ضعف و نقاہت جے پور شادی میں شرکت فرمائی اور پچاس روپے دُلہن کو سلامی میں دیئے۔ اہلِ جے پور نے علامہ کے آنے میں کالج کے سب سے بڑے ہال میں ایک بزمِ مشاعرہ موصوف ہی کی صدارت میں منعقد کی۔ مشاعرے کے سب سے آخر میں مولانا اطہر ہاپوڑی کی غزل پڑھی گئی۔ مولانا اطہر ہاپوڑی ایک کہنہ مشق شاعر ہیں اور ان کا شمار صفِ اول کے اساتذہ میں ہے اور ان کی ادبی خدمات جے پور ہی نہیں بلکہ سارے راجستھان میں بے بہا ہیں۔ نواب ممتاز الدولہ بہادر رئیسِ اعظم پہاسو و جاگیردار جے پور کی غزل پڑھی جانے والی تھی کہ علامہ کیفی نے فرمایا "مولانا اطہر کی غزل کے بعد کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنی غزل پڑھے مشاعرہ مولانا اطہر کی غزل پر ختم ہو چکا ہے اور اب میں کسی کو اجازت نہیں دے سکتا" چونکہ نواب ممتاز الدولہ ریاست کے رکنِ اعظم اور شعراء نواز تھے اس لئے اصرار کیا گیا کہ نواب صاحب کو پڑھوایا جائے۔ ان کے سیکرٹری جو غزل پڑھنی چاہتے تھے انہوں نے کہا کہ یہاں کا یہی طریقہ ہے کہ نواب صاحب کا کلام بوجہ رکنِ اعظم ریاست ہونے کے سب سے آخر میں پڑھا جاتا ہے۔ علامہ نے فرمایا "یہ وجہ میرے لئے قابلِ تقلید نہیں۔ میں ہرگز ہرگز اجازت نہیں دوں گا۔ میری صدارت میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ نواب صاحب، نواب صاحب ہیں اگر مہاراجہ جے پور بھی پڑھنا چاہیں تو میری صدارت میں یہ ناممکن ہے۔" اس کے بعد مولانا اطہر صاحب نے خود اسٹیج پر آکر علامہ سے درخواست کی کہ نواب صاحب کی غزل پڑھوا دیجئے کیونکہ وہ اُردو کے بڑے حامی ہیں اور شعراء پر ہمیشہ ان کے لطف و کرم کی بارش رہی ہے نیز ماہانہ بزمِ سخن کا جلسہ بھی نواب صاحب کے دولت کدہ پر ہوتا ہے جس سے اُردو کی ترقی متصور ہے۔ یہ سب سُن کر بھی علامہ کیفی نے فرمایا کہ "میں ان دلائل کو قبول کرتے ہوئے بھی اپنی صدارت میں آپ کے بعد کسی کو پڑھنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ میں مشاعرہ ختم کر چکا ہوں اور صدارت کے فرائض بھی ختم ہو چکے ہیں" یہ کہہ کر دوسری کرسی پر بیٹھ گئے اور مولانا اطہر صاحب سے کہا کہ "اب آپ اس کرسیٔ صدارت پر تشریف رکھئے" لیکن مولانا اطہر صاحب نے بھی اس کو سوءِ ادب خیال کر کے یہ جرأت نہیں کی کہ علامہ کے بعد ان کی کرسی پر بیٹھیں۔ غرضیکہ نواب صاحب کی غزل ان کے سیکرٹری نے پڑھ کر سُنائی۔ اسی حالت میں کہ کرسیٔ صدارت خالی تھی۔ اسے خرقِ مراتب کہئے یا اصول پرستی۔ دراصل علامہ موصوف کی وضعداری کی یہ ایک معمولی مثال ہے۔ زندگی کا جو ضابطہ اور اصول انہوں نے بنا لیا ہے کیا مجال کہ دنیا کی کوئی طاقت اسے ادھر سے اُدھر کر سکے۔

جو حضرات علامہ کیفی کے ادبی کارناموں ان کے تبحرِ علمی و جہانگیر واقفیت اور ہمہ گیر ادراک سے واقف ہیں اور جانتے ہیں جو تبحر موصوف کو مشرق اور مغرب کے قدیم و جدید ادب اور ثقافت میں حاصل ہے ان کو بھی یہ دیکھ کر ایک قسم کی حیرت ہوتی ہے کہ ہندی اور ہندو قوم پر بھی ان کا احسان کم نہیں۔ ہندی کے جوشیلے اور متعصب حضرات ان کو "پنڈت" کی جگہ "مولوی" خطاب دیں، خواہ مسلمان پکاریں لیکن جو احسان ان کا ہندی زبان اور ہندو قومیت پر ہے وہ فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی حیثیت واقعاتی اور تاریخی ہے جس کی مجمل تفصیل یہ ہے کہ ۱۹۰۵ء میں انہوں نے ایک مسدس تصنیف کیا جس میں ہندوؤں کی گذشتہ زمانے کی قومی عظمت، شائستگی اور ادب و مشرقی علوم میں ایجاد و ترقی کا ذکر کر کے اس وقت کی گری ہوئی حالت کی سچی تصویر کھینچ کر ہندوؤں کی غیرت اور خودداری کو جگایا اور رشک و حسد سے بچتے ہوئے ترقی کا سیدھا راستہ بتایا۔ خواجہ حالی اپنے مسدس میں مسلمانوں کے بارے میں جو کچھ لکھ چکے تھے وہ آپ کی نظر میں تھا ہی۔ آپ نے اس پر یہ اضافہ کیا کہ ایک سرسری سا پروگرام آئندہ کے لئے پیش کیا۔ یہ نوٹ کرنا ضروری ہے کہ اس وقت تک ہندی زبان میں قومی ادب اور وطنی شاعری کی بنیاد نہیں پڑی تھی۔ لوگ بڑے غفلت کے نشہ کے خمار میں ہی گرفتار رہتے اور نہیں جانتے تھے کہ اُٹھ کر کچھ کام کریں یا پڑے ہوئے جمائیاں اور انگڑائیاں لیتے رہیں۔ علامہ کیفی کی تصنیف "بھارت درپن" نے ہندو ذہنیت کو زور سے جھنجھوڑا اور اس کی دُکھتی رگوں کو ایسا مسوسا کہ بیداری کے آثار پیدا ہونے لگے۔ ہندوؤں کا شعور اس جانچ میں پڑ گیا کہ ان کی موجودہ حالت گذشتہ زمانے کے مقابلہ میں کتنی گری ہوئی ہے۔ مختصر یہ کہ جو بیج بھارت درپن نے بویا تھا وہ پنپتا رہا اور شری میتھلی شرن گپت کی کتاب بھارت بھارتی کی شکل میں بار آور ہوا جو بھارت درپن کے دس بارہ برس بعد شائع ہوئی۔ گپت جی نے اپنی کتاب کے دیباچہ میں دونوں مسدسوں یعنی مدّ و جزرِ اسلام اور بھارت درپن سے مستفید ہونے کا اقرار کیا ہے۔ ان کے قلم سے نکلے ہوئے یہ چند الفاظ ہیں

کافی ہیں :

"میں نے حالی اور کیفی کی مسدسوں سے بھی لابھ (فائدہ) اٹھایا ہے اور میں ان کے پرتی (نزدیک) ہاردِک (دلی) پرتگیہ (شکریہ) پرگٹ (ظاہر) کرتا ہوں۔"

حقیقت یہ ہے کہ قومی اور وطنی شاعری کے باب میں علامہ کیفی ہندی کے استاد تسلیم کئے جانے چاہئیں۔

حضرت عزیز لکھنوی کا مجموعۂ کلام "گل کدہ" شائع ہوا۔ انہوں نے تبصرہ کے لئے ایک کاپی مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں بھیجی۔ مولانا آزاد نے اس پر دو اعتراض وارد کئے ایک یہ کہ لفظ "تحریک" آمادہ کرنے کے معنی میں فارسی میں مستعمل نہیں ہے بلکہ فارسی اور عربی میں اس کے معنی حرکت کے ہیں۔ دوسرا اعتراض یہ تھا کہ لفظ "مستی" ایک مبتذل لفظ ہے اور عزیز لکھنوی چونکہ غالب اسکول کے پیرو ہیں اس لئے ان کو یہ لفظ استعمال نہیں کرنا چاہئے تھا۔ مصرعہ یہ تھا — "سامنے آئینہ تھا مستی تھی۔"

عزیز لکھنوی نے پہلے اعتراض کی تردید میں لفظ "تحریک" کی سند میں عرفی کا شعر پیش کیا اور لفظ "مستی" کے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد کے اعتراض کو قبول کر لیا۔ مولانا اطہر ہاپوڑی نے مولانا آزاد کی تردید میں ایک مضمون لکھا جو رسالہ مخزن میں شائع ہوا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ لفظ "تحریک" کے متعلق جو سند عزیز صاحب نے پیش کی ہے وہ کافی ہے۔ لفظ "مستی" کے متعلق مولانا اطہر نے اننداونزک کا فلسفہ پیش کیا اور لکھا کہ کسی لفظ کی ذات میں ابتذال نہیں ہوتا۔ یہ شاعر اور ادیب کا فرض ہے کہ اس کو قرینے سے استعمال کرے۔ خود مرزا غالب کے اس شعر میں ؎

ہم سے کھل جاؤ بہ وقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کے عذرِ مستی ایک دن

وہ ابتذال موجود ہے جس کی طرف مولانا آزاد نے اشارہ کیا ہے اور پھر مولانا اطہر نے اپنا یہ شعر پیش کیا ؎

ان آنکھوں میں مستی بھی ہے، شوخی بھی، حیا بھی:
لیکن نہیں، دیکھی تو مروت نہیں دیکھی

اور لکھا کہ اس شعر میں لفظ مستی بغیر عطف و اضافت نظم ہوا ہے۔ لیکن ابتذال کا شائبہ بھی نہیں۔ اس مضمون کے شائع ہونے کے بعد منشی احمد علی شوق قدوائی ایڈیٹر آزاد نے ایک مضمون لکھا اور کہا کہ عزیز لکھنوی ہیں اور آزاد دہلوی اور دونوں اپنی زبان میں پختہ اور ماہر ہیں اطہر ایک ہاپوڑ کا رہنے والا آدمی جو نہ دلی کی زبان سے واقف نہ لکھنؤ کی اس کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ دو اہلِ زبان ادیبوں کے معاملہ میں دخل دے۔ مولانا اطہر نے تو اس بات کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا لیکن علامہ کیفی نے مولانا اطہر کی تائید میں ایک مضمون لکھا جو مخزن میں شائع ہوا جس میں موصوف نے مشورہ دیا کہ اگر ہمیں اُردو کو بین الاقوامی زبان بنانا ہے تو یہ ضروری ہے کہ اہلِ زبان اور زبان دانی کے دعووں سے منہ موڑ کر تمام اختلافات کو ختم کرنا چاہئے اور یہ خلیج ہندوستانی و پنجابی، دہلوی و لکھنوی حضرات کے درمیان حائل ہے، ہمارا فرض ہے کہ اسے پاٹ کر اُردو کے دامن کو وسیع کریں۔ تب ہی تو علامہ کیفی "بابائے اُردو" ہیں کہ وہ تمام دنیائے اُردو کو ایک ہی کنبہ اور برادری سمجھتے ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ ایک مرتبہ علامہ نے شوکت سبزواری کو خط میں لکھا تھا کہ :

"جہاں تک اُردو کا تعلق ہے میں ہندوستان و پاکستان کو دو ملک نہیں سمجھتا۔"

پہلے بھی ذکر آیا ہے کہ ہندی والے آپ کو طنزاً "مولوی کیفی" لکھا کرتے تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ آپ جو دیکھتے یا پڑھتے ہیں وہ ذہن میں محفوظ ہو کر شعور میں جذب ہو جاتا ہے ان کے مجموعۂ کلام واردات میں ہندو اور مسلمان بزرگوں اور واجب التکریم شخصیتوں کی شان میں بہت سی نظمیں ہیں یہاں صرف ایک کا ذکر کیا جائیگا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زندگی کے ایک واقعہ کا ذکر علامہ شبلی نے اس طرح کیا ہے کہ آپ چند آدمیوں کے ساتھ کسی جگہ

جا رہے تھے۔ رستے کے کنارے پر ایک سرسبز درخت دیکھ کر آپ کھڑے ہو گئے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ بڑبڑا رہے تھے "کاش میں بھی ایک درخت ہوتا"۔ لوگوں نے حیرانی سے پوچھا کہ حضرت کیا بات ہے؟ ارشاد ہوا "اس درخت کی زندگی پر غور کرو۔ اس کی افادیت اور فیض رسانی تقلید کے قابل ہے۔ اس کا سایہ، اس کے پتے، اس کا پھل کتنے انسانوں اور حیوانوں کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں یہاں تک کہ جب یہ اس قابل نہیں رہتا کہ اس کی ذات سے استفادہ ہو سکے تو کڑیوں اور تختوں کی صورت میں تمہارے گھر کی حفاظت کرتا ہے اور تم کو دھوپ اور بارش کی تکلیف سے بچاتا ہے۔ ہم انسانوں میں کتنے ایسے ہیں جو تمام عمر بلکہ موت کے بعد بھی خلق اللہ کی خدمت کرتے ہیں" یہ نظم اس قابل ہے کہ بلا قید مذہب و ملت اس کا مضمون ہر شخص کا جزوِ اعظم ہونا چاہئے۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اس وقت تک بے شمار ہندو مسلمان شاعر اور سخن گو ہو چکے ہیں اور صحابہ کرامؓ کے حالات اور سوانح عمری سبھی کو معلوم ہیں مگر آج تک کسی کو نہ سوجھا کہ اس واقعہ کو نظم کا جامہ پہنائے۔ جی چاہتا تھا کہ وہ نظم یہاں نقل کروں مگر طوالت کے خوف سے صرف آخر کا بند پیش کیا جاتا ہے:-

بتاؤ تم میں ایسا رحم دل انسان ہے کوئی ۔۔۔ شجر کی مثل فیض اور شفقتوں کی کان ہے کوئی

بدی کا بدلہ دے نیکی میں کیا آسان ہے کوئی ۔۔۔ ہے کوئی جس سے ایسا کا نہیں امکان ہے کوئی

حضور ایزدی میں بار بس مدہ کو اگر ہوتا

یہی درخواست کرتا کاش میں بھی اک شجر ہوتا

"صحبتِ شاہ نہ صدیث می خیزد" والا مضمون ہے۔ دراصل علامہ کیفیؔ کی زندگی ایک عظیم داستان ہے اور میں حیران ہوں کہ ان کی کن کن باتوں کا ذکر کروں کہ ان کی بات بات ہمارے لئے پند و موعظت کا ایک دفتر ہے لہٰذا ؎

سفینہ چاہیئے اس بحرِ بے کراں کے لئے

انگریزی میں آپ کی قابلیت نہایت اعلیٰ درجے کی ہے۔ انگریزی ادب پر آپ اتنے ہی حاوی ہیں جتنے اپنے اردو اور فارسی ادب پر۔ فرائڈ اور مارکس کے نظریوں پر انگریزی کے پروفیسروں سے بحث کرتے ہوئے میں نے ان کی طرّاری اور بیدار مغزی دیکھی ہے۔ یونیورسٹیوں میں آپ کے توسیعی لکچر اور آل انڈیا اورینٹل کانفرنس وغیرہ میں صادق مقالے تحقیق اور استدلال کا خزانہ ہوتے ہیں۔ ان کی نظیر چند مخصوص تخصیصوں کے سوا انگریزی تعلیم یافتوں میں کم ملتی ہے۔

آپ کی اردو زبان کی واقفیت ابتدا سے لے کر آج تک کی ہے اور اس کا مطالعہ حال کے سائنٹیفک طرز اور اصول پر ہے۔ چونکہ سنسکرت اور عربی سے بھی آپ بالکل ناواقف نہیں اس لئے اپنے مقالوں، خاص کر اپنی عہد آفرین کتاب کیفیہ میں زبان سے متعلق جہاں کہیں آپ کسی امر سے بالمقابل بحث کرتے ہیں تو پڑھنے اور سننے والے حیران رہ جاتے ہیں۔ آپ کی تحقیق کا طریق بھی اپنا ہی ہے۔ راقم کو یاد ہے آپ نے فرمایا تھا اگرچہ سنسکرت شاعری میں سولہ سنگار کا وضاحت سے ذکر ہے۔ لیکن اس میں مہندی کا لفظ نہیں آیا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بعض دوسری چیزوں کی طرح مہندی بھی باہر سے آئی ہوئی ہے۔ یہ بات راقم کی سمجھ میں نہیں آئی کیونکہ مہندی شادی وغیرہ تہواروں کے مراسم میں ہندو مسلمانوں کے یہاں ایسی رچی پچی چیز ہے کہ باہر سے آئی ہوئی نہیں معلوم ہوتی میں چپ ہو گیا اور بات آئی گئی ہوئی۔ ایک دن میں خدمت میں حاضر تھا کہ دہلی کا ہفتہ وار اخبار "ریاست" مورخہ ۸ ستمبر ۱۹۵۲ء آیا۔ آپ کام میں مصروف تھے۔ مجھ سے کہا دیکھو اس میں کوئی خاص بات ہے؟ ریاست کے ایڈیٹر سردار دیوان سنگھ مفتون اپنے قارئین کے جذبات کا پورا لحاظ رکھتے ہیں۔ ان کے اخبار میں "جذباتِ مشرق" ایک مستقل عنوان ہے۔ جس اشاعت کا ابھی ذکر ہوا ہے اس میں عنوان مذکورہ کے نیچے "سولہ سنگار" ذیلی عنوان تھا اور بھاشا کے مشہور شاعر کیشو کا ایک مشہور کبت دیا ہوا تھا جس میں سولہ سنگار کی اشیاء گنائی گئی تھیں۔ ان میں ایک لفظ "جاوک" بھی آیا تھا جس کے معنی مہندی لکھے ہوئے تھے۔ میں نے علامہ موصوف کو اس کبت کی طرف متوجہ کیا۔ آپ نے فرمایا یہ ترجمہ غلط ہے۔ مہندی یقیناً مسلمانوں کے ساتھ

ہندوستان آئی۔ یہاں دلہن اور جوان عورتوں کے ہاتھ پاؤں سُرخ رنگ سے ضرور رنگے جاتے تھے مگر وہ لاکھ کا ایک مرکب ہوتا تھا جسے "جاور" کہتے ہیں۔ جاور کی ٹکیاں پہلے پنساریوں کے یہاں بکا کرتی تھیں آج کل کا حال معلوم نہیں۔ آپ نے ہندی ڈکشنری الماری میں سے منگوائی اور مجھ سے فرمایا! اس میں وہ لفظ دیکھو۔ چنانچہ اس میں بھی "جاوک" کے معنی لاکھ یا جاور لکھے تھے۔ کمار سمبھو جس کا اردو منظوم ترجمہ حضرت منور لکھنوی کا شائع ہوا ہے نکالا گیا تو معلوم ہوا کہ پاربتی جی کے عروسی سنگار کی اشیاء میں بھی لاکھ اور جاور ہی کا ذکر ہے۔ دلّی یونیورسٹی کے سنسکرت شعبہ کے صدر سے آپ نے درخواست کی کہ کام سوتر میں پتہ لیں کہ مہندی کا ذکر ہے یا نہیں۔ وہاں سے بھی نفی میں جواب ملا۔ آیورویدک کی کتاب مفردات میٹریا میڈیکا سے بھی استفادہ کیا گیا اس میں بھی مہندی کا پتہ نہ چلا۔ آخر ماننا پڑا کہ مہندی اصلی ہندوستانی چیز نہیں ہے۔ ان تحقیقات کی وجہ سے شہر کے ایک حلقہ میں اس بات کا چرچا ایک مدت تک رہا۔

علامہ موصوف کی روزانہ زندگی سادگی کے ساتھ کچھ ایک غیر معمولی رہی ہے۔ فرماتے ہیں "جب سے ہوش سنبھالا قبض کا علم ہوا۔ جوں توں کام چلتا رہا آخر تیس برس بعد سے اس نسخے پر کاربند ہوں کہ علی الصباح بغیر کچھ کھائے چائے پیتا ہوں جس میں دودھ کی مقدار کم ہوتی ہے اور پھر حقہ کا شغل ہوتا ہے۔ اس عمل سے قبض کی شکایت رفع ہو گئی۔ آپ ناشتہ نہیں کرتے، بارہ بجے کے قریب کھانا جسے لنچ کہئے کھاتے ہیں۔ ہاں تیسرے پہر کو چائے کے ساتھ میوہ یا کوئی کھانے کی چیز ضرور ہوتی ہے۔ پھر موسم کے مطابق رات کے آٹھ نو بجے رات کا کھانا۔ دودھ کا شوق نہیں ہے۔ میووں میں آم اور خربزہ بہت پسند کرتے ہیں۔ آپ کو سادہ کھانے بہت پسند ہیں۔ تکلفاتی کھانوں سے گھبراتے ہیں۔ حقہ کا بہت شوق ہے۔ برسوں ان کا حقہ اور قلم برابر چلتے رہے۔ چودہ پندرہ گھنٹے نوشت و خواند کی مصروفیت انضباط کے ساتھ رہی۔ ابتدا میں ڈنٹر، مگدر کی ورزش اور پھکیتی وغیرہ کی کسرت ضرور کی تھی مگر بعد میں یہ سب چیزیں چھوٹ گئیں۔ جب کبھی ہوا خوری کا ذکر آتا تو فرماتے "اس کے لئے وقت نہیں نکالا جا سکتا"۔ کھانے میں سبزیاں زیادہ پسند ہیں۔ لحم سے پرہیز نہیں لیکن اس کا استعمال کم کرتے ہیں۔ یہی حال انڈے اور مچھلی کا ہے۔ کیونکہ طبیعت سادگی پسند تھی اور اوّل ہی سے کردار حمیدہ کی پابندی اور تہذیبانی ناہنجاری سے نفرت رہی جس کا نتیجہ بقول آپ کے یہ تھا کہ ڈاڑھ کی تکلیف کے سوا آپ کبھی بیمار نہیں ہوئے۔ فرماتے ہیں "ہاضمہ یا معدے کی تکلیف کبھی نہیں ہوئی۔ دہلی چھوڑنے اور پنجاب جانے کے بعد بخار کبھی نہیں ہوا۔" فرماتے ہیں شاید دائمی ادبی سر دردی کی وجہ ہو یا کچھ، سر کے درد کی بھی شکایت کبھی نہیں ہوئی۔ منشیات اور مسکرات سے ہمیشہ پرہیز رہا۔ جہاں جہاں گئے ادبی انجمنوں کے ساتھ ٹمپرنس سوسائٹیوں کی بھی بنیاد رکھتے گئے۔

یہ حالات ۱۹۵۸ء کی مئی تک ہیں اس منحوس مہینہ میں یکایک بیماریوں کا شکار ہوئے جن سے اب تک چھٹکارا نہیں ملا ہے۔ وجع مفاصل، اختلاجِ قلب، اور خون کی از حد کمی وغیرہ خاص شکایتیں تھیں۔ اگرچہ علاج اور پرہیز میں کوئی کمی نہیں تھی مگر جو تکلیفیں تھیں وہ بالکل رفع نہیں ہوئیں ان کی شکلیں بدلتی رہیں اور ان میں اتار چڑھاؤ ہوتی رہی۔ اس وقت وجع مفاصل کی از حد تکلیف آپ کو ہے۔ مہینے میں دو تین بار تنفس اور قلب کے دورے بھی پڑتے رہتے ہیں۔ پچھلے جاڑوں میں دل اور سانس کا بہت سخت دورہ پڑا۔ کئی دن تک مایوسی کی حالت اوپر والوں پر طاری رہی۔ آپ نے کچھ نوٹ ایک صاحب کو دیئے اور کہا کہ "انہیں رکھ چھوڑو یہ آخری وقت کے لئے ہیں نہیں کہہ سکتے وہ گھڑی کتنی دیر میں آنے والی ہے۔" ہم لوگ جوان کی دیکھ بھال کرتے تھے بہت غمگین اور مایوس ہوئے۔ دل افزائی اور تسلی کا تو کیا ذکر ہے کوئی لفظ ہماری زبان سے نہ نکل سکا۔ آپ نے کروٹ بدلوائی اور سانس کی ذرا خوشامد کر کے مسکرانے لگے۔ اب ہم کو ذرا جرأت ہوئی اور پوچھا کہ کیا بات ہے فرمایئے۔ کمزوری بہت تھی۔ دھیمی آواز میں مسکراتے ہوئے ارشاد کیا۔

"وہ عزرائیل ہو یا یم راج میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اس نے فیض بازار کے ڈاکٹر داور سے سازش کی ہوئی ہے کہ یہ بڈھا بڑا پاپی ہے تم اس کو زندہ رکھو تا کہ ہم اس کے اعمال کی سزا میں اس کو پوری دے لیں دوزخ اس کو قبول نہ کرے گا۔"

ہم لوگ کچھ نہ کہہ سکے۔ سوائے اس کے کہ یہ آپ کیا فرما رہے ہیں اور کئی آنکھیں نم آلود بھی ہو گئیں۔

ڈاکٹر ایچ۔ آر۔ داور دہلی کے مشہور ڈاکٹر ہیں اور کیفی صاحب کے بڑے عقیدت مند اور معالج خاص ہیں۔ کیفی صاحب بھی ان پر اپنے عزیزوں کی طرح شفقت فرماتے ہیں۔ ایک دفعہ بیماری کے دوران میں ڈاکٹر داور سے اپنی محبت کا اظہار مجھ سے یوں فرمایا "بھئی اگر تمہاری جنت یا سورگ کی واقعی کچھ حقیقت ہے،

اور میں وہاں گیا بھی تو اپنے ڈاکٹر داور کو کہاں سے لاؤں گا؟"

اب یہ حال ہے کہ ضعفِ پیری تو جو ہونا چاہیئے تھا سو ہے ہی امراض نے بہت معذور کر دیا ہے۔ زینہ چڑھنا یا دس بیس قدم سے زیادہ چلنا ان کے لئے ناممکن ہے۔ سماعت اور بصارت برائے نام باقی رہ گئی ہے۔ فرماتے ہیں کہ "یہ جو اُردو کی کہاوت ہے "بہرہ بہشتی اندھا دوزخی" کچھ دنوں میں یہ دونوں باتیں مجھ پر صادق ہونے والی ہیں اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ مرنے کے بعد غالباً اعراف میں مجھ کو جگہ ملے گی۔" مختصر یہ کہ اب معمولی خط و کتابت بھی اپنے ہاتھ سے نہیں کر سکتے اور ہر کام میں دوسروں کی امداد کے محتاج ہیں۔ باوجود ان سب ناخواستہ عوارض کے مقدمہ، پیش لفظ، تعارف اور تقریب وغیرہ کی درخواستوں سے شاید ہی کوئی ہفتہ خالی جاتا ہوگا اور آپ ہر ایک کو کچھ نہ کچھ بھیج دیتے ہیں۔ کیونکہ آپ کو کسی کی دل شکنی گوارا نہیں۔ ادبی مشورہ اور اصلاح بھی بالکل بند نہیں ہوئی یہ کام بھی دیر سویر چلا ہی چلتا ہے۔

دیکھا گیا ہے کہ جب خاص احباب یا قریبی رشتہ داروں میں سے کوئی آپ کو تاکید کرتے ہیں کہ اب تو ادبی جھنجھٹ کو چھوڑو اور رہے سہے قویٰ کی حفاظت کرو تو آپ مسکرا کر جواب دیتے ہیں کہ "میں بد ترین سے خوب ترین استفادہ کرنے کا قائل ہوں۔ میاں جب میں جانتا ہوں کہ وہ عناصر جن سے میرا جسم بنا ہے تیز تدریج کے ساتھ زوال اور تحلیل کا شکار ہو رہے ہیں تو کیوں نہ میں باقی ماندہ لمحوں کو ادب کی خدمت کے لئے صرف کروں۔" غالباً خواجہ میر دردؔ ایسے ہی موقع کے لئے فرما گئے ہیں ؎

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

اگر مدح منظور نہ سمجھی جائے تو میں بلا تامل کہوں گا کہ علامہ کیفی کی ہستی مغتنماتِ زمانہ میں سے ہے۔ آپ کے اوصاف کیا بہ اعتبار ایک ادیب، عہد آفرین شاعر اور نقاد کے ایسے عالی قدر اور ممتاز ہیں جن کی نظیر مشکل سے ملے گی اور کیا بہ لحاظ ایک شہری کے آپ کے اخلاق ایسے حمیدہ، مشرب اتنا وسیع اور دل اتنا فراخ ہے کہ جن کو آپ سے کچھ بھی واسطہ پڑا ہے بلا قید قوم و ملت آپ کی شان میں یہ شعر دہرا کر کچھ مایوس ہو جاتے ہیں کہ آپ کے بعد کیا ہوگا اور کسے ہندوستان کی شرافت اور ثقافت کے اعلیٰ نمونہ کی طرح پیش کیا جا سکے گا۔

کفر کافر را و دیں دیندار را
ذرۂ دردے دلِ عطار را

خواجہ حسن نظامی

مُلّا واحدی

اللہ شاہ خورے کو شکر دینا ہے۔ خواجہ صاحب نو برس کے تھے۔ اُن کے والد نے اُنہیں ترکی ٹوپی لاکر دی۔ جس کا رنگ بہت سُرخ تھا۔ حضرت سلطان نظام الدین اولیا محبوب الٰہی کی درگاہ کے پائنتی سنگ مرمر کا فرش ہے۔ فرش میں ایک پتھر سُرخی مائل ہے۔ خواجہ صاحب سُرخ ٹوپی پہن کر سُرخ پتھر پر بیٹھ جاتے اور ہم عمر لڑکوں سے کہتے۔ میں تمہارا بادشاہ ہوں۔ میرے سامنے دست بستہ کھڑے ہو جاؤ۔ لڑکوں میں اُن کے عزیز اور عمر میں اُن سے سال دو سال بڑے سید محمد غوث بھی تھے۔ انہوں نے خواجہ صاحب کی بادشاہت قبول کرنے سے انکار کیا۔ خواجہ صاحب نے اپنی رعایا کو حکم دیا کہ غوث کی کندی کر دو۔ لیکن غوث نے خواجہ صاحب ہی کی کندی کر دی۔ خواجہ صاحب لہولہان ہوگئے۔

کوئی اور ہوتا تو پھر بادشاہی کا نام نہ لیتا مگر خواجہ صاحب نے دوسرے دن غوث پر دوبارہ زور ڈالا کہ مجھے بادشاہ مانو۔ ورنہ میں آج بھی لڑوں گا۔ غوث نے سمجھداری برتی اور ہنس کر خواجہ صاحب کو بادشاہ مان لیا۔

خواجہ صاحب کی پوری زندگی اسی جدوجہد میں گزری ہے۔ خواجہ صاحب اب بادشاہ نہیں، چھوٹے موٹے بہت سے بادشاہوں سے اُونچے ہیں۔ اور اُونچے اسی طرح ہوئے ہیں کہ لوگ رکاوٹیں ڈالتے رہے اور وہ اُونچے ہوتے رہے۔

خواجہ صاحب کا خاندان نہایت برگزیدہ خاندان ہے۔ سید تو خیر وہ ہیں ہی۔ اُن کے جدّ اعلیٰ مولانا سید محمدؒ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے حقیقی نواسے اور حضرت سلطان نظام الدین اولیاؒ محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کے بھانجے داماد اور منہ بولے بیٹے تھے۔ حضرت سلطان جیؒ کی اپنی اولاد نہیں تھی۔ حضرت نے شادی نہیں کی تھی۔

لیکن جب خواجہ صاحب دُنیا میں تشریف لائے تو یہ خاندان برگزیدگی کھو چکا تھا۔ جو تمام درگاہوں کے متوسّلین کا حال ہے وہی حضرت سلطان جیؒ کی درگاہ کے متوسّلین کا حال تھا۔ تاہم خواجہ صاحب کو حضرت سلطان جیؒ کی خواہرزادگی سے مدد ضرور ملی۔ خواجہ صاحب کی تحریر میں علاوہ اور کششوں کے یہ کشش بھی تھی کہ اُن کے نام کے ساتھ خواہرزادہ حضرت سلطان نظام الدین اولیاؒ ہوتا تھا۔

میرا خواجہ صاحب سے ملنا جلنا ۱۹۰۸ء سے ہے ۱۹۰۸ء میں اُن کی عمر تیس اکتیس برس کی تھی اور اُن کی انشا پردازی کی عمر دس گیارہ برس کی تھی۔ اس عمر میں اور اتنے کم عرصے میں خواجہ صاحب خاصا امتیاز حاصل کر چکے تھے۔ بڑے بڑے لوگ اُن کے پاس آتے تھے اور بڑے بڑے جلسوں میں وہ

بلائے جاتے تھے۔ پیری اور پیرزادگی نے انشا پردازی کو چمکایا اور انشا پردازی نے پیرزادگی اور پیری کو شہرت دی۔

خواجہ صاحب کی تاریخ پیدائش ۲ محرم ۱۲۹۶ھ ہجری ہے۔ بارہ سال کے تھے کہ والد اور والدہ دونوں کا انتقال ہوگیا۔ بڑے بھائی نے کچھ سنبھالا، کچھ نہیں سنبھالا۔ بچپن بہت عسرت میں کٹا۔ اپنے پیروں پر کھڑے ہو جانے کے بعد تو خواجہ صاحب کو درگاہ کی آمدنی کی ضرورت کیا تھی مگر اس آمدنی نے اُن کا ساتھ والدین کے انتقال کے بعد ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ آمدنی بڑے بھائی کے لئے ہی کافی نہ تھی۔

ایک دفعہ خواجہ صاحب راجہ نوشاد علی خاں، تعلقہ دار جہانگیر آباد (اودھ) کو درگاہ حضرت سلطان جیؒ لے گئے۔ اُس زمانے میں خواجہ صاحب نے بستی نظام الدین کی رہائش ترک کر رکھی تھی اور دلّی میں میرے ہاں رہتے تھے۔ اس لئے میں بھی راجہ صاحب اور خواجہ صاحب کے ساتھ تھا۔ درگاہوں کے دروازوں پر جوتیوں کے رکھوالے بیٹھا کرتے ہیں۔ ہم سب نے جوتیاں اُن کے سپرد کیں۔ واپس آنے لگے تو خواجہ صاحب نے رکھوالوں کو انعام دینے کی غرض سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اتفاق سے ریزگاری کی بجائے روپیہ ہاتھ آگیا۔ خواجہ صاحب نے روپیہ رکھوالوں کو دے دیا اور ہمیں یہ قصہ سنایا کہ بچپن میں مجھے خود یہاں بیٹھنا پڑتا تھا اور میں پیسہ پیسہ انعام کا لیا کرتا تھا۔

خواجہ صاحب عجیب و غریب حوصلے کے آدمی ہیں۔ میں نے خواجہ صاحب کا وہ دور دیکھا ہے کہ اُن کی مالی حالت بُری نہیں تھی تو اچھی بھی نہیں تھی۔ لیکن دوستوں اور ملنے جلنے والوں کی مدارات میں خواجہ صاحب ایسے حوصلے سے روپیہ اٹھاتے تھے کہ واقعی پھر فاقہ ہو جاتا تھا۔ اِس کا علم بھی مجھے کبھی فاقے کے وقت نہیں ہوا۔ افلاس کو ظاہر نہ ہونے دینے کا بھی خواجہ صاحب میں حوصلہ ہے اور عروج پا کر افلاس کے وقت کی باتیں بیان کرنے کا بھی وہ حوصلہ رکھتے ہیں۔ فاقے میں خواجہ صاحب کے چہرے پر ضعف کے آثار نہیں آتے تھے اور شگفتگی پژمردگی سے نہیں بدلتی تھی۔

ایک صاحب عبدالنعیم خاں نے جن کا آجکل تاج کمپنی کراچی سے تعلق ہے متعدد حضرات سے خواجہ صاحب کے متعلق مضامین لکھوائے ہیں۔ ان میں مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی کا مضمون بھی ہے۔ مرزا صاحب لکھتے ہیں :۔

"میں نے فقط دو آدمی ایسے دیکھے ہیں جنہوں نے اپنے زور بل پر نیچے سے اتنے اونچے درجے تک ترقی کی اور اپنے پہلے زمانے کو نہ صرف یاد رکھا بلکہ اس کے اظہار سے نہیں شرمائے۔ ایک مولوی نذیر احمد مرحوم اور دوسرے خواجہ حسن نظامی، ورنہ آجکل تو جو لا ہے اونچی کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں تو باپ کو باپ کہتے شرماتے ہیں۔"

خواجہ صاحب کی ترقی کی رفتار تیز ۱۹۱۱ء سے ہوئی۔ ۱۹۱۱ء میں اُنھوں نے مصر و شام و حجاز کا سفر کیا اور سفر نامہ شائع فرمایا۔ اور سفر نامے کے علاوہ ایک چھوٹی سی کتاب شیخ سنوسی کی پیشین گوئیاں لکھی۔ اس چھوٹی کتاب کے پے در پے چھ ایڈیشن اُردو میں نکلے اور گجراتی اور مرہٹی وغیرہ زبانوں میں ترجمے چھپے۔

سفر نامے کے ایسے طرز نگارش نے ادب نواز اور باذوق لوگوں کے دلوں میں خواجہ صاحب کی جگہ مستحکم کر دی۔

حجاز ریلوے کی گاڑی میں خواجہ صاحب کو حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سبز گنبد کی جھلک نظر آتی ہے۔ خواجہ صاحب لکھنا شروع کر دیتے ہیں :۔

"فجر کی نماز کے بعد سے مسافروں میں خوشی کی لہر دوڑ رہی ہے کہ وہ قریب ہیں جن کے لئے یہ سفر کیا ہے۔ ذرا دن چڑھا تو کالے کالے پہاڑوں کے بیچ میں سبز گنبد کی ننھی سی جھلک دکھائی دی۔ جیسے اندھیری رات میں کہیں دور آسمان کے کنارے بجلی کوندا کرتی ہے۔ اس جھلک نے جو کہرام مچایا اُسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔

کلیجے پھٹے جاتے تھے۔ ہاتھ گریبانوں پر تھے۔ دل تھامتے تھے۔ کرتے چاک کرتے تھے۔ گردنیں کھڑکیوں سے باہر تھیں۔ آنکھیں ٹکٹکی باندھ رہی تھیں۔ ریل لہراتی چلی جاتی تھی۔

لے لو، اب نصاف دکھائی دینے لگا۔ ہاں سبز گنبد ہے۔ اونچے مینار ہیں۔ مدینہ آیا۔ مدینہ آیا۔ ذرا میں بھی دیکھوں۔ کہاں ہے۔ کیا ہے۔ کچھ سنا، آسمان والے نغمہ سرائی کر رہے ہیں۔ انجن روکو۔ پہلے وہ کیوں جائے۔ ہمیں بڑھنے دو۔ ہم اشرف المخلوقات ہیں۔ اشرف الانبیاؐ کی اُمت ہیں۔ بصارت اور بصیرت رکھتے ہیں۔ لو وہ رک گیا۔

ذرا دیکھنا کیسی سہانی قباؤں والے نورانی چہرے استقبال کو آئے ہیں۔ کہتے ہیں۔ اُترو۔ پہلے کون سا قدم اُتاروں۔ سر کے بل کیسے چلا کرتے ہیں۔ کیا یونہی چلوں۔

دل دھڑکتا ہے۔ ہاتھ پاؤں میں رعشہ ہے۔ توانائی نے جواب دے دیا۔ کیا کروں۔

لوگو! میرا ہاتھ پکڑنا۔ میں چلا۔ مجھے سہارا دو۔ میں گرا۔"

محراب حضرت زکریا علیہ السلام کے نیچے کھڑے ہو کر یہ دعا کر رہے ہیں:۔

"زکریاؑ کے رب، اپنے بندے کی ندا کو رحمت سے سننے والے! زکریاؑ نے اس محراب میں بیٹھ کر تجھ سے کچھ مانگا۔ جسے تو نے سن لیا۔ اور زکریاؑ کے دامن کو گوہر مقصود سے بھر دیا۔ تنہا میں ندائے خفی سے پکاروں یا صدائے جہر لگاؤں۔ زکریاؑ عمر میں بوڑھے تھے۔ اور میں قویٰ کے اعتبار سے ضعیف ہوں۔ زکریاؑ کو اپنی بیوی کے بانجھ ہونے کی شکایت تھی اور مجھے اپنی قوم کے بانجھ پن کا شکوہ ہے۔ اس سے نمو کی صفت مفقود ہو گئی ہے۔"

حضرت یوسف علیہ السلام کے مزار پہ پہنچے ہیں اور کہتے ہیں:۔

"یوسف، ایہا الصدیق! دروازہ کیوں بند ہے۔ صورت دیکھنے دیجئے۔ مصری عورتوں کی طرح چھری سے ہاتھ نہیں کاٹوں گا۔ جلوۂ محمدیؐ نے جمالِ بینی کا عادی کر دیا ہے۔

میرے اچھے یوسفؑ! تم سے کس طرح ہم کلام ہوں۔ جی چاہتا ہے، بیباک ہو کر، گستاخ ہو کر، از خود رفتہ کیف میں، مجنونانہ جوش سے خطاب کروں، مگر پیغمبری آداب مانع ہیں۔ ادب روکتا ہے۔ معاف کیجئے۔ میں نے بادشاہ مصر اور مقبولِ پروردگار پیغمبر کو تم کہہ کر مخاطب کیا۔

خواب کی تعبیر بتانے میں حضور کو ملکہ تھا۔ فرمایئے تو اس دنیا کے خواب کی کیا تعبیر ہے۔ یہاں کے متحرک نظاروں نے میری نیند برباد کر دی ہے۔"

فرعون کی لاش کے پاس کھڑے ہیں اور فرماتے ہیں:۔

"فرعون کے ہونٹوں کو دیکھتا ہوں اور سوچتا ہوں۔ یہی حضرت موسےٰ علیہ السلام سے بولتے وقت حرکت میں آتے تھے۔ انہی سے وزیر ہامان کو حکم دیا تھا کہ اونچا مینار بنا تاکہ موسےٰؑ کے خدا کو جھانکوں اور دیکھوں وہ کیسا اور کتنا بڑا ہے۔

او سرکش انسان! تو نے دیکھا موسےٰؑ کا خدا کیسا اور کتنا بڑا ہے۔

جی اُٹھ فرعون —— آ —— چل —— ہوٹل میں بیٹھ کر وسکی کا ایک ایک جام پئیں اور دیکھیں
دنیا میں کتنے انسان تجھ سے زیادہ سرکشی کے جذبات میں سرشار ہیں۔"

سفرنامہ مصر و شام و حجاز باوجود ضخیم ہونے کے ہاتھوں ہاتھ بکا۔ ہمت کی خواجہ صاحب میں پہلے بھی کمی نہیں تھی۔ کامیابی نے اور ہمت بڑھادی۔ خواجہ صاحب نے اپنے سن ۱۹۱۱ء تک کے شائع شدہ مضامین کا مجموعہ چھاپا۔ وہ بھی مقبول ہوا تو غدر دہلی کے افسانے اور "غدر" ۱۸۵۷ء کے متعلق گیارہ بارہ کتابیں لکھیں۔ اور پھر کتابوں کا سلسلہ جاری رہا۔

ادھر خواجہ صاحب کی کتابیں چلیں۔ اُدھر مریدوں اور معتقدوں کی تعداد کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔

کتابوں کے ساتھ ساتھ خواجہ صاحب نے اخبار اور رسالے بھی کئی نکالے۔ حکومت میں خواجہ صاحب کا رسوخ ہوگیا اور اُونچے اُونچے لوگ، حتیٰ کہ ملک کے سارے راجہ نواب سر آنکھوں پر بٹھانے لگے۔ مالی حالت اتنی بڑھی کہ پچھلی جنگ میں خواجہ صاحب کے فرزند اکبر میاں حسین نظامی نے گوشت خشک کرنے اور ڈبوں میں بند کرکے بھیجنے کا ٹھیکہ لیا تھا۔

مجھے خواجہ صاحب کی کامیابی پر تعجب نہیں ہوتا بے حد پس ماندہ سرپرستوں کی نگرانی اور انتہائی عسرت و گمنامی کی حالت میں کامیابی حاصل کرنے پر تعجب ہوتا ہے۔ اور تعجب کی بات یہ ہے کہ مخالفت کے طوفانوں میں خواجہ صاحب نے اپنی زندگی کی کشتی چلائی ہے۔

عبدالنعیم خاں صاحب کے جمع کردہ مضامین میں ایک مضمون مسٹر عبدالعزیز "فلک پیما" کا بھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"خواجہ صاحب کو اپنی زندگی میں عجیب عجیب طرح سے تائید غیبی نصیب ہوئی۔ علی گڑھ کے سٹیشن پر مسلم یونیورسٹی کے عمائد قطار باندھے پرنس آف برار کے استقبال کے واسطے کھڑے تھے۔ کسی انسان ناشناس بزرگ نے خواجہ صاحب کو درشتی سے حکم دیا کہ آپ دُور، جہاں مولوی صاحبان ہیں، وہاں کھڑے ہوں۔ خواجہ صاحب نے محسوس ضرور کیا۔ مگر تعمیلِ حکم کی۔

شاہزادہ قطاروں کے آگے سے شانِ آصفجاہی کے ساتھ ناموں کو سنتا گزر گیا۔ لیکن جب خواجہ صاحب کے قریب پہنچا تو شہزادے نے "مولا"، کہہ کر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا اور باتیں شروع کردیں۔

لوگ دنگ رہ گئے۔ اِسے کہتے ہیں تائید غیبی۔"

انسان اُوپر سے نیچے گرتا ہے تو لوگ اُس سے ہمدردی کرتے ہیں۔ اُس کی عزت کرنے کو شرافت گردانتے ہیں۔ اور انسان نیچے سے اُوپر چڑھتا ہے تو ٹانگیں پکڑ کر گھسیٹتے ہیں۔ خواجہ صاحب کا جرمِ عظیم یہی تھا کہ وہ بہت نیچے سے اُونچے اُٹھ رہے تھے۔

خواجہ صاحب نے دلّی میں بھی دیوبندی علما سے تعلیم پائی تھی۔ اور آخر میں وہ مولانا رشید احمد صاحبؒ بانی مدرسہ دیوبند کے مدرسہ گنگوہ میں داخل ہوگئے تھے۔ وہاں سے گھر پہنچے تو اُنہوں نے درگاہ حضرت سلطان جیؒ اور ہندوستان بھر کی درگاہوں کی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا۔ اُس دن سے جو مخالفت اور تائید غیبی کا ساتھ ساتھ سلسلہ چھڑا ہے تو اُس کا تانتا آج کے دن تک نہیں ٹوٹا۔ خواجہ صاحب ڈیڑھ سال سے سخت علیل ہیں۔ اس پر بھی مخالفت اور تائیدِ غیبی کا سلسلہ جاری ہے اور خواجہ صاحب علالت کی طرح اُسے برداشت کر رہے ہیں۔

برداشت کا لفظ اب استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ایک زمانے میں یہ عالم تھا کہ خواجہ صاحب مخالفت کو قابلِ توجہ نہیں سمجھتے تھے۔ مخالف راستے میں کانٹے بچھاتے تھے اور خواجہ صاحب کانٹوں کے ہٹانے میں وقت ضائع نہیں کرتے تھے۔ کانٹوں سے بچ کر اور راستہ کاٹ کر نکل جاتے تھے۔

ابتداً خواجہ صاحب کو انجمنوں کی ممبری کا شوق تھا۔ پھر دیکھا کہ انجمنیں میری رفتار کا ساتھ نہ دے سکیں گی، انجمنوں سے الگ ہوگئے اور تنہا کام شروع کردیا۔ اہلِ انجمن نے اسے پسند نہیں کیا۔ یہ بھی مخالفت کا ایک محاذ بن گیا۔

پھر بقول بھیّا احسان الحق صاحب میرٹھی، ندرت اور جدّت طرازی انشاپردازی ہی کا نہیں، خواجہ صاحب کی زندگی کے ہر شعبے کا جزو لاینفک ہے۔ کبھی کبھی خواجہ صاحب اس قابلِ رشک قابلیت کو بے محل بھی استعمال کر جاتے ہیں۔ لہٰذا خواجہ صاحب کی روشنیِ طبع بھی خواجہ صاحب پر بلا بن کر نازل ہوتی رہی۔ لیکن خواجہ صاحب کی آنکھ میں موہنی ہے۔ زبان میں جادو ہے اور شخصیت میں کشش ہے۔ مخالف اگر خواجہ صاحب کے قریب آجائے تو خواجہ صاحب کی خندہ پیشانی اور شیریں زبانی سے رام ہو جاتا ہے۔

لوگ خواجہ صاحب کی طرف اس طرح کھنچتے ہیں جس طرح مقناطیس کی طرف چیونٹیاں کھنچتی ہیں۔

ایک روز میں اور خواجہ صاحب حضرت سلطان جیؒ کی بہن بیبی نورؒ کے مزار پر گئے۔ یہ مزار مہرولی سے دو میل ورے ہے۔ میں نے کہا۔ مہرولی تک چلئے۔ مولانا راشد الخیری وہاں ٹھیرے ہوئے ہیں اُن سے ملتا چلوں۔ خواجہ صاحب قطب مینار کے پارک میں رُک گئے اور میں بستی میں مولانا کے پاس چلا گیا۔ جاتے وقت قطب مینار کے اِردگرد آدمی کا دُور دُور پتہ نہیں تھا۔ واپس آیا تو ساٹھ ستّر آدمی خواجہ صاحب کو گھیرے بیٹھے تھے۔ آنے جانے میں بیس منٹ لگے ہوں گے۔ بیس منٹ میں نہ معلوم کہاں سے آدمی اُبل پڑے۔

اِس سے زیادہ حیرت انگیز واقعہ سرینگر کا ہے۔ خواجہ صاحب کو سرینگر جانا تھا۔ میں اور بھیا احسان الحق بھی ساتھ ہو لئے۔ ہم نے ریاست کشمیر کی سرحد پر قدم رکھا تو مہاراجہ کشمیر کے دو مسلمان اے۔ڈی۔ کانگ ہمارے منتظر تھے۔ اُنہوں نے کہا۔ مہاراج شملہ میں ہیں۔ مگر اُن کا تار موصول ہُوا ہے کہ خواجہ صاحب کی تشریف آوری کی خبر ہے۔ اُن سے درخواست کرو کہ ریاست کی مہمانی قبول فرمائیں۔

سرینگر میں ہم لوگ ایسے مہمان خانے میں اُتارے گئے، جس کے ایک جانب ڈَل ندی تھی اور دوسری جانب اتنا لمبا چوڑا لان صحن تھا کہ اُس کی چار دیواری تک جانے کا خیال نہیں آتا تھا۔ ہمارا راستہ ڈل ندی کی جانب رہا۔ راستہ کیا رہا۔ مہاراج کے مذکورہ بالا اے۔ڈی۔ کانگ روز صبح ناشتے کے بعد کہتے کہ چلئے کشمیر کی سیر کو چلئے۔ اور ڈل ندی کی جانب سے نکال کرلے جاتے۔ دوپہر کا کھانا کہیں ملتا اور سہ پہر کی چائے کہیں۔ رات کا کھانا البتہ قیام گاہ پر کھاتے۔

ہم سرینگر میں دس دن رہے۔ دس دن میں مضافات کی سیر تو ان اے۔ڈی۔ کانگوں نے پیٹ بھر کر کرا دی۔ لیکن سرینگر کے اندر جانے کی نوبت نہ آنے دی۔

ایک صبح بہت سویرے مولوی الف دین صاحب وکیل کیمبلپور ہمارے پاس تشریف لائے اور کہنے لگے۔ آپ مہمان نہیں ہیں، نظربند ہیں لان والے دروازے پر پولیس کا پہرہ ہے۔ لوگوں کو گھسنے نہیں دیا جاتا۔ میں تین روز کی کوشش میں آج اس وقت بمشکل کامیاب ہُوا ہوں۔

خیر دس دن گذر گئے اور پارٹی واپس چلی۔ اے۔ڈی۔ کانگ صاحبان خوش تھے کہ مہاراج کے حکم کی تعمیل بحُسن وخوبی کر دی۔

ایک موٹر میں ہم سب سوار تھے اور ایک موٹر اے۔ڈی۔ کانگوں کی الگ تھی۔ کشمیر کا آخری ریسٹ ہاؤس گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے فاصلے پر ہوگا کہ اے۔ڈی۔ کانگوں نے ہمیں آزاد چھوڑ دیا اور کہا ہم آپ کے لئے شکار مار کر لاتے ہیں۔ اُن کے جاتے ہی سنسان جنگل میں کسی نے خواجہ صاحب کو دیکھ لیا اور پہچان لیا اور خدا معلوم کیونکر گاؤں میں خبر پھیلا دی کہ خواجہ صاحب آئے ہیں۔ اے۔ڈی۔ کانگ صاحبان شکار کھیل کر ریسٹ ہاؤس پہنچے تو ریسٹ ہاؤس آدمیوں سے کھچا کھچ بھرا تھا اور خواجہ صاحب اُن سے باتیں کر رہے تھے۔

ریسٹ ہاؤس کے برابر ایک نہر تھی۔ میں اور بھیّا احسان الحق نہر کے کنارے جا بیٹھے۔ اے۔ڈی۔ کانگ صاحبان گھبرائے گھبرائے وہاں آئے اور کہنے لگے۔ غضب ہو گیا۔ خواجہ صاحب کو ان لوگوں نے بے آرام کر دیا ہے۔ خواجہ صاحب سے کہئے۔ انہیں رخصت کریں۔

ہمیں مولوی الف دین صاحب کا بیان یاد تھا۔ حقیقتاً دس دن کی کارگذاری خاک میں مل جانے سے اے۔ڈی۔ کانگ صاحبان پریشان تھے۔ ہم نے خشک مُنہ بنا کر اُنہیں اطمینان دلایا کہ خواجہ صاحب ان بے آرامیوں کے عادی ہیں۔ وہ ہرگز نہیں کہیں گے کہ جاؤ۔ یہ لوگ آپ کی رعایا ہیں۔ آپ کہہ دیجئے ـــ بولے۔ ہمارے کہنے کا موقع نہیں ہے۔ ہم اِن کے آنے کے وقت یہاں ہوتے تو تھوڑے تھوڑے آدمیوں کو بھگا سکتے تھے۔ ہم نے غفلت کی۔

بہرحال یہ دو واقعے بطور مثال لکھے گئے ہیں۔ ورنہ ایسے واقعے بے شمار ہیں۔ اہم سے اہم مجامع میں بھی خواجہ صاحب نظر انداز نہیں کئے جاتے۔

میں سیلف میڈ کا لفظ استعمال نہیں کیا کرتا۔ خواجہ صاحب نے بے شک بڑی محنت کی ہے۔ لیکن محنت کرنے کی طاقت اُن کے جسم ناتواں نے کہاں سے پائی۔ تحریر کا اسٹائل۔ بات چیت کا انداز۔ شخصیت کی کشش ایسی چیزیں ہیں جیسی خوش گلوئی۔ کیا انسان اپنے آپ کو خوش گلو بنا سکتا ہے؟

خواجہ صاحب نے جتنے کام کئے ہیں اُن کی چھٹائی کی جائے جس طرح کلیات میں سے دیوان کے لئے اشعار کی چھٹائی کی جاتی ہے تو بہت سے کام ردّی کرنے پڑیں گے۔ لیکن بچے ہوئے منتخب اور اچھے کاموں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں رہے گی۔ خواجہ صاحب میں خوبیاں خرابیوں سے بہت زیادہ ہیں۔

ایک ایک کام اور ایک ایک خوبی لکھنے کے لئے کتاب چاہیئے۔ مضمون میں جو طویل ہوتا جاتا ہے اُنہیں گنوانا ممکن نہیں ہے۔

خواجہ صاحب کا بہترین کام میرے نزدیک قرآن مجید کا ترجمہ ہے۔ خواجہ صاحب نے قرآن مجید کا اُردو ترجمہ بھی شائع کیا ہے اور ہندی ترجمہ بھی۔

خواجہ صاحب کی خوبیوں میں قدرتاً مجھے یہ خوبی بہت محبوب ہے کہ وہ انتہائی عروج پانے کے بعد اپنے ابتدائی ملنے والوں کو نہیں بھولے۔ اور اُن سے برتاؤ کا بال برابر فرق نہیں کیا۔

خواجہ صاحب میں بنیادی خرابی یہ ہے کہ مزاج میں اعتدال اور استقلال نہیں ہے۔ رائے بڑی جلدی بدلتے ہیں۔

خواجہ صاحب کا حافظہ بے مثال ہے۔ لڑتے یا سخت کلامی کرتے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔ گاتے یا گنگناتے بھی کبھی نہیں سُنا۔ ہنسی مذاق سے نفرت ہے۔ قہقہہ لگا کر نہیں ہنستے۔ غیبت کرنے کی تو شاید فرصت ہی نہیں ہے۔ علیٰ ہذا سیر و تفریح کی بھی فرصت نہیں ملتی۔ البتہ تھیٹر اور سینما دیکھتے تھے۔ مضمون لکھنے بیٹھتے ہیں تو پان پر پان کھاتے ہیں۔ پان ہی کا کام تھیٹر اور سینما دیتا تھا۔

کھانا راجاؤں اور نوابوں کے ساتھ بھی کھا لیتے ہیں اور دھوبی اور سقوں کے ساتھ بھی۔

مطبع اور اخبار کا نام خواجہ صاحب نے پہلی مرتبہ گیارہ سال کی عمر میں سُنا۔ بستی حضرت سلطان جی کے ایک باشندے لالہ چرنجی لال نے مطبع کھولا تھا اور اُس میں کتاب سیر الاولیا چھاپی تھی۔ اِس کا چرچا ہُوا تو خواجہ صاحب نے اُسی وقت ارادہ کر لیا کہ میں بھی کتابیں شائع کروں گا۔

خواجہ صاحب کے گھر میں خواجہ صاحب کی رہنمائی کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ درگاہ حضرت سلطان جیؒ کے ایک حاضر باش منشی غلام نظام الدین صاحب عُرف خاکسار عالم نے دُنیا کے نشیب و فراز سمجھائے اور درگاہ کی آمدنی سے بیزار کر کے معاش پیدا کرنے کے راستے بتائے۔ خاکسار صاحب کتب فروش تھے۔ اس لئے کتابوں ہی کا کاروبار اُنہوں نے بھی سکھایا۔

کتابیں شائع کرنے کا خیال گیارہ سال کی عمر میں ہو گیا تھا۔ لیکن اخباروں اور رسالوں کو خواجہ صاحب سولہ سال کی عمر تک نہیں جانتے تھے۔ سولہ سال کی عمر میں اخبار "ہمدرد" مراد آباد کسی نے دیا۔ دینے والے سے پوچھا۔ یہ کیا ہے۔ اُس نے کہا۔ اخبار ہے۔

اخبار پڑھنے میں خواجہ صاحب کا جی لگا۔

۱۸۹۷ء میں سب سے پہلا مضمون انڈیا گزٹ کے لئے "انڈیا کی نازک حالت" کے عنوان سے لکھا۔

کتاب خواجہ صاحب نے سب سے پہلی، سولہ صفحے ضخامت کی ۱۹۰۰ء میں لکھی۔ اِس کا نام "مفلسی کے مجرب علاج" تھا۔ یہ علامہ جلال الدین سیوطیؒ کے ایک رسالے کا ترجمہ تھا۔

میں اُوپر ذکر کر چکا ہوں کہ خواجہ صاحب کی مالی حالت کتابیں تصنیف کرنے کے بعد سنبھلی ہے۔ کتابوں کے کاروبار کا بھی اُوپر تذکرہ آیا ہے۔ ۱۹۰۳ء کے دربار دہلی میں خواجہ صاحب کتابوں کی گٹھری لے کر وہاں پہنچ جاتے تھے۔ جہاں باہر کے لوگوں کے خیمے نصب تھے۔ ایک روز اُن لوگوں میں سے کسی نے ان سے سیّد علی حسن نظامی خواہرزادہ حضرت سلطان نظام الدین اولیاؒ محبوب الٰہیؒ کو دریافت کیا۔ (خواجہ صاحب کا اصلی نام علی حسن ہے۔ بڑے بھائی کا نام حسن علی تھا۔ علی حسن نظامی کو مختصر خواجہ صاحب نے ۱۹۰۴ء میں کیا اور ۱۹۰۸ء ہی میں خواجہ صاحب کا لفظ حسن نظامی کے ساتھ علامہ اقبالؒ

۱؎ تحریری لڑائیاں آخر عمر میں دو ایک لڑی ہیں مگر اِس فن کے امام نہیں بن سکے۔ (دواحاری)

نے لگایا، جو اس وقت پروفیسر شیخ محمد اقبال تھے۔) خیر خواجہ صاحب نے دریافت کرنے والوں سے یہ نہیں کہا کہ علی حسن میں ہی ہوں۔ کہا کہ درگاہ میں آئیے۔ فلاں حجرے میں علی حسن ملیں گے۔ دوسرے دن وہ صاحب درگاہ پہنچے اور اُن کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ خواہر زادہ صاحب جن کے مضامین کی دھوم ہے کتابوں کی گٹھری لئے پھرنے پر مجبور رہیں۔

خواجہ صاحب نے عمر کے کسی حصے میں یہ نہیں سوچا کہ فلاں کام میرے کرنے کا ہے یا میرے کرنے کا نہیں ہے۔ ضرورت پڑے اور ضعیفی مانع نہ ہو تو وہ آج بھی کتابوں کی گٹھری لے کر پھر سکتے ہیں۔ اِسی نہ سوچنے نے اُنہیں کامیاب کیا اور اِسی نہ سوچنے سے اُنہوں نے ٹھوکریں کھائیں۔ دل میں سما جائے کہ فلاں کام کرنا ہے۔ بس کافی ہے۔ حرکت اور عمل کی قوت اللہ تعالیٰ نے خواجہ صاحب میں کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے۔ سنہ ۱۹۱۱ء کا سفر شروع کرتے وقت خواجہ صاحب کی جیب میں صرف اس قدر روپے تھے کہ تھرڈ کلاس میں بمبئی پہنچ جائیں۔ لیکن مصر و شام و حجاز کا قصد کر کے چل کھڑے ہوئے تھے۔ یہ معمولی جرأت نہیں ہے اور اللہ تعالےٰ نے خواجہ صاحب کی جرأت کو ہمیشہ عزت آبرو کے ساتھ نبھوا دیا۔ خواجہ صاحب نے فاقے کئے ہیں۔ لیکن ہاتھ کبھی کسی کے آگے نہیں پھیلایا۔ ہاتھ اُن کا اُوپر ہی رہا۔

مولانا عبدالماجد دریاآبادی

حکیم عبدالقوی دریاآبادی

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی، مولوی عبدالقادر مرحوم ڈپٹی کلکٹر کے چھوٹے صاحبزادے ہیں۔ مولانا کے دادا مولانا مفتی محمد مظہر کریم صاحب اپنے وقت کے ایک ممتاز عالم تھے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں انگریزوں کے خلاف فتویٰ جہاد دینے کے الزام میں اودھ کے بعض اور اکابر علماء مثلاً مولانا فضل حق خیرآبادی اور مفتی عنایت احمد صاحب (مؤلف علم الصیغہ) کے ساتھ انہیں بھی حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ملی۔ مفتی مظہر کریم صاحب نے وہاں ایک ضخیم عربی کتاب کا اُردو میں ترجمہ کیا، وہاں کے انگریز افسر نے ان کے اس کارنامہ سے خوش ہو کر سفارش کرا کر ان کی قید کی میعاد کم کرا دی پھر بھی کئی سال انہیں قید و جلا وطنی کی پُرمحن زندگی برداشت کرنی پڑی۔

مولانا عبدالماجد صاحب، مارچ ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اُردو عربی فارسی کی قدیم دستور کے مطابق گھر ہی پر مختلف مولوی صاحبان سے حاصل کی۔ انگریزی تعلیم کی ابتدا سیتاپور گورنمنٹ ہائی اسکول میں کی۔ شروع ہی سے پڑھنے میں بہت تیز تھے۔ ساتھ میں مطالعۂ کتب و مضمون نویسی کا شوق بھی ابتدا ہی سے ہو گیا تھا۔ ساتویں یا آٹھویں درجہ میں پڑھتے تھے کہ ان کے مضامین لکھنؤ کے اس زمانہ کے مشہور روزنامہ اودھ اخبار اور پنجاب کے بعض اخبارات مثلاً وکیل (امرتسر) پیسہ اخبار (لاہور) وغیرہ میں، کبھی خود ان کے نام سے اور کبھی فرضی ناموں یا دوسرے ہم عمر اعزاء کے ناموں سے شائع ہونے لگے۔ انٹرنس (میٹرک) کا امتحان ۱۹۰۸ء میں سیتاپور (اودھ) سے پاس کرنے کے بعد کالج کی تعلیم کے لئے لکھنؤ آئے۔ ۱۹۱۲ء میں کیننگ کالج (جو اب لکھنؤ یونیورسٹی میں تبدیل ہو چکا ہے) سے بی۔ اے کی سند حاصل کی فلسفہ اور انگریزی ان کی خاص دلچسپی کے مضامین تھے۔ ساتھ ہی عربی کا مضمون بھی بی۔ اے میں لئے ہوئے تھے۔ کالج کے مشہور استاد ڈاکٹر کیمرن (جو بعد میں لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی ہو گئے تھے) ان کے مطالعہ اور علمی شوق کی بہت قدر کرتے تھے۔ کالج چھوٹنے پر انہوں نے ان کو جو سارٹیفکیٹ دیا اس پر یہاں تک لکھ دیا کہ "کالج کی لائبریری سے ان سے زیادہ کسی اور طالب علم نے فائدہ نہیں اٹھایا"!

مولانا جب ایف۔ اے کے طالب علم تھے تو ان کا ایک مضمون، کتابی صورت میں "غذائے انسانی" کے نام سے اخبار وکیل امرتسر کے دفتر سے شائع ہوا، اور اس زمانہ میں وہیں سے ان کا ایک اور مضمون "محمود غزنوی" بھی کتابی صورت میں طبع ہوا تھا۔ اول الذکر رسالہ میں انہوں نے آریہ سماجیوں کے جواب میں یہ ثابت کیا تھا کہ گوشت انسان کی فطری غذا میں داخل ہے۔

کالج کی تعلیم کے ساتھ ساتھ لکھنؤ کے علمی و ادبی حلقوں اور محفلوں میں خاص طور سے شریک ہوتے تھے، اس لئے فلسفیت کے ساتھ ذوقِ ادب بھی شروع ہی سے انہیں ہوگیا۔ سب سے زیادہ انہیں علامہ شبلی نعمانی کا فیضِ صحبت حاصل ہوا اور ان کے خاص اور نامور شاگردوں، مثلاً علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم، مولوی عبدالسلام ندوی، مولانا عبدالباری ندوی، اور مولانا مسعود علی ندوی سے ان کا ربط ضبط بہت بڑھ گیا۔ اس زمانہ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے علمی رسالہ الندوہ کا اجراء ہوا۔ اس میں ان کے مضامین بھی نکلے۔ مولانا شبلی کے علاوہ مولانا عبدالحلیم شرر اور مرزا محمد ہادی رسوا سے بھی فیضِ صحبت حاصل کیا۔ مولانا شبلی نے جب سیرۃ النبی کی تالیف شروع کی تو موضوع سے متعلق انگریزی کتب کی عبارات کے ترجمہ و تلخیص کے کاموں کے لئے انہیں اپنے اسٹاف میں رکھا (اس کا ذکر مکاتیبِ شبلی حصہ دوم میں موجود ہے) اس زمانہ میں لکھنؤ کے مشہور ادبی رسالہ الناظر میں انہوں نے بکثرت مضامین (زیادہ تر فلسفیانہ) لکھے۔ اس وقت ان کا طرزِ تحریر بڑی حد تک مولانا شبلی سے ملتا تھا، تاہم ان کی انفرادیت بھی نمایاں تھی۔ ان کے اس دور کے مضامین کا ایک مجموعہ الناظر بک ایجنسی لکھنؤ نے "فلسفیانہ مضامین" کے نام سے شائع کیا تھا۔ الناظر ہی میں انہوں نے "طالب علم" کے فرضی نام سے مولانا شبلی کی کتاب "الکلام" پر تنقید کئی نمبروں میں لکھی تھی۔

بی۔اے کی ڈگری لکھنؤ سے لینے کے بعد ایم۔اے۔ او کالج علی گڑھ کی ایم۔اے کلاس میں داخل ہوئے اور اس کا فرسٹ ایئر پاس کر چکے تھے کہ ان کے والدِ ماجد کا انتقال، سفرِ حجاز کے دوران میں عین ایامِ حج میں ہوگیا۔ اس لئے انہیں مجبوراً سلسلۂ تعلیم منقطع کرنا پڑا۔ کچھ دنوں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ میں، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم کی طلبی پر، بطور لٹریری اسسٹنٹ کام کیا۔ اس کے بعد دارالترجمہ حیدرآباد دکن میں تقریباً ۲ سال ترجمہ کے کام پر مامور رہے۔ اس زمانے میں ان کی مشہور کتاب 'فلسفۂ جذبات'، جو اردو میں نفسیات کی پہلی مقبول ترین کتاب تھی انجمن ترقیٔ اردو کی طرف سے شائع ہوئی۔ حیدرآباد کے زمانۂ قیام میں بھی وہاں کی علمی سوسائٹی میں نمایاں حصہ لیتے رہے۔ اس زمانہ میں ان کے مضامین اردو رسالوں، الناظر (لکھنؤ)، ادیب (الہ آباد)، افادہ (آگرہ)، کانفرنس گزٹ (علی گڑھ)، ذخیرہ (حیدرآباد دکن) میں اور انگریزی مضامین، نیو انڈیا (مدراس)، رسالہ ایسٹ اینڈ ویسٹ، ماڈرن ریویو (کلکتہ) وغیرہ میں بھی نکلتے رہے، اور ان کی ایک انگریزی کتاب "سائیکالوجی آف لیڈرشپ" انگلستان کے مشہور ناشر فشر اینڈ انون (لندن) نے شائع کی۔ یہی انگریزی کتاب ان میں اور مولانا محمد علی مرحوم میں ذریعۂ تعارف اور باعثِ خط و کتابت بنی اور اس وقت سے تادمِ آخر مولانا محمد علی سے ان کے تعلقات انتہائی گہرے قائم رہے۔ اس انگریزی کتاب کا اردو ایڈیشن "فلسفۂ اجتماع" کے نام سے انجمن ترقیٔ اردو کے زیرِ اہتمام نکلا۔ اس کتاب کے بعض مندرجات پر بعض علماء نے ان پر کفر کے فتوے دیئے اور حیدرآباد کے بعض اخبارات نے ان کے خلاف شورش میں نمایاں حصہ لیا۔ حیدرآباد کے زمانۂ قیام میں انہوں نے "منطق" کے نام سے ایک ضخیم کتاب، جدید علمِ منطق پر لکھی جو عرصہ تک عثمانیہ یونیورسٹی میں داخلِ نصاب رہی۔ حیدرآباد کے زمانۂ قیام میں انجمن ترقیٔ اردو کے روحِ رواں مولوی عبدالحق صاحب سے خاص مراسم ہوگئے اور انجمن ترقیٔ اردو نے مذکورہ بالا دو کتابوں کے علاوہ ذیل کی کتابیں ان سے ترجمہ کرائیں۔ لیکی کی تاریخِ اخلاقِ یورپ کا ترجمہ ۲ جلدوں میں۔ ٹامس بکل کی تاریخ تمدن کا ترجمہ۔ موخر الذکر کتاب کی پہلی جلد اور دوسری جلد کے ایک حصہ کا ترجمہ منشی احد علی مرحوم کاکوروی نے کیا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد ترجمہ کی تکمیل، مولانا عبدالماجد صاحب نے کی۔

کالج کے زمانۂ تعلیم ہی سے مولانا پر فلسفیت کا غلبہ ہوگیا تھا اور ابتدائی زمانہ کی مذہبیت کی جگہ الحاد اور "عقلیت" نے لے لی تھی۔ حیدرآباد کے دورانِ ملازمت میں بھی یہی رنگ رہا۔ اس دورِ فلسفیت میں بھی طبیعت ملازمت کے قیود سے متنفر تھی۔ اس لئے ملازمت سے مستعفی ہو کر وطن چلے آئے۔ اعلیٰ حضرت نظامِ دکن نے وطن سے بلوا کر سببِ استعفا دریافت کیا۔ انہوں نے ملازمت کی پابندیوں کو اپنے لئے ناقابلِ تحمل بتایا۔ اس پر نظامِ دکن نے ان کے لئے ایک سو پچیس روپیہ ماہوار کا وظیفۂ علمی حینِ حیاتی، مقرر کر دیا (پولیس ایکشن کے بعد یہ وظیفہ بند کر دیا گیا تھا لیکن مولانا آزاد وغیرہ کی مداخلت سے دوبارہ جاری ہوا۔ اور ان سطور کی تحریر کے وقت دوبارہ اس کے بند ہونے کا حکم آگیا ہے)۔

۱۹۱۸-۱۹ء سے ان کے افکار و خیالات میں انقلاب عظیم واقع ہوا۔ اولاً مسز اینی بسنٹ کی تحریروں سے وہ ہندوؤں کے روحانی افکار و خیالات کی طرف راغب ہوئے۔ گیتا کے انگریزی تراجم پڑھے۔ گاندھی جی کی تحریریں بھی مادیت کو روحانیت سے بدلنے میں کسی حد تک معین ہوئیں۔ اس کے بعد مثنوی مولانا روم کے مطالعہ نے ان کی بالکل ہی قلب ماہیت کر دی۔ اب فلسفہ کی جگہ ان پر تصوف کا غلبہ ہوا۔ شہر لکھنؤ کا قیام ترک کر کے اپنے آبائی وطن قصبہ دریا آباد ضلع بارہ بنکی (جو لکھنؤ سے ۴۲ میل کے فاصلہ پر واقع ہے) آ کر ایک حد تک گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنی شروع کر دی۔ مذہب کا رنگ روز بروز غالب آتا گیا۔ داڑھی رکھی۔ وضع قطع، طرز ماندو بود، سب پر مذہب کا اثر نمایاں ہوا۔ اس زمانہ میں روحانی مشقتیں بھی کثرت سے کیں، روزے کثرت سے رکھے۔ محافل سماع میں بھی کثرت سے شریک ہوئے۔ حضرت نظام الدین محبوب الٰہیؒ کے مزار پر چلہ کشی بھی کی۔ تحریک خلافت و ترک موالات سے بھی بہت متاثر ہوئے۔ اس زمانہ میں مولانا محمد علی کا اثر ان پر خاص طور سے پڑا۔ مولانا محمد علی نے اپنی نظر بندی چھندواڑہ کے زمانہ میں ان کی کتاب سائیکالوجی آف لیڈر شپ پر تبصرہ کرتے ہوئے ان پر تبلیغ اسلام شروع کر دی تھی۔ وہ تبلیغ رفتہ رفتہ مؤثر ہوئی۔ اسی طرح لسان العصر حضرت اکبر الٰہ آبادی بھی شروع سے ان پر بہت مہربان تھے۔ یہ اپنے دور فلسفیت میں بھی اکبر صاحب سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ مراسلت کے علاوہ ملاقات بھی ہوتی رہتی تھی۔ حضرت اکبرؒ مراسلت اور ملاقات دونوں میں نہایت حکیمانہ انداز میں (نہ کہ بحث و مناظرہ کے طریق پر) انہیں تبلیغ کرتے رہتے تھے۔ اس کا اثر بھی رفتہ رفتہ مرتب ہوا اور جس وقت حضرت اکبرؔ نے وفات پائی (۲۱ ستمبر ۱۹۲۱ء) فلسفی عبدالماجد صاحب، مولانا عبدالماجد صاحب بن چکے تھے۔ حضرت اکبر کی تبلیغ کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔ اپنے خط مورخہ ۱۱ فروری ۱۹۱۶ء میں فلسفۂ اجتماع کے مصنف عبدالماجد صاحب کو (جن کے متعلق فتاویٰ تکفیر اس وقت علماء بے تکان دے رہے تھے) اکبر صاحب بھی یوں لکھتے ہیں:

> "برادرم! قرآن شوق سے دیکھئے، خوب دیکھئے، یہاں تک کہ بلا مدد ترجمہ اس کے ظاہری معنی سمجھنے لگیں۔ تفسیر کی تو حد نہیں۔ مذاق مفسرین کی بوقلمونی حیرت انگیز ہے۔ قرآن مجید کو بطرز تلاوت پڑھا کیجئے۔ ایک سرے سے پڑھ جائیے اور پھر پڑھئے اور پھر پڑھئے۔ زیادہ نہ رکئے پڑھتے جائیے۔ ثواب کا عقیدہ نہ سہی، لٹریری لطف و ذوق کا خیال کیجئے۔ ہر وقت طبیعت یکساں نہیں رہتی۔ کسی وقت کوئی آیت دل کو متوجہ کرے گی۔ مزا آئے گا یا کوئی مسئلہ منکشف ہوگا۔ جو اس وقت یا ان روزوں ذہن میں ہے۔ کسی وقت اس طرح کوئی اور آیت دامن دل کو کھینچے گی۔ غور اور اسٹڈی اور کریٹیسزم (criticism) اور مضمون نگاری کے لئے قرآن مجید کو خاص طور پر جا بجا حسب مرضی دیکھنے کا کوئی اور وقت نکال لیجئے۔"
>
> (خطوط مشاہیر حصہ اول، صفحہ ۸۹-۹۰)

۱۲ رجون ۱۹۱۸ء کے خط میں اسی فلسفی اور دہری، عبدالماجد صاحب کے بارہ میں لسان العصر حضرت اکبرؔ نے ذیل کی پیشین گوئی حضرت نیاز بریلویؒ کے فارسی شعر پر تضمین کہتے ہوئے فرمائی تھی ؎

ماجد کو آپ سمجھیں بیگانۂ طریقت — دل میں مرے تو ہے اک امید کا قصیدہ
ہیں غالباً وہ مصداق اس شعر با اثر کے — ارشاد کر گیا ہے اک عبد برگزیدہ
من پاکباز عشقم ذوق فنا چشیدہ — آہوئے دشت ہویم از ما سوا رمیدہ

اور جب حضرت اکبرؔ نے اپنی زندگی کے آخری دور میں یہ پیشین گوئی پوری ہوتی دیکھی تو انہوں نے اپنے ایک خط میں جو ۱۹۱۹ء کا لکھا ہوا ہے تحریر فرمایا:-

"میں نے بے ساختہ آپ کی نسبت لکھ دیا تھا کہ

آہوئے دشت ہویم از ما سوا رمیدہ

میں خوش ہوں کہ اس کی صداقت کے آثار آپ کی صاف اور بلند طبیعت سے نمایاں ہوتے جاتے ہیں۔ ہمارے مکرم ڈپٹی صاحب مرحوم کو شاید شبہ وافسوس تھا کہ لڑکا دین سے بیگانہ ہوتا جاتا ہے۔ اب فرشتوں سے یہ سُن کر ان کی رُوح خوش ہوگی کہ وہ لڑکا حقیقت آشنا ہوتا جارہا ہے اور انشاء اللہ بہت جلد کہہ دے گا:

"بمقامے رسیدہ ام کہ مپرس"

(خطوطِ مشاہیر جلد اوّل صفحہ ۱۵۴-۱۵۵)

اس زمانہ میں گاندھی جی کی تحریک ترکِ موالات وستیہ گرہ کے سیاسی پہلوؤں سے زیادہ روحانی پہلوؤں سے وہ خاص طور پر متاثر ہوئے اور فرنگی تہذیب وتمدن، فرنگی نظامِ تعلیم ونظامِ معاشرت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے والوں میں جلد ہی نمایاں حیثیت اختیار کر لی اور ملک وملت کے لئے انگریزوں کی غلامی سے زیادہ انگریزیت بلکہ فرنگیت کے مسحور کن ومرعوب کن اثرات سے آزادی ضروری سمجھنے لگے۔ اس زمانہ سے انہوں نے کھدّر پہننا شروع کر دیا اور اس پر اب تک قائم ہیں۔

۱۹۲۷ء میں ان کی ملاقات پہلے پہل حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی سے ہوئی۔ ان کی صحبت کے اثرات ان پر بہت نمایاں پڑے۔ ان کی تفصیل مولانا دریابادی کی کتاب حکیم الامت — نقوش وتاثرات (دار المصنفین اعظم گڑھ۔ شائع شدہ ۱۹۵۲ء) میں مل سکتی ہے۔

اس تحریکِ ترکِ موالات کے زمانہ میں مولانا نے تحریکِ خلافت سے، اپنی گوشہ نشینی کے باوجود ایک حد تک دلچسپی لی۔ حضرت مولانا محمد علی کی وجہ سے ایک زمانہ میں اودھ خلافت کمیٹی کے صدر بھی رہے۔ مرکزی خلافت کمیٹی کے رکن عرصہ تک رہے اور جب ۱۹۲۷ء میں آل انڈیا خلافت کانفرنس کا اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا تو اس کی مجلسِ استقبالیہ کے صدر بھی تھے۔

۱۹۱۹ء میں لکھنؤ سے ایک ہفتہ وار اخبار حقیقت کے نام سے نکلا۔ مولانا نے اس میں کثرت سے مضامین لکھے اور ان میں سیاسی مضامین بھی شامل تھے۔ ۱۹۱۶ء سے دار المصنفین اعظم گڑھ کا مشہور علمی رسالہ معارف نکلنا شروع ہوا۔ اس کے مضمون نگاروں میں یہ شریک تھے 'اخبارِ علمیہ' کا عنوان سالہا سال انہی کے قلم کا رہینِ منت رہا اور ۱۹۲۰ء میں جب صاحبِ معارف، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا محمد علی' کی معیت میں وفدِ خلافت کے رکن کی حیثیت سے یورپ گئے تو معارف کی ادارت مولانا عبد الماجد صاحب نے کی اور اس کے شذرات انہی کے قلم سے نکلے تقسیمِ ملک کے بعد، مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کے پاکستان چلے جانے کے بعد سے اب تک اس رسالہ معارف اور اس ادارۂ دار المصنفین کی نگرانی مولانا ہی کے سپرد ہے۔

۱۹۲۵ء سے مولانا نے ایک ہفتہ وار دینی واصلاحی پرچہ "سچ" کے نام سے نکالا۔ اس کا خاص مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور خصوصیت کے ساتھ فرنگیت اور مغربیت کے سیلاب سے ان کو بچانا تھا۔ اس اخبار کی زبان بہت ہی سہل اور دل نشین ہوتی تھی۔ ۱۹۲۹ء میں سفرِ حج وزیارتِ مدینۂ طیبہ سے مشرف ہوئے۔ اور پورا سفرنامہ اولاً اخبار سچ میں بصورتِ مضمون قسط وار اور بعدازاں کتابی شکل میں سفرِ حجاز کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے پڑھنے سے ان کی انشا پردازی کا اصل رنگ ظاہر ہوتا ہے۔ حج کے متعلق مذہبی وفقہی معلومات کے ساتھ ساتھ ادب وانشا کے جواہر ریزے، سفر وسیاحت کی دلچسپیوں کے ساتھ ساتھ سیاسیات وجغرافیہ کی معلومات کا ایک عجیب دلکش گلدستہ۔

۱۹۳۲ء میں قرآن مجید کے انگریزی ترجمہ و تفسیر کے کام کا آغاز کیا۔ اس لئے اخبار "سچ" کو وقتی طور پر بند کر دیا۔ ۱۹۳۴ء سے یہی اخبار "صدق" کے نام سے لکھنؤ سے نکلنا شروع ہوا۔ شروع شروع میں وہ روزنامہ تھا، بعدازاں ہفتہ وار ہوگیا۔ اس کی سچی باتوں اور نوٹوں اور مقالات نے بہت جلد ملک گیر شہرت حاصل کر لی۔ اخبار "سچ" کی سابقہ خصوصیات کے ساتھ ساتھ عہد حاضر کے جدید ترین فتنوں کے مقابلہ میں بھی اس اخبار نے نمایاں شہرت حاصل کر لی۔ اس کے علاوہ اُردو کتب اور ... پر اس کی بلند پایہ تنقیدات کی بھی ملک میں دھوم مچ گئی۔ ۱۹۵۰ء میں بعض مجبوریوں کے باعث اخبار صدق بند کرنا پڑا اور چند ماہ کے تعطل کے بعد یکم دسمبر ۱۹۵۰ء سے یہی اخبار "صدق جدید" کے نام سے نکل رہا ہے۔ ہر ہفتہ اس کے اقتباسات ہند اور پاکستان کے بیشتر اخبارات میں کثرت سے نقل ہوتے ہیں۔ اُردو کے بہت کم پرچے ایسے ہیں جن کے مضامین اس کثرت سے دوسرے پرچے اپنے یہاں نقل کرتے ہوں۔

انگریزی ترجمہ کلام مجید اور تفسیر کا کام مولانا عرصہ ہوا ختم کر چکے ہیں۔ ۱۹۴۱ء میں تاج کمپنی لاہور نے پارۂ اول بڑے اہتمام سے شائع کیا۔ ۱۹۴۳ء میں پارۂ دوم طبع ہوا۔ اس کے بعد سے اس کی طباعت کا کام رُکا پڑا ہے جس کی ذمہ داری تمام تر ناشر پر ہے۔ حال میں کمپنی مذکور نے وعدہ کیا ہے کہ عنقریب پانچ پاروں کا ترجمہ و تفسیر یکجائی طور پر شائع ہوگا۔ اس انگریزی ترجمہ و تفسیر کی خصوصیات امتیازی یہ ہیں:۔

(۱) ترجمہ اہل سنت کے راسخ عقائد کے مطابق ہے۔

(۲) پوری کوشش کی گئی ہے کہ حتی الامکان کسی چیز، حتیٰ کہ کسی حرف کا بھی ترجمہ چھوٹنے نہ پائے۔

(۳) ترجمہ کے الفاظ کے لئے انتخاب بھی ایسے لفظوں کا کیا گیا ہے جو قرآن پاک کے اصل مفہوم سے قریب تر ہیں۔

(۴) ترجمہ کے تفسیری حواشی میں جو بہت بڑی تعداد میں ہیں، خصوصیت کے ساتھ یورپ اور یورپ زدہ لوگوں کو سامنے رکھا گیا ہے اور ان کی طرف سے ہونے والے عقلی، تاریخی، جغرافی اور مذہبی ہر قسم کے اعتراضات اور شبہات کی پوری تشفی کر دی گئی ہے اور اس کے لئے خود مغربی کتب کے حوالہ جات اور نامور مصنفین کی کتابوں کے بکثرت حوالے پیش کئے گئے ہیں۔

(۵) اسلام کی تعلیم کا مقابلہ دوسرے مذاہب سے کر کے اس کی فوقیت کے دلائل پیش کئے گئے ہیں۔

الغرض یہ ترجمہ اسلام سے متعلق ایک ضروری انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتا ہے۔

انگریزی ترجمہ و تفسیر کا کام تقریباً دس گیارہ سال کی محنت شاقہ میں مکمل ہوا۔ اس کے بعد مولانا نے اُردو ترجمہ و تفسیر کا کام شروع کیا۔ خدا کے فضل سے اس کا مسودہ بھی عرصہ ہوا مکمل ہو چکا، اور "تفسیر ماجدی" کے نام سے اس کی دو جلدیں، منزل اول اور منزل ثانی کی تفسیر پر مشتمل، تاج کمپنی لاہور و کراچی کے یہاں سے شائع ہو چکی ہیں، بقیہ پانچ جلدیں بعد میں شائع ہوں گی۔ اس اُردو تفسیر میں انگریزی ترجمہ و تفسیر کے مذکورہ بالا حصہ جات کے علاوہ مستند عربی کتب تفسیر کے حوالے بھی کثرت سے درج ہیں جن سے اُردو خواں طبقہ کی تفسیری معلومات بہت وسیع ہو سکتی ہیں۔ اس تفسیر اُردو پر فاضل علماء نے نہایت اچھی رائیں ظاہر کی ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم مولانا محمد طیب صاحب نے جلد دوم پر اظہار رائے فرماتے ہوئے لکھا ہے:۔

> "تفسیر کی خوبی کے لئے مفسر مسلمہ کا علم اور قلم بہترین شہادت ہیں۔ اس تفسیر کا امتیازی پہلو وہ موازنہ ہے جو جگہ جگہ قرآن حکیم اور عہد قدیم کی کتب میں کر کے قرآنی معارف کی حقیقی فطرت کسولی گئی ہے جس سے اسلامی تعلیمات کا تفوق ہی نہیں، بلکہ دنیا کے ہر دور کے لئے ان کی ہمہ گیری اور ناگزیری نمایاں ہو جاتی ہے۔ ساتھ ہی عام تفسیری خوبیاں اور صاحب قلم مفسر کے تعبیری کمالات اس پر مستزاد ہیں۔"

مولانا ان سطور کی تحریر کے وقت، اخبار "صدقِ جدید" (لکھنؤ) کے مدیر کی حیثیت سے ہند اور پاکستان دونوں میں نمایاں شہرت رکھتے ہیں۔ ان کی تحریر کردہ سچی باتیں اور نوٹ دونوں ملکوں کے اخبارات کثرت سے نقل کرتے ہیں۔ اس اخبار میں مولانا کے قلم سے کتب و رسائل پر تنقیدیں بھی وقتاً فوقتاً نکلتی رہتی ہیں۔ جو اعلیٰ تنقید اور انشائے ماجد کا بہترین نمونہ ہوتی ہیں۔

مولانا کا طرزِ تحریر، ان کے دورِ فلسفیت میں ایک حد تک مولانا شبلی مرحوم کے تتبع کو ظاہر کرتا تھا۔ اب ان کا طرز پہلے سے بالکل مختلف ہو چکا ہے۔ بے ساختگی، سادگی، شدتِ تاثر، رعایتِ لفظی کا وقتاً فوقتاً استعمال، لیکن اس خوش اسلوبی کے ساتھ کہ نہ ابھی آورد نہ معلوم ہو۔ مضمون کے لحاظ سے موزوں الفاظ اور فقروں کا انتخاب ان کی تحریر کے خاص جوہر ہیں۔ طنز نگاری میں آپ کا اسٹائل درجۂ کمال کو پہنچ چکا ہے لیکن اس میں نہ تو دوسروں پر ذاتی حملے ہوتے ہیں نہ کسی قسم کی رکاکت و ابتذال۔

مولانا کے طرزِ تحریر پر، مولوی رئیس احمد جعفری (مؤلف سیرت محمد علی) اپنی کتاب "دید و شنید" میں یہ لکھتے ہیں:۔

"مولانا طنزیات کے بادشاہ ہیں۔ نثر میں رعایتِ لفظی اس کمال سے استعمال کرتے ہیں — کہ سہلِ ممتنع کا مزا آجاتا ہے۔ طرزِ تحریر اتنا دلکش:

بلائے جاں ہے غالبؔ اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

اور پھر لطف یہ کہ جس موضوع پر لکھیں گے، اپنی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے، طرزِ تحریر بھی ایسا جو موضوع سے مناسبت رکھتا ہو۔ ایک ہی قلم ہے جس نے تاریخِ اخلاقِ یورپ بھی لکھی اور فلسفۂ جذبات بھی۔ جس نے تصوفِ اسلام بھی لکھی اور فلسفۂ اجتماع بھی۔ جس نے مثنوی بحر المحبت (مصحفی) مرتب و مہذب کی اور مکالماتِ برکلے بھی۔ سفرِ حجاز بھی لکھا اور سچی باتیں بھی لکھتا ہے۔ ان میں ہر ایک میں انفرادیت پوری شان سے قائم ہے۔ طرزِ تحریر کہیں معلم کا، کہیں مترجم کا۔ کہیں فلسفی کا، کہیں انشا پرداز کا، کہیں ادیب کا۔ تاریخِ اخلاقِ یورپ شستہ و رواں ترجمہ ہے۔ فلسفۂ جذبات اور فلسفۂ اجتماع کا اندازِ تحریر باوقار اور سنجیدہ ہے تصوفِ اسلام اور فیہ ما فیہ میں تصوف کی متانت غالب ہے۔ سفرنامۂ حجاز میں قلم ایک ایسے مصور کا موقلم ہو جاتا ہے جو دل کے جذبات کو تصور کی نقش آرائیوں، عقیدت اور احترام کے تاثرات کو محسوس اور مرئی صورت میں دکھا سکتا ہے۔ ہر مصنف کو اپنے قلم پر یہ قدرت نہیں ہوتی۔"

مولانا کے متعلق ناواقفوں کو شاید یہ غلط فہمی ہو کہ وہ بڑے خشک مزاج اور کٹر مذہبی ہیں۔ جو لوگ ان سے ذاتی واقفیت رکھتے ہیں، وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ چیز حقیقت سے کتنی دور ہے۔ مولوی رئیس احمد جعفری کی تحریری شہادت اس سلسلہ میں خاص وزن رکھتی ہے۔ وہ اپنی اسی کتاب دید و شنید میں لکھتے ہیں:۔

"ایک بڑی چیز ہے توازن۔ کم لوگ ایسے ہیں جو اس نعمت سے بہرہ ور ہیں۔ افراط میں مبتلا ہیں یا تفریط میں۔ مولانا کو خدا نے توازن کے ساتھ وہ سلامتیٔ فکر عطا کی ہے جو افراط و تفریط سے بہت دور ہے۔ وہ کٹر حنفی ہیں، لیکن غیر مقلدوں کے دشمن نہیں۔ وہ سیاسیات

میں مسلم لیگ اور پاکستان کے قائل ہیں، لیکن نیشنلسٹوں کو اچھوت نہیں سمجھتے۔ وہ اپنے سنی ہونے پر ناز کرتے ہیں لیکن شیعوں کو مسلمان سمجھتے ہیں۔ جس کے مخالف ہیں اس کی حمایت کر سکتے ہیں۔ وہ ظاہر کو بھی دیکھتے ہیں اور باطن کو بھی۔ وہ ان میں سے کسی ایک پر فیصلہ نہیں کر دیتے۔ ان کا فیصلہ ہر دو پر مبنی ہوتا ہے۔

وہ ہنستے بھی ہیں اور روتے بھی ہیں، ہنساتے بھی ہیں اور رُلاتے بھی ہیں۔ ہنستے ہیں تو ان کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ روتے ہیں تو آنکھوں سے آبدار موتیوں کی بارش ہونے لگتی ہے۔ ہنساتے ہیں تو فضا کو باغ و بہار بنا دیتے ہیں۔ رُلاتے ہیں تو دل میں گداز و سوز پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کے پاس نشاطِ حیات بھی ہے اور فکرِ آخرت بھی۔ وہ فکرِ آخرت پر نشاطِ حیات کو قربان نہیں کرتے اور نشاطِ حیات کے مقابلہ میں فکرِ آخرت کو فراموش نہیں کرتے۔ وہ آخرت کی فکر بھی کرتے ہیں اور زندگی سے لطف بھی لیتے ہیں۔ وہ ورزش بھی کرتے ہیں، واکنگ (walking) بھی کرتے ہیں، نماز بھی پڑھتے ہیں، روزہ بھی رکھتے ہیں۔ رات کو جاگتے بھی ہیں اور سوتے بھی ہیں، دن کو آرام بھی کرتے ہیں اور کام بھی۔ جاگنے کے وقت جاگتے ہیں، سونے کے وقت سوتے ہیں۔ غرض یہ کہ ان کی ہر چیز میں ایک اعتدال ہے، توازن ہے۔ ایک کامل المعیار انسان میں اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے؟

مولانا کی تصنیفات و تراجم کی مکمل فہرست حسبِ ذیل ہے۔ اس سلسلہ میں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ مولانا اپنی کتابوں میں بہت کانٹ چھانٹ اور انتہائی عمیق نظرِ ثانی کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے جن کتابوں کے ایک سے زائد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، مثلاً فلسفۂ جذبات، تصوفِ اسلام، مقالاتِ ماجد وغیرہ، ان کے پہلے اور بعد کے ایڈیشنوں میں نمایاں فرق کثرت سے ملیں گے اور مولانا کے حقیقی اور پختہ رنگ کا اگر مطالعہ کرنا ہے تو ان کی کتابوں کے تازہ ترین ایڈیشن نظر کے سامنے رہنے چاہئیں:

نام کتاب	مختصر تعارف
(۱) غذائے انسانی	ایک مختصر مضمون جو آریہ سماجیوں کے رَد میں ہے۔ یہ دورِ طالب علمی کی تالیف ہے۔ اس میں گوشت کو انسان کی فطری غذا ثابت کیا گیا ہے۔
(۲) فلسفۂ جذبات	نفسیات (سائیکالوجی) پر اردو کی پہلی مقبولِ عام کتاب۔ اس کے اب تک تین ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ اس کا فارسی ترجمہ بھی افغانستان میں کرایا گیا ہے۔
(۳) فلسفۂ اجتماع	(اس کتاب کو مولانا نے عرصہ ہوا اپنی تصانیف سے خارج کر دیا ہے)
(۴) فلسفہ اور اس کی تعلیم	مولانا کا ایک مضمون جو رسالہ الناظر لکھنؤ میں شائع ہوا تھا اور بعد میں اسے الناظر ایجنسی لکھنؤ نے کتابی شکل دے دی۔
(۵) تاریخ اخلاقِ یورپ دو جلد	لیکی کی کتاب "ہسٹری آف دی یوروپین مارلس" کا سلیس و شگفتہ ترجمہ۔
(۶) منطق	منطقِ جدید پر جامع درسی کتاب۔ عرصہ تک عثمانیہ یونیورسٹی میں داخلِ نصاب رہی۔
(۷) تاریخ تمدن جلد ۲	طامس بکل کی کتاب کا ترجمہ۔ اس کتاب کا ترجمہ منشی احمد علی مرحوم کر رہے تھے۔ ان کے انتقال پر ترجمہ کی تکمیل مولانا نے کی۔

(۸) فلسفیانہ مضامین — موصوف کے ان فلسفیانہ مضامین کا مجموعہ، جو رسالہ الناظر لکھنؤ میں شائع ہوئے تھے۔

(۹) مبادی فلسفہ حصہ اول
(۱۰) ″ ″ ″ دوم — ان فلسفیانہ مضامین کا مجموعہ جو رسائل معارف و الناظر و ادیب وغیرہ میں شائع ہوئے۔ مکمل نظرثانی کے بعد۔

(۱۱) فرائضِ والدین — "خادمِ تعلیم" کے فرضی نام سے شائع کردہ مطبع نولکشور لکھنؤ۔

(۱۲) مکالماتِ برکلے — مشہور فلسفی "برکلے" کے ڈائیلاگس کا ترجمہ۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ سے شائع ہوئی۔

(۱۳) پیامِ امن — ایک فرانسیسی مفکر مسیو پال رچرڈ کی تصنیف کا اردو ترجمہ۔ ختمِ جنگِ عظیم اول کے بعد، دنیا میں امن کے قیام کی تدابیر کا ذکر۔ مترجم نے اسلام کے نظریۂ امن سے متعلق ایک مستقل باب اپنے قلم سے لکھ کر کتاب میں اضافہ کیا ہے۔

(۱۴) تحفۂ خسروی — حاکم و محکوم کے تعلقات کے بارہ میں اسلامی تعلیمات اور قدیم حکماء و حکمائے اسلام کے اقوال و افکار کا مجموعہ۔

(۱۵) مثنوی بحر المحبت — اُردو کے استاد مصحفی کی ایک غیر مطبوعہ مثنوی۔ ترتیب و تصحیح و تحشیہ کے ساتھ، مع ایک مقدمہ کے۔

(۱۶) تصوفِ اسلام — تصوفِ اسلام کی مختصر مگر جامع کتاب۔

(۱۷) فیہ ما فیہ — مولانا جلال الدین رومی کے غیر مطبوعہ ملفوظات۔ ترتیب و تصحیح کے ساتھ۔ شروع میں ایک مبسوط مقدمہ۔

(۱۸) سفرِ حجاز — مولانا کے سفرِ حج و زیارتِ مدینہ منورہ کی روداد۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۳۱ء میں اور دوسرا مع ضمیموں اور جدید حاشیوں کے ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا۔

(۱۹) زُودِ پشیماں — ایک ڈرامہ جو موجودہ دور سے بہت قبل انہوں نے 'ناظر' کے فرضی نام سے لکھا۔ لیکن اب وہ اس کی اشاعت کے روادار نہیں ہیں۔

(۲۰) ہم آپ — جدید نفسیات پر مولانا کی آخری کتاب۔ شائع کردہ ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد۔

(۲۱) ترجمہ و شرح مناجاتِ مقبول — مولانا اشرف علی تھانوی کی دُعاؤں کی کتاب کا ترجمہ مع تشریحی حواشی۔

(۲۲) تمدنِ اسلام کا پیام بیسویں صدی کے نام
(۲۳) تمدنِ اسلام کی کہانی خود اس کی زبانی — مولانا کے دو لکچر جو مجلسِ اسلامیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پڑھے گئے۔

(۲۴) مردوں کی مسیحائی — مضامین متعلق سیرتِ نبوی و متعلقات کا مجموعہ۔

(۲۵) مضامینِ عبد الماجد — اخبار 'سچ' و 'صدق' میں شائع شدہ مقالات کا انتخاب۔

یہ دونوں کتابیں ادارۂ اشاعتِ اُردو حیدرآباد نے شائع کی تھیں۔

(۲۶) قصص و مسائل — مولانا کے دو قرآنی مضامین، قدیم مسائل جدید روشنی میں اور جدید قصص الانبیاء پر مشتمل۔

(۲۷) سچی باتیں — اخبار 'سچ' و 'صدق' میں شائع ہونے والی سچی باتوں کا مجموعہ۔

(۲۸) تفسیرِ ماجدی جلد اوّل و جلد دوم — قرآن مجید کا ترجمہ و تفسیر۔ اب تک اس کی دو جلدیں جو پہلی اور دوسری منزلوں کی تفسیر پر مشتمل ہیں، تاج کمپنی لاہور کے زیرِ اہتمام شائع ہو چکی ہیں۔

(۲۹) ترجمہ و تفسیر قرآنِ مجید (انگریزی)، پارۂ اول و دوم — مولانا کا یہ شاہکار بھی تاج کمپنی شائع کر رہی ہے۔ ابھی تک صرف دو پارے طبع ہوئے ہیں۔

(۳۰) حکیم الامت۔ نقوش و تاثرات: حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی سے متعلق مولانا دریابادی کے تاثرات۔

(۳۱) محمد علی۔ ذاتی ڈائری حصہ اوّل، رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم سے متعلق مولانا دریابادی کی تازہ ترین تصنیف۔ اکثر نقادوں کے نزدیک ان کی سب سے زیادہ مؤثر اور آبدار کتاب۔ اس کا حصہ دوم ابھی طبع نہیں ہوا۔ یہی کتاب دس بارہ سال ہوئے، ناتمام صورت میں اسی نام سے حیدر آباد سے بھی ایک ناشر کتب شائع کر چکے ہیں۔

(۳۲) مقالاتِ ماجد حصہ اوّل مولانا کے ادبی مضامین مثلاً پیامِ اکبر، ایک بدنام شاعر، اور تنقیدات کا مجموعہ۔ پہلا ایڈیشن تاج آفس بمبئی نے شائع کیا تھا اور اب دوسرا ایڈیشن، عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور نے شائع کیا ہے۔

(۳۳) مقالاتِ ماجد حصہ دوم یہ مجموعہ بھی عشرت پبلشنگ ہاؤس عنقریب شائع کرنے والا ہے۔

(۳۴) خطوطِ مشاہیر حصہ اوّل مولانا دریابادی کے نام مولانا شبلی نعمانی، حضرت اکبر الہ آبادی اور مولانا محمد علی جوہر کے خطوط مع متعدد حواشی۔

(۳۵) اکبرنامہ یا اکبر میری نظر میں اکبر الہ آبادی سے متعلق مولانا کے نوشتوں کا مجموعہ۔

ان کتابوں کے علاوہ متعدد تصنیفات کے مسودے تیار ہیں۔ جن کی اشاعت ابھی نہیں ہو سکی۔ مثلاً خطوطِ مشاہیر حصہ دوم، نشریاتِ ماجد (ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ) الحیوانات فی القرآن یا حیواناتِ قرآنی، الاماکن فی القرآن یا جغرافیہ قرآنی۔

مولانا نے حال ہی میں اپنی آپ بیتی بھی لکھنی شروع کی ہے لیکن اس کے متعلق ان کا ارادہ یہی ہے کہ ان کی زندگی میں شائع نہ ہو۔

ذاکر صاحب

ڈاکٹر عابد حسین

طفیل صاحب کی فرمائش پہنچی کہ ذاکر صاحب کی شخصیت پر ایک مضمون نقوش کے لئے لکھ دوں۔ پہلے پہل اس سعادت سے معذرت کی، دو وجوہ سے۔ ایک تو سست سوچنے اور سست لکھنے کی عادت، ویسے بھی کبھی رسالوں کے لئے مقررہ وقت کے اندر مضمون نہیں لکھ سکتا اور پھر اس زمانے میں شدید مصروفیت کی وجہ سے اور بھی مشکل ہے۔ دوسرے یہ کہ ذاکر صاحب جیسی ہمہ رنگ و یک رنگ شخصیت کا نقشہ ایک مضمون کی چوکھٹ پر اتارنا قلم کا نہیں بلکہ موقلم کا کام ہے جس میں مجھے دسترس حاصل نہیں۔ مگر یہ مشکل طفیل صاحب نے مجھے کچھ اور مہلت دے کر حل کر دی [illegible] کہ اگر اس وقت ایسا مضمون لکھنا ممکن نہیں [illegible] تو ایسا ہی [illegible] شاید یہ سلسلہ اطمینان [illegible] کسی دن اس موضوع پر ایک سیر حاصل مضمون اور (یا شاید ایک پوری کتاب) لکھ دوں۔

شخصیت کیا ہے؟ اس پر مفصل بحث کرنے کا اس وقت موقع نہیں مجمل طور پر یوں سمجھ لیجئے کہ شخصیت ان جسمانی اور اخلاقی صفات کا ایک ہم آہنگ مجموعہ ہے جن کی بدولت کوئی شخص عام لوگوں سے امتیاز حاصل کرتا ہے اور ان پر اثر انداز ہوتا ہے۔ بعض اوقات ہم شخصیت کے مالک یعنی اس انسان کو بھی جو غیر معمولی جسمانی اور اخلاقی صفات رکھتا ہے شخصیت کہہ دیتے ہیں۔ اس مضمون میں شخصیت کا لفظ ضرورت کے مطابق دونوں معنوں میں استعمال ہوگا۔

یہ بات تو شخصیت کی تعریف ہی میں داخل ہے کہ وہ اپنے ماحول پر اثر انداز ہوتی ہے۔ البتہ اس بارے میں بہت کچھ اختلاف ہے کہ اس کے اثر کی کیا حدود ہیں۔ اکبر نے کہا ہے:

ع مرد وہ ہیں جو زمانے کو بدل دیتے ہیں

اور اقبال نے تو شخصیت کو (جسے وہ خودی کہتے ہیں) خدائی کی حد تک قریب قریب پہنچا دیا ہے مگر ایسے لوگ بھی ہیں جن کے نزدیک شخصیت سراسر اپنے زمانے یا ماحول کی پیداوار ہوتی ہے۔ عام طور پر تصوریت (Idealism) کے علمبردار اس کے قائل ہیں کہ شخصیت اپنے ماحول پر غیر محدود اثر ڈال سکتی ہے اور بہت بڑی شخصیتیں واقعی قوموں کی زندگی اور زمانے کے دھارے کو بدل سکتی ہیں۔ مگر ثبوتیت (Positivism) کے پیرو یہ سمجھتے ہیں کہ بڑی سے بڑی شخصیت کا اثر بھی بہت محدود ہوتا ہے بلکہ خود شخصیت اپنے طبعی، سماجی اور سب سے زیادہ معاشی ماحول کے سانچے میں ڈھل جایا کرتی ہے۔

فلسفیوں کی افراط تفریط سے بچ کر تاریخ کا بے لاگ مطالعہ کرنے والا جانتا ہے کہ شخصیت اس انجن کی طرح ہے جس سے بڑی سے بڑی اصلاحی یا انقلابی تحریک کی گاڑی کھینچی جا سکتی ہے۔ لیکن خود یہ انجن جس طاقت سے چلتا ہے وہ اسے زمانے یا ماحول سے ملتی ہے۔ ایسی شخصیتیں جن میں اصلاح یا انقلاب پیدا کرنے کی صلاحیت ہے کبھی کبھی پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن ان کی صلاحیت کا قوت سے فعل میں آنا اس پر موقوف ہے کہ ان کے زمانے کے حالات اور زمانے کے لوگ ان کا ساتھ دیں۔

میں نے اپنے زمانے یعنی بیسویں صدی کے نصف اول میں جن مسلمانوں کو لوحِ تاریخ پر نمودار ہوتے دیکھا تھا ان میں کھری شخصیتیں بھی تھیں اور ملمع کی ہوئی بھی۔ نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں میں عام طور پر ملمع کا مال کھرے مال سے کہیں زیادہ مقبول ہوا۔ اس لئے کہ اس میں ظاہری چمک جس پر مسلمان جان دیتے ہیں زیادہ تھی۔ ذاکر صاحب ان کھری شخصیتوں میں سے ہیں جن کی مقبولیت کا دائرہ اب تک بہت محدود ہے، لیکن ملمع کی عارضی چمک ماند پڑنی شروع ہو گئی ہے اور کھرے سونے کی پائدار دمک بدستور موجود ہے۔ ممکن ہے اب ہندوستان کے مسلمان ذاکر صاحب کی شخصیت کو پرکھ سکیں :

ہم دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہے ہیں

اور ان کی مدد کے لئے ذاکر صاحب کی شخصیت کی نشو و نما اور موجودہ آب و رنگ پر تھوڑی سی روشنی ڈالتے ہیں۔

ذاکر حسین ۱۸۹۷ء میں حیدر آباد (دکن) میں پیدا ہوئے ان کے والد فدا حسین خان صاحب ضلع فرخ آباد (یو۔ پی) کے مشہور قصبے قائم گنج کے رہنے والے تھے اور حیدر آباد میں وکالت کرتے تھے، قائم گنج کے پٹھان صدیوں سے سپہ گری کا پیشہ رکھتے تھے چنانچہ ذاکر حسین کے خاندان کے بھی بہت سے لوگ فوج میں ملازم تھے۔ ان کے والد کا مشرقی علوم کی اعلیٰ تعلیم پانا اور وکالت کا پیشہ اختیار کرنا قائم گنج والوں کے نزدیک بدعت سے کم نہ تھا۔

ذاکر حسین کا بچپن حیدر آباد میں گزرا لیکن وہ اپنے گھر کی چار دیواری میں پلے اور بڑھے اور ریاست کی جاگیردارانہ آب و ہوا سے متاثر نہیں ہوئے۔ اس زمانے میں سب سے گہرا اثر ان کی سیرت پر اپنے پیر حسن شاہ صاحب کا پڑا جن کے وہ بہت کم عمری میں مرید ہو گئے تھے۔ یہ بزرگ ذاکر حسین کے عزیزوں میں سے تھے اور حضرت شاہ طالب حسین فرخ آبادی سے ارادت رکھتے تھے۔ حسن شاہ صاحب پر ایک واردات ایسی گذری تھی جس سے ان کی روحانی زندگی کی کایا پلٹ گئی۔ ابتدا میں وہ ہندوؤں سے تعصب رکھتے تھے اور شاید انہیں برا بھلا بھی کہتے تھے جب ان کے مرشد حضرت شاہ طالب حسین کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے ان کی تادیب اور تہذیب کے لئے یہ حکم دیا کہ تم چوٹی رکھو اور پشاور تک پیدل جاؤ اور واپس آؤ۔ اس تادیب نے حسن شاہ صاحب کو آزادہ روی اور صلح کل سکھانے کے علاوہ جہانیانِ جہاں گشت بنا دیا اور ان کا یہ شعار ہو گیا کہ ایک گٹھڑی کپڑوں اور کتابوں کی ساتھ لئے، پیدل دنیا بھر میں پھرا کرتے۔ جب کبھی حیدر آباد آکر کچھ دن رہتے تو ذاکر حسین کی ہدایت و ارشاد کا کام زیادہ تر ان دو طریقوں سے انجام دیتے : ایک تو وہ کمسن مرید سے علم دین یا سلوک و معرفت کی کسی کتاب کی نقل کراتے، دوسرے اسے روپیہ دیتے اور پھر حاجتمندوں کو اس کے پیچھے لگا دیتے کہ خیرات و حسنات کی مشق سے اس کا دل بھی کھل جائے اور ہاتھ بھی۔

۱۹۰۷ء میں ذاکر حسین تعلیم کے لئے اٹاوہ کے اسلامیہ ہائی اسکول میں بھیج دئے گئے جسے سید احمد خان کے ایک دور کے رفیق مولوی بشیر الدین نے قائم کیا تھا۔ ان بزرگ کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ انہیں ایک ہی دھن تھی اور اپنی دھن کے پکے تھے۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر سید الطاف حسین ان سچے معلموں میں سے تھے جو اس راز سے واقف ہوتے ہیں :

درسِ ادب اگر بود زمزمۂ محبتش
جمعہ بہ مکتب آورد طفلِ گریز پائے را

ذاکر حسین کے حساس دل پر مولوی صاحب کی ایک صفت اور سید صاحب کی بہت سی صفات کا بڑا گہرا نقش بیٹھا جو کبھی مٹ نہ سکا۔

۱۹۱۳ء میں ذاکر حسین ایم۔ اے۔ او کالج علی گڈھ میں داخل ہوئے۔ انٹر میڈیٹ انہوں نے سائنس میں پاس کیا اور ۱۹۱۵ء میں بی۔ ایس۔ سی کا امتحان

پڑھنے کے لئے لکھنؤ کرسچین کالج میں داخل ہوئے تاکہ میڈیکل کالج میں داخلہ لے سکیں۔ لیکن شدید علالت کی وجہ سے اس ارادہ کو ترک کر کے پھر علی گڑھ واپس آنا پڑا۔ اس طرح ان کا ایک سال بیکار گیا۔ اس بار انہوں نے آرٹس کا کورس لیا۔ ۱۹۱۸ء میں بی۔ اے اور ۱۹۱۹ء میں اقتصادیات کے مضمون میں ایم اے پریوئیس پاس کیا۔ ایم اے کی تیاری کے ساتھ ساتھ ذاکر حسین اقتصادیات کے شعبے میں جونیئر لکچرار کے فرائض انجام دے رہے تھے کہ علی گڑھ میں ترکِ موالات کا زلزلہ آیا جس سے سید احمد خان کا ایم۔ اے۔ او کالج زیر و زبر ہو کر ڈاکٹر ضیاء الدین کی مسلم یونیورسٹی بن گیا۔ کچھ لوگوں نے گرتی ہوئی عمارت سے نکل کر ایک خیموں کی بستی میں پناہ لی اور اس کا نام جامعہ ملیہ اسلامیہ رکھا ان پناہ گزینوں میں ذاکر حسین بھی تھے جو اب ذاکر صاحب کہلانے لگے تھے۔ علی گڑھ کالج کی تعلیم کے دوران میں ذاکر حسین یونین کے اور عام طور پر طالب علموں کی اجتماعی زندگی کے روحِ رواں تھے۔ انہوں نے اپنے بہت سے ساتھیوں پر گہرا اثر ڈالا۔ لیکن خود سب سے گہرا اثر ڈاکٹر ضیاء الدین کا قبول کیا۔ گو وہ مثبت نہیں منفی اثر تھا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کی ذات، ان سب صفات کا مجموعہ تھی جن سے سرکارِ برطانیہ کا تقرب اور عنادید قوم میں مقبولیت حاصل ہوتی تھی۔ ذاکر صاحب نے شعوری یا غیر شعوری طور پر ڈاکٹر ضیاء الدین کی پیروی معکوس کو اپنی زندگی کا اصول بنا لیا۔ ۱۹۲۰ء میں جب گاندھی جی اور مولانا آزاد نے علی گڑھ کے طلبہ کو ترکِ موالات کی دعوت دی تھی اور مولانا محمد علی نے شیخ الہند مولانا محمود الحسن مرحوم کے دستِ مبارک سے جامعہ ملیہ کا افتتاح کرایا تھا تو ذاکر صاحب کے لئے ایم۔ اے۔ او کالج کو چھوڑ کر جامعہ ملیہ میں شریک ہونے کا فیصلہ کرنا نہایت دشوار معلوم ہو رہا تھا۔ کئی روز شدید کشمکش میں مبتلا رہے مگر ایک دن جب ڈاکٹر ضیاء الدین نے انہیں بلا کر بڑی محبت سے زندگی کے نشیب و فراز سمجھائے اور یقین دلایا کہ ایم۔ اے۔ او کالج میں رہ کر تم کو ایک نہ ایک سال کے اندر ڈپٹی کلکٹری مل جائے گی تو ذاکر صاحب کی مشکل آسان ہو گئی۔ وہ فوراً ایم۔ اے۔ او کالج کو خیر باد کہہ کر جامعہ ملیہ پہنچ گئے۔

دو سال تک جامعہ ملیہ کی تعمیر میں مولانا محمد علی کا ہاتھ بٹانے کے بعد ۱۹۲۲ء میں ذاکر صاحب معاشیات کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے برلن پہنچے۔ میری ملاقات ان سے ایک مرتبہ علی گڑھ میں ہو چکی تھی۔ لیکن اب سوا تین برس تک میرا ان کا ہر وقت کا ساتھ رہا۔ میں نے انہیں ہر رنگ میں دیکھا اور ہر رنگ میں چوکھا پایا۔ سب سے زیادہ مجھ پر اس بات کا سکہ بیٹھا کہ ذاکر صاحب "دورِ ایام جوانی چناں کہ افتد و دانی" کی وادیٔ پُر خار سے بڑی پامردی سے گذر رہے۔ گھبرا کر بھاگنے کی کوشش میں کانٹوں میں اُلجھے نہیں بلکہ اوسان قائم رکھے دامن بچائے قدم بڑھائے چلے گئے۔ برلن میں ذاکر صاحب کے استادوں میں پروفیسر زومبارٹ اور دوسرے بڑے پائے کے عالم تھے جن سے انہوں نے بہت فیض اٹھایا مگر فیضان اگر تھوڑا بہت کسی سے پایا تو شاید میرے استاد اشپرانگر سے جو خبر کے ساتھ ساتھ نظر بھی رکھتے ہیں۔

۱۹۲۶ء میں ذاکر صاحب جرمنی سے ڈاکٹر ذاکر حسین بن کر لوٹے تو ملک کی یہ کیفیت دیکھی کہ ترکِ موالات اور خلافت کی تحریکیں ٹھنڈی پڑ چکی ہیں اور لوگوں پر خصوصاً مسلمانوں پر ایک عام افسردگی چھائی ہوئی تھی۔

گلشن میں کہیں بوئے دمساز نہیں آتی
اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی

مگر ایک آواز اب بھی سنائی دے رہی تھی اور وہ خود ان کے دل کی آواز تھی:

بیگانہ ہوئی دنیا رسم و رہِ الفت سے
اک میری طبیعت ہے جو باز نہیں آتی

یہ سخت جان طبیعت باز نہیں آئی اس نے جامعہ ملیہ کی سوکھتی ہوئی بیل کو خونِ جگر سے سینچا اور پروان چڑھایا۔ ۱۹۲۷ء کے آخر میں حکیم اجمل خان کے انتقال کے بعد جامعہ ملیہ کا چلنا قریب قریب ناممکن نظر آتا تھا۔ جن لوگوں نے ان دنوں ذاکر صاحب کے ساتھ کام کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ وسائل کے فقدان، اپنوں کی مخالفت، غیروں کی شماتت، حکومت کے عتاب کے باوجود جامعہ ملیہ کو چلانا ہر ایک کا کام نہیں تھا۔ یہ وہی کر سکتا تھا جسے

خدا پر، انسان پر اور خاص کر اپنے آپ پر سچا پورا اور گہرا بھروسہ ہو۔ جو ایثار ذاکر صاحب نے جامعہ ملیہ کے لئے کیا اس میں تن، من، دھن کی قربانی تو سب کو نظر آئی مگر ایک قربانی جو حوصلہ مند طبیعتوں کے لئے ان سب سے مشکل ہے بہت کم لوگوں نے دیکھی وہ یہ ہے کہ پبلک لیڈری کے موقعے جن کے لئے ذاکر صاحب کے ہم چشم ہزاروں جتن کرتے تھے ان کو بے مانگے مل رہے تھے مگر انہوں نے بے تامل چھوڑ دیئے۔ اس لئے کہ ان کے نزدیک تعلیم کا کام یوں بھی یکسوئی چاہتا ہے اور ان دنوں جامعہ ملیہ کی جوئے شیر لانے کے لئے خاص طور پر اپنے آپ کو پوری طرح کھپا دینے اور پتہ مار کر کام کرنے کی ضرورت تھی۔

ان دنوں ذاکر صاحب کو قریب قریب سبھی قومی اور ملی لیڈروں سے سابقہ رہا لیکن ان کی شخصیت پر قابل ذکر اثر حضرت مہاتما گاندھی اور حکیم اجمل خان کا پڑا۔ گاندھی جی کی حق بینی، حق شناسی، حق گوئی اور ہمہ گیر انسانیت کی آنچ نے اگر کچے سونے کو کندن بنایا تو حکیم اجمل خان کے خلق و مروت، صبر اور حلم نے اس پر جلا کر دی۔

بزرگان قوم میں سے سوا ڈاکٹر انصاری اور مولانا ابوالکلام آزاد کے سب، اس بے دلی کی فضا میں جو خلافت اور سوراج کی تحریک کے ناکام ہونے کے بعد چھا گئی تھی، اس ادارے کی کشتی کو حکومت کی مدد کے بغیر پار لگانے سے ہمت ہار چکے تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے وہ کام کر دکھایا جو انگریزی تعلیم پائے ہوئے مسلمانوں کے کبھی خواب و خیال میں بھی نہ آیا تھا۔ انہوں نے گاندھی جی کے مشورے سے جامعہ کے استادوں میں سے ان لوگوں کو ساتھ لے کر جنہوں نے بیس برس تک برائے نام معاوضے پر جامعہ ملیہ کی خدمت کا عہد کیا، انجمن تعلیم ملی کی بنا ڈالی۔ اس انجمن نے جامعہ ملیہ کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور چلایا۔ اہل حکومت روڑے اٹکاتے رہے۔ بزرگان قوم (الا ماشاء اللہ) دور سے تماشا دیکھتے رہے اور خود دار ان قوم ذاکر صاحب کی رہنمائی میں روکھی سوکھی کھا کر، موٹا جھوٹا پہن کر ایک آزاد تعلیم گاہ کی تعمیر کرتے رہے۔

۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کا زمانہ ذاکر صاحب کے لئے بڑی سخت آزمائش کا زمانہ تھا۔ یوں تو ہندوستان کے خون میں تحریک آزادی نے ۱۹۱۸ء سے ہیجان پیدا کر رکھا تھا۔ لیکن ۱۹۳۷ء میں حکومت خود اختیاری ملنے کے بعد ہندو مسلم اہل غرض کی اغراض کے تصادم سے فرقہ داری زہر اس شدت سے پھیلنے لگا تھا کہ ہیجان خون نے زہر باد کی صورت اختیار کر لی۔ ذاکر صاحب اور ان کی جامعہ ملیہ اس زمانہ میں دوگونہ رنج و عذاب میں مبتلا تھی۔ فرقہ پرست ہندو اور مسلمان چاہتے تھے کہ دونوں کو نفرت کی آگ میں لپیٹ لیں یا ہلاک کر دیں۔ قوم پرور ہندو اور مسلمان چاہتے تھے کہ دونوں کو محبت کی زنجیروں سے سیاست کی جنگ میں گھسیٹ لیں۔ ذاکر صاحب کو پورا احساس تھا کہ اس وقت جب ملک کی موت اور زندگی کا فیصلہ ہونے والا تھا سیاست سب سے زیادہ اہم چیز ہے۔ لیکن معلم کی روح مجاہد کی روح نہ بن سکی۔ دشمنوں کی عداوت اور دوستوں کی محبت، دونوں ان کو عملی سیاست میں کھینچنے میں ناکام رہے۔ البتہ ذاکر صاحب نے اپنی سی کوشش کی کہ کانگریس اور مسلم لیگ میں مفاہمت کرانے اور ملک کی تقسیم کو روکنے میں گاندھی جی کا ہاتھ بٹائیں اور انہیں آخر تک یہ آس رہی کہ اس کوشش میں کامیابی ہو گی چنانچہ ۱۹۴۶ء میں جب معتبر ذریعوں سے معلوم ہوا کہ ذاکر صاحب کو پہلی قومی کابینہ میں لینے کی تجویز ہے تو انہوں نے اس امید پر کہ ایک دن کانگریس اور لیگ کی مشترک کابینہ متحدہ ہندوستان کا اصول مان کر بنے گی، اس وقت وزارت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور یہ وہی کر سکتا تھا جو اقبال کی اصطلاح میں مرد فقیر ہو۔ مگر ظاہر ہے ساحل پر رہ کر طوفان کو روکنے کی سعی کیا کامیاب ہوتی۔ فرقہ دارانہ فساد کی آگ بھڑکتی ہی چلی گئی۔ ہندوستان کو تقسیم کرنا ہی پڑا جس کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں کے جسم و روح تین ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئے —— بھارت، مشرقی پاکستان، مغربی پاکستان۔ ذاکر صاحب کے جگر پر آرے چل گئے، ان کی آنکھوں میں دنیا تاریک ہو گئی۔ مگر اس اندھیرے میں انہیں اپنے فرض کی راہ صاف نظر آتی رہی۔ انہوں نے پاکستان کو دعائے خیر دی اور اپنے آپ کو تن من سے ہندوستان (یعنی بھارت) کے حوالے کر دیا۔

۱۹۴۷ء کے بعد کے تین سال ذاکر صاحب کے لئے سخت روحانی کرب اور شدید جسمانی اور دماغی محنت کے تھے۔ اس عرصے میں انہیں دہلی کے مسلمانوں کی تباہی، اضطراب، مایوسی، ہراس، دہشت، آئے ہوئے ہندوؤں اور سکھوں کی بے سروسامانی، مصیبت، آزردگی، طیش کے جگر خراش منظر دیکھنے پڑے اور ان سب کی یکساں خدمت کرنے والے مردوں اور عورتوں کے ساتھ انتھک کام کرنا پڑا، گاندھی جی کی شہادت کا جانکاہ صدمہ اٹھانا پڑا، جامعہ ملیہ کو اپنے معتمد ساتھیوں

کے سپرد کر کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو اندر اور باہر کے بے شمار خطروں سے بچانے کی جو دوڑ دھوپ کرنی پڑی اور اسی زمانے میں یونیورسٹی کمیشن کے ساتھ سارے ملک کی خاک چھاننی پڑی۔ روح، دماغ اور جسم تینوں پر مسلسل بوجھ پڑتا رہے تو انسان کہاں تک سہہ سکتا ہے۔ آخر جسم کی قوتِ برداشت نے جواب دے دیا۔ ۱۹۴۹ء کے آخر میں شدید قلبی مرض (THROMBOSIS) کا حملہ ہوا جس سے جان کے لالے پڑ گئے۔ مگر خدا کو ذاکر صاحب سے کچھ اور کام لینا تھا۔ اس لئے چار پانچ مہینے صاحبِ فراش رہ کر اچھے ہو گئے۔

۱۹۵۰ء اور ۱۹۵۱ء میں ذاکر صاحب نے اپنا سارا وقت، اور توجہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی خدمت میں صرف کی اور جہاں تک ان سے ہو سکا تھا نا امیدی میں امید، بے دلی میں ولولہ، بدنظمی میں نظم پیدا کر کے علی گڑھ کو ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں بڑی اونچی جگہ پر پہنچا دیا۔

۱۹۵۲ء سے ان کی مصروفیتوں کا دائرہ بڑھ گیا ہے۔ ہندوستانی پارلیمنٹ کے ایوانِ بالا، یونیورسٹی گرانٹ کمیشن اور اس طرح کی بے شمار عارضی اور مستقل مجلسوں کی رکنیت، انجمن ترقیٔ اردو (ہند) اور عثمانیہ یونیورسٹی کی تنظیمِ نو کمیٹی کی صدارت ان کے وقت کا بہت سا حصہ لے لیتی ہے۔ اس لئے ان کو مسلم یونیورسٹی کے کاموں میں ہاتھ بٹانے کے لئے بمبئی کے ایجوکیشنل سروس کے قابل ترین افسر سید نور اللہ صاحب کو بلا کر پرو وائس چانسلر بنانا پڑا ہے۔ مگر اب بھی ان کی توجہ اور سعی کا مرکز علی گڑھ ہے اور اس کو سنوارنے اور سدھارنے میں دل و جان سے لگے ہوئے ہیں۔

ذاکر صاحب کی شخصیت کی نشو و نما کا ایک سرسری سا خاکہ کھینچنے کے بعد اب ہم اس میں کچھ تھوڑا سا رنگ بھرتے ہیں تاکہ اس قلمی تصویر کے نقش کسی حد تک ابھر آئیں۔

میرے محترم استاد پروفیسر اشپرانگر نے انسانی شخصیتوں کی چھ بنیادی قسمیں قرار دی ہیں۔ مذہبی، سماجی، علمی، جمالیاتی، سیاسی، معاشی۔ ذاکر صاحب کی شخصیت ان میں سے دوسری قسم سے تعلق رکھتی ہے۔ یعنی گو اس میں مذہب و تصوف، فکر و نظر اور ذوقِ جمال کا خاصا گہرا رنگ ہے اور اقتصاد و سیاست کا کچھ ہلکا سا رنگ موجود ہے لیکن ساری زمین انسان دوستی سے رچی ہوئی ہے۔ ان کے لئے انسان سے، خواہ فرد کی شکل میں ہو یا جماعت کی شکل میں، محبت اور اس کی خدمت کرنا نہ کوئی مذہبی یا اخلاقی فرض ہے، جس کے لئے شعوری عقیدے اور ارادے کی، نہ کوئی علمی اصول ہے جس کے لئے فکر کی، اور نہ کوئی سیاسی تدبیر ہے جس کے لئے تدبر کی ضرورت ہو بلکہ وہ تو ان کی فطرت کا قانون ہے جو بلا شعور، بلا ارادہ کام کرتا ہے۔ ہم سنا کرتے ہیں کہ فلاں شخص نے دوستوں عزیزوں یا عام طور پر بندگانِ خدا کی خدمت کا بیڑا اٹھایا ہے۔ فلاں نے قوم و ملت کے لئے اپنی زندگی کو وقف کر دیا ہے۔ دنیا کو تج دیا ہے۔ ایثار کیا ہے، قربانی کی ہے۔ ذاکر صاحب کو میں نے پچھلے ۳۲ سال میں ہمیشہ افراد اور جماعتوں کی بھلائی کی کوشش میں محو دیکھا ہے۔ لیکن میرے علم و یقین میں نہ انہیں کبھی خدمت کا بیڑا اٹھانے کا احساس ہوا، نہ اپنے آپ کو وقف کرنے کا، نہ تیاگ کا، نہ ایثار و قربانی کا۔ احساس ہوا تو صرف یہ کہ زندگی کا دھارا خود بخود بے تکلف، بے رکاوٹ ایک سمت بہہ رہا ہے اور انہوں نے کہا اچھا ہے بہنے دو۔ سماجی یا انسان دوست ٹائپ کی ایک اور بڑی پہچان ہے اور وہ بھی ذاکر صاحب میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ان میں "خودی" اور "بے خودی" اس طرح گھل مل کر شیر و شکر ہو گئی ہے کہ دوسرے انسانوں کے مقابلے میں خواہ وہ کسی ملک، کسی مذہب، کسی طبقے کے ہوں انہیں احساسِ کمتری اور اظہارِ برتری کی کشمکش سے گذرنا، خود فروشی اور خود فراموشی کے بیچ میں جھولنا نہیں پڑتا۔ نئے آدمی سے وہ اس طرح کھلے آغوش اور کھلے دل سے ملتے ہیں جیسے برسوں کا دوست ہو، وہ انسان کو کتاب سمجھ کر اس کی تنقید، تحلیل اور تجزیہ نہیں کرتے کہ کسی جزو کو رد اور کسی کو قبول کریں، بلکہ جیسا ہے سارے کا سارا لے لیتے ہیں اور اپنے کو تمام و کمال اس کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اخلاقی رہنما ہمیشہ سے کہتے آئے ہیں اور ہمارے زمانے میں گاندھی جی نے اس پر بہت زور دیا ہے کہ برے آدمی اور اس کی برائی میں فرق کرو، اس طرح جیسے بیمار اور بیماری میں کرتے ہو۔ برائی کو ضرور برا کہو اور دفع کرنے کی کوشش کرو۔ مگر اس انسان کو جس کے اندر برائی نظر آئے بیمار کی طرح ہمدردی کے قابل، علاج کا محتاج، محبت کا سزاوار سمجھو۔ اس اصول پر اپنی طبیعت کے تقاضے سے عمل کرتے ہوئے میں نے کسی کو دیکھا ہے تو ذاکر صاحب کو۔ برے اعمال کی وجہ سے کسی کو برا سمجھنا تو درکنار،

ذاکر صاحب کی انتہا مروّت اکثر انسان کے جوہرِ انسانیت کی خاطر اس کے بُرے اعمال کو قبول نہیں تو گوارا تو ضرور کر لیتی ہے۔ کسی کے دل کو ہاتھ میں لینا ان کی طریقت میں حجِ اکبر ہے اور کسی کے دل کو توڑنا گناہِ کبیرہ بلکہ کفر ہے۔ ان کی طبیعت حوصلہ مند ہے اور قومی اعزاز، اجتماعی منصب بے مانگے ملے تو ان کا دل قبول کرنے کو چاہتا ہے۔ لیکن اگر اس میں کسی حریف کا مقابلہ کر کے اس کو شکست دینا ہو، کسی انسان کو روند کر آگے بڑھنا ہو تو وہ عموماً پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ جب ذاکر صاحب تعلیم کے لئے برلن پہنچے تو وہاں کے ہندوستانیوں کی قومی انجمن ہندوستان ایسوسی ایشن کے عہدہ داروں کا انتخاب درپیش تھا۔ ذاکر صاحب کی شخصیت نے چند ہی روز میں اتنا گہرا اثر ڈال دیا تھا کہ بہت بڑی اکثریت ان کو صدر منتخب کرنا چاہتی تھی۔ لیکن ذاکر صاحب اپنے حریف کے حق میں دستبردار ہو گئے۔ دوسرے سال جب لوگ انہیں اچھی طرح جان گئے تھے اور کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکتا تھا کہ وہ ان کا حریف بنے، بلا مقابلہ وہ صدر منتخب ہوئے۔

انسان دوستی کے بعد سب سے گہرا رنگ ذاکر صاحب کی شخصیت میں خدا پرستی کا ہے۔ ان کی دینداری دنیاداری کے پردے میں سے یوں بھی تھوڑی بہت جھلکتی رہتی ہے۔ لیکن اچھی طرح چمکتی اس وقت ہے جب آس پاس کی فضا میں مایوسی کا اندھیرا چھا جاتا ہے۔ ان کے ایمان کی ثابت قدمی اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب اچھے اچھوں کے ایمان ڈانواں ڈول ہو جاتے ہیں۔ اس کی سب سے روشن مثال وہ ہے جب ستمبر ۱۹۴۷ء میں دہلی میں مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا تھا، جامعہ ملیہ کے کارکنوں کی جان ہر وقت خطرے میں تھی اس کے بہت سے سچے ہمدرد جو اہل الرائے سمجھے جاتے تھے اصرار کر رہے تھے کہ کچھ دن کے لئے دہلی چھوڑ کر کہیں اور چلے جاؤ۔ لیکن ذاکر صاحب کے قدم جمے رہے اور ان کی وجہ سے ہزاروں اُکھڑے ہوئے قدم پھر جم گئے جسمانی اور روحانی ہلاکت کے سیلاب میں ذاکر صاحب نے نہ خود اپنا لنگر سنبھالے رکھا بلکہ بہت سے ڈوبنے والوں کو یہاں تک کہ ان لوگوں کو جو خود ان کو ڈبونا چاہتے تھے، سہارا دے کر کنارے پر پہنچا دیا۔ ان دنوں ذاکر صاحب نے ایک دوست کو لکھا تھا کہ مجھے انسان کی انسانیت پر بھروسہ ہے جنون کی یہ لہر دیکھتے دیکھتے گزر جائے گی۔ ظاہر ہے انسان کی انسانیت پر ایسا بھروسہ وہی کر سکتا ہے جو خدا کی خدائی پر اٹل ایمان رکھتا ہو۔

نفاستِ ذوق اور لطافتِ احساس وہ صفات ہیں جو ذاکر صاحب کی شخصیت کی گہرائی سے ناسازگار ماحول کے باوجود اُبھر کر رہیں۔ مولوی بشیر الدین کے اٹاوے اور ڈاکٹر ضیاء الدین کے علی گڑھ میں رہ کر شعر و ادب اور فنونِ لطیفہ کا ذوق رکھنا، روزمرہ کی زندگی میں، رہن سہن اور اخلاق و آداب میں بیرونی صفائی اور ستھرائی اندرونی پاکیزگی اور حسن و تناسب کا لحاظ رکھنا بہت دشوار تھا۔ مگر ذاکر صاحب نے کر دکھایا۔

جامعہ ملیہ کے دورِ تنگدستی ہی میں ذاکر صاحب نے اپنے گھر اور اپنے ادارے کو سادگی اور سلیقے کا نمونہ بنا دیا تھا۔ اب علی گڑھ میں جہاں انہیں مقابلتاً فراغت حاصل ہے ان کی ذاتی توجہ اور اہتمام کی بدولت وائس چانسلر کے بنگلے سے لے کر یونیورسٹی کی آخری حدود تک ساری بستی گلزار نظر آتی ہے۔ سڑکوں، نالیوں، چپے چپے کی صفائی سے صحتِ جسم و صحتِ دماغ دونوں کی سطح اونچی ہو گئی ہے۔ علی گڑھ کی بے ہنگم اور بدنما عمارتیں ذاکر صاحب کی آنکھوں میں طالب علمی کے زمانے سے کھٹکتی ہیں۔ مگر ظاہر ہے انہیں ایک دم سے گرا کر بدل نہیں سکتے۔ اب جہاں تک وسائل میسر آتے ہیں نئی عمارتیں اپنے مذاق کے مطابق بنوا رہے ہیں۔

موسیقی اور مصوری میں ذاکر صاحب خاصا وسیع ذوق رکھتے ہیں اور مشرقی اور مغربی فنکاروں کے کمال سے یکساں لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ان کے پاس منتخب تصویروں اور ریکارڈوں کا ایک چھوٹا سا مجموعہ ہے جس میں آہستہ آہستہ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ خطاطی کا فن بھی ان کا پسندیدہ فن ہے اور ایک زمانے میں ان کے پاس کتبوں کا بہت اچھا ذخیرہ تھا۔ جس کا بڑا حصہ ضائع ہو گیا۔ شعر میں ان کی دلچسپی کا دائرہ اُردو، فارسی، انگریزی، جرمن شاعری کو محیط کئے ہوئے ہے۔ مگر سب سے زیادہ حظ وہ فارسی شاعری سے خصوصاً اقبالؔ کے فارسی کلام سے اٹھاتے ہیں۔ ذاکر صاحب کو جھوم جھوم کر دلکش لحن میں اقبالؔ کے شعر پڑھتے سنئے تو آپ کو یاد آ جائے گا کہ اقبال مفکر، معلّم، مصلح ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھے۔

علمی مشاغل میں ذاکر صاحب کو سب سے زیادہ پڑھنا اس سے کم پڑھانا اور اس سے کم لکھنا مرغوب ہے۔ کتب بینی کا ان کو اتنا گہرا ذو

سچا شوق ہے کہ انتہائی مصروفیت، پریشانی یہاں تک کہ علالت کی حالت میں بھی اس کا تھوڑا بہت سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ باقاعدہ تحصیل انھوں نے علمِ معاشیات کی کی تھی اور آگے چل کر فنِ تعلیم کو اپنا فن بنایا۔ لیکن ان کا مطالعہ ان دونوں کے علاوہ اور دنیا بھر کے موضوعات پر بھی حاوی ہے۔ البتہ قصے کہانیاں جن کا شوق اس زمانے میں لوگوں کو خبط کی حد تک پہنچ گیا ہے، ذاکر صاحب کم پڑھتے ہیں، درس و تدریس کا کام جب تک انہوں نے کیا، خاصی دلچسپی سے کیا لیکن باقاعدہ درس سے زیادہ ان کو اس کی لگن تھی اور اب بھی ہے کہ طلبہ کے دل میں عام مطالعے کا، اپنی اپج سے پڑھنے اور لکھنے کا شوق پیدا کریں۔ علی گڑھ ہی پر موقوف نہیں کسی یونیورسٹی کا کوئی نوجوان طالب علم یا استاد جو زر و منصب کی طلب اور پارٹی بازی کی لت سے محفوظ رہ کر خلوص سے علمی کام کرنا چاہتا ہے، ذاکر صاحب کو دل سے عزیز ہوتا ہے اور وہ اس کی اپنے امکان بھر پوری مدد کرتے ہیں۔

ذاکر صاحب اردو انگریزی تقریر و تحریر پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی تقریر سادگی اور پرکاری میں ان کی شخصیت کی بولتی ہوئی تصویر ہوتی اور ان کی تحریر اگر یکسوئی سے لکھی ہوئی ہو، بے ساختہ پن، جوش اور خلوص میں ان کی سیرت کا آئینہ ہوتی ہے۔ لیکن ہندوستان کی علمی اور تعلیمی دنیا کو ذاکر صاحب سے یہ شکایت ہے کہ وہ بہت کم بولتے اور لکھتے ہیں۔ تقریر سے بچنے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ قلب کی بیماری کا دورہ پڑنے کے بعد ڈاکٹروں نے ذاکر صاحب کو زیادہ تقریر کرنے سے منع کر دیا ہے۔ شاید اس وجہ سے کہ وہ اس میں دل کی طاقت بہت کھپاتے ہیں۔ اب رہی تحریر سو اس کے لئے آج کل تو انہیں جتنی فرصت چاہئیے، وہ نصیب نہیں، لیکن دراصل یہ ان کی پرانی کمزوری ہے کہ لکھنے کے کام کو برابر ٹالتے رہتے ہیں یہاں تک کہ یا تو وہ بالکل ہی ٹل جاتا ہے یا عین وقت پر رات بھر جاگ کر پورا کیا جاتا ہے۔

لوگوں کو مشکل سے یقین آئے گا کہ بیسویں صدی کی دوسری چوتھائی میں ہندوستان میں زندگی گذارنے اور جامعہ ملیہ اور مسلم یونیورسٹی جیسی قومی اور ملی تعلیم گاہوں کے وائس چانسلر رہنے کے بعد ذاکر صاحب سیاست سے بالکل بے تعلق رہے۔ سیاسی لیڈر بننے کے لئے جن اوصاف کی ضرورت ہے ان میں سے اکثر ذاکر صاحب میں بڑے بڑے لیڈروں سے زیادہ موجود ہیں ——— مردم شناسی، موقع شناسی، مصلحت بینی، شخصیت کی کشش، زبان کی طلاقت، جلد فیصلہ کرنے کی قوت۔ مگر ایک تو معلمی کی غالب صلاحیت نے انہیں اس طرح باندھ کر جکڑ لیا کہ کسی اور صلاحیت کے آزمانے کا موقع ہی نہیں دیا۔ دوسرے اور سب صفات کے باوجود ان میں ایک صفت یعنی سخت دلی کی اس حد تک کمی ہے کہ سیاسی لیڈری کے میدان میں ان کا کامیاب ہونا بہت مشکل ہے۔ جس کا دل دوسرے کو گراتے ہوئے دکھتا ہو وہ اس اکھاڑے میں ہر ایک سے چت ہو سکتا ہے۔

سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ اقتصادیات اور معاشیات میں مہارت حاصل کرنے کے باوجود اقتصاد و معیشت ذاکر صاحب کا سب سے کمزور پہلو ہے۔ جہاں تک ان کا بس چلتا ہے وہ کوئی کام پہلے سے پورا منصوبہ بنا کر نہیں کرتے۔ اس لئے اکثر انہیں بے جا زحمت اور زیر باری اٹھانی پڑتی ہے۔ ضبط و نظم کی کمی نے ان کی کارکردگی کو جتنی ہو سکتی تھی، اس سے کم کر دیا ہے۔ ان کا معاشی قانون یہ ہے کہ طلب کو رسد کا پابند نہیں بلکہ رسد کو طلب کا پابند بناؤ۔ چادر دیکھ کر پاؤں نہ پھیلاؤ بلکہ پاؤں دیکھ کر چادر بناؤ۔ یہ بات اصولاً بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے لیکن اس پر عمل کرنے میں بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ جہاں تک قومی کاموں مثلاً جامعہ ملیہ اور مسلم یونیورسٹی کا تعلق ہے ذاکر صاحب کا یہ اصول کہ وہ خرچ ضرورت یا حوصلہ کے مطابق بڑھاتے چلے جائیں اور آمدنی خرچ کے مطابق بڑھنے کی امید رکھیں، عموماً کامیاب رہا۔ اس لئے کہ قوم اور حکومت کو ان کی جرأتِ رندانہ کی لاج رکھنی پڑی۔ لیکن نجی زندگی میں انہیں بے اندازہ خرچ کرنے سے نہ صرف عسرت کے زمانے میں سخت دقتیں اٹھانی پڑیں بلکہ اب یک گونہ فراغت کے زمانے میں بھی اٹھانی پڑتی ہیں اس لئے کہ جس نسبت سے آمدنی بڑھی اسی نسبت سے جا و بیجا خرچ خصوصاً داد و دہش بھی بڑھتی چلی گئی۔

ہم نے دیکھا کہ ذاکر صاحب کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں مگر ان میں مرکزی اور بنیادی حیثیت انسان دوستی کو حاصل ہے۔ انسان دوست شخصیت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک مرشد و معلم کی دوسرے مصلح و مجاہد کی۔ مرشد و معلم کی توجہ کا موضوع انسان بحیثیتِ فرد کے ہے وہ ارشاد و ہدایت

تعلیم وتربیت کے ذریعے افراد کے اندر ان قدروں کو پیدا کرتا ہے جو اسے انسانیت کے بلند منصب کے سزاوار بنائیں۔ مصلح ومجاہد کا کام انسانی جماعت یا سماج کا سدھار کرنا ہے یعنی ان خرابیوں سے جو سماج میں پیدا ہوگئی ہیں لڑنا اور ان کو دور کرنا، تاکہ انسانیت کی دبی ہوئی، رُندھی ہوئی قدریں اُبھر آئیں، چمک اُٹھیں۔ دونوں قسم کے انسان دوستوں کی زندگی کا قانون محبت ہے لیکن ایک کے ہاں محبت جمالی شان دکھاتی ہے، دوسرے کے ہاں جلالی۔ کبھی کبھی یہ دونوں شانیں ایک ہی شخصیت میں جمع ہو جاتی ہیں۔ اور وہ پیمبر یا مجدّد کی شخصیت بن جاتی ہے۔

ذاکر صاحب کی انسان دوستی اب تک مرشد ومعلّم کی شان رکھتی ہے۔ وہ انسان کو فرد کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اس کی روح سے محبت رکھتے ہیں۔ اور اسے تعلیم وہدایت کے ذریعے سنوارنا چاہتے ہیں۔ وہ کہا کرتے ہیں اچھے مسلمان پیدا کرو، اچھی اسلامی جماعت پیدا ہو جائے گی اچھے ہندوستانی بناؤ اچھا ہندوستان بن جائے گا۔ لیکن وہ اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ معلّم کا مدرسہ ہو یا مرشد کی خانقاہ، دونوں کا اثر فرد کی تعلیم وہدایت ہی محدود ہے۔ دوسرے اجتماعی ادارے خاندان، طبقہ، قوم، مذہب، رسم ورواج اگر الگ الگ نہیں تو مل کر انسانی شخصیت کی تشکیل میں کہیں زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ اگر ان اجتماعی سانچوں میں سے اکثر خراب ہو گئے ہوں، اگر آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہو تو معلّم اور مرشد کی ساری سعی رائگاں جاتی ہے جب تک کوئی مصلح اور مجاہد اجتماعی سانچوں کو نہ سدھارے یا ان کو توڑ کر نئے سانچے نہ بنائے، اور جو ایک ہی شخص میں معلّم اور مرشد کے ساتھ مصلح اور مجاہد یعنی مجموعی طور پر مجدّد کی شان پیدا ہو جائے تو پھر کیا کہنا!

شاید ذاکر صاحب جیسے صوفی منش کو یہ توڑ پھوڑ قانونِ وحدت اور آئینِ محبت کے خلاف نظر آئے لیکن اس مشکل کو اس مردِ عارف نے حل کر دیا ہے جس نے کہا ہے ؎

نقشِ حق را ہم ز امرِ حق شکن!
بر زجاجِ دوست سنگِ دوست زن

اور اس مردِ عمل نے ثابت کر دیا کہ پُرانے سانچے خواہ سنگِ خارا کے بنے ہوئے ہوں بے تیشہ وگرز محض "نہ تک یالحق حرف" سنبہ گرہ" سے توڑے جا سکتے ہیں۔

مرزا محمد سعید

اشرف صبوحی

یوں تو دہلی کے بطن سے ہزارہا اہلِ کمال نے جنم لیا اور ہر عہد میں چند ایسے نفوسِ قدسیہ عالمِ وجود میں آئے جن کے فضل و کمال کا شہرہ بیرونِ ہند تک پہنچا۔ مگر غدر ۱۸۵۷ء کے بعد قحط الرجال کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی انحطاطی دور یعنی ۱۸۸۶ء میں قدرت نے ایک ایسی ہستی کو عالمِ وجود میں بھیج دیا۔ جس نے اپنے اسلاف کی دیرینہ روایات کو بحال کر دیا اور دلّی کی سابقہ علمی شہرت پر آنچ نہ آنے دی۔ اس پیکرِ علم کا نام نامی محمد سعید ہے جو آگے چل کر پروفیسر مرزا سعید کہلائے اور آپ کے چشمۂ علم سے ہزارہا تشنگانِ علم نے اپنی پیاس بجھائی۔

آپ کے والد بزرگوار کا نام مرزا عبدالرحیم تھا۔ اور غدر ۵۷ء سے کوئی سات آٹھ برس پہلے دہلی میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے انٹرنس کا امتحان اس زمانے میں پاس کیا جب انگریزی مدارس میں پڑھنا اور انگریزی زبان کی تحصیل کفر کے برابر سمجھی جاتی تھی۔ لیکن مرزا صاحب نے اپنے طرزِ عمل سے ثابت کر دیا کہ انگریزی پڑھ کر کافر ہونا ایک بے ہودہ خیال ہے۔ کسی زبان کی تحصیل کا کفر و اسلام سے کیا واسطہ! بہرحال انٹرنس پاس کرنے کے بعد مرزا صاحب کو محکمہ انہار میں جگہ ملی اور وہ دہلی سے لاہور پہنچ گئے۔ یہاں اپنی کارکردگی اور فرض شناسی کی بدولت سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر فائز ہوئے قومی کاموں میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیتے تھے۔ چنانچہ لاہور کی انجمن حمایت اسلام کے سرگرم معاونین میں سے تھے۔ اور انجمن کے مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ آخر میں انجمن اسلامیہ پنجاب کے جوائنٹ سیکرٹری بھی رہے۔ بالآخر دلّی کی خاک پھر کھینچ لائی اور ۱۹۳۰ء میں انہوں نے اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کی۔ ع

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

وہ باپ تھے اور ایسے باپ جنہوں نے اپنے بچوں کو صداقت، دیانت اور خودداری کا سبق دیا۔ نیز ان کی تعلیم پر دل کھول کر خرچ کیا۔

آپ کی والدہ مرحومہ سرسید کے حقیقی بڑے بھائی سید محمد کی نواسی تھیں۔ جن کا ذکر مولانا حالیؔ کی "حیاتِ جاوید" میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

پروفیسر مرزا محمد سعید صاحب اپنی نانی صاحبہ کے مکان میں پیدا ہوئے جو سرسید کی بھتیجی تھیں۔ چونکہ والد صاحب کی ملازمت کے سلسلہ میں سکونت لاہور میں تھی اس لئے لاہور ہی آپ کی تعلیمی سرگرمیوں کا مرکز قرار پایا۔ مڈل تک تعلیم گھر پر ہوتی رہی پھر لاہور کے سنٹرل ماڈل اسکول میں انٹرنس کا امتحان دیا۔ اس وقت آپ کی عمر کوئی تیرہ سال کے لگ بھگ ہوگی۔ امتحان میں پاس ہوئے اور ذوقِ تعلیم بڑھتا گیا۔ مثل مشہور ہے "ہونہار بروا

کے چکنے چکنے پات"۔ انٹرنس تو تعلیم کی پہلی منزل تھی اور آپ کو اس صحرا کا ہفت خواں طے کرنا تھا۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہو کر انگریزی کا ایم اے پاس کیا اور یونیورسٹی میں سب سے اول رہے۔ جس پر آرنلڈ گولڈ میڈل اور مبلغ یک صد روپے کی تعلیمی انعام میں حاصل کی۔ اس وقت آپ کی عمر ۱۹ سال سے کم تھی۔ چھوٹی عمر میں یہ اعزاز۔ خدا جسے چاہے عطا کرے۔ ایم اے پاس کرنے کے بعد آپ کی ژرف نگاہی اور علمی موشگافیوں کا شہرہ بڑھا تو ایم اے او کالج علی گڈھ نے آپ کو کھینچا۔ وہاں آپ نواب وقار الملک کے عہد میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ کوئی ایک سال وہاں گزرا ہوگا کہ ۱۹۰۷ء یا ۱۹۰۸ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں مستقل اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ اور یہاں برسوں طلبا کو علم کی دولت سے مالا مال کرتے رہے۔ منطق، ادب، فلسفہ تاریخ غرض ہر شعبۂ علمی میں کامل دسترس حاصل ہے۔

۱۹۱۸ء میں آئی، ای ایس کے درجہ میں آپ کو ترقی ملی تو اسسٹنٹ پروفیسر سے پروفیسر ہوئے۔ پھر دہلی اور شملہ میں گورنمنٹ آف انڈیا کے محکمہ تعلیم میں اسسٹنٹ سکرٹری کا عہدہ ملا۔ جب یہ عہدہ تخفیف میں آیا تو آپ پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں اپنے سابقہ عہدہ پر آگئے۔ لیکن اب کی دفعہ زیادہ جم کر نہ رہے بلکہ لدھیانہ میں ایک نئے سرکاری کالج کی پرنسپلی اختیار کرنے کا حکم ملا۔

۱۹۲۰ء میں ایک نیا کالج رہتک میں کھلا تو دہلی سے قریب ہونے کے باعث وہاں چلے گئے۔ اور یہاں بھی پرنسپل ہوگئے۔ پنڈت جواہر لعل نہرو اسی زمانے میں رہتک آئے تو ایک مقامی کانگریسی لیڈر سے آپ کی تعریف سن کر ملنے کے لئے آئے اور گفتگو کے بعد افسوس ظاہر کیا کہ ایسے قابل آدمی سیاسیات کی بجائے سرکاری ملازمت میں ہیں۔

رہتک میں آپ پورے چار سال تک رہے۔ اس کے بعد کچھ صحت کی خرابی اور کچھ محکمہ کی ناقدر شناسی کے باعث قبل از وقت ملازمت ترک کر دی اور پنشن لے کر اپنے آبائی وطن دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

آپ کی اہلیہ محترمہ آپ کے حقیقی ماموں نواب سید محمد علی مرحوم کی صاحب زادی ہیں جو علی گڈھ کالج کے بورڈ آف ٹرسٹیز کے آخری آنریری سیکرٹری اور مسلم یونیورسٹی کے پہلے آنریری خزانچی تھے۔ اور آپ کی ممانی سرسید کے بڑے لڑکے سید حامد کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ اس شجرہ سے یہ بات واضح ہوگئی کہ آپ سرسید کے خاندان کے ایک قابل فرد ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس بیوی سے کئی اولادیں مرحمت فرمائیں۔

دہلی کے نزدیک بیرم خاں میں اولیا مسجد سے ملحق سرراہ آپ کے مکان کا پھاٹک تھا۔ اندر داخل ہوں تو ایک مختصر سا احاطہ جس میں نیم کا درخت۔ ایک طرف دو تین سیڑھیاں چڑھ کر ایک چھوٹا سا لمبا کمرہ۔ دنیاوی آرائش و زیبائش سے خالی۔ جاڑے گرمی میں یہی آپ کی نشستگاہ تھی اور مطالعہ کا کمرہ۔ یہیں سب قسم کے لوگ کھنچے چلے آتے تھے۔ ادیب، شاعر، طبیب، ماہرانِ تعلیم، قومی رہنما اور کارکن، خواجہ حسن نظامی، مولانا راشد الخیری، جوش ملیح آبادی، مسٹر آصف علی، پروفیسر بخاری، مرزا فرحت اللہ بیگ، بہار کے سید محمود مشہور کانگریسی لیڈر۔ پرنسپل مشتاق احمد زاہدی۔ اختر شیرانی۔ حکیم محمد احمد خاں دہلوی وغیرہم گھنٹوں پروفیسر صاحب سے مصروف گفتگو رہتے تھے۔ آل انڈیا ریڈیو کے پہلے ڈائرکٹر جنرل مسٹر فیلڈن بھی ایک آدھ مرتبہ مرزا صاحب سے ملاقات کرنے وہیں آئے تھے۔ ستمبر ۱۹۴۶ء میں جب ہر طرف قیامت برپا تھی تو ایک انگریز ماہر قانون جو ہندوستان کا نیا قانون وضع کرنے میں بغرض امداد ولایت سے آیا تھا، آپ کے پاس گھنٹوں بیٹھا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ آپ دہلی کی قدامت کے متعلق اس سے گفتگو فرما رہے تھے۔ اور وہ اس طرح دم بخود بیٹھا سن رہا تھا جیسے کوئی شاگرد استاد کے سامنے۔ غرض اس دیوان خانے یا کمرے میں لوگ مختلف فیہ مسائل زیر بحث لاتے تھے۔ اور پروفیسر صاحب کا فلسفیانہ طرز بیان دل نشیں انداز استدلال ہر پیچیدگی کو سلجھا دیتا تھا۔ گو یہ صحبتیں اب خواب و خیال ہوگئیں۔ لیکن ان کی یاد کبھی دل سے محو نہیں ہو سکتی۔ یہ دیوان خانہ پورے سولہ برس تک مرجع عام و خاص رہا۔ آخر ۱۹۴۷ء کے پرآشوب زمانے میں جبکہ محلّے کی سلامتی غیر محفوظ ہوگئی اور لوگ اپنے اپنے مکانوں کو خالی کر کے پاکستان چلے گئے یا اور محلوں میں منتقل ہوگئے تو آپ بھی اپنے داماد میجر طیب حسین کے ہمراہ (جو حال میں پاکستان کے نائب سفیر تھے)، دہلی سے راولپنڈی پہنچے۔ اور وہاں ایک سال رہ کر اب کراچی میں مقیم ہیں۔

پنشن کے بعد آپ کے مشاغل کا کچھ حال تحریر کیا جا چکا ہے۔ اس کے علاوہ دہلی یونیورسٹی۔ اینگلو عربک کالج۔ ہارڈنگ لائبریری، آل انڈیا ریڈیو کی مشاورتی مجلس کے اعزازی رکن کی حیثیت سے مفید کام سرانجام دیتے رہے۔ نیز مختلف یونیورسٹیوں اور پبلک سروس کمیشنوں کے ممتحن بھی رہے۔ حیدرآباد دکن کی سول سروس کے پرچے آپ کے پاس آتے تھے۔ یہ سارے کام صرف علمی خدمت کو مدِّ نظر رکھ کر کئے جاتے تھے، اور حصولِ زر کی خواہش نہ تھی۔ مزاج میں توکل و استغنا حد سے زیادہ ہے۔ اور یہ صفت ہر باکمال آدمی میں دیکھی گئی ہے۔ آپ اسی پنشن پر قانع تھے جو آپ کی تنخواہ کا تہائی حصہ بھی نہ تھی۔ اسی میں سارے خرچ پورے ہوتے تھے۔ چونکہ خدا پر پورا توکل ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کی مختصر آمدنی میں برکت عطا فرما دی ہے۔ غالباً ۱۹۲۶ء میں پہلی مرتبہ مجھے جناب کی خدمت میں نیاز حاصل ہوا۔ اس کے بعد سے آپ کے دہلی چھوڑ آنے تک تقریباً اکیس سال کی ملاقات میں کبھی کوئی موقع ایسا نہیں آیا کہ میں نے آپ کو کسی طرح کی مالی پریشانی کا ذکر کرتے سنا ہو۔ ہمیشہ آپ کے چہرے پر اطمینان کی کیفیت پائی۔

بچپن سے تلاشِ علم کا جذبہ تھا اور اہلِ علم کی صحبت نشینی کا شوق۔ اس زمانے میں مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم ہر سال انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں شرکت کے لئے لاہور آتے اور آپ کے والد مرحوم کے پاس فروکش ہوتے۔ یہ سلسلہ ۱۹۰۵ء تک جاری رہا۔ آپ ان کی باتیں سنتے اور ان سے نہایت متانت سے باتیں پوچھتے۔ مولوی صاحب آپ کی غیر معمولی ذہانت سے بہت خوش ہوتے اور آپ سے خاص محبت سے پیش آتے۔ بعض دفعہ انجمن کے جلسے میں اپنی تقریر کے دوران میں نظم یا اشعار آپ سے پڑھواتے۔ اور اس کام کے لئے آپ کو بھرے جلسے میں میز پر کھڑا کر دیتے۔

لاہور کے زمانۂ طالب علمی میں علامہ اقبال۔ شیخ عبد القادر ایڈیٹر مخزن۔ جسٹس شاہ دین ہمایوں، میاں عبد العزیز فلک پیما خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ یہ سب لوگ آپ سے عمر میں بڑے تھے لیکن جلد یہ تعلقات برابر کی دوستی میں تبدیل ہو گئے۔

جس کسی اہلِ نظر کو آپ سے کچھ واسطہ پڑا گرویدہ ہو گیا۔ ان میں بعض بڑے بڑے آدمی بھی شامل ہیں۔ مثلاً سروجنی نائیڈو اس قدر مہربان تھیں کہ جب ۱۹۱۸ء کے لگ بھگ بحیثیت ایک آل انڈیا لیڈر کے لاہور تشریف لائیں تو کئی ہندو مسلمان عمائدینِ شہر کی میزبانی کی پیش کش کو رد کر کے آپ کی مہمان ہوئیں۔

گورنمنٹ کالج لاہور کے بیشتر طلبا جن میں سر محمد ظفر اللہ خاں سابق وزیر خارجہ پاکستان۔ پروفیسر اے۔ ایس بخاری (پطرس) جیسے نامور لوگ شامل ہیں آپ کے عقیدت مند شاگردوں میں سے ہیں۔ اسی طرح علی گڈھ کالج کے اکثر طلبا جن میں مشہور کانگرسی لیڈر سید محمود بہاری اور سید حسین مرحوم جو مشہور اخبار نویس تھے اور آخر میں ہندسرکار کی طرف سے قاہرہ میں سفیر بن کر گئے تھے آپ کے شاگردوں کی صف میں نظر آتے ہیں۔ ان کے علاوہ سینکڑوں شاگرد ہیں جو آج جلیل القدر عہدوں پر ممتاز ہیں۔ جس طرح مفتی صدر الدین صدر الصدور آزردہ دہلوی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کا ایک بھی شاگرد ایسا نہیں تھا جو دنیاوی وجاہت سے محروم رہا ہو۔ ٹھیک اسی طرح آپ کے شاگرد بھی خدا کے فضل و کرم سے عزت و ناموری کی بلند سطح پر پہنچتے رہے۔

اردو تو خیر اپنی زبان ہے۔ انگریزی تحریر و تقریر کی قابلیت کا لوہا انگریز تک مانتے رہے۔ انگلستان کے مشہور پروفیسر اور نقاد سر الیور ایلٹن SIR OLIVER ELTON جب پنجاب یونیورسٹی کی دعوت پر لاہور آئے تو آپ سے ملاقات کر کے دریافت کرنے لگے "WHERE DID YOUR LEARN TO SPEA K THIS BEAUTIFUL ENGLISH" پھر جب یہ معلوم ہوا کہ آپ کبھی ولایت نہیں گئے تو بے حد متعجب ہوئے۔

عربی فارسی کے علاوہ فرانسیسی اور ہندی میں اس قدر استعداد ہے کہ دونوں زبانوں کی کتابیں بلا تکلف پڑھ سکتے ہیں۔ فلسفہ کالج میں خود پڑھا تھا اور برسوں گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھاتے رہے۔ تاریخ سے ہمیشہ دلچسپی رہی۔ خصوصاً اسلام کی مذہبی اور سیاسی تاریخ سے جو آپ کو واقفیت ہے بہت کم تاریخ دانوں کو ہوگی۔ مشرقی اور مغربی ادبیات میں ایک مبصّر کا درجہ حاصل ہے۔ قدیم افسانے اور جدید ناول بھی آپ کے مطالعہ اور توجہ کا مرکز رہے ہیں۔

کتب بینی شروع سے روزانہ کا معمول رہا ہے۔ اِدھر اُدھر کی کتابیں نہیں بلکہ منتخب اور پائے کی کتابیں۔ دہلی اور لاہور کے کتب خانوں ہی پر اکتفا نہ کرتے بلکہ اپنی پسند کی کتابیں اکثر ولایت سے براہِ راست منگواتے اور اس مد میں آمدنی کا ایک معتد بہ حصہ پنشن کے زمانے میں بھی خرچ کرتے رہے ہیں۔ آپ نے اپنی ولایت سے منگوائی ہوئی کتابوں میں سے دو ناول انتخاب کر کے مجھے عنایت فرمائے تھے جنہیں میں نے اردو میں منتقل کیا اور آپ سے پیش لفظ لکھوا کر "سلمیٰ" اور "بن باسی دہلوی" کے نام سے شائع کیا۔

لکھنے سے زیادہ آپ کو پڑھنے کا شوق رہا۔ اس لئے آپ کی تصانیف گنتی کی ہیں۔ اوّل اوّل مخزن وغیرہ کے لئے مضمون لکھے۔ علی گڈھ کے زمانے میں آپ کا مشہور ناول "خوابِ ہستی" شائع ہوا جو اس صنف میں ایک نئی چیز تھی۔ کچھ عرصے کے بعد دوسرا ناول "یاسمین" لکھا پھر کئی برس بعد غالباً قیامِ رہتک کے زمانے میں "مذہب اور باطنیت" کے نام سے ایک عالمانہ کتاب تحریر فرمائی۔ متفرق مضامین کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ ملک کے متعدد رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ دہلی کے زمانے میں آل انڈیا ریڈیو سے نئی کتابوں پر تنقید و تبصرے فرماتے رہے۔ شیخ محمد اکرام بیرسٹر نے ساتھ اردو کے نصاب کی کتابیں بھی مرتب کیں۔ اعصابی کمزوری کی وجہ سے ہاتھ میں رعشہ کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے جس سے لکھنے میں تکلف ہوتا ہے — لیکن آپ کی شخصیت کا صحیح اندازہ آپ کی تصانیف سے نہیں بلکہ آپ کی گفتگو سے ہوتا ہے۔ یہ کچھ وہی جانتے ہیں جن کو آپ سے باتیں کرنے کا موقع ملا ہو۔

میں بطور نمونہ آپ کے ایک مکتوبِ گرامی کی نقل پیش کرتا ہوں جسے آپ نے میری بچی اور برادرم وصی اشرف سلمہٗ کے بچے کے انتقال کی خبر معلوم ہو کر تحریر فرمایا تھا۔

<u>۲۸۲ پشاور روڈ راولپنڈی</u>
مورخہ ۴ دسمبر ۴۷ء

مجبّی و مکرمی!

تسلیم۔ آپ کا خط آج صبح ملا۔ اس خبر سے بہت افسوس ہوا کہ آپ کو لاہور پہنچ کر بہت سی تکلیف اور پریشانی اٹھانی پڑی خصوصاً اولاد کا داغ ایسی چیز نہیں جو مرورِ زمانہ کے ساتھ کبھی بھی پوری طرح محو ہو سکے۔ مجھے آپ سے اور سید وصی اشرف صاحب سے دلی ہمدردی ہے۔ لیکن معمولی تسلی و تعزیت کے الفاظ ایسے موقعوں پر نہ صرف بے سود بلکہ دوسروں کے ناقابلِ تلافی نقصان اور سچی جذبۂ غم کی ایک گونہ تخفیف و توہین معلوم ہوتے ہیں۔ صرف ایک خیال سے شاید اپنا غم کسی قدر برداشت کیا جا سکتا ہے کہ گزشتہ بارہ تیرہ ماہ میں ہزارہا انسانوں کو بہت زیادہ صدمات برداشت کرنے پڑے اور لاکھوں جانیں ضائع ہو گئیں۔ لیکن ممکن ہے کہ یہ محض ایک تخیل ہو اور مرگِ انبوہ سے فی الواقع اپنے عزیزوں کی موت کا صدمہ اور بھی زیادہ شدید محسوس ہونے لگے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ سید وصی اشرف صاحب کو بھی میری جانب سے دلی ہمدردی اور تعزیت کا اظہار کر دیجئے۔

افسوس ہے کہ آپ کے راولپنڈی آنے سے بھی ملاقات کا موقع نہ مل سکا۔ گزشتہ ماہ کی آخری تاریخوں میں میرے لاہور جانے کا کچھ امکان پیدا ہوا تھا لیکن اپنی عادت کے موافق عین روانگی کے دن میں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ فی الحال سب گھر والوں کا ارادہ ۱۹، ۲۰ دسمبر کو کراچی جانے کا ہے۔ اگر خدا کو منظور ہوا اور وہ سب لوگ گئے تو مجھے بھی طوعاً و کرہاً ان کے ہمراہ جانا پڑے گا۔ راولپنڈی اور سب لحاظ سے اچھی جگہ ہے لیکن یہاں کی سردی بہت غضب کی ہوتی ہے۔ اس لئے خیال ہے کہ جاڑے کا کچھ زمانہ کراچی کی معتدل ہوا میں گزارا جائے۔ دیکھئے وہاں سے کب واپسی ہو اور آپ سے ملاقات کا کوئی موقع کب میسر ہو سکے۔

نیازمند محمد سعید

پاکستان سے لگاؤ فطری طور پر تھا۔ اگرچہ عملی طور پر آپ نے سیاست میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ ایک مرتبہ دہلی میں صوبائی مسلم لیگ کا صدر بنا دیا گیا تھا مگر خالص علمی مشاغل کے پیش نظر استعفا دے دیا۔ لیکن وہ اس بات کے زبردست حامی تھے کہ مسلمانوں کا ایک علیحدہ وطن ہو جس میں ان کی تہذیب، تمدن اور مذہب کو پھلنے پھولنے کا موقع ملے۔ جس زمانے میں مسلم لیگ نے کیبنٹ مشن کے پلان کے مطابق ہندوستان کی سالمیت کو عارضی طور پر منظور کر لیا تھا تو اس پر آپ بہت رنجیدہ ہوئے تھے۔ دراصل آپ ایک مخلص مسلمان ہیں اور سچائی و دیانت داری کے ساتھ اس نتیجے پر پہنچے کہ اس برصغیر کے مسلمان اس وقت تک نہیں پنپ سکتے جب تک ایک خطہ ان کے پاس نہ ہو۔ اس خیال کے مطابق کانگریس سے اختلاف ہونا لازمی چیز ہے۔ با ایں ہمہ یہ اختلاف ان دوستانہ مراسم میں حائل نہیں ہوا جو کانگریس کے سرکردہ لیڈروں سے تھے۔

طبیعت کی نفاست اور پاکیزگی حد سے بھی کچھ آگے ہے۔ ایک مرتبہ کسی یونانی دواخانے سے جوارش شاہی منگوائی۔ اتفاق سے عطار نے جوارش ٹین کی اچھلی ڈبیہ میں دینے کی بجائے جست کی ڈبیہ میں دے دی۔ ڈبیہ اگرچہ نئی تھی مگر چونکہ جست کا رنگ ملگجا ہوتا ہے۔ آپ نے اسے دیکھنا بھی گوارا نہ فرمایا۔ اور پھینکوا دی۔ اسی طرح ایک اور دماغی طاقت کے لئے کوئی معجون منگوائی تھی۔ جب اس کا پیکنگ کھولا تو ڈبیا پر غلطی سے طلائے اعظم کا لیبل لگا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر طبیعت حد درجہ منغض ہوئی اور دوا کو دیکھے بغیر ہی اٹھا کر پھینک دیا اور مجھ سے شکایت کی کہ ہمارے دواخانوں میں کتنی بے غوری سے کام ہوتا ہے۔

ضابطہ کی پابندی کی صرف ایک مثال ہی پیش کرنی کافی ہوگی۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے لئے آپ کو انگریزی کا پرچہ بنانا تھا اور اس کے لئے بیک وقت سات آٹھ کتابوں کی ضرورت تھی۔ اور یہ کتابیں دہلی یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود تھیں۔ آپ اس یونیورسٹی کے ممتحن بھی تھے اور لائبریری کے ممبر بھی۔ وہاں کے ہیڈ کلرک عبدالسلام صاحب آپ کے ہمسایہ بھی تھے اور ملاقاتی بھی۔ لیکن دو کتابوں سے زیادہ ایک وقت میں نکالنے کا قاعدہ نہ تھا۔ لہٰذا آپ نے مجھ سے فرمایا کہ یہ کتابیں اپنے طور پر کہیں سے فراہم کیجئے میں اپنے اثر و رسوخ سے اس قاعدہ کو توڑنا نہیں چاہتا۔

فرض شناسی کا یہ عالم کہ ممتحن بننے سے اس لئے انکار کر دیا کہ طالب علموں کو پڑھانے کا واسطہ نہیں رہا جس سے ان کے معیار کا اندازہ ہوتا۔ مبادا پرچہ بنانے یا دیکھنے میں ان کی حق تلفی ہو جائے۔

غرض یہ جامع کمالات ہستی پاکستان کے دارالحکومت کراچی میں خاموش زندگی گزار رہی ہے۔ اور وہ آنکھیں بند ہیں جو اس ہیرے کی آب و تاب دیکھتیں اور اس کے علم و فضل سے اپنے ملک کو منور ہونے کا موقع بہم پہنچاتیں ؎

کب ایسے لوگ ہوتے ہیں پیدا جہان میں
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

آخر میں مجھے اپنے محترم جناب مرزا محمد رشید صاحب ایم۔ اے ریٹائرڈ پرنسپل گورنمنٹ کالج لدھیانہ ساکن حال ملتان کا شکریہ ادا کرنا ہے کہ جناب نے اپنے برادر گرامی قدر کے متعلق مجھے کافی معلومات بہم پہنچائیں۔

مولانا حامد حسن قادری

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی

حامد حسن قادری صاحب سے میری پہلی ملاقات کب ہوئی، یہ یاد نہیں لیکن اوّلین صحبتوں میں جس صحبت کی یاد اب تک میرے دل پر نقش ہے، وہ غالباً ۱۹۳۰ء یا ۱۹۲۹ء کی ہے۔ جون کا مہینہ تھا اور صبح کے ۸، ۹ بجے کا وقت۔ قادری صاحب بچھراؤں میں اپنے بہنوئی مولوی حامد علی صاحب مرحوم کے یہاں مقیم تھے۔ بچھراؤں ہے تو چھوٹی سی بستی لیکن کچھ دنوں پہلے بڑی پُر رونق تھی۔ سب عزیز، احباب، اہلِ علم دور و نزدیک سے جمع ہو جاتے تھے۔ وہ چاندنی راتیں، وہ تپتے ہوئے دوپہر، تہ خانوں میں سونا، وہ ظہر و عصر کے درمیان کی گرمی کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے، وہ آم طشتوں میں بھیگے ہوئے، گھر گھر نوروز، دعوتیں، مہمانیاں، آدھی رات سے اُٹھ کر شکار کے پروگرام، بچہ بچہ کے پاس غلیل، ڈنڈا یا ٹیلو، شعر و شاعری اور مضمون نگاری کے چرچے، بچھراؤں کلب کے جلسے، غرض صبح سے شام تک ایک ہنگامہ سا برپا رہتا تھا۔ قادری صاحب بھی چھٹی میں آتے ہوئے تھے اور میں والدِ مرحوم کے ساتھ ہردوئی سے۔ اس وقت میری عمر دس گیارہ سال کی تھی اور میں ساتویں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ میں غنچہ اور پھول میں تو مضامین لکھتا رہتا تھا لیکن اس کا ارمان تھا کہ کسی بڑے رسالے میں بھی کوئی مضمون چھپے۔ چنانچہ اپنے جانتے بڑی محنت سے ایک مضمون لکھا: "مشرق و مغرب کے طریقۂ ازدواج پر ایک نظر"۔ اسے شوق کے مارے خود ڈاک میں ڈالنے جا رہا تھا۔ راستہ مولوی حامد علی کے پھاٹک کے سامنے سے تھا اور میں لفافہ کو اس طرح چھپائے ہوئے تھا کہ وہ نہ دیکھ لیں۔ مولوی حامد علی بڑے دیدہ ور اور با محبت بزرگ تھے لیکن مجھے نہ معلوم کیوں ان سے کچھ ڈر لگتا تھا: "مختنہ کرا دیں دوبارہ؟ کوے کے کباب کھاؤ گے؟ تمہیں اس گھوڑے کی پیٹھ پر بٹھا کر بھگا دیں۔" ان کی بڑی تیز نظر تھی، مجھے جاتے دیکھ لیا اور زور سے پکارا۔

میرا دم ہی تو سوکھ گیا۔ مجرموں کی طرح حاضر ہوا — پوچھا:

"میاں! یہ کیا چھپائے لئے جا رہے ہو؟ ذرا ہم بھی تو دیکھیں!"

"کچھ نہیں — لفافہ ہے!"

"کیا ہے حضرت اس میں؟"

"جی ..... مضمون ہے!"

"مضمون! اچھا! " (لفافہ ہاتھ میں لے کر، چاک کرتے ہوئے) "کاہے پر ہے بھئی؟"

"مشرق و مغرب کے طریقۂ ازدواج پر !"

"اوہو ہو ! یہ آپ بڑے میاں کب سے ہو گئے ؟ ایک داڑھی اور لگا لیجئے شیخ صاحب !"

میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ قادری صاحب قریب تھے۔ انہوں نے شاید معاملہ کی نزاکت کو سمجھا اور ان کے ہاتھ سے مضمون لیتے ہوئے بڑی دلکش نرمی کے ساتھ فرمایا "واہ واہ ! بڑا اچھا عنوان ہے یہ تو۔ جب بچپن کی شادیاں ہوں تو بچوں کی بھی تو ایک رائے ہونا چاہیئے۔" چند جملے زور سے پڑھے اور شاباش دی۔

اس واقعہ کے بعد میں نے وہ مضمون ڈاک کے سپرد نہیں کیا۔ لیکن دو ڈھائی سال کے بعد وہ اعتماد پھر لوٹا اور میں نے اسے "عالمگیر" لاہور کو بھیج دیا جس نے اسے "مولانا خواجہ احمد فاروقی" کے نام سے چھاپا ——— حامد علی صاحب کی بات غلط نہ تھی !

قادری صاحب کی وہ صورت، اور وہ دل نواز تبسّم اب تک میری آنکھوں میں پھر رہا ہے۔ خوب گورا چٹّا رنگ، معمولی ناک نقشہ، موٹی سی عینک لگائے ہوئے، سفید نورانی داڑھی، پستہ قد، دبلے پتلے، چھوٹی بوٹی کے چکن کی بہت صاف دُھلی ہوئی شیروانی، پٹّے کی بیل دار سفید ٹوپی، جس کا کلف اسی طرح قائم تھا، لیکن نکّے دار نہیں، دہلی کی سی گھری اور مولویانہ، علی گڑھ کاٹ کا پاجامہ لیکن ٹخنوں سے اونچا، آگرے کا سیاہ پمپ گُرگابی پہنے ہوئے تھے۔

اس کے بعد سے اب تک میں نے قادری صاحب کو بارہا دیکھا ہے لیکن ان کی وضع قطع میں مطلق کوئی فرق نہیں آیا۔ وہی پاک صورت اور نورانی چہرہ جو پہلے تھا، اب بھی ہے، بلکہ عمر کے ساتھ یہ پاکیزگیٔ وضع اور نورانیت اور بڑھ گئی ہے۔

قادری صاحب بڑے باغ و بہار، زندہ دل اور اعجوبہ لوگوں میں سے ہیں۔ ان کی ہر بات میں لطیفہ اور ہر لطیفہ میں زبان یا ادب کا چٹخارا ہوتا ہے۔ وہ باتیں کم کرتے ہیں لیکن جب کرتے ہیں تو ایسے مزے کی کہ 'وہ کہیں اور سنا کرے کوئی'۔ آپ ان سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن یہ ممکن نہیں کہ ان کی بزرگی اور ان کے خلوصِ نیّت کا احترام نہ کریں۔

ادب سے ان کا تعلق آج کا نہیں، نصف صدی سے زیادہ کا ہے۔ ان کی ولادت بمقام بچھراؤں (ضلع مراد آباد) مارچ ۱۸۸۶ء میں ہوئی۔ ان کے پردادا مولوی محمود عالم، سرسیّدؒ کے ہم عصر اور دوست تھے۔ غدر میں سرسیّد انہی کے ہاں آ کر ٹھہرے تھے۔ مولانا حالیؔ نے حیاتِ جاوید میں لکھا ہے :

> "سرسیّد برابر اس فکر میں تھے کہ کسی طرح بجنور سے نکل کر میرٹھ پہنچ جائیں۔ مگر موقع نہ ملتا تھا..... میر صادق علی نے خود ساتھ ہو کر ان کو موضع مچولہ تک پہنچا دیا۔ وہاں سے سرسیّد نے بچھراؤں پہنچ کر بسبب علالت اور رستے کی کوفت کے چند روز مولوی محمود عالم کے مکان پر جو ان کے دوست تھے، مقام کیا اور اپنی مفصّل سرگذشت حکّامِ انگریزی کو لکھ بھیجی اور چند روز بعد خود بھی میرٹھ چلے گئے۔"

جب سرسیّد نے اپنی تحریک شروع کی ہے اور لوگوں نے انہیں کرسٹان مشہور کیا تو اسی گھرانے کی ایک بی بی نے تعجب سے کہا تھا "ہے ہے سید احمد خان اور کافر ! یہاں تو ان کی ایک وقت کی نماز قضا نہیں ہوئی۔ میں نے خود ان کے قرآن شریف پہ جو لی چڑھائی ہے۔"

قادری صاحب کے والد مولوی احمد حسن رام پور میں وکیل تھے۔ اس کی حجن بندی لکھنؤ اور دہلی کی خزاں سے ہوئی تھی اور وہ غدر کے بعد اہلِ کمال کے لئے دارالسرور بن گیا تھا "ناظم منیر آئے یہاں، ہم ہیں قدرداں" مخصوص دعوت کے ساتھ صلائے عام بھی ہے۔ چنانچہ ۱۸۵۸ء میں آپ رام پور پہنچ گئے اور عدالتِ عالیہ کا منصبِ افتا ان کے سپرد کیا گیا۔ اس وقت ہر جگہ شاعری کے چرچے تھے۔ زبان کا کھرا کھوٹا پرکھا جا رہا تھا اور ایک ایک لفظ کی تراش خراش دیکھی جا رہی تھی۔

ل صفحہ نمبر ۲۸۰ کے بعد ۲۷۳ غلطی سے دوبارہ لگ گیا ہے۔ لیکن مضمون مسلسل ہے۔

قادری صاحب نے اسی ماحول میں ہوش کی آنکھ کھولی اور ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی جو خود اچھے شاعر، عالم اور محدث تھے۔ ان کا گھر محلّہ گھیر کھنہ میں امیر مینائی کے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ جب نومبر ۱۸۹۹ء میں امیر کے گھر میں آگ لگی ہے تو قادری صاحب کے الفاظ میں "اس کے "اڑ اڑ کر ہمارے یہاں گرتے تھے۔" اس آگ کے متعلق امیر مینائی نے زاہد حسین رئیس سہارن پور کو لکھتے ہیں :

"میں ایسی کاہشوں میں رہا اور ہوں کہ میری کوتاہ قلمی عفو کے قابل ہے۔ مرض سے رنجوری و معذوری ایک طرف۔ نومبر کے مہینے میں آگ نے زنانے مکان سے مشتعل ہو کر مردانے مکان تک دو پہر میں تمام اسبابِ راحت و سامانِ معاشرت جلا کر خاک کر دیا۔ قلمی اور مطبوعہ کتابیں بھی بہت سی جل گئیں۔ بڑا حصہ میرے کلامِ غیر مطبوعہ کا بھی نذرِ آتش ہوا۔" (خطوط امیر مینائی ص ۲۱۶)

قادری صاحب داستان تاریخ اردو کے ایک حاشیہ میں لکھتے ہیں :

"بعض تذکروں میں آگ لگنے کا سال ۱۸۹۵ء درج ہے اگر ایسا ہے تو ممکن ہے وہ آگ پہلے لگی ہو۔ ۱۸۹۹ء میں آگ لگنا خود مجھے یاد ہے۔ میں رام پور میں حضرت امیر مینائی کے محلے میں ان کے مکانات سے قریب ہی رہتا تھا میرا لڑکپن کا زمانہ تھا۔ آگ ایسے غضب کی تھی کہ اگرچہ مکان آتش زدہ سے میرا مکان فاصلے پر تھا ———— پھر بھی وہاں سے جلے ہوئے کاغذ اڑ کر میرے گھر آتے تھے۔ اس حادثہ سے ہم سب پر عجیب ہیبت چھائی ہوئی تھی۔ امیر صاحب اور جلیل صاحب کا دیکھنا اچھی طرح یاد ہے۔ بعض تقریبیں جن میں شریک ہوا یاد ہیں۔" (ص ۳۶۸)

اس وقت قادری صاحب کی عمر گیارہ برس کی تھی، لیکن وہ امیر و داغ کے اشعار گنگناتے اور ان سے مزے لیتے تھے۔ انہوں نے منشی امتیاز احمد خاں راز تلمیذ امیر سے اصلاح بھی لی تھی۔ ان کے والد مولوی احمد حسن اور چچا پروفیسر محمد حسن فاروقی استاذ عربی اسلامیہ کالج پشاور، دونوں "بزمِ احباب" رام پور کے سرگرم ممبر تھے جہاں شعر و شاعری، اخبار اور رسائل کا ذکر رہتا تھا۔ ان کے والد مولوی احمد حسن نے "قصۂ قاضیٔ جون پور" فارسی زبان میں بطرزِ مثنوی لکھا اور اسے قادری صاحب کے نام منسوب کر کے چھپوا دیا تھا۔ سستے کا زمانہ تھا۔ جس میں سو نسخے چھپ گئے۔ یہ مثنوی جس کا تاریخی نام "نظمِ رنگین" (۱۳۲۰ھ) ہے، قادری صاحب کو حفظ یاد تھی اور اسی نے ان کے اندر تاریخ گوئی اور شعر فہمی کی عجیب و غریب صلاحیتوں کو بیدار کیا۔ قادری صاحب کی اکثر تاریخیں ایسی ہیں جن میں اول پورا مصرعِ تاریخ ذہن میں آیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ سعادت معمولی نہیں۔ انہوں نے امیر مینائی کی تاریخ وفات کہی تھی: "آں قدح بشکست و آں ساقی نماند" (۱۳۱۸ھ)۔ یا جو کی نوکری چھوڑتے وقت فرمایا تھا: "رخصت اے اجلِ ہم جاتے ہیں ہم" (۱۹۱۲ء) اب تک انہوں نے دو ہزار سے زیادہ تاریخی مادے نکالے ہیں اور ان میں سے ایک ہزار سے زیادہ نظم کر دئیے ہیں۔ پھر کوئی تاریخ ایسی نہیں جس میں کوئی لطیفہ اور کوئی چٹکلہ نہ ہو۔ شگفتگی اور برجستگی بلا استثنا ہر تاریخ میں ملے گی۔ اندر سے چارلا رہے ہیں، ریل میں سوار ہو رہے ہیں، وضو کر رہے ہیں اور تاریخ کہہ رہے ہیں۔ یہ روانی اور آمد تاریخ کے معاملہ میں نہ دیکھی، نہ سُنی۔

ان کے بڑے صاحبزادے ساجد حسن قادری کے تیسرا لڑکا ہوا۔ تاریخ نکالی "فرزندِ ثالث" دوسری تاریخ ہے "سرورِ دل ہے یہ نورِ نظر بھی" مزے کی بات یہ ہے کہ لڑکا یکم جنوری ۱۹۵۳ء کی صبح کو پیدا ہوا۔ حساب کیسا صحیح ہے !

میں نے "قدیم دلی کالج" نمبر نکالا۔ اس کی عجیب تاریخ نکالی ہے۔ لکھتے ہیں :

"دہلی کالج نمبر موصول ہوا۔ کیا کہنا۔ کیا خوب یادگار قائم کی ہے۔ مضامین، ترتیب، سلیقہ، سب کچھ اعلیٰ سے اعلیٰ۔ بڑی مسرت ہوئی۔ ڈپٹی نذیر احمد اور مولوی ذکاء اللہ وغیرہ سب کی ارواح کی طرف سے جزاک اللہ :

بڑی ہے یادگار دلّی کالج ا   تری ایک ایک سطر، ایک ایک پیرا
"دلِ دلّی" سے یہ تاریخ نکلی   "جزاک اللہ فی الدّارین خیرا"

۶۸   ۱۲۹۴ھ
+ ۶۸ = ۱۳۶۲ھ

میں نے لکھا کہ ایک صاحب کے پوتا ہوا ہے آپ تاریخ کہہ دیجئے۔ اس موقع پر اپنی تاریخ گوئی کے متعلق بڑا دلچسپ خط لکھا ہے،

"انہوں نے تو کیا تاریخ کو کہا ہوگا۔ آپ ہی کو یہ لپکا پڑ گیا ہے۔ مگر وہ تو کہئے مجھے خود اس کا خبط ہے۔ اکثر میرے لئے محنتِ محبت LABOUR OF LOVE ہوتی ہے۔ محض تاریخ کہنے میں مزا آتا ہے کتنی تاریخیں کہتا ہوں کہ کبھی کسی کو نہیں سُناتا لکھیں اور رکھ لیں ٹہلتا جا رہا ہوں تو تاریخ کہہ رہا ہوں، امتحان کی نگرانی کر رہا ہوں تو تاریخ کہہ رہا ہوں، بات بے بات، سبب بے سبب کہتا ہوں، تو اب بات اور سبب پر کیوں نہ کہتا، مگر آج کل اصل میں فرصت بالکل نہ تھی۔ کالج کے آخری دن ہیں۔ کاپیاں پڑی ہوئی ہیں اور لطیفہ یہ کہ امتحان ابھی ختم نہیں ہوئے کہ آئندہ سال کے پرچے بنانے کو آگئے اس لئے میں نے سوچا کہ فوراً آپ کی تعمیل نہ ہوئی تو پھر نہ ہو سکے گی۔ چنانچہ عجلت میں یہ چند تاریخیں آج ہی لکھ کر ختم کر دیں اتوار کے سبب آج خط نہ جا سکا۔ کل جائے گا۔ ان کے اچھے بُرے ہونے کی ذمہ داری نہیں۔ ماحضر سمجھئے"؛

قادری صاحب نے ۱۹۰۹ء میں اسٹیٹ ہائی اسکول رامپور سے میٹرک پاس کیا اور ستمبر ۱۹۱۰ء میں ریزیڈنسی ہائی اسکول اندور چھاؤنی میں اُردو کے استاد مقرر ہو گئے لیکن مزید تعلیم کے شوق میں یہ ملازمت ترک کر دی۔ ۱۹۱۱ء میں انہوں نے لاہور سے منشی فاضل پاس کیا اور اس کے بعد غالباً ادیب فاضل۔ جون ۱۹۱۱ء میں وہ خان بہادر عادل جی پسٹن جی زرتشتی ہائی اسکول مہو چھاؤنی میں بہ حیثیت ہیڈ مولوی ملازم ہو گئے۔ نومبر ۱۹۱۲ء سے دسمبر ۱۹۱۳ء تک اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ میں اردو و فارسی کے مدرّس رہے۔ جنوری ۱۹۱۴ء میں ان کا تقرر فارسی کے لکچرار کی حیثیت سے بڑودہ کالج میں ہو گیا۔ لیکن جون ۱۹۱۷ء میں انہوں نے بیماری کے سبب سے یہ ملازمت ترک کر دی۔

مولوی محمود علی صاحب (برادرِ بزرگ مولوی حامد علی مرحوم) ان کی بیماری کا یہ قصّہ سُنایا کرتے ہیں کہ "میں ان کو لے کر ڈاکٹر انصاری کے پاس گیا۔ انہوں نے دیکھ کر فرمایا: "جیسے یہ چھوٹے سے ہیں، ایسے ہی ان کا معدہ بھی چھوٹا سا ہے۔ آپ تردّد نہ کریں۔ یہ کھانے کے اوقات کا خیال رکھیں اور صبح اُٹھ کر ٹہلا کریں، ٹھیک ہو جائیں گے"۔ اس وقت سے یہ معمول ہے کہ صبح کو ضرور ٹہلتے ہیں اور یہ ٹہلنا آندھی مینہ میں بھی ناغہ نہیں ہوتا۔

قادری صاحب جولائی ۱۹۲۷ء سے ۱۹۴۵ء تک سینٹ جانس کالج آگرہ میں اردو اور فارسی کے لکچرار رہے اور اپنے چھوٹے بھائی پروفیسر عابد حسن فریدی کے انتقال کے بعد صدر شعبہ ہو گئے اور اسی حیثیت سے ۱۹۵۲ء میں ریٹائر ہوئے۔

یہ داستان میں نے اس لئے بیان کی کہ قادری صاحب اول و آخر استاد ہیں۔ وہ باتیں بھی اس طرح کرتے ہیں جیسے پڑھا رہے ہوں۔ ہر لفظ کو کھینچ کر اور زور دے کر ادا کرتے ہیں۔ کلاس میں گھنٹہ بجتے ہی داخل ہوتے ہیں اور گھنٹہ ختم ہوتے ہی کتاب کو آواز کے ساتھ بند کر دیتے ہیں۔ اس ۴۵ یا ۵۰ منٹ میں وہ ایسے منہمک رہتے ہیں کہ ان کو کچھ خبر نہیں ہوتی کہ کون آیا اور کون گیا۔ پڑھانے میں لڑکے ہی نہیں وہ خود بھی مزا لیتے ہیں۔ مضمون کیسا ہی خشک کیوں نہ ہو وہ اسے ایسا دلچسپ بنا دیتے ہیں کہ اس میں قصّہ کہانی کا لطف آتا ہے۔ اشعار کے مطالب، معانی و بیان کے اصول و قواعد، فصاحت و بلاغت کے نکات، اور کلام کے محاسن و عیوب پر ان کی ایسی نظر ہے کہ کوئی نکتہ چھوٹنے نہیں پاتا۔ پھر اس کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ بات دل نشین اور خاطر نشان ہو جاتی ہے۔ پڑھانے میں وہ ایسے بے عذر ہیں کہ کسی وقت پہنچ جائیے ان کی طبیعت اچھی ہو یا نہ ہو، کام میں مشغول ہوں یا خالی، انکار نہیں کریں گے اور گھنٹوں شفقت کے ساتھ پڑھائیں گے۔

قادری صاحب نیچی نظریں کرکے پڑھاتے ہیں اور نیچی نظریں کرکے چلتے ہیں۔ راستہ میں سلام کیجئے' انہیں خبر نہ ہوگی۔ پان بہت کھاتے ہیں لیکن کالج میں نہیں۔ ڈبیا سفر میں رکھتے ہیں لیکن وہ بھی عجوبہ ہے۔ سگریٹ کیس سے ملتی جلتی۔ اس میں چھوٹے چھوٹے پان اور چھالیہ خشخاش کے دانہ کے برابر۔ فاؤنٹین پن پرانا ہے جو الٹا اور سیدھا دونوں طرف سے لکھتا ہے اور اس میں بہت سی روشنائی آتی ہے۔ اسی سے انہوں نے ہزاروں صفحے لکھے ہیں۔ خط ایسا پاکیزہ ہے کہ دیکھ کر آنکھوں کا نور بڑھ جاتا ہے۔

قادری صاحب بڑے سنجیدہ، متین اور منکسرالمزاج آدمی ہیں۔ لیکن زاہدِ خشک نہیں۔ وہ روایت پرست ہونے کے باوجود اچھی اور نئی بات جہاں بھی ملتی ہے اسے پسند کرتے ہیں اور داد دیتے ہیں۔ وہ جدید ایرانی افسانوں کے قائل ہیں لیکن جدید ایرانی شاعری کے قائل نہیں۔ ایک مرتبہ کہنے لگے "اقبال کا کلام ایک پلڑے میں اور جدید ایرانی شاعری کا پورا سرمایہ دوسرے پلڑے میں ــــــ جب آپ ترازو اٹھائیں گے تو اقبال کا پلڑا بھاری رہے گا۔"

قادری صاحب رائے دیتے میں بڑے نڈر اور بیباک ہیں۔ لگی لپٹی نہیں رکھتے، لیکن ان کی ادبی بحث کبھی ذاتیات تک نہیں پہنچتی۔ سیماب اکبر آبادی سے ان کے کیسے کیسے علمی مجادلے ہوئے لیکن "ہنوز رنگِ ادب بر رخِ سخن باقیست"۔ مجھے ایک خط میں مومن کے متعلق لکھتے ہیں:

"میں نے مومن کی غزلیات کا تو انتخاب مع شرح و تنقید لکھ لیا ہے، ان کی مثنویوں کا بھی انتخاب و تبصرہ لکھنا چاہتا ہوں، مگر قصہ یہ ہے کہ میں اپنی عادت کے مطابق کسی کو بخشنے والا نہیں۔ ایسے مضامین بھی نہ چھوڑوں گا ؎

کچھ تجھ کو نہ غم کسے کا ہووے

ہر چند کہ غم امام ہووے

ان ہی باتوں نے مومن خان کو مقبول نہ ہونے دیا۔ میری تحریر سے لوگ اور بدکیں گے۔ غنیمت ہے کہ ان کی غزلیں ان جذبات سے خالی ہیں۔"

قادری صاحب ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی دونوں نظریوں کا احترام کرتے ہیں لیکن وہ بے راہ روی اور مغرب کی کورانہ تقلید کو برداشت نہیں کر سکتے وہ اپنی ادبی بنیادوں سے واقف ہیں۔ علمی مزاج کو پہچانتے ہیں اور روایتی تہذیبی عظمت کے شناسا ہیں۔

ایک مرتبہ مرزا شوق کے متعلق قادری صاحب سے گفتگو ہوئی۔ اس سلسلہ میں فرمانے لگے "اشعار سے کسی شاعر کی سیرت اور عادت کے متعلق قطعی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ میری شاعری، تاریخ گوئی، تصانیف، تنقید، ان چیزوں کو میری شخصیت سے کچھ بہت تعلق نہیں۔ کم سے کم تعلق ہونا لازمی اور ضروری نہیں ؎

در حقِ من بہ دُرد کشی ظنِ بد مبر

کآلودہ گشت خرقہ ولے پاک دامنم

امیر مینائی کیسے بیباک ہیں۔ وہ بڑے متقی تھے لیکن شعر کہتے ہیں تو اس رنگ کے

ع شرم بھی جائے تو میں جانوں کہ تنہائی ہوئی

شبلی کے استاد مولانا فیض الحسن سہارن پوری کا یہ شعر آپ نے سنا ہوگا ؎

پہلے ہی اپنی کون سی تھی قدر و منزلت

پر شب کی منتوں نے ڈبو دی رہی سہی

اور خود علامہ شبلی کا یہ لطیفہ نسیم عالم صاحب نے مجھے سنایا تھا۔ انہوں نے ایک مرتبہ شبلی کے سامنے یہ شعر پڑھا ؎

کارخانے میں خدا کے ہے کسے دخل اے لوگ

بچہ تم پہلے جنیں، ہیسا ہوا میرے بعد

مولانا آرام کرسی پر لیٹے ہوئے تھے، اُٹھ کے بیٹھ گئے۔ پہلے مصرع کو بار بار پڑھتے تھے اور اس کے محاورے سے لطف اٹھاتے تھے —— لیکن بات بس یہیں تک ہے۔ اس کے آگے نہیں۔ شوق کی "بہارِ عشق" میں جو زندگی پیش کی گئی ہے، وہ سچی ہے لیکن گھٹیا۔ اس میں بقول آپ کے کوئی ایسا ردِّ عمل بھی تو نہیں جو ایک مغربی افسانہ نگار نے ایک دودھ بیچنے والی لڑکی کی آبروریزی کے وقت پیش کیا تھا کہ وہ دودھ کا خالی برتن جبر و تشدد کرنے والے کے سر پہ دے مارتی ہے۔"

قادری صاحب نے ۱۸۹۹ء سے مضامین لکھے ہیں اور ان کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ اس مختصر سے مضمون میں ان کا حصر و شمار آسان نہیں۔ پیسہ اخبار لاہور، وکیل امرتسر، وطن لاہور، انتخاب لاجواب لاہور، مخزن لاہور، زمانہ کانپور، علی گڑھ منتھلی، نقاد آگرہ، عالمگیر لاہور اور نگار لکھنؤ میں ان کے بہت سے مضامین شائع اور مقبول ہو چکے ہیں۔

قادری صاحب نے سب سے پہلا تنقیدی مضمون ۱۹۱۵ء میں لکھا تھا۔ اس کے متعلق مجھے یکم دسمبر ۱۹۴۲ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"آپ نے مضمون کے اصرار میں کمال کر دیا۔۔۔ ۔۔۔ اس زمانے میں کتابیں چھپ رہی تھیں اور وہ تا ایں دم جاری ہیں اور کیا عجب کہ تا آں دم دمِ واپسیں یا ہنگام قیامت، جاری رہیں۔ اس لئے کہ ایک اپریل سے چھپ رہی ہے۔ ۸ مہینے ہو گئے۔ نہ لکھنا پورا ہوا نہ چھپنا۔ آپ نے ان کتابوں کی فہرست مانگا تھا۔ یہ بھی ممکن نہ تھا، اس لئے کہ ایک بی۔ اے فارسی کورس میں ہے۔ اس میں سے کیا بھیج دیتا؟ دوسرا میرے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ وہ پندرہ بیس سال سے کہیں نہ کہیں چھپتے ہی رہے ہیں۔ بعض نئے ہیں تو طویل ہیں، اور میں ان کو نیا ہی رکھنا چاہتا ہوں۔ پھر ان کو دوبارہ آپ کے لئے نقل کرنا ناممکن تھا ——

بہرحال اب ایک مضمون تقریباً تیار ہے اور بھیج سکتا ہوں۔ تنقیدی ہے۔ اور بہت عجیب و غریب لیکن یہ دو تین غلطیں کچھ اور معنی رکھتی ہیں جو پڑھنے کے بعد آپ سمجھیں گے۔ مجھے اس کی تکمیل اور نقل سے پہلے یہ دریافت کرنا ہے کہ آپ کے کارڈ میگزین میں کتنے صفحوں کی گنجائش ہے۔ معمولی میگزین سائز مثلاً نگار کے پانچ چھ صفحوں میں آئے گا۔ دوسرے یہ کہ میگزین کب تک شائع ہوگا —— ہوگا یا نہ ہوگا —— جب واقعی سب مضامین مرتب ہو جائیں اور کاتب کو دینے لگیں اس وقت مجھ سے منگا لیجئے گا اور میرا مسودہ واپس کرنا ہوگا۔ یہ مضمون شوق صاحب[1] بچھرایونی کی ایک غزل پر تنقید ہے اور اس کا مضطر خیرآبادی کی غزل سے مقابلہ۔ ۲۸ برس ہوئے ۱۹۱۵ء میں یہ تنقید نورالرحمٰن[2] کی فرمائش سے لکھی تھی۔ ان کی فرمائش مجھے حامد علی کی معرفت بڑودہ میں ملی تھی۔ میں نے تنقید خط میں لکھ کر حامد علی کو بھیجی تھی۔ اس سال گذشتہ جنوری میں جب میں حامد علی کی عیادت کے لئے بچھراؤں گیا تھا اور آپ بھی شاید آئے تھے، تو حامد علی نے وہ خط مجھے دیا تھا۔ یہ طویل خط اور طویل تنقید ہے۔ کہئے تو بھیج دوں۔"

قادری صاحب نے کانپور سے بچوں کا ایک اخبار سعید بھی نکالا تھا جو ۱۵ مارچ ۱۹۱۸ء سے ۱۵ ستمبر ۱۹۲۴ء تک برابر نکلتا رہا۔ اس کا بچوں کے اخبارات میں بہت ممتاز درجہ ہے اور اس نے جو بچوں کا ادب پیش کیا ہے وہ اس قابل ہے کہ اس کا ایک علیحدہ انتخاب شائع کیا جائے۔ قادری صاحب

---

[1] شوق مرحوم کا ترجمہ خمخانۂ جاوید میں موجود ہے۔ [2] مصنف حیاتِ سرسید

بچوں کی نفسیات کے ماہر ہیں اور اسمٰعیل میرٹھی کی طرح ان تمام امور کا خیال کرتے ہیں، جو ان کے ذہن کو متوجہ اور مسرور کر سکیں۔ ابھی حال میں انہوں نے پھر ایک پرچہ نکالنے کا ارادہ کیا تھا لیکن افسوس ہے کہ یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔ مجھے ۱۰ راکتوبر ۵۲ء کے خط میں لکھتے ہیں :

"عصمت" کی جگہ "عفت" نکالنے کی آپ نے خوب سوچی۔ بھلا کہیں مجھ سے اب یہ دردِ سر مول لیا جائے گا۔

"جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا" آپ کو مزا آئے گا یہ سُن کر کہ آگرہ سے گزشتہ مئی جون میں ایک پرچہ بالکل بطنِ پریس سے نکلنے ہی والا تھا۔ دردِ زہ شروع ہو گیا تھا۔ اشتہار چھپ گیا، بڑا قیمتی بلاک بن گیا، چندے آنے لگے، آگرہ سے باہر بھی یار و آشنا منتظر رہنے لگے، ڈیکلریشن منظور ہو گیا، میرے اور دوسروں کے سو ڈیڑھ سو روپے لگ گئے لیکن میں نے غور کرتے کرتے آخری وقت یہی مناسب سمجھا کہ اس قدر نقصان گوارا کرنا بہتر ہے آئندہ کے مسلسل دردِ سر سے۔ یہ پرچہ بالکل بے ضرر و بے خطر تھا یعنی بچوں کا "جیبا" "کھلونا" وغیرہ ہے۔ غرض قصّہ ختم کیا۔ تمام شرکاء میں سب سے زیادہ بار مجھ پر تھا، میں نے ہمت ہار دی۔"

اسی خط میں اپنی تین نئی کتابوں کے متعلق لکھتے ہیں جو ابھی تک شائع نہیں ہوئیں :

"شاہکار کے پہلے پرچے میں آپ نے میرا مضمون (انتخابِ مومن) دیکھا ہوگا۔ نہ دیکھا ہو تو دیکھئے اور رائے دیجئے تمام غزلیاتِ مومن کا انتخاب مع شرح و تنقید کیا تھا۔ کاپی سائز پر تقریباً ۱۵۰ صفحے کی کتاب قلمی مجلّد ہو گئی ہے اس کے بعد فتح پور میں غزلیاتِ غالب (فارسی) کا زیادہ سخت و مختصر انتخاب مع مطالب و تبصرہ لکھ کر تقریباً ۹۰ صفحے کی کتاب مجلّد کرا لی ہے۔ غزلیاتِ بیدل کا انتخاب پہلے کر چکا ہوں مگر اب ہمت پست ہو گئی۔ کوئی کام جم کر نہیں کر سکتا۔ کوئی بڑا مضمون نہیں لکھا جاتا۔ نیاز صاحب اپنے سالنامہ کے لئے مضمون مانگتے ہیں نہیں لکھ سکتا۔ ان سے شرمندہ رہتا ہوں۔"

قادری صاحب کی کتابیں باغبان (۱۹۲۱ء)، الکمال (۱۹۲۳ء)، فطرتِ اطفال (۱۹۲۵ء)، کمالِ داغ (۱۹۳۴ء)، تاریخ مرثیہ گوئی (۱۹۳۴ء)، تاریخ و تنقید (۱۹۳۸ء)، داستانِ تاریخِ اردو (۱۹۴۱ء)، نقد و نظر (۱۹۴۲ء)، ایرانی افسانے (۱۹۴۴ء)، صید و صیاد (افسانے ۱۹۴۴ء)، مشہور و معروف ہیں اور ان پر کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ ان کے نظریۂ ادب کے بارے میں چند جملے لکھنا بے محل نہ ہوں گے۔ اُردو کے قدیم طرز کے نقادوں میں قادری صاحب کا درجہ بہت بلند ہے۔ ان کے خیال میں "شاعری کام بھی ہے اور کھیل بھی۔ شاعری برائے زندگی بھی ہے اور برائے شعر و ادب بھی، اور برائے لاشئے بھی۔ مشرق و ہندوستان کا نظریۂ شاعری مغرب سے بالکل مختلف رہا ہے۔ اور ہے اور رہے گا۔" وہ لکھتے ہیں "میرے نزدیک ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی میں تضاد نہیں ہے۔ ان کا اجتماع ممکن ہے . . . . . خیالات، تجربے، موضوعات نئے نئے ہوں، بدلتے رہیں، اور بدلتے رہتے ہیں لیکن ان کے اظہار کا بہترین طریقہ نہیں بدلتا۔" وہ شعر و ادب کے ظاہری پہلو کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "کس طرح کہنا شاعر کو شاعر بناتا ہے۔"

قادری صاحب بڑھاپے کی نسبت سے بڑھ کر قدامت پسند بلکہ قدامت پرست ہیں اور اپنے خیالات میں بڑے سخت اور مضبوط ہیں۔ لکھتے ہیں "میں اپنے مذہب، اخلاق و معاشرت، ادب اور شاعری سب میں نہایت کٹّر واقع ہوا ہوں۔ میں اپنے مذہب کو الہامی، اپنی تہذیب کو توفیقی اور اپنے شعر و ادب کو روایتی سمجھتا ہوں اور ان میں سے کسی کے متعلق اپنے نظریۂ ادب کو بدلنے کے لئے تیار نہیں۔" لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہوگا کہ وہ نئے اسالیب یا نئے موضوعات کے خلاف ہیں۔ لکھتے ہیں :

"میرا مقصود یہ ہے کہ انقلابِ جدید کے اثرات سے اُردو شاعری کے قدیم موضوعات میں تغیّر ہو جائے۔

۱

قدیم اصناف تبدیل ہو جائیں، نئے تجربات کئے جائیں، نئی افادی حیثیت پیدا کی جائے۔ کوئی مضائقہ نہیں۔
لیکن ہندوستانیت فنا نہ ہونی چاہئے۔ مشرقیت تباہ نہ ہو جائے۔"

قادری صاحب کی تنقید کی طرح ان کی مکتوب نگاری بھی ان کی شخصیت کا آئینہ ہے۔ عصرِ حاضر کے بہت کم لوگ ہیں جن کے خطوں میں معمولی لمحوں کو جاوداں بنا دینے کا سلیقہ، باتوں کا لطف اور روزمرّہ کی چاشنی ہو۔ جس شخص نے ان کو نہیں دیکھا وہ ان کے خطوں کو دیکھ لے۔ ان کی زندہ شخصیت با فرینت اگر کسی جگہ صاف نظر آتی ہے تو خطوں میں۔ ان کے بے تکلف رقعوں میں حسن کا وہ ناز و انداز نہیں ہے کہ وہ خلوت میں بھی نقاب ڈال کر آئے اور نہ عشق کی وہ احتیاط ہے کہ بازار میں کبھی رُسوا نہ ہو۔

ان کا اندازِ تحریر ایک عمدہ قسم کا شیشہ ہے جس کے ذریعہ ہر چیز اپنے اصلی رنگ روپ میں نظر آ سکتی ہے۔ تصنّع اور آب و رنگ مطلق نہیں ہے وہ جو کچھ اثر مرتب کرتے ہیں، وہ موضوع اور اسلوب کی ہم آہنگی سے ——— ایک مرتبہ فلابرٹ نے موپاساں سے کہا تھا:

"بات کہنے کے لئے دراصل ایک ہی لفظ ہوتا ہے۔ صفت کو ظاہر کرنے کے لئے ایک ہی اسمِ صفت اور فعل کو ظاہر کرنے کے لئے بس ایک ہی فعل۔"

قادری صاحب کے یہاں بھی یہی بات ہے۔ وہ ایک اچھے طبیب کی طرح ایک ایک لفظ کی نبض پہچانتے ہیں اور جہاں ودیعت ہے اس کو سجاتے ہیں۔ ۲۰ را پریل ۱۹۵۲ء کے ایک خط میں کاموں کی کثرت کا ذکر کرتے ہیں:

"میں آج کل کثرتِ کارِ سرکار سے بہت پریشان ہوں اور سرکار ایک دو نہیں، چھ سات ہیں۔ سب کی بندگی کے لئے وقت کی پابندی ہے۔"

۱۴ر اگست ۱۹۵۳ء کے خط میں کس محبت سے لکھتے ہیں:

"ابھی آدھ گھنٹہ ہوا کہ بشارت نامہ ملا ——

فضیلت مبارک ابد تک مبارک
مبارک، مبارک، مبارک، مبارک

تاریخ

ہزار شکر کہ پی ایچ ڈی ہوئے خواجہ	بڑا صلہ ہے بڑی نعمتِ خدائے احد
یہ فی البدیہہ کہا قادری نے سالِ نشاط	کہ "ڈاکٹر ہوئے کیا خوب خواجہ احمد"

۱۹۵۳ھ

مجھے جیسی خوشی ہے، اظہار مشکل ہے۔ آیئے تو مٹھائی کھلاؤں —— پہلے کھلا لوں تو پھر کھانے آؤں۔"

میں نے عرض کیا تھا کہ "مرزا شوق لکھنوی" پر مقدمہ لکھ دیجئے۔ اس کے جواب میں یکم فروری ۱۹۵۵ء کو خط لکھتے ہیں:

"کل کارڈ ملا۔ بالکل شاعری کا مزا آ گیا۔ میں تو نثر میں بھی شاعری کا قائل ہوں ..... معلوم ہوتا ہے میری خطوط پر کوئی خاص زوال اور آفت ہے ..... مجھے شکایت کرنی ہی تھی۔ جب کبھی آپ کا خط آتا ضرور لکھتا اب معلوم ہوا کہ آپ نے دونوں مرتبہ رسید لکھی مگر نہ پہنچی۔ چلئے بات ختم ہوئی۔

باقی، مقدمہ میں واقعی نہیں لکھ سکتا۔ آج کل تصنیف و تالیف، لکھنے پڑھنے سے بالکل دست کش ہوں۔ طبیعت بالکل متوجہ نہیں ہوتی اور یہ مبالغہ آپ کا فضول ہے کہ چند سطریں ——— ایک سطر ——— ایک لفظ،

بھلا اس کی کیا ٹھکانہ ہے ..... اگر میرے جمود کی یہی حالت رہی تو آئندہ شاید یہ سلسلہ بالکل ہی ختم ہو جائے مگر میرے دل و دماغ کی یہ کیفیت ابھی لوگوں کی عقل میں نہیں آسکتی - خدا کرے آپ کی عقل میں آسکے اور یقین کر سکیں ۔"

۲۶ مارچ ۵۰ء کے خط میں لکھتے ہیں :

" یہ آپ نے خوب کہی کہ شوق کا مقدمہ نہ لکھئے لیکن خیریت لکھئے یعنی میں نے مقدمہ نہیں لکھا تو سب تعلقات خاندانی، برادرانہ القط ہو گئے ؟ آپ بھی بہت اچھے رہے ۔"

۲۰ اکتوبر ۴۸ء کے خط میں اپنا حال لکھا ہے ۔ چند الفاظ میں لیکن پوری تصویر سامنے آجاتی ہے :

" میں اچھا ہوں ..... (عید کے روز) بعض احباب نے ڈیڑھ سو [۱۵۰] دو سو [۲۰۰] کو ایک ایک بکرا خریدا اور ڈھیر گوشت ہمارے گھر بھیج دیا ۔ پھر کیا تھا ۔ کیسا بخار اور کہاں کا پرہیز ۔ گوشت کیا تھا موٹی موٹی چکنائی سے مخلوط و محشور ۔ میں نے بھی خوب اڑایا ۔۔۔ عمدہ گوشت کو میں بغیر روٹی کی لاگ کے کھایا کرتا ہوں خلاصہ نتیجہ یہ کہ عید کے تیسرے دن سے پھر حرارت محسوس ہونے لگی مگر اب اچھا ہوں ..... ضعف بھی کچھ کم ہے ۔"

مولوی حفیظ الرحمٰن صاحب کو آموں کا شکریہ لکھتے ہیں ۔ روزمرہ ملاحظہ ہو :

" آج بلٹی ملی اور پارسل آگیا ۔ حفاظ پہنچا مگر اسٹیشن سے گھر تک قلی پر رس ٹپکتا آیا ۔ چھوٹے آم نیچے تھے بالکل دب کر بہہ گئے ۔ بڑے آم بھی دب کر نرم ہو گئے ۔ بہرحال خوب آئے ۔ کھائے ہی جائیں گے ۔ بہت بہت شکریہ ۔" (مورخہ ۳۰ جون ۱۹۵۳ء)

ہڈسن نے لکھا ہے کہ شخصی اور انفرادی تجربہ ادب کی جان ہے ۔ اسی لئے شخصیت کا اظہار جتنا ان بے تکلف اور سرسری خطوں سے ہوتا ہے جہاں مصلحت کی دراندازی نہ ہو، اتنا کسی اور ذریعہ سے نہیں ہوتا ۔ وہ سوانحی مواد کا گنجینہ اور خزینہ ہیں اور ہم ان کے آئینے میں شخصیت کے اکثر خدوخال صاف دیکھ سکتے ہیں ۔ قادری صاحب ہماری قدیم تہذیب کا نمونہ ہیں ۔ ان کے نظامِ فکر میں معاشرتی اور اخلاقی اقدار کا ایک خاص معیار ہے جس کا اظہار بعض خطوں میں بھی ہے

۵ اگست ۵۴ء کے خط میں لکھتے ہیں :

" [illegible] والد ڈاکٹر عبدالحق صاحب کا خطاب شاید افضل العلماء بھی ہے ۔ مجھے بھی ایک مرتبہ ان کی زیارت کا موقع ملا ہے جب وہ جامعہ اردو کے جلسے میں آگرہ تشریف لائے تھے ۔ مجھے ایک ادا ان کی بہت پسند آئی تھی ۔ ایک مشہور بزرگ گزرے ہیں مولانا احمد حسن صاحب محدث کانپوریؒ ۔ ڈاکٹر صاحب کے والد مرحوم محدث کانپوری رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے ۔ صرف اس تعلق سے ڈاکٹر صاحب آگرہ سے کانپور گئے ۔۔۔ مولانائے مغفور کے مزار شریف پر فاتحہ پڑھی اور ان کے خاندان سے ملے ۔ یہ سن کر آپ کو لطف آئے گا کہ حضرت محدث کانپوریؒ مغیث الدین فریدی کے حقیقی نانا تھے اور لطفِ مزید کا باعث یہ لطیفہ ہو گا کہ حضرت مولانا احمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ میرے پیر و مرشد حضرت قبلۂ عالم محدث علی پوری روحی فداہ کے بھی استاد تھے ۔ حضرت صاحبؒ نے کانپور آکر اور مولانا صاحبؒ کی خدمت میں رہ کر حدیث شریف پڑھی ہے لطیفہ یہ ہے کہ جب حضرت صاحب آگرہ تشریف لائے اور فریدی صاحب مرحوم نے مغیث اور ان کے بھائی کو حضرتؒ کی خدمت میں پیش کیا تو حضرت صاحب اپنے استاد کے نواسوں کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے ۔

حالانکہ انتہائے ضعف کے سبب سے ایک آدمی کی مدد سے اُٹھتے اور کھڑے ہوتے تھے۔ اور پہلے لڑکوں کو بٹھایا جب خود بیٹھے۔"

قادری صاحب نے بعض جگہ اپنے مذہبی عقائد کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔" دنیا میں نظامِ جسمانی و مادی کے ساتھ نظامِ روحانی بھی قائم ہے اور روح کے بعض کرشمے مادہ کی کارفرمائیوں سے زیادہ حیرت ناک ہوتے ہیں۔" اسی لئے وہ عرش و کرسی، جنت و دوزخ کو استعارہ و مجاز نہیں بلکہ مادی حقیقت سمجھتے ہیں۔ اور اس میں کسی قسم کی تاویل اور حجت کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ سرسید سے بھی وہ اسی وجہ سے خفا ہیں کہ وہ مذہب کو سائنس کی عینک سے دیکھتے ہیں۔ کس مزے سے لکھتے ہیں۔" وہ یورپ کے لپیٹ اور انگریزوں کے پھیر میں ایسے آئے کہ صرف معجزات اور بعض دوسرے عقائد و اعمال کے تردید کے لئے قرآن مجید کی تفسیر لکھنے بیٹھ گئے۔ بھلا کوئی پوچھے کہ آپ کہاں کے محقق و مجتہد، محدث و فقیہہ اور عالمِ زبان و ادب تھے کہ تحویلِ کلمات اور تاویلِ آیات کا حوصلہ کر بیٹھے۔" آگے چل کر لکھتے ہیں۔" خیر، سرسید کو چھوڑیئے۔ مجھے علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ ڈاکٹر سید سلیمان ندوی پر تعجب آتا ہے کہ ان کی غرض و غایت تو وہ نہ تھی۔ سیرت النبی میں مغرب و مشرق کی مرضی ڈھونڈھنی نہ تھی۔ تحقیق کرنی تھی۔ لیکن معجزات ان بزرگوں کی سمجھ میں بھی نہ آئے..... عقل و نقل سے معجزات پر روشنی ڈالنی چاہی ہے لیکن خود تاریکی میں تھے، اس لئے ظلمت ہی چھائی رہی..... عجیب بات ہے کہ علامہ ندوی دلیر و جری ہو کر یہ نہ فرما سکے کہ جو معجزات نبوی احادیث صحیحہ سے ثابت ہیں، وہ بلاشبہ برحق ہیں۔ خواہ سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں۔ سائنس ان کی تصدیق کرے یا نہ کرے۔ عقل و سائنس سمجھنے سے عاجز ہیں تو یہ ان کا اپنا قصور و نقصان ہے۔"

قادری صاحب کے بعض خطوں میں بڑی دلچسپ ادبی بحثیں بھی ہیں جن سے ان کا نقطۂ نظر سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ میں نے اب سے دس برس پہلے حسرت موہانی نمبر نکالنے کا ارادہ کیا تھا اور ایک خط میں لکھا تھا۔" حسرت موہانی کی زندگی اور شاعری کے مختلف پہلوؤں کو بے نقاب کرنے کے لئے مندرجہ ذیل عنوانات انتخاب کئے گئے ہیں۔" قادری صاحب نے اس جگہ "بے نقاب" کے استعمال کو پسند نہیں کیا اور ۱۸ر مارچ ۱۹۴۴ء کے خط میں لکھا:

"محاوروں کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے۔ ان کی صحت، رواج عامہ اور قبولِ خاطر پر منحصر ہوتی ہے۔ محاورے کے مختلف پہلو اور مختلف استعمال معنی میں فرق پیدا کر دیتے ہیں..... آپ نے "بے نقاب" کے حقیقی اور مجازی مفہوم پر غور نہیں کیا اور چار شاعروں کی مثالیں لکھ دیں جن میں سے ایک بھی آپ کے لئے مفید نہیں، اس لئے کہ ان سب میں حقیقی معنی مراد ہیں۔ یعنی چہرے سے نقاب اٹھانا۔ طالب، انوری، جوش کے اشعار میں تو حقیقی معنی ظاہر ہیں۔ اقبال کے شعر میں مجازی معنی کے الفاظ نے نیاز کو حقیقت سے مشابہ کر دیا ہے یعنی نقاب چہرہ اس رخ سے اٹھایا ہے۔ اگرچہ معنی کا رخ ہے۔ چہرے کا بے نقاب ہونا اور سیرت کا بے نقاب ہونا، زندگی کا بے نقاب ہونا، قابلیت کا بے نقاب ہونا، دعوے کا بے نقاب ہونا اور بات ہے۔ ان میں لا محالہ معائب کا بھی بے نقاب ہونا مفہوم ہوتا ہے بلکہ ذہن سب سے پہلے معائب ہی کی بے نقابی کی طرف منتقل ہوتا ہے، اس لئے اس محاورے کو کسی ایسے شخص کے متعلق استعمال کرنا مناسب نہیں جس کا احترام مدِ نظر ہو۔ مثلاً اگر زید نے غالب کے متعلق لکھا ہے تو میرے نزدیک درست ہے۔ اس لئے کہ اس کا کوئی خاص احترام مجھے مدِ نظر نہیں اور مجھے اس کی زندگی اور شاعری دونوں میں معیوب پہلو نظر آتے ہیں اور بعض پہلو اب تک واقعی پوشیدہ بھی ہیں یا تھے۔ لیکن، مثلاً اگر یہ فقرہ حسرت موہانی کے لئے لکھا جائے تو میں پسند نہ کروں گا۔ "حسرت موہانی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بے نقاب کرنا" اس کو بار بار پڑھ کر دیکھئے اور سوچئے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ کچھ مذموم پہلو بیان کرنے ہیں۔

ایک عرصہ ہوا نگار اور نیرنگِ خیال میں مضمون بازی ہوئی تھی۔ آرگس نے ایک مضمون لکھا تھا "غالب بے نقاب"۔ اس کا جواب دیا گیا "آرگس بے حجاب"۔ "غالب بے نقاب" کے الفاظ ہی سے ظاہر ہو رہا ہے کہ غالب کے معائب کا بیان ہے۔ یہ ہماری زبان، محاورہ، رواج کی بات ہے، ورنہ ممکن ہے ایران میں ان الفاظ کا یہ مفہوم نہ لیا جائے۔"

میں نے پھر لکھا کہ کیا حسرت موہانی کی زندگی اور شاعری کے متعلق دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ہم ان میں سے کسی رائے سے متفق ہوں اور کسی رائے سے نہ ہوں۔ کم از کم ان کی شاعری پر تو "محرمانہ" نظر بھی ڈالی گئی ہے اور ابھی حال میں ڈاکٹر عندلیب شادانی نے بعض اعتراضات ایسے کئے ہیں کہ اٹھائے نہیں اٹھتے۔ اس کے جواب میں ۱۲ اپریل ۱۹۴۴ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"میرا اب بھی وہی خیال ہے...... زندگی کو بے نقاب کرنے اور شاعری کو بے نقاب کرنے میں فرق ہے۔ حسرت کی شاعری کو جتنا چاہئے بے نقاب کیجئے لیکن جب کہئے گا کہ حسرت کی زندگی کو بے نقاب کرنا ہے تو فوراً ذہن ان کے عیوبِ اخلاقی کی طرف جائے گا......

ڈاکٹر شادانی نے حسرت پر جو اعتراضات کئے ہیں وہ میں نے حرف بحرف کئی کئی بار پڑھے ہیں اور ان کا جواب ڈاکٹر صاحب کو لکھ دیا ہے۔ آپ کہتے ہیں "اٹھائے نہیں اٹھتے"۔ میں نے سب اٹھا دئے کوئی پڑا نہ رہا۔ ڈاکٹر صاحب سے میری پرانی شناسائی ہے۔ ۲۶ سال کی ——— وہ مجھ سے بڑا خلوص رکھتے ہیں۔ ان کے اعتراضات ایک خاص نظریہ کی بناء پر ہیں۔ اور صرف حسرت کی ذات پر نہیں، بلکہ قلی قطب شاہ اور ولی دکنی سے لے کر جگر و حسرت تک ہزاروں شاعروں پر ہیں۔ بلکہ ایران، عرب، مصر وغیرہ سب ان کی زد میں ہیں۔"

قادری صاحب شاعری بھی کرتے ہیں لیکن یہ شاعری زندگی کے وسیع تر حقائق کا جزو نہیں ہے اور نہ اس میں اجتماعی شعور اور گہری سنجیدگی ہے۔ ان کا سارا آرٹ چھیڑ چھاڑ اور چٹکلہ کا ہے اور بعض اوقات واقعی برائے لاشے ——— لیکن جو مصرعہ ہے وہ چست اور برجستہ، جو فقرہ ہے وہ شوخ اور برمحل۔ ایک مرتبہ انہوں نے تحریکِ صدارت سے قبل سینٹ جانس کالج آگرہ کے ایک طرحی مشاعرہ میں یہ قطعہ پڑھا تھا۔ ملاحظہ ہو ــ

ہمیشہ کاملانِ فن یہاں تشریف لاتے ہیں
ہوا کرتی ہے یہ بزمِ سخن مےخانہ برسوں سے
کمی مجمع کی شاید ابر و باراں کے سبب سے ہے
مگر ہم کو ہوا تھا اتفاق ایسا نہ برسوں سے
سکوں سے آج تھوڑا کام لے لیتی تو کیا ہوتا
تڑپتی ہی رہی ہے برقِ بےتابانہ برسوں سے
دبا رکھتا ذرا سا آج اپنے جوشِ گریہ کو
یہ مانا ابر بھی ہے ضبط سے بیگانہ برسوں سے
ذرا دلدل کو اپنی خشک رکھتیں شہر کی سڑکیں
رہی ہیں عرصہ گاہِ لغزشِ مستانہ برسوں سے

مگر یہ مشکلیں ہیں امتحانِ شوق کی خاطر

ہوا تھا کب ظہورِ ہمتِ مردانہ برسوں سے

یہ برسوں بعد اے حامد صلائے شیخ اردو ہے

کہاں سوئی ہوئی ہے فطرتِ پروانہ برسوں سے

ایک صاحب نے پاکستان جا کر داڑھی منڈا دی۔ ان کو لکھتے ہیں :

وہاں جا کر جو مونڈی تم نے داڑھی

دیا گویا یہ پاکستان کو باج!

ذرا سے بال تھے رہنے ہی دیتے

نہ تھی آخر وہ عرض وطول میں چھاج

یہ ڈر تھا آتی جاتی ہے سفیدی

مگر تھا یہ تو ذیبِ و ربّ و تاج

اگر روئی کا گالا ہو بھی جاتی

نہ آتا اس کو دُھننے کوئی حلّاج

نہ دیتا آ کے بچّہ اس میں خرگوش

جو کی پہلے سے تم نے فکرِ اخراج

کبھی قصاب سمجھا تھا کسی نے؟

کہ ذبحِ ریش کو سمجھا حلال آج!

بنایا تھا "بُجزِ اخفش" کسی نے؟

کہ چڑھ آیا غضب کا بحرِ مواج

نہ کرتے تم جو منڈوانے کی غلطی

تو کیوں بنتے مرے طعنوں کا آماج؟

صفائی کی سنو یہ صاف تاریخ

خس و خاشاک داڑھی کا نہیں آج

۱۹۴۸ء

قادری صاحب نے رباعی کے میدان میں بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ ان کی بعض رباعیاں ندرتِ ادا کا کامیاب نمونہ ہیں جن سے ان کی انفرادیت اور مذاق کی پختگی ظاہر ہوتی ہے ؎

اس عہدِ شباب پر جو مغرور ہے تو

یہ سوچ کہ حق سے کس قدر دور ہے تو

بہتر ہے کہ خوشی سے کر لے سجدہ بھی کبھی

پیری میں تو رکوع پر مجبور ہے تو

اُٹھ صبح ہوئی، خبر ہے غافل تجھ کو
فیضانِ سحر نہیں ہے حاصل تجھ کو
مشکیں کس لی ہیں کروٹوں نے تیری
شکنیں بستر کی ہیں سلاسل تجھ کو

آخر میں اس مضمون کے متعلق بھی چند کلمے لکھنا ضروری ہیں۔ میں عرصہ سے قادری صاحب کے متعلق ایک مضمون لکھنا چاہتا تھا لیکن انہوں نے کبھی ہمت افزائی نہیں کی۔ ۱۲ ستمبر ۱۹۵۰ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"آپ کا خط بڑا دلچسپ ہے۔ ہمیشہ دلچسپ لکھتے ہیں۔ بہت لطف آیا......
میں اس قابل یقیناً نہیں ہوں کہ میرے "اوپر" مضمون لکھئے۔ میرا تو یہ حال ہے کہ
" زادہ و مرد و ہیچ نکرد " آپ لکھیں گے کیا؟ سعید کوئی بڑی کارگزاری نہ تھی ——
کتابیں بڑا کارنامہ نہیں —— پھر مضمون آپ کی "کارستانی" رہے گی میں تو ملاقاتوں
اور باتوں کا بھی آدمی نہیں کہ آپ لطفِ صحبت کے واقعات لکھ سکیں۔ خواہ مخواہ
آپ کو خیال پیدا ہوگیا ہے۔ چھوڑئیے اس خیال کو۔"

یہ لڑائی ان سے آج کی نہیں، پرانی ہے۔ ۲۸ دسمبر ۱۹۳۹ء کے خط میں جو کچھ لکھتے ہیں وہ خود پوشی کی آخری حد ہے:

"میرے کچھ حالات ہیں ہی نہیں جو لکھے جائیں۔ بہت خاموش اور پرسکون زندگی ہے"

۲۵ نومبر ۵۲ء کے خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"میرے متعلق مضمون کو میرے بعد لکھئے۔ اب تو ایسا معلوم ہوگا کہ میں نے خود فرمائش
کرکے چھپوا دیا۔ میں نے تو کبھی تصویر بھی نہ چھپوائی۔"

نفیِ ذات کا معاملہ بھی عجیب ہے، اس لئے کہ خود "عملی نفی" دوسروں کو نفی کرنے والے کی طرف متوجہ کر دیتا ہے۔ اس مضمون کے سلسلہ میں بھی میرے پاس بس معذرت کے سوا اور کچھ نہیں۔

رشید احمد صدیقی

آل احمد سرور

تاج محل کی شہرت اتنی ہے کہ اکثر پہلی دفعہ دیکھنے پر انسان کو کچھ مایوسی ہوتی ہے۔ آدمی جو خواب دیکھتا ہے، وہ حقیقت بن جائے تو اس کی طلسمی فضا کچھ مدھم سی معلوم ہوتی ہے۔ یہی حال رشید صاحب کا ہے۔ جن لوگوں نے رشید صاحب کے مضامین مزے لے لے کر پڑھے ہیں اور "ارہر کا کھیت" "گلِ منزل" "شیطان کی آنت" "پاسباں" "مرشد" یا "مولانا سہیل" پر وجد کر چکے ہیں، ان کے ذہن میں رشید صاحب کی شخصیت کا جو نقش بنتا ہے وہ اصل سے بالکل مختلف ہے۔ آپ ایک باغ و بہار آدمی کی تلاش میں ہیں اور آپ کو دوچار ہونا پڑتا ہے ایک خزاں رسیدہ ہستی سے۔ پطرس بخاری اور رشید صاحب کی شخصیت میں وہی فرق ہے جو ان کے فن میں ہے۔ بخاری ایک شوخ اور زندہ دل انسان ہیں۔ رشید صاحب ایک ناکام عاشق کی زندہ تصویر ہیں۔ بخاری کی شخصیت ایک پھلجھڑی کی طرح ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے فضا رنگ و نور سے معمور ہو جاتی ہے اور پھر وہی اندھیرا۔ رشید صاحب کی لو اتنی مدھم ہے کہ اس سے اول اول اندھیرے کا احساس کچھ بڑھ جاتا ہے مگر رفتہ رفتہ ہم اندھیرے سے آنکھیں چار کر سکتے ہیں۔ شوکت تھانوی نے ٹھیک کہا تھا کہ رشید صاحب صورت سے مزاح نگار تو نہیں البتہ مرثیہ گو معلوم ہوتے ہیں مگر ان کی شخصیت کا حسن ان کے فن کی طرح کچھ ریاض چاہتا ہے۔ وہ اپنی چنگاری کو چھپانے میں کامیاب ہیں۔

رشید صاحب ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے۔ وہ جونپور کے ایک قصبے "مریاہو" کے رہنے والے ہیں۔ پورب دیس کے قصبے بڑے مردم خیز ہیں۔ ان میں صدیوں تک قدیم علم و ادب کی شمع روشن رہی ہے۔ سید سلیمان ندوی نے حیاتِ شبلی کے دیباچے میں بڑی تفصیل سے مشرقی اضلاع کے مذہبی و علمی اداروں کا ذکر کیا ہے جو ایک محدود پیمانے پر مگر مسلسل علم کی لگن اور اخلاق و شرافت کے جوہر عام کرتے رہے۔ رشید صاحب کو اپنے گھریلو ماحول سے یہ سب کچھ ملا۔ پھر قصباتی زندگی سے انہیں دیہاتی زبان، وہاں کی فضا، انسانیت کا ایک کھردرا مگر خاصا پائیدار تصور ملا۔ ہائی اسکول کے بعد وہ علی گڑھ آ گئے مگر مالی حالات نے انہیں تعطیل میں کچہری کی کلرکی کرنے پر بھی مجبور کیا۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ وہ کالج کی تعلیم کے زمانے میں کبھی ڈیپوٹی سوسائٹی کے وفد کے ساتھ بڑے بڑے آدمیوں سے ملتے اور کبھی کچہریوں کی مصروف اور سیلی فضا میں بدخط افسروں کے فیصلوں کی نقل کرتے۔ رشید صاحب اپنے بل بوتے پر کھڑے ہوئے ہیں۔ انگریزی میں ایسے آدمی کو SELF MADE کہتے ہیں۔ انہوں نے ہر قسم کے لوگوں کو دیکھا اور برتا ہے۔ زندگی کے کتنے ہی نشیب و فراز، دیوتاؤں کے کتنے ہی مٹی کے پاؤں اور پجاریوں میں دیوتاؤں کی کتنی ہی

اوائیں پائی ہیں۔ وہ اس زمانے میں علی گڈھ پہنچے جب علی گڈھ ایک طرف شائستگی اور علم طلبی کے لئے مشہور تھا اور دوسری طرف بقول سجاد انصاری میپیر وفا کی خانقاہ سے مجاہدوں کا لشکر برآمد ہونے والا تھا؟ ۱۹۱۵ء میں مسٹر ٹول کالج کے پرنسپل تھے۔ اس زمانے میں ترک ہندوستانی مسلمانوں کے ہیرو تھے اور رشید صاحب کے کئی ساتھیوں نے قومی زندگی میں اسی وقت سے حصہ لینا شروع کر دیا تھا، مگر رشید صاحب نہ غازی بنے نہ شہید ہوئے۔ وہ زندگی کے ایک خاموش تماشائی ہی رہے! اور شاید اس ذوقِ تماشا ہی نے اُردو ادب کو ایک صاحب طرز انشا پرداز، ایک نکتہ سنج ادیب، ایک اعلیٰ درجے کا مزاح نگار اور طنز نگار دیا۔ زندگی کی بعض محرومیاں، ادب کی کامرانیاں بھی ہوتی ہیں۔

بی۔ اے کرنے کے بعد رشید صاحب نے علی گڈھ سے فارسی میں ایم۔ اے کیا۔ طالب علمی کے دوران میں وہ یونین کے سیکرٹری بھی رہے اور اس زمانے میں انہوں نے مزاحیہ مضامین بھی لکھنے شروع کئے۔ ان مضامین میں ولایت علی بمبوق کا ہلکا سا پرتو ہے، مگر بہت جلد رشید صاحب نے اپنا ایک علیحدہ رنگ قائم کر لیا۔ علی گڑھ منتھلی جو بعد میں علی گڈھ میگزین کہلایا، اس زمانے میں اُردو کے موقر رسالوں میں شمار ہوتا تھا۔ رشید صاحب عرصے تک اس کے ایڈیٹر رہے۔ انہیں ذاکر صاحب (ڈاکٹر ذاکر حسین وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی)، مولانا سہیل، اقبال احمد، نور اللہ جیسے ممتاز ساتھی ملے۔ اردو ادب میں ایسے نثر نگار کم ہیں جو زمانۂ طالب علمی ہی میں ادبی شہرت حاصل کر چکے ہوں۔ ان میں رشید صاحب کا نام ممتاز ہے۔ عظمت اللہ خان اور سجاد انصاری جو ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے، رشید صاحب کا جوہر پہلے پہچاننے میں مشترک ہیں۔

۱۹۲۱ء میں علی گڈھ میں ایک بہت بڑا ذہنی سیلاب آیا۔ یہ سیلاب بہت سوں کو بہا لے گیا اور اس کی موجوں نے ہماری ادبی اور علمی زندگی میں کتنے ہی طوفان پیدا کئے، مگر رشید صاحب پر بظاہر اس کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ جن لوگوں نے قوم پر اپنی زندگیاں قربان کر دیں، رشید صاحب نے انہیں بڑے احترام اور عزت کی نظر سے دیکھا، مگر خود انہوں نے کوئی قربانی یا ایثار اس قسم کا کبھی نہیں کیا۔ وہ کبھی ہیرو نہ بن سکے۔ نہ انہوں نے بڑے بڑے اصول اپنی زندگی میں بنائے۔ ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے کہ مخالف چاہے بقراط یا جالینوس ہی کیوں نہ ہو، انہوں نے ووٹ ہمیشہ اپنے دوست کو دیا۔ انہوں نے اصول پرستی کے خطروں کو دیکھ لیا تھا۔ انہیں خیالات یا تصوّرات سے زیادہ انسانوں سے دلچسپی رہی۔ ہاں انہوں نے ہر تصوّر کی آب و تاب، اس کی گرمی اور روشنی، اس کی بلندی یا پستی کو دیکھنے کی کوشش کی۔ انہیں ادب ایک "پناہ گاہ" کی شکل میں نظر آیا۔ سعدیؔ اور حافظؔ، غالبؔ اور اقبالؔ، شبلیؔ اور اکبرؔ، گوئٹےؔ اور ملٹنؔ، برنارڈ شا اور وکٹر ہیوگو کی تصانیف سے انہوں نے انسانوں کے متعلق ایک بصیرت بھی حاصل کی اور انہیں ایک پاکیزہ ادبی ذوق بھی ملا۔ ان کے مضامین اس وجہ سے مسرت اور بصیرت کے خزانے ہیں۔

رشید صاحب اس زمانے میں علی گڈھ پہنچے تھے جب وہاں کی اقامتی زندگی بڑی رنگینی اور کشش رکھتی تھی۔ وہ اس کے جادو کا شکار ہو گئے۔ یہ ان کی خوبی بھی ہے اور خامی بھی کہ اس کے بعد کوئی اور حسن ان کی نظر میں نہ جچا۔ رشید صاحب نہ مُصلح ہیں نہ امیرِ قوم، وہ صرف معلّم بھی نہیں ہیں۔ وہ دراصل ایک عاشق ہیں۔ انہوں نے ایک فرد سے نہیں بلکہ ایک ادارے اور ایک انجمن سے عشق کیا ہے اور اسی انجمن کو خلاصۂ کائنات سمجھتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ رشید صاحب علی گڈھ سے باہر نہ گئے ہوں۔ انہوں نے پہاڑوں کی سیر بھی کی ہے اور ہندوستان کے میدانوں کی بھی۔ وہ برما تک ہو آئے ہیں اور ریڈیو ان کا جنوبی ہند کے ایک سفر میں بھی ساتھ رہا۔ مگر دراصل ہر جگہ وہ اپنی علی گڈھ والی عینک پہنے رہے۔ وہ نہ کسی انسان کے پیچھے چلتے ہیں نہ کسی تصوّر کے۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی شخص یا خیال کسی نہ کسی طرح ان کے حرم میں داخل ہو ہی جائے۔ اپنے مزاج کے اعتبار سے وہ ایک مضبوط چٹان کی طرح ہیں جس میں جلال بھی ہے اور جمود بھی۔ ان کے خیالات میں کوئی بڑا انقلاب نہ ملے گا ہاں ایک مدھم سا ارتقا ضرور ہے۔ ان کی شرافت نے انہیں بعض اہلِ غرض کا شکار بھی بنایا۔ انہوں نے دوستی کو ایک فنِ لطیف بنا دیا ہے۔ انہیں دوسرے کی مطلب پرستی سے سروکار نہیں، اپنی دوستی سے غرض ہے۔ وہ اپنی ہر ضرورت کو دوستوں کی معمولی سی مصلحت پر قربان کر سکتے ہیں۔ وہ کسی سے کچھ مانگتے نہیں، اسے بہت کچھ دینے کو تیار رہتے ہیں۔ مشرقیت، شرافت، معقولیت، انسانیت کو انہوں نے جس طرح

زندگی میں برت کر دکھایا ہے، کم نے دکھایا ہوگا۔ گو وہ اس راز سے بے خبر ہیں کہ یہ چیزیں بھی مطلق نہیں اضافی ہوتی ہیں۔ ان کے یہاں مشرقیت بعض اوقات قدامت پرستی کی شکل میں، شرافت کمزوری کے ادب میں، معقولیت مصلحت کے قالب میں اور انسانیت سستی رواداری کے لباس میں بھی نظر آتی ہے۔ اسی لئے ان سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، مگر ان کی عزت اور محبت کئے بغیر چارہ نہیں۔

رشید صاحب ۱۹۲۲ء میں یونیورسٹی میں اردو کے لکچرار ہوئے۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں شروع شروع میں صرف بی۔ اے میں لازمی اردو تھی۔ رشید صاحب کو طالب علمی میں ٹینس کا شوق تھا۔ اس شوق کو وہ دردِ گردہ کی وجہ سے جاری نہ رکھ سکے۔ ان کا کھیل سلیم کی سلامت روی اور مستقل مزاجی کا مظہر تھا۔ لازمی بی۔ اے کا کورس کچھ زیادہ نہ تھا۔ اس لئے ایک عرصے تک رشید صاحب آبِ حیات اور دیوانِ غالب اور جدید شعرا کے کچھ انتخابات پڑھاتے رہے۔ ڈاکٹر ضیاءالدین کو یہ گوارا نہ تھا کہ اردو میں کوئی فیل ہو۔ اردو تو ان کے لئے ایک (NECESSARY EVIL) سے زیادہ نہ تھی۔ ۱۹۳۲ء سے ایف۔ اے اور بی۔ اے میں اختیاری مضمون کی حیثیت سے اردو شروع ہوئی۔ ۱۹۳۵ء میں وہ اردو کے ریڈر ہوئے۔ ان کا انتخاب علامہ اقبال نے کیا تھا۔ حال میں وہ پروفیسر بنا دیئے گئے ہیں۔ علی گڑھ میں اردو کی تدریس کی اہمیت صحیح معنی میں ذاکر صاحب کے دور سے شروع ہوئی ہے۔

رشید صاحب کی جوانی دردِ گردہ کے پیہم حملوں میں گزری۔ ان کی شادی ۱۹۲۳ء میں ہوگئی تھی۔ ۱۹۳۰ء تک گردہ کی تکلیف نے انہیں بہت پریشان کیا۔ ڈاکٹر بھاٹیا نے بالآخر ایک کامیاب اپریشن کر کے ایک گردے کو بالکل "آں جہانی" کر دیا۔ ان کا مضمون "شیطان کی آنت" اسی ظلمات کا آبِ حیات ہے۔ رشید صاحب نے عشق کیا یا نہیں، یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ ان کے اعصاب پر عورت سوار نہیں ہے، مگر وہ اس معاملے میں میرؔ کے اس مسلک پر عامل رہے ہیں :-

ع ٹک دیکھ لیا، دل شاد کیا، خوش وقت ہوئے اور چل نکلے

رشید صاحب پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ اردو اور فارسی کے کلاسیکل سرمائے پر ان کی نظر گہری ہے۔ انہوں نے انگریزی ادب کے شاہکاروں کا نہ صرف مطالعہ کیا ہے، بلکہ ان سے اثر بھی قبول کیا ہے۔ وہ نہایت ذہین آدمی ہیں اور بڑی جلدی بات کی تہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ مگر وہ کتابوں کے کیڑے نہیں ہیں۔ ان کے پاس ہر سال بہت سی کتابیں آتی ہیں، مگر رہتی نہیں، دوست احباب لے جاتے ہیں۔ باقاعدہ مطالعے کے وہ عادی نہیں۔ انہوں نے گھریلو زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملات کو اتنی اہمیت دے رکھی ہے کہ انہیں مہدی افادی کی "نازنینانِ حرم" سے دل بہلانے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ مگر وہ کسی بھی اہم مضمون یا کتاب کا تذکرہ سنتے ہیں تو اسے غور سے پڑھتے ہیں اور پھر ان کی رائے تقلیدی نہیں، بلکہ اوریجنل ہوتی ہے۔ ان کا ادبی ذوق پاکیزہ ہوتے ہوئے قدرے پرانا ہے اور نئے خیالات سے انہیں خدا واسطے کا بیر تو نہیں مگر وہ اس نئے پن کو پوری طرح ہضم نہیں کر پاتے۔ یوں وہ ادب میں تجربات کے قائل ہیں، مگر ان کا سفید پوش ذوق، ذرا سی بھی گرد کو برداشت نہیں کر پاتا۔ وہ اسالیبِ فن میں رچاؤ اور زبان میں پختگی اور ہمواری ڈھونڈتے ہیں۔ وہ ادب کے ایک اخلاقی تصور کو مانتے ہیں۔ اس کی مقصدیت پر بھی انہیں اعتراض نہیں ہے مگر وہ بے محابا تجلی کے بجائے حجاب اور جلوے کے بجائے نقاب کے زیادہ قائل ہیں۔ غزل کو وہ "اردو شاعری کی آبرو" سمجھتے ہیں مگر اس میں ہماری بے آبروئی کا جو سامان ہے اس سے بھی چشم پوشی نہیں کرتے۔ وہ اچھی نظم پر وجد بھی کرتے ہیں مگر جو "اہتزاز و اہتزاز" (یہ انہی کے الفاظ ہیں) انہیں غزل کے اشعار سے ملتا ہے، وہ نظم سے نہیں۔ غالبؔ کے اشعار سے انہوں نے بڑا کام لیا ہے۔ یہ غالب کی عظمت کی دلیل ہو یا نہ ہو، رشید صاحب کے عرفان کا ثبوت ضرور ہے۔ جدید دور میں اچھے شعر کا برمحل استعمال یا اس کے چراغ سے چراغ جلانا کم ہوگیا ہے۔ اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کی نظر ہمارے کلاسیکل سرمایے پر اتنی گہری نہیں ہے۔ رشید صاحب ان لوگوں میں سے تو نہیں ہیں جو شعر پڑھیں اور ریحان بحق تسلیم ہو جائیں۔ انہوں نے بار بار اس کا ذکر کیا ہے کہ وہ بعض اوقات پڑھنے میں شعر کو نثر بنا دیتے ہیں اور اچھا خاصا موزوں شعر نا موزوں معلوم ہوتا ہے، مگر وہ شعر کے جادو سے واقف ہیں اور اس کا جادو جگانے میں بھی کامیاب ہیں۔ وہ غالبؔ، اقبالؔ، حسرتؔ، اصغرؔ اور جگرؔ کے بڑے قائل ہیں۔

رشید صاحب کے مضامین میں ترتیب و تنظیم کی کمی کا متعدد اشخاص نے ذکر کیا ہے۔ یہ بات ان کی زندگی میں بھی ہے۔ وہ اپنی صبح کا مصرف جانتے ہیں کیونکہ

اس وقت وہ اپنے گھر کے باغ کی دیکھ بھال میں مصروف ہوتے ہیں۔ انہیں گلابوں سے عشق ہے، مگر ان کی شامیں اکثر دوستوں کے مجمعوں یا برج کی میز کی نذر ہو جاتی ہیں۔ انہوں نے اپنی ادبی صلاحیت کو دوستوں کی فرمائشوں پر بھی برباد کیا ہے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کے پروپیگنڈے، الیکشن کے لئے مینی فیسٹو، یونیورسٹی کے معزز مہمانوں کے لئے سپاس نامے، سبھی کچھ لکھتے رہے، مگر انہوں نے روزمرہ زندگی کو اتنا دلچسپ، اتنا نشہ آور، اتنا پُر سحر اور پُر کیف پایا ہے کہ ادب کا جادو بھی انہیں پوری طرح اپنا اسیر نہ کر سکا۔ وہ کسی کتاب کو پڑھتے ہیں تو اس کے خیالات سے مستفید ہونے کے لئے اتنا نہیں جتنا اپنے خیالات کو تب و تاب دینے کے لئے۔ دوسروں کی چنگاری صرف ان کی چنگاری کو ہوا دیتی ہے۔ مگر مضامین میں ترتیب و تنظیم کی بظاہر جو کمی ہے اس کا ایک جواز بھی ہے۔ اس کی ایک اور تنظیم ہے جو عام ترتیب سے زیادہ آزاد اور بے پروا، مگر اپنی جگہ پر پُر اثر اور کار آمد ہے۔ یعنی رشید صاحب کی زندگی ایک کتاب سے دوسری کتاب تک نہیں ہے، بلکہ یہ کتابیں ان کی شخصیت کے سمندر کا ایک پیمانہ ہیں۔ رشید صاحب کی کوئی کتاب باقاعدہ تحقیق یا تلاش کا نتیجہ نہیں ہے۔ لیکن ان کی ہر کتاب میں بڑے پتے کی باتیں ملتی ہیں۔ "طنزیات و مضحکات" ایک طرح آبِ حیات کی یاد دلاتی ہے۔ آبِ حیات کی ہر بات غلط ثابت ہو سکتی ہے مگر آبِ حیات سے کوئی ادب کا طالب علم بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح طنز و ظرافت کے موضوع پر اس سرسری نظر میں بھی ایسے گہرے اور بصیرت افروز تاثرات ملتے ہیں کہ ان کی اہمیت کبھی کم نہیں ہو سکتی۔ یہی حال "زبان اُردو پر ایک نظر" کا ہے جو دراصل ان کے ایک لیکچر کا عنوان ہے۔ اس میں اُردو زبان کی تاریخ نہیں ہے لیکن اس کے مزاج کا ایک حیرت انگیز احساس ہے۔ وہ بعض چونکانے والے فقرے لکھتے ہیں جن میں حقیقت کچھ سمٹ کر محدود ہو جاتی ہے، مثلاً "حالی ماضی کے، اکبر حال کے اور اقبال مستقبل کے شاعر ہیں" یا مثلاً ان کا یہ جملہ کہ "کوئی شاعر بڑا نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ معقول آدمی نہ ہو" مگر ان میں حقیقت کی جو کرن ہے وہ بھی کم نظر فریب نہیں ہے۔

رشید صاحب نے یوں تو تنقیدی مضامین میں بھی بڑی خیال انگیز باتیں کہی ہیں، مگر دراصل وہ ایک مزاح نگار، طنز نگار اور انشا پرداز کی حیثیت سے اہمیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے غالب، اقبال، اکبر، عبدالرحمٰن بجنوری، فانی بدایونی، جگر مراد آبادی پر جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ان میں وزن سے زیادہ وقار ہے۔ مگر یہ وقار یونہی نہیں آیا ہے اس میں زندگی اور ادب کا قدرے پُرانا سہی مگر پھر بھی ایک سنجیدہ اور پاکیزہ شعور ملتا ہے۔ وہ بہت سے اچھے پہلوؤں پر نظر نہیں کر پاتے، مگر جن پہلوؤں پر ان کی نظر ہے، وہ پہلو سطحی اور سستے نہیں، قابلِ قدر بلکہ قابلِ غور ہیں۔ وہ بہت سے قیمتی تجربات کو نہیں پرکھ پاتے، مگر انہوں نے کسی گھٹیا یا مصنوعی یا نمائشی پہلو کی کبھی داد نہیں دی۔ ان کی تنقید میں ڈاکٹر جانسن کی یاد دلاتی ہیں۔ یا تو یہ تاثرات ہیں یا فیصلے، مگر ان کے پیچھے ایک رچا ہوا اور پختہ شعور ضرور ملتا ہے۔

مگر رشید صاحب کا بڑا کارنامہ مضامینِ رشید، خنداں، گنج ہائے گراں مایہ اور ذاکر صاحب ہیں۔ پہلی دو کتابیں ان کے مزاحیہ مضامین پر مشتمل ہیں۔ موخر الذکر دونوں کتابوں میں شخصیتوں کے مرقعے ہیں۔ گنج ہائے گراں مایہ ان اشخاص کا تذکرہ ہے جو اپنی موت کے باوجود زندہ اور روشن ہیں اور ذاکر صاحب ڈاکٹر ذاکر حسین کی پُر سوز اور دل ربا شخصیت کا خاکہ ہے۔ رشید صاحب کے طنز و مزاح پر اظہارِ خیال کا یہ موقع نہیں اور نہ چند سطروں میں اس کے ساتھ انصاف ہو سکتا ہے، مگر اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ صرف "خوانِ مسرت" نہیں، سامانِ بصیرت بھی ہے۔ یہ ہنسی کا فوارہ نہیں ہے تبسم کا خزانہ ہے۔ رشید صاحب ہنسی ہنسی میں نہ صرف بہت کچھ کہہ جاتے ہیں بلکہ سوچنے کے لئے بھی بہت کچھ چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ رعایتِ لفظی سے بڑا کام لیتے ہیں۔ ان کے فقروں میں صوتی حسن بھی ہے اور موسیقی بھی۔ وہ ایک پڑھے لکھے انسان کی زندگی کے نشیب و فراز پر لطیف تبصرے ہیں۔ ان میں کتنے ہی افسانوں کی کمزوریوں کا حسن اور کتنے ہی معمولی آدمیوں کی بڑی اور قابلِ قدر باتیں محفوظ ہو گئی ہیں۔ وہ قصے بھی سناتے ہیں۔ قولِ محال سے بھی کام لیتے ہیں۔ جاندار اور خیال انگیز تشبیہات سے چمن بندی آراستہ کرتے ہیں اور اپنے تخیل کی مدد سے زندگی کے گزرتے ہوئے لمحات کو ایک ابدی روشنی اور ایک سدا بہار رنگینی بخش دیتے ہیں، مگر زندگی کی وہ قدریں جن پر ان کا ایمان ہے گنج ہائے گراں مایہ میں اشاروں کے بجائے داستان بن کر آئی ہیں۔ ان کی انشا پردازی کا حسن جو ظرافت کی چاشنی کی وجہ سے مزاحیہ مضامین میں بعض اوقات نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے، گنج ہائے گراں مایہ

میں اپنے بزرگوں اور دوستوں کی یاد کے سہارے نکھر کر ایک اور آب و تاب سے آیا ہے۔ محمد علی، اقبال اور اصغر پر ان کے جو مضامین ہیں ان کی خوبی میں کلام نہیں، مگر اس مجموعے کی جان مولانا سلیمان اشرف اور ایوب مرحوم ہیں۔ یہاں سرِ دلبراں حدیثِ دیگراں سے پھوٹ نکلتا ہے۔ مولانا سلیمان اشرف کی شخصیت میں علم کی رئیسانہ شان ہے، مگر ایوب میں خدمت کا حسن ہے۔ رشید صاحب کی خوبی یہ ہے کہ وہ جلال و جمال دونوں کو دیکھ سکتے ہیں اور دکھا سکتے ہیں۔

ذاکر صاحب پر رشید صاحب کی چھوٹی سی کتاب ممدوح کی شخصیت کی جامع تصویر نہیں ہے مگر پھر بھی بڑی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ اس میں اقبال کے "مردِ مومن" کا سا جادو ہے اور ان کے ایک شعر ؎

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

کی تفسیر ملتی ہے، پھر بھی یہ ایک عاشق کا کارنامہ ہے ایک عارف کا نہیں۔

رشید صاحب کی باتیں بڑی پُرلطف ہوتی ہیں مگر ہر ایک کے لئے نہیں ہوتیں۔ میں نے بہت سے لوگوں کو دیکھا ہے جنہیں اپنی طلاقتِ لسانی پر بڑا ناز ہے۔ ایسے لوگوں کے یہاں ایک " POSE " ضرور ہوتا ہے جو رشید صاحب کے یہاں نہیں ہے۔ وہ شرمیلے آدمی ہیں۔ مجمعوں سے گھبراتے ہیں، مدّاحوں سے دور بھاگتے ہیں۔ دربارداری سے انہیں نفرت ہے مگر بے تکلف دوستوں کے مجمع میں وہ ایک بلبلِ ہزار داستاں ہیں۔ اس "پیمانہ و صہبا" کے بغیر وہ گل افشانیٔ گفتار پہ آمادہ نہیں ہوتے، مگر ان کی باتوں سے زیادہ ان کے خط دلچسپ ہوتے ہیں۔ اکبر سے وہ بہت متاثر ہیں اور اکبر کی طرح انہیں بھی بہت سی مصلحتوں کا خیال رہتا ہے مگر وہ اپنے دوستوں کو جو خط لکھتے ہیں ان میں بے تکلف مختلف اشخاص یا واقعات پر بڑے پُرلطف تبصرے کرتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت کا سب سے بھرپور اظہار نہ ان کے مزاحیہ مضامین میں ہے، نہ قلمی رقعوں میں، نہ تنقیدوں میں، نہ دوسرے مضامین میں، بلکہ ان کے خطوں میں ہے۔ اصغر مرحوم نے ان کے وہ سب خط محفوظ کر رکھے تھے جو ان کو لکھے گئے تھے۔ مگر رشید صاحب نے ان کے مرنے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ یہ خط ان کی بیوی سے لے کر جلا دئیے۔ وہ ادب کے تقاضوں سے زیادہ زندگی کی مجبوریوں کا لحاظ رکھتے ہیں۔ میرے پاس ان کے کئی سو خط ہوں گے اور میں ان کو شائع کرنے کا ارادہ بھی رکھتا ہوں مگر ابھی تک سب سے بڑا مرحلہ خود رشید صاحب کی منظوری کا ہے۔ انہوں نے خود کسی جگہ لکھا ہے "خطوں سے میں نے بڑے بڑے کام نکالے ہیں"۔ رُوٹھے ہوئے دوستوں کو راضی کرنے میں، ڈیوٹی سوسائٹی کے لئے چندے حاصل کرنے میں، کسی عالم کی وفات کے بعد اس کے ورثا کے لئے مالی دشواریوں کو دور کرنے میں، اپنا غم غلط کرنے کے لئے، دوستوں کے رنج و راحت میں شریک ہونے کے لئے اور مذہب، سیاست، جنس، عورت اور عطریات، ڈاکٹر ضیاء الدین اور مولانا عبدالماجد، کانگرس اور مسلم لیگ، ہندوستان اور پاکستان، گھریلو زندگی کے مہر و قہر اور احباب کے جلسوں کے لطف و انبساط، ان سب بولتے ہوئے طرح کے مصرعوں پر رشید صاحب نے ایسے ایسے شعر کہے ہیں کہ جب وہ شائع ہوں گے تو غالب کے بعد ہمارے خطوط کے سرمایے میں سب سے بڑا اضافہ ہوں گے۔

رشید صاحب کو قابلِ دید مقامات سے کوئی دلچسپی نہیں۔ سفر میں وہ ضروری کام کر کے پہلی گاڑی سے گھر واپس آ جاتے ہیں۔ وہ نئے واقعات کے ہیجان کے مقابلے میں مانوس راحتوں کو پسند کرتے ہیں۔ ان کے دو محبوب مشغلے ہیں۔ ایک برج کھیلنا، دوسرے خریداری کرنا۔ ان دونوں چیزوں میں وہ فن برائے فن کے قائل ہیں۔ یعنی خریداری میں چھوٹی موٹی چیزیں خریدنا اور برج میں مسلسل ہارنا ان کے لئے یکساں نشاط کا باعث ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ نہ اچھا برج کھیلتے ہیں اور نہ خریداری میں ہوشیاری کا ثبوت دیتے ہیں۔ یہ چیزیں ان کے لئے نفع بخش نہیں، موجبِ نشاط ہیں۔ وہ دعوتیں کرنے کے بڑے شائق ہیں۔ ان کی بیوی بڑا اچھا کھانا پکاتی ہیں اور وہ بڑے لطف سے دوستوں کو کھلاتے ہیں۔ اپنے لباس کے معاملے میں بہت بے پروا ہیں مگر جامہ زیب اور خوش پوش اشخاص کو دیکھ کر بڑے خوش ہوتے ہیں۔ کسی اچھے آدمی سے ملتے ہیں یا کوئی خوشی کی بات سنتے ہیں تو دوستوں کو

ضرور اس خوشی میں شریک کر لیتے ہیں مگر اپنی تکلیف اور دُکھ کا بار خود ہی مردانہ وار اٹھا لیتے ہیں، دوسروں کو یہاں تک کہ بیوی بچوں کو بھی اس میں شریک کرنا پسند نہیں کرتے۔ وہ سب کا بوجھ اٹھا لیتے ہیں مگر کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہتے۔

ایک دفعہ وہ اور میں نواب چھتاری کے مہمان تھے۔ نواب صاحب اس زمانے میں حیدر آباد کے صدرِ اعظم تھے۔ حیدر آباد میں ایک اُردو کانفرنس تھی۔ ہم لوگ شاہ منزل میں ٹھہرائے گئے۔ ہر طرف آداب، تسلیمات، سیکرٹری، کلرک، چپراسی ہر اشارے پر موجود۔ نواب صاحب بہت مہربان، دوسرا یا تیسرا دن تھا۔ ایک دن صبح کو ناشتے کے بعد میں کچھ خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ رشید صاحب بھی چپ تھے۔ کچھ دیر کے بعد پوچھنے لگے "بھئی یہ آج آپ مہاتما بدھ کی طرح سوچ میں کیوں بیٹھے ہیں؟" میں نے کہا، "سوچ رہا ہوں، بُرے پھنسے ہیں۔ ہم لوگ ٹھہرے چھ چھ پیسے والے آدمی۔ مگر اب تو شوکیس میں سجا دئے گئے ہیں۔ چھ پیسے والے مال کو وہائٹ وے میں رکھ دیا جائے تو کیا ہو؟" رشید صاحب کے چہرے پر جیسے نور دوڑ گیا، کہنے لگے "میں بھی یہی محسوس کر رہا تھا مگر حبس دم کئے ہوئے تھا۔ دیکھ رہا تھا پہلے کون ہار مانتا ہے۔" اور اس کے بعد ہم لوگ جلد سے جلد وہاں سے بھاگے اور مجھ سے زیادہ رشید صاحب خوش تھے۔ حیدر آباد کے اسٹیشن پر شوفر کو ٹپ کر کے ہم لوگوں نے ٹی اسٹال پر دو آنے پیالی والی چائے پی۔ مونگ پھلی والے سے مونگ پھلی خریدی۔ میں نے اخبار لیا۔ رشید صاحب نے اپنا بیگ کھول کر پاندان نکالا۔ پان بنایا اور پیک کو منہ میں تول کر بولے۔ "سرور صاحب اب جان میں جان آئی ہے۔ یہ سرکاری درباری لوگ نہ جانے کیسے اس قدر باقاعدہ اور مہذّب زندگی بسر کر لیتے ہیں۔" میں نے کہا "رشید صاحب برنارڈ شا نے کہا ہے" بات کاٹ کر بولے "دیکھئے حضرت یہ شیکسپیئر یا شا کی بات اب علی گڑھ تک نہ ہو گی۔" میں نے کہا "اچھا اقبال کے اشعار پڑھنے کی تو اجازت ہے؟" کہنے لگے "ہاں اس میں مضائقہ نہیں۔"

ایک دفعہ ہم دونوں نے جنوبی ہند پر پہلا اور غالباً آخری حملہ کیا۔ یعنی میسور گئے۔ دہلی سے ساتھ سفر طے ہوا تھا۔ سخت گرمی کا زمانہ تھا۔ میں نے لکھا کہ "یونیورسٹی والے ہوائی جہاز کا کرایہ دینے پر رضامند ہیں۔ کیوں نہ ہم لوگ ہوائی جہاز سے چلیں۔ اس لُو میں مرنے سے بچ جائیں گے۔" رشید صاحب کا جواب آیا کہ "ہوائی جہاز سے سفر نہیں ہوگا۔ سیکنڈ کلاس میں چلیں گے۔ ہو سکا تو میسور سے ساڑی اور وہاں کی مصنوعات خریدیں گے اور کچھ بچا لائیں گے۔ آج کل فضول خرچی قومی جرم ہے۔" غرض میں لُو میں مرنے کے لئے راضی ہو گیا کہ رشید صاحب ٹھکانے سے دفن کرا دیں گے اور پھر عمر بھر کے لئے بال بچوں کے خرچ کے کفیل بھی ہو جائیں گے۔ دہلی صبح پہنچا۔ دوپہر کو چلچلاتی دھوپ میں رشید صاحب آئے۔ شام کو ۷ بجے جب ٹمپریچر کم از کم ۱۱۵ رہا ہوگا، ہم لوگ گرینڈ ٹرنک ایکسپریس میں بیٹھنے کے لئے روانہ ہوئے۔ سیکنڈ کلاس کے ٹکٹ نہ مل سکے تھے، اس لئے فرسٹ کلاس کا سفر تھا۔ رشید صاحب کے ساتھ ناشتے کا بہت سا سامان اور پانوں سے بھرا ہوا پاندان تھا۔ میرے ساتھ صرف ایک صراحی تھی۔ راستہ باوجود گرمی کے بڑے لطف سے کٹا۔ میں نے مدراس سے گھر خیریت کا تار دیا۔ رشید صاحب نے بھی میری تقلید میں تار دیا۔ بنگلور پہنچے تو بڑا حسین موسم تھا۔ ہلکی ہلکی بارش، لطیف خنکی اور بڑا دُھلا منجھا شہر۔ یونیورسٹی پہنچے، اُردو کے پروفیسر کے تقرّر کا مسئلہ تھا۔ رشید صاحب نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ "حضرت امیدواروں سے سوالات وغیرہ آپ ہی کیجئے گا۔ آپ کے فیصلے کی میں تائید کر دوں گا۔" بنگلور سے فارغ ہو کر ہم لوگ ایک شاگرد کے ہمراہ میسور گئے۔ مجھے ٹیپو کے مزار اور دریائے کاویری کے دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ وندرابن کے باغ کی سیر کا بھی ارمان تھا۔ شاگرد نے ازراہِ عقیدت میسور کے سب سے اچھے ہوٹل میں ٹھہرا دیا۔ وہاں کے ٹھاٹھ دیکھ کر ہم لوگ چوبیس گھنٹے میں گھبرا گئے۔ آخر اپنے شاگرد کے ایک دوست کے یہاں ٹھہرے۔ یہ بڑے اچھے ذوق کے آدمی ہیں اور میسور کے سربرآوردہ مسلمانوں میں سے ہیں۔ انگریزی اور اردو ادب دونوں سے گہرا شغف ہے۔ رشید صاحب کے اسلوبِ بیان کے دلدادہ اور ان کے غائبانہ عاشق۔ ان کے اصرار پر ہم لوگ اوٹی چلے مگر رشید صاحب بڑی مشکل سے راضی ہوئے تھے۔ حسبِ عادت جلد سے جلد گھر جانا چاہتے تھے۔ طے ہوا تھا کہ اس پروگرام میں صرف دو دن خرچ ہوں گے، مگر چار دن لگ گئے۔ اوٹی پہنچے تو رشید صاحب عورتوں کی طرح خفا ہو گئے۔ اب نہ بات کرتے ہیں نہ کمرے سے نکلتے ہیں۔ خفگی یہ تھی کہ میں نے

کیوں سپر ڈال دی اور کیوں پروگرام گڑبڑ کیا۔ میں نے کہا "رشید صاحب اتنی دور آکر بھی جنوبی ہند کی اس پری کے نظارے سے محروم رہ جانا بدمذاقی ہے اور ایسے اچھے میزبانوں اور ساتھیوں کی موجودگی میں منہ پھلا کر بیٹھ جانا آپ کو ہرگز زیب نہیں دیتا۔" خیر اس شرط پر راضی ہوئے کہ دوسرے دن ہی واپس ہو سکے۔ میسور پہنچ تو خریداری شروع کی۔ واپسی میں مدراس پر حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ تقریباً پانچ سو روپے کرائے کے ملے تھے، رشید صاحب سوا پانچ سو خرچ کر چکے تھے اور میرے پاس پچاس سالٹھ بچ رہے تھے۔

رشید صاحب لڑنے والے آدمی نہیں، کوئی زیادتی کرے تو کڑھتے ہیں، جھگڑتے نہیں۔ اصولی بات ہو رہی ہو تو وہ مصلحت اور عافیت کا سہارا لیتے ہیں۔ علی گڑھ میں ایک چھوٹا سا معرکہ مجھے یاد ہے۔ میری سفارش پر سجّاد انصاری کی کتاب "محشرِ خیال" ایم۔ اے کے نصاب میں داخل کی گئی تھی۔ سجاد انصاری کی انشاپردازی کے رشید صاحب بھی بہت قائل تھے۔ نصاب پر اتفاق سے مولانا عبدالماجد دریا بادی کی نظر پڑ گئی، جنہیں ہر "رعنائی خیال" کو "گناہ" ٹھہرانے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں ہوتا۔ انہوں نے رشید صاحب کو خط لکھا کہ "یہ کتاب جس میں خدا اور مذہب سے شوخیاں ہیں ہرگز مسلم یونیورسٹی کے نصاب میں نہ رکھنی چاہیے۔" رشید صاحب نے مولانا کا خط مجھے دکھا دیا اور خاموش ہو رہے۔ مولانا نے پھر "صدق" میں مضامین لکھنے شروع کئے۔ ہم لوگ پی گئے۔ آخر انہوں نے اپنا آخری حربہ استعمال کیا۔ مولانا صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن شیروانی دینیات کی فیکلٹی کے ڈین تھے۔ یوں بھی یونیورسٹی میں ان کا بڑا اثر اور رسوخ تھا۔ انہوں نے مولانا عبدالماجد کی تحریک پر وائس چانسلر ابوبکر احمد حلیم صاحب کو ضابطے کا خط لکھا اور اس کتاب کے خارج کئے جانے پر زور دیا۔ حلیم صاحب نے شعبۂ اردو کا جلسہ بلایا اور یہ مشورہ دیا کہ کتاب نصاب سے خارج کر دی جائے۔ میں نے احتجاج کیا کہ شعبہ صرف ادبی اہمیت کو دیکھتا ہے۔ اگر مذہبی اور اخلاقی اعتبار سے نصاب کی کوئی کتاب خارج کرنی ہے تو اگزیکٹو کونسل کو کرنا چاہیئے۔ نصاب میں اہم اور نمائندہ اسالیب اور پہلو لئے جاتے ہیں۔ ان کے پڑھانے اور ماننے میں فرق ہے۔ فلسفے اور سیاست کے نصاب میں بھی ہم ہر مفکر اور مصنف کے نظریات پڑھاتے ہیں۔ یہ آزادیٔ فکر یونیورسٹی کی خصوصیت ہے۔ اس لئے شعبہ اس کتاب کو خارج نہیں کر سکتا۔ خلافِ توقع رشید صاحب نے فوراً سپر ڈال دی۔ کہنے لگے "سرور صاحب! جب کتاب رکھ نہیں سکتے تو پھر جانے دیجئے۔" میں نے کہا "حضرت! یہ لوگ ہم سے کیوں نکلوانا چاہتے ہیں۔ خود یہ جرأت کیوں نہیں کرتے کہ اپنے مصالح کی بنا پر اگزیکٹو کونسل میں قرارداد پاس کریں۔" مگر رشید صاحب نہ مانے، مجھے ہی ماننا پڑا۔

رشید صاحب یوں تو اصولوں کے چکر میں نہیں پڑتے۔ مگر جہاں شعبے کی عزت کا سوال آتا ہے، وہاں وہ ضرور سینہ سپر ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر ضیاءالدین نے نظامِ حیدر آباد کو علی گڑھ بلایا۔ ایڈریس لکھنے کی خدمت رشید صاحب کے سپرد ہوئی۔ رشید صاحب نے بڑے چاؤ سے ایڈریس لکھا اور مجھے بھی سنایا۔ میں نے کہا "دیکھ لیجئے گا، پسند نہ آئے گا۔" بولے "کیوں؟" میں نے کہا "اس میں خوشامد کم ہے، ادبی رنگ زیادہ، ڈاکٹر صاحب کی سمجھ میں نہ آئے گا۔" یہی ہوا ——— ایڈریس سُن کر کہنے لگے "کچھ جچا نہیں، پھر کوشش کیجیے۔" رشید صاحب نے نظرِ ثانی کی اور پھر پیش کیا۔ رشید صاحب نے لکھا تھا "مغلوں کے عہد نے ہندوستان کو تین تحفے دئے ——— تاج محل، غالبؔ اور دولتِ آصفیہ۔" اس پر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ "نظامِ حیدر آباد کے سلسلے میں تاج محل کے ذکر کا کیا موقع ہے؟" غرض کئی دفعہ ایڈریس میں کانٹ چھانٹ ہوئی اور ڈاکٹر ضیاءالدین اور ان کے حواریوں کی جبیں پر شکن ہی رہی۔ آخر رشید صاحب نے کہا کہ "مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ آپ کسی اور سے لکھوا لیجئے۔" اس پر ڈاکٹر صاحب بہت چراغ پا ہوئے اور رشید صاحب کی غیبت میں کہنے لگے کہ "اگر ایسے شعبے کے لوگ ایک ایڈریس نہیں لکھ سکتے تو شعبے کی ضرورت ہی کیا ہے؟" جب رشید صاحب نے یہ سُنا تو کمال کر دیا۔ ایک صاحب کو لے کر ڈاکٹر صاحب سے دریافت کرنے گئے کہ "میں نے یہ الفاظ سُنے ہیں، کیا آپ نے کہے تھے؟" ڈاکٹر صاحب نہ معلوم کس عالم میں تھے۔ انہوں نے پھر خفگی ظاہر کی اور اقرار کیا۔ اس پر رشید صاحب کہنے لگے کہ "آپ مجھے جو چاہیں کہہ لیں لیکن شعبے کے متعلق اس قسم کے الفاظ میں نہیں سُن سکتا۔" اس کے بعد سے آخر تک

رشید صاحب نے ڈاکٹر ضیاء الدین کو معاف نہ کیا۔ عرصے تک تو بات ہی نہ ہوتی تھی، پھر رسمی مراسم ہو گئے مگر دل صاف نہ ہونا تھا نہ ہوا۔

ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے بھی ایک دفعہ نہ معلوم کس ترنگ میں علی گڑھ کے شعبۂ اردو پر سخت اعتراضات کئے۔ رشید صاحب مولوی صاحب کا بڑا احترام کرتے تھے۔ مگر شعبے پر بے موقع اعتراضات سے انہیں بڑا رنج ہوا۔ انہوں نے مولوی صاحب سے بات چیت ترک کر دی۔ مولوی صاحب کو لوگوں نے بھڑکایا تھا۔ وہ خواہ مخواہ رشید صاحب سے بدظن ہو گئے تھے۔ میں نے مولوی صاحب کو بہت سمجھایا مگر وہ نہ مانے۔ وہ خفا ہو جائیں تو پھر بخشتے نہیں۔ رشید صاحب کچھ عرصے تک رنجیدہ رہے مگر تقسیم کے بعد پھر انہوں نے مولوی صاحب کو لکھا کہ آپ چاہیں تو انجمن کا دفتر علی گڑھ لے آئیں۔ مولوی صاحب علی گڑھ آئے، جلسہ ہوا۔ نواب اسمٰعیل خان صاحب خود اس کے حق میں نہ تھے۔ غرض فیصلہ علی گڑھ کے لئے نہ ہوا، مگر رشید صاحب نے اپنا فرض ادا کر دیا تھا۔ بزرگوں کی عزت اور ان کی خدمت کرنا کوئی رشید صاحب سے سیکھے۔

رشید صاحب کو جلسوں، کانفرنسوں، ادبی مجالس، مشاعروں سے بھی بالکل دلچسپی نہیں۔ اگر گرفتار ہو جائیں تو اس طرح پھڑپھڑاتے اور مضطرب ہوتے ہیں جیسے کوئی طائر دام میں پھنس گیا ہو۔ جلسے کے وقت پہنچتے ہیں اور پہلی گاڑی سے بھاگ نکلتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوا ہے کہ جس جلسے کا انہوں نے افتتاح کیا، اس کے صدر کی تقریر بھی سننے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ انہیں خود اپنے فرائضِ منصبی کے سلسلے میں کوئی مشاعرہ یا ادبی صحبت منعقد کرنی پڑے تو اور بات ہے۔ ویسے وہ ان چیزوں سے دور ہی رہتے ہیں۔ میں نے کبھی رشید صاحب کو بلند آواز سے داد دیتے یا شعر پر وجد کرتے نہیں دیکھا۔ ہاں اچھے شعر سے ان کے چہرے پر ایک انبساط ضرور کھیلنے لگتا ہے۔ شعر انہیں یاد نہیں رہتے۔ اچھا شعر ہوا تو یہی بہت ہے کہ انہیں شعر کا کوئی لفظ یا اس کی کوئی ترکیب یاد رہ گئی، ورنہ ایسے ویسے شعر سے تو وہ بالا بالا ہی گزر جاتے ہیں۔ انہیں مطالعے کا شوق ضرور ہے اور کسی کتاب یا مصنف کی تعریف کی جائے تو اس سے آشنا ہونا چاہتے ہیں، مگر مصنف کے خیالات سے مستفید ہونے کے بجائے اس کی چنگاری سے اپنا چراغ جلاتے ہیں۔ وہ تصورات سے زیادہ تصویروں کو، اصولوں سے زیادہ آدمیوں کو اور علم سے زیادہ عمل کو دیکھتے ہیں۔ وہ جس سے جھلا جائیں یا چڑ جائیں اس کا کام ضرور کر دیتے ہیں گو اسے کبھی معاف نہیں کرتے۔ وہ ضرورت مند کی بڑی مدد کرتے ہیں اور بارہا ایسا ہوا ہے کہ اچھے خاصے کھاتے پیتے آدمیوں نے ان کو اپنی فرضی ضروریات ظاہر کر کے بیوقوف بنایا ہے، مگر وہ مدد کر کے کسی شکریے یا احسانمندی کے منتظر نہیں رہتے۔ وہ نیکی کر کے دریا میں ڈال دینے کے قائل ہیں۔

رشید صاحب سے زیادہ طلبا کے ہمدرد کم نکلیں گے۔ وہ اچھے طلبا کی بڑی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ وہ ذوق و شوق دیکھتے ہیں۔ نظریے یا نصب العین سے سروکار نہیں رکھتے، مگر وہ طلبا کی مقبولیت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ایک دفعہ ہم لوگ علی گڑھ کی نمائش میں گھوم رہے تھے۔ خبر ملی کہ طلبا اور پولیس میں جھگڑا ہو گیا۔ دیکھتے دیکھتے طلبا کا ایک ہجوم جمع ہو گیا اور پولیس کی چوکی کی طرف بڑھنے لگا۔ پہلے تو میں نے بھی طلبا کو روکنے کی کوشش کی مگر جب دیکھا کہ وہ اس وقت ہوش میں ہیں اور کسی کی نہیں سنتے تو میں الگ کھڑا ہو گیا۔ مگر رشید صاحب نہ مانے۔ وہ ہجوم میں گھس گئے اور انہیں آگے بڑھنے سے روکنے لگے۔ کچھ لڑکے خاموش ہو گئے، مگر کچھ زور سے ان سے بحث کرنے لگے۔ اتنے میں رشید صاحب کو کسی نے ایک دھکا بھی دے دیا جو یقیناً غیر ارادی تھا، مگر وہ باز نہ آئے۔ آخر میں انہیں نکال کر لایا۔ راستے میں جب میں نے ان سے کہا کہ "کیوں شہادت کے لئے کمربستہ ہو رہے تھے؟ فن کار تو آپ کے نزدیک تماشائی ہوتا ہے۔ وہ معرکے میں حصہ نہیں لیتا۔" کہنے لگے، "فن کار کو گولی ماریئے۔ میں معلّم بھی تو ہوں۔ طلبا کو حماقت کرنے سے کیسے نہ روکوں؟" میں نے کہا "اس کے لئے قیمچی کی ضرورت ہے اور وہ آپ کے پاس نہیں ہے۔ یا پھر آپ کی آواز کسی سارجنٹ میجر کی سی ہونی چاہیے جس سے آپ محروم ہیں۔" رشید صاحب کا غصہ اُتر گیا۔ کہنے لگے "کبھی کبھی رباب کے بغیر بھی گانا پڑتا ہے۔ علی گڑھ کی خاطر سب کچھ گوارا ہے۔"

رشید صاحب کی کچھ رائیں بڑی عجیب ہیں۔ مثلاً انہیں اس میں تامل ہے کہ عورتیں مردوں سے زیادہ ذہین بھی ہو سکتی ہیں۔ ان کا عورت کا تصور کچھ "خاتونِ مشرق" کا سا ہے۔ "آنچل پرچم بھی بن سکتا ہے"، یہ رشید صاحب مشکل سے مانیں گے۔ انہیں ہر اچھے شخص یا کام میں علی گڑھ کا فیضان ضرور نظر آ جاتا ہے گو وہاں دور دور تک اس قسم کا کوئی اثر نہ ہو۔ اس معاملے میں وہ "ہمہ اوست" نہ سہی تو "ہمہ از دست" پر ضرور ایمان رکھتے ہیں۔ وہ مرنے والوں کی نکتہ چینی کو بُرا سمجھتے ہیں۔

مجھے یاد ہے جب عصمت کا مضمون "دوزخی" شائع ہوا تو میں نے بڑی تعریف کے ساتھ وہ رشید صاحب کو پڑھنے کے لئے دیا۔ رشید صاحب کو مضمون مطلق پسند نہ آیا۔ کہنے لگے کہ "یہ کیسی بہن ہے جو مرحوم بھائی کے متعلق اس طرح لکھتی ہے"۔ میں نے کہا "یہ اس فن کار کے قلم کا اعجاز ہے جو بہن ہونے کے ساتھ ساتھ بے لاگ مصور اور بے جھجک نقاد بھی ہے"۔ میں بحث کرتا رہا مگر رشید صاحب کو قائل نہ کر سکا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم سابق وائس چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی کی سوانح عمری 'ضیا کی حیات' کے نام سے شائع ہوئی۔ میں نے اس پر "اردو ادب" میں خاصی تفصیل سے ریویو کیا اور ڈاکٹر صاحب کی سیرت اور کارناموں پر بھی تنقیدی نظر ڈالی۔ رشید صاحب نے ریویو کی بڑی تعریف کی مگر اس کے لب و لہجے کو اس لئے کہیں کہیں نامناسب قرار دیا کہ مرنے کے بعد نکتہ چینی ختم ہو جانی چاہیے۔ اب اس کو کیا کیا جائے کہ بعض ناقدین کا خیال ہے کہ کسی شخص پر بھی تنقید اسی وقت ہو سکتی ہے جب وہ انتقال کر چکا ہو یعنی اس کی شخصیت کا رنگین نقاب نگاہوں کے سامنے نہ ہو۔

رشید صاحب سے میں نے "اردو ادب" کے لئے ایک مضمون کی فرمائش کی۔ جواب آیا کہ جس رسالے کا ایڈیٹر پورے رسالے کے مضامین اپنے قلم سے لکھ سکتا ہو اسے فرمائش کرنے کا کیا حق ہے۔ میں نے انہیں غیرت دلائی، خوشامد کی، دھمکیاں دیں لیکن کوئی اثر نہ ہوا۔ حسنِ اتفاق دیکھئے کہ ان کا ایک غیر مطبوعہ مضمون میرے پاس نکل آیا۔ غیر مطبوعہ اس لئے کہ یہ جگر صاحب کے نئے مجموعۂ کلام کے دیباچے کے طور پر لکھا گیا تھا۔ جگر صاحب کا نیا مجموعہ ان کے لاابالی پن کی وجہ سے اب تک نہ نکل سکا۔ میں نے بھی ایک مضمون لکھا تھا، اس کی نقل تو نہ ملی، ان کے مضمون کی نقل مل گئی۔ میری شرافت دیکھئے کہ میں نے انہیں اطلاع دے دی کہ وہ مضمون بقول کسے 'شائع ہونے جا رہا ہے'۔ دوسرے دن ایس او ایس آیا کہ مضمون نظرِ ثانی کے لئے بھیج دیا جائے، میں نے بھیج دیا۔ رسید آئی اور یہ مژدۂ جانفزا کہ تین چار دن میں ٹھیک ٹھاک کر کے بھیج دوں گا۔ میں منتظر رہا۔ کچھ دن بعد اطلاع ملی کہ وہ مضمون کچھ کا کچھ ہو گیا۔ اب عنقریب روانہ کیا جائے گا۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ مضمون مل ہی جائے گا۔ مگر دو تین دن کے بعد اطلاع ملی کہ وہ ایک دوسرے پرچے کو دے دیا گیا ہے۔ میں نے بہت برا مانا اور بڑی سخت شکایت کی، جواب ندارد۔ اس عرصے میں عشرۂ محرم بھی آیا اور گزر گیا۔ چند دن اور گزر جانے کے بعد میں نے پھر اپنی آزردگی ظاہر کی۔ جواب ملا کہ "محرم ختم ہو گیا —— اب ماتم موقوف کیجئے"۔ خط پڑھ کر ہنسی آ گئی اور میں نے صدق دل سے رشید صاحب کو معاف کر دیا۔

ایک دفعہ اردو کے سلسلے میں سمپورنانند جی سے ملنا پڑا۔ ذاکر صاحب وفد کے صدر تھے۔ یادداشت پہلے سے بھجوا دی گئی تھی۔ ہم لوگ پہنچے تو وزیر تعلیم بظاہر اخلاق مگر دراصل رکھائی سے پیش آئے۔ کہنے لگے کہ "یادداشت میں نے دیکھ لی ہے۔ کچھ اور کہنا ہو تو فرمائیے"۔ ذاکر صاحب نے ہم لوگوں کی طرف دیکھا۔ میں نے دو چار باتیں کہیں، پھر ڈاکٹر عابد علیم نے مسئلہ اٹھایا مگر فضا کچھ ایسی سرد تھی کہ بات کرنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا۔ غرض مشکل سے دس منٹ کی سرسری سی بات چیت کے بعد ہم لوگ واپس ہوئے۔ مجھے سب سے زیادہ قلق اس بات کا تھا کہ وزیر موصوف نے ذاکر صاحب جیسے مستند ماہرِ تعلیم کی بھی قرار واقعی تواضع نہیں کی اور بہت رسمی لہجہ رہا۔ گھر آ کر دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے رشید صاحب کو ایک لمبا سا خط لکھا جس میں اہلِ علم کی ناقدری اور اربابِ سیاست کی فرعونیت کا ذکر تھا۔ رشید صاحب نے پنسل سے جواب لکھا جس کا ایک جملہ مجھے اب تک یاد ہے "سرور صاحب! میں سمپورنانند کی بے حسی کو کیا دیکھوں، مجھے تو گاندھی جی کی دردمندی اور دلنوازی یاد ہے"۔ میں رشید صاحب سے متفق نہ ہو سکا مگر اس جذبے کا احترام کیسے نہ کرتا۔

ابھی حال کا واقعہ ہے کہ رشید صاحب نے مجھ سے کچھ پھولوں کے پودے لکھنؤ سے بھجوانے کی فرمائش کی۔ میں نے لکھا کہ "میں گل رخوں کی یاد سے فرصت پالوں تو پھولوں کی طرف بھی توجہ کروں"۔ رشید صاحب نے فوراً اپنی فرمائش واپس لے لی اور اس رعایتِ لفظی کی خوب داد دی۔ اچھے فقرے کا اثر رشید صاحب پر اچھے شعر کی طرح ہوتا ہے۔

رشید صاحب بڑے شریف آدمی ہیں اور ان میں شرافت کی سادہ کمزوریاں بھی ہیں۔ وہ سادہ لوح نہیں، دوسروں کی شرافت سے بقدرِ ضرورت فائدہ اٹھانا بھی جانتے ہیں۔ وہ تصورات کے نہیں تصویروں کے، نظریات کے نہیں، نظر کے قائل ہیں۔ وہ کارناموں سے آدمیوں کو نہیں، آدمیوں سے کارناموں کو پرکھتے ہیں۔ وہ جہاں بھی سچی لگن، جذبہ اور جوش دیکھتے ہیں تو اس کا احترام کرتے ہیں۔ وہ بیسویں صدی کے آغاز کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو بزرگوں کا احترام

اور چھوٹوں پر شفقت دونوں کو جزوِ ایمان جانتی تھی۔ وہ مذہبی قدروں سے زیادہ اخلاقی قدروں کے قائل ہیں۔ ان کا صحیفۂ اخلاق اس شعوری دور کے لئے قدرے پُرانا ہے، مگر پھر بھی لائقِ توجہ ہے۔ انتہا پسندی کے اس زمانے میں وہ لبرل، معتدل اور مرنجاں مرنج ہیں۔ وہ خود سرپھرے نہیں مگر سرپھروں سے انہیں شغف ضرور رہے۔ وہ خالص جذباتی ہیں مگر جذباتیت کے شکار نہیں۔ جن لوگوں کو ان سے قریب رہنے کا موقع ملا ہے وہ ان کو ہمیشہ یاد رکھنے پر مجبور ہیں۔ ان سے میں نے اکثر اختلاف کیا ہے مگر اس کے باوجود میں ان کے لئے اپنے اندر احترام اور محبت کا ایک ملا جلا جذبہ پاتا ہوں۔ وہ قائد نہیں ہو سکتے مگر بڑے اچھے رفیق ہیں۔ ان کی تصانیف میں افکار سے زیادہ "شخصیت" کا حسن ہے۔ انہوں نے علم و ادب کو ایک عاشق کی طرح چاہا ہے۔ وہ اس ذہنی کرب سے دوچار نہیں ہو سکے جو اس نسل کی کمزوری بھی ہے اور طاقت بھی، مگر انہوں نے ہمیں جو مسرت و بصیرت عطا کی ہے، اس کی وجہ سے زندگی کچھ اور گوارا، پُر کیف اور پُر معنی ہو جاتی ہے۔ وہ گلاب کے پھول اور عطرِ حنا کی طرح ہماری تہذیب اور اس کی رنگینی و رعنائی کی ایک علامت ہیں۔ ان کے بہت سے خیالات سے لوگ بڑی جلدی ان کی طرف سے بدگمان ہو جاتے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ کمیونزم اور ترقی پسندی یا مغرب اور جدیدیت سے انہیں کوئی چڑ نہیں، بلکہ وہ ہر رومان یا ہر فیشن پر اس لئے ہنس سکتے ہیں کہ ان کی تیز نظر اس کے مضحکہ خیز پہلو دیکھ سکتی ہیں۔ انہوں نے آئی۔ سی۔ ایس یا مولوی کسی کا کبھی رعب نہیں مانا اور ہر قسم کی ذہنی غلامی کا پردہ فاش کیا۔ وہ ہر لیڈر کی کمزوری اور ہر بلندی کی پستی دیکھ لیتے ہیں۔ اردو ادب کی خوش قسمتی ہے کہ اس نے ایک رشید صدیقی بھی پیدا کیا ہے جس میں سوداؔ کا سا تخیل، اکبرؔ کی سی صنعتِ لفظی اور غالبؔ کی سی نکتہ سنجی اور شوخی ہے۔ انہوں نے ظرافت کو ادب بنانے میں حصہ لیا ہے اور ادب کو مشرقیت کی بعض صالح قدروں کا ترجمان بنایا ہے اور "بقائے دوام" کے دربار میں ان کی جگہ محفوظ ہے۔

علی گڑھ سر سید کے خواب کی ایک تعبیر ہے۔ پوری یا ادھوری۔ اس بحث کو فی الحال جہاں کا تہاں رہنے دیجئے۔ یہاں ذاکر صاحب کی پُرسوز شخصیت کی وجہ سے علم و عمل کی ایک نئی چنگاری ہے۔ یونیورسٹی کے بعد یہاں کے تالے، یہاں کا مکھن، یہاں کے بسکٹ اور یہاں کی گرد مشہور ہے، لیکن علی گڑھ کے اس عجائب خانے میں ایک اور قابلِ دید شخصیت رشید احمد صدیقی کی بھی ہے کیونکہ ان سے مل کر اقبالؔ کا وہ مصرع یاد آتا ہے —

"جس کی پیری میں ہے مانندِ سحر رنگِ شباب"

مجنوں گورکھپوری

فراق گورکھپوری

بات ہے غالباً ۱۹۱۹ء کی، برسات کا زمانہ تھا، گورکھپور میں کچھ لوگوں نے گورکھپور بینک کی عالیشان عمارت میں صبح کے وقت کسی چھٹی کے دن ایک مشاعرہ کیا۔ میری کائناتِ شاعری اس وقت تک شاید ڈیڑھ دو سو ابتدائی اشعار تک محدود تھی۔ مشاعرے میں میں نے بھی غزل پڑھی اور منجملہ دیگر اصحاب کے ایک حد درجہ دُبلے پتلے نوجوان نے بھی غزل پڑھی جس کی عمر بمشکل سولہ برس کی ہوگی۔ نہایت پُرتکلف شیروانی اور تنگ مہری کا پاجامہ، ترکی ٹوپی۔ یہ تھی اس نوجوان کی پوشاک۔ کھُلتا ہوا گورا رنگ، چہرے پر چیچک کے کچھ داغ، کشادہ پیشانی اور آنکھوں میں کسی قدر چمک۔ جسم کی انتہائی لاغری کے ساتھ پورے جسم اور مختلف اعضاء میں ایک طرح کا برقی چنچل پن۔ اس سب پر طُرّہ یہ کہ ہر امر میں انتہائی خود اعتمادی، ہونٹ کسی قدر موٹے لیکن ہرگز ناموزوں نہیں۔ اُن پر پان کا لاکھا۔ کچھ کچھ نکلتی ہوئی مونچھیں، سر کے بال بہت ہلکے اور کچھ کچھ بڑھے ہوئے۔ ہلکے سے میری مراد ہلکے رنگ سے ہے یعنی بالوں کے رنگ میں تین حصّہ دبی ہوئی سیاہی اور ایک حصّہ اس میں ملی ہوئی سُرخی۔ بیٹھنے میں کسی قدر ملبی ور بہت ہی پتلی گردن مستقل طور پر داہنے طرف کو جُھکی ہوئی۔ ایک سپاٹ انداز میں اس نوجوان نے پوری غزل سنائی۔ غزل کا یہ حال کہ شاید ہی کوئی ایسا مصرع رہا ہو جس میں چار اضافتوں سے کم کی ترکیبیں ہوں۔ غلطی یا کچا پن یا کم مشقی کسی شعر میں بھی نہیں۔ ہر شعر سے ذہانت نمایاں اور شاعرانہ کاریگری بھی پوری چابک دستی کے ساتھ جلوہ گر تھی۔ البتہ سوز و گداز و تاثیر اس غزل کی صفتیں نہ تھیں۔ بہرحال اس دُبلی پتلی کم سن شخصیت کو جو ہر لحاظ سے کمسن معلوم ہوتی تھی نظر انداز نہیں کیا جا سکا۔ اور یہ چرچا مشاعرے میں ہونے لگا کہ یہ نوجوان شاعر شہر گورکھپور کی جانی بوجھی ہوئی ہستی فاروقی صاحب کا فرزندِ اکبر ہے۔ اور غالباً ہائی اسکول میں پڑھتا ہے۔ اس مشاعرے میں اس نوجوان شاعر سے میں براہِ راست نہیں ملا۔ البتہ اس امر کا خاص احساس ہوا کہ فاروقی صاحب جو ہمارے شہر کی بہت قابل ہستیوں میں تھے اور جنہوں نے مجھے اسکول میں پڑھایا بھی تھا انہیں کے گھرانے کا چشم و چراغ یہ نوجوان شاعر ہے۔

دن گزرتے گئے، تحریکِ آزادی کے سلسلے میں آئی سی ایس اور پی سی ایس دونوں سے مستعفی ہو کر میں ڈیڑھ برس کی قیدِ فرنگ بھی کاٹ آیا۔ جیل سے نکل کر جب گورکھپور آیا تو فاروقی صاحب نے میرے اعزاز میں اپنے گھر پر ایک بڑی شاندار دعوت دی۔ اس بار اس چھوٹی سی صحبت میں یہ نوجوان شاعر ہم مہمانوں کو پھر ملا۔ اور دعوت کے بعد شعر و شاعری کا چرچا شروع ہو گیا جب استادوں اور ان کی اصلاحوں کا ذکر ہو رہا تھا تو بیچ میں یہ نوجوان بول اُٹھا کہ "میں اصلاح کے سخت خلاف ہوں" ہم سب نے حیرت سے پوچھا "آخر کیوں؟" ——— تو اس نے فوراً جواب دیا کہ "اصلاح سے شعر دوغلا ہو جاتا ہے۔" بات

آئی گئی ہوگئی۔ اس واقعہ کے کچھ دنوں بعد میں شہر میں اپنے ایک عزیز کے یہاں گیا ہوا تھا۔ اور اس عزیز کے مکان کے سامنے پھاٹک پہ میں کھڑا تھا کہ یہ نوجوان بھی سامنے ہی نظر آیا۔ کیونکہ فاروقی صاحب کا گھر بھی یہاں سے بہت قریب تھا۔ میں مزاج کا بہت زود آشنا واقع ہوا ہوں۔ اس لئے فوراً میں نے مجنوں گورکھپوری کو (یہ نوجوان مجنوں گورکھپوری تھا) اپنے مکان پر روز تیسرے پہر آنے کی مستقل دعوت دے دی۔ میرے گھر اس سے پہلے کبھی چائے نہیں بنی تھی۔ مجنوں بچپن سے ہی چائے کے شوقین تھے۔ اور اب ہمارے گھر والوں کے لئے بھی چائے ایک جزو زندگی بن گئی۔ پیالے تک نہیں تھے۔ ہم لوگ پھول کے کٹوروں میں ناشتے کے ساتھ چائے پیتے تھے۔ اور تین تین چار چار گھنٹوں تک ایک دوسرے کو اپنی یاد کے شعر سناتے تھے اور مل کر باہم گھومتے تھے۔ میں تو کئی برس پہلے بی۔ اے پاس کر چکا تھا۔ لیکن فاروقی صاحب کے ایما سے مجنوں انٹرنس پاس کر کے اپنے والد کی ایک بہت بڑی دکان سنبھالے ہوئے تھے۔ اس امر کا اظہار مجنوں کی پختہ دماغی کا روشن ثبوت ہے کہ میں نے ان ملاقاتوں میں پل بھر کو یہ محسوس نہیں کیا کہ شاعری اور ادب، سائنس اور فلسفہ اور فنون لطیفہ کے نازک سے نازک نکات کو سمجھنے میں اور ان امور پر خود اعتمادی کے ساتھ گفتگو کرنے میں یہ نوجوان مجھ سے کسی طرح کم ہے۔ ان امور پہ باتیں دیر دیر تک ہوتی تھیں اور یہ باتیں برابر کی ہوتی تھیں۔ یہ انٹرنس پاس نوجوان اور میں دونوں یہ محسوس کرتے تھے کہ پورے شہر میں حقیقی علمی مذاق رکھنے کی وجہ سے ہم لوگ اتنی جلد ایک دوسرے سے اس قدر قریب ہوگئے ہیں۔ ہم دونوں کی ایک دنیا بن گئی تھی۔ روز مجنوں میرے یہاں آتے تھے، روز چائے اور ناشتے کا دور چلتا تھا، درجنوں سگریٹ ہم لوگ پی جاتے تھے۔ میں پان کا عادی نہیں تھا۔ مجنوں کے لئے گھر میں سے پان بھی بن کر آجاتے تھے۔ اور پھر ایک دوسرے کو میرؔ، غالبؔ، آتشؔ، ریاضؔ اور کچھ فارسی شعراء کا کلام جو مجھے کم یاد تھا، لیکن مجنوں کو بہت یاد تھا۔ ہم ——— دیر دیر تک سناتے تھے۔ آسیؔ غازی پوری کے کلام کے بھی ہم دونوں عاشق تھے۔ جسے لذت لے لے کر ایک دوسرے کو سناتے تھے۔ اور جس پہ دونوں مل کر تبصرے کیا کرتے تھے۔ کئی برس بعد ایسا ہوا کہ میں کانپور سناتن دھرم کالج میں پروفیسر ہوگیا اور مجنوں جو اب بی۔ اے پاس کر چکے تھے گورکھپور ہی میں تھے۔ ہم دونوں کے شعور اور وجدان کے باہمی ربط کا یہ کرشمہ تھا کہ بغیر ایک دوسرے کی خبر رکھے ہوئے ہم دونوں نے پچاس رباعیاں کہہ ڈالیں اور دونوں نے ایک دوسرے کو خط لکھا کہ آسیؔ کی رباعیوں سے متاثر ہو کر یہ رباعیاں کہی گئی ہیں ——— ہم دونوں اب تک اس حسنِ اتفاق پر حیرت کرتے ہیں۔

پھر یورپ کی فلاسفی اور انگریزی ادب اور مذہب کی ماہیت اور کبھی کبھی سیاسی امور پر بھی ہماری باتیں شروع ہو جاتی تھیں۔ اس طرح کہ ختم ہونے میں نہیں آتی تھیں۔ شاید میں اور مجنوں ۱۹۲۳ء کے ان چند مہینوں کو اپنی زندگی کا بہترین زمانہ سمجھتے ہیں۔ آپ کو یہ بات یاد دلا کر پھر حیرت میں ڈال دوں کہ مجھ سے آٹھ برس چھوٹے ہوتے ہوئے اور رسمی تعلیم میں اتنا فرق ہوتے ہوئے یہ محض انٹرنس پاس نوجوان علمی میدان میں جو میرے دوش بدوش چلتا رہا تو اس کی ایک وجہ تھی اور وہ یہ تھی کہ عربی کی اچھی خاصی تعلیم اور فارسی کی بہت بلند اور مکمل تعلیم یہ نوجوان لڑکپن ہی میں حاصل کر چکا تھا چنانچہ اسکول میں خواہ اس کا درجہ دسواں ہی کیوں نہ ہو، اس کا دماغ ایک بہت پڑھا لکھا دماغ بن چکا تھا۔ فردوسیؔ، عرفیؔ، بیدلؔ اور دیگر فارسی شعراء کے کلام کے حساس مطالعہ نے مجنوں کے دل و دماغ پر جلا کر دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جو ذہنی محسوسات میں نے مغربی ادب و فلسفہ سے حاصل کئے تھے، اس طرح جو دماغی صلاحیت حاصل کی تھی، وہ مجنوں نے عربی اور فارسی کے غائر مطالعہ سے حاصل کر لی تھی۔

۱۹۲۴ء میں پنڈت جواہر لال نہرو نے گورکھپور سے مستقل طور پر مجھے آل انڈیا کانگرس کے انڈر سیکرٹری کے منصب پر بلا لیا۔ کچھ دنوں بعد مجنوں بھی اپنے گھر والوں کی رضامندی سے میرے پاس الہ آباد چلے آئے اور یہاں کے کرسچین کالج میں نام لکھا کر میرے ساتھ ہی رہنے لگے۔ ہم دونوں نے قریب قریب اسے معمول بنا لیا کہ شام کو سنیما ضرور دیکھیں کیونکہ کانگرس آفس کے اوپر جس مکان میں ہم دونوں رہتے تھے موتی محل سنیما اس سے بہت قریب تھا۔ کبھی کبھی دوسرے سنیما گھروں میں بھی ہم لوگ جاتے تھے۔ ابھی ٹاکیز کی ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ یہ دور خاموش چلتی پھرتی تصویروں کا تھا۔ ان فلموں میں پلاٹ بہت مکمل اور معنی خیز ہوتا تھا۔ اور خاص کر کچھ سیریل ایسے دکھائے جاتے تھے جن میں SUSPENSE یعنی امید و بیم کی وہ حالت

جو یہ جاننے کے لئے بے چین کر دے کہ اب کیا ہوگا۔ ایک خاص عنصر پلاٹ کا ہوتا تھا۔ کیونکہ کردار سب کے سب خاموش رہتے تھے۔ اس لئے ان فلموں میں خاص چیز وہ بولتی ہوئی "پیشانیاں" یا عنوانات ہوتے تھے جسے انگریزی میں CAPTION کہتے ہیں۔ یہ جملے یا فقرے بہت چابکدستی سے بنائے جاتے تھے اور نثر کے ان معجزوں پر ہم دونوں وجد کرتے تھے۔ شاید ہم نے اپنی اپنی انشا پردازی میں ان "پیشانیوں" کا غیر شعوری طور پر اثر لیا ہے۔ یہ بات ہے اس وقت کی جب ہندوستانی فلم انڈسٹری ابھی وجود میں نہیں آئی تھی۔ اور سیمیں پردوں پر یہ جگمگاتی ہوئی "پیشانیاں" ہم دونوں کے لئے انگریزی زبان کی نثر کا زندہ درس ہوتی تھیں۔ بڑی ڈرامائی کیفیت اور صفت ان "پیشانیوں" میں ہوتی تھی۔ اب کئی برسوں سے سینما دیکھنے کا شوق نہ مجھ میں رہ گیا نہ مجنوں میں۔ کبھی سینما کا ذکر اٹھتا ہے تو ہم دونوں یہ کہہ دیتے ہیں کہ ٹاکیز کے آنے کے بعد سے سینما بے تہ اور بے مغز طفلانہ دماغ رکھنے والوں کی تفریح کی چیز ہو کر رہ گیا ہے۔

مجنوں نے کرسچین کالج میں سائنس کے مضامین لئے تھے۔ ان کے والد فاروق صاحب کو ریاضی اور سائنس کی دوسری شاخوں پر غیر معمولی عبور تھا۔ اور مجنوں بھی ادبی رجحانات کے ساتھ ساتھ سائنس کے بہت اچھے طالب علم تھے۔ الٰہ آباد میں میرے ساتھ قیام کے دوران میں ایک بار ایسا ہوا کہ میں پنڈت جواہر لال نہرو کے یہاں سے آسکر وائلڈ کا ڈرامہ SALOME اٹھا لایا۔ اور ٹالسٹائی کے ڈرامے بھی اٹھا لایا۔ میرے پڑھ چکنے کے بعد سرسری طور سے دونوں کتابیں مجنوں بھی دیکھ گئے اور نہایت تیز رفتاری کے ساتھ لیکن نہایت چچے تُلے انداز میں SALOME کا اردو ترجمہ کر ڈالا۔ اور ٹالسٹائی کے ڈرامہ THE FIRST DISTILLER کا اردو ترجمہ ابو الخمر (پہلا کلوار) کے نام سے کر ڈالا۔ مجنوں کے پاس انہیں چھپوانے کے لئے روپے نہ تھے۔ میرے پاس کچھ فالتو روپے تھے۔ جس سے یہ دونوں کتابیں بہت جلد چھپ گئیں۔ جب مجنوں کے پاس روپے ہوئے تو بغیر کسی یاد دہانی کے انہوں نے میرے روپے واپس کر دیئے۔ مجنوں میں جہاں دوسری بہت سی اعلیٰ صلاحیتیں ہیں، وہاں ایک غیر معمولی صلاحیت یہ بھی ہے کہ انگریزی الفاظ اور انگریزی فقروں کا نہایت برجستہ اور صحیح ترجمہ وہ کر سکتے ہیں۔ مجنوں کی عمر ابھی مشکل سے انیس برس کی ہوگی، اور میں اس امر کا تصور نہیں کر سکتا کہ انیس برس کا لڑکا انگریزی شاعری۔ انگریزی نثر، سائنس اور فلسفہ اور جمالیات اور دیگر علوم کی انگریزی اصطلاحوں کا اتنا تیر بہدف ترجمہ کر دے کہ آنکھیں کھل جائیں۔ مجنوں کی نثر اسی عمر میں اپنے تجے تُلے پن۔ توازن اور جملوں کی ایسی ساخت جس میں ایک لفظ بھی گھٹایا یا بڑھایا یا بدلا نہ جا سکے اور جنہیں دوسرے الفاظ و انداز میں ادا ہی نہ کیا جا سکے ان تمام نکھری ہوئی صلاحیتوں کا ثبوت دینے لگی تھی۔ اگر مجنوں کی تصنیفات مختصر کتابوں کی شکل میں نہ ہوتیں اور اگر وہ ایک ایک موضوع پر چار چار پانچ پانچ سو صفحات اپنی نثر کے لکھتے تو ان کے ٹھوس کارنامے اردو میں وہی جگہ رکھتے جو انگریزی ادب میں سوئیفٹ کے نثری کارناموں کو حاصل ہے۔ میں تو اب بھی یہی کہوں گا کہ اندازاً دس بارہ سو صفحات کی نثر جو مجنوں نے ہمیں دی ہے، وہ اپنی حساس منطقیت اور زندہ عقلیت کے لحاظ سے اردو زبان میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔

یہ وہ زمانہ ہے جب میری عمر اٹھائیس برس کی تھی اور مجنوں کی عمر انیسویں بیسویں سال میں تھی۔ ہم لوگوں کا اُٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا ساتھ ساتھ رہتا تھا۔ ایک بار مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے یہ کہہ دیا کہ مسلمان صرف گوشت کھانا جانتا ہے۔ خاص کر ترکاری بنانا یا سبزیوں کی قدر کرنا اس قوم کو نہیں آتا۔ مجنوں جھلا اُٹھے اور تیورا کر مجھ سے کہا کہ تم نے ترکاری کھائی بھی ہے؟ مجنوں کا یہ بگڑنا مجھے اتنا پیارا لگا، اور اپنے اوپر یہ حملہ مجھے اتنا خوشگوار معلوم ہوا کہ میں اس بحث ہی سے بالکل بے نیاز ہو گیا۔ جب کئی برس بعد مجنوں نے گورکھپور میں اپنے گھر کی بنی ہوئی ترکاریاں مجھے کھلائیں تو یقین جانئے میرے چودہ طبق چمک گئے۔ اور مجنوں کا کئی برس پہلے کا بگڑنا یاد کر کے مجھے اور بھی خوشی ہوئی۔ اُس یاد نے ان انتہائی لذیذ ترکاریوں کی لذت کو اور بھی بڑھا دیا۔ ایک چیز کی عادت البتہ میری صحبت سے مجنوں کے اندر پیدا ہو گئی، یعنی اچاروں کی عادت۔ اچار بھی اب مجنوں کے گھر اتنا اچھا پڑتا ہے کہ کھانے کے وقت زبان چٹخارے لیتی ہے۔

قیام الٰہ آباد کے اس دوران میں، میں اور مجنوں نئی کتابوں، فلسفہ کے نئے مدرسوں، مذہب کے گہرے نکات اور اس دور کے اُردو ادب پر جی کھول کر باتیں کیا کرتے تھے۔ مجنوں باتوں باتوں میں اپنے بہت سے حالات بھی مجھے سُنا دیا کرتے تھے۔ انیس بیس برس کی عمر ہی میں وہ درجن بھر عشق کر چکے تھے۔

اچھی سے اچھی شراب پی چکے تھے۔ ایک ایک رات میں صرف ایک شبانہ محبت کی تکمیل میں محبوب کو نذر و نیاز، شراب اور شاندار دعوت کے سلسلے میں سو سو ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپے اڑا چکے تھے۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ یہ ایک نہیں آدھے تھپڑ کا لونڈا کتنا نڈر اور کس جیوٹ کا ہے۔ بدمعاشوں سے ان کو سابقے پڑ چکے تھے اور بدمعاش محض اُن کے تیور سے سہم کر رہ گئے تھے۔

اب یہ بھی بتا دوں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف اس لئے نہیں کھنچتے تھے کہ بنیادی طور پر ہم دونوں کا مزاج یکساں تھا، ہماری باہمی ہم آہنگی اور قربت اس وجہ سے تھی کہ مجنوں کی شخصیت میں غالب عنصر حسّاس عقلیت کا تھا۔ اور میرے اندر غالب عنصر ذہن کی روحانیت اور وہ وجدانیت تھی جو بعد کو میری شاعری میں نمایاں ہوئی۔ میں اُن کی جچی تُلی باتوں پر فریفتہ تھا اور وہ میری باتوں کی اشاریت اور رمزیت کے شیدائی تھے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے سیکھتے تھے۔ "نقوش" میں جو میرے خطوط شائع ہو چکے ہیں، اُن سے یہ پتہ چل گیا ہوگا کہ کئی برسوں سے میری زندگی ایک مستقل المیہ بن چکی تھی۔ مجنوں کی غمگسار اور پُرخلوص ہمدردی میرے لئے ایک بہت بڑا سہارا تھی۔ اُن کا دل بھی چوٹ کھایا ہوا تھا اور اس لئے جو بھیانک دنیا میرے اندر میری زندگی کو ایک چلتا پھرتا جہنم بنائے ہوئے تھی، اس کا مجنوں کو پورا پورا احساس تھا۔ میں نے جو اپنے مزاج کو شاعرانہ اور وجدانی اور مجنوں کے مزاج کو جو عقلی اور منطقی کہا ہے، اگر یہ بات یہیں تک کہہ کر چھوڑ دی جائے تو ہم دونوں کے متعلق یہ بات یک طرفہ رائے ہوگی۔ اصل بات یوں ہے کہ مجنوں کے مزاج کا فاعلی عنصر عقلیت ہے لیکن ان کے مزاج کا ایک انفعالی عنصر بھی ہے جو وجدانیات و جمالیات کا شدید احساس کرتا ہے۔ مجنوں کے مزاج کا یہ عنصر یا اُس کی یہ رگ بہت حسّاس ہے۔ اسی سے وہ خود تو کیف یا سوز و ساز میں ڈوبے ہوئے اشعار نہیں کہتے۔ لیکن ایسے اشعار کو سُن کر ان پر حال و قال کا عالم طاری ہو جاتا تھا۔ میری شاعری میں غالباً وجدانی عنصر غالب ہے۔ اسے مجنوں اسی طرح محسوس کرتے تھے اور اس سے شاید اس درجہ متاثر و متکیف ہوتے تھے کہ باید و شاید۔

مجنوں کی انفعالی وجدانیت نے آسی غازی پوری اور میر پر اُن سے ایسے مضامین لکھوائے جن میں تنقید خود وجدان بن گئی ہے۔ اسی طرف آگے چل کر کچھ اور اشارے کروں گا۔ لگے ہاتھوں اپنے متعلق بھی یہ عرض کر دوں کہ میرے مزاج میں وجدانی اور جمالیاتی احساس کا عنصر غالب عنصر ہے، لیکن عقلیت کا عنصر بھی اس عنصر کے تحت بہت زندہ شکل میں موجود ہے۔ یعنی میرے یہاں جس عنصر کو اولیت حاصل ہے، مجنوں کے یہاں وہ عنصر ایک امکان کی صورت میں یا نیم خوابیدہ عالم میں ہر وقت موجود رہا ہے۔ اس لئے اسے ان کے یہاں دوئمیت کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اور عقلی جس جسے میرے یہاں دوئمیت حاصل ہے، مجنوں کے یہاں اولیت کا مرتبہ رکھتی ہے۔ بہرحال عقلیت و وجدانیت ہم دونوں میں ایک قدرِ مشترک کی طرح کارفرما رہی ہیں۔ اور ہم دونوں شاعری میں قریب قریب یکساں مذاق رکھتے ہوئے فلسفہ اور علوم میں بھی یکساں طور پر منہمک رہے ہیں۔

الہ آباد میں مجنوں کا قیام زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکا۔ وہ سخت بیمار پڑ گئے اور مستقل طور پر کرسچین کالج کو چھوڑ کر پھر گورکھپور واپس چلے آئے۔ تین برس تک میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی میں اپنے منصب پر اس کے بعد کام کرتا رہا۔ اس دوران میں مجنوں نے گورکھپور میں "ایوانِ اشاعت" قائم کر لیا۔ اور رسالہ "ایوان" کا اجرا کیا۔ ان کے رنگا رنگ ادبی کارناموں کی تخلیق اب باقاعدہ شروع ہوگئی۔ افسانے، ناول، بصیرت افروز تنقیدی مضامین، فلسفیانہ اور علمی تصنیفات، طویل ادبی بحثیں، کبھی کبھی نہایت جچی تُلی شاعری، نظموں اور غزلوں کی شکل میں ان تمام میدانوں کو انہوں نے اپنی فکر اور تخلیقی قوت کی جولانگاہ بنا لیا۔ یہ تین چار برس کا زمانہ ان کی ادبی زندگی کا سب سے زیادہ زمانہ رہا ہے۔ جو بعد کو بھی کئی برس تک رہ رہ کر ان سے بہت قابل قدر چیزیں لکھواتا رہا۔ اور جو اس وقت تک قائم رہا جب تک وہ "ایوان" نکالتے رہے SALOME اور الوالخر کے بعد برنارڈ شا کے مشہور ناٹک BACK TO METHUSELA سے ماخوذ "آغازِ ہستی" افسانوں کے دو مجموعے "سمن پوش" اور "خواب و خیال" کئی برس پہلے کی تصنیف "زیدی کا حشر" یا ناول "سوگوارِ شباب" بلند فلسفیانہ مقالہ "شوپنہار" "تاریخ جمالیات" "مریم مجدلینی"۔ بائرن کے منظوم ڈرامہ CAIN کا ترجمہ "قابیل" کے نام سے اور ان کے علاوہ سینکڑوں صفحات پر پھیلی ہوئی نہایت تربیت یافتہ تحریریں، بہت سے ادبی اور تنقیدی تبصرے، دس بارہ برس کے اندر یہ تمام پُرمغز، ٹھوس اور یادگار تصنیفیں مجنوں نے اردو دنیا کو دی ہیں۔

میں مجنوں سے اکثر کہا کرتا تھا کہ "تمہارے افسانوں میں بسا اوقات زمانہ کے خلاف ایک جھلاہٹ کا عنصر پیدا ہو جایا کرتا ہے۔ مجھے یہ بات پسند نہیں تھی۔ پریم چند کے افسانوں کا سوز و گداز اپنے افسانوی ادب میں پیدا کرو۔ اور ہندوستانی زندگی کی ناقابل فراموش سچی مصوری سے اپنے افسانوں کو سدا بہار بنا دو۔" میری تجویز کا بیج ایک زرخیز زمین میں دفن ہوا۔ اور "سوگوار شباب" نامی ناول کی شکل میں کچھ دنوں بعد بارور ہوا۔ مجھے جاننے والوں میں بہتوں کو یہ نہیں معلوم کہ اب سے تیس برس پہلے چھ سات افسانے میں نے بھی لکھے تھے لیکن یہ میدان مجھ سے بہت جلد چھوٹ گیا۔ انہیں دنوں کی بات ہے کہ ایک بار کئی دنوں کے لئے مجنوں اور پریم چند دونوں میرے مہمان رہے۔ ایک دن صبح کو جب ہم تینوں سو کر اٹھے تو میں نے کہا کہ بھائی ایک پلاٹ میرے ذہن میں آیا ہے۔ خود اپنی زندگی کے واقعات سے متاثر ہو کر اور ٹینی سن کے منظوم افسانہ ENOC ARDEN اور ٹامس ہارڈی کے ناول TESS سے متاثر ہو کر۔ آپ دونوں میں جو بھی چاہے اسے یہ پلاٹ نذر ہے۔ میں نے پلاٹ بیان کر دیا جو دونوں کے دلوں میں گھر کر گیا۔ پریم چند نے "ابھوشن" کے نام سے ہندی کا جامہ اسے پہنا دیا اور مجنوں نے یہ افسانہ "گنا" کے نام سے شائع کیا۔

مجنوں سے میری گفتگو جیسا کہ اب تک عرض کرتا آیا ہوں فلسفہ اور جمالیات کے موضوع پر نہایت انہماک سے اکثر ہوتی رہتی تھی۔ انہیں لمحوں کی تحریک سے غالباً مجنوں نے کچھ دنوں بعد "شوپنہار" اور "تاریخ جمالیات" دو کتابیں شائع کیں۔ مجنوں کے افسانوں سے جو ذرا سی مجھ میں ناآسودگی تھی، اس کی بنا پر ان سے میں اکثر کہا کرتا تھا کہ خلاقانہ اور دیانت دارانہ تنقیدی مضامین بھی ہم لوگوں کو لکھنا چاہئیں۔ میں تو ان دنوں خط و کتابت کے علاوہ نثر قریب قریب لکھتا ہی نہیں تھا، لیکن مجنوں نے دو تین مجموعے تنقیدی مضامین کے شائع کئے جن کا ذکر پہلے کر چکا ہوں۔ مجنوں نہایت محبت سے کبھی کبھی یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ مجھے افسانوں کو چھوڑ کر تنقید کی طرف آنے کی ترغیب فراق نے دلائی۔ اس امر میں غالباً مجنوں کی نشو و نما میں میرا حصہ کچھ اسی طرح کا رہا ہے جیسے ورڈزورتھ کی شاعری کی نشو و نما میں اس کے دوست کولرج کا حصہ رہا ہے۔

کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں اور مجنوں علمی اور ادبی امور میں ہمیشہ یکساں ردِ عمل ظاہر کرتے تھے۔ مثلاً میر کے بارے میں تو ہم دونوں کا ردِ عمل ایسا رہا ہے کہ ہمارے خیالات بالکل ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔ لیکن میں سودا کی غزلوں کا بھی قائل رہا ہوں، مجنوں بالکل قائل نہیں رہے ہیں۔ اور یہ کہہ کر اکثر مجھے چھیڑتے رہتے ہیں کہ میاں تم سودا کو کیوں گھسیٹ لایا کرتے ہو۔ میں آتش کے کلام کے بہترین حصے پر مٹا ہوا ہوں۔ مجنوں کا کہنا ہے کہ آتش کے بڑے اشعار میں اکثر دوسرا مصرع پہلے مصرعے سے کچھ کم حیثیت کا ہوتا ہے۔ مجھے لکھنؤ اسکول کی شاعری عام طور پر کم پسند ہے۔ مجنوں کا کہنا ہے کہ دبستانِ دلی کی شاعری یکسر جذباتی ہے۔ اور گوشت کے ایک ایسے لوتھڑے کے مانند ہے جس میں ہڈی نہ ہو۔ مجنوں کی عقلیت اس خارجیت کو مناسب خراج پیش کرتی ہے جو لکھنؤ کی شاعری میں ہمیں ملتی ہے۔ حسرت کی شاعری کے ہم دونوں دلدادہ ہیں لیکن اب میں مجنوں کی نسبت کسی قدر کم دلدادہ ہوں۔ اصغر کی شاعری کو میں جس بلند لہجے میں سراہتا تھا وہ مجنوں کے دل کو نہیں لگتی تھی۔ اگرچہ اصغر کی شاعری کی خوبیوں کا انہیں بھی اعتراف ہے۔ جوش کی شاعری میں جو زور و توانائی ہے اور جو رنگا رنگی ہے، میں اکثر اسے اچھالتا رہتا ہوں۔ لیکن مجنوں ذرا کم ہی قائل ہوتے رہے ہیں۔ انگریزی شاعری پر رائے زنی میں مجنوں شیلے کے ہم پرواز ہیں۔ اور میں ورڈزورتھ کا ہم رفتار ہوں۔ یہ ایک عجیب بات ہے۔ رموزِ ادب کو چیر جانے والی ذہنیت رکھتے ہوئے بھی مجنوں ورڈزورتھ کے قائل نہیں ہوئے۔ شاید اس وجہ سے ہو کہ میں ہندو گھر میں پیدا ہوا اور مجنوں مسلمان گھر میں پیدا ہوئے۔ وہ مجرد اور معری تخیل سے متاثر ہوتے ہیں جس کی بہترین مثال شیلے ہے۔ میں خاکی دنیا کی پاکی کا قائل ہوں۔ اور سفر سے زیادہ وطن یعنی آفاق کی وطنیت کے تصور کی طرف کھنچتا ہوں۔ اسی سے وہ کیٹس کے مداح تو ضرور ہیں، لیکن معتقد اتنے نہیں ہیں اور میرا ردِ عمل اعتقاد کی حد تک پہنچا ہوا ہے۔ مجنوں نے ایک نہایت بصیرت افروز اور متوازن کتابچہ اقبال پر لکھا تھا جو کئی برس پہلے شائع ہو چکا ہے۔ میں اس سے حرف بحرف متفق ہوں۔

میں اور مجنوں دونوں بہت دنوں تک لینن کی شخصیت اور اس کے کارناموں سے اپنے آپ کو ہم آہنگ نہیں پاتے تھے۔ جب اس کی وجہ ہم لوگ بیان کرتے ہیں تو ہم دونوں مزے لے لے کر خوب ہنستے ہیں۔ ہم دونوں کو بہت دنوں تک لینن کی تصویر ناپسند تھی۔ خاص طور پر اس کی داڑھی کی

تراش خراش۔ جب آدمی کا چہرہ پسند نہ آئے تو اس کا فلسفہ یا اس کے عمل کیونکر پسند آئیں۔ بعد کو یعنی ترقی پسند ادب کی تحریک شروع ہونے کے بعد ہی ہم دونوں کو اپنی اس دلچسپ حماقت کا احساس ہوا اور ہم دونوں لینن اور اشتراکیت سے اپنے آپ کو ہم آہنگ پانے لگے۔ خود میری شاعری کے متعلق بھی ادھر ایک زمانے سے مجنوں کے دل و دماغ میں کچھ سوالیہ نشانات بن جایا کرتے تھے۔ بات یہ تھی کہ وہ میری غزلیت کے جی جان سے دلدادہ تھے اور میری ایسی نظموں کی بھی قدر کرتے تھے جن میں غزلیت کا عنصر بہت غالب ہوتا تھا۔ جب میری نظموں میں اور میری غزلوں میں بھی کچھ ایسے عناصر نمایاں ہوئے جن میں تفکر یا مقصد کے پہلو ہوتے تھے اور جن میں ذاتی جذباتیت نسبتاً کم ہوتی تھی تو مجنوں ناآسودہ سے نظر آنے لگتے تھے۔ شاید انہوں نے میری شاعری کے نئے پہلوؤں سے اب کسی قدر مصالحت کر لی ہے۔ "روپ" کی رباعیاں اشاعت سے پہلے جب مجنوں نے سُنیں تو وہ کچھ ناخوش سے نظر آئے۔ وہ رباعیوں کی روایت کے ساتھ اسے بغاوت سمجھتے تھے۔ شاید اب وہ انہیں ان کی مناسب جگہ دینے کو تیار ہیں۔ اگر زمانے نے فرصت دی تو دو چار سو ایسی مفکرانہ اور فلسفیانہ رباعیاں بھی مجنوں کی خدمت میں پیش کر سکوں گا کہ انہیں شکایت نہ رہے۔

ہاں تو اب میں الٰہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی ادب کا معلّم ہو گیا تھا۔ اور اب تک اسی منصب پر ہوں۔ مجنوں انگریزی اور اردو میں ایم۔ اے کر کے سینٹ اینڈریوز کالج گورکھپور کے ایک باوقار پروفیسر ہو چکے تھے اور اس طرح اب ہم دونوں بہت حد تک ہم مذاق ہونے کے ساتھ ساتھ ہم پیشہ بھی ہو چکے تھے اور یہ رشتہ اب تک قائم ہے۔ میرے طریقۂ تعلیم اور مجنوں کے طرزِ درس میں کافی فرق ہے۔ میرا ذہن غالباً درس و تدریس میں خلاقانہ اور طبع زادانہ ہے۔ میں کسی ادبی سبق کو پڑھانے یا ادبی مسئلہ کو سلجھانے میں تجربات زندگی کی اصطلاحوں میں بے لاگ مسلسل تقریر کرتا چلا جاتا ہوں اور مناسب محسوسات کا اظہار اپنے لفظوں میں کرتا ہوں .... مجنوں شاید اتنی تیزی سے اور بیک وقت اتنی باتیں سمجھنے کے عادی نہیں ہیں۔ وہ عقلی منطقی اور لغوی مفہوم کو بہت باقاعدگی سے جچے تلے الفاظ میں بیان کر دیتے ہیں، لیکن ان کے لیکچر اور ان کے لکھائے ہوئے نوٹ ہوتے ہیں بہت کارگر اور عموماً تیر بہدف۔ بہت کوشش و انہماک کے ساتھ اور بہت مرکوز توجہ کے ساتھ وہ درجے کو ایسی باتیں بتاتے ہیں جن میں کوئی لفظ بدلا نہیں جا سکتا اور کوئی لفظ بڑھایا گھٹایا بھی نہیں جا سکتا۔ یہ حسابی کتابی تدریس بہت معلّمانہ اور پُر از معلومات ہوتی ہے۔ اس اندازِ تعلیم و تادیب میں اگرچہ کیف آوری کم ہوتی ہے۔ لیکن روکھا پھیکا پن بالکل نہیں ہوتا۔ مجنوں درجے میں کہنے کی باتیں پہلے سے سوچ کر مرتّب کر لیتے ہیں۔ میری باتوں میں آمد زیادہ ہوتی ہے اور وہ گویا اپنے آپ کو خود مرتّب کرتی جاتی ہیں۔ میں کبھی کبھی مجنوں کو یہ کہہ کر چھیڑتا ہوں کہ تم تو اس شدّ و مد سے اپنے لیکچر کی تیاری کرتے ہو کہ اپنے پیشے کو جان کا جنجال بنا لیا ہے۔ پورے کالج پر بلکہ کالج کے پورے اسٹاف پر بھی مجنوں کا ایک رعب رہتا ہے۔ کچھ دنوں کے لئے مجنوں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پروفیسر ہو کر چلے گئے تھے۔ میں نے مجنوں سے پوچھا کہ علی گڑھ سے چلے کیوں آئے۔ اس کے جواب میں مجنوں نے بڑی مزے دار بات کہی۔ کہنے لگے کہ بھائی جہاں خالی مسلمان ہی مسلمان رہتے ہوں، وہاں کسی کو پڑھنے لکھنے سے کیا غرض۔ اگر مجنوں کا یہ کہنا غلط ہے تو یہ لطیفہ سنانے کا جواز میں یہی کہہ کر دے سکتا ہوں کہ "نقلِ کفر کفر نہ باشد"۔

مجنوں سے متعلق کچھ اور لطیفے پیش کرتا ہوں جو ان کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ مرزا یگانہ کی شاعری کے مدّاح ہیں اور مجنوں دونوں رہے ہیں، بلکہ مجنوں نے تو اپنی تحریروں میں کئی موقعوں پر جی کھول کر ان کی شاعری کو سراہا ہے۔ چھ سات برس پہلے کی بات ہے کہ مرزا یگانہ کو مجنوں نے گورکھپور کے مشاعرے میں بلایا اور ان کا بہت پُرتپاک خیر مقدم کیا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ مرزا یگانہ اپنا بہترین و بلند ترین دین اردو کو دے چکے تھے۔ اور اب بجائے یگانہ شاعری کے یگانہ آرٹ کے علمبردار ہو گئے تھے۔ جب مجنوں سے پوچھا گیا کہ یگانہ صاحب کے نئے کلام پر آپ کی کیا رائے ہے تو مجنوں نے کہا کہ "اب ان کی شاعری تھوڑی کر رہ گئی ہے"۔ پڑھنے والے اس فقرے کا مطلب جو چاہیں لگائیں۔

ایک بار ایک صاحب نے جو میرے اور مجنوں دونوں کے معتقد و مدّاح تھے میری اور مجنوں کی دعوت اپنے یہاں کی۔ مجنوں جانا نہیں چاہتے تھے لیکن میرے اصرار سے راضی ہو گئے۔ جب دعوت کھا کے ہم لوگ پلٹے تو مجنوں نے مجھ سے اچانک طور پر یہ کہا کہ "یہ باتیں مجھے سخت ناپسند ہیں" میں نے پوچھا

"کیا ہوا؟" کہنے لگے "تھرماس بالکل آج ہی خرید اگیا تھا، ہم لوگوں کو مرعوب و متاثر کرنے کے لئے۔" وہ کافی غصّہ ہوکر بول رہے تھے۔ لیکن ہنسی کے مارے میرا بُرا حال ہوگیا۔

گورکھپور کے ایک نو عمر شاعر جنہیں خاص حلقوں میں کافی شہرت مل چکی تھی، اپنی نظموں کی فرضی محبوبہ کا جب جب ذکر کرتے تھے تو اس فرضی محبوبہ کے لئے صرف ایک لفظ استعمال کرتے تھے۔ وہ لفظ تھا محترمہ۔ مجنوںؔ اس لفظ کی تکرار کے کچھ حد تک تو حامل ہو سکے، مگر بعد کو ان سے نہ رہا گیا۔ کہنے لگے کہ اُردو میں صرف 'والدہ محترمہ' مستعمل ہے۔

یوں تو مجنوںؔ نے شاعری شروع کر کے بہت جلد اسے ترک کر دیا۔ لیکن ان کی نظر بہت تیز ہے۔ اُردو کے ایک چوٹی کے شاعر نے انہیں اپنا یہ مطلع سنایا

اپنا ہی سا اے نرگسِ مستانہ بنا دے
میں جب تجھے جانوں مجھے دیوانہ بنا دے

مجنوںؔ نے فوراً کہا کہ نرگسِ مستانہ یا نرگس دیوانہ نہیں ہوتی۔ شاعر مذکور کو اپنا مطلع بدلنا پڑا۔

حضرت اصغرؔ گونڈوی مرحوم کچھ موٹے تازے اور کافی تن و توش کے آدمی تھے۔ ایک بار میں نے مجنوںؔ سے کہا کہ یار اصغرؔ کے کئی اشعار میں بہت سوز و گداز ہے۔ مجنوںؔ نے منہ بنا کر کہا کہ 'سوز ہو یا نہ ہو گداز ضرور ہے۔'

مجنوںؔ کے منعقد کئے ہوئے مشاعرے یادگار ہوتے ہیں۔ شعراء اور پورا مجمع یہ محسوس کرتا ہے کہ مجنوںؔ صاحب کلاس لے رہے ہیں۔ یعنی کیا مجال کہ کسی سے کوئی بے قاعدگی سرزد ہو۔ اُن کی شخصیت ان کے اندازِ تدریس و طرزِ تحریر کی طرح ان کے مشاعرے بھی بہت جچے تُلے ہوتے ہیں۔ شاعروں کی جی کھول کے خاطر کرتے ہیں، لیکن کچھ شاعروں کی خفیف الحرکتی سے وہ بجا طور پر جھلا جاتے ہیں۔ مجنوںؔ شراب کے عادی کبھی نہیں ہوئے، اور اب تو رو زاہد و شب باہتاب میں بھی وہ اس طرف راغب نہیں ہوتے، مگر جب میں ان کا مہمان ہوتا ہوں تو وہ مجھے بمبئی ہوٹل ضرور لے جاتے ہیں اور اچھی سے اچھی شراب سے میری خاطر کرتے ہیں

مجنوںؔ کے کچھ تنقیدی فقروں کی نوک پلک دیکھئے۔ مثلاً "غالبؔ بڑا پاجی شاعر ہے۔" جس کا مفہوم یہ ہے کہ جس نے اس کی تقلید کی، وہ خراب ہو کر رہ گیا۔ "غزل ایک بہت کثیر صنفِ سخن ہے۔" "کثیر کا لفظ دعوتِ فکر دے رہا ہے۔" "حالیؔ ماتھے پر بل ڈالے بغیر سلامت روی سے اپنی نثر لکھتے چلے جاتے ہیں۔" کس خوبی سے حالیؔ کے مزاجِ نثر نگاری کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ایک بار میں شبلیؔ کے مقابلے میں محمد حسین آزادؔ کی نثر نگاری کی حمایت کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بحث جاری رہنے کے بعد مجنوںؔ نے کہا "آزاد نے لکھا ہی کیا ہے؟" کس خود اعتمادی سے مجنوںؔ نے اپنی بات کہی۔

ایک بار میں نے مجنوںؔ سے پوچھا کہ بھائی تمہارے والد صاحب نے جو کرگھوں کے کپڑوں کا کاروبار کیا ہے وہ کیسا چل رہا ہے، مجنوںؔ کہنے لگے کہ جب تجارت میں تصوّف کو دخل دیا جائے گا تو کاروبار کا پھلنا پھولنا معلوم۔ میں نے کہا بھائی اس کا کیا مطلب؟ فرمانے لگے کہ والد صاحب نے کئی ہزار کا سوت پہلے سے خرید رکھا تھا۔ اب سوت کی قیمت دُگنی تگنی ہو گئی ہے۔ لیکن والد صاحب اس سُوت سے تیار شدہ کپڑوں کی قیمت بڑھانے کو بالکل تیار نہیں۔

جاڑوں کے دن تھے۔ اسلامیہ کالج گورکھپور میں مجنوںؔ کے اہتمام سے ایک مشاعرہ ہوا۔ کئی شعراء مجنوںؔ کے مہمان تھے۔ جن میں میں بھی شامل تھا۔ ذوقیؔ جو اپنی ایکٹنگ اور نقالی کے لئے بہت مشہور و مقبول ہیں، وہ بھی تھے۔ بارہ بجے رات کے قریب مجنوںؔ صاحب کے ساتھ ان کے گھر ہم لوگ واپس آئے۔ اور سب لوگ ابھی بہت دیر جاگنے کے موڈ میں تھے۔ مجنوںؔ صاحب کی لائبریری میں انگیٹھی جلوائی گئی، اندر سے چائے منگوائی گئی۔ اور ذوقیؔ نے کئی زبانوں میں اپنی نقالی شروع کر دی جس میں ایک زبان پشتو بھی تھی۔ ہم لوگوں کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہوا جا رہا تھا۔ پاس ہی مجنوںؔ صاحب کا ہندو ملازم ستر برس کا چوکیدار لیٹا ہوا اونگھ رہا تھا۔ قہقہوں کا شور سن کے وہ چونک اٹھا اور کہنے لگا کہ "تم لوگ شور کر دے۔" صبح جب مجنوںؔ صاحب اٹھیں گے تو جو بات ہوگی

تم لوگوں نے مچا رکھی ہے اس کا مزا وہ تم لوگوں کو چکھا دیں گے" لطف یہ تھا کہ مجنوں صاحب سب سے زیادہ شور مچا رہے تھے۔ جس کی اس غریب کو خبر نہ تھی۔

میرے اور مجنوں کے درمیان کئی بار جھڑپیں بھی ہو گئی ہیں۔ ایک بار جب مجنوں گورکھپور رہتے تھے اور میں الہ آباد تو ڈاک پر بھی ہم لوگ ایک دوسرے سے خوب لڑے۔ منہ سے لڑتے تو منہ تھک جاتا لیکن دونوں کے قلم جلد نہ تھکے۔ اور خوب چلی کئی ہم لوگ ایک دوسرے کو لکھتے رہے —— دونوں کا غصہ جتنا بڑھتا جاتا تھا اتنی ہی باہمی محبت بھی عود کرتی چلی آتی تھی۔ اور دونوں اپنے غصہ بھرے خطوں میں لکھتے تھے کہ خیر دوستی اور تعلقات تو ختم نہیں ہو سکتے، لیکن یہ باتیں بہت بری ہیں۔ کئی خطوں کے بعد یہ لڑائی بند ہوئی۔ لیکن تحریری صلح کے ساتھ نہیں۔ بلکہ ہم دونوں خطوط کے ذریعے لڑ جھگڑ کر چپ ہو رہے۔ اس بات کے کئی مہینوں بعد مجنوں ایک دن اچانک میرے گھر الہ آباد وارد ہو گئے۔ میں غسل خانہ میں تھا۔ اور ان کے آنے کا شان و گمان بھی مجھے نہ تھا۔ وہ میرے ملازم کو چائے بنانے کا حکم دے رہے تھے۔ اور غسل خانہ میں ان کی آواز آ رہی تھی۔ میں جلدی نہا کے باہر نکل آیا۔ ہم دونوں دیوانے پھر مل بیٹھے تھوڑی دیر تک خوب گزرتی رہی۔ پھر مجنوں نے سلسلۂ استفسار شروع کر دیا، یوں کہ "جناب آپ نے مجھے میرے متعلق اپنے خطوط میں یہ یہ باتیں کیوں لکھیں"؟ میں نے جواب دیا کہ غصے میں اگر جھوٹ الزامات نہ لگائے جائیں تو غصہ کیسے قائم رہے اور غصے کا لطف کیسے آئے؟ اب باقاعدہ صلح ہو گئی۔

مجنوں کی شخصیت کئی لحاظ سے مجھ سے بہت مختلف ہے۔ انہیں سیر و سیاحت کا بڑا شوق ہے۔ اور میرے لئے سفر سقر ہے۔ ہوٹلوں میں انہیں جنت کی بہار نظر آتی ہے اور مجھے دہشت ہوتی ہے۔ وہ گھر پر شراب پینے کے قائل نہیں۔ ہوٹل میں کھانا پینا گویا ان کی عمر بڑھا دیتا ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ اب تک ان کا اپنا کوئی گھر نہیں ہے۔ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ کنبے کے اور لوگوں سے الگ ہو کر رہنے کا انہیں موقع نہیں ملا۔ اس لئے ہوٹل ان کے لئے ایک خوشگوار فرار کا موقع بن جاتا ہے۔ چائے کا انہیں بڑا شوق ہے اور انہیں کی وجہ سے چائے پینا میری عادت ہو گئی۔ وہ پان کے بھی رسیا ہیں جیسا میں پہلے بھی لکھ چکا۔ جب سے میرے یہاں الہ آباد کبھی کبھی ان کا آنا ہوتا ہے تو وہ اپنا سب وقت مجھے نہیں دیتے۔ دو تین دن کے قیام میں بھی ان کے تانگے کا بل بیسوں روپے تک پہنچ جاتا ہے۔ الہ آباد کی خاص ہستیوں سے وہ مل چکے ہیں۔ اور میرے یہاں آ کر سب سے باقاعدہ جا کر ملاقات کرتے ہیں۔ میں اپنا تکیہ نہیں چھوڑتا۔ کیونکہ میں ایک بے دست و پا آدمی ہوں۔ پہلی ہی ملاقات میں مجنوں بڑے سے بڑے آدمی کو اپنا والہ و شیدا بنا لیتے ہیں۔ ڈاکٹر تارا چند۔ پنڈت جواہر لال نہرو۔ پروفیسر نعیم الرحمٰن مرحوم۔ پنڈت امرناتھ جھا۔ ان سب پر ان کی شخصیت کا جادو چل چکا ہے۔

جب جب میں گورکھپور جاتا ہوں تو مجنوں ہی کا مہمان ہوتا ہوں۔ گاڑی بہت صبح گورکھپور پہنچتی ہے۔ اپنے ملازموں اور بال بچوں کو وہ ہدایت کر دیتے ہیں کہ جب میں آؤں تو میری آسائش کا تمام انتظام وہ لوگ کر دیں۔ خود وہ دو گھنٹہ دن چڑھے اٹھتے ہیں۔ اور میں تمام ضروریات سے فارغ ہو کر بیوقوف بنا بیٹھا رہتا ہوں، تب کہیں آپ اندر سے تشریف لاتے ہیں۔ لیکن اس میں مجنوں کا ذرا بھی قصور نہیں۔ میں تو اپنی بے خوابی شام ہی سے غرقِ جام کر دیتا ہوں۔ مجنوں کی صحت اس کی انہیں اجازت نہیں دیتی۔ جوانی میں تو وہ بوتلیں پی کر ہضم کر جاتے تھے، لیکن اب شراب ان سے نہیں چلتی۔ بے خوابی کے شکار وہ بھی ہیں اس لئے کہیں رات رہے ان کی آنکھ لگتی ہے۔

ہم دونوں کے درمیان کبھی کبھی مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمۂ قرآن کا ذکر بھی اٹھا ہے۔ اور ہم دونوں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مولانا نے قرآن کو اپنے ترجمے میں نذرِ لغت، نذرِ عقلیت اور نذرِ قواعد کر دیا ہے۔ اور روحِ قرآن تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔ اسلام، اسلامیات سے بڑی چیز ہے۔ ایک بار میں نے مجنوں سے ایک ایسی بات کہی کہ اگر وہ بات میں کسی اور سے کہتا تو اس کی اندر کی سانس اندر اور باہر کی سانس باہر رہ جاتی، لیکن مجنوں نے فوراً مجھ سے اتفاق کیا۔ وہ بات یہ تھی کہ اردو کے بہت بڑے محسن ہوتے ہوئے بھی سر سیّد اردو کے سب سے بڑے دشمن تھے۔ آگے نہ پڑھئے۔ رک کر سوچئے کہ

میرا اور مجنوں کا مفہوم کیا تھا اب آپ سوچ چکے ہوں گے اور بات سمجھ میں نہ آئی ہوگی - ہم لوگوں کا مفہوم یہ تھا کہ اردو ادب کے کچھ حصوں میں ایک عالمگیر کیفیت، رمزیت، تحلیلِ قلب، سوز و گداز، جمالیاتی احساس اور وجدانی قدریں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔ سرسید نے ان تمام قدروں کو نذرِ تدبّر کر دیا۔ انہوں نے اُردو کو نذرِ ملّت کر دیا۔ اور علی گڈھ کی فضا میں ایک صحافتی اور محض علمی و تاریخی ادب کے لئے قدر شناسی کا احساس کسی قدر بچ رہا۔ اُردو ادب کا وہ حصہ جو حالی و قال سے لبریز ہے اُسے سرسید کی سرپرستی نہیں ملی۔ صرف معاملت جس حصے میں ہے اُسی حصے کو سرپرستی ملی۔ یہ امرِ واقعہ ہے کہ سرسید کے زمانے میں عام طور پر اُردو ادب مائل بہ انحطاط تھا۔ لیکن ان کے زمانے میں غالبؔ اور غالبؔ کا ادب دونوں موجود تھے۔ جنہیں سرسید نے نظر انداز کر دیا۔ کوئی چاہے تو سرسید کی بڑی شخصیت کا صحیح اندازہ لگا کر اس امر کا فیصلہ کرے کہ میرؔ اور ان کے ہم نوا شعرا غالبؔ، مومنؔ، مصحفیؔ اور آتشؔ کے کلام کو سرسید اپنے دل میں جگہ دینے کا مذاق رکھتے تھے یا نہیں۔ آج ترقی پسند ادب کی تحریک نے اس گتھی کو بہت کچھ سلجھا لیا ہے کہ ادب میں وجدانی کیفیت اور حال و قال یا جمالیاتی صفات کے ساتھ ساتھ پیامِ عمل اور قومی بیداری کی تحریکیں بھی شامل کی جا سکتی ہیں۔

مجنوںؔ کے والد فاروقی صاحب سائنسدان ہوتے ہوئے بھی کبھی کبھی شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنا تخلص دیوانہ رکھا تھا۔ مجنوں نے کیا عجب۔ اسی رعایت سے اپنے تخلص کا انتخاب کیا ہو۔ ایک بار مجنوںؔ کے سب سے چھوٹے بھائی نے جس کی عمر مشکل سے اس وقت سولہ برس کی رہی ہوگی، ایک صحبت میں اپنی غزل سنائی۔ شاید ابھی اس لڑکے نے اپنا کوئی تخلص نہیں رکھا تھا۔ لوگوں نے رائے دی کہ تم اپنا تخلص خبطیؔ کر لو۔ خیر شاعری تو دیوانہ صاحب، مجنوںؔ صاحب اور خبطیؔ صاحب نے جاری نہیں رکھی۔ لیکن اس واقعہ نے ہمیں ایک لطیفہ ضرور دیا۔

مجنوںؔ کی شخصیت پر میں جیسا کچھ لکھ سکتا تھا لکھ چکا۔ اگرچہ مجھ سے وہ کافی چھوٹے ہیں لیکن ادبی میدان میں مجھ پر انہیں اوّلیت حاصل ہے۔ اور وہ میرے سینئر ہیں۔ ان کی ذہنی و ادبی نشو و نما بہت تیز رفتار رہی ہے۔ میری بہت سُست رفتار ——— جب مجنوں قریب قریب ڈیڑھ ہزار صفحات لکھ کر اپنا قلم ڈال چکے تھے اس وقت لوگ مجھ سے روشناس ہوئے، لیکن اگرچہ مجنوںؔ اب نسبتاً کم لکھتے ہیں پھر بھی ان کا ذہن شوقی صد بیدار ہے۔ آج بھی جب ان کے قلم سے کوئی چیز نکلتی ہے تو سب کی نگاہیں اُٹھ جاتی ہیں۔

میں یہ لکھ چکا ہوں کہ مجنوںؔ کو تنقید کی طرف مائل کرنے میں میں نے بھی حصہ لیا ہے۔ مجھے نثر نگاری کی طرف مائل کرنے میں مجنوںؔ کی شخصیت بہت حد تک کارگر رہی ہے۔ میری نثر مجنوںؔ کی نثر سے کافی مختلف قسم کی ہے۔ میں نے مجنوںؔ کی نثر کو سوئیفٹ کی نثر سے مشابہ بتایا ہے لیکن شاید یہ محض ایک نیم صداقت ہے۔ مجنوںؔ کی نثر ڈاکٹر جانسنؔ کی اس نثر سے مشابہ ہے جس میں عقلِ عام ذہانت یا GENIUS کے مقامات تک پہنچ گئی ہے۔ اور جس کی بہترین مثال شیکسپیئر کے ڈراموں کی شرح میں جانسنؔ نے پیش کی ہے۔ لیکن ڈاکٹر جانسنؔ کی کتاب حیات شعرا میں جس طرح جانسن کہیں کہیں بہک گیا ہے مجنوںؔ اپنی تنقیدوں میں ایک جگہ بھی نہیں بہکے۔ عقلی تنقید کو مجنوںؔ نے ایک تاثری صفت عطا کی ہے اور ان کے تنقیدی ادب کو ان کے تمام کارناموں میں قدرِ اوّل کی چیز تسلیم کیا جائے گا۔ میں خوش ہوں کہ اس طرف میں نے مجنوںؔ کو راغب کر دیا۔

کئی لحاظ سے میں مجنوںؔ کو اپنے آپ سے ایک بہتر انسان سمجھتا ہوں۔ وہ غلط باتوں پر جھلاہٹ کی حد سے آگے نہیں بڑھتے۔ لیکن غالبؔ کی طرح یا میری طرح غیر مہذب الفاظ میں انہوں نے کبھی اظہارِ عتاب نہیں کیا۔ شاید یہ بہت سے لوگوں کو نہیں معلوم کہ بسا اوقات غالبؔ شرمناک گالیاں بکنے کے بھی مرتکب ہو جاتے تھے۔ جس سے اُن کی عظمت ہماری نظروں میں کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ مجنوںؔ کی شخصیت میں ایک باقاعدگی ہے جس کی میرے یہاں بہت کمی ہے۔ ایک امر میں مجنوںؔ سے میرا کچھ اختلاف بھی ہے۔ بہت سے ہندوؤں کی تنگ نظری یا تعصب یا مسلم آزاری کا ذکر کرتے ہوئے مجنوںؔ بسا اوقات ہندو قوم سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ یہ مایوسی غالباً ان کی ایک مستقل کیفیت بن چکی ہے۔ میں بھی ہندوؤں کی بہت سی بدتمیزیوں، حماقتوں اور ذلالتوں کا شدید احساس رکھتا ہوں لیکن میرا عقیدہ یہ ہے کہ ہندو قوم نئے سرے سے مہذب

اور متمدن ہوگی۔ اور اپنی کئی لعنتوں سے آزاد ہو جائے گی۔ مجنوں بھی ہندوؤں سے مایوس ہوتے ہوئے غالباً بالکل مایوس نہیں ہوئے ہیں کہ ہندو قوم نئی تہذیب کو جلد اپنا سکے۔ آمین۔

مجنوں کے سر پر ابھی بفضلہ باپ کا سایہ ہے۔ وہ اپنے سب بھائیوں کے بڑے بھائی ہیں اور شاید ان کی تمام بہنوں میں صرف ایک بہن ان سے بڑی ہے۔ پریوار کے تمام مرد عورتوں سے مجنوں کے تعلقات نہایت شگفتہ ہیں۔ وہ ایک سعادت مند فرزند، محبت کرنے والے بھائی، پرخلوص شوہر اور پُرشفقت باپ ہیں۔ انتہائی سنجیدہ ہونے کے باوجود ان کی طبیعت میں کسی قدر شرارت آمیز ظرافت بھی ہے۔ ایک اور لطیفہ یاد آیا الٰہ آباد کے ایک مشاعرے میں اتفاق سے سرحد کے ایک ہندو شاعر شریک ہوگئے تھے۔ ان کی غزل میں بہت بھولی بھالی مگر ہنسانے والی باتیں موجود تھیں اور قریب قریب ہر شعر میں رب العالمین کا لفظ ضرور آتا تھا — اب مجنوں کا بالکل لڑکپن کا زمانہ تھا۔ یعنی وہی زمانہ جب وہ میرے پاس رہ کر ایف۔ اے میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ دو تین شعر سننے کے بعد مجنوں نے کہا کہ رب العالمین کے لفظ کو اگر آپ اپنا تخلص بنائیں تو بہت اچھا ہو۔

ہم دونوں کی دوستی کو اب قریب قریب تیس برس ہونے کو آئے۔ شروع ہی سے مجنوں کو میں احمد صدیق نہ کہہ کر ہمیشہ مجنوں کہہ کے مخاطب کرتا ہوں اور وہ مجھے ہمیشہ رگھوپت کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ ملاقات کے پہلے دن مجھے بحیثیت فراق کے کوئی نہیں جانتا تھا اور وہ مجنوں کے نام سے مشہور ہو چکے تھے۔ یا کم از کم ان کا عجیب و غریب لیکن نہایت مناسب تخلص گورکھپور میں تو مشہور ہو ہی چکا تھا۔

ڈاکٹر زورؔ

رفیعہ سلطانہ

کہتے ہیں اکبر آباد (آگرہ) کی سرزمین دو چیزوں کی وجہ سے مشہور ہوئی۔ ایک تاج محل، دوسرے غالبؔ۔ میرے خیال میں آنے والے دنوں میں حیدرآباد بھی دو چیزوں کی بنا پر یاد کیا جائے گا۔ ایک اجنٹا ایلورا کے غار اور دوسرے ڈاکٹر زورؔ۔ جن میں سے ایک ہمارا تہذیبی ورثہ ہے اور دوسرا ادبی۔ موخر الذکر کی قدر و قیمت صرف اس سبب سے نہیں کہ انہوں نے ادب میں مفید اور بیش بہا اضافے کئے بلکہ اس لئے کہ انہوں نے قدیم دکنی دور کو جو صفحۂ قرطاس سے قریب قریب مٹ چکا تھا از سرِ نو زندہ کیا۔ اس سلسلے میں خود بھی کام کیا اور دوسروں سے بھی کام لیا۔ اگر زورؔ صاحب اس طرف توجہ نہ کرتے تو ولیؔ سے پہلے کا تقریباً ڈیڑھ سو برس کا وہ ادبی سرمایہ جو محمد قلیؔ، وجہیؔ، ابن نشاطیؔ، غواصیؔ، رستمیؔ، خوشنودؔ، قطبیؔ، فائزؔ، تانا شاہ، فیروزؔ، محمودؔ جیسے اساتذۂ فن کے کارناموں سے درخشاں ہے، آج گوشۂ گمنامی میں پڑا ہوتا۔ ان معنوں میں وہ اسم بامسمیٰ ثابت ہوئے۔

حضرت غوث اعظم "محی الدین" عبدالقادر جیلانیؒ (جن کے نام پر ڈاکٹر زورؔ کا نام محی الدین رکھا گیا) کی وجہ تسمیہ کے متعلق ایک بڑی دلچسپ حکایت ان کی ایک قلمی سوانح میں لکھی ہے۔ حکایت یوں شروع ہوتی ہے کہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ آپ کا لقب "محی الدین" کیسے ہوا تو آپ جواب دیتے ہیں "سنہ ۵۱۱ھ جمعہ کے روز جس وقت میں سفر سے بغداد لوٹا تو ایک بیمار کو دیکھا جس کا رنگ متغیر اور بدن لاغر تھا۔ اس نے مجھے سلام کیا اور میرے پاس بیٹھنے کی خواہش کی۔ میں نے دیکھا کہ میرے قریب بیٹھتے ہی اس کا بدن موٹا، رنگ صاف اور صورت بہتر ہوگئی۔ میں اس سے ڈر گیا تو اس نے کہا "آپ مجھے نہیں جانتے؟ میں 'دین' ہوں۔ میں مرنے کے قریب تھا جب آپ نے دیکھا۔ اب خدائے تعالےٰ نے مجھے زندہ کیا اس لئے آپ 'محی الدین' ہیں یعنی 'دین کو زندہ کرنے والے'۔"

میرے خیال میں ڈاکٹر زورؔ کے سوانح نگار کو اس قصے کے لکھتے وقت ذرا سی تبدیلی کرنی پڑے گی اور "دین" کے بجائے "ادب" لکھنا پڑے گا۔ کیونکہ انہوں نے بھی قدیم اردو ادب کو موت کے منہ سے چھڑایا ہے اور دکن کے اردو ادیبوں اور شاعروں میں خود اعتمادی پیدا کی ہے۔ یہ انہی کی ذہانت اور کوشش کا طفیل ہے کہ آج دکن میں اردو ادب کا طوطی بولتا ہے۔ شاید اسی مناسبت سے دکن کے مشہور رباعی گو اور صاحب عرفان شاعر حضرت امجدؔ نے اپنے قلم سے خوش خط لکھ کر ایک قطعہ دیا ہے جو اس وقت ان کے کتب خانے میں آویزاں ہے۔ وہ قطعہ یہ ہے :

این مسمیٰ زندہ ماند ہمچو اسم
محیِ اُردو ہست محیُ الدینِ ما !

دوستاں را یاد داریم از دعا

ہست اے امجد ہمیں آئین ما!

اگر آپ ڈاکٹر صاحب سے ملنا چاہیں تو حیدرآباد میں خیریت آباد کے اسٹیشن سے گذر کر آگے سوماجی گوڑہ کے خوبصورت اور پرسکون محلے میں چلے جائیے وہاں لال رنگ کی ایک شاندار عمارت دکھائی دے گی جس پر لکھا ہوگا "رفعت منزل" (یہ ڈاکٹر صاحب کے خسر نواب رفعت یار جنگ صوبہ دار اورنگ آباد کی تعمیر کردہ کوٹھی ہے)؛ اس کے سامنے سڑک کے قریب ان کی دختر یعنی ڈاکٹر صاحب کی بیوی کی دو منزلہ کوٹھی ہے۔ کوٹھی میں داخل ہونے سے پہلے بغلی حصہ میں ادارہ ادبیاتِ اردو کا شاندار کتب خانہ اور دفتر ملے گا جس پر گلابی رنگ کی استرکاری کی ہوئی ہے اور جس میں اردو کے ماضی، حال، مستقبل کا سارا ادب مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں، مسودوں، نقشوں اور تاریخوں کے ساتھ موجود ہے۔ سامنے باغ میں ڈاکٹر صاحب کے چار پانچ خوبصورت بچے آپ کے استقبال کو موجود رہیں گے جن میں سے بڑے صاحب تو نہایت سنجیدگی سے (کیونکہ اس کم عمری میں وہ اپنے دادا کی درگاہ کے سجادہ نشین کے فرائض انجام دینے لگے ہیں)، یا تو موٹر کی دیکھ بھال کرتے یا پھر باغبانی میں مشغول نظر آئیں گے۔

دوسرے بچے جن کی عمروں کی اوسط ۳ سے ۸ سال تک ہے، باغ میں تتلیاں پکڑتے یا پھول توڑتے نظر آئیں گے۔ ان میں سے ڈاکٹر صاحب کا منجھلا لڑکا "صفی الدین" جو ذہانت اور شکل میں ڈاکٹر صاحب کا چھوٹا نمونہ معلوم ہوتا ہے (کیونکہ اس کی بھی ویسی ہی فراخ بڑی بڑی ذہین آنکھیں، سرخ و سفید رنگ، چوڑا ماتھا اور سر پر سیاہ سُرخ گھنگھریالے بال ہیں) سامنے آکر آپ سے پوچھے گا:

"آپ بابا سے ملنے آئے ہیں؟ چلئے اندر!"

اندر وسیع ڈرائنگ روم میں طلائی کام کی سُرخ مخمل کی گدے والی کرسیاں اور قرونِ وسطیٰ کی مصوری کے شاہکار مجسمے اور تصویریں آپ کو خاص انداز میں سجی ملیں گی۔ ساتھ ہی بڑی قد آدم الماریوں میں صرف اردو ہی کی نہیں انگریزی اور فرانسیسی کی بھی قدیم اور دورِ حاضر کی مشہور تصانیف نظر آئیں گی لیکن ڈاکٹر صاحب یہاں نہیں ملیں گے، اس سے متصل چھوٹے کمرے میں جہاں ایک جھولنے والی کرسی، بڑی سی میز اور تخت بچھا ہوا ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب سفید تن زیب کے کرتے اور چوڑے پائنچے کے پائجامہ میں مسکراتی ہوئی آنکھوں سے آپ کا استقبال کریں گے۔ سامنے پاندان رکھا ہوگا جس میں سے ایک پان وہ چبا رہے ہوں گے اور دوسرے کی تیاری میں مشغول ہوں گے۔ پھر آپ سے پوچھیں گے:۔

"کیا منگواؤں چائے یا کافی؟"

چائے آنے کے بعد باتیں بھی ہوتی جائیں گی۔ اردو ادب کے متعلق کیسا ہی سوال کریں ڈاکٹر صاحب کے پاس اس کا جواب ایسا موجود رہے گا جس پر آپ کو شبہ ہوگا کہ انہوں نے اسے پہلے سے تیار کر رکھا تھا۔ پی ایچ ڈی کے سلسلے میں مجھے ایک مخطوطے کے سنہ تالیف کے بارے میں بہت پریشانی تھی۔ کیونکہ اس میں ایک جگہ کاتب نے سنہ ۸۰۰ھ لکھا تھا اور مرتب نے سنہ ۹۵۶ھ درج کیا تھا۔ میرے نگران سروری صاحب نے اس کے سنہ کی تحقیق میرے ہی ذمہ کر دی۔ کیونکہ یہ بڑا اہم مخطوطہ تھا۔ میں ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچی۔ انہوں نے دو ہی سطریں پڑھی تھیں کہ کہہ دیا "یہ ساتویں صدی ہجری کی تصنیف ہے۔" میں نے پوچھا "کیسے؟" کہنے لگے "معلوم ہوتا ہے آپ نے پورا مخطوطہ نہیں پڑھا۔" (حالانکہ میں اسے تقریباً چاٹ گئی تھی) وہ کہنے لگے "دیکھا نہیں اس میں مخدوم شرف الدین یحییٰ منیری کا ذکر ہے جو ساتویں صدی کے تھے۔" میں ان کے استخراج کے طریقے پر حیران رہ گئی۔ سنا ہے جب انہوں نے دکن کے نامور بزرگ اور محمد قلی کے وزیرِ اعلیٰ میر محمد مومن کی حیات لکھی اس وقت بھی ایسے ہی تفحص اور تجسس سے کام لیا تھا اور قصبات اور دیہات میں گھوم کر کتبات اور اسی قسم کے آثار سے مدد لے کر ان کے حالات یکجا کئے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کی گھریلو نشستوں کی ایک اور بھی خصوصیت ہے۔ ملنے والوں میں اگر کوئی خاتون ہو تو وہ اس کمرے میں مسز زور اور بچوں کو بھی بلا لیتے ہیں۔ پھر گفتگو سنجیدہ ادبی موضوعوں سے ہٹ کر لباس اور زیور جیسے ہلکے پھلکے موضوعات کی طرف پلٹ جاتی ہے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے

کہ ڈاکٹر صاحب کا جمالیاتی ذوق کافی بلند ہے۔ مسز زور کہتی ہیں کہ خواتین کے لباس اور زیور کے متعلق وہ بڑے اچھے مشورے دیتے ہیں۔

یہ تو ڈاکٹر صاحب کی گھر کی بیٹھک تھی۔ اگر انہی کو آپ کچھ دیر بعد کالج میں جا کر دیکھیں تو اعلیٰ گبرڈین، اولن، سرج کے سوٹ اور شارک اسکن کے پینٹ اور بش شرٹ میں پہچاننا مشکل ہو جائے گا۔ اس وقت وہ فائیلوں کے انبار پر دستخط بھی کرتے جائیں گے، کالج کے انتظامی امور بھی طے کرتے جائیں گے اور ساتھ ہی اپنے کسی دوست مثلاً سروری صاحب (صدر شعبۂ اردو) یا ٹوپا صاحب (رجسٹرار جامعہ عثمانیہ) یا مجید صدیقی صاحب (صدر شعبۂ سیاسیات)، یا نصیر الدین ہاشمی صاحب سے اردو کی کسی میٹنگ یا کسی بڑے جلسے یا مسئلے کے متعلق تبادلہ خیال بھی کرتے جائیں گے، یہاں یہ ڈاکٹر صاحب ہی کی خصوصیت ہے کہ وہ بیک وقت کئی کام کر سکتے ہیں۔

ان سے ملنے اور گفتگو کرنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ گھٹی ہوئی فضا سے ایکدم کھلے میدان میں آ گئے ہیں، جہاں ہر طرف پھول ہیں، رنگینی ہے، مسرت ہے، غم و فکر کا نام و نشان بھی نہیں۔ وہ خود بھی کبھی پریشان نہیں ہوتے۔ دوسروں کو بھی پریشان نہیں کرتے۔ مجھے یاد ہے ایم۔اے کے آخری سال میں میں اپنے مقالے کے مواد کے سلسلہ میں کافی پریشان تھی۔ یوں بھی میری عادت ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی بات سے بہت جلد پریشان ہو جاتی ہوں۔ ڈاکٹر صاحب مجھے ہمیشہ ڈھارس دیتے اور کہتے کہ "اتنی سی بات سے تم پریشان ہو جاتی ہو، زندگی میں تو اس سے سخت مرحلے آتے ہیں۔ انسان کو ہمیشہ ہنستے کھیلتے مشکلات کا مقابلہ کرنا چاہئے۔" دوسری ملاقات میں ایک چھوٹا سا چینی کا مجسمہ ایک ہنستے ہوئے آدمی کا لا دیا اور کہا کہ "اس سے ہنسنے کا سبق سیکھو اور اسے ہمیشہ میز پر رکھا کرو۔"

یہ عجب بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو دیکھ کر اکثر ادبی شخصیتوں کی طرح مجنوں کی انگلیوں اور لیلیٰ کی پسلیوں کا خیال نہیں آتا۔ بلکہ ان کے سُرخ و سفید رنگ، سیاہ روشن چمکیلی آنکھوں اور بھرے ہوئے جسم کو دیکھ کر کسی مشہور ٹانک کا اشتہار یاد آتا ہے جس پر لکھا ہوتا ہے "استعمال کے بعد"۔۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک نہ آنکھوں پر عینک چڑھی۔ نہ سر ہی گنجا ہوا۔ اگرچہ وہ اس وقت چالیس پینتالیس سال کے لگ بھگ ہوں گے لیکن جوانی کی بہار بڑھاپے کی خزاں میں تبدیل نہیں ہونے پائی۔ ڈاکٹر صاحب ابھی جوان ہیں، ان کی امیدیں ابھی جوان ہیں، ان کے حوصلے ابھی جوان ہیں اور ان کی جوانی نے اردو ادب کو جوان رکھا ہے۔ زندگی کے متعلق ان کا نقطۂ نظر رجائی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں زندگی کے ہر مرحلہ میں کامیابی اور ہر بازی میں فتح ہوئی۔

بچپن ہی سے خوش قسمتی ان کے ہم رکاب رہی۔ انہوں نے حیدرآباد کے مشہور بزرگ سید شاہ ابوالبرکات غلام محمد زعم قادری الرفاعی کے یہاں جنم لیا جو دکن کے مشہور صوفی اور ولی سید شاہ علی سانگڑے سلطان مشکل آسان قندھاری کی اولاد میں سے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے والد بھی اپنے وقت کے زبردست ادیب اور شاعر تھے لیکن آخر عمر میں سب کچھ چھوڑ کر اہل اللہ بن گئے۔ ڈاکٹر صاحب بچپن ہی سے غیر معمولی ذہین تھے۔ سنہ ۱۹۲۷ء میں ایم۔اے میں غیر معمولی امتیاز سے کامیاب ہوئے۔ اپنے مضامین اردو و فارسی میں اوّل آئے۔ اس اعزاز کی بنا پر یورپی تعلیم کا سرکاری وظیفہ ملا۔ لندن یونیورسٹی میں آریائی زبانوں کے تقابلی مطالعہ اور اردو پر کام کر کے پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے اس مقالے کے متعلق ڈاکٹر ٹی گراہم بیلی صدر شعبۂ اردو لندن یونیورسٹی لکھتے ہیں:

> "مسٹر قادری کا مقالہ ادب کا گرانقدر کارنامہ ہے۔ یہ بڑی حد تک اچھی ہے! اس میں بہت سے ایسے ادیبوں کا تذکرہ ہے جن سے آج تک دنیا واقف نہیں تھی۔"

لطف یہ ہے کہ تین سال کا نصاب دو سال میں ختم کر لیا۔ اس ایک سال کو ضائع نہ کر کے پیرس کے صوتیاتی تحقیق کے ادارے میں شرکت کی اور وہاں دو سال رہ کر تجرباتی صوتیات پر کام کیا۔ اس کے نگران پروفیسر لائیڈ جیمز اور ڈینوس بلاک تھے۔ یہ بھی ان کی ذہانت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور لکھا:

> "جب یہ کام تکمیل کو پہنچے گا تو علمِ زبان میں ایک گراں قدر اضافہ ثابت ہوگا۔"

پروفیسر آر ایل ٹرنر پرنسپل اورینٹل سکول آف اسٹڈیز نے لکھا :

"انڈو آرین زبانوں کی تقابلی گرامر پر میں نے جو لکچر دیئے تھے ان میں سید محی الدین قادری
شریک رہے ۔ میں نے دیکھا کہ وہ ایک ذہین طالب علم ہیں اور انہیں اس موضوع
سے بہت دلچسپی ہے ۔"

پروفیسر سٹن حیدر آبادی طلبہ کے انگریز نگران کار کی رائے تھی :

"وہ ہمارے انتہائی ذہین طالب علموں میں سے ہیں اور ان کا کیرکٹر ایسا ہے کہ کوئی شخص
اس پر حرف نہیں رکھ سکتا ۔"

ذہانت کے بعد ڈاکٹر صاحب کے کردار کا دوسرا نمایاں وصف جوش اور ولولہ ہے ۔ وہ کبھی نہیں تھکتے ۔ ناامیدی کے کیسے ہی خوفناک بادل ہوں وہ کبھی ہمت نہیں ہارتے ۔ وہ اپنے طلبہ میں بھی یہی خصوصیات دیکھنا چاہتے ہیں ۔ ادب پر ان کی نظر بہت گہری ہے خصوصاً دکھنی ادبیات میں ان کے مقابل کوئی نہیں ٹھہر سکتا ۔ ادب ہی میں ان کے کارنامے قابلِ قدر نہیں، زبان کی تحقیق و تدقیق میں بھی انہوں نے جو گراں بہا خدمات انجام دی ہیں وہ بھلائے جانے کے قابل نہیں ۔ اب تک ان کی سو کے قریب کتابیں اور طویل مضامین چھپ چکے ہیں جن میں بعض کتابیں ایسی ہیں کہ ان کے کئی کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں اور ہندوستان کی مختلف جامعات کے نصاب میں شامل ہیں ۔

طلبہ کے لئے یہ اطلاع بھی شاید دلچسپ ہو کہ ڈاکٹر صاحب ہندوستان اور پاکستان کی تقریباً تمام یونیورسٹیوں میں اُردو کے ممتحن رہتے ہیں ۔ یوں تو وہ سہل انگار ہیں اور کسی کا دل نہیں دُکھاتے لیکن ان کی جانچ کا معیار کافی سخت ہے اس لئے کہ ان کی نظر سے اردو ادب کا کوئی گوشہ چھپا ہوا نہیں ۔ ادب کی جزوی تفصیلات سے بھی وہ باخبر رہتے ہیں اور طالب علم کسی صورت میں دھوکا نہیں دے سکتے ۔ جیسا کہ اکثر ممتحنین کے ساتھ ہوتا ہے ۔ چنانچہ ڈاکٹر مسعود حسن خاں نے پی ایچ ڈی کے لئے تاریخِ زبانِ اردو پر جب مقالہ پیش کیا اور وہ چھپ گیا ۔ اس میں ایک کھانچ باقی تھی ۔ انہوں نے اُردو کی ابتدا میں ہریانوی کو بڑا دخل دیا تو ڈاکٹر صاحب نے فوراً ایک مدلّل مضمون نقوش میں لکھ دیا ۔ پچھلے سال بمبئی کے ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی نے ولی گجراتی پر ایک مقالہ لکھا اور اس کو گجراتی ثابت کرنے کی کوشش کی ۔ ڈاکٹر صاحب نے ماہنامہ آجکل میں ایک دھڑکے کا مضمون لکھ کر چھپوایا جس میں اس کی غلطی ثابت کی ۔ اس ضمن میں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ان میں عربوں کی طرح ممکن ہے یہ عرب خون کا اثر ہو کیونکہ ان کے آباء و اجداد عربستان سے آئے تھے ، بڑی شدید عصبیت ہے ۔ وہ دکن اور دکھنیوں کے خلاف ایک لفظ بھی سننے کو تیار نہیں ۔ غالباً اسی محبت نے انہیں دکھنی ادب کو زندہ کرنے اور مجلس اشاعت دکھنی مخطوطات قائم کرنے پر اکسایا اور "سیر گولکنڈہ" اور "گولکنڈے کے ہیرے" جیسے افسانے لکھوائے ۔ جن کے لفظ لفظ میں دکن اور دکنیوں سے محبت کا اتھاہ سمندر کروٹیں لے رہا ہے ۔

یادش بخیر ۱۹۴۷ء کا وہ زمانہ آنکھوں کے سامنے ہے جب ہم ایم ۔ اے میں پڑھتے تھے اور ڈاکٹر زورؔ اور ڈاکٹر سید سجاد دہلوی جامعہ عثمانیہ میں اُردو کے پروفیسر تھے ۔ اُردو زبان کی ابتدا کے بارے میں دونوں میں بہت اختلاف تھا ۔ اور بڑا لطف آتا تھا ۔ کچھ دیر نہ گذرتی کہ ڈاکٹر سجاد اپنے مخصوص مستعلیق دھیمے لہجے میں سمجھاتے "اردو کا مبدا گنگ و جمن کا دوآبہ ہے" کہ اس کے بعد ہی کے گھنٹے میں زورؔ صاحب دبنگ آواز اور خالص دکنی لہجے میں گویا ہوتے "اگر یہ اردو کی ابتدا پنجاب سے ہوئی ہے لیکن اس کو بڑھانے اور سنوارنے کا سہرا دکن کے سر ہے ۔" یہ وہ زمانہ تھا جب دکن میں ملکی اور غیر ملکی کے نعرے زور و ر پر تھے حتیٰ کہ یونیورسٹی میں بھی ملکی اور غیر ملکی پروفیسروں کے جتھے بنے ہوئے تھے ۔ میں نے سُنا تھا اس سے قبل "بابائے اردو" ڈاکٹر عبدالحق اور ڈاکٹر زورؔ کے مابین وجہ اختلافات بھی یہی جھگڑا تھا ۔ ورنہ دونوں ایک ہی شمع کے پروانے تھے ۔

ان کا دشمن بھی اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ڈاکٹر زورؔ کی شخصیت میں غیر معمولی مقناطیسیت ہے ۔ بالکل وہی کیفیت جو شکسپیئر نے قلوپطرہ کے متعلق بتائی تھی کہ اس کے اطراف ایک قسم کا حلقۂ کشش (ZONE OF ENCHANTMENT) تھا ۔ جو بھی اس حلقہ میں آتا مسحور ہوئے بغیر نہ رہتا ۔

زورؔ صاحب کی شخصیت بھی کچھ اسی قسم کی ہے۔ ان کے حلقۂ احباب میں مرد بھی ہیں اور خواتین بھی۔ مرحومہ بیگم زین یار جنگ پرنسپل کلیہ اناث، سکینہ بیگم رحمت اللہ دختر خدیو جنگ، معصومہ بیگم حسین علی خان ایم ایل اے، محترمہ شاہجہان بیگم ایم ایل اے، محترمہ جہاں بانو بیگم صدر شعبۂ اردو کلیہ اناث، محترمہ لطیف النساء بیگم، محترمہ بشیر النساء بیگم بشیر، محترمہ صغرا بیگم ہمایوں مرزا، زینت ساجدہ ایسی خواتین تھیں اور ہیں جن کے قلوب میں ڈاکٹر صاحب کی محبت اور احترام پایا جاتا ہے۔

یہ انہی کی شخصیت کا سحر تھا جس نے حیدر آباد کے امیر الامرا سالار جنگ مرحوم جیسے کفایت شعار اور جزرس انسان کو اردو ادب کی اشاعت اور ترقی اور کتابوں کی فراہمی کے لئے لاکھوں روپے خرچ کرنے پر مجبور کیا اور حکومت حیدر آباد سے ادارۂ ادبیات اُردو کے لئے امداد حاصل کی۔

زورؔ صاحب خود کہتے ہیں وہ اچھے مقرر نہیں۔ لیکن جب بھی، جس وقت بھی انہیں بولنے پر مجبور کیا گیا ان کے پاس خیالات کا ذخیرہ نکلا۔

ڈاکٹر زورؔ کی زندگی پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک شخصیت نہیں، کئی شخصیتوں کا مجموعہ ہیں۔ صرف ادبی زندگی پر نظر ڈالی جائے تو نظر آتا ہے کہ وہ افسانہ نگار بھی ہیں، شاعر بھی، نقاد بھی اور محقق بھی۔ اگر تذکرہ نگاری میں کمال دکھایا ہے تو مضمون نگاری اور لسانیات کی طرف سے بھی آنکھیں نہیں موندیں ان سب چیزوں پر الگ الگ روشنی ڈالی جائے تو ہر ایک، بجائے خود ایک طویل مضمون بن سکتا ہے۔ ان سب میں صرف زورؔ صاحب کی شاعری ہی ایسی چیز ہے جس پر کچھ کہنا مشکل ہے، کیونکہ ان کی شاعری سے زیادہ ان کا تخلص مشہور ہے۔ لکھنے کی ابتدا انہوں نے تنقید سے کی جو اردو میں اس وقت ایک نئی آواز تھی اور ایک باضابطہ فن کی حیثیت سے اس پر کسی نے کچھ نہیں لکھا تھا۔ تنقید میں ان کی مندرجہ ذیل کتابیں مشہور ہیں:

(۱) ۱۔ روحِ تنقید ۲۔ تنقیدی مقالات ۳۔ تین شاعر ۴۔ روحِ غالب ۵۔ ادبی تاثرات

ان میں سے پہلی تصنیف "روحِ تنقید" گو زمانۂ طالب علمی کی یادگار ہے لیکن اسی سے ان کی سیرت کا آغاز ہوا اور یہی اردو کی پہلی تنقیدی کتاب ہے جو یورپی طرزِ تنقید سے اہلِ اُردو کو روشناس کرانے کا باعث ہوئی۔

(۲) تاریخِ ادب میں مشہور کتابیں یہ ہیں:

۱۔ اُردو شہ پارے ۲۔ اُردو کے اسالیب بیان ۳۔ عہدِ عثمانی میں اُردو کی ترقی ۴۔ داستانِ ادبِ حیدر آباد۔

(۳) سوانحی ادب میں قابلِ یادگار یہ ہیں:

۱۔ حیات سلطان محمد قلی قطب شاہ ۲۔ میر محمد مومن ۳۔ سرگزشتِ غالب ۴۔ سرگزشت حاتم گارسن دتاسی۔

(۴) ادبی تحقیق پر ڈاکٹر صاحب نے بطور خاص توجہ دی ہے اور حسبِ ذیل کتب ان کی اعلیٰ تحقیق کی مظہر ہیں:

۱۔ تذکرۂ گلزارِ ابراہیم ۲۔ دیوانِ زادۂ حاتم ۳۔ مرقع سخن جلد اول و دوم ۴۔ متاعِ سخن ۵۔ کیفِ سخن ۶۔ بادۂ سخن ۷۔ فیضِ سخن ۸۔ رمزِ سخن۔ ۹۔ مکتوباتِ شاد عظیم آبادی ۱۰۔ شاد اقبال ۱۱۔ قصص خوب ترنگ (بزبانِ فرانسیسی) ۱۲۔ ارشاد نامہ ۱۳۔ ابراہیم نامہ ۱۴۔ کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ۔

(۵) لسانیات جیسے مشکل موضوع پر سنیتی کمار چٹرجی اور گریرسن کے بعد ڈاکٹر صاحب ہی کے کارنامے سائنٹیفک مانے جاتے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ ہندوستانی لسانیات ۲۔ ہندوستانی صوتیات (بزبانِ فرانسیسی)، ۳۔ لسانیاتی مضامین کا مجموعہ (جو اس وقت زیرِ طبع ہے)

(۶) افسانوں کے مجموعے:

۱۔ سیرِ گولکنڈہ ۲۔ گولکنڈے کے ہیرے ۳۔ طلسمِ تقدیر

اس کے علاوہ انہوں نے ادارہ ادبیاتِ اُردو کے مخطوطات کے دو کیٹلاگ بھی تذکرۂ مخطوطات کے نام سے شائع کئے ہیں جن میں اعلیٰ درجہ کی تحقیق و تفتیش ظاہر کی گئی ہے۔

ان تصانیف میں "اردو شہ پارے" ان معدودے چند کتابوں میں سے ہے جو صدیاں گزرنے کے بعد بھی باقی رہیں گی۔ اس میں قدیم دور کے شاعروں کی

حیات اور کارناموں پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس کے پیش کرنے کا طریقہ ان کا اپنا ہے۔ یوں تو زور صاحب نے دو تین دہائیاں قبل لکھنا شروع کیا لیکن ان کی تحریروں کی شوخی اور رنگینی، نیز اسلوب کی جدت جدید دور کی یاد دلاتی ہے۔ "اردو شہ پارے" کے بعد "حیات محمد قلی قطب شاہ" ایسی تصنیف ہے جس سے خود مصنف کو بھی پیار ہے۔ یہ اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر سلطان محمد قلی قطب شاہ کی حیات ہے۔ صرف حیات ہی نہیں بلکہ اپنے دور کی مبسوط تاریخ بھی ہے جس میں قطب شاہی تمدن کی واضح تصویریں ہیں۔ کتب سوانح میں اس کو خاص اہمیت ہے۔ اس میں محمد قلی کے ذاتی حالات پیدائش، تعلیم، آغازِ شباب، شباب کی بدمستیاں، جوانی و رعنائی حتیٰ کہ اس زمانے کی عیدوں اور تیوہاروں پر بڑی واضح تفصیلیں ملتی ہیں۔ ساتھ ہی کلام پر بھی تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ یہ ڈاکٹر صاحب کا بڑا اہم کارنامہ ہے۔ ان کی دوسری تصنیف "حیاتِ میر محمد مومن" بھی اس سے کم پایہ کی نہیں۔ میر محمد مومن قطب شاہی عہد کے ایک وزیر، فارسی کے مشہور شاعر اور مذہب امامیہ کے مبلغ تھے۔ اس کا اندازِ بیان بھی بڑا دلنشین ہے۔

لیکن ڈاکٹر صاحب کی ادبی زندگی کا ایک پہلو جو لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہا، درحقیقت بڑا درخشاں ہے۔ وہ ہے ان کی افسانہ نگاری۔ زور صاحب کے علمی، ادبی اور تحقیقی کارناموں نے ان کی افسانہ نگاری کو پسِ پشت ڈال دیا ہے۔ حالانکہ ان کے افسانوں میں بڑا سحر ہے اور وہی حسن ہے جو اقبال کی مسجدِ قرطبہ والی نظم میں موجود ہے۔ یعنی اس میں حقیقت، تخیل اور فلسفہ کا بڑا دلکش امتزاج ہے۔ خصوصاً سیرِ گولکنڈہ کے افسانے "چاملم کی رقاصہ"، "اورنگ زیب"، "تاناشاہ"، "ننھی سانولی"، "سروِ صحرا"، "ملاپ خوشنود"، اردو زبان کے بے مثال افسانے ہیں۔ اگر زور صاحب کچھ اور نہ لکھتے تب بھی یہ کتابیں ان کا نام زندہ رکھنے کے لئے کافی تھیں۔ ان کی بڑی خوبی یہ ہے کہ انہیں پڑھ کر گولکنڈے کے حکمرانوں، امیروں اور عام باشندوں سے غائبانہ محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ ساتھ ہی اس دور کی تہذیب و تمدن اور معاشرت کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ یہ بڑے فن کار ہی کا کام ہے کہ وہ ناظر کے جذبات کو بھی اپنے جذبات میں شریک کر لیتا ہے۔ تخلیقی ادب کی کم مائیگی دیکھتے ہوئے مجھے افسوس ہوتا ہے کہ زور صاحب نے ناحق اچھی اور تخلیقی ادب کی لائن چھوڑ کر تنقید، تحقیق اور تاریخ میں اپنے کو الجھا لیا۔ کیونکہ ان کا قلم انسانی جذبات اور نفسیات کے اظہار کا خوب ملکہ رکھتا ہے۔ ان کے افسانوں کے مجموعے سیرِ گولکنڈہ کو پڑھ کر حضرت امجد اتنے متاثر ہوئے کہ بہت ہی جلی حروف میں ایک وصلی پر یہ قطعہ لکھ کر روانہ کیا جو ان کے کتب خانے کے ایک خوبصورت فریم میں آویزاں ہے :

دکھلائیے گا حمدِ الٰہی کے مناظر ‏ ‏ ‏ ‏ تا مدح کریں آپ کی ہم اور زیادہ
ہے زور کی تحریر میں کیا زورِ خداداد ‏ ‏ ‏ ‏ اللہ کرے زورِ رقم اور زیادہ

ان کی اس فنکاری کے باوجود ان کی زندگی فن کاروں کی سی غیر معتدل نہیں جیسا کہ میراجی، فراق وغیرہ کے متعلق سننے میں آتا ہے۔ وہ بڑی اپ ٹو ڈیٹ اور معتدل زندگی بسر کرتے ہیں اور مشرقی و مغربی دونوں طریقِ زندگی سے مانوس ہیں۔ جہاں آپ انہیں سوٹ بوٹ میں ملبوس کلب میں باتیں کرتے دیکھیں گے، وہیں وہ شیروانی اور رامپوری ٹوپی میں اپنے والد کی خانقاہ میں قوالی یا عرس کا انتظام کرتے ہوئے بھی ملیں گے۔ ان کی ان تمام علمی سرگرمیوں کو دیکھنے سے خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ میر کی طرح خلوت پسند آدمی ہوں گے۔ کیونکہ جو شخص بیس پچیس سال کی مدت میں تیس چالیس کتابیں لکھ سکتا ہے اسے سوائے لکھنے کے اور کسی طرف توجہ کرنے کی فرصت نہ ہو گی۔ لیکن ایسا نہیں، وہ "مجلسی آدمی" ہیں۔ ان کی گفتگو بڑی دلچسپ اور پُرلطف ہوتی ہے۔ موقع بموقع وہ اشعار کا بھی استعمال کرتے ہیں۔ حاضر دماغی میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ان میں "جرأتِ رندانہ" کی بھی کمی نہیں۔ ساتھ ہی وہ بلا کے خود اعتماد ہیں اور صرف "قلمے اور سخنے" ہی اردو ادب کی خدمت میں مشغول نہیں، عملاً بھی اس کی ترقی میں لگے ہوئے ہیں۔ مثلاً ادارۂ ادبیاتِ اردو کا قیام ان ہی کا کارنامہ ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل طلبہ کی طرف سے ایک مجلہ نکالنے کا خیال ان ہی کا تھا اور وہی اس کے پہلے مدیر بھی قرار پائے۔

مجلس اشاعتِ دکنی مخطوطات انہیں کی تحریک پر سالار جنگ نے بنائی اور ہزاروں کا گراں قدر عطیہ دیا۔ اس انجمن کے تحت دکنی اور قدیم مصنفین کے غیر مطبوعہ کارناموں کو منظرِ عام پر لایا گیا۔ ڈاکٹر زور نے کلیاتِ قطب شاہ، ارشاد نامہ (اردو کے قدیم صوفی شاعر برہان الدین جانم کی طویل مثنوی)،

اور ابراہیم نامہ (بیجاپور کے شاعر عبدل کی مثنوی) اسی کی طرف سے چھاپی۔ ہندوستان کی لسانیاتی تجزیہ کی کمیٹی کی مجلسِ عاملہ کے بھی ممبر رہے۔

اب ایک نیا کام شروع کیا ہے جو ان ہی کے دماغ کی اپج ہے اس لئے وہی اس کے نائب صدر بھی ہیں۔ یہ کمیٹی قدیم اردو یعنی دکھنی کتابوں کو دیوناگری رسم الخط میں چھاپ رہی ہے۔ اس کام میں یہاں کی ہندی پرچار سبھا کی طرف سے بھی تعاون ہو رہا ہے۔ ان مصروفیات اور رچا درگھاٹ کالج کی پرنسپلی اور اُردو کی جماعتوں خاص کر پی ایچ ڈی کی تعلیم اور نگرانی کے ساتھ وہ اُردو انسائیکلو پیڈیا کی تدوین جیسے اہم کام سے بھی غافل نہیں۔

غالباً ان ہی خدمات کے مدِ نظر حکومت نے انہیں ایک بڑا اعزاز بخشا ہے یعنی وہ انڈین نیشنل اکاڈمی آف لیٹرز (ساہتیہ اکیڈمی) کے شعبۂ اردو کے مشیر چنے گئے ہیں جس کے صدر خود پنڈت نہرو ہیں۔ میری نظر میں یہ اعزاز ڈاکٹر زور کی خدمات کا بہت بڑا اعتراف ہے۔

ایک مرتبہ میں نے پوچھا آپ کو اتنے کام کرنے کا وقت کیونکر مل سکا تو وہ یہ شعر پڑھ کر چپ ہو گئے:

ما نقدِ عمر صرفِ رہِ یار کردہ ایم
کارے کہ کردہ ایم ہمیں کار کردہ ایم

اتنا لکھنے کے بعد میں سوچتی ہوں کہ یہ تو میں نے سب ان کے محاسن ہی دکھائے ہیں جو بقول کسے "کتابِ مناقب" اور "قصیدۂ منثورہ" ہو گیا لیکن جیسا کہ ان ہی کے ایک شاگرد مکیش نے ان پر مضمون لکھتے وقت اعتراف کیا تھا کہ انہیں ان کی ذات میں کوئی بُرائی کا پہلو نظر نہیں آیا۔ میں بھی سوچتی ہوں تو یہ پہلو تشنہ نظر آتا ہے۔ اور صرف ایک بُرائی نظر آتی ہے وہ یہ کہ وہ کسی سے "برائی" اور کسی کی مخالفت نہیں کر سکتے۔ اپنے بڑے سے بڑے دشمن کی بھی ـــــ ممکن ہے یہ ان کی بزدلی ہو یا پھر مشائخ اور صوفی گھرانے کی تربیت کا اثر جہاں کا پہلا قرینہ دل کی صفائی ہوتا ہے۔

مرزا جعفر علی خاں اثر

بشیخ ممتاز حسین جونپوری

کچھ عرصہ ہوا میرے ایک ایرانی دوست نے جو یورپ کی سیاحت کے بعد ان دنوں تہران میں مقیم ہیں۔ مرزا جعفر علی اثر کو دیکھ کر کہا تھا کہ ان کے چہرے کی ساخت ہو بہو ایرانی ہے۔ بات گئی گزری ہو گئی تھی۔ مگر آج جب اثر کی شخصیت کا خاکہ کھینچنے بیٹھا اور اس میں رنگ بھرنے کی ضرورت ہوئی تو ان کی گوناگوں اور بوقلموں شخصیت کے جلوے قوس قزح کے طرح طرح کے رنگوں کے مانند سامنے گویا رقصاں نظر آ رہے ہیں۔ بقول انشا

بوٹے ہے یہی خامہ کہ کس کس کو میں باندھوں؛
بادل سے چلے آتے ہیں مضموں مرے آگے

اثر صاحب کی ظاہری شخصیت کی عکاسی کے لئے یہی کہہ دینا کافی ہے کہ گورا رنگ، ایرانی نما صورت مرو چمن کی طرح چھریرا بدن، نرگسی آنکھیں، کتابی چہرہ، باتیں کرنے میں لبوں پر پھولوں کی سی مسکراہٹ، معمولاً شیروانی اور حسب ضرورت انگریزی لباس میں ملبوس، خلق و مروت میں شاہکار، لکھنؤ کی پرانی وضعداری کی یادگار، مزاج میں حد درجہ انکسار، طبیعت میں مزاح اور سنجیدگی کا خاندانی عکیمانہ امتزاج۔ ملنے جلنے میں بے تکلف، نہ بناوٹ نہ غرور۔ جس طرح مقیاس الحرارت (تھرمامیٹر) کد و کاوش سے تیار ہوتا ہے۔ اسی طرح اثر کے بزرگوں نے جو حکیموں کے مشہور خاندان کی یادگار چلے آتے ہیں ہر صحبت میں بٹھا کر، ہر رنگ میں ڈبو کر اور نچوڑ کر انہیں ایک رچی ہوئی معتدل زندگی کا نمونہ بنا دیا ہے۔ بادل کی طرح یہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیئے ہوئے ہیں۔ یوں بظاہر خشک مزاج سے ہیں، مگر محبت کا رنگ چوکھا کرنے کے لئے نچوڑ کر دیکھئے تو ان کی زندگی کے جوہر بوئے گل کی طرح چمن میں پھیلنے لگتے ہیں۔

پرانے زمانے کے لکھنؤ نے دنیا کی تہذیب و تمدن میں اثر کے آباؤ اجداد کے ہم وطن ایرانیوں کا کلچر پیدا کرنے میں بڑا حصہ لیا ہے۔ پہلے زمانے میں مختلف قسم کے سبق آموز ظاہری و باطنی اثرات و عوامل سے شخصیت اور کردار کی تعمیر کی جاتی تھی۔ اب لکھنؤ کی بربادی کے بعد ۱۰۲ سال کے دورِ شاہانِ اودھ کی ریاضت کے مٹے مٹائے نقوش کا دھندلا سا نشان ایک ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنوں میں ہمیں دکھائی دیتا ہے۔ اس قدیم تہذیب و تربیت کو قوسِ قزح کے سے رنگوں میں جلوہ ریز دیکھنا ہو تو ۱۲ جولائی ۱۸۸۵ء کے مسعود زمانے میں پیدا ہونے والے اثر کو دیکھ لیجئے۔ جو بزمِ لکھنؤ میں ۷۹ سال سے جلنے والی آخری شمع ہیں۔

میرے مذکورالصدر ایرانی دوست کو یہ معلوم نہ تھا کہ اثر کے مورثِ اعلیٰ ایران سے ہندوستان آئے تھے اور وہ ایرانی نژاد ہی ہیں لیکن

اس نے انہیں دیکھ کر جو اندازہ قائم کیا، وہ غلط نہیں تھا۔ ان کے جد امجد حکیم مرزا محمد شفیع اصفہان سے اکبرآباد آئے تھے۔ جہاں وہ اپنی حکمت و حذاقت کے جوہر لٹاتے اور اپنی مسیحائی کا اعجاز دکھاتے تھے کہ اودھ کی سلطنت نے ان کے کمالات کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا اور بڑھ کے آواز دی۔

گل پھینکے ہے غیروں کی طرف بلکہ ثمر بھی

اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی

حکیم صاحب یہ قدر افزائی دیکھ کر اودھ کے نواب وزیر شجاع الدولہ کے دربار کی زینت بن گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اپنی ماں سے روٹھ کر نواب آصف الدولہ وزیر اودھ نے ۱۱۸۹ھ میں لکھنؤ کو بسانے کی دل میں ٹھان لی۔ اور طرح طرح سے دلّی اور بیجا پور دکن سے باکمالوں کو توڑ توڑ کر لکھنؤ کے شطرنجی بساط پر جمانا شروع کیا۔ شاعروں میں سودا اور میر تقی میر آئے۔ خوشنویسوں میں حافظ اللہ اور نعمت اللہ یہاں پہنچے۔ تاریخ کے صفحات وجد کرتے ہیں کہ کس کس حکمت عملی سے لکھنؤ کو باکمالوں کی راجدھانی بنایا گیا تھا۔ باکمال طبیب رہے جاتے تھے۔ سو ان کی کمی اس طرح پوری ہوگئی کہ عاشق مزاج آصف الدولہ بیمار پڑے۔ خوش اقبال رنجوری کہ ان کی نظر انتخاب اثر کے ان ہی جدِّ اعلیٰ پر پڑی اور وہ آصفی چتر کے آبدار موتی بن گئے۔ ان کا خاندان یہیں بس گیا۔ حکیم مرزا محمد شفیع کے بیٹے حکیم مرزا محمد سمیع متخلص بہ ذرّہ کربلا چلے گئے۔ اور ان کو مرنے کے بعد بھی وہ سعادت اور عزت نصیب ہوئی کہ کربلا کے روضہ کے تحت محراب قبہ میں دفن ہوئے۔ مگر ان کے بیٹے حکیم مرزا علی خاں لکھنؤ چلے آئے اور حکیم الملک کا خطاب پایا۔ اس سلسلۂ حکما کی آخری کڑی اثر کے والد ماجد حکیم مرزا تفضل حسین خاں تھے جو راقم الحروف کے طبی کرم فرما تھے۔ اس وجہ سے جو کچھ جناب اثر کی شخصیت کے بارے میں یہاں سپرد قلم کیا جا رہا ہے وہ براہِ راست علم و اطلاع کا نتیجہ ہے۔

اثر کی خاندانی شخصیت کا یہ وقار ہے کہ علامہ تفضل حسین خاں ساجد عالم دوراں جس کے کمالات علمی و سیاسی پر اودھ کی تاریخ گواہ ہے، اسی خاندان کے سلسلے کی ایک زرّین کڑی ہے۔ اس لئے اگر اثر کی شخصیت کے تمام اجزا کو الگ کر کے بھی دیکھا جائے تو تنہا خاندانی وقار ہی ان کی عظمت و برتری کی بڑی ضمانت ہے۔ اثر صحیح معنوں میں اس وقار کے وارث اور سچے امین ہیں۔

غدر کے بعد لکھنؤ کے شرفا اور باکمالوں پر تباہی کا پہاڑ ٹوٹ کر گر پڑا۔ کچھ لوگ تو اسی کے نیچے دب کے رہ گئے۔ کچھ دور بھاگ کر چلے گئے۔ وہ نوابوں کی ڈیوڑھیاں جہاں باکمالوں کے جمگھٹے رہتے تھے۔ ان کو اثر نے سنسان دیکھا۔ لکھنؤ کے وثیقہ دار انگریزی تعلیم سے کنارہ کش تھے۔ اور بڑا مشہور شغل بٹیر بازوں اور کنکوے لڑانے والوں کی صحبتیں تھیں۔ ماحول کا پورا پورا تجربہ حاصل کرنے کے لئے اثر کے والد ماجد نے ان کو ہر صحبت میں بٹھایا۔ مجھے خود اثر کا کنکوے لڑانا یاد ہے۔ اثر نے مٹتے ہوئے لکھنؤ کو دیکھا۔ اور وہ بھرے مجمعے اور صفوں کو مجاہدانہ شان سے چیرتے ہوئے کنکوے کے اُچکے اور پرتی کو پھینک اور کنکوے کو پھاڑ خاندانی اقتدار اور شخصیت کو عزت کی سطح پر برقرار رکھنے کے لئے رسم و رواج اور خاندانی نوابی کی قیود کو توڑتے چلے گئے۔ ۱۹۰۶ء میں انہوں نے بی۔ اے پاس کیا اور ۱۹۰۹ء میں ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر فائز ہوئے۔ عہدے کی شخصیت اور حاکمانہ عزت و آبرو کے بل پر دوسروں کے دلوں میں جبراً اپنی عظمت کی دھاک بٹھانا اور چیز ہے جو سبھی بدنصیب اور دل فریب حکام کو نصیب ہوتا ہے۔ لیکن یہ کوئی شخصیت ہی شخصیت نہیں عزت میں عزت نہیں۔ آئیے اس سے الگ ہو کر اثر کے اقتدار شخصیت اور ہر دلعزیزی کا ایک سبق آموز منظر دکھائیں جس میں شاہانِ اودھ کے سلوک رعایا پروری۔ ترحم۔ ہندو مسلم اتحاد، حمیت اور بے تعصبی کے دیرپا جوہر اس طرح جھلک رہے ہیں جیسے خاک میں دبے موتی اور دہقانوں کی چوپال میں دبی ہوئی آگ۔

اثر بہ حیثیت ڈپٹی کلکٹر ہردوئی کے ضلع میں پہنچے اور دورے پر نکلے۔ تحصیل شاہ آباد میں پالی کے قریب تمام حکام کے قیام کے لئے ایک مقررہ باغ ہے۔ چنانچہ اسی میں ان کا خیمہ بھی لگایا جانے لگا۔ جب چودھری فتح سنگھ تعلقدار کے ورثا کو معلوم ہوا کہ لکھنؤ کے رہنے والے یعنی مرزا جعفر علی خاں اثر یہاں آنے والے ہیں تو انہوں نے ان کے قیام کے لئے وہ باغ تجویز کیا جس میں عہدِ شاہی میں ایک کمیدان ایک بڑی فوج لے کر

اثرؔ سے اور مال گزاری کے بقایا کی علت میں سارے قصبے کو توپ اور گولوں سے اڑا دینے پر مامور ہوئے تھے۔ مگر اسی قصبے میں لکھنؤ کے ایک غریب کہار کی لڑکی بیاہی ہوئی تھی جس کے جہیز کا ساز و سامان انہیں کمیدان نے پورا کیا تھا۔ کنوئیں پر وہ لڑکی پانی بھرنے آئی تو اس نے کمیدان کے فیل بان سے جو ہاتھی کو نہلا رہا تھا، پوچھا کہ کیا کاکا بھی آئے ہیں۔ پہلے زمانے کا دستور تھا اور اب بھی یہ رواج کچھ کچھ باقی ہے کہ گاؤں گراؤں میں ہندوؤں کے لڑکے لڑکیاں مسلمان بزرگوں سے اور مسلمانوں کے لڑکے لڑکیاں ہندو بزرگوں سے کسی نہ کسی رشتے سے خطاب کرتی ہیں۔ چنانچہ جب کمیدان کو لکھنؤ کے کہار کی لڑکی نے کاکا کے لفظ سے یاد کیا اور کمیدان کو اس کی خبر ہوئی تو دل بھر آیا اور انہوں نے بادشاہ کو ایک عرضی بھیجی کہ جو سزا تجویز ہو، وہ بھگتنے کے لئے کمیدان تیار ہے۔ مگر اس گاؤں پر گولہ باری کی حمیت نہیں جس میں لکھنؤ کی ممنونِ احسان ایک ہندو لڑکی بیاہی ہے۔ بادشاہ پر اس شرافتِ نفس کا یہ اثر پڑا کہ سارے علاقے کی مال گزاری بفرمانِ شاہی معاف ہوگئی۔ (اثرؔ کے وقت تک یہ معافی چلی آتی تھی) یہ اقتدارِ شخصیت جس کا نیر مقدم ایک ہندو تعلقہ دار کے ورثاء کی طرف سے ہوا اثرؔ کی ذاتی جاذبیت اور کشش کی ایک مثال ہے۔ جس میں ان کے عہدے اور منصب کو کوئی دخل نہیں تھا۔ اس کے جواب میں اثرؔ نے جو احترام ان لوگوں کا کیا۔ وہ شرافت، خلوص اور حسنِ اخلاق کی ایک لمبی داستان ہے۔

اب اسی اقتدارِ شخصیت کا ذاتی پہلو ایک دوسری مثال میں دیکھئے۔ اثرؔ جب اناؤ میں تبدیل ہو کر گئے تو راجہ بینی مادھو سنگھ کے ورثا میں ایک غریب زمیندار زندہ تھا جس کے پاس کچھ تھوڑی سی سیر یا باصطلاح زمینداری ما فظ الملکیت جائداد باقی رہ گئی تھی۔ اور اب وہ بھی مہاجن کے قرضے کی وجہ سے ہاتھ سے نکل جانے والی تھی۔ یہ راجہ بینی مادھو سنگھ وہی ہیں جو غدر کے زمانے میں جب سلطانِ عالم واجد علی شاہ آخری تاجدارِ اودھ کو اسیرِ سلطانی کرکے انگریز مٹیا برج (کلکتہ) لے گئے اور شہزادہ برجیس قدر اپنی جان اور عزت بچانے کے لئے نیپال بھاگ کر جانے لگے تو راجہ برہنہ تلوار ہاتھ میں لئے برجیس قدر کے ساتھ ساتھ سپاہیوں کی جمعیت لئے انہیں نیپال پہنچا آئے تھے۔ واپسی پر انگریزوں نے ان کا سارا علاقہ ضبط کرلیا اور ان کو اس شریفانہ سلوک کی پاداش میں پھانسی دے دی تھی۔ خیر راجہ بینی مادھو سنگھ کے اس وارث زمیندار پر نالش کر دی گئی۔ اثرؔ صاحب کے سامنے مقدمہ آیا۔ بجائے اس کے کہ وہ اپنے اقتدار اور اختیارات سے کام لیتے، انہوں نے بڑی ایمانداری، نرمی اور خوش اسلوبی سے مدعی کو سمجھایا۔ اور اس کا یہ اثر ہوا کہ مدعی ان کی بات مان گیا۔ قرضہ کی قسط مقرر ہوگئی۔ اور غریب ہندو زمیندار کا آذوقہ بچ گیا۔ اس طرزِ عمل اور سلوک سے اس زمیندار کے دل میں اثرؔ صاحب کی اتنی قدر و منزلت بڑھی کہ جس ضلع میں اثرؔ صاحب تبدیل ہو کر گئے۔ ان کی احسان مندی اور قدردانی کے اعتراف کے لئے وہ تا عمر حیات ان کی زیارت کے لئے حاضر ہوتا رہا۔

ادبی دنیا اور شعر و شاعری میں اثرؔ کی شخصیت نہ صرف لکھنؤ بلکہ تمام ہندوستان اور پاکستان میں مسلّم ہے۔ اور عروض و فنونِ ادب و محاورات کی معلومات میں وہ منفرد ہیں۔ اس موقع پر مجھے ان کے کلام پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھنا چاہئے تھا۔ تاکہ ان کی علمی اور ادبی کاوشوں کے کچھ نقوش ابھر سکیں۔ لیکن اس موضوع پر بحث و تبصرہ مدیرِ "نقوش" کی طرف سے علی الاعلان ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔ جس طرح فسادات اور بلوے کے اندیشے سے دفعہ ۱۴۴ نافذ کی جاتی ہے۔ گویا اسی طرح شاعری کا ذکر بھی شخصیت کے ذیل میں ممنوع قرار دیدیا گیا ہے۔ اور یہ ایک لحاظ سے بہتر ہی ہوا۔ ورنہ شاعری اور عاشقی چلوے ہی کا دوسرا نام ہے لیکن ؎

ہرچند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو ——— بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

شعر نہ سنایا جائے اور اس پر تبصرہ بھی نہ کیا جائے مگر اتنا کہنے میں تو میرے مضمون کا اس دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی میں چالان نہ ہوسکے گا کہ پرستارانِ اردو میں اثرؔ وہ منفرد شخصیت ہیں جس نے ہر صنفِ نظم میں ہزاروں لاکھوں شعر کہے اور سینکڑوں تنقیدی مضامین اردو کی حمایت اور اس کی قدرتی شان و شوکت کی بقا کے لئے لکھے۔ مسلسل ۵۰ سال سے ان کا یہ جہاد جاری ہے۔ اور اس میں انہوں نے اپنا خون پسینہ ایک کر دیا ہے۔ "اثرستان" اور "بہاراں" کی طرح کے دیوان اور تنقیدی مضامین سے قطع نظر زمانۂ حال کے موافق اثرؔ دنیا کی مختلف زبانوں کے شاعرانہ خیالات کو اردو کے قالب اور لکھنؤ کی ٹکسالی زبان کے سانچے میں ڈھال چکے۔ ان میں سے کچھ چھپ گئے اور بڑا ذخیرہ گنج گرانمایہ کی طرح ابھی چھپا نہیں چھپا ہوا ہے۔

ہندوستان میں اردو زبان کے مستند مرکز دلّی اور لکھنؤ مانے گئے ہیں۔ اور لکھنؤ میں بھی محلہ کٹرہ ابو تراب خاں جہاں اثرؔ پیدا ہوئے، بڑے ہوئے، پروان چڑھے اور اپنے

بزرگوں کی آغوش میں زبان و محاورات کی لوریوں میں پلے ۔ یہ ثقافت کا مخزن تھا۔ جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں ؎

ثقافت کٹرہ کہہ کر لوگ ہم کو یاد کرتے ہیں　　　سند خود لکھنؤ میں بھی تھا معیار زباں اپنا

اثرؔ انگریزی زبان کے بڑے ماہر ہیں اور کتب بینی اور تراجم کی مشق نے ان کی قادر الکلامی میں چار چاند لگا دئے ہیں۔ سنجیدہ مزاج کا حصہ جوان کو اپنے والد ماجد کے بذلہ سنجی اور خوش طبعی اور خوش مزاجی سے حاصل ہوا وہ ان کی روزمرہ زندگی اور لطفِ کلام کا جزو بن گیا ہے۔ ایک بار ان کی عدالت میں ایک صاحب نے باپ کے بجائے "فادر" بار بار استعمال کیا۔ اور تمام لوگ، اور یہ خود بے لطفی محسوس کرنے لگے تو بجائے غصہ کرنے اور تحکمانہ انداز صرف کرنے کے بڑے خوشگوار عنوان سے اثرؔ نے ان سے فرمایا کہ "باپ کہتے آپ کو کیوں شرم آتی ہے۔"

اثرؔ کو نظم و نثر پر یکساں قدرت ہے۔ اور اس حیثیت سے ان کی بلند پایہ شخصیت جدید تخیّل کی علمبردار اور قدیم طرز ادب کے محافظ کی حیثیت سے شہرتِ دوام پاکر ایک خاص متاثر کرنے والی شخصیت بن گئی ہے۔

اثرؔ کی شخصیت ان کے کمالات ذہنی کو قطع نظر کر کے ایسے کردار و سیرت کا مجموعہ ہے جس کے لئے اخلاق کی کتابیں اور معاشرتی مواعظ اور ہر شرافت پسند نفس اور خاندان خواہاں ہے۔ سادہ دلی، نیک باطنی، ایمانداری، وضعداری، مہمان نوازی، عالی ظرفی، صاف طبعی، آزادہ روی کی ہزارہا مثالیں اثرؔ کی زندگی کی آئینہ دار ہیں۔ ہر ایک بات ان کی شخصیت کا ایک الگ باب ہے۔ اثرؔ مذہب کے پابند مگر تعصب و تنگ نظری سے دور ہیں۔ مسلمان تو مسلمان ہندو کو بھی اثرؔ نے ہمیشہ مذہبی جذبات سے الگ ہو کر دیکھا۔ ان کے اس شعر کے آئینے میں ان کے اس کردار کی صورت بالکل صاف صاف نظر آتی ہے۔

نہ تو ہندو کبھی دیکھا نہ مسلماں دیکھا　　　میں نے انساں کی نظر سے سوئے انسان دیکھا

اگر یہ شعر ان کے سیرت و کردار کی صحیح تصویر نہ ہوتا اور یہ اپنے اعزّا اور ہم قوموں کو ملازمت میں آگے بڑھاتے۔ ایمانداری کو ہاتھ سے کھو بیٹھتے تو عمر بھر یہ کھٹکا لگا رہتا کہ ان کی سیرت کے اُجلے دامن پر یہ شعر داغِ معصیت بن کر کردار کی حرف گیری کرتا رہے گا۔

کوئی مثال ایسی نہیں ملتی کہ اپنے مندرجہ ذیل شعر کی صحیح ترجمانی سے وہ چوک گئے ہوں۔

ہم دل میں کسی سے کبھی کینہ نہیں رکھتے　　　یہ شیوۂ رندانِ مے آشام نہیں ہے

جس طرح رندانِ مے آشام کا دل بے کینہ ہوتا ہے اس طرح ایسا پاک نفس جس نے پینا کیسا شراب چھوئی بھی نہ ہو استعارے کے لئے اس سے زیادہ موثر مثال تو داپنے کردار کو سمجھانے کے لئے نہ پیش کر سکتا تھا نہ ملی۔

اثرؔ صاحب کی داد و دہش اور کینہ پروری کی خاموش زندگی کا آئینہ دار ان کا یہ شعر ہے۔ اپنی تعریف وہ خود کیا کرتے مگر ان کے سچے جذبات کی اس میں پوری پوری جلوہ گری ہے جو عمومیت کا رنگ لئے ہے:

اسی شخص کو میں نے انسان جانا　　　جو احسان کر کے نہ احسان جانا

اسی طرح بطور اختصار انہیں کا شعر ان کی شخصیت سازی کے ہر کردار کے سند میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

مرزا جعفر علی خاں نے ڈپٹی کمشنری کے عہدے سے پنشن لی۔ کشمیر میں وزیر اور کچھ دنوں وزیر اعظم رہے اور باوجود اس کے کہ ان کے لئے یہ موقع تھا کہ جب تک چاہتے وزارتِ عظمیٰ پر فائز رہتے مگر اپنی آن بان قائم رکھنے کے لئے انہوں نے کشمیر کی وزارت پر رہنا پسند نہ کیا اور کشمیر سے روانگی کے وقت یہ شعر ارشاد فرمایا

متاعِ عیش پہ قرباں کیا نہ عزّت کو　　　ہزار شکر رہا پاسِ آبرو باقی

اثرؔ صاحب کے سیرت و کردار کے بنانے والے بے شمار واقعات ہیں جس میں سے ہر ایک پر تھوڑا تھوڑا لکھا جائے تو ایک طویل داستان ہو جائے گی۔ اس لئے صرف اتنی باتیں چن کر پیش کر دی گئی ہیں جو ان کی شخصیت کا اہم جزو ہیں۔

جگر صاحب

رشید احمد صدیقی

بالکل یاد نہیں آتا جگر صاحب سے پہلے پہل کب، کہاں اور کیسے ملاقات ہوئی۔ ممکن ہے الہ آباد میں ہوئی ہو جہاں اصغر صاحب مرحوم ہندوستانی اکیڈمی (یو۔پی) میں صیغۂ اردو کے مشیر ادبی تھے۔ کسی کام سے الہ آباد جانا ہوتا تو میرا قیام اصغر صاحب کے ہاں ہوتا۔ یہ زمانہ اور اس کے بعد کا کافی زمانہ ایسا تھا جب جگر صاحب پر شراب کا بڑا تسلّط تھا۔ رفتہ رفتہ مجھ سے اتنی رسم و راہ ہو گئی کہ جگر صاحب جب کبھی علی گڑھ تشریف لاتے تو میرے ہاں ٹھہرتے۔ یہاں تک کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے بڑے عزیز اور محترم دوست بن گئے۔

الہ آباد میں اصغر صاحب کے سامنے جگر صاحب اس طرح خاموش، مؤدّب اور آنکھیں نیچی کئے ہوئے بیٹھتے کہ ان سے گفتگو بھی کی جاتی تو صرف ہاں نہیں بمشکل سے جواب دیتے اور پھر سر جھکا لیتے۔ اصغر صاحب مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے۔ ان کے ہاں پہنچ جاتا تو وہ ایسے خوش ہوتے جیسے ان کا رُواں رُواں مسکرانے لگا ہو۔ ان کے اس طرح خوش ہونے سے مجھ پر آسودگی اور عفو کی ایسی کیفیت طاری ہوتی جیسے میں ان تمام لوگوں کا قصور معاف کرنے لگا ہوں جنھوں نے میرے ساتھ ظلم و زیادتی کی تھی۔

کبھی کبھی وہیں جگر صاحب مل جاتے۔ ان کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ خود نہ آئے ہوں بلکہ کسی نے پہنچا دیا ہو اور اس کے منتظر ہوں کہ موقع ملے تو پھر اپنی مُہم پر چلے جائیں۔ ان کے مواجہ میں اصغر صاحب مجھ سے تفصیل سے گفتگو نہ کرتے۔ میں بھی کوئی ذکر نہ چھیڑتا۔ ہم دونوں بیٹھے ہوتے تو جگر صاحب اُٹھ کر چلے جاتے۔

اصغر صاحب، جگر صاحب کو زیادہ خاموش یا اُکتایا ہُوا دیکھتے تو کبھی کبھی مسکرا کر یہ فقرہ ان کو سُنا دیتے "چاہے جہاں پھرو، لوٹ کر یہیں آنا پڑے گا" اس کے بعد مجھ سے مخاطب ہو کر ہنسنا بولنا شروع کر دیتے۔ ایک دفعہ میں نے پوچھا "اصغر صاحب کہاں آنا پڑے گا، بیچارے آ تو جاتے ہیں"۔ اصغر صاحب میری طرف دیکھ کر مسکرا دئے۔ ان کی آنکھیں ان سے زیادہ مسکراتی تھیں۔ پھر بولے "ابھی کہاں آئے ہیں، ابھی تو لائے جاتے ہیں" ایک دفعہ الہ آباد پہنچا تو اصغر صاحب کے ہاں جگر صاحب پھر اُسی حال میں ملے۔ کھانے کا وقت آیا تو میں اور اصغر صاحب کھانے کے کمرہ کی طرف چلے۔ جگر صاحب نے شرکت سے معذوری کا اظہار کیا۔ اصغر صاحب اس دن کچھ بدخط سے معلوم ہوتے تھے۔ چلتے چلتے کھڑے ہو گئے اور جگر صاحب کو مخاطب کر کے بولے "یہ سب تمھارے شعر نہیں سُنتے تمھارا گوشت کھاتے ہیں"! اصغر صاحب کی آزردگی

پر کسی قدر برہمی کا رنگ چھانے لگا تھا۔

میں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور کھانے کے کمرہ میں داخل ہوا۔ اصغر صاحب کھانے کی طرف متوجہ ہوئے تو میں نے کہا "اصغر صاحب آپ تو لکھنوی شاعری کے تشبیہہ استعاروں کے کبھی شیدائی نہ تھے۔ یہ گوشت کا کیا قصہ ہے؟" کھانے سے ہاتھ روک لیا۔ کچھ خشمگین لیکن زیادہ حزین لہجہ میں بولے رشید صاحب آپ کو کیا معلوم یہاں ایسے بیرحم لوگ بھی ہیں جو ان کو جہاں چاہتے ہیں پکڑ لیتے ہیں اور یہ جو اسپرٹ ہوتی ہے نہ وہ پلا پلا کر ان سے شعر سنتے ہیں اور جب یہ ادھ موئے ہو جاتے ہیں تو یکّے پر لاد پھاند کر یہاں پہنچا دیتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ اصغر صاحب بے کیف ہو گئے ہیں اور کھانے سے بھی ہاتھ کھینچ لیا ہے۔

میں نے پوچھا "اصغر صاحب آپ نماز تو پڑھتے ہیں؟" بولے "ہاں"، میں نے کہا "۔ ۔ ۔ صاحب تو آپ کو صاحب کشف و کرامات بھی بتاتے ہیں"۔ بولے "جی تو پھر؟" میں نے عرض کیا "۔ ۔ ۔ ۔ صاحب نے آپ کا ایک شعر سن کر آپ کو مستجاب الدعوات بھی قرار دیا تھا"۔ بولے "آپ بھی تو کچھ کہئے"، میں نے کہا "آپ اللہ سے دعا کیوں نہیں مانگتے کہ جگر صاحب کا گوشت کھانے والے ویجیٹیرین ہو جائیں"، اصغر صاحب ہنس پڑے اور اور ہم دونوں کھانے میں مصروف ہو گئے! کھانا کھلانے پر جو ملازم مامور تھا اس سے پوچھتے جاتے تھے یہ کھانا یا وہ کھانا جگر صاحب کے لئے رکھ دیا ہے یا نہیں۔ اس سے اطمینان نہیں ہوتا تھا تو ڈونگے اور پلیٹ سے نکال کر علیحدہ پلیٹوں میں رکھتے جاتے اور کہتے "یہ سب جگر صاحب کے لئے ہے۔ بغیر کھانا کھلائے ان کو باہر نہ جانے دینا!"

میرے گھر کا ہر چھوٹا بڑا جگر صاحب کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ یونیورسٹی اور شہر میں بھی جگر صاحب محبوب و مقبول تھے۔ اس زمانہ میں بھی شراب کا بڑا زور تھا۔ اکثر غافل اور بدمست شہر سے لائے جاتے۔ یونیورسٹی کے اندر کوئی نہ کوئی طالب علم مل جاتا جو ان کو میرے ہاں لاتا۔ میں گھر پر نہ موجود ہوتا تو وہ کمرہ میں پہنچا کر دیکھ بھال میں مصروف ہو جاتا۔

یہ طالب علم جگر صاحب کی نرسنگ اس طور پر کرتے جیسے کوئی اپنے باپ یا بھائی کی خدمت کر رہا ہو یا کوئی نرس سرسام میں مبتلا مریض کی نرسنگ کرتی ہو۔ اور یہ اس زمانہ کی بات ہے جب جگر صاحب اور یہ طالب علم دونوں اپنی اپنی جگہ پر ان بانکوں سے کم نہ تھے جن کے قصے تاریخوں اور داستانوں میں ہم پڑھتے آئے ہیں۔

میں آجاتا تو طالب علم چلے جاتے اور معلوم نہیں کیوں اور کیسے جگر صاحب خاموش اور مؤدب ہو جاتے۔ لیکن ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا جیسے رہ رہ کر سمندر کی تہ سے کوئی طاقتور موج ابل کر باہر آنے والی ہو لیکن سطح کے قریب پہنچ کر یک بیک زور ختم کر کے واپس چلی جاتی ہو۔

یہ باتیں میں اس لئے نہیں بیان کر رہا ہوں کہ اس میں میری بڑائی نکلتی ہے، میری یہ نیت ہوتی تو میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ اس بھونڈے طریقہ سے اس کی نمائش کرتا۔ جگر صاحب سے مجھے بھی تو شکایت ہے کہ وہ میرے سامنے مؤدب کیوں ہو جاتے ہیں۔ مجھے ایسے آدمی سے ملنے میں بڑی الجھن ہوتی ہے جو مجھے ہر وقت گارڈ آف آنر دیتا رہے اور اس سے بھی کچھ کم کوفت اس وقت نہیں ہوتی جب کوئی شخص میرے سامنے مجھ سے زیادہ مسخرا بننے کی کوشش کرتا ہے!

جگر صاحب اپنے حلقہ کے لوگوں میں بیٹھے ہوتے ہیں تو بہت خوش اور بے تکلف ہوتے ہیں۔ ایسے میں جگر صاحب کے پاس جانے سے پرہیز کرتا ہوں۔ لیکن اتفاق یا ضرورت سے پہنچ جاؤں تو وہ اس طرح خاموش اور سنجیدہ ہو جائیں گے جیسے مکتب کے چھوٹے بچے ہنس بول یا اودھم مچا رہے ہوں اور دفعتاً مولوی صاحب نمودار ہو جائیں!

جگر صاحب یقیناً مجھ سے بہتر انسان ہیں۔ وہ مجھ سے مساوات برتیں، میری عیادت کریں، مجھ سے خدمت لیں، مجھ سے جھگڑیں یا مذاق کریں یہ ساری باتیں سمجھ میں آتی ہیں لیکن وہ مجھے حرمین شریفین قسم کا مولوی یا کسی اردو اخبار کا آبرو باختہ اڈیٹر یا برطانوی عہد کا تھانیدار سمجھیں یہ میرے لئے

ڈوب مرنے کی بات تو ہے ہی خود جگر صاحب کے لئے کوئی فخر کی بات نہیں ہے۔

میرا خیال ہے کہ اُن کے ہاں میرا جو رکھ رکھاؤ ہے وہ غالباً اس تعلق سے ہے جو مجھے اصغر صاحب سے یا اصغر صاحب کو مجھ سے تھا۔ اس طرح کی باتوں کا جگر صاحب بڑا لحاظ کرتے ہیں۔ وضعداری شریفوں کی پرانی کمزوری ہے !

ایک دفعہ خبر آئی کہ جگر صاحب شراب سے تائب ہو گئے۔ یقین نہ آیا کہ ایسا ہوا ہوگا۔ سمجھتا تھا کہ آج نہیں کل یہ خبر آئے گی کہ پھر سے شروع کر دی۔ بری عادتیں اس آسانی سے نہیں چھوٹتیں جس آسانی سے اچھی عادتیں چھوٹ جاتی ہیں۔ سوچتا یہ تھا کہ جب میں اپنی معمولی بری عادتیں چھوڑ دینے پر قادر نہیں ہوں تو جگر صاحب شراب کیسے چھوڑ دیں گے جس میں وہ اس طرح ڈوبے ہوئے تھے جس طرح شاید جوشِ گریہ میں غالبؔ کا دل ڈوبی ہوئی اسامی تھا !

جگر صاحب شراب سے کیوں اور کیسے تائب ہوئے اس کا مجھے علم نہیں۔ اس بارہ میں آن سے کبھی ذکر نہ آیا۔ اتنا البتہ جانتا ہوں کہ ان پر شراب کا کتنا ہی غلبہ کیوں نہ ہوتا ان سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہوتی جسے مبتذل کہہ سکیں۔ ان کی زبان سے سخیف کلمات نہیں نکلتے تھے۔ وہ کبھی لوٹتے پوٹتے دُند مچاتے نہیں پائے گئے۔ مجھے تو اکثر محسوس ہوا جیسے کیفِ سرخوشی بخشنے کے بجائے شراب ان کو انتہائی درد و کرب میں مبتلا کر دیتی ہو۔ اُن پر تھوڑی شراب بھی بہت اثر کرتی تھی۔

ممکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ ان کے اعصاب بڑے ذکی الحس ہیں اور تھوڑی سی تحریک بھی بہت ہو جاتی ہو۔ شاعری میں بھی آن کا یہی حال ہے جیسے خیال یا جذبہ برقی رو بن کر ان کے جسم و جان کو جھنجھنا دیتا ہو۔ کچھ دنوں سے اُن کے کلام میں یہ بات بظاہر کم ہو گئی ہے لیکن غور کرنے پر محسوس ہوتا ہے کہ جو بات کہی گئی ہے اس میں تاثرات کی شدت ہے لیکن ان کو پیش کیا گیا ہے زیادہ مدھم آواز اور انداز میں۔

جگر صاحب کی شاعری میں ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ اصلاً وہ دوری و مہجوری کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کی رفتار اور سمت کا مطالعہ کیا جائے تو آسانی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ فراق کے شاعر ہیں وصال کے نہیں۔ اُن کا محبوب سے رشتہ کا انداز CENTRIFUGAL (مرکز گریز) ہے۔ یہی سبب ہے کہ جگر صاحب کی شاعری میں محبوب کی عفت میں کہیں کوئی خلل نظر نہیں آتا اور ان کا کلام اُس آلودگی اور بے راہ روی سے پاک ہے جو ہماری شاعری اور سوسائٹی میں آج کل نظر آتی ہے۔ میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ جو شاعر ذہن و فکر کے اعتبار سے محبوب سے قریب سے قریب اور جسم و جان کے اعتبار سے دُور سے دُور ہو وہ اس شاعر سے بالعموم بہتر و برتر ہوگا جس کے پوزیشن اس کی بالکل برعکس ہو۔ جگر کے نقاد کو یہ نکتہ مدِ نظر رکھنا چاہیئے۔

شراب چھوڑنے کے بعد جگر صاحب طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا ہو گئے۔ یہ زمانہ ان پر بڑا سخت گزرا۔ صحت خراب ہو گئی طرح طرح کی ذمہ داریوں نے آگھیرا، مالی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی۔ جگر صاحب نے جس پامردی سے ان مصیبتوں کو جھیلا وہ جگر صاحب کا رزمیہ ہے۔ کتنے اور کیسے کیسے "روزِ ابر و شب ماہتاب" آئے ہوں گے اور جگر صاحب پر سے گزر گئے ہوں گے، اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

جگر صاحب بڑے مذہبی آدمی ہیں۔ مذہبی لوگوں کے بارہ میں میرا تجربہ کچھ اچھا نہیں ہے میں نے اکثر ایسے لوگوں کو مذہب میں مبتلا پایا جن میں خاصی اخلاقی کمزوریاں ملتی تھیں۔ یہ لوگ خدا کو اس منطق سے قائل کرتے رہتے ہیں "میں جعلی شادیاں کرتا اور طلاق دیتا ہوں اتنی ہی زائد رکعتیں نماز کی بھی تو پڑھ لیتا ہوں۔" وہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح امریکہ ہر چیز کی قیمت ڈالر میں وصول کرتا ہے اللہ تعالیٰ ان کے گناہ کا کفارہ نفلوں میں قبول کر لیتا ہے۔

مذہب بڑی سخت اور بڑی قابلِ قدر آزمائش ہے۔ بالخصوص مسلمانوں کا مذہب۔ جس طرح کے مذہبی لوگ میرے پیشِ نظر ہیں وہ اس در

ے اس سے کوئی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ میرا مطلب شراب کی فضیلت جتانا ہے۔ یہاں شراب کے چھوڑنے اور مصیبتوں کے آنے میں سبب اور مسبب کا رشتہ نہیں ہے (رشید صدیقی)

بے وقوف ہوتے ہیں کہ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ جب وہ اپنے اردگرد کے معمولی سوجھ بوجھ کے لوگوں کو دھوکا نہیں دے سکتے تو وہ خدا کو کیونکر دھوکا دیں گے جس کی صفات کا ان کو علم ہے۔ یقین ہو یا نہ ہو۔ ان کو یہ بھی نہیں معلوم کہ خدا نے اپنے سارے اختیارات اُن بندوں کو ہمیشہ کے لئے منتقل کر دیئے ہیں جن کا وہ حق مارتے رہتے ہیں۔ ایسے معاملات میں وہ خدا کے ہاں جتنی عرضیاں بھیجتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن سب کو پڑھے بغیر عدالتِ مجاز کو واپس کر دیتا ہے۔

ان میں بعض ایسے معصوم بھی ملیں گے جو اس کوشش میں رہتے ہیں کہ خدا کو نہ سہی اُن فرشتوں ہی کو دھوکا دے کر کار براری کر لیں جو ان کا اعمالنامہ مرتّب کرنے کے لئے کاندھوں پر بٹھا دیئے گئے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ آخرت میں پٹواری کے اندراجات کی بنا پر مقدمہ جیت لیں گے!

جگر صاحب ان معنوں میں مذہبی آدمی ہیں کہ وہ اللہ رسول اور انسان کے حقوق پہچانتے ہیں اور اس کا لحاظ رکھتے ہیں کہ جس کا جو حق ہو اُسے پہنچ جائے۔ وہ نفع کے ضرر اور ضرر کے نفع کو جانتے ہیں۔ اُن میں جیا ہے وہ پرائی چیز کو اپنانے کے درپے نہیں ہوتے ان میں غیرت اور حمیت ہے۔ ظلم اور زیادتی اپنے پر ہو تو جھیل جائیں گے دوسرے پر ہو تو اس کی حمایت میں اپنے کو خطرہ میں ڈال دیں گے۔ اُن کے یہ جوہر تقسیم ملک کی ہلاکتوں میں کھلے! تفصیل میں طوالت ہے۔

جگر صاحب عالم فاضل نہیں ہیں۔ مذہب ہو سیاست ہو شعر و ادب ہو ان پر ان کی گفتگو منطقیانہ یا فلسفیانہ نہ ہوگی۔ ان کا احساس جتنا سریع اور شدید ہے اتنا ان کا مطالعہ وسیع نہیں ہے۔ وہ خود اپنی شاعری کے بارہ میں تفصیل سے گفتگو نہیں کر پاتے۔ وہ اپنی شاعری سے باہر نکل کر کسی اور کی شاعری پر غور کرنا نہیں چاہتے۔ شاید غور کر بھی نہیں سکتے۔ جس کے جذبات تند و تیز ہوں وہ غور کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ جگر صاحب اقبال کی شاعری کے کچھ ایسے قائل نہیں ہیں۔ فانی بھی نہ تھے۔ دونوں کا یہ کہنا ہے کہ شاعری میں فکر و فلسفہ کیسا؟ حالانکہ دونوں بالخصوص جگر صاحب جب جست و جہار سے بلند ہوتے ہیں اقبال کے قریب ہو جاتے ہیں۔ لیکن جگر صاحب شعر و شاعری کے بارہ میں جو کچھ کہتے ہیں وسعت اور وزن سے قطع نظر اس میں خلوص کی پاکیزگی اور یقین کی محکمی ملتی ہے۔

میں نے جگر صاحب کو تقریباً ہر حال اور ہر صحبت میں دیکھا ہے۔ خوبصورت نوجوان آزاد منش عورتوں میں، ماں بہن بیٹیوں میں، عمائد اور اکابر کی موجودگی میں، طلباء اساتذہ اور دوسرے سنجیدہ اور ثقہ حلقوں میں۔ گفتار و کردار کے اعتبار سے میں نے ان کو کہیں قابلِ گرفت نہ پایا۔ عورتوں کی موجودگی میں جگر صاحب عفیف و شفیق نظر آئیں گے۔ ان کی زبان سے کوئی ہلکی بات نہ نکلے گی اور نگاہ کبھی بے باک اور بے محابا نہ ہوگی۔ عورتوں کی موجودگی سے قطع نظر بے تکلف دوستوں میں میں نے کبھی یہ نہ دیکھا کہ جگر صاحب نے بے خیالی میں یا تفریحاً کوئی ایسا جملہ کہا ہو جس میں عورتوں سے تفریح یا عورتوں کی تضحیک کا پہلو نکلتا ہو۔ کم سے کم میری جان پہچان کا کوئی اُردو شاعر ایسا نہیں ہے سوا فانی مرحوم کے جو اس بارہ خاص میں جگر صاحب کا مقابلہ کر سکے۔

رؤسا اور امرا کے سامنے جگر صاحب حتی الوسع اپنا اور ان کا دونوں کا رکھ رکھاؤ ملحوظ رکھتے ہیں۔ لیکن اس طرح کی صحبتوں میں جگر صاحب کی طرف سے میں ہمیشہ متردد رہا۔ اس لئے کہ معمولی آدمیوں کی بدتمیزی وہ بالعموم نظر انداز کر دیتے ہیں لیکن کسی بڑے آدمی سے ذرا بھی کوئی نامناسب حرکت سرزد ہو جائے تو جگر صاحب بغیر کچھ کہے یا کئے نہ رہیں گے۔ چاہے اس کا انجام کچھ ہی ہو۔ بھوپال کے نوابزادہ رشید الظفر صاحب زمانہ طالب علمی سے جگر صاحب کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ ایک زمانہ میں انھوں نے جگر صاحب کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ اور کسی طرح کی کوئی پابندی نہیں عائد کی تھی کہ وہ کیا کریں یا کہاں رہیں۔ اس زمانہ میں والیانِ ریاست میں سے اکثر یہ چاہتے تھے کہ جگر صاحب ان سے وابستہ ہو جائیں۔ ان میں سے ایک جو بہت بڑی ریاست کے چشم و چراغ تھے اس کے درپے ہوئے کہ جگر صاحب بس معاوضہ اور شرط پر چاہیں ان

کے متوسلین میں شامل ہو جائیں۔ طرح طرح سے ڈورے ڈالے گئے۔ جگر صاحب کی مالی حالت خراب تھی۔ بھوپال کے وظیفہ سے بس بسر اوقات ہو جاتی تھی۔ جگر صاحب اس آفر کو خوش اسلوبی سے ٹالتے رہے۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ رئیس نے جگر صاحب سے برملا اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔ جگر صاحب نے بات ٹالنی چاہی، لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ اصرار بڑھا اور اصرار میں کچھ رنگ امارت کا بھی جھلکا۔ جگر صاحب بے قابو ہو گئے۔ بولے "جناب آپ مجھے داموں خریدنا چاہتے ہیں۔ میں تو رشید الظفر خان کے ہاتھوں بک چکا ہوں!" حاضرین سناٹے میں آ گئے اور جگر صاحب گھر آ گئے۔

جگر صاحب میں مروّت اور وضعداری بہت ہے۔ جس سے رسم و راہ ہو جائے اُس کے لئے وہ تمام آداب برتتے ہیں جو شریفوں میں قدیم سے چلے آتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے بڑے دھوکے کھائے اور نقصان اُٹھائے۔ جگر صاحب کا شمار کھاتے پیتے لوگوں میں نہیں ہے۔ مدّتوں بڑی تنگی ترشی سے بسر ہوئی ہے۔ اب بھی خرچ آمدنی سے بہت زیادہ ہے لیکن انھوں نے اپنی تنگدستی کا اظہار کبھی کسی سے نہیں کیا۔ مہمان کا خیر مقدم اس طرح کرتے ہیں جیسے ان کے گھر خیر و برکت کا نزول ہو رہا ہو۔ تکریم و تواضع میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھتے۔ کپڑے اچھے پہنتے ہیں۔ سامان قیمتی رکھتے ہیں جس کو ہمیشہ کوئی نہ کوئی مانگ لیتا ہے یا چرا لیتا ہے ورنہ خود کہیں کھو آتے ہیں!

جگر صاحب جب کبھی میرے ہاں آئے میں نے یہ سوال کیا "جگر صاحب سفر میں کیا کھو آئے؟" اور تقریباً ہمیشہ یہی معلوم ہوا کہ کچھ نہ کچھ کہیں نہ کہیں چھوڑ آئے۔ ایک دفعہ مشاعرہ میں جو کچھ ملا تھا اُسے جیب میں رکھ لیا تھا۔ جن کے ہاں ٹھہرے تھے انھوں نے جگر صاحب کی دیکھ بھال کے لئے اپنے کسی عزیز کو مقرر کر دیا تھا۔ انھوں نے جگر صاحب کی بڑی خدمت کی، ہر وقت موجود رہتے اور اظہارِ عقیدت کرتے۔ جگر صاحب کو غافل سمجھ کر انھوں نے سارے روپے نکال لئے۔ جگر صاحب کہتے تھے کہ وہ یہ سب دیکھ رہے تھے، لیکن چُپ رہے۔ میں نے پوچھا "یہ کیوں؟" بولے "یہ واقعہ ایسے وقت ہوا جب میں جائے قیام سے رخصت ہو کر اسٹیشن آ رہا تھا۔ بہت سے لوگ موجود تھے۔ کچھ اچھا نہ معلوم ہوا کہ وہاں اس چوری کا اعلان کروں اور کسی شریف آدمی کو رسوا کر دوں۔"

جگر صاحب جن کے مہمان ہوتے ہیں اس پر بہت کچھ اپنا ہی صرف کر دیتے ہیں۔ میں نے غصہ میں ان کو آپے سے باہر ہوتے نہ دیکھا، حکم چلاتے نہ پایا۔ اپنی بڑائی کبھی اُن کی زبان پر نہ آئی دوسروں کے عیب انھوں نے کبھی نہیں ڈھونڈھے نہ کبھی ان کی تشہیر کی۔ ایسے لوگ کم ہیں جو اپنی بڑائی جتانے کے لئے ایسا نہ کرتے ہوں! جگر صاحب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ عام شعرا کی مانند اس تاک میں نہیں رہتے کہ کوئی غریب اور شریف مل جائے تو اپنے اشعار سنا سنا کر اسے ادھ موا کر دیں!

جگر صاحب کو معصوم بچّوں سے کھیلتے ہوئے کم لوگوں نے دیکھا ہوگا۔ بالخصوص ایسے حال میں کہ جگر صاحب کو نہ معلوم ہو کہ انھیں کوئی دیکھ رہا ہے۔ بچّے سے کہیں زیادہ معصوم وہ خود نظر آتے ہیں۔ وہ اتنے خوش اور شگفتہ معلوم ہوں گے جیسے اُن کے سر پر آسمان نہ ہو۔ جگر صاحب کا چہرہ بشرہ ایسا نہیں ہے کہ کوئی بچّہ اُن کے سامنے بے تکلف ہو سکے۔ اس کی کمی جگر صاحب طرح طرح سے پوری کرتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو بچّہ کا کھلونا بنا دیتے ہیں۔ ایسا کھلونا جس کو بچہ نہ کھیلے تو کھلونا خود کھیلنے لگے۔ وہ بچّوں سے مصافحہ، معانقہ یا چوما چاٹی نہیں کرتے، نہ دُعائیں دیتے ہیں نہ تلقین کرتے ہیں۔ نہ اُسے ملک و ملّت کی خدمت یا خواری کے لئے تیار کرتے ہیں۔ وہ اس کے سامنے اپنی شاعری بھول جاتے ہیں، اپنی عمر، صحت، حلیہ، زبوں حالی سب فراموش کر دیتے ہیں۔ بس طرح طرح سے خوش ہوتے ہیں اور بچّہ کو خوش کرنا چاہتے ہیں۔ بچّے خدا کا مصرعہ طرح ہوتے ہیں جن پر خدا طرح طرح سے طبع آزمائی کرتا ہے!

میں نے بعض مشہور مستند اور عمر رسیدہ شعرا کو دیکھا ہے جو دوسرے شاعر کی برائی بیان کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مشاعرہ میں شاعر اپنا کلام سنا

وہاں ہے اور یہ بیٹھے اس پر بازاری فقرے چُست کر رہے ہیں اور آس پاس کے نالائقوں سے اپنی اس خفیف الحرکتی کی داد لیتے جا رہے ہیں۔ اس طرح کی بے ہودگی کسی اور بیں ہو تو ہو شاعر ہیں ہرگز نہ ہونی چاہیئے۔

اس طرح کی حرکت شاعر ہی نہیں کرتے وُہ لوگ بھی کرتے ہیں جو شعر و ادب کے پارکھ سمجھے جاتے ہیں اور جنھوں نے عمر کا بیشتر حصّہ شعر و ادب کی خدمت میں گزارا ہے۔ بس یہ گوارا نہیں کہ اُن کے ہوتے دوسرا کیوں!

بعض شعراً، بعض اشعار اور بعض مواقع ضرور ایسے ہوتے ہیں جب پھبتی یا فقرے بے اختیار زبان پر آجاتے ہیں۔ اسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ یہ فقرے اور پھبتی کبھی کبھی وہ مزا دے جاتے ہیں جو اچھے اچھے اشعار نہیں دے پاتے، لیکن اس طرح کے فقرے اور پھبتی کہنے کا حق مشاعرہ میں سامعین کو حاصل ہے خود شعرا کو نہیں۔

مشاعروں میں اب یہ بات عام ہوگئی ہے بالخصوص دہلی کے پبلک مشاعروں میں۔ آج کل شاید ہی کوئی اور تقریب ایسی ہوتی ہو جہاں بے ہودگی اور آبرو ریزی کے ایسے مناظر دیکھے جاتے ہوں جیسے دِلّی کے اس طرح کے مشاعروں میں۔ عام مجمع میں جہاں شریف خواتین، ذمہ دار حکّام، پیشوایانِ ملک و قوم، غیر ممالک کے اکابر، ناسمجھ لڑکے لڑکیاں موجود ہوں وہاں شعرا کا جو قوم کا ناموس ہوتے ہیں، فخریہ اور علانیہ شراب پی پی کر اس طرح کی نالائقی دکھانا بڑے رنج اور شرم کی بات ہے۔

مجھے تو کبھی کبھی اس کا اندیشہ ہونے لگتا ہے کہ شاید وہ دن بھی دُور نہیں جب دِلّی کا کوئی منچلا سرمایہ دار شاعروں کی کوئی سرکس کمپنی بنالے اور امریکن فری اسٹائل میں ان کے کرتب اور کرتوت شہر شہر دکھاتا پھرے!

خلوت ہو یا جلوت جگر صاحب کو میں نے ساتھی شعرا کے کلام پر کبھی حاشیہ آرائی کرتے نہیں پایا۔ مشاعرہ میں اُن کی طرح سنجیدہ اور خاموش بیٹھنے والا شاعر شاید ہی کوئی اور ہو۔ اُن کی زبان سے کوئی فقرہ کبھی نکلے گا بھی تو تحسین اور ہمّت افزائی کا۔ یہاں مجھے ثاقبؔ اور اصغرؔ مرحومین بے اختیار یاد آتے ہیں۔ لکھنؤ کے یہ باکمال شعرا مشاعرہ میں جس ادب و احترام سے بیٹھتے اور مناسب مواقع پر تحسین کے کلمات جس شریفانہ انداز سے کہتے وُہ اب کہیں نہیں نظر آتا۔

یہ مشاعرہ میں شروع سے آخر تک دو زانو نیچی نظر کئے ہوئے بیٹھے رہتے خواہ مشاعرہ کتنے ہی دیر میں کیوں نہ ختم ہوتا۔ کبھی چائے، پان یا پانی کی فرمائش نہ کرتے۔ کوئی پیش کر دیتا تو بڑی فروتنی سے قبول کر لیتے یا عذر کر دیتے۔ ان لوگوں نے ایسے مشاعروں میں بھی شرکت کی جہاں مخالف کیمپ کے شعرا اور اُن کے حمایتی موجود ہوتے اور اس کا اندیشہ رہتا کہ کہیں کوئی نا ملائم فقرہ نہ کہہ دے لیکن آج تک کوئی ناگواری پیش نہ آئی۔ مخالفین کا کلام یہ دونوں بڑے شوق اور شائستگی سے سُنتے اور داد دیتے تھے۔

ثاقبؔ صاحب کو علی گڑھ سے بڑی اُلفت تھی۔ کوئی بڑی ہی مجبوری ہوتی تو خیر ورنہ یہاں کے مشاعروں میں ضرور شرکت کرتے۔ میری طالب علمی کا زمانہ تھا، ثاقبؔ صاحب یکی بارک کے ایک کمرہ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ دن بھر کا سفر کر کے آئے تھے۔ طبیعت ناساز تھی۔ رات کو مشاعرہ تھا۔ میں نے عرض کیا آپ آرام فرمالیں، وقت آنے پر میں حاضر ہو جاؤں گا اور آپ کو لے چلوں گا۔ فرمایا "میاں نہیں، یہ آدابِ مشاعرہ کے خلاف ہے کہ جب جس کا جی چاہے آجائے اور جب جی چاہے چلا جائے۔ میں آپ کے ساتھ ابھی چلتا ہوں"۔

اس مشاعرہ میں ثاقبؔ صاحب کے دو اشعار علی گڑھ میں بہت مقبول ہوئے۔ جیسے آجکل رات کو سینما ہُوا اور صبح اس کے مقبول فلمی گانے یا دُھنیں بچّہ بچّہ کی زبان پر آگئیں۔ اُس زمانے میں علی گڑھ کے مشاعروں کا یہی حال تھا، اچھے اشعار ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر رواں ہو جاتے تھے، ثاقبؔ صاحب کے وہ دو اشعار یہ تھے۔ ؎

باغباں نے آگ دی جب آشیانہ کو مرے — جن پہ تکیہ تھا وُہی پتّے ہوا دینے لگے!

ہے روشنی قفس میں مگر سوجھتا نہیں　　　ابرِ سیاہ جانبِ کہسار دیکھ کر!

جگؔر صاحب میرے ہاں تشریف لاتے ہیں تو چند باتوں کا میں خاص طور پر خیال رکھتا ہوں۔

اوّل یہ کہ جگؔر صاحب کی صحت اچھی نہ ہوگی۔ اس لئے اپنے عزیز ترین ڈاکٹروں کو بلواتا ہوں جو ان کا مکمل معائنہ کرتے ہیں۔ وہ دوا اور غذا تجویز کریں گے، پرہیز بتائیں گے اور دوسرے مشورے دیں گے۔ میں ان سب پر جگؔر صاحب سے عمل کراؤں گا۔

دوسرے یہ کہ جگؔر صاحب معلوم نہیں کہاں کہاں کا اور کتنے دنوں کا چکر لگاتے ہوئے آتے ہیں۔ ان کے ساتھ میلے کپڑے چادر غلاف تولئے کا انبار ہوتا ہے۔ دھوبی بلوا کہ یہ کپڑے اس کے حوالہ کر دوں گا۔

تیسرے یہ کہ جگؔر صاحب کا خط بڑھا ہوگا۔ اس کے لئے نائی بلاؤں گا تاکہ وہ جگؔر صاحب کو نوک پلک سے درست کر دے۔

چوتھے یہ کہ اس بات کا انتظام کروں گا کہ جگؔر صاحب کے عشاق ان کو علی گڑھ میں گھسیٹتے نہ پھریں۔ اور میرے ہاں نہ اپنا کلام ان کو سنائیں نہ ان کا کلام خود سنیں۔

پانچویں یہ کہ جگؔر صاحب کے پاس جو نقدی ہوتی ہے اسے ضبط کر لیتا ہوں تاکہ وہ علی گڑھ میں روپے اس طرح نہ خرچ کریں جس طرح بعض حکومتیں دوسری حکومتوں پر خرچ کرتی ہیں۔

چھٹے یہ کہ جگؔر صاحب رخصت ہونے لگتے ہیں تو میں خدا حافظ کہنے کے لئے نہیں موجود ہوتا اس لئے کہ جگؔر صاحب کچھ اس گداز قلب کے ساتھ رخصت ہوتے ہیں جیسے نہ ان کو میری زندگی کا بھروسہ ہے نہ اپنی زندگی کا اور اس طرح سے رخصت ہونا یا رخصت کرنا میرے بس کی بات نہیں!

ابوالاثر حفیظ جالندھری

عزیز ملک

یہ ہے ہمارے شعروادب کا مستی سخنور ——— ابوالاثر حفیظ ——— سوکھا سا کھا اکہرا بدن، لیکن طبعاً سخت جان و سخت گیر اور نسلی اعتبار سے راجپوتی صفات کا مکمل نمونہ ———

وہ اس صدی کے ابتدائی سال یعنی ۱۹۰۰ء میں ۱۴ جنوری کو جالندھر میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا گھرانا متوسط حال، معزز اور متدین افراد پر مشتمل تھا۔ والد مرحوم (شمس الدین) حافظِ قرآن تھے اور فوج کو وردیاں مہیا کرنے کا دھندا کرتے تھے۔ حفیظ نے ہوش کی آنکھیں کھولیں تو مسجد میں پہلے قرآن مجید پڑھا۔ پھر مختلف مقامی اسکولوں میں مروجہ تعلیم حاصل کی لیکن بس اتنی کہ ساتویں جماعت سے بھاگ نکلا۔ کیونکہ اس کو نو عمری ہی میں شعر کی لگن لگ گئی تھی والدین نے اس شغل سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی، مارا پیٹا بھی، لیکن شعر کی چاٹ ایک بار لگ جائے تو مشکل ہی سے چھوٹتی ہے۔ اس نے سرزنش کے باوجود شاعری کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا اور ایک راہ قائم کر کے اس پر مستعدی سے گامزن ہوگیا۔ اور ابھی تک اسی ڈگر پر رواں ہے۔ چلا جا رہا ہے مگر والہانہ ———

کوئی چالیس برس اُدھر کی بات ہے جب وہ ادبی اُفق پر صبح کے ستارے کی طرح نمودار ہوا اور اس نے دیکھتے دیکھتے ہونہار باغبان کی طرح گلشنِ شعر کو خوش رنگ اور دل آویز کیاریوں سے سجا دیا اور پورے کمالِ فن کے ساتھ شاعری کو مصوری اور موسیقی میں سمو کر ایک انوکھے امتزاج کا رنگ بخشا اور اہلِ ذوق و ادب کے ذہن و ضمیر پر مسلط کر دیا۔ اس کی بھرپور قوتِ گویائی نے سب کی شہنائیاں گنگ کر دیں۔ گذشتہ ربع صدی کے عرصہ میں کتنی ہی شعر و سخن کی محفلیں ہوں گی جو اس نے اپنے سحرِ کلام کی بدولت اُلٹ کر رکھ دیں۔ وہ محفلیں جہاں سامعین اس کی جنبشِ لب کے منتظر رہا کئے ہیں۔

اس نے شعر کے روایتی انداز سے ہٹ کر اپنا سفر اختیار کیا۔ غزل، گیت، ترانے، نغمے اور منظریہ نظموں میں نئے نئے تجربات کئے۔ یہ ساری تگ و دو دراصل اس کے باطنی اضطراب کی مظہر ہے جو اسے بالآخر شاہنامۂ اسلام کی منزل تک لے آئی۔ وہ خود کہتا ہے :۔

راہ پر آ ہی گئی گردشِ ایام آخر
ہوگیا روئے سفر سُوئے مدینہ میرا

معجزہ جس نے نہ دیکھا ہو وہ مجھ کو دیکھے
کس طرح ڈوب کے اُبھرا ہے سفینہ میرا

لیکن اس مقام تک پہنچنے میں اسے کن کن مراحل سے گذرنا پڑا۔ یہ داستان بہت طولانی ہے۔ ربع صدی پہلے کی بات ہے جب وہ لاہور میں تازہ وارد اور ایک ایسی ادبی مشقت گاہ کا مزدور تھا جہاں شعر کا دامن گزوں سے ناپ کر اس کی مزدوری چکائی جاتی تھی۔ اور اسے معاش کی اُلجھنوں سے بہت کم فراغت نصیب ہوتی تھی ———

اک طرف فکرِ سخن تھی، اک طرف فکرِ معاش!
اس تصادم سے ہوا تھا شیشۂ دل پاش پاش

یہی لیل و نہار تھے جب وہ ادبی مجلسوں میں اپنی دھاک بٹھا رہا تھا۔ مشاعروں میں بڑی واہ واہ ہوتی اور وہ بار بار پڑھوایا جاتا۔ یہ قصّہ ہے جب کہ آتش جوان تھا" (تقاضے تو اس عمر میں بھی اس کے تعاقب میں رہتے ہیں) ان مشاعروں میں پڑھ پڑھا کر جب وہ فاتحانہ برآمد ہوتا تو اس کے جیب و داماں داد سے پُر ہوتے لیکن دام و درم سے یکسر خالی ——— داد سے نفس کی تشنگی سیراب ہو سکتی ہے، پیٹ کا دوزخ نہیں بھر سکتا۔ ایسے میں اس کے لئے مزدوری کرنے کے سوا کچھ چارا نہ ہوتا اور وہ لاہور میں اکثر شام کے بعد اپنے گھر سے کھدر کی فتوحی اور نیچے نیلا تہ بند باندھ کر نکلا کرتا اور ریلوے سٹیشن سے باہر قلیوں کے ساتھ باضابطہ مشقت میں شریک ہو جاتا ———

ع بِکنے کے قابل ہوا کرتے تھے میرے شاہکار

اس کی زندگی کے سونے کو کندن بن کر دمکنے میں ابھی بہت سی بھٹیوں سے گذرنا تھا اور اس کی غمزدہ ماں کے دل سے نکلی ہوئی اس دُعا کو بابِ قبول تک پہنچنے میں کچھ مہلت درکار تھی کہ "میرا بیٹا حفیظ ایک دن بہت بڑا آدمی بننے والا ہے۔"

اسی دور کے متصل ایک وقفہ آیا جب اس نے فکر و نظر کی تمام راہیں بند کر کے اندوہِ معاش سے بے نیازانہ ایک گوشے میں بیٹھ کر شاہنامۂ اسلام کی پہلی جلد مکمل کر ڈالی اور اسے خود ہی شائع بھی کیا۔

پاکستان میں قومی شاعر کا مقام تو اسے اب حاصل ہوا ہے۔ ان دنوں بھی اس کی شخصیت شاعرِ اسلام کی حیثیت سے کس قدر مسلّم ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا اندازہ ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے۔

جس دن لاہور میں رسوائے عالم راجپال کو شانِ رسولؐ میں گستاخی کے بدلے قتل کیا گیا، حفیظ اسی شام کسی کام سے جالندھر جا رہا تھا۔ جب گاڑی امرتسر سٹیشن پر رُکی تو ہندوسکھوں کے مشتعل ہجوم نے ڈبوں میں اِدھر اُدھر جھانکنا شروع کیا۔ ایک مہاسبھائی نے حفیظ کو پہچان کر اپنے حلیفوں کو پکارا۔ "بھائیو اِدھر آؤ شکار مل گیا۔" یہ اشارہ اس امر کا تھا کہ ایک مشہور مسلمان تشدد کا نشانہ بن سکتا ہے۔ بے دریغ چلے آؤ۔ چنانچہ بے شمار ہندو اور سکھ یمین و یسار سے اُمڈ آئے اور دربارِ رسالت کا مدح خواں بے طرح پیٹا جانے لگا۔ اس کی پیشانی پہ شدید زخم آیا۔ یہ سب کچھ اتنی عجلت میں ہوا کہ دوسرے ہم سفروں کی سمجھ میں بھی نہ آیا کہ کیا ہوا ہے اور کیوں ہوا ہے۔ اس ضربتِ کاری کا نشان حُبِّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سند بن کر آج بھی اس کی پیشانی میں جگمگا رہا ہے گویا ؎

حفیظؔ بے نوا بھی ہے گدائے کوچۂ الفت
عقیدت کی جبیں تیری مروّت سے ہے نورانی

یہی وہ دَور تھا جب مشاعروں کے علاوہ ملک بھر کے طول و عرض کے ہر چھوٹے بڑے مذہبی جلسے میں اس کی شرکت ضروری سمجھی جانے لگی تھی اور لوگ گھنٹوں ان بزم آرائیوں میں مسلسل مسحور اور گوش بر آواز رہتے تھے۔ رفتہ رفتہ اس کی شہرت نزدیک و دور پہنچنے لگی اور وہ وسیع مقبولیت

حاصل کرتا گیا ——

عرصہ ہوا بنارس میں "مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" کے اجلاس میں کوئی اختلافی مسئلہ نزاع کا سبب بن گیا اور ہنگامہ برپا ہو گیا۔ پنڈال کی فضا میں گنڈاسوں کے لٹھ لہرانے لگے۔ اس شورِ بے ہنگام کو بہت سے نعت خوانوں اور مقرروں نے قابو میں لانے کی کوشش کی لیکن بے سود جب یہ جوش و خروش کسی عنوان تھمنے میں نہ آیا تو نواب صدر یار جنگ بہادر، بابا خلیل داس چترویدی اور حبیب الرحمٰن خان شیروانی نے ملتجی نظروں سے حفیظ کو دیکھا کہ اگر کچھ کر سکو تو کرو۔ اس وقت تا حدِ نظر انسانوں کا ہجوم ہلڑ مچا رہا تھا۔ لیکن اس قبیل کی بیرنگیوں میں نیرنگ کا اعجاز دکھانا حفیظ کے کلام کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ وہ اٹھا۔ اِدھر فضا میں "سلام اے آمنہؓ کے لال اے محبوبِ سبحانی" کی صدا گونجی اُدھر پنڈال میں سکوت کا عالم طاری ہو گیا اور لوگ آرام سے بیٹھ گئے —— سر راس مسعود نے جو اس کانفرنس کے منتخب صدر تھے، بڑھ کر حفیظ کی پیشانی چوم لی اور بغل گیر کرتے ہوئے کہا۔ "حفیظ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ یہ منظر تو معجزاتِ نبوی کا بقیہ معلوم ہوتا ہے"۔ یہ اس کے لحنِ داؤدی کا کرشمہ ہے یا شاید اس کے سخن کا بین السطور تاثر —— بہر حال کوئی شعبدہ ضرور ہے جس کا فیصلہ وقت کرے گا۔ یہ موقعہ اس تفصیل کا نہیں ہے۔ اس مضمون میں مجھے صرف اس کی شخصیت پر کچھ عرض کرنا ہے۔ یہ میں کسی اندیشۂ تردید کے بغیر کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے ملک میں اور بھارت کے مسلمانوں میں جہاں کہیں وہ آباد ہیں اور اردو وہاں بولی اور سمجھی جاتی ہے حفیظ ہی ایسا زندہ شاعر ہے جس کو مرد، عورتیں اور بچے کسی نہ کسی طرح پہچانتے ہیں اور اس امر میں خواص و عوام کی تخصیص نہیں ہے۔ پردہ دار گھروں میں تلاوتِ قرآنِ مجید کے بعد شاہنامۂ اسلام کا وِرد ہوتا ہے اور بوڑھے، بچے، جوان سب کے سب حفیظ کے لئے دعا کرتے ہیں۔ کسی شاعر کو اپنی زندگی میں اس رنگ سے قبولیت نصیب نہیں ہوئی۔ اس کے علاوہ حفیظ کو یہ خصوصیت بھی حاصل ہے کہ لوگ اسے ذاتی طور پر جانتے ہیں۔ وہ اس قدر ہر دلعزیزی حاصل کر چکا ہے کہ جدھر سے بھی گذر جاتا ہے اس پر انگلیاں اٹھائی جاتی ہیں۔ راہ گیر اسے ایک نظر دیکھنے کے لئے ٹھہر جاتے ہیں اور بعض عقیدت مند آگے بڑھ کر مصافحہ اور معانقہ بھی کر لیتے ہیں۔ اس لحاظ سے بھی عصرِ حاضر کے کسی شاعر کو یہ سعادت میسر نہیں کہ اس کا کلام بیک وقت واعظوں، نعت خوانوں اور سیاسی لیڈروں کی زبانوں پر ہو۔ ریڈیو پر اس کے زمزمے رات دن انگڑائیاں لیں۔ طلبا مدرسوں میں اسے پڑھتے ہوں اور اس کا کلام گداگروں تک کے لئے کشکول کا کام دے —— یہ اور بات ہے کہ ابھی تک شہروں میں اس کے جلوس نہیں نکالے گئے۔ اگرچہ کبھی کبھی اس کا دل چاہتا تو ہوگا کہ اسے بھی پھولوں کے ہار پہنائے جائیں۔ کیونکہ اس نے بھی بڑے بڑے معرکے جیتے ہیں۔

اس میں کلام نہیں کہ وہ فطرتاً عوامی شاعر ہے اور ابتدا ہی سے عوامی احساس اس کے قلب و نظر کا موضوع رہا ہے اور اب بھی ہے لیکن میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ شعر کہتے کہتے ڈپٹی کلکٹر ہو جانا روایات میں سنتے آئے تھے مگر حفیظ نے محض اپنی شاعرانہ شخصیت کے سبب اس سے اونچے معیار کے عہدوں کو پا لیا اور یوں اس کا دائرۂ اثر عوام سے گذر کر طبقۂ خواص تک بھی پہنچ گیا۔ وہ کسی احساسِ کمتری کے بغیر جس وقت چاہے، اکابرِ سیاست و تدبیر، اہلِ شمشیر اور عمائدینِ سلطنت سے بلا روک ٹوک مل لیتا ہے۔ اس کے باوصف کہ طبقاتی کشمکش میں وہ عوام کا رہنما ہے۔ اونچے طبقہ میں بھی اس کی شخصیت بڑی محبوب ہے۔ مئی ۱۹۵۰ء میں اس کے جشنِ پنجاہ سالگی کے موقعہ پر اونچے طبقہ کے بیشتر افراد نے دستِ تعاون بڑھا کر اس کی واقعی عظمت کا اعتراف کیا تھا۔

غالباً اسی غیر معمولی ہر دلعزیزی کی وجہ سے وہ ہم عصر شعراء میں معتوب ہے اور اس کی شخصیت ہر گام پر ملامت کا نشانہ بنائی جاتی ہے تنقید کا مفہوم حسد اور غیبت سے ورا ہے۔ لیکن چند ہم عصر بزرگ جہاں بھی باہم مل بیٹھتے ہیں حفیظ کی ذات گفتگو کا موضوع بن جاتی ہے۔ شاید وہ اپنے ہم پیشہ بھائیوں کے ذہن و ضمیر پر کابوس کی طرح سوار ہے، جبھی تو کوئی مدعی بھری محفل میں اس کا منہ چڑانے کے لئے مسخرہ بن کر نے اور سوانگ بھرنے پر اتر آتا ہے تو ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ اختلاف کی صورت میں تضحیک کا پہلو نکال لانا اعترافِ شکست نہیں تو کیا ہے۔

لیکن یہ اپنے اپنے ظرف کی بات ہے۔ حفیظ دشمنی کی کیفیت اور کمیت کا پیمانہ تھوڑے بہت امتیاز کے ساتھ ہم عصر شعرا میں ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ مگر ان لوگوں کی بھی کمی نہیں جو اس کے مقام کو سمجھتے ہیں۔ گزشتہ مارچ میں جب بیگم حفیظ کا انتقال ہوا تو بھارتی اخبارات میں خود حفیظ کی اپنی رحلت کی غلط خبر شائع ہوگئی۔ اس دن حضرت جوش ملیح آبادی جالندھر آئے ہوئے تھے۔ خبر پڑھی تو بے حد ملول ہوئے اور دیر تک حفیظ کو یاد کرکے زار زار روتے رہے اور احباب کے ہمراہ اس مکان کو بھی دیکھنے گئے جہاں حفیظ جالندھر میں رہا کرتا تھا۔

ہم عصر شعراء کے علاوہ بعض دوسرے لوگ بھی ہیں جن کا کام شب و روز مخالفت کی آگ میں جلنا ہے۔ ان حضرات نے حفیظ سے مخاصمت کا کوئی نہ کوئی فرضی عنوان پیدا کر لیا ہے اور قلعہ بند ہو کر تیر آزمائی میں مصروف ہیں اور موقع ملے تو اس پر رکیک ترین حملے کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ لیکن ایسے موقعوں پر حفیظ کی عالی ظرفی اور فراخ حوصلگی اپنے عروج پر ہوتی ہے۔ بہت دنوں کی بات ہے۔ ایک شام میں حفیظ کے ساتھ سیر میں شریک تھا۔ اس دن ایک کم نہاد شخص نے کسی معاملہ میں صریح بددیانتی کے علاوہ گالی گلوچ بھی کی تھی۔ دوران گفتگو میں میں نے اس شخص سے انتقام لینے کی ایک تجویز کا ذکر کیا۔ حفیظ نے میری طرف دیکھا اور کہا "عزیز! بھلائی کرنا سیکھو۔ کینہ پروری شیوۂ مردانگی نہیں ہے۔"

حفیظ کی شخصیت کا ایک اور پہلو اس کے داخلی افکار ہیں۔ لوگوں نے اسے ادبی اور مذہبی اجتماعات میں صرف نظمیں پڑھتے، لطیفے اور چٹکلے کہتے سنا ہے۔ وہ اپنے سیلاب میں بالعموم سب کو بہالے جاتا ہے۔ لوگ واہ واہ کرتے اور مسحور ہوتے ہیں۔ لیکن کوئی نہیں جانتا کہ اس کے قلب و روح پر کیا بیت رہی ہے۔ بعض مادی آسائشوں کے باوجود اس کی داخلی زندگی مصائب، درد و کرب اور پریشان حالی کا مرقع ہے۔ وہ اس بھری دنیا میں تنہا ہے اور ابتدا سے تنہا ہی چلتا رہا ہے۔ ایک بڑے کنبے کا وہ کفیل ہے۔ اس کے خاندان کے مرد افراد لقمۂ اجل ہو چکے۔ سب سے بڑی ضرب اس پر تقسیم کے وقت پڑی ہے کہ جب اس کے کنبے کے ارکان میں سے نو کو قتل کر ڈالے گئے۔ خود اس کے کوئی اولاد نرینہ نہیں ہے۔ اس کی ایک بیٹی صرع جیسے عسیر العلاج مرض میں گذشتہ کئی برس سے مبتلا ہے۔ اس کے اپنے نصیبوں میں بھی روگ کا جوگ پڑا ہے اور وہ مستقل بے خوابی تبخیر اور امراض معدہ کے علاوہ بعض روحانی آلام کا بھی شکار رہے۔ لیکن وہ بیماریوں اور افکار پر قابو پانے، اپنی پریشانیوں کو دل ہی دل میں سمیٹ لینے کی پوری قدرت رکھتا ہے اور اپنی بے پناہ قوت ارادی کے بل پر روزمرہ کے التزام میں فرق نہیں آنے دیتا۔ وہ اپنے بیماروں کا تیماردار ہے، مطالعہ بھی کرتا ہے، فکر سخن کے لئے بھی وقت نکال لیتا ہے اور مشاعرے بھی پڑھتا ہے۔ اپنی کتابوں کا آپ ہی ناشر ہے۔ بعض ان ایماندار کتب فروشوں سے مقدمات بھی لڑتا ہے جو اس کی مصروفیات سے فائدہ اٹھا کر اس کی کتابیں چوری چھپے چھاپ لیتے ہیں اور کھلے بندوں بیچتے ہیں۔ ملک و ملت کو اس کی خدمات درکار ہوں تو وہ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مہینوں طوفانی دورے پر رہتا ہے۔ اجتماعات کو شب و روز خطاب کرتا پھرتا ہے۔ شاید اس کے پاؤں میں حلقہ پڑا ہے کہ

ع مانع دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں

وہ اپنے مستقر میں ہو تو دن رات دوستوں اور ملنے والوں کا ہجوم رہتا ہے۔ عقیدت مند، اغراض کے بندے، اثر و رسوخ سے فائدہ اٹھانے والے، سفارش کے طالب، مشاعرہ باز، اخباروں اور رسائل کے نمائندے۔ ہر قسم کے لوگ اس سے ملنے آتے ہیں۔ گھر کے ایک مختصر سے کمرے میں اس کی فرشی نشست رہتی ہے۔ ملنے جلنے والے قریب ہی کرسیوں یا فرش پر اس کے ساتھ بیٹھے ہوتے ہیں۔ بھانت بھانت کی باتیں ہوتی ہیں، شعر و سخن سے سیاست اور دیر سے حرم تک سبھی قسم کی باتیں ـــ کسی دن فکر سخن کا موقع ہو جاتا ہے تو دن بھر اسی خیال میں مگن رہتا ہے۔ شعر کے معاملہ میں اس سے زیادہ محتاط کوئی دوسرا نہ ہوگا۔ وہ عروس سخن کو سنوارنے اور نکھارنے میں بے حد محنت کا قائل ہے اور فن کو صرف الہام تک محدود نہیں سمجھتا۔ کسی دن قرآن مجید کی تلاوت کرتا ہے تو سحر سے شام کر دیتا ہے۔ پڑھتا اور فکر و تدبر کرتا ہے۔ ہفتہ میں ایک یا کبھی دو بار خطوط کا جواب لکھنے کی نوبت آ جاتی ہے تو ایسے خطوط کا انبار کھل جاتا ہے۔ وہ یکے بعد دیگرے قلم برداشتہ جواب لکھتا جاتا ہے۔ ایک دن میں نے کہا، آپ

خطوط کے جواب میں بالکل اہتمام نہیں برتتے تھا حالانکہ خطوط بھی ادبی سرمایہ بن سکتے ہیں۔ جواب میں کہا "تم یہ چاہتے ہو کہ میں بھی تصنع سے کام لوں اور مطالب کو عبارت آرائی کی نذر کر دوں"۔

بالعموم عصر کے بعد سیر کے لئے نکلتا ہے اکثر پیدل اور شاذ و نادر موٹر پر، کوئی دوست بھی ہمراہ ہوتا ہے لمبی سیر اس کا محبوب مشغلہ ہے۔ چلنا چلنا چلتے جانا، اثنائے راہ کسی ریستوران میں لسی یا شربت پینے کے لئے ٹھہر جاتا ہے اور کبھی سربازار چاٹ، دہی، پکوڑے وغیرہ کھانے کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے اور اسے معیوب نہیں سمجھتا۔

سیر سے واپسی پر اشیائے ضروری اور نواسوں کے لئے ایک آدھ کھلونا ضرور خریدے گا اور رشتہ داروں سے ملاقات کرتا ہوا نکلے گا۔ دوستوں کے گھروں پر دستک دینا اور ان کی خیریت پوچھنا اس کے مذہب میں داخل ہے۔ اگرچہ اس کے دوستوں کا حلقہ دن بدن بے حد مختصر ہوتا جا رہا ہے، تاہم ان میں سے ہر ایک اس کو عزیز ہے۔ زبانی ہی زبانی نہیں بلکہ کسی ضرورت مند دوست کی دامے درمے مدد بھی کر دیتا ہے۔ اس عمل سے بڑے کے ساتھ اس کی رُوح بھی سبک ہو جاتی ہے۔ اس مسرت کی وجہ سے جو نیکی کا حسین ثمرہ ہے، یہ نوازشیں کم و بیش اس نے اپنے ان تمام کرم فرماؤں سے کی ہیں جو آج اس کی جان کے لاگو بنے ہوئے ہیں ؎

صبح دم اپنی اپنی راہ لگے　　شمع کے جاں نثار پروانے

یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس حریف بے زبان کو وہ لذتِ گفتار سے آشنا کرتا ہے، اسی کے قلم کی خنجر آزمائی سے اس کی اپنی ذات محفوظ نہیں رہتی، لیکن جب سانپ اسے ڈس جاتا ہے تو وہ یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے ؎

نہیں عتابِ زمانہ خطاب کے قابل　　ترا جواب یہی ہے کہ مسکرائے جا

اس کی زبان پر بہر عنوان دوستوں کا ذکر رہتا ہے۔ لیکن دشمنوں کے پیہم کچوکے کھانے کے باوجود وہ کوئی جملہ بر سبیلِ شکایت بھی تو زبان پر نہیں لاتا۔

طبعاً اس کی نس نس میں شرارے بھرے ہوتے ہیں۔ اس کا ہیولیٰ طنز کے خمیر سے تیار ہوا ہے۔ اس کے کلام سے قطع نظر صرف اس کا وجود بھی سوسائٹی پر کامیاب طنز معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ وہ ماحول کے تاثرات سے الگ ہو کر نہیں سوچتا اور نہ کچھ کہتا ہے۔ اس لئے اس کی آواز میں عوام کا درد اور چیخ و پکار برابر سنائی دیتی ہے اور اب تو دن بدن اس کے طنز کے نشتروں کا گھاؤ پہلے سے زیادہ گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جن تلخیوں کو اس نے عمر بھر جرعہ جرعہ پیا ہے اب وہ دریا دریا بہہ نکلی ہیں۔ اس کی تند و تیز گفتگو جس میں اس کی بے پناہ جرأت اور بے باکی بھی شامل ہے، مئے دو آتشہ کی مثال ہے اور اپنا مثالی مقام رکھتی ہے۔ وہ جب اپنی کہنے پر آتا ہے تو بے نیازِ نتائج ہو کر کہہ جاتا ہے۔ ایسے موقعوں پر وہ سر کو والہانہ جنبش دے کر سیدھے ہاتھ کی انگشتِ شہادت کو ہوا میں لہراتے ہوئے عینک کے گوشے سے سامعین پر معنی خیز نظر ڈالتا ہے اور ایسا تیر مارتا ہے کہ ہائے ہائے ——!

طنز کا تلخ آب (اگرچہ تلخابۂ شیریں ہی ہو) اس کی زندگی کے دھارے سے یوں گھل مل رہا ہے کہ وہ کوشش کے باوصف طبیعت کی فطری اُفتاد پر قابو نہیں پا سکتا۔ اسے غصہ آتا ہے تو آتا چلا جاتا ہے۔ ایسے میں اکثر و بیشتر اپنے دوستوں اور گھر والوں پر بھی گرجتا برستا ہے۔ لیکن سب جانتے ہیں کہ اس کی یہ کیفیت وقتی و آنی ہے اور اس کے بعد پھر وہی ادائے محبوبی!

بارہا ایسا ہوا ہے کہ وہ دوستوں سے محوِ کلام ہے۔ دفعتاً اس کے خیال کے پردوں پر کوئی اندوہگیں یاد پری بن کر جھلملانے لگی اور اس کے ہونٹوں پر پھیلا ہوا تبسم یک بارگی دم توڑ دے گا۔ افسردگی اس کے چہرے پر پارہ پارہ ہو کر بکھر جائے گی اور اس کی تیز بیں نگاہیں دور بہت دور فضا کی پہنائیوں میں تیرنے لگیں گی۔ پھر وہ جب داخلی ہیجان کے تلاطم سے اُبھرے گا تو کوئی شعر یا نغمہ اس کے لبوں پر تھرتھراتا ہوگا ؎

اے مرے آقا مبرّہ از خطا تو ہے کہیں　　بخش دینا کام کس کا ہے خدا تو ہے کہیں

منزلِ مقصد نہیں ملتی نواب میں کیا کروں ‌‌‌ ‌‌ راہ تیری ہے کہ میری راہنما تو ہے کہ میں

کرب کو کم کرنے کے لئے وہ ہمیشہ نغمات کی شیریں اثری سے کام لیتا ہے۔ عرصہ ہوا ایک رات شانے کے درد سے بیتاب ہو کر اس نے ہسپتال کی فضا میں گیتوں کا رس بکھیر کر اپنے ساتھ وارڈ کے دوسرے مریضوں کو بھی بیدار کر لیا تھا۔ لیکن اس حال میں اس کی نوا تلخ نہیں ہوتی بلکہ اس کے گیتوں میں ایمان کی حلاوت نظر آتی ہے۔ مثلاً ——

راہ میں حائل کوہِ سینا ‌‌‌ جس کی چوٹی پہلا زینہ
دل آئینہ ہے تو تجھ پر ‌‌‌ جھلکیں گے انوارِ مدینہ
تجلیوں میں مستور ‌‌‌ مسافر —— تیری منزل دور

یا وہ وارداتِ قلب ہوتے ہیں جن کی تلمیس اس کے سارے ملّی کلام میں موجود ہیں۔ جس کا مقصود اس کے سوا کچھ نہیں کہ بمصطفےٰ برساں خویش را۔ اسی جذبے کے تحت وہ چھپ چھپ کر نمازیں بھی پڑھ لیتا ہے اور اس کی سحر خیزی میں اوراد و وظائف کی ہم آہنگی بھی شامل ہے۔

امجد حیدرآبادی

نصیر الدین ہاشمی

سن ۱۹۱۱ء حیدرآباد کی تاریخ میں اس لئے یادگار ہے کہ آصفی فرمانروا میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کا انتقال ہوا اور میر عثمان علی خاں آصفجاہ سابع مسند نشین ہوئے تھے۔ اور اس سال پہلی مرتبہ شہر حیدرآباد میں طاعونی وبا پھیلی تھی۔

تمام مدارس طاعون کی طویل تعطیلات کے بعد کھلے تھے۔ اور میں اس وقت مدرسۂ دارالعلوم (جو مشرقی تعلیم کا مدرسہ تھا) پانچویں جماعت میں شریک تھا۔ چونکہ طویل تعطیلات کے بعد مدرسہ کھلا تھا اس لئے جدید ٹائم ٹیبل تقسیم ہوا۔ پانچویں جماعت میں تاریخِ دکن اور جغرافیۂ دکن کی تعلیم مولوی سید احمد حسین صاحب المتخلص بہ امجدؔ سے متعلق تھی۔ انہی دنوں میں نے حضرت امجدؔ کو پہلی بار دیکھا تھا۔ تیس پینتیس سال کے جوان، لمبا قد، چھریرا بدن، گندمی رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، کشادہ پیشانی، داڑھی صاف، سفید شیروانی، ترکی ٹوپی، حیدرآبادی دوہرا پاجامہ، سلیم شاہی چڑھاواں، یہ تھے امجد صاحب۔

اس وقت امجدؔ صاحب ٹریننگ اسکول کی تعلیم کے بعد اپنی ملازمت پر مدرسہ واپس آئے تھے۔ بعض لڑکے ایسے تھے جو اس سے پہلے امجد صاحب کے زیرِ درس رہ چکے تھے۔ انہی کی زبانی معلوم ہوا کہ لڑکوں کو بڑی شفقت سے پڑھاتے ہیں۔ اور یہ بھی کہ موسیٰ ندی کی طغیانی سن ۱۹۰۸ء میں ان کی بی بی بچے نذرِ سیلاب ہو گئے تھے۔ اب درگاہ شاہ خاموش کے سجادہ نشین حضرت سید محمد ہاشم حسین صاحب کے پوتے سید صابر حسین کو پڑھاتے ہیں۔ شاعر ہیں۔ قوال ان کی تضمین گاتے ہیں، حسن پرست ہیں۔ یہ تھیں وہ معلومات جو مجھے لڑکوں سے حاصل ہوئی تھیں۔ اس کے بعد کے حالات قلم بند کرنے سے پہلے امجد صاحب کے جو حالات بچپن، تعلیم اور آغازِ ملاقات سے متعلق ہیں خود ان کے قلم سے حسب ذیل ہیں۔

(۲)

"ہم نے اپنی والدہ صوفیہ مرحومہ سے سنا تھا کہ نواب سالار جنگ اول کی وفات ۱۳۰۰ھ کے پانچ یا چھ سال بعد حیدرآباد دکن میں ۷ رجب کے قریب صبح روز دوشنبہ ہماری نحوست کا ستارہ طلوع ہوا۔ یعنی ہم بمعنی غم پیدا ہوئے۔ صحیح تاریخ و سن ہم کو بھی نہیں معلوم۔ ہمارے والد حضرت صوفی رحیم علی مرحوم کا ہماری والدہ سے عقد کے تین سال بعد عین ہمارے چھلہ کے دن مرض فالج سے آناً فاناً انتقال ہو گیا۔ چھلہ کی رسم میں مہمانوں سے بھرا ہوا گھر دم بھر میں ماتم کدہ بن گیا۔

اگرچہ ہماری والدہ کے عزیز و اقارب سب مر چکے تھے۔ شوہر کا سایہ بھی سر پہ باقی نہیں رہا تھا۔ سب بچے جا کر ہم اکیلے رہ گئے تھے، مگر نہ معلوم ہماری ان امی جان میں تعلیم کا شوق کہاں سے، اور کس طرح پیدا ہو گیا تھا کہ ہم سے بارہا فرماتیں :-

"بیٹا، اگر جینا ہو تو کچھ ہو کر جیو ورنہ مر جاؤ۔"

ماں علم کی دلدادہ ہم کھیل پر آمادہ، ان کو علم سے محبت ہم کو پڑھنے سے وحشت۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ غرض اسی طرح جان چرا چرا کر مار کھا کر خانگی طور پر قرآن مجید اور اردو کی دو ایک کتابیں الٹی سیدھی ختم کریں۔

جب مدرسے میں شریک ہوئے ان حیلے بہانوں کی چنداں ضرورت نہ پڑی۔ کتابوں کا بستہ بغل میں دبا کر شوقین بچے کی طرح گھر سے نکل جاتے۔ باغوں اور جنگلوں کی سیر کیا کرتے اور پھر عصر کے وقت اسی طرح بستہ بغل میں لئے ہوئے گھر واپس آجاتے۔ آخر ایک دن ہماری والدہ کو ہماری آوارہ گردی کا پتہ چل ہی گیا۔

ایک روز ہمارے دروازے کے سامنے سے کہاروں کے کندھوں پر پالکی میں کوئی امیر سوار جا رہے تھے۔ پالکی پکڑے ہوئے ایک آدمی بھی ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔ والدہ نے ہم کو بلا کر دکھایا اور کہا دیکھو اور اچھی طرح سمجھو، ایک آدمی سوار ہے۔ ایک پیدل پاؤں پالکی کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا ہے۔ بتاؤ ان دونوں میں سے تم کو کس کی زندگی پسند ہے۔ ہم نے کہا پالکی سواری۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ والدہ نے کہا ایسی زندگی تو بغیر علم کے کسی کو نصیب نہیں ہو سکتی۔ اگر نہ پڑھو گے تو تم کو بھی اسی دوسرے آدمی کی طرح پالکی کے ساتھ دوڑنا پڑے گا۔ وقت کی بات، گفتگو کا اثر، اس بیش بہا مثال سے ہم بہت سہم گئے۔ اور آیندہ کھیلنے سے توبہ کر کے پڑھنے لکھنے کا عہد کر لیا ؎

دل پہ لگی جا کے ہتھوڑے کی طرح   کہنے کو ظاہر میں وہ ایک بات تھی
کر دیا دم بھر میں ادھر سے ادھر   بات تھی یا کوئی کرامات تھی

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر مدرسہ نظامیہ میں داخل ہوئے۔ قیام بھی مدرسہ کے بورڈنگ میں تھا۔ قیام کے آخری زمانے میں ہم نے پڑھنا لکھنا بالکل چھوڑ دیا تھا "خفتن و خوردن" وہی مصدر خوب از بر تھے۔ آخر مہتمم صاحب مدرسہ کو ہماری بے مہاری کی خبر ہو گئی۔ اگرچہ مدرسے کے قاعدے کے اعتبار سے ہمارا حصہ فوراً بند ہو جانا چاہئے تھا۔ مگر مہتمم صاحب ہماری روبراہ ہونے کی امید پہ کچھ دنوں ٹالتے رہے۔ آخر ایک دن مدرسے کے بڑے ہال کے سامنے ہم کو روک کر پوچھ ہی بیٹھے کہ تم نے پڑھنا کیوں چھوڑ دیا۔ ہم نے کہا کس سے پڑھیں۔ مہتمم صاحب نے کہا تمہارے پڑھنے کے لئے استاد نہیں ہیں۔ ہم نے کہا ان معمولی استادوں سے ہم نہیں پڑھ سکتے۔ مہتمم صاحب نے کہا پھر کس سے پڑھوگے؟ ہم نے کہا مولوی عبدالوہاب بہاری سے۔ مہتمم صاحب نے کہا تمہارے لئے اتنی بڑی ماہوار کا استاد تو نہیں رکھا جا سکتا۔ ہم نے کہا تو پھر ہم بھی نہیں پڑھ سکتے۔ ہمارے اس جواب پر مہتمم صاحب کو سخت غصہ آیا۔ اور جھلا کر ہم کو پکڑنے اور مارنے کے لئے لپکے۔

ہم تقریباً ۱۳۱۶ھ میں مدرسہ نظامیہ کے وظیفہ خواروں میں شریک ہوئے، وہاں قطبی تک تعلیم پا کر چھوڑ دیا۔ اب تک والد مرحوم کے پس انداز اور ان کے چھوڑے ہوئے مکانات بیچ بیچ کر زندگی بسر کرتے تھے۔ دو روپے ماہوار پر ایک لڑکی کو پڑھانے کے لئے چار میل جایا کرتے۔ سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں شیخ میران صاحب کی لڑکی سے پہلی شادی ہوئی جس سے ایک لڑکی اعظم النساء پیدا ہوئی۔ اس کے دو سال کے بعد کسی خانگی وجہ سے ماں سے بگڑ کر ہم بنگلور چلے گئے۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نئے ملک میں کہیں ٹھہرنے کو جگہ نہ ملی۔ مجبوراً کنٹونمنٹ کے عیسائی مشن میں اتر پڑے۔ مشن اسکول میں تعلیم بھی دیا کرتے تھے۔ نئے کرسچنوں اور پادریوں سے دن رات مذہبی گفتگو رہا کرتی تھی۔ پادری صاحب اتوار کے دن جب بستی میں وعظ کرنے کے لئے جاتے ہم بھی ان کے ساتھ جایا کرتے تھے۔ بڑا لطف تو یہ تھا، ایک طرف پادری صاحب کھڑے ہوئے عیسوی راگنی بجاتے۔ دوسری طرف ان کے مقابل ہم دین محمدی کی تبلیغ کیا کرتے تھے۔ کام

ختم کر کے ہم دونوں پھر ایک ساتھ گاڑی میں سوار ہو کر مشن کو واپس آتے ۔ ہماری اس طرزِ روش سے سارے مسلمان بنگلور میں متحیر تھے ۔ کوئی ہم کو عیسائی کہتا کوئی محمدی سمجھتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پریشانی کی حالت میں ایک جنٹلمین امیر عبد اللطیف صاحب کے گھر پہنچے ۔ انہوں نے قصیدہ سُن کر بڑی تعریف فرمائی ۔ ہماری دعوت کی، کچھ روپے بھی دئے ۔ اور ایک سفارشی چھٹی ایک پارسی ڈاکٹر کے نام لکھی جس کا مضمون یہ تھا

"آپ کو اپنی تعلیم کے لئے ایک مدرس کی ضرورت تھی ۔ حامل ہذا آپ کو اچھی طرح تعلیم دے سکیں گے ۔"

ہم دوسرے دن پتہ پوچھتے اپنے پھٹے پرانے لباس میں ڈاکٹر صاحب کے مکان پر پہنچے ۔ عالی شان مکان کی شان دیکھ کر باہر ہی ٹھٹک کر رہ گئے ۔ اتفاق کی بات اس وقت ڈاکٹر صاحب باہر چمن کی روشوں میں سگار کے کش لگاتے ہوئے ٹہل رہے تھے ۔ ہم کو دروازے پر کھڑا دیکھ کر پوچھا ۔ "ول تم کون ہے ؟" ہم نے جواب دینے کی جگہ گھبرا کر چھٹی ہاتھ میں دے دی ۔ ڈاکٹر صاحب نے لفافہ کھول کر چھٹی پڑھی ۔ چھٹی پڑھتے ہوئے کبھی سر سے پاؤں تک ہم کو دیکھتے کبھی بھویں چڑھا چڑھا کر چھٹی پڑھتے ۔ ہم اس وقت ریش و بروت سے بھی معرا تھے ۔ آخر ڈاکٹر صاحب سنبھل نہ سکے ۔ نہایت خشمناک لہجے میں گرم ہو کر فرمایا "تم ہم ساٹھ برس کے بڈھے کو تعلیم دے گا" ہم نے کچھ جواب نہ دیا ۔ پھر ڈاکٹر صاحب نہایت سختی سے ہمارا ہاتھ پکڑے ہوئے اندر لے گئے ۔ مکان اگرچہ حقیقت میں جنت کا نمونہ تھا ۔ مگر ہمارے لئے تو جہنم سے بدتر تھا ۔ ہم کو لے جا کر کتب خانہ میں بٹھایا ۔ "کلیاتِ قاآنی" نکال لائے ۔ اور ایک قصیدہ پڑھنے کا حکم دیا ۔ دو چار شعر پڑھ دئے ۔ حکم ہوا اس کی تقطیع کرو ۔ ہم نے تقطیع کر دی ۔ حکم ہوا کہ بحر کا نام بتاؤ ۔ اب تو ہم بھی غوطے کھا گئے ۔ یکایک دیکھا کہ کتاب کے حاشیہ پر کچھ انگریزی میں لکھا ہوا ہے ۔ ہم نے ایک ایک حرف پڑھ کر سب کو جوڑ کر "بحر اخرب" کہہ دیا ۔ ڈاکٹر صاحب بہت خوش ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی زبان میں اپنی لیڈی صاحبہ سے بھی ہماری بہت تعریف کی کیونکہ اثنائے گفتگو میں لیڈی صاحبہ مسکرا کر محبت اور قدر دانی کی گرم جوش نگاہوں سے ہم کو دیکھ رہی تھیں ۔

نگہے نیاز بود و در نفتہ باز بود

شاہ نامہ پڑھانے کے لئے ہم کو اپنا منشی مقرر کر لیا

پھر عبد اللطیف صاحب کے توسط سے ناظم تعلیمات بنگلور کے پاس پہنچ گئے ۔ اور اسی دن سٹی اسکول میں بالفعل پندرہ روپے ماہوار کے مدرس ہو گئے ۔ ہم دو مہینے تک سٹی ہائی سکول میں مدرسی کرتے رہے ۔ کئی انسپکٹر تعلیمات اور پرنسپل ہمارے شاگرد ہو گئے ۔ رہنے کو مدرسہ ہی کا دلچسپ اور پرفضا مکان، پڑھنے کے لئے مدرسہ کا سارا کتب خانہ، خدمت کے لئے مدرسہ کے طلبا، کھانے کے لئے قدر دانوں کی ضیافتیں، دل بہلانے کے لئے دوستوں کے ساتھ باغوں کی تفریحیں، رقص و سرود کے جلسے ۔ غرض وہ تمام سامان جو دنیوی مسرت کو مکمل کر سکتا ہے وہاں پردیس میں خدائے تعالیٰ نے ہمارے لئے فراہم کر دیا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اس طرح تین چار مہینے بنگلور میں گزار کر ماں کی وجہ سے پھر حیدر آباد واپس ہوئے ۔

یہاں آ کر چند مصیبتوں کے بعد مولوی عزیز مرزا صاحب بی ۔ اے کی علمی قدر دانی کی شہرت سن کر ایک دن ان کے مکان پر پہنچ گئے اور "رباعیاتِ امجد" کی ایک جلد پیش کر دی ۔ مولوی عزیز مرزا ہمارے حال پر بہت مہربان ہو گئے ۔ اور وہ ہمیشہ قدر دانی فرماتے رہے ۔ آپ ہی کی سفارش سے ابتداً ہم مدرسہ دار العلوم میں بیس روپے ماہوار پر مدرس ہو گئے ۔

ہمارا مکان موسیٰ ندی سے کوئی ساٹھ گز کے فاصلے پر تھا ۔ سلخ شعبان سنہ ۱۳۲۶ھ کی شام ہی سے رود موسیٰ لبریز ہو کر اپنے دونوں ساحلوں کی طرف سیلِ بلا کی طرح بڑھ رہی تھی ۔ رات کے دس بجے تک تو بڑھتے ہوئے پانی نے غنیم کی فوج کی طرح چاروں طرف سے محاصرہ کر لیا تھا ۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد قبلہ رخ کی دیوار شق ہوئی کمرے کے ہال میں پانی آگیا ۔ ہم ادھر سے بھاگ کر دوسری طرف جا بیٹھے ۔ ادھر بھی دم لینے نہ پائے کہ صحن کا پانی دروازے

کے راستے چڑھتا ہؤا اوپر آگیا۔ آخر ایک تخت بیچ میں ڈال کر ہم سب اس پر بیٹھ گئے۔ ہمارے لئے یہ بہت نازک وقت تھا۔ دونوں طرف سے پانی برابر چڑھتا اترتا آرہا تھا۔ نہ ادھر کوئی راستہ نہ ادھر کوئی مفر۔ ادھر موت ادھر ملک الموت ......

...... ہم ایک طرف، ماں ایک طرف، بیوی ایک طرف، بچی ایک طرف۔ مجتمع عناصرِ اربعہ منتشر ہو گئے۔ اس جگہ بھی قدرت کا کرشمہ دیکھنے کے قابل ہے۔ ہمارا قدم ڈوبنے کے بعد زمین کی جگہ گھاس کے چھپر پر جا پڑا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ کچھ وقت اسی چھپر پر ہی گذر گیا مگر کس طرح گذرا

"سینہ بشگافم اگر طاقتِ دیدن داری"

یہاں تک کہ صبح کاذب نمودار ہو گئی۔ اس ہولناک بیداری سے رات کا متوحش خواب ہی غنیمت رہے گا۔ یعنی صبح کے وقت ندی کی زد سے فصیلِ شہر کا ایک حصہ گر پڑا۔ فصیل گرنے کی وجہ سے اس کا سمٹا ہؤا زور دور دور پھیل کر ہماری طرف بھی منتقل ہو گیا۔

ماں نے بیٹے کی آواز سن لی۔ اسی عالمِ بدحواسی میں ہاتھ بڑھا کر ایک پتلی سی ڈالی پکڑ لی اور ہماری طرف دیکھ کر کہا ہائے بیٹا میرے دونوں چاند ڈوب گئے (یعنی بہو اور پوتی) ہم نے کہا خیر جو ہوا ہوا۔ تم تو کسی طرح بچ جاؤ.......... اور وہ پتلی سی ڈالی بھی ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اماں کے دو چاندوں کی طرح ہمارا ایک چاند بھی پانی میں ہمیشہ کے لئے ڈوب گیا۔ ہم ننگِ خاندان، خاندان کو ڈبو کر ڈوبتے ڈوبتے ندی کے زبردست دھارے میں بہتے چلے۔ اسی دھارے میں کچھ دور بہنے اور زنانہ ہسپتال کے محاذی میں آنے کے بعد ہسپتال کی بیمار عورتوں نے ہمت کر کے ڈوبتے کو بچا لیا۔ بے غیرت کی بلا دور۔ عزیزوں کو کھو کر ننگے دھڑنگے، بھیانک صورت ڈراؤنا چہرہ لئے مانس بنے ہوئے ایک مرتبہ پھر کنارے تو لگ گئے۔ اور بہنے والے بہہ گئے۔ ڈوبنے والے ڈوب گئے۔ گئے اور ایسے گئے کہ لاشوں تک کا پتہ نہ ملا

سیلاب میں جسمِ زار گویا خس تھا　　عرفاتِ محیطِ غم کس دناکس تھا
اتنے دریا میں بھی نہ ڈوبا امجد　　غیرت والے کو ایک چلو بس تھا "

(۳)

یہ تھے امجد صاحب کی زندگی کے وہ حالات جو میرے ملنے سے پہلے گزر چکے تھے۔ مدرسہ دار العلوم کی پانچویں اور چھٹی جماعت میں میں امجد صاحب کا شاگرد رہا۔ خصوصاً چھٹی جماعت میں تو تقریباً تمام مضمون یعنی عربی، فارسی، حساب، تاریخ، جغرافیہ سب کا امجد صاحب ہی درس دیتے تھے۔ آپ کی تعلیم کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ دوسرے مدرسین کے قطع نظر مکان سے تیار ہو کر مطالعہ کر کے آتے تھے۔ ورنہ اس زمانہ میں مدرسہ کا کوئی مدرس ایسا نہیں ہوتا تھا جو درس دینے سے پہلے تیار ہو کر آتا ہو۔ یہی وجہ تھی کہ لڑکے گرویدگی سے امجد صاحب سے پڑھنے کی خواہش کرتے تھے۔

پھر وہ زمانہ آیا جبکہ حضرت امجد مدرسہ دار العلوم کی مدرسی سے نکل کر صدر محاسبی میں تصفیۂ مقدمات کی شاخ میں چلے گئے۔ اور ہم دار العلوم کی اعلیٰ جماعتوں میں شریک ہوئے لیکن امجد سے جو انسیت پیدا ہو گئی تھی اور خلوص ہو گیا تھا وہ منقطع نہیں ہو گیا۔ نہ صرف باقی رہا بلکہ رفتہ رفتہ اس میں اضافہ ہوتا گیا۔ اور پھر ایک زمانہ وہ بھی آیا ہم ہفتہ میں دو مرتبہ بلاناغہ امجد صاحب کے مکان کو جاتے رہے۔ اور کبھی امجد صاحب بھی چار چھ روز ہمارے مکان میں آکر اپنے متعلقین سمیت قیام کرتے۔ یا میرے بی بی بچے امجد صاحب کے مکان میں جا رہتے۔ میری بی بی امجد صاحب کی مرید ہو گئی تھیں۔ امجد صاحب کی بی بی کا پردہ مجھ سے نہیں ہوتا۔ کبھی میرے موٹر میں امجد صاحب　تنہا کبھی بی بی کے ساتھ سیر و تفریح ملنے ملانے کو بھی جایا کرتے۔ غرض کہ مجھ میں اور امجد صاحب میں بالکل یگانگت ہو گئی تھی۔ اس طرح مجھے امجد صاحب کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ جو باتیں مجھے معلوم ہیں بشاید وہ اور کسی کو معلوم نہیں۔ بہرحال ان ہی معلومات کا ایک حصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

امجد صاحب جس وقت مدرسہ دار العلوم سے صدر محاسبی کے دفتر میں منتقل ہوئے اس وقت ان کو تھرڈ گریڈ میں لیا گیا تھا یعنی (۴۰ تا ۸۰)

ماہوار تنخواہ ملتی۔ پھر سکنڈ گریڈ (۱۰۰ تا ۱۷۰) اس کے بعد فرسٹ گریڈ (۱۸۰ تا ۳۰۰) پر ترقی ملی اور ملازمت کے آخری زمانہ میں (۴۵۰ تا ۶۰۰) کے مددگار ہو گئے تھے۔ چار سو سے زیادہ ماہوار پر آپ کو وظیفہ ملا۔ آپ کے افسر ہمیشہ آپ کا ادب کرتے تھے۔ کیونکہ آپ کی شخصیت مشہور اور معروف ہوتی جا رہی تھی۔

سیلاب رود موسیٰ کی تباہی کے کئی سال بعد تک آپ نے دوسرا بیاہ نہیں کیا۔ اس کے بعد مولانا سید نادر الدین صاحب کی دختر جمال النساء بیگم سے آپ کا عقد ہوا۔ امجد صاحب کی یہ بی بی اپنی روحانی قوت میں امجد صاحب سے ترقی کر گئیں۔ ان کے مشاہدات اور مکاشفات "جمال امجد" میں صاحبان بصیرت کے لئے ایک درس رکھتے ہیں۔ جن کی صراحت یہاں غیر ضروری ہے۔

میاں بی بی کی زندگی بڑی پر لطف گزرتی رہی۔ جس کی تفصیل خود امجد صاحب نے "جمال امجد" میں کر دی ہے۔ اس کی پوری تفصیل کا تو یہ موقع نہیں ہے۔ البتہ چند سطور پیش کی جاتی ہیں:۔

> "شادی کے پانچ چھ برس بعد ہماری کسی خاص کوشش اور محنت کے بغیر ہماری زندگی کا دور بدلنے لگا۔ وقت آ گیا۔ رحمتِ الٰہی کے دروازے آہستہ آہستہ کھلنے لگے۔ خدا رسول کی محبت کے آثار سلمیٰ (جمال النساء بیگم کو امجد صاحب نے "سلمیٰ" کا لقب دیا تھا) کے اوضاع و اطوار سے ظاہر ہونے لگے۔ ہماری حیرانی ان کی مسرت کا سبب، ہمارا تعجب ان کے انبساط کا موجب ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ لطائف و نکات جو کبھی اور کسی وقت تو ہمارے وہم و خیال میں بھی نہ آتے تھے ان کی زبان سے بلا تکلف ادا ہوتے تھے۔ کبھی کبھی پکانے کے لئے بھی وقت نہ ملتا۔ بازار سے روٹی لا کر کھا لیتے۔ اکل و شرب کی تمام لذتیں روحانی اور مذہبی مسرتوں پر قربان تھیں۔ کبھی کبھی ادھر سالن چولھے پر چڑھا ہوتا ادھر کوئی بحث چھڑ جاتی سالن اپنے آپ پک کر ٹھنڈا بھی ہو جاتا۔ مگر یہاں سلسلۂ گفتگو ختم ہی نہ ہونے پاتا۔ ہمارے گھر میں ہمیشہ ایک ہی سالن پکا کرتا تھا۔ کبھی کبھی تو ایک ہی سالن دو دو تین تین دن تک برابر کھاتے رہتے لذت میں کوئی فرق نہ آتا۔ ہر لقمہ پہلے لقمے سے لذت میں ترقی کرتا جاتا تھا۔ خانۂ خدا کے زیر سایہ صابر منزل کے چھوٹے اور پرُفضا چمن میں ہم دونوں کی پر لطف زندگی بسر ہوتی تھی۔"

امجد صاحب کی زندگی کے کئی سال جمال النساء بیگم سلمیٰ کے ساتھ ہنسی خوشی بسر ہوئے۔ دونوں مل کر حج کو گئے "حج امجد" میں امجد صاحب نے دلچسپ اور دلکش انداز میں اپنے سفر حج کا حال لکھا ہے۔ واپسی حج کے کچھ عرصہ بعد جمال النساء کا انتقال ہو گیا۔ یہ انتقال امجد کی زندگی کا نہایت اہم اور پر درد واقعہ تھا۔ موسیٰ ندی کے سیلاب کی طرح ہی یہ واقعہ امجد صاحب کے لئے اندوہناک اور پرُالم ہوا۔ عرصہ تک امجد صاحب نہایت رنجیدہ رہے۔ آخر دوستوں نے ایک شادی کر دی۔ مگر امجد صاحب کی نفاست پسند طبیعت نے اس بی بی کے ساتھ زندگی بسر کرنا گوارا نہیں کیا۔ ان کو روز اول ہی طلاق دے دی گئی۔ اور کچھ عرصے کے بعد چوتھی بی بی سے عقد کیا جو اس وقت آپ کی شریک حیات ہیں۔

امجد صاحب کی خانگی زندگی کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں شروع سے اب تک بہت کم فرق ہوا ہے۔ جو لباس و خوراک اور جس وضع کا آپ پہلے بیس روپیہ ماہوار کے وقت استعمال کرتے تھے وہی چھ سو روپیہ کی ماہوار کے وقت استعمال کرتے تھے۔ اور اب بھی کرتے ہیں۔ سفید یا خاکستری رنگ کی شیروانی اور ترکی کلاہ استعمال ہوتا تھا۔ حج کے بعد کپڑے کی عربی کلاہ استعمال کرتے ہیں۔ حیدر آبادی دوہرا پاجامہ باہر جاتے وقت استعمال کرتے ہیں۔ مکان میں تہبند کا اور قمیص کا استعمال ہوتا ہے۔ چوڑا دے کا جوتا پہنتے ہیں۔

امجد صاحب نہایت سادگی پسند ہیں۔ کھانے پینے، رہنے بسنے پہننے اوڑھنے میں انتہائی سادگی ہوتی ہے۔ جو مل جائے وہ پہننا آپ کی عادت ہے۔ ضروریات زندگی کی ہر چیز اکثر خود خریدتے ہیں۔ لباس اور کھانے پینے کے بعد آپ کی خانگی زندگی یا گھریلو معاشرت کا مختصر تذکرہ ضروری ہے۔

ہم کو جمال النساء بیگم مرحومہ کے زمانے میں قریب سے امجد صاحب کی گھریلو زندگی دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ مگر موجودہ رفیق حیات کے ساتھ آپ کی منزلی زندگی کا نقشہ ہمارا دیکھا بھالا ہے۔ اس کو دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ دونوں کی زندگی خوش و خرم طور پر بسر ہوتی ہے۔ اگرچہ آپ کی رفیق حیات تعلیم یافتہ نہیں ہیں اور عمر کے لحاظ سے بھی وہ آپ سے بہت چھوٹی ہیں۔ مگر ان کی سلیقہ شعاری اور شوہر کی طبیعت میں خود کو ڈھالنے کے باعث دونوں مسرت آمیز زندگی گزارتے ہیں۔ دونوں میں انسیت ہے۔ محبت ہے۔ خلوص ہے۔ شوہر بی بی کی رعایت اور ناز برداری کرتے ہیں تو بی بی شوہر کی اطاعت اور فرمانبرداری کو افضل سمجھتی ہیں۔ جہاں تک ہم کو معلوم ہے کبھی دونوں میں اختلاف نہیں ہوتا۔ اگر کوئی نامناسب بات ہو جائے تو دونوں چشم پوشی کرتے ہیں۔ امجد صاحب نے اپنی بی بی کو قانون اسلامی کے مطابق آزادی دے رکھی ہے۔ امجد صاحب کے بعض خاص خاص دوستوں سے وہ پردہ نہیں کرتیں۔ ہر وقت ان سے بات چیت کی پوری اجازت ہے۔ پہننے اوڑھنے اور آرائش میں آزادی ہے۔ جانے آنے میں پابندی نہیں۔ حسب استطاعت ان کی فرمائش کی تکمیل کرتے ہیں۔ ان کی ضروریات کی سب چیزیں بخوشی فراہم کی جاتی ہیں۔ نرمی، شفقت اور ملائمت سے گفتگو فرماتے ہیں۔ خوش مذاقی، خوش طبعی میں ہوتی ہے۔ کبھی خانہ داری کے کاموں میں مدد دیتے ہیں۔ دونوں مل کر پکاتے ہیں۔ اسی طرح بی بی بھی آپ کی راحت، آرام اور آسائش کا پورا خیال رکھتی ہیں۔ فرمائش نہیں کرتیں۔ سکھ چین سے زندگی بسر کرنا دونوں کا معمول ہے۔ غرض دونوں کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ امجد صاحب خوش قسمت ہیں کہ آپ کی منزلی زندگی نہ صرف آرام اور آسائش میں بسر ہوتی ہے۔ بلکہ قابل رشک معلوم ہوتی ہے۔ ورنہ اکثر ادیبوں اور شاعروں کو اپنی شریک حیات سے کوفت اور تکلیف ہوتی ہے۔ راحت اور چین نہیں ملتا۔

امجد صاحب اگرچہ ایک عرصے تک تنگ دست رہے۔ مگر وہ خود دار شخص ہیں کسی کا احسان گوارا نہیں کرتے۔ خود ہر قسم کا ایثار کرتے ہیں۔ ساتھ ساتھ خاکساری اور فروتنی بھی ہے۔ آپ کے یہاں حیدرآباد کی بڑی بڑی شخصیتیں مثلاً سر امین جنگ مرحوم، سر اکبر حیدری، مہدی یار جنگ مرحوم وغیرہ بھی آتے رہے ہیں اور چھوٹے آدمی بھی۔ آپ دونوں سے اخلاق اور مروّت سے پیش آتے ہیں۔ بڑی شخصیت سے مرعوب نہیں ہوتے، ان کی بے جا عزت نہیں کرتے اور چھوٹی شخصیت کی توہین روا نہیں رکھتے۔

آپ بڑے مہمان نواز ہیں۔ مہینوں مہمانداری کرتے ہیں۔ جو خود کھاتے ہیں وہی مہمان کو کھلاتے ہیں۔ اس میں چھوٹے بڑے کا امتیاز نہیں ہے۔ عام طور سے آپ کسی کے یہاں نہیں جاتے۔ مگر جب تعلقات ہو جاتے ہیں تو ان سے ترکِ تعلق پسند نہیں کرتے۔ حتی الامکان سابقہ تعلقات کو قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تواضع اور انکساری کی صفت امجد صاحب کے خاص جوہر ہیں۔ غریبوں سے خندہ پیشانی سے ملنا ان کی دست گیری کرنا آپ کا معمول ہے۔ مجلس میں صدر پر بیٹھنا یا صدر بننا پسند نہیں کرتے۔

امجد صاحب کے ملنے والوں کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ دونوں صنف اور ہر طبقہ کے لوگ آتے ہیں اور ان میں جہاں اعلیٰ عہدہ دار، جاگیردار، وکلا، تجارت پیشہ ہیں، وہاں اہلکار، جز معاش، مفلس بھی ہوتے ہیں۔ آپ کا ہر ملنے والا یہ خیال کرتا ہے کہ میں ہی زیادہ دوست ہوں۔

امجد صاحب نہایت نرم دل ہیں۔ دوسروں کی تکلیف کو دیکھ کر خود بے چین ہو جاتے ہیں۔ اور جہاں تک ہو سکے مدد سے دریغ نہیں کرتے۔ کوئی حاجت مند آپ کے گھر سے محروم نہیں جاتا۔

تعصب آپ میں نہیں ہے۔ ہر قوم و ملت کے آدمی سے یکساں خلوص اور محبت سے پیش آتے ہیں۔

نام و نمود کی خواہش نہیں ہے۔ آپ کی تصانیفِ نظم و نثر کی وجہ سے جو شہرت ہے اس سے آپ میں شیخی نہیں ہے۔ دنیاوی جاہ و مال کی کبھی ہوس نہیں کی۔ اور اگر آپ اس کی خواہش کرتے تو کم از کم ہزاروں روپیہ کا گریڈ ملنا آسان تھا۔ کیونکہ سر اکبر حیدری جیسا شخص آپ کی خاطرداری کرتا تھا۔ اور آپ کی خواہش کی تکمیل ضروری تصور کرتا تھا۔ مگر آپ نے اس کو پسند نہیں کیا۔

مروّت بھی آپ کا ایک خاص جوہر ہے۔ وقت بے وقت لوگ آتے ہیں اور فضول باتوں میں وقت ضائع کرتے ہیں۔ مگر آپ سے محض دل آزاری

کے خیال سے یہ نہیں ہوتا کہ اُٹھ کر چلے جائیں۔

امجد صاحب عورتوں کے بڑے حامی ہیں، آپ کے پاس اپنا دکھ درد رکھنے والی بیسیوں عورتیں اکثر آتی ہیں اور آپ ان کی ہر طرح مدد فرماتے ہیں۔ میاں بی بی کی زندگی کو خوشگوار بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

امجد صاحب ایک فقیر منش اور صوفی ہیں۔ خاص خاص لوگوں کو مرید کرتے ہیں۔ مگر عام طور پہ ہمارے یہاں کے مشائخ طریقت اور مرشد اور مرید کا جو طریقہ ہے اور مرشد اپنے مرید سے جس طرح پیش آتے ہیں۔ مشائخین طریقت کا جو عام طریقہ اور رواج نظر آتا ہے وہ یہاں مفقود ہے۔

امجد صاحب سنیما بھی دیکھا کرتے ہیں۔ اکثر المیہ اور دردناک فلم دیکھتے اور اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ مجلس سماع سے بھی خاص لگاؤ ہے۔ مجلسِ سماع میں آپ تڑپتے اور لوٹتے نہیں۔ البتہ رو لیا کرتے ہیں۔ بعض طوائفیں خصوصیت سے آپ کو آپ کا کلام گا کر سناتی ہیں۔

کسی شخص کی زندگی پر نظر ڈالنے کے لئے اس کے ماحول اور گرد و پیش کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

آج سے نصف صدی پہلے کلکتہ، بمبئی اور مدراس کی یونی ورسٹیاں قائم ہوئے عرصہ ہو چکا تھا۔ اور ان جامعات سے مرد تو مرد خواتین بھی اعلیٰ ڈگریاں لے کر میدانِ عمل میں بازی لگا رہی تھیں۔ مگر حیدر آباد پر جمود طاری تھا۔ مغربی علوم سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ مشرقی علوم کی طرف لوگوں کی طبیعتیں مائل تھیں۔ قدیم علماء شائقینِ علم کو اپنے مکانوں میں مفت درس دیتے تھے۔ ان کے گھر تشنگانِ علم کے لئے آبِ حیات بنے ہوئے تھے۔ شاعری کا بول بالا تھا۔ ایک طرف حضرتِ فیضؔ کے شاگرد اپنے استاد کی میراث تقسیم کر رہے تھے۔ تو دوسری طرف داغؔ کی محفل آراستہ تھی۔ سرشار۔ ترکی گرامیؔ۔ ظہیرؔ۔ حبیبؔ کنتوری وغیرہ شمالی ہند سے آکر حیدر آباد کی فضا کو شعر و سخن سے گرما رہے تھے۔ مگر شاعری کا رنگ وہی قدیم تھا۔ گل و بلبل۔ شاہد و ساقی کی داستان شعراؔ کا موضوع بنا ہوا تھا۔ داغؔ نے غزل کے رنگ کو بدل دیا تھا۔

معاشرت میں اگرچہ مغربی طرز کی آمیزش ہو چکی تھی۔ مگر مشرقیت کو غلبہ تھا۔ عام طور سے متوسط بلکہ اعلیٰ طبقہ کی اکثریت کا رجحان مشرقی نہج پر تھا۔ رہنے سہنے۔ کھانے پینے، پہننے اوڑھنے میں مشرقی تہذیب، مشرقی معاشرت کی جھلک نمایاں تھی۔ مذہب سے زیادہ دلچسپی تھی مشائخ عظام نے اپنے سلسلوں کے مطابق پیری مریدی کی بساط بچھا رکھی تھی۔ یہ تھا وہ ماحول جس میں امجد صاحب نے پرورش پائی اور اپنی زندگی کا بڑا حصہ بسر کیا ہے۔ اس کے بعد وہ زمانہ آتا ہے جبکہ حیدر آبادی تہذیب مغربی تہذیب سے بدلنے لگی۔ رسم و رواج، کھانے پینے، رہنے سہنے میں مغربی اثرات نمایاں ہونے لگے۔ اس ماحول کے مدِ نظر امجد صاحب کی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ امجد صاحب ماحول سے متاثر ہوئے ہیں۔

امجد صاحب کی زندگی کا تجزیہ کیا جائے تو ہمیں تین امور مابہ الامتیاز نظر آتے ہیں۔ اولاً تنگ دستی اور غربت۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ آپ کی پرورش کی کفیل بیوہ ماں تھیں۔ کوئی ذریعۂ آمدنی نہیں تھا۔ پھر مدرسہ نظامیہ میں غریب طالب علموں کی طرح آپ کی زندگی بسر ہوئی۔ اور جب مستقل ملازمت ملی تو بیس روپے کی۔ اگرچہ اس زمانہ کے بیس روپے آج کل کے سو روپے سے زیادہ حیثیت رکھتے تھے۔ مگر کھانے والوں کی تعداد کے لحاظ سے کبھی راحت حاصل نہیں ہوئی۔ ایک زمانہ وہ بھی گذرا کہ صرف چنے کھا کر آپ نے بسر کیا۔ اور کبھی یہ بھی ہوا کہ گھر میں جو سالن پکتا وہ مہمان یا خوشدامن اور سالے سالی کے آگے رکھ دیا جاتا اور امجد اور ان کی بی بی بغیر سالن کے کھاتے۔ اگرچہ وظیفہ کے کچھ عرصہ پہلے جب منتظم اور پھر مددگار بن گئے تھے، ماہوار تنخواہ ڈھائی تین سو بلکہ چار سو تھی مگر جو زمانہ تنگ دستی میں بسر ہوا تھا اس کی یاد فراموش نہیں ہو سکتی تھی۔

دوسری چیز غم و الم، یاس و حسرت ہے۔ طغیانیٔ رودِ موسیٰ میں گھر بار کے ساتھ مشفق ماں۔ بی بی اور چار سال کی لڑکی موجوں کی نذر ہو گئیں۔ سارا کنبہ آنکھوں کے سامنے ڈوب گیا۔ ...... پھر ایک عرصے کے بعد قابل اور لائق بی بی جمال النساء کا ساتھ ہوا۔ اور چند سال کے بعد اُن کی موت نے پھر غم و الم کو تازہ کر دیا۔ دختر اعظم النساء کے انتقال کے بعد کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اس طرح امجد کی زندگی رنج و الم، یاس و حرماں کا ایک مجسمہ بن گئی۔

امجد کی زندگی پر اثر انداز ہونے والی تیسری شے تصوّف ہے۔ موسٰی ندی کی طغیانی کے بعد آپ درگاہ شاہ خاموش صاحب کے سجادہ کے گھر مقیم رہے۔ موجودہ سجادہ سید شاہ صابر حسینی کی تعلیم و تربیت آپ سے متعلق رہی۔ اس حیثیت سے آپ کو تصوّف سے مناسبت پیدا ہوگئی۔ اور پھر شریکِ حیات جمال النساء بیگم یا جمال سلمٰی کی بدولت تصوّف سے رات دن کام رہا۔ اور ان کی موت کے بعد آپ کی زندگی کا جزو لاینفک بن گیا۔

"رباعیات کے شہنشاہ" کی شاعری پر غور کیا جائے تو یہی تینوں امور آپ کی شاعری میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ اس کے سوا سب سے بڑا عنصر انسانیت کی آواز ہے جو امجدؔ کے کلام میں صحیح طور پر سنائی دیتی ہے۔

مولانا ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے مولانا حالؔی کے حالات کو حسب ذیل الفاظ پر ختم کیا ہے :۔

"مرحوم ہماری قدیم تہذیب کا بے مثال نمونہ تھے۔ شرافت اور نیک نفسی ان پر ختم تھی۔ چہرے سے شرافت ہمدردی اور شفقت ٹپکتی تھی۔ اور دل کو ان کی طرف کشش ہوتی تھی۔ ان کے پاس بیٹھنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کہ کوئی چیز ہم پر اثر کر رہی ہے۔ درگذر کا یہ عالم تھا کہ کوئی ان سے کیسی ہی بدمعاملگی اور بدسلوکی کیوں نہ کرے ان کے تعلقات میں کبھی فرق نہ آتا تھا۔ جب ملتے تو اس سے شفقت و عنایت سے پیش آتے ۔۔۔۔ اخلاق اگر سیکھنے کی چیز ہے تو ایسے ہی پاک نفس بزرگوں کی صحبت میں آسکتے ہیں۔ کیسا ہی بُرا زمانہ کیوں نہ ہو، دنیا کبھی اچّھوں سے خالی نہیں ہوتی" (چند ہم عصر ص ۱۶۳)

بلا خوف تردید ہم ان سطور کو امجد صاحب کی زندگی کے بارے میں بھی دہرا سکتے ہیں جو حرف بہ حرف صادق آتی ہیں۔

عابد صاحب

محمد طفیل

جب میں نے سیّد عابد علی صاحب عابدؔ سے یہ کہا۔ کہ میں آپ پر فلاں صاحب سے مضمون لکھوا رہا ہوں۔ تو سیّد صاحب نے فرمایا ——
" یہ مجھ پر ظلم ہوگا "

اپنی طرف سے میں نے بڑے صحیح لکھنے والے کا انتخاب کیا تھا۔ ادب میں اُن کا بڑا مقام ہے۔ اور سیّد صاحب سے اُن کے صرف دیرینہ ہی نہیں بلکہ دوستانہ تعلقات تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے قدرے جھنجھلا کر کہا " تو پھر آپ پر کس سے لکھواؤں ؟ "

میرا خیال تھا۔ کہ جواب میں اب مجھے یہ سُننا پڑے گا۔ مجھ پر ابوالکلام سے لکھواؤ یا ڈاکٹر عبدالحق سے، لیکن انھوں نے جو جواب دیا۔ وہ میری توقعات کے بالکل برعکس تھا۔ فرمایا " اوّل تو مجھ پر مضمون چھاپنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور اگر چھاپنا ہی چاہتے ہو تو خود لکھو "

میں اِس جواب پر بوکھلا سا گیا۔ اس لئے کہ اِن کے قریباً تمام بڑی بڑی ادبی شخصیتوں سے برادرانہ تعلقات تھے اور وہ مضمون کے لئے منتخب مجھے کر رہے تھے۔ یہی وجہ تھی۔ کہ معاً خیال آیا کہ یہ یا تو مجھے بنا رہے ہیں یا شاید بیماری کی وجہ سے ان کی قوتِ فیصلہ جواب دے چکی ہے۔ دونوں صورتیں میرے لئے تکلیف دہ تھیں۔ لیکن اُنھوں نے مجھے اُسی وقت بہ خلوصِ تمام یہ یقین دلا دیا۔ کہ میں یہ فرمائش بہ قائمی ہوش و حواس کر رہا ہوں۔ اور اس کے بعد جو انھوں نے میری اسکیچ نگاری کی تعریفیں کیں۔ وہ میں آپ سے کیا کہوں۔ اگر اُن میں سے کوئی بات میرے نزدیک بھی سچّی ہوتی۔ تو یہاں لکھ دیتا۔ ایک شرمندگی کا احساس اُس وقت بھی تھا۔ اور اِس وقت بھی ہے۔ جب یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔

اگر ان پر کوئی اور مضمون لکھتا۔ تو بقول سیّد صاحب اِن پر ظلم ہوتا۔ اب وہ ظلم مجھ پر ہو رہا ہے۔ اِس لئے کہ میں سمجھتا ہوں کہ اِن کی رنگا رنگ شخصیت کو قلم کے سحر سے کاغذ پر نہ لا سکوں گا۔ اِس احساس سے اِس مضمون کو شروع کر رہا ہوں۔ خدا آبرو رکھے۔

میں نے سیّد صاحب کو کئی ادبی محفلوں میں دیکھا اور سُنا تھا۔ اور یہ بھی علم تھا۔ کہ یہ دیال سنگھ کالج کے پرنسپل ہیں —— بڑے وجیہہ، خوش شکل، خوش پوشاک اور خوش آواز! لیکن میرا ان سے کوئی باقاعدہ تعارف نہ تھا۔ جی بھی چاہتا تھا۔ کہ ان سے راہ و رسم بڑھے۔ لیکن تعارف کا کوئی آبرومندانہ موقعہ ہی نہیں ملا تھا۔ خواہ مخواہ کے تعارف کے لئے میرا دل کبھی راضی نہیں ہوا۔ ورنہ تعارف کا یہ طریقہ بڑا آسان تھا۔ کہ یہ کسی مشاعرے سے شعر پڑھ کر نکلتے۔ اور میں سلام جھاڑ کر ان کے دو چار شعروں کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتا۔ چلیئے تعارف

ہوگیا ـــــ شاعر بیچارے کی یہ بڑی کمزوری ہے۔ کہ اُسے روٹی نہ ملے تو گذارہ کر لیتا ہے۔ لیکن شعروں کی داد نہ ملے تو جیتے جی مر جاتا ہے۔ اور جب بلا وجہ داد ملے۔ تو تعارف چھوڑ دوستیاں تک ہو جاتی ہیں۔

دوسری جھجک ایک اور بھی تھی۔ کہ مجھے آج تک پرنسپلوں سے ملتے، ڈر لگتا ہے۔ میرے ایک اور کرمفرما بھی ایک کالج کے پرنسپل ہیں، اُن سے بھی مجھے ملتے ہوئے ڈر ہی لگتا ہے۔ حالانکہ وہ بڑے نیک اور نستعلیق قسم کے بزرگ ہیں۔ میرے تو ذہن میں یہ بات گھسی ہوئی ہے۔ کہ سب کے سب پرنسپل ہر ایک سے طالب علم ہی سمجھ کر پیش آتے ہیں۔ حالانکہ اِس طالب علم کے ساتھ کبھی کسی پرنسپل نے طالب علم سمجھ کر روکھائی سے بات نہیں کی۔

آخر ایک موقع ایسا آیا۔ کہ مجھے سیّد صاحب کی ضرورت پڑ گئی۔ اور میں تمام آبرومندانہ تعارف کے آداب بھول کر انھیں خط لکھنے بیٹھ گیا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے۔ جب میں نقوش کی ادارتی ذمہ داریوں میں نیا نیا پھنسا تھا۔ اور مجھے اِس گھٹیا منصب کے اسرار و رموز اور نزاکتوں کا قطعی احساس نہ تھا۔ مجھے یہ بھی علم نہ تھا۔ کہ اس باب میں میری کون مدد کرے گا۔ اور کون ٹانگ گھسیٹے گا۔ مدیرانہ فرائض کو میں نے گھٹیا منصب اس لئے کہا ہے۔ کہ آج کوئی بھی خوددار انسان کسی اچھے رسالے کا مدیر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ بیشتر لکھنے والے پارٹی بازیوں کا شکار ہیں۔ رادب اور پارٹی بازی، سبحان اللہ) خدانخواستہ کوئی مدیر اگر کسی لکھنے والے سے سلام دعا کرتا ہوا پکڑا جائے۔ تو سمجھیے۔ اُس ادیب کے جتنے مخالف ہیں۔ وہ سب دفعتہً مدیر کے حصے میں آ گئے۔ نقوش کی ادارت سے پہلے میں بہت اترایا کرتا تھا۔ کہ میرے تمام لکھنے والوں سے دوستانہ اور برادرانہ تعلقات ہیں۔ لیکن آج اس دعوے پر خود شرمسار ہوں ـــــ اُفوہ! ـــــ میں نے خواہ مخواہ یہ تکلیف دہ مسئلہ چھیڑ دیا۔ عرض یہ کرتا تھا۔ کہ میں اپنے ہاں کے ادبی ماحول کی نزاکتوں سے کچھ بیگانہ ہی تھا۔ بڑی سوچ بچار کے بعد میں نے ڈاکٹر تاثیر (مرحوم) اور عابد صاحب کو خط لکھے۔ کہ میں بعض معاملات میں آپ سے مشورہ لینا چاہتا ہوں۔ مجھے کوئی وقت دیں۔

اِن حضرات کو میں نے یہ اہمیت اس لئے دی تھی۔ کہ یہی حضرات یہاں کے ادبی ماحول کے باوا آدم تھے۔ تاثیر صاحب نے خط کا جواب ہی نہ دیا۔ عابد صاحب نے فوراً لکھا: "آپ جب آنا چاہیں، تشریف لائیں۔ میں آپ سے ہر وقت ملنے کو تیار رہوں۔"

یہاں اگر میں نے تاثیر صاحب کا ذکر یونہی چھوڑ دیا۔ تو شاید میں مرحوم کے ساتھ انصاف نہیں کروں گا۔ اس لئے کہ میرے خط لکھنے کے کوئی ڈیڑھ ماہ بعد اُن کا پیغام یہ آیا تھا: "آپ نے بڑا اچھا کیا کہ ترقی پسندوں کے چنگل سے نکلے۔ اور اب آپ خالصتاً ادبی اقدار کے ماتحت پرچہ نکالیں گے۔ اگر اس سلسلے میں میری خدمات کی ضرورت ہو۔ تو وہ بلا معاوضہ حاضر ہیں ـــــ کسی دن گھر پر آئیے۔ تاکہ کچھ کھانے پینے کا شغل رہے۔"

جو صاحب یہ پیغام لائے تھے۔ میں نے اُن سے ڈاکٹر صاحب کی اِن عنایات کا شکریہ ادا کر کے یہ عرض کیا تھا۔ کہ نوبت صرف کھانے تک ہی رہے۔

وہ صاحب تو ہنستے ہنستے چلے گئے۔ لیکن میں اُن کے ہاں نہ جا سکا۔ ایک تو یوں کہ اِس واقعہ کے کچھ ہی دنوں کے بعد اُن کا اچانک انتقال ہو گیا۔ دوسرے مجھے یہ وہم ہونے لگا تھا۔ کہ ممکن ہے تاثیر صاحب جو مشورہ مجھے دیں، وہ میرے لئے قابلِ قبول نہ ہو۔ میں جب بھی اُن کے ہاں جانے کے لئے تیار ہوتا تھا۔ تو مجھے اُن کا یہ فقرہ یاد آ جاتا تھا: "آپ نے بڑا اچھا کیا۔ کہ ترقی پسندوں کے چنگل سے نکلے۔" اور یہ فقرہ مجھے یاد اس لئے آ جاتا تھا۔ کہ بعض اختلافی امور کے باوجود میں یہ سمجھتا تھا۔ کہ آج بھی جو ہمارے ادب میں بہار اور تازگی سی ہے۔ وہ کچھ انہی "سر پھروں" کی رہینِ منت ہے۔ ورنہ ادب ایک ہی ڈگر پر چل چل کر اپنی ساری دلکشی کھو بیٹھتا ـــــ اگر مجھے علم ہوتا۔ کہ اُن کا یوں انتقال ہو جائے گا۔ تو میں اپنے تمام اوہام اور کمزوریوں کو بالائے طاق رکھ کر اُن سے ضرور ملتا۔ افسوس کہ مجھے اُن کے جنازہ میں شریک ہونے کا موقع تو ملا۔ لیکن اُن سے ہم کلام ہونے کی نوبت نہ آ سکی۔

عابد صاحب کے متعلق میں نے یہ سن رکھا تھا۔ کہ وہ دل کے بڑے کھرے ہیں دوستوں کے دوست اور دشمنوں کے دشمن ہیں۔ اِس لئے اِن کی اِس

تعریف کو حسبِ حال پاکر اِن سے ملنا ضروری سمجھا۔

جب میں نے انھیں قریب سے دیکھا۔ تو مندرجہ بالا فقرے میں قدرے اختلاف پایا۔ یہ دشمنوں کے پکّے دشمن اور دوستوں کے دوست نکلے۔ اگر طبعاً جذباتی نہ ہوتے تو دوستوں کے پکّے ہی دوست ہوتے۔ آناً فاناً ناراض ہو جاتے ہیں اور چشم زدن میں راضی بھی ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات ناراضی دشمنی کی حدود تک جا پہنچتی ہے۔ اگر غلط فہمی دُور ہو جائے۔ تو وہی یاری ہو گی۔ وہی مزے مزے کی حکایتیں ہوں گی۔ اور وہ تمام گفتہ اور ناگفتہ باتیں ہوں گی۔ جو صرف آپ کو انہی میں ملیں گی۔ اس لئے کہ ان میں جھوٹا تقدس نام کو نہیں۔ یہ اتنے اوریجنل ہیں کہ اپنی اوریجنلٹی میں نقطۂ آخر پر ہیں۔ یوں تو یہ بعضوں کو بڑے مغرور اور خود سر معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن واقعہ اس کے برعکس ہے۔ جنھوں نے انھیں دُور سے دیکھا۔ اُن کے لئے یہ مغرور اور خود سر ہیں۔ جو ان کے قریب آ کے بیٹھ گئے۔ وہ ان کے خلوص اور برابری کی اپنایت محسوس کرنے لگے۔ یقین کر لیجئے ایسے لوگ اب خال خال ہی رہ گئے ہیں جو دُنیا کے ہر موضوع پر جچی تُلی باتیں کر سکتے ہوں۔ اُردو ادب کے تو تمام پہلوؤں پر یوں بولتے چلے جاتے ہیں۔ جیسے سب کچھ ازبر ہو۔ فارسی بھی اُردو ہی کی طرح اِن کی اپنی زبان معلوم ہوتی ہے۔ اِس پر ان کا لہجہ اور الفاظ کے صحیح چناؤ کے ساتھ معاملے کی تہ تک مخاطب کو پہنچا دینا۔ ہر کسی کو کہاں نصیب ہوتا ہے۔ میں نے ان سے کبھی بحث ہی نہیں کی۔ اس لئے کہ بحث بھی ایک فن ہے جو ریاضت ہی سے آتا ہے۔ پھر بھی کسی بات پر لقمہ دے کر وہ وہ لطف اندوز ہوا ہوں۔ کہ کچھ نہ پوچھئے۔ بسا اوقات ان سے باتیں کرنے کے بعد مجھ پر ایک سرشاری کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اور یوں محسوس ہوا۔ جیسے میں نے ادب کی کئی بوتلیں چڑھا رکھی ہوں۔

میری ان سے پہلی باقاعدہ ملاقات غالباً ۱۹۵۱ء میں ہوئی تھی۔

لیکن میں آپ کو اس سے پہلے کے حالات بھی بتاؤں گا۔ تاکہ آپ کو یقین آ سکے کہ اِن میں سے کوئی بات بھی سچّی نہیں ہے۔ اگر اِن میں کوئی بات سچّی نکل آئے۔ تو اس میں میرا کوئی اعجاز نہ ہو گا۔ بلکہ یہ سمجھ لیجئے گا۔ کہ میں نے یہ باتیں مستعار لی تھیں۔ جو یہ مضمون لکھنے کے بعد سب کو نام بہ نام لوٹا دوں گا۔

یہاں ایک بات تو یہ سمجھ میں آتی ہے۔ کہ سرے سے اُن حکایتوں ہی کو نہ دُہرایا جائے۔ جن پر پرائے مال کا شبہ تک ہو۔ بہت ممکن ہے کل کلاں کو سب یہ کہہ دیں۔ کہ ہم نے فلاں بات یوں تو نہیں بتائی تھی۔ بلکہ یوں بتائی تھی۔ اِس اعتبار سے میں اپنی جھوٹی باتوں کو دوسروں کی سچّی باتوں پر یوں ترجیح دینا چاہتا ہوں۔ کہ جو کچھ اپنا مشاہدہ ہے۔ صرف اُسی پر اکتفا کروں۔ تاکہ سینہ تان کر یہ کہہ سکوں۔ کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے۔ وہ میرا مشاہدہ ہے۔ اگر میں نے اپنے مشاہدے کے سلسلے میں کہیں ٹھوکر کھائی ہو۔ تو اس کی معذرت قارئین سے بھی چاہوں گا اور عابد صاحب سے بھی۔

کل ہی کا ذکر ہے کہ جب میں نے ریڈیو کا بٹن گھمایا۔ تو چھوٹتے ہی سیّد صاحب کی فنِ موسیقی پر تقریر سُننے میں آئی۔ عرصہ ہوا۔ اِن کا اسی موضوع پر ایک مقالہ پہلے بھی یونیورسٹی ہال میں سُن چکا تھا۔ اور میں نے اِس مقالے کے دوران میں جمائیاں لے لے کر اپنا ستیاناس کر لیا تھا۔ مجھے سرے سے موسیقی ہی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ فنِ موسیقی سے خاک ہو گی۔ کل جو ان کی اُسی موضوع پر تقریر سُنی۔ تو وہی پُرانا نقشہ آنکھوں کے سامنے ایک بار پھر گھوم گیا۔ اور مجھے وہ بات بھی یاد آ گئی۔ جب میں نے واپسی پر اپنے ساتھی سے کہا تھا۔ کہ میں جب عابد صاحب کی تقریر سُن رہا تھا۔ تو یوں محسوس ہُوا۔ جیسے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر رہا ہوں ——— کل پھر میں نے فنِ موسیقی پر ہی ان کی پُوری تقریر سُنی۔ اور اب تو اِن کی خاطر ان کی ساری تقریریں سُننی پڑیں گی خواہ وہ بھیڑ بکریاں پالنے کے متعلق ہی کیوں نہ ہوں ——— بُرا ہو تعلقِ خاطر کا۔

آج سے بارہ تیرہ برس پہلے میں نے ان کا پیراڈائز لاسٹ کی ایبفراڈائٹ کا ترجمہ "داستان" کے نام سے پڑھا تھا۔ اور بے حد متأثر ہُوا تھا۔ اور اُسی وقت یہ اندازہ لگا لیا تھا۔ کہ اس کا مترجم کوئی بڑا زندہ دل قسم کا انسان ہو گا۔ جس نے اِس انداز کی رنگین کتاب کا ترجمہ اس ٹھاٹھ

سے کیا۔ اگر وہ کتاب فرانسیسی ادب میں بڑا نمایاں مقام رکھتی ہے۔ تو انھوں نے اُس کا ترجمہ بھی اس شان سے کیا کہ میں نے اُردو میں اس پائے کے ترجمے نہیں دیکھے۔

مجھے ان سے یہ شکایت رہی ہے کہ اتنی ٹھوس علمی شخصیت ہونے کے باوجود انھوں نے اب تک کوئی قابلِ ذکر ادبی کام نہیں کیا۔ یہ "فضیلت" صرف انہی میں نہیں ہے۔ بلکہ یہاں کی اور بھی کئی بڑی بڑی شخصیتوں میں تھی اور ہے۔ اگر میں اس سلسلے میں ڈاکٹر تاثیر (بعض زندہ کرمفرماؤں کا نام لیتے ہوئے ڈر لگتا ہے) کا نام لوں۔ تو میرے دوست مجھے معاف فرمائیں گے۔ اس لئے کہ یہاں تو میں نے اپنے اُس دُکھ کا اظہار کیا ہے۔ جو مجھے ان حضرات کی ادب سے بے توجہی برتنے کے سلسلے میں ہُوا ہے۔ اس کی وجہ کچھ یوں۔ بہرحال یہ لوگ اگر سنجیدگی سے اُردو ادب کے لئے کچھ کرنا چاہتے۔ تو اُردو ادب اپنے ان محسنوں کو کبھی نہ بھولتا۔ دیکھئے آج تاثیر ہم میں موجود نہیں ہیں۔ اور ان کی کوئی ایسی معرکے کی تصنیف بھی موجود نہیں ہے۔ جو تاثیر کو صدیوں زندہ رکھ سکے۔ اگر وہ پوری یکسوئی کے ساتھ کچھ لکھ جاتے۔ تو یقین کیجئے۔ اُن کی لکھی ہوئی چیزیں کبھی نہیں مر سکتی تھیں۔ خدانخواستہ اگر آج عابد صاحب بھی ہم میں سے اُٹھ جائیں تو لوگ انھیں کے برس تک یاد رکھیں گے؟ اور ان کے علم و فضل سے لوگوں کو کتنا فیض پہنچا؟ ان کے پاس بیٹھئے تو یہ علم و فضل کے خزانے کھول کے رکھ دیں گے۔ اور جب ہم انہی چیزوں کو کتابی صورت میں ڈھونڈھنا چاہیں گے۔ تو ہمیں مایوسی ہوتی ہے۔

آجکل اس کمی کا احساس عابد صاحب کو بھی ہوا ہے۔ وہ احساس غالباً اس لئے بھی ہے۔ کہ یہ بہت بیمار رہے ہیں اور ہیں۔ سوچتے ہوں گے۔ اگر یونہی چل بسنے، تو کیا ہوتا۔ بہت ممکن ہے وہ اب صحت یاب ہونے پر کچھ کریں۔ میں تو ان کی زندگی کی دعا صرف اسی لئے مانگتا رہتا ہوں۔

یہاں لطیفے کی ایک بات یہ بھی سُن لیں۔

یہ مجھ سے اکثر کہا کرتے ہیں "طفیل تم جو اپنی تمام صلاحیتیں اور روپیہ نقوش کے یہ بیگراں ڈیل نمبر چھاپ کر ضائع کیا کرتے ہو اسے فی الفور ختم کر دو۔ اور کوئی ایسا کام کرو۔ جو تمہیں زندۂ جاوید بنا دے۔ مثلاً چار ہزار صفحوں کی تاریخ ادبِ اردو چھاپو۔ تمام بڑے بڑے شعرا پر بڑے معرکے کے مضامین کوئی دو ہزار صفحوں پر چھاپو۔ تمام مثنویوں کو ایڈٹ کر کے یا کرا کے ان کے بسیط مقدمات کے ساتھ ایک جگہ چھاپو۔ اور یہ بھی بتاؤ۔ کہ ان مثنویوں کا تاریخی پس منظر یہ یہ تھا۔ یہ تم کیا کر رہے ہو کہ ہر مہینے اتنا اتنا ضخیم نمبر چھاپ دیتے ہو۔ خدا را کوئی کام کرو" ——— عابد صاحب نے جو کچھ کہا۔ میں وہ سب کرنے کی کوشش کروں گا (خدا مجھے اس کی توفیق بھی دے) لیکن میں بھی ان سے یہ کہتا ہوں ——— خدا را کوئی کام کریں!

یوں تو انھوں نے کئی مشاعروں اور ادبی نشستوں کی صدارت کی ہو گی۔ لیکن ایک مرتبہ جو انھوں نے ایک مشاعرے کی صدارت کی تو مزا ہی آ گیا۔ اُس مشاعرے میں بڑے بڑے اساتذہ کے ساتھ ایک نئی اُبھرتی ہوئی شاعرہ کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ جو بلاشبہ اُس وقت اور اس عمر میں بھی اچھے شعر کہتی تھیں۔ اس پر مستزاد، اُن کا ترنم۔ چند ہی روز پہلے لاہور ہی میں پڑھ کر اتنی داد وصول کر چکی تھیں۔ کہ آج غالب بھی زندہ ہو کر آ جاتے۔ تو انھیں بھی اتنی داد نصیب نہ ہوتی۔ یہی وجہ تھی کہ ہال کے باہر یا علی کے نعرے لگ رہے تھے۔ ہجوم نے ہال کے تمام شیشے توڑ ڈالے۔ حتیٰ کہ دروازوں کی چولیں تک چوں چوں کرنے لگیں۔ جب عابد صاحب نے یہ صورتِ حال دیکھی۔ تو اُنھوں نے منتظمین کی حالتِ زار کا اندازہ کئے بغیر شہنشاہ جہانگیر کے سے انداز میں فرمایا (جو میں نے پکار نامی فلم میں دیکھا تھا) ہال کے تمام دروازے کھول دیئے جائیں۔ جب اس پر بھی کارکن ٹس سے مس نہ ہوئے۔ تو کرسیٔ صدارت سے ایک بار پھر اعلان ہوا "میں کہتا ہوں۔ تمام دروازے کھول دیئے جائیں" چنانچہ تمام دروازے کھول دیئے گئے۔ چونکہ بیشتر لوگ بلا ٹکٹ آئے تھے۔ اس لئے اس موڈ میں تھے۔ کہ سب کو ہوٹ کریں گے۔ بڑے بڑے شاعر ہوٹ

ہوئے۔ لیکن جب محترمہ کی باری آئی تو انھیں متوقع داد ملی۔ اُن کے بعد چند ایک اساتذہ کرام کو محض احتراماً سُن کر پھر یہ اصرار کہ محترمہ ہی پڑھیں۔ اُس وقت ماحول ایسا تھا کہ ایک دَور اور ہوتا۔ لیکن لوگوں کے بے جا بڑھتے ہوئے اصرار نے عابد صاحب سے یہ کہلوا دیا کہ اگر آپ لوگ ایسے ایسے اساتذہ کے بعد بھی محترمہ ہی کے کلام کی فرمائش کریں گے۔ تو میں مشاعرہ برخاست کر دوں گا۔ جب اِس دھمکی پر بھی سامعین کا مطالبہ جُوں کا تُوں رہا تو اِن کی طرف سے مشاعرہ شروع ہونے کے کوئی ڈیڑھ گھنٹہ بعد ہی یہ اعلان کر دیا گیا۔ کہ میں مشاعرے کے برخاست ہونے کا اعلان کرتا ہوں۔

مشاعرے کے دو تین روز بعد جب میری سیّد صاحب سے ملاقات ہوئی۔ تو انھوں نے خود اُس مشاعرے کا ذکر کیا اور کہا "بچّی بے شک اچھے شعر پڑھتی اور کہتی ہے۔ لیکن اِس کا یہ مطلب نہیں ہے۔ کہ ہم سامعین کو اس کی اجازت دے دیں۔ کہ وہ اساتذہ کی تذلیل پر اُتر آئیں۔"

اِسی طرح کا ایک واقعہ اور بھی ہے۔

میرے ایک کرمفرما دوست نے عابد صاحب کی صدارت میں ایک مشاعرہ اور کرایا تھا۔ اور میری یہ ڈیوٹی لگا دی کہ گیٹ پر کھڑا رہوں تاکہ جو شاعر ایک بار ہال میں آ جائے۔ وہ باہر نہ نکلنے پائے۔ ابھی مشاعرہ شروع ہی ہُوا تھا۔ کہ ایک صاحب بھاگے ہوئے آتے اور کہا "یار عابد صاحب تو مشاعرہ ختم کرنے والے ہیں"۔ یاد رکھیئے کہ ابھی مشاعرہ شروع ہوئے پون گھنٹہ ہی ہُوا تھا۔ میں بھی اِس صورتِ حال سے گھبرا سا گیا۔ چنانچہ ایک چھوٹا سا پرزہ لکھ کر اِن کی خدمت میں پیش کیا۔ کہ "اِس مشاعرے کو ذرا اور چلایئے۔ تاکہ مشاعرہ مشاعری بن کر نہ رہ جائے۔ اور اگر آپ کو جلدی ہو تو اپنا قائم مقام صدر شوکت صاحب کو بنا دیں"۔ میں نے محسوس کیا کہ میری اِس بے جا مداخلت پر بڑے جھلّائے۔ لیکن انھیں میری خاطر منظور تھی۔ اس لئے بادلِ نخواستہ اعلان کر دیا "چونکہ مجھے جلدی ہے۔ اِس لئے میں شوکت تھانوی صاحب سے کہوں گا۔ کہ وہ کرسیٔ صدارت پر براجمان ہوں۔"

اِس پون گھنٹے کی صدارت میں بات صرف اتنی ہوئی تھی۔ کہ شاعر شعر پڑھ رہا تھا۔ اور سامعین میں سے کچھ شی، شی کر رہے تھے اور کچھ مرغوں کی طرح اذانیں دے رہے تھے ——— اس کے بعد شوکت صاحب نے کچھ سامعین کے ساتھ مل کر اور کچھ انھیں اپنے ساتھ ملا کر مشاعرے کو اس انداز سے چلایا۔ کہ خاصا کامیاب رہا ——— عابد صاحب کی خدمت میں میری گذارش یہ ہے۔ کہ وہ کسی مشاعرے کی صدارت نہ کیا کریں۔ اس لئے کہ وہ اس دور میں بھی مہذّب اور با سلیقہ سامعین کی توقع کر آتے ہیں۔ اور جب ماحول اس کے برعکس پاتے ہیں۔ تو پرنسپل بن جاتے ہیں۔

ان کی زندگی میں چند ایک واقعات ایسے بھی آئے جنھوں نے ان کی زندگی کے رُخ ہی کو موڑ دیا۔ ان میں ایک دوسری شادی کا قصّہ ہے اور ایک کالج کے ٹرسٹ سے تنازعہ۔ اِن دونوں جھگڑوں کا معاملہ عدالت کے رُوبرو ہے۔ اِس لئے اِس پر اپنی طرف سے کسی قسم کا اظہارِ خیال کرنا مناسب نہ ہوگا۔ پھر بھی وہ باتیں کہہ لینے میں کچھ ہرج نہیں ہے۔ جو بے ضرر ہوں۔ میرا خیال ہے کہ شادی کے معاملات کو بالکل نہ چھیڑا جائے۔ اس لئے کہ وہ دل کے معاملات تھے۔ جو اب عدالت کے معاملات بن گئے ہیں۔

کالج کے ٹرسٹیوں سے جب یہ جھگڑا اچلا۔ تو یہ اختلاجِ قلب میں بڑی طرح مبتلا تھے۔ حالات یکسر اِن کے خلاف تھے۔ اور یہ خود اتنے بیمار تھے۔ کہ زندگی اور موت میں صرف دو چار ہی قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ انھیں پہروں اپنا ہوش نہ رہا۔ لیکن ان دنوں بھی ان کے دم خم دیکھنے والے تھے۔ ذرا بھی تو پریشان نہ تھے۔ ان کی جگہ کوئی اور ہوتا۔ تو وہ مرنے سے پہلے ہی مر جاتا۔ لیکن یہ صرف اُنہی پریشانیوں کی وجہ سے نہ مر سکے۔

ویسے آجکل یہ بھی کہتے رہتے ہیں۔ کہ مرنے والا ہوں۔ فلاں کتاب کا ڈھانچہ ذہن میں ہے۔ فلاں کام کرنا ہے۔ چاہتا ہوں کہ مرنے سے پہلے کر جاؤں۔ لہٰذا تم وعدہ کرو۔ کہ میرے مرنے کے بعد میرے تمام مضامین اکٹھے کرو گے۔ اور چھاپو گے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ مر جائیں لیکن جو

کام یہ کرنا چاہتے ہیں۔ اور جسے شاید ان سے بہتر کوئی نہ کرسکے۔ وہ اگر کرگئے۔ تو کوئی لاکھ زور لگالے۔ یہ کبھی نہیں مریں گے۔ اور اب بھی مجھے ان کی موت میں کچھ شک ہی ہے۔

یوں تو یہ شیعہ ہیں۔ لیکن ذرا یونہی سے، بیٹھے بیٹھے اپنے شیعہ دوستوں سے پوچھیں گے۔ کہ بھئی سناؤ۔ تبرّا کے قائل ہو یا نہیں؟ اگر وہ انکار کرے تو یہ کہیں گے۔ تو پھر آپ کیسے شیعہ ہیں۔ صحیح قسم کا شیعہ تو وہ ہے۔ جو تبرّے کو اپنا ایمان سمجھتا ہو۔ اگر کوئی شامتِ اعمال سے یہ کہہ دے کہ ہاں میں تو تبرّے کا قائل ہوں۔ تو سُنّی دوستوں سے مخاطب ہو کر فرمائیں گے۔ بھئی یہ لعین (اور لعین کا لفظ بڑے پیار میں کہیں گے) حضرت ابوبکر رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہٗ حضرت عمر رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہٗ اور حضرت عثمان رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہٗ کو گالیاں دیتا ہے۔ اور اسے شرم نہیں آتی۔ بھلا سوچو تو گالی دینا بھی کوئی اچھا کام ہو سکتا ہے ———— مطلب یہ ہے۔ کہ ان کے ہاں تنگ نظری کو کوئی دخل نہیں۔ ایسے نازک معاملات میں بھی دل لگی سے باز نہیں آتے۔

ایک بار انھوں نے یہ بھی فرمایا۔ کہ میں نے سُنا ہے۔ کل رات فلاں مجتہد صاحب امام حسینؑ کی سیرت پر روشنی ڈال رہے تھے۔ اور مجمع زار زار رو رہا تھا کہ مجتہد صاحب نے ایک دم رُک کر یہ فرمایا۔ حضرات قبل اس کے کہ میں حضرت امام حسین کی سیرت پر مزید روشنی ڈالوں۔ آپ ایک خوشخبری سُن لیں۔ کہ پاکستان کرکٹ کا میچ جیت گیا ہے ———— اس لطیفے پر حاضرین کا ہنستے ہنستے وہ بُرا حال ہوا ہے۔ کہ سماں دیکھنے ہی والا تھا۔

یہ بلا کے زندہ دل ہیں۔ لسّان ایسے کہ بڑے بڑے ان کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے۔ یہ ذہنی طور پر گنجلک قسم کے انسان نہیں ہیں۔ بلکہ بڑے صاف ذہن کے مالک ہیں۔ جذباتی ضرور ہیں۔ وہ بھی اس حد تک کہ منٹ میں راضی اور منٹ میں ناراض۔

بڑوں کو یہ کچھ نہیں سمجھتے۔ لیکن بچوں کو اپنا مشیر بھی بنا لیتے ہیں۔ باتیں بڑے تیقن کے ساتھ کرتے ہیں۔ اور بچہ سمجھ کہ چھوٹے بڑوں کی باتیں سُنتے ہیں۔ ایکدم ہر ایک پر اعتماد کر لیتے ہیں۔ لیکن خود دوسروں کے سامنے ڈٹ جاتے ہیں۔

ہنگامہ آرائی ان کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ ہر دور میں کسی نہ کسی ہنگامہ کی سرپرستی کرتے ہی رہے ہیں۔ یہ بھی ایک طرح سے ان کی طبیعت کے کھرے پن کی نشانی ہے۔ کہ جس چیز کو حق پر سمجھا۔ اس کی حمایت میں سر دھڑ کی بازی لگادی۔ اور جس بات کو غلط سمجھا۔ اسے زندگی اور موت کا سوال بنا ڈالا۔

عابد صاحب نے زندگی کی تمام ناکامیوں اور تمام اُلجھنوں کا اِس پامردی سے مقابلہ کیا ہے۔ کہ مجھے ان پر رشک آیا ہے۔

انھوں نے اپنی خوشیوں اور مسرتوں کو جب اپنے ہاں سے خود دھتکارا ہے تو افسوس بھی ہوا ہے۔

لیجئے عابد صاحب، آپ کے حکم کی تعمیل ہوگئی۔ مگر کیوں کر ہوئی۔ یہ نہ پوچھئے۔ اتنے بڑے نمبر نے میرے ذہن میں گھس کر دماغ کی ساری چیزوں کو بے جگہ کر دیا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے برتن میں جامنوں کو ڈال کر بڑے زوروں سے ہلایا گیا ہو۔ ان حالات میں میری تو دعا یہ ہے کہ یہ مضمون آپ کی نظر ہی سے نہ گذرے۔ لیکن ایسا ہوگا نہیں، اس لئے کہ میری دعائیں پہلے کونسی قبول ہوئی ہیں جو یہ ہوگی۔ قارئین کے سامنے اس مضمون کو پیش کرتے ہوئے اِس لئے جھجک نہیں ہے۔ کہ وہ اچھے بُرے مضامین پڑھنے کے عادی ہو ہی جاتے ہیں۔

مخفی کھتانی

میرزا ادیب

"ہاں صاحب ، چائے سے تو فارغ ہوگئے ۔ اب کہئے کیا پروگرام ہے ؟"

"پروگرام ——— آپ جو پسند کریں"

"لاہور ایک تاریخی شہر ہے ۔ اس کے چپے چپے پر تاریخی عمارتیں پھیلی ہوئی ہیں ۔ اگر آپ کو شوق ہو تو آج کا دن انہی مقامات کے لئے وقف کر دیا جائے ، کیوں کیا خیال ہے ؟"

"خیال تو اچھا ہے مگر مجھے ابھی چند روز اور آپ کے شہر میں قیام کرنا ہے ۔ یہ شوق آخری دن پورا کیا جائے گا ۔"

"تو آج کے لئے کیا سوچا جائے ؟"

"واقعہ یہ ہے کہ میں اب تک جہاں جہاں بھی گیا ہوں کسی نہ کسی بڑی شخصیت سے ملاقات کا شرف ضرور حاصل ہوا ہے ۔ آپ کے توسط سے یہاں بھی ایسا موقع مل جائے تو کیا حرج ہے ؟"

"حرج تو کوئی نہیں ، مگر بھائی ! لاہور میں بے شمار ایسی شخصیتیں موجود ہیں اور میں اکثر سے خود بھی غیر متعارف ہوں !"

"یہ مسئلہ بڑی آسانی سے حل ہو سکتا ہے !"

"وہ کس طرح ؟"

"مجھے آپ ایک ایسی شخصیت سے ملا دیں جس سے آپ بہت متاثر ہوئے ہیں ۔ میرا خیال ہے اس معاملے میں آپ کو کوئی خاص الجھن پیش نہیں آئے گی"

عجیب کشمکش میں ڈال دیا ہے آپ نے ۔"

"کیا آپ کے لئے یہ بتانا مشکل ہے کہ زندگی میں سب سے زیادہ کس سے متاثر ہوئے ہیں اگر وہ ہستی خوش قسمتی سے یہیں موجود ہے تو اس سے ملاقات کرنے میں کیا مشکل حائل ہو سکتی ہے ۔ ؟"

"میرے لئے یہ بتانا مشکل نہیں ——— اور حسنِ اتفاق سے وہ ہستی بھی یہیں لاہور میں ہے ——— مگر ممکن ہے آپ اس سے قطعاً متاثر نہ ہوں ۔ نہایت سادہ انسان ہیں اور چہرے کے چہرے میں بھی ظاہری طور پر کوئی جاذبیت نہیں ——— انہیں دیکھ کر ایک لمحے کے لئے بھی دل میں یہ خیال پیدا نہیں ہوتا کہ یہ کوئی اہم شخصیت ہیں "

"پھر آپ کس طرح ان سے اس درجہ متاثر ہوئے ہیں ۔ ؟"

ایک آئیڈیل انسان میں جو خوبیاں ہونی چاہئیں وہ ان میں موجود ہیں ! ——— ہو سکتا ہے آپ کے ذہن میں ایک مثالی انسان کا جو تصور موجود ہو وہ میرے تصور سے مختلف ہو تاہم

ذکر اپنے تصور کا کر رہا ہوں"

"جب تو میں ان سے ضرور ملوں گا"!

"میں آپ کو ایسی رائے نہیں دوں گا جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں انہیں دیکھ کر یا پہلی بار ان سے مل کر کوئی شخص بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ نحیف و نزار آدمی عالم و فاضل ہونے کی حیثیت ہی سے نہیں، ایک انسان ہونے کی حیثیت سے بھی بہت بلند ہے — آپ ان سے مل کر بھی ان سے دُور رہتے ہیں۔ اور یہ کوئی مُبالغہ نہیں۔ عام طور پر جب آپ کسی اہم ہستی سے ملاقات کرتے ہیں تو پہلے پہل بہت عقیدت مندی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اور پھر آہستہ آہستہ چند ملاقاتوں کے بعد کہیں جا کر ذرا بے تکلف ہوتے ہیں مگر یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ آپ جب ان سے ملیں گے تو — وہ آپ کو ایک بالکل عام آدمی نظر آئیں گے — اور آپ ان سے بلا تکلف سب کچھ کہہ دیں گے۔ لیکن چند ملاقاتوں کے بعد جب ان کی خدمت میں حاضر ہوں گے — تو بقول جگر مراد آبادی کے

جو بیٹھو با ادب ہو کر تو اٹھو باخبر ہو کر

آپ محسوس کریں گے کہ یہ شخص تو علم کا بحرِ ناپیدا کنار ہے اور شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہو گی جو ان کی نظروں سے نہ گزر چکی ہو۔"

"خوب! ایسی ہستی سے نہ ملنا تو سراسر بدنصیبی ہے!"

"میں نے جب انہیں پہلی مرتبہ دیکھا تو یہ پنجاب یونیورسٹی میں لائبریرین تھے — کتابوں کی ایک الماری کے پیچھے، مجھے ایک بے آب و رنگ ننھا سا، خشک سا چہرہ دکھائی دیا اور معاً میرے دل میں خیال گزرا کہ یہ فراعنۂ مصر کے زمانے کی کوئی ممی ہے جسے کسی عجائب گھر سے اٹھا کر یہاں رکھ دیا گیا ہے تاکہ ان لوگوں کے کام آئے جو آثارِ مصر پر ریسرچ کر رہے ہیں۔"

"واقعی؟"

"ممی یہ لفظ کہنے کو تو میں نے کہہ دیے ہیں مگر میرے ذہن پر ایک لرزش سی طاری ہو گئی ہے۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ مجھے ان کی ذات سے کتنی گہری عقیدت ہے اور میں ان کا کس قدر احترام کرتا ہوں، دوسری مرتبہ جب میں نے انہیں دیکھا تو وہ حافظ محمود شیرانی کے مکان کی سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے اور میں اُتر رہا تھا۔ یوں سمجھئے جس قدو قامت کے یہ خود تھے اسی قدو قامت کی کتاب ان کی بغل میں تھی — میں ایک لمحے کے لیے ٹھٹک کر رہ گیا۔ کتاب انہوں نے اٹھا رکھی ہے یا کتاب نے ان کا وزن اٹھا رکھا ہے۔ میرا جی چاہا کہ ان کی مدد کروں۔"!

"اور آپ نے کی؟"

"اس کا موقعہ ہی نہیں ملا۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے اوپر چلے گئے اوپر سے حافظ شیرانی کی آواز آئی "آیئے"۔ اس آواز میں محبت کی گرم جوشی اور ملاقات کا فراواں اشتیاق تھا۔ میں جب کچھ دیر کے بعد دوبارہ اوپر گیا تو سوچا اختر شیرانی کے کمرے میں جانے سے پہلے ذرا اس عجیب و غریب آدمی کو دیکھ لوں کہ کیا کر رہا ہے اور میں نے —"

"ہاں ہاں کہو!"

"آپ جانتے ہیں میں اختر مرحوم کو اپنی نظمیں دکھایا کرتا تھا۔ اس زمانے میں اسلامیہ کالج میں پڑھتا تھا اور قریب قریب ہر روز کالج سے بھاگ کر اختر مرحوم کے یہاں پہنچ جاتا تھا۔ محمود شیرانی ان کے والد تھے اور سچی بات یہ ہے کہ جتنی محبت مجھے اختر شیرانی سے تھی اسی قدر ان کے والد گرامی سے خوف آتا تھا — اس کی وجہ غالباً یہ ہو گی کہ اختر بھی ان سے خوف زدہ رہتے تھے۔ حافظ شیرانی کے متعلق یہ بات بھی مشہور تھی کہ جہاں تک علم و فضل کا تعلق ہے حافظ سارے ہندوستان میں لاثانی ہیں — تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس عجیب و غریب آدمی کو دیکھنا چاہتا تھا کہ حافظ صاحب کے پاس کیا کر رہا ہے۔ میں اختر شیرانی کے کمرے میں جانے کی بجائے حافظ صاحب کے کمرے کے دروازے پر رک گیا اور اندر نظر ڈالی۔ دیکھتا کیا ہوں کہ حافظ صاحب ہمہ تن توجہ بنے اس نوواردہ کی گفتگو سن رہے ہیں — یہ میری ان سے دوسری خاموش ملاقات تھی۔ اس کے بعد میں نے مدت تک انہیں کہیں نہیں دیکھا۔ پھر ایک دن اتفاق سے انہیں دیکھ لیا۔ شاید یونیورسٹی لائبریری میں — ان کے سامنے دو طالب علم بیٹھے تھے۔ ان طالب علموں کو مخاطب کر کے جو کچھ یہ کہہ رہے تھے وہ اب تک میرے کانوں میں گونج رہا ہے۔ وہ کہہ رہے تھے۔

"زندگی بغیر کسی نصب العین کے بیکار ہے۔ زندگی جس قدر وقیع اور بلند ہوگی۔ نصب العین اسی قدر ارفع اور اعلیٰ ہوگا۔ مجھے ان لوگوں پر افسوس ہوتا ہے جو بغیر کسی آئیڈیل کے زندگی بسر کرکے مر جاتے ہیں۔ جب کوئی اعلیٰ نصب العین پیشِ نظر نہ ہو تو انسان کے سینے میں وہ حرارت پیدا ہی نہیں ہو سکتی جو اسے مسلسل مصائب برداشت کرنے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔ علم حاصل کرنا اور اس میں وقیع درجہ حاصل کرنا بھی ایک بہت بڑا نصب العین ہے ــ"

"یہ الفاظ سن کر پہلی مرتبہ میرے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ معمولی آدمی ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

"ایسے الفاظ معمولی انسان کہہ ہی نہیں سکتا۔!"

ان کے الفاظ ـــ ہاں تو آپ کچھ اور سننا پسند کریں گے۔ ایک منٹ ٹھہریئے۔ ابھی حاضر ہوتا ہوں۔ یہ ننھی کاپی جو آپ اس وقت میرے ہاتھوں میں دیکھ رہے ہیں، مجھے بہت عزیز ہے ـ اور کیوں عزیز ہے اس کی وجہ ابھی آپ کو معلوم ہو جائے گی! سنئے کہیں کہیں سے پڑھتا ہوں!

حافظ محمود شیرانی بلا کے کام کرنے والے تھے۔ ہر روز کم و بیش آٹھ گھنٹے مطالعے کے لئے وقف کر دیتے تھے ان سے میں نے ایک ایسا سبق سیکھا ہے جسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ وہ کہا کرتے تھے ہنگامہ خیزی ایک ادنیٰ درجے کی چیز ہے اور یہی حالت نمود و نمائش کی بھی ہے۔ اصل مقصد خاموشی کے ساتھ کام کرنا ہے۔ دروازہ بند کرکے کام کرو۔ ایک سکالر کا یہی فرض ہے اور یہی فرض ہونا چاہئے۔"

اور سنئے!

"میں اس ادارے سے وابستہ ہوں جس کی روایات کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی ہنگامہ خیزی اور نمود و نمائش سے بالکل الگ رہے۔ دوسروں کے لئے مواد جمع کرے۔ ہم لوگ انشاء پرداز نہیں۔ ریسرچ کرنے والے ہیں ہمارا کام یہ ہے کہ ریسرچ کرکے مختلف موضوعات پر بنیادی معلومات فراہم کریں اور یہ معلومات انشاء پردازوں کے حوالے کر دیں تاکہ وہ انہیں استعمال کریں۔ کام کرتے وقت شہرت کا خیال دل سے نکال دینا چاہئے ورنہ وہ سپرٹ سلامت نہیں رہ سکتی جس کا دوسرا نام فرض کا احساس ہے۔"

اگر آپ فرمائیں تو چند سطریں اور سنا دوں۔

"ادب کا سرچشمہ اصل میں دردمندی ہے۔ جب تک سینے کی گہرائیوں میں درد پیدا نہ ہو احساسات میں خلوص پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ خلوص ہی ادب کی جان ہے۔ دوسروں کے جذبات کو سمجھنا اور ہمدردی کے ساتھ سمجھنا ہمدردی ہی کا نتیجہ ہے۔ ایک ادیب کو سب سے پہلے ایک دل دردمند چاہئے۔"

صرف دو تین سطریں اور

"مقاصد عظیم، شوقِ بے نہایت، دلِ دردمند، کتابوں کی ایک مکمل لائبریری ـ یہ چیزیں میسر ہو جائیں تو اور کیا چاہئے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ موجودہ معاشرے میں یہ چیزیں میسر نہیں آسکتیں۔ ہمیں زندہ رہنے کے لئے لغو اور بیہودہ قسم کی تگ و دو کرنا پڑتی ہے۔ انسانی زندگی کا یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے۔"

"یہ انہی کے الفاظ ہیں؟"

"ظاہر ہے۔ میں جب بھی ان سے ملاقات کرتا ہوں گھر آکر ان کے چند الفاظ لکھ لیتا ہوں"

"خوب آپ تو باسویل بننے کی کوشش کر رہے ہیں!"

"میں اور باسویل ـــ جی نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی شخصیت علم و فضل کے اعتبار سے کسی طرح بھی ڈاکٹر جانسن سے کم نہیں ـ مگر باسویل

کون بنے گا یا کون جانے !"

"ہاں تو صاحب — یہ ہیں کون۔ آپ نے ابھی تک بتایا نہیں۔ کمال کرتے ہیں آپ بھی۔"

"تو کیا آپ کا خیال ہے میں آپ کو ان کا نام نہیں بتاؤں گا بلکہ میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ یہاں سے اٹھ کر انہیں کے پاس جائیں گے۔"

"چلئے نا پھر"

"اگر آپ اجازت دیں تو ذرا اس شخصیت کا پس منظر بتا دوں۔ ملاقات اس وقت بہتر ہوگی جب آپ بھی میری طرح ان کے متعلق کچھ جانتے ہوں ابھی چلتے ہیں چند لمحوں میں ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ان کے بارے میں دو ایک باتیں بتاؤں آپ کو۔ اب یہی دیکھئے۔ آپ ان سے ملنے کے لئے بیتاب ہو گئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جلد سے جلد ان کے پاس پہنچا جائے مگر ان کی طبیعت میں اس قسم کی بے چینی اور اضطراب کا گزر ممکن ہی نہیں جس شخص نے پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری میں سالہا سال تک قلمی کتابوں کی ورق گردانی کی ہے اور ایک ایک کتاب کے بیسیوں نسخے پڑھ ڈالے ہیں اس شخص کے تحمل کا اندازہ کرنا کوئی آسان کام نہیں اسی چیز نے ان کو اصول اور ضابطے کا اس قدر پابند بنا دیا ہے کہ وہ ذرا سی بے ضابطگی بھی دیکھ نہیں سکتے۔ نہ خود بے ضابطگی کرتے ہیں اور نہ دوسرے کو کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ ایک ننھا سا واقعہ سناتا ہوں۔ ایک دن میری موجودگی میں وہ اپنے شاگردوں کی درخواستیں دیکھ رہے تھے۔ ایک درخواست پر دستخط کر کے انہوں نے اس درخواست والے شاگرد کو اندر طلب کیا مگر یک لخت خیال آیا کہ اس درخواست سے پہلے۔ نہیں ایک اور درخواست مل چکی ہے۔ "دستخط شدہ درخواست" والا شاگرد آیا تو کمرے کے باہر بھیج دیا کہ چند منٹ انتظار کرو اور پھر اس شاگرد کی درخواست پر غور کرنے لگے جو پہلے پہنچ چکی تھی — یہ ہے اصول اور ضابطے کی پابندی کا عالم مگر دوسری طرف وہ مطمئن ہونا بھی نہیں جانتے !"

"کیا مطلب ؟"

"ان کی فطرت کا ایک خاص پہلو یہ بھی ہے کہ وہ عموماً غیر مطمئن بھی رہتے ہیں — مثلاً اگر آپ حسنِ اتفاق سے یا سوءِ اتفاق سے کسی ادبی رسالے کے ایڈیٹر ہیں اور ان کی خدمت میں جا کر مضمون طلب کرتے ہیں تو وہ پہلے بڑے عاجزانہ لہجے میں معذرت طلب کریں گے۔ اگر آپ "ڈھیٹ" ہیں اور ظاہر ہے ایک ایڈیٹر ڈھیٹ نہیں ہوگا تو دنیا میں اور کون ہو سکتا ہے اچھا تو آپ ڈھیٹ بنے اصرار کرتے رہے تو وہ وعدہ کریں گے اور اپنے سامنے رکھی ہوئی ڈائری میں آپ کے رسالے کا نام لکھ دیں گے اور وہ تاریخ بھی بتا دیں گے جس دن آپ کو مضمون مل جائے گا — مضمون آپ کو مقررہ تاریخ پر مل جائے گا مگر بھائی صاحب ! یہ سمجھ لیجئے آپ کی آزمائش کا وقت آ پہنچا ہے۔"

"مضمون مل جائے تو پھر آزمائش کے کیا معنی۔ میں نے تو یہ سن رکھا ہے کہ ادیب حضرات وعدہ کرتے وقت تو بڑی دریا دلی کا ثبوت دیتے ہیں مگر ان سے مضمون حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔"

"یہاں یہ معاملہ نہیں ہے آپ کو مضمون مل جائے گا اور اس کے ساتھ آپ کو یہ خوشخبری بھی سنا دی جائے گی کہ مضمون کی کاپیاں اور پروف وہ خود پڑھیں گے۔ آپ نہیں جانتے ادارتی فرائض میں سب سے کٹھن مرحلہ کاپیاں اور پروف پڑھنا ہوتا ہے۔"

"اور یہاں مضمون نگار ایڈیٹر کو اس مصیبت سے بھی نجات دلا رہے ہیں ؟"

"جی ہاں۔ اب ذرا سنیئے ! جب کاتب ان کا مضمون لکھ لے گا تو کتابت شدہ اوراق آپ ان کی خدمت میں بھیج دیں گے — دو تین دن کے بعد چپڑاسی یہ اوراق آپ کو پہنچا دے گا اور اس کے ساتھ ہی یہ چھوٹا سا رقعہ بھی ہوگا جس میں لکھا ہوگا۔ مضمون میں ذرا تبدیلی کر دی ہے۔ کاتب سے درست کروا لیجئے۔ اب اس ذرا تبدیلی کی کیفیت یہ ہے کہ ہر پانچ سات سطروں کے بعد ایک نئی سطر لکھ دی گئی ہے اور یہی نہیں ہر صفحے کے حواشی بھی پُر ہیں اور لطف یہ کہ یہ سب کچھ سرخ سیاہی سے کیا جائیگا"

"وہ کیوں ؟"

"شاید اس خیال سے کہ بقول اقبال کے "معجزۂ فن کی ہے خون جگر سے نمود"۔ اب یہ الگ بات ہے کہ اس قسم کے معجزۂ فن سے آپ اور کاتب دونوں کا خون کھولنے لگے۔ یہ معاملہ یہیں نہیں ختم ہو سکتا اور آگے بڑھے گا اور وہ اس طرح کہ ہمارے محترم جب پروف دیکھیں گے تو ان کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جائے گا۔ آپ سر پیٹ چکے ہیں، کاتب سر پیٹ چکا ہے اور اب سنگ ساز کے سر پیٹنے کی باری ہے ؟"

"کیا وہ اپنی تحریر پر مطمئن نہیں ہوتے" ؟

"میرا خیال ہے۔ وہ اپنی تحریر پر اس وقت تک مطمئن نہیں ہوتے۔ جب تک وہ چھپ کر سامنے نہ آجائے۔ بلکہ اس وقت بھی شاید ہی مطمئن ہوتے ہوں۔ اگر ان کا بس چلے تو وہ اس تحریر کی پھر کتابت کروائیں گے اور اپنے فونٹن پین میں از سرِ نو سرخ سیاہی بھر لیں گے۔"

"ہیں مزے دار آدمی — نام کیا ہے ؟"

"نام — بتاتا ہوں۔ محقق کہستانی !"

"کیا — یہ نام تو میں نے آج تک نہیں سنا۔"

"اگر آپ نے مرحوم اختر شیرانی کا پرچہ "رومان" دیکھا ہوتا تو آپ اس نام سے ناواقف نہ ہوتے۔ اس نام سے "رومان" میں "سفر نامہ لیل و نہار" شائع ہوتا تھا۔"

"مگر آپ تو کہتے تھے یہ شخص بہت بڑا عالم اور محقق ہے۔"

"کہتا تھا نہیں۔ کہتا ہوں — کہ ان کے پائے کے محقق برصغیر میں بہت کم ہوں گے"

"تو یہ نام کیا ہوا — محقق کہستانی"

"تو پھر سید زبیر، ایم اے سمجھ لیجئے !"

"آخر یہ کیا مذاق ہے بھئی ؟"

"پندرہ بیس سال گزرے سید زبیر ایم اے کے سیاسی مضامین "انقلاب" مرحوم میں چھپ کر بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ بعض لوگ انہیں جنید ثانی کے نام سے بھی جانتے ہیں !"

"سبحان اللہ ! بس بھئی اب کوئی اور نام نہ بتانا۔"

"ان کا ایک نام اور بھی ہے۔ وہ ابھی عرض کرتا ہوں — وہ نام جو آج سے پوری نصف صدی پہلے رکھا گیا تھا۔ یہ صاحب ۱۹۰۶ میں ایک ایسی جگہ پیدا ہوئے تھے جو صوبہ سرحد کا ایک گوشہ ہے۔ اسے منگور کہتے ہیں۔ یہ تحصیل مانسہرہ کا ایک بلند مقام ہے ان کے والد ایک مشہور عالم اور فقیہہ تھے اور سادات کے ایک مشہور سلسلے سے متعلق تھے۔ پرائمری تک انہوں نے گھر ہی میں تعلیم پائی اور اپنے فاضل والد کی وساطت سے عربی اور فارسی کی کتابوں سے روشناس ہوئے۔ پھر لاہور آگئے اور بہت کم مدت میں علم کے انتہائی مراحل سے گزر گئے۔ علم و ادب کے حصول کے ساتھ ساتھ بقدرِ استطاعت سیاسی کاموں میں بھی حصہ لیتے رہے مولانا محمد علی کے ساتھ مل کر تحریک خلافت میں خاص طور پر حصہ لیا۔ اور چونکہ سینے میں آزادی کی سچی تڑپ موجود تھی اس لئے وقتاً فوقتاً ہر اس تحریک کے ساتھ مخلصانہ تعاون کیا جو برطانوی سامراج کو ختم کرنے کے لئے اٹھی میرا خیال ہے کہ اگر اس زمانے میں انہیں حافظ شیرانی اور علامہ ڈاکٹر محمد شفیع کی صحبت نصیب نہ ہوتی تو ان کا اصل مقام یونیورسٹی لائبریری کی بجائے جیل خانے کی کوٹھڑی ہوتی۔ ان دونوں بزرگوں نے ہمارے محترم کے آتشیں رجحانات کا دھارا اپنی استادانہ شفقتوں کے زیرِ اثر، علمی مشاغل کی طرف پھیر دیا اور وہ لائبریری میں اپنے وقت کا بیشتر حصہ کتابوں کی صحبت میں گزارنے لگے۔ مگر جب دل کی گہرائیوں میں ایک مرتبہ آگ شعلہ زن ہو جاتی ہے تو اس کی حرارت کوئی اور رخ اختیار کر لیتی ہے۔ مکمل طور پر ٹھنڈی نہیں ہو سکتی میں سمجھتا ہوں محقق کہستانی کے سینے کی حرارت فقرِ غیور، بلند آہنگ خطابت اور تب و تابِ جاودانہ میں تبدیل ہو گئی ہے۔ ان کی فطری ناصبوری اسی حریت پرستانہ جذبے کا منطقی ردِ عمل ہے۔ جب کبھی وہ تحریکِ خلافت کے زمانے کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی کمزور و ضعیف آواز میں ایک طوفانی قوت پیدا ہو جاتی ہے اور میں حیران ہوتا ہوں کہ اس تپلے دبلے سے انسان میں یہ بجلی کی کڑک اور بادل کی گرج کہاں سے آگئی ہے۔ یہ لاغر و نحیف جسم کتنا بڑا طوفان اپنے سینے میں چھپائے پھر رہا ہے۔"

"یہ سب کچھ درست۔ مگر نام ؟"

"میں چاہتا تھا کہ جس شخص سے آج آپ کی ملاقات کرا رہا ہوں اس کی شخصیت کا ذرا نفسیاتی پس منظر آپ پر واضح کر دوں !"

"وہ تو آپ نے واضح کر دیا ہے نا۔ اب چلئے!"

"ابھی کہاں واضح کیا ہے۔ دو چار لمحوں کے لئے رک جائیے اور سنئے! ان کا اندازِ فکر عام اہلِ قلم سے بہت مختلف ہے۔ اپنی تحریروں میں واقعات کی صداقت پر سب سے زیادہ زور دیتے ہیں۔ کسی چیز کو ادھوری چھوڑ دینا جانتے ہی نہیں۔ محنتِ شاقہ ان کی فطرتِ ثانیہ بن چکی ہے۔ میں نے ابھی بتایا تھا تاکہ دروازے بند کر کے کام کرنا انہوں نے حافظ محمود شیرانی سے سیکھا ہے مگر شیرانی مرحوم سے صرف یہی نہیں کچھ اور بھی سیکھا ہے اور وہ ہے درویشانہ خصوصیت۔ شیرانی مرحوم نے بہت کچھ کمایا، آئے دن قلمی کتابیں اور نوادر خریدتے رہے مگر جب تک لاہور میں رہے کرایے کے ایک نہایت معمولی مکان میں رہے۔ یہی حال ہمارے محترم کا بھی ہے۔ آپ خود دیکھ لیں گے کہ کس جگہ رہتے ہیں۔ یہ ان کی شانِ استغنا، درویشی اور بے نیازی کا نتیجہ ہے۔۔۔ ہاں ایک بات اور عرض کر دوں۔ جن لوگوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ خشک کتابوں کے مطالعے میں گزارا ہو اور دنیاوی جاہ و جلال سے بے نیاز ہوں وہ عموماً "سنکی" ہوتے ہیں۔ بہت کم آمیز اور کم گو ہوتے ہیں مگر قلمی کتابوں کی بوسیدگی نے ان کی فطری خوش مزاجی پر قطعاً کوئی اثر نہیں ڈالا۔ جب بھی کسی سے ملتے ہیں نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے ہیں اور ان سے جو کچھ پوچھا جائے گا اس کی پوری پوری وضاحت کریں گے۔ طالب علموں کے لئے ان کی ذاتِ گرامی ایک قسم کا ادارہ بن کر رہ گئی ہے۔ طالب علموں کے لئے ہر وقت ان کے اپنے کمرے کے دروازے بھی کھلے ہیں اور گھر کے دروازے بھی۔"

"دیکھئے حضرت! اب میں اور کچھ نہیں سنوں گا۔ خاموشی سے اٹھ بیٹھئے مجھے ساتھ لے چلئے!"

"میں اس کے لئے بالکل آمادہ ہوں۔ مگر پہلے آپ کو بتا تو دوں۔ ہمیں جانا کہاں ہے۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے!"

"بہت عجیب جگہ پر رہتے ہیں۔۔۔ دیکھئے تاہم سب سے پہلے ایک ایسے بازار میں پہنچیں گے جسے لاہور کے گندے حصے میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس بازار کی فضا دو چیزوں سے عموماً دبی رہتی ہے۔ ایک چیز تو ہے پوریوں اور تمباکو کی مشترکہ خوشبو یا بُو اور دوسری چیز ہے پرانے گھسے پٹے ریکارڈوں کی سمع خراش آواز۔ آپ جیسے ہی وہاں قدم رکھیں گے پانچ سو سال کے پرانے ریکارڈوں کی آواز لاؤڈ سپیکر کے بازوؤں پہ تیرتی ہوئی آپ کے کانوں میں گھس پڑے گی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہ آواز یا شور ایک ریکارڈ کا نہیں کئی ریکارڈوں کا ہوگا۔ آپ ذرا آگے بڑھیں گے تو دائیں طرف ایک تمباکو بیچنے والے کی دکان کے ساتھ ایک چھوٹا سا خلا نظر آئے گا جس میں ایک نل بھی دکھائی دے گا۔ میری کوشش یہ ہوگی کہ اس وقت آپ کو خلا کے اوپر والی بالکنی کی طرف دیکھنے نہ دوں۔ وہاں گندے اور بدنما پردے لٹک رہے ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ آپ میرے ممدوح اور محترم کے مکان کے بارے میں کوئی ناخوشگوار رائے قائم کریں یا یہ سوچنے لگیں کہ یہاں رہنے والے صاحب کنجوس ہیں اچھا تو صاحب میں آپ کا ہاتھ پکڑ کر اس نل والے خلا کی طرف قدم اٹھاؤں گا۔ آپ حیران ہو کر دیکھیں گے کہ یہ شخص کسی مکان میں داخل ہو رہا ہے یا کسی غار میں اتر رہا ہے۔ آپ کو صبر سے کام لینا ہوگا یہ میرے محترم کے مکان کا نچلا حصہ ہے۔ آپ میرے پیچھے پیچھے آئیں گے کیونکہ دو شخص ایک ساتھ اس "پل صراط" سے گزر نہیں سکتے۔ نل سے کچھ دور سیڑھیوں کے پاس ایک سائیکل پڑی ہوگی۔ ہم بچ بچا کر سیڑھیوں پر قدم رکھیں گے۔۔ نوکر کی اطلاع دینے کا مرحلہ جب ختم ہو جائے گا تو ہم اوپر جائیں گے۔ پہلے ایک چھوٹا سا کمرہ نظر آئے گا۔ جہاں ہر طرف کتابیں بکھری پڑی ہوں گی فرش پر اُجلی دری بچھی ہوگی۔۔۔ آگے چلیں گے تو ایک اور چھوٹا سا کمرہ نظر آئے گا۔ یہاں کتابوں اور الماریوں کے سوا اور کچھ بھی نظر نہیں آئیگا ہم ایک صوفے پر بیٹھ جائیں گے۔ میں جانتا ہوں اس وقت آپ کے ذہن میں کیا خیال آئے گا آپ پوچھیں گے نہیں مگر سوچیں گے ضرور کہ یہ تمہارے محترم کا ڈرائنگ روم ہے یا کسی معمولی کلرک کا کمرہ۔۔۔ خیر آپ سوچتے رہیں گے اور میں آپ کو بتاؤں گا کہ آپ کے ساتھ یہ جو الماری پڑی ہے اس میں میرے ممدوح کی زندگی بھر کا اثاثہ محفوظ ہے ولی دکھنی سے لے کر علامہ اقبال تک ہر بڑے اور نمایاں شاعر کے متعلق ہزاروں صفحات الگ الگ فائل میں موجود ہیں۔ خدا جانے یہ کتابیں کب مکمل ہوں گی اور کب چھپیں گی گوناگوں مصروفیات نے ان کے ایک ایک لمحے پہ قبضہ کر رکھا ہے۔ پھر بھی وہ وقت نکال کر اردو کے کلاسیکی مصنفوں پہ پوری طرح دلجمعی کے ساتھ کام کرتے رہتے ہیں۔۔۔ اسی الماری میں بے شمار مضامین کے غیر مکمل مسودات بھی موجود ہیں جو اگر مکمل ہو کر چھپ جائیں تو ہماری زبان و ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہو جائے۔ پھر آپ کو بتاؤں گا کہ یہ نیلا پردہ جو ہمارے پاس دروازے پر لٹک رہا ہے۔۔۔ ابھی حرکت کرے گا اور اس کے ساتھ ہی ایک نہایت نحیف و نزار جسم آنکھوں اور ہونٹوں پہ مسکراہٹ کی ایک باریک سی لکیر لئے ذرا جھکے ہوئے اور بائیں کان کے اوپر ہاتھ رکھے ہوئے یہاں آجائیں گے۔ اور میں کہوں گا۔

"آپ سے ملئے۔۔ آپ ہیں یونیورسٹی اورینٹل کالج کے پرنسپل ڈاکٹر سید عبداللہ، ایم اے، ڈی لٹ"

مولانا صلاح الدّین احمد

وزیر آغا

ایک چینی مصنف کا قول ہے کہ مکمل شخصیت ، خواب پرستی ، حقیقت پسندی اور احساسِ مزاح کے حسین امتزاج کے سوا اور کچھ نہیں ۔ یہ قول مولانا صلاح الدین احمد کی شخصیت پر بڑی حد تک صادق آتا ہے ۔

۱۹۴۷ء کے فسادات میں جب مولانا کا آبائی مسکن ، ان کا بے حد قیمتی کتب خانہ اور گھر کا دوسرا سامان نذرِ آتش ہو گیا تو مولانا نے مسکرا کر کہا تھا ؎

تنم بسوخت ، دلم سوخت ، استخوانم سوخت
تمام سوختم و ذوقِ سوختن باقیست

اور یہ کہہ کر انہوں نے قطعاً غیر شعوری طور پر یہ ثابت کر دیا تھا کہ ان میں ایک مکمل شخصیت کے تمام ضروری عناصر موجود ہیں ——— سنگین حقائق کا احساس ، غم کو خندۂ استہزا میں اڑا دینے کی روش اور دور دھندلکوں میں ایک انجانی ، پُر اسرار منزل کی طرف مسلسل پیش قدمی ——— آج اس واقعہ کو قریباً آٹھ برس ہو چکے ہیں ، لیکن پیہم مصائب اور مسلسل آفات کے باوجود مولانا صلاح الدین احمد کا یہ " ذوقِ سوختن " کم ہونے کی بجائے فزوں تر ہے ۔ ہر صبح وہ ایک تازہ عزم کے ساتھ زندگی کا سامنا کرتے ہیں ۔ دن بھر مصائب کی چکی میں پستے ہیں ، لیکن ہر شام وہ ان مصائب پر ایک فلک شگاف قہقہہ لگاتے ہیں اور اپنے ان خوابوں میں کھو جاتے ہیں جن کی تعبیر ان کی زندگی کا منتہا ہے ۔

مولانا موصوف کے یہ " خواب " ان کے رفیق و غم گسار ہیں اور وہ اکثر و بیشتر زندگی کی کرخت سنجیدگی کو ان خوابوں کی ملائمت سے قابلِ برداشت بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں ۔ لیکن مولانا کے ان خوابوں کی نوعیت شخصی یا ذاتی نہیں ۔ وہ ایک عام انسان کی طرح جاہ و حشمت ، دولت و ثروت اور قوت و شہرت کے خواب نہیں دیکھتے ۔ ان باتوں سے وہ کافی بلند ہیں ۔ ان کے خوابوں کا منتہا تو " مسرت کی تقسیم " ہے ۔ شاید اگر وہ لیڈر ہوتے تو ملک کے باشندوں کی مادی ترقی کے لئے اپنی زندگی وقف کر دیتے ۔ یا اگر مہاتما یا صوفی ہوتے تو عوام کی روحانی بلندی کے لئے سدا کوشاں رہتے ۔ لیکن اب کہ انہوں نے فنکار کا لباس منتخب کیا ہے تو ان کی نظریں بھی اپنی زبان و ادب کی ترویج و ارتقا پر مرکوز ہیں اور وہ اسی راہ پر گام زن ہو کر مسرت و بہجت کی تقسیم کے آرزومند ہیں ۔

زندگی میں مسرت کی فراوانی نہیں ۔ اس کے حصول کے لئے انسان کو بہرحال کافی تگ و دو کرنا پڑتی ہے ۔ ہم نعت ، آرٹ ، نیچر اور گھر میں اس کی

تلاش کرتے ہیں لیکن آپ مولانا سے ملیئے اور چند ہی لمحوں کے بعد آپ کو اس بات کا احساس ہوگا کہ آپ خوش ہیں۔ آپ بتا نہیں سکیں گے کہ کس پُر اسرار طریق سے مسرّت کا یہ خزانہ آپ تک پہنچا ہے۔ آپ کو صرف اس قدر یاد ہوگا کہ آپ کمرے میں داخل ہوئے تو ایک مسرور چہرے نے آپ کا استقبال کیا۔ ایک مضبوط ہاتھ نے جلدی سے قلم کو میز پر رکھ کر آپ کا ہاتھ دبایا اور وہ مسرّت سے چھلکتی ہوئی آنکھوں نے آنِ واحد میں آپ کا احاطہ کر لیا۔ اور آپ کو محسوس ہوُا کہ مسرت ایک برقی رو کی طرح آپ کی رگ رگ میں دوڑتی چلی گئی۔ اس کے بعد باتیں شروع ہوئیں تو مولانا نے اس خلوص سے آپ کے معاملات میں دلچسپی لی کہ آپ نے اپنی ساری سرگزشت بلا تکلف سنادی۔ ادھر سے غم گساری، ہمدردی اور خلوص نے آپ کے ایک ایک لفظ کا خیر مقدم کیا اور جب دو تین گھنٹوں کے بعد آپ نے بمشکل رخصت حاصل کی اور کمرے سے باہر نکلے تو آپ کو محسوس ہوُا کہ آپ کے سینے پر ایک بوجھ تھا کہ اتر گیا ہے اور آپ خود کو تازہ دم اور سُبک تر محسوس کر رہے ہیں۔

مولانا اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور ہیں ورنہ اس طریق کار نے خود مولانا کو کئی بار مشکل میں بھی ڈالا ہے۔ ان کا حلقۂ احباب بڑا وسیع ہے اور اس میں زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق لوگ شامل ہیں۔ چنانچہ کئی بار ایسا اتفاق ہوُا کہ مولانا اپنا قلم ہاتھ میں لیئے جلدی جلدی کوئی مقالہ ختم کرنے کی دُھن میں ہیں شاید انہیں شام کو ریڈیو پر کوئی مقالہ پڑھنا ہے یا شاید کسی علمی و ادبی مجلس کے سیکرٹری نے انہیں ابھی ابھی ٹیلیفون پر بتایا ہے کہ شام کی مجلس میں ان کا مضمون ہوگا کہ اچانک بڑے زور سے دفتر کا دروازہ کھلتا ہے اور ایک نوی ہیکل نوجوان "السلام علیکم" کا نعرہ لگا کر داخل ہو جاتے ہیں اور اس سے قبل کہ مولانا صورتِ حال کی نزاکت سے انہیں آگاہ کر سکیں، وہ جیب سے کاغذات کا ایک پلندہ نکال کر ان کے سامنے رکھ دیتے ہیں اور مسکرا کر کہتے ہیں "مولانا آپ کو زحمت تو ہوگی لیکن انگریزی کے اس مسودہ کو ذرا دیکھ دیجیئے۔ آج چار بجے تک مجھے یہ مسودہ پیش کر دینا چاہیئے" اور پھر تو مارک کر کہتے ہیں "مولانا یہ وہی بوسے کے پرمٹ کے متعلق ہے نا جس کا پچھلے موسمِ گرما میں ذکر ہوُا تھا" اب یہ بات تو معلوم نہیں کہ مولانا کو پچھلے موسم گرما کی ایک گرم شام کا یہ "خطرناک" فیصلہ یاد ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ اپنا کام چھوڑ کر مسودے کی نوک پلک سنوارنے لگتے ہیں۔ نووارد کی چائے پیسٹری سے تواضع کرتے ہیں، ان کے سیاسی نوعیت کے سوالوں کا جواب دیتے جاتے ہیں۔ ان کی "منّی" کی کھانسی کے لئے کوئی نسخہ تجویز کرتے ہیں، اور جب گھنٹہ بھر کے بعد یہ صاحب "تھینک یو مولانا" کہہ کر اٹھ جاتے ہیں تو میز کی دراز سے دوبارہ اپنے مضمون کا مسودہ نکالتے ہیں اور دماغ پر زور دے کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مقالہ نذیر آمد کے کرداروں سے متعلق تھا یا بوسے کے پرمٹ سے متعلق۔

مولانا کو تقریبًا ہر روز اسی قبیل کے چند ایک "حادثات" سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ لیکن وہ بہت کم دوسروں کے سامنے ان کا ذکر کرتے ہیں چنانچہ اگر اتفاق سے آپ نے خود کوئی ایسا واقعہ دیکھ لیا تو آپ کے ذہن میں رہ گیا ورنہ مولانا کے لئے یہ "حادثات" کسی انوکھی کیفیت کے حامل نہیں ہوتے۔ اس ضمن میں ایک واقعہ مجھے بھی یاد آگیا۔ کوئی دو برس کی بات ہے۔ ایک روز میں مولانا کے پاس دفتر میں بیٹھا تھا اور مولانا کسی ادبی موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ غالبًا غالبؔ کے معاصرین زیرِ بحث تھے۔ اتنے میں آہستگی سے دروازہ کھلا اور ایک سفید ریش بزرگ ہولے ہولے بڑھتے چلے آئے۔ مولانا نے حسبِ معمول بڑے پُر تپاک انداز سے ان کا خیر مقدم کیا۔ بیٹھنے کے لئے کرسی پیش کی۔ حال احوال پوچھا اور پھر مجھ سے باتوں میں مصروف ہو گئے۔ یہ سفید ریش بزرگ پہلے تو کچھ دیر غالبؔ کے معاصرین کے بارے میں مولانا کی باتیں نہایت توجہ سے سنتے رہے، اور پھر جو گفتگو میں ایک چھوٹا سا وقفہ آیا تو فورًا مولانا کو مخاطب کر کے کہنے لگے "وہ مولانا صاحب آپ نے آج کا اخبار دیکھا ہے؟" میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا، مولانا بھی حیران تھے کہ آج ہی کے اخبار میں غالبؔ کے معاصرین کس طرح زیرِ بحث آگئے کہ یہ بزرگ کہنے لگے "وہ اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر تھی کہ احمد آباد میں ایک لڑکی لڑکا بن گئی ہے آپ کی نظر سے یہ خبر ضرور گزری ہوگی۔ کہاں تک سچ ہو سکتا ہے یہ واقعہ؟" اس روز یہ بزرگ کوئی دو گھنٹے تشریف فرما رہے۔ اور اس دوران میں انہوں نے اس مخصوص واقعہ سے لے کر نجومیوں کی کرامات، پیروں کے معجزوں اور مافوق الفطرت عناصر تک تقریبًا ہر موضوع پر اپنے قیمتی خیالات کا اظہار کیا، اور یوں مولانا کے "حقیرؔ ذخیرۂ علم" میں اضافہ کر کے تشریف لے گئے۔

یہ اصحاب تو خیر وہ لوگ ہیں جن سے مولانا کی محض علیک سلیک ہے ورنہ مولانا کے اصلی کرم فرما وہ ہیں جنہیں ان کے دوست ہونے کا فخر حاصل ہے۔ مجھے مولانا کے دوستوں سے کوئی پرخاش نہیں۔ میں خود اسی زمرے میں شامل ہوں لیکن ایسے "احباب" کا ذکر آہی جاتا ہے جو مولانا کی فطری شرافت سے فائدہ اٹھا کر نہ صرف اپنے فالتو وقت کو بخیر و خوبی بسر کرنے کا تدارک کر لیتے ہیں بلکہ جو اس آٹھ دس گھنٹوں کی "مصاحبت" کے دوران میں مولانا ہی کے ساتھ چائے پیتے اور ان ہی کے کھانے سے کچھ نوالے بھی چکھ لیتے ہیں۔ ان احباب میں سے ایک صاحب کا تذکرہ خاص طور پر ضروری ہے۔ یہ پتلے دبلے آدمی ہیں۔ سگریٹ بے تحاشہ پیتے ہیں۔ ہر گھنٹے آدھ گھنٹے کے بعد اٹھ کھڑے ہوتے ہیں "اچھا مولانا رخصت، فی امان اللہ!" لیکن اس کے بعد پھر کرسی پر دراز ہو جاتے ہیں۔ اور باتوں کا سلسلہ شروع کر دیتے ہیں۔ تا آنکہ گھنٹہ بھر کے بعد اچانک کھڑے ہو کر ایک بار پھر مولانا سے مصافحہ کرتے ہیں اور پھر کرسی پہ بیٹھ جاتے ہیں۔ مولانا ان کی حرکات سے پریشان نہیں ہوتے کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ یہ صاحب جب پانچویں بار کرسی سے اٹھیں گے تو یقیناً چلے جائیں گے۔ ایک بار مولانا کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب یہ صاحب چوتھی بار مصافحہ کرنے کے بعد واقعتاً اٹھ کر باہر چلے گئے اور ابھی مولانا انقلاب زمانہ کے اس مسئلہ پہ سوچ ہی رہے تھے کہ دروازہ کھول کر پھر اندر آ گئے۔ کہنے لگے "مولانا ایک منٹ اور ضائع کروں گا۔ ایک چھوٹی سی بات رہ گئی تھی ——" ایک گھنٹہ کے بعد جب وہ پھر مولانا سے رخصت ہو کر نکلے تو مولانا یقین کے ساتھ کہہ سکتے تھے کہ اب یہ لوٹ کر نہیں آئیں گے۔

میں نے نسبتاً تفصیل سے ان واقعات کا تذکرہ اس لئے کیا ہے کہ یہ مولانا کے کردار کے ایک اہم پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں۔ یعنی ان کی تحمل مزاجی اور ہر کس و ناکس سے ایک سمجھوتہ کر لینے کی صلاحیت پر۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جس صبر و تحمل سے وہ اپنے احباب کی بعض حرکات کو برداشت کرتے ہیں کچھ اسی صبر و اطمینان سے وہ وسیع تر زندگی کے دوسرے معاملات سے بھی نبرد آزما ہوتے ہیں۔ میں نے پچھلے دس بارہ برس میں انہیں کئی ایک شدید الجھنوں میں گرفتار دیکھا ہے، لیکن یہ کبھی نہیں دیکھا کہ خارجی حالات و واقعات نے انہیں کوئی گہرا چرکا لگایا ہو۔ وجہ اس کی محض یہ ہے کہ وہ غم، الجھن یا صدمے سے فوراً ایک طرح کا سمجھوتہ COMPROMISE کر لیتے ہیں۔ یہ نہیں کہ ان پہ اتنی مشکلیں پڑتی ہیں کہ از خود آسان ہو جاتی ہیں۔ مشکلیں تو بہر صورت ان پر پڑتی ہی رہتی ہیں لیکن مولانا خود ان مشکلات کی عارضی اور ہنگامی حیثیت کے پیش نظر ان سے بے نیاز ہی رہتے ہیں۔ چنانچہ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ اگرچہ وہ خود اپنی حالت کو سنوارنے یا خود کو کسی شدید الجھن سے نکالنے کی شعوری کاوش نہیں کرتے تاہم ان کی بے نیازی ان کے بہت سے مسائل کو حل بھی کر دیتی ہے۔ وہ مثل کہ "آرزو تمہارے سائے کی طرح ہے، اگر اس سے منہ موڑ لو تو یہ تمہارا پیچھا کرے گی"، مولانا کے سلسلے میں بالکل صحیح ثابت ہوئی ہے۔

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی عرض کیا مولانا صلاح الدین احمد ہر شے سے سمجھوتہ کرنے کی طرف ہر دم مائل رہتے ہیں۔ لیکن ان کے سمجھوتے کا افق اتنا وسیع ہے اور ان کی وسیع القلبی کا یہ عالم ہے کہ وہ افراد کے علاوہ زندگی کے تلخ واقعات اور آلام و مصائب کے ایام کا بھی ہنسی خوشی خیر مقدم کرتے ہیں۔ یوں دیکھئے تو ہر شخص زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر حالات و واقعات سے ضرور کوئی سمجھوتہ کرتا ہے۔ لیکن اس سمجھوتہ کی دو اقسام ہیں اور یہ سمجھوتہ کرنے والے کے کردار پہ منحصر ہے کہ اس نے کون سی نہج اختیار کی۔ بعض لوگ منفی اندازِ نظر کے تحت اسی طرح سوچتے ہیں کہ زندگی مسرت سے تہی ہے۔ پس انہیں تلخ اور غم ناک واقعات کو بہر حال برداشت کر لینا چاہئے۔ ایسے لوگوں کے برعکس مولانا کا انداز نظر مثبت ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ ہر شے، ہر نظریے اور ہر کیفیت میں نہ صرف کوئی نہ کوئی سچائی کا عنصر پنہاں ہوتا ہے۔ بلکہ دنیا کا تلخ سے تلخ واقعہ بھی کوئی نہ کوئی افادی پہلو ضرور رکھتا ہے اور اجتماعی مفاد میں اضافہ کرتا ہے انسان کا کام یہ ہے کہ وہ فرد۔ نظریے یا واقعے کے ساتھ خود کو اس انداز سے ہم آہنگ کر لے کہ اسے تصویر کا دوسرا رُخ اپنی پوری تابانی کے ساتھ نظر آ جائے چنانچہ میں نے دیکھا ہے کہ زندگی میں بھی اور ادبی تنقید کے دوران میں بھی مولانا نے دوسرے کے خیالات یا ادبی نظریات کو انتہائی ہمدردی سے دیکھا اور اس "سچائی" کے عنصر کو تلاش کرنے کی کوشش کی جو فرد کے نظریے کی کسی نہ کسی تہہ میں ضرور موجود تھا۔ عام زندگی میں بھی مولانا کو میں نے بہت کم نظریاتی بحث میں الجھتے دیکھا ہے۔ وہ مخالف کے نقطۂ نظر کو ہمیشہ ہمدردی سے دیکھتے ہیں۔ اور اگر اس نقطۂ نظر کے بعض پہلوؤں سے اختلاف بھی کرتے ہیں تو اس تحمل اور ملائمت کے ساتھ کہ مخالف ردِ عمل پر آمادہ نہیں ہوتا۔ عام ادبی تنقید میں بھی مولانا نے یہی روش اختیار کی ہے۔ اور بعض لوگ جو وار کرنے

اور وار ثین ہی کو ادبی تنقید کا مابہ الامتیاز قرار دیتے ہیں، مولانا کے اس مخصوص اندازِ تنقید کو "مدلل مداحی" کے سوا اور کوئی نام نہیں دیتے۔ حق یہ ہے کہ تنقید کے دوران میں مولانا کی یہ تعریف محض برائے تعریف نہیں ہوتی بلکہ اس کے پس پشت دلائل کا ایک مضبوط سلسلہ موجود ہوتا ہے۔ مزید برآں اس تعریف کی اساس اس "تجسس" پر استوار ہوتی ہے جس کے سہارے وہ دوسرے کے نظریات و تجربات میں سچائی کے عناصر دریافت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مولانا صلاح الدین احمد کی ادبی تنقید کے بارے میں یہ بات محض ضمناً زیر بحث آگئی ورنہ دراصل موجودہ مطالعہ کی حدود اس قسم کے جملہ معترضہ کی اجازت نہیں دیتیں۔ مولانا کی شخصیت۔ کے بارے میں ایک اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ان کی زندگی میں بیک وقت "بے قاعدگی" اور "باقاعدگی" کے عناصر موجود ہیں۔ بے قاعدگی کے عناصر کو تو مولانا خود بھی بڑی معصومیت سے تسلیم کرتے ہیں مگر شاید "باقاعدگی" کے متعلق میرے الفاظ پڑھ کر وہ چونک اٹھیں۔ لیکن میں ابھی عرض کروں گا کہ میں نے یہ بات کیوں کہی۔

مولانا کی زندگی میں "بے قاعدگی" کی تلاش کچھ زیادہ مشکل بات نہیں۔ وہ تقریباً پچیس برس سے "ادبی دنیا" کے مالک اور قریباً بیس برس سے اس کے ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں لیکن شاید انہوں نے کبھی بھی "ادبی دنیا" کے سلسلے میں پورے طور سے باقاعدگی پیدا کرنے میں کامیابی حاصل نہیں کی۔ اگر وہ چاہتے تو "ہمایوں" کی طرح "ادبی دنیا" بھی ہر مہینہ کی پہلی تاریخ کو منصۂ شہود پر آتا لیکن شاید ان کی فطری بے نیازی ایسی قیود کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ "ادبی دنیا" ہمیشہ ہی کچھ تاخیر سے برآمد ہوتا ہے۔ پھر بیچ میں کافی لمبے وقفے بھی آئے۔ کچھ عرصہ بند بھی رہا۔ پھر لڑکھڑاتا ہوا نکلا اور آج کل پھر ایک بحران میں مبتلا ہے۔ "ادبی دنیا" کی بے قاعدگی سے قطع نظر خود مولانا نے دفتری قواعد و ضوابط میں بھی کافی لچک پیدا کی ہے۔ مضامینِ نظم و نثر میز کی درازوں، بڑے بڑے کاغذی تھیلوں اور کبھی کبھی "بوروں" میں بھی پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں یہ اکیلے نہیں ہوتے بلکہ دوستوں کے خطوط، بیرونی ممالک کے اشتہار، بنک کی رسیدیں، پرانے اخبارات کے تراشے اور نہ جانے کون کون سی چیزیں ان کے ساتھ "مصروف گفتگو" رہتی ہیں۔ چنانچہ اگر مولانا کو کسی خاص مسودے کی ضرورت پیش آجائے تو پھر اس کو ڈھونڈ نکالنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہوتا۔ ابھی پچھلے دنوں کی بات ہے کہ مولانا کو ایک ایسا مسودہ درکار تھا جو مسودوں کے اس "گودام" میں کہیں پڑا تھا۔ مولانا نے اس مسودہ کو آخر کار ڈھونڈ تو نکالا لیکن اس پر کتنا وقت صرف ہوا اور اس سلسلے میں کن کن مصیبتوں کا سامنا ہوا یہ ایک لمبی کہانی ہے۔

لیکن مولانا کی اس "بے قاعدگی" کے پس منظر میں ایک "باقاعدہ" انسان کے نقوش بھی صاف نظر آتے ہیں اور یہ خیال تقویت اختیار کرنے لگتا ہے کہ مولانا کی یہ "بے قاعدگی" محض اتفاقیہ ہے۔ مثلاً یہی دیکھئے کہ پچھلے تیس برس سے مولانا نے صبح کی سیر میں ناغہ نہیں کیا۔ وہ بہت سویرے بستر سے نکل آتے ہیں۔ اور ایک چھڑی ہاتھ میں لے کر سیر کو چلے جاتے ہیں۔ واپسی پر کسی غیر معروف سی برلبِ سڑک چائے کی دکان سے گرم گرم چائے کی ایک پیالی پیتے ہیں۔ گھر پہنچ کر سرد پانی سے نہاتے ہیں، کپڑے تبدیل کرتے ہیں اور پورے نو بجے دفتر پہنچ جاتے ہیں۔ دوپہر کا کھانا بازار سے منگواتے اور دفتر ہی میں کھاتے ہیں۔ اس کھانے میں بھی کبھی تبدیلی نہیں دیکھی گئی ——— دو ٹوسٹ، دو کباب اور ایک ٹماٹر جس کے فوراً بعد وہ چائے کی ایک گرم پیالی پی لیتے ہیں (چائے وہ دن میں چھ بار پیتے ہیں) شام کو آٹھ بجے دفتر سے نکلتے ہیں اور سیدھے گھر چلے جاتے ہیں۔ اس دوران میں بجز کسی میٹنگ یا جلسہ کے اور انہیں کہیں جانے کا اتفاق نہیں ہوتا۔ میں جب ۱۹۴۴ء میں ان سے پہلی بار ملا تو ان کا یہی قاعدہ دیکھا اور آج ۱۹۵۴ء کے اختتام پر بھی وہ اسی ڈگر پر رواں ہیں۔

بظاہر ان کے کام کرنے کے طریق میں کچھ "بے قاعدگی" ضرور نظر آتی ہے لیکن یہاں بھی بنیادی طور پر وہ بڑے "باقاعدہ" ہیں۔ مثلاً اگر انہیں ریڈیو سٹیشن پہنچ کر کسی خاص تاریخ کو اتنے بج کر اتنے منٹ پر کوئی مضمون پڑھنا ہے تو ریڈیو والے اپنے طریق کار سے مجبور ہو کر انہیں دو تین ہفتے پہلے ہی مطلع کر دیتے ہیں اور پھر غالباً ہر ہفتہ یاد دہانی بھی کراتے رہتے ہیں لیکن مولانا ان یاد دہانیوں سے بے نیاز دوسرے کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ تا آنکہ آخری دن آجاتا ہے۔ اسی روز ریڈیو والے انتہائی پریشانی میں انہیں ٹیلیفون کر رہے ہوتے ہیں اور مولانا نے ابھی مضمون کے لئے کاغذ بھی نکال کر میز پر نہیں رکھا ہوتا۔ تب وہ کاغذ نکالتے ہیں، قلم ہاتھ میں لیتے ہیں، اور قلم اور وقت کے مابین ایک "جنگ" شروع ہو جاتی ہے .... ——— قلم لکھ رہا ہے،

ٹیلیفون گونج رہا ہے اور وقت گزر رہا ہے لیکن شاید آج تک اس معرکے میں ایک بار بھی وقت نے قلم پر فتح حاصل نہیں کی۔ ہمیشہ قلم ہی فتح یاب ہوا ہے۔ اور کیا یہ مولانا کی "باقاعدگی" کا ایک ادنیٰ ثبوت نہیں کہ وہ ہمیشہ دیر سے کام شروع کرتے ہیں اور ہمیشہ وقت سے پہلے اسے ختم کر لیتے ہیں؟ —— کچھ عرصہ ہوا مولانا کے اس مخصوص طریقِ کار کا ایک نہایت عمدہ نمونہ دیکھنے میں آیا۔ مولانا کو "حلقۂ ارباب ذوق" شاخ راولپنڈی کے سالانہ اجلاس میں صدارتی خطبہ پڑھنا تھا۔ اور حلقے والوں نے کئی ہفتے پہلے ہی مولانا کو مطلع کر دیا تھا۔ مگر نتیجہ اس ساری کارروائی کا یہ نکلا کہ مولانا نے خطبے کا ایک حصہ ریل میں لکھا، ایک حصہ ویٹنگ روم میں اور بقیہ ایک تانگے کی پچھلی سیٹ پر دراز ہو کر۔ ادھر تانگہ جلسہ گاہ میں پہنچا اور ادھر خطبۂ صدارت مکمل تھا۔ اور ہم نے لوگوں کو یہ بھی کہتے سنا ہے کہ اس روز کا خطبہ انشا پردازی کا ایک ایسا لاجواب نمونہ تھا کہ نہ صرف وہ لوگ اسے فراموش نہیں کر سکیں گے جو اس روز جلسہ میں شریک ہوئے بلکہ جو اردو ادب میں بھی زندۂ جاوید اور ناقابلِ فراموش فن پارہ ثابت ہوگا۔

میں نے اس "مطالعہ" کے شروع میں ہی عرض کیا تھا کہ مولانا صلاح الدین احمد کی نظریں اردو زبان کی ترویج و ارتقا پر مرکوز ہیں۔ اور ان کے بیشتر خوابوں کا منتہا بھی محض یہ ہے کہ کسی طریق سے یہ زبان دنیا کی عظیم زبانوں میں ایک امتیازی حیثیت حاصل کر سکے۔ اس ضمن میں یہ کہنا غالباً بے موقع نہ ہوگا کہ مولانا صلاح الدین ہند و پاکستان کے ان چند اصحاب میں سے ہیں جنہیں اردو زبان سے والہانہ محبت ہے اور جنہوں نے نہ صرف اپنی زندگیاں اس کی خدمت کے لئے وقف کر دی ہیں بلکہ جنہوں نے محض اردو کی خاطر زندگی کی دوسری آسائشوں سے محروم ہونا بھی گوارا کیا ہے۔ کئی بار مجھے خیال آیا کہ اگر مولانا آج سے تیس برس پہلے اے۔ ایس۔ پی (A.S.P.) ہو جاتے (جیسا کہ وہ منتخب ہو گئے تھے) تو آج شاید وہ بہت بڑے عہدے پر ہوتے اور دنیاوی ترقی اور آسائش کے لحاظ سے ان کی زندگی قابلِ رشک ہوتی۔ لیکن انہوں نے اس وقت بھی محض خدمتِ زبان و ادب کے لئے ملازمت کے اس سلسلے سے انکار کیا۔ اور بقیہ زندگی نت نئے آلام و مصائب سے برسرِ پیکار رہ کر گزار دی۔ اس دوران میں مولانا نے اردو زبان کے لئے جو خواب دیکھے اور ان خوابوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جو تگ و دو کی اس کا نتیجہ "ادبی دنیا" کی روایات، "اردو بولو تحریک" کی مقبولیت اور اکادمی پنجاب کے عظیم الشان منصوبے کی صورت میں ہر ایک کے سامنے ہے۔ موخر الذکر منصوبہ مولانا کا جدید ترین اور عظیم ترین خواب ہے۔ یہ خواب ایک ایسے ادارۂ تصنیف و تالیف کے متعلق ہے جو مصنفین کے لئے تالیف، مطالعہ، تحقیق، تفریح اور آسودگی کے بیشتر لوازم بہم پہنچائے گا اور جو ہند و پاکستان میں یقیناً اپنی طرز کا واحد عظیم الشان ادارہ ہوگا۔ مولانا نے اپنے اس خواب کی تعبیر کے لئے پچھلے چار پانچ برس میں جو کام کیا ہے اور جو مصائب اٹھائے ہیں، وہ کسی سے مخفی نہیں لیکن اب کہ اس خواب کی تعبیر نظر آنے لگی ہے اور اکادمی کی مطبوعات منظرِ عام پر آنا شروع ہوئی ہیں۔ تو لوگوں نے بھی سنجیدگی کے ساتھ اس منصوبے کے متعلق سوچنا شروع کر دیا ہے۔

ان دنوں مولانا دن رات "اکادمی پنجاب" کے سلسلے میں تن تنہا مصروف ہیں۔ خود ہی اکادمی کی مطبوعات کا پروگرام بناتے ہیں، اپنی نگرانی میں کتابت کراتے ہیں۔ چھپائی کے لئے ایک ایک پریس سے معاملہ کرتے ہیں، پروف دیکھتے ہیں اور جب ذرا فرصت ملتی ہے تو مجھ سے اکادمی پنجاب کے مستقبل کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں۔ ان کا ارادہ ہے کہ لاہور کے شور و شغب سے بہت دور پنجاب کے کسی سرسبز و شاداب پہاڑی علاقے میں ایک چھوٹی سی بستی آباد کریں جہاں ملک کے منتخب مصنفین ایک سادہ، مفید اور باوقار زندگی بسر کر سکیں۔ جہاں ایک بہت بڑی لائبریری ہو، نہانے کے لئے تالاب ہو، مطالعہ کے لئے جنگلی درختوں کے ٹھنڈے میٹھے سائے ہوں اور گھومنے کے لئے میلوں لمبی پگڈنڈیاں۔ یہ بستی ہنگامے سے دور بھی ہو اور نزدیک بھی۔ دور اتنی کہ یہاں کے لوگ ستاروں اور پھولوں سے ہم کلام ہوں، اور قریب اتنی کہ چند گھنٹوں میں وہ کسی قریبی شہر کے ہنگاموں میں خود کو کھو سکیں —— مولانا نے اپنی زندگی میں بہت سے خواب دیکھے ہیں۔ ان میں سے بعض پورے ہوئے، بعض پورے نہ ہو سکے لیکن "اکادمی پنجاب" کا یہ خواب اتنا عظیم اور شاندار خواب ہے کہ مجھے یقین ہے ایک روز یہ پورا ہو کر رہے گا۔

(چودھری) محمد علی ردولوی

بیگم اخلاق حسین

میرے کرم فرما محمد طفیل صاحب (ایڈیٹر نقوش) کی فرمائش ہے کہ چودھری محمد علی صاحب پر میں مضمون لکھوں۔ انکار کیسے کروں، اس لئے کہ بقول طفیل صاحب کے مجھ سے زیادہ ان کو یہاں کوئی اور جانتا نہیں ہے۔ اور اگر لکھوں تو وہ باپ میں بیٹی۔ پہلے تو ڈر یہ لگتا ہے کہ محبت کہیں صحت سے ہٹا نہ دے۔ دوسرے ان کی وہ خصوصیات جن سے ان کی زندگی ایک اپنا خاص انداز لئے ہوئے رنگین رہی کیسے لکھوں۔ دنیا کہے گی، اور خود چودھری صاحب بھی سوچیں گے کہ ہاں حفظِ مراتب کو قائم رکھنا بالکل بھول ہی گئی۔ بہرحال طفیل صاحب کا کہنا ٹالا نہیں جا سکتا ہے۔ کوشش کرتی ہوں کہ چودھری صاحب کو تھوڑا بہت انہی کے رنگ میں دکھا سکوں۔

چودھری محمد علی صاحب۔ قصبہ ردولی ضلع بارہ بنکی (یو پی) کے رہنے والے ہیں۔ ان کے والد چودھری احسان رسول صاحب ردولی میں تعلقہ دار تھے۔ طبیعتاً بڑے شوقین، رنگین مزاج، صورت شکل کے بڑے حسین اور وجیہہ آدمی تھے۔ لچھولراں کا گنا فیض آباد سے آتا تھا اور دن رات طبلے ٹھنکا کرتے تھے۔ ۲۸ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ اس وقت چودھری صاحب کی عمر ڈھائی تین سال کی تھی۔ چونکہ تعلقہ کے وارث یہی ایک فرزند تھے، اس لئے علاقہ کورٹ آف وارڈس کے سپرد ہو گیا۔ چودھری صاحب کی تعلیم اور تھوڑی بہت جو ہو سکتی تھی تربیت کی بھی ذمہ داری ایک انگریز منیجر تھا اس کے ذمہ ہو گئی۔ پانچ چھ سال تک چودھری صاحب گھر پر رہے۔ بیوہ عورت کے اکلوتے لڑکے ہونے کی وجہ سے بڑی ناز برداریاں ان کی ہوئیں۔ صورت چودھری محمد علی صاحب کی بھی بہت غیر معمولی اچھی تھی اور بہت غیر معمولی دماغ اور ذہانت پانے کی وجہ سے ہر جا و بے جا خواہش اپنی آسانی سے پوری کر لیتے تھے۔ جب اسکول گئے تو لکھنؤ کالون تعلقہ دار کالج میں بھی باوجود نئی شرارتیں ایجاد کرنے کے چودھری صاحب اپنے پرنسپل اور استادوں کے بڑے چہیتے تھے۔ ایک مرتبہ لکھنؤ میں دربار ہوا۔ اس موقع پر تمام یو پی کے تعلقہ دار اکٹھے تھے۔ وہاں دستور یہ تھا کہ ہر تعلقہ دار حسب حیثیت اشرفیاں ہاتھوں پر رکھ کر گورنر صاحب کے سامنے نذر دکھانے جاتے۔ وہ اس پر ہاتھ رکھ دیتا تھا یہ لوگ واپس لے آتے تھے۔ چودھری صاحب کی عمر اس وقت دس سال سے زیادہ نہ رہی ہو گی۔ یہ بھی گئے اور اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ دیکھا کہ تمام تعلقہ دار جن میں زیادہ تر مسن اور سن رسیدہ تھے۔ اُٹھ اُٹھ کر نذریں پیش کر رہے ہیں۔ چونکے کہ میں تو لایا نہیں! سوچنے لگے کہ کیا ترکیب کرنا چاہیئے۔ اکدم دماغ نے کام کیا اور اپنے پاس والے ایک بزرگ تعلقہ دار جو طبیعتاً عمدہ نہ تھے اور جن کو محمد علی صاحب نے بھانپ بھی لیا تھا کہ اگر ان سے اشرفیاں عاریتاً مانگی گئیں تو یہ دیں گے نہیں۔ لہٰذا سیدھے ہی وہ نذر دکھا کے آ کر بیٹھے اور ان

کے جانے کی باری آئی فوراً اٹھ کر کہنے لگے دیکھوں آپ نے کتنی اشرفیاں نذر دکھائیں؟ انہوں نے ہاتھ کھول دیا۔ چودھری صاحب نے فوراً وہ سب اشرفیاں اٹھا لیں اور کہا میں لانا بھول گیا، ابھی آپ کو واپس لا کر دے دوں گا۔ وہ جز بز، کچھ تعجب کہ نو دس سال کے لڑکے نے عجب بے وقوف بنایا مگر کرتے کیا۔ گھور گھور کر دیکھتے رہے۔ جب چودھری صاحب واپس آئے تو ان کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور اشرفیاں واپس کر دیں۔ وہ موٹے سے سن رسیدہ آدمی ہکا بکا۔ کہنے لگے، صاحبزادے! ماشاءاللہ اس عمر میں اتنی برجستہ سمجھداری! خدا نظرِ بد سے بچائے! پھر ان سے اور چودھری صاحب سے ہمیشہ دوستی کا سا انداز قائم ہو گیا۔ وہ ان کی قدر کرتے تھے۔

اسکول کالج میں زیادہ نہ پڑھ سکے۔ صرف انٹرنس تک پہنچے تھے کہ ماں کو اور خود چودھری صاحب کو بھی شادی کی جلدی پڑ گئی۔ کورٹ آف وارڈس کے مینجر کی رائے نہیں تھی لیکن ان لوگوں نے اس سے چھپا کر ایک روز بارہ بجے دن کو نکاح کر لیا۔ بعد میں مینجر نے بہت شور مچایا مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ کرتا کیا۔ چپ ہو رہا—

شادی کے کوئی آٹھ سال کے بعد جب کہ چودھری صاحب کی عمر کوئی ۲۵ سال کی رہی ہو گی۔ علاقہ کورٹ آف وارڈس سے چھوٹا۔ اس وقت گھر میں پانچ بچے بھی ہو چکے تھے۔

چودھری محمد علی صاحب بڑے نفیس مزاج، بہت با مذاق، خوش دل، خوش گفتار اور جوانی میں نیز بڑھاپے میں بھی بہت خوش لباس، خوش وضع اور بہت ہی خوبصورت اور متین آدمی سمجھے جاتے تھے۔ سوشل اتنے تھے کہ یوپی کا شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جو چودھری صاحب کو نہ جانتا ہو۔ دوستوں سے دوستی نباہنا اور ان کو ان کے پیٹھ پیچھے بھی دل سے چاہنا ان کا خاص حصہ ہے۔ جو دوست ان کے مر گئے ہیں آج تک ان کے لئے اس طرح روتے ہیں جیسے کوئی اپنے عزیز قریب کے لئے روتا ہے۔

علمی شوق اور مشاغل بھی اس حد تک تھے کہ گھر پر سوائے پڑھنے لکھنے کے اور کام ہی کیا تھا۔ نوکری کبھی کی نہیں۔ ایک مرتبہ جوانی میں شوقیہ بنک میں نوکری کی تھی، مگر وہ گاڑی چلی نہیں۔ طبیعت کے خلاف حساب کتاب کا کام، اور کسی کی پابندی یہ ان کے خمیر ہی میں نہ تھا۔ بیزار ہو گئے۔ چھوڑ کر گھر چلے آئے۔ کتابیں ہزاروں روپوں کی منگا کر پڑھ ڈالیں۔ عربی، فارسی، انگریزی، ہندی کوئی زبان اور مضمون ایسا نہیں ہے جس میں چودھری صاحب نے خاص قابلیت نہ پیدا کی ہو۔ علمی مباحث بڑے بڑے انگریزی داں اور بڑے بڑے عربی داں علماء سے برابر کے ہوتے تھے اور اکثر چودھری صاحب صحیح ہوتے۔ ڈاکٹری میں بھی بہت زیادہ دخل ہے۔ اکثر امراض میں جہاں بڑے بڑے ڈاکٹر رائے قائم کرنے سے قاصر رہتے، چودھری صاحب فوراً صحیح رائے قائم کر کے تشخیصِ مرض کر دیتے۔ کتابیں جتنی پڑھتے تھے زیادہ تر ان کو یاد رہ جاتی تھیں۔ ذہانت اور یادداشت کی یہ کیفیت تھی کہ ایک مرتبہ کہیں مشاعرے میں گئے، وہاں جتنے شعر ان کو اچھے لگے وہ سنتے گئے اور رومال اور کمربند میں گرہ لگاتے گئے۔ گھر واپس آئے تو گرہ کھولتے گئے، اور اشعار لکھتے گئے۔

گانے کا، اشعار کا اور دوسرے ادبی مضامین کا مذاق (عادتاً) ان کا اتنا عمدہ تھا اور اب بھی ہے کہ لوگوں کو اشتیاق رہتا تھا کہ چودھری محمد علی سے ایک بار مل لیں۔ باتیں ایسی عمدہ کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ملنے کے بعد کوئی کبھی ان کو بھول نہیں سکتا ہے۔ خصوصاً بڑی بوڑھی عورتیں جب مل جاتی تھیں تب تو چودھری صاحب ہنستا پھول بکٹنی کلی ہو جاتے تھے اور ایسی دلآویز، دلچسپ اور رنگا رنگی باتیں کرتے تھے کہ مرد تو مرد، لڑکیاں، بڈھی، جوان عورتیں سب لوٹ پوٹ ہو جاتی تھیں اور چودھری صاحب کا کلمہ پڑھنے لگتی تھیں۔ ہم لوگ اکثر ردولی سے لکھنؤ جاتے اور دو دو مہینے رہتے۔ وہاں سب سے ملنا جلنا رہتا۔ ایک مرتبہ چودھری صاحب نے اپنے استاد کی لڑکی کو جو ۳۲ سال کی رہی ہو گی، کھانے پر بلایا اور بڑی تعریفیں کیں کہ "بڑی خوبصورت ہے، پڑھی لکھی ہے" وغیرہ وغیرہ۔ کھانے پر وہ آئیں۔ ہم لوگ ملے۔ کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ بعد میں ذکر چلا تو ہم سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ خوبصورت تو وہ بالکل نہیں ہے اور عمر بھی خاصی ہے۔ تو بہت تنبیہاً ہم سب کی طرف دیکھا اور مسکرا کر کہنے لگے کہ "تم عورتیں کبھی کسی دوسری عورت کو کمسن نہیں بتاتیں۔ اور نہ ہی تم سے دوسری عورت کی تعریف ہوتی ہے۔ ہمیشہ یہ جانتی ہو کہ دس برس تم سے بڑی نکلے اور کہیں آنکھ ناک میں کوئی کمی ضرور ہو!"

اس کے بعد فرمانے لگے، "واللہ میں نے آج تک کوئی عورت بدصورت دیکھی ہی نہیں۔ عورت کیسی ہی کیوں نہ ہو۔ مجھے اچھی لگتی ہے"۔ ہم لوگ چپ ہو گئے۔ اب اس کے بعد کبھی کچھ نہیں کہتے تھے۔

جوانی میں پھولوں کا، عمدہ کپڑوں کا، بہترین عطر کا بڑا شوق رہا۔ جامہ وار، جامدانی کی شیروانی اور انگرکھے پہنتے تھے۔ مشک، عود اور اگر وغیرہ کے سب سے قیمتی عطر استعمال کرتے تھے۔ بیلے، چنبیلی کے پھولوں کا پورا بستر لگتا تھا جس پر آرام فرماتے تھے۔ حقہ ایسا پیتے تھے کہ اس کے مثل دوسرا شاید ہی کہیں دکھائی دے۔ خود رودولی میں "پیچ بند" کو سمجھا کر تیلی نے کے بڑے لمبے۔ اور خوبصورت نیچے بنواتے تھے۔ لکھنؤ وغیرہ میں دوستوں کو بھی بھیجا کرتے تھے۔ چاندی کا چنبر، نیچے چاندی کی تمالی جس میں رنگ رنگ کے پھول نفاست سے رکھے ہوئے اور چاندی ہی کا مقوّابی بیلے کے پھولوں کا ہار نے میں لپٹا ہوا عجب بہار دکھاتا تھا۔ تب کو لکھنؤ کا بڑا عمدہ خمیرہ جس کی خوشبو اور رنگ پھیلی ہوئی ان کی تیرے لطیف (Fine Arts) سے گرویدگی کا پتہ دیتی تھی۔

جوانی میں شکار کا بڑا شوق رہا۔ اکثر رودولی سے باہر سے احباب بھی شکار کھیلنے آیا کرتے تھے اور ہفتوں رہتے تھے۔ گھوڑے کی سواری بھی کافی اچھی کی۔ لیکن ایک مرتبہ گھوڑے سے گر پڑے تھے۔ دماغ میں بہت چوٹ آئی جب سے گھوڑے کا شوق کم ہو گیا۔

خوش دلی اور ہر ایک سے مذاق کرنے کی یہ کیفیت تھی کہ ماں، بہن، بیوی، لڑکیاں، سالی وغیرہ سب سے ایک سا مذاق کرتے تھے۔ ایک مرتبہ رودولی میں کالرا پھیلا۔ ہم لوگ اور ہمارے کچھ رشتہ دار بھاگ کر گاؤں چلے گئے۔ وہاں اکثر یہ ہوتا تھا کہ رات کو ہم سب بہت سی عورتیں اور بچے مل کر گھومنے جایا کرتے تھے۔ اسی سلسلے میں ایک آدھ مرتبہ بھوت اور چڑیلوں کا ذکر بھی گھر میں ہو چکا تھا۔ ہمارے گھر کے قریب آم کا بڑا گھنا باغ بھی تھا جس کے اندر سے ہو کر ہم لوگ ادھر ادھر جاتے تھے۔ چودھری صاحب نے سن لیا کہ ہم لوگ آج پھر سیر کو نکلیں گے۔ لہٰذا گھر میں ایک سمجھدار اور تیز قسم کا لڑکا ساعد خدمتگار تھا اس کو بلایا اور چپکے سے اس سے کہا کہ تم ان سب عورتوں کے جانے سے پہلے سامنے والے باغ میں جا کر ایک درخت کے اوپر چڑھ کر بیٹھ جانا اور جب یہ لوگ بیچوں بیچ باغ میں پہنچ جائیں، تو درخت کی شاخوں کو پہلے ہلانا پھر چڑیلوں کی طرح (جیسا کہ اس وقت مشہور تھا) ناک میں بولتے ہوئے کہنا کہ "روز روز تم لوگ ادھر آتی ہو آج ٹھہر جاؤ میں سب کو بتاؤں گی"۔ یہ کہہ کر کھٹ کھٹ کھڑکھڑانا شروع کرنا اور یہ چوڑیاں (جو چودھری صاحب نے اس کے ہاتھ میں ڈال دی تھیں) خوب بجانا۔ لہٰذا اس نے ویسا ہی کیا۔ ہم لوگ سب سرِ شام ہی سے رات کے منتظر تھے۔ اندھیرا ہوتے ہی کوئی پندرہ بیس عدد عورتیں اور بچے نکل کھڑے ہوئے۔ بہت خوش، بڑی باتیں، بڑی ہنسی اور چہل پہل کے ساتھ یہ قافلہ جا رہا تھا حسبِ معمول وہی آم کا باغ راستے میں پڑا۔ چونکہ اندھیرا تھا اور اس باغ کے متعلق قصے بھی مشہور تھے کہ یہاں درختوں پر چڑیل اور بھوت رہتے ہیں، اس لئے سب ڈرتے ڈرتے اکٹھے ہو گئے۔ اکٹھا ہونا تھا کہ اوپر سے کھڑکھڑ کی آواز آئی اور ... چڑیل کی پُرشبیہ آواز کہ "تم لوگ ٹھہر جاؤ میں آتی ہوں"۔ اتنا سننا تھا کہ آفت آ گئی۔ ایک کے اوپر ایک گرتے پڑتے ہوئے کوئی چیخ رہی تھی۔ کوئی بھاگنے کی کوشش کرتی تھی مگر پاؤں نہ اٹھتے تو کسی اور کے گلے میں لپٹی ہوئی ہائے ویلا مچا رہی تھی۔ کسی کا پاؤں مڑ گیا وہ گر پڑی۔ غرض جس طرح کسی سے بن پڑا بھاگنے کی کوشش کی اور بہ ہزار خرابی باغ سے نکل کر گھر کی طرف سب مڑے۔ کسی کے پیٹ میں سانس نہیں جاتی تھی۔ ہانپتے کانپتے گھر کے قریب پہنچے تو دیکھا چودھری صاحب بہت محظوظ اور کامیاب مزاج پرسی کے لئے کھڑے تھے۔ پوچھا کیا ہوا؟ کیا آج پھر چڑیلوں سے مڈبھیڑ ہو گئی؟ اتنے حواس کس کے تھے کہ قصہ بتاتا۔ گھر کے اندر بھاگ کر کوئی ادھر پڑا کوئی ادھر پڑا۔ کسی کی گھٹنی چھل گئی کسی کا ہاتھ مڑ گیا۔ غرض دو گھنٹے تک حواس بجا نہ تھے۔ آخر صبح کو پتہ چلا کہ یہ کارروائی انھی کی تھی۔ پھر کئی دن تک اس واقعہ پر محظوظ ہوتے رہے۔

خلافِ مزاج بات پر غصہ بھی ایسا آتا تھا کہ الاماں! الحفیظ! پکی پکائی ہانڈیاں سب ایک ایک کر کے نالیوں میں اونڈھا دیتے تھے کہ نہ خود کھانا کھاؤں گا اور نہ کسی کو گھر بھر میں کھانے دوں گا۔ اس وقت ہم سب کونوں میں جا کر جل تو جلال تو پڑھا کرتے تھے۔ علاوہ اس کے ان کے مخاطب نے

اگر باتوں میں بے وقوفی کو دخل دیا یا کسی بھلے چنگے مریض نے ان کے سوال کا حماقت آمیز جواب دیا اور بہت فاش ناسمجھی کی تو چودھری صاحب کا (Sense of humour) غضب کا عکس لئے ہوئے اس شامت کے مارے مخاطب کو ایسی ایسی چوکس پھبتیاں دیتا تھا کہ دوسرے جو سنتے اس کے تو ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے اور جس پر گذرے اس غریب سے دھرتے اٹھائے نہ بنتے۔ مثلاً چودھری صاحب کا ایک خط حسب ذیل ہے ——— واضح ہو کہ ان بیگم صاحبہ نے جن کو چودھری صاحب نے خط لکھا تھا، موصوف سے اپنے لئے دوا منگوا بھیجی تھی زبانی حال یوں ہی سا کہلا بھیجا تھا، حالانکہ ہومیوپیتھک دوا دینے کے لئے بہت تفصیل کے ساتھ ساری علامتیں معلوم کی جاتی ہیں تب صحیح دوا دی جاتی ہے) اور کہا تھا کہ "استخارہ صرف تمہاری دوا استعمال کرنے پر آتا ہے"

"محترمہ! قریب تھا کہ مجھ کو بھی دوا دینے کو استخارہ منع آ جائے۔ اسی وجہ سے میں نے استخارہ نہیں دیکھا آخر کچھ انصاف ہے؟ گھر گھوڑی۔ نخاس مول۔ کیسے دوا تجویز کروں؟ اور کیسے مرض کی تشخیص کروں؟ تقریباً "بڑے گاؤں" کے تمام سادات الخیرات کا یہی حال ہے مگر کیا کروں! دوا دینے کا کام ہی اپنے سر لیا ہے۔ دوا نہ دوں تو کیا کروں؟ یہ گولیاں اسی طرح ارسال ہیں جیسے بعض شریر لڑکے رات کو ڈھیلے پھینکتے ہیں۔ اگر لگ گیا تو واہ واہ۔ اگر نہ لگا تب بھی لوگ پریشان تو ہوں گے ہی۔ اگر خدانخواستہ اس دوا سے آپ کو دو ہزار دست آ جائیں یا دو ہزار قے آ جائیں۔ یا نصیب دشمناں آپ کا سندہ ٹل گیا تو مجھے شکایت نہ کیجئے گا۔ اندھے کی داد نہ فریاد۔ ان گولیوں کو صبح شام کھائیے اور گھنٹہ بھر پہلے اور گھنٹہ بھر بعد پان تمباکو نہ ہو۔ اور جب فائدہ ہو تو دوا بند کر دیجئے گا۔ اس دوا میں خوشبو بدبو نہ لگے کسی ایسے طاق پر رکھئے گا جہاں دھواں نہ بھرتا ہو۔

محمد اسلم!"

اگر کبھی نوکروں پر غصہ آیا تو ان کو مار بھی مگر بعد میں جب غصہ اتر جاتا تو بلا کر اس سے معافی مانگتے اور انعام دیتے۔ نوکروں سے ان کا ایک خاص قسم کا برتاؤ تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہر نوکر ان کو دل سے چاہتا تھا۔ یہاں تک کہ اب علاقہ چلا جانے اور روپیہ بہت کم ہو جانے کے باوجود ان کے پرانے سپاہی، خدمت گار اور فیلحدار دل سے ان کی خدمت کرنے پر تلے ہیں اور خدمت کرتے ہیں۔ ایک آدھ سپاہی سے تو چودھری صاحب نے کہا بھی کہ اب ہمارے پاس روپیہ کم ہو گیا ہے تم کو تکلیف ہو گی لہذا تم چلے جاؤ۔ لیکن ان لوگوں نے انکار کر دیا اور بہت روئے "ہم آپ کو چھوڑ کر نہ جائیں گے"۔ وہ لوگ سب بھی ہیں اور صبح شام آدھی رات اس دل سے چودھری صاحب کی خدمت کرتے ہیں کہ دیکھنے سے تعلق ہے۔

یہی حال ان کے گاؤں میں اکثر اسامیوں (مزارعے) کا ہے۔ پرانے سلوک اور برتاؤ چودھری صاحب کے وہ لوگ اس بدلے ہوئے زمانے میں بھی بھولے نہیں ہیں۔ محض انہی لوگوں کے خیال سے ہومیوپیتھک دوا بانٹنے کا مشغلہ اختیار کیا۔ مفت دوا دیتے اور صبح و شام مطب کرتے۔

چودھری صاحب کی غیر معمولی ذہانت نے یہاں بھی نمایاں کارنامے دکھائے۔ یعنی ان کی دوا سے چالیس پچاس سال کے پرانے سخت امراض کے مریض پورے طور سے اچھے ہوئے ہیں۔ میری آنکھوں دیکھا ہوا پچاس سال پرانا گٹھیا کا مریض چودھری صاحب کی دوا سے بالکل صحت مند ہوا ہے۔ خود میرے دس سال تک ایسا دمہ رہا کہ سردیوں میں پوری پوری رات میں تکیہ پر سر رکھے بیٹھی رہتی تھی۔ دنیا کا بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا علاج کر ڈالا۔ ڈاکٹر، حکیم، وید اور اناڑی کوئی باقی نہیں جس کا علاج ہوا نہیں۔ لیکن فائدہ نہ ہوا۔ آخر میں ایک روز تکلیف میں مجھے بہت زیادہ مایوس دیکھ کر چودھری صاحب نے کہا "ڈر نہ گھبراؤ نہیں اب میں تمہیں دوا دوں گا"۔ یہ کہہ کر کتاب باہر سے منگوائی اور صرف اس علامت پر کہ بائیں کروٹ اور صبح ہوتے سانس کی تکلیف زیادہ ہو۔ انہوں نے مجھے صرف ایک خوراک دوا ایک لاکھ قوت کی کھلا دی۔ اس وقت سے آج تک

جس کو کوئی تینتیس سال ہو گئے ہوں گے۔ میرے کبھی سانس پھولنے کی کیفیت تک نہیں ہوئی۔ خود ان کی صحت بہت عمدہ رہی۔ کبھی بیمار نہیں ہوئے کھانا تمام زندگی عمدہ، مقوی اور ہلکا کھاتے تھے، اور پورا پیٹ بھر کر کبھی نہیں کھایا۔

گاؤں کے اسامیوں کے لئے مطب ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ چاہے کوئی دوپہر کو ان کے آرام کے وقت آئے جب بھی فوراً اس کو بلا کر دوا دیتے اور تسلی و تشفی سے بھی مطمئن کرتے۔ اکثر جب گاؤں تفریحاً جاتے تو کبھو خالی ہاتھ نہ جاتے۔ عورتوں کے لئے رنگین موتیوں کی تلریاں (گلے میں پہننے کا زیور) اور بچوں کے لئے مٹھائی کے کھلونے لے کر جاتے تھے۔ کبھی لکھنؤ میں اگر اسی قسم کے اچھے زیور مل جاتے تو لڑکیوں اور عورتوں کے لئے ضرور لاتے تھے اور روزانہ بانٹا کرتے تھے۔ ہر ایک سے بڑی دلداری کی بات کرتے۔ ان کے لڑائی جھگڑے اور معاملات بڑے انصاف اور سمجھداری سے نپٹاتے تھے۔ چودھری صاحب میں دوسروں کے چھوٹے سے چھوٹے جذبات بھی پورے طور سے سمجھ لینے کی پوری اہلیت ہے۔

میری والدہ مرحومہ سے ان کو بہت محبت تھی۔ ہر طرح ان کا خیال کیا۔ بڑی خدمت بڑا علاج کیا (کیونکہ وہ زیادہ تر بیمار رہتی تھیں) لیکن عورت کے معاملہ میں چودھری صاحب کی کچھ ایسی مجبوریاں رہیں کہ تکلیفیں بھی ان کو کافی پہنچ گئیں۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں میری والدہ مرحومہ حج کو جانے والی تھیں۔ چودھری صاحب کو کبھی سوتے جاگتے اس کا خیال نہیں آتا تھا کہ وہ بھی حج کو جائیں۔ خود میری والدہ کے جانے کے خلاف تھے۔ کہا کرتے تھے کہ حج کے سفر کی صعوبات تم برداشت نہ کر سکو گی۔ مر جاؤ گی۔ لیکن میری والدہ کو حج اور مدینہ منورہ کی ایسی لو لگی تھی کہ انہوں نے چودھری صاحب کی بات نہ مانی اور حج کے لئے روانہ ہو گئیں۔ ادھر والدہ مرحومہ کا حج کے لئے جانا ادھر چودھری صاحب کی بے چینی ناقابل برداشت ہو گئی۔ آخر کار بمبئی سے حاجیوں کا جہاز روانہ ہونے سے دو دن پہلے تار دیا کہ میں بھی آ رہا ہوں جہاز میں سیٹ بک کرا لو۔ اور صرف دو جوڑے کپڑے لے کر وہ بھی بے جوڑ کپڑے، بیوی کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گئے۔ وہاں جہاز میں سیٹیں سب بک ہو چکی تھیں، ایک بھی نہ تھی۔ لیکن آخر وقت کوئی اور محمد علی تھے جنہوں نے اپنے لئے سیٹ ریزرو کروائی تھی اور وہ کسی وجہ سے نہ پہنچ سکے، وہ ان کو مل گئی ——— گئے ——— حج کیا اور بڑے دل سے کیا ——— آج تک مدینہ منورہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر زار و قطار روتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "بیوی کے طفیل میں حج نصیب ہو گیا"۔ ظاہراً مذہباً میری والدہ سنی تھیں اور والد شیعہ۔ لیکن دراصل دونوں مسلمان کہے جا سکتے تھے اور ہیں۔ سنی شیعہ کوئی نہیں رہے۔ چودھری صاحب کے مذہب پر یو۔پی میں بڑی چہ میگوئیاں ہوئیں کہ شیعہ ہیں یا سنی ——— جس کے بعد انہوں نے "میرا مذہب" ایک کتاب تھوڑے دن ہوئے لکھ کر شائع کروائی ہے اور جس کی سات آٹھ جلدیں میرے پاس اس وقت پڑی بھی ہیں۔ اس میں انہوں نے اپنے مذہب کے متعلق اظہار کیا ہے۔ میری والدہ حج سے پلٹ کر ایک ماہ تک صاحب فراش رہیں اور پھر وہی ہوا جو چودھری صاحب فرماتے تھے۔ یعنی صعوبات سفر برداشت نہ کر سکیں اور آخر کار ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے نجات پا گئیں۔

چودھری صاحب اکیلے کب رہ سکتے تھے۔ تھوڑے دنوں مرحومہ بیوی کا ذکر کر کر کے دن گذارے۔ ارادے بھی بظاہر یہی تھے کہ اب دوسری شادی نہ کریں گے۔ لیکن بقول مصنف "زہر عشق" کے۔ ع عمر بھر کون کس کو روتا ہے؟ جی نہ مانا اور نکاح کر ہی لیا ——— اب اس کو بھی بڑی محبت اور رواداری سے رکھتے ہیں اور شاید اس حد تک کہ اگر وہ کھانا نہ دینا چاہے تو یہ کھانا بھی نہ کھائیں۔ آخر پچاس ساٹھ سال کا محبوب حقہ! وہی حقہ جس سے ان کا دماغ معطر تھا اور جس کے ذکر سے لوگوں کی گفتگو اکثر رنگین رہتی تھی، ختم ہو گیا۔ بیوی کی ضروریات پوری کرنا تھیں۔ حقہ چھوڑ دیا۔

بلڈ پریشر ان کے ساتھی۔ حقہ چھوٹا، تفکرات بڑھے، تکلیفیں بڑھیں۔ جنوری ۱۹۵۶ء کے قریب فالج گرا۔ اب پہلے سے بہتر ہیں مگر وہ کہاں ——— باتیں البتہ اب بھی وہی ہیں بشرطیکہ پرانے احباب یا ہم لوگوں میں سے کوئی موجود ہو ———

ع   پھر دیکھئے انداز گل افشانی گفتار!

عندلیب شادانی

شوکت سبزواری

شخصیت اُردو ادب کے کثیر الاستعمال الفاظ میں سے ہے جو تنقیدی تحریروں میں زیادہ برتا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں کے کثیر الاستعمال الفاظ کی یہ خصوصیت ہے کہ جتنا ان کا استعمال ادب میں زیادہ ہوتا ہے ان کا مفہوم دھندلا پڑتا جاتا ہے۔ عام استعمال میں آنے والی ٹھوس مادی چیزوں میں تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کثرتِ استعمال سے وہ گھس جاتی ہیں۔ اور کبھی کبھی گھستے گھستے مٹ بھی جاتی ہیں لیکن لفظوں میں یہ اصول کارفرما نہیں ہوتا۔ لفظ استعمال سے منجھ کر نکھرتے ہیں۔ ان کے مفہوم میں کسی قسم کا ابہام ہوتا ہے تو بار بار کے استعمال سے وہ بھی دور ہو جاتا ہے لیکن ہمارے ادب کا مزاج نرالا ہے۔ یہاں الفاظ نکھرتے نہیں، دھندلاتے ہیں۔ منجھتے نہیں کجلاتے ہیں۔ آج اردو ادب میں جو الفاظ استعمال کئے جا رہے ہیں ان کا مفہوم آج سے پہلے تو کچھ واضح بھی تھا لیکن آج کثرتِ تعبیر نے خواب پریشاں بنا رکھا ہے۔

شخصیت کی بھی یہی کیفیت ہے۔ کوئی اسے کردار کے معنی میں استعمال کرتا ہے۔ کوئی سیرت کے معنی میں کسی کے نزدیک روزانہ زندگی کے واقعات شخصیت کا پرتو ہیں، کسی کے نزدیک ظاہری شکل و صورت، وضع قطع، خط و خال میں اس کی جھلک نظر آتی ہے شخصیت ان سے ورا ہے۔ وہ نہ کردار ہے نہ سیرت نہ روزانہ عمل و حرکت، نہ ظاہری شکل و شباہت۔ شخصیت ایک فطری چھاپ ہے۔ ایک پختہ مزاج ہے جس کی تعمیر میں جبلت کو بھی اتنا ہی دخل ہے، جتنا گردوپیش کے موثرات اور خارجی محرکات کو ہے۔ انسان کی جسمانی ساخت میں گوشت، پوست، رگ و پٹھے وغیرہ سبھی کا حصہ ہے۔ ان کی خاص قسم کی ترکیب سے اس کے جسم کا ڈھانچہ بنا ہے۔ قدیم یونانی طبیب عناصر اربعہ کی چار مختلف اور متضاد کیفیات کے اعتدال کو مزاج کہا کرتے تھے۔ یہ بات بدیہی صحیح نہ ہو لیکن اس میں شبہ نہیں کہ شخصیت انسان کا باطنی مزاج ہے جس کی تعمیر مختلف قسم کی اخلاقی کیفیات سے ہوتی ہے۔ مشہور نقاد اسپنگارن نے لکھا ہے کہ ہم اپنے دوست سے محبت کرتے ہیں۔ اس کے حسنِ سیرت، صاف گوئی، دیانت، ذہانت، ذوقِ شعری ہی نہیں بلکہ حسنِ صورت، ظرافت، خوش باشی اور صحت کے گرویدہ ہوتے ہیں۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو ہماری گرویدگی اس کی شخصیت سے ہوتی ہے جو ہر چند ان تمام ذاتی محاسن اور اخلاقی فضائل سے مل کر بنی ہے لیکن پھر بھی ان سے ماورا اور آزاد ہے۔

شخصیت کے سلسلے میں ایک دو غلط فہمیاں اور ہیں۔ ان کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ سب سے بڑی غلط فہمی تو یہ ہے کہ شخصیت عام طور سے بنی بنائی چیز سمجھی جاتی ہے جس میں گردوپیش کے اسباب و حالات کی وجہ سے کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہ غلط ہے شخصیت بنی بنائی چیز نہیں۔ وہ حالات کے

زیر اثر ڈھلنے والی اور آئے دن بننے بگڑنے والی ہے۔ میں نے اوپر اسے فطری چھاپ اس لئے بتایا تھا کہ اس کی تعمیر میں بیک وقت دو قوتیں کارفرما ہوتی ہیں۔ ایک جبلت جو خود ایک سطح کی بچتہ اور فطری چھاپ ہے۔ دوسرے خارجی حالات۔ اوّل اوّل انسان جبلت کی چھاپ لئے پیدا ہوتا ہے لیکن جب وہ بڑا ہو کر شعور کی طرف قدم بڑھاتا ہے تو اس کی یہ جبلی چھاپ دھندلا جاتی ہے اور گرد و پیش کے مخصوص حالات کی چھاپ لگ جاتی ہے۔ جب حالات بدلتے ہیں تو بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ یہ چھاپ بھی بدل جاتی ہے۔ اس لئے کسی شخصیت کے خط و خال اجاگر کرنے کے لئے اس کے نت نئے بدلنے والے پہلوؤں کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ دوسرے شخصیت کے بے نقاب ہونے کی بہت سی راہیں ہیں۔ بہت سے دروازے ہیں جن سے شخصیت جھانکتی ہے۔ ان میں سے کچھ سیدھی، صاف اور کشادہ ہیں، کچھ ٹیڑھی میڑھی اور تنگ و تاریک ہیں۔ عام طور سے لوگ سیدھی اور کشادہ راہوں سے شخصیت کا مشاہدہ کرتے ہیں لیکن شخصیت کی جھلک تیرہ و تار راہوں سے دکھائی دیتی ہے۔ چور دروازے اس کے مشاہدے کے لئے زیادہ موزوں ہیں۔ ان چور دروازوں تک رسائی آسان نہیں۔ ایک ادیب اور شاعر کی شخصیت کے لئے اس کی تحریریں اور اس کا کلام کبھی کبھی چور دروازے کا کام دیتا ہے۔ ایک شاعر کا کلام اس کی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے جس میں وہ اصلی خط و خال کے ساتھ نظر آتا ہے۔ بہت سے نقادوں نے اسلوب بیان کو ادیب کی شخصیت قرار دیا ہے۔ اسلوب ہو یا مواد دونوں میں ادیب کی شخصیت جھلکتی ہے۔ شعر اگر آپ بیتی ہے تو شاعر کی شخصیت کے مطالعہ کے لئے اس سے اچھا اور قابلِ اعتماد مواد اور کہیں نہیں مل سکتا۔ شعر کے انتخاب سے اگر دل کا معاملہ کھل سکتا ہے اور رسوائی کا سامان بہم پہنچ سکتا ہے —
بقول شاعر ؎

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

تو شعر کہنے سے شاعر کی تشہیر تک ہو سکتی ہے۔

اوّل اوّل عندلیب شادانی کی شخصیت کے مطالعے کا موقع مجھے ان کے چند اشعار اور سچی کہانیوں کے ذریعے ملا جو رسالہ "ساقی" میں پریم پجاری کے نام سے شائع ہوا کرتی تھیں۔ شادانی نے پریم پجاری کا پردہ، جس سے خود ان کی شخصیت کا ایک پہلو نمایاں ہوتا ہے، شاید اس لئے اختیار کیا تھا کہ ان کہانیوں میں صحیح اور سچے واقعات بیان ہوتے تھے اور شادانی اپنے دل کا معاملہ کسی پر کھولنا نہیں چاہتے تھے۔ شادانی کی شاعری کو بھی سچی کہانی ہی سمجھئے کہانی میں جو روداد بے پردہ بیان کی گئی ہے یہاں اس پر شعر کے ابہام کا ہلکا سا پردہ پڑا ہوا ہے۔ شادانی نے کہیں لکھا ہے کہ میں دل کی باتوں کے سوا دوسرے مضامین کو غزل میں داخل کرنے کا حامی نہیں۔ گزشتہ دس برس میں میں نے تقریباً تین سو غزل کے شعر کہے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک شعر بھی ایسا نہیں جسے آپ بیتی نہ کہہ سکیں۔ شادانی نے جو کچھ لکھا ہے وہ سبھی آپ بیتی ہے۔ ان کی کہانیاں تو آپ بیتیاں ہیں ہی۔ ان کی غزلیں اور نظمیں بھی آپ بیتی ہیں اور ان کی تنقیدیں بھی آپ بیتی کی حیثیت رکھتی ہیں، جو کسی شخصی جذبے یا انفرادی تاثر کے ماتحت لکھی گئی ہیں۔ اگر ان سب پر یکجائی نظر ڈالی جائے تو شادانی کی شخصیت کا ایک اہم پہلو نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے جسے میں ان کی شخصیت کی بنیاد سمجھتا ہوں۔ ان کی شخصیت کے دوسرے پہلو صرف اسی ایک پہلو پر قائم ہیں۔ یہ شاید شخصیت کا وہ جبلی پہلو ہے جسے گرد و پیش کے حالات نے اور زیادہ پختہ کر دیا ہے۔

شادانی کے یہاں "انا" کی بڑی اہمیت ہے نفسیات میں ایسے شخص کو اناتی (Egoist) کہتے ہیں۔ جدید نفسیات نے انانیت کی بہت سی شاخیں بنائی ہیں جن میں سے ایک خود پرستی بھی ہے جو انانیت کی ایک بڑھی ہوئی لَو ہے۔ ہمارے ادب کی بعض بڑی شخصیتیں خود پرستی کی حد تک اناتی تھیں۔ غالبؔ بھی انہی میں سے ہیں اور میں اپنے ایک مضمون میں غالبؔ کی شخصیت کے اس پہلو پر کسی قدر تفصیل سے بحث کر چکا ہوں۔ غالبؔ کے یہاں انانیت سے خود بینی پیدا ہوئی اور خود بینی سے خود داری۔ خود داری نے آزادہ روی کو جنم دیا اور آزادہ روی نے انہیں کائنات کی سیر کرائی لیکن شادانی کے یہاں انانیت خود بینی اور خودداری سے آگے نہ بڑھی۔ وہ مطالعۂ نفس میں گھٹ کر رہ گئی۔ اس اعتبار سے شادانی دروں بیں (Introvert) ہیں

ان کی شخصیت کے اس پہلو کی جھلک ہم ان کی کہانیوں میں بھی دیکھ سکتے ہیں اور ان کے کلام میں بھی۔ ان کی کہانیاں ان کی زندگی کے واقعات ہیں اور ان کے اشعار ذاتی تجربات۔ ان واقعات و تجربات میں ان کی ذات کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ وہ خود اس داستان کے ہیرو ہیں۔ باقی دوسرے کردار ہیرو کی شخصیت کے کسی نہ کسی پہلو کو روشن کرتے ہیں۔ شادانی کے کلام میں جو نشاطیہ رنگ جھلکتا ہے وہ اسی دروں بینی کی پیداوار ہے۔ شادانی نے آنکھ کھول کر کبھی آس پاس کی زندگی پر نظر نہیں ڈالی۔ وہ اپنے دل سے پھوٹنے والی خوشیوں اور مسرتوں میں ایسے مگن رہے کہ گرد و پیش کی چیخیں ان کے کانوں تک نہ پہنچیں۔ ان کی زندگی کے دو باب ہیں جن کا ذکر انہوں نے اپنے اس شعر میں کیا ہے ؂

گذاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں !
انہی کی یاد میری زندگی ہے

جب تک وہ خوشی سے ہمکنار رہے مسرت کی پھواریں ان کے دل سے چھوٹتی رہیں اور جب خوشی کی گھڑیاں گذر گئیں تو ان کی یاد دل میں چٹکیاں لینے لگی۔ دوسروں کے درد سے متاثر ہونے کا موقع انہیں کہاں ملا اور ان کے دل کے تاروں کو غم و اندوہ کے مضراب نے کب چھیڑا؟

شادانی نے اردو کے جدید شعراء کے کلام پر کچھ اعتراضات کیے ہیں اور اس میں فنی غلطیاں نکالی ہیں اس سے بھی ان کی انفرادیت پسند شخصیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ انہوں نے اردو کے ان اساتذہ کے کلام کا مطالعہ انفرادی نقطۂ نگاہ سے کیا۔ اسے ذاتی معیاروں پر پرکھ کر دیکھا۔ اور جب انہیں شاعر کی زندگی اور اس کے کلام میں تضاد نظر آیا تو وہ شاعر کو رسم پرست اور اس کے کلام کو رواجی کہنے لگے۔ اگر وہ انفرادیت کے تنگ دائرے سے باہر نکل کر دیکھتے اور آفاقی یا خارجی نقطۂ نگاہ پیدا کرتے تو وہ ان شعراء کے کلام کو صرف ان کی زندگی پر منطبق کرنے کی کوشش نہ کرتے۔ اس میں انہیں گرد و پیش کی تصویر نظر آتی اور وہ ان کی آواز کو کائنات کے دکھی دلوں کی صدائے بازگشت سمجھ کر اس پر معترض نہ ہوتے۔

شادانی سے میری پہلی ملاقات ۴۶ء میں بریلی میں ہوئی۔ میں اس زمانے میں ایک مقامی کالج میں اردو کا استاد تھا۔ شادانی موسم خزاں کی چھٹیاں بریلی میں اپنی بیگم کے پاس گذار رہے تھے جو اس وقت گورنمنٹ گرلز کالج کی پرنسپل تھیں۔ ایک روز میرے ایک رفیق چودھری عبدالمجید جو شادانی کے رفیق درس رہ چکے تھے، میرے پاس آئے اور کہنے لگے "چلو شادانی سے مل آئیں۔" میں نے شروع میں انکار کیا لیکن جب انہوں نے یہ بتایا کہ شادانی کے شعر پڑھنے کا انداز بڑا ہی دل کش ہے تمہیں ان کا کلام اسی دل کش انداز میں سنوائیں گے، تو میں آمادہ ہو گیا۔ اور ہم دو چار احباب شادانی سے ملنے بیگم شادانی کی قیام گاہ پر پہنچے۔ میں نے شادانی کی کہانیوں اور عاشقانہ اشعار کو پڑھ کر ان کی ایک ذہنی تصویر بنا رکھی تھی۔ جب شادانی مسکراتے ہوئے باہر آئے تو مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ان کی صورت میری ذہنی تصویر کے مطابق ہے۔ وہی دراز قد، چھریرا بدن، بڑی بڑی روشن آنکھیں اونچی پیشانی، مسکراتا ہوا حسین چہرہ اور مترنم آواز۔ مختصر تعارف کے بعد شعر سنانے کی فرمائش ہوئی اور جب انہوں نے اپنی رسیلی آواز میں اپنے چٹیلے شعر سنانے شروع کیے تو مجھ پر ایک عجیب وجد آفرین کیفیت طاری ہو گئی اور ایسا محسوس ہوا کہ کوئی میرے کانوں میں رس گھول رہا ہے۔ یہ مبالغہ نہیں، سخن سرائی نہیں۔ ایک تاثر کا صحیح اور سچا بیان ہے۔ شعر کے بارے میں میرا معیار ذرا سخت قسم کا ہے۔ بہت کم میں کسی شعر کو داد کے قابل سمجھتا ہوں۔ اب یہ شادانی کی شخصیت کا اثر سمجھیے یا ان کی دل کش مترنم آواز کا یا غالب کے الفاظ میں تقریر کی لذت کا۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ ان کے بعض شعروں کی میں نے خوب دل کھول کر داد دی۔ میں نے محسوس کیا کہ ان میں میرے دل کی بات کہی گئی ہے۔

اس مختصر ملاقات کے بعد جب میں گھر واپس آیا تو شادانی کے متعلق ایک نقش ابھرا ابھرا سا میرے ذہن میں تھا کہ وہ مجسم شعر و نغمہ ہیں اور بقول شخصے جہاں بھی کوئی حسین عورت ہے وہ ان کی رشتہ دار ہے۔ اس کے بعد بریلی ہی میں دو چار ملاقاتیں اور ہوئیں جن میں میں نے انہیں بہت ہی خوش باش،

ظرافت، نکتہ رس اور بذلہ سنج پایا۔ ان کی زبان سے ڈھلے ڈھلائے شعر بھی سنے، ان کی خوش گفتاری کا لطف بھی لیا، اور ان کے چٹکلوں اور لطیفوں سے حظ بھی حاصل کیا۔ شادانی بڑے نکتہ رس اور خوش گفتار ہیں۔ جب وہ گفتگو کرتے ہیں تو ایک سماں باندھ دیتے ہیں۔ قیامِ بریلی کے زمانہ میں انہوں نے انگلستان کے کچھ دلچسپ واقعات مجھے اپنے مخصوص انداز میں سنائے۔ میں ان سے اس درجہ متاثر ہوا کہ میں نے اسی وقت ان سے درخواست کی کہ آپ ان کو قلم بند کر کے شائع فرما دیں۔ یہ یقیناً ان کے اندازِ بیان کی سحر آفرینی کا اثر تھا۔

اس کے بعد شادانی ڈھاکے چلے آئے اور میں میرٹھ چلا گیا۔ ۱۹۴۷ء تک ان سے رسمی خط و کتابت رہی۔ قیامِ پاکستان کے بعد مغربی یو۔ پی میں ایک بھونچال آیا جس نے زندگی کی طنابیں تک اکھاڑ پھینکیں۔ بہت سے نشیب و فراز دیکھنے کے بعد ۱۹۵۰ء میں میں ڈھاکے آ گیا۔ اس زمانہ سے میں شادانی کو بہت قریب سے دیکھ رہا ہوں اور ان کی دلچسپ لیکن سادہ شخصیت کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ میں نے ان کی شخصیت کو دلچسپ اس لئے کہا کہ وہ بڑی مسحور کن اور حسین شخصیت ہے اور سادہ اس لئے کہ وہ سیدھے اور یک رنگ خطوط سے بنی ہے۔ اس میں نہ ٹیڑھے میڑھے خطوط ہیں اور نہ نفسیاتی گرہیں۔ اس لئے اس کا مطالعہ بہت آسان ہے۔ میں نے پورے چار سال اس کا مطالعہ کیا ہے۔ شادانی کو سمجھنے کے لئے صرف چار روز کافی ہیں۔ میں شادانی کی شخصیت کو انوکھی شخصیت نہیں سمجھتا۔ ہمارے ادب میں انوکھی شخصیتوں کی کمی ہے اور شاید اسی لئے اردو میں کوئی بڑا کارنامہ وجود میں نہ آسکا۔ بڑے کارناموں کی تخلیق سادہ قسم کی شخصیت نہیں کر سکتی۔ اس کے لئے گرہ در گرہ پیچیدہ شخصیت کی ضرورت ہے۔

شادانی حسن پرست ہیں۔ اس حسن پرستی کا اثر ان کی زندگی کے ہر شعبہ پر پڑا ہے۔ وہ صاف ستھرا اور پاکیزہ لباس پہنتے ہیں۔ ان کے ہر کام میں ستھرا پن ہے۔ ان کی تحریر حسین و جمیل ہوتی ہے۔ صاف اور بے داغ کاغذ پر موتی سے ٹانکتے چلے جاتے ہیں۔ عبارت لکھنے کا انداز بھی سلیقہ مندانہ ہے اور شاید یہ اسی حسن پرستی اور جمالیاتی نقطۂ نگاہ کا اثر ہے کہ وہ پان اور سگرٹ، دونوں سے بیزار ہیں۔ ہماری مشرقی تہذیب میں برگِ سبز تحفۂ درویش کی حیثیت رکھتا ہے اور سگرٹ جدید مغربی تہذیب کی نئی دوشیزہ ہے۔ لیکن شادانی اپنے حسنِ ذوق کے باعث نئی اور پرانی تہذیب کی ان برکتوں سے محروم ہیں۔

شادانی کی حسن پرستی ان کی انفرادیت پسندی کی پیداوار ہے۔ اس لئے اس میں آفاقیت پیدا نہ ہو سکی۔ ان کا عشق بڑا ہی محدود قسم کا ہے ان کے یہاں حسن چاہے جانے کے لئے نہیں اپنانے کے لئے ہے۔ بڑے فنکاروں نے حسن سے اپنے تخیل میں رنگ بھرا، رعنائیٔ خیال اور رنگینیٔ بیان کا اکتساب کیا۔ شادانی انانیت پسند ہیں۔ وہ مانگنے کے قائل نہیں قبضہ کرنا جانتے ہیں۔ یہ ان کے اس نقطۂ نگاہ کا اثر ہے کہ وہ حسن کے جس منظر کو اپنا نہیں سکتے اور اس پر قبضہ جمانا ان کے اختیار سے باہر ہے اس میں انہیں حسن نظر نہیں آتا۔ وہ پھول کی نرمی و گداز پتیوں اور اس کی مست کن مہک پر اکتفا نہیں کرتے۔ اسے شاخ سے توڑ لینا چاہتے ہیں۔ اس سے ان کے ادبی نظریوں پر کچھ اچھا اثر نہیں پڑا۔ ان میں شکست و ریخت اور تخریب کا ذوق زور پکڑ گیا اور تعمیر کی جگہ تشہیر نے لے لی۔

وہ صرف محبت نہیں کرتے، نفرت کرنا بھی جانتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی شخصیت یک رُخی نہیں، جو نفرت نہیں کر سکتا وہ محبت بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن ان کی محبت ان کی نفرت سے بڑھی ہوئی ہے۔ ان کے احباب، رفقاء اور عام شناسا اکثر ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں کہ وہ کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ میں اسے کمزوری اس لئے کہتا ہوں کہ ان کے اس طرزِ عمل سے ان کو نہ سہی ان کے اصولوں کو جو انہیں عزیز ہیں نقصان پہنچ جاتا ہے۔ ان کی شخصیت میں محبت اور نفرت کے عدم توازن سے ان میں کچھ اور کمزوریاں بھی پیدا ہو گئی ہیں۔ وہ ہر شخص سے دل کھول کر ملتے ہیں اور محبت سے ابتدا کرتے ہیں۔ اس لئے خود غرض اور مطلب پرست لوگ جھوٹی محبت جتا کر انہیں اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں۔ شادانی اپنی نیک نیتی اور سادگی کی بنا پر، جو ان کی محبت کی پیداوار ہے، خود غرض لوگوں کے دل میں چھپا ہوا کھوٹ نہیں دیکھ سکتے۔ وہ بڑے دقیقہ رس اور ذہین ہیں لیکن ان کی فطرت معصوم ہے۔ کبھی کبھی اصل اور نقل میں وہ فرق نہیں کر پاتے۔ ظاہر پر فریفتہ ہو کر غلط فہمی کا

[ش]کار ہو جاتے ہیں اور حقیقت بہت بعد میں ان پر آشکار ہوتی ہے۔ ان کے ایک رفیق اور منہ چڑھے شاگرد نے پورے دو سال تک انہیں اس [فری]ب میں مبتلا رکھا کہ وہ ان کی حسبِ ہدایت کام کر رہا ہے۔ اور بالکل آخر میں اس کا انکشاف ہوا کہ انہیں فریب دیا جا رہا تھا۔

ڈھاکے میں وہ گذشتہ ستائیس سال سے ہیں۔ اور اپنی باغ و بہار طبیعت، بھلمنساہت، نیز معاشرے میں اپنے مقامِ عالی کی وجہ سے وہ یہاں کے او[نچے] طبقے میں اثر و نفوذ رکھتے ہیں اور درمیانی طبقے میں بھی ہر دل عزیز اور مقبول ہیں۔ اس لئے اہلِ غرض بڑی تعداد میں ان کو گھیرے رکھتے ہیں۔ او[ر صب]ح سے لے کر شام تک ایک تانتا سا بندھا رہتا ہے۔ وہ ان سب کے اٹکے ہوئے کام نکالتے ہیں۔ یونیورسٹی کے حلقے میں بھی ان کا رسوخ بڑھا ہوا ہے۔ جب میں ڈھاکے آیا تھا اس وقت وہ شعبۂ فنون (فیکلٹی آف آرٹس) کے ڈین تھے۔ اور آج کل بھی ڈین ہیں۔ ان کی [را]ئے وزن رکھتی ہے۔ اکثر اہم معاملات ان کے مشورے سے طے پاتے ہیں۔ وہ اپنے اس موقف سے اپنی ذات کو شاید ہی کوئی فائدہ پہنچاتے ہوں۔ دوسروں کو فائدہ پہنچانے میں وہ کبھی دریغ نہیں کرتے۔ اس شہرت اور عزت سے فائدہ تو بڑی بات ہے الٹا ان کا زیان ہوا ہے۔ ک[سی ز]مانے میں دل لگا کر وہ [ٹھ]وس علمی کام کیا کرتے تھے۔ بعض مفید تصانیف کا انہوں نے ڈول ڈال رکھا تھا۔ لیکن اب ان کے مشاغل ا[تن]ے بڑھ گئے ہیں کہ وہ کسی علمی کام کے لئے وقت نہیں نکال سکتے۔ جسے اپنی غیر معمولی ذہنی صلاحیتوں سے کام لے کر علم و ادب اور فن کی خدمت کرنی چاہیئے تھی، وہ اپنی اخلاقی پابندی سے مجبور ہو کر غرض مندوں کی کاربرآری کر رہا ہے۔ علم کی دیوی کی طرف سے جو وہ بے اعتنائی بر[ت] رہے ہیں، وہ شاید کبھی معاف نہ کرے گی۔ اس سے بڑھ کر ایک اور نقصان بھی ہوا جس کا تعلق شادانی کی شخصیت کی تعمیر سے ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں کام نکالنے کی صرف ایک صورت ہے جسے تملق، چاپلوسی، مداہنہ وغیرہ الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے۔ شادانی کے گرد و پیش جن غرض مندوں کا جمگھٹا رہتا ہے، وہ قریب قریب سبھی اس چلتے ہوئے ہتھیار سے کام لیتے ہیں اور مصاحبوں کی طرح [illegible] بے جا ان کی تعریف کرتے ہیں۔ آپ نے فلاں نظم خوب کہی۔ فلاں شعر پر آپ نے جو تنقید کی ہے اس کا جواب نہیں ہو سکتا۔ آپ پاکستان کے نئے اور پرانے شاعروں میں سب سے اونچے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اگرچہ شادانی بڑی سوجھ بوجھ کے مالک ہیں۔ اور ان کو شیشے [میں] اتارنا آسان نہیں۔ لیکن اس منزل سے کوئی "سفری" اپنا سامان سلامت نہ لے جا سکا۔ ان تعریفوں کا شادانی پر غیر شعوری طور سے اثر ہوتا ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ بعض اصولوں کے معاملے میں وہ ذرا کٹر ہوتے جا رہے ہیں۔

کل تک، وہ بے رحم قسم کے نقاد تھے۔ انہوں نے اکثر بڑے شاعروں کے کلام پر بے لاگ تنقیدیں لکھیں اور آج بھی وہ یہ کہتے ہیں کہ تم بخشنا نہیں جانتے۔ لیکن اخلاقی وسعت اور ذہن و فکر کی ناہمواریوں کے باوجود وہ اپنے کلام اور طرزِ عمل پر کسی کی تنقید گوارا نہیں کرتے۔ مجھ سے برابر وہ یہی کہتے ہیں کہ میں جائز تنقید سے ناخوش نہیں ہوتا۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ جرح و تنقید سے وہ ناخوش نہیں ہوتے۔ وہ اتنے وسیع الاخلاق ہیں کہ ان کی ناخوشی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ لیکن انہیں تنقید گوارا نہیں یہ بھی درست ہے۔ یا تو وہ اس تنقید کو جائز نہیں سمجھتے یا دل کے کسی گوشے میں ان کی ناخوشی دب کر رہ جاتی ہے جسے وہ ابھرنے نہیں دیتے۔ جس زمانے میں انہوں نے "خاور" کے نام سے ایک اردو ماہنامہ ڈھاکے سے نکالا، چاپلوس قسم کے لوگوں کی ان پر یورش تھی۔ تقاضا کر کے انہوں نے "خاور" کے لئے [مجھ] سے ایک مضمون لیا۔ "اردو" حالی نمبر کے لئے بھی میں نے ایک مقالہ لکھا تھا۔ ان کے ایک شاگرد نے ان سے جا کر کہا کہ حالی پر میں نے جو مقالہ لکھا ہے وہ زیادہ بہتر ہے۔ "خاور" کے لئے اسے حاصل کرنا چاہیئے۔ شادانی نے اسی وقت مجھے ایک پرچہ لکھا اور اس میں اس امر کی شکایت کی کہ جو چیز بہتر ہے وہ "خاور" کو نہیں دی گئی۔ میں نے مشکل [سے] انہیں یقین دلایا کہ "خاور" کو جو چیز دی گئی ہے، وہ بھی اسی درجے کی ہے۔ اس کے بعد یہ پرچہ چھپ کر آیا تو انہوں نے اس کی بابت میری رائے دریافت کی۔ میں نے اس نٹ کی طرح، جو اپنے رفیق کو بانس پر پیٹ کے بل ناچتے اور کرتب دکھاتے دیکھ کر نیچے سے ڈھول پیٹ پیٹ کر کہتا ہے "کس رہ گئی! کس رہ گئی!" کہا۔ پرچہ ابھی معیار کو نہیں پہنچا۔ اور ساتھ ہی ایک مقالے پر دبے دبے لفظوں میں کچھ اعتراض بھی کیا۔ شادانی یکایک بگڑ گئے اور کہنے لگے "معلوم نہیں لوگوں کا معیار کیا ہے۔ مجھ سے یہ کہتے ہیں کہ سبزواری نے کیا لکھا ہے! اس کا

سر ہے نہ پیر۔" میں یہ سُن کر خاموش ہو گیا۔

مجھے یقین ہے کہ بعض معاملات میں ان کا تشدد ابھی حال کی پیداوار ہے اور اس کی تربیت میں تملق پسندوں کی بے جا ستائش کا بڑا حصہ ہے۔ اگر ان کے کسی اصول پر نکتہ چینی کی جائے تو وہ اس کی اچھی سی نفسیاتی وجہ نکال لیتے ہیں اور اعتراض کی معقولیت اس طرح بڑی آسانی سے نظر انداز ہو جاتی ہے۔ کوئی دو سال ہوئے ان کا مجموعۂ کلام "نشاطِ رفتہ" بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع ہوا۔ اس پر مختلف ادبی حلقوں کی طرف سے تبصرے ہوئے۔ آل احمد سرور اور نیاز فتح پوری نے دھیمے دھیمے لہجے میں اعتراضات کئے۔ لیکن بزرگ محترم اثر لکھنوی نے تو بلند آہنگ تنقید لکھی جس میں وہی مدرسانہ انداز اختیار کیا گیا تھا جو کبھی شادانی عصرِ حاضر کے شعراء کے کلام پر تنقید کرتے ہوئے اختیار کر چکے تھے۔ شادانی نے اس تنقید کو پسند نہیں کیا اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ یہ سب نقاد ان سے ناخوش ہیں۔ ان سے ذاتی عداوت اور کاوش رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ ایک زمانہ میں ان کے محبوب شعراء کے کلام کو اپنے بے پناہ اعتراضات کا نشانہ بنا کر ان کے شیشۂ عقیدت کو پاش پاش کر چکے ہیں۔ انہوں نے ایک اعتراض کا جواب دیتے ہوئے یہاں تک لکھا کہ "معترضین کی ناواقفیت یا غلط فہمی جذبۂ انتقام سے قطع نظر اعتراضات کا باعث ہوئی ہے۔" ایک موقع پر ایک نومشق نے ایک تبصرے کے سلسلے میں میرے ایک مضمون کو ہدفِ مطاعن بنایا۔ اس پر شادانی کے محترم بزرگ مولانا حامد حسن قادری نے ان کے ایک عزیز شاگرد کی وساطت سے انہیں ان مطاعن کی طرف توجہ دلائی۔ شادانی نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اس میں ایک نفسیاتی نکتہ ہے۔ اس نومشق نے قادری صاحب کے متعلق اپنے تبصرے میں کچھ چبھتی ہوئی باتیں کہی ہیں اس لئے وہ ناخوش ہو کر جذبۂ انتقام کے ماتحت یہ لکھ رہے ہیں۔

شادانی کسی زمانے میں مطالعہ کے بڑے دلدادہ تھے۔ علم کی تحصیل میں انہوں نے جو ریاض کیا ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ حال میں ان کی کاوش اور علمی ریاض کے چند نمونے میں نے دیکھے۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جس زمانے میں علم کی دیوی کے پجاری تھے اور ان پر کام کرنے کی دھن سوار رہتی۔ وہ تمام رات آنکھوں ہی آنکھوں میں گزار دیتے تھے۔ آج بھی ان کا شوق اتنا ہی تیز ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی توجہ بٹ گئی ہے۔ اب معاشرے میں ان کے مقام نے ان کو سیاسی جوڑ توڑ پر مجبور کر دیا ہے۔ اس سے پہلے ان کا ذہن صرف علمی و ادبی مسائل کی نبرد گاہ تھا۔ آج وہ سیاست کی لپ طبعی ہے۔ لیکن سرسوتی دیوی سے ان کا ناطہ بالکل منقطع نہیں ہوا۔ میں جب ان کے پاس جاتا ہوں تو گھنٹوں علمی مسائل پر گفتگو کرتے رہتے ہیں اور اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کوئی یاد نہیں دلاتا کہ آپ کے کھانے کا وقت ہو گیا ہے یا فلاں میٹنگ میں آپ کو شرکت کرنی ہے۔

شادانی کا حافظہ بلا کا ہے۔ انہیں بڑی پرانی پرانی باتیں یاد ہیں اور وہ انہیں اس طرح سُناتے ہیں گویا یہ کل کا واقعہ ہے۔ ان کی طبیعت کو شعر سے خاص مناسبت ہے۔ فی البدیہہ شعر کہتے ہیں۔ دوسروں کے اشعار بھی بڑی تعداد میں ازبر ہیں۔ طبیعت شگفتہ کھیول ہے اس لئے لطیفے اور چٹکلے خوب مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ خدا جانے یہ لطیفے انہیں سُن کر یاد ہو گئے یا خود ان کے زرخیز دماغ کی پیداوار ہیں۔ وہ خود یہ کہتے ہیں کہ یہ لطیفے ان کے دماغ میں محفوظ ہیں۔ ان کی مخصوص مجلسیں بڑی پُر بہار ہوتی ہیں جہاں ان کی طبعی ظرافت کی پھواریں چھوٹتی رہتی ہیں۔ ان کی مجلس سے اُکتا کر کبھی کوئی نہیں اُٹھتا۔

کھانے کا میں نے اوپر کہیں ذکر کیا تھا۔ کھانے کے بارے میں وہ شاید حضرت مسیح کے اس مقولے پر عمل کرتے ہیں کہ انسان صرف کھانے سے زندہ نہیں رہتا۔ وہ بہت کم مقدار میں کھاتے ہیں اور جو کچھ کھاتے ہیں وہ بہت ہی سادہ اور ہلکا ہوتا ہے۔ مجھے ان کی یہ ادا بہت پسند ہے کہ وہ کسی چیز کے پابند نہیں۔ پان، سگرٹ، حقہ وغیرہ کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں۔ وہ ڈھاکے میں رہتے ہوئے بھی جہاں کی آب و ہوا مرطوب ہے، چائے نہیں پیتے۔ انہیں صرف کام کی دھن ہے۔ جب وہ کام کرنے بیٹھتے ہیں تو دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر۔ اور جب تک مکمل

نہیں کہ لیتے اُٹھتے کا نام نہیں لیتے۔ جب وہ دوپہر کا کھانا کھائے بغیر گھر سے نکل کھڑے ہوتے ہیں تو شام کو واپس آکر کھاتے ہیں اور اکثر یہی ہوتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ بغیر کچھ کھائے پئے مشین کی طرح کیسے کام کر لیتے ہیں۔ انہیں مدت سے نزلہ کی شکایت ہے۔ باری باری سے اس کے دورے سے پڑتے ہیں جس کی وجہ سے کبھی کبھی وہ صاحبِ فراش ہو جاتے ہیں۔ میں نے اس زمانہ میں بھی انہیں اسی انہماک، شوق اور تن دہی سے کام کرتے دیکھا ہے۔

انہیں کسی کھیل سے دلچسپی نہیں جسمانی ہو یا ذہنی۔ جس طرح ایک ماہر سازندے کی ساری جسمانی طاقت کھنچ کر اس کی انگلیوں میں آجاتی ہے جن سے وہ ساز کے تاروں کو چھیڑتا ہے۔ اسی طرح شادانی کی ساری دلچسپیاں ان کی آنکھوں میں جمع ہو گئی ہیں۔ وہ اپنی آنکھوں سے لذت و شوق کا کام لیتے ہیں۔ کبھی کبھی سینما بھی دیکھتے ہیں۔ لیکن اس وقت جب کوئی اچھی تصویر ہو اور کوئی صاحبِ نظر دیکھ کر اس کی تعریف کرے۔ ان کی سب سے بڑی دلچسپی حسن کاری ہے اور ان کا سب سے بڑا کام احساسِ فرض۔ لیکن ان کی حسن کاری کی حدود ہیں اور ان کے احساسِ فرض کی بھی۔ کسی کو سامنے بٹھا کر حسین شعر کہنا ان کا حاصلِ زندگی ہے اور پورے احساس کے ساتھ اپنے فرائض انجام دینا ان کی زندگی ہے، اور ان کی شخصیت ان کے حاصلِ زندگی اور زندگی کا حاصل جمع۔ غالب نے یہ شعر اپنے متعلق کہا تھا لیکن یہ شادانی کی زندگی اور شخصیت پر زیادہ صحیح اور پورا اُترتا ہے:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ڈاکٹر شوکت سبزواری

سید شکور عظیم

شوکت صاحب کے متعلق بہت سی باتیں ہیں۔ وہ تنگ مزاج ہیں۔ کٹر قسم کے مولوی ہیں۔ رجعت پسند ہیں۔ ترقی پسندوں کے بہت زیادہ خلاف ہیں۔ بڑے ہٹ دھرم ہیں۔ اپنی بات کے آگے کسی کی نہیں سنتے۔ بڑے نازک مزاج ہیں۔ کسی کی ذرا سی تنقید بھی گوارہ نہیں کرتے۔ اپنی ادبیت کے زعم میں کسی دوسرے کو کچھ نہیں سمجھتے۔ بہت سے ادباء پر جہالت کا الزام فوراً عائد کر دیتے ہیں۔ قابلِ عزت انسان نہیں ہیں۔ بہت کنجوس ہیں ——— اور یہ بھی کہ وہ بہت بلند آدمی ہیں۔ قابلِ عزت انسان ہیں۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ وہ بڑے قابل شخص ہیں۔ انہیں مشرقی و مغربی ادب پر عبور حاصل ہے۔ ڈھاکہ میں صرف وہی ایک قابل آدمی ہیں۔ ڈھاکہ میں ان کی حیثیت اندھوں میں کانے راجہ کی سی ہے ——— ارے صاحب! کانے راجہ بھی تو نہیں، وہ ایک بلند پایہ ادیب ہیں مگر بلند پایہ انسان نہیں .... وغیرہ وغیرہ۔

شروع شروع میں میں نے ان بہت سی رایوں میں سے کسی سے اتفاق کیا، کسی سے اختلاف۔ اقبال عظیم صاحب کا یہ جملہ "ڈھاکہ میں صرف وہی ایک قابل آدمی ہیں" مجھے ماننے میں تامل ہوا۔ پھر حلقۂ اربابِ ذوق میں ان کا ایک مضمون "دہلی اور لکھنؤ کی زبان" پر سننے کا اتفاق ہوا۔ لکھنؤ کی شاعری کا جائزہ انہوں نے ہمدردی سے نہیں لیا تھا اور میرٹھ کو اردو کا مولد قرار دیا تھا۔ بعد میں اس موضوع پر اثر لکھنوی سے ان کی بحث کافی عرصہ تک جاری رہی۔ بعض بعض مقامات پر واقعی ہی ان کی تحریر میں دھاندلی تو نہیں، ہٹ دھرمی کے آثار ضرور ملتے تھے اور میں نے بھی پہلے گروہ کی باتوں پر آمنّا و صدّقنا کہنا مناسب سمجھا۔

میں نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو شوکت صاحب کے متعلق جو میری رائے تھی اسی کی وجہ سے میں ان کے شروع کے دو تین کلاسوں میں شریک نہیں ہوا۔ "یہ شخص بھلا کیا خاک پڑھاتے ہوں گے وہی جی جلانے والی باتیں ہوں گی" اور میرے دو ایک دوستوں نے بھی میری رائے سے اتفاق کیا۔ لیکن آخر کب تک ——— جانا ہی پڑا اگرچہ بادلِ ناخواستہ۔ اور پھر سمندر میں رہ کر مگرمچھ سے بیر تو ویسے بھی ممکن نہیں ہوتا۔ ایم اے کا کلاس ایک تو ویسے ہی چھوٹا ہوتا ہے۔ ذرا سا کمرہ تھا جس میں صرف دو بنچیں تھیں۔ اگلی بنچ پر صرف تین لڑکے تھے۔ کافی جگہ تھی مگر میں اپنے جذبات کو نہ دبا سکا۔ اور پیچھے جا کر بیٹھا۔ لسانیات کا موضوع ایک تو ویسے ہی خشک اور پھر شوکت صاحب سے پڑھانے والے ——— بس ہو چکی نماز مصلّیٰ اٹھائیے والا مصرع زیرِ لب گنگناتا رہا۔

شوکت صاحب نے لکچر دینا شروع کیا تو میرے ذہن نے ناگواری کے ساتھ اس کو رد کرنا شروع کیا اور منھ بنانے لگا جس پر دو ایک لڑکے مسکرائے ——— مگر ان کی باتوں میں کچھ ایسی کشش تھی کہ میں باوجود کوشش کے بھی ان کے لکچر کو غور سے سنتا رہا اور شوکت صاحب جو بظاہر بڑے سنجیدہ اور مقطع نظر آتے تھے۔ صورت دیکھ کر ہی ڈر لگتا تھا، ہر وقت

[1] ڈاکٹر صاحب ہمارے یہاں صرف شادانی صاحب کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

سُوکھا سا تنا ہوا چہرہ۔ سنجیدہ، متین اور بُردبار کہ بات کرنے کی جرأت نہ ہو سکے، کلاس میں باغ و بہار بنے ہوئے تھے اور میں لاکھ نفرت کے باوجود ان کی باتیں کو دلچسپی سے سُننے پر مجبور ہو گیا۔ موضوع کی خشکی کے باوجود شوکت صاحب نے اس میں جان ڈال دی تھی۔ اور اسی پر نہیں بلکہ انہوں نے بیچ میں رُک کر کہا۔ "اس بات پر مجھے ایک لطیفہ یاد آگیا ہے۔ بمبئی میں تو دلچسپی سے پڑھانے کا قائل ہوں (اور پھر میں نے مُنہ بنا کر اپنے پاس بیٹھے ہوئے لڑکے سے کہا یہ سب سستی شہرت اور مقبولیت حاصل کرنے کے گُر ہیں) لطیفہ تھا تو بہت معمولی، مگر انہوں نے جس انداز سے سُنایا وہ بذاتِ خود بڑا قہقہہ آور تھا۔ پہلے مجھے یہ بھی شبہ تھا کہ ان حضرت نے اگر لطیفہ سُنایا تو ان کے سُوکھے سے چہرے کے سامنے جس پر خشونت سی برستی ہے بھلا کون ہنسنے کی جرأت کرے گا۔ لیکن جب وہ سُنا کر خود بھی بے تکلفی سے ہنسے تو ہم سب لوگ بھی بے اختیار ہنس پڑے۔ اور میں نے صرف ایک لمحہ کے لئے سوچا کہ جسے میں خذف سمجھتا تھا وہ تو صدف نکلا۔ مگر میں اتنی جلدی ہار ماننے والا نہیں تھا۔ کلاس کے بعد میں نے لاپروائی سے کہا "بُرا نہیں پڑھاتے" اور شوکت صاحب کے ایک معتقد اور دوست پروفیسر طاہر فاروقی صاحب نے کہا کہ "شوکت صاحب محنت سے پڑھاتے ہیں"۔ اور رفتہ رفتہ میرا یہ حال ہوا کہ میں نے ان کا کوئی کلاس نہیں چھوڑا۔ اور ایک دفعہ انہیں خود بھی حیرت ہوئی کہ میرے لکچر سب سے زیادہ تھے!

لیکن انہیں شوکت صاحب کو کسی جلسہ میں دیکھئے تو مخالفین کی ایسی دھجیاں اُڑاتے اور وہ خبر لیتے ہیں کہ توبہ بھلی! حلقۂ اربابِ ذوق میں ان کی تنقید میں اکثر شدت پیدا ہو کر تلخی آجاتی ہے اور اس کی وجہ جہاں تک میری فہمِ ناقص میں آسکی ہے وہ کسی سستی قسم کی کوشش کے قائل نہیں ہیں۔ کوئی معمولی سی نظم یا غزل دیکھ کر اُن کی آنکھیں سہتی نظر آتی ہیں۔ "شعر گفتن چہ ضرور" اور وہ اکثر تعریف میں اس حد تک بھی بڑھ جاتے ہیں کہ "ایسا تو میں بھی نہیں کہہ سکتا تھا" عام طور پر وہ کسی کی پیٹھ ٹھونک کر کہنے کے عادی نہیں ہیں کہ "ابھی عمر ہی کیا ہے۔ بچہ ہے۔ کچھ دنوں میں اچھا کہنے لگے گا" لیکن یہ حقیقت پھر بھی اپنی جگہ پر ہے کہ وہ کسی کو ہمدردی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے اور ---- میں صاف صاف ہی کیوں اقرار نہ کر لوں کہ شوکت صاحب سے میری سرگشتگی کا سبب اسی حلقۂ اربابِ ذوق میں میرے ایک مقالہ پر ان کی بہت کڑی تنقید تھی جو مجھے فطرتاً ناگوار معلوم ہوئی تھی اور اسی وقت سے غالباً میرے خیالات ان کے متعلق بہت خراب ہو گئے تھے۔ حالانکہ میں آج سوچتا ہوں تو اُن کی سخت اور کڑی تنقید مجھے اپنے حق میں رحمت معلوم ہوتی ہے۔ مجھے حلقہ میں کچھ پڑھنا تھا۔ میں کسی نئے موضوع پر لکھنا چاہتا تھا اور اس نئے موضوع کی تلاش میں بھٹک گیا اور اپنے مقالہ کا عنوان "اکبر کی عامیانہ شاعری" رکھا جس پر اتنی لے دے ہوئی کہ پھر مجھے اسے کہیں شائع کرنے کی جرأت بھی نہ ہو سکی۔ اس کے بعد میرے خیالات بدلے۔ میں نے سوچا کہ میں بالکل غلط راہ پر جا نکلا تھا اور تخریبی تنقید کی طرف قدم اُٹھا رہا تھا۔ اگر ذرا بھی ہمت افزائی ہوتی تو کلیم الدین احمد کے شاگردوں کی فہرست میں میرا نام بھی داخل ہو جاتا۔

شوکت صاحب سے صرف کلاس تک دلچسپی رہی اور اس کے بعد ہم لوگ انہیں زاہدِ خشک سمجھتے رہے۔ ایک دفعہ ان کے گھر پر جانے کا اتفاق ہوا (اگرچہ وہ ہمارے گھر سے بالکل قریب ہی رہتے تھے مگر دو سال سے واقفیت کے باوجود میں ان کے یہاں کبھی نہ گیا تھا) شوکت صاحب خود دروازہ کھولنے تشریف لائے اور کافی محبت، شفقت اور خلوص سے ہم لوگوں کو بٹھایا۔ میرے ایک دوست ان سے کچھ پوچھنے گئے تھے۔ انہوں نے بڑی شفقت کے ساتھ سمجھانا شروع کیا اور اس خوبی سے سمجھایا کہ لسانیات کا ایک مسئلہ آسانی سے حل ہو گیا۔ اس کے علاوہ کافی دیر تک بڑی مزے دار قسم کی گفتگو کرتے رہے۔ اور ہم لوگ اُن کی بڑائی اور عظمت کے قائل ہو کر اُٹھے۔

باتیں کرنے میں شوکت صاحب کو بڑا کمال حاصل ہے۔ جس موضوع پر بولنے میں آتے ہیں اس کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑتے اور بہت برجستہ اور دلچسپ قسم کا تبصرہ کر دیتے ہیں۔ باتوں میں ایسی کشش ہوتی ہے کہ سُننے والا کبھی اُکتاتا نہیں! اور ہمہ تن گوش ہو کر سُنتا رہتا ہے۔ اور شوکت صاحب بھی اپنی باتوں میں ایسے محو ہوتے ہیں کہ وقت کا بالکل خیال نہیں کرتے۔ اس دن ہم لوگ ان کے یہاں سے ساڑھے دس بجے واپس آئے۔

اس کے بعد تو پھر اکثر ان کے یہاں جانا ہوا۔ جہاں ذرا سی مشکل پیش آئی اور شوکت صاحب کے یہاں پہنچ گئے۔ اور اُن کے خلوص اور سادگی نے ہم لوگوں میں بھی جرأت پیدا کر دی تھی کہ "کرمہائے تو مارا گستاخ کرد" پڑھتے ہوئے وقت ناوقت جب چاہا جا کے دستک دے دی۔ انہیں بھی ہم لوگوں کی بے وقت آمد کبھی ناگوار نہ گزری۔ اگر طبیعت خراب ہے تو جب بھی محبت سے بٹھا کر گفتگو کریں گے۔ آپ لاکھ انکار کیجئے گا کہ صاحب آپ کی طبیعت ناساز ہے پھر کبھی سہی، مگر وہ آپ کو بغیر کچھ بتلائے جانے نہ دیں گے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ مجھے یاد آگیا۔ میرا ایم۔ اے فائنل کا امتحان ہو رہا تھا اور مجھے کوئی بہت ضروری بات دریافت کرنی تھی۔ مگر رات کے ساڑھے نو بج چکے تھے۔ کسی شریف آدمی کے یہاں جانے کا وقت نہ تھا اور پھر ڈھاکہ جیسے شہر میں جہاں آٹھ ہی بجے سے شہر خموشاں معلوم ہونے لگتا ہے، سب دوکانیں اور بازار بند، سڑکیں سنسان۔ لیکن سخن گسترانہ بات یہ آپڑی تھی کہ دوسرے دن غالباً صبح کو پرچہ تھا۔ کچھ جھجکتے اور ٹھٹکتے ہوئے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ان کے صاحبزادے باہر آئے، پوچھنے پر معلوم ہوا کہ موجود ہیں۔ انہوں نے باہر والا کمرہ کھلوایا۔ شوکت صاحب کا یہی کمرہ ان کے ڈرائنگ روم کا کام بھی دیتا ہے اور سٹڈی روم کا بھی۔ یہ دراصل ایک بڑا کمرہ تھا جس کو پارٹیشن کر کے دو کمرے بنا لئے گئے ہیں۔ داخل ہوتے ہی داہنی طرف کونے میں ایک تخت بچھا ہے (ڈھاکہ میں مسہری اور پلنگ وغیرہ کا رواج بہت کم ہے۔ سب لوگ زیادہ تر تخت استعمال کرتے ہیں اور یا زمین پر سوتے ہیں۔ کمروں کے فرش یہاں پختہ بنے ہوتے ہیں اس لئے زیادہ تر لوگ زمین پر ہی سوتے ہیں) سامنے بید کا ایک کوچ پڑا ہوا ہے (بید کی صنعت مشرقی پاکستان کی خاص چیز ہے۔ بید کی کرسیاں اور کوچ وغیرہ بڑے خوبصورت بنتے ہیں اور یہاں زیادہ تر گھروں میں ان کا ہی رواج ہے) بیچ میں میز اور دوسری طرف تخت سے ذرا ہٹ کر دو کرسیاں۔ داہنی طرف کونے میں ریڈیو اور اس کے پاس ہی دوسری میز پر ٹیبل فین۔ شوکت صاحب بالعموم کافی رات تک اس کمرہ میں بیٹھے ہوئے پڑھتے رہتے ہیں۔ خلاف معمول ان کو وہاں نہ دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ مگر وہ خود ہی باہر آگئے۔ چہرہ پر ناگواری کے اثرات مطلقاً نہ تھے ہاں پژمردگی ضرور تھی یہ وہم ہی نہیں۔ معلوم ہوا طبیعت کچھ سست تھی سونے کے لئے لیٹ گئے تھے۔ یہ سن کر مجھے حد درجہ ندامت ہوئی میں نے معذرت کر کے اٹھنا چاہا مگر شوکت صاحب نے اصرار کر کے کہا کہ جب آئے ہو تو پوچھتے ہی جاؤ۔ میں نے بات کو مختصر کرنے کے لئے ایک معمولی سا سوال کیا۔ شوکت صاحب نے بغیر کسی اکتاہٹ، جھنجھلاہٹ اور ناگواری کے اپنے مخصوص انداز میں بتانا شروع کیا اور نہ صرف یہ بلکہ اٹھ کر الماری سے نکال کر اس موضوع پر پڑھنے کو مواد بھی دیا۔ اور اس دن سے میں ان کی بلند شخصیت کا قائل ہو گیا۔

ان کے متعلق یہ بھی مشہور ہے کہ وہ اپنی کتابیں کسی کو نہیں دیتے۔ اور واقعی وہ کتابوں کو اتنی احتیاط سے رکھتے ہیں کہ کوئی کیا رکھے گا۔ ہر رسالے کی ایک ایک سال کی جلدیں بندھی ہوئی رکھی ہیں۔ اس کے علاوہ قریب قریب سبھی کتابوں کی جلدیں بندھی ہوئی ہیں۔ ان کی الماری ایک دلہن کی طرح سنوری ہوئی رہتی ہے۔ شوکت صاحب کی کتاب کوئی خراب کر دے یا کھو دے تو ان کو واقعتاً بہت سخت افسوس ہوتا ہے۔ مگر اپنی دقت میں بہت کم انکار کرتے ہیں اور دوسروں کو پڑھنے کے لئے کتابیں دے دیتے ہیں۔ حالانکہ کتاب کسی کو دیتے ہوئے ان کے دل پر جو گذرتی ہے وہ وہی بہتر جان سکتے ہیں۔

شوکت صاحب کی شخصیت کچھ ایسی پیچیدہ قسم کی ہے کہ انہیں آسانی سے کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ اسی لئے ان کے متعلق سطحی قسم کی رائے رکھنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان کے سنجیدہ اور کرخت چہرے کے پیچھے شفقت اور ہمدردی کا جو دریا موجیں مارتا ہے اسے دیکھنا ہر شخص کے بس کا کام بھی نہیں۔ اور پھر کنارے سے کبھی اندازۂ طوفان نہیں ہوتا جب تک اس دریا میں کوئی ڈوب کے موجوں کے تھپیڑے نہ کھائے اس وقت تک اس کی تہہ تک پہنچنا ناممکن ہے۔

مگر جن لوگوں نے شوکت صاحب کو قریب سے دیکھا ہے ان کی رائے اس عام رائے سے بہت زیادہ مختلف ہے۔ شوکت صاحب کے متعلق کچھ سن کر اور ان کی سیدھی سادی وضع قطع دیکھ کر عام طور پر لوگ اس رائے پر صاد کر دیتے ہیں۔ مگر حقیقت کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ مولویانہ وضع قطع اور عربی کے وسیع مطالعے کے باوجود شوکت صاحب بہت ہی آزاد خیال واقع ہوئے ہیں۔ یوں وہ نماز بھی پابندی سے پڑھتے ہیں، روزے بھی رکھتے ہیں اور اس بڑھاپے میں تراویح بھی بہت پابندی سے پڑھتے ہیں جبکہ ہم نوجوانوں کا یہ حال ہے کہ آدھی بھی کھڑے ہو کر نہیں پڑھ سکتے اور پھر اس پر داڑھی مستزاد۔ اسی وجہ سے لوگوں نے ان پر مولوی ہونے کا الزام لگا دیا۔ لیکن اس "ملائیت اور مولویت" سے شوکت صاحب کو حد درجہ چڑ ہے۔ مذہب کو ان کی زندگی میں بڑا دخل ہے اور وہ صوم و صلوٰۃ کے پابند بھی ضرور ہیں مگر زمانہ کے ساتھ چلتے ہیں اور اس کے تقاضوں سے واقف ہیں۔ اسی وجہ سے انہوں نے اپنے گھر والوں کو آزادی دے رکھی ہے اور کوئی پردہ کا پابند نہیں ہے۔ ان کی مولویانہ وضع قطع کی وجہ سے لوگ ان کی اس بات کو پسند نہیں کرتے اور اسی وجہ سے اکثر غلط رائے قائم کر لیتے ہیں۔

شوکت صاحب سے آپ ملنے جائیے تو وہ تپاک اور خلوص سے ضرور ملتے ہیں مگر بے جا تکلفات سے کام نہیں لیتے کہ آپ پہنچے اور انہوں نے نوکر کو بلا کر چائے کا انتظام کرنے کو کہا۔ کسی بے جا تکلف اور تصنع کے وہ بالکل قائل نہیں حتیٰ کہ ادب تک میں وہ سادگی کو ضروری قرار دیتے ہیں اور اسی وجہ سے

لکھنؤ کی شاعری سے منحرف ہیں کہ بقول ان کے "آتش نے شاعری کو مرصع سازی سے تعبیر کیا ہے" اسی وجہ سے لوگ انہیں کنجوس کہتے ہیں۔ ایک تو ماشاءاللہ ان کا کافی بڑا خاندان ہے۔ ایک نہیں دو دو گھروں کا انتظام (انہوں نے دو شادیاں کی ہیں اور دونوں بحیات ہیں) تو ظاہر ہے کہ اتنی ذمہ داریوں کے بعد اس غریب الوطنی میں اتنی فرصت اور فراغت کسے کہ وہ ہر آنے والے کی تواضع کرے۔ اگر اسی کا نام سخاوت ہے کہ ہر آنے والے کے سامنے کچھ نہ کچھ کھانے کی چیز ضرور رکھی جائے تو شوکت صاحب اس معیار پر پورے نہیں اترتے اور یقیناً وہ بہت بڑے کنجوس ہیں ——— اور اگر یہ بات نہیں تو میں نے ان کے بچوں کو اچھے سے اچھا کپڑا خریدتے اور پہنتے دیکھا ہے۔ ان کی کتابیں اور کتابوں کی ظاہری "آرائش" سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتابوں پر یقیناً کافی روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ لوگ یونیورسٹی کے ایک لیکچرار سے کیا امید رکھ سکتے ہیں؟

شوکت صاحب کو بعض عارضات نے قبل از وقت بوڑھا بنا دیا ہے۔ حالانکہ وہ روزانہ علی الصبح ڈاکٹر کی ہدایات کے مطابق کافی دور تک ہوا خوری کے لئے جاتے ہیں مگر ان کی تندرستی پر یقیناً کافی اثر پڑا۔ اور وہ سینتالیس سال کی عمر ہی میں کافی معمر لگتے ہیں۔ پھر بھی بظاہر ان کی صحت اب بھی قابلِ رشک معلوم ہوتی ہے۔ بھرا بھرا وجیہہ چہرہ، خوب چوڑا چکلا سینہ، میانہ قد، بھاری بھرکم، ذہین آنکھیں جو بغیر چشمہ کے اکثر بڑی بھیانک معلوم ہوتی ہیں، فراخ پیشانی، گندمی رنگ، سر پہ چھوٹے چھوٹے بال ایسے نہیں جن میں کنگھا نہ کیا جا سکے۔ مگر بکھرے رہنے کی وجہ سے شوکت صاحب کے ادیب ہونے کی چغلی کھاتے ہیں۔ اور اگر کچھ بڑے ہوتے تو یقیناً پیشانی اور آنکھوں پر پڑے رہتے۔ چھوٹی سی کھچڑی داڑھی جو بیک وقت ان کے چہرہ کو باوقار بھی بناتی ہے اور کچھ کرخت سا بھی۔ ٹوپی بہت کم پہنتے ہیں۔ تنقید سے لے کر لباس و رہائش ہر چیز مشرقی ہے اور وہ بڑے ٹھیٹ مشرقی ہیں۔ روایات کے پرستار۔ سفید کرتا، سفید علیگڈھ کٹ پاجامہ، پاؤں میں شو اور سردی ہو یا گرمی اسی کی مناسبت سے ہمیشہ شیروانی۔ بغیر شیروانی پہنے گھر سے بہت کم باہر نکلتے ہیں۔ جس زمانہ میں زبان کا جھگڑا چل رہا تھا، اور لڑکے یونیورسٹی میں کسی کو داخل نہ ہونے دیتے تھے۔ میں نے بہت سے اساتذہ کو دیکھا جو ہمیشہ شیروانی پہن کر آتے تھے مگر اس ڈر کی وجہ سے لباس بدل کر آتے۔ کیونکہ شیروانی اردو دان ہونے کا بڑا ثبوت تھی۔ مگر یہ جاننے کے باوجود بھی شوکت صاحب ہمیشہ شیروانی ہی پہن کر یونیورسٹی جاتے۔

زبان کا ذکر آ گیا تو اتنی بات اور سن لیجئے کہ شوکت صاحب تعصب کی حد تک اردو سے محبت کرتے ہیں اور کسی حالت میں بھی بنگلہ کے مطالبہ کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ بابائے اردو نے ان کے زبان کے معاملہ میں لڑنے کو جہاد سے تعبیر کیا ہے اور میرے خیال میں بہت صحیح اندازہ لگایا ہے جب کبھی اس کا ذکر چھڑ جاتا ہے تو شوکت صاحب بڑے بڑوں کو آڑے ہاتھوں لیتے ہیں۔ اس زمانہ میں جو لڑکے زبان کے سلسلہ میں مارے گئے تھے ان بنگالی لڑکوں نے ان کے لئے چندہ جمع کیا اور شوکت صاحب سے بھی مانگا مگر انہوں نے سب کو بری طرح لتاڑا اور ایک پیسہ نہیں دیا۔

یوں تو شوکت صاحب لباس میں کافی اہتمام کرتے ہیں مگر بالعموم اس کی طرف سے لاپرواہ رہتے ہیں۔ اکثر شیروانی کے سب بٹن نہیں لگاتے۔ کبھی شیروانی کئی دن کی ہو گئی ہے تو یوں ہی سہی۔ وہی پہن کر یونیورسٹی چلے آئیں گے۔ بنیان پہنے بہت دن گذر چکے ہیں اور وہ کافی میلی ہو گئی ہے مگر اتارنے کی مہلت یا فرصت کسے ہے۔ یا جوتے پر غالباً جب سے خریدا گیا اس کے بعد سے پالش نہیں ہوئی۔ بحیثیت مجموعی ان کی شخصیت میں پوری ادبیت جھلکتی ہے۔

گھر پہ ہمیشہ وہ تہمد اور بنیان پہنتے ہیں۔ کوئی بھی ملنے آئے اسی حال میں بلا جھجک بلا لیتے ہیں۔ ان کا تہمد بھی بنیان کی طرح کافی میلا ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ سردی میں بھی وہ چاروں طرف سے کواڑ بند کرکے اپنی اسی وضع اور اسی انداز میں بیٹھتے ہیں۔

شوکت صاحب زود رنج بھی بہت زیادہ ہیں۔ اکثر چھوٹی چھوٹی باتوں پر دوسروں سے خفا ہو جاتے ہیں۔ کسی کے متعلق اگر ایک دفعہ رائے قائم کر لیتے ہیں تو پھر وہ مشکل ہی سے بدلتی ہے۔ اس لئے ان سے جن جن لوگوں کا سابقہ پڑتا ہے وہ ہمیشہ کوشش کرتے ہیں کہ کوئی بات شوکت صاحب کی طبیعت کے خلاف نہ ہو جائے۔

شوکت صاحب کی یادداشت بھی قابلِ رشک ہے۔ آپ کوئی بھی موضوع چھیڑ دیجئے وہ ایسے باتیں کرنا شروع کریں گے کہ معلوم ہوگا بحر ذخار موجیں مار رہا ہے۔ میں نے یہ محض تشبیہاً نہیں کہا بلکہ سچ مچ ان کا یہی حال ہے فلسفہ، منطق، لسانیات، عربی، فارسی، اردو، انگریزی، ہندی، سنسکرت،

اور قانون پر موضوع پر ان کی معلومات بہت وسیع ہیں۔ ان میں سے کسی چھوٹے سے چھوٹے پہلو پر گفتگو کیجیئے تو وہ تفصیلات ایسے بتانا شروع کر دیں گے گویا اس خاص موضوع کو انہوں نے امتحان کی تیاری کے لئے پڑھا ہے اور حوالے تو اتنے صحیح دیتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ مثلاً بات کے دوران میں کہیں گے جون ۱۹۳۰ء کے نگار میں فلاں صاحب نے یہ جملہ لکھا ہے۔ اب آپ جون ۱۹۳۰ء کے نگار کی فائیل نکال کر دیکھ لیجیئے گا اور تفاوت نہ پائیے گا۔

ایسے ہی شعر کا مطلب سمجھانے میں بھی شوکت صاحب کو کبھی کوئی دقت نہیں ہوئی۔ ایسا اکثر ہوا ہے کہ ولی دکنی کے پرانے زمانہ کے اشعار جن میں وریں اور اتنا ایسے الفاظ ہوتے ہیں یا سودا کے مشکل قصائد جن کا مطلب کوئی دوسرا نہیں سمجھا سکتا۔ شوکت صاحب اتنی آسانی سے بغیر لغت دیکھے سمجھا دیتے ہیں کہ لوگ انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔ حالانکہ یونیورسٹی میں نظم پڑھانا ان کے مضامین میں نہیں ہے۔ وہ تاریخ ادب اور لسانیات کے پروفیسر ہیں۔ مگر کوئی بھی موضوع ہو ان کی معلومات کو آپ اپ ٹو ڈیٹ پائیے گا۔

اگرچہ شوکت صاحب اب کہتے ہیں کہ ان کا حافظہ کمزور ہو گیا ہے اور وہ سب باتیں یاد نہیں رکھ سکتے ہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ ان کا حافظہ اب بھی ہم جیسے ہزالعل نوجوانوں سے بہتر ہے۔

(۳)

ز شرر ستارہ جویم، ز ستارہ آفتابے

اقبال

منٹو

کرشن چندر

عصمت چغتائی

راجندر سنگھ بیدی

احمد ندیم قاسمی

خواجہ احمد عباس

ممتاز مفتی

قرۃ العین حیدر

دیوندر ستیارتھی

خدیجہ مستور

شفیق الرحمٰن

تسنیم سلیم چھتاری

پروفیسر فراق

فیض احمد فیض

کلیم الدین احمد

آل احمد سرور

شاہد احمد دہلوی

کنہیا لال کپور

منٹو ماموں

حامد جلال

منٹو میرے ماموں ہیں اور میں انہیں خالص پنجابی انداز میں سعادت ماماجی کہتا ہوں کیونکہ ہم آپس میں ہمیشہ پنجابی میں باتیں کرتے ہیں اور یہی ہمارے گھر کے بول چال کی زبان ہے۔ وہ صرف اپنے بچوں سے اردو میں بات کرتے ہیں لیکن اردو بولنے میں انہیں سخت تکلف ہوتا ہے اور وہ اردو بولنے سے اتنا ہی گریز کرتے ہیں جتنا پنجابی میں لکھنے پڑھنے سے۔

یہ تو ہمارے رشتے ہی سے ظاہر ہے کہ میرا بھی منٹو ہونا ضروری نہیں ہے اور میں منٹو ہوں بھی نہیں۔ یہ سن کر منٹو ماموں کو شاید دھچکا سا لگے۔ حالانکہ انہوں نے بڑی فراخ دلی سے اعتراف کر لیا ہے کہ اس کے تمام اعزا منٹو نہیں ہو سکتے۔ میرا بھی منٹو نہ ہونا ان کی سمجھ میں آ سکتا ہے اور اسے غالباً وہ معاف بھی کر دیں لیکن اپنے منٹو نہ ہونے کے برملا اعلان پر تو میری شامت ہی آ جائے گی

حقیقت یہ ہے کہ میں منٹو ہوتا تب بھی اپنے نام کے ساتھ منٹو ہرگز نہ لکھتا کیونکہ یہ اب کوئی خاندانی نام نہیں رہ گیا بلکہ ایک فرد واحد کی ملکیت بن چکا ہے منٹو کا لفظ اب ایک اہم صفت بن گیا ہے جو صرف ایک خاص ادبی رجحان یا شخصیت کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے اور میں اسی شخصیت پر کچھ روشنی ڈال سکتا ہوں سعادت حسن اور منٹو دو الگ الگ شخصیتیں ہیں لیکن ان دونوں کا فرق اور ان کی علیحدہ علیحدہ امتیازی خصوصیتیں بیان کرنا ایک انتہائی دشوار کام ہے۔ سعادت حسن ۱۱ مئی ۱۹۱۲ء کو سمبرالہ میں (جو موجودہ مشرقی پنجاب میں واقع ہے۔) پیدا ہوئے اور منٹو کو خود انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم کے آخری دور میں جنم دیا:۔

ان کی منٹوئیت کی بلند آہنگی کا آغاز کب ہوا اسکی بالکل صحیح تاریخ تو میں نہیں بیان کر سکتا لیکن ایک واقعہ سے کچھ اندازہ ضرور لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے شروع شروع میں کس طرح ظاہر ہونا شروع کیا۔ یہ اس زمانے کا واقعہ ہے جب انہوں نے اپنی زندگی کی بیس منزلیں بھی طے نہیں کی تھیں۔ ان دنوں ہر جگہ ماسٹر خدا بخش کے کارناموں کا چرچا تھا جنہوں نے آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہونے کے باوجود پکیڈلی میں کار چلا کر لندن میں سنسنی دوڑا دی تھی۔ اس کے کچھ دنوں بعد ہی امرتسر میں ایک شخص آیا جس کا نام غالباً اللہ رکھا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ ماسٹر خدا بخش کا استاد تھا اور دہکتے ہوئے انگاروں پر چل سکتا تھا۔ اسے آگ پر صحیح سلامت چلتا دیکھنے کے لئے لوگ ٹوٹے پڑتے تھے۔ ایک روز اس نے ایک نئی بات کی۔ اس نے اعلان کیا کہ کسی شخص کو اگر خدا اور میرے اوپر اعتماد ہو تو وہ بھی دہکتے ہوئے انگاروں پر چل سکتا ہے اس کا بال بھی بیکا نہیں ہو گا جم غفیر نے ایک نظر انگاروں کو دیکھا اور معاً کچھ پیچھے ہٹ گیا جیسے ہر شخص کو یہ ڈر تھا کہ ماسٹر اللہ رکھا اسی کو اپنے ساتھ آگ پر چلنے کو مجبور کر دیگا اس نے ایک بار پھر آواز لگائی اور پہلے کی طرح وہ بھی فضا میں کھو گئی۔ مجمع پر بدستور مکمل سکوت طاری تھا ہر شخص دم بخود بیٹھا تھا۔ اچانک ایک نوجوان مجمع کو چیرتا ہوا آگے بڑھا شاید وہ اس بات کا یقین کر لینا چاہتا تھا کہ کوئی اور آگ پر چلنے کی ہمت نہیں کرتا اور وہ اسی لئے رکا ہوا تھا۔ ہر شخص منہ ہی منہ میں اپنی سی کہہ رہا تھا۔ ماسٹر اللہ رکھا کی ہدایت کے مطابق دبلے پتلے نوجوان نے اپنے جوتے اور موزے اتار ڈالے اور پائجامے کی پائنچے چڑھا لئے۔ پھر آواز گونجی کہ اپنے انگوٹھے اندر کی طرف کر کے کلمہ پڑھو اور میرے

سانحہ آپہا۔ مجمع یہ سوچ بھی نہیں سکا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے کہ نوجوان ماشاء اللہ دکھا کے ساتھ انگاروں پر سے گزر بھی چکا تھا۔ وہ ہکا بکا ہو کر اپنے تلوے دیکھ رہا تھا جس میں چھالوں یا سوزش کا نام و نشان تک نہ تھا۔ دوسری طرف مجمع نے تالیاں بجا بجا کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔

مجمع عام میں سعادت حسن کی تحسین و ستائش کا یہ پہلا موقع تھا۔ اجتماعی زندگی میں قدم رکھنے کا یہ کوئی بہت اچھا آغاز نہیں تھا کیونکہ منٹو ماموں اس کے بعد ہمیشہ انگاروں پر چلتے رہے۔ ان کی مذمت و ستائش بھی کی گئی ہے اور کافی کی گئی ہے لیکن آگ کے دلفریب اثرات سے انہیں کبھی مفر نہیں ملی کہ جب انہیں اندیشہ ہے کہ اس آگ کے شعلے انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیں اور ان سے بچنے کی وہ کوشش بھی کرتے ہیں اور اس پر اپنی پوری قوت بھی صرف نہیں کرتے تو لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ بھی بجائے خود آگ پر چلنے کا ایک حصہ ہے۔ میں ان کی کوشش کو ادھوری اس لئے کہتا ہوں کہ منٹو ماموں کا خیال ہے کہ ایک مصنف اور منفرد شخصیت کی حیثیت سے آگ پر چلنا بھی ان کی زندگی کا ایک حصہ ہے غیر شعوری طور پر شاید ان کا یہ خیال ہے کہ وہ اگر ایسے کرتب نہ دکھائیں جو اتنے ہی غیر معمولی اور خطرناک ہوں جتنا آگ پر چلنا تو ان کی تحسین و تعریف ہی نہ کی جائے گی۔

مجھے تو یہ کہنے سے بھی گریز نہ ہوتا کہ یہی غیر شعوری خوف وہ اسم اعظم ہے جس کی مدد سے ان کی شخصیت کے رازوں کے سربستہ تک رسائی ممکن ہے۔ لیکن مجھ کو یہ بھی معلوم ہے کہ تراشے ہوئے نگینے کی طرح ان کی شخصیت کے کئی اور رخ ہیں اور ہر رخ کا راز سمجھنے کے لئے ایک نئے اسم اعظم کی ضرورت ہوتی ہے۔ ممکن ہے کوئی ماہر نفسیات جانفشانی سے کام لے کر منٹو ماموں کی شخصیت کے ہر پہلو کو الگ الگ کر کے ان کی جامع فہرست تیار کر سکے اور ان سب کی علیحدہ علیحدہ امتیازی خصوصیات بیان کر سکے لیکن یہ کام میرے بس کا نہیں ہے۔ جب میں ان کے ماضی پر نظر ڈالتا ہوں جسے مجھے ان کے ساتھ رہ کر دیکھنے کا موقع ملا ہے تو مجھے وہ نلکی نما کھلونا یاد آ جاتا ہے جس میں رنگین شیشوں کے ٹکڑوں کے عکس سے بڑی خوبصورت صورتیں نظر آتی ہیں اور نلکی کو ذرا سی حرکت دے دی جائے تو تمام صورتیں اچانک بدل جاتی ہیں۔ ان کی ادبی سرگرمیاں، ان کی خانگی زندگی اور ان کی بادہ نوشی شیشے کے ٹکڑے کے تین پہلو ہیں۔ جن کا رنگ روشنی کے رخ کے مطابق بدلتا رہتا ہے۔

اس خاکے میں منٹو ماموں کی پوری تصویر پیش کرنا اتنا ہی مشکل ہے، جتنا شیشے کے ٹکڑوں کی نلکی میں پیدا ہونے والی تمام شکلوں کا ہو بہو عکس تیار کرنا اس لئے میں منٹو کی نلکی آہستہ آہستہ گھماتا جاؤں گا اور میرے ذہن پر جتنے عکس پڑیں گے ان کی تشریح کرتا جاؤں گا۔

ان کا پہلا عکس جو آج تک میرے ذہن میں پوری طرح محفوظ ہے اسی زمانے کا ہے جب وہ آگ پر چلے تھے وہ اپنے مطالعے کے کمرے میں لکھنے کی میز پر بیٹھے ہوئے ہیں جس پر جو چیز سب سے نمایاں ہے وہ پیتل کی ایک بڑی سی دوات ہے جو موٹر کار سے مشابہ ہے وہ مجھ سے کچھ سرگوشی کرتے ہیں۔ میں باہر چلا جاتا ہوں۔ کچھ دیر بعد واپس آتا ہوں تاکہ ان کے لنگوٹیے یار حسب معمول جمع ہو لیں۔ وہ میرا تعارف اپنے بعض نئے دوستوں سے کراتے ہیں جنہوں نے اس سے پہلے میری صورت تک نہیں دیکھی تھی۔ وہ اپنے احباب سے بتاتے ہیں کہ میں ابھی ابھی لاہور سے آیا ہوں پھر مجھ سے بڑی تشویش کے ساتھ پوچھتے ہیں کہ تاج محل کے متعلق لاہور میں کوئی مزید اطلاع موصول ہوئی یا نہیں۔ اس وقت میری عمر دس برس بھی نہیں تھی لیکن کچھ دیر پہلے مجھے اچھی طرح سکھا پڑھا دیا گیا تھا۔ اس لئے میں اپنی صورت جتنی بھی سنجیدہ بنا سکتا تھا۔ بنا کر جواب دیتا۔ جی ہاں یہ خبر درست ہے۔ یہ خبر لاہور میں بچے بچے کی زبان پر ہے کہ تاج محل امریکہ والوں کے ہاتھوں بیچ دیا گیا ہے۔

منٹو ماموں اور ان کے سادہ لوح نو واردوں کو یقین ہو جاتا کہ انگریزوں کے تاج محل امریکہ والوں کے ہاتھوں بیچ دیا جو اسے نیویارک لے جانے کے لئے بڑی بڑی مشینیں لا رہے ہیں۔ دوسرے ہی روز یہ افواہ امرتسر کے بازاروں میں پھیل جاتی اس پر چہ میگوئیاں شروع ہو جاتیں اور منٹو ماموں اپنے مطالعے کے کمرے بیٹھے دل ہی دل میں ہنستے رہتے۔

منٹو ماموں کو ان دنوں اس طرح کی افواہیں پھیلانے کا بے انتہا شوق تھا۔ ان کی پھیلائی ہوئی ہر افواہ ان کی جدت پسندی اور ان کے تخلیقی جوہر کا ثبوت ہوتی ان کا ایک محبوب مشغلہ یہ بھی تھا کہ وہ اپنے دوستوں سے مل کر ان سے عجیب و غریب باتیں کہتے اور انہیں منوانے کی کوشش کرتے مثلاً انہوں نے ایک بات یہ کہی تھی کہ ان کا ذہن نہیں گدھے کے سینگ کا بنا ہوا ہے وہ امرتسر کے نوجوان دانشوروں کے ایک گروہ کے لیڈر تھے اور انہیں عام ہمعصروں سے ممتاز کرنے کے لئے انہوں نے نئے نئے محاورے اور فقرے وضع کر رکھے تھے۔

گزشتہ بیس برس میں ان کی دو اصطلاحیں "کباب" اور "فراڈ" خاص طور پر رائج اور مقبول ہوئی ہیں۔ آج کل بہت سے لوگ بول چال میں "فراڈ" اسی روانی اور بے تکلفی سے استعمال کرتے ہیں گویا وہ اردو یا پنجابی کا کوئی لفظ ہو۔ منٹو ماموں "فراڈ" کسی فعل کے لئے نہیں بلکہ کسی کی شخصیت بیان کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ کوئی شخص ان کا وقت پر ساتھ نہ دے یا ان کی جھنجھلاہٹ کا باعث ہو تو منٹو ماموں کے قول مطابق بس نے انہیں کباب بنا دیا ہے۔ ان کی بول چال کا انداز ان کے حلقے کے باہر کے لوگوں کے لئے دلچسپ ہونے کے ساتھ ہی ان میں الجھن بھی پیدا کر دیتا تھا۔ کسی شخص سے اپنی قمیص یا اپنے فاؤنٹن پن کے متعلق رائے دریافت کرنا چاہتے تو اس سے سوال کرتے "اس قمیص کے متعلق تمہارا ری ایکشن کیا ہے؟" یا "اس قلم کے متعلق تمہاری ٹپ کیا ہے؟" اس طرح کی باتوں کی اصل محرک ان کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ ان میں تنوع ہو۔ وہ تمام روایتوں سے آزاد ہوں اور کسی چیز کے لئے کسی کے مرہونِ احسان نہ ہوں۔ اور جامع الفاظ میں ان کی صرف یہ خواہش ہوتی تھی کہ وہ منٹو کے سوا کچھ نہ ہوں

انہوں نے شراب نوشی بھی غالباً اسی لئے شروع کی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے شراب صرف اس لئے پی ہو کہ وہ اپنے دوستوں سے مختلف رہنے میں سبقت لے جائیں۔ یہ ایک عجیب و غریب دوڑ اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے لامتناہی تھی۔ اس کا مقصد دوسروں سے آگے بڑھنا نہیں بلکہ اس کی تہ میں صرف یہ جذبہ کارفرما تھا کہ وہ نہ صرف اپنے احباب بلکہ امرتسر کے تمام دوسرے شہریوں میں بھی ممتاز رہیں۔

میں امرتسر کبھی کبھی ہی جاتا تھا۔ اس لئے اس دوڑ کو قریب سے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ لیکن میں وہاں اگر جلد جلد بھی جاتا رہتا یا منٹو ماموں وقتاً فوقتاً لاہور آتے تب بھی مجھے ان کی تمام سرگرمیوں کا علم نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ ہماری عمر کا تفاوت ہمارے درمیان حائل تھا۔ پھر وہ بمبئی چلے گئے اور ہم ایک دوسرے سے زیادہ دور ہو گئے۔ ہماری کئی سال تک ملاقات نہیں ہوئی۔ اپنے افسانوں کے پہلے مجموعے "منٹو کے افسانے" کی اشاعت کے سلسلہ میں وہ دسمبر ۱۹۴۰ء میں بمبئی سے لاہور آئے۔ اس کے گرد پوش کے متعلق انہوں نے ناشر کو میرے سامنے ہدایات دیں۔ انہوں نے کہا کہ گرد پوش پر ان کا خاکہ ایسا بنایا جائے جو پورے صفحے پر چھا جائے۔ ان کے کالر کھلے ہوئے اور ان کی گردن تنی ہوئی ہو تاکہ اس سے سرکشی اور تکبر ظاہر ہو۔ انہوں نے ناشر کو یہ ہدایت خاص طور پر دی کہ خاکہ ایسا بنایا جائے کہ لوگ مشتعل ہو کر انہیں گالیاں دینے لگیں۔ معلوم نہیں انہوں نے یہ باتیں اپنے پبلشر کو مرعوب کرنے کے لئے کہیں یا مصنف اور قاری کے تعلقات کے متعلق ان کا نظریہ ہی یہی تھا۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ انہوں نے یہ باتیں عمداً نہیں کہی تھیں اور منٹو ماموں کو شاید اب یاد بھی نہ ہوں۔ لیکن ان کا یہ قول ان کی شخصیت کا راز سمجھنے میں بہت معاون ہو سکتا ہے۔

ان کا منشا شاید یہ تھا کہ وہ پبلشر کے ذہن میں یہ بات بٹھا دینا چاہتے تھے کہ اسے منٹو کو عام آدمیوں کے معیار سے نہیں جانچنا چاہیئے لیکن میری رائے میں اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ منٹو ماموں اپنی شخصیت کو اپنی ادبی تخلیق کا جزوِ لاینفک بنا دینا چاہتے تھے۔ کیونکہ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ اصل چیز یہ نہیں ہے۔ کہ کیا کہا گیا ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ کس نے کہا ہے۔ آسکر وائلڈ اور برنرڈ شا کی مثالیں ان کے سامنے ہیں جن کی شخصیت کی شہرت یا رسوائی ان کی ادبی تخلیقات کے ہم پلہ ہے۔ منٹو ماموں اردو کے غالباً پہلے ادیب ہیں جنہوں نے اپنی کتاب کے گرد پوش پر اپنی تصویر بنوائی ہے گویا کہ وہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں اپنے افسانوں ہی کا نہیں منٹو کی شخصیت کا بھی خالق ہوں۔

وہ چاہتے تھے کہ لوگ "منٹو کے افسانے" کا گرد پوش دیکھتے ہی انہیں گالیاں دینے لگیں لیکن میرے خیال میں گالی انہیں کسی نے بھی نہیں دی۔ گرد پوش کا ڈیزائن مشہور فلم اسٹار ایم اسماعیل نے بنایا تھا۔ اور بعد میں ان کی تمنا کے مطابق نہ صرف انہیں گالیاں دی گئیں بلکہ انہیں اپنی تمنا سے بھی زیادہ گالیاں کھانی پڑیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس وقت تک جب تک وہ سعادت حسن بھی تھے اور محض منٹو نہیں بن گئے تھے۔ خود سعادت حسن نے بھی اپنی تخلیقات کو اتنی ہی گالیاں دی ہوں گی جتنی کسی اور نے۔ تخلیق کی ذمہ داری ان پر ضرور تھی لیکن ایک لحاظ سے وہ معذور بھی ہیں۔ کیونکہ انہوں نے اپنے آپ کو ایک میڈیم تصور کیا تھا۔ لیکن ان کی تخلیق مسٹر ہائڈ یا فرینکن سٹین کے سانچے میں ڈھل گئی۔

یہ ہمزاد ——— اور موجودہ سیاق و سباق میں اسے ہمزاد ہی سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ کئی سال سے آپے سے باہر ہو کر دوڑا دوڑا پھر رہا ہے۔ لیکن اسے مطیع کرنے میں انہیں کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی کیونکہ خود انہیں شراب نے مغلوب کر رکھا ہے۔ مثال کے طور پر میں ایک واقعہ بیان کروں گا جس کا تعلق شراب کے صرف چند قطروں سے ہے۔

اگست سنہ ۵۳ء میں منٹو ماموں شدید یرقان میں مبتلا ہو گئے اور انہیں میو ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ ڈاکٹروں نے انہیں دیکھتے ہی کہہ دیا کہ انہیں جگر کا ایک مہلک عارضہ ہے اور ایسا مریض ایک ہزار میں ایک بھی مشکل سے بچتا ہے۔ میں مری گیا ہوا تھا اور جس روز آنے والا تھا اسی دن مجھے تار ملا کہ ان کی حالت بہت خراب ہے۔ راولپنڈی پہنچ کر میں نے لاہور ٹیلیفون کیا تھا تو مجھے بتایا گیا کہ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔ وہ مجھے بار بار بلاتے ہیں لیکن ان کی حالت ایسی ہے کہ شاید میں ان کا دیدار بھی نہ کر سکوں۔ مجھے کئی سال سے ڈر تھا کہ ان کا یہی انجام ہونا ہے۔ لیکن اب اسے قریب دیکھ کر مجھے حد سے زیادہ صدمہ پہنچا یہ سنکر مجھے اور بھی اذیت ہو رہی تھی کہ وہ مجھے بار بار بلاتے ہیں منٹو کے سانحہ میں ساما جان سعادت بھی نزع کے عالم میں تھے یہ سوچ کر جیسے میرے تمام احساسات سن ہو گئے رات بھر کا سفر کرنے بعد لاہور پہنچنا بیکار معلوم ہوتا تھا کیونکہ ڈاکٹر کہہ چکے تھے کہ وہ صرف چند گھنٹوں کے مہمان ہیں

ان سطروں کو پڑھنے والے سوچتے ہوں گے کہ شراب سے متعلق ایک واقعہ کا ذکر کرنے کے لئے یہ کتنی تمہید بیان کرونگا۔ لیکن میں اس واقعہ کو فوراً نہیں بیان کرونگا کیونکہ اس سے پہلے میں منٹو ماموں کی شخصیت کے چند دل آویز پہلو بیان کرنا چاہتا ہوں جو ان کی زندگی سے مایوسی کے عالم میں بے ساختہ یاد آرہے تھے

مجھے ان کا ایک سفر یاد آگیا۔ ہم دونوں لاہور سے ایک ساتھ روانہ ہوئے انہیں بمبئی جانا تھا اور مجھے صرف دہلی تک ان کے سامان میں کم سے کم ایک درجن جوتے اور کامدار جوتیاں تھیں جنہیں وہ لاہور آ کر ضرور خریدتے اور بمبئی جا کر اپنے فلمی دوستوں کو دیا کرتے۔ جوتوں کا شوق انہیں خبط کی حد تک ہے وہ نہ صرف خود انتہائی بیش قیمت جوتے، سینڈلیں و جوتیاں پہنتے ہیں۔ بلکہ انہیں دوسروں کو تحفتہً دینے میں بھی ان کو خاص لطف آتا ہے۔ جوتے ہمیشہ ہماری گفتگو کا موضوع ہوتے ہیں جب بھی بمبئی جاتا مجھے پہلے سے ہی یقین ہوتا تھا کہ وہ مجھے پہننے کے لئے جوتے پہن کر آئیں گے جنہیں دیکھ تو میں ان سے ملتے ہی لیتا تھا لیکن ان پر تبادلہ خیال ٹیکسی یا گاڑی پر سوار ہونے تک ملتوی رہتا۔ جس پر بیٹھنے کے بعد اپنی ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر رکھ لیتے اور جوتے اچھی طرح منظر آنے لگتے۔ وہ بہت ہلکے پھلکے جوتے پہنتے ہیں۔ کیونکہ ان کے پیر پتلے دبلے پتلے بلکہ تقریباً نسوانی ہیں۔ مجھے تو یاد نہیں آتا کہ میں نے اپنے لئے خود کبھی کوئی سینڈل خریدی ہو۔ ہر سال گرمیوں میں ایک دو جوڑی سینڈلیں کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے وہ مجھے ضرور دے دیتے ہیں۔ اس کا سلسلہ منٹو ماموں نے اس زمانے میں بھی جاری رکھا جب وہ شدید مالی پریشانیوں میں مبتلا رہے اور جب وہ شراب کے سوا دنیا و مافیہا سے مکمل طور پر بے نیاز رہے۔ کبھی کبھی تو میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ شراب کے بعد ان کو زندگی میں صرف جوتوں سے سب سے زیادہ دلچسپی ہے۔ مجھے جو سینڈل ان سے پچھلی بار ملی ہے اسے میں نے صرف چند ربڑ بینڈ کے عوض حاصل کیا ہے۔

انہیں ربڑ بینڈ کی کمی کی ہمیشہ شکایت رہی ہے کیونکہ یہ ایک ایسی چیز ہے جسے خریدنا چنداں دشوار نہیں ہے ان سے کہہ دیا جائے کہ فلاں چیز بازار سے غائب ہو کر منافع خوروں کے تہہ خانوں میں پہنچ گئی ہے تو ان کی آنکھوں میں فوراً چمک پیدا ہو جائے گی اور وہ چیلنج قبول کر کے کالے بازار کا چکر لگانا شروع کر دیں گے۔ یہ خصوصیت ان میں بمبئی کے دوران قیام میں بدرجہ اتم پائی جاتی تھی جہاں ان کی آمدنی کافی تھی۔ اور میرا خیال تھا کہ کسی چیز کی انہیں جس قدر زیادہ قیمت ادا کرنا ہوتی تھی انہیں اطمینان حاصل ہوتا تھا گزشتہ جنگ عظیم کے زمانے میں پارکر اور شیفر کی سنہری اور روپہلی کیپ کے قلم پہلی بار ہندوستان آئے تو منٹو ماموں نے ان کی خوب خریداری کی۔ انہوں نے ایک ایک قلم کے لئے ڈیڑھ سو روپے تک قیمت ادا کی اور کم سے کم دس قلم خریدے ہوں گے لیکن اپنے پاس صرف ایک قلم رکھ کر باقی سب کے سب دوسروں کو دے دیئے انکی افادیت کے بجائے انکی ذات ان کیلئے کشش کی سب سے بڑی وجہ تھی کیونکہ قلم وہ کبھی کبھی استعمال کرتے ہیں۔ ریڈیائی ڈرامے یا فلمی منظر لکھنے کیلئے وہ ہمیشہ اپنا ٹائپ رائٹر استعمال کرتے ہیں کیونکہ اسکی رفتار سست ہوتی ہے اور ٹائپ کرتے وقت انہیں سوچنے کی مہلت بھی مل جاتی ہے لیکن افسانے اور دوسرے مضامین لکھنے کے لئے وہ تیز رو پنسل کو ترجیح دیتے ہیں تاکہ ان کا ہاتھ ان کے خیالات کی رفتار کے ساتھ چل سکے۔ وہ افسانہ لکھنے بیٹھ جائیں تو پھر وہ اسے مکمل ہی کر کے اٹھتے ہیں۔ کمرے میں بچے شور مچا مچا کر کھیل رہے ہوں اور ان کا قلم چل نکلے تو پھر اس کا رکنا ناممکن ہے۔ کمرے میں کچھ لوگ بیٹھ کر باتیں کر رہے ہوں تو منٹو ماموں نہ صرف ان کی باتیں سنتے رہتے ہیں بلکہ خود اس میں شریک ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن اس سے بھی ان کی افسانہ نگاری میں کوئی خلل نہیں پڑتا

انہوں نے شراب نوشی کی انتہا کر کے اپنی موت کو دعوت کیوں دی؟ یہ سوال اس رات راولپنڈی سے لاہور آتے ہوئے میرے ذہن میں بار بار آرہا تھا۔ رنجیدہ ہونے کے بجائے مجھے غصہ آرہا تھا۔ یہ انتہا پسندی اپنے اہل و عیال کی محبت اور شراب کی مقناطیسیت میں کشمکش عرصے سے جاری تھی اور میدان بالآخر شراب

کے اندر رہا تھا۔ مجھے شک تھا کہ چند ہفتوں سے وہ خودکشی کے اسی تصور سے اپنا دل بہلا رہے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فرار کا یہ آسان ترین راستہ تھا۔ یا پھر وہ اپنے خاندان والوں کو منفعل کرنا چاہتے تھے جنہوں نے ان سے مایوس ہو کر انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میں وقت پر نہیں پہنچ سکوں گا کیونکہ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ بیہوش ہو چکے ہیں اور ان کے پھیپھڑوں میں آکسیجن پہنچائی جا رہی تھی۔

میں سوچ رہا تھا کہ آج بمبئی کے اس منجم کو بھی شکست ہو جائے گی جس نے منٹو ماموں کی غیر معمولی درازیٔ عمر کی پیش گوئی کی تھی اور اس کا یہ قول صحیح ثابت ہو چکا تھا کہ ان کے اچھے دن نہیں آنے والے۔ یہ ۱۹۴۶ء کی بات ہے جب منٹو ماموں فلمی دنیا میں پورے عروج پر پہنچ چکے تھے۔ اور ان کی آمدنی بہت اچھی تھی لیکن فلمی صنعت میں کساد بازاری کی وجہ سے غالباً فوراً ہی ان کی آمدنی گھٹنے بھی لگی تھی تقسیم کے بعد ہجرت کر کے پاکستان آنے پر ان کی حالت اور بھی خراب ہو گئی۔ منجم نے انہیں آگاہ کر دیا تھا کہ ان کا کیتو یا اسی قسم کی کوئی چیز منحوس برج میں داخل ہونے والی ہے اور حالات ٹھیک ہونے کے لئے انہیں سات سال تک بدحالی کا سامنا کرنا ہو گا۔ ان کی موت قریب دیکھ کر میں نے منجم کی پیش گوئی کا ایک نیا مفہوم نکال لیا تھا یعنی ان کی بدحالی کے سات سال ان کی جسمانی موت کے ساتھ ختم ہو جائیں گے۔ لیکن ایک ادیب کی حیثیت سے وہ اس کے بعد بھی عرصے تک زندہ رہیں گے

میں ہسپتال پہنچا تو اپنا دل کافی کڑا کر چکا تھا اور خبر بد سننے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ وہاں مجھے اعزا کا ایک جم غفیر ملا۔ ہر شخص کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور مجھ سے بتلایا گیا کہ وہ ابھی تک زندہ ہیں۔ لیکن میں کسی سے کوئی سوال نہیں کر سکا کیونکہ شدت جذبات سے میرا دم گھٹ رہا تھا۔ ان کا پلنگ بالکل دروازے سے ملا ہوا تھا اور میں ان کی پائنتی جا کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے جو کچھ دیکھا اس کا نقش میرے ذہن سے کبھی محو نہیں ہو سکے گا۔

بستر پر ایک آدمی کا ڈھانچہ پڑا ہوا تھا۔ ان کے چہرے پر صابن کی موٹی تہہ تھی اور وہ بڑی بڑی زرد اور بے رونق زرد آنکھیں نمایاں طور پر منظر آ رہی تھیں جو لال ان کے چہرے پر صابن تھپا ہوا تھا اور جو شخص ان کے چہرے پر جھکا ہوا تھا وہ ڈاکٹر نہیں بلکہ ہسپتال کا حجام تھا جو یہ سننے کی کوشش کر رہا تھا کہ مریض اپنی انتہائی نحیف آواز میں اس سے کیا کہہ رہا تھا۔ منٹو ماموں بڑی کوشش سے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ اپنی ٹھوڑی تک لے گئے اور اپنی انگلیاں اس کے اوپر پھیریں تب جا کر حجام سمجھ سکا کہ ان کا منشا کیا ہے اس نے اپنا شیونگ برش اٹھاتے ہوئے کہا کہ صاحب کہتے ہیں کہ داڑھی ٹھیک نہیں بنی۔ ابھی کھردرا پن باقی ہے میں منٹو ماموں سے کچھ اور قریب ہو گیا۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس وقت مجھے ہنسنا چاہیئے یا رونا۔ ان کو یقین نہ تھا کہ وہ ایک گھنٹہ بھی جی سکیں گے یا نہیں مگر پھر بھی انہیں اصرار تھا کہ داڑھی ایسی بنائی جائے کہ کھردرا پن ذرا بھی باقی نہ رہ جائے۔ یہ منظر منٹو کی کسی کہانی کا انجام معلوم ہوتا تھا

اس کے بعد میں نے ڈاکٹروں سے ملاقات کی وہ اپنے سر ہلا کر اپنی مایوسی کا اظہار کر کے رہ گئے۔ منٹو ماموں کی حالت روز بروز سدھرتی گئی لیکن مزید دو ہفتے تک ڈاکٹر اپنی رائے بدلنے پر تیار نہ ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ ایسے مریض کو شاید ہی کبھی صحت ہوئی ہو۔ ان کے خون کی طرح طرح سے آزمائش کی جاتی اور ہر بار ایسا نتیجہ نکلتا جو ڈاکٹروں کے اندیشوں کے مطابق ہوتا۔ ڈاکٹر اتنے مایوس ہو چکے تھے کہ انہوں نے ان کی شراب بھی فوراً بند نہیں کی۔ ان کا جسمانی نظام شراب کا اس قدر عادی ہو چکا تھا کہ اس حالت میں بھی ڈاکٹروں نے ان کو دن میں دو تین بار شراب کے چند قطرے پی لینے کی اجازت دے دی تھی۔

مری سے میری واپسی کے بعد ایک روز ایک عجیب واقعہ پیش آیا جس سے ہر طرف کھلبلی سی مچ گئی۔ منٹو ماموں کے بستر کے قریب میز پر پانی ملی ہوئی شراب کا ایک گلاس رکھا تھا جو نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔ معلوم نہیں کسی نے غلطی سے اسے پھینک دیا تھا۔ یا ہسپتال کا کوئی ملازم موقع پا کر اسے پی گیا تھا۔ منٹو ماموں اس حال میں پڑے رہتے تھے کہ ان پر کسی کو بھول کر بھی شک نہیں ہو سکتا تھا۔ زیادہ تر وہ سکتے کے عالم میں پڑے رہتے اور جب وہ ہوش میں آتے تھے۔ تو ان میں اتنی بھی طاقت نہ ہوتی تھی کہ وہ خود اپنے ہاتھوں میں سگرٹ لے کر بھی پی سکیں۔ شام کو جب شراب کی مقررہ خوراک کا وقت آیا تو بڑی مشکل سے اشاروں اور سرگوشی کے ذریعہ انہوں یاد دہانی کی کوشش کی۔ یہ سننے کیلئے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں نوکر اپنا منہ ان کے قریب لے گیا تو شراب کی ہلکی سی بو معلوم ہوئی۔ انہوں نے بڑی مشکل سے اقبال کیا کہ وہ شراب پہلے ہی پی چکے ہیں ان سے پوچھا گیا کہ انہیں شراب دی کس نے تھی؟ اور یہ معلوم کر کے ہماری حیرت کی کوئی حد نہ رہی کہ ان کی انگلیوں میں اگرچہ اتنا بھی دم نہیں تھا کہ وہ چند سیکنڈ سے زیادہ ایک سگرٹ بھی پکڑ سکیں لیکن شراب کے لئے وہ اپنی کہنی کے سہارے اٹھ بیٹھے تھے اور گلاس کو جسے

ایک نرس نے لاپرواہی سے وہاں وقت سے پہلے ہی رکھ دیا تھا اٹھا کر ——— خالی کر گئے تھے اور بڑی احتیاط سے اسے پھر وہیں رکھ دیا تھا۔

یہ واقعہ ان کی حیرت انگیز قوتِ ارادی کا مظہر تھا لیکن اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ وہ اپنے مرض کے خلاف جدوجہد نہیں کر رہے تھے بلکہ اس کی مدد کر رہے تھے ڈاکٹر بالکل ناامید ہو چکے تھے۔ چند روز سے ان کی حالت اور بھی بگڑ چکی تھی کیونکہ ان کے چند ہم پیالہ دوستوں نے انہیں تھوڑی تھوڑی سے وہسکی پہنچا دی تھی۔ اس واقعہ کے بعد ڈاکٹروں نے انتہائی سختی برتنی شروع کر دی اور ان کی شراب بالکل ہی بند کر دی گئی۔

اس کا نتیجہ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ انہیں طرح طرح کے وہم ہونے لگے اور انہوں نے بہکی بہکی باتیں شروع کر دیں۔ ایک بار اس سے پہلے بھی ایسا ہی وہم ہو چکا تھا۔ وہ رات کو اپنے بستر سے اٹھ بیٹھتے اور خیالی شکلیں دیکھ کر ان سے باتیں شروع کر دیتے۔ یہ دیکھ کر ہمارے ہوش و حواس بھی جاتے رہے اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ ان کا دماغی توازن ہی درہم برہم ہو گیا۔ میں جب ان کے پاس پہنچا تو وہ اصرار کر رہے تھے کہ ان کی بیوی اس مچھلی کو تل دیں جو ان کے اینگلو پاکستانی ہمسائے نے انہیں بھیجی تھی۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے فلیٹ سے باہر لے کر چلے گئے۔ وہ اینگلو پاکستانی ہمسائے کو زور زور سے پکارنے لگے اور میں بڑی مشکل سے انہیں گھسیٹ کر گھر کے اندر لے گیا۔ چند منٹ تک تو میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں کیا کروں اور منہ ہی منہ میں ان کے سوالات کے جواب دیتا رہا۔ وہ باتیں تو بالکل عام آدمیوں کی طرح کر رہے تھے لیکن ان کی گفتگو کا موضوع غلط تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں ان کے ساتھ دوسرے ہمسائے کے گھر جاؤں جہاں ان کے وہم کے مطابق چند لڑکیاں گانا گا رہی تھیں۔ وہ ان کا پنجابی گانا سننا چاہتے تھے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ کیا گا رہی ہیں۔

میں نے ان کی ذہانت پر بھروسہ کر کے آخر کار ایک خطرہ مول لینے کا فیصلہ کیا۔ اور کچھ سوچے سمجھے بغیر ان سے کہہ دیا۔ یہ سب محض آپ کا وہم ہے ورنہ جس اینگلو پاکستانی دوست کے متعلق ان کا خیال ہے کہ اس نے ان کے لئے مچھلی بھیجی ہے اس کے تبادلے کو چھ مہینے سے زائد ہو چکے ہیں اور اب وہ لاہور میں نہیں ہے نہ آس پاس کوئی گا رہا ہے اور رات کے سناٹے میں صرف ہماری آواز آ رہی ہے۔ چند لمحوں تک توقف کے بعد انہوں نے کہا کہ پھر تمہارا کیا خیال ہے کہ اس کونے میں چڑیاں بھی نہیں پھڑپھڑا رہی ہیں۔ جب اس کا بھی جواب میں نے نفی میں دیا تو وہ لڑکیوں کے گانے کی آواز اب بھی آ رہی ہے۔ میں گانا لکھ لوں گا۔ وہ ایک منٹ تک کچھ لکھتے رہے۔ جب میں نے اصرار کیا کہ اس طرح کا کوئی گانا سنائی ہی نہیں دیتا تو انہوں نے اپنی بیوی اور دوسرے اعزا سے جو بیٹھک میں آ گئے تھے دریافت کیا کہ وہ بھی گانا سن رہے ہیں یا نہیں۔ ان کا جواب بھی نفی میں پانے کے بعد انہوں نے لکھنا تو چھوڑ دیا لیکن اس پر بدستور اصرار کرتے رہے کہ گانے کی آواز اسی طرح آ رہی ہے۔ رفتہ رفتہ وہ وہم اور حقیقت میں تمیز کرنے لگے اور بادلِ ناخواستہ اپنے بستر پر چلنے لگے لیکن واپسی سے پہلے پڑوسی کی بھیجی ہوئی عمدہ مچھلی پر شدت سے افسوس ظاہر کرتے رہے۔

مجھے اچھی طرح تو یاد نہیں کہ پہلی بار ان کے وہم میں مبتلا ہونے اور بہکی بہکی باتیں کرنے کا سبب کیا تھا؟ لیکن میرے خیال میں اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے کھانا اور پینا دونوں یک بیک بند کر دیا تھا۔ ہسپتال میں ان پر جو حملہ ہوا وہ پہلی بار سے زیادہ شدید تھا اور اس کا اثر ایک ہفتے تک رہا۔ اس دوران میں زیادہ انہیں یہی وہم رہتا تھا کہ وہ بمبئی میں ہیں جہاں انہوں نے اپنی زندگی کے سب سے زیادہ پُرمسرت دن گزارے تھے۔ میں ان سے بار بار کہتا کہ وہ بمبئی میں نہیں لاہور میں ہیں لیکن انہیں اس کا یقین ہی نہ آتا تھا۔ غالباً وہ اس پر یقین کرنا ہی نہیں چاہتے تھے کیونکہ تقسیم کے بعد لاہور میں ان کی زندگی بڑی تلخ ہو گئی تھی۔ ہسپتال میں ان کو بڑے بڑے عجیب وہم ہوتے تھے۔ ایک دن انہوں نے ایک اخبار سے مجھے ایک خیالی خبر پڑھ کر سنائی ——— "اطلاع ملی ہے کہ پولیس نے شراب کی ایک دکان پر کامیاب چھاپہ مار کر چھ خالی بوتلوں، تاش کے باون پتوں اور ایک رقاصہ کو گرفتار کر لیا ہے" ——— اس کا میں نے یہ مطلب نکالا کہ وہ خیال ہی خیال میں مسرت کش گروہ پیش کی مذمت کر رہے ہیں۔

اپنی علالت کے انتہائی خطرناک دور سے وہ بڑی جرأت اور تحمل کے ساتھ گزر آئے تھے۔ لیکن جیسے جیسے ان کی حالت روبہ اصلاح ہوتی گئی ان میں تنک مزاجی اور چڑچڑاپن آ گیا۔ وہ ہر ایسی بات کرنا چاہتے تھے جو ان کے لئے ممنوع تھی۔ انہیں ہر ایسی چیز کھانے یا پینے پر اصرار تھا جو انہیں چند گھنٹوں کے اندر موت کی آغوش میں سلا سکتی تھی۔ وہ اپنے پلنگ سے اٹھ کر چلنا چاہتے تھے۔ کیونکہ ڈاکٹر کہہ چکا تھا کہ تقریباً ایک مہینے تک انہیں چلنے پھرنے کا تصور بھی نہیں کرنا چاہیئے لیکن۔ چلنے پھرنے

کی خواہش اتنی زبردست تھی کہ وہ اسے ضبط نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اپنے کارناموں سے وارڈ میں بجلی کی سی لہر دوڑا دینا چاہتے تھے وہ ثابت کر دینا چاہتے تھے کہ اس حالت میں بھی وہ بخوبی چل پھر سکتے ہیں۔ ایک بار وہ سب کی نظریں بچا کر اٹھ کھڑے ہوئے لیکن اس حالت میں چلنا بالکل ایسا تھا جیسے وہ مکھن کے بنے ہوئے پیروں سے دہکتے ہوئے سرخ انگاروں پر چلنے کی کوشش کر رہے ہوں اور تھوڑا سا بھی زمین پر پیر رکھتے ہی وہ پگھل کر بہہ گئے اور ان کا ہڈیوں کا ڈھانچہ فرش پر گر گیا لیکن خوش قسمتی سے زخم بالکل معمولی سے آئے۔

ان کی ضد کا یہ صرف ایک نتیجہ تھا ان کی شب و روز نگرانی کی ضرورت تھی کیونکہ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کیا کر گزریں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی آنکھوں اور ان کے دماغ کو دہکتے ہوئے انگاروں کی جستجو تھی تاکہ وہ ان پر پا برہنہ چل سکیں۔ ان کا چڑچڑاپن بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا جیسے وہ ڈاکٹروں اور اپنے اعزا سے اپنے بدصحت ہونے کا انتقام لے رہے ہوں ان کا طرز عمل بسا اوقات ان سے مجھے بھی برداشتہ خاطر کر دیتا تھا اور یہ دیکھ کر ان کے درجنوں دوستوں اور مداحوں کو بھی سخت حیرت ہوتی تھی جو ان کی عیادت کے لئے آیا کرتے تھے۔ بعض لوگ چاہتے تھے کہ انہیں کسی اور بستر پر منتقل کر دیا جائے کیونکہ اسی پر چند سال قبل اختر شیرانی کی آنکھیں بند ہوئی تھیں۔ کچھ لوگ دوسرے سے وارڈ ہی بدل دینے کی رائے دیتے تھے کیونکہ اسی وارڈ میں منٹو ماموں کے دیرینہ دوست مولانا باری نے دم توڑا تھا۔ میری دل برداشتگی کا سب سے بڑا سبب میرا یہ اندیشہ تھا کہ انہوں نے شراب نوشی پھر شروع کر دی تو ان کو موت کے منہ سے نکالنے کی یہ تمام جدوجہد اکارت جائے گی۔ اسکی مجھے کوئی خاص امید تو نہ تھی لیکن میں بالکل مایوس بھی نہیں ہوا تھا اور صرف چند مہینوں کے اندر ان کے نام نہاد دوستوں نے ان کو قائل کر دیا کہ وہ اتنے مہلک مرض میں مبتلا ہی نہیں ہوئے تھے یا ان کی حالت اتنی خراب ہو گئی تھی کہ ان کے بچنے کی کوئی امید باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اور منٹو ماموں دوبارہ شراب پینے لگے۔

اپنی شفایابی کے بعد انہوں نے پہلی بار شراب پی تو مجھے اس کا فوراً پتہ چل گیا حالانکہ وہ شد و مد سے انکار کرتے رہے یہ بھی ان کی ایک پرانی عادت ہے۔ وہ وہسکی یا جن کا ایک جام بھی پی لیں تو ان کا چہرہ اس کی غمازی کر دیتا ہے۔ لیکن وہ اس خود فریبی میں مبتلا ہیں کہ وہ شراب پی کر کبھی نہیں بہکتے۔ ان کی اس جسمانی معذوری کا ان کے سامنے مبہم سا بھی اشارہ کر دیا جائے تو ان کے پندار کو ٹھیس لگ جاتی ہے۔ کاش وہ محسوس کر سکتے کہ شراب ان کے لئے کتنی مضر ثابت ہو رہی ہے۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہونگا کہ اُن کی صحت کے مقابلے میں ان کی شخصیت کو اس نے کہیں زیادہ برباد کیا ہے۔

سات آٹھ برس بھی نہیں ہوئے جب میں ان کی خانگی زندگی دیکھ کر سوچا کرتا تھا کہ اتنے سکھ اور چین سے شاید ہی کسی کے دن بسر ہوتے ہوں۔ ان کے ساتھ کھانے کی میز پر بیٹھ کر یہ احساس بھی نہیں ہوتا تھا کہ میز پر کیا ہے کیا نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی سب سے بڑی کشش ان کی بذلہ سنجی اور ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے والے اعزا احباب کے قہقہوں میں ہوتی تھی۔ بمبئی میں ان کے پاس جو فلیٹ تھا وہ نہ تو بہت بڑا تھا نہ بہت چھوٹا۔ لیکن اس میں مہمانوں کا ہمیشہ ہجوم رہتا۔ کیونکہ وہ ان کی دل کھول کر خاطر مدارات کرتے تھے مسہریوں کی تعداد سے اگر مہمان زیادہ ہو جاتے تو منٹو ماموں فرش پر اپنا بستر سب سے پہلے بچھا دیتے۔ کبھی کبھی تو مہمانوں کی اتنی کثرت ہوتی کہ فرش پر بھی جگہ باقی نہ رہتی اور منٹو ماموں رات لکڑی کے ان تختوں پر گزار دیتے جو بیت الخلا کے راستے میں چھت کے نیچے لگے ہوئے تھے۔ منٹو ماموں اپنے اس ایثار کا کسی سے ذکر تک نہ کرتے نہ ان کی صابر بیوی کی زبان پر کبھی حرف شکایت آتا۔ یہ تمام انتظام اس خوش اسلوبی سے کیا جاتا کہ ہر شخص اسے بے چون و چرا قبول کر لیتا۔

ان کی نئی شخصیت کو سب سے پہلے میں نے کھانے کی میز پر بے نقاب دیکھا۔ وہ شام کو عموماً شراب پیتے تھے اور رات کے کھانے کے وقت تک بہکنے لگتے تھے، اور دوسروں کے لئے مکلف ہونے لگتے بلکہ آمادۂ پیکار تک ہو جاتے۔ شاید ہی کوئی ایسی شام گزرتی کہ ہم میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر نوک جھوک نہ ہوتی اور ہم ایک دوسرے سے خفا نہ ہو جاتے۔ ان سے میرا یہ مطالبہ شاید واجب بھی نہیں تھا کہ وہ مخمور ہونے کے بعد بھی آپے سے باہر نہ ہوں۔ بمبئی جاکر شام کا تصور ہی میرے لئے مہیب ہو جاتا تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ میں یہ برداشت نہیں کر سکوں گا کہ شراب سے مغلوب ہو جانے والی شخصیت منٹو ماموں کا بہروپ بھرے۔ اس کا صرف یہی علاج تھا کہ میں ان سے شام کے وقت ملاقات سے گریز کروں اور میں کرتا بھی یہی تھا۔

پاکستان بننے کے بعد ہم لاہور میں قریب قریب ایک ہی مکان میں رہنے لگے وہ پہلی منزل پر رہتے ہیں اور میں دوسری منزل پر۔ ہمارے فلیٹ ایک راستے

کے ذریعے ایک دوسرے سے ملے ہوئے بھی ہیں۔ پاکستان آکر ان کے لئے شراب سے گریز بہت مشکل ہو گیا۔ شراب کی ایک دکان کے قریب کی وجہ سے ان کے لئے یہ بھی ممکن ہو گیا کہ وہ دن بھر شراب پیتے رہیں۔ دکان تک پہنچنے کے لئے انہوں نے ایک خاص راستہ نکالا تھا اور ان کا خیال تھا کہ کسی اور کو اس کا ہرگز علم نہیں وہ دن میں کئی بار غسل خانے میں جاتے، دروازہ بند کر کے زور سے چٹخنی لگا لیتے۔ نل کھول دیتے اور مکان کا عقبی دروازہ چپکے سے کھول کر گلی ہی گلی شراب کی دکان میں پہنچ جاتے۔ ایک بار غسل خانے سے واپس آ کر انہوں نے جنرل رومیل کی حکمت عملی اور فوج آرائی کا ذکر چھیڑ دیا۔ ان کا انداز بیان اتنا عمدہ تھا کہ میری آنکھوں کے سامنے ایک لمحے کے لئے جرمن کمانڈر کی سرگرمیوں کا نقشہ پھر گیا جیسے العالمین کے معرکے سے پہلے وہ ٹینک پر بیٹھا ہوا خفیہ طور پر دشمن کے اڈوں کا سراغ لگا رہا ہو ——۔

پنجاب میں امتناع شراب نوشی کے بعد شراب کی وہ دکان تو بند ہو گئی لیکن منٹو ماموں کی حیات میخواری میں غسل خانے کو وہی اہمیت حاصل رہی۔ وہ اپنی بوتل عموماً وہیں چھپا کر رکھتے تھے۔ اور بیس پچیس منٹ کے بعد وہاں جا کر ایک گھونٹ چڑھا لیتے تھے۔ ایک بار میں نے کموڈ کے پیچھے چھپی ہوئی بوتل دیکھ لی اسے دیکھ کر مجھے ان کی حالت پر بڑا افسوس ہوا کیونکہ ہوش اور فرزانگی کے عالم میں منٹو ماموں اصول صحت سے زیادہ کسی چیز کو اہم نہیں سمجھتے ان کے دودھ کی طرح سفید اور صاف شفاف کرتے پاجامے نے ضرب المثل کی حیثیت حاصل کر لی ہے ان کی تحریر بڑی پاکیزہ اور صاف ستھری ہوتی ہے۔ ٹائپ رائٹر کو اچھی طرح جھاڑے پونچھے بغیر اس پر ایک حرف بھی ٹائپ نہیں کرنے دو سکتے اور دھبے دار کاغذ پر لکھنا کبھی گوارا نہیں کرتے۔ کسی ایسی پلیٹ یا گلاس کو چھونا تک پسند نہیں کرتے جو بالکل صاف اور بے داغ نہ ہو بلکہ ضرورت ہو تو وہ اسے خود ہی دھو لیتے ہیں۔ لیکن وہی منٹو ماموں ایسی بوتل منہ سے لگا کر شراب پی لیتے تھے جو چپکتے ہوئے فلش کموڈ کے پیچھے رکھی ہوتی تھی۔ ایسا صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب مجبوری حد سے زیادہ ہو۔

ان کا جب یہ حال ہو گیا تو ہم نے ان میں بھی ملنا چھوڑ دیا اور کبھی کبھی تو مفتوں ہم ایک دوسرے کی صورت تک نہ دیکھتے۔ مجھے ان کی تمام سرگرمیوں کا پوری طرح علم تھا اور ان کی نوعیت ایسی تھی کہ انہیں سن کر ہر شخص کا خون سینے لگتا۔ وہ انتہائی غیر ذمہ دار اور غیر معقول ہو گئے تھے انہوں رات کو بھی بالکل نیند نہ آتی اور ہر آدھ گھنٹے بعد چسکی لگانی پڑتی وہ بے اندازہ شراب پیتے تھے لیکن اس کا خیال رکھتے تھے کہ بوتل ایسے وقت نہ ختم ہو جب نئی بوتل نہ مل سکے لیکن وہ کوئی دوا تو تھی نہیں کہ اس پر خوراک کے نشان لگا لیتے اس لئے کبھی کبھی ان کا اندازہ غلط ہو جاتا اور انہیں آدھی رات کو معلوم ہوتا کہ بوتل خالی ہو چکی ہے اس پر گھر میں ایک قیامت صغریٰ بپا ہو جاتی۔ وہ اتنا شور مچاتے کہ ایک ایک کر کے ہر شخص جاگ اٹھتا وہ اپنی بیوی پر برسنے لگتے اور ان پر الزام لگاتے کہ انہوں نے بوتل تلاش کر کے شراب نالی میں پھینک دی ہے تاکہ وہ جلد ختم ہو جائے

کبھی رات گئے ان کے سگریٹ ختم ہو جاتے اور ہر دس منٹ کے بعد ملازم کو پکارتے اور اسے حکم دیتے کہ بازار جا کر سگریٹ لے آئے۔ جب وہ آ کر یہ جواب دیتا کہ سگریٹ کی تمام دکانیں بند ہو گئی ہیں تب بھی وہ خاموش نہ ہوتے اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد اسے جا کر سگریٹ لانے کے لئے کہتے رہتے۔ اس کا سلسلہ یوں ہی دیر تک جاری رہتا یہاں تک کہ ناتوانی کے باعث ان کی آنکھ جھپک جاتی یا ان پر سکتے کا سا عالم طاری ہو جاتا۔

رات کے سناٹے میں ان کا بے ربط اور بے ہنگم شور و غل بڑا ہولناک اور مہیب معلوم ہوتا تھا پہلے تو دونوں گھروں کے تمام لوگ ان کے فلیٹ میں جمع ہو جاتے اور انہیں سمجھا بجھا کر ان سے سو جانے کو کہتے۔ لیکن جب اس کا کوئی فائدہ نظر نہ آیا تو ہر شخص نے تھک ہار کر ان کے پاس جانا چھوڑ دیا۔ ان کی رات گئے کی چیخ پکار اسی طرح جاری رہی۔ دونوں گھروں کے تمام لوگ بدستور بیدار ہو جاتے لیکن اب ایک بھی آدمی اپنے بستر سے نہ اٹھتا۔ ہم لیٹے ہی لیٹے سب کچھ سنتے رہتے اور ایسا معلوم ہوتا کہ ہمارے دلوں کو کوئی اپنے پیروں سے روند رہا ہے۔ ہمارے دلوں میں رہ رہ کر صرف ایک خیال آتا تھا یہ اذیت آخر کب ختم ہو گی؟ دوسروں کے متعلق تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن میرے لئے یہ اذیت آج تک ختم نہیں ہوئی جب وہ ہسپتال میں تھے ان دنوں بھی رات کو کہیں بھی کوئی شور ہوتا تو میری آنکھ کھل جاتی اور میرے دل میں ایک ہیجان برپا ہو جاتا تھا۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ ہر ادیب کے اہل و عیال کو اس کی ادبی عظمت کے لئے کیا ایسی ہی قیمت ادا کرنی ہوتی ہے۔ منٹو ماموں کو اپنی ان تمام خامیوں کا خود

بھی علم ہے ۔ ایک بار اس کا انہوں نے ایک عذر بھی پیش کیا اور ممکن ہے ان کی صفائی میں کچھ وزن بھی ہو کہیں ان کا عذر یہ تھا کہ کہانیاں لکھنے کے لئے انہیں متعدد تجربوں سے گزرنا ہوتا ہے خواہ وہ تجربے کتنے بھی ناخوشگوار اور اذیت رساں ہوں ۔ ممکن ہے ایک حد تک ان کی یہ بات درست بھی ہو، لیکن نصف درجن سے زیادہ ایسی کہانیاں پیش نہیں کر سکتے جو انہوں نے نشے میں لکھی ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ صرف ہوش میں رہ کر لکھ سکتے ہیں ۔ میری نظر میں ان کی بعض ایسی کہانیاں ہیں جو انہوں نے اپنے بے خودی کے دور میں لکھی ہیں لیکن ان کا معیار اتنا پست ہے کہ وہ انہیں اپنی کہنے کے لئے بھی تیار نہیں ہیں ۔ آخر وہ پھر کیوں شراب پیتے ہیں ۔

یہ سوال اگر خود انہیں سے کر دیا جائے تو وہ آپ سے اس پر بڑے تپاک اور خلوص کے ساتھ تبادلہ خیال کریں گے ۔ ممکن ہے اس لعنت سے چھٹکارا حاصل کرنے کی جد و جہد میں آپ سے مدد کی درخواست کریں، اپنی تحلیل نفسی کے لئے اپنے آپ کو بڑی خوشی سے پیش کر دیں گے، ان کے جن دوستوں کو ان کی شراب نوشی کے اسباب معلوم کرنے اور اس کا علاج تجویز کرنے کا شوق ہوتا ہے انہیں وہ اپنے متعلق تمام معلومات فراہم کر دیں گے وہ ان کے اخذ کئے ہوئے نتائج سے مکمل اتفاق رائے کر کے ان کے دل میں جھوٹی امیدیں پیدا کر دیں گے ۔ ان کی حوصلہ افزائی کریں گے اور ان میں یہ غلط فہمی پیدا کر دیں گے کہ ان سے پہلے کسی نے ان کے معاملہ پر اس باقاعدگی اور ہمدردی کے ساتھ غور ہی نہیں کیا تھا لیکن ایک طرف وہ اپنی تحلیل نفسی کے لئے اپنے دوست کی حوصلہ افزائی بھی کرتے رہیں گے اور ذرا ذرا دیر کے بعد "ابھی حاضر ہوا" کہہ کر غسل خانہ میں چھپی ہوئی بوتل سے چند گھونٹ بھی پیتے رہیں گے ۔ کبھی نہ ٹوٹنے والی توبہ کے ہر وعدے کے ساتھ ان کے پائے استقلال کی لغزش بھی بڑھتی جائے گی ۔ اور اپنے دوست کے جانے کے بعد اس کی باتوں کے بعد وہ اسی طرح دل ہی دل میں خوش ہوتے ہیں جس طرح امرتسر میں تاج محل کے متعلق افواہ اڑانے کے بعد مسرور ہوتے تھے

جہاں تک مجھے یاد ہے منٹو ماموں نے اپنی زندگی میں صرف ایک بار شراب ترک کرنے کی سنجیدگی سے کوشش کی تھی یہ اس زمانے کی بات ہے جب ان کی حالت روز بروز ابتر ہوتی جا رہی تھی ان کی بیوی نے ان سے میری اس تجویز کا ذکر کیا کہ انہیں دماغی امراض کے ہسپتال کے شرابیوں کے وارڈ میں داخل کر کے ان کا علاج کرایا جائے ۔ دوسرے روز یہ دیکھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ میں ان کے کمرے کے سامنے سے گزرا تو انہوں نے میرا نام لے کر مجھے پکارا میں اندر گیا تو وہ بستر پر لیٹے ہوئے تھے ۔ اور انہوں نے اپنا چہرہ دیوار کی طرف کر رکھا تھا تاکہ میں یہ نہ دیکھ سکوں کہ ان کا کیا حال ہے ۔ انہوں نے مجھے کہا کہ میں ہسپتال جانے کے لئے تیار ہوں ۔ مہربانی کر کے اس کا انتظام کر دو ۔

میں نے دوسرے ہی روز ڈاکٹر سے مشورہ کا وقت مقرر کرا لیا لیکن ہسپتال جانے کا وقت آیا تو وہ گھر سے غائب تھے اور کئی گھنٹوں تک واپس نہ آئے ۔ لیکن ان کی عدم موجودگی کا مطلب اس کے بجائے کچھ اور تھا کہ وہ عین وقت پر بھاگ کھڑے ہوئے تھے ۔ انھوں نے سنا تھا کہ ہسپتال کے سپرنٹنڈنٹ کی فیس بہت زیادہ ہے اور اس وقت وہ اسی کا انتظام کرنے گئے تھے ۔ مجھے ان کی خوشحالی کا وہ زمانہ یاد آ گیا جب بمبئی میں ان کا دلچسپ مشغلہ ہی یہ تھا کہ وہ اس ڈاکٹر سے مشورہ لیں جس کی فیس سب سے زیادہ یعنی ۶۴ روپے تھی ۔ ایک بار وہ ایک ایسے ہی ڈاکٹر کے پاس اپنے ایک نوکر کو لے کر پہنچ گئے ۔ ڈاکٹر کے لئے یہ ایک بالکل نیا تجربہ تھا اس کے مریض عموماً لکھ پتی ہوتے تھے جو اپنے غریب اعزا کو بھی اس کے پاس نہیں بھیجتے تھے ۔ ڈاکٹر نے منٹو ماموں کے نوکر کو دیکھنے کی فیس آدھی یعنی صرف ۳۲ روپے لی ۔ لیکن اس بار انہیں ۳۲ روپے کی حیثیت اتنی بڑی رقم کی ہو گئی تھی کہ منٹو کے پاس خود اپنے علاج کے لئے موجود نہ تھی ۔ ان دنوں ان کے دل میں اتنا لحاظ باقی تھا کہ کس سے انہیں قرض لینا چاہیے کس سے نہیں ۔ بالآخر وہ کہیں سے روپے لے ہی آئے اور انہیں ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا ۔ ہسپتال میں ان کے ابتدائی چند روز بڑی مصیبت سے گزرے اسکے باوجود وہ چھ ہفتے تک وہیں رہے ۔ انہیں مکمل صحت ہو چکی تھی اور آٹھ مہینے تک انھوں نے شراب کو چھوا بھی نہیں اس دوران میں تقریب تقریب ہر مہینے وہ ایک کتاب مکمل کر لیتے تھے ۔ کبھی کبھی تو وہ ایک ہی روز میں ایک کہانی لکھ لیتے ۔ لیکن اسکے بعد پھر وہی سلسلہ شروع ہو گیا اور اس بار رد عمل اتنا شدید تھا کہ وہ ہر وقت مدہوش رہنے لگے ان کا لکھنا پڑھنا پھر بند ہو گیا اور آمدنی کے تمام راستے مسدود ہو گئے ۔

منٹو ماموں نے اب ایک ایسا راستہ اختیار کر لیا جس پر ان کے خاندان کو ان کی شراب نوشی سے بھی زیادہ دکھ پہنچا ۔ انھوں نے اندھا دھند قرض لینا شروع کر دیا ۔ انہیں اس کی پرواہ نہیں تھی کہ وہ کس سے اور کتنا قرض مانگ رہے ہیں انھوں نے عزیزوں، دوستوں، ہمسایوں بلکہ اجنبیوں تک کو نہیں چھوڑا ۔ ان کے

جو مداح ان سے اظہارِ عقیدت کے لئے آتے تھے ان سے بھی قرض لینے سے انھوں نے گریز نہیں کیا۔ اپریل ۵۲ء سے اگست ۵۲ء تک شاید ہی کوئی ایسا وقت گزرا ہو جب وہ نشہ میں نہ رہے ہوں اور اسی کے بعد شراب نوشی کے مہلک عارضہ کے علاج کے لئے ہسپتال میں داخل کرایا گیا تھا۔ ایک بار ہم نے انھیں ذہنی و دماغی امراض کے ہسپتال میں بھی داخل کرا دیا لیکن وہ کسی طرح علاج کرانے پر آمادہ نہیں ہوئے اور انہیں مجبوراً گھر واپس لانا پڑا کیونکہ ہسپتال کے قاعدے کے مطابق وہاں کسی صحیح الدماغ آدمی کا علاج اس کی مرضی کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے بعد منٹو ماموں اپنے خاندان والوں سے بہت کبیدہ خاطر ہو گئے لیکن یہ ایسا زمانہ تھا کہ انھیں خود بھی ہوش نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔

وہ دن مجھے ابھی تک خواب کی طرح آج تک بخوبی یاد ہیں۔ ان کی سب سے بڑی لڑکی سخت بیمار ہوئی اور یہ دیکھ کر میرے دل پر دھکا سا لگا کہ ان پر اس کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ ان کی شراب نوشی اپنے انتہائی عروج پر تھی۔ انھیں دعویٰ ہے کہ ان کو اپنے بچوں سے بے انتہا محبت ہے۔ اور اس کا وہ طرح طرح سے ثبوت بھی دیتے رہتے ہیں مثلاً یومِ پاکستان کے موقع پر ہمیشہ انتہائی سرگرمی کا ثبوت دیتے ہیں۔ دوسرے دانشوروں کی طرح وہ اپنے حب وطن کو جھنڈا بنا کر اسے اپنے گھر پر لہراتے تو نہیں لیکن وہ چاہتے ہیں کہ ان کے بچے ضرور ایسا کریں۔ ہر اگست کو وہ ہمیشہ بڑے جوش میں آ جاتے ہیں۔ اور بچوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا۔ ان کے ساتھ جھنڈیاں اور آرائش کا سامان خریدتے ہیں۔ اور اپنے فلیٹ کو چھوٹی چھوٹی جھنڈیوں سے سجا کر دلھن بنا دیتے ہیں۔ پچھلی بار ان کی ایک لڑکی بیمار ہوئی تو اس کی تیمارداری اور خبرگیری خود انہی نے کی اور اس سے اپنی ایک کتاب معنون کی۔

ان کی سب سے بڑی لڑکی کو ٹائیفائیڈ ہو گیا۔ تو انھیں اس کا مبہم سا احساس ضرور رہا ہوگا کہ گھر میں روپیہ کی کمی ہے اور علاج کافی مہنگا ہوگا۔ انھوں نے اس کے لئے کسی سے قرض لیا لیکن وہ انتہائی ضروری دوا خریدنے کے بجائے وسکی کی بوتل لے کر گھر پہنچے۔ ان کی زندگی میں شراب کی یہ سب بڑی فتح تھی۔ وہ اپنے اس فعل پر نادم ضرور ہوئے ہوں گے اور دل ہی دل میں اپنے اوپر لعنت ملامت بھی کرتے ہوں گے کیونکہ انھوں نے بچی سے ملیا رجعت کرنے کی تلافی کی کوشش بھی کی۔ اپنی بیوی کے احتجاج کے باوجود وہ اس کے بستر پر گرتے پڑتے کسی نہ کسی طرح بیٹھے رہے۔ ان کے لمبے لمبے بال ان کے چہرے پر بکھرے ہوئے تھے۔ بچی کو گود میں لے کر انھوں نے اسے چمکارنے اور پیار کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ ان کی بیوی نے انھیں گھسیٹ کر بستر سے ہٹا دیا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے پدری حقوق کو سنبھالنے کا تہیہ کر چکے تھے خواہ اس کے لئے تشدد سے ہی کام لینا پڑے لیکن قبل اس کے کہ نوبت یہاں تک آتی میری بیوی جو اس وقت وہیں موجود تھیں غصہ میں ان پر برس پڑیں۔ انھیں زندگی میں غالباً پہلی بار غصہ آیا تھا اور اس سے منٹو ماموں کو سخت دھکا لگا۔ وہ فوراً اپنے ہوش میں آ گئے اور چپ چاپ سر جھکائے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

دوسرے روز وہ سو کر اٹھے تو انتہائی نحیف و نزار نظر آ رہے تھے۔ کیونکہ انھوں نے شراب ترک کر دی تھی۔ شادمانی کا دور منٹو کے گھر میں لوٹ آیا تھا ہر شخص خوشی سے پھولا نہیں سماتا تھا کیونکہ سب کو امید تھی کہ ان کی توبہ اب کبھی نہیں ٹوٹے گی۔ ان کے سرہانے کی بجائے دواؤں کی گولیاں اور ٹانک کی شیشیاں دوبارہ نظر آنے لگیں۔ منٹو کی زندگی میں پھر ایک نیا دور شروع ہوا گھر کی ٹوٹی پھوٹی چیزوں کی مرمت شروع ہو گئی۔ ٹوٹی ہوئی کرسیاں بنوائی جانے لگیں۔ وہ اپنے دلچسپ مشغلے یعنی پرانی بوتلوں، پرانے اخباروں کی فروخت میں مصروف ہو گئے کبھی وہ بچوں کے لئے جھولا بناتے نظر آتے کبھی اگی چڑیوں کے پنجرے ٹھیک کرنے میں مصروف ہوتے۔ مکان کے مختلف حصوں اور گھروں کی چیزوں کی مرمت کے لئے معمار اور بڑھئی تلاش کرتے پھرتے، سگریٹ کے خالی ڈبوں سے بچوں کے لئے صوفا سیٹ بنانے لگے اور تمام گھریلو اور خاندانی معاملات میں گہری دلچسپی لینے لگے۔

گھر میں کسی مسئلہ پر عام انسانوں یا مخلوط صحبتوں کے جواز پر بھی بحث چھڑ جاتی ہے تو منٹو ماموں اپنے آپ کو ہمیشہ قدامت پسند بلکہ رجعت پرست ظاہر کرتے ہیں۔ ان امور پر وہ اظہارِ خیال کرتے ہیں تو مجھے ان کا ایک کردار یاد آ جاتا ہے جو دس سال سے ان کے ذہن میں ہے لیکن ابھی تک ان کی کسی کہانی کا ہیرو نہیں بن سکا۔ یہ کردار ایک شخص ہے جس سے شہر کا ہر شخص کانپتا ہے جس کا قتل، ڈاکے، اغوا اور لوٹ مار کی ہر واردات میں ہاتھ ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ خود اپنے محلے پر پہنچتا ہے تو اس کی تمام اکڑ ختم ہو جاتی ہے۔ وہ بیٹا ہے۔ تو اس کی نظریں ہمیشہ زمین پر ہوتی ہیں اور اس سے چمٹ جاتے ہیں

اور جب وہ اسے اپنے کھیل میں شریک ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ تو ان کی خواہش کبھی مسترد نہیں کرتا۔ محلہ کے بڑے بوڑھے کسی بات کے لئے اشارہ بھی کر دیں تو وہ پوری ہو جاتی ہے، وہ عورتوں کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا بلکہ اس کے کان میں اگر بھنک بھی پڑ جائے کہ کوئی شخص محلے کی کسی لڑکی کو دیکھ کر مسکرا بھی دیا ہے تو اس کی خیر نہیں ہوتی۔

منٹو کے گھر میں مسرت و شادمانی کا دور ہمیشہ عارضی ہوتا ہے ان کے جسم و جان میں توانائی جیسے ہی عود کر آتی ہے اور ان کے خاندان والوں کے دل میں پر امید پیدا ہونے لگتی ہے کہ یہ توانائی تو برکو دوام بخشے پر صرف کی جائے تو وہ اپنے آپ کو دوبارہ غرق مے ناب کر دیتے ہیں۔

ان کی توبہ کے ٹوٹنے کے ذمہ دار عموماً ان کے ہم نشین ہوتے ہیں۔ میں نے یہاں دوست کا لفظ عمداً استعمال نہیں کیا کیونکہ ان کے دوستوں اور انھیں دوستی کا فریب دینے والوں میں بڑا فرق ہے۔ ان کے دوست ان سے ہمیشہ دور ہی دور رہتے ہیں۔ کیونکہ شراب نوشی کو وہ پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے اور ان کے دوسرے معاملات میں بھی آزادی سے اظہار خیال ہیں اور بے کم و کاست اپنے دل کی بات کہہ دیتے ہیں۔ لیکن منٹو ایسے لوگوں کی رفاقت کو ترجیح دیتے ہیں جو وقتاً فوقتاً انھیں یقین دلاتے رہیں کہ وہ بہت بڑے ادیب ہیں اور ان کی شخصیت اتنی عظیم ہے کہ وہ جگر کے مہلک امراض سے بھی متاثر نہیں ہو سکے۔ ان نام نہاد دوستوں نے انھیں کافی خراب کیا ہے۔ وہ ہر وقت منٹو کے گرد جمع رہتے ہیں۔ ان کا جی چاہتا ہے تو وہ آسانی سے نہیں دھکار دیتے یا انھیں زمین کر دیتے۔ اگر وہ ان سے کرسی پر کھڑے ہو جانے کو بھی کہیں تو وہ اس کے لئے کسی پس و پیش کے بغیر تیار ہو جاتے ہیں۔

پاکستان کی کرکٹ ٹیم ہندوستان کا دورہ کر کے واپس آئی تو بعض کھلاڑی جن میں وقار حسن اور محمود حسین بھی شامل تھے، مجھے ملنے کے لئے آئے۔ منٹو ماموں کو نہ جانے کیسے اس کی اطلاع مل گئی۔ اس زمانے میں انھوں نے اپنا حال ایسا بنا رکھا تھا کہ وہ میرے فلیٹ میں نہیں آتے تھے لیکن کرکٹ کے کھلاڑیوں سے ملنے کے لئے چلے آئے تعارف کے بعد وہ وہیں بیٹھ گئے اور کرکٹ کے کھلاڑی اپنے دورے کے تاثرات بیان کرنے لگے لیکن منٹو ماموں کب تک خاموش بیٹھتے۔ وہ آگے کی ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے اور انھیں کے برابر کرکٹ کے کھلاڑیوں کی کرسیاں تھیں۔ وہ مشکل سے پانچ منٹ بیٹھے ہوں گے کہ اپنی کرسی سے اٹھ کر کمرے کے وسط میں قالین پر بیٹھ گئے۔ انھوں نے محمود حسین کو بات کرنے کرتے روک دیا۔ ان کا جملہ بھی پورا نہ ہونے پایا تھا کہ انھوں نے کہنا شروع کر دیا۔ مجھے معلوم ہے تمام تیز باؤلر فراڈ ہوتے ہیں۔ اچھا بتاؤ تم گیند کو کس طرح ٹپ کرتے ہو۔ وقار حسن کو بھی منٹو ماموں سے بتانا پڑا کہ وہ اپنے "فراڈ اسٹروک" کس طرح لگاتے ہیں۔ اس کے بعد منٹو ماموں نے کسی اور کو نہیں بولنے دیا اور بہت سے لوگ جو ہندوستان کے دورے کا حال خود پاکستان کے کھلاڑیوں سے سننا چاہتے تھے پیچ و تاب کھا کر رہ گئے۔

ہر محفل میں تمام نظروں اور ہر شخص کی توجہ کا مرکز بننے کی خواہش ان کے دل میں غالباً اس سے پیدا ہوئی ہے کہ گذشتہ چند سال میں ان کے گھر، ان کے اعزا اور ان کے دوستوں میں ان کا وقار بہت گر گیا ہے اس سے انھیں شدید صدمہ پہنچا ہے اس کا اپنی زبان سے اعتراف تو وہ شاید کبھی نہ کریں۔ وہ محبت و اخلاص کے بھوکے ہیں اور جب وہ اس سے محروم رہتے ہیں تو دوسروں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے کی کوشش وہ خود ہی کرنے لگتے ہیں۔ ساسے حقیقی جذبات کا نعم البدل تو نہیں کہا جا سکتا لیکن مکمل نظر اندازی سے پھر بھی بہتر ہے۔ منٹو نے اپنے اعزا اور سچے دوستوں سے اپنی زندگی کے پر مسرت دور میں بے لوث اور بے دریغ محبت کی تھی۔ ان کے اقربا اور احباب کے دل آج بھی ان کے لئے اسی محبت و اخلاص سے معمور ہیں لیکن وہ صرف اتنا چاہتے ہیں کہ اس کا اظہار حسن شخص سے کریں وہ بہروپئے کی بجائے ایک حقیقی انسان ہو۔ لیکن منٹو ماموں کا ان سے یہ مطالبہ معلوم ہوتا ہے کہ سعادت حسن سے محبت کرو لیکن منٹو کو بھول جاؤ اور نہ درگزر کرو۔ یہ مطالبہ بالکل ہی ناقابل قبول نہیں ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ سعادت حسن کی تکمیل ہمیشہ منٹو کے ہاتھوں ہی ہوتی ہے۔

منٹو ماموں کو اس حقیقت کا خود بھی علم ہے کہ ان کی خود ساختہ شخصیت کی وہ شاعر ہیں اس کا علم مجھے جن حالات میں ہوا وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ بمبئی میں ایک بار اشوک کمار اور ساوک واچا نے مجھے دعوت دی کہ میں ایک کہانی کے متعلق اپنی رائے ظاہر کروں۔ کہانی بڑی مشہور اور عمدہ تھی لیکن ہیرو ہونے کے باوجود اشوک کمار کو جو کردار دیا گیا تھا اس سے زیادہ آب و تاب ایک شرابی اور ظالم انسان کی شخصیت میں تھی۔ میں نے بار بار زور دیا کہ دوسرے کردار کی اہمیت کم کر دی جائے لیکن منٹو ماموں کسی کام سے اٹھ کر ذرا دیر کے لئے باہر گئے تو اشوک کمار نے مجھ سے سرگوشی کے انداز میں کہا تم یہ کیا کر رہے ہو تمہیں معلوم نہیں وہ کردار منٹو نے خود اپنے لئے لکھا ہے؟ لیکن اس کے باوجود میں اپنی بات پر اڑا رہا میں اسی صفائی اور درشتی سے گفتگو کر رہا تھا جو اس خلک کے یہاں تھی ہے اس سے لکھتے وقت منٹو ماموں نے اس کا ایک بہم

حرف پڑھا ہے لیکن کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لائے۔ اس تبادلۂ خیال کے دوران میں بھی منٹو ماموں نے تسلیم کر لیا کہ پردۂ سیمیں پر وہ خود اس کردار کو پیش کریں گے کیونکہ اس آئینے میں انھوں نے خود اپنی شکل دیکھی تھی۔ کہانی میں اس کردار کا انجام یہ دکھایا گیا تھا کہ اسے خود اسی کی ماں نے ہلاک کر دیا۔

اس کا مطلب میں یہی سمجھ سکا ہوں کہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ منٹو کی شخصیت کے خطرناک رجحانات خود اس کے خالق یعنی سعادت حسن کے سوا کوئی ختم نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے ان کے بعض مداحوں کو اندیشہ ہو کہ منٹو کے ختم ہو جانے کے بعد ان کی ادبی زندگی بھی ختم ہو جائے گی۔ لیکن میں ان کی رائے سے متفق نہیں ہوں بلکہ میری رائے تو یہ ہے کہ اس طرح ان کا کینوس اور زیادہ وسیع ہو جائیگا۔ اگر وہ بنیادی ذریعہ معاش بدل بھی دیں تو ان کے گھر والوں خصوصاً ان کی بیوی کو مطلق افسوس نہ ہوگا۔ بلکہ جہاں تک ان کی بیوی کا تعلق ہے منٹو ماموں افسانہ نگاری کے بجائے تجارت شروع کر دیں تو انہیں اس کا چنداں غم نہ ہوگا۔ ادب نوازی کے دعویدار اور عوام کے خیالات و افکار کو حقارت سے دیکھنے والے ممکن ہے اس قول پر ادب کی بے حرمتی کا فتویٰ صادر کر دیں لیکن میری ہمدردیاں خاندان کے ساتھ ہیں۔ ادب سے محظوظ ہونا اور پیٹ بھرنے کے لئے ادب کی تخلیق کرنا دو علیحدہ علیحدہ باتیں ہیں۔ یہ امتیاز ایسے ملک میں خاص طور پر باقی رکھنا ہوگا۔ جہاں منٹو ایسے مصنف کو جس کی کتابیں سب سے زیادہ بکتی ہیں ایک کہانی کے پچاس روپے بھی مشکل سے ملتے ہیں۔

اس زمانے کے تمام اردو ادیبوں کے مقابلے میں منٹو ماموں کو اپنی تصانیف سے سب سے زیادہ آمدنی ہوتی ہے ان کا شمار ان چند ادیبوں میں ہے جن کا واحد ذریعہ معاش ان کی تصنیف و تالیف ہے۔ منٹو ماموں کی ادبی کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ وہ اپنے فنی محاسن کے علاوہ اعلیٰ درجے کے سیلز مین بھی ہیں۔ یہ دونوں کام انتہائی کٹھن ہیں ان کا بار ان کے ذہن پر نہیں پڑتا بلکہ یہ ان کی قوتِ حیات بھی سلب کرتے جا رہے ہیں۔ اور اس نے ایک ایسا چکر پیدا کر دیا ہے جس میں ایک برائی سے دوسری برائی پیدا ہوتی ہے اور ہر برائی میں پہلے سے زیادہ شدت ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ سے بڑے شاہ خرچ واقع ہوئے ہیں۔ انھیں کہیں جانا ہو اور اس ہر منزل مقصود تک آسانی سے پہنچ سکتے ہوں تب بھی وہ ٹیکسی کو ترجیح دیتے ہیں۔ بازار جاتے ہیں تو بہترین چیز خریدتے ہیں خواہ وہ کپڑے ہوں یا قلم، کاغذ ہو یا سگرٹ جوتے ہوں یا ٹائی۔ وہ ہمیشہ اعلیٰ درجوں میں سفر کرتے ہیں اور بہترین ڈاکٹر سے مشورہ کرتے ہیں۔ فلم کمپنیاں جب تک ان کی فلمی کہانیاں اور مکالموں کے لئے معقول رقم دیتی رہیں۔ ان کی فضول خرچیوں میں بھی کوئی مضائقہ نہیں تھا لیکن فلمی صنعت میں کساد بازاری اور پاکستان میں توطن نے صورت حال کو یکسر بدل دیا۔ زیادہ کمانے کے لئے انھیں زیادہ لکھنا پڑتا اور ان کا خیال تھا کہ زیادہ لکھنے کے لئے انھیں اس ٹانک کو بھی زیادہ استعمال کرنا چاہیے جسے انھوں نے خود اپنے لئے تجویز کیا ہے۔ وہ جتنی زیادہ شراب پیتے ہیں اتنا ہی کم لکھتے ہیں، وہ جتنا کم لکھتے ہیں انھیں اتنا ہی زیادہ تفکرات گھیرتے ہیں اور جتنے تفکرات زیادہ ہوتے ہیں انھیں بھلانے کے لئے وہ اتنی ہی زیادہ شراب پیتے ہیں ....

یہ ہے اس گرداب کا ایک ہلکا سا خاکہ جس میں منٹو ماموں اب اپنے آپ کو پھنسا ہوا پاتے ہیں اور جس سے نجات حاصل کرنے کے لئے وہ سخت جدوجہد کر رہے ہیں۔ مسرتوں نے ان سے منہ موڑ لیا ہے۔ اب ان کی اس انداز سے مدح و ستائش بھی نہیں کی جاتی جیسی آگ پر چلنے کے بعد کی گئی تھی۔ بلکہ اب تو وہ اپنے تلوؤں کو چھوتے ہیں تو اس میں انھیں آبلے بھی نظر آتے ہیں۔ لیکن اب وہ اپنی جسمانی اور روحانی بقا کے لئے ہاتھ پیر مار رہے ہیں۔ ان کے ناداں دوست اس گرداب میں شراب کی کوئی بوتل پھینک دیتے ہیں تو لہریں اس زور سے اٹھنے لگتی ہیں اور یہ ڈر لگتا ہے کہ ان کی جدوجہد ناکام ہو جائے گی لیکن پار اترنے کی موجودہ کوشش میں نسبتاً زیادہ ثابت قدمی اور استقامت ہے۔ ان کی آخری اور ہسپتال کی قریب قریب مہلک کشمکش سے زیادہ پائدار ہے۔

اپنے اہل و عیال کا اعتماد دوبارہ حاصل کرنے، اس لامتناہی چکر کو توڑ کر اس سے نکل آنے اور شاید اپنے کیٹو کو زیادہ نیک ساعت میں داخل ہونے پر مجبور کرنے کے لئے انھوں نے اپنے اوپر بعض بندشیں لگائی ہیں۔ انھوں نے اپنی پرانی، موجودہ اور مستقبل کی تصانیف کے جملہ حقوق اپنے ہاتھ سے منتقل کر دیئے ہیں۔ تمام اکاؤنٹ اب ان کی بیوی کے نام ہیں جن کے دستخط کے بغیر وہ کسی پبلشر سے ایک روپیہ بھی قرض نہیں لے سکتے۔ لیکن ان کی بیوی نے ان کی ادبی زندگی کو اب بھی دل سے قبول نہیں کیا۔ منٹو ماموں کی کامیابی اور رسوائی کے لئے انہیں بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی ہے۔ منٹو ماموں نے اگر ادب کی راہ میں مصیبتیں جھیلی ہیں تو ان کی شریک حیات نے کچھ زیادہ ہی دکھ بھرے ہیں۔ ان کو جب معلوم ہوا کہ میں بھی ادیب کا سوانگ بھرتا ہوں اور کچھ لکھنے بھی لگا ہوں تو انہوں نے میری بیوی سے جو ان کی سب سے چھوٹی بہن بھی ہیں، کہا۔ "خدا کرے یہ خبر غلط ہو۔ دعا کرو وہ کبھی مصنف نہ بنیں ورنہ تمہیں بھی عمر بھر پچھتانا پڑے گا۔" جب ان کے اس قول کا مجھے علم ہوا تو میں نے اس پر حیرت و استعجاب کا بالکل اظہار نہیں کیا۔

کرشن چندر

مہندر ناتھ

کرشن چندر کی دو شخصیتیں ہیں، ایک اُن کی ادبی شخصیت جس سے آپ لوگ اچھی طرح واقف ہیں۔ ۷۰ کتابوں کا مصنف جو ہندوپاک کی جنتا کا سب سے محبوب فن کار ہے اور جس کی شہرت اپنے دیس سے باہر بھی اردو افسانے کو چار چاند لگا رہی ہے۔ کرشن چندر روس میں بے حد مقبول ہیں، اُن کے افسانوں کی ایک کتاب تقریباً ڈیڑھ لاکھ فروخت ہو چکی ہے۔ اور روس کے علاوہ چین، چیک، ایسٹ جرمنی اور روس کی باقی سترہ زبانوں میں اُن کے افسانوں اور ناولوں کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ میں آج کرشن چندر کی ادبی شخصیت اور اُن کے فن کے بارے میں کچھ نہیں لکھوں گا۔ کیونکہ اس موضوع پر ایک پوری کتاب چاہیئے، محض ایک مضمون کافی نہ ہوگا۔

لیکن ایک کرشن چندر اور بھی ہیں جن کی کتابیں آپ پڑھتے ہیں۔ لیکن جن کے متعلق آپ بہت کم جانتے ہیں۔ میں یہ مضمون اس لئے لکھ رہا ہوں کہ میں اُن کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ تقریباً زندگی کے ۳۵ سال میں نے اُن کے ساتھ گذار دیئے ہیں۔ جہاں بھی وہ گئے میں اُن کے ساتھ رہا، بالکل ایک سائے کی طرح۔

اس لئے آپ کے محبوب فن کار کے متعلق بہت سی ایسی باتیں بتا سکوں گا جو شاید آپ کو معلوم نہ ہوں۔ کرشن چندر کی پیدائش ریاست بھرت پور میں ہوئی۔ اس ریاست میں ہمارے والد بحیثیت ڈاکٹر نوکر تھے۔ کرشن چندر کی عمر پانچ برس کی تھی، جب ہمارے والد صاحب نے ریاست پونچھ میں ملازمت اختیار کر لی۔ کرشن چندر کا بچپن وہیں گزرا۔ دسویں جماعت تک پونچھ کے ہائی سکول میں تعلیم پائی۔ سکول کے زمانے میں بھی اُن کی ذہانت کا چرچا اُن کے دوستوں کی زبانی سنا کرتا تھا۔ ریاضی میں کمزور لیکن ہسٹری اور Essays میں سب سے آگے اور اوّل۔ کرشن چندر کو کھیل کود سے کافی شغف تھا۔ خاص کر کرکٹ کھیل بے حد پسند کرتے تھے۔

اُن کے دوستوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ وہ بے حد ملنسار تھے۔ کھیل کود کے علاوہ انہیں ڈراموں میں کام کرنے کا بہت شوق تھا۔ ایک بار تو انہوں نے مہابھارت کے ڈرامے میں ارجن کا پارٹ ادا کیا، کافی خوبصورتی سے ادا کیا ——— اس زمانے میں سنگیت اور Painting سے بھی دلچسپی رہی۔ ساتویں اور آٹھویں جماعت میں انہوں نے دس پندرہ تصویریں بنائیں، لیکن نویں اور دسویں جماعت میں انہیں ڈرامے سے زیادہ دلچسپی ہوتی گئی۔

پونچھ میں اُن دنوں کوئی سینما گھر نہ تھا۔ کبھی کبھار لیلا رچائی جاتی تھی، یا باہر سے گویئے آتے تھے، یا ماسٹر رحمت کی ڈرامہ کمپنی مختلف ڈرامے کھیلا کرتی تھی۔ کرشن چندر نے شاید ہی کوئی ڈرامہ نہ دیکھا ہو۔ اکثر وہ بہانہ بنا کر چلے جاتے کہ فلاں کے گھر پڑھنے جا رہا ہوں۔ لیکن جاتے تھے وہ ڈرامہ دیکھنے۔ ہماری والدہ اکثر ان پر خفا ہوتی تھیں، لیکن والد کچھ نہ کہتے تھے ——— ۴۰ سال سے میں نے اپنے والد کو کبھی بچوں پر خفا ہوتے ہوئے نہیں دیکھا وہ نہایت ہی خاموش اور سنجیدہ قسم کے آدمی تھے اور یہ خاموشی اور سنجیدگی شاید ہم نے ورثے میں پائی ہے۔

سکول کے زمانے میں ہی کرشن چندر کو کتابوں کے پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ سب سے پہلے "الف لیلیٰ" پڑھی، پھر "فسانۂ آزاد"۔ پھر پریم چند کی کہانیاں۔ ٹیگور کے ناول انہوں نے دسویں جماعت سے پہلے ہی پڑھ ڈالے۔

جب وہ پڑھنے بیٹھتے تو کھانا، پینا اور کسی سے بات تک کرنا بھول جاتے تھے۔ والدہ اگر بلاتیں تو وہ جواب تک نہ دیتے۔ والدہ باورچی خانے سے غصے سے بھری ہوئی نکلتیں، کتاب ہاتھ سے چھین کر پھینک دیتیں اور کھانے کے لئے کہتیں۔ بہرحال کرشن چندر کو والدہ کا کہنا ماننا پڑتا اور کھانا کھا لیتے۔ کتنی بار والدہ نے والد صاحب سے شکایت کی کہ انہیں کتابیں نہ پڑھنے دیا کریں، صحت خراب ہو جائے گی، آنکھیں کمزور ہو جاتی ہیں اور آدمی کسی کام کا نہیں رہتا۔ لیکن والد محترم کچھ نہ کہتے۔ بس ایک چپ، ایک لمبی خاموشی! اور والدہ بڑبڑاتی ہوئی خاموش ہو جاتیں۔

کرشن چندر کا پہلا مضمون مزاحیہ تھا جو انہوں نے میٹرک کے زمانے میں اپنے فارسی کے ٹیچر پر لکھا تھا، جو ہفتہ وار پرچہ "ریاست" میں چھپا۔ یہ اُن کی پہلی کوشش تھی جو اُن کے دوستوں نے کافی پسند کی۔ کالج کے زمانے میں وہ زیادہ تر انگریزی میں لکھتے رہے اور اپنے کالج کے میگزین سیکشن کے ایڈیٹر رہے۔ کالج کے زمانے میں انہوں نے کھیل کود میں حصہ لینا چھوڑ دیا اور کالج اور کالج سے باہر کی دنیا میں زیادہ دلچسپی لی۔ جب کرشن چندر ایف۔ ایس۔ سی میڈیکل میں پڑھتے تھے، اُن دنوں وہ گوردت بھون میں رہتے تھے۔ یہیں پر بھگت سنگھ کے ساتھیوں سے ان کا تعارف ہوا۔ اور جب بھگت سنگھ اور اس کا گروہ پکڑا گیا تو کرشن چندر کو بھی پولیس پکڑ کر لے گئی اور کرشن چندر تقریباً ایک ماہ تک لاہور کے قلعے میں نظر بند رہے۔ تفتیش کے بعد کرشن چندر کو رہا کر دیا گیا۔ شاید انہی دنوں ان کا سیاسی نظریہ بننے لگا تھا۔ کیونکہ انہوں نے کالج کی زندگی کو زیادہ اہمیت نہ دی۔ ڈگری حاصل کرنا تو ٹھیک بات تھی لیکن زندگی کا مقصد محض ڈگری حاصل کرنا نہیں تھا۔ وہ کالج کے کورسوں کو بہت کم پڑھتے تھے۔ زیادہ وقت ناولوں اور کتابوں کے پڑھنے میں صرف ہوتا تھا یا طلبا کی تحریک میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ کرشن چندر نے فارمن کرسچین کالج سے انگلش کا ایم اے کیا پھر ایل ایل بی کی ڈگری لی۔ ان چار برسوں میں کرشن چندر نے مختلف شعبوں میں کام کیا۔ سیاست میں ان کی دلچسپی بڑھنے لگی۔ ایل ایل بی کے دنوں میں سوشلسٹ پارٹی سے نزدیک ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ ایک بار کرشن چندر بھنگیوں کی پہلی انجمن کے صدر چُنے گئے۔ انہی دنوں کرشن چندر نے کہانیاں لکھنی شروع کیں۔ "یرقان"، "انگور" اور "طلسم خیال" کا مجموعہ انہی دنوں چھپا۔ طنزیہ اور مزاحیہ انداز میں مضمون لکھے "پنجرہ"، "دو فرلانگ لمبی سڑک"، ایسی معرکۃ الآرا کہانی لکھی جس نے اردو افسانے میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ لیکن اس عرصے میں کرشن چندر سیاست کی گتھیوں کو بھی سلجھاتے رہے۔ وہ تقریباً ہر روز بھنگیوں کی چالوں میں جاتے تھے، لیکچر دیتے تھے، میٹنگ آرگنائز کرتے تھے۔ پنجاب کے لیڈروں سے بات چیت کرتے تھے۔ جب تک وہ یہ طے نہ کر پائے تھے کہ انہیں کیا بننا ہے۔ کیا انہیں پروفیسر بننا چاہیے، یا ایک سیاست دان۔ چالوں کے گرد چکر لگاتے ہوئے، لیڈروں سے ملتے ہوئے، کہانیاں لکھتے ہوئے انہیں یہ طے کرنا تھا کہ کالج کی زندگی کے بعد انہیں کیا کرنا تھا۔ ان دنوں وہ ہندو ہوٹل میں رہتے تھے، یہاں پر کنہیا لعل کپور، اشک اور بیدی سے ملاقات ہوئی، ادیبوں نے آنا شروع کیا، ہمایوں نے کرشن چندر کے مضمون کی بہت تعریف کی۔ ہندوستان کے مختلف رسالوں سے افسانوں کی مانگیں بڑھنے لگیں۔ اور "ادبی دنیا" کے ایڈیٹر صلاح الدین احمد نے اُن کے افسانوں کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی ہمت افزائی کی۔ کرشن چندر کی زندگی کا یہ دور الجھنوں سے بھرپور تھا۔ دماغ میں کشمکش تھی کہ کیا انہیں سیاست دان بننا چاہیے یا محض ایک ادیب۔ اور آخر کار انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی ساری زندگی ادب کی نذر کر دیں گے۔ یہ فیصلہ ایک نیک فال تھا، کیونکہ اُن کی طبیعت کا رجحان بھی یہی تھا، محض لیڈری اُن کے بس کی بات نہ تھی۔

اور جب کرشن چندر یہ فیصلہ کر چکے تو انہوں نے متواتر افسانے لکھنے شروع کر دیئے، ایک افسانہ کے بعد دوسرا افسانہ، پھر تیسرا۔ ایک کتاب کے بعد دوسری کتاب پھر تیسری۔ اور پھر ایک دن آیا کہ وہ ہندوستان کے سب سے بڑے افسانہ نگار بن گئے۔ اس میں شک نہیں کہ انہوں نے بے حد محنت کی، وہ کبھی بھی آرام نہ کرتے تھے، وقت کو یوں ضائع نہ کرتے تھے۔ کتابیں پڑھنا یا لکھنا اُن کا محبوب مشغلہ بن گیا اور اُن کی شہرت ملک کے کونے کونے میں پھیل گئی۔

جب کرشن چندر محض ایک ذہین طالب علم تھے میں اُن کے ساتھ تھا، جب انہوں نے لیڈر بننے کی کوشش کی، میں اُن کے ساتھ تھا، جب وہ ایک مشہور افسانہ نگار بن گئے میں اُن کے ساتھ تھا، لیکن میں نے اُن کے رویے میں کوئی فرق نہ دیکھا، ان تمام باتوں میں اُن کے Attitude میں کوئی فرق نہ

آیا۔ وہی ہنستا ہُوا چہرہ، زبان میں وُہی حلاوت اور مٹھاس، چہرے پر وُہی شگفتگی اور زندگی سے اُتنا ہی پیار، لوگوں پر بھی اُتنا ہی بھروسہ اور اُتنا ہی اعتماد۔

پڑھنے والے اُنہیں کتنا چاہتے ہیں، اُن سے کتنا پیار کرتے ہیں، پڑھنے والوں کے دلوں میں کرشن چندر کی کتنی قدر و منزلت ہے، اس کا مجھے احساس نہ تھا شاید اُنہوں نے اس کا احساس دلانے کی کبھی کوشش نہ کی اور میں اُنہیں صرف ایک مشفق اور مہربان بھائی سمجھتا رہا۔

لیکن اس عرصہ میں ایک عجیب واقعہ ہُوا جس کا ذکر میں یہاں کرنا چاہتا ہُوں۔ میں ڈی اے وی کالج میں ایم اے کی تعلیم پا رہا تھا اور اپنی کلاس میں کرشن چندر کی نئی کتاب "نظارے" کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ ایک طالب علم میرے قریب آیا۔ اُس نے یہ کتاب مجھ سے لی۔ کرشن چندر کی تصویر جو اُس میں شامل تھی، دیکھ کر کہنے لگا "آپ انہیں جانتے ہیں"؟

"جی ہاں!"

"کہاں رہتے ہیں کرشن چندر؟"

"کیا بات ہے؟"

"مَیں اُن سے مِلنا چاہتا ہوں"

"میں آپ کو اُن سے ملا دُوں گا"

"آپ کیسے ملا دیں گے؟"

"میں اُنہیں جانتا ہُوں"

"کیسے؟"

"میں اُن کے ساتھ رہتا ہُوں"

"کیوں؟"

اِس کیوں کا جواب میرے پاس نہ تھا۔ میں ذرا خاموش ہو گیا۔

"آپ اُنہیں کیسے جانتے ہیں؟"

"میں اُن کا بھائی ہُوں" یہ ٹھیک بھی تھا۔ اُن دنوں مَیں کرشن چندر کا محض بھائی تھا۔ افسانہ نگار نہ تھا۔

"آپ واقعی اُن کے بھائی ہیں؟" اُس نے حیرت سے پُوچھا۔ جیسے کرشن چندر کا کوئی بھائی نہیں ہو سکتا۔

"آپ کو یقین نہیں آتا" میں نے چڑ کر کہا۔

"آپ اُن کے سگے بھائی ہیں؟" اُس نے پھر لفظ "سگے" پر زور دیتے ہُوئے کہا۔

میں نے کہا "ہاں"۔

اُس کا چہرہ اُتر گیا۔ اُس نے شاید یُوں کبھی نہ سوچا تھا۔

طالب علم کی یہ کیفیت دیکھ کر مجھے بے حد صدمہ ہُوا۔ مَیں نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو کوسا۔ میں نے سوچا۔ مجھے کرشن چندر کے متعلق اس طالب علم کو کچھ نہ بتانا چاہیئے تھا۔ نہ جانے یہ کرشن چندر کو کیا سمجھتا ہے۔ شاید وُہ کرشن چندر کو کوئی آفاقی شخصیت سمجھتا تھا۔ شاید وُہ یہ سمجھتا تھا کہ کرشن چندر زمین پر نہیں رہتا، آسمان پر رہتا ہے یا کشمیر کے مرغزاروں میں رہتا ہے۔ شاید کرشن چندر کا کوئی بھائی نہیں ہو سکتا اُس کی کوئی ماں، باپ، اور دیگر رشتہ دار نہیں ہو سکتے۔ شاید کرشن چندر کچھ نہیں کھاتا، وُہ صرف افسانے لکھتا ہے۔ طالب علم یہ سُن کر آگے بڑھ گیا۔ اُس نے کرشن چندر سے ملنے کے لئے خواہش ظاہر نہ کی۔ اُس کے خوابوں کو شدید جھٹکا لگا تھا۔

اُس دن سے مَیں نے یہ قسم کھالی کہ میں اب دوبارہ کسی کے سامنے اپنے آپ کو کرشن چندر کا بھائی نہ کہوں گا۔ کرشن چندر جو عوام میں اتنا محبوب ہے۔ شاید لوگ اُسے یوں بکھیا پسند نہیں کرتے تھے۔ اِس واقعے کے بعد مَیں نے آج تک کسی شخص کو یُوں نہ کہا کہ میں کرشن چندر کا بھائی ہوں"۔

کرشن چندر بے حد نارمل قسم کے انسان ہیں۔ اُن سے مل کر آپ اُن کی ادبی شخصیت کے کبھی قائل نہ ہوں گے۔ کیونکہ آپ پر کبھی رُعب نہ جمائیں گے، وُہ آپ کی باتیں سُنیں گے، آپ کے نظریے کی جان پہچان کریں گے۔ وُہ اپنے افسانوں کے بارے میں آپ کی رائے چاہے وُہ اچھی ہو یا بُری ہو۔ بڑی خندہ پیشانی سے سُن کر برداشت کریں گے۔ صبر کا مادہ کرشن چندر میں سب سے زیادہ ہے۔ میں نے آج تک اُنہیں خفا ہوتے نہیں دیکھا۔ کبھی کبھی تو میں سوچتا ہُوں کہ کرشن چندر کے پاس اتنی قوتِ برداشت کہاں سے آئی۔ زندگی میں کتنی بار مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن وُہ زندگی سے لڑتے رہے حرفِ شکایت اُن کے لبوں پر کبھی نہ آیا۔ زندگی میں تلخی جو کبھی زہر کا رُوپ دھارن کر لیتی ہے۔ اُن کی گھریلو زندگی میں اس کا اظہار کبھی نہ ہُوا۔

یہ ٹھیک ہے کہ اُنہوں نے زندگی میں ناکامیوں کا مُنہ بہُت کم دیکھا۔ لیکن اپنی شہرت حاصل کرنے کے بعد دماغی توازن کبھی نہ کھویا۔ ہر چھوٹے اور بڑے ادیب کی عزّت کی۔ اپنی بساط کے مطابق ہر ادیب کی ہمت افزائی کی اُسے آگے بڑھنے کی تلقین کی، اُسے مشورہ دیا، اُسے اچھی صلاح دی۔ روپوں سے مدد کی۔ میں نے آج تک کرشن چندر کی زبان سے کسی ادیب کے خلاف کچھ نہیں سُنا۔ حسد کا جذبہ اُن میں نہیں ہے وُہ زندگی میں صرف خُود ہی آگے بڑھنا نہیں چاہتے بلکہ آدمیوں کے قافلے کو اپنے ساتھ لے کر آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔

جب کرشن چندر آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن پر نوکر ہُوئے تو اس نوکری کو پاکر اُنہیں خوشی نہ ہوئی۔ اور اس بات کا ذکر اُنہوں نے ایک کتاب کے انتساب میں کیا جس میں یہ لکھا " اُس کرشن چندر کے نام جس نے ایک حسین صبح کو اپنا گلا گھونٹ لیا"۔ یہ وُہ صبح تھی، جب اُنہوں نے آل انڈیا ریڈیو پر نوکری کرنی منظور کر لی تھی۔ دراصل وُہ یہ چاہتے تھے کہ محض لکھ کر اپنا اور باقی کنبے کا پیٹ پال سکیں، لیکن ہندوستان میں ایک ادیب کے لئے نا ممکن ہے کہ وُہ صرف کتابوں کی آمدنی پر ایک صحت مند زندگی گذار سکے۔

اُنہیں اپنی شخصی آزادی کے کھونے کا رنج تھا۔ شاید وُہ سمجھتے تھے کہ سرکار کی نوکری کرنے کے بعد وُہ آزادی سے لکھ نہ سکیں گے لیکن آل انڈیا ریڈیو کی نوکری کرتے ہُوئے بھی اُنہوں نے ترقی پسند افسانے اور ڈرامے لکھے "سرائے کے باہر" اسی نوکری کے دَوران میں لکھا گیا۔ دلّی ریڈیو اسٹیشن پر ادیبوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا یہیں پر میری پہلی بار منٹو، راشد، میراجی، احمد ندیم قاسمی، اوپندر ناتھ اشک، شمشیر سنگھ نرالا۔ شاہد احمد دہلوی، چراغ حسن حسرت، ڈاکٹر تاثیر اور دیگر احباب سے ملاقات ہُوئی۔

کرشن چندر کا گھر اُن دنوں ادیبوں کا مسکن بنا ہُوا تھا۔ تقریباً ہر ادیب سے مُلاقات ہو جاتی۔ اگر گھر پہ نہیں تو ریڈیو اسٹیشن پر۔ اُن دنوں اوپندر ناتھ اشک اور منٹو کی خُوب لگتی تھی لیکن کوئی حاسدانہ جذبہ نہ تھا۔ اُن دنوں آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دلّی سے بہترین ڈرامے نشر کئے گئے۔ کرشن چندر ڈرامہ سکیشن کے انچارج تھے۔ اگر اشک ایک ڈرامہ لکھ کر لاتے تو منٹو دو ڈرامے لکھ کر لاتے۔ اُن دنوں خُوب بحثیں ہُوا کرتی تھی۔ ادیب آپس میں مل بیٹھ کر خوش ہوتے تھے۔ تخلیقی کام میں ایک دُوسرے کی مدد کرتے تھے۔ ایک دُوسرے سے پیار کرتے تھے۔ ایک دُوسرے کو گھر پہ بُلاتے تھے۔ اکٹھے ملتے تھے، کھاتے تھے، پیتے تھے، ہنستے تھے اور لکھتے تھے۔ اور بے حد خُوبصُورت چیزوں کی تخلیق کرتے تھے۔ اُن دنوں تمام ادیبوں میں بھائی چارے کا شدید احساس تھا۔

میں نے اس قسم کا ادبی دَور کبھی نہیں دیکھا۔ ادیبوں کو اس طرح خوش رہتے ہُوئے کبھی نہیں دیکھا۔ اُن دنوں اُردُو افسانہ سنِ بلوغ کو پہنچ چکا تھا۔ ہر ادیب ایک دُوسرے سے اچھا لکھنے کی کوشش کرتا تھا اور ہر اچھے افسانے کی تعریف کرتا، چاہے وُہ اپنا ہو یا کسی اور کا۔ اُنہی دنوں کرشن چندر کے گھر میں نئے ادیبوں نے آنا شروع کیا۔ عسکری آتے تھے، نہایت خاموش اور متین، اور سنجیدہ، ہاں یا نہ کر کے واپس چلے جاتے۔

کرشن چندر دلّی سے لکھنؤ گئے اور اُس کے بعد ڈبلیو زیڈ احمد نے اُنہیں شالیمار میں بلا لیا۔ سرکاری مُلازمت ترک کرنے کے بعد اُنہیں ذہنی تسکین ضرور ملی۔ ریڈیو پر کافی کام کرنا پڑتا تھا۔ لیکن ریڈیو پر کرشن چندر کو ہر قسم کی سہُولتیں مُیسّر تھیں۔ اعلیٰ افسر اُن کی عزّت کرتے تھے۔ بخاری، کرم ناتھ چب

اور دیگر افسر مل نے کرشن چندر کے تخلیقی کام میں کبھی رکاوٹ نہ ڈالی ۔

پونہ میں آنے کے بعد انہوں نے اس بات کا پورا تہیہ کر لیا تھا کہ فلم اُن کی ادبی زندگی میں رکاوٹ نہ بن سکے ۔ اور پونہ میں رہ کر انہوں نے بہترین افسانے لکھے ۔ یہ نہیں کہ وہ فلم کی طرف توجہ نہ دیتے تھے بلکہ وہ ادبی کاموں کو سب سے افضل درجہ دیتے ہیں ۔ ادبی تخلیق میں وہ COMPROMISE کے قائل نہیں ۔ کبھی کبھی میں اُن کے اس رویہ پر حیران اور ششدر رہ جاتا ہوں کہ کرشن چندر ایسا ارل انسان جو زندگی میں ہر قسم کی بات برداشت کر لیتا ہے وہ ادب میں کوئی Compromis کرنے کے لئے تیار نہیں ۔ وہ فلمی کہانی میں دلچسپی قائم رکھنے کے لئے پروڈیوسر کی بات مان لیں گے ۔ لیکن ادب میں وہ جس بات کو صحیح سمجھیں گے اُسی پر عمل کریں گے ۔ ادب میں اُن کی شخصیت کا روپ نہایت مکمل، صحیح اور جاذبِ نظر ہے ۔ وہ تمام باتیں جو کرشن چندر زندگی میں کرتے تھے، ادب میں اُن کا بہترین انتخاب آتا ہے، زندگی کا صحیح نچوڑ ۔ اگر کسی ادیب نے صحیح معنوں میں ادب کو ایک لڑنے کا ہتھیار بنایا ہے تو اُس کا جائز استعمال کرشن چندر نے کیا ہے ۔ انہوں نے اردو افسانے کو تلوار کی صورت دے دی ہے ۔

کرشن چندر کی زندگی مختلف ادوار سے گذری ہے ۔ اچھے دن بہت دیکھے ہیں ۔ روپیہ کافی کمایا جو انہوں نے خرچ کر دیا ۔ بُرے دن بھی دیکھے لیکن انہوں نے ہمت کبھی نہیں ہاری، یاسیت اُن کے نزدیک بھٹک نہیں پاتی ۔ رونا انہوں نے سیکھا نہیں ۔ یار دوستوں کے رحم و کرم پر جینا بھی نہیں سیکھا ۔ چاپلوسی کے وہ قائل نہیں ۔ زیادہ تعریف بھی وہ پسند نہیں کرتے ۔ دوستوں اور ادیبوں کے سامنے اپنے افسانوں کا ذکر نہیں کریں گے ۔ دوسرے ادیبوں کے اچھے افسانوں کی وہ تعریف کریں گے ۔

کرشن چندر روپیہ کمانا جانتے ہیں لیکن اُن کی نگاہ میں روپیہ اس لئے کمایا جاتا ہے کہ اُسے خرچ کیا جائے ۔ اگر کوئی ضرورت مند اُن کے پاس آتا تو وہ ضرور اُس کی مدد کرتے ۔ روپیہ بچانا وہ نہیں جانتے ۔ جیب میں روپے رہ نہیں سکتے ۔ انہیں خرچ کرنا اُن کا اہم فریضہ ہے ۔ اور روپیہ کمانا اُس سے بھی بڑا کام ۔

اکثر وہ بیمار بھی ہو جاتے ہیں اور بیماری کے دنوں میں زیادہ پڑھتے اور لکھتے ہیں اور ساتھ ہی تھوکتے ہیں ۔ اُن کے تھوکنے کی عادت سے ہر شخص تنگ ہے ۔ وہ ہر جگہ تھوکتے ہیں ۔ گھر کے اندر، گھر کے باہر، صحن میں، پھاٹک میں، ڈرائنگ روم میں ۔ کھانے سے پہلے ۔ کھانے کے بعد ۔ اور پھر تھوکنے کے بعد مسکرا دیں گے اور ساتھ ہی کہیں گے "بھیا ایک سگرٹ دینا" ۔

سگرٹ وہ خرید کر نہیں پیتے ۔ اکثر دوست اُن کی ان حرکتوں سے چڑ جاتے ہیں ۔ لیکن آخر میں اُن کی یہ حرکتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں ۔ کیونکہ وہ خود بھی دوستوں کی بہت سی عجیب حرکتوں کو برداشت کر لیتے ہیں ۔

کرشن چندر کو اچھے لذیذ کھانے کا شوق ہے ۔ وہ کالج میں سوٹ اور ٹائی کے بغیر نہ جاتے تھے ۔ شروع میں کچھ Dandy بننے کا شوق تھا لیکن ایم اے کرنے کے بعد اُن کا Dandyism ختم ہو گیا ۔ لیکن اچھی خوراک کھانے کا شوق ابھی تک باقی ہے ۔ کار سے پیدل چلنا انہیں زیادہ پسند ہے ۔ گھر میں تنہا وہ بیٹھ نہیں سکتے ۔ لوگوں سے ملنا انہیں زیادہ مرغوب ہے ۔

اور لکھنے کے بارے میں میں بھول گیا ۔ لکھتے وقت وہ سب سے بڑھیا کاغذ استعمال کریں گے ۔ جتنا زیادہ قیمتی کاغذ وہ خرید سکتے ہیں، خرید کر لائیں گے ۔ قلم گھٹیا ہو گا ۔ فونٹن پن کا وہ استعمال نہیں کرتے، محض ایک عامیانہ قسم کا ہولڈر وہ استعمال کریں گے ۔ بازار سے ایک درجن نب خرید لاتے ہیں اور انہیں وقتاً فوقتاً استعمال کرتے رہتے ہیں ۔

وہ افسانہ صرف ایک بار لکھتے ہیں ۔ دوبارہ اُسے شاید پڑھتے بھی نہیں ۔ کبھی کبھار اپنا لکھا ہوا پڑھ نہیں پاتے ۔ کاتب پڑھ لیتا ہے ۔ ناول "شکست" انہوں نے ۲۲ دنوں میں لکھا ۔ کبھی کبھار لکھنے کی خواہش زیادہ بھڑک اٹھے تو ایک ہفتے میں سات افسانے لکھ دیں گے ۔ "ان داتا" ۔ "مولی" ۔ "ہمکا گوبھنگی" اور "تھبومی وان" یہ سب افسانے انہوں نے صرف ایک بار لکھے ہیں اور صرف ایک Sitting میں ۔ وہ شاید دوبارہ لکھنے کے قائل نہیں ۔ پہلے سوچ لیتے ہیں، پھر لکھتے ہیں ۔

کرشن چندر جیل جانے سے ڈرتے نہیں ۔ تلنگانہ کی تحریک کے دنوں میں جب ہمارے بہت سے ترقی پسند ادیب گرفتار ہو چکے تھے ۔ انہوں نے اُس

وقت اپنے آپ کو کبھی پیچھے نہ رکھا۔ ترقی پسند انجمن کی میٹنگوں میں باقاعدہ آتے رہے۔ افسانے پڑھتے اور اپنے افسانوں پر تنقید سنتے تھے۔ پھر انہی دنوں SOUTH کا دورہ کیا اور واپس آ کر "صبح ہوتی ہے" ایک رپورتاژ لکھا۔

کرشن چندر کے کردار میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ دوسروں پر چھا جانے کی کبھی کوشش نہیں کرتے۔ میٹنگ میں آ کر سب سے پیچھے بیٹھ جائیں گے۔ اور جان بوجھ کر تقریر نہیں کریں گے۔ کوئی بلائے گا تو ضرور اپنی رائے کا اظہار کریں گے۔ وہ ایک نہایت ہی نارمل زندگی بسر کرتے ہیں، ایک عام انسان ایسی زندگی، جیسے اپنے گھر سے محبت ہے۔ بیوی سے محبت ہے۔ بھائیوں سے پیار ہے۔ وہ دوستوں میں مل بیٹھ کر خوش ہوتے ہیں۔ زندگی کی جتنی اچھائیاں ہیں، انہیں اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ زندگی میں بے راہ روی اختیار کرنے کے قائل نہیں۔ بہت سے ادیبوں کی طرح لمبے بال نہیں رکھتے۔ گندے اور میلے کپڑے پہننے کے عادی نہیں۔

تھوڑی بہت شراب پی لیتے ہیں، شراب پی کر بہکتے نہیں۔ بلکہ زیادہ سنجیدہ ہو جاتے ہیں۔

آج کل وہ بمبئی کے مضافات ورسوا میں قیام پذیر ہیں۔ ایک نہایت ہی شاندار کوٹھی، باہر سے شاندار لیکن اندر سے نہایت عامیانہ۔ جس کے اندر ایک عام آدمی رہتا ہے، جس کے خیال اونچے ہیں، جس کا ادب قدآور ہے۔ جس کی ادبی شخصیت اس کی ذاتی شخصیت سے بہت بلند تر ہے۔ اس کے رکھ رکھاؤ سے، اس کے رہنے سہنے میں، اس کی بات چیت میں کوئی اچنبھے والی بات نہیں اور نہ ہی وہ جان بوجھ کر کوئی ایسی بات کرتا ہے کہ دیکھنے والا اس کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ وہ چپکے سے مسکراتے ہوئے عین سامنے سے گزر جاتے ہیں۔ اتنی شہرت حاصل کرنے کے بعد ان کی ذات میں گھمنڈ کا شائبہ تک نہیں۔ مجھ سے اکثر کہتے رہتے ہیں "مجھے لوگوں نے بہت کچھ دیا۔ مجھے شہرت دی، میرے ادب کے وہ پرستار ہیں اور مجھے روپے بھی کم نہیں دیئے مگر" جتنے روپے کرشن چندر نے اپنی کتابوں سے کمائے ہیں، شاید ہی کسی ہندوستانی ادیب نے ادب کے ذریعے کمائے ہوں۔ لیکن جمع کرنے کی ان کی عادت نہیں۔ جب کبھی وہ عوام کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی آنکھیں چمکنے لگتی ہیں۔ انہیں عام لوگوں سے بے انتہا محبت ہے۔ شاید اسی وجہ سے عوام ان سے اتنی محبت کرتے ہیں۔ اور وہ فرطِ محبت سے اپنا سر بلند کر لیتے ہیں کہ میں اکیلا نہیں ہوں۔ میرے ساتھ میرے عوام ہیں ——— جن کے لئے میں ادب تخلیق کرتا ہوں۔

کرشن چندر کی کامیابی کے دو راز ہیں۔ پہلی بات یہ کہ وہ کام کرنے سے کبھی نہیں ہچکچاتے۔ اگر وہ لکھیں گے نہیں تو پڑھیں گے ——— بیکار وقت ضائع نہیں کرتے۔ اگر ان دو چیزوں سے فرصت مل جائے تو باقی وقت سوشل کاموں میں صرف کریں گے۔ کام کرنے کی بے پناہ قوت ان میں ہے بلکہ میں اگر یہ کہوں کہ تخلیقی کام سے انہیں انتہائی محبت ہے تو بے جا نہ ہو گا۔ میں نے زندگی میں انہیں بیکار بیٹھتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔

اور ساتھ ہی انہیں اپنی ذات پر بھروسہ ہے، اپنے لوگوں پر بھروسہ ہے اور یہی دو چیزیں ان سے لازوال افسانے لکھوانے کی محرک ہیں۔ کام کی صلاحیت اور لگن۔ زندگی سے پیار۔ بیکار وقت ضائع نہ کرنا، یہ چیزیں ہم آدمیوں کو ان سے سیکھنا چاہئیں۔ یہی ان کی کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے۔

ایک بات کے بارے میں میں کچھ نہ کہوں گا۔ وہ ہے ان کا عشق۔ زندگی میں ہر شخص نے عشق کیا ہے۔ کرشن چندر نے بھی عشق کئے ہیں، اور اس موذی مرض کا تقریباً ہر شخص شکار ہوا ہے، بڑے بڑے ادیبوں نے بڑے بڑے عشق کئے ہیں اور کرشن چندر نے بھی ——— یہ راہ کچھ ایسی ہے کہ بڑے فن کار بھی بھٹک جاتے ہیں کیونکہ یہ دل کا معاملہ ہے۔ عشق کے کوئی خاص اصول نہیں ہوتے۔ کوئی فارمولا نہیں ہوتا کہ انسان سوچ سمجھ کر چلے۔

کرشن چندر عشق کرتے ہیں لیکن جلدی ہی راہِ راست پر آ جاتے ہیں۔ ان کا دل بہت بڑا ہے اور چونکہ انہیں معلوم ہے کہ زندگی میں انہیں کیا کرنا ہے اس لئے وہ عشق و محبت کو سب سے افضل چیز قرار نہیں دیتے۔ اسے ہمیشہ Secondary Position دی۔ میں اس مسئلے پر زیادہ روشنی نہیں ڈالوں گا، کیونکہ اس میں کسی کا بس نہیں۔

اخیر میں صرف یہ عرض کروں گا کہ گو کرشن چندر قدآور ادب کی تخلیق کرتے ہیں اور ان کا شمار دنیا کے چوٹی کے ادیبوں میں سے ہے۔ لیکن ان کی نجی زندگی ایک عام انسان کی طرح ہے ———۔

عصمت چغتائی

خالد لطیف

عصمت کے افسانے پڑھنے والوں کی زبانی میں نے ہمیشہ یہی سنا کہ وہ بڑی مردمار قسم کی عورت ہے۔ لیکن جب پہلی بار میں نے انہیں دیکھا تو یوں محسوس ہوا جیسے خمیری آٹے میں کسی نے بہت ہی نرم و نازک اور حساس دل گوندھ دیا ہو۔

یہ ۱۹۴۲ء کی بات ہے۔ میں دسویں جماعت میں پڑھتا تھا ——— دسویں جماعت کا ایک عام اور معمولی طالب علم —— یہ بات میں نے اس لئے کہی کہ میں اس سے زیادہ کچھ اور نہ تھا ——— جب پہلی بار میں نے عصمت کو دیکھا شاہد لطیف سے ان کی شادی ہو چکی تھی۔ بڑی بوڑھیوں کو یہ شادی پسند نہیں آئی تھی ——— "اے ہے۔ سنا ہے بہوا فسانے لکھتی ہے" ——— "جی ہاں خالہ بی۔ بڑے فضول، واہیات اور ننگے افسانے" ——— "ننگے —— اللہ توبہ —— آج کل کی لڑکیوں کے دیدے کا پانی ڈھل گیا ہے" ——— میں یہ باتیں سنتا تھا اور سوچتا تھا کہ نہ جانے دیدے کا پانی ڈھلنے کے بعد عورتیں کیسی ہوتی ہیں ——— پھر اچانک معلوم ہوا کہ شاہد لطیف اور عصمت آرہے ہیں۔ پہلے وہ بھائی میاں اور بی سے ملنے کے لئے بریلی گئے۔ پھر بڑے بھائی عظمت اللہ خاں سے ملنے کے لئے لکھنؤ آئے۔ جس دن شاہد اور عصمت لکھنؤ آرہے تھے معلوم نہیں کیوں بھائی صاحب بغیر مجھے بتائے ہوئے انہیں لینے کے لئے اسٹیشن پہنچ گئے۔ میں ابھی سو کر اٹھا ہی تھا کہ یہ لوگ آگئے ——— میں نے سلام کیا اور پھر ڈرتے ڈرتے عصمت کو دیکھا ——— وہ تو ویسی ہی تھیں جیسے گھر کی اور عورتیں ——— بی۔ خالہ بی۔ بھابی صاحبہ۔ آپا جان ——— میرا تعارف کرایا گیا۔ شاہد بھائی بولے

"یہ ہیں عصمت!"

"اور یہ ہیں خالد!"

عصمت بڑے سرپرستانہ موڈ میں مسکرائیں لیکن اس مسکراہٹ میں نہ تو اجنبیت تھی اور نہ احساس برتری۔ بلکہ بہت ساری انسانی محبت۔ ہاں اس محبت میں طنز ضرور تھا۔ یہ طنز تو عصمت کے مزاج کا حصہ ہے جسے انہوں نے اپنے کرداروں کے رگ و پے میں سمو دیا لیکن وہ خود اس سے کبھی نجات نہ حاصل کر سکیں ——— میرا سر ان دنوں گھٹا ہوا تھا ——— آسان اور سلیس اردو میں یوں کہہ لیجئے کہ بزرگوں نے اُسترا پھروا دیا تھا ——— جہاں لڑکے کے سر پر بال بڑھے بزرگوں کے دلوں میں یہ اندیشہ جاگ اٹھا کہ آوارہ ہو جائے گا۔ اور یہ سب کچھ آج سے بارہ تیرہ برس پہلے یو پی میں ہوتا تھا ——— شاید کیا بلکہ یقیناً عصمت کی اس مسکراہٹ میں میرے گھٹے ہوئے سر کے لئے طنز تھا۔

—— "یہ کیا حماقت ہے؟"

—— "بھئی ذرا جلدی بال اُگا لو، ہمیں تو تمہیں دیکھ کر وحشت ہوتی ہے۔"

مجھے غصہ تو آیا کہ 'بال اُگا لو' گویا کہ ہمارا سر نہ ہُوا آلوؤں کا کھیت ہو گیا۔ مگر کرتے کیا.......

اس زمانے میں لکھنؤ میں نمائش لگی ہوئی تھی۔ ہم لوگ نمائش دیکھنے گئے۔ شاہد، عصمت، بھائی صاحب اور ایک آدھ اور عزیز.... عصمت اور شاہد ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ نہ معلوم مجھے کیوں یوں محسوس ہُوا جیسے عصمت دانستہ ایک قدم پیچھے رہنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اس وقت یہ خیال میرے ذہن میں بہت مبہم تھا، لیکن اب میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ عصمت شاہد سے بہت بڑی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ انہوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو چھوٹا بنا کر دوسروں کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی۔ اپنی اس کوشش میں وہ کہاں تک کامیاب ہوئیں؛ اس کے متعلق میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔

ہاں تو نمائش میں بھائی صاحب کے ایک دوست بھی مل گئے۔ شاہد اور عصمت کو دیکھ کر کہنے لگے "قد و قامت کے لحاظ سے جوڑ برابر کا نہیں۔" انہوں نے محض ظاہر دیکھ کر یہ فیصلہ کیا تھا، ویسے اگر قد و قامت کا لفظ ہٹا دیا جائے تو بات زیادہ سچی ہو جائے گی۔ تسلسل اور برسوں کی ترتیب سے فی الحال نجات حاصل کرتے ہوئے ایک بات اور کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ۱۹۴۶ء میں اتفاقاً میری نظر عصمت کی ڈائری پر پڑ گئی۔ اس ڈائری کو پڑھنے کے بعد ان کی فطرت کی چھپی ہوئی عظمتیں میرے سامنے کچھ اس طرح آ گئیں کہ میں نے اپنا سر جھکا دیا —— ایک جگہ لکھا تھا:۔

"میں نے اونچی ایڑی کی سینڈلیں اس لئے پہننا چھوڑ دیں کہ میرے اور شاہد لطیف کے قدوں کا باہمی فرق کم ہو جائے اور وہ بڑے معلوم ہونے لگیں —— میں نے لکھنا کم کر دیا تاکہ میری شہرت سے وہ احساسِ کمتری میں مبتلا نہ ہوں —— میں نے اچھے لباس پہننے چھوڑ دئے تاکہ لوگوں کی نظریں مجھ پر کم پڑیں۔"

یہ ہے حقیقی عصمت چغتائی کا ایک عکس۔ اس کی روح کی ایک جھلک۔ مولانا صلاح الدین نے کہیں لکھا ہے کہ "آنے والی نسلوں کی مائیں بہنیں عصمت کے کرداروں کو اپنے پہلو میں مچلتا ہُوا محسوس کریں گی" —— یہ بڑی سچی بات ہے۔ عصمت نے بے باک افسانے لکھے۔ روایتی اخلاق کو ٹھکرایا۔ لیکن اس ایثار پیشگی کی مثال کہیں اور مشکل ہی سے ملے گی۔

بڑی شخصیتوں کی قلمی تصویریں بنانا اس لئے اور بھی مشکل ہے کہ بات سے بات نکلتی آتی ہے اور ترتیب باقی نہیں رہتی ——

—— تو عصمت دس پندرہ دن لکھنؤ رہ کر بمبئی واپس چلی گئیں —— میں عارضی طور پر انہیں بھول گیا اور اپنے میٹرک کے امتحان کی تیاری میں اُلجھ گیا۔ جب امتحان ختم ہُوا اور سر پر بال اُگ آئے تو شاہد بھائی اور عصمت بھابی یاد آئیں —— ویسے بھی بمبئی میرے خوابوں کی بستی تھی۔ چند سال پہلے گھر کا ایک نوکر اچانک بھاگ گیا، اور دو تین سال کے بعد جب لوٹا تو حلیہ ہی بدل گیا تھا۔ سفید پتلون، ریشمی قمیض، اس میں سونے کے بٹن، بیڑی کے بجائے سگریٹ، ہاتھ میں گھڑی —— میں نے پوچھا "یہ سب کیا؟" کہنے لگا "بھیّا بمبئی کا فیض ہے" —— غرضیکہ میں بمبئی کے فیض کا قائل بھی تھا اور اس فیض کے حاصل کرنے کا متمنی بھی۔ عصمت بھابی اور شاہد کا تو بہانہ تھا۔ مقصد تو بمبئی جانا تھا۔ امتحان سے فارغ ہوتے ہی میں نے اپنے ارادے کا اعلان کر دیا۔ بھائی صاحب نے شروع میں مخالفت کی لیکن پھر مان گئے۔ چنانچہ میں لکھنؤ سے بمبئی کے لئے روانہ ہو گیا —— پہاڑ جیسا سفر اللہ اللہ کر کے ختم ہُوا۔ وکٹوریہ ٹرمینس سے دوسری گاڑی میں بیٹھ کر ملاڈ پہنچا۔ ایک قلی سے پوچھا —— "عصمت چغتائی کو جانتے ہو؟" —— "ہاں" — اس نے "ہاں" کچھ اس طرح کہا کہ اس کا قطعی مطلب یہ تھا کہ نہیں۔ پھر میں نے پوچھا "شاہد لطیف کو جانتے ہو؟ نیا سنسار اور قسمت کے انہوں نے ڈائیلاگ لکھے ہیں، بہت مشہور آدمی ہیں۔ اور عصمت بہت بڑی ادیبہ ہیں" قلی مجھے حیرت سے دیکھتا رہا اور پھر بولا "نکو جانے" —— یقین جانئے قلی پر بہت غصہ آیا کہ اتنی مشہور ادیبہ اور جوبلی منانے والے فلم کے ڈائیلاگ رائٹر کا نام تک نہیں معلوم —— اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس وقت "ادیب" کا کیا تصور میرے ذہن میں ہو گا۔ بہر حال میں نے قلی سے کہا "سامان اٹھاؤ"۔ اس زمانے میں شاہد اور عصمت دفتری بلڈنگ میں

رہتے تھے۔ شاہد بمبئی ٹاکیز سے الگ ہو چکے تھے۔ فلمستان کی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی۔ اور عصمت اس وقت تک انسپکٹرس آف سکولز تھیں، لیکن دفتر نہیں جا رہی تھیں ——— کچھ دنوں کے بعد انہیں ماں بننا تھا۔ اپنی زندگی کے ہر گوشے میں عصمت نے تخلیق کو ایک عظمت عطا کی ہے ——— ان کی قوتِ تخلیق کے لئے کوئی ایک میڈیم کافی نہیں ہے۔ افسانے، ڈرامے، ناول، فلم ——— عصمت اس زمانے میں "ٹیڑھی لکیر" لکھ رہی تھیں۔ ان کا املا بہت خراب ہے۔ انہیں ذرا سا موقع ملے تو وہ ظالم کو "ز" سے لکھ دیں۔ عصمت بھابی بولتی جاتیں اور میں لکھتا جاتا۔ اس سے پہلے مجھے بس یہ معلوم تھا کہ وہ بہت بڑی لکھنے والی ہیں۔ میں ان کی شہرت سے بہت مرعوب تھا، لیکن کبھی ان کی کوئی چیز پڑھی نہ تھی۔ "ٹیڑھی لکیر" میں مجھے بہت مزہ آیا۔ مزہ میں نے اس لئے کہا کہ اس وقت میں اس ناول کی ادبی قدر و قیمت کو کیا سمجھ سکتا تھا۔ لیکن پہلی منزل میں باتیں ایسی تھیں کہ محسوس ہوتا تھا کہ "ننھی" کے دماغ میں اٹھنے والے مختلف النوع سوالات جیسے میرے اپنے ذہن میں گونج رہے ہیں۔ بعض باتیں ایسی ہوتیں کہ کبھی کبھی تو میرے کانوں کی لَویں تک سُرخ ہو جاتیں ——— "توبہ توبہ! یہ لڑکیاں اپنے ہوسٹل میں کیا کرتی ہیں" ———

عصمت ان دنوں مجھے اچھی لگتی تھیں۔ ان کے چہرے کے گرد ایک ہالہ سا نظر آتا۔ جو تخلیق کے ساتھ لازم و ملزوم ہے۔ وہ دھیمے دھیمے قدموں سے چلتیں اور بڑی پُر وقار معلوم ہوتیں۔ وہ خود جس وقت لکھتی ہیں تو اوندھی لیٹ کر۔ ان کا چہرہ کاغذ سے اتنا قریب ہوتا جیسے کاغذ اور عصمت کا کوئی گہرا تعلق ہے۔ نوکر بھاگ گیا تھا۔ عصمت کھانا خود پکاتی تھیں۔ انہیں کھانا پکانے کا بہت شوق ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کبھی کوئی چیز سلیقے سے نہ پکا سکیں۔ ہاں کھانا اپنی مرضی سے، اچھا پک جائے تو اس کا کرم۔ میں بھی حسبِ توفیق عصمت کی مدد کرتا۔ آٹا گوندھتا۔ آٹا ہمیشہ بہت ڈھیلا ڈھیلا رہتا کہ مشکل ہی سے روٹی پک پاتی ...... ایک رات عصمت بھابی کا پاؤں پھسل گیا۔ اور ان کی تخلیق مکمل نہ ہو سکی۔ وہ شاہکار جسے وہ فن کے نہاں خانوں میں ڈھال رہی تھیں خوابوں کی طرح بکھر گیا، ٹوٹ گیا۔

بمبئی میں کوئی دو مہینے رہا، لیکن یہ شہر لکھنؤ کی طرح میرا دوست نہ بن سکا۔ ہمیشہ مجھے اپنے سے بڑا معلوم ہوا، اس سے ملتے ہوئے مجھے جھجک محسوس ہوتی رہی اور پھر میں لکھنؤ واپس آ گیا ——— مجھے اپنے ہائی اسکول کا نتیجہ بمبئی میں تار کے ذریعے معلوم ہوا لیکن اس کا اس خاکے سے کیا تعلق؟

دوسری مرتبہ ۱۹۴۸ء میں میں بمبئی گیا اور اس مرتبہ میں نے عصمت بھابی کا زیادہ قریب سے مطالعہ کیا۔ کیونکہ پہلی مرتبہ بمبئی سے واپس آنے کے بعد میں نے اُن کے افسانوں کو پڑھا، ان کی تخلیقات غور اور توجہ سے دیکھیں ——— ان تحریروں میں کہیں کہیں ان کی جھلک بھی نظر آتی۔ مگر ان کے افسانوں کو آپ بیتی نہیں کہا جا سکتا۔ ان کا مشاہدہ بہت تیز ہے۔ زندگی کے نہ معلوم کتنے چھوٹے چھوٹے واقعات اور نہ معلوم کتنے چھوٹے بڑے کرداروں کو انہوں نے افسانوں میں ڈھال دیا ——— بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں، بیتے ہوئے واقعات یاد آ رہے ہیں، مگر میں ان سے دامن چھڑا کر عصمت بھابی کی کچھ اور عادتوں کا ذکر کر دوں۔ اب رہا اُن کے ذہن میں اُترنے کا سوال تو یہ بات میرے بس کی نہیں، وہ اتنی چھوٹی کہاں کہ میری گرفت میں آ جائیں۔ ان کا ہر ارادہ، ہر خیال ذہن کی وسیع وادیوں کا مسافر ہے، اور ہونٹوں پر تو ہمیشہ سادہ و پُرکار مسکراہٹ رہتی ہے ——— بہت گمراہ کُن ان کے غموں تک کس کی پہنچ؟

عصمت بھابی طبیعت کی بہت فیاض ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بہت اچھی ماں ہیں۔ اپنی بچیوں سے انہیں بے حد محبت ہے۔ شاہد کو کسی زمانے میں ان سے گلہ تھا، معلوم نہیں اب بھی ہے یا نہیں کہ ان میں لڑکا پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ شاید یہی وہ شکوہ ہے جو "سونے کے انڈے" کی شکل میں اُبھر آیا ——— لڑکا پیدا ہوتا ہے تو یوں روتا ہے کہ "ہیا نو ہیا نو" گویا ماں باپ کو یقین دلاتا ہے کہ گھبرا دمت میں یہاں بہت کچھ لے کر آؤں گا۔ لڑکی پیدا ہوتے ہی یوں روتی ہے کہ "ہُواں ہُواں" یعنی دولت وہاں لے جاؤں گی۔ بچیاں تو ایک بوجھ ہیں۔ جہیز، داماد، برات، دولہا، دولہا کے نخرے۔ لیکن یہ ردّ عمل عصمت کی زندگی میں نہیں ہے۔ ان کے عمل میں کوئی تلخی نہیں، اور ان کی محبت محدود نہیں ہے۔ وہ اپنی بچیوں سے ہی محبت نہیں کرتیں۔ اپنے اور شاہد کے رشتہ داروں کا بھی خیال رکھتی ہیں بلکہ ان کی مدد بھی کرتی ہیں۔ دوستوں اور جان پہچان والوں کے لئے عصمت

کیا نہیں کر سکتیں۔ شاہد کے پاس مکان نہ تھا اسے اکبر منزل کا فلیٹ دے دیا۔ بہنوئی کا انتقال ہوا تو بہن اور بھانجوں کو ساتھ رکھ لیا اور سارا بار اٹھایا۔

عصمت کا ہاتھ بہت کھلا ہوا ہے۔ روپے کو واقعی ہاتھ کا میل سمجھتی ہیں۔ دل کے حوصلے کا یہ عالم ہے کہ جب کبھی میں نے ان سے پیسے مانگے انہوں نے کہا جاؤ الماری میں سے لے لو۔ یہ کہہ کر وہ کنجی ڈھونڈنا شروع کر دیتیں۔ الماری کی کنجی ڈھونڈنا جوئے شیر لانا ہوتا تھا۔ ڈھونڈتے رہتے۔ کبھی کھانے کی میز پر ملتی، کبھی غسل خانے میں۔ کبھی کسی کتاب کے اندر۔ کنجی میرے حوالے کر دیتیں۔ اور مجھے جتنے پیسوں کی ضرورت ہوتی لے لیتا۔ انہوں نے کبھی یہ نہیں پوچھا کہ تم نے کتنے پیسے لئے اور ان کا کیا کیا؟ عصمت پان کھانے کی خاصی شوقین ہیں۔ لیکن ان کا پاندان دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ کبھی پان میں سوکھا کتھا استعمال کیا جاتا ہے۔ کبھی چھالیہ غائب۔ چھالیہ ہیں تو سروتہ نہیں ملتا۔ سروتہ مل گیا تو چھوٹی غائب ہو گئی۔ یہ بے ترتیبی تو عصمت بھابی کا حصہ ہے۔ ترتیب اور بے ترتیبی کا امتزاج کچھ عجیب و غریب سا ہے۔ گھر کی صفائی، چیزوں کی دیکھ بھال کے بارے میں بہت ہی موڈی ہیں۔ صفائی پر آئیں تو ایک دن میں دھنئے کی طرح گھر کو دھنک کر رکھ دیں۔ پرانی چیزیں اٹھا کر پھینک دیں — "ایں ہم رفت۔ آں ہم رفت" — اور پھر دس پندرہ دن میں حالات حسب سابق ہو جانے — دس پندرہ جوڑی جوتے۔ ایک کمرے سے جوتے پہن کر دوسرے کمرے تک گئیں اور وہیں اتار کر بھول گئیں۔ پھر گئیں دوسرا سینڈل پہن آئیں کھانے کی میز کے پاس چھوڑ دیا۔ تیسرا سینڈل باورچی خانے کے قریب۔ چوتھا غسل خانے میں۔ اور یونہی صبح سے شام تک جوتے ہر طرف پھیل جاتے۔ جنہیں نوکر سجا سجا کر رکھتے رکھتے تنگ آ جاتے۔ لباس کی طرف سے بے پروا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے پاس اچھے لباس نہیں۔ وارڈ روب کھولی جائے تو بہترین ساریاں ہینگر پر ٹنگی ہوئی ملیں گی مگر ان میں سے شاید ہی کسی پر استری ہو۔ عصمت کو چیزیں خریدنے کا بہت شوق ہے۔ لیکن چیزوں کے بارے میں ان کی پسندیدگی استوار نہیں ہوتی۔ جس طرح ایک بچہ نیا کھلونا خرید کر خوش ہوتا ہے۔ دو چار روز اس سے کھیلتا ہے اور پھر گھر کے کسی کونے کھدرے میں ڈال دیتا ہے۔ بالکل یہی حال ان کا ہے۔ آج نکاح کل طلاق۔ غالباً ۱۹۴۷ء کی بات ہے۔ شاہد اور عصمت دونوں بے کار تھے۔ اتنے فالتو پیسے بھی نہ تھے کہ ہزار پندرہ سو کی کوئی چیز محض اس لئے خرید لی جائے کہ وہ اچھی ہے اور خریدنے کو دل چاہتا ہے۔ عصمت کو "فریجی ڈیئر" خریدنے کا شوق چرایا۔ باوجود سب کے منع کرنے کے خرید لیا گیا۔ اب سوال یہ تھا کہ اس میں رکھا کیا جائے؟ چنانچہ بڑے خلوص سے انہوں نے فریجی ڈیئر کو سجانے کی تیاری شروع کر دی۔ شہد۔ جیم۔ مکھن۔ جیلی۔ پنیر۔ ترکاریاں، انڈے، اچار، اور پھر گوشت۔ لیکن جگہ پھر بھی بچی تو ترکاریاں اور پیاز بھر دی۔ چند دنوں تک فریجی ڈیئر کی ہر صبح اٹھ کر صفائی کرتیں، چیزوں کو سجاتیں اور پھر بڑے پیار سے دیکھتیں۔ جیسے کوئی بانجھ یا مالکن کے خوبصورت بچے کو دیکھتی ہے۔ اور پھر چند دن دیکھنے کے بعد اس سے بالکل بے نیاز ہو جاتی ہے۔ عصمت نے بھی بالکل یہی کیا۔ چند دن بعد وہ فریجی ڈیئر سے اس طرح بے نیاز ہو گئیں جیسے اس قسم کی چیز گھر میں کوئی ہے ہی نہیں۔

لڑنے کا انہیں کوئی خاص شوق نہیں۔ لیکن لڑنے پر آئیں یا بحث پر تل جائیں تو بہت سارے حربے استعمال کر ڈالتی ہیں۔ بات کا جواب اس طرح دیتی ہیں کہ آدمی سوچتا رہ جاتا ہے کہ وہ کہے تو کیا کہے۔ ایک مرتبہ شاہد اور عصمت کی خوب بحث ہوئی۔ دونوں ہی کہتے تھے کہ اب یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی۔ ...... میں نے اس پر عصمت بھابی سے کہا کہ "چھوڑئیے، درگذر کیجئے، بات کیوں بڑھاتی ہیں"۔ کہنے لگیں "اگر ایک مرتبہ غلطی سے جلتے ہوئے کوئلے پر ہاتھ پڑ جائے تو کیا تمہارے کہنے کے مطابق ہاتھ نہ ہٹایا جائے"۔ (جلتے ہوئے کوئلے سے مراد شاہد تھے) اس بات کا میرے پاس کیا جواب تھا سوائے خاموشی کے .... انتظار کرتا رہا کہ وہ جلتے ہوئے کوئلے سے ہاتھ ہٹائیں مگر انہوں نے جب دو تین دن نہیں بلکہ پورے دو مہینے تک اپنا ہاتھ نہیں ہٹایا تو میں نے یہی سمجھا اور ٹھیک ہی سمجھا کہ عصمت کا عمل کچھ عجیب سا ہوتا ہے۔ ایسا عجیب جس کے متعلق پہلے سے کچھ نہیں کہا جا سکتا ——

جن دنوں وہ اکبر منزل شیواجی پارک میں رہتی تھیں شاہد لطیف "نوبگ پکچرز" پونہ میں نوکر تھے۔ غالباً "سمراٹ چندر گپت" کے مکالمے لکھ رہے تھے۔ عصمت سے ان کے تعلقات اس زمانے میں کچھ کشیدہ تھے۔ کشیدگی کا ردِ عمل تو کچھ اور ہی ہونا چاہئے تھا۔ لیکن ان کی عملی ہمدردی شاہد کے ساتھ تھی۔ ان کی زبان شاہد سے لڑتی تھی اور ان کا قلم شاہد کے لئے کام کرتا تھا۔ اسی زمانے میں انہوں نے اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی کی تین کہانیوں

کو ملاکر "شکایت" لکھی اور فلمانے کے لئے شاہد کے حوالے کر دی۔

دو ایک اور چھوٹی چھوٹی باتیں، تاش کھیلنے کی بہت ہی شوقین ہیں۔ لیکن تاش کے اس کھیل سے نفرت جس میں دماغ سوزی کرنا پڑتی ہے۔ رمی، سوئپ اور کورٹ پیس ان کے پسندیدہ کھیل ہیں۔ شاہد کے بچپن کے دوست یوسف آئے نہیں کہ تاش شروع ہو گئے۔ کھیل کے درمیان ادب سے سیاست تک، کھانا پکانے کی ترکیبوں سے مچھلی کے شکار تک کی باتیں ہوتیں۔ کھانے پینے کی ہر چیز کو جائز سمجھتی ہیں۔ مگر شراب سے انہیں نفرت ہے۔ اور میرے خیال میں اس کی وجہ شرعی نہیں بلکہ ذاتی ہے۔

ان کے افسانوں کو پڑھ کر ہر شخص یہی سوچتا ہے کہ اتنے اچھے مکالمے لکھنے والی یقیناً گفتگو بھی بڑی شگفتہ کرتی ہوں گی۔ مگر ہر وہ شخص جو پہلی مرتبہ ان سے ملتا ہے اسے بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ صرف "جی ہاں۔ ہوں۔ جی۔ جی ہاں نہیں" میں ہی ٹالتی رہتی ہیں۔ عصمت دو چار چھ ملاقاتوں میں کھلتی ہیں اور پھر دیکھئے رفتارِ گفتار۔

——— اور یہ سب کچھ لکھنے کے بعد میں سوچ رہا ہوں کہ مجموعی طور پر یہ عصمت چغتائی ہیں یا .... اس سوال کا سب سے مکمل جواب یہی ہے کہ یہ عصمت چغتائی ہی ہیں۔

راجندر سنگھ بیدی

کنہیا لال کپور

راجندر سنگھ بیدی کا نام زبان پر آتے ہی ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے یہ نام نہیں نغمہ ہے۔ بیدی واقعی خوش نصیب ادیب ہے کہ وہ ایک بصورت رفیقۂ حیات کے علاوہ ایک خوبصورت نام کا بھی مالک ہے۔ میں نے پہلی بار یہ نام "ادبی دنیا" کے سالنامے میں پڑھا۔ اور مجھے اس نام بے اختیار پیار اور رشک آیا۔ جس شخص کا نام راجندر سنگھ بیدی ہو، میں نے سوچا اُسے واقعی بہت بڑا ادیب ہونا چاہیئے۔ اس نام میں ریت اور موسیقیت ہے۔ یہ نام نہیں۔ چھوٹی بحر میں لکھی ہوئی غزل کا مصرع ہے!

۱۹۳۹ء کی سرما کی ایک شام کو میں کرشن چندر کے مکان (واقع موہنی روڈ لاہور) پر بیٹھا ہُوا تھا۔ کہ اچانک دو نوجوان کمرے میں داخل ہوئے۔ نوں نکر اور قمیص پہنے ہوئے تھے۔ اور راوی پر بوٹنگ کر کے آ رہے تھے۔ کرشن چندر نے دونوں کا بڑے خلوص سے استقبال کیا۔ ان میں سے ے گندمی رنگ اور درمیانے قد کا سکھ نوجوان تھا۔ جو ضرورت سے زیادہ ستم زدہ نظر آتا تھا۔ کرشن چندر نے میرا اُس سے رسمی تعارف کراتے ئے کہا "یہ آپ مشہور افسانہ نویس راجندر سنگھ بیدی ہیں" ایک لحظہ کے لئے مجھے محسوس ہُوا۔ کہ کرشن چندر میرا مذاق اُڑا رہا ہے۔ بھلا یہ معمولی سا ں سا۔ بیچارہ سا شخص راجندر سنگھ بیدی کیسے ہو سکتا ہے۔ میں نے اُس کے خدوخال کا جائزہ لیا۔ ایک عام سا چہرہ۔ خوشنما سی چھوٹی سی ڈاڑھی۔ جیب سی آنکھیں۔ ایسی آنکھیں جنہیں نہ اچھا کہا جا سکتا ہے نہ بُرا۔ جن میں ذہانت کے بجائے مظلومیت اور بے چارگی کی جھلک ہے۔ جیسے وہ یں بڑے مدھم اور دھیمے انداز میں کہہ رہی ہوں "تم دیکھ رہے ہو۔ راجندر سنگھ بیدی انسان نہیں فرشتہ ہے۔ لیکن افسوس ہاس دُنیا میں ؤں کے لئے کوئی جگہ نہیں"

دس پندرہ منٹ بیٹھنے کے بعد راجندر سنگھ بیدی اور اُس کا ساتھی (جو دھرم پرکاش آنند تھا) رخصت ہوئے۔ کرشن چندر نے ایک سرد آہ ے ہوئے کہا "کاش اتنا اچھا افسانہ نویس ڈاک خانے میں اپنا وقت برباد نہ کرتا" "ڈاک خانے میں"! یا الٰہی۔ یہ کرشن چندر کیا کہہ رہا ہے۔ ی ایسا افسانہ نویس اور ڈاک خانے میں۔

"ڈاک خانے میں وہ کیا کرتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

" معمولی ملازم ہے" کرشن چندر نے ایسی آواز میں جواب دیا جس پر ماتم کا گمان ہوتا تھا۔

یہ میری راجندر سنگھ بیدی سے پہلی ملاقات تھی۔

اُسی سال کرسمس کے دنوں میں مجھے ایک دفعہ جنرل پوسٹ آفس میں جانے کا اتفاق ہوا۔ میں نے دیکھا کہ ایک کھڑکی کے پیچھے راجندر سنگھ بیدی بیٹھا ہوا بجلی کی سی تیزی سے خطوط اور لفافوں پر مُہریں لگا رہا ہے۔ ایک لفافہ۔ دوسرا لفافہ۔ تیسرا لفافہ..... چوتھا لفافہ..... لفافوں کا سلسلہ ہے۔ کہ ختم ہونے میں نہیں آتا۔ کبھی کبھار وہ دائیں طرف لگی ہوئی گھڑی پر اُچٹتی نظر ڈال لیتا ہے۔ اور پھر اُسی برق رفتاری سے مُہریں لگانے لگتا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر میرا دل بیٹھ گیا۔ ایک آدھ بار سوچا۔ کہ اُس کے قریب جاؤں۔ لیکن ہمت نہ ہوئی۔...... راجندر سنگھ بیدی ایک کافی لمبے عرصے تک ڈاک خانے میں مُہریں لگاتا رہا۔ اور ساتھ ساتھ اُردو افسانہ پر اپنی عظمت کی مُہریں ثبت کرتا رہا۔ اور اُس کے علاوہ اُس کے بیشتر احباب کفِ افسوس ملتے رہے۔ کہ قدرت نے اُس کے ساتھ کتنا خوفناک مذاق کیا ہے۔

۱۹۴۰ء میں جون کی ایک شام کو مہندر ناتھ میرے گھر آیا۔ اور بڑے اُداس لہجے میں کہنے لگا۔ جب سے بیدی کا تبادلہ لاہور چھاؤنی ہوا ہے۔ اُس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ چلو آج بیدی کے پاس چلتے ہیں۔" مہندر ناتھ کی بیدی سے اس ناگہانی عقیدت کا راز میری سمجھ میں نہ آیا۔ کیونکہ اکثر میں اور مہندر۔ کرشن چندر کو چڑانے کے لئے بیدی کی بُرائی کیا کرتے تھے۔ کرشن چندر پلنگ پر لیٹے ہوئے ہوتے۔ مہندر اور میں فرش پر۔ ہم دونوں میں سے کوئی بیدی کو زیرِ بحث لے آتا۔

مہندر۔ یار یہ بیدی بالکل فراڈ (FRAUD) ہے۔ پنجاب کا سب سے بڑا فراڈ۔ خدا جانے لوگ اِسے افسانہ نویس کیوں سمجھتے ہیں۔

میں۔ لوگ تو بالکل جاہل ہیں۔ مہندر۔ اور پھر اتنے جاہل بھی نہیں۔ دراصل وہ بیدی کو بناتے ہیں۔ کہ لے بھئی تو بھی افسانہ نویس ہے۔

کرشن چندر۔ شیطان! کیا بک رہا ہے۔ بیدی کی عظمت میں شک کرنا کفر ہے۔

میں۔ اور بیدی پر ایمان لانا ذہنی دیوالیہ پن ہے۔

مہندر۔ کتنا اُلجھا ہوا اسلوبِ بیان ہے بیدی کا۔

میں۔ بالکل۔ جیسے جیسے۔

مہندر۔ ہاں ہاں جیسے۔

میں۔ جیسے گیسوں (بالوں) میں کنگھی کرتے وقت کنگھی اُلجھ کر رہ جائے۔

کرشن چندر۔ بکواس مت کرو۔ جس چیز کا علم نہ ہو۔ اُس کے متعلق فتوے مت دیا کرو۔

مہندر۔ کرشن جی۔ آپ تو خواہ مخواہ بیدی کی طرفداری کر رہے ہیں۔ میں کہتا ہوں۔ جیسے افسانے بیدی لکھتا ہے۔ اُس سے بہتر میں افسانے لکھ سکتا ہوں۔

کرشن چندر۔ لکھ سکتے ہو۔ تو لکھتے کیوں نہیں۔ بیدی نے تمہیں منع کیا ہے کیا؟

مہندر ناتھ نے اُس وقت تک لکھنا شروع نہیں کیا تھا۔ اور یہ حقیقت ہے۔ کہ بیدی سے بہتر افسانے لکھنے کے رقیبانہ جذبہ نے مہندر ناتھ کو افسانہ نویس بنا دیا۔ اور جب مہندر نے شروع شروع میں افسانے لکھے۔ تو اُسے بیدی پر ایمان لانا ہی پڑا۔

چنانچہ میں اور مہندر نے فیصلہ کیا۔ کہ آج بیدی کے ہاں ایک دلچسپ شام گزاری جائے۔ چھ بجے کے قریب ہم لاہور چھاؤنی میں بیدی کے مکان پر پہنچے۔ پتہ چلا کہ بیدی صاحب ابھی ڈاک خانے سے واپس نہیں آئے۔ ڈاک خانے گئے۔ بیدی نے نہایت لجاجت سے کہا۔ آج کام کچھ زیادہ ہے۔ ساڑھے چھ بجے سے پہلے فارغ نہ ہو سکوں گا، ہم دونوں اُس کے گھر پر انتظار کرتے رہے۔ پونے سات بجے بیدی ڈاک خانے سے لوٹا۔ ہم اُسے لعن طعن کرنے لگے۔ ڈاک خانے کی ملازمت میں کیا رکھا ہے۔ اِسے ترک کیوں نہیں کرتے۔ کب تک

یہ عجیب مذاق برداشت کرتے رہوگے۔ بیدی بھیگی بلی بنا ہماری ڈانٹ ڈپٹ سنتا رہا۔ کبھی کبھی ایک پھیکی ہنسی کے ساتھ کہہ دیتا: "ملازمت چھوڑ دوں تو کیا کروں۔ بڑی ذمہ داریاں ہیں۔ دو تین بچے ہیں۔ ایک بھائی کالج میں پڑھتا ہے۔ میری انگریزی کی تعلیم معمولی ہے۔ کوئی دوسری ملازمت ملے گی نہیں۔" ہم نے اُسے کئی مشورے دیئے۔ لیکن وہ ہر بار یہی کہتا رہا۔ ملازمت چھوڑ دوں تو بھوکا مرونگا۔ اگر گریجویٹ یا ایم۔اے ہوتا۔ تو دوسری بات تھی۔

دراصل بیدی اُن دنوں احساسِ کمتری کا شکار تھا۔ خود اعتمادی اُس میں نام کو نہ تھی۔ اکثر وہ اپنے احساسِ کمتری کا اظہار آنکھیں جھپکا کر یا شانے ہلا کر کیا کرتا تھا۔ ہم میں سے اکثر اُس کی اِس کمزوری سے واقف تھے۔ اور کبھی کبھی اُس کو شرارتاً بنایا بھی کرتے تھے۔

"بیدی صاحب۔ اگر آپ نے انگریزی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہوتی۔ تو آپ کا شمار صفِ اوّل کے افسانہ نویسوں میں ہوتا۔"

"ہاں یار۔ یہ تو کافی حد تک صحیح ہے۔ دراصل حالات ہی ایسے تھے۔ کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکا۔"

"بیدی صاحب۔ آپ کے افسانوں میں ایک چیز بڑی طرح کھٹکتی ہے۔ اور وہ ہے رومانیت کا فقدان۔"

"یار۔ میری زندگی ہی تو ایسی ہے۔ رومانیت کہاں سے آجاتی۔"

"بیدی صاحب۔ اگر آپ معمولی سوٹ کی بجائے بڑھیا سوٹ پہنتے تو کتنے اچھے لگتے۔"

"یار۔ ساٹھ روپے میں بڑھیا سوٹ کس طرح پہن سکتا ہوں۔"

"بیدی صاحب۔ اگر آپ کے اسلوبِ بیان میں انفرادیت ہوتی تو کیا بات تھی۔"

"یار۔ مجھے خود اِس کمزوری کا احساس ہے۔ لیکن کیا کروں۔"

اِس ضمن میں مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آگیا۔ ایک دفعہ بیدی سے میری ملاقات سرِ راہ ہوئی۔ اُس وقت بیدی 'ادبِ لطیف' کا اعزازی مدیر تھا۔ وہ مجھے ادبِ لطیف کے دفتر لے گیا۔ اور اپنی کتاب 'دانہ و دام' اُٹھا کر کہنے لگا۔ میں آپ کو اپنے دو افسانے پڑھ کر سنانا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد آپ سے ایک سوال کرونگا۔ دونوں افسانے پڑھنے کے بعد اُس نے پوچھا "بتائیے ان دونوں میں سے کونسا افسانہ پسند آیا۔"

"دونوں۔"

"اچھا۔ پہلے افسانے کا اسلوب بہتر ہے۔ یا دوسرے کا۔"

میں اُس وقت بیدی کو بنانے کے موڈ میں تھا۔ اِس لئے میں نے بڑی سنجیدگی سے کہا "بیدی صاحب۔ اسلوب کا مسئلہ ذرا پیچیدہ ہے۔ دراصل جب تک آپ اسلوب پر جرمن مصنف وان گان زان۔ زٹ وٹ برگ کی کتاب نہ پڑھیں۔ آپ اسلوب کی پیچیدگیوں کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ میرے پاس یہ کتاب ہے۔ وہ میں آپ کو پڑھنے کے لئے دونگا۔

بیدی سچ مچ میری باتوں میں آگیا۔ اُس کے بعد کئی دفعہ اُس نے مجھ سے وان گان زان زٹ وٹ برگ کی کتاب لانے کے لئے کہا۔ اور میں ہر بار کوئی نہ کوئی عذر پیش کر کے اُسے ٹالتا رہا۔

اور پھر ایک دن بیدی نے کرشن چندر کے کہنے پر ڈاک خانے کی ملازمت ترک کر دی۔ اُس کے سب دوستوں کو تعجب ہوا۔ کہ بیدی جیسے کم ہمت شخص نے یہ فیصلہ کیسے کر لیا۔ پھر پتہ چلا۔ کہ بیدی آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہوگیا ہے۔ ریڈیو میں جانے کے بعد بیدی کی گوناگوں ایڈوینچرز (ADVENTURES) کا دور شروع ہوا۔ وہ لاہور سے دہلی پہنچا۔ جہاں وہ پبلک ریلیشن ڈیپارٹمنٹ میں ایک معزز عہدے پر تعینات ہوا۔ جنگ کے ختم ہونے کے بعد اُس نے 'مہیشوری فلمز لاہور' میں ملازمت کر لی۔ اور فلم "کہاں گئے" کے مکالمے لکھے۔ فلم لائن سے دل برداشتہ ہو کر اُس نے 'سنگم پبلشرز نسبت روڈ' کی بنیاد رکھی۔ اُن دنوں بیدی ایک ملازمت ترک کر کے دوسری اس طرح کر لیتا تھا۔ جیسے کوئی شخص ایک انگوٹھی اُتار کر دوسری پہن لے۔ آج ریڈیو میں ہے۔ کل فلم انڈسٹری میں۔ اور پرسوں ناشر بنا بیٹھا ہے۔

تقسیم ہند کے بعد بیدی لاپتہ ہوگیا۔ اور پھر یکلخت ریڈیو کشمیر کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے نمودار ہوا۔ چند ماہ کے بعد اُس نے ریڈیو کی ملازمت ترک کر دی اور بمبئی چلا گیا۔ جہاں وہ اُس وقت سے اب تک ایک کامیاب افسانہ نویس اور مکالمہ نویس کے فرائض انجام دے رہا ہے۔

میں بیدی کی شخصیت کے متعلق کچھ لکھنا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے بیدی کی زندگی کے اہم واقعات قلمبند کر دیئے۔ در اصل بیدی کی زندگی کا اُس کی شخصیت سے بہت گہرا تعلق ہے۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے۔ تو بیدی کی دو زندگیاں اور دو شخصیتیں ہیں۔ ایک وہ جس کا تعلق اُس بیدی سے ہے جو ڈاک خانے میں ملازم ہوا کرتا تھا۔ اور دوسری وہ جو اُس وقت معرضِ وجود میں آئی جب بیدی نے "چرا کارے کند عاقل، کے مقولے پر عمل کرتے ہوئے ڈاک خانے کی ملازمت ترک کر دی۔

اِس دوسری شخصیت کی نشوو نما زیادہ تر دہلی میں ہوئی۔ چنانچہ جنگ کے ختم ہونے کے بعد جب بیدی دہلی سے لاہور آیا۔ تو ماضی اور حال کے بیدی میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ اب وہ بڑے بڑوں کے کان کاٹتا تھا۔ دلچسپ چوٹیں کرتا تھا چست فقرے کستا تھا۔ اور اُس کے دوست اُس کی باتیں سن کر دل ہی دل میں حیران ہوتے تھے۔ کہ

بات تک کرنی نہ آتی تھی انہیں
یہ ہمارے سامنے کی بات ہے

بھیگی بلی اب مرکھنی گائے میں تبدیل ہو چکی تھی۔ احساس کمتری کی جگہ خود اعتمادی نے لے لی تھی۔ اب بیدی سے بات کرتے ڈر لگتا تھا کہ اگر ذرا کہیں لغزش ہوئی۔ تو بیدی کبھی معاف نہیں کرے گا۔ اپنی گفتگو میں وہ موپاساں۔ چیخوف۔ مائیخل شولوکوف۔ ابلیا اہرن برگ کا ذکر اِس انداز میں کرتا تھا۔ جیسے یہ سب اُس کے بڑے اچھے ذاتی احباب ہوں!۔

اُن دنوں اُس کا محبوب شغل اُن سب دوستوں سے انتقام لینا تھا۔ جو اُسے کبھی شرارتاً بنایا کرتے تھے۔

کسی نے کنہیا لال کپور کا ذکر کیا۔ بیدی نے جھٹ پھبتی کسی "کپور کے متعلق ہی کسی نے کہا ہے۔ کپور ہے کپور تیری کون سی کل سیدھی"

کسی نے ایک مشہور ادیب کی بات چھیڑی۔ بیدی نے برجستہ کہا "ہاں اُس بیچارے نے ہاتھ پاؤں تو بہت مارے۔ لیکن ابھی تک بات بنی نہیں"

کسی اور نے کہا "فلاں شخص نے بڑا اچھا افسانہ لکھا ہے"۔ بیدی نے تبصرہ کیا "اُس کا افسانہ واقعی اچھا کہلاتا۔ اگر اُس سے پیشتر وہی افسانہ موپاساں نے نہ لکھا ہوتا"

بیدی کی غیر معمولی ذہانت کے جوہر اُسی زمانے میں کھلے۔ انہی دنوں کی بات ہے۔ کہ ایک بار اُس نے مجھ پر چوٹ کرتے ہوئے پوچھا "کپور صاحب کارٹون اور کیریکیچر (CARICATURE) میں کیا فرق ہے۔ مثال دے کر واضح کیجئے"۔

میں نے مذاقاً کہا "بیدی صاحب۔ میں قدرت کا سب سے بڑا کارٹون ہوں۔ اور آپ آج سے چند سال پہلے قدرت کے سب سے بڑے کیریکیچر تھے"۔

ہنس کر کہنے لگا "پہلی بات تو بالکل صحیح ہے۔ لیکن دوسری محل نظر ہے"!

ایک بار اُس نے میرے ہاتھ میں "فرہنگ عامرہ" کا نسخہ دیکھ کر کہا "اگر آپ سمجھتے ہیں۔ کہ اس کے مطالعہ کے بعد آپ صحیح اُردو لکھنے لگیں گے۔ تو ایں خیال است و محال است و جنوں۔ کیونکہ آپ کی اُردو صحیح اُردو تو کجا صحیح پنجابی بھی نہیں ہوتی!"

سب سے دلچسپ چوٹ اُس نے ایک دفعہ ایک پرائیویٹ محفل میں کی۔ کسی نے پطرس کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

"کاش وہ "پطرس کے مضامین" کے بعد لکھنا ترک نہ کر دیتے"! بیدی نے نہایت معصوم بن کر کہا "میں پطرس کی دیانتداری کا معترف

ہوں: اُس نے محسوس کیا۔ کہ وہ پطرس کے مضامین، ایسی یا اُس سے بہتر کتاب نہیں لکھ سکے گا۔ چنانچہ اُس نے لکھنا ترک کر دیا۔ کنہیا لال کپور کی طرح نہیں کہ ڈھیٹ بن کر لکھے چلا جاتا ہے۔ حالانکہ تمام سمجھدار لوگ اُس سے عاجز آچکے ہیں ۔“

فطرتاً بیدی بڑا احساس واقع ہوا ہے۔ اُسے ہر ستم زدہ سے آنِ واحد میں ہمدردی یا محبت ہو جاتی ہے۔ وہ شخص دیویندر ستیارتھی ہو۔ (زمانہ ماضی کا دیویندر ستیارتھی) رامانند ساگر ہو (سن بیالیس کا رامانند ساگر) بلونت سنگھ ہو۔ یا بلونت گارگی (پنجابی ڈرامانسٹ) ہو۔ بیدی اُس کے آنسو پونچھنے کے لئے اس فراخدلی سے تیار ہو جاتا ہے۔ جیسے وہ اس فرض کو انجام دینے کے لئے مدت سے چشم براہ تھا۔ وہ اپنا بیش قیمت وقت اُن کی دلجوئی اور خاطر داری میں صرف کر کے ایک عجیب روحانی مسرت محسوس کرتا ہے "گرتے ہوؤں کو تھام لینا"، اُس کے کردار کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ مہمان نوازی میں اُس کا مقابلہ کوئی عربی یا عجمی کر سکتا ہے۔ معمولی سے معمولی واقف کار اُس سے ملنے آئے۔ تو یہ کیفیت ہوتی ہے۔ جیسے بیدی محسوس کر رہا ہو کہ ؏

بن گیا گھر مرا خیام کا گھر آج کی رات

لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی سے بیدی کو والہانہ اُنس ہے۔ خاص کر جب وہ اپندر ناتھ اشک سے ملتا ہے۔ تو سب سے پہلی فرمائش یہ کرتا ہے۔ "کوئی نیا چٹکلہ سناؤ" اشک کی عادت ہے کہ چٹکلہ سنانے کے فوراً بعد ایک فلک شگاف قہقہہ بلند کرے گا۔ اور بیدی چٹکلے پر ہنسنے کی بجائے اشک پر ہنسنا شروع کر دیگا۔

بیدی کی شروع سے خواہش رہی ہے۔ کہ اُس کا نام ایک ہی سانس میں کرشن چندر کے ساتھ لیا جائے۔ شروع شروع میں جب نقادوں نے کرشن چندر کے نام کو بہت اُچھالا۔ اور بیدی کی طرف نسبتاً کم توجہ دی۔ تو اُسے نقادوں کی ذہانت پر شک ہونے لگا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد جب ہر کہ و مہ نے بیدی کا لوہا مان لیا۔ تو اُسے اطمینان ہوا۔ کرشن چندر غالباً بیدی کے سب سے پہلے اور سب سے بڑے مداح ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ "نئے زاویئے" کی جلد ۲ میں اُنہوں نے بیدی کا افسانہ "گرہن" سرِ فہرست رکھا تھا۔ اُس وقت بعض لوگوں نے جو بیدی سے جلتے تھے۔ اعتراض کیا۔ کہ بیدی کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ کرشن چندر نے ان لوگوں سے کہا تھا "میں سمجھتا ہوں کہ اگر نئے زاویئے میں اِس افسانے کے سوا اور کچھ بھی نہ ہوتا۔ تب بھی یہ ایک نمائندہ اور جاندار مجموعہ ہوتا"

بیدی اُس وقت ترقی پسند تھا۔ جب لوگ ترقی پسندی کا مفہوم بھی اچھی طرح نہیں سمجھ سکے تھے۔ وہ خود نچلے طبقہ میں پیدا ہوا اور اُسے اِس طبقہ سے محض ہمدردی نہیں۔ بلکہ عشق ہے۔ اُس نے ہمیشہ اِس طبقہ کی نمائندگی کی ہے۔ اور اس کامیابی سے کی ہے کہ آنے والے دور میں اگر بیدی کو ہندوستان کا گورکی سمجھ لیا جائے۔ تو بہت کم لوگوں کو تعجب ہوگا۔

چھٹپنے میں بیدی نے حالی کا مشہور شعر سنا تھا۔ ؎

فرشتے سے بہتر ہے انسان ہونا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

اُسی وقت سے اُس نے یہ فیصلہ کیا تھا۔ کہ وہ ہر قیمت پر "انسان ہونے" کی کوشش کریگا۔ آج جب کہ وہ زندگی کی چالیس بہاریں دیکھ چکا ہے، وہ فخر سے کہہ سکتا ہے "انسان بننے کے لئے جو محنت کرنی پڑتی ہے، اُس سے میں نے کبھی گریز نہیں کیا۔ چاہے میں مکمل انسان ہوں یا نہیں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں۔ کہ جتنی انسانیت مجھ میں ہے۔ اُس سے زیادہ بہت کم ادباء میں ہوگی۔"

احمد ندیم قاسمی

خدیجہ مستور

بہت دنوں سے میری تمنا تھی کہ ندیم کی شخصیت کے لئے کچھ لکھوں - یہ دیوالی کے دیوں جیسی جگمگاتی ہوئی شخصیت مدتوں سے مجھے متاثر کر رہی تھی - مگر میں ہمیشہ یہ سوچ کر ٹال جاتی کہ کہیں کوئی یہ نہ کہے کہ بہن نے بھائی کے لئے ضرورت سے زیادہ لاڈ فرمایا ہے اور ادھر ہماری "بیچاری" اپنا سا منہ لے کر رہ جائے - لیکن اب جبکہ طفیل صاحب "نقوش" کا شخصیت نمبر مرتب کر رہے ہیں اور مجھے لکھنے کی دعوت دی ہے تو پھر کیوں نہ میں اپنی دیرینہ تمنا پوری کر لوں - ویسے ایک بات چپکے سے کہہ دوں کہ ندیم نے مارے لاڈ کے مجھے اپنے اکلوتے بھانجے سے بیاہ کر اپنی بہو بھی بنا لیا ہے - میں ٹھہری سچی عورت - اب زیادہ کیا وضاحت کروں - آپ کو پتہ ہی ہے کہ خسر سے تھوڑی بہت رواداری کتنی ضروری ہے ، اس لئے انشاءاللہ پورے خلوص سے ان کی شخصیت کے ہر پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش کروں گی - اس کے باوجود اگر آپ کو کوئی خطرناک پہلو نظر نہ آئے تو یہ میرا قصور نہیں بلکہ ندیم کا قصور ہوگا -

ہاں تو ندیم سے ہمارے گہرے مخلصانہ تعلقات کی عمر اتنی ہی ہے جتنی کہ پاکستان کی - اس سے پہلے جب ہمارا گھرانا لکھنؤ میں آباد تھا تو ندیم سے بس تھوڑی سی جان پہچان تھی - ان دنوں ندیم "ادب لطیف" کے ایڈیٹر تھے - انہوں نے افسانوں کے لئے خطوط لکھے اور ہم نے بڑی سعادتمندی سے افسانے دے دیئے - ایڈیٹروں سے افسانہ نگاروں کا صرف اتنا ہی رشتہ ہوتا ہے مگر جانے کیوں جب بھی ندیم کا خط آتا تو ہمیں محسوس ہوتا کہ یہ خط ایڈیٹروں کے خطوط سے کچھ الگ تھلگ ہے - ایک بار ہم لوگوں نے کافی عرصے تک نہ تو ندیم کے خط کا جواب دیا اور نہ افسانہ بھیجا - پھر ندیم کا خط آیا تو اس میں افسانے کی تکرار کے بجائے ہماری خیریت پوچھی گئی تھی اور ہمیں اس شخصیت سے جانے کیوں یوں ہی ایک کھویا کھویا سا خلوص محسوس ہونے لگا - انہی دنوں ہم لوگ ایک عجیب و غریب مصیبت سے دوچار ہو گئے - ہمارے ابا میاں ہمارے بچپن ہی میں مر گئے تھے اس لئے آس پاس کی دنیا بڑی منتشر نظر آتی ، پھر غیروں سے کیا کہتے اپنا دکھ درد - بس یوں سمجھئے کہ بغیر کچھ سوچے سمجھے بہن نے اور ہاجرہ نے ندیم کو ایک خط لکھتے ہوئے اس مصیبت کا ذکر بھی کر دیا اور ان سے مشورہ طلب کیا - جب خط ڈاک کے سپرد کر دیا گیا تو فی البدیہہ اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ آخر یہ کیا حرکت کی ہے - بھلا ندیم ہماری اماں کے کون سے ہوتے سوتے ہیں جو انہیں ایسی خطرناک بات لکھ دی - اب اللہ جانے یہ شخص کیسے کیسے شان میں یہ خط دکھائے گا اور جانے کیسی کیسی "شاندار" باتیں ہوں گی - اپنی عقلمندی کے سلسلے میں جتنی خوش فہمیوں میں مبتلا

تھے ساری خاک ہوگئیں —— ابھی سوچنے اور کڑھنے کا سلسلہ جاری تھا کہ ندیم کا رجسٹرڈ خط آ دھمکا۔ نہ صرف بڑی محبت سے ہمیں مشورہ دیا تھا بلکہ ہمارے خط بھی واپس کر دیئے تھے۔ ہم نے مارے حیرت کے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے خطوں کو دیکھا کہ کیا واقعی یہ وہی خط ہیں۔ کیا واقعی کوئی دوسرا شخص ان خطوں کو بغیر مانگے واپس کر سکتا تھا۔ کیا واقعی ہماری اس عظیم بے وقوفی سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا ——

مگر اب جبکہ میں سات سال سے ندیم کے بالکل قریب ہوں تو مجھے خطوں کی واپسی کا قصہ بالکل مضحکہ خیز لگتا ہے۔ یہ بات تو بڑی معمولی تھی۔ ندیم تو نہ جانے لوگوں کے ایسے کتنے واقعات پر پردہ ڈالے اس طرح پھرتے ہیں جیسے کوئی بات ہی نہیں۔

ندیم ۲۰ نومبر ۱۹۱۶ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں والد کا انتقال ہوگیا اور زندگی بڑی بے دردی سے گزرنے لگی۔ وجہ یہ تھی کہ ندیم کے والد مرحوم خدا کی محبت میں اس قدر سرشار رہتے تھے کہ دنیاوی نعمتوں کی کبھی پروا نہ کی۔ چند بیگھے زمین سے پیدا ہونے والی گندم اور ماں کی محبت، لے دے کے یہی دو سہارے تھے جن پر ندیم کی زندگی کا انحصار تھا۔ رہ گئی تعلیم وغیرہ تو اس کا کوسوں پتہ نہ تھا۔ مشفق ماں اپنی تینوں یتیم اولادوں کے لئے ہر دم فکر مندی سے لرزا کرتیں۔ مگر جب تعلیم کا زمانہ آیا تو ندیم کے ایک چچا نے جو گورنمنٹ کے ایک اچھے خاصے عہدے پر فائز تھے۔ ندیم اور ان کے بڑے بھائی محمد بخش کو اپنے پاس بلا لیا۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ افلاس میں پلا ہوا بچہ کوٹھی، کار اور چچا چچی کی بے انتہا محبت کے باوجود خود کو عیش میں نہ پا سکا بلکہ وہ ہر وقت لکھنے پڑھنے اور شاندار مستقبل کو خوش آمدید کہنے کی تیاریاں کرتا رہا۔ ندیم نے بی اے میں امتیازی کامیابی حاصل کی تو اس وقت تک چچا کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا تھا۔ اور اس کے بعد انتہائی جدوجہد کے باوجود وہ آگے تعلیم جاری نہ رکھ سکے —— سچی بات تو یہ ہے کہ آج ندیم جو کچھ ہیں اس میں ان کے چچا کی تعلیم و تربیت کا بڑا ہاتھ ہے۔ یہ یقینی بات ہے کہ اگر بچپن میں ندیم کو کوئی بھی سہارا نہ ملتا تو پھر وہ جانے کیا سے کیا بن جاتا۔ چچا کے اس عظیم سہارے کے باوجود وہ کون سا ایسا غم ہے جو انہوں نے نہ سہا ہو۔ وہ لوگوں کی ایذا رسانی پر ہنس دیا کرتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ ندیم کو ان ہی چیزوں نے صحیح معنوں میں ندیم بنا دیا۔ جو بیس تیس سال کی مدت تک انتہائی بے دردیاں سہنے کے باوجود وہ بدخواہ انسان نہیں بنے۔ بڑے انسانوں کے ساتھ ساتھ انہیں چھوٹے انسانوں سے بھی سابقہ پڑتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ انسان کی عظمت کے بے حد قائل ہیں۔ ایذا رسانیوں کی کوئی نہ کوئی وجہ تلاش کرکے وہ سب کو معاف کر دینے کے عادی ہیں۔ ان میں ایک شے کبھی منتقمانہ جذبات پیدا نہ ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی پسند نہیں کرتے کہ ایسے لوگوں سے جنہوں نے اپنی باتوں یا حرکتوں سے انہیں دکھ پہنچائے ہیں، خود مل بیٹھیں۔ لیکن اگر ایسے لوگوں کو ندیم سے کوئی کام پڑ جائے تو وہ ان کے کام کو اپنے تمام ضروری کاموں پر ترجیح دیں گے اور ان سے ملیں گے بھی اس طرح جیسے وہ سب کچھ بھول چکے ہیں —— سچ کیوں نہ کہوں کہ میں نے اکثر ندیم کے دل میں منتقمانہ جذبات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ وجہ یہ تھی کہ بعض منافقوں نے نہ جانے کن جذبات کی بنا پر ندیم کے ساتھ ہم دونوں بہنوں کو بھی بدظن کرنا چاہا۔ غصہ اور افسوس کی وجہ سے ہم آپے سے باہر ہو ہو گئے مگر ندیم جو اپنی اکلوتی بہن سعیدہ کی طرح ہمیں چاہتے ہیں، ذرا بھی آپے سے باہر نہ ہوئے۔ غصہ بھی کیا، رنجیدہ بھی ہوئے مگر ایسی باتوں کا جواب دینے کو تیار نہیں۔ "ارے بلو، پھر ہم میں اور ان میں فرق ہی کیا رہ جائے گا۔ یعنی میں بھی ایسی حرکتیں کرنے لگوں" —— اور مجھے واقعی ان پر غصہ آ جاتا۔ میں نے کئی بار سنجیدگی سے سوچا کہ یہ شخص بنتا ہے۔ خواہ مخواہ خود کو عظمتوں کا پوٹ ثابت کرتا ہے۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ مگر پھر اپنے خیال پر خود ہی شرمندہ ہونا پڑتا —— بھلا کوئی شخص خود کو ساری زندگی کیسے چھپائے رکھ سکتا ہے۔ یہ کام تو اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ کچھ کو چھوڑ کر باقی تمام پنجابیوں کے لئے صحیح ش ق اف بولنا۔ ان صحیح نہ بولنے والوں میں میرے شوہر ظہیر بابر صاحب بھی شامل ہیں۔ اب اس سے آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ بیچارے ندیم کس قدر بغیر دل گردے کے آدمی ہیں۔ نہ کسی موقع پر غصہ آئے اور نہ منتقمانہ جذبات پیدا ہوں۔ سوچ یہ ہے کہ منتقمانہ جذبات پیدا ہوتے ہیں اور بڑی شدت سے مگر صرف بڑی بڑی ظالم قوتوں کے خلاف، اور ان جذبات

کی تسکین کو اپنا پہلا اور سب سے بہترین فرض سمجھتے ہیں۔ انفرادی چھوٹی چھوٹی نیچی حرکتوں پر تو وہ افسوس کے ساتھ خاموشی کو بہتر سمجھتے ہیں۔

ندیم نے عمر کا خاصا حصہ تنگ حالی اور پریشانیوں میں گذارا، مگر کبھی تنگدل نہ ہوئے۔ جو بھی پاس ہوا وہ احباب و متعلقین اور اپنے اوپر یا جو بھی ضرورتمند ہوا اس پر خرچ کر دیا اور پھر جب یہ خیال آیا کہ صبح چائے بھی ملے گی یا نہیں تو اس طرح پوری قوت سے ہنسیں گے جیسے کوئی بڑے مزے کا لطیفہ ہاتھ آ گیا ہو۔ میرا خیال ہے کہ ان کی تنگدستی کی اصل وجہ بھی حد سے بڑھی ہوئی فراخدلی ہے۔ ورنہ تعلیم کے بعد ایسا تو کبھی بھی نہ ہوا کہ ندیم نے گذر بسر کرنے کے لائق روپیہ نہ پیدا کر لیا ہو۔ اور آج بھی جبکہ وہ چھ سات سو روپے کما لیتے ہیں تب بھی تنگ حال ہیں۔ اس فراخدلی کے سلسلے میں انہیں کوئی نہیں سمجھا سکتا۔ اگر کوئی سمجھائے تو سخت بددل اور رنجیدہ ہو جاتے ہیں۔ زیادہ قریبی لوگوں سے بڑے پیار کے ساتھ الجھ بھی لیتے ہیں۔

بچپن میں ندیم بے حد شریر تھے۔ بڑی سے بڑی شرارت کرنے سے نہ چوکتے۔ ایک بار ندیم کے بڑے بھائی محمد بخش اور چچا زاد بھائی حیات مرحوم کہیں سے ایک کتاب مار لائے جس کا نام تھا "کالا جادو"۔ کتاب سخت جادوئی اور دلچسپ تھی۔ دونوں نے اس خیال سے کتاب کو چھپا چھپا کر پڑھا کہ کہیں بیچ ہی سے ندیم نہ اچک لے۔ ندیم بچپن ہی سے کتابوں کے مطالعے سے بڑا شغف رکھتے تھے، اس لئے پہلے تو شرافت سے کتاب مانگی اور پھر جب ملنے کی کوئی امید نہ رہی تو حضرت چھت پر چڑھ گئے۔ حیات اور محمد بخش بھائی یہ سمجھ کر کہ بالکل بے خطر ہیں صحن میں بیٹھ کر اس پر اسرار کتاب کی باتیں کرنے لگے کہ اچانک آسمان سے بالکل جادو کی قسم کی بارش ہونے لگی۔ ذرا دیر بعد معلوم ہوا کہ ندیم انہیں سزا دینے کے لئے اوپر سے شاشیدن کا مصدر گردان رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ دونوں بھائی ان سے چھوٹے موٹے بھی بڑے تھے۔ بڑے نے اس لئے بری طرح پٹائی کی۔ بڑے بھائی ان کی شرارتوں سے اس قدر تنگ تھے کہ نہ تو ان سے نفرت سے دوستی کرتے نہ [illegible] تنبیہ دیتے اور مار نے لگتے۔ ندیم شریر تو تھے مگر مار پیٹ میں تیز نہ تھے۔ بس یوں ہی دھمکیاں دے کر رہ جاتے۔ بھائی [illegible] مزے مزے کے بیر کھاتے اور یہ نیچے کھڑے پہلے تو بیر مانگتے اور پھر گٹھلیاں مارنے کی سوچتے۔ روز [illegible] کے خیال سے جان سرکتی۔ شرارتوں کا یہ سلسلہ آج تک قائم ہے۔ والدہ اور سب بہنیں اب تک انہیں [illegible] تو بھاگتی ہیں اور وہ اپنے کمرے میں بند ہو کر پناہ لیتے ہیں۔ ویسے جہاں وہ بے تکلف نہ ہوں بے حد سنجیدہ رہتے ہیں۔ بے تکلف دوستوں میں خوب چہکتے ہیں۔ پچاسوں لطیفے یاد ہیں۔ اگر وقت بے وقت لطیفوں کا اسٹاک ختم ہونے لگے تو فی البدیہہ لطیفہ گھڑ لینے میں بھی ملکہ حاصل ہے۔

گھریلو زندگی میں وہ بے حد چھوٹے اور شریر بچے نظر آتے ہیں۔ والدہ سے لے کر دو سال کے معصوم بچوں کو بھی چھیڑتے رہتے ہیں۔ میری سات سالہ بھانجی صبوحی کی گڑیا کو دیکھتے ہی کوسنے لگتے ہیں "اللہ کرے مر جائے صبوحی کی گڑیا" اور صبوحی منہ پھاڑ پھاڑ کر رونے لگتی ہے۔ ہنسنے میں ندیم بے تحاشہ فراخدل ہیں۔ اس کے باوجود میں نے آج تک انہیں بلند قہقہے لگاتے نہیں سنا۔ وہ کچھ عجیب سے ہنستے ہیں۔ ان کی ہنسی واقعی بہت خوبصورت ہے۔ ہنستے ہوئے ان کے چھوٹے مگر ذرا چوڑے چوڑے دانت صاف نظر آتے ہیں، ہر دانت کے بیچ میں کھڑکی سے جس سے ان کی ہنسی معصوم بھی لگتی ہے۔

ندیم لوگوں کی مضحکہ خیز حرکتوں اور باتوں کا مذاق اڑانے میں واقعی بڑے حاذق ہیں۔ محال ہے کہ کوئی مضحکہ خیز بات یا حرکت ان کی نظر سے بچ جائے۔ [illegible] سامنے تو شرافت سے بیٹھے رہیں گے اور [illegible] بیٹھے نہیں کہ قیامت آ گئی۔ ندیم میں ایک اور کچھ دلچسپ اور کچھ عجیب سی بات ہے۔ وہ یہ کہ اگر کسی کو [illegible] نظر آ جائے تو اس پر انہیں بہت ہنسی آتی ہے۔ [illegible] بڑا دلچسپ ہوتا ہے جب ندیم اس شخص کا حلیہ بتاتے ہیں تو حرکتوں اور باتوں دونوں کا استعمال کرتے ہیں اور [illegible] سے جو حلیہ بتانے کی کوشش فرماتے ہیں۔ میں نے اکثر ان کو اس حرکت پر ٹوکا ہے۔

"لالہ تمہاری یہ کیا عادت ہے کہ انسان کے جسم و جثّے کا مذاق اُڑاتے ہو؟"

"بس یار ایسے لوگوں کو دیکھ کر مجھے کچھ ہونے لگتا ہے۔ اس میں میری کوئی بُری نیت نہیں ہوتی۔" اور بغیر کسی شرمندگی کے بڑے چار فٹ گیارہ انچ جسم کا مذاق اُڑا کر مجھے بھاگنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں شاید ندیم پکڑے بھی جاتے مگر صاف بچ گئے۔ ہُوا یوں کہ میں، ظہیر بابر صاحب اور ندیم بھائی محمد بخش کو خوش آمدید کہنے اسٹیشن پہنچے۔ بھائی چونکہ انگلینڈ سے واپس آ رہے تھے اور وہ بھی مدتوں کے بعد، اس لئے ہم سب سخت بے چین تھے کہ بس کسی طرح ٹرین آ جائے۔ مگر ٹرین آدھ گھنٹہ لیٹ تھی۔ ظاہر ہے کہ اِدھر اُدھر متوجہ ہو کر وقت گزارنا تھا۔ اور میں وقت گزار رہی تھی کہ مجھے ایک بے حد توندیل لمبی ٹھوڑی اور گنجے جیسی پیشانی والے صاحب نظر آئے۔ مجھے جانے کیا ہُوا کہ ندیم کو دکھا دیا۔ بس جناب نے ہنس ہنس کر ان کے حلیے کی نقل کرنا شروع کر دی اور ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ وہی صاحب اچانک ہمارے سروں پر نازل ہو گئے۔ ندیم نے جلدی سے خود کو ٹھیک کر کے حیرت سے ان کی طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں "یار مجھے مارنا مت" مگر وہ صاحب بڑی عقیدت سے ہاتھ ملاتے ہوئے یہ بتا کر چلے گئے کہ "میں آپ کا ایک عقیدت مند ہوں آپ کو دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی۔" کاش ان صاحب نے دیکھ ہی لیا ہوتا کہ جس سے عقیدت ہے وہ کیا کر رہا تھا۔ ویسے وہ کسی لنگڑے کانے یا لُولے کا مذاق نہیں کریں گے۔ بلکہ جو مذاق کرے گا اسے ڈانٹ دیں گے۔

ندیم کے آپ نے بہت سے فوٹو دیکھے ہوں گے۔ آپ کو وہ لگے بھی خاصے خوبصورت ہوں گے۔ مگر میں آپ کو سچ بتا دوں کہ ندیم اتنے خوبصورت نہیں۔ ان کے خوبصورت گھنگھریالے بالوں اور ہونٹوں کی وجہ سے کیمرہ ان پر مہربان رہتا ہے۔ گندمی رنگ، موٹی ناک، نہ دُبلے نہ موٹے، پانچ فٹ آٹھ انچ کے انسان ہیں۔ ایک رخسار سے ذرا نیچے چاقو کے زخم کا گہرا نشان ہے۔ (یہ نشان بڑے بھائی سے ایک گنڈیری چھیننے کا خمیازہ ہے) مگر عجیب بات ہے کہ یہ زخم کا نشان ان کے چہرے پر بُرا نہیں لگتا۔ بس ہم تو یہ جانتے ہیں کہ بعض لوگوں کے ہنستے ہوئے گالوں میں ننھے منے گڑھے پڑتے ہیں۔ ندیم کے رخسار پر ایک طویل و عریض گڑھا ہر دم پڑا رہتا ہے، یہ بھلا کن خوش نصیبوں کو نصیب ہو سکتا ہے۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ انکے دیکھنے والوں کو کبھی پلاسٹک سرجری کا خیال نہ آیا ہوگا۔ ندیم کی آنکھیں بڑی عجیب سی ہیں۔ بادامی رنگ کی آنکھیں جن میں ذہانت کے ساتھ ایسی بھرپور معصومیت ہے جو میں نے بہت کم لوگوں کی آنکھوں میں دیکھی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر ان کی ایسی آنکھیں نہ ہوتیں تو وہ یہ ندیم نہ ہوتے۔ وہ تو کوئی اور ہی ندیم ہوتا۔ یہ تو وہ ندیم ہے جس سے ان کے صرف جاننے والے تک محبت کرتے ہیں۔ اس سے کبھی کوئی بھولے بھٹکے دشمنی باندھنے یا ندھنے دوستی کا ہاتھ بڑھا دیتا ہے۔ اور اختر شیرانی مرحوم، شراب کے رسیا، پیتے ہوئے کسی کا احترام نہ کرنے والے، ندیم کے اُستاد، ندیم کی موجودگی میں ندیم سے چھپ کر پیتے۔ میرا خیال ہے کہ یہ ندیم کی آنکھوں کا کرشمہ تھا۔ اور یہ بھی ان کی آنکھوں ہی کا قصور ہے کہ جتنی بھی لڑکیاں عقیدت کی وجہ سے ملتی ہیں وہ پہلی ہی ملاقات میں لالہ اور بھائی کے خطاب سے نوازی جاتی ہیں۔

نظموں والی محبوبہ کے علاوہ میں نے ندیم کا کوئی اسکینڈل نہیں سنا اور نہ کوئی چونکا دینے والی بات دیکھی ہے۔ ہزاروں بار نہیں کریدا کہ یہ محبوبہ کون تھی، کیا تھی، کیا واقعی تم اس سے محبت کرتے تھے؟ مگر ندیم آج تک کچھ نہ بولے۔ نہ تو وہ ہاں کرتے ہیں اور نہ نہیں۔ ہمیشہ ایک ہی بات فرماتے ہیں [illegible] ندیم مجھ سے اور ہاجرہ سے بے حد محبت کرنے کے باوجود آج تک اس سلسلے میں کچھ نہ بتا سکے مگر مجھے یقین ہے کہ یہ [illegible] ندیم کو چھیڑ دو تو وہ حضرت کنی کاٹنے لگتے ہیں۔ زیادہ ستاؤ تو ایسی نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں جیسے کہہ رہے ہوں کہ "اچھا تو پھر تمہارا اجارہ ہے، کی تھی محبت؟"

پڑھنے لکھنے سے ندیم کو عشق ہے۔ رات کے بارہ بارہ بجے تک مطالعہ کرنا یا پھر لکھنا دن کا سب سے محبوب مشغلہ ہے۔ اگر خدانخواستہ وہ چند دن نہ لکھ پڑھ سکیں تو سخت بیزار ہو جاتے ہیں۔ اب تک انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ماشاءاللہ اچھا خاصا ضخیم ذخیرہ ہے۔ اس پر ایک لطیفہ یاد آ گیا جو خود ندیم نے بے حد محظوظ ہوتے ہوئے مجھے سنایا ـــــ اس لطیفے کے مصنف راجہ مہدی علی خاں ہیں۔ راجہ مہدی کہتے ہیں کہ ایک بار میں کسی کو "رسید" کرنے

لاہور ریلوے اسٹیشن گیا۔ وہاں کیا دیکھتا ہوں کہ لاہور کے سارے پبلشرز اور ایڈیٹرز موجود ہیں۔ پوچھا کہ بھائی یہ کس کا استقبال کرنے آئے ہو۔ انہوں نے بتایا کہ ندیم صاحب کے افسانوں اور نظموں کی بلٹیاں اسی ٹرین سے آ رہی ہیں، وہی چھڑانے آئے ہیں۔

اس کے باوجود جب ندیم سے پوچھو کہ کہو لالہ کچھ لکھ رہے ہو تو فوراً منہ بسور لیں گے۔

نہ کیا یار! ایک ہفتے سے کچھ نہیں لکھا۔ بس چند شعر لکھ سکا ہوں، ایک کہانی شروع کی تھی اور بس۔ کاش مجھے ہر طرف سے سکون ہوتا، یہ پیٹ کمانے کی فکریں نہ ہوتیں۔ یہ خواہ مخواہ بھرتی کا کام نہ کرنا پڑتا تو پھر میں واقعی کچھ لکھتا —— یہ کچھ لکھنے کی بھوک کا غم ہے جو انہیں اکثر ستایا کرتا ہے۔

ندیم نے محکمۂ آبکاری سے لے کر بیکاری تک کو بھگتا ہے۔ مگر کبھی خودداری کو چوٹ نہ لگنے دی۔ ایک بار ندیم کے —— ایک بدمزاج افسر کو کسی بات پر غصہ آ گیا، اور اس نے ندیم کی طرف جلتی ہوئی سگریٹ کھینچ ماری، ندیم نے جواباً دوات اس کے منہ پر دے ماری جو اتفاق سے دیوار پر جا لگی —— یہ اس زمانے کی بات ہے جب ندیم نے تعلیم کے بعد پہلی باقاعدہ ملازمت کی تھی۔ ندیم محکمۂ آبکاری میں رہنے کے باوجود کبھی شراب نہ پی سکے۔ ٹانکوں میں ملی ہوئی جتنی شراب پی ہو خیر سے اس کا کوئی حساب نہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ ویسے انہوں نے کبھی نہیں پی لیکن یہ عجیب بات ہے وہ نہ تو شراب کو برا سمجھتے ہیں اور نہ پینے والوں سے منہ بناتے ہیں۔ کوئی ان کے سامنے پیتا بھی ہے تو وہ ذرا مخل نہ ہوں گے۔ بلکہ انہوں نے تو اپنے کئی دوستوں کو اپنے سامنے پینے دی۔

ندیم نے اسکول اور کالج کے زمانے میں ہر کھیل کھیلا مگر کسی میں بھی کوئی قابل ذکر کارنامہ انجام نہ دیا۔ تاش اور کیرم کے سوا کسی کھیل میں کامیاب نہیں۔ کرکٹ میچ کی کمنٹری ریڈیو پر سنیں گے اور اچھل اچھل پڑیں گے۔ اگر کہو کہ لالہ ذرا تم بھی کرکٹ کھیلا کرو، تو انہیں فوراً صفر پر آؤٹ ہونے کا خطرہ ستانے لگے گا۔ کھیلنے کو سب کھیل جی جان سے کھیلیں گے۔ لیکن اگر ہار جائیں تو پھر منہ اتر جاتا ہے۔ اور اگر ہرانے والا خوشی کا اظہار کرے تو ندیم اس کی طرح طرح کی نقلیں کریں گے اور دو ایک گھونسے بھی جڑ دیں گے۔ مگر یہ سب کچھ گھر میں کرتے ہیں۔

بزرگوں کے سلسلے میں ندیم بے حد سعادت مند ثابت ہوئے ہیں۔ گھریلو معاملات میں ان کی جا و بے جا سن کر سر جھکا دیں گے۔ باہر کی دنیا میں بھی بزرگوں کا احترام حد سے بڑھا ہوا ہے۔ مگر جب کوئی اصولی بات آ جائے تو پھر کیا مجال ہے جو ندیم چپ ہو رہیں، سنبھل سنبھل کر اچھے الفاظ میں اپنی بات کہہ کر رہیں گے۔ یہی بزرگوں والی سعادت مندی بیوی کے ساتھ بھی برتتے ہیں۔ گھریلو معاملات میں اس کی ساری جا و بے جا سنتے رہیں گے لیکن اگر اتفاق سے وہ ان کے پڑھنے لکھنے میں مداخلت کرے تو فوراً سمجھا دیں گے کہ یہ معاملہ غلط ہے —— ندیم کی شادی ان کی والدہ کی پسند سے دیہات میں ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اپنی بیوی سے عشق نہیں کرتے تو نفرت بھی نہیں کرتے، خاصی گذر رہی ہے۔ بیوی کی دلجوئی بسا اوقات بڑھ چڑھ کر کرتے ہیں۔ ان کی دو پیاری پیاری بچیاں ہیں جن پر وہ جان چھڑکتے ہیں۔ مگر یہ مزے کی بات ہے کہ وہ روایتی ابا بالکل نہیں لگتے، اور اپنی بچیوں سے شرارتیں کرنے سے بھی نہیں چوکتے —— لیکن ایسی شرارتیں جن سے بچے خوش ہوں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بچے ان سے بہت جلدی ہل جاتے ہیں۔ دوستوں سے لے کر بہنوں تک کے بچے، انہیں دیکھ کر کھل جاتے ہیں، اور انہیں یاد رکھتے ہیں۔

ندیم کی بیوی، بس برائے نام پڑھی لکھی ہیں۔ اپنے میاں کو "سرتاج من سلامت" کے القاب سے ٹوٹا پھوٹا خط لکھ لیتی ہیں۔ دیکھنے والوں کے لئے ندیم کی زندگی کا یہ ایک بڑا ہی دردناک پہلو ہے کہ ان کی بیوی یہ تک نہیں جانتیں کہ ان کا شوہر کیا ہے —— ندیم جب جیل میں تھے۔ تو ان کی بیوی ان سے مل کر آئیں۔ کافی جھلائی ہوئی تھیں۔ کہنے لگیں "جانے کیا کرتے ہیں۔ کہیں نوکری تک نہیں ملی آج تک —— میرے ابا جی سے آج ہی کہیں تو وہ سفارش کر کے سپاہی بھرتی کرا دیں، پھر کس کی مجال جو جیل بھیجے اور گاؤں میں بدنامی ہو —— اس دن میں نے محسوس کیا کہ ندیم کی زندگی کا یہ پہلو کتنا دردناک ہے —— لیکن ندیم کو اس درد کا احساس بھی ہے یا نہیں، اسے وہ ظاہر نہیں ہونے دیتے —— وہ اپنے تازہ کہے ہوئے اشعار گھر بھر کے سامنے سناتے ہیں اور ان کی بیوی بڑے اہتمام سے حلوہ پکانے میں مصروف ہوتی ہیں ——

حلوے کی بات پر یاد آیا کہ ندیم حلوے کو بے حد پسند کرتے ہیں۔ ان کی حلوہ خوری دیکھ کر مجھے یہ شبہ ہوتا ہے کہ یہ حضرت بھی حلوے کے ڈھیروں پر قناعت کر سکتے ہیں [illegible] جب وہ [illegible] مزے سے کہیں [illegible] ہوتے ہیں تو مجھے یقین ہوتا ہے کہ وہ تھوڑی دیر بعد حلوہ [illegible] ۔ آپ مجھ [illegible] ہوتے ہیں کہ ابھی اٹھے گی یہ بلو! حلوہ پکا دو "حلوہ ان کے خیال [illegible] ان سے پوچھ جائے کہ [illegible] تو فوراً فرماتے ہیں کہ بلو! [illegible] حلوے سے [illegible] ۔ ذرا سا حلوہ پکا دو۔"

امراض کے علاوہ [illegible] اگر کسی شخص [illegible] حلوے کا نام [illegible] رونق [illegible] عیش [illegible] گئے ـــــ ایک بات پیچھے سے کہہ دوں [illegible] بہنوں کی طرح تھوڑا سا ہیں۔

ندیم کی [illegible] بھی عجیب ہوتی ہیں۔ ایک ذرا سا [illegible] ہو جائے تو غضب ہو جاتا ہے [illegible] ہوئے [illegible] پڑے ہیں۔ باورچی خانے میں حلوہ [illegible] حضرت [illegible] بیمار ہوں [illegible] ہم دونوں انتہائی سنجیدہ [illegible] دیکھئے [illegible] دعائیہ باتیں کرتے جاتے ہیں۔ ان کی بیماری کے خوف سے رقت طاری ہے [illegible] اور لالہ صاحب بے ساختہ ہنسنے لگتے ہیں۔ اور سنجیدہ ہونے کی کوشش [illegible] اور ہم پروا کئے بغیر چھوٹی بہنوں سے پوچھتے ہیں "حلوہ بنایا ہے یا نہیں، بھلا [illegible] جب [illegible] ہوا حلوہ آ جاتا ہے تو ندیم جیسے ٹھیک ہو جاتے ہیں ـــ

یہ حلوہ بھی ان کا پرانا مرض ہے۔ دنیا میں سب سے بڑی خاطر حلوہ ہے۔ ندیم کی [illegible] اپنے [illegible] پیارا آتا تو وہ نہیں حلوہ بنا کر کھلاتے ہیں [illegible] نہیں پہنچے گا۔ اب تو حلوہ بہنوں کی [illegible] کسوٹی بن گیا ہے۔ ندیم کی عادت ہے کہ [illegible] عام طور سے حلوہ کھاتے ہیں ـــــ باجرہ [illegible] سے محبت نہیں رہی۔"

اب حلوے کا قصہ [illegible] دوست کی [illegible] یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہ دونوں بھائی تعلیم ختم کر کے لاہور کے [illegible] ندیم نے کچھ [illegible] کر کے پانچ روپے کمائے تھے۔ اور دونوں بھائی اس دن بہت خوش خوش تھے ـــــ [illegible] بھاٹی گیٹ (جہاں وہ مقیم تھے) کی طرف رواں تھے اور حلوہ بنانے کی سوچ رہے تھے۔ اتنے میں ایک پھٹے حالوں مزدور سر پر [illegible] کی ایک میز لئے قریب سے گزرا۔ ندیم نے سوچا اگر اپنے ہاتھ کا پکایا ہوا حلوہ میز پر رکھ کر کھایا جائے تو لطف دوبالا ہو جائے گا ـــــ آپ نے میز کی قیمت پوچھی، مزدور نے کہا پانچ روپے۔ آپ کو غصہ آ گیا بولے ایک روپے میں دو گے ـــــ اور اس نے کہا لو۔ بھائی محمد بخش پر بجلی گر پڑی۔ کل پانچ۔ وہ بھی تو کمائے، جس میں سے تھوڑی خریداری ہو گئی ـــــ اور اب میز کا [illegible] روپیہ، در اصل اس میز سے اب دونوں ہی چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے ـــــ ندیم نے کہا نہیں ہم ایک روپے کی نہیں لیں گے بارہ آنے میں عام ملتی ہیں ـــــ اس نے کہا اچھا بارہ آنے سہی۔ ندیم نے کہا اچھا تو میز بھائی دروازہ میں ہمارے گھر تک پہنچا دو۔ اور اس نے میز گھر تک پہنچا دی ـــــ [illegible] کر ندیم حلوہ بنانے بیٹھے۔ ترکیب دونوں میں سے ایک کو نہ آتی تھی۔ گھی ڈال کر سوجی

ڈالی اور چینی جھونک دی، اپنے حساب سے پانی ڈالا، ساری گٹھلیاں بن گئیں ——— اب لاکھ گھونٹ رہے ہیں مگر سوجی نیچے سے چھٹتی ہی نہیں۔ پھر بھائی محمد بخش نے پانی ڈالنے کی سوچی، اور لوٹا بھر پانی جھونک دیا ——— لالہ کہتے ہیں، وہ ایسا [illegible] حلوہ تھا [illegible] اب تک کسی نے نہ پکایا ہوگا اور بھائی [illegible] کی نالیوں میں کئی دن تک اور وہ دور تک یہ حلوہ بہا رہا۔ لیکن ایک [illegible] نے اس میں سے کافی حلوہ اپنی نازک [illegible] پر رکھ کر کھانے کے لیے بقیہ نالی میں او ندھا یا تھا ——— اب [illegible] جاتا ہے۔

ندیم کو پڑھتے پڑھتے سونے کی عادت ہے ——— سونے میں کراہتے ہیں۔ شاید خواب دیکھتے ہیں ——— جو انہیں ذرا بھی یاد نہیں رہتے ——— صبح وافی دیر سے سو کر اٹھیں گے اور کچھ اخبارات کے حد سنجیدگی سے اپنے بستر پر کڑا ہو بیٹھ جائیں گے۔ اگر اس دوران میں کوئی بدنصیب ان سے بولے تو بڑی بے بسی سے کہیں گے "دیکھو مجھے ستاؤ نہیں۔" اور پھر اسی عالم میں سگریٹ پھونک کر اپنی ضروری کی خاطر سیڑھیاں چڑھتے چلے جائیں گے ——— اب اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ خدانخواستہ حلوے کھا کھا کر ان کا معدہ بیمار ہو گیا ہے۔ قطعی نہیں، ماشاءاللہ ایسا تنومند معدہ ہے کہ انشاءاللہ سو برس ابھی اور حلوے کی کھائیں گے۔

لیکن معدے کی تندرستی ان کے پورے جسم کی تندرستی کی ضامن نہیں ——— اکثر بیمار پڑتے ہیں۔ ایک کان مدتوں سے خراب ہے، ڈاکٹر ایک بہت بڑے آپریشن کا مشورہ دیتے ہیں لیکن وہ راضی نہیں ہوتے۔ اس لیے اکثر کان کے شدید درد میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود دن رات پڑھنے سے باز نہیں آتے ——— اس کان کے علاوہ کئی بار سنجیدگی سے کافی عرصہ بیمار رہتے ہیں ——— مگر کبھی میں نے ان کے منہ سے موت (میرے منہ میں خاک) کے بارے میں نہیں سنا۔

ندیم کو میں نے اس سات سال کے عرصے میں آج تک کبھی نا امید نہیں دیکھا۔ وہ مایوس ہونا جانتے ہی نہیں ——— امید اور یقین سے اس قدر بھرپور انسان میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ ندیم کے چچا زاد بھائی حیات کو دق ہو گئی تھی وہ علاج کی غرض سے لاہور ہمارے گھر پر ٹھہرے تھے۔ ندیم ان سے بے حد محبت کرتے تھے۔ ڈاکٹروں کی مایوسی کے باوجود ندیم کو ان کے تندرست ہو جانے کی پوری امید تھی۔ جس دن حیات کا علاج ختم ہو رہا تھا، اس دن وہ ایک مشاعرے کے سلسلے میں باہر چلے گئے۔ ہم لوگ مریض کے چہرے کی کیفیات دیکھ کر امید کرتے تھے کہ وہ دو چار دن سے زیادہ نہیں جئیں گے۔ لیکن جب ندیم سے اس حادثے کا ذکر آیا تو وہ بالکل یقین نہیں کرتے۔ وہی ہوا ایک رات ما [illegible] ——— اب وہ فکر بیٹھے تو حیات بھائی چل بسے۔ ندیم کا دکھ ناقابل بیان تھا مگر پھر بھی میں نے ان کے منہ سے دنیا کی بے ثباتی کا تذکرہ نہیں سنا۔

ندیم کو زندگی سے بے انتہا لامحدود محبت ہے۔ وہ ایک ایک لمحے کو کام میں لاتے ہیں اور مسلسل جدوجہد کرتے ہیں۔ انہیں ایسے لوگوں سے چڑ ہے جو خواہ مخواہ دکھ پال کر حسرت ناک زندگی گذارتے ہیں اور دوسروں کی ہمدردیاں بٹورنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ڈرامہ کو سامنے دیکھ کر اس کے ڈیل ڈول کے مطابق اس کا سوانگ کرتے ہیں، منہ بناتے ہیں، ٹھنڈی آہیں بھرتے ہیں، سگریٹوں پر سگریٹ پیتے ہیں۔ اونڈھے لیٹتے ہیں اکڑوں بیٹھے جھومتے ہیں، کبھی کبھی آنکھیں بھی ملتے ہیں۔ اور پھر آہستہ آہستہ نہیں بلکہ تیزی سے اس کیفیت سے نکل جاتے ہیں ——— شاید یہی وجہ ہے کہ میں نے ان میں ڈھونڈے سے بھی کوئی نفسیاتی الجھن نہ پائی۔

ندیم بہت نرم دل ہیں۔ اگر ذرا گہری چوٹ لگے تو رو پڑتے ہیں اور رونے سے قطعی نہیں شرماتے۔ آنسوؤں کو دل کا وضو سمجھتے ہیں۔ میں نے ان کو کئی بار دوسروں تک کے لئے روتے دیکھا ہے۔ وہ عینک اتار کر بازو میں منہ چھپا کر کروٹ سے لیٹ جائیں تو سمجھ لیجئے کہ رو رہے ہیں۔ لیکن اگر اس وقت کوئی مزیدار بات کہہ دے تو فوراً ہنسنے بھی لگتے ہیں۔ ہنسی ان کو کس قدر عزیز ہے۔

ندیم زیادہ تر سوٹ یا قمیص پتلون پہنتے ہیں۔ پہنتے بڑی سلیقے سے ہیں۔ پہن اوڑھ کر خاصے پیارے لگتے ہیں۔ اپنے گاؤں جاتے ہیں تو

وہاں کا خاص لباس، چادر، چولا اور بڑا سا پگڑ پہنتے ہیں۔ فارغ بخاری نے بالکل ٹھیک کہا تھا کہ بالکل پٹواری لگتے ہیں۔ کبھی کبھی شلوار قمیص بھی پہن لیتے ہیں۔ اللہ! کیا رُوپ نکالتے ہیں۔ اور کیا چال ہوتی ہے ان کی ـــــ بالکل سپڑ سپڑ! ایک بار ندیم رات کو پھل خریدنے نکلے۔ شلوار قمیص پہنے بیٹھے تھے وہی پہنے چل پڑے۔ خدا جانے میری اور ہاجرہ کی کیا کمبختی آئی کہ انہیں پھل خریدنے کے سلسلے میں سخت پھوہڑ ثابت کرتے ہوئے خود بھی ساتھ ہو لیے۔ آگے آگے ندیم۔ پیچھے پیچھے ہم دونوں۔ سڑک کی گہما گہمی ایک طرف اور ندیم کی چال ایک طرف۔ ہم نے غور سے ندیم کی چال دیکھی تو میں منمنائی "ہائے بھیا کی چال کیسی ہے ہاجرہ؟" اور ہاجرہ نے کہا صبر کرو، خدا بچائے، اب ہو ہی کیا سکتا ہے، اپنا بھائی ہے برداشت کرو۔ مگر اب مدت ہوئی ہمارے اصرار پر انہوں نے شلوار پہننا چھوڑ دی ہے۔ مگر اب بھی کبھی کبھی ان کے کلیجے میں ہوک سی اُٹھتی ہے۔ بہنوں سے شلوار مانگتے ہیں کہ دے دو ایک گھٹنے ٹیکن لوں مگر کیا مجال جو کوئی ان کی یہ آرزو پوری کر دے۔ ان کی اپنی بے چاری شلواریں تو جانے کب کی، پوتڑوں گھبوں میں تبدیل ہو کر دم دے بیٹھیں ہیں ـــــ شلوار میں ان کی چال کتنی بے ڈھنگی ہو جاتی ہے کہ بس کیا بتاؤں۔

اچھے کپڑوں پر ہمیشہ جان دیتے ہیں۔ اور اچھے کپڑوں کا اندازہ قیمت سے لگاتے ہیں۔ اپنے لئے جوتا، کنگھا، برش، بلیڈ، ریزر، تیل یا اس قسم کی جو چیز بھی لائیں گے قیمتی سے قیمتی۔

ندیم جس جگہ رہیں گے اُسے صاف ستھرا رکھیں گے۔ ان کے کمرے میں ہر چیز سلیقے سے اپنی جگہ رہے گی۔ لکھتے پڑھتے وقت کاغذ اور کتابیں ادھر اُدھر بکھر جائیں گے لیکن جب کام ختم کر کے اٹھیں گے ہر چیز اپنی جگہ پر جما دیں گے ـــــ خود بھی مجال ہے جو میلے کپڑوں میں یا بغیر شیو کے ایک دن گزاریں۔ اگر ان کے ان کاموں میں کوئی مدد کر دے تو سبحان اللہ اس سے بڑھ کر ان کا چہیتا اور کوئی نہیں۔ اور اگر نہ کرے تو خود ہی یہ سب کام سر انجام دے لیں گے۔

ان کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب تک میری شادی نہیں ہوئی تھی، میں ندیم کے لئے بے شمار ملاقاتیوں کی وجہ سے بہت پریشانی محسوس کرتی تھی، رات دن اطلاعی گھنٹی کی آواز سے کان پک گئے تھے۔ حد تو یہ ہے کہ رات کے تین چار بجے بھی ملاقاتی پہنچ جاتے تھے۔ ان میں سب سے قابل ذکر ملاقاتی پولیس تھی۔ ندیم بیٹھے نظم یا افسانہ تحریر فرما رہے ہیں۔ گھنٹی بجی اور سب خاک میں مل گیا۔ گھنٹے دو گھنٹے بعد آئے، پھر لکھنے بیٹھے۔ پھر گھنٹی بج اٹھی ـــــ ہم سب عاجز تھے۔ بہت دفعہ کہا کہ للہ! اوقات ملاقات کا بورڈ باہر لگوا دو۔ مگر نہ مانے۔ تھک کر میں نے تو اپنی شادی کی ناکہ اس گھر سے دفع ہو جاؤں، یا اللہ کی نوکری کی دعائیں مانگا کرتی۔

نوکری کا ذکر آیا ہے تو کہہ دوں کہ نوکری ندیم کے مزاج کو راس نہیں۔ وہ آزاد رہ کر کمانا چاہتے ہیں۔ کتنی ہی بار نوکری کی اور پھر بھاگ کھڑے ہوئے۔ وہ کہتے ہیں نوکری کی گھس گھس میں آدمی اچھی طرح تخلیقی کام نہیں کر سکتا۔ اب امروز کی ادارت میں بندھ کر بھی اس دکھ میں مبتلا ہیں۔ مگر یہ صحافت تو بڑوں بڑوں کو نگل چکی ہے ـــــ یہ تو وہی روایتی کمبل ہے جسے انسان چھوڑنا چاہتا ہے مگر وہ انسان کو نہیں چھوڑتا۔

ندیم عورت کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ خدا جانے اس احترام میں عورت کی قوتوں کو تسلیم کر لینے کا جذبہ ہے یا عورت کی مظلومیت سے ہمدردی۔ میں نے ان کی زبان سے کسی دور قریب کی عورت کے بارے میں کوئی گری ہوئی بات نہیں سنی۔ یہ عورت کا عبادت کی حد تک احترام کہاں سے آیا؟ چاہے ندیم اعتراف کریں یا نہ کریں۔ یہ عنفوان شباب کی کوئی عورت ہے جس نے انہیں اتنا پختہ ایمان بخشا ہے۔ عورت کسی روپ میں بھی ہو، بیوی، بہن، ماں یا دوست، وہ اسے رگ جاں سے زیادہ عزیز اور محترم رکھتے ہیں۔

بہنوں سے انہیں غیر معمولی محبت ہے۔ ہزاروں مصیبتوں میں مبتلا ہوں، سب کا پرانے روایتی بھائی کی طرح خیال رکھتے ہیں۔ ہر ایک کے حقیر سے حقیر کام کو تیار۔ سعیدہ آپا ان کی بڑی بہن ہیں، اس کے باوجود جب وہ گاؤں جاتے ہیں تو بہن کا حق لے کر جاتے ہیں۔ چاہے بیمار ہوں، چاہے بیکار، چاہے قرض میں ـــــ بہنوں کو ذرا اداس پائیں تو فوراً بہنوئیوں پر شک کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ اپنے اکلوتے بھانجے ظہیر کو میری وجہ سے یار با بہنوئی سمجھ کر منہ پھلایا ہے ـــــ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ بہنوں میں ترجیح کسی کو دینے پر راضی نہیں۔ تسنیم سلیم چھتاری ان کی بڑی عزیز

اور پیاری بہن ہیں۔ ایک بار ان سے ایک ننھی سی غلط فہمی کی وجہ سے ہاجرہ نے تھوڑا دکھ محسوس کیا، اور اس کا ندیم سے ذکر کر دیا، ندیم بہت اداس ہوئے، اور صاف کہہ دیا کہ میں تسنیم کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں سنوں گا، اور نہ تسنیم سے تم لوگوں کے بارے میں۔ تسنیم مجھے بہت عزیز ہے۔" وہ دن اور آج کا دن کسی کی ہمت نہیں کہ کوئی کسی بہن کی شکایت لالہ سے کرے۔ یہ ندیم کی شخصیت کا جادو ہے، کہ وہ اپنے محبت کرنے والوں سے جو چاہتے ہیں کروا لیتے ہیں۔ جو چاہتے ہیں وہ حاصل کر لیتے ہیں۔

اس چاہنے کی بات پر مجھے ندیم کی ایک اور مزیدار بات یاد آ گئی۔ یہ دس سال پہلے کی بات ہے ندیم میو روڈ پر اپنے عزیز دوست حمید اللہ خاں نیازی (رحمٰن کے نام رحم مجسم معنون ہے اور جو پنجاب پولیس کے بڑے افسر ہیں) کے ساتھ رہتے تھے۔ ایک دفعہ حمید صاحب اپنے گھر سے آئے تو ہاتھ کا بنا ہوا بڑا خوبصورت کمر بند بھی لائے۔ جیسے جب انہوں نے شلوار میں ڈالنے کو کمر بند نکالا تو ندیم کو پہلی ہی نظر میں بھا گیا۔ کہنے لگے "خان جی یہ کمر بند مجھے دے دو" خان جی نہ جانے کس موڈ میں تھے۔ بولے "نہیں ملے گا" ندیم نے دوسرے دن چپکے سے یہ کمر بند چرا لیا اور بکس کے پیچھے چھپا دیا۔ خان جی نوکر پر بہت چلائے چیخے۔ مگر اس نے لیا ہوتا تو بتاتا ——— ندیم بھی کمر بند چھپا کر بھول گئے۔ ایک دن نوکر نے بکس ہٹا کر صفائی کی تو مل گیا اور دوبارہ خان جی کی شلوار کے حق میں ضبط ہو گیا ——— ندیم نے پھر موقع پا کر اڑا دیا۔ اور اب کی اپنی شلوار کے علاوہ کہیں نہیں چھپایا ——— ایک زمانے کے بعد، جب دونوں یہ قصہ بھول گئے تو، ایک بار ندیم نے ان کے سامنے کمر بند ایک شلوار میں ڈالا اور خان جی فوراً پہچان گئے۔ پھر چھن گیا۔ لیکن آخر کو بازی ندیم کے ہاتھ رہی ——— یہ ایک کمر بند کا قصہ تھا، جو ندیم کو بھا گیا اور جسے وہ حاصل کر کے رہے، مگر، انہیں تو جس کی بھی کوئی چیز پسند آ جائے لے کر چھوڑتے ہیں ——— خصوصاً وہ بے تکلف دوست جو انہیں تنگ کرنے کو انکار کر دیں۔ ہم بہنوں سے کاغذ قلم، کتابیں جھپٹ لینا تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اور بہنوئیوں کے رومال اور ٹائیاں ——— عید آئی، عید کو سب سے پہلے بن ٹھن کر تیار، اور پھر چھوٹی بہنوں سے لے کر بچوں تک سے عیدی وصول کرتے ہیں اور پھر ایسے خوش ہوتے ہیں جیسے زندگی کی معراج حاصل ہو گئی ہو۔

ندیم کی زندگی کا سب سے محترم پہلو ماں سے بے پناہ الفت ہے۔ ان کی ماں بچوں کی محبت میں سرشار، بیمار، ضعیف خاتون ہیں۔ وہ اب بھی شہر کی دلچسپیوں سے چونک کر ماں کی طرف بھاگتے ہیں تو ایک ننھے سے بچے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ ان کی ماں ہر وقت ان کے پاس ہوں، لیکن نہ تو ندیم کی زندگی کا ڈھب ایسا ہے کہ وہ تمام زندگی انگہ میں بسر کر دیں، اور نہ والدہ اپنے بزرگوں کی زمین اور مرحوم شوہر کا گھر چھوڑ سکتی ہیں۔

ماں کے لئے ان کی یہ تڑپ دیکھ کر میں اس وقت بہت حیران ہوتی ہوں جب میرا ننھا سا بچہ کھیل میں مصروف ہو کر میری گود میں آنا بھی پسند نہیں کرتا ——— زندگی کی اتنی مصروفیتوں میں ماں کا اتنا خیال کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ ندیم کہتے ہیں "اس میں عجیب بات کیا ہے؟ میری ماں کے برابر کون ماں اپنے بچوں کے لئے دکھ جھیل سکتی ہے ——— میری ماں خود روکھی روٹی کھا لیتی تھی، اور ہمارے لئے گڑ یا پیاز رکھا کرتی تھی۔ ماں نے ہمیں کتنی مصیبت سے گاؤں کے پرائمری اسکول میں پڑھایا، درختوں کی گوند اور توے کی کالک اکٹھا کر کے وہ ہمارے لئے روشنائی تیار کرتی، ایک پنسل خریدنے کے لئے وہ کتنے دکھ جھیلتی۔ کیا کوئی ماں اس طرح کر سکتی ہے؟" ندیم کی اس جذباتیت کا کیا جواب، ماں بن کر کہتی ہوں سب مائیں یہ کرتی ہیں۔ مگر کیا بچے اتنی بے پایاں احسان مندی کے قائل ہوتے ہیں؟ ندیم قائل ہیں۔ انہوں نے برسوں تک ماں کے ساتھ بیٹھ کر اناج پسوایا ہے، ان کے لئے سوکھی لکڑیاں چن لائے ہیں۔ اور جمعہ جمعہ ان کے کپڑے اپنے ہاتھوں سے دھوئے ہیں۔ اور جب مزید تعلیم کے لئے اپنے مہربان چچا، اور شریف النفس چچی، کے پاس چلے گئے تو راتوں کو بستر میں چھپ چھپ کر ماں کے یہ سب کام نہ کر سکنے پر آنسو بہاتے ——— اور آج بھی جب وہ ان باتوں کا تذکرہ کرتے ہیں تو ان کی آنکھیں پر آب ہو جاتی ہیں۔ اور جب انہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ماں خوش نہیں تو ان کا ذہنی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔

وہ عالموں، مبلغوں اور پیروں کے خاندان کے ایک فرد ہیں، لیکن خود فطرتاً کسان ہیں ——— انہیں زمین سے محبت ہے، وہ آسمان پر جانے کے خواہشمند نہیں، انہیں تو اپنی زمین سے عشق ہے۔ وہ اسی کو بنانا سنوارنا چاہتے ہیں ——— وہ کہتے ہیں کہ مجھے اس زمین کے ذرّے ذرّے سے محبت ہے، اس کے ہر ذی نفس سے عشق ہے ——— زمین تو میری ماں کی طرح پیاری ہے، جو اپنے سینے پھڑواتی ہے اور اپنے بچوں کو دنیا کی ہر دولت بخش دیتی ہے۔

یہ ہے ندیم کی نجی زندگی ——— ندیم جس کے قدم اس زمین پر مضبوطی سے جمے ہوئے ہیں۔ جو برداشت کرتا ہے، نباہتا ہے اور جی جان سے محبت کرتا ہے۔ جو فیصلہ کر کے بھاگتا نہیں۔ جس میں مخالف ہواؤں کے مقابلے میں بغیر چیخے پیٹے، بغیر روئے دھوئے، جمے رہنے کی قوت ہے۔ جو قدیم اور جدید کے امتزاج کا سب سے خوبصورت نمونہ ہے۔

ندیم شرافت اور محبت سے بھرپور ایک روائتی انسان ہے۔ جو آج کے کرم خوردہ نظام میں مفقود ہے۔ لیکن جسے ایک سنہرا انسانی مستقبل اپنی گود میں پال رہا ہے۔

خواجہ احمد عبّاس

صالحہ عابد حسین

کھلتا ہوا گندمی رنگ، چھوٹی چھوٹی سیاہ، تیز اور ذہین آنکھیں، ذرا موٹی ناک، معمولی ہونٹ، دہن کشادہ، پیشانی جس کو بالوں کی بے وفائی نے اور زیادہ وسیع کر دیا ہے۔ گنجا سر جس کے چاروں طرف کی بالوں کی جھالر میں سیاہی سے زیادہ سپیدی جھلکتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی مونچھیں جن کی سیاہی کو سفیدی روز بروز مغلوب کر رہی ہے۔ گول ڈاڑھی، متوسط سے کچھ چھوٹا قد، چہرے پر متانت و غور و فکر کے آثار ..... یہ ہے عباس — خواجہ احمد عباس۔ جرنلسٹ اور ادیب، افسانہ نگار، اسٹوری رائٹر، فلم ڈائرکٹر اور پروڈیوسر، مقرر اور مصنف، جو مقبول و ہر دل عزیز بھی ہے اور مطعون بھی، مشہور بھی ہے اور بدنام بھی، جو ترقی پسند ہوتے ہوئے ترقی پسندوں پر سخت سے سخت نکتہ چینی سے نہیں چوکتا۔ جو نیشنلسٹ ہونے کے باوجود قومی حکومت پر سخت تنقید کرتا ہے، جو جواہر لال کا معتقد اور دلدادہ ہوتے ہوئے ان پر اعتراض بھی کرتا رہتا ہے۔ جس سے اپنے بھی خفا ہیں اور بیگانے بھی ناخوش مگر دونوں کو اس کی قدر کرنی پڑتی ہے۔

عباس کی عمر کا اکثر لوگ بڑا غلط اندازہ کرتے ہیں۔ اس کے سفید بال، گنجا سر اور بزرگوں جیسا تدبر لوگوں کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیتا ہے لیکن اس کی آنکھوں کی چمک، شرمیلی مسکراہٹ اور بچوں کی سی معصوم ہنسی اس راز کو فاش کر دیتی ہے کہ اس کی عمر اس سے کہیں کم ہے جتنی نظر آتی ہے۔ حقیقت میں قوم کے درد، ملک کی محبت اور اس کی خدمت کی لگن نے اسے چالیس سال کی عمر میں بوڑھا بنا دیا ہے۔

عباس مولانا الطاف حسین حالی کا قریبی رشتہ دار ہے۔ اس کے نانا خواجہ سجاد حسین حالی کے چھوٹے بیٹے تھے اور اس کے والد خواجہ غلام السبطین کا بھی حالی سے قریبی رشتہ تھا۔ حالی کی وفات سے چند ماہ پیشتر ۷ جون ۱۹۱۴ء کو اس بڑے خاندان کے ارمانوں کے سائے میں اس بچے نے جنم لیا اور اس کا نام دادا کے نام پر عباس رکھا گیا۔ خاندان میں لڑکوں کی کمی تھی اور بہنیں ہی بہنیں تو وہ اکلوتا ہی لڑکا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کی پرورش بڑے ناز و نعم میں ہوئی۔ عورتیں بہت چاؤ چونچلے کرتیں اور مرد بھی لاڈ پیار بہت کرتے تھے۔ البتہ خواجہ غلام السبطین بڑے معیار پرست، با اصول اور ایک حد تک سخت گیر انسان تھے۔ ان کی زندگی اسلامی تعلیمات اور اخلاقی بلندیوں کا ایک مرقع تھی جس میں درد دل کی انمول نعمت نے اور خدمت کی سچی لگن نے بڑی دلکشی پیدا کر دی تھی۔ اسلام سے انہیں والہانہ عشق تھا اور ان کی تمنا اور کوشش تھی کہ ان کے خاندان کے سب بچے اسلام کے سچے جاں نثار اور اسلام کی اصلی روح سے آشنا ہوں۔ وہ خاندان کے نہ بلکہ شہر بھر کے افراد سے بہت محبت کرتے اور

ان کی ہر مدد کے لئے تیار رہتے تھے لیکن رسمی محبت کا اظہار کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ خاندان کے لڑکوں کے ساتھ ان کا رویہ ذرا سخت رہتا تھا۔ مگر لڑکیوں سے بڑی نرمی اور محبت سے پیش آتے تھے۔ اخلاقی لحاظ سے ذرا سی لغزش کو وہ برداشت نہ کر سکتے تھے اور نوجوانوں کی سرکشی اور خود رائی بھی انہیں پسند نہ تھی۔ اپنے اکلوتے بیٹے کو وہ بہت چاہتے تھے اس لئے اس میں ان سب اصولوں اور خیالات کا عکس دیکھنا چاہتے تھے جو خود ان کے تھے۔ عباس کی والدہ اپنے دادا کی طرح کم سخن بھی تھیں اور درد مند دل بھی رکھتی تھیں۔ ان کے دل میں اپنے بچوں کی محبت کا جذبہ بڑا شدید اور گہرا تھا خصوصاً بیٹے سے بڑا عشق تھا۔ غرض ناز و نعم، محبت و شفقت، دلداری و ناز برداری اور ساتھ ساتھ اصول پرستی و سخت گیری کے اس گہوارے میں پل کر عباس بڑھا۔ اس کے مزاج میں بچپن کی اسی کشمکش کا عکس اور ماں اور باپ دونوں کی صفات کا پرتو ملتا ہے۔ وہ اپنے باپ کی مستقل مزاجی، خودداری اور اپنے مقصد کے لئے جان تک کی پروا نہ کرنے والی صفات رکھتا ہے اور ماں کے نرم و نازک دل اور گہری جذباتی محبت بھی اس کے اندر موجود ہے جسے وہ ہمیشہ چھپانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔

عباس کی ابتدائی تعلیم اس کے نانا کے قائم کردہ حالی مسلم ہائی سکول میں ہوئی۔ ابتدا ہی سے اسکول میں اس کی ذہانت کو مان لیا گیا تھا لیکن جوں جوں وہ بڑا ہوتا گیا بزرگوں اور استادوں کو یہ اندازہ ہونے لگا کہ وہ عام بچوں سے مختلف ہے۔ نہ تو وہ روایاتی "شریف" بچوں کی طرح اطاعت شعار فرماں بردار اور حلیم ہے اور نہ عام بچوں کی طرح چالباز، حیلہ ساز اور دروغ گو۔ وہ ان کا ہر کہنا سر جھکا کر نہیں مانتا مگر ساتھ ہی سزا یا تنبیہہ سے بچنے کے لئے جھوٹے بہانے نہیں بناتا ہے۔ سزا کو ضبط اور خودداری کے ساتھ سہتا ہے مگر اس وقت آنکھوں سے بغاوت کے جذبات صاف جھلک اٹھتے ہیں۔

اس اسکول میں اس زمانے میں سچے تعلیمی ڈھنگ کے مطابق زیادہ زور لکھنے پڑھنے پر ہی دیا جاتا تھا۔ پھر بھی جب کبھی موقع نکلتا، جلسے وغیرہ ہوتے تو عباس اس میں نمایاں حصہ لیتا تھا۔ اس کے خاندان میں ایک علمی فضا اور ادبی ماحول موجود تھا جس کی وجہ سے بچوں میں بھی یہ شوق ابھرتا تھا کہ وہ کچھ اس قسم کے کام کریں۔ چنانچہ بچوں کی لائبریری، ادبی انجمن کا قیام اور ڈرامائی سوسائٹی ان کے کارنامے تھے جن میں ان کے بزرگ ان کے معاون اور [illegible] ہوتے تھے۔ ادبی انجمن میں خاندان بھر کے بچے جمع ہو کر مضمون اور کہانیاں پڑھتے، تقریریں کرتے اور اقبال و غالب کی چیزیں سنایا کرتے تھے۔ اس انجمن کا سب سے پرجوش کارکن عباس تھا۔ ان جلسوں میں جو سب سے کم عمر، سب سے کوتاہ قد اور سب سے زیادہ لڑنے اور چیخنے والا مقرر نظر [illegible] سمجھ جائیے کہ عباس کے سوا اور کوئی نہیں۔ ڈراموں میں عباس اور اس کے رشتے کے دوسرے بھائیوں کو بہت انہماک تھا۔ لڑکیاں بزرگوں کے حکم سے اس سے دور ہی رہتی تھیں۔ یہ سوسائٹی مختلف چھوٹے چھوٹے ڈرامے اسٹیج کیا کرتی تھی جس میں کبھی انگریزی سے ترجمہ کئے ہوئے ڈرامے ہوتے اور زیادہ تر آغا حشر کے ڈراموں کا انتخاب۔ مجھے یاد ہے کہ اس طرح کے کسی ڈراما میں عباس ایک جانباز مجاہد بنا تھا جس نے ایک ظالم عیسائی بادشاہ کے استبداد کے سامنے سر جھکانا منظور نہیں کیا اور اس کی پاداش میں پہلے اپنی بہن کی جان نچھاور کی اور پھر خود "کلمۃ الحق" بلند کرتا ہوا دار پر چڑھ گیا۔

۱۹۲۶ء میں عباس پانی پت سے مڈل پاس کر کے علی گڑھ یونیورسٹی اسکول میں آ کر داخل ہو گیا اور دو سال بعد اعلیٰ نمبروں پر میٹرک پاس کر کے کالج میں آ گیا۔ یہ چھوٹا سا دبلا پتلا چودہ سال کا لڑکا جب کالج میں داخل ہوا تو سینئر لڑکوں کو ایک دلچسپ مشغلہ ہاتھ لگا اور وہ اسے ستانے اور چھیڑنے پر تل گئے۔ عباس کا پیار کا نام 'باچھو' تھا۔ آج اسے اپنے اس نام سے جتنا پیار ہے اس وقت اتنا ہی وہ اس سے چڑتا تھا۔ کسی طرح یہ نام کالج میں مشہور ہو گیا اور لڑکے اسے باچھو باچھو کہہ کر چھیڑتے اور وہ روتا بسورتا گھر آ کر اپنی چچی سے شکایت کرتا جو اسے سینے سے لگا کر سمجھاتیں اور تسلی دلاسا دیتی تھیں۔ لیکن وہ بہت جلد اس منزل سے نکل آیا۔ اس کی ذہانت، تقریری قابلیت اور تحریری صلاحیت جلد ہی لوگوں پر ظاہر ہو گئی اور دو سال کے اندر اندر اس کا سکہ بیٹھ گیا۔ اب کسی کی ہمت نہ تھی کہ اس کے عجیب نام، چھوٹے قد یا نوعمری کا مذاق اڑائے۔ اس کے گرد اپنے ہم خیال،

ہم مذاق، جوشیلے اور باذوق قوم پرست طالب علموں کا ایک حلقہ قائم ہو گیا جو اس وقت کالج کا سب سے اہم حلقہ سمجھا جاتا تھا۔ عباس کے والد اور نانا پکے مسلم لیگی تھے مگر عباس نے سیاسی خیالات میں ان کا بالکل اثر قبول نہیں کیا بلکہ اپنے بڑے بھائی خواجہ غلام السیدین اور ان کے بعض قوم پرست دوستوں کے خیالات سے متاثر ہوا اور پندرہ سولہ سال کی عمر ہی سے وہ نیشنلسٹ نوجوانوں میں گنا جانے لگا۔ عمر کے ساتھ ساتھ اس کی نڈرتا اور جوش بڑھتا گیا۔ وہ بے دھڑک تقریریں کرتا، مضمون لکھتا اور آپس کی گفتگو میں حکومتِ وقت پر سخت اعتراض جڑتا۔ نوجوانی کے جوش نے کبھی یہ نہ سوچنے دیا کہ ایک کم سن نوجوان کے دنیا کی سب سے بڑی حکومت سے ٹکر لینے کی خواہش کا کیا انجام ہو سکتا ہے؟ چنانچہ طالب علمی کے زمانے ہی میں اس پر خفیہ پولیس کی نگرانی رہنے لگی اور وہ جہاں جاتا ایک خفیہ پولیس کا آدمی اس کے ساتھ لگا رہتا تھا۔ عباس کو اس کی ذرا سی پروا نہ تھی۔ البتہ اس کے والد اور نانا کو بڑی فکر تھی۔ ان کو اس کا بھی افسوس تھا کہ عباس سیاسی طور پر دوسری جماعت کا ہمدرد ہے اور اس کی فکر بھی تھی کہ اس ذہین و قابل نوجوان کا مستقبل کیا ہو گا جس سے انہوں نے بڑی بڑی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں؟ لیکن اس کے والد بڑے اصول پرست ہونے کے باوجود جبر کرنے کے قائل نہ تھے اور سمجھانے بجھانے کے سوا انہوں نے اسے مجبور کرنے کی کوشش نہیں کی۔

سنہ ۱۹۳۳ء میں عباس نے فسٹ ڈویژن میں علی گڑھ یونیورسٹی سے بی۔ اے پاس کر لیا۔ وہ اس وقت پورے انیس سال کا بھی نہ تھا مگر ارادہ یہ کر رہا تھا کہ کسی اخبار میں نوکری کرے۔ لیکن اس کے بزرگ اس کم عمری میں اس کے نوکری کرنے کے خلاف تھے۔ یوں بھی ان لوگوں کا خیال تھا کہ وہ ابھی "بچہ" ہے اور اس عمر کا فیصلہ دیرپا نہیں ہوتا۔ چند سال اور تعلیم حاصل کرے تو شاید اپنا نیک و بد سوچنے کی عقل آ جائے۔ لوگوں کے سمجھانے بجھانے سے عباس نے ایل۔ ایل۔ بی میں داخلہ لے لیا مگر اس نے ایک لمحہ کے لئے بھی یہ نہ سوچا کہ وہ وکالت کا پیشہ اختیار کرے گا اس زمانے میں یونیورسٹی کی بڑی تعطیل میں وہ دہلی جا کر رہتا جہاں اس کے والد ملازم تھے اور مختلف اخباروں میں سیکھنے کے طور پر کام کرتا رہا۔ شروع ہی سے اس کا رجحان جرنلزم کی طرف تھا اور اسی پیشے کو وہ آئندہ اختیار کرنا چاہتا تھا۔ بہت نوعمری سے اس نے رسالوں اور اخباروں میں مضمون لکھنے شروع کر دئیے تھے جن میں سے اکثر وہ فرضی نام سے چھپوایا کرتا تھا۔ شاید اس لئے کہ اسے اندیشہ تھا کہ اس کی عمر دیکھتے ہوئے ایڈیٹر اسے ایسے اہم مسائل پر قلم فرسائی کرنے کے قابل نہ سمجھیں جن پر وہ لکھا کرتا تھا۔ مثلاً پردہ یا قومی و ملکی مسائل وغیرہ۔

عباس نے سنہ ۱۹۳۵ء میں وکالت کا امتحان بھی پاس کر لیا لیکن اس کی رائے میں تبدیلی نہ آئی۔ اس کے والد اس کے جرنلزم کا پیشہ اختیار کرنے کے خلاف تھے اس لئے کہ ان کا خیال تھا کہ اس کام میں سچائی، بہادری اور بے خوفی سے حق بات کہنے کا نتیجہ اکثر قید و بند کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا اور یہ وہ جانتے تھے کہ عباس نڈر اور سچا ہے اور خود ان کی دلی تمنا تھی کہ وہ ہمیشہ ایسا رہے مگر باپ کی محبت انہیں مجبور کرتی تھی کہ وہ آگے کسی کم پُرخطر راستے پر ڈالیں۔ اس کی والدہ اپنی مامتا سے مجبور اسے اپنے سے ہزار میل دور بمبئی بھیجنے پر کسی طرح تیار نہ تھیں، اور یوں بھی وہ اس کی آئندہ زندگی کے متعلق جو خواب دیکھ رہی تھیں وہ اس کے موجودہ فیصلے میں پورے ہوتے نظر نہ آتے تھے لیکن عباس کی ضد اور خوشی پر باپ کی تمنا اور ماں کی مامتا کو ہار ماننی پڑی، اور عباس نے بمبئی جا کر بریلوی صاحب مرحوم کے ساتھ "بمبئی کرانکل" میں سب ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیا۔ عباس کے "اونچے" مستقبل سے (جس کے معنی اس وقت اونچی سرکاری نوکری اور بہت سے پیسے کمانے کی صلاحیت سمجھے جاتے تھے) لوگ مایوس ہو گئے۔ اور بعض لوگ جو اس سے قریبی رشتے کے خواہش مند تھے اس سے مایوس ہو کر روگرداں ہو گئے۔ مگر عباس کو ایک لمحے کے لئے اس کا افسوس نہ ہوا۔ عباس نے اپنی شریکِ زندگی کا جو تصور قائم کیا تھا وہ ایک ایسی عورت کا تھا جو اسی کی طرح قوم پرست، جفاکش اور اس کے کندھے سے کندھا ملا کر چلنے والی تھی، جسے زندگی کی سختیاں اور مشکلات ہرا نہ سکیں۔

"بمبئی کرانکل" میں عباس نے تقریباً نو دس سال تک باقاعدہ کام کیا۔ یہی زمانہ تھا جب اس کی صحافتی اور ادبی صلاحیتوں کو پورا پورا ابھرنے اور پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ اس زمانے میں اس نے بہت سے مضامین اور افسانے لکھے اور وہ مقبول افسانہ نگار اور محبوب جرنلسٹ بن گیا۔

جیسا کہ ہم نے پہلے کہا وہ پکا نیشنلسٹ اور آزادی کا پرجوش حامی تھا اور اس کی تحریروں میں یہ رنگ پوری طرح ظاہر ہے۔ اس کے اخباری آرٹیکل بھی اسی طرز کے ہوتے تھے۔ بدیسی حکومت اس سے خار کھاتی تھی اور اسے جیل خانے میں ڈالنے سے بھی دریغ نہ کرتی۔ خود عباس کو نہ صرف یہ کہ قید سے خوف نہ تھا بلکہ خواہش تھی کہ ملک کے لئے یہ قربانی دے سکے لیکن اپنے اصول پرست باپ کی محبت اور عاشق زار ماں کی مامتا نے اسے شعوری یا غیر شعوری طور پر اتنا محتاط رکھا کہ وہ اس منزل سے بچ گیا۔

عباس کی سب سے پہلی تصنیف "محمد علی" ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔ یہ مولانا محمد علی کی مختصر سوانح حیات تھی۔ محمد علی عباس کے نوجوانی کے ہیرو تھے۔ اور اس نے اس چھوٹی سی کتاب میں ان کی جن صفات کو پورے جوش اور عقیدت سے بیان کیا ہے وہ وہی ہیں جن کا عکس کسی نہ کسی حد تک خود عباس کے اندر نظر آتا ہے۔ اس کا پہلا افسانوی مجموعہ "ایک لڑکی" تھا جس کے ایک افسانہ میں پردے کی سخت مخالفت کی گئی تھی۔ قدامت پرست حلقے میں اس کی بڑی مخالفت ہوئی۔ خود اس کے والد کو یہ افسانہ پڑھ کر بہت افسوس ہوا مگر عباس مجبور تھا۔ جس بات کو وہ حق سمجھے اسے کہنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ اس کے بعد سے اب تک عباس کے بہت سے افسانوں کے مجموعے (زعفران کے پھول، پاؤں میں پھول، اندھیرا اجالا، کہتے ہیں جس کو عشق) اور کئی ڈرامے (زبیدہ، یہ امرت ہے، چودہ گولیاں) اور مسافر کی ڈائری (سفرنامہ) اردو میں شائع ہو چکے ہیں۔ مگر وہ صرف اردو ہی کا نہیں انگریزی کا بھی ادیب ہے اور بڑی بے تکلف اور رواں زبان لکھتا ہے۔ انگریزی میں اس کی کئی کتابیں شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ اس کی متعدد چیزوں کے ہندوستان کی بہت سی زبانوں میں ترجمے ہوئے ہیں۔ مغربی زبانوں میں بھی علاوہ انگریزی کے روسی، چیک اور جرمن زبان میں اس کی کتابیں چھپی ہیں۔ چند برس ہوئے اس نے ایک ناول اردو اور انگریزی میں "انقلاب" کے نام سے لکھنا شروع کیا تھا۔ اب وہ مکمل ہو چکا ہے مگر ابھی تک اردو یا انگریزی میں نہیں چھپ سکا البتہ روسی زبان میں ترجمہ ہو کر عنقریب شائع ہونے والا ہے اور حال کی اطلاع یہ ہے کہ روسی زبان میں بھی شائع ہو [illegible] کا مصنف ہے لیکن ان میں کسی مستقل تصنیف کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ یہ متفرق افسانوں، ڈراموں اور مضامین کے مجموعے ہیں یا سفرنامے۔ اس کا ناول ابھی تک اردو داں طبقے تک نہیں پہنچا ہے اور اب تو فلمی مصروفیات نے اس کا وقت اس طرح گھیر لیا ہے کہ آئندہ کے لئے یہ امید پیدا نہیں ہوتی کہ وہ بیٹھ کر دل جمعی سے تصنیف و تالیف کا کام کر سکے گا۔

عباس کو بچپن سے سفر کا شوق تھا۔ پانی پت سے باہر کہیں جانا ہوتا تو شوق اور خوشی سے بےخود ہو جاتا۔ دلی، علی گڈھ، بمبئی اور ہندوستان کے دوسرے شہر سیاحت کی اس پیاس کو بجھا نہ سکے۔ ۱۹۳۴ء میں علی گڈھ کالج کے لڑکوں کی ایک جماعت افغانستان گئی۔ عباس نے بہت چاہا کہ اسے بھی پاسپورٹ مل جائے مگر بدیسی حکومت نے ایسے "باغی" نوجوان کو باہر جانے نہ دیا۔ عباس کو بڑی مایوسی ہوئی مگر ہمت نہ ہاری۔ بمبئی آ کر بھی یہ کوشش جاری رکھی کہ اسے باہر جانے کے لئے پاسپورٹ مل جائے۔ آخر ۱۹۳۸ء میں اس کی یہ آرزو پوری ہوئی بمبئی کی نئی کانگرس وزارت کی بدولت اسے دنیا کے سفر کی اجازت مل گئی۔ روپیہ کا مسئلہ بھی خاصا دشوار تھا۔ نہ عباس کے پاس کچھ تھا نہ اس کے والد کے پاس اتنا سرمایہ کہ آسانی سے اس خرچ کو برداشت کر سکتے۔ بہرحال اس نے کچھ عزیزوں دوستوں سے قرض لیا، کچھ والد نے مدد کی، کچھ خود جمع کیا اور چند سو روپے فراہم کر کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ وہ بے حد خراچ ہونے کے ساتھ ساتھ جفاکش بھی ہے اور ہر قسم کی تنگی اور سختی سہہ سکتا ہے۔ اسی لئے وہ اتنے تھوڑے روپے سے ساری دنیا کو دیکھنے کا عزم لے کر نکلا اور پانچ مہینے میں قریب قریب ساری دنیا کا ایک چکر لگا کر اور [illegible] امریکہ گیا۔ یورپ کے مختلف ممالک اور ایشیا کے اسلامی ملکوں [illegible] واپس آیا۔ اس نے اپنے اس سفر [illegible] اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں لکھے ہیں۔ "مسافر کی ڈائری" پڑھنے سے

بمشکل یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ مسافر جس کی فکر و نظر بڑھاپے پر بھاری ہے اس وقت صرف چوبیس سال کا نوجوان تھا۔

بمبئی جیسی پُر آشوب و ہنگامہ پرور فضا میں عباس کی بے چین اور حوصلہ مند طبیعت کا صبر اور خاموشی سے کسی اخبار کے کام کو کئے جانا محال تھا۔ یہاں اس کی دلچسپی کی سبھی چیزیں تھیں۔ ادبی انجمنیں، ڈرامائی سوسائٹیاں، آرٹ کی سیوا کرنے والے ادارے اور فلمی دنیا۔ اور عباس کے دماغ میں ان سب کی اصلاح و ترقی کا سودا تھا۔ چنانچہ وہ اس میدان میں کود پڑا۔ بمبئی میں "پیپلز تھیٹر" کو جو لوگ چلاتے تھے ان میں عباس پیش پیش تھا۔ یہ تھیٹر "اپٹا" (APTA) کے نام سے بہت مشہور ہوا اور ملک کے بعض دوسرے شہروں میں بھی اس کی شاخیں قائم ہوئیں۔ آرٹ اور ادب کی خدمت اور تھیٹر و ڈراما کے معیار کو بلند کرنا اس کا مقصد تھا۔

فلموں سے بھی اس کی دلچسپی بڑھی۔ سب سے پہلے ۱۹۴۱ء میں اس نے ایک کہانی "نیا سنسار" لکھی۔ اس زمانہ میں بمبئی میں خاصی اچھی فلمیں بنا کرتی تھیں اور فن کاروں میں سے بھی بعض کو واقعی اپنے فن سے لگاؤ اور اس کی لگن تھی۔ "نیا سنسار" میں کام کرنے کے لئے خورشید جہاں کو مدعو کیا گیا جس نے حال ہی میں رینوکا دیوی کے نام سے شہرت حاصل کی تھی۔ "نیا سنسار" رینوکا دیوی کا سب سے بہتر اور شاید آخری فلم تھا۔ یہ فلم اور اس کی کہانی بہت مقبول ہوئی اور عباس اچھا فلمی کہانی لکھنے والا سمجھا جانے لگا۔ میرا خیال ہے کہ عباس کی ادبی زندگی کو اس فلم کی بدولت گھن لگ گیا۔ اس کے بعد سے اس کی توجہ فلمی کہانیوں کی طرف زیادہ ہو گئی۔ وہ اخبار کا جو کام اب بھی کرتا تھا، دوسرے اخباروں اور رسالوں میں بھی مضمون لکھتا رہتا تھا کوئی نہ کوئی ناول بھی زیر تصنیف رہا کرتا تھا، بہت سی کہانیوں کے پلاٹ دماغ میں اور نامکمل کاپی میں اب بھی موجود رہتے تھے لیکن اصلی توجہ اب فلمی کہانی کی طرف تھی اور روزی کمانے کا ذریعہ بھی اب یہی تھا۔ زندگی روز بروز مہنگی ہوتی جا رہی تھی۔ عباس کی ذمہ داریاں اور ضروریات بڑھ رہی تھیں۔ اب اخبار کی قلیل تنخواہ اس کا بار نہ اٹھا سکتی تھی۔ لیکن مالی ضرورت سے کہیں زیادہ اسے یہ فکر تھی کہ اچھی کہانیاں لکھی جائیں اور معیاری فلم بنیں۔ اس کا خیال تھا کہ ڈائرکٹر و پروڈیوسر اس کی کہانیوں کو جیسا چاہئے ویسا پیش نہیں کرتے اور اس خیال نے اسے اس پر اکسایا کہ ایک فلم خود بنائی جائے۔ روپیہ لگانے والے کچھ دوست بھی مل گئے۔ آرٹ کے دلدادہ کچھ فن کار بھی ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئے۔ طے ہوا کہ احمد عباس فلم کی کہانی لکھیں گے اور ڈائرکٹ کریں گے۔ نفع جو ہوگا وہ "اپٹا" کے حصے میں آئے گا۔ ۱۹۴۵ء میں اس نے "دھرتی کے لال" بنانی شروع کی جو ۱۹۴۶ء میں ختم ہوئی۔ اس فلم کو خواص کے حلقوں میں بہت پسند کیا گیا۔ بڑے بڑے سیاسی رہنماؤں نے دیکھ کر سراہا۔ مگر فلم کے بازار میں وہ زیادہ نہ چلی اور فن کا کیا ذکر کام کرنے والوں کو پیٹ کے لالے پڑ گئے۔ ۱۹۴۶ء کے آخر میں ایک اور کمپنی نے اس سے ایک فلم بنانے کی فرمائش کی۔ "آج اور کل" کے نام سے لاہور میں عباس نے اس فلم کو ڈائرکٹ کیا جو ۱۹۴۷ء کے شروع میں بن کر تیار ہو گئی مگر فلم ابھی پورے طور پر مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ عباس کو بمبئی واپس جانا پڑا۔ یہ وہ پُر آشوب دور تھا جب دیس میں فتنہ و فساد کی آگ سلگ رہی تھی۔ خاص طور پر پنجاب میں یہ فتنہ بہت زور پکڑ گیا تھا۔ ایک طرف آزادی کی آمد آمد تھی تو دوسری طرف انسانوں کے خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ اگست ۱۹۴۷ء میں آزادی ملی۔ ملک تقسیم ہوا اور بہت سے علاقوں میں بہیمیت اور شیطانیت کے وہ مظاہرے ہوئے کہ انسانیت کانپ کانپ اٹھی۔

اس خون آشام دور میں عباس سب کچھ بھول گیا۔ اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا اور دن کا چین اور رات کی نیند حرام ہو گئی تھی۔ وہ اور سب کام چھوڑ چھاڑ کر ہنگامی حالات کو سدھارنے کی ہر ممکن کوشش اپنے قلم کے ذریعے کر رہا تھا۔ عباس کا گھر بمبئی کے ایک ایسے علاقے میں تھا جس کے ہر طرف جن سنگھی اور مہاسبھائی لوگ رہتے تھے۔ جن میں سے بیشتر مسلمانوں کے جانی دشمن تھے۔ اور عباس سارے بمبئی میں جانا پہچانا تھا اس کے سب دوستوں نے، جن میں مسلمانوں سے زیادہ ہندو اور سکھ تھے، اسے سمجھایا کہ وہ اس جگہ کو چھوڑ کر کہیں اور چلا جائے۔ یہاں اس کی جان کا خطرہ ہے مگر عباس اس پر رضامند نہ ہوا۔ اس کی لغت میں جان کے خوف سے بھاگنا ایسی بزدلی ہے جس کا کلنک وہ کسی طرح گوارا

نہیں کر سکتا تھا اور وہ اکیلا نہ تھا۔ غرض وہ اس سارے زمانے میں وہیں رہا، کھلے بندوں رہا، اپنے اہلِ خاندان کے ساتھ رہا جو پانی پت سے کسی طرح جان و آبرو بچا کر بمبئی پہنچ گئے تھے۔ خطرے آتے رہے اور ٹلتے رہے اور خدا کی مہربانی سے عباس کا یا اس کے کسی عزیز یا ساتھی کا بال تک بیکا نہ ہوا۔

عباس نے اس زمانے میں کئی ڈرامے ایسے لکھے، جن کا مقصد امن و آشتی کی فضا پیدا کرنا اور اخوت و محبت کی برادری کے خیالات کو پھیلانا تھا۔ یہ ڈرامے بمبئی میں جگہ جگہ اسٹیج کئے گئے اور انہوں نے گہرا اثر ڈالا۔ اس نے متعدد افسانے بھی فسادات کے موضوع پر لکھے جو ہندوستان اور پاکستان کے رسالوں میں چھپے۔ ان میں ایک افسانہ "سردار جی" تھا۔ جس کا پلاٹ صرف اتنا تھا کہ دہلی میں ایک مسلمان کو ایک سکھ بڈھا اپنی جان پر کھیل کر بچاتا ہے۔ اس افسانے میں طنز و ظرافت کا عنصر غالب تھا۔ یہ واقعہ اس کے ایک قریبی عزیز کو پیش آیا تھا جسے عباس نے افسانوی رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کیا تھا۔ اس کا مقصد یہ دکھانا تھا کہ ہر مذہب و قوم میں نیک اور رحم دل اور تھوڑے سے لوگ ہوتے ہیں جو اپنی جان پر کھیل کر دوسروں کی مدد کر سکتے ہیں۔ عباس خود مسلمان ہے اس لئے قدرتی طور پر مسلمانوں پر اس نے زرا سخت تنقید کی تھی لیکن لطف کی بات یہ کہ یہ افسانہ اچھا خاصا ایک ہنگامہ بن گیا۔ ہندی رسالے مایا نے اسے شائع کیا تو کچھ سکھ حضرات کے ایما سے اس رسالے اور مصنف دونوں پر مقدمہ دائر کر دیا گیا کہ اس کا مقصد سکھوں کو ذلیل کرنا اور آپس میں نفرت و عداوت کے جذبات بھڑکانا ہے۔ دوسری طرف پاکستان کے بعض رسالوں نے اسے شائع کیا تو لوگوں نے اسے مسلمانوں کے خلاف قرار دیا اور مسلمان دشمنی سے تعبیر کیا۔ اس زمانے میں دونوں طرف کے بعض اخبار رسالوں نے کچھ بے خبری اور کچھ تعصب سے ایسی ایسی بے پر کی اڑائیں اور وہ وہ باتیں عباس کے بارے میں لکھیں جن کا نہ سر تھا نہ پیر۔ کئی مہینے تک یہ مقدمہ چلتا رہا اور اس سلسلے میں متعدد ہندی اردو کے اخبار رسالوں نے اسے شائع کیا۔ آخر کار یہ مقدمہ گورنمنٹ نے واپس لے لیا۔ لیکن اس دوران میں اس افسانے کی اتنی اشاعت اور عباس کی اتنی شہرت ہوئی جو اور کسی طرح ممکن نہ تھی۔

فسادات پر اردو میں ہر انسان دوست ادیب اور شاعر نے کچھ نہ کچھ اپنے اپنے انداز میں لکھا ہے اور انسانیت کو فنا ہونے سے بچانے اور امن و محبت کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ رامانند ساگر نے اسی موضوع پر ایک ناول "اور انسان مر گیا" کے نام سے لکھا جس کا مقدمہ عباس سے لکھوایا۔ عباس فسادات کے دوران میں اسی مسئلے پر غور کرتا رہا تھا کہ اس خون خرابے اور شیطانی حرکات کی جو لوگوں نے اس دوران میں کیں، آخر کیا وجہ ہے؟ وہ یہ تو مانتا تھا کہ بدیسی حکومت ہمیں لڑوا کر اپنا اقتدار قائم رکھنا چاہتی تھی مگر یہ نہیں مانتا تھا کہ ان فسادات کے سلسلے میں جرائم کرنے والے خود معصوم ہیں۔ وہ سوچتا تھا کہ جب تک ہماری قوم میں خود یہ جراثیم موجود نہیں تھے کوئی خارجی چیز ایسا مہلک اثر نہیں ڈال سکتی تھی۔ اس ناول کے مقدمہ میں اس نے اپنے اسی خیال کو ظاہر کیا اور لکھا کہ لوگ خود اپنے گناہ سے یہ کہہ کر نہیں بچ سکتے کہ کسی دوسری طاقت نے ہمیں یہ کرنے پر مجبور کیا تھا۔ بات بظاہر معمولی تھی اور عام طور پر لوگ اس رائے سے متفق نظر آتے تھے لیکن اس وقت اس مقدمہ پر ترقی پسند حلقے سے اس کے خلاف ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ وہ دور تھا جب ہندوستانی کمیونسٹ اور ان کی ہم خیال پارٹیاں انتہا پسندی کی طرف مائل تھیں۔ ترقی پسند تحریک کے بہت سے ذمہ دار لیڈر جیل کی ہوا کھا رہے تھے اور تحریک کچھ سنے، جوشیلے اور انتہا پسند نوجوانوں کے ہاتھ میں آ گئی تھی۔ ہر شخص پر جو ان کے اصول سے ذرا ادھر یا ادھر ہٹتا تھا رجعت پرستی اور بورژوائی ہونے کا الزام عائد کر کے سخت احتساب کیا جاتا تھا۔ عباس ابتدا سے ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہا تھا۔ وہ کمیونسٹ نہ تھا مگر ان کا دوست، ہمدرد اور بہی خواہ ہمیشہ رہا۔ وہ ان پر نکتہ چینی کرتا تھا مگر دوستانہ۔ اور اس کے سب ساتھی اس کے خلوص اور حق گوئی کو جانتے اور قدر کرتے تھے۔ لیکن اس وقت دھارے کا رخ ہی اور تھا۔ عباس پر بڑی بڑی سخت تنقیدیں کی گئیں۔ معقول قسم کے اعتراض ذمہ دار اور معقول لوگوں کے تھے لیکن اس وقت تو ہر کوئی پورے جوش سے اس کی مخالفت کر کے اپنے "ترقی پسند" ہونے کا ثبوت دینے پر تل گیا تھا۔ لہٰذا کوئی ممکن اور ناممکن الزام ایسا نہ تھا جو اس پر نہ لگایا گیا ہو۔ اس کو انگریزوں کا پٹھو، رجعت پرست، کانگریس کا گماشتہ، عوام کا دشمن سبھی کچھ تو کہا گیا۔ اس کے اور اس کے

خاندان والوں کے کیریکٹر تک پر حملہ کرنے اور گندگی اچھالنے سے لوگ نہ چوکے۔ عباس شروع میں ان ادبی جلسوں میں بحث مباحثہ کر کے اور اپنی اونچی آواز سے دوسروں کی آوازوں کو دبانے اور سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ اسے حیرت تھی کہ اس نے کون سی ایسی بات کہہ دی ہے کہ ؎

اعتراضوں کا زمانے کے ہے حالیؔ پر نچوڑ
شاعر اب ساری خدائی میں ہے کیا ایک ہی شخص؟

لیکن اس نے یہ نہیں مانا کہ وہ غلطی پر ہے۔ عباس کی حمایت میں اس وقت کوئی اگر منہ کھولنے کی جرأت کرتا تو فوراً اس پر بھی یہ سب الزام عائد کر دئے جاتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ طوفان دھیما پڑا، مخالفت، دل آزاری و بدگمانی کے بادل چھٹنے لگے۔ سیاسی پالیسی بدلنے کے ساتھ ساتھ عباس کا خلوص اور نیک نیتی پھر تسلیم کر لی گئی اور اب پھر عام طور پر اسے عوام دوست اور ترقی پسند سمجھا جانے لگا ہے۔

عباس کے ذہن میں عرصے سے ایک آسان ہندی کا رسالہ جاری کرنے کی خواہش تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ شیریں، سہل اور رسیلی اردو اور ہندی میں ایک عمدہ رسالہ نکالا جائے۔ آخر ——— "سرگم" کے نام سے یہ رسالہ نکلا جو ادب، آرٹ، شاعری، فلم اور ڈراما کا معجونِ مرکّب تھا۔ یہ رسالہ خاص طور پر جنوبی ہند میں بہت مقبول ہوا اور اس نے مداحوں کا خاصا وسیع حلقہ پیدا کر لیا۔ عباس کے مضامین اور افسانے و سوال جواب، کرشن چندر کا ناول اور بعض دوسرے مشہور ادیبوں کی چیزیں اس میں شائع ہوتی تھیں۔ مالی لحاظ سے وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ ایک نوزائیدہ اردو ہندی کے جریدے کب اپنا بار خود اٹھا سکتے ہیں اور پھر عباس کی کاروبار سے ناواقفیت اور ہر کس و ناکس پر بھروسا کرنے کی عادت نے بہت جلد اسے بٹھا دیا۔ وہ جو کچھ کماتا "سرگم" میں جھونکتا رہا لیکن ساری کوششوں کے باوجود وہ اس کے بار کو نہ اٹھا سکا اور آخر کار اسے ——— "سرگم" بند کرنا پڑا۔ صحافت کی خدمت کرنے والے جانتے ہیں کہ اپنے رسالے سے مدیر کو کس قدر لگاؤ ہوتا ہے۔ عباس نے "سرگم" بند کیا تو اسے ایسا صدمہ ہوا جیسے کسی باپ کو اپنے ہونہار بچے کے دفن کرتے وقت ہوتا ہے، مگر وہ غم کو پالنے کا عادی نہیں اور نہ ہار مانتا ہے۔ فوراً اس کے دماغ نے ایک نئی اسکیم کو جنم دیا اور اس نے "نیا سنسار" نامی ایک فلم کمپنی بنا ڈالی۔ اس سے پہلے اس کی لکھی ہوئی کہانی "آوارہ" خاصی مقبول ہو چکی تھی۔ اس کمپنی نے اب تک تین فلم "انہونی"، "راہی" اور "منا" بنائے ہیں۔ یہ فلم ایک لحاظ سے بہت کامیاب ہیں۔ اس لئے کہ اپنی بعض خامیوں کے باوجود خوش مذاق اور سمجھدار طبقے میں انہیں بہت پسند کیا گیا لیکن ان کو بھی وہ قبولیت حاصل نہ ہو سکی جو کاروباری لحاظ سے ضروری ہے۔ کچھ ان فلموں کا معیار دوسرے عام پسند فلموں سے مختلف ہے اور کچھ عباس کاروبار سے ناواقف محض ہے اور آج وہ اتنی فلمیں بنانے کے باوجود قلاش ہے مگر اس کو نہ اس کا رنج ہے نہ اس سے مایوسی، وہ اب بھی کئی فلمیں بنانے کے خیال میں لگا ہوا ہے۔

۱۹۵۱ء میں نئے چین کی سالگرہ میں شرکت کرنے کے لئے چینی حکومت کے بلاوے پر ایک ڈیلیگیشن ہندوستان سے چین گیا۔ اس میں احمد عباس کو بھی مدعو کیا گیا تھا لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ جس طرح بدیسی حکومت عباس کو دوسرے ملکوں میں بھیجنے سے ڈرتی تھی اپنی قومی حکومت بھی (جس قوم کی خدمت وہ ۲۵ سال کی عمر سے کر رہا ہے) اسے "مشکوک" آدمی ہی سمجھتی ہے۔ اسے پاسپورٹ ملنے میں سخت مشکل کا سامنا ہوا اور اتنی دیر لگا دی گئی کہ ڈیلیگیشن روانہ ہو گیا۔ پھر دو تین ہی دن بعد چینی حکومت کے اصرار اور پنڈت نہرو کے ایما پر عباس کو فوراً پاسپورٹ بھی دے دیا گیا اور اسے خاص اہتمام کے ساتھ چینی سرحد تک پہنچایا گیا جہاں چینی اسپیشل ٹرین نے اور چینی ہوائی جہاز نے جس میں یہ اکیلا مسافر تھا، اسے عین سالگرہ کے دن پیکن پہنچا دیا۔ حسبِ عادت عباس نے نئے چین کو بہت غور سے دیکھا، بہت سے لوگوں سے ملا، وہاں کے حالات معلوم کئے، چینیوں سے دوستیاں کیں اور اپنے لکھنے کے لئے نیا مواد اور نئے منصوبے لے کر ہندوستان واپس آیا تو اس کی زبان چین کی تعریف کرتے نہ تھکتی تھی۔ اس سفر سے اس نے اور جو کچھ بھی

حاصل کیا ہو، ایک اچھی کتاب کی تصنیف تو ہوگئی۔ اس کا نام "IN THE IMAGE OF MAO" ہے اور جس میں چین کے ان جاں بازوں کی سچی اور با اثر کہانیاں ہیں جنہوں نے اپنے ملک کے لئے قربانیاں دیں اور جان کی بازی لگا دی۔

آج کل عباس فلمی ڈیلی گیشن کے لیڈر کی حیثیت سے رُوس گیا ہوا ہے اور وہاں روس کو دیکھنے اور ساتھ ہی اپنے دیس کی عظمت اور خلوص کا سکہ جمانے کی کوشش میں مصروف ہے، وہ ہر چیز اور ہر جگہ سے ذرا ضرورت سے زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ چنانچہ آج کل اس کا یہ خیال ہے کہ ع

اگر فردوس بر روئے زمیں است

تو وہ یہی جگہ ہے جہاں وہ آج کل ہے۔

اس مضمون میں ہم نے عباس کی شخصیت کا ایک خاکہ ناظرین کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس کی طبیعت اور سیرت کو پورے طور پر وہی سمجھ سکتا ہے جو اس سے بہت قریب رہا ہو۔ اس کے مزاج اور طبیعت میں بہت سی متضاد چیزیں اکٹھی ہوگئی ہیں۔

عباس کو ہم "جینیئس" تو نہیں کہہ سکتے لیکن وہ ذہین اور تیز ضرور ہے اور یہ ذہانت اس کے چہرے سے، آنکھوں سے، قلم سے اور باتوں سے ٹپکتی ہے۔ ساتھ ہی اسے اپنی ذہانت کا احساس ہے۔ وہ اگرچہ اس پر مغرور نہیں لیکن ایک حد تک اسی ذہانت کے احساس نے اسے اپنے ارادے میں اس قدر پکا بنا دیا ہے کہ اسے ہٹ دھرم کہا جا سکتا ہے اور اسی وجہ سے وہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ جس کام میں ہاتھ ڈالے گا اسے ضرور پورا کرے گا۔ پچھلے کاموں کی ناکامی اسے اس لئے بد دل نہیں ہونے دیتی کہ مالی ناکامی، یا نقصان کو وہ نقصان نہیں سمجھتا اور سخن شناس کی تسکین اور قدر دان کی مسکراہٹ کو وہ اپنی ہر مشکل و مصیبت کی قیمت تصور کر لیتا ہے۔ لیکن وہ محض ذہین ہی نہیں، انتہا درجہ کا محنتی بھی ہے۔ وہ جس کام کو ہاتھ میں لیتا ہے، اسی کے لئے دن رات سر گاڑی پاؤں پہیہ کرتا ہے۔ اخبار کے لئے ایڈیٹوریل اور Last Page لکھتا ہو یا رسالے کے لئے افسانہ، فلمی کہانی لکھنی ہو یا فلم ڈائرکٹ کرنا ہو وہ اس طرح اس کام میں لگ جاتا ہے کہ کسی بات کا اسے ہوش نہیں رہتا۔ دنیا میں کیا ہو رہا ہے، خاندان کا کیا حال ہے، بیوی کس پریشانی میں ہے، دوستوں پر کیا بیت رہی ہے، وہ سب سے بے نیاز اپنے کام میں اس انداز سے محو ہوتا ہے گویا اگر یہ نہ ہوا تو کائنات اپنے محور پر گھومتی گھومتی رُک جائے گی۔ فلم کی شوٹنگ کے زمانے میں خاص طور پر اس کی حالت قابلِ رحم ہوتی ہے۔ کپڑے میلے ہیں۔ داڑھی بڑھی ہوئی ہے آنکھیں سُرخ، چہرہ اُترا ہوا، چوبیس گھنٹے میں دو تین گھنٹے کی نیند نصیب نہیں۔ ایک دو وقت کا کھانا ڈھنگ سے نہیں کھا سکتا مگر کوئی پروا نہیں، کوئی فکر نہیں۔ ہاں اس وقت کوئی ٹوکے نہیں یا ہمدردی نہ کرے ورنہ عباس کا پارہ ایک سو دس ڈگری پر پہنچ جائے گا۔ اس مسلسل محنت اور بے اصول طریقۂ زندگی کا اثر اس کی صحت پر بھی بُرا پڑا ہے۔ اس کے قویٰ اچھے ہیں اور صحت اکثر خراب رہتی ہے۔ ڈاکٹر اس کے ہر مرض کا علاج آرام کرنا اور با اصول طریقے سے پابندیٔ وقت کے ساتھ سونا، کھانا اور کام کرنا تجویز کرتے ہیں، مگر عباس نے ۲۵ سال سے بے اصولی کو اصول بنا رکھا ہے۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہے مگر اس کی پابندی نہیں کر سکتا کہ وقت پر کھائے، سوئے اور وقت سے کام کرے۔

عباس کے لئے دوسرا ناممکن کام خرچ اور آمدنی میں توازن رکھنا ہے۔ جب وہ سو ڈیڑھ سو کماتا تھا تب بھی قرض دار رہتا تھا۔ جب ہزاروں کماتا تھا تب بھی، اور جب بالکل کچھ نہیں ہوتا تب بھی اس کے اخراجات میں کمی نہیں آتی۔ بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ جب تک اس کی آمدنی محدود تھی تب بھی اسے فراغت حاصل تھی اور چند اخراجات مثلاً والدہ کو خرچ دینا، ایسے تھے جن کو وہ پابندی کے ساتھ ادا کرتا تھا۔ لیکن جوں جوں اس کی آمدنی بڑھی اس کی تنگ دستی بھی بڑھتی گئی۔ اس لئے کہ نہ وہ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے کا قائل ہے اور نہ یہ جانتا ہے کہ کون سے خرچ لازمی ہوتے ہیں اور کون ایسے جن کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ وہ خود انتہائی نفس کش، جفاکش اور ایک حد تک پھوہڑ ہے۔ اسے کبھی معقول اور اچھے کپڑے پہنے دیکھئے تو سمجھ جائیے کہ کسی دوست کے ہوں گے۔ نہ وہ اپنی ذات پر خرچ کرتا ہے نہ بیوی بچوں پر۔ اس لئے کہ وہ میاں سے زیادہ نفس کش اور جفاکش ہے۔

نہ اسے نفیس کھانوں کا شوق ہے اور نہ عیش و آرام کا۔ لیکن اس کے باوجود اس کے پاس پیسہ نہیں رہتا۔ اول تو وہ دوسروں کی پریشانی اور تکلیف نہیں دیکھ سکتا۔ دوسرے چال باز اور زمانہ ساز دوست بڑی آسانی سے اس سے سینکڑوں روپے اینٹھ سکتے ہیں جب کہ گھر کی اشد ضرورت کے لئے دس بیس خرچ کرنے میں وہ سوچ بچار کر رہا ہے۔ پھر جو کام جس زمانے میں وہ کرتا ہے۔ اسے مالی لحاظ سے اکثر گھاٹا ہوتا ہے اور اس کی کمائی کا بیشتر حصہ اس میں جھونک دیا جاتا ہے۔ تحفے لانے اور دینے کا بے انتہا شوق ہے۔ جب ضرورتوں پر بیس پچیس خرچ نہ کر رہا ہو اس وقت بھی وہ کہیں جائے تو وہاں سے سینکڑوں کے تحفے لے آتا ہے۔ پھر یہ تحفے مخصوص لوگوں کے لئے نہیں۔ چیزیں رکھی ہیں۔ اس کے دوست، آشنا، ملنے جلنے والے آ رہے ہیں، جس کو جو پسند آیا اٹھا کر لے گیا۔ میاں عباس بہت خوش ہیں کہ ان کی لائی ہوئی چیزوں کی تعریف ہو رہی ہے۔ کسی نے کہہ دیا کہ یہ کیا طریقہ ہے چیزیں برباد کرنے کا تو وہ برہم ہو جائے گا۔ وہ پھٹے کپڑے اور پرانا جوتا پہنے پھر رہا ہو (اس لئے کہ ان کاموں کے سلئے اس کے پاس پیسے بہت کم نکلتے ہیں) مگر کوئی فرمائش کر دے تو جھٹ سینما دکھانے لے جائے گا۔ بچوں کو آئس کریم کھلانے ہی میں پچیس تیس روپے خرچ کر دے گا۔ بے دھڑک قرض لیتا ہے جس کے ادا کرنے کی فکر میں خواب و خور حرام کر لیتا ہے اور دن رات کام کرتا ہے۔ بے تحاشا "قرض" دیتا ہے جس کے واپس لینے کا خود اسے تو کبھی خیال آتا ہی نہیں اگر کوئی دوسرا بھی توجہ دلائے تو بگڑ جاتا ہے اور لینے والے کو بھی بہت کم اسے واپس کرنے کا دھیان آتا ہے۔ اس کے پاس ٹیکسی کے کرائے کے پیسے نہ ہوں گے اور وہ کلکتہ، چین یا روس جانے کا پروگرام بنا رہا ہوگا۔ بنک میں ہزار پانسو جمع نہ ہو لیکن لاکھوں کی فلمیں بن رہی ہوں گی۔ ۲ر کا خط بھیجنے میں بخل کرے گا اور پچاس کا تحفہ آسانی اور خوشی سے نذر کر دے گا۔ وہ روپیہ کمانا جانتا ہے مگر نہ ڈھنگ سے خرچ کرنا جانتا ہے نہ اس کا رکھنا۔ اس کے پاس اپنا گھر نہیں، اپنی موٹر نہیں، گھر میں عمدہ ساز و سامان نہیں، اپنے پاس کافی کپڑے نہیں، بیوی کے پاس زر و زیور نہیں۔ صرف ایک چیز ہے جس کے جمع کرنے کا عباس کو انتہا سے زیادہ شوق ہے اور وہ ہیں کتابیں۔ کوئی اچھی کتاب دنیا کے کسی کونے میں چھپے، کسی قیمت کی ہو عباس جب تک اسے منگا نہ لے گا اسے چین نہ آئے گا۔ اگرچہ اس کی ان [illegible] کتابوں کو بھی اس کے "کرم فرما" نہیں چھوڑتے ——— اس لئے ——— کہ اس کا اصول ہے کہ اس کے گھر کی ہر چیز دوسروں کی بھی ہے۔ "مجھے تالے کنجی میں چیزیں رکھنے سے نفرت ہے۔ جس کو ضرورت ہو وہ لے جائے۔" اور اس کی ہزاروں کتابیں اسی طرح ضائع ہو چکی ہیں لیکن اب بھی جو چیز اس کے گھر میں نظر آتی ہے وہ کتابیں ہیں۔ عباس کو اپنے اور بیوی کے لئے گھر کی ضرورت نہیں۔ لیکن ان کتابوں کی خاطر اسے گھر ——— خاصا بڑا گھر ——— لینا پڑتا ہے۔ اس لئے کہ اس کو تو ہر شخص ساتھ رکھنے پر تیار ہو جاتا ہے لیکن ان بیسیوں الماریوں اور ہزاروں کتابوں رسالوں کے ڈھیر کی مہمان داری کون کرے؟

عباس ذہین ہوتے ہوئے بھی خطرناک حد تک سادہ لوح ہے۔ دنیاوی چال فریب سے ناواقف محض۔ اسے بڑی آسانی سے لوگ اپنے فریب کے جال میں پھنسا لیتے ہیں۔ مردم شناسی کا مادہ اس میں بہت کم ہے اور لوگوں کی ظاہری محبت و خلوص اور ہمدردی سے بڑی جلدی متاثر ہو جاتا ہے پھر جب آخر کار دھوکے بازوں کے دھوکے سے آگاہ بھی ہو جائے تو مروت کے باعث اس سے نکلنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اس پر جب کسی ایسے ابن الوقت "دوست" یا "کرم فرما" کا حال کھلتا ہے تو مدتوں اس کا غم کرتا ہے لیکن پھر اسے معاف بھی کر دیتا ہے۔

عباس بڑا جذباتی، نرم دل اور حساس ہے۔ مگر اپنے کو بہت سخت دل اور جذباتی محبت سے بیگانہ سمجھتا ہے۔ اظہارِ محبت و خصوصیت سے بہت گھبراتا ہے اور اسے "Fuss" کہتا ہے اور مذاق اڑاتا ہے۔ گھر میں اس کی ذرا سی خاطر یا خیال کیجئے تو وہ بجائے خوش ہونے کے الٹا جھنجھلائے گا۔ اور الجھے گا کہ "مجھے یہ نخرے نہیں بھاتے۔" لیکن اصل میں وہ محبت و مدح سے بہت متاثر ہوتا ہے بشرطیکہ اس کا کرنے والا اس کے مزاج کے انداز کو پہچان لے۔ اس میں بچپن سے احساسِ کمتری کا ایک چھپا ہوا مادہ ہے اور اس لئے زمانہ ساز اور چال باز دوستوں کے بناوٹی خلوص، مداحوں کی مدح سرائی اور بنت [illegible] جذباتیت، اس کے دل کی گہرائیوں میں برتری کے احساس کو ابھارتی اور اسے تسکین دیتی ہے۔ وہ اس قسم کے اظہارِ خلوص کو سچا خلوص سمجھ لیتا ہے۔ اس کی [illegible] سادہ لوحی کی بدولت دوسروں نے بڑے بڑے فائدے اور عباس نے بڑے بڑے نقصان اٹھائے ہیں۔ بدنامی، دکھ اور غم سہا ہے عباس

فرشتہ نہیں انسان ہے ۔ اس میں بہت سی خامیاں ہیں۔ اس سے لغزش بھی ہو سکتی ہے لیکن وہ جہاں دوسروں کی غلطیوں کو آسانی سے معاف کر سکتا ہے اپنی کسی لغزش کو معاف کرنا اس کے لئے بڑا کٹھن ہے اور اس کی گہری ندامت اور کڑا احتساب نفس اور دلی رنج اس کے قصور کو دھو سکتا ہے ۔

عباس بظاہر گھر اور خاندان کے حالات سے بیگانہ، بے پروا اور سخت دل انسان نظر آتا ہے لیکن جن لوگوں نے اسے اپنے والد کی آخری بیماری میں خدمت کرتے دیکھا ہے، اسے سالہا سال اپنی والدہ کی تکلیف میں ان کے ساتھ راتوں کو جاگتے اور ان کے دکھ پر اپنا دل خون کرتے پایا ہے، اپنے بھائی کی بیماری میں ساری ساری رات جاگ کر اور سارا کام کاج چھوڑ کر تیمارداری میں محو پایا ہے، جنہوں نے اسے اپنی بیوی کی بیماری میں خواب و خور حرام کر کے آٹھ آٹھ دن پلنگ کی پٹی سے لگے دیکھا ہے، وہ جانتے ہیں کہ اس "سخت دل" عباس کے ظاہری خول کے نیچے ایک بہت نرم و نازک کھال ہے۔ اس کے دل میں صرف انسانیت کی اور ملک و قوم کی محبت ہی نہیں، صرف ادب و آرٹ کی خدمت کی لگن ہی نہیں بلکہ دوستوں اور عزیزوں کی محبت، بیوی کا گہرا پیار، اور ان سب سے سچا لگاؤ موجود ہے البتہ اس کا اظہار ہر وقت نہیں بلکہ کسی ایسے ہی سخت وقت پر ہوتا ہے۔

عباس کے اپنے کوئی بچہ نہیں لیکن بچوں سے اسے بڑی محبت اور دلچسپی ہے۔ وہ ان میں مل کر خود بھی بچہ بن جاتا ہے اور ایسی حرکتیں کرتا ہے کہ بچے اسے بالکل اپنا ہم سن دوست سمجھ لیتے ہیں۔ صرف بچوں پر ہی منحصر نہیں نو عمر لڑکے لڑکیوں سے بھی وہ چند منٹ میں بے تکلف ہو سکتا ہے۔ وہ ان سے مذاق کرے گا، ڈانٹے گا، بحث مباحثہ کرے گا اور چیخے چلائے گا۔ بالکل اس طرح جیسے اپنی عزیز لڑکیوں لڑکوں کو کرتا ہے۔ اس کی یہ طفلانہ حرکتیں اور بے تکلفانہ انداز اسے بچوں اور نوجوانوں میں یکساں محبوب بنا دیتے ہیں۔ یوں بھی عباس جس محفل میں پہنچ جائے اس پر عام طور پر چھا جاتا ہے ۔

عباس پردے کا سخت مخالف ہے لیکن اسے عورتوں کے ننگے لباسوں، کھلے سر اور شوخ سنگاروں سے اس سے زیادہ نفرت ہے۔ وہ عورت کو مرد کے مساوی درجہ دیتا ہے مگر سوسائٹی کی شوخ و شنگ، نمائش کی دلدادہ عورتوں کو کبھی عزت کی نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔

وہ بڑے سے بڑے خطرے کا مقابلہ کر سکتا ہے مگر بلی اور چوہے سے ڈر جاتا ہے۔ کھلی ہوئی ٹھنڈی ہوا سے ڈرتا ہے اور بادل کی گرج سے گھبراتا ہے۔ بڑے سے بڑے آدمیوں کے رعب میں نہیں آتا، بڑے سے بڑے بزرگ کا کہنا ٹال سکتا ہے لیکن کوئی کمسن بچہ، کوئی الھڑ لڑکی بڑی آسانی سے اس سے اپنی بات منوا سکتی اور اپنا رعب جما سکتی ہے ۔

عباس میں بہت سی کمزوریاں ہیں لیکن یہ سب وہ ہیں جن سے زیادہ تر اسے خود تکلیف اور نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس میں خودسری ہے، ضد ہے ، ہٹ دھرمی ہے مگر اس لئے کہ وہ اپنی ذات کو قوم اور ملک، ادب اور آرٹ کی خدمت کے لئے مٹا دینا چاہتا ہے۔ اس کے چاہنے والے اسے سوچ سمجھ کر، دیکھ بھال کر، اونچ نیچ کا خیال کر کے کام کرنے کا مشورہ دیتے ہیں اور جب وہ ان کی نہیں سنتا تو اس سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ اس کی بے اصولی سے اور لاابالی حرکتوں سے کڑھتے ہیں لیکن عباس کی محبت کو دل سے کم نہیں کر سکتے۔ اس کی شخصیت میں کچھ ایسی کشش، اس کے قلم میں کچھ ایسا جادو، اس کی نگاہوں میں ایسا اثر اور اس کی باتوں میں خلوص اور سچائی کی ایسی بو باس ہے کہ لوگ اسے چاہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں ۔

ممتاز مفتی

مسعود قریشی

"اونئیں جی۔ ایہہ گل نئیں۔"

دیکھئے صاحب اس جملے پر بدکئے نہیں۔ مفتی کا اس جملے سے یہ مطلب نہیں کہ وہ آپ کی بات کو نہ سمجھا ہے۔ اور آپ سے متفق نہیں۔ یہ تو محض اس کا انداز تخاطب ہے۔ آخر مخاطب کرنے کے لئے کوئی مجہول جملہ تو کہا ہی جاتا ہے نا۔ "دیکھئے صاحب" "سنئے صاحب" "میں کہتا ہوں" یا کچھ اور۔ بس مفتی کا بھی یہ اسی قسم کا خطابیہ جملہ ہے۔ ویسے میں آپ سے متفق ہوں کہ خطابیہ جملے کے طور پر یہ الفاظ کچھ زیادہ موزوں نہیں۔ بلکہ زیادہ موزوں نہیں کیا بالکل ناموزوں ہیں۔ خواہ مخواہ دوسرا آدمی چڑ جاتا ہے۔ ایک قسم کی ضد پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر آپ مفتی کو جانتے ہیں تو یہ ضد پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور اگر آپ کی پہلی ملاقات ہے تو اس کی شخصیت اور گفتگو میں اپنانے کے لئے کئی اور پہلو موجود ہیں۔ اب آپ سے کیا چھپاؤں۔ پہلی ملاقات (ہے تو اس کی شخصیت) میں اس سے یہ جملہ سن کر مجھے خود بڑا غصہ آیا تھا۔ دیکھئے نا پہلی ملاقات میں تو انسان ملاقاتی سے ہر ممکن طور پر متفق ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ ابھی کل کی بات ہے، میری موجودگی میں دو دوستوں کا تعارف ہوا۔ اور وہ دونوں شرفا کی طرح ایک دوسرے کو اپنانے کے لئے ہر بات میں متفق ہونے کی کوشش میں مصروف ہو گئے۔ بات چیت کا انداز کچھ ذاتی سا تھا۔ چنانچہ ایک صاحب جو کافی بڑے افسر تھے اور اس لئے بلا کسی خطرے کے اپنی نالائقی کی داستانیں سنا سکتے تھے۔ کہنے لگے کہ وہ میٹرک میں تین دفعہ فیل ہوئے۔ دوسرے صاحب شومیٔ قسمت سے کلرک قسم کی چیز تھے۔ اس لئے ان پر واجب تھا کہ اپنی واقعی یا مفروضہ ذہانت کے قصے سنائے۔ (اور وہ سنایا بھی کرتے تھے)، لیکن پہلی ملاقات کا سوال تھا۔ شرافت کا تقاضا تھا کہ اتفاق کی راہ نکالی جائے۔ چنانچہ انہوں نے بھی کہا کہ وہ نویں جماعت میں چار دفعہ فیل ہوئے تھے۔ دونوں میں یہ بات بھی مشترک نکلی کہ بچپن میں کافی غربت میں زندگی گزری تھی۔ سکول سے عموماً ناغہ کیا کرتے تھے۔ استادوں کا ادب بالکل نہیں کرتے تھے۔ اور دونوں کی والدہ وفات پا چکی تھیں۔ افسر حضرت نے یہ بھی کہہ دیا کہ ان کے والد کی حال ہی میں وفات ہوئی ہے۔ دوسرے صاحب تھوڑی دیر کے لئے جھجکے اور پھر نیچی نظروں سے فرمانے لگے "میرا والد بھی کئی بیماریوں میں مبتلا ہے اور عنقریب ہی دنوں میں وفات پانے والا ہے۔"

دیکھئے نا پہلی ملاقات میں شریف لوگ تو اتفاق رائے کے لئے اس حد تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور ایک یہ مفتی ہے کہ پہلی ہی ملاقات میں "اونئیں جی ایہہ گل نئیں" کا ٹھیٹھ پنجابی لٹھ مارتا ہے۔ چنانچہ پہلی ملاقات پر مجھے بھی بڑا غصہ آیا۔ لیکن مروّت کی وجہ سے پی گیا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ مروّت کی ایک ہی نشانی ہے۔

کوئی کچھ کہے، کچھ کرے۔ بس خاموش رہو۔ لیکن جلد ہی مجھے اپنے غصّے پر ہنسی آنے لگی۔ وجہ یہ کہ مفتی اپنے اس جملے کے باوجود مجھ سے اختلاف نہیں کر رہا تھا۔

دراصل قصہ یوں ہے کہ مفتی لاشعور کا دیوانہ ہے، اور اگر وہ بے شعور نہیں تو کم از کم اسے اتنی اہمیت نہیں دیتا۔ اس کے خیال میں بات کا اصل مطلب ظاہر الفاظ سے ہٹ کر ہوتا ہے۔ اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ باقی لوگ بھی اس حقیقت کو سمجھتے ہوں گے۔ وہ کہی سے زیادہ "ان کہی" پر توجہ دیتا ہے۔ جب آپ اس سے بات کریں تو وہ عذر اس بات پر نہیں کرے گا۔ جو آپ لفظوں کے قالب میں اس تک پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں بلکہ اس کی توجہ اس حصے پر ہوگی جو آپ حذف کر رہے ہیں۔ بات تو عجیب سی ہے لیکن حیرت ہے کہ اس کے باوجود اسے سمجھدار انسان کہا جا سکتا ہے۔

یہی حال اس کے افسانوں کے کرداروں کا ہے۔ "آپا" تو آپ نے پڑھا ہی ہوگا۔ جی ہاں بڑی ہی پیاری کہانی ہے۔ سات زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ ویسے یہ سن کر آپ کو حیرت ہوگی کہ مفتی اسے اپنی بہترین کہانیوں میں شمار نہیں کرتا۔ اس بات میں تو وہ بالکل یوسف ظفر ہے۔ دونوں کو اپنی بہترین تخلیقات ہمیشہ بھول جاتی ہیں۔ اور اگر یاد رہیں تو وہ انہیں بہترین نہیں سمجھتے۔ یہ نقص صرف ان دو ادیبوں میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے تقریباً ہر بڑے ادیب میں ہوتا ہے۔ شاید اس لئے کہ اپنی گنجلک تخلیقات میں انہیں تخیل اور جذبے کی وہ عظمت نظر آتی ہے جو ان کے ذہن میں تھی۔ لیکن لفظوں میں نہ ڈھل پائی اور قاری تک نہ پہنچ سکی۔ ہاں تو میں "آپا" کا ذکر کر رہا تھا۔ اس میں ایک کردار ہیں "بھائی جان" وہ باتیں تو کرتے ہیں "بدو" سے لیکن مخاطب ہوتی ہے "آپا" بات تو کر رہے ہیں کھلونوں اور کیرم کی اور مقصد ہے بازئ محبت کا۔ حیرت یہ ہے کہ اس کی کہانیوں میں یہ انداز بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔ کرداروں کی اصلی شخصیت پڑھنے والے پر آئینہ ہو جاتی ہے۔ لیکن گفتگو میں مفتی کا یہ انداز پوری طرح اپناتا نہیں۔ شاید اس لئے کہ باتوں میں مفتی خلوص سے بات کہنے کی بجائے SMART ہونے کی کوشش میں مصروف نظر آتا ہے اور SMART نظر آنے کی کوشش کرنے والے مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتے شاید اس لئے کہ میں خود اس کوشش میں عموماً ناکام رہتا ہوں!

افسانہ نگار مفتی نے تو جب سے ہوش سنبھالا۔ رسالوں، کتابوں کے ذریعے ملاقات رہی۔ شعور و لاشعور کی بھول بھلیاں تو نہ ہم اس وقت سمجھتے تھے نہ اب لیکن اس کے افسانے پڑھنے میں لطف بہت آتا تھا۔ عام افسانہ، ان کی عام باتیں، اور ان عام باتوں میں عام معنوں سے ہٹے ہوئے معنی۔ ڈھکے چھپے پہلو اس کی ایک کہانی "نفرت" نہیں پڑھی آپ نے بھی۔ "ان کہی" میں ہے وہ کہانی۔ خیر میں سناتا ہوں۔ ایک گاڑی میں دو لڑکیاں سفر کر رہی ہیں ایک نازلی حسین، شوخ، پردے سے نفرت کرتی ہے اور زرد رنگ سے عشق۔ دوسری لڑکی نجمہ نازلی کی بھاوج اور اس کی سہیلی ہے۔ گاڑی ایک سٹیشن پر رکی

"لاحول ولاقوۃ!"

میں نے نازلی کو لاحول پڑھتے سنا۔ دیکھا تو اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔

"کیا ہے؟" میں نے پوچھا

اس نے انگلی سے پلیٹ فارم پر ایک بنچ کی طرف اشارہ کیا۔ بنچ پر بجلی کی روشنی کے نیچے دو نوجوان کھانا کھا رہے تھے۔

"توبہ۔ جانگلی معلوم ہوتا ہے۔ کیسے بھدّے اعضا ہیں۔" نازلی نے جھرجھری لی اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"تم خواہ مخواہ کیوں پریشان ہو رہی ہو۔ جانگلی ہے تو پڑا ہؤا کرے۔" میں نے کہا

"اسے کھاتے ہوئے تو دیکھنا۔ توبہ ہے۔" نازلی نے یوں کہا جیسے اپنے آپ سے کہہ رہی ہو

اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ ہونٹ نفرت سے بھینچے ہوئے تھے۔

"توبہ!" نازلی نے نحیف آواز میں کہا "اس کا بس چلے تو کچا ہی کھا جائے۔ کوئی مردم خور معلوم ہوتا ہے۔"——

"مگر تم نے شادی سے انکار کیوں کیا؟" جانگلی کا ساتھی کہہ رہا تھا۔

بس اس لئے کہ مجھے بے پردگی سے سخت نفرت ہے (اور وہ پردہ نہیں کرتی تھی) آج کل کا بناؤ سنگار مجھے قطعی پسند نہیں۔ آج کل

تو عورتیں یوں بُرقع اٹھائے پھرتی رہیں جیسے جنگل میں شکاری بندوقیں - ہاں اور جو لڑکی زرد دوپٹہ پہن سکتی ہے میں اسے اپنی بیوی نہیں بنا سکتا - مجھے زرد رنگ سے چڑ ہے۔"

اس ٹکڑے سے آپ یہی سمجھے ہوں گے کہ نازلی کو اس گنوار سے شدید نفرت اور وحشت تھی، اور اس کی باتوں سے یہ نفرت شدید تر ہو گئی۔ لیکن نہیں صاحب۔ مفتیؔ کے فلسفۂ زندگی میں الفاظ اور حرکات کا وہ مطلب ہرگز نہیں جو ظاہر کیا جا رہا ہو۔ بلکہ وہ جو چھپانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ چنانچہ اصل کیفیت نازلی کے گھر پہنچنے پر کھلتی ہے۔

اگلے دن دوپہر کے قریب مظفر بھائی (نازلی کے شوہر) میرے (نجمہ کے) کمرے میں تشریف لائے - ان کے چہرے پر پریشانی اور تشویش کے آثار تھے۔ کہنے لگے

"نجمہ نازلی کو کیا ہو گیا ہے۔ کہیں مجھ سے ناراض تو نہیں؟"

"مجھے تو معلوم نہیں۔"

خدا جانے کیا بات ہے۔ اس میں وہ پہلی سی بات ہی نہیں۔ آج صبح سے ہر بات کے جواب میں نہایت فرمانبرداری سے "جی ہاں جی ہاں" ہو رہی ہے۔ نازلی اور جی ہاں - میں سمجھا مجھ سے ناراض ہے شاید۔"

"ویسے ہی طبیعت ناساز ہو گی۔"

"اگر طبیعت ناساز ہوتی تو کیا وہ باورچی خانے میں بیٹھی کام کر رہی ہوتی - وہ تو صبح سے باورچی خانے میں حشمت کے پاس بیٹھی ہے۔ کہتی ہے میں کھانا پکانا سیکھوں گی۔"

دو قدم چل کر وہ رک گئے

"اور ہاں مزے کی بات تو میں تمہیں بتانا ہی بھول گیا۔ جانتی ہو نا اسے زرد رنگ سے کتنا پیار ہے - میں نے اس مرتبہ ایک نہایت خوبصورت زرد دوپٹہ اس کے لئے خریدا تھا۔ خیال تھا وہ دیکھ کر خوشی سے ناچے گی - مگر اس نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا - وہیں کھونٹی سے لٹک رہا ہے۔"

(نفرت ——— ان کہی)

دیکھا آپ نے - یہ وہ دنیا ہے۔ مفتیؔ کے ہاں عام الفاظ اور حرکات کے برعکس معنی پہن لیتے ہیں - ان دنوں ہم سب دوست نہ صرف فرداً فرداً اس کے افسانے پڑھتے بلکہ چسکے کے لئے با جماعت اس کی تلاوت کرتے۔ فرائڈ کا نام ہم نے نیا نیا سنا تھا اور ہمارے ایک دوست حبیب اللہ بیگ نے چسکے کے لئے ہیولاک ایلس کی کئی ہسٹریاں بھی پڑھی تھیں۔ چنانچہ سب لوگوں کا خیال تھا کہ مفتیؔ بھی ایسی ہی کئی ہسٹریاں سامنے رکھ کر کہانی کے تانے بانے بنتا ہے۔ اس عمر میں یہ گمان کیسے گزرتا کہ یہ انوکھے پہلو کسی شخص کے اپنے مشاہدے یا تجربے کا نتیجہ ہو سکتے ہیں۔ اگر ہو سکتے تو ہمارے نہ ہوتے۔ اور چونکہ ہمارے نہیں تھے لہذا لازم ٹھہرا کہ کتابوں سے لئے گئے ہیں۔ اس وقت ان باتوں پر ہنسی آتی تھی۔ آج کل حقیقی زندگی میں جب لوگوں کے الفاظ اور حرکات کے خول سے متضاد حقیقت کھلتی ہے تو اس ہنسی پر ہنسی آتی ہے۔

پہلی دفعہ ایسے شخص سے جس نے گوشت پوست کے مفتیؔ کو دیکھا تھا پشاور میں ملاقات ہوئی۔ اچھی بھلی شکل صورت اور رنگ روپ (مفتیؔ کی نہیں اس کی) اچھا بھلا نام۔ جلیل۔ لیکن ساتھ کریر کی دم لگاتے ہیں جس کی نسلی وجہ تو جو ہو سو ہو جمالیاتی وجہ آج تک سمجھ میں نہ آسکی۔ ویسے کچھ ہو گی ضرور ورنہ کون بھلا آدمی محض نسلی بنا پر کریر جیسا دم چھلا چپکائے رہے گا! پشاور کے گرین ہوٹل میں بیٹھے گپ بازی کر رہے تھے۔ بے سلسلہ باتیں۔ سیاست کی۔ ادب کی۔ جانوروں کی۔ جانے کیسے مفتیؔ کا ذکر آ گیا۔ کہنے لگا

"یار بڑا دلچسپ آدمی ہے۔"

دلچسپی کا تو میں بھی قائل تھا۔ دلچسپی کی نوعیت جاننے کا اشتیاق ہوا۔ معلوم ہوا کہ ان کا علم بھی واجبی ہی ہے۔ ایک بات انہوں نے البتہ بتائی۔ کہنے لگے کہ ایک دن مفتی صاحب ایک تانگے میں خواجہ دل محمد روڈ سے گزر رہے تھے۔ وہ ایک اور دوست بھی ساتھ تھے۔ ہچکولے جو لگے تو کسی نے سڑک کی شکستہ حالت اور کارپوریشن کی بے توجہی کا رونا رویا، مفتی صاحب کہنے لگے

"او نئیں جی۔ سڑک کا کیا قصور۔ ذہن میں ہچکولے ہوں تو ہموار سڑک پر بھی لگیں گے۔ اور نہ ہوں تو سڑک بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔"

اس فقرے نے بڑا لطف دیا۔ دیر تک ہنستے رہے، اور متفقہ طور پر یہ فیصلہ ہو گیا کہ مفتی افسانے ہی کتابی نہیں لکھتا۔ باتیں بھی کتابی کرتا ہے۔

مفتی سے پہلی ذاتی ملاقات مری میں ہوئی۔ یہ یوسف ظفر کے ہمراہ وہاں آیا تھا۔ ظفر سے پشاور میں ایک مشاعرے میں ملاقات ہو چکی تھی۔ انہوں نے مفتی سے تعارف کرایا۔

ادیبوں سے ملاقات کرنے سے میں بہت کتراتا ہوں۔ یہ ملاقاتیں بہت غیر فطری اور طبیعت پر بار ہوتی ہیں۔ آپ اس شخص کی تخلیقات پڑھ کر ذہن میں ایک تصور قائم کر چکے ہوتے ہیں۔ ادبی تخلیقات چونکہ دل اور دماغ کا حسین امتزاج ہوتی ہیں اس لئے عموماً ایک بڑی ذہین اور شفاف قسم کی تصویر آپ کے تصور پر نقش ہو چکی ہوتی ہے۔ جب ملاقات ہوتی ہے تو ایک بہت عام بلکہ عام سے بھی گھٹیا شخص سے، چنانچہ ذہن کی تصویر چکنا چور ہو جاتی ہے۔ اور آپ اس شخص کی طرح محسوس کرتے ہیں جو کورٹ شپ کے رومانی اور رنگین دھندلکوں میں سے خوابوں کی ملکہ کے دیکھنے کا عادی ہونے کے بعد پہلی مرتبہ حقیقت کی دنیا میں اس محبوبہ کو بیوی کے روپ میں دیکھتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ جب کسی ادیب کی کسی سے ملاقات کرائی جائے تو وہ خواہ مخواہ اپنے لفظوں اور حرکات سے ملاقاتی پر اپنے فوق البشر ہونے کا نقش چھوڑنے پر مصر ہوتا ہے۔ انجام یہ کہ ایک مصنوعی کھوکھلے ماحول میں دونوں ملتے ہیں اور ایک دوسرے سے بیزار رخصت ہوتے ہیں۔ چنانچہ چند ایک ایسے ہی تجربوں کے بعد (ماسوائے فیض کے) میں ایسی ملاقاتوں سے کترانے لگا تھا۔ بہرحال مری میں تالاب کے قریب سردیوں کی ایک شام پانچ فٹ چار انچ کے اس منحنی افسانہ نگار سے ملاقات ہوئی۔ ملاقات کے رسمی فقروں کے بعد پہلی ہی کسی بات پر جب کہ یوسف ظفر اپنی مونچھیں نتھنوں میں سمیٹے دانت ہونٹوں پر دھرے مسکرا کر "جی بھائی" کی رٹ لگا رہا تھا مفتی نے اپنے اجڈ پنجابی لہجے میں کہا —

"او نئیں جی ایہہ گل نئیں۔"

بڑا غصہ آیا تھا مجھے۔

"بن رہا ہے۔ بڑا افسانہ نگار ہی سہی۔ لیکن انسانیت بھی تو کوئی چیز ہے۔" میں نے سوچا اور پھر دو تین منٹ بعد ہی یہ ساری بناوٹ اور جھجک نہ جانے کیسے دور ہو گئی۔ یہ بھول کر کہ میں اس وقت ہندوستان کے نمبر دو افسانہ نگار سے ابھی ابھی متعارف ہوا ہوں ہم عام دوستوں کی طرح عام عام سی باتیں کر رہے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔

اس کے بعد مری میں اس سے ملاقاتیں رہیں۔ اس کے کمرے میں جب پہلے پہلے آنا جانا شروع کیا تو بڑی کوفت ہوتی تھی۔ سارا سارا دن اپنے گندے بستر میں گندہ سا پاجامہ اور قمیض پہنے پڑا رہتا۔ دوسرے کونے میں یوسف ظفر کا ڈیرہ ہوتا۔ کئی کئی دن وہ منہ نہ دھوتا۔ بس پڑا چائے پیتا۔ تاش کھیلتا۔ گپ بازی کرتا اور لکھتا۔ باہر آنے جانے سے کتراتا۔ کہتا

"مجلسی آدمی نہیں خلوت پسند ہوں۔ اپنی تو ذات ہی محشر خیال ہے۔" اگر کبھی مجبور کر کے باہر جانے کے لئے اسے تیار بھی کرتے تو مناسبت کا خیال کئے بغیر کپڑے پہنتا۔ ناٹ کا خیال کئے بغیر ٹائی لگانا، دھار وغیرہ کے بغیر، پتلون پہننا اور یوں بے پروا چل دینا جیسے کسی واقف سے ملاقات کا خطرہ ہی نہیں۔ اس کی اس حالت سے مال روڈ پر یا ریستوران میں جب دوسرے خوش پوش لوگ گھورتے تو ہم نادم ہو جاتے لیکن اسے ذرہ برابر خیال نہ ہوتا۔ اپنے بے تکلف انداز میں "او نئیں جی" میں مصروف رہتا۔

مفتی کی اس عادت کا ذکر ایک دفعہ میں نے "کشمیر اداس ہے" والے محمود ہاشمی سے کیا (ہاشمی مفتی کا شاگرد رہا ہے)، وہ کہنے لگا کہ سکول ماسٹری کے

زمانے میں مفتی سب سے زیادہ خوش پوش آدمی سمجھا جاتا تھا۔ لڑکے اس کی تقلید کرتے تھے اور دوسرے ماسٹر تنقید۔ یہ بھی ہاشمی سے معلوم ہوا کہ مفتی تھا بہت سخت گیر۔ بہت مارتا تھا۔ لیکن پڑھانے کا طریقہ بھی انوکھا تھا۔ انجام یہ کہ سب لڑکے اس سے ڈرتے تھے۔ درمیانہ قسم کے اور ہوشیار طالب علم تو بہت پسند کرتے تھے۔ ہاں ازلی نالائق محض ڈرتے تھے۔ اور کو سنتے۔ مفتی سے جب میں نے ہاشمی کی اس گفتگو کا ذکر کیا تو کہنے لگا

"اونئیں جی۔ وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ وہ دن ظاہری بناؤ سنگار کے تھے۔ ہر شخص کی زندگی میں ایک دن ایسا آتا ہے جب وہ اس حقیقت کو پالیتا ہے کہ بھدے کپڑے بھی اسی قدر جاذب توجہ ہیں جس قدر بھڑکیلے۔ مطلب تو توجہ حاصل کرنے سے ہے نا؟"

آخری فقرے میں ہنسنے کی اتنی واضح کوشش تھی کہ مجھے بھی ہنسی آگئی اور اس نے بھی دانت نکال دئے۔

اچھا یہ بات مفتی میں کمال ہے۔ بلکہ اب تو اس کی فطرت کا جزو بن چکی ہے کہ بات ہو یا افسانہ روایت سے بغاوت ضرور کرے گا۔ ایسی بات کہنے میں تو اسے خاص لطف آتا ہے جو غیر متوقع ہو۔ ایک روز ہمارے ایک نیک پاک دوست محمد عمر نے مفتی سے گلہ کیا کہ تم جگہ جگہ مجھے بدنام کیوں کر رہے ہو۔

"یار بڑا بے وقوف ہے تو" مفتی صاحب چہکے

"ورڈ ورڈم....." عمر غصے میں بولتا گیا۔ مطلب یہ تھا کہ

"اس میں بے وقوفی کی کون سی بات ہے۔ سیدھی طرح جواب دو میری بات کا۔"

"کیا تمہارا خیال ہے میں تمہارا ایسا ہی دشمن ہوں کہ تمہاری نیکی کی تشہیر کرتا پھروں۔"

"اس میں دشمنی کی کیا بات ہوئی؟"

"دشمنی نہیں تو اور کیا ہے۔ اگر تمہارے دوستوں کو معلوم ہو گیا کہ تم واقعی نیک ہو تو کسی کو تمہاری شخصیت میں دلچسپی نہ رہے گی۔ سارا رعب جاتا رہے گا تمہارا۔ اور پھر میری بھی تو سخت بدنامی ہے"

"یہ کیا واہی تباہی بک رہے ہو۔ بدنامی کیسی؟"

"لوگ کہیں گے مفتی اتنا گھٹیا ہو گیا ہے ایسے یار بناتا ہے جنہیں نیکی کے علاوہ کوئی کام ہی نہیں۔"

قہقہہ پڑا اور عمر صاحب کا غصہ۔ اور گلہ اس میں دب کر رہ گیا۔

اپنے افسانوں میں بھی انوکھی بات نئے انداز میں کہنے کی دھن میں وہ لاشعور کے طلسمات میں غوطہ زن ہوا۔ کردار تو اس کے ہی عام انسان تھے۔ یہی اسمارائیں، یہی سمیع، یہی آپا جان، یہی بھائی جان۔ وہی سیدھے سادے واقعات جو ہماری آپ کی دنیا میں غوطہ زن ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ان عام لوگوں کے عام واقعات میں مفتی وہ پہلو دیکھتا ہے جو ہم آپ نہیں دیکھتے۔ اور وہ انہیں اپنے مخصوص انداز میں بیان کرتا ہے۔ نقطۂ نگاہ کا یہ عجب اور اظہار کا انوکھا پن۔ مفتی کی باتوں کی بھی خصوصیت ہے اور افسانوں کی بھی۔

بیٹھے بٹھائے جب مفتی آپ کی بات کو سیدھی سادی بات کو "اونئیں جی" کی کند چھری سے کاٹے تو سمجھ لیجئے کہ میاں ممتاز مفتی بات کا کوئی انوکھا پہلو پیش کرنے کی تمہید کر چکے ہیں۔ ویسے یہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ اس کی بات مانیں نہ مانیں۔ اس پر عمل کریں نہ کریں۔ اس کی دلچسپی کے طلسم سے نہیں بچ سکتے۔

اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر آپ اس کی عجیب باتوں کو حقیقت کے روپ میں بھی دیکھ لیں گے۔ چاہے اس بات نے لمحے بھر کے لئے ہی حقیقت کا روپ محض آپ کو پریشان کرنے کے لئے دھار لیا ہو۔ اس کا ایک افسانہ ہے۔ نام مجھے یاد نہیں۔ شاید آپ کو یاد آجائے۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ ایک نوجوان لڑکا محلے کی ایک نوجوان لڑکی سے عشق کرتا ہے۔ لڑکے کے کمرے کی کھڑکی ملاقات کا ذریعہ بنتی ہے۔ افسانے

میں اس لڑکے کی شادی لڑکی سے ہو جاتی ہے۔ (آج کل تو عام زندگی میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے) ازدواجی زندگی میں تلخیاں آتی ہیں، لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں سخت سست کہا جاتا ہے۔ بات چیت کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے، پھر آدھی رات کے قریب کمرے کی اس کھڑکی پر آہستہ سے دستک ہوتی ہے۔ لڑکی خوف سے دبی آواز میں پوچھتی ہے —

"کون؟"

"میں ہوں انور" جذبات سے بھری آواز آتی ہے۔

کھڑکی آہستہ سے کھلتی ہے۔ لڑکا جوتے بغل میں دبائے ڈرا سہما ہوئے ہوئے داخل ہوتا ہے۔ کھڑکی آہستہ سے بند ہو جاتی ہے۔

رات بھر سرگوشیاں ہوتی ہیں۔ ملبوس سرسراتے ہیں اور اگلے روز پھر زندگی کا دھارا سکون سے بہنے لگتا ہے۔

بڑی عجیب بات ہے۔ ہے نا۔ یہ "عجیب" آپ کو مفتی کی کہانیوں اور باتوں میں عموماً ملے گا۔ یہ عجب ہی مفتی ہے۔ ویسے اس سلسلے میں آپ کو ایک واقعہ سنا دوں۔ میرے اپنے ایک دوست نے سچ مچ ایسی ہی ایک کھڑکی بنا رکھی ہے۔ یہ کھڑکی ہے ٹیلیفون۔ اپنی ہی بیوی سے ٹیلیفون پر عشق و محبت کی باتیں کی جاتی ہیں۔ اور کسی ریستوران میں ملنے اور چائے پینے کے وعدے وعید ہوتے ہیں۔ شادی کو تیرہ برس ہو چکے ہیں اور ماشاءاللہ تین بچے بھی ہیں۔ یقین نہیں آ رہا آپ کو۔ مجھے خود مفتی کے اس افسانے اور اپنے دوست کے اس واقعہ پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ آپ بھی یقین نہ کیجئے۔ جب تک کوئی ایسا ہی واقعہ آپ کے ساتھ یا آپ کے دوستوں کے ساتھ نہ ہو گزرے۔ یہ آپ خاطر جمع رکھئے کہ ایسا واقعہ ہوگا ضرور۔ میں نے کہا نا کہ حقیقتوں نے مفتی کی عجیب باتیں سچ کر دکھانے کے لئے اس سے سازش کر رکھی ہے۔

مفتی کی افسانہ نگاری کی ابتدا کا واقعہ بھی عجیب ہے۔ انگریزی کا اچھا ماہر بنتا ہے۔ لیکن اردو جاننے کا اس کو بالکل دعویٰ نہیں۔ یہ واقعہ ۱۹۳۶ء کا ہے۔ محمود ہاشمی نے ہی بتایا تھا آدمی گپ باز ہے اس لئے آپ کو سنانے سے پہلے میں نے اس کی تصدیق مفتی سے کر لی ہے۔ ملتان میں مفتی سکول ماسٹر تھا۔ اور راشد وہیں کلرک۔ ایک اور ماسٹر صاحب ایک رسالہ "نخلستان" کی ادارت کرتے تھے۔ وہ چھٹی پر گئے تو راشد سے ایڈیٹر کا کام کرنے کے لئے کہہ گئے، حالانکہ کچھ کم تھا۔ راشد نے مفتی سے کوئی انگریزی مضمون ترجمہ کرنے کے لئے کہا۔ مفتی صاحب نے ایک مزاحیہ مضمون انگریزی میں لکھا اور پھر راشد کے ارشاد کے مطابق اس کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ یہ ایک ہندوستانی فلم "البیلی دلہن" پر طنزیہ مضمون تھا۔ راشد نے مضمون پسند کیا۔ ہاشمی کہتا ہے کہ اس مضمون کا اتنا چرچا ہوا کہ جب ہاشمی نے افسانہ نگاری شروع کی تو پہلا افسانہ "نخلستان" کو ہی بھیجا۔ کچھ تعریفی خطوط بھی آئے۔ اور لکھنے کی فرمائش ہوئی۔ اس دفعہ ترجمے کی پہنچ نہیں تھی۔ اس لئے اردو میں کہانی لکھی گئی اور "ادبی دنیا" کے سالنامے میں چھپی۔ یہیں سے مفتی کی افسانہ نگاری کی ابتدا ہوئی جو آج سترہ سال بعد بھی عروج پر ہے۔ اس شہرت بلکہ دھاک کے بعد بھی وہ اپنے آپ کو زبان و بیان کا ہمدایا فن کا دیوتا نہیں گردانتا۔ اردو بولنے والوں کے ساتھ بھی پنجابی میں بات کرتا ہے۔ کہتا ہے مجھے زبان پر قدرت نہیں۔ اور یہ کہنے کے باوجود اظہار کے لطیف اور نازک پہلو پیش کرتا ہے۔ اس کا انداز اس قدر منفرد ہے کہ کسی افسانے سے بھی ایک ٹکڑا اٹھا کر پڑھ لیجئے۔ یقینی طور پر یہ کہا جا سکے گا۔ کہ یہ مفتی کا ہے یا نہیں۔ اردو کے شاعروں اور مزاح نگاروں میں تو چند باکمالوں کو اسلوب کی یہ انفرادیت حاصل ہے لیکن افسانہ نگاروں میں مفتی کے سوا کسی کو یہ امتیاز حاصل نہیں۔

"اگر شیخ اجمل حسین کو بے تحاشہ ہنسنے کی عادت نہ ہوتی۔ اگر خدا بخش کو صمد و کباب کے ہاتھ کے بنے ہوئے کباب کھانے کی لت نہ پڑتی اگر اسلم کو مس انگلی کی محبت کا عارضہ اور مجھے چغتائی کے خطوط کا جنون نہ ہوتا تو یہ آپ بیتی کبھی معرض وجود میں نہ آتی۔"

"اس واقعہ کو عمل میں لانے کے لئے فطرت کو کیا کیا کرنا پڑا۔ اور پھر جمیل اسلم خدا بخش اور میرے علاوہ ربڑ کی گڑیا کی طرح چیختی ہوئی بڑھیا۔ اس کی پوتی مینا جسے فطرت نے چغتائی کے کسی عمل سے متاثر ہو کر بنایا تھا۔ اور بالآخر ہمارا نوکر بدھو جو برائے نام بدھو نہ تھا۔"

"اے ہے لڑکی سر پہ دوپٹہ لے لے۔" ربڑ کی گڑیا چیختی اور ہمیں شدت سے اس بات کا احساس ہوتا کہ کہیں پاس ہی ایک لڑکی

موجود ہے جس کے سر سے ریشمی آنچل پھسل پھسل جاتا ہے۔

" اے ہے مینا سنبھل کے بیٹھ۔ تجھے اپنا ہوش بھی نہیں۔" اور ہمیں احساس ہوتا کہ وہ لڑکی عمر کے اس حصے سے گزر رہی ہے جب اپنا ہوش بھی نہیں ہوتا۔

وہ ربڑ کی گڑیا چیختی اور جمیل خواہ مخواہ شرماتا۔ اسلم کے دل میں انگلی کی یاد تازہ ہو جاتی۔ خدا بخش تہ بند جھاڑ کے کہتا۔ یار بڑے گرم مصالحے تلنے لگا ہے صدو کبابوں میں۔ گرمی ہو گئی ہے کچھ کچھ۔ اور میرے دل میں مینا بدوش کا چغتائی کا عکس ابھرتا۔"

(اوئی اللہ)

دیکھا آپ نے۔ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ یہ تحریر کہیں دیکھیں اور نہ پہچان پائیں۔ کہ یہ ممتاز مفتی ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے آپ خاکستری ہوتے ہوئے بال۔ دھنسی ہوئی آنکھیں، جھریوں والا لمبوترا چہرہ اور شکنوں بھرے لباس والے اسسٹنٹ انفرمیشن آفیسر کو دیکھتے ہی پہچان جاتے ہیں کہ یہ ممتاز مفتی ہے۔ ابھی پچھلے دنوں اس نے ایک نیا افسانہ بین بازار پر لکھا ہے۔

" بین بازار سے کہیں آپ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ اسے بین سے تعلق ہے۔ اگرچہ وہاں بین کے سنبوسے بنتے ہیں اور شہر بھر میں مشہور ہیں لیکن اس بازار کا نام "بے سن" تھا جو بگڑ کر بین ہو گیا۔

بین بازار کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ سرگرم خرید و فروخت ہونے کے باوجود جو وہاں سرِ شام سے دیکھنے میں آتی ہے، یوں محسوس ہوتا ہے جیسے خریدار کو خرید سے دلچسپی نہیں۔ اور دکاندار فروخت کی تگ و دو سے بے نیاز ہیں۔ وہاں کے دکاندار کے انداز سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ بذاتِ خود خریدار ہو۔ گاہک کی توجہ اس شے پر مرکوز نہیں رہتی جس کا وہ خریدار ہوتا ہے۔ وہاں کے بھکاریوں میں ایک احساسِ فراغت ہوتا ہے۔ وہاں کے مزدور کی پھٹی ٹوپی سر پر اس انداز سے دھری ہوتی ہے جیسے کسی نواب کی کلاہ ہو۔"

" وہاں کے کم سن آوارہ لڑکوں کی آنکھ میں بلوغت کی چمک ہوتی ہے۔ چلتے چلتے سپاہیوں کی چال ڈھال سے فرائض نہیں بلکہ حقوق کی جھلک مترشح ہوتی ہے۔ وہاں نوجوان آرزو کرتے ہیں کہ پختہ کار ہوتے، اور پختہ کار خواہش کرتے ہیں کہ جوان ہوتے۔ بوڑھے وہاں لاحول پڑھنے کے لئے آتے ہیں۔ وہ بین بازار ......"

میرے تجربے میں مفتی پہلا افسانہ نگار ہے جو اپنے علاوہ دوسرے افسانہ نگاروں کا بھی معتقد ہے۔ خاص طور پر منٹو کا۔ ابھی پچھلے دنوں جب منٹو پر عریانی کے الزام میں کراچی میں مقدمہ چلا تو مفتی کو بہت غصہ آیا۔

" میں مضمون لکھ رہا ہوں۔"

" کس بات پر؟" میں نے پوچھا

"بات کیا یار مسعود ادب کے معاملے میں یہ حکومت بھی کمال ہے۔ بھئی آخر کیا ہو گیا جو دو لفظ لکھ دیئے اس نے۔ خواہ مخواہ مقدمے بازی۔"

"پھر کس کی حمایت میں تقریر شروع کی ہوئی ہے؟"

" او نہیں جی، حمایت و مایت نہیں۔ وہ تو حرامی جو ہے سو ہے۔ لیکن انہیں بھی تو دیکھو۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ اپنے درزیوں کے خلاف کیوں مقدمہ نہیں چلاتے جن کی ساری دکانداری ہی اس بات پر ہے کہ لباس کے ایسے ڈیزائن نکالیں جن سے عورت کی ہر چھپانے کی چیز ملبوس ہو کر نمایاں تر ہو جائے۔ تاجروں پر کیوں مقدمے نہیں چلتے کہ یہ من کی پیاس، آنکھ کا نشہ اور تیری میری مرضی کیا نام ہوتے کپڑوں کے۔ ان کی تو سرپرستی ہو گئی۔ اور جہاں ادیب نے کوئی بات کہی مقدمے بازی شروع ہو گئی۔ واہیات بات ہے یار۔"

" لیکن یہ منٹو بھی تو باز نہیں آتا۔ بھئی کیا ضروری ہے جو وہ چار فقرے ایسے لکھ دے کہ گرفت ہو سکے۔

"وہ تو میں نے کہا نا کہ ہے ہی حرامی۔ آخر کون سی ایسی بات ہے جو اگر چاہو تو پہلو بچا کر نہ کہی جا سکے"۔

"اب اپنے افسانے ہی دیکھو۔ جنسیات کے علاوہ ان میں ہوتا ہی کیا ہے۔ اور موضوع پر کیا نہیں ہوتا۔ لیکن کبھی مقدمہ نہیں چلا تم پر"۔ میں نے لقمہ دیا۔

"اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ایک افسانہ لکھوں گا جس میں جنسِ محبت اپنی قبیح ترین غیر فطری صورت میں موجود ہوگی۔ لیکن مقدمہ نہیں چلے گا"
اور معلوم ہے آپ کو کون سا افسانہ لکھا گیا "لٹی کا بل"۔

مفتی عام انسانوں کی طرح محبت بھی کرتا ہے نفرت بھی کرتا ہے۔ دوستی بھی دشمنی بھی لیکن چونکہ عام انسان کہلانا چاہتا ہے اس لئے ان کو چھپاتا رہتا ہے۔ اور ان پر اپنے الو کھے الفاظ کے پردے ڈالتا رہتا ہے۔ چھپانے کا انداز بہت دلچسپ ہے۔ ایک حربہ جو عموماً استعمال کرتا ہے وہ تو ہے مبالغہ آمیز سچ۔ سچ میں اس قدر مبالغے سے کام لے گا کہ دوسرا اسے قطعی جھوٹ سمجھ کر گمراہ ہو جائے۔ اور وہ بنیادی سچ جس کے اظہار سے مفتی شرماتا ہے محفوظ ہو جائے۔ مجھے اس کی بہت کم باتوں پر یقین ہے۔ آپ بھی نہ کریں تو سکھی رہیں۔ سنا ہے ایک دفعہ شراب پی کر رات کے وقت گھر گیا۔ خیال تھا بیوی سوئی ہوئی ہوگی نوکر دروازہ کھولے گا۔ لیکن دروازہ کھلا تو بیوی کھڑی ہے۔ لمحے بھر کے لئے ٹھٹکا۔ پھر منہ اس کے قریب لے جا کر بدبو کا بھبکا اس پر پھینکا اور کہنے لگا "دیکھو شراب پی کر آ رہا ہوں"۔ وہ بے چاری بھلا اس گناہ کے یوں کھلے بندوں اعتراف کو کیسے مان لیتی۔ ہنس کر بولی کہ گپیں نہ ہانکیئے۔ میں اتنی احمق نہیں کہ الائچیوں کی خوشبو نہ پہچان سکوں۔ خواہ مخواہ مجھے چھیڑ رہے ہیں۔ اور اس کے بعد مفتی کی شراب نوشی پر ہمیشہ کے لئے الائچیوں کا پردہ پڑ گیا۔

اس کی یہ بات تو زیبِ داستاں ہی معلوم ہوتی ہے لیکن یہ تو میں نے خود دیکھا ہے کہ اگر واقعی کسی کو چاہتا ہے تو پندرہ سال کے بچے کی طرح اس جذبے اور اس کے اظہار سے ڈرے شرمائے گا۔ اس کا علاج یہ ہوگا کہ اس فرد سے اس کے واقفوں، ملنے والوں سب سے کہتا پھرے گا کہ مجھے تو اس سے عشق ہو گیا ہے۔ اور یوں اس طرز کی مبالغہ آمیز تشہیر کرنے سے اسے محفوظ کرے گا۔ محمد حسین ڈرامہ آرٹسٹ سے لگاؤ ہوا تو اسے اول درجے کا الو کا پٹھا کہہ کہہ کر اس کا مذاق اڑائے گا۔ یوسف ظفر سے کھٹ پٹ ہوئی تو جا بجا اس کا خود ذکر کرتا۔ اس کی تعریفیں کرتا اور ساتھ ہی کہہ دیتا کہ یار اس کی کیا بات ہے۔ بہت جذباتی آدمی ہے اور یوں جذباتی جذباتی کی تکرار سے اس کی شخصیت کو بے معنی بناتا رہا۔

ان سب چالاکیوں کے باوجود مفتی میں انسانیت کا عنصر غالب ہے۔ خود ہی کہا کرتا ہے کہ انسان میں باقی تمام جذبات کے مقابلے میں انسانیت کا عنصر زیادہ نہ ہوتا تو دنیا ختم ہو چکی ہوتی۔ انسانیت سے لبریز دل رکھتا ہے اور اس سے شرماتا ہے گھبراتا ہے۔ اسے ہر ممکن ذریعے سے چھپاتا ہے۔ لاشعورگی کی کر یہہ حقیقتوں کو اچھال کر، سچ میں مبالغہ کر کے۔ جھوٹ اور سچ کی چابک دست آمیزش سے اور "اونٹیں جی ایبہ گل نئیں" کے مسلسل استعمال سے۔ لیکن یہ انسانیت اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ اجاگر ہونے سے بھی باز نہیں آتی۔ افسانوں میں۔ باتوں میں "بے ـــ چارہ ـــ مفتی!"

قرۃ العین حیدر

ابنِ سعید

"عینی ایک ادبی فراڈ ہے۔"

"عینی کانوینٹ کی پڑھی ہوئی بددماغ قسم کی لڑکی ہے!"

"عینی ایک پردہ نشین لڑکی ہے جس نے کانوینٹ تو کیا، کسی انگریزی اسکول کی شکل بھی نہیں دیکھی!"

"عینی رومان پسند ہے!"

"اس کی طبیعت میں مغربیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے!"

"وہ ایک قدامت پرست مشرقی لڑکی ہے، جس کو کلبوں اور کاک ٹیل پارٹیوں سے کوفت ہوتی ہے!"

"عینی ترقی پسند ہے!"

"عینی ——— رجعت پسند ہے!"

——— یہ اور اس قسم کی ہزاروں باتیں آپ عینی کے بارے میں سنیں گے۔ ان لوگوں سے بھی جو اس کو ذاتی طور پر جانتے ہیں، اور ان سے بھی جو اس کو بالکل نہیں جانتے۔ ہر کوئی وثوق کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ بس یہ عینی پر "آخری حرف" ہے۔ اس سے زیادہ اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ میں بھی عینی کو ایک طویل عرصے سے جانتا ہوں۔ لیکن میں اب بھی وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ عینی کے بارے میں "آخری حرف" کیا ہے۔

بظاہر عینی کے بارے میں جو باتیں سننے میں آتی ہیں ان میں ایک طرح کا تضاد نظر آتا ہے۔ لیکن عینی سے مل چکنے کے بعد، یہ باتیں متضاد نہیں معلوم ہوتیں غیر معمولی بھی نہیں معلوم ہوتیں۔ اور اس تضاد میں ایک "ہم آہنگی" ایک قسم کی یک رنگی معلوم ہونے لگتی ہے ——— "تضاد اور ہم آہنگی" ہی غالباً عینی کی اصل شخصیت ہے۔

کئی سال پہلے کی بات ہے۔ دلی کے "ساقی" میں عینی کی ایک کہانی چھپی ——— ملکے پھلکے انگریزی وضع کے نام، انگریزی گیتوں کے پورے پورے STANZAS، بائیبل کی دعائیں، اور ان سب پر حاوی رومن کیتھولک کانونٹ کی مخصوص فضا ——— ان چیزوں نے پڑھنے والوں کو چونکا دیا اور شاید

جو کنا بھی کر دیا۔ اس کے بعد پے در پے اینی کی کئی کہانیاں چھپیں۔ ان سب کا کچھ ایسا ہی انداز تھا۔ یہی اَن ہونا سا، خوابناک سا، ماحول تھا۔ ایسا ماحول جو اس مادی حقیقی دنیا سے منسلک ہوتے ہوئے بھی کچھ ماوراء تھا۔ اور جب کبھی اینی کی کوئی کہانی چھپتی تو "ساقی" کے صفحے کے صفحے انگریزی رسم الخط سے پُر نظر آتے، ان کہانیوں کے عنوان بھی کچھ نئے سے لگتے جیسے لفظوں سے اخذ کئے گئے ہوں، اور پڑھنے والے سوچتے کہ نہ جانے یہ لکھنے والی کون ہے جس کی کہانیوں کے ماحول کا ایک سرا غالبؔ اور فیضؔ کی شاعری سے جا ملا ہے اور دوسرا سرا بادلوں میں گم ہو کے رہ گیا ہے ـــــ پھر کچھ عرصہ بعد اینی نے اپنے پڑھنے والوں کے لئے اس معمّے کو ذرا سہل بنا دیا۔ اس نے اپنی کہانیوں سے انگریزی رسم الخط نکال پھینکا، اور اس کے بجائے اردو رسم الخط میں، یا پھر اردو کے جامے میں اپنے تاثرات اور احساسات کو ڈھال کر پیش کرنا شروع کر دیا۔ یہ بھی اردو افسانہ نگاری میں ایک نیا تجربہ تھا۔ اس نے ایک عرصے تک اردو پڑھنے والوں کو تحیّر میں رکھا، اور میرا خیال ہے کہ موجودہ دور کے لاتعداد نو عمر افسانہ نگاروں کو، جن کے نام آج کل رسالوں کی فہرستوں میں نظر آتے ہیں، اس تجربے نے ایک بہت بڑی حد تک متاثر کیا ہے!

بنیادی طور پر اینی افسانہ نگار ہے۔ لیکن اس نے دو کامیاب ناول بھی لکھے ہیں۔ وہ کلاسیکی اور نیم کلاسیکی موسیقی سے بھی واقف ہے اور اس کو پینٹنگ سے بھی گہرا شغف ہے۔ یوں وہ اپنے تخیل کو فنونِ لطیفہ کے مختلف شعبوں پر وارد کرنے کی اہل ہے! لیکن ان سب مختلف النوع تجربوں میں اس کی ذاتی شخصیت کو بھی ایک واضح اور داخلی حیثیت حاصل ہے۔

اینی چیزوں کی ظاہری ہیئت کو دیکھنے کے علاوہ ان کی ماہیت کو داخلی طور پر محسوس کرنے کی عادی ہے۔ شاید اس کی قوتِ باصرہ اور قوتِ سامعہ دونوں بہت غیر معمولی طور پر حساس واقع ہوئی ہیں۔ ایک طرف تو اس کی قوتِ باصرہ رنگوں اور شکلوں اور خطوں کی کیفیت اور ہم آہنگی کو اپنے میں جذب کرنے پر تلی رہتی ہے اور دوسری طرف اس کی قوتِ سامعہ آوازوں کی کیفیت اور زیر و بم اور داخلی موسیقی پر مرکوز رہتی ہے اور اس کے اپنے محسوسات نہ جانے ان رنگوں اور آوازوں کے سہارے کہاں سے کہاں نکل جاتے ہیں اور ایک طرح کی چکاچوند کیفیت اس کی ادبی اور فنی کاوشوں میں جھلک آتی ہے۔

تاریخی اعتبار سے اینی ہمارے موجودہ دور کی پیداوار ہے۔ اس نے ڈیرہ دون اور لکھنؤ کے سکولوں میں اولین تربیت پائی۔ پھر لکھنؤ کے مشہور ازبیلا تھوبرن کالج سے بی، اے پاس کیا اور پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے لکھنؤ یونیورسٹی میں داخل ہو گئی۔ اس نے آنکھ کھولتے ہی اپنے اردگرد اودھ کے اس مخصوص ماحول کو دیکھا جو اپنی جگہ ایک منفرد حیثیت رکھتا تھا۔ جس دور میں اینی نے نشو و نما پائی، اس میں ایک طرف تو دلی کی تہذیب تھی جو دم توڑ رہی تھی، جہاں اب شریف مسلمانوں کے زیادہ تر خاندان چند پرانے، تاریک، تنگ محلوں میں محبوس ہو کر رہ گئے تھے، اور ان کے اردگرد ایک نئی دلی پیدا ہو رہی تھی جس میں نو دولتیے ٹھیکیدار تھے، یا وہ مختلف صوبوں اور علاقوں سے برآمد کئے ہوئے سرکاری ملازم تھے جو برسوں دلی میں زندگی بسر کرنے کے بعد بھی اپنی اپنی علاقائی بندشوں میں جکڑے رہتے تھے اور اس پرانی دلی کے جغرافیے اور معاشرت سے بے خبر اپنی تمام زندگیاں گذار دیتے تھے یا پھر دوسری طرف اسی دور میں بمبئی اور کلکتہ جیسے کاروباری شہر تھے جن میں زندگی ایک بے پناہ، دم گھونٹ دینے والی رفتار سے بہتی تھی، اور جہاں لوگ دن رات ایک ختم نہ ہونے والی دوڑ میں شریک رہتے تھے ـــــ لیکن اسی دور کا لکھنؤ، تعلقہ داروں کا لکھنؤ، ایک خاص حیثیت کا مالک تھا اس ماحول میں وہ کاروباری یا نو دولتی ذہنیت نہ تھی بلکہ ایک قسم کا ٹھہراؤ تھا۔ ایک بھاری بھرکم پن تھا جو بہت سے شعبوں کو بہت سی Traditions کو اپنی جگہ مستحکم رکھتا تھا۔ شاید اس استحکام اور ٹھہراؤ کی پشت پر تعلقہ داروں کی مالی آسودگی تھی۔ یہ تعلقہ دار مسلمان حکمرانوں کی تہذیب، تمدن اور زبان سے بے حد متاثر تھے، اور اینی نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے کو اس ماحول میں پایا، اور اس لئے اس کو اپنے اردگرد زندگی میں وہ جمود اور گھٹن محسوس نہ ہوئی جو اور علاقوں کے نوجوان لکھنے والوں کو محسوس ہوتی تھی۔

بہت سے لوگ اینی کو رجعت پسند کہتے ہیں۔ عصمت چغتائی نے بھی ایک مرتبہ اینی کی شخصیت پر یہی الزام لگایا تھا۔ لیکن اگر آپ اینی سے ملیں تو

وہ اس قسم کے الزام کو شد و مد کے ساتھ رد کرنے کی کوشش کرے گی۔ وہ کہتی ہے کہ وہ تو محض اس تمدن، اس ماحول کی ترجمانی کرنے کی کوشش کرتی ہے جو اس بیسویں صدی کے لکھنؤ کے تمدن کو، سنبھالے ہوئے تھا، جس نے آئی، ٹی کالج کی لڑکیوں میں ایک ایسی سنجیدہ مزاجی پیدا کر دی تھی، جو دوسرے کالجوں کی لڑکیوں میں مفقود تھی، اور جس نے لکھنؤ یونیورسٹی کے بہت سے لڑکوں کو ترقی پسند اور انقلابی بنا دیا تھا ـــــ اس لئے وہ رجعت پسند نہیں ہے۔ اب پتہ نہیں کہ کون سی بات ٹھیک ہے، کون سی غلط، عصمت ٹھیک کہتی ہے یا اینی ـــــ!

جب اینی کا ناول "میرے بھی صنم خانے" چھپا تو اس کو سب سے زیادہ مسرت اس بات کی تھی کہ اس نے لکھنؤ کے اس مخصوص ماحول کو ایک کینوس پہ پیش کر دیا ہے۔ جو لوگ اینی کو جانتے تھے انہوں نے اس کے ناول کے کرداروں کے روپ میں فوراً ان ہستیوں کو پہچان لیا جو حقیقی تھیں، اور اس بڑے پیمانے پر اس قسم کے ادبی تجربے میں اینی کو ایک عجیب مسرت محسوس ہوئی۔ "میرے بھی صنم خانے" کے بعد کوئی تین سال ہوئے اینی نے ایک اور ناول لکھا "سفینۂ غم دل"۔ مجھے وہ زمانہ اچھی طرح یاد ہے جب اینی یہ ناول لکھنے میں مصروف تھی۔ اس کے لکھنے کی رفتار ہمیشہ بہت تیز ہوتی ہے، وہ ایک وقت میں پیپر کے پیپر لکھ ڈالتی ہے، ایک روز اس نے مجھ کو اپنے ناول کے مسودہ میں سے وہ حصہ دکھایا جس میں اس نے اپنے ان تاثرات کو بیان کیا ہے جو اس کے دل میں اپنے باپ کی موت سے پیدا ہوئے ہیں اور مجھ کو بے ساختہ غیر شعوری طور پر ۱۹۴۳ء کی وہ صبح یاد آ گئی جب میں نے لکھنؤ میں سجاد حید ریلدرم صاحب کے انتقال کی خبر سُنی تھی اور میں ایک دوست کے ہمراہ ان کے گھر گیا تھا۔ مجھے اس صبح کی بہت سی باتیں تفصیل کے ساتھ یاد نہیں لیکن ایک مجموعی تاثر جو اب بھی میرے ذہن میں محفوظ ہے، اس تصویر سے بہت قریب ہے جو اینی نے اپنے ناول میں کھینچی ہے۔ اس صبح کو لکھنؤ کی فیض آباد روڈ کے اس بنگلے میں لوگوں کا کافی ہجوم تھا۔ لیکن پھر بھی فضا میں ایک سناٹے کی سی کیفیت تھی جس کو انسان اس گھر میں قدم رکھتے ہی محسوس کر سکتا تھا، اس وقت میں اینی سے بہت ہی سرسری طور پر واقف تھا، بلکہ تقریباً ناواقف تھا۔ لیکن جب میں نے "سفینۂ غم دل" میں یہ حصہ پڑھا تو مجھ کو اب سے برسوں پہلے کے لکھنؤ کی وہ صبح بے ساختہ یاد آ گئی۔

یہاں پر ایک ایسا سوال پیدا ہوتا ہے جو مجھ سے اکثر ان لوگوں نے پوچھا ہے جو اینی سے ذاتی طور پر واقف نہیں۔ "اینی کی شخصیت کو اس کی اپنی کہانی میں کیا حیثیت حاصل ہے۔" عام طور پر لوگ جب کسی نوجوان خاتون کے افسانوں کو پڑھتے ہیں تو ان کو فوراً یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ان کہانیوں کے "واحد متکلم" میں یا کسی اور بنیادی کردار میں لکھنے والی کی اپنی شخصیت پوشیدہ ہے۔ نہ جانے کیوں مرد افسانہ نگاروں کی کہانیاں پڑھ کر کبھی بھی اس قسم کا کوئی رومانوی اندیشہ نہیں پیدا ہوتا۔ اس کو آپ ہماری بدخود غلط گمانی کہہ لیجئے یا نفسیاتی کمزوری۔ لیکن واقعہ یہی ہے کہ جہاں کوئی دلچسپ قسم کا نسوانی کردار کسی خاتون افسانہ نگار کی کہانیوں میں نظر آیا اور فوراً یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ دراصل یہ مصنفہ کا اپنا اصلی روپ ہے، گویا لکھنے والی کی شخصیت بھی ایک ایسا راز ہے جو داستانوں کے جامے میں تو اُجاگر ہو جاتا ہے، لیکن ویسے مخفی ہی رہتا ہے!

واقعہ یہ ہے کہ اگر آپ اینی کے کرداروں کا تجزیہ کریں تو آپ کو ان میں بہت سی اصلیتیں نظر آئیں گی۔ وہ ماحول نظر آئے گا جس میں وہ خود پلی بڑھی ہے۔ کالجوں کا ماحول اور جغرافیہ بالکل آئی ٹی کالج سے مماثل نظر آئے گا، سڑکوں اور عمارتوں اور جگہوں کے نام ہم صورت سے نظر آئیں گے ـــــ لیکن بس یہاں تک پہنچ کر اینی کی اپنی شخصیت اس تمام ماحول اور فضا کا ایک جزو بن کر رہ جاتی ہے، وہ کہیں بھی شخصی طور پر خود کو اپنے کرداروں میں مخل نہیں ہونے دیتی۔ وہ ان کو اپنی ذات سے ضرور متاثر ہونے دیتی ہے۔ لیکن اس حد سے آگے وہ ان کو اپنے طور پر مختلف ارتقائی منزلوں سے گذرنے کا موقعہ دیتی ہے، اور پھر وہ کردار محض فنی تقاضوں کے مطابق نشو و نما پاتے ہیں۔ جو لوگ اینی سے اچھی طرح واقف ہیں، ان کو اینی کے افسانوں میں کبھی کبھار کسی فقرے میں، کسی منظر کشی میں، کسی دلچسپ سے واقعے میں، اینی کی ایک ہلکی سی جھلک نظر آ جاتی ہے، لیکن محض ایک خفیف لمحے کے لئے اور پھر یہ جھلک بھی اس بڑے ماحول، وسیع فضا کا ایک حصہ بن کر رہ جاتی ہے۔

ایک عنصر ایسا ہی ہے جو اینی کے ادب میں اور اس کی اپنی ذات میں یکساں طور پر نظر آتا ہے۔ یہ ہے اس کا فنی خلوص! وہ ہر چیز کو اس خلوص کی

کسوٹی پر پرکھتی ہے، اگر وہ اس کے معیار پر پوری اترتی ہے تو وہ اس کو قبول کر لیتی ہے، ورنہ اس کی طرف سے منہ موڑ لیتی ہے، اور پھر کسی بھی قیمت پر اس کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ سینکڑوں لوگوں سے مل چکنے کے باوجود اور پارٹیوں اور ہنگاموں سے پُر زندگی کی قربت کے باوجود اس کا اپنا حلقۂ احباب بہت مخصوص ہے۔ ایسے لوگوں کو جو فنی خلوص کے معیار پہ پورے نہیں اُترتے، وہ قطعی ناقابلِ برداشت اور "بور" سمجھتی ہے۔ اور "بور" لوگوں سے محض سوشل قسم کی ملاقاتوں کے بجائے ایک قسم کی سست الوجودی کی زندگی کو زیادہ پسند کرتی ہے۔ اس کے گھر میں جہاں اس کی کتابوں کے انبار ہیں، اس کا پیانو ہے، نکمل اور غیر نکمل Paintings ہیں۔ اپنے گروہ میں ایسے وہ گھنٹوں باتیں کرنے سے بھی نہیں تھکتی، میں نے اس کو ایک وقت میں مختلف النوع موضوعات پر کئی کئی لوگوں سے بحث کرتے دیکھا ہے۔

ادیبوں اور ادبی معیاروں کے سلسلے میں بھی وہ اپنی ذاتی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کو بہت اہمیت دیتی ہے۔ مثلاً اگر اس کو معلوم ہے کہ ایک شہرت یافتہ ادیب اپنی بیوی سے اچھا سلوک نہیں کرتا تو وہ اس کے ادبی کارناموں کو کبھی بھی سراہنے کے لئے تیار نہ ہوگی۔ اسی بناء پر اس کے حلقۂ احباب میں ادیب بہت کم ہیں، اور جو ہیں بھی وہ اپنی ادبی شخصیت کی بناء پر نہیں بلکہ اپنی ذاتی شخصیت کی بناء پر اس سے رابطہ بڑھا سکے ہیں۔ زبردستی کی "ادبی" گفتگو سے بھی اپنی بہت گھبراتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی اس سے یوں ہی طرح پر پوچھ لے کہ وہ "آج کل کیا لکھ رہی ہے؟" تو سخت کوفت محسوس کرتی ہے اور کہتی ہے کہ بقول شخصے یہ سوال ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ جیسے دو باورچی ایک دوسرے سے ملنے پر پوچھیں "آج تم کیا پکا رہے ہو؟"

خونیں جنگوں اور ایٹم بم سے پیدا کئے ہوئے اس تمدن کو وہ بہت دو بھر سمجھتی ہے۔ موجودہ نسل کی "مغربیت زدگی" سے بڑی گھبراتی ہے —— کاک ٹیل پارٹیوں میں بیٹھ کر وہ سوچتی ہے کہ یہ سب لوگ جو ناچ رہے ہیں، دراصل اپنی حقیقت سے، اپنے مرکز سے، اپنے محور سے کتنے دور ہٹ گئے ہیں۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ ٹھیک ہیں۔ لیکن یہ ماحول، یہ فضا ان باتوں کے لئے موزوں نہیں، اور وہ سوچتی ہے کہ شاید یہ لوگ اب اپنے مرکز سے اتنے دور نکل آئے ہیں کہ ان کی زندگیاں ایک قسم کے کلچرل خلاء میں بسر ہونے لگی ہیں، اور اس خلاء کو پُر کرنے کی کوشش میں انہوں نے "جاز" "جائیو" اور "رمبا" اور "سامبا" میں دلچسپی لینی شروع کر دی ہے۔ نئی نئی پیدا کی ہوئی دولت کی نمائش کرنی سیکھ لی ہے —— لیکن ان کی یہ کوششیں رائیگاں جاتی ہیں۔ اور وہ سب اور بھی زیادہ بے بس اور قابلِ رحم نظر آنے لگتے ہیں اور اپنی زندگیوں کے Tempo میں کچھ اور اضافہ کر دیتے ہیں! —— اور نہ جانے اب یہ Tempo کہاں جا کر ٹوٹے گا؟ —— شاید یہی وجہ ہے کہ پریوں کی کہانیوں کی سنڈریلا کی طرح آپی کو بھی یہ احساس ہونے لگا ہے کہ وہ اپنا شیشے کا سلیپر کہیں کھو بیٹھی ہے —— اور نہ جانے اس کی طرح موجودہ دور کے اور کتنے نوجوانوں، ادیبوں، شاعروں، افسانہ نگاروں اور آرٹسٹوں کو ایک شیشے کے سلیپر کی تلاش ہے!

فُٹ نوٹ

(از قرۃ العین حیدر)

آج صبح صبح ہماری پیاری بہن نفیس کا فون آیا کہ بھئی تمہارے متعلق وہ مشہور و معروف نمبر تیار ہے۔ ایک لمحے کے لئے دل ڈوب سا گیا۔ پھر دفعتاً یاد آیا کہ مضمون بہت اہم ہستیوں پر لکھے جاتے ہیں۔ لا زانی الذر کچھ عجیب آسمانی خوشی سی محسوس ہوئی۔ قصہ یوں ہوا کہ نفیس کے میاں جو ہیں لفٹیننٹ کمانڈر عسکری، ان کا نام ہے اور آپ کچھ ادب وغیرہ سے شغل کرتے ہیں اور دوسرے سارے نہایت قابل اور مہذب پرش لوگوں کی طرح یہ بھی INCOGNITO رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ تو آپ نے گویا ایک مضمون اس خاکسار کے بارے میں رقم فرمایا۔ (یہ ایک اور عسکری ہیں) وہ جو

دوسرے والے عسکری صاحب ہیں تو وہ بھلا ہم جیسے چھٹ بھیوں پر کیا مضمون لکھیں گے حالانکہ ڈرتے ڈرتے ایک روز خیال تو آیا تھا کہ ان سے کہا جائے کہ اللہ عسکری صاحب ایک مضمون آپ ہی لکھ دیجئے۔ مگر پھر سوچا کہ کہاں ملا ئے اور ہریں تو اور کہاں ہم خاکسار لوگ) تو قصہ مختصر یہ کہ اب عسکری (ابن سعید) نے شخصیت نگاری گویا شروع کی۔ کئی دفعہ ان سے کہا تھا کہ بھئی مضمون لکھو۔ خدا کے لئے ہم پر مضمون لکھو۔ یہ تک وعدہ کیا کہ آئندہ "ابن سعید میری نظر میں" کی قسم کا ایک مضمون میں بھی لکھ دوں گی۔

بہرحال، نواب مختر مرنفیس عسکری نے اطلاع فرمایا کہ مضمون تیار ہو چکا ہے۔ بس ایک آنچ کی کسر ہے۔

دراصل ہمارے بارے میں اس قدر بھانت بھانت اور انواع و اقسام کے مضامین لکھے گئے ہیں کہ ہم اب بالکل ہی مور لائیزڈ ہو چکے ہیں چنانچہ اب عسکری (یعنی ابن سعید) نے اور ہم نے طے کیا کہ یہ اور بھی بہترین چیز ہے کہ گیارھویں COMMANDMENT پر عمل کرتے ہوئے (اپنی مدد آپ کرو) اپنے اوپر مضمون خود لکھو اور کبھی دوسرے کو اس کا موقع ہی نہ دو۔ یعنی جو ایکٹوٹی وہ تم پر کرنا چاہتا ہے اس سے پہلے کہ وہ ہو جائے وہ ایکٹوٹی اپنے اوپر خود کر لو۔

اور پھر سوال یہ بھی ہے کہ اس قدر پریشانی کا ہے کی ہے۔ بقول شاعر:

ع جب اوکھلی میں سر دیا تو موسلوں کا کیا ڈر

یا شاید یہ کہ: دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر

بلکہ ایک اور ضرب المثل ہے کہ ——— بہرحال۔ دراصل شخصیت نگاری یوں کی جاتی ہے کہ:

"موصوفہ ایک شاعرانہ مزاج کی مالک ہیں۔ پھولوں اور قوسِ قزح سے سخت دلچسپی ہے۔ موسیقی سے الفت۔ فلسفے کی کتابوں کا مطالعہ کرتی ہیں۔ ان کے کمروں کا رنگ ہلکا ہے، پردے چھینٹ کے۔ دریچوں میں بنفشہ کے شگوفے پڑے ہوتے ہیں۔"

ادیبوں کے بارے میں اس طرح کے مضمون پڑھ کر جی چاہتا ہے کہ زور سے چیخو۔ خدا کا شکر ہے کہ اس طرح کی شخصیت نگاریاں اب دیکھنے میں نہیں آتیں۔

نمبر دو عسکری صاحب (یعنی ابن سعید) نے تو بہت شرافت سے کام لیا ہے۔ ورنہ حقیقت حال جو ہے وہ تو ہم پر خوب روشن ہے۔ مثال کے طور پر عسکری نے یہی نہیں لکھا۔ بلکہ صاف چشم پوشی کی کہ ہم نہایت ذوق و شوق سے رسالہ "شمع" پڑھتے ہیں اور یہ بھی کہ جب سارے بہن بھائیوں کی محفل جمع ہو کر مسلسل ایک چنڈو خانہ بن جاتا ہے تو گھر میں کیا کیا ہنگامہ رہتا ہے ماشاء اللہ سے۔ ایک کمرے میں ریڈیو چلایا جا رہا ہے۔ دوسرے میں ایک چھوٹی بھانجی صاحبہ پیانو سے شغل فرما رہی ہیں۔ گیلری میں پنچ ہے دوڑ بلی آئی کھیلا جا رہا ہے۔ برآمدے میں باضابطہ کرکٹ میچ ہو رہا ہے۔ متواتر فون کی گھنٹی بج رہی ہے اور کوئی نہیں سنتا۔ سب ایک دوسرے پر حکم چلا رہے ہیں۔ ہماری بڑی بھاوج صاحبہ اللہ کے فضل و کرم سے ڈاکٹر ہیں اور ایئر فورس میں فلائیٹ لفٹیننٹ کے عہدے پر فائز ہیں۔ مگر ان کا یہ عالم ہے کہ ان کو ڈاکٹری کے علاوہ دنیا بھر کی فضولیات اور خرافات سے سخت دلچسپی ہے۔ جدید انگریزی ادب، یونانی آرٹ، ہند و فنونِ لطیفہ سے شدید انس ہے اور کومکس کی تو آپ عاشق ہیں۔ ٹیل للو اور ٹام اینڈ جیری اور ڈونلڈ ڈک آپ کے پسندیدہ کردار ہیں۔ جب کبھی کوئی ان سے ڈاکٹری کی باتیں کرتا ہے تو دفعتاً یاد آتا ہے کہ ارے یہ تو ڈاکٹر بھی ہیں۔

قصہ یہ ہے کہ مجھے اپنا احوال رقم کرنے سے پہلے اپنے سارے گھرانے کا احوال رقم کرنا پڑے گا۔ کیونکہ میں ان سب سے علیحدہ کوئی انوکھی ہستی قطعی نہیں ہوں۔ (انفرادیت وغیرہ ابن سعید نے جو سخت عالمانہ الفاظ استعمال کئے ہیں وہ سب گپ ماری ہے) ایک روز ہم حسب معمول گھاس پر بیٹھے (ریاضت کے بارہ کا عمل رہا ہوگا) نہایت اطمینان سے شنکرا کو کیدارا میں منتقل کرنے میں مشغول تھے کہ ایک چھوٹے بھائی نے جو اب مستقلاً کینیڈا میں رہتا ہے اچانک یہ انکشاف کیا (جس طرح ایک انگریز منعنہ نے یہ انکشاف کیا تھا کہ وہ ساری عمر نثر بولتا رہا) کہ ساری عمر

ہم لوگوں کی اسی PITCH پر گذری ہے (کرکٹ کا PITCH نہیں) باوجودیکہ ہماری زندگیوں میں تقسیمِ ہند کے کارن واقعتہً بڑا زبردست انقلاب آچکا ہے۔ اور بہرصورت اب اس تبدیلی کی عادت بھی ہوگئی ہے۔ ایک چیز ہم دوسروں میں ہمیشہ تلاش کرتے رہتے ہیں۔ شدید ذہانت اور شدید مزاجی حس۔ فی الحال یہاں دونوں چیزوں کا تقریباً فقدان ہے۔ غالباً ہماری اپنی "خصوصیات" بھی زیادہ لوگوں کے پلّے نہیں پڑتیں۔ (یہ انکشاف بھی اسی کینیڈا والے بھائی نے کیا تھا۔ اور اسی لئے وہ دوسرے لمحے گھاس پر سے اٹھ کر کینیڈا چلا گیا)

میری تین عزیز ترین سہیلیاں[1] جو مجھے سگی بہنوں کی طرح عزیز ہیں اور جن کے ساتھ میں نے بہت بچپنے سے لے کر ۱۹۴۷ء تک عمر کا ایک ایک لمحہ اکٹھے بِتایا تھا۔ ہندوستان ہی میں ہیں۔ ان کے علاوہ دوسری سہیلیوں کی ایک بہت بڑی فوج بھی تقریباً ساری کی ساری وطنِ مرحوم ہی میں رہ گئی۔

سہیلیوں سے قطع نظر ہم سب ماشاء اللہ سے اٹھارہ انیس فرسٹ کزن ہیں (سیکنڈ تھرڈ فورتھ ففتھ (سلسلہ چینیوں کی طرح آٹھویں کزن تک پہنچا ہے) ان کے علاوہ خدا نظرِ بد سے بچائے، ان سب میں جو ہمارا اپنا ایج گروپ ہے وہ اللہ کے فضل سے ایک ہی مدرسۂ فکر سے تعلق رکھتا ہے۔

المورڑے میں ہمارے منجھلے بڑا چچا جان کا مکان "بیکٹ ہاؤس" تھا۔ گرمیوں کے زمانے میں اس میں مستقل اُودھم کی وجہ سے ایک زلزلہ سا آیا رہتا۔

شاہجہان پور میں چھوٹے چچا جان کی کوٹھی کے باغ کے پیچھے سے ٹرین گذرتی تھی۔ ہم لوگ ٹرین آنے سے چند منٹ پہلے پٹری پر جا کر پتھر رکھ آتے اور پھر درختوں میں چھپ کر انتظار کرتے کہ اب ٹرین پٹری سے اُترے گی۔ بالکل دہشت پسندوں کا گروہ تھا۔ اب خیال آتا ہے کہ اگر واقعی کبھی ایسا ہوگیا ہوتا تو کیا ہوتا۔ غالباً سب کو جیل خانے بھیجا جاتا۔

یہ سب بڑے ہوئے تو اسے لیجئے۔ ایک سے ایک عالم فاضل پیدا ہو رہا ہے۔ دو بہنوں نے یونیورسٹی کے سارے ریکارڈ کھٹا کھٹ توڑ ڈالے ننھیال میں جو بہن بھائی ہیں ان کا بھی یہی سلسلہ ہے۔ ایک نوجوان خاتون نے مانچسٹر یونیورسٹی میں ٹیکسٹائیل ٹیکنولوجی کی ڈگری لی۔ ایک بزرگوار بہت بڑے سیاست داں بن گئے۔

بہت کم کنبوں میں اتنا زیادہ "قبیلے" کا احساس ہوتا ہے۔ اس کی وجہ غالباً وہی تربیت اور وہ مخصوص تہذیبی پس منظر ہے جس کا ذکر میں نے بلدیم کے متعلق مضمون میں کیا ہے۔ ہمارا کنبہ اب بہت دور دور تتر بتر ہے۔ کچھ افراد سان فرانسسکو میں ہیں۔ کچھ لندن میں۔ بہت سے اپنے آبائی وطن ہندوستان ہی میں رہتے ہیں۔

بعض دفعہ مجھے خیال آتا ہے۔ بھانت بھانت کی جگہوں پر رہے۔ بھانت بھانت کے انسانوں سے ملے۔ بھانت بھانت کی مصروفیتیں رہیں بچپن رنگا رنگ مناظر سے پُر رہا۔ اُتر پردیش کے ہرے بھرے ضلع، ترائی کے جنگل، ہمالیہ کی چوٹیوں پر بسنے والی معروف اور غیر معروف بستیاں، سب سے پہلی یاد جو ہے وہ جہاز کے سفر کی ہے، کہ بس تیرتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ بمبئی، کلکتہ، جنوبی ہند کی بندرگاہیں، ایران کے ساحل، کربلائے معلّٰی، قاہرہ، ترکی۔ مستقل اِدھر سے اُدھر گھوم رہے ہیں۔

پہلی کہانی بعمر چھ سال لکھی۔ (ہاں صاحب! کیا بات ہے، ہونہار بروا —) کہانی کچھ یوں تھی کہ "کاٹھ گودام کا اسٹیشن تھا۔ رات کے بارہ بجے تھے۔ قلی لالٹینیں لئے اِدھر اُدھر دوڑے پھرتے تھے۔ جگنو کی قطاروں کی طرح ٹرین آتی دکھلائی پڑی۔" وغیرہ وغیرہ۔ ماشاء اللہ کس قدر شاعرانہ تخیّل تھا یعنی غور کیجئے کہ جگنوؤں کی قطاریں۔

پھر مدتوں تک گڑیوں کا بہت سخت سلسلہ رہا۔ گڑیاں ہی گڑیاں۔ ان کے لئے باقاعدہ اسکول کھولا گیا تھا۔ ایک جرمن سہیلی نے بہت سمجھا بجھا کر آمادہ کیا کہ "لیڈی ہیلنڈا" سے اس کے گڈے کا بیاہ کر دیا جائے۔ آئیڈیا کچھ اچھا نہیں مگر اس کی دل شکنی کے خیال سے مان گئے یعنی برات

---

[1] لکھنؤ کی مشہور جیپال سسٹرز۔ شکنتلا قدوائی، کملا جیپال، وِملا سال۔

کے وقت جرمن لڑکی جو تھی اس نے کسی بات پر بگڑ کر کہہ دیا کہ بہر حال میرا گڈا خالص جرمن ہے سیدھا برلن سے آرہا ہے، تمہاری "لیڈی بیلنڈا" گو بلونڈ ہے مگر تمہاری گڑیا ہے، لہٰذا ہندوستانی ہے۔ اس قدر غصہ آیا کہ فوراً برات واپس لوٹا دی گئی۔ عرصے تک شدید اینٹی جرمن جذبات دل میں موجزن رہے۔

اسپورٹس اور ریاضی سے جان نکلتی تھی۔ اسکول اور کالج میں کبھی جو باسکٹ بال کھیل کر دیا ہو ——— فساد کرانے میں بڑا لطف آتا تھا۔ بیک وقت دونوں پارٹیوں میں شامل ہیں اور فساد کرا رہے ہیں۔ بعد میں خود ہی صلح کرا دی۔ اس وجہ سے کالج کی سیاسیات میں ہم کو بہت ہی اہم مقام حاصل تھا۔

اب یہاں پہ یہ عرض کرنا ہے کہ سب سے بڑی ٹریجڈی جو ہوئی، وہ یہ تھی کہ اسی مستقل ہنگامے کے چکر میں بغیر سوچے سمجھے جو کہانیاں وغیرہ کالج کے رسالوں کے لئے لکھتے تھے، وہ ادبی رسالوں میں چھپوا دیں۔ یہ ایسی ایکبوڈنٹی ہوئی جسے آج تک بھگتنا پڑ رہا ہے۔ کوئی عقلمند آدمی انگریزی میں کہہ گیا ہے:

Literary sins have very long shadows

یہ بہت ہی حسب حال مقولہ ہے۔ یعنی یہ کہ اب بیٹھے اس قسم کا روح افزا تبصرہ سن رہے ہیں:۔

ایک خاتون ہماری ایک کتاب کی ورق گردانی کرکے نہایت اطمینان سے بولیں۔ "آپ انگریزی بہت اچھی لکھتی ہیں!!" اور اس روز تو مجھے بہت ہی کوفت ہوئی جب میں نے کرشن چندر صاحب کی (جن کی میرے دل میں بڑی عزت ہے) یہ رائے پڑھی کہ "میرے بھی صنم خانے" میں سوائے پارٹیوں کے تذکرے کے اور کچھ نہیں ہے۔ اے لیجئے یہاں ہم نے تو اپنی طرف سے ایک عظیم انسانی ٹریجڈی کی داستان قلمبند کی تھی۔ کرشن چندر صاحب نے اسے ایک جملے میں نہایت خوش اسلوبی سے قصہ مختصر کر دیا۔ اب آپ ہی بتلایئے کہ کیا کیا جائے۔

اپنے اور اپنے قبیلے کے متعلق اس "فٹ نوٹ" کا اضافہ کرنے کے ساتھ میں یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ واضح رہے کہ ہم لوگ بر خود غلط نہیں ہیں۔ ہمارے یہاں اکثر و بیشتر لوگوں کو اپنے متعلق بڑی غلط قسم کی اہمیت کا احساس ہے۔ ہمارا جو معاشرہ ہے، جس طرح ہمارے ذہنوں کی تشکیل کی جاتی ہے اور جو ہمارے یہاں کے موجودہ حالات ہیں، ان کی وجہ سے لوگ یا تو احساسِ برتری کا شکار ہیں اور یا احساسِ کمتری میں مبتلا ہیں۔ ہر فرد کسی نہ کسی طرح کے complex میں گھرا ہوا ہے۔ NORMAL کوئی بھی نہیں رہنا چاہتا۔ اور میں ان لوگوں کو بہت قابلِ قدر سمجھتی ہوں جو ہر ملول اور ہر موقع پہ نارمل رہتے ہیں۔

رہی ہماری "شخصیت"، تو بھئی یہ تو ایک بڑا عجیب قسم کا خوفناک لفظ ہے۔ شخصیت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور بیگم رعنا لیاقت علی خان کی ہوتی ہے۔ ہم اور ہماری "شخصیت" ——— یہ کیا مسخرہ پن ہے!

دیوندر ستیارتھی

پرکاش پنڈت

تھیلا + کیمرہ + داڑھی = دیوندر ستیارتھی +

دیوندر ستیارتھی کے بارے میں کچھ لکھنا الجبرے کے کسی پیچیدہ سوال کو حل کرنے سے کم مشکل کام نہیں بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ الجبرے، ریاضی یا جیومیٹری کے سوال کے بجائے دیوندر ستیارتھی جلی حروف میں لکھا ہوا ایک ایسا سوالیہ نشان ہے جو نظر آتا ہے اور نہیں آتا اور جس کا اور چھور پانا خود دیوندر ستیارتھی کے بس کی بات نہیں اور اسی لئے دیوندر ستیارتھی کے بارے میں کچھ لکھنے سے پہلے میں سوچ رہا ہوں کہ اس کا آغاز کہاں سے کروں اور اس کا چھور کہاں ہوگا۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ اس میں صداقت کہاں تک ہوگی :

غالباً یہ ۱۹۴۲ء کی کسی شام کا ذکر ہے کہ میں اور رامانند ساگر سینما دیکھنے کے ارادے سے لپکے ہوئے نسبت روڈ لاہور پر چلے جا رہے تھے اور وقت کی کمی کے باعث اس وقت کسی قدر کی مداخلت گوارا نہ کر سکتے تھے کہ ناگاہ سڑک کی دوسری جانب سے کسی نے اونچے سُروں میں ساگر کو آواز دی ——— سڑک کی دوسری جانب چھ فٹ قد کا سا ہوتا ایک لمبا وجیہہ شخص جس کی داڑھی، جٹاؤں اور چہرے کے خط و خال سے ٹیگور خاندان کے کسی فرد کا دھوکا ہوتا تھا۔ لمبا کھدر کا کوٹ پہنے کندھے سے کیمرہ لٹکائے اور بغل میں پھولے ہوئے پیٹ کا یہ بڑا چرمی تھیلا دبائے کھڑا تھا۔ میں سمجھا ٹیگور کا کوئی خاندانی گورو ہوگا اور میں نے ساگر کو ٹالنے کے لئے کہا بھی۔ دوسرے ہی لمحے وہ بزرگ سڑک پار کرکے ہمارے پاس آ پہنچے اور ساگر کے تعارف کرانے پر پتہ چلا کہ سادھو، خاندانی گورو یا کیمرہ مین کے بجائے وہ دیوندر ستیارتھی تھا یعنی ٹلنے والی آسانی نہیں تھی۔

اور واقعی دیوندر ستیارتھی رات کے دس بجے تک نہیں ٹلا۔ سینما کا پروگرام اس کی وجہ سے منسوخ ہوا۔ بنگالی رس گلوں اور مدراسی ڈوسوں کا پروگرام اس کی وجہ سے شروع ہوا۔ نسبت روڈ سے لارنس باغ تک مٹرگشت چل کر اس کی وجہ سے صحت بنائی گئی اور تاروں کی چھاؤں میں بیٹھ کر گومتی اور سابرمتی کے قصے اور اس کے تین چار افسانے بھی اسی کی وجہ سے سُنے گئے۔ اس سے پہلے ستیارتھی کی داستانیں سنانے کی بیماری کے بارے میں کئی مختلف لطیفے سُن چکا تھا اور انہیں صرف لطیفے سمجھتا تھا۔ آخر افسانہ کوئی بیڑی سگریٹ تو ہے نہیں کہ راہ میں کوئی آپ سے ملے اور افسانہ پلا کر چلتا بنے لیکن اس روز میں خود حیران تھا اور دس سال گزرنے کے بعد آج بھی حیران ہوں کہ وہ کون سی چیز ہے جو ستیارتھی کے سامنے مجھ ایسے منہ پھٹ آدمی کو بھی سعادت مند اور فرمانبردار بنا دیتی ہے۔ اس کی شخصیت میں اچھے بھلے معقول آدمی کو کاٹھ کا اُلّو بنانے کا کون سا جادو ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے اور ناقابلِ گنگ ہو کر

رہ جاتا ہے۔

اس دن کے بعد ستیارتھی سے اکثر میری ملاقاتیں ہونے لگیں۔ بہ الفاظِ دیگر مجھے اس کے اکثر افسانے سُننے کی سعادت نصیب ہونے لگی۔ میں ان دنوں شاہ عالمی دروازے کے اندر ایک پیچ در پیچ گلی میں رہتا تھا اور ستیارتھی وہاں سے تقریباً ڈھائی میل دور سنت نگر میں۔ سنت نگر میں کنہیا لال کپور، ہنس راج رہبر اور فکر تونسوی بھی رہتے تھے۔ ظاہر ہے ان لوگوں کو ستیارتھی کے افسانے سُننے کی اس درجہ سعادت نصیب ہو چکی تھی اور ستیارتھی کی طلسمی شخصیت سے وہ بھی اس درجہ خوف زدہ تھے کہ بعض اوقات ستیارتھی کو دروازے پر ہی کہلوا دیا جاتا کہ کپور صاحب یا رہبر صاحب یا فکر صاحب گھر پر نہیں ہیں۔ لہٰذا ستیارتھی نے دوسرے چوتھے علی الصبح ڈھائی میل کی سیر کرنی شروع کر دی اور میرے منہ پر سے لحاف ہٹا کر یہ مژدہ جانفزا سُنانا شروع کر دیا۔

"چڑیاں چہچہا رہی ہیں اور تم سو رہے ہو۔ جاگو پیارے پنڈت! بھور بھئی!"

ایک ایسے شخص پر جو صبح نو بجے سے پہلے کروٹ نہ لیتا ہو، پانچ چھ بجے ہی یہ انکشاف کر دینا کہ چڑیاں چہچہا رہی ہیں کس قدر پُر لطف ثابت ہو سکتا ہے، اسے کچھ وہی خوش نصیب سمجھ سکتے ہیں جن پر ایسی واردات گذری ہو۔ لیکن مجھے خود حیرت ہوتی کہ کس طرح چند لمحوں کے بعد ہی چڑیوں کے ساتھ ہی میں بھی چہچہانے لگتا تھا اور اپنی ناقص عقل کے مطابق ستیارتھی کی نئی کہانی میں ترمیم و اضافے کرتا تھا۔ ستیارتھی کے کہنے کی دیر ہوتی تھی اور میں دفتر میں بیماری کی عرضی بھیج دیتا تھا۔ ستیارتھی کے کہنے کی دیر ہوتی تھی اور میں منہ ہاتھ دھوئے بغیر کہیں بیس پچیس میل پیدل چلنے پر تیار رہتا تھا اور کسی بھی ضروری کام کے لئے بچا کر رکھے ہوئے پیسوں سے اسے لاطینی لوک گیتوں کی کتاب خرید دیتا تھا۔

بے تکلفی بڑھی تو سب سے پہلا سوال جو میں نے کیا، وہ ستیارتھی کی داڑھی سے متعلق تھا۔ "یہ کیا بڑھاپا طاری کئے پھرتے ہو!" میں نے اس کی نورانی داڑھی میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے کہا "جوانی میں ہی خود کو بوڑھا بنا کر پیش کرنے سے تمہارے اندر کا مرد تمہیں کچھ نہیں کہتا؟"

"کہتا ہے۔" ستیارتھی نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر زور زور سے جھنجھوڑتے، مروڑتے، توڑتے ہوئے کہا "لیکن میرے اندر کا مرد آرٹسٹ بھی ہے۔"

"پھر تو اور بھی مصیبت ہوئی۔"

"آرٹسٹ کھانے کو مانگتا ہے۔" ستیارتھی نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا "میری جیب میں ایک پیسہ نہیں تھا لیکن میں نے پورے ہندوستان کا دورہ کیا۔ اسی داڑھی کی بدولت میں نے بھیل دوشیزاؤں کے جھرمٹ میں بیٹھ کر ان کے لوک گیت سُنے۔ اسی داڑھی کی بدولت دونوں ہاتھوں سے یاتریوں کو لوٹنے والے ہردوار کے پنڈتوں نے میرے پاؤں چھوئے۔ سری نگر میں بانجھ عورتوں نے مجھ سے اولاد مانگی اور مجھے بنگال تک جانے کا کرایہ دیا ——— آؤ تمہیں ایک تماشہ دکھاؤں۔"

تماشہ یہ تھا کہ ہم سے تھوڑی دور سڑک پر ایک پوربیا بیٹھا بھٹے بھون رہا تھا۔ ستیارتھی مجھے اس کے پاس لے گیا اور خود اسی کی طرح آلتی پالتی مار کے اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"کیوں بھائی!" ستیارتھی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنی ملائم دلکش آواز میں کہا "کیسے دیتے ہو بھٹے؟"

بھٹے والے نے چونک کر ستیارتھی کی طرف دیکھا اور ایک دم ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے چھ سات عمدہ بھٹے ستیارتھی کی طرف بڑھاتے ہوئے اور بولا "آپ مہاتماؤں سے ہم غریب لوگ کیا لیں گے؟ بس اتنی کرپا ہو جائے، کوئی وڑا بتا دیجئے۔ بیٹی بیاہنے جوگ ہے۔"

ستیارتھی نے قہقہہ لگا کر کہا "بھائی میں وڑا بتانے والا مہاتما نہیں ہوں تم اپنے بھٹے واپس لے لو۔"

ستیارتھی نے وڑے کا نمبر نہیں بتایا پھر بھی بھٹے والے نے بھٹے واپس نہیں لئے اور ستیارتھی کے پاؤں چھو چھو کر بُرا بھلا منہ سے نکالنے کی معافی مانگتا رہا۔

وہ بھٹے بھونسنے والا ہو یا صوبے کا وزیر اعلیٰ ستیارتھی کی داڑھی ہر جگہ ستیارتھی کے آڑے آتی ہے۔ آپ دل میں لاکھ فیصلہ کر لیجئے کہ ستیارتھی کا کوئی کام ہرگز ہرگز نہیں کریں گے۔ اس کے آنے پر کوئی بہانہ کر کے گھر سے سٹک جائیں گے لیکن جب ستیارتھی آپ کے گھر آئے گا تو نہ صرف آپ بھی اس کو کبھی اپنے گھر کو دیکھیں گے بلکہ آپ کو خدا کی قدرت بھی نظر آئے گی۔

داڑھی کے علاوہ ستیارتھی کی وضع قطع بھی کام نکالنے میں ید طولےٰ کا درجہ رکھتی ہے اور یہاں تک اس کی شیریں اور ریشمیں آواز کا تعلق ہے اس کا تو جواب ہی نہیں۔ ذرا اندازہ لگائیے کہ ستیارتھی لاہور ریلوے اسٹیشن کے کسی پلیٹ فارم پر کھڑا کسی رسالے کی ورق گردانی کر رہا ہے کہ ٹکٹ چیکر اس سے ٹکٹ مانگتا ہے۔ ٹکٹ کے بجائے ستیارتھی اس رسالے میں چھپی ہوئی اپنی تصویر اسے دکھاتا ہے اور انگریزی میں کہتا ہے کہ وہ اس رسالے کو خریدنا چاہتا ہے لیکن اس کے پاس بارہ آنے نہیں۔ کیا ایک ادیب کے لئے وہ اپنی نیک کمائی میں سے بارہ آنے نہیں نکال سکتا؟

ٹکٹ چیکر حیرت و استعجاب سے اس مردِ ملنگ کی طرف دیکھتا ہے۔ ٹکٹ مانگنا بھول جاتا ہے اور نہ صرف بڑے خلوص سے ستیارتھی کو بارہ آنے پیش کرتا ہے بلکہ بلا ٹکٹ سفر کرنے والوں کے لئے اس شاندار موقع سے فائدہ اٹھانے کا موقع بھی فراہم کر دیتا ہے۔

یہ اور اس قسم کی تمام باتیں آج سے دس بارہ سال پہلے کی باتیں ہیں جب ستیارتھی پورے ہندوستان کی صحرانوردی کے بعد لاہور میں آکر مقیم ہو گیا تھا۔ سوائے مضامین کے تھوڑے سے معاوضے کے اس کی کوئی آمدنی نہ تھی اور اس کی بیوی اپنے ہاتھوں کی محنت سے گھر کا پورا کرتی تھی۔ شوہر اور وہ بھی ستیارتھی ایسے الکھ نرنجن شوہر کو برداشت کرنا جو کلکتے کے کسی چوراہے میں ایک منٹ کے لئے اسے کھڑا کر کے چھ دن بعد اسے ڈھونڈنے نکلا۔ جو مضامین کا معاوضہ ملنے پر راشن کے بجائے تصویروں کے فلم خرید لیتا تھا۔ گھر میں ناشتے کا سامان نہ ہونے پر خود ناشتہ کرنے کسی دوست کے یہاں چلا جاتا تھا اور وہیں سے جھومر ناچ کے گروپ فوٹو لینے لائل پور جا پہنچتا تھا ——— صرف ستیارتھی کی بردبار بیوی ہی کے بس کی بات تھی۔ ورنہ اس کی جگہ جھومر ناچ کے گروپ فوٹو کی کوئی عورت ہوتی تو ادیب کے بجائے آج ستیارتھی بڑھئی کا کام کر کے کنبے کا پیٹ پال رہا ہوتا۔

لیکن نہیں، میرا یہ اندازہ صحیح نہیں ہے۔ ستیارتھی کو اگر بڑھئی بننا ہوتا تو پٹیالہ ریاست کے اپنے گاؤں سے وہ کبھی باہر نہ نکلتا۔ حصولِ تعلیم کے جو مواقع اسے ملے تھے انہیں یک قلم ترک کر کے خانہ بدوشی اختیار نہ کرتا۔ بچپن ہی سے اس نے ایک حساس دل پایا تھا۔ پہروں کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھ کر اس نے رہٹ کی اُداس رون رون سُنی۔ پنہارنوں کی پازیب کی متوازن اور اوبڑ کھابڑ جھنکاروں سے اس نے ان کے دکھوں سکھوں کو ٹٹولا اور کھلے نیلے آسمان میں آزادانہ اُڑانیں بھرتی ہوئی کبوتریوں کی پرواز کو سمجھنے کی کوشش کی اور ایک دن ——— پُراسرار فطرت اور پُراسرار انسان کو سمجھنے اور پانے کی شدید خواہش اسے گھر سے لے اُڑی۔ آسام کی گھاٹیوں سے لے کر وہ کولمبو کے ناریل کے جھنڈوں تک پہنچا۔ کشمیر کے زعفران زاروں سے لے کر زلفِ بنگال تک کی سیر کی اور اُردو ادب کو ہندوستان کی مختلف زبانوں اور بولیوں کے ہزاروں لوک گیتوں سے روشناس کرایا۔ لوک گیتوں کو ادب کا ایک عنصر بنانے اور ان کے ذریعے مختلف قوموں کے کلچر کو ایک لڑی میں پرونے کا جو نمایاں کام ستیارتھی نے سرانجام دیا ہے اور اس کے لئے جو جو صعوبتیں اٹھائی ہیں، اُردو ادب کی تاریخ اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

”ان گیتوں کی کھوج میں میں قلندر کی طرح ایک صوبے سے دوسرے صوبے تک گھوما ہوں۔ بھک منگوں کی طرح اپنا کشکول لے کر ہر اس شخص کے پاس گیا ہوں جو اس میں لوک گیت کی چٹکی ڈال سکتا تھا۔ میں نے جواہرات کی مانند ان گیتوں کی قدر کی قیمتی پتھروں کی طرح انہیں سینے سے لگایا۔ کاش تم اس بات کا اندازہ لگا سکتے کہ ان گیتوں کی خاطر میں نے کس کس کے ناز اٹھائے۔ سانولی سلونی بنگالنوں کے ناز، خوددار گڑھوالنوں کے ناز، ہرنیوں کی مانند ہمالہ کی وادیوں میں چوکڑیاں بھرنے والی نیپالنوں کے ناز ...... ذرا سی بات پر چمک کر راگیروں پر خونی وار کرنے والی پٹھانیوں

کے ناز...... ڈھول کی بھاری بھرکم آواز، بانسری کی مہین اور سُریلی تان اور گھنگھروؤں کی سحر آفریں جھنکاریں اونچ نیچ، ذات پات، ہندو مسلمان کے تفرقات غرق ہی نہیں ہو جاتے، ہمیشہ کے لئے فنا بھی ہو جاتے ہیں۔ آزادی کا نغمہ سُننے پر غلامی کی زنجیریں ڈھیلی ہی نہیں ہوتیں ٹوٹ بھی جاتی ہیں۔ لوک گیت تو قوم کا دفینہ ہیں اے دوست!"

چنانچہ لوک گیتوں کا یہ رسیا قوم کا دفینہ مستعار لے کر جب لاہور پہنچا تو اس کے چرمی تھیلے اور اس کے کیمرے کی بند آنکھ میں ہندوستان کی پچاس زبانوں کے ڈھائی لاکھ لوک گیت اور لوک ناچ محفوظ تھے۔ پنجاب کا گدھا اور جھومر، بناری اور جونپور کی آلہے، اودھی وادرے اور دوہے، راجپوتانے کے جنگی ترانے اور کلّو اور کشمیر کے خوشبو میں بسے ہوئے نغمے ——— دیس بدیس کے دل کی دھڑکنیں اس تھیلے اور اس بند آنکھ میں محفوظ تھیں اور جب وہ تھیلا کھلا اور شوخی کی آنکھ کی طرح کیمرے کی بند آنکھ کھلی تو مغربی تہذیب کے پروردہ ادیبوں نے چونک کر اپنے ہندوستان کی طرف دیکھا جس کی لمبی داڑھی میں بیکانیر کی ریت بھری ہوئی تھی۔ جس کا لمبا کھلا کوٹ لنکا کی ساحلی ہواؤں سے نم آلود تھا اور جس کے ساتھ اس کی کمزور و نحیف بیوی تھی جس کے مدقوق چہرے پر بارہ برس کی کٹھن منزلیں اور اَن گنت فاقے کندہ تھے۔

لاہور میں بھی کٹھن منزلوں اور مسلسل فاقوں نے ستیارتھی کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اس کی ننھی بیٹی کوتیا اور اس کی بیوی شانتی سدھا ستیارتھی کے چہرے اور اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھتی رہیں لیکن یہ درویش صفت انسان اپنے حال میں مگن رہا۔ ایک عجیب لگن کے ماتحت، دن رات لوک گیتوں پر کام کرتا رہا۔ دن رات تاثراتی خاکے لکھتا رہا اور لکھ لکھ کر دوستوں کو سُناتا رہا اور بلا تمیز عمر ان سے زبان و بیان کی غلطیاں درست کروا کے انہیں شائع کرواتا رہا۔ دوست اس کے مضامین اور افسانے سُن سُن کر عاجز آ گئے اس سے کنی کترانے اور اس کو ٹالنے لگے لیکن ستیارتھی ٹلنے والی آسامی نہ تھی ——— "عجیب آدمی ہو!" وہ مخاطب کی دُکھتی رگ پر انگلی رکھتا! "لوک گیتوں کو دھتکار رہے ہو۔ میں نے بارہ برس تک انہیں سُنا ہے اور تم بارہ منٹ تک سُننے کے لئے بھی آمادہ نہیں۔"

لوک گیتوں کو جمع کرنے پر ستیارتھی نے جتنی محنت کی ہے اس سے کہیں زیادہ محنت وہ بند کمرے میں بیٹھ کر کہانی یا مضمون لکھنے وقت کرتا ہے بلکہ اس سلسلے کی اس کی محنت، کا آغاز بہت پہلے شروع ہو جاتا ہے! افسانے یا مضمون کا موضوع سُوجھنے پر وہ ہر دوست، ہر ملاقاتی یہاں تک کہ طویلے میں بندھے ہوئے گھوڑے تک کو سُناتا ہے۔ ان کے مشوروں سے ذہن ہی ذہن میں اس میں ردوبدل کرتا ہے اور پھر تنگ سطروں کے کاغذ پر بار بار یک اور نوک پلک سے درست حروف میں اس طرح اسے اتارتا ہے اور غلط الفاظ کو کاٹنے کے بجائے یوں بلیڈ سے کھرچ کھرچ کر ان پر نئے الفاظ بٹھاتا ہے گویا سُنار بیٹھا انگوٹھی میں نگینے جڑ رہا ہو ——— لیکن جتنی محنت سے وہ انگوٹھی میں نگینے جڑتا ہے اتنی ہی دریا دلی کے ساتھ وہ کم از کم دس دوستوں سے ان نگینوں کو تڑواتا ہے اور ہر دوست کے سامنے نئے سرے سے لکھا ہوا مسوّدہ رکھتا ہے۔ وجہ کچھ بھی ہو ستیارتھی اپنی ہر تخلیق کے دوران میں عجیب دردِ زہ میں مبتلا رہتا ہے اور چیخ چیخ کر لوگوں کو اپنی روئیداد سُناتا رہتا ہے۔

۱۹۴۶ء میں سُنانے کا یہ مریض لاہور چھوڑ کر دلّی میں جا بسا۔ سنت نگر والا اپنا مکان مجھے دلواتے ہوئے اس نے مالکِ مکان سے کہا "ان سے آپ کو باقاعدہ کرایہ ملے گا ——— اس کا ذمہ میں لیتا ہوں۔"

جس پر مجھے یاد ہے مالکِ مکان نے تمسخر آمیز نظروں سے ستیارتھی کی طرف دیکھا تھا اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پیئے ہوئے ستیارتھی نے مالکِ مکان کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا تھا "گھبرائیے نہیں میرا تین مہینے کا واجب الادا کرایہ آپ کو اگلے مہینے ضرور مل جائے گا ——— اب میں برسرِ روزگار ہوں۔"

مسلسل فاقہ کشی کی زندگی اور بیوی اور بچی کی تکالیف کے خیال نے بالآخر ستیارتھی کے ہتھیار ڈھیلے کر دئے اور اس نے دِلّی کے ایک سرکاری اخبار میں پناہ لی اور پھر ہندی کے بقراط ادیبوں کی شدید مخالفت کے باوجود داڑھی کے بل بوتے پر جست لگا کر وہ ہندی "آج کل" کا

چیف ایڈیٹر بن گیا اور آج بھی اسی عہدے پر فائز ہے۔

تقسیم ہند کے بعد دلی میں جب ستیارتھی سے میری ملاقات ہوئی تو اس کا چرمی تھیلا اسی طرح پھولا ہوا تھا۔ اس کا کیمرہ اسی طرح اس کے کندھے سے لٹک رہا تھا۔ اس کی داڑھی اور اس کی سُنانے کی بیماری بدستور تھی البتہ بیماروں کو اس نے رشوت دینی شروع کر دی تھی۔ وہ انہیں اپنی دس ہزار کی گاڑی میں بٹھا کر کناٹ پلیس کی سیر کراتا تھا۔ ہوٹل میں یا اپنے دفتر میں چائے اور بنگالی رس گلوں سے ان کی تواضع کرتا تھا اور ان کے یہاں جانے کے بجائے انہیں اپنے گھر لے جا کر کھانا کھلاتا تھا اور بیوی کا خوش وخرم چہرہ دکھاتا تھا۔ ہاں اگرچہ کچھ نہ کچھ سُنانے پر ہی تُلی تھی لیکن اب سُننے والے کے دل میں غصّے کے بجائے اس کے تئیں ہمدردی پیدا ہو جاتی تھی۔

آج وہ پُرتکلف زندگی بسر کر رہا ہے لیکن وہ خوش نہیں۔ آج وہ ہندی، اُردو، پنجابی اور انگریزی کی دو درجن سے زیادہ کتابوں کا مصنف ہے لیکن وہ خوش نہیں اور اس لئے خوش نہیں کہ جن تلوں سے وہ بڑی محنت سے تیل نکالتا تھا آج وہ تل از خود تیل اُگل دیتے ہیں۔ وہ انہیں کچھ کھلاتا پلاتا ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ ستیارتھی اپنا پُرانا قرض چکا رہا ہے، اور وہ اس لئے بھی خوش نہیں کہ کسی سے ترمیم واضافہ کرائے بغیر اسے اپنی کہانیاں اور مضامین شائع کرانے پڑتے ہیں۔

کل ایک تشویش ناک خبر کی تصدیق کے لئے میں نے ستیارتھی کو فون کیا۔

”ہاں!“ اس کی نرم وگداز آواز آئی ”حکومت ہند اُردو اور ہندی ”آجکل“ کو ختم کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔“

”پھر ——— میرا مطلب ہے اس صورت میں تمہاری داڑھی .....“

”داڑھی سے اس بار میں کام نہیں لوں گا ——— میں پرسوں آسام جا رہا ہوں۔ وہاں سے مشرقی بنگال جاؤں گا اور وہاں سے.....“

”اور اس دوران میں اگر تمہاری نوکری .....“

”نوکری کی اب مجھے زیادہ فکر نہیں ——— نوکری ساری نے مجھے مفلوج کر دیا ہے ——— میں تو وہاں جامع مسجد کی سیڑھیوں میں تمہارے قریب آنا چاہتا ہوں۔“

”آسام میں تمہارا کیا پتہ ہوگا؟“

قہقہہ لگاتے ہوئے اس نے جواب دیا ”وہی تھیلا، کیمرہ اور داڑھی!“

خدیجہ مستور

ہاجرہ مسرور

جب میں اس کی تمام بکھری ہوئی خصوصیتیں سمیٹ کر دیکھتی ہوں تو وہ ایک ننھے سے جھرنے کی طرح معلوم ہونے لگتی ہے۔ ایک ننھا سا جھرنا جو کسی سربفلک پہاڑ تلے کسی چھوٹی سی چٹان کو چیر کر بہنے لگتا ہے اور بہتا رہتا ہے۔ ناچتا، گنگناتا، اپنے آپ میں مست۔ اس کی اپنی ایک مخصوص چال ہوتی ہے اور اپنا ہی گیت۔ وہ دریاؤں کی طرح طغیانیوں کی زد میں آ کر نہ تو اپنا راگ بدلتا ہے اور نہ اپنی چال بدلتا ہے — اور نہ وہ عظیم الشان سمندروں کی طرح جوار بھاٹا کا شکار ہوتا ہے۔

وہ تو سچ مچ ایک جھرنا ہے جو اپنی دھن میں ابل رہا ہے۔ اس کی اپنی ایک مکمل شخصیت ہے، جو دوسروں کی دیکھا دیکھی تبدیل ہونا نہیں جانتی۔ چھوٹی سی سادہ سی خدیجہ کے لئے ”شخصیت“ جیسا ڈاڑھی مونچھوں والا بے ڈول لفظ استعمال کرتے ہوئے مجھے ہنسی آتی ہے۔ اور جب تک خدیجہ زندہ سلامت ہے۔ مجھے اس لفظ کو اس کے بارے میں استعمال کرتے ہوئے ہنسی آئے گی۔ اول تو ہمارے ہاں لکھنے پڑھنے والے چھٹ بھئیے طبقے کے لئے یہ لفظ بڑا نامانوس ہے اور اگر کہیں ذرا بہت چپکتا دیکھا بھی ہے تو آنجہانی قسم کے لکھنے والوں پر — یہاں تو ایک لکھنے والا زندگی بھر جھک مار کر مرنے کا انتظار کرتا ہے، اور جب مر جاتا ہے تو ”شخصیت“ بننے کی امید ہوتی ہے۔ خدا جانے یہ ”نقوش“ والے صاحب کو کیا سوجھی کہ زندوں کو بھی ”شخصیت“ بنانے پر تل گئے۔ بہرحال عذاب ثواب سب انہی کی گردن پر ——

ہاں تو راوی لکھتا ہے کہ بھئی اپنے بچپن کے قصے کہنے سننے میں کیسے مزا نہیں آتا۔ اپنا اپنا رخ متعین کرنے کی پہلی اور آخری کوشش اسی زمانے میں ہوتی ہے۔ ورنہ اس کے بعد تو زمانے کی رو میں تنکے کی طرح بہتے چلے جاتے ہیں — جاڑوں کی ایک رات کو ہم سب بہن بھائی بھی اسی قسم کے فضول سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ امی نے ہم بہن بھائیوں کے وہ قصے بیان کرنا شروع کر دئے، جہاں ہمارا حافظہ پہنچنے سے عاری تھا۔ انہوں نے سبھی کی باتیں کیں۔ مگر کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ لیکن خدیجہ کا قصہ میرے خیال میں بچپن ہی سے اس کی مکمل ہوتی ہوئی شخصیت کا اظہار ہے۔

امی نے بتایا۔ ”خدیجہ تم سب بچوں کی طرح اپنی نئی آئی ہوئی بہن (ہاجرہ) سے بالکل نہیں جلیں۔ حالانکہ عائشہ بڑی ہونے کے باوجود ماں پر ابھی تک، سب سے زیادہ اپنا حق جتاتی اور نوزائیدہ بچی کو موقع پا کر کھسوٹ لیتی تھی۔ ہاجرہ جب تقریباً ایک سال کی تھی۔ ایک بار میں نے اس کا منہ دھلا کر پونچھتے ہوئے لاڈ سے کہا ”آہا میرا چاند نکل آیا۔“ خدیجہ پلنگ کے پائے سے لگی کھڑی تھی۔ میں نے کچھ دھیان نہیں دیا کہ وہ ایک دم کدھر رینگ گئی۔ تھوڑی دیر بعد

وہ چہرے پر پانی چھڑکے ہوئے آئی اور میرے پلّو سے منہ رگڑنے لگی۔ میں نے اس کا چہرہ پونچھ دیا تو وہ اپنا بھولا سا منہ اٹھا کر بولی "امی دیکھیے خدیجہ نکل آئی" یہ چاند نکل آنے کے مبالغے کا ٹھوس جواب تھا — خدیجہ کا یہ معصوم قصہ سن کر ہم بہت ہنسے۔ لیکن میں سوچ میں پڑ گئی کہ دیکھو وہ ننھے پن میں بھی چاند کے مبالغے میں نہیں الجھی۔ وہ تو اپنے آپ کو اتنا اہم سمجھتی تھی کہ "چاند" کے مقابلے میں خدیجہ کو منوا لیا — امی کہتی ہیں وہ دن اور آج کا دن میں نے بچوں کے لئے دلار کے الفاظ استعمال کرنا چھوڑ دیئے۔

خدیجہ ۱۲ دسمبر ۱۹۲۷ء کو پیدا ہوئی۔ وہ مجھ سے ایک سال ایک ماہ پانچ دن بڑی ہے (اگر میرا حساب غلط نہ ہوا تو) بچپن میں میں اسے دیدی کہہ کر پکارتی۔ لیکن دیدی کہنے کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ وہ واقعی میری بڑی بہن بن بیٹھتی۔ ہم نے ساتھ ساتھ ہوش سنبھالا۔ حد تو یہ ہے کہ الف بے شروع کرنے سے لے کر، نکاح کی "ہاں" تک ساتھ ساتھ کی۔ اس کے باوجود ہمیشہ اسے اپنی بڑی بہن اور محافظ پایا۔ اس طرح اس کے بارے میں میرا علم اتنا ہی گہرا ہے، جتنا اپنے بارے میں، اور جس طرح اپنے بارے میں لکھنا مشکل ہے اسی طرح خدیجہ کے بارے میں بھی۔ جب سے خدیجہ پر لکھنا میرے ذمے لگا ہے میں سخت الجھن میں مبتلا ہو گئی ہوں۔ میں خدیجہ کی زندگی کے ساحل پر کھڑے ہو کر دیکھتی تو شاید کوئی اچھوتی چیز بنتی۔ لیکن یہاں تو میں اسی کے دائرے میں ہوں اور اسی کا ایک حصہ ہوں۔ اس قصے میں اگر "میں" کہیں کہیں آ جاؤں تو میرا قصور نہیں، واقعات کا قصور ہے —

ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ وہ مجھے اپنی چھوٹی بہن سمجھتی ہے۔ جب بچپن میں اسے دیدی کہتی تھی، ذرا ہوش آیا تو خدیجہ کو سخت اعتراض ہوا، کہتی میرا نام لیا کرو، ہم تم تو دوست ہیں اور ہمیشہ برابر کی سطح پر رہے ہیں۔ لیکن عملاً اس کا رویہ میری طرف بہت مشفقانہ اور سرپرستانہ ہوتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ میرے ہی ساتھ نہیں، بلکہ بعض اوقات تو اپنے سے دوگنی چوگنی عمر والوں کے لئے بھی وہی مشفق بڑی بہن والا انداز ہوتا ہے اور مجھے حیرت ہوتی ہے جب لوگ بلا چون و چرا اس کی شفقت قبول کر لیتے ہیں۔

بچپن میں خدیجہ بڑی تیز طرار اور کھلنڈری تھی۔ چھوٹے چھوٹے قصبوں میں تفریح کے کوئی اعلیٰ ذرائع تو ہوتے نہیں۔ وہیں تعینات ہونے والے چھوٹے بڑے افسر یا مقامی وکیل وغیرہ مل کر عموماً ایک جگہ اکٹھا ہو جایا کرتے اور جسے بڑے ارمان سے کلب کہتے۔ ان کلبوں میں ٹینس اور کیرم قسم کے کھیل سے جی بہلا کر اپنے حساب میں شہری روایات سے ناطہ جوڑے رہتے۔ اسی طرح چھوٹی چھوٹی جگہوں پر اپنا رعب، داب قائم رکھنے کے لئے اپنے بچوں کو بھی عام بچوں سے جدا رکھنے کی کوشش میں "کلب" کا ایک حصہ اپنے بچوں کے لئے وقف کر دیتے۔ یہاں ہفتے کو بچوں کا خاص دن ہوتا — اور ان چھوٹے بڑے افسروں کی پردہ دار بیویاں اپنے بچوں کی گدیاں صاف کر کے لچکے گوٹے لگی فراکوں، اور ریشمی نیکروں سے سجا کر اور کینوس کے جوتے پہنا کر، دو روپے مہینے پر رکھی ہوئی آیاؤں کے ہمراہ کلب بھیجتیں۔ اس دن بچوں کو اپنے آباؤں کے سامنے چھوٹے موٹے کھیلوں کے مقابلے میں حصہ لینا پڑتا اور پھر انعامات بٹتے۔ جنہیں پا کر یہ بچے قصبے کے دوسرے بچوں پر رعب جماتے۔ وہ بچے جو خاردار تاروں سے چپٹے دور کھڑے یہ سارے تماشے دیکھتے۔ ان مقابلوں میں خدیجہ ہر معاملے میں چیمپئن ہوتی۔ بڑی تیاریاں ہوتیں، ہفتے کے ہفتے نائی کے سامنے بیٹھ کر سر کے بڑھے ہوئے بال ترشوانا پڑتے اور ہم سب بڑے چاؤ سے یہ سب کروا لیتے۔ خواہ نائی کی قینچی کتنا ہی گدگدائے یا نوچے — لیکن خدیجہ گنوارن کہلانا پسند کرتی مگر اپنی موٹی موٹی چوٹیاں اس قینچی کو نہ چھواتی۔ ننھے سے قد پر لمبی لمبی چوٹیاں اس وقت بڑی دلچسپ لگتیں جب وہ دوڑ میں حصہ لیتی، اور دوڑ کا یہ حال کہ لمبے لمبے پونگے لڑکے گزوں پیچھے ہانپتے رہ جاتے — "پوئم" سنانے کا مقابلہ ہوتا تو دوسرے بچے شرمائے جا رہے ہیں مگر آپ بڑی بے حیائی سے کھڑی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں نچا نچا کر پوئم کو قینچی کی طرح کتر کر پھینک دیتی تھیں۔

خدیجہ کی زبان بڑی دھاردار ہے، بچپن میں اس کی تیزی کی وجہ سے بچے اسے "خدیجہ قینچی" کہہ کر چڑاتے لیکن یہ ذرا نہ بگڑتی اور فخر سے سر اونچا کر کے چلتی۔ "ہاں ہاں قینچی ہیں، کچھ بگاڑ لو ہمارا، لاؤ تمہارے کان کتر لیں" کلب کے یہ بنے ہوئے بچے خدیجہ کو ذرا نہ پسند کرتے، خدیجہ کی اصل مقبولیت تو قصبے کے بھنگیوں، چماروں، کوریوں اور چپراسیوں کے بچوں میں تھی۔ موقع ملا اور مزے سے ان کے گلے میں ہاتھ ڈالے گھوم رہی ہے۔ آبا میاں دولے

پر ہوتے تو تمام تمام دن گلی ڈنڈا، کشتی اور کبڈی ہوتی۔ مجھے بھی ان نعمتوں سے ہم آغوش کرنے کی کوشش کرتی لیکن میں اس لائن کی عادی نہ تھی۔ اپنے کھیلوں سے فرصت پا کر کبھی کبھار اس کا جوش و خروش دیکھنے کھڑی ہو جاتی — اور جب وہ اپنے سے فٹ فٹ بھر اونچے لڑکے لڑکیوں سے خم ٹھونک کر کشتی لڑتی تو میں بھوں بھوں رونا شروع کر دیتی — یہی نہیں بلکہ انہی بچوں کے انداز کی باتیں بھی — "اچھا بیٹا! ٹنگڑی مارتے ہو، ابھی دیکھو کمر پر اٹھا کر پھینکیں گے سالے کی ہڈیاں چور ہو جائیں گی۔" اور اس قسم کی ساری خرافات — جب میں بہت بلبلاتی تو اکھاڑے سے بڑے انداز سے اکڑتی آتی۔

"بڑی بزدل ہو یار، تم بھی کشتی لڑو، چلو میں وہ داؤں بتاؤں کہ سالا کوئی سامنے نہ آئے۔" وہ مجھے مشورہ دیتی اور میں اس کا مشورہ قبول کرنے کے بجائے اس کی پھٹی ہوئی فراک اور مٹی میں تپا ہوا چہرہ دیکھ دیکھ کر مارے محبت کے سسکتی — اور اتنی دیر میں اگر خدیجہ کا ازلی بیری کمال چپراسی ڈھونڈھتا ہوا پہنچتا، تو سب ملیا میٹ ہو جاتا۔ غریب بچوں کا دم نکلتا اس کی صورت دیکھ کر۔ سب ابھرا مار کر بھاگتے جو پکڑا جاتا اسے دھو ہی جاتا اور خدیجہ اس بدنصیب کو بچانے کے لئے کمال کی ٹانگوں سے لپٹ کر اسے نوچ ڈالتی — اور پھر وہ سب سے زیادہ اک روپ اختیار کر لیتا۔ "چلو آنے دو صاحب کو، سب شکایتیں کروں گا — اور بیگم صاحب ڈنڈا لئے بیٹھی ہیں، دیکھنا کیا گت ہوتی ہے۔" وہ ہمیں گھسیٹتا ہوا گھر لے جاتا — لیکن خدیجہ کی کج کلاہی میں ذرا فرق نہ آتا۔ "ہنہ — پیٹ لیں، مجھے ذرا چوٹ نہیں لگتی۔" گھر پہنچ کر واقعی گت ہوتی۔ اگر مجھ پر ہاتھ اٹھتا تو خدیجہ فوراً آنکھیں نکال کر چلاتی "ارے اسے کیوں مارتی ہیں یہ تو تماشہ دیکھتی ہے۔" میں بچ گئی تو خیر ورنہ مجھے بھی مٹھیں کر خدیجہ کے ساتھ رونا پڑتا دو چار منٹ۔ لیکن خدیجہ غضب کی روتی اور ضدی تھی۔ گھنٹوں آنکھیں مل مل کر روتی رہتی۔ لیکن دوسرے دن پھر وہی کھیل اور وہ — مگر اب یہ ساری اچھل پھاند، اور دوڑ بھاگ، شطرنج کے افیونی کھیل میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ لمبی لمبی بیماریوں اور آپریشنوں نے اسے تتلیوں کی طرح اڑنے سے معذور کر دیا — اور پھر ماحول بھی تو بدل گیا تھا — بیسیوں میں گھری ہوئی یتیم لڑکی گھر کے آنگن میں دوڑتی بھی تو کتنا، دیواروں سے سر ٹکرا کر رہ جاتی — جب خود مختاری ملی تو اب جسمانی کمزوری نے شطرنج میں پناہ ڈھونڈھ لی — ایسا لگ کر کھیلتی ہے کہ دیکھنے والوں کو شطرنج سے نفرت ہو جائے — شطرنج کے گھوڑے دوڑانے کے علاوہ اخبار میں اسپورٹس رپورٹس بھی ذوق و شوق سے پڑھ لیتی ہے — وہ دن بہت شاندار ہوتا ہے جب کہیں کرکٹ میچ ہو۔ نہ ہوا اور سونے پر سہاگہ جب ہوتا ہے کہ ریڈیو پر کمنٹری بھی ہو رہی ہو۔ — کھانا پینا بھول کر ریڈیو سے کان لگائے بیٹھی ہیں۔ "وہ مارا۔ آؤٹ آؤٹ!" کرسی سے اچھل پڑ رہی ہیں، تالیاں بجا رہی ہیں۔ اگر اس دوران میں ہم جیسا کوئی اللہ کا بندہ پہنچ جائے تو اب ان کے منہ سے نہ صرف میچ کی پوری تفصیل سنئے بلکہ کرکٹ کی تاریخ پر بھی پورا عبور حاصل کرے۔ ورنہ بد مذاقی کے طعنے سنئے۔

خدیجہ نے بڑی چوریاں کی ہیں — مگر مجھے ایک دفعہ کے سوا یاد نہیں کہ اس نے اپنے لئے کوئی چیز چرائی ہو — چوری کی لت یوں پڑی کہ خدیجہ کچے مکانوں کے مکینوں سے ملی ہوئی تھی اور ان مکانوں میں کیا حالت ہوتی ہے یہ کون نہیں جانتا۔ وہ جو کھاتی سب کو بتاتی۔ "ہم نے آج فیرنی کھائی تھی۔"

"بہت سا گڑ ڈالا ہوگا اس میں؟" بچے زبان مٹر مٹراتے۔

"گڑ! اگڑ تو امی کھانے نہیں دیتیں، شکر کی ہوگی۔" جواب دیتی۔

"شکر کی کھیر کا رنگ لال ہوتا ہے؟" بچے کہتے۔

"سپٹ سفید ہوتا ہے۔ بالکل سفید!" اور پھر خدیجہ کو اپنی بات کے ثبوت میں دو چار پیالے فیرنی کے گھر سے چرانا پڑتے۔ اس کے بغیر بات مکمل ہی نہ ہوتی۔

یہ چوریوں کا سلسلہ بڑا طویل ہو گیا۔ جوں جوں وہ ان گھروں میں گھستی گئی، ویسے ویسے چیزوں کے مزے سے ان کو متعارف کرانا ضروری معلوم ہوتا گیا۔ دالیں، مصالحے، میوے، اچار، کتھا، شکر، پیسے جو ہاتھ لگتا اڑا لیتی اور دوستی کے بندھن مضبوط ہوتے رہتے۔ چوریاں پکڑی گئیں اور اس عادت پر کافی مرمت بھی ہوئی، لیکن مکمل تحقیقات، کے بعد ابا میاں نے سزاؤں کا سلسلہ یک لخت بند کروا دیا۔ بلکہ آہستہ آہستہ سمجھانا شروع کیا۔ کچھ سمجھیں کچھ نہ سمجھیں —

جب ابا میاں ہی ختم ہو گئے تو اسٹور اتنا خالی رہنے لگا کہ خاک دھول چرائیں اور بانٹیں؛ مگر بانٹنے اور بخشنے کا یہ سلسلہ آج تک تو نہ چھوٹا — اب چرانے کی تکلیف اٹھانے کی ضرورت نہیں، کیونکہ اپنی مالک آپ ہیں۔ اب بھی یہ حال ہے کہ کوئی بہن، نند، دوست یا نوکر یا غیر، کسی چیز کی تعریف کر دے تو فوراً اس کو بخش دیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے پاس کپڑے بہت ہی کم ہوتے ہیں۔ اور پیسے کے معاملے میں قطعی کھو کھلی۔ اپنی کوئی کتاب مکمل کرنے سے پہلے ہی یہ طے کر لیتی ہے کہ اس کتاب کا معاوضہ فلاں فلاں کے لئے ہے — مگر یہ مزا اور لٹنا انہی لوگوں کے لئے ہے جن کے لئے اسے ذرا بھی شبہ پڑ جائے کہ یہ اچھا آدمی ہے، اب یہ ضروری نہیں کہ وہ ہمیشہ سے اسے برا لگتی آئی ہو، مگر کوئی لمحہ ایسا ہو سکتا ہے کہ اس کے سارے عیب آنکھوں سے اوجھل ہو جائیں — میں شرطیہ کہہ سکتی ہوں کہ خدیجہ اس معاملے میں بڑی جذباتی اور کچی ہے (یہ دوسری بات ہے کہ ان کا یہ کچا پن دیکھ کر کوئی بدطینت بھی ان کے لئے شرماً حضوری اچھا ثابت ہو جائے) اپنے قریب آنے والوں پر وہ فوراً ہی بھروسہ کرنے لگتی ہے اور بے حد شدت سے اس کے گن گانے لگے گی۔ لیکن جب اس طرف سے کوئی چوٹ لگ جائے تو پھر اس سے کھنچی کھنچی رہنے لگے گی۔ لیکن اگر وہ پلٹ کر ذرا بھی تہ دید کر دے تو پھر وہی —

اس سلسلے میں کوئی سمجھائے کہ بھئی ذرا احتیاط کیا کرو، جلدی سے سب کو اچھا نہ سمجھ لیا کرو، تو آپے سے باہر ہو جائے گی —" واہ بھئی! انسان نہ ہوا بنیا ہو گیا۔ ہر وقت اسی چکر میں رہے کہ کہاں ڈنڈی ماروں، کہاں ملاوٹ کروں، اور کہاں جھکتا تولوں — اس طرح تو میں یہ زندگی نہیں گزار سکتی۔ کہو تو دنیا میں کسی سے ملوں جلوں نہیں — بابا میں انسان ہوں، جس کے لئے جو جذبہ پیدا ہوتا ہے، بغیر لاگ لپیٹ کے اسے برتوں گی، مجھ سے یہ تمہارا گڈمڈی اخلاق نہیں سنبھلے گا۔"

"اتنی بہادر ہو تو پھر بعد میں روتی کیوں ہو؟"

"کیوں رونا کوئی غیر انسانی جذبہ ہے۔ اگر رونا برا ہوتا تو اللہ میاں یہ غدودیں غائب رکھتے۔ ہزار دفعہ روئیں گے، دکھ ہوگا تو روئیں نہیں تو کیا ہنسیں؟ محترمہ! جب جگر خون بنتا ہے تو دو آنسو آتے ہیں۔"

تو جگر کو خون بنانے پر وہ تلی رہتی ہے۔ کیونکہ اسے لوگوں کی طرف سے دکھ پہنچتے ہیں — مگر کبھی بعض وسوسے اور تصورات تک رلا دیتے ہیں مثلاً کسی عزیز کی صحت خراب ہو تو اس سے ہمیشہ کے لئے چھوٹ جانے کے خوف سے وہ کبھی کبھی گھلتی ہے اور آنسو بہا لیتی ہے۔ یہ چھوٹ جانے چھن جانے کا خوف اس پر جب مسلط ہو جائے تو ہر چیز سے بیزار ہو جاتی ہے — صرف یہ وسوسے ہی اسے نہیں رلاتے بلکہ کبھی کبھی تو اس کا قلم بھی اسے دکھ دینے لگتا ہے — مثلاً بہت دن گزر گئے ہیں — دنیا جہاں کے ٹنٹوں میں ڈوبی ہوئی ہے بخششیں ہیں، سوغاتیں ہیں۔ دنیا جہاں کے غموں میں دبلی ہو رہی ہے۔ اچانک خیال آگیا کہ بہت دن سے کچھ لکھا نہیں — بس فوراً نہایت وجدانی کیفیت طاری ہو گئی۔ دنیا سے منہ موڑ لیا، سارے جہاں کے درد و غم دے دیئے۔ ساری محبتوں پر لعنت بھیج دی اور قلم کاغذ لے کر اپنے پلنگ پر کروٹ سے لیٹ گئیں۔ ٹانگ پہ ٹانگ اور ندھائے ہلائے جا رہی ہے۔ آدھ بات ٹر بڑاتی ہے — دو چار سطریں لکھنی ہے — دیر تک جب بات نہ بنے تو رونا آ جائے گا۔ "ہائے یہ دماغ! زنگ لگ گیا اس میں۔ جہنم میں جائیں یہ ساری محبتیں۔ ظہیر کب چاہتے ہیں کہ میں رات دن ان کا خیال کرتی رہوں، پرویز بھی میری پروا نہیں کرتا، منی بھی آپا سے عشق کرتا ہے — لالہ دفتر میں بہت کام کرتے ہیں تو کیا ہوا، سبھی دفتر میں بہت کام کرتے ہیں۔ میں کیوں اس غم میں مبتلا رہوں — عابدہ بیمار ہے تو میں کیا کروں، علاج تو ہو رہا ہے — آخر میں ہی کیوں سب کی خاطر مری پھرتی ہوں، ذرا بیٹھ کر نہیں سوچتی، کوئی کام کی بات نہیں سوچتی؟"

جب یہ دورہ پڑ جائے اور کافی رو لیں تو سمجھ لیجئے کہ کوئی افسانہ لکھ لیں گی۔ اور پھر اس کے بعد پہلے سے زیادہ گرم جوشی سے اپنے چہیتوں پر مرنا شروع ہو جائے گا۔

لکھنے کی بات پر یہ بتاتی چلوں کہ سات آٹھ سال کی عمر سے ہی ان کا ایک اسکینڈل ہو گیا۔ گھر کا ماحول سخت علمی، ادبی، سیاسی قسم کا تھا — والدہ

زنانہ رسائل کی مضمون نگار، والدان کے بھی استاد۔ دنیا جہان کی کتابیں پڑھنے اور سجانے کا شوق، گھر میں دن رات یہی چرچے۔ کہیں سے خدیجہ کے پلّے لفظ "پلاٹ" پڑ گیا۔ اب سب سے کہہ کہہ کر تھکی جا رہی ہیں کہ میرے دماغ میں اتنے پلاٹ ہیں کہ لکھنا چاہوں تو ڈھیر لگا دوں اور لوگ ہیں کہ مذاق اڑا اڑا کر تھک گئے پر یہ نہ تھکیں۔ اسکول کے زمانے میں سدا تیز رہیں (ریاضی جیسے بے تکے مضمون میں بھی تیز!) اسی لئے گھر میں کتابوں پر کتابیں، رسالوں پر رسالے پڑھے پھینکے دے رہی ہیں ——— اور جناب ادھر بادل گھر کر آئے اور وہ بڑے فلسفیانہ موڈ میں کھڑکی میں بیٹھی "تلاشِ پلاٹ" اور فکرِ شعر فرما رہی ہیں۔

پہلے وہ گیت لکھنے کی کوشش کرتی رہی ہیں، سب ہنستے مگر ان کے کان پر جوں نہ رینگتی۔ ایک بار مجھ سے ان کی یہ قابلِ رحم حالت نہ دیکھی گئی۔ میں نے بڑی رقت سے کہا "بیدی یہ نہ کیا کرو، سب تمہیں اُلّو بناتے ہیں۔" جواباً انہوں نے نہایت خلوص سے مجھ سے فرمایا کہ "دیکھو بجو بی بی تم بھی بیٹھ کر سوچا کرو پھر ہم لوگوں کا نام چھپا کرے گا۔" (اس وقت تو مجھ پر اثر نہ ہوا مگر سنتے ہیں یہ جراثیم! انہوں نے مجھے لگا کر چھوڑے ہیں) انہیں دیکھ دیکھ کر سارے بچے عبرت حاصل کرتے۔

اسکول میں جہاں کلاس میں تیزی کی وجہ سے وہ سب ٹیچروں کی چہیتی تھی۔ وہاں بچے اس سے گھبراتے اور اسے تنگ کرنے کی جرأت نہ کرتے۔ مجھے اگر کوئی تنگ کرتا تو وہ سمجھا کا کاغذ بن کر لپٹ جاتی اور وہ سبق پڑھاتی کہ دوبارہ کسی کی ہمت نہ پڑتی کہ مجھے تنگ کرے۔ اور آج بھی خدیجہ کے سامنے مجھے کوئی کچھ کہہ کر دیکھے۔ ساری دنیا ایک طرف اور خدیجہ ایک طرف۔ خواہ میں اپنی پیروی کروانے پر راضی ہوں یا نہ ہوں، مگر وہ کئے رہے گی۔ حد تو یہ ہے کہ امی تک سے میرا کوئی عیب نہیں سن سکتی — امی جب کہا کرتی ہیں کہ "لو دیکھو وہاجرہ کی والدہ صاحبہ میرے سر ہو گئیں!" خدیجہ مجھ سے لپٹ کر کہتی ہے، اس لئے ہنستے ہنستے یہ لفظ سن لیتی ہے۔ وہ تو جسے بھی پسند کرے اس کے لئے کسی سے کچھ نہیں سن سکتی۔ اس معاملے میں بڑی ڈھیٹ ہے لیکن جہاں اپنے بہنوں کی وکالت کرتی اور دم دیتی ہے وہاں انہیں اپنی اپنی جگہ دل کھول کر نصیحتیں بھی کرتی ہے۔ مثلاً ندیم سے کہیں گی۔ "لالہ بچیوں کے لئے کچھ جمع بھی کیا کرو، انشورنس تو فوراً کرا لو، فضول خرچی نہ کیا کرو لالہ!" لالہ کہیں گے "یہ تو لاؤ دکھاؤ کم بخت کیا تنگ کیا ہے۔" اور خدیجہ کو چوٹ سی لگے گی "ارے لالہ مجھے نہ دیا کرو سسرال والوں کی طرح، میرے پاس بچا ہی کیا ہے۔ حساب سے لو، گھر میں خود جیب کر رہی ہوں نہیں چاہتی کہ تم نہ دو۔"

اگر اس بار بہک نکلنے کو لالہ نہ سمجھ سکیں تو اداس ہو جائیں گی۔ مجھے بھی جب ملتی ہیں تو نصیحتیں ضرور کرتی ہیں۔ اور ہم میں اکثر لڑائی ہو جاتی ہے۔ میں لڑنے میں کافی تیز ہوں اور لڑ کر خدیجہ کو مظلوم بھی نہیں سمجھتی۔ لیکن خدیجہ لڑ کر ذرا ہی دیر بعد سارا الزام اپنے سر تھوپ لیتی ہیں اور پھر بیٹھی گھنٹوں پچھتاتی رہیں گی۔ جلد سے جلد موقع تلاش کر کے ہنسی شور مچاتی آ کر ملاپ کریں گی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میری کاہلی اور گھر کے اگڑم بگڑم پن پر گفتگو شروع کر دیں گی۔

انہیں اپنا گھر صاف ستھرا اور خوبصورت رکھنے کا بہت خیال رہتا ہے۔ بس چلے تو دنیا بھر کا حسن لا کر اپنے گھر میں بند کر دیں۔ ذرا سی بدنظمی برداشت نہیں کرتیں۔ نوکروں سے خوب دوستانہ تعلقات رکھتی ہیں اس لئے نوکر بھی خوش رہتے ہیں۔ پچھلے دنوں لاہور میں قیامت کی بارش ہوئی۔ ظاہر ہے اکھٹی سوا ڈیڑھ انچ بارش لاہور کے گھروں کی چھتوں نے کاہے کو کبھی دیکھی تھی۔ اب دھوپ نکلنے کے بعد چھتیں خشک ہوئیں تو چونا جھڑنے لگا۔ یہ سبھی گھروں کا حال تھا۔ لیکن یہ جھڑتا ہوا چونا خدیجہ کے سر پر منوں کا بوجھ بن گیا۔ اس زمانے میں ندیم بھائی کا اسکیچ لکھ رہی تھیں۔ اس دوران میں اٹھا کر رکھ دیا۔ اور لگ گئیں رات دن چھت کے پیچھے۔ آج جھاڑو سے جھڑوائی۔ کل کپڑے سے رگڑوائی، پرسوں دوبارہ سفیدی کروائی۔ اس دوران میں طفیل صاحب تقاضے کے لئے پہنچے تو ان سے لالہ کے اسکیچ کی بات سرسری طور پر کی اور چونے کی کوئی پندرہ بیس منٹ۔

اب سگھڑاپے کا سلسلہ چلا ہے تو عرض کر دوں کہ اس سگھڑاپے کے مارے بچپن میں تیرے میرے گھر باجرے کی روٹیاں پکانا سیکھ آئی تھیں۔ کیونکہ گھر پر والد کا حکم تھا کہ لڑکیوں کو تعلیم کے زمانے میں چولہا ہنڈیا کی طرف بالکل متوجہ نہ ہونے دیا جائے گا۔ سو گھر کی ماما یا خانساماں اتنے مستعد ہوتے کہ خدیجہ بے چاری کو چوری کے لئے بھی باورچی خانے میں قدم نہ رکھنے دیتے۔ اب بے چاری کو گھر داری کا شوق تو تھا ہی اس لئے اپاہج امامن کی اماں کے گھر موقع پا کر روٹی پکا آتیں۔ ایک دن امامن کی اماں کو ہمارے ہاں کا ایک ملازم اطلاع دینے گیا کہ رات نیاز ہے، کھانا لینے اپنے لونڈے کو بھیج دینا۔

دیکھا تو خدیجہ گھرداری سیکھ رہی ہیں — اس دن تو خدیجہ نے نوکر کو دو پیسے رشوت دے کراتی سے یہ راز چھپا لیا۔ لیکن یہ راز اس وقت کھلا جب ابا میاں کے ختم ہونے سے گھر بگڑا اور خدیجہ نے نہایت ذوق و شوق سے گھرداری میں ایک سچے پکے وفادار ملازم کا ہاتھ بٹانا شروع کیا۔

اب بھی کبھی کبھی نہایت جوش سے باورچی خانے میں نوکر کو اچھی روٹیاں پکانے کا طریقہ بتانے جاتی ہیں۔ لیکن ضروری نہیں کہ ہاتھوں کے ساتھ دماغ بھی رہے۔ اس لئے اکثر تیزی میں توے پر پڑی ہوئی چپاتی پر دوسری نہایت لکھنوی قسم کی مہین چپاتی ٹھونک دیتی ہیں۔

کھویا کھویا رہنا، اور بیٹھے بیٹھے غائب ہو جانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ محفل جمی ہے۔ خود بھی خوب چہک رہی ہیں کہ اچانک بھاگ لیں، پکڑی اس وقت جاتی ہیں جب کوئی ایسی حرکت کر بیٹھیں۔ مثلاً زیر بحث موضوع پر ان سے کوئی سوال کر بیٹھئے — "ہوں" — "ہوں" — آپ آنکھوں میں آنکھیں ڈالے فرمائیں گی — صاف پتہ چل جاتا ہے کہ بےچاری کہیں سے گھوم پھر کر آ رہی ہیں۔

خدیجہ کی طبیعت اونچ نیچ سے واقف نہیں۔ وہ صاف سیدھی لائن پر کھٹ کھٹ کرتی بڑھی چلی جاتی ہیں۔ پیٹھ پیچھے نہ کسی کو کچھ کہیں نہ سنیں سامنے ہی جو منہ میں آتا ہے کہہ بیٹھتی ہیں۔ جو کرنا چاہتی ہیں کر لیتی ہیں۔ کوشش بھی کریں تو بننا بالکل نہیں آتا۔ چھپنے اور پڑھے جانے کا ذرہ بھر احساس نہیں۔ کم از کم ظاہر تو بالکل نہیں ہوتا۔ جہاں آتی جاتی ہیں اپنی مخصوص لاابالیانہ سادگی سے۔ کتنے ہی جغادری ادیب یا نقاد بیٹھے ادب بگھارتے رہیں، مرعوب بالکل نہیں ہوتیں۔ اور نہ خود ادب بگھار کر دوسروں کو متاثر کرتی ہیں — کتنے ہی اونچے طبقے کی الٹرا موڈرن خواتین و حضرات کے جمگھٹ میں پھنس جائیں، اپنے آپ پر ان کا عکس بھی نہ پڑنے دیں گی — ایک دفعہ ایک بہت بڑے ڈبیٹ میچ میں جہاں لاہور کا نہایت چمکیلا طبقہ زیادہ تعداد میں جمع کر دیا گیا تھا۔ مجھے بھی جانا تھا — میں اس ماحول کے کھوکھلے پن سے گھبراتی ہوں۔ میں اسی کشمکش میں ذرا دیر سے پہنچی۔ دیکھا تو خدیجہ موجود، ایک خاتون سے چہک رہی ہیں — اور قریب ہی ایک افسانہ نگار خاتون نہایت تکلف سے کھڑی کچھ کھا رہی تھیں۔ خدیجہ نے ان خاتون سے میرا تعارف کرایا، اور پھر ہم دوسرے دوستوں میں گھل مل گئے۔ تقریب کے خاتمے پر، ہم تینوں بہنیں ایک طرف کھڑی کچھ ذاتی باتیں کر رہی تھیں کہ وہی افسانہ نگار خاتون ہماری طرف آئیں اور خدیجہ سے نہایت پلی پُتی مسکراہٹ کے ساتھ مخاطب ہوئیں "آپ کا شکریہ ادا کر لوں میں نے سوچا۔ کیونکہ آپ نے اپنا تعارف خود کرایا تھا۔" ہاتھ ملا کر دوسرے لمحے وہ اس شام کی گہما گہمیوں میں غائب ہو گئیں، اور ان کا اتنا اعلیٰ ادبی فقرہ میرے کانوں میں گونجتا رہ گیا۔ خدیجہ نے ایک لمحے ادھر دیکھا، اور پھر پرانے موضوع پر اس جوش سے باتیں کرنے لگیں جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی — لیکن مجھے ان کا "کیونکہ" بہت کھلا تھا۔ اس لئے میں خدیجہ پر برس پڑی "کتنی دفعہ کہتی ہوں، ایسے لوگوں سے انہی جیسا رویہ اختیار کیا کرو۔ یہ محترمہ اپنے آپ کو لاثانی —"

"لاحول ولا" خدیجہ نے سختی سے میری بات کاٹ دی "میں تو ہرگز یہ نہیں کروں گی، میرا جی چاہا کہ ان سے بات کروں کیونکہ وہ تنہا بےچاری کھڑی تھیں۔ منہ۔ کیا بیہودہ بات ہے کہ ایک شخص اکیلا کھڑا ہو اور دوسرا اس سے بات نہ کرے — اب رہا محترمہ کا اپنے آپ کو لاثانی سمجھنا تو کیا حرج ہے، آج ان کی شام ذرا زیادہ نارنجی ہو جائے گی — اس میں تمہیں دکھ کیوں ہوا — سچ کہہ دوں تم میں سے تمہاری ذات غائب ہوتی جا رہی ہے۔ تم تو جوں جوں آگے بڑھ رہی ہو آئینہ بن رہی ہو — جو تمہارے قریب آئے اپنا ہی عکس پائے — بھئی میں ایسی تہذیب سے باز آئی۔"

اس قسم کے لمبے چوڑے لکچر سے میں مکدر ہو کر خاموش ہو رہی۔ لیکن خدیجہ مجھے آج تک قائل کرتی رہتی ہیں۔

خدیجہ میں مزاح اور طنز کی سادگی کی حس بھی کافی موجود ہے۔ اس لئے پھبتی اڑانے میں بہت تیز ہیں۔ مشکل ہی سے کسی کو بخشنے پر تیار رہتی ہیں۔ اور اس سلسلے میں زیادتی بھی کر بیٹھتی ہیں — ۱۹۴۶ء میں ہم عام انتخابات کے سلسلے میں مسلم لیگ کی طرف سے رضاکاری فرما رہے تھے۔ یہ لکھنؤ کا ذکر ہے۔ اتفاق سے ہم جس پولنگ اسٹیشن پر تھے وہاں مدح صحابہ والوں کا زور تھا اور لیگی امیدوار کا کیمپ رائیں سائیں کر رہا تھا۔ ہمارے ساتھ اور کئی لڑکیاں بھی تھیں۔ ان میں ایک نہایت فربہ قسم کی خاتون بھی تھیں۔ ہم سب تمام دن خالی بیٹھے بیٹھے کرسیوں پر پہلو بدلتے رہے۔ شام تک پہلو بدلنے کی طاقت بھی

جواب دے گئی۔ وقت ختم ہونے پر اِدھر اُدھر سے اور بھی لڑکیاں آگئیں۔ خدیجہ نے بمشکل کرسی پر سے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کراہ کر کہا۔ "اسپرنگ تک سن ہو گئے۔" اور پھر ان ضرورت سے زیادہ فربہ خاتون کی طرف مخاطب ہو کر سنجیدگی سے پوچھا: "کیوں بیگم صاحبہ! آپ تو آج ہی کشن بدلوا لیں گی؟" یاد رہے کہ ان فربہ بیگم کی نہایت شاندار فرنیچر کی دکان تھی۔ یقین کیجئے کہ وہ بیگم صاحبہ عمر بھر کے لئے دشمن ہو گئیں۔

ایک دن ہم دونوں کچھ شاپنگ کرنا چاہتے تھے۔ تانگے میں بیٹھنے ہی والے تھے کہ ایک عزیز کی کار سامنے سے گزری، خدیجہ نے جلدی سے ہاتھ ہلایا۔ کار رُکی تو ہم دونوں تانگہ چھوڑ کر فوراً کار میں گھس پڑے اور کہا شاپنگ کرنا ہے ذرا پہنچا دیجئے۔ ان صاحب کو کہیں اور پہنچنا تھا، شرما حضوری لے چلے مگر دو تین دفعہ کہا کہ بی بی خدیجہ ذرا جلدی کرنا۔ شاپنگ تو ہم نے پورے اطمینانِ قلب سے کی اور ان صاحب کو بھی کچھ خریداری کروا دی لیکن جب پیکیٹ بندھنے لگے تو خدیجہ نے بڑی سنجیدگی سے دکاندار سے کہا: "مہربانی فرما کر جلدی کیجئے، ہماری کار چھٹ جائے گی۔"

اس کار چھٹ جانے پر "ہماری کار" کا سارا بھرم کھل گیا اور دکاندار دل کھول کر ہنسا۔

خدیجہ میں عام عورتوں کی طرح دوسروں میں کیڑے ڈالنے اور ان سے جلنے کی عادت نہیں۔ کوئی کتنا ہی شاندار ہو، زرلفت کی جھاڑن بنائے، یا بیٹھ کر موتی نگلے، یا چاند کی طرح جگمگائے، ذرا حسد نہیں کریں گی۔ عام طور سے لکھنے والے دوسرے ہم عصروں سے بخار کھاتے ہیں اور ڈر کے مارے کسی کے سامنے نام نہیں لیتے کہ کہیں کوئی انہیں بھی لکھنے والا نہ سمجھ لے، مگر یہ ہیں کہ اپنے سوا ہر ایک لکھنے والے کا ذکر کرنا ضروری سمجھتی ہیں۔ نئے سے نئے لکھنے والے کی اچھی چیز کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیں گی۔ شرط یہ ہے کہ کسی کی کوئی تحریر ان کے دل کو لگ جائے۔ شاید یہی فراخ دلی ہے جس نے ان کی ازدواجی زندگی کو اتنا خوبصورت خواب ناک اور پُر سکون بنا رکھا ہے۔ ظہیر خدیجہ سے صرف سات آٹھ ماہ عمر میں بڑے ہیں۔ دونوں خوب برابری سے بسر کرتے ہیں۔ ایک چھوٹا سا بچہ ہے جس کی ہر جنبش دونوں کے لئے دنیا کی دلچسپ سے دلچسپ چیز بن جاتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے کوئی بات اپنی اپنی اماں بہنوں سے بھی سننا پسند نہیں کرتے ——— یہ دیکھ کر بعض اوقات ہم جیسے کہہ بیٹھتے ہیں "بھئی کب تک لیلیٰ بنو گے؟" مگر کوئی بنے گا کہاں تک۔ ساڑھے چار سال کا عرصہ کافی ہوتا ہے کھلنے کے لئے ——— اس مکمل زندگی کے باوجود اگر کوئی خدیجہ سے کہہ دے کہ "تمہارے شوہر" تو جل کر خاک ہو جائیں گی "یہ کیا بکواس لگا رکھی ہے۔ شوہر، شوہر، شوہر۔ کیا کوئی شریفانہ لفظ نہیں اس مقدس رشتے کے لئے۔ مثلاً دوست کہہ لو، چلو دوست عام سہی، ساتھی کے بارے میں کیا خیال ہے؟" گھر کے اندر بھی وہ دوستی ہی برتتے ہیں۔ اگر ظہیر مذاقاً بھی برتری جتائیں تو پھر لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔

خدیجہ چار فٹ گیارہ انچ کی مختصر سی انسان ہیں۔ مجھے یاد ہے بچپن میں وہ ہمیشہ بازوؤں کی موٹائی کا مقابلہ مجھ سے کرتی تھیں۔ مگر اب دُبلی پتلی سی ہیں۔ میں نے جلدی سے پیدا ہو کر ان کے حصے کا دودھ چھین لیا، مگر وہ اس حق تلفی پر بھی مجھ سے ناراض نہیں ——— جن بالوں پر وہ کبھی فخر کرتی تھیں اور کبھی نانی کے سامنے نہ جھکتی تھیں، اب لمبی لمبی بیماریوں نے وہ گھنے بال ہلکے اور چھوٹے کر دئے ہیں۔ خوب تیکھا ناک نقشہ، رنگ سانولا، آنکھیں خوبصورت لیکن آدھی اندھی۔ قطعی اندھی ہونے کے بعد شاید ہر وقت عینک لگائیں گی۔ ابھی تو صرف پکچر میں یا باہر نکلتے ہوئے یہ تکلف کر لیتی ہیں۔ کیونکہ تین چار گز کے فاصلے سے سُوجھتا نہیں ——— انہیں دیکھ کر مجھے نہ جانے کیوں ہمیشہ سے کچے آم کی میٹھی چٹنی یاد آتی ہے جس میں تھوڑا نمک اور تھوڑی لال مرچ بھی ملائی گئی ہو۔ کپڑوں کے معاملے میں پرلے سرے کی لاپروا، سوائے ساری کے ہر لباس سے اُلجھتی ہیں۔ مصنوعی خوبصورتی کے تمام لوازمات سے ایسے بدکتی ہیں جیسے وہ گھوڑے ہیں اور لات رسید کر کے رہیں گے۔ یہ وہ خدیجہ ہیں جن کی زندگی کے ساحل پہ کھڑے ہو کر میں تماشہ نہیں دیکھتی رہی ہوں، میں تو اسی کا ایک حصہ ہوں۔ میں نے ان کی زندگی کا ہر رُخ، ہر موڑ دیکھا ہے ——— وہ کس قسم کی انسان ہیں، یہ میں نے بتا دیا۔ مگر میں اتنا ضرور سوچتی ہوں کہ ایسے لوگوں کی اس نظام میں کتنی گنجائش ہے اور ہے بھی یا نہیں ——— میں اس وقت ایک عجیب درد سے اپنے آنسو ضبط کرتی ہوں، جب وہ اپنے پیاروں کا اتنی گرم جوشی سے ذکر کرتی ہے ——— توصیف ہمارا چھوٹا بھائی پرلے سرے کا لاپرواہ آدمی ہے، وہ کہتا ہے میں چونچلوں کا قائل نہیں۔ اور بہنوں کو اپنے گھر دیکھ کر نہایت پُر تکلف لہجے میں صرف "ہلو" کہتا ہے لیکن جب میں خدیجہ کو اس کے لئے سگریٹیں رکھتے دیکھتی ہوں، اور چاؤ سے ایسی جگہوں پہ جاتے دیکھتی ہوں جہاں توصیف، اس کا چھوٹا بھائی نظر آ سکے۔ تو میں سوچتی ہوں، خدیجہ سچ مچ بڑی بہن ہیں۔ میری ہی نہیں سب کی بڑی بہن ———

شفیق الرّحمٰن

محمد خالد

ایڈیٹر "نقوش" نے شفیق الرحمٰن کی شخصیت پر لکھنے کے لئے مجھے چُنا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ شفیق سے اس قدر نزدیک ہونے کی وجہ سے اس کام کو مجھ سے زیادہ خوش اسلوبی سے کوئی دوسرا انجام نہیں دے سکتا۔ اب یہ ایک بحث طلب امر ہے کہ آیا ایک آدمی اپنے دوست کا بہترین سوانح نگار ہو سکتا ہے۔ کیا کوئی اپنے دوست کے بارے میں اس ٹھنڈے اور غیر جذباتی طریق سے سوچ سکتا ہے جو اس قسم کی تصویر کشی کے لئے بےحد ضروری ہے۔ ہم عام انسان تو ساد ہ موم کے بنے ہوئے بت نہیں۔ ہم خون اور پوست کی مخلوق ہیں اور دوستی بڑی حد تک ایک جذباتی وابستگی ہے۔ ہم سب میں اپنے دوستوں کی آبرو کی خاطر خون کی تیز تر گردش کا پیش خیمہ ہوتی ہے ——— ہم محفل میں اور محفل کے باہر اپنے بہترین دوستوں کے گُن اونچے سُروں میں گاتے ہیں۔ وہ ہماری اپنی زندگی میں اس قدر اہم ہوتے ہیں۔ اور ہم ان سے اس درجہ محبت کرتے ہیں۔ کہ ہم انہیں حسین اور چمکیلے رنگوں میں پیش کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ اسے انسانی کمزوری کہو یا کچھ اور۔ ایک دوست کے متعلق مکمل غیر شخصی انداز میں نہیں لکھا جا سکتا۔ دوستی اپنی ماہیت سے تنقید کی قوت کو معطل کر دیتی ہے۔ ہم اپنے دوستوں کی ویسی ہی تصویر کھینچ سکتے ہیں جیسے وہ ہمیں نظر آتے ہیں۔

اس مشکل کے پیش نظر اور اپنی ادبی حدود اور کوتاہیوں کو پوری طرح جانتے ہوئے مجھے ایڈیٹر کی فرمائش کو افسوس کے ساتھ رد کر دینا چاہئیے تھا۔ مگر کوئی چیز مجھ کو ایسا کرنے سے روک رہی ہے۔ اچھے اور خوش اخلاق ایڈیٹر کی یہ دعوت مجھے اپنے دوست کو ایک چھوٹا سا خراجِ عقیدت پیش کرنے کا ایسا موقعہ دیتی ہے جو ایک آدمی کی زندگی میں روز روز نہیں آتا۔ کیا میں اسے اس آسانی سے جانے دوں؟ نہیں! میں اس دعوت کو قبول کرتے ہوئے، الفاظ میں اپنے سب سے پیارے اور ہر دلعزیز دوست کا ایک ہلکا سا تاثر دینے کی کوشش کروں گا ——— اس کے باوجود کہ میری لغت محدود ہے اور میری زبان عجیب اور لنگڑی۔

شفیق اور میں قریب قریب ہم عمر ہیں۔ ہم نے ایک ہی ماہ اور سال میں اس خوبصورت اور حیران کن دنیا پر آنکھیں کھولیں۔ دو جماعتیں ہم نے بہاولپور ہائی سکول میں اکٹھی پڑھیں ——— ساتویں اور آٹھویں ——— ہم فوراً دوست نہیں بنے، اور کافی مدت تک ایک دوسرے کو اجنبی جانوروں کی طرح مشتبہ نظروں سے دیکھتے رہے۔ ان دنوں کا شفیق ایک گول گوتھنا گول مٹول لڑکا تھا۔ جو ترکی ٹوپی پہنتا تھا اور ایک چھوٹے بچوں کے سائیکل پر چڑھ کر سکول میں آتا تھا۔ وہ فضل بک ڈپو کے سنسنی خیز اور راتوں کی نیند حرام کر دینے والے جاسوسی ناولوں کا بڑی شدت سے مطالعہ کیا کرتا تھا۔ اور میرا خیال ہے بچپن کی خود فریبی سے اپنے آپ کو بھی

ایک ماہر جاسوس سمجھتا تھا۔ وہ اکثر سائیکل پر خیالی ڈاکوؤں یا مجرموں کا تعاقب کیا کرتا۔ اور اپنی کارکردگیوں کی لمبی محیر العقول کہانیاں سناتا جو ہمیں اس کی خوش قسمتی پر رشک کرنے پر مجبور کر دیتیں۔ بازار میں ایک دکان تھی جہاں چاند تارے کی شکل کی چوسنے والی مٹھائیوں کے علاوہ فضل بک ڈپو کے ناول بھی شاید ایک پیسہ یومیہ کرایہ پر مل سکتے تھے۔ شفیق کے توسط سے میں بھی ان ناولوں سے متعارف ہو گیا۔ اور رفتہ رفتہ ان کا رسیا بن گیا۔ ہم ان ناولوں کو کلاس میں لے کر آتے۔ اور ماسٹر کی موجودگی میں انہیں ڈیسک کے نیچے چھپا کر پڑھتے۔ ہم ضخیم سے ضخیم ناول کو ایک دن میں ختم کر کے دم لیتے۔ نہ صرف اس لئے کہ انہیں ایک بار شروع کر کے ختم کئے بغیر چھوڑنا ناممکن ہوتا بلکہ اس لئے بھی کہ ایک زائد دن کتاب کو رکھنے سے ہمیں خواہ مخواہ ایک پیسہ مزید کرایہ دینا پڑتا تھا۔ جب ماسٹر جماعت میں سود یا تجارت کی گتھیاں سلجھا رہا ہوتا۔ ہم بڑے مزے سے اپنی تہ خانوں اور نقاب پوشوں کی دنیا میں گم ہوتے۔ ہم دونوں کو پڑھنے کی عادت انہی ناولوں نے ڈالی۔ ہم ان جاسوسی ناول لکھنے والوں کی ذہانت اور قابلیت پر رشک کیا کرتے۔ ان مصنفوں کے ناموں میں ہمیں ایک شان، ایک عظمت نظر آتی۔ اور ہم دونوں کے دلوں میں اس ارادے نے پہلی بار جڑ پکڑی کہ ہم بڑے ہو کر مصنف بنیں گے۔ اور فضل بک ڈپو کے ناول نگاروں کی طرح سنسنی خیز اور دلچسپ ناول لکھا کریں گے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، میری یہ مصنف بننے کی خواہش اور ہوس ایک غلطی تھی۔ اس کی مجھے ایک بڑی قیمت ادا کرنا پڑی ہے۔ اب جب کہ مجھے اس غلطی کا احساس ہو چلا ہے کسی نئی زندگی کی طرف لوٹ جانا ناممکن ہے۔

شفیق میں ان دنوں بھی قصے لکھنے کا ایک قدرتی ملکہ تھا۔ اس وقت بھی اس میں وہ دوسروں کو ہنسی سے لوٹ پوٹ کر دینے کی وہ انوکھی ادا تھی جس نے اسے اس قدر مسرت بخش مصنف اور دوست بنا دیا ہے۔ وہ بیٹھے بٹھائے پانچ منٹ میں چھوٹی سی مزاحیہ نظمیں چست کر لیتا۔ مضمون آفرینی اور طباعی کا فطرتی مادہ اس میں موجود تھا۔

ہم گھر والوں سے چوری چھپے دارالاشاعت پنجاب سے بھی کتابیں منگواتے۔ ان کی وی پی چھڑانے کے لئے ہم اپنے جوڑے ہوئے پیسوں کو پول کرتے۔ کیا ہم بادشاہوں کی طرح خوش نہ ہوتے تھے جب کتابوں کا بنڈل ہمارے قبضہ میں ہوتا تھا۔ اور کس دھڑکن اور اضطراب سے ہم اس بنڈل کو کھولتے تھے۔ اور کیسی خوبصورت کتابیں وہ ہوتی تھیں۔ "تصویر [illegible]"، "عمر عیار"، "جنوبی سمندر کی کہانی"، "الحمرا کی کہانیاں"۔ میں نے ایسی کتابیں پھر نہیں پڑھیں۔ اور نہ کبھی پڑھوں گا۔ وہ لڑکے خوش قسمت ہیں جنہوں نے بچپن میں انہیں پڑھا ہے۔ شفیق اکثر لکھتا ہے کہ وہ جو کچھ ہے انہی کتابوں کی بدولت ہے۔ انہوں نے ہمیں اصل ادب کے حسن اور لطافت سے روشناس کیا اور ہمارے تخیل کو جلا دی۔

ہم دونوں میں سے ایک بھی ابھی تک ان کتابوں کے اثر کے تلے سے نہیں نکل سکا۔ میری اپنی پہلی کتابیں "قصر صحرا" کے تین حصے اور "جنوبی سمندروں کی کہانی" تھے۔ یہ پہلی بحری لڑائیوں اور عجیب ملکوں میں دہشتناک مہموں کے متعلق ایک ناول ہے۔ اور اس سے زیادہ اچھی کہانی کی کوئی لڑکا خواہش نہیں کر سکتا۔ شفیق کو جو کتاب سب سے اچھی لگی وہ غلام عباس کی "الحمرا کی کہانیاں" تھی۔ ان کہانیوں کے اسرار، جادو اور رومان نے اسے بالکل مسخر کر لیا۔ اور پھر اس کتاب میں رنگین تصویریں بھی تھیں۔ ان دنوں بھدی سے بھدی تصویریں بھی کس قدر حقیقی اور جاندار لگتی تھیں۔ ہم دونوں کے دل پر ابھی تک وہ عجیب تصویریں نقش ہیں۔ جو ان کتابوں کے متن کو السٹریٹ کرتی تھیں۔ ویسے آرٹسٹ آج کل کیوں نہیں ہوتے؟

آٹھویں پاس کر کے شفیق غالباً محض تبدیلی آب و ہوا کی خاطر بہاولپور سکول چھوڑ کر بہاولنگر کے ہائی سکول میں داخل ہوا۔ ہم پھر ایک سال تک نہ ملے۔ جب وہ گرمیوں کی چھٹیوں میں چند ہفتوں کے لئے بہاولپور آیا تو وہ جسمانی طور پر ایک مختلف شفیق تھا۔ اور اس کی آواز بھاری ہو گئی تھی۔ یہ مجھے بڑا عجیب اور دلچسپ معلوم ہوا۔ میں اس سے آگاہ نہیں تھا کہ بعینہ وہی تبدیلیاں مجھ میں بھی آ چکی تھیں۔ حقیقت میں ہم دونوں کے قدوں میں یک لخت اضافہ ہو گیا تھا۔ ہم نے پھر کچھ وقت اکٹھے گزارا۔ میرے والد صاحب کی کتابوں میں واشنگٹن ارونگ کی انگریزی کتاب "الحمرا کی داستانیں" کی ایک جلد نکل آئی۔ اسے میں نے شفیق کو دے دیا۔ اور وہ چھٹیوں کے بعد اسے اپنے ساتھ بہاولنگر لے گیا۔ اس نے اس میں سے دو تین کہانیوں کے آزاد ترجمے کئے۔ میرا خیال ہے وہ عصمت میں چھپے۔ وہ بڑے خوبصورت ترجمے تھے۔ شوخ اور شگفتہ اور بے تکلف۔ ان کے بعد شفیق مختلف رسائل میں چھپنے لگا۔

اس نے پہلے ہلے میں ہی چھاپے کی عجیب دنیا کو فتح کر لیا تھا۔ اور وہ غالباً اردو کا واحد مصنف ہے جس کا کوئی مضمون ناقابلِ اشاعت سمجھ کر نہیں لوٹایا گیا۔ اسے اس کی خوش نصیبی پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ ابتدا ہی سے اس کی طنازی نے زبان کی روانی اور شوخی کے پردے میں اپنا رنگ جما دیا... ادبی شہرت اسے اس عمر میں ہی حاصل ہو گئی۔ جب بہت سے اپنے مطلب کے اظہار کے لئے زبان کی مشکلات سے ایک مایوسانہ پیکار میں سرگرداں ہوتے ہیں۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد شفیق نے رہتک میں ایک کالج میں داخلہ لیا (یہ لوگ رہتک کے راجپوت ہیں۔ اور شفیق کا پورا نام راؤ شفیق الرحمٰن ہے) رہتک سے اس نے ایف۔ ایس سی (پری میڈیکل) بڑے اچھے نمبروں پر پاس کیا۔ اور لاہور کے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں داخلے کے لئے منتخب کر لیا گیا۔ میں نے ۱۹۳۶ء میں بہاولپور کالج سے بی۔ اے کیا۔ اور اپنے والد کو لا کالج بھیجنے پر اکسایا۔ اگرچہ قانون سے مجھے کوئی طبعی رغبت نہیں تھی۔ اسی سال میں لا کالج میں داخل ہوا۔ لا کے پہلے سال میں باعزت طریقے سے فیل ہوا۔ کیونکہ ممتحنوں نے قانون کی اس تشریح سے جو میں نے (متعدد کارٹونوں کی مدد سے) اپنے پرچوں میں کی تھی، اتفاق نہیں کیا تھا۔ دوسرے سال میں مغلپورہ کے انجینئرنگ کالج میں داخل ہو گیا۔ انجینئرنگ کے لئے مجھے قانون سے بھی کم رغبت تھی، مگر میرا خیال تھا کہ انجینئرنگ کالج میں جا کر میں "پریکٹیکل" ہو جاؤں گا۔ دوسرے لوگ "پریکٹیکل" تھے۔ میں "پریکٹیکل" PRACTICAL نہیں تھا۔ اور یہ خیال مجھے کافی ناخوش رکھتا تھا۔

شفیق اب میڈیکل کالج کے تھرڈ ایئر میں تھا جب میں لا کالج میں تھا تو ہم کسی وجہ سے بہت کم ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ اب ہم دوسرے تیسرے ملنے لگے۔ وہ بلاناغہ ہر چھٹی کو سائیکل پر میرے پاس آ جاتا۔ ہم وہاں سے سچے آوارہ گردوں کی طرح پاپیادہ کھیتوں میں سے دریا کی طرف چل پڑتے۔ ہم دونوں انتھک چلنے والے ہیں۔ ہم راستے میں دم لیتے۔ دھوپ سینکتے۔ کسی درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر وہی باتیں کرتے جو کربِ زدہ جوان ہمیشہ کرتے ہیں۔ ہم راہ میں پڑتے ہوئے تاریخی کھنڈروں کی دیواروں پر سکول کے لڑکوں کی طرح اپنے ناموں کو چاقو سے کندہ کرتے ــ تاکہ ہم لافانی ہو جائیں۔ اور آئندہ نسلوں کے سیلانی جان سکیں کہ ہمارا بھی کبھی اس سرائے دوروزہ میں گزر ہوا تھا۔

بعض وقت ہم اپنے ساتھ کوئی کتاب لے جاتے اور کسی سبزا ور شاداب جگہ پر بیٹھ کر اس میں سے صفحے پڑھ کر ایک دوسرے کو سناتے۔ ہم نے مزاح نگار اسٹیفن لیکاک کی بیشتر کتابیں انہی سیروں میں اسی طریق سے پڑھی ہیں۔ ہم چھوٹے شرارتی بچوں کی طرح بے تکلفانہ قہقہے لگا کر ہنستے۔ اور کئی بار سنجیدہ دہقانی راہ گیر ہمیں عجیب نظروں سے دیکھتے جیسے کہ ہم باؤلے ہوں۔

میں نے شفیق کے قہقہوں کے سے اونچے، اور صحت مند اور کسی کے قہقہے نہیں سُنے۔ اور میں کسی اور کو نہیں جانتا جس کی باتوں میں اتنی شگفتگی اور چمک ہو۔ اس کے قہقہے مجھے اپنے تاریک خول سے باہر کھلی ہوا اور چمکیلی دھوپ میں لے جاتے۔ اس کی مسرت مجھے چھو جاتی، اور میں اس قدر ہنستا کہ میری آنکھوں سے آنسو بہ نکلتے۔ وہ کون سی ایسی باتیں ہوتی تھیں جو ہمیں یوں بے تحاشا ہنساتی تھیں۔ دو تین مجھے یاد ہیں، مگر میں ان کو یہاں اس لئے نہیں لکھوں گا کہ ایسی باتیں لکھے جانے کے بعد اپنی آب و تاب کھو دیتی ہیں اور سپاٹ اور بے جان لگتی ہیں۔

شفیق اور میں اب تک ان بیس برسوں کو نہیں بھولے۔ ان سیروں کا سرا کا نیلا آسمان اب تک ہم پر چمکتا ہے۔ اب تک کسی اکیلے پرندے کی راگنی ہمارے کانوں کو سنائی دیتی ہے۔ ان سیروں نے واقعی ہمیں ایک دوسرے کے نزدیک کر دیا۔ کھلی سڑک کی رفاقت سی اور کوئی رفاقت نہیں۔ ــــــ انہوں نے زندگی کو بھی قابلِ برداشت بنا دیا۔ اور انجینئرنگ کالج کے خشک ماحول میں رنگینی کی لہر پیدا کر دی۔

کالج کے دنوں ہی سے شفیق کو ایک خوبصورت جسم بنانے کا خبط تھا۔ وہ اب تک اپنی روزانہ ورزش میں باقاعدہ ہے۔ کالج میں اس کا معمول تھا کہ وہ صبح اٹھ کر ہوسٹل کے سامنے کے لان میں ایک میل دوڑتا۔ شام کو وہ کرکٹ کے لئے چلا جاتا (وہ ایک وقت میں اچھا خاصا فاسٹ باؤلر سمجھا جاتا تھا) کھیل کے بعد وہ گرمیوں میں اکثر کالج سوئمنگ ٹینک میں آدھ میل تیرتا۔

وہ ایک اچھا طالب علم تھا۔ اور جہاں تک مجھے یاد ہے، وہ کسی سال میں فیل نہیں ہوا۔ وہ اپنے کالج کی دوسری سرگرمیوں میں بھی چمکا اور اپنے فائنل ایر میں اتفاق رائے سے اس سال کے لئے ڈرامٹیک کلب کا سیکرٹری منتخب ہوا۔ اس کی سیکرٹری شپ کے دور میں میڈیکل کالج کے ڈرامٹیک کلب نے ایک ڈرامہ سٹیج کیا جو بہت کامیاب رہا۔

۱۹۴۱ء میں اس نے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کا امتحان پاس کیا۔ اسی سال اس کی پہلی کتاب "کرنیں" خوشنما جیبی سائز میں اور حجاب امتیاز علی کے حوصلہ افزا دیباچے کے ساتھ چھپی۔ یہ شفیق الرحمٰن کے لئے ایک مسعود اور مبارک سال تھا —— نئی کامرانیوں اور نئی آزادیوں کا سال۔ امتحان میں کامیابی نے اسے وہ معاشی خود مختاری دی جس کے لئے وہ اتنا بے تاب تھا۔ اس کے اعزہ اسے سول میں ڈاکٹر دیکھنے کے خواہاں تھے۔ شفیق کو سویلین ڈاکٹر کی زندگی سے نفرت تھی۔ فوج کی ملازمت کی دمک اور ایڈونچر نے اس کے نوجوان دل کو اپیل کیا۔ اس نے کمیشن کے لئے درخواست دی جو اسے فوراً مل گیا۔ وہ جنگ کے دن تھے اور فوج میں ڈاکٹروں کی بڑی مانگ تھی۔

لاہور چھوڑنے سے پہلے دو دن اس نے میرے ساتھ گزارے (میں نے ہوسٹل چھوڑ دیا تھا۔ اور اب ریلوے اسٹیشن کے سامنے ریوالی سینما کے پاس ایک تاریک اور اداس دو منزلہ ہوٹل میں اقامت پذیر تھا) ہر ایک شخص کی طرح وہ اپنی پہلی تقرری کے متعلق تردد میں اور مضطرب تھا۔ اسے لاہور چھوڑنے پر افسوس تھا۔ اور اپنی نئی زندگی کے لئے وسوسے اسے کچھ بے سکون اور اداس بنا رہے تھے۔ یہ وسوسے ایک ایسے شخص کے لئے قدرتی تھے جو بنیادی طور پر شرمیلا ہے۔

ٹریننگ کے بعد اس کی مختلف جگہوں پر تقرری ہوتی رہی۔ مجھے اس کے خط باقاعدگی سے رومینٹک ناموں والے شہروں سے آتے رہے —— فورٹ سنڈیمن۔ دارجیلنگ۔ آسام اور جنوبی ہند کے مقامات سے۔ وہ ایک بڑا دلچسپ خط لکھنے والا ہے۔ اس کے خط بتاتے تھے کہ وہ اپنی ابتدائی جھجک اور شرمیلے پن پر غالب آ گیا ہے۔ اور اپنی نئی زندگی کی کڑی روٹین میں نہ صرف رچ گیا ہے بلکہ اسے پرلطف اور مزاج کے موافق پا رہا ہے۔ وہ اپنی یونیفارم اور اپنے ستارے پر اتنا مغرور تھا جتنا ایک چھوٹا سکول کا لڑکا پہلی بار انگریزی کپڑے پہننے پر۔ اور یہ کہنا کوئی مذاق نہیں کہ اس نے کمیشن یونیفارم پہننے کے لئے لیا۔ وہ اپنی نئی شان میں جو میرے لئے باعث رشک تھی کبھی کبھی لاہور میں ایک دو روز کے لئے آ نکلتا۔ وہ ایک نمائشی چوڑے چھجوں کا فیلٹ پہننے کا بڑا مشتاق تھا۔ اس میں وہ کسی امریکن فلم کا "کاؤبوائے" لگتا۔ مجھے یہ فیلٹ ایک آرمی ڈاکٹر کے لئے بہت نمایاں FLAMBOYANT معلوم ہوتا۔ شفیق کو اس چیز سے محبت تھی۔ اور ایک دفعہ اس نے اس چیز کی دوسری سب ٹوپیوں پر برتری ثابت کرنے کے لئے مجھے ایک گھنٹے کا لکچر دیا۔ اپنے دوستوں کے احتجاجات کے باوجود اس نے اس "ٹوپی" کا پہننا جاری رکھا۔

۱۹۴۳ء میں خوش قسمتی سے اس کی ایک ایسے اسٹیشن پر تقرری ہوئی جس سے بہتر اسٹیشن اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ نیا اسٹیشن خوبصورت اور شاداب وادی کلو میں ایک پہاڑ کے دامن میں واقع تھا۔ یہاں تقریباً چار ہزار اٹلی کے جنگی قیدی جنگ کے شور و شغب سے دور ایک مکمل چین اور امن میں اپنی ویکیشن گزار رہے تھے۔ یول کیمپ۔ یہ اس جگہ کا نام تھا۔ ایک قیدیوں کے کیمپ کے علاوہ ایک ہالی ڈے کیمپ تھا۔ اور اطالوی یہاں جنگ کے خاتمے تک ایک مسلسل پک نک کے مزے لے رہے تھے۔ یہاں میں نے شفیق کے ساتھ ایک حسین مہینہ گزارا۔ اس نے دو تین سالوں میں انگریزی ادب کی کتابوں کی اچھی خاصی لائبریری اکٹھی کر لی تھی۔ ہم نے ایک دوسرے کو صفحے پڑھ کر سنانے کے خوشگوار طریقے سے ڈیمن رینان کی اور دوسری کئی مزاحیہ کتابیں ختم کر ڈالیں۔ بہترین کتاب جو ہم نے اس طرح پڑھی گڈ سولجر شویک (GOOD SOLDIER SHWIEK) تھی۔ گڈ سولجر شویک غالباً جنگوں اور فوجی زندگی پر سب سے پرلطف طنز، ہر لحاظ سے دنیا کی عظیم کتابوں میں شمار کی جا سکتی ہے۔ جب ہم پڑھ نہ رہے ہوتے ہم کیمپ سے دور میلوں لمبی سیروں پر نکل جاتے یا پہاڑوں پر چڑھائی کرتے۔ کیمپ سے نیچے پتھریلی سڑک پر مارچ کرتے ہوئے اطالوی قیدی ہمارے لئے ایک مستقل تفریح کا سامان تھے۔ وہ باتیں کرتے ہوئے اپنے بازوؤں اور ہاتھوں کو مبالغہ آمیز طریق پر ہلاتے —— جھگڑتی ہوئی عورتوں کی طرح ان کی زبان کترکتر

چلتی تھی ــــ "تغیرو - لا - تغیرو - تیرو - تیرو" اطالوی بڑی باتونی اور جذباتی نسل ہیں۔ منقطع داڑھیوں والے۔ چشمے لگے اطالوی جرنیل ہمیں بڑے مضحکہ خیز لگتے۔ شفیق اور میں نے اتفاق کیا کہ اطالویوں کو جنگ میں جھونکنا سراسر زیادتی تھی۔

اسی پول کیمپ میں ہی کاؤنٹ کولا شفیق کا دوست بنا۔ کاؤنٹ کی شخصیت نے اس پر گہرا اور انمٹ نقش ڈالا۔ اس نے ایک ناول کے لئے بھی نوٹ لینے شروع کئے جس میں کاؤنٹ کولا کو مرکزی کردار ہونا تھا۔ بعض وجوہات کی بنا پر وہ ناول نہ لکھا جا سکا ــــ جب ۱۹۵۲ء میں شفیق کاؤنٹ کے وطن میں گیا تو کاؤنٹ نے اس کی میزبانی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ "برساتی" میں شفیق نے "کولا" کی فیاضی اور فراخدلی کی ایک نہایت دلآویز تصویر کھینچی ہے۔

پول کے بعد ہم اکثر ملتے رہے ہیں۔ اسے سال میں ایک مہینے کی چھٹی ملتی ہے جو وہ راولپنڈی میں بسر کرتا ہے۔ کبھی میں اسے چار پانچ دن اسے ملنے کے لئے چلا جاتا ہوں۔ ہم دونوں کے ملازمت کے بکھیڑے ان ملاقاتوں کے وقفوں کو طویل کرتے جا رہے ہیں۔ ۱۹۵۶ء میں شفیق آرمی کی طرف سے ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلینڈ گیا۔ وہ اپنے نام کے ساتھ ایک ڈگریوں کی لڑی لایا ہے جو مجھے ہمیشہ بھول جاتی ہے۔

(۲)

جب اس کی پہلی کتاب "کرنیں" چھپی تو اس کا نام ایک مزاحیہ افسانوں کے مصنف کی حیثیت سے کافی مشہور ہو چکا تھا۔ "کرنیں" ۱۹۴۱ء میں طبع ہوئی ــــ اسی سال میں اس نے ایم بی بی ایس کیا اور کمیشن لیا۔ یہ کتاب خوب بکی اور ایک سال میں ہی اس کے دوسرے ایڈیشن کے چھپنے کی نوبت آ گئی۔ "شگوفے"، "لہریں"، "مدوجزر"، "حماقتیں" اور "پچھتاوے" ایک دوسرے کے بعد ایک ایک سال کے وقفے سے شائع ہوئیں۔ ان کی شگفتگی اور تازگی نے اس کے پڑھنے والوں کو مسحور کر لیا۔ اور اس کی شہرت کو بڑھا دیا۔ بقول اس کے "ہندوستان بھر میں اس کا طوطی بولنے لگا"۔ اس کی سب کتابوں کے تین یا اس سے زیادہ ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ اس سے اس کی مقبولیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

الحمرا کی کہانیوں نے جنہیں اس نے اسکول کے زمانہ میں پڑھا تھا اسے بے حد متاثر کیا ہے۔ اور وہ ابھی تک اس کے جادو کے اثر سے (خوش قسمتی سے) نہیں نکل پایا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر کوئی اچھی خواہشیں پوری کرنے والی پری اسے اس کے لڑکپن کے زمانے کی چند گھڑیاں واپس دینے پر تیار ہو جائے تو وہ ان گھڑیوں کو چنے گا جن میں وہ الحمرا کے رومانوں کی پراسرار دنیا میں کھویا ہوتا تھا۔ ایک لکھنے والے پر اس کے بچپن اور لڑکپن کی پڑھی ہوئی کتابوں کے اثر کا اندازہ کرنا بڑا مشکل ہے۔ مگر اس میں کوئی کلام نہیں کہ ان کا اثر گہرا اور دیرپا ہوتا ہے ــــ شفیق کی سنجیدہ کہانیوں میں رومانیت اور حسن کی حس "الحمرا" کی دین ہے۔

مزاح میں اس کا استاد کینیڈین مصنف "اسٹیفن لی کاک" (STEPHEN LEACOCK) ہے۔ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ لی کاک سے پہلے پہل میں نے شفیق کا تعارف کرایا۔ میں اس بڑے مزاح نگار سے واقفیت کے لئے اپنے باپ کا زیربار احسان ہوں۔ جس کا لی کاک ایک زمانہ میں چہیتا مصنف تھا۔ اور جسے لی کاک کی کتاب "لٹریری لیپسز" (LITERARY LAPSES) کے کئی مزاحیہ مضمون ازبر یاد تھے۔ میں نے "لٹریری لیپسز" کو پڑھا اور اس قدر ہنسا کہ میں پہلے کسی کتاب کو پڑھ کر نہ ہنسا تھا۔ میں نے یہ کتاب شفیق کو دی۔ لی کاک اس کے دل کو لبھا جانے والا مزاح نگار تھا۔ اور وہ ایک "لی کاک فین" بن گیا۔ اس نے لاہور کی ساری سیکنڈ ہینڈ کتابوں کی دکانیں پروفیسر لی کاک کے دوسرے ورکس WORKS کی تلاش میں چھان ماریں۔ اور کافی "لیکاک" اکٹھا کر لیا۔ جب شفیق کسی کباڑیے کی دکان پر لی کاک کی کوئی کتاب دیکھتا تو اس کا چہرہ روشن ہو جاتا۔ اور وہ اس پر ایک طفلانہ بے تابی سے جھپٹتا۔ گویا کہ اس نے ایک سونے کی کان دریافت کر لی ہے۔

ہم دونوں لی کاک سے محبت کرنے لگے ــ وہ ہمیں ہنساتا تھا۔ اور ان دنوں قہقہے لگا کر ہنسنا ہماری زندگی کا واحد مقصد تھا۔ اگر شفیق

کے اندر اس کی طبعی ظرافت اور شوخی کا جوہر نہ ہوتا تو بیس لی کاک بھی اسے مزاح نگار نہ بنا سکتے۔ اس نے بڑی خوبی اور لطافت سے اردو نثر میں انگریزی مزاح کے مزاج کو رچایا ہے۔ جو اردو میں ایک نئی چیز تھی۔ ایک نئی وضع کو اس خوبصورتی اور شگفتگی سے فروغ دینا کہ نثر کا چہرہ نہ بگڑے، ہر کسی کا کام نہیں۔ وہ لوگ جو اسے آسان خیال کرتے ہیں ذرا اس کے رنگ میں دو صفحے تو لکھ کر دیکھیں۔ اس کے نقادوں نے اس سے انصاف کا سلوک نہیں برتا۔ اور اکثر اس کی کتابوں کی طرف ایک بزرگانہ اور سرپرستانہ انداز اختیار کیا ہے۔

ایک کتاب کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ پڑھی جا سکے اس کا پڑھنا ایک فرض نہ بن جائے ——۔ شاید یہ بھی کہ وہ پڑھنے والے کے دل کو مسرت بخشے۔ شفیق کی کتابیں اور کہانیاں اس آزمائش پر پوری اترتی ہیں۔ کوئی اس پر ایک پھیکا یا بے جان فقرہ لکھنے کا الزام نہیں دھر سکتا۔ اس کی رواں، ترل اور شگفتہ نثر ایک قدرتی پہاڑی ندی کی طرح اچھلتی اور نغمے سناتی بہتی جاتی ہے۔ اس کی انشا کی قوت پیدائشی اور طبعی ہے۔ اس کی نثر اپنے کئی معاصروں کی نثر کی طرح دھچکوں اور ہچکچاہٹوں کے ساتھ آگے نہیں بڑھتی۔ اور کہیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ اس کا قلم چلتے چلتے رک گیا ہے۔ اسے شاذ و نادر ہی صحیح لفظ یا موزوں استعارے کے لئے سوچنا پڑتا ہے۔ ایک بڑے ذہین اور سلجھے ہوئے ترقی پسند افسانہ نگار نے ایک دفعہ میرے سامنے اقرار کیا جہاں تک انشا کا تعلق ہے۔ خاص نریٹو (NARRATIVE) کا شفیق کا مقابلہ ہم میں سے بہت کم کر سکیں گے۔ اس کا ہلکا خوبصورت اسلوب جو ہر قسم کے مطلب کا بار آسانی سے اٹھا سکتا ہے، واقعی قابلِ رشک ہے۔ لیکن ...... لیکن کے بعد جو اس نے کہا اس کا مطلب یہ تھا کہ شفیق کا دماغ پوری طرح پروان نہیں چڑھا۔ اس کا سماجی شعور ناپختہ اور چھوٹا ہے۔ کہ اپنی کہانیوں میں وہ اپنے کو "گلیمرائز" (GLAMOURIZE) کرتا رہتا ہے۔ کہ وہ ڈانس ہالوں اور فاکس ٹراٹ کی "کلاؤڈ ککو لینڈ" سے باہر نکلنے سے گریزاں ہے۔ اس افسانہ نگار کا فیصلہ یہ تھا کہ شفیق ایک "بورژوا" مصنف ہے۔

ان الزامات میں سے اکثر کوتاہ نظری اور ہمدردی کی کمی پر مبنی ہیں۔ اور اس مختصر مضمون میں میں ان پر تفصیل سے بحث کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا ہم میں سے وہ جنہیں شفیق کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا ہے، جانتے ہیں کہ وہ سڑک پر کبھی کسی اپاہج یا بوڑھی مانگنے والی عورت کو کچھ دئیے بغیر نہیں گزر سکتا۔ انگلستان جاتے وقت وہ اپنے بیرے علی کے متعلق بڑا فکرمند تھا کہ اس کے پیچھے وہ بے روزگار یا اداس نہ ہو جائے۔ اور انگلستان سے وہ اسے باقاعدگی سے دل جوئی کے خطوط لکھتا رہا۔ کیا کوئی ایسے شخص کے بارے میں یہ کہے گا کہ وہ دوسروں کے لئے درد سے بیگانہ ہے!

ہم ایک ایسے لکھنے والے کے بارے میں جس کا واحد مقصد ہمیں مسرت دینا اور ہنسانا ہے، تنگ نظری سے نہیں سوچ سکتے۔ میں ہمیشہ اس شخص کا احسان مند اور شکر گزار رہوں گا جو جاتے ہوئے مجھے سڑک پر ملے اور چند شوخ، زندہ دلانہ فقروں سے میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ لے آئے۔ — یہی شگفتگی اور زندگی ہے جس نے اسے اتنے ادبی اور غیر ادبی لوگوں کا چہیتا مصنف بنا دیا ہے۔ اگلے روز کی بات ہے کہ میں نے ریل کے سفر کے دوران میں سامنے کی نشست پر ایک درشت اور متین ادھیڑ عمر کے شخص کو بڑے انہماک سے ایک کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے پایا۔ ہر چار پانچ منٹ کے بعد درشت چہرہ کے نقوش کو مسکراہٹ کی سلوٹیں نرم اور جاندار بنا دیتیں۔ اور مسرت اس کے (معمول کے طور پر) بے روح چشموں میں سے باہر دمکنے لگتی۔ مجھے یقین ہے کہ ایک دو بار اس کی ہنسی بھی نکل گئی۔ اب یہ ایک ایسا آدمی تھا۔ (غالباً کوئی متفکر وکیل یا بینک کا ہیڈ اکاؤنٹنٹ) جس کے دل پر عموماً پریشانیوں اور سنجیدگی کے تاریک روح فرسا سائے چھائے رہتے تھے۔ اور جو شاذ و نادر ہی مسکراتا تھا۔ میں بیٹھا تعجب کرتا رہا کہ وہ کون سا خوش نصیب مصنف ہے جس نے اس بجھی ہوئی راکھ میں خوشی کی چنگاری ڈال دی ہے۔ میں اس مصنف پر رشک کرنے لگا — ایک اسٹیشن پر جب وہ آدمی تھوڑی دیر کے لئے کوئی چیز لینے کی خاطر اٹھا تو میں نے فوراً سیٹ پر پڑی ہوئی کتاب کو اٹھا کر دیکھا۔ یہ سنٹ یونیفارم ایڈیشن میں "شفیق الرحمٰن کی حماقتیں" تھیں۔

شفیق سہل نویس نہیں ہے، جیسا کہ اس کی نثر کی بے ساختہ روانی سے کئی ایک کو گمان ہوگا۔ اس نے آج تک کوئی چیز قلم برداشتہ یا

ایک نشست میں نہیں لکھی۔ جب کسی چیز یا کہانی کے جراثیم اس کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں تو وہ اس پر اچھی طرح سوچتا ہے۔ اپنے دوستوں سے مشوروں کی خاطر اس پر بحث کرتا ہے۔ اپنی کاپی بک کے بیسیوں صفحے کرداروں کے سکیچوں اور پلاٹ کے ارتقا کے مختلف ممکنات سے سیاہ کر ڈالتا ہے۔ کئی کئی ہفتے وہ ایک بھینس کی طرح اس "آئیڈیا" کی جگالی کرتا رہتا ہے۔ اور جب تک اسے پورا اطمینان نہیں ہو جاتا وہ اصل کہانی کا لکھنا شروع نہیں کرتا ——— "پچھتاوے" اور "مد و جزر" کی اکثر کہانیاں دو تین مہینے کی مسلسل سوچ اور محنت کا نتیجہ ہیں۔

اکثر وہ ایک کہانی کو دوبارہ اور سہ بارہ لکھے گا۔ اور اسے اشاعت کے لئے اس وقت تک نہ بھیجے گا۔ جب تک اس کا "فنکارانہ ضمیر (ARTISTIC CONCIENSE) اسے یہ نہیں کہے گا "اسے اشاعت کے لئے بھیج دو۔ یہ اچھی چیز ہے۔" وہ ایک بے حد دیانت دار فنکار ہے۔ وہ اپنے پڑھنے والوں کو سونے کے بدلے پیتل دے کر دھوکا نہیں دیتا۔

کیا وہ شہرت کا بھوکا ہے؛ رسالوں اور کتابوں میں اس کے نت نئے فوٹو گراف چھپتے ہیں۔ اور کیور کے الفاظ میں "وہ اپنی ہر نئی تصویر میں اپنی پچھلی تصویر سے جوان نظر آتا ہے۔ اس سے کئی لوگوں کو خیال ہو گیا ہے کہ وہ باغ میں ایک مور کی طرح شیخی خورہ ہے۔ اور اپنی ذات سے محبت کرتا ہے، یہ درست نہیں۔ پیٹر پین (PETER PAN) کی مانند دراصل وہ ایک لڑکا ہے جو بڑا نہیں ہوا اسے جینے کے عمل سے ——— اور نمائشیت سے جو اس کا لازمہ ہے، محبت ہے۔ سب سے اچھی بات جو اس کی زندگی میں ہوئی اس کی پیدائش تھی ——— اس عجیب اور خوبصورت کرّے پر اس کا ورود۔ وہ ابھی تک اس معجزے پر مغرور اور حیران ہے۔ اس کے فوٹو گراف اس کی "جینے کے عمل" سے محبت کے آئینہ دار ہیں۔

اور وہ شہرت کا بھوکا کیوں ہو؟ شہرت اور مقبولیت اسے ایک بڑی کم عمر میں بن مانگے ہی مل گئیں۔ اس نے مشہور ہونے کے لئے وہ کمینہ اور گھٹیا حربے کبھی نہیں استعمال کئے جو کئی ناکامیاب ادیب کرتے ہیں ...... اور ایک اور طرح سے دیکھا جائے تو شہرت یا نمائشیت کی خواہش ایک بالکل قدرتی اور فطرتی خواہش ہے۔ پچھلے دنوں اسی رسالہ میں مجھے حضرت فراقؔ گورکھپوری کے ان دلآویز خطوط پڑھنے کا اتفاق ہوا جو انہوں نے وقتاً فوقتاً ایڈیٹر "نقوش" کو لکھے تھے۔ فراقؔ اردو ادب میں ایک بڑی اور محترم ہستی ہیں۔ اور وہ خطوط بڑے خیال افروز اور اعلیٰ ذہنی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ لیکن ان "پرائیویٹ" خطوط کو پڑھتے ہوئے اس خیال سے بچنا ناممکن ہے کہ وہ اشاعت اور آیندہ نسلوں کو مد نظر رکھ کر لکھے گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ریکگنیشن (RECOGNITION) کے لئے تڑپ رہے ہیں۔ یہ انسانی کمزوری فراقؔ کی شخصیت کو میری نظر میں زیادہ محبوب بنا دیتی ہے۔ پھر بھی پڑھنے والے کو اس خواہش میں ایک مریضانہ گھٹن کا احساس ہوتا ہے ——— جیسے لکھنے والا خود رحمی کا شکار ہو رہا ہے۔

شفیق کی "نمائشیت" میں اس مریضانہ گھٹن کا دخل نہیں۔ وہ سٹیج پر محض اس لئے چمکیلے پردوں اور کلغیوں میں سج سجا کر اٹھلاتا ہوا آتا ہے کہ "سٹیج" پر ہونا اس کے لئے بڑا پر لطف ہے۔ "اچھے لوگو تالیاں بجاؤ" وہ کہتا ہوا معلوم ہوتا ہے "میں شفیق الرحمٰن ہوں اور تمہیں ہنسانے آیا ہوں"۔ اور اگر کوئی تالی نہیں بجاتا تو اس کو صدمہ پہنچتا ہے لیکن وہ اس شخص سے کوئی میل نہیں رکھتا۔

شفیق قہقہے تو ہر وقت لگاتا رہتا ہے۔ مگر میری رائے میں اس کے خمیر میں ایک بنیادی یاسیت ہے۔ ایک بڑی گہری یاسیت۔

اس کی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ اسے زندگی سے بے حد محبت ہے ——— زندگی جس میں چمکتا ہوا سورج ہے۔ نغمہ ریز جھرنے ہیں۔ حسین آنکھوں والی لڑکیاں ہیں۔ سنہری کاغذوں والے چاکلیٹ ہیں۔ اسے اس پر رنگ میلے سے محبت ہے۔ اور بیشتر وقت اسے چیزوں اور لوگوں کی وقتی اور عارضی نوعیت کا احساس رہتا ہے۔ یہ دو دن کا تماشا ہے۔ گزرا ہوا لمحہ پھر نہ آئے گا۔ میں یہ شفیق پھر نہ دیکھ سکوں گا۔ یہ لڑکی مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائے گی ...... زندگی کی گھڑی کی ریت گرتی ——— گرتی جاتی ہے اور ایک وقت، کسی وقت اسے اس سٹیج سے یک لخت رخصت ہونا پڑے گا۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بزدل ہے یا موت سے ڈرتا ہے ——— سر والٹر سکاٹ کے داماد، دوست اور سوانح نگار لاک ہارٹ (LOCK HART) نے ناولسٹ کی لائف میں لکھا ہے کہ جب سر والٹر کو یقین ہو گیا کہ اس کا آخری لمحہ اب دور نہیں ہے۔ اور وہ مرنے لگا

ہے تو اس کا چہرہ دہشت سے پیلا پڑ گیا۔ اور وہ ایک بچے کی طرح رو پڑا —— سر والٹر بزدل نہیں تھا اور موت سے خائف نہ تھا آنسو زندگی سے رخصت ہونے کے لئے تھے۔ وہ رویا کیونکہ اُسے پتہ لگ گیا کہ کل سورج اس کے لئے نہیں ابھرے گا، نہ بلبلیں پھر کبھی بن کی حسین جھیلوں سے ڈھنپی ہوئی پہاڑیوں کو اپنی گنجار سے نغمہ ریز کریں گی۔

اسی لئے یہ تضاد ہے کہ یہ کامیڈین ایک ٹریجیڈین بھی ہے، اس کے افسانوں کے دو مجموعوں "پچھتاوے" اور "مد و جزر" میں اس کی یہ یاسیت ایک اندوہناک چیخ بن جاتی ہے "پچھتاوے" کے "افسانے" ایک دبی ہوئی جدت اور ایک نادر لطافت سے لکھے ہوئے ہیں اور انہیں ابھی آدھی تعریف بھی نہیں ملی جس کے وہ حقدار ہیں۔

"مد و جزر" "پچھتاوے" سے پہلے آئی اور اسی لئے "پچھتاوے" میں جو پختگی اور مشاہدہ ہے وہ "مد و جزر" میں نہیں ملتا، "مد و جزر" کی بیشتر کہانیوں میں ایک یکسانیت ہے، اور اس کی کہانیاں ایک ہی "تھیم" پر مختلف "ویری ایشنز" (VARIATION) ہیں۔ یہ کتاب اس زمانہ میں لکھی گئی ہے جب شفیق اپنی سب سے پہلی محبت کی میٹھی تلخیاں برداشت کر رہا تھا۔ بچپن کی سنہری دنیا اور بلوغت کے شروع کی گلابی محبت (جسے انگریزی میں بچھڑے کی محبت یا گرین سک نیس (GREEN SICKNESS) کہتے ہیں) کی تصویریں سارے اردو ادب میں اس سچائی اور لطافت سے شاید ہی کسی اور نے پیش کی ہونگی اس کی یہ دو کتابیں (اور ان میں وہ شاہکار ناولٹ "برساتی" بھی شامل کر لیجئے) کئی لحاظ سے اس کی اپنی آپ بیتیاں ہیں۔ اس کی ساری شخصیت اس کی ان کتابوں میں ہے۔ یہ سب صیغہ واحد متکلم میں لکھی ہوئی ہیں۔ اور ان کا ہیرو خود شفیق الرحمن ہے۔ ان کتابوں کے پڑھنے کے بعد ایک شخص اس کی شخصیت، اس کے خیالات، اس کے انداز گفتگو سے پوری طرح واقف ہو سکتا ہے "برساتی" پڑھیے آپ کو معلوم ہو جائے گا، کہ شفیق لنچ نہیں کھاتا، کرکٹ و باکسنگ کا شوقین ہے دوستوں میں بڑا مقبول ہے، ایک چنچل اپریل کی طرح ہنستا رہتا ہے "بور" نہیں ہوا۔ یہ "بور" نہ ہونا ہی میری نظر میں بذاتِ خود ایک "اچیومنٹ" ہے۔

لیکن یہ ایک مزاح نگار اور پیروڈسٹ کی حیثیت میں ہے کہ اس کی انفرادیت سب سے نمایاں ہے۔ مزاح میں جدید نسل میں اس کا کوئی رقیب نہیں —— کپور کے استثنا کے ساتھ، مگر یہ کپور ایک مزاح نگار سے زیادہ ایک طنز نگار ہے ایک طنز نگار کی حیثیت سے شفیق اتنا کامیاب نہیں اس کی تحریر میں وہ کٹیلا پن وہ پرکینہ شرارت نہیں آسکتی جس کیلئے بیکار ہاضمہ کا ہونا ضروری ہے۔ شفیق کا ہاضمہ بالکل درست ہے کیونکہ وہ "لنچ" نہیں کھاتا۔

شفیق کے کتابی "رومانس" اسکے دوستوں میں ایک مذاق بن چکے ہیں، وہ متعدد اور دلچسپ ہیں۔ وہ ایک مستقل عاشق ہے جو اپنی کہانیوں میں اپنے محبوبوں کی شکلوں، گیسوؤں، ابروؤں، آنکھوں کے رنگوں اور قد و قامت کی موزونیت کو اسی کثرت سے بدلتا رہتا ہے، جس طرح لوگ اپنی قمیضیں یا اپنے ہیٹ بدلتے ہیں۔

اس نے اپنی ایک پیروڈی "قصہ حاتم طائی" میں بہت سی سرگذشتوں کے درمیان حاتم طائی کی ذہنی کیفیتوں کا نقشہ کھینچا ہے

وہ اسکے حسبِ حال ہے۔ اس میں ایک مقام پر حاتم طائی کو ایک حور شمائل نازنین دکھائی دیتی ہے۔ وہ والہانہ اس کا عاشقِ زار ہو کر اس کی سمت چل پڑتا ہے۔ رستے میں راہ میں اسے ایک اور مہوش دلربا حسینہ نظر آتی ہے۔ وہ فوراً پہلی کو چھوڑ کر دوسری کے پیچھے ہو لیتا ہے۔ راستے میں اسے ایک تیسری عشوہ طراز جاتی ہوئی ملتی ہے۔ حاتم طائی فوراً اس پر ہزار جان سے عاشق ہو جاتا ہے اور عشقِ صادق کا دم بھرنے لگتا ہے۔

لیکن میں اسکی کہانی "وسعت" کی روشنی میں ایک ایسا رومانس دیکھتا ہوں جو اس کی زندگی سے میرے خیال میں قریب ہے۔ جب وہ کالج میں تھرڈ ایر کا طالب علم تھا اس نے کسی شادی کی تقریب میں (یا شاید سینما میں) مس ج ——— کو پہلی بار دیکھا تھا۔ مس ج ——— اس وقت اس عمر میں تھی جسے انگریزی میں میٹھے چودہ (SWEET FOURTEEN) کہا گیا ہے۔ ج ——— کشیدہ قامت، سپید اور معصوم تھی۔ اس کا بالوں کو گوندھنے کا سٹائل ہوش رُبا تھا۔ اس کی آنکھیں گرما کے آسمان کی طرح نیلی تھیں۔ بہر حال شفیق کی رائے تھی کہ وہ نیلی ہیں۔

میرا خیال ہے کہ ج ——— سے اسکی محبت بڑی طویل اور صبر آزما تھی، جو اس کے متعدد افسانوں میں سے جھانکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ متعدد وقفوں اور انٹرپشنز (INTERUPTION) کو چھوڑ کر یہ محبت آٹھ نو برس تک چلتی ہوئی نظر آتی ہے لیکن غالباً ج ——— شفیق سے زیادہ اپنی پینٹنگ اور تصویر کشی کے مشاغل کو چاہتی تھی۔ شفیق کو اس سنگ دل محبوبہ سے وہ پیار و محبت کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ ج ——— نے غالباً غیروں سے کہا اور غیروں سے سُنا لیکن اپنوں یعنی شفیق سے نہ کبھی کہا نہ سنا۔ محبوب کی اس بے اعتنائی نے شفیق کو اسے رام کرنے کے لئے اور زیادہ بے صبر اور شدید بنا دیا۔ اس افسانوی رومانس کا ذکر میں اس لئے کر رہا ہوں کہ اسکی آگ بہت سی کہانیوں میں پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔ میں اس زمانے میں لاہور سے باہر تھا، اور لاہور کی خبریں کبھی کبھار ہی مجھ تک پہنچتی تھیں۔ اس دور کے اکثر واقعات کو میں نے شفیق کے افسانوں سے مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے افسانے "نفرت" "سرخ پھول" وغیرہ جو "مدوجزر" میں شامل ہیں، میرے اس حسنِ ظن کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ میں نے شفیق سے اپنی تائید کے لئے تصدیق چاہی لیکن اس کی خیالی دنیا کے کردار حقیقی کرداروں سے اس قدر گڈمڈ ہیں کہ وہ ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کر سکتا۔

"مدوجزر" غالباً ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ج ——— افیئر اپنے پورے عروج پر تھا لیکن شفیق ملازمت کے سلسلے میں لاہور سے باہر جا چکا تھا اور اس کے نئے افسانے "ناگ" "یوسف" وغیرہ کے غماز ہونے لگے۔ جب میں ۱۹۴۸ء میں انگلستان سے واپس آیا تو "حماقتیں" چھپ چکی تھی۔ اس مجموعے کے افسانے "نائٹ آؤٹ" اور "شیطان" "عینک اور موسم بہار" سے مجھے اندازہ ہوا کہ ج ——— ابھی تک اس کے ذہن پر مسلط ہے اس کے دل میں جاگزیں اور وہ اسے بھولنے کے لئے تیار نہیں اور پھر میری ملاقات شفیق سے ہوئی میں اب اس کے روبرو ہو گیا، میں نے ج ——— کے سلسلے میں تحقیقات شروع کیں۔ تمام افسانوں کا حوالہ دے کر میں نے اسے مجبور کیا کہ وہ اس

محبوبہ ہزاروں سال کا انتہ پتہ تیا ہے، لیکن وہ بدستور قہقہے لگاتا رہا۔ اور نا چار مجھے محسوس کرنا پڑا کہ آج بھی اس کے خوابوں کی وہ ملکہ ہے جس کا وجود کالعدم ہے۔ اٹھارہ بیس دوشیزاؤں کے محاسن کا گلدستہ خیالی محبوبہ جو وجود کی سرحدوں تک پہنچ کر دم توڑ دیتی ہے۔

سیاحت نامہ نادر شاہ افغانی میں نادر شاہ صاحب کے فلسفۂ شادی و محبت سے متدرجۂ ذیل پُر لطف اقتباس پڑھنے کے بعد یہ اندازہ بخوبی لگایا جا سکے گا کہ وہ کیوں اتنی جلدی کسی حسینہ سے مل کر متھیار نہیں ڈال دیتا۔ اور آج تک شادی کی زنجیروں میں جکڑا نہیں جا سکا۔

"ہمارا فلسفہ شادی و محبت"۔ ہمارے خیال میں اگر محبت کو شادی سے
اور شادی کو محبت سے دور رکھا جائے تو دونوں نہایت مفید چیزیں
ہیں لیکن نوجوان نہایت جلد بازی سے کام لیتے ہیں، دوسرے کے
تجربے سے مستفیض نہیں ہوتے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خواہ مخواہ شادی
مول لے بیٹھتے ہیں۔
اکثر مشاہدے میں آیا ہے کہ جو لوگ شادی سے پہلے پچھتاتے تھے
وہ شادی کے بعد بھی پچھتاتے ہیں، ہم کبھی نہیں پچھتائے، حالانکہ کسی زمانے
میں بڑے بانکے البیلے نوجوان مشہور تھے۔"

چند سال ہوئے سننے میں آیا کہ شفیق کئی غیر شادی شدہ لڑکیوں کی ماؤں کا منظورِ نظر رہا ———۔ آٹھ نو سو روپے تنخواہ پانے والا صحت مند سمارٹ اور خندہ جبیں فوجی ڈاکٹر جو اتنی اچھی کتابیں لکھتا تھا، انہیں اپنی لڑکیوں کے لئے آئیڈیل شوہر دکھائی دیتا۔ اس کے پاس ایک چھوٹی اطالوی "ناپا لیبنو" گاڑی بھی تھی۔

اس کے رومانس اس کی ذہنی صحت مندی اور اُبلتے ہوئے ولولے کی OUTLET ہیں، شادی سے یہ دائمی کنوارا سخت خائف ہے، انگلستان سے واپسی کے بعد یا تو اس میں متانت اور سنجیدگی آگئی ہے اور یا وہ اپنے "رومانس" کے متعلق کم سخن ہو گیا ہے۔ اس کا آجکل کا کوئی "رومان" سننے میں نہیں آتا۔ ایک امکان بھی ہے کہ اس محبت کرنے والے شخص نے آخر اپنے ساتھی کا انتخاب کر لیا ہو۔ اس نے اتنے لوگوں کو مسرت دی ہے، وہ مسرت اور اطمانیت کا سب سے زیادہ حقدار ہے۔

یہ میرا دوست شفیق الرحمٰن ہے۔

اس کے چہرے پر علم اور محبت کی جوت ہے، اس کی متنوع رنگا رنگ کی معلومات، اس کا بات کرنے کا شگفتہ اور دلچسپ انداز، اس کی انسانیت ———— یہ سب صفات اسے ایک بڑا پُر لطف ساتھی اور دوست بناتی

ہیں ڈرائنگ روم میں یا باہر کھلی سڑک پر اسکی باتیں ایک ساسحر ڈالتی اور مردہ ترین سے مردہ ترین دل میں بہار سے آتی ہیں۔

اکثر ادبی مزاج کے لوگوں کو سفید بالوں اور ایک اعصابی بے سکونی کی شکل میں عملی زندگی میں داخل ہونے کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اسے یہ قیمت ادا نہیں کرنا پڑی، کیونکہ اُس نے ادب کے فن کے ساتھ زندہ رہنے کے فن سے غفلت نہیں برتی۔ لکھنا اس کے لئے خون اور پسینہ بہانا نہیں، بلکہ زندہ رہنے کی مانند ایک دلچسپ اور پُر لطف شغل ہے

میرے ایک ترقی پسند دوست کا اعتراض کہ شفیق طبقاتی شعور سے بیگانہ ہے، شاید درست ہو۔ ایک اچھا ایماندارانہ دل اور تندرست جسم طبقاتی شعور سے زیادہ ضروری چیزیں ہیں، یہ ممکن ہے کہ ایک آدمی میں بڑا گہرا طبقاتی شعور ہو اور جذباتی اور روحانی طور پر وہ اتنا بے حس ہو جتنا ایک پتھر کا ٹکڑا ...... مجھے یہ تمنا ضرور ہے کہ شفیق بھی کالو بھنگی یا اپنے بیرے علی کے متعلق کوئی افسانہ لکھے اور ڈرائنگ روم اور ڈانس ہال کی گھونٹ دینے والی فضا سے باہر زندگی کے کوچوں میں نکل آئے۔ جب وہ ایزنگ سوٹ "ڈمیوں" کی بجائے ان عام آدمیوں کے بارے میں لکھے گا جو جرنیلوں اور بادشاہوں سے کہیں زیادہ اہم اور عظیم ہیں۔ تو اس کے قلم میں ایک نئی توانائی اور جولانی آجائے گی، فن کار کے لئے سب سے بڑا خطرہ اس کا ذریعہ معاش ہوتا ہے۔ روٹی تو اسے بہر طور کمانا ہی ہے، مگر اُسے چوکس رہنا چاہیئے۔ کہ کہیں وہ اپنے پیشے کے ماحول میں ڈھل کر رہ جائے، یہ فن کار کی موت ہے۔ اور ایک سچا فنکار ہمیشہ سوسائٹی کی قبول شدہ قدروں اور معیاروں کے خلاف برسرپیکار رہتا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ضرور لمبے بال ہی رکھے اور کلب میں چادر پہن کر جا بیٹھے، بلکہ یہ کہ اسے یہ احساس رہنا چاہیئے کہ دنیا کی عزت اور آداب محفل کے Notions ضروری طور پر صحیح نہیں، ...... شفیق سے مجھے اکثر یہ شکایت رہی ہے کہ اپنی تحریروں اور افسانوں میں وہ اخلاق کے معاملے میں ایک بوڑھی کنواری جیسی کا رویہ رکھتا ہے وہ احتیاط برتتا ہے کہ اس کے قلم سے کوئی ایسا خیال نہ ادا ہو جائے جو بستر میں پڑھتی ہوئی سکول کی لڑکی کے چہرے کو شرم سے لال کر دے۔ اسے شریف لوگوں کی طبائع سلیم کا بڑا خیال رہتا ہے، اس سے اس کی تحریروں میں دودھ اور شوربہ کا اثر آجاتا ہے۔ ہم اپنے ادب کو داڈ کا کی طرح تیز اور چڑھ جانے والا پسند کرتے ہیں۔

یہ میری تمنائیں اور شکایتیں ہیں۔ 'برساتی' میں اس نے انشاء کی بڑی قوت کا ثبوت دیا ہے میں اس قوت کو کسی عظیم تر مقصد کے لئے استعمال دیکھنا چاہتا ہوں ———

تسنیم سلیم چھتاری

سلمیٰ خورشید منیر

لوگ مجھے کتنا ہی کم عقل سمجھتے ہوں اپنے بارے میں میری یہ رائے کبھی نہیں رہی مگر آج تسنیم پر مضمون لکھ کر میں نے اپنی حماقت کو حق بجانب ثابت کر دیا۔ تسنیم کے بارے میں مجھے بے شمار "خوش فہمیاں" رہی ہیں، جن میں ایک یہ بھی تھی کہ وہ مجھ سے بے حد مرعوب ہیں۔ ان کی پہلی کتاب "کسک" شائع ہوئی اور اس کی ایک جلد مجھ تک پہنچی تو پہلا صفحہ میں نے بڑے اعتماد سے یہ سوچ کر کھولا کہ انتساب یقیناً میرے نام ہوگا ——— لیکن، توبہ کیجئے تسنیم میں اتنی وضعداری کہاں۔ میں نے اپنے دل کو یہ سمجھا کر بہلا لیا کہ "پہلی حقیر کوششوں کا نتیجہ" آخر وہ میرے نام کس طرح معنون کر سکتی تھیں جبکہ انہیں میرے "ادبی ذوق" کے بارے میں "کافی علم" ہے۔ لیکن جب ان کا دوسرا افسانوں کا مجموعہ "رقصِ شرر" کے بعد موصول ہوا تو ——— یقین آگیا کہ تسنیم کا فن ہنوز تجربہ کے دور سے گذر رہا ہے ——— اور جونہی انہیں خود پر بھروسہ ہوا ——— ظاہر ہے ——— عقلمند کو اشارہ کافی ہے۔

تسنیم کے اوپر مضمون لکھنے میں ایک بڑی دشواری یہ درپیش ہے کہ وہ خود بھی یہ مضمون پڑھیں گی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میرے لئے بڑی سہولت ہو جاتی۔ مضمون محض پڑھ لینا ہی ہوتا تو بھی زیادہ مضائقہ نہیں تھا۔ ستم تو یہ ہے کہ وہ اسے ہنس ہنس کر، لطف لے لے کر اور اپنے چبھتے ہوئے جملوں کے اضافے کے ساتھ پڑھیں گی ——— یقین نہ آئے تو خود تسنیم ہی سے پوچھ لیجئے ——— وہ ایسا ضرور کریں گی۔

تسنیم اور میری "دوستی" (کاش ہم دونوں کو اس کا یقین ہوتا) کی ابتدا ہماری دوستی کی انتہا کی طرح نامعلوم ہے۔ یعنی کچھ ٹھیک طرح یاد نہیں کہ کب اور کس طرح یہ حادثہ پیش آیا تھا ——— کہتے ہیں کہ محبت پہلی جھلک میں اپنا رنگ جما لیتی ہے اور ہماری پہلی ملاقات، جہاں تک مجھے اس کی دھندلی سی یاد ہے دونوں کے لئے سخت باعثِ کوفت ثابت ہوئی تھی اور حال ہی میں دونوں نے اس باہمی نازک خیالی کا اعتراف بھی کر لیا۔ میں نے انہیں دیکھ کر سوچا تھا "بنتی بہت ہیں امارت کا زعم شدید ہے" تسنیم نے اس ناچیز کے بارے میں بیان دیا "کس بلا کی ناک چڑھی ہیں" میرا خیال تو بہت جلد غلط فہمی میں تبدیل ہو گیا۔ تسنیم کی رائے البتہ "زبان زدِ خاص و عام" ہوئی۔

دھیرے دھیرے جب ملاقاتیں جلدی جلدی ہونے لگیں تو ہم دونوں نادانستہ طور پر ایک دوسرے سے "مانوس" ہوتے گئے تعلقات استوار کرنے کے لئے میں نے طے کیا کہ اپنے گڈے کی شادی تسنیم کی گڑیا سے کر دوں تسنیم کو یہ تجویز بہت پسند آئی۔ بہت جی لگا کر ہم دونوں نے

شادی کا انتظام شروع کر دیا۔ دو چار ہی دن میں ہم دونوں تو اس ہنگامے سے اُکتا گئے اور اپنے "روزمرہ" میں مبتلا ہو گئے اور ہمارے بزرگوں کو یہ کارِ خیر انجام دینا پڑا۔ تقریب بہت دھوم دھام سے ہوئی اور گو بائیسے جہیز میں بیشتر ایسی چیزیں ملیں کہ اگر ہیں ذرا بھی دور اندیشی سے کام لیتی تو یقیناً میرے جہیز میں بھی کام آ سکتی تھیں مگر اس وقت اپنے بارے میں قطعاً وثوق سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ یہ مصیبت ابھی کوئی مول لے گا۔

اس زمانے میں ہمیں پکچرز دیکھنا، ناول پڑھنا، لڑنا جھگڑنا، اور چاندنی راتوں میں راحت منزل (علی گڑھ) میں نواب صاحب چھتاری کی کوٹھی کے وسیع اور شاداب لان پر رات گئے تک گھومنا بہت مرغوب تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ہماری "امائیں" ہمارے مستقبل سے قطعی مایوس تھیں اور ہمارے پھوہڑپن اور بدسلیقگی کے تذکرے اکثر گھروں کی چہار دیواری میں پہنچا کرتے مگر ہم "بڑے آدمیوں" کی طرح چھوٹی چھوٹی باتوں کی پروا نہیں کرتے تھے اور خود کو حجاب امتیاز علی کے افسانوی ماحول کی ہیروئن سمجھنا چاہتے تھے مگر مشکل یہ تھی کہ راحت منزل میں عرب شہ نشین، فرانسیسی دریچے، جبشن زوناش اور ڈاکٹر گار ڈھونڈھے سے بھی نہ ملتے اور ہمیں مجبوراً یہ خواہش ترک کرنا پڑتی۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس قدر ساتھ ساتھ رہنے اور ایک دوسرے سے انتہائی وابستگی کے باوجود ہم ایک دوسرے کی کوئی بات ماننے پر تیار نہیں ہوتے تھے نہ کسی فیصلہ پر متفق ہوتے۔ ہر وقت ایک نامعلوم ذہنی کھچاؤ قائم رہتا جس میں ایک دوسرے پر چھینٹے اڑانے میں بڑا لطف آتا۔ اگر کوئی شعر تسنیم کو پسند آتا تو یقیناً مجھے اس شاعر تک سے چڑ ہو جاتی۔ مجھے کوئی کہانی پسند آتی تو کوئی وجہ نہ ہوتی کہ تسنیم کو اس افسانہ نگار کے نام تک سے کوفت نہ ہو جاتی ہو۔ میں کرشن چندر کی بڑی مداح تھی اور تسنیم محض مجھے زک دینے کے لئے کرشن کی کہانیوں سے بے رخی برتتیں۔ تسنیم احمد ندیم قاسمی کی طرزِ تحریر کی بڑی قائل تھیں۔ انتقاماً میں نے قاسمی کی کہانیاں ہی پڑھنا چھوڑ دیں۔ اگر کوئی پوچھ بیٹھے کہ اپنی ان حماقتوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کو ہم نے ان عظیم فن کاروں کا انتخاب کیوں کیا تھا تو یقیناً ہم دونوں کے پاس اس بارے میں کوئی جواب نہ ہوگا۔

تسنیم کی شادی بہت کم عمری میں ان کے ماموں زاد بھائی سلیم سے کر دی گئی تھی۔ مگر تسنیم نے شادی شدہ ہونے کو بہت کم اہمیت دے رکھی تھی۔ اس وقت تو مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا تھا کہ یوں ہی ہونا بھی چاہئے۔ کیونکہ شادی تو 'شادی' ہے ہی، جو ہونے ہی کے لئے ہوتی ہے۔ پھر اس کا ذکر کیا۔ البتہ دوستوں سے ملنا جلنا، سنیما دیکھنا، مشاعرے سننا، نمائش گھومنا اور ٹھاٹھ سے پڑا رہنا، "شادی" سے کہیں زیادہ ضروری اور برتر ہیں۔ اس سلسلہ میں سلیم کا رول بہت ہی دلچسپ تھا۔ اس شخص نے کبھی کہیں اور کسی لمحے بھی ہمیں یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ تسنیم کے اوپر کچھ حقوق وہ بھی رکھتے ہیں۔ ہماری مشغولیتوں، دلچسپیوں، اور نت نئے پروگراموں کے درمیان کبھی کوئی رکاوٹ نہ ڈالی۔ اگر یہ شادی محض بزرگوں کے کئے ہوئے فیصلے کے مطابق ہوتی جب بھی کچھ صبر آ جاتا مگر تسنیم اور سلیم کی شادی میں سلیم کے والہانہ شوق اور وابستگی کو بھی دخل تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود سلیم نے کبھی تسنیم پر کسی قسم کی پابندی نہیں عائد کی۔ بلکہ ان کے ہر شوق، پروگرام اور فیصلہ پر ہمیشہ صاد کیا اور تسنیم باوجود بالعوض سکہ رائج الوقت قسم کی نہ بیوی اور سسرال کی بہت ہی "مستند سی بہو" ہونے کے بڑے اطمینان سے تتلی کی طرح ادھر سے ادھر ہوا کے رخ پر تیرتی رہتیں۔ شوہر سے ملاقات کا تذکرہ یوں ہوتا گویا کسی اچھی فلم کی آمد یا کسی پسندیدہ کتاب کا ذکر ہو۔ اسی دوران میں اکثر اپنی سسرال "طالب نگر" بھی جانا پڑ جاتا تو لگتا جیسے پک نک پر جا رہی ہوں۔ زندگی قطعاً "رس بھرے نوالوں کا ہجوم" تھی — طالب نگر میں کچھ عرصہ قیام کرنا ناگزیر ہو جاتا تو وہاں بیٹھے بیٹھے ڈرامے لکھا کرتیں۔ پھر سلیم سے فرمائش ہوتی کہ اس کو اسٹیج کیا جائے۔ ایک ڈرامہ "روپ متی باز بہادر" دیکھنے کا اتفاق مجھے بھی ہوا۔ اس میں باز بہادر کا کردار سلیم ہی نے پیش کیا اور سچ تو یہ ہے کہ بہت کامیابی سے پیش کیا۔ اسٹیج کی سج دھج، پنڈال کے جگمگاتے ہوئے قمقمے زریں و بیش قیمت ملبوسات اور اداکاری کا معیار سب کچھ ہی دلفریب رہا۔ سب کچھ سلیم اور ان کے دوسرے ساتھی کرتے رہے اور تسنیم پورے وقت بڑے اعتماد، فخر، پیار، چاؤ اور ٹھہراؤ سے اسٹیج پر نظریں گاڑے رہیں۔ گویا اپنی مخلوق کو پھولتے پھلتے دیکھ کر مسرور و مطمئن ہیں۔

لکھنے کا شوق تسنیم کو بہت بچپن سے ہے۔ ان کے بیان کے مطابق وہ "تختی پر بھی کہانی" لکھا کرتی تھیں۔ میں نے ان کی سب سے پہلی کہانی [illegible]

خود انہی کی زبانی چھتاری میں سُنی تھی۔ قصہ تو اب یاد نہیں البتہ وہ ماحول اور وہ فضا اب تک نہیں بھول سکی جو اس وقت چھتاری میں تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اُتر پردیش میں زمینداری کو فروغ حاصل تھا۔ چھتاری کے وہ وسیع اور دور دور تک پھیلے ہوئے کھیت جن میں سرسوں کے پھول اپنی تمام شادابی اور رنگینی سے کھِلے ہوتے تھے اور گوبھی کے بیج، اور معصوم سے پھول اور پر تکتے ہوئے کتنے بھلے لگتے تھے۔ قلعہ کی وہ باوقار سی فصیل، وہ بہت دور سے نظر آنے والے میناروں کی بُرجیاں، وہ تنہا کھجور کا درخت کس قدر پُراسرار نظر آتا جو پختہ فصیل پر نہ جانے کس طرح اُگ آیا تھا اور یوں پروان چڑھ رہا تھا۔ وہ خوبصورت عمارت جو "باغ کوٹھی" کے نام سے موسوم تھی جس میں شادی بیاہ کے موقع پر نئی دلہن کو قلعہ میں لانے سے پہلے اتار کر سنوارا جاتا تھا، وہ طویل قدیم اور مضبوط پھاٹک، وسیع صحن، کشادہ دالان اور در دالان جس میں پرانے پرانے جھاڑ فانوس، قدیم خاندانی تصاویر، ایرانی قالین اور پرانا بھاری بھرکم فرنیچر کسی مستند تہذیب اور قدیم مشرقی روایات کے نقوش بکھیرتے ہوئے ——— مجھے وہ چھتاری ہمیشہ یاد رہے گا۔

تسنیم کو میں نے کہانی پڑھتے ہی نہیں کہانی لکھتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ اور مجھے حیرت ہوتی ہے جب میں سوچتی ہوں کہ کس طرح وہ اکثر ایک ہی نشست میں اپنی کہانی مکمل کر لیتی ہیں۔ یہی نہیں لکھنے کے دوران میں سب کی باتوں کے جواب دیتی جاتی ہیں، پان بنا لیتی ہیں۔ لفافے پر پتہ بھی لکھ دیتی ہیں اور روزمرہ کے حساب کتاب میں بھی ترمیم و اضافہ کرتی جاتی ہیں اور پھر کہانی پڑھیے تو کس بلا کی روانی، برجستگی، حسن اور توازن ملتا ہے۔ تسنیم کی تخلیق کسی ادارہ کی محتاج نہیں رہی۔ اسی لیے ان کی شخصیت میں وہ انفرادیت، وضاحت، اور ذہنی کشادگی ملتی ہے جو کسی ادارہ سے منسوب ہونے کے بعد اکثر کچلی جاتی ہے۔ انہوں نے زندگی کی بڑی خوشگوار صبحیں اور شامیں دیکھی ہیں۔ وہ محبت، آسودگی اور فراغت کے سایے میں پلی ہیں لیکن تسنیم کے دل میں، ان کی فطرت میں، ان کی شخصیت میں جو رچاؤ ہے وہ فراغت، دولت اور خوشحالی سے نہیں پیدا ہوتا، یہ پیدا ہوتا ہے فطری معصومیت، فطرت کے مشاہدے، خیال کی ندرت اور شخصیت کے اعتماد سے!

وہ کسی حد تک جذباتی بھی ہیں۔ میں نے ان کو اکثر سخت کشمکش کے موقع پر مسکراتے دیکھا ہے اور چھوٹی سے چھوٹی معمولی بات پر بُری طرح بے انتہا ہوتے بھی دیکھا ہے۔ یہ گنگا جمنی کیفیت تسنیم کے وجود کا ایک جزو ہے۔ ان کی طبیعت میں مزاح کو بھی بڑا دخل ہے۔ تسنیم سے ملتے ہی پہلا احساس یہ ہوتا ہے کہ جلد سے جلد اپنی مدافعت میں کچھ کر لو، ورنہ تسنیم بولنے لگیں گی تو سوچا سمجھا سب دھرا رہ جائے گا۔ جملے چسپاں کرنے اور برجستہ جواب دینے میں تسنیم کو ملکہ حاصل ہے۔ مجھے ان کی خوش دلی، حاضر جوابی اور مزاح کے سلسلہ میں ایک لطیفہ اکثر یاد آتا ہے۔ سنہ ۱۹۴۶ء کے وسط میں ایک بار میں تسنیم کے ساتھ دہلی آئی، نواب صاحب چھتاری اس زمانے میں حیدرآباد کے صدر اعظم تھے اور انہی کے سیلون میں ہم نے علی گڑھ سے دہلی تک کا سفر کیا تھا۔ اور نئی دہلی کی ایک عالیشان کوٹھی کے بالائی حصے میں ہمارا قیام تھا۔ ایک رات نچلی منزل میں کسی میٹنگ کے سلسلہ میں مرحوم لیاقت علی خان صاحب، جناح صاحب اور سر اسٹیفورڈ کرپس موجود تھے اور ہم لوگ ایک روشندان میں سے ان سب کو دیکھنے کی کوشش میں آنکھیں لگائے بیٹھے تھے۔ اچانک ایک بڑا سا پتنگا ہوائی جہاز کی طرح کچھ اُڑتا، لرزتا اور بھنبھناتا ہوا ہمارے قریب آکر گرا۔ تسنیم بہت چونک کر اچھلیں، پھر سنبھل کر اُس سے مخاطب ہوئیں "ہلو نواب صاحب چھتاری!" ہم نے گھبرا کر صورت حال سمجھنا چاہی۔ ننھے سے پتنگے کے وجود کو دائیں اور بائیں دو بہت ہی لمبی سی پتلی پتلی پروں کی، نوکیلی مونچھوں نے چھپا رکھا تھا۔ چھتاری خاندان کے ساتھ مونچھوں کا جو رشتہ ہے اسے مدنظر رکھتے ہوئے اس جملے نے بہت لطف پیدا کیا۔ تسنیم حملہ کرنے میں کبھی نہیں چوکتیں، اور مجھے کوئی ایسا واقعہ یاد نہیں جب کبھی ان کے کسی جملے کی گرفت کمزور پڑی ہو یا کوئی بات کہہ کر ان کو اس کی معذرت کرنا پڑی ہو۔

تسنیم کے افسانے پڑھیے تو بے اختیار آپ کے ذہن کا گوشہ گوشہ مسکرا اٹھے گا۔ ان کی کہانیوں میں اکثر درد، اُلجھن اور سماجی مجبوریاں ملیں گی۔ ان کی بیشتر کہانیاں انہی واقعات و حالات کے گرد چکر کاٹتی ہیں۔ اور ہم سوچنے پر مجبور رہ جاتے ہیں کہ بظاہر اس قدر مطمئن زندگی میں ایسی کون سی بے رنگی ہے جس نے ان کی تحریر میں یہ رنگینی پیدا کر دی ہے۔ تسنیم کی کہانیاں "کسک"، "دور دیس کا رہنے والا"، "خبطی"، اور "نشیب و فراز" ان کے کرداروں کی

نفسیاتی اُلجھن اور ذہنی خلش کی آئینہ دار ہیں۔ "ڈاک بنگلہ"، "شجرۂ نسب"، "ٹوٹ گیا کنارہ" اور "حسنِ انتخاب" میں ان کا فن نکھرا ہوا اور نسبتاً واضح ہے۔ "وہ بو کا ہے بنگال" اپنے موضوع ہی کے نہیں، زبان، بیان، خیالات اور جذبات کے اعتبار سے بھی جامع اور مکمل ہے۔

تسنیم کے بارے میں کچھ لکھنے سے پہلے میرا پورا ارادہ یہی تھا کہ ان کی ادبی کاوشوں پر میں کسی قسم کی رائے نہ دوں گی۔ مگر میں دیکھتی ہوں کہ تسنیم ادبی میدان میں اب اس حد تک پہنچ چکی ہیں جہاں فن اور فن کار ایک ہو جاتے ہیں۔ اب اگر ہم چاہیں بھی تو تسنیم کی شخصیت کو ان کے طرزِ تحریر سے الگ نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہیں کہیں بے اختیار میں ان کے ادبی ذوق کا تذکرہ کرنے لگتی ہوں۔ ایسا کرنے میں کچھ ایسا حرج بھی نہ ہوتا بشرطیکہ میں تسنیم کے فن کے ساتھ انصاف کر سکتی!

تسنیم کی سنجیدہ اور ذمہ دار زندگی کا آغاز ہوتا ہے سلیم کی نوکری سے۔ گویا وہ دور آ پہنچا تھا جب رؤساء کے لڑکے بھی اپنی محنت کی کمائی کو آباؤ اجداد کی جائداد پر بیکار محض بن کر پڑے رہنے کے مقابلے میں ترجیح دینے لگے تھے۔ سلیم کو بارہ چکیہ (بہار) میں ایک شوگر فیکٹری میں جگہ مل گئی اور وہ فوراً ہی کام سنبھالنے روانہ ہو گئے تھے۔ مکان وغیرہ کا بندوبست ہونے پر تسنیم کو بھی وہاں جانا پڑا۔ وہ وہاں گئیں تو اپنی مخصوص بے فکری اور لاپروائی کے انداز سے! مگر ——— جب کچھ عرصہ بعد ان سے ملاقات ہوئی تو ان میں ذمہ داری کا احساس پیدا ہو چلا تھا۔ گرمی کی چھٹیاں تھیں اور جب تسنیم واپس بارہ چکیہ جانے لگیں تو مجھے بھی ساتھ لیتی گئیں۔ ان دنوں ہماری بے فکری اور لطف و تفریح کی کوئی حد ہی نہیں تھی۔ تسنیم کے گھر جا کر میں دنگ رہ گئی جب میں نے دیکھا کہ وہ باورچی کو کھانا پکانے کے بارے میں ہدایات دیتیں، دھوبی کو کپڑا جلد لانے اور بھٹی نہ چڑھانے کی تلقین کرتیں اور خود بڑی "بیبی ورتا استریوں" کی طرح سلیم کے آفس سے آنے کے وقت چائے بنا کر ان کا انتظار کرتیں۔ یہ میرے لئے سخت اچنبھا تھا۔ یہی نہیں ایک دن تو ستم ہو گیا جب باورچی کے اچانک بیمار ہو جانے کی وجہ سے بیرے کے ہاتھ کا بدمزہ کھانا کھانا پڑا۔ تو تسنیم نے طے کیا کہ سالن وہ خود پکائیں گی اور چپاتی بیرا۔ میں نے یہ صورتِ حال دیکھی تو اخلاقاً اپنی خدمات بھی پیش کر دیں۔ ہم دونوں نے طرح طرح سے خود کو بہلانا چاہا کہ ہم دونوں ہی کھانا پکانے میں ماہر ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ پکاتے نہیں ——— ایک انگیٹھی اور دوسرے لوازمات لے کر ہم کھانا پکانے بیٹھ گئے۔ سلیم بھی ہماری تسکینِ قلوب کو (گویا مصیبت میں برابر کے شریک ہیں) کرسی لے کر وہیں بیٹھ رہے۔ مسالہ دیگچی میں ڈالا جا چکا تھا کہ اچانک کسی کی یہ رائے ہوئی کہ سالن تو پکتا ہی رہتا ہے اور پھر بھی پک جائے گا اس وقت تو بیسن کی پکوڑیاں تلی جانی چاہئیں۔ والنٹیرز تو تیار ہی تھے فوراً ہم نے بیسن گھولنا شروع کر دیا۔ سلیم نے کہا "بھئی پکوڑیاں ذرا چٹپٹی ہونی چاہئیں" بس پھر کیا تھا نمک ڈالنے کا ذمہ تسنیم نے لیا اور مرچ ملانے کی خدمت میں نے اپنے سر لی۔ ہمیں رہ رہ کر یہ اندیشہ ہوتا کہ فرض میں کوتاہی نہ رہ جائے لہٰذا تھوڑے تھوڑے سے وقفے پر تسنیم نمک کی چٹکی اور میں مرچ کا چمچہ بیسن میں ڈالتے رہے ——— پہلا گھان اُترا تو سلیم مع اپنے دو مہمانوں کے، سنہری سنہری نہایت اشتہا آمیز پکوڑیوں پر لپکے ——— اور پکوڑیاں منہ میں ڈالیں! خدا کی پناہ ——— ہم دونوں گھبرا گئے ——— سلیم اور ان کے دوستوں کے چہرے ایسے ہو رہے تھے گویا کسی نے ان پر اچانک ٹیئر گیس استعمال کی ہو ——— یوں بھی ایک مہمان بھوت سے بہت خائف رہتے تھے۔ پکوڑے کھا کر انہیں اور بھی پکا یقین ہو گیا کہ یہ بھوت کی کارستانی ہے۔ جس کمرے میں ان کو ٹھہرایا گیا تھا اس کے بارے میں ہم سب نے مشہور کر رکھا تھا کہ رات کو کوئی رُوح روشندان کے ذریعے کمرے میں اُترتی ہے۔ ان بچارے مہمان کا بُرا حال تھا اور ہمارا بھی ہنستے ہنستے بُرا حال ہو گیا جب ایک دن ان صاحب کو تنہائی میں اس کمرے میں ہاتھ باندھے دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کئے نہایت عقیدت سے روشندان سے مخاطب تھے کہ "اے پاک رُوح! تو ہم پر رحم فرما۔ جب ہم تجھے نہیں ستاتے تو تو بھی ہمیں نہ ستا!" وہ پاک رُوح دراصل چوکیدار کی تھی جسے ہر رات ہم لوگ سفید چادر اوڑھا کر روشندان میں بٹھا دیا کرتے تھے۔

یہ تسنیم کے "خانہ داری" کے ابتدائی مرحلے تھے۔ اب تو وہ نہ صرف کھانے پکاتی ہیں بلکہ باغ میں سبزی اُگاتی ہیں کھیت میں گیہوں بوانی ہیں،

مویشی پالتی اور ڈیری فارم چلاتی ہیں، نمک اور مرچ بہت سوچ سمجھ کر اچار اور چٹنیوں میں ڈالتی ہیں اور پیارے پیارے سے بچوں کے لئے کپڑے سیتی ہیں، گھر کے لئے کشن پردے تیار کرتی ہیں۔ غرضیکہ سب کچھ انتہائی سلیقے سے کرتی ہیں مگر ——— ان کے ماضی کی جھلک اب بھی ان کے کہانی لکھتے وقت یا کتاب پڑھتے وقت نظر آتی ہے جس میں اب بھی وہی بے فکری، لاپروائی، زندہ دلی، شگفتگی اور حرکت ملتی ہے جس کے بغیر تسنیم کی شخصیت نامکمل ہوتی ہے!

مخلص دوستوں کے معاملے میں، میں بہت خوش قسمت واقع ہوئی ہوں۔ (دوستوں کی رائے چنداں ضروری نہیں ہے) اور جب کبھی اپنے ماضی کی طرف نظریں دوڑاتی ہوں، متعدد جانے پہچانے اور خلوص بھرے چہرے، محبت و اُنسیت سے لبریز نگاہیں اور لطف و شفقت سے بھرپور کلمات، ذہن و دماغ میں تیرنے لگتے ہیں ——— لیکن ذرا بھی غور کرتی ہوں تو اکثر تصویریں لمحے ہی بھر میں دُھندلی پرچھائیاں بن کر فضا میں تحلیل ہونے لگتی ہیں۔ ان سب کے اُوپر ایک نقش اُبھرتا چلا آتا ہے اور دوسرے ہی لمحے تسنیم کی دلآویز شخصیت، طنزیہ مسکراہٹ اور ذہین وجود ایک ٹھوس اور واضح حقیقت بن کر ذہن پر جگمگانے لگتی ہے۔ مجھے تسنیم کے ساتھ گذارے ہوئے اپنے لڑکپن کے بے شمار برسوں کی یاد کبھی کبھی یوں بھی آنے لگتی ہے جیسے اچانک کوئی عمدہ شعر یاد آ جائے، کوئی دلکش منظر نگاہوں میں تیر جائے یا کوئی حسین چہرہ ذہن پر چھا جائے یا جیسے بیمار کو بے وجہ قرار' اور ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے ——— تسنیم کے تذکرے سے وابستہ ہے گذرے ہوئے خوبصورت دنوں کی وہ جان لیوا مہک جو رُوح کی گہرائیوں میں اُتر جاتی ہے۔

پروفیسر فراق

مجتبیٰ حسین

"فراق صاحب! ۲۳ اکتوبر سنیچر کا دن گذار کے ڈیڑھ بجے رات کو اشرف علی کا انتقال ہو گیا۔
۱۶ اکتوبر کو ایک کار انہیں روندتی ہوئی گذر گئی ؎

یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا

انہیں اسپتال پہنچا دیا گیا جہاں وہ گہری بیہوشی کے عالم میں ایک ہفتے تک پڑے رہے۔ پھر ان کی سانس اکھڑ گئی اور وہ لالو کھیت (کراچی) کے قبرستان میں دفن کر دیے گئے۔"

آج جب میں فراقؔ صاحب؟ پر ذاتی قسم کا مضمون لکھ رہا ہوں تو اشرف علی بار بار مجھے یاد آ رہے ہیں۔ اسی کے ساتھ مجھے فراقؔ صاحب کی وہ سخت علالت بھی یاد آتی ہے جب ۴۳ء میں الٰہ آباد سول اسپتال میں جہاں صرف بڑے بڑے افسروں کا داخلہ ہو سکتا تھا، وہ بیہوش پڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہوش میں آنے کے بعد اتنی سخت اور خطرناک علالت کے باوجود "شامِ عیادت" والی نظم شروع کر دی تھی جسے انہوں نے دو تین دن ہی میں ختم کر دیا تھا۔ اس نظم کو سنانے سے قبل مجھے ان کے وہ الفاظ بھی یاد آ رہے ہیں ــــ "صاحب! کتنی منحوس فضا ہے اس اسپتال کی ــــ! ہر شخص مجذوب بنا بستر پہ لیٹا رہتا ہے ــــ یہ صاحب لوگوں کا اسپتال ہے نا، مگر جب سے میں آیا ہوں جان پڑ گئی ہے اس اسپتال میں ــــ اب معلوم ہوا ہے یہاں کے اسٹاف کو ــــ کوئی "آدمی" آیا ہے اسپتال میں!" ــــ اور واقعی اسپتال میں جان پڑ گئی تھی ــــ خاموش اور پُر سکون اسپتال ایک مشاعرے کے پنڈال میں تبدیل ہو گیا تھا۔ صاحب لوگوں کو سخت پریشانی دامنگیر تھی۔ اشرف علی بھی ایک ایسے ہی اسپتال میں داخل تھے۔ اگر وہ بچ جاتے تو وہ بھی کچھ اسی قسم کی باتیں کرتے۔ وہ فراقؔ صاحب کے سب سے پرانے اور ذہین ترین شاگردوں میں سے تھے جہاں کہیں اور جب کہیں مل جاتے فراقؔ صاحب کی گفتگو ضرور چھیڑ دیتے۔ جب ان کے پاس اور بہت سی ضروری اور اہم باتیں کرنے کو ہوتیں تو بھی وہ ان سے ذرا دیر کے لئے منہ موڑ کر فراقؔ صاحب کے بارے میں ادھر ادھر کی باتیں ضرور شروع کر دیتے اور جب ان کے پاس بات کرنے کو کچھ بھی نہیں رہ جاتا اس وقت بھی وہ فراقؔ صاحب کا تذکرہ کرتے۔ مجھے معلوم ہے فراقؔ صاحب سب سے زیادہ اشرف علی سے نالاں تھے۔ فراقؔ صاحب کے ہاں بالعموم احمد حسین، ممتاز حسین، مرتضیٰ حسین، سردار انصاری، پروفیسر رام پرتاب بہادر،

پروفیسر ید پتہ سہائے (فراقؔ صاحب کے چھوٹے بھائی) اور دیگر چند حضرات بیٹھتے تھے، مگر وہ سب سے زیادہ جس شخص کے شاکی اور جس شخص سے "خائف" تھے، وہ اشرف علی تھے ـــــ "خائف" کا لفظ میں قصداً استعمال کر رہا ہوں۔ اس لئے کہ اشرف علی، فراقؔ صاحب کو ان سب حضرات سے زیادہ جانتے اور سمجھتے تھے۔ عین اس وقت جب فراقؔ صاحب بڑے جوش و خروش کے ساتھ کسی مسئلہ پر گفتگو کرتے وہ ان کو ـــــ اگر انہیں اختلاف ہوتا ـــــ ٹوک دیتے یا کہہ دیتے "فراق صاحب! اس سلسلے میں آپ نے جس مصنف کا حوالہ دیا ہے غلط ہے۔ یوں نہیں یوں ہے" یا "یہ حوالہ کسی کتاب کا نہیں ہے۔ یہ آپ ہی کا ایجاد کردہ ہے جو آپ صرف اپنی بات منوانے کے لئے کسی اور کے نام سے منسوب کر رہے ہیں" اور فراقؔ صاحب بپھر جاتے۔ مگر وہ ان کی برہمی کی پروا کئے بغیر اپنی بات پر اڑے رہتے ـــــ "فراق صاحب! جو بات آپ نے کہی ہے وہ اپنی جگہ بہت مناسب ہے، مگر یہ کیا فرض ہے کہ آپ اسے کسی دوسرے کے نام سے پیش کریں؟" فراقؔ صاحب اور برہم ہو جاتے۔ ان کا چہرہ سُرخ ہو جاتا۔ گفتگو سخت اور درشت لہجے میں ہونے لگتی۔ صبح سے شام ہو جاتی اور پھر رات۔ دو دو تین تین بج جاتے مگر بحث جاری رہتی۔ فراقؔ صاحب کی بھاری، کھردری، لوہے کی طرح تپتی ہوئی آواز گونجتی گرجتی آس پاس کے مکانوں سے ٹکراتی۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا جیسے ان کی آواز پوری کائنات پر حملہ آور ہے ـــــ ادب، سائنس، مذہب، اخلاق، فلسفہ نفسیات، جنس، جمہوریت، اشتراکیت، فسطائیت ـــــ سارے مسائل کی تہ ان کے لہجے کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ کھلتی چلی جاتی۔ گویا سارے مسائل لہجے ہی میں لپیٹ کر رکھ دئے گئے ہیں ـــــ اس لہجے میں تجربات کا نچوڑ ہوتا۔ یہ ایک طویل مسافت طے کرتا ہوا، زندگی کی پیچیدہ اور پُر اسرار راہوں سے گزرتا ہوا، نور و ظلمت دونوں کو سمیٹتا ہوا لوگوں کے دلوں میں اترتا رہتا اور انہیں بھی اپنے ساتھ کھینچتا ہوا اپنے کبھی نہ ختم ہونے والے سفر پر روانہ ہو جاتا۔ اس لہجے میں کبھی عظمت ہوتی کبھی پستی، کبھی سکون ہوتا کبھی اضطراب، کبھی شدید محبت کبھی شدید نفرت، کبھی صرف بغض، عناد اور تحقیر! مگر یہ ہر حال، ہر صورت میں ایک للکار، ایک چیلنج، ایک دعوتِ فکر ضرور ہوتا۔ اسی کے ساتھ بڑی بڑی "بے تحاشہ" کھلی ہوئی آنکھوں میں سیاہ پتلیاں ایک جنون کے عالم میں گردش کرتی رہتیں۔ یہ پتلیاں لہجے کے ساتھ ساتھ دوڑتی رہتیں ـــــ ہر لفظ کے گرد گھوم جاتیں ـــــ اور ہر جملے کے اختتام پر سننے والے پر جم جاتیں اور اسے کچل کر رکھ دیتیں۔ یہ جیسے سارے خیالات اور لفظوں کو پہلے ہی سے جمع کئے ہوئے ان کے مناسب اظہار اور استعمال کا موقع سوچتی رہتیں۔ انہیں ٹٹول ٹٹول کر دھیرے دھیرے ـــــ اور کبھی برق رفتاری کے ساتھ جملوں میں رکھتی جاتیں، ٹھونستی جاتیں ـــــ یہاں تک کہ جملہ پورا ہو جاتا اور بالکل وہی تاثیر پیدا ہو جاتی جو وہ پیدا کرنا چاہتیں ـــــ سننے والا دم بخود، مبہوت بیٹھا رہتا۔ اسے ایسا محسوس ہونے لگتا جیسے آج ہی، اسی گھڑی وہ تمام چیزوں کے باہمی ربط سے واقف ہو رہا ہے۔ اب تک جو کچھ اس کی معلومات تھیں، وہ بہت ناکافی، معمولی اور سطحی تھیں۔ اس نے اس طرف کبھی دیکھا ہی نہیں تھا جہاں متضاد چیزیں الگ ہوتے ہوئے بھی ایک ہو جاتی ہیں ـــــ آنکھوں اور لہجے کے ساتھ ہی ساتھ ہاتھ بھی، ان دیکھی، فضاؤں سے خیالات کو سمیٹتے رہتے۔ لفظوں کے ساتھ اٹھتے اور گرتے رہتے۔ انگلیاں آگے بڑھ بڑھ کر سننے والوں کو برابر متوجہ کرتی رہتیں، دھمکاتی رہتیں، ان پر فردِ جرم عائد کرتی رہتیں اور اگر ان کا بس چلتا تو وہ شاید سننے والوں کی گردن بھی مروڑ دیتیں ـــــ "دیکھئے صاحب! اِدھر دیکھئے!" آواز میں غصے کی دبی ہوئی لرزشیں، کشادہ اور سیاہ پیشانی پر لمبی لمبی شکنیں، سڈول اور بھرا ہوا جسم ـــــ بے چین، متحرک، پورے کمرے پر چھایا ہوا ـــــ!

"صاحب ـــــ!" کھنچا ہوا "صا" اور دبا ہوا "حب" ـــــ "صاحب آپ چپ ہیں۔ جواب دیجئے میری بات کا ـــــ یہ دیکھئے، دیکھا آپ نے ـــــ میری انگلی یہاں سے اب تک نہیں ہٹی ہے" چھنگلیے کی آخری پور پر انگوٹھا رکھا ہوا ـــــ "بتائیے صاحب! نمبر ایک۔ دیکھئے میں انگلی رکھے ہوئے ہوں۔ کیا شکایت ہے آپ کو ـــــ جی ہاں! آپ ہی کو ـــــ دیکھئے یہ انگلی ہٹی نہیں یہاں سے اب تک ـــــ صاحب آپ بولتے کیوں نہیں، نمبر ایک کیا شکایت ہے آپ کو ـــــ صاحب خون کر دینے کو جی چاہتا ہے آپ کی خاموشی سے۔ کتنے لمحے برباد کئے آپ نے ـــــ آپ کو نہیں احساس ہے اتنے عرصہ میں جنگ میں شکست اور فتح دونوں ہو سکتی ہیں۔" لمحے بھر کے لئے کمرے میں خاموشی چھا جاتی۔

انتہائی خاموشی ——— باہر بندر روڈ پر سواریوں کے بڑے گھنگھروؤں کی جھنکاریں کچھ اونگھتی ہوئی بڑھتی رہتیں۔ پھر اشرف علی کچھ بول اٹھتے اور بات خاص گالم گلوچ تک پہنچ جاتی ——— "میں تو گالیوں کا بادشاہ ہوں" ——— اور اس میں شک نہیں کہ فراقؔ صاحب کی گالیاں کھا کر ادب کبھی بے مزہ "نہیں ہوا۔ یہ گالیاں بارہ بارہ گھنٹے کی یک لخت نشست میں کبھی کبھی ایک RELIEF بن کر آتیں۔ کبھی یہ بہت سی اُلجھی ہوئی باتوں کو نہایت آسانی سے سُلجھا دیتیں۔ یہ ایک ٹیلی ویژن کا کام دیتیں جس کے ذریعے معنی کے خد و خال اُبھر آتے۔ کبھی یہ سارے فاصلوں کو ختم کر کے اپنایت کی فضا پیدا کر دیتیں ——— اور کبھی ان گالیوں کے بعد محفل برخاست ہو جاتی۔ اشرف علی اور دوسرے حضرات رخصت ہو جاتے اور دوسرے دن پھر آ دھمکتے۔ اشرف علی نے غلط بات سے یا جس کو وہ غلط بات سمجھتے اس سے سمجھوتہ نہ کرنے کا "گُر" فراقؔ صاحب ہی سے سیکھا تھا اور وہ اس کو ان پر آزمایا بھی کرتے۔ اسی لئے شاید فراق صاحب نے انہیں کبھی معاف نہیں کیا۔ "صاحب! اگر آپ تھانے میں رپٹ نہ کریں تو میں اس شخص کو شوٹ کر دوں۔" اشرف علی نے مجھے بتایا تھا کہ دلّی میں فراقؔ صاحب نے جوشؔ سے لڑنے کے بعد اشرف علی کے بارے میں کچھ اسی قسم کے کلمات کہے تھے۔ مگر اشرف علی کار کی زد میں آنے سے صرف دو تین دن قبل بھی فراق صاحب ہی کی باتیں کہہ رہے تھے۔ وہ بڑی سے بڑی بات کہتے وقت بھی فراق صاحب کو QUOTE کرتے اور اپنی معمولی سے معمولی باتوں کی سطح بلند کرنے کے لئے بھی فراقؔ صاحب ہی کا سہارا لیتے۔ وہ کراچی میں "فراق کا ایک مرکز" تھے جہاں وہ سب لوگ جمع ہو جاتے جنہیں فراق اور اشرف علی سے دلچسپی تھی۔ فراقؔ صاحب ان سے سخت نفرت کرتے۔ وہ فراق صاحب سے بڑی محبت کرتے تھے۔ یہ بات نہیں ہے کہ ان کی اپنی شخصیت نہیں تھی۔ انہوں نے اپنی شخصیت کو فراق صاحب ہی کی طرح بڑی محنت اور محبت سے پالا تھا اور اپنی شخصیت کی عظمت کے اسی طرح قائل تھے جس طرح فراق صاحب۔ شاید ان میں اور فراق صاحب میں تصادم کی ایک وجہ یہ بھی تھی، مگر وہ بڑی شخصیتوں کے کبھی منکر نہیں ہوئے، اسی لئے وہ فراق صاحب کے بھی منکر نہیں تھے۔ یہاں کراچی میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جسے ادب سے دلچسپی ہو اور انہوں نے اس سے فراق صاحب کا ذکر نہ کیا ہو ——— اپنے مخصوص انداز میں۔ آہستہ آہستہ، اپنی باتوں سے خود لطف اندوز ہوتے ہوئے، ہر لفظ کو سنبھال سنبھال کر، رُک رُک کر استعمال کرتے ہوئے، نہایت احتیاط کے ساتھ ——— آنکھوں میں خود اعتمادی کی چمک ——— لہجے میں متانت اور تہذیب ——— وہ بڑے سرکش اور باغی ہوتے ہوئے بھی بڑے وضع دار اور منکسر مزاج تھے۔ کسی صورت میں حفظِ مراتب اور رکھ رکھاؤ میں فرق نہیں آنے دیتے، یوں چاہے وہ جو کچھ بھی کہیں۔ وہ ہمارے ہاں کے جاگیری دور کے تو نہیں البتہ وکٹورین عہد کے انسان معلوم ہوتے تھے۔ فراقؔ صاحب ان کے لئے صرف ایک شاعر ایک استاد کی حیثیت نہیں رکھتے۔ وہ ان کے لئے ایک "طرزِ فکر" بن گئے تھے۔ بعض دفعہ کہتے ——— "مجتبیٰ! فرقوا (وہ کبھی کبھی پیار سے یوں بھی پکارتے) کو ہم لوگوں سے بہتر کون جانتا ہے اور ......" ذرا سا رُک کر اور مسکرا کر "...... اور تم بھی کیا جانتے ہو۔ بڑی زبردست سوانح عمری ہوگی اس کی اگر لکھی جائے۔" پھر کچھ سوچ کر کہتے: "مگر ایک دقت ہے۔ اس کی گفتگو کا پورا حسن اس وقت تک اُجاگر نہیں ہو سکتا جب تک وہی لب و لہجہ تحریر میں منتقل نہ کر دیا جائے۔ یہ اگر نہ ہو سکا تو اس کی (فراق صاحب) گفتگو کا وزن زائل ہو جائے گا۔ یہ کام بڑا کٹھن ہے۔"

اس کے بعد وہ خاموشی سے کچھ سوچنے لگتے۔ میں پوچھتا "پھر کیا ارادہ ہے؟" ——— "پھر اگر کبھی یہ سوانح عمری لکھی گئی تو ہمیں لوگ لکھیں گے۔" مگر وہ لکھنے سے پہلے ہی چل بسے اور وہ لکھتے بھی نہیں۔ عرصہ ہوا انہوں نے لکھنا پڑھنا چھوڑ دیا تھا اور صرف باتیں کرتے یا باتیں بناتے۔ اس میں ان کا جواب نہیں تھا۔ اس لحاظ سے وہ اپنی جگہ خود ایک ادارہ تھے۔ ادب میں صرف ادیبوں ہی کی اہمیت نہیں ہوتی۔ اس میں ان کی بھی اہمیت ہوتی ہے جو ادب پر اچھی گفتگو کر سکیں۔ کبھی کبھی تو ایسے لوگ ادیبوں سے بہتر ادب کو سمجھتے اور دوسروں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ان کی گفتگو بیشتر ادیبوں کے شائع شدہ ادب سے بلند پایہ، بہتر، زیادہ فکر انگیز اور تخلیقی ہوتی ہے۔ اشرف علی اگرچہ ادیب نہیں تھے مگر وہ "ادیب گر" تھے۔ وہ جہاں بیٹھتے ایک ادبی ماحول، ایک ادبی فضا پیدا کر دیتے۔ اس فضا میں ادب جاندار ہو کر سامنے آ جاتا اور لوگوں کو وہ "شے" مل جاتی جو آج بہت سے ادیبوں کی کتابوں میں تلاش کرنے پر بھی نہیں ملتی۔ اشرف علی کی یہی سب سے بڑی اہمیت تھی۔ انہوں نے ادب کے سلسلے میں ایک قسم کی "اقوامِ متحدہ" کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اشرف علی کو اس

راہ پر لگانے میں فراقؔ صاحب نے بڑا اثر چھوڑا تھا۔

اس مضمون کو لکھتے ہوئے میں نے بڑی دیانت داری کے ساتھ اپنا جائزہ لیا ہے کہ کہیں میں صرف بر بنائے دوستی تو اشرف علی کا ذکر نہیں ٹھونس رہا ہوں! آخر فراق صاحب پر لکھنے کے لئے اشرف علی یا ان کے اور کسی جاننے والے کی شخصیت کے ذکر کا کون سا محل ہے؟ مگر میں بڑی ذمہ داری کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ فراقؔ صاحب کی وہ شخصیت جو غزلوں میں ہے، اس تک تو ممکن ہے سب کی رسائی ہو سکے اور کوشش کرنے پر بہت سے لوگ اسے پہچان بھی سکیں، مگر وہ شخصیت جو غزلوں میں نہیں ہے اور اس سے بڑی بھی ہے، جو اپنے دوستوں، اپنے شاگردوں کی بے تکلف محفل میں نمایاں ہوتی ہے، وہ بغیر ان لوگوں کے ذکر کے کبھی نہیں جا سکتی جو فراقؔ صاحب کی صحبت میں رات دن اٹھتے بیٹھتے تھے۔ یہ لوگ ایک ایسا محور تھے جس کے گرد فراقؔ صاحب کی گفتگو گھومتی تھی اور فراقؔ صاحب کی گفتگو ہی ان کی سب سے بڑی تخلیق ہے۔ ان کی غزلوں، نظموں اور رباعیات سب سے بڑی! فراقؔ صاحب نے اسی گفتگو کے ذریعے اپنے ذہن کو سلجھایا ہے۔ ایک راہ پر لگایا ہے۔ بہت سی چیزیں دریافت کی ہیں۔ اپنے جذبات کا تزکیہ کیا ہے۔ یہ ان کی پوری شخصیت کا مکمل اظہار ہے۔ اس گفتگو کی کچھ جھلک ان سطروں میں بھی مل جاتی ہے جو فراقؔ صاحب کسی زمانے میں ساقی میں "باتیں" کے عنوان سے گھسیٹ دیا کرتے تھے۔ ان کی اس گفتگو کے سننے والے محض تختۂ مشق کا کام نہیں دیتے تھے وہ خود بھی فراقؔ صاحب کو بہت کچھ دے کر اٹھتے تھے۔ انہوں نے فراقؔ صاحب کی "آگہی" کو جدید سے جدید تر بنائے رکھا ہے۔ سوچنے اور سمجھنے کا نیا ڈھنگ اور نیا جذبہ جو فراقؔ صاحب کو ہمہ وقت بے چین رکھتا ہے، اسے ان لوگوں کی گفتگو نے برقرار رکھنے اور نکھارنے میں بڑی مدد دی ہے۔ فراقؔ صاحب کی بزرگی کی یہ بھی بڑی دلیل ہے کہ وہ نئے زمانے کے پڑھے لکھے لوگوں سے بحث کر کے نئے خیالات کو قبول کرنے سے کبھی گریز نہیں کرتے ہیں۔ ہر ابھرتے ہوئے شاعر کی آواز پر ان کے کان لگے رہتے ہیں۔ وہ شاعری اور ادب کے نو بہ نو امکانات سے کبھی غافل نہیں ہوئے۔ اگرچہ انہوں نے بہت سے نئے شاعروں اور ادیبوں کی تصانیف نہیں پڑھی ہیں یا اِدھر اُدھر سے پڑھی ہیں، مگر وہ ان کا ذکر ہمیشہ سننا چاہتے ہیں اور اس "نہ پڑھنے" کی کمی کو وہ دوسروں سے بحث کر کے پوری کر لیتے ہیں۔ فراقؔ صاحب کی قوت، ادراک اور اکتساب اتنی زبردست ہے کہ ان کی معلومات کے لئے صرف یہی گفتگو اور بحث کافی ہو جاتی ہے۔ ایک سرسری نگاہ میں وہ ساری کتاب کے نفسِ مضمون سے واقف ہو جاتے ہیں۔ ان کی نگاہیں بہت زود رس اور دور رس ہیں۔ فراقؔ صاحب نے اِدھر عرصہ سے پڑھنا تقریباً ملتوی کر رکھا ہے۔ انگریزی ادب میں بھی ان کا مطالعہ ٹی ایس ایلیٹ پر آ کر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد انہیں کوئی دلچسپی نہیں رہ جاتی۔ جب تک بڑا ادب سامنے نہ آئے۔ فراقؔ صاحب توجہ مشکل ہی سے کرتے ہیں۔ انگریزی ادب میں انہیں ROMANTIC AGE کے شاعروں سے سب سے زیادہ دلچسپی رہی ہے اور ان میں بھی وہ غالباً WORDSWORTH سے سب سے زیادہ متاثر ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ جدید ادب کی رفتار سے ناواقف اور بے خبر یا کم باخبر ہیں۔ وہ جدید ادب کی رفتار سے شاید اس سے زیادہ واقف ہیں جتنا خود جدید شاعر یا ادیب۔ بات یہ ہے کہ فراقؔ صاحب نے ادب کی اصل روح کو پا لیا ہے۔ ان کو باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ فراقؔ نہیں خود ادب بول رہا ہے ——— دنیا کا سارا ادب جو کبھی دانتے کی زبان میں بولتا ہے، کبھی شیکسپیئر کی زبان میں، کبھی گوئٹے، کبھی ملٹن، کبھی فردوسی، کبھی حافظ، کبھی میرؔ، کبھی غالبؔ، کبھی کالی داس، کبھی تلسی داس کی زبان میں ——— اس وقت وہ ایک شاعر اور ادیب ہی نہیں، کچھ اس سے بڑے بھی معلوم ہونے لگتے ہیں ——— الٰہ آباد یونیورسٹی کے ایک پروفیسر! جو ادب پر دوسروں ہی کی رائے نہیں اپنی بھی رائے دے سکتا ہو اور اتنی ہی معتبر اور "گرہ کشا" رائے جو شیکسپیئر یا کسی اور مغربی ناقد کی ہو سکتی ہے۔ ادب پر فراقؔ صاحب کی نظر عالمانہ اور محققانہ نہیں ہے اور نہ وہ ادیبوں اور شاعروں کے سنِ پیدائش سے واقف ہیں اور نہ ان کی زندگی کے پورے پورے واقعات سے۔ وہ ان کے زمانے کے تمام سیاسی اور سماجی رجحانات سے بھی ایک مورّخ کی طرح واقف نہیں ہیں۔ انہیں ان سب باتوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب کی تاریخ بیان کرتے وقت ان کا بے تکان قلم لڑکھڑانے لگتا ہے اور ان کی تحریر کمزور معلوم ہونے لگتی ہے۔ وہ غلطیاں کر جاتے ہیں۔

کبھی کبھی فاش غلطیاں۔ وہ ادب کے عالم نہیں ہیں ——— خالق ہیں۔ وہ ادب کو پہچانتے نہیں جانتے ہیں۔ اسی لئے انہیں اب زیادہ پڑھنے کی ضرورت کم پڑتی ہے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے ایک مشہور پروفیسر کے بارے میں ایک دفعہ کہنے لگے "صاحب! ان کے پاس کوئی کیا جائے وہ تو کہہ دیتے ہیں جنگ کی وجہ سے (دوسری جنگ عظیم) یورپ سے کتابیں آنی بند ہو گئی ہیں اس لئے THINKING رک گئی ہے ——— ذرا سوچئے چالیس سال STUDY کرنے کے بعد بھی آپ بغیر کتاب کے THINKING نہیں کر سکتے۔ اب کچھ اپنے دماغ سے بھی سوچنے کی عادت ڈالو۔" ایک اور مشہور پروفیسر کے بارے میں ایک دن کہنے لگے " آپ کو کتابیں پڑھنے کا بڑا شوق ہے۔ کہتے ہیں میں نے HAMLET کو سو بار پڑھا ہے ——— اگر ایک بار پڑھنے پر سمجھ میں نہیں آیا تو ہزار بار پڑھنے کے بعد بھی سمجھ میں نہیں آئے گا۔" یہ فراقؔ صاحب کی صریح زیادتی ہے۔ جن لوگوں کے بارے میں فراقؔ صاحب نے یہ فرمایا ہے وہ علم و فضل میں ہندوستان کے گنے چُنے لوگوں میں سے تھے۔ فراقؔ صاحب صرف اپنی کمزوری کے جواز میں اس قسم کے نظریات اور نکتے وضع اور بیان کرتے ہیں۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں ہے کہ ان کی ہر بات میں کچھ نہ کچھ صداقت ضرور ہوتی ہے۔ کتابوں کے مطالعے کی طرح اور بہت سی چیزوں کے بارے میں فراقؔ صاحب کا رویہ بڑی حد تک داخلی اور سخت قسم کا انفرادی ہے۔ وہ جست لگا کر اشیاء کی ماہیت تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس جست میں وہ کبھی کبھی بیچ ہی میں گر جاتے ہیں اور اصل شے تک نہیں پہنچ پاتے۔ وہ تجزیے کی زحمت سے بچنا چاہتے ہیں اور ہر چیز کو اپنی ذات کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں مگر اس سے حقیقت کا چہرہ کبھی کبھی دھندلا پڑ جاتا ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود ان کا "تیار ذہن" "صحیح نتائج اخذ کرنے میں بڑی سرعت سے کام لیتا ہے اور چشم زدن میں اس منزل پر پہنچ جاتا ہے جہاں پہنچنے کے لئے "تجزیہ نگار" حضرات کو برسوں کا سفر طے کرنا پڑتا ہے اور بعض اوقات وہ پھر بھی وہاں نہیں پہنچ پاتے۔ فراقؔ صاحب کی نگاہ ادب کو پہچاننے میں مشکل ہی سے خطا کرتی ہے۔ یہ ان کی ذہنی تربیت کی تکمیل اور "ہمہ بیداری" ہے جس کو وہ 'وجدان' سے تعبیر کرتے ہیں۔ فراقؔ صاحب حقائق سے آنکھیں نہیں چراتے وہ خارجیت کے بہت سے 'ماہرین' سے زیادہ خارجیت کا احترام اور اعتراف کرتے ہیں۔ مگر ان کی فکر جامد اور پابند نہیں ہے۔ اس میں جستجو ہے اور جستجو عقیدہ نہیں ہوتی۔ یہ سوچ کر میں ڈر جاتا ہوں کہ کیا کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ آدمی کو پڑھنے کی ضرورت نہ پڑے اور وہ صرف اپنے دماغ کے سہارے زندہ رہ سکتا ہو ——— یہ شاید نہیں یقیناً ناممکن ہے، مگر فراقؔ صاحب پر کبھی کبھی ایسا گمان ضرور ہوتا ہے۔ پڑھنے کی طرف سے فراقؔ صاحب کی اسی "بے نیازی" کے خلا کو ان کے شاگردوں کی موجودگی نے پورا کر دیا تھا۔ وہ ان سے بحث کر کے اپنے کام کی باتیں چُن لیتے۔ بہت سی نئی چیزیں اخذ کر لیتے۔ پھر ان اخذ شدہ چیزوں کو ادب کی مجموعی اور مرکزی روح سے ربط دے کر مستحکم، وسیع اور متحرک کر دیتے۔ اس کے بعد وہ جو باتیں کرتے وہ ان کی اپنی ہوتیں۔ ان میں کسی اور کا دخل نہ ہوتا۔ فراقؔ صاحب کی گفتگو ہمیشہ بڑی معتبر ہوتی ہے۔ باتیں کرتے وقت ان میں بڑی خود اعتمادی پائی جاتی ہے۔ اس خود اعتمادی کو پروان چڑھانے میں بھی ان کے پاس بیٹھنے والوں کا کافی حصّہ ہے۔ انہی لوگوں نے ان کی غزلوں کو پہلی بار "دریافت" کیا۔ ان کو پسند کیا۔ ایک سے دوسرے تک پہنچایا۔ ان کے نئے فکری انداز کو سراہا۔ کھلے دل سے ان کی بے پایاں عظمت کا اعتراف کیا۔ ان کی آواز کو اردو شاعری کی ایک نئی آواز سے تعبیر کیا۔ کھُردری سے کھُردری غزل کو ایک نیا موڑ، ایک نیا تجربہ بتایا۔ اور اس طرح فراقؔ صاحب کی غزلوں کے بارے میں ان لوگوں کی یہ رائے یونیورسٹی کے محدود دائرے سے نکل کر دور دور تک پھیل گئی۔ ان چیزوں نے بھی فراقؔ صاحب کی خود اعتمادی کو سینچا ہے، اُبھارا ہے اور اس کی تائید کی ہے۔ جس زمانے میں ان لوگوں کا جمگھٹ تھا، وہی زمانہ شاید فراقؔ صاحب کی بہترین غزلوں کی تخلیق کا زمانہ تھا ——— ۱۹۳۹-۴۰ء سے لے کر ۱۹۴۵-۴۶ء تک! اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں ہے کہ فراقؔ صاحب کی غزلوں کی زندگی انہیں لوگوں کے دم سے تھی۔ اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ یہ لوگ فراقؔ صاحب کی غزلوں کے نہ صرف بہت دیانت دار سامعین میں سے تھے بلکہ ان کی غزلوں کا "صلہ" بھی تھے اور نہ فراقؔ صاحب کی عدم خود اعتمادی کے ذکر سے یہ مطلب تھا کہ انہیں اپنی فکر کی صداقت پر یقین

نہیں ہے ——— وہ بڑے بے یقین آدمی ہیں۔ ان میں اگر بعض اوقات خود اعتمادی کی کمی نظر آنے لگتی ہے تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ بیک وقت بہت بڑے شاعر اور بہت بڑے ناقد ہیں۔ ان کے پیشِ نظر اپنا اور دنیا کے تمام بڑے ادیبوں اور شاعروں کا ادب ہے۔ وہ سب کے مرتبہ داں ہیں۔ اسی "ادب شناسی" کی بدولت شاید انہیں اندیشہ ہونے لگتا ہے کہ کہیں نئی نسل ان کی عظیم تعمیری کوششوں اور کاوشوں سے منکر نہ ہو جائے۔ لہٰذا وہ پیش بندی کے طور پر اپنی اور دوسروں کی شاعری کے بارے میں عجیب و غریب باتیں بھی کہہ جاتے ہیں۔ اپنا رنگ چھوڑ کر کبھی دوسروں کے رنگ میں کہنے لگتے ہیں۔ کبھی ایک نیا رنگ پیدا کرنے کے سلسلے میں بالکل بے رنگ ہو جاتے ہیں۔ کبھی طولانی نظموں کی طرف رجوع ہو جاتے ہیں۔ کبھی ادب کے ایسے نظریے پیش کرنے لگتے ہیں جن کے وہ خود شدید مخالف ہیں۔ اور یہ سب جتن وہ صرف اپنی شاعری کی "خاطر" کرتے ہیں۔ انہی "نظریات" کو بعض "فراق پسند" ناقد فراق صاحب کے اصلی نظریات سمجھ کر اپنی تنقید میں جگہ دے کر وہ موشگافیاں کرتے ہیں کہ خود فراق صاحب دل ہی دل میں کڑھتے ہوں گے۔ مگر فراق صاحب اپنے اس کڑھنے کا اظہار زبان سے نہیں کرتے اس لئے کہ آجکل انہیں اپنے حلقے کو وسیع کرنے کی دھن ہے، حالانکہ فراق صاحب کو نہ کل اس کی ضرورت تھی نہ آج۔ وہ ادب میں جس جگہ کھڑے ہیں وہاں انہیں ادب کی ضرورت نہیں ہے، ادب کو ان کی ضرورت ہے۔ فراق صاحب کی یہ ذہنیت اس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک آدمی ان سے پوری طرح واقف نہ ہو جائے۔ اسی لئے ان کی شخصیت کو جاننے اور پہچاننے کے لئے ہمیں اس آدمی کی ضرورت پڑتی ہے جو ان سے بخوبی واقف ہو، جو دن رات ان سے بحث کرتا ہو، جو ان کو اس حد تک جانتا ہو کہ وہ چڑ جائیں، خفا ہو جائیں، گالیاں دینے لگیں اور کبھی معاف نہ کریں۔ اسی لئے اشرف علی کا ذکر ناگزیر ہے۔ وہ فراق صاحب کے سب سے بڑے مفسّر اور مبلّغ تھے۔ فراق صاحب کی شخصیت کا ایک یہ پہلو بھی بہت اہم ہے کہ جہاں ان کے چار جاننے والے اکٹھے ہو گئے ان کی بات ضرور چل نکلتی ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ کیا بات ہے؟ یہ کیسی شخصیت ہے جو ماہ و سال کے تغیرات کو رد کرتی، میلوں کا فاصلہ طے کرتی ہوئی آنِ واحد میں سامنے آ کھڑی ہوتی ہے اور اس کے حوالے سے ہر بات کی جا سکتی ہے، ہر مسئلہ کو خوش اسلوبی سے سمجھایا جا سکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ فراق صاحب کی شخصیت بے فیض نہیں ہے۔ یہ ایک "وسیلۂ اظہار" زندگی کا ایک رویّہ بن گئی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ایسی توانا اور ہمہ گیر شخصیت ساری اُردو تاریخ میں شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔ اس کے پرتو سے ذہن جاگ اُٹھتے ہیں۔ اشرف علی نے اسی پرتو کو اپنی پُر نور شخصیت سے ملا کر اور نورانی کر دیا تھا اسی لئے آج جب میں فراق صاحب کی ذاتی زندگی پر لکھنے بیٹھا ہوں تو اشرف علی بار بار یاد آ رہے ہیں۔

اشرف علی کی باتوں میں ایک بانکپن ہوتا، غالباً خود فراق صاحب بھی اس کے منکر نہ ہوں گے۔ وہ کسی کی دھونس میں نہیں آتے تھے۔ اناڑیوں اور بہروپیوں کے چہرے سے نقاب اتار لینے کو وہ اپنا "دھرم" سمجھتے اور یہ سب فراق صاحب ہی کا فیضِ صحبت تھا۔ اشرف علی جلدی کبھی کسی کو قبول کرنے کے عادی نہیں تھے خواہ کتنا ہی بڑا آدمی کیوں نہ ہو ——— لیکن ان کے لہجے میں فراق صاحب کی طرح "تشدد" نہیں تھا۔ ان کا لہجہ اپنی بات پر اڑے رہنے کے باوجود نرم ہوتا۔ اسی لئے ان کی شخصیت فراق صاحب کے مقابلے میں کمزور رہتی۔ ایک اعلیٰ تہذیبی احساس نے انہیں ہمیشہ "ناکام" بنائے رکھا۔ ان کا نازک جسم تہذیب اور بغاوت دونوں کے بار کو ایک ساتھ سنبھال نہیں سکا۔ مجاز کے بارے میں ایک دن بات کرتے کرتے فراق صاحب نے اپنے بارے میں جو جملہ کہا ہے، وہ مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ فراق صاحب کو غیر ذمہ دار آدمیوں سے جو اپنی زندگی کو دانستہ تباہ کرنے پہ تلے ہوں، سخت چڑ ہے۔ ایسے آدمیوں کو وہ زیادہ دیر برداشت نہیں کر پاتے۔ وہ انہیں "اکھڑے ہوئے لوگ" کہا کرتے۔ وہ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے کہ یکایک اپنے بارے میں کہنے لگے "——— میں اور جوش بھی اپنی زندگی میں سخت غیر ذمہ دار واقع ہوئے ہیں، مگر پھر بھی ہمارا دماغ توازن کے احساس سے کبھی خالی نہیں رہتا ——— ہمارے خیموں کی طنابیں ڈھیلی

ضرور پڑ جاتی ہیں مگر گھونٹے گس کر گڑے رہتے ہیں۔" اشرف علی کبھی کبھی سرور کے عالم میں فراق صاحب کے بارے میں کہتے۔ "فراق کی شخصیت بڑی ABNORMAL ہے۔" جب وہ یہ کہتے تو مجھے الٰہ آباد یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر امرناتھ جھا کے والد مہا مہوپادھیائے گنگا ناتھ جھا کی بات یاد آ جاتی ——— "فراق اگر یونہی رہا تو ایک دن پاگل ہو جائے گا۔" اشرف علی اور گنگا ناتھ نے مختلف پیرایے میں قریب قریب ایک ہی بات کہی ہے۔ مگر فراق صاحب کی شخصیت کو اسی توازن نے بچا لیا جس کی طرف انہوں نے مجاز پر گفتگو کرتے ہوئے اشارہ کیا تھا۔ فراق صاحب خود سے کبھی غافل نہیں ہو پاتے۔ عین بے خبری کے عالم میں بھی وہ خبردار رہتے ہیں۔ اپنے نیک و بد کو خوب سمجھتے ہیں۔ اسی لئے وہ درحقیقت اتنے ABNORMAL ہیں نہیں جتنے نظر آتے ہیں ——— میں اشرف علی کی اس بات سے اختلاف کرتا تو وہ ذرا کھل کر اپنی بات کی تشریح کرنے لگتے ———

"میاں تمہاری سمجھ میں فراق نہیں آئے گا اور نہ تم اس کی غزل سمجھ سکو گے۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ اس کی غزل اس کی شخصیت ہے ——— بڑا کرب اور درد ہے اس شخصیت میں۔ یہ دوزخ اور جنت دونوں سے مل کر بنی ہے۔ اس میں شدید بہیمیت پائی جاتی ہے مگر اسی کے ساتھ انسانیت سے بھی یہ بڑی محبت کرتی ہے۔ ایک طرف اپنے پورے گھر بار سے متنفر ہے، دوسری طرف یہ سب کو چاہتی ہے۔ یہ شخص (فراق صاحب) ایک طرف تو پیسے کو دانت سے پکڑتا ہے دوسری طرف نادار مگر ذہین طلبا کی فیس بھی جمع کر آتا ہے اور اپنا نام تک نہیں ظاہر کرتا ——— اس نے زہر کو تریاق بنایا ہے اور یہی اس کی غزل کی روح ہے۔ اسی کشمکش، اسی تضاد نے اس کی فکر کو جنم دیا ہے۔ کبھی موقع ملا تو لکھوں گا اس کے بارے میں ———"

آج جب وہ نہیں رہے تو معلوم ہوتا ہے کہ فراق صاحب کی شخصیت کتنی بڑی ہے جس نے اشرف علی ایسے شخص کو متاثر کیا جو خود ایک دو نہیں بیسیوں آدمیوں کو متاثر کر چکا ہے۔ اشرف علی ان ادبی روایات کی ایک کڑی ہیں جن سے مل کر فراق صاحب کی شخصیت کا پورا سلسلہ تعمیر ہوتا ہے اسی لئے ان کے اٹھ جانے سے ایک بہت ہی مضبوط اور اہم کڑی گم ہو گئی ہے۔ انہوں نے فراق صاحب کی ادبی روایات کو آگے بھی بڑھایا تھا۔ ادب اور ادیبوں کو پسند کرتے ہیں وہ صرف سقا کی اور ریا کی سے کام نہیں لیتے۔ اس میں انہوں نے دردمندی کی بھی 'آمیزش' کی تھی۔ مجھے اس وقت ان کا یہ جملہ یاد آ رہا ہے۔ "فراق کی زندگی میں بڑی تنہائی ہے۔" جب میں اس پر غور کرتا ہوں تو میری نظر فراق صاحب کی اس قوتِ فکر پر پڑتی ہے جس نے اس 'تنہائی' کو بڑی شاعری میں بدل دیا۔ اس کو انسانیت سکھائی۔ ع اس بھری دنیا میں ہم تنہا نظر آنے لگے ——— کے بعد کی منزل پر فراق صاحب کی شاعری جس طرح پہنچی ہے وہ اردو ادب کا گراں قدر سرمایہ ہے ؎

رفتہ رفتہ عشق مانوسِ جہاں ہوتا گیا
خود کو تیرے ہجر میں تنہا سمجھ بیٹھے تھے ہم

اشرف علی کے اس جملے سے میری نظر میں الٰہ آباد کی متعدد شامیں پھر جاتی ہیں . . .

جب ہم لوگ پہنچے ہیں تو شام ہو رہی تھی۔ فراق صاحب حسبِ معمول متوحش سے برآمدے میں تنہا ٹہل رہے تھے۔ ابھی ہم لوگ کچھ دور ہی پر تھے کہ ان کی آواز آئی ——— "آیئے صاحب!"

"آداب عرض ہے!"

"آداب عرض! آداب عرض! ——— چلو!" ان کی آواز گونجی اور نوکر بیچارا لرزتا ہوا کانپتا ہوا دوڑتا آیا ——— "کرسیاں باہر لگا دو۔" کرسیاں

باہر لگا دی گئیں۔ ہم لوگ بیٹھ گئے۔ فراق صاحب اب متوحش نہیں تھے۔ ہم لوگوں کے آنے سے جیسے فراق صاحب میں جان پڑ گئی ہو۔ ان کے لئے شام ہمیشہ ایک بوجھ بن کر آتی ہے۔ یہ وقت ان کے لئے بڑا صبر آزما ہوتا ہے اور وہ برآمدے میں عام طور سے ٹہلتے رہتے ہیں اور روز کے آنے والوں کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ ان کی شاعری میں شامِ ہجر اور شامِ غم کا ذکر جتنی بار اور جس جس طرح سے ملتا ہے وہ اردو شاعری میں کہیں اور نہیں ملتا۔ شام کی اداسی اور رات کا بے پایاں پُر اسرار سکوت ان کی شاعری کا نغمہ بن جاتا ہے۔ ان کی غزل کے لہجے میں نرم روی اور سکون کا احساس اس فضا کا بھی پروردہ ہے۔ ان کی گفتگو میں بعض اوقات جو تندی اور تیزی پائی جاتی ہے وہ ان کی غزلوں تک پہنچتی پہنچتی اوس اور چاندنی میں بدل جاتی ہے البتہ ان کی گفتگو کی "دیدہ وری" جوں کی توں ان کی غزلوں میں بغیر کسی ردّو بدل کے کھنچ آتی ہے۔ فراق صاحب تنہائی سے بچنے کے لئے بڑی کوشش اور بڑا اہتمام کرتے ہیں۔ اسی لئے جب کوئی آجاتا ہے تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں کوئی بھی شخص کسی بھی وقت بلا روک ٹوک کے آسکتا ہے ان کا دروازہ کسی پر بھی بند نہیں ہوتا ——— یہ الگ بات ہے کہ ذرا دیر بعد وہ آنے والے کی بناوٹ سے خفا ہو کر اسے نکال دیں ——— "صاحب ابھی آپ سے کیا بات کروں ——— آپ کی گردن پر جو اتنا بڑا سر رکھا ہوا ہے ——— معاف کیجئے گا ——— اس میں کچھ نہیں ہے۔" اس بات پر اگر اس نے ذرا بھی احتجاج اور اپنی حیرت کا اظہار کیا تو فراق صاحب ضبط کھو دیتے ہیں ——— "آپ نہیں سمجھیں گے میری بات۔ آپ چلے جائیے فوراً یہاں سے ——— ابھی!" اور اس کے بعد چیختی ہوئی آواز محلے والوں کو چونکاتی ہوئی آنے لگتی ہے ——— "نکل جاؤ ——— نکل جاؤ!" ——— فراق صاحب کی گالیاں، سراسیمگی کے عالم میں بھاگنے والے کا دور تک پیچھا کرتی رہتی ہیں۔ مگر فراق صاحب بد اخلاق یا بد گفتار نہیں ہیں۔ وہ اس کے بالکل برعکس ہیں۔ جب وہ اپنے "گورکھپوریہ" انداز میں گفتگو کرنے لگتے ہیں تو ہر لفظ نہایت نرم، معصوم اور طاہر بن جاتا ہے۔ فراق صاحب پر کبھی کبھی ایک بگڑے بچے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ ایک ایسا بچہ جو بچپن ہی میں ماں باپ کی محبت سے محروم ہو گیا ہو، یا جسے سوتیلی ماں سے سابقہ پڑ گیا ہو اور وہ گھر سے بھاگ کھڑا ہوا اور اس میں ہر طرح کی شرارت اور عیاری آگئی ہو۔ وہ گھاگھ ہو چکا ہو۔ لیکن پھر بھی گفتار سے، رفتار سے بچپن جھلک ہی پڑتا ہو ——— فراق صاحب بعض وقت ایسے ہی معلوم ہونے لگتے ہیں۔ وہ اپنی تمام انتہا پسندی کے باوجود بڑی خاطر تواضع کے آدمی ہیں۔ وہ ملنے ملانے کے معاملے میں کسی قسم کے تکلف کے ذرا بھی روادار نہیں ہیں۔ ان کے ہاں آنے والے کو اطلاع کرانے کی کبھی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ اطلاع کرانے کی رسم سے ہمیشہ نالاں رہے۔ کہتے کہ ایسے مکان میں قدم رکھنا سخت توہین اور اذیت کی بات ہے جہاں اطلاع کرانی پڑے ——— چپراسی یا ملازم نام پوچھ کر اندر گیا ہے اب کھڑے ہوئے جواب کا انتظار کیا کیجئے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ مکان میں آدمی رہتے ہیں اور آدمی سے ملنے کے لئے آدمی ہی آتے ہیں جانور نہیں آتے ——— پھر اطلاع کرانے کے کیا معنی ہوئے؟ صاحب! جس مکان میں اطلاع کرانی پڑے سمجھ لیجئے اس کے رہنے والے سخت منحوس اور ارذل ہیں ——— اور وہ اس رسم کے خلاف گھنٹوں لکچر دیا کرتے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک پورا "فلسفۂ اطلاع" تیار کر رکھا تھا۔ نوکر کو سخت ہدایت تھی کہ "اگر میں نہ رہوں تو بابو جی کا نام ضرور پوچھ لینا۔" فراق صاحب دل سے چاہتے ہیں کہ ان سے ملنے کے لئے لوگ آیا کریں۔ بغیر دو گھنٹے بحث کئے انہیں چین نہیں آتا۔ وہ بدحواس رہتے ہیں ——— جہاں قدموں کی آہٹ ہوئی ان کی نظر اٹھی ——— "آئیے صاحب!" یا اگر وہ کمرے میں ہوئے تو باہر نکل آئے۔ وہ جس حال میں بھی ہوتے باہر چلے آتے۔ نہا کر آئے ہیں۔ تولئے سے بدن پونچھ رہے ہیں۔ پوری طرح دھوتی بھی نہیں باندھ سکے ہیں کہ اتنے میں کوئی آگیا ہے اور فراق صاحب اسی عالم میں باہر چلے آئے ہیں۔ کمرے میں بٹھا کر اور یہ تاکید کر کے کہ "بیٹھئے صاحب! میں ابھی آیا" پھر کپڑے پہننے چلے گئے ہیں ———

بہرحال تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہم لوگ پہنچے۔ گرمیوں کا زمانہ تھا۔ کرسیاں باہر لگی ہوئی تھیں۔ باہر ہی ذرا دور پر ریڈیو بھی ایک چھوٹی سی تپائی پر رکھا ہوا تھا اور اس پر انہوں نے ایک "غیر ادبی" شخص کو بٹھا رکھا تھا کہ جنگ کی خبریں سن کر انہیں بتاتا جائے۔ اس زمانے میں دوسری جنگِ عظیم چھڑی ہوئی تھی۔ فراق صاحب کو خود ریڈیو سے دلچسپی نہیں ہے۔ انہوں نے محض جنگ کی خبریں سننے کے لئے اسے خرید لیا تھا جب جنگ

ختم ہوگئی تو یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے اسے فروخت کر دیا۔ اسی طرح انہیں سینما سے مطلق دلچسپی نہیں ہے، مگر وہ باتیں سب موضوعات پر کر سکتے ہیں اور پورے عبور کے ساتھ۔ انہیں دو چیزوں سے البتہ دلچسپی ہے، اچھے کپڑے پہننے اور اپنی کتابوں کے لئے اپنے بنائے ہوئے ڈیزائن کے مطابق نہایت خوبصورت الماریاں بنوانے سے۔ ان الماریوں کو بھی وہ سال دو سال کے بعد فروخت کر دیتے ہیں اور پھر نئے سرے سے بنواتے ہیں ـــــ خیر تو اس وقت وہ کچھ گنگنا رہے تھے۔ پھر انہوں نے شعر سُنانا شروع کر دیا ؎

شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اُداس اُداس دل کو کئی کہانیاں یاد سی آکے رہ گئیں

اس زمین میں اس وقت انہوں نے صرف دو ہی تین شعر کہے تھے، غزل انہوں نے ایک عرصہ بعد پوری کی ہے۔ شعر و شاعری کے بعد بحث مباحثہ ہونے لگا ـــــ رات ہو چکی تھی۔ اسی اثناء میں ریڈیو سے خبریں آنے لگیں۔ جو صاحب ریڈیو پر بیٹھے تھے انہوں نے ریڈیو کو ذرا تیز کر دیا۔ فراق صاحب شد و مد سے بحث کر رہے تھے ـــــ معاً رُک گئے۔ ذرا سے توقف کے بعد ان کی گھٹی ہوئی آواز آئی "صاحب! آپ ریڈیو سمیت کمرے میں تشریف لے جائیں اگر آپ کو خبریں سُننے کا اتنا ہی شوق ہے۔"

وہ عزیز ذرا سی خاموشی کے بعد کہنے لگا "مگر فراق صاحب! آج ہٹلر کی تقریر نے ...... "

فراق صاحب نے جملہ پورا نہیں ہونے دیا "صاحب یہاں ادب کی بات ہو رہی ہے ـــــ ہٹلر کا یہاں کہاں گذر ......"

ریڈیو کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ پھر دوسری باتیں چھڑ گئیں ـــــ سیاست، فلسفہ اور اخلاق کی ـــ دفعتاً گفتگو نے پھر پلٹا کھایا ـــ "آپ لوگوں کو معلوم ہے اس لفظ "چاہیئے" سے بڑھ کر گندہ کوئی لفظ نہیں ہے" ہم لوگ حیران کہ اس سوال کا یہاں کون سا محل ہے؟ ذرا دیر ڈرامائی فضا پیدا کر کے فراق صاحب نے خود ہی تشریح فرمائی ـــ "خبر سُننے کا وقت آگیا ہے اس لئے خبر سُننا چاہیئے۔ صاحب آپ محسوس کیوں نہیں کرتے کس قدر بد اخلاقی ہے اس لفظ میں ـــ؟ میں فلاں شخص سے اس وقت ملنا نہیں چاہتا مگر چونکہ وہ بُرا مان جائیں گے اس لئے ان سے ملنا چاہیئے ـــــ کتنا دکھاوا، ریاکاری، تصنع اور غلاظت ہے اس لفظ میں ـــ!" اب ان کی گفتگو پوری طرح شباب پر آ چکی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مختلف موضوعات پر دنیا کی ہزاروں لاکھوں ایسی بڑی بڑی کتابوں کے ورق پر ورق اُلٹتے چلے جا رہے ہیں جو کہیں چھپی نہیں ہیں صرف ان کے ذہن میں لکھی ہوئی ہیں ـــــ ان کی گفتگو جب عروج پر ہوتی تو ان کی تقریر کے انداز سے مل جاتی۔ فراق صاحب اردو اور انگریزی دونوں کے بڑے اچھے مقرر ہیں۔ جس انداز سے وہ تقریر کرتے ہیں، وہ اپنا جواب آپ ہے۔ یونیورسٹی یونین کا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا ہے ـــــ فراق صاحب آئے ـــ اس سے قبل انہوں نے اپنی تقریر کے بارے میں کچھ بھی نہیں سوچا ہے بلکہ جان بچانے کا موقع ڈھونڈھ رہے ہیں ـــــ وہ ہمیشہ فی البدیہہ تقریر کرتے ہیں اور کبھی تیاری نہیں کرتے ـــ اب وہ کشاں کشاں ہال میں آتے ہیں اور تقریر شروع کر دیتے ہیں۔ شروع شروع میں سامعین اکتانے لگتے ہیں مگر جیسے جیسے ان کی تقریر آگے بڑھتی جاتی ہے سامعین مسحور ہونے لگتے ہیں۔ ان کی تقریر کنول کے پھول کی طرح کھلنے لگتی ہے ـــ بالکل ان کی گفتگو کی طرح ـــــ جیسے جیسے وہ گفتگو کرتے جاتے ہیں ان کی گفتگو میں بیشمار دریچے کھلنے لگتے ہیں۔ یہی حال ان کی تقریر کا ہے۔ وہ خطابت سے کام نہیں لیتے۔ سامعین کو اِدھر اُدھر کی باتوں میں نہیں لگاتے۔ چٹکلے بازی اور لطیفوں کا سہارا نہیں ڈھونڈھتے۔ اس سے انہیں بڑی نفرت ہے۔ اسے وہ ذہنی تہی مائیگی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسی لئے وہ اردو کے بعض بسیار نویس مزاح نگاروں سے بدظن ہیں۔ اپنی تقریر میں وہ زباندانی کے جوہر نہیں دکھاتے ـــــ وہ صرف تقریر کرتے ہیں ـــ ان کی تقریر کے ہر لفظ کے پیچھے جو شاعرانہ معنویت اور فکری رعنائی ہوتی ہے، وہی خطابت بن جاتی ہے۔ یہ سامع کو جتائے اور بتائے بغیر اپنا بناتی رہتی ہے۔ چپکے چپکے۔ اور پھر سامع آہستہ آہستہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس میں اور مقرر میں کوئی فرق نہیں رہ گیا ہے۔ یہ تو وہ خود تقریر کر رہا ہے۔ فراق صاحب کی تقریروں میں بڑی انسانیت اور یگانگت ہوتی ہے وہ اپنی گفتگو کی طرح تقریر میں بھی چھوٹی چھوٹی اور آسان تمثیلوں سے کام لیتے ہیں۔ یہ تمثیلیں ہماری روزمرہ کی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سامع فوراً مقرر سے قرب محسوس کرنے لگتا ہے۔ فراق صاحب تقریر کرتے کرتے رَو میں ہال سے باہر بھی نکل جاتے ہیں ـــــ شیروانی کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے

ایک آدھ منٹ گیلری میں ٹہلنے کے بعد وہ پھر خراماں خراماں اندر آجاتے ہیں اور پھر تقریر شروع کر دیتے ہیں۔ سامعین اسی طرح ساکت و صامت کھوئے ہوئے بیٹھے رہتے ہیں ـــ تقریر کا سلسلہ کہیں سے بھی ٹوٹتا ہوا محسوس نہیں ہوتا ـــ دیکھئے! بات پھر دوسری طرف جا پڑی۔ ذکر تھا ان کی گفتگو کا اور قصہ چھڑ گیا تقریر کا۔ بات دراصل یہ ہے کہ فراق صاحب کی شخصیت اتنی "پہلو دار" ہے کہ ایک پہلو پر غور کرنے سے ہزاروں پہلو سامنے آنے لگتے ہیں ـــ فراق صاحب بحیثیت پروفیسر کے، فراق صاحب بحیثیت شاعر اور ناقد کے، فراق صاحب ایک دوست، ایک باپ، ایک بھائی کی حیثیت سے ـــ اتنے رُخ اور اتنے موڑ ہیں ان کی زندگی کے، جس کا ایک مضمون احاطہ کر ہی نہیں سکتا۔ بہر حال اخلاقیات کے فلسفہ پر زوردار گفتگو کر رہے تھے۔ بیچ بیچ میں حسبِ معمول گالیاں اپنا جوہر دکھاتی جا رہی تھیں۔ اب رات کافی ہو چکی تھی۔ ہم لوگوں نے اجازت مانگی ـــ وہ بولتے بولتے رُک گئے "ہاں صاحب! کافی دیر ہو گئی۔ اچھا صاحب جائیے، کل تو کوئی کام نہیں ہے آپ لوگوں کو، صبح ہی آجائیے گا۔ دھوپ بہت سخت ہو جاتی ہے" وہ ذرا رُکے۔ ہم لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے "ابھی آپ لوگ بیٹھے ہوئے تھے ـــ خیال تھا آپ لوگ بیٹھے ہوئے ہیں" ان کی آواز آہستہ اور بھاری ہو گئی۔ "اب آپ لوگ چلے جائیں گے پھر خیال آجائے گا کہ گھر میں میری بیوی ہے!" ہم لوگ ان سے رخصت ہو کر چلے گئے۔ لیکن فراق صاحب کا یہ بھیانک جملہ آج بھی میرے ذہن کا تعاقب کرتا رہتا ہے ـــ فراق صاحب کی زندگی کا یہ پہلو بڑا دردناک ہے ـــ ان کے اور ان کی بیوی دونوں کے لئے ـــ ذمہ داری کس کی ہے، اس کو فراق صاحب تمام لوگوں سے بہتر سمجھتے ہیں ......

۱۹۴۹ء میں پرمٹ بنوا کر میں ہندوستان گیا۔ کچھ ہم بدل گئے تھے کچھ ہندوستان ـــ الٰہ آباد جانے پر یہ احساس ہوا کہ جیسے الٰہ آباد کی زندگی اب ہمیں پہچانتی نہیں ـــ وہی زندگی جو کبھی ہماری تھی۔ یونیورسٹی کے در و بام وہی تھے، طالب علم بھی ویسے ہی تھے ـــ مگر کوئی چیز گم ضرور ہو گئی تھی ـــ شاید طالبِ علم ـــ اب وہ صرف ڈگری کے طالب رہ گئے تھے۔ شام کو میں فراق صاحب کے ہاں پہنچا۔ وہ برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ اب ان کے یہاں بہت کم لوگ آتے تھے ـــ پرانے بیٹھنے والوں کا مجمع منتشر ہو چکا تھا۔ کبھی کبھار کوئی بھولا بھٹکا طالبعلم ادھر آنکلتا مگر وہ بھی ذرا دیر بعد فراق صاحب کی باتوں سے اُکتا کر اُٹھ کھڑا ہوتا ـــ

"آئیے صاحب! آداب عرض ہے!" فراق صاحب نے سلام کرنے میں پہل کی ـــ "کب آئے؟"

"آداب عرض ہے فراق صاحب!"

"جیتے رہو ـــ آؤ بیٹھو!"

میں بیٹھ گیا ـــ دیر تک بیٹھا رہا ـــ

شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اُداس اُداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آکے رہ گئیں

پھر میں چلا آیا ـــ

ٹالسٹائی کو دیکھ کر گورکی کو "دیوتا" یاد آگئے تھے ـــ فراق صاحب کو دیکھ کر مجھے صرف فراق صاحب یاد آتے ہیں ـــ اور اشرف علی کو دیکھ کر!؟ انہیں دیکھ کر بھی فراق صاحب یاد آجاتے تھے ـــ

فراق صاحب! اشرف علی مرگئے ـــ!!

فیض احمد فیض

ایلس فیض

"کیا تم اپنے شوہر کی شاعری سمجھ لیتی ہو؟" یہ سوال مجھ سے اکثر کیا گیا ہے اور میں نے کافی غور و خوض کے بعد اس کا ایک ایسا جواب ڈھونڈ لیا ہے جو میرے خیال میں صداقت پر بھی مبنی ہے اور حرفِ آخر کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ میرا جواب ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ میں ان کی شاعری کو سمجھنے کا دعویٰ تو نہیں کرتی لیکن یہ دعویٰ ضرور ہے کہ میں شاعر کو سمجھتی ہوں۔ اور کسی شاعر کی شخصیت ہی اس کی شاعری کا سرچشمہ اور اس کے وجدان کی قوت متحرکہ ہوتی ہے مگر میں اس مضمون میں اُن کی شخصیت کی صورت گری کی کوشش نہیں کروں گی کیونکہ اس کے لئے ان اقلیموں کو طے کرنا پڑے گا جو ایک بیوی کے دائرۂ عمل سے باہر ہیں۔ بلکہ میں ایک شاعر کے گھر کی زندگی کا خاکہ پیش کروں گی جہاں وہ اپنے اعزا اور احباب کے جمگھٹے میں ہوتا ہے، جس کے کسی گوشۂ تنہائی میں وہ اپنی جسمانی اور ذہنی تکان دور کرتا ہے اور جہاں وہ کبھی شعوری اور کبھی غیر شعوری طور پر شعر کی تخلیق کرتا ہے۔

میں نے لوگوں کو اکثر کہتے سُنا ہے کہ فلاں شخص کا مزاج عجیب و غریب ہے، اس کے اطوار دنیا جہان سے نرالے ہیں تو کیا ہوا۔ وہ بہر صورت ایک فنکار ہے۔ اس کی تلوّن مزاجی، اس کی بدقلمونیت اور اس کے لا اُبالی پن کو صرف اس لئے قابلِ معافی سمجھا جاتا ہے کہ وہ فنکار ہے۔ اسے کسی حد تک خود فراموشی، تساہل، تن آسانی اور بعض دنیوی فرائض سے گریز کرنے کی اجازت ہوتی ہے بالخصوص وہ فرائض اگر ایسے ہوں جنہیں ادا کرنے کے لئے ہاتھ پیر ہلانے کی بھی ضرورت ہو۔ لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ عام لوگوں کے مقابلہ میں فنکار زیادہ خود فراموش کیوں ہوتا ہے۔ غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ اس کا ذہن ہمہ وقت مصروف رہتا ہے۔ بہر صورت یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ فنکار کی بعض کوتاہیوں سے ہر شخص کو سابقہ پڑتا رہتا ہے اور اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسے ایک حد تک قابلِ معافی بھی سمجھنا چاہئے۔ وہ لوگوں سے ملنے کے وعدے کر کے بھول جاتا ہے، اسے اپنے جیب و گریبان کا ہوش نہیں رہتا۔ کہیں جانا ہو تو ٹرین روانہ ہو جانے کے بعد اسٹیشن پہنچتا ہے۔ روپے کا بٹوا کہیں رکھ کر بھول جاتا ہے اور اس کے لئے سارا گھر چھان مارتا ہے لیکن ممکن ہے وہ اس کی جیب ہی میں موجود ہو۔ اس کا فونٹین پن ہمیشہ چوری ہو جاتا ہے۔ اس کے اعزا و اقربا کو طوعاً و کرہاً یہ تمام باتیں برداشت کرنا ہوتی ہیں بلکہ دن بھر کی مسلسل الجھنوں کا نتیجہ کسی نظم، کسی شبیہہ یا تصویر یا کسی اور شاہکار کی شکل میں ظاہر ہو جائے تو اُنہیں اپنی قسمت پر شاکر ہونا چاہئے۔

کئی سال اُدھر کی بات ہے کہ مجھے ایک کوٹ کی گم شدگی کا پہلا تجربہ ہوا۔ ہماری نئی نئی شادی ہوئی تھی اور ہماری آمدنی بہت کم تھی۔ جنگ چھڑ چکی تھی اور قیمتیں تیزی سے چڑھ رہی تھیں۔ میں ہندوستان میں تھی اور میرے والدین انگلستان میں۔ اس لئے ان سے بھی ہمیں کوئی مدد نہیں مل سکتی تھی۔ پھر

تنخواہ بھی اتنی ہی تھی جتنی جنگ سے پہلے ملتی تھی۔ ہمیں شادی یا فنکار کی ان کمزوریوں کے لئے کوئی الاؤنس بھی نہیں ملتا تھا جنہیں وہ اپنا حق تصوّر کرتا ہے۔ اس کے باوجود ہم نے ایک سوٹ بنوا ہی ڈالا۔ نیا سوٹ بنوانا اس زمانے میں ایک عیاشی سے کم نہ تھا۔ فیض اسے لینے کے لئے امرتسر گئے اور رات گئے لاہور واپس آئے۔ ان دنوں ہم نہر کے قریب ایک دور دراز اور الگ تھلگ مکان میں رہتے تھے۔ اُس وقت کوئی تانگے والا وہاں تک جانے پر تیار نہیں ہوتا تھا۔ بڑی مشکل سے ایک تانگے والا اس پر راضی ہوگیا کہ وہ انہیں کچھ دور تک پہنچا دے گا۔ تانگے والے نے فیض کو جس جگہ اتار دیا وہاں سے ہمارا گھر تقریباً ایک میل تھا اور انہیں یہ مسافت پیدل طے کرنی پڑی۔ قیمتی بنڈل ان کے بغل میں دبا ہوا تھا۔ گھر پہنچ کر فیض نے مجھے جگایا اور میں نے بنڈل ان سے لے لیا۔ لیکن اسے ہاتھ میں لیتے ہی میرا ماتھا ٹھنکا۔ کیونکہ اس میں ایک گرم سوٹ ہونے کے باوجود بنڈل بہت ہلکا تھا۔ بنڈل کا ایک کنارا کھلا ہوا تھا اور کوٹ ندارد تھا فیض نے کہا کہ رات بہت ہوگئی ہے اب اسے صبح تلاش کروں گا لیکن مجھے یقین ہے کہ جہاں تانگے والے نے مجھے اتارا تھا وہاں سے گھر تک آنے ہی میں کوٹ کہیں گر گیا ہے۔ لیکن تھوڑی سی بحث کے بعد جو ایک حد تک یک طرفہ تھی یہ طے پاگیا کہ وہ ٹارچ لے کر اسی وقت کوٹ تلاش کرنے چلے جائیں۔ لیکن ان کی تلاشِ نیم شبی کے باوجود کوٹ نہ ملا۔ پتلون البتہ میرے پاس کئی سال تک اور جوں کی توں رکھی رہی۔ اسے کسی نے استعمال نہیں کیا اور ہماری ازدواجی زندگی کے پہلے اسراف کی یاد تازہ کرتی رہی لیکن ۱۹۵۰ء کے سیلاب کے بعد یہ نشانی میرے پاس باقی نہیں رہی۔ اسے ایک مستحق کو دے دیا گیا۔

چند مہینے بعد کپڑوں سے بھرا ہوا ایک سوٹ کیس گم ہوگیا تو میں نے کسی ناگواری کا اظہار تک نہیں کیا۔ لیکن ۱۹۴۹ء میں کراچی جاتے ہوئے فیض کا بستر ایک اور مسافر سے بدل گیا تو میری قوت برداشت قریب قریب جواب دے گئی۔ بستر کھولنے پر مجھے اس میں جو گدا ملا وہ اس گدّے سے بہت اچھا تھا جو کہیں اور چلا گیا تھا لیکن مجھے اپنی جگہ پر کچھ ندامت اور کچھ پریشانی سی تھی کہ اس بستر کے مالک نے اپنے دل میں کیا سوچا ہوگا۔

بعض اوقات میرا یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ فیض کا یہ لاابالی پن ان کی طبعی فراخدلی اور بے نیازی کی غمّازی کرتا ہے اور انہیں کسی چیز کی افادی قدر و قیمت کی کوئی پروا نہیں ہے۔ اس سے صرف ان کی کتابیں مستثنیٰ ہیں جنہیں وہ بڑی حریصانہ نظروں سے دیکھتے ہیں اور انہیں اس طرح اپنے سینے سے لگا کر رکھتے ہیں جیسے کوئی بندۂ زر اور بخیل اپنے مال و دولت پر اپنی جان نچھاور کر رہا ہو۔ لیکن کوئی شخص ان سے کوئی کتاب مانگتا ہے تو ان سے انکار بھی بن نہیں پڑتا۔ جب میں ان سے پوچھتی ہوں کہ تم نے بلا سوچے سمجھے کتاب کیوں دے دی۔ معلوم نہیں اب وہ واپس بھی ملے گی یا نہیں، تو وہ بڑی متانت اور برجستگی سے جواب دیتے ہیں "جب تک کوئی اس کتاب کو پڑھتا رہے اسے دینے کا خطرہ مول لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔"

۱۹۴۷ء میں میرے تمام زیورات چوری ہو گئے۔ میری خوشدامن نے مجھے کچھ چھوٹے چھوٹے لیکن پُرتکلّف زیور دئے تھے۔ چند چیزیں میں نے خود بھی خریدی تھیں۔ چور وہ سب اُٹھا لے گئے۔ میرے اپنے گھر میں یہ پہلی چوری تھی۔ پولیس کی مدد سے بھی ہمیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا اور ہم یہ سوچ کر بیٹھ رہے کہ جانے والی چیز کا غم ہی کیا۔ میرے چہرے پر احساسِ محرومی کی جھلک دیکھ کر فیض کہنے لگے۔ تم نے شاعر کا یہ مصرع نہیں سنا۔ رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو۔ اور میں اچانک یہ محسوس کرنے لگی کہ میرے احساسِ محرومی میں ایک طرح کا احساسِ مخلصی بھی شامل ہوگیا ہے۔ ان دونوں شاعروں سے میری اپنی رائے بھی زیادہ مختلف نہیں ہے۔

میرا یہ قیاس آہستہ آہستہ یقین کی منزل پر پہنچ گیا ہے کہ ہماری بڑی بچی سلیمہ بھی اپنے والد کے نقشِ قدم پر چل رہی ہے اور ان سے کافی مماثل ہے۔ لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں کہ جو لوگ بڑی فراخدلی سے اپنی اچھی سے اچھی چیز دوسروں کو اٹھا کر دے دیتے ہیں یا کسی چیز کی گم شدگی پر ذرا بھی ملول نہیں ہوتے بلکہ جن کے لئے احساسِ محرومی بھی لذّت بخش بن جاتا ہے ان کی معیشت انتہائی مسرّت افزا، ان کی شخصیت انتہائی دلپذیر اور ان کی رفاقت ہمیشہ تفنّنِ طبع کا باعث ہوتی ہے۔ ان خامیوں یا خصوصیتوں کا توڑ کرنے کے لئے خوش قسمتی سے مجھ میں ایک طرح کی ملکیت پسندی پیدا ہوگئی ہے اور کبھی کبھی کوئی ایسی چیز بھی واپس لے لیتی ہوں جس کی واپسی کی کوئی امید نہیں رہ جاتی کیونکہ ہمارے پاس بھی تو کچھ ہونا چاہئے ورنہ ہم دوسروں کو دیں گے کیا؟ منیزہ اپنی بڑی بہن سے زیادہ حقیقت پسند ہے اور ہر چیز کا باقاعدہ حساب رکھتی ہے وہ بہت چھوٹی سی تھی لیکن کتابیں پڑھنے اور تصویریں دیکھنے کی حد سے زیادہ شوقین تھی ایک دن اس نے اپنی باجی کی کتاب اٹھاتے ہوئے پوچھا "باجی۔ میں آپ کی یہ کتاب دیکھ لوں؟" سلیمہ کو بھی اپنی کتابیں بہت عزیز ہیں۔ اس نے جواب دیا "نہیں تم خود اپنی کتاب کیوں نہیں

دیکھتیں" —— "باجی میں اپنی کتاب بہت زیادہ دیکھوں گی تو وہ گھس جائے گی"۔ منیزہ نے جواب دیا۔ فیض کو اس واقعہ کا علم ہوا تو انہوں نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا "ہمارے گھر میں کوئی تو ایسا بھی ہونا چاہئے"۔

ظاہر ہے کہ فیاض اور فراخدل آدمی انسانوں کے ہجوم اور ان کی معیت کو بھی بہت پسند کرتے ہیں۔ عید، ہولی، بسنت اور دوسرے تہواروں پر سیر و تفریح کرنے والوں کا ہجوم دیکھ کر فیض خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ وہ ان کا دور سے تماشہ نہیں دیکھتے بلکہ ان کی رنگ رلیوں میں خود بھی حصہ لیتے ہیں۔ اپنی خاموشی اور کم آمیزی کے باوجود —— اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ ہمیشہ ذہنی یکسوئی، ایک پرسکون گھریلو زندگی اور عزلت گزینی کے متمنی رہے ہیں۔

ہمارے گھر کے معمولات بچوں کے نظام اوقات کے تابع ہیں اور فیض نے اسے بے چون و چرا قبول کر لیا ہے تاکہ بچوں کی باقاعدہ زندگی میں کوئی خلل نہ پڑے یا انہیں کسی قسم کی زحمت نہ ہو۔ ممی کا ہر قول بچیوں کے لئے حکم کی حیثیت رکھتا ہے جس کے خلاف کسی اور عدالت میں اپیل ممکن نہیں۔ رات کو سونے سے پہلے اگر انہیں بہت چھوٹی سی کہانی سنائی جائے یا بچے کہتے رہ جائیں کہ ہم نے ابا جان کو دن بھر سے نہیں دیکھا انہیں آ جانے دیجئے لیکن ممی اگر یہ کہہ دیں کہ نہیں اب سو جاؤ تو ان میں سرتابی کی مجال نہیں۔ بچوں کی پرورش و پرداخت کے معاملات سے اپنی لاعلمی کا اعتراف خود فیض کو بھی ہے اور وہ اکثر کہتے ہیں کہ یہ کام میرے دائرۂ عمل سے باہر ہے۔

جون ۱۹۵۳ء میں فیض جب حیدرآباد جیل میں تھے تو میں نے انہیں ایک خط میں لکھا تھا کہ "ان بچیوں کی بیک وقت ماں اور باپ کے فرائض انجام دینا میرے لئے کتنا مشکل ہے"۔ اس کے جواب میں انہوں نے مجھے یہ لکھا تھا کہ "میری بچیوں کو تم سے اچھی ماں نہیں مل سکتی۔ کتنی خوش نصیب ہیں وہ!" ان کی تعلیم و تربیت سے فیض کی بے تعلقی کے باوجود بچیاں فیض سے بالکل نہیں ڈرتیں بلکہ باپ بیٹیوں نے ایک دوسرے کے عجیب و غریب اور بڑے دلچسپ نام رکھ چھوڑے ہیں۔ ان کے مقدمے کے دوران میں ہمارے وکیل صاحبزادہ نوازش علی خاں مرحوم نے ایک بار جیل جاتے ہوئے مجھ سے پوچھا تھا کہ تم نے فیض کے نام عید کے تار میں جن کبوتروں کا ذکر کیا تھا وہ کون ہیں۔ اور میں نے دونوں بچیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو میرے سامنے اسی وکٹوریا پر بیٹھی تھیں کہا "وہ کیا بیٹھی ہوئی ہیں"۔

منیزہ نو مہینے کی جدائی کے بعد جب اپنے والد سے پہلی بار جیل میں ملی اس وقت اس کی عمر صرف ساڑھے چار سال تھی۔ اس نے انہیں دیکھتے ہی کہا۔ "ابا جان آپ تو بالکل بوڑھے ہو گئے۔ میں تو سمجھتی تھی کہ آپ کی عمر بہت کم ہو گی اور آپ بڑے خوبصورت ہوں گے۔ ارے آپ کے تو بال بھی سفید ہو گئے"۔ لیکن ان کی گود میں پہنچتے ہی جیسے وہ بالکل ہی بدل گئی اور اس نے کہنا شروع کیا "ابا جان آپ گھر نہیں چلیں گے۔ امی مجھے مارتی ہیں"۔ یہ سن کر جیسے میری اندر کی سانس اندر اور باہر کی باہر رہ گئی۔ کیونکہ بچوں کو مارنا ہمارے خاندان میں قریب قریب بالکل منع ہے۔ لیکن فوراً ہی میں نے محسوس کیا یہ شکایت بڑی بامعنی ہے اور وہ دراصل کہنا چاہتی ہے کہ گھر میں ان کی کمی کس شدت سے محسوس کی جاتی ہے۔

منیزہ انہیں ہر خط میں یہ ضرور لکھتی ہے کہ دیکھئے میرا خط کسی اور کو نہ دکھایئے گا۔ لیکن اسے کیا معلوم کہ ان کے نام جتنے خط جاتے ہیں ان کے ایک ایک لفظ کو سنسر بڑے غور سے پڑھتا ہے۔ پچھلے سال ایک بار منٹگمری جیل کے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ مسٹر لودھی کی تو شامت ہی آ گئی۔ بے چارے نے کہیں اس سے یہ کہہ دیا کہ تم نے اپنے ابا جان کو جو خط لکھے ہیں وہ مجھے بہت پسند آئے۔ یہ سنتے ہی منیزہ غصے سے سرخ ہو گئی اور ان پر برس پڑی "چھوٹی بچی بڑی لڑاکا، چلبلی اور زود حس ہے، غصہ تو اس کی ناک پر رکھا رہتا ہے۔ لیکن وہ محبت کا ایک ننھا منا مجسمہ بھی ہے۔ اس میں صبر و تحمل کی ضرور کمی ہے لیکن اس کے باوجود وہ بڑی دلچسپ اور باغ و بہار ہے ہم میں ہمت ہوتی تو غالباً ہم سب اسی طرح بن جانا چاہتے۔ اس میں اپنے والد کا بے پایاں صبر و تحمل نہیں، نہ وہ اپنی بڑی بہن کی طرح متین اور سلیم الطبع ہے۔ بلکہ بعض رشتے والیاں تو یہ کہتی ہیں کہ یہ بالکل اپنی ماں پر گئی ہے۔ لیکن میری رائے میں اس کی تصدیق تو اس کی نانی اماں ہی کر سکتی ہیں۔

بعض لوگ مجھ سے کہتے ہیں آپ تو بڑی اچھی اردو بول لیتی ہیں۔ شاید یہ فیض کا اثر ہے۔ حقیقت اس کے برعکس نہ سہی مگر اس سے مختلف ضرور ہے۔ باتیں میں کچھ فطری طور پر آسانی سے سیکھ لیتی ہوں لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہم جس ماحول میں رہتے ہیں وہ ادبی اور بول چال کی زبان سیکھنے کے لئے انتہائی سازگار ہے۔ جہاں تک بچیوں کا تعلق ہے فیض کی ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ وہ اردو ہی کو اپنائیں۔ وہ اکثر کہتے ہیں کہ بچیاں میری "خوشدامنی زبان" تو بہر صورت سیکھ لیں گی اور ان کی ماں اسے سکھانے کے لئے کافی ہے لیکن اب اپنی زبان پر عبور حاصل کرنے کی ضرورت تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے جس وقت تمام گھر والے بیٹھے ہوتے ہیں اور آپس میں باتیں ہوتی ہیں تو بچیاں کبھی ایک زبان بولتی ہیں کبھی دوسری۔ وہ مجھ سے انگریزی میں اور فیض سے اردو میں باتیں کرتی ہیں اس لئے کسی خاص کوشش کے بغیر وہ دونوں زبانیں بولنے لگی ہیں۔

بعض دوست مجھ سے سوال کرتے ہیں کہ تم نے کبھی فیض کو غصے کے عالم میں بھی دیکھا۔ فیض اپنی نرم مزاجی کے لئے مشہور ہیں اور ہر شخص کو معلوم ہے کہ غصہ انہیں کبھی آتا ہی نہیں۔ میں اپنے دوستوں کو یقین دلانا چاہتی ہوں کہ گھریلو زندگی میں بھی انہوں نے کبھی کسی آبگینے کو ٹھیس نہیں لگائی۔ میرا یہ جواب سُن کر ایک بار ایک دوست نے بڑی نیک نیتی کے ساتھ کہا تھا کہ جنگ کے بعد ملاپ میں جو مزہ ملتا ہے اس کی لذت سے تم محروم ہو۔ یہ درست ہے کہ ہم اس مسرّت سے محروم رہے ہیں جسے معلوم نہیں مسرّت کہا بھی جا سکتا ہے یا نہیں لیکن اس کرب اور کوفت سے ہم یقیناً محفوظ رہے۔ جو برافروختگی یا جلد بازی کے عالم میں کوئی بات کہہ جانے میں اس پر متاسف ہونے سے ہوتی ہے ہم اپنے اختلافات پر باتیں ضرور کرتے ہیں لیکن بات اس سے آگے کبھی بڑھنے ہی نہیں پاتی اور آخر کار ہم اختلاف رائے ہی پر متفق ہو جاتے ہیں۔

ہماری خانگی زندگی کے اس پہلو پر ایک بار جوش صاحب نے بڑا دلچسپ تبصرہ کیا تھا۔ ۱۹۴۶ء میں وہ دہلی آئے۔ اس سے پہلے ان سے سری نگر میں ہماری شادی کے موقع پر ملاقات ہوئی تھی لیکن عقد کے بعد ہی ایک مشاعرہ شروع ہو گیا جس میں انہوں نے اور مجاز نے خوب خوب اپنا کلام سنایا۔ اس لئے باتیں کرنے کا موقع ہی نہیں مل سکا اور اسے بعد کے لئے اٹھا رکھ گیا۔ دہلی میں ملاقات ہونے پر انہوں نے مجھ سے سوال کیا۔ "آپ اور فیض میں لڑائی بھی ہوتی ہے یا نہیں؟ میرا جواب نفی میں سُن کر انہوں نے افسوس کے ساتھ اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا "کتنے افسوس کی بات ہے یہ؟" انہوں نے اپنا جملہ پھر دُہرایا لیکن اُن کی آنکھوں میں تمسخر جھلک رہا تھا۔ "یہ بڑے ہی افسوس کی بات ہے۔ پھر آپ لوگوں میں محبت کیسے ہو سکتی ہے؟" میں نہیں کہہ سکتی کہ جوش صاحب نے یہ نتیجہ کیسے اخذ کیا لیکن میں آج تک ان سے اتفاق رائے نہیں کر سکی۔

ہماری ازدواجی زندگی کے دوران میں دکھ درد اور رنج و ملال کے مواقع بھی آئے ہیں۔ میں نے فیض کو ایک پیاری بہن، ایک بھائی اور بہت سے عزیز اور محبوب دوستوں سے محروم ہوتے دیکھا ہے۔ لیکن وہ جیسے ان غموں کو برداشت کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ان کی جبین کبھی شکن آلود نہیں ہوتی۔ ان میں ایک ایسا تحمل اور ایک ایسی رجائیت پیدا ہو گئی ہے جو محض موضوعی نہیں ہے بلکہ ان کا فلسفۂ حیات۔ اور ان کی امیدیں اس کی آئینہ دار ہیں۔ انسان کی فطری شرافت پر ان کا عقیدہ بہت راسخ ہے۔ یہ شرافت ناسازگار حالات میں مسخ تو ہو جاتی ہے لیکن اس کا وجود ختم کبھی نہیں ہوتا۔ وہ کہتے ہیں کہ انسانی فطرت کا جائزہ لیتے ہوئے ہم اس کی خامیوں ہی پر کیوں انگشت نمائی کریں ہم اس کی خوبیوں کی بات کیوں نہ کریں یا انہیں اپنا موضوع سخن کیوں نہ بنائیں۔

گزشتہ ساڑھے تین سال میں انہوں نے مجھے بارہا لکھا ہے کہ بچیوں کو خوش رکھو اور انہیں سُکھ پہنچاؤ۔ انہیں رنج و غم سے روشناس کرنے کے لئے کافی وقت پڑا ہے اور بچیاں بھی اپنی تمام پہیلیاں، لطیفے اور پُر مذاق کہانیاں اپنے والد سے ملاقات کے لئے اٹھا رکھتی ہیں ان کی باتیں سُن کر اکثر سنگدل اور ترش رو وارڈر بھی اپنی ہنسی ضبط نہیں کر سکے۔ فیض نے غم کا ایک روشن اور اثباتی پہلو بھی تلاش کر لیا ہے یعنی غم کے باوجود حصولِ مسرّت کے لئے مسلسل جدوجہد۔

ہمارے گھر میں اگر کسی کی سالگرہ ہو تو خوب خوشیاں منائی جاتی ہیں اور ایک دوسرے کو تحفے دیئے جاتے ہیں۔ مجھے ننھی سلیمہ کی پہلی سالگرہ کی تقریب ابھی تک اچھی طرح یاد ہے۔ فیض تہیہ کر چکے تھے کہ وہ اس کے لئے تحفے ضرور لائیں گے۔ لیکن میرا دعویٰ ہے کہ اتنے چھوٹے بچے کے قابل تحفوں کے انتخاب

کے لئے صرف پدری محبت کافی نہیں ہے - اس زمانے میں ہم دہلی میں رہتے تھے - وہ اور مجید ملک خریداری کی مہم پر روانہ ہوئے اور کناٹ پلیس سے واپس آئے تو بنڈلوں سے لدے ہوئے تھے - وہ بچوں کی ایک چھوٹی سی گاڑی، تصویروں کی ایک کتاب اور ایک ٹی سٹ لے کر آئے تھے لیکن ایک بنڈل ابھی تک نہیں کھلا تھا - اور ہر شخص یہ دیکھنے کا مشتاق تھا کہ اس میں کیا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ پارسل میں ایک ننھی منی خوبصورت سی گڑیا ہے جو گاڑی پر شان سے بیٹھ کر سیر کرے گی - لیکن ان دونوں نے اس کی خریداری سے پہلے گڑیا کے کپڑے اٹھا کر دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی کیونکہ جسے وہ گڑیا سمجھ کر خرید لائے تھے وہ دراصل ایک ٹی کوزی تھی جسے آخر کار آتش دان پر فروکش کر دیا گیا اور گاڑی پر سواری کے لئے ایک اور گڑیا خرید لی گئی جو اتنی خوبصورت تو نہیں تھی لیکن تھی وہ گڑیا ہی - انگلستان کے ہر خاندان میں سالگرہ کے موقع پر بڑی خوشیاں منائی جاتی ہیں لیکن پاکستان میں پیدائش کے اندراج اور ولادت کے سرٹیفکیٹ کے اندراج کا باقاعدہ انتظام نہ ہونے کی وجہ سے عموماً یہی مسئلہ حل نہیں ہوتا کہ سالگرہ منائی کب جائے - میں نے ایک بار اپنی خوشدامن سے فیض کی تاریخ ولادت دریافت کی کیونکہ میری رائے میں یہ کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا کہ سب کی تو سالگرہ منائی جائے لیکن صاحبِ خانہ ہی اس تقریب سے محروم رہے - ان کا جواب بہت مبہم لیکن انتہائی دلچسپ تھا - انہوں نے کہا کہ مجھے صحیح تاریخ تو یاد نہیں لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ ان کی ولادت کے وقت بارش ہو رہی تھی - مگر یہ کسی کو یاد نہیں تھا کہ بارش گرمیوں میں ہو رہی تھی یا سردیوں میں یا بادل محض اتفاق سے گھر کر برسنے لگے تھے - بعد میں فیض کے ایک ماموں نے ہماری مشکل حل کر دی انہیں صحیح تاریخ یاد تھی اور یہ وہی تاریخ تھی جو ان کے میٹرک کے سرٹیفکیٹ میں درج ہے -

میں ۱۹۳۸ء میں ہندوستان آنے کی تیاریاں کر رہی تھی کہ میری روانگی سے چند ہی روز قبل لندن میں مسز تاثیر کا خط ملا جس میں انہوں نے ایک انتہائی عزیز دوست کے لئے بعض چیزیں منگائی تھیں - اپنی مصروفیت کے باوجود میں ان فرمائشوں کی خریداری کے لئے آکسفرڈ سٹریٹ میں بھاگی بھاگی پھری اور ان کے دوست کو برا بھلا کہتی رہی - نئی چیزوں کے لئے جگہ نکالنے کے لئے مجھے اپنا سامان کئی بار کھولنا باندھنا پڑا - اس وقت مجھے کیا معلوم تھا کہ کچھ دن بعد یہی چیزیں میری اپنی گرہستی بن جائیں گی - لیکن اس کا احساس مجھے اب ہوتا ہے کہ اس انتہائی عزیز دوست نے عین وقت پر جن چیزوں کی فرمائش کی تھی ان پر متعجب ہونے کی کوئی ضرورت نہیں تھی -

اپنی شاعرانہ شہرت قائم رکھنے کے لئے ہر شاعر کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ برابر شعر کہتا رہے - لوگ مجھ سے پوچھتے تھے کہ شادی کے بعد فیض نے شاعری کیوں ترک کر دی - لیکن یہ درست نہیں کہ انہوں نے شاعری ترک کر دی تھی ۱۹۵۰ء تک وہ کبھی کبھی کچھ نہ کچھ لکھتے رہے اور اس دوران میں بھی انہوں نے بعض نظمیں اور غزلیں بڑی معرکتہ الآرا کہی ہیں - لیکن یہ درست ہے کہ انہوں نے زیادہ نہیں لکھا - فیض اس کا جواب یہ دیتے تھے کہ شاید اب میں بہت زیادہ آسودہ خاطر ہو گیا ہوں اور میری بہت زیادہ خبرگیری کی جاتی ہے - لیکن اچھی شاعری کے لئے شاید تکلیف اور غم ضروری ہے - "دستِ صبا" کی نظموں اور غزلوں کا محرک بھی ان کا غم ہی ہے لیکن یہ محض ان کا ذاتی غم نہیں بلکہ ایک وسیع تر غم ہے - "دستِ صبا" کے متعلق انہوں نے جیل سے مجھے لکھا تھا "یہ مجموعہ تمہارا ہے"۔

جب آسمان پر بادل چھا جاتے ہیں اور تیز ہوا چلنے لگتی ہے تو شاعر کی رگِ احساس بھی بھڑک اٹھتی ہے - اس کی شاعری اس کے دل میں کروٹیں بدل کر بیدار ہو جاتی ہے اور وہ سوال کرتا ہے "کیا میں دن کا باقی حصہ باغ میں گزار سکتا ہوں - ممکن ہے میں کوئی نظم کہنے میں کامیاب ہو جاؤں"۔ کئی گھنٹے کے بعد وہ واپس آتے ہیں تو میں ان کی آہٹ سن کر اندازہ لگا لیتی ہوں کہ انہیں کامیابی ہوئی یا نہیں - ان کے برعکس تاثیر مرحوم آمد کے وقت اپنی کشمیری شال اوڑھ کر بیٹھ جاتے، کبھی دبی زبان سے کراہتے، کبھی جھومنے لگتے اور پھر شعر ہو جاتا -

ہمارا عموماً یہ خیال ہوتا ہے کہ شاعر اور فنکار عجوبہ روزگار اور دنیا زمانے سے نرالے ہوتے ہیں - لیکن وہ دوسرے انسانوں سے اس لئے مختلف ہوتے ہیں کہ ان کا مشغلہ خالص ذہنی ہوتا ہے اور ان کی عرق ریزی اور جگر کاوی کا نتیجہ ہر کس و ناکس کے لئے نہیں ہوتا اور اس سے ہر شخص محظوظ نہیں ہو سکتا - لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ اس کی ذمہ داری دراصل ہمارے معاشرے پر ہے جو ایسے حالات پیدا کرنے میں ناکام رہا ہے جن میں ہر شخص شاعری یا مصوری سے تو لطف اندوز

ہو سکتا ہے لیکن شاعر یا فنکار کی ذات سے نہیں۔ فنکار کا مشغلہ چونکہ خالص ذہنی ہوتا ہے اس لئے وہ اس دنیا کی حدوں سے نکل جاتا ہے، اسے اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہتا، اپنے گھر بار اور روزمرہ کی مزدوریوں کی پروا نہیں رہتی۔ اسے ایسے رفقا کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کے دنیاوی معاملات کی دیکھ بھال کر سکیں۔ یہ مہمّت خواں اگر آسانی اور خوش اسلوبی سے طے ہو جائیں تو شاعر، مصوّر یا مصنف اپنی دنیا میں کھو سکتا ہے اور اسے یہ اطمینان ہوتا ہے کہ کار دنیا تمام ہو چکے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ مصنفوں کی ایک بہت بڑی تعداد اپنی تصانیف کو اپنے دوستوں اور ان لوگوں کے نام معنون کرتی ہے جو انہیں عزیز ہوتے ہیں کیونکہ وہ نہ ہوتے تو ان کی تصنیف بھی تشنۂ تکمیل رہ جاتی۔ اور مجھے یقین ہے کہ فیض نے "دست صبا" کا مسودہ بھیجتے وقت مجھے جب یہ لکھا تھا کہ "یہ تمہاری ہے" تو اُن کا بھی یہی مطلب تھا۔

کنہیّا لال کپور

فکر تونسوی

کنہیّا لال کپور سے میری پہلی ملاقات کب ہوئی؟ یہ مجھے بالکل یاد نہیں۔ شاید وہ ملاقات کوئی اہم واقعہ نہ ہو۔ یا شاید کپور اس کا اہل نہ ہو کہ پہلی ملاقات پر کوئی گہرا نقش چھوڑ جائے ——— (یا شاید میرے مادّۂ قبولیت میں ہی کوئی نقص ہو سکتا ہے)

لیکن اب یہ عالم ہے کہ کپور سے ملنے کے لئے طبیعت میں اُبال سا اُٹھنے لگتا ہے۔ حالانکہ وہ نہ حسین و جمیل جسم کا مالک ہے نہ اس کے لمبے تڑنگے قد میں کوئی کشش ہے اور نہ اس کی گفتگو اور لب و لہجہ میں کوئی چکنی تلی شائستگی ہے۔ صرف ایک لیڈی کٹ عینک کے سوائے اس کی پوری شخصیت میں کوئی چیز چمکیلی نہیں ہے ——— بدن کے ماہرین کا خیال ہے کہ ہر شخصیت کے جسم میں سے کچھ خاص قسم کی لہریں نکلا کرتی ہیں۔ ان لہروں کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک قسم کی لہریں اپنی طرف کھینچتی ہیں مگر دوسری قسم کی لہریں دھکے دے دے کر اپنے سے دور پھینکتی ہیں۔ کپور کے نصیب میں دوسری قسم کی لہریں لکھی ہیں جو جسم سے پھوٹتی ہیں تو انسان کو بھگا دیتی ہیں۔ سیّد سجاد ظہیر اور کپور متذکرہ بالا دونوں قسم کی لہروں کے دو الگ الگ نمائندے کہے جا سکتے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود میرا عالم یہ ہے کہ میں کپور سے ملنے کے لئے مضطرب ہو اُٹھتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ میرے اپنے عالم یعنی میری اپنی لہروں میں ہی کوئی گڑبڑ ہے، ورنہ کپور کے لئے مضطرب ہونا کہاں کی دانشمندی ہے؟

وہ شہروں میں رہتا ہے مگر دیہاتی خدوخال رکھتا ہے۔ اگر وہ کسی گاؤں کے جاگیردار کا بیٹا ہوتا تو ضلع کا مجسٹریٹ بن کر اپنی دیہاتیت کو چھپا لیتا مگر وہ تو ایک غریب پٹواری کا بیٹا ہے جس کی پرورش اور تربیت لائل پور کے ضلع کے جانگلی بلوچوں کے درمیان ہوئی۔ اس لئے اب چاہے وہ یونیورسٹی کا چانسلر ہی کیوں نہ ہو جائے اور بورژوا سوسائٹی کے آداب ہی کیوں نہ اپنا لے لیکن محفل میں وہ توس پر آملیٹ رکھ کر ہاتھوں سے ہی کھانے لگے گا چھری کانٹے سے نہیں۔ کیونکہ وہ تو ٹھونسی ہوئی بناوٹ کا مذاق اُڑانے کے لئے پیدا ہوا ہے۔ خود اس کا شکار ہونے کے لئے نہیں۔

لیکن کپور کا خیال ہے کہ وہ پھر بھی مایوس نہیں ہے۔ اس جنم میں اسے فطرت کی طرف سے جتنی بھی چیزیں ودیعت نہیں کی گئیں وہ اگلے جنم میں مل جائیں گی۔ اگلے جنم میں بھی نہ ملیں تو اس سے اگلے میں ملیں گی۔ انسان کو ابھی چوراسی لاکھ مرتبہ جنم لینا ہے اس لئے جلنے اور کڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں ——

"چوراسی لاکھ جنم کا آئیڈیا بہت مسرت انگیز ہے۔" وہ ایک سنجیدہ قہقہہ لگا کر کہتا ہے۔ "یہ آئیڈیا سینے میں امید کی مشعلیں جلا دیتا ہے۔ چنانچہ میں آنے والے کسی نہ کسی جنم میں ہر ایک سے انتقام لوں گا۔ راجندر سنگھ بیدی سے، کرشن چندر سے، فکر تونسوی سے۔ ہا ہا ہا ہا ہا ———"

کیا کپور یہ بات کہہ کر "چوراسی لاکھ جون" کے آئیڈیا پر طنز کرتا ہے؟ کون کہہ سکتا ہے۔ کپور کی کسی بھی بات کا کیا اعتبار ہے۔ کیونکہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے ہی دیکھ رہا ہے کہ وہ ساٹھویں سال میں داخل ہو چکا ہے۔ جس میں سے عمر کا بیشتر قیمتی حصہ (اس کے خیال میں تین بٹہ چار حصہ) تو ضائع چلا گیا ہے یعنی ایک پورا جنم تباہ و برباد ہو گیا ہے اور اب جبکہ "دمِ واپسیں اب سرِ راہ ہے" تو اب چاہے وہ انڈیا کا پریذیڈنٹ ہی کیوں نہ بن جائے اس سے کیا فرق پڑے گا۔ خوشی اور رومینٹک کے وہ لمحے تو ہاتھوں سے نکل ہی گئے، جبکہ وہ ایک دور افتادہ گاؤں میں سوکھے ٹکڑوں پر پلتا رہا۔ تلخیوں کے زہریلے گھونٹ پیتا رہا، یہاں تک کہ آٹھویں سال ہی میں ماں کی ممتا سے بھی محروم ہو گیا۔ اس لئے اب چاہے پورا بھارت اس کی رانی بن جائے وہ اس سے محبت کی کونسی لہر کھینچ سکے گا۔

اس لئے آنے والے جنم پر بھروسہ رکھو اور قہقہے اڑاتے چلے جاؤ۔

یہ قہقہے وہ اپنے مضامین میں بھی اُڑاتا ہے اور روزمرّہ زندگی میں بھی یہ قہقہے اسے اپنے داخلی کرب و غم سے فرار اختیار کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ وہ غم سے بھاگ کر قہقہہ کے دامن میں پناہ لیتا ہے، چاہے کوئی سا بھی غم ہو۔ وہ اس سے بھاگ جائے گا۔ اگر اسے کسی حسین ترین عورت نے نگاہِ التفات سے نہیں دیکھا اور اس کے ذہن و دل میں غم کی ایک سیاہ لکیر چھوڑ گئی تو کپور اس حسین عورت پر آوازے کسے گا۔ اس کے حسن پر نہیں بلکہ اس کی بدذوقی پر۔ وہ اس حسین عورت کا یہ کہہ کر مذاق اُڑائے گا کہ تمہیں تو غالب کا ایک شعر سمجھنے کی بھی تمیز نہیں —— گویا یہ کپور کا ایک فرار ہوگا جسے وہ بے التفاتیٔ حسن کے غم سے نجات پانے کے لئے اختیار کرے گا۔

کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے جیسے طنز نگار کپور بڑا بہادر اور جیالا انسان ہے۔ کیونکہ وہ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کو ایک ہی فقرہ میں چٹکیوں سے اُڑا دیتا ہے لیکن کبھی کبھی اس کی بزدلی دیکھ کر اس کے جیالے پن پر شبہ ہونے لگتا ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کسی کالج میں اسے پرنسپل بننے کا یقینی چانس مل رہا تھا۔ کپور کی اپنی بھی یہی خواہش تھی کہ اتنی عمر پروفیسری کرتے بیت گئی۔ اب اسے پرنسپل ضرور بن جانا چاہئے۔ کوالیفکیشن، تجربہ اور سفارش سبھی کچھ مکمل تھا۔ اسے انٹرویو کے لئے بُلایا گیا اور اس پر سوالات کئے گئے:

"کیوں جناب! کیا آپ سپورٹس میں دلچسپی رکھتے ہیں؟"

"جی نہیں!"

"کیا کالج میں کلچرل فنکشن کروا سکتے ہیں؟"

"جی نہیں!"

"کیا آپ کالج کی ازسرِ نو تنظیم میں حصہ لیں گے؟"

"جی نہیں!"

اور پھر کپور نے مجھے بتایا کہ وہ یہ سُن کر بے حد مسرور ہوا کہ انٹرویو بورڈ اسے نہایت نااہل سمجھتا ہے اور اسے پرنسپل بننے کا چانس نہیں دیا جائے گا۔ اس نے جان بوجھ کر سبھی جوابات نفی میں ہی دئے تاکہ اسے ایک ذمہ دار پوسٹ سے فرار ہونے کا لطف حاصل ہو سکے۔

یہی حالت اس کی گھریلو زندگی میں ہے۔ وہ گھر سے بھاگنا چاہتا ہے۔ حالانکہ سات بچے ایک بیوی اور ایک باپ اسے معاشی طور پر اپنے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ لیکن پھر بھی اس کا یہ فارمولا ہے کہ جب تک آدمی جاگتا ہے، جب تک اس کی آنکھیں بیدار ہیں اسے گھر میں دن اور رات بھر میں زیادہ سے زیادہ ایک آدھ گھنٹہ ہی رہنا چاہئے اور باقی وقت گھر سے باہر حالتِ فراری میں گذارنا چاہئے۔ چنانچہ اگر اس کا بچہ بیمار ہے تو وہ اسے اس ڈر سے ڈاکٹر کے ہاں نہیں لے جائے گا کہ کہیں ڈاکٹر یہ نہ کہہ دے کہ بچہ کا بچنا محال دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ وہ اس مفروضہ خوف سے فرار چاہنے کے لئے بیوی سے کہہ دیتا ہے کہ تم خود جا کر اسے دکھا آؤ۔ وہ یہ جانتا ہے کہ بیوی سودا سلف خریدنے نئے بازار جائے گی تو ڈیوڑھے دام دے آئے گی

لیکن وہ اس نقصانِ مایہ کو ہنسی خوشی برداشت کرے گا۔ وہ تو یہاں تک جانے کو تیار ہو جاتا ہے کہ اس کی پینٹ کا کپڑا خریدنے کے لئے آٹھ سالہ بچے شمبو کو بھیج دیا جائے۔ زیادہ سے زیادہ کتنا فرق پڑے گا آخر؟ یہی پانچ' دس' بارہ روپے کا؟ مگر فرار تو ایک بیش قیمت چیز ہے۔ پانچ دس بارہ روپے سے کہیں زیادہ قیمتی ——!!

اور اس فراریت کے حق میں اس کے پاس بڑی بڑی دلچسپ دلیلیں بھی ہیں، مثلاً وہ کہتا ہے کہ دنیا کی یہ ساری جدوجہد آسائش کے لئے ہے آسائش اور فراریت کی سرحدیں بالکل قریب قریب ہیں۔ تم کام کس لئے کرتے ہو؟ اس لئے کہ کام کرنے کے بعد کام سے فرار حاصل کر کے پک نک پر چلے جاؤ۔ تم کام کے زیادہ بوجھ کو مشینوں پر کیوں ڈالنا چاہتے ہو؟ تاکہ تم کام سے فرار حاصل کر سکو۔ اور پھر وہ نہایت غرور سے گردن اٹھا لیتا ہے اور کسی حد تک جھجکتے ہوئے بےباکانہ لہجہ میں کہتا ہے —— "سوویت روس میں بھی تو کام کے چھ گھنٹے مقرر کئے گئے ہیں۔ آخر کیوں؟ کیا اسی لئے نہیں کہ باقی اٹھارہ گھنٹے کے لئے انسان فرار کی لذت سے آشنا ہو سکے۔ گویا وہاں اٹھارہ گھنٹے فرار کے اور چھ گھنٹے کام کے ہوتے ہیں۔"

اور جب میں اس مسئلہ پر اس سے شدید اختلاف کرتا ہوں اور اسے کہتا ہوں کہ "کپور صاحب! آپ صرف اپنی ذاتی فراریت پسندی کو صحیح ثابت کرنے کے لئے سوویت روس کی مثال کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں ——" تو وہ (شاید ایک طنزیہ ہنسی) ہنس کر کہتا ہے —— "توڑنا مروڑنا بھی تو ایک فرار ہی ہے جو چیز کی اصلیت کے مقابلہ پر اختیار کیا جاتا ہے۔"

اور فرار کا یہ جذبہ اس وقت نقطۂ عروج پر پہنچ گیا جب لاہور چھوڑنے کے بعد کپور نے موگا ایسے معمولی قصبہ کا رخ کیا اور بمبئی یا دہلی کی بجائے موگا کو اپنی فراریت کا مسکن بنا لیا۔ موگا سے بھاگ کر وہ کہاں جائے گا؟ اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ موگا کے بعد مختصر ترین جگہ قبر ہی ہے ——
(لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ موت سے فرار اختیار نہیں کرے گا؟)

اس کا حلقۂ احباب بہت مختصر ہے۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ اس نے کوئی ایسا دوست نہیں بنایا جس پر وہ جی جان سے مٹ جائے تو زیادہ مناسب رہے گا۔ یوں کہنے کو تو اس کے سینکڑوں دوست ہیں مگر میرا خیال ہے کہ کپور نے کسی کو اپنا دل نہیں دیا۔ اگرچہ اس میں کپور کی بدمزاجی کو دخل نہیں ہے کیونکہ ٹریجڈی یہ ہے کہ اس کے پاس دل کی مقدار ہی بے حد کم ہے۔ وہ کسی کے لئے بھی بے محابا نہیں تڑپ سکتا۔ نہ اس کی یاد میں تارے گن سکتا ہے نہ آہیں بھر سکتا ہے —— یہ بات بھی نہیں ہے کہ وہ جذبات سے بالکل کورا ہے۔ بلکہ جھگڑا صرف مقدار کا ہے۔ وہ اگر کسی کو اپنی محبت سونپتا ہے تو دل سے نہیں بلکہ دماغ سے۔ اس کا دماغ ہی محبت کا فیصلہ کرتا ہے —— اگر کوئی مرد ذہانت سے عاری ہے تو چاہے وہ یوسفِ ثانی ہی کیوں نہ ہو کپور اسے منہ نہیں لگائے گا۔ وہ کہتا ہے کہ مرد کو ذہین اور عورت کو حسین ہونا چاہئے۔ عورت کے حسن کا فیصلہ بھی وہ دل سے نہیں دماغ سے کرتا ہے —— علمِ جمالیات کے فیتے سے ہی وہ حسنِ نازک کو ماپتا ہے۔ پورا اترا تو زہے نصیب۔ ورنہ کنڈم!"

ہاں اس کے ایسے احباب کی تعداد بے شمار ہے جو کپور کو اپنا دوست سمجھتے ہیں۔ مگر کپور انہیں بناتا رہتا ہے —— کیونکہ اگر کپور کسی کو نہ بنائے تو اس کی زندگی اجیرن ہو جائے۔ ایک مرتبہ اس نے ایک نہایت بدصورت شاعر کو اپنا دوست بنایا۔ یہ شاعر اسے لاہور کے کافی ہاؤس میں ملا۔ وہ اپنے نہایت ہی گھٹیا شعر سُنا سُنا کر محفل سے اپنا مذاق اڑوا رہا تھا۔ کپور نے اس کے اشعار کی تعریف و توصیف شروع کر دی اور نہایت سنجیدہ لہجہ میں اہلِ محفل کے سامنے اشعار کی گہری خوبیوں کو اجاگر کرنے لگا۔ بدصورت شاعر کپور پر لٹو ہو گیا۔ دوستی کا ہاتھ آگے بڑھایا جسے کپور نے بڑے خلوصِ قلب کے ساتھ پکڑ لیا۔ یہاں تک کہ سبھی سمجھنے لگے کہ کپور اور بدصورت شاعر میں گاڑھی چھن رہی ہے۔

ایک بار وہی شاعر اسے مال روڈ پر مل گیا۔ علیک سلیک ہوئی۔ شاعر نے جذباتِ محبت سے چور چور ہو کر کہا "کپور صاحب! مجھے کوئی خدمت بتائیے۔ میں آپ کے کسی نہ کسی کام آنا چاہتا ہوں۔"

کپور نے کہا "رہنے دیجئے، دوستی میں بے تکلفی ہی اچھی رہتی ہے۔"

شاعر نے کہا "آپ میرے مخلصانہ جذبات کو ٹھکرا رہے ہیں۔"

کپور بولا "تو پھر آپ میرا صرف ایک چھوٹا سا کام کر دیجئے۔"

شاعر بولا "فرمائیے۔"

کپور نے نہایت سادگی سے کہا "آپ ذرا تکلیف فرما کر چند منٹ کے لئے میرے غریب خانہ پر تشریف لے چلئے۔"

شاعر نے کہا "وہاں کیا کام کرنا ہوگا مجھے؟"

کپور نے کہا "کچھ بھی نہیں۔ میں صرف آپ کو اپنی بیوی سے ملاؤں گا اور پھر اسے بتاؤں گا کہ دیکھو تم مجھ پر خواہ مخواہ کڑھتی ہو۔ حالانکہ دنیا میں مجھ سے بھی زیادہ بدصورت آدمی موجود ہیں ــــ"

تو کیا اس کے اس بناتے رہنے میں صرف تفریح کو دخل ہے؟ کیا وہ صرف طنز کرتا ہے اور ابلیسانہ لذت اخذ کر کے رہ جاتا ہے؟ کیا وہ اس کردار ـــــ یا اس کیفیت کے ساتھ ہمدردی رکھتا ہے۔ جس پر وہ اپنے طنز کا نشتر چلاتا ہے؟ نہیں! کپور یہ بات نہیں مانتا۔ وہ کہتا ہے اگر میں طنز کرتے وقت ہمدردی کے جذبہ کی لپیٹ میں آجاؤں تو میرا وار خطا جائے گا۔ اور اگر خطا نہیں جائے گا تو پھس پھسا واعظ ہو کر رہ جائے گا۔ میں واعظ نہیں ہوں بلکہ طنز نگار ہوں۔ جس کیفیت یا جس کردار کی مضحکہ خیز حرکت پر میں طنز کر رہا ہوں، وہ مجھے ناپسند ہوتی ہے۔ میری پسند کیا ہے؟ یہ سوچنا اسی کا کام ہے جس پر وار کیا جا رہا ہے۔ میرا کام رحم کرنا نہیں ہے بلکہ قابلِ رحم افراد اور کیفیتوں پر چوٹ کرنا ہے کسی میں دانائی ہو تو اس چوٹ میں لپٹی ہوئی ہمدردی کے لطیف ترین عناصر ڈھونڈھ لے۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟

چنانچہ اسی بنا پر وہ کیفیتوں کو بناتا رہتا ہے۔ جو لوگ اس کی طنز کا نشانہ بنتے ہیں، ان کی تین قسمیں بن جاتی ہیں۔ ایک وہ جو شکار رہتے ہیں اور آخری دم تک اسی سادگی کے ساتھ بنے رہتے ہیں۔ ایک وہ جو اس کی طنز کے راز کو پا جاتے ہیں اور جل کر کباب ہو جاتے ہیں اور اس سے گھٹیا قسم کے انتقام لینے پر تل جاتے ہیں اور ایک وہ جو چوٹ سہہ کر اسے جب سہلانے لگتے ہیں تو شدتِ لذت سے مسکرا دیتے ہیں اور ان کی آنکھوں سے تبسّم آمیز آنسو بہہ نکلتے ہیں اور طنز کے اثر کی یہی معراج ہوتی ہے۔

ایک مرتبہ جب وہ پہلگام کی سیر کو جا رہا تھا تو راستے میں اسے ایک بہت بڑے پنجابی زمیندار کے ساتھ سفر کرنے کا موقعہ مل گیا جسے اپنے بھدّے اور بھاری گلے پر سُریلے اور رسیلے ہونے کا یقین تھا۔ چنانچہ اسی مضحکہ خیز یقین کی بنا پر کپور نے اسے بتایا کہ کیا آپ نے کشمیر میں اُبلتی ہوئی چائے کے تالاب بھی ملاحظہ فرمائے ہیں ــ تو زمیندار نے حیرت کے ساتھ وہ تالاب دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ کپور اس کیفیت کو اتنی سنجیدگی کے ساتھ آگے بڑھاتا رہا کہ بالآخر اس زمیندار کو پہلگام کے قریب گندھک کے ایک پہاڑی چشمہ پر لے گیا اور اس میں سے چائے کا ایک کپ بھر کر اسے پلایا۔ جس پر زمیندار نے صرف اتنا کہا کہ یہ چائے کچھ نمکین زیادہ ہے۔ کپور نے کہا کہ کشمیری لوگ نمکین چائے ہی پسند کرتے ہیں کیونکہ یہاں کھانڈ کی پیداوار بے حد مشکل ہے۔

علم اور جذبات کا یہ افلاس واقعی ایک مضحکہ خیز کیفیت کو جنم دے دیتا ہے اور کپور کو اس بات سے بے حد تسکین ملتی ہے کہ ان مضحکہ خیز کیفیتوں پر ایسے عملی طنز کرے جو مسرت خیز بھی ہوں اور عبرت انگیز بھی۔

اسے اپنے دُبلے پتلے جسم کا شدید احساس رہتا ہے اور اسی بنا پر وہ کسی عورت کی زلفِ عشق میں گرفتار نہیں ہونا چاہتا۔ بلکہ گلی محلہ سے گزرتے ہوئے ایک نیک اور شریف بچھڑے کی طرح نکل جاتا ہے۔ وزن تولنے والی مشین سے یوں خوف کھاتا ہے جیسے شیطان لاحول سے۔ نہانے سے بہت ڈرتا ہے کیونکہ نہانے میں کپڑے اتارنا پڑتے ہیں اور جسم کا پتلا پن صاف چغلی کھانے لگتا ہے۔ سفر کرنے سے بھی گھبراتا ہے۔ کیونکہ سفر کے دوران میں دھکّے لگتے ہیں، ٹکٹ لینے کے لئے، گاڑی میں سیٹ حاصل کرنے کے لئے، اسٹیشن پر اترنے چڑھنے کے لئے، سامان اتارنے اور چڑھانے کے لئے۔ اور اس سارے عمل میں اس کا جسم اس کے ساتھ تعاون کرنے

انکار کر دیتا ہے۔ چنانچہ وہ سفر کو مضر سمجھتا ہے ـــــ ایک مرتبہ ایک انگریز خاتون نے اس کے ساتھ مذاق کرتے ہوئے کہا ـــ "کپور صاحب!

"YOU ARE AS THIN AS A NEEDLE —"

"آپ تو سوئی کی طرح پتلے ہیں۔" کپور نے بیساختگی سے اس چوٹ کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "محترمہ آپ ذرا مبالغہ سے کام لے رہی ہیں کیونکہ چند ایک سوئیاں مجھ سے موٹی بھی ہوتی ہیں!"

جسمانی کمزوری کا یہ احساس اس میں مقابلہ کرنے کی سپرٹ کو کم کر رہا ہے۔ ایک مرتبہ ایک پبلشر نے اس کی کتاب شائع کر دی۔ اور جب کپور نے اس سے رائلٹی مانگی تو پبلشر نے اسے سربازار جسمانی مقابلہ کے لئے للکار دیا۔ جس پر کپور نے بڑی بے تکلف مسکراہٹ کے ساتھ وہ کتاب پبلشر کو مفت دے دی۔ اسی طرح ایک مرتبہ لاہور کے ایک سیاسی وکیل اور ادبی مجاہد نے اسے ایک طنزیہ مضمون لکھنے پر ڈوئل کے لئے پکارا تو کپور نے معافی مانگ لی۔ اس کا مقولہ ہے کہ لڑائی صرف عقلمندوں سے کرنی چاہئیے۔ مورکھوں سے لڑائی کرنے میں ہڈیاں ٹوٹ جانے کا احتمال ہوتا ہے جو ایک نہایت احمقانہ عمل ہے ــــ چنانچہ عقلمندوں کے ساتھ لڑائی کرتے ہیں اسے بیحد لطف آتا ہے۔ ایک مرتبہ محفل جمی ہوئی تھی تو ایک انٹلکچوئیل قسم کے حضرت تشریف لائے جو کپور سے بیحد نالاں تھے۔ چنانچہ انہوں نے باتوں باتوں میں اپنی ذہانت کا ہتھیار نکال کر کپور سے نبرد آزمائی شروع کر دی۔ کپور نے کہا۔ "صاحب! میں تو آپ کو بیحد شریف آدمی سمجھتا تھا۔" ان صاحب نے فوراً چوٹ کی اور کہا "کپور صاحب! میں بھی آپ کو شریف ہی آدمی سمجھتا تھا۔" اس پر کپور بھڑک اٹھا اور بولا۔ "معاف کیجئے۔ آپ ٹھیک سمجھے تھے۔ غلطی مجھ سے ہوئی۔"

چنانچہ ذہانت کے میدانِ جنگ میں اکثر پالا مار جاتا ہے۔ اگرچہ منٹو کا خیال ہے کہ ابھی تک منٹو اس میدان میں نقطۂ وحدت ہے۔ مگر منٹو کے اس دعویٰ پر اوپندر ناتھ اشک بگڑ جاتا ہے۔ اور یوں ایک خاصا میدانِ کارزار گرم ہو جاتا ہے۔

کنہیا لال کپور صرف طنز نگار اور "پالا مار" ہی نہیں ہے۔ بلکہ اس میں سنجیدگی اور متانت کے جراثیم بھی کافی مقدار میں ہیں۔ وہ زندگی اور سماج کے ہر مسئلہ پر اپنی ایک نہ ایک رائے رکھتا ہے۔ مثلاً خدا کے متعلق اس کا خیال ہے کہ اس کے وجود کو ضرور تسلیم کر لینا چاہئیے۔ کیونکہ دنیا میں بیک وقت اتنی خوبصورتی اور اتنی بدصورتی پیدا کرنا کسی بہت بڑے اعلیٰ اور برتر وجود کا ہی کام ہے۔ مگر وہ کسی مذہب کو نہیں مانتا۔ کیونکہ اس کا خیال ہے کہ کسی بھی مذہب میں کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں کہی گئی جسے ایک ذہین آدمی پہلے سے نہ جانتا ہو۔ لیکن ــــ وہ اچانک رومانٹک سا موڈ بنا کر کہتا ہے۔" مذہب میں جہاں جہاں بھی شعریت کے عناصر پائے جاتے ہیں وہ اسے بے حد پسند آتے ہیں۔ گیتا کے اشلوک اور قرآن کے آہنگ پر وہ جھوم اٹھتا ہے۔

وہ اُردو زبان کو ایک الہامی زبان سمجھتا ہے کیونکہ اس کا خیال ہے کہ دنیا کی ہر الہامی زبان کے خوبصورت ترین اور تاثر انگیز پہلو اُردو زبان میں موجود ہیں۔ اس زبان کو مارنے کی کوشش بالکل ایسے ہی ہے جیسے کوئی چنگیز خان کسی بہت بڑے علمی کتب خانہ کو جلا دے اور اس جگہ پر ایک فوجی خیمہ کھڑا کر دے "کیا اُردو زبان صرف دہلی اور لکھنؤ کی زبان ہے؟" میں نے اس سے ایک بار پوچھا تو اس نے بھڑک کر جواب دیا۔ "لکھنؤ میں ــــ! لکھنؤ میں تو اُردو زبان بے حد غلط بولی جاتی ہے۔ انہیں تو ابھی اتنا بھی شعور نہیں کہ کونسی چیز مذکر ہے اور کونسی مونث۔"

اس کا خیال ہے کہ موجودہ ہندی میں ایک بہت بڑی تعداد متروک الفاظ کی ہے۔ ان متروکات کو فوراً نکال دینا چاہئیے تاکہ ہندی زبان چل سکے۔ ورنہ زمانے کی سُوئی کو تین سو سال پیچھے کی طرف گھما دینا تاریخ کی سب سے بڑی حماقت ہوگی۔"

جب اس کے احباب اسے بتلاتے ہیں کہ تم ادبی اعتبار سے سٹیفن سن سے مشابہت رکھتے ہو تو وہ خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔ لیکن جب اسے یہ خیال آتا ہے کہ سٹیفن سن تپ دق سے مرا تھا۔ تو وہ گھبرا جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ وہ سٹیفن سن بالکل نہیں بنے گا۔

حالانکہ ایک ماہر پامسٹ نے اسے صاف صاف بتا دیا تھا کہ تمہاری موت جگر کی خرابی کے باعث ہوگی۔

شاہد احمد دہلوی

جمیل جالبی

جب میں اس دکان میں داخل ہوا تو وہاں ایک ننھے صاحب کو بیٹھے دیکھا۔ ڈھیلی ڈھالی گہرے کتھئی رنگ کی شیروانی، کھلتا ہوا سیاہ رنگ، پھیلی ہوئی کھڑی ناک، مسکراتے ہوئے سنجیدہ ہونٹ، منہ میں بیڑی، آنکھوں پر موٹے شیشوں کا چشمہ، داڑھی مونچھ صاف، سر پر جناح کیپ، چہرے پر ایک وقار اور سنجیدگی۔ کوئی بات کرتا تو مسکرا کر خاکسارانہ انداز میں مختصر سا جواب دیتے اور خاموش ہو جاتے۔ کوئی کچھ اور کہتا تو زور سے ہنس کر ذرا سی دیر میں پھر سنجیدہ ہو جاتے۔ وہ کتابوں کی دکان تھی۔ بہت سے خریدار آجا رہے تھے۔ آنے والوں میں سے اکثر ان صاحب سے سلام دعا کرتے احترام سے ہاتھ ملاتے۔ خیر صلا خیر عافیت پوچھتے۔ کچھ دیر ٹھہرتے اور چلے جاتے۔ یہ دیکھ کر میں نے سوچا کہ آخر یہ صاحب ہیں کون؟ میں نے برابر کھڑے ہوئے ایک صاحب سے پوچھا جو ان سے بات چیت کر کے ابھی فارغ ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک دفعہ مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور پھر جلدی سے بولے ——— "شاہد احمد دہلوی ہیں!" نام سنتے ہی میرے جسم میں ایک لہر سی دوڑ گئی۔ شاہد صاحب کا نام میں نے سینکڑوں بار سنا اور پڑھا تھا اور ان سے ملنے کی تمنا ایک زمانہ سے تھی۔ چونکہ دکان میں بہت سے لوگ کھڑے تھے میری ہمت نہ ہوئی کہ میں ان سے ہاتھ ملاؤں۔ کچھ دیر الگ کھڑا ان کو ایک خاص احترام کے ساتھ دیکھتا رہا اور جب میں نے یہ محسوس کیا کہ اب لوگ مجھے دیکھنے لگے ہیں میں دکان سے باہر آگیا۔

شاہد صاحب اس زمانہ میں ایک عزیز کے ساتھ مارٹن روڈ پر رہتے تھے۔ چھوٹا سا مکان اور اس میں کئی کنبے، نہ بجلی نہ پانی۔ ابھی بن رہے تھے۔ ایک دن میں ملنے کے ارادہ سے چلا۔ بڑی مشکل سے مکان ملا۔ شاہد صاحب ململ کا کرتہ پہنے، تہمد باندھے پلنگ پر بیٹھے بیڑی پی رہے تھے۔ شام کا وقت تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ تاریکی نہایت تیزی کے ساتھ اپنا جال بن رہی تھی۔ میں نے کہا ——— "شاہد صاحب! میں آپ سے ملنے آیا ہوں۔" مسکرا کر میرا خیر مقدم کیا۔ کہا "آئیے یہیں بیٹھ جائیے۔" اندر سے لیمپ منگوایا جو کراچی کی تیز ہوا کے جھونکے سے فوراً ہی بجھ گیا۔ پھر لالٹین منگوائی جو کچھ دیر تو ٹھیک ٹھیک جلتی رہی اور پھر ایک دم بھڑکنے لگی۔ اتنے میں کوئی بچہ اسے اندر اٹھا کر لے گیا۔ اسی اندھیرے میں ان سے باتیں ہوتی رہیں۔ دنیا زمانے کی باتیں، فساد کے قصے، دلی کا ذکر اور نہ جانے کیا کیا۔ کہنے لگے "بہت سوں کو تو ابھی معلوم بھی نہیں کہ میں جیتا ہوں۔ کرشن چندر کا خط آیا تھا۔ جس میں میرے انتقال پُر ملال کے بارے میں تعزیتی جلسہ اور قرارداد کا ذکر کیا تھا۔ مگر میں ابھی زندہ ہوں۔ جما جمایا سارا کام بکھر گیا۔ دلی چھوٹ گئی۔ بہار کالونی میں مکان بنوا رہا ہوں۔" میں کئی گھنٹے بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ ان کے اخلاق اور خلوص کو دیکھ کر میرا دل بڑھ گیا۔ اور پھر ہمارے تعلقات

اتنی تیزی کے ساتھ بڑھے کہ وہ میرے دُکھ درد میں شریک اور میں ان کے دُکھ تکلیف میں ساتھ۔ اُٹھنا بیٹھنا، آنا جانا بڑھ گیا۔ شام کو ہم ساتھ جاتے، چائے پیتے۔ بے مقصد گھومتے۔ میں نے قدم قدم پر ان کے خلوص اور محبت کو محسوس کیا۔ شاہد صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جن کی دوستی پر فخر کیا جا سکتا ہے۔

کچھ دن بعد شاہد صاحب نے بہار کالونی کا مکان فروخت کر دیا۔ وہاں کی آب و ہوا خراب تھی۔ تمام دیواروں میں شورا اور سیل۔ اور پیر الٰہی بخش کالونی میں مکان خرید لیا اور یہیں اُٹھ آئے۔ میں نے بھی ایک مکان یہیں خرید لیا تھا۔ جب جی گھبراتا اور کہیں جانے کو جی نہ چاہتا تو میں ان کے ہاں چلا جاتا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا، گپیں لڑاتا اور چلا آتا۔ جی ہلکا ہو جاتا۔ ساری کوفت دور ہو جاتی۔ اگر میں ایک آدھ دن نہ جاتا تو خود آتے، اور نہ آنے کی وجہ پوچھتے۔

فسادات کے بعد کون سی مصیبت تھی جو ان پر نہ ٹوٹی۔ دوست دشمن ہو گئے، اپنے بیگانے ہو گئے۔ یہ سب کچھ چھوڑ کر دلّی کے پُرانے قلعہ میں آ پڑے کئی دن وہاں رہے مصیبتیں جو سب نے جھیلیں ان سے زیادہ انہوں نے جھیلیں۔ زندگی بھر آرام سے گزری تھی مصیبت یا پریشانی کا ہے کو دیکھی تھی یہاں کئی دن دھوپ، بارش، بدبو اور تعفن میں چھوٹے بڑے بچوں کے ساتھ پڑے رہے۔ اور پھر ایک دن مہاجرین کی ٹرین میں بیٹھ کر راستہ کی صعوبتیں اور حملے برداشت کرتے لاہور آ گئے۔ اور جب لاہور میں کچھ نہ ہوا تو کراچی آ پڑے۔ اور اپنا پُرانا مشغلہ پھر سے شروع کر دیا۔ اور وہ پونجی جو لا سکے تھے اسی پر گنوا دی۔ دلّی کی ساری جائیداد اور کتب خانہ کچھ کسٹوڈین صاحب کی ستم ظریفی کی نذر ہو گیا اور کچھ خرد برد ہو گیا۔ ساقی آج تک کبھی فائدہ میں نہیں چلا تھا۔ کراچی میں تو کیا چلتا۔ لوگوں کو گھر بار اور دال روٹی کی پڑی تھی۔ کتابیں اور رسالے کون پڑھتا۔ تہذیب اور کلچر کی باتیں کون سُنتا۔ شاہد صاحب کی صحت خراب ہو گئی تھی۔ صدمہ پر صدمہ، بڑا کنبہ، کھانے والے سب اور کمانے والا کوئی نہیں۔ شاہد صاحب اگر ساقی نہ نکالتے اور گانے بجانے کا شوق نہ ہوتا تو شاید وہ زندہ بھی نہ رہ سکتے۔ کچھ ساقی میں مصروف رہے، کچھ گانے بجانے میں۔ بُرے دن گذر گئے۔ بات پُرانی ہو گئی۔ غم ہلکا ہو گیا۔

اس عرصہ میں سب کچھ ہوا۔ لیکن شاہد صاحب کی وضعداری میں فرق نہیں آیا۔ اس مصیبت کے زمانے میں نہ انہوں نے کسی کی خوشامد کی، نہ کسی سے گر کر بات کی۔ نہ کہیں خود غرضی کا مظاہرہ کیا۔ بے وطنی اور غربت میں انسان کے جوہر کھلتے ہیں۔ کمینے اور شریف کی پہچان ایسے ہی موقع پر ہوتی ہے لیکن انہوں نے نہ اپنی خو چھوڑی، نہ وضع بدلی۔ نہ سیکریٹریٹ کے کسی سے سرگردانی کی وجہ پوچھی۔ اور یہ بات ان کے کردار کا وہ جوہر ہے جو گنتی کے چند لوگوں میں پایا جاتا ہے۔

شاہد صاحب میں سب سے بڑی بات ان کی سادگی ہے۔ جھوٹی عزت ان کو پاس سے بھی چھو کر نہیں گذری۔ تہمد باندھے چلے آ رہے ہیں۔ کھل کر باتیں کر رہے ہیں۔ نہ کسی کی بُرائی، نہ کسی کی غیبت۔ سب پر فقرے چست کریں گے۔ سب کا ذکر کریں گے۔ مزا لیں گے، مذاق اڑائیں گے جس قسم کی صحبت میں بیٹھیں گے، اس میں گھل مل جائیں گے۔ بڈھوں میں بڈھے، جوانوں میں جوان اور بڑوں میں بڑے۔ ہر ایک کے متعلق بہت کچھ جانتے ہیں۔ ہر ادیب کا ذکر کریں گے۔ اپنی ملاقات کی تفصیل سُنائیں گے۔ لچھے دار انداز میں گفتگو کریں گے۔ خود بھی ہنسیں گے اور سُننے والوں کو بھی ہنسائیں گے۔ گھنٹوں چہچہے رہے گی۔ اچھی بُری ہر قسم کی بات کریں گے۔ شاہد صاحب سے باتیں کرتے وقت آدمی سب کچھ بھول کر ایک الگ دنیا میں کھو جاتا ہے۔ جہاں خلوص، ہنسی، دلچسپی، اور ادب اور موسیقی کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ ادیبوں اور شاعروں کے قصے ہوں گے۔ ان کے بھی جو مر گئے، ان کے بھی جو جیتے ہیں۔ اور ان کے بھی جو ابھی اُبھر رہے ہیں۔ ادیبوں کا ذکر آئے گا۔ ان کی اچھی بُری عادتوں کا ذکر کریں گے چال چلن اطوار اور حماقتوں پر روشنی ڈالیں گے۔ کھل کر ان کے لین دین، مروّت، معاملہ، شراب، عورت، شادی بیاہ، عشق اور ہوس کا ذکر کریں گے۔ ایک دن مزے میں باتیں کر رہے تھے۔ کہنے لگے کہ دلّی کے ایک ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ مجاز بھی تھے۔ مجاز شراب کا رسیا، عورت کا عاشق، بات

چل نکلی۔ مجاز نے شراب پی پی کر اپنی صحت خراب کر لی تھی۔ شاہد صاحب نے کہا۔ مجاز! مر جاؤ گے۔ مجاز نے بے ساختہ کہا۔ شاہد صاحب!

موت بھی اس لئے گوارا ہے
موت "آتا" نہیں ہے "آتی" ہے

کہنے لگے حیدر آباد میں جوش سے ملاقات ہوئی۔ جوش شراب پی رہے تھے محفل جمی ہوئی تھی۔ دور چل رہا تھا۔ مجھ سے کہنے لگے شاہد صاحب! آپ بھی پیجئے۔ میں نے انکار کیا۔ ان کا اصرار بڑھا۔ جب اُدھر سے اصرار اور اِدھر سے انکار بڑھا تو جوش اپنے مخصوص انداز میں بولے:

"ساقی" کے "مدیر" اور نہیں ہیں مخمور
برعکس نہند نام زنگی کافور

ہر ایک سے ملتے ہیں اور کھل کر ملتے ہیں۔ آپ سے ملاقات ہو یا نہ ہو۔ لیکن ملیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ آپ کے نئے واقف کار نہیں، پُرانے دوست ہیں۔ ایسے موقع پر ہمدردی کی باتیں کریں گے۔ اور مقدور بھر جو کچھ کر سکتے ہیں کریں گے۔ بہت سے لوگ، ایسے ہیں جو انہی کی وجہ سے پیٹ پال رہے ہیں، ان میں ادیب بھی ہیں۔ اور ڈوم ڈھاڑی بھی۔ بات کرتے ہیں ہلکی پھلکی گالیاں بھی دیں گے۔ چھیڑ چھاڑ بھی کریں گے، مگر سنجیدگی طبع موجود رہے گی۔ ساقی جب کراچی سے نکلا تو ساقی کے پُرانے منشی بھی یہیں کام کرنے لگے۔ ان سے بیٹھے گھنٹوں باتیں کرتے۔ مزے لیتے۔ کام کرتے جاتے، فقرے کستے جاتے، ایک دن شاہد صاحب، منشی جی اور میں ایک ہوٹل میں چائے پی رہے تھے۔ منشی جی اپنی بیوی سے بے زاری کا اظہار کر رہے تھے۔ بڈھے آدمی ہیں۔ لیکن اس کے بُرے سلوک کے ایسے شاکی کہ میں حیرت میں رہ گیا۔ شاہد صاحب بہت دیر تو سُنتے رہے پھر ایکدم بولے۔ کیوں بھئی! تمہاری "سوتیلی بیوی" ہے؟ اور پھر ہنسنے لگے۔

مارٹن روڈ پر سرکاری کوارٹر ہیں جو سب کے سب ہم شکل اور یکساں ہیں۔ ایک دن شام کو گھر لوٹ رہے تھے۔ غلطی سے کسی اور مکان میں گھس گئے۔ بلا تکلف اندر کمرے میں گئے۔ شیروانی اتاری اور کھونٹی پر لٹکانے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ کھونٹی وہاں نہ تھی کسی کو آواز دی۔ ایک عورت کمرے میں آئی۔ غیر مرد کو دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی۔ انہوں نے اسے دیکھا تو ان کی بھی پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ جلدی سے شیروانی لئے اور دونوں ہاتھوں سے دستار تھامتے باہر نکلے۔ اندر سے عورتیں چیخنے چلانے لگیں۔ انہوں نے معذرت چاہی۔ کہنے لگے جمیل صاحب —! قربِ قیامت ہے۔ ہر چیز ہم شکل ہونے لگی ہے۔ اور پھر زور زور سے ہنسنے لگے۔ شاہد صاحب ہنستے بڑے مزے سے ہیں۔ پہلے بات کہیں گے مزے لے لے کر، تفصیل کے ساتھ۔ بات کے دوران میں وہ بالکل سنجیدہ رہیں گے۔ سُننے والا مسکراتا رہے گا۔ جب بات ختم ہو جائے گی تو پھر گہری گہری آنکھوں سے دیکھیں گے اور یک لخت زور زور سے ہنسنے لگیں گے۔ پھر ہنسی کا غوطہ لگائیں گے اور پھر ہموار ہو جائیں گے۔ ان کے ہنسنے کا انداز دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے گھنگھور گھٹا میں ابابیل سیدھی اُڑتے اُڑتے بھیگی بھیگی فضا میں غوطہ لگاتی ہے اور پھر سیدھی اُٹھنے لگتی ہے — پھر غوطہ لگاتی ہے اور سیدھی اُڑنے لگتی ہے۔

شاہد صاحب کو شاعروں سے چڑ ہے۔ چڑ ان معنی میں نہیں کہ وہ شعر و شاعری کو پسند نہیں کرتے بلکہ ان معنی میں کہ شاعروں کو سُنانے کا مرض ہوتا ہے اور انہیں سُننے سے اللہ واسطے کا بیر ہے۔ اس معاملہ میں وہ بڑے کھرے ہیں۔ صاف صاف لحاظ مروت کو بالائے طاق رکھ کر سختی سے انکار کر دیں گے۔ کہنے لگے۔ جمیل صاحب! اگر میں ایسا نہ کروں تو میری زندگی عذاب بن جائے۔ مجھے سڑک پر، ہوٹل میں، بسوں میں، گھروں پر، دعوتوں میں، ہر جگہ غزلیں سُنانے لگیں — دو تین سال پہلے کی بات ہے۔ ایک صاحب لکھنؤ سے آئے۔ طبلہ بجاتے تھے، موسیقی کے سلسلہ میں شاہد صاحب کی تعریف سُنی تھی۔ شاہد صاحب سے ملنے آئے۔ "کند ہم جنس باہم جنس پرواز" کے مصداق پھر روز آنے لگے۔ اپنے طبلے کی بہت ڈینگیں مارتے۔ کئی محفلوں میں انہوں نے طبلہ بجایا۔ شاہد صاحب نے تعریف کی۔ کچھ مروت سے

کچھ ویسے ہی عطائی تھے۔ ایک دن گانے بجانے کی ایک محفل میں مصر ہوئے کہ شاہد صاحب میرے ساتھ گائیے۔ شاہد صاحب راضی ہو گئے۔ لیکن طبلہ بجاتے وقت وہ اس فکر میں پڑ گئے کہ کسی صورت سے گانے والے پر غالب آجائیں۔ اور شاہد صاحب کو من جملہ سراسیمہ کا احساس ہو جائے۔ شاہد صاحب نے جب یہ دیکھا تو ایسے استادانہ انداز سے راگ گایا کہ کچھ دیر بعد طبلہ صاحب عاجز ہو گئے۔ شاہد صاحب نے کہا۔ میر صاحب! کیا بجا رہے ہیں؟ وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ اور ان کے عقیدت مندوں میں شامل ہو گئے۔

یہی صاحب ایک دن تشریف لائے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ میں بھی وہیں بیٹھا تھا۔ سالنامہ کی تیاری تھی۔ کاپیاں جوڑی جا رہی تھیں۔ وہ فرمانے لگے۔ شاہد صاحب! میں نے ایک غزل کہی ہے۔ ذرا سُن لیجئے۔ طبیعت خوش ہو جائے گی۔ شاہد صاحب نے انہیں دیکھا۔ آگ ہی تو لگ گئی۔ کہنے لگے صاحب! مروت میں ایک دفعہ بُرا کام کرایا جا سکتا ہے مگر غزل نہیں سُنی جا سکتی۔ ایک دفعہ میں غزل سُن چکا ہوں۔ اب بار بار تو یہ حرکت نہیں ہو سکتی۔ وہ بے چارے دم بخود رہ گئے۔ کچھ دیر بیٹھے اور پھر چلے گئے۔ مگر شاہد صاحب کا پیچھا اس پر بھی ان سے آج تک نہیں چھوٹا۔

ایک دن ڈاک دیکھ رہے تھے۔ ایک خط میری طرف بڑھایا۔ بولے۔ پڑھ لیجئے۔ اس میں لکھا تھا "مکرمی! غزل روانہ ہے۔ بڑی محنت اور کاوش سے کہی ہے۔ یہاں کے لوگوں نے بہت پسند کی ہے۔ براہِ کرم ساقی میں نمایاں طور پر شائع فرما کر ممنون فرمائیے"۔ خط پڑھ کر میں نے واپس کیا۔ کہنے لگے "جمیل صاحب! کیا سالے کو ٹائیٹل پیج پر چھاپ دوں؟"

ایک دن باتوں باتوں میں سرکاری افسروں کا ذکر آگیا۔ کہنے لگے "یہ سالے ہر وقت اور ہر جگہ افسر ہی رہتے ہیں۔ انسان کبھی نہیں ہوتے۔ ایسے ایسے لائق افسر پڑے ہیں کہ جو جس کام پر لگا یا گیا ہے بس وہی کام اسے نہیں آتا"۔ ایک محکمہ کے ایک بڑے افسر کا ذکر کرنے لگے۔ وہ طباعت کے نگران تھے۔ ایک صاحب ان کے پاس گئے۔ ان کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ بڑے مسخرے اور منہ پھٹ۔ ان سے کہنے لگے ...... صاحب آپ کی سرکاری طباعت میں لفظوں میں ذرا بھی چمک نہیں ہوتی۔ شاید آپ کتابت کے بعد مسطر پر زیتون کا تیل نہیں پھرواتے؟ یہ بات نہایت سنجیدگی سے کہی گئی تھی۔ انہوں نے فرمایا ——"نہیں تو"۔ "یہی وجہ ہے کہ الفاظ چکنے نہیں ہوتے۔ یہ تو کاتب کا کام تھا کہ وہ کتابت کے بعد مسطر پر تیل کا پچارا پھیرے"۔ وہ غصہ میں بھر گئے۔ فوراً انچارج کاتب کو بلایا۔ ڈانٹا اور کہا "عجیب بات ہے کہ آپ اپنے تجربہ کا اتنا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔ لیکن زیتون کا تیل تک مسطر پر کتابت کے بعد نہیں پھیرتے"۔ کاتب یہ سُن کر سناٹے میں آگیا۔ کہنے لگا "یہ صاحب! ——" صاحب وا ب کچھ نہیں۔ آئندہ سے خیال رہے"۔ کاتب چلا گیا۔ وہ صاحب ہنسنے لگے "یار! میں تو مذاق کر رہا تھا"۔

شاہد صاحب چائے کے بہت دھنی ہیں۔ دن میں بیسیوں پیالیاں پی جاتے ہیں۔ اس میں اچھی بُری کی کوئی تخصیص نہیں۔ چائے ہو اور بس۔ مہینہ میں پندرہ سو بیڑیاں پی جاتے ہیں۔ ساقی کا سارا کام اپنے ہاتھ سے کرتے ہیں۔ ایک دن حسب معمول بنیان پہنے، تہمد باندھے زمین پر بیٹھے ہوئے پرچہ پیک کر رہے تھے۔ میں پہنچ گیا۔ میں نے کہا شاہد صاحب! ایسے میں آپ کی تصویر لے لی جائے۔ زور سے ہنسے۔ کہنے لگے۔ اور ہاں اس کے نیچے لکھ دینا —— "پچیس سال ادب کی خدمت کرنے کا حشر"

گانے کے رسیا ہیں اور اس فن کے استاد۔ ہندوستان و پاکستان میں ایک آدھ ہی شخص ایسا ہوگا جو اس فن سے ایسا واقف ہو جیسے کہ شاہد صاحب ہیں۔ میں نے بڑے بڑے خاندانی خانصاحبوں کو ان کے سامنے عقیدت مندانہ طریقہ سے بیٹھے دیکھا ہے۔ استاد بندو خاں میں ایک بڑا عیب یہ ہے کہ وہ سارنگی بجانے سے پہلے کم از کم تیس چالیس منٹ تک بھری محفل میں سارنگی کے تاروں کو ہلاتے رہتے ہیں۔ سامعین بیٹھے

انتظار کرتے رہتے ہیں۔ ہر محفل میں ان کی یہ روش قائم رہتی ہے۔ کس کی مجال کہ کوئی ان سے کچھ کہے۔ اپنے فن کے لاثانی فنکار۔ ناراض ہو جائیں یا روٹھ جائیں تو پھر منائے نہ منیں لیکن میں نے دیکھا ہے کہ شاہد صاحب ان کو غصہ بھرے لہجہ میں ڈانٹ دیتے ہیں۔ یا پھر جل کر اس عرصہ میں کسی اور کو گوا دیتے ہیں۔ اور وہ ان کی بات ایسے سن لیتے ہیں جیسے کوئی ان کے استاد یا بزرگ ہوں۔ وہ اس فن پر لکھ بھی ماہرانہ انداز سے لیتے ہیں اور ساتھ ساتھ گا بھی استادانہ طریقہ پر لیتے ہیں۔ میں نے انہیں بیسیوں دفعہ سنا۔ ریڈیو پر بھی اور محفلوں میں بھی۔ گانے والے کے جوہر محفل میں کھلتے ہیں شاہد صاحب جب محفل میں گاتے ہیں تو وہ لوگ بھی جو کلاسیکل موسیقی سے ناواقف ہیں۔ تال اور سُروں کے زیر و بم اور آتار چڑھاؤ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ایک دن میرے ہاں محفل تھی۔ کراچی کے سب مشہور گویے اور سازندے جمع تھے۔ رات کے تین بجے شاہد صاحب کی باری آئی سب نے آنکھیں ملیں۔ پہلو بدلے اور انہیں سننے کے لئے ہمہ تن گوش ہو گئے۔ شاہد صاحب سامنے آئے۔ طبلچی نے طبلہ کھٹر کھڑایا۔ سارنگیے نے سارنگی کے تار کسے۔ ستاریہ نے ستار کی کھونٹیاں گھمائیں۔ ایک شاگرد نے تان پورا سنبھالا۔ شاہد صاحب نے گانا شروع کیا۔ تقریباً پون گھنٹہ گائے۔ ایسا سماں باندھا کہ سب محو ہو گئے۔ محفل کو سانپ سا سونگھ گیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی جادوگر نے ساری محفل کو باندھ دیا ہے۔ ڈھلتی رات، چاروں طرف فضا میں سناٹا۔ وقت کی راگنی "مال کوس" گا رہے تھے۔ ترانہ میں "تنا نا دیم" کی تکرار پر ستاریہ اور سارنگیہ ہاتھ چھوڑ بیٹھے۔ گویا تاروں کی موسیقی سے بہت آگے نکل گیا۔ طبلچی بے قابو ہو کر رہ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ فضا میں رس گھل رہا ہے۔

گلے تے اونچی آواز میں ہیں۔ بول بہت یاد ہیں۔ بیسیوں شاگرد ہیں۔ سب استاد کہتے ہیں۔ طبلہ، سارنگی اور دوسرے ساز گھر میں رکھے رہتے ہیں۔ ڈوم ڈھاڑی، عطائی اور خانصاحب سب ان کے فن کا لوہا مانتے ہیں۔ شاہد صاحب کا کہنا ہے کہ فنِ موسیقی کو ہندوؤں نے اپنا لیا حالانکہ جتنی خدمات، ایجادیں اور اضافے مسلم فنکاروں نے کئے، دوسری قوم اس کے پاسنگ کو بھی نہیں پہنچی۔ اس سلسلہ میں ان کے متعدد مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

ان کی شرافت ضرب المثل ہے۔ پچیس تیس سال ہو گئے ہیں۔ لیکن آج تک کسی طوائف کے کوٹھے پر نہیں گئے۔ اور نہ آج تک کسی طوائف کو شاگرد بنایا۔ اور وہ صرف اس لئے کہ اسی چیز نے اس عظیم فن کو بدنام کر دیا ہے اور شرفا اس سے نفرت کرنے لگے ہیں۔ ان کا ایک شاگرد ایک مرتبہ کسی طوائف کے ہاں چلا گیا۔ کچھ آتا جاتا بھی نہیں تھا۔ ابھی مبتدی تھا۔ شاہد صاحب کو معلوم ہوا تو بہت بگڑے۔ کہنے لگے اللہ تعالیٰ نے موسیقی و شراب کو اسی لئے حرام کیا ہے کہ اس میں بڑے ظرف کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ عام آدمی کے پاس ہوتا نہیں ہے۔ ایسے ہی، دیکھو (اپنے شاگرد کی طرف) کچھ آتا جاتا ہے نہیں۔ سبق دینے لگے ہیں۔ کراچی میں مسلمان، ہندو، پارسی لڑکیاں عام طور پر اسی محفل میں شریک ہوتی ہیں جس میں شاہد صاحب شریک ہوں۔ موسیقی کی وہی محفلیں کامیاب ہوتی ہیں جن کے محرک شاہد صاحب ہوں۔ اور اسی وجہ سے پاکستان میوزک اکاڈمی کے جلسے اور محفلیں کراچی میں سب سے زیادہ شاندار اور کامیاب ہوتی ہیں۔ شاہد صاحب اس اکاڈمی کے بانی اور صدر ہیں۔ ایسی محفلوں میں وہ خاص طور پر اپنے بیوی بچوں کو ضرور لے جاتے ہیں۔

آج سے پچیس تیس سال پہلے کا ذکر ہے۔ شاہد صاحب ابھی پڑھتے تھے۔ دلی میں کوئی گانے کی محفل تھی۔ دلی کے مشہور گویے چاند خاں کے چھوٹے بھائی رمضان خاں بھی اس میں شریک تھے۔ بڑے اور خاندانی گویوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ شاہد صاحب کی جب باری آئی تو وہ گانے کے لئے سامنے آئے اور "خیال" گانا چاہا۔ رمضان خاں اس پر اڑ گئے۔ کہنے لگے "خیال" نہیں گا سکتے۔ میاں صاحبزادے غزل گاؤ۔ ان کے خیال میں استادوں کی محفل میں نومشق اور غیر خاندانی گویئے کا 'خیال' گانا ان کی ہتک اور بے عزتی تھی۔ شاہد صاحب بے چارے اُٹھ آئے۔ ذلت کا ایک احساس ان کے سارے وجود پر چھا گیا۔ انہوں نے اس فن کو انتہائی کاوش اور محنت سے حاصل کرنا شروع کیا۔ دن رات کا ریاض، بڑے بڑے گویوں کی صحبت، اچھے استادوں کی شاگردی۔ چھپے ہوئے جوہر نکھر آئے اور ایسے چمکے کہ خود استادوں کی صف میں شامل ہو گئے۔

اور اب پچیس تیس سال بعد عید کے چاندان کے بڑے لڑکے کی شادی تھی۔ ولیمہ کی دعوت کے بعد رات کو گانا بجانا تھا۔ استاد بندو خان، رمضان خان، امراؤ خان، ظہوری، کبیر خان اور دوسرے نامی فنکار جمع تھے کہ ایک نوجوان لڑکا گانے کے لئے آیا اور "خیال" گانا شروع کیا۔ شاہد صاحب جو ایک طرف کھڑے تھے بولے۔ میاں صاحبزادے خیال مت گاؤ۔ غزل گاؤ۔ اور اس پر اتنا اصرار بڑھا کہ وہ خیال نہ گا سکا۔ میں نے شاہد صاحب کے چہرے کو دیکھا۔ پھر رمضان خان کی طرف دیکھا اور میرا ذہن ماضی کے دھندلکوں میں کھو گیا۔

شاہد صاحب دلّی کی دائی ہیں۔ دلّی کی ہر بات، ہر رسم و رواج، ہر عمارت، ہر پہلو، ہر شخص سے خوب واقف ہیں۔ دلّی کا کبابی ہو یا باورچی، کبوتر باز ہو یا قلفی حلیم والا سب کے متعلق پوری معلومات رکھتے ہیں۔ جو زندہ ہیں ان سے دعا سلام ہے۔ اکثر کہتے ہیں۔ جمیل صاحب۔ چلو بھئی دلّی کے کباب کھالیں۔ فلاں کبابی کا لڑکا آ گیا ہے۔ دلّی میں یہ اپنے باپ کے ساتھ کام کرتا تھا۔ اب تو گدی پر بیٹھتا ہے لیکن اس زمانہ میں پنکھا جھلتا تھا۔ دلّی سے شاہد صاحب کو والہانہ محبت ہے۔ بی۔ اے کرنے کے بعد داخلہ کے لئے علی گڑھ گئے۔ ابھی غازی آباد ہی پہنچے تھے کہ دلّی کی یاد ستانے لگی۔ علی گڑھ پہنچے، پروفیسر ہادی سے ملے اور دوسرے دن دلّی واپس آ گئے اور پھر واپس نہ گئے۔ کراچی آ کر دلّی کے بارے میں شاہد صاحب نے بہت سے مضامین لکھے۔ یہ مضامین دلّی سے متعلق اچھوتے اور مخصوص اسلوب میں ایسی۔ تہذیبی دستاویز ہیں جن کا لکھنا صرف شاہد صاحب ہی کا حصہ ہے۔ ان کے پاس معلومات بھی ہیں اور کوثر و تسنیم سے دُھلی ہوئی دلّی کی پیاری اور ٹکسالی زبان بھی۔ ان سب مضامین کو یکجا کر دیا جائے تو خاصہ کی چیز بن جائے۔ یہ سب مضامین دلچسپ، ایسے لطیف اور ایسے پیارے ہیں کہ افسانہ کی طرح پڑھتے چلے جاتے ہیں۔ دلّی کی بپتا، چوک کی بہار، دلّی کی عید، سترھویں کی سیر شائع ہو کر خاص و عام سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں—— ایسے ہی ان کے ترجمے ہیں۔ وہ اُردو کے ایک بہترین مترجم ہیں۔ انہوں نے سینکڑوں مشہور افسانوں اور ڈراموں کے ترجمے کئے۔ ان کے ترجمہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ترجمے نہیں بلکہ اصل معلوم ہوتے ہیں۔ ترجمہ کرنے کی مشق اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ بڑی تیزی سے ترجمہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ مسوّدہ میں کہیں کانٹ چھانٹ نہیں ہوتی۔ جو مسوّدہ ہوتا ہے وہی مبیضہ۔ یہ خوبی مجھے بہت کم مترجموں میں نظر آتی ہے۔

ایک دن ترجمہ کر رہے تھے۔ میں پہنچ گیا۔ دیکھ کر مسکرائے۔ کہنے لگے مزدوری کر رہا ہوں۔ ریڈیو بج رہا تھا۔ پکا گانا ہو رہا تھا۔ جب تال سُر کا اتار چڑھاؤ ہوتا تو ان کی آنکھ اور سر بھی اسی اتار چڑھاؤ پر ہلتے۔ میں نے کہا۔ شاہد صاحب! موسیقی کے پس منظر میں ترجمہ ہو رہا ہے۔ کہنے لگے۔ نہیں بھئی یلمن ازم کی مشق کر رہا ہوں۔ ایک وقت میں دو کام۔

ہنسی مذاق ان کی فطرت میں شامل ہے۔ میاں بیوی میں بڑے خوشگوار تعلقات ہیں۔ سب کی موجودگی میں بھابی کا مذاق اڑاتے رہتے ہیں۔ ان کی ہمت شکنی کرتے رہتے ہیں۔ پانچ بچوں کی ماں۔ کوئی بیس سال کے بعد انہیں شوق ہوا کہ وہ بی۔ اے کا امتحان دیں۔ تیاری شروع کر دی۔ امتحان قریب تھا۔ میں پہنچ گیا۔ وہ مجھ سے انگریزی شاعروں کے متعلق کچھ پوچھنے لگیں۔ شاہد صاحب بولے۔ جمیل صاحب! اگر یہ پاس ہو گئیں اور انہیں بی۔ اے کی سند مل گئی تو میں اپنی سند واپس کر دوں گا۔

پاکستان بننے کے بعد جب ترقی پسندوں نے واویلا مچائی اور اپنے سے جُدا نظریہ رکھنے والوں کو رجعت پسند اور قدامت پرست قرار دیا تو لاہور کے جلسہ میں "ساقی" کے خلاف بھی قرار داد پاس ہوئی۔ ساقی اور ادارۂ ساقی کو رجعت پسند قرار دیا۔ ساقی کو رجعت پسند قرار دینے اور بائیکاٹ کرنے میں وہ لوگ بھی شامل تھے جنہیں ساقی اور شاہد صاحب کے توسط یا توسل سے شہرت ملی تھی یا ان کی ادبی حیثیت قائم ہوئی تھی—— بات کچھ بھی نہ تھی۔ عسکری صاحب بے چارے "جھلکیاں" لکھتے تھے۔ اس میں کھری کھری باتیں کرتے تھے۔ وہ باتیں جو ان کے دماغ میں آتی تھیں

واضح طور پر ایمانداری کے بل بوتے پر لکھ دیتے تھے۔ اور وہ اس فکر میں تھے کہ انتشار اور ابر آلود فضا کو چیر کر صاف اور واضح فکر تک پہنچ سکیں۔ اس زد میں ترقی پسندوں کے محدود نظریات بھی آ گئے۔ ادب میں سطحی سیاست، غلط پالیسی اور پروپاگنڈا کا ذکر بھی آیا۔ ترقی پسندوں کو یہ بات ناگوار گذری۔ ساقی معلون ہوا۔ سب نے لکھنا چھوڑ دیا۔ اس سے سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہوا کہ لوگوں پر یہ بات واضح ہو گئی کہ ترقی پسند کس حد تک آمرانہ رویہ رکھتے ہیں اور وہ کیا چاہتے ہیں اور کس انداز سے۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ ترقی پسندوں کو خود اس بات کا احساس ہو گیا کہ ان کے قرارداد پاس کرنے یا کسی رسالہ کا بائیکاٹ کرنے سے رسالہ اشاعت و مقبولیت کے اعتبار سے کس حد تک متاثر ہو سکتا ہے۔ شاہد صاحب کہا کرتے تھے کہ ابھی کچھ دن کی بات ہے، سب ڈھنگ پر آ جائیں گے۔ میں تو جب بھی ان کو چھاپنے کو تیار تھا اور اب بھی ہوں۔ ساقی کی پالیسی ہمیشہ یہی رہی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اور مختلف الخیال قسم کے مضامین اور نظریات پیش کر سکے تاکہ اس تنوع سے ادب صحیح معنی میں ترقی کر سکے۔ مثال کے طور پر انہوں نے ایسے مضامین شائع کئے جو خود ادارہ کے ایک آدمی ——— عسکری صاحب کے خلاف تھے۔ نہ اس پر ان کو اعتراض تھا اور نہ خود عسکری صاحب کو۔ انتظار حسین نے عسکری کے خلاف سخت مضمون لکھا۔ وہ ساقی میں چھپا اور پسند کیا گیا۔ میں نے خود بارہا عسکری صاحب کی مخالفت" باتوں" میں کی۔ ادب one way traffic تو ہے نہیں کہ جو ایک گروہ یا جماعت پیش کرے وہی صحیح ہو۔ اور جو راستہ اس نے خیالات کی آمد و رفت کا مقرر کر دیا اس کے علاوہ دوسرا راستہ ہو ہی نہیں سکتا۔ شاہد صاحب کا کہنا تھا کہ ادیب کو کبھی بھی سیاسی یا جماعتی ہرکارہ نہیں بننا چاہئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ترقی پسندوں کے ہوش و حواس ٹھکانے آئے تو انہوں نے کراچی میں جلسہ کیا اور اس میں کھلے بندوں اپنی غلطی کا اعتراف کر کے اپنے گناہوں سے توبہ کی اور وہی راستہ اختیار کیا جس کا پرچار ساقی ہمیشہ سے کرتا آیا تھا۔ ساقی کی یہ پالیسی دوسروں کو کتنی ہی کھٹکا کرے لیکن اس سے ادب کو بہت فائدہ پہنچتا رہا ہے۔ اور ساقی کی اشاعت کا یہی مقصد رہا ہے جسے وہ گزشتہ پچیس سال سے حتی الوسع پورا کر رہا ہے۔ جب ترقی پسند تحریک کا سلسلہ شروع ہوا تھا اور یارانِ حاشیہ کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ تحریک کیا ہوتی ہے؟ اور ترقی پسندی کس چڑیا کا نام ہے؟ شاہد صاحب نے ہی سب سے پہلے دلّی میں "انجمن ترقی پسند مصنفین" قائم کی تھی جس کے وہ ایک زمانہ تک جنرل سیکرٹری رہے۔ ساقی نے ترقی پسند ادب کی خوب خوب اشاعت کی۔ ان کی کتابیں شائع کیں۔ ان کے حوصلے بڑھائے۔ ان کی شہرت کو چار چاند لگائے۔ اسے ان کی جوہر شناسی کہئے یا ادب کی خدمت کا صحیح و صحت مند جذبہ۔ کرشن چندر سے شاہد صاحب کہہ رہے تھے۔ کرشن ناول لکھو میں شائع کروں گا۔ کرشن اس وقت دلّی میں تھے۔ انہوں نے کہا شاہد بھائی ایک ہزار روپیہ دے دیجئے۔ کشمیر جا کر لکھوں گا۔ شاہد صاحب نے ایک ہزار روپیہ دے دیا۔ کرشن چندر کشمیر چلے گئے اور وہاں کی صحت مند آب و ہوا میں ایک ناول لکھ لائے جو بعد میں "شکست" کے نام سے شائع ہوا۔ عصمت نے ساقی ہی میں لکھنا شروع کیا اور یہیں سے عصمت، عصمت بنیں۔ ساقی نے کتنے ادیبوں کو پیدا کیا اور ابھارا۔ کسی دوسرے اردو رسالے کو یہ فخر حاصل نہیں ہے اور یہ شاہد صاحب اور ساقی کی وہ خدمت ہے جسے اردو ادب کی تاریخ نظر انداز نہیں کر سکتی۔

وہ واحد شخص ہیں جو نئے اور پرانوں سب کو جانتے ہیں۔ دلّی میں ایک دکان تھی ——— کتب خانۂ علم و ادب ——— یہ ہمیشہ ادیبوں کی بیٹھک اور نشست گاہ رہی ہے۔ وصی اشرف اس کے مالک تھے۔ شام کو یہاں ادیبوں کا جمگھٹا رہتا۔ شعر و شاعری ہوتی۔ تبادلۂ خیالات ہوتا۔ اچھی بری باتیں ہوتیں۔ جو باہر سے دلّی آتا وہ یہاں آ جاتا اور سب سے مل لیتا۔ سامنے چوک تھا۔ شام ہوئی اور میلہ لگ گیا۔ یہ جگہ دلّی کے عوامی کلچر کا مرکز تھی۔ کبوتر باز، مرغ باز، کبابی، قلفی والے، حلیم والے، کباڑی، کپڑے والے، دہی بڑے اور پھلکی والے اور پنواڑی ——— کوئی چیز ایسی ہو گی جس کا سودا یہاں نہ ہوتا ہو۔ سامنے اردو بازار تھا اور یہیں یہ کتب خانہ۔ ایک دن وصی اشرف نے کہا۔ شاہد صاحب! اگر آپ ان لوگوں پر لکھ دیں جو کتب خانہ میں آئے اور بیٹھے تو بڑی مزے دار چیز بن سکتی ہے۔ شاہد صاحب نے کہا۔ آپ فہرست بنا دیجئے۔ جو رہ جائیں گے میں شامل کر لوں گا۔ فہرست جو بنی تو تین سو سے زیادہ افراد تھے ——— شاہد صاحب کے علاوہ ان ادیبوں پر دوسرا کوئی نہیں لکھ سکتا۔ میں بھی چار سال سے سر ہوں۔ میں نے

یہ بھی کہا کہ ژاں پال سارتر نے بھی ایک طویل سلسلۂ مضامین لکھا ہے، جس میں ان تمام ادیبوں، فن کاروں، شاعروں کا ذکر کیا ہے جن سے اس کی ملاقات ہوئی۔ ضمنی طور پر ادبی تحریکات۔ میلانات اور نظریات پر بھی بحث ہوتی چلی گئی ہے۔ میرے زیادہ اصرار پر انہوں نے کچھ لکھا۔ جو "نیرنگِ خیال" کے عنوان سے ساقی میں اور کچھ مختلف عنوانات سے "نقش" "ماہِ نو" وغیرہ میں شائع ہوا۔ اگر وہ اس عنوان سے کچھ لکھیں تو خاصہ کی چیز بن جائے۔ اس طرح تیس چالیس سال کے زمانہ کا احاطہ ہو سکتا ہے۔ اور سارے ادب کے قدیم و جدید رجحانات پر روشنی بھی پڑ سکتی ہے ——— ایک تو ذاتی حالات اور پھر شاہد صاحب کا اسلوب ——— واقعی مزا آجائے ——— دیکھئے اللہ میاں شاہد صاحب کو کب نیکی دیتا ہے۔

شاہد صاحب بڑے کاہل ہیں۔ یہ چیز ان کے وجود کا ناگزیر جزو بن کر رہ گئی ہے۔ کہیں آنے جانے سے انہیں وحشت ہوتی ہے۔ پابندیٔ اوقات کا یہ عالم کہ اگر کہیں پانچ بجے جانا ہے تو وہاں سات بجے پہنچیں گے۔ یا پھر اتنی پابندی ہوگی کہ وقت سے آدھ گھنٹہ پہلے پہنچ جائیں گے انتظامی صلاحیت بالکل نہیں ہے اور یہ شاید اس وجہ سے ہو کہ طبیعت میں مروت اور لحاظ حد درجہ ہے۔ کراچی آئے تو مالی اعتبار سے پریشان رہے۔ قدر دانوں نے جب دیکھا تو ریڈیو میں رکھ لیا۔ بڑی قدر کی۔ معقول مشاہرہ دیا۔ زندگی بھر نوکری کی نہیں تھی۔ نوکری کے لئے کچھ اور خوبیاں چاہئیں؛ وقت کی پابندی ——— مکھن لگانے کی غیر معمولی صلاحیت ——— آنا جانا ——— کھانا پینا ——— اٹھنا بیٹھنا ——— اور نہ جانے کیا کیا۔ یہ باتیں ان میں سرے سے ہیں ہی نہیں۔ کچھ ہی دنوں میں وہ لوگ جو قدر دان تھے سٹا کی ہوگئے اور نوکری کا یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔ ایک دن کہنے لگے ——— جمیل صاحب! پاکستان میں ملازمت اور منافقت شاید ہم معنی الفاظ ہیں۔ واقعی نوکری کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ یہ کہہ کر بیڑی سلگائی اور زور زور سے کش لگانے لگے۔

ایک دلچسپ واقعہ اور سُنئے۔ جب پاکستان بنا اور یہ لاہور آئے تو لوگوں نے بڑی آؤ بھگت کی۔ ایک دن ریڈیو پاکستان لاہور میں بیٹھے حسبِ معمول بیڑی پی رہے تھے۔ ریڈیو لاہور والے ان کی خاطر تواضع سے اپنی عقیدت مندی اور احترام کا ثبوت دے رہے تھے۔ ہمدردی، خلوص اور محبت کی باتیں ہو رہی تھیں۔ ایک خاتون کچھ فاصلہ پر بیٹھی سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ اور سوچ رہی تھیں کہ آخر یہ صاحب ہیں کون کسی سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ شاہد احمد دہلوی ہیں۔ یہ سُنتے ہی چونک پڑیں۔ غالباً دورانِ خون تیز ہوگیا تھا۔ دماغ پر استعجاب اور عقیدت کا کوندا لپکا۔ وہ پہلو بدلنے لگیں اور بے ساختہ بولیں اگر یہ بیڑی نہ پیتے ہوتے تو میں ان پر ابھی عاشق ہو جاتی۔ کہنے لگے۔ خدا کا شکر ہے کہ میں کیوپڈ صاحب کی ستم ظریفیوں سے بال بال بچ گیا اور بیڑی میرا (organ of defence) بن گئی۔

شاہد صاحب کو عظیم بیگ چغتائی اور عظیم بیگ چغتائی کو شاہد صاحب سے والہانہ محبت تھی۔ دونوں ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ "نیرنگِ خیال" کے عروج کا زمانہ تھا۔ اردو دان طبقہ میں اس کا طوطی بول رہا تھا۔ عظیم بیگ اسی میں لکھتے تھے۔ جب ان کا مشہور افسانہ "انگوٹھی کی مصیبت" شائع ہوا تو گھر گھر اس کا چرچا ہوا۔ انہوں نے بھی جو کبھی افسانہ نہیں پڑھتے تھے بڑے شوق اور اشتیاق سے اسے پڑھا۔ اس افسانے کی اشاعت سے عظیم بیگ کی شہرت ایک دم پھیل گئی۔ شاہد صاحب نے ابھی ساقی نکالا ہی تھا۔ نیا نیا زمانہ تھا۔ مضمون نگار ملتے نہ تھے۔ حجاب امتیاز علی اور فرحت اللہ بیگ لکھنے لگے تھے۔ انہیں فکر ہوئی کہ کسی طرح عظیم بیگ کا پتہ معلوم کریں۔ بہت کوشش کی مگر پتہ معلوم نہ ہوسکا۔ کچھ عرصہ بعد ساقی کی ڈاک میں ایک خط آیا۔ یہ عظیم بیگ کا خط تھا ——— اس میں لکھا تھا کہ میرے پاس سب پرچے آتے ہیں لیکن ساقی نہیں آتا۔ کیا آپ ایک پرچہ نمونے کے طور پر بھیج سکتے ہیں؟ اس خط کے ساتھ ہی دونوں کے تعلقات اتنے تیزی سے بڑھے کہ دانت کاٹی روٹی بن گئے۔ عظیم بیگ دلی آتے تو شاہد صاحب کے ہاں ٹھہرتے۔ شاہد صاحب عظیم بیگ کے ہاں جاتے تو کئی کئی دن رہتے۔ راتوں باتیں کرتے۔ وہ افسانے لکھتے اور شاہد صاحب کو دے دیتے۔ ایک ہفتہ میں ناول لکھ دیتے۔ شاہد صاحب اسے شائع کرنے کے منصوبے بناتے۔ تپ دق کے مریض تھے۔ دس سال بیمار رہے اسی بیماری میں بہترین افسانے لکھے۔ دھول دھپا اور ہنسی مذاق کرتے رہے۔ اور یونہی مر گئے۔ جب ان کے مرنے کی اطلاع شاہد صاحب کو ملی، تو

ایسے روئے کہ اگر کوئی قریبی عزیز بھی مرتا تو نہ روتے۔ کئی روز تک سوگ مناتے رہے۔ اب بھی بیگم چغتائی آتی رہتی ہیں اور شاہد صاحب خلوص کے مارے بچھ بچھ جاتے ہیں۔ شاید ان کو دیکھ کر عظیم بیگ یاد آجاتے ہیں۔ دبے زخم ابھر آتے ہیں۔ پرانا دوست یاد آجاتا ہے۔ وہ دوست جو وقت سے پہلے مرگیا۔ جواں مرگ۔

شاہد صاحب ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے۔ دلّی میں پلے بڑھے۔ بچپن جوانی وہیں گذرا۔ بال سفید ہوئے تو پاکستان آگئے۔ ۱۹۴۷ء سے پیر الٰہی بخش کالونی میں مقیم ہیں۔ یہیں ساقی کا دفتر ہے۔ وضع وہی ہے جو دلّی میں تھی۔ دلّی میں سکون تھا۔ آسودگی تھی۔ کراچی میں نہ سکون ہے نہ آسودگی۔ بڑا کنبہ ہے پیٹ پالنے کے لئے اپنی ساری صلاحیتوں کو وضعداری کے ساتھ بروئے کار لاتے ہیں۔ کبھی گا کر کماتے ہیں۔ کبھی لکھ کر۔ زمانے کی نیرنگیاں ہیں۔ سدا زمانہ ایک سا نہیں رہتا۔ اب وہ ہیں اور ریڈیو پاکستان۔ اگر آپ کبھی ریڈیو پاکستان سے گذریں اور ایک ایسے شخص کو دیکھیں جو ڈھیلی ڈھالی شیروانی پہنے جس کا ایک یا دو بٹن لگے ہوں، سیاہ رنگ ہو۔ آنکھوں پر چشمہ ہو۔ بیڑی منہ میں ہو۔ سر پر سیاہ یا گہرے کتھئی رنگ کی جناح کیپ ہو۔ ذرا دائیں طرف کو جھکی ہوئی، بائیں طرف سے اٹھی ہوئی، اور وہ شخص کسی کا بازو پکڑے یا کندھے پر ہاتھ رکھے چشمہ میں سے جھانکتی ہوئی چمکدار آنکھوں سے سامنے دیکھتے ہوئے، چھوٹی مہری کا پاجامہ پہنے جس کے پائنچے کی مہری کے ڈورے ٹنکے ہوں اور ہلکا سا کشیدہ کاری کا جال بنا ہو۔ نیو کٹ کا جوتا ہو تو سمجھ لیجئے کہ شاہد احمد دہلوی ہیں ——— دلچسپ انسان، فاضل مدیر، بہترین مترجم، صاحب زبان، دلّی والے۔

کلیمُ الدّین احمدؔ

قاضی عبدالودود

کلیم الدین[1] احمد صاحب کے والد، ڈاکٹر عظیم الدین احمد مرحوم کی خدمت میں مجھے زمانۂ طالب العلمی سے نیاز تھا، لیکن خود اُن سے تعلقات کا آغاز دسمبر ۱۹۴۷ء یا جنوری ۱۹۴۸ء میں ہُوا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ کلیمؔ الدین احمد صاحب اور اُن کے قدیم دوست فضل[2] الرحمٰن صاحب کی مساعی سے پٹنہ میں دائرۂ ادب قائم ہُوا تھا اور اس کی طرف سے ماہنامۂ معاصر جاری ہُوا تھا۔ سرورق میں ایڈیٹر کی حیثیت سے نام تو ڈاکٹر صاحب کا ہُوا کرتا تھا، لیکن یہ محض نمائش کے لئے تھا۔ معاصر کی عنانِ ادارت دراصل کلیم الدین احمد صاحب کے ہاتھ میں تھی۔ ان سے میری پہلی مُلاقات کا مقصد اس رسالہ کے متعلق مبادلۂ خیالات تھا۔ لیکن رسمی بات چیت کے بعد جس میں ان کا بہت کم حصّہ تھا میں نے رسالے کے بارے میں جو سوالات کئے ان کا جواب سید حسن عسکری[3] صاحب نے دیا جو اُن کے ساتھ آئے تھے اور میں نے اس کے متعلق جو تجویزیں پیش کی تھیں۔ ان کی نسبت خود ان کا ردِ عمل مطلقاً معلوم نہ ہو سکا۔ وہ دورانِ گفتگو میں بالکل خاموش رہے اور رخصت کے وقت ان کی مُہرِ سکوت ٹوٹی بھی تو ایک آدھ لفظ سے زیادہ ان کی زبان سے نہ نکلا۔ مجھے بعد کو یہ پتہ چلا کہ یہ ان کی خاص روش ہے۔ اب میرے ساتھ ان کی یہ کیفیت نہیں رہی، لیکن ایسے لوگوں کے ساتھ جن سے وہ اچھی طرح واقف نہیں اور ان کے فرائضِ منصبی ان سے گفتگو کرنے پر مجبور نہیں کرتے۔ ان کا اب تک یہی حال ہے۔

بعض اوقات کلیم الدین احمد صاحب ضروری سوالات کا جواب دینا بھی غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ تین ساڑھے تین سال کی بات ہے کہ ایک نج کی صحبت میں وہ" سید مسعود حسن رضوی صاحب، آل احمد صاحب سرور، میں اور کچھ اور اصحاب موجود تھے۔ میں نے اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں کہ گارساں دتاسی اُردو اچھی

---

[1] پیدائش ۱۵ ستمبر ۱۹۰۷ء۔ ابتدائی تعلیم بطورِ قدیم ہوئی۔ بی۔ اے میں ان کے اختیاری مضامین عربی و معاشیات تھے اور انگریزی میں آنرز یونیورسٹی میں اوّل نکلے اور ایم۔ اے انگریزی میں بھی یہی حال رہا۔ ۱۹۲۸ء میں کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہوئے۔ ٹرائی پوس کے حصّہ اوّل میں انگریزی اور دوم میں فرانسیسی اور اطالوی ان کے مضامین تھے۔ واپسی پر پٹنہ کالج میں انگریزی کے لیکچرار ہوئے۔ اور ۱۹۴۲ء میں شعبۂ انگریزی کے صدر۔ کچھ دن ڈپٹی ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن رہنے کے بعد پٹنہ کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے اور آج کل اسی عہدے پر ہیں۔ پٹنہ یونیورسٹی کی فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین بھی ہیں۔ تصانیف: سائیکو انیلیسز اینڈ لٹریری کری ٹیسزم۔ اُردو تنقید پر ایک نظر۔ فنِ داستان گوئی۔ رسالہ کرنٹ اسٹڈیز کے بانی اور مدیر بھی ہیں (یہ حالات محمد حسین صاحب لیکچرار گیا کالج سے معلوم ہوئے ہیں)

[2] آج کل پرنسپل مظفر پور کالج

[3] آج کل صدر شعبۂ تاریخ پٹنہ کالج۔

طرح نہیں جانتا تھا۔ ایک اُردو شعر پیش کیا اور اس نے فرانسیسی میں جو اس کا ترجمہ کیا ہے پڑھا۔ فرانسیسی سے کل حاضرین واقف نہ تھے اس لئے فرانسیسی کی عبارت کو اردو شعر میں منتقل کرنا ضروری تھا، لیکن سوءِ اتفاق سے ایک معمولی سے لفظ کے معنی اس وقت یاد نہ تھے۔ میں نے کلیم الدین احمد صاحب کی طرف رجوع کیا لیکن اُنہوں نے نہ تو اس کے معنی بتائے اور نہ یہ کہا کہ مجھے معلوم نہیں۔ دُوسرا واقعہ علی گڈھ کا ہے جو میں نے ایک معتبر راوی سے سُنا ہے۔ اپنی پہلی اشاعت کے بعد ان کا علی گڈھ جانا ہُوا تھا اور وہاں رشید احمد صدیقی صاحب نے انہیں چائے پر مدعو کیا تھا۔ اُس موقعہ پر کچھ اور لوگ بھی موجود تھے اور ان سے ان کی کتاب کے متعلق سوال کئے گئے تھے مگر جواب دینا درکنار، اُنہوں نے ٹالنے کی بھی کوشش نہ کی تھی۔

ایسے لوگ بہت ہیں جو قلم پر تو قدرت رکھتے ہیں لیکن ان کی زبان ان کے اختیار میں نہیں۔ اس لئے نجی کی صحبت ہو یا عام مجمع وُہ خاموشی ہی میں اپنی نجات سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی کم نہیں جو نجی کی صحبتوں میں خُوب چہکتے ہیں۔ لیکن عام مجمع کا رعب یا تو انہیں قوتِ گویائی سے بالکل محرُوم کر دیتا ہے یا اس کی وجہ سے ان کا دماغی توازن اس قدر درہم برہم ہو جاتا ہے کہ اپنے خیالات کو منظم طور پر پیش نہیں کر سکتے۔ کلیم الدین احمد صاحب کا مُعاملہ بالکل جُداگانہ ہے۔ اپنے فرائضِ منصبی کی انجام دہی میں انہیں مجمع سے خطاب کرنا اور مباحثوں میں شریک ہونا پڑتا ہے۔ سید حسن عسکری صاحب کا بیان ہے کہ بعض ایسے مواقع پر بھی انہیں تقریر کرنا پڑی ہے جب وُہ اس کے لئے بالکل تیار نہ تھے۔ اور انہوں نے اپنے خیالات کو سُلجھے ہُوئے انداز اور شُستہ زبان میں پیش کیا تھا میں نے اصلی زندگی میں ان کا نظیر نہیں دیکھا۔ دُنیائے افسانہ میں آرنلڈ بنٹ کی مخلوقِ ذہنی لیڈی مسولم ان سے مشابہ ہے۔ بنٹ نے اس کے متعلق لکھا ہے:۔

"It was not that Lady Massulam was tongue tied, nor that She was impolite; it was merely that with excellent calmness She did not talk, if anybody handed her a Subject, she just dropped it, The floor around her was strewn with subjects"

کلیم الدین صاحب کم سُخن ہی نہیں، کم آمیز اور دیر آشنا بھی ہیں۔ سید حسن عسکری صاحب پٹنہ کالج کے ایم۔اے کلاس میں اس وقت داخل ہُوئے ہیں جب مقدم الذکر کا متعلم کی حیثیت سے وہاں آخری سال تھا۔ سید صاحب کا بیان ہے کہ دوستی تو خارج از بحث ہے فضل الرحمٰن کے سوا جو اُن کے ہم جماعت تھے اور جن سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔ کسی طالبُ العلم سے وُہ کبھی بات چیت بھی نہیں کرتے تھے۔ میرے چھوٹے بھائی قاضی محمد فرید کیمبرج میں ان کے ہم عصر تھے، وُہ کہتے ہیں کہ وہاں بہُت کم لوگوں سے ان کا ملنا جُلنا تھا، اور مطالعہ ان کا واحد شغلہ تھا۔

کلیم الدین احمد صاحب نئی بات صرف اس لئے تو نہیں کہتے کہ وُہ نئے ہیں، لیکن اگر کوئی ایسی بات کہنا چاہتے ہیں تو یہ نہیں دیکھتے کہ پیچھے آمین گویوں کی ایک جماعت موجود ہے یا نہیں۔ وُہ جو کُچھ کہتے ہیں کھُلّم کھُلّا کہتے ہیں۔ اور طنز سے خواہ خفی ہو یا جلی بہُت کم کام لیتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ تنقیدی مباحث میں ایسے الفاظ استعمال ہوتے ہیں جن کے معانی متعین ہیں۔ مُبالغے سے بھی وُہ بچنا چاہتے ہیں۔ لیکن ایک آدھ جگہ ان سے خود اس کا ارتکاب ہُوا ہے۔ ان کی کتاب "اُردو تنقید پر ایک نظر" کے افتتاحی جملے ہیں:۔

"اُردو میں تنقید کا وجُود محض فرضی ہے۔ یہ معشوق کی موہُوم کمر ہے یا اقلیدس کا خیالی نُقطہ"

اُردو میں اعلیٰ درجے کی تنقید مفقُود سہی، مگر تنقید کے وجُود سے کس طرح انکار کیا جا سکتا ہے؟ ان کی تحریروں میں کہیں کہیں تحکم اور تضاد بھی ملتا ہے لیکن اس وقت مثالیں پیش کرنے سے قاصر ہُوں۔ وُہ بُرے کو بُرا نہ کہنا شہر بہار کی طرح اچھوں سے ظُلم کا مترادف سمجھتے ہیں۔ اور اس سے جو نتائج نکل سکتے ہیں۔ ان سے

؎ میں نے سُنا ہے کہ جس زمانے میں ڈاکٹر سچدانند سنہا پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے اُنہوں نے کلیم الدین احمد صاحب سے فرمائش کی تھی کہ "اقبال" پر جو اُن کی کتاب ہے اُس کا دیباچہ تحریر کریں تعمیلِ حکم تو کی گئی مگر اس طرح کہ وُہ ان کے معتوبین میں شامل ہو گئے۔ بعض اصحاب اس سے منکر ہیں مجھے خود کلیم الدین احمد صاحب سے اس کے متعلق دریافت کرنے کا موقع نہیں ملا۔

بے پرواہیں۔ اُنہیں اپنی ناقدانہ رایوں پر کامل اعتماد ہے اور مخالف سے نہیں ڈرتے۔ ان کے خلاف جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ عموماً اس کا جواب نہیں دیتے۔ لیکن اس قاعدے کا استثنا بھی ہے۔ رسالۂ اُردو میں ان کی پہلی کتاب پر جو ایک غیر ذمہ دارانہ تبصرہ نکلا تھا۔ اُنہوں نے "تنقید یا استہزا" کے عنوان سے اس کا مسکت جواب دیا تھا۔ ایک ایماندار نقاد کو ٹف نس (اس انگریزی لفظ کا اردو بدل اس وقت ذہن میں نہیں) کی بڑی ضرورت ہے۔ اور ان میں اس کی کمی نہیں لیکن بعض امور میں وہ بڑے ذکی الحس واقع ہوئے ہیں۔ 'معاصر' کے ابتدائی دور میں ان کی نظمیں اس رسالہ[1] میں شائع ہوا کرتی تھیں۔ سرور صاحب نے ان پر اعتراض کئے۔ کلیم الدین احمد نے ان کا جواب دیا۔ لیکن اعتراضات کو تسلیم نہ کرنے کے باوجود وہ دن اور آج کا دن ان کا ایک مصرع بھی منظرِ عام پر نہیں آیا۔ لکھ کر رکھ چھوڑی ہوں تو اور بات ہے۔ نقاد کی حیثیت سے وہ بڑے سخت گیر ہیں۔ لیکن جہاں تک میرا علم اور مشاہدہ ہے عملی زندگی میں بڑے نرم ہیں۔ 'معاصر' کے اڈیٹر کی حیثیت سے بھی وہ کبھی کبھی ایسی نظم و نثر شائع کر دیا کرتے تھے جو کسی طرح ایک اچھے رسالے میں شمول کے لائق نہ تھی۔ میں نے اس پر اعتراض بھی کیا تھا، مگر وہ تشفی بخش جواب نہ دے سکے۔

کساچے کی طرح کلیم الدین احمد صاحب کا بھی یہ عقیدہ ہے کہ ذہنِ انسانی کی تمام سرگرمیوں میں شاعری سب سے بلند درجہ رکھتی ہے۔ فرائیڈ کے متعلق ان کا خیال ہے کہ اس نے "کچھ کام کی باتیں بتائی ہیں لیکن ادب کو سمجھنے یا تنقید پر جلا کرنے میں اس کے نظریوں سے زیادہ مدد نہیں ملتی"۔ ارکسیت کی نسبت ان کی رائے ہے کہ "اس کی بنیاد ہیگل اور خوا پر باخ کے متضاد فلسفوں پر ہے"۔ یہ فلسفہ ہے تو "ادھورا، کچا اور مانگا ہوا"۔ تاریخ ہے تو "من مانی اور خیالی"۔ سائنس ہے تو "غیر سائنٹیفک"

کلیم الدین احمد صاحب کو وہابی تحریک سے بڑی دلچسپی ہے اور اس کے متعلق بہت کچھ مواد اُنہوں نے فراہم کیا ہے۔ میں ان کے مذہبی عقائد کے متعلق کچھ کہنے سے قاصر[2] ہوں لیکن اُن کے والد کا شمار کسی طرح اہلِ حدیث میں نہیں ہو سکتا۔ ایک بار نہیں بار بار میں نے اُنہیں یہ کہتے ہوئے سُنا ہے کہ قرآن میں سب کچھ جو ایک مُسلمان کے لئے ضروری ہے" موجود ہے۔ اگر کوئی بات اس میں نہیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ مُسلمانوں کو اس کے متعلق کامل آزادیِ فکر و عمل حاصل ہے۔

---

[1] یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ کلیم الدین احمد صاحب کسی زمانے میں غزل بھی کہتے تھے۔ بلکہ ان کی شعر گوئی کا آغاز اسی سے ہوا تھا۔ کلیم الدین احمد صاحب کو خاندانی شاعر کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ ان کے والد کا تو مجموعۂ اشعار طبع بھی ہو چکا ہے۔ حکیم عبدالحمید پریشاں بھی جو ان کے والد کے نانا تھے، اور جن کے زیرِ سایہ اُن کے نواسوں نے تربیت پائی تھی۔ اُردو، فارسی، عربی میں شعر کہتے تھے۔ یہ اپنے زمانے کے بڑے نامی طبیب تھے اور سُنا گیا ہے کہ سرِ پنج پٹنہ کے ابتدائی دور میں شاد عظیم آبادی کی نظم و نثر پر اُنہوں نے بکثرت اعتراض بھی کئے تھے۔

[2] حکیم عبدالحمید مرحوم کے والد پٹنہ کے نہایت ممتاز اہلِ حدیث میں تھے۔ اور گذشتہ صدی میں وہابیوں کے خلاف جو مشہور مقدمہ ہوا تھا اس میں انہیں بھی حبسِ دوام بعبور دریائے شور کی سزا ملی تھی اور جزیرۂ انڈمان میں اُنہوں نے وفات پائی تھی۔ ان کی ساری جائداد بھی جو معتدبہ تھی بطورِ سزا ضبط کر لی گئی تھی۔ ممکن ہے کہ اس تحریک سے یہ تعلق دلچسپی کا باعث ہو۔

سرور صاحب

وقار عظیم

سرور صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۴۳ء کے شروع میں ہوئی تھی۔ اس بات کو اب تھوڑے دن بعد بیس برس ہو جائیں گے لیکن بیس برس کی یہ مدت اتنی تیزی سے گزری ہے کہ ۱۹۴۳ء کی وہ باتیں جن کا ذکر میں اس وقت کر رہا ہوں، کل کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ممکن ہے اس احساس میں وقت کی ضرب المثل تیزگامی کو بھی دخل ہو، لیکن میرے نزدیک اس کی زیادہ بڑی وجہ یہ ہے کہ جو نقش دل پر اتنی مدت ہوئی قائم ہوا تھا، اس کی سادگی میں ایک ایسی کشش تھی جس پر ہزاروں رنگینیاں قربان ہوں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب سرور صاحب انگریزی میں ایم۔اے کر چکنے کے بعد اردو کے ایم۔اے کا امتحان دے چکے تھے۔ انہیں دنوں علی گڑھ کے شعبۂ اردو میں ایک لکچرار کی اسامی خالی ہوئی تھی اور بہت سے لوگوں کے علاوہ میں اور میرے دوست طالب الہ آبادی بھی اس کے لئے امیدوار تھے اور اسی سلسلہ میں علی گڑھ آئے ہوئے تھے۔ طالب صاحب ابو طالب نقوی صاحب کلکٹر علی گڑھ (حال چیف کمشنر کراچی) کے مہمان تھے اور ان کے توسل سے معاملات کو آسان بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں اپنے پھوپھی زاد بھائی تجمل حسین انصاری صاحب سب پوسٹ ماسٹر کے یہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ ان کی ملاقات خان صاحب کرم احمد صاحب ریٹائرڈ انسپکٹر ڈاکخانہ جات سے تھی۔ مجھ سے کہنے لگے کہ "خان صاحب کی یونیورسٹی کے حلقوں میں رسائی ہے، اس لئے چلو، تمہیں ان سے ملوا دیں۔ شاید کوئی کام کی بات معلوم ہو۔" میں نے کہا "چلئے!"

ہم دونوں خان صاحب کی خدمت میں پہنچے تو وہ بڑی محبت اور شفقت سے پیش آئے۔ بھائی صاحب سے اِدھر اُدھر کی بہت سی باتیں کیں۔ گھر کے ہر چھوٹے بڑے کی خیریت پوچھی اور اس اندازِ خاص سے تواضع فرمائی جو صرف ان بزرگوں کے لئے مخصوص تھا۔ تھوڑی دیر بعد یونیورسٹی کی اسامی کا ذکر نکلا۔ خان صاحب بولے "یونیورسٹی کے معاملات سے اب مجھے لگاؤ نہیں رہا۔ اب یہ کام "علّو میاں" نے سنبھال لیا ہے۔ ابھی شاید گھر ہی میں ہوں گے۔ میں بلوائے دیتا ہوں۔" نوکر کو آواز دی اور کہا "ذرا جا کر علّو میاں کو بھیج دو۔" ایک منٹ کے اندر علّو میاں آ گئے۔ پستہ قد اور چھریرے جسم کے ایک گورے چٹے نوجوان، ذہین اور شگفتہ چہرہ، سیدھی سادی وضع، منکسر مزاج۔ یہ آل احمد سرور تھے۔ خان صاحب ہم لوگوں کا تعارف کرا کے، کسی کام سے اندر چلے گئے۔ سرور صاحب نے بیٹھ کر باتیں شروع کیں اور ایسے غیر رسمی انداز سے شروع کیں کہ منٹوں ہی منٹوں میں دنوں، ہفتوں اور مہینوں کی ساری منزلیں طے ہو گئیں۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میں سرور صاحب کو مدتوں سے جانتا ہوں اور بغیر کسی تکلف اور حجاب کے انہیں ہم راز بنا سکتا ہوں ——— نہ صرف یہ بلکہ ان سے بہترین رفاقت اور دوست داری کی توقع کر سکتا ہوں۔ یونیورسٹی کے معاملہ پر بڑی سادگی اور صفائی سے گفتگو ہوئی۔ مصلحت اور سیاست کے تقاضوں کا ذکر آیا اور جس خاص معاملہ کے سلسلہ میں میں علی گڑھ گیا تھا، اس کے ہر پہلو پر باتیں ہوئیں تو مجھے اندازہ اور یقین ہو گیا کہ اس اسامی پر کون لیا جائے گا۔ ایسے موقعوں پر تذبذب کی جو لازمی خلش اور بے چینی ہوتی ہے، سرور صاحب کی

باتوں سے وہ دور ہو گئی اور میں نتیجہ اور انجام کی طرف سے قطعی بے نیاز ہو گیا۔ ممکن ہے مجھے یہ سوچ کر کوفت ہوتی کہ ناحق الٰہ آباد سے علی گڑھ آ کر زیرِ بار ہوا۔ لیکن ایک اچھے آدمی سے قریب ہونے کا جو موقع ملا تھا، اس نے ہر زیان اور احساسِ زیاں کی تلافی کر دی۔ سرور صاحب سے تعارف ہی بجائے خود ایک ایسی چیز تھی جو زندگی کے بہت سے مرحلوں میں زادِ راہ بن سکتی ہے۔

میں علی گڑھ سے بہت مطمئن، بلکہ مسرور لوٹا۔ الٰہ آباد آ کر پھر پہلے کی طرح زندگی کی کشمکشوں میں گھر گیا۔ علی گڑھ کا سفر اور سرور صاحب سے ملاقات کی یاد بہت جلد ماضیٔ بعید کے تصور کی طرح بہت سی چیزوں کے نیچے دب کر رہ گئی۔ اور اسی طرح دو سال گذر گئے۔

دو سال بعد میں نے جولائی ۱۹۳۷ء میں بی ٹی میں داخلہ لیا۔ اس زمانہ میں سرور صاحب شعبۂ اردو میں لکچرار تھے۔ جو لوگ علی گڑھ کی تعلیمی زندگی سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ بی ٹی میں داخلہ لینے والے علی گڑھ کے روایتی ہنگاموں سے الگ، ایک ایسی دنیا میں رہتے ہیں، جہاں تک دوسروں کی رسائی کم ہوتی ہے اور خود یہاں کے رہنے والوں کو اتنی فرصت نہیں ہوتی کہ آنکھ اٹھا کر بھی کسی طرف دیکھ سکیں۔ چنانچہ علی گڑھ آ کر میں اس ماحول میں ایسا گھرا کہ کسی سے ملنے جلنے کی طرف توجہ نہ ہوئی۔ یوں کبھی کبھی رشید صاحب اور سرور صاحب سے ملنے کو جی ضرور چاہتا رہا۔ کبھی کبھی ایسے لوگوں سے اتفاقی ملاقاتیں بھی ضرور ہوتی رہیں۔ جن سے رشید صاحب اور سرور صاحب کی باتیں سننے میں آتی رہیں۔ ان باتوں سے میں نے جو کچھ نتیجہ نکالا وہ یہ تھا کہ سرور صاحب نے زندگی کی جو ذمہ داری سنبھالی ہے، اسے پورے انہماک اور خلوص سے پورا کرنے میں مصروف ہیں۔ انہیں ایک استاد، ایک ادیب اور ایک نقاد کے جو منصب ماحول نے بیک وقت سونپے ہیں ان کی اہمیت کا انہیں پورا پورا احساس ہے اور اس احساس کے بعد وہ پوری سنجیدگی کے ساتھ ہر ایک کا حق ادا کرنے کو اپنا فرض سمجھ رہے ہیں۔ زندگی نے انہیں اپنا ہم سفر بنایا ہے۔ زندگی ایک مرتبہ ہر شخص کو یہ موقع دیتی ہے۔ جسے یہ موقع دیا گیا ہے وہ اس سے فائدہ اٹھائے یا نہ اٹھائے، یہ اس کا اپنا کام ہے۔ سفر شروع کر کے اسے منزل بہ منزل طے کرنا اور کسی آخری منزل تک پہنچانا ہی اچھے راہی کا سب سے بڑا منصب و مقصد ہے۔ لیکن اس منصب اور مقصد کو بہت کم لوگ محسوس کرتے اور پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سرور صاحب کے متعلق میں نے علی گڑھ کے قیام کے ابتدائی چند مہینوں میں جو کچھ سنا وہ یہی تھا کہ زندگی کے ہم سفر ہو کر سرور صاحب کسی قیمت پر بھی اس سے بچھڑ جانے میں اپنی موت سمجھتے ہیں۔ انہوں نے طے کیا ہے کہ وہ سفر کی رفاقت کا ایسا حق ادا کریں گے کہ زندگی انہیں اپنا ہم سفر بنا کر پچھتانے کے بجائے مسرور ہو کر، فخر محسوس کرے۔

سرور صاحب ان دنوں، اپنے اس سفر کی راہ کو استوار کرنے کی فکر میں تھے۔ وہ زندگی میں اپنے لئے کوئی جگہ بنانے کی کشمکش اور جد و جہد سے دوچار تھے اور اس لئے لازمی طور پر انہیں تصادم سے سابقہ پڑتا تھا۔ لیکن اس تصادم میں انہوں نے کبھی غیر معمولی جوش سے کام لے کر، اپنے حاسدوں کو بغلیں بجانے کا موقع نہیں دیا۔ خلوص، انہماک، محنت، مشقت، اور وسیع النظری کو اپنا ہمدم و دمساز بنا کر اس کام میں مصروف رہے، جو ابھی شروع ہوا تھا۔

بی ٹی کے ابتدائی چند مہینے گزر جانے کے بعد اتفاق سے سرور صاحب کہیں مل گئے۔ وہی دو برس پہلے کی سادگی و شگفتگی اور وہی بے اندازہ خلوص اس مرتبہ اس سادگی میں ایک ہلکا سا نکھار، شگفتگی میں ایک لطیف سی سنجیدگی اور خلوص میں محبت و شفقت کی چاشنی البتہ زیادہ تھی۔ ملتے تو لگتے دن تک نہ ملنے کی شکایت کی۔ پھر خود ہی میری وکالت میں، بی ٹی کی مصروفیتوں کا عذر پیش کر دیا۔ اس کے بعد اپنی مصروف زندگی کا ذکر کر کے، خود نہ مل سکنے کی معذرت پیش کی۔ یونیورسٹی، شعبۂ اردو اور گھر کی باتیں سنائیں اور میرا حال پوچھا۔ لیکن نہ اس پرسشِ حال میں تکلف کا کوئی شائبہ تھا، اور نہ گھر و شعبہ کی زندگی کے بیان میں کسی قسم کی دنیاداری۔ تھوڑی سی دیر میں بہت سی باتیں ہوئیں اور ان باتوں نے سرور صاحب کو مجھ سے اور مجھے سرور صاحب سے اور قریب کر دیا۔ مجھے رنج ہو رہا تھا کہ میں نے بی ٹی کی مصروف زندگی کے باوجود سرور صاحب سے اکثر ملنے کا وقت کیوں نہیں نکالا۔

اس کے بعد کئی مہینے میں علی گڑھ میں رہا اور اس دوران میں سرور صاحب سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ پڑھانے اور لکھنے کے کام میں ان کا انہماک اور شغف برابر بڑھ رہا تھا اور بڑی تیزی سے طالب علموں، استادوں اور یونیورسٹی کے اعلیٰ اور وسیع تر حلقوں میں ان کے وقار میں اضافہ ہو رہا تھا۔

طالب علموں میں ایک شفیق رہنما، استادوں میں ایک ذہین، شگفتہ طبع اور مخلص رفیقِ کار اور یونیورسٹی کے اربابِ اقتدار میں ایک ہونہار استاد کی حیثیت سے انہیں ایک ایسی جگہ مل رہی تھی جو ان کے دوستوں کے لئے سرمایۂ مسرت اور بعض ہم چشموں کے لئے باعثِ حسد تھی۔

تقریباً سال بھر علی گڑھ میں رہ کر میں پھر الٰہ آباد آ گیا اور چند ہی مہینے بعد میرا تقرر اردو کے استاد کی حیثیت سے جامعہ ملیہ (دہلی) میں ہو گیا۔ یہ بات جون یا جولائی ۳۹ء کی ہے۔ تقریباً اسی زمانہ میں میرے خسر عابد حسین خاں صاحب پنشن لے کر علی گڑھ آ گئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ان کے علی گڑھ کے قیام نے مجھے اور علی گڑھ کو ایک دوسرے سے بہت قریب کر دیا۔ ہر بڑی چھٹی علی گڑھ میں گذرنے لگی اور اس طرح فرصت کے نسبتاً طویل زمانوں میں مجھے سرور صاحب سے زیادہ ملنے اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ چنانچہ مئی ۴۰ء میں جب جامعہ میں گرمی کی چھٹیاں ہوئیں تو میں یہ زمانہ گذارنے کے لئے علی گڑھ آیا۔ شروع کے دو تین دن جمنے جمانے میں لگے۔ ایک دن شام کو سرور صاحب کے گھر پہنچا۔ دستک دی، ایک بچہ باہر آیا۔ اسے اپنا نام بتایا۔ وہ اندر گیا اور چند ہی سیکنڈ میں سرور صاحب ہمہ تن تبسم و شگفتگی بنے ہوئے باہر نکلے۔ آتے ہی نہ جانے کتنے سوال کر ڈالے۔ سوال جواب کے اس سارے مرحلہ میں جس بات نے انہیں سب سے زیادہ مسرور کیا وہ یہ خبر تھی کہ میں دو مہینے کی چھٹیاں علی گڑھ میں بسر کروں گا۔ یہ باتیں کھڑے کھڑے ہوئیں۔ پھر بیٹھک کھولی گئی۔ سرور صاحب کی بیٹھک ایک کشادہ و فراخ کمرہ تھا۔ لیکن ہر طرح کے تکلف سے بے نیاز۔ صرف چند کرسیاں اور ایک بڑی سی میز اس کا کل سامانِ آرائش تھا۔ میز پر کچھ اردو اور کچھ انگریزی کی کتابیں اور بعض تازہ رسالے پڑے ہوئے تھے۔ ہم بے تکلفی سے کرسی پر بیٹھ گئے۔ بے تکلفی، کچھ اس انداز کی جیسے کرسی پر بیٹھ جانے اور باتیں کرنے کے علاوہ زندگی کا اور کوئی مقصد نہیں۔ اس صحبت میں پان کھائے گئے، حقہ پیا گیا اور بس باتیں کی گئیں۔ طرح طرح کی باتیں۔ لیکن ان میں زیادہ باتیں میری نئی زندگی کے متعلق تھیں۔ سرور صاحب بڑی محبت سے، میرے نئے ماحول کے بارے میں باتیں پوچھتے اور مشورے دیتے رہے۔ میں تھوڑی دیر بیٹھ کر رخصت ہوا تو ایک اور پان پیش کرتے ہوئے سرور صاحب نے کہا۔ "اچھا ہے، دو مہینے خوب گپ رہے گی" اور سچ مچ دو مہینے خوب گپ رہی۔

کبھی میں سرور صاحب کے گھر پہنچ جاتا، کبھی وہ میرے گھر آ جاتے۔ کبھی ہم دونوں شام کی سیر کو ایک ساتھ جاتے اور کبھی شعبۂ اردو میں ملاقات رہتی۔ ان ساری ملاقاتوں میں خوب گپ رہتی۔ "گپ" کا مفہوم کتنا وسیع ہے اور اس میں کیا کیا چیزیں شامل کی جا سکتی ہیں، اس کا اندازہ مجھے پہلے سرور صاحب کی ان ملاقاتوں میں ہوا اور اس کے بعد شعبۂ اردو کے اسٹاف روم کی غیر رسمی نشستوں میں۔ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، مسکرا کر، ہنس کر اور قہقہے لگا لگا کر سرور صاحب جن موضوعات پر گپ کرتے تھے ان میں گھریلو باتوں کے علاوہ یونیورسٹی کی سیاست، ادب و شعر کے رجحانات، نئی تصانیف، رسالوں کے تازہ نمبر اور ان رسالوں میں چھپنے والے خاص خاص مضامین، ادب، سیاست اور یونیورسٹی کی شخصیتیں، دوست دشمن اور ان کے کردار و روزمرہ افعال جیسی چیزیں شامل ہوتی تھیں۔ اس گپ میں سرور صاحب کی شخصیت اور کردار کے جتنے پہلو میرے سامنے آتے، ان کی عزت اور محبت دل میں زیادہ ہوتی۔

سرور صاحب سے کسی موضوع پر بھی گفتگو ہوتی، وہ جذبات کی رو میں ہرگز نہ بہتے۔ بات کہتے تو اس میں شگفتگی و توازن کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ دوست داری سے زیادہ، غیر جانب داری ان کے میزانِ عدل کی زینت ہوتی۔ اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے تو دوسروں کے نقطۂ نظر کا احترام ملحوظِ خاطر رہتا۔ جو بات کہتے اس میں اعتماد کے باوجود لچک ہوتی۔ کسی کے حق میں کہتے تو اس میں جانب داری کا شائبہ نہ ہوتا۔ کسی کے خلاف کچھ کہنا ہوتا تو اس طرح کہتے کہ اخلاص و صداقت و شگفتگی کی بدولت اس میں ذرہ برابر تلخی نہ پیدا ہوتی۔ اچھائی خواہ کسی میں ہو اس کا اعتراف ان کا مسلک ہوتا۔ برائی کی پردہ دری انہیں مسرور نہ کرتی۔ لیکن جب اس کا ذکر آ جاتا تو اس کی تنقید اس طرح کرتے کہ اندھیرے اجالے میں صاف فرق دکھائی دیتا۔

سرور صاحب کو اب شعبۂ اردو میں آئے کئی سال ہو گئے تھے۔ دو برس پہلے تک میں نے انہیں قدم جمانے اور اپنے لئے کوئی راہ متعین کرنے کی جس کوشش میں منہمک اور مصروف دیکھا تھا، اس میں اب پہلے کی سی شدت باقی نہیں رہی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہرگز نہیں تھی کہ انہیں اب اس مقصد کی اہمیت کا احساس

نہیں رہا تھا۔ احساس تھا، اور غالباً پہلے سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ لیکن اتنی مدت کے انہماک اور اس انہماک کی وجہ سے جو کامیابی حاصل ہوئی تھی، اس نے ان میں اعتماد کی قوت پیدا کر دی تھی۔ اب ماحول پر ان کی گرفت پہلے سے زیادہ مضبوط تھی۔ ماحول انہیں اپنے رنگ میں رنگنے کے بجائے آہستہ آہستہ ان کی شخصیت کا رنگ قبول کر رہا تھا۔ اور جوں جوں ماحول اور شخصیت میں مطابقت اور ہم آہنگی زیادہ ہو رہی تھی، سرور صاحب اپنے کام کو ایک پرمشقت مشغلہ سمجھنے کے بجائے اس میں زیادہ لذت محسوس کر رہے تھے۔ تنقید و تدریس کو انہوں نے اپنی زندگی کا شغل سمجھ کے اختیار کیا تھا۔ ان دونوں کاموں سے ان کے مزاج کو جو فطری مناسبت تھی، اس میں سرور صاحب کی مشقت، انہماک اور خلوص شامل ہوا تو دونوں کام ان کے لئے اور اس سے بھی زیادہ دوسروں کے لئے ان کے ہاتھوں میں ایک لطیف فن بن گئے۔ شروع شروع میں انہیں تدریس و تنقید کی ضرورت تھی۔ اب کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ تدریس اور تنقید دونوں کو سرور صاحب کی سخت ضرورت ہے۔ دونوں ان کی منت پذیر ہیں اور دونوں کا مستقبل ان کے ہاتھوں تاباں و درخشاں بننے والا ہے۔ گرد و پیش کے ماحول نے سرور صاحب پر یہ بات پوری طرح روشن اور واضح کر دی تھی۔ سرور صاحب کی جگہ کوئی اور ہوتا تو یہ نشہ اسے بدمست کرنے کے لئے کافی تھا۔ لیکن اس اہم حقیقت کے علم نے انہیں زیادہ محتاط، زیادہ معتبر اور زیادہ سنجیدہ بنا دیا۔ مگر اس احتیاط اور سنجیدگی نے ان کی شخصیت کی فطری شگفتگی میں ذرا بھی کمی نہیں آنے دی۔ احتیاط اور اعتبار سے ان کی شگفتگی زیادہ ابھری۔ زیادہ نکھری۔ ان کے تمام انداز میں بے نیازی کی جو کیفیت مجھے پہلی ہی ملاقات میں نظر آئی تھی اور جس پر کبھی کبھی لاابالی پن کا شبہ کر کے ایک خوشی سی محسوس ہوتی تھی۔ اب ذرا زیادہ ہو رہی تھی۔ بظاہر ان دونوں باتوں میں سخت تضاد ہے یہ بات ذرا مشکل سے سمجھ میں آتی ہے کہ ایک استاد اور نقاد بہ یک وقت اتنا محتاط، اتنا معتبر، اتنا سنجیدہ، متوازن، دیانت دار اور غیر جانب دار بھی ہو اور بے نیاز، شگفتہ طبع اور وضع دار اور دوست نواز بھی۔ لیکن سرور صاحب کی شخصیت کا یہی تضاد ان میں ایک ایسی حسین کشش پیدا کرتا ہے جو انہیں دوستوں میں محبوب اور دشمنوں کے لئے قابل قبول بناتی ہے۔

علی گڑھ کی زندگی کے جس دور کا میں ذکر کر رہا ہوں اس میں سرور صاحب آہستہ آہستہ علی گڑھ کی متنوع زندگی کے مختلف شعبوں میں اس حد تک دخیل ہو چکے تھے کہ جس جگہ وہ نہ ہوں وہاں ان کی کمی محسوس کی جاتی تھی اور سچ پوچھئے تو ان کے وجود کے بغیر اب ہر محفل سونی سونی سی لگتی تھی۔ اسٹاف کلب میں ٹینس اور تاش کی رونق ان کے دم سے تھی۔ یونین کے ہنگاموں اور میگزین کے کارناموں میں سرور صاحب جان ڈالتے رہتے۔ دوستوں کی محفل میں ان کے قہقہے اور اپنے ڈرائنگ روم میں گپ کے ساتھ ساتھ پانوں کی کھڑک علی گڑھ کے مختلف حلقوں کا موضوع بنتے جا رہے تھے۔ اور خود شعبۂ اردو کے تو سارے کاروبار کی روح رواں سرور صاحب ہی تھے۔

سرور صاحب ادب اور تنقید میں ارضیت (THIS WORLDLINESS) کے اصول کو بڑا اہم جانتے ہیں۔ ان کا مقولہ ہے کہ ادیب اور نقاد کا منصب یہ ہے کہ وہ اپنی دنیا کے حدود میں رہ کر اسی زندگی کی سطح کو اپنے فکر، تخیل اور تخلیق کی سطح سمجھیں تو اس سے ادب کو بھی فائدہ پہنچتا ہے اور زندگی کو بھی۔ ادیب، انسان، انسانیت اور دنیا و زندگی کی خدمت سب سے بہتر اسی سطح پر رہ کر انجام دے سکتا ہے۔ ایک نقاد کی حیثیت سے انہوں نے ہمیشہ ادب میں اس اصول کی تبلیغ کی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اپنی روزمرہ زندگی میں سرور صاحب خود بھی اسی "ارضی سطح" پر رہنے میں عافیت سمجھتے ہیں۔ وہ فکر، تخیل اور اخلاق کی بلندی کے پیرو ہونے کے باوجود بہت اونچے اڑنے اور بہت تیز چلنے کے قائل نہیں۔ محض اونچا اڑنے اور تیز چلنے کی عادت انسان کو اس کی منزل سے بیگانہ بھی رکھتی ہے اور اس کی جان کا زیاں بھی بنتی ہے۔ منزل مقصود ہمیشہ ان کے قدم چومتی ہے جو تھک کر نہ قدم ہٹاتا، اعتماد اور استقلال کے ساتھ منزل کی طرف بڑھتے ہیں — میں نے سرور صاحب کو کبھی تیز چلتے نہیں دیکھا۔ وہ شام کی سیر کے لئے جا رہے ہوں، انہیں سینما دیکھنا ہو، ایم۔ اے کی کلاس لینی ہو، کسی جلسہ کی صدارت کرنی ہو، ان کے چلنے کی رفتار ایک سی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ وہ وقت کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن جانے کے بجائے، انہوں نے اسے اپنا حلقہ بگوش بنا لیا ہے۔ وہ وقت کے ساتھ گھسٹتے چلنے کے بجائے اس کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر چلتے ہیں۔ وقت سے ان کے مراسم و روابط معاندانہ یا رقیبانہ ہونے کے بجائے دوستانہ و مخلصانہ ہیں اور اس لئے وہ کبھی کبھی اس میں بھی کوئی ہرج نہیں سمجھتے کہ وقت کی گرفت کو بالکل ڈھیلا چھوڑ دیں، اس کے وجود کی طرف سے بالکل بے نیاز ہو جائیں۔ وہ جدھر کو چاہے

بغیر روک ٹوک کے اسے چلنے دیں۔ اس بے نیازانہ اندازِ نظر کے بدلے وقت نے انہیں یہ انعام دیا ہے کہ وہ جب چاہیں اور جس حال میں چاہیں اسے اپنی خدمت کے لئے طلب کر سکتے ہیں۔ وقت بے چون و چرا ان کے پاس آتا اور حسبِ دلخواہ ان کی خدمت انجام دیتا ہے۔

سرور صاحب کی اس نرم اور دھیمی رفتار کو بعض لوگوں نے آسائش پسندی، تن آسانی اور سہل انگاری کہا ہے۔ اس میں شبہ بھی نہیں کہ سرور صاحب کا عام اندازِ زندگی دیکھنے والوں کو ان کے متعلق اسی طرح کے نتیجے مرتب کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ لیکن ایک دوسری چیز، جس تک عام نظر نہیں پہنچتی یہ ہے کہ سرور صاحب کو اس بات پر پوری قدرت حاصل ہے کہ جب کوئی کام آپڑے تو وہ اس تن آسانی کو ترک کرکے ہمہ تن اسی کام کے ہو رہیں اور اسے اس طرح انجام دیں جیسا کہ اس کا حق ہے۔

سرور صاحب سے آدمی جوں جوں زیادہ قریب ہوتا جائے ان کے مزاج کی نرمی اور دھیمے پن کا نقش اس کے دل پر گہرا ہوتا جاتا ہے لیکن یہ جاننے کے لئے کہ اس دھیمے پن کے پیچھے ایک طوفان موجزن ہے، ان سے زیادہ قریب ہونے کی ضرورت پڑتی ہے —— اور پھر یہ اندازہ لگانے کے لئے کہ یہ طوفان کشتیوں کو ڈبونے کے بجائے انہیں ساحل سے لگانا چاہتا ہے۔ ان سے قریب تر ہونا ضروری ہے۔ سرور صاحب کی زندگی تخریبی عناصر سے یکسر خالی ہے اور اس خاص معاملہ میں بھی ان کے کردار میں ایک نمایاں تضاد موجود ہے۔ نہ وہ انقلاب کے ساتھ دلشر طیکہ وہ ہلکا پھلکا ہو چلنے سے ڈرتے اور گھبراتے ہیں اور نہ کسی سازش میں شریک ہوتے ہچکچاتے ہیں۔ لیکن انقلاب اور سازش کی ہم نوائی کرتے وقت یہ بات ہمیشہ ان کے پیشِ نظر رہتی ہے کہ اس انقلاب یا سازش کا مقصد تخریب تو نہیں۔ اچھے نتیجوں کی طرف لے جانے والے انقلاب اور تعمیر کی بنیاد رکھنے والی سازشوں میں، میں نے سرور صاحب کو ہمیشہ پیش پیش دیکھا ہے۔ اور اس طرح دیکھا ہے کہ نہ ان کے پائے استقلال میں جنبش تھی اور نہ چہرے کے تبسم اور شگفتگی میں کمی۔

سرور صاحب نے علی گڑھ میں رہ کر اپنی دلچسپیوں کے دائرہ کو جتنا زیادہ وسیع بنایا تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ ان کی شناسائی کا حلقہ بھی وسیع ہو۔ انہیں ہر طرح کے لوگوں سے سابقہ پڑتا تھا۔ اچھے بھی اور برے بھی، بہت اچھے بھی اور بہت برے بھی۔ ان میں سے کچھ ایسے تھے جو مختلف معاملات میں ان کے ہم مذاق اور ہم مسلک تھے۔ ان میں ان کا اٹھنا بیٹھنا، ظاہر ہے کہ زیادہ ہونا چاہئے تھا۔ وہ اس خاص حلقہ میں اٹھتے بیٹھتے، ملتے جلتے اور ان کی خوشیوں اور غموں میں ان کے برابر کے شریک ہوتے۔ اس حلقہ کے لوگوں سے بے لوث اور بے غرض اخلاص و محبت کا رشتہ قائم کرتے لیکن اس مخلصانہ تعلق میں بھی انہوں نے ہمیشہ جس چیز کو، ہر حال میں سامنے رکھا یہ تھی کہ دوستوں کی خوبیوں کا بڑی فراخ دلی سے اعتراف کیا، اور ان کی کمزوریوں کی بے باک نکتہ چینی کی۔ صحیح نکتہ چینی کو سرور صاحب سچی دوستی کی کسوٹی سمجھتے ہیں۔ دوستی کے پردے میں دشمنی کرنے کو انہوں نے کبھی اپنا مسلک نہیں بنایا، اس لئے کہ اس سے بہت سے اندیشوں اور خطروں کے دروازے کھلتے ہیں۔ سرور صاحب دوستوں سے مسحور تو ہوتے ہیں، مرعوب نہیں ہوتے۔ ان کے ظاہر میں باطن کی جھلک دیکھ لینے کے بجائے بھرپور نظر سے کام لے کر ہر ایک نیک و بد کا سراغ لگاتے ہیں اور اس طرح رازِ درون کے شناسا بن کر وہ دوسروں کی خدمت کرکے خوش ہوتے ہیں۔

جس طرح زندگی میں سرور صاحب نے مرتبہ شناسی اور قدر دانی کو اپنا مسلک بنایا ہے اسی طرح تنقید میں ان کا نقطۂ نظر ادیب اور شاعر کے صحیح مرتبہ کا اندازہ، تعین اور اعتراف ہے۔ اسی لئے ادب میں جہاں کہیں انہوں نے یہ محسوس کیا ہے کہ کسی ادیب یا شاعر کو زمانہ نے اس کا پورا حق نہیں دیا، انہوں نے اس کی پوری حمایت کی ہے۔ کوتاہ نظروں اور حق تلفی کرنے والوں کی کوتاہیوں کا پوری طرح جائزہ لے کر، بڑی جرأت اور قوت سے اپنے موکل کی وکالت کی ہے، اور عموماً اس طرح کی ہے کہ حقدار کو اس کا حق مل گیا ہے۔ اس وکالت میں منطقی تجزیہ، متوازن لہجہ اور شیریں و دل نشین اندازِ بیان ان کے ممد و معاون رہے ہیں۔

منطقی تجزیہ، فکر و احساس کا توازن اور انداز کی شیریں دل نشینی سرور صاحب کی شخصیت اور کردار کے اہم اجزاء ہیں۔ ایک نقاد کی حیثیت سے بھی انہیں جو مرتبہ و مقام حاصل ہوا ہے اس میں ان مختلف چیزوں کا بڑا گہرا اثر ہے۔ لیکن جس چیز نے انہیں ہر طبقہ کا محبوب نقاد بنایا ہے، وہ ان کا وہ تنقیدی مسلک

کی زندگی، ان کا اندازِ حیات، ان کے اسالیبِ فکر و تخیل اور ان سب سے بڑھ کر ان کے طرزِ نگارش میں قدیم و جدید اور مشرق و مغرب کا جو مکمل اور شیریں امتزاج ہے، وہ اس دور کے کسی اور ادیب اور نقاد کے یہاں نہیں۔ یوں ہمارے ادب اور تنقید میں ایسے لکھنے والوں کی کمی نہیں جن کی نظر مشرقی ادب اور شاعری پر بھی خاصی گہری ہے اور جنہوں نے مغربی تنقید سے بھی پورا استفادہ کیا ہے۔ لیکن ان میں اور سرور صاحب میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ دوسرے مشرقی اندازِ تخیل اور مغربی طرزِ فکر کو پوری طرح آپس میں سمو نہیں سکے اور سرور صاحب نے ان دونوں چیزوں کو شیر و شکر کر کے ان کے امتزاج سے ایک ایسا مرکب تیار کیا ہے جو ہر مذاق کے کام و دہن کے لئے لذت و سرور کا سرمایہ بہم پہنچاتا ہے۔ سرور اس طرح اردو کے واحد نقاد ہیں جن کی تحریریں "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" دونوں کی حامل اور ترجمان ہیں۔ انہوں نے ادب کو سرمایۂ لذت و سرور سمجھتے ہوئے بھی محض ذہنی عیاشی بننے سے باز رکھا ہے۔ وہ اشتراکی نہ ہونے کے باوجود زندگی کی مادیت اور ادب کے گہرے رشتے کے قائل اور اس کے پُرجوش مبلغ ہیں جس طرح سرور کی قدامت پسندی زندگی پر جدت اور تجربہ کے دروازے بند نہیں کرتی اسی طرح ان کی ترقی پسندی ہر طفلِ بیاہس کو تجربہ کہہ کر ادب کی بارگاہ میں اذنِ باریابی دینے کے خلاف ہے۔

سرور صاحب نے ادب اور تنقید کی دنیا میں اپنی زندگی کا خاصا طویل عرصہ بسر کرنے کے باوجود صرف چند مضامین لکھے ہیں۔ لیکن ان تھوڑے سے مضامین کی مجموعی اہمیت و افادیت اس لئے کسی مستقل تصنیف سے کم نہیں کہ ان میں سے اکثر مضمون سرور صاحب کے علم، ان کے غور و فکر اور منطق و شعر میں رچ بس کر منظرِ عام پر آئے ہیں۔ انہوں نے زندگی کو کبھی کوئی تلخ و ناگوار حقیقت سمجھنے کے بجائے اسے متحرک، بامعنی، بامقصد اور حسین شے سمجھ کر برابر اس سے اپنا رشتہ استوار رکھا ہے۔ اور اپنے رشتوں کے معاملہ میں سرور صاحب نے ہمیشہ اخلاص و محبت کو اپنا ہمدم و دمساز بنایا ہے۔ اسی لئے اپنے ادب اور اپنی تنقید کو بھی انہوں نے کبھی بے مقصد نہیں ہونے دیا۔ ادب کے داغوں کو دھونا، اس کی تاریک راہوں کو روشن کرنا، کھوٹے اور کھرے کو الگ کر کے رکھنا، ان کا تنقیدی مسلک ہے۔ انہوں نے اجتماعی حیثیت سے ادب میں ماضی اور حال کے تعلق کو ہموار اور مضبوط بنانے اور انفرادی نقطۂ نظر سے حقدار کو اس کا حق دلانے کی جو خدمت انجام دی ہے وہ ہماری تنقید کی تاریخ میں منفرد ہے۔ اجتماعی زندگی کے مختلف شعبوں میں ان کے چھوٹوں بڑوں نے معاملات کو سلجھانے اور سمجھوتے کرانے کی جو تابڑ توڑ خدمت ان سے لی ہے اور ادب میں سرور صاحب نے وہ خود اختیار کی ہے اور اسے کمالِ حسن و خوبی سے انجام دیا ہے۔

سرور صاحب کی تدریسی اور ادبی زندگی علی گڑھ میں شروع ہوئی۔ یہیں اس نے ترقی کی ساری منزلیں طے کیں۔ اس تدریسی و ادبی زندگی کے آغاز میں ایک محدود اور مخصوص حلقہ کے لوگ ان کی صلاحیتوں سے واقف اور ان کے معترف تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ ان کی شہرت یہیں آفتاب بن کر بامِ عروج تک پہنچی۔ ملک تقسیم ہوا اور سرور صاحب علی گڑھ کے مانوس اور محبوب ماحول کو چھوڑ کر لکھنؤ پہنچے۔ تقسیم کے بعد کا زمانہ اردو اور اردو والوں کے لئے بڑی سختی اور آزمائش کا زمانہ تھا۔ سرور صاحب نے اس سختی اور آزمائش کے زمانہ میں ایک محبوب مقصد کے لئے ہر ممکن جد و جہد کی۔ قیادت کا بارِ گراں بھی سر پہ اٹھایا اور ابتلا کی آزمائشوں میں سے بھی گذر رہے —— لیکن ایک دل آویز بے نیازی اور شانِ استغنا جسے سرور صاحب نے ہر حال میں عزیز رکھا ہے، اس سختی اور آزمائش کے دور میں بھی ان کی رفیق رہی ہے۔ میں نے سرور صاحب کو تقسیم کے بعد سے نہیں دیکھا ہے۔ میری تھوڑی بہت معلومات کا ذریعہ یا تو وہ خطوط ہیں جو کبھی کبھی اس دوران میں سرور صاحب لکھتے رہے، اور یا ان دوستوں کی گفتگو جو کبھی کبھی لکھنؤ ہو کر وہاں کی دلدوز اور دلنشین یادیں اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ ان پیامیوں نے سرور صاحب کے متعلق جو کچھ بتایا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی بے نیازی اور استغنا کے حسن میں اب اور بھی اضافہ ہوا ہے۔ پان اور تاش اب ان کے مستقل ہم نشین و ہم جلیس ہیں۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ادب ان کی رہبری و رہنمائی سے محروم ہو گیا ہے۔ یوں، جو کوئی پان اور تاش میں ان کا شریک ہوا اس کے لئے ان کی نکتہ آفرینیوں سے لذت اندوز ہونے کے موقعے بے شمار ہیں۔ لیکن جنہیں یہ قرب حاصل نہیں، وہ حسرت سے بس یہی کہہ سکتے ہیں کہ

ع اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی

(۴)

چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

(غالب)

(چند علمی ادبی شخصیتیں)

لاہور کا ایک دَور

سیّد عابد علی عابدؔ

میری ادبی زندگی کا آغاز سنہ ۱۹۱۹ء سنہ ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ ہو گیا تھا، شاید ایک آدھ سال کا فرق ہو لیکن اس تحقیقات میں اس وقت میں نہیں اُلجھنا چاہتا۔ اس وقت سے لے کر آج تک بہت سے ادیبوں سے واسطہ پڑا ہے کچھ ایسے تھے جنھیں میں دوست کہتا تھا اور دوست سمجھتا تھا کچھ واقعی میرے دوست تھے۔ کچھ ایسے تھے جن سے نیازمندی اور عقیدت کے تعلقات قائم تھے اور رہیں۔ کچھ نوجوان معاصر تھے جو اب چالیس سے لے کر پچاس تک کے پیٹے میں ہیں۔ ان میں نقّاد تھے، نکتہ طراز تھے، سخن ساز تھے، گفتگو باز تھے ——— اور آپ کے کان میں کہنے کی بات کچھ مادر پدر آزاد بھی تھے۔ افسانہ نگار تھے، مکالمہ نویس تھے شاعر تھے اور شعر گر تھے، خود فریب تھے خود نگر تھے۔ انشاپرداز تھے، منشی تھے، اخبار نویس تھے، محقق تھے۔ بعض دوستوں پر یہ اصطلاح دونوں معنی میں صادق آتی تھی۔ علمی تحقیق بھی کرتے تھے اور حقّے کا دم بھی بھرتے تھے۔ مختصر یہ ہے کہ ۲۰ سے لے کر ۴۵ تک کہ قریب قریب ربع صدی ہوتی ہے میں نے جو کچھ دیکھا ہے سُنا ہے اس کی داستان بیان کروں تو طلسم ہوش ربا کا آٹھواں دفتر مرتّب ہوتا ہے۔ خود جو میرے کارنامے ہیں وہ بھی اس ضمن میں شنیدنی ہیں۔ اُن کے متعلق یادداشتیں مرتّب کر رہا ہوں اُمید ہے کچھ زندگی میں چھپ جائیں گی۔ وہ سرمۂ چشمِ بصیرت اور نورِ دیدۂ عبرت ہوں گی کچھ مرنے کے بعد شائع ہوں گی اور پُرانی کتابوں کے جو اشتہار دیئے جاتے تھے اُن کے الفاظ میں "حیرت افزائے ناظرین بالمکین" ہوں گی۔

آج کی صحبت میں ایسے ادیبوں کا ذکر کرتا ہوں جو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ آپ ضرور کہیں گے کہ زندوں کا تذکرہ اس لئے نہیں چھیڑا کہ ان سے ڈرتا ہوں۔ چلئے شخصیات نمبر میں ایک ڈرپوک مضمون نگار ہی سہی جن لوگوں کا مجھے ذکر کرنا ہے اُن میں کچھ تو ایسے ہیں کہ کچھ عرصے کے لئے لاہور کے ادبی افق پر طلوع ہوئے، فروزاں رہے اور پھر یہاں سے رخصت ہو گئے۔ ایک آدھ ایسے بزرگ ہیں کہ لاہور کے نہ تھے لیکن یہاں آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ پیوندِ خاک ہوئے۔ ان سب کا ذکر تاریخی تسلسل سے کرنے بیٹھا تو بات کسی طرح ختم نہ ہو گی اس لئے فرداً فرداً اُن کے ذکر سے اپنے عالمِ خیال کی تصویروں کے خطوط گویا از سرِ نو واضح کرتا ہوں۔

سیّد ممتاز حسین سُہا مجدّدی بلند شہری

سنہ ۱۹۲۱ء یا سنہ ۱۹۲۲ء کا ذکر ہے کہ حکیم احمد شجاع نے لاہور سے رسالہ "ہزار داستان" جاری کیا پہلے یہ پندرہ روزہ تھا، پھر ماہانہ ہو گیا۔ حکیم

احمد شجاع خود ایک ادارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ خوش کلامی میں اپنی نظیر آپ ہیں۔ خوش وضع۔ خوش قامت اور خوش لباس ہیں۔ رسالہ بھی انھوں نے اپنی خوش ذوقی کو ملحوظ رکھتے ہوئے نکالا۔ حصۂ نثر کی ادارت اپنے ذمے لی اور حصۂ نظم کا مدیر سہاؔ کو مقرر کیا جن کا پورا نام زیب عنوان ہے، سہاؔ نے علی گڑھ کالج سے بی۔ اے کیا تھا اور پہلے غالباً بلند شہر سے بھوپال گئے تھے پھر لاہور آئے اُن کا قد کسی طرح تین فٹ سے زیادہ نہ ہوگا۔ چوڑی دار پاجامہ پہنتے تھے پاؤں میں پمپ شو۔ اچکن۔ سر پر عام طور پر قراقلی کی ٹوپی۔ اُن کے اس قد و قامت کو دیکھ کر اور وضع قطع کا مشاہدہ کر کے ذہن کو ایک دھچکا سا لگتا تھا اور ابھی آدمی سنبھلنے نہیں پاتا تھا کہ سہاؔ نہایت شستہ اور فصیح زبان میں لچھے دار باتیں شروع کر دیتے تھے۔ پڑھے لکھے آدمی تھے۔ طب سے لے کر انتقاد تک اور مراۃ العروس سے لے کر دیوانِ غالب کے مطالب تک ہر چیز سے بحث کرتے تھے۔ ہنسنے کا انداز بہت شگفتہ اور بے تکلّف تھا وہ جو پر تصنّع آدابِ محفل والا تبسم ہوتا ہے اُسے بالکل صرف نہیں کرتے تھے۔ پان کے بہت رسیا تھے ہر وقت ڈبیا ساتھ رہتی تھی صرف یہی نہیں بلکہ پان میں کوکین کھاتے تھے۔ اُن دنوں میں بھی پان سے شغل کرتا تھا چنانچہ ایک دن سہاؔ نے (ذرا بے تکلفی بڑھی تو) پانوں کی ڈبیا پیش کی۔ میں نے پان لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ سہاؔ نے کہا بھئی کوکین ہے پان میں۔ میں ٹھٹکا تو ہنسے اور کہا اچھا پان بھی کھاتے ہو اور کوکین سے پرہیز بھی کرتے ہو یا پان کھانا چھوڑ دو یا کوکین کھاؤ۔ مشورے کی دوسری شق پر عمل کرنا میرے لئے بہ وجوہ ناممکن تھا۔ میں نے اخراجاً پہلی شق پر عمل کرنا شروع کر دیا کہ پان کھانا چھوڑ دیا۔ معلوم نہیں مولانا دستِ غیب رکھتے تھے یا کیا بات تھی بہرحال میرا اندازہ ہے کہ وہ دن میں پانچ چھ روپے کی کوکین ضرور کھاتے تھے۔ اُس زمانے میں حصۂ نظم کو مرتّب کرنے میں ڈیڑھ دو سو روپے سے زیادہ کیا تنخواہ ملتی ہوگی۔ یہ تنخواہ تو کوکین پر ہی صرف ہو جاتی ہو گی۔

مولانا مجھ سے عمر میں بڑے تھے۔ اس لئے بہت بے تکلّفت وہ مجھ سے کبھی نہ ہوئے۔ سُنتا تھا کہ بے تکلّف دوستوں کی محفل میں اُن کی شیریں کلامی لطیفہ گوئی بذلہ سنجی اپنی نظیر آپ ہے۔ شعر کا مطلب وہ خوب سمجھتے تھے اور اچھے بُرے شعر کی پہچان بھی انھیں بہت اچھی تھی۔ میرے اُن کے روابط کا نقطۂ آغاز یہ ہے کہ میں نے ایک غزل لکھی اور چاہا کہ ہزار داستان میں شائع ہو جائے اب یاد نہیں وہ کونسی غزل تھی۔ زمین حسرتؔ موہانی کی تھی خیالات بھی کم و بیش انہی کے تھے۔ میں نے ذرا اُلٹ پھیر سے کام لے کر مضامین کی صورت بدل دی تھی۔ ایک آدھ شعر ایسا بھی تھا جس سے یہ سراغ ملتا تھا کہ شاید شعر کہنے کا جوہر موجود ہے۔ سہاؔ کو میں نے غزل دکھائی۔ انھوں نے پڑھی۔ نہ ہوں کی نہ ہاں۔ نہ مذّمت کی نہ داد دی اپنے کاغذات میں رکھ لی۔ بس اتنا کہا شائع ہو جائے گی اور پھر ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔

سہاؔ نے شعر کہنے کا ایک منفرد اسلوب نکالنا چاہا تھا اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے تھے۔ یعنی کم از کم یہ تو ہو گیا تھا کہ سہاؔ کی غزل پہچانی جاتی تھی۔ اس کی وہ شعوری کوشش کرتے تھے۔ کبھی کبھی بہت اچھا شعر کہتے تھے لیکن جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں سخن فہم بہت اچھے تھے اور اپنے ذوقِ نظر پہ انھیں بہت ناز تھا اُس لئے بے حد مستغنی، بے پروا اور بے نیاز تھے۔ شعر بہت اچھا ہو تو داد دیتے تھے ورنہ چپکے بیٹھے رہتے تھے لیکن اچھے شعر پر اس طرح داد دیتے تھے گویا پہلے سو رہے تھے اور اب ہڑ بڑا کر اُٹھ بیٹھے ہیں۔ کچھ عرصہ لاہور کے مشاعروں میں وہی جانِ عالم بنے رہے اُن کے قد و قامت نے ایک دن بھی اُن کو مذاق کا ہدف نہیں بننے دیا وہ سٹیج پر آتے تھے بلکہ سٹیج کی میز پر کھڑے کر دیئے جاتے تھے اور ابھی لوگ حیرانی کی منزل سے تمسخر و استہزا کی منزل تک نہیں پہنچتے تھے کہ وہ شعر پڑھ کے سامعین کی تمام توجہ رنگِ سخن کی طرف منعطف کرا لیتے تھے۔ اِسے اُن کی شخصیت کا کمال کہیئے کوئی طلسماتی اثر کہیئے، کسی فقیر کی دعا کا نتیجہ قرار دیجئے، بہرحال جو بھی ہو، وہ مشاعروں میں بہت کامیاب ہوتے تھے۔ مشاعرے بھی الامان۔ لاہور کے مشاعرے۔ سامعین شاعر کا بیڑا غرق کرنے پر تُلے ہوئے۔ صدر اکثر غیر مؤثر۔ سیکرٹری کی آواز بہ صدا بہ صحرا۔ ایسے مشاعروں میں جو شاعر کلام سُنا جائے، داد لے جائے، اُسے بہت

باکمال گننا چاہیئے۔

نجی محفلوں میں سہا کے قد و قامت پر دوست پھبتیاں ضرور کستے تھے۔ کچھ پھبتیاں مجھ تک بھی پہنچی تھیں لیکن وہ فحاشی کا ایسا عنصر رکھتی ہیں کہ نقوش کے صفحات اس کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ان پھبتیوں کے جواب بھی جو سہا نے دیئے تھے میں نے سنے وہ بھی پھبتیوں کے مطابق ہی تھے۔

لاہور میں مشاعروں کی محفلیں گرمانے کے بعد یا تو سہا کا دل لاہور سے اُچاٹ ہو گیا یا انہیں محسوس ہوا کہ خرچ زیادہ ہے اور آمدنی کم (میرا خیال ہے کہ سہا شادی شدہ تھے اور اُن کے بچے بھی تھے لیکن اس مسئلے پر قطعی قسم کی بات صرف حکیم احمد شجاع ہی کر سکتے ہیں) بہر حال وہ دربارِ خیرپور کے شاعرِ خاص ہو کر چلے گئے۔ حکیم احمد شجاع صاحب اس تقرب کا وسیلہ بنے۔ کچھ عرصہ وہاں رہے پھر اُن علاقوں کا رُخ کیا جنھیں آج بھارت کہتے ہیں۔ مجھے اُن کا ایک خط مجو پال سے آیا تھا۔ (اُن دنوں میں گجرات میں وکالت کا شغل کرتا تھا) جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ لکھنوال کا ایک تیر میرے دل میں ابھی تک پیوست ہے۔ "ناظرین با تمکین" پر واضح ہو کہ لکھنوال ضلع گجرات کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جو شاید اِن بازاری کی کثرت کی وجہ سے مشہور ہے یا بدنام۔ یہ نہیں معلوم کہ سہا لکھنوال کب گئے اور گئے بھی یا انھوں نے محض لطیفہ بازی کے طور پر لکھنوال کے تیروں کا ذکر فرما دیا کہ میں یہ نہ سمجھوں کہ سہا پنجاب سے زخم خوردہ نہیں گئے۔ بہرحال حقیقتِ حال تو سہا ہی کو معلوم ہے۔

میری اُن سے غالب کے اشعار کے متعلق اکثر باتیں ہوا کیں۔ میرے علم میں دو ادیب ایسے ہیں جنھوں نے غالب کے کلام پر اس نقطۂ نظر سے بھی غور کیا ہے کہ وہ اہلِ زبان ہے اور اسی لئے اس کے اشعار میں بھی بعض مقامات پر لہجے کا اطلف اور اس کا اُتار چڑھاؤ غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے کہ اس بات کو ملحوظ رکھے بغیر غالب کے بہت سے اشعار کا مطلب واضح نہیں ہوتا۔ یہ دو ادیب رام رچپال سنگھ شیدا دہلوی اور سہا مرحوم ہیں۔ پہلے سہا نے اور پھر شیدا نے مجھے اس بات کی طرف متوجہ کیا کہ غالب صرف اپنے فکر کے اعتبار ہی سے نکتہ طراز نہیں ہے بلکہ اس کا لہجہ بھی شعر کے سمجھنے میں اس کا معاون ہوتا ہے اس بات کی تفصیل پھر کسی وقت کیلئے اُٹھا رکھتا ہوں۔

جن دنوں سہا لاہور میں تھے، اُن کی غزلیں "ہزار داستان" میں اکثر شائع ہوا کرتی تھیں۔ میرے پاس اس زمانے کے فائل تھے لیکن ایک دوست جو آزاد پر کام کرنا چاہتے تھے یہ فائل لے گئے اور آج تک واپس نہیں دیئے اُن کا نام اُن یادداشتوں میں شائع ہوگا جو میری وفات کے بعد "حیرت افزائے ناظرینِ باتمکین" ہونگی۔

سہا کی ایک غزل کے کچھ اشعار میں نے ماہِ اگست کے "ماہِ نو" میں نقل کر دیئے ہیں۔ سہا کے متعلق کچھ لطائف میرے رفیقِ کار سید سرفراز حسین تسنیم کو یاد تھے خیال تھا کہ اُن سے کہوں گا کسی وقت ان لطائف کو قلمبند کر لیں کہ تسنیم خود بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

سہا کی ایک اور غزل جو "ہزار داستان" ہی میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے کچھ اشعار سُن لیجئے۔ ؎

جذبۂ سرورِ جاں اضطراب ہو گیا ۔۔۔ آرزو کے کھیل میں دل خراب ہو گیا
یوں ندامتِ ستم کچھ ستم سے کم نہیں ۔۔۔ خامشی سے اور وہ لاجواب ہو گیا
ہر نظر کی نذر ہے عہدِ ترکِ عاشقی ۔۔۔ رندِ مئے پرست کا اجتناب ہو گیا
ان کی مہربانیاں شب کا خواب ہو گئیں ۔۔۔ روز رات کاٹنا اِک عذاب ہو گیا
اپنے جوشِ شوق میں ہم ہی ہوش میں نہ تھے ۔۔۔ ورنہ لاکھ بار وہ بے حجاب ہو گیا

پھر ترے غرور کا اور کیا دماغ ہے   اب سہا کا ذکر بھی ناصواب ہو گیا

اصغر گونڈوی

مجھے سال تو ٹھیک یاد نہیں لیکن تخمیناً کہہ سکتا ہوں کہ ۱۹۲۳ء کے بعد اور ۱۹۲۶ء سے پہلے مولانا تاجور مرحوم نے لاہور میں ایک ادارہ اردو مرکز کے نام سے قائم کیا اس کی تفصیل میں مولانا تاجور کے تذکرے میں عرض خدمت کروں گا یہاں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مولانا نے اس سلسلے میں مولانا اصغر گونڈوی کو لاہور بلوا لیا اور اُردو مرکز کے دفتر کا مہتمم بنا دیا۔ انہی دنوں یاس یگانہ چنگیزی اور جگر بھی لاہور آئے۔ ساغر و سیماب بھی لاہور پہنچے۔ سیماب صاحب کو غالباً مولوی فیروز الدین صاحب نے طلب فرمایا تھا جو اُن سے کچھ اُردو کتابیں تالیف کروانا چاہتے تھے۔ بہرحال یہ بڑا باغ و بہار زمانہ تھا کہ اصغر، یاس، جگر، ساغر، سیماب سب لاہور جمع تھے۔ ان تمام لوگوں میں سیماب اور اصغر رکھ رکھاؤ، متانت، وضعداری اور علم و فضل کے اعتبار سے ممتاز تھے۔ سیماب صاحب بھی جس سے ملتے تھے ایک ڈھنگ پر ملتے تھے اور اس ڈھنگ کو ملحوظ رکھتے تھے وہ عروض قافیہ اور دوسرے علومِ شعری کے رازدار تھے اور تاریخ اسلام سے بھی واقف تھے۔ عربی فارسی بھی خوب جانتے تھے، لیکن اس کے باوجود ان کی باتوں میں وہ کشش، دلبستگی اور مٹھاس نہ تھی جو اصغر گونڈوی کی باتوں میں تھی۔ اصغر صاحب نے بہت زمانہ دیکھا تھا۔ بہت پاپڑ بیلے تھے۔ زندگی کے بہت کھیل کھیلے تھے۔ علم و فضل کی بہت سی منزلیں گذار چکنے کے بعد آخر وہ تصوّف کی طرف جھک پڑے تھے اور میں نے جس وقت انھیں دیکھا ہے تو وہ اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ سر پہ لمبے لمبے بال جو گردن تک آتے تھے۔ داڑھی اچھی خاصی۔ مجھے تو یہی یاد ہے کہ چوڑی دار پاجامہ اور اچکن پہنتے تھے سر پر کالے رنگ کی ٹوپی۔ یاد پڑتا ہے کہ لا کالج کے قریب سے جو سڑک پیسہ اخبار کی طرف جاتی ہے، وہاں کہیں کسی گلی میں قیام فرما تھے۔

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ کہ اصغر نے انگریزی کی تعلیم کس منزل تک حاصل کی تھی۔ عربی سے میرا خیال ہے وہ بقدر ضرورت آگاہ تھے۔ فارسی خوب جانتے تھے اور کلاسیکی فارسی شاعری کی تمام تلمیحات، علامات، اور اصطلاحات اُنھیں گویا نوک بر زبان تھیں۔ اُردو ادبیات کی تاریخ سے آگاہ تھے۔ اور اُردو شاعری پر جو کچھ بیتی ہے، اُس پر بھی مطلع تھے۔ مجھے اُن کی جس بات نے سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ اُن کی مشرقی وضعداری، رکھ رکھاؤ، زندگی بسر کرنے کا سلیقہ اور متانت آمیز شگفتگی ہے۔ میں نے اُستادوں کے سامنے ممتاز مُسِن شعرا کے سامنے، اُدبا کے حضور میں گستاخیاں کی ہیں، لیکن اصغر گونڈوی مجھ سے اِس طرح ملتے تھے کہ میں اُن کے سامنے کوئی ناشائستہ بات کرنے کا تصوّر بھی نہ کر سکتا تھا۔ وہ مسکراتے تھے، لیکن اُن کی مسکراہٹ میں بزرگوں کی سی شفقت تھی۔ اور اُس کے متعلق یہ گمان ہوتا تھا۔ کہ یہ مسکراہٹ کسی وقت تیوری کی شکل اختیار کر سکتی ہے۔ جب تک وہ لاہور میں رہے، میں نے اُنھیں نہ کبھی جھنجھلاتے ہوئے دیکھا۔ نہ خستگی کے عالم میں دیکھا۔ نہ اُنھیں قہقہے لگاتے سُنا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ تصوّف سے جو اُن کا رابطہ تھا، اُس کی کیا کیفیت تھی۔ حال تھا کہ قال۔ اور واقعی اُن پر وجد کی کیفیت طاری ہوتی تھی یا نہیں، لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ وہ بددیانت ہرگز نہ تھے۔ اگر انھوں نے اشعار میں کسی متصوّفانہ کیفیت کا ذکر کیا ہے تو اُسے محسوس بھی ضرور کیا ہوگا۔

میں کہہ چکا ہوں کہ اصغر مرحوم فارسی کی کلاسیکی شاعری کے رازدار تھے۔ اُردو شاعری کی علامات کو بھی اچھی طرح سمجھتے تھے اور اِس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے اِس سلسلے میں اُن سے بہت استفادہ کیا ہے۔ میں اُن دنوں مبتدی شمار کیا جاتا تھا۔ نوآموز تھا۔ طالب علم تھا۔ لیکن اصغر مرحوم مجھ سے ملنے کے لئے میرے گھر تشریف لاتے تھے۔ اُن سے جو صحبتیں رہی ہیں، اُن میں یوں تو میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ لیکن فارسی شاعری کی علامات کے رموز بالخصوص مجھ پر اُنھیں کے ذریعے روشن ہوئے ہیں۔ اور ان میں سے کون کون سے رموز اُردو میں منتقل

ہوگئے ہیں، یہ بھی اُنہی نے مجھے بتایا ہے کہ بہار، فارسی کی کلاسیکی روایت میں عہدِ شباب کا عشق ہے۔ کہ نشاط سے لبریز ہے۔ گل محبوب کا استعارہ ہے۔ اور بلبل ظاہر ہے کہ عاشق کی علامت ہے۔ فارسی میں اس سے بہت خوبصورت مضمون پیدا ہوئے ہیں مثلاً

نمی گویم دریں گلشن کہ ایں باغ و بہار از من
گل از یار و بہار از یار و باغ از یار و یار از من

اور غالب کہتا ہے:۔

یار در عہدِ شبابم بکنار آمد و رفت
ہمچو عیدی کہ در ایامِ بہار آمد و رفت

اُردو میں میر کہتا ہے :۔

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

اور حالی کہتا ہے :۔

یہی انجام تھا اے فصلِ خزاں
گل و بلبل کی آشنائی کا

جگر کے اس شعر میں بھی بہار کے علامتی مفہوم پر غور کیجئے گا۔ کہ بدلا ہوا ہے۔

کبھی شاخ و سبزہ و برگ پر کبھی غنچہ و گل و خار پر
میں چمن میں چاہے جہاں رہوں میرا حق ہے فصلِ بہار پر

بہرحال میں نے مثال کے طور پر بہار کی علامتی اہمیت کا ذکر کیا۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں۔ فارسی اور اُردو شعری روایت کے بہت سے رموز اصغر گونڈوی کے ذریعے مجھے معلوم ہوئے ہیں۔ اور وہ بھی مشفقانہ اور مربیانہ انداز میں تقریر کرکے اُنھوں نے مجھے نہیں بتائے۔ باتوں باتوں میں سمجھا دیتے تھے۔ گویا میں اُن کا معاصر ہوں۔ ہم پلّہ ہوں۔ ہم سن ہوں۔ ہم رتبہ ہوں۔ اصغر گونڈوی کی یہ وضعداری اور اُن کا یہ انداز مجھے نہ کبھی بھول سکتا ہے، نہ بھولے گا۔ لاہور سے چلے جانے کے بعد بھی اُن سے تعلقات قائم رہے۔ اور اُنھوں نے مرتے دم تک وضعداری نبھائی۔ غفلت میری ہی طرف سے رہی۔

مولانا تاجور نجیب آبادی

تاجور مرحوم سے میرے روابط کی ابتدا سنہ ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ ہوئی۔ جب میں رنگ محل مشن ہائی سکول میں پڑھتا تھا۔ میرے ایک ہندو دوست ـــ کنھیا لال ـــ مجھے اُن کے ہاں لے گئے۔ اور میں نے اُن کی خدمت میں اصلاح کے لئے اپنا کلام پیش کیا۔ اُنھوں نے کہیں کہیں اشعار میں کچھ تبدیلیاں کیں۔ اور ایک شعر مرحمت بھی فرمایا۔

رنگِ چمن طرازی داماں نہ پوچھئے
گلزار ہے یہ دیدۂ خوں نابہ بار کا

افسوس کہ میری ابتدائی مشق کا یہ نمونہ کہیں شائع نہیں ہوا۔ اس لئے یہ شعر بھی کہیں شائع نہ ہوسکا۔

مولانا پہلے دیال سنگھ سکول میں مدرس تھے۔ پھر دیال سنگھ کالج میں عربی، فارسی اور اُردو پڑھانے پر مامور ہو گئے۔ ۲۲-۱۹۲۱ء سے مولانا نے پنجاب میں اُردو کی ترویج اور اس کے فروغ کے لئے انتھک کوششیں کیں۔ وہ یوں بھی ہنگامہ پرور اور جنگ آزما آدمی تھے۔ ہر وقت کسی نہ کسی سے ان کی ٹھنی رہتی تھی۔ بہرحال اُنھوں نے بڑا کام کیا۔ ایس۔پی۔ایس۔ کے ہال میں مشاعرے منعقد ہونے لگے۔ ان مشاعروں میں مولانا مستقل کی حیثیت سے صدر کے ساتھ سٹیج پہ جلوہ افروز ہوتے تھے۔ میرے متعلق اُنھیں یہ بدگمانی ہو گئی تھی کہ ذہین ہوں۔ اور شعر اچھے کہتا ہوں۔ چنانچہ ان مشاعروں میں وہ اور اُن کے عقیدت مند مجھے بہت داد دیتے تھے۔ ظاہر ہے۔ کہ میں بھی فراخ دلی سے مولانا اور اُن کے شاگردوں کے کلام کی تعریف کرتا تھا۔ ان مشاعروں میں عمائد و اکابر، علماء، اُدباء، شعراء سبھی شریک ہوتے تھے۔ یہاں میں نے شیخ عبدالقادر مرحوم کو دیکھا ہے۔ بخاری (پطرس) کی بذلہ سنجیاں سنی ہیں۔ ابو الاثر حفیظ جالندھری کو معرکے سر کرتے دیکھا ہے۔ اختر شیرانی کو نظمیں اور غزلیں پڑھتے سنا ہے۔ پنڈت ہری چند اختر کو چٹکلے بیان کرتے اور نہایت اچھے شعر کہتے دیکھا ہے۔ جن لوگوں نے ان مشاعروں کی صدارتیں کی ہیں، اُن میں سر شادی لال سے لے کر مولانا ظفر علی خاں تک ہر وضع کے لوگ شامل تھے۔ ایس۔پی۔ایس ہال کے ان مشاعروں میں مولانا نے یہ کڑ لگا دی تھی۔ کہ غزل میں کوئی بات ایسی نہ ہو جس سے جنسی بے راہ روی کا پہلو نکلتا ہو۔ محبوب کے لئے ضمیر مؤنث بھی اکثر شعراء یہاں استعمال کرتے تھے۔ نظمیں بھی پڑھی جاتی تھیں۔ گائی بھی جاتی تھیں۔ ترنم سے پڑھنے والوں میں مولانا مرحوم نے حفیظ کے بالمقابل گویا ایک اور صاحب کو صف آرا کیا تھا۔ یہ صاحب حبیب مکرم (بادشہ بخیر) وجاہت حسین عندلیب شادانی ہیں۔ جو مشاعرے میں ترنم سے پڑھتے تھے۔ اور اس طرح پڑھتے تھے کہ محفل پہ چھا جاتے تھے۔ حفیظ کے ساتھ کبھی کبھی نشتر جالندھری بھی تشریف لاتے تھے۔ اور سید امتیاز علی تاج اور مولانا عبدالمجید سالک بھی رونق افروز ہوتے تھے۔

مولانا کا خیال تھا۔ کہ پنجاب میں اُردو کی ترویج تبھی ممکن ہے۔ کہ ہندو اور سکھ بھائیوں کو یقین دلایا جائے کہ وہ بھی اُردو نثر لکھ سکتے ہیں۔ اور اچھا شعر کہہ سکتے ہیں۔ چنانچہ مولانا کے اردگرد ہندو اور سکھ شعراء کا ہمیشہ ایک جمگھٹ ہوتا تھا۔ پنڈت میلا رام وفا، مرداد اوم سنگھ شاعر اور بعد میں کرپال سنگھ بیدار اُن کے ہندو اور سکھ شاگردوں میں بہت نمایاں تھے۔ رفتہ رفتہ ایس۔پی۔ایس ہال کے مشاعرے شکر رنجیوں اور تلخیوں کا موجب بنے۔ ابو الاثر حفیظ جالندھری نے ایک نئی انجمن کی بنیاد رکھی۔ کیونکہ کچھ لوگوں کو یہ گمان ہونے لگا تھا۔ کہ مولانا اور اُن کے شاگرد اپنے حلقے کے شعراء کو داد سے نوازتے ہیں۔ اور بس۔ اس کھینچا تانی میں تاثیر، تبسم، بخاری اور سالک حفیظ کے ساتھ تھے۔ لیکن مولانا سے بھی اُن کے تعلقات بالکل بگڑے نہیں۔ البتہ حفیظ نے اور پنڈت ہری چند اختر نے کچھ ایسے اشعار ضرور کہے۔ جن سے جھلکتا تھا۔ کہ دل میں بہت غبار رہے۔

اسی زمانے میں مولانا نے عطر چند کپور کی مالی اعانت کے بل بوتے پر لاہور میں اُردو مرکز قائم کیا۔ اس سلسلے میں جگر، اصغر اور ریاض بھی لاہور بلوائے گئے۔ اور جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ——— یا کچھ عرصہ پہلے ٹھیک یاد نہیں۔ ساغر و سیماب بھی آ پہنچے۔

مولانا تاجور کا مذاقِ سلیم شعر کے معاملے میں بہت اچھا تھا۔ اور بالعموم اُن کی رہنمائی میں اُن کے شاگرد منزلِ مقصود تک جا پہنچتے تھے، لیکن میں نے اُن سے جب بات کی، یہ محسوس کیا کہ علوم شعری کے علاوہ انھیں کسی چیز کی پروا نہ تھی۔ مولانا بڑے محفل آرا، بذلہ سنج، نکتہ رس اور لطیفہ گو ادیب تھے۔ اُن کے بعض لطیفے کلاسیکی بن چکے ہیں۔ ایک سن لیجئے۔ اس کا میں شاہدِ عینی ہوں۔

ایک نو آموز شاعر جو غزلوں پہ غزلیں کہتے چلے جاتے تھے۔ اور کسی کے قابو میں نہیں آتے تھے، انھوں نے طے کیا کہ اپنا دیوان چھپوائیں۔ اصلاح وہ مولانا تاجور سے لیتے تھے۔ ایک دن دُکھی صورت بنائے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور فرمایا۔ مولانا! بڑا

غضب ہوا۔ مولانا نے پوچھا کیا ہوا؟ تو کہا۔ کہ میرا دیوان کسی نے چرا لیا ہے۔ یہ بات سن کر مولانا کوئی آدھ منٹ تو بالکل خاموش رہے۔ پھر فرمایا۔ بھئی برا نہ ماننا۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ جس نے تیرا دیوان چرایا ہے، اُس نے اُردو ادب پر بڑا احسان کیا ہے۔ محفل کشتِ زعفران بن گئی۔ اور نوآموز شاعر مولانا کا مُنہ دیکھنے لگے۔

سنہ ۱۹۲۹ء میں کچھ سال گجرات میں وکالت کا شغل کرنے کے بعد لاہور آیا۔ تو مولانا نے جو رسالہ ادبی دُنیا جاری کیا تھا۔ اُس کے حلقۂ ادارت میں منسلک ہو گیا۔ اُنہی دنوں ایک اخبار نکلتا تھا۔ اُس کا نام ٹھیک یاد نہیں رہا۔ حبیب مکرم وقار انبالوی اُس کے ایڈیٹر تھے۔ ادبی دنیا مولانا نے بڑے ٹھاٹھ سے جاری کیا تھا۔ اور میں خوب جانتا ہوں۔ کہ بیوی کا زیور بھی بک کر رسالے کے مصارف کا جزو بنا۔ مولانا کسی طرح تیار نہ ہوتے تھے۔ کہ ادبی دُنیا کا بوجھ اپنے کاندھوں سے اُتار پھینکیں۔ یہ میں سنہ ۱۹۳۰ء کی بات کر رہا ہوں۔ اُن دنوں ادبی دُنیا کے لئے میں نے بہت سی تصویری نظمیں لکھیں۔ اور مولانا کو بغرضِ اصلاح دکھائیں بھی، لیکن غزل کے معاملے میں میں اُن سے بے نیاز ہو گیا، کیونکہ اِس سلسلے میں ہم دونوں کا نقطۂ نظر بالکل مختلف تھا۔ اُس کے بعد مولانا دیال سنگھ کالج میں میرے رفیقِ کار ہو گئے۔ اور قریباً بیس سال تک یہ رفاقت قائم رہی۔ اِس دوران میں مولانا مجھ سے بگڑے بھی۔ مجھ پر برسے بھی۔ مجھے بُرا بھلا بھی کہا۔ لیکن وضعداری وہ نبھاتے گئے۔ اور میں بھی نبھاتا گیا۔ اِس دَوران میں رسالہ بازی کا چسکا چھوٹا نہیں۔ اُنھوں نے شاہکار جاری کیا۔ لیکن وہ بھی خسارے کا موجب ثابت ہوا۔

مولانا مرحوم کے متعلق مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہُوا ہے۔ کہ دُنیا میں جو کچھ وہ کر سکتے تھے۔ وہ کر نہیں گئے۔ بے شک اُردو مرکز نے اُردو ادب کا انتخاب شائع کیا۔ مولانا کی کچھ تصانیف بھی شائع ہوئیں۔ لیکن اُن کے علم و فضل اُن کے ذوقِ سلیم اور اُن کے تعلیمی تجربے سے جو توقعات وابستہ تھیں، وہ پُوری نہیں ہوئیں۔ مولانا اواخر عمر میں شمس العلما ہو گئے تھے۔ لیکن ساتھ ہی اُن کو دو بچّوں کی موت کا پے در پے صدمہ برداشت کرنا پڑا تھا۔ کچھ اور بھی اُلجھنیں تھیں۔ جن کا ذکر بے محل ہے۔ بہر حال وفات سے پہلے اُن میں وہ شگفتگی اور زندہ دلی نہیں رہی تھی جو اُن کی طبیعت کا خاصہ تھی۔

میرا خیال ہے کہ وفات سے تین چار سال پہلے وہ امراضِ قلبی میں مبتلا تھے۔ میں نے اُنھیں مشورہ دیا کہ وہ طویل رخصت پر چلے جائیں۔ لیکن وہ مانے نہیں۔ کہ ایسا کرنا اُن کی ہنگامہ پروری کے خلاف تھا۔ اور آخر وہی ہُوا۔ جس کا خدشہ تھا۔ ایک رات اچانک اُن کو دَورہ پڑا۔ اور وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

مولانا تاجور مرحوم ظریف کے نام سے بھی لکھا کرتے تھے۔ بیگم تاجور نے اُن کے مضامین غزلیات اور منظومات کا مجموعہ مرتب کرنے کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ کہ ابھی تک اِس سلسلے میں کوئی ٹھوس کام نہیں ہُوا۔

تاجور مرحوم ہوا کے رُخ کو خوب پہچانتے تھے۔ زمانے کے مزاج شناس تھے۔ ادب کی بدلتی ہوئی قدروں سے آگاہ تھے۔ اُن کی غزل کے مختلف دَور ہیں۔ اور ہر دوسرا دَور پہلے سے زیادہ صحت مند اور توانا ہے۔ اُن کا بہت پہلے کا کلام یہ ہے۔

تم نے لڑا لڑا کے نگاہیں پرائی آنکھ
ہم نے ملا ملا کے نظر دل ملا دیا
دن رات اُن کو کھیل یہ رہتا ہے تاجور
مٹی پہ میرا نام لکھا اور مٹا دیا

———

نہ تم بدلے نہ دِل بدلا نہ دِل کی آرزو بدلی
میں کیونکر اعتبارِ انقلابِ آسماں کر لوں

اور اواخرِ عمر کے اشعار یہ ہیں :-

اُلفت ہے راز، راز کی حدتک ہے سرفراز
جب داستانِ بزم بنی، خوار ہوگئی
خودداریٔ جنوں نے نہ جانے دیا وہاں
کم بخت راہِ دوست میں دیوار ہوگئی

حافظ محمود شیرانی

حافظ محمود شیرانی سے میرے روابط کی بنا یہ تھی۔ کہ وہ اختر شیرانی کے والد تھے۔ میں غالباً آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ کہ حافظ محمود شیرانی لاہور تشریف لائے۔ اور قلعہ گوجر سنگھ میں ایک مکان کرائے پر لے لیا۔ میں اُن دونوں دادا جان کے پاس وہیں رہتا تھا۔ چنانچہ اختر شیرانی سے میری ملاقات ہوئی۔ اور میں کبھی کبھی اُن کے گھر جانے لگا۔ وہیں مَیں نے پہلے حافظ صاحب کو دیکھا۔ لمبے، تڑنگے، گندمی رنگ، سبز سی آنکھیں، سر پہ رومی ٹوپی۔ اُن کو دیکھ کر طبیعت پہ ایک دہشت سی طاری ہوتی تھی۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا، اختر سے میرے تعلقات بڑھتے گئے۔ لیکن حافظ محمود شیرانی سے ملاقات کی نوبت نہیں آئی۔ مَیں شعر گوئی اور افسانہ نگاری میں مشغول تھا۔ اور حافظ محمود شیرانی دادِ تحقیق دے رہے تھے۔ پہلے وہ اِسلامیہ کالج میں ملازم ہوئے۔ اور اُن کی کتاب "پنجاب میں اُردو"، اُن کے طالب علموں ہی نے شائع کی۔ اِس کتاب میں ایسے انقلاب آفریں نظریئے تھے۔ اور مصنّف کا طریقِ اثبات ایسا مستحکم تھا۔ کہ یکایک دنیائے علم میں شیرانی صاحب کی دھاک بیٹھ گئی۔ پنجابی تو بالخصوص پھُولے نہ سمائے کہ آخر یہ ثابت ہو کر رہا۔ کہ اُردو زبان نے صرف و نحو کے بیشتر اصول پنجابی ہی سے سیکھے۔ جب یہ کتاب شائع ہوئی ہے تو مَیں نے اِسے غور سے نہیں پڑھا، لیکن جب ایم۔ اے فارسی کے امتحان دینے کا وقت آیا۔ اور شیرانی کی علمی شان اور اُس کا تعلیمی مقام معلوم ہوا۔ تو اُن کے تمام مضامین اور اُن کی تصانیف بغور پڑھیں۔ میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تو اُنھوں نے ازراہِ کرم رسالہ اُردو کے وہ پرچے بھی عنایت فرمائے جن میں اُنھوں نے شعر العجم پر تنقید کی تھی۔ شیرانی صاحب سے میرا ملنا تاجور مرحوم کو بہت ناگوار ہوتا تھا، لیکن یہ ناممکن تھا کہ کوئی شخص لاہور میں رہے۔ اپنے آپ کو طالب علم کہے۔ اور شیرانی سے نہ ملے۔

عام طور پر اُن کے متعلق یہ خیال ہے کہ وہ محقق ضرور تھے، لیکن خشک مزاج تھے۔ اور اُن کا اندازِ نگارش بھی شگفتہ نہ تھا۔ یہ غلط ہے۔ وہ محقق بھی تھے۔ مؤرّخ بھی۔ ادیب بھی اور عروض پہ تو ایسی قدرت رکھتے تھے۔ کہ بایدوشاید۔ تاجور مرحوم بہت کم لوگوں کی لیاقت اور علم و فضل کے قائل ہوتے تھے۔ لیکن شیرانی کو وہ بھی جگت گورو مانتے تھے۔ ایک بار اُنھوں نے عروضی بحث کے سلسلے میں جو اقبال کے کسی شعر کے متعلق شروع ہوئی تھی، یہ لکھ بھی دیا تھا کہ شیرانی بہت پیچدار بزرگ ہیں۔ اُن کی مراد یہ تھی کہ عروض کے رموز و غوامض اُنھیں اس طرح مستحضر تھے۔ کہ جب چاہتے مدِمقابل کو شکست دے سکتے تھے۔ جس بحث کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں، وہ غالباً اطہر ہاپوڑی نے چھیڑی تھی۔ سالک نے افکار و حوادث میں غالباً اطہر کا جواب دیا۔ اور پھر شیرانی صاحب اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس کے بعد کانٹے کی تول لڑائی ہوئی۔ لیکن میدان شیرانی کے ہاتھ رہا۔

شیرانی مرحوم میں مَیں نے ایک بات دیکھی ہے۔ جو بالعموم معلّموں اور محققوں میں نہیں ہوتی۔ آپ اُن سے استفادہ کرنے کے لئے

جائیں۔ تو وہ ہر ممکن مدد کریں گے۔ لیکن کبھی کسی محفل میں بیٹھ کر اس بات کے مدعی نہ ہوں گے کہ فلاں صاحب نے فلاں علم میں مجھ سے استفادہ کیا۔ غالباً نہیں بلکہ یقیناً اُنھوں نے میری بھی اسی طرح پردہ پوشی کی۔ جب ایم۔ اے کے بعد میں نے تدریس کا شغل اختیار کیا تو اُن کی خدمت میں حاضر ہونا شروع کیا — میں کسی تلمیح کے سلجھانے کی درخواست کرتا یا کسی استعارے کی گرہ کشائی میں مدد کا طالب ہوتا، شیرانی کا اسلوبِ کار ایک ہی تھا۔ وہ جواب میں معلومات کا دریا بہا دیتے تھے۔ میں نے سلمان ساوجی کے ایک شعر کا مطلب پوچھا، مطلب تو گویا ضبط ہو گیا۔ شیرانی نے پہلے شہرِ ساوہ پر ایک عالمانہ تقریر کی۔ پھر سلمان کا مقام متعین کیا۔ اُس کے دبستانِ شعر کی تعریف اور توضیح کی۔ یہ سب کچھ ہو چکا تو پھر شعر کے الفاظ کی طرف متوجہ ہوئے۔ اُن کی تاریخ بیان کی۔ معانی کے تغیرات سے بحث کی۔ اُن کی مختلف دلالتیں بتائیں۔ اُن کا صحیح تلفظ بتایا۔ اب تلمیحات، استعارات اور تشبیہات کا مرحلہ آیا۔ اس سے فارغ ہوئے تو شعر کی تشریح کی طرف توجہ کی۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ میں کہہ دیتا تھا کہ میں شعر کا مطلب سمجھ گیا اور وہ کہتے تھے۔ ابھی کہاں۔ اور تقریر جاری رکھتے تھے۔ یہ تو سب جانتے ہیں۔ کہ وہ نایاب کتابیں اور سکے جمع کرتے رہتے تھے۔ جب وہ یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو اُنھوں نے یہ علمی ذخیرہ فروخت کر دیا۔

میں نے عرض کیا ہے کہ شیرانی بڑی شگفتہ نثر لکھتے تھے۔ بشرطیکہ مضمون ہی ایسا نہ ہو کہ شگفتگی کی تاب نہ لائے۔ فردوسی پر چار مقالے اور تنقیدِ شعر العجم میں اُن کے اندازِ نگارش کی شگفتگی کی اُتنی ہی مثالیں ہیں۔ جتنے اِن کتابوں کے صفحات۔

مجھ میں لفظوں کی تاریخ دریافت کرنے کا شوق اُنھی نے پیدا کیا۔ پنجابی زبان کی اہمیت کی طرف اُنھی نے متوجہ کیا۔ یہاں تک کہ میں نے ایک مضمون میں دعوےٰ کیا ہے کہ پنجابی حقیقت میں قدیم فارسی اور پہلوی (ایک طرف) اور سنسکرت (دوسری طرف) کے درمیان ایک کڑی کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ پنجابی زبان کا مطالعہ کئے بغیر نہ اُردو الفاظ کی تحقیق مکمل ہو سکتی ہے، نہ فارسی زبان کی۔

اواخرِ عمر میں شیرانی مرحوم (اقبال مرحوم کی طرح، تاثیر کی طرح، تاجور کی طرح، حسرت کی طرح اور اب یہ بھی کہہ دینا چاہیئے کہ میری طرح) امراضِ قلبی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اُن کے جو خطوط شائع ہوئے ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ اُنھیں وجع القلب تھا۔ یعنی دردِ دل۔ اِس موذی مرض کا دَورہ جب پڑتا ہے (اور مجھ پر یہ کیفیت گزر چکی ہے) تو مریض کو یوں معلوم ہوتا ہے۔ گویا اِس حملے سے جانبر نہیں ہوگا۔ پھر یکایک درد رفع ہو جاتا ہے۔ اور کچھ عرصے کے بعد طبیعت بحال ہو جاتی ہے۔ اور یوں معلوم ہوتا ہے۔ جیسے درد کبھی تھا ہی نہیں۔ اِس مرض کے دَوران میں (۱ اپریل سنہ ۱۹۴۵ء) ٹونک راجپوتانے سے شیرانی صاحب ڈاکٹر محمد اقبال پرنسپل اورینٹل کالج کو ایک خط لکھتے ہیں۔ (اور شگفتہ کلامی دیکھیئے گا) اقبال صاحب کے فرزند ارجمند محمد داؤد رہبر ٹونک جانا چاہتے ہیں۔ شیرانی صاحب یہ خبر سن کر خط لکھتے ہیں:۔

مہندی باغ، ٹونک، راجپوتانہ

۱۵ اپریل سنہ ۱۹۴۵ء

مخدومی و محترمی جناب ڈاکٹر صاحب!

عنایت نامے کا جواب جلد دے رہا ہوں۔ میری خرابیٔ صحت بڑھتی جاتی ہے۔ رات کو بارہ بجے کھانسی اور زکام کا حملہ ہو گیا۔ دو گھنٹے کے بعد نیند آسکی۔ صبح آٹھ بجے سے دل پر درد شروع ہوا۔ خاصہ تیز ہو گیا۔ اور اب تک ہے (یہ چار بجے کا وقت ہے۔ پُرانا وقت) کوئی دو گھنٹے سے تخفیف ہے۔ اب صرف گہرے سانس کے ساتھ معلوم ہوتا ہے۔ آج ہی بارہ بجے دن کو پھر زکام اور کھانسی شروع ہو گئی۔ ساتھ ہی بخار ہو گیا۔ لیکن ہلکا۔ اب آپ ہی دیکھیں۔ میری صحت اگر تماشہ نہیں تو کیا ہے اس وقت دل میں یوں سما رہا ہے کہ آپ کی خدمت میں عریضہ لکھوں۔ اِسی لئے لکھ رہا ہوں۔ داؤد آئیں۔ میری آنکھوں اور سر پر آئیں۔ میرے

لئے تو یہ بڑی نوید ہے، مگر میں کیا کروں۔ وہ آئے اور میرے ضعفِ صحت کی بنا پر ان کو تکلیف ہوئی۔ تو میں آپ کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گا۔ اور اب مجھ میں برداشت کی طاقت نہیں رہی۔ ادنیٰ سی تشویش اور خیالی تکلیف مجھ کو بہت پریشان رکھتی ہے۔ اگر وہ آئیں تو پتھر کا دل لے کر آئیں۔ ورنہ میں درخواست کروں گا۔ نہ آئیں اگر کبھی تقدیر میں ہوگا مل لیں گے۔ ورنہ ؎

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"

ایک اور خط میں جو ۲۹ اگست ۱۹۴۳ء کا لکھا ہوا ہے۔ اور ڈاکٹر اقبال ہی کے نام ہے۔ وہ ٹونک میں اپنے روز و شب گذارنے کا ذکر کرتے ہیں۔ بیماری کی تکلیف ان دنوں بھی تھی۔ لیکن شگفتہ کلامی کا اسلوب دیکھئے گا۔

" نہاری باغ ٹونک راجپوتانہ

۲۹ اگست ۱۹۴۳ء

محترمی جناب ڈاکٹر صاحب

شفقت نامہ عین انتظار میں پہنچا۔ جب میں نے لاہور کا ارادہ کیا تھا۔ وہ وقت کچھ اور ہی تھا۔ اتنے میں گرامی نامہ شرفِ ورود لے آیا۔ اور میری تشویش رفع ہو گئی۔ اب میں کیا دیوانہ تھا۔ جو لاہور آنے کا قصد کرتا۔ آپ فرماتے ہیں۔ کہ لاہور آج کل جہنم کا نمونہ بن رہا ہے۔ تو آپ وہاں کیوں پڑے ہیں۔ یہاں تشریف لے آیئے۔ یہاں حالت یہ ہے۔ کہ گرمیاں اس سال میں نے ندی میں گذاریں۔ بڑے لطف سے گذاریں۔ راتوں کو نہایت پُر لطف موسم ہوتا تھا۔ اور چادر اور دلائی اوڑھنی پڑتی تھی۔ گرمی کے چند دن میں نے وہی دیکھے جب میں دہلی اور رامپور میں تھا۔ ٹونک میں ایک رات بھی گرم مجھے یاد نہیں۔ دہلی سے واپسی کے بعد میں مستقلاً گیارہ بارہ بجے دن کے ندی آ جاتا ہوں۔ یہاں دریا کے کنارے کے قریب پھوس کا ایک جھونپڑا ڈلوا لیا ہے۔ آس پاس کھیت ہیں۔ اور بیچ میں مابدولت کا جھونپڑا۔ ہم جس میں فرعونِ بے سامان بنے بیٹھے ہیں۔ دل میں آئی سو گئے۔ ورنہ کتاب دیکھتے رہے۔ یا اپنا کام کرتے رہے۔ برسات کی وجہ سے منظر نہایت پر لطف ہے۔ ایک طرف پہاڑوں کا سلسلہ ہے جو سرتا پا سبز ہے۔ دوسری طرف ندی ہے جو جنوبی سمت سے آکر موڑ کھاتی ہوئی شمالی رخ سے ہوتی ہوئی مشرق میں نکل گئی ہے۔ تازہ ہوائیں ہر وقت چل رہی ہیں۔ عصر سے خنکی ہو جاتی ہے۔ رات کو معلوم نہیں، کیا حالت رہتی ہے۔ میں تو مغرب کے وقت یہاں سے رخصت ہو جاتا ہوں اور گھر پہنچ جاتا ہوں۔ پچھلے پانچ چار روز سے پھر بارش شروع ہو گئی ہے۔ سورج مہاراج گاہے ماہے گھنٹے دو گھنٹے کے واسطے وہ بھی حاضری دینے کی غرض سے آ جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ندی کے پانی اور اس کی ہوا نے میری صحت میں بڑا فرق پیدا کر دیا ہے۔"

یہ خطوط کی شگفتگی کا عالم ہے، اسی سے علمی مضامین کے اسلوب کا بھی اندازہ کر لیجئے کہ آخر ذہن تو ایک ہی ہے جو دونوں جگہ کار فرما ہے

(چند علمی و ادبی شخصیتیں)

دِلّی کا ایک دَور

شاہد احمد دہلوی

اب سے پچیس تیس سال پہلے دلّی میں میں نے جن بزرگوں کو دیکھا اور اُن سے قریب ہونے کا بھی مجھے موقع مِلا اُن میں سے بیشتر تو اللہ کو پیارے ہو گئے، باقی جو ہیں (اللہ انھیں ہزاری عمر دے) وہ چراغِ سحری ہیں۔ اُن بزرگوں کے دم سے دِلّی کچھ نہ رہ جانے پر بھی دلّی ہی تھی۔ یہ اگلے وقتوں کے لوگ تھے۔ ان کے دم قدم سے اگلی وضعداریاں قائم تھیں۔ دلّی کی تہذیب زندہ تھی۔ دلّی کی زبان ہانکے پکارے کہہ رہی تھی کہ "میری گل افشانی اب دیکھ لو، پھر تمھاری آنکھیں ڈھونڈا ہی کریں گی۔ میری البیلی من موہنی باتیں اب سُن لو، ورنہ کان ترستے ہی رہیں گے۔ میرے جادو کا اثر محسوس کر لو، بعد میں تمھارا دل پھڑکتا ہی رہ جائے گا۔

وہ شکلیں ایک ایک کر کے مٹ گئیں۔ اُن کی یاد بھی اب دُھندلی پڑ ہو گئی۔ اُن کے نورانی چہرے ماضی کے دھندلکوں میں چمکتے دکھائی دے رہے ہیں مگر اُن کے نقوش مدھم اور ماند پڑتے جا رہے ہیں۔ میں یاد کا چراغ جلا کر ان مقدس شکلوں کو دیکھتا ہوں تو خواب کے سائے سے دکھائی دیتے ہیں۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں یہ خواب، یہ سائے بھی نہ مِٹ جائیں، کہیں عہدِ رفتہ کی بھول بھلیوں میں نہ کھو جائیں۔ اس لئے ان کے دُھندلے نقوش نذرِ نقوش کرتا ہوں۔ یہ طاقِ نسیاں کے چند مِٹے مٹے سے نقش و نگار ہیں۔ کاش کوئی انھیں اجاگر کر دے!

شاہد احمد دہلوی

اُستاد بیخود دہلوی

منشی وحید الدین بیخودؔ دلّی کے ایک قدیم خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ تعلیم واجبی واجبی ہی تھی۔ داغؔ کے محبوب شاگرد تھے، داغؔ کے انتقال کے بعد بہادر شاہ بادشاہِ دہلی کے پوتے مرزا خورشید عالم نے جانشینی کی پگڑی بیخودؔ صاحب کے باندھ دی مگر دیکھتے ہی دیکھتے اُستاد کے سینکڑوں جانشین پیدا ہو گئے۔ ان میں سائلؔ دہلوی بھی تھے جن سے اُلجھنا بیخودؔ صاحب نے اپنا شعار بنا لیا تھا۔ دلّی کے مشاعرے اکھاڑے اور دنگل بن گئے اور

وہ بے ہودگی پھیلی کہ بھلے آدمیوں نے مشاعروں میں جانا چھوڑ دیا۔

بیخود صاحب انگریزوں کو اُردو پڑھایا کرتے تھے۔ اس سے ان کی معقول آمدنی تھی۔ شہسواری کا شوق تھا۔ مُنہ زوری سے مُنہ زور گھوڑے ان کے پاس سدھائے جانے کے لئے بھیجے جاتے۔ جوانی میں اچھے جاندار آدمی ہوں گے۔ ہم نے تو انہیں اسّی برس کی عمر میں بھی یہی دیکھا کہ ان کی ران تلے گھوڑا چیں بول جاتا تھا۔

بیخود صاحب نے شاعری میں تو خیر نام پایا ہی ایک زمانے میں جن بھوت اُتارنے میں بھی کافی شہرت رکھتے تھے۔ مرچوں کی دھونی دے کر جب جُوتے اُڑانے شروع کرتے تو جن تو جن دیوتا بھی کوُچ کر جاتے۔

جب عمر ستّر سے اُوپر ہوگئی تو مزاج کی حدّت میں کمی آگئی۔ مشاعروں میں جانا چھوڑ دیا۔ کسی شاگرد کے ہاتھ اپنی غزل بھیج دیتے۔ بعض آل انڈیا قسم کے مشاعروں میں بادلِ نخواستہ شریک ہو جاتے تھے۔ کسی سُریلے شاگرد سے اپنی غزل پڑھواتے۔ خود برابر میں بیٹھے داد و تحسین وصول کرتے رہتے۔ دس بارہ سال اُدھر کی بات ہے دِلّی کے ٹاؤن ہال میں ایک بڑا مشاعرہ ہوا۔ بیخود صاحب بھی شرکت کرنے پر مجبور کئے گئے۔ بڑے بڑے سُریلے شاعر پڑھ کر ہٹے تھے کہ بیخود صاحب کا نمبر آگیا۔ انھوں نے اپنے سب سے سُریلے شاگرد کو غزل پڑھنے کیلئے دی وہ صاحب رنگے ہوئے تھے۔ ایک مصرعہ کسی دُھن میں ناموزوں پڑھا، دوسرا کسی میں۔ بیخود صاحب کے کان کھڑے ہوئے، گھُور کر شاگرد کو دیکھا۔ مگر وہ لہک لہک کر پڑھے جا رہے تھے اور مشاعرہ ہنس رہا تھا۔ تیسرا مصرعہ تیسری دُھن میں پڑھ کر چوتھے کے لئے راگ انتخاب فرمانے کا ارادہ کرہی رہے تھے کہ ایکدم سے جیسے بجلی کا تڑاخہ ہوا اور دھواں دھار گالیاں برسنی شروع ہوگئیں۔ بیخود صاحب نے شاگرد کے ہاتھ سے اپنی غزل کا پرچہ چھینا اور اُسے دھکّا دے کر خود تحت اللفّظ پڑھنا شروع کر دیا۔ ان کی آواز کا کڑاکا آج تک کانوں میں گونجتا ہے۔ بیخود صاحب نے بڑھاپے میں جوانی کی تصویر کھینچ دی۔

اُردو بازار میں کتب خانہ علم و ادب ادیبوں اور شاعروں کا اڈّا بن گیا تھا۔ بیخود صاحب بھی روزانہ شام کو یہاں بیٹھکی ضرور لیتے تھے۔ ایک ناول روزانہ پڑھنے لے جاتے اور اگلے دن اُسے واپس کر کے دوسرا لے جاتے۔ ہاتھ میں ہزار دانہ کھٹاکھٹ چلتا رہتا۔ باتیں خاص دِلّی والوں کے لہجے میں کرتے اور یہ باتیں بڑی دلچسپ ہوتیں۔ مثلاً فرماتے "میں ابّا کے ساتھ دادا غالبؔ کے ہاں پانچ سال کی عمر میں گیا تھا۔ بلوری صراحی اور گلاس رکھا تھا۔ ایک طشتری میں تلے ہوئے بادام اور پستے تھے۔ ایک چُسکی لگاتے اور دو چار دانے پھانک لیتے۔ ابّا تو اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے نماز پڑھنے کھڑے ہوگئے اور دادا غالبؔ مجھ سے باتیں کرنے لگے۔ بولے" یار چہ، لو کچھ کھاؤ"۔ میں نے تھوڑے سے بادام اُٹھا لئے۔ ہنسی مذاق کی باتیں کرتے رہے، پھر بولے" یار چہ، تم ہمارے سر پہ ایک دَھول تو کَس کر لگاؤ"۔ یہ کہہ کر اپنا گُھٹا ہُوا سر میرے آگے کر دیا۔ میں بچپن میں بہت شریر تھا۔ دَھول رسید کرنے کے لئے کھڑا ہوگیا۔ ابّا نے جلدی سے سلام پھیر کر" ہوں ہوں" کہہ کر مجھے گھُورا اور مرزا سے بولے "مرزا صاحب، اللہ نے بڑی خیر کی۔ مجھے تو مُنہ دکھانے کو جگہ نہ رہتی۔ یہ بڑا شیطان ہے۔ اِس کا کیا ہے "یہ تو مار بیٹھتا، مگر میں تو کہیں کا نہ رہتا"۔

ہمیں اگر کوئی پُرانا لفظ یا محاورہ پوچھنا ہوتا تو بیخود صاحب سے پوچھ لیتے اور وہ بے تکلّف بتا دیتے۔ دیوانِ غالبؔ کی تو اُنھوں نے شرح ہی کر دی تھی، مومن خاں کے اشعار کا مفہوم بھی اِس خوبی سے سمجھاتے کہ مزہ آجاتا۔ ایک دفعہ خود اُن کے ایک مقطع کا مطلب اُن سے پوچھا ؎

بیخودؔ کے لب بھی تر نہ ہوئے وقتِ میکشی
آلودۂ شراب گریبان ہی رہا

فرمانے لگے "دراصل یہ شعر ایک واقعہ سے متعلق ہے۔ میں فلاں ریاست میں ملازم تھا۔ رئیس کی محفلِ خاص روزانہ رات کو سجتی۔ جب دَورِ شراب چلتا تو رئیس کی منظورِ نظر طوائف جام بھر بھر کر مقرّبین کو پیش کرتی۔ انکار کی مجال کسی کو نہ ہوتی تھی۔ میں بھی اُس سے جام لے لیتا اور مُنہ تک لے جا کر چُپکے سے اپنے گریبان میں اُلٹ لیتا تھا۔

بڑے آدمیوں کی بڑی کمزوریاں۔ ہر سوال کا جواب ضرور دیتے تھے۔ لاعلمی کا اظہار کبھی نہ کرتے۔ اور جب کہیں مجبور ہو جاتے تو ناراض ہو کر بات کو ٹال جاتے۔ ایک زمانے میں سُہراب مودی کو غالب فلم بنانے کا خیال ہوا۔ مکالمے اور سینا ریو منٹو نے لکھا تھا۔ اس سلسلے میں وہ مجھے بھی بمبئی بلوانا چاہتے تھے مگر مَیں نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد اُن کے ایک ڈائریکٹر نندا مجھ سے ملنے دلّی آئے اور سو سال پہلے کے لباس وغیرہ کے متعلق مجھ سے کچھ پُوچھنے لگے۔ مجھے بہت کم باتیں معلوم تھیں۔ میں اُنھیں لے کر بیخود صاحب کے ہاں پہنچا۔ بیخود صاحب ملاقات کی غایت سُن کر کچھ خوش نہیں ہوئے۔ اُکتا کر بولے "پوچھیے"۔ نندا صاحب نے کہا مثلاً پالکی اور نالکی میں کیا فرق تھا اور ان کی شکلیں کیسی ہوتی تھیں"؟ بیخود صاحب چیخ کر بولے "پالکی پالکی ہوتی ہے، نالکی نالکی۔ پالکی نالکی کیسے ہو سکتی ہے، نالکی پالکی کیسے ہو سکتی ہے؟" میں نے دیکھا کہ یہاں دال نہ گلے گی۔ مزاج بھی برہم ہے۔ میں نے نندا صاحب سے کہا "آپ ایسا کیجیے کہ ایک فہرست بنا لیجیے، پھر کسی دن حضرت کو زحمت دیجیے۔" زحمت دینے کی پھر نوبت نہ آئی۔

شاگرد بناتے تو شیرینی ضرور لیتے۔ ایک مہربان ایک صاحبزادہ کو لے کر پہنچے۔ بیخود صاحب کبوتر اُڑانے میں چھت پر مصروف تھے۔ بہت مکدّر ہو کر نیچے بیٹھک میں آئے۔ مہربان نے مٹھائی کی ٹوکری پیش کی اور عرضِ مدّعا کیا۔ ٹوکری تو اُن کا پوتا فوراً اندر لے گیا اور بیخود صاحب نے پوچھا "صاحبزادے، شعر کہتے ہو؟" اس نے کہا "جی ہاں"۔ فرمایا "سناؤ"۔ شامتِ اعمال، وہ غریب نہ جانے کس سے لکھوا لایا تھا، ناموزوں شعر سنانے لگا۔ بیخود صاحب ایک دم سے بکھر گئے۔ گالیوں کا سیلاب اُمنڈ پڑا "نکل میرے گھر سے۔ نکل۔" اور کوئی گالی ایسی نہ تھی جو اُس پر صرف نہ کی گئی ہو۔ کھڑے کھڑے اُسے گھر سے نکالا اور کُنڈی لگا اُوپر جا کر پھر کبوتر اُڑانے لگے۔

بیخود صاحب کی عمر اس وقت کوئی ۹۵ سال کی ہے۔ حکومتِ ہند نے ڈیڑھ سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا ہے۔ اِسے بہت بڑی قدردانی تصوّر کرنا چاہیئے۔

میر باقر علی داستان گو

داستان گوئی کا فن اب ہمارے ہاں بالکل ختم ہو چکا ہے۔ دلّی کے آخری داستان گو میر باقر علی تھے۔ جن کے انتقال کو اب بیس برس سے اُوپر ہوئے۔ دُبلے پتلے سے آدمی تھے۔ سفید چھوٹی سی ڈاڑھی، سر پر دو پلّی، پاؤں میں دیسی جُوتی، انگرکھا اور چُست پاجامہ پہنتے تھے۔ عمر ساٹھ اور ستّر کے درمیان۔ کھلتا ہوا رنگ، ستواں سی ناک، میانہ قد۔ باتیں کرتے تو مُنہ سے پھُول جھڑتے۔ داستان سُنانے دُور دُور جاتے تھے۔ رجواڑوں اور نوابوں میں بُلائے جاتے۔ ایک زمانے میں ریاست پٹیالہ میں داستان سنانے کے لئے ملازم بھی رہے۔ رئیس مر گیا تو دلّی واپس آ گئے۔ املی کی پہاڑی پر گھر تھا۔ آخری وقت میں افلاس نے گھیر لیا تھا۔ سینما ایسا چلا کہ میر صاحب کی پُرسش ختم ہو گئی۔ دلّی کے ہندو رئیس چُھنّامل کے ہاں کسی وقت میں چالیس پچاس روپے ماہوار پر ملازم تھے۔ چُھنّامل والوں کا بیان ہے کہ ہم میر صاحب سے بچپن سے داستان سُن رہے ہیں۔ بیس پچیس سال ہو گئے، ایک داستان ہی ختم ہونے میں نہیں آتی۔ میرے بچپن میں میر صاحب فراش خانہ میں داستان سُنایا کرتے تھے۔ ہفتے میں ان کا ایک دن مقرر تھا۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ داستان کہتے۔ برسوں یہ سلسلہ جاری رہا۔ داستان کا ایک حصّہ سُنانے پاتے تھے کہ یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ میر صاحب ہمیشہ داستانِ امیر حمزہ ہی سُنایا کرتے۔ ایک نے اُن سے پُوچھا کہ میر صاحب، یہ داستان کبھی آپ نے ختم بھی کی ہے؟ بولے "عمر بھر میں

ایک دفعہ "۔

میر صاحب کے آبا و اجداد شاہی داستانگو تھے۔ غالباً انہی میں سے کسی کے متعلق یہ روایت مشہور تھی کہ بادشاہ کو روزانہ داستان سنایا کرتے تھے۔ ایک موقع ایسا آیا کہ عاشق و معشوق کے درمیان صرف ایک پردہ حائل تھا۔ پردہ اُٹھ جائے تو وصال ہو جائے۔ مگر داستان گو نے احساسات، خیالات اور کیفیات کے بیان میں بارہ سال گزار دیئے اور پردہ نہ اُٹھا۔ آخر بادشاہ کا اشتیاق بے قابو ہو گیا اور اس نے تنگ آ کر کہا "آج پردہ اُٹھ جانا چاہیئے"۔ تب کہیں وہ پردہ اُٹھا۔ میر صاحب کا بھی اسی سے کچھ ملتا جلتا حال تھا۔ بیگم کے بناؤ سنگھار میں ایک نشست ختم کر دیتے تھے۔ آراستہ ہونے کی تفصیل، زیورات کی قسمیں، لباس کی قسمیں۔ زیورات کی تفصیل شروع ہوتی تو میر صاحب سینکڑوں نام گنا جاتے۔ پھر یہ بھی بتاتے کہ شاہی بیگمات کے زیور کیا ہوتے تھے، درمیانہ طبقے کی خواتین کون کون سے زیور پہنتی تھیں۔ بعدیاریاں، سقدیاں اور مہترانیاں کیا کیا پہنتی تھیں۔

میر صاحب بزم اور رزم کو اس انداز سے بیان کرتے کہ آنکھوں کے سامنے پورا نقشہ کھنچ جاتا۔ داستان کہتے جاتے اور موقع بہ موقع ایکٹنگ کرتے جاتے۔ آواز کے زیر و بم اور لب و لہجے سے بھی اثر بڑھاتے۔ امیر حمزہ اور عیاروں کا جب بیان کرتے تو ہنسا ہنسا کے لٹا دیتے۔ ہتھیاروں کے نام گنانے شروع کرتے تو ڈیڑھ دو سو نام ایک سانس میں لے جاتے۔ پھر کمال یہ کہ نام صرف طوطے کی طرح رٹے ہوئے نہیں تھے بلکہ آپ جب چاہیں ٹوک کر کسی ہتھیار کی شکل اور اس کا استعمال دریافت کر سکتے تھے۔ میر صاحب پوچھنے سے چڑتے نہ تھے بلکہ خوش ہوتے اور تفصیل سے بتاتے۔ مثلاً منجنیق کو بیان کرنے ہی میں پندرہ منٹ صرف کر دیئے۔ عورت کا حسن بیان کرنے پہ آئیں تو زمین آسمان کے قلابے ملا دیں۔ اور کچھ نہیں تو چال کی ہی سینکڑوں قسمیں بتاتے۔ بیگم بن سنور کر ایک کمرے میں سے دوسرے کمرے میں آ رہی ہیں۔ ڈیڑھ گھنٹہ ہو گیا، بیگم دہلیز نہیں پھلانگتیں۔ پھر کیا مجال کہ آپ میر صاحب کے بیان سے اُکتانے یا گھبرانے لگیں۔ انھوں نے یہ وسیع معلومات بڑی محنت سے حاصل کی تھی۔ ہر علم کا انھوں نے باقاعدہ مطالعہ کیا تھا۔ اُستادوں سے باقاعدہ سیکھا تھا۔ اور تو اور جب دلی میں طبیہ کالج کھلا تو میر صاحب نے ساٹھ سال کی عمر میں اس میں داخلہ لیا اور لڑکوں کے ساتھ بیٹھ کر پڑھنے لگے اور وہاں سے فارغ التحصیل ہونے کی سند بھی حاصل کی۔

میر صاحب کی داستان جہاں ہوتی وہاں اُجلی اُجلی چاندنیوں کے فرش بچھ جاتے۔ میر صاحب کے لئے ایک چھوٹا سا تخت بچھا دیا جاتا۔ اس پہ قالین اور گاؤ تکیہ ہوتا۔ سامعین گاؤ تکیوں سے لگ کر بیٹھ جاتے۔ پان اور حقے کا دَور چلتا رہتا۔ گرمیوں میں شربت اور جاڑوں میں چائے سے تواضع کی جاتی۔ میر صاحب تخت پر براجمان ہوتے۔ کٹورے یا گلاس میں پانی منگواتے۔ جیب میں سے چاندی کی ڈبیا اور چاندی کی چھوٹی سی پیالی نکالتے۔ ڈبیا میں سے افیون کی گولی نکالتے۔ اسے روئی میں لپیٹتے۔ پیالی میں تھوڑا سا پانی ڈال کر انٹے کر اس میں گھولتے رہتے اور دوستوں سے باتیں کرتے رہتے۔ جب ساری افیون ڈھل کر پانی میں آ جاتی تو روئی اگالدان میں پھینک دیتے اور گھولوے کی چُسکی لگا لیتے۔ اس کے بعد چائے کا ایک گھونٹ پیتے۔ فرماتے "چائے کی خوبی یہ ہے کہ لب بند، لب ریز اور لب سوز ہو"۔ پھر داستان شروع کر دیتے۔

جب داستان سننے والوں کا قحط ہو گیا تو میر صاحب نے چند کتابیں لکھیں مثلاً گاندھی جی کی کھادی تحریک کے زمانے میں ایک کتابچہ "گاڑھے خاں نے ململ جان کو طلاق دے دی"۔ "باجی پڑوسن"۔ "مولا بخش ہاتھی" اور ایسی ہی چھوٹی چھوٹی کتابیں کئی لکھی تھیں جو ایک بار چھپنے کے بعد دوبارہ نہیں چھپیں۔ اکثر رسالوں میں ان کے مضامین بھی شائع ہوئے، مگر جو لطف اُن کی تقریر میں تھا تحریر میں نہ آ سکا۔

میر باقر علی اپنے نانا میر امیر علی کے شاگرد تھے۔ جن بزرگوں نے میر امیر علی کی داستانیں سنی تھیں، کہتے تھے کہ باقر علی کی داستان ان کی پاسنگ بھی نہیں تھی۔ غالباً فرق یہی ہو گا کہ وہ بارہ سال تک پردہ پڑا رہنے دیتے ہوں گے، میر باقر علی سال دو سال میں پردہ اُٹھا دیتے تھے۔

بڑھاپے میں نادری اور کس مپرسی کے ہاتھوں میر صاحب کو بڑی تکلیف پہنچی۔ دلی کا کامل الفن آخری داستانگو اپنا پیٹ پالنے کے لئے چھالیا بیچتا تھا۔ ع

اے کمال افسوس ہے، تجھ پہ کمال افسوس ہے

مولوی عنایت اللہ

شمس العلما منشی ذکاء اللہ کے صاحبزادے مولوی عنایت اللہ نے بھی اپنے والد کی طرح ترجمہ کرنے میں بہت نام پایا۔ بلکہ سرسید احمد خاں نے اپنے ایک خط میں ذکاء اللہ کو لکھا تھا کہ "تمہارا لڑکا تم سے اچھا ترجمہ کرتا ہے۔" مولوی صاحب نے سرسید کے زمانے میں علی گڑھ میں پڑھا تھا اور بی۔ اے کرنے کے بعد سرسید کے پرائیویٹ سکریٹری کے فرائض انجام دینے لگے تھے۔ سرسید احمد کی فرمائش پر مولوی صاحب نے سر ولیم میور کی کتاب سیرتِ نبوی کا ترجمہ کیا تھا۔ اِسی ترجمے سے مولوی صاحب کی شہرت کا آغاز ہوا۔ مولوی صاحب مختلف سرکاری ملازمتوں پر مامور رہے۔ جب حیدرآباد میں عثمانیہ یونیورسٹی کے سلسلے میں دارالترجمہ قائم ہوا تو عنایت اللہ صاحب اس کے ناظم مقرر کئے گئے۔ اس ملازمت میں آنے سے پہلے مولانا نے جغرافیۂ اندلس اُردو میں ترتیب دیا تھا۔ یہ عظیم علمی کارنامہ دارالترجمہ سے شائع ہوا۔ اس پر دس ہزار کا انعام انھیں ریاست سے ملا تھا۔ مولانا فرماتے تھے کہ یہ کتاب میری ساری عمر کی محنت کا نتیجہ ہے اور اس پر وقتاً فوقتاً جو خرچ ہوا وہ بارہ ہزار سے کم نہیں۔ مولانا نے دارالترجمہ کے لئے اور بھی بعض دقیق کتابوں کے ترجمے کئے تھے۔ ڈوزی کی تاریخ کا ترجمہ اُنھوں نے خود اپنے صرفہ سے دو جلدوں میں چھپوایا تھا، اور کوئی اور پرانی مغلوں کی تاریخ تھی۔ چار ضخیم جلدوں میں، اس کا ترجمہ فرصت میں کرتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ مجھے لکھا کہ "تین جلدوں کا ترجمہ کر لیا ہے، چوتھی کا شروع کر دیا ہے۔ دیکھئے ترجمہ پہلے ختم ہوتا ہے یا زندگی۔" بارے اُن کے انتقال سے پہلے چاروں جلدوں کا ترجمہ ہو گیا تھا۔ یہ ترجمہ چیمبرز ڈکشنری سائز کی چار مجلّد کاپیوں میں اُن کے پاس تھا اور فرماتے تھے کہ "علی گڑھ یونیورسٹی لائبریری کے لئے یہ جلدیں بھیج دوں گا۔ چھپنا تو اس کا ناممکن ہے۔"

مولوی صاحب کو میں نے پہلے "زلفو" اور "ٹائیس" کے ذریعے جانا۔ اُن سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا مگر کوئی دس سال بعد اُن سے پہلی ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ مولوی صاحب حیدرآباد میں ایک عالی شان کوٹھی میں رہتے تھے۔ میرے برادرِ نسبتی سید وزیر حسن اُن سے ملانے مجھے لے گئے۔ گورا رنگ، سفید مونچھیں، داڑھی صاف، چھوٹے قد کے دھان پان سے آدمی تھے۔ سُرخ مخمل کی ٹوپی ان کے سفید بالوں اور اُجلے رنگ پر بڑی بھلی لگتی تھی۔ محبت سے ملے۔ بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ بھولی بھولی باتیں کرتے تھے۔ حیدرآباد کی سازشوں سے سخت بیزار تھے۔ ادبی گفتگو بھی ہوئی۔ "ٹائیس دلّی میں" ایک مضمون سید وزیر حسن نے لکھ کر ساقی میں چھپوایا تھا۔ اس سے متأثر اور خوش تھے۔ مولانا نے فرمایا "عجیب بات ہے، یہ کتاب سب کو پسند آئی ہے۔ راس مسعود کہتے ہیں کہ تمھارے ترجمے میں جو لطف ہے وہ فرانسیسی زبان کی اصل کتاب میں بھی نہیں۔ مگر مجھے ٹائیس سے زیادہ نجم السحر پسند ہے۔" میں نے پوچھا "نجم السحر کہاں سے شائع ہوئی ہے؟" کہا "مسودہ رکھا ہوا ہے۔ چھاپے کون؟" یہ کہہ کر الماری میں سے اس کا مسودہ نکال لائے۔ میں نے کہا "اگر آپ پسند فرمائیں تو میں اِسے چھاپ دوں؟" بہت خوش ہوئے اور بولے "لے جائیے۔" میں نے کہا "گستاخی معاف، معاوضہ بھی فرما دیجئے۔" حیرت سے دیکھ کر بولے "معاوضہ! معاوضہ تو آج تک کسی نے مجھے نہیں دیا اور نہ میں نے مانگا۔ کتاب چھپ جائے، بس یہی بہت ہے۔ میں نے تو جتنی کتابیں چھپوائیں (انھوں نے دو بڑے اداروں کے نام لئے) انھوں نے کتابوں کی پوری لاگت مجھ سے لی اور ہمیشہ انھیں نقصان ہوا۔ آپ نجم السحر چھاپ دیجئے مگر میں اس میں روپیہ نہیں لگا سکتا۔ دیکھ لیجئے کہیں آپ کو اس کے چھاپنے میں نقصان نہ ہو جائے۔"

اس کے بعد مولانا سے تعلقات بہت بڑھ گئے۔ وہ حیدرآباد سے دل برداشتہ ہو کر یکایک دِلّی چلے آئے۔ بارہ پندرہ ہزار روپیہ انعام کا ملنے والا تھا وہ بھی چھوڑا۔ چند روز دلّی میں رہے، اس کے بعد دہرہ دون میں ایک کوٹھی خرید کر وہیں رہنے لگے۔ اب انھیں فرصت ہی فرصت تھی۔ میری فرمائش پر اُنھوں نے کئی ترجمے کئے جن میں سلامبو بھی شامل ہے۔ جانسن کی راسیلاس کا ترجمہ بالاقساط ساقی میں چھپا۔ پھر

شیکسپیئر کے ڈراموں کے ترجمے کرنے شروع کئے تو بارہ چودہ ڈراموں کو اُردو میں منتقل کر دیا۔

گرمیوں کے دو سیزن میں نے دہرہ دُون اور مسوری میں گزارے۔ میرا کرایہ کا بنگلہ مولوی صاحب کی کوٹھی کے قریب ہی تھا۔ بیشتر وقت مولانا ہی کے ساتھ گزرتا تھا۔ پُرانے فلسفیوں کی سی زندگی تھی۔ ساری عمر شادی نہیں کی۔ دس بارہ کمروں کی عمدہ کوٹھی تھی۔ مولوی صاحب نہایت نفاست سے رہتے تھے۔ گھنٹوں ترجمہ کرتے۔ اُنھیں اور کوئی کام ہی نہیں تھا۔ بہت کم دوست تھے۔ ویسے بھی مولانا کم آمیز بلکہ مردم بیزار تھے۔ دہرہ دُون کے دَورانِ قیام میں میں صبح شام ان کے پاس جایا کرتا تھا۔ اگر کسی دن نہ جاتا تو خود مجھے لینے آجاتے۔ اُن کی پُرانی باتوں میں میرا بھی جی لگا رہتا۔

اسی زمانے میں مولانا کے چھوٹے بھائی کی لڑکی سے میرے ایک بھائی کی شادی ہوگئی۔ مولوی صاحب شادی میں شریک تھے۔ نکاح کے بعد بولے "اِس شادی سے دو شمس العلماؤں کے خاندان ایک ہوگئے۔" منشی ذکاء اللہ اور مولوی نذیر احمد، دلّی کالج میں ہم جماعت تھے۔ ان دونوں میں اتنی محبت تھی کہ سگے بھائیوں میں بھی کیا ہوگی۔ جب ابّا کے انتقال کی خبر میں نے مولوی صاحب کو دی تو آبدیدہ ہوکر بولے "ذکاء اللہ نے جلدی کی۔ ساتھ ہی چلتے۔"

آخری بار جب مجھے ان کی علالت کی اطلاع ملی تو میں اُن سے ملنے گیا۔ اندر کمرۂ خواب میں اکیلے لیٹے ہوئے تھے۔ نحیف آواز میں بولے "معاف کیجئے، میں تکلیف کی وجہ سے اُٹھ نہیں سکتا۔ مرنے کا کوئی ہراس نہیں مگر مرض کی گندگی سے سخت پریشان ہوں۔" کھانسی بہت سخت تھی۔ میں تھوڑی دیر بیٹھ کر چلا آیا۔ بیچ میں طبیعت کچھ سنبھل گئی تھی یا انھوں نے سنبھالا لیا تھا۔ ایک دن صبح کو لان میں کرسی ڈلوا کر بیٹھے۔ مالی پھولوں کی کیاریاں ٹھیک کر رہا تھا۔ مولوی صاحب کو کھانسی اُٹھی اور اس غضب کی اُٹھی کہ کرسی ہی میں منکا ڈھلک گیا۔ مالی نے دوڑ کر سہارا دیا، مگر وہاں کیا رکھا تھا؟ طائرِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکا تھا۔

شمس العلما مولوی عبدالرحمٰن

مولوی صاحب مشن کالج دہلی میں عربی کے پروفیسر تھے۔ عربی، فارسی اور اُردو تینوں زبانوں میں غیر معمولی قابلیت رکھتے تھے، مگر بڑے لدھڑ اور سست آدمی تھے۔ کبھی نام و نمود کی طرف توجہ نہ ہوئی۔ بہت کچھ لکھ سکتے تھے مگر کچھ نہ لکھا۔ نہ جانے "مراۃ الشعر" بھی کیسے لکھ گئے۔ کالج میں یہ "بڑے مولی ساب" کہلاتے تھے۔ ان کی سنجیدگی، بُردباری اور علمی قابلیت کی وجہ سے عیسائی پرنسپل تک ان کا احترام کرتا تھا۔

میں نے جب انگریزی ادب میں بی۔ اے کیا تو خیال ہُوا کہ اب فارسی ادب میں ایم۔ اے کرنا چاہیے۔ اُس زمانے میں فارسی کے پروفیسر ڈاکٹر اظہر علی تھے جو ڈاکٹریٹ کے لئے ولایت گئے ہوئے تھے۔ کالج میں ایک نئے پروفیسر آگرہ سے آئے تھے۔ انھوں نے نظامی پڑھانا شروع کیا۔ وہاں بسم اللہ ہی غلط ہوگئی۔ چھوٹتے ہی عربی کا شعر آگیا۔ پوچھنے لگے "مولانا، آپ کو عربی آتی ہے؟" میں نے کہا "نہیں"، بولے "مجھے بھی نہیں آتی۔ آپ عربی کے شعر بڑے مولوی صاحب سے پوچھ لیجئے گا!" ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی قصائد قاآنی پڑھانے بیٹھے۔ اُن سے اشعار کے معنوں میں اختلاف ہُوا تو بولے "ہاں یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں۔ بلکہ بہتر معنی یہی ہیں۔ آپ تو خود اچھی فارسی جانتے ہیں۔ کوئی شعر دشوار معلوم ہو تو پوچھ لیا کیجئے۔" اس کے بعد ڈاکٹر صاحب سے دوبارہ ملنے کی نوبت نہ آئی۔ فارسی والے مولوی صاحب نے کچھ دن تو کام چلایا پھر وہ کالج ہی چھوڑ کر چلے گئے۔ بڑے مولوی صاحب سے کبھی ملنے کا اتفاق نہیں ہُوا تھا۔ لڑکے ان کے رعب میں ہی مرے جاتے تھے۔ میں بھی کچھ تنگ ہی آگیا تھا۔ جان پر کھیل کر مولوی صاحب سے اسٹاف روم میں ملا اور انھیں بتایا کہ کوئی پڑھانے والا نہیں۔ مولوی صاحب نے فرمایا "آپ میرے گھر آجایا کیجئے مگر بہت سویرے آنا پڑے گا، صبح کی نماز کے فوراً بعد۔" میں نے بہ جبر اسے منظور کیا اور مولانا کے گھر سورج نکلتے ہی پہنچ جاتا۔ مولانا

نے چند مہینے میں "وقائع نعمت خانِ عالی" اور "اخلاقِ جلالی" دو کتابیں پڑھائیں۔ دوسری کتاب ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ رمضان شریف آگئے مولانا روزے رکھتے تھے۔ میں اب گویا ان کے آرام میں مخل ہونے لگا۔ وہ سر سے پاؤں تک کمبل تانے پلنگ پر پڑے رہتے اور میں بہ آوازِ بلند پڑھتا رہتا۔ جہاں اٹکتا وہ فرفر آگے بڑھ جاتے۔ ایک دن پہنچا تو ایک اور شاندار بزرگ ان کے پاس بیٹھے دکھائی دیئے۔ بڑی بے تکلف اور مذاق کی باتیں ہو رہی تھیں۔ وہ بھی یہی جھینک رہے تھے کہ تم کوئی کام کیوں نہیں کرتے اور مولوی صاحب انھیں بہ لطائف الحیل ٹال رہے تھے۔ ان کے جانے کے بعد مولوی صاحب نے بتایا کہ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر میمن تھے۔

ایک دن میں حسبِ دستور پڑھ رہا تھا اور مولوی صاحب کمبل تانے پڑے تھے کہ کسی عربی کے فقرے پر اٹک گیا۔ مولوی صاحب نے کہا "رُک کیوں گئے؟" میں نے کہا "جی عربی ہے"۔ بولے "تو کیا ہوا؟" میں نے کہا "جی ممکن ہے کوئی قرآن کی آیت ہی ہو۔ غلط پڑھ جاؤں گا۔" فرمایا "آپ پڑھیئے، عذاب ثواب مجھ پہ ہوگا"۔ میں نے بھی دھڑکے عربی کو اردو کی طرح گھسیٹ ڈالا۔ مولوی صاحب نے کہا "سبحان اللہ، سبحان اللہ! مولوی نذیر احمد کے پوتے اور قابلیت کا یہ حال! اس وقت ہم اپنے آپ کو بڑا قابل سمجھتے تھے۔ مولوی صاحب کا کہنا بہت بُرا لگا۔ پھول کر بیٹھ رہے۔ اب مولوی صاحب لاکھ کہتے ہیں "ہاں صاحب، پڑھیئے" "ارے بھئی آگے چلو"۔ مگر یہاں گُم سُم بیٹھے تاؤ کھا رہے ہیں۔ مولوی صاحب سمجھ گئے کہ صاحبزادے اکڑ گئے۔ اُٹھ بیٹھے اور کمبل ہٹا کر بولے "بہت غصہ آتا ہے آپ کو؟" میں نے کہا "جی ہاں آتا ہے۔ یہ کوئی میرا قصور ہے کہ میں مولوی نذیر احمد کے ہاں پیدا ہوا؟ نہیں آتی مجھے عربی"۔ فرمایا "ارے بھئی تو میں نے کیا تمھیں منع کیا ہے، عربی بھی پڑھ لیا کرو۔" میں نے کہا "بس مولوی صاحب، پڑھائی تو آج ختم ہو چکی کل سے میں نہیں آؤں گا"۔ مولوی صاحب سمجھے مذاق سے کہہ رہا ہے۔ ہنس کر چُپکے ہو رہے۔ مگر میں اُس دن کے بعد نہ تو مولوی صاحب کے ہاں گیا اور نہ کالج۔ کئی دن بعد میں اپنے ماموں کے ساتھ لال کنوئیں سے گذر رہا تھا کہ سامنے سے مولوی صاحب آتے دکھائی دیئے۔ ماموں سے ان کے دیرینہ مراسم تھے۔ اس لئے وہ لپک کر مولوی صاحب کی طرف چلے۔ مجھے بھی جانا پڑا۔ ماموں نے سلام کے بعد مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا تو مولوی صاحب نے فرمایا "نہیں، پہلے ان سے، یہ رُوٹھے ہوئے شاگرد ہیں"۔ مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ مولوی صاحب نے کہا "ہاں بھئی۔ اُستاد زادہ ہیں۔ ہمیں تو ان کا احترام ملحوظ رکھنا ہی پڑتا ہے"۔ گویا اُوپر سے پانچ جوتے اور مار دیئے۔ ماموں نے بعد میں بتایا کہ مولوی صاحب نے تمھارے دادا سے بھی ایک زمانے میں پڑھا ہے۔ اِس واقعہ کے بعد مولوی صاحب سے کبھی کبھی ملاقات ہوتی رہی۔ انھوں نے ساقی کے لئے کچھ لکھا بھی مگر تعلیم کا دروازہ مجھ پر ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔

ایک عرصے کے بعد مولوی صاحب کو کراچی میں دیکھا۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی وزیر بن گئے تھے۔ انھیں مشن کالج والوں نے "خوشامدانہ" دیا تھا۔ مولوی صاحب ڈاکٹر اشتیاق کے بھی اُستاد رہ چکے تھے۔ اس لئے انھیں خاص طور پر جاکر لایا گیا تھا۔ میں نے کوئی بیس سال کے بعد مولوی صاحب کو دیکھا۔ بالکل سُوکھ گئے تھے۔ آنکھوں سے کم دکھائی دیتا تھا۔ بہرے بھی ہو گئے تھے۔ میں آگے بڑھ کر اُن سے لپٹ گیا۔ ان کے لڑکے نے کان میں چیخ کر کہا "شاہد احمد دہلوی ہیں"۔ فرمایا "اچھا!" پھر بڑی محبت سے دیکھ کر بولے "بھائی اندھا ہو گیا، بہرا ہو گیا۔ معاف کرنا"۔ میرا دل بھر آیا کچھ نہ کہہ سکا۔ بس یہ اُن سے آخری ملاقات تھی۔ کسی نے بعد میں بتایا کہ وزیر تعلیم ان کے شاگرد ہیں مگر مولوی صاحب کے پاس رہنے کو گھر تک نہیں ہے۔ کسی نے توجہ بھی دلائی مگر دُعا قبول نہ ہوئی۔ مالی دشواریوں، بیماریوں اور سخت پریشانیوں میں چند مہینے ہوئے یہ آفتابِ علم و ادب کراچی کے ایک بوسیدہ سے کمرے میں غروب ہو گیا۔

خواجہ حسن نظامی

اکبر الہ آبادی کا شعر ہے ؎

حضرت ابو ہریرہؓ سے بلّی نہ چھٹ سکی
خواجہ حسن نظامی سے دلّی نہ چھٹ سکی

اور یہ واقعہ ہے کہ خواجہ صاحب اور دلّی کو الگ کرنا ناخن کو گوشت سے جُدا کرنا ہے۔ خواجہ صاحب کے بزرگ صدیوں سے دلّی میں رہتے چلے آئے ہیں۔ پیدا ہوئے تو غریب گھرانے میں۔ نحیف الجثہ، جیسے ستوانسے ہوں۔ ہوش سنبھالا تو مصائب و مفلسی کا شکار۔ چھوٹی عمر میں کمانے کا فکر۔ دو پیسے سے کتابیں خرید کر پھیری پر بیچتے۔ دھیلی پاؤلا کماتے اور اپنا اور ماں کا پیٹ پالتے۔ ماں نے تربیت کچھ ایسی دی تھی کہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا عیب سمجھتے۔ محنت مزدوری سے جو کچھ رُوکھی سُوکھی مل جاتی اُسی پر اکتفا کرتے۔ سلطان جی کی درگاہ میں ان کے بھائی بند مجاوری کرتے۔ رئیس یا انگریز آکر درگاہ میں پیسے بانٹتے مگر خواجہ صاحب لینے والوں میں شریک نہ ہوتے۔ برسوں دلّی کی گلیوں میں کتابیں، رسالے، نماز کی کتاب بیچتے پھرے۔ نہ جانے پڑھنے لکھنے کا وقت انھیں کب ملتا؟ انھوں نے چپکے چپکے اُردو، فارسی اور عربی میں اچھی استعداد پیدا کرلی۔ لکھنے کا ڈھنگ اللہ نے ایسا دیا کہ سب کو ان کی تحریر پر رشک آتا ہے۔ چند مضامین متفرق رسالوں میں لکھے۔ اِن کا طوطی بولنے لگا۔ پھر واحدی صاحب کے سرمایہ اور ان کی ذہانت نے یکجا ہو کر وہ وہ کام کئے کہ پوری پوری جماعتیں بھی نہ کرسکیں۔

پیری مُریدی شروع کی تو مُریدوں کی تعداد لاکھوں پر پہنچی۔ شدّھی کی وبا پھیلی تو انھوں نے تبلیغ کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ کتابیں لکھنی شروع کیں تو خواجہ صاحب کی نئی کتابوں کا انتظار رہنے لگا۔ دوائیں بیچیں تو ہُن برسنے لگا۔ اخبار نکالا تو دُھوم مچ گیا۔ لیڈر بنے تو صفِ اوّل میں جا دھمکے۔ صوفی بنے تو حال و قال کی وہ وہ محفلیں سجیں کہ درویشوں اور صوفیوں میں ہلّس پڑگئی۔ پبلک میں اعتماد قائم کیا تو ایسا کہ عورتوں کا زیور تک اُتروا لیا۔ انگریزوں اور حکّام میں رسُوخ پیدا کیا تو اتنا کہ ڈپٹی کمشنر اور چیف کمشنر گرد ہو گئے۔ غرض قسمت نے ایسی یاوری کی کہ شہرت، عزّت اور دولت سب نے بڑھ کر قدم چُومے۔

خواجہ صاحب عجب مقناطیسی شخصیت کے آدمی ہیں۔ باتیں بہت متاثر اور مرعوب کرنے والی کرتے ہیں۔ کشف و کرامت کا تو کوئی واقعہ اِن سے ظہور میں نہیں آیا مگر یہ کیا کم کرامت ہے کہ جس کے سر پر انھوں نے ہاتھ رکھا وہ ان کا دم بھرنے لگا۔ راجہ، نواب، بیگمات رئیس، حکّام، زمیندار، بابو لوگ، حد یہ کہ دستکار تک ان کے حلقۂ مُریدین میں شامل تھے۔ حیدر آباد کے مہاراجہ کرشن پرشاد نے اپنے لڑکے کا نام خواجہ پرشاد رکھا۔ ایک اطالوی شہزادی بھی ان کی مُرید تھی۔ ہندو، سکھ اور عیسائی بھی ان کے عقیدت مندوں میں شریک تھے۔

بستی نظام الدین اولیاؒ میں یا تو ان کا اپنا رہنے کا مکان تک نہ تھا، یا یہ کیفیت تھی کہ درگاہ کے آس پاس کا بیشتر علاقہ خواجہ صاحب کی ملکیت بن گیا تھا۔ دلّی میں ان کی کافی جائداد تھی۔ یہ سب ان کی محنت اور سلیقے کی کمائی تھی۔

خواجہ صاحب بہت بڑے پرچارک (PROPAGANDIST) ہیں۔ ان کی تحریر اور تقریر کا زور دیکھنا ہو تو اِس باب میں دیکھیئے۔ یہ پرچار ان کی سب سے بڑی قوت بھی ہے اور کمزوری بھی، خوبی بھی اور عیب بھی۔ اپنی بات منوانے کے لئے وہ جائز و ناجائز، موزوں و ناموزوں کا امتیاز بھی اُٹھا دیتے ہیں۔ بعض پرانے اور بہت اچھے دوستوں سے بگاڑ لینے کو بھی بُرا نہیں سمجھتے۔ مولانا محمد علی، مرزا حیرت اور سردار دیوان سنگھ مفتوں جیسے دوستوں سے بگاڑ لی اور ایسی بگڑی کہ جوتیوں میں دال بٹ گئی۔

خواجہ صاحب نے شہرت حاصل کرنے کے لئے کوئی ذریعہ نہ چھوڑا۔ اُن کی شہرت کا آغاز ان کے حُلیے سے ہوا۔ نمایاں ہونے کے لئے انھوں نے اپنی وضع قطع سب سے الگ بنائی۔ پیلے رنگ کی قُبّہ نما ٹوپی۔ پھر یری داڑھی، شانوں پر بل کھائے ہوئے کاکل، ٹخنوں تک کی قبا۔

جب شُدّھی نے سوامی شردھانند کی سرکردگی میں بہت زور پکڑا تو اُنھوں نے اُسے مباہلہ کا جو چیلنج دیا وہ بھی دُنیا سے نرالا تھا۔ خواجہ صاحب نے کہا "آؤ ہم اور تم دونوں جامع مسجد کے مینار پر سے چھلانگ لگاتے ہیں۔ جو سچا ہوگا وہ بچ جائے گا جو جھوٹا ہوگا مر جائے گا" اس کے لئے اُنھوں نے دن اور وقت بھی مقرر کر دیا اور وقت مقررہ پر جامع مسجد پہنچ بھی گئے۔ ہزاروں آدمی یہ تماشہ دیکھنے جمع ہو گئے تھے مگر شردھانند نہیں آئے۔

انگریز یا کوئی اور غیر ملکی حکومت اگر مسلمانوں کے ساتھ کبھی بھلائی کرتی تو خواجہ صاحب "تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے" اس کا شکریہ ادا کرتے۔

سیاسی اعتبار سے خواجہ صاحب نے کئی قلابازیاں کھائیں۔ کبھی کانگریس کا ساتھ دیا، کبھی مُسلم لیگ کا، اور کبھی دونوں سے الگ ہو گئے۔ کبھی مسٹر جناح کی مخالفت کرتے اور کبھی حمایت۔ جب پاکستان بننے کا یقین ہو گیا تو مُسلم لیگ کی حمایت میں اتنا غلو کیا کہ قرآنِ کریم کی ایک آیت پیش کر کے مولانا ابوالکلام آزاد کو واجب القتل ٹھہرا دیا۔

خواجہ صاحب نرم دل بھی اتنے ہیں کہ روپے پیسے اور سعی و سفارش سے ہر ایک کی مدد کرنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے ہزاروں آدمیوں پر احسانات کئے ہیں، اور اکثر اپنی غلط بخشیوں سے نقصان اُٹھایا۔ زندہ دِلی میں اب بھی اُن کا جواب نہیں۔ بڑے مضبوط اعصاب کے آدمی ہیں۔

میر ناصر علی

دُبلے پتلے، کمر جھکی ہوئی، اسّی کے پیٹے میں، گندمی رنگ، خشخاشی داڑھی، سر پر عمامہ، لمبا سا چُغہ، پیچھے ہاتھ باندھے، میر صاحب روزانہ تیسرے پہر جھُومتے جھامتے اپنی حویلی "نمک والوں کے پھاٹک" میں سے برآمد ہوتے اور فراش خانہ کی دو ایک دکانوں پر ٹھیکیاں لیتے لال کنواں، سرکی والان، حوض قاضی، چاؤڑی بازار پیدل طے کرتے ہوئے مغرب کے لگ بھگ چوک پر پہنچ جاتے۔ آندھی جائے مینہ جائے اِن کے اِس روزانہ کے معمول میں فرق نہ آتا تھا۔ چوک پہنچ کر کباڑیوں میں گھس جاتے۔ پُرانی کتابیں، پُرانے نوادر دیکھتے بھالتے، بھاؤ تاؤ کرتے، پیسے کی جگہ چار پیسے دیتے اور خوش خوش اپنا مال اُٹھائے پھر اُسی طرح جھومتے جھامتے اسی راستہ سے اپنے گھر عشا کے وقت پہنچ جاتے۔ میر صاحب نے نمک کے محکمے میں پچیس سال ملازمت کی تھی اور کوئی پینتالیس سال پنشن کھائی تھی۔ پنشن خواروں میں دلّی کے دو بڈھے مشہور تھے، ایک میر ناصر علی اور دوسرے پنڈت امرناتھ ساحر۔ یہ دونوں تقریباً ہم عمر تھے اور مرے بھی بہت تھوڑے وقفے سے۔ اعلیٰ کارکردگی اور حکّام رسی کی وجہ سے میر صاحب کو خان بہادر کا خطاب بھی ملا تھا۔

میر ناصر علی جیسا فلسفیانہ انشاپرداز اُردو میں اور کوئی پیدا نہیں ہوا۔ انگریزی ادب میں اگر ان کے مقابلہ پر کوئی ٹھہرتا ہے تو بیکن۔ مگر وہ بھی نازک خیالی میں اِن کے آگے گرد ہو جاتا ہے۔ میر صاحب نے اپنی ساٹھ سال کی طویل ادبی زندگی میں بہت لکھا اور بڑے بڑے معرکے سر کیے۔ سر سید احمد خاں کے تہذیب الاخلاق کے جواب میں "تیرھویں صدی" اور پھر "ناصری" نکالا۔ میر صاحب کے آبا و اجداد اپنے وقت کے بڑے عالم فاضل سمجھے جاتے تھے اور مناظرہ کرنے میں دُور دُور مشہور تھے۔ ایسے مذہبی ماحول میں تربیت پانے کی وجہ سے علمِ دین سے کماحقہٗ واقفیت رکھتے تھے۔ اس پر مغربی

تعلیم سونے پر سہاگہ ہوگئی۔ سر سید کی آزاد خیالی کے لتے لے ڈالتے تھے۔ مگر آخر آخر میں خود دہریئے مشہور ہوگئے تھے۔ کوئی تیس سال تک اُن کا رسالہ "صلائے عام" جاری رہا۔ ایک زمانے میں اس کا طوطی بولتا تھا۔ بیشتر مضامین میر صاحب ہی کے ہوتے تھے۔ نظر نکتہ رس تھی، بال کی کھال نکالتے۔ ریاض خیر آبادی، مہدی افادی، نیاز فتحپوری اور دلگیر اکبر آبادی صلائے عام کے لکھنے والوں میں تھے۔ میر صاحب کے قدردان مرتے گئے، صلائے عام سسکنے لگا، مگر مرتے دم تک انھوں نے پرچہ بند نہ ہونے دیا۔ اپنی پنشن میں سے دو سو روپے اس کے اخراجات کے دیتے تھے اور صرف سو کاپیاں چھپ کر قدردانوں میں تقسیم ہو جاتیں۔ اگر کوئی خریدار بننا بھی چاہتا تو اس کا چندہ واپس کر دیتے کہ "یہ پرچہ آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ کچھ اور پڑھیئے۔" لوگ عقیدت سے ملنے آتے مگر ان کی اُکھڑی اُکھڑی باتیں سُن کر مایوس لوٹتے۔ میر صاحب پُرانے متشائم فلسفیوں کی سی زندگی گزارتے تھے۔ ایک زمانے میں ان کا ذاتی کتب خانہ اتنا عمدہ تھا کہ لالہ سری رام کے بعد انہی کے کتب خانے کا نمبر آتا تھا۔ جب میر صاحب زیادہ بوڑھے ہوگئے اور نہ ہول بڑھنے لگا تو ان کا بیش بہا ذخیرۂ کتب چوری ہو کر کوڑیوں کے مول کباڑیوں میں بکنے لگا۔ میر صاحب شام کو چوک جاتے تو اپنے کتب خانے کی کتابیں مُنہ مانگے داموں پر پھر خرید لاتے۔ گھر میں رہنے والے پوتوں نواسوں نے میر صاحب کو گھکھہ کر دیا۔

میر صاحب راستہ چلتے چلتے چُپکے سے کسی لونڈے کے چانٹا مار دیتے۔ وہ پلٹ کر بُری سی گالی دیتا اور میر صاحب کے دل کی کلی جیسے کھل جاتی "آہا ہا ہا۔ دلّی کا روڑا ہے نا۔ کیا بات کہی ہے، مزہ آگیا" اور میر صاحب جھومتے چلے جاتے۔

میر صاحب اپنی قابلیت کے آگے کسی کو نہ گانٹھتے تھے۔ نواب سائل سے کہتے "ارے بھئی تُو تو نواب ہے۔ شاعر کہاں؟" ہم نے دیکھا نہیں کہ کبھی اُن کے ہاں احباب جمع ہوئے ہوں۔ سب اُن کی کڑوی کسیلی باتوں سے گھبراتے تھے۔ اکثر تو انھیں سڑی کہتے اور بعض "پاگل ڈپٹی"۔ لیکن اصل بات یہ تھی کہ وہ بڑے نفیس مزاج اور نفیس خیال آدمی تھے۔ انھیں نئی نسل کے لوگوں کی کوئی بات پسند نہ آتی تھی۔ حد یہ کہ گفتگو بھی۔ جانتے تھے کہ کسی سے ملوں گا تو مجھے صدمہ پہنچے گا۔ اور کچھ نہیں تو غلط محاورہ یا غلط لفظ ہی بولے گا اور میرے کان خراب ہوں گے۔ چنانچہ ایک بڑے ادیب سے محض اس لئے ناراض ہوگئے کہ اُس نے کہیں "معافی مانگنا" کہہ دیا۔ میر صاحب بولے "میاں بھیک مانگو بھیک۔ معافی کیا مانگتے ہو بھیک مانگو!"

میر ناصر علی میر تقی میر کی طرح مردم بیزار اور بددماغ ہوگئے تھے۔ مگر جو اُن کے مزاج کو پاگئے تھے وہ ان کی باتوں سے بہت کچھ سیکھ کر اُٹھتے تھے۔ چھیاسی برس کی عمر پائی۔ افسوس کہ آج میر صاحب کے نام سے بھی کم آدمی واقف ہیں۔

علّامہ راشد الخیری

دلّی کے ایک ممتاز مولویوں کے خاندان سے مولانا کا تعلق تھا۔ والد حیدرآباد دکن میں ملازم تھے اور بیوی بچوں سے بے پروا۔ مولانا کو ان کی امّاں نے پالا اور میٹرک تک تعلیم دلائی۔ ددھیال میں سب عالم اور واعظ تھے۔ مولانا نے بھی ابتدا میں وعظ کہنا شروع کیا تھا مگر بعد میں ایک مقامی سرکاری دفتر میں ملازمت کر لی تھی۔ مولانا بچپن ہی سے بڑے غیور تھے۔ اس لئے ابتدائی عمر عسرت میں بسر ہوئی۔ لکھنے پڑھنے کا شوق بچپن سے تھا۔ شروع کے مضامین اپنے پھوپا مولوی نذیر احمد دہلوی کو دکھائے اور ان سے اصلاح لی۔ جب مخزن نکلا تو اس میں ان کے مضامین شائع ہونے لگے اور دُنیائے ادب میں مشہور ہونے لگے۔ سر عبد القادر دہلی آگئے تو ان سے مولانا کے روابط بڑھ گئے اور جب وہ بیرسٹری کے لئے انگلستان گئے تو ادارت کے فرائض مولانا کو سونپ گئے۔ اِسی زمانے میں مولانا نے لکھنے کی مشق بڑھائی۔ اُس زمانے میں کم پیسوں میں دائمی حقوق خرید کر دِلّی کے بعض ناشر کتابیں چھاپا کرتے تھے۔ انہی میں سے ایک سے مولانا کو بھی کچھ تعلقِ خاطر تھا۔ مولانا نے اپنی ابتدائی تصانیف ان صاحب کے ہاتھ اونے پونے بیچیں۔ ہوتا یہ کہ جب کبھی مولانا کو کچھ روپے کی ضرورت ہوئی، دو چار دن میں ایک ناول لکھ کر بیچ ڈالتے۔ مولانا نے پچاس پچاس روپے میں اپنی بعض کتابوں کا حقِ تصنیف بیچ ڈالا تھا۔ عجب بے نیاز طبیعت پائی تھی۔ سستی فروخت کا یہ سلسلہ اُس وقت ختم ہوا

جب واحدی صاحب نے مولانا سے کتابیں معقول معاوضے پر لکھوانی شروع کیں۔ مولانا اُس زمانے میں ضرورت کے تحت لکھتے تھے۔ اب ان سے، اگر ان کی کوئی ضرورت اٹکی نہ ہو تو کیسے لکھوایا جائے؟ واحدی صاحب نے ان سے دو تین گھنٹے روزانہ لکھتے رہنے کا معاہدہ کیا۔ مولانا گھر سے آتے تو واحدی صاحب ان کی ضرورت کی سب چیزوں کے ساتھ انھیں ایک کوٹھڑی میں بند کر دیتے اور مولانا دو تین گھنٹے لکھ کر پسینے میں شرابور باہر نکلتے۔ اس طرح صبحِ زندگی، شامِ زندگی، وغیرہ لکھی گئیں۔ اس عرصے میں مولانا نے اپنا پرچہ "عصمت" خواتین کے لئے جاری کر دیا تھا۔ مولانا نے سرکاری دفتر کی ملازمت چھوڑ دی تھی۔ گھر کا خرچ قلم چلا کر مہیا کرتے۔ پھر وہ زمانہ آیا کہ ان کے بڑے صاحب زادے رازق الخیری صاحب نے "عصمت" مرتب کرنے اور عصمت بک ڈپو قائم کرنے میں ان کا ہاتھ بٹانا شروع کیا اور رازق صاحب کی محنت ہی سے ادارہ "عصمت" نے وہ فروغ پایا کہ آخری عمر میں مولانا دلّی کے اچھے خاصے رئیس آدمی سمجھے جاتے تھے۔

مولانا نے نامساعد حالات میں ہوش سنبھالا تھا اور بڑی صعوبتیں برداشت کی تھیں۔ ان کا دل بہت کمزور تھا۔ ذرا سے غم پر بھر آتا۔ ذرا سے دُکھ پر (چاہے پرایا ہی کیوں نہ ہو) تڑپ اُٹھتا۔ مسلمان عورتوں کے حقوق کے لئے ساری عمر لڑتے رہے اور اپنی زندگی میں اپنے مشن کو کامیاب ہوتے دیکھا۔ دل کی اس کمزوری نے انھیں مصوّرِ غم بنایا۔ اردو ادب میں ان سے زیادہ دردناک ٹریجڈی اور کسی نے نہیں لکھی۔ لوگ طنزیہ انھیں "رونے رُلانے کے اُستاد" کہتے تھے۔ ایک صاحب نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ مسلمان عورتوں کو دِق ہونے کے جو اسباب ہیں ان میں سے ایک سبب مولانا راشد الخیری کی کتابیں بھی ہیں۔ مگر وہ شاید یہ بھول گئے کہ مولانا نے عورتوں کو اُس لمبی بیماری سے چھڑایا جس میں مردوں نے انھیں مبتلا کر رکھا تھا۔

مولانا نے ایک کتاب بڑے اہتمام و احترام سے لکھی ہے۔ یہ کتاب ہے "آمنہ کا لال"۔ مولانا عاشقِ رسول تھے۔ یہ کتاب بڑی محنت و عقیدت سے بھی لکھی گئی ہے۔ مولانا روزانہ اس کے لکھنے سے پہلے غسل فرماتے، اُجلے کپڑے پہنتے، خوشبو لگاتے، مصلّٰی بچھاتے، نماز پڑھتے، اگر بتّیاں اور لوبان سُلگاتے، پھر لکھنے بیٹھتے۔ ان کی باقی سب کتابیں اور مضامین قلم برداشتہ لکھے گئے ہیں۔

مولانا رانڈ بیواؤں، یتیموں اور غریب رشتہ داروں کی روپے پیسے سے مدد کرتے رہتے تھے۔ اور اس خاموشی کے ساتھ کہ اس ہاتھ کی خبر اُس ہاتھ کو نہ ہوتی تھی۔ اُن کے انتقال کے بعد معلوم ہوا کہ غریبوں اور مسکینوں کا کتنا بڑا حلقہ ان کے سہارے پَل رہا تھا۔

مولانا کو بدزبانی یا بدکلامی کرتے ہم نے کبھی نہیں دیکھا۔ ہم نے انھیں کبھی غصہ آتے بھی نہیں دیکھا۔ اپنے عزیزوں کے لئے بے قرار رہتے۔ ایک ایک کے گھر جا کر خیریت معلوم کرتے۔ بیوی بچوں پر تو جان ہی چھڑکتے تھے۔ اب سے دو ُر میاں صادق الخیری کو موتی جھرہ ہُوا تو دیوانہ وار ان کے پلنگ کے چکر کاٹتے رہتے۔ راتوں کو پٹی کے پاس بیٹھے رہتے۔ بچوں سے بڑی خوش مزاجی سے پیش آتے، بلکہ اکثر ان سے ہنسی مذاق کی باتیں بھی کرتے۔ ہم عمر بے تکلّف دوستوں سے وہ چھُوٹ کا مذاق ہوتا کہ الٰہی توبہ! بالخصوص قاری سرفراز حسین اور خواجہ فضل احمد شیدا سے۔

علّامہ راشد الخیری بڑے صابر و ضابط آدمی تھے۔ مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو ہمیشہ یہی ظاہر کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ گویا مرض بہت معمولی ہے اور طبیعت ٹھیک ہے۔ انتقال سے چند روز پہلے دلّی کے ایک ماہر امراضِ سینہ نے معائنہ کے بعد نہایت بھونڈے پن سے اعلان کر دیا کہ پھیپھڑے کا کینسر ہے اور مریض کے بچنے کی کوئی اُمید نہیں۔ مولانا اس کی ضرورت سے زیادہ صاف گوئی پر برافروختہ ہو گئے۔ بولے "ڈاکٹر صاحب، میں جانتا ہوں کہ میں مر رہا ہوں۔ اس کا اعلان کرنا ہی کیا ضرور تھا۔" انھیں اس سے رنج پہنچا کہ بیوی بچّے ہراساں اور نااُمید ہو گئے۔ انھیں اس کا شدید احساس تھا کہ تیمار دار سخت پریشان ہیں۔ ڈاکٹر کے اعلان نے ان کی پریشانی میں مایوسی بھی شامل کر دی۔ آخری وقت میں بھی مولانا کا احساسِ ظرافت زندہ تھا۔ ڈاکٹر کے جانے کی تھوڑی دیر بعد مولانا کے بھانجے حاجی محمد میاں بخاری آ گئے۔ ہم قدّے سادہ لوح آدمی ہیں۔ جارج پنجم کا انتقال انھیں دنوں ہُوا تھا۔ مولانا سے حاجی جی بولے "بادشاہ کے تخت پر تو اب بادشاہ کا لڑکا ہی بیٹھے گا"۔ مولانا نے

نحیف آواز میں فرمایا "نہیں، تمہارے حق میں وصیّت کر گئے ہیں"۔ اور سب کے سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

خواجہ ناصر نذیر فراقؔ دہلوی

خواجہ میر دردؔ کی بارہ دری کسی زمانے میں بارہ دری ہو تو ہو ہم نے تو جب سے ہوش سنبھالا اس بارہ دری میں چند پرانے گھروندے ہی دیکھے انہی گھروندوں میں سے ایک میں خواجہ ناصر نذیر فراقؔ دہلوی رہتے تھے۔ میں نے بچپن میں انھیں اپنے والد کے پاس آتے جاتے دیکھا۔ سُرخ و سپید رنگ، سفید کھچڑی داڑھی، گول چہرہ، بھاری ڈیل، انگشتیا گندہ ہوا انگرکھا، سر پہ کبھی صافہ کبھی ٹوپی، پاؤں میں سلیم شاہی۔ ہاتھوں میں رعشہ تھا اور بہت تھا مگر خود ہی لکھتے۔ ان کی تحریر قسمت کی تحریر ہوتی تھی کہ پڑھنے ہی میں نہ آتی۔ نومبر ۱۹۲۹ء میں مجھے ان کے ہاں جانے کا پہلا اتفاق ہوا۔ پتہ پوچھتا پوچھتا ان کے گھر پہنچا۔ کنڈی کھٹکھٹائی، غالباً کہیں قریب تھے، خود ہی دروازے میں آ گئے۔ مجھے جانتے نہ تھے پوچھا کون ہو بھائی؟" میں نے اپنا نام بتایا کوئی اثر نہ ہوا۔ باپ کا نام بتایا بے قرار ہو کر سینے سے لگا لیا۔ برابر والی مردانی بیٹھک میں لے جا کر بٹھایا۔ بولے "تم تو بھتیجے ہو۔ تمہارے ابّا مجھے سگے بھائیوں سے زیادہ سمجھتے تھے۔ ہائے، اب وہ اگلی سی وضعداریاں کہاں! اچھا بتاؤ گھر میں تو سب خیریت ہے؟ تم آج کیسے آئے؟" میں نے کہا "ایک ادبی ماہنامہ دلّی سے جاری کرنے کا ارادہ ہے"۔ پوچھا "نام کیا رکھا؟" میں نے کہا "ساقی"۔ خوش ہو کر بولے "اچھا نام ہے۔ بدہ ساقی مے باقی کہ در جنّت نہ خواہی یافت"۔ بیسیوں شعر ساقی کے سنا ڈالے۔ "ہاں بھئی ساقی کے لئے ضرور لکھوں گا بھتیجے کے لئے ضرور لکھوں گا، نثر بھی اور نظم بھی"۔ اتنے میں ایک اُن سے بھی زیادہ معمّر بزرگ بیٹھک میں در آئے۔ کرخنداروں کا سا لب و لہجہ، دروازے ہی میں سے جھگڑا پن شروع کر دیا۔ بارے ایک غیر آدمی کو دیکھ کر سنبھل گئے۔ فراقؔ صاحب نے کہا "بھائی بشیر کے صاحبزادہ ہیں۔ رسالہ نکالنا چاہتے ہیں"۔ مگر انھوں نے سنی اَن سنی کر دی اور فراقؔ صاحب سے باتیں کرنے لگے۔ فراقؔ صاحب نے کہا "اب دلّی میں کیا رہ گیا ہے؟ نظم میں تم ہو، نثر میں ہیں۔ باقی اللہ کا نام ہے"۔ میں نے چونک کر اُن بزرگ کی طرف دیکھا، وہ دو باتیں کر کے رخصت ہوئے۔ اُن کا قدم دہلیز سے باہر نکلا ہی تھا کہ فراقؔ صاحب نے کہا "اور یہ بھی کیا ہیں، بس میں ہی رہ گیا ہوں"۔ میں نے پوچھا "یہ کون صاحب تھے؟" بولے "تم انھیں نہیں جانتے؟ اماں بیخودؔ دہلوی ہیں"۔

ناصر نذیر فراقؔ کوئی چار رسال اور جئے مفلسی اور بڑھاپے نے اُن کا دھڑ توڑ رکھا تھا۔ ساقی کے لئے انھوں نے قسط وار "لال قلعہ کی جھلک" لکھی۔ بڑی پیاری زبان لکھتے تھے۔ مخزن کے ابتدائی دَور کے لکھنے والوں میں سے تھے۔ جب مخزن بند ہو گیا تو انھوں نے لکھنا چھوڑ دیا تھا۔ پھر ساقی کے لئے لکھا۔ لکھنے میں انھیں بڑی زحمت ہوتی تھی مگر مرتے دم تک اپنی وضعداری پہ قائم رہے۔ بڑی محبّت سے ملتے تھے اور مل کر خوش ہوتے۔ آخری بار اُن سے ملا تو پردہ کروا کے اندر گھر میں بلوا لیا۔ ایک جھلنگے میں لحاف اوڑھے پڑے تھے۔ ان کے صاحبزادے ناصر خلیق فگارؔ بہت پریشان تھے۔ فراقؔ صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بولے "لو بھئی شاہد میاں، چلنے کا وقت آ پہنچا ؎

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ\
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

بھئی تمّھے، ہمارے مرنے کی خبر اِن کو ضرور کر دینا"۔ میرا دل بھر آیا۔ منہ سے کچھ نہ کہہ سکا۔ اُن سے مصافحہ کر کے باہر چلا آیا۔ فگارؔ صاحب نے بتایا کہ "ابّا کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ کوئی دم کے مہمان ہیں"۔

تیسرے دن اُن کی سناؤنی سنی۔ خواجہ میر دردؔ کی یادگار ختم ہوئی۔ اُردوئے مُعلّیٰ کا کوئی لکھنے والا نہ رہا۔ شمس العلماء مولانا محمد حسین آزادؔ کے شاگرد تھے۔ اُستاد کا ذکر بڑی عقیدت سے کرتے تھے۔ ان کی نا تمام تصنیف "ڈرامہ اکبر" کی تکمیل فراقؔ صاحب ہی نے کی تھی۔ افسوس

کہ زمانے نے انھیں اتنی فرصت نہ دی تھی کہ کوئی مستقل تصنیف اپنی یادگار چھوڑتے۔ عرصہ ہُوا سر عبدالقادر کی فرمائش پر ایک ناول "المور کھا" لکھنا شروع کیا تھا۔ مخزن بند ہُوا تو ان کی ہمت بھی پست ہوگئی۔ پھر اور لوگوں کے اصرار پر اُسے مکمّل بھی کر لیا تھا مگر اس کے چھپنے کی نوبت نہ آئی۔ نہ جانے اُس مسودے کا کیا حشر ہُوا۔

قاری سرفراز حسین

قاری سرفراز حسین عزمی دلّی کے اُن شرفا میں سے تھے جنھوں نے انگریزی تعلیم حاصل کی مگر مذہب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ ادب کا بھی بہت سُتھرا ذوق رکھتے تھے۔ طوائفوں کی اصلاح کے لئے ایک ناولوں کا سلسلہ لکھا۔ اس کی پہلی کڑی "شاہدِ رعنا" بہت مشہور و مقبول ہوئی۔ دلّی کی ایک ڈیرہ دار طوائف کی پوری زندگی اس ناول میں پیش کی گئی تھی۔ "شاہدِ رعنا" کے جواب میں مرزا رسوا نے "امراؤ جان ادا" لکھی۔ اِس طرح اُردو ادب میں دو عمدہ ناولوں کا اضافہ ہُوا۔

قاری صاحب گوناگوں خوبیوں کے آدمی تھے۔ مولانا شوکت علی نے "اولڈ بوائے" میں قاری صاحب کا مختصر تعارف اس طرح کرایا تھا۔ "فیشن نژاد، دل پھینک، عشقِ مجازی کے ساتھ عشقِ حقیقی دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہُوا۔ قاری صاحب سب کچھ ہیں۔ مُبلغ اسلام بھی اور مُفکّر بھی۔ شاعر بھی اور ادیب بھی۔ سحر البیان مقرّر بھی۔ قاری اچھا ہے یا بُرا لیکن علی گڑھ کا کھلنڈرا ہے، اور عجیب الخلقت۔"

قاری صاحب مٹیا محل میں رہتے تھے۔ بڑے کلّے ٹھلے کے آدمی تھے۔ ورزشی بدن، گیہواں رنگ، تُرکی ٹوپی، سیاہ فراک کوٹ پتلون اور پیٹنٹ کا جُوتا پہن کر نِچ جاتے تھے۔ ہاتھ میں چھڑی اور سفید دستانے ہوتے تھے۔ تقریر کرنے میں علی گڑھ یونین میں کیمبرج پرائز لے چکے تھے۔ تبلیغِ اسلام کے لئے انگلستان اور جاپان جا چکے تھے۔ نہایت بذلہ سنج، ظریف الطبع اور چٹپٹے آدمی تھے۔ جاورہ اور رامپور کے نواب ان کے گرویدہ تھے۔ نواب حامد علی خاں تو ان پر ایسے فریفتہ ہوئے کہ انہیں دِلّی سے اغوا ہی کر کے لے گئے۔

قاری صاحب کی خوش گفتاری کے سلسلے میں ایک پُرلطف واقعہ یاد آگیا۔ نواب صاحب شیش محل مسوری میں فروکش تھے کسی نے اُنھیں خبر دی کہ قاری صاحب بھی مسوری میں موجود ہیں۔ وہ غائبانہ بہت تعریف سُن چکے تھے۔ انھوں نے ایک مصاحب کو بھیجا کہ قاری صاحب کو لے آئے۔ قاری صاحب کو یہ اندازِ طلب ناگوار ہوا۔ بولے "میں اُمرا کے ہاں حاضری کی فیس سو روپیہ فی گھنٹہ لیتا ہوں" نواب صاحب نے جزرسی کے باوجود اِس شرط کو منظور فرما لیا۔ قاری صاحب نے اپنا فراک سُوٹ پہنا اور وقتِ مقررہ پر نواب صاحب کے دربار میں حاضر ہو گئے۔ جب ایک گھنٹہ ہو گیا تو گھڑی دیکھ کر اجازت طلب کی اور دوسرے روز سو روپے کا بل بھیج دیا جو وصول ہو گیا۔ یہ رقم مسجد کے تعمیری فنڈ دے دی گئی۔

اپنے لڑکے قاری عباس حسین کی شادی کی تو سہرا خواجہ حسن نظامی صاحب سے بندھوایا۔ سہرا کچھ اُلجھ گیا اور بندھنے میں دیر لگی تو حکیم اجمل خاں نے فقرہ کسا "آدمی وہ کام کیوں کرے جو اُسے آتا نہ ہو"۔ خواجہ صاحب تو مسکرا کر رہ گئے مگر قاری صاحب بھلا کب چُوکنے والے تھے۔ بولے "حکیم صاحب! یہ سہرے والے بڑے بے وحدت ہوتے ہیں، پرچہ ترکیب استعمال ساتھ نہیں رکھتے"۔ حکیم صاحب کے ساتھ خواجہ صاحب بھی شرمندہ ہوئے کیونکہ انھوں نے بھی دوائیں بیچنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔

بُڑھاپے میں جوان شادی کر لی تھی۔ ناخوش اور پریشان رہنے لگے تھے۔ ہاتھوں میں رعشہ آ گیا تھا۔ لکھا نہ جاتا تھا۔ ایک منشی ملازم رکھ لیا تھا جو ان کی تقریریں لکھتا رہتا تھا۔ اسی حالت میں انھوں نے ساقی کے ابتدائی پرچوں کے لئے ایک پُورا ناول "مس عنبریں" لکھوایا۔ صحت تیزی سے گرتی چلی جا رہی تھی۔ آخری بار دیکھا تو بالکل بتاسے کی طرح گھُل گئے تھے۔ اور ایک دن سُنا کہ یہ ہزار داستان ہمیشہ

کے لئے خاموش ہوگیا۔ اُن کا صرف ایک شعر یاد رہ گیا ہے

تھم تھم کے کہہ رہی ہیں دمِ نزع ہچکیاں
کس کس کو بھولنا ہے، ذرا یاد تو کرو

نواب سائل دہلوی

نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی لوہارو کی نوابی کے اصل وارث تھے مگر انگریزوں نے ان کے والد کو گدی سے لاتعلق کر کے ان کے چچا کو گدی پر بٹھا دیا تھا۔ ان کے والد پر الزام لگایا گیا تھا کہ ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں انھوں نے باغیوں کا ساتھ دیا۔ نواب سائل پہلے لال دروازے میں رہتے تھے، پھر فراش خانہ میں اُٹھ آئے تھے۔ سب سے پہلے ہم نے انھیں اپنے بچپن میں ایک مشاعرے میں دیکھا۔ عجب شان و شوکت کے بزرگ تھے۔ میدہ و شہاب رنگ، گول چہرہ، سفید براق داڑھی، سنہری فریم کی عینک، سر پر چوڑی زرکار لیس کی مخملی ٹوپی۔ قریب سے دیکھو تو اس پر زردوزی میں سائل دہلوی لکھا ہوا۔ چست پجامہ، چوڑیاں پنڈلیوں تک پڑی ہوئیں۔ پاؤں میں سلیم شاہی۔ بائیں ہاتھ میں چاندی کی مُٹھ کی چھڑی، داہنے ہاتھ میں چھ انچ لمبا سگار۔ مخصوص ترنّم سے غزل پڑھتے اور سُننے والوں کو پھڑکاتے۔ پھر نواب صاحب کو اکثر دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ مشاعروں میں، پارٹیوں میں، شادی بیاہ کی محفلوں میں اور جب میرے والد کو آخری عمر میں شعر کہنے کا شوق ہوا تو انھوں نے نواب سائل کو اپنا کلام دکھانا شروع کیا، اکثر میرے والد ان کے ہاں جاتے اور کبھی کبھی نواب صاحب بھی ہمارے ہاں آتے۔ کلام دکھانے کا بھی عجب لطیفہ ہے۔ شاگرد نے دس دس پندرہ پندرہ غزلیں (داغ کے رنگ میں اور زمین میں بھی) روزانہ کہنی شروع کر دیں۔ نواب صاحب کوئی ترمیم کرتے تو شاگرد صاحب اُن سے اُلجھ جاتے اور ان کی اصلاح کو نہ مانتے۔ لہٰذا اُستادی شاگردی زیادہ دن نہ چل سکی، دوستی البتہ قائم رہی۔

نواب سائل بڑے حلیم الطبع اور بُردبار آدمی تھے۔ دلی کے معززین میں شمار ہوتے اور انگریزوں میں بھی اُن کی خاصی پوچھ تھی۔ اُن کا کلام خود ان کی شہرت کو چار چاند لگاتا تھا مگر ان کی بعض باتیں بالکل بچکانہ ہوتی تھیں، مثلاً ٹوپی پر نام لکھوانا یا کسی نہ کسی بہانے یہ جتانا کہ "میں داغ کا داماد ہوں"۔ اُن کی یہ کمزوری ان کے اکثر مقطعوں میں بھی ظاہر ہوتی ہے، مثلاً۔ ع

جنابِ داغ کے داماد ہیں ہم دلی والے ہیں

یا وہ مقطع جس پر لکھنؤ والوں نے بہت اعتراض کیا تھا۔ ع

اُنگلیاں اُٹھنے لگیں داغ کے داماد آئے

ایک دفعہ میں اُن سے رسالے کے لئے غزل لینے ان کے گھر گیا۔ اور بھی کئی احباب اور شاگرد جمع تھے۔ سائل صاحب نے اپنی تازہ غزل سنائی۔ ہر شعر پر واہ واہ ہوتی رہی اور وہ یہی فرماتے رہے "میں کیا کہتا ہوں؟ وہ کہلوا رہی ہے جو گھر میں بیٹھی ہے!" "داغ کی بیٹی کہلوا رہی ہے"۔ اصل بات یہ تھی کہ نواب صاحب کو بیگم سے اور انہی کی وجہ سے اُستاد سے بے حد محبت تھی۔ ورنہ بیگم صاحبہ داغ کی حقیقی بیٹی نہیں تھیں بلکہ ان کی سالی کی صاحبزادی تھیں، داغ نے انھیں گود لے لیا تھا۔ اسی طرح اُن کا ایک مصرعہ تھا

"غالب میرے دادا تھے میں غالب کا پوتا ہوں"

حالانکہ نہیں تھے۔

نوابوں میں عام طور سے اتنے شریف طبیعت کے لوگ نہیں ہوتے تھے جتنے کہ نواب سائل۔ ان کے بڑے بھائی نواب تاباں ان کی ضد تھے، گالیاں دینے پر آتے تو شیطان بھی کانوں پر ہاتھ دھرتا۔ اکثر سائل صاحب پر برس پڑتے اور وہ مغلظات سناتے کہ الٰہی توبہ، مگر وہ بچارے منہ

سے اُف تک نہ کرتے ۔ دبی زبان سے اتنا البتہ کہہ دیتے کہ " بھائی جان ، گالیاں آدھی مجھ پر پڑ رہی ہیں اور آدھی آپ پر "۔ اسی طرح جب بیخود صاحب مشاعروں میں برہم ہو کر مادر چادر پہ اُتر آتے تو سائل صاحب جواب میں ایک لفظ بھی نہ کہتے ۔ دلّی میں بیخود والوں اور سائل والوں کے بڑے بڑے پالے ہوتے ۔ اکثر مشاعروں میں مار پیٹ تک نوبت پہنچ جاتی ۔ سائل صاحب ان جھگڑوں سے بہت گھبراتے تھے اور بالآخر انھوں نے دلّی کے مشاعروں میں شریک ہونا ہی چھوڑ دیا تھا ۔ بیخود اور سائل کے اختلاف کی اصل وجہ داغ کی جانشینی تھی جس کے مدّعی دونوں تھے ۔

آخر عمر میں سائل صاحب کی ران کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی ۔ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے ۔ ایک رکشا رکھ لی تھی ۔ اس میں ان کا سوار ہونا اور اس میں سے اُترنا ہی ایک بڑا مرحلہ ہوتا تھا ۔ ایک دن اس رکشا کا پہیہ لال کنوئیں پر ٹریم کی لیکھ میں ایسا اڑا کہ رکشا اُلٹ گئی ۔ سائل صاحب کے سر میں سخت چوٹ آئی ۔ لوگوں نے دوڑ کر انھیں اُٹھایا ۔ ہائے ہائے کرتے تھے اور اپنی بے بسی پر روتے تھے ۔ میں بھی پرسشِ احوال کو گیا ۔ آبدیدہ ہو کر کہنے لگے " ایک وقت وہ تھا کہ جب ابّا جان کا ہاتھی ڈیوڑھی پر آتا تو میں لپک کر اس کی دُم پکڑ اُوپر جا بیٹھتا ۔ یا اب یہ حال ہے کہ دو مردوں کے سہارے بغیر اُٹھ بیٹھ بھی نہیں سکتا ۔"

سائل صاحب نے ہزاروں غزلیں کہیں ، ان کے دیوان بھی چھپے مگر اُن کا عمر بھر کا حاصل نظروں سے پوشیدہ ہی رہا ۔ نورجہاں اور جہانگیر کے عشق پر ایک مثنوی لکھ رہے تھے جس کے پندرہ ہزار شعر کہہ چکے تھے ۔ افسوس کہ یہ عزیز دفینہ بن کر رہ گیا ۔

مولوی احتشام الدین

مولوی احتشام الدین صاحب دلّی کے حقّی خاندان کے سپوت تھے ۔ علی گڑھ کے پرانے گریجویٹ ۔ عرصے تک وہیں لائبریرین رہے ۔ کتابیں پڑھتے کیا تھے نگلتے تھے ۔ انھوں نے سارا اُردو ادب چاٹ رکھا تھا ۔ حافظہ بہت اچھا تھا ۔ طلسم ہوشربا اور بوستانِ خیال جیسی ضخیم کتابیں انھیں ازبر تھیں انھیں یہ تک یاد تھا کہ کونسا لفظ کس کتاب میں کس صفحے پر آیا ہے ۔

مولوی عبدالحق صاحب نے جب اُردو کی بڑی لغت کوئی تیس پینتیس جلدوں میں مرتّب کرنی شروع کی تو بڑے بڑے جغادری بطور مددگار رکھے مگر سب رسّے تڑا کر بھاگ گئے ۔ بالآخر احتشام الدین صاحب ان کے ہتھے چڑھے ۔ حیدرآباد دکن میں ان کا کمرہ دیکھنے کی چیز تھا سینکڑوں ننھے ننھے خانوں کی الماریاں دیواروں میں لگی ہوئی تھیں ۔ مولوی صاحب بیچ میں بیٹھے پرچیوں پر الفاظ لکھتے اور ان خانوں میں ڈالتے رہتے ۔ مولوی صاحب کے کام کرنے کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا ، جب تک جاگتے رہتے یہی کام کرتے رہتے ۔ ایک ایک لفظ کے کئی کئی معنی نکالتے اور سند کے لئے کسی مستند کتاب کا حوالہ بھی دیتے ۔ جب انجمن دلّی آگئی تو مولوی صاحب نے اپنے گھر کے ایک کمرے میں یہی دھندا پھیلایا ۔ اُنھیں اپنے کام میں اتنا انہماک ہوتا تھا کہ کھانے کا بھی ہوش نہ رہتا ۔ اُن کی بیگم صاحبہ اکثر یاد دہانی کراتیں اور اکثر خود آ کر کہتیں تب کہیں کھانا کھانے اُٹھتے ۔ تہمد اور بنیان پہنے پسینے میں شرابور کتابوں اور پرچیوں کے ڈھیر میں دبے رہتے ۔

پھر ایک وقت ایسا آیا کہ اس کام کے لئے انجمن کو جو حیدرآباد سے امداد ملتی تھی وہ بند ہو گئی تو مولوی عبدالحق صاحب نے ان سے کہا کہ کام روک دیا جائے ۔ مگر مولوی صاحب اُسی تندہی سے کام کرتے رہے ۔ لغت ختم پر آ رہی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح جلدی ختم ہو تو اس کی چھپائی کا کام شروع ہو ۔ کم و بیش بیس سال کی محنت تھی بلکہ عمر بھر کی جانفشانی کا حاصل ۔ عبدالحق صاحب کے ہاں سے تنخواہ آنی بند ہو گئی مگر مولوی صاحب کا کام بند نہ ہوا ۔ اُنھیں اپنے کام سے محبت ہو گئی تھی ، جنون ہو گیا تھا ۔ بڑھاپا ، غذا کم ، محنت زیادہ ۔ صحت نے جواب دینا شروع کر دیا تھا ۔ دوستوں اور گھر والوں نے بہت سمجھایا کہ کام چھوڑیئے اور آرام کیجئے ، مگر مولوی صاحب کہتے کہ اگر یہ کام نہ کروں تو پھر کیا کروں ؟ غرض تنخواہ نہ ملنی تھی نہ ملی مولوی صاحب اسی طرح کام کرتے رہے ۔

مولوی صاحب شاعر بھی تھے۔ اِس سلسلے میں ان کا زبردست کارنامہ دیوانِ حافظ کا منظوم ترجمہ تھا۔ مولوی صاحب نے ترجمہ بقیدِ بحر کیا تھا افسوس کہ یہ کاوشِ ذہنی زمانے کی ناقدری کے ہاتھوں برباد ہوئی۔

مولوی احتشام الدین جیسا محققِ الفاظ ہم نے کوئی اور نہیں دیکھا۔ ہمیں بھی اپنی زباندانی پر بڑا ناز تھا مگر مولوی صاحب کے سامنے ہماری حیثیت ایک طفلِ مکتب کی رہ جاتی۔ مثلاً مولوی صاحب نے ایک دفعہ فرمایا "یہ اُردو زبان بھی عجیب زبان ہے۔ فقرے کے لحاظ سے ایک لفظ کئی کئی معنی تو دیتا ہی ہے مگر "اچھا" بہ معنی بُرا اور "بُرا" بہ معنی اچھا کسی اور زبان میں کبھی سُنا؟" اور زبان کا تو ذکر ہی کیا؟ ہم نے تو اُردو میں بھی ان الفاظ کے کبھی ان معنوں میں استعمال ہونے پر غور نہیں کیا تھا۔ اب جو مولوی صاحب نے جتایا تو معلوم ہُوا کہ ہم روزانہ ان دونوں لفظوں کو متضاد معنی میں بولتے ہیں، مگر لفظوں کے اِس نازک پہلو کو دیکھنے کی آج تک توفیق نہ ہوئی۔ اِس قسم کے سینکڑوں لفظ مولوی صاحب کو یاد تھے اور لغت میں تو خدا جانے الفاظ کے کتنے خزانے تھے۔

ایک دن سُنا کہ مولوی صاحب بیمار ہیں۔ میں خیریت معلوم کرنے گیا۔ دیکھا لیٹے لیٹے پرچیاں اُلٹ رہے ہیں۔ کئی دن سے بخار تھا، اس وقت بھی بڑا پھُنک رہا تھا۔ ان کے صاحبزادے میاں شان الحق بہت پریشان تھے۔ انہیں تسلی دے کر چلا آیا۔ دو دن بعد معلوم ہُوا کہ مولوی صاحب اروِن ہسپتال میں داخل کر دیئے گئے۔ ہسپتال جاکر اُن سے ملا تو بہت خفیف آواز میں شکریہ ادا کیا۔ چہرے پر خوشی کے آثار پیدا ہوئے۔ بولے "آپ کے اچھے ہونے کے بعد ساقی کے لئے ایک سلسلۂ مضامین لکھوں گا۔" مگر دوسرے دن سُنا کہ مولوی صاحب کا انتقال ہو گیا۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

مرزا چپاتی

مرزا فخر الدین نام، فخر تخلص۔ عرف مرزا چپاتی۔ دلّی کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ گورا رنگ، کشادہ پیشانی، غلافی آنکھیں گالوں کی ہڈیاں اُبھری ہوئیں، گول سفید داڑھی، کسرتی بدن، سرو قد، بر میں سفید انگرکھا، آڑا پاجامہ، سر پر چوگوشہ، پاؤں میں سلیم شاہی جوتی۔ واقعی مغل شہزادہ دکھائی دیتے تھے۔ بڑھاپے میں عسرت نے گھیر لیا تھا۔ سر پر چوڑی لیس کی ٹوپی، گلے میں پھٹا ہُوا ململ کا کرتہ، پاؤں میں لیترے ہلکائے پھرتے تھے۔ مگر مرزا کی خوش مزاجی میں آخر تک فرق نہ آیا۔

جب تک پیسہ رہا خوب اللّے تللّے سے گزر کی۔ شاید ہی کوئی بازی اُن سے چھوٹی ہو۔ کبوتر، لال اور بٹیریاں اُڑانے تو اور وں کو بھی دیکھا لیکن طوطے اُڑاتے مرزا چپاتی ہی کو دیکھا۔ پتنگ بنانے اور پیچ لڑانے میں جواب نہ رکھتے تھے۔ آخر آخر میں بیرم خاں کے تراہے کے قریب ایک لوٹی سی دکان لے کر بیٹھ گئے تھے۔ پتنگیں بناتے اور پیٹ پالتے۔

غضب کے توتلے تھے۔ "ت" کو "ٹ" بولتے۔ زندہ دل اور فقرے باز تھے۔ سیر سپاٹے کے دلدادہ، ذرا رُت بدلی اور اُنھیں دُور کی سُوجھی۔ برسات کا چھینٹا پڑا اور انھوں نے قطب کی راہ لی۔ کسی کھنڈر کے ایک در میں مرزا بھی اپنی گڈیاں لگا کر بیٹھ جاتے۔ کانپ ٹھاٹے چاقو سے چھیلتے رہتے اور انھیں جھکا جھکا کر دیکھتے رہتے۔ دمڑ چل، دھیل چل، پٹیّل، پری، بھبڑیا، ل دمّا، کل دُما، بیسیوں قسم کی گڈیاں ان کے پاس تیار رہتیں۔ برکھا رُت ساری قطب ہی میں گزارتے۔

مرزا کی وجہ تسمیہ بھی عجیب ہے۔ مرزا بڑے چاؤ اور ارمانوں کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ ان کی امّاں نے منّت مانی تھی کہ جب میرا بچہ بڑا ہوگا تو قطب صاحب کی درگاہ پر اس کے ہاتھ سے حلوہ اور چپاتیاں بٹواؤں گی۔ بارھویں برس ان کی منّت بڑھائی گئی تو مرزا نے چپاتیاں بانٹنی شروع کیں۔ لینے والے "مرزا چپاتی"، "مرزا چپاتی" کہہ کہہ کر چپاتیاں مانگتے تھے۔ اُسی دن سے مرزا کا نام مرزا چپاتی مشہور ہو گیا۔

مرزا صاحب اپنی خوش گفتاری کی وجہ سے ہر دلعزیز تھے۔ اپنے خاندانی وقار کی وجہ سے اُمرا میں بُلائے جاتے تھے۔ شعر بہت اچھا کہتے تھے اس لئے مشاعروں میں بلاوُ ہوتی۔ تُتلا کر پڑھتے تو لوگ اور بھی محظوظ ہوتے۔ ان کے اکثر اشعار دلّی والوں کو ازبر ہو گئے تھے۔ اس ایک شعر پر مرزا نے مشاعرہ اُڑا کر رکھ دیا ؎

بنائی شوٹ میں شدّاد نے پر یہ نہیں سمجھا
نہ میں جنّت کے قابل ہوں نہ جنّت میرے قابل ہے

ایک مسالمہ میں اُن کا یہ شعر بہت مشہور ہوا ؎

شمر نے عابد سے کہا بدلہ نہ لینا شمر سے
سر عابد کا ہو نہیں سکتا مرے سر کا جواب

اُن کے تین شعر اور یاد آ گئے ؎

صرّاف کسوٹی پہ گھسا کرتے ہیں زر کو — ہم وہ ہیں جو آنکھوں سے پرکھتے ہیں بشر کو
دل دل کے ہیں جو تیس عدد حرف بھی دو ہی — بے تکلّف سمجھ لیتے ہیں ہم زیر و زبر کو
ان چاروں کو جادوئے ستم دیکھا ہے تُر دو — اک حسن کو، آواز کو، دولت کو، ہنر کو

دِلّی کی دو ڈیرہ دار طوائفیں اب سے کوئی چالیس سال پہلے بہت مشہور تھیں۔ نام تو خبر نہیں ان کے کیا تھے دوتی اور چوتی کہلاتی تھیں۔ دلّی کے شہزادوں میں ایک بڑی دھوم دھام کی شادی ہوئی۔ اس میں دوتی جان کا مجرا تھا۔ جب مجرا جم گیا اور دوتی جان فرمائشی گانے سُنا چکیں تو انھوں نے اپنی پسند کے گانے سُنانے شروع کئے۔ مرزا چپاتی نے کہا، بائی جی ذرا ٹھہرنا۔ ایک شعر ہو گیا ہے، پہلے وہ سُن لو۔ محفل میں سنّاٹا ہو گیا۔ مرزا نے شعر پڑھا ؎

ڈھستے ڈھستے ہو ڈئی اتنی ملاٹ — سات پیسے کی ڈوڈی رہ ڈئی
(گھستے گھستے ہو گئی اتنی ملٹ — سات پیسے کی دوتی رہ گئی)

محفل میں ایک قہقہہ پڑا اور سب ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔ دوتی جان بڑی شگفتہ کی خاتون تھیں، ان کی تیوری پر ہلکا سا بل آیا مگر انھوں نے مجلس میں کشیدگی نہ ڈالنی چاہی۔ خود بھی ہنسنے لگیں اور بولیں "سبحان اللہ، مرزا صاحب۔ میں تو بیماری میں بالکل گھُٹ گئی تھی۔ اب بھی مجھ میں پوری سی جان کہاں آئی ہے۔ صاحب عالم نے یاد فرمایا تھا اس لئے حاضر ہو گئی"۔ صاحب خانہ نے کہا "بائی جی تم تو جانتی ہی ہو مرزا کی عادت شوخی کی ہے۔ ہاں، آپ سنائیے کیا سُنا رہی تھیں"۔ اور گانا پھر شروع ہو گیا۔

مرزا بڑے لاڈ پیار میں پلے اس لئے کورے جاہل رہے۔ مگر ان کی گفتگو سے جہالت ظاہر نہ ہوتی تھی۔ لمبی عمر پائی۔ آخری وقت اچھا نہ گزرا۔ عسرت و تنگدستی میں مرے۔

(چند علمی و ادبی شخصیتیں)

لکھنؤ کا ایک دَور

شوکت تھانوی

"خدا آباد رکھے لکھنؤ کو پھر غنیمت ہے"۔ یہ مصرع جب سے کہا گیا ہے اس وقت سے لکھنؤ کے ہر دَور میں دُہرایا گیا ہے۔ کم سے کم اس وقت تک تو ضرور دُہرایا جاتا تھا جب تک میں وہاں تھا معلوم نہیں اب بھی دُہرایا جاتا ہے یا نہیں۔ بہرحال جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے نہ صرف اس مصرع کی آئے دن تکرار سُنی ہے بلکہ میں خود بھی اس مصرع کی صداقت کا قائل تھا۔ ہر چند کہ میں نے وہ لکھنؤ تو نہیں دیکھا جو انیس کا لکھنؤ تھا نہ میں وہ لکھنؤ دیکھ سکا جو مرزا محمد ہادی رسوا کا لکھنؤ تھا بلکہ منشی سجاد حسین کے زمانے کے لکھنؤ میں بھی میرا وہ بچپن گزرا ہے جس کے نقوش اس قدر دھندلے ہیں کہ ان کو معتبر نہیں کہا جا سکتا۔ مگر ہوش کی آنکھیں کھول کر جو لکھنؤ میں نے دیکھا ہے وہ واقعی غنیمت تھا اور اس قابل تھا کہ اس کے آباد رہنے کی دعائیں مانگی جائیں یہ دوسری بات ہے کہ میری دوسری دعاؤں کی طرح یہ دُعا بھی لکھنؤ کو بددُعا ہو کر لگی اور لکھنؤ نے میرے سامنے ہی اس تیزی سے اُجڑنا شروع کیا کہ واقعی یہ خطرہ اُسی وقت پیدا ہو گیا تھا آخر کب تک "پھر غنیمت ہے" کہا جا سکے گا۔ مگر شکر ہے کہ تقسیم ملک سے بھی دو سال قبل مجھ کو وہ لکھنؤ چھوڑ دینا پڑا جو اُجڑتے اُجڑتے بھی ایسا ضرور تھا کہ اُس کو اس انحطاط کے باوجود "پھر غنیمت ہے" کہا جا سکتا تھا اور اس کے آباد رہنے کی دعائیں مانگی جا سکتی تھیں۔

بہرصورت لکھنؤ کے جس دَور کا میں ذکر کر رہا ہوں اُس دَور میں ایسے ایسے صاحبانِ کمال لکھنؤ میں جمع ہو گئے تھے جن کے دیکھنے کو اب آنکھیں ترستی تھیں۔ اگر ان سے تعارف کرانے کے لئے میں یہ طریقہ اختیار کروں کہ خود ایک سیاح کی طرح لکھنؤ کے ریلوے اسٹیشن پہ اُتروں اور پھر شہر میں داخل ہو کر اس ترتیب سے لکھنؤ کی علمی ادبی شخصیتوں سے ملتا چلوں جو راستے میں ملتی جائیں تو اس ترتیب کے اعتبار سے لکھنؤ سے لاٹوش روڈ پر ہوتے ہوئے میں شہر میں داخل ہونا چاہتا ہوں۔ اسٹیشن سے تھوڑی ہی دُور چل کر غازی الدین حیدر کی نہر عبور کر کے ایک زرد عمارت پر ایک بہت بڑا بورڈ آویزاں نظر آتا ہے جس پر لکھا ہے "روزنامہ ہمدم" اس اخبار کے دفتر میں داخل ہوتے ہی داہنے ہاتھ کے ایک کمرے میں ایک لمبی سی میز کے دونوں طرف تین چار اخبار نویس اپنے کام میں مصروف نظر آتے ہیں اور سامنے کی میز پر ایک معمر بزرگ بیک وقت حقّے کی نے بھی منہ میں لگائے ہوئے ہیں اور سُلگتا ہوا سگریٹ بھی ہاتھ کی چوتھی اور پانچویں انگلی کے درمیان پھنسا ہوا ہے۔ وہ لکھنے میں اس طرح مصروف ہیں کہ جیسے دُنیا و مافیہا کی خبر نہیں۔ عجیب اُجاڑ سی صورت ہے سر پر ترکی ٹوپی، ٹوپی سے نکلے ہوئے سفید بال، شیروانی کے

نوٹبنوں میں سے دو بند ہیں اور سات کھُلے ہوئے ہیں۔ داڑھی سے زلفِ پریشاں کا کام لیا جا رہا ہے۔ اگر وہ ہاتھ جنبش میں نہ ہو جس میں قلم ہے تو معلوم ہو کہ کسی نے عمر خیام کا ماڈل بنانے کی ادھوری کوشش کی ہے یہ ہیں :۔

سیّد جالب دہلوی

اُردو کے مشہور و معروف اخبار نویس۔ جیتی جاگتی انسائیکلو پیڈیا۔ آپ لاکھ اجنبی بن کر جائیں مگر جہاں آپ نے اپنا نام بتایا اور والد کا نام سُنایا آپ کے متعلق باقی حالات وہ آپ کو سُنانا شروع کر دیتے تھے کہ آپ کے دادا اس سنہ میں ہجرت کر کے افغانستان کے راستے پشاور تشریف لائے، اتنے دن تک خشک میووں کی تجارت کی اور اس تجارت میں اتنا کمایا۔ پھر خشک میووں کی تجارت پر ایک سیر حاصل تقریر کریں گے۔ میووں کے باغات کو اگر موضوعِ سخن بنا لیا ہے تو سمجھاتے چلے جائیں گے کہ پالیز کس طرح بناتے ہیں اور ان میں کاریزوں کے ذریعے کس طرح پانی پہنچاتے ہیں، ان زمین دوز نہروں کے پانی کا مزہ کیسا ہوتا ہے، ان کا پانی کس قسم کے امراض پیدا کرتا ہے اور اُن امراض کے لئے کون کون سی دوائیں مفید ہیں پھر اُن دواؤں سے جو مزید امراض پیدا ہوتے ہیں ان کا کیا علاج ہے۔ اگر آپ نے گھبرا کر ان کی توجہ خود ان ہی کے حقّے کی طرف مبذول کرا دی کہ "سید صاحب حقہ جل بُجھا ہے شاید" تو اب وہ حقّے کے موضوع پر ایسی بحث کریں گے کہ حقّے کی تمام تاریخ آپ کے سامنے آجائے گی کہ کب یہ ایجاد ہُوا، کن کن ممالک میں کس کس قسم کا حقّہ پایا جاتا ہے عظیم اللہ خانی حُقّہ کیا چیز ہے، پیچوان، گڑگڑی، ناریل، ہشتک یہ سب کیا ہیں، لکھنؤ نے حُقّے کے معاملے میں کن تکلّفات سے کام لیا ہے، ہر دم تازہ حقّے کی کونسی قسم ہے۔ مختصر یہ کہ اگر آپ اُسی وقت حقّے پر ایک تھیسس لکھ دیں تو ڈاکٹریٹ کہیں نہیں گئی۔ اور ایک حقّے پر کیا منحصر ہے کسی موضوع پر بات کر لیجئے انشاء اللہ بات کریں گے۔ بات کی جڑ بتا نکلنے اور بات کی پھننگی تک بحث کرتے چلے جائیں گے۔ مثلاً چھیڑ دیجئے حلوہ سوہن کا ذکر بس وہ شروع ہو جائیں گے کہ " جی ہاں خوب ہوتا ہے حلوہ سوہن مگر دراصل یہ مٹھائی نہیں ہے بلکہ حکماء نے اُمرا کو زیادہ سے زیادہ مقدار میں گھی کھلانے کا یہ طریقہ اختیار کیا تھا اور تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ حلوہ سوہن سب سے پہلے ناتا فرنویس کے لئے ان کے طبیب ہندی عبدالستار سرہندی نے بنایا تھا مگر وہ اس کو ترقی نہ دے سکے اور یہ نسخہ صرف بیاضِ سرہندی میں رہ گیا یہاں تک کہ حکیم الحکماء میر فضل اللہ سبزواری نے اس نسخے کو حاصل کیا اور کئی امرا پر آزمایا اور دماغ کی خشکی اور ضعف کی کمی کے لئے یہ بہترین نسخہ ثابت ہُوا۔ پھر اس میں ترمیمیں کی گئیں اور آخری صورت یہ ہوئی کہ شہد کی مکھیوں کے چھتّے کی طرح کی ایک چیز بنائی جاتی تھی جس کے سوراخوں میں گھی ہوتا تھا اور اس میں ایسے اجزا بھی ہوتے تھے کہ یہ گھی نقصان نہ پہنچا سکے اور معدہ اس کو قبول کرے۔ سینہ بہ سینہ یہ نسخہ دلّی کے رحمت علی حلوائی تک پہنچا اور ان کے خاندان نے حلوہ سوہن کو اتنی ترقی دی کہ ملکہ وکٹوریہ اس ہندوستانی تحفے کو کرسمس کا بہترین تحفہ کہا کرتی تھیں "۔ غرض تو کیا کہ کیا حُقّہ اور کیا حلوہ سوہن، ان کو تو اپنی معلومات کے اظہار کے لئے ایک موضوع چاہئیے ہوتا تھا وہ حقّہ نہ سہی حلوہ سوہن سہی۔ حلوہ سوہن نہ سہی، اجنتا کے غار سہی۔ جو موضوع چھڑ جائے جالب صاحب اس پر گھنٹوں بول سکتے تھے خواہ وہ جنگِ بلقان سے متعلق ہو، یا سائمن کمیشن سے متعلق۔ وہ زر دوزی کا قصّہ ہو یا نقب زنی کا، ان کو اپنی معلومات کے خزانے لُٹانے سے مطلب۔ افیون سے شوق فرماتے تھے اور پُرانی کتابیں جمع کرنے کے افیون سے زیادہ رسیا تھے۔ دعوتوں کی شرکت عبادت کی طرح فرض سمجھتے تھے اور یہ حق اسٹاف کے کسی ممبر کو کبھی نہ دیتے تھے۔ روزنامہ ہمدم ہی کے زمانے میں بڑے بڑے شاگرد پیدا کئے۔ سیاست والے سیّد حبیب، چودھری رحم علی ہاشمی، قاضی محمد حامد حسرت، انیس احمد عباسی اور نہ جانے کون کون۔ نام تھا بشارت علی مگر مشہور ہوئے جالب دہلوی کے نام سے۔ یہ پتہ نہ چل سکا کہ جالب صاحب نے اپنے اس تخلّص سے بھی کبھی کام لیا یا نہیں، بہرحال جالب صاحب کا کوئی شعر کبھی نہیں سُنا۔ جالب صاحب ہمدم سے دست بردار ہو کر اپنے ذاتی اخبار روزنامہ ہمّت کے مالک اور مدیر بن گئے مگر وقت پُورا ہو چکا تھا۔ عمر نے وفا نہ کی۔ جالب صاحب سے رخصت ہو کر

لاٹوش روڈ پر آگے بڑھیے تو لاٹوش روڈ ہی سے ایک گلی قندھاری لین کے نام سے نکلتی ہے اور لکھنؤ کی مشہور انجمن ایک آنہ فنڈ کو جاتی ہے بلکہ اسی گلی سے ایک چھوٹی سی گلی اور پھوٹتی ہے جس کا نام ہے ایک آنہ فنڈ لین۔ اس گلی میں لکھنؤ کے ایک نہایت قابلِ ذکر بزرگ رہتے ہیں

قدیر لکھنوی

جی ہاں اب تو یقیناً قدیر صاحب بزرگ ہو چکے ہیں ورنہ لکھنؤ کے بزرگ شعرا کی بزرگی سے گھبرا کر جن نوجوان شاعروں نے ینگ پارٹی کے نام سے اپنی علیحدہ تنظیم کی تھی، اُن باغی نوجوانوں میں قدیر لکھنوی، سراج لکھنوی کے نام سرِفہرست تھے۔ لکھنؤ کی مشہور انجمن شعر و سخن معین الادب سے یہ حضرات علیحدہ ہو گئے تھے اور بہارِ ادب کے نام سے اپنی علیحدہ انجمن بنالی تھی۔ اور آخرکار بہارِ ادب ہی میں سب سمٹ آئے تھے۔ قدیر لکھنوی غزل کے شاعر ہیں۔ اور بہت اچھے غزل گو۔ اپنے زمانے میں پڑھتے بھی خوب تھے اور ہر غزل میں کسی نہ کسی طرح 'موسیٰ' اور 'طور' کا ذکر لے ہی آتے تھے۔ یہ مضمون انھوں نے ایسا اپنایا کہ کیا کسی یہودی نے اپنایا ہوگا۔ مشاعروں میں ان کو ہمیشہ نہایت ذمہ دار حیثیت حاصل ہوتی تھی اور جب انجمن بہارِ ادب کے سکریٹری مقرر ہوئے پھر تو ذمہ داری ہی ذمہ داری تھی۔ سراج اور قدیر کا اتحاد اسی طرح ضرب المثل کی حیثیت رکھتا تھا جیسے نور الٰہی محمد عمر کا اتحاد یا اصغر علی محمد علی تاجرانِ عطر کا اتحاد۔ قدیر لکھنوی سے مل کر ہر شخص ان کی تواضع اور ان کے اخلاق کا گرویدہ ہو جاتا تھا اور وہ نہایت وضعداری کے ساتھ دوستی نباہنے کی پوری کوشش کرتے تھے۔ اب نہ جانے کیا حال ہے اور اب بھی غزل کہہ رہے ہیں یا لکھنؤ کا مرثیہ۔ قدیر صاحب سے رخصت ہو کر لاٹوش روڈ ہی سے موتی لال بوس روڈ پر مڑ جائیے اور نئے گاؤں کا رُخ کیجیے تو گنگ صاحب کے اسپتال کے پاس ہی نگار کا دفتر ہے یہاں

مولانا نیاز فتحپوری

سے ملاقات ہو سکتی ہے۔ صاحبِ طرز انشا پردازوں میں نیاز صاحب کا نام سب سے پہلے ذہن میں آتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ نیاز صاحب نے افسانوی ادب میں اضافہ کرنے کے بجائے ایک دم نہ مذہبیات سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ اور پھر مذہب سے ایسی کھلم کھلا بغاوت فرمائی کہ بہت سے ہنگامے بھی ہوئے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی سے نہایت زبردست رن پڑا اور خاصی بدمزگی پیدا ہوئی۔ تجربہ تو جو کچھ ہوا اُس سے یہاں بحث نہیں مگر اصل نیاز، شہاب کی سرگزشت اور کیوپڈ اور سائیکی والے نیاز کو اس رنگ میں دیکھ کر کم سے کم مجھے کبھی خوشی نہیں ہوئی۔ مولانا نیاز فتحپوری کے علم و فضل سے انکار نہیں، ان کی ذہانت کا بھی میں قائل ہوں، میرا اکثر جی بھی چاہا ہے کہ اُن سے محبت کروں مگر اُن سے ڈر ہی لگتا ہے۔ وہ جس قدر دلچسپ اور محبوب شخصیت ہیں، اسی قدر کھرے اور سپاٹ بھی بن جاتے ہیں اور بعض اوقات تو اس قدر کاروباری آدمی نظر آتے ہیں کہ وحشت ہونے لگتی ہے۔ وہ جو جذبے ہر دہ سے اعتبارات ہیں، مثلاً مروّت، ایثار، دوست نوازی وغیرہ نیاز صاحب ان لغویات کے بس اسی حد تک قائل ہیں کہ ان سے خود ان کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ بہرحال یہ بھی ایک اصول ہے اور اگر کوئی شخص اپنے کو یہ کہہ کر سمجھا سکے کہ ان کی ان باتوں سے ہم کو کیا مطلب تو اس کو نیاز صاحب نہایت خوشگوار دوست ثابت ہوں گے یعنی اگر ان کی ناگواریاں نظرانداز کر دیجیے تو وہ واقعی خوشگوار ہیں۔ نیاز صاحب کے گھر میں پہلے وصل صاحب بلگرامی بھی رہتے تھے مگر اب ان سے ملاقات یہاں نہ ہوگی۔ بہرحال نیاز صاحب کے گھر سے چل کر پھر لاٹوش روڈ پر آ جائیے اور اُس چڑھائی پر چڑھ جائیے جو تکیہ گھامی کی طرف جاتی ہے یہاں

حامد اللہ افسر میرٹھی

رہتے ہیں۔ پروفیسر حامد اللہ افسر جو ایک زمانے میں اپنے نام کے ساتھ بی۔ اے لکھا کرتے تھے مگر جب سے بی۔ اے کے طالب علموں کو پڑھانا شروع کیا ہے

لکھنا چھوڑ دیا ہے۔ بچوں کے نہایت کامیاب شاعر ہیں اور مشاعرے کے شاعر قطعاً نہیں، اس لئے کہ نہایت ہولناک انداز سے پڑھتے ہیں البتہ وہی نظم یا غزل اگر وہ خود نہ سنائیں تو پڑھ کر پڑھنے والے کو زیادہ لطف آتا ہے۔ نہایت محتاط قسم کے لئے دیئے سے آدمی ہیں اور ایک حد تک الگ تھلگ سے رہتے ہیں۔ نہ کسی ہنگامے میں کبھی حصّہ لیا نہ کسی سے اتنی دوستی بڑھائی کہ دشمنی کا خطرہ پیدا ہو۔ نہ کسی کو ان سے خواہ مخواہ کی کوئی توقع ہوتی ہے، نہ وہ کبھی خلافِ توقع ثابت ہوتے ہیں۔ کالج جاتے ہیں۔ گھر آجاتے ہیں۔ کوئی مل گیا تو ہنس بول لئے ورنہ اپنے کام سے کام۔ ادبی خدمات سے ایک زمانے میں کافی کمایا اور جو کمایا وہ لٹایا نہیں بلکہ سلامت روی سے چلتے رہے۔ ان سے رسالوں میں ملاقات کا امکان زیادہ ہے۔ یوں ملاقات ذرا کم ہی ہوتی ہے اور ہو بھی جائے تو بہت مختصر اور سرسری۔ لہٰذا ان سے سرسری ملاقات کر کے نظیر آباد سے ہوتے ہوئے قیصر باغ چلئے اور

مولانا وصّل بلگرامی

سے ملاقات کیجئے۔ سُرخ و سفید معمّر بزرگ، چہرے پر نورانی داڑھی اور مُنہ میں نقلی دانت۔ اسم مبارک ہے مقبول حسین مگر مشہور ہیں وصّل بلگرامی کے نام سے۔ وصّل صاحب کے تخلص کا جو پول مولانا نیاز فتحپوری کی بیگم صاحبہ مرحومہ نے کھولا تھا ہمیشہ یاد رہے گا۔ نیاز صاحب کو ایک مرتبہ اچانک یہ خیال آیا کہ وصّل صاحب کو ہر ایک وصّل یا وصّل بلگرامی کہتا ہے مگر بیگم صاحبہ مقبول حسین کہتی ہیں چنانچہ انھوں نے پوچھا کہ یہ آخر مقبول حسین کہنے کا کیا تُک ہے، وصل کیوں نہیں کہتی ہو۔ تو بیگم صاحبہ نے بڑی سادگی سے کہا: "تو کیا میں بھی گالی بکوں"۔

وصّل صاحب اپنے زمانے کی نہایت ہنگامہ پرور شخصیت گذرے ہیں۔ ان کے افسانے اگر دہرائے جائیں تو بھی ایک داستان، امیر حمزہ کی داستان کو آئینہ دکھا دے۔ مختصر یہ ہے کہ وصّل صاحب کے نزدیک دُنیا کی کوئی بات ناممکن نہ تھی بلکہ وہ لفظ ناممکن کو نہایت بے معنی لفظ سمجھتے تھے اور اپنے کارناموں سے واقعی یہ ثابت کر دکھایا تھا کہ ان کے لئے دُنیا کی کوئی بات ناممکن نہیں ہے۔ میں اکثر ان کا امتحان لیتا رہتا تھا۔ ان کے اکثر کمالات پر مختلف مضامین میں روشنی بھی ڈال چکا ہوں اس وقت ان کا ایک کارنامہ یاد آ رہا ہے۔ بیان کئے ہوئے واقعات کو دہرانے کے بجائے یہی کارنامہ پیش کئے دیتا ہوں۔

رائے بریلی میں مشاعرہ تھا جس میں لکھنؤ کے بہت سے شعرا شرکت کے لئے گئے ہوئے تھے۔ یہ مشاعرہ ساری رات ہوتا رہا اور صبح اس وقت ختم ہوا کہ رائے بریلی سے لکھنؤ جانے والی ٹرین ہم کو مشکل مل سکی۔ جس وقت ہم تار پھاند کر پلیٹ فارم پر پہنچے ہیں ٹرین رینگ رہی تھی لہٰذا ٹکٹ لینے کا موقع ہی نہ مل سکا اور جو ڈبہ سامنے آگیا اُسی میں سب سما گئے۔ ٹراولنگ ٹکٹ کلکٹر نے بھانپ لیا کہ یہ بے ٹکٹ کے مسافر ہیں، لہٰذا ہم لوگوں کے ساتھ ہی وہ حضرت بھی اسی ڈبے میں آگئے۔ سب سے پہلے امین سلونوی صاحب سے ٹکٹ مانگا۔ انھوں نے وصّل صاحب کی طرف اشارہ کر دیا۔ مجھ سے ٹکٹ مانگا میں نے بھی یہی کیا۔ پھر تو سراج، قدیر، مولانا آسی، مولانا امید سب ہی نے وصّل صاحب کی طرف اشارہ کیا، یہاں تک کہ ٹکٹ کلکٹر صاحب وصل صاحب کے پاس پہنچ گئے جو انتظاماً اس وقت اونگھ رہے تھے چنانچہ ٹکٹ کلکٹر نے ان کا شانہ ہلا کر سب کے ٹکٹ مانگے۔ وصل صاحب نے گویا چونک کر پہلے تو ایک منٹ تک محض اُن حضرت کو غور سے دیکھا۔ پھر نہایت شفقت سے ایک طمانچہ اُن کے رخسار پر مار کر کہا: "کتنا لمبا ہو گیا ہے تو اچھا خاصا قد آدم"۔

اور پھر ہم سب سے مخاطب ہو کر بولے: "یہ صاحبزادے اتنے سے تھے اور دن بھر ٹنگے رہتے تھے میری گود میں۔ مگر صاحب ایسا بدمعاش تھا یہ کہ جہاں آکر بیٹھا گود میں اور میرے نمازی کپڑے اس نے ناپاک کئے۔ پیشاب کرنے کی سب سے مناسب جگہ گویا میری گود تھی ان کے لئے۔ اسی لئے میں اس کی کوشش کرتا تھا اور ایک اس پر کیا ہے۔ ان کے باواجان سے زندگی بھر کے مراسم، ساتھ اٹھنا ساتھ بیٹھنا، مگر قسم لے لیجئے جو میں ان کا نام بھی جانتا

ہوں ہمیشہ ان کو چغد کہا اور یہی ان کا نام پڑ گیا تھا۔"

پھر ان حضرت سے مخاطب ہو کر کہا "ہیں کہاں آجکل ہمارے چغد بھائی؟"

اس بیچارے نے نہایت سعادتمندی سے کہا "جی ان کا تو دو سال ہوئے انتقال بھی ہو گیا۔"

لیجئے وصل صاحب نے واقعی آنسوؤں سے رونا شروع کر دیا۔ ان کے کارنامے، ان کی وضعداری کے قصے، ان کی دولت نوازی کی داستانیں سنا رہے ہیں اور رو رہے ہیں۔ باتوں ہی باتوں میں یہ بھی پوچھ لیا کہ مرزا پور میں انتقال ہوا ہے پھر کیا تھا اپنے اور مرحوم کے مرزا پور کے قصے سنانا شروع کر دیئے۔ اس بیچارے نے حیرت سے کہا "مگر وہ تو مرزا پور اپنی زندگی کے آخری دنوں میں گئے تھے۔"

وصل صاحب نے اس کو ڈانٹ دیا کہ "تم کو کیا معلوم اپنی والدہ سے پوچھنا کہ جب مرحوم ان کو طلاق دینے والے تھے اس وقت میری اور ان کی مرزا پور میں کیسی جنگ ہوئی ہے۔ کہہ دینا اپنی ماں سے کہ مقبول چچا ملے تھے۔"

نتیجہ یہ کہ جب باقاعدہ چچا بن گئے تو اس سے برسبیل تذکرہ یہ بھی کہہ دیا کہ "بیٹے وہ بات یہ ہوئی کہ ہم میں سے کوئی بھی ٹکٹ نہیں لے سکا۔ گاڑی چل چکی تھی لہٰذا مجبور ہو گئے۔ حد یہ ہے کہ چائے تک نہیں پی۔"

اس نے کہا "لاحول ولا قوۃ۔ بھلا کوئی بات بھی ہو۔ ٹکٹ نہیں لیا تو کیا ہوا میں جو حاضر ہوں۔"

اور لکھنؤ کے اسٹیشن پر پہنچکر اب وہ سعادت آثار مصر ہیں کہ چچا پہلے ریسٹوران چل کر آپ سب چائے پی لیں۔ چنانچہ سب کو اس غریب نے چائے پلائی اور ریسٹوران ہی کے راستے باہر نکال دیا۔ غالباً یہ بتانے کی اب ضرورت نہیں کہ وصل صاحب کے یہ تو تصنیف بھتیجے اس کے بعد سے زندگی بھر بھتیجے رہے۔ لذیذ حکایت اگر طویل ہو جائے تو بھی مزہ دے جاتی ہے۔ لگے ہاتھوں ان کا ایک قصہ اور ملاحظہ فرمایئے۔

وصل صاحب کے ساتھ میں شریک سفر ہوں۔ رفیع احمد خاں مرحوم بھی ہیں اور جوش ملیح آبادی بھی۔ اسی ڈبے میں ایک نوجوان صاحبزادے اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ سفر کر رہے ہیں اور یہ ارمان انگیز جوڑا سب کے سامنے بے تکلفی میں مصروف ہے کبھی دلہن صاحبہ ایک ادائے خاص کے ساتھ دولہا کے شانے پر سر رکھ دیتی ہیں کبھی دولہا میاں اپنی دلہن کے دست ناز پیرا کو اپنے ہاتھ میں لے کر دباتے ہیں اور کبھی دونوں تقریباً لپٹ جاتے ہیں۔ وصل صاحب سامنے کی برتھ پر بیٹھے ہوئے وظیفہ پڑھ رہے ہیں کہ یکایک انھوں نے تسبیح رکھی اور لپک کر اس لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر کھڑے ہو گئے کہ "تم کو جو کچھ انھوں نے دیا ہے اس سے زیادہ رقم ہم دینے کو تیار ہیں اب ادھر آؤ۔"

پیروں تلے کی زمین نکل گئی کہ وصل صاحب کو یہ کیا سوجھی۔ وہ نوجوان جوش میں کھڑا ہو گیا کہ "مطلب کیا ہے تمہارا۔ تم نے میری بیوی کا ہاتھ کیسے پکڑا۔"

ادھر وصل صاحب نے اس سے بھی زیادہ کڑک دار آواز سے کہا "بکتے ہو تم۔ یہ بیوی ہو ہی نہیں سکتی۔ بیوی ہوتی تو یہ بے تکلفی تم گھر جا کر کرتے۔ سر راہ مجمع عام میں یہ بے تکلفی اسی کے ساتھ ہو سکتی ہے جو بیوی نہ ہو۔"

اور پھر اس نوجوان کو ڈانٹا "صاحبزادے مجھ کو معلوم ہے کہ یہ تمہاری بیوی ہے اور مجھ کو یہ بھی معلوم ہے کہ تم ایک شریف باپ کے بیٹے ہو مگر اتنی دیر سے جو حرکتیں تم کر رہے ہو وہ ہرگز شریفانہ نہیں ہیں۔ میں نے تم کو ایک سبق دینے کے لئے یہ حرکت کی ہے۔ اور اب میں تمہارے باپ سے بھی مل کر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ان کی خاندانی شرافت تم سر راہ کس طرح لٹاتے پھرتے ہو۔ ڈوب مرو تم ننگ خاندان۔"

اور ہم سب نے دیکھا کہ واقعی وہ نوجوان ڈوب مرنے کو تیار تھا۔ وصل صاحب جب کافی ڈانٹ چکے تو اس نے ندامت سے صرف یہ کہا کہ "آپ نے مجھ کو زندگی بھر کے لئے ایک ایسا سبق دیا ہے کہ اب میں کبھی نہ بھول سکوں گا۔"

اس کے جواب میں وصل صاحب نے اس کو گلے سے لگایا۔ دلہن کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر وظیفہ پڑھنے لگے۔

وصّل صاحب تو مرگئے۔ مگر کیا ایسے آدمی بار بار پیدا ہوتے ہیں۔ وصّل صاحب کا قصہ خواہ کتنا ہی طول کھینچے اس کو ادھورا ہی چھوڑنا پڑتا ہے آپ بھی اس قصے کو ادھورا چھوڑ دیجئے اور اسی قیصر باغ میں وصّل صاحب کے گھر سے دس پانچ قدم آگے بڑھ کر

سیّد آلِ رضا

سے ملئے۔ اگر مولانا عبدالحلیم شرر نے اپنی کتاب کا نام "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" نہ رکھا ہوتا تو سیّد آل رضا کو مشرقی تمدن کا آخری نمونہ کہتا۔ صرف شکل و صورت ہی کے نہیں سیرت اور طینت کے بھی حسین، چہرے پر خاندانی شرافت کا نور، مزاج میں تکلفاً نہیں بلکہ واقعی انکسار، شخصیت میں اس بلا کی جاذبیت کہ جو ایک مرتبہ ملا اُس نے ہمیشہ دم بھرا، شائستگی اور نفاست کا معیاری پیکر۔ میں جب سب سے پہلے سیّد آل رضا سے ملا ہوں وہ قیصر باغ میں نہیں بلکہ نعمت اللہ روڈ پر رہتے تھے اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس خلوص اور یگانگت کے ساتھ سیّد صاحب ملے تھے کہ مجھے یہ شبہ بھی نہ ہو سکا کہ میں ان سے پہلی مرتبہ مل رہا ہوں ان سے مل کر مجھ کو بڑی تقویت حاصل ہوئی تھی کہ میں آج ایک ایسے انسان سے ملا ہوں جس پر پورا بھروسہ کیا جا سکتا ہے معلوم نہیں کیوں؟ یہ ملاقات رسمی ملاقات نہیں معلوم ہوئی بلکہ یگانگت کا دل کو جیسے یقین سا ہو گیا۔ اور اس کے بعد میں ہمیشہ سیّد آل رضا سے اس طرح ملتا رہا کہ میرا دل چاہتا تھا کہ ان سے محبت کروں۔ محبت کو احترام کا رنگ دوں اور ان کی زیادہ سے زیادہ توجہ حاصل کروں۔ ان کا کلام پڑھا، ان کو مشاعروں میں سُنا اور ان کی شاعری کے متعلق ہمیشہ یہی رائے رہی کہ یہ شاعری ان کے دل کا چور ہے۔ وہ اپنے شعر میں مجھ کو ہمیشہ چوٹ کھائے ہوئے محسوس ہوئے مگر یہ پتہ نہ چل سکا کہ یہ چوٹ کب کھائی ہے اور کہاں کھائی ہے۔ رفتہ رفتہ ان کی رعنائیوں پر مذہبی **رنگ غالب** آتا چلا گیا اور دوستوں والے آلِ رضا، اللہ والے آل رضا بن کر رہ گئے۔ بہرحال وہ بھی لکھنؤ کے ان لٹیروں میں سے ہیں جو لکھنؤ کی چہل پہل لوٹ کر پاکستان آگئے اور اب کراچی میں ہیں۔

قیصر باغ سے پھر امین آباد کا رُخ کیجئے تاکہ گوٹن روڈ پر آپ کو اس بدنام شاعر سے ملایا جا سکے جس کا کوئی تخلّص نہیں ہے، جس کا کوئی دیوان نہیں ہے، جس کا کوئی شعر چھپ نہیں سکتا مگر جس کے اشعار سینہ بہ سینہ جانے کہاں تک پہنچ چکے ہیں۔ ع

یہ ذکر اب کارواں در کارواں ہے

جی ہاں کارواں در کارواں۔ یہ وہی شاعر تو ہے جس کے متعلق شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے کہا تھا کہ خیریت ہوئی کہ یہ حضرت اس رنگ میں شعر کہتے ہیں، ورنہ سنجیدگی سے شعر کی طرف توجہ فرماتے تو بہت سے شاعروں کا پتہ نہ چلتا کہ کیا ہوئے۔ یہ ہیں

رفیع احمد خاں

وہ ذہین ترین انسان جس کی ذہانت کی داد "لاحول ولا قوۃ" سے دی جاتی ہے۔ جس کا کلام سُن کر ثقہ قسم کے لوگ عجیب گو مگو مشکل وگرنہ گویم مشکل میں مبتلا ہو کر کہتے ہیں "استغفراللہ۔ مگر سبحان اللہ۔ کیا خوب کہا ہے"۔ فحاشی کو آرٹ بنا کر اس فحاشِ اعظم نے پیش کیا اور اپنے ساتھ ہی اس فن کو ختم کر دیا۔ صرف گالیاں نہیں بکی ہیں، بڑے بڑے مسائل اپنے اسی رنگ میں پیش کئے ہیں۔ سیاسی گتھیاں اسی رنگ میں سلجھائی ہیں۔ معاشی اور معاشرتی مسائل کو اسی رنگ میں حل کیا ہے اور بڑے بڑے ماہرینِ فنِ شعر سے کم سے کم اس بات کا لوہا منوا لیا ہے کہ جہاں تک شعر کا تعلق ہے نہایت پختہ کارانہ انداز سے ٹھُکا ہوا شعر کہتا ہے۔ اور اس رنگ میں جو انفرادیت اس کو حاصل ہوئی مشکل ہی سے کسی اور کو نصیب ہوئی ہو گی اور یہ اس کے کلام کا سحر ہے کہ نہ مشاعرے میں پڑھا گیا، نہ دیوان کی صورت میں آیا، نہ کہیں چھپا، مگر حافظوں میں محفوظ ہے۔

جہاں تک علم و فضل کا تعلق ہے انگریزی زبان کے چند فاضلوں میں سے ایک سمجھا جاتا تھا۔ اور شعری سلیقے کے لئے غالباً صرف یہ کہہ دینا کافی

ہوگا کہ آپکے شاعرِ انقلاب جن کو اب ہندوستان نے پدم بھوشنٹر بنا دیا ہے یعنی جوشؔ ملیح آبادی کو اپنے سب سے پہلے مجموعۂ نظم "روحِ ادب" کے لئے رفیع احمد خاں سے بہتر مقدمہ نگار نہ مل سکا تھا۔ رفیع احمد خاں نے بہت کہا اور بہت خوب کہا۔ مگر اپنی موت سے چند دن پہلے زندگی کی پہلی اور آخری ایک سنجیدہ غزل بھی کہہ ڈالی۔ میں نے یہ غزل سُنی تو مجھ کو سخت غصہ آیا اور میں نے رفیع احمد خاں سے بہت تلخی کے ساتھ کہا کہ آخر یہ گھاس کھودنے کی جناب کو کیا ضرورت پیش آئی۔ اب آپ گویا اس قابل رہ گئے ہیں کہ اپنے کو وبائے عام کے سپرد کر دیں۔ رفیع احمد خاں نے میرے اس احتجاج کی قدر کی اور بڑی بے چارگی کے ساتھ کہا کہ بخدا مجھے خود نہیں معلوم کہ کس شامت کے ماتحت یہ غزل ہو گئی ہے، اگر جب وہ میرے ساتھ رمی کھیلتے کھیلتے مر گئے اس وقت مجھ کو اندازہ ہوا کہ موت نے یہ غزل کہلوائی تھی بلکہ اس غزل میں موت ہی نے ان کو آواز دی تھی۔ اس غزل کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

اجل خدا کے واسطے بس اتنی مہلت اور دے
میں زندگی سے کہہ تو لوں کہ یہ ترا مآل ہے

رفیع احمد خاں کے گھر سے کلّن کی لاٹ ہوتے ہوئے کچّے احاطے میں

مولانا آسیؔ

سے ملنے چلئے۔ ایک چھوٹے سے بوسیدہ مکان میں ایک افیونی قسم کے بڑے میاں سے ایک صاحب بیٹھے ہوئے شطرنج کھیل رہے ہیں۔ ان صاحب کا بھی یہ عالم ہے کہ میلی قمیص پر اُجلا پاجامہ پہنے بیٹھے ہیں حالانکہ کل یہی بزرگ اُجلی قمیص پر میلا پاجامہ پہنے بیٹھے تھے۔ حقّہ لگا ہوا ہے۔ چند نوجوان بھی اِدھر اُدھر مونڈھوں پر تخت پر، چارپائی پر بیٹھے ہیں اور منتظر ہیں کہ شطرنج کی بازی ختم ہو۔ خود ان حضرت کو بھی بازی ختم کرنے کی جلدی ہے مگر مقابلہ جن بڑے میاں سے ہے وہ شطرنج کے مہروں کو بھی افیون چٹانے میں مصروف ہیں۔ معلوم نہیں یہ بڑے میاں کون ہیں مگر جو صاحب ان سے کھیل رہے ہیں ان کا اسم گرامی ہے مولانا عبدالباری آسیؔ۔ شارحِ غالب بھی ہیں اور مطبع نول کشور سے نہ جانے کتنی ایسی کتابیں مرتّب کر کے نکلوا چکے ہیں۔ جو ہمیشہ باقی رہیں گی۔ کلیاتِ میرؔ اس اہتمام سے چھپوائی ہے کہ سبحان اللہ۔ کلیاتِ نظیرؔ اکبرآبادی واقعی بے نظیر ہے۔ دیوانِ خواجہ میر دردؔ اس خوبصورتی سے چھپوایا ہے کہ اب تک یہ اہتمام نہ ہوا تھا۔ مختصر یہ کہ بے شمار ایسی ہی کتابیں آپ ہی کے اہتمام میں نولکشور کے مطبع سے نکل رہی ہیں اور آپ ہیں کہ کبھی آرگس کے فرضی نام سے غالبؔ کے خلاف ایک چونکا دینے والا مضمون لکھ دیتے ہیں کبھی یہ شوشہ چھوڑ دیتے ہیں کہ رباعیاتِ عمر خیام، عمر خیام کی تھیں ہی نہیں۔ کبھی کسی ہمعصر سے چوٹیں چل رہی ہیں کبھی شاگردوں کو اکھاڑے میں زور کرا رہے ہیں۔ ایک سے ایک عجیب الخلقت شاگرد موجود ہے اور مولانا اس کو مشاعرے میں چمکانے کے لئے غزل پہ غزل لکھ کر دے رہے ہیں۔ مشاعرہ ہے تو شاگردوں کو سمیٹے بیٹھے ہیں کہ آپ یہ مطلع لکھ لیجئے آپ یہ شعر لکھیئے۔ آپ یہ مصرع لگائیے۔ آپ کی غزل کا یہ مقطع ہوا اور وہ سب شاگرد مشاعرے میں مولانا کی غزلیں پڑھ پڑھ کر سلام کر رہے ہیں اور مولانا خوش ہیں کہ شاگرد چمک گیا۔ اس سے بحث نہیں کہ وہ کمبخت کبھی شاعر بن بھی سکے گا یا نہیں۔ اکثر یہ بھی ہوا ہے کہ دماغ کی بہترین کاوش تبرک بن کر شاگردوں میں بٹ گئی اور خود مولانا نہایت پھُسپھُسی غزل پڑھ کر آ گئے۔ مگر مولانا آسیؔ بھی نہ رہے یہ اکھاڑہ بھی ختم ہو گیا۔

مولانا آسیؔ کے گھر سے چل کر مولوی گنج کا راستہ پکڑ لیجئے۔ مولوی گنج کے چوراہے سے بائیں ہاتھ والی سڑک پر مڑ جائیے یہی راستہ اس گلی کو جاتا ہے جس میں

مولانا صفیؔ

رہتے ہیں۔ لکھنؤ کے نہایت قابلِ احترام شاعر۔ عزیزؔ لکھنوی کے استاد۔ حضرت آرزوؔ کے ہمعصر۔ وہ کیا بیٹھے ہیں اپنی چارپائی پر صرف ایک گاندھی بنے ہوئے۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ معلوم ہوتا ہے۔ نہ جانے کب سے بیمار ہیں حالانکہ بیمار نہیں بلکہ تندرستی ہی ایسی ہے۔ چاروں طرف کتابیں بکھری ہوئی ہیں اور خود ان کے درمیان اس چارپائی پر بیٹھے ہیں جس کے سرہانے بستر گول کیا ہوا رکھا ہے۔ حقّہ قریب ہی رکھا ہوا ہے اور صراحی اسٹول پر دھری ہے جس پر کٹورا اوندھا ہوا ہے۔ جس کا جی چاہے چلا جائے اور جب تک جی چاہے بیٹھ کر ان کا دماغ تناول فرماتا رہے نہ گھر کا دروازہ بند کریں گے نہ کسی آنے والے سے کبھی اپنی مصروفیت کا ذکر کریں گے اور یہ سلسلہ تقریباً دن بھر جاری رہے گا۔ ایک گیا تو دو اور آ گئے وہ اٹھے تو کوئی اور آ گیا البتہ بس دو قسم کے آنے والوں سے ذرا گھبراتے تھے ایک وہ جو کلام سننے آئیں دوسرے وہ جو کسی مشاعرے میں مدعو کرنا چاہیں۔ اور جب یہ اطمینان کر لیتے کہ آنے والا ان دونوں میں سے کسی کام سے نہیں آیا تو چہرے پر خوف کی جگہ اطمینان کی بشاشت نظر آنے لگتی پھر خواہ کوئی کتنی ہی دیر بیٹھے اور کتنا ہی ان کا وقت برباد کرے ان کو پروا نہ ہوتی۔ انجمن معین الادب اور بہار ادب کے سالانہ مشاعروں اور شیعہ کانفرنس کے ان اجلاسوں میں تو چلے جاتے تھے جن میں ان کو نظم پڑھنا ہوتی تھی اس کے علاوہ نہ کہیں اور جانے کو جی چاہتا تھا نہ صحت اجازت دیتی تھی پھر بھی آئے دن تقاضے اور اصرار ہوتے ہی رہتے تھے اور مولانا صفیؔ کبھی کبھی اپنی انتہائی مروّت کے باوجود چڑچڑے پن پر مجبور ہو جاتے تھے۔ مولانا صفیؔ کی شاعرانہ عظمت سے کسے انکار ہو سکتا ہے مگر میں ایک مرتبہ ان کی تصویر دیکھ کر سخت رنجیدہ ہوا جس میں وہ تمغے لگائے بیٹھے تھے۔ مجھ کو ان کی بلند شخصیت پر یہ تمغے کچھ بدنما داغ نظر آئے اور میں نے اپنی اس تکلیف کا ان سے اظہار بھی کر دیا۔ قصّہ یہ ہوا کہ میں اس زمانے میں شباب نامی ایک ماہنامے کا ایڈیٹر تھا اس میں مولانا پر ایک مضمون حضرت ماجد الہ آبادی نے لکھا تھا لہٰذا میں مولانا سے تصویر لینے گیا اور مولانا نے وہی تصویر دینا چاہی۔ مگر میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ یہ تمغے والی تصویر چھاپ کر میں اپنے اس اعتقاد کو مجروح نہ کروں گا جو مجھ کو آپ سے ہے یعنی اس تصویر کو آپ کے شایانِ شان نہیں سمجھتا۔ مولانا نے اس کے متعلق مجھ سے کوئی بحث نہیں کی بلکہ یہ عذر کر دیا کہ یہ تمغے مشاعروں کے نہیں بلکہ شیعہ کانفرنس کے ہیں۔ بہرحال چونکہ اس وقت اور کوئی تصویر موجود نہیں، لہٰذا آپ فوٹوگرافر کو لے آئیں اور اپنی مرضی کی تصویر کھنچوا لیں۔ چنانچہ مجھ کو یہی کرنا پڑا۔ مولانا صفیؔ کے مکان کے قریب ہی ان کے برادرِ عزیز سیّد مقبول حسین ظریفؔ لکھنوی کا بھی مکان ہے۔ ان سے بھی ملتے چلیں۔ آہنی پھاٹک کے اندر میدان میں کرسی ڈالے جو بزرگ اپنی بڑی بڑی مونچھوں کے بالوں کا خود ہی جائزہ لے رہے ہیں اور قینچی سے ان بالوں کو بغیر آئینے کی مدد کے برابر کرنے جا رہے ہیں یہی ہیں

ظریفؔ لکھنوی

جن کو اردو کی مزاحیہ شاعری میں بہت ہی بلند مقام حاصل ہے۔ ظریفؔ لکھنوی کی شہرت اودھ پنچ سے شروع ہوئی اور مشاعروں سے اُمنڈ کر تمام دنیائے اردو پر چھا گئی۔ میں نے ان کو سب سے پہلے خود ان ہی کے گھر میں انجمن معین الادب کے ایک مشاعرے میں دیکھا تھا جس میں تمام مشاعرہ ختم ہونے کے بعد سب کے آخر میں ظریفؔ صاحب نے غزل پڑھی تھی۔ لکھنؤ کے طرحی مشاعروں میں مزاحیہ کلام مشاعرے کے آخر ہی میں پڑھا جاتا تھا۔ اس مشاعرے میں بھی آخری غزل ظریفؔ صاحب کی تھی۔ ظریفؔ صاحب سے پہلے مولانا صفیؔ غزل پڑھ چکے تھے جن کی غزل کا ایک شعر اب تک دماغ میں محفوظ ہے۔ ؎

قسمت میں جو لکھا ہے ملتا ہے بہرصورت　　　دانہ نہ سہی خرمن، خرمن نہ سہی دانہ

اور صفی صاحب سے پہلے حکیم دانش لکھنوی نامی ایک متقی صورت بزرگ نے ایک عجیب و غریب شعر پڑھا تھا اور انتہائی سنجیدگی سے پڑھا تھا ؎

ہو گرم شبِ وصلت یوں پہلوئے جانانہ رخسار بہ رخسارہ شانہ بسرِ شانہ

ظریف صاحب کی غزل کا یہ شعر جو غالباً غزل کا تیسرا مطلع تھا اب تک یاد ہے ؎

لیلیٰ تری محمل میں گھس پڑتا ہے درّانہ مجنوں کی شکایت کیا دیوانہ تو دیوانہ

ظریف صاحب ایک خاص قسم کے ترنم کے ساتھ شعر پڑھتے تھے اور جب سامعین ان کے کلام پر ہنستے تھے تو وہ اس قدر سنجیدہ نظر آتے تھے کہ ان کی اس سنجیدگی پر اور بھی ہنسی آتی تھی۔ ظریف صاحب کی غزلوں کے علاوہ ان کی شہرت کا باعث ان کی نظمیں ہیں۔ سفر نامۂ عراق ان کی ایک ایسی نظم ہے جس میں ان کے رنگِ سخن کے تمام پہلو نمایاں ہیں۔ ہم سفر مستورات کا ذکر کیا ہے تو خالص بیگماتی زبان ہے ؎

بیوی کی جھاڑو ایسے موئے بدمعاش پر اُترے یہاں پہ کوئی کہاں اس کی لاش پر

نوکر کا ذکر کیا ہے تو اس کی زبان پوربی ہے وہ ملازم سخت نالاں ہے کہ اس کو جہاز کے خلاصیوں میں ٹھونس دیا گیا ہے اور اس کی کوئی نہیں سنتا چنانچہ وہ کہتا ہے کہ ؎

کھلاسیوں میں کون سنت ہمری بات ہے کپتان سے کہی تو سسر بھاڑ کھات ہے

اور جب خود اپنا حصہ نظم کرتے ہیں تو اپنی زبان ہے اور اپنا بیان کہ ؎

اسٹیشنوں کی بھیڑ بھی اک یادگار تھی عورت پہ مرد، مرد پہ عورت سوار تھی

اس شعر میں جو غیر محتاط اندازِ بیان ہے وہ کبھی کبھی ظریف صاحب کے کلام میں آجایا کرتا تھا مثلاً ؎

مذاق اچھا کیا عاشق سے یہ حسرت بھرے دل نے اِدھر وصلت کا نام آیا یہ پہلے سے لگا ملنے

بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ ظریف صاحب کے کلام کا بیشتر حصہ مولانا صفی کا ہے۔ اور یہ شبہ اس وقت سے تقویت حاصل کر گیا جب لکھنؤ کے مشہور ماہر امراضِ جنسی ایس۔ لے حکیم کا ایک منظوم اشتہار مولانا صفی نے اپنے نام سے لکھا تھا اس اشتہار میں جو شوخی اور ظرافت تھی وہ تقریباً وہی تھی جو ظریف صاحب کے کلام میں نظر آتی ہے۔ بہرحال ہم کو اس سے بحث نہیں اگر یہ واقعہ بھی ہے تو اس کو گھر ملو لین دین سمجھنا چاہیئے۔ ظریف صاحب بہرحال مولانا صفی ہی سے مشورہ فرماتے تھے۔ بڑے بھائی اور اُستاد نے اگر کچھ بخش دیا ہو تو کیا عجب ہے۔ بہرحال نہ صفی زندہ رہے نہ ظریف۔ دونوں ہی لکھنؤ کی ادبی صحبتوں کو ویران کر گئے۔ ظریف صاحب کے مکان سے چل کر رکاب گنج کے پُل کی طرف ہو کر جانا چاہیئے اس لئے کہ رکاب گنج کا پُل آنے سے پہلے ہی داہنے ہاتھ کو ایک گلی مڑتی ہے جس میں سراج لکھنوی کا مکان ہے۔ لکھنؤ کی ینگ پارٹی کے سربراہ اور مقدمۂ سراجین کے ہیرو

سراج لکھنوی

سراج لکھنوی نے اگر جامِ جہاں نما کے ایڈیٹر مولانا افقر موہانی پر مقدمہ نہ بھی چلایا ہوتا تو بھی لکھنؤ کی تاریخ کی تدوین کے وقت ان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ نہ صرف نہایت خوش گو غزل کے شاعر ہیں بلکہ ان کے کلام میں نقاد کو بہت کچھ مل جاتا ہے اور غزل کی تہی مائیگی کی شکایت کرنے والے سراج کا کلام دیکھ کر اپنی شکایت پر نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ سراج نے بھی بعض اوقات صرف زبان کے چٹخاروں سے کام لیا ہے مثلاً ؎

اک ذرا آپ کو زحمت ہوگی　　　آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے

مگر ہر جگہ صرف زبانی جمع خرچ نہیں ہے بلکہ بہت سے اہم مسائل بھی ہیں۔ اہم مسائل سے مطلب وہ اہم مسائل نہیں جن کے لئے قومی نظمیں کہنا پڑتی ہیں غزل کے بھی اہم مسائل ہوتے ہیں یہ دوسری بات ہے کہ وہ ہر غزل میں نظر نہ آئیں۔ سراج لکھنوی مشاعروں کے مردِ میدان رہ چکے ہیں اور ان کی مقبولیت کا ایک وسیع میدان بھی تھا۔ غالباً یہ اسی مقبولیت کا نتیجہ تھا کہ مولانا افقر موہانی نے اپنے رسالے میں ان کی ایک غزل کے متعلق لکھ دیا کہ یہ غزل شروع سے آخر تک دیوان سراج جھنجھانوی میں موجود ہے۔ سرقے کے اس الزام پر سراج لکھنوی نے افقر صاحب پر مقدمہ چلا دیا اور یہ مقدمہ خاصی ادبی اہمیت حاصل کر گیا اس لئے کہ کون سا ایسا قابلِ ذکر ادیب یا شاعر تھا جو خانۂ شہادت میں نہ آیا ہو۔ سراج صاحب کی طرف سے پنڈت آنند نرائن ملّا وکیل تھے اور افقر موہانی صاحب کے وکیل مسٹر متابن الدین مرحوم تھے۔ خان بہادر سیّد عین الدین مرحوم کی عدالت میں یہ مقدمہ بہت دنوں تک چلا اور سراج لکھنوی کی طرف سے جو گواہ پیش کئے گئے ان میں میں بھی تھا۔ احاطۂ عدالت میں مختلف درختوں کے سائے میں ادیبوں اور شاعروں کی مختلف ٹولیاں مشاعرے کرتی نظر آتی تھیں۔ بعد میں یہ مقدمہ سراج لکھنوی کے حق میں فیصل ہوا اور مولانا افقر موہانی کے متعلق فاضل مجسٹریٹ نے چند پُرلطف ریمارک دے کر یہ قصّہ ختم کر دیا۔ بہرحال یہ تو سراج لکھنوی کے ذکر میں بات چل پڑی تھی۔ ذکر تھا خود سراج لکھنوی کا جو نہایت دھان پان سے مرنجاں مرنج دوست بھی تھے اور چونکہ اسی دفتر میں ملازم تھے جس میں رفیع احمد خاں مرحوم تھے لہذا رفیع احمد خاں مرحوم کی کوششوں سے ان کو اس وقت اپنے بلوغ کا احساس ہوا جب اولاد بالغ ہونے کے قریب تھی۔ زندگی جو ایک سطحیت کے ساتھ بسر ہو رہی تھی اس میں مدوجزر کی کیفیت پیدا ہوئی۔ شب بیداریاں شروع ہوئیں۔ تیری گلی کے سو سو پھیرے شروع ہوئے۔ گھر میں ناچاقیاں بڑھیں۔ مگر یہ سب کچھ بھی عارضی تھا۔ چراغ پھڑ پھڑا یا ضرور تھا مگر طلوعِ سحر کا مخبر بن کر۔ نتیجہ یہ کہ پھر سویرا ہو گیا۔ آنکھ کھلی تو گھر ہی میں بکری بنے بندھے ہوئے تھے۔ اور ان لغزشوں پر ندامت کی جگالی فرما رہے تھے جو نہ جانے کیوں سرزد ہو گئی تھیں۔ سراج لکھنوی سے مل کر نخاس کی طرف چلنے کے لئے نادان محل روڈ سے گذرنا ہوگا۔ تاکہ اشرف آباد چل کر سب سے پہلے

عزیز لکھنوی

سے نیاز حاصل کیا جائے۔ عزیز لکھنوی کی شاعرانہ عظمت کے لئے صرف یہی کہہ دینا کافی ہوگا کہ وہ جوش ملیح آبادی کے استاد تھے۔ جعفر علی خاں اثر لکھنوی کے استاد تھے۔ حکیم سید علی آشفتہ کے استاد تھے اور پنڈت جگت موہن لال رواں کے استاد تھے۔ ایسے مشاہیر شاگرد کسی استاد کو مشکل ہی سے حاصل ہوتے ہیں۔ میں نے ان کو سب سے پہلے رفاہِ عام کیمپ کے اس جلسے میں نظم پڑھتے ہوئے دیکھا تھا جس میں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی طویل اسیری کے بعد رہا ہو کر لکھنؤ آئے تھے اور ان کا شاہانہ استقبال اس طرح کیا گیا تھا کہ جلوس میں ہندو بھی اللہ اکبر کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ یہ جلسہ بھی خیر مقدم کرنے کے لئے منعقد کیا گیا تھا۔ مولانا عزیز لکھنوی نے جو نظم پڑھی تھی اس کا صرف ایک مصرع اس وقت ذہن میں ہے۔ ؎

یوسف کی قید سلطنتِ مصر بن گئی

اس کے بعد کئی مرتبہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور کئی مرتبہ ان کا ساتھ مشاعروں میں شریک ہوا۔ ایک دن عزیز صاحب امین آباد میں مل گئے۔ مجھ سے باتیں ہی کر رہے تھے کہ ایک نہایت موٹے تازے شخص کو میں نے دیکھا کہ آخر یہ کس چکّی کا پسا کھاتا ہے۔ عزیز صاحب میرے تجسّس کو تاڑ گئے اور مجھ سے پوچھا کہ "جانتے ہو ان حضرت کو؟" میں نے نفی میں سر ہلایا تو بولے "یہ لکھنؤ کا ابر ہے"۔ میں پھر بھی حیران رہا تو فرمایا "ابر قدوائی

کے صاحبزادے۔ اسی طرح کے بے شمار لطیفے ہمدم کے دفتر میں آتے اور سُنا جاتے۔ ہمدم کے دفتر میں ان کی آمد و رفت اس زمانے میں بہت بڑھ بڑھ گئی تھی جب ان کے شاگرد چودھری رحم علی الہاشمی ہمدم کے ایڈیٹر تھے۔ ایک دن میں نے عزیز صاحب سے پوچھا کہ بجنور کے اخبار مدینہ کی پیشانی پر آپ کا جو شعر لکھا رہتا ہے ؂

معجزہ شق القمر کا ہے مدینے سے عیاں   مہ نے شق ہو کر لیا ہے دین کو آغوش میں

یہ محض کاریگری ہے یا کچھ اور۔ تو ہنس کر بولے کہ ہے تو یہ واقعی کاریگری مگر آپ کاریگری کے اتنے مخالف کیوں ہیں مدینہ کی 'میم' ادھر اور 'ہ' اُدھر بیچ میں صرف دین رہ گیا اور مہ گویا شق ہو گیا۔ یہ بات اگر مجھے سوجھ گئی اور میں نے نظم کر دی تو آپ ناراض کیوں ہیں۔ میں نے لاکھ لاکھ سمجھایا کہ میں ناراض نہیں ہوں بلکہ صرف یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ اور کوئی بات تو نہیں ہے اس شعر میں مگر ان کو یہی شبہ رہا کہ میرے دل میں کوئی اعتراض ہے جسے میں بیان کرنا نہیں چاہتا۔ چنانچہ پھر جب کبھی ملے یہی پوچھتے تھے کہ ہاں بھئی وہ بات کیا تھی اور میں از سرِ نو یقین دلاتا تھا کہ میں نے کسی اعتراض کی غرض سے یہ بات نہیں پوچھی تھی۔ عزیز لکھنوی میں اپنے خوردوں کو بھی دوست بنا لینے اور اپنے کو ان کے لئے دلچسپ ثابت کرنے کا خاص ملکہ تھا۔ چنانچہ ان کے انتقال کے بعد صرف ان کے ہمسروں اور ان شاگردوں ہی کو ایک کمی محسوس نہیں ہوئی جو ان سے مشورہ سخن کرتے تھے بلکہ امین آباد ہائی اسکول کے ان لڑکوں کو بھی ایک نقصان ہوا جو ان سے صرف درسی کتابیں پڑھتے تھے مگر عزیز لکھنوی ان کے دل و دماغ میں بھی رچے اور بسے ہوئے تھے۔ عزیز صاحب کے مزار سے تھوڑی ہی دُور کے فاصلے پر

پروفیسر مسعود حسن ادیب

بھی رہتے ہیں ان سے بھی ملتے چلئے۔ پروفیسر مسعود حسن ادیب پروفیسر تو خیر ہیں ہی لکھنؤ یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو اور مسعود حسن بھی ہیں مگر یہ 'ادیب' ان کا تخلص ہے اس کا مصرف کبھی سمجھ میں نہ آیا۔ ممکن ہے یہ تخلص بھی مسعود حسن صاحب اسی احتیاط سے رکھتے ہوں جس طرح وہ قلمی نوادر احتیاط سے رکھتے ہیں جن کو وہ اپنی زندگی کا سرمایہ سمجھتے ہیں اور یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ ان نوادر کو ہوا بھی لگ سکے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے کتب خانے میں بہت ہی قیمتی چیزیں ہیں اور ان کی قیمت کا راز صرف ان کی نایابی میں ہے۔ مثلاً اندر سبھا کا نایاب نسخہ، واجد علی شاہ کی بیگمات کے خطوط، واجد علی شاہ کی قلمی مثنویاں اور اسی قسم کی بے شمار چیزیں جن کو لوگ عجائبات کے طور پر دیکھنے جاتے ہیں اور مسعود حسن صاحب اگر بہت مجبور کئے گئے تو وہ نوادر اس طرح دکھاتے ہیں جس طرح نظام حیدر آباد نے علامہ اقبال کو اپنے جواہرات کا خزانہ دکھایا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ مسعود حسن صاحب کا خزانہ بھی جواہرات سے کم نہیں مگر وہ اس کو دولت بیدار بنانے کی جگہ دفن کئے ہوئے ہیں۔ مسعود حسن صاحب اردو کے شیدائیوں میں سے ہیں ان کی خدمات سے قطع نظر صرف ان کو اردو بولتا ہوا سُن کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی مزہ لے لے کر مٹھائی کھا رہا ہو وہ ایک ایک لفظ سے ایسا مزہ لیں گے اور ان کے چہرے پر ایسا انبساط ہو گا کہ سُننے والے کے مُنہ میں پانی بھر آئے۔ ویسے بھی ان میں رہنے سہنے اُٹھنے بیٹھنے اور بات چیت کرنے کا بڑا سلیقہ ہے۔ ہر بات سے فطری نفاست پسندی جھلکتی ہے اور ان سے ملنے والے کو ان سے مل کر یہ محسوس ہوتا ہے جیسے اس نے خطاطی کا کوئی نہایت نفیس نمونہ دیکھا ہو۔ مسعود صاحب سے مل کر نخاس ہوتے ہوئے جھوائی ٹولے کی طرف مُڑ جائیے تو حکیم عبدالعزیز روڈ پر

مرزا محمد عسکری

کا نہایت بلند و بالا مکان ہے جس میں اب صرف ان کی یاد رہتی ہے وہ قبر کا کونہ آباد کر چکے ہیں مگر یہ ذکر ہے اُس وقت کا جب وہ زندہ تھے اور ان میں زندگی کی ہر چہل پہل موجود تھی۔ وہ بھی بڑی چٹخارے دار زبان بولتے تھے اور بات کرتے وقت بات کا مزہ لیتے تھے۔ رام بابو سکسینہ کی

تاریخ ادبِ اُردو کے مترجم کی حیثیت سے ان کی شخصیت اتنی بلند نہیں ہے جس قدر اپنی دوسری کتابوں نے ان کو ہر دلعزیز اور ساتھ ہی ساتھ قابلِ ذکر بنایا ہے۔ نوادر، من کیستم اور آئینہ بلاغت ان کی وہ کتابیں ہیں جن میں مرزا صاحب اپنے صحیح خدوخال کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ بڑے اچھے دوست، بڑے دلچسپ بزرگ مگر ساتھ ہی ساتھ منتظم اتنے تھے کہ اگر آپ ان کے پاس پہنچ جائیں اور آپ کی تواضع ان کے بجٹ سے باہر جا رہی ہو تو وہ شاید آپ کو پان کے لئے بھی نہ پوچھیں اور سلیقہ اتنا کہ پان اگر کھلائیں گے تو گلوریوں پر کیل کے ساتھ گلاب کی پنکھڑیاں بھی لگی ہوں گی کہ دیکھتے ہی طبیعت خوش ہو جائے۔ بات بات میں لطیفہ سنائیں گے آپ کو ہنسائیں گے اور خود بھی ہنسنا چاہیں گے مگر آپ ذرا غلط زبان بولے اور ان کا مزہ کرکرا ہوا۔ لوگ ان کے پاس صرف ٹکسالی بولی ٹھولی اور کبھی کبھی ضلع جگت سننے جایا کرتے تھے مگر جب ٹکسالی بولی ٹھولی اور ضلع جگت ہی نہ رہا تو اب وہ کیا کرتے رہ گئے۔ مرزا محمد عسکری کے مکان سے جھوائی ٹولہ ہوتے ہوئے آگے بڑھ جائیے تو

مولانا عبدالحلیم شررؔ

کا مکان ہے جہاں وہ سفید گھنی داڑھی والے نحاور کریمس کی شکل کے بزرگ رہتے تھے جن کا ناول نویسی میں طوطی بولا کرتا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی ان کا کتابوں اور کاغذوں سے اٹا ہوا وہ کمرہ نظر آتا تھا جس میں ایک میز پر کتابوں میں دفن یہ بزرگ ہر وقت کچھ نہ کچھ لکھتے نظر آتے تھے۔ مجھ کو ان سے بات کرکے کبھی لطف نہ آیا نہایت سپاٹ قسم کی باتیں کرتے تھے البتہ اُس زمانے میں وہ دلچسپ بن گئے تھے جب ایک شخص منسارام شررؔ پیدا ہو گیا تھا جو ان کی ہر ناول کو ہتھیا لیتا تھا۔ مثلاً انھوں نے لکھا دربار رام پور، اس نے دربار حرام پور کے نام سے کچھ ادھر اُدھر سے بدل وہی کتاب چھاپ دی سخت عاجز تھے مولانا اس کے ہاتھوں اور کچھ بنائے نہ بنتی تھی۔ نہ جانے ان کی کتنی کتابوں کا اس نے اسی طرح ناس مارا اور اپنے کو شررؔ لکھ کر اپنی خرافات بھی ان ہی کے سر منڈھ دیں اُس زمانے میں مولانا کی اس نورانی صورت پر وہ گالیاں بڑی بھلی لگتی تھیں جو منسارام شررؔ کو وہ دیتے تھے۔ اس کے علاوہ مولانا کو میں نے ہمیشہ نہایت خشک اور کھرا پایا وہ مصنّف کم اور تاجر زیادہ نظر آتے تھے۔ مولانا شررؔ سے سرسری ملاقات کے بعد پھر جھوائی ٹولے سے ہوتے ہوئے ذرا چوک میں داخل ہو جائیے جہاں حیدر حسین خاں کے پھاٹک سے آگے بڑھ کر چودھرائن کے امام باڑے کے سامنے ہی ایک قابلِ ذکر بزرگ

خواجہ عبدالرؤف عشرتؔ

کی کتابوں کی دوکان ہے۔ اب نہ خواجہ عشرتؔ رہے نہ ان کی دوکان مگر تصوّر میں اس وقت بھی یہ دوکان موجود ہے جس میں خواجہ صاحب نہایت دھان پان قسم کے بزرگ اپنی ہی لکھی ہوئی شاعری سکھانے کی کتابیں شاعری کی پہلی کتاب۔ شاعری کی دوسری کتاب۔ شاعری کی تیسری کتاب۔ شاعری کی چوتھی کتاب بیچا کرتے تھے۔ شاگردوں کی غزلیں بناتے تھے اور شام کو یہی دوکان دوسرے شاعروں کا اڈا بن جاتی تھی جن میں صفدر مرزا بھی نظر آتے تھے۔ مشاطۂ سخن کے مصنّف

صفدر مرزا پوری

ریاض خیر آبادی کے شاگرد اور بہت سے شاگردوں کے اُستاد تھے۔ مشاعروں میں بڑی پابندی سے شرکت کرتے تھے اور غزل اس طرح پڑھتے تھے کہ کبھی کسی نے قافیہ اور ردیف نہ سُنا قافیہ اور ردیف تک پہنچتے پہنچتے اس قدر انکسار میں مبتلا ہونے کہ "بس" ہیں ہیں ہیں" کرکے رہ جاتے مثلاً ـــ

فرق کیا عاشق و معشوق میں بس اتنا ہے　　کوئی دیوانہ بنائے کوئی دیوانہ بنے

یہ شعر جب وہ پڑھتے تو وہ اس طرح سننے والے سنتے تھے کہ ؎

فرق کیا عاشق و معشوق میں بس اتنا ہے　　کوئی دیوانہ بنائے کوئی ہیں ہیں ہیں

ایک حادثے میں پیر اور ایک ہاتھ بیکار ہو گیا تھا چنانچہ پھر ہر غزل میں اس قسم کا ایک آدھ مصرع ضرور آجاتا تھا کہ ۔ ع ۔

کر دیا مجبور اس بے دست و پائی نے مجھے

صفدر مرزا پوری سے مل کر چوک میں ہوتے ہوئے پارچے والی گلی سے فرنگی محل کی طرف چلیئے ۔ زردوزی کا کام کرنے والوں اور کڑھائی کے کام کی دوپلّی ٹوپیاں اور کرتے بیچنے والوں کی دوکانوں سے گزر کر فرنگی محل شروع ہو جاتا ہے یہاں بھی علمائے کرام ہی ہیں کچھ ادیب اور شاعر قسم کے بزرگ بھی ہیں مثلاً

مولانا صبغتہ اللہ شہید فرنگی محلی

بنیادی طور پر آپ بھی مولوی ہیں چنانچہ وعظ فرماتے ہیں مجالس پڑھتے ہیں، نہایت خوش بیان خطیب ہیں اور جس تیزی سے اُردو کے شگفتہ اور ڈھلے ڈھلائے فقرے اپنی تقریر میں آپ بولتے ہیں بہت کم مقرر یہ شگفتگی اور زبان کی یہ صحت قائم رکھ سکتے ہیں ۔ مختلف رسالوں اور اخباروں کی ادارت بھی کر چکے ہیں مگر ایک عالمِ دین و مفتیِ شرعِ متین زیادہ دنوں تک محض شاعر یا ادیب نہیں رہ سکتا لہٰذا اب آپ صرف مولانا ہیں ۔ فرنگی محل میں آپ سے مل کر اور آپکے یہاں کی پُرتکلّف چائے پی کر وکٹوریہ اسٹریٹ پر بزازے کے قریب آجائیے تو فرنگی محل کے پُل پر سامنے ہی

حکیم سیّد علی آشفتہ

کا مطب اور دواخانہ ہے ۔ حکیم آشفتہ لکھنؤ کی ینگ پارٹی کے سربراہ ۔ عزیز لکھنوی کے شاگرد اور خود نہایت شگفتہ بیان شاعر ہیں لکھنوی تکلّف کی منہ بولتی تصویر یہ سر پر پٹھے دار بال گلے میں چنا ہوا نفیس انگرکھا پیروں میں جالی کھلا ہوا چوڑی دار پاجامہ پیر میں کامدار جوتا ۔ اور ۔ ع

لکھنؤ ہم پر فدا ہے ہم فدائے لکھنؤ ۔

کی بذاتِ خود تفسیر ۔ ہر وقت شاعروں کا مجمع لگا رہتا ہے شہر بھر کی ادبی اور شعری فضاؤں پر تبصرہ ہوتا ہے ۔ بہت سے شاعروں کو خود بھی سمیٹے ہوئے ہیں مثلاً نوجوان خوش گو شاعر

منظر لکھنوی

آپ ہی کے دواخانے کے منتظم ہیں ۔ یہ وہی منظر لکھنوی ہیں جن کا مطلع ؎

ایسا بیخود کیا خوفِ شبِ تنہائی نے　　صبح سے شمع جلا دی ترے سودائی نے

سن کر نواب سائل دہلوی نے سرِ مشاعرہ ان حضرت کا منہ چوم لیا تھا ۔ یہ منظر لکھنوی مشہور ڈرامہ نویس منشی احسن کے بھانجے ہیں ۔ مگر خود صرف غزل گو شاعر ہیں اور ان کا میدانِ عمل صرف مشاعرہ ہے ۔ ینگ پارٹی کے رکن ہیں مگر سراج اور قدیر بلکہ حکیم آشفتہ تک مشاعروں کے علاوہ ادبی رسائل میں بھی نظر آتے ہیں لیکن منظر ان بیشتر شعرائے لکھنؤ میں سے ہیں جن کو لٹریچر زیادہ عرصے تک یاد نہ رکھ سکے گا ۔ منظر لکھنوی سے مل کر آپ پولیس پوسٹ پاٹا نالہ تک بڑھ جائیے وہاں خان بہادر شیخ احمد علی عرف ڈٹن صاحب سوداگر کے مکان میں آپ کی ملاقات

خواجہ مجذوب غوری

سے ہو سکتی ہے۔ خان بہادر خواجہ عزیز الحسن غوری۔ جو حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے مرید بن کر ڈپٹی کلکٹری کو چھوڑ بیٹھے تھے اور اپنی خدمات محکمۂ تعلیم میں اس لئے منتقل کرا لی تھیں کہ ڈپٹی کلکٹری میں نہ جانے کب سود کی ڈگری دینا پڑ جائے یا کوئی اور خلاف شرع فیصلہ کرنا پڑ جائے چنانچہ خان بہادر ہیں ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہیں۔ بڑے سینیر ڈپٹی کلکٹر رہ چکے ہیں مگر وضع قطع سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی کسی مسجد سے اذان دے کر آ رہے ہیں سر پر چوگوشیہ ٹوپی سُرخ سفید رنگ، چہرے پر بھوری داڑھی لمبا کرتہ اٹنگا پاجامہ۔ بغل میں لٹکا ہوا کلام مجید۔ مگر آپ کو مل جائیں گے تو سڑک ہی پر کھڑے کھڑے اپنی غزل سُنانا شروع کر دیں گے اور غزل بھی وہ جس میں کم سے کم بہتّر شعر ہوں گے۔ لہراتا ہوا ترنم اور ترنم کے ساتھ لہراتے ہوئے ہاتھ بلکہ کبھی کبھی سارے جسم سے لہرا جائیں گے اور غزل سُناتے رہیں گے۔ ؎

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی　　　اب تو آجا اب تو خلوت ہو گئی

ایک مرتبہ میرے گھر پر مشاعرہ تھا مجذوب صاحب نے مطلع پڑھا ؎

تو نے ان کو کیا سے کیا ذوقِ فراواں کر دیا　　　پہلے جاں پھر جانِ جاں پھر جانِ جاناں کر دیا

میں نے کہا مجذوب صاحب تو ارد ہو گیا ہے میرا مطلع ہے ؎

تو نے اکبر کیا سے کیا بیرم کو ہاں ہاں کر دیا　　　پہلے خان پھر خانِ خاں پھر خانِ خاناں کر دیا

بڑی زور سے ہنسے اور پھر غزل شروع کر دی۔ ایک مرتبہ میں اور مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی ان کے ساتھ ان ہی کے موٹر پر جا رہے تھے جسے وہ خود چلا رہے تھے راستے میں غزل سُنانا شروع کر دی اور اسٹرئنگ وہیل چھوڑ کر ہاتھ لہرانے لگے نتیجہ یہ کہ موٹر ایک کھڈ میں قلابازی کھا گئی۔ شکر ہے کہ کسی کو چوٹ نہیں آئی سب کپڑے جھاڑ کر کھڑے ہو گئے مجذوب صاحب نے پوچھا کہ "چوٹ تو نہیں آئی" مولانا عنایت اللہ نے فرمایا کہ "اللہ نے بڑا فضل کیا" مجذوب صاحب نے کہا "تو اس کا دوسرا مصرع یہ تھا کہ ـــــ" اور غزل شروع ہی کرنے والے تھے کہ مولانا عنایت اللہ نے ڈانٹ کر چپ کر دیا کہ پہلے کار کی خبر لو۔ اب کہاں ملتے ہیں یہ لوگ مجذوب صاحب بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مجذوب صاحب سے ملتے ہوئے حضرت شاہ مینا صاحب کی درگاہ پر فاتحہ پڑھ کر جگت نرائن روڈ پر ہو لیجئے۔ یہ سڑک پنڈت جگت نرائن ملا کے نام نامی سے منسوب اور اسی سڑک پر گولہ گنج میں ان کے صاحبزادے پنڈت آنند نرائن ملا صاحب۔ جوئے شیر رہتے ہیں

پنڈت آنند نرائن ملّا

اُردو کے اُن چند ہندو شاعروں میں سے ایک ہیں جو آج بھی بھارت میں اُردو کے لئے سینہ سپر بنے ہوئے ہیں۔ ہائی کورٹ کے جج ہیں اپنی ذمہ داریوں کا پورا احساس رکھتے ہیں۔ وطن پرست ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ اُردو پرست بھی اور ہندوستان کی اُردو دشمنی سے آگاہ بھی۔ چنانچہ اپنا مجموعۂ کلام جوئے شیر پیش کرتے ہوئے اس کا انتساب یوں کیا ہے :-

مٹتی ہوئی اُردو کے نام

اک موت کا جشن بھی منا لیں تو چلیں　　　پھر پونچھ کے اشک مسکرا لیں تو چلیں

آ تجھ کو گلے لگا کے مٹتی اُردو　　　اک آخری گیت اور گا لیں تو چلیں

اور اسی کے بعد دوسرے صفحے پر اس سے بھی زیادہ سخت ایک چیز ہے :-

آئندہ تاریخ کا ایک صفحہ

یہ سانحہ سالِ چہل و نو میں ہُوا　　ہندی کی چھُری تھی اور اُردو کا گلا
اُردو کے رفیقوں میں جو مقتول ہوئے　　ملّا نامی سنا ہے شاعر بھی تھا

پنڈت آنند نرائن ملا اُن کشمیری پنڈتوں میں سے ہیں جن کے یہاں ہمیشہ مسلمان باورچی رہا کرتا تھا۔ جو بات بات میں انشاء اللہ۔ اور ماشاء اللہ کہنے سنتے۔ اور تقسیم ملک کے بعد وہ اپنے ہم زبانوں۔ ہم سفیروں اور ہم نفسوں سے محروم ہو گئے ہیں اس تکلیف کا اظہار پنڈت آنند نرائن ملا نے مجھ سے اس طرح کیا کہ اپنا مجموعہ مجھے دیتے ہوئے اس کے پہلے صفحہ پر لکھا ہے:۔

بھائی شوکت کی خدمت میں

بیادِ ایامے

کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کوئی پوچھے پنڈت جی سے کہ یہ باتیں بھلا دینے والی ہوتی ہیں؟۔ میں جذباتی ہو رہا ہوں لہٰذا یہاں سے چلئے بھلا غضب خدا کا راستے میں وزیر گنج پڑتا ہے وہاں آپ اُردو کے جلیل القدر شاعر اور جلال لکھنوی کے جانشین

آرزو لکھنوی

کو بھول آئے ہیں۔ کانوں سے بہرے مگر صحیح معنوں میں بحر العلوم۔ ڈرامہ کا میدان سر کئے ہوئے۔ تغزّل میں اپنا جھنڈا گاڑے ہوئے زبان دانی میں اپنا لوہا سب سے منوائے ہوئے اس طرح مسکین صورت بنائے بیٹھے ہیں گویا ان باتوں سے اور ان حضرت سے کوئی تعلق ہی نہیں مگر یہ واقعہ ہے کہ اُردو زبان کے محسنوں کی جب تاریخ مرتب ہوگی اور اس کا ایک جگمگاتا ہُوا باب جلال لکھنوی کو ملے گا تو اس میں سب سے نمایاں آرزو کا نام ہوگا۔ لکھنؤ کی مٹی سے یہ آفتاب ابھرا تھا مگر خود اس کی مٹی کراچی کی تھی جہاں یہ سورج پاکستانی پرچم کے ہلال کے زیرِ سایہ غروب ہُوا اور اُردو شاعری کو مرتے مرتے آبِ حیات پلا گیا۔ آرزو لکھنوی سے مل کر گولہ گنج ہوتے ہوئے امین آباد کا رُخ کیا ہی تھا کہ کسی کو دیکھ کر ٹھٹھک جانا پڑا۔ اور زغاہ کہہ کر آگے بڑھے اور

سیّد علی عبّاس حسینی

سے بغل گیر ہو گئے۔ عہدِ حاضر کا یہ جلیل القدر افسانہ نویس اپنی آنکھوں میں ذہانت کا تبسّم لئے سامنے کھڑا تھا باسی پھول کا یہ شگفتہ مصنّف جس نے اُردو کے فنِ افسانہ نگاری کو نئی راہوں سے آشنا کیا خود اب تک پرانی روش پر چلتا ہے۔ وہی کھلے پائینچوں کا پاجامہ اور وہی شیروانی نہ سوٹ ہے نہ ہیٹ اور نہ زمین پر اس طرح چلنے کا انداز کہ قدم آسمان پر پڑ رہے ہوں اتنا بڑا فن کار اور خود اتنا سادہ کہ اپنی پرکاری کو کبھی اُبھرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ ملئے تو خلوص ہی خلوص۔ پرکھیئے تو اعتماد ہی اعتماد۔ علی عباس حسینی سے مل کر آگے بڑھے ہی تھے کہ ایک تانگہ خود ہی آکر قریب رُکا۔ ہاتھوں میں ایک مجلد کاپی، کاپی پر رکھی ہوئی چاندی کی پانوں والی ڈبیا دبائے سفید مونچھوں والے چہرے پر بچّوں کی سی مسکراہٹ اور بھولپن لئے ایک صاحب آگے بڑھے اور گلے سے لگا لیا۔ یہ ہیں

جعفر علی خاں اثر

لکھنوی تہذیب و تمدّن اور رکھ رکھاؤ کی وضعداری اور شرافت کی ایک زندہ مثال۔ بہت بڑے شاعر، بہت بڑے نقّاد، بہت بڑے

انشاپرداز مگر ان سب سے بڑے انسان جن کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس سے انسانیت نہ برستی ہو۔ خان بہادر ہیں۔ ایم۔ بی۔ اے ہیں۔ کمشنری سے لے کر وزارت تک کر چکے ہیں مگر عالی ظرفی کا یہ عالم کہ کہیں بھی چھلکنے نہ پائے جس سے ایک مرتبہ مل لئے اس نے ہمیشہ ان کو اپنا سمجھا کیا عزیز اور کیا دوست۔ دوستوں کے عزیز بنے رہے اور عزیزوں کے دوست اور جس سے جو تعلقات قائم کر لئے ان کو آخر تک نباہ کر دکھا دیا۔ مرزا جعفر علی خاں اثر سے مل کر آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ اس لکھنؤ سے مل لئے جو اب لکھنؤ میں بھی دراصل نہیں ہے وہ روایتی وضعداری۔ وہ سُنا سُنایا اخلاق اور وہ افسانہ بن جانے والا علم اس ایک پیکر میں یکجا نظر آتا ہے۔

مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی سے مل کر امین الدولہ پارک ہوتے ہوئے گونگے نواب کے باغ کی طرف اگر گذر ہو گیا تو وہاں منشی احمد علی

شوق قدوائی

اور ان کے بھائی منشی واحد علی آبر سے ملنے کا خطرہ ہے۔ شوق قدوائی مرحوم اس وقت تک زندہ ہیں جب تک مثنوی عالم خیال زندہ ہے۔ ان کی شاعرانہ عظمت سے اُردو شعر و ادب کی تاریخ کبھی انکار نہیں کر سکتی۔ ان کا شمار اپنے وقت کے ان اساتذہ میں تھا۔ جو شاعر ہی نہیں بلکہ شاعر گر تھے۔ ان کا فنی تبحر مسلّم سمجھا جاتا ہے۔ ان کی پُرگوئی سے ان کے معاصرین لرزہ براندام رہتے تھے۔ اور دم نکلتا تھا۔ ان کے احباب کا اس وقت کے خوف سے جب شوق صاحب ان کو پکڑے جائیں۔ اپنے گھر اور سنانا شروع کریں۔ اپنا کلام۔ حال یہ تھا کہ دوستوں نے ان کی گلی کا راستہ چھوڑ رکھا تھا۔ شوق صاحب اگر دُور سے نظر آ جاتے تو لوگ بدل گئے تھے۔ سر پہ پیر رکھ کر۔ مگر اس کے باوجود شوق صاحب کو ہر روز کوئی نہ کوئی شکار مل ہی جاتا تھا۔ جس کو نہایت محبت سے گھیر کر گھر لاتے تھے۔ بڑے خلوص سے بٹھاتے تھے۔ اچھے سے اچھا کھلاتے تھے۔ اور پھر اپنا کلام سُنا کر کھلایا پلایا سب اس سے وصول کر لیتے تھے۔

لکھنؤ میں گونگے نواب کے باغ میں ایک بارہ دری میں شوق قدوائی مرحوم اور ان کے برادرِ عزیز منشی واحد علی آبر مرحوم کی بیٹھک تھی۔ اس بیٹھک کے ایک در میں شوق صاحب کی نشست ہوتی تھی اور دو تین در چھوڑ کر ایک اسی قسم کے در میں منشی واحد علی آبر کچھ لکھا اور پڑھا کرتے تھے۔ خود تو خیر کس کی شامت آتی تھی۔ کہ وہ شوق صاحب کے پاس آتا البتہ لوگوں کو پرچے لکھ لکھ کر دعوتوں کے بہانے سے اور بیماری کا دھوکہ دے دے کر دوستوں کو بلواتے تھے۔ پھر بھی اگر کوئی نہ آئے تو شکار کی تلاش میں نکل جاتے تھے۔ اور کسی نہ کسی کو پکڑ ہی لاتے تھے۔ خاطر و مدارات کے دام بچھاتے تھے۔ ناشتہ کرائیں گے۔ مرغن کھانے کھلائیں گے۔ آم خربوزوں سے تواضع کریں گے۔ اور اس کے بعد کلام سُنانے بیٹھ جائیں گے۔ حال یہ تھا کہ لوگ ماؤں سے دودھ اور بیویوں سے مہر بخشوا کر ان کا کلام سُننے آتے تھے۔ بلکہ جب پکڑ کر لائے جاتے تھے تو آتے تھے۔ اور عموماً ہوتا یہ تھا۔ کہ مثلاً کوئی شکار سہ پہر کو پھنسا اس کو ناشتہ کرایا اور رات کے کھانے کے وقت تک کلام سنایا۔ کھانے کا وقت ہو گیا تو اس کو ہزاروں قسمیں دے کر دسترخوان پر لے گئے۔ بہت ہی تواضع سے کھانا کھلایا اور دسترخوان سے اُٹھا کر پھر مقتل میں لے آئے۔ اور سنانا شروع کر دیا کلام۔ اس کو انتظار کہ غزل ختم ہو اور اجازت حاصل کرے۔ اور یہاں غزل کے ختم ہوتے ہی دوسری غزل کا مطلع۔ جب دیکھا کہ سُننے والے کی داد میں تھکاوٹ کے آثار پیدا ہوئے ہیں تو چائے منگا لی۔ اس نے اجازت چاہی تو اس کے زانو پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ بھئی کب کب ملنا ہوتا ہے۔ ہم سخن کب کب ملتے ہیں۔ تمہارے ہی رنگ میں ایک غزل کہی تھی مطلع ملاحظہ ہو۔

اور جب سُننے والے کو آدھ موا کر دیا تو پان کھلا دیا۔ کبھی حقہ بڑھا دیا۔ مگر غزل کے بعد غزل کا سلسلہ جاری رہا۔ رات زیادہ آگئی تو بستر کا انتظام کر دیا۔ کہ اب کہاں جاؤ گے۔ سواری بھی نہ ملے گی۔ اور صبح قبل اس کے سونے والا جاگ کر بھاگے شوق صاحب خود اس کے سرہانے موجود اور منتظر کہ وہ جاگے تو سلسلہ شروع ہو۔ اور اگر شوق صاحب غسل خانے جانے کے لئے یا کسی اور ضرورت سے اُٹھے بھی تو ان

کے چھوٹے بھائی موجود ہیں

آبر قادری

آبر صاحب نے پکارا :-

حضرت وہاں اکیلے کیوں بیٹھے ہیں آپ ۔ بھائی جان نے جس زمین میں ابھی غزل سنائی ہے ۔ اس میں عرض کیا ہے میں نے ۔ شاید کسی قابل ہو

مطلع :-

لیجئے یک نہ شد دو شد بڑے میاں تو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ ۔ یہ برادرِ عزیز بیاض سنبھالے ۔ ناک کی پھنگی پہ عینک لگائے اسی لئے ناک میں بیٹھے رہتے تھے کہ بڑے بھائی ذرا ٹلیں تو یہ اس سننے والے کی خبر لیں بہرحال یہ اپنی غزل سنا چکے کہ شوق صاحب آگئے اور ان کو مجبوراً غزل ادھوری ہی چھوڑنا پڑی اور شوق صاحب پھر شروع ہو گئے ۔ مگر اب وہ بھی نہیں ملتے ان سے بھاگنے والے ان کے لئے بھی ترس رہے ہیں ۔ کچھ خدا کو پیارے ہوئے کچھ پاکستان کو اور جو رہ گئے ہیں وہ خود اپنے اچھے دن یاد کر کے سرد آہوں میں اپنے کو گھیرے ہوئے ہیں اور ان کے لئے ایک سرد آہ میں بھی بھرتا ہوں ۔

اس خاکے میں صرف یہ انتظام رکھا گیا ہے کہ اس دور کے مشاہیر سے میں آپ
کو بھی ملا دوں جن سے میں مل چکا ہوں ۔ وقت کے آگے پیچھے ہونے کا خیال نہ
کیجئے صرف ان لوگوں سے میرے ساتھ مل لیجئے ۔

(چند علمی و ادبی شخصیتیں)

حیدر آباد کا ایک دور

قطب النسا ہاشمی

کائنات کی وہ پیچیدہ و گراں قدر تخلیق جس پر خالقِ ازل کو بھی ناز ہو، باریک بینی اور گہرا مطالعہ چاہتی ہے۔ انسان کو جاننا پہچاننا کوئی آسان کام نہیں۔ ہم دن رات انسانوں میں رہتے بستے ان کے میٹھے بول اور کڑوے جملے سنتے ہیں، ان کے طور طریق دیکھتے ہیں اور کبھی کبھی ان کی انفرادیت منفعت اسباب اور واقعات سے ایک دم ہمارے سامنے عیاں بھی ہو جاتی ہے۔ پھر بھی زاویۂ نظر کی صحت کامل نہیں ہو سکتی۔ یہ کام یوں اور بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ ہر انسان سوشل اعتبار سے ایک نقاب اوڑھے رہتا ہے۔ اس کی داخلی زندگی اور خارجی زندگی میں بیّن تفاوت ہے۔ شاذ و نادر کوئی منچلا بے نقاب نظر آئے تو آ جائے ورنہ اصلیت اپنے اصلی نقوش میں ظاہر ہونا نہیں چاہتی۔

لیکن وہ لوگ جو انسانیت کے خادم ہیں علم و ادب کے پیاسے ہیں، صداقتوں کو ٹٹولنے اور حقیقتوں کو جاننے کے لئے بے چین رہتے ہیں، اس کے مستحق ہیں کہ ان کا تعارف عوام سے کرایا جائے۔ یعنی انسانی تمناؤں اور آرزوؤں کو پالنے والی یہ ہستیاں قابلِ ستائش ہی نہیں قابلِ تعارف بھی ہیں میں بھی آج اسی جذبہ کے تحت ذیل کے چند افراد کا مختصر سا تعارف قارئینِ کرام سے کرانا چاہتی ہوں وہ بھی اپنی مرضی سے نہیں بلکہ "مدیرِ نقوش" کی خواہش پر اس مشکل مسئلہ پر میں نے قلم اٹھایا ہے۔ اس لئے پہلے ان سب شخصیتوں سے معافی چاہتی ہوں جن کے تعارف میں اگر میں بخل یا غلو سے کام لوں تو اس کا سبب میری کم علمی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

ڈاکٹر زورؔ (سید محی الدین قادری)

حیدر آباد کی دنیا کے پہلے ادبی ڈاکٹر — آپ کے نام سے کون واقف نہیں — طالب علمی کے زمانے ہی سے آپ نے تصنیف و تالیف شروع کر دی تھی۔ اردو زبان جب پر تول رہی تھی آپ نے اس کا انداز قد پہچان لیا تھا اور اس میں تحقیقی و تنقیدی نظریہ پیدا کر دی تھیں۔ دکنی زبان کی بڑی کھوج محترم نے کی ہے۔ آپ کی کئی تصانیف و تالیفات ہیں جن کا تذکرہ فنِ تنقید میں بھی ایک نمایاں مقام ہے۔ اردو زبان کی حفاظت و اشاعت ان کی زندگی کا مقصد عظیم ہے۔

"ادارۂ ادبیاتِ اردو" کی زندگی میں آپ کی سعی اور محنت ایسے رچ گئی ہے کہ گویا اس کا تانا بانا آپ کی ذات ہی تو ہے۔ وقت کے بڑے نباض ہیں۔ ڈاکٹر صاحب قدیم روایتوں کو لے کر وقت کے دھارے پر برابر آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔ ان کی کوششیں قابلِ تعریف ہی نہیں بلکہ قابلِ قدر بھی ہیں۔ ادارہ سے انہیں دلی محبت ہے۔ اس کی ترقی پہلے اور بعد سب کچھ —— ادارہ جو اردو کی خاموش اور مسلسل خدمت کر رہا ہے وہ آپ کے تدبّر اور مصلحتوں

کی کھلی نشانی ہے۔

"چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو"

اس مسلک پر محترم کی نظریں گڑی ہیں اور اردو دوستوں کو اس مسلک کے تحت بڑا سہارا دیتے ہیں۔

تنقیدی نظر کی رسائی گفتگو اور علمی صحبتوں میں بھی جھلک جاتی ہے۔ بے باک انسان ہیں، لیکن مصلحتوں کا دامن تھامے رہتے ہیں۔ راستہ سے الگ ان کی آنکھیں پہنچ جاتی ہیں۔

آپ کی زندگی کامیاب زندگی ہے۔ اردو دان حلقہ میں امتیازی مرتبہ رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا علمی ذوق ابھی دھیما نہیں ہوا بلکہ عمر کے ساتھ ساتھ اس کی رفتار تیز ہوتی جا رہی ہے۔ گھر میں اچھا کتب خانہ ہے جو علمی ذوق کا ثبوت ہے۔ کالج کے پرنسپل ہیں۔ جو وقت بچ جاتا ہے وہ ادارہ کی خدمت اور اردو دوستی میں گذار دیتے ہیں۔ آپ کی تحریریں علمی، تحقیقی، سادہ اور لچکدار ہوتی ہیں۔ طرز بانکا اور منفرد ہے۔ پان بڑے چاؤ سے کھاتے ہیں۔

پروفیسر عبدالقادر سروری

کامیاب پروفیسر ــــــ سلجھے ہوئے منتظم ــــــ صبح جو کارگذار ــــــ امن کے متلاشی اور کام کے بندے ہیں۔ حیدرآباد کے اس بے چین دور میں جہاں اردو اپنی اکھڑی سانسیں جمع کر رہی ہے، بڑی مصلحت اندیشی اور عاقبت کوشی سے محترم نے اپنے شعبہ کو مستحکم کیا ہے۔ شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ کے صدر ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اردو دوستوں سے رکھ رکھاؤ، شاگردوں سے خاص محبت اور ان کی سدھار و زندگی کے دھارے ہیں۔ جس رواداری اور محنت سے آپ نے ساتھ دیا ہے، وہ بڑا قابلِ قدر کام ہے۔

یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ محترم علم دوست بھی ہیں اور انسان دوست بھی ــــــ وقت کے نباض اور اس سے کام لینے کی خاص صلاحیت رکھتے ہیں۔ آج یونیورسٹی میں اپنی محنت اور کاوش سے جو درجۂ امتیاز آپ کو حاصل ہے، وہ ہر کس و ناکس کے بس کا نہیں۔ کاروباری دنیا میں کون سب کو خوش رکھ سکتا ہے۔ مصلحتیں ہمیشہ غلط افہام پیدا کرتی ہیں۔ لیکن پروفیسر صاحب بڑے کمال اور تدبر سے اپنا زاویۂ نظر دنیا کے سامنے پیش کرتے رہتے ہیں۔ دانشمندی اور رکھ رکھاؤ نے ان کی ذات میں ایک خاص اعتماد پیدا کر دیا ہے اور بڑے تدبّر اور دھیمے پن سے گتھیوں کو سلجھا دیتے ہیں۔ پھر ایسے معلوم ہوتا ہے کہ اب کوئی مشکل ہی نہ رہی۔ مشکلات کا مقابلہ نڈر پن اور رجان داری سے کرتے ہیں۔ آج اردو زبان کی جان پر جو کٹھن گھڑیاں آگئی ہیں، محترم نے ان کا اچھی طرح جائزہ لیا اور پس منظر پر بھی گہری نگاہ ڈالی اور ہر اس لمحہ کو حاصل کیا جس میں وہ اپنی زندگی پاتی تھی، اور پھر اس کو اپنا لیا۔

پروفیسر صاحب کا مطالعہ وسیع اور نظر نکتہ رس ہے۔ ان کی اکثر تصانیف تنقیدی اور ٹھوس پیپروں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ لسانیات ان کا محبوب مضمون ہے، دکنیات میں ان کی نظر امتیازی ہے۔ تنقیدی مضامین ٹھوس ہونے کے علاوہ وہ جزئیاتی تفصیل سے بھی پُر ہوتے ہیں۔ اس طرح محترم کا قلم قیمتی بن جاتا ہے۔

زمانہ کے نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اخلاق اور انصاف پسندی میں ان کی مثال منفرد ہے۔ ان کی گھریلو زندگی پُر امن، یونیورسٹی کی زندگی مطمئن ہے۔ اپنے بچوں سے بہت محبت کرتے ہیں۔

فضل الرحمٰن

میں نے پہلی مرتبہ آپ کو نظامت تعلیمات کی کرسی پر دیکھا تھا۔ مدرسہ عالیہ سے ایک میگزین کی ادارت و اجازت کے سلسلے میں گئی تھی۔ مجھے اجازت بھی مل گئی اور میگزین کا ایک کچا خاکہ بھی۔ ان کی شخصیت کی ہمہ گیر قابلیت اور صلاحیت ہم سب سے پوشیدہ نہیں۔ کئی محکموں کی نظامت کر کے محترم نے ہمہ گیر صلاحیت کا ثبوت دیا ہے لیکن ہر جگہ علمی ذوق و ادب کے بھی پرستار رہے۔ آپ ایک فطری شاعر ہیں۔ چاندنی رات میں یا صبح صبح کوئی آپ کو بنجارہ ہل کی پہاڑیوں اور قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہوتے دیکھ کر فوراً یہ اندازہ کر لیتا ہے کہ حسنِ فطرت کے آپ کتنے پرستار ہیں۔ کئی نظمیں اس کی گواہ ہیں۔ پاکیزہ

نثر اور ٹھوس ڈراموں نے آپ کو دنیائے ادب میں ممتاز و بلند کر دیا ہے۔ مجرد زندگی نے ادبی کام کے لئے کافی وقت دے رکھا ہے۔ اطمینان کی زندگی، غلط چیزوں سے انحراف و خاموشی لیکن برمحل سے۔ ان پر بے باکانہ اظہار جو ایک خاص سلیقہ و نفاست سے کیا جاتا ہے' انسانی محبت کے تقاضے کو ظاہر کرتا ہے۔

آپ ان سے ملئے' ایسے معلوم ہوتا ہے کہ ایک "انسان" سے مل رہے ہیں۔ بات کہنے کا سلیقہ اتنا پاکیزہ اور صحیح زاویۂ نظر لئے ہوتا ہے کہ آپ سنتے رہ جائیں گے۔ نظریات میں رواداری اور علمی نوک جھونک ملے گی۔ میں آپ کو محترم غلام یزدانی صاحب کے الفاظ میں پیش کرتی ہوں یہی میرے لئے کافی ہے:۔

"فضل الرحمٰن صاحب جتنے متین، سنجیدہ ہیں اتنی ہی ان کی طبیعت شوخی اور مزاح پر مائل ہے لیکن ذوق پاکیزہ ہے۔ ان کی شکل و صورت بھی اچھی ہے، کھلا ہوا رنگ، کھڑا نقشہ، بڑی بڑی آنکھیں، متوسط قامت، چھریرا بدن، بات کرتے ہیں تو شرافت ٹپکتی ہے۔ ظاہر و باطن یکساں ہے۔ کوئی طمطراق نہیں۔ پھر بھی اپنے وقار کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ انہی صفات نے حیدر آباد کے نوجوان طبقہ میں ان کو بہت محبوب بنا دیا ہے۔ حیدر آباد کے اسٹیج کی بنیاد اور رونق انہی کی سعی کا نتیجہ ہے۔

حکومت کو بھی ان کی قابلیت کو ماننا پڑا۔ حیدر آباد لاسلکی محکمہ کے ضمن میں ولایت بھیجے گئے اور پھر ناظم تعلیمات رہ چکے ہیں۔

فضل الرحمٰن صاحب کا مطالعہ وسیع ہے اور حقائق اور قدرت کے کرشموں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ یہ رجحان ان کی اکثر نظموں میں نمایاں ہے۔ ان کا ذوق نہایت نفیس اور وہ اعلیٰ پایہ کے نقاد بھی ہیں۔ ان ہی صفات کی بنا پر ان کو دکن کی اردو شاعری کا میتھیو آرنلڈ سمجھتا ہوں۔ ان کا کلام ایک استادانہ حیثیت رکھتا ہے۔" (ماخوذ ایوان حیدر آباد نمبر)

راجہ جانکی پرشاد

ایک یونانی فلاسفر کے لئے مشہور ہے کہ دن کے اُجالے میں ہاتھ میں چراغ لئے گلیوں میں گھس جاتا تھا۔ لوگوں نے اس دیوانگی کا سبب پوچھا تو کہنے لگا "انسان کو تلاش کرتا ہوں" کیا تعجب ہے انسانوں کی اس بھری دنیا میں اسے ایک انسان نہیں مل سکتا تھا۔ یہ بالکل سچ ہے۔ حقیقی معنوں میں انسان ملنا بہت مشکل ہے لیکن یہ دنیا انسانوں سے خالی بھی نہیں۔ انسان مل سکیں گے۔ لیکن ان کی تعداد انگلیوں پر ہوگی۔

راجہ جانکی پرشاد اوپر کے نظریہ سے انسان ہیں۔ ان کی خاموش انسانی خدمتیں بہت سی ایسی ہیں جو منظر عام پر نہ آسکیں۔ اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ اس کے اظہار سے انسانی خدمت کا جذبہ متاثر ہوتا تھا۔ رواداری اور خدمتِ انسانی نے انہیں ایک بڑا انسان بنا دیا ہے۔ مشرقی تہذیب و تمدن، بلند اخلاق، پرانی حسین روایات کے دلدادہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایثار کے صحیح معنی بھی جانتے ہیں۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مسلک یہ ہے کہ اس دنیا میں کسی کا دل نہ توڑیں۔ یہ بہت بڑی بات ہے، بہت ہی بڑی ـــــ جیسے "انسان" کے رازِ تخلیق کی بات ـــــ ان کے انسانی پہلو کو بیان کرنے کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔

عالم، صحافت پر عبور رکھنے والے، اُردو زبان کے شیدائی، انگریزی کا بلند مطالعہ کرنے والے، خاموش خدمت گار، کام کے قدر دان اور انسان شناس۔ ـــــ اس بڑے انسان پر اتنا لکھنا کافی ہے۔

جہاں بانو

محترمہ "بانو" حیدرآباد کے تمام علمی حلقوں میں "بانو آپا" کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کی شخصیت میں بلا کی جاذبیت ہے۔ ایک مرتبہ ملنے کے بعد دوبارہ کی خواہش باقی رہتی ہے۔ بات سوچ کر اور تول کر کرتی ہیں۔ آواز دھیمی مگر سُریلی، جملے مختصر مگر دل میں کھب جانے والے۔ موزوں اور برمحل شعر گفتگو میں جان ڈال دیتے ہیں۔ باتوں باتوں میں بہت سی باتیں سکھا جاتی ہیں۔ بے محل اور بے ڈھب چیزوں پر طنز ضرور کرتی ہیں۔ اچھائی اور بُرائی میں ایک قدم کا ہی تو فاصلہ ہے۔ ایک قدم آگے بڑھاؤ یا پیچھے ہٹاؤ، اچھائی بُرائی یا بُرائی اچھائی بن جاتی ہے۔ ان کے دل میں انسانیت کا درد چھپا ہوا ہے، جیسے ایک آبلہ جسے ٹھیس کی بھی ضرورت نہیں۔ صرف بادِ مخالف کا ایک سرسری جھونکا اس میں ٹیس پیدا کرنے کے لئے کافی ہے۔ اس لئے کسی کو دُکھی دیکھ نہیں سکتیں۔ خود ان کا کہنا ہے:

"دل ٹوٹ کر ہی تو انمول ہو جاتا ہے۔ ٹوٹا ہوا دل ہی ہستی کے لئے سامانِ زینت ہے"۔

سب سے بڑھ کر ان کو بدمذاقی سے نفرت ہے:

"جن کو مذاق کا سلیقہ نہیں ان کو مذاق نہیں بدمذاقی کرتے دیکھ کر مجھے اپنی زندگی خود ایک مذاق محسوس ہونے لگی ——— مذاق کرنا ایک زبردست فن ہے۔ مذاق کا عموماً کوئی سطحی مطلب نہیں ہوتا۔ صرف ہنسنا ہنسانا مذاق نہیں، یہ تو ایک سطحی عکس ہے۔ اس کی گہرائیوں میں چیخوں اور آنسوؤں کے سیلاب ہوتے ہیں"۔

سچ تو یہ ہے کہ عوام ان کی انفرادیت اور شخصیت کو سمجھ نہیں سکتے۔ اسی لئے کسی نے ان کی شخصیت کو خشک اور رجعت پسند کہا۔ کسی نے طعن و طنز کا بت بنا دیا۔ لیکن وہ ایسی انسان ہیں جو انسانیت کے صحیح مفہوم سے آشنا ہیں۔ ان کو لکچرار کا نام دیں یا ادیب و افسانہ نگار کا۔ سب سے بڑھ کر انہیں "خاتونِ مشرق" سجتا ہے۔ سینکڑوں میں ایک ہیں جو اپنا وزن اور انفرادیت رکھتی ہیں۔

محترمہ کئی تصانیف کی مالک ہیں۔ محمد حسین آزاد، رفتارِ خیال، بربطِ ناہید، فتراک وغیرہ۔ ایک عرصہ تک اردو انجمن کی صدارت اور کئی رسالوں کی ادارت کر چکی ہیں ——— خوش پوش، نفاست پسند، ذوقِ سلیم کی مالک۔

ان کے اکثر مضامین بھٹکے بھٹکے سے ہوتے ہیں، جیسے بہت ساری غیر متناسب چیزیں ان کے سامنے آ گئی ہیں۔ کس کو سلجھاؤں اور کیسے سلجھاؤں کا سوال پیشِ نظر رہتا ہے۔ لیکن ان کی اس برگشتہ روی میں بھی دیکھنے والی آنکھ کے لئے "بہت کچھ" مل جاتا ہے جو "سب کچھ" کے برابر ہے۔

سکندر علی وجد

وجد کی شاعری وجدان کی دنیا ہے۔ فن پختہ اور اس پر ناز بھی۔ اپنے آپ پر اعتماد اور فن سے واقفیت نے انہیں بہت قیمتی بنا دیا ہے۔ ان کے اشعار میں عظمتِ رفتہ کی یاد بہت گہری ہے۔ ان کو اپنے آبا و اجداد کے کارناموں پر ناز و تفاخر ہے۔ لیکن اپنے آپ پر بھی کچھ کم نہیں۔ درد و تڑپ کے ساتھ گرجدار آواز، طرزِ کلام میں موسیقی جو محفل کو سکتہ کی حالت میں تبدیل کر دیتی ہے، اس بات کی گواہ ہے کہ شاعر نے کیسا درد بھرا دل پایا ہے۔

دُبلی پتلی شخصیت، گورا رنگ، چھریرا بدن، آنکھیں نغمہ و شعر سے متلاطم اور اس پر جامہ زیبی ان کی شخصیت کے ظاہری رعب داب ہیں لیکن اگر ان کو اصلی روپ میں دیکھنا ہو تو اس وقت دیکھئے جب وہ شعر پڑھتے ہیں۔ یوں کہئے ہمہ تن شعر بن جاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ شعر نغمہ ہے اور نغمہ شعر ——— جس کا نتیجہ تاثیر ہے۔ کئی بار میں نے شعر پڑھتے سنا اور ہر بار "ایک اور" کی تمنا رہ گئی۔

بلند اخلاق، دوستوں کے اچھے رفیق، سوسائٹی کے نمایاں نمائندہ، دل سوز شاعر، حیدرآباد کی علمی فضا میں ان کا خاص اور بلند مقام ہے۔ اس لئے آج بھی دل چاہتا ہے کہ ان کی کوئی تازہ غزل یا نظم ان ہی کی آواز میں سنوں اور جھوم جاؤں۔

نصیر الدین ہاشمی[1]

"دکن میں اردو" کے مصنف اپنی شہرت کے آپ مالک ہیں۔ جب سے انہوں نے قلم اٹھایا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نہ رکھنے کی قسم کھائی ہے سنتی ہوں اب بھی روزانہ بلاناغہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں۔ ان کی طبیعت میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ عملی انسان ہیں۔ خیال و عمل میں بہت کم بعد رکھتے ہیں۔ اِدھر کسی چیز کا خیال آیا اُدھر کام شروع ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک چوبیس پچیس کتابوں کے مصنف ہو گئے اور تقریباً اتنی ہی کتابیں لکھی دھری ہیں جن کی طبع و اشاعت کا سامان اب تک نہ ہو سکا۔ تھوڑے دنوں کی بات ہے "لائبریری خواتین دکن" کی ایک مشاورتی محفل میں انہوں نے اپنی تصانیف کو ایک تخت پر سجایا تھا۔ تخت اس سرے سے اس سرے تک بھر چکا تھا۔ خدا نظرِ بد سے بچائے۔

محترم محقق زیادہ ہیں ادیب کم۔ ذخیرہ اندوزی کا ذوق ہے اور اسے خاص ڈھب سے عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ذاتی رائے اور تبصروں کے لئے انہیں وقت کم ملتا ہے۔ ایک کام ختم نہ ہوا کہ ابھی ان کی "اور" کی فطری خواہش نے نیا سامان فراہم کر دیا۔ زود فہم، زود نویس اور زود رس ہیں۔ میرے خیال میں یہی وجہ ہے کہ محترم نے اپنی ابتدائی زندگی ہی سے قلم اٹھا لیا ہے۔ اُردو سے اور خصوصاً "دکنی" سے خاص عشق ہے۔ ان کی تمام تصانیف اسی محبت کا ثمرہ ہیں۔

یہ دُبلے پتلے انسان دیکھنے میں ناتوان مگر ارادہ کے پکے ہیں۔ ان کا مسلک کام ہے اور بس۔ ان کے گھر میں علم و ادب کا کافی ذخیرہ ہے لیکن وہ اس کے قائل نہیں کہ کتابوں سے ایسی محبت کرو کہ انہیں سینے سے لگائے رکھو۔ وہ کتابوں کا استعمال جانتے ہیں۔ ان کو چھانتے ہیں، خود پڑھتے ہیں، دوسروں کو پڑھنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ ان کی دعوت عام ہے۔

حیدرآباد کی تمام ریسرچ خواتین ان کی کتابوں سے فائدہ اٹھاتی ہیں۔ مزا یہ ہے کہ یہ خود ان کی خواہش پر کتابوں کی سربراہی کا انتظام اپنے سر لیتے ہیں اور جو کچھ نقصان ہو خود برداشت کر لیتے ہیں۔ خواتین ان کی اس کمزوری یا فیاضی سے بے حد فائدہ اٹھاتی ہیں۔ کوئی تحقیقی کام سر پر آن پڑا اور محترم کو ایک پوسٹ کارڈ سے اس کی اطلاع کر دی۔ پھر کیا، پہلے کتاب حاضر، حوالے موجود ـــــ اس لئے خواتین ان کی دل سے مشکور ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنی سب ذمہ داریوں کو وہ کیسے سہارتے ہیں اور ان کا نحیف و نزار جسم تھکن بھی محسوس نہیں کرتا اس لئے کہ یہ سب کام بڑی خوش اخلاقی سے سرانجام دیتے ہیں۔

آج کل ایک خاص تاریخ لکھنے میں مصروف ہیں۔ اس سے پہلے کتب خانہ آصفیہ کی قلمی کتابوں کی تفصیلی فہرست کا صبر آزما کام اپنے عملی انداز میں ختم کر دیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ کتب خانہ سالار جنگ کی قلمی کتابوں کی فہرست بھی ترتیب دے رہے ہیں۔ بہ حیثیت انسان خوش اخلاق، صاف گو، سادہ دل، محنتی، بے لوث خادمِ قوم ہیں۔ میرے خیال میں بہ حیثیت مورخ و محقق آپ نے ہند و پاکستان میں اپنا نام دائمی جانب لکھوایا ہے۔ اس لئے اب مزید تفصیل خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔ ہر فن اور ہر مذاق کے لوگ آپ کے دوست ہیں۔

زینت ساجدہ

زینت ساجدہ نے ایک ناتوان جسم اور قوی دماغ سے دنیائے علم و ادب میں قدم رکھا۔ جب وہ ہائی اسکول میں پڑھتی تھیں جب ہی سے ان کی انفرادیت نمایاں تھی۔ محنتی کم ذہین زیادہ ـــــ خاموش رہنے والی لیکن بہت سوچنے والی ـــــ وسیع زاویۂ نظر اور گہرا مشاہدہ ـــــ اپنی اس سوچ اور گہرائی میں ایک خاص رچاؤ رکھتی ہیں۔ اپنی کمزوریٔ صحت کے باوجود اکثر جماعت میں اوّل رہا کرتی تھیں۔

---

[1] راقمہ کو ہاشمی صاحب کے خاندان سے کوئی رشتہ داری نہیں ہے اگرچہ میرے نام کے ساتھ بھی ہاشمی کی نسبت ہے لیکن بالکل جداگانہ خاندان ہے۔

ان کی ادبی زندگی کالج میں چمکی۔ دادا کی تربیت نے ان کی خوبیوں کو اجاگر کیا۔ آنکھیں کھلیں اور وہ آگے بڑھتی گئیں۔ آگے اور بہت آگے — آج ترقی پسندوں کی صف میں خاص درجہ رکھتی ہیں۔

زندگی کے تقاضوں کو بہت سلجھی ہوئی نظر سے دیکھتی ہیں۔ ماں باپ کے گھر کی زینت اور اپنے شاگردوں میں بہت مقبول ہیں۔ دیکھنے سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ اپنی ذات سے بے خبر صرف آگے بڑھنے پر نگاہ ہے نہ زیادہ آرائش و زیبائش کا خیال نہ اپنی صحت کا فکر، لیکن کچھ دنوں سے اس خیال میں تبدیلی پائی جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب وہ اپنی خبرگیری کرنے لگی ہیں اور اپنی ذات سے انہیں کچھ محبت ہو چلی ہے، ان کی شخصیت کا پورا مدار ان کے رکھ رکھاؤ اور علمی وسعتِ نظر میں ہے۔ بات بہت پُر کشش کرتی ہیں۔ موقع و محل کو جان کر جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ حیدرآباد کی علمی فضا میں جانی پہچانی ہستی ہی نہیں مقبول ہستی ہیں۔

کامیاب افسانہ نگار، سیدھا سادا طرز، دلچسپ اور صحیح زاویۂ نگاہ اسی لئے ان کی پہلی کتاب "جلترنگ" اب تک بہت سی خوش آیند امیدوں کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے لیکن اب وہ جلترنگ والی دنیا سے بہت آگے بڑھ چکی ہیں۔ ان میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ دوسروں سے کم متاثر ہوتی ہیں لیکن دوسروں کو بہت جلد متاثر کر دیتی ہیں۔

ہندی اُردو کی محبت نے انہیں دونوں جگہ خاص امتیاز دے رکھا ہے۔ خوش مزاج اور سادگی پسند ہیں۔ طبیعت میں انکسار ہے لیکن خودی کی قوت اس پر غالب ہے۔

سید محمد صاحب

سید محمد صاحب بڑے خاموش آدمی ہیں۔ ان کا شعار علمی خدمت اور کتابوں سے محبت ہے۔ میں سید صاحب کو بہت نزدیک سے بھی دیکھتی ہوں یونیورسٹی سے کبھی فرصت ملی کہ بازار جا کر اچھی اچھی کتابیں خرید لائے۔ حیدرآباد میں شاید ہی اتنی زبردست "خانہ لائبریری" ملے گی جتنی سید صاحب کے پاس ہے۔ پھر حسن سلیقہ و صفائی کا یہ عالم کہ لائبریری میں خاموش و پاکیزہ علمی لہر مل جائے گی۔ کتابوں سے آپ کو بہت محبت ہے۔ بڑی احتیاط اور دل دہی سے ان کی حفاظت کرتے ہیں۔

علم دوستی نے انسان دوستی کا جذبہ بڑی شدت سے پیدا کر دیا ہے۔ جب جہاں، جس وقت کسی کو مدد کی ضرورت ہوتی ہے خاموشی اور فیاضی سے اس کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔

رہنمائی کا طریقہ بھی اچھا ہے۔ ان سے ملاقات ہو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی گھر کے سردار سے مل رہے ہیں۔ جو تمہارا دکھ سکھ ایسے ہی سُننے گا جیسے بڑا بھائی سن رہا ہے۔ پھر اس کی مدد پر تھوڑی دیر غور کریں گے۔ دامے، درمے، قدمے، قلمے کبھی کوتاہی نہ کریں گے — یہ تو رہا ان کا جذبۂ خدمتِ انسانی۔ اس کے علاوہ محترم کی سب سے بڑی خوبی ان کی انتظامی صلاحیت ہے۔ وہ کافی حد تک ایک کامیاب منتظم ہیں۔ سلیقہ صفائی، تنظیم و ترتیب کی صلاحیتیں ان کے گھر کے قرینہ میں بھی ملتی ہیں۔ یونیورسٹی میں اردو کے ریڈر ہیں۔ بہت زمانہ سے اُردو کی خاموش خدمت کرتے آئے ہیں۔

مرزا عصمت اللہ بیگ (مرحوم)

میرا مضمون اِدھر ختم ہوا اور اُدھر معلوم ہوا کہ مرحوم اس چلتی پھرتی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ آہ کیا ہستی تھی۔ ان کے بات کرنے کا انداز، شعر پڑھنے کا طریقہ، نثر لکھنے کا سلیقہ ——— کوئی سنجیدہ علمی محفل ان کے بغیر سُونی ہو جاتی تھی۔ وہ ہر مجلس کے روحِ رواں تھے۔

علمی ادبی محفلیں عوام کو زیادہ دیر تک دماغی کاوشوں میں پھنسائے رکھنے میں اکثر ناکام رہتی ہیں۔ سنجیدہ سے سنجیدہ صاحبِ فکر بھی اس اُلجھن سے گھبرا جاتے ہیں اور کچھ تنوع تلاش کرتے ہیں۔ [illegible]

گیا۔ ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی اور ہر شخص ہنستا ہنساتا پایا گیا۔ وہ گرماگرمی اور مرحوم کی وہ خاص لَے اب تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔

مرحوم ظریف ادب کے مردِ میدان تھے۔ آج حیدرآباد میں ان کا کوئی بدل نہ مل سکے گا۔ میں نے ان کو قریب سے بھی دیکھا اور دور سے بھی ہر وقت میں یہی سوچتی رہی کہ یہ قدرت کا کتنا زبردست شاہکار ہیں۔

اردو دانی کا ذوق، سلیقہ سے انگریزی الفاظ کی کھپت، بات میں بات پیدا کرنے کا انداز، پاکیزہ اور دھیمی ظرافت جس کا اثر عوام اور خواص دونوں پر ہوتا تھا۔ مرزا صاحب کو مصوری و نقاشی سے بھی خاص لگاؤ تھا۔ میں یہاں ان کی شخصیت کی ایک عام جھلک دکھانے کی کوشش کروں گی۔ اگر ان کے علمی و ادبی کارناموں کا جائزہ لوں تو ایک کتاب بن جائے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اکبر کا ایک جانشین غلط چیزوں کی خبر لے رہا ہے۔ لیکن اکبر کی طرح کھلم کھلا وقت سے انحراف کرنے کے عادی نہیں تھے۔ بلکہ حُسنِ طلب کا رنگ ہی اور تھا۔ وہ وقت کے تقاضوں کا ساتھ پوری قوت سے دیتے تھے اور اپنی ظرافت کے باریک تاروں سے بڑی بڑی گتھیوں کی گرہ کھول کے رکھ دیتے تھے۔ ان کی کوئی نظم یا نثر اٹھائیے۔ اس میں وہ حال سے باخبر، ماحول سے بےچین اور صداقت کی تلاش میں ملیں گے۔

ان کو ایک نظر دیکھنے ہی سے محسوس ہوتا تھا کہ اس شخص میں کوئی خاص بات ہے۔ الفاظ اس کے اظہار کی قوت نہیں رکھتے۔ کوئی نرالی اور انوکھی بات جو عام انسانوں میں نہیں ملتی۔ گویا وہ اس دنیا کو ایک خاص زاویۂ نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ یا یوں کہہ رہے ہیں:

ع بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے

ان کی متلاشی آنکھیں دیکھنے والے کو حیرت میں ڈال دیتی تھیں۔ ہنسنے کم تھے، ہنساتے زیادہ تھے۔ آخر دنوں میں ایک میگزین "تماشا" کے نام سے جاری کیا تھا۔ خود ادارت کرتے تھے۔ تماشے کے تمام صفحات اندازِ تمسخر میں سچی باتوں سے بھرے ملتے ہیں۔ ہم نے ایک بڑے ادیب اور خاموش فنکار کو کھو دیا۔ ان کی موت بھی ایسے ہوئی جیسے وہ ہماری محفل سے اٹھ کر پردہ کے پیچھے چلے گئے اور ہم ان کی راہ تکتے تکتے اپنا ہی منہ تکنے لگے ہیں۔ خدا مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین!

بشیر النّساء بیگم بشیر

آپ دکن کی وہ واحد شاعرہ ہیں جن پر طبقۂ اناث کو ناز و فخر ہے۔ میں جب ان کے اشعار انہی سے سُنتی تھی تو سر دھنتی رہ جاتی تھی۔ شعر ایسے فطری پاکیزہ جیسے موتی ڈھل رہے ہیں۔ جذب و تاثیر میں ڈوبے ہوئے۔ الفاظ پر پوری قدرت کی شان لئے ہوئے۔ لہجہ میں انفرادیت اور بانکپن تخیل اونچا اور منجھا ہوا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ شاعرہ بنی نہیں، پیدا ہوئی ہیں۔

یوں عام طور پر محترمہ شاعرہ معلوم نہیں ہوتیں۔ سچ دھج سے ایسا لگتا ہے کہ ایک مکمل کامیاب گھریلو خاتون ہیں۔ اجنبی انہیں شاعرہ نہ کہے گا۔ لیکن کسی محفل میں انہوں نے اپنے اشعار پیش کئے اور سب کی نگاہیں معنی خیز طور پر محترمہ کی طرف جھک گئیں اور محترمہ نے ازراہِ انکساری سر جھکا لیا۔ ان کی شاعری میں جگہ جگہ سچائی ملے گی، آرزو بھرا دل ملے گا، سکون کی تلاش ملے گی، جذب و اثر کا یہ عالم رہے گا کہ بات دل سے نکل کر دلوں میں سما جائے گی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی گوشہ سے دُکھ درد کی آواز آئی اور محترمہ نے اسے شعر میں سمو لیا۔ انسانیت کے خادم کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ وہ دُکھ درد سے دور نہیں رہتا بلکہ اس میں ڈوب کر اُبھرتا ہے۔ وہی کامیاب شاعر ہے جو سرتاپا دکھی ہے۔ زمانہ کے نشیب و فراز پر ایک خاص نظر اور اتار چڑھاؤ کے مرحلوں نے انہیں ایک کہنہ مشق شاعرہ بنا دیا ہے۔ ان کا فن پختہ ہے جس کا اعتراف بھی کرتی ہیں ؎

تجھ پہ کیا خاک اے زمیں ہوتا
ہم نہ ہوتے تو کچھ نہیں ہوتا

خدا کا شکر ہے کہ یہ "کچھ" ہماری سرزمین کو پوری آب و تاب سے منوّر کر رہا ہے۔ افتخار سے بے حد متاثر ہوں۔ پہلے محترمہ مشاعروں میں برقع

اشعار سناتی تھیں اور محفل تڑپ جاتی تھی۔ اب اپنے اشعار دوسروں سے پڑھواتی ہیں۔ وہ گرمی و جوش تو نہیں ملتا لیکن کلام کی تاثیر اور ستھرا پن وادلے کے رہتا ہے۔ ان کے کلام میں اکثر جگہ اقبال کے خیالات سے ٹکراؤ ہے۔ نظامِ کائنات حرکت پسند ہے۔ اقبال کے فلسفہ کی جھلک محترمہ کے پاس زیادہ نہ ہو تو کیا' اس کا جذب و تاثر تو قریب آجاتا ہے۔

رفیعہ سلطانہ

رفیعہ سلطانہ سے گفتگو کیجئے —— دھیما انداز اور شیریں بیانی آپ کو ان کے قریب کر دے گی۔ گویا موسیقی کی جھلک مل رہی ہے۔ لکچر دینے کھڑی ہیں تو مجمع کو اس قوت سے متاثر نہ کر سکیں گی۔ علمیت بہت رکھتی ہیں۔ اس کے اظہار میں اکثر ناکام رہ جاتی ہیں۔ مطالعہ وسیع ہے۔ زاویۂ نظر چونکا تا ہے۔ اپنی بات منوانے اور اپنے نظریات عام کرنے کی متمنی رہتی ہیں۔ لیکن خیالات گنجلک اس لئے نظر آتے ہیں کہ وقت واحد میں بہت سی باتیں کہہ دینا چاہتی ہیں۔ "کچے دھاگے" اس کی تفسیر ہیں۔ ان کے مضامین مغربی خیالات سے متاثر رہتے ہیں۔ یہ ایک اچھی نشانی ہے لیکن گھر سے زیادہ گھر پر وارد ہونے والے اثرات دیرپا زندگی نہیں پاتے۔ اطراف واکناف کے وہ مسائل جو اپنے اندر درد بھری آواز رکھتے ہیں ان پر اگر یہ سوچنے لگیں تو بہت کارآمد چیزیں ان کے ہاتھ سے نکلنے لگیں۔

سلطانہ نے طبیعت بڑی با اخلاق پائی ہے۔ دشمن کی بھی تعریف ایسی کریں گی جیسے قریب کے دوست کی کر رہی ہیں۔ قناعت پسندی اور بے نیازی نے انہیں اتنا آگے نہیں بڑھایا جتنا وہ بڑھ سکتی تھیں۔ بڑی مہمان نواز، اچھی دوست —— نقصان پہنچانے کا جذبہ ان میں نہ ملے گا —— سوسائٹی سے واقف —— فیشن کی دلدادہ —— لہجہ اور رنگ آبادی جس میں مقامی رنگ اور علمیت کی جھلک ملتی ہے —— زمانہ سے بھی ایک حد تک بے نیازی برتتی ہیں۔ ایک خاص شخصیت کی مالک ہیں۔ اپنی مثال آپ ہیں —— حریف کی مدِ مقابل نہ ہو سکیں گی —— خاموشی اپنے راستہ پر چلتی رہیں گی۔

رشید قریشی

اپنے پاؤں آپ بڑھنے والا یہ افسانہ نگار و ادیب دنیا کو کھلی آنکھوں سے دیکھتا اور گہری سوچ سے پرکھتا ہے۔ بلند ارادہ اور عزمِ مستقل نے انہیں ایک کامیاب ادیب بنایا۔ خود ان کا کہنا ہے "آج نہیں کل —— کل نہیں پرسوں"۔ لیکن ہمت ہارنے والی آسامی نہیں۔ یہ ان کے ضبط کردار کی نشانی ہے۔ کمال یہ ہے کہ انتہائے رنج و غم کے تاثرات میں ڈوبے ہوئے دل و دماغ کو بھی اپنے قابو میں رکھتے ہیں۔ اور اس عالم میں بھی زبردست مزاحیہ یا طربیہ لکھ سکتے ہیں۔ "عورتوں کی عدالت" اسی المی اثر میں رکھا ہوا زبردست مزاحیہ ہے۔ یا کسی خوشی و مسرت کے موڈ میں انہوں نے سوچا اور ایک زبردست المیہ لکھ ڈالا۔ یہ ان کی انفرادیت ہے۔ ادیب، وشاعر موڈ (MOOD) کے نقشِ قدم پر چلتا ہے۔ ایسا کم ہوتا ہے کہ ادیب نے موڈ کا دھارا خود بدل دیا ہو۔ یہ ان کے فن کی قوت کی نشانی ہے۔ انہیں اپنے کمال کا احساس ہے —— دماغی صلاحیتوں پر ناز ہے لیکن اوروں کی آنکھ سے دیکھنے کی بجائے اپنی آنکھ پر بھروسہ کرتے ہیں۔ یہ جذبات کو پوری صداقتوں اور کرداروں کو ان کے اصلی خد و خال میں پیش کرتے ہیں۔

ماحول سے باخبر اور ہم جنسوں کے سال سے متاثر رہتے ہیں۔ زمانہ کے اشاروں اور زندگی کے تقاضوں سے بڑی دوستی ہے۔ "ایجنٹا کی آوازیں" کے عنوان سے گوتم بدھ کی روحانی زندگی کا تجزیہ پانچ ڈراموں میں کیا ہے جس پر انہیں فخر ہے۔ کامیاب اور مشہور افسانہ نگار —— فنِ افسانہ پر بھی ان کو نگاہیں جم چکی ہیں۔ ان کے فیچرس بھی بہت مقبول اور کامیاب ثابت ہوئے جو کہ وہ نشرگاہ کے لئے لکھتے رہتے۔

———

انتظاریه

سرسیّد احمد خان

ڈپٹی نذیر احمد

ریاض خیرآبادی

پریم چند

سر عبدالقادر

ڈاکٹر تاثیر

میراجی

ظفر علی خان

نیاز فتحپوری

پطرس

جوش ملیح آبادی

عبدالمجید سالک

چراغ حسن حسرت

غلام رسول مہر

وقار عظیم

ابواللیث صدّیقی

عبادت بریلوی

غلام عباس

حجاب امتیاز علی

ہاجرہ مسرور

شوکت تھانوی

سرسیّد احمد خاں

عنایت اللہ دہلوی

محترم شیخ محمد اسماعیل پانی پتی کی بدولت ہمیں دو بڑے ہی نادر اور غیر مطبوعہ مضامین ملے۔ جن میں ایک حالی پر خواجہ غلام الحسنین کا مضمون ہے۔ (جو نقوش کے ابتدائی صفحات کی زینت ہے) خواجہ غلام الحسنین، خواجہ غلام الثقلین ایڈیٹر "عصر جدید" کے برادر بزرگ اور مولانا حالی کے نواسے تھے۔

دوسرا سرسیّد کے بارے میں مولوی عنایت اللہ دہلوی (مرحوم) کا یہ مختصر سا مضمون ہے۔ جس میں سرسیّد کی طرز معاشرت اور گھریلو زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔

ہمیں سرسیّد پر ایک بڑا اہم اور طویل مضمون شیخ صاحب نے لکھ کر مرحمت فرمایا ہے جس میں مولوی عنایت اللہ دہلوی کی مندرجہ ذیل تحریر، سرسیّد کا ایک غیر مطبوعہ فارسی خط، اور سرسیّد کے لٹریری اسسٹنٹ سید وحید الدین سلیم کی زبانی کچھ اہم کلمات درج ہیں۔

ہمیں افسوس ہے۔ کہ پرچے کی بڑھتی ہوئی ضخامت کے خوف سے اس قیمتی مضمون کو آئندہ شمارہ میں لے جا رہے ہیں اور اب اُس مضمون میں سے صرف مولوی عنایت اللہ دہلوی کی ایک تحریر یہاں پیش کر رہے ہیں۔ جو انھوں نے شیخ صاحب کو اپنے حالات زندگی کے ضمن میں لکھ کر بھیجی تھی — آئندہ شمارہ میں پورا مضمون پیش کریں گے۔

(محمد طفیل)

"غالباً جولائی ۱۸۷۸ء کا زمانہ تھا کہ میرے والد مرحوم (مولانا ذکاء اللہ) جو اُس وقت میور کالج الہ آباد میں پروفیسر تھے۔ گرمیوں کی تعطیل دہلی میں ختم کرکے الہ آباد واپس جانے لگے۔ اِس مرتبہ اُنھوں نے مجھے اور میرے بڑے بھائی کو جو مجھ سے تین برس بڑے تھے اپنے ہمراہ لے جانا چاہا تاکہ الہ آباد میں ہماری تعلیم کا کوئی بہتر بندوبست کریں۔ راستہ میں سیّد صاحب (سرسیّد مرحوم) کے پاس علی گڑھ میں قیام کرنے کا قصد کیا۔ میری عمر اُس وقت آٹھ برس کچھ مہینے کی تھی اور یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے اپنی والدہ سے جُدا ہونے کا اتفاق ہوا۔ چلنے کا وقت آیا تو اُنھوں نے ہم دونوں بھائیوں کو گلے لگایا۔ پیار کیا اور کوئی دعا پڑھ کر دم کی۔ مجھے بے اختیار رونا آیا مگر میں نے ضبط کیا۔

اس سے پہلے میں کبھی ریل پر سوار نہ ہُوا تھا۔ سٹیشن پہنچ کر گاڑی میں بیٹھا۔ بیٹھا کیا، کبھی دوڑ کر اِس کھڑکی سے منہ لگا کر جھانکتا تھا کبھی اُس کھڑکی سے۔ اور سب سے زیادہ بے قراری اس بات کی تھی کہ دیکھئے ریل کب چلتی ہے؟ اور کیونکر چلتی ہے؟ آخر کار یہ وقت بھی آگیا۔ ریل کھسکی سٹیشن کی جتنی صورتیں تھیں ایک ایک کر کے پیچھے رہتی گئیں۔ ٹرین کبھی سیدھی۔ کبھی سانپ کی طرح لہراتی جمنا کا پُل اُترتے ہی فرّاٹے بھرنے لگی۔ پہیّوں کی لَے دار آوازیں اور رفتار کی تیزی کے ساتھ ہوا کے جھونکے دل میں ایک اُمنگ پیدا کرنے لگے۔ اب یہ معلوم ہُوا کہ میدان۔ کھیت۔ گاؤں۔ آدمی۔ درخت۔ مویشی کوئی ایسا نہ تھا جو دلّی کی طرف نہ بھاگا جا رہا ہو۔ میں اپنے وطن سے نکلا اور یہ میرے وطن کی طرف چلے۔ دُور کی چیزیں آہستہ اور پاس کی اشیاء بے تحاشا دوڑتی نظر آئیں۔ جدھر دیکھا آسمان کے کنارے زمین سے ملے ہوئے معلوم ہوئے۔ اُوپر سورج تھا اور چلتے پھرتے بادل۔ نیچے دھوپ تھی اور چھاؤں کے ٹکڑے کبھی یہاں کبھی وہاں۔ انجن کی طرف کبھی کبھی سیاہ گھٹا وُور نظر آتی تھی۔ مگر تھوڑی دیر میں ٹرین دھوپ میں سے نکل کر بادلوں کے سایہ میں آجاتی اور ہر طرف اندھیرا چھا جاتا۔ بادل کی گرج جسے گھر میں سُن کر ڈر لگا کرتا تھا اب یہاں سُنائی ہی دیتی تو بہت ہلکی۔ یہ کیفیت بھی تھوڑی دیر میں بدل جاتی اور ٹرین اندھیرے کو چھوڑ کر روشن مطلع میں آجاتی۔

جب کوئی سٹیشن قریب آنے کو ہوتا تو انجن ٹرین کو پلیٹ فارم پر لانے کے لئے پٹڑی بدلتا اور پھر کونسا لڑکا ایسا ہوگا جس کا منہ کھڑکی سے باہر ہو اور انجن کو اس حال میں دیکھ کر تالیاں نہ بجانے لگے۔ چھوٹے اسٹیشنوں پر ریل کے ٹھہرتے ہی مسافروں کی بھاگ دوڑ گارڈ کا اپنی گاڑی سے اُتر کر انجن تک خطِ مستقیم جانا اور پھر ہری جھنڈی دکھا کر ٹرین کو چلتا کرنا اس کے بعد اپنی گاڑی کی طرف آ۔ چلتی ریل میں دوڑ کر پائےدان پر کھڑا ہو جانا۔ بڑے سٹیشنوں کے قریب بہت سے انجنوں کا نظارہ۔ کوئی کھڑا ہے۔ کوئی چل رہا ہے۔ کوئی صاف نظر آرہا ہے۔ کوئی دھوئیں اور بھاپ میں چھپا ہُوا ہے مگر چیختے چلاتے سب ہیں۔ پھر ٹرین کا ہلکی چال سے دفعتاً بڑی گرج اور لرزے سے سٹیشن کی اُونچی اور لمبی چھت کے نیچے داخل ہونا۔ پلیٹ فارم پر لوگوں کا ہجوم۔ قلیوں اور مسافروں کا شور۔ سودے والوں کی بے تکی بولیاں۔ ہوٹلوں اور چائے خانوں کا چمکتا ہُوا سامان۔ اگرچہ یہ سب معمولی چیزیں تھیں مگر میرے لئے تو آج دنیا کے مشاہدوں کا ایک دفتر کھل گیا تھا۔ جو نئی چیز دیکھتا چاہتا کہ والد بھی اسے دیکھیں۔ کئی دفعہ آنکھوں میں کوئلے کی راکھ بھی پڑی مگر میں دیکھنے سے نہ ہارا۔ غرض اسی حال میں چند گھنٹوں کے سفر کے بعد علی گڑھ آگیا۔ والد یہاں اُترے۔ اتنا یاد ہے کہ کسی نے آکر کہا کہ "سیّد صاحب نے گاڑی بھیجی ہے"۔ سٹیشن سے نکل کر ہم سب اُس گاڑی میں بیٹھے اور تھوڑی دیر کے بعد ایک احاطہ میں جو مجھے باغ معلوم ہُوا داخل ہوئے۔ ایک بڑے بنگلے کے سامنے برساتی میں آکر گاڑی ٹھہر گئی۔

میں نے اب تک انگریزی وضع کے مکان دُور سے دیکھے تھے۔ کبھی اُن کے اندر نہیں گیا تھا۔ گاڑی سے اُتر کر ہم کئی کمروں سے گزرتے ہوئے ایک بڑے کمرے میں آئے جو مجھے بہت وسیع معلوم ہُوا۔ اس کمرے کے سب سے بڑے دروازے میں خس کی ٹٹی لگی ہوئی تھی اور پنکھا چل رہا تھا۔ مگر کھینچنے والا نظر نہ آتا تھا۔ کمرے میں بہت سی خوبصورت کرسیاں کئی وضع کی رکھی ہوئی تھیں اور خس کی خوشبو کے ساتھ کوئی اور خوشبو بھی وہاں موجود تھی جو بہت اچھی معلوم ہوتی تھی۔ خس کی ٹٹی کے قریب ایک میز پر جس کی پوشش سبز تھی بہت سے کاغذ اور کتابیں اور کچھ چمکتی ہوئی چیزیں نہایت سلیقے اور خوبصورتی سے رکھی ہوئی تھیں۔ میز کے قریب ہی کرسی پر ایک بھاری بھرکم آدمی۔ سفید سر۔ سفید داڑھی۔ سفید لباس۔ موٹے موٹے پاؤں اور اُن میں سلیپر جو مجھے قالین کے ٹکڑے معلوم ہوتے تھے۔ شیر کا سا کلّہ۔ عینک لگی ہوئی۔ برہنہ سر بیٹھے تھے۔ یہی سیّد احمد خاں تھے جنھیں دلّی کے بعض لوگ صرف "علی گڑھ والا" کہنا کافی سمجھتے تھے اور وہ ایک خوف اور پرہیز کی چیز سمجھے جاتے تھے۔ سیّد صاحب والد صاحب کو دیکھ کر السّلام علیکم کہتے ہوئے کرسی سے کچھ جھکتے جھکتے اُٹھے اور یہ کہہ کر کہ "آپ آگئے" والد سے مصافحہ کیا۔ اور ہم دونوں بھائیوں کو دیکھ کر کہا "ارے یہ کون ہیں؟" ہم دونوں قریب گئے اور جھک کر آداب کیا۔ سیّد صاحب نے ہماری صورتیں غور سے دیکھیں۔ پھر خوب ہنسے اور والد سے باتیں کرنے لگے۔ اب میں کبھی سیّد صاحب کی صورت دیکھتا تھا اور کبھی کمرے کے ساز و سامان کو۔ فرشی پنکھے کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا۔ ہر طرف

صفائی اور سلیقہ۔ نیچے فرش پر زرد حاشیہ دے کر سُرخ اور نیلی دھاریوں کی دری اور سفید براق سی چھت گیری۔ دیواروں پر ہلکا فیروزی رنگ۔ کہیں کہیں سنہری چوکھٹوں میں تصویریں لٹکی ہوئیں۔ جن میں پہاڑ۔ سبزہ زار اور چشمے نظر آتے تھے۔ جی چاہتا تھا کہ میں بھی انہی میں کہیں ہوتا۔ آتش دان کا کارنس میرے لئے اس قدر پُرلطف تھا کہ اب بڑی سے بڑی نمائش گاہ بھی لطف نہیں دے سکتی۔ اس کارنس پر بہت سی خوبصورت رنگ برنگ کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں اور ان سب کے اُوپر دیوار میں ایک عجیب صورت کا گھنٹا لگا ہوا تھا۔ سیّد صاحب اور میرے والد جب باتیں کرتے کرتے چُپ ہو جاتے تھے تو پنکھے کی ہلکی آواز کے ساتھ اس گھنٹے کی کھٹ کھٹ میرے تصوّر میں اس کمرے کی بزرگی اور متانت کو دوبالا کر دیتی تھی۔ کارنس پر جو چیزیں آراستہ تھیں اُن میں سب سے زیادہ دلکش سنگِ مرمر کا ایک چھوٹا سا روضہ تھا جو شیشے کی صندوقچی میں رکھا ہوا تھا۔ یہ مجھے منصور کا مقبرہ معلوم ہوا جسے میں دہلی میں بار ہا دیکھ چکا تھا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تاج بی بی کا روضہ ہے۔ میں اس کو ایک کھلونا اور اُس لڑکے کو جو اس کا مالک ہو قابلِ رشک سمجھنے لگا۔ مگر یہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ اتنے اُونچے پر کیوں رکھا ہوا ہے کہ کسی لڑکے کا ہاتھ وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔

سیّد صاحب اس قدر جسیم و شحیم تھے کہ مجھ کو اپنے والد اُن کے سامنے بہت دُبلے اور مختصر معلوم ہونے لگے۔ دراں حالیکہ اس سے پہلے میں اُن کے برابر کسی کو بڑا آدمی نہ سمجھتا تھا۔

سیّد صاحب والد سے بھی باتیں کرتے جاتے تھے اور کبھی کبھی ہم دونوں بھائیوں سے بھی کوئی بات پوچھ لیتے تھے۔ میرے بڑے بھائی تو کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔ مگر میں کھڑا رہا۔ کیونکہ سخت عدیم الفرصت تھا۔ میں سیّد صاحب کے پاس کھڑا اُن کے لکھنے کی دوات کو بڑی محویت کے ساتھ دیکھنے میں مصروف تھا۔ اس دوات کا ڈھکنا مجھے بالکل شیر ببر کا سر معلوم ہو رہا تھا۔ بالکل اُسی صورت کا جس کی تصویر میری ریڈر میں بنی ہوئی تھی۔ اُس کی آنکھیں لال لال نگینوں کی طرح خوب چمک رہی تھیں۔ میں اس خواب حیرت سے اُس وقت چونکا جب سیّد صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ "تم کیا پڑھتے ہو؟" میں نے ایک ہی سانس میں جواب دیا "اُردو کی چوتھی ختم کر چکا ہوں۔ فارسی کی دوسری پڑھتا ہوں اور رائل ریڈر شروع کر رکھی ہے۔" اس سیدھے سادے جواب پر سیّد صاحب اور میرے والد بہت زور سے ہنسے۔ وجہ میری سمجھ میں نہ آئی۔ شاید میرا یہ "علم و فضل" باعث مسرّت ہوا ہو۔

یہ دونوں بزرگ باتیں بھی کرتے جاتے تھے اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد قہقہے بھی لگاتے تھے۔ سیّد صاحب نے کچھ کاغذات والد کو دیئے جب وہ اُن کو پڑھنے لگے تو سیّد صاحب لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد سیّد صاحب نے لکھتے لکھتے قلم ہاتھ سے رکھ دیا اور ایک چھوٹے سے بکس کی طرف ہاتھ بڑھا کر بڑی مہیب آواز میں کہا، "پنکھا روکو"، جس پر فرشی پنکھا فوراً رُک گیا۔ سیّد صاحب نے بکس میں سے ایک چرٹ نکال کر دیا سلائی جلائی اور جب دیا سلائی چرٹ کے قریب لائے تو مجھ کو اُن کا چہرہ اور بھی عظیم الشان اور خوفناک معلوم ہونے لگا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ خس کی خوشبو کے علاوہ جو خوشبو کمرے میں پھیلی ہوئی تھی وہ چرٹ کی تھی۔

اس آواز اور چہرے کا نقش دل پر ہوتے ہی میں سیّد صاحب سے ڈرنے لگا اور یہ اُس خوف کی ابتدا تھی جو ہمیشہ قائم رہا۔ حاضر و غائب کبھی دل سے نہ گیا۔

جس کمرے میں سیّد صاحب کی نشست تھی اُس کے قریب ہی ایک کمرہ والد کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ وہیں ہمارا اسباب رکھا گیا تھا۔ کچھ دیر سیّد صاحب کے پاس ٹھہر کر جب والد اس کمرہ میں آئے تو ہم دونوں بھائی بھی اُن کے ساتھ آئے۔ اس کمرے میں جو غسل خانہ تھا اُس کا چینی کا سامان اتنا صاف ستھرا اور میرے لئے عجیب تھا کہ بغیر اجازت کسی چیز کو برتنے کی ہمّت نہ ہوئی۔ کپڑے بدلنے کے کمرہ میں جو آئینہ دار خوبصورت میز تھی۔ اُس پر کچھ چیزیں شیشے کی بھی رکھی تھیں۔ مگر اُن سب کو مجھ سے سخت دشمنی تھی۔ کیونکہ جہاں میں نے خوش ہو کر کسی چیز کو ہاتھ لگایا۔ اور وہ آپ سے آپ ٹوٹ کر گر پڑتی تھی۔

شام ہوئی تو سیّد صاحب بنگلے سے باہر آئے۔ کوٹھی کے احاطے میں ایک طرف کو باغ تھا۔ اُس کے سرے پر ایک چبوترہ تھا۔ اُس پر بہت سی کرسیاں

رکھی ہوئی تھیں۔ کرسیوں پر بیٹھ کر سید صاحب اور میرے والد پھر باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد سید صاحب نے مجھے اپنے قریب بلایا اور میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر کہا "منہ کھولو" میں نے منہ کھولا تو کہنے لگے "ارے اس لڑکے کے منہ میں سے تو خون نکل رہا ہے توبہ۔ توبہ" میں دلی سے چلا تھا تو پان کھایا تھا۔ اس لئے دانت لال ہو گئے تھے۔ میں نے شرمندہ ہو کر جلدی سے منہ بند کر لیا اور سمجھ لیا کہ پان کھانا بری بات ہے۔

جب کچھ رات ہو گئی تو آدمی نے آکر کہا "کھانا میز پر ہے" اس پر سب لوگ اٹھے اور کھانے کے کمرہ میں آئے۔ یہاں پھر میری آنکھوں کے لئے عجیب و غریب منظر تھے۔ میز پر نہایت سفید چادر۔ چینی کے برتن۔ شیشے کے گلاس۔ چاندی کے چمچے۔ ہاتھی دانت کے دستہ کی چھریاں میز پر رکھی تھیں۔ میز پر دو بڑے شاندار لیمپ روشن تھے۔ پنکھا چل رہا تھا۔

اس سامان کو دیکھ کر مجھے اپنے گھر کا دسترخوان۔ برتن اور فتیل سوز یاد آیا۔ میری والدہ دسترخوان ہمیشہ اجلا بچھوایا کرتی تھیں۔ مگر وہ گاڑھے کا ہوتا تھا۔ اس میز پوش کی صفائی اور چمک سے اسے کیا نسبت تھی۔ برتن تانبے کے قلعی دار ہوتے تھے۔ چینی کے برتن خاص خاص کھانوں کے لئے یا جب کوئی مہمان آئے تو برتے جاتے تھے۔ شیشے کے گلاس صرف گرمیوں میں یا رمضان شریف میں افطاری کے وقت نکالے جاتے تھے۔ مامائیں ان کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتی تھیں۔ چھریاں اور چاندی کے کانٹے تو میں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے تھے۔ گھر کا فتیل سوز اگرچہ روزمرہ منجھوایا جاتا تھا مگر اس کی صورت شکل اور ٹمٹماتی ہوئی روشنی ان لمپوں کی صاف اور تیز روشنی کے سامنے کیا حقیقت رکھتی تھی۔

باتیں کرتے اور قہقہوں پر قہقہے لگاتے سب لوگ میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ تین چار سفید پوش ملازم اور ایک بہت بڑی لمبی داڑھی کا دبلا پتلا سو کھا مگر بہت چست و چالاک اور تیز خانساماں طرح طرح کے کھانے سامنے لاتا تھا۔ اور سب لوگ چمچوں سے حسب ضرورت کھانا اپنی رکابی میں نکال کر کھاتے تھے۔ ہم دونوں بھائیوں کی رکابیوں میں بڈھے خانساماں نے اپنے ہاتھ سے کھانا نکال کر دیا۔ کھانے کے ذائقہ کی نسبت میں نے غور نہ کیا مگر یہ یقین ہے کہ وہ گھر جیسا نہ تھا۔ اور سچی بات یہ ہے کہ میں نئی نئی چیزوں کے دیکھنے میں ایسا مصروف تھا کہ کچھ سمجھ ہی میں نہ آیا کہ کیا کھا رہا ہوں۔

جب ہم دونوں کھانا کھا چکے تو سید صاحب نے ایک نوکر سے کہا کہ "ان بچوں کو ان کے پلنگوں پر لے جا کر سلا دو۔"

صبح ہوتے ہی چڑیوں کی آواز پر آنکھ کھلی۔ میں بے انتہا خوش تھا۔ جتنی چیزیں اب تک دیکھی تھیں ان کی نسبت بیسیوں سوال والد سے کرتا تھا۔ اور بار بار پوچھتا تھا کہ الہ آباد میں یہ سب چیزیں ہونگی یا نہیں؟ والد کبھی تو جواب دے دیتے تھے۔ کبھی ہنس کر چپ ہو جاتے تھے۔

والد نے علی گڑھ میں دو دن قیام کیا۔ پھر الہ آباد روانہ ہو گئے اور دوسرے دن سورج ابھی نہیں نکلا تھا کہ وہاں پہنچ گئے۔

ساڑھے آٹھ برس کی عمر میں سید صاحب کی طرز معاشرت پر میرا چھوٹا سا دماغ غور کرنے کے قابل تو کیا ہوتا۔ مگر ان کے بنگلہ کی بہت سی چیزیں ایسی تھیں کہ جی چاہتا تھا میرے پاس بھی ہوتیں۔ اب یہ شوق پیدا ہوا کہ جہاں بھی رہوں وہاں کی ہوا ایسی ہی اچھی ہو۔ ایسے ہی کھلے میدان ہوں۔ باغ ہو۔ باغوں کے پھولوں کے پودے ہوں۔ گرد و پیش کی سب چیزیں صاف ستھری چمکتی ہوئی ہلکے ہلکے رنگوں کی ہوں۔ اور کوئی چیز میلی اور خراب نہ ہو۔ یہ ایسا خیال تھا جس کا بہت کچھ اثر طبیعت پر تمام عمر غالب رہا۔"

شمس العلماء مولوی نذیر احمد

قاری عباس حسین

موضع ریڑھ ضلع بجنور کے ایک شریف مگر غریب خاندان کے ایک صاحبزادے جن کا نام نذیر احمد تھا مذہبی تعلیم مکمل کرنے کی غرض سے دلّی آئے۔ جس طرح بہت سے بچے حصولِ تعلیم کے لئے دلّی آیا کرتے تھے۔ کیونکہ دلّی علم و فضل کا مرکز اور تعلیم و تربیت کا گہوارہ تھی جہاں سے ہر کس و ناکس فیض پاتا اور تعلیم حاصل کرتا۔ لاتعداد طلبا دوسرے شہروں سے یہاں آتے کیونکہ آنے والوں کو دلّی میں معاشی فراغت میسر آتی اور وہ اسی ذریعہ حصولِ معاش کی غرض سے مدتوں رہتے۔ دلّی آتے ہوئے یہ طلبا دینیات کے مدرسوں میں جو اکثر مسجدوں سے ملحق ہوتے ہیں، داخل ہوا کرتے تھے۔ اکثر و بیشتر حالات میں ان کے کھانے پینے کی صورت یہ ہوتی تھی کہ دلّی کے لوگ شادی و غمی کے موقعوں پر اسلامی درسگاہوں میں زیرِ تعلیم بچوں کو کھانا کھلانے کی غرض سے بلاتے اور جب بھی کہیں سے دعوت ہوتی تو پندرہ بیس یا زیادہ تعداد میں بھی لڑکے وہاں جا کر کھانا کھاتے ورنہ مختلف طور پر مختلف لوگوں کے ہاں سے دونوں وقت کی روٹی مقرر ہو گئی اور یہ لڑکے کھانے کے وقت اپنا کھانا جا کر لاتے۔ نذیر احمد نے بھی اسی طرح تعلیم حاصل کی۔ نہ ان کے جسم پر ڈھنگ کے کپڑے تھے نہ سونے کے لئے بستر بلکہ ہوتا یہ تھا کہ یہ رات کو مسجد کی ٹاٹ کی کسی صف میں لپٹ کر پڑ رہتے۔ اکثر صبح ایسا ہوتا کہ مؤذن لات مار کر انہیں لڑھکا دیا کرتا اور یہ اپنے شاندار بستر میں سے اس طرح نکل آتے جس طرح بازی گر کی پٹاری میں سے کوئی جانور یا پتلی وغیرہ نکل آتا ہے۔ نذیر احمد مولوی عبدالخالق صاحب کے گھر روٹی کھاتے تھے۔ اور چونکہ عمر کے چھوٹے تھے اس لئے ان سے کوئی پردہ بھی نہ تھا اور گھر کا کام کاج مثلاً جھاڑو دینا، مسالہ پیسنا وغیرہ کی خدمات انجام دیتے تھے۔ مولوی صاحب کی پوتی مسالہ خراب پیسنے پر کبھی کبھی بٹے سے ان کے ہاتھ کچل دیتیں۔ ان سب محنتوں اور ریاضتوں سے نذیر احمد نے اپنی تعلیم جاری رکھی۔ اپنی ذہانت کی وجہ سے قدیم دلّی کالج میں داخلہ لیا۔ ذکاء اللہ اور محمد حسین آزاد کے ساتھ پڑھے عربی میں اعلیٰ استعداد حاصل کی اور مولوی کہلانے لگے۔ اللہ کی شان مولوی عبدالقادر صاحب کی لڑکی سے جو مرچوں بھرے ہوئے بٹے سے ان کا ہاتھ کچلتی تھیں، نذیر احمد کی شادی ہوئی۔ جب مولوی نذیر احمد فارغ التحصیل ہو گئے تو فکرِ معاش میں سرگرداں پھرے۔ ایک دن ایک صاحب بہادر کے پاس پہنچے جو ڈائرکٹر تعلیمات تھے، جیب سے اپنی ڈگری نکال کر سامنے رکھ دی اور کہا کہ یا تو نوکری دلوائیے ورنہ میں اُپلوں کی ڈنڈی لے کر بیٹھوں گا اور اس ڈگری کو وہاں لٹکا دوں گا۔ ڈائرکٹر صاحب نے متاثر ہو کر مدرسی کی ایک جگہ انہیں دے دی۔ یہ سرکاری ملازمت اور سرکاری اعزازات کی پہلی سیڑھی تھی جس پر چڑھ کر مولوی نذیر احمد صاحب نے انتہائی اعزازات اور شہرت حاصل کی۔ انہیں قانون کی اور ڈاکٹری کی

ڈگری بھی ملی اور خان بہادر و شمس العلماء کے خطاب بھی۔ اور حیدر آباد میں کئی ہزار تک کی تنخواہ ہوئی اور مرتے دم تک پندرہ سو روپیہ ماہوار پنشن ملتی رہی چونکہ اکثر میری والدہ ماجدہ "اصغری اکبری" پڑھا کرتی تھیں اس نام سے ڈپٹی صاحب کی کتاب مراۃ العروس عورتوں میں یاد کی جاتی تھی اس سے مولوی نذیر احمد صاحب کا نام تو دل پر نقش تھا ہی۔ انہیں دیکھنے کو بھی جی چاہتا تھا۔ یہ تمنا اس طرح پوری ہوئی کہ جب میری عمر تقریباً گیارہ برس کی ہوگی تو ڈپٹی صاحب کے خاندان میں کوئی شادی تھی۔ اس شادی میں سب سے پہلے میں نے ڈپٹی صاحب کو دیکھا۔ چونکہ ڈپٹی صاحب کو دیکھنے کا خاصا شوق تھا اس لئے ان کی اس وقت کی تصویر اب بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ موزوں قد، گٹھا ہوا بھرا بھرا جسم، چھدری داڑھی، لبیں کتری ہوئی نہیں منڈی ہوئی، سر پر ترکی ٹوپی، جسم پر شیروانی مگر معمول سے نیچی گھٹنوں اور ٹخنوں کے درمیان تک لٹکتی ہوئی، آواز گرجدار ——— ابا جان نے سلام کرایا، انہوں نے سر پر ہاتھ رکھ کر جب نام پوچھا تو ان کی آواز کی کڑک سے میں کچھ گھبرا سا گیا۔ میرے اس بیان سے معلوم ہوگا کہ ڈپٹی صاحب کے لہجہ میں کرختگی ہوگی۔ یہ بات نہیں تھی بلکہ بات یہ تھی کہ ڈپٹی صاحب کی آواز میں لوچ کم تھا۔ اپنی آواز کی اس خصوصیت کی وجہ سے وہ بہت کامیاب مقرر تھے اور اچھے بڑے مجمع میں ان کی آواز سب کو سنائی دیتی تھی۔

ہاں تو ڈپٹی صاحب کو پہلی مرتبہ دیکھنے کے بعد بہت دفعہ ان کو دیکھنے کا اتفاق ہوا اور ان کے متعلق سننے کا اتفاق تو اتنا ہوا کہ اس زمانہ کے کسی شخص کا نام اتنا زیادہ سننے میں نہیں آیا۔ اس لئے کہ جوں جوں بڑا ہوتا گیا ڈپٹی صاحب کا نام زبان زدِ خاص و عام پایا۔ پہلے پہلے تو بحیثیت مصنف ان کی تعریف سنی، پھر بحیثیت مقرر کے۔ لیکن بعد میں ان کی برائیاں زیادہ ہونے لگی تھیں۔ ڈپٹی صاحب کے ترجمہ قرآن مجید کے بعد عوام میں اور خصوصیت کے ساتھ اس زمانہ کے علماء میں ڈپٹی صاحب کی مذمت اتنی بڑھ گئی تھی کہ شاید ہی کوئی محفل یا مجمع ایسا ہوتا ہوگا جہاں کسی نہ کسی طرح ڈپٹی صاحب کا ذکر اور وہ بھی برائی کے ساتھ نہ آتا ہو۔ ایک دن شام کا وقت تھا ڈپٹی صاحب، عبدالرحمٰن صاحب کے (جو ڈپٹی صاحب کی ترغیب کی بدولت وکیل، دلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور ہائی کورٹ کے جج اور سر ہوئے) والد کی دوکان پر بیٹھے تھے کہ برابر سے ایک صاحب کی آواز آئی۔ وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے "وہ بیٹھا ہے نیچری" کہہ کر خدا رنے انگلی سے اشارہ کیا۔ میری نگاہ بھی اس طرف گئی۔ دیکھا کہ ڈپٹی صاحب بیٹھے ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد صاحب عقائد کے اعتبار سے سر سید احمد سے متفق نہ تھے اور بعض امور میں ان کے اور سر سید احمد کے درمیان بنیادی اختلافات تھے۔ لیکن عام طور پر ڈپٹی نذیر احمد صاحب سے ممتاز لوگوں کی شدید مخالفت کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ وہ بڑے ضدی اور غصیل آدمی تھے۔ اپنے علم پر انہیں اتنا اعتماد تھا کہ کسی کو اپنے آگے گردانتے نہ تھے۔ دوسرے زبان دانی کے غرّے میں رسمی ادب آداب کو بالائے طاق رکھ دیتے تھے۔ کلام مجید کے بامحاورہ ترجمہ پر مولویوں نے بہت شورش برپا کی ——— ویسے تو سر سید اور ان کی پارٹی کی مخالفت میں بھی علماء پیش پیش تھے لیکن ڈپٹی صاحب کی مخالفت میں علماء نے اس قدر زور مارا کہ ڈپٹی صاحب کے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ اپنی کتاب امہات الامہ کو نذرِ آتش کرا دیں۔ ڈپٹی صاحب کے خلاف جو ہنگامہ برپا ہوا اور ان کے خلاف الحاد اور کفر کے جو فتوے تیار ہوئے اور انہیں قتل کئے جانے کی جو دھمکیاں دی گئیں ان کو دیکھتے ہوئے اگر ڈپٹی صاحب کے کردار پر نظر ڈالی جائے تو سخت تعجب معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ڈپٹی صاحب عقیدتاً ہی ایک کٹر مسلمان نہ تھے بلکہ عملی طور پر بھی ایک سچے اور پکے مسلمان تھے۔ ڈپٹی صاحب پر سب سے بڑا الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے اسلام کی تضحیک اور توہین کی لیکن جو لوگ مولانا نذیر احمد سے واقفیت رکھتے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ——— ان پر شوخ نویسی اور محاوروں کی بے احتیاطی کے استعمال کا الزام لگایا جائے تو لگایا جائے لیکن ان کے متعلق یہ کہنا کہ وہ اسلام کی تضحیک اور اکابرینِ دین کی توہین کرتے تھے، غلط ہے۔ ڈپٹی صاحب مرحوم کی تصانیف اس کا کافی ثبوت ہیں اور مجھے تو ذاتی طور پر معلوم ہے کہ ڈپٹی صاحب اسے کسی حالت میں بھی گوارا نہ کرتے تھے کہ کوئی شخص اشارتاً، کنایتاً، مزاحاً کوئی ایسی بات مذہب کے بارے میں کہے جس سے استہزا کا پہلو نکلتا ہو بلکہ اس بات پر وہ سخت ناراض ہوتے تھے۔ میں اس سلسلہ میں ایک واقعہ کا ذکر کروں گا۔ "رسالہ تمدن" کے پہلے پرچے میں، جو جون ۱۹۱۱ء میں علامہ راشد الخیری اور شیخ محمد اکرام صاحب بیرسٹر نے دلّی سے جاری کیا تھا۔ والد ماجد قاری سرفراز حسین مرحوم کا ایک مضمون شائع ہوا جس کا عنوان تھا

"انسان فرشتہ کی عینک سے" اس مضمون کو دیکھ کر ڈپٹی صاحب جس قدر ناراض ہوئے اس کی کیفیت علامہ راشد الخیری نے اس طرح بیان کی:

> "یہ مضمون جب مولانا مرحوم نے پڑھا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ بدن کانپ رہا تھا۔ ناخوش ہوئے اور میرے سامنے ایک مختصر سا لکچر شروع کیا ——— وہ وقت میری آنکھوں کے سامنے ہے کہ رسالت مآب کا نام آتے ہی ان کی حالت بگڑ گئی، زار زار رونے لگے اور مجھ سے فرمایا اگر اجرائے "تمدن" کا مقصد اسلام کی تضحیک ہے تو آئندہ مجھے صورت نہ دکھانا ———"

جو بزرگ، مذہب کے متعلق اس درجہ شدید جذبات رکھتا ہو اس پر کفر کے فتوے لگائے گئے اور اس کی تصنیف جلائی گئی۔ یہ میری آنکھوں دیکھی باتیں ہیں۔ غالباً سنہ ۱۹۱۱ء کے جاڑوں کا ذکر ہے کہ اجمیری دروازہ کے باہر عربک اسکول دہلی کے کھیل کے میدان میں ندوۃ العلماء کا جلسہ ہوا۔ تمام ہندوستان سے بڑے بڑے مولوی آئے۔ عربک اسکول کے بورڈنگ ہاؤس میں مہمانوں کے ٹھہرنے کا انتظام تھا۔ عربک اسکول کے بہت سے طالب علم ان مہمانوں کی خاطر مدارات اور جلسہ کے انتظام کے لئے والنٹیر بنے تھے۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔ اس جلسہ کی بہت سی خصوصیات تھیں لیکن ——— سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ مولوی نذیر احمد پر نہایت شدید لعن طعن ہوئے، کفر کا فتویٰ لگایا گیا اور ان کی تازہ ترین تصنیف "امہات الامہ" نذرِ آتش کی گئی۔ اس جلسہ میں مولوی صاحبان نے درشت کلامی کا جو مظاہرہ کیا وہ حد درجہ نامناسب تھا۔ ایک ایک مولوی اٹھتا تھا اور انتہائی درشت آواز میں سخت الفاظ کہتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ مولوی نذیر احمد پر سب وشتم کرکے وہ اسلام کی کوئی بڑی خدمت انجام دے رہا ہے۔ مقررین جوش میں آپے سے باہر ہو جاتے تھے اور ایسے جملے استعمال کرتے تھے جو کوئی پڑھا لکھا آدمی تو کیا جاہل عوام آپس کی لڑائی جھگڑے میں بھی استعمال نہ کرتے تھے۔ علماء کا یہ جلسہ تھا جس نے علماء کرام کے اس احترام کو جو میری گھٹی میں پڑا ہوا تھا، بہت کچھ متزلزل کر دیا۔ جلسہ میں جو جوش تھا اور ڈپٹی صاحب کے خلاف جو آگ لگائی گئی تھی اور اسے جس طرح ہوا دی جا رہی تھی اگر اس کو فرو کرنے کی کوشش نہ کی جاتی تو اس کا قوی اندیشہ تھا کہ کوئی سرپھرا جاہل ڈپٹی صاحب کو قتل کر دیتا لیکن یقیناً یہ حکیم اجمل صاحب کا بہت بڑا کارنامہ تھا کہ انہوں نے ڈپٹی صاحب کو اس پر آمادہ کیا کہ تمام کتابیں انہیں دے دیں۔ چنانچہ جلسہ کے دوران ہی میں پنڈال کے سامنے میدان میں امہات الامہ کا ڈھیر لگایا گیا اور علماء نے اس میں آگ لگائی۔ ایک مولوی صاحب تو برسوں اس پر فخر کرتے رہے کہ میں نے اس کتاب کے ڈھیر پر تیل چھڑکا اور اس میں دیا سلائی لگانے کی اولیت کا شرف حاصل کیا۔ ایک ایسی کتاب کے جلنے پر علماء خوش ہو رہے تھے جو ایک پادری کے اسلام پر اعتراضات کے جواب میں لکھی گئی تھی اس وقت امہات الامہ جل گئی۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ کتاب صفحۂ ہستی سے مٹ گئی لیکن بہت سی کتابیں اس جلتے ہوئے ڈھیر میں سے اڑ گئی گئیں۔ چنانچہ ایک کتاب میں نے بھی اٹھالی تھی جس کا ایک کونہ جل گیا تھا جو عرصہ تک میرے پاس رہی جہاں علماء کرام کا ایک مخصوص حصہ اور ان کے جاہل پیرو امہات الامہ کے جلائے جانے پر خوش تھے وہاں ایسے لوگ بھی تھے جو علماء کی اس حرکت کو وحشیانہ سمجھتے تھے۔ شاید اسی کا ردِ عمل ہو یا لڑکوں کی شرارت مگر ہوا یہ کہ اس رات کو جب اس پنڈال میں تقریریں ہو رہی تھیں اور مولوی صاحبان جوتے اتارے ہوئے آلتی پالتی مارے کرسیوں پر رضائیوں میں دبکے بیٹھے تھے اور جلسہ پر ایک ہیجانی کیفیت طاری تھی تو ان میں سے بیشتر کی جوتیاں غائب ہوگئیں۔ بہر حال جوتیاں اس رات تو نہ مل سکیں لیکن دوسرے دن صبح کو دیکھا گیا کہ جلسہ گاہ سے کچھ دور کھائی میں جوتیوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ اور جو علماء رات کو ننگے پاؤں اپنے کمروں میں گئے تھے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اپنی جوتیاں لا رہے ہیں۔

امہات الامہ جل گئی۔ ڈاکٹر نذیر احمد کے خلاف جو ہنگامہ برپا تھا وہ کچھ نہ کچھ دب گیا۔ لیکن ان سب واقعات کا ڈپٹی صاحب پر بہت گہرا اثر ہوا۔ وہ اس حادثہ کے بعد زیادہ دن نہ جی سکے اور جب تک جیتے انہوں نے ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔ اب تک آپ نے جو کچھ پڑھا وہ زیادہ تر اس عظیم المرتبت شخصیت کے متعلق میرے ذاتی تاثرات تھے جو اپنی ذاتی کوشش سے بامِ رفعت پر پہنچے۔ اب مختصراً وہ حالات بھی سُن لیجئے جن سے ان کی تدریجی ترقی پر

روشنی پڑتی ہے۔

نذیر احمد سنہ ۱۸۴۵ء میں دلی آئے اور بہت بڑے فاضل، صاحبِ کمال، جید عالم حضرت مولانا عبدالخالق کے شاگرد ہو گئے۔ مولوی عبدالخالق نے جو علمی ادبی فنون کے ماہر تھے نہایت شفقت فرمائی اور نذیر احمد کو علم و فضل کے مکمل اور کامیاب راستوں پر سے گزرنے کا سلیقہ سکھایا۔ انہی ایام میں مولوی مملوک علی صاحب ایک باشرع بزرگ جو دلی کالج میں عربی کے پروفیسر تھے اور ایک قابل ہستی مانے جاتے تھے، انہوں نے مولانا نذیر احمد کو تلمذ ہی میں بھانپا اور دلی کالج میں اصرار کے ساتھ داخل کرا دیا جہاں مولانا نذیر احمد نے عربی، فلسفہ اور ریاضی کی تعلیم مکمل کی اور اسناد حاصل کیں اور اب یہ بالکل مجلا ہو گئے۔ مسٹر ٹیلر جو دلی کالج کے پرنسپل تھے، ان پر مولانا کی بافہم و ذکا شخصیت کا بہت گہرا اثر ہوا اور مسٹر ٹیلر نے از راہِ محبت و حسنِ خلوص ——— مولانا نذیر احمد کو انگریزی پڑھنے کی ترغیب دی۔ جس پر مولانا نے انگریزی کی تعلیم بھی حاصل کرنی شروع کر دی۔

دلی کالج میں مولانا نذیر احمد کے ہم سبق ساتھیوں میں مولانا محمد حسین آزاد، مولوی ذکاء اللہ، منشی کریم الدین، و لالہ پیارے لال آشوب تھے جو ہمیشہ مولانا کے قریب ترین اور صفِ اول میں رہے۔ مولانا نذیر احمد کی زندگی نہایت سادہ رہی اور مزاج کی کیفیت نہایت مہذب تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ مولانا کی طبیعت میں بلا کی ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور وہ اس وجہ سے بھی مشہور تھے۔ باوجودیکہ وہ بڑے جزرس تھے تاہم وہ اپنا فرض سمجھتے تھے کہ جب بھی موقع ملے غریب شریف گھرانے کے بچوں کی مدد کی جائے۔ اور مولانا نے بطور مدد اپنا بہت کافی روپیہ حسب المقدور اس نیک کام پر خرچ کیا اور بہت سے لڑکوں کی مالی مدد کی۔

۱۸۹۷ء میں مولانا نے شمس العلماء کا خطاب پایا۔ ۱۹۰۲ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ڈی۔ او۔ ایل کی ڈگری لی۔ جس وقت مولانا کو گورنر پنجاب نے جو وائس چانسلر تھے ڈگری پیش کی تو مولانا کی قابلیت و فہم و ذکا کی بہت تعریف کی۔ گو شروع میں مولانا نے پنجاب کے ایک ضلع میں مدرسی کی ملازمت کی لیکن کچھ عرصے کے بعد ہی وہ ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو گئے۔ چونکہ ۱۸۵۷ء میں مولانا نے ایک انگریز عورت کی جان بچائی تھی اس کے صلے میں مولانا کو ایک طلائی تمغہ اور کچھ زر نقد انگریزی حکومت سے بطور انعام ملا تھا اور ساتھ ہی ساتھ ان کو انسپکٹر مدارس مقرر کر کے الہ آباد میں تعینات کر دیا گیا تھا جہاں انہوں نے تعزیراتِ ہند کا بے نظیر ترجمہ کیا جو آج تک مروج ہے۔ اس پر مولانا کو تحصیلدار بنانے کے بعد افسر بندوبست مقرر کیا گیا۔ اسی دوران میں مولانا کے کسی واقف کار نے حیدر آباد میں مولانا کی قابلیت کا ذکر سر سالار جنگ اول سے کر دیا اور سر سالار جنگ اول نے مولانا کو حیدر آباد دکن بلا لیا۔ حیدر آباد پہنچ کر مولانا نے سالار جنگ کے زور دینے سے انگریزی ملازمت ترک کر دی اور نظام گورنمنٹ میں مشیر مال کا عہدہ قبول کر لیا۔ انہی ایام میں مولانا نے ایک نصابِ تعلیم تیار کیا جو بہت مقبول ہوا۔ اس طرح مولانا کافی مدت تک حیدر آباد دکن میں رہے۔ ملازمت سے سبکدوش ہو کر دلی میں [illegible] تصنیفِ کتب کے شغل میں مصروف رہے اور ۱۹۱۲ء میں انتقال فرمایا۔

ریاضؔ خیر آبادی

رئیس احمد جعفری

حضرت ریاضؔ خیر آبادی بہت اچھے اور بہت بڑے شاعر تھے۔ تغزل کے بادشاہ، خمریات کے امام، قلیمِ نازک خیالی کے شہر یار ——— جو اچھے شاعر ہوتے ہیں وہ اچھی نثر لکھنے پر قدرت نہیں رکھتے، لیکن انہوں نے "حرم سرا" لکھ کر ثابت کر دیا کہ وہ وقت کے بڑے اچھے ناول نویس بھی تھے۔ اور روزنامہ "ریاض الاخبار" اور روزنامہ "صلح کل" نکال کر دنیا سے یہ اعتراف بھی کرا لیا کہ وہ جلیل القدر انشا پرداز اور صحافی تھے۔ ان کی ادبی زندگی انہی خصائص پر قانع نہ تھی وہ بلند پایہ طنز نگار اور ثقہ مزاح نگار بھی تھے۔ جیسی لطیف طبع پر ہفتہ وار "فتنہ" نکالتے تھے جس نے ملک کے ادبی حلقوں میں دھوم مچا دی۔ بہت جلد یہ "فتنہ"، فتنۂ قیامت بن گیا۔ میٹھی میٹھی چٹکیاں، دل آویز چٹکلے، دل میں کھب جانے والے طنز و تعریض کے تیر، نئی نئی اور پھڑکتی ہوئی اصطلاحیں، نئے نئے اور بولتے ہوئے محاورے، نئے نئے اور کشت زار زعفران بنا دینے والے چٹکلے ——— یہ تھا "فتنہ" ——— یہ قامت کمتر اور بہ قیمت بہتر کا مصداق، ثقہ مجلسوں میں، بزمِ بے تکلف میں، علما کے حلقوں میں، صوفیا کی خانقاہوں میں، اہلِ دل کے زاویوں میں اور اربابِ نظر کی انجمنوں میں، ریاضؔ کا کلام جھوم جھوم کر پڑھا جاتا تھا۔ اور ریاضؔ کا فتنہ ہر جگہ پہنچتا تھا، جہاں پہنچتا تھا، ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔

فتنہ کو پوچھتا ہے کوئی کس ادا کے ساتھ
چھوٹا سا وہ ریاضؔ کا اخبار کیا ہوا؟

لیکن ان سب حیثیتوں سے بالا حیثیت ریاضؔ کی یہ تھی کہ وہ بہت اچھے انسان بھی تھے، اور میں اس مختصر سے مضمون میں اسی موضوع پر کچھ عرض کروں گا۔

میں نے جب ہوش کی آنکھیں کھولیں تو ریاضؔ بوڑھے ہو چکے تھے۔ وہ شیخِ شہر بھی تھے اور شیخِ قبیلہ بھی۔ خیر آباد ایک چھوٹی سی بستی ہے، اس بستی کا ہر فرد، خواہ وہ کسی مذہب و ملت سے تعلق رکھتا ہو ان کے اعزاز و احترام پر مجبور تھا، اور یہی حالت خاندان کی تھی، خاندان میں سب طرح کے لوگ موجود تھے، تعلیم یافتہ، اعلیٰ تعلیم یافتہ، جاہل، زمیندار، ملازمِ سرکار، منصب دار، لیکن ان سب کی گردنیں ریاضؔ کو دیکھتے ہی ادب و احترام سے جھک جاتی تھیں۔ وہ کسی کو مارتے نہیں تھے، ڈانٹتے نہیں تھے، تنبیہہ بھی نہیں کرتے تھے۔ لیکن کسی کو یہ منظور نہ تھا کہ اس کی غلطی ان پر آشکار ہو۔ وہ باہمہ اور بے ہمہ آدمی تھے، سب کے ساتھ شریک اور سب سے الگ۔ بچوں کی محفل میں پہنچ کر پتنگ اڑانے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے، جوانوں کی مجلس میں شطرنج اور گنجفہ سے پوری دلچسپی لیتے تھے، اور بوڑھوں کے گروہ میں خدا و رسولؐ کی باتیں بڑے انہماک اور استغراق سے سنتے اور سناتے تھے، جب پتنگ اڑاتے تھے تو مانجھے اور ڈور کی

نزاکتوں پر، جب شطرنج اور گنجفہ کھیلتے تھے تو چالوں کے فن اور قلعہ بندی کے ہنر پر، جب ذکرِ خدا و رسول میں مصروف ہوتے تھے تو علماء، صوفیاء اور مشائخ کے احوال و سوانح پر، ان کی گل افشانی گفتار سننے سے تعلق رکھتی تھی۔

ع وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

ریاض خمریات کے امام تھے، زندگی بھر جام و مینا کی تصویریں الفاظ کے ذریعہ کھینچتے رہے۔ ریاض نے اسّی برس سے زیادہ عمر پائی اور کبھی شراب کا ایک قطرہ بھی نہ پیا، ریاض کے پیش رو اور معاصر شعرا میں بہت سے ایسے تھے جو شراب پی کر شعر کہتے تھے اور شعر کہہ کر شراب پیتے تھے۔ قدح خوار بلانوش سیہ مست، لیکن کوئی بھی شرابی ہونے کے باوجود خمریات میں وہ مقام حاصل نہ کر سکا جو بغیر پیئے ہوئے ریاض نے حاصل کر لیا۔ وہ شراب پر جب کچھ لکھتے تھے تو سماں کھینچ دیتے تھے۔ ان کی بیان کی ہوئی کیفیت محسوس ہونے لگتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا ہم بھی شرابی ہیں، اور یہ واردات ہم پر گذر رہی ہے۔

کیا کیا خوشامدیں ہیں کہ پی لوں بہار میں
بادل کے ٹکڑے سر پہ مرے چھاتے جاتے ہیں

کتنا سادہ شعر ہے لیکن کتنا سحر طراز اور اثر انگیز!
جس شخص نے یہ شعر لکھا ہے ؎

اس طرح کہ گھنگھرو کوئی چھاگل کا نہ بولے
جب جھُم سے چلیں گود میں چپکے سے اٹھا لیں!

اس کی رندانہ مزاجی اور سرمستی میں کون شک کر سکتا ہے؟ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اپنی خوبصورتی، رعنائی اور بانکپن کے باعث مطلوبِ حسیناں ہونے کے باوجود عہدِ شباب اور عہدِ شیب ہر دور میں ان کا کردار بے داغ رہا، انہوں نے بڑے سے بڑے ترغیب انگیز مواقع پر بھی شرعی حدود سے تجاوز نہ کیا۔ انہوں نے کبھی شراب نہیں پی۔ کبھی عیاشی نہیں کی۔ لیکن وہ غزل کے بہترین شاعر تھے، وہ خمریات کے اردو زبان میں موجد اور خاتم تھے۔

چھلکائیں لاؤ بھر کے گلابی، شراب کی
تصویر کھینچیں آج تمہارے شباب کی

شاید یہی شعر سن کر فراق گورکھپوری کہہ اٹھے تھے "یہ ریاض ہے یا کرشن کنہیا؟" بہت کم لوگ اس بات کا یقین کریں گے کہ ریاض کرشن کنہیا نہ تھے۔ ریاض ہی تھے۔

وہ پابندی سے نماز پڑھتے تھے۔ پابندی سے روزے رکھتے تھے، پابندی سے تلاوتِ کلامِ پاک کرتے تھے، پابندی سے اوراد اور وظائف کا سلسلہ جاری رکھتے تھے، اور اسی پابندی سے وہ احباب کی مجلس آرائیوں میں حصہ لیتے تھے، گپیں کرتے تھے، آپ بیتی سناتے تھے۔ جگ بیتی میں دلچسپی لیتے تھے شعر سناتے بالکل نہیں تھے، سُننا گوارا کر لیتے تھے۔ دوستی کا نباہ ان پر ختم تھا، جس سے ربط و تعلق کا جو رشتہ قائم ہو گیا وہ مرورِ ایام سے مستحکم ہوتا گیا، کمزور کبھی نہیں پڑا۔ دوست کی غلطیوں کو، خود غرضیوں کو، فریب کاریوں کو، وہ ایسی خندہ جبینی سے درگذر کرتے تھے، گویا یہ سانحے ان پر نہیں کسی اور پر گذرے ہیں۔ یہ نقصانات انہیں نہیں کسی اور کو پہنچے ہیں، وصل بلگرامی سے انہیں زیادہ تر نقصان ہی پہنچا۔ لیکن اس دنیا میں وصل کا سب سے بڑا سہارا ریاض کی ذات تھی، اپنے دوستوں ہی کے بارے میں انہوں نے کہا ہے ؎

شریکِ درد تو کیا باعثِ اذیت ہیں   وہ لوگ جن سے روابط تھے جسم و جاں کی طرح

اور انہی حالات سے دل برداشتہ ہو کر وہ کہہ اٹھتے تھے ؎

ریاض موت ہے اس شرط سے ہمیں منظور   زمیں ستائے نہ مرنے پہ آسماں کی طرح

لیکن کوئی تکلیف، وہ سے تکلیف دہ واقعہ بھی ان پر اس طرح اثر انداز نہیں ہوا کہ وہ کسی دوست سے راہ و رسم منقطع کر لیتے، یا اس کی دوستی سے باز آجاتے خان بہادر حبیب اللہ بھی ان کے دوست تھے جو مہاراجہ صاحب محمود آباد کے جنرل ایجنٹ تھے۔ دوستی کے باوجود دشمنی سے کبھی باز نہ آئے، مہاراجہ کے دربار میں ہمیشہ در اندازی کرتے رہے۔ ریاض بہت برہم ہوئے تو ایک دفعہ چند اشعار دل کے جلے پھپھولے پھوڑنے کو کہہ ڈالے۔

نگاہِ شیخ میں سید کی آبرو کیا ہے

لیکن سوا اس کے کہ چند احباب کو یہ اشعار سنائے، نہ کسی کو نقل دی، نہ چھاپنے کی اجازت دی، نہ دیوان میں شامل کیا۔ نہ ان اشعار کو غیر مطبوعہ کلام کے فائل میں محفوظ رکھا کہ وفات کے بعد ان سے کوئی کام لے سکتا۔ منشی نظام احمد خیر آبادی بچپن کے دوست تھے۔ ان کا انتقال ہوا تو ان کے گھر کا راستہ چھوڑ دیا۔ اسٹیشن جاتے ہوئے راستہ میں وہ گھر لازمی طور پر پڑتا تھا، ریاض سواری چھوڑ کر چکر کا راستہ اختیار کر کے پا پیادہ کھیتوں میں ہوتے ہوئے اسٹیشن جاتے اور آتے تھے۔ لیکن زندگی بھر اس راستہ سے نہیں گزرے۔

شوخی، زندہ دلی اور بذلہ سنجی ریاض کی سرشت تھی۔ قاضی سر عزیز الدین اور ان کے بھائی خان بہادر خلیل الدین نوعمری کے بے تکلف دوست تھے۔ ایک مرتبہ وہ تشریف لائے، گرمی کا موسم تھا، شربت کی ایک بوتل میز پر رکھی تھی، ریاض اور قاضی صاحب گفتگو میں مصروف تھے۔ اتنے میں حضرت وسیم خیر آبادی آتے ہوئے نظر آئے۔ وسیم صاحب ریاض کے بہنوئی تھے۔ بڑے ثقہ، متین اور بزرگ صورت ـــــ انہیں دیکھتے ہی ریاض نے بوتل کی طرف اشارہ کر کے قاضی صاحب سے کہا ؎

اُٹھواؤ میز سے مے و ساغر ریاض جلد
آتے ہیں اک بزرگ پُرانے خیال کے

وسیم صاحب تو مسکرا کر خاموش ہو گئے لیکن قاضی صاحب ہنستے ہنستے لوٹ ہو گئے۔

امین آباد لکھنؤ کے پرنس ہوٹل میں ایک مرتبہ جوش ملیح آبادی جا کر ٹھہرے۔ ان کے کمرے سے ملا ہوا ایک دوسرا کمرہ تھا جس کے دروازے بھڑے ہوئے تھے۔ جوش صاحب نے ایک مرتبہ کراچی میں خود مجھ سے یہ روایت بیان کی کہ رات کو ذرا دیر سے وہ اپنے کمرہ میں آئے اور اپنے ساتھی سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے، دوسرے کمرہ سے جو بالکل ملا ہوا تھا اور جس کا دروازہ بھڑا تھا، دفعتاً آواز آئی:

"خاموش ہو جاؤ، بک بک نہ کرو۔"

جوش صاحب نے سنی ان سنی کر دی اور باتوں میں مشغول رہے۔ اتنے میں پھر کانوں سے ایک آواز ٹکرائی:

"ایسا معلوم ہوتا ہے یہ لوگ بغیر پٹے ہوئے نہیں مانیں گے۔"

جوش صاحب آخر آفریدی پٹھان ٹھہرے۔ کہاں تک ضبط کرتے؟ آخر پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ انہوں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ اندر سے آواز آئی:

"کیا لڑنا چاہتے ہو؟"

جوش صاحب نے نہایت برہمی کے عالم میں جواب دیا:

"ہاں ـــــ لڑیں گے!"

اندر سے پھر جواب ملا:

"تو اندر آجاؤ!"

جوش صاحب نے آستینیں چڑھالیں اور کہا:

"بڑے مرد ہو تو باہر آؤ!"

جواب ملا:

"تم اندر آنے سے ڈرتے ہو! بزدل! جاؤ ہم نے معاف کیا۔"

اب جوش صاحب میں کہاں تاب — بپھرے ہوئے اندر پہنچے اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ریاض صاحب نہایت اطمینان سے بستر پر تشریف فرما ہیں۔ اب جناب، وہ بیکار رکا کیا سوال تھا۔ معانقہ ہوا، مصافحہ ہوا۔ باتیں ہونے لگیں۔ شعر و شاعری کا چرچا شروع ہوا اور ساری رات اسی طرح بیت گئی۔

ریاض کی زندگی کا ایک دور وہ تھا کہ وہ ریاض الاخبار، صلح کل، فتنہ اور امیر المطابع کے مالک تھے۔ آمدنی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ الٹے تلّے سے خرچ کرتے تھے۔ اچھے سے اچھا کھاتے تھے، اچھے سے اچھا پہنتے تھے۔ اندر اور باہر ملازموں اور ماماؤں کی ریل پیل تھی۔ اسٹاف اور عملہ کی تنخواہوں پر بہت کافی رقم ہر ماہ خرچ ہو جاتی تھی۔ لیکن ایک الم انگیز سانحہ سے متاثر ہو کر ہنگامہ آرائیوں سے کچھ ایسے دل برداشتہ ہوئے کہ چلتے ہوئے کارخانے میں تالا لگا دیا اور پاؤں توڑ کر خیر آباد میں بیٹھ رہے۔ آمدنی کاروبار سے تھی۔ وہ ختم ہوا تو آمدنی بھی بند ہو گئی۔ گورکھپور میں مولوی سبحان اللہ خان نے زنجیرِ پا بننے کی کوشش کی، لکھنؤ میں مہاراجہ محمود آباد نے ترغیب و تحریص کے اسباب پیدا کر کے روکنا چاہا، لیکن وہ کسی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ خیر آباد کے ویرانہ میں آ کر اس طرح بیٹھے کہ مر کر اٹھے ——— البتہ گورکھپور کی یاد ان کے دل سے کبھی نہ گئی!

وہ گلیاں یاد آتی ہیں جوانی جن میں کھوئی ہے
بڑی حسرت سے لب پر ذکرِ گورکھپور آتا ہے

پریم چند

جینندر کمار

پریم چند جی کا نام بچپن سے سُنتا ، دیکھتا آیا تھا ۔ یہ نام کچھ اس طرح دل و دماغ میں رچ بس چکا تھا جیسے قدیم رشیوں کے نام ، جیسے وہ دل کی بستی کے باسی ہوں ۔ ان کا کوئی جسمانی وجود بھی ہے اور وہ ہم آپ کی طرح دنیاوی کام دھندا بھی کرتے ہیں ——— اس قسم کی کوئی بات ذہن قبول نہیں کرتا تھا ۔ ۱۹۲۶ء میں یا شاید ۱۹۲۷ء میں ان کا ناول "رنگ بھومی" پڑھنے لگا ۔ اسے پڑھنے کے بعد تو میرے لئے وہ اور بھی مافوق البشر ہو گئے ۔

لیکن دن نکلتے گئے اور ادھر میرا شعور بھی بالغ ہوتا گیا ۔ ادھر اُدھر کی اطلاعات سے معلوم ہوا کہ پریم چند جی مصنّف ہی نہیں اور کسی آسمانی سرزمین میں ہی نہیں رہتے ، وہ ہم آپ ایسے انسان بھی ہیں ۔ یہ جان کر مجھے مسرّت ہوئی یہ تو نہیں کہہ سکتا لیکن یہ معلومات عجیب ضرور معلوم ہوئیں اور ان سے ملنے کا مجھے اشتیاق پیدا ہوا ۔

۱۹۲۹ء میں اچانک میں ایک کہانی لکھ بیٹھا اور میری جرأت دیکھئے کہ پہلی چیز کو ہی اس زمانے کے مشہور ہندی رسالے "مادھوری" اور اس کے معروف ایڈیٹر پریم چند جی کو بھیج دیا ۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ کہانی شکریہ کے ساتھ واپس آ گئی ۔ اتنا ہی نہیں یہ بھی مجھ سے پوچھا گیا کہ لکھنے یہ کسی کہانی کا ترجمہ تو نہیں ہے ۔ کچھ دنوں بعد میں نے ایک اور کہانی انھیں بھیجی اس بار انھیں لکھ دیا کہ یہ کہانی قابلِ اشاعت تو ہوگی نہیں لیکن پریم چند جی اس پر اپنی رائے دیں یہ میری تمنا ہے ۔ رائے نہیں دو سطروں کا یہ خط ملا ۔

"محترمی ۔ دو مہینے بعد "مادھوری" کا خاص نمبر نکلنے والا ہے ۔ آپ کی کہانی اس کے لئے چن لی گئی ہے ۔"

اور یوں پریم چند جی سے میرا تعارف ہوا اور پھر باقاعدہ خط و کتابت ہونے لگی اور بالآخر ۱۹۳۰ء میں جب میں کنبھ کے میلے پر الہ آباد گیا تو مجھے ان کا یہ خط ملا ——— "امین الدولہ پارک کے پاس لال مکان ہے لوٹتے وقت آؤ گے ہی ۔ ضرور آؤ ۔"

جنوری کا مہینہ تھا ۔ گاڑی لکھنؤ رات کے تقریباً چار بجے ہی جا پہنچی تھی ۔ اندھیرا تھا اور سردی بھی کم نہ تھی ۔ ایسے عالم میں امین الدولہ پارک کے قریب لال مکان مل تو جائے گا مگر ممکن ہے کچھ دقّت بھی ہو ۔ ایسا میں سوچ رہا تھا لیکن فی الواقع جو دقّت اور پریشانی اُٹھانی پڑی اس کے لئے میں ہرگز تیار نہیں تھا ۔

کیا مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں پریم چند جی کے یہاں جا رہا ہوں؟ جی ہاں، وہی جو شہنشاہِ ادب ہیں۔ گھر گھر جن کے نام کا چرچا ہے مجھے معلوم تھا اور بڑے فخر کے ساتھ میں ہر کسی کو یہ بتانے کے لئے بے چین تھا کہ میں ان کے، انھیں کے یہاں جا رہا ہوں۔ پانچ بجے کے لگ بھگ میں امین الدولہ پارک کی سڑک کے بیچوں بیچ آ کھڑا ہوا۔ سامان سامنے کی ایک بند دوکان کے تختوں پر لٹکا دیا۔ اکا دکا شریف لوگ سیر کی غرض سے آ جا رہے تھے۔ میں نے تقریباً ہر ایک سے پوچھا "جی معاف کیجئے۔ پریم چند جی کے مکان کا پتہ آپ بتا سکتے ہیں؟"

"پریم چند" ہر کسی نے بڑے تعجب سے کہا "کون پریم چند؟"

"جی وہی بلند پایہ ادیب، ناولسٹ، صاحب وہ ایڈیٹر بھی ہیں ——— مشہور آدمی ہیں۔"

لیکن ہر کسی نے اپنی ناواقفیت کی بنا پر مجھ سے معافی مانگی اور سیر کے لئے آگے بڑھ گیا۔

اس سڑک پر ہی مجھے چھ بج گئے۔ ساڑھے چھ بجنے لگے۔ اس عرصہ میں میں درجنوں اصحاب کو معاف کر چکا تھا۔

آس پاس مکان کم نہ تھے اور لال مکان بھی کم نہ تھے اور جہاں میں کھڑا تھا وہاں سے پریم چند جی کا مکان مشکل سے بیس گز دور تھا لیکن اس روز مجھے مہذب اور معزز لوگوں کی رہنمائی میں اس بیس گز کے معمولی سے فاصلے کو طے کرنے میں کافی دیر لگی اور کیا اسے محض اتفاق نہ کہا جائے کہ بالآخر جس شخص کی رہنمائی میں میں ان بیس گزوں کا فاصلہ طے کر کے پریم چند جی کے پاس پہنچا، سماجی حیثیت سے وہ غیر معزز اور غیر مہذب ہی تھا۔

مکان پر پہنچ کر آواز دی گئی اور جب اوپر کا کواڑ کھلا تو زینے کے نیچے سے اوپر جھانکنے پر جو کچھ مجھے نظر آیا اس کے لئے میں ہرگز تیار نہیں تھا۔ جو صاحب اوپر کھڑے تھے ان کے بڑی گھنی مونچھیں تھیں۔ پانچ روپے والی لال اٹلی کی چادر اوڑھے ہوئے تھے جو کافی بوسیدہ اور میلی تھی۔ بالوں نے آگے بڑھ کر ماتھے کو کچھ ڈھانپ سا دیا تھا اور ماتھا کافی چھوٹا معلوم ہوتا تھا۔ سر ضرورت سے زیادہ چھوٹا نظر آیا۔ کیا جیتے جی پریم چند انھیں صاحب کو سمجھنا ہوگا۔ اتنی دور سے، اتنے اشتیاق کے ساتھ میں اس شخص کے نیاز حاصل کرنے یہاں آیا تھا؟ ایک بار تو جی میں آیا کہ اگر اپنے ذہن میں پریم چند جی کی عظمت کو برقرار رکھنا ہے تو مجھے فوراً وہاں سے لوٹ جانا چاہیئے۔ پریم چند کے نام پر یہ سامنے کھڑا شخص کس درجہ معمولی، کس درجہ عام، کس درجہ دیہاتی تھا۔

خیر، میں اوپر پہنچا۔ سب کام چھوڑ کر پریم چند جی مجھے لے کر بیٹھ گئے۔ سات بج گئے، ساڑھے سات بج گئے، آٹھ ہونے کو آئے۔ باتوں کا سلسلہ ٹوٹتا ہی نہیں تھا۔ اس دوران میں میں بہت کچھ بھول گیا۔ یہ بھول گیا کہ وہ پریم چند ہیں۔ ہندی، اردو کے عظیم ادیب ہیں، یہ بھی بھول گیا ——— کہ میں ادب کے کنارے پر بھونچکا کھڑا ایک معصوم بچّہ ہوں۔ یہ بھی بھول گیا کہ لمحہ بھر پہلے اس شخص کو دیکھ کر میرے دل میں کچھ ناپسندیدگی سی پیدا ہوئی تھی۔ دیکھتے دیکھتے میں ایک انتہائی گہری اپنائیت میں گھر کر اوپری سب باتوں کو بھول گیا۔ ان کے چہرے پر بہت کچھ لکھا تھا جو پڑھنے کے قابل تھا۔ میں سوچتا ہوں کہ بادام کی میٹھی گری کے لئے کیا یہ نہایت ضروری اور ناگزیر نہیں ہے کہ اس کے اوپر کا چھلکا بہت سخت ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو بادام کو کبھی بادام بننے کا شرف حاصل نہیں ہو سکتا۔ اب وہ کسی بھی لباس میں، کسی بھی رنگ روپ میں ہوتے، میں ان کے پیر چھوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔

اب نو بج چکے تھے باتوں کا سلسلہ برابر چل رہا تھا کہ اندر سے اطلاع آئی کہ ابھی ڈاکٹر کے یہاں سے دوا لا کر نہیں رکھی گئی ایسی بھی کیا مصروفیت ہے۔ پریم چند جی اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھے حاجاتِ ضروری سے فارغ ہونے کو کہہ کر انھیں کپڑوں میں سلیپر پہن کر باہر نکل گئے۔

میرے دل پر پریم چند جی کی شخصیت کی پہلی چھاپ یہ پڑی کہ یہ شخص جو کچھ بھی ہے اس سے ذرہ برابر مختلف دکھائی دینے کا خواہشمند نہیں۔ اس شخص کو اپنے بارے میں صرف اتنا ہی علم ہے کہ لاکھوں کروڑوں انسانوں کی طرح وہ بھی ایک انسان ہے۔ اس سے زیادہ کچھ ہونے کا یا پانے کا وہ دعویدار نہ بنے گا۔

ان دنوں اپنے سرسوتی پریس بنارس سے وہ ہندی ماہنامہ 'ہنس' نکالنے کا فیصلہ کر رہے تھے، میں نے پوچھا کہ پریس چھوڑ کر، اپنے گاؤں کا گھر چھوڑ کر یہاں لکھنؤ میں ملازمت کریں، آپ کو ایسی کیا لاچاری ہے؟

میری ان سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ ہم میں کوئی برابری نہ تھی۔ اس قسم کے ذاتی سوال کو نامناسب سمجھا جا سکتا تھا لیکن میں کہہ چکا ہوں کہ اس پہلے موقعہ پر ہی ان کے تئیں میں اپنی تمام دُوری کھو چکا تھا۔ میں لاکھ چھوٹا سہی لیکن پریم چند جی اتنے بڑے تھے کہ اپنی موجودگی میں وہ مجھے ذرہ بھر بھی اپنے تئیں چھوٹا محسوس نہ ہونے دیتے تھے۔ اس سوال کے جواب میں انھوں نے بلا جھجک اپنی اقتصادی حالت یا یوں کہیئے کہ اقتصادی بدحالی کی داستان کہہ سنائی۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ پریم چند جو لکھتے ہیں وہ صرف لکھتے ہی نہیں ہیں اس کو مانتے بھی ہیں۔ اس پر زندہ بھی رہتے ہیں۔ سول نافرمانی کے دنوں میں انھوں نے سرکاری ملازمت چھوڑ دی تھی۔ کچھ دنوں تک تو اسی تحریک میں کام کرتے رہے پھر کچھ دنوں تک کانپور کے ایک اسکول میں پڑھایا کئے۔ پھر کاشی ودیا پیٹھ میں آئے۔ تحریک اس وقت بہت مدھم پڑ چکی تھی۔ سوچنے لگے کہیں ایسا تو نہیں کہ میں اور میری تنخواہ ودیا پیٹھ پر بار ہو ہو۔ اور یہی سوچ کر اسے بھی چھوڑ دیا۔ اب کیا کریں؟

"کیوں؟" میں نے کہا "آپ کے ہاتھ میں قلم ہے پھر یہ کیسا سوال کہ اب کیا کریں؟"

"نہیں جینندر" انھوں نے کہا "تمہارا خیال درست نہیں ہے۔ یہ ملک ولایت نہیں ہے۔ ولایت بن جائے یہ بھی شاید میں نہیں چاہوں گا۔" پھر بتایا کہ محض لکھنے سے کام نہیں چلتا۔ دل کو بھی تسکین نہیں ہوتی اور اخراجات بھی پورے نہیں ہوتے۔ طبیعت بے چین ہو جاتی ہے۔ پھر کن کن حالتوں میں سے گذرنا پڑا، یہ بھی سنایا۔ آخر یہاں وہاں سے کچھ پونجی بٹور کر پریس کھولا۔ لیکن بازاروالوں سے نپٹنا نہ آتا تھا۔ پریس ایک ایسا لقمۂ سخت بن گیا جو نہ نگلا جاتا تھا نہ اُگلتے بنتی تھی۔ اپنا لینا پٹے نہیں، لینداروں کو دینا بہر صورت پڑے۔ ان حالات میں پریم چند جی ایسے شخص کی حالت ناقابلِ بیان ہو گئی اور کچھ نہ سوجھا تو پریس میں تالا ڈال گھر بیٹھ گئے۔ پریس چلے نہ چلے، جان کو کب تک گھلایا جائے؟

"اب بتاؤ جینندر" وہ بولے "کیا اس حالت میں بھی نوکری نہ کرتا۔ اب اتنا تو ہے کہ روٹی چل جاتی ہے۔"

کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر انھوں نے مجھ سے پوچھا "کیا دفتر چلوگے؟"

میں چلنے کو پہلے سے تیار تھا۔ جس ڈھنگ سے انھوں نے یکے والے کو پکارا۔ اس کو پٹایا، یکے میں بیٹھے بیٹھے اس کی خیر خیریت پوچھ ڈالی، جس آسانی اور جلدی سے انھوں نے یکے والے سے اپنائیت پیدا کر لی وہ سب کہنے کی جگہ شاید یہاں نہ ہو لیکن میرے ذہن میں وہ سب کچھ بڑے خوبصورت انداز میں مرتسم ہے۔

راستے میں معاً بولے ——— "کہو جینندر، جیوتش ودیا کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟"

میں نے پوچھا "کیا آپ یقین رکھتے ہیں؟"

بولے "کیا بتاؤں۔ دفتر میں ایک صاحب بہت اچھا ہاتھ دیکھنا جانتے ہیں۔ ان کی بتائی ہوئی کئی باتیں ایسی ٹھیک بیٹھی ہیں کہ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ پوری بار یا پاکھنڈ ہے۔"

میں نے کہا "اس کا مطلب ہے آپ کو یقین ہے۔ مجھے تو کبھی نہیں ہوا۔"

بولے "اتنے لوگ اتنے زمانے سے پوری ایمانداری کے ساتھ اس کھوج میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کے اخذ کئے ہوئے نتائج کو ہم کس طرح نظر انداز کر سکتے ہیں۔"

مجھے یہ سن کر تعجب ہوا۔ میں نے کہا "تو کیا اسی بنا پر یقین کرنا ہوگا؟ خدا میں تو آپ یقین نہیں رکھتے۔"

پریم چند جی سنجیدہ ہو گئے۔ بولے "جینندر! میں کہہ چکا ہوں۔ میں خدا تک نہیں پہنچ سکتا اس لئے یقین نہیں کر سکتا۔ کیسے یقین کروں، جب میں دیکھتا ہوں کہ بچہ بلبلا رہا ہے۔ مریض تڑپ رہا ہے۔ یہاں بھوک ہے، افلاس ہے، مصیبتیں ہیں۔ اس صورت میں مجھے یہاں خدا کی حکومت نظر نہ آئے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ مشکل تو یہ ہے کہ خدا کو مان کر اسے رحمدل بھی ماننا پڑتا ہے۔ مجھے وہ رحمدلی کہیں نظر نہیں آتی ——— کیا تمہیں خدا پر یقین ہے؟"

میں نے کہا "اس سے بچنے کا راستہ مجھے نظر نہیں آتا۔"

پریم چند جی خاموش ہو گئے۔ ان کی آنکھوں کی پتلیاں گویا جم سی گئیں اور وہ کسی نقطے پر مرکوز ہو گئیں۔

دفتر پہنچ کر ان صاحب کو میرا ناٹک دکھایا گیا۔ انھوں نے کافی بحث طلب باتیں کیں۔ میرے لئے یہ کہنا مشکل تھا کہ جو کچھ بتایا گیا ہے وہ درست نہیں ہے۔ دفتر سے لوٹتے وقت پریم چند جی نے پوچھا "کہو! اب کیا کہتے ہو؟"

میں نے کہا "تبدیلی تو کر دوں گا پر میرے یقین کے نہ ہونے کی بات پوچھتے ہیں تو وہ جوں کا توں ہے۔"

یہ سن کر پریم چند جی کو افسوس ہوا۔ اس جواب میں انھیں دوسروں کے تجربوں کی توہین معلوم ہوئی۔ پریم چند جی کے دل میں بنیادی عنصر یعنی خدا کے بارے میں اگرچہ لایقینی تھی لیکن انسان کی تخلیق کردہ سائنس اور اس کے نتائج پر ان کا یقین مستحکم تھا۔ توہین، چاہے وہ کسی قسم کی ہو، اس سے انھیں سخت نفرت تھی۔ وہ کچھ بھی تھے لیکن کٹر ہرگز نہیں تھے۔ مذہب کی مخالفت لیکن جیوتش پر ان کا اس قسم کا یقین ——— یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ دیکھ کر کبھی کبھی مجھے تجسس بھی ہوا مگر میں نے ان کی زندگی میں ہمیشہ ان دونوں متضاد قسم کے نظریات کو نبھتے دیکھا ہے۔ کئی چھوٹی چھوٹی باتوں کو وہ جوں کا توں مان لیتے تھے اور کئی بڑی بڑی باتوں میں وہ بڑے بے باک اور نڈر مصلح تھے۔

رات کو جب چلنے کی بات آئی تب بولے "تو آج ہی تم چل بھی دو گے۔ میں سمجھتا تھا کہ کچھ روز رہو گے۔"

ان کے الفاظ میں کچھ زیادہ اصرار نہیں تھا۔ اصرار ان کے مزاج میں تھا ہی نہیں۔ کسی کے آنے جانے کی آسانی کے درمیان وہ کبھی اپنی خواہش کو حائل نہیں کرتے تھے۔ کسی کے کام میں خلل انداز ہونے سے وہ ہمیشہ بچتے تھے یہاں تک کہ لوگوں سے ملتے ہوئے بھی انھیں تذبذب ہوتا تھا کہ کہیں وہ ان کا وقت تو ضائع نہیں کر رہے۔ آج کے مشینی دور میں ان کے مزاج کی یہ خصوصیت بہت ہی بیش بہا تھی، ادب دوستوں کو بھلے ہی یہ پسند نہ آئے۔

پھر ۱۹۳۰ء کی قومی تحریک آگئی جس میں بہت سے لوگ جیل چلے گئے۔ اس دوران میں پریم چند جی نے "ہنس" نکالنا شروع کر دیا تھا۔ یہ خوش قسمتی ہی ہوئی کہ وہ جیل نہیں گئے۔ ان کا جیل سے باہر رہنا زیادہ سخت عبادت تھی۔ جیل میں مجھے جو ان کے خطوط ملے ان سے مجھے معلوم ہوا کہ پریم چند جی کی بدولت مجھے کیا کچھ حاصل ہوا ہے۔ شروع میں ہی پریم چند جی نے اطلاع دی ——— "میری بیوی صاحبہ بھی پکٹنگ کے جرم میں دو مہینے کی سزا پا گئی ہیں۔ کل فیصلہ ہوا ہے۔ ادھر پندرہ دن تک اسی میں پریشان رہا۔ میں جانے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ انھوں نے خود جا کر میرا راستہ بند کر دیا۔"

ان کے خطوط میں ہندی ادب پر بھی خاصی بحث ہوتی تھی اور کچھ اپنے دل کی، اپنے حالات کی اور سکھ دکھ کی باتیں بھی ہوتی تھیں۔ ایک خط میں انھوں نے لکھا:-

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ غبن ابھی تیار نہیں ہوا۔ ابھی سو صفحات اور ہوں گے۔ یہ ایک سماجی واقعہ ہے۔ میں پرانا ہو گیا ہوں اور پرانے طرز تحریر کو نبھائے جا رہا ہوں۔ کہانی کو درمیان سے شروع کرنا یا اس طرح شروع کرنا کہ جس سے ڈرامے کا سا انداز پیدا ہو جائے، میرے لئے

مشکل ہے۔"

ان کی اقتصادی حالت کا اندازہ اس خط سے کیجئے :-

"پیارے جیندر!

تمہارا خط کئی دن کے بعد ملا۔ مجھے اُمید تھی کہ دہلی دُگھر سے آ رہا ہوگا لیکن آیا لاہور (ریڈیو) سے۔ خیر لاہور (ریڈیو) ملتان (ریڈیو) سے کچھ کم دُور ہے۔ اس سے کئی دن پہلے میں نے ملتان بھی ایک خط بھیجا تھا شاید وہ لوٹ کر آ گیا ہو۔ تمہیں مل گیا ہو۔ اچھا میری کہانی سنو۔ "ہنس" کی ضمانت مانگی گئی۔ میں سمجھا تھا آرڈیننس کے ساتھ ضمانت بھی ختم ہو جائے گی لیکن نیا آرڈیننس آ گیا اور اس کے ساتھ ضمانت بھی بدستور قائم رہی۔ جون اور جولائی کا شمارہ ہم نے چھپانا شروع کر دیا ہے لیکن جب منیجر صاحب نیا ڈیکلریشن دینے گئے تو مجسٹریٹ نے رسالہ جاری کرنے کی اجازت نہ دی۔ اگر ضمانت گھٹ گئی تو رسالہ فوراً نکل آئے گا۔ چھپ، کٹ، سِل کر تیار رکھا ہے۔ اگر اجازت نہ ملی تو معاملہ ٹیڑھا ہو جائے گا۔ میرے پاس نہ روپیہ ہے نہ پرامیسری نوٹ۔ سکیورٹی کسی سے قرض لینا نہیں چاہتا۔ یہ سال کا آغاز ہے چار پانچ سو وی۔ پی جاتے تو کچھ روپے ہاتھ آتے۔ لیکن اب شاید ایسا نہیں ہو سکے گا۔

"اس دوران میں میں نے "جاگرن" ایک رسالہ لے لیا ہے۔ جاگرن کے بارہ شمارے نکلے لیکن خریداروں کی تعداد دو سو سے آگے نہ بڑھی۔ اشتہار تو ویاس جی نے بہت کیا لیکن کسی وجہ سے رسالہ نہ چلا۔ انھیں اس پر تین ہزار روپیہ کا گھاٹا رہا۔ وہ رسالے کو بند کرنے جا رہے تھے، مجھ سے بولے اگر آپ اسے نکالنا چاہیں تو لے لیں۔ میں نے اسے لے لیا۔ ہفتہ وار اخبار کی صورت میں نکالنے کا ارادہ ہے۔ پہلا شمارہ اس جنم اشٹمی سے شائع ہوگا۔ میرا ارادہ بھی ایک ہفت روزہ اخبار نکالنے کا تھا۔ یہ سب سامان تمہارے ہی لئے ہے۔ میں جب تک اسے چلاتا ہوں اس کے بعد یہ تمہاری ہی چیز ہوگی۔ سرمائے کا فقدان ہے۔ "ہنس" میں کئی ہزار کا گھاٹا اٹھا چکا ہوں لیکن ہفتہ وار اخبار نکالنے کے لالچ کو نہ روک سکا۔ کوشش کر رہا ہوں کہ اخبار عوام الناس کے رجحانات کا آئینہ دار ہو۔ اس کام میں بھی ہزاروں کا گھاٹا ہوگا لیکن کیا کروں یہاں تو زندگی ہی ایک مسلسل گھاٹا ہے۔"

ایک گلے کا خط دیکھئے :-

پیارے جیندر!

آداب عرض! بھئی واہ۔ مانتا ہوں۔ جون گیا، جولائی گیا اور اگست کا مہینہ بھی جانے والا ہے لیکن حضور کو یاد ہی نہیں۔ کیوں یاد آئے۔ بڑا آدمی ہونے میں یہی تو عیب ہے۔ روپے تو ابھی کہیں سے ملے نہیں لیکن شہرت تو مل ہی گئی ہے اور شہرت یافتہ شخص سرمایہ دار شخص سے کم بھلکڑ اور مغرور نہیں ہوتے۔

اچھا دل لگی چھوڑو۔ یہ بات کیا ہے؟ تم کیوں مجھ سے تنے بیٹھے ہو۔ نہ کہانی بھیجتے ہو نہ خط۔ کہانی نہ بھیجو خط تو بھیجتے رہو۔ میں تو ادھر بہت پریشان رہا۔ یاد نہیں آ رہا کہ پہلے بھی یہ داستان لکھ چکا ہوں یا نہیں۔ بیٹی کے یہاں بچہ پیدا ہوا اور زچگی میں ہی اُسے بخار نے جکڑ لیا۔ مرتے مرتے بچی۔ ابھی تک نیم جان ہے۔ بچہ بھی کسی طرح بچ گیا ہے۔ آج بیس روز ہوئے یہاں آ گئی ہے۔ اس کی ماں بھی دو مہینے اس کے ساتھ رہی۔ میں تنہا رہ گیا تھا۔ بیمار پڑا، دانتوں میں تکلیف ہوئی مہینوں اس میں لگے دست آئے اور ابھی تک کچھ نہ کچھ شکایت باقی ہے۔ دانتوں کے درد سے بھی پنڈ نہیں چھوٹا۔ بڑھاپا بذاتِ خود

ایک مرض ہے اور اب اس نے قبول کروالیا ہے کہ میں اس کے نیچے آچکا ہوں۔

کام کی کچھ نہ پوچھو۔ بے ہودہ کام کر رہا ہوں۔ کہانیاں صرف دو لکھی ہیں، اُردو اور ہندی میں۔ ہاں کچھ ترجمے کا کام کیا ہے۔

'سرسوتی' (ایک رسالہ) میں تم نے وہ نوٹ دیکھا؟ آج معلوم ہوا کہ یہ فلاں صاحب کی نوازش ہے۔ میں تو خیر بوڑھا ہو گیا ہوں۔ جو کچھ لکھ سکتا تھا لکھ چکا اور دوستوں نے مجھے آسمان پر بھی چڑھا دیا لیکن تمھارے ساتھ یہ کیسا سلوک؟ اور یہ چترسین (ہندی کے ایک مانے ہوئے ادیب) کو کیا ہو گیا ہے کہ 'اسلام کا وِش ورکش' (اسلام کا زہریلا درخت) لکھ ڈالا۔ اس پر ایک تنقید تم لکھو اور کتاب میرے پاس بھیجو۔ اس فرقہ وارانہ پروپیگنڈے کا زوروں سے مقابلہ کرنا ہوگا ......"

حالات نے ان پر کبھی رحم نہیں کیا۔ پریم چند جی نے بھی ان سے کبھی رحم نہیں مانگا۔ وہ مسلسل جدوجہد کرتے رہے۔ پوری عمر اسی میں گذاری پھر بھی نئے مصائب کا سامنا کرتے ہوئے انھیں خوف نہ آتا تھا۔ وہ بچتے نہ تھے، قرض سے کتراتے نہ تھے۔ پیسے کا انھیں لالچ نہیں تھا ہاں گھاٹے کا ڈر ضرور تھا۔ آمدنی چاہے کوڑی کی نہ ہو لیکن اوپر سے گھاٹے کا بھوت تو منہ پھاڑے کھانے کو نہ دوڑے۔ اتنا ہی چاہیئے لیکن اتنا بھی نہیں ہوا۔ اس گھاٹے نے ان کی کمر توڑ دی۔ 'ہنس' چلایا 'جاگرن' چلا۔ دونوں ان کا تن من تو لیتے ہی تھے اوپر سے پیسہ بھی مانگتے تھے۔ پیسہ ان کے پاس دیتے اور مسلسل دیتے چلے جانے کے لئے کہاں تھا۔ آخر فلمی دنیا کی طرف سے آئے ہوئے ایک دعوت نامہ پر انھیں غور کرنا پڑا۔ ۲۰ را پریل ۱۹۳۴ء کو انھوں نے ایک خط میں لکھا:۔

"...... تمھارا خط عین انتظار کی حالت میں ملا۔ تم سے مشورہ کرنے کی خاص ضرورت آپڑی ہے۔ بمبئی کی ایک فلم کمپنی مجھے بلا رہی ہے۔ تنخواہ کی بات نہیں کنٹریکٹ کی بات ہے۔ [illegible] روپے سالانہ۔ میں اس حالت پر پہنچ گیا ہوں جب میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا کہ یا تو وہاں چلا جاؤں یا اپنے ناول کو بازار میں فروخت کروں۔ میں اس سلسلے میں تمھاری رائے ضروری سمجھتا ہوں۔ کمپنی والے حاضری کی کوئی قید نہیں رکھتے۔ میں جو چاہوں لکھوں، جہاں چاہے لکھوں، ان کے لئے چار یا پانچ سینریو تیار کر دوں۔ سوچتا ہوں کہ ایک سال کے لئے چلا جاؤں۔ سال بھر وہاں رہنے کے بعد کچھ ایسا کنٹریکٹ کر لوں کہ یہیں بیٹھے بیٹھے تین چار کہانیاں لکھ دیا کروں اور چار یا پانچ ہزار روپے مل جایا کریں۔ اس لئے 'جاگرن' اور 'ہنس' دونوں مزے سے چلیں گے اور پیسے کی دقّت جاتی رہے گی۔ پھر ہماری دونوں چیزیں دھڑلّے سے نکلیں گی۔"

میرے اور دوسرے دوستوں کے مشورہ نہ دینے پر بھی وہ بمبئی گئے۔ اقتصادی حالت نے مجبور کر دیا لیکن تجربے نے بتایا کہ وہ وہاں کے قابل نہیں تھے۔ فلم اور پریم چند! دونوں متضاد چیزیں تھیں۔ وہاں سے انھوں نے لکھا:۔

" میں جن ارادوں سے آیا تھا ان میں سے ایک بھی پورا ہوتا نظر نہیں آتا۔ یہ پروڈیوسر جس انداز کی کہانیاں بناتے آئے ہیں اُس لکیر سے ذرا برابر بھی نہیں ہٹ سکتے۔

VULGARITY کو یہ لوگ ENTERTAINMENT VALUE کہتے ہیں۔ عجیب وغریب ان کا ایمان ہے۔ راجہ رانی۔ ان کے وزیروں کی سازشیں۔ نقلی لڑائی، بوسے بازی ——— یہی ان کے مخصوص موضوعات ہیں۔ میں نے سماجی کہانیاں لکھی ہیں جنھیں پڑھے لکھے لوگ بھی دیکھنا چاہیں لیکن ان کو فلماتے ہوئے انھیں شبہ ہو رہا ہے کہ چلیں نہ چلیں۔ یہ سال تو پورا کرنا ہی ہے۔ قرضدار ہو گیا تھا، قرض اُتار دوں گا لیکن اور کچھ حاصل نہیں۔ ناول 'گئودان' کے چند آخری صفحات لکھنے باقی ہیں ادھر طبیعت نہیں جاتی۔ جی چاہتا ہے یہاں سے چھٹی پاکر اپنے پرانے اڈے پر جا بیٹھوں۔ وہاں پیسہ نہیں ہے مگر اطمینان ضرور ہے۔ یہاں تو معلوم ہوتا ہے زندگی برباد کر رہا ہوں۔"

ان کا ایک فلم بنا تھا 'مزدور'، اس کا ذکر کرتے ہوئے ایک خط میں لکھا :۔

" مزدور تمھیں پسند نہ آیا، یہ میں جانتا تھا۔ میں اسے اپنا کہہ بھی سکتا ہوں اور نہیں بھی کہہ سکتا۔ اس کے بعد ہی ایک 'رومانس' آرہا ہے وہ بھی میرا نہیں ہے، میں اس میں بہت تھوڑا سا ہوں۔ فلم میں ڈائریکٹر ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ ادیب قلم کا بادشاہ ہی کیوں نہ ہو، یہاں ڈائریکٹر کی عملداری ہے اور اس کے راج میں ادیب کی حکومت نہیں چل سکتی۔ وہ یہ کہنے کی جرأت نہیں رکھتا کہ "میں عوام کے رجحانات کو جانتا ہوں آپ نہیں جانتے" اس کے برعکس ڈائریکٹر بڑے زور سے کہتا ہے "میں جانتا ہوں عوام کیا چاہتے ہیں اور ہم یہاں عوام کی اصلاح کرنے نہیں آئے ہیں۔ ہم نے کاروبار کھولا ہے، دولت کمانا ہماری غرض ہے۔ جو چیز عوام مانگیں گے وہی ہم دیں گے" اس کا جواب یہی ہے "اچھا صاحب ہمارا اسلام قبول کیجیے، ہم گھر جاتے ہیں" وہی میں کر رہا ہوں۔ مئی کے آخر میں بندہ بنارس میں بیٹھا ناول لکھ رہا ہوگا۔ اس کے علاوہ مجھ میں کسی نئے فن کو نہ سیکھ سکنے کی بھی صفت ہے۔ فلم لائن میں میرے دل کو اطمینان نہیں مل سکا۔ اطمینان ڈائریکٹروں کو بھی نہیں ملتا لیکن وہ اور کچھ نہیں کر سکتے جھک مار کر پڑے رہتے ہیں۔ میں کچھ اور کر سکتا ہوں چاہے وہ بیگار ہی کیوں نہ ہو اس لئے چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ میں جو پلاٹ سوچتا ہوں اس میں آدرش وادگھس آتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس میں ENTERTAINMENT VALUE نہیں ہے۔ اسے میں تسلیم کرتا ہوں۔ مجھے لوگ بھی ایسے ملے جو نہ ہندی جانیں نہ اُردو۔ انگریزی میں ترجمہ کر کے انھیں کہانی کا مفہوم سمجھانا پڑتا ہے ورنہ کام کچھ نہیں بنتا۔ میرے لئے وہی پرانی لائن مزے کی ہے۔ جو چاہا لکھا "

اس طرح فلم لائن سے کنارا کر کے انھیں واپس آنا پڑا۔ اس کے بعد وہ کچھ زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہے۔

مرنے سے ایک سوا مہینہ پہلے کی بات ہے۔ پریم چند جی چارپائی پہ پڑے تھے۔ مرض بڑھ گیا تھا، چل پھر نہیں سکتے تھے۔ لیکن چہرے پر مکمل سکون تھا۔

ایسی حالت میں ایک دن انھوں نے کہا "جینندر! لوگ ایسے وقت میں خدا کو یاد کیا کرتے ہیں۔ مجھے بھی خدا یاد دلایا جاتا ہے لیکن ابھی تک مجھے خدا کو تکلیف دینے کی ضرورت معلوم نہیں ہوئی۔"

الفاظ آہستہ آہستہ بڑی دلجمعی سے کہے گئے تھے اور میں اس انتہائی مطمئن وہریئے درویش کی طاقت پر حیران تھا۔

موت سے ایک رات قبل بھی میں ان کی کھاٹ کے برابر بیٹھا تھا۔ صبح سات بجے انھیں اس دنیا سے اٹھ جانا تھا۔ اسی سویرے تین بجے مجھ سے باتیں ہوئیں۔ چاروں طرف گہرا سناٹا تھا۔ سب سوئے پڑے تھے۔ الفاظ ان کے منہ سے پھسپھسا کر نکل جاتے تھے۔ کانوں سے زیادہ انھیں دل سے سننا پڑتا تھا۔ رات کے بارہ بجے 'ہنس' کی باتیں ہوتی رہی تھیں۔ اپنی امیدوں اور تمناؤں کو وہ کچھ الفاظ کے ذریعے اور کچھ آنکھوں کے ذریعے مجھ پر ظاہر کر چکے تھے۔ 'ہنس' کی اور ادب کی فکر انھیں اس وقت بھی کھائے جا رہی تھی۔ اپنے بچوں کا مستقبل بھی ان کے ذہن پر بار بنا ہوا تھا۔ مجھ سے انھیں کچھ ڈھارس تھی۔

اب تین بجے رات کے وقت میں ان کے پھولے ہوئے ہاتھ کو، جسے انھوں نے دابنے کو کہا تھا، اپنے ہاتھ میں لے کر سوچ رہا تھا کہ کیا مجھ سے جو ان کی ڈھارس ہے وہ صحیح ہے؟ رات کے بارہ بجے میں نے ان سے کچھ بحث کرنے کی زیادتی بھی کی تھی۔ وہ کانٹا میرے دل میں کھٹک رہا تھا۔

——— کیا کہوں؟ کیا کروں؟

اتنے میں پریم چند جی بولے ——— "جینندر!"

اور یہ کہہ کر خاموشی سے میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے ان کے ہاتھ کو دونوں ہاتھوں سے دبایا۔ ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "آپ کچھ فکر نہ

کیجیے بابو جی۔ آپ جلد اچھے ہو جائیں گے پھر کام کرنے کے لئے ہم سب لوگ موجود ہی ہیں۔"

تھوڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد یکایک وہ بولے "آدرش سے کام نہیں چلے گا۔ ۔"

میں نے کہنا چاہا۔ ۔۔۔" آدرش ......"

"بحث نہ کرو" اور یہ کہہ کر انھوں نے کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیں۔

اس وقت میرے دل پر لاچاری کا ایک ناقابلِ برداشت بار آپڑا۔ اس وقت پریم چند جی کو طرح طرح کی پریشانیاں گھیرے ہوئے تھیں۔ میں یا کوئی اور ان پریشانیوں کو کسی طرح نہ بٹا سکتا تھا۔ پریشانیوں کا مرکز یہی تھا کہ 'ہنس' کیسے چلے گا؟ نہیں چلے گا تو کیا ہوگا؟ 'ہنس' کے لئے جینے کی اس وقت بھی انھیں حسرت تھی اور 'ہنس' نہ جئے گا یہ تصور ان کے لئے ناقابلِ قبول اور ناقابلِ برداشت تھا۔ 'ہنس' کے لئے اس وقت نہ جانے وہ کس درجہ جھکنے، گرنے کو تیار تھے۔

میری خواہش تھی کہ ان سے کہوں ۔۔۔ "'ہنس' نہیں مرے گا۔ وہ جھکے بنا جئے گا۔ وہ آپ کا رسالہ ہے پھر وہ کس طرح جھک سکتا ہے" لیکن میں کچھ بھی نہ کہہ سکا اور کوئی تسلی اس شہنشاہِ ادب کو تسکین نہ پہنچا سکی۔

تھوڑی دیر بعد بولے ۔۔۔ "گرمی بہت ہے پنکھا کرو"

میں پنکھا کرنے لگا۔ انھیں نیند نہ آئی تھی۔ تکلیف بے حد تھی لیکن کراہتے نہیں تھے، چپ چاپ آنکھیں کھولے پڑے تھے۔

دس پندرہ منٹ بعد بولے "جاؤ جینندر، سوؤ"

کیا معلوم تھا کہ اب صرف چند گھڑیاں باقی ہیں۔ میں جاکر سو رہا۔

صبح ہوتے ہوتے انھیں ایسا غش آیا کہ پھر دوبارہ حواس نہ لوٹے۔

پریم چند کو گئے اب اٹھارہ برس ہوتے ہیں لیکن دل کو یہ سمجھانا مشکل ہے کہ وہ اب جنت کے ہیں، ہمارے سماج اور زمانے کے نہیں رہے۔ سچ تو یہ ہے کہ انھیں اٹھا کر موت نے غلطی ہی کی ہے۔ نہ ان کی عمر اس قابل تھی نہ کسی طرح وہ وقت سے پیچھے تھے۔ تھے تو ایک قدم آگے تھے اور موجودہ حالات میں شاید وہ پہلے سے بھی زیادہ صحیح اور ضروری ثابت ہوتے۔

سر عبد القادر

پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر

"شیخ صاحب ہیں؟"

"جی۔"

"میرا کارڈ لے جائیے۔"

"کارڈ تو میں آپ کا لے جاؤں گا۔ لیکن وہ بہت بیمار ہیں۔"

"کیا تکلیف ہے؟"

"بخار ہے۔ اور بغل میں کچرالی کی تکلیف ہے۔"

"خیر میرا کارڈ لے جائیے۔"

میں شیخ سر عبد القادر کے ملازم کو کارڈ دے کر برآمدے میں ٹہلنے لگا۔ میں نے انھیں آج سے پہلے کبھی بیمار نہیں دیکھا تھا۔ ایک دوست نے اصرار کیا کہ تم آج اُن سے ضرور ملو۔ ایک ملازمت کے سلسلے میں میرے متعلق اُن کی رائے پوچھی جائے گی۔ میں ٹمپل روڈ کے مکان پر پہنچا تو ملازم نے بتایا کہ وہ بیمار ہیں۔ مجھے یہ شبہ تھا کہ شاید وہ اِس حالت میں ملنے سے انکار کر دیں۔ چند منٹ گزرنے کے بعد جب ملازم واپس نہ آیا تو اس شبہ کو اور تقویت پہنچی۔ میں تشکیک اور ایقان کے تصادم میں گرفتار دوست کے اصرار کو ذہن میں دہراتا ہوا برآمدے کو متذبذب انداز میں اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ناپ رہا تھا۔ اتنے میں ملازم نے دروازہ پھر کھولا۔

"تشریف لائیے۔"

میں ملازم کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا کھانے اور گول کمرے سے گزرتا ہوا اُن کے سونے کے کمرے میں جا پہنچا۔ وہ لحاف اوڑھے لیٹے ہوئے تھے اور چہرہ پر کرب اور تکلیف کے آثار نمایاں تھے لیکن مسکراتے ہوئے بولے۔

"تشریف رکھیے۔ معاف کیجیے آپ کو انتظار کرنا پڑا۔ میں پٹی کرا رہا تھا۔"

میں مزاج پرسی کے الفاظ جمع ہی کر رہا تھا کہ بول اُٹھے:-

"اور ہاں محمود صاحب نے مجھے لکھا ہے کہ وہ آپ کو میرے پاس یاددہانی کے لئے بھیجیں گے۔ میں اگر تندرست ہوتا تو خود اُنھیں لکھتا۔ لیکن یہ اچھا ہُوا کہ آپ آگئے۔ آپ اُنھیں لکھ دیں کہ میں اُن کے متعلق اچھی رائے کا اظہار کر دوں گا۔"

میں نے دیکھا کہ بغل کے پھوڑے اور بخار کی تکلیف اِس قدر زیادہ ہے کہ آسانی سے پہلو بھی نہیں بدل سکتے۔ یہ ۱۹۴۰ء کا ذکر ہے۔ عمر ساٹھ سال سے متجاوز ہو چکی تھی لیکن اِس حالت میں بھی احباب اور نیازمندوں کے تقاضے پُورے کرنے کے لئے نہ صرف آمادہ تھے بلکہ بیتاب تھے۔ یہ اُن کے اخلاق کا ایک پہلو تھا۔

شیخ صاحب لندن میں وزیرِ ہند کے مشیر تھے جب پہلی دفعہ راقم کو اُنھیں قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہُوا۔ یہ ۱۹۳۷ء کی بات ہے۔ اُردو سے محبت رکھنے والے حلقوں میں ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان میں ایسا کوئی فرد نہ تھا جو شیخ صاحب کو نہ جانتا ہو۔ لیکن اُن سے ملنے کے بعد یہ حقیقت کھُلی کہ وہ نہ صرف اُردو کے عظیم المرتبت ادیب اور فدا کار تھے بلکہ اپنی ممتاز شخصیت کے اعتبار سے ایک لاثانی انسان تھے۔ اپنے عہد کے ان بزرگوں میں اُن کا مرتبہ بہت بلند تھا جنھوں نے مشرقی اور مغربی تہذیب کے محاسن کو اپنے اندر خوش اسلوبی سے جذب کیا تھا۔ وہ مشرقی اور مغربی طرز کے اجتماعات میں اپنے اس وصف کی وجہ سے ہمیشہ ممتاز ترین جگہ پیدا کر لیتے۔

۴۹ ٹینی ہل لندن میں سر فیروز خاں نون کے مکان پر پنڈت جواہر لال نہرو کے اعزاز میں دوپہر کا کھانا دیا گیا۔ کھانے پر سر ظفر اللہ خاں، نائب وزیرِ ہند سر فنڈلیسٹر سٹوآرٹ اور وزیرِ ہند کے پارلیمنٹری سکرٹری کرنل میور ہیڈ کے علاوہ سر عبدالقادر بھی مدعو تھے۔ سر فنڈلیسٹر نے کھانے پر بیٹھے ہوئے سر عبدالقادر کے ایک چٹکی لی۔ اور کہا:۔

"سر عبدل میں نے سُنا ہے آپ کے ہاں ابھی تک لوگ ہاتھ سے کھانا کھاتے ہیں!" (مراد یہ تھی کہ چمچہ اور کانٹا استعمال نہیں کرتے)۔

سر عبدالقادر ایک لمحہ کے لئے مسکرائے اور پھر فوراً بول اُٹھے "بالکل اُسی طرح جیسے حضرت عیسےٰ اور موسیٰ کھاتے تھے۔"

اس پر ایک قہقہہ پڑا اور سر فنڈلیسٹر اپنا سا منہ لے کے رہ گئے۔ یہ جولائی ۱۹۳۸ء کی بات ہے۔ میرے پاس اِس موقعہ کی اپنی کھینچی ہوئی تصویر ہے۔ کبھی حالات مساعد ہوئے تو یہ شائع کر دوں گا۔

مجلسی انسان کی حیثیت سے شیخ صاحب نوادر میں سے تھے۔ وہ گھنٹوں آپ کو اپنی زندگی کے وہ واقعات سُناتے رہتے جن میں اُن کے اپنے کردار کی اہمیت نمایاں طور پر نظر آنے لگتی لیکن اُن کا اندازِ بیان اِس قدر شگفتہ اور اظہارِ تفاخر سے مبرا ہوتا کہ آپ یہ واقعات سُنتے ہوئے نہ تو اُکتاتے اور نہ یہ محسوس کرتے کہ شیخ صاحب اپنی عظمت سے آپ کو متاثر کرنا چاہتے ہیں۔

اُن کی آخری علالت نے طوالت اختیار کی تو مجھے یہ شبہ ہونے لگا کہ شاید اُن کی کہولت باوصف پامردی بیماری سے جانبر نہ ہو سکے۔ اور ایک دن میں نے اپنے اندیشہ کا ذکر کچھ اس طرح کیا، آپ جیسی بزرگ ہستیاں یوں تو دُنیا میں نادر ہیں لیکن ہمارے معاشرے میں اِن کی جو کمی ہے، وہ اظہر من الشمس ہے۔ اور اب جبکہ ہم خود عمر کے اُس حصّے سے گزر رہے ہیں جہاں شباب بڑھاپے سے دست و گریباں ہے تو اکثر یہ احساس ہوتا ہے کہ اچھے اچھے لوگ بننے شاید ختم ہو گئے۔ اور پھر میں نے اپنے مرحوم اُستاد محمود شیرانی کا ذکر چھیڑا اور کہا کہ اُن کی موت سے جو نقصان ہُوا ہے اس کی تلافی ناممکن ہے۔ نجانے میرے اندیشہ کو کیسے بھانپ گئے۔ بولے "باقر صاحب! اچھے آدمیوں کے روز بروز فقدان کا احساس سوجھ بوجھ والے انسانوں کو ہمیشہ دامنگیر رہا ہے۔ لیکن حقیقت یُوں نہیں۔ اچھے اور بڑے آدمی ہمیشہ ہی پیدا ہوتے رہے ہیں اور مرتے بھی رہے ہیں۔ مجھے یاد ہے جب میں ملازمت کے سلسلے وزیرِ ہند کا مشیر ہو کر دوبارہ لندن میں قیام کے لئے پہنچا تو میں نے بھی ایک دن کھانے پر بیٹھے ہوئے اِسی خدشہ کا اظہار مالکِ مکان کے صاحبزادہ سے کیا، اور کہا "مجھے کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جب میں کئی سال پہلے یہاں طالب علم کی حیثیت سے آیا تھا تو انگریزوں کی قوم میں بہت بڑے بڑے آدمی تھے جن کی تعداد اب نسبتاً بہت کم

ہوگئی ہے، مثلاً اُس وقت لندن میں اُدبا اور سیاستدانوں کی تعداد بہت تھی۔ اور ان کا درجہ بہت بلند تھا۔ لیکن اب نہ تو اُس درجے کے آدمی یہاں دکھائی دیتے ہیں، نہ اِن کی تعداد اس قدر زیادہ ہے، حالانکہ لندن کی آبادی روز افزوں ہے"۔ اِس نوجوان نے کہا: "بات اصل میں یہ ہے کہ انسانی فعالیت کا رُخ بدلتا رہتا ہے، ورنہ بڑے آدمیوں کی نہ تو تعداد انگلستان میں کم ہوئی ہے نہ اِن کا درجہ۔ مثلاً میرا باپ ایک بڑا سیاستدان تھا، لیکن میں نے انجنیئرنگ کی تعلیم پائی اور یہ محسوس کیا کہ فقط سیاست کا میدان ہی نہیں جہاں آدمی اپنی اہلیت اور استعداد کا مظاہرہ کرے۔ چنانچہ میں نے انجنیئرنگ کے ایک خاص شعبہ میں تخصص حاصل کیا اور اِس میں اس قدر استعداد بہم پہنچائی ہے کہ چند خارجی حکومتیں مجھ سے استفادہ کرنے کی متمنی رہتی ہیں۔ چنانچہ حال ہی میں حکومتِ مصر سے میرا ایک کاروباری معاہدہ ہوا ہے اور میں اب ایک گرانقدر رقم کے معاوضہ میں حکومتِ مصر کو اپنی خدمات پیش کر رہا ہوں۔ سو باقر صاحب قصہ یہ ہے کہ نہ تو اِس مُلک میں بڑے آدمیوں کا فقدان ہے، اور نہ ہوگا، صرف فعالیت کا رُخ بدلتا رہے گا"۔

بات ختم ہوگئی۔ میں شیخ صاحب کی عظمت کی طرف اشارہ کرکے اپنا غم بیان کرنا چاہتا تھا کہ جب موت کا ظالم ہاتھ اُنھیں ہم سے چھین لے گا تو ہم شیرانی مرحوم کی طرح اُن کا بدل بھی نہ پاسکیں گے لیکن اُنھوں نے اور لوگوں کی عظمت کا افسانہ سُنا کر گفتگو کا رُخ موڑ دیا۔

میں نے اُنھیں انتہائی طور پر مسرور اور غمگین دیکھا ہے۔ لیکن وہ زندگی کے نشیب و فراز سے کچھ اس طرح مانوس ہو چکے تھے کہ بظاہر اُن کی کیفیت ہمیشہ اُس ٹھہرے ہوئے سمندر کی مانند ہوتی تھی جس کی سطح پر کبھی کبھار ہلکی ہلکی غم و مسرت کی لہریں تو پیدا ہوتی تھیں لیکن حوادث کا مدّ و جزر اُسے متلاطم نہ کر پاتا۔

میں ایک دن ملنے گیا تو ہلکے ہلکے قہقہوں کے ساتھ متین لیکن کسی قدر کرب سے بھری ہوئی باتیں بھی سناتے رہے۔ میں نے ٹٹولا تو معلوم ہوا اپنے ایک صاحبزادے کے متعلق پریشان ہیں۔ جن کو بڑی مشکل سے ملازمت ملی تھی لیکن وہ اُسے ترک کرکے واپس آگئے تھے اور اب ان کا بوجھ بنے ہوئے تھے۔ میں نے عرض کیا۔ آپ اجازت دیں تو میں ان سے بات کروں۔ فرمانے لگے۔ اِس سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اُنھوں نے اپنے لئے ایک فلسفۂ حیات وضع کیا ہے جس میں میری اور آپ کی منطق کو نہ دخل ہے نہ راہ۔ ایسے حالات میں آپ کی کوشش اُسی طرح بیکار جائیگی جس طرح میری منطق۔ اور پھر ایک قہقہہ لگاتے ہوئے اُنھوں نے گفتگو کا رُخ بدل دیا۔

دوسروں کے عیوب کی پردہ پوشی اور مجبور آدمیوں کی کمزوریوں کو درگذر کرنا آپ کا شیوہ تھا۔ اور اِس سلسلے میں آپ اِس قدر وسیع مشرب واقع ہوئے تھے کہ میری سمجھ کے مطابق وہ فقیر نوازی میں بعض دفعہ اپنا رتبہ بھی بھول جاتے تھے۔

لندن میں عرصہ سے ایک شاہ صاحب مقیم تھے جو نہ جانے کس سلسلہ میں کب وہاں پہنچے، لیکن اپنے مقصد میں ناکامی کے بعد لندن کے ہی ہو رہے۔ اور ایک انگریز عورت سے اُنھوں نے شادی بھی کر لی۔ لندن پہنچنے سے چند ہفتوں کے بعد مجھے اِن شاہ صاحب کی طرف سے چائے کی ایک دعوت موصول ہوئی۔ کارڈ ملا تو میں نے احتیاطاً سر عبدالقادر سے ٹیلیفون پر پوچھا کہ آپ بھی اس چائے پر مدعو ہیں یا نہیں اور اگر ہیں تو آپ تشریف لا رہے ہیں یا نہیں، کیونکہ میں اِن شاہ صاحب کو ذاتی طور پر جانتا نہیں تھا۔ اِس لئے گمان گذرا کہ شاید سر عبدالقادر سے انھیں میرا پتہ ملا۔ ٹیلیفون کے جواب میں کہنے لگے "آپ شاہ صاحب کو نہیں جانتے تو کچھ دیر کے بعد جان جائیں گے۔ مجھے بھی دعوت کا رقعہ ملا ہے۔ اور میں جاؤں گا بھی۔ آپ پسند کریں تو میرے ساتھ چلے چلیں"۔ میں نے سر عبدالقادر کا شکریہ ادا کیا اور عرض کیا کہ میں سیدھا شاہ صاحب کے مکان پر پہنچ جاؤں گا کیونکہ اُس روز میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ پہلے آپ کی خدمت میں حاضر ہوسکوں۔ مقررہ وقت پر میں شاہ صاحب کے مکان پر پہنچا۔ گھنٹی بجائی تو شاہ صاحب کی بیگم نے دروازہ کھولا۔ میں نے اپنا کارڈ پیش کیا اور بیگم صاحبہ نے نہایت پُر شوق اور مخلصانہ انداز میں کہا ـــــ

" COME RIGHT IN " (سیدھے اندر چلے آئیے) بیگم مجھے گول کمرہ میں لے گئیں۔ میں نے دیکھا کہ وہاں دو تین اور ہندوستانی نوجوان سمٹے سمٹائے بیٹھے ہوئے ہیں اور باقی کمرے میں چند انگریز لڑکیوں کا ہجوم ہے جن کے درمیان سر عبدالقادر بیٹھے ہوئے لطیفے سنا رہے ہیں اور گپ شپ ہو رہی ہے۔ میرا تعارف حاضرین سے کرایا گیا اور میں بھی ہندوستانی نوجوانوں کے ساتھ بیٹھ گیا۔ شاہ صاحب سے ملاقات ہوئی معلوم ہُوا کہ ہندوستانی نوجوان بھی میری طرح سے نو وارد ہیں۔ انگریزی بولنے سے بھی خائف ہیں۔ انگریزوں کے بقول

THEY HAD NOT FOUND THEIR FEET.

یعنی ابھی لندن میں اُن کے قدم نہیں جمے تھے۔ چائے بڑی پُر تکلف اور بڑے پیمانے پر دی گئی۔ اور اس مخلصانہ انداز میں پیش کی گئی کہ میں اور میرے نو وارد ساتھی شاہ صاحب اور اُن کی بیگم کا شکریہ ادا کرنے کے لئے اپنے پاس الفاظ نہیں پاتے تھے۔ شام کے قریب چائے ختم ہوئی تو ہم نے رخصت چاہی۔ اِس موقعہ پر مہمان لڑکیوں نے منزل اور راستہ کے متعلق استفسار شروع کر دیئے۔ میں چونکہ سر عبدالقادر کے ساتھ واپس آنا چاہتا تھا اس لئے میں نے تو فوراً کہہ دیا۔ میں سر عبدالقادر کو اُن کے مکان پر چھوڑنے جاؤنگا۔ لیکن اس سے پہلے میرے پاس بیٹھی ہوئی لڑکی نے نہایت مشفقانہ انداز میں مجھ سے میرا کارڈ، گھر کا پتہ اور ٹیلیفون کا نمبر لے لیا تھا۔ اور یہ وعدہ بھی لے لیا تھا کہ ہم پھر بھی ملیں گے۔ چنانچہ میں اور سر عبدالقادر رخصت ہونے کے لئے اُٹھے تو ہندوستانی نوجوان بھی اُٹھ کھڑے ہوئے لیکن اس طرح کہ شاہ صاحب کی تجویز پر اِن لڑکوں نے اُن لڑکیوں کو اُن کے گھر تک پہنچانے کا فرض اپنے ذمہ لے لیا جو اُن کی سمت میں جا رہی تھیں۔ راستہ میں شاہ صاحب کا مخلصانہ سلوک اور چائے زیر بحث رہی۔ لیکن ایک بات سمجھ میں نہ آئی کہ شاہ صاحب نے میرا پتہ کیسے معلوم کیا تھا اور چائے کی تقریب کا سلسلہ کیا تھا۔ میں نے سر عبدالقادر سے اپنی اُلجھن کا ذکر کیا تو کہنے لگے۔ چند دن اور انتظار کریں آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ میں خاموش ہو گیا۔

بات آئی گئی ہوئی۔ آئندہ جمعہ کو جب ہم مسجد میں جمع ہوئے تو میں نے دیکھا کہ اُن دو ہندوستانی لڑکوں کے ساتھ اُن کی دو دوست لڑکیاں بھی ہیں جو شاہ صاحب کی چائے پر ملے تھے۔ آج اُن کا شرمیلا پن ختم ہو چکا تھا۔ اور وہ بڑی بیباکی سے ہر ایک سے مل رہے تھے۔ اور اپنی دوستوں کا تعارف ملنے والوں سے کرا رہے تھے۔ مجھ سے بھی تعارف کرایا گیا تو لڑکیوں نے کہا۔ آپ بھول گئے شاہ صاحب کے ہاں چائے پر آپ سے ملاقات ہو چکی ہے۔ دفعتاً مجھے یاد آ گیا کہ یہ صحیح کہہ رہے ہیں۔ نماز کے بعد مسجد میں چائے اور حالات حاضرہ پر تبصرہ کرنے کے لئے ہم کچھ دیر بیٹھے رہتے تھے۔ لندن میں بہت دیر سے مقیم ایک دوست سے میں نے برسبیل تذکرہ شاہ صاحب کی چائے کا ذکر کر دیا۔ پہلے تو وہ چند لمحے میری طرف حیران ہو کر دیکھتے رہے پھر بولے "تو آپ بھی اُن کے ہاں سے ہو آئے؟" میں نے کہا "سر عبدالقادر سے مشورہ کر کے گیا تھا۔" دوست بولے "وہ بزرگ آدمی ہیں۔ اور آپ کو تو شکار کرنے کے لئے بلایا گیا تھا۔" میں نے تفصیل پوچھی تو اس دوست نے کہا۔ "بیگم شاہ کا تو یہ کاروبار ہے۔ کہ وہ آوارہ لڑکیوں کو اپنے ہاں بُلا لیتی ہیں۔ اور نو وارد ہندوستانیوں سے اُن کا تعارف کرا کے پیسے کماتی ہیں۔" میں نے کہا "لیکن ہم سے تو کسی نے پیسے وصول نہیں کئے۔ بلکہ ہم تو نہایت عمدہ چائے مفت پی کر چلے آئے۔" دوست کہنے لگا "آپ اتفاقیہ طور پر بچ گئے جو سر عبدالقادر کے ساتھ واپس چلے آئے۔ ورنہ آپ کو بھی کسی لڑکی کو اُس کے گھر پہنچانا پڑتا۔ اور راہ و رسم کا آغاز یہیں سے ہوتا۔ پھر یہ لڑکی آپ کے گلے کا ہار ہو جاتی اور آپ سے جو کچھ بٹورتی اُس میں بیگم شاہ کا حصّہ ہوتا۔" میں یہ سُن کر حیران رہ گیا۔ لیکن یہ خیال تشویش انگیز تھا کہ اگر سر عبدالقادر کو یہ سب کچھ معلوم تھا تو وہ وہاں کیوں تشریف لے گئے اور پھر مجھے اُنھوں نے کیوں نہ روکا۔ چند اور لوگوں سے بھی یہ ذکر آیا تو اُنھوں نے بھی بیگم شاہ کے دلچسپ کاروبار کی تصدیق کی، چنانچہ آئندہ ملاقات پر میں نے سر عبدالقادر سے سارا قصہ کہہ سنایا اور اپنے خدشات اُن کی خدمت میں پیش کئے۔ کہنے لگے۔ میری ان شاہ صاحب سے اُس وقت کی ملاقات ہے۔ جب میں صرف عبدالقادر تھا۔ نہ سر عبدالقادر تھا نہ وزیر ہند کا مشیر۔ مجھے اِن کے کاروبار کا بھی علم ہے لیکن میں اپنے قدیم مراسم کے پیش نظر ان کی چائے کو رد نہیں کر سکتا۔ دوسرے مجھے اُن کی نجی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمارے راستے الگ الگ ہیں۔

نہ جانے یہ میاں بیوی کس خیال سے مجھے بلاتے ہیں۔ اور میں ان کے ہاں پہنچ جاتا ہوں۔ اور پھر زیر لب مسکراتے ہوئے کہا: "آپ کو بلانے کا تو ایک مقصد تھا۔ اور اسی لیئے انھوں نے انڈیا ہاؤس سے نو وارد وں کی فہرست منگوا کر اُس میں سے آپ کا نام منتخب کیا تھا۔ میں نے عرض کیا۔ "اگر حضور کو یہ سب کچھ معلوم تھا تو آپ نے مجھے ایسی جگہ پر جانے سے کیوں نہ روکا۔" کہنے لگے "یہ شاہ صاحب نے مجھے بعد میں بتایا کہ انھوں نے آپ کا پتہ کہاں سے لیا تھا۔ اُس وقت مجھے معلوم نہیں تھا۔ لیکن آپ متاہل آدمی ہیں اور میرا خیال ہے کہ آپ کے وہاں جانے میں کوئی قباحت نہ تھی، کیونکہ میرے اندازے کے مطابق آپ خطرہ کی لکیر سے باہر تھے۔" اِس پر شیخ صاحب نے پھر ایک روایتی قہقہہ لگایا۔ اور میں یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ اتنا بڑا آدمی درویش مزاج بھی ہے اور اس حد تک کہ کوئے بدنامی سے بھی خائف نہیں۔

مزاح کا صحیح مفہوم سمجھنے کی اہلیت عوام میں کم ہے لیکن خواص میں بھی گنے چُنے آدمی اِس کی حدود کی پابندی بہرحال اپنے اوپر فرض سمجھتے ہیں۔ شیخ سر عبدالقادر کو میں نے ہمیشہ اس سلسلے میں مزاح کی نازک اور نفیس حدود کی پابندی کرتے ہوئے دیکھا۔ ڈاکٹر شاکر محمدی کے ہاں دعوت تھی۔ اور لوگوں کے علاوہ مرحوم عبدالرحمٰن صدیقی (جو اُس وقت کلکتہ کے میئر تھے اور بعد میں بنگال کے گورنر بھی ہوئے) چوہدری خلیق الزمان - سر عبدالقادر اور علی گڑھ کے ایک نوجوان پروفیسر بھی مدعو تھے۔ ڈاکٹر شاکر محمدی لندن سے اتنے فاصلے پر رہتے تھے کہ ہمیں اُن تک پہنچنے کے لیئے اُس گاڑی میں بھی سفر کرنا پڑا جو زمین کے اُوپر چلتی ہے۔ ورنہ لندن میں سفر تو زیرِ زمین ہی ہوتا ہے۔ ڈاکٹر محمدی کی بیگم جرمن خاتون تھیں اور انگریزوں کی بہ نسبت زیادہ خلوص اور کشادہ پیشانی سے پیش آئیں۔ شام کے کھانے کے بعد ہم کافی دیر تک اُن کے ہاں بیٹھے رہے۔ اور چونکہ میزبانوں کا اصرار ہندی اور جرمن تپاک کا مثنوی نمونہ تھا اس لئے ہم وہاں سے واپس آنے کی خواہش کرنے کے باوجود جلدی رخصت نہ ہو سکے۔ علی گڑھ سے تازہ وارد پروفیسر بھی ہماری طرح لندن واپس آنے کے لئے بیتاب تھے۔ بالآخر انھوں نے کہا: "صاحب میری لینڈ لیڈی کی ہدایت ہے کہ تم شام کو مکان پر جلدی پہنچ جایا کرو۔ اس لئے میں اجازت چاہتا ہوں۔" سر عبدالقادر فوراً بول اُٹھے: "پروفیسر صاحب ہمیں بھی لندن تو واپس پہنچنا ہے، لیکن لینڈ لیڈی سے ہم خائف نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ سے کسی اور نے بھی یہی تقاضا کر رکھا ہو۔" اِس پُر معنی اور لطیف مزاح کے حامل جملہ سے ایک قہقہہ پڑا۔ اور ہم سب رخصت ہونے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

شیخ صاحب مجلسی اعتبار سے منفرد شخص تھے۔ اُن کی وفات سے مجلسی حلقوں میں ایک ایسا خلا پیدا ہو چکا ہے جو شاید کبھی پُر نہ ہو۔ میں نے اُن سے علمی اور ادبی مباحث میں بہت کچھ سیکھا۔ وہ بڑی شفقت سے کبھی کبھی میری کوتاہیوں کی طرف بھی توجہ دلاتے لیکن اُن کی شفقت اُس وقت عروج پر ہوتی تھی جب وہ قدر دانہ انداز میں از راہِ لطف و کرم اُن بڑے آدمیوں سے میرا تعارف کراتے جو اُن کے سامنے ادب و احترام سے جُھک رہے ہوتے تھے۔ اس وقت میں اپنی بے مائگی کے شدید احساس کے باوجود اپنی سرافرازی پر ناز کرتا۔ اور بعد میں اُن سے کہہ بھی دیتا کہ اس بڑے آدمی کے سامنے مجھ جیسے ہیچمدان اور بیکس آدمی کو آپ نے اس طرح پیش کر کے مجھ پر تو آپ نے احسان کیا لیکن یہ صاحب دل میں کیا کہتے ہوں گے۔ وہ اکثر مسکرا کر جواب دیتے: "عظمت کی راہیں نرالی ہیں۔ کون جانے اِن میں سے کتنے آدمی میرے اِسی تعارف کا حوالہ دے کر تمھارے پاس اپنی مطلب برآری کے لئے پہنچیں۔" اور میں یہ دُعا سُن کر اُن کے احسانِ عظیم کے نیچے دب کر خاموش ہو جاتا۔

سر عبدالقادر کے پاس ایک وسیع اور گراں قدر کتاب خانہ تھا۔ اُن کی ساری زندگی مطالعہ میں گزری۔ وہ اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں بے تکان گفتگو کر سکتے تھے اور دونوں زبانوں کے ادیب تھے۔ ضرورت اِس امر کی ہے کہ اُن کی انگریزی اور ادبی کاوشوں کا ایک تفصیلی جائزہ لیا جائے۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ انھوں نے اپنی عمر میں بہت سے ادبا اور شعرا کی حوصلہ افزائی کر کے اُن کی تربیت

کی۔ اور اُن کے جوہرِ قابل کو اُجاگر کیا، لیکن ابھی تک یہ تمام تفاصیل کسی ایک جگہ پر مرتّب نہیں کی گئیں۔ ہندوستان میں عبدالقادر کا نام اُردو کے بڑے بڑے محسنوں میں شمار ہوتا رہے گا۔ لیکن اُردو کے بہی خواہوں کا فرض ہے کہ وہ اُس کی کاوشوں کی تفصیل بھی مرتّب کریں۔ میری نیاز مندی پر اُن کی شخصیت اس قدر غالب ہے کہ چند مضامین لکھنے کے باوجود میں ابھی تک اِس سے آگے نہیں بڑھ سکا۔

ز اہلِ خُلق کس نگریزد آنکہ صحبتش
با نیک و بد ز فیضِ نوازش بود نواخت

تاثیر

بلقیس تاثیر

تاثیر کو میں نے شوہر، باپ اور دوست کے روپ میں دیکھا۔ ان میں سے کسی ایک کو دوسرے سے الگ کرنا میرے لئے ناممکن ہے۔ وہ جس طرح میرے شوہر ہوتے ہوئے بھی میرے دوست تھے اسی طرح وہ اپنے بچوں اور سینکڑوں طالب علموں سے بے انتہا محبت کرتے تھے اور جب وہ تعلیم ختم کر کے چلے جاتے تھے اس کے بعد بھی ان کے ساتھ پدری شفقت اور دوستانہ خلوص سے پیش آتے تھے۔ رشتہ خواہ کسی قسم کا ہو تاثیر اس میں دوستی کے عنصر کو ہمیشہ اولیت دیتے رہے، اسی لئے اس خاکے میں بھی میں تاثیر کو دوست ہی کی حیثیت سے پیش کروں گی۔

تاثیر کی تمام خوبیوں اور کمزوریوں سے قطع نظر ان کے کردار کا ایک نمایاں وصف اپنے دوستوں کے ساتھ ان کا کھرا پن تھا۔ خاص طور پر ہماری شادی کے معاملے میں انہوں نے جس صاف گوئی اور دیانت داری کا ثبوت دیا اس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔ ہمارے باہمی عہد و پیمان اور تعلقات کی رومانیت کے باوجود شادی کا مرحلہ کوسوں دور تھا۔ انہوں نے طے کیا تھا کہ وہ ہندوستان آ کر اس ملازمت کو حاصل کر لیں گے جو انہیں ملنے والی تھی اور میں سات سمندر پار رہ کر چند مہینے تک ٹھنڈے دل سے غور کروں گی کہ میں اس شادی سے پیدا ہونے والے نتائج اور نئی زندگی کی تبدیلیوں اور سختیوں کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہوں یا نہیں۔ انہوں نے مجھے نئی زندگی کے نشیب و فراز سے بھی پوری طرح آگاہ کر دیا تھا۔ ہم نے یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ ہم سول میرج نہیں کریں گے کیونکہ ازدواجی زندگی اگر ناکام ہو تو طلاق کے لئے بلاوجہ تلخیوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ ہم شرعی نکاح کرنا چاہتے تھے جس کے تمام فوائد مجھے ملتے تھے۔ علامہ اقبالؒ نے لاہور کے بہترین وکیلوں سے مشورے کے بعد ایک مثالی نکاح نامہ تیار کیا جس کی رو سے مجھے طلاق کا حق حاصل تھا لیکن تاثیر کو نکاح ثانی کا حق نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ مہر کی رقم انتہائی قلیل مقرر کی گئی اور اس طرح اس سودے بازی کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی جو قانونِ شریعت کی آڑ میں اکثر روا رکھی جاتی ہے۔ ہمارے نکاح میں قاضی کے فرائض بھی علامہ اقبالؒ ہی نے سرانجام دئے اور میرے انتہائی قیمتی سرمایہ میں وہ نکاح نامہ بھی شامل ہے جس پر علامہ اقبالؒ کے دستخط ثبت ہیں۔

تاثیر کا راسخ عقیدہ تھا کہ شادی مرد اور عورت کی رفاقت کا دوسرا نام ہے۔ اس کی کامیابی کے لئے باہمی اعتماد، وفاداری، دیانت داری اور مساوات ناگزیر ہیں۔ وہ عورت اور مرد کے حقوق اور فرائض کی نوعیت میں بھی کوئی تفریق نہیں کرتے تھے اور دونوں کی ذمہ داریاں مساوی سمجھتے تھے۔ تاثیر عورت کو مرد کے ہاتھ میں خوبصورت کھلونا سمجھنے کے لئے تیار نہ تھے اور ان کا خیال تھا کہ ازدواجی زندگی کے دائمی رشتہ میں منسلک ہو جانے کے بعد مرد کو عورت

کی عزت کرنا اور اس پر اعتماد کرنا اور اسے اپنی ذمہ داریوں میں پورا پورا شریک سمجھنا چاہئے۔ معاشرے میں عورت کے مقام کے بارے میں بھی ان کی یہی رائے تھی اور وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ ازدواجی زندگی اسی وقت کامیاب اور پُرمسرت ہوسکتی ہے جب عورت کو مرد کے برابر حقوق حاصل ہو جائیں، وہ صحیح معنی میں مرد کی شریکِ حیات بنے اور اس کا احساسِ کمتری ختم ہو جائے۔

"تاثیر میاں بیوی کی ہر چیز مشترک سمجھتے تھے۔ ان کی ہر چیز "ہماری" ہوتی ہے اور ان میں کبھی "میری" یا "تمہاری" کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ میں آج بھی ایک واقعہ یاد کرکے شرمندہ ہو جاتی ہوں ـــــ میں گھر کے لئے کچھ ایسی چیزیں خریدنا چاہتی تھی جن کی خریداری تاثیر کی رائے میں فضول خرچی تھی۔ میرے اصرار پر بھی جب تاثیر نے اس کی اجازت نہ دی تو میں نے ان سے کہا کہ "میرے پاس تیس، اپنے روپے ہیں جو مجھے ریڈیو پر تقریر کرنے کے عوض میں ملے تھے اور تم نہ مانو گے تو میں انہی روپوں سے خرید لوں گی" ـــــ "اپنے روپے؟" تاثیر نے گرج کر کہا "اس سے تمہارا مطلب کیا ہے؟ ہمارے گھر میں کوئی چیز 'میری' یا 'تمہاری' نہیں ہے۔ ہر چیز 'ہماری' ہے۔"

میرے ساتھ اور بعد میں اپنے بچوں کے ساتھ تاثیر نے جس جبلّی دیانت داری کا ثبوت دیا اس نے ہماری زندگی کو مسرتوں سے معمور کر دیا۔ ہم میں کسی بات پر شاید ہی کبھی اختلاف ہوتا تھا۔ تاثیر جب ایم۔اے۔او کالج امرتسر کے پرنسپل تھے تو فیض احمد فیض جو اسی کالج میں انگریزی کے لکچرار اور ہمارے گھر کے دوست تھے ہم میں کوئی اختلاف نہ دیکھ کر اکثر تعجب اور حیرت کا اظہار کرتے تھے۔ کبھی کبھار وہ جھنجھلا کر یہاں تک کہہ اٹھتے تھے کہ "تم دونوں میں ضرور کوئی نہ کوئی کمی ہے۔ آخر تم لوگ کبھی لڑتے کیوں نہیں؟ تم کیسے انسان ہو؟ آخر دنیا میں دوسرے میاں بیوی بھی تو ہیں وہ کیسے لڑتے ہیں؟" میں انہیں بڑی معصومیت سے جواب دیتی "لیکن ہم لڑیں کس بات پر؟" اس پر فیض ٹھنڈی سانس بھر کر خاموش ہو جاتے۔

"تاثیر کی اسی جبلّی صاف گوئی اور دیانت داری کو میں نے اپنے تعلقات کے آغاز ہی میں محسوس کر لیا تھا۔ انہی دنوں اس کے باعث ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ ہماری منگنی کو زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ تاثیر نے اپنی ایک جرمن دوست سے جو میڈیکل کالج کی طالبہ تھی اس منگنی کا ذکر کیا تو اس نے یہ ماننے ہی سے انکار کر دیا کہ تاثیر شادی کے سوال پر سنجیدگی کے ساتھ غور کر سکتے ہیں، بلکہ اس نے میرے وجود ہی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ غالباً تم اس طرح میری اور اپنی دوستی کو ختم کرنے کا بہانہ ڈھونڈھ رہے ہو۔ تاثیر کے بہت سمجھانے کے بعد وہ کسی طرح نہ مانی تو انہوں نے اس سے کہا "تم چاہو تو میں اپنی منگیتر سے تمہاری ملاقات بھی کرا سکتا ہوں۔" اس نے جواب دیا "ہاں اگر تم مجھے وہ لڑکی دکھا دو جس سے تم شادی کرنا چاہتے ہو تو میں تمہاری دوستی سے دستبردار ہو جاؤں گی۔" یہ لمحہ تاثیر کے لئے بڑا نازک تھا۔ میری اور جرمن لڑکی کی ملاقات میں کسی ناخوشگوار واقعے کا پورا امکان تھا اور اس سے بھی زیادہ مشکل کام مجھ پر اس ملاقات کا مقصد واضح کرنا اور مجھے اس سے ملنے پر آمادہ کرنا تھا۔ لیکن تاثیر کامیاب ہو گئے اور ایک دن ہم تینوں دوپہر کے کھانے پر اکٹھے ہوئے۔ اتنی بے جوڑ دعوت شاید ہی کبھی ہوئی ہو۔ اس لڑکی کا چہرہ [illegible] حیرت کی تصویر بنا ہوا تھا اور دو محبت کرنے والے دل جو اس کی ذہنی الجھنوں اور پریشانیوں سے بے نیاز تھے [illegible] چاپ دھڑک رہے تھے۔

"تاثیر کی شخصیت کے دو نمایاں پہلو اور بھی ہیں۔ ان کی شوخی اور ان کی بدحواس کر دینے والی صاف گوئی۔ کبھی کبھی اس کے نتائج اچھے خاصے پریشان کن ہوتے تھے۔ اکتوبر ۱۹۳۶ء میں ہماری شادی کے بعد ہی جب وہ ایم۔اے۔او کالج کے پرنسپل تھے، مقامی روٹری کلب نے ان سے کلب کے اجلاس میں ایک مقالہ پڑھنے کی فرمائش کی۔ تاثیر نے کیمبرج یونیورسٹی سے "انگریزی ادب میں ہندوستان اور مشرقِ بعید" پر مقالہ لکھ کر پی۔ایچ۔ڈی کی نئی ڈگری لی تھی۔ اس کے علاوہ وہ حال ہی میں انگلستان سے واپس آئے تھے اس لئے انہیں اپنے ملک کی سیاسی محکومی کا بھی شدید احساس تھا۔ ان کا ارادہ تھا کہ وہ روٹری کلب کے لئے "انگریزی ناول نگار اور ہندوستان کے متعلق ان کے نظریہ" کے موضوع پر مقالہ لکھیں۔ چنانچہ اس میں سفید فاموں' برطانوی سامراج' انگریزوں کی ملک گیری' اینگلو انڈین طبقہ' بابوؤں کی انگریزی اور ایسی ہی دوسری باتوں کا بھی لامحالہ تذکرہ کیا گیا۔ حاضرین میں انگریز بھی تھے اور ہندوستانی افسر بھی۔ تاثیر نے جیسے ہی مقالہ شروع کیا سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ کسی کو اتنی جرأت بھی نہ ہوئی کہ وہ اپنے ساتھی کو کنکھیوں ہی سے دیکھ لے یا اپنی پلیٹ سے نظریں ہٹالے۔

مقالہ ختم ہوا تو مجمع پہ سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس کے بعد کلب کے ہندوستانی صدر نے اعلان کیا کہ اس مقالے پر کوئی بحث نہیں ہوگی۔ اس وقت اس کے چہرے کی جو کیفیت تھی اسے بیان کرنا ناممکن ہے۔ کچھ عرصہ بعد ہمیں معلوم ہوا کہ روٹری کلب نے اپنے دوسرے اجلاس میں فیصلہ کیا کہ کلب میں جو مقالے پڑھے جائیں گے وہ پہلے سیکرٹری کو دکھا لئے جائیں۔

انگلستان میں تاثیر سے ملاقاتوں کے دوران میں میں نے شروع ہی میں یہ محسوس کر لیا تھا کہ انہیں اپنی ثقافت اور روایات پر بڑا ناز تھا اور وہ اپنے ملک کی سیاسی محکومی پر بڑے آزردہ تھے۔ انہیں اپنے مسلمان اور پنجابی ہونے پر فخر تھا، ادب، شاعری اور موسیقی میں مسلمانوں کی میراث پر فخر تھا، اپنے آباؤاجداد کے کشمیری ہونے پر فخر تھا۔ اسی لئے وہ جہاں بھی گئے انہوں نے لوگوں کے دلوں میں اپنے اور اپنے ملک کے لئے عزت اور دلچسپی پیدا کی۔ لندن اور یورپ میں رہنے والے ہندوستانی نسلی تعصبات اور یورپی اقوام کے نامناسب برتاؤ کے سخت شاکی تھے لیکن تاثیر کے ساتھ ایسا سلوک کبھی نہیں کیا گیا۔ انہیں اپنی اصلیت پر فخر تھا اور اپنی روایات اور اپنے ہم وطنوں سے والہانہ وابستگی تھی، اس لئے ان کے ساتھ کوئی ناروا سلوک کرنے کی جرأت ہی نہ کر سکتا تھا۔

میں نے اپنی ازدواجی زندگی کے آغاز میں اپنے اندر سب سے پہلے یہ تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت محسوس کی کہ میں تاثیر کی دوست پرستی کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھوں۔ کیونکہ انہیں اپنے دوستوں سے باتیں کرنے، بحث کرنے اور شعروادب پر باتیں کرنے سے خاص شغف تھا۔ میں نے جیسے ہی یہ سمجھ لیا کہ یہ چیز تاثیر کی فطرتِ ثانیہ بن گئی ہے اور اس کے بغیر وہ رہ ہی نہیں سکتے تو میں نے اپنے آپ کو انہی کے رنگ میں ڈھال لینے کا فیصلہ کر لیا۔ تاثیر کو انسانوں سے اتنی محبت تھی، انہیں اپنے ہم جلیسوں کے مفاد اور مسائل سے اتنی دلچسپی تھی اور وہ ان کے دلوں کو ٹٹولنے اور ان کا بھید پا لینے کا اتنا ملکہ رکھتے تھے کہ ہمارا گھر ہر وقت طرح طرح کے لوگوں سے بھرا رہتا تھا۔ تاثیر کی ہمدردیاں سب کے لئے اتنی ہمہ گیر تھیں کہ ان کے دوستوں میں مسلم لیگی، رضاکار، مولوی، جماعتِ اسلامی کے ارکان، کمیونسٹ، احرار، سوشلسٹ اور کانگریسی سبھی شامل تھے۔ ان کے دل اور گھر کے دروازے ان سب کے لئے ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔ وہ ہر شخص کی بات بڑے غور سے سنتے، ہر شخص کی مشکل کو اپنی مشکل سمجھتے اور اسے ہمیشہ مفید مشورے دیتے۔ ہر شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والے ان کے دوست تھے۔ ان میں وزیر بھی تھے اور چٹھی رساں بھی۔ اعلیٰ سرکاری عہدیدار بھی تھے اور معمولی کلرک بھی، دکھی بیویاں بھی اور خوش باش جوڑے بھی۔ تاثیر کسی امتیاز کے بغیر ان سب کا انتہائی تپاک سے خیر مقدم کرتے تھے۔ وہ دوستی میں مرتبے اور منصب کے قائل نہ تھے اور کبھی کوئی ملازم ناواقفیت کی بنا پر ان کے کسی دوست یا ملاقاتی کی ظاہری وضع قطع دیکھ کر اس کی تعظیم و تکریم نہ کرتا تو وہ اس پر بری طرح برس پڑتے۔ کھانے کے وقت کسی ملاقاتی کو میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا کھانے میں تکلف ہوتا تو ہم سب کو ــــ اس کے ساتھ فرش پر بیٹھ کر کھانا پڑتا۔ لیکن تاثیر جب اپنے دوستوں کے ساتھ قالین پر بیٹھے ہوتے اور شعروسخن کی محفل گرم ہوتی تو دنیا کی بڑی سے بڑی ہستی کو ان کے ساتھ وہیں بیٹھنا ہوتا تھا اور اس میں شاید ہی کبھی کسی کو تکلف ہوا ہو۔ تاثیر کسی کے القاب یا جائداد کی نہیں اس کی ذات کی عزت کرتے تھے۔ ایک بار موسلا دھار بارش میں وہ رات گئے پرانی دہلی سے نئی دہلی آئے اور آتے ہی انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ کشتی میں کھانا رکھ کر خود تانگے والے کو دے آئے تب جا کر انہوں نے کھانا کھایا۔

تاثیر دوستوں کی طرح خوبصورتی کے دلدادہ اور حسن کے پرستار تھے خواہ وہ مصوری کا کوئی نادر شاہکار ہو، یا کوئی نفیس کپڑا، اخروٹ کی لکڑی کی منقش میز ہو یا کوئی زری کے کام سے آراستہ کوٹ یا ساری کا کنارہ ہو۔ انہیں کوئی چیز پسند آ جاتی تو وہ اسے ہر قیمت پر حاصل کر لینا چاہتے تھے اور کبھی کبھی تو وہ اتنا بھی نہیں سوچتے تھے کہ یہ چیز ان کے کسی کام کی بھی ہے یا نہیں۔ وہ صرف اتنا جانتے تھے کہ کسی چیز میں اگر حسن ہو اور اس کا حصول انسانی طاقت سے باہر نہ ہو تو اسے حاصل کر لیا جائے۔ مجھے اب تک وہ واقعہ یاد ہے جس میں مجھے تاثیر کی حسن پسندی کا نشانہ بننا پڑا تھا۔ تاثیر میرے لئے ساٹن کی ایک ساری خرید کر لائے تھے جس کی سرخ زمین پر روپہلے راج ہنس بڑی خوبصورتی سے چھپے ہوئے تھے۔ لیکن ساری اتنی بھاری تھی کہ مجھے اسے چھوتے ہوئے بھی وحشت ہوتی تھی۔ گلمرگ میں جون کی تیز دوپہر میں ہم ایک دعوت پر جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ تاثیر کو وہ ساری یاد آ گئی اور

انہوں نے اصرار کیا کہ میں وہی ساری پہنوں۔ ان کی خوشی کے لئے مجھے فرمائش کی تعمیل کرنی پڑی لیکن میں چونکہ ساری پہن کر گھوڑے پر نہیں بیٹھ سکتی تھی اس لئے سارا راستہ دھوپ میں پیدل طے کرنا پڑا۔ خوبصورت لیکن بھاری ساری کے بوجھ سے میں دبی جا رہی تھی لیکن میں نے صرف اس خیال سے اپنی تکلیف کا اظہار نہ کیا کہ تاثیر کے جذبۂ حسن پسندی کو ٹھیس نہ لگنے پائے۔

میرا خیال ہے کہ میں شوہر کی حیثیت سے تاثیر کی ذات پر کافی روشنی ڈال چکی ہوں، اب میں بچوں کے ساتھ ان کی محبت اور برتاؤ کا بھی کچھ ذکر کروں گی۔ انہیں اپنے بچوں سے بے پناہ محبت تھی اور ان کا خیال تھا کہ بچے ہم دونوں کی زندگی کے بڑے اہم جز ہیں۔ ہمارے ہر منصوبے کا مرکز ہمارے بچے اور ان کا مستقبل ہوتا تھا۔ بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ تاثیر اپنے بچوں کے ساتھ کچھ ضرورت سے زیادہ ہی محبت اور فراخ دلی سے پیش آتے تھے۔ وہ خود پانچ سال کی عمر میں یتیم ہو گئے تھے اور ماں باپ کی محبت کی نعمتِ گم گشتہ انہوں نے غالباً اپنے بچوں کے ذریعہ حاصل کر لی تھی۔ وہ ان کے لئے روز نئے نئے تحفے لاتے اور انہیں خوش کرنے کے لئے عجیب عجیب باتیں سوچتے رہتے۔ وہ ان کے کھیلوں میں اسی گرم جوشی، ذوق و شوق اور بے تکلفی سے شریک ہوتے جو ان کی طبیعت کا خاصہ تھی۔ وہ بچوں کے ساتھ خود بھی بچہ بن جاتے تھے۔ اسی لئے ہر عمر کے بچے ان سے مل کر خوش ہوتے تھے۔ وہ ان کے ساتھ کھیلتے، دوڑتے، انہیں نئے نئے کرتب اور تاش کے کھیل سکھاتے، ان کی شکایتیں سنتے اور ان سے چھیڑ چھاڑ کرتے تھے۔ وہ اپنے بچوں کے اور بچے ان کے پرستار تھے۔ تاثیر نے ان کے ساتھ کبھی سخت گیری کا سلوک نہیں کیا بلکہ وہ بیک وقت ان کے استاد، رہنما اور ہمجولی تھے۔ وہ بچوں کے ساتھ انتہائی بے معنی مذاق بھی کرتے تھے اور مجھے یاد ہے کہ اکثر وہ اور ہماری بڑی لڑکی بستر پر لیٹے کسی بے معنی بات پر بے تحاشہ ہنستے رہتے۔ لیکن اس سے یہ اندازہ نہیں لگانا چاہئے کہ تاثیر نے بچوں کو اپنی محبت سے خراب کر دیا ہوگا۔ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ تہذیب اور شائستگی کے معاملے میں تاثیر ان سے انتہائی سختی کا سلوک کرتے تھے۔ تاثیر بچوں کے معاملہ میں ایک اصول کی سختی سے پیروی کرتے تھے یعنی ان پر کبھی ہاتھ نہ اٹھایا جائے لیکن میرا خیال تھا کہ کبھی کبھار کسی سرکش بچے کو ایک آدھ تھپڑ مار دینے میں کوئی مضائقہ نہیں اور میں اس پر عمل بھی کرتی تھی لیکن تاثیر اس معاملے میں سخت محتاط اور انتہا پسند تھے اور ان کا نظریہ تھا کہ بچوں کو مارنے پیٹنے سے انہیں ناقابلِ تلافی نقصان پہنچتا ہے۔ اس معاملے میں ہمارے درمیان کبھی کبھی معمولی سا اختلاف رائے بھی پیدا ہو گیا۔ تاثیر نے صرف ایک بار ایک بچے پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ ان دنوں میں بیمار تھی اور تینوں بچے میرے کمرے میں بے انتہا شور مچا رہے تھے۔ تاثیر کو میرے متعلق اتنی تشویش تھی کہ انہوں نے ان کو خاموش کرنے کے لئے بڑی لڑکی کو ایک تھپڑ مار دیا۔ یہ بات اس کے لئے اتنی نئی اور خلافِ توقع تھی کہ وہ گم سم ہو گئی۔ تاثیر نے فوراً ہی محسوس کر لیا کہ انہوں نے اپنا اصول توڑ دیا ہے اور اتنے نادم ہوئے کہ وہ فوراً دوڑے دوڑے اس کے پاس گئے اور اس سے معافی مانگ لی۔

تاثیر کی طرح بچے بھی کتابوں کے بے انتہا دلدادہ ہیں۔ شروع ہی سے تینوں بچے مٹھائیوں اور کھلونوں پر کتابوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ بچے جیسے ہی گھٹنوں کے بل چلنے اور کسی چیز کے سہارے کھڑے ہونے کے قابل ہوتے وہ الماریوں سے کتابیں نکال کر انہیں دیکھنا شروع کر دیتے تھے۔ وہ ان کو دانتوں سے پکڑتے، ان کے گھر بناتے اور ان سے طرح طرح کے کھیل کھیلتے۔ وہ جیسے ہی بولنے اور یہ سمجھنے لگتے کہ ان کتابوں میں کیسے کیسے خزانے بھرے ہوئے ہیں تو کہانیاں سنانے کی فرمائش شروع کر دیتے۔ اور جیسے ہی خود پڑھنے کے قابل ہو جاتے انہیں بھی کتابیں پڑھنے کا خبط ہو جاتا۔ ہمارے گھر میں کسی بچے نے کبھی یہ شکایت نہیں کی کہ گھر میں اس کا دل نہیں لگتا۔ بچوں نے کبھی اپنی عیادی یا اپنا جیب خرچ مٹھائیوں یا کھلونوں پر صرف نہیں کیا۔ بلکہ کتابیں ہی ان کے کھلونے اور ان کی مٹھائیاں ہوتیں اور یہی کتابیں ان کی سب سے زیادہ بیش قیمت میراث ہیں جو ان کی زندگی پر انتہائی دیرپا اثر ڈالیں گی۔

تاثیر کی شریکِ حیات اور ان کے بچوں کی ماں بننا میرے لئے ایک نادر تجربے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا مطلب ایک ایسی رفاقت میں بھرپور زندگی گزارنا تھا جس میں زندہ دلی اور چہل پہل تھی، صداقتِ جذبات اور عمیق معنویت تھی اور جس نے مجھ میں اتنا حوصلہ پیدا کر دیا اور جو میرے لئے ایک ایسی شمعِ ہدایت بن گئی ہے کہ میں اسی انداز سے اپنی زندگی کی شاہراہ پر گامزن ہوں۔

میرا جی

محمود نظامی

اصل بات کہنے سے قبل اگر میں دو ایک ضمنی باتیں شروع ہی سے کہہ دوں تو نامناسب نہ ہوگا۔

میرا جی کی موت کا حادثہ اتنا حالیہ ہے کہ ادبی دنیا میں ان کو ذاتی طور پر جاننے والے بیسیوں افراد موجود ہیں۔ ان میں بعض ایسے لوگ ہیں جو انھیں بچپن سے جانتے تھے۔ بعض ایسے ہیں جو اُن سے اُس وقت ملے جب ان کی ادبی شہرت لاہور کی صحافت کے ذریعے باہر پھیل چکی تھی۔ اور پھر کچھ ایسے بھی ہیں جو ان سے اُن کی مختصر زندگی کے آخری ایام ہی میں مل پائے۔ میرا شمار آخری قسم کے افراد میں ہے۔ چنانچہ میں عرض کر دوں کہ گو میں میرا جی کو ان کے کلام اور تحریروں کے ذریعے اب بھی کبھی دیکھ لیتا ہوں، لیکن اصل زندگی میں ان کی رفاقت کے لئے مجھے صرف پانچ برس ہی میسر آئے۔

پانچ برس کا عرصہ کوئی بہت بڑی مدت نہیں۔ لیکن ایسے شخص کی زندگی کے لئے جسے خود اس جہانِ رنگ و بو میں صرف چند برس بسر کرنے کی مہلت ملی ہو، یہ اگر کچھ ایسی قلیل بھی نہیں۔ خصوصاً جب کہ اُس کی زندگی کے کئی جوہر انہی پانچ برس میں کھلے ہوں۔

تاہم میں اپنی اور میرا جی کی دوستی کو مثالی دوستی نہیں کہہ سکتا۔ بلکہ اس امر کے باوجود کہ میرا جی کی ہیئت کذائی اور میرا جی کی بعض دیرینہ عادات کو بدلنے کا گناہ بھی گو خود مجھی سے سرزد ہوا، مگر میں اپنی اور میرا جی کی دوستی کے متعلق یہ دعوے نہیں کر سکتا کہ وہ کوئی ایسی لاہوتی شے تھی جس سے باقی دنیا کو سبق لینا چاہیئے۔ البتہ اتنا کہوں گا۔ یہ ایک ایسا قرب تھا جس کا ذمہ دار دل نہیں بلکہ دماغ تھا۔ گویا یہ ایک ایسی رفاقت تھی۔ جو اجنبی دنیا میں بعض اوقات دو ہمجنسوں کو یوں اکٹھا کر دیتی ہے۔ کہ وہ پھر ایک دوسرے کے بغیر رہ نہیں سکتے اور ہر مشکل میں ایک دوسرے سے استمداد کرتے ہیں۔

جس چیز نے ہم دونوں کو ایک دوسرے کے اس قدر قریب لا کھڑا کیا تھا، وہ نہ تو میرا جی کی ادبی حیثیت تھی نہ میری ادب سے وابستگی۔ حقیقت یہ ہے کہ سب سے پہلے مجھے جس چیز نے میرا جی کی طرف متوجہ کیا، وہ اُن کی شاعری نہیں بلکہ ہیئتِ کذائی تھی۔ اور پھر جس چیز نے ہم دونوں کو ایک دوسرے سے صحیح معنوں میں روشناس کرایا، وہ ہمارا باہمی ادبی ذوق نہیں، بلکہ ہمارا ریڈیو سے شغف تھا۔ چنانچہ ہماری رفاقت اس امر کی دلیل تھی کہ بعض اوقات جغرافیائی اور لسانی بُعد اور طبائع کے اختلاف کے باوجود دو شخص ایک مشترک مشغلے کی وجہ سے ایک دوسرے سے بہت قریب آ سکتے ہیں۔ اگر ہم دونوں ریڈیو سے وابستہ نہ ہوتے۔ اور ہم دونوں کے معاش میں ریڈیو کو دخل نہ ہوتا۔ تو شاید میں میرا جی کو نہ جان

سکتا اور وہ تو یقیناً مجھ سے کبھی متعارف نہ ہوتے۔

میراجی کا نام میں نے شاید ۱۹۳۹ء میں پہلی مرتبہ "ادبی دنیا" میں ایک نظم کے نیچے لکھا ہوا دیکھا۔ لاہور کے اکثر ادیبوں کو میں ذاتی یا غائبانہ طور پر جانتا تھا۔ چونکہ یہ نام میرے لئے بالکل نیا تھا اس لئے میں نے اس سے یہی اندازہ لگایا کہ یہ شاید کوئی ہندو خاتون ہیں جنھیں ہندی اُردو الفاظ کی آمیزش سے ہندی اور فارسی بحور میں شعر کہنے کا بہت اچھا ذوق ہے۔ اس کے بعد بھی میں نے اسی نام کے ساتھ کئی اور نظمیں دیکھیں اور میں سمجھا کہ مجلّہ "ادبی دنیا" نے کہیں سے ایک اچھی ہندو شاعرہ کو ڈھونڈ نکالا ہے۔ چند ماہ بعد میں ایک دن گیلانی پریس لاہور کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ بشیر ہندی کسی سے باتیں کرتے ہوئے نظر آ گئے۔ اُنھوں نے مجھے آواز دے کر روک لیا اور ہم کچھ عرصے کے لئے اِدھر اُدھر کی گپ میں مصروف ہو گئے۔ میں چونکہ ان صاحب کے عقب کی طرف سے وارد ہوا تھا جن سے ہندی میری آمد سے قبل مصروفِ کلام تھے۔ اس لئے مجھے ان کی طرف دیکھنے کا دھیان نہ رہا۔ میری بے توجہی سے متأثر ہو کر ہندی نے پوچھا "تم ان ذاتِ شریف کو نہیں جانتے؟" میں نے پلٹ کر ان صاحب پر نظر ڈالی اور انھوں نے میری طرف دیکھا اور پھر ہم جلدی جلدی ایک دوسرے کا جائزہ لینے لگے۔ ایک ساعت جو مشاہدے اور غور کے لئے ملی اس میں میں نے دیکھا کہ یہ حضرت اپنے حلیئے کی وجہ سے بھارت ماتا کے ان سپوتوں کا نمونہ تھے جن پر ہندو مسلم سکھ عیسائی بیک وقت سبھی ہونے کا شبہ گزرتا تھا۔ سر پر سادھوؤں کی تقلید میں لمبے لمبے اُلجھے ہوئے چکٹ میلے بال، چہرے پر چینی طرز کی نیچے کو لٹکی ہوئی مونچھیں۔ گلے میں ایک حرف کو بڑی سی گولری نیچے پیک سے لتھڑی ہوئی باچھیں، جسم پر مٹی، کتھے اور سیاہی کے دھبوں سے اٹی ہوئی ایک بوسیدہ سی شیروانی اس کے نیچے ٹخنوں سے اُوپر تک اٹی ہوئی مٹی کی میلی کچیلی پتلون، اس سے اور نیچے ایک گندا سا خستہ حال فل بوٹ اور پھر ہاتھ میں ایک ٹوٹی پھوٹی سائیکل اور ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ یہ صاحب کس مذہب اور پیشے سے متعلق ہو سکتے ہیں کہ ہندی نے میرے استعجاب کو رفع کرتے ہوئے کہا "یہ میراجی ہیں۔"

کئی مہینے گزر گئے۔ پھر ایک دن میں اعجاز بٹالوی کی دعوت اور اصرار پر حلقۂ اربابِ ذوق میں شرکت کے لئے جا نکلا۔ حلقہ ابھی نیا نیا وجود میں آیا تھا۔ اس زمانے میں اس کے اجلاس ایبٹ روڈ پر نشاط سینما کے بالمقابل ایک دو منزلہ مکان کے نچلے حصے میں ہوا کرتے تھے۔ اور اس کے ارکان مقامی کالجوں کے وہ چند ادب پسند طلبہ تھے۔ جو آج ہمارے نوجوان ادیبوں کی صف میں ممتاز جگہ پر نظر آتے ہیں۔ یہ شاید حلقے کا تیسرا یا چوتھا اجلاس تھا اور میں جب اس تاریک سے کمرے میں پہنچا ہوں تو اٹھارہ یا بیس نوجوانوں کی مختصر سی جماعت عاشق حسین بٹالوی کی صدارت میں دیوندر ستیارتھی سے ان کا کوئی افسانہ سننے میں محو تھی۔ اپنی نشست پر پہنچ کر میں نے ایک اچٹتی ہوئی نظر کمرے میں دوڑائی، کچھ لوگ ایک اونچی سی میز پر چڑھ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سے ہٹ کر دروازے کی اوٹ میں دو تین نوجوان کھڑے تھے۔ اور ان کے پیچھے وہی سادھوؤں کے بالوں اور چینی مونچھوں والا چہرہ آگے کو جھکا ہوا یوں ساکت و جامد نظر آ رہا تھا۔ گویا اسے کسی نے پتھر سے تراشا ہے۔

دفعتاً اس میں زندگی کے آثار پیدا ہوئے دو تین جنبشوں کے بعد اس نے دائیں جانب کو حرکت کی اور میں بھانپ گیا کہ وہ ادھر ہی کو پلٹ رہا ہے جہاں آ کر میں ابھی ابھی بیٹھا تھا جیسے ہی ہماری آنکھیں چار ہوئیں اس چہرے کی مسکراہٹ سے مجھے یوں محسوس ہوا گویا اس پر وہی تبسم کھیل رہا ہے جس سے بعض اوقات برسوں کے بچھڑے ہوئے دوست ایسی محفلوں میں ایک دوسرے کا خیر مقدم کیا کرتے ہیں جہاں آدابِ محفل انھیں ہمکلام ہونے کی اجازت نہیں دیتے اور پھر سادھو کے بال لہرائے، پان کی پیک سے لتھڑی ہوئی باچھیں ایک ساعت کے لئے کھلیں اور اس کے ساتھ ہی ہونٹ سکڑ کر پہلی حالت پر آ گئے۔ سادھو کے بالوں میں ایک اور جنبش ہوئی اور پھر وہ چہرہ ادھر ہی کو پلٹ کر جامد ہو گیا جدھر سے اس نے میری جانب پانچ سیکنڈ پہلے حرکت کی تھی۔

جلسہ ختم ہونے سے ایک منٹ پہلے ایک صاحب نے اُٹھ کر چند حضرات کے نام لئے اور کہا کہ اجلاس کے بعد یہ لوگ حلقہ سے متعلق بعض ضروری

امور کے فیصلے کے لئے رُک جائیں۔ جب مجمع چھٹنے لگا تو میں رخصت ہونے کی غرض سے اُٹھا۔ مگر مجھے اعجاز بٹالوی نے جو اس عرصے میں میرا جی سے دروازے کی دہلیز کے قریب کھڑے کوئی مشورہ کر رہے تھے، جانے سے روک دیا۔ جب یہ مجلس شوریٰ منعقد ہوئی اور حلقے کے انتظامی امور اور لائحۂ عمل کے لئے بحث و تمحیص کا آغاز ہُوا تو میں نے دیکھا کہ ان نوجوانوں کی مجلس میں میرا جی کی حیثیت پیرِ مغاں کی سی تھی۔ ہر معاملے میں آخری فیصلہ کے لئے یہ لوگ میرا جی ہی کی طرف دیکھتے اور ہر بات اُنھیں کے فیصلے کے مطابق طے ہوتی۔ جس خشک متانت اور سختی سے وہ بحث کے ہر پہلو کو ختم کرتے تھے اس سے مجھے شبہ ہو رہا تھا کہ یا تو یہ شخص حد درجہ اکھڑ اور بد دماغ واقع ہُوا ہے یا پھر اپنے ساتھیوں کی رائے کو بچپنے پر محمول کرتا ہے۔ مجلس کے ختم ہونے تک مجھ پر یہ بات واضح ہو گئی کہ حلقۂ اربابِ ذوق کا قیام اسی شخصِ واحد میرا جی کی کوششوں کا نتیجہ ہے اور یہ مجلس اسی طرح چلے گی۔ جس طرح اس کا بانی چاہے گا۔

مجلس کے خاتمے پر جب میں ریڈیو اسٹیشن کی طرف روانہ ہونے کے لئے اُٹھا تو میرا جی بھی جن سے یہ میری دوسری ملاقات تھی میرے ہمراہ ہو لئے۔ مجھے دوپہرے ان کے لئے ایک ریڈیو پروگرام کا ایک مسودہ پھر سے دیکھنا تھا۔ یہ مسودہ میرا اپنا لکھا ہُوا تھا۔ پروگرام کے ریہرسل ہو چکے تھے۔ اور مسودے میں بظاہر اب کسی ترمیم کا وقت نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی اس میں دو تین ٹکڑے ایسے تھے جو ریہرسل میں ہر مرتبہ مجھے کھٹکتے تھے۔ ان فقروں کی زبان میں کچھ اُلجھاؤ سا تھا جن کی وجہ سے ان کی ادائیگی میں روزمرّہ کی بے ساختگی نہ آ پاتی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ انھیں پھر سے لکھوں لیکن ہر کوشش بیکار ثابت ہو چکی تھی چنانچہ جب میرا جی نے میرے تردّد کی وجہ پوچھی تو قدرتی طور پر میں نے وہ صفحات ان کی طرف بڑھا دیئے۔ اُنھوں نے پڑھنے کے بعد قلم اُٹھایا پہلے فقروں پر خطِ تنسیخ کھینچا اور پھر نئے فقرے جلدی جلدی لکھنا شروع کر دیئے۔ میں بے اعتباری کے عالم میں اُن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس زود نویسی پر مجھے کچھ بے اطمینانی سی ہو رہی تھی۔ ریڈیو کے پروگراموں پر نشریات کے ان ابتدائی ایّام میں بہت اہتمام کیا جاتا تھا۔ مسودات میں نہ کتابی قسم کی رسمی طرزِ تحریر کو اور نہ محض بول چال کے استعمال کو قبول کیا جاتا تھا۔ ریڈیو ایک اپنا ادب پیدا کر رہا تھا جن میں الفاظ کے آہنگ، و اصوات کے صحیح جائزے کے بعد ان کے مناسب اور موزوں استعمال پر اصرار کیا جاتا تھا اور اس بات پر خاص زور دیا جاتا تھا۔ کہ جو کچھ کہا جائے وہ سُننے والوں کے اس طبقے کے عین مزاج کے مطابق ہو جو اس کے مخاطب ہیں۔ اور ایسے الفاظ کے استعمال کا انتظام ملحوظ رکھا جائے۔ جو آسانی کے ساتھ بولے جا سکیں۔ آسانی کے ساتھ لکھے جا سکیں اور آسانی کے ساتھ سمجھے جا سکیں۔ یہ طرزِ تحریر ہمارے عام لکھنے والوں کے لئے ایک نئی چیز تھی۔ اس لئے اکثر ادیبوں کی طبیعتوں نے اس نئی پابندی کو اپنے لئے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

میرا جی سے جنھیں میں اُس وقت تک محض شاعری کی حیثیت سے جانتا تھا، مجھے اس سلاست اور سادگی کی توقع نہ تھی جو ریڈیو کی تحریروں کا اصل سرمایہ متصوّر ہوتی ہے۔ چنانچہ میں نے اُن کی اصلاح کو بے اعتباری کے عالم میں محض رفعِ استعجاب کی خاطر یونہی ایک نظر دیکھا۔ خیال تھا یہ بھی مروّجہ کتابی طرزِ تحریر کا ایک اور نمونہ ہوگا۔ لیکن جیسے ہی میں نے اُنھیں پڑھا وہ فقرے کچھ ایسے پھڑکتے ہوئے نظر آئے، گویا خود بول رہے تھے۔ اُن کی جان وہی سادگی تھی جو ریڈیو کے مکالموں کے لئے ضروری متصوّر ہوتی ہے۔ جملوں کی ساخت کی سادگی، الفاظ کی سادگی اور مافی الضمیر کے اظہار کی سادگی۔ لیکن میرا جی کا اصل کمال یہ تھا کہ انھوں نے کہیں کہیں اَدھورے فقروں سے ایسا کام لے لیا تھا جو پُورے فقرے بھی ادا نہ کر سکتے تھے۔ بالکل اُسی طرح جیسے بعض اوقات بے تکلف دوستوں کی بات چیت میں نامکمل فقرے پُورے معنی پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ ایک ایسے شاعر سے جو انسانی ذہن کو اپنے پیچیدہ خیالات اور مبہم تصوّرات سے الجھاؤ میں ڈالنے کا بہت بڑا ملکہ رکھتا ہو، ایسی تحریر کو دیکھنا جو آنکھ کے لئے نہیں بلکہ محض کان کے لئے تھی میرے لئے بڑی اچنبھے کی بات تھی۔

اس زمانے میں ریڈیو کے لئے نئے لکھنے والوں کی تلاش بڑی شدّت سے جاری تھی۔ جہاں کوئی اچھا لکھنے والا مل جاتا ریڈیو کے ارکان

اُس کے سر ہو جانے۔ میرا جی کی تحریر کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ اس شخص کو ریڈیو کی طرف مائل کرنا چاہیئے۔ چند روز میں "معجونِ مرکب" کے عنوان سے ایک ورائٹی پروگرام نشر ہونے والا تھا۔ جس کے مختلف ٹکڑے میرے پاس لکھے رکھے تھے۔ انھیں منطقی سلسلے میں جوڑنے کے لئے "راوی" کے فقروں کی ضرورت تھی۔ جنھیں لکھنے کا کام میں نے میرا جی کے سپرد کیا۔ بادی النظر میں یہ کام شاید بہت معمولی دکھائی دے لیکن فی الحقیقت مختلف لوگوں کے لکھے ہوئے الگ الگ خاکوں، تمثیلچوں، افسانوں، گانوں، لطیفوں وغیرہ کو ایک ہی منطقی سلسلے میں فنکارانہ کامیابی کے ساتھ منسلک کرنا کوئی ایسی آسان بات بھی نہیں۔ لیکن جب میرا جی دوسرے دن مکمل مسودہ واپس لائے تو مجھے مزید حیرت ہوئی کہ اُنھوں نے کس خوبی سے یہ کام سرانجام دیا تھا۔ اس کے بعد اُنھوں نے حلقۂ اربابِ ذوق کے بعض ارکان کے ساتھ مل کر تین پروگرام اور لکھے۔ ان کی کامیابی سے متأثر ہو کر میں نے انھیں ایک بالکل نئی طرز کا پروگرام لکھنے کو کہا۔ میں ریڈیو پر ایک ایسے پروگرام کو پیش کرنا چاہتا تھا جس میں مُلک کے نامور فنکاروں کو اپنے اپنے کام اور فن پر بے تکلف تبادلۂ خیال کے لئے ایک ہی جگہ پر اکٹھا کیا جا سکے۔ یہ پروگرام جو "خرابات" کے عنوان سے پیش کیا گیا اور جس میں دینا ناتھ زتشی، نفیس خلیلی، عبدالمجید سالک، فیض احمد فیض، اُستاد غلام علی خاں، ملکہ پکھراج اور دوسرے فنکاروں نے اپنے اپنے ناموں کے ساتھ شرکت کی۔ میرا جی نے میرے لئے لکھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس پروگرام کی کامیابی میں نامور فنکاروں کا بھی ہاتھ تھا۔ لیکن میرا جی نے اس پر جس قدر محنت کی تھی اس سے ہمارے لئے ریڈیو سٹیشن پر یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا۔ کہ نشریات کو ایک نیا فنکار مل گیا ہے۔

دراصل اس نئے ذریعۂ اظہار کے جملہ لوازم کو جسے نشریات کہا جاتا ہے سمجھنے اور ان پر حاوی ہونے کے لئے میرا جی نے بہت محنت کی تھی۔ انھوں نے متواتر مطالعہ، تجربے اور محنت سے اندازہ لگا لیا تھا کہ اظہارِ خیال کا یہ نیا ذریعہ انسانی تقریر کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچانے ہی کا نام نہیں، بلکہ ایک مخصوص فن ہے جس کی تکمیل کے لئے ذاتی جوہر اور اہلیت کا ہونا ازبس ضروری ہے۔ ورنہ ٹیلیفون ہی کے چونگے کی طرح مائیکروفون کے سامنے کون کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اصل اہمیت اس میکانکی عمل میں مائیکروفون پر کچھ کہنے یا پڑھنے کی نہیں، بلکہ اُس تأثر کی ہے۔ جو مائیکروفون میں جاتے ہوئے نہیں بلکہ لاؤڈ سپیکر سے نکلتے ہوئے الفاظ پیدا کرتے ہیں۔ اگر بولنے والے کے جملوں نے سُننے والوں کی دلچسپی کو اپنی گرفت میں لے کر چند منٹوں کے لئے ان کے تصوّر میں سوئی ہوئی دُنیا میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔ تو سمجھ لیجیئے کہ بولنے والا ان چند منٹوں کے لئے ضرور فن کار بن گیا گویا ریڈیو کا کام بے بصر سُننے والوں کی ذہنی نگاہ میں ایسی بینائی یا بصیرت پیدا کرنا ہے جس سے تصوّر کے پردۂ سیمیں پر مطلوبہ تصاویر اُبھرتی ہوئی اور معنی پیدا کرتی ہوئی چلی آئیں۔ میرا جی کی نشری تحریروں کی یہی خوبی تھی کہ وہ جس طبقے اور جماعت کے لئے لکھی جاتیں انھیں کی ذہنی سطح اور فہم و فراست کے مطابق ہوتیں۔ سُننے والوں کے لئے ان کا ساتھ دینا حد درجہ آسان ہوتا۔ اور اُس کی قوّتِ متخیلہ آسانی سے حرکت میں آجاتی۔

کچھ عرصے کے بعد لاہور سے میرا تبادلہ دہلی کر دیا گیا۔ میرے لاہور سے رخصت ہونے سے دو تین دن قبل میرا جی مجھے اتفاقیہ طور پر ملنے آگئے۔ انھیں دیکھتے ہی مجھے فوراً خیال آیا کہ میں انھیں ساتھ کیوں نہ کھینچ لے چلوں۔ دہلی میں میرے ذمّے فوجی پروگرام کی تشکیل اور نگرانی کا کام تھا جس کے لئے مجھے ایسے مصنّف کی ضرورت پیش آسکتی تھی جو میری فرمائش پر قلیل عرصے میں پروگرام لکھ کر دے سکتا۔ میں نے سوچا جب میرا جی ہر ڈھب کے پروگرام لکھ سکتے ہیں تو دہلی میں کسی نئے آدمی کو آزمانے کی بجائے انھیں ہی کو ساتھ کیوں نہ رکھا جائے۔ میں نے فوراً اُن سے اپنا عندیہ بیان کیا۔ وہ کچھ سوچ میں پڑ گئے پھر بولے کل تبلاؤں گا۔ اس کے بعد وہ ملنے نہیں آئے۔ آخر روانگی کا دن آگیا۔ اور میں دوست احباب سے رخصت ہو کر ریلوے سٹیشن پر پہنچا۔ وہاں جا کر دیکھتا ہوں تو میرا جی مجھ سے قبل اپنا مختصر سا سامان ایک ڈبّے میں جما کر میرے انتظار میں پلیٹ فارم پر کھڑے ہیں۔ انھیں دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا گویا میرے بازوؤں میں پھر سکت آگئی ہے اور میرے ذمے نئے شہر میں جو کام سپرد کیا گیا ہے اس کی مشکلات آسان ہو گئی ہیں۔

دفتر میں چارج لینے کے دوسرے دن میراجی اپنی رہائش کے انتظامات سے فارغ ہو کر میرے پاس پہنچ گئے۔ مگر اِدھر اُدھر کی باتوں کے دوران میں اچانک سب سے مجھے جس چیز کا پھر شدت سے احساس ہوا وہ میراجی کی ہیئت کذائی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ اس نئی جگہ پر شاید ان کی ظاہری حالت ان کے خلاف جائے۔ دلی ریڈیو کا عملہ ایک خاص قسم کے خوش پوش نوجوانوں کی ایک ایسی جماعت پر مشتمل تھا جو کالجوں کے ماحول سے نکل کر تازہ تازہ اس نئے ادارے میں وارد ہوئے تھے۔ ان میں سے اکثر افراد کی نظریں ملنے والوں کی وضع قطع اور ان کی پوشش پر ضرور جا کر اٹکتی تھیں۔ ظاہر تھا کہ اپنے عجیب و غریب حلیئے کی وجہ سے میراجی ایسے افراد کے مجمع میں آسانی سے پنپ نہ سکتے تھے۔ جہاں ان کا دوست تو کیا کوئی واقف تک نہ تھا۔ جب کمرے سے میرے دوسرے ساتھی چلے گئے اور میراجی اور میں اکیلے رہ گئے تو میں نے کہا۔ میراجی میرا ایک مخلصانہ مشورہ ہے۔ آپ میرے ساتھ جس ارادے سے یہاں آئے ہیں۔ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ اپنی اوّلین فرصت میں اپنے بے ڈھنگے بالوں اور مونچھوں کو صاف کرا دیں۔ اور پھر اپنے لباس کی طرف توجہ دیں۔ ان کپڑوں میں آپ پر ریڈیو کے ادیب ہونے کی بجائے لکڑہارے کا گمان ہوتا ہے۔

میراجی میری تجویز سے بگڑ گئے۔ کہنے لگے آپ کو مسودات لکھوانا ہیں یا مجھ سے اپنی مصاحبت کے فرائض سرانجام دلوانا ہیں۔ میں نے جو کچھ آج تک لکھا ہے انھیں کپڑوں اور داڑھی مونچھ کی موجودگی میں لکھا ہے۔ یہ چیزیں میری سوچ بچار اور طرزِ نگارش میں پہلے حائل ہوئی ہیں۔ نہ اب ہوں گی۔ اس لئے آپ کے مذاق کا میں لطف اٹھانے سے قاصر ہوں۔ آخر مجھے اپنا نقطۂ نظر سمجھانے کے لئے میراجی سے پہلے ایک طویل مناظرے اور پھر مجادلے میں الجھنا پڑا۔ اس کے آخر میں میراجی خفگی کے عالم میں کھڑے ہوئے اور جھنجھلا کر بولے "آپ شاید ثناءاللہ سے ملنا چاہتے ہیں۔ عرصہ ہوا میں اسے دفن کر چکا ہوں اور اب اس کی خاطر میں میراجی کو مار نہیں سکتا، اتنا کہا۔ اور غصے میں کمرے سے نکل گئے۔

اور پھر ان کے جاتے ہی مجھے وہ سرگذشت یاد آگئی جو لاہور میں میں نے دہلی کی طرف روانہ ہونے سے چند ہفتے قبل ایک دوست کی زبانی سُنی تھی۔ اور ثناءاللہ اور میراجی کے متضاد کردار میرے تصوّر کی دنیا میں اُبھر کر میرے سامنے آئے۔

ثناءاللہ خاں ڈار لاہور کے ایک طالب علم تھے۔ جو میٹرک کے امتحان میں کامیابی کے بعد بعض وجوہ کی بنا پر مزید تعلیم کے لئے کالج میں داخل نہ ہو سکے۔ اتفاق سے ان کے دوستوں میں سے ایک صاحب ایسے بھی تھے۔ جنھیں ثناءاللہ خاں افسانہ نویس بنانے کی بڑی آرزو رکھتے تھے۔ انھیں ادبی مشورے دینے کے لئے یہ کبھی کبھی ان کے کالج میں جا نکلتے۔ ان صاحب کی سیٹ کے برابر ایک بنگالی لڑکی بیٹھا کرتی جس کا نام میرا سین تھا۔ ثناءاللہ خاں نے اس لڑکی کو نہ جانے کس عالم میں دیکھا۔ کہ وہ ہمیشہ کے لئے اس پر مر مٹے میرا کو اس کے اعزا پیار سے میراجی کے نام سے پکارتے تھے۔ ثناءاللہ خاں نے پہلا کام تو یہی کیا کہ اپنا اصل نام ہمیشہ کے لئے ترک کر کے یہی نام اپنے لئے اختیار کر لیا۔ پھر میرا کے بال انھیں خاص طور پر پسند تھے۔ جب اس کے بالوں تک ان کی دسترس نہ ہو سکی۔ تو خود اپنے بال بھی میرا ہی کی تقلید میں بڑھا لئے۔ کچھ عرصے میں میرا کے گیان دھیان نے انھیں ایسا بے سُدھ کیا۔ کہ انھیں نہانے دھونے اور لباس کا بھی ہوش نہ رہا۔ زندگی کے تمام مشاغل ختم ہوئے۔ اگر کوئی لو باقی تھی تو وہ میرا کے دھیان کی تھی اور جو وقت اس سے بچ رہتا، وہ مطالعے کی نذر تھا۔ ثناءاللہ خاں ڈار یوں عشق کی آگ میں جل کر ہمیشہ کے لئے ختم ہوئے۔ اور ان کی راکھ میں سے جو نیا کردار میراجی کے نام کے ساتھ معرضِ وجود میں آیا، وہ اپنے ادراک و استعداد، اپنی طبیعت، اپنے حلیئے، اور اپنے اعمال و افعال کی وجہ سے اس قدر جاندار ثابت ہوا کہ اس نے ثناءاللہ کے تمام نقوش احباب کے دل سے یوں مٹا کر رکھ دیئے۔ گویا اس نام کا کوئی شخص زندگی میں کبھی تھا ہی نہیں۔

دوسرے دن جب میراجی وقتِ مقررہ پر دفتر میں دیکھے نہ گئے تو شبہ گزرنے لگا۔ کہ وہ مجھ سے شاید خفا ہو گئے ہیں۔ دل نے ملامت کی

کہ میں نے اپنے نقطۂ نظر کو تسلیم کروانے کے لئے ان سے خواہ مخواہ بحث میں اُلجھنے کی کوشش کی۔

دو دن گزر گئے میراجی یوں غائب تھے گویا دِلّی میں نہیں ہیں۔ گمان گزرنے لگا شاید وہ خفگی کے عالم میں لاہور چلے گئے ہیں۔ اور انہیں پکڑنے کے لئے وہیں جانا پڑیگا۔ میں بد دلی کے عالم میں اس معاملے پر غور کر ہی رہا تھا کہ مجھے کمرے میں کسی نو وارد کی موجودگی کا احساس ہوا۔ نظر اٹھائی۔ تو میز کے سامنے ایک ایسے بزرگوار کو کھڑا پایا جن کا چہرہ تو مانوس معلوم ہو رہا تھا لیکن یہ یاد نہیں آ رہا تھا کہ زندگی میں ان سے کہاں ملاقات ہوئی تھی۔ اور پھر یکلخت مُنڈی ہوئی مونچھوں، کٹے ہوئے بالوں اور بدلے ہوئے کپڑوں کے باوجود میراجی کے تبسّم نے ان کی نئی ہیئت کا راز فاش کر دیا۔ آج میراجی عمر میں دس برس کم دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی اُجلی قمیص اور صاف ستھری پتلون سے پتہ چلتا تھا کہ اس ہیئت کو اختیار کرنے سے قبل اُنھوں نے بڑی محنت سے کام لیا ہے۔ مگر جیسے ہی ہماری آنکھیں چار ہوئیں تو مجھے یوں محسوس ہُوا گویا اس حُلیئے میں میراجی کچھ کھسیانے سے ہو رہے ہیں۔ اور پھر اپنی خفّت کو کم کرنے کے لئے اُنھوں نے پان کی پڑیا میری طرف بڑھائی۔ اور مُسکرا کر میری طرف دیکھنے لگے۔ مطلب یہ تھا گویا مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ کہو لپسند آیا یہ نیا حُلیہ۔

میراجی کی پُرانی ہیئت ان کی شخصیت کا ایک ایسا ضروری جزو بن چکی تھی۔ کہ اس کے بغیر میراجی کو دیکھ کر مجھے خوشی کی بجائے قلق سا ہُوا۔ میراجی کی اس تبدیلیٔ ہیئت نے ان کی ظاہری حالت میں ایک معقولیت ضرور پیدا کر دی تھی۔ لیکن آج ان میں وہ کشش دکھائی نہیں دے رہی تھی جس نے روزِ اوّل مجھے ان کی شخصیت کو سمجھنے کی ترغیب دلائی تھی۔ پہلے تو میرے جی میں آئی کہ میراجی سے صاف صاف کہہ دوں۔ کہ جو تجربہ میں کرنا چاہتا تھا۔ اس کا نتیجہ کچھ بہت حوصلہ افزا ثابت نہیں ہُوا۔ لیکن پھر میں نے مصلحتاً خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ اور ان کے نئے حُلیئے کے بارے میں اپنی رائے کے اظہار کی بجائے ان سے کام کے اس طُومار کا ذکر چھیڑ دیا جو پچھلے دو دن سے میرے لئے سوہانِ روح ہو رہا تھا۔ میراجی نے کاغذات اُٹھائے اور ساتھ کی میز پر بیٹھ کر ان کا مطالعہ کرنے لگے۔ فاصلے پر سے میں جوں جوں ان کی طرف دیکھتا مجھے رہ رہ کر افسوس ہوتا کہ میں نے انھیں اپنا حُلیہ بدلنے کا مشورہ کیوں دیا۔ اور پھر مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ اگر میراجی نے ثناء اللہ خاں ڈار کا گلا گھونٹ ڈالا تھا۔ تو اُنھوں نے کوئی زیادتی نہ کی تھی۔ ثناء اللہ خاں بہرحال ایک غیر متشخص انسان تھے۔ اور میراجی بہرطور ایک حد درجہ پُرکشش شخصیت!

دن گزرتے گئے اور آہستہ آہستہ دِلّی میں میراجی کا حلقۂ احباب وسیع ہونے لگا۔ حلقے کی وسعت کے ساتھ میراجی کے مشاغل میں بھی کئی گُنا اضافہ ہو گیا۔ اور جب ان مشاغل کی توسیع سے ان کی آمدنی کے وسائل وسیع ہوئے تو میراجی کی اکثر شامیں بھولا رام کے شراب خانے کی نذر ہونے لگیں۔ جیسے ہی چار بجتے میراجی کی طبیعت بے قرار ہونے لگتی۔ اور انھیں موری دروازے کی نکڑ والی اُس عمارت کی یاد ستانے لگتی جس میں بھولا رام کا بار مرجع خواص و عوام تھا۔ وہ جلدی جلدی کام سے فارغ ہو کر ہم مشرب دوستوں کو اکٹھا کرتے اور ان کی معیت میں سیدھے بار کا رُخ کرتے یہاں رات گئے تک ان کے رفقا کے ہنگاموں کی آوازیں باہر سڑک پر سنائی دیتیں۔

پھر میراجی پر ”میر ہیئت“ دوبارہ طاری ہونے لگی۔ ایک دن دفتر میں آئے تو دیکھتا ہوں قمیص کے نیچے کوئی چیز ان کی گردن کے قریب اُبھری ہوئی ہے معلوم ہُوا کہ گنگے کی وہی پُرانی مالا ہے جو حُلیہ بدلنے سے قبل ہمیشہ سے ان کے گلے کا ہار ہُوا کرتی تھی۔ دو چار دن میں قمیص کے اوپر شیروانی بھی نمودار ہو گئی اور کچھ ہفتے میں دس دن بعد جسمانی غلاظت کے آثار بھی دکھائی دینے لگ گئے۔ گویا میراجی پھر میراجی نظر آنے لگے۔

۱۹۴۵ء میں ہندوستانی نغموں پر ایک پروگرام مرتّب کرنے کا کام میرے سپرد کیا گیا۔ اس پروگرام کی تکمیل کے لئے مجھے بمبئی جانا تھا۔ سفر پر روانہ ہونے سے تین چار دن قبل مجھے خیال آیا۔ کہ پروگرام کا مسودہ مرتّب کرنے کے لئے میراجی کو ساتھ لے جانا چاہیئے۔ مگر اس وقت بظاہر میراجی دِلّی کی گوناگوں رنگینیوں میں کچھ اس طرح کھوئے ہوئے تھے کہ سفر پر چلنے کے لئے اُن سے کہنا کچھ بیکار دکھائی دیتا تھا۔ لیکن جیسے ہی میں نے اس سفر کا ذکر کیا وہ فوراً میرے ساتھ چلنے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ بمبئی پہنچ کر پہلے چار پانچ دن بڑی مصروفیت میں گزرے مگر ایک دن ایسا بھی آیا۔ کہ میں بعض وجوہ کی بنا پر میراجی کو کام پر ساتھ لے جانے کی بجائے اُنھیں نخشب جارچوی کے ہاں مسودے کی تکمیل کے لئے چھوڑ گیا، رات کو جب بہت دیر کے بعد میں واپس پہنچا تو

دیکھتا ہوں نخشب اور نوابزادہ شمشاد علی خاں بڑے فکر کے عالم میں گم سم کرسیوں پر بیٹھے میری راہ تک رہے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف لپکے۔ اور مجھے اشارے سے خاموش رہنے کے لئے کہا۔ معلوم ہوا۔ میری غیر موجودگی میں شام کو میراجی بہت زیادہ شراب پی کر گھر آئے تھے۔ انھوں نے پہلے تو آتے ہی ان آہنی گولوں سے جنھیں وہ ہر وقت ساتھ رکھتے تھے۔ کھڑکیوں کے تمام شیشے توڑ ڈالے۔ پھر کھڑکی میں کھڑے ہو کر راہگیروں پر آوازے کسنے۔ بعد میں ہر شخص کو صلواتیں سنائیں اور آخر میں غسل خانے کا فلش توڑ دیا۔

صبح جب میں اور میراجی ناشتے کے لئے میز پر بیٹھے تو میں نے میراجی کو رات کی حرکات سے آگاہ کیا۔ کہنے لگے "شاید میں زیادہ پی گیا تھا۔" میں نے پوچھا "کس علت میں؟" بگڑ کر بولے "منشی مہتاب دین کی آنکھیں خراب ہوگئی ہیں۔" میں نے غصّے سے کہا "مہتاب دین کی بینائی کو آپ کی شراب خوری سے کیا کام ہے۔" بولے "مہتاب دین میرے والد ہیں شاید آپ سمجھتے ہوں گے میں یہاں ممبئی میں پروگرام لکھنے کے لئے آیا تھا۔ میں یہاں غم غلط کرنے آیا ہوں۔"

چند روز کے بعد مجھے دلی واپس جانا پڑ گیا اگر میں اس وقت میراجی کو ساتھ لے جاتا۔ تو شاید صورت حال وہ نہ ہوتی۔ جو بعد میں ہوئی۔ بہرحال جب ایک ہفتے کی غیر حاضری کے بعد میں ممبئی لوٹا تو دیکھتا ہوں۔ میراجی اب وہ میراجی نہیں تھے۔ اُن کے مشاغل اور حلقۂ احباب دلی کی طرح یہاں بھی بہت وسیع ہو چکا تھا۔ شراب کا دور اب کم و بیش ہر وقت چلتا اور میراجی ممبئی کی فلمی دنیا کی رنگینی میں بتدریج کھوئے چلے جا رہے تھے۔

جب ہمارا پروگرام تیار ہوگیا۔ تو میں نے میراجی سے دلی واپس چلنے کو کہا۔ مگر اب کہاں۔ میراجی اب کچھ اور ہی تھے۔ کہنے لگے "آپ جائیے میں دلی نہیں جاؤں گا۔ آپ لاہور سے مجھے دلی لائے میں آگیا۔ آپ دلی سے مجھے ممبئی لائے تو میں چلا آیا۔ آگے چلئے تو تیار ہوں پیچھے نہیں جاؤں گا۔"

چار سال اور گزر گئے اور پھر اچانک اطلاع آئی کہ میراجی ممبئی سے بھی آگے چلے گئے ہیں۔ بہت آگے۔ جہاں سے واقعی کوئی نہیں لوٹتا ؎

ظفر علی خان

شورش کاشمیری

جدید پود کے لئے ظفر علی خاں ایک بھولی بسری کہانی ہیں۔ آج سے پچیس تیس برس پہلے ان کا طوطی بولتا تھا ــــ وہ ہندوستان کے پنجابی رہنماؤں میں سرِفہرست، مجموعۂ اضداد اور جامع صفات تھے ــــ اب تو خیر گور کنارے ہیں لیکن جب جوان تھے، آگ تھے۔ ایک زندگی میں کئی زندگیاں اکٹھی ہو گئی تھیں ادیب، خطیب، صحافی، شاعر اور سیاس ــــ آج بظاہر وہ ایک گم شدہ ورق ہیں اور لیل و نہار کی بہت سی گردشوں نے ان کے آفتاب کو گہنا دیا ہے، لیکن ایک زمانے میں ان کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ حتیٰ کہ ان کا وجود ملی جدوجہد کی ایک تاریخ بنتا گیا۔ ہر چند اس تاریخ میں ایک عجیب سا تضاد ملتا ہے اور ظفر علی خاں اس تضاد کا ایک شدید مظہر ہیں ــــ لیکن اس تضاد میں بھی اتنی دلکشی ہے کہ اس زمانے کے احوال و ظروف سے ملا کر ان کی شخصیت کو دیکھیں تو اس میں نہ صرف ادب کی فرزانگی او سیاست کی دیوانگی نظر آتی ہے، بلکہ وہ ایک عجیب و غریب پیکر دکھائی دیتے ہیں ــــ ان کا ادب ان کی زندگی سے متاثر ہے اور ان کی زندگی ان کی سیاست کا عکس اور ان دونوں کے امتزاج سے جو صورت بنتی ہے، اس سے ایک ایسا وجود ابھرتا ہے جس میں مصوری تھوڑی، سنگتراشی زیادہ ہے ــــ ظفر علی خاں سراپا ہنگامہ تھے اور ظاہر ہے کہ ہنگامے میں حکایتیں شاذ اور شکایتیں وافر ہوتی ہیں۔ ظفر علی خاں کی شخصیت سے ہم عصروں اور ان کے جانشینوں نے جو تغافل برتا، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ظفر علی خاں نے گرد و پیش کی عمارتیں ڈھاتے ہیں زبان اور قلم کو ہمیشہ گرزِ البرز شکن بنائے رکھا۔ نتیجہ معلوم کہ ــــ آج وہ ماضی کی تمام ہماہمی کے باوصف دُودِ چراغِ محفل نظر آتے ہیں لیکن اس کے باوجود کوئی ادبی یا سیاسی نقشہ ایسا نہیں جس میں ان کا خط نہ ہو ــــ اور پھر وہ محض خط ہی نہیں رنگ بھی ہیں۔ کہیں مدھم، کہیں شوخ۔ انہیں ان خطوں اور رنگوں سے علیحدہ کر کے پرکھنا زیادتی ہے۔ وہ جو کچھ بھی ہیں اپنے ماحول کی صدا ہیں ــــ اور اسی سے ان کی سیرت عبارت ہے ــــ وہ ایک ایسی تصویر ہیں جس میں بوقلمونی ہی بوقلمونی ہے۔

اب سے چالیس پچاس برس پہلے پنجاب سپاہیوں کی کھلی منڈی تھا۔ صدیوں تک لشکریوں کی گزرگاہ رہا۔ برطانیہ نے پنجاب کو حیطۂ اختیار میں لیا تو یہ خصوصیت اور پختہ ہو گئی ــــ حتیٰ کہ تمام صوبہ برطانوی مقاصد کی جولانگاہ بن گیا ــــ اس سارے عرصہ میں صوبے کی اصل پیداوار سپاہی ہی رہے یا پھر ظفر علی خاں کی مخصوص سیاسی اصطلاح میں کاسہ لیسانِ سرمدی ــــ جن کا طغرائے امتیاز وفاداری بشرطِ استواری" تھا۔ ادھر ہندوستان کے دوسرے حصوں میں سیاسی شعور کی کرنیں پھوٹ چکی تھیں لیکن پنجاب کا مطلع بدستور تاریک تھا۔ بعض سمتوں میں چند گونجدار آوازیں سنی جاتی تھیں لیکن ان کا دائرہ نہایت مختصر تھا ــــ ایک انجمن تھی اور

اس میں چند چراغ ـــــ بالفاظِ دیگر ایک طبقاتی مذاق پیدا ہو رہا تھا جس سے عامۃ الناس بہمہ وجوہ محروم تھے۔ ظفر علی خان نے ایکا ایکی اسی جمود میں نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ ادھر لاہور میں کئی ادبی محفلیں جم چکی تھیں۔ ان کے بانی محمد حسین آزاد تھے۔ عبد القادر نے مخزن نکالا تو ایک بزم آراستہ ہو گئی۔ ادھر صحافت میں دو چار اخبار پیش رو تھے لیکن ظفر علی خان جو شبلی، حالی، داغ، محسن الملک اور اس عہد کے دوسرے اکابر کی صحبتوں سے فیض یاب ہو چکے اور حیدر آباد کی خوشگوار ادبی فضا میں رہ چکے تھے، ایک نیا رنگ لے کر اٹھے ـــــ وہ کسی روایت کے تابع نہیں تھے لیکن انہوں نے بزم کو رزم میں ڈھالا۔ "زمیندار" جو ان کے والد کی امانت تھا، اس کی ہیئت بدل ڈالی۔ وزیر آباد سے لاہور منتقل ہو گئے اور یہیں سے "زمیندار" نکالنا شروع کیا۔ ان کا ادبی مذاق بہت منجھ چکا تھا۔ علی گڑھ کی تعلیم، حیدر آباد کی صحبتیں، سر سید، شبلی اور حالی کا تلطف ـــــ ان سے ایک منفرد ظفر علی خان نکلا ـــــ اُردو جو مشکل پنجاب کے چند گھرانوں میں راہ پیدا کر سکی تھی، اب عوام کے مزاج میں دخیل ہونے لگی۔ پڑھے لکھوں کا تناسب چنداں حقیر ہی تھا ـــــ لیکن قارئین کی قلت نے سامعین کی کثرت پیدا کر دی اور دیکھتے دیکھتے اس سرے سے اس سرے تک ظفر علی کا نام ہو گیا جس کا مطلب تھا کہ ظفر علی خان کے رشحاتِ قلم نوکِ زبان ہوتے گئے ـــــ اتفاقات بڑی چیز ہیں۔ ادھر ظفر علی خان نے زمیندار کی ادارت سنبھالی اُدھر بلقان میں جنگ چھڑ گئی۔ یہ پہلا سیاسی موڑ تھا جو مسلمانوں کو ۱۸۵۷ء کے بعد مڑنا پڑا اور ان میں اپنے پاؤں پر اُٹھنے کی قدرے ہمت پیدا ہوئی ـــــ ظفر علی خان ادبی اعتبار سے سونا پہلے ہی تھے، اس سیاسی اتفاق نے سہاگہ کا کام کیا اور چند ہی دنوں میں ایک نیا ولولہ پیدا ہو گیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کا آغاز ہو چکا یا بعض روایتوں کے مطابق ہو رہا تھا۔ اپنے تئیں کہ ان کی تصنیفیں بسا اوقات غبار آلود ہوتی ہیں لیکن ہم لوگوں کا خیال ہے کہ اس دور کے اسلامی جذبات کی مظہر چار شخصیتیں ہیں۔ ابو الکلام، اقبال، محمد علی اور ظفر علی خان۔ ان چاروں میں بہت سی خصوصیتیں مشترک اور بیشتر میں تضاد تھا لیکن ان کے اشتراک اور تضاد دونوں میں حیاتِ ملی کی رُوح کارفرما تھی۔ ابو الکلام علم و عمل کا مرقع تھے لیکن وہ جس مقام سے پکارتے رہے، وہاں انہیں یہی احساس رہا کہ وہ اپنی ہی قوم میں ایک اجنبی آواز اور اپنے ہی ملک میں ایک غریب الدیار ہیں ـــــ اقبال کی فکر میں ان کا عمل تھا ـــــ محمد علی ایک نصب العین تھے جس کا امتیاز تھا ـــــ "کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست" ـــــ اور ظفر علی خان ـــــ "من از سرِ نو جلوہ دہم دار و رسن را" کی صدائے بازگشت ......

اس وقت مولانا کی عمر چوراسی برس سے کچھ اوپر ہے اور سنِ پیدائش ۱۸۷۳ء! ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں کوٹ مہرتھ میں پیدا ہوئے، وزیر آباد مشن اسکول میں داخلہ لیا، پٹیالہ سے میٹرک کیا اور علی گڑھ سے ۱۸۹۲ء میں ایف۔ اے کی سند لی۔ والد کشمیر میں ڈاک اور تار کے افسرِ اعلیٰ تھے۔ ان کے بلاوے پر سری نگر چلے گئے اور اسی محکمہ میں ملازمت کر لی۔ وہاں اپنے ایک افسر سے اُلجھ پڑے۔ ان کی ہجو لکھی اور ملازمت سے دست کش ہو کر مزید تعلیم کے لئے علی گڑھ لوٹ گئے۔ فرسٹ ڈویژن میں بی۔ اے کیا۔ نواب محسن الملک کو خواجہ غلام الثقلین کے استعفا دینے کی وجہ سے پرائیویٹ سیکرٹری کی ضرورت تھی۔ آپ نے اخبار میں اشتہار دیکھا، درخواست گذاری ـــــ اور خواجہ صاحب کی جگہ ملازم ہو گئے۔ وہاں تھوڑا عرصہ قیام کیا، پھر محسن الملک سے سفارشی خط لے کر حیدر آباد چلے گئے۔ نواب افسر جنگ سے ملے، انہوں نے فوج میں ملازم رکھ لیا۔ وہاں کسی نہ کسی طرح فوج سے دار الترجمہ میں چلے گئے۔ چند ہی دنوں میں اسسٹنٹ رجسٹرار ہو گئے۔ میر عثمان علی خان کے اتالیق بنے۔ عزیز مرزا ہوم سیکرٹری تھے، ان کی توجہ سے اسسٹنٹ ہوم سیکرٹری کے عہدے تک پہنچے۔ ان کا تبادلہ ہو گیا تو نواب سر بلند جنگ ان کی جگہ ہوم سیکرٹری ہو گئے۔ وہ قدرے ترش رُو اور چڑچڑے تھے۔ مولانا کی جودتِ طبع کو مضمون ہاتھ آ گیا۔ محمد رفیع سودا نہیں تھے کہ غنچہ سے کہتے "قلمدان لاؤ" ـــــ قلم اٹھایا اور ہجو لکھ ماری۔ سر بلند جنگ کو بھی خبر ہو گئی۔ مولانا چھٹی لے کر میر محفوظ علی بدایونی کے ہاں بربرہ چلے گئے۔ اُدھر وہ بھی ملازمت سے بیزار تھے، دونوں نے بمبئی میں امپورٹ ایکسپورٹ کا دفتر کھولنے کی ٹھانی اور استعفا دے کر رخصت ہو گئے۔ وہاں مکان کرایہ پر لے کر اورینٹل کمرشل ایجنسی کے نام سے ایک تجارتی ادارہ قائم کیا ـــــ جاپان سے ریشم اور افریقہ سے ہاتھی دانت کا سامان درآمد کیا مگر بیل منڈھے نہ چڑھی دونوں ادیب تھے اور یہ کاروبار تھا۔ عزیز مرزا تو دل شکستہ ہو کر بدایوں چلے گئے لیکن آپ نے دکن ریویو نکالنے کا فیصلہ کیا۔ ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ

عزیز مرزا دوبارہ ہوم سیکرٹری ہو گئے۔ انہوں نے تار سے بلوا بھیجا، بمبئی سے حیدرآباد پہنچے اور لیجسلیٹو اسمبلی کے رجسٹرار مقرر ہو گئے۔ یہاں آپ نے لارڈ کرزن کی تالیف خیابانِ فارسی کا اردو میں ترجمہ کیا اور شہرت پائی۔ پنجاب یونیورسٹی نے پانچ سو روپے انعام میں دئے جو ایک پنجابی نژاد کو کسی اردو ترجمے پر پہلا انعام تھا۔ خود نظام نے از راہِ خوشنودی تین ہزار روپے مرحمت فرمائے ——— داغ، میر محبوب علی خان کے استاد اور مرجعِ امرا تھے۔ انہوں نے تقریظ لکھی، جس میں صحتِ زبان کی بے حد تعریف کی ——— احسن مارہروی راوی ہیں کہ داغ کے قلم سے نثر کا جو سب سے بڑا ٹکڑا نکلا وہ یہی تقریظ ہے ——— اس سے پہلے مولانا سیرِ ظلمات، فسانۂ لندن اور سنہری گھونگا کا ترجمہ کر چکے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا کہنا ہے کہ ظفر علی خان فسانۂ لندن کے بجائے کسی علمی کتاب کا ترجمہ کرتے تو ان کی خدماتِ علمی میں شمار ہوتا۔ معرکۂ مذہب و سائنس کے متعلق ان کی رائے ہے کہ ایک مفید دینی خدمت ہے۔ غرضیکہ ان تراجم سے مولانا کی ادبی قابلیت کا شہرہ ہو گیا۔ انہی دنوں موسیٰ ندی میں طغیانی آ گئی جس نے تمام ریاست کو ہلا ڈالا اور متاثرہ لوگوں کی امداد کے لئے تحریک چل نکلی۔ مولانا نے اس پر جو طویل نظم لکھی۔ اس سے ادبی و شعری حلقوں میں ان کا نام اور ثقہ ہو گیا۔ اس نظم کو موضوع کے اعتبار سے اولیت کا درجہ ملا۔ اسی اثنا میں دکن ریویو جاری کیا۔ جنگِ روس و جاپان کے نام سے ایک منظوم ڈرامہ لکھا۔ گو اس کی فنی حیثیت سٹیج کی نہیں لیکن ادبی اعتبار سے قادر الکلامی کا نمونہ ہے ———!

ایک روز نواب افسر جنگ فوج کے جوانوں کی نیزہ بازی دیکھ رہے تھے۔ آپ قریب ہی کھڑے تھے ——— جی مچلا تو نواب افسر جنگ سے عرض کی ؎

تو دستگیر شو اے خضرِ پے خجستہ کہ من

پیادہ می روم و ہمرہان سوارانند

افسر جنگ مسکرائے۔ نیزہ موجود تھا، گھوڑا طلب کیا ——— فرمایا:

ہمیں میدان و ہمیں گوئے است۔

مولانا تامل کئے بغیر گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ گئے اور آنِ واحد میں میخ اکھاڑ لائے ——— ایک دن داغ کے ہاں شریکِ مجلس تھے کہ محلے میں شور رہا۔ کوئی بچہ کنوئیں میں گر گیا ہے۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ، لنگوٹ باندھ کنوئیں میں اُتر گئے اور بچے کو نکال باہر کیا۔

حیدرآباد میں کسی یوروپین تھیٹریکل کمپنی نے ڈرامہ کیا جس میں نیم برہنہ عورتوں کا رقص بھی تھا۔ ریاست کی طرف سے کمپنی کا شکریہ ادا کرنے کے لئے اُٹھے تو اظہارِ تبریک کے بجائے اظہارِ ملامت کر ڈالا۔ ریذیڈنٹ کو ناگوار گذرا، دل میں گرہ باندھ لی اور آخر حیدرآباد سے نکلنا پڑا ——— والد حیات تھے۔ یہاں آکر زمیندار میں شریک ہو گئے لیکن ایک آدھ برس ہی میں دوبارہ طلبی ہو گئی۔ سر مائیکل اڈوائر حیدرآباد میں ریذیڈنٹ رہ چکے اور اب پنجاب میں گورنر تھے، ان کے اشارہ پر خواجہ حسن نظامی نے چغلی کھائی اور حیدرآباد سے دوبارہ نکالے گئے۔ حتیٰ کہ پنشن بھی ضبط ہو گئی۔ الزام یہ تھا کہ نظام حیدرآباد کو پان اسلامزم کی راہ پر لاتے اور انگریزوں کے خلاف اُکساتے ہیں۔ لاہور پہنچے تو والد بسترِ مرگ پر تھے یا غالباً اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ زمیندار کو وزیر آباد سے اٹھایا اور لاہور چلے آئے۔ بلقان کی جنگ نے مہمیز کا کام کیا۔ اخبار کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ سر مائیکل گھات میں تھا ؎

اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

زمیندار کا گلا گھونٹ دیا گیا اور مولانا کرم آباد میں نظر بند کئے گئے۔ وہاں سے ستارۂ صبح نکالا لیکن تابکے؟ بالآخر اس کی شہ رگ بھی کٹ گئی۔ جن لوگوں کے سپرد احتساب کا کام تھا وہ ادبی استعاروں اور شعری کنایوں کو بھی شک کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ایک زمانہ میں زمیندار کو محض اس لئے ایک بڑی رقم کی ضبطی سے دوچار ہونا پڑا کہ اس میں کسی مقالہ کا سرعنوان یہ شعر تھا ؎

گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی

اے خانہ برانداز چمن کچھ تو اِدھر بھی

لاہور کے ایک سرکاری فیصلے نے مخبری کی اور زمیندار موت کے گھاٹ اُتر گیا۔ اب جو ضبطیوں، قرقیوں اور بندشوں کا سلسلہ چلا تو سیلاب تھا نہیں ——— تحریکِ خلافت

میں یہ طغیانی اور تیز ہو گئی حتیٰ کہ حضرو کی ایک تقریر میں ماخوذ ہو کر پانچ سال کے لئے قید ہو گئے، اور پھر ۱۹۳۶ء تک کبھی رہائی، کبھی اسیری۔ آپ کی مجموعی قید جو آپ نے مختلف وقتوں میں کاٹی، تقریباً بارہ برس ہوتی ہے۔ ہر تحریک میں حصہ لیا اور ہمیشہ پیش پیش رہے لیکن ہر تنظیم میں شامل ہو کر اس سے الگ ہو گئے۔ — کانگرس میں گئے تو برہنہ تلوار، اس سے نکلے تو ذوالفقار — مجلسِ خلافت کی روحِ رواں تھے لیکن کنارہ کشی اختیار کی تو اپنے ہی ہم عصروں سے دو دو ہاتھ کئے۔ احرار کی عمارت اٹھائی لیکن شہید گنج کی کدال سے گرا بھی دی۔ اتحادِ ملت کی بنیاد رکھی لیکن جلد ہی ڈھا دی — لیگ میں تھک ہار کر شریک ہو گئے اور اسی کو گوشۂ عافیت سمجھا مگر جمعیت کا اندازہوں کا توں رہا۔ مولانا ابوالکلام نے ایک دفعہ آپ کی انہی صلاحیتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا:

"ملک میں کسی تحریک کو مہینوں کے بجائے ہفتوں میں چلانا چاہو، تو ظفر علی خان اور
شوکت علی کو چھوڑ دو۔ وہ بسرعت تمام یہ قلعہ بنا ڈالیں گے، لیکن جب قلعہ بن جائے تو
ان کو فوراً باہر کر دو، کیونکہ وہ پھر اسی قلعے کو ڈھا دیں گے۔"

الغرض ظفر علی خان انہی حادثوں کی مخلوق اور یہ حادثے ان کے سراپا کو محیط ہیں۔ بظاہر یہ ان کی زندگی کا سیاسی پہلو ہے لیکن حقیقتاً ادبی ہے کیونکہ ان کا ادب ان کی سیاست کی تخلیق نہیں۔ ان کی سیاست ان کے ادب کی پیداوار ہے۔ ان کی سیاسی زندگی میں جو چمک ہے، وہ ان کے ادب کی وجہ سے ہے۔ ظفر علی خان میں سے ادب کو حذف کر دیں تو ایک فرد رہ جاتا اور شخصیت اوجھل ہو جاتی ہے۔ بعض ثقہ لوگوں کی رائے ہے کہ ظفر علی خان کا ادب ان کی سیاست کے ہاتھوں پٹ گیا۔ وہ سیاست کے ہتھے نہ چڑھتے تو ادبی اعتبار سے اقبال اور ابوالکلام کی صف میں ہوتے۔ اور ہنگامی ادب کی جگہ تخلیقی ادب پیدا کرتے۔ اس کے برعکس دوسرا خیال یہ ہے کہ یوں ہوتا اور دوں ہوتا کی بحث سرے سے غلط ہے۔ ظفر علی خان کا پیکر ہی اس امتزاج سے بنا ہے — اگر ادب کا کوئی مقصد ہے تو ظفر علی خان کے ادب نے بوجہ احسن اس مقصد کو پورا کیا ہے۔ بلکہ ان لوگوں سے زیادہ مقصد کی خدمت کی ہے جن کے ہاں ادب محض ایک سماجی نظام کی اکھاڑ پچھاڑ کے لئے آلۂ تخریب ہے۔ میتھو آرنلڈ کے الفاظ میں ادب تنقیدِ حیات، تفسیرِ حیات، تطہیرِ حیات اور تعمیرِ حیات ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ خود حیات کیا ہے؟ اس کا موقف کیا ہے؟ اور اس موقف تک پہنچنے کے لئے وہ کون سے اصول ہیں جن پر زندگی کا نظم قائم ہے — ظاہر ہے کہ زندگی ایک فرض ہے اور اس فرض کے کچھ مقاصد ہیں۔ ان مقاصد کے بارے میں یہاں تک احوال و ظروف کا تعلق ہے، ہمیشہ اختلاف رہا ہے۔ ہر دائرۂ انسانی میں حرکت و عمل کے خطوط ایک دوسرے سے مختلف ہیں ظفر علی خان نے جس ماحول میں قدم رکھا، وہ مسلمانوں کے لئے حد درجہ اجنبی تھا۔ تمام عالمِ اسلامی کے مسلمان صنعتی یورپ کے ہاتھوں پٹ رہے تھے — ابھی ایسے لوگ زندہ تھے جنہوں نے ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے محو ہو جانے کا سانحہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا یا جن کے لئے یہ غم تازہ تھا۔ ادھر ملک میں قومی تحریک نے بال و پر پیدا کر لئے اور حریت کا احساس کروٹیں لینے لگا تھا۔ ظفر علی خان نے ایک مردِ کارزار کی راہ اختیار کی — اب تک رمز و کنایہ اور استعارہ و تشبیہہ میں باتیں کہی جاتی تھیں۔ چنانچہ غالب اس ہنگام پر ایک آہِ سرد نظر آتے ہیں۔ ان کے خوشہ چینوں میں حالی نے نالۂ درد بلند کیا، شبلی صفِ ماتم میں شریک تو رہے لیکن آخر تاریخ کی راہ پر نکل گئے۔ اکبر نے تنقید اور تطہیر کو اختیار کیا۔ ان کے ہاں آنسوؤں اور قہقہوں کا امتزاج ہے۔ اقبال ایشیائی کارل مارکس کی حیثیت سے آگے بڑھے اور وہ قومی سے زیادہ بین الاقوامی نظر آتے ہیں لیکن ان کے مخاطب مسلمان ہی تھے۔

ظفر علی خان نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ادب کو عوام کے لئے ڈھالا اور اس کی عزت بھی قائم رکھی۔ انہوں نے اپنے آپ کو مسلمانوں کے جذبات کا سفیر بنا لیا۔ جو باتیں اب تک وضعداری سے کہی جاتی تھیں وہ کھل کر سامنے آ گئیں — ظاہری رکھ رکھاؤ سے ہاتھ اٹھا لیا۔ مرحلہ یہ تھا کہ جن غیر ملکوں کے قبضہ میں ہندوستان ہے، ان کے خوف اور جبر کو ذہنوں سے خارج کیا جائے — اور یہ کسی قومی تحریک کا ابتدائی شیوہ ہوتا ہے ظفر علی خان نے غیر ملکی حکومت پر تابڑ توڑ حملے کئے۔ جوں جوں قومی تحریک پھیلتی گئی، توں توں ان کا قلم تیز ہوتا گیا۔ انہوں نے برطانوی نظم و نسق اور اس کے کل پرزوں ہی کو

ہدفِ تنقید نہیں بنایا بلکہ ان کے ہندوستانی معاونوں کو بھی آڑے ہاتھوں لیا۔ ان کے اس حملے کی لپیٹ میں سبھی آ گئے ــــ افراد، مجالس، عقیدے، نظریات، تحریکیں اور اپنے، پرائے ــــ ان کی مدارات کے لئے ایسی اصطلاحیں اور ترکیبیں وضع کیں کہ سبھی واد دے اُٹھے ــــ ان میں تلخیاں بھی تھیں اور کچھ کچھ بھی لیکن اس کے سوا چارہ بھی نہ تھا ــــ عوام ہمیشہ جذبات پر اکٹھے ہوتے ہیں۔ شاعری بجائے خود جذبات کی پیداوار ہے اور صحافت کی بنیاد ہی جمہور پر ہے۔ ادھر قومی تحریک میں جذبات کا بلوغ نفرت اور محبت سے ہوتا ہے۔ لوگ جذبات ہی کے بل پر نفرت کرتے اور جذبات ہی کے ذریعہ محبت کرتے ہیں۔ ان تمام محرکات نے ظفر علی خان کے قلم کا اسلوب متعین کیا اور وہ نظم و نثر کے میدان میں یکہ تاز ہو گئے۔ پھر ان عوامل سے صحافتی شاعری پیدا ہوئی جس میں قصیدہ تھا یا ہجو ــــ اور ظفر علی خان کا سارا کردار اس میں جھلکتا ہے۔ ان کے ممدوحین کی فہرست مختصر لیکن معتوبین کی فہرست طویل ہے۔ جن ہستیوں اور عقیدوں کو انہوں نے خراج ادا کیا ان میں حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم تو مستقلاً ہیں۔ اس باب میں انہوں نے سنگلاخ سے سنگلاخ زمینیں منتخب کیں اور شگفتہ سے شگفتہ شعر نکالے۔ ان کے نعتیہ کلام کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دوسرے شعرا کی طرح غلو سے کام نہیں لیتے بلکہ حضورؐ کی سیرت کا نقشہ اور ان کے محاسن کی تصویر اس کمال سے کھینچتے ہیں کہ آنکھوں کے سامنے سیرت النبی چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ چنانچہ خواجہ حسن نظامی نے ایک دفعہ آپ کے قلمی چہرے میں لکھا تھا کہ قیامت کے روز اپنی نعتوں کے باعث بخشے جائیں گے۔ خود ظفر علی خان اپنے اس کلام کو توشۂ آخرت سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہیں اسلام اور تاریخ اسلام سے والہانہ عقیدت ہے ــــ بعض مسلمان بادشاہوں کی تعریف میں انہوں نے بہت کچھ لکھا اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی مسلمانوں کو تلقین کی ہے ــــ مثلاً صلاح الدین ایوبی، محمود غزنوی، اورنگ زیب اور اس زمانہ میں ابنِ سعود، امان اللہ خان، مصطفےٰ کمال ان کے ممدوحین تھے۔ بعض تحریکوں کی تائید و اعانت کے لئے جذبات کی شیفتگی کے ساتھ قلم اٹھایا۔ مثلاً کانگریس، خلافت، احرار، اکالی (گوردوارہ تحریک)، مسلم لیگ، اتحادِ ملت وغیرہ۔ اسی طرح بیشتر ہم سفر رہنماؤں اور ہم نوا عزیزوں کو بھی ہدیۂ سپاس پیش کیا لیکن ان رہنماؤں، عزیزوں اور تحریکوں کے معاملہ میں ان کے ہاں دونوں طرح کے جذبات عام ہیں۔ جس کی تعریف کی اس کی ہجو بھی لکھی، اور جس کی ہجو لکھی اس کی ستائش بھی کی۔ مولانا کے تینوں مجموعے "بہارستان" "نگارستان" اور "چمنستان" اس سے لبریز ہیں بلکہ ان واقعات کی دستاویز۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا کا کلام پوری نصف صدی کے سیاسی واقعات کی منظوم تاریخ ہے۔ ایک مؤرخ اس میں واقعات اور حالات کی بہت سی گم شدہ کڑیاں تلاش کر سکتا ہے۔

اس کے علاوہ مولانا کے تین مجموعے اور تھے۔ پہلا "روحِ معانی" ــــ یہ اصلاً گورکھپور خلافت کانفرنس کا خطبہ تھا۔ اسی کے اخیر میں چند نظمیں شامل تھیں جنہیں بہارستان میں شامل کر لیا گیا۔ دوسرا "حبسیات" ــــ یہ مولانا کے زندانی کلام کا مجموعہ ہے جو آپ نے پانچ سالہ قید کے دوران میں منٹگمری سنٹرل جیل میں سپردِ قلم کیا۔ تیسرا "ارمغانِ قادیان" جس میں مقالات کے علاوہ وہ نظمیں تھیں جو آپ نے قادیانی فرقہ پر لکھیں اور اب ان کے دوسرے مجموعوں میں ملتی ہیں۔

جہاں تک معتوبین کا سوال ہے، ان کا کوئی معاصر اور جماعت ان کے قلم سے نہیں بچی۔ یہاں تک کہ علامہ اقبال، قائدِ اعظم، ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر، گاندھی جی، جواہر لال بھی ان کے قلم کی زد میں آچکے ہیں۔ اور جماعتوں کا تو ذکر ہی کیا۔ یہی حال عقیدوں اور نظریوں کا ہے۔ اس طنز بلکہ تضحیک میں ان کا جواب نہیں۔ اس میدان میں انہوں نے اچھے اچھوں کی دستارِ فضیلت کے پیچ کھولے اور بڑے بڑوں کو چاروں شانے چت کیا ہے۔

مولانا سے پہلے ہجو کا انداز شخصی یا ذاتی تھا۔ جس کی بہترین مثالیں سودا، انشا اور مصحفی کے ہاں ملتی ہیں۔ یا پھر اجتماعی طنز جس کے موجد و خاتم اکبر الٰہ آبادی ہیں۔ ظفر علی خان نے سیاسیات میں ہجو کو استعمال کیا اور اس کی بنا قومی و ملکی مقاصد پر رکھی۔ گو ان میں ذاتیات کا زہر بغایت ہے اور یہ ایک بشری تقاضا ہے۔

لیکن اس افراط و تفریط کے باوجود اس میں جو جذبہ کارفرما ہے وہ اجتماعی ہے۔ ان ہجوؤں میں جن کا اصل نشانہ برطانوی ڈپلومیسی، ہندو بنیا پن، قادیانی نبوت اور اپنوں کی کاسہ لیسی ہے، کہیں کہیں دشنام بھی ہے۔ لیکن تلخ نوائی کے باوجود بعض اچھوتی تشبیہیں، دلچسپ استعارے، عمدہ ترکیبیں، اور دل آویز کنایے بھی ملتے ہیں۔ گو ایک قاری ان کی درشتی کو محسوس کرتا ہے اور بعض ناک بھوں بھی چڑھاتے ہیں۔ لیکن بیشتر ان اشعار پر سر دھنتے اور صاد کرتے ہیں۔

اس قدرتِ کلام پر مولانا نے بڑے بڑے معرکے سر کیے۔ زمیندار ان کے ایامِ صحت تک ایک ادارہ رہا ——— کئی آئے اور کئی گئے ——— عبداللہ العمادی، وحید الدین سلیم پانی پتی، نیاز فتح پوری، غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت، مرتضیٰ احمد میکش اور نصراللہ خان عزیز، یہ سب اپنے اپنے وقت پر زمیندار کی وجاہت کے ستون رہے ——— بعض نے علیحدگی اختیار کی تو شعر و سخن اور تضحیک و طعن کا ڈول ڈالا، لیکن مولانا کے شباب کا زمانہ تھا، جو سامنے آیا مات کھا گیا ———!

عجیب زمانہ تھا، مسلمان رہنما تحریکِ خلافت کے نتیجوں سے منتشر ہو کر ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو رہے تھے ——— مولانا محمد علی، مولانا ظفر علی خان اور خواجہ حسن نظامی میں بڑے بڑے قلمی معرکے ہو چکے تھے۔ روزنامہ "انقلاب" مرحوم ان معرکوں کی دل آویز فصل تھا۔ مولانا نے انقلاب پر چوٹ کی ———

مجموعہ انقلاب کا اقبال و نون ہیں

انہیں شبہ تھا کہ انقلاب کے اجرا میں علامہ اقبال اور ملک فیروز خان نون کا ہاتھ ہے ——— بس اس پر ایک معرکہ گرم ہو گیا ——— انقلاب کے ہم نواؤں میں نیاز مندانِ لاہور یعنی ——— مہر و سالک کے علاوہ تاثیر، تبسم، حفیظ، پطرس اور ان کے ساتھی ——— اُدھر تنہا ظفر علی خان ——— اِدھر افکار و حوادث اُدھر فکاہات ——— وہاں کئی لکھنے والے، کوئی نظم لکھ رہا ہے، کوئی افتتاحیہ اور کوئی افکار و حوادث کے محمل سے پتھر برسا رہا ہے اور مولانا ہیں کہ چومکھی لڑ رہے ہیں ——— ایسے معرکوں میں مولانا کا ادبی نام نقاش ہوتا ——— پھر ایک نام نہیں کئی نام ——— اِدھر افتتاحیہ لکھا، اُدھر فکاہات اور پھر سنگلاخ سے سنگلاخ زمین میں نئے نئے قوافی، نئی نئی ردیفیں اور بولتی ہوئی نظم ——— گاہے ماہے حسرت نے بھی ہاتھ بٹایا اور ایک آدھ دفعہ اختر شیرانی نے بھی عکاس کے نام سے چند نظمیں کہیں ——— مگر ظفر علی خان بلا کے شہسوار تھے ——— لڑائی تیز ہو گئی، اعلان کیا ———

زمیندار ایک، آپ اتنے نگر اوجِ صحافت پر
یہ اک تُکّل لٹے گا آپ کی ساری پتنگوں سے

اب فقرے بازی شروع ہے، شعر چل رہے ہیں، مصرع ہو رہے ہیں، اُدھر سے طعن توڑتا جا رہا ہے اِدھر سے جواب آں غزل آ رہا ہے، کہیں طنز گرم ہوا ہے کہیں پھبتی آتش فشار ——— اور پھر ایک آدھ دن کی بات نہیں ——— ہفتوں یہ دہ رہا ——— حریفانِ بذلہ سنج، حریفانِ دشنام ہو گئے تو بات مطلع سے مقطع پر آ گئی ——— غنیم چو رنگ ہے اور مولانا فاتح ———

ع ہم تھے حریفِ بذلہ وہ دشنام کے حریف

ایکا ایکی دیکھتے کیا ہیں کہ محاذ پھر گرم ہو گیا۔ مولانا نے لکھا ؎

انقلابات ہیں زمانے کے
مہر و سالک کے انقلاب کو دیکھ

اب جو مصرع اٹھایا تو مشاعرہ ہو گیا ——— یک غزلہ، دو غزلہ، سہ غزلہ ——— نظم و نثر کی فراوانی ——— انقلاب کے سبھی ساتھی ادبی اور مولانا کے تمام رفیق سیاسی ——— سالک نے لکھا "خلافت کی بلیاں ہمارا کھمبا نوچنے پر آمادہ ہیں"۔ مولانا نے جواب دیا "کیوں حضرت! خلافت کے ابوہریرہ یعنی

مولانا عبدالقادر قصوری کے متعلق کیا ارشاد ہے ——

اور پھر یہ معرکے محض جہر و ساک تک ہی محدود نہ تھے —— ان کا دائرہ پورے ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا۔ بعض حوادث و وقائع پر ایسے ایسے برجستہ شعر کہے ہیں کہ ان کا جواب نہیں۔ شنواریوں کی بغاوت سے متعلق زمیندار میں افتتاحیہ لکھا تو سر آغاز تھا ؎

جنگ کا کب ہے سلیقہ کسی شنواری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

کسی مسئلہ میں مسٹر جناح سے بھڑ گئے — قلم اٹھایا، اداریہ لکھا اور عنوان میں یہ شعر ؎

کیونکہ اس کی نگہِ ناز سے جیتا ہوگا — زہر دے اس پہ یہ تاکید کہ پینا ہوگا

ایک زمانہ میں علی برادران سے گاڑھی چھنتی تھی اب جو اختلاف کی ہوا چلی تو عمارت ہی بیٹھ گئی ؎

دونوں نے مل کے ڈالی ہے اسلامیوں میں پھوٹ — ہے صلح و آشتی سے علی بھائیوں کو ضد
منڈلا رہے ہیں آج خلافت کی لاش پر — دہلی کے اور بمبئی کے موٹے موٹے گدھ

اور پھر ایسے ایسے قافیے نکالے کہ مضمون سے قطع نظر بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے —— علامہ اقبال سے عمر بھر دوستانہ تعلقات رہے۔ ایک زمانہ میں حضرت علامہ نے روزنامہ احسان کے ظفر علی خان نمبر کو پیغام دیتے ہوئے کہا تھا کہ —— مولانا کا قلم مصطفےٰ کمال کی تلوار ہے — لیکن سائمن کمیشن کی آمد پر مولانا ان کی تواضع بھی کر چکے تھے ؎

مانگ کر احباب سے رجعت پسندی کی کدال — قبر آزادی کی کھودی کس نے؟ سر اقبال نے
کاٹ لی پنجاب کی ناک آپ اپنے ہاتھ سے — آبرو ملت کی کھودی کس نے؟ سر اقبال نے

گاندھی جی کے ہمرکاب تھے — تو ان کے قصیدے لکھے مثلاً ؎

پروردگار نے کہ وہ ہے منزلت شناس — گاندھی کو بھی یہ مرتبہ پہچان کر دیا

لیکن رُوٹھے تو پھر منے نہیں —— زاویۂ نظر ہی بدل گیا ؎

بھارت میں بلائیں دو ہی تو ہیں اک ساورکر اک گاندھی ہے — اک جھوٹ کا چلتا جھکڑ ہے اک مکر کی اٹھتی آندھی ہے

—— الغرض مولانا کا تمام کلام ان شعری سانحات سے بھرا پڑا ہے — ایک عام آدمی کے لئے یہ تضادات بظاہر حیرت انگیز ہیں لیکن مولانا نے جو کچھ لکھا وہ اصلاً ہماری پچاس سالہ سیاست کے داخلی اختلافات کا رنگا رنگ مرقع ہے۔ ان کے جذبات کی دو آنکھیں ہیں، مدح اور قدح —— وہ جس آنکھ سے جو تصویر دیکھتے ہیں، اسی کو کھینچتے ہیں۔ ان کے ہاں صحیح شعر کی کمی نہیں۔ انہوں نے بہت سی مثبت نظمیں اور سینکڑوں مثبت شعر کہے ہیں۔ لیکن کمی یہ ہے کہ ان کا انتخاب نہیں ہو سکا۔ مولانا نے زندگی بھر جتنے شعر کہے، وہ دس بارہ ہزار سے کیا کم ہوں گے؟ اور جو کچھ ان کے قلم سے نثر میں نکلا ہے اس سے کئی جلدیں مرتب ہو سکتی ہیں۔ مگر اس کام کے لئے فرصت اور محنت کی ضرورت ہے۔ خود مولانا بوڑھے ہو گئے اور زمانہ کا مذاقِ سخن بدل چکا ہے ——

ایک خوبی جس نے مولانا کو ہندوستان میں نامور کیا وہ ان کی بدیہہ گوئی ہے۔ ان کا تمام کلام ارتجال کی یادگار ہے۔ راقم الحروف نے بدیہہ گوئی کے ان معرکوں کو آنکھوں دیکھا ہے۔ کسی نے فرمائش کی اور شعر ہو گئے۔ جلسہ میں گئے، حاضرین نے اصرار کیا، نظم کہہ ڈالی۔ طبیعت کی آمادگی کا یہ عالم رہا کہ ایک ایک نشست میں دس دس نظمیں موزوں ہو گئیں —— ادھر کالج کے نوجوانوں کا ایک وفد حاضر ہوا، عرض کیا۔ مولانا شعر —— فرمایا بھائی شعر کہاں —— ہر وقت طبیعت حاضر نہیں ہوتی۔ انہوں نے اصرار کیا — چپ ہو گئے، حقے کا کش کھینچا اور کہا — اچھا لکھو —— اب فی کش ایک شعر لکھوائے جا رہے ہیں اور اس طرح پندرہ بیس شعر کہہ ڈالے ——

"حقے کی نے منہ میں آئی، انگوٹھا انگشتِ شہادت پر پہنچا — پیشانی پر بل پڑے اور بالفاظِ حسرت کھٹ سے شعر سامنے آگیا۔ اب بندش پر غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ کل کا بنا ہوا شعر ہے ہاتھ کا بنا ہوا ہی نہیں۔"

جب تک حواس بجا تھے مولانا محشرِ خیال تھے — ہر کوچہ میں قدم رکھا اور ٹھہرے کہیں نہیں —

ع ٹک دیکھ لیا، دل شاد کیا، خوش وقت ہوئے اور چل نکلے

ہاتھ کے سخی، دل کے سادہ — اکثر نوجوان ان سے روپیہ بٹورتے رہتے — جس ادا سے کماتے اسی ادا سے خرچ بھی کرتے تھے — دفتر میں ہوتے تو نگہائی رہتی — سفر میں ہوتے تو ملازم اور حقہ ساتھ رکھتے ہے

زندگانی کے لطف دو ہی تو ہیں صبح کی چائے شام کا حقہ

انہیں زمیندار کی زبان اور کتابت کا بڑا خیال رہتا — ایک دفعہ اپنے خواہرزادے مہدی علی خان (مصنف چاند کا گناہ اور دوسرے افسانے) کو ترجمہ کی ایک چھوٹی سی لغزش کے باعث دفتر سے الگ کر دیا — اور صفحۂ اول پر ایک طول طویل معذرت لکھی — ہر کاتب کے دست خط کا جائزہ لیتے — دائرے اور نقطے خاص طور پر دیکھتے۔ کسی کے کلام پر بہت کم اصلاح دیتے۔ کسی کی نظم پسند آتی تو اس میں ایک آدھ جگہ قلم لگا دیتے جس سے مصرعوں کا حسن سوا ہو جاتا۔

ایک دفعہ راقم نے عرض کیا — مولانا آپ کی زندگی تو محض سفر ہے — فرمایا:

"تم ٹھیک کہتے ہو — ایک حصہ زنداں میں بسر ہو گیا، ایک سیاسی سفروں کی بھینٹ چڑھ گیا — قلم دوات کی نعمتیں تو شاذ ہی میسر آئی ہیں — جی چاہتا ہے زمیندار انگلستان کے اخباروں کی طرز پر نکلے لیکن روپیہ —— ؟"

اور روپیہ زندگی بھر ان کے لئے ایک پرابلم رہا — !

جب کبھی اداریہ لکھتے تو اس کا پروف بھی خود ہی دیکھتے۔ اس کی لکھائی کے لئے کاتب بھی تجویز کرتے۔ ایک دفعہ راقم نے پروف پڑھا تو تسلی نہ ہوئی خود پڑھا آخر ایک غلطی پکڑی، مگر خوش ہوئے اور انعام میں بہارستان کا ایک نسخہ عنایت فرمایا۔

ہندوستان کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں مولانا نہیں پہنچے۔ وہ رنگون سے خیبر اور رمالا بار سے سری نگر تک گئے۔ اپنے زمانہ میں وہ ایک صاف گو مقرر تھے یعنی الفاظ کی نوک پلک درست، برجستہ فقرے، خوبصورت بندشیں، صحت مند استعارے، طبیعت میں روانی بلکہ طغیانی، ہر موضوع پر تقریر کرتے لیکن اپنا موضوع کہیں کبھی نہ چھوڑتے — ان کی تقریر ہبوطِ آدم سے شروع ہوتی اور سقوطِ خلافت پر ختم ہو جاتی — تمام دنیا کے مسائل زیرِ بحث آجاتے — ان کا دل اس سے ہمیشہ دکھی رہا کہ مسلمان اپنی سیزدہ صد روایات کو گلدستۂ طاقِ نسیان بنا چکے ہیں — ان کے قویٰ میں اضمحلال اور اعضا میں انحلال آگیا ہے — ان کی مرکزیت کا شیرازہ منتشر ہو چکا ہے اور ان کی داستانِ مصائب جناب علم الملکوت کے رودہ واحشا کے مانند دراز ہے —

اور یہ مولانا کا مخصوص انداز تھا — وہ خطابت کے میدان میں ابوالکلام آزاد یا عطاء اللہ شاہ بخاری نہ تھے — لیکن بہت کچھ تھے۔

ان کی بے شمار آرزوئیں تھیں اور انہی کے تصور میں انہوں نے عمر کے چوراسی سال بتا دئے۔ مگر ایک ہی آرزو پروان چڑھی — اور وہ ہے ملک کی آزادی — اور غالباً یہ آرزو سب سے بڑی آرزو ہے — اب وہ ہڈیوں کا ایک "ڈھیر" ہیں — حواس کا اختلاج — اور سچ تو یہ ہے بڑھاپا بجائے خود جوانمرگی ہے — بہ تصرفِ ادنیٰ ہے

ادیب آنہ آئے، صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

————

نیاز فتحپوری

سیّد ابوالخیر مودودی

نیاز صاحب گھریلو اور مکتبی تعلیم کے ساختہ پرداختہ ہیں۔ وہ انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں پیدا ہوئے۔ اگرچہ اس زمانے میں انگریزی حکومت کی جڑیں مسلمانوں کے مفتوحہ برصغیر میں پوری استواری کے ساتھ جم چکی تھیں، لیکن یہ جماؤ زیادہ تر صرف ذہن میں تھا، ہماری زندگی کی تہوں میں ان کے جمنے اور پھیلنے کا سانحہ اس وقت تک پیش نہیں آیا تھا۔ اس لئے ہمارا معاشرتی دروبست ان کی گرفت سے بہت کچھ آزاد تھا اور زندگی کی قدریں بھی کچھ ایسی زیادہ نہیں بدلی تھیں۔ نئے اقتدار کے اثر اور خصوصاً مغربی تہذیب و تمدّن کے مشئوم اثر سے دیہات تقریباً محفوظ تھے اور جدید مدارس کا جال شہروں ہی تک محدود تھا۔ دیہات میں شرفا کے گھرانے اپنے بچوں کی تعلیم کا خود انتظام کرتے تھے، ہر خاندان کا ایک مکتب ہوتا جس میں اس خاندان کے تمام بچے تعلیم پاتے۔ تعلیم قرآن سے شروع ہوتی، پھر فارسی عربی پڑھائی جاتی، زیادہ زور فارسی پر دیا جاتا اور درسِ نظامی کی تکمیل کے معنے یہ تھے کہ بچے نے بی۔ اے کر لیا۔ یہی ماحول تھا جس میں نیاز صاحب نے آنکھ کھولی، اور یہی تعلیم تھی جو انھوں نے اپنے وطن فتح پور کے مکتب میں حاصل کی۔

اس مکتبی تعلیم سے بہت زیادہ فائدہ نیاز صاحب کو خود اپنے والد سے پہنچا اور ان کی ادبی صناعت پر اثر انداز ہوا۔ وہ امام بخش صہبائی کے شاگرد تھے اور فارسی ادب کا بہت گہرا اور ستھرا مذاق رکھتے تھے۔ انھوں نے فارسی کی متداول درسیات کے علاوہ نیاز صاحب کو دوسرے اساتذۂ ہند و عجم کا کلام نظم و نثر بھی پڑھایا، اس بیش از درس تعلیم نے نیاز صاحب میں ادبی نکھار پیدا کیا، وہ بیدل سے روشناس ہوئے، ان کا 'انا' بیدل کے 'انا' سے ہم آہنگ ہوگیا۔ اس ہم آہنگی کے نقوش ان کی ابتدائی تحریروں میں بہت نمایاں ہیں۔ خصوصاً "ایک شاعر کا انجام" طرزِ بیدل میں ایک کامیاب ریختہ ہے، جس میں نیاز کی انفرادیت تاثر میں اور تاثر انفرادیت میں تحلیل ہے۔

انگریزی نیاز صاحب نے تقریباً خود پڑھی، اور ان کی ذہانت و ذکاوت نے برق رفتاری سے کمال رسی کی منزلیں طے کرلیں۔ اس کو خرقِ عادت ہی کہا جاسکتا ہے۔ اپنی دراک ذہانت اور بلند ادبی ذوق کے سہارے بڑی آسانی اور روانی سے انگریزی ادب کے فن کاروں کی صناعتوں سے استفادہ کرنے لگے۔ "ٹیگور کی گیتانجلی" اسی خارقِ عادت کمال رسی اور استفادے کا نقش جمیل ہے، جس میں نیاز نے مغربی ادب کے اسالیب کو اپنے فن میں جذب کیا ہے۔ انشائے لطیف میں یہ ان کی ابتدائی ادبی زندگی کا دوسرا کارنامہ ہے۔

انگریزی کی طرح ترکی بھی انھوں نے خود پڑھی اور دو تین مہینے میں اتنی استعداد حاصل کرلی کہ نامق کمال کے فن سے اسی کی زبان میں لطف اندوز

ہونے لگے۔ یہ سُنی سُنائی کہانی نہیں، آنکھوں دیکھی بات ہے۔

کم و بیش کچھ ویسا ہی کچھ زمانے کا ایک اور پُرشکوہ ادبی کارنامہ "گیتانجلی" کا ترجمہ ہے۔ شاید خود ٹیگور بھی اُردو میں عرضِ مناجات کرتے تو اس سے زیادہ بہتر حسنِ بیان کی قدرت نہ پاتے۔ لیکن جس طرح ٹیگور کو ان کے اہلِ وطن نے اس وقت جانا پہچانا، جب ان کو نوبل پرائز ملا، اسی طرح نیازؔ بھی اپنی زبان کے ادبی افق پر اس وقت نمایاں و نمایاں ہوئے جب ان کا یہ ترجمہ شائع ہُوا۔

نیازؔ صاحب کی یہ ادبی صناعتیں ان کی قلم کاری کا صرف ایک پہلو ہیں۔ انشائے لطیف و ادب عالیہ کے سوا انھوں نے اپنی ادبی زندگی کے اسی دَور میں اور بھی بہت کچھ لکھا ہے، اور یہ بہت کچھ اسی اسلوب میں لکھا ہے جس اسلوب میں آجکل لکھ رہے ہیں۔ یہ طرزِ انشا تو صاف کہہ رہی ہے کہ ہیں آمد ہی آمد ہوں، لیکن انشائے لطیف کی وہ گئی گذری بداعت طرازیاں بھی آمد ہی تھیں، آورد نہ تھیں۔ نیازؔ کا ذہنی سانچہ کچھ ایسا ہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اسلوبِ نگارش اظہارِ انفرادیت کے لئے اختیار کیا ہو اور قدرتِ بیان آورد سے آمد میں ڈھل گئی ہو۔

نیازؔ صاحب کے انشائے لطیف کے متعلق اُس زمانے میں عام گمان یہی تھا کہ اس طرح کی تحریر بکمال تکلّف و تصنّع ہی سے نمود پا سکتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ندرتِ فکر و اسلوب کے یہ انمول نمونے آورد و تکلّف کے اتنے بھی منت کش نہیں جتنی کانٹے پر اوس ہوتی ہے۔ "شہاب کی سرگزشت" کا ایک بڑا حصہ اس طرح لکھا ہے کہ احباب سے بیٹھے خوش گپی کر رہے ہیں، کسی بات سے ذہن کو مہمیز ہوئی، "شہاب" کلبلایا اور انھوں نے یہ کہتے ہوئے کہ "آپ لوگ باتیں کیجئے اور مجھے ہم کلام ہی سمجھیے" کاغذ کے چند سلپ ہاتھ میں لئے، پان کی گلوری منہ میں رکھی اور قلم رُکی یا پوتے نہیں بلکہ زراٹ چل نکلا۔

نیازؔ صاحب اپنی زندگی کے ایک دَور میں ریاست بھوپال میں ملازم بھی رہے ہیں۔ میری ان سے ملاقات بھوپال ہی میں ہوئی۔ میں نے ان کو رقعہ بھیجا: "آپ سے ملنے کا مشتاق ہوں، آپ تشریف لائیے یا مجھے وقت دیجئے" نیازؔ صاحب بے تکلّف تشریف لے آئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب گیتانجلی کا ترجمہ ادبی فضا پر چھایا ہُوا تھا، اور رقعہ لکھنے والا محض طفلِ مکتب تھا ——— اور آج بھی وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ——— خوانندگانِ نیازؔ اس سے نیازؔ کے "انا" اور ان کی شخصیت کو سمجھ سکتے ہیں۔ میں نے ان میں کوئی پندار و تبختر نہیں پایا۔ تعلقات بڑھتے، لیکن یہ تعلقات دوستانہ نہیں خوردانہ و بزرگانہ تھے۔ میں نے ان کی صحبت میں بے پڑھے بہت کچھ پڑھا، اور انھوں نے بے سکھائے مجھے بہت کچھ سکھایا۔

نیازؔ میں سمجھی تکلّف بالکل نہیں۔ ان کی بے تکلفی میں دوستانہ اور شریفانہ شان پائی جاتی ہے۔ وہ اسی حد تک بے تکلّف ہوتے ہیں جس حد تک آدابِ تہذیب کا اقتضا ہوتا ہے۔ ہنسی دل لگی میں بھی میں نے ان کے مُنہ سے کبھی ایسے الفاظ نہیں سُنے جو آدابِ شرافت کے منافی یا مذاقِ سلیم پر بار ہوں۔ میں نے ان کو اپنے آپ پر کبھی فخر کرتے نہیں سُنا، اور برہمی میں آپے سے باہر نہ پایا۔

ایک سچے ادیب کی طرح وہ اہلِ مناصب سے کبھی مرعوب نہیں ہوئے۔ میں نے انھیں عہدہ داروں کی گرد کرتے کبھی نہیں دیکھا۔ ان کے "انا" کا حقیقی اظہار یہ تھا کہ وہ اپنی شفقت سے میرے پاس تشریف لاتے لیکن میرے بڑے بھائی سے ملنے کے کبھی خواستگار نہ ہوئے۔ ہمیشہ یہی ہُوا کہ اتفاقیہ آمنا سامنا ہو گیا اور وہ سرِ راہ علیک سلیک کرتے گزر گئے۔

ایک دفعہ بہت مزیدار حادثہ پیش آیا۔ بھائی جان کے پاس چند عالی مقام وارد تھے۔ حسنِ اتفاق یا سوئے اتفاق سے میرا کمرہ ان کے ڈرائنگ روم سے متصل واقع ہو گیا تھا۔ نیازؔ صاحب میرے پاس تشریف لائے اور عین اسی وقت چند بزرگانِ کرام بھائی جان کے پاس، ان میں قابلِ ذکر صرف ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم ہیں، کہ حادثہ آدر انہی کی ادب دوستی تھی۔ وہ نیازؔ کے بڑے مداح تھے، پیش قدمی کی اور نیازؔ کو اپنا شریکِ بزم کر لیا۔ ڈرائنگ روم کی فضا بدل گئی، ادبی بات چیت ہونے لگی۔ شرکائے بزم میں ایک انجنیئر صاحب بھی تھے، اپنے فن کی متعدد ڈگریوں سے ارجمند انگلستان کے تعلیم یافتہ، لیکن شئے لطیف سے محروم! ان کو بھی اپنی ادب نوازی کا اظہار ضروری محسوس ہُوا، کہنے لگے: نیازؔ صاحب! وہ مضمون

تو آپ نے بہت ہی خوب لکھا ہے جس کا عنوان رقاصہ ہے — مگر رقاصہ کا آرٹ کیا ہے۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔" وہ بچارے فقرہ تمام کرکے سانس بھی نہ لینے پائے تھے کہ نیاز نے جواب کھینچ مارا "آپ سمجھنے کی کوشش بھی نہ کیجئے۔ اس کا آرٹ آپ کی سمجھ میں آئے گا بھی نہیں۔" وہ غریب گھگیا کے رہ گیا اور مجلس پر سناٹا چھا گیا۔

نیاز فطرتاً کچھ کھرے ہیں اور ان کا یہ کھرا پن، اکھڑ پن بھی بن جاتا ہے۔ وہ معاف کرنا جانتے تو ہیں، مگر معاف کر دینا پسند نہیں کرتے۔ وہ طبعاً انتقام جو ہیں اور انتقام پسند بھی۔ نیاز کے مزاج کی یہ کیفیت خصوصیت کے ساتھ ان کی تنقیدوں سے عیاں ہے اور کسی حد تک ان کی اس تصویر سے بھی جو انھوں نے "گیتان جلی" میں لگانے کے لئے بڑے اہتمام سے کھنچوائی تھی۔

نیاز کے ایک دلچسپ ترین رفیق طریق ایک ملک صاحب تھے۔ یہ کچھ نیاز کی خوش قسمتی تھی اور کچھ ملک صاحب کی۔ دونوں کا اقتران ایک ایسے دفتر میں ہوا جس پر عدم ہی کا اطلاق کیا جا سکتا تھا نہ وجود کا۔ ملک صاحب کا واحد امتیاز، میرے نزدیک تو یہ ہے کہ وہ شیخ عبدالقادر مرحوم کی باغ و بہار صحبتوں سے ارجمند و بہرہ مند ہیں۔ لیکن خود ملک صاحب اپنا واحد امتیاز یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بہت اچھے شکاری ہیں، چھاپہ مار ہیں اور ان کا چھاپہ کبھی خالی نہیں جاتا۔ ملک صاحب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ پیدائشی طور پر جہاں دیدہ ہیں۔ عالم اور عامل کا یہ اقتران دونوں کے لئے خوشگوار تھا۔ دفتر پر صرف وجود کی تہمت تھی۔ افسری اور ماتحتی کا وہاں کوئی سوال ہی نہ تھا۔ نیاز اور ملک دونوں بیٹھے گپ لڑایا کرتے تھے۔ نیاز اپنے ذہن سے چیزیں تراشتے اور ملک بہت سی سنی سنائی باتوں کو اپنا کر بیان کیا کرتے۔ نیاز تو پھر بھی کچھ وقت لکھنے پڑھنے میں صرف کرتے تھے۔ وہ ڈھائی گھنٹے روز وہیں اوقاتِ دفتر میں، مطالعہ ان کا معمول تھا، لیکن یہ اسی وقت تھا، جب ملک صاحب گپ لڑانے کے شوق میں دفتر یعنی اپنے گھر سے باہر کہیں گئے ہوئے ہوں۔ ملک صاحب خوش رو بھی تھے، خوش لباس بھی اور جامہ زیب بھی۔ انگلستان جاکر وہ کچھ اور سیکھ کر آئے ہوں، یا نہ آئے ہوں، لیکن لباس پہننے کا سلیقہ اور کچھ اور ایسے فنون، جو اس قسم کے نوجوان، بہت چابکدستی سے حاصل کر لیا کرتے ہیں، ضرور سیکھ آئے تھے۔

ملک صاحب کی شومیٔ قسمت سے مسز نائیڈو بھوپال تشریف لائیں۔ نواب صاحب بھوپال سے ان کے مراسم تھے اور ایک مسز نائیڈو ہی کیا، بہت سے قومی لیڈروں اور اس عہد کے اکابر سے نواب حمید اللہ خاں کے دوستانہ تعلقات تھے۔ نواب زادگی کے ساتھ یہ تعلقات، علی گڑھ کی تعلیم و تربیت کے رچاؤ کا ثمرہ تھا۔ مسز نائیڈو سرکاری مہمان تھیں۔ ملک صاحب نے سوچا قسمت آزمائی کا اچھا موقع ہے۔ بن سنور کے ان سے ملنے پہنچے۔ دو تین ملاقاتیں فرمائیں۔ ان کی شاعری کی بہت شعر شناسانہ دادیں دیں اور اظہارِ عشق فرما دیا۔ ملک صاحب اپنی نگاہ میں کچھ بھی ہوں، مسز نائیڈو کی نگاہ میں بچہ ہی تھے۔ انھوں نے کمال شفقت سے فرمایا:

"میں آپ کے عرضِ محبت کو مادرانہ شفقت کے ساتھ قبول کرتی ہوں!"

ملک صاحب نے اپنی ذہانت سے شرمندگی کو "تشکر و سپاس" میں منتقل کر دیا۔ لیکن وہاں سے آئے اس شان سے کہ چہرہ بے حد اترا ہوا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لقوہ کی لہر ملک صاحب کے چہرے سے ٹکرا کے نکل گئی۔ نیاز صاحب سے روداد بیان کی۔ نیاز کی شریر طبیعت نے ——— اور نیاز کی یہ شرارت ان کی اسی تصویر میں گوشۂ چشم سے جھانک رہی ہے، جو گیتان جلی میں انھوں نے چھپائی ہے ——— بہت لطف لیا۔ بہت دیر تک بناتے رہے اور کہنے کی بات یہ ہے کہ ان کے حق میں بھی ویسا ہی دوٹوک فیصلہ صادر کیا، جیسا فیصلہ انجنیئر صاحب کے حق میں صادر کیا تھا:

"ملک صاحب! آپ بھی کہاں پہنچے۔ آپ کا میدان ہیرا منڈی ہے، سفید گلی ہے۔ گوکھلے کے رمنے کی ہرنی بھلا آپ کے دام میں کہاں آنے والی تھی!"

نیاز صاحب کو ملازمت کے آخری دنوں میں انسپکٹر جنرل پولیس کے دفتر میں بھی چسپاں ہونے کا سانحہ پیش آیا اور یہ سانحہ ان کے لئے مفید ثابت ہوا۔ ڈاکٹر بجنوری مرحوم نے نواب حمید اللہ خاں کو، جو اس زمانہ میں ریاست کے چیف سیکرٹری تھے ——— لیکن حقیقت میں

سب کچھ وہی تھے ـــــــ توجہ دلائی کہ بہت ہی بدزیب بات ہے کہ نیاز جیسی اعلیٰ ادبی صلاحیتوں کا آدمی آپ کی ریاست میں پولیس کے دفتر میں ہیڈ کلرک ہے۔ نیاز کے لئے ادبی خدمات کا وظیفہ مقرر فرما دیجئے۔ نواب صاحبہ نے ان کی تجویز کے مطابق وظیفہ مقرر فرما دیا اور نیاز صاحب کو دفتری جھنجھٹ سے نجات مل گئی۔ یہ ۱۹۱۹ء کا واقعہ ہے۔ نیاز صاحب کے دوستوں نے اصرار کیا کہ وہ اسی سال بیگم صاحبہ کی سالگرہ کے موقعہ پر کوئی تصنیف پیش کریں۔ سالگرہ دو مہینے بعد ہی ہونے والی تھی۔ معاملہ کٹھن تھا۔ لیکن نیاز بہرحال اس سے عہدہ برآ ہوئے۔ نواب سلطان جہاں بیگم کی رعایتِ مذاق کے مطابق کتاب تصنیف کی اور دو مہینے کی قلیل مدت میں کتاب تصنیف ہو کر اور طباعت کے مراحل سے گذر کر سالگرہ کے دن پیش ہو گئی۔ یہ کتاب "گہوارۂ تمدن" ہے۔ یہاں میرا مدعا اس کے صرف انتساب کو پیش کرنا ہے کہ نیاز کی شخصیت اس انتساب میں ہے:-

مانا کہ لعل و گہر بغیر کسی وصفِ اضافی کے بھی دُنیا میں اک مستقل امتیاز رکھتے ہیں!
لیکن ان کا حقیقی شرف تو اسی طرفِ کُلہ سے وابستہ ہے، جہاں جگمگانے کے لئے
وہ حقیقتاً وضع ہوئے ہیں۔ اس لئے اگر میں ان اوراق کو علیا حضرت، بلقیس تربت،
نوشیرواں صفت گردوں رکاب، والا جناب، سلطان جہاں بیگم......
ادامہا اللہ بالعزّ والکمال فرمانروائے دار الاقبال بھوپال کے اسم گرامی سے
منسوب کرنے کی عزت حاصل کر کے بے حد مفتخر ہوں، تو جائے حیرت نہیں، کیوں کہ
اربابِ نظر لعل و گہر کو نہیں، بلکہ

عروج طالع لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

نیاز کو ایک مرتبہ اپنے "انا" کا بہت سخت امتحان دینا پڑا۔ حیدر آباد میں ان کے ایک دوست ہوش بلگرامی ہیں بڑے صاحبِ کمال اور صاحبِ فن، ذہانت اور طباعی میں اگر نیاز سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں دونوں میں فرق صرف میدانِ تگ و تاز کا اختلاف ہے۔ بحث یہ تھی کہ "انا" اس محدود دائرہ ہی میں ظہور کر سکتا ہے یا اس پھیلی ہوئی کائنات اور حیات کی رنگا رنگی میں بھی اس کا ظہور ممکن ہے ہوش دربار داری کے فن میں یکتا تھے ـــــــ تھے اس وجہ سے کہ اب وہ گھر دنیا ہی لوٹ چکا ـــــــ ان کے "انا" نے چاہا کہ اپنے میدان میں نیاز کی صلاحیتوں کی آزمائش کریں وہ نیاز کو نظام کی پیش گاہ میں لے جانے پر مُصر تھے اور میرا خیال تھا کہ نیاز اس میدان میں نہیں چل سکیں گے اوّل تو نظام کی پیش گاہ میں جانے کے آداب ہی ایک مستقل عذاب۔ پہنے، کرتے ایک خاص وضع کی پگڑی باندھو سر پر ایک فنہ رکھو نا بہ رکوع جھک کر سات سلام کرو اور نگاہیں نیچی کئے دست بستہ دم بخود کھڑے رہو۔ پھر بادشاہوں کی قوم ایک ایسی مخلوق ہے جس کا خمیر تمام حیواناتِ مرضعہ اور غیر مرضعہ کے مجموعہ سے تیار کیا گیا ہے ان سے وہی لوگ برسر آ سکتے ہیں جن میں اس قوم کا خمیر مایہ شامل ہو نیاز نے کہا کہ یہ نہ سمجھو کہ میں اس میدان میں چل نہیں سکتا دو چار دفعہ چلا جاؤں تو ہوش تمہاری اگلن بھی اُتر جائے گی اور تم تو صرف ناک کا بال ہی ہو میں نفسِ ناطقہ بن جاؤں گا ہوش صاحب کا "انا" بلبلا اُٹھا انھوں نے کہا تو پھر چلو کل، نیاز نے کہا کہ میرا چلنا بلائے جانے پر منحصر ہے تم بلواؤ میں آؤں گا۔ بات ٹھن گئی تھی ہوش صاحب نے اس طمطراق سے تقریب کی کہ طلبی ہو گئی وہاں نیاز نے دربار داری کے آداب و فنون کا ایسا مظاہرہ کیا کہ گویا پیدائشی دربار دار اپنے اصلی مقام پر پہنچ گیا۔

نیاز کی انشائے لطیف میں عورت کا بڑا عمل دخل نظر آتا ہے شاید اس عمل دخل کے بغیر انشائے لطیف ممکن بھی نہیں یہ عمل دخل سجاد یلدرم کے ہاں بھی ہے اور مہدی افادی کے ہاں بھی یلدرم اس عمل دخل سے خیالات کی رنگینی و رعنائی کا کام لیتے ہیں مہدی افادی اعصاب میں تشنج پیدا کرتے ہیں اور نیاز جذبات کی شدت اور خیالات کی رنگینی کا مرقع بنا لیتے ہیں۔ نیاز کے ہاں جذبات کی شدت جس قدر زیادہ بڑھتی ہے اسی قدر خیالات کی رنگینی و رعنائی زیادہ ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں نیاز کے ہاں جذبات کا ہیجان و طغیانِ جنس کا نتیجہ ہے وہ بظاہر اپنے فن میں موپساں کا ایک کردار نظر

آتے ہیں لیکن فی الحقیقت وہ افلاطونی تصورِ عشق کا کردار ہیں۔ ان کی انشائے لطیف کی حقیقت ریاض کے خمریات سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ وہ رقاصہ جس کی انھوں نے عکاسی کی ہے ان کی ذہن آفریدہ ہستی ہے اس عالم رنگ و بو اور سہت و بو دکا کوئی وجود نہیں۔ وہ ایسے فن کار ہیں جو اپنے فن کے نشہ میں بے پیئے مست رہتے ہیں میں نے چار پانچ برس کے تعلقات میں ان کو ایسا ہی پایا۔ ہو سکتا ہے کہ تعلق کی نوعیت نے یہ بات روا نہ رکھی ہو کہ خرد بزمِ رامش و رنگ میں بار پائے کیونکہ وہ بہرحال اس ماحول کے پروردہ یافتہ ہیں جس میں ان باتوں کا بہت لحاظ رکھا جاتا تھا۔

نیاز صرف مجموعۂ خوبی ہی نہیں۔ نہیں! ان میں کمزوریاں بھی ہیں ان کی کمزوریاں جو کچھ بھی ہوں اور جتنی بھی ہوں گی ان کے لئے ہیں۔ مجھے صرف انسانی خوبیوں سے سروکار ہے، متاعِ نیک ہر دکاں کہ باشد' خاکر دبی کوئی پسندیدہ فعل نہیں اور میں اس پر اپنے آپ کو آمادہ بھی نہیں کر سکتا لیکن یہاں نیاز کی صرف ایک کمزوری کا ذکر ضرور کروں گا۔ وہ کمزوری ان کی تنگ دلی اور تنگ نظری ہے وہ بحیثیت نقاد کے حد سے گزر جاتے ہیں اور جس سے ذرا سا بھی کوئی اختلاف ہو اس کے ساتھ انصاف نہیں کرتے یہ بات ان کے درجہ سے فروتر ہے اور مجھے افسوس ہے کہ جس قدر یہ بات دون مرتبہ ہے اسی قدر زیادہ وہ اس بے اعتدالی کے مرتکب ہوتے ہیں۔

پطرس بخاری

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم

۱۹۲۸ء کی بات ہے۔ شام کا وقت تھا۔ پروفیسر بخاری اماں میں بیٹھے کالج کی باتیں کر رہے تھے۔ میں نے کالج کی تدریسی اور ادبی سرگرمیوں کے سلسلے میں کچھ تجویزیں پیش کیں۔ ہنس کر بولے "صوفی! یہ تو شعر ہوئے۔ تم نے سنائے اور میں نے سن کر داد دی"

میں چپ ہو گیا۔

کچھ وقفے کے بعد بولے "سنو! تم استاد ہو اور میں کالج کا پرنسپل۔ ہمارا کام اس درسگاہ کے نظم و نسق کو عملی طور پر آگے بڑھانا ہے۔ میرے نزدیک وہ تجویز جو عملی صورت میں نہیں آتی خواہ وہ آسمان ہی سے کیوں نہ نازل ہوئی ہو، محض ذہنی عیاشی ہے۔ اور میں ذہنی عیاشیوں میں شعروں اور دوستانہ خوش گپیوں کو ہمیشہ ترجیح دیتا ہوں"

میں نے مرزا بیدل کی ایک غزل جو اسی روز پڑھی تھی سنانی شروع کر دی۔

رات کچھ بے چینی سی رہی۔ ایک مدت سے کالج میں اردو کی تدریس شبانہ جاری کرنے کا ارادہ تھا۔ صبح ہوتے ہی میں نے "ادیب فاضل کلاس" کی تدریس کا ایک مکمل "پیشں نامہ" مرتب کر لیا۔ اور اس کی تین نقلیں بھی تیار کر دیں۔ شام کو یہ مسل بغل میں دبائے بخاری صاحب کے مکان پر پہنچا۔

انھوں نے پوچھا "ضلع کچہری سے آ گئے ہو؟"

میں نے کہا "نہیں گھر سے آ رہا ہوں"

"تو یہ پلندہ کیسا ہے؟"

"میرے ذاتی کاغذات ہیں"

"ٹھیک۔ بیٹھو"

اُن دنوں پرنسپل کے مکان میں سرکاری کاغذات کا داخلہ ممنوع تھا۔

ایک آدھ ادھر اُدھر کی بات کرنے کے بعد میں نے جھجکتے جھجکتے اپنا تجویزی کلام سنانا شروع کیا۔

میں نے کہا "عام شائقین کے لئے اردو کی اعلیٰ تدریس کے لئے کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں، ارادہ ہے کالج میں ادیب فاضل کی ایک کلاس

شام کو جاری کی جائے۔ اس کلاس کے جملہ نظم و نسق، ترتیب و تدوین اور دروس و تدریس کا کفیل کالج ہی ہو۔

حسبِ معمول کہنے لگے: "یہ طرحیہ اشعار ہیں؟"

میں نے کہا "جی ہاں، مطلع سنا چکا ہوں، پوری غزل یہ رہی۔"

یہ کہہ کر میں نے کاغذات کا پلندا اُن کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ اسے پڑھتے جاتے تھے اور اُن کا چہرہ خوشی اور مسرّت سے تمتماتا جاتا تھا۔ درمیان میں کہیں کہیں وہ کچھ سوال بھی پوچھتے جاتے۔ میں جواب دیتا اور کہتا "آپ سارا مسودہ پڑھ لیں آپ کو معلوم ہو جائے گا۔"

کاغذات ختم ہوئے تو بولے:

"ہوں! گویا میں ہی پڑھاؤں گا۔"

میں نے کہا "آپ فقط پرنسپل ہی نہیں اُستاد بھی ہیں۔"

"کیوں نہیں؟"

اس کے بعد انھوں نے ایک سگرٹ سلگایا جس کا دھواں تھوڑے ہی وقفے میں برآمدے کے ہر گوشے میں لہرا رہا تھا۔

شام کا کھانا کھانے کے بعد وہ موٹر کار میں بیٹھ کر شہر میں گھومنے لگے۔ جہاں جاتے اسی غزل کی تلاوت ہوتی، اور پڑھنے کے ساتھ ہی اس طرح داد بھی دیتے کہ دوسروں کے منہ سے بے ساختہ واہ نکل جاتی۔ اہلِ فکر حضرات اور مشفق احباب سب نے اسے سراہا۔ اس تبلیغی اعلان اور نشری پرچار میں آدھی رات گزر گئی۔

صبح کو یہ بات لاہور کی گلی گلی، کوچے کوچے میں گشت لگا رہی تھی۔ ایک ہفتے کے اندر تمام ضروری مراحل طے ہو گئے۔ محکمانہ اجازت، اشتہار و اعلان، درخواستوں کی طلبی، امیدواروں کی پیشی، داخلہ اور پڑھائی۔

پروفیسر بخاری اپنے روزمرّہ مشاغل میں خواہ وہ فرائضِ منصبی سے تعلق رکھتے ہوں یا نجی ہوں ایسی ہی مستعدی سے کام لیتے ہیں، زندگی میں اُن کی کامیابی کا سب سے بڑا راز یہی ہے۔

قدرت نے انھیں غیر معمولی ذہانت عطا کی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اُن کی معاملہ فہمی اور جزرسی اس ذہانت کو اور بھی چمکاتی ہے۔ وہ کسی کام میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے اس کے تمام امکانی پہلوؤں کو بھانپ لیتے ہیں، اُس کے حسن و قبح اور دُور رس نتائج کو دیکھتے ہیں۔ بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی قوتِ عمل بڑی تیزی سے کام کرتی ہے اور وہ کسی خیال کے آتے ہی اُسے فی الفور عملی جامہ پہنا دینے کی عادی ہیں لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ معمولی اقدام کے لئے بھی کئی دن تک غور کرتے رہتے ہیں۔ اُٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے سوچتے ہیں، دوسروں سے مشورہ بھی لیتے ہیں۔ اور اس مشورہ طلبی میں ایسے حسنِ تدبر سے کام لیتے ہیں کہ بات بھی سلجھ جائے اور کسی کو اصلی راز کا پتہ بھی نہ چلے۔ جب ذہنی جائزہ لینے کے بعد انھیں پورا اطمینان ہو جاتا ہے، تب وہ قدم اُٹھاتے ہیں۔ اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اس کام کی تکمیل کے درپے ہو جاتے ہیں۔

کاموں کی تکمیل کے لئے دوسروں سے مدد لینے میں انھیں خاص ملکہ حاصل ہے، وہ اپنے عملی اقدام کا چرچا بڑی خوش اسلوبی سے کرتے ہیں۔ دوستوں کی ہمدردی اور رفیقانِ کار کی اعانت ہمیشہ اُن کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ پھر اُن کے کام کرنے کا طریقہ بھی اتنا خوش آیند ہوتا ہے کہ دیکھنے والوں میں بھی تکمیلِ کار کا ایک غیر معمولی ولولہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ خود بخود اُن کے شریکِ کار بن جاتے ہیں اور اس شرکت میں ایک راحت محسوس کرتے ہیں۔

بخاری کا مقولہ ہے کہ کسی کام کی صحیح تکمیل کے لئے انسان میں محض شوق نہیں بلکہ چسکا ہونا چاہیئے۔ چنانچہ وہ جب بھی کسی کام کو کرتے ہیں تو ایسے ذوق و شوق سے کرتے ہیں کہ گویا انھیں اس کام کا چسکا ہے۔ اُن کا یہ ذوق و شوق ایک سہولت اور آسانی پیدا کرتا ہے۔ اُن میں ایک

قدرتی روانی اور حسن آجاتا ہے، اور اُن کی تکمیل ایک فطری تقاضے کی تکمیل معلوم ہوتی ہے۔

بخاری جس کام کو کرتے ہیں ایسی سرگرمی، ایسے انہماک اور شغف سے کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے یہی اُن کا فطری مشغلہ ہے اور قدرت نے انھیں اسی کام کے لئے بنایا ہے، لیکن وہ تمام کاروبارِ زیست کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک ہر کام کے لئے ایک پیشہ ورانہ مہارت درکار ہے۔ جب تک کوئی مشغلہ فن نہیں بن جاتا ہے، اپنی صحیح حیثیت کو برقرار نہیں رکھ سکتا۔ انسان کام کرے تو حسنِ کار کو کام میں لائے، نہیں تو بے کار رہے۔

بخاری نے ایک بے چین طبیعت پائی ہے۔ اُن کا دماغ اُن کے جسم سے اور اُن کا جسم اُن کے دماغ سے زیادہ تیز کام کرتا ہے۔ اُن کے ذہنی اطوار اور عملی رفتار ہمیشہ ہم آہنگ رہتے ہیں اس لئے انتہائی مصروفیتوں میں بھی اُن کی طبیعت پر کوئی ناگوار بوجھ نہیں پڑتا بلکہ ہر تکمیلِ کار اُن کے لئے خاص لذت اندوزی کا سامان مہیا کرتی ہے۔ وہ کسی شے کو معمولی حالت میں دیکھنا گوارا نہیں کرتے۔ اُن کی طبیعت کی اُپج اس میں ہر روز کوئی نہ کوئی تغیر چاہتی ہے۔ اگر یہ تغیر واقع نہ ہو تو ہر مشغلہ اپنی دلچسپی کھو دیتا ہے اور اس کی یکسانیت اُسے بے کیف بنا دیتی ہے۔ بخاری کو یہ یکسانیت کسی طرح بھی گوارا نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ایسی یکسانیت سے نہ صرف کام کی رفتار ڈھیلی پڑ جاتی ہے بلکہ کام کرنے والے کی طبیعت کو بھی زنگ لگ جاتا ہے۔ گورنمنٹ کالج میں "مجلس" کا قیام، محکمۂ تعلیم میں منتخب کتابوں کے تراجم، ریڈیو کے نئے نئے نشری پروگرام سب کے سب اسی اُپج کا نتیجہ ہیں۔

بخاری کی تیز رفتاری کا ایک واقعہ مجھے اب تک یاد ہے۔ "مجلس" کے ہفتہ وار ادبی اجلاس پہلے پہل انہی کے مکان پر ہوا کرتے تھے۔ ایک شام جب مجلس کی کارروائی شروع ہونے والی تھی، وہ ساتھ کے کمرے سے نکل کر آئے۔ آستینیں چڑھی ہوئیں، ہاتھ گرد آلود تھے۔ بولے آج میں سخت مصروف ہوں۔ آپ میرا انتظار نہ کریں میں شریکِ محفل نہ ہو سکوں گا۔ بات ختم ہوئی۔ دوسرے روز معلوم ہوا کہ آپ نے رات بھر میں ٹیکسٹ بک کمیٹی پنجاب کی پچیس سالہ کارگزاریوں کی ایک رپورٹ مرتب کر لی۔ اس رپورٹ کی ترتیب میں انہیں سینکڑوں مسلوں کو کھنگالنا پڑا۔ متفرق اوراق سے ضروری مواد کا انتخاب اور اس کی تدوین و تہذیب کوئی آسان کام نہ تھا، دفتری کارروائی کی جاتی تو شاید مہینے لگ جاتے لیکن یہ کٹھن کام اُن کے تنہا ہاتھوں نے ایک رات میں سرانجام دیا۔

یہاں ایک لطیفہ بھی سُن لیجئے۔ صبح سویرے بخاری صاحب یہ رپورٹ لے کر دفتر پہنچے۔ اُن کا خیال تھا، افسرانِ بالا اُن کی اس خدمت گذاری اور تیز کاری پر خوش ہوں گے، لیکن وہاں اس وقت کرسیٔ منصب پر ایک ایسے صاحب براجمان تھے جن کی قابلیت محض کہنہ سالی تھی، انھوں نے بڑی تمکنت اور رعونت سے رپورٹ کو ہاتھوں میں لیا، اوراق کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر نہایت بے پروا انداز میں بولے "یہ کیا لکھا ہے ..... خیر کوئی بات نہیں میں درست کر لوں گا"، یہ کہہ کر انھوں نے رپورٹ کاغذات کی ٹوکری میں ڈال دی، بخاری نے یہ سب کچھ دیکھا اور سُنا، کوئی صاحبِ ذوق یہ لفظ کہتا تو کوئی بات بھی تھی۔ ایک نااہل کا اس افسرانہ لہجے میں گفتگو کرنا نہایت ناگوار گذرا۔ انھوں نے لپک کر رپورٹ اُٹھائی اور پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دی۔

"ہیں ہیں! یہ کیا حماقت کر رہے ہو؟"

"اگر یہ رپورٹ اچھی نہیں تو اس کا رکھنا بے کار ہے"۔

بخاری یہ کہہ کر کمرے سے باہر چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہوا کہ افسر کے کمرے میں دفتر کے چپراسیوں کا ایک بڑا دستہ بیٹھا رپورٹ کے پھاڑے ہوئے کاغذات کے پرزے جوڑ رہا ہے۔

صلۂ کار کی کسے تمنا نہیں ہوتی لیکن جب کوئی کام کسی لالچ کے بغیر یا حصولِ نام و نمود سے بے نیاز ہو کر کیا جائے اور وہ بھی دوسروں کی

خاطر کیا جائے اور پھر اس کام کو یوں ٹھکرا دیا جائے تو انسان کے دل کو ضرور ٹھیس لگتی ہے۔ نا اہل ہاتھوں نے جو چرکے لگائے تھے معلوم نہیں کہاں تک ان پھٹے ہوئے کاغذوں پر چیپیوں نے مرہم کا کام کیا۔ یہ بخاری صاحب کا دل ہی بتا سکتا ہے۔ میں تو یہی کہہ سکتا ہوں کہ اُن کی چابکدستی دونوں طرح اپنا جوہر دکھا کے رہی۔

ایک مرتبہ اُن کے رفیقوں میں سے ایک صاحب یونیورسٹی کے کسی رُکن کی غلط کاریوں پر جیں بہ جبیں ہو رہے تھے۔ بخاری صاحب کہنے لگے "بھائی صاحب! میری دو باتیں یاد رکھو۔ زندگی میں کسی سے اُلجھنا ہو تو کسی بڑے مسئلے پر اُلجھنا چاہیئے۔ اور اپنے سے بڑے آدمی کے ساتھ اُلجھنا چاہیئے۔ ورنہ مزا نہیں آتا۔ انسان کی قوتیں اور کوششیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ کمزور آدمی کو دبانے میں کوئی شان نہیں۔ بڑے آدمی سے تصادم ہو تو انسان کی استعدادِ کار اور بھی چمکتی ہے۔ مجھے دیکھو! میں نے ریڈیو کی ملازمت کے دوران میں ہمیشہ بڑے آدمیوں سے ٹکر لی ہے اور اللہ کے فضل و کرم سے کامیاب رہا ہوں۔"

بظاہر ٹکراؤ ایک ناگوار سی شے ہے اور کاموں کی تکمیل میں ایک رُکاوٹ سا نظر آتا ہے لیکن جب اس کی بنیاد کسی بڑے اصول پر ہو اور ٹکرانے والے اہل لوگ ہوں تو اس سے مفید نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ بخاری کی طبیعت کا خاصّہ ہے کہ وہ ہمیشہ ایسی رکاوٹوں سے خوش ہوتے ہیں۔ رکاوٹوں سے اُن کی طبعی صلاحیتیں اور استعدادیں اور بھی اُبھرتی ہیں۔ اُن کا بڑا کمال یہ ہے کہ وہ اِن رکاوٹوں سے عہدہ برآ ہوتے وقت کبھی تھکن یا تلخی محسوس نہیں کرتے۔ اور تو اور خود اُن سے ٹکرانے والا جب اُن سے شکست کھاتا ہے تو اُسے اپنی شکست کا اتنا احساس نہیں ہوتا جتنا اُن کی عظمت اور برتری کا۔

ریڈیو کے محکمے میں اُن کا بالتدریج آگے بڑھنا اور آگے بڑھ کر محکمے پر چھا جانا ایک ایسا ہی کارنامہ ہے۔ انھوں نے دس سال کے عرصے میں ریڈیو کو جو وسعت اور شہرت دی وہ اُن کی ذہانت اور مستعدی کی بیّن دلیل ہے۔ جنگِ عظیم کے دوران میں ریڈیو پروگرام اور بالخصوص خبروں کی نشر و اشاعت کا کام بہت کٹھن تھا۔ اس بارے میں انگریز حکّام اور اُن کی پالیسی بارہا اُن کے آڑے آئی لیکن انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے ایک طرف اُن کے تصرّفات کی روک تھام کی اور دوسری طرف اپنی پالیسی کے پیشِ نظر ریڈیو کے وقار کو برقرار رکھا۔ خبروں کا اہتمام ریڈیو کے پروگرام میں سب سے اہم کام ہے۔ اس کی اہمیت کو غالباً ریڈیو کے عملے کے کارکنوں کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اسے موزوں بنانے میں ایک فنی شکل و صورت دینے میں بخاری صاحب کا زبردست ہاتھ تھا۔ اس میں اُن کی شخصیت کا پورا پورا عکس نظر آتا ہے۔

انھیں نئی نئی تجویزیں سوجھتی تھیں ایک مرتبہ حسبِ معمول انھوں نے حکومت کو لکھا کہ ریڈیو پروگرام میں بہت سی چیزیں مستقل اہمیت رکھتی ہیں اگر انھیں شائع کر کے محفوظ کر لیا جائے تو ایک ادبی خدمت بھی ہوگی۔ چونکہ جنگ کا زمانہ تھا انھوں نے ایک دلیل یہ بھی دی کہ بعض پروگراموں میں جنگی پرچار کے عنصر پوشیدہ ہوتے ہیں چھپ جانے کی صورت میں وہ بھی کارآمد ثابت ہوں گے۔ اس تجویز کا جواب کوئی آٹھ مہینے کے بعد موصول ہوا۔ تجویز رد کرنے میں جہاں بہت سے دلائل تھے وہاں ایک دلیل یہ بھی تھی کہ جنگ اب جلد ختم ہونے والی ہے لہٰذا ایسے مواد کا چھپنا بے موقع ہے۔ بخاری نے اس دلیل کو پڑھ کر لکھا "ہاں درست! لیکن اگر ہماری حکومت اسی "رفتار" سے کام کرتی رہی تو "امن" کا دور بھی جلد ختم ہو جائے گا۔

"پطرس کے مضامین" بخاری صاحب کی مزاحیہ طبیعت کے آئینہ دار ہیں۔ مزاح نگاری بظاہر بڑی ہلکی پھلکی شے ہے لیکن طنز نگاری کی طرح اس لطیف شے کو پیدا کرنے کے لیئے ایک بڑی شخصیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب تک کسی شخص میں غیر معمولی ذہانت، عمیق مشاہدہ کی عادت اور شگفتہ طرزِ بیان کی قوت نہ ہو وہ کامیاب مزاح نگار نہیں ہو سکتا۔ انسانی اعمال میں بعض حرکات بڑی مضحکہ خیز ہوتی ہیں لیکن ہر انسانی آنکھ انھیں نمایاں طور پر نہیں دیکھتی۔ ایک مشاہدہ کار انسان انھیں بروئے کار لاتا ہے اور اُن کا اظہار لطیف اور شگفتہ انداز میں اس طرح

کرتا ہے کہ وہ تحت شعور سے اُبھر کر اجاگر ہو جاتی ہیں اور ہم ان انسانی لغزشوں کو دیکھ کر مسکرا دیتے ہیں۔ بخاری کی نظر بڑی وسیع اور گہری ہے اور پھر اُسے بیان پر قدرت حاصل ہے۔ اس لئے وہ بے ساختہ ان حرکات کو دیکھتے، سمجھتے اور چمکاتے رہتے ہیں۔

مذکورہ بالا ریڈیو مسل کا التوا میں پڑ جانا روزمرہ کا معمول ہے۔ کوئی اور ہوتا تو اسے دفتری سُرخ فیتے کے سلسلے کی ایک کڑی سمجھ کر ٹال دیتا لیکن بخاری کی نظر التوا کے تمام پہلوؤں پر پڑی تھی۔

مشاعروں کی بے طرحی سے کون واقف نہیں اور شہروں کی گندی حالت کو کون نہیں جانتا لیکن "کتے" اور "لاہور کا جغرافیہ" بخاری ہی لکھ سکتے ہیں۔

بخاری کا مزاحیہ انداز اُن کی تحریروں تک ہی محدود نہیں۔ اُن کی تقریریں بھی مزاح سے مزین ہوتی ہیں۔ وہ بڑے سے بڑے اہم اور سنجیدہ مسائل پر بحث کرتے ہوئے اسی حربے کو کام میں لاتے ہیں۔ احباب کی صحبتوں اور عام موقعوں پر بھی اسے بے ساختہ استعمال کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مجمع میں اُن کی گفتگو لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے اور لوگ پہروں اُن کے پاس بیٹھے نہیں اُکتاتے۔

لیکن اس سے یہ اندازہ نہیں لگانا چاہیئے کہ بخاری کی ذات میں جو کشش ہے، وہ محض اُن کی مزاح گوئی کی وجہ سے ہے۔ بے شک اُن کا مزاح ملنے والوں کے دل میں ایک شگفتگی پیدا کرتا ہے لیکن انھیں قریب سے دیکھنے والے جانتے ہیں کہ اُن میں خلوص بھی ہے۔ وہ اپنے عزیزوں دوستوں اور عام لوگوں سے بڑے رکھ رکھاؤ سے ملتے ہیں۔ اس رکھ رکھاؤ میں دوستداری بھی ہوتی ہے اور سلیقہ بھی۔ عام ملاقاتوں میں جہاں انسانی منافقت کام کرتی ہے وہ اس آراستگی سے بات کرتے ہیں کہ طبیعت کو خوشگوار معلوم ہوتی ہے۔ وہ چھیڑ چھاڑ کے خوگر ہیں لیکن اس چھیڑ چھاڑ سے اُن کی مراد کسی کی دل آزاری نہیں بلکہ اس سے لگاؤ کا اظہار ہوتی ہے۔

بخاری صاحب کو اپنے ان کرشموں کا پورا پورا احساس ہوتا ہے بلکہ وہ دوسروں پر اکثر ایک خاص تفوق محسوس بھی کرتے ہیں اور اس تفوق سے دوسروں کو اپنے مطابق چلاتے بھی رہتے ہیں جہاں کہیں اُن کی طلاقت لسانی کارگر نہیں ہوتی وہ اپنی مزاحیہ گفتگو کو چھوڑ کر کوئی ایسی حرکت بھی کر گزرتے ہیں جو دوسروں کو چپ کر سکے یا انھیں شکست دے سکے۔ ۱۹۴۷ء کے اواخر میں جب قومی زبان کا مسئلہ پیش ہوا تو بنگال کے ایک صاحب اقتدار بزرگ نے بنگالی زبان کی حمایت میں بڑی پُر زور تقریر کی۔ بخاری نے اپنی بذلہ سنجیوں سے انھیں بہت کچھ مرعوب کرنا چاہا لیکن خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ دوسرے روز وہ بزرگ اپنے عقائد کی تائید میں کچھ اعداد و شمار پیش کرنے والے تھے بخاری صاحب کو ایسے مسودے کے مؤثر ہونے کا اندیشہ تھا۔ آپ ان کے پاس ہی بیٹھے تھے۔ اچانک آپ کی نظر ایک کاغذ پر پڑی۔ تاڑ گئے۔ ہو نہ ہو یہ اعداد و شمار کا پلندا ہے۔ انھوں نے چپکے سے وہ پلندا نکال لیا۔ جب وہ بزرگ پُرجوش خیالات کا اظہار کرنے کے بعد اعداد و شمار پر آئے اور کاغذوں پر ہاتھ ڈالا تو غائب تھے۔ پریشانی میں جیبوں کو ٹٹولتے رہے اور بہ معصوم صورت بنائے اُن سے ہمدردانہ استفسار کرتے چلے گئے اُن کی بدحواسی پر محفل میں ایک کہرام سا مچا۔ جب محفل کا رنگ بگڑ گیا تو بخاری نے اچانک جھک کر میز کے نیچے سے وہی پلندا اُٹھا کر انھیں دکھایا اور بھولے انداز میں کہا ۔

"آپ یہ تو نہیں تلاش کر رہے؟"

اس پر ایک زور کا قہقہہ لگا، اور ساری بات ہنسی مذاق کی نذر ہو گئی۔

دوستداری، بخاری صاحب کا شیوہ ہی نہیں مسلک بھی ہے اگرچہ اس دوستداری میں گرمجوشی اور وفورِ جذبات کا اظہار بہت کم ہوتا ہے۔ وہ آہوں اور آنسوؤں سے زیادہ جذباتِ محبت کے اعتدال اور اخفا کے قائل ہیں۔ اس بارے میں اُن کا گرم جوش دل مغرب کی خنک فضاؤں میں سانس لیتا رہتا ہے اور اپنی آگ کو دبائے رکھتا ہے۔

بظاہر دیکھو تو بخاری صاحب پورے "صاحب لوگ" ہیں۔ اُن کی وضع قطع، اُن کا لباس، اُن کے اُٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، کھانے پینے، باتیں کرنے سے یورپین انداز ٹپکتے ہیں۔ وہ مشرقی طرزِ بود و باش پر اکثر پھبتیاں کستے رہتے ہیں۔ اُن کے ساتھ بازار میں گھومنے جائیے تو معلوم ہوتا ہے انھیں یہاں کی کوئی حرکت پسند نہیں۔

"وہ دیکھو تہ بند کے ساتھ انگریزی قمیص۔"

"سبحان اللہ چپلی کے ساتھ پتلون۔"

"ٹائی اور شلوار کیا کہنے۔"

"یہ شخص بازار میں کھڑا کباب کھا رہا ہے۔"

"یہ دیکھیے اس نے بائیسکل بازار میں بغیر اشارے کے گھما دی۔"

"اور یہ چار آدمی صف باندھے چلے جا رہے ہیں میں موٹر کہاں سے گزاروں۔"

یہ فقرے مسلسل آپ کے کان میں پڑیں گے اور آپ انھیں سُنتے سُنتے اپنے ملک، بلکہ اپنے آپ سے بیزار ہو جائیں گے۔ آپ کو اپنی کم سوادی کا احساس ہونے لگے گا جو خامی آپ میں نہیں وہ بھی نظر آئے گی۔

لیکن اس سے آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ بخاری صاحب مغربی طریق زندگی کے قالب سے نکلے ہوئے ایک مجسمہ ہیں اور ان میں کوئی لوچ نہیں۔ اُن کی صورت شکل مغربی اور مزاج مشرقی ہے۔ اُن کی ذات مغرب و مشرق کا تضاد نہیں بلکہ ایک لطیف امتزاج پیش کرتی ہے

اُن کی مشرق مزاجی کو دیکھنا ہو تو اُنھیں گھر کی چار دیواری میں دیکھیے جہاں ہر شے مغربی انداز میں جلوہ گر ہے لیکن جہاں زندگی کی حرکات ٹھیٹھ مشرقی فضا میں سانس لیتی دکھائی دیتی ہیں۔ وہی بے پروا، لاابالی پن، وہی بے تکلف گفتگو، وہی خلوص آمیز میل ملاپ، یوں معلوم ہوتا ہے جیسے لنڈن یا نیویارک کے کسی مکان میں دِلّی کے بلّی ماروں کے محلّے والے اچانک آ بسے ہیں اور وہ ماحول کے لئے اجنبی اور ماحول اُن کے لئے اجنبی ہے۔

کوئی یہ اندازہ نہیں کر سکتا کہ دن بھر اتنی باقاعدگی اور مستعدی سے مشین کی طرح مسلسل کام کرنے والا رات کو کیونکر جاگتا ہوگا، لیکن بخاری صاحب کی شب بیداری کو اُن کے ساتھ راتیں گزارنے والے ہی جانتے ہیں۔ رات کے دس گیارہ بجے کے بعد گھر سے گھومنے کے لئے نکلنا اُن کا روزمرّہ کا شیوہ بلکہ معمول ہے، کوئی مقصد، کوئی منزل مقصود نہیں، محض گھومنا اور گھومنا، اور گھومتے گھومتے کسی سنسان سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر گھنٹوں گپیں ہانکنا، یہ ہے اُن کی تفریح جس میں اُن کے تمام ہم قدم دوست برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ مجال نہیں کہ کوئی شب خیز اس ثواب سے محروم رہ جائے۔ بیدلؔ کے دقیق اشعار، شیکسپیئر کے ڈرامے، ہیلیٹ کی مجرّد نگاری، منٹو کے افسانے انھی خوش گپیوں کے تحت میں آ جاتے ہیں۔

راتوں کی یہ بیداری اُن کے روزانہ کاموں میں مخل نہیں ہوتی۔ جس طرح دوستوں کو ایک ایک کر کے جمع کیا تھا اسی طرح ایک ایک کو گھر پہ چھوڑنے کے بعد وہ بستر پر آ کر لیٹتے ہیں اور ایک آدھ گھنٹہ آرام کے بعد حسبِ معمول اُٹھ کر روزمرّہ مشاغل میں کھو جاتے ہیں۔ اور اس معمول پر وہ سختی سے کاربند ہیں اور خود ہی نہیں بلکہ اپنے رفیقانِ کار سے خواہ وہ اُن کے کتنے ہی بے تکلّف دوست کیوں نہ ہوں، اسی باقاعدگی اور ضبط و نظم کی توقع رکھتے ہیں۔ کسی طرح کی بے قاعدگی کو برداشت نہیں کر سکتے۔

بارہا ایسا ہوا کہ رات بھر گھومنے کے بعد ہم پانچ بجے صبح کو گھر لوٹے۔ پونے آٹھ بجے انھوں نے میرے یہاں ٹیلیفون کر کے پوچھا۔

"صوفی کہاں ہے؟"

بچوں نے کہا "وہ یونیورسٹی گئے ہیں۔ کوئی کام"؟

"کوئی نہیں یونہی پوچھا تھا۔"

اُن کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں ہُوا کہ رات کی سیر نے مجھے اپنے فرائضِ منصبی سے غافل کر دیا ہو۔

اُن کے نزدیک دوستی اور فرائض کی بجا آوری دو الگ الگ خانے ہیں۔

ریڈیو کے زمانے میں اُن کے ایک دوست سے کوئی کوتاہی ہوئی۔ اُنھوں نے بڑی سختی سے مواخذہ کیا۔ دوست اُن کی غیر معمولی خفگی پر بگڑ گئے اور استعفا لکھ کر اُن کے حوالے کیا۔ انھوں نے بڑے افسرانہ وقار کے ساتھ لے لیا اور کہا۔ بہت اچھا آپ تشریف لے جائیں۔

دفتر کے بعد بخاری صاحب، اس دوست کے مکان پر بیٹھے دیگر احباب کے ساتھ معافی مانگ رہے تھے۔

جوش ملیح آبادی

سید احتشام حسین

یہ ایک دلچسپ اتفاق ہے کہ انہی دنوں ریڈیو کے لیے خیام پر ایک فیچر بھی لکھ رہا ہوں، شعوری اور غیر شعوری طور پر جوش اور خیام ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوتے جا رہے ہیں۔ نو دس صدیوں کے وقفہ کے باوجود دونوں ایک دوسرے سے قریب، ایک دوسرے کے دوست، ایک دوسرے کی طرح آسانی سے گرفت میں نہ آنے والے اور بہت سے اختلافات کے باوجود ملتے جلتے نظر آتے ہیں۔ کیا ہزار سال کی شکست و ریخت اور ارض و سما کی گردش نے مزاجوں کے سانچے نہیں بدلے ہیں؟ میں اس فلسفیانہ بحث میں الجھنا نہیں چاہتا اور نہ جوش اور خیام کے افکار و خیالات کا تقابلی مطالعہ کرنا چاہتا ہوں لیکن دونوں میں کوئی اندرونی مماثلت ضرور ہے، کوئی ذہنی رشتہ ہے جو میرے ذہن کو بار بار ادھر لے جاتا ہے اور جوش کے خوبصورت چہرے کو خیام کی داڑھی میں الجھا دیتا ہے۔

میں ہر اثر اور ہر تقابل سے بچ کر جوش کی شخصیت کو سمجھنا اور سمجھانا چاہتا ہوں جو ان کے اشعار کے نقاب میں چھپ جاتی ہے تو گفتگو میں ظاہر ہوتی ہے اور گفتگو میں واضح نہیں ہوتی تو اشعار میں نمایاں ہوتی ہے، جس کی تعمیر میں خود ان کی عمر کے تقریباً پچاون سال اور ان کی کئی پشتیں شریک رہی ہیں، جسے وقت کے تقاضوں نے سنوارا ہے اور جس پر مختلف قسم کے عقائد نے رنگ و روغن چڑھائے ہیں، سب کی تہیں ابھارنا، ہر طرح کی پالش کھرچ کر اصلی سطح کو دیکھنا اور پھر کوئی شخص جس طرح ہمارے سامنے آتا ہے اس سے اس کا مقابلہ کرنا ایک دلچسپ مشغلہ ہو تو ہو لیکن دشوار بھی ہے اور نتائج کے لحاظ سے تکلیف دہ بھی۔ ایک ایسا شخص جسے ہزاروں اشخاص اپنی پسند اور اپنے تعلقات کے آئینہ میں دیکھتے ہوں، میرے آئینہ میں وہی نہیں ہوگا جو دوسروں کے آئینے میں نظر آتا ہے، نہ وہ ہوگا جیسا خود اپنے آئینہ میں دکھائی دیتا ہے۔ پھر اگر کہیں اس کا یہ خیال ہو کہ ؎

تیری نظر حسین ہے، کوئی حسیں نہیں
میں نازنیں نہیں، تو کوئی نازنیں نہیں
(جوش)

تو ساری اہمیت دیکھنے والے کی نظر کی ہو جاتی ہے اور جس شخص یا چیز کو دیکھا گیا ہے اس کی حقیقت زیر نقاب ہی رہتی ہے۔ ایسی صورت میں یہی ہو سکتا ہے کہ بغیر اس کا دعویٰ کیے ہوئے کہ میں نے جوش کو پہچانا ہے، وہ باتیں کہوں جن کے متعلق میرا خیال ہے کہ یہ جوش کی شخصیت کا جزو ہیں۔ یوں تو آپ جانتے ہی ہیں کہ شخصیتیں بنی بنائی، ترشی ترشائی نہیں ہوتیں، بنتی رہتی ہیں، مکمل بھی نہیں ہوتیں، کچھ گوشے اور زاویے ادھر ادھر نکلے ہوئے بھی ہوتے

ہیں، وہ کبھی تصویر کے چوکھٹے میں بیٹھ جاتے ہیں، کبھی نہیں بیٹھتے اور ایک ہی شخص کبھی کچھ نظر آتا ہے کبھی کچھ۔ کبھی آسمان پر ہوتا ہے اور کبھی دو گز کے فاصلے پر اسے زمین بھی نظر نہیں آتی ہے

گر جاتا ہوں ذرات کی ٹھوکر کھا کر
اور گاہ پہاڑوں سے گزر جاتا ہوں (جوشؔ)

جنون و حکمت کی آمیزش، شعلہ و شبنم سے ساز، فکر و نشاط سے وابستگی، عرش و فرش کی سیر، مے و سبو سے شغل، سموم و صبا سے دلچسپی، حرفِ آخر کہنے کی آرزو — نے جوشؔ کی شخصیت کو ادق پیچیدہ بنا دیا ہے۔ یہ ایک بے قید و بند ہواؤں کی طرح پھرنے والے شاعر اور وقت کی آواز پر کان دھر کر نکلے ہوا ہیں جو شاعر کے آرزو مند فکر پسند انسان کی شخصیت ہے جو اخلاقی اقدار اور بے راہ روی دونوں کو دعوت دیتا ہے کہ اسے سہارا دیں۔ جوشؔ کی زندگی اور اظہار میں کلاسیکیت اور رومانیت، متعین راستوں اور نئی جستجوؤں، قدامت اور جدت کی ایسی آمیزش ہے کہ وہ بعض اوقات مجموعۂ اضداد نظر آنے لگتے ہیں۔ اور ان کی شخصیت کی اصل روح گرفت میں آنے سے انکار کرتی ہے۔ اور اسی تضاد کی پرچھائیاں ان کی شاعری اور افکار پر پڑنے لگی ہیں۔ پھر لطف یہ ہے کہ وہی شخصیت بزمِ سخن میں کچھ اور ہوتی ہے اور بساطِ عمل پر کچھ اور، وہ ایک پروگرام بناتی ہے اور فکر و فلسفہ، رندی اور سرمستی، حیات کے قصے سننے اور تماشائے لبِ بام دیکھنے کے اوقات مقرر کر دینا چاہتی ہے۔ ایسی شخصیت کے سمجھنے کے لئے اس کے پیچھے پیچھے چلنے، اس کی صبح و شام میں شریک ہونے، خلوت و جلوت میں اس کے ساتھ وقت گزارنے، اس کے ساتھ غم اور خوشی کے لمحات بسر کرنے، اسے سوتے جاگتے مشاہدہ کرنے، اس کو دوستوں میں خوش طبعی کرنے اور سنجیدہ صحبتوں میں بحثیں چھیڑتے دیکھنے اور نیاز مندی اور تمنائے ناز برداری کی منزلوں سے گزرتے اس پر نظر کرنے کی ضرورت ہے۔ شاید کوئی ان کے پروگرام کی طرف توجہ کرے کہ انہوں نے اپنا پتہ آپ بتا دیا ہے لیکن پروگرام محض ان کے جسم کی تلاش میں مدد دیتا ہے، ان کی روح اور شخصیت اس میں نہیں ملتیں۔ پروگرام پڑھ لیجئے تو میری بات واضح ہو جائے

اے شخص اگر جوشؔ کو تو ڈھونڈھنا چاہے — وہ پچھلے پہر حلقۂ عرفاں میں ملے گا
اور صبح کو وہ ناظرِ نظارۂ قدرت — طرفِ چمن و صحنِ بیاباں میں ملے گا
اور دن کو وہ سرگشتۂ اسرار و معانی — شہرِ ہنر و کوئے ادیباں میں ملے گا
اور شام کو وہ مردِ خدا، رندِ خوش اوقات — رحمت کدۂ بادہ فروشاں میں ملے گا
اور رات کو وہ خلوتیٔ کاکل و رخسار — بزمِ طرب و کوچۂ خوباں میں ملے گا
اور ہوگا کوئی جبر تو وہ بندۂ مجبور — مُردے کی طرح کلبۂ احزاں میں ملے گا

یہ محض اس جوشؔ کا جسم ہے جس کی شخصیت کی تلاش ہے، یہ وہ جوشؔ نہیں جو "میں" کہہ کر "کائنات" مراد لیتا ہے اور اپنی انفرادی ذات کے گرد اس طرح محیط کر لینا چاہتا ہے کہ اس کی ذات میں کائنات کی آرزو شامل ہو جائے

کہنے کو تو ایک بات کہتا ہوں میں — پر فلسفۂ حیات کہتا ہوں میں
جب بر زباں سے "میں" نکلتا ہے ندیم! — اس پردے میں "کائنات" کہتا ہوں میں

اس لئے جوشؔ کا سمجھنا مشکل ہے، یہ بات اس وجہ سے اور مشکل ہو جاتی ہے

جھکتا ہوں کبھی ریگِ رواں کی جانب — اُڑتا ہوں کبھی کاہکشاں کی جانب
مجھ میں دو دل ہیں، ایک مائل بہ زمیں — اور ایک کا رخ ہے آسماں کی جانب

جوشؔ کا اصرار ہے کہ ہر شاعر کے کردار کو اس کے کلام کی روشنی میں سمجھا جائے، شاید ہی کسی شاعر نے اپنے متعلق اتنا کہا ہو جتنا جوشؔ نے، اس لئے یہ ایک طریقہ ہو سکتا ہے ان کے سمجھنے کا۔ لیکن جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، یہاں افکار کی یکسانی کے لحاظ سے جوشؔ اُلجھے اُلجھے نظر آتے ہیں، شخصیت کا مطالعہ کرتے ہوئے محض یہ کہہ دینا کہ اس میں متضاد عناصر یکجا ہو گئے ہیں، ناکافی ہے اور شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ کہہ دینا کہ یہ صرف شاعری ہے، درست نہ ہوگا۔ میرے خیال میں شخصیت ایک کیمیاوی ترکیب ہے جس میں متضاد اور متخالف عناصر مل کر ایک ہو جاتے ہیں ورنہ وہ چیز وجود میں آتی ہے جسے "بکھری ہوئی شخصیت،" کہتے ہیں۔ جوشؔ کے یہاں ایسا نہیں ہے۔ جب وہ یہ کہتے ہیں:

اے محرمانِ کہنہ و اے دوستانِ نو ۔۔۔ اک وضع پر نہیں ہے مرے ولولوں کی رو
کعبے کا نور ہوں تو کبھی بتکدے کی ضَو ۔۔۔ گرتی ہے گاہ برق نکلتی ہے گاہ لَو

دریا ہوں اک مقام پہ رہتا نہیں کبھی
اک خطِ مستقیم پہ بہتا نہیں کبھی

وہ زمزمہ ہوں جس کی نہیں کوئی خاص لَے ۔۔۔ وہ نالہ ہوں کہ رُک نہیں سکتا جو وقفِ نَے
مجھ میں نہاں ہے دہر کی ہر گرم و سرد شے ۔۔۔ زہر و زلال و زمزم و زہراب و قند و مے

شاعر کا دل فقیر بنے اور امیر کا
سنگم ہوں رودہائے حدید و حریر کا

تو یہاں بھی شخصیت کے پارہ پارہ ہونے کی طرف اشارہ نہیں شاعر کی ہمہ گیری اور ہر جہتی نگاہ رکھنے پر فخر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جوشؔ کی شخصیت کے بہت سے بھید ان کی شاعری ہی میں کھلیں گے لیکن شاعری بھی تو اس شخصیت کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے۔ جیسے اور عناصر نے ترتیب دیا ہے، شاعری بھی شخصیت کے رازہائے سربستہ میں سے ایک راز ہے اور غالباً جوشؔ ایسے ہمہ تن شاعر کی شخصیت کا سب سے بڑا راز ــــ اس لئے ذرا دیر کے لئے ان عناصر پر بھی نگاہ ڈال لینا چاہئے جنہوں نے ان کے ذہن کے ارتقاء اور شخصیت کی تشکیل میں حصہ لیا ہے۔

جوشؔ آفریدی پٹھانوں کے گھرانے میں اس وقت پیدا ہوئے جب انیسویں صدی کا آفتاب غروب ہو رہا تھا اور اس دولت و ثروت کا بھی جو کئی پشتوں سے ان کے خاندان کو حاصل تھی۔ جوشؔ کی صورت اور سیرت میں اس "افغانی رگ و ریشہ" کی جھلک اور اثر نمایاں ہے نسلی تعلق ممکن ہے عام حالات میں اہم نہ ہو لیکن اگر کوئی شخص اسے یاد رکھے، اسے ہر وقت دہراتا رہے، دل ہی دل میں اس پر فخر محسوس کرتا رہے تو اس کا شخصیت اور کردار کا جزو بن جانا لازمی ہے۔ جوشؔ اسے نہیں بھولتے کہ وہ کس خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں اور اس کی کیا خصوصیات رہ چکی ہیں، کسی نہ کسی شکل میں رئیس ابن رئیس ہونے کا ذکر بھی ان کے یہاں آتا رہتا ہے۔ آبا و اجداد کے صاحب سیف و قلم ہونے اور ان کو اپنا آبائی پیشہ بنانے کا خیال ان کی ابتدائی زندگی میں ان مسئلوں میں تھا۔ اب بھی جب کبھی جوشؔ کو چھیڑ دیا جائے اور ان کے بزرگوں کا ذکر شروع ہو جائے تو وہ مزے لے لے کر ان کے کردار کے انوکھے پن اور ان کے طرزِ زندگی کی خصوصیات بیان کرتے ہیں۔ وہ اپنے دادا محمد احمد خان کا ذکر کرتے ہوں یا اپنے نانا رستم علی خان کا، اپنے والد بشیر احمد خان کا یا اپنے چچا اسحٰق علی خان کا، ہر ایک کی زندگی ایک دلچسپ داستان کی شکل اختیار کر لیتی ہے بعض حیثیتوں سے یہ انوکھا پن ان کے کردار میں بھی ہے، جسے حالات بدل جانے کے بعد بھی وہ برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔

اس احساس کے ساتھ اگر بچپن کی فارغ البالی، نازبرداری، حکومت اور طنطنہ، الھڑ بانکپن اور حسن و صحت کو شریک کر لیا جائے تو اس جوشؔ کی تصویر ہماری نگاہوں کے سامنے آسکتی ہے جو ان خصوصیات سے تشکیل پانے والی نفسیات کا نتیجہ ہے۔ جوشؔ اپنے بعض بزرگوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کے غیر معمولی جنسی جذبہ کا ذکر ضرور کرتے ہیں۔ ایک دفعہ اپنے دادا محمد احمد خان کی متعدد بیویوں اور بچوں کا ذکر کر رہے تھے اور

کہتے تھے کہ ان کے ایک سو دس اولادیں ہوئیں، کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ وہ انہیں پہچان بھی نہیں سکتے تھے۔ میں نے کہا "جوش صاحب! ہوا یہ کہ آپ کے بزرگ جنگ آزما سپاہی تھے اور اپنی جسمانی قوت کا مظاہرہ میدانِ جنگ میں کرتے تھے۔ آپ کے دادا کے ہاتھ سے تلوار چھین گئی تو انہوں نے اس کا مظاہرہ افزائشِ نسل کے میدان میں کیا، میرا مطلب یہ ہے کہ جنسی خواہش نے بھیس بدل لیا۔" بہت خوش ہوئے تو میں نے ذرا اور خوش کرنے کے لئے یہ کہا کہ "آپ میں یہ جذبہ فنِ شعر گوئی کی طرف مڑ گیا ہے، ہے وہی چیز۔" پھر خوش ہوئے لیکن ذرا دیر بعد بولے "تو کیا اس سے آپ یہ نتیجہ نکالنا چاہتے ہیں کہ مجھ میں اس جذبے کی کمی ہے؟ ایسا ہرگز نہیں ہے۔" اور پھر انہوں نے بہت سے قصے بیان کر ڈالے۔ ——— بے تکلف دوستوں کی صحبتوں میں اور رات کے مخصوص اوقات میں جوش کی گفتگو کا یہ موضوع دلچسپ لطائف سے بھرا ہوا ہونے کے باوجود تھکا دیتا ہے۔

اسی سلسلہ میں اگر جوش کے اٹھارہ عشقوں کا ذکر کر دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ جوش نے "روحِ ادب" کے دیباچے میں لکھا ہے کہ "جی تو بیاختہ چاہتا ہے کہ میں اس اوّلیں وارداتِ محبت کو اور اس کے ساتھ اپنے تمام واقعاتِ رنگیں کو اس دیباچے میں درج کر دوں اور دنیا کو بتا دوں کہ حسن کی زلفوں کی کمندوں نے کتنی بے پایاں نیاز مندیوں کے بعد میرے ناز کو گرفتار کرنے کی سعادت حاصل کی، لیکن ڈرتا ہوں ——— بیان کرنے سے ڈرتا ہوں ——— اپنی رسوائی سے نہیں، اپنے صیادوں کی رسوائی سے ڈرتا ہوں کہ کہیں ان کی جبینِ ناز پر شکنیں نہ پڑ جائیں۔ بہرحال مجموعی حیثیت سے اس موقع پر میں صرف اس قدر کہہ دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ میں محبت کے معاملہ میں ہمیشہ خوش قسمت اور عرفی کے اس شعر کا مصداق رہا ؎

آنہا کہ آہوانِ حرم را کنند صید
در آرزوئے ناوکِ صید افگنِ من اند

اور یہی وجہ ہے کہ میری شاعری میں آنسو، آہیں اور سینہ کوبیاں بہت ہی کم ہیں کیونکہ یہ چیزیں ناکامی اور انفعالیت سے پیدا ہوتی ہیں اور میں ان چیزوں سے شاذ ہی دوچار ہوا ہوں۔"

ایک ذرا سا اقتباس اور ——— مجھے ایک خط میں لکھا ہے:

"میری بیشتر عاشقانہ نظموں میں اس چیز کی (لوگ کہتے ہیں) کمی ہے جسے آہ و فغاں اور سوز و گداز کہا جاتا ہے۔
اگر ایسا ہے تو اس کی ذمہ داری ہے میرے عشق ہائے کامراں پر ——— میرے اٹھارہ بڑے بڑے عشقوں میں سے سترہ عشق ایسے رہے ہیں جن کا محبوبوں کی طرف سے بھرپور جواب دیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ عاشقِ کامیاب آنسوے نہیں بہایا کرتا اور جس کا یہ دعوٰی رہا ہو کہ ؎

آنہا کہ آہوانِ حرم را کنند صید
در آرزوئے ناوکِ صید افگنِ من اند

اس کی جوتی کو کیا غرض پڑی ہے کہ وہ ناکامی کے آنسو بہائے ——— میں ناکامی کے آنسو لکھ رہا ہوں، اس کا خیال رہے، ورنہ اشک و عشق کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔"

یہ خیالات دلچسپ تبصرے کی دعوت دیتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ بغیر تبصرے کے بھی یہ بہت کچھ کہہ جاتے ہیں۔ صرف ایک بات کی طرف اشارہ کرنا دلچسپ ہوگا۔ جوش نے دونوں مقامات پر عرفی کا جو شعر نقل کیا ہے اور اس کے جو معنی لئے ہیں وہ بھی ان کی ذہنی کیفیت کی غمازی کرتے ہیں۔ اس شعر کے حوالے سے جوش معشوق صفت اور صید افگن بننے کے خواہش مند ہیں حالانکہ عرفی اپنے محبوب کو صید افگن کہتا ہے جو محبوبوں کا محبوب ہے اور جس کے ناوک کی آرزو آہوانِ حرم کا صید کرنے والے صیاد بھی کرتے ہیں۔ اگر کسی کو جوش کی شاعری میں ان کے اٹھارہ عشقوں کی جستجو کرنا ہو تو غالباً اسے ناکامی ہوگی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ صرف پہلے اور آخری عشق کے نقوش ان کی شاعری میں واضح ہیں گفتگو میں صرف آخری کے۔

شاعر جوش کے یہاں بھی شخصیت کے اس جارحانہ اظہار کی تصویریں ملتی ہیں۔ ان کی تعلّی روایتی تعلّی کے انداز سے مختلف اور شاعری کے متعلق ان کے خیالات دوسرے شعراء سے مختلف ہیں۔ انہوں نے نو برس کے سن سے شعر کہنا شروع کیا۔ مکتب میں کتابوں کے حاشیوں پر شعر لکھے، امتحان کی کاپیوں میں شاعری کی۔ خود ان کے الفاظ یہ ہیں کہ "نو برس کی عمر سے شعر نے اپنے کو مجھ سے کہلوانا شروع کیا" (یہاں بھی جبر کے تصوّر کی کارفرمائی ہے جس کا ذکر آگے آئیگا) کہتے ہیں کہ "جب میرے دوسرے ہم سن بچے پتنگ اڑاتے اور گولیاں کھیلتے تھے اس وقت کسی گوشے میں شعر مجھ سے اپنے کو کہلوایا کرتا تھا اور یہی وجہ ہے کہ پتنگ اڑانے اور گولیاں وغیرہ کھیلنے کے فن سے میں اب تک ناواقف ہوں۔" گھر پر ہر وقت شعراء کا مجمع ہوتا تھا، ادبی محفلیں گرم ہوتی تھیں، وحیدالدین سلیم پانی پتی اکثر ملیح آباد میں جوش کے والد کے مہمان رہتے تھے۔ اس لئے جوش کے لئے محرکات شاعری کی کمی نہ تھی۔ ہاں ان کے والد البتہ یہ چاہتے تھے کہ شاعری کرنے کے بجائے ان کا بچہ کسی کام کا بنے چنانچہ وہ اسے روکتے رہتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے جاسوس مقرر کر دئے تھے کہ جوش (اس وقت شبیر حسن خان شبیر تھے) کو شعر کہتے پائیں تو مطلع کریں۔ اس خبر رسانی پر جاسوسوں کو انعام اور انہیں جھڑکیاں ملتی تھیں۔ جوش نے خود بتایا کہ ایک زمانے میں یہ کام داروغہ حامد علی کے سپرد تھا، ہر دفعہ خبر پہنچانے پر انہیں پانچ روپے ملتے تھے۔ انہوں نے اپنی آمدنی بڑھانے کے لئے جھوٹی سچی خبریں پہنچانا شروع کر دیں، مجھے جہاں تنہا دیکھتے فوراً والد کو جا کر مطلع کرتے کہ میاں! شبیر حسن خان شعر کہہ رہے ہیں۔ انہیں پانچ روپے مل جاتے تھے اور مجھے تنبیہ ——— اس طرح جوش نے شاعری شروع کی۔ جب باپ نے دیکھا کہ اب انہیں روکا نہیں جا سکتا تو خود اپنے ساتھ لا کر مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی کے سپرد کر دیا۔

تخلص شبیر سے کس طرح جوش ہوا، یہ بھی ایک دلچسپ قصہ ہے۔ اس کے متعلق جوش نے ایک دفعہ خود کہا "ابتدائے شباب و شاعری کا زمانہ تھا، لکھنؤ میں قیام تھا۔ شہر میں ایک تھیٹر یکل کمپنی آئی ہوئی تھی، رات گئے چند دوست تھیٹر دیکھ کر واپس آ رہے تھے۔ اس خوبصورت ایکٹرس کا ذکر تھا جس کے حسن سے سب متاثر تھے، کچھ اشعار پڑھے جا رہے تھے، دوران گفتگو میں کسی نے کہا 'ہم لوگ بڑے جوش میں ہیں اس وقت'۔ بس نہ جانے کیسے اسی وقت یہ طے ہو گیا کہ میرا تخلص اب شبیر کے بجائے جوش ہوگا۔" معلوم نہیں یہ رائے کس نے دی تھی لیکن جس نے بھی یہ سوچا ہوگا اس نے جوش کی ابتدائی شاعری میں اس رومانی وفور کو دیکھا ہوگا جس نے کبھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

بہرحال جوش نے بچپن ہی سے شعر کہنا شروع کیا ہے اور بہت معمولی وقفوں کو چھوڑ کر ہمیشہ ایک تپسیا کرنے والے کی طرح شاعری کی دیوی کے قدموں پر پھول چڑھاتے رہے ہیں۔ وہ روزی کے لئے کسی قسم کا کام بھی کرنے پر مجبور رہے ہوں لیکن سب سے پہلے وہ شاعر ہیں پھر کچھ اور ——— ان کی زود گوئی بعض اوقات حیرت انگیز شکل اختیار کر لیتی ہے، اس حالت میں وہ اس قدر غیر واضح لکھتے ہیں کہ پڑھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ جب دوسری جنگِ عظیم چھڑی اس وقت جوش کچھ دنوں کے لئے ملیح آباد اپنے مکان "قصر سحر" میں مقیم تھے، کبھی کبھی لکھنؤ آتے تھے۔ ایک دن وہاں سے چلے تو سیدھے میرے یہاں آئے اور خلافِ معمول جیب سے ایک کاپی نکال کر کہنے لگے، رات ایک نظم ہو گئی ہے اور محض دس منٹ میں، ذرا سنئے تو ——— یہ نظم تھی "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے"۔ میں نے سوچا اس کی ایک نقل لے لوں ممکن ہے ضبط ہو جائے اور پھر نہ ملے۔ چنانچہ بغیر جوش کی مدد کے اس کا لکھنا ناممکن ہو گیا۔ یہ بھی لکھ دوں کہ میرے یہاں سے اٹھ کر جوش "نیا ادب" کے دفتر گئے، وہاں سبطِ حسن اور سردار جعفری نے یہ نظم ان سے لے کر "نیا ادب" میں شائع کر دی اور رسالہ کا وہ نمبر ضبط ہو گیا۔

یہ زود گوئی جذباتی ابال کی بھی غمازی کرتی ہے۔ جس وقت جو جذبہ ان پر طاری ہوتا ہے اس وقت وہی ان کے لئے ساری شاعرانہ صداقتیں رکھتا ہے اور وہ اس کی گرفت میں ہوتے ہیں۔ جب اس جذبہ کی شدت کی بنا پر کوئی رائے قائم کر لیتے ہیں تو ان کی ذہانت اور خلاقی اس کے لئے استدلال بھی تلاش کرتی ہے، رفتہ رفتہ وہ جذباتی نتائج کو منطقی نتائج سمجھنے لگتے ہیں۔ جس شخص نے بھی جوش سے علمی مسائل پر گفتگو کی ہے، وہ ان کے خیالات میں یہ خصوصیت ضرور دیکھے گا لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ پوری توجہ سے یا دلچسپی سے گفتگو ہی نہ کر رہے ہوں۔ اگر ان کو کسی طرح یہ اندازہ ہو جائے کہ گفتگو کرنے والا ذہین

نہیں ہے، محض گفتگو کے لئے گفتگو کرنا چاہتا ہے، مقصد وقت گزاری ہے تو پھر ان کی گفتگو یونہی سی ہو سکتی ہے، ہو سکتا ہے کہ گفتگو کرنے والے کی صورت یا آواز انہیں اچھی نہ معلوم ہوتی ہو، اس کے ساتھ کوئی ایسا آدمی ہو جو انہیں ناپسند ہو یا اس شخص کو کبھی انہوں نے کسی ایسے شخص کے ساتھ دیکھا ہو جو معقول نہ ہو۔ ان تمام حالات میں ان کی گفتگو ٹالنے اور مناسب جوابات سے بچنے کے لئے ہوگی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس وقت بات چیت میں طنز اور کڑوا پن زیادہ ہو۔ اگر جوشؔ کا جی لگ جائے، موضوع علمی یا ادبی ہو تو اکثر ان کی باتیں بہت دل کش اور شگفتہ ہوتی ہیں اور گفتگو کرنے والا مایوس نہیں ہوتا۔

جوشؔ کی شراب نوشی کا مطالعہ بھی کئی دلچسپ پہلو رکھتا ہے۔ اس کے کچھ آداب اور ضوابط ہیں، معین وقت ہے، تقریباً معین نشہ کی کیفیت ہے مخصوص لوگوں کے ساتھ مختلف کیفیتیں وابستہ ہوتی ہیں، شراب بنتی ہے، بگڑتی ہے، بولتی ہے، خوب بولتی ہے اور خاموش رہتی ہے۔ بعض اوقات صحبتیں خراب ہو جاتی ہیں بعض اوقات یادگار بن جاتی ہیں۔ جوشؔ نے متعدد مقامات پر اور متعدد اشعار میں اس کا اظہار کیا ہے کہ جب آفتاب غروب ہونے کے قریب ہوتا ہے تو میں پیمانہ بکف طلوع ہوتا ہوں۔ اس کا اثر سہ پہر ہی سے شروع ہو جاتا ہے، تیاریاں ہونے لگتی ہیں اور سب تیار ہو کر بیٹھ جاتے ہیں، پھر جام میں شراب انڈیلی جاتی ہے اور "بنام فلاں بنت فلاں" دور چلنے لگتے ہیں۔ باتیں ہر سطح پر پہنچتی ہیں اور جوشؔ بزم کے صدر کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس بزم میں سب سے زیادہ احمق وہ شخص ہوتا ہے جو محض تماشائی ہو، کبھی کبھی وہ طنز و استہزا کا نشانہ بنتا ہے، کبھی اس پر رحم کیا جاتا ہے کبھی اس کی بزدلی پر افسوس۔ ایسی مجلسوں میں ہر قسم کا ظرف رکھنے والے ہوتے ہیں، کوئی دو ہی جام میں چھلک کر بیکار ہو جاتا ہے کوئی دیر تک جوشؔ کا ساتھ دیتا ہے۔ وہ احتیاط سے پیتے ہیں اور عام طور سے مدہوش نہیں ہوتے۔ ایک بار ایک ایسی ہی محفل میں جو کئی مشہور پینے والوں کو مستی کے اس عالم میں پہنچا چکی تھی جہاں صرف وہی ہوتے ہیں، میں نے محسوس کیا کہ جوشؔ بھی بہک رہے، وہ کھڑے ہوتے تو بار بار قدم ادھر ادھر پڑ رہے تھے۔ ایک دفعہ مجھے معلوم ہوا کہ جیسے وہ گر رہے ہیں، میں نے ہاتھ پیٹھ پر رکھ کر اپنے خیال میں انہیں سنبھالنا چاہا، جوشؔ نے قہقہہ لگایا اور کہا میں بالکل حواس میں ہوں آپ کو آزما رہا تھا کہ آپ حواس میں بھی میری مستی کا اندازہ لگا سکتے ہیں یا نہیں۔ اس بزم ناؤ نوش کی حیثیت کبھی کبھی دربار کی سی ہو جاتی ہے۔ لوگوں کا اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، باتیں کرنا تمام چیزیں ایک خاص نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ میں اکثر اس دربار کی رونق کو برہم کرنے کا جرم کر دیتا ہوں اور دلچسپ فقرے سنتا ہوں۔ لیکن اسی بزم میں جوشؔ اپنی تازہ ترین اور پسندیدہ نظمیں سناتے ہیں، دوسروں کے اچھے اشعار پڑھتے ہیں۔ اشعار کی بعض خوبیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور داد چاہتے ہیں۔ وہاں سبھی مصرعے اٹھاتے ہیں اور سبھی فردوسی اور رودکی کا مرتبہ حاصل کرتے ہیں، سبھی سخن شناس معلوم ہوتے ہیں اور سبھی جی کھول کر داد دیتے ہیں۔ یہاں نظموں کی تنقید نہیں ہو سکتی، دنیا کے بڑے سے بڑے شاعر کی حیثیت پست ہوتی ہے اور جوشؔ غیر معمولی نشاط اور اطمینان محسوس کرتے ہیں۔ اگر اس محفل میں کوئی ایسا ہوا جو "نامطبوع" ہے یا جوشؔ کا جی نہ چاہتا ہو تو (ننانوے فی صد) ایسا ہوتا ہے کہ جوشؔ کوئی نظم نہیں سناتے۔

جو شخص جوشؔ کی مکمل سوانح عمری لکھے گا وہ اس مجلس سے نتائج اخذ کرے گا، بزم میں بیٹھنے والوں کا ذکر کرے گا اور اس کی تفصیلات پیش کر کے جوشؔ کے کردار پر روشنی ڈالے گا کیونکہ یہاں کے لطائف اور ظرائف، لوگوں کے متعلق رائیں، ماضی کی طرف بازگشت اور بیتی ہوئی یادوں کے تذکرے سب معنی خیز ہوتے ہیں، جوشؔ مستقبل سے زیادہ ماضی کے واضح نقوش ابھار سکتے ہیں اور جب عالم کیف میں گذرے ہوئے دن نگاہوں کے سامنے رنگین تصویریں بنا رہے ہوں اس وقت معمولی معمولی اشاروں میں بھی جوشؔ بہت سی کام کی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ ان باتوں کو بدحواسی کی گفتگو سمجھنا درست نہ ہوگا کیونکہ میں نے وہی باتیں اور تقریباً انہیں الفاظ میں دوسرے اوقات میں بھی سنی ہیں۔

خیر تو مستی اور ہوش کے عالم میں جوشؔ کی حالت میں کوئی بڑا فرق اس کے سوا نہیں ہوتا کہ رات کو ان کے موضوعات گفتگو محدود ہو جاتے ہیں اور کچھ الفاظ کے استعمال میں بے احتیاطی برتنے لگتے ہیں۔ حالانکہ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ جب کبھی ایسی صحبتوں میں ڈاکٹر رشید جہاں مرحومہ یا ہاجرہ بیگم یا کوئی اور ایسی ہی ذی وقار خاتون موجود ہوتیں تو جوشؔ کبھی سنجیدگی نہیں کھوتے تھے۔ ویسے ان سے بدحواسیاں تو ایک خاص رنگ میں ہوش و حواس کے عالم میں

بھی سرزد ہوتی ہیں جن میں سے چند کا ذکر انہوں نے اپنے رسالہ "کلیم" میں بھی کیا تھا لیکن ان کا تعلق ایک طرح کی خود فراموشی سے ہے۔

ایک اور ضروری اور اہم پہلو ——— جوش نے اپنے بچپن کے واقعات میں ایک ایسے رجحان کا بھی ذکر کیا ہے جس سے ان کے کردار پر تیز روشنی پڑتی ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ:

"شاعری سے جب فرصت پاتا تھا تو یہ میرا محبوب ترین مشغلہ تھا کہ ایک اونچی میز پر بیٹھ کر اپنے ہم عمر بچوں کو، جو جی میں آتا تھا اناپ شناپ درس دیا کرتا تھا۔ درس دیتے وقت میری میز پر ایک پتلا سا بید رکھا رہتا تھا اور جو بچہ توجہ کے ساتھ میرا درس نہیں سنتا تھا اسے میں بید سے اس بری طرح مارتا تھا کہ بیچارہ چیخیں مار مار کر رونے لگتا تھا، اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ میں کسی کند ذہن بچے کے کاندھوں پر سوار ہو کر اسے اس طرح بید مار مار کر دوڑاتا کہ وہ غریب بے دم ہو کر گرنے لگتا ——— اور میرے مزاج کی یہی وہ بنیادی سختی ہے جو میری سیاسی خطیبانہ شاعری میں تلخ و ترش بن کر آج بھی نمودار ہوتی رہتی ہے اور میری شاعری کا نقاد میرے لہجے کی درشتی پر چیخ پیخ اٹھتا ہے۔"

یہ اقتباس دلچسپ حقائق کا حامل ہے۔ میرے خیال میں صرف اتنی ہی بات نہیں ہے، بچپن میں درس دینے کا مشغلہ بڑی عمر میں پیمبری اور رہبری کی خواہش میں تبدیل ہو گیا ہے۔ بچپن میں جو بچے درس کی طرف متوجہ نہ ہوتے تھے وہ سزا پاتے تھے اور آج جو لوگ جوش کی شاعری پر دھیان نہیں دیتے انہیں جوش اپنے مخصوص انداز میں گونگا، بہرا، اندھا، جاہل اور نہ جانے کیا کیا کہہ ڈالتے ہیں مثلاً ——

اندھوں سے جب پڑا ہو زمانے میں سابقہ
اے جوش آپ یوسفِ کنعاں ہوئے تو کیا

———

صد حیف کہ قدرت سے ملا ہے یہ حکم
بہروں کو سنائے جا ترانہ اپنا

اس کے علاوہ بر رہا رہنے میں بھی گہرے نفسیاتی رمز ہیں جن میں سے بعض طنز، صاف گوئی، نازک مزاجی، سریع الحسی اور کسی حد تک ایذا دہی میں لذت اندوزی کے جذبات کی شکل میں آج بھی نمایاں ہوتے ہیں۔ یہ پہلو روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں۔ طنز، شاعری اور گفتگو میں زیادہ جگہ پانے لگا ہے۔ احساسِ برتری رسمی تعلی کے پردوں کو چیر کر نمایاں ہوتا جا رہا ہے۔ یہ احساسِ برتری محض ایک نفسیاتی کیفیت نہیں ہے۔ حالات نے انہیں اس کا موقع بھی دیا کہ وہ بچپن سے اس وقت تک اس کو اپنے رگ و پے میں محسوس کریں۔ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ جا ہے جن دوسرے عناصر نے یہ بات پیدا کی ہو لیکن سب سے زیادہ جس چیز نے ان میں یہ خود اعتمادی، خود بینی اور احساسِ فخر پیدا کیا وہ ان کی شاعری ہے۔ اسی چیز نے انہیں حیدرآباد میں عزت بخشی، اسی نے انہیں ہندوستان کے مختلف حلقوں میں سربلند کیا اور اسی نے انہیں آج یہ موقع دیا ہے کہ وہ بے جھجک، وقت بے وقت پنڈت نہرو اور مولانا آزاد سے بھی صاف صاف باتیں کہہ آتے ہیں اور وہ ان کے غرورِ شاعرانہ کو ہنسی خوشی برداشت کرتے ہیں۔ جو کچھ بھی ہو، شاعری نے ان کے مزاج میں ایک بانکپن اور شخصیت میں ایک دلکشی پیدا کی ہے جس کی وجہ سے ان کی ناز نہ بننے اور ناز برداری کرانے کی تمنا برابر پوری ہوتی رہتی ہے۔

شدتِ جذبات اور سریع الحسی نے جوش میں بہت سے متضاد عناصر پیدا کر دیئے ہیں اور چونکہ وہ سب باتیں ان کی شاعری اور گفتگو میں نمایاں جگہ پا چکی ہیں، اس لئے جوش ان سے دست بردار بھی نہیں ہوتے۔ گو تفکر بچپن سے انہیں عزیز رہا ہے اور انہوں نے اسے سینے سے لگائے رکھا ہے لیکن ان کا ذہن طبعاً جذباتی ہے منطقی نہیں ہے۔ ان کی منطق بھی جذبات ہی کی گود میں پرورش پاتی ہے۔ مذہب، خدا، حیات بعدِ موت،

جبر و اختیار، مقصدِ حیات، علمِ انسانی، عقل و عشق، جنون و حکمت ان تمام مسائل پر انہوں نے غور کیا ہے اور حسین ترین شاعرانہ انداز میں ان کے نازک مقامات کو پیش کیا ہے لیکن ہر مقام پر عقل اور جذبہ کی آویزش اتنی شدید رہی ہے کہ مفکر جوشؔ کو شاعر جوشؔ نے اکثر شکست دے دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک طرف مطلق جبر کے قائل ہیں اور دوسری طرف انسان کو عمل پر اکسا کر خدا بننے اور نئی کائنات کی تشکیل کرنے کی دعوت دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ دونوں باتیں جبر کے تحت ہو رہی ہیں۔ یہاں ان کے خیالات اور معتقدات کی بحث بے محل ہوگی۔ کہنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ جوشؔ جذبے کی والہانہ تندی اور شدت کی گرفت میں اس طرح آجاتے ہیں کہ ان کی شعوری کوششیں بھی اسی میں رنگ جاتی ہیں، اس میں ان کے خلوص یا ان کی صداقت پر حرف نہیں آتا۔

اس جذباتیت کی بہت سی مثالیں ان کی زندگی سے دی جا سکتی ہیں۔ وہ ہر شخص کی سفارش کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں کیونکہ وہ کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے۔ اس میں انہیں یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ وہ ایک ہی جگہ کے لئے کئی آدمیوں کی سفارشیں کر رہے ہیں۔ جوشؔ مردم شناس نہیں ہیں، انہیں اس میں دھوکا ہوتا رہتا ہے لیکن جب وہ ایک دفعہ ایک رائے قائم کر لیتے ہیں تو اس کے مخالف پچاس دلیلیں اور واقعات بھی ان کے پہلے نقش کو مٹا نہیں سکتے۔ اس میں ان کی کوئی غلطی یا بدنیتی شامل نہیں ہوتی۔ اس جذباتیت کی ایک اور شکل کبھی کبھی یادگار حیثیت بھی اختیار کر لیتی ہے۔ غالباً ۱۹۳۵ء کی بات ہے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے مسلم بورڈنگ ہاؤس میں وہاں کا شاندار سالانہ مشاعرہ تھا۔ یہ مشاعرہ برسوں سے ہوتا آیا تھا۔ ایک طرف چلمن ڈال کر کچھ عورتوں کے بیٹھنے کا انتظام ضرور کر دیا جاتا تھا۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ مردوں کی صف میں خواتین بیٹھ کر مشاعرہ سنیں۔ اتفاق سے اس دن الہ آباد میں ہاجرہ بیگم، ڈاکٹر رشید جہاں (مرحومہ) اور بعض دوسری خواتین موجود تھیں، ان لوگوں نے مشاعرہ میں شرکت کی خواہش ظاہر کی۔ معلوم ہوا کہ چلمن کے پیچھے بیٹھ کر سنیں تو سنیں ورنہ مجبوری ہے۔ ان لوگوں نے جوشؔ سے کہا کہ ہم تو سامنے ہی بیٹھ کر سنیں گے، آپ کچھ مدد کیجئے۔ جوشؔ نے منتظمین سے کہلا بھیجا کہ جب تک ان خواتین کو مشاعرے میں بیٹھنے کی اجازت نہیں دی جائے گی میں شریک نہیں ہوں گا۔ تھوڑی دیر کے بعد مشاعرے کے دروازے پر آ کھڑے ہوئے اور بہت سے شعراء ان کی وجہ سے باہر ہی رہے۔ اچھی خاصی ہلچل رہی۔ یہاں تک کہ ان خواتین کو مشاعرے میں بیٹھنے کی اجازت دی گئی۔ اس سے کچھ ہی دن پہلے انہوں نے اپنی نظمیں "خاتونِ مغرب" اور "خاتونِ مشرق" لکھی تھیں۔ اب تو جوشؔ ان نظموں کو ایامِ جاہلیت کی نظمیں کہتے ہیں اور سماج میں عورت کے مقام کے متعلق ان کے خیالات میں کچھ تبدیلیاں بھی ہوئی ہیں لیکن اس کا اظہار ابھی تک واضح شکل میں صرف "حرفِ آخر" کے ایک مقام پر ہوا ہے جس سے بہت تھوڑے سے لوگ واقف ہیں۔ جوشؔ میں عجیب طرح سے ایک بت پرست اور بت شکن کی روح مل گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سمجھنے میں دشواری پیش آتی ہے اپنی ایک رباعی میں وہ لکھتے ہیں:

عفریت، خبیث، دیو، اژدر، شیطاں
درویش، اقطاب، امام، مرسل، یزداں
گیتی، گردوں، بہشت، دوزخ، اعراف
یہ سب ہیں مرے دل میں خروشاں و تپاں

جوشؔ کا سینہ کتنے متضاد اور متصادم عناصر کی جولاں گاہ ہے! کیا ان کی شخصیت میں ان کا اظہار نہیں ہوگا؟ پھر کیا جوشؔ کی شخصیت ایک پارہ پارہ بیمار شخصیت ہے؟ نہیں ایسا نہیں ہے۔ ان کا کردار ایک ایسے ذہین، ذکی اور زود حس انسان کا کردار ہے جو عمل میں کم اور خیال میں زیادہ اپنے ماحول اور گرد و پیش کے واقعات سے متاثر ہوتا ہے، یعنی ان کا ذہن جن تاثرات کو بجلی کی طرح قبول کر لیتا ہے ان کا اظہار ان کے تخیلی کارناموں میں فوراً ہو جاتا ہے چاہے عمل میں نہ ہو سکے۔ یہ چیز ان کے افتادِ مزاج سے ہم آہنگ ہے کیونکہ جوشؔ میں نازبرداری کے متمنی ایک عیش پسند کی روح ہے جس کا

بچپن پھولوں کی سیج پر گذرا، جو محبت میں کامیاب رہا، جس نے اپنی راتیں زلفوں کے سائے میں گذاریں، جو اپنے حسبِ توقع نہ سہی پھر بھی ملک کی ایک متاعِ عزیز بننے میں کامیاب ہوا۔ جوش کی عمر اور خیالی زندگی میں یہ تضاد حقیقتاً جنون و حکمت کی کشمکش کا وہی پہلو ہے جو ہر ایسے حساس انسان کے یہاں نمایاں ہوتا ہے جسے عمل کی زندگی میں وہ سب کچھ کرنے کا موقع نہیں ملتا جو وہ سوچتا ہے یا سوچ سکتا ہے۔ سریع الحسی جلد باز بناتی ہے جوش بھی بہت جلد نتائج تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ جو باتیں ان کے جذبات سے ہم آہنگ ہوں انہیں وہ جلد قبول کر کے ایک نئی قوت سے پیش کرتے ہیں، ان پہلوؤں کو نہیں دیکھتے جنہیں دوسرے دیکھ سکتے ہیں اور دوسرے نتائج نکال سکتے ہیں۔

ان حالات میں اگر جوش کی شاعری اور کردار کے سمجھنے میں الجھنیں پیدا ہو رہی ہیں تو تعجب کی کیا بات ہے! ان کے مذہبی اور سیاسی معتقدات محض ایک ذہنی کیفیت کا پتہ دیتے ہیں۔ ان کی سماجی زندگی وضع کی پابندی اور آزادی کی آمیزش کا ایک عجیب مجموعہ ہے۔ ان کی گفتگو بھولے پن اور دیوانہ پن یا جوش و ہشیار دونوں کیفیات سے بھری ہوئی ہوتی ہے اس لئے دو چار ملاقاتوں میں انہیں سمجھنا آسان نہیں ہے۔ مجموعی طور پر ان کی شخصیت اور شاعری دونوں کے متعلق رائے دینے میں جلد بازی مفید نہیں ہوگی۔

سالکؔ صاحب

احمد ندیم قاسمی

شروع ہی میں بتا دوں کہ میں سالکؔ صاحب کی شخصیت کو ان چند صفحات میں سمیٹنے سے قاصر رہوں گا۔ اس عجز کے اعتراف ہی میں خیریت ہے کیونکہ جس شخصیت میں مشرق کا کلچر مجسم ہو گیا ہو، اس کا کما حقہٗ احاطہ کرنا میرے بس کی بات نہیں اور جس طرح ایشیائی کلچر کی ان گنت، ایک سے ایک دلآویز اور موتیوں کی طرح جگمگاتی ہوئی پرتیں ہیں، اسی طرح سالک صاحب کی شخصیت کے بھی بے شمار محبوب پہلو ہیں اور اگر میں ان سب کا ذکر کرنے بیٹھوں گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں ایک ضخیم کتاب تصنیف کر رہا ہوں حالانکہ مدیرِ نقوش نے مجھے صرف ایک 'اسکیچ' لکھنے کو کہا ہے۔

شعر و افسانہ کی دنیا میں میرے ذہن نے جو بھی موضوع سوچا ہے، اس سے میں نے بہت کم شکست کھائی ہے۔ میں نے موضوع کو فنی تخلیق پر کبھی مسلط نہیں ہونے دیا بلکہ میری کوشش ہمیشہ یہ رہی ہے کہ میں تخلیقی عمل کے دودھ میں موضوع کو کھانڈ کی طرح گھول لوں۔ مگر میں سالکؔ صاحب کی شخصیت کا ایک ذرا سا پرتو پیش کرنے کے تصور ہی سے کانپ رہا ہوں۔ اس موضوع اور میرے تخلیقی جذبے کے درمیان بہت بڑا فاصلہ ہے اور یہ فاصلہ افق تا افق کا نہیں، فراز و نشیب کا فاصلہ ہے۔ آپ کہیں گے، یہ ندیم نہیں بول رہا، ندیم کی بے پناہ عقیدت بول رہی ہے۔ آپ نے صحیح اندازہ لگایا ہے اور سالک صاحب کے متعلق کچھ لکھتے ہوئے میرے قلم کی روانی کو اسی عقیدت نے جکڑ رکھا ہے۔

سالکؔ صاحب کے اور میرے درمیان عقیدت و شفقت کا رشتہ ہے۔ عقیدت میری اور شفقت ان کی۔ اور گزشتہ اٹھارہ برس کے طویل عرصے میں نہ میری عقیدت میں کوئی کمی آئی ہے اور نہ ان کی شفقت میں۔ حالانکہ ہماری راہیں عموماً الگ الگ رہی ہیں بلکہ اکثر اوقات ہم دو قطعی مخالف راہوں پر گامزن رہے ہیں۔

میں مولانا ظفر علی خان کے نیلی پوشوں میں شامل تھا کیونکہ مولانا نے مسلمانوں کو حکم دیا تھا کہ مسجد شہید گنج کے حصول کی خاطر نیلی پوش ہو جاؤ۔۔۔ "خدا کا نام لو اور عاقبت بردوش ہو جاؤ۔" میں نے سفید لٹھے کی تنہا قمیص کو نیلے رنگ میں ڈبو لیا اور بزعمِ خود غازی بنا لاہور کی سڑکوں پر ٹہلتا رہا، مگر نیلی پوشوں کے معاملے میں سالکؔ اور مہرؔ کے "انقلاب" کا رویہ کچھ ایسا ہمدردانہ نہیں تھا۔ میرا عنفوانِ شباب تھا۔ رائے کے ذرا سے اختلاف کو دشمنی قرار پا جانا چاہیے تھا مگر سالکؔ صاحب سے میری عقیدت بدستور رہی (اس وقت یہ عقیدت غزل کے چند اشعار، "چترا" کے ترجمے اور "افکار و حوادث" کے کالم تک محدود تھی)، پھر میں نے اس علاقے میں مسلم لیگ کا پرچم بلند کیا جس کی نمائندگی صوبائی اسمبلی میں ملک خضر حیات خان ٹوانہ کر رہے تھے۔۔۔

ملک صاحب پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ تھے اور "انقلاب" ملکی پیمانے پر مسلم لیگ کا ہمنوا ہونے کے باوجود صوبائی مسائل میں ملک صاحب کی یونینسٹ پارٹی کا مؤید تھا۔ پنجاب میں قائدِ اعظمؒ کی تشریف آوری کے بعد ان سے ملک خضر حیات خان کے شدید اختلاف اور "انقلاب" کی یونینسٹ حکمتِ عملی ملک بھر میں ہدفِ طعن بن رہی تھی اور خود مجھے بھی "انقلاب" کی صوبائی پالیسی کے لفظ لفظ سے اختلاف تھا مگر سالک صاحب سے میری عقیدت مندی میں شمہ بھر بھی فرق نہ آیا (اس وقت تک میں سالک صاحب کی شخصیت سے بھی متعارف اور متاثر ہو چکا تھا) قیامِ پاکستان کے بعد جب ترقی پسند ادب کی تحریک زوروں پر تھی اور بعض علماء کا واحد وظیفۂ حیات یہ رہ گیا تھا کہ وہ ترقی پسند ادیبوں کے خلاف نت نئے فتوے جاری کریں۔ پھر جب اس رَو میں سالک صاحب کے اور میرے بعض مشترک احباب بھی بہ گئے اور انہوں نے میرے نظریۂ فن سے اختلاف کی وجہ سے مجھے ننگی گالیوں سے بھی نوازا، اور جب خود سالک صاحب کے بیٹے اور میرے دوست مسٹر عبدالسلام خورشید کو بھی اس ادبی انجمن سے متعدد اختلافات پیدا ہو گئے جس کا میں سیکرٹری تھا تو جب بھی سالک صاحب سے میری عقیدت کا وہی عالم رہا۔ اس سارے سلسلۂ واقعات کا نقطۂ اوج یہ ہے کہ حکومت نے مجھے چھ مہینے کے لئے تدارکی نظربندی کے تحت جیل بھیج دیا اور سالک صاحب "انقلاب" کے بند ہو جانے کے بعد کسی سرکاری محکمہ سے منسلک ہو گئے۔ لیکن جب میں رہا ہوا تو سب سے پہلے جس شخص نے میرے گھر آ کر مجھے اپنے سینے سے لگایا، وہ سالک صاحب ہی تھے۔ آج میں سالک صاحب کی طرح ایک روزنامے کا ایڈیٹر ہوں اور سالک صاحب میری طرح گھر میں بیٹھ کر تصنیف و تالیف میں مصروف ہیں۔ ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے ہم مہینوں ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے۔ لیکن اگر اس عالم میں بھی کوئی مجھے یہ بتلائے کہ سالک صاحب کچھ عرصہ کے لئے لاہور سے باہر جا رہے ہیں تو میں اُداس ہو جاؤں گا اور میرے لئے لاہور ایک دم خالی ڈھنڈار ہو کر رہ جائے گا۔ سو میری عقیدت کا معیار وہی ہے اور اس کے ساتھ ہی سالک صاحب کی شفقت کا بھی۔

اسکیچ ایسی محدود صنفِ ادب اتنی طویل تمہید کی یقیناً متحمل نہیں ہو سکتی لیکن یقین کیجئے کہ یہ خالی خولی تمہید نہیں تھی۔ سالک صاحب کی شخصیت کے ایک نہایت ہی دل آویز رُخ کا ایک ایسا اظہار تھا جس میں راقم الحروف، کی "میں" کو ان تمام افراد کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے جو سالک صاحب سے متعارف ہیں اور جنہوں نے اس ازلی و ابدی مسکراہٹ کو قریب سے دیکھا ہے جسے میں نے صرف ایک بار ان کے ہونٹوں سے غائب پایا تھا۔

یہ ۱۹۴۴ء کا واقعہ ہے۔ میں "نروس بریک ڈاؤن" کا مریض تھا۔ اچانک پسینے چھوٹ جاتے۔ ہاتھ پیر سُن ہونے لگتے اور میں "حاضرین" کو وصیت تک کر دیتا۔ سالک صاحب نے میری حالت دیکھی تو دفتر سے اُٹھے۔ مجھے چیمبرلین روڈ کے چوک میں حکیم دینا ناتھ کوہلی کے یہاں لے آئے اور انہیں میرے مرض کی کیفیت بتانے کے بعد کہا کہ "اگر آپ نے ندیم کو تندرست نہ کیا تو میں "افکار" میں آپ کو نیم حکیم کو ہلو ناتھ دہلی لکھ دوں گا۔" حکیم صاحب ادب دوست اور باذوق بزرگ تھے۔ میرا معائنہ کیا اور اچانک چونک کر سالک صاحب سے کہا "ندیم کا دل دس بارہ ضربوں کے بعد ایک ضرب "مِس" کر جاتا ہے" اور اس وقت میں نے سالک صاحب کی ازلی و ابدی مسکراہٹ کو ان کے ہونٹوں سے غائب ہوتے دیکھا۔ الگ جا کر دونوں بزرگ کچھ کُھسر پُھسر کرتے رہے۔ واپس آئے تو دونوں مسکرا رہے تھے۔ دونوں نے مجھے بہلانے کی کوشش کی۔ حکیم صاحب نے کہا "جس چیز کے لئے جی چاہتا ہے وہی کھاؤ البتہ دال مت کھاؤ۔ دال ہم لالاؤں کا کھاجا ہے، اسے ہمارے لئے رہنے دو۔"

ہم مطب سے باہر نکلے تو چند بچے مسلم لیگ کے جھنڈے اُٹھائے نعرے لگاتے جا رہے تھے۔ سالک صاحب نے حکیم صاحب سے کہا "آج کل تو جسے دیکھو آپ کے ہری چند اختر کو بانس پر اٹھائے پھرتا ہے۔"

حکیم صاحب نے لطیفے سے محظوظ ہونے میں دیر لگائی تو سالک صاحب نے بتایا کہ جھنڈا ہرا (ہری) ہے اور اس پر چاند (چند) ستارے (اختر) کا نشان ہے۔ اور ——— "لالہ تم اب تو ہنس دو!"

اور میں اپنی آدھی بیماری وہیں کہیں راستے ہی میں جھٹک آیا۔

سالک صاحب کی محبت، ان کا خلوص، ان کی فراخ دلی، وسیع المشربی اور نیک نیتی ان کی اسی مسکراہٹ میں سمٹ آئی ہے اور یہی مسکراہٹ

اُن کا کہہ دار ہے اور جب یہ مسکراہٹ لمحے بھر کے لئے غائب ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان پر کوئی حادثہ گذر گیا ہے۔ ان "حادثوں" کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟ اس کی ایک جھلک تو اوپر کے واقعہ میں موجود ہے مگر ایک مثال اور بھی سُن لیجئے۔

آغا شورش کاشمیری نے ایک بار ایک جلوس کی رہنمائی کرتے ہوئے دفتر "انقلاب" پر ہلّہ بول دیا اور انقلاب کے دفتر اور پریس میں کچھ دیر تک توڑ پھوڑ کا سلسلہ جاری رہا۔ چند روز کے بعد حکومت نے شورش صاحب کو نظر بند کر دیا۔ جب سالک صاحب کو ان کی گرفتاری کی اطلاع ملی تو ان کے لبوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی اور وہ بولے "یہ حکومت کو آخر ہو کیا گیا ہے۔ شورش ذرا سا جذباتی ضرور ہے مگر جذباتیت پر تو غصّے کے بجائے پیار آنا چاہیئے اور بد ذوق حکومت کو شورش پر ہمیشہ غصہ ہی آتا ہے، پیار کبھی نہیں آیا۔"

طور یہ مبالغے کی حد تک وسیع القلبی اور نرم دلی صرف ان لوگوں کے لئے مخصوص نہیں جو سالک صاحب سے متعارف ہیں۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ ایک عجیب الخلقت بھلے مانس بزرگ دفتر انقلاب میں آئے اور بتایا کہ وہ ضلع گوجرانوالہ کے کسی گاؤں کے باشندے ہیں۔ ان کا بیٹا پٹوار کی تربیت حاصل کر رہا تھا کہ اچانک اسے جواب مل گیا۔ اور وہ چاہتے ہیں کہ محکمہ مال کے کسی خدا ترس اور منصف مزاج افسر سے ان کے بیٹے کے حقوق کا لحاظ رکھنے کی درخواست کی جائے ـــــــ ظاہر ہے کہ عام حالات میں ایسے لوگوں کو ٹالا جاتا ہے۔ مگر سالک صاحب اٹھے، چھڑی ہاتھ میں لی، سائل کو ہمراہ لے کر تانگے میں بیٹھے اور سیکرٹیریٹ میں جا کر اس وقت تک وہاں سے نہ ہلے جب تک اس بزرگ کو بیٹے کی ٹریننگ کی اجازت نہ لے دی۔

میں سالک صاحب کی اس خدا ترسی کو ایک آزمائش میں ڈالنے کا بھی گنہگار رہوں۔ خود سالک صاحب کو بھی معلوم نہیں ہوگا کہ ایک بار میرے ایک عزیز سالک صاحب سے کوئی سفارش حاصل کرنے کے لئے میرے پاس آئے۔ کام ایسا بھونڈا سا تھا کہ میں سالک صاحب کے سامنے اس کا ذکر کرتے ہوئے جھجکتا تھا۔ مزاروں مجاوروں کا کوئی قصہ تھا اور سالک صاحب نے "پیر افکار شاہ" کی حیثیت سے مسلمانوں کی قبر پرستی پر بڑی زبردست چوٹیں کی ہیں۔ سو میں نے ایک ترکیب سوچی۔ اپنے عزیز سے کہا کہ میں سالک صاحب کو بلا ناغہ ایک نہ ایک کام کہتا ہوں۔ آج کا "کوٹا" آپ کے آنے سے پہلے پورا ہو چکا ہے مگر میں نے سُنا ہے کہ سالک صاحب سے امداد حاصل کرنے کے لئے کسی تعارف کی ضرورت ہی نہیں۔ آپ سیدھے ان کے پاس چلے جایئے، یہ بھی نہ بتایئے کہ آپ میرے رشتہ دار ہیں۔ اپنی مظلومیت کا ذکر کیجئے اور پھر دیکھئے پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔

میرے عزیز دفتر "انقلاب" میں گئے اور دو تین گھنٹے تک واپس نہ آئے۔ میں نے فون کیا تو معلوم ہوا کہ سالک صاحب دو تین گھنٹے پہلے کسی شخص کے ساتھ اٹھ کر چلے گئے ہیں۔ کچھ دیر کے بعد میرے عزیز واپس آئے اور معلوم ہوا کہ سالک صاحب نے ان سے بے انتہا ہمدردی کی۔ پہلے فون کیا لیکن جب انہیں محسوس ہوا کہ فون پر انہیں ٹرخانے کی کوشش کی گئی ہے تو وہ انہیں ساتھ لے کر متعلقہ افسر کے پاس پہنچے اور کام کرا کے اٹھے جب واپس آنے لگے تو اس افسر نے سالک صاحب سے کہا "کام تو میں نے کر دیا مگر قبلہ! مجھے یہ وہم بھی نہ تھا کہ آپ ایسے معاملات میں بھی دلچسپی لے سکتے ہیں" اور سالک صاحب نے مسکرا کر کہا "یہ تو ایک بزرگ کے مزار کا معاملہ تھا اور بعض لوگ تو میرے پاس اپنے محلّے کی مسجد کے لئے سستے داموں پر مٹی کے ڈھیلوں کا انتظام کرانے آ نکلتے ہیں۔"

سالک صاحب کے پاس اس قسم کے ضرورت مندوں کا ہمیشہ تانتا لگا رہتا ہے۔ اور آج بھی جب وہ ایک حد تک گوشہ نشین ہو چکے ہیں، ضرورت مند انہیں جا ہی لیتے ہیں اور اگر ضرورت معقول ہو (یعنی مٹی کے ڈھیلوں کی سی ضرورت نہ ہو) تو حسبِ عادت ان کے ساتھ چل کھڑے ہوں گے۔ بلکہ اب تو انہوں نے موٹر کار بھی خرید لی ہے اور میری ذاتی رائے یہ ہے کہ یہ تکلف بھی انہوں نے محض اس لئے کیا ہے کہ لاہور سے ان کے پاس مسلم ٹاؤن آنے والوں کو واپسی میں تکلیف نہ ہو۔

"ضرورت مندوں" کی ایک اور قسم کا بھی ان کے ارد گرد ہمیشہ ہجوم رہا ہے۔ یہ ادب و فن، شعر و نغمہ اور لطافت و جمال کے "ضرورت مند" ہیں، اور سالک صاحب کی انجمن آرائی گذشتہ ربع صدی کی علمی و ادبی دنیا کی ایک حقیقت بن چکی ہے۔ جس محفل میں بیٹھیں گے آن کی آن میں جانِ محفل بن جائیں گے۔

اور گفتگو صرف لطیفے اور پھبتی تک محدود نہیں ہوگی بلکہ دنیا جہان کا کوئی سا موضوع لے آیئے اور ع

اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

معلومات کا ایک دریا رواں ہو جاتا ہے۔ اور پھر یہ بھی نہیں کہ ان معلومات میں علم کی خشکی یا ضرورت سے زیادہ سنجیدگی کی یبوست راہ پا جائے ـــ سالک صاحب بنیادی طور پر فن کار ہیں اور اگرچہ اردو صحافت میں ان کا درجہ بہت بلند ہے مگر وہ اول و آخر شاعر ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ بات تاریخ کی ہو یا فلسفے کی، نفسیات کی ہو یا جنرل فیچر کی، سائنس کا کوئی موضوع ہو یا سیاسیات کا، توحید کا ذکر ہو رہا ہو یا الحاد کا، ان کی گفتگو کی ادبی چاشنی برقرار رہے گی۔ ایک بار سائنس کی ترقی کا ذکر چلا۔ سائنس کی ترقی کو ماقبل تاریخ کے دور سے شروع کیا اور جب وہ اٹھارویں انیسویں صدی تک آئے تو (مجھے نام یاد نہیں) کسی ایسے سائنس دان کا ذکر کر رہے تھے جس نے اپنی تحقیقات تو مکمل کر لی تھیں اور وہ ایجاد کی حدوں تک بھی پہنچ گیا تھا مگر وہ اپنی ایجاد کو مناسب انداز میں اہلِ علم کے سامنے پیش نہ کر سکا اس لئے کسی نے اس پر اعتماد نہ کیا اور تمام عمر اسے یہی حسرت رہی کہ وہ ایجاد کرنے کے باوجود موجد نہ کہلا سکا۔ اسی سلسلے میں سالک صاحب نے کہا کہ سائنس دان کی کیفیت میرزا بیدل کے اس شعر کی سی تھی ـــ

ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نہ رفت رنجِ خمارِ ما
چہ قیامتے کہ نمی رسی زکنارِ ما بکنارِ ما

ایک بار ترقی پسند ادب کی تحریک کا ذکر چلا تو کہنے لگے کہ تاریخ کے ہر دور میں اپنے زمانے سے کچھ آگے بڑھ کر سوچنے والے اور اپنے وقت کے نقائص پر بے قرار ہو جانے والے موجود رہے ہیں۔ دور کیوں جاؤ یہی دیکھو کہ ذوق کے زمانے میں غالب بھی موجود ہے اور امیر مینائی کے زمانے میں حالی کی آواز بھی آ رہی ہے اور نوح ناروی کے وقت میں اقبال کا نغمہ بھی گونج رہا ہے۔ اور پھر یہ تو اب کی بات ہے۔ آج سے چار صدی پہلے فیضی وہی بات کہہ گیا ہے جسے تم لوگ قطعی نئی بات سمجھ کر اس پر اپنے فن کی تعمیر اٹھا رہے ہو۔ دیکھو فیضی کی یہ رباعی دسویں صدی ہجری کی پیداوار معلوم ہوتی ہے یا تمہاری چودھویں صدی ہجری کی ـــ

ما عقل بہ صد جام لبالب ندہیم
یک پرتوِ دل بہ سبعہ کوکب ندہیم
با ما ز فروغِ شب مہتاب مگو
ما یک دمِ صبح را بہ صد شب ندہیم

اور اس کے ساتھ ہی جب سالک صاحب شگفتگی کے موڈ میں آ جائیں (آ جانے کا جھگڑا ہی نہیں بلکہ ان کے مزاج کی شگفتگی سدا بہار ہے) تو پھر وقت پر بڑا غصہ آتا ہے جو گزرا جا رہا ہے اور وہ لمحہ قریب آ رہا ہے جب یہ محفل جسے قیامت تک برپا رہنا چاہئے، منتشر ہو جائے گی۔

گرمیوں کا موسم تھا۔ سالک صاحب نے اپنے دفتر میں چھڑکاؤ کرا رکھا تھا، چقیں گرا رکھی تھیں اور چھوٹے سے کمرے میں گرمی کا نشان تک نہ تھا۔ محفل میں دو ہندو بزرگ بھی بیٹھے تھے اور بے تعصبی اور فراخ دلی کے موضوع پر باتیں ہو رہی تھیں۔ سالک صاحب تاریخی حوالوں سے مسلمانوں کی بے تعصبی کا ذکر کر رہے تھے ـــ اچانک چق اٹھی اور دو نوجوان طلبا اندر آئے۔ آتے ہی انہوں نے اطمینان کی لمبی لمبی سانسیں لیں اور ان میں سے ایک بولا "مولانا آپ نے تو اپنے دفتر کو بالکل جنت بنا رکھا ہے"۔ سالک صاحب نے فوراً کہا "تشریف رکھئے۔ اب جنت بالکل مکمل ہو گئی، صرف غلمان کی کمی تھی"۔

محفل کا رنگ بدلا تو ایک ہندو بزرگ کو سالک صاحب سے مذاق کرنے کا شوق چرایا۔ بولے "ہندوؤں اور سکھوں کی بے تعصبی کی ایک مثال عرض کرتا ہوں۔ اردو کے مشہور افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی نے اپنے ایک افسانے میں لکھا ہے کہ دو پڑوسیوں میں (ایک ہندو اور ایک مسلمان) آپس میں

حکام کی بد دیانتیوں کا ذکر کر رہے تھے۔ جب مسلمان پوسٹ مین نے کہا ؏

"چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی؟"

تو ہندو پوسٹ مین نے فوراً کہا "تمہیں مسلمانی کی فکر نہ کرنی چاہیئے۔ بھابی کو میرے ہاں بھیج دینا۔"

زور کا قہقہہ پڑا اور پھر سالک صاحب نے فوراً کہا "اور لالہ جی! کیا آپ نے علامہ اقبال کا یہ مصرع نہیں سنا ؏

عروس لالہ! مناسب نہیں ہے مجھ سے حجاب"

ہندو بزرگوں نے ہاتھ تک جوڑ دیئے مگر سالک صاحب کی طرف سے "لالہ" کے سلسلے میں اُردو اور فارسی کے اشعار کا سلسلہ رُکنے ہی میں نہ آتا تھا۔ اچانک ساتھ کے کمرے سے مہر صاحب کی آواز آئی "یہ سنئے تو سالک صاحب! میرے پاس ضلع راولپنڈی کے ایک صاحب بیٹھے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ گاندھی جی نے سنہ انیس سو سنتری (۷۰ء) میں فلاں تقریر کی تھی۔ یہ "سنتری" کیا ہوتی ہے؟" اور سالک صاحب نے فرمایا "یہ سنتری کی بیوی ہوتی ہے!"

آج سے دس بارہ برس پہلے میں دارالاشاعت پنجاب میں "پھول" اور "تہذیبِ نسواں" مرتب کرتا تھا اور دفتر "انقلاب" بھی دارالاشاعت والی سڑک پر ہی واقع تھا۔ سالک صاحب کا معمول تھا کہ شام کو چار بجے کے قریب جب وہ دفتر سے اٹھتے تو میرے پاس تشریف لے آتے میرے کمرے میں پھول اور تہذیب کے دو خوشنویس منشی فرزند علی اور منشی تہوّر علی بھی بیٹھتے تھے اور یہ دونوں اس ادارے میں اس وقت سے کام کر رہے تھے جب شمس العلماء مولوی ممتاز علی مرحوم کی زندگی میں سالک صاحب پھول اور تہذیب کے ایڈیٹر تھے۔ اس لئے سب ایک دوسرے کے پرانے مزاج داں تھے۔ سالک صاحب کمرے میں آتے ہی فرماتے "چپراسی سے کہو کہ دلّی والے کی چاٹ کی چار پلیٹیں لے آئے" ہم چاٹ پر جھپٹتے تو سالک صاحب چپراسی سے کہتے "چار پلیٹیں قلفی کی بھی تو لے آؤ" پھر قلفی کی چار پلیٹوں کا صفایا کیا جاتا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتیں اور سالک صاحب دو ڈھائی روپے ادا کر کے مسلم ٹاؤن روانہ ہو جاتے۔ تین مہینے تک یہی سلسلہ جاری رہا تو میں نے اپنے خوشنویسوں کے ساتھ جو اب تک میرے عزیز دوست ہیں مشورہ کیا کہ آخر کب تک ہم سالک صاحب پر بوجھ بنے رہیں گے۔ وہ ہم پر ماہانہ ستر پچھتر روپے خرچ کئے جا رہے تھے اور یہاں اپنی تنخواہ ہی ستر پچھتر تھی۔ طے پایا کہ ہم تینوں اپنی اپنی تنخواہوں میں سے بارہ بارہ روپے نکال کر الگ رکھ لیا کریں اور چاٹ اور قلفی کے اخراجات کا نصف اپنے ذمے لے لیں۔ مجھ میں تو اتنی جرأت نہیں تھی کہ سالک صاحب پر اپنی "سازش" کا انکشاف کرتا۔ منشی تہوّر علی رام پور کے پٹھان تو تھے مگر "نہ بھئی ہم سے تو یہ نہ ہوگا" کہہ کر رہ گئے۔ البتہ مرچی دروازے کے منشی فرزند علی نے ہماری ترجمانی کی ذمہ داری اٹھائی اور سالک صاحب کے تشریف لانے سے پہلے ہی ہم نے چاٹ اور قلفی والے کو پیشگی رقم ادا کر دی۔ سالک صاحب حسبِ معمول تشریف لائے۔ چاٹ اور قلفی کا آرڈر دیا اور جب رقم نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا تو منشی فرزند علی نے (جن کے گنج پر پسینے کے قطرے بجلی کی روشنی میں چمکنے لگے تھے) اپنی تلخ ڈیوٹی ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں ادا کر دی اور سالک صاحب جیسے ایک دم سناٹے میں آ گئے ہم تینوں کو باری باری گھورا اور بولے "تم لوگوں نے پچھلے تین مہینوں کی چاٹ کا نمک اور قلفی کی مٹھاس غائب کر دی ہے۔ ارے سرمایہ دارو! میں تم سے زیادہ کماتا ہوں اس لئے مجھے ہی خرچ کر لینے دیا کرو۔ تم اپنی تنخواہیں چاٹ پر اڑا دو گے تو تمہاری بیویاں اور بچے کیا تمہیں چاٹیں گے؟ بڑی بیہودگی کی تم لوگوں نے ———" اور چند مہینے بعد تک سالک صاحب بلاناغہ ہمیں چاٹ کھلاتے رہے حتیٰ کہ مجھے بیمار ہو کر گاؤں بھاگ جانا پڑا۔

آخر وہ کیا بات تھی کہ ایک بلند پایہ ادیب اور اولوالعزم صحافی جس کے پاس چند لمحے بیٹھنے کے لئے امراء و وزراء تک ترستے رہتے تھے، پچھتر روپے ماہانہ پانے والے ایک غریب اور نومشق شاعر اور دو کاتبوں کے پاس روزانہ دو گھنٹے گزار جاتا تھا۔ میں نے یہیں لاہور میں وہ شعراء اور ایڈیٹر بھی دیکھے تھے جو نومشق شاعروں اور کاتبوں کی سی اقتصادی حیثیت والے لوگوں سے کترا کر نکل جاتے تھے تاکہ ان کا کوئی شناسا انہیں

"غربا" سے مصافحہ کرتے دیکھ کر ان کی بلند سماجی حیثیت پر شبہ نہ کرنے لگے۔ اور یہاں "انقلاب" کا مدیر اور ملک کا مسلّم الثبوت شاعر اور ادیب کہہ رہا تھا "دیکھو بھئی! کل اتوار ہے۔ کل تم تینوں میرے ہاں کھانا کھاؤ گے۔ تمہر پر تحقیق و تفحص کا موڈ سوار نہ ہوا تو اسے بھی بلالیں گے اور خوب باتیں ہوں گی۔ اور شعر اور لطیفے ہوں گے اور غالب کا فارسی دیوان پڑھا جائے گا۔ غالب کی فارسی غزلوں کی عظمت کو اب تک بہت کم لوگوں نے پہچانا ہے۔ وہ ——"

اور پھر میرزا بیدل کی شاعری، غالب پر بیدل کے اثرات، غالب کی اردو شاعری میں فکر کی گہرائی کے دور دور تک پھیلے ہوئے ڈانڈے، غالب سے جدید اردو شاعری کی اثرپذیری، اور یوں بیدل اور غالب کی فارسی شاعری سے بیسویں صدی کی معیاری اردو شاعری کا بالواسطہ رشتہ ——— "اور ستم یہ ہے کہ ہمارے شاعر غالب کی فارسی شاعری کو پڑھتے ہی نہیں ———" غرض یہ سب گرہیں کھلنے لگتیں۔ مگر یہاں مجھے سالک صاحب کے بے پناہ تبحرِ علمی کی نمائش مقصود نہیں۔ کہنا صرف یہ ہے کہ ایک بہت بڑی شخصیت جب اپنی عظمت کے باوجود ذرا سا نشیب میں آ کر "بچوں" کو بھی اپنی عظمت میں شریک کر لیتی ہے تو زندگی پر کتنا پیار آتا ہے۔ سالک مجسم عظمت ہے اور مجسم پیار، اور اس کے ہزاروں شناساؤں میں سے اگر کسی کو اس سے شکایت ہے تو میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ اس نے سالک کو سمجھا ہی نہیں۔ اور پھر بعض لوگوں کا "ذائقہ" ہی خراب ہوتا ہے اور ان کا ذہن شہد میں بھی کونین کا مزا ڈھونڈ نکالتا ہے۔

پچھلے دنوں لاہور کے ناشرین کا ایک وفد سالک صاحب کے پاس گیا کہ ان کی ایک تحریک میں وہ ان کی اخلاقی امداد کریں۔ سالک صاحب کو اس تحریک سے اختلاف تھا اس لئے کوئی لگی لپٹی اٹھا رکھے بغیر صاف صاف کہہ دیا کہ "میرے خیال میں آپ لوگ غلطی پر ہیں اس لئے آپ کی حمایت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ آپ کی مخالفت ضرور کروں گا اور یہ مخالفت اصولی ہوگی۔" جب سے میں نے بعض ناشرین کو سالک صاحب سے ایسی باتیں منسوب کرتے سنا ہے جو سالک صاحب کا جانی دشمن بھی ان سے منسوب نہیں کر سکتا بشرطیکہ وہ سالک صاحب کو جانتا ہو، میں نے ان دوستوں میں سے ایک دو سے کہا کہ تمہیں سارے لاہور میں صرف سالک ہی اپنا مخالف نظر آیا۔ اس لئے کہ اس نے ریاکاری کے بجائے صداقت سے کام لیا اور اس کی اخلاقی جرأت نے (اور اخلاقی جرأت کی امید صرف بلند اخلاق انسان ہی سے کی جا سکتی ہے) تمہیں دھوکے میں نہیں رکھا ورنہ یہیں لاہور میں تمہیں ایسے "ہمدرد" بھی ملے تھے جنہوں نے تمہارے ناسور میں چھرا گھمانے کے بجائے تمہاری کشتی میں چپکے سے چھید کر ڈالے اور پھر خود تمہارے اندر بھی ایسی شخصیتیں موجود تھیں جنہوں نے تمہارے پاس جماعتی مفاد کا رونا رویا اور تنہائی میں جا کر اپنے ذاتی مفاد کی قربان گاہ پر اپنے ضمیر کی بھینٹ دے دی۔ سو یہ سب "ذائقے" کی باتیں ہیں! (یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ میں اپنی ذاتی حیثیت میں ان ناشرین کے مطالبات کا ہمنوا تھا اور آج تک ہوں)

سو یہ ہیں مولانا عبدالمجید سالک جو آج پاکستان کے علمی و ادبی حلقوں میں وسیع النظری اور متوازن اجتہاد کا ایک نشان ہیں اور جن کی شخصیت کے قریبی مطالعہ کے بعد غالب کا یہ شعر زبان پر رواں ہو جاتا ہے ؎

راہ زیب دیدہ وراں پرس کہ در گرم روی   جادہ چوں نبضِ تپاں در تنِ صحرا بینند

باقی رہے وہ سالک جو گھر میں دھوتی باندھے پھرتے رہتے ہیں، جنہوں نے کرسی اور میز کے بجائے ہمیشہ پلنگ پر گاؤ تکیہ کا سہارا لے کر بلکہ لیٹ کر لکھا ہے، جن کے تیس تیس صفحات کے "فی البدیہہ" لکھے ہوئے علمی مقالات میں بھی آپ کو کوئی لفظ کٹا ہوا نظر نہیں آئے گا، جن کی شیروانی کی ایک جیب میں رومال اور دوسری میں رومال ہوتا ہے، جن کی سینے کی بائیں جیب میں گھڑی اور دائیں میں کاغذ کا وہ طویل ٹکڑا ہوتا ہے جس پر ضرورت مندوں کے ناموں اور کاموں کی فہرست درج ہوتی ہے، جو مطالعہ کرتے وقت عینک کو آنکھوں پر سے اٹھا کر ماتھے پر رکھ لیتے ہیں، جو اچھا پہننے، اچھا کھانے اور اچھے رہن سہن کے سلسلے میں بلا کے وضعدار ہیں اور جو اپنے تمام بیٹوں بیٹیوں کی شادیوں کے بعد اطمینان سے ایک گوشے میں بیٹھے ماضی اور حال کے بعد اب مستقبل پر بھی مسکرا رہے ہیں۔ تو ان سالک صاحب کے بارے میں مسٹر عبدالسلام خورشید سے پوچھئے۔ میں نے ان کی شخصیت سے جو اثرات قبول کئے ہیں، وہ مجملاً آپ کے سامنے رکھ دئے ہیں۔ یہ درست ہے کہ میں ان کا عقیدت مند ہوں لیکن میری عقیدت اندھی نہیں، نہایت باشعور ہے۔ میں نے تو خدا کو بھی حسبِ مقدور مجھ لینے کے بعد مانا ہے۔

———

چراغ حسن حسرت

ظہیر بابر

۱۹۴۸ء کا آخری مہینہ تھا جب میں نے صحافت کے کوچے میں قدم رکھا۔ ساعت بُری تھی یا بھلی اس کا فیصلہ میں آج تک نہ کر سکا۔ مگر یہ فخر اس فیصلے سے بالا ہے کہ اس کوچے میں مولانا چراغ حسن حسرت سے نہ صرف متعارف ہونے کا موقعہ ملا بلکہ ان کی نگرانی میں کام کرنے کا بھی شرف حاصل ہوا۔ اس سے پہلے میں نے حسرت صاحب کو کبھی دیکھا تک نہ تھا۔ "مردم دیدہ" "پنجاب کا جغرافیہ" "کیلے کا چھلکا" اور خصوصاً مرحوم ہفت روزہ "شیرازہ" کے ذریعے تعارف ضرور تھا مگر تصور بالکل مختلف تھا اس لئے ان کے کمرے میں قدم رکھنے کے بعد میں تھوڑی دیر کے لئے حیرت زدہ رہ گیا۔ چھ سوا چھ فٹ کا بھاری بھرکم شخص، خاصی نمایاں مونچھیں اور مونچھوں کے بال سر کے بالوں سے کہیں گھنے، بڑی بڑی سرخ آنکھیں، ایک ہاتھ میں قلم اور دوسرے میں سگریٹ تھامے لکھنے میں مصروف تھا۔ دفتری میز پر ہر طرف اخبارات اور کتابیں بکھری ہوئی تھیں اور چہرے پر رسمی مسکراہٹ کے بھی دور دور تک آثار نہ تھے۔ تعارف کرایا تو جواب میں صرف "اچھا"، سنا وہ بھی ایسی گونجدار اور بارعب آواز میں کہ حرف و حکایت کے لکھنے والے سندباد جہازی اور "امروز" کے چراغ حسن حسرت پر دو قطعی الگ شخصیتوں کا گمان ہونے لگا۔ اس وقت سنجیدگی سے اخبار نویسی کا پیشہ اپنانے کا ارادہ بھی نہیں تھا۔ اس لئے جی چاہا کہ چپکے سے سلام کروں یا سلام کئے بغیر ہی چلتا بنوں۔ ایسی جگہ ہماری گذر ممکن نہیں۔ جہاں ایسے ایڈیٹر کا راج ہو۔ مگر نہ جانے کیوں ان کے ارشاد کی تعمیل پر مجبور ہوا اور "اسسٹنٹ ایڈیٹرز" کی میز پر جا بیٹھا۔ دوسرے ہی روز ملازمت تو مل گئی۔ مگر اس کا احساس بہت بعد میں ہوا کہ حسرت صاحب کے متعلق میرا پہلا تاثر کتنا بے جا اور خام تھا۔ انھیں ایک مرتبہ سمجھ لینے کے بعد کوئی شخص بھی ان سے نفرت نہیں کر سکتا۔

ان کی شخصیت اتنی خوبیوں کا مرقع ہے کہ ان کے پیشِ نظر ہر شخص ان کے وقتی اور لمحاتی "موڈ" خندہ پیشانی سے برداشت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ بالفرض ان کے "موڈ" سے کسی کے جذبات مجروح ہوں تو خود حسرت صاحب اس کی تلافی کرنے میں تاخیر نہیں کرتے۔ یہ غالباً ۱۹۴۹ء کی بات ہے جب سر عبدالقادر کے انتقال پر دن بھر کی محنت کے بعد میں نے معلومات حاصل کیں۔ اور رات گئے تک ان کے متعلق فیچر لکھتا رہا جو سر عبدالقادر مرحوم کے انتقال کی خبر کے ساتھ ہی اخبار میں شائع ہوا۔ مگر صبح حسرت صاحب اس پر برہم تھے کہ کاپی جوڑتے وقت آخری چند سطور کالم پورا کرنے کے لئے قدرے کھلی کیوں جوڑی گئیں۔ میں یقیناً اس قسم کی داد کی توقع نہیں رکھتا تھا۔ مگر دوسرے ہی لمحے غالباً حسرت صاحب کو بھی اس کا احساس ہو گیا اور فوراً طلبی ہوئی۔ چائے پلائی۔ فیچر کی تعریف کی اور اپنی صحافتی زندگی کے بعض ایسے واقعات سنائے جو کسی بھی نئے صحافی کو محنت کرنے کی ترغیب دے

سکتے ہیں ۔ اسی قسم کا سلوک میرے پہلے فیچر سے ہوا ۔ دو دن کی محنت کے بعد وہ فیچر مکمل ہوا تھا اور تین یا چار مرتبہ حسرت صاحب کا مخصوص جملہ "صاحب بات نہیں بنی" سُنا ۔ مگر جب وہ شائع ہو گیا ۔ تو اس وقت بھی حسرت صاحب کو اس میں کوئی خصوصیت نظر نہ آئی ۔ وجہ یہ تھی کہ اس ادارے کے ایک "بڑے صاحب" نے اس کی بے حد تعریف کی اور حسرت صاحب کو غالباً یہ خدشہ تھا کہ کہیں یہ تعریف ایک نوعمر صحافی سے سیکھنے کی صلاحیت اور خواہش نہ چھین لے ۔ البتہ تھوڑی دیر بعد خود حسرت صاحب نے کچھ اس انداز میں اس کا ذکر کیا کہ اس میں اصلاح کی گنجائش تو تھی مگر بُرا نہیں تھا ۔ میرے اطمینان کیلئے یہی کافی تھا ۔ یہ سلوک ادارے کے ہر رُکن سے ہوا ۔ اور اسی نے سب کی صلاحیتیں نکھارنے میں مدد دی ۔ "محنت" ادارے کے ہر رُکن کے لئے یکساں لازمی تھی اور خود حسرت صاحب اس معاملے میں پیش پیش تھے ۔ شاید ہی کسی ایڈیٹر نے اتنی محنت کی ہو ۔ جتنی حسرت صاحب نے "امروز" کے ابتدائی تین برس میں کی ۔ ان کی مثال ادارے کے ہر رُکن کے سامنے تھی اس لئے کسی کے لئے بھی محنت سے جی چرانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا ۔ جو اصحاب اس کے لئے تیار نہ تھے ، انھیں بہت جلد "امروز" کو خیر باد کہنا پڑا ۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس زمانے میں حسرت صاحب نے اپنے ارد گرد نوعمر مگر اُردو کے بہت اچھے صحافیوں کی ایک ٹیم جمع کر لی تھی ۔

حسرت صاحب خود بلا کسی کاوش کے اس درجے تک نہیں پہنچے ۔ اسی لئے آج یہ دعوےٰ کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی کہ ملک میں ان کے پایہ کا ایک بھی صحافی موجود نہیں ۔ اگر وہ بعض اوقات یہ کہہ دیتے تھے کہ "میں تنہا اخبار مرتّب کر سکتا ہوں" تو یہ کوئی تعلّی نہیں تھی بلکہ وہ حقیقت میں اس پر قادر تھے ۔ وہ صحافت کے ہر شعبے کا تجربہ رکھتے ہیں اور ہر پہلو سے اس کے ماہر ہیں ۔ انھوں نے کم و بیش درجن بھر روزناموں میں کام کیا اور مترجم سے لے کر مدیر تک کے فرائض سرانجام دیئے ہیں ۔ وہ خداداد صلاحیتوں کے مالک ہیں مگر بعض اوقات یہ احساس ہوتا ہے کہ اگر ان کے والد بزرگوار اسلام قبول نہ کرتے تو شاید اُردو صحافت اور ادب کو یہ عظیم شخصیت میسّر نہ آتی ۔ اس صورت میں دادا کی دولت میں وہ برابر کے شریک ہوتے اور ممکن ہے یہ دولت انھیں ادب اور صحافت کی طرف متوجہ ہونے کا موقعہ ہی نہ دیتی ۔ مگر ان کے والد بزرگوار کے مشرّف بہ اسلام ہونے کے بعد وہ آبائی جائیداد میں حصّہ دار نہ رہے ۔ کشمیر کے ڈوگرہ حکمران کا قانون یہی تھا ۔

حسرت صاحب تقریباً اکاون برس پہلے بارہ مولا کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے ۔ اُردو اور فارسی کی تعلیم اپنے والد بزرگوار کی وساطت سے حاصل کی ۔ جنھوں نے اپنے صاحبزادے کے رجحان کا غالباً اندازہ کر کے ادبِ عالیہ سے روشناس کرا دیا ۔ باقاعدہ تعلیم بی ۔ اے تک حاصل کی ۔ مگر حالات نے انھیں سند کا انتظار کرنے کی مہلت نہیں دی انھوں نے کچھ عرصہ کشمیر ہی میں اور اس کے بعد شملہ میں درس و تدریس کا سلسلہ قائم رکھا ۔ ۱۹۲۵ء میں کلکتہ جا پہنچے ۔ یہیں سے ان کی صحافتی زندگی کا آغاز ہوا ۔ "عصرِ جدید" کے ادارے میں سب ایڈیٹر کی حیثیت سے شامل ہوئے اور ایک ماہ ختم ہونے سے پہلے اس کے مدیر ہو گئے ۔ کچھ عرصہ بعد "آفتاب" کے نام سے اپنا ایک ادبی جریدہ جاری کیا مگر وہ مالی گورکھ دھندوں میں اُلجھ گیا ۔ اور حسرت صاحب کو روزانہ صحافت کی طرف لوٹنا پڑا ۔ اب کی مرتبہ "نئی دُنیا" کے دو کالم انھیں سونپے گئے ۔ "کوچہ گرد" کے نام سے "کلکتے کی باتیں" لکھنا شروع کیں ۔ جنھوں نے حسرت کی شہرت کو کلکتہ سے لاہور تک پہنچا دیا ۔ مولانا محمد علی مرحوم اور مولانا ظفر علی خاں بھی اس کالم کے مدّاحوں میں سے تھے ۔ اسی زمانے میں مولانا ابو الکلام آزاد نے "پیغام" جاری کیا اور حسرت صاحب اس کے ادارے میں شامل ہو گئے ۔ اگرچہ یہ تعلق زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا ۔ مگر حسرت صاحب جس عقیدت سے مولانا آزاد کا ذکر کرتے ہیں ، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس مختصر سے دَور میں حسرت صاحب کو مولانا آزاد کی شخصیت اور علمیت نے بے حد متأثر کیا ۔ چنانچہ جب کبھی حسرت صاحب کو کسی کی خود پسندی کا ذکر کرنا ہو تو وہ ہمیشہ بڑے طنز سے یہ کہتے ہیں کہ "مولانا وہ تو اپنے آپ کو ابو الکلام آزاد سے بھی بڑا صحافی سمجھتا ہے" ، حسرت صاحب کے دَور میں اس طنز کا نشانہ ادارے کے تقریباً ہر رُکن کو بننا پڑا ۔ ویسے سنجیدہ محفل میں بھی حسرت صاحب ہمیشہ اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ "پیغام" سے انھوں نے بہت کچھ حاصل کیا ہے ۔ مولانا آزاد کے علاوہ حسرت صاحب نصیر حسین خیال اور آغا حشر کاشمیری سے بھی خاصے متأثر ہیں ۔ اقبال کے زبردست مدّاح ہیں اور ٹالسٹائی کے ناول "جنگ اور امن" کو اپنی پسند کے

چند عظیم ناولوں میں شمار کرتے ہیں۔

حسرت صاحب جب لاہور میں وارد ہوئے تو ان کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں تھا۔ یہاں کے صحافتی حلقوں میں انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ سب سے پہلے "زمیندار" کے ادارے میں شامل ہوئے۔ کچھ عرصے کے بعد "انصاف" کے نام سے ایک روزنامہ جاری کیا مگر اسے بھی "آفتاب" کے انجام سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کے بعد "پھول" اور "تہذیب نسواں" کے ادارے میں پہنچے۔ اور کئی برس تک اس سے منسلک رہے۔ تحریک کشمیر کے دنوں میں جب "احرار" کے نام سے ایک اخبار جاری ہوا تو حسرت صاحب اس کے مدیر مقرر ہوئے۔ مگر یہ اخبار زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکا اور حسرت صاحب پھر "زمیندار" کے عملے میں شامل ہو گئے۔ "احسان" کے اجرا پر اس کے عملے میں شامل ہوئے۔ اور دوسری عالمگیر جنگ سے پہلے اس سے الگ ہو کر "احسان" کے دوسرے عملے کے ساتھ مل کر "شہباز" جاری کیا۔ چند روز ڈاکٹر ستیہ پال کے روزنامہ "نیشنل کانگرس" سے بھی منسلک رہے۔ ۱۹۳۹ء میں برٹش براڈکاسٹنگ کارپوریشن کی طرف سے ایک عہدہ پیش کیا گیا مگر حکومت انھیں پاسپورٹ دینے پر آمادہ نہ ہوئی۔ البتہ اسے مولانا حسرت کے آل انڈیا ریڈیو کے عملے میں شامل ہونے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ چنانچہ حسرت صاحب ریڈیو سے ہوتے ہوئے ہفت روزہ "پنچایت" میں پہنچے، اس کے بعد فوج میں ملازم ہو گئے۔ کچھ عرصہ "فوجی اخبار" مرتب کرنے کے بعد ملایا بھیج دیئے گئے۔ جہاں فوجیوں کے دو روزناموں کے ایڈیٹر بنا دیئے گئے۔ اور جب فوجی ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو ان کی وردی پر میجر کا "کراؤن" تھا۔

تقسیم کے بعد جب "امروز" جاری ہوا۔ تو اس کی ادارت حسرت صاحب کو سونپی گئی۔ اس اخبار سے اردو صحافت پر دُور رس اثرات مرتب ہوئے اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ حسرت صاحب نے اس کے ذریعے اردو صحافت میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ ۱۹۵۱ء میں حسرت صاحب اس پرچے سے الگ ہوئے اور ریڈیو پاکستان کے نیشنل پروگرام کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ مگر ریڈیو کا ماحول ان کے مزاج کے مطابق نہ تھا۔ اس لیے اس سے دستکش ہو گئے۔ صحت کی خرابی کی وجہ سے "ڈیلی جرنلزم" سے ان کا گہرا تعلق تو اس وقت قائم نہیں ہے۔ مگر انھوں نے اردو صحافت کو اس دور میں بھی اپنے کالم "حرف و حکایت" سے محروم نہیں رکھا۔

یہ تو بہت سے اصحاب کے متعلق سنا ہے کہ وہ بذات خود ایک انجمن ہیں اور ان کی معلومات کی حد متعین کرنا ممکن نہیں۔ مگر میں اس قسم کی رائے (تردید کے خوف سے بے نیاز ہو کر) صرف دو شخصیتوں کے متعلق ظاہر کر سکتا ہوں۔ اور اتفاق سے دونوں صحافی ہیں۔ ایک حسرت صاحب اور دوسرے سالک صاحب۔ دونوں حضرات کو چلتا پھرتا "انسائیکلوپیڈیا" کہنا بے جا نہیں۔ سالک صاحب کے ساتھ کام کرنے کا تو مجھے کبھی شرف حاصل نہیں ہوا صرف چند ملاقاتوں ہی سے یہ اندازہ کیا مگر حسرت صاحب کے تبحر اور معلومات کی صحت کا تجربہ کرنے کا مجھے کئی مرتبہ موقع ملا۔ سچ تو یہ ہے کہ حسرت صاحب کی علمیت کے سامنے صرف میں نہیں بلکہ میرے کئی ساتھی احساس کمتری کا شکار ہونے لگے۔ مگر ہم میں سے بیشتر اسے قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ کچھ چڑچڑا اٹھتے مگر چند ایسے بھی تھے جنھوں نے ان کی علمیت سے استفادہ کرنے کی سوچی اور وہی فائدے میں رہے۔ ایک سچے صحافی کی طرح حسرت صاحب کی معلومات کا دائرہ وسیع ہے۔ انھیں ہر شعبۂ حیات سے دلچسپی ہے۔ اور اس کے متعلق وہ زیادہ سے زیادہ معلومات جمع کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ اردو ادب کو انھوں نے پڑھا، سمجھا اور اس پر عبور حاصل کیا۔ مغربی ادب سے بھی بے تعلق نہیں۔ مصوری کے رموز بھی جانتے ہیں۔ موسیقی کے اسرار سے بھی واقف ہیں۔ مذاہب عالم اور خصوصاً اسلام پر ان کی نظر بڑی وسیع ہے۔ تاریخ کا گہرا مطالعہ رکھتے ہیں اور سیاست کے اونچ نیچ سے بھی بیگانہ نہیں۔ جس موضوع پر بھی بات چھڑے وہ اس پر بے تکان بولتے چلے جائیں گے اور کسی مسئلے پر بھی ان کی گفتگو میں کہیں جھول نہیں پڑے گا۔ یہ ان کی شخصیت کا ایک ایسا پہلو ہے جس سے بہت کم لوگ آگاہ ہیں۔ وہ انھیں صرف طنز و مزاح میں ہی استاد مانتے ہیں۔ جس میں کسی کو بھی کلام نہیں۔ مگر ان کا میدان صرف طنز و مزاح ہی نہیں۔ وہ اگر چاہیں یا انھیں متوجہ کیا جا سکے تو بعض دوسرے امور میں بھی کئی نام نہاد "ماہرین" کو اپنے دعوے پر نظر ثانی کرنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ برنارڈ شا صحافت سے اس لئے متنفر تھا کہ وہ ذہانت کو قحبہ بنا دیتی ہے۔ اس رائے سے اختلاف بھی

ممکن نہیں۔ اس نے بڑے بڑے ذہین افراد کو "کھا" لیا ہے۔ یقیناً ایسے اصحاب نے صحافت میں بھی بڑا نام پیدا کر لیا مگر وہ اس میدان سے بہت دور چلے گئے جہاں وہ واقعی اپنی ذہانت اور صلاحیتوں کے جوہر دکھا سکتے تھے۔ صحافت بلاشبہ ایک بہت بڑا فن ہے مگر ہمارے ملک میں ابھی اس فن کی صحیح قدر اور حیثیت متعین نہیں ہو سکی۔ خصوصاً اردو صحافت میں تو ایک صحافی سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ ہر موضوع پر قلم اٹھا سکے اور ہر مسئلے کے متعلق نہ صرف مکمل معلومات رکھتا ہو بلکہ اس کے متعلق رائے بھی ظاہر کر سکے۔ کسی ایک شعبے میں مہارت کافی نہیں۔ یہ "ذمہ داری" بیشتر ذہین صحافیوں کی راہ میں حائل ہو گئی اور وہ صرف صحافت کے ہو کر رہ گئے۔ حسرت بھی ان ہی میں سے ایک ہیں۔ وہ ایک مکمل صحافی ہیں مگر صحافت کے علاوہ ادب، تاریخ اور مذہب کے متعلق بھی ملک کو بہت کچھ دے سکتے ہیں۔ لیکن صحافت نے انھیں اس کا موقع نہیں دیا۔ اور اب شاید صحت انھیں اس کی اجازت نہ دے۔

حسرت صاحب کے نظریات کے متعلق میں نے مختلف حلقوں میں مختلف رائے سنی، اس کی وجہ یہ ہے کہ حسرت صاحب صحیح معنوں میں آزاد خیال یا "لبرل" ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں آزاد خیال کا مفہوم ہی مختلف لیا جاتا ہے۔ اور لبرل طبقہ انتہائی محدود ہے۔ رجعت پسند اور ترقی پسند ایسے لوگوں کو پوری طرح اپنا ہم خیال نہیں پاتے اس لئے انھیں سرے سے نظریات سے ہی عاری سمجھنے لگتے ہیں۔ حسرت صاحب کو شہری آزادیاں بے حد عزیز ہیں۔ وہ کسی بھی شخص کو ان سے محروم نہیں دیکھنا چاہتے۔ اسلام ان کا ایمان ہے مگر اسلام میں وہ "پاپائیت" کے قائل نہیں۔ اور جب کوئی شخص زمینداریوں وغیرہ کو اسلام کی رو سے جائز ثابت کرنے کی کوشش کرے تو ان کے تن بدن میں آگ سی لگ جاتی ہے۔ معاشرے میں غیر ضروری پابندیوں اور بے معنی رسوم کے وہ پر زور مخالف ہیں مگر قابل قدر مشرقی روایات کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ وضعداری اور دوست نوازی ان کے مزاج میں رچی بسی ہے۔ ۱۹۵۹ء میں جب حکومت نے ادارہ "امروز" کے دو ارکان سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بند کر دیئے۔ تو باہر کی دنیا میں ان کا سب سے زیادہ خیال حسرت صاحب نے ہی رکھا۔ اتفاق سے اسی دوران میں عید پڑ گئی۔ اس روز حسرت صاحب کے ہاں سے نہ صرف کھانا آیا بلکہ ہفتہ بھر کے سگرٹوں کا کوٹہ بھی ساتھ کر دیا گیا۔ عام حالات میں شاید یہ معمولی سی بات معلوم ہو مگر اس زمانے میں دہشت کا یہ عالم تھا کہ بعض عزیز دوست تک برائے نام تعلق ظاہر کرنے پر بھی آمادہ نہ تھے اور بعضوں نے تو سرے سے لاہور کا رخ ہی نہیں کیا۔ حسرت صاحب ان چند بزرگوں اور دوستوں میں سے تھے۔ جنھیں سیاسی دہشت مرعوب نہ کر سکی۔

تاثیر مرحوم حسرت صاحب کے عزیز دوستوں میں سے تھے۔ مگر بعض امور پر اختلاف ہو گیا اور روزنامہ "مغربی پاکستان" اور "امروز" کے صفحات پر شعروں کی "جنگ" چھڑ گئی۔ سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی ہونے لگی۔ ایک دوسرے کے نظریات پر چوٹیں ہوئیں۔ ادب دوست حلقے اس "جنگ" سے خوب لطف اندوز ہوئے۔ اسی زمانے میں یہ احساس ہوا کہ شعر کے معاملے میں بھی حسرت صاحب کی طبیعت میں کتنی روانی ہے۔ اور وہ کس سلیقے سے اپنی بات کہنے پر قادر ہیں۔ انھوں نے دوسری اخباری ذمہ داریوں کے باوجود دن میں دو دو نظمیں کہیں۔ اس "جنگ" میں حسرت صاحب کا پلہ بھاری رہا۔ مگر کچھ عرصہ بعد تاثیر صاحب کا اچانک انتقال ہو گیا۔ اور یہ تفریحی "لڑائی" بھی حسرت صاحب کے لئے رنج کا باعث بن گئی۔ دوست کی دائمی جدائی کے علاوہ انھیں یہ دکھ بھی تھا کہ انھوں نے اپنے ایک عزیز دوست سے یہ لڑائی کیوں مول لی۔ اور اگر یہ گلے پڑ بھی گئی تھی تو اس کے بعد وہ تاثیر مرحوم سے ملے کیوں نہیں۔ تاثیر کے جنازے پر ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ "امروز" میں تاثیر مرحوم کے انتقال پر سب سے زیادہ سوگ منایا گیا۔ حسرت صاحب نے جی کھول کر انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔

یہ دوسرا موقعہ تھا کہ میں نے حسرت صاحب کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ اس سے پہلے مجھے ان کی نرم دلی کا اندازہ اس وقت ہوا تھا جب ان کے بڑے صاحبزادے کی گمشدگی کی اطلاع ملی تھی۔ ان دنوں کراچی سے "امروز" جاری ہوا تھا۔ حسرت صاحب بھی کراچی ہی میں مقیم تھے۔ لاہور سے یہ اطلاع ملی کہ دو تین دن سے ان کا صاحبزادہ گم ہے اور اب تک تلاش کی تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئی ہیں۔ حسرت صاحب کو جب اس کی اطلاع ملی تو وہ لکھنا پڑھنا سب بھول گئے۔ ہم میں سے کسی کو بھی توقع نہیں تھی کہ حسرت صاحب اپنے بچوں سے اتنا پیار کرتے ہیں یا وہ اس حد تک نرم دل ہیں۔ ان کی پریشانی

دیکھ کر کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ "حرف و حکایت" کے کالم کے بارے میں پوچھے مگر وہ خود کہنے لگے کہ "اب تو شاید حرف و حکایت کا کالم کبھی نہ لکھا جا سکے۔" خدا کا شکر ہے کہ چند روز بعد ان کا صاحبزادہ مل گیا اور اخبار میں طبقے کو "حرف و حکایت" کے کالم کا زیادہ دنوں انتظار نہ کرنا پڑا۔

حسرت صاحب کی بعض کمزوریاں بڑی دلچسپ ہیں۔ جس روز حسرت صاحب کا موڈ خراب ہوتا۔ یا وہ کسی بات پر برہم ہوتے تو ادارتی عملے کی میٹنگ میں انھیں بطور حربہ استعمال کرتے۔ مثلاً میٹنگ کے باقاعدہ آغاز سے قبل کوئی ملایا کا ذکر لے بیٹھا کیونکہ حسرت صاحب ملایا کے بڑے مداح ہیں۔ بات نہ چلی تو دوسرے نے کشمیر کی گل پوش وادیوں کی بات چھیڑ دی۔ اگر ناکامی ہوئی تو کسی نے کلکتہ یا مولانا آزاد کا نام لے دیا۔ حسرت صاحب نے توجہ نہ دی۔ تو اس روز سے حرف و حکایت کے کسی دلچسپ حصے کے متعلق کسی محفل کی رائے پیش کر دی۔ اگر یہ تمام حربے بے سود ثابت ہوئے تو ہر ایک ہوشیار ہو گیا کہ آج کچھ سننا ہی پڑے گا۔ بعض اوقات کوئی خاص بات ہی نہ ہوتی۔ لیکن عموماً حسرت صاحب کسی بہت بڑی کوتاہی پر ہی ٹوکتے۔ بات ہو یا نہ ہو، ہر فرد اسے سننے پر مجبور تھا۔ محض اس لئے نہیں کہ حسرت صاحب ایڈیٹر تھے بلکہ اس لئے کہ وہ بزرگ، مددگار اور صحیح معنوں میں انسان ہیں۔ ان کی برہمی ہمیشہ عارضی ہوتی۔ تھوڑی دیر بعد محفل اپنے اصل رنگ پر آ جاتی۔ چائے کی پیالیاں بج رہی ہیں۔ سگریٹ پر سگریٹ پھونکے جا رہے ہیں۔ چٹکلے اور لطیفے ہو رہے ہیں۔ حسرت صاحب اپنے دلچسپ تجربات دہرا رہے ہیں اور ادارتی میٹنگ "حرف و حکایت" کے کالم کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ نہ کسی کی گستاخی سے حسرت صاحب کا دل میلا ہوا نہ حسرت صاحب کی سرزنش کسی کو یاد رہی۔

پچھلے دنوں حسرت صاحب اچانک بیمار پڑ گئے۔ ان کے دوستوں، مداحوں اور عقیدت مندوں کی پریشانی کی وجہ تو سمجھ میں آتی تھی مگر حیرت تو اس بات پر ہے کہ ان سے ملنے جلنے والوں میں بھی جو اس سے قبل صحافتی اور ادبی حلقوں میں ان کی علالت پر تشویش ظاہر کی جا رہی تھی۔ اس کی وجہ محض ان کی بذلہ سنجی اور علمیت نہیں بلکہ اس میں خود ان کی شخصیت کا سب سے زیادہ ہاتھ ہے۔ ان کے نظریات سے بہتیروں کو اختلاف ہو گا مگر ان کی ذات سے وہی نفرت رکھ سکتا ہے جو انھیں سمجھنے کی صلاحیت ہی نہ رکھتا ہو۔ یا جس کے دل میں کسی کے لئے بھی جگہ موجود نہ ہو۔ خدا کا شکر ہے کہ ان کی صحت بحال ہو گئی۔ بہرحال مجھے نہ جانے کیوں اس وقت بھی جب ڈاکٹر بھی تشویش کا اظہار کر رہے تھے یہ یقین تھا کہ زندگی اتنی بڑی دولت سے آسانی کے ساتھ دستبردار نہیں ہو سکتی۔

غلام رسول مہر

خلیل الرحمٰن داؤدی

جانسن کو باسویل مل گیا اور گاندھی کو ڈیسائی، ذوق کو آزاد مل گئے اور غالب کو بجنوری۔ مہر صاحب کی شخصیت ان میں کسی سے کمتر نہیں لیکن نہ میں باسویل ہوں اور نہ ڈیسائی۔ نہ آزاد ہوں اور نہ بجنوری، کہ اپنے ممدوح کے حق میں اس درجہ زور دار انشاپردازی دکھاؤں جس سے ناظرین کو انسانوں اجسام اور اساطیر الاصنام کا گمان گزرے۔ آج مہر صاحب کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ اُس مہرِ مُنیر سے ایک عالم مستنیر ہے۔ اس کی ضو افگنی اور ضیا گستری نے تاریکیٔ صحافت کی دھجیاں فضائے دہر میں اُڑا ڈالی ہیں۔ مسلمانوں کے روشن مستقبل کے نقیب، والیٔ انقلاب، انقلاب انگیز، انقلاب آگیں، انقلاب آفریں روزنامہ "انقلاب" کے ایڈیٹر اپنے وقت کے مسلّم و مستند مورّخ اور بلند پایہ مصنف۔ اتنی عظیم المرتبت شخصیت کے محامد و محاسن کا استقصاء مجلّدات کی صورت ہی میں ممکن ہے ؎

سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

مشاہیر کی سیرت کے خاکے یوں تو چھوٹے چھوٹے مقالات کی صورت میں ہر ایک زبان میں ملتے ہیں لیکن اُردو میں یہ خاکے افراط و تفریط کے بُری طرح شکار ہیں۔ یہاں یاروں کی ایک مخصوص نہج ہے یا تو کسی کی ہجو لکھ کر اسے تحت الثریٰ میں اُتارنے کے لئے "غنچہ" سے قلمدان مانگتے ہیں یا کسی کی مدح گستری میں قصیدہ کہہ کر اس کو بامِ ثریا سے ہمدوش کر دیتے ہیں۔ آج کل ایک اسلوب اور بھی چل نکلا ہے۔ وہ یہ کہ کسی شخصیت کا عنوان قائم کر کے اس سے اپنے روابط و علائق دکھاتے ہیں، جگہ جگہ اس کے ساتھ نظر آتے ہیں اور اگر اس بچارے نے کسی موقع پہ رسمی انداز میں بھی ان کے بے شمار مراسلات کے جواب میں کچھ لکھ دیا تو نمائش کے لئے اس کی نقل کرتے ہیں۔ ان سب باتوں سے مضمون نگار کا مقصد اپنی شخصیت کو ابھارنا اور دوسرے کی آڑ لے کر خود کو مشتہر کرنا ہوتا ہے۔ میں ان سطور میں حتی الامکان ایسی باتوں سے اجتناب کروں گا۔ مجھے مہر صاحب کی نشستوں اور ان کے ساتھ اپنی ملاقاتوں کی رُوداد سنا کر یا موصوف کے خطوط کے اقتباسات شائع کر کے اپنا پروپیگنڈہ کرنا مقصود نہیں۔ میں تو انتہائی سادہ طور پر بالاجمال کچھ باتیں پیش کروں گا جن سے ان کی شخصیت کے چند اہم خدوخال سامنے آجائیں گے۔

مہر صاحب انتہائی فراخ حوصلہ، سیر چشم، فیاض طبیعت اور مخلص انسان ہیں۔ میں نے ان کی طبیعت میں انقباض اور گرفتگی کبھی نہیں دیکھی ان کی نگاہوں کی کشش اور یگانگت، چہرہ کی حیات آفریں مسکراہٹ، گفتگو کی بے پناہ حلاوت، ملاقات کی حد درجہ گھلاوٹ ان سے ملنے والوں کو ہمیشہ یاد رہتی ہے۔

جو شخص مہر صاحب سے ایک بار ملا ہے اسے دوبارہ ان سے ملنے کی ہوس رہتی ہے۔ عام علماء و فضلا کی طرح مہر صاحب اپنے علم و فضل کے سلسلہ میں بخیل نہیں۔ وہ بڑے خلوص، محبت، شفقت اور محنت سے تشنہ کامانِ علم و فضل کی تشفی کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ کوئی شخص ان کے یہاں کسی وقت چلا جائے وہ آرام کر رہے ہوں یا کسی ضروری کام میں مصروف ہوں لیکن وہ ہر آنے والے شخص کا استقبال نہایت خندہ پیشانی اور شگفتہ خاطری سے کرتے ہیں۔ ان کے چہرے سے اس کا مطلقاً احساس نہیں ہوتا کہ انہیں اس شخص کا ایسے بے وقت آنا بارِ خاطر ہوا ہے۔ وہ نہایت فیاضانہ اور مخلصانہ انداز میں ہر شخص کی مدد کرتے ہیں۔ اپنی بساط اور مقدرت کے مطابق کسی کی امداد کو ان کے لئے کوئی عذر مانع نہیں ہوتا۔ آج کل اس درجہ وضع و خوش خلق اور ایثار و قربانی سے پیش آنے والے شخص کی نظیر ملنا محال ہے۔ وہ اگر کسی شخص کے کام آسکتے ہیں تو اس کے لئے کسی قسم کی امکانی سعی و سفارش سے دریغ نہیں کریں گے۔ ان سے کام لینے کے لئے متعارف ہونا ضروری نہیں۔ کوئی شخص ان کے پاس چلا جائے ان کی دستگیری کا باب ہر ضرورت مند کے لئے ہر وقت کھلا ہے۔

مہر صاحب کے ذاتی خصائص کا احاطہ اس مختصر خاکہ میں دشوار ہے۔ مجھے انتہائی قلق ہے کہ میں اپنی وقتی علالت کی وجہ سے مہر صاحب کا اسکیچ خاطر خواہ طریق پر پیش نہیں کر سکا۔ لوگ دنوں، ہفتوں اور مہینوں میں مشاہیر کے سوانحی مقالات تیار کرتے ہیں اور مجھے اس سلسلہ میں چند گھنٹے بھی نصیب نہ ہوئے۔ بہر حال ایک مختصر وقت کی یہ مختصر تحریر ہے۔ انشاء اللہ اس کی تلافی پھر کسی وقت کر دی جائے گی۔ میں اس سلسلہ میں مخدومی مہر صاحب اور ناظرین کرام سے عذر خواہ ہوں۔

مہر صاحب کا نام سنتے ہی انقلاب کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ وہی انقلاب جس نے صحافت کے معیار کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ وہی انقلاب جو پابندیٔ وقت، تازہ خبروں، برمحل مضامین، مزاحیہ کالم، دلچسپ مباحث، احتیاطِ رائے اور عالمانہ شان کے لحاظ سے تمام معاصرین میں ممتاز و منفرد تھا۔ وہی انقلاب جس کا انداز دلچسپ، ترتیب مزے دار اور اداریہ کا بانکپن چسکا لگا دینے والا ہوتا تھا۔ اسی انقلاب کا ایڈیٹر مہر عالمتاب افقِ کائنات پر آج سے ۶۰ سال پیشتر یعنی ۱۸۹۶ء کو طلوع ہوا۔ سب سے پہلے جس قریہ میں اس کی شعاعیں نمودار ہوئیں وہ جالندھر سے چار میل کے فاصلہ پر پھول پور ہے۔

مہر صاحب نے ابتدائی تعلیم پھول پور پرائمری اسکول میں پائی۔ مشن ہائی اسکول جالندھر سے میٹرک پاس کیا اور ۱۹۱۵ء میں ڈگری اسلامیہ کالج لاہور سے لی۔ شعر گوئی کا ذوق زمانۂ طالب علمی میں ہی پیدا ہو گیا تھا۔ ابھی مہر صاحب نویں جماعت ہی میں تعلیم پا رہے تھے کہ مشغلۂ سخن طرازی اپنے شباب پر پہنچ چکا تھا۔ اس زمانہ میں نوجوان شعراء انجمن حمایت الاسلام کے جلسوں میں اپنے جوہر دکھایا کرتے تھے۔ علامہ اقبال نے بھی انجمن کے ہی جلسوں میں اپنی نظمیں پڑھ کر ملک میں دھوم مچا دی تھی۔ مہر صاحب بھی انجمن کے جلسوں میں اس شان سے اپنا کلام پڑھا کرتے کہ نہ صرف جواں سال شاعر بلکہ انتہائی کہنہ مشق استاد بھی عش عش کرنے لگتے۔ مہر صاحب کو زمانۂ طالب علمی میں ہی سیاست اور مذہب کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔ اس زمانہ میں مولانا ابوالکلام کا الہلال بڑی آب و تاب کے ساتھ کلکتہ سے نکل رہا تھا۔ وہ نوجوانوں کے دلوں کو برما اور خون کو گرما رہا تھا۔ چنانچہ مہر صاحب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اور ان کے عام تصوراتِ زندگی میں یک گونہ تغیر پیدا ہوا۔ مولانا ابوالکلام نے نوجوانوں کی دینی تربیت کے لئے ایک انجمن کا خاکہ تیار کیا تھا جس کا نام "حزب اللہ" تھا۔ مہر صاحب اپنی طالب علمی کے زمانہ میں ہی اس کے ممبر بن گئے اور مولانا کے رجسٹر میں مہر صاحب کا نام درج ہو گیا۔ الہلال نے مولانا سے عہد لیا کہ وہ ملک اور قوم کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کر دیں گے۔ مولانا نے تعلیم سے فارغ ہو کر اپنا اخبار نکالنے کا منصوبہ باندھا لیکن حالات کی نامساعدت کے باعث فوراً ایسا نہ کر سکے۔ اور حیدر آباد دکن چلے گئے۔ وہاں پہنچ کر پائگاہ وقار الامراء میں انسپکٹر تعلیمات ہو گئے۔ جنگِ عظیم کے خاتمہ پر ترکی کے ساتھ اتحادیوں کے سلوک کی کیفیت منظرِ عام پر آئی تو اسلام کا درد رکھنے والے دل بے قرار ہو گئے۔ ایسے میں مہر صاحب نے حیدر آباد کے دورانِ قیام میں ہی اپنے چند دوستوں کی معیت میں ایک روزنامہ نکالنے کا فیصلہ کیا۔ "سلطنت" اس کا نام تجویز ہوا۔ کئی مہینے اس کی اجازت حاصل کرنے میں گزر گئے۔ اس زمانہ میں مولانا ابوالکلام نظر بند ہو گئے اور ان کے تمام کاغذات پولیس کے قبضہ میں گئے۔ ان

کاغذات میں حزب اللہ کے ممبروں کا رجسٹر بھی تھا جس میں مہر صاحب کا نام موجود تھا۔ حکومت نے تمام ممبروں کے حالات کی باقاعدہ تحقیقات شروع کر دی۔ اس سلسلہ میں مہر صاحب سے متعلق تفتیش کے کاغذات پہلے ان کے وطن اور بعد میں حیدر آباد پہنچے۔ چونکہ حزب اللہ کے ممبر سیاسی لحاظ سے حکومت کے نزدیک ناقابلِ اعتماد تھے، دوسرے مہر صاحب حیدر آبادی نقطۂ نگاہ سے 'غیر ملکی' تھے۔ حیدر آباد میں غیر ملکی کو عموماً معتمد علیہ نہ سمجھا جاتا تھا اور نہ اس سے مساویانہ سلوک ہی روا رکھا جاتا تھا اس لئے ان حقائق کے پیشِ نظر مہر صاحب کو حیدر آباد میں اخبار نکالنے کی اجازت نہ مل سکی۔ اور وہ تقریباً چار سال حیدر آباد میں گزار کر اپنے وطن چلے آئے۔

اس زمانہ میں تحریکِ ترکِ موالات جاری تھی اور خلافت کمیٹیوں نے مسلمانوں میں سرگرمی سے کام شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ مہر صاحب بھی جالندھر خلافت کمیٹی کے سکرٹری ہو گئے۔ اخبار نکالنے کا ارادہ اس زمانہ میں اور بھی پختہ ہو گیا۔ بعض دوستوں نے یہ اصرار رائے دی کہ پہلے کسی اخبار کے دفتر میں کچھ مدت کام کر کے تجربہ حاصل کر لینا چاہیے۔ اسی زمانہ میں سالکؔ صاحب زمیندار کے ایڈیٹر کی حیثیت سے گرفتار ہو چکے تھے۔ مولانا ظفر علی خاں اور اختر علی خاں ان سے پہلے ہی گرفتار ہو گئے تھے۔ مہر صاحب کے دوست مولوی شفاعت اللہ صاحب زمیندار کے منیجر تھے۔ انہوں نے اور سید عبد القادر شاہ ایم اے نے اصرار کیا اور نومبر ۱۹۲۱ء میں مہر صاحب زمیندار میں چلے آئے۔ جہاں افتتاحیہ (اداریہ) لکھنے کی خدمت مہر صاحب سے متعلق ہوئی لیکن یہ تعلق چار چھ روز سے زیادہ نہ رہا کیوں کہ اسی پُر آشوب زمانہ میں جب کہ آئے دن گرفتاریاں ہو رہی تھیں مہر صاحب کے بعض عزیزوں نے انہیں اخبار نویسی کی اجازت نہ دی۔ چند روز بعد زمیندار بھی ضمانت ضبط ہونے کے باعث عارضی طور پر بند ہو گیا۔

فروری ۱۹۲۲ء میں زمیندار پھر جاری ہوا۔ مولوی شفاعت اللہ خاں اور مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکشؔ (جو مہر صاحب سے پیشتر ہی زمیندار میں شامل ہو چکے تھے) خود مہر صاحب کے وطن پہنچے اور ان کے عزیزوں کو رضامند کر کے انہیں پھر زمیندار میں لے آئے۔ یہ فروری ۱۹۲۲ء کا زمانہ ہے۔ یہاں سے مہر صاحب کی باقاعدہ اخبار نویسی کا آغاز ہوا۔ مہر صاحب زمیندار سے بحیثیت ایڈیٹر آخر مارچ ۱۹۲۷ء تک وابستہ رہے۔ یہاں سے ہٹ کر ۴ اپریل ۱۹۲۷ء کو انہوں نے اپنا ذاتی اخبار 'انقلاب' نکالا۔

اس اثنا میں متعدد اہم مسائل سامنے آئے۔ مثلاً ترکِ موالات کی تبلیغ و اشاعت۔ ہندو مسلم اتحاد کی فضا میں مختلف عناصر نے جو فتنہ انگیزیاں شروع کر دی تھیں ان کا مقابلہ، سلطان ابن سعود کے حملۂ حجاز کی پرزور حمایت، مجلس خلافت کے پلیٹ فارم سے کاؤنسلوں میں آئینی جدوجہد کی تائید۔ ان تمام مسائل میں انقلاب نے ہندوستان کے تمام اخباروں سے بڑھ کر سرگرمی سے حصہ لیا۔ اسی زمانہ میں مہر صاحب کو حجاز کا پہلا سفر پیش آیا۔

۴ اپریل ۱۹۲۷ء سے مہر صاحب اور سالکؔ صاحب نے روزنامہ 'انقلاب' جاری کر دیا۔ انقلاب کے اجراء کے ساتھ ہی اسلامی سیاسیات کو مستقل اصول و قواعد پر قائم کرنے کی ضرورت پیش آ گئی۔ کیوں کہ اتحاد کی فضا بُری طرح مکدّر ہو چکی تھی اور کانگریس عملاً ہندو مہاسبھا کا ضمیمہ بن کر رہ گئی تھی۔ یہ اسلامی سیاسی جدوجہد کا انتہائی نازک دور تھا۔ اس میں انتہائی سوچ بچار اور غیر معمولی ذمہ داری سے کام لئے بغیر چارہ نہ تھا۔ خود مسلمانوں کے فکر و نظر کی فضا خاص مکدّر تھی۔ بعض گروہ کاملاً آزادی کی سعی و کوشش کو قومی مقاصد تک پہنچنے کا واحد ذریعہ سمجھتے تھے۔ اور وہ مسلمانوں کی مستقل کے تحفظ کا سوال پس پشت ڈال رہے تھے۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ کانگریس کے خلاف کچھ نہ کہا جائے۔ اگرچہ وہ مسلمانوں کے حقوق کا درست فیصلہ بھی نہ کرے۔ بعض گروہوں کے نزدیک حکمران قوم کے مقاصدِ تسلط کی حمایت ہی میں مسلمانوں کی بہبود مضمر تھی۔ 'انقلاب' کا مسلک یہ تھا کہ آزادی کے لئے پوری سرگرمی سے کام جاری رکھا جائے لیکن مسلمانوں کی مستقل ملّی ہستی کو ہر خطرے سے محفوظ کر دینا بھی لازم ہے۔ یہ دور 'انقلاب' کی سیاسی سرگرمیوں کا سب سے شاندار اور درخشاں دور ہے۔ اسی زمانہ میں ہندو مسلم اتحاد کے لئے بارہا کوششیں ہوئیں۔ اسی زمانہ میں سائمن کمیشن ہندوستان آیا۔ انہیں ایام میں مسلم کانفرنس کی بنیاد رکھی گئی جو تمام اسلامی طبقات کو سیاسی مقاصد میں متحد کرنے کی ایک نہایت اہم اور

باعتبارِ اثرات وہ درس اور پہلی منظم کوشش تھی۔

۱۹۳۵ء میں نیا آئینِ حکومتِ ہند منظرِ عام پر آیا۔ اور اس کا پہلا حصہ جو صوبائی خود مختاری سے متعلق تھا جاری ہوا۔ "انقلاب" نے اس دور میں اسلامی مقاصد کے لئے جس اسلوب پر کام کیا وہ ہندوستان میں اسلامی سیاست کی تاریخ کا ایک ہمیشہ یادگار رہنے والا باب ہے۔ جب کانگریس سے مفاہمت کی کوئی امید باقی نہ رہی اور مستقل اسلامی حکومت کے لئے سعی و کوشش کے سوا چارہ نہ رہا جس کی پہلی صدا علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء میں بلند کی تھی۔ چنانچہ "انقلاب" ہی نے سب سے پہلے یہ بیڑا اٹھایا۔ کانگریس کی طرف سے مایوس ہو کر مسلم لیگ نے اپنی منظم جدوجہد شروع کی۔ لیگ نے ایک فارن کمیٹی (مجلسِ امورِ خارجہ) بنائی جس کے صدر سیٹھ عبداللہ ہارون مرحوم اور سکرٹری سید علی محمد راشدی تھے۔ سیٹھ صاحب نے پاکستان کی اسکیم تیار کرانے کا انتظام کیا اور اس کا خاکہ تیار کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنائی جس میں سید علی محمد راشدی، ڈاکٹر افضال حسین قادری، ڈاکٹر لطیف حیدر آبادی، مولانا رضوان اللہ، اور مولانا غلام رسول مہر شریک تھے۔ یعنی پاکستان کی اسکیم تیار کرنے کے لئے جس اولین کمیٹی کی تشکیل ہوئی مہر صاحب اس کے ایک سرگرم رکن تھے۔ اسی زمانہ میں سیٹھ صاحب کی فرمائش پر مہر صاحب نے ایک رسالہ "سیاسیاتِ اسلامیانِ ہند" بھی لکھا۔ بات دراصل یہ تھی کہ کانگریس نے ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق غیر ملکوں میں عموماً اور اسلامی ممالک میں خصوصاً یہ پراپگنڈا کر رکھا تھا کہ وہ تو انگریز کے سایہ میں رہنا چاہتے ہیں یعنی کامل آزادی کے خواہاں نہیں ہیں۔ مہر صاحب نے ۸ صفحات کے اس رسالہ میں حیرت انگیز اختصار اور جامعیت کے ساتھ مسلمانانِ ہند کے قومی حسیات کی پوری تاریخ بیان کر دی۔ یہ رسالہ آل انڈیا مسلم لیگ کے دفترِ امورِ خارجہ نے ۱۱ جولائی ۱۹۳۹ء کو شائع کیا۔ ایسی ہی اثر آفریں تحریروں نے پوری قوم کو ایک مرکز پر جمع کر دیا حتیٰ کہ ۱۹۴۰ء میں لیگ نے پاکستان کی قرارداد منظور کر لی تو "انقلاب" ہی کو یہ شرف حاصل ہوا کہ اس نے اس تحریک کو پوری قوم میں زیادہ سے زیادہ ہر دلعزیز بنایا۔ سر اسٹیفورڈ کرپس اور کیبنٹ مشن کی آمد پر "انقلاب" نے مسلم لیگ اور مسلمانانِ ہند کا نقطۂ نظر بڑی شد و مد سے پیش کیا۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب لیگ نے پنجاب و بنگال کی تقسیم قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ اس وقت "انقلاب" نے اس تقسیم در تقسیم خصوصاً پنجاب کی تقسیم کے خطرناک نتائج سے قوم کو بروقت آگاہ کر دیا۔ باؤنڈری کمیشن کی ثالثی پر شدید اعتراضات کئے اور اس کے فیصلوں کو بے چون و چرا مان لینے کے خلاف آواز بلند کی۔ قیامِ پاکستان کے بعد بھی "انقلاب" نے مسئلۂ کشمیر، مہاجرین کی آباد کاری، نہری پانی کے جھگڑے، اسلامی دستور اور جمہوری روایات کے قیام و دوام پر بار بار زور دیا لیکن ....

۱۰ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو "انقلاب" کی آواز ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی لیکن اس کی گونج اسلامیانِ ہند کی سیاسی تاریخ کے ایوان میں صدیوں تک سنائی دیتی رہے گی۔ مہر صاحب نے اردو صحافت کو ذمہ دارانہ غور و فکر سے روشناس کر کے ایک باوقار حیثیت عطا کی۔ مسلمانانِ ہند کی سیاسیات کو جذباتی خوش خیالیوں سے پاک کر کے حقیقت پسندی کی راہ پر لگایا۔ ان کا ٹھوس استدلال مخالف کو چاروں طرف سے اس طرح گھیر لیتا تھا کہ اس کے لئے فرار کی کوئی راہ نہیں رہ جاتی تھی۔ اور ہتھیار ڈالے ہی بن پڑتی تھی۔ مہر صاحب نے افتتاحیہ نگاری کا نیا معیار قائم کر کے اسے ایک مستقل فن کی حیثیت عطا کر دی۔ "انقلاب" کی بندش کے بعد اہلِ نظر ان افتتاحیہ کالموں کو ترس گئے۔ جس نے کچھ دن مسلسل مہر صاحب کے اداریے پڑھ لئے اس کی نظر میں پھر باقی اردو اخبارات کے لئے کوئی کشش باقی نہیں رہی۔ مہر صاحب کی اس خصوصیت پر کتابیں بھی لکھی جائیں تو حق ادا نہیں ہو سکتا۔ دہلی کے ایک روزنامہ "نئی دنیا" کے سالگرہ نمبر مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۵۲ء میں بعنوان "ہندوستان اور پاکستان کے چند ممتاز اخبار نویس" ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس میں مولانا غلام رسول مہر کا تذکرہ ان الفاظ میں ہے:۔

> "مولانا غلام رسول مہر ـــــ ہندوستان اور پاکستان کے اخبار نویسوں میں وہ کامیاب ترین افتتاحیہ نگار (ایڈیٹوریل رائٹر) ہیں۔ ان کا استدلال نہایت مضبوط ہوتا ہے اور مطالعہ بہت گہرا۔ بڑی بات یہ ہے کہ وہ محض اخبار پڑھ کر اخبار نویس نہیں بنے بلکہ سیاست کے صحیح پس منظر سے واقف ہیں۔ اور بہت سے سیاسی واقعات کی ترتیب میں ان کا حصہ رہا ہے .... وہ ایک ٹھوس آدمی اور ٹھوس اخبار نویس ہیں اور علم و ادب کا

بہت گہرا مطالعہ کرنے کے عادی ہیں ؟ صٓ ۴۳"

سیاست و صحافت کے علاوہ مہر صاحب دینی اور علمی حلقوں میں بھی ایک خاص مقام حاصل کر چکے ہیں۔ ایک نقاد اور مصنف کی حیثیت میں ان کا امتیازی مرتبہ مسلّم ہے۔ انہوں نے بچوں کی درسی کتابیں لکھ کر تعلیمی حلقوں میں ایک خاص اثر چھوڑا ہے۔ تقریباً ۵۰ کتابیں نصاب سے متعلق ان کے قلم سے نکل چکی ہیں۔ ہزار صفحات کی سیرت سید احمد شہید (جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے) لکھ کر انہوں نے اسلامی تاریخ پر احسانِ عظیم فرمایا ہے۔ غالب کا کلام بیشک اس کے نام کے دوام کے ضامن تھا لیکن مہر صاحب نے اس کے سوانح حیات لکھ کر غالب کو زندگی جاوید عطا فرما دی۔ آپ کسی وقت بھی اپنی الماری سے "غالب" کو نکال کر دیکھیں۔ غالب اپنی ساری جاذبیتوں کے ساتھ ہنستا بولتا، لطائف کے شگوفے چھوڑتا آپ کے سامنے آموجود ہوگا۔ یوں تو غالب پر کافی کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن مہر صاحب کا غالب ہمیشہ ممتاز و منفرد رہے گا۔ غالب کے کلام کا تفصیلی جائزہ لینے والے ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو نے علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر میں شذرات کے تحت لکھا تھا" ...... زمانہ حال میں سب سے زیادہ مفصل اور جامع کتاب غلام رسول مہر کی ہے..." اور بالکل صحیح لکھا تھا۔ مہر صاحب نے "غالب" کے علاوہ غالب کے خطوط بھی دو ضخیم جلدوں میں تاریخ وار ترتیب دیئے ہیں۔ اور ساتھ ہی مکتوب الیہم کے حالات بھی دیتے چلے گئے ہیں۔ مہر صاحب نے ۱۹۴۹ء میں نپولین کی بیوی جوزیفین کی لائف بھی بڑے دلچسپ پیرایہ میں قلمبند کی تھی۔ "غالب" (اشاعت اول ۱۹۳۶ء) کو چھوڑ کر جسے شیخ مبارک علی صاحب نے شائع کیا ہے مہر صاحب کی بقیہ تمام کتابیں شیخ غلام علی اینڈ سنز تاجر کتب لاہور نے شائع کی ہیں۔ اس کا فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ مہر صاحب بطور صحافی قوم کی بہتر خدمت کر سکتے ہیں یا بطور مصنف۔ ان کے دماغ میں جتنی صلاحیتیں ہیں اگر خدا نے انہیں لکھنے کے ہاتھ بھی اتنے ہی دیئے ہوتے تو شاید اس الجھن کا کوئی حل نکل آتا۔ بہرحال موجودہ عہد میں ہمارے ملک میں نہ کوئی صحافت میں ان کا ہم پلہ ہے اور نہ تصنیف و تالیف میں ان کا ہم پایہ۔

مہر صاحب نے اپنی زندگی میں تاریخی اہمیت کے چند سفر بھی کئے ہیں جن کا تذکرہ ضروری ہے :۔

۱۹۲۵ء میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ ابن سعود نے روضۂ اطہر پر گولہ باری کی ہے۔ واقعات کی تصدیق کے لئے مہر صاحب وفد کے ساتھ اکتوبر ۱۹۲۵ء میں حجاز اور رابغ (عدن سے ۹۰ میل) تشریف لے گئے۔

حجاز کا دوسرا سفر برائے زیارت حرمین شریفین و ادائے فریضۂ حج بیت اللہ ۱۹۳۰ء میں کیا۔

اکتوبر ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس کے موقع پر انگلستان کا سفر کیا۔ راستے میں اٹلی، سوئٹزرلینڈ اور فرانس ٹھہرتے ہوئے گئے۔ واپسی میں علامہ اقبال بھی ساتھ تھے۔ فرانس، سوئٹزرلینڈ ہوتے ہوئے اٹلی پہنچے۔ وہاں چار یا پانچ یوم قیام کرکے مصر آئے۔ مصر میں چار روز ٹھہرے۔ اس کے بعد مفتی امین الحسینی کی دعوت پر یروشلم پہنچ کر موتمر اسلامی میں شرکت کی اور ۸ روز قیام فرمایا۔ اس کے بعد اوائل ۱۹۳۲ء میں واپس ہندوستان آئے۔ ۱۹۳۴ء میں افغانستان کا سفر کیا۔ افغانستان کے اربابِ اختیار چاہتے تھے کہ مہر صاحب وہاں کی سیاحت کے تاثرات قلمبند فرمائیں۔

۱۹۵۲ء میں موتمر عالم اسلامی کے وفد میں مصر کا سفر کیا۔ واپسی میں بیروت اور شام کا دورہ کرتے ہوئے آئے۔

مہر صاحب اپنے عہد کے اکابر میں ایک ممتاز حیثیت کے حامل ہیں اور تمام مشاہیر سے ان کی بے تکلّف ملاقاتیں رہی ہیں۔ یہاں موقع نہیں ہے کہ ہم ملک کی عظیم شخصیتوں کے الفاظ نقل کریں جن کے گلدستے ان حضرات نے مہر صاحب کی بارگاہ میں نذر کئے ہیں صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ مہر صاحب کے پاس مشاہیر کے تقریباً ڈھائی ہزار خطوط کا ذخیرہ موجود ہے جن میں سے ہر ایک خط کو اپنی جگہ تاریخی اختصاص حاصل ہے۔

مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، سر عبدالقادر، علامہ اقبال، سر شفیع، میاں فضل حسین، مہاراجہ محمود آباد، مہاراجہ سلیم پور، حسرت موہانی، مولانا حسین احمد، مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، مولانا ابوالکلام آزاد، عبدالرحمٰن صدیقی، شعیب قریشی، فضل الحق اور شہید حسین سہروردی وغیرہ سے مہر صاحب کی ذاتی ملاقاتیں اور ان سے مراسلت رہی ہے۔ آج ملک کے مقتدر اصحاب اور افاضل میں سے کون ہے جو مہر صاحب

کے تدبر و فراست، ملکۂ صحافت، سیاسی بصیرت اور علمی فضیلت کا معترف و مداح نہیں ہے۔ نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی مرحوم کے انتقال کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد کے وہ عزیز ترین دوست اور آزاد شناس ہیں۔ مولانا ابوالکلام سے مہر صاحب کا تعلق انتہائی قدیم ہے۔ ۱۹۱۴ء میں پہلی ملاقات ہوئی تھی اس کے بعد اس میں تدریجی استحکام آتا گیا یہاں تک کہ اب "من تو شدم تو من شدی، من تن شدم تو جاں شدی" والا معاملہ ہے۔

مہر صاحب کی شادی ۱۹۱۴ء میں ہوئی لیکن دو ہی بچے ہونے پاتے تھے کہ زوجۂ محترمہ داغ مفارقت دے گئیں۔ ۱۹۲۹ء میں مولانا نے دوسری شادی کی۔ دوسری بیوی سے دس بچے ہیں۔ کل ۶ لڑکے اور ۶ لڑکیاں مولانا کی اولاد ہیں۔ بڑے صاحبزادے عبدالسلام صاحب آج کل راولپنڈی میں ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن آفیسر ہیں۔

مہر صاحب جیسی غیر معمولی شخصیت کے متعلق لوگوں کو ان کی وضع قطع، گفتار و رفتار، طعام و قیام، اکل و شرب، نشست و برخاست اور دیگر معمولاتِ زندگی سے واقف ہونے کی بڑی خواہش رہتی ہے۔ مہر صاحب دوہرے جسم کے طویل القامت، قوی الاعضاء اور صحت مند انسان ہیں۔ سر پہ قراقلی کی شاندار ٹوپی، جسم پہ دیدہ زیب شیروانی اور لٹھے کی نفیس شلوار، پاؤں میں چیک کا عمدہ موزہ اور منقش دیسی جوتا اس عظیم المرتبت شخصیت میں اور زیادہ بانکپن پیدا کر دیتے ہیں ماشاءاللہ مہر صاحب کے اعضاء کا تناسب انتہائی موزوں صورت اختیار کئے ہوئے۔ مہر صاحب کی صحت کے ضامن دراصل ان کی روزمرہ زندگی کے معمولات ہیں جن پہ وہ بڑی باقاعدگی سے عمل پیرا ہیں۔ وہ ایک طویل زمانہ سے صبح سویرے چار بجے اٹھتے ہیں۔ غسل کرتے ہیں۔ فریضۂ نماز سے فارغ ہو کر طلوعِ آفتاب سے بہت پہلے سیر کے لئے نکل جاتے ہیں اور نسیم صبح گاہی سے پوری طرح متمتع اور لذت گیر ہوتے ہیں ؎

خوشش خوش نسیم صبح گاہی
کہ دردِ شب نشیناں را دوا کرد

دوپہر کے کھانے کے بعد قدرے آرام کرتے ہیں۔ پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ شام کو چائے پینے کے بعد غروب آفتاب کے قریب پھر سیر کے لئے نکل جاتے ہیں۔ شب میں انتہائی ہلکی غذا کھاتے ہیں، اور سویرے ہی سو جاتے ہیں۔ مہر صاحب کے معمولات کی سادگی اور باقاعدگی ان کی صحت کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی عمر ۶۰ سال سے متجاوز ہے لیکن وہ مجھ جیسے جوان آدمی کے دونوں ہاتھ اپنے ایک ہاتھ سے پکڑ لیں تو چھڑائے نہیں جائیں گے۔ خدا ان کی صحت کو اور زیادہ شاندار صورت میں دائم و قائم رکھے۔

وقار عظیم

اقبال عظیم

"ایسے ہوا کرتے ہیں وقار عظیم صاحب ؟"

اپنے ایک شوخ اور بے تکلف دوست کا یہ جملہ مجھے آج تک یاد ہے۔ جو بھائی صاحب کو پہلے پہل دیکھ کر بے ساختہ اس کے منہ سے نکل گیا تھا۔ یہ بات آج سے اٹھارہ برس پہلے کی ہے جب بھائی صاحب الہ آباد یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر تھے۔ اور ہم سب بھائی بہن لکھنؤ میں رہا کرتے تھے۔ حسب معمول وہ ہم سب کو دیکھنے دو روز کے لئے لکھنؤ آئے تھے، اور دوپہر کو باہر کے کمرے میں سو رہے تھے کہ میرا یہ دوست آگیا اور انہیں سوتا دیکھ کر مجھ سے پوچھنے لگا "کون صاحب ہیں؟" میں نے جواب دیا "بھائی صاحب" میرے اس جواب پر اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ کبھی حیرت سے مجھے دیکھتا کبھی انہیں۔ اور جب استعجاب کی یہ کیفیت گزر گئی تو مایوسی کی ایک ٹھنڈی سانس کے ساتھ اس کے منہ سے از خود یہ جملہ نکل پڑا۔

"ایسے ہوا کرتے ہیں وقار عظیم صاحب ؟"

اور اس میں شبہ بھی نہیں کہ ہر ایک شخص، جو بھائی صاحب کے متعلق سب کچھ جانتا ہو، ان کے ادبی مقام کو پہچانتا ہو، اور دل سے اُن کی قدر کرتا ہو وہ جب پہلے پہل انہیں دیکھے گا تو اسے کسی نہ کسی حد تک مایوسی ضرور ہوگی۔ اس لئے کہ دراز قد، متناسب اعضا اور اچھے ہاتھ پیروں کے باوجود، بے حد دبلا پتلا بدن، کشادہ پیشانی، اور نرم و ذہین آنکھوں کے باوجود بے آب و تاب اور جھریوں دار چہرہ - اور پھر بھرپور علم و صلاحیت کے باوجود رفتار و گفتار میں انتہائی درجہ کی سادگی اور عجز، ایسی چیزیں ہیں جو "ہیرو ورشپ" کے جذبے کو کسی طرح سیر نہیں کر سکتیں ——— خاص طور سے ایسی صورت میں کہ ان جسمانی کمزوریوں کو چھپانے کے لئے لباس کا تکلف و طمطراق بھی ضروری نہ سمجھا گیا ہو۔ چنانچہ بھائی صاحب نے سوٹ کبھی نہیں پہنا۔ اس وقت بھی نہیں جب پی سی ایس کے انٹرویو کے وقت دنیا نے انہیں سمجھایا اس وقت بھی نہیں۔ جب شادی کے بعد بدلتے ہوئے ماحول کے تقاضوں کے پیش نظر انہیں سوٹ کے فوائد سے باصرار آگاہ کیا گیا ——— بس وہی علی گڑھ کٹ پاجامہ اور اکہرے کالر کی قمیض ہمیشہ سے ان کا لباس ہے۔ جس میں موسم سرما صرف مفلر کا اضافہ کر دیتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سوٹ، اور سوٹ پہننے والوں سے یا فیشن پسندوں سے انہیں نفرت ہے۔ بس ایک وضع ہے جو قائم ہے، حد کہ اس میں نہیں ... دخل نہیں جس کا ثبوت یہ ہے کہ شیروانی پر ہمیشہ وہ ٹوپی پہنتے ہیں۔ اور اب کم و بیش دس برس سے "کلین شیوڈ" بھی ہیں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ دونوں چیزیں فیشن نوازوں کی راہ سے نہ ہوں صرف ضرورتاً ہوں۔ یعنی پہلی چیز سخت دھوپ سے بچنے

کے لئے۔ اور دوسری وقت کی کفایت اور سہولت کی خاطر۔

لیکن صرف سوٹ نہ پہننے سے لباس کی سادگی پوری طرح ثابت نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ شیروانی اور قمیض پاجامہ میں بھی تکلف و اہتمام کی بڑی گنجائش ہے۔ اس لئے وضاحت ضروری ہے۔ کہ جہاں تک کپڑوں کے صاف ستھرے ہونے کا سوال ہے۔ بھائی صاحب محتاط ضرور ہیں۔ لیکن اس کے آگے ان کا معاملہ "درویشوں" جیسا ہے۔ شیروانی کا کپڑا کس قسم کا ہے، کس وضع، قیمت اور رنگ کا ہے۔ شیروانی کیسی سلی ہے۔ ان چیزوں سے انہیں علاقہ نہیں۔ وہ خوب سمجھتے ہیں کہ دن کو پہننے جانے والے کپڑے رات کو پہن کر سونا مناسب نہیں۔ لیکن وہ کیا کریں کہ "سلیپنگ سوٹ" کا تصور انہیں گوارا نہیں۔ تن زیب کا کرتہ، جالی دار بنیان، ریشمی قمیض، ازار بند، موزہ یا رومال، عطر، سینٹ، کریم، اسنو، پاؤڈر، گھڑی، فاؤنٹین پن اس قسم کی چیزیں ہیں جو نفاست پسندی کی دلیل سہی، لیکن ان کے لئے بے فائدہ اور غیر ضروری ہیں۔ قلم کی تو خیر مجبوری ہے کہ آلۂ کار ہے اور اس کے بغیر کام نہیں چلتا۔ لیکن یہ کسی طرح ضروری نہیں کہ جب گھر سے باہر نکلا جائے تو قلم کو شیروانی کی جیب میں لگا کر بھی نکلا جائے۔ یہی حال گھڑی کا بھی ہوتا ہے جب کبھی ان کے حصہ میں آجاتی ہے۔

یہ سب کچھ ہے لیکن ایک پڑھا لکھا انسان کہیں سر راہ ان سے ملاقات کرے یا اطمینان سے گھر جا کر ان سے باتیں کرلے اور ان کی شخصیت اس کے ذہن پر اپنے گہرے نقوش نہ چھوڑ جائے۔ اور وہ قلب کی گہرائی سے ان کا احترام کرنے پر مجبور نہ ہو جائے، ناممکن، بلکہ احترام کا یہ جذبہ بعض صورتوں میں اس سرحد تک جا پہنچے گا جہاں سے مرعوب ہو جانے کی منزل شروع ہوتی ہے۔

میری اور بھائی صاحب کی عمر میں صرف ۱۲ برس کا فرق ہے۔ یعنی میری اکتالیس سے کچھ زیادہ ان کی پینتالیس[45] سے کچھ کم۔[1] لیکن جہاں تک احساس بزرگی و خوردی کا سوال ہے عمروں کے اس فرق کو میں نے ہمیشہ اس سے کئی گنا زیادہ سمجھا ہے۔ اور ہمیشہ ان سے مرعوب رہا ہوں حالانکہ مرعوب ہونا میری افتاد طبیعت کے خلاف ہے ——— چند دیرینہ احباب کو میں نے ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ بعض سے قطع تعلق کر بیٹھا ہوں۔ اور اکثر اپنے افسران اعلیٰ سے بھی برسر پیکار رہا ہوں۔ صرف اس لئے کہ انہوں نے زندگی کے بعض حالات میں مجھے مرعوب کرنے کی کوشش کی ——— لیکن بھائی صاحب سے میں مرعوب تھا اور مرعوب ہوں (اور یہ بات کچھ صرف میرے ہی ساتھ نہیں) یا دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ لیجئے کہ سنجیدہ مزاجی، ضبط و تحمل اور وسعت نظر کے پیش نظر جو عمر ان کی آج ہے۔ میرے نزدیک ان کی وہی عمر آج سے بیس برس پہلے بھی تھی۔ جن چیزوں نے مجھے اور ان کے جاننے والوں کو ہمیشہ متاثر ہونے پر مجبور کیا ہے وہ ان کی ادبی صلاحیتوں کی عظمت اور کردار کا وقار ہے۔ ان کی ادبی حیثیت سے بحث کرنے کی مجھے اجازت نہیں اور اگر ان کے کردار کے متعلق یہ کہہ کر بات ختم کردوں کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتے، بددیانتی سے کام نہیں لیتے، کریم النفس ہیں، رواداری برتتے ہیں، خلیق ہیں، سیر چشم ہیں، متوکل مزاج ہیں، انکسار پسند ہیں، اور وہ سب کچھ ہیں جو ایک شریف النفس اور بلند فطرت انسان کو ہونا چاہیئے تو میرا یہ بیان توجہ سے نہ سنا جائے گا۔ اس لئے کہ ایک مداح کو اپنے ممدوح کے متعلق اسی قسم کی باتیں کہنا چاہئیں۔ اس لئے اصرار کے ساتھ وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ جب میں کہتا ہوں کہ وہ جھوٹ نہیں بولتے اور بددیانت نہیں ہیں تو میرا مطلب یہ ہے کہ ان چیزوں کا انہیں سرے سے سلیقہ ہی نہیں ہے۔ نجی زندگی میں اور دوست احباب کی بے تکلف محفل میں ہم میں سے کون ہے جو کبھی کبھی ازراہ تفنن جھوٹ نہ بولتا ہو۔ لیکن بھائی صاحب کو اس قسم کا جھوٹ بھی بولنا نہیں آتا۔ اگر وہ کبھی اس قسم کی کوشش کرنا بھی چاہیں تو آسانی سے پکڑے جائیں گے۔ اس لئے کہ زمانہ سازی، سیاست، اکثر بیونت اور حیلہ جوئی نہ کبھی ان کے بس کی چیزیں تھیں نہ اب ہیں۔ جس کا جی چاہے انہیں دھوکا دے جائے۔ کبھی بے خبری میں، کبھی جان بوجھ کر دھوکا کھالیں گے۔ اور بعد میں انہیں اس کا پچھتاوا بھی نہ ہوگا۔ تحمل اور رواداری کا یہ عالم ہے کہ ہر مزاج کا آدمی ان سے خوش اور ہر مزاج کے آدمی سے وہ خوش۔ ممکن ہے کہ کبھی کسی سے وہ خفا بھی ہو جاتے ہیں۔

---

[1] "وقار عظیم" ان کا تاریخی نام ہے۔ جس سے ۱۳۲۸ھ ان کا سن پیدائش نکلتا ہے۔ اور سن ہجری کے حساب سے ۴۶ برس عمر۔

لیکن اس خفگی میں نہ شدت ہوگی، نہ تنفر۔ چنانچہ ساری زندگی انہوں نے فریب کھایا ہے۔ اور ایسا کھایا ہے کہ قدم قدم پر انہیں اپنی زندگی کی راہیں بدلنا پڑی ہیں۔ لیکن جن لوگوں نے انہیں فریب دیا، آج بھی ان سے وہ متنفر نہیں ہیں۔ بلکہ جب کبھی موقع ہوتا ہے زبان و قلم دونوں سے ان کی بھلائیوں کا اعتراف کرتے ہیں، اور دل سے ان کی قدر کرتے ہیں۔ اس بات کو ذرا اور وضاحت سے بیان کرتا۔ لیکن وضاحت میں کچھ نام لینا پڑیں گے۔ اور نام گنوانے سے نزاکتیں پیدا ہوں گی۔ اس لئے ان کی خانگی زندگی کی دو ایک چھوٹی چھوٹی باتیں بتاتا ہوں، جن سے ان کے کردار کا یہ رخ سمجھ میں آجائے گا۔

ہماری دوسری والدہ صاحبہ کو ہماری سگی خالہ تھیں۔ تاہم عملاً سوتیلی ماں تھیں۔ جیسے جیسے ماشاءاللہ ہمارے نئے بھائی بہنوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ فطری طور پر گھر میں تصادم کے امکانات پیدا ہوتے گئے۔ کبھی ہمیں والدہ صاحبہ سے، کبھی والدہ صاحبہ کو ہم سے۔ شکایات رہنے لگیں۔ اور یہ شکایات اکثر کشیدگی میں بھی تبدیل ہوئیں۔ لیکن اس وقت بھی بھائی صاحب کے نزدیک گویا گھر کی فضا پہلے کی طرح خوشگوار تھی۔ نہ صرف یہ کہ وہ والدہ صاحبہ کی میں تھے۔ بلکہ وہ انہیں اپنا "کماؤ بیٹا" اور "اللہ میاں کی گائے" کے ناموں سے یاد کرتی تھیں اور ان کی صورت دیکھ کر باغ باغ ہو جاتی تھیں۔ چنانچہ انتقال کے وقت بھائی صاحب کے نام کا وظیفہ ان کی زبان پر تھا اور بڑا اصرار تھا کہ انہیں فوراً الہ آباد سے بلا لیا جائے۔ بھائی صاحب آئے اور جس طرح ان کی تیمارداری کی کہ کھانا، پینا سب کچھ چھوٹ گیا۔ بھائی صاحب ہی کے زانو پر والدہ صاحبہ نے دم توڑا۔ اپنی پہلی تصنیف بھائی صاحب نے والدہ صاحبہ ہی کے نام منسوب کی ہے۔ اور اس انتساب کے الفاظ بتاتے ہیں کہ انہیں ان سے کس درجہ محبت تھی۔ کوئی اپنی سگی ماں سے بھی ایسی محبت کیا کرے گا! کچھ والدہ صاحبہ ہی پر منحصر نہیں۔ بھائی، بہن، دیگر اعزا، احباب، ہم جماعت، اساتذہ، سب سے ہمیشہ بھائی صاحب کا رویہ یہی رہا کہ انہوں نے دوسروں کی خوشنودی کو اپنی سہولت پر ترجیح دی ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے، جو انہیں سب کا عزیز بناتی ہے حتیٰ کہ خود والد صاحب کو میں نے ان سے جیسی احتیاط اور احترام سے گفتگو کرتے دیکھا ہے کوئی باپ اپنی اولاد سے اس طرح بات نہیں کرتا۔ بس بھائی صاحب کے پورے ماحول کو ایک بڑا سا کنبہ سمجھ لیجئے اور انہیں اس کنبہ کا ایک فرد اور ان کے کردار کو اس ماحول پر پھیلا دیجئے، بات سمجھ میں آجائے گی۔

بھائی صاحب کی تعلیم ایک پنڈت جی کے مدرسے سے شروع ہوئی۔ جہاں ٹاٹ کی پٹیوں پر بیٹھ کر کھریا کی بنی ہوئی سفید روشنائی اور سرکنڈے کے قلم سے تختی پر لکھا جاتا تھا۔ لیکن اللہ جانے پنڈت جی نے انہیں کون سا گر سکھا دیا تھا کہ ایک دم سے ان کا داخلہ پانچویں درجے میں ہوا۔ اور وہ ہمیشہ صف اول کے طلبا میں شمار ہوتے رہے۔ یہ پنڈت جی ہی کی تعلیم کا اثر تھا کہ حساب اور ہندی جیسے مضامین میں بھی، جو مسلمان طلباء کو راس نہیں آتے۔ بھائی صاحب ہمیشہ غیر معمولی طور پر نمایاں رہے۔ اور اپنے درجہ پر حاوی۔ یہ بات بڑھ کر یہاں تک پہنچی کہ ان کا کمرہ ان کے دوسرے ہم جماعتوں کے لئے ایک مکتب بن گیا۔ جہاں بھائی صاحب کو معلمی کے فرائض سرانجام دینا پڑتے تھے۔ امتحانات کے زمانے میں رات رات بھر پڑھائی ہوتی تھی۔ اور اس حد تک ہوتی تھی کہ جب اپنی لالٹین کا تیل ختم ہو جاتا، تو میونسپلٹی کی سڑک والی لالٹین اٹھا کر وہاں چلی آتی اور اپنا کام ختم کر کے صبح کو اپنی جگہ واپس چلی جاتی۔ لیکن ان دنوں میں بھی وہ پڑھتے کم تھے پڑھاتے زیادہ تھے۔ اور جب امتحان کا نتیجہ سامنے آتا تو وہ فرق پھر بھی قائم رہتا جو معلم اور متعلمین میں قائم رہنا چاہئے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ تعلیم و ملازمت کے سلسلے میں بھائی صاحب کو ہندوپاک کے پانچ مشہور تعلیمی مرکزوں سے وابستگی کا موقع ملا ہے۔ اور اس راہ میں ہر قدم پر انہیں ایسے اساتذہ، ہم جماعت اور احباب ملتے گئے۔ جن میں سے بیشتر ادبی دنیا میں اپنا اپنا الگ مقام رکھتے ہیں۔ چنانچہ جوبلی کالج لکھنؤ میں علی عباس حسینی اور افسر میرٹھی۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں مسعود حسن رضوی۔ الہ آباد یونیورسٹی میں ڈاکٹر اعجاز حسین اور احتشام حسین رضوی۔ علی گڈھ یونیورسٹی میں غلام السیدین اور رشید احمد صدیقی۔ اور جامعہ ملیہ دہلی میں ڈاکٹر ذاکر حسین اور ڈاکٹر عابد حسین ان سے اس قدر قریب رہے کہ ان کے ادبی شعور کی تشکیل و ارتقا سے ان سب کو کسی نہ کسی طرح منسلک کیا جا سکتا ہے۔

اس سلسلے میں یہ بتا دینا بھی بے محل نہ ہوگا کہ مجھے وہ دن یاد ہے جب بھائی صاحب نے ایک ادیب کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ یہ بات ۱۹۳۲ء کی ہے، جب گرمیوں کی تعطیل میں ہم دونوں والدین کے پاس دیہات گئے تھے، اور چھٹیوں میں وقت گزاری کے لئے کچھ کتابیں ہمارے ساتھ تھیں جن میں پریم چند کے افسانے بھی تھے۔ بھائی صاحب نے پریم چند کے تمام افسانے پڑھ ڈالے۔ اور پھر ایک روز دیکھا کہ نیم کے پیڑ کے نیچے بیٹھے افسانہ لکھ رہے ہیں۔ دوسرے ہی دن یہ افسانہ کہیں چلا گیا۔ اور کچھ دنوں بعد شائع ہوگیا۔ اس کے بعد انہوں نے ایک دو افسانے اور لکھے اور بس! ان افسانوں کا مزاج قطعاً پریم چند جیسا تھا ——— ——— کچھ عرصے کے بعد میں نے انہیں پریم چند کے علاوہ علی عباس حسینی، پطرس اور رشید احمد صدیقی کی تعریف کرتے ہوئے سنا ہے۔ اور اس کے بعد نیاز فتحپوری، عبدالماجد دریاآبادی اور افادی الہدی کا بھی مداح پایا ہے۔ پرانے شاعروں میں مولانا محمد حسین آزاد اور میر امن دہلوی سے زیادہ کسی اور کا ذکر میں نے ان کی زبان سے نہیں سنا۔ یوں پڑھتے وہ سب کچھ تھے اور توجہ سے پڑھتے تھے۔

شعر گوئی کا شوق بھائی صاحب کو کبھی نہ تھا۔ بلکہ مجھے بھی ہمیشہ اس "تضیع اوقات" سے روکتے رہے ہیں۔ لیکن ان کا مذاق شعری معتبر اور رواداری کے باوجود سخت گیر ہے۔ جبکہ موزونئ طبع یقیناً قدرت کی طرف سے ان کے حصے میں آئی ہے۔ چنانچہ کبھی یوں بھی ہوا ہے کہ نصابی کتاب مرتب کی جا رہی ہے۔ کسی خاص موضوع پر بچوں کے لئے ایک نظم کی ضرورت ہے، جو نہیں ملتی۔ اس وقت قلم برداشتہ پوری نظم لکھ دی ہے۔ اور اچھی خاصی لکھی ——— کسی شعر یا شاعر کی برائی عام طور پر وہ بلاضرورت کبھی نہیں کرتے۔ لیکن شعر پسند بھی انہیں مشکل سے آتا ہے۔ قدیم شعرا میں سے ہر ایک کا وہ احترام کرتے ہیں۔ لیکن تاثر کے لحاظ سے میر، علمیت کے لحاظ سے غالب اور نہ معلوم کس لحاظ سے نظیر اکبرآبادی کو وہ بہت موقر جانتے تھے۔ اور زمانۂ حال کے شعرا میں حسرت فانی اور اصغر کے قائل تھے۔ لیکن شعر کی پسندیدگی میں شہرت کو وہ کبھی بنیاد نہیں بناتے۔ چنانچہ ماجد الہ آبادی، جگت موہن رواں اور آل رضا لکھنوی کے درجنوں اشعار انہیں کسی زمانے میں یاد تھے، جو مزے لے لے کر دوسروں کو بھی سناتے تھے۔ اقبال کا ذکر اس سلسلے میں ضروری نہیں کہ ان کا معاملہ ہی الگ ہے۔ اگر بھائی صاحب بھی ان کی عظمت کے قائل تھے اور ہیں تو عجب نہیں ——— خاص طور سے ان دنوں ہماری زندگی کی رفتار اس قدر تیز اور ہمارے دماغ اس درجہ مصروف ہیں کہ ہمیں پیچھے مڑ کر دیکھنے کی فرصت نہیں۔ حالانکہ ہماری موجودہ زندگی کی ساری ... اگر غور سے دیکھئے تو ہمارے ماضی ہی سے وابستہ ہے۔ یہی سبب ہے کہ بھائی صاحب کے ان رجحانات کا ذکر ضروری سمجھا گیا، جن کا تعلق بالکل ابتدائی زندگی سے ہے۔ ان کی مدد سے ممکن ہے کہ ان کے موجودہ رجحانات کا تجزیہ کرنے میں آسانی ہو۔ اس لئے کہ بہر حال ان کی شخصیت کا نمایاں ترین پہلو ان کا ادبی شعور ہے۔

سب سے بعد میں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ طبیعت کی اس بزرگی اور شدید علمی انہماک کے باوجود بھائی صاحب کے مزاج میں خشکی یا جمود نہیں ہے۔ بلکہ شگفتگی اور لچک ہے، اور وہ اپنے ماحول سے مصالحت کرنا بھی جانتے ہیں۔ چنانچہ جہاں انہوں نے اس شدت سے نمازیں پڑھی ہیں کہ کڑکڑاتے جاڑوں میں منہ اندھیرے محلے والوں کو ایک ایک کر کے فجر کی نماز کے لئے جگایا ہے، اور مسجد میں خود اذانیں دی ہیں۔ وہاں تفریح طبع کے لئے تاش اور کیرم کھیلنے اور کثرت سے سینما دیکھنے کو بھی روا رکھا ہے۔ بوائے اسکاؤٹنگ میں بڑی دلچسپی سے حصہ لیا ہے اور بے شمار انگریزی ناول پڑھے ہیں۔ شکار کا انہیں مدتوں شوق رہا ہے۔ اور بندوق کے نشانہ کی کبھی اس حد تک مشق کی ہے کہ ہوائی بندوق سے، اسی بندوق کے دوسرے چھرے کو مسجد کی منڈیر پر رکھ کر پے بہ پے کامیاب نشانہ لگایا ہے۔ گھوڑے کی سواری میں وہ کبھی اتنے مشاق تھے کہ منہ زور سے منہ زور گھوڑا ان کے زانو کے نیچے جا کر ایسا ہو جاتا تھا جیسے ہمارے آپ کے لئے سائیکل۔ موسیقی کا بھی انہیں ذوق ہے۔ اور ایک زمانہ میں خود بھی اتنے اچھے ترنم کے شعر پڑھتے تھے کہ آج اس کا تصور دشوار ہے۔ کھانا پکانا بھی وہ بہت اچھا جانتے ہیں۔ اور کبھی کبھی اس میدان میں ان کا اور بھابی صاحبہ کا مقابلہ بھی ہو گیا ہے۔ اگر بھابی صاحبہ کے خفا ہو جانے کا ڈر نہ ہوتا تو یہ بھی بتا دیتا کہ ان مقابلوں میں کبھی کبھی میدان کس کے ہاتھ رہتا ہے۔ ضرورت پڑ جائے تو انہیں مشین سے اپنا پاجامہ خود سی لینے میں بھی کسی کا سہارا نہیں ڈھونڈنا پڑتا۔ اسی طرح سفر کے اہتمام، تقریبات کے انتظام، گھر کی صفائی اور آرائش، بچوں کی پرورش اور تیمارداری میں بھی انہیں خاص ملکہ حاصل ہے۔ گویا ایک ادیب کی حیثیت سے وہ

کسی وقت بھی اپنے ماحول سے فرار کی کوشش نہیں کرتے۔ بلکہ ان کی زندگی کے تمام شعبے پوری طرح ایک دوسرے میں حل ہیں۔

نہ بھائی صاحب کا کوئی اسٹڈی روم الگ ہے، نہ لائبریری۔ نہ ادبی مشاغل کے لئے کسی وقت کا تعین بلکہ ادب اور ادب کے تمام لوازمات ان کی گرہستی میں شامل ہیں۔ شور غل، بچوں کی چیخ پکار، ان کے کام میں کبھی مخل نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ ادبی کاموں کو وہ کبھی اپنے لئے بوجھ نہیں بناتے۔ زندگی کے ہنگامے بھی جاری، ادبی مشاغل بھی جاری۔ چنانچہ یوں بھی ہؤا ہے کہ کسی مضمون کا عنوان کاغذ پر لکھا جا چکا ہے۔ اور بھابی صاحبہ نے کھانے کا نوٹس دے دیا ہے۔ اتنے میں کہ کھانا نکلے اور دسترخوان پر چنا جائے فل اسکیپ کا آدھا صفحہ لکھا جا چکا۔ جب کھانا لگ گیا تو جو جملہ جس جگہ ہے، اسے اسی جگہ چھوڑ کر اور مضمون سے بالکل بے تعلق ہو کر ہنسی خوشی کھانا کھایا گیا۔ اور شام کو تفریح کے لئے نکلنے سے پہلے مضمون ختم —— یہ ان مضامین کا حال ہے جن سے بھائی صاحب بحیثیت ادیب پہچانے جاتے ہیں۔ بالکل یہی حال ان کے مطالعے کا بھی ہے۔ ہر تازہ سے تازہ تصنیف ان کی نظر سے ضرور گزرے گی۔ لیکن یوں کہ ریڈیو کے پاس بیٹھے ہیں، خبریں بھی سن رہے ہیں اور کتاب بھی پڑھ رہے ہیں۔ بچہ گود میں ہے۔ اسے بہلا بھی رہے ہیں اور مطالعہ بھی جاری ہے۔ چنانچہ کتاب پڑھتے وقت انہیں نوٹس لیتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ جو کچھ بھی پڑھا ہے، دماغ میں محفوظ ہے۔ اور اس طرح محفوظ ہے کہ جیسے ابھی ابھی کتاب پڑھ کر اٹھے ہوں۔ بڑے مزے کی بات یہ ہے کہ اگر آپ ان سے گفتگو کریں گے تو شاید آپ کو یہ بھی اندازہ نہ ہو کہ وہ گفتگو کے موضوع پر پوری طرح حاوی ہیں۔ لیکن جب قلم لے کر بیٹھیں گے تو سارا ضروری مواد ہاتھ باندھ کر ان کے سامنے آ کھڑا ہوگا۔ اور وہ دریا کی روانی کے ساتھ بغیر کہیں رکے لکھتے چلے جائیں گے۔ اور جو کچھ لکھیں گے بغیر کسی خاص ترمیم و تنسیخ کے ڈاک کے حوالے کر دیں گے۔ چنانچہ اگر ان کا کوئی مضمون کہیں راہ میں گم ہو جائے تو اس کی نقل کہیں نہ ملے گی۔ یہ دوسری بات ہے کہ ایسی صورت میں کسی شدید ضرورت کے تحت اگر وہ اسی مضمون کو دوبارہ لکھنے بیٹھیں تو کم و بیش وہی چیز پھر سامنے آ جائے، جو کبھی پہلے آئی تھی۔

سننے والوں کو حیرت ہوگی کہ قلم کی اس دریا دلی کے باوجود ایک معاملے میں بھائی صاحب بہت کوتاہ قلم ہیں یعنی خط لکھنے میں۔ جس کی شکایت ان کے دوستوں اور عزیزوں کو مستقل ہے، لیکن مجھے شکایت کی بھی اجازت نہیں۔ اس لئے کہ میرے اور ان کے درمیان معاہدہ ہے کہ جب تک خیریت رہے گی خطوط نہ لکھے جائیں گے —— شروع شروع میں جب کبھی ان کا خط آتا تھا تو اسے کھولتے ڈر لگتا تھا۔ لیکن شکر ہے اب کبھی کبھی اتنی مدت گزر جاتی ہے کہ خیریت کی صورت میں بھی ایک آدھ خط آ جاتا ہے۔ حالانکہ اس قسم کا طویل سے طویل خط دس بارہ سطروں سے زیادہ نہیں ہوتا۔

لیث صاحب

صابر علی خاں

لیث صاحب سے میری پہلی ملاقات آج سے کوئی بارہ تیرہ سال پہلے علی گڑھ میں ہوئی۔ میں ایک امتحان کے سلسلے میں علی گڑھ پہنچا تھا اور قیام کا مسئلہ درپیش تھا۔ اس سال علی گڑھ میں طالب علموں کا اس قدر ہجوم تھا کہ دارالاقاموں میں کہیں جگہ ملنا دشوار تھی، جن کمروں میں پہلے صرف دو یا تین طالب علم رہتے تھے وہاں اب چھ سات بلکہ آٹھ آٹھ طالب علم داخل ہو چکے تھے۔ میں پہنچا تو عثمانیہ ہوسٹل میں اپنے ایک پرانے ساتھی اور دوست نعیم ندوی صاحب کے پاس اترا اور اسی دن شام کو لیث صاحب سے ملنے گیا۔ عثمانیہ ہوسٹل کی کھلی ہوئی چھت پر کرسیوں کا ایک بڑا سا حلقہ پڑا تھا۔ بیچ میں ایک چھوٹی سی میز پر دفتری کاغذات پڑے تھے۔ لیث صاحب ایک کرسی پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے، جس سے خمیرہ کی خوشبو اڑ اڑ کر دور تک پھیل رہی تھی۔ لیث صاحب حقہ پیتے جاتے اور ساتھ ہی دوستوں اور طالب علموں سے باتیں کرتے جاتے۔ ساری فضا میں ایسی بے تکلفی تھی جو علی گڑھ سے پہلے میں نے کہیں اور ایسے موقعوں پر نہیں پائی تھی۔ پہلے ہی تعارف کے بعد ایسا محسوس ہوا کہ میں لیث صاحب کو برسوں سے جانتا ہوں۔ جب تک علی گڑھ میں قیام رہا تقریباً روزانہ ملاقات ہوتی رہی۔ پھر ۴۷ء کا انقلاب آیا۔ لیث صاحب انگلستان جانے والے تھے۔ علی گڑھ اور دوسرے شہروں میں فسادات کی آگ بھڑک چکی تھی۔ خود لیث صاحب کے وطن بدایوں میں فساد ہو چکا تھا۔ لیث صاحب کو یہ فکر تھی کہ اپنی غیر حاضری میں اہل و عیال کو کہاں رکھیں۔ چنانچہ انہوں نے طے کیا کہ بچوں کو پاکستان پہنچا کر خود ولایت چلے جائیں۔ مجھے خط لکھا کہ لاہور میں مکان کا بندوبست ہو سکے تو کر دو۔ یہاں اس وقت عجب نفسا نفسی کا عالم تھا۔ مہاجرین کا بے پناہ سیلاب امڈا چلا آتا تھا۔ میری کوشش کے باوجود لیث صاحب کو لاہور میں مکان نہ مل سکا۔ اور انہیں اپنے اہل و عیال کو لے کر کوئٹہ جانا پڑا۔ لیث صاحب دہلی سے لاہور ہوائی جہاز سے پہنچے۔ اور ظاہر ہے اس سفر میں وہ کیا سامان لا سکے ہوں گے۔ چنانچہ وہ اس وقت سچ مچ مہاجر بن کر آئے۔ میں نے علی گڑھ میں ان کی ذاتی کوٹھی، ان کا رہن سہن اور ساز و سامان دیکھا تھا۔ لیث صاحب ان چیزوں کا ذکر کبھی نہیں کرتے۔ لیکن میں سوچتا ہوں جب کبھی وہ باتیں یاد آتی ہوں گی تو لیث صاحب کی کیا کیفیت ہوتی ہوگی۔ وہ علی گڑھ میں بڑے اطمینان، آرام و آسائش اور عزت سے زندگی بسر کرتے تھے۔ جو شاید انہیں یہاں کے ماحول میں مشکل ہی سے نصیب ہو۔

غرض لیث صاحب انگلستان چلے گئے۔ وہاں سے واپس آنے کا زمانہ قریب آیا تو بعض لوگوں نے یہ کوشش کی کہ لیث صاحب پاکستان میں رہ جائیں۔ پنجاب یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کی تنظیم ہو رہی تھی۔ چنانچہ احباب نے لیث صاحب کو آمادہ کر لیا کہ وہ یہاں چلے آئیں۔ ان میں میں بھی شامل تھا۔ اب کبھی کوئی ایسی بات ہوتی ہے جس سے لیث صاحب کو رنج ہو یا صدمہ پہنچے تو ہم سب بہت شرمندہ ہوتے ہیں۔ شاید علی گڑھ میں وہ اس سے زیادہ

خوش اور مطمئن رہتے ۔

بہرحال اس عرصہ میں میں نے لیث صاحب کو بڑے قریب سے اور بہت غور سے دیکھا۔ سب سے پہلے تو میں نے ان کے وسیع مطالعے اور قیامت کے حافظے سے متاثر ہوا۔ کتابوں کے حوالے، صفحوں کی قید کے ساتھ وہ ایسے بتاتے جاتے ہیں، جیسے کتاب سامنے کھلی رکھی ہو۔ شعر کا یاد رکھنا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ لیث صاحب کو بھی ہزاروں شعر یاد ہوں گے۔ لیکن اُن کے حافظے کا عالم ا... ہی ہے۔ لیث صاحب علی گڑھ میں اقبال کی نظمیں پڑھا رہے تھے۔ اتفاق سے جس مجموعے سے نظمیں پڑھائی جا رہی تھیں وہ موجود نہ تھا۔ طالب علم مجھے آج چھٹی مل ... یا پھر علمی گپ ہوگی۔ لیکن لیث صاحب نے معمول کے مطابق پڑھانا شروع کیا۔ جہاں پہلے دن گفتگو ختم ہوئی تھی اگلے شعر سے بحث شروع ہوئی اور آخر تک پوری نظم اسی طرح پڑھائی گئی۔ نثر کی کئی کئی صفحوں کی عبارتیں وہ اپنے طالب علموں کو حافظے سے سنا دیتے ہیں۔ کوئی قلمی نسخہ یا مطبوعہ کتاب کہیں نظر سے گزرے حافظ میں محفوظ رہ جاتی ہے۔ اور پھر یہ نہیں کہ صرف اپنی خاص دلچسپی یعنی تاریخ ادب، لسانیات اور تنقید ہی کی کتابوں کے بارے میں یہ بات درست ہو۔ تاریخ، تاریخ اسلام، فنون لطیفہ، مذہب، سب حافظے میں ایک ہی حلقے میں آجاتے ہیں۔

شاید اسی حافظے اور وسیع مطالعے کے بل پر لیث صاحب نے بہت کچھ لکھا ہے۔ انہوں نے ۱۹۲۰ء کے قریب لکھنا شروع کیا اور پچھلے پچیس سال میں ہزاروں صفحے کے مضامین، مقالات، تنقیدیں اور مستقل کتابیں لکھ ڈالیں۔ شاید ان کے معاصرین میں کم لوگوں نے اتنے متنوع اور مختلف موضوعات پر ایسے اعلیٰ پائے کی چیزیں لکھی ہوں۔ ان موضوعات میں سب سے پہلے لسانیات اور تاریخ ادب اردو ہے۔ اردو میں لسانیات پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ جن لوگوں نے لسانیات پر لیث صاحب کے وہ مضامین پڑھے ہیں جو علی گڑھ میگزین میں برسوں شائع ہوتے رہے، وہ اس میدان میں ان کی محنت اور لیاقت کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ تاریخ ادب اور تنقید میں لکھنؤ کا دبستانِ شاعری، سرسید، تذکرۂ حالی، طبقات الشعراء، میرحسن اور ان کا کلام، مصحفی، جرأت، نظیر اکبرآبادی وغیرہ ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ لیکن ان کتابوں کے علاوہ جو مضامین پچھلے پچیس سال میں شائع ہوئے، ان میں اکثر و بیشتر اس قابل ہیں کہ انہیں مرتب اور جمع کر کے مجموعے کی شکل میں شائع کیا جائے۔ غالباً غزل اور متغزلین پر اس طرح کا ایک مجموعہ مرتب ہو کر شائع ہونے والا ہے۔

اس موقع پر میں لیث صاحب کی علمی اور ادبی حیثیت پر کچھ زیادہ لکھنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ ان کے بعض دوسرے احباب شاید اپنے مطالعے اور لیاقت کے اعتبار سے اس موضوع پر لکھنے کے زیادہ اہل ہیں۔ اور میں جو کچھ لکھوں شاید اسے ایک دوست۔ نیازمند کے جذبات پر محمول کیا جائے۔ اس لئے اس سلسلے میں صرف اتنا ہی لکھوں گا کہ لیث صاحب اپنی وسیع معلومات، گہرے مطالعے، تنقید میں توازن اور متانت کے اعتبار سے معاصرین میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں، اور بلاشبہ ان کا شمار موجودہ زمانے کے چند گنے چنے نقادوں میں ہوتا ہے۔ ان کی تحریر سجھے دار ... ہوتی۔ سرسید اور حالی کی طرح انہیں سادہ اور دل نشیں اسلوب نگارش زیادہ پسند ہے۔ وہ بات کو طول نہیں دیتے۔ نہ تشبیہوں، استعاروں اور رنگین و پرقصاں ترکیبوں کا سہارا لیتے ہیں۔ انہیں اپنی رائے اور بات کی معقولیت پر اتنا بھروسہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ صاف اور سیدھے طریقے سے اس کے اظہار کو کافی سمجھتے ہیں۔ نہ وہ بعض لکھنے والوں کی طرح غیر ملکی مصنفین اور ان کی تصانیف کے حوالوں سے ناظرین کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اردو کی ادبی اور تنقیدی کتابیں پڑھنے والوں کی اکثریت ان مصنفین اور ان کے کارناموں کا شاید صحیح تلفظ بھی ادا نہیں کر سکتی، اس لئے ان کے سرسری حوالوں سے کیا فائدہ۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ خود بھی ان مصنفین اور ان کی تصانیف کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔ ان کے ذاتی کتب خانے میں لسانیات اور تاریخ زبان کے بعد سب سے زیادہ کتابیں دنیا کے مختلف ملکوں کے ادب اور تنقید پر ہیں۔ یہ سب انہوں نے بڑے شوق اور محنت سے جمع کی اور پڑھی ہیں۔

لیث صاحب کو قلمی نسخوں اور نادر و نایاب مطبوعات جمع کرنے کا بڑا شوق ہے۔ چنانچہ بھوج پتر پر لکھی ہوئی کتابوں سے لے کر لکھنوی دور تک کے شعرائے کے نسخے ان کے پاس موجود ہیں۔ میرحسن کی قلمی کلیات، قدرت اللہ شوق کا تذکرہ طبقات الشعراء، سودا کا ایک نادر قلمی کلیات، آتش کے کلیات کا ایک نسخہ جو ان کی زندگی میں لکھا گیا، ان کے قلمی کتابوں کے ذخیرے میں موجود ہیں۔ اردو شاعری کے قدیم و جدید دور کے شعرائے کے تقریباً تمام دواوین تذکرے اور

ان پر شائع شدہ کتابیں میں نے خود دیکھی ہیں۔ پھر تاریخ، آثارِ قدیمہ، مصوری، موسیقی اور ڈرامے پر بھی بہت سی نادر و نایاب کتابیں ان کے پاس ہیں۔ لاہور میں لوگوں نے اکثر لیث صاحب کو کباڑیوں اور پرانے کتب فروشوں کی دکانوں پر ان چیزوں کی تلاش میں گھومتے دیکھا ہوگا۔ جب تک علی گڑھ میں تھے ان کا دستور تھا کہ جب دلی کا چکر لگاتے تو کباڑیوں کے یہاں کتابیں تلاش کرنے ضرور جاتے اور کتنے ہی گہر ہائے نایاب انہوں نے اس طرح جمع کئے ہیں۔

علمی اور ادبی زندگی کی طرح ان کی ذاتی اور خانگی زندگی بھی بڑی دلچسپ ہے۔ لیث صاحب کو دیکھ کر شاید کوئی شخص مشکل سے باور کرے گا کہ ان کی شادی ہوئے کوئی بیس بائیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ شادی ہوئی تو طالب علمی کا زمانہ تھا۔ یہ خود علی گڑھ میں اور بیگم صاحبہ بدایوں میں تھیں۔ لیث صاحب کا معمول یہ تھا کہ جمعہ کے دن کالج ختم کرکے سیدھا اسٹیشن کا رخ کیا اور بدایوں پہنچ گئے۔ اتوار کی رات کو بدایوں سے روانہ ہوئے اور صبح کو کالج میں پہنچ گئے۔ رشید احمد صدیقی صاحب کو معلوم ہوا۔ انہیں لیث صاحب سے غیر معمولی اُنس تھا اور بڑی شفقت فرماتے تھے۔ ایک دن لیث صاحب بدایوں سے واپس آئے۔ رشید صاحب نے خیریت دریافت کی۔ ایک صاحب جو پاس بیٹھے تھے پوچھنے لگے کیا بات ہے۔ رشید صاحب نے فرمایا بھئی بیچارے آجکل (WiFOFOBiA) میں مبتلا ہیں۔ خدا رحم کرے۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ لیکن رشید صاحب کے مشورہ سے یہ طے ہوا کہ ٹھکانے سے پڑھنے کے لئے یہ چکر ختم کرنا چاہئے۔ چنانچہ لیث صاحب بیگم صاحبہ کو علی گڑھ لے آئے اور بورڈنگ ہاؤس چھوڑ کر میرس روڈ آباد کی۔ تعلیم ختم ہوئی تو وہیں ملازم ہوگئے۔ اس عرصہ میں دوسری جنگ عظیم چھڑی۔ علی گڑھ سے باہر اچھی اچھی ملازمتوں کے امکانات پیدا ہوئے لیکن یہ وہاں ایسے جمے کہ کہیں جانے کا نام نہ لیا۔ طالب علم غیر معمولی تھے۔ جب تک یونیورسٹی میں رہے ہر امتحان میں یونیورسٹی میں اول رہے۔ علی گڑھ سے اردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کی ہمت بھی پہلے پہل لیث صاحب نے کی۔ امتحان سے باہر علی گڑھ کے تمام تحریری اور تقریری مقابلوں میں بھی ہمیشہ یہی امتیاز حاصل کیا۔

لیث صاحب کو گھر اور گھریلو زندگی سے ویسی ہی دلچسپی ہے جیسی ان کے استاد رشید احمد صدیقی صاحب کے مضامین میں جھلکتی ہے۔ یونیورسٹی سے سیدھے بازار جاتے ہیں۔ دنیا بھر کا سامان خرید کر گھر پہنچے۔ پھر دوسرے دن کالج آنے کے لئے ہی گھر سے نکلتے ہیں۔ لوگوں نے انہیں بہت کم جلسوں اور دعوتوں میں دیکھا ہوگا۔ ان کا مسلک یہ ہے کہ گھر میں بیوی بچے سامنے ہوں، سارے گھریلو قضیے طے ہو رہے ہوں، یہ اپنی مسہری پر لیٹے، سردی ہو تو دھوپ میں اور گرمی ہو تو لان کے سبزہ زار پر بیٹھے حقہ پیتے ہوں۔ اس سے زیادہ مسرت نہ کسی جلسہ میں شریک ہونے سے مل سکتی ہے نہ دعوت میں۔

لیث صاحب کو اچھے کھانوں اور اچھے تمباکو کا بہت شوق ہے۔ آپ ان سے پوچھ لیجئے شہر میں سب سے اچھا گوشت کہاں ملتا ہے۔ کونسا باورچی سب سے اچھی نہاری پکاتا ہے۔ شیرمال یا پراٹھے پکوانا ہوں تو کس کی خدمات حاصل کی جائیں۔ کھانے میں مرغ اور کباب شاید لیث صاحب کی کمزوری ہیں۔ خود بھی کھاتے ہیں اور دوسروں کو بھی کھلاتے ہیں۔ کبابوں کا "شوق" کچھ "عشق" کی حد تک پہنچا معلوم ہوتا ہے۔ شاید ہی کسی وقت بغیر کسی قسم کے کباب کے کھانا کھاتے ہوں۔

اس خانہ پسندی کی وجہ سے لیث صاحب کا حلقۂ احباب بڑا محدود ہے۔ لیکن اس محدود حلقے میں احباب ان کے خلوص کی شدت، طبیعت کی قلندری، اور صاف گوئی کی داد دیتے ہیں۔ اس صاف گوئی سے انہیں اکثر نقصان ہی پہنچا ہے۔ وہ اسے جانتے اور محسوس کرتے ہیں۔ لیکن ترک کرنے پر آمادہ نہیں۔ جس شخص کے بارے میں ان کی جو رائے ہے وہ اس کے اظہار اور اعلان میں کبھی تامل نہیں کرتے اور نہ اس کے عواقب کی پروا کرتے ہیں۔ یہ بات بہت اچھی سہی لیکن کیا کیجئے کہ زمانہ اسے گوارا نہیں کرتا۔ اور لیث صاحب "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز" کی جگہ "با زمانہ ستیز" کے قائل ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ سازباز کے ماحول میں انہیں بڑا دکھ پہنچتا ہے۔

لیث صاحب میں ایک اور کمزوری ہے، وہ شدید قسم کے جذباتی انسان ہیں، معمولی معمولی باتوں کا شدید اثر قبول کرتے ہیں، اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر چھوٹی چھوٹی باتیں بہت بڑھ جاتی ہیں۔ جو لوگ ان کی فطرت سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ جذباتی آدمی صاف دل اور صاف طینت ہوتا ہے لیکن ان کے دشمن اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں، کیونکہ جذباتی ہونے کے ساتھ ساتھ انہیں غصہ بھی ذرا جلدی آتا ہے۔ لیکن اس غصہ میں وہ حفظِ مراتب کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں۔ کسی سے اختلاف ہوتا ہے تو اس کا اظہار کرنے میں شدت اختیار کرتے ہیں۔ لیکن مخالف کی پگڑی نہیں اچھالتے، شاید وہ اب تک اس بات کو محسوس نہیں کر پائے کہ اپنی

ٹوپی سنبھالنا ہو تو دوسروں کو محسوس کراؤ کہ تم بھی ان کی پگڑی اچھال سکتے ہو بلکہ انہیں شارع عام پر برہنہ بھی کر سکتے ہو۔ شاید اس طرح سوچنا یا اس پر عمل کرنا ان کی فطرت سے بعید ہے۔

لیث صاحب میں انسان دوستی کا ایک عجیب جذبہ پایا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک انسانیت خانوں میں بٹی ہوئی نہیں ہے۔ اس وقت مجھے علی گڑھ کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ علی گڑھ میں ایک بہت پرانا بیرا تھا۔ تمام دوسرے بیرے اور طالب علم اس کا لحاظ کرتے تھے۔ بعض اساتذہ جو کسی زمانہ میں طالب علم رہ چکے تھے اور اب یونیورسٹی میں عہدے دار تھے، وہ بھی اس کا خیال کرتے۔ اتفاق سے اس زمانے میں بورڈنگ ہاؤس کے کھانے کے انتظام کا ٹھیکہ ایک ریاست کے سابق وزیر اور علی گڑھ کے ممتاز اولڈ بوائے کو دیا گیا۔ اس نے ڈائننگ ہال میں جو منشی رکھا وہ ذرا تیز مزاج تھا۔ چنانچہ اس نے کسی بات پر بیرے کو گالی دے دی۔ بیرے نے جواب میں خاموشی سے اس کے منہ پر ایک تھپڑ رسید کیا۔ بات بہت بڑھ گئی۔ لیث صاحب وارڈن تھے۔ معاملہ ان تک پہنچا۔ جب پوری تفتیش کے بعد انہیں یقین ہو گیا کہ منشی جی نے پہلے گالی دی تھی تو انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ منشی جی کا قصور ہے۔ اس لئے بیرے کو سزا ملنے کا کیا سوال ہے۔ البتہ ایسے منشی کو تبدیل کر دینا چاہئے۔ لیث صاحب پر طرح طرح کے اثرات ڈالے گئے۔ لیکن انہوں نے کہا کہ بیرا بھی میرے نزدیک اتنا ہی معزز ہے جتنا کوئی دوسرا انسان۔ اگر منشی مجھے گالی دیتا تو جو حال میرا ہوتا وہی اس بیرے کا ہوا ہوگا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ لیث صاحب کی جیت ہوئی۔ جب لیث صاحب انگلستان جانے کے لئے علی گڑھ سے روانہ ہوئے اور بیوی بچے پاکستان آنے لگے۔ تو وہ بیرا بھی رخصت ہونے آیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ کہنے لگا "آپ کل جا رہے ہیں آج دفتر سے مجھے بھی آزاد کرا دیجئے۔ اتنا عرصہ نوکری کر لی۔ آپ جا رہے ہیں کوئی دوسرا آئے گا تو یہ باتیں کہاں نصیب ہوں گی۔ اب میں نوکری نہیں کر سکتا۔" لیث صاحب اسے سمجھا بجھا کر چلے آئے۔ لیکن اس بیرے نے ٹھیک کہا تھا۔ اس نے ملازمت سے استعفا دے دیا اور اپنے گاؤں چلا گیا۔ معلوم نہیں اس انقلاب میں اس پر کیا گزری۔ لیث صاحب نے ولایت سے واپس آکر اسے خط لکھا لیکن جواب نہ آیا۔

جو شخص ایک ملازم کا اتنا خیال رکھتا ہو وہ اہل و عیال کے ساتھ جیسا ہوگا ظاہر ہے۔ لیث صاحب گھر میں بھی ایک مثالی کردار ہیں۔ ان کی کنبہ پروری کا حال ان کے دوستوں سے پوچھئے۔ وہ جو کچھ پیدا کرتے ہیں اپنے بیوی بچوں اور عزیز رشتہ داروں پر صرف کرتے ہیں۔ علی گڑھ میں ان کی کوٹھی کو مزاحاً "قومی یتیم خانہ" کہا جاتا تھا باہر صحن میں چارپائیوں کی ایک قطار ہوتی۔ کچھ لوگ امتحان دینے آتے، کچھ داخلہ لینے۔ کسی کا یونیورسٹی سے نام کٹ جاتا اور ڈائننگ ہال سے کھانا بند ہو جاتا۔ کسی کے گھر سے روپیہ آنا بند ہو جاتا۔ غرض یہ سب بلا تکلف اس گھر کا رُخ کرتے۔ اب علی گڑھ والی بات تو ممکن نہیں لیکن وضعداری اب بھی قائم ہے۔

لیث صاحب کی آمدنی خاصی ہے۔ لوگ سمجھتے ہوں گے کہ انہوں نے بڑا سرمایہ جمع کر رکھا ہوگا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ وہ جو کماتے ہیں خرچ کر ڈالتے ہیں۔ یہ خرچ عیاشی یا اسراف نہیں۔ وہ اپنے اہل و عیال کی آسائش اور آرام پر مقدور سے زیادہ خرچ کرتے ہیں۔ انہیں بہترین تعلیم دلواتے ہیں اور اس پر اتنا خرچ کرتے ہیں جو شاید ان سے بہت بڑی مالی حیثیت رکھنے والے بھی برداشت نہ کر سکیں۔ انہیں اچھا کھلاتے اور اچھا پہناتے ہیں۔ گو خود اس بارے میں قدرے لاپروا ہیں۔ اور جب جون میں لاہور کا میدانی علاقہ موسم گرما کے سورج کی شعاعوں سے تپتا ہوا تانبا معلوم ہونے لگتا ہے وہ ان سب کو لے کر کوہ مری چلے جاتے ہیں۔ جہاں کی بلند پہاڑیوں گھنے درختوں کے سائے، خنک ہوا اور ٹھنڈے پانی کی فضا میں وہ اپنا خوشبودار تمباکو پیتے ہیں۔ اور سال بھر میں جو گرد و غبار، رنج و ملال اور کوفت ان کے دل پر بوجھ بن کر جمع ہوتا رہتا ہے اسے بھلا دیتے ہیں۔

عبادت بریلوی

مکین احسن کلیم

طفیل صاحب نے مجھ سے نقوش کے شخصیات نمبر کے لئے عبادت بریلوی کی شخصیت پر لکھنے کی فرمائش کی تو میں نے انہیں بے ساختہ جواب دیا کہ عبادت پر کچھ لکھنا بہت مشکل ہے ۔ وہ بھلے مانس اور سیدھے سادھے شریف آدمی ہیں ۔ ان میں کوئی خاص انوکھا پن یا کوئی ایسی خوبی یا عیب نہیں ہے جو آنکھوں کو خیرہ کر دے یا دماغ کو چکرا دے ۔ کسی پر قلم اٹھانے میں مزہ اسی وقت آتا ہے جب اس کی شخصیت غیر معمولی یا عجیب و غریب ہو ۔ یا وہ انسان ہونے کے بجائے صرف فرشتہ یا شیطان ہو ۔ طفیل صاحب اس جواب پر خاموش ہو گئے ۔ میں مطمئن ہو گیا کہ چلو گلو خلاصی ہو گئی ۔ لیکن میرا یہ احساس نجات وقتی ثابت ہوا ۔ طفیل صاحب کو دوسروں سے کام لینے کا سلیقہ خوب آتا ہے ۔ وہ کسی سے کوئی کام کرانا چاہیں تو ان سے مفر کی کوئی صورت نہیں ہے اور پھر لطف یہ ہے کہ وہ فرمائش عموماً ایک آدھ بار اور یاد دہانی ہمیشہ ذیلی زبان سے اشاروں اور کنایوں میں کرتے ہیں اور وہ بھی شاذ و نادر ہی ۔ وہ زبان سے تو کچھ نہیں کہتے لیکن تبسم تقاضا بن جاتے ہیں ۔ آخر کار مجھے بھی اعترافِ شکست ہی میں عافیت نظر آئی ۔ اب غور کرتا ہوں تو اپنا یہ جواب بھی درست نہیں معلوم ہوتا

کوئی شخصیت اسی وقت دلچسپ یا قابلِ ذکر ہوتی ہے جب وہ عجیب و غریب اور غیر معمولی بھی ہو ۔ انسانیت آج کل جس دور سے گزر رہی ہے وہ بجائے خود کچھ اس درجہ عجیب و غریب اور غیر معمولی ہے کہ اس میں کسی شخصیت کی ندرت یا یکتائی اور بے مثالی میں کوئی انوکھا پن اور نیا پن باقی نہیں رہا ہر شخص ایک منتشر خیال اور اپنی جگہ سے کچھ ہٹا اور کھسکا ہوا معلوم ہوتا ہے ۔ بیشتر افراد کی ذات بےہنگم اور بے ڈول ہو گئی ہے ۔ اکثر شخصیتیں کوزہ پشت یا نقاب پوش ہیں ۔ ہر وحدت میں ایک ناقابلِ فہم کثرت کا جلوہ نظر آتا ہے ۔ آج کل کے زیادہ تر ادیب اُکل کھرے اور قریب قریب تمام شاعر سر پھرے ہیں ۔ ان کی زندگی سراپا تکلف اور مکمل تصنع ہے ۔ اب کسی کردار میں کجی یا الجھاؤ دیکھ کر کوئی شخص حیرت و استعجاب کا اظہار نہیں کرتا ۔ گویا اس سے توقع ہی اسی کی تھی ۔ ہر شخص اپنے لیبل سے پہچانا جاتا ہے ۔ اب انسان نایاب ہو گیا ہے اور صرف فرشتہ یا شیطان بن کر رہ گیا ہے ۔ ان حالات میں کسی کا عام انسان باقی رہنا اور بشری خصائل کو برقرار رکھنا یقیناً ایک قابلِ ذکر بات ہے ۔ عبادت کا سب سے بڑا وصف یہی ہے کہ وہ غیر معمولی انسان نہیں ہیں ۔ وہ عامی تو نہیں ہیں لیکن ان میں ایک بڑی خوشگوار عامیت اور یکسانیت ضرور ہے ۔ اور اسی احساس نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اپنی ایک تہائی عمر کا سمندر متھ کر اس میں سے یادوں کا امرت نکالنے کی کوشش کروں ـــــ یادیں جو ان کے مضامین اور مقالات کی طرح طویل ہیں ۔ جن میں شرح و بسط اور تفصیل و تسلسل ہے ۔ جو اتنی پھیلی اور بکھری ہوئی ہیں کہ ان میں اجمال و جامعیت پیدا کرنا آسان نہیں ہے ۔ لیکن عبادت کی تحریروں کی طرح ان کی شخصیت کے مطالعے اور جائزے کے لئے سنبھل کر یا ہوشیار ہو کر

بیٹھنے کی ضرورت نہیں ہے ۔ ان کے گہرے اور ہلکے نقوش آہستہ آہستہ اُبھرتے ہیں ۔ ان میں استواری اور ثابت قدمی ہے لیکن دھیمے پن اور آہستگی کے ساتھ جس طرح ان کی تنقید نے غیر محسوس طور پر سلامت روی کے ساتھ اور بتدریج اردو ادب میں اپنی جگہ بنا لی ہے اسی طرح ان کی شخصیت کا اثر بھی غیر مرئی اور غیر شعوری ہوتا ہے ۔ وہ جھنجھوڑتے یا چونکاتے نہیں ۔ دوسروں کو کہنی مار کر آگے بڑھ جانے یا کوئی مصنوعی انداز اختیار کر کے اپنی جانب توجہ مبذول کرانے کی ان میں صلاحیت ہی موجود نہیں ہے ۔ ان میں برق رفتاری اور طوفان خیزی نہیں اعتدال اور میانہ روی ہے بلاغت اور معنویت ہے ۔ تندی اور تابانی کم ہے ۔ توازن اور توانائی زیادہ ہے ۔ ان کی شخصیت پیچ در پیچ نہیں تہ در تہ ہے ۔

عبادت کی شخصیت کے عناصر ترکیبی کو چیر پھاڑ کر اس کے ایک ایک جزو کا مفصل تجزیہ کرنا یا اس کی ایک ایک تہ کو الگ الگ کر کے اس کی کیفیاتی اور کیمیائی تحلیل کرنا ان کی شخصیت کا خون کرنے کے مترادف ہے اور میں اس سفاکانہ جرم کا ارتکاب کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں ۔ عبادت کو جاننے اور پہچاننے کے لئے میرے خیال میں اس کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے ۔ کیوں کہ وہ کوئی معمہ نہیں ہیں ۔ ان کی شخصیت ان کی زندگی کی طرح مطلع اور مستقیم ہے ۔ سیدھی اور صاف ہے لیکن سپاٹ یا زمین دوز نہیں ۔ اس میں کوئی خاص اُلجھن یا گھٹن نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو اس کے چھپانے یا پُر اسرار بنانے کے لئے وہ لیپ پوت اور میک اپ نہیں کرتے ۔ ان کی خارجی اور داخلی زندگی کے عناصر قریب قریب وہی ہیں جو ہمیں بالعموم نظر آتے ہیں ۔ عبادت دنیا دار ہیں لیکن ظاہر دار اور کاروباری نہیں ۔ انہوں نے اپنے طبقے یا معاشرے کے خلاف کوئی بغاوت نہیں کی ۔ بغاوت یا انقلابیت سے ان کی فطرت میل نہیں کھاتی ۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ وہ کسی محاذ پر جم کر مقابلہ کرنے کے قابل نہیں ہیں یا وہ کبھی نرغے میں آجائیں تو فوراً ہار مان لیتے یا سپر ڈال دیتے ہیں ۔ وہ فتنہ و فساد سے حتی الامکان گریز کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان پر کوئی چڑھ دوڑے تو وہ بڑی بے جگری سے مقابلہ کرتے ہیں ۔ عبادت نے اپنی کشتیٔ حیات کو موجوں کے رحم و کرم یا ہوا کے رخ پر نہیں چھوڑ رکھا ہے ۔ ان کی زندگی مشقت اور ریاضت سے بھرپور ہے ۔ اس میں کشمکش اور جد و جہد ہے اور وہ اس سے پوری سرگرمی کے ساتھ دست و گریباں ہیں ۔ اس کے باوجود عبادت میں ایک عجیب قلندری اور درویشی ملتی ہے ۔ ان میں ایک استغنا اور بے نیازی ہے ۔ باہمہ اور بے ہمہ والی کیفیت ہے ۔ وہ زندگی کے تمام طوفانوں کو اپنے دل میں سمیٹے ہوئے ہیں پھر بھی بڑے جنم قسم کے آدمی نظر آتے ہیں ۔ ثابت قدمی اور استقلال ان کی شخصیت کا مرکزی وصف ہے ۔ زندگی کے غم آگیں اور کرب انگیز حالات میں بھی ان کا توازن و اعتدال قائم رہتا ہے اور ان کی جبین شکن آلود نہیں ہونے پاتی ان کے لبوں پر ہمیشہ ایک بے ساختہ اور نرم تبسم کھیلتا رہتا ہے ۔ ان کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ ناساز گار حالات اور انتہائی پریشانی کے عالم میں بھی ان کے معمولات میں کوئی فرق نہ آنے پائے ۔

عبادت کی زندگی آداب کی پابند لیکن تکلفات سے خالی ہے ۔ انہیں نستعلیق قسم کا آدمی تو نہیں کہا جا سکتا لیکن ان کی سلامت سے کبھی انکار نہیں کیا جا سکتا قرینہ اور شائستگی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے ۔ ان میں سادگی ہے لیکن بے رنگی نہیں ہے ۔ خوش مذاقی کا فقدان یا نمود و ٹیپ ٹاپ نہیں ہے ۔ وہ تصنع سے دور بھاگتے ہیں لیکن زیب و زینت سے نفرت نہیں کرتے بلکہ ان میں سادگی اور نفاست پسندی کا ایک متوازن امتزاج ملتا ہے ۔ ان میں اگر تمرد اور جھوٹا پندار نہیں ہے تو مصنوعی خاکساری اور بناوٹی عجز و انکسار بھی نہیں ہے ۔ عبادت کے لباس اور رہن سہن ، وضع قطع اور ذوق و مذاق غرض ان کی تمام ذاتی خصوصیات سے توازن ، انضباط پسندی اور شائستگی کا ثبوت ملتا ہے ۔ عبادت خوش خور اور مہمان نواز ہیں ۔ لباس اور جامہ زیب ہیں ۔ ذاتی آرام و آسائش کی جزئیات پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں بلکہ اس معاملے میں ضرورت سے زیادہ حساس واقع ہوئے ہیں ۔ ایک زمانے میں جب انہیں اپنی پسند کا مکان نہیں ملتا تو اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے اسی کا رونا روتے رہتے تھے ۔ انہیں معمولی سا نزلہ کبھی ہو جائے تو وہ بالکل نڈھال ہو جاتے ہیں ۔ آنا جانا اور ملنا جلنا ترک کر کے صاحب فراش بن جاتے ہیں ۔ ہفتوں گھر سے باہر نہیں نکلتے ۔ بعد میں ان سے شکایت کی جائے کہ وہ اتنے دن کہاں غائب رہے تو وہ بڑے دردناک اور مظلومانہ لہجے میں اپنی بپتا بیان کرتے ہیں " ارے صاحب میں تو بڑا بیمار ہو گیا تھا ۔ ایک ہفتہ طبیعت اتنی خراب رہی کہ بالکل بستر سے لگ گیا ۔ نزلہ تو تھا ہی ہر وقت یہی معلوم ہوتا تھا کہ بخار اب آیا اور اب آیا ۔ جوڑ جوڑ میں اتنا شدید درد تھا جیسے کوئی جان نکالے لے رہا ہو میں نے زندگی میں اتنی شدید بیماری کبھی نہیں اٹھائی "

ان کی باتیں سن کر کسی کو ہنسی آ جائے یا کوئی انہیں ٹوک دے کہ نہیں صاحب آپ مبالغے سے کام لے رہے ہیں ورنہ نزلہ بھی کوئی بیماری ہے تو وہ ہنس کر خاموش ہو جاتے ہیں لیکن ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہوتا کہ اس تردید سے انہیں جتنی تکلیف ہوئی ہے اتنی تکلیف شاید انہیں اپنی بیماری سے بھی نہیں ہوئی تھی۔ ان کی مبالغہ آرائی کا شکار کبھی کبھی ان کی مروت اور وضعداری کا ہاتھ ہوتا ہے جس سے ناجائز فائدہ اٹھانے والوں کی کمی نہیں ہے۔ اس کی کوشش عموماً وہی لوگ کرتے ہیں جنہیں اپنی بے مائگی اور کہتری کا شدید احساس ہوتا ہے اور جو ادیب کی حیثیت سے اتنے پستہ قد اور کم عیار ہوتے ہیں کہ منظر عام پر آنے اور شہرت حاصل کرنے کے لئے کسی سہارے اور مددگار یا کسی ایسی قد آور شخصیت کی دستگیری کی ضرورت ہوتی ہے جو اس ادبی بونے کو اپنے کندھوں پر بٹھا کر یہ اعلان کر دے کہ اسے حقیر اور بے حقیقت سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے۔ عبادت بعض اوقات ان عیاروں کے دام میں گرفتار ہو جاتے ہیں جو ان کی شرافت اور مروت سے پورا پورا استفادہ کرتے ہیں اور اپنی عارضی مشیخت اور تفاخر کی قیمت کی ادائیگی عبادت کی شہرت اور نیک نامی کے سر منڈھ دیتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ عبادت ——— اور صرف عبادت نہیں بلکہ تمام مقدمہ نویس اور نقاد ایسے مواقع پر ہمدردی کے مستحق ہوتے ہیں اور پھر نیت کا علم جب کسی کو ہو ہی نہیں سکتا تو کسی لغزش یا فیصلہ کی غلطی کو فروگزاشت اور افراط و تفریط کو مجبوری کیوں نہ کہا جائے۔

بے رنگ ادبی مجلسوں کو عبادت بڑی خندہ پیشانی اور ہمت سے جھیل جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ جن لوگوں کا ادبی مذاق بقول فراق روحانی ضعف باہ کا شکار ہے ان سے ملاقات کے وقت وہ جس تحمل اور قوت برداشت کا ثبوت دیتے ہیں وہ ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایم۔ اسلم ایسے لوگ بھی ان کے مداح ہیں۔ ان کی بُردباری قابل رشک ہے۔ اعتراف جوہر کے ساتھ احترام جہل کا یہ مادہ میں نے کم لوگوں میں دیکھا ہے۔

عبادت کی علم دوستی، کتابوں سے گہری محبت اور اپنے کام میں ان کی انتہائی محویت و استغراق نے بھی زندگی کی رنگینیوں، حلاوتوں اور محظوظ اور لطف اندوز ہونے کی صلاحیتوں کو کند نہیں کیا۔ انہیں زندگی کی دلچسپیوں سے والہانہ عشق ہے۔ تدریس و تصنیف میں عرصہ تک مصروف رہنے کے بعد وہ فرصت و فراغت سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں اور طویل تعطیلیں عموماً سیر و سیاحت میں گزارتے ہیں۔ فرصت کے وقت وہ احباب کے ساتھ یا تو کسی چائے خانے میں بیٹھ جاتے ہیں یا لارنس کی پُرکیف شاموں میں تنہا حسن فطرت کی رنگینیاں دل و نظر کے دامن میں سمیٹتے نظر آتے ہیں۔ ماحول اچھا اور پاکیزہ ہو، موسم سہانا اور خوشگوار ہو تو وہ باغ باغ ہو جاتے ہیں اور یہ معلوم کرنا مشکل نہیں ہوتا کہ ان کی ظاہری سنجیدگی کی تہ میں زندہ دلی اور خوش وقتی چھپی ہوئی ہے۔ عبادت کو حسن فطرت کے ساتھ حسن انسانی سے بھی دلچسپی ہے۔ ان کا جمالیاتی شعور ان کی تنقید نگاری کی نذر نہیں ہوا بلکہ وہ کافی رنگین مزاج اور ذہنی عیاش واقع ہوئے ہیں لیکن ان کی رنگین مزاجی بڑی پاکباز اور ذہنی عیاشی انتہائی پارسا ہوتی ہے۔ ان کے جذبات میں اکثر لہریں اٹھتی ہیں لیکن ان میں کبھی بے راہ روی یا جذباتیت پیدا نہیں ہوتی اور ان لہروں کو کبھی طوفان نہیں بننے دیتے۔ ان میں اس چھچھورے پن یا لپتی کا دور دور نشان نہیں ملتا جو بعض معمر اور سن رسیدہ اساتذہ میں بھی قریب سے دیکھنے پر نظر آتی ہے۔ عبادت شدت جذبات کے وقت بھی اپنی حد سے تجاوز نہیں کرتے

لیکن زندگی میں انسان کو ہمیشہ بیدار مغز آدمیوں کی نہیں بلکہ اچھے دل والے انسان اور مخلص دوست کی ضرورت بھی محسوس ہوتی ہے۔ میں ادیبوں اور شاعروں سے عموماً بچ کر اور ان کے اجتماع سے ہمیشہ دور بھاگتا ہوں لیکن عبادت محض ادیب نہیں ہیں۔ ان سے ملاقاتیں کم ہی ہوتی ہیں ایک بار مل کر دو عرصہ تک ڈوبے ہوئے اور مفقود الخبر رہتے ہیں لیکن ان سے دوری کا احساس کبھی نہیں پیدا ہونے پاتا۔ ان سے ملنے کو دل اس وقت بے اختیار چاہتا ہے جب میں بہت زیادہ قریب رہنے والے دوستوں سے اکتانے سا لگتا ہوں یا جب فراق کے الفاظ میں ان سے پیار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہوں جن سے مجھے پیار نہیں ہوتا۔ ملاقات کے وقت اگر عبادت سے کوئی دہلی یا لکھنؤ کا ذکر چھیڑ دے تو ان کا انداز گل افشانی دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ دہلی کے ادیبوں اور ادبی مجلسوں، وہاں کے پُربہار صبح و شام، ہنگاموں اور دلچسپی سے معمور فضا اور حسن و لطافت سے بھرپور زندگی کے ذکر میں بڑی رطب اللسانی سے کام لیتے ہیں۔ لکھنؤ کا ذکر چھڑ جائے تو دانش محل کی محفلوں، احتشام صاحب سے ملاقاتوں، فرحت کے یہاں کی نشستوں، کافی ہاؤس کے جمگھٹوں، امین آباد اور حضرت گنج کی شاموں سے کر ٹُنڈے کے کباب تک ہر موضوع کو مزے اور چٹخارے لے کر بیان کر جاتے ہیں۔ عبادت کو کافی عرصے کے بعد پا کر عموماً میں اپنے آپ کو کھو دیتا ہوں۔ ان کے ساتھ خاموش بیٹھنے یا خاموشی کے ساتھ اور کسی منزل کا تعین کئے بغیر چلتے رہنے کو جی چاہتا ہے۔

خاموشی بُعد اور بے گانگی کی نہیں انسیت اور یگانگت کی ہوتی ہے۔ عبادت کی ذات لاہور میں میرے لئے ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ ان کا معجزہ یہ ہے کہ ان میں مجھے اپنے بہت سے دوستوں اور کرم فرماؤں کی جھلکیاں نظر آتی ہیں اور ان سے مل کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمان و مکان کی حایل ٹوٹ گئی ہیں اور ان سب سے بیک وقت ملاقات ہوگئی ہے۔ عبادت میں مجھے کبھی تو احتشام حسین کی سادگی اور پرکاری ملتی ہے کبھی علی جواد زیدی کی بیدار مغزی اور روشن خیالی کبھی حبیب الرحمان کا چاہو ا دماغ اور قربانی کے جذبے سے معمور دل کبھی منان کی ساحرانہ ذات اور رویے المشربی اور کبھی نسیم احمد کی صداقت جذبات، مزاج کی نرمی اور لہجے کی مٹھاس۔ اس رنگارنگی کی وجہ غالباً یہ ہے کہ عبادت نے دوستی کو نگلا نہیں ہضم کیا ہے، اپنے ہم نشینوں کے اوصاف اور صحت مند اثرات کو قبول کیا ہے اور ان خوبیوں کو اپنی ذات میں سمویا اور جذب کیا ہے۔ عبادت کم آمیز نہیں لیکن دیر آشنا ضرور ہیں۔ ان کی شخصیت کا کنول آہستہ آہستہ کھلتا ہے لیکن انہیں قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کے بعد ان کا گرویدہ نہ ہو جانا ناممکن ہے۔

عبادت کی نقادانہ صلاحیتوں کے متعلق کوئی رائے ظاہر کرنے کا یہ موقع نہیں ہے لیکن ان کے ایک پہلو پر شاید ہی کسی کی نظر پڑی ہو۔ عبادت ادب کے افق پر ایک شاعر کی حیثیت سے اُبھرے تھے لیکن کچھ عرصے کے بعد انہوں نے تنقید نگاری شروع کردی اور نقاد کی حیثیت سے ان کا قد و قامت جیسے جیسے بلند ہوتا گیا ان کی شاعری کم ہوتی گئی۔ اور اب تو یہ حال ہوگیا ہے کہ ان سے شعر سنانے کی فرمائش کی جائے تو ان کے چہرے پر رنگ آجاتا ہے اور وہ کچھ شرمندہ سے ہو جاتے ہیں جیسے ان کی کسی بہت بڑی غلطی یا خامی کا بھری محفل میں ذکر کر دیا گیا ہو۔ ان کی تنقید نگاری کے عیوب و محاسن سے قطع نظر ان کی نقادانہ حقیقت پسندی کے اس پہلو کا ذکر نہ کرنا انتہائی حق ناشناسی ہے۔

عبادت کی سرشت اور مذاق کی تعمیر میں ایک سے زائد آب و ہوا کا دخل ہے۔ روہیلکھنڈ، لکھنؤ، دہلی اور پنجاب سب نے ان پر اپنا اپنا مخصوص اثر ڈالا اور اپنا اپنا رنگ چڑھایا ہے اور غالباً یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان میں ایک خاص قسم کی طرح داری اور بانکپن کے ساتھ ایک شگفتگی اور تازگی بھی ملتی ہے۔ اٹھنے بیٹھنے کے انداز کے ساتھ تصنع سے نفرت نے ان میں ایک منفرد آن بان پیدا کر دی ہے۔ اسی لئے ان کے مزاج میں تباین و تضاد کے بجائے گوناگونی اور مرنجاں مرنج بدرجہ اتم ملتی ہے۔ عبادت کی شخصیت بہت دلکش اور دلنشیں ہے لیکن ان میں کبھی کبھی تیکھے پن یا دبی دبی سی شوخی کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔ عبادت کے دمکتے اور مسکراتے ہوئے چہرے، ان کی سرگیں اور مستعد آنکھوں، ان کی فطرت کی متانت اور سنجیدگی، ان کے مزاج کی شگفتگی اور تازگی، ان کی طباعی اور ان کے ضبط و اعتدال نے ان کی ذات میں ایک دلپذیر جاذبیت اور شخصیت میں ایک وجاہت پیدا کر دی ہے۔ عبادت میں لکھنؤ کا رسیلا پن اور مٹھاس بھی ہے اور پنجاب کا کھرا پن اور بے ریائی بھی۔ انہوں نے لکھنؤ کی خارجیت کے بجائے دہلی کی داخلیت کو اپنایا ہے۔ ان میں کرختگی اور کھردرا پن نہیں ملتا۔ عبادت کو لکھنؤ، دہلی اور پنجاب نے انہیں مل کر سنوارا اور پروان چڑھایا ہے اور ان پر اپنا اثر ڈالا ہے اور اسی سے پیدا ہونے والے حسین و متوازن امتزاج میں عبادت کی شخصیت کا عطر ہے۔

غلام عبّاس

پریم ناتھ در

غلام عباس ۔۔۔۔۔ ذکر چھڑتے ہی مجھے پوربیوں کا ایک چھوٹا سا گیت یاد آتا ہے جسے اس طرف کے ''بھیّین'' بھی بے تکلفی کے موقع پر اور دروازے بند کر کے ہی گاتے ہوں گے۔ میں اس گیت کو یہاں نہیں دہرا سکتا۔ لیکن پوربیوں کا وہ گیت میرے ذہن پر نرم نرم، موٹا موٹا، اُبھرا اُبھرا، اسی انداز میں بیٹھا ہوا ہے جیسے غلام عباس کے وہ دو ہونٹ جن سے اس نے گیت کے ایک ایک بول کو بھینچ بھینچ کر سنایا تھا ـــــ غلام عباس کے ہونٹوں سے بڑھ کر اس کی شگفتہ پیشانی ہے جس پر ہمہ وقت ایک دعوت کھلی رہتی ہے اور ملاقاتی آنکھیں اٹھاتے ہی صحبت کا حظ لینے لگتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان کو آپ کے ساتھ بات کرنے کی فرصت نہیں ہے، یا فرض کیجئے کہ انسانی جذبے کے تحت وہ عدیم الفرصتی کا اظہار کرنا چاہتے ہیں تو وہ آپ سے رک رک کر معافیاں مانگیں گے، تفصیل کے ساتھ وجوہات بتا دیں گے اور اس مسئلے کی اہمیت سمجھا دیں گے جو اس وقت درپیش ہے۔ مگر جب وہ اپنے مضمون کی طرف دھیان لگا کے کسی لکھی ہوئی سطر کو بنا آواز نکالے اپنے انہی ہونٹوں سے پڑھنے لگیں گے اور آپ رخصت ہونے کو کھڑے ہو جائیں گے تو وہ فوراً کاغذ کو ایک طرف سرکا کے آپ کو کندھوں سے پکڑ کر بٹھائیں گے، موٹے موٹے ہاتھوں سے اپنی بڑی بڑی جیبیں ٹٹول کر سگرٹ کا ایک ڈبہ نکال لیں گے۔ ایک سگرٹ آپ کو پیش کر کے ایک اپنے ہونٹوں میں پھنسا کر، کرسی پر ٹیک لگا کے، ٹانگیں لمبی کر کے، ایک اچھے اونچے درجے کے ماہرِ فن کے انداز میں بیٹھیں گے۔ پہلے آپ کے کسی کارنامے کی تعریف کریں گے۔ آپ کو دور دراز صوبوں، ملکوں کی پرانی کہانیاں اور لطیفے سُنائیں گے۔

اور غالباً پوربیوں کا وہ گیت بھی سُنا ڈالیں گے۔ پھر نہ ان کو اپنی مصروفیت کا خیال رہے گا نہ آپ کی ملاقات کے ابتدائی ٹکڑے کا۔

غلام عباس فوراً ہی بے تکلف نہیں ہو جاتے، گفتگو بڑھتی جاتی ہے، تکلف گھٹتا جاتا ہے۔ بات جو کہیں تھی کہیں پہنچ جاتی ہے اور غلام عباس جو صرف مسکرا رہے تھے ہنسنے لگتے ہیں۔ لیکن پھر بھی وہ کھلکھلا کر کبھی نہیں ہنستے۔ زیادہ ہنسی آئے گی، منہ پر خون بھی لپکے گا لیکن وہ سر کو جھٹکے آواز کو دانتوں تک نیچے روک روک کر ہی ہنستے رہیں گے، جیسے ان کو یہ ڈر ہو کہ منہ کے زاویے بہت بگڑ جائیں گے۔ غلام عباس کو میں نے کبھی غصے میں بھی چلاتے نہیں سُنا۔ کچھ بھی ہو گیا ہو، کنپٹیاں تک لال ہو گئی ہوں، غلام عباس آپ کی طرف ایسے دیکھیں گے جیسے انہیں غصہ نہیں تعجب ہو رہا ہے۔

ملاقات کتنی ہی لمبی ہو جائے آپ کبھی اُکتائیں گے نہیں۔ بیچ بیچ میں پوچھ کے وہ آپ کی بات بھی سُنتے رہیں گے اور آپ پھر دل و جان سے ان کی ساری باتیں سُن رہے ہوں گے۔ یوں بھی ان کی باتیں دلچسپ ہوتی ہیں۔ واقعات ایسے بیان کرتے جاتے ہیں جیسے دلپذیر افسانہ سُنا رہے ہوں۔

کئی بار وہ گھر ہی سے یہ تہیہ کر کے آتے ہیں کہ ان کے کلام سے ان کی بزرگی اور وقار ظاہر ہو۔ لیکن آپ اپنے دل میں ان کے لئے عزت سے زیادہ پیار کا جذبہ لے کر آئیں گے۔ کیونکہ ان کے چہرے کی بھاری، چوڑی اور موٹی بناوٹ کے نیچے ان کے ٹوٹتے ہوئے دانت کی جھری میں سے ان کی سادگی، معصومیت اور پیارا پیارا مسکراتا ہوا بچپن جھانک ہی لیتا ہے۔

میلہ ٹھیلہ ہو یا تہوار کا دن، عید کی بھیڑ بھاڑ ہو یا محرم کا جلوس، غلام عباس گھر سے باہر نہیں جائیں گے۔ مزاج میں سنجیدگی اور کم آمیزی اس حد تک ہے کہ کسی دوست کے گھر بھی کسی بہت ضروری وجہ کے بغیر نہیں جاتے۔ لیکن کسی ادب نواز افسر کے گھر اگر کھانے کے ساتھ ساتھ ایک بے تکلف مشاعرے کا پروگرام ہے تو غلام عباس اپنے ذمے نامہ بر کا کام بھی لے لیں گے۔ دن بھر ٹیلیفون کرتے رہیں گے اور جو لوگ ٹیلیفون پر نہیں ملیں گے انہیں گھر جا جا کے کہہ آئیں گے۔

انہیں کھلانے کا بے حد شوق ہے۔ ان کے گھر روز ایک مخصوص لذت کا گوشت پکتا ہے جس میں کوئی نہ کوئی سبزی ضرور ہوتی ہے، چاہے سبزی کوئی بھی ہو، سالن کا مزا ہر روز ایک جیسا ہوتا ہے اس کے رنگ میں بھی فرق نہیں پڑتا۔ روز گھر سے بندھی ہوئی ایک مقدار دفتر آتی ہے۔ اگر ان کے پاس دو تین آدمی بھی بیٹھے ہوں تو غلام عباس یونہی تواضعاً نہیں پوچھیں گے بلکہ سالن کی اسی مقدار کو ٹفن کیریر کے الگ الگ حصوں اور ڈھکنوں میں بانٹ کر سب کے آگے رکھ دیں گے۔ اگر کوئی ان کے گھر دعوت میں پہنچ جائے تو وہ اسے جی بھر کے کھلائیں گے۔ اتنا کہ عمر بھر یاد رہے گوشت لذیذ ہو گا، اپنے دیسی رنگ ڈھنگ کا، اور غلام عباس اسے ایک انگریزی نام دے کر زیادہ دلچسپ بنائیں گے اور کھانے والا جتنی تعریف کرتا جائے گا اتنا اور گوشت اس کے سامنے آتا جائے گا۔

مذاق مذاق میں عباس صاحب نے ایک دن اپنے گھر ایک سالم بکرا کٹوایا اور چھ "پیٹ پہلوانوں" کو سیر ہونے کی دعوت دی۔ پکا ہوا لذیذ گوشت تل تل کے برتنوں میں آتا گیا اور جس نے جس مقدار کا برتن مانگا اس کے سامنے وہی رکھ دیا گیا۔ ان میں ایک حکیم صاحب بھی تھے جنہوں نے دو سیر کھا لیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ حکیم صاحب کو چھ دن تک ہیضہ نما بدہضمی لاحق رہی اور وہ بال بال بچے۔ غلام عباس نے دراصل ایک اور دوست کا دعویٰ غلط ثابت کرنے کے لئے اتنا گوشت پکوایا تھا لیکن اس شخص نے پورے ڈھائی سیر کھا کر ہڈیوں تک کو سفوف بنا کر رکھ دیا اور حکیم صاحب ہار گئے۔ اس دعوت میں ڈیڑھ سیر سے کم کسی نے نہیں کھایا تھا لیکن غلام عباس نے حسب عادت دو تین نرم نرم بوٹیاں لیں۔ ان کے پسندیدہ کھانوں کی فہرست بہت مختصر ہے۔ وہ چھوٹے بکرے کی اگلی ٹانگوں کا گوشت کھاتے ہیں، دوسری کسی قسم کا گوشت نہیں کھاتے۔ مرغا ہو یا مرغابی، مچھلی ہو یا شکار، کسی اور جانور کا گوشت وہ کبھی نہیں کھائیں گے۔ کھانے کے معاملے میں وہ حد درجے کے حساس واقع ہوئے ہیں اور کھانے کی ایک قائم شدہ عادت کی حدود سے باہر نہیں آ سکتے۔

انہیں ایک ادبی مجلس چاہئے اور ہو سکے تو ملکی دُھن میں ایک آدھ مشاعرہ بھی ہو جائے، ایسے شعروں کا جنہیں شاعر چھپوا نہ سکیں۔ اور اگر اس قسم کی مجلس کوئی بڑا آدمی یا بڑا ادیب اپنے گھر بُلا رہا ہے تو اس وقت بھی غلام عباس سب کو بلاتے اور اطلاع کرتے پھریں گے۔

سنجیدہ ادبی مجلسوں میں جانے سے پہلے غلام عباس یہ ضرور معلوم کریں گے کہ مجلس میں اور کون کون شریک ہو گا۔ خیر یہ بات تو انہیں کوئی امتیازی خصوصیت نہیں دیتی۔ ہر شائستہ ادیب اس کا دھیان رکھتا ہے۔ لیکن جب بھی وہ کسی سوسائٹی یا مجلس میں دلچسپی لیں گے تو اس کی خاطر ہر تکلیف برداشت کرنے کے لئے تیار رہیں گے۔ حلقۂ ارباب ذوق دہلی کی دلچسپ مجلسوں کے لئے جب کوئی جائے نشست نہ رہی تو غلام عباس نے اپنا گھر پیش کیا۔ کئی مہینوں تک انہی کے گھر حلقے کی مجلسیں ہوتی رہیں۔ ان کے اشتیاق اور دلچسپی کی حد دیکھئے کہ ایک دن کسی نامعلوم وجہ کی بنا پر صرف ایک ہی صاحب مجلس میں شریک ہونے کو آئے جنہیں اس دن اپنا افسانہ پڑھنا تھا۔ غلام عباس نے اس دن بھی نشست منعقد کی۔ بڑے عجیب و غریب طریقے پر خود مجلس کی صدارت سنبھالی، صاحبِ افسانہ کو پڑھنے کا حکم دیا اور سامعین کی جگہ اپنے کتے کو بٹھا دیا۔

غلام عباس کے بارے میں کئی لوگوں کو غلط فہمی ہے کہ وہ مغرب پسند ہیں اور زندگی کے ہر شعبے میں انگریزیت کو اپنانا چاہتے ہیں۔ ایسا سمجھنے والے دراصل ان کی سطح کو دیکھتے ہیں، سطح کے نیچے گہرائی میں دیسی غلام عباس کو نہیں پہچانتے۔ مثال کے طور پر آپ ان کے ساتھ انگریزی میں بات کر کے دیکھ لیجئے۔ انگریزی میں صرف ان کے ہونٹ ہلتے رہیں گے لیکن الفاظ جب بھی نکلیں گے خالص اردو کے ہوں گے۔ آپ انگریزی بولتے جائیے وہ "بالکل بالکل بالکل" کرتے ہوئے آپ کے جملوں کا ساتھ دیں گے یا زیادہ سے زیادہ " YES, YES بالکل بالکل" کہتے جائیں گے۔

ان کے پاس ہزاروں کتابیں ہیں جنہیں انہوں نے بڑی کاوش سے جمع کیا ہے۔ سیکنڈ ہینڈ کتابوں کے پرانے خریدار ہیں۔ مشہور مصنفوں کی بڑی بڑی کتابیں نہ جانے کہاں کہاں سے نکال لاتے ہیں۔ سب کی سب کتابیں الماریوں میں قرینے سے رکھی رہتی ہیں۔ بیشتر کتابیں انگریزی کی ہیں لیکن ان کے دوش بدوش اپنی دیسی کتابیں بھی کم تعداد میں نہیں۔ ان میں اکثر انگریزی کتابیں ایسی ہیں جنہیں غلام عباس نے پڑھا ہی نہیں یا پڑھا ہے تو زیادہ سے زیادہ اس عبارت کو جو کتاب کے گرد پوش کے اندر مڑے ہوئے حصے پر ہوتی ہے۔ اسی حد تک وہ انگریزیت پسند ہیں۔ وہ بہت کم پڑھتے ہیں اور اگر کبھی پڑھیں گے بھی تو انگریزی افسانے کیونکہ انگریزی میں دنیا بھر کے افسانے پڑھنے کو ملتے ہیں۔

میں غلام عباس کے لکھنے کے بارے میں یہاں کچھ کہنا ضروری نہیں سمجھتا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ غلام عباس ایک ایک سطر کو لکھ لکھ کر پانچ پانچ چھ چھ بار بغیر آواز نکالے اپنے موٹے موٹے نرم نرم ہونٹوں سے ایسے پڑھتے ہیں جیسے کوئی عامل بھوت اتارنے کے لئے منتر پڑھ رہا ہو۔

آپ کو ان کے گھر میں ایک آدھ انگریزی ساز بھی رکھا ہوا ملے گا۔ لیکن پوچھئے تو ان کو اس پر آدھی دھن بھی بجانی نہیں آتی ویسے وہ اس فن میں ملک کے ایک بڑے استاد کے شاگرد ہیں اور اس بات پر بڑا فخر کرتے ہیں۔

غلام عباس کبھی کبھی اونچی ٹانگوں والی انگریزی لیگ ہارن (LEGHORN) مرغیاں پالتے ہیں اس لئے کہ ان مرغیوں پر کبھی کبھی انعام ملتا رہتا ہے۔

غلام عباس سے ملے ہوئے مجھے اب سات سال ہو گئے ہیں۔ اس اثناء میں وہ ولایت بھی رہ آئے ہیں اور سنا ہے وہاں انہوں نے ایک اور شادی بھی کر لی ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ بہت بدل گئے ہوں لیکن مجھے یقین نہیں آتا۔ میں اب بھی اسی غلام عباس کو دیکھتا ہوں کہ گھر آئے، اپنا انگریزی قسم کا لمبا کوٹ اتار پھینکا، ہاتھ سے پائپ کو ایک طرف گرا دیا، تہمد باندھا، رضائی کھولی، اوڑھی اور سردی کا لطف لینے لگے اور وہیں بیٹھے بیٹھے اپنے دیسی الٹے توے کے بڑے بڑے پھلکے، ان کے بڑے بڑے نوالے جلد جلد کھائے اور سو گئے۔

حجاب امتیاز علی

شوکت تھانوی

میں حجاب امتیاز علی کو جانتا ہوں، بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ مگر اتنا نہیں جاننا جتنا جاننا چاہئے۔ مصیبت سب سے بڑی یہ ہے کہ ان کی ادبی شخصیت کو زیر بحث لانے کی اجازت نہیں۔ اور ان کی نجی اور گھریلو شخصیت درکار ہے۔ اگر یہی شرط تھی تو ان پر مضمون لکھوانا چاہئے تھا خود سید امتیاز علی صاحب تاج سے یا ان کی بچی عزیزہ یاسمین امتیاز علی سے یا ان کی خواہر محترمہ مسز کاظم علی سے اور اگر کوئی غیر متعلق ہی لکھنے والا درکار تھا تو یہ خدمت سپرد کرنا تھی نذر سجاد حیدر صاحبہ کو۔ مگر معلوم نہیں کیوں ایک پتلی گردن والا میں نظر آیا اور قرعۂ فال میرے نام نکلا۔ اس میں شک نہیں کہ مقربین میں میرا نام بھی اس حیثیت سے لیا جا سکتا ہے کہ میں محترمہ حجاب امتیاز علی کا معتقد رہ چکا ہوں۔ سعادت مند دیور رہا ہوں۔ دردمند معالج رہا ہوں۔ اور ان کی بلیوں، طوطوں اور ملازموں کا نگرانِ خاص بھی رہا ہوں۔ ان میں سے کچھ باتیں چونکا دینے والی ہیں۔ مثلاً میرا معالج ہونا، مگر میں تفصیل سے عرض کروں گا کہ یہ واقعہ ہے اور اس کی تصدیق خود محترمہ حجاب امتیاز علی سے کرائی جا سکتی ہے۔

جاننے کو تو میں ان کو اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ حجاب امتیاز علی نہ تھیں۔ بلکہ مس حجاب اسمٰعیل تھیں، اور ان کے افسانے تہذیب نسواں میں چھپا کرتے تھے۔ مگر ان کو دیکھا سب سے پہلے ۴۶ء میں۔ جب میں پنچولی صاحب کی طلبی پر آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کی ملازمت ترک کر کے پنچولی آرٹ پکچرس میں لاہور آ گیا تھا۔ اس زمانے میں سید امتیاز علی تاج بہاولپور روڈ کی ایک کوٹھی میں رہا کرتے تھے۔ اور میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ مگر اس زمانے میں محترمہ حجاب امتیاز علی کا میں بس اتنا ہی مطالعہ کر سکا تھا کہ وہ گویا کسی اور دنیا کی مخلوق ہیں۔ کچھ بے نیاز سی اور الگ تھلگ سی۔ ایک آدھ مرتبہ نظر آئیں اور انہوں نے میرا نوٹس ہی نہ لیا، بلکہ میرے سلام کے جواب میں بھی کچھ ایسا انداز اختیار کیا کہ اپنے سلام کرنے پر نادم ہی ہونا پڑا۔

پنچولی آرٹ پکچرس سے مجھ کو سونگ پبلسٹی کے محکمے میں ایک منصب قبول کر کے پھر لکھنؤ جانا پڑا اور تقسیم ملک سے دو سال پہلے جب میں دوسری مرتبہ پنچولی میں آیا، اس وقت تک حالات بدستور تھے۔ مگر تقسیم ملک کے بعد جب میں ریڈیو پاکستان میں آ گیا، اور تاج صاحب بھی بہاولپور روڈ سے ایبٹ روڈ کی ایک کوٹھی میں ریڈیو اسٹیشن سے قریب ہی آ گئے اور ہم دونوں نے ریڈیو پاکستان کے تعمیری اور بحالیاتی پروگرام "پاکستان ہمارا ہے" میں ساتھ ساتھ حصہ لیا اور دن رات ساتھ رہ کر کام کیا۔ اس وقت سے تعلقات میں رفتہ رفتہ یگانگت بڑھنا شروع ہوئی اور اب اندازہ ہوا کہ جس حجاب امتیاز علی کو میں بے نیاز اور الگ تھلگ سمجھ رہا تھا ان کی تو دنیا ہی دوسری ہے۔ اور یہ دنیا انہوں نے خود اپنے لئے وضع کی ہے۔ یہ وہی دنیا ہے جو ان کے افسانوں میں نظر آتی ہے۔ اور جس کی وہ بار بار اپنے پڑھنے والوں کو سیر کرا چکی ہیں اگرچہ سیر کرنے والے سمجھتے ہیں کہ یہ شاید تحریری دنیا ہے یہ شاید کوئی افسانوی فضا ہے یا کوئی شاعرانہ تخیل ہے۔ میں خود بھی سمجھتا تھا مگر جتنا جتنا حجاب امتیاز علی

کو قریب سے دیکھا میں قایل ہوتا گیا کہ وہ جو کچھ لکھتی ہیں، وہی ان کے احساسات بھی ہیں۔ بلکہ ان کی سمجھ میں تو یہ بات آ ہی نہیں سکتی کہ بغیر ایک کیفیت کو محسوس کئے ہوئے کوئی اس کیفیت کا اظہار کس طرح کر سکتا ہے۔ وہ جو مناظر اپنے افسانوں میں پیش کرتی ہیں ان مناظر میں وہ خود بھی کھوئی رہتی ہیں۔ وہ گرم ایشیا کی دوپہر کا گہرا گلابی رنگ لکھتی ہی نہیں ہیں دیکھتی بھی ہیں۔ وہ ماہ مارچ کے گستاخ آفتاب کو پیتل کے تھال کی طرح جگمگاتا ہوا بیان ہی نہیں کرتیں بلکہ اس سے ان کو ہر سال مارچ کے مہینے میں واسطہ بھی پڑتا ہے۔ وہ آسمان کے مختلف رنگ تصنیف نہیں کرتیں بلکہ یہ مختلف رنگ ان کی کیفیات پر براہِ راست اثر انداز ہوتے ہیں۔ میں کئی مرتبہ گرمیوں کی دوپہر میں بھی ان کے گھر گیا ہوں اور میں نے ہمیشہ کوٹھی کے نچلے حصے میں خس کے پردوں سے ڈھکے ہوئے کمرے میں صرف تاج صاحب اور یاسمین کو پایا ہے۔ مگر حجاب صاحبہ اس تپتی ہوئی دوپہر میں اوپر ہی پائی گئی ہیں۔ جہاں وہ کھلے ہوئے دروازوں سے اس گہری گلابی دوپہر کو درختوں پر بکھرے ہوئے زرد رنگ کو اور اس گہرے آسمان کو دیکھتی رہتی ہیں جس پر کسی نے جیسے نیلم پگھلا کر دور دور پھیلا دیا ہو۔ اور یہی مناظر ان کے لئے افسانے پیدا کرتے ہیں۔ لُو کے تھپیڑے ان میں لکھنے کا ولولہ پیدا کرتے ہیں۔ اور وہ اس قدرتی ماحول سے گھبرا کر خس کے پردوں اور مصنوعی تاریکی کے غیر قدرتی ماحول میں کبھی پناہ نہیں ڈھونڈتیں۔ اور کیسے پناہ ڈھونڈیں جبکہ ان ہی موسموں کا تغیر ان کی کیفیات میں تنوع پیدا کرتا ہے۔ اور یہی موسم اور یہی موسمی مناظر تو ان کے مطالعے میں رہتے ہیں۔ یہ بدلتے ہوئے رنگ ہی تو ہیں جو ان سے اس قسم کے بے ساختہ فقرے لکھوا لیتے ہیں:۔

"گرم ایشیائی مئی کے سبز آسمانوں پر ہلکے کاسنی رنگ کا چاند متبسّم تھا۔"

ہم اور آپ سب مئی میں بھی آسمان کی طرف دیکھتے ہیں مگر ہم میں سے کتنے ہیں جن کو آسمان کا رنگ سبز اور چاند کا ہلکا کاسنی نظر آتا ہو۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم رنگ کے بے بصر ہیں، البتہ یہ واقعہ ہے کہ ہم رنگ ڈھونڈتے بھی نہیں چاند ضرور دیکھ لیتے ہیں مگر یہ ہوش نہیں ہوتا کہ اس کا رنگ کیا ہے اور کس موسم میں کیا ہوتا ہے۔ حجاب امتیاز کو چونکہ اپنے لئے شگفتگی یا پژمردگی ان ہی مناظرِ قدرت اور موسم کے ان ہی تغیرات سے حاصل کرنا ہوتی ہے، لہٰذا وہ ان ہی میں کھوئی رہتی ہیں۔ اگر کوئی ان کو گرمیوں کی کسی دوپہر میں اس طرح دیکھے کہ وہ ساری احتیاط سے اٹھائے ہوئے سنبھل سنبھل کر کمرے میں ٹہل رہی ہیں اور وہ آپ سے کہیں کہ آسمان کا رنگ اتنا گہرا ہے کہ گویا اس کا نیل بہہ بہہ کر کمرے میں آتا ہوا محسوس ہوتا ہے، اور مجھے ڈر ہے کہ میری ساری بھی اس رنگ میں رنگ نہ جائے تو شاید آپ یا کوئی اور ان کو اس طرح دیکھنے والا یہ سمجھے کہ وہ بن رہی ہیں مگر مجھے یقین ہے کہ وہ واقعی یہی محسوس کرتی ہیں۔ اور وہ اپنے احساسات کو اسی حد تک شدید بنا چکی ہیں کہ موسم کی کیفیات براہِ راست ان پر گزرتی ہیں۔

حجاب امتیاز علی تجزیۂ نفس کی دلدادہ ہیں، اس فن کا گہرا مطالعہ بھی کر چکی ہیں اور خود بھی اس فن کے لئے اپنے کو مطالعہ بنا کر پیش کر چکی ہیں۔ جب کبھی تو ان کو کوئی شکایت ہوتی ہے ماہرینِ معالجۂ نفس کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ مگر پچھلے سال جب وہ بیمار ہو کر صاحبِ فراش ہوئیں تو ان کی نظرِ انتخاب ایک اور مسیحائے دوراں، افلاطونِ زماں پر پڑی، اور وہ تھا یہ خاکسار۔ چنانچہ طے کیا گیا کہ میں روزانہ کچھ وقت ان کی خدمت میں حاضر ہو کر بیماری کا غم غلط کرنے کی کوشش کیا کروں۔ چنانچہ میں نے یہ خدمت بسر و چشم قبول کر لی اور روز ان کے پاس بیٹھ کر ادھر اُدھر کی گپ ہانکا کرتا۔ لطائف بیان ہوتے۔ تاج صاحب۔ یاسمین۔ حجاب صاحبہ اور میں۔ یہ چار ایک کمرے میں بیٹھ جاتے اور تھوڑی ہی دیر میں وہ کمرہ قہقہوں سے گونجنے لگتا۔ میرا کام صرف یہ تھا کہ میں ان کی بیماری کا مذاق اڑاتا رہوں۔ چنانچہ وہ رفتہ رفتہ ٹھیک ہونے لگیں۔ جو بستر سے نہ اٹھ سکتی تھیں وہ سیڑھیاں اترنے لگیں۔ ڈرائیو پر جانے لگیں اور صحت اتنی اچھی ہو گئی کہ نظرِ بد سے بچنے کی دعائیں دی جانے لگیں۔ وہ تو کہئے کہ حجاب امتیاز علی نے میرے اس ماہرانہ علاج کا پروپیگنڈا نہیں کیا ورنہ اس وقت میرا مطب کافی چل رہا ہوتا۔ اور علاج بالنفس کو بہت بڑا درجہ حاصل ہوتا۔ اسی زمانے میں میں نے دیکھا کہ وہ بے شمار ذمہ داریاں اپنے سر لئے ہوئے ہیں۔ مثلاً درجنوں تو بلیاں ہی ہیں، کوئی برما کی ہے کوئی کہیں کی اور کوئی کہیں کی۔ گویا آپ کا گھر بلیوں کی جمیعۃ اقوام کا صدر دفتر ہے۔ کسی کے لئے خانساماں کو ہدایت ہو رہی ہے کہ غسل خانے میں ایک کُشن رکھ کر بلی کو وہاں بند کر دو اور اس کا کھانا وہیں پہنچا دو۔ کسی کے لئے خود طشتری میں خاصہ لئے پھر رہی ہیں کہ ماحضر تناول فرمالیں۔ ایک دن میں نے ان کو بے حد متفکر پایا۔ ڈرتے ڈرتے خیریت پوچھی تو معلوم ہوا کہ کوئی صاحب ہیں جعفر ان کی طبیعت خراب ہے۔ ظاہر ہے کہ میں یہی سمجھا کہ کوئی

قریبی عزیز ہوں گے۔ مگر جب تاج صاحب نے کہا کہ "اس کا پنجرہ اندر رکھوا دو" تو میں بھی چونکا اور تحقیقات کی تو معلوم ہوا کہ جعفر اسم مبارک ہے ایک طوطے کا اور ان ہی مٹھو میاں کی طبیعت ناساز تھی۔

تاج صاحب کو مع یاسمین اور حجاب صاحبہ کے کراچی جانا تھا۔ مگر فکر یہی تھی کہ ان کی عدم موجودگی میں اس زندہ عجائب خانے کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ ان طوطوں اور بلیوں کی فکر سب سے زیادہ تھی۔ آخر یہ خدمت میرے سپرد ہوئی کہ میں کبھی کبھی آ کر ان سب کی خیریت پوچھ جایا کروں۔ مگر میری قسمت میں ایک بدنامی لکھی ہوئی تھی کہ اسی زمانے میں ایک طوطے نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اور میں اب اس فکر میں کہ کس طرح اس غم جانکاہ کی اطلاع تاج صاحب کو دوں۔ بہرحال اس طوطے کی تجہیز و تکفین کے بعد میں نے ڈرتے ڈرتے تعزیتی خط تو لکھ دیا مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی لکھ دیا کہ اس کی خبر حجاب کو فی الحال نہ دیجئے گا۔ اس لئے کہ ڈر یہ تھا وہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑے بڑے نتیجے اخذ کرنے والی نہ جانے اس حادثے کا کیا اثر لے بیٹھیں۔

بہ حال حجاب امتیاز علی ایک ایسے ماحول میں رہتی ہیں جو ان کا وضع کیا ہوا ہے۔ وہ اپنے افسانوں کا خود بھی ایک پیکر ہیں۔ ان کے افسانے ان کے اسی ماحول سے ابلتے ہیں۔ اور ان کے ہر افسانے میں ان کی وہ کیفیت نمایاں ہوتی ہے جو ان دنوں ان پر طاری ہو۔ یوں ان کی مختصر سی دنیا میں صرف تین افراد ہیں۔ وہ خود۔ ان کی بچی یاسمین جس کے نام میں ان کو تین حسن نظر آتے ہیں پھول، موسیقی اور چاندنی رات۔ اور ان کے شوہر جو یقیناً ایک معیاری شوہر ہیں۔ وہ شوہر جو اپنی شریک حیات کے لطیف سے لطیف احساس کا بھی نبض شناس ہو۔ یاسمین ان کے گھر کا اجالا بھی ہے اور رونق بھی۔ زمزمہ بھی ہے اور تبسم بھی۔ اور گو ظاہر نہیں کرتے مگر یہ دونوں انشا پرداز میاں بیوی اسی کو دیکھ دیکھ کر جیتے ہیں۔ وہی ان کا حال ہے اور وہی ان کا مستقبل !!

ہاجرہ مسرور

احمد ندیم قاسمی

آج سے بیس برس پہلے کا ذکر ہے۔ یو۔ پی کا ایک قصبہ چلچلاتی دھوپ میں نڈھال پڑا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے گھر پر بھی سناٹا طاری ہے۔ سب لوگ سو رہے ہیں۔ اچانک برآمدے کی چق ہلتی ہے اور ننھی سی نکیلی ناک اور موٹی موٹی آنکھوں والی ایک گوری چٹی لڑکی، کٹے ہوئے بالوں والا سر چق کے پیچھے سے نکالتی ہے۔ دور دیر تک یونہی کھڑی فضا میں ٹکر ٹکر دیکھتی رہتی ہے۔ سامنے کمپاؤنڈ کے ایک درخت کی چھاؤں میں لمبے کانوں اور اونچے قد والی ایک "جمنا پاری" بکری قیلولہ کر رہی ہے۔ لڑکی چق اٹھا کر دبے پاؤں بکری کے پاس آتی ہے۔ ذرا سا سوچتی ہے اور پھر اس پر بیٹھ جاتی ہے۔ لڑکی کے بیٹھتے ہی حواس باختہ بکری اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ دراز قد اور دراز گوش بکری کو انسانی سواری کا یہ پہلا تجربہ ہے اس لئے وہ خوف سے ممیاتی ہوئی بھاگ اٹھتی ہے اور خوف سے زرد لڑکی بکری کے کانوں کی لگام پکڑ لیتی ہے مگر بکری کے ہر قدم پر اس کا سارا جسم کود کود جاتا ہے۔ آخر دور کھیتوں میں جا کر بکری اپنے ننھے منے بوجھ کو گرا کر چل دیتی ہے اور یوں ہاجرہ مسرور کی مہم پسندی کا جذبہ کم سے کم بچپن کے دور تک کے لئے تو ایک بکری کے ہاتھوں شکست کھا جاتا ہے۔

اگر ہاجرہ کی جگہ خدیجہ ہوتی تو بکری کو بھگا بھگا کر اسے تھک کر بیٹھ جانے پر مجبور کر دیتی، مگر یہاں تو جمنا پاری بکری سے اسی ہاجرہ کو واسطہ پڑا تھا جسے دنگے فساد اور مار پیٹ سے ازلی چڑ تھی۔ خدیجہ اونچے اونچے درختوں پر بلی کی طرح چڑھ جاتی اور ہاجرہ نیچے کھڑی اللہ کی قدرت اور بڑی بہن کی مہارت کا تماشہ دیکھتی۔ خدیجہ کشتیاں لڑتی اور گلی ڈنڈا اور کبڈیاں کھیلتی اور ہاجرہ تماشہ دیکھنے پر اکتفا کر لیتی۔ بچوں نے ہر طرف ہیجم دھاڑ مچا رکھی ہے اور ہاجرہ ایک کونے میں بقراط بنی بیٹھی ہے۔ نائی آیا تو خدیجہ چڑیا کی طرح کہیں پھر سے اڑ گئی اور ہاجرہ انکار یا احتجاج کی ضرورت محسوس کئے بغیر گردن پر قینچی چلوا رہی ہے۔ بہت ہوا تو اٹھی اور قریب آ کر خدیجہ کا دنگل دیکھنے لگی۔ اور اگر کوئی پٹخنی کھا گیا تو سب کھڑے ہنس رہے ہیں اور ہاجرہ الٹے ہاتھوں سے آنسو پونچھتی ہوئی واپس گھر کی طرف جا رہی ہے۔ کبھی کبھی باورچی خانے سے چھری اٹھائی۔ اور مکان کے پچھواڑے جا کر تن تنہا "کھیتی باڑی" کھیلنے لگی۔ زمین کو گوڑا۔ جیب سے اناج کے دانے نکال کر انھیں بکھیرا اور اب کیاری کے ایک طرف بیٹھ کر انتظار ہو رہا ہے کہ انکھوے کب پھوٹیں گے۔ اور اگر کسی نے زمین کو گوڑتے دیکھ لیا تو مارے شرم کے سرخ پڑ گئی۔ پسینے چھوٹ رہے ہیں۔ چھری کو چھپایا جا رہا ہے اور دیوار سے لگ لگ کر گھر کی طرف رینگا جا رہا ہے۔ سب سے بڑی بہن عائشہ اپنے بڑے پن کے ٹھسے میں رہتی تھیں اس لئے ہاجرہ کا ان کے ہاں جی

کیا لگتا۔ خدیجہ نے اپنے سے فٹ فٹ بھر اونچے لڑکوں لڑکیوں کو ٹھینگی دے کر ان کی ہتھیلیاں ڈھیلی کر دی تھیں اور ہاجرہ کو اچھے خاصے سمجھتے بوجھتے سیانے بچوں کی یہ گت کبھی بھلی نہ لگتی۔ گڑیوں سے بھی اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ رہ گئی پڑھائی تو جب ابّا اسے ماسٹر کے پاس بٹھا کر لوٹ رہے تھے تو تھوڑی دور جا کر کیا دیکھا کہ ہاجرہ بھی واپسی پر ان کے ساتھ ساتھ چلی آ رہی ہے۔ وہ تو بھلا ہو عائشہ کا کہ انھوں نے ایک بار گھر بھر کو جمع کر کے بچوں کے ایک رسالے میں سے "سنڈریلا" کی کہانی پڑھ کر سنائی تو ہاجرہ چونکی ورنہ وہ تو بجے ہوئے چونے کو کھود کھود کر ننھے ننھے گھروندے بنانے میں مگن تھی اور وہ بھی اس حد تک کہ کوئی دیکھ نہ پائے۔ اس نے عائشہ سے "سنڈریلا" کی کہانی دوبارہ سنی۔ سہ بارہ سنی اور چوتھی بار فرمائش کی تو عائشہ بور ہو چکی تھیں۔ انھوں نے کہانی سنانے سے انکار کر دیا اور کہا "بڑی ہو کر خود پڑھ لینا"۔ اس وقت ہاجرہ نے فیصلہ کر لیا کہ کسی کا محتاج ہوئے بغیر "سنڈریلا" کی کہانی سے محظوظ ہونے کے لئے ماسٹر صاحب سے سبق لینے میں کوئی خاص قباحت نہیں۔

چارلس پیرالٹ کی کہانی "سنڈریلا" سے لے کر ہاجرہ کی اپنی کہانی "بندر کا گھاؤ" تک کا عرصہ آٹھ نو برس پر محیط ہے۔ میں ماہنامہ "ادبِ لطیف" کا ایڈیٹر تھا جب میں نے رسالہ "ساقی" میں یہ افسانہ پڑھا اور اس کے بھرپور فنی تاثر کے تحت میں نے ہاجرہ سے "ادبِ لطیف" کے لئے ایک کہانی طلب کی۔ لیکن اس وقت مجھے وہم بھی نہ تھا کہ جس خاتون کو میں "محترمہ" کے رسمی القاب سے مخاطب کر رہا ہوں وہ چار ہی برس کے بعد اپنے گھرانے کے گیارہ افراد سمیت میرے گھرانے کے اس قدر قریب آ جائے گی جیسے ہم سب ایک ہی ماحول اور ایک ہی گود میں پلے بڑھے ہیں۔ اور جس تیرہ چودہ برس کی "محترمہ" سے (ہاجرہ کی تاریخ پیدائش ۱۷ جنوری ۱۹۲۹ء ہے) میں "ادبِ لطیف" کے لئے افسانے کی درخواست کر رہا ہوں وہ پانچ چھ برس کے بعد اپنی ماں کی بات ٹوکنے پر میرے ہاتھوں پٹ بھی جائے گی۔

اکتوبر ۱۹۴۷ء میں جب ہاجرہ اپنے گھر کے تمام افراد سمیت لکھنؤ سے بمبئی، بمبئی سے کراچی اور کراچی سے لاہور پہنچی (لکھنؤ سے لاہور کے صراطِ مستقیم کو انسانی خون کے ایک دریا نے کاٹ ڈالا تھا) تو میں پشاور ریڈیو اسٹیشن میں مسلمان شہنشاہوں کے عدل و انصاف کو ڈراموں اور فیچروں کے لباس پہنا رہا تھا۔ ان دنوں رسالہ "سویرا" کی ادارت بھی میرے سپرد تھی اور ڈیکلیریشن حاصل کئے بغیر رسالہ شائع کرنے کے جرم میں رسالے کے مالک کے علاوہ مجھ پر بھی مقدمہ چل رہا تھا۔ اسی مقدمے کے سلسلے میں لاہور آیا۔ فسادات کی وجہ سے ڈاک میں بہت گڑبڑ تھی اس لئے مجھے ہاجرہ کے لاہور پہنچنے کی اطلاع نہیں مل سکی تھی۔ بھائی طفیل (مدیر نقوش) نے بتایا تو سیدھا نسبت روڈ پر پہنچا۔ اس روز سے لے کر اب تک کی ہاجرہ سے تو میں بہت اچھی طرح واقف ہوں لیکن اس سے پہلے کے اٹھارہ انیس برسوں کے سلسلے میں بھی میری معلومات ہمہ گیر ہیں۔ میں ان سب کو خط و کتابت کے ایک طویل سلسلے کے بعد بہت اچھی طرح جان چکا تھا بلکہ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں تو انھیں جنم جنم سے جانتا ہوں۔ ویسے بھی ہاجرہ کی شخصیت سے متعلق میری معلومات ان مشاہدات پر مبنی ہیں جن کے غلط ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کیونکہ یہ مشاہدات باقاعدہ انٹرویو کے رہینِ منّت نہیں ہیں جب انٹرویو دینے والا کسی "تکلیف دہ" سوال کے جواب میں کترا کر بھی نکل سکتا ہے۔ یہاں تو ہاجرہ نے خدیجہ پر کوئی چھینٹا کسا تو خدیجہ نے ہاجرہ کا سارا کچا چٹھا بیان کر ڈالا۔ اور پھر جب سرما کی طویل راتوں میں باجی امّاں کے پاس بیٹھ کر ہم سب نے اپنے اپنے بچپن کے قصّے مزے لے لے کر سنائے اور ہاجرہ نے اپنے سلسلے میں جہاں بھی غلطی کی وہاں فوراً اس کی "تصحیح" کر دی گئی۔ مثلاً خدیجہ کہتی "یہ "میں نے کہا میں نے کہا" کی کیا رٹ لگا رکھی ہے۔ تم نے خاک کہا ہو گا۔ تم تو "کم سخن" مشہور تھیں۔ اتنی چچی تلی بات تو جہاں تک میری یاد میرے ذہن کا ساتھ دیتی ہے، خدیجہ مستور ہی نے کہی ہو گی"۔ ہاجرہ نے بتایا "افوہ۔ حساب سے تو میری جان نکلتی تھی"! اور خدیجہ نے اطلاع دی "یہ صاف صاف بتا دو نا کہ تم پڑھائی میں بالکل "ڈل" تھیں اور حساب تو خیر تم سے چلتا ہی نہ تھا"۔ معلوم ہوا کہ ہاجرہ دو اور دو پانچ، اور پانچ اور پانچ چھ کا کچھ ایسا چکر چلاتی تھی کہ ریاضی کے سلسلے میں آئن سٹائن کے نظریات بھی منہ تکتے رہ جاتے۔ ایک بار انگریزی کا پرچہ ہاجرہ کے مبلغِ علم سے اونچا نکلا۔ بقراط تو تھی ہی۔ کچھ دیر بیٹھی سر کھجاتی رہی۔ پھر سب سوالوں کا یہ واحد جواب لکھ ڈالا۔

"اور جو ہم آپ کے مُلک میں اُردو پڑھانے آئیں ؟"

ایک دفعہ انگریزی لفظ پنک (PINK) کو فقرے میں استعمال کرنے کی ہدایت ہوئی تو کہیں دُور جانے کی ضرورت ہی نہ سمجھی اور اپنے آپ کو ہی فقرے میں استعمال کر ڈالا :-

MY CHEEKS ARE PINK

ہاجرہ آٹھ برس کی تھی جب دسمبر ۱۹۳۶ء میں والد چل بسے۔ اور متوسط درجے کا یہ خاصا کھاتا پیتا گھرانا اچانک جیسے ایک لق و دق صحرا میں بھٹک گیا۔ گھر میں صرف ایک "مرد" تھا جس کی عمر اس وقت بمشکل پانچ برس ہوگی۔ یہ چھ بہنوں کا بھائی توصیف تھا۔ گھرانے کی یہ بے بسی دیکھ کر اقارب عقارب میں بدل گئے اور ایک بیوہ اور سات یتیموں کا سارا اثاثہ چھین جھپٹ کر الگ ہو بیٹھے۔ ماں اپنا دامن جھاڑ کر آٹھ بیٹیں اور بچوں کو ساتھ لے کر مستقل طور پر لکھنؤ میں اپنے ابّا کے پاس آ گئیں۔ اس کے بعد مصائب کا ایک ایسا طوفان اٹھا جس میں سب رُلتے پھرے۔ عزیزوں سے ایسے ایسے چرکے پہنچے کہ آپس ہی میں کچھ بچھڑ لگئے، ٹکرا ٹکرا گئے۔ ماں کا صبر و ضبط، دُور اندیشی اور خودداری ان زخموں پر مسلسل پھاہے رکھتی رہی اور آخر ماں نے ہی سب کو ایک لڑی میں پرو دیا۔ ہاجرہ کی حساسیت نے یہیں سے بڑی گہری اور شروع شروع میں قنوطی اور کلبی صورت اختیار کر لی۔ اور وہ جو بچپن میں کم سخن مشہور تھی۔ اپنے ننھے منّے معصوم خوابوں کے ملبے میں بھٹک کر رہ گئی۔

ہاجرہ کے وُہ تمام خواب چکنا چُور ہو گئے تھے جو وہ اپنی تنہائیوں میں دیکھا کرتی تھی۔ ہاجرہ آج بھی خواب دیکھتی ہے مگر ان کی نوعیت یکسر بدل گئی ہے، ابّا کی وفات سے پہلے ہاجرہ کے خوابوں اور ان کی تعبیروں میں کچھ زیادہ بُعد نہیں ہوتا تھا۔ اِدھر اس نے کسی خواب کا اظہار کیا اُدھر ملازم بازار سے اس خواب کی تعبیر خرید سے چلا آ رہا ہے۔ مگر اب اس کے خواب "ایسا کیوں ہے" سے شروع ہوتے اور "اگر یوں ہو جائے" اور "ایسا کس طرح ہو" کی وسعتوں میں نکل جاتے۔ اور یہ وسعتیں بیکراں تھیں۔ ان کا کوئی اور چھور نہیں تھا۔ سفر ختم نہیں ہوتا تھا اور خواب جاری رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہاجرہ کے سوتے جاگتے کے خوابوں میں ہمیشہ ایک تسلسل قائم رہتا ہے۔ دھوپ میں بارش کے خواب۔ بارش میں حدِ نظر تک پھیلے ہوئے سبزہ زاروں کے خواب۔ سبزہ زاروں میں نگینوں کی طرح جڑی ہوئی جھاڑیوں اور ان پہ اُڑتے ہوئے پھولوں کے خواب۔ اور یہ سلسلہ رواں رہتا ہے۔ آج بھی اگر آپ اس سے بات کر رہے ہوں تو آپ یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ آپ کی بات سُن رہی ہے یا کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھی بیٹھی اچانک وہ اپنے خوابوں کی دُنیاؤں میں چلی جاتی ہے اور اسی لئے بعض عزیزوں کو شکایت ہے کہ ہاجرہ کسی کی بات تو سُنتی ہی نہیں۔ شادی سے پہلے اس کے خوابوں کی اُڑان اس وقت کٹتی جب باجی امّاں کی آواز آتی۔ "بھئی ہاجرہ۔ ناشتہ کرو گی یا مہترانی کو بھجوا دوں ؟" اور شادی کے بعد تو ہاجرہ کے خوابوں میں اس کی بیٹی نوید مسلسل اور مستقل ناچتی اور تھلاتی پھرتی ہے۔ مگر نوید تو ہاجرہ کے لئے ایک مجسّم خواب ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مٹی کھانے یا جُوتا نہ پہننے پہ اس نے اپنے ہی خواب کو دھیرے سے جھڑک بھی دیا ہے۔

جب بھی اس کے خوابوں کا ذکر چلا ہے۔ اس نے اپنی اس عادت کی بڑی پُر زور وکالت کی ہے مگر کبھی کبھی وہ میرے کان میں کہتی ہے "بھیّا۔ یہ خواب دیکھنے کی عادت ایک لحاظ سے تو بُری بھی ہے۔ اس سے عمل کی قوتیں پُوری طرح بیدار نہیں ہو پاتیں"۔

مگر میری رائے میں جو انسان خواب نہیں دیکھ سکتا وہ بڑا ہی غبی ہوتا ہے۔ خواب ہی تو انسان کے تخلیقی تسلسل کی بنیاد ہیں اور خواب دیکھنے والا ہمیشہ بہت حساس ہوتا ہے۔ جب ڈراؤنے افلاس، گھناؤنے امراض اور انسان کے ہاتھوں انسانوں ہی کے استحصال کے مناظر اس کے خوابوں کو نتاڑ دیتے ہیں تو وہ جارحہ صورت پذیر ہوتا ہے جس نے انسانی تاریخ کا رُخ پلٹ پلٹ دیا ہے۔ ہاجرہ کے بچپن کا واقعہ ہے۔ گلی میں سے ایک بوڑھا چاٹ والا گزر رہا تھا۔ شریر بچّوں نے اسے گھیر لیا اس کے لباس کو نوچنے کھسوٹنے لگے۔ اور آخر کار اس کے خوانچے کو

گرا کے دم لیا۔ ہاجرہ بھی ان بچوں میں موجود تھی مگر وہ شرارت میں حصہ لینے کے بجائے کھڑی سوچتی رہی کہ ایسا کیوں ہوا؟ بوڑھے نے بچوں کا آخر کیا بگاڑا تھا۔ یہ بوڑھا خوانچے والا برسوں تک اس کے خوابوں کے پس منظر میں منڈلاتا رہا ہے اور اسی لئے آج بھی جب وہ خرچ کے معاملے میں خاصی سگھڑ ہے، افلاس زدہ لوگ اس سے کچھ نہ کچھ لے ہی مرتے ہیں۔ بعض لوگ کہیں گے "جذباتیت۔ نری جذباتیت"۔ مگر کاش یہ "جذباتیت" عام ہو کر انسانی فطرت بن سکتی!

دو برس کی بات ہے۔ میں ہاجرہ کے ہاں گیا تو ایک بڑھیا اس کے پاس بیٹھی اپنا دکھڑا رو رہی تھی۔ وہ سرحد کی رہنے والی تھی اور ہاجرہ کو بتا رہی تھی کہ اس کا شوہر سردی میں ٹھٹھر کر مر گیا ہے۔ جوان بیٹے کو نمونیہ ہو گیا ہے۔ وہ ایک دکان کے تختے تلے پڑے ہیں اور اللہ کی قدرت دیکھ رہے ہیں۔ بھیک نہیں مانگ سکتے، کیونکہ عمر بھر اپنے ہاتھوں کی کمائی کھائی ہے اور باچھیں ڈھیلی کر کے بات کرنے کی عادت نہیں ——— اس قسم کے لوگ ایشیا کے شہروں کے ہر چوراہے پر مل جاتے ہیں اس لئے میں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور ایک رسالے کے ورق الٹتا رہا۔ اپنی رام کہانی سنانے کے بعد بڑھیا نے رو رو کر ہاجرہ سے قرضِ حسنہ کا مطالبہ کیا اور ہاجرہ نے جو نہایت سوچ سمجھ کر رحم کھاتی ہے۔ اسے چند روپے دے ڈالے۔ بڑھیا کے جانے کے بعد میں نے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ وہ جو اس نے اپنی محنت سے کما کر کھانے کی بات کی تھی، تو وہ اس کے دل میں اتر گئی۔ چند روز بعد معلوم ہوا کہ ہاجرہ کے کچھ اور روپوں سے بڑھیا کے لڑکے نے مزنگ کے کسی چوک میں خشک میووں کی ریڑھی لگا دی ہے۔ پھر پتہ چلا کہ بڑھیا ڈبی بازار کے بزازوں کی طرف سے رؤسا کی کوٹھیوں میں جاتی ہے اور کپڑے کا سودا کر کے دکانداروں سے کمیشن حاصل کرتی ہے۔ ایک روز وہ سستے کپڑے کا وعدہ کر کے ہاجرہ سے بیس روپے لے گئی اور آج دو برس سے وہ ڈبی بازار سے جیل روڈ کا فاصلہ طے نہیں کر سکی۔ میں نے ایک روز طنزاً پوچھا "اس مسکین بڑھیا کا کوئی سراغ چلا؟" بولی "لالہ۔ میں سوچتی ہوں۔ کہ وہ جھوٹی نہیں تھی، اس نے محنت کر کے کھانے کی بات کی تھی۔ وہ سچی ہی تھی۔ یہ جو بڑی بڑی ایکٹریسیں لاکھوں روپیہ کماتی ہیں، وہ بھی تو اپنے فن سے ہمیں رلاتی ہیں، ہنساتی ہیں اور سوچنے پہ مجبور کرتی ہیں، بڑھیا جو اتنی دیر روئی تو کیا یہ کردار ادا کرنے کے لئے اس نے کوئی محنت نہیں کی؟ میں سوچتی ہوں، اس قسم کی چھوٹے پیمانے کی ایکٹریسیں اگر کسی سے کچھ لے مریں تو اس میں غصے کی کیا بات ہے۔ بے چاریاں اپنی اس "فنکاری" کے سلسلے میں کتنا خطرہ مول لیتی ہیں۔ اور کتنی محنت کرتی ہیں"

آپ کہیں گے یہ ہاجرہ کی نرم دلی اور خدا ترسی ہے۔ نرم دل اور خدا ترس تو وہ ہے مگر باون تولہ پاؤ رتی قسم کی۔ اس معاملے میں تو وہ اتنی خوفناک حقیقت پسند ہے کہ دو میل پیدل چل لے گی مگر تانگے والے کو آٹھ آنے سے نو آنے نہیں دے گی۔ "اصول کی بات ہے"، وہ کہتی ہے۔ مگر ہم لوگوں نے قسم قسم کے لطیفے گھڑ رکھے ہیں۔ حمید اختر کا کہنا ہے کہ لاہور بھر کے تانگے والوں نے ایک ہزار کا نقد انعام اس کوچوان کے لئے مقرر کر رکھا ہے جو ہاجرہ مسرور سے جیل روڈ سے نسبت روڈ تک کا کرایہ آٹھ آنے کے بجائے سوا آٹھ آنے وصول کرے اور آج چار برس سے یہ انعام جوں کا توں رکھا ہے۔ ہاجرہ ان لطیفوں پر خوب خوب ہنستی ہے۔ بلا کی حاضر جواب ہے اس لئے محض ہنسی پہ اکتفا نہیں کرتی بلکہ الٹا مذاق کرنے والوں کو چکرا دیتی ہے۔

۱۹۴۱ء کے دن تھے۔ پانی برس رہا تھا۔ ساری فضا سرمئی ہو رہی تھی جب ہاجرہ کے پاس خدیجہ آئی اور بولی "کہتے ہیں ایسے موسم میں لوگ لکھتے ہیں۔ آؤ ہم بھی لکھیں"۔ ذرا سی رد و کد کے بعد دونوں بہنیں قلم لے کر لکھنے بیٹھ گئیں اور ابتدا شاعری سے ہوئی۔ دونوں نے گیت لکھنے شروع کئے مگر یہ مرحلہ سر ہونے تک مطلع صاف ہو گیا اور "موڈ" ختم ہو گئے۔ خدیجہ اس دوران میں ہاجرہ کو لکھنے کے لئے بار بار اکساتی رہی۔ حالات خراب تھے۔ اور پھر جنگ کی وجہ سے مہنگائی عروج پر تھی۔ دونوں اداس اداس ایک کمرے میں پڑی رہتیں اور ادب کی باتیں ہوتیں۔ اماں رسالہ "عصمت" کی مضمون نگار تھیں۔ ابا مرحوم ادبی کتابوں کے رسیا تھے سو لاشعور میں تو ادب رچا بسا ہوا تھا۔ ایک دن خدیجہ نے کہا "شاعری نہیں چلتی تو لاؤ افسانہ لکھیں"۔

"ہمیں تو نہیں آتا" ہاجرہ نے بے دلی سے کہا۔

مگر خدیجہ نے "کوشش تو کر دیکھیں" کی صلاح دی۔ دونوں اِدھر اُدھر کروٹ بدل کر لکھنے لگیں۔ خدیجہ کے افسانے کا عنوان "صبا" تھا اور ہاجرہ نے "لاوارث لاش" سے ابتدا کی۔ لکھ چکیں تو دونوں دم بخود رہ گئیں۔ ارے! یہ کہانیاں ہیں۔ ہماری کہانیاں ہیں۔ پھر ہاجرہ نے اپنی کہانی خدیجہ کو سُنائی۔ اور خدیجہ نے اپنی کہانی ہاجرہ کے گوش گزار کی۔ اور دونوں احساسِ کمتری میں مبتلا ہوگئیں۔ ہاجرہ خدیجہ کی کہانی کو شاہکار بتا رہی تھی اور خدیجہ ہاجرہ کی کہانی کو بے مثال قرار دے رہی تھی۔ دلّی میں ایک عزیز تھے جن کی خاصی ادبی حیثیت بھی تھی۔ دونوں نے انھیں اپنی اپنی کہانیاں اشاعت کے لئے بھجوائیں۔ انھوں نے نصیحتوں بھرا خط لکھا کہ شریف اور پردہ دار مسلمان گھرانوں کی بیٹیاں ایسا نہیں کرتیں۔ باجی اماں نے یہ خط دیکھا تو کہا کہ شریف مسلمان گھرانوں کے بزرگوں کو ایسی پوچ نصیحتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ مگر خیر، جانے دو اور تم لکھتی جاؤ۔ دلّی کے عزیز نے افسانے توجہ سے پڑھ دیئے مگر ہاجرہ مسرور کی جگہ "ہ۔ م" کا نام دینا مناسب سمجھا۔ اور اِدھر ہاجرہ کی یہ حالت کہ چھوٹی سے بھی چھوٹی بہن عائدہ تک کو اپنی کہانی سناڈالی۔ جب لکھنؤ کے عزیزوں کو پتہ چلا کہ ان ذرا ذرا سی لڑکیوں کے نام اخباروں میں چھپ گئے ہیں تو ٹوٹ ٹوٹ کر برسے مگر یہ اپنی ماں کے سہارے لکھتی رہیں۔ بمبئی کے ایک ماہنامہ اور ہفت روزہ کے پروپرائیٹر نے ہاجرہ کو لکھا کہ اگر وہ مہینے میں چار افسانے ہفت روزہ کے لئے اور ایک افسانہ ماہنامہ کے لئے لکھا کریں تو انھیں مبلغ تین روپے فی افسانہ کے حساب سے مبلغ پندرہ روپے ماہوار پیش کئے جائیں گے۔ اقتصادی حالات بھی اچھے نہ تھے اور پھر تیرہ برس کی عمر میں لکھے ہوئے افسانوں کا معاوضہ اور وہ بھی بمبئی ایسے سوجھ بوجھ والے شہر سے۔ ہاجرہ نے مارے فخر کے پانچ افسانے لکھ مارے اور پندرہ روپے حاصل کرلئے مگر دوسرے ہی مہینے احساس ہُوا کہ اس ذہنی مزدوری کی شرح معقول نہیں ہے۔ اور یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔ ابتدا معمولی رسالوں سے ہوئی۔ پھر دونوں بہنیں ساقی، ادبی دُنیا اور ادب لطیف میں نمودار ہوئیں اور جب وہ ستمبر ۱۹۴۷ء میں لاہور آئیں تو ہاجرہ کے افسانوں کے دو مجموعے "چرکے" اور "ہائے اللہ" شائع ہوچکے تھے اور ہاجرہ کا شمار اُردو کے ان افسانہ نگاروں میں ہوتا تھا جنھوں نے اُردو فکشن کو زبان، بیان اور موضوع کے لحاظ سے نئے امکانات اور وسعتوں سے روشناس کرایا ہے۔

لکھنؤ میں سونے کے کمرے سے ملی ہوئی ایک بے ڈول سی کوٹھری تھی جس میں صرف ایک کھڑکی تھی۔ کھڑکی میں سے باہر کی دنیا کے چند درخت، تکمیل الطب کالج کا اناٹومیکل بلاک اور چند پختہ قبریں نظر آتی تھیں۔ ایک طرف جھک کر دیکھنے سے مولانا عبدالحلیم شرر مرحوم کا مقبرہ بھی دکھائی دے جاتا۔ کمرے میں ایک پرانی میز تھی۔ ایک کرسی، میز پر کاغذ بکھرے ہوئے۔ بہت سے قلم اور پنسلیں، خطوط کا انبار۔ کتابیں۔ رسالے، آل پن کی ڈبیا، روشنائی کی بوتل اور ایک گلاس۔ یہ کل کائنات تھی۔ عموماً رات کو لکھا پڑھا جاتا۔ بروقت ادائیگی نہ ہونے کے باعث بجلی کا میٹر اکھڑ چکا تھا اس لئے لالٹین کی روشنی سے کام چلایا جاتا۔ لکھنا ہوتا تو پلنگ پر لیٹ کر یا اوندھے ہوکر یا کروٹ سے لیٹ کر، ایک ہاتھ پر سر رکھ کر دوسرے ہاتھ میں قلم تھام لیا جاتا۔ افسانہ تین روپ بدلتا۔ پہلی بار جو کچھ ذہن میں ہے وہ کاغذ پر منتقل کر دیا جاتا۔ دوسری بار فنّی انتخاب کا درجہ آتا اور خامیاں دُور کی جاتیں اور تیسری بار افسانہ صاف ہوتا۔ دونوں بہنیں ایک دوسرے کی نقّاد تھیں۔ اس لئے افسانے کی خوبیوں یا خامیوں پر خوب بحثیں رہتیں۔ اس دَوران میں افسانوں کے پلاٹوں پر خوب خوب جھگڑے ہوتے۔ ایک نے دوسرے کو اپنی اگلی کہانی کا پلاٹ سُنا دیا تو "اس پر تو ہم لکھیں گے" کا حکم صادر ہو جاتا۔ اس معاملے میں ہاجرہ اور خدیجہ کے درمیان وہ چھینا جھپٹی ہوئی ہے کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ اس ہاتھا پائی سے ایک آدھ بار میں نے یوں فائدہ اُٹھایا ہے کہ ان کی لڑائی کے دَوران میں میں نے ہی اس پلاٹ پر اپنی کہانی تعمیر کرلی اور دونوں میرا منہ تکتی رہ گئیں۔

یہ ہاجرہ کے ساتھ خدیجہ کا جو بار بار ذکر آجاتا ہے تو یہ میری مجبوری نہیں، حقیقت ہی یہی ہے کہ ان دونوں بہنوں میں سے ایک کو دوسری سے جُدا کرکے دیکھا ہی نہیں جاسکتا۔ میں نے ایک بار ہاجرہ سے پوچھا تھا کہ آخر تمہاری سہیلیوں کی تعداد اتنی معمولی کیوں ہے تو اس نے کہا تھا۔

"در اصل خدیجہ نے یہ سارے خلا پر کر رکھے ہیں۔"

میں جب پہلی بار اس گھر میں آیا ہوں تو جب بھی سب سے پہلے خدیجہ ہی سے ملاقات ہوئی۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء کی کسی شام کا ذکر ہے۔ میں بھائی طفیل کے ہمراہ ہاجرہ کے ہاں آیا تو ایک کمرے میں بیٹھ کر میں نے محسوس کیا کہ میرے پہنچتے ہی گھر میں ہلچل سی پیدا ہو گئی ہے۔ سب افراد ادبی کے سیلاب کے بعد کے ملیریا میں ناک ناک تک ڈوبے ہوئے تھے۔ ذرا سی دیر کے بعد مجھے ایک کمرے میں لے جایا گیا جہاں تین پلنگ بچھے تھے۔ ایک پر توصیف ملیریا سے گزر کر محرقے کی سرحدیں طے کر رہا تھا۔ دوسرے پر چھوٹی بہنیں عابدہ اور شاہدہ اکٹھی لیٹی ایک دوسرے کا بخار تاپ رہی تھیں۔ تیسرے پلنگ پر سے ایک لڑکی اٹھی اور بھیا بھیا پکارتی ہوئی مجھ سے لپٹ کر بے اختیار رو دی۔ یہ خدیجہ تھی۔ اس کے بعد خدیجہ نے دوسرے کمرے میں سب سے میرا تعارف کرایا۔ سب کو بخار میں بھنتا دیکھ کر مجھے بے حد دکھ ہوا۔ اور یہ بھی یاد نہ رہا کہ ابھی ہاجرہ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ پھر خدیجہ نے آواز دی کہ ہاجرہ آؤ۔ بھیا سے ملو۔ معلوم ہوا کہ ہاجرہ دروازے کے پاس گیلری میں کھڑی ہے۔ میں اٹھ کر اس کے پاس گیا۔ اس کے سر پہ ہاتھ رکھا اور اسے اندر لے آیا۔ وہ مجھے اتنی چھوٹی سی لگی کہ ایک بار جی چاہا۔ کہہ دوں۔ "ابھی مجھے اس ہاجرہ سے نہیں" ہائے اللہ" کی مصنفہ ہاجرہ مسرور سے ملنا ہے۔ کیونکہ جب ہم بڑی ریاضت کے بعد چوبیس پچیس برس کی عمر میں اس قابل ہوئے ہیں کہ اپنے شعروں اور افسانوں سے لوگوں کو ذرا سا اپنی طرف متوجہ کر سکیں تو یہ اتنی سی لڑکی جو اپنے منہ بولے بھائی سے پہلی ملاقات کے بعد خدیجہ کی طرح مارے خوشی کے لپٹ جا رہی ہے، اور رونے کی وجہ سے اور بھی چھوٹی ہو گئی ہے۔ ان کہانیوں کی مصنفہ کیسے ہو سکتی ہے جن میں انسان اور سماج کے رن پڑے ہیں اور جن میں نفسیات مشاہدات اور بڑی جاندار توقعات کی دنیائیں آباد ہیں۔

ذرا دیر بعد سب میری خاطر مدارات میں لگ گئے۔ میں دیکھتا رہا کہ وہ بڑی پھرتی سے اکیلی سارے گھر کی تیمار داری کر رہی ہے اور ساتھ ہی میرے کھانے کا انتظام بھی۔ میں نے سوچا کس قدر سلیقہ مند بچی ہے۔ (یہ راز بعد میں جا کر معلوم ہوا کہ ہاجرہ خدیجہ کی سرپرستی کے تحت اتنی سگھڑ نظر آ رہی تھی) پھر توصیف نے دوسرے کمرے میں شور مچا دیا کہ بھیا میرے پاس کیوں نہیں آ بیٹھتے؟ میں اٹھ کر اس کے پاس چلا گیا اور وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے مجھے پیار سے دیکھتا رہا۔ بولا نہیں۔ پھر معلوم ہوا کہ اوپر کے کمرے میں کسی طرح نانا کو پتہ چل گیا ہے کہ ندیم آیا ہے اور وہ اندھیرے میں سیڑھیوں سے اتر رہے ہیں۔ میں تصور تک نہیں کر سکتا تھا کہ اس گھر کا بچہ بچہ مجھے اتنی اچھی طرح جانتا ہے اور میں اچانک اتنی گھریلو فضا سے دوچار ہو جاؤں گا۔ میں مارچ ۱۹۴۸ء میں پشاور چھوڑ کر مستقل طور سے لاہور آ گیا اور ہاجرہ اور میں نے بھائی طفیل کے تعاون سے "نقوش" کے پہلے نمبر کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ہاجرہ کے سگھڑاپے کے جوہر اب کھلے۔

میں "نقوش" کا اداریہ لکھ رہا ہوں۔ وقت کم ہے۔ طفیل صاحب کا آدمی نیچے گلی میں منتظر کھڑا ہے۔ ہاجرہ بیکار مسودات کو الٹ پلٹ رہی ہے۔ مسکوڑوں کے تواتر نے میرا گلا خشک کر دیا ہے۔ میں کہتا ہوں "ہٹو۔ جلدی سے ایک گلاس پانی پلا دو" اور ہاجرہ جواب دیتی ہے "نوکر کو پکارو نا بھیا۔ میں تو آج بری طرح تھک گئی ہوں"

سنسنا کر سارا خون میری کنپٹیوں میں جمع ہو جاتا ہے اور میں نوکر کو پکارنے کے بجائے پاؤں پٹختا ہوا خود ہی پانی پینے چلا جاتا ہوں۔ اب ہاجرہ کی آواز آتی ہے "پلیز بھیا۔ اب گئے ہو تو لگے ہاتھوں ایک گلاس میرے لئے بھی لیتے آنا مجھے بھی پیاس لگی ہے"

میں جل کر رہ جاتا ہوں۔ خدیجہ بے چاری ڈانٹتے ڈانٹتے ہار جاتی ہے مگر جب سمجھا کر اٹھتی ہے تو ہاجرہ کی آواز آتی ہے "پھر نیچے کمرے میں آنا ہو تو میری چائے لیتی آنا۔ گرم کرنے کی ضرورت نہیں۔ ٹھنڈی ہی پی لوں گی"

میں اس کی کاہلی پر کئی بار سنجیدگی سے خفا ہو گیا اور سمجھانے کی کوشش کی کہ عورت کو یہ کاہلی قطعی نہیں جچتی۔ میری "دانائی" کے لکچروں کو وہ مزے سے سنتی رہتی اور جب پیمانہ لبریز ہو جاتا تو ہمیشہ ایک بات کہتی "کاہلی تو بھیا کسی پر زیب نہیں دیتی۔ چاہے کوئی عورت ہو یا مرد"

"لیکن عورت پر خصوصیت سے۔ کیونکہ خدا جانے کیسا گھر ملے۔"

"جناب یہ بوڑھیوں والی باتیں مجھے مطمئن نہیں کر سکتیں۔ مجھے عورت ہونے سے کیوں رات دن ڈراتے ہو۔ بڑی چیز سب کے لئے بری ہے۔"

"مگر ہجو۔ تقسیم کار بھی تو دیکھو۔"

"جہنم میں جائے تقسیم کار۔ مزے سے اچھے اچھے کام خود چن کر بیٹھ گئے ہو اور عورت کو تقسیم کار کے کولہو میں جوت دیا۔ اس تقسیم کار کا شکار وہ مرد اور عورتیں ہوں جو کچھ نہ کریں۔ میں تو برابر سے کام کرتی ہوں۔ دن رات قلم گھستی ہوں۔ بھلا دوسرے کاموں میں اپنی "انرجی" کیوں ضائع کروں۔"

"فرض کرو شادی کے بعد ——"

"ابھی شادی سے نہ ڈرایا کرو تم لوگ۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔"

اور وہ جو کسی نے کہا ہے کہ شکر خورے کو خدا شکر دے ہی دیتا ہے تو واقعی شادی کے بعد بھی ہاجرہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ کیونکہ احمد علی خاں کو بھی ہاجرہ سے عموماً سب سے بڑی شکایت یہ ہوتی ہے: "صاحب۔ تین چار مہینے ہونے کو آئے ہیں۔ مادام نے ایک سطر بھی لکھ کے نہیں دی۔" مطلب یہ کہ احمد علی بھی ہاجرہ کو ذرا بھی "انرجی" ضائع کرتے نہیں دیکھتے۔ خدا جوڑ ملا ہی دیتا ہے۔

ویسے یہ بات بھی نہیں کہ ہاجرہ محض بستر پر لیٹ کر ہی زندگی گزارنے کی قائل ہو۔ وقت اور ضرورت اور موڈ پر سبھی کچھ کرے گی۔ میں نے اسے اپنی کوٹھی میں کئی بار پھاوڑا اور کھرپی لئے "گارڈننگ" کرتے دیکھا ہے۔ اور اسے بتایا ہے کہ بچپن کا کھیتی باڑی کا کھیل اب اس "باغبانی" کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ لہر آ جائے تو مالی سے قینچی لے کر ایسی خوبصورتی سے باڑ تراشے گی جیسے کشیدہ کاری کر رہی ہے۔

مگر اس کا کیا کیا جائے کہ اس سے کشیدہ کاری نہیں ہوتی بلکہ اسے سارے زنانہ کاموں اور سلیقہ مندیوں سے الجھن ہوتی ہے۔ میں نے کئی دفعہ کہا: "بجی۔ میرے لئے سوئٹر بن دو۔" مگر توبہ کیجئے۔ آج تک حسرت ہی رہی۔ احمد علی خاں نے تو ایک بار "نٹنگ" کو مذاق مذاق میں محبت کی آزمائش قرار دے دیا۔ لیکن وہ امتحان میں اس طرح پوری اتری کہ بازار سے بنا بنایا سوئٹر لا دیا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

سوئی دھاگا لئے ہوئے میں نے اسے صرف ایک بار دیکھا۔ بڑی حیرت ہوئی کہ یہ کیا ہو گیا اور آسمان کیوں نہیں ٹوٹا۔ معلوم ہوا کہ نوید کی فراک سل رہی ہے۔ لیکن وہ اس وقت بڑی جھینپی جب فراک تیار ہونے کے بعد خود اسے ہی پسند نہ آئی۔ خدیجہ کو گھریلو کاموں میں دلچسپی لیتے دیکھتی ہے تو ظہیر کو نصیحت کرتی ہے کہ خدیجہ کو وقت نہ ضائع کرنے دیا کرو۔ ایک تو اس کی صحت اچھی نہیں۔ دوسرے اس نے عرصے سے کوئی کہانی بھی تو نہیں لکھی۔"

شادی سے پہلے وہ کبھی خوبصورت، رنگین یا قیمتی کپڑے پہنے نظر نہیں آئی۔ گھر بھر میں مضبوط اور بدرنگ سے بدرنگ لباس اسی کا ہوتا تھا۔ بلکہ بدرنگی پر میل مستزاد تھا۔ وہ ہمیشہ سفید ساری پہننے کی عادی رہی ہے اور سفید کپڑا جس تیزی سے میلا ہوتا ہے وہ ظاہر ہے۔ اور پھر اگر تین تین دن تک ایک ہی سفید ساری کو استعمال کیا جائے تو سفیدی ایک ایسے رنگ میں بدل جاتی ہے جسے زیادہ سے زیادہ گدلا پن کہہ لیجئے۔ بہرحال میں نے شادی سے پہلے ہاجرہ کو اسی گدلے لباس میں دیکھا ہے۔ ویسے شلوار، فراک اور ڈوپٹہ بھی اسے محبوب ہے۔ کسی زمانے میں چوڑی دار پاجامہ اور لکھنؤ فیشن کا غرارہ بھی پسند کرتی تھی مگر جب سے قیام پاکستان کے بعد غرارے پر بڑے ہی اونچے طبقے کی مہر ثبت ہو گئی ہے تو وہ مجھے غرارہ پہنے کبھی نظر نہیں آئی۔ ریشمی کپڑوں کی نسبت سوتی اور رنگین کپڑوں کی نسبت سفید اسے زیادہ پسند تھے۔ شادی کے بعد بھی یہی ڈھنگ جاری رہا ہے لیکن سنا ہے کہ نفاست پسند احمد علی کو کافی عرصہ محض اس بحث مباحثے میں گزارنا پڑا کہ عورت ہی کو نہیں مرد کو بھی لباس کے معاملے میں بور نہیں ہونا چاہیئے۔ سو جب ہاجرہ اس منطق کی قائل ہو گئی تو پھر کپڑے خریدنا ایک "مسئلہ" بن گیا۔ اول تو وہ ہمیشہ بڑبڑاتی کہ خواہ مخواہ کی فضول خرچی۔ اور اگر کچھ خرید لیا تو یوں لگ کر پہنا کہ اچھی اچھی ساریاں دنوں میں ہوا ہو گئیں۔ بے تکا پن بھی قائم ہے۔ ساری ہے تو بلاؤز نہیں۔ بلاؤز ہے تو ساری میچ نہیں کرتی اور نہ "کنٹراسٹ"

پیدا ہوتا ہے حالانکہ میچ نہ کرتے ہوئے کپڑوں سے اسے ہمیشہ سے نفرت رہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ زیادہ شوخ اور بھڑکیلے کپڑے دیکھ کر وہ بھاگ کھڑی ہوتی ہے۔ لیکن اگر اس کے "میاں" کوئی نہایت شوخ رنگ کا کپڑا بھی خرید لائیں تو خوشی خوشی پہن لے گی۔ کوئی اس کے گھر ملنے آئے تو جیسے بھی بے تکے لباس میں ہو، فوراً مل لے گی۔ کپڑے تبدیل کرنے کا تکلف ہرگز نہیں کرے گی۔

بازار جائے گی تو انتہائی محویت سے دکانوں میں گھسے گی اور ایک دم بہت سی چیزیں خرید لے گی۔ اور جب اس ملغوبے کو تھیلوں میں لاد کر گھر آئے گی تو اچانک اس پر انکشاف ہوگا کہ یہ سب چیزیں بیکار ہیں "میں سوچتی ہوں مجھے تو ان کی ضرورت نہ تھی۔ اور جن چیزوں کی ضرورت تھی وہ ذہن ہی سے اتر گئیں۔ یعنی یہ بیکار کا جھنڈار جمع کر لائی۔ لاحول ولا قوۃ"

شادی سے پہلے اس کا یہ عالم تھا کہ کئی کئی مہینے اپنے ہاتھ میں ایک پیسہ لے کر بھی خرچ نہیں کیا۔ اس کی ضروریات ہی محدود تھیں۔ معمولی کھانا، معمولی کپڑا۔ خط بھیجنے کے لئے ٹکٹ۔ کبھی کبھی کاغذ اور روشنائی اور بس۔ ویسے دولت جمع کرنے کا بھی اسے شوق نہیں تھا۔ اس کے قلم سے جو آمدنی ہوتی وہ بھی اس نے اپنے اوپر شاید ہی کبھی خرچ کی ہو۔ اور اگر اس میں سے کچھ اس کے حصے میں پڑ جاتا تو وہ پریشان ہوتی کہ آخر کس ضرورت پر صرف کرے۔ شادی کے بعد بھی یہی حالت رہی لیکن جیسے ہی وہ ماں بنی ہے۔ وہ اپنی بیٹی کے آئندہ کم سے کم پچیس برس تک کے مستقبل کو اپنے خوابوں کی مدد سے کھنگال آئی ہے۔ اور اب اکنّی کے بجائے تین پیسے خرچ کرنے کے موڈ بھی طاری ہونے لگے ہیں۔ اور بہیں میں اس کے سگھڑاپے کے درپے ہو جاتا ہوں۔ مذاق کرتا ہوں۔ لطیفے گھڑتا ہوں۔ مگر وہ نہایت سنجیدگی سے مجھے میری دو بیٹیوں کے مستقبل اور خود میرے سفید ہوتے ہوئے بالوں کا واسطہ دے کر مجھے اپنے خوابوں کی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ عجیب بات ہے کہ اس کے پاس کچھ بھی جمع نہیں۔

ہاجرہ مجھ سے تیرہ برس چھوٹی ہے، لیکن جب وہ مجھے نصیحتیں کرنے بیٹھتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ان تیرہ برسوں کو طے کر کے تیرہ برس اور آگے کی طرف زقند بھر گئی ہے۔ نصیحتیں کرتے وقت وہ اس قدر سنجیدہ ہو جاتی ہے اور اتنا بھرپور حملہ کرتی ہے کہ ہتھیار ڈالے بغیر چارہ نہیں رہتا۔ اول اول تو میں سخت گھبرایا کیونکہ میں ایک ایسے خاندان کا فرد ہوں جو گذشتہ کئی صدیوں تک محض وعظ و نصیحت کے سہارے زندہ رہا اور۔ ع

میراث میں آئی ہے جسے مسندِ ارشاد

مگر بعد میں معلوم ہوا کہ اس کی علمیت اور دانائی کا رعب تو گھر بھر پر طاری ہے۔ دراصل اس کے اس رعب داب میں چند اور عناصر بھی شامل ہیں، مثلاً ان کی چھوٹی بہنیں کہتی ہیں کہ "اپّی" نے ان پر آج تک ایک بار بھی ہاتھ نہیں اٹھایا "ہماری شرارتوں سے تنگ آ کر بہت ہوا تو رو دیں مگر پیٹا نہیں"۔ یہی وجہ ہے کہ چھوٹوں کو اس سے اندھا دھند پیار ہے۔ رہے بڑے تو انہیں ہاجرہ کی شخصیت نے گرفتار کر رکھا ہے۔ (میں ان بڑوں میں خدیجہ کو شامل نہیں کروں گا کیونکہ ہاجرہ اور خدیجہ کا رشتہ تو اس تشبیب فراز سے حیرت انگیز طور پر بلند ہے) عالم یہ رہا ہے کہ اگر چھوٹی بہنوں کو کسی سہیلی کے ہاں جانا ہے تو ہاجرہ سے اجازت لیں اور اگر اجازت مل گئی تو سمجھئے سارے گھر سے اجازت مل گئی۔ اور اگر کسی نے ہاجرہ کا سامنا کرنے سے بچنے کے لئے امّاں سے اجازت طلب کر لی تو کہا گیا "ہاجرہ سے پوچھ لو"۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ گھر میں اس کی حیثیت ایک آمر کی سی رہی ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ماں بہنوں اور بھائیوں کی محبت اور قربت کے بغیر وہ خود کو لٹا لٹا سا محسوس کرتی ہے۔ آج بھی یہ حالت ہے کہ کسی کے سر میں درد کی تکلیف ہوئی اور ہاجرہ کو اطلاع ملی تو حواس باختہ ہو کر بھاگی آ رہی ہے۔ مزاج پرسی ہو رہی ہے۔ دوائیں تجویز کی جا رہی ہیں اور مریض اس کی اس گھبراہٹ پر ہنستے جا رہا ہے۔ گھر میں اس کی اتنی "وقعت"، پر جب میں نے غور کیا تو محسوس کیا کہ اس کا باعث ہاجرہ کی "فراخدلی" ہے، وہ اپنی زندگی اور اپنے ہر نئے تجربے سے فوراً سیکھتی ہے، اپنی حماقتوں اپنی غلطیوں کو ذرا

بھی نہیں چھپاتی، تیزی سے نتائج پر پہنچتی ہے اور زندگی میں دوبارہ اپنی غلطی کا اعادہ نہیں کرتی، وہ بڑے پیار سے اپنی حماقت دکھا کر دوسروں کو وہ حماقت کرنے سے روکتی ہے اس لئے وہ سب کے دلوں میں گھسی جاتی ہے۔

خدیجہ اور ہاجرہ کے تعلقات تو دنیا بھر کی بہنوں کے لئے قابلِ رشک ہیں۔ مزاجوں میں بلا کا تفاوت ہے، مگر ایک دوسرے سے ٹوٹ کر پیار کرتی ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ زبان سے کچھ نہیں کہیں گی۔ بلکہ اکثر یوں بھی ہوا ہے کہ دونوں میں بڑے زناٹے کی لڑائی ہو گئی اور نوبت "کدیا کمینی" تک جا پہنچی۔ خدیجہ پاؤں پٹختی اوپر کے کمرے میں چلی گئی اور ہاجرہ بقراط بنی اپنے کمرے میں پلنگ پر آ گری۔ ذرا دیر کے بعد میرا ادھر سے گذر ہوا تو ہاجرہ بولی "اے لالہ سنو۔ خدیجہ کے پاس ذرا سا پانی تو رکھوا دو۔ وہ کمبخت ایک دم بہت سارہ دیتی ہے اور پھر ہفتہ بھر تک سر پکڑے بیٹھی رہتی ہے" میں خدیجہ کے پاس گیا تو اس نے بڑے موٹے موٹے آنسو گراتے ہوئے پوچھا "اے بھیا۔ ہاجرہ سے کہہ دو کہ آئندہ زبان سنبھال کر بات کیا کرے" پھر ذرا سا پانی پی کر کہا "سنو، وہ کہیں رو تو نہیں رہی کمبخت" اور اگر ان حالات میں میں نے دونوں میں سے کسی ایک سے کہہ دیا کہ "مجھے کیا پڑی ہے کہ تمہاری ترجمانی کا فرض ادا کروں۔ ایسا پیار امڈ رہا ہے تو خود چلی جاؤ" تو ایک دم خفگی کا کانٹا بدل گیا۔ دونوں ایک ہو گئیں اور دونوں مجھ سے پوچھ رہی ہیں کہ میں اتنی سختی سے کیوں بولا۔ اور پھر ان گھریلو محبتوں کے بارے میں اس کے نپے تلے نظریے ہیں۔ اس کے خیال میں ماں کی محبت ایک بے لوث عادت ہے۔ بہن اور بھائی کی محبت کہیں رسمی اور کہیں حقیقی ہوتی ہے بہر حال یہ محبت ہمیشہ کسوٹی پر ہی آ کر کھلتی ہے۔ رہی سہیلیاں تو ان کا اسے زیادہ تجربہ نہیں۔ جو لڑکی بھی اس سے ملتی ہے، اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی اور یوں ایک ایسی محبت پیدا ہوتی ہے جو احترام اور عقیدت کے بوجھ کے نیچے دبی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہاجرہ کی سہیلیاں اکا دکا ہی ہوں گی۔ کسی خاتون سے تعلق پیدا ہو تو ہر قیمت پر نباہتی ہے لیکن اگر ادھر سے ذرا سے بھی اچاٹ پن کا احساس ہو تو اپنے فیصلے کو زیادہ دیر تک معلق حالت میں رکھنے کی قائل نہیں۔ اس لئے کہ وہ تعلقات کے معاملے میں بلا کی خوددار ہے۔ انہیں ان لوگوں سے نفرت ہے جن کی نظریں مخالف صنف پر پڑ کر مجسم حسن بن جائیں، جو خود کو نمایاں کرنے کے لئے غیر معمولی حرکتیں یا باتیں کریں۔ ہر اچھے بھلے آدمی کا نفسیاتی تجزیہ کرنے والوں سے اسے چڑ ہے۔ ان لوگوں سے اسے بیر ہے جن کے نزدیک انسانی فطرت کی بنیادی پاکیزگی کے نام کی کوئی چیز ہوتی ہی نہیں۔ مرغ کی ایک ٹانگ پر اڑ جانے والوں، بے رحم جھگڑالو لوگوں اور خاص طور سے ان آدمیوں کی تو وہ دشمن ہے جن کی آنکھیں آنسوؤں سے نہ بھیگ سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ملنے والوں میں سے کوئی اسے خوش مزاج اور ملنسار کہتا ہے اور کوئی خود پسند اور اکھڑ۔ مگر حقیقت میں اس کا ایک نہایت صاف ستھرا معیار ہے۔ ایک بار میرے اس سوال پر کہ اس نے اب تک کوئی سہیلی کیوں نہیں بنائی، کہا تھا۔

"اول تو میرے لئے اکیلی خدیجہ کافی ہے پھر بات یہ ہے کہ جس عورت میں ادبی ذوق اور سماجی اور سیاسی شعور نہ ہو وہ بھی کوئی عورت ہے۔ یہاں تو اس ذوق و شعور کے بجائے اتراہٹ کے چرچے ہیں۔ اور اترانے والے لوگ مجھے سخت کھلتے ہیں" اس کے خیال میں مرد اتراتے ہیں تو عورتوں کو گھورتے ہیں، فقرے کستے ہیں۔ قہقہے لٹاتے ہیں اور عورتوں کا پیچھا کرتے ہیں۔ عورتیں اتراتی ہیں تو خواہ مخواہ کھلی جا رہی ہیں۔ لجائی جا رہی ہیں۔ ضرورت سے زیادہ بن رہی ہے، مصنوعی قہقہے لگ رہے ہیں۔ لباسوں کے نرخ پوچھے جا رہے ہیں۔ اور تصنع چاہے نجی زندگی میں ہو چاہے سماج میں، فن میں ہو یا سیاست میں، ہاجرہ کی شدید نفرت کا واحد ہدف ہے۔

شادی سے پہلے تک گھر میں وہ ایک "سادھو مہاتما" کی سی زندگی گذارتی تھی۔ رات کو تین چار بجے تک پڑھتی لکھتی یا سوچتی رہتی اور جب سارا گھر ناشتے سے فارغ ہو چکتا اور دوپہر کے کھانے کی تیاریاں شروع ہوتیں تو وہ اٹھتی اور اس کے کمرے سے "اے بھئی کوئی ذرا سا پانی تو لا دو" کی آواز آتی "لو۔ اب اٹھی ہے" اماں کہتیں۔ مگر خدیجہ ہمیشہ اس کی کمک کو پہنچ جاتی "جب رات کو تین چار بجے سوئے گی تو صبح کو دس ہی بجے اٹھے گی۔ اور پھر وہ رات بھر بیکار تو نہیں بیٹھی رہی۔ لکھتی پڑھتی رہی ہے"

پانی آیا۔ کلّی کی اور چُپ چاپ بیٹھ گئی۔ چائے رکھی ہے تو ایک پیالی بھجوا دی گئی ورنہ ہاجرہ کوئی شکایت کئے بغیر پڑی رہے گی۔ کافی دیر کے بعد اُٹھے گی اور اپنے کمرے کو جھاڑ پونچھ کر پھر پلنگ پر گر پڑے گی۔ گھر کا کوئی کام سپرد ہُوا تو جی جان سے کر ڈالا ورنہ بس پڑے پڑھ رہے ہیں یا یونہی خواب دیکھ رہے ہیں۔ البتہ اگر "نقوش" کی ترتیب کا کام ہو رہا ہے تو کلّی کرنے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ تمام مسودات اپنے قریب کر لئے۔ اوندھے ہو کر مسودات کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔ قلم چل رہا ہے۔ مسودہ بُرا ہے تو "اُفوہ" کہہ کر اُدھر ڈال دیا۔ اچھا ہے تو "واہ" کہہ کر اِدھر رکھ لیا۔ فہرستیں بن رہی ہیں۔ ترتیب کی ندرتیں سوچی جا رہی ہیں۔ غرض اگر ادبی کام ہے تو اس میں یوں کھو جائے گی جیسے باقی سب ہیچ ہے۔ ادب میں اس وارفتگی کا لطف اس وقت آیا جب ہم دونوں "نقوش" سے الگ ہوئے۔ مہینوں تک وہ ایسی اداس رہی جیسے وہ اسی عمارت کے نیچے دب گئی ہے جسے اس نے اپنے ہاتھوں سے تعمیر کیا تھا۔ "نقوش" کا نام آتے ہی وہ بالکل بچّوں کی طرح رو دیتی اور جس روز "نقوش" ۱۱ شائع ہُوا (جس پر ہم دونوں کے نام نہیں تھے) تو اس نے اپنے کمرے میں اس شمارے کا داخلہ ہی بند کر دیا۔ البتہ شام کو وہ یہی رسالہ پڑھتی نظر آئی اور پھر آہستہ آہستہ اس کڑی حقیقت کو قبول کر لیا۔

نومبر ۱۹۴۹ء کی کل پاکستان ترقی پسند مصنّفین کانفرنس کے بعد بعض "مہربانوں" نے نام لے لے کر ہاجرہ اور خدیجہ کو گالیاں دیں۔ ان کے کارٹون چھاپے۔ اور ترقی پسند مصنّفین کو سازندے بنا کر دونوں بہنوں کو اپنے اخبارات کے صفحات پر ناچتا ہُوا دکھایا۔ یا پھر جب دونوں بہنوں کی شادی ہوئی اور بڑے بڑے "مؤقر" اخبارات اور بڑے بڑے "ایثار پیشہ" ایڈیٹروں نے جی بھر کر گندگی اُچھالی اور صحافت کو نجاست کے درجے پر لے آئے تو اس وقت شروع شروع میں تو ہاجرہ بھونچکّا سی رہ گئی مگر پھر آہستہ آہستہ اس نے ایسے صبر و ضبط کا ثبوت دیا کہ بعض اوقات جب میں اپنے ہم پیشہ قلمکاروں کی ان انسانیت سوز حرکات کے خلاف منتقمانہ جذبات کا اظہار کرنے لگتا تو ہاجرہ کہتی: "جانے بھی دو بھیا۔ تمھیں یقین ہے نا کہ تم ترقی پسند ادب کی تحریک میں شامل ہو کر کوئی بُرا کام نہیں کر رہے، تمھیں اعتماد ہے نا کہ ادب میں زندگی اور اس کی توانائی کی قدروں کی علمبرداری تمھارے عقائد پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ پھر جب تم اپنے آپ کو سچائی، حقیقت اور انصاف کا علمبردار کہتے ہو تو کبھی ایسا بھی ہُوا ہے کہ سچائی اور حقیقت اور انصاف کی قوتیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مطعون قرار دی جاتی رہیں۔ وقت آئے گا جب ہمارے ادبی نظریات کو ایک زندہ قوم کے نظریات تسلیم کیا جائے گا۔ اور اس وقت یہ کارٹون اور یہ گالیاں ہمیں طے شدہ راہ کے چند حقیر روڑے معلوم ہوں گی۔ اس لئے انھیں کہنے دو جو وہ کہہ سکتے ہیں اور تم لکھو جو تمھیں لکھنا چاہیئے۔ اپنی نظم مکمل کر دو۔"

"نقوش" سے علیحدگی کے سلسلے میں ہاجرہ کی چیخم دھاڑ اور پھر گالیوں کی بوچھاڑ کے مقابلے میں ہاجرہ کی یہ سنجیدگی اور صبر و ضبط اس کی شخصیت کو پوری طرح واضح کرتا ہے۔ بظاہر ہاجرہ تیز مزاج اور انتہا پسند معلوم ہوتی ہے مگر دراصل وہ نہایت متوازن انداز میں سوچتی ہے اور اکثر مسائل میں تو میں اسے رجعت پسندی تک کا طعنہ دے ڈالتا ہوں۔

بعض لوگ عرصے تک اسے لکھنؤ کی مشہور سیاسی ورکر "ہاجرہ بیگم" سمجھتے رہے اور میرے خیال میں پنجاب کی سی۔ آئی۔ ڈی اب بھی اسے "ہاجرہ بیگم" ہی سمجھتی ہے، جبھی تو مہینے میں ایک آدھ بار خفیہ پولیس کا کوئی نہ کوئی آدمی اس کی کوٹھی پر "ہاجرہ بیگم" کا پتہ پوچھتا آ نکلتا ہے۔ اور وہ نہایت نرمی سے اسے بتاتی ہے کہ ہاجرہ یہیں رہتی ہے۔ وہ احمد علی خاں اسسٹنٹ ایڈیٹر پاکستان ٹائمز کی بیوی ہے اور ان دنوں اس کی تنہا سرگرمی یہ ہے کہ وہ ایک ناول لکھ رہی ہے۔ میں نے ایک روز کہا کہ پولیس کی یہ غلط فہمی دُور ہو جانی چاہیئے مگر اس پر ہاجرہ بولی کہ آخر یہ کیا جانیں کہ ہاجرہ بیگم کون ہیں اور ہاجرہ مسرور کون ہے۔ یہ بے چارے تو اپنی ڈیوٹی ادا کرنے آتے ہیں۔

میں نے ایک دن ایک الگ مدرسۂ فکر کے کسی شاعر کا ذکر کیا جس نے ایک ناشر کو اپنی نظموں کے مجموعہ کے حقوق کسی مجبوری کے تحت چالیس پچاس روپے میں دے ڈالے تھے۔ اور پھر جب چند روز بعد اسے اپنی نادانی کا احساس ہُوا اور اس نے ناشر سے

معاوضے میں ذرا سے اضافے کے لئے کہا تو ناشر نے شاعر کو سرِ بازار تھپڑ مار دیا۔ مجھے گمان تک نہ تھا کہ یہ واقعہ سن کر ہاجرہ کتنا شدید اثر قبول کرے گی۔ وہ ایک دم مجھ پر برس پڑی اور بولی "اور تم لاہور کے ادیبوں اور شاعروں نے یہ واقعہ سنا اور چپ چاپ پی گئے؟ تم لوگوں کو شرم نہ آئی کہ ایک شاعر سرِ بازار ایک ناشر کے ہاتھوں بے بات کی بات پر پٹ گیا اور تم لوگ کافی ہاؤسوں میں بیٹھ کر لطیفے گھڑتے اور قہقہے لگاتے رہے۔ تم سب نے اکٹھے ہو کر اس ناشر کو نوچ نہ ڈالا؟ کیا ہوا اگر وہ شاعر ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا ممبر نہ تھا۔ وہ شاعر تو تھا اور شاعری کسی ایک مدرسۂ فکر کا اجارہ تو نہیں۔ تم لوگ اس بات پر تو آپس میں جنگوں پر تُل جاتے ہو کہ فلاں شاعر نے زندگی کو "اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا" کیوں کہا اور یوں زندگی کی ہتک کیوں کی لیکن شاعر کی ہتک پر تمہاری غیرتیں کہاں سو جاتی ہیں" وغیرہ وغیرہ۔

ہاجرہ کو ترقی پسند ادب کی تحریک سے ہمیشہ والہانہ پیار رہا ہے مگر وہ اس تحریک کی بڑی بے رحم نقاد بھی ہے۔ اسی طرح وہ اس بات کو ماننے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوئی کہ غیر ترقی پسند شاعر، شاعر ہی نہیں ہے۔ کسی نظریاتی امتیاز کے بغیر وہ فن اور فنکار کی عظمت کی بڑی سختی سے قائل ہے بشرطیکہ فن کار خود بھی اپنے منصب کی عظمت کا احترام کرنا جانتا ہو۔

اپنی تحریروں سے وہ کبھی کماحقہٗ مطمئن نہیں ہوتی۔ ہمیشہ ہر افسانے کے بعد۔ ایک آہ سرد کھینچے گی اور کہے گی "بات بنی نہیں"۔ اور پھر آئندہ افسانے میں "بات بنانے" کی کوشش میں سر دھڑ کی بازی لگا دے گی۔ یہ سلسلہ اب تک چل رہا ہے اور میرے خیال میں ہمیشہ چلتا رہے گا۔ ہاجرہ کا یہ احساس اسے اپنے فن کو نکھارنے کے لئے نئے سے نئے انداز کھوجنے پر مجبور رکھتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کے افسانوں میں فن کا تدریجی ارتقاء بہت واضح نظر آتا ہے۔

مطالعہ اور چھالیہ اس کی عادت ہے۔ چھالیہ پاس رکھ دیجئے اور کتابوں کا ڈھیر لگا دیجئے اور چاہے دو دن کھانا نہ دیجئے۔ لیٹے لیٹے سب کتابیں بہت تیزی سے پڑھ ڈالتی ہے، اچھی کتابوں کو تین چار مرتبہ پڑھ لے گی۔ لیکن شاید ہی اس نے کبھی کوئی کتاب خرید کر پڑھی ہو۔ ایک خریدی تھی جو میرے ہاں بھول گئی اور میں نے اسے اپنی لائبریری میں داخل کر لیا۔ آج ہی یہ راز فاش کر رہا ہوں۔

کتابیں ہوں تو اسے نیند بھی نہیں آتی۔ ویسے نیند اس کی کمزوری ہے۔ بے تحاشہ سوتی ہے۔ ایک بار اسے ضد میں جگایا نہیں گیا تو مسلسل بیس گھنٹے سوتی رہی۔

تاش کیرم قسم کے کھیلوں سے ایک آدھ بازی کے بعد بور ہو جائے گی۔ اور میں اس عادت سے بے حد چڑتا ہوں۔ اچھا خاصا کھیل ہو رہا ہے کہ کیرم بورڈ کو الٹ دے گی اور کہے گی "لاؤ بھئی کوئی اِدھر اُدھر کی بھی بات کریں"۔ کہتی ہے کھیل جسم کو تر و تازہ کرنے کے لئے ہوتے ہیں اس لئے کھیلنا ہے تو ایسا کھیل کھیلو کہ ذرا دوڑ بھاگ ہو۔ یہ کیا کہ افیمچیوں کی طرح بیٹھے ٹھک ٹھک کریں۔

موسیقی سے اسے حد درجہ کا عشق ہے مگر ریڈیو سے چڑ ہے۔ ریڈیو سے چڑ اس لئے ہے کہ اگر ریڈیو رکھا ہو تو وہ دن رات سارے جہاں کے اسٹیشن بدل کر کے ملکوں ملکوں کی موسیقی اس شدت سے سنتی ہے کہ پھر پڑھنے لکھنے میں اس کا جی نہیں لگتا۔ شادی سے پہلے میں یہ تماشہ دیکھ چکا تھا۔ لیکن اس وقت مجھے سخت حیرت ہوئی جب اس نے اپنی شادی کے بعد اپنے گھر کے لئے آج تک ریڈیو نہیں خریدا۔ میں نے پوچھا تو پتہ چلا کہ وہ ریڈیو کی کشش سے ڈرتی ہے۔ "لالہ پھر تم جانو لکھنے پڑھنے کا سارا پروگرام ٹھپ ہو جاتا ہے"۔ سنا ہے احمد علی تازہ بتازہ خبریں سننے کے لئے ان دنوں ریڈیو کی ضرورت سختی سے محسوس کرتے ہیں اور ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو ریڈیو خریدنے نہ خریدنے پر ان کے گھر میں مباحثہ منعقد ہوتا ہے۔ تاوقتِ تحریر ہاجرہ جیت رہی ہے، یعنی ریڈیو ابھی تک اس کے گھر میں داخل نہیں ہوا۔

ٓ ندیم بھائی! چلتے چلتے اتنا تو بتا دیجئے ——— کیا سارے پبلشر ایسے ہی ہوتے ہیں؟! اگر آپ نے میرے اس سوال کا جواب نہ دیا۔ تو اس "بے قلم" طبقہ کے ساتھ انصاف نہ ہوگا ——— میں تو اس باب میں کچھ نہ کہوں گا۔ اس لئے کہ میرے اور اہلِ قلم کے درمیان کچھ نازک قسم کے رشتے ہیں۔ ورنہ اس ضمن میں کچھ میں بھی عرض کرتا۔
(محمد طفیل)

پھر کئی بار ایسا بھی ہوا ہے کہ میں گھر میں اپنی نئی نظم یا غزل سنانے بیٹھا ہوں۔ بچوں کو ڈانٹ کر خاموش کر دیا گیا ہے۔ باورچی خانے میں ملازم نے برتن بجانے بند کر دیئے ہیں۔ سب لوگ میرے آس پاس سمٹ آئے ہیں۔ میں پہلا شعر پڑھتا ہوں۔ کوئی "ہوں" کہتا ہے، کوئی داد دیتا ہے۔ کوئی خاموش رہتا ہے اور پھر ہاجرہ کی آواز آتی ہے "لالہ۔ معاف کرنا۔ اے بھئی طاہرہ۔ مجھے ذرا سی ڈلی تو لا دو۔ دانتوں میں عجیب چل سی ہو رہی ہے۔ لالہ تم کیوں خاموش ہو گئے۔ پڑھتے جاؤ نا!" میں سچ مچ خفا ہو جاتا ہوں۔ کسی کے سنبھالے نہیں سنبھلتا۔ ہاجرہ منتیں کرتی ہے "پھر ایسا نہیں کروں گی کمبخت عادت ہی ایسی ہے۔ پھر میں نے ایسی کون سی گستاخی کر دی کہ تمہارے دماغ ہی نہیں ملتے۔ بڑے آئے وہاں سے۔ چپکے سے غزل سنا دو ورنہ یاد رکھو پھر اس گھر میں قدم نہیں رکھوں گی۔ خدا جانے تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو؟" سارے گھر کے مجبور کرنے سے میں پھر بیاض کھولتا ہوں۔ چند شعر پڑھتا ہوں کہ اچانک دبی دبی آواز آتی ہے "ذرا لپک کر دیکھنا تو صبوحی۔ بے بی کا دودھ گرم ہوا کہ نہیں۔ چپکے سے جاؤ ورنہ لالہ مار ڈالیں گے۔" پھر سب کو اپنی طرف متوجہ پا کر۔ ہاجرہ مجھ سے مخاطب ہو کر کہتی ہے "واہ، بڑا اچھا شعر نکالا ہے۔" "کونسا شعر؟" میں امتحان لینے پر اتر آتا ہوں اور ہاجرہ کہتی ہے "وہی جو سب سے اچھا تھا۔" اور ہم سب ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں "کمبخت جاہل، بد ذوق" میں خفا ہوئے بغیر کہتا ہوں۔ "جس شخص کو شعر کا ذوق نہ ہو وہ فنکار تو قطعی نہیں بن سکتا۔ دکانداری کی بات دوسری ہے۔ کیوں خدیجہ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میں اپنے بھیا سے متفق ہوں اور ہاجرہ کی بد ذوقی پر آٹھ آٹھ آنسو گرانے کے لئے ادھر باورچی خانے کی طرف جا رہی ہوں کیونکہ مجھے شدید بھوک لگی ہے۔" خدیجہ حسبِ معمول ہاجرہ کے شعری ذوق پر حملہ کر کے بھاگ جاتی ہے اور میں ہاجرہ سے جھگڑنے لگتا ہوں۔

"تم اتنی بد ذوق کیوں ہو ہجو؟"

"میرے دشمن بد ذوق ہوں" وہ کہتی ہے "بد ذوق تو گالی ہے، مجھے تو شعر بہت پسند آتے ہیں۔ مجھے تو اردو اور فارسی کے بیسیوں شعر یاد تھے کسی زمانے میں۔"

"شعر پڑھ بھی لیتی ہو؟" خدیجہ باورچی خانے میں سے چلاتی ہے "نثر میں شعر پڑھنا تو کوئی ایسی مشکل بات نہیں۔ یہ کام تو ظہیر بابر صاحب بھی کر لیتے ہیں۔"

ہنستے ہنستے سب کی بری حالت ہو جاتی ہے مگر اس کے باوجود ہاجرہ بضد رہتی ہے کہ وہ فن کی رسیا ہے۔ اور معنی کا حسن شعر میں ہو یا افسانے میں، رقص میں ہو یا نغمہ میں۔ رنگ میں ہو یا سنگ میں اسے اپنی طرف محض متوجہ ہی نہیں کرتا بلکہ ڈبو لیتا ہے۔ اور وہ جھوٹ نہیں کہتی۔ شعر کے معاملے میں اس کے ذوق کا معیار شعر سننا نہیں گنگنانا ہے۔ رقص، نغمہ، تصویر، مجسمہ، پھول اور رنگ میں اس کا ذوق سارا سلجھا ہوا اور معیاری ہے مگر سچی بات یہ ہے کہ جب فکشن کا ذکر آتا ہے تو اس کی گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ چاہے وہ زبان سے اس کا اعتراف نہ کرے لیکن وہ فکشن کو تمام فنونِ لطیفہ کی جان سمجھتی ہے۔

ان دنوں اپنی بچی نوید سے جاہل ماؤں کی طرح محبت کرتی ہے، اس کا بس چلے تو اسے پیٹھ پر باندھے پھرے۔ وہ تو کہیئے نوید خود فطرتاً عالی ظرف ہے اور ماں کو زیادہ لفٹ نہیں دیتی ورنہ اب تک بچی کا ستیاناس ہو چکا ہوتا۔ کوئی سمجھائے تو کہے گی "میں چاہتی ہوں میری بچی کو محبت کی پیاس نہ رہ جائے۔"

اگر کوئی سمجھائے کہ "اچھا اگر اسے زندگی میں تمہارے برابر پیار نہ ملا تو پھر؟" تو پھر وہ سنبھل سنبھل کر اور گن گن کر نوید سے محبت کرے گی۔ اور چائلڈ سائیکالوجی پڑھنے پر جٹ جائے گی۔

وہ کہا کرتی ہے کہ پہلے میں مایوس ہو جایا کرتی تھی۔ شاموں کو تو میری اداسی ناقابلِ بیان ہوتی تھی۔ میں جس جگہ ہوتی، شام کو وہاں سے بھاگ جاتی۔ مگر جب سے نوید آئی ہے میں ایک بار بھی مایوس نہیں ہوئی۔ میرے دل میں کسی کی بات اب نہیں چبھتی۔ میں اب جلدی سے معاف کر دیا کرتی

ہرن۔" اور واقعی نوید کی آمد کے بعد سے شاید ہی کبھی اسے اتنا غصہ آیا ہو کہ وہ رو دی ہو۔ اسے ہر وقت ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی بہتر بات ہو رہی ہو۔ کوئی بہت اہم اور دلچسپ تبدیلی۔

یہ اہم اور دلچسپ تبدیلی کے خواب بہت پرانے ہیں۔

وہ تصورات کی دھند میں آنکھیں جھپکا کر کہا کرتی ہے "میرے پاس کچھ جمع ہو جائے تو میں دنیا بھر کے سفر پر چل پڑوں۔ کہیں پیدل۔ کہیں لمبے سمندری سفر۔ برف زاروں میں۔ ریگستانوں میں۔ سبزہ زاروں میں۔ زندگی سفر میں کٹ جائے۔ یہ گھر بنانے کی کٹ کٹ کہیں نہ ہو۔ احمد علی اور میں مل کر سفر نامہ لکھیں۔ بڑا شاندار سفر نامہ ہوگا۔ لالہ۔ تم بھی کچھ جمع کر لو تاکہ تمہارے بچے بعد کو پریشان نہ ہوں۔ تم بھی ہمارے ساتھ چلنا۔ خدیجہ اور طاہرہ کو بھی چلنا چاہیے اور"—— آہستہ آہستہ اس کی ساری محبوب ہستیاں اس کے پیچھے قافلے کی طرح رینگنے لگتی ہیں۔

وہ اپنی محبتوں، یادوں اور حماقتوں سے پیچھا نہیں چھڑا سکتی۔ اس کے ذہن میں بچپن کے بوئے ہوئے دانے اب بھی لہلہاتے ہیں۔ اور نشیب میں کسانوں کی آبادی سے شام کے وقت اپلوں کے اٹھتے ہوئے دھوئیں کا نقش اب بھی اس کے ذہن میں اجاگر ہے جسے وہ شام کو تنہائی کے بے تکے کھیلوں سے بھاگ کر احاطے کی دیوار سے ٹک کر خواہ مخواہ دیکھا کرتی تھی۔

(محمد طفیل پرنٹر پبلشر نے اشرف پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کیا)

شوکت تھانوی

عشرت رحمانی

اوائل جنوری ۱۹۵۵ء میں ایک اچانک آپریشن کے زیرِ عتاب صاحبِ فراش تھا کہ فرمائشوں کی یورش ہوئی "شوکت تھانوی" پر "نقوش" کے "شخصیات نمبر" کے لئے فوراً مضمون لکھ دوں۔ یہ بھی آپریشن کی طرح ایک شدید ناگزیر حملہ تھا۔ ایک زخمی مریض کا "شوکت" جیسے شاندار ظرافت نگار شخص کے بارے میں شایانِ شان مضمون لکھنا ——— اور پھر "فوراً" ...... ! شاید بیمار نہ ہوتا تو منہ چھپا کر گریز کی کوشش میں کامیاب ہو سکتا ——— لیکن بستر پر دراز تھا بچنے کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ سوچنے سمجھنے کی بھی طاقت نہ تھی ——— جو کچھ لکھنا چاہتا تھا اس کے لئے وقت بھی نہ تھا۔ "حیاب کی تعمیل میرے نزدیک "گناہ" ہے۔ اس لئے یہ مختصر مضمون "عذر" کے طور پر حوالے کر دیا تاکہ گناہ کی بدتری کا ثبوت ہو، اور "عیادت" کے شکریہ کے طور پر کام آسکے! ——— (عشرت)

دہلی کے محلہ چیلی والان میں جو اب اردو بازار کہلاتا ہے، ایک خوشنما مکان "اکبر منزل" کے نام سے موسوم تھا۔ قیام پاکستان سے پہلے وہاں اس مکان کے مالک کا خاندان رہتا تھا، اور اب ایک سردارجی کا کنبہ قابض ہے۔

اسی اکبر منزل کے ایک گوشہ کا ذکر ہے ۱۹۳۳ء کے اوائل میں گرمیوں کی ایک دوپہر، چند ادیبوں کی مختصر مجلس منعقد تھی۔ یوں تو اس کو باقاعدہ قسم کی ادبی مجلس نہیں کہا جا سکتا۔ صاحبِ خانہ خود خوش گو صاحبِ ذوق ادیب و شاعر تھے، ان کے چند ادبی دوست باہر سے آئے ہوئے تھے۔ اور یہ مجلس ان کی ملاقات کی تقریب کے طور پر منعقد کی نہیں گئی تھی بلکہ ہو گئی تھی۔ میزبان تھے اکبر حیدری (جو ۱۹۴۰ء میں غیر متوقع طور پر بے وقت رحلت کر گئے)، مہمانوں میں لکھنؤ سے "سودیشی ریل" کے مصنف شوکت تھانوی آئے اور ان کے ساتھ ان کے پبلشر دوست نسیم انہونوی تھے۔ لاہور سے "نیرنگ خیال" کے اڈیٹر یوسف حسن، دہلی سے ہفتہ وار "ریاست" کے مدیر حنیف ہاشمی (جوانمرگ ادیب) اور راقم الحروف مدیرِ "نیرنگ"۔

ان تمام احباب کے درمیان اول طعام کے بعد سلسلۂ کلام جاری تھا۔ اور نہایت گرما گرم بحث ہو رہی تھی۔ لطف یہ کہ موضوعِ بحث ادبی ہونے کی جگہ "غیر ادبی صوبہ جاتی تعصب" کے بارے میں تھا۔ دلچسپ انداز میں نوک جھونک ہو رہی تھی۔ بحث میں حصہ لینے والوں میں نسیم صاحب کچھ زیادہ سنجیدہ رہے۔ اور یوپی کا تفوق جتانے میں بہت بڑھ چڑھ کر مباحثہ کرتے رہے۔ ان کے مقابلہ میں مرحوم حنیف ہاشمی پنجاب کے سرگرم طرفدار تھے۔ بات یوپی اور پنجاب کے ادیبوں اور

شاعروں سے ہوتی ہوئی جغرافیائی و طبعی حالات کے ضمن میں داخل ہونے لگی۔ شوکت صاحب اپنے ساتھی نسیم صاحب کو سنبھالنے میں مصروف رہے۔ حکیم صاحب بین بین۔ انہیں اپنے رسالہ کے ہر علاقائی مضمون نگار کا لحاظ تھا۔ اور چونکہ سوویٹی پیل۔ کے موجد شوکت تھانوی ان کے سامنے پہلے ثالث کی حیثیت سے دو علاقائی بھائیوں کو متحد کرنے میں مصروف کبھی ایک کی طرفداری میں اور کبھی دوسرے کی موافقت میں اپنے مخصوص انداز میں بول رہے تھے۔ راقم الحروف کے لئے اس گفتگو کا عجیب انداز تکلیف دہ بھی تھا اور محیر العقل بھی۔ صلح صفائی کی ہر کوشش بظاہر رائگاں نظر آ رہی تھی۔ تعلیم یافتہ حضرات جب کج بحثی پر آمادہ ہو جائیں تو ان کو سمجھانے کا ہر گُر بے کار ثابت ہوتا ہے۔ بہت سی باتیں اس بحث کے دوران میں ایسی سننے میں آئیں جن کا انداز کچھ بے پڑھے لکھے لوگوں کا سا تھا۔

اکبر حیدری مرحوم ہم سب کے بڑے مخلص اور پیارے دوست تھے۔ اور ان کی بے چینی کا ہم سب کو احساس تھا کہ میزبان کی حیثیت سے ان کی پوزیشن بہت نازک ہو رہی تھی۔ وہ بڑی بے چارگی کے ساتھ پہلو بدل بدل کر مخصوص انداز میں اپنا پائپ سُلگاتے اور دھواں دھار بحث کو اپنے "پس ماندہ دھوئیں" میں اڑانے کی سعیٔ لاحاصل کرتے۔ آخر انہوں نے کہا

"بھیا۔ اب اس بے کار مباحثہ کا خاتمہ کیجئے۔ یہ دو آنکھوں کی جنگ ہے۔ اور میں تو سنگم کا پرستار ہوں۔ انبالہ میں پیدا ہوا۔ دہلی میں پرورش پائی۔ ایک بیوی لکھنؤ کی اور دوسری دہلی کی"۔

اس پر شوکت صاحب نے قہقہہ لگا کر کہا "گویا آپ کے بارے میں ایک دوست کی زبانی جو اطلاع ملی تھی خود آپ اس کی تائید کر رہے ہیں"۔

سب "کیا کہا!" پکارتے شوکت صاحب کی طرف مخاطب ہوئے۔ انہوں نے کہا

"سنا تھا دو آپ کی مادری زبان ہے۔ اب آپ نے اس کا اقرار وجہ تسمیہ کے ساتھ فرما دیا!"

کمرہ قہقہوں سے گونج اٹھا آخر شوکت صاحب نے اپنے انداز خاص میں صلح کرا کے چھوڑی۔ اور حنیف ہاشمی و نسیم انہونوی گلے مل لئے۔ بات آئی گئی ہوئی۔ پھر ملاپ کے مزے آنے لگے۔ اور دلچسپ ادبی گفتگو کے بعد یہ مجلس بخیر و خوبی ختم ہوئی۔

یہ تھی پہلی ملاقات جو میرے اور شوکت تھانوی کے درمیان ہوئی۔ غائبانہ تو پہلے تھی مگر آمنا سامنا نہ ہوا تھا۔ اور پھر کچھ عرصہ بعد دہلی میں آل انڈیا ریڈیو قائم ہوا۔ شوکت صاحب تقریریں نشر کرنے آتے رہے اور ملتے ملاتے رہے۔ کئی بار کی بے تکلف ملاقاتوں اور صحبتوں میں اس بات کا بخوبی اندازہ ہو گیا کہ شوکت تھانوی ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جس کی تحریر اور تقریر کا ایک ہی انداز ہے۔ اور اس کے ظاہر و باطن میں چنداں فرق نہیں۔ جو دل میں وہ زبان پر۔ جو تقریر وہی تحریر۔ اور یہی سبب ہے کہ اس حیوانِ ظریف کی بے تکلف ظرافت کو لوگ تحریر کے پردہ میں بھی تقریر کے مزے لے کر پڑھتے ہیں۔ شوکت کے مضامین سے میں نے ان کی دلچسپ شخصیت کا جو اندازہ لگایا تھا چند بے ربط ملاقاتوں میں اس کا وہی لطف اٹھایا۔

مئی ۱۹۳۹ء میں جب آل انڈیا ریڈیو سے منسلک ہو کر لکھنؤ پہنچا تو شوکت صاحب وہاں پہلے ہی موجود تھے۔ پرانی واقفیت تھی مگر دور کی۔ لیکن اس قربت سے ادبی خلوص بے ادبی کی حد تک "بے تکلفی" پر آمادہ ہو گیا۔

اس کے بعد شوکت اور عشرت قریب سے قریب تر ہوتے گئے۔ چنانچہ ادبی دنیا میں یہ دونوں نام کچھ اس طرح لازم و ملزوم ہو گئے کہ شوکت کے مضمون کی فرمائش عشرت کو اور عشرت کے مضمون کے لئے شوکت کے پاس تقاضے آنے لگے اور آتے رہتے ہیں۔ اور یہ ملاپ اب پیار محبت، جھگڑے لڑائی کی تمام پرخلوص حدود سے تجاوز کر کے محض قربت بن گیا ہے۔ بہر حال یہ معاملہ تو میرے اور شوکت کے واسطہ کا ہے جو جملہ معترضہ کے طور پر استعمال نہیں کیا گیا! بلکہ اس ثبوت کے طور پر ہے کہ شوکت کی شخصیت کو پرکھنے کا حق عشرت کے لئے کیوں محفوظ رکھا گیا ہے۔

شوکت تھانوی کی شخصیت کی نمایاں ترین کیفیت اس مضمون کی تمہید میں واضح کی جا چکی ہے۔ یعنی بڑے سے بڑے اور سنجیدہ سے سنجیدہ مسئلے کو شوکت اپنے مخصوص ظریفانہ انداز میں حل کر سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اہم سے اہم شخصیت کو شوکت چٹکیوں میں اڑانے کی اہلیت رکھتا ہے۔ بعض حضرات نے شوکت تھانوی کے دلچسپ افسانے، ناول اور مزاحیہ مضامین پڑھے ہیں وہ یہ سمجھتے ہوں گے کہ شوکت صاحب کی زندگی کا کوئی لمحہ سنجیدگی سے نہیں گزرتا ہوگا۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ شوکت

جس بلا کا مزاح نگار اور بذلہ سنج ہے وہ اسی غضب کا سنجیدہ انسان بھی ہے۔ اور پھر لطف یہ کہ کسی محفل میں شوکت کو بے اختیار ہنستے ہنساتے دیکھ کر حاضرین کو کبھی گمان تک نہیں ہو سکتا کہ یہ "موجِ تبسم" یا "دیوارِ قہقہہ" کسی لمحہ انتہائی درجہ کا سنجیدہ بن کر اہلِ محفل کو ساکت وصامت کر دے۔ اور سب حیرت زدہ ہو کر منہ تکتے رہ جائیں گا۔ پھر یہ بھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ سنجیدگی۔ شوکت کی ادائے خاص ہے یا واقعی کوئی سنجیدہ پہلو نکل آیا۔ لیکن شوکت جب واقعی سنجیدہ ہو تو آفت ہے۔ کیونکہ شوکت فطری طور پر دوستوں کا پکا دوست اور دشمنوں کا سخت دشمن ہے۔ البتہ خصوصیتِ مزاج اور افتادِ طبع کے لحاظ سے وہ "دیرآشنائی" کا دشمن ہے۔ تبدیلی عام انسان کی عادت میں داخل ہوتی ہے۔ لیکن شوکت ان انسانوں میں ہیں جن کی فطرت کا دوسرا نام تبدیلی ہے۔ شوکت صاحب کو زیادہ قریب سے جاننے کے لئے یہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ ان کی شخصیت "زود رسی" کا مجسمہ ہے۔ وہ ادبی لحاظ سے بسیار نویس، زود گو، طبعاً زود فہم، زود رس اور زود رنج ہیں۔ ادیب وشاعر کی حیثیت سے وہ جس قدر "زود گو" ہیں عام زندگی کے معاملات حتیٰ کہ شادی اور اولاد کے معاملہ میں بھی اسی قدر "زود گو" اور "بسیار نویس" واقع ہوئے ہیں۔ شوکت کے نام میں نہیں تخلص میں جو شان ہے اس کے لحاظ سے ان کی طبیعت میں بھی انتہائی نفاست ہے۔ رہائش و زیبائش لباس اور وضع قطع ہر انداز میں یہ کیفیت پوری طرح نمایاں نظر آتی ہے۔ ایک زمانہ میں تخلص سے دور اپنے نام اور مقام کی رعایت سے حضرت نے مقطع ریش بھی رکھ ڈالی تھی۔ لیکن اس کی نفاست کو برقرار رکھنے کے لئے بھی خاص اہتمام اور روغنیات برتتے رہے۔ واضح ہو کہ شوکت کا پورا نام "محمد عمر" اور مقام حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا وطن "تھانہ بھون" ہے۔ اور اس کعبہ سے اس "بت" کو دور کی نہیں قریب کی نسبت بھی ہے۔ چنانچہ اسی نسبت سے اگر وہ "مولانا" نہ بن سکے تو صرف "حضرت" بن کر داڑھی کے احترام پر مجبور ہو گئے تھے۔ لیکن صاف دلی کا بھلا ہو کہ پھر صفاچٹ ہو کے رہے۔

شوکت صاحب کی نفاست پسندی ان کی ہر ادا سے ظاہر ہوتی ہے۔ چنانچہ ان کی تحریر کی خوشنمائی یقیناً قابلِ دید ہوتی ہے۔ اور ایک خصوصیت تو یہی ہے جو شاذ ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ شوکت ایک صفحہ کا مضمون لکھیں یا کئی سو صفحات کی پوری کتاب۔ لیکن ان کے مسودے میں ایک حرف داخل خارج نہیں پایا جاتا۔ ہر لفظ، ہر سطر اور ہر صفحہ ابتدا سے آخر تک ایک ہی انداز کا ہوتا ہے۔ تحریر و نشست الفاظ میں کہیں بھی تبدیلی نہیں پائی جاتی۔ ان کی تحریر کا بناؤ چناؤ اور بے تکلف سلیقہ ضرب المثل ہے۔ اور اس حقیقت کا آئینہ دار کہ شوکت کی شخصیت اسی قدر مسجع ہے جس قدر ان کا مسودہ! اور ان کی طبیعت میں اسی انداز کی صفائی اور نزاکت ہے جیسی ان کے الفاظ کی نوک پلک میں۔ اگر کوئی ناواقف شخص شوکت کو کسی مضمون یا کتاب کا مسودہ لکھتے دیکھے تو وہ کبھی یہ یقین نہ کرے کہ وہ طبعزاد تصنیف میں مصروف ہیں۔ بلکہ یہ قیاس کرے کہ کہیں سے کوئی رٹا ہوا ٹکڑہ لیا ہے۔ اور اس کو اس تیزی اور صفائی سے رقم کر رہے ہیں۔ کیونکہ عموماً نقل کرنے میں بھی زیادہ تکلف اور تاخیر ہوا۔ مگر شوکت کا زود نویس قلم تصنیف میں بھی بلا تکلف سرعت سے چلتا رہتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے شوکت لکھتا پہلے ہے اور سوچتا بعد میں ہے۔ اور اسی حال گفتگو کا بھی ہے۔ بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی کا جو غیر معمولی ملکہ شوکت کو ودیعت ہوا ہے عام طور پر دیکھنے میں نہیں آتا۔ عام گفتگو میں جس طرح برجستہ فقرے سہولت کی زبان سے بلا تکلف ادا ہوتے ہیں یہی کیفیت تحریر میں بھی ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ شوکت کا اسلوبِ تحریر نہایت سادہ اور عام بول چال کی طرح بے تکلف ہے۔ یہی ثبوت ہے کہ شوکت کی گفتار و کردار تحریر میں تصنع نام کو نہیں۔ مگر سلیقہ اور نفاست کی شان نمایاں ہے۔ اور شوکت کی سب سے بڑی شان یہی ہے جس کو وہ سنِ شعور سے کر آج تک پوری آن بان کے ساتھ قائم رکھے ہوئے ہے۔ اور عمر بھر برقرار رکھنے کا اہل ہے۔ شوکت کو اپنی مخصوص شان اور نفاست و نزاکتِ مزاج سے بے حد پیار اور خلوص ہے۔ شاید ان کو اپنی جان بھی اتنی پیاری نہیں جتنی شان۔ غالباً شوکت اپنی اس خصوصیت سے خود بھی خبردار نہیں ہیں۔ اور بعض احباب کو ان کے بارے میں کبھی جو اس بات کی شکایت پیدا ہوتی ہے کہ وہ بہت متلون مزاج اور زود رنج ہیں۔ وہ یقیناً اس حقیقت سے ناواقف ہیں۔ دراصل شوکت کی شکر رنجی کا باعث اس کی اپنی شان کا خلوص ہے۔ جب اس کو کسی شخص کے بارے میں یہ شک ہوتا ہے کہ وہ اس کے مزاج و شان کے ساتھ خلوص نہیں برت رہا ہے اس وقت شوکت بلا پس و پیش اس کو اپنی جان کا مخالف سمجھنے لگتا ہے۔ اس رنجش کو شخصِ مخالف کی ذاتیات سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

شوکت اپنے متعلق خود بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ "مابدولت" میں انہوں نے اپنی ذات وصفات کے بارے میں بہت سی کھری کھری حقیقتیں بیان کر ڈالی

ہیں۔ اور بہت سی چھپی ڈھکی باتوں کو بے نقاب کر کے رکھ دیا ہے۔ اس لئے بڑی حد تک ان کی شخصیت، عادات، خصائل اور ادبی سرگرمیوں کی تفصیل ہمارے سامنے آچکی ہیں۔ لیکن میری ذاتی رائے یہ ہے کہ انھوں نے اب تک اپنی ذات کو اپنی شان کے آئینہ میں دیکھا ہے۔ جو ان کے تمام حالات و کمالات اور خصائل پر پوری طرح چھائی ہوئی ہے۔ ان کے رہن سہن، تعلقات اور تمام کوائف پر اسی کا اثر ہے۔ اور شوکت خود اس سے حد درجہ متاثر ہیں۔ یہی خلوص و صداقت شوکت کی زندگی میں رچی ہوئی ہے۔ جس کے لئے اکثر وہ دوستوں اور دشمنوں کی نظر میں بعض اوقات مطعون بھی قرار پاتے ہیں۔ اور اس کے سبب سے وہ اکثر ناکردہ گناہ بعض حلقوں میں معتوب بھی بن جاتے ہیں۔ مگر شوکت کو اس کی بہت کم آگاہی ہوتی ہے۔ اور ہوتی بھی ہے تو اس کا علاج ان کے بس کی بات نہیں۔ اس کیفیت کی بہت کچھ تفصیل اگر بغور دیکھا جائے تو شوکت کے اکثر مضامین اور افسانوں میں ملتی ہے۔ چنانچہ بہت سے ناولوں اور افسانوں کے کرداروں پر ان کی اپنی یہی شان جلوہ گر نظر آتی ہے۔

شوکت کا ایک بڑا کمال (جو معدودے چند ادیبوں میں ملتا ہے) ان کا تحریری خلوص ہے۔ عموماً کہنے یا بولنے اور لکھنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ لیکن شوکت نے ظاہر و باطن کو کمال خلوص و صداقت سے یکساں بنا کر اس تفریق کو غیر محسوس طور پر مٹا ڈالا ہے۔ جن حضرات نے شوکت کی غیر معمولی ذہانت اور شگفتہ بیانی کا آمنے سامنے اندازہ کیا ہے وہ اس حقیقت کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ اور شوکت کی ہر تحریر کو پڑھ کر ان کی گفتار کا لطف حاصل کرتے ہیں۔ اس مختصر مضمون میں، میں نے دانستہ ان عام باتوں کو نظر انداز کر دیا ہے جو اس سے پہلے اکثر مضامین اور "ما بدولت" میں تفصیل سے بیان کی جا چکی ہیں۔ اور نہ ان کے اسلوب تحریر پر کوئی تبصرہ ضروری سمجھا ہے۔ کیونکہ متذکرہ بالا خصوصیت کو بیان کرنے کے بعد ان تمام تفصیلات کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اور شوکت کے مجسم کردار کو ہم اپنے سامنے چلتا پھرتا، ہنستا بولتا اور بنتا بگڑتا دیکھ سکتے ہیں۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ کسی ادیب یا شاعر کے نام اور تخلص کا اس کی شخصیت، کردار اور عام زندگی پر بڑا اثر ہوتا ہے۔ لیکن میں ذاتی تجربہ کی بنا پر اس کلیہ کو دوسرے الفاظ میں اس طرح سمجھا ہوں کہ انسان اپنے لئے ادبی نام یا تخلص انتخاب کرتے وقت غیر محسوس طور پر اپنی فطری کیفیت نمایاں کرتا ہے چنانچہ "محمد عمر" نے اپنا تخلص "شوکت" اس لئے منتخب کیا کہ ان کی ذاتی شان و شوکت ان کو سب سے زیادہ پیاری تھی۔ اور دلی صداقت کا اظہار اس تخلص کے ذریعہ ضروری تھا۔ اس حقیقت کی مثالیں ہمارے شعر و ادب کی اکثر شخصیتوں کو سامنے رکھ کر پیش کی جا سکتی ہیں: شوکت علی خاں "بدایونی" اپنا تخلص "شوکت" رکھ سکتے تھے۔ مگر "فانی" تخلص اختیار کرنے کے بعد وہ "فنا فی الشعر" نہیں ہوئے بلکہ ان کی ذات میں یہ خصوصیت فطری طور پر موجود تھی جو تخلص کے انتخاب سے بکمال خلوص نمایاں ہوئی۔ یہی کیفیت مولانا فضل الحسن حسرت موہانی، حضرت علی سکندر جگر مراد آبادی، نواب شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی، پنڈت رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری وغیرہ حضرات کی ہے۔ اسی طرح متقدمین کا بھی حال ہے۔

جہاں تک "تھانوی" ہونے کا تعلق ہے۔ وہ ایک بار ان کی داڑھی سے ثابت ہو چکا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں ایک دلچسپ لطیفہ قابل ذکر ہے۔ شوکت اور عشرت کے درمیان جو ربط ہے اس کا اظہار ابتدائی سطور میں کر چکا ہوں۔ لکھنؤ کے قیام کے دوران میں میرے پاس ایک "خانساماں" ملازم تھا جو نہایت معقول مگر سخت بہرہ تھا۔ شوکت صاحب کو اس زمانہ میں "پنچولی" کا فلمی عارضہ لاحق ہوا اور وہ لاہور میں مقیم ہو گئے۔ لاہور سے جب کبھی وہ لکھنؤ جاتے تو "فلاش" وغیرہ کے عشق میں شب و روز کہیں اور مقیم رہتے مگر روزانہ ایک دورہ میرے مکان کا ضرور لگا لیتے۔ اور لوگوں کو اطلاع یہ ہوتی کہ میرے پاس مقیم ہیں۔ اس اطلاع کے ثبوت میں بھی شوکت کا میرے پاس آنا ضروری تھا۔ یا خلوص کے خوف میں ـــــ بہرحال جب وہ آتے اور "خانساماں" ان کو دور سے دیکھتا تو دوڑ کر مجھ کو اندر اطلاع کرتا کہ "آپ کے بھائی تھانیدار صاحب آئے ہیں" میں اور میرے گھر والے "بھائی" کی نسبت کو تو تعلقات کی بنا پر صادق آتا سمجھ لیتے۔ لیکن "تھانیدار" کا عہدہ ان کو کیونکر ملا۔ یہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ آخر ہم نے مفاہمت کے طور پر فرض کر لیا تھا کہ شوکت کی شان سے اس نے یہ عہدہ تفویض کر دیا ہوگا۔ لیکن ایک عرصہ کے بعد اس حقیقت کا انکشاف اس طرح ہوا کہ شوکت صاحب جب پہلی بار آئے تو انھوں نے خانساماں کے بہرے پن سے واقف ہو کر مجھے اطلاع کرانے کی غرض سے ایک پرچہ پر اپنا نام لکھا اور اس نے جلدی میں "شوکت تھانوی" کو "تھانیدار" پڑھا

اور 'تھانہ' کی یہ نسبت جو شوکت کی وطنی حیثیت کے علاوہ ورثہ میں بھی ملی تھی ان کے نام کے ساتھ چپکا دی۔

واضح ہو کہ شوکت کے والد صاحب مرحوم ریاست بھوپال میں افسر اعلیٰ پولیس تھے۔ شوکت صاحب کے خلوص کا ایک بیّن ثبوت تو ان کی تحریر و تقریر کی یکسانیت ہے۔ مگر اس کے علاوہ ایک انداز یہ ہے کہ کسی بزم میں یا کسی چھوٹے بڑے یا عورت مرد کے سامنے وہ گفتگو میں مصروف ہوں۔ جیسا بھی کوئی فقرہ خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ ان کے دماغ میں آئے وہ ان کی زبان سے بلا تکلف ادا ہو جائے گا۔ ایک بار انہوں نے اپنے والد صاحب کو طالب علمی کے زمانہ میں اپنی تعلیم کے سلسلے میں خط لکھتے ہوئے آخر یہ شعر چسپ کر دیا تھا ؎

مانو نہ مانو جانِ جہاں اختیار ہے ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں

گو یہ واقعہ کم عمری کے زمانہ کا ہے۔ لیکن اس سے ان کی فطری افتادِ طبع کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور اب بھی یہی دیکھنے میں آتا ہے کہ بلا لحاظ عمر و مرتبہ وہ کبھی برجستہ فقرہ چست کئے بغیر نہیں رہتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ فقرہ ادا نہ کریں تو بدہضمی ہو جائے گی۔ اس چلبلی عادت کے طفیل شوکت کے دوست احباب، عزیز و اقارب سب ہی ان سے خائف رہتے ہیں کہ معلوم نہیں کب کس کے سامنے شوکت کے ہاتھوں ان کی شامت آجائے۔ کیونکہ شوکت کی طبیعت میں جو بے پناہ آمد و روانی ہے اس کا اندازہ ابھی تک کسی کو نہیں ہو سکا۔ میرا خیال ہے کہ شوکت برجستہ جملہ ادا کر کے خود بھی بعد میں سوچتا ہے۔ کہ اس قدر روانی اور تیزی سے ایسا چست فقرہ کیونکر چسپاں ہو گیا۔ اور دیر تک وہ دل ہی دل میں خود بھی اس برجستگی کی داد دینے پر مجبور ہوتا ہے۔ یہ تو بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ شوکت چلتا پھرتا ظرافت و بذلہ سنجی کا منبع ہے۔ جس کی روانی کبھی ختم ہونے کو نہیں آتی۔ اور موزوں الفاظ کا ایک لافانی ذخیرہ ہے۔ جس کی جولانی بحرِ ذخار کی طرح طوفاں خیز رہتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال شوکت کا ہفت سالہ نشری کارنامہ "قاضی جی" ہے۔ جو ۱۹۴۷ء سے ریڈیو پاکستان کا ایک مستقل فیچر بنا ہوا ہے۔ اور ملک کے مسائلِ حاضرہ پر مخصوص اسلوب اور امتیازی شان سے تہلکہ خیز تبصرہ جاری رکھے ہوئے ہے۔ کوئی موضوع یا مسئلہ ایسا نہیں جو "قاضی جی" کے حیطۂ بیان سے باہر ہو۔ اور پھر کمال یہ کہ اس کی دل کشی اور خصوصیت اسی طرح برقرار رہتی ہے۔ دنیا بھر کے نشری اداروں میں کہیں بھی یہ مثال نہیں ملتی کہ کوئی مستقل فیچر اس اندازِ خصوصی سے اس قدر طویل استقامت کے ساتھ جاری رہا ہو۔ اور سامعین میں بھی اس کی وہ دلچسپی اسی شان سے قائم ہو جیسے "قاضی جی" ——— اور اب تو "شوکت" کا دوسرا نام "قاضی جی" ہو گیا ہے۔ اس مخصوص کردار اور اس فیچر کے دوسرے خاص خاص کرداروں کے مختلف کوائف ضرب المثل کے طور پر مشہور ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ "قاضی جی" شوکت کے لئے ایک عذاب مستقل بن کے رہ گیا ہے۔ شوکت کے اس فیچر میں بعض ایسے نشتر چھپے ہوتے ہیں جو شگفتہ پھولوں میں چھپ کر بڑے سے بڑے زخم کو آسانی سے چھیڑتے رہتے ہیں۔

شوکت کی خاص کمزوریوں میں سب سے بڑی کمزوری تو اس کی وہی شان ہے جس نے اس کو اتنی عمر میں بھی "جواں حال" بنائے رکھا ہے۔ شوکت کو کھانے پینے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ اس معاملے میں اسی قدر لاپروا ہے جس قدر لباس کے معاملے میں محتاط۔ لباس کی خوش اسلوبی اور تراش خراش سے اس کو عشق ہے۔ ویوں تو ہر قسم کا لباس پسند اور استعمال کرتا ہے۔ مگر سب سے زیادہ اس کو مشرقی اور خصوصاً لکھنوی لباس مرغوب ہے۔ چنانچہ مخصوص محفلوں میں وہ ہمیشہ سیاہ اچکن اور چوڑی دار چست پاجامہ زیبِ تن کر کے خوش ہوتا ہے۔ اور ایک بانکا سجیلا جوان بن کر اپنی شگفتہ بیانی کی روانی دکھاتا نظر آتا ہے۔

دراصل شوکت بجائے خود ایک سجی سجی محفل ہے۔ بے تکلف احباب کا کوئی مجمع شوکت کے بغیر بارونق نہیں سمجھا جاتا۔ کیسی ہی سنجیدہ اور خاموش محفل کیوں نہ ہو شوکت کی آمد وہاں ایک متبسم سیلاب بن کر جانِ محفل ثابت ہوتی ہے۔ شوکت کو اگر کسی جنازے کے مجمع میں بھی چست فقرہ سوجھ جائے تو وہ ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ اس کے بے تکلف احباب جو اس خصوصیت سے واقف ہیں، ایسے موقعوں پر شوکت کو حتی الامکان دور رکھنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ کوئی نازک مرحلہ درپیش نہ آئے۔ مرحوم رفیع احمد خاں صاحب مشہور صاحبِ طرز ہزل گو، ہمارے حلقۂ احباب میں بہت محبوب

مخلص دوست تھے۔ اور اصل یہ ہے کہ ان کی بے وقت اور اچانک موت نے بزمِ احباب میں ناقابلِ تلافی کمی واقع کی ہے۔ شوکت صاحب اور رفیع احمد خاں صاحب مرحوم قدیمی ہم پیالہ و ہم نوالہ تھے۔ اور دونوں ایک دوسرے کی رنگ رگ سے واقف۔ خانصاحب مرحوم کی خالہ جنہوں نے مرحوم کو بیٹے کی طرح پرورش کیا تھا وفات پاگئیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی رفیقہ اور شفیق عزیزہ کی وفات پر خانصاحب کو کس قدر صدمہ تھا۔ اور ان کے احباب کی شرکت اس سانحہ میں کتنی ضروری تھی۔ لیکن خانصاحب کو دیکھا گیا کہ وہ آنسو پونچھ پونچھ کر ہر طرف یہ دیکھ رہے ہیں کہ شوکت صاحب کدھر ہیں۔ اور شوکت صاحب پر نظر پڑتے ہی رونا دھونا بھول کر انہیں مجمع سے الگ لے گئے۔ اور ہاتھ جوڑ کر منت سماجت کی کہ میں نے عمر بھر تمہاری مرضی کے خلاف تمہیں کسی بات پر مجبور نہیں کیا۔ مگر اس وقت یہ درخواست منوا کر چھوڑوں گا کہ تم یہاں سے ابھی چلے جاؤ۔" شوکت حیران و پریشان تھے کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر خانصاحب کا یہ احتراز کیوں ہے۔ اور ان کی یہ بات وہ کیسے مانیں۔ جبکہ خانصاحب کی ان بزرگ رفیقہ کو وہ اپنی بزرگ تصور کرتے تھے۔ شوکت کا انکار بڑھتے دیکھ کر خانصاحب نے کہا "تو پھر تم یہاں رہو میں خود کہیں چلا جاتا ہوں ورنہ ابھی تم کوئی نہ کوئی موقعہ تلاش کر لوگے اور میں بے ساختہ ہنسنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ مجھے اس ذلت سے بچانا ہے تو فوراً چلے جاؤ۔" آخر شوکت لاچار ہو گئے اور اپنا سا منہ لے کر بادلِ ناخواستہ وہاں سے رخصت ہونا پڑا۔ اس عبرت ناک واقعہ کے بعد شوکت نے ایسے مواقع پر ہر چند سنجیدہ بننے کی کوشش کی مگر ان کے دماغ کی لہریں ان کے بس کی نہیں۔ اس لئے وہ اپنے اوپر قابو نہیں رکھ سکتے۔

اسی طرح ایک بار محرم الحرام کے موقعہ پر لکھنؤ کی ایک "بزمِ عزا" میں چند احباب شریک تھے۔ ان میں بلا اختلافِ عقیدہ بے تعصب سنجیدہ اصحاب شریک تھے۔ اس بزم میں شوکت صاحب بھی جو کسی صوبہ جاتی یا فرقہ وارانہ تعصب و اختلاف کے قائل نہیں موجود تھے۔ شوکت کے برابر بیٹھے ہوئے ایک شیعہ دوست پر مصائبِ کربلا کے ذکر پر رقت طاری تھی۔ اور ان کی زبان سے بآوازِ بلند یہ فقرے ادا ہوئے "بخدا اب نہیں سنا جاتا! کیا کروں؟" شوکت نے ان کے کان میں برجستہ کہا "سنّی ہو جاؤ!" ان دوست کو بے اختیار ہنسی آگئی۔ اور انہوں نے رومال سے منہ چھپا لیا۔ غرض اس قسم کے متعدد حادثے گزر چکے ہیں اور آیندہ بھی گزرتے رہنے کا یقین ہے!

حقیقت یہ ہے کہ زندہ دلی کے ایک دلکش اور نفیس حادثہ کا نام "شوکت تھانوی" ہے!

احباب اور قارئین

ایک بات نوٹ فرمالیں۔ کہ اب تمام خط و کتابت مندرجہ ذیل پتے پر ہونی چاہیئے

ادارۂ فروغِ اردو - ۱۱ - مال روڈ - لاہور

ماہنامہ "نقوش" - ۱۱ - مال روڈ - لاہور

۱۱ - ایبک روڈ - انارکلی اب صرف سیل ڈپو ہے